فسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون

مُعْجَمُ الْدِّیْنِ

از

شمس العلماء مفسر القرآن پیر و مرشد مولٰنا

سید میرانجی عابد خوندمیری

صاحب دامت فیوضہم

مُعْجَمُ الْدِّیْنِ از شمس العلماء مفسر القرآن پیرو مرشد مولٰنا سید میرانجی عابد خوندمیری صاحب دامت فیوضہم

﴿جدولِ حروف﴾

ا	1 تا 230	ب	231 تا 313	پ	314 تا 323
ت	324 تا 437	ٹ	- تا -	ث	438 تا 440
ج	441 تا 458	چ	459 تا 461	ح	462 تا 573
خ	574 تا 594	د	595 تا 687	ڈ	- تا -
ذ	688 تا 696	ر	697 تا 717	ڑ	- تا -
ز	718 تا 726	ژ	- تا -	س	727 تا 771
ش	772 تا 834	ص	835 تا 849	ض	850 تا 855
ط	856 تا 865	ظ	866 تا 867	ع	868 تا 917
غ	918 تا 937	ف	938 تا 963	ق	964 تا 1018
ک	1019 تا 1048	گ	1048 تا 1049	ل	1050 تا 1054
م	1055 تا 1153	ن	1154 تا 1197	ں	- تا -
و	1198 تا 1204	ھ	1205 تا 1210	ء	- تا -
ی	1211 تا 1235	ے	- تا		

فہرستِ عنوانات

الف

ب

پ

ت

ث

ج

چ

ح

خ

د

ذ

ر

ز

س

ش

غ

ف

ق

ک

گ

ن

و

مقدّمہ

العبد الفقیر سید میراں جی عابد خوندمیری بن حضرت سید اشرف صاحب تشریف اللّٰہیؒ بن حضرت سید میراں جی میاں صاحبؒ بن حضرت میاں سید اشرف صاحبؒ بن حضرت میاں سید زین العابدین صاحبؒ بن حضرت سید میراں جی صاحبؒ بن حضرت میاں سید زین العابدینؒ بن حضرت سید شریف میاں صاحبؒ بن حضرت میاں سید راج محمد صاحبؒ بن حضرت میاں سید طاہر غازیؒ بن حضرت میاں سید راج محمد غازیؒ بن حضرت بندگی میاں سید سعد اللہ غازیؒ بن حضرت بندگی میاں سید شریف تشریف اللہؒ بن حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہداءؓ بدلہ مہدی موعود، حامل بار امانت حجت مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بن سید موسیٰؒ بن سید خوندمیرؒ بن سید جلالؒ بن سید خوندمیر سعیدؒ بن سید عبد اللہؒ بن سید عبد القادرؒ (المعروف سید قادن) بن سید عیسیٰؒ بن سید احمدؒ بن سید حیدرؒ بن سید نجم الدینؒ بن امیر سید نعمت اللہؒ بن امیر سید اسمٰعیلؒ بن حضرت امام موسیٰ کاظمؒ بن امام جعفر صادقؒ بن امام محمد باقرؒ بن امام زین العابدینؒ بن امام حسین شہید کربلاؓ بن امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہؓ۔

اس کتاب کی بنیاد حدیث جبرئیل ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کے دریافت کرنے پر ارکان اسلام، ایمان اور احسان کی مختصر مگر جامع تشریح بیان فرمائی ہے۔

اسلام کے تعلق سے جبرئیلؑ کے سوال پر حضور ختمی مرتبت ﷺ نے جو جواب دیا ہے اور جن امور کا ذکر فرمایا ہے ان کی جامع تشریح ہے اور ان امور کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی پابندی سے عبادت کرنے والا اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

نیز یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ "عبادات" راستے ہیں، منزل مقصود "خدا" ہے، راستوں کے اختلاف کت شکر میں پڑ کر عبادت کرنے والا مقصود سے دور بھی ہو سکتا ہے، ذہن میں یہ بات رکھنا ضروری ہے کہ عبادات راستے ہیں اور خدا ہمارا مقصود ہے اور اس کیلئے یکسوئی کی ضرورت ہے اور خدا کو یکسوئی ہی پسند ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو "حنیف" کے نام سے یاد فرمایا ہے۔

ایمان کے باب میں عقائد کا ذکر ہے۔ عقائد کی صحت کے بغیر اعمال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ انسان بظاہر لاکھ عمل کرے، لیکن جب اسکا اعتقاد وہ نہ ہو جو قرآن میں اللہ نے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقوال شریفہ اور اعمال رفیعہ سے بیان کیا ہے تو اسکے سارے اعمال قیامت کے دن حبط ہو جائیں گے۔ اس کے پیش نظر عقائد صحیحہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی

اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

احسان کے باب میں جو کہ دین کا اعلیٰ ترین باب ہے، ان امور کا ذکر کیا گیا ہے جن کو ملحوظ رکھنے سے بندہ اللہ کا دیدار حاصل کر سکتا ہے یا دیدار الٰہی کی طلب اس میں پیدا ہو سکتی ہے۔ احسان کو تصوف کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ اور ماننا چاہئے۔ پس اسکی ''اصل'' کیا ہے اور اسکی ''فصل'' کیا ہے۔ اسکی ''زمین'' کونسی ہے۔ اس کیلئے کونسا بیج (تخم) درکار ہے، اس کو کیسے بویا جاتا ہے۔ اسکی سیرابی کس طرح کی جاتی ہے۔ اسکی حدبندی کیسی ہونی چاہئے، اسکی فصل کب نکلتی ہے اور اسکی حفاظت کن موذی عناصر و بہائم سے کرنی چاہئے وغیرہ کی تفصیل بھی قرآن شریف اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال مبارکہ کی روشنی میں دی گئی ہے۔

عقائد کے سلسلے میں سب سے اہم اور سب پر حاوی ''عقیدۂ توحید'' ہے۔ اور اس کا مرکزی نقطہ وجود باریٔ تعالیٰ ہے۔ اس لئے اس پر بھی خاص بحث کی گئی ہے تاکہ موحدین کو کافی تقویت نصیب ہو۔ خود اللہ تعالیٰ نے جن جن آیتوں کے ذریعہ اپنے مقدس وجود کو ثابت کیا ہے۔ ان کو بیک وقت نظر میں لاتے ہوئے اور ان پر غور و خوص کرتے ہوئے اللہ پر ایمان لانے کی توفیق ملے۔

قرآن اور اس کی آیتوں کی تفسیر کے تعلق سے بعض مقامات پر جو بے اعتدالیاں مروی ہوئی ہیں ان کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے منشاء و مراد کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی گئی ہے یعنی قرآن میں بعض مفسرین نے، نسخ، تکرار، حذف، جملۂ مستانفہ، حرف زائد، استثناء منقطع اور جملۂ معترضہ کو تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ یہ امور فصحاء و بلغاء کے کلام میں عیوب میں داخل ہیں تو کلام الٰہی کو تو ان عیوب سے عاری ہونا چاہئے، ان امور پر بھی مدلّل بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کلام الٰہی میں جو قیامت تک کیلئے باعتبار فصاحت، بلاغت، بداعت، بیان، وعظ، حکمت، اسرار، رموز اور نکات اب تک چیالنج ہے، ان امور سے پاک ہے۔

حدیث جبرئیلؑ میں ملائکہ پر ایمان لانے کی تاکید کی گئی ہے تو ملائکہ کے سلسلے میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور قرآن میں جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے اسکی نشاندہی کی گئی ہے۔

پیغمبروں پر بھی ایمان لانے کا حکم ہے۔ تو پیغمبروں پر بھی تفصیلی بحث کرتے ہوئے قرآن شریف میں جن مقامات پر جن جن پیغمبروں کے نام آئے ہیں ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے ہر پیغمبر پر ضروری بحث کی گئی ہے اور بالخصوص حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفی خاتم الانبیاء ﷺ کے صفات، درجات اور آپؐ کے بلند ترین مقامات کی بھی قرآن کے ذریعہ نشاندہی کی گئی

ہے۔

نیز پیغمبروں کو جو کتابیں دی گئیں ان کا ذکر کرتے ہوئے بالخصوص قرآن مجید کے تعلق سے جو حضور محمد مصطفی ﷺ پر بذریعہ جبرئیل ۲۳ سال کی مدت میں نازل کیا گیا، اس کے مبارک ناموں، اسکے اعلیٰ صفات، اسکی بلند و بالا، مقام و حیثیت اور اسکی ناقابل انکار صداقت پر بھی، قرآن کے الفاظ کے ذریعہ سے ہی نشاندہی کرتے ہوئے روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرآن شریف میں یوم آخر کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کی بھی کافی وضاحت کی گئی ہے۔

قرآن میں قدر یعنی تقدیر کے تعلق سے بھی آیات آئی ہیں، ان کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے، قضاء قدر کے مسئلہ پر اور بعد کے زمانے میں اسکی جو غلط تاویلات کی گئیں اور عقلی اعتبار سے اس مسئلہ پر جو سفیہانہ اعتراضات کے گئے ہیں اور آج بھی کئے جارہے ہیں ان پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

حضور رسول اللہ ﷺ کی شان ''بحیثیت نبی'' اور ''بحیثیت عبد'' ظاہر کی گئی ہے۔

حضور ﷺ بحیثیت ''خاتم النبیین'' کے ساتھ ساتھ حیات النبیؐ پر بھی مدلّل بحث کی گئی ہے، حضور ﷺ کے ازواج مطہرات و آل اولاد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

حضور ﷺ کے غزوات کے تعلق سے بھی ضروری باتیں درج کی گئی ہیں۔

ہجرت، اخراج، ایذاء فی سبیل اللہ اور شہادت کے تعلق سے بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

خلافت راشدہ کے موضوع پر بھی بحث کی گئی ہے۔

مجیٔ مہدی موعود علیہ السلام پر قرآن، احادیث اور اقوال صوفیاء کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

احسان جس کی تعریف تصوف سے کی گئی ہے اس کی شان اور اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے، نیز احسان یا تصوف کے بارے میں جو اختلافات ہیں یعنی بعض لوگ تصوف کو شریعت کے بالمقابل سمجھتے ہیں تو بعض لوگ شریعت سے آزاد مسلک کو تصوف کا نام دیتے ہیں اور بعض لوگوں نے چند ظاہری رسوم کی ادائی کو شریعت اور بعض لوگوں نے طریقت کے بعض رسوم کی پابندی کو طریقت یا تصوف کا نام دے دیا، اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اصل طریقت یا تصوف کیا ہے، اس کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسائل احسان میں بیعت، ذکر وفکر، مراقبہ، مشاہدہ، معائنہ، مغائبہ، حال، مقام، حقیقت، معرفت، ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، جمع، تفریق، وحدت الشہود، وحدت الوجود، تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیۂ روح، فناء، بقاء، صبر، شکر، قناعت، توکل، ترک دنیا جیسے افعال حمیدہ اور اعمال مرضیہ جو بندہ کو خدا تک پہنچاتے ہیں۔ اور حسد، غرور، انا (خودی وخود پرستی) ریاء (شرک خفی)، نفاق، بخل، طلب دنیا وطلب جاہ وباہ، جیسے اخلاق ذمیمہ اور اعمال مردودیہ کی تفصیل قرآن واحادیث کی روشنی میں دی گئی ہے۔

علاوہ ازیں حضرت مہدی موعودؑ کا دعویٰ، دعوت، ارکان دعوت، آپؑ کی سیرت، آپؑ کے فرامین پر قرآن شریف اور سنت رسول اللہ و کی روشنی میں مدلّل، مفصّل اور مکمّل بحث کرتے ہوئے مندرجہ بالا عنوانات پر مخالفین کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ نیز ضرورت مرشد، بیعت، صحبتِ مرشد وصحبتِ صادقین، پس خوردہ، بہرۂ عام، نذر نیاز و فاتحہ، ایصال ثواب برائے مرحومین ومجالس میلاد برائے بیان سیرت مقدسہ خاتم نبوت وخاتم ولایت وخلفاء راشدین واہل بیت واولیاء کرام وصوفیاء عظام اور ایسے ہی دیگر عناوین پر کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

نیز اسلام اور مہدویت پر مختلف گوشوں سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں اور کئے جاتے رہے ہیں ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ تاکہ عقائد میں مضبوطی اور استقامت ہو اور دلوں کا خلجان دور ہو۔

اس کتاب کا نام ''معجم الدین'' رکھا گیا ہے۔ عربی میں جسے ''معجم'' کہا جاتا ہے، انگریزی میں اسے ENCYCLOPAEDIA کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں A book of knowledge of all sciences اردو میں اس کا ترجمہ مخزن العلوم، قاموس، دائرۃ المعارف سے کیا گیا ہے۔

{concise twenty first century dictionary by M Raza-ul-Haq Badakhshani, M Saqlain Bhatti page no-229}

نیز معجم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی ترتیب میں ابجد یعنی ا، ب، پ، ت کی ترتیب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، جیسے الف کے تحت اللہ، اللہ دیا، ایمان، اخلاص وغیرہ اور ''ب'' کے تحت بصیرت، بہرہ عام، برّ، اسی طرح ''ی'' تک الفاظ اور ان کے متعلق تشریح کی جاتی ہے، تاکہ پڑھنے والا اپنے مطلب کا لفظ بآسانی ڈھونڈھ لے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرلے۔

اسی آسانی کے پیش نظر حدیث کی کتابوں کو بھی اسی بنیاد ونہج پر مدوّن کیا گیا ہے چنانچہ ''معجم الطبرانی''۔ اور قرآن

شریف کے الفاظ کے معانی معلوم کرنے کیلئے حروف تہجّی کی ترتیب ہی کو اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ محمد فواد عبد الباقی نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "المعجم المفهرس لالفاظ القران الكريم" (دارالمعرفہ۔ بیروت)

اسی طرح لغت میں بھی بعض لوگوں نے یہی ترتیب اختیار کی ہے، جیسے "معجمة اللغة العربية المعاصرة" (جے، ملٹن کوان)

نیز یاقوت حموی نے "معجم البلدان" نامی کتاب لکھی ہے۔ جس میں شہروں سے متعلق ابجد کی ترتیب پر تفصیل ہے۔

اسی طرح کم مایہ فقیر نے جو عقیدہ میں چست اور عمل میں سست اور علم کے دریا کا ایک قطرہ ہے، اس پُر فتن ماحول کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے، جس میں کہیں افراط ہے تو کہیں تفریط، کہیں اعراض ہے تو کہیں اغماض، کہیں انبساط ہے تو کہیں انقباض، کہیں اظہار ہے تو کہیں بیزاری، یہ مناسب سمجھا کہ اسلام، ایمان اور احسان کے موضوعات پر ایک مختصر خدمت انجام دوں، تاکہ دین کی طلب رکھنے والوں اور حق کی تلاش میں سرگرداں اور مایوس اذہان کو چند کرنیں مل جائیں جن کی روشنی میں وہ اپنا سفر شروع کر سکیں تا آنکہ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔

اس بات کا قوی احساس ہے کہ منتخب کردہ عنوانوں کا پورا حق ادا نہیں کیا جا سکا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہیں تشنہ بھی نہیں رکھا گیا۔ اندیشہ تھا کہ کتاب بہت طویل اور ضخیم ہو جائے گی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "ما لا يدرك كلّه لا يترك كلّه" یعنی جس چیز کے کل کا ادراک (احاطہ) نہیں کیا جا سکتا، اسکے کل کو چھوڑا بھی نہیں جاتا۔

آج کا زمانہ تو ایسا ہے کہ لوگ طویل مضامین کے پڑھنے کے نہ تو عادی ہیں اور نہ متحمل، بس شارٹ نوٹس پڑھ لیتے ہیں اور ان سے ہی ان کی تسکین ہو جاتی ہے۔

اور بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو صرف بنیادی باتوں کی تلاش کر لیتے ہیں، تفاصیل اور اختلافات کے چکّر میں پڑنا تو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اس نقطہ کو سامنے رکھتے ہوئے بعض مقامات پر اور خصوصاً اصطلاحات کے مواقع پر صرف تعریفات لکھنے پر اکتفا کیا گیا، اور سچّی بات تو یہ ہے کہ ان مقامات کی محض الفاظ کے ذریعہ تفہیم ہو بھی نہیں سکتی، جب تک کہ وہ ان مقامات کی، طالب کو، اپنی صحبت میں رکھ کر نشان دہی نہ کرائی جائے۔

حوالہ جات کے تعلق سے عرض ہے کہ قرآن شریف اور احادیث کے سلسلے میں پوری توجہ دیتے ہوئے عرق ریزی

کے ساتھ سورتوں کے نام اور آیتوں کے نمبر دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ احادیث کے سلسلے میں بھی کتابوں میں مندرج حوالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

جہاں ضرورت محسوس ہوئی تنقید و تبصرہ سے بھی کام لیا گیا ہے اور اس کے متعلق بھی حوالے درج کئے گئے ہیں۔

شمس الدین محمد بن العلا یابلی فرمایا کرتے تھے۔ "کہ کوئی شخص جب کسی کتاب کی تالیف کرے تو مندرجہ ذیل سات شرائط کو پیش نظر رکھے۔ (۱) ایسی چیز تالیف کرے جسکی طرف اس سے پہلے کسی کا ذہن نہ گیا ہو۔ (۲) کوئی چیز نامکمل ہو جسکی تکمیل مقصود ہو (۳) کوئی چیز مغلق ہو اور اسکی شرح پیش نظر ہو، (۴) کوئی چیز طویل ہو، اسے مختصر کرنا مقصود ہو، مگر اس اختصار میں معانی اور تفسیر مطالب کو راہ نہ دے (۵) کسی بات میں خلط مبحث ہو جسے صحیح ترتیب میں لانا مقصود ہو (۶) کوئی ایسی چیز جس میں مصنف نے کوئی غلطی کی ہو اور یہ اسکی تصحیح چاہتا ہو۔ (۷) کوئی چیز منتشر ہو جسے جمع کیا جائے، اگر کسی کتاب کی تالیف میں مندرجہ بالا سات وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ نہ پائی جائے تو ایسی تصنیف تضئیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔

واضح ہو کہ یہ کتاب اپنی موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے پہلی اور منفرد ہے، اور جیسی بھی ہے ناظرین کے سامنے حاضر ہے۔ تقاضہ تو یہ تھا کہ اس سلسلے میں ایک جماعت بالاتفاق یہ کام کرتی تو یہ ہوتا کہ ہر موضوع اور مضمون کے تعلق سے پورا مواد جمع ہوتا اور کوئی دفاتر اس طرح معرض وجود میں آتے کہ کسی قسم کی تشنگی محسوس نہ ہوتی۔ لیکن اس کمترین اور بے بضاعت فقیر نے یہ بیڑا اٹھایا تو امر لازمی ہے کہ بعض عنوانات یا تو نظر سے رہ گئے ہیں یا فقیر نے اپنی دانست میں ان کو ضروری نہ سمجھا، بہرحال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر کہ مصداق، ضروری مضامین و عنوانات سپرد قلم کئے ہیں، جن کو میں "سیر حاصل" تو نہیں کہتا، البتہ "ناشتہ {break fast}" کہہ سکتا ہوں، اور امید ہے کہ بزمانۂ آئندہ اس اہم ترین ضرورت کی تکمیل کیلئے کوئی ہمہ گیر شخصیت یا شخصیتوں پر مشتمل ایک جماعت اس خلا کو پر کرنے میں اپنی پوری قوت و طاقت صرف کرے گی۔

اس خصوص میں اور دو باتیں قابل ذکر ہیں، ایک تو یہ کہ مسوّدہ کو مبیضّہ کرنے اور پروف ریڈنگ و نظر ثانی کرنے نیز عناوین کی ترتیب و تبویب میں فرزندان دلبندان عزیزم فرزند ارجمند سید اشرف روحی خوندمیری، افضل العلماء مدراس یونیورسٹی عزیزم فرزند دلبند سید طاسین آغا عرشی خوندمیری، افضل العلماء، مدارس یونیورسٹی نے اپنا وقت دیا جس کی وجہ سے کتابت اور طباعت کے مرحلے طے کرنے میں آسانی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خدائے رحیم و کریم اور علیم و خبیر ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور نہ صرف دنیا اور دین میں ان کو اجر عظیم عطا فرمائے بلکہ دین اور قوم کی ہمہ جہتی خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، آمین، ثم آمین۔

لکھنے کے اعتبار سے آخر میں اور اصولی اعتبار سے اولاً شکریہ اور دلی دعاؤں کے مستحق ہیں ادارۂ دار المعارف کے عہدیدار اور اراکین جنھوں نے اس کتاب کی ضرورت اور افادیت کو سمجھ کر اسکی طباعت کی ذمہ داری اپنے سر، اپنی خوشی سے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور ایک اہم قومی خدمت انجام دینے کی غرض سے، لی۔

ادارۂ ھذا بحمد اللہ تعلیم یافتہ ہے، اس کے افراد قوم کے ہمدرد ہیں، تعلیم کے میدان میں طلباء و طالبات کی خدمت کر رہے ہیں، ادارۂ دار المعارف ۱۹۶۵ء میں قائم ہوا، بحمد اللہ مسلسل ۱۵ سال سے اشاعت و تبلیغ کا کام کر رہا ہے۔ اس ادرارہ کے زیر اہتمام تقریباً ۴۲ کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ دینی محافل کا انعقاد اور بالخصوص دینی تربیتی گاہ (ورک شاپ) کا اہتمام بھی اسی ادارے کی ذیلی شاخ ''شائنگ جمس آف مہدویہ'' کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ ادارے کے علاوہ جن جن مخیّر حضرات نے اس کتاب کی اشاعت میں مالی مدد فرمائی ہے وہ قابل قدر اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے انہیں نوازے اور قوم و دین کی مزید خدمت کرنے کے مواقع عطا فرماتے ہوئے، انہیں دنیا اور آخرت میں خیر جزاء عطا فرمائے اور یعنی اپنے دیدار سے مشرف فرمائے، بطفیل حضرت خاتم الانبیاء و افضل الرسل محمد مصطفی ﷺ و خاتم الاولیاء حضرت سید محمد مہدی موعود خلیفۃ اللہ الودود علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

المختصر یہ جو کچھ ہوا ہے اللہ ہی کا فضل و احسان ہے، اس ہیچ مداں فقیر کی کیا بساط؟ بقول شاعر:

گر موج زند عنایت او؛ موراں کنند کار پیلاں۔ ترجمہ: اگر اسکی عنایت کا بحر موج مارے تو چیونٹیاں بھی ہاتھیوں کا کام کریں۔

نیز احادیث میں آتا ہے کہ۔ ''ان الله يفعل بالضعيف ما يتحيّر فيه القوي'' اللہ ضعیف و کمزور سے وہ کام کرا لیتا ہے جس میں طاقتور بھی حیران (عاجز) ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ عمر ۸۶ سال، کندھے کمزور، بوجھ زیادہ، اللہ کا نام لیکر شروع کیا ہوا کام انجام تک پہنچا، اللہ تعالیٰ کی واحد کتاب جو ہر قسم کے سقم، عیب، خطا اور غلطی سے معرّا ہے، وہ قرآن کریم ہے، اس کا مصنف بھی بے عیب ہے۔ اسے چھوڑ کر باقی کتابیں، تو ان میں احتیاط کے باوجود سقم اور غلطی ہو جاتی ہے، اس فقیر کی اس تالیف میں کچھ سقم ہو تو پڑھنے والوں سے امید ہے کہ وہ بنظر عفو مطالعہ فرمائیں اور ہو سکے تو اغلاط سے مطلع فرمائیں، تا کہ آئندہ احتیاط ہو سکے اور تلافیٔ مافات کی صورت نکل آئے۔ پسند خاطر ہو تو دعاؤں سے ممنون فرمائیں۔

اللہ

پروردگار عالم اپنی ذات میں صاحب جمال، صفات میں صاحب کمال، اور شان صاحب کمال ہے، حیات میں ازلی و ابدی، علم میں بے مثل، عزم میں مختار کل، اختیارات و اقتدار میں یکتا ہے، رحمت ورأفت میں سب سے بہتر ہے، اور جلال و جبروت میں سب پر غالب ہے، حاکمیت و ملکیت میں واحد، عطاو قضاء میں بے نیاز، قدرت ورازقیت میں صاحب عظمت ہے، ربوبیت اور کفالت میں سب سے افضل ہے، بصیرت ولطافت میں اکمل ہے، بزرگی میں جلیل و کریم ہے، غرض یہ کہ اس جیسا نہ کوئی تھا نہ کوئی ہے نہ کوئی ہوگا، جس طرح اس کی ذات یکتا (بے مثل) ہے ایسی ہی اسکی ہر تخلیق جامع، اکمل اور پر از حکمت ہے۔

چناچہ اللہ کی تعریف عقائد کی مشہور کتاب "عقائد نسفی" میں اس طرح لکھی گئی ہے۔

"والمحدث للعالم هو الله تعالى، الواحد، القديم، الحي، القادر، العليم، السميع، البصير، الشائي، المريد، ليس بعرض، ولا جسم، ولا جوهر، ولا مصور، ولا محدود، ولا معدود، ولا متبعض، ولا متجزئ، ولا متناه، ولا يوصف بالماهية، ولا بالكيفية، ولا يتمكن في مكان، ولا يجري عليه زمان، ولا يشبهه شيء، ولا يخرج عن علمه وقدرته شيء وله صفات أزلية قائمة بذاته، وهي لا هو ولا غيره"

ترجمہ: عالم کو پیدا کرنا والا اللہ تعالیٰ ہے، جو واحد ہے قدیم ہے زندہ ہے جاننے والا ہے سننے والا ہے دیکھنے والا ہے چاہنے والا ہے ارادہ کرنے والا ہے اور وہ نہ عرض ہے اور نہ جسم ہے، اور نہ جوہر ہے اور نہ اس کی تصویر ہے، نہ محدود ہے اور نہ گنتی میں آنے والا ہے، نہ اس کا کوئی بعض ہے اور نہ اس کے کوئی اجزاء ہیں، وہ نہ مرکب ہے نہ اس کی کوئی انتہاء ہے، اس کی تعریف نہ ماہیت سے کی جاسکتی ہے اور نہ کیفیت سے، وہ کسی مکان میں نہیں اور نہ اس پر کوئی زمانہ آتا ہے، اور نہ اس کے مشابہ کوئی چیز ہے، اس کے علم اور قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں ہے، اس کی صفات ازلی ہیں جو اسکی ذات کے ساتھ قائم ہیں، اس کی صفات نہ اسکی ذات ہیں نہ اس کے غیر ہیں۔

نوٹ۔ وہ کسی مکاں میں نہیں ہے لیکن وہ ہر جگہ موجود ہے، چناچہ قرآن میں آیا ہے، "فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ" ﴿بقر۔۱۱۵﴾ یعنی تم اپنے منہ جدھر پھیرو گے وہاں اللہ کا منہ ہے یعنی اللہ کی ذات۔

حضرت مہدی موعودؑ نے اللہ کی تعریف چار چیزوں سے اسطرح فرمائی ہے۔ یعنی (۱) عشق ذات خدا است۔ (۲) برّ ذات خدا است۔ (۳) ایمان ذات خدا است۔ (۴) امانت ذات خدا است۔ اس کی تفصیل اسکے موقع پر آئے گی، ان شاء اللہ۔

اللہ اسم ذات ہے اور وہ ذات سے کچھ تفاوت و تجاوز نہیں رکھتا، اسم اللہ چار حروف ہیں، ایک۔ **الف**، دو۔ **لام**، ایک۔ **ھاء**۔ اگر **اللّــہ** سے الف جدا کر دو تو "**لله**" ہو گا، اور اگر پہلا 'لام' جدا کر دو تو "**له**" رہیگا، اور اگر دوسرا 'لام' بھی جدا کر دو تو "**هُ**" (ھو) رہیگا۔ یہ چاروں اسم، اسم اعظم ہیں۔ اللہ، للہ، لہ، ھو، ذات باقی رہیگی، بجز ذات کے سب فانی ہے۔

دادۂ خود سپہر بستاند اسم اللہ جاوداں ماند ترجمہ: آسمان اپنا دیا ہوا (آخر میں) لے لیگا اور صرف اسم اللہ ہمیشہ کو باقی رہیگا۔

مسلمانوں کے پاس اللہ کی ذات کی تعریف یہی ہے کہ وہ کمال مطلق ہے، نیز اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ "**المستجمع لصفاته الكماليه**" یعنی وہ ہستی جو سارے صفات کمالیہ کی جامع ہے، "**لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ**" ﴿الشوری: ۱۱﴾ "اس کے جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ عقل بھی اس کی دین ہے لیکن "**اله**" یا "**اللّٰه**" کا تصور مختلف زمانوں میں مختلف ہوتا گیا، شروع میں تو معبود ایک ہی تھا، لیکن جیسا جیسا زمانہ آگے بڑھتا گیا، "**اله**" کے تعلق سے نظریات بھی مختلف ہوتے گئے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام نے ایک خدا کی ہی تعلیم دی تھی، لیکن ان کے اس دنیا سے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے ان کی ہی خیالی تصویروں اور اس زمانے کے صالحین کی خیالی شکلوں کی عبادت شروع کی، پھر جب انہوں نے عقل کا ہاتھ تھاما تو عقل نے ان کو اسباب کی طرف موڑ دیا اور وہ مسبب الاسباب سے ہٹ کر اسباب کی پرستش کرنے لگ گئے، چونکہ اسباب کا موضوع و میدان بہت وسیع تھا، اسلئے ہر ایک نے اپنی دانست میں جس کو اصل یا مرکز سمجھا اس کو معبود بنا ڈالا، اس طرح کئی معبود بنا لئے گئے یعنی معبود افکار کے تابع ہو گئے اور اس میں سب سے بڑا "رول" عقل ہی نے ادا کیا، لیکن ان کو کون سمجھائے کہ عقل خالق نہیں ہے، اور نہ ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ ہوا کہ بعد کے زمانے میں جب فلسفہ نے ترقی کی تو عقل کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا، اس نے اب یہ پٹی پڑھائی کہ خدا ہے ہی نہیں، اس لئے کہ وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، اب ان کون سمجھائے کہ اللہ نے عقل عنایت کی تاکہ اللہ کی مخلوقات اور اس کاءنات کو دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس ساری مشنری اور اس پورے نظام کا کوئی منتظم اور مدبر ہونا چاہیئے اور وہ نہ مادّہ ہو سکتا، نہ محدود۔ لیکن افسوس کہ ان نام نہاد عقل مندوں نے اسی کی عطا کردہ عقل کو اس کے خلاف استعمال کر لیا۔ چونکہ کتاب "**اللّــہ**" کے مصنف نے اس سلسلہ میں کیا ہی اچھی بات لکھی ہے۔ "**فالكائن الذي يستحق الايمان به هو الاكائن الذي يتصف بالكمال المطلق في جميع الصفات و غير معقول ان يكون سبب الايمان هو السبب المبطل للايمان** (ص ۲۹۵) ترجمہ: جو ہستی ایمان کی مستحق ہے، وہ وہی ہے جو تمام صفات میں مطلق کمال سے متصف ہو اور یہ تو نا معقول بات ہے کہ جو ایمان کا سبب ہے، وہی ایمان کو باطل کرنے کا سبب بن جائے۔

ایک اور جگہ لکھا ہے "**فكل ما نعلمه انه جل وعلا، كمال مطلق و ان العقل المحدود لا يحيط بالكمال**

المطلق الذي ليســـت له حدود وليس لهذا العقل ان يقول للكمال المطلق كيف يكون و كيف يفعل و كيف يريد "ہماری معلومات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کمال مطلق ہے اور عقل محدود اس کمال مطلق کا احاطہ نہیں کر سکتی، جو غیر محدود ہے، اور اس محدود عقل کو یہ کہنا کا حق نہیں ہے کہ وہ کمال مطلق کے بارے میں کہے کہ وہ کیسا ہے اور کیسا کر تا ہے اور کیسا ارادہ کر تا ہے (کتاب فی نشاءۃ العقیدۃ الالٰہیہ۔ عباس محمود العقاد۔ دار المعارف، ص ۲۹۴)

آدم علیہ السلام

قرآن شریف میں آدمؑ کا نام اور ذکر ۳۵ مرتبہ آیا ہے۔

(۱) پہلے یہ ذکر ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھلائے، پھر ان کو فرشتوں کے پاس لایا فرشتوں سے کہا کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی پھر اللہ نے آدمؑ سے فرمایا کہ فرشتوں کو چیزوں کے نام بتلاؤ آپ نے بتلا دیا۔ پھر اللہ نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا اسکے بعد اللہ نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور تم دونوں اس میں جو چاہو اور جہاں سے چاہو فراغت سے کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔ ورنہ نافرمانوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے آدم و حوا کو پھسلا کر اس درخت ممنوعہ کا پھل کھلا دیا۔ اللہ نے ان دونوں کو بھی جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا اور کہا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ ایک تو یہ کہ شیطان آدمی کا دشمن رہے گا اور جو اللہ والے ہیں وہ شیطان کو اپنا دشمن سمجھیں گے اور دوسرا یہ کہ انسان بھی ایک دوسرے کے دشمن رہیں گے یہی وجہ ہے کہ نبی آدم میں ایک دوسرے کا حسد، بغض اور عناد کارفرما ہے۔

مقام عزت سے نکالے جانے پر آدمؑ بہت نادم ہوئے برسوں زار و قطار روتے رہے۔ پھر اللہ نے ان کو چند کلمات اِلقاء کئے جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی لیکن زمین پر ہی رکھا گیا اس لئے کہ ان کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا تھا نہ کہ خلیفہ فی الجنۃ (یہ تمام باتیں البقرہ میں بتائی گئی ہیں)۔

(۲) آل عمران میں اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے آدم، نوح۔ آل ابراہیم اور آل عمران کو چن لیا۔ یعنی ان کو دیگر لوگوں پر فضیلت دی ﴿آل عمران ۳۴﴾ پھر دوسری جگہ فرمایا بے شک عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے پاس آدم کی سی ہے۔ اللہ نے ان کو پہلے مٹی سے پیدا کیا پھر کہا (انسان ہو جاؤ تو وہ انسان ہو گئے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے۔ إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّـهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿آل عمران ۵۹﴾۔ ترجمہ: بے شک اللہ کے پاس عیسیٰؑ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے ان کو مٹی سے بنایا پھر فرمایا ہو جاؤ تو وہ ہو گئے۔

(۳) سورۂ مائدہ میں آدمؑ کے دو بیٹوں کا واقعہ بیان فرمایا ہے آیت نمبر ۲۷ تا ۳۱، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمؑ کے زمانے میں حکم یہ تھا کہ حوا کے پیٹ سے بیک وقت جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے ان میں شادی جائز نہیں تھی بلکہ دوسری مرتبہ جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے تو پہلے کے لڑکے سے دوسری مرتبہ کی لڑکی کا نکاح درست تھا۔ آدم کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل دو جداگانہ وقت پر پیدا ہوئے تھے ان کے ساتھ دو لڑکیاں بھی پیدا ہوئی تھیں طریقے کے مطابق ہابیل کی شادی قابیل کی بہن سے اور قابیل کی

شادی ہابیل کی بہن سے ہونا تھی۔ لیکن قابیل نے ضد کی کہ جو لڑکی میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے میں اسی کے ساتھ نکاح کروں گا اللہ نے جب ماں کے پیٹ میں ہم دونوں کو جمع کیا ہے تو دنیا میں کیوں نہیں پھر آدمؑ نے فیصلہ کیا کہ تم دونوں نذر مانو اللہ جس کی نذر قبول کرے گا اسی کی بات مانی جائے گی دونوں نے اپنی قربانیاں رکھیں۔ اس وقت کے طریقے کے مطابق آسمان سے آگ آئی اور ہابیل کی قربانی لے گئی یہ قربانی کی قبولیت کی علامت تھی بجائے اس کہ قابیل اس فیصلے کو منظور کرتا حسد کی آگ میں جل کر ہابیل کو قتل کرنے کی ٹھانی ہابیل نے کہا مجھے تیرا ڈر نہیں۔ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں تو مجھے قتل بھی کردے گا تو میں تجھ پر دست درازی نہیں کروں گا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تیرے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ میرے قتل ناحق کا بوجھ بھی قیامت میں تولے جائے اور اللہ میرے بوجھ کو کم کردے لیکن قابیل غصہ کی حد پار کرچکا تھا اس نے نہ تو آدمیت کو دیکھا نہ رحم کا خیال کیا اور نہ قتل ناحق جیسے گناہ سے ڈرا۔ سچ ہے کہ حسد اور غصہ انسان کو پاگل کردیتا ہے۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کردیا۔ روئے زمین پر ہونے والا یہ پہلا قتل تھا۔ حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں جتنے قتل ناحق ہوتے ہیں ان سب کے وبال کا ایک حصہ قابیل کے سر جائے گا۔ چونکہ روئے زمین پر قتل کا یہ پہلا واقعہ تھا اور موت کا بھی۔ اس لئے اب قابیل کو پریشانی ہوئی کہ اپنے بھائی کی لاش کا کیا کرے۔ ایسے میں اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدرہا تا۔ یا یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کوّے کی لاش کو زمین کھود کر چھپا رہا تھا یعنی اس پر مٹی ڈال رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے بھی خیال ہوا کہ مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ مگر اب اپنے آپ پر افسوس کرنے لگا کہ کہ میں تو اس کوّے کے جیسا بھی نہیں ہوں اس میں جتنی سمجھ ہے اتنی بھی مجھ میں نہیں ہے مگر یہ شرمندگی قتل کی بناء پر نہیں تھی بلکہ اپنی لاعلمی وجہالت پر تھی۔

(۴) سورۂ اعراف میں آیت نمبر ۱۷۲ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور خود ان سے ان کے مقابلے میں یہ اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے جواب دیا "بَلَىٰ" کیوں نہیں۔ ہم سب گواہ ہیں۔ یہ اس لئے کیا کہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہم تو اس (توحید) سے بے خبر تھے۔ یا یوں کہو کہ شرک تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل سے ہوئے کیا اہل باطل کے اعمال کے بدلے میں تو ہم کو ہلاک کرتا ہے ﴿اعراف ۱۷۳﴾

علاوہ ازیں اللہ نے آدم کا ذکر اعراف ۱۱۔۱۹۔۲۶۔۲۷۔۳۱۔۳۵ اور اسراء میں ۶۱۔۷۰۔ کہف میں ۵۰ مریم میں ۵۸، طٰہٰ میں ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱، یٰسین میں ۶۰ میں فرمایا ہے۔ ویسے جملہ مقامات پر اللہ نے آدم و ابلیس کے واقعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اسکو تکرار کے نام سے یاد نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کی شان بلاغت یہی ہے کہ گو واقعہ ایک ہی ہو لیکن نہ صرف

بیان کا انداز جداگانہ ہے بلکہ ہر مقام پر ایک ایسانادر نکتہ ملتاہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم ان ہی نکات کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کریں گے۔

(۱) اللہ نے آدم وحوادونوں سے کہدیا تھا کہ جنت میں اطمئنان سے رہو۔ فراغت سے کھاؤ اور پیو لیکن اس درخت کے پاس نہ جاناورنہ تمہارا شمار حد سے آگے بڑھنے والوں میں ہو جائے گا۔ لیکن شیطان نے سوچا کہ جس ہستی کی وجہ سے مجھے دربار خداوندی سے ذلت کے ساتھ نکالا گیا۔ میں خدا سے تو بدلہ نہیں لے سکتا لیکن آدم وابن ادم سے بدلہ یوں لے سکتا ہوں کہ انہیں بھی اللہ کے نافرمان بنادوں۔ چنانچہ اس نے آدم اور حوا کے دلوں میں وسوسہ پیدا کر دیا اور بہت ہی خوبصورت پیرایہ میں کہا کہ اللہ نے تم کو اس درخت سے اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تم اسی جنت میں ہمیشہ ہمیشہ نہ رہ جاؤ۔ اور اس درخت کی یہی خاصیت ہے۔ اور اس جنت کی خاصیت اللہ نے خود بیان کی ہے کہ

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿طٰہ:۱۱۸،۱۱۹﴾ ترجمہ: یہاں تم کو (یہ آسائش ہے کہ) تم نہ بھوکے رہوگے نہ ننگے اور نہ پیاسے رہوگے اور نہ دھوپ میں تپوگے۔

دونوں نے شیطان کے وسوسہ کو صحیح سمجھ لیا انہوں نے سوچا کہ یہ یہاں برسوں سے ہے تو یہاں کی ہر چیز کی خاصیت سے بھی واقف ہوگا۔ مزید اس وسوسہ کو مضبوط کرنے کیلئے اس نے اللہ کی قسم بھی کھالی۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ﴿اعراف:۲۱﴾۔ اور ان دونوں کے آگے قسم بھی کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

پس معلوم ہوا کہ حکم خداوندی کے خلاف کسی کے وسوسہ کو خواہ کتنا ہی خوشنما پیرایہ میں سامنے آئے قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی طرح دشمن کی قسم کا بھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔

(۲) درخت ممنوعہ کا پھل کھانے سے دونوں برہنہ کیوں ہو گئے یعنی وہ جنتی لباس کیوں اتر گیا۔ اسکو ظاہری طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جنت میں نہ بھوک نہ پیاس نہ کوئی دوسری شہوانی خواہش۔ لیکن پھل کھالیا تو کھانے کے بعد استنجاء اور حاجت کا تقاضہ ضرور ہوتا ہے اور اس کیلئے کپڑے اتارنے ہی پڑتے ہیں۔ اور جب کپڑے یعنی جنتی لباس اتر گیا تو دونوں نے ایک دوسرے کے اعضاء دیکھے اور دوسری خواہش پیدا ہوئی تو اللہ نے کہا کہ یہاں اسکی گنجائش نہیں ہے۔ تم دنیا میں زمین پر جاؤ وہاں یہ سب چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

(۳) اللہ نے ان دونوں سے کہا کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا تو اللہ نے کہا کہ آدم بھول گئے۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴿طه:۱۱۵﴾ یعنی آدم (ہمارے اس حکم کو) بھول گئے اور ہم نے ان میں ارادے کی پختگی نہیں پائی۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ارادہ میں پختگی نہ ہو تو انسان سے نسیان ہو جاتا ہے۔

(۴) وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ﴿طٰہٰ:۱۲۱﴾ پس آدم نے اپنے رب کا حکم ماننے میں کوتاہی کی اور مطلوب سے دور ہو گئے۔

یعنی حکم الٰہی کی تعمیل میں غفلت اور کوتاہی ہو گئی اور عزم اور استقامت کا مظاہرہ نہ ہوا تو اسی کو اللہ عصیان اور غوایت (نافرمانی اور راہ بھٹکنا) کا نام دے رہا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ جو کچھ ہوا اس میں ابلیس کا کارفرمائی زیادہ تھی بلکہ وہی اصل تھا تو اللہ نے ان کو توبہ کی توفیق بخشی، جب انہوں نے صدق دل سے توبہ کی تو اسکو قبول بھی فرمایا اور ان کو برگزیدہ بھی فرمایا۔ چنانچہ اللہ کہتا ہے۔ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ﴿طٰہٰ ۱۲۲﴾۔ ترجمہ: پھر اللہ نے ان کو نواز دیا تو پھر ان پر متوجہ ہوا اور ان کو راہ پر لایا۔

ہم نے عَصَىٰ اور غَوَىٰ کا ترجمہ فقط عربیت کے لحاظ سے نہیں کیا بلکہ حضرت آدمؑ کی شان کو ملحوظ رکھتے ہوئے "کوتاہی" اور مطلوب سے دور ہو گئے سے کیا ہے کہ یہی شان ایمان ہے اور ادب کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ کہنے اور کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ہم کو نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم یا نبی آدم کے نام سے خطاب قرآن شریف میں ۲۲ مقامات پر فرمایا ہے۔

اصطلاحات

تجلی ذاتی۔ اور اگر وجود عنصری کے آثار بالکل فنا ہو گئے تو مشاہدہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ قبل موت تو یہ خلعت خاص اولاًرسول اللہ ﷺ کو عنایت ہوئی۔ اور پھر حضرت مہدیؑ کو اور ان حضرات کو جنھوں نے طلب دیدار حق میں خدا کی ذات میں اپنی ہستی وخودی کو فنا کر دیا۔ دوسری **تجلی صفاتی**۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر صفات جلالی تجلی کریں تو سالک پر خشوع و خضوع کا غلبہ ہوتا ہے اگر صفات جمالی تجلی کریں تو سالک کو سرور وانس نصیب ہوتا ہے، تیسری **تجلی افعالی** اسکی علامت یہ ہے کہ سالک کی نظر کسی مدح وذم، نفع وضرر، ردو قبول پر نہیں پڑتی۔ **تجلی روح** کے وقت سالک کے اندر عجب وپندار پیدا ہوتا ہے اور **تجلی حق** کے وقت فنا اور عجز طاری ہوتا ہے۔ بعض اوقات سالک روحانی تجلی کو ربانی تجلی سمجھ کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر مرشد کامل کی ضرورت ہے۔ **ترسا:** اس روحانی آدمی کو کہتے ہیں جو بری صفات اور نفس امارہ سے خلاصی پائے ہوئے ہے اور اچھی صفات رکھتا ہے۔

ترسابچہ: ان واردات غیبی کو کہتے ہیں جو عالم غیب سے سالک کے دل میں وارد ہوں۔

تزکیہ: اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا۔ جس طرح جسم ظاہری کے لئے ایک حالت صحت کی ہے اور ایک مرض کی۔ اسی طرح باطن کے لئے بھی ایک حالت صحت کی ہے اور ایک حالت مرض کی۔ اور نفس کو امراض سے پاک کرنا یہی تزکیہ ہے جس کا شریعت میں نہایت تاکیدی امر ہے۔

تفرد: تمام غیر اللہ کو اپنے آپ سے خالی کر لینا۔

تلوین و تمکین: سالک کے قلب کے حالات کا مختلف ہونا یعنی کبھی قبض ہو کبھی بسط کبھی سکر ہو کبھی صحو بالخصوص مبتدی کو بہت تغیر پیش آتا ہے اس کو تلوین کہتے ہیں۔ یہ لوازم سلوک سے ہے مضر نہیں ہے۔ اس سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔ دوام طاعت و کثرت ذکر میں استقامت کے ساتھ مشغول رہنے سے حسب استعداد آخر میں مناسب حالات محمودہ پر قرار ہو جاتا ہے۔ اس کو تمکین کہتے ہیں۔ تلوین والا پہچانا جاتا ہے اور صاحب تمکین کی حالت عوام جیسی ہوتی ہے۔ صاحب تلوین صاحب حال ہے اور صاحب تمکین حقیقت شناس ہے۔ صاحب تلوین ابھی راہ میں ہے اور صاحب تمکین واصل ہو چکا ہے۔

تمثل: کوئی ذات اپنی حالت وصفت کی بقاء کے باوجود کسی دوسری صورت میں ظہور کرے اس دوسری صورت کو صورت مثالی کہتے ہیں جیسے حضرت جبرئیلؑ صورت بشریہ میں متمثل ہوتے تھے یہ نہ تھا کہ فرشتے سے آدمی بن جاتے تھے۔ ورنہ

تمثل نہ ہوتا۔ بلکہ استحالہ اور انقلاب ہوتا۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ خواب و مکاشفات میں حق تعالیٰ کو صورت مثالیہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے فرمایارايت ربي في احسن صورته۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی تجلی مثالی سے نور الٰہی کو دیکھا۔ ذات خداوندی کو نہ دیکھا۔ ورنہ طالب دیدار نہ ہوتے۔ پس اللہ تعالیٰ مثل سے پاک ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ مگر مثال خود اللہ نے اپنے نور کی بیان فرمائی ہے مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ۔

جفا: مشاہدہ سے سالک کے دل کو باز رکھنا۔

جمع و فرق۔ و جمع الجمع۔ مخلوق کو یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی فاعل اور موصوف بصفات فرمایا ہے فرق ہے اور یہ سمجھنا کہ ان میں نہ کوئی فعل ہے نہ کوئی صفت حقیقتاً فاعل اور موصوف ذات حق ہے اور سب اس کا پرتو ہے، یہ جمع ہے اور بالکل مخلوق پر نظر نہ رکھنا یہ جمع الجمع ہے اور ایک اصطلاح اور ہے ممکنات کو فاعل اور موصوف سمجھنا فرق ہے اور صرف حق پر نظر رکھنا جمع ہے اور مخلوق کو آئینہ صفاتِ حق سمجھنا جمع الجمع ہے۔

جور: سالک کو مقامات عالیہ پر چڑھنے سے روکنا جور ہے۔

حال و مقام: سالک کے دل پر جو کیفیت غیب سے نازل ہو جس میں اس کا کچھ اختیار نہ ہو اس کو حال کہتے ہیں اور جس مرتبہ سلوک میں اس نے پختگی اور استقامت حاصل کی ہو وہ مقام ہے۔ مقامات سلوک وہی اعمال باطنیہ ہیں جن کی تحصیل کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ ہر سالک ان کے طے کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ مقام سالک کے تحت رہتا ہے اور سالک حال کے تحت۔

حجابات: اہل کشف نے فرمایا ہے کہ ہر لطیفہ میں دس دس ہزار حجابات ظلماتی اور نورانی ہوتے ہیں اور لطیفہ قالبیہ کو ملا کر سات لطائف ہوتے ہیں تو ستر ہزار حجابات ہوئے۔ ذکر سے ظلمت دفع ہوتی ہے اور لطیفہ کا نور سالک کو نظر آتا ہے یہ علامت حجابات کے اٹھ جانے کی ہے۔ مثلاً حجاب نفس کا شہوت اور لذت سے۔ اور حجاب دل کا نظر کرنا غیر حق پر۔ حجاب عقل کا معانی فلسفیہ میں غور و خوض کرنا اور حجاب روح کا عالم مثال کے مکاشفات۔ ان میں کسی کی طرف ملتفت نہ ہو مقصود حقیقی کی طرف متوجہ رہے۔ اور غیر مقصود کی نفی کرتا رہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند۔

ماند الا اللہ وباقی جملہ رفت   مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہو جاتا ہے تو معشوق کے سوا سب کو جلا دیتا ہے۔ غیر اللہ پر لا کی تلوار چلا اور پھر دیکھ لا کے بعد کیا رہتا ہے بس الا اللہ باقی رہ جائے گا باقی سب ختم ہو جائے گا۔

حجابات کے 4 مرتبے ہیں۔ مرتبہ لاہوت، جبروت، ملکوت، ناسوت۔ بعضوں نے کہا، اسی قافیہ پر ہاہوت بھی ایک درجہ ہے۔ ہاہوت مرتبہ ذات حق ہے۔ لاہوت مرتبہ اجمال صفات ہے۔ جبروت مرتبہ تفصیل صفات ہے۔ ملکوت عالم ملائکہ ہے ناسوت عالم انسان ہے۔ مرتبہ لاہوت و مرتبہ جبروت غیر مخلوق ہیں۔ باقی دو مرتبے جو مخلوق ہیں وہ حجاب ہیں۔

ابرو و چشم و جمال۔ کلام اور الہام غیبی کو کہتے ہیں۔

ابن الوقت اور ابو الوقت۔ ابن الوقت کا اطلاق دو معنی پر آتا ہے۔ ایک وہ سالک جو مغلوب الحال ہو۔ یعنی جو حالت اس پر وارد ہو اس کے آثار میں مغلوب ہو جائے۔ اس کے مقابل ابو الوقت ہے، یعنی وہ سالک جو اپنے حال پر غالب ہو یعنی جس کیفیت و حالت کو چاہے اپنے اوپر وارد کر لے۔ جس کیفیت کی طرف توجہ کرے اس کے آثار اس میں پیدا ہو جائیں۔ مثل انس، شوق و رضا و وجد دوسرے معنی ابن الوقت کے دونوں مذکور معنوں کو عام اور شامل ہیں۔ یعنی وہ سالک جو واردات مقتضائے وقت کا حق ادا کرے خواہ وہ واردات اس پر غالب ہوں یا وہ ان پر غالب ہو۔

اتحاد: خدا کی ہستی میں مستغرق ہونے کا نام ہے۔

اتصال: ماسوا اللہ سے منقطع ہونے کو حق کے ساتھ اتصال کہتے ہیں۔ اور ذات کا اتصال ذات سے نہیں ہوتا کیونکہ یہ جسم کا خاصہ ہے حق کی شان میں اس امر کا اعتقاد کفر ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں: اتصالے بے تکیف بے قیاس... ہست رب الناس باجانِ ناس۔ یعنی پروردگار عالم کو لوگوں کے ساتھ جو اتصال ہے وہ کیفیت و قیاس سے بالاتر ہے۔

چنانچہ رسالہ قشیریہ میں ہے ابن شاہین نے حضرت جنیدؒ سے معیت کے معنی پوچھے تو فرمایا کہ معیت کے دو معنی ہیں۔ انبیاء کے ساتھ باعتبار نصرت اور حفاظت کے معیت ہوتی ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ۔ اور عوام کے ساتھ علم اور احاطہ کے اعتبار سے جیسا کہ اللہ نے فرمایا نہیں ہوتی تین آدمیوں کی سرگوشی مگر ضرور اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔

اجتباء: بلاواسطہ اکتساب و مجاہدہ جو احوال باطنیہ حاصل ہو جاتے ہیں اس کو جذب کہتے ہیں۔ (التکشف: ص:٦٢)

آزادی و حریت: آزادی کی معنی ہیں اپنے نفس کی بندگی و اطاعت سے نکل جانا۔نہ یہ کہ خدا کی بندگی اور احکام شرع سے باہر ہو جانا کہ یہ عین گرفتاری ہے۔احکام شرع کبھی معاف نہیں ہوتے۔البتہ پہلے جو اطاعت دشواری سے ہوتی تھی وہ اب آسانی سے ہونے لگتی ہے۔تو تکلیف ساقط نہیں ہوتی بلکہ کلفت تکلیف ساقط ہو جاتی ہے۔

من آں روز کہ در بندِ توام آزادم پادشاہم کہ بدست تو اسیر افتادم

یعنی جس روز میں تیری قید میں ہوں، آزاد ہوں۔جب سے تیرے ہاتھ میں قیدی ہوا ہوں بادشاہ ہوں۔

اقامت: غلبہ عشق کو کہتے ہیں۔

اوباش: جو ثواب و عذاب کا غم نہ کرے۔

بادہ و شراب: عشق و محبت کو کہتے ہیں

بازگشت: بازگشت یہ ہے کہ جب بزبان دل کلمہ کہا جائے تو اس کے بعد دل میں خدا تعالیٰ سے دعاء کرے کہ خدایا تو اور تیری رضا ہی میرا مقصود ہے۔

بادہ فروش: پیر مغاں، پیر خراجات و **خمار**: مرشد و رہبر کو کہتے ہیں۔

بامداد: حالات و واقعات کے بازگشت کے مقام کو کہتے ہیں۔

بت و شاہد: معانی مقصودہ کو کہتے ہیں۔

بتخانہ، بت کدہ، شراب خانہ دیر۔خرابات عالم معنی۔عارف کے باطن کو کہتے ہیں۔

بوسہ، غمزہ و فیض: باطنی جذبہ کو کہتے ہیں۔

تجرید و تفرید: دنیاوی اور اخروی اغراض کو ترک کر دینا تجرید ہے اور کسی چیز کی اپنی طرف نسبت نہ کرنا تفرید ہے۔

تجلی و استتار: تجلی ظہور کو کہتے ہیں۔اور استتار پوشیدہ ہونے کو کہتے ہیں۔تجلی کی کئی قسمیں ہیں اور ہر ایک کے آثار جدا ہیں (۱) **تجلی ذاتی** ہے اس کا اثر یہ ہے کہ اگر سالک کے وجود عنصری کے صفات و آثار کچھ باقی ہیں تب تو بے ہوش ہو جاتا ہے چنانچہ موسیٰؑ طور پر بے ہوش ہو گئے۔

خاطر: قلب پر جو خطاب وارد ہوتا ہے وہ خاطر ہے۔اس کی چار (4) قسمیں ہیں۔ایک اللہ کی طرف سے دوسرے

فرشتے کی طرف سے تیسرا نفس کی طرف سے چوتھا شیطان کی طرف سے۔ اول کو **خاطر حق** کہتے ہیں دوسرے کو **الہام**۔ تیسرے کو **ہوا** جس چوتھے کو **وسواس** کہتے ہیں۔ پہچان یہ ہے کہ اگر نیک بات دل میں آئے اور اس کے خلاف پر عمل کر سکے تو وہ الہام ہے اور اگر خلاف پر عمل نہ کر سکے تو وہ خاطر حق ہے۔ اگر بری بات دل میں آئے تو اگر شہوت، غضب، تکبر وغیرہ صفات نفس کی طرف رغبت ہو تو وہ ہوا جس ہے اور اگر کسی گناہ کی طرف میلان ہو تو وہ وسواس ہے۔

خلوت در انجمن: ظاہر میں مخلوق کے ساتھ اور باطن میں بواسطہ ذکر حق کے ساتھ ہو اور ذکر سے مراد ذکر قلبی۔

دلبر: قبض کی صفت کو کہتے ہیں۔ **دوست، صنم، محبوب یار**، صفات کی تجلی اور انکشاف کو کہتے ہیں۔ **دلدار**: بسط کی صفت کو کہتے ہیں۔

دیر: عالم انسانی کو کہتے ہیں۔

رابطہ: رابطہ خاص ایک شغل کا نام ہے۔ جس میں شیخ کی صورت ذہن میں حاضر کر کے نظر قلب سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر اور خیال کو سادھ کر دیکھا جاتا ہے۔ یہ فرض کیا جائے کہ شیخ حاضر و ناظر ہے۔ اس کا فائدہ شیخ (مرشد) کے ساتھ شغف ہے جس سے بے تکلف اس کا اتباع اخلاق و اعمال میں ہونے لگتا ہے۔ **رجعت**: وصل کے مقام سے بسبب قہر بصورت انقطاع لوٹنے کو رجعت کہتے ہیں۔

زلف: ذات و حقیقت کے غائب ہونے کو کہتے ہیں۔

زنار: یکرنگی اور یکجہتی کی علامت کو کہتے ہیں۔

ساغر و پیمانہ: جو شخص غیبی انوار کا مشاہدہ کرے اور مقامات کا ادارک کرے۔

ساقی و مطرب: معنوی فیض پہنچانے والوں کو کہتے ہیں۔

سالک، واقف راجع: فوائد الفوائد میں ہے کہ سالک وہ ہے جو راہ چلے اور واقف وہ ہے جو بیچ میں اٹک جائے۔ پس جب سالک عبادت میں کوتاہی کرتا ہے اگر جلدی سے توبہ و استغفار کر کے بدستور پھر سرگرم ہو گیا تو پھر سالک بن جاتا ہے اگر خدا نخواستہ وہی غفلت رہی تو اندیشہ ہے کہ کہیں راجع نہ ہو جائے۔ اس راہ کی لغزش کے سات درجے ہیں: اعراض، حجاب، تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی، عداوت۔ اول **اعراض** ہوتا ہے اگر معذرت اور توبہ نہ ہو تو حجاب ہو جاتا ہے اگر پھر بھی اصرار رہا تو **تفاصل** ہو گیا اگر اب بھی استغفار نہ کیا عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق اور شوق کی تھی وہ سلب ہو گئی۔ یہ **سلب مزید** ہے

اگر اب بھی بے ہودگی نہ چھوڑی تو جو حلاوت کہ اصل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہوگئی اس کو **سلب قدیم** کہا جاتا ہے۔ اگر پھر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل گوارا کرنے لگا، یہ **تسلی** ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت **عداوت** میں بدل جاتی ہے۔**نعوذ باللہ**۔

سعادت: حق تعالیٰ کی محبت میں مستغرق ہو جاتا۔

سفر در وطن: یہ ہے سالک طبیعت بشریہ سے سفر کرے۔ یعنی صفات ذمیمہ کو چھوڑ کر صفات حمیدہ اختیار کرے جو تخلقوا باخلاق اللہ کے معنی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنانا اور اپنے اندر وہ اخلاق پیدا کرنا۔ **سمع**: اللہ کے نور کو کہتے ہیں۔

سیر الی اللہ و سیر فی اللہ: تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں۔ ایک سیر الی اللہ یہ تو محدود ہے۔ ایک سیر فی اللہ یہ غیر محدود ہے۔ سیر الی اللہ یہ ہے کہ نفس کے امراض کا علاج شروع کیا، یہاں تک کہ امراض سے شفا ہوگئی اور ذکر میں مشغول ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہو گیا یعنی تخلیہ و تحلیہ کے قواعد جان گیا۔ موانع مرتفع ہو گے۔ نفس کی اصلاح ہو گئی۔ اخلاق رذیلہ زائل ہو گئے۔ اخلاق حمیدہ اور انوار ذکر سے قلب آراستہ ہو گیا۔ اعمال صالحہ کی رغبت زیادہ ہوگئی۔ نسبت و تعلق مع اللہ حاصل ہو گیا تو سیر الی اللہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ اللہ کی ذات و صفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا۔ تعلق سابق میں ترقی ہوئی، اسرار و حالات کا ورود ہونے لگا۔ یہ غیر محدود ہے یہ وہ تعلق ہے جس کی نسبت کہا گیا۔

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست — اینجا جز ایں کہ جاں بسپارند چارہ نسیت

عشق کا سمندر ایک ایسا سمندر ہے کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں جان سونپنے کے کوئی چارہ نہیں

شاہد: جو چیز قلب پر غالب ہو وہ شاہد ہے۔ بعض کا قول ہے کہ صاحب جمال کو شاہد کہتے ہیں۔

شطح: بے اختیاری کی حالت میں غلبہ وارد کی وجہ سے ظاہری قواعد کے خلاف کوئی بات منہ سے نکل جائے وہ شطح ہے۔ اس شخص پر نہ گناہ ہے نہ اس کی تقلید جائز ہے۔

شقاوت: حق تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہنا۔

شیدا: اہل جذب اور اہل شوق کو کہتے ہیں۔

صبح: احوال، اوقات اور اعمال کے طلوع کو کہتے ہیں۔

صبوحی: باہم تکلم کو کہتے ہیں۔

صوفی: خیر القرون میں تو صحابی، تابعی، تبع تابعی وغیرہ کے القاب تھے۔ پھر خواص کو زہاد وعباد کہنے لگے۔ پھر جب فتن وبدعات کا شیوع ہوا اور اہل زیغ بھی عباد وزہاد کہنے جانے لگے اس وقت اہل حق نے امتیاز کے لئے صوفی کا لقب اختیار کیا اور دوسری صدی کے اندر ہی اس لقب کی شہرت ہو گئی۔

طامات: معارف کو کہتے ہیں۔ **طریق باطن:** مداوت ذکر اور اطاعت احکام وملکات فاضلہ باطنہ مثل توکل رضا شکر وغیرہ کا نام ہے۔ (انفاس عیسیٰ۔ ص:۲۸۱)

طریق جذب وسلوک: تربیت کے دو طریقے ہیں۔ ایک جذب دوسرا سلوک۔ **جذب** یہ ہے کہ طالب پر ذکر وفکر کے ذریعہ محبت کا غلبہ ہو جائے اور اس طریق محبت کے ذریعہ اس کو مقصود تک پہنچایا جائے۔ دوسرا طریق **سلوک** وہ یہ کہ تلاوت قرآن اور ذکر میں مشغول کیا جائے۔

عالم خلق: اللہ نے بعض مخلوقات مادہ ومقدار سے خالی (مجرد) پیدا کی ہیں ان کو **مجردات** کہتے ہیں۔ ارواح انسانیہ ودیگر لطائف قلب، سر وخفی واخفی ایسے ہی ہیں اور یہی مراد ہے۔ صوفیاء کے اس قول سے کہ لطائف فوق العرش ہیں۔ مادیات کو **عالم خلق** اور مجردات کو **عالم امر** کہتے ہیں۔ اور جو مخلوقات ذی مادہ اور ذی مقدار ہیں ان کو **مادیات** کہتے ہیں۔

عالم مثال: عالم خلق وعالم امر کے درمیان کے عالم کو عالم مثال کہتے ہیں۔

عروج: سالک جب مراتب سلوک طے کرتا ہوا مرتبہ فنا کو پہنچتا ہے اور ہر مرتبہ میں تجلیات اسمائی وصفاتی کا انکشاف ومشاہدہ، غلبہ کے ساتھ ہوتا ہو تو اصطلاح میں اس کو عروج کہتے ہیں۔

نزول: اس مرتبہ کے بعد ہر سالک کا حال جداگانہ ہوتا ہے۔ بعض کو حسب تمنا ان کے احوال میں ترقی ہوتی ہے اور بعض کو اس سکر وفنا سے افاقہ ہوتا ہے۔ اور یہ نزول کہلاتا ہے۔

علم اعتبار: باطنی معنی جو بیان کئے جاتے ہیں۔ اس سے مقصود تفسیر وتعیین مراد نہیں ہوتی بلکہ ایک شئی کی حالت کو دوسری شئی کی حالت پر محض تمثیل دینا، قیاس کرنا ہوتا ہے۔ اس کو علم اعتبار کہتے ہیں۔

غم گساری: رحمانی صفت کو کہتے ہیں۔

غیبت: کوئی وارد قلبی قلب پر آیا خواہ صفات خداوندی کا غلبہ ہو یا کچھ ثواب وعذاب یاد آیا۔ اس کے غلبہ سے حواس

معطل ہو گئے۔ اور ادھر کی خبر نہ رہی۔ یہ غیبت ہے یعنی خلق سے۔ اور جب ہوش آگیا تو یہ حضور ہے۔ اور کبھی اس غیبت کو **حضور** کہتے ہیں۔ یعنی حضور بحق اور کبھی حضور کی جگہ **شہود** کہتے ہیں۔ یعنی مخلوق کے اعتبار سے غیبت اور حق کے اعتبار سے حضور و شہود۔

غیرت: طاعت حق ہر امر میں مقدم ہوتی ہے۔ اگر کبھی کسی چیز کی مشغولی نے طاعت میں خلل ڈالا تو اہل کمال کو اس چیز کے رفع کرنے کا ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے، یعنی حق تعالیٰ سے غافل کرنے والی چیز سے نفرت ہو جانا، اس کو غیرت کہتے ہیں۔

قلندر اور قلاش: اہل ترک اور اہل فنا کو کہتے ہیں۔

کباب: حق تعالیٰ کی تجلیات میں دل کی پرورش ہونا

کشف و شہود: عین اللہ کے مرتبے کو کہتے ہیں

کفر: تاریکی کو کہتے ہیں۔

کلیسا: عالم حیوانی کو کہتے ہیں۔

گبر و کافر: جو شخص وحدت میں یک رنگ ہو جائے اور غیر اللہ سے روگرداں ہو جائے۔ اس کو گبر و کافر کہتے ہیں۔ مے: اس ذوق کو کہتے ہیں جو سالک کے دل سے اٹھتا ہے اور اس کو خوش وقت بناتا ہے۔

گیسو: طالب کے ظاہر کو کہتے ہیں۔ **لب و دہان**: حیات کی صفت کو کہتے ہیں۔

لطائف ستۃ: حسب ذیل ہیں (بجز نفس کے) کہ وہ عالم خلق سے ہے۔ باقی سب عالم امر سے ہیں۔

لطائف کا نام (۱) نفس (۲) قلب (۳) روح (۴) سرّ (۵) خفی (۶) اخفیٰ (۷) غذا یا فعل غفلت

ذکر	حضور	مکاشفہ ملکوت	مشاہدہ	فنا	معائنہ	فناء الفناء
مقام	زیر ناف	زیر پستان چپ	زیر پستان راست	مابین قلب و روح	مابین دو ابرو	ام الدماغ
رنگ	زرد	سرخ	سفید	سبز	نیلا	سیاہ

محاضرہ۔ تجلّی افعال کو کہتے ہیں۔

مکاشفہ۔ تجلّی صفات کو کہتے ہیں۔

مشاہدہ۔ تجلّی ذات کو کہتے ہیں۔

محاضرہ قلب سے ہوتا ہے، مکاشفہ سر سے ہوتا ہے، مشاہدہ روح سے ہوتا ہے۔

محو و اثبات۔ اسکے معنی قریب قریب وہی ہیں جو فنا اور بقاء کے ہیں۔ محو کے معنی اور چند الفاظ اور بھی ہیں یعنی۔ محق، سحق، طمس۔ محو صفات کو "**محق**" کہتے ہیں اور فناء ذات کو "**سحق**" اور صفات و ذات کے آثار محو ہو جانے کو "**طمس**" کہتے ہیں۔

مدارات و مداہنت۔ مدارات کا حاصل اہل جہل کے ساتھ نرمی اختیار کرتا ہے تاکہ وہ دین کی طرف رجوع ہو جائیں اور اسی طرض پر اہل شر کے ساتھ نرمی سے پیش آنا، تاکہ ان کے شر سے محفوظ رہیں، چناچہ قرآن میں زکوٰۃ کی رقم میں سے کچھ حصّہ مؤلفین قلب کو دینے کا حکم آیا ہے۔ اول تو خود دین میں مقصود ہے اور ثانی مقصود دین میں مددگار ہے، کیونکہ کسی شریر کی ایذاء میں مبتلاء ہو جانے سے کبھی اطاعت خدا اور رسول میں خلل واقع ہوتا ہے۔ مداہنت کے معنی بددینوں کے ساتھ نرمی برتنا، یا ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہے، تاکہ ایک ان کے مال و جاہ سے فائدہ حاصل کریں یا ان کو خوش کریں۔ اور یہ نہ صرف ناجائز ہے بلکہ حرام ہے، چناچہ قرآن شریف میں اللہ کا رشاد ہے۔ لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ یعنی اگر آپ ان کی (کفریہ یا شرکی) بات سن لیں یا مان لیں تو وہ بھی آپ کی بات مان لیں گے، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ" یعنی آپ حق کو جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں۔ مدارات حضرات صوفیہ کے خاص اخلاق سے ہے۔

مست و خراب۔ استغراق کو کہتے ہیں۔

مست و شیدا۔ اہل حزن و ذوق کو کہتے ہیں۔

مستی۔ عشق کو مع اسکی جمیع صفات کے اختیار کرنا۔

مکّہ و مدینہ۔ مکّہ کی حقیقت تجلّی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت تجلّی عبودیت (محمدیہ) ہے۔ عارف وہ ہے جو ہر وقت تجلّی الوہیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

میخانہ۔ لاہوت کو کہتے ہیں۔

می لعل۔ عاشقوں کا خون جو آنسو بن کر ان کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے۔

نسبت۔ نسبت کے لغوی معنی لگاؤ اور تعلق کے ہیں اور اصطلاح میں بندہ کا حق تعالیٰ سے خاص قسم کے تعلق کو کہتے

ہیں، یعنی قبول و رضا جیسا کہ عاشق، معشوق کا مطیع اور وفادار ہوتا ہے۔ جب ذکر اللہ کی مواظبت سے ظلماتِ نفسانیہ و کدورت طبعیہ کا ازالہ ہو جاتا ہے تو قلب اور روح کو حق تعالیٰ کے ساتھ ایک مخصوص تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسکو "نسبت" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی نسبت کے پیدا ہو جانے کا نام "وصول" ہے۔ نسبت تعلق طرفین کا نام ہے، ایک طرفہ تعلق کو نسبت نہیں کہتے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو اللہ کے ساتھ محض یاد کا تعلق ہے، پس یہ تعلق یک طرفہ ہے، جب انسان اپنی جانب سے عمل و اطاعت اور یاد خدا کا اہتمام کرتا ہے، تو اسی وقت حق تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہو جاتا ہے اور پھر القاء ہوتا ہے، مگر وہ ایک دم نہیں ہوتا بلکہ رفتہ رفتہ ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا، البتہ اسکی ظاہری علامت یہ ہے کہ حضور محمد مصطفی ﷺ کے ساتھ افعال، اقوال اور حرکات و سکنات میں زیادہ پیروی کی وجہ سے تشابہ ہو، یعنی ہر بات میں حضور ﷺ کے اتباع کی کوشش کی جاتی رہے اور یہ اتباع عادت ہو جائے کہ بے تکلف سنت کے مطابق افعال صادر ہونے لگیں۔

نظر بر قدم۔ نظر بر قدم یہ ہے کہ آمد و رفت میں جہاں کہیں بھی ہو نظر اپنے پاؤں پر رکھے تاکہ نظر منتشر نہ ہو، یہ تو ظاہری بات ہے اسکی حقیقت یہ ہے کہ ہستی کی مسافت طے کرنے میں سالک تیز رفتاری پر مائل ہو یعنی سالک کی نظر جس مقام پر ختم ہو سالک اپنا قدم اس مقام پر رکھے۔

نفس: نفس انسان کے اندر ایک قوت ہے، جس سے وہ کسی چیز کی خواہش کرے۔ خواہ وہ خواہش خیر کی ہو یا شر کی۔ اگر وہ اکثر شر کی خواہش کرے اور اسکو اس پر ندامت بھی نہ ہو تو اس وقت اس کو "**نفس امّارہ**" کہا جاتا ہے۔ یعنی "کثیر الآمر بالسوء" (برائی کا بہت زیادہ حکم کرنے والا) اور اسی مرتبہ کی خواہش کا نام "**ھویٰ**" ہے، چنانچہ حضور ﷺ کے تعلق سے اللہ فرماتا ہے "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ" اور اس میں خیر کی خواہش بھی پیدا ہو جاتی ہے، مگر کبھی کبھی۔ اور اگر شر کی خواہش پیدا ہو لیکن اس پر نادم بھی ہو تو اسکو "**نفس لوّامہ**" کہتے ہیں اور اگر صرف خیر کی خواہش ہو تو اس کو "**نفس مطمئنہ**" کہتے ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے "يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي" بعض لوگوں کے پاس نفس کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جس کا نام "**نفس ملہمہ**" ہے، جیسا کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ "وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا"۔

وقوف زمانی۔ یعنی بندہ ہر حال میں اپنے احوال سے واقف رہے، اگر طاعت ہے تو شکر کرے اور اگر نافرمانی ہے تو عذر چاہے اور توبہ کرے۔

وقوف عددی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفی و اثبات میں طاق عدد کا لحاظ رکھے۔

وقوف قلبی۔ یعنی ذاکر حق تعالیٰ کا واقف ہو، اسطرح کہ دل متواتر غیر اللہ سے متعلق نہ ہو۔

ہمت۔ قلب کو اسطرح یکسو کرنا کہ دوسری چیز کا خطرہ نہ آئے، اس ہمت سے ہی بڑے بڑے کام بنتے ہیں، اسی کو توجہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ہوش در دم، یعنی اپنے نفس پر ہمیشہ ہوشیار رہنا اور اس امر پر آگاہ رہنا کہ کوئی نفس غفلت سے نہ گذرے۔

ہیبت۔ قبض میں جب اور ترقی ہوتی ہے اس کو ہیبت کہتے ہیں۔

یاد داشت۔ ہر حال میں بطریق ذوق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا۔

اخلاص

اللہ کا ارشاد ہے وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّـهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ ﴿البینة:۵﴾ "ان کو تو صرف اسی بات کا حکم ہوا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اللہ کے واسطے خالص کرتے ہوئے، دوسروں کی طرف سے منھ پھیرتے ہوئے۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ لا ینظر الی صورکم واعمالکم ولکن ینظر الیٰ نیاتکم و قلوبکم۔ اللہ تمہاری صورتوں اور اعمال کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ تمہاری نیتوں اور تمہارے دلوں کی طرف دیکھتا ہے۔

اخلاص کے معنی ہیں کسی کام کو صرف اللہ کا قرب اور اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرنا جس میں مخلوق کی خوشنودی اور رضا یا اپنے نفس کی کسی خواہش کی ملاوٹ نہ ہو۔ اسی کو للّٰہیت بھی کہتے ہیں۔ یعنی جو کام کیا جارہا ہو وہ صرف اللہ ہی کے لئے ہو۔ اور اگر اس کام میں دوسری غرض شامل کرلی جائے تو وہ کام صحیح ہو جائے گا لیکن اخلاص اور للّٰہیت باقی نہ ہو گی۔ اخلاص کے ساتھ تھوڑی خیرات بھی بغیر اخلاص کے، بھاری خیرات پر بھاری پڑتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے فرمایا، اگر میرا صحابی نصف مد (آدھا سیر) جو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے یعنی غیر صحابی کے احد (پہاڑ) کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حضور کی صحبت کی وجہ سے صحابہ کے اندر جس شان کا خلوص تھا وہ اوروں کے اندر اتنا نہیں۔ اخلاص کی ضد ریا ہے جس کا مطلب دنیا کو دکھانے کے لئے کام کرنا اگرچہ وہ کام دین کا ہی کیوں نہ ہو، مثلاً نماز پڑھنا اور نماز میں دیر کرنا تاکہ دوسرے لوگ دیکھ کر یہ سمجھیں کہ اس کی نماز خشوع و خضوع سے بھری ہوئی ہے تو ایسی نماز ریاکاری کی ہوگی۔ جس کا اسے کوئی صلہ نہیں ملے گا اسی کو اللہ فرماتا ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ﴿الماعون:۵﴾۔ یعنی ان نمازیوں کے لئے ویل ہے جو نماز میں سستی کرتے ہیں اور جو ریاکاری کی نماز پڑھتے ہیں۔

قرآن شریف میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ نے عمل صالح کی قبولیت کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

اخلاص یہ ہے کہ عمل صالح خالصۃً اللہ کے لئے ہو اور اس عمل کا مقصود دنیا کا حصول، ریاکاری یا غیر اللہ کے لئے نہ ہو۔

چنانچہ اللہ کا فرمان ہے فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿الکھف:۱۱۰﴾ پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات (دیدار) کا امیدوار ہے اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے، اور اپنے رب کی

عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ عمل صالح سے مراد "ترک دنیا" ہے۔

نیز ارشاد خداوندی ہے"وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّـهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ"﴿البینة:۵﴾اور لوگوں کو اسی بات کا حکم دیا گیا کہ وہ یکسو ہو کر، اللہ کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں اور یہی ہے صحیح دین۔

اسی طرح اللہ نے فرمایا"حُنَفَاءَ لِلَّـهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ"﴿الحج:۳۱﴾ اللہ کے لئے یکسو ہو کر رہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور فرمایا"فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ الْحَمْدُ لِلَّـهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴿المومن:۶۵﴾ پس اسے پکارو اس کے لئے دین خالص کرتے ہوئے، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔

عمل حسن: اسی سلسلے میں اللہ کا ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿الکہف:۳۰﴾۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے تو بے شک ہم اچھا عمل کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔ العمل الاحسن کے بارے میں فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا"هو الاخلص و الاصوب۔ یعنی احسن عمل وہ ہے جو زیادہ خالص اور زیادہ درست ہو۔ پوچھا گیا کہ اخلص سے کیا مراد ہے۔ تو فرمایا۔ خالص اللہ کے لئے ہو۔ پھر پوچھا گیا کہ اصوب سے کیا مراد ہے تو فرمایا وہ عمل سنت کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ اگر عمل خالص اللہ کے لئے نہ ہو تب بھی وہ مردود ہے اور سنت کے مطابق نہ ہو تو بھی وہ مردود ہے۔ نیز عمل کی مقبولیت کے لئے عمل میں صدق ضروری ہے۔ پس **صدق فی العمل** کے معنی ہیں کہ صرف وہی عمل مقصود ہو اس کے ساتھ کسی قسم کے دنیوی امور یا نفسانی خواہشات کا تعلق نہ ہو جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿التوبة:۱۱۹﴾ اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ۔ نیز فرمایا۔ هَـٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ﴿المائدہ:۱۱۹﴾ یہ وہ دن ہے جب کہ صادقین کو ان کا صدق فائدہ دیگا۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو صادقین کا لقب دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے" لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّـهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّـهَ وَرَسُولَهُ أُولَـٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴿الحشر:۸﴾ (مال) ان مہاجرین فقراء کے لئے جو کہ اپنے گھروں اور اموال سے نکال دیئے گئے کہ وہ اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴿التوبة:۱۱۹﴾ کی تشریح میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں صادقین یعنی مہاجرین کے ساتھ مل جاؤ کیوں کہ اس موقع پر مہاجرین کا مقصد صرف اللہ کی رضا کا حصول تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اخلاص فی العمل کی جو شاندار مثال پیش کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ روایت ہے کہ ایک کافر کا آپ سے مقابلہ ہوا وہ کافر جو آپ کو قتل کرنے کے در پے تھا۔ آپ نے اس کو پچھاڑ دیا اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ اپنی شمشیر بلند کی تا کہ اس کو ختم کر دیں۔ ایسے میں اس کافر نے اچانک آپ کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی وقت اس کے سینے پر سے اٹھ گئے اور اس کو چھوڑ دیا۔ مقابل حیران ہو گیا اور پوچھا، کیا بات ہے۔ میں نے تمہارے منہ پر تھوک دیا تھا تم کو تو زیادہ غصہ آنا چاہئے اور اس کا اظہار پوری قوت سے کرنا چاہئے تھا۔ آپ نے اس کو یہ جواب دیا کہ میرا جو تجھ سے مقابلہ تھا وہ اسلام اور ایمان کے لئے تھا۔ درمیان میں صرف اللہ کا واسطہ تھا۔ اور اسی لئے میں تجھ سے لڑ رہا تھا اور جب میں تجھ پر قابو پا گیا اور چاہتا ہی تھا کہ سر کاٹ دوں تو تو نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ نفس کا تقاضہ یہی تھا کہ میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ اس طرح تجھے قتل کرنے میں اللہ کے ساتھ میرا نفس بھی خوش ہو گا۔ اب اگر میں تجھ کو قتل کرتا تو دین کے ساتھ اس کام میں میرا غصہ بھی شامل ہو جاتا۔ گویا کام صرف اللہ کے لئے نہ ہوتا بلکہ میرا نفس بھی اس سے شامل ہو جاتا۔ اس طرح اخلاص متاثر ہو جاتا۔ اس لئے میں نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ شاعر نے کیا اچھی بات کہی ہے: از علی آموز اخلاص عمل۔

آداب

ادب کی کچھ قسمیں ہیں۔(۱) اللہ کے ساتھ ادب (۲) رسول کے ساتھ ادب (۳) کتاب و سنت کے ساتھ ادب (۴) صحابہ اور سلف الصالحین کے ساتھ ادب (۵) عام اہل ایمان کے ساتھ ادب۔ اللہ کے ساتھ ادب یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ اپنے معاملات کو درست رکھے۔ دل کو غیر اللہ کی طرف التفات سے بچائے۔

اہل دنیا کا ادب: فصاحت، بلاغت، بداعت، حفظ علوم و اشعار کا لکھنا اور یاد کرنا ہے۔

اہل دین کا ادب: نفس کی ریاضت، حدود اللہ کی حفاظت اور شہوات کر ترک کرنا ہے۔

شبلیؒ فرماتے ہیں کہ حق کے سامنے لب کشائی کرنا ترک ادب ہے۔یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں نے اللہ کے سامنے اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو بھی پیش کیا تو اللہ کے ادب کو ملحوظ رکھا۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب ان سے چوک ہوگئی تو فرمایا"رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿الأعراف:۲۳﴾ یعنی اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، یہ نہیں کہا کہ تو نے ہماری تقدیر ایسی بنائی۔ اس کے بر خلاف ابلیس نے بے محابہ کیا۔ بِمَا أَغْوَيْتَنِي، یعنی تو نے مجھے گمراہ کیا۔ دیکھو شیطان نے کس قدر بے ادبی کی۔

خدا کے ساتھ ادب: حضرت موسیٰ علیہ السلام بھوکے تھے مگر آپؑ نے اللہ سے یہ نہیں کہا مجھے کھانا کھلا۔ بلکہ ادب کو ملحوظ رکھ کر کہا۔ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ﴿القصص:۲۴﴾۔ اے میرے رب جو خیر بھی تو میری طرف اتارے میں اس کا محتاج ہوں۔

اسی طرح ایوب علیہ السلام کا ادب دیکھئے، فرمایا أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿الانبیاء:۸۳﴾ اے میرے رب بے شک مجھے تکلیف نے چھولیا ہے اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ یہ نہیں فرمایا میں بیمار ہوں۔ مجھے شفا دیدے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تو پوری زندگی اللہ سے ادب کرنے سے عبارت ہے۔ سخت سے سخت حکم ہونے پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں پوچھا بس حکم کی تعمیل کرتے چلے گئے۔ اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ آپ نے لوگوں کو ستر ڈھانپنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اگر ہم میں سے کوئی اکیلا ہو تو پھر؟ یعنی اس وقت بھی ستر کو ڈھانپنا چاہئے۔ تو آپ نے

فرمایا: اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔

رسول اللہؐ کے ساتھ ادب: آپؐ کی زندگی میں اور آپؐ کی وفات کے بعد بھی آپؐ کی تعظیم کی جائے۔ آپؐ کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔ آپؐ کی ہر بات اور ہر حکم دل و جان سے قبول کرے اور اس پر عمل کرے۔ اور کسی باطل خیال کو، عقل، وہم، قیاس، علم، سائنس، ذوق اور سیاست کا نام دے کر آپ ﷺ کی مخالفت نہ کرے۔

جس طرح عبادت رب العالمین کی فرض ہے۔ اسی طرح اطاعت رحمتہ اللعالمین و خاتم النبیین کی بھی فرض ہے۔ آپؐ کے نام کی تعظیم کی جائے۔ آپؐ کے واضح حکم کے خلاف فتویٰ نہ دیا جائے۔ احادیث نبویہ میں اشکالات نہ تلاش کرے۔ یہ بھی آپؐ کا ادب ہے کہ آپؐ کے صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کا بھی احترام کیا جائے۔ اور جب بھی آپؐ کا نام زبان سے لیا جائے یا سنا جائے تو آپؐ پر درود و سلام پڑھا جائے۔

صحابہ کرام اور سلف صالحین کا ادب: ان سے محبت کرنا۔ ان کے تعلق سے، اگرچہ ان کے درمیان باہمی جھگڑے ہوئے ہوں، دل میں برا خیال نہ کرنا اور ان کے معاملہ میں فتویٰ صادر نہ کرنا۔

کتاب و سنت کا ادب: ان پر ایمان لانا۔ ان کی نصوص پر بغیر تاویل کے ایمان لاتے ہوئے عمل کرنا۔ ان کا ذکر اچھے الفاظ سے کرنا، قرآن و سنت کی کتابوں کو دوسری کتابوں کے اوپر رکھنا۔

آداب

حضرت پیغمبر خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم برگزیدۂ حق تھے۔ آپؐ بلند ترین مقام پر پہنچے مگر آپؐ نے نہ سونے میں تکلف فرمایانہ بیداری میں۔ حکم باری تعالیٰ ہوا۔ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿المزمل:۲تا۳﴾ آپؐ رات کو عبادت میں قیام کریں مگر رات کا تھوڑا حصہ یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم۔

جب بندہ کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ہر چیز اس کے دسترس سے باہر ہوتی ہے، وہ غیر کا متحمل نہیں ہوتا۔ وہ سوئے یا جاگے وہ صاحب توقیر ہوتا ہے۔ چنانچہ اصحاب کہف کو اللہ نے سلا دیا تھا۔ انہوں نے جاگنے میں تکلف کیا نہ سونے میں۔ تو حق تعالیٰ نے ان کی نگہبانی کی اور ان کی اپنی کوشش کے بغیر ان کی پرورش فرمائی۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ﴿الکھف:۱۸﴾ یعنی تم انہیں بیدار تصور کروگے حالانکہ وہ سو رہے ہیں اور ہم ان کو دائیں وبائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ پس انسان کو چاہئے کہ ہر ابتدائے خواب کو اپنی عمر کا آخری وقت سمجھے۔ گناہوں سے توبہ کرے۔ مخالف اور رنجیدہ لوگوں کو خوش کرے۔ اچھی طرح طہارت کرے۔ اور دائیں ہاتھ پر قبلہ رو سوئے اور بیدار ہونے کے بعد مرتکب معاصی نہ ہونے کا عہد کرے۔

آداب کلام و خاموشی: اللہ کا ارشاد ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ الخ ﴿الإسراء:۷۰﴾۔ ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی۔ مفسرین کرام "كَرَّمْنَا" کا مطلب "گویائی" بیان کرتے ہیں۔ نیز اللہ نے فرمایا "وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴿فصلت:۳۳﴾ "اس سے زیادہ اچھی کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے۔ اسی طرح اللہ نے فرمایا "قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ ﴿البقرۃ:۲۶۳﴾ " نیک بات کہنا۔ بولنے کی طاقت نعمت عظمیٰ ہے۔ اور آدمی اسی کی وجہ سے دیگر جانوروں سے ممتاز ہے۔

لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ گویائی جتنی بڑی نعمت ہے اتنی ہی خرابی کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا "أَخْوَفُ مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي اللِّسَانِ" امت سے متعلق میں جس چیز سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ زبان ہے۔ گفتار کی مثال شراب کی سی ہے۔ جو عقل کو مست کر دیتی ہے۔ اور جسے اس کی لت پڑ جاتی ہے وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اہل طریقت نے یہ سمجھ کر کہ گفتار باعث آفت ہے۔ بجز ضرورت کے بات کرنے سے گریز کیا ہے وہ ہر کلام کے آغاز و انجام کو جانچتے ہیں۔ اگر اظہار جانب حق ہو تو اظہار کرتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔

نیز یہ بھی ایمان کی بات ہے کہ اللہ ہماری گفتار کو سنتا ہے اور اس کی نیت کو بھی جانتا ہے۔ کیوں کہ اللہ فرماتا ہے "أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ" ﴿الزخرف:۸۰﴾ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے اسرار اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے۔ بلکہ ہم سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے لکھتے ہیں۔

حضور نے فرمایا: مَنْ صَمَتَ نَجَا۔ جس نے خاموشی اختیار کی وہ نجات پا گیا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مقام پر خاموشی اختیار کی جائے۔ جہاں حق کے اظہار کی ضرورت ہو تو وہاں اظہار کرنا چاہیئے۔ اور اس معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا بھی خوف نہیں ہونا چاہیئے۔

احکام شریعت کے اظہار کرنے میں انسان کو بے باک ہونا چاہیئے۔ لیکن حقائق کے اظہار میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں "جس کو اللہ کی معرفت نصیب ہوئی اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ کیوں کہ لوگ حقائق کو برداشت نہیں کر سکتے۔ نیز بھٹک جانے کا بھی اندیشہ لگا رہتا ہے۔

پس مسلمان کو چاہیئے کہ جس زبان سے کلمہ شہادت پڑھا ہے اور اقرار توحید کیا ہے اسے جھوٹ، غیبت اور بہتان کے لئے استعمال نہ کرے۔ مسلمانوں کا دل نہ دکھائے زبان سے ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتا رہے جیسا کہ اللہ نے آنحضرتؐ سے فرمایا۔ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿الضحیٰ:۱۱﴾۔ اپنے پروردگار کی نعمت کو بیان کرو۔

روایت ہے کہ ایک بادشاہ نے مہتمم باورچی خانہ سے ایک روز کہا کہ بکرے میں جو سب سے اچھی چیزیں (نفع بخش) ہیں وہ پکاؤ۔ بادشاہ کے سامنے دل اور زبان لائے گئے۔ بادشاہ نے کھا لیا۔ دوسرے دن پھر بادشاہ نے کہا کہ بکرے میں جو بری (نقصان دہ) چیزیں ہیں وہ پکاؤ۔ بادشاہ کے سامنے وہی دل اور زبان لائے گئے۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کیا؟ کل میں نے اچھی چیزوں کا حکم دیا تھا تو دل اور زبان لائے گئے تھے اور آج بری چیزوں کا حکم دیا تو وہی چیزیں لائی گئی ہیں تو دانش مند مہتمم نے کہا، حضور تمام اعضاء میں یہی دو چیزیں ایسی ہیں کہ یہ اگر اچھی ہوں تو انسان اچھا ہوتا ہے اور اگر یہ دو چیزیں یعنی دل اور زبان خراب ہوں تو آدمی خراب ہوتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" آدمی کے جسد میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے کہ اگر وہ اچھا ہے تو پورا جسم اچھا ہے اور اگر وہ فاسد ہے تو پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ "دل" ہے۔ نیز ارشاد ہوا کہ انسان کو جہنم میں جھونکنے والی چیز زبان ہے۔

آداب صحبت: جاننا چاہئے کہ مرید کے لئے سب سے اہم چیز ہم نشینی (صحبت) ہے تو ہم نشینی کے حقوق کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

مرید کے لئے تنہائی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لئے حضور نے فرمایا۔ الشیطان مع الواحد و هو من الاثنین أبعد ابلیس تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے دور ہوتا ہے۔ اور حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ ﴿المجادلة:۷﴾ اگر تین آدمی باہم مشورہ کررہے ہوں تو چوتھا باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ ہم نشینی کی اہم شرط یہ ہے کہ ہر شخص کا درجہ ملحوظ خاطر رہے۔ پیر طریقت کے ساتھ حرمت کا لحاظ، اپنے جیسوں کے لئے خوش وقتی، بچوں کے ساتھ شفقت، اور بوڑھوں کے ساتھ پاس توقیر واحترام۔

آداب سفر: پہلی چیز یہ ہونی چاہئے کہ سفر فی سبیل اللہ ہو، نفس کی تابعداری سے دور ہو۔ ہمیشہ باوضو رہے۔ سفر کا کوئی مقصد ہونا چاہئے یعنی حج بیت اللہ، جہاد، کسی مقدس مقام کی زیارت، تلاش علم، یا کسی بزرگ کے مزار کی زیارت۔ سفر میں مصلی۔ لوٹا۔ رسی۔ جوتا اور عصا ساتھ رکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ کنگھی، صابون، ناخن تراش، سوئی سرمہ بھی ساتھ رکھے تو بہتر ہے۔ راستہ میں کسی کی عیب جوئی نہ کرے۔ کیوں کہ کسی کی عیب جوئی کرنا خالق (اللہ تعالیٰ) پر اعتراض کرنے کے برابر ہے۔

آداب طعام: انسان کے لئے غذا لازمی ہے۔ طبیعت کا سکون کھانے پینے سے برقرار رہتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مبالغہ سے کام نہ لیا جائے۔ اور آدمی صبح وشام صرف کھانے پینے کی فکر میں ہی نہ رہے۔

سالکوں کی پاس پیٹ بھر کر کھانا ہی سب سے بری چیز ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ کے بعد سب سے پہلی بدعت جو مسلمانوں میں آئی وہ پیٹ بھر کر کھانا ہے۔ حضور نے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

کہتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامیؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ بھوک کی بہت تعریف کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر فرعون بھوکا ہوتا تو ہرگز یہ نہ کہتا أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ﴿النازعات:۲۴﴾ (میں تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں) اگر قارون بھوکا ہوتا تو کبھی سرکشی نہ کرتا۔ ثعلبہ جب تک بھوکا تھا تو سب اس کی تعریف کرتے تھے۔ جب سیر ہوا تو نفاق کا بیج بویا۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی نسبت آنحضرت سے فرمایا ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿الحجر:۳﴾ اے رسول آپ انہیں چھوڑ دیجئے۔ وہ کھائیں (پئیں) تمتع حاصل کریں۔ تمناؤں میں الجھے رہیں۔ عنقریب وہ سب کچھ جان لیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿محمد

:۱۲﴾ کفار دنیامیں تمتع حاصل کرتے ہیں اور چوپایوں کی طرح کھاتے ہیں۔ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

آداب طعام یہ ہیں: تنہانہ کھائیں۔ کھاتے وقت دوسرے کے لئے ایثار کریں۔ جب دستر خوان پر بیٹھیں تو بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کریں۔ خوان پر رکھی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر نہ دیکھیں۔ ساتھیوں کے ساتھ انصاف کریں۔ کھانا ہاتھ سے کھانا چاہیئے۔ نظر صرف اپنے لقمے پر رکھے۔ لقمہ چھوٹا بنائے۔ منہ میں ڈالنے اور چبانے میں جلدی نہ کرے۔ کھانے سے فارغ ہو کر الحمد للہ کہے۔ دعوت میں جو ملے کھالے۔

چلنے پھرنے کے آداب: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا ﴿الفرقان :۶۳﴾ اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عجز وانکسار سے چلتے ہیں۔ طالب حق کو چاہیئے کہ قدم اٹھاتے وقت سوچے کہ وہ کس کے لئے چل رہا ہے۔ خواہش نفس کے لئے یا حق تعالیٰ یا نیک کام کے لئے۔ اگر خواہش نفس کے لئے ہے تو توبہ کرے اگر حق تعالیٰ کی خوشی کے لئے ہے تو مزید کوشش کرے۔ اگر جماعت کے ساتھ جارہا ہے تو کسی سے بات کرنے کے لئے راستہ میں نہ ٹھہرے۔ اس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ آہستہ چلے۔ جلد بازی نہ کرے۔ صحیح قدم صحیح قلبی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا۔ درویش کی رفتار بغیر مراقبہ، غفلت کا نشان ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا 'دم و قدم رانگہدار'۔ اے مومن دم اور قدم پر نظر رکھ۔ یعنی دم (ہر سانس) اللہ کے ذکر کے ساتھ ہو اور قدم کی حفاظت یہ ہے کہ ہر قدم پر نقش قدم کو سامنے رکھے۔ یعنی اطاعت رسول کا خیال رہے۔

سونے کے آداب: ایک جماعت کا خیال ہے کہ سالک کو اس وقت سونا چاہیئے جب نیند کا غلبہ ہو۔ کیونکہ حضورؐ نے فرمایا النوم اخ الموت۔ نیند اور موت میں برادری ہے۔ زندگی نعمت ہے اور موت بلا ہے۔ حضرت شبلیؒ سے روایت ہے کہ حق تعالیٰ نے مجھ پر نظر کی اور فرمایا "من نام غفل و من غفل حجب"۔ یعنی سونے والا غافل ہے اور جو غافل ہوا وہ حجاب میں ہے۔

اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ سالک اپنے اختیار سے سو بھی سکتا ہے اور حق کے احکام کی بجا آوری بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جف القلم عن ثلاث،عن النائم حتیٰ ینتبه وعن الصبی حتی یحتلم و عن المجنون حتی یفیق۔ تین آدمیوں پر احکام جاری نہیں ہوتے ایک سونے والے پر جب تک بیدار نہ ہو۔ دوسرے لڑکے پر جب تک وہ جوان نہ ہو اور تیسرے دیوانے پر جب تک وہ ہوش میں نہ آئے۔

سویا ہوا آدمی تکلیف (شرعی) سے بری ہوتا ہے کیونکہ وہ خلق کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ بے اختیار ہوتا ہے۔ اس کا

نفس خواہش سے بری ہوتا ہے، اس کے کراماًکاتبین فارغ ہوتے ہیں اس کی زبان دعویٰ سے معذور ہوتی ہے۔ جھوٹ اور غیبت میں وہ مبتلا نہیں ہوسکتا اور خود بینی اور ریا سے پاک ہوتا ہے۔**لا یملکون لانفسھم ضرا و لا نفعا و لا یملکون موتا و لاحیوٰۃ و لا نشورا**۔یعنی نہ ہو اپنی ذات کو ضرر پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ، نہ اسے موت اور زندگی پر اختیار رہتا ہے اور نہ وہ دوبارہ زندہ ہونے پر قادر ہوتا ہے۔

آدمی کو چاہیئے کہ جب تک وہ رات میں خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت، ذکر کر سکتا ہے کرے۔ اگر نیند کا غلبہ ہو جائے تو سو جائے۔ پھر اٹھ کر عبادت کرے۔ تہجد کا بھی یہی حکم ہے کہ سو کر اٹھ کر نماز پڑھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"باوضو سونے والے کی روح کو طواف عرش کی اور حق تعالیٰ کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

ادب اور ادیب

آداب ستودہ عادات کا یکجا ہونا ہے۔ جس کسی میں نیک عادتیں جمع ہوں وہ ادیب ہے۔

اصطلاح عام میں لغت اور صرف و نحو کے عالم کو ادیب کہتے ہیں۔

مگر صوفیاء کے پاس ادب کے معنی یہ ہیں: حق تعالیٰ سے ہر معاملہ باادب ہو۔ خواہ خفیہ ہو یا علانیہ۔ اگر معاملہ باادب ہے تو آدمی ادیب ہے چاہے عجمی ہو ورنہ اس کا برعکس۔ عبارت آرائی کو معاملت میں کوئی دخل نہیں۔

ایک بزرگ نے ادب کی شرط اس طرح بیان کی ہے۔ ادب یہ ہے کہ جو کچھ تیری زبان سے نکلے، سچ ہو۔ اگر کوئی معاملہ کرے تو اس کی بنیاد حق و انصاف پر ہو۔ کلام سچا ہونا چاہئے۔ خواہ کڑواہی کیوں نہ ہو۔ عمل نیک ہونا چاہئے خواہ سخت ہی کیوں نہ ہو۔ بولو تو سچ بولو، خاموشی کو راستی پر مبنی رکھو۔ شیخ ابو نصر سراج نے اپنی کتاب اللمع میں ادب کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ فرماتے ہیں ادب کے لحاظ سے لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔

اہل دنیا، جن کے نزدیک فصاحت، بلاغت، علوم و فنون کی تحقیق و تدقیق و تدوین، بادشاہوں کی داستانیں، مختلف شعراء کے اچھے شعر، علمی چیزوں شاہی نسب ناموں اور عربی زبان کے اشعار کو حفظ کرنا ادب ہے۔

اہل دین، ادب نفس، ریاضت و مجاہدہ کی عادت، اعضاء جسمانی کی تادیب، حدود حق کی حفاظت اور ترک خواہشات نفسانی کو ادب کہتے ہیں۔

خاص لوگوں کے پاس ادب کے معنی، دل کو پاک رکھنا، اسرار باطن پر نظر رکھنا، ایفائے عہد، وقت کی پاسداری، پراگندگی خیالات کا استیصال، حضور حق میں مؤدب رہنا ادب ہے۔

انا

أَنَا بَشَـرٌ مِّثْلُكُمْ ﴿الکھف:۱۱۰﴾ یعنی میں تمہاری طرح بشر ہوں۔ یعنی میں بھی انسانوں سے ہوں یعنی اللہ نے مجھے بنی نوع انسان میں پیدا کیا ہے۔ تاکہ انسانوں کی ہدایت کر سکوں۔ میں جن یا فرشتہ نہیں ہوں۔ جیسا کہ اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا" إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُـولًا مِّنْ أَنفُسِـهِمْ ﴿آل عمران:۱۶۴﴾ یعنی اللہ نے تمہارے میں سے ہی رسول کو بھیجا ہے۔ یا دوسری جگہ فرمایا لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ ﴿التوبة :۱۲۸﴾ تمہارے میں سے تمہارے پاس ایک رسول آیا۔ اس کا مقصد بھی یہ بیان کرنا ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے انسان ہی ضروری تھا۔ کیونکہ ہر جنس اپنی ہی جنس کی طرف میلان رکھتی ہے اور اسی سے مانوس بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں مقام، مرتبہ اور کمالات میں بھی تم جیسا ہوں۔ توبہ توبہ۔ **العیاذ باللہ** ایک بادشاہ اور اس کا ایک ادنیٰ خدمتگار دونوں انسان ہیں۔ جنس کے اعتبار سے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دونوں مرتبہ میں ایک ہیں یا برابر ہیں۔ ہیرا اور پتھر دونوں جمادات کی جنس سے ہیں مگر ایک تو پاؤں کی ٹھوکر سے پامال ہوتا ہے اور ایک بادشاہ کے تاج میں لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل صورت کے اعتبار سے انسان اور آدمی نظر آتے ہیں لیکن کیا دونوں کا ایک ہی مقام ہے۔ ایک کو اللہ تعالیٰ نے معراج میں اپنے پاس بلایا اور دوسرا تحت الثریٰ میں دوزخ کی سیر کر رہا ہے۔ ایک کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور ڈوبا ہوا سورج پلٹ آیا۔ بکری کے تھن کو ہاتھ لگایا تو بے تحاشہ دودھ بہنے لگا، تھوڑے پانی اور کھانے میں انگلیاں ڈبوئیں تو لشکر سیراب ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کیا کوئی ایسے کمالات رکھ سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ آپ بشر تو ہیں مگر اوروں کی طرح بشر نہیں ہیں۔

انا: اللہ نے فرمایا: إِنَّنِي أَنَا اللَّـهُ لَا إِلَـٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ﴿طٰہ:۱۴﴾ ترجمہ: بے شک میں ہی اللہ ہوں نہیں ہے کوئی معبود سوائے (انا) میں پس (اے موسیٰ) تم میری عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز کو قائم کرو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ لا الہ الا اللہ کی جگہ پر یہاں اللہ نے لا الہ الا انا فرمایا ہے۔ پس "انا" ایک خاص لفظ ہے۔ اور انا کہنے کا صحیح مستحق اللہ ہی ہے۔ کسی دوسرے کے لئے 'انا' کہنا اللہ کے ساتھ "ہمسری" کا دعویٰ کرنا ہے۔ پس اللہ کی غیرت اس کو برداشت نہیں کرتی کہ اس کے سواء کوئی اور "انا" کہے۔ اور اگر کسی نے ایسا کیا ہے، خواہ کسی بھی حال میں ہو، تو اللہ نے اس کو معاف نہیں فرمایا۔

انا اللہ یا انا الحق کہنے والے افراد دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جو اللہ کو بھول کر اور اپنی انانیت میں ڈوب کر "انا اللہ" یا انا ربکم الاعلیٰ" کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، اور دوسروں سے اپنی "الٰہیت، ربوبیت، اور معبودیت" کو منواتے بھی

ہیں۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو اللہ کی عبادت، ذکر و فکر میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں۔ اور اس کے حصول کے لئے اتنی ریاضتیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں کہ وہ ''خود'' کو بھول جاتے ہیں اور ''وہی'' ان کو یاد رہتا ہے۔ گویا وہ ''اس میں'' فنا ہو جاتے ہیں اور اسی فنا، جذب اور مستی کے عالم میں ان کی زبان سے ''انا الحق'' نکل جاتا ہے۔ لیکن اس سے ان کی مراد ''حق'' یا ''اللہ'' کا انکار نہیں ہوتی اور نہ وہ دوسروں کو اپنی ''الوہیت، معبودیت اور ربوبیت'' کے ماننے کی تلقین کرتے ہیں اور ان کو مجبور کرتے ہیں پھر ان میں بھی بعض وہ ہیں جو ہمیشہ جذب و سکر کی حالت میں رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں جن کو ہوش بھی آجاتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایسا کہا تھا تو وہ اس قسم کے دعوؤں سے صاف انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں ان کو قتل کر دیا جائے۔

لوگ بھی ان کی اس حالت کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ یہ ''مسلوب الحواس'' یعنی مجذوب ہیں۔ یا ''فاترالعقل'' ہیں اس لئے ان سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ ''مرفوع القلم'' ہو گئے ہیں۔ یعنی ان کی ایسی حرکتوں کے بارے میں ان سے خدا کے پاس باز پرس نہیں ہو گی۔ ان کی یہ کیفیت معصوم اور نابالغ بچوں کی سی ہو جاتی ہے یا پھر مجنون کی سی۔ اور یہ دونوں مرفوع القلم ہیں۔

لیکن چونکہ ان کی ایسی حرکتوں اور اقوال سے سادہ لوح عوام پر برا اثر پڑ سکتا ہے، اللہ کی توحید کو دھکا لگ سکتا ہے اور شریعت حقہ کی علانیہ خلاف ورزی ہوتی ہے، اس لئے اگر ایسا معاملہ کسی قاضی شریعت کے پاس پیش ہو تو ایسے اشخاص پر قاضی، ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے فتنہ پیدا ہونے کے خوف اور اس کے سدباب کی نیت سے شریعت کا حکم نافذ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس پر شریعت مصطفی کا حکم نافذ کر دیتا ہے۔ اور اس کا اصل سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اسرار الٰہیہ کو فاش کرنے کے جرم کا مرتکب سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اصل تو یہ ہے کہ محبوب کے راز کو اپنے سینے میں دفن کرنا چاہئے اور اس کی بھنک بھی دوسروں تک نہیں جانی چاہئے۔ لیکن کوئی شخص ''راز'' کی حفاظت نہیں کرتا اور اس کو طشت ازبام کر دیتا ہے تو لازماً راز کو فاش کر دینے کی وجہ سے اس کو نااہل سمجھا جاتا ہے اور اس کو قتل کر دیا جاتا ہے یا سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے کیونکہ وہ نظام شریعت میں خلل پیدا کرنے اور اس کو درہم برہم کرنے کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ جو ایسا کرتے ہیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کا ظرف چھوٹا ہوتا ہے۔ اور ایک بڑے راز کو ہضم کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہوتی پس وہ بہک جاتے ہیں اور راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان پر جو واردات قلبی ہوتے ہیں، وہ فوراً زبان پر آجاتے ہیں۔ شریعت کی اولین نگاہ چونکہ زبان پر ہوتی ہے اس لئے ایسے الفاظ پر فوری گرفت ہوتی ہے اور سزا دی جاتی ہے۔

حضرت امامنا مہدی موعود علیہ السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد شریعت محمدیہ ﷺ کی مکمل طور پر حفاظت کرنی تھی تو آپؑ نے بھی اس پر گرفت فرمائی۔ لیکن آپؑ کی نظر ان کے واردات قلبی اور احوال باطنی پر بھی تھی، تو آپؑ نے اپنے فرمان کے ذریعہ تعلیم دی اور اس مسئلہ کو جس خوبی کے ساتھ حل فرمایا وہ اپنی آپ نظیر ہے اور خلیفۃ اللہ کی شان کا مظہر بھی۔ آپؑ نے فرمایا: دانستن ایمان گفتن کفر۔ یعنی جاننا ایمان ہے اور کہنا کفر ہے۔ یعنی جاننے کی حد تک یہ صحیح ہے کہ آپ اس انا میں واصل اور اس انا میں فانی ہو چکے ہیں۔ لیکن جب بات بولنے کی آتی ہے تو آپ کو چاہئے کہ آپ وہ کہیں جو "ظاہر میں ہیں" ورنہ اصحاب شریعت تو صاف کہتے ہیں "نحن نحکم بالظاھر" یعنی ہم (اصحاب شرع) تو ظاہر پر حکم لگاتے ہیں۔

نیز یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ انا الحق وغیرہ کہنا تو بہت دور کی بات ہے اس طرح کا قول کسی پہلو جائز نہیں ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنا بھی مخلوق کے پاس نہ صرف معیوب ہے بلکہ عند الحق معتوب ہے۔ کیوں کہ بندگی کا جو مقام ہے وہ تمام مقاموں پر افضل و برتر ہے۔ بقول شاعر: بندگی اوبہ از سلطانی است۔ کہ انا خیر دم شیطانی است۔ اللہ کی بندگی، سلطانی سے بہتر ہے۔ اپنے آپ کو بہتر سمجھنا شیطانی سانس ہے۔ (معرفت الٰہیہ۔ ص:۲۵۰)

یہ تو سب جانتے ہیں کہ ابلیس (عزازیل) جو خوار، مردود اور مطرود ہوا وہ صرف أَنَا خَيْرٌ کہنے کی وجہ سے ہوا۔ آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے نہیں ہوا۔ پس حکم الٰہی سے سب فرشتوں نے سجدہ کیا اور ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تو اللہ نے اس کو لعین اور مردود نہیں کہا۔ بلکہ جب اللہ نے اس سے پوچھا کہ مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴿ص:۷۵﴾ اے ابلیس جس ہستی کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا اس کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے تجھ کو منع کیا تو ابلیس نے جواب دیا "أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" ﴿ص:۷۶﴾ اس سے میں بہتر ہوں۔ پھر دلیل بھی یہ پیش کی کہ "خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ" ﴿ص:۷۶﴾۔ کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے (آدم کو) مٹی سے پیدا کیا۔ یہ جواب سنتے ہی اللہ نے فرمایا فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿ص:۷۷﴾۔ پس (یہاں سے) نکل جا اس لئے کہ تو مردود ہے۔

اللہ کی کتاب ہی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دربار خداوندی سے شیطان کا اخراج فقط سجدہ نہ کرنے سے نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ نے جب اس سے پوچھا کہ سجدہ نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ تو جو جواب شیطان نے دیا کہ "أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" میں اس سے بہتر ہوں۔ اس جواب کے سنتے ہی اللہ نے اس کو اپنے دربار سے نکال دیا۔ شیطان کے اس جواب میں دو باتیں ہیں۔ پہلا أَنَا کا استعمال۔ اور دوسرا "خَيْرٌ مِّنْهُ" اس سے بہتر۔ اس سے معلوم ہوا کہ غضب خداوندی کا سبب یہ دونوں باتیں ہیں۔ دربار خداوندی میں اللہ کے سامنے "انا" (میں) کہا اور دوسرا اس سے بہتر ہوں کہا۔ اور یہ دونوں باتیں ہی تھیں جو اس کے حق میں

مردودیت اور مطرودیت کا باعث بنیں۔ یعنی اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھنا بھی خدا کو پسند نہیں ہے۔ یہ بحث تو اس باب میں ہوئی کہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنا بھی باعث عتاب ہے۔ لیکن کیا مطلقاً ''انا'' کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ تو اس بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ ''انا'' سے ہر حال میں بچنا ہی مستحسن سمجھا گیا ہے بلکہ اس لفظ کے استعمال سے احتراز کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے اس سلسلے میں روایت آئی ہے:

عن جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ صلى اللّهُ عليه و سلم فِي دَيْنٍ كَانَ عَلَى أَبِي، فَدَقَقْتُ الْبَابَ، فَقَالَ: " مَنْ ذَا "، فَقُلْتُ: أَنَا، فَقَالَ: " أَنَا، أَنَا، كَأَنَّهُ كَرِهَهَا (اشعة اللمعات کتاب الاداب باب الاستیذان فصل-۱-ص:۹۱)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ایک قرضہ کے قضیہ کے سلسلے میں جو میرے باپ پر تھا۔ پھر میں نے دروازے پر دستک کی آپ ﷺ نے فرمایا کون ہے (وہ جو دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے) پس میں نے کہا ''انا'' میں۔ تو آنحضرت ﷺ فرمایا انا انا (میں میں) اس انداز میں گویا کہ آپ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جابرؓ کے لفظ انا کو پسند نہیں فرمایا۔ جبھی تو اس کو تکرار کے ساتھ انا انا کہا۔

شارحین حدیث نے اس کی کئی طرح سے تاویلیں کی ہیں کہ 'میں' کہنے سے معلوم نہیں ہوتا کہ دروازہ پر کون ہے۔ ابہام باقی رہتا ہے۔ تعین اور تشخیص نہیں ہوتی یا کہ حضور نے آداب کی تعلیم دی ہے۔ ہاں تکبر، نفسانیت اور انانیت ہو تو پھر انا کہنا درست نہیں ہے۔ لیکن صوفیاء کا مسلک الگ ہے چنانچہ اسی حدیث کے ذیل میں لکھا ہے:

بعضے از متصوفیہ گویند کہ مکروہ است کہ کلمہ انا بر زبان رود کہ مبنی از ہستی اور انانیت است۔ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ آدمی کی زبان پر ''انا'' کا کلمہ مکروہ ہے۔ کیوں کہ وہ ہستی اور انانیت پر مبنی ہے۔ (ص:۲۰)

اب پھر عنان قلم کو اس مسئلہ کی طرف موڑتے ہیں کہ منصور نے بھی انا الحق کا دعویٰ کیا تھا اور فرعون نے بھی انا ربکم کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن دونوں میں بہت بڑا فرق کیا گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے تو اس کا جواب مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں اس طرح دیا ہے:

گفت فرعونے انا الحق گشت پست　　　　فرعون نے انا الحق کہا ذلیل ہوا

گفت منصورے انا الحق پس برست	منصور نے انا الحق کہا نجات پائی
ایں انارا رحمت اللہ اے محب	اس انا کے لئے اللہ کی رحمت ہے اے دوست
واں انارا لعنت اللہ در عقب	اور اس انا کے لئے اللہ کی لعنت ہے اس کے ساتھ
زانکہ آں سنگ سیہ بدویں عقیق	اس لئے کہ وہ کالا پتھر تھا اور یہ لعل تھا
آں عدو نور بود و ایں عشیق	وہ نور کا دشمن تھا اور یہ عاشق تھا
ایں انا ہو بود در سری فضول	یہ انا ہو تھا حقیقت میں کچھ نہیں تھا
نے ز روئے اتحاد و از حلول	یہ انا نہ مسئلہ اتحاد سے تعلق رکھتا تھا اور نہ حلول سے

اس کی مزید وضاحت اس نقل سے ہوتی ہے۔

نقل است شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ فرمودند وقتیکہ مرا حال گرم بود بزیارت منصور حلاج رفتم چوں مراقبہ کردم روح او را در مقام علیین یافتم از علیین مناجات کردم کہ خدایا ایں چہ حال است کہ فرعون انا ربکم گفت و منصور انا الحق گفت ہر دو ایک دعویٰ کردند، روح منصور در علیین است و روح فرعون در سجین۔ پس بہ من ندا آمد کہ فرعون بخود بینی در افتادہ ہمہ خود را دیدہ مارا گم کرد۔ و منصور ہمہ مارا دیدہ خود را گم کرد۔ پس درمیان ایں ہر دو را فرق بسیار است۔

ترجمہ: شیخ رکن الدین نے فرمایا کہ جس وقت مجھ کو جذبہ ہوا تو منصور حلاج کی زیارت کو گیا جب مراقبہ کیا تو منصور کی روح کو جنت میں پایا اس کے متعلق اللہ سے عرض کیا کہ یہ کیا حال ہے۔ کیوں کہ فرعون نے کہا میں تمہارا رب ہوں اور منصور نے کہا میں حق ہوں۔ دونوں نے ایک ہی دعویٰ کیا لیکن منصور کی روح جنت میں ہے اور فرعون کی روح دوزخ میں۔ پس مجھ کو غیب سے ندا آئی کہ فرعون نے خود بینی میں پڑ کر سب میں اپنا ظہور دیکھا اور میرے ظہور کو گم کر دیا اور منصور نے سب میں میرا ظہور دیکھا اور خود کو گم کر دیا پس ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے (حاشیہ، ص ۱۸۴)

اور خلاصہ یہ کہ ''انا'' اگر حق سے روگردانی کر کے استکبار کرے اور فرعون کی زبان سے انا ربکم الاعلی کہے یا شیطان کی زبان سے ''أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ'' کا نعرہ بلند کرے تو یہ اس کی دناءت، پستی اور حقیقی صفت انا کی گم کردگی ہے۔ انسان اپنی ذات کے لحاظ سے مخلوق اور فانی ہے۔ اور اپنی صفت بحیثیت مومن کے باقی باللہ ہے وَلِلَّـــــهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُـــولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ ﴿المنافقون:۸﴾ کا ترجمان ہے ایک دوسرے مقام پر مولانا رومؒ نے فرمایا ہے:

آں انا بے وقت گفتن آفت است	ویں انا در حقیقت راحت است

آں انا منصور رحمت شد یقیں وآن انا فرعون لعنت شد ببیں (اسرار خودی۔ ص:۳۰۷،۳۰۶)

صوفیاء کے ہاں ایک باب ہے جس کو **شطحیات** کہتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ ان پر حالات گزرتے ہیں اور ان حالات میں کچھ کلمات ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں جو ظاہری قواعد پر چسپاں نہیں ہوتے اور بسا اوقات غلط راستہ لینے کا سبب بن جاتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ کوئی شخص جو کسی حال کا مالک نہیں ہوتا وہ ایسی باتوں سے الجھ جاتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس مقام سے با خبر یا اس حال کا مالک نہیں ہوتا یا صوفیاء کی اصطلاح سے واقف نہیں ہوتا اس لئے وہ ان پر اپنی زبان دراز کر بیٹھتا ہے۔ کبھی کبھی جاننے والے بھی یعنی اہل شرع بھی فتنہ عمومی کے خوف سے ظاہر پر حکم لگانے پر ''مجبور'' ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ جن سے شطحیات سرزد ہو رہے ہیں وہ اپنے حال اور مقام کے سبب ''معذور'' ہیں۔ جیسا کہ حضرت حلاج کے تعلق سے ہوا ہے۔

انا کے معنی ایک تو ''میں'' کے ہیں جو عربی میں صیغہ واحد متکلم ہے۔ اور اس کے دوسرے معنی تکبر۔ انانیت، خودی، خود پرستی، خود ستائی، اور خود رعنائی کے ہیں۔ انانیت مفضی الی التکبر ہوتی ہے۔ انا میں کبر پوشیدہ ہوتا ہے کبر کا منشاء ''عجب'' ہوتا ہے۔ یعنی نفس کو، خود کو اور اپنی صفات کو نیک اور بہتر سمجھنا اور اپنے مقابلے میں دوسروں کو حقیر اور کمتر سمجھنا۔ اور ان پر تقدم اور علو مرتبت حاصل کرنا۔ اور یہ چیز انقیاد اور تسلیم حق سے منع کرتی ہے۔ اور تکبر و استکبار تک لے جاتی ہے، جو مذموم ہے۔

شروع میں تو اپنی اچھی صفات کا اظہار کسی موقع پر ہو امر واقع کا اظہار ہوتا ہے لیکن بعد میں وہ چیز نفس پر غالب ہو کر تکبر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لئے مشائخ صوفیہ قدس اللہ ارواحھم نے صفت تکبر کو جب نفس پر اکثر غلبہ پاتے ہوئے دیکھا تو اس کی نفی اور ازالہ پر مبالغہ اور سختی اختیار کی۔ (اشعۃ اللمعات۔ ص:۱۷۶۔ کتاب الاداب، باب الغضب والکبر)

اس سلسلے میں احادیث رسول اللہ ﷺ بھی وارد ہیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ من كان فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْكِبْرِ''یعنی جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔

نیز فرمایا''الكبر يبطل الحق''یعنی کبر حق کو باطل کر دیتا ہے۔

نیز فرمایا یقول اللہ تعالیٰ۔ الكبرياء ردائی و العظمة ازاری فمن نازعنی واحدا منهما ادخلته النار۔ یعنی کبر

یا میری چادر ہے اور عظمت میری ازار ہے پس جو شخص ان دو صفتوں میں مجھ سے منازعت کرے گا اس کو میں دوزخ میں داخل کروں گا۔

یہ ایک مثال ہے جس کے ذریعہ یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں صفتیں میری ذات سے مخصوص ہیں۔ اور یہ کہ کسی شخص کو ان میں شرکت کی مجال اور ان سے متصف ہونے کی جرأت درست نہیں ہے چنانچہ جود و کرم و مہربانی میری صفات ہیں۔ اور مخلوق کو بھی ان سے ان میں سے حصہ ہے اور یہ جائز ہے۔ اس لئے کہ ان کا وصف بطور مجاز کے ہے۔ لیکن یہ دو صفتیں بطور مجاز کے بھی میرے غیر کے لئے درست نہیں ہوں گی۔ جس طرح کہ کوئی شخص پاجامہ پہنا ہوا ہے۔ اور کوئی دوسرا شخص وہی پاجامہ اسی وقت پہن سکے گا جب وہ اس سے چھین لے۔

"فمن نازعنی واحدا منهما ادخلته النار"۔ پس جو شخص ان دو صفتوں میں سے مجھ سے جھگڑے اور میرے ساتھ مشارکت چاہے تو میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا۔

نیز ایک حدیث میں آنحضرتؐ ﷺ نے تین مہلکات کے بیان کے آخر میں إِعْجَابُ الْمَرْءِ لِنَفْسِهِ کا ذکر فرمایا۔ یعنی آدمی کا خود کو نیک اور اپنی صفات کو بہتر سمجھنا۔ اس کی تشریح میں یہ کہا گیا ہے کہ اعجاب سے کبر پیدا ہوتا ہے۔ اور کبر سے تکبر وجود میں آتا ہے۔ اور آخر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا "وَهِيَ أَشَدُّهُنَّ" یعنی یہ عجب کی صفت مذکورہ مذمومہ صفتوں میں سے سب سے سخت اور بدترین خصلت ہے۔ (اشعتہ اللمعات۔ ص:۱۸۳ باب الغضب والکبر)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک قرض کے معاملہ میں جو میرے باپ پر تھا آیا (یعنی ان کے والد نے کسی سے کچھ قرض لیا تھا اور وہ شخص تقاضا کر رہا تھا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضرت کی خدمت میں اس غرض سے آئے تھے آپ اس شخص سے کہیں کہ وہ ذرا نرمی برتے۔ جب جابر کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کے دروازے پر دستک دی۔ حضورؐ نے فرمایا "من ذا" کون ہے وہ۔ تو جابر نے جواب "انا" میں تو آنحضرت نے فرمایا "انا انا" میں میں۔ كَأَنَّهُ كَرِهَهَا۔ گویا انا کے لفظ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔ (اشعتہ اللمعات باب الاستیذان۔ ص:۲۰۔۱۹)

اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ میں کہنے سے کسی شخص کی تعیین اور تشخیص نہیں ہوتی۔ بات مبہم ہی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یعنی ایسے موقع پر یہ ضروری ہے کہ نام، لقب یا کنیت ذکر کرے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون ہے۔ اور آنحضرتؐ نے جو دوبار "انا انا" کہا وہ ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے تھا۔ اہل تصوف نے اسی وجہ سے زبان پر انا کہنے کو مکروہ جانا ہے کہ لفظ انا ہستی

اور انانیت پر مبنی ہے۔

چنانچہ حضرت مہدی علیہ السلام نے بھی ''میں'' کہنے کو خود اپنے لئے بھی پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کی بجائے ''بندہ'' کا لفظ استعمال فرمایا۔ چنانچہ بے شمار نقلیات شریفہ میں آپ نے اپنے لئے ''بندہ'' فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''انا'' اللہ کو پسند نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ نے اپنے لئے ''انا'' کہا ہے چنانچہ قرآن میں آیا ہے۔ إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا ﴿طه:۱۴﴾۔ میں بے شک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

اور یہ بات حقیقت بھی ہے۔ اس لئے کہ ''میں'' کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہر شخص کہتا ہے ''میں'' ''میں'' اور پھر کہتا ہے کہ میرا جسم، میرا ہاتھ، میرا پیر، میرا سینہ وغیرہ تمام اعضاء کو میرے کہتا ہے۔ اور ہم جب اس سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے تو وہ کہتا ہے میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میری آنکھ وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ پھر میں کہاں ہے تو وہ بے بس ہو کر اپنی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر ہم جب یہ کہیں کہ تو جس کی طرف اشادہ کر رہا ہے تو وہ تیرا سینہ ہے یا دل ہے یا سر ہے، ہم یہ پوچھ رہے ہیں کہ "میں" کہاں ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ میں کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف ایک وہم و گمان ہے میں ہونے کا اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور میں بھی جو کہتا ہے وہ سن کر کہتا ہے۔ پہلے نہیں تھا۔ پھر نہیں ہوگا۔ مرنے کے بعد اس سے اگر پوچھیں کہ بھائی تو کون ہے جواب ندارد۔ بلکہ لوگ تو اس کے نام کو بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس کی لاش (Body)۔ یہاں رکھی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ''میں'' ایک اضافی اور وہمی ہے۔

اصل میں ''میں'' کہنے کا حقدار تو وہ ہے جو ازل سے ابد تک ہے۔ اور وہ ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

بندوں میں بعض ہستیاں، بزرگ ہستیاں جنھوں نے اللہ کے عشق میں اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ وفور محبت اور غلبہ عشق کے تحت اپنی فنائیت کاملہ کا اظہار اپنی بے خودی میں انا سے کر دیا ہے اور خلاف شریعت انا اللہ یا انا الحق جیسے الفاظ ان کی زبان سے نکل گئے ہیں۔ جس کی اجازت شریعت ہرگز نہیں دیتی۔ یہ ''انا'' کہنے والے بھی دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا کہ چند اہل اللہ نے فنا فی الذات ہو کر انا اللہ یا انا الحق کہہ دیا۔ اور چند لوگ محض اپنی بڑائی، تکبر اور حکومت و سطوت کے نشے میں اپنے طور پر، خدا کی عظمت و بڑائی کا انکار کرتے ہوئے، اپنی معبودیت کو منوانے کے زعم میں انا کا دعویٰ کر دیا۔ چنانچہ نمرود اور فرعون اور ان جیسے ناہنجار لوگ تھے۔ چنانچہ فرعون نے اپنے دور میں اعلان کر دیا انا ربکم الاعلیٰ اسی طرح نمرود کا بھی حال تھا۔

اللہ تعالیٰ نے خدائی کے ان مدعیوں کی سرکشی کی لوگوں کے دیکھتے یعنی بر سر عام ان کو سخت سزا دی اور دنیا میں ان کا

منہ کالا ہوا۔ اور آخرت میں بھی جہنم کا عذاب ان پر مسلط رہے گا۔

لیکن ان اہل اللہ کے بارے میں جنھوں نے ساری زندگی اللہ کی محبت میں عبادتیں فرمائیں۔ ریاضتیں برداشت کیں۔ دنیا اور اس کے مزخرفات اور تعیشات سے دست کش رہے رات رات اس کے ذکر میں رہے اور اپنے آپ کو اس کی ذات میں فنا کر دیا اور غلبہ حال کا شکار ہو کر انا اللہ یا انا الحق کہہ اٹھے۔ تو ان کے بارے میں بھی لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ جو ظاہر پرست تھا اس نے ان کو کافر کہا اور گردن زنی کے قابل سمجھا تو دوسروں نے جو اہل باطن یا اہل طریقت تھے ان کی طرف داری تو نہیں کی بلکہ ان کو معذور سمجھا۔ اس لئے ان کو برے الفاظ سے یاد نہیں کیا جس طرح کہ فرعون اور نمرود کے لئے کہا تھا۔ حالانکہ ان کا بھی یہی مسلک تھا کہ ان کا جو حال تھا وہ صحیح تھا البتہ اس کا برملا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وقت کا اور شرع کا تقاضہ اخفاء کا تھا۔ اظہار کا نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنے حال کو پہنچے۔

چنانچہ مثنوی میں ہے:

شبلی سوال کرد بدر حضرت کریم	شبلی نے اللہ کی درگاہ میں سوال کیا
منصور را بہ دار چرا دادہ اے حکیم	اے حکیم منصور کو دار پر کس لئے چڑھایا
منصور بود واقف اسرار سر دوست	(جواب دیا) منصور دوست کے بھیدوں سے واقف تھا
ہر کس کہ سرّے فاش کند ایں سزائے اوست	جس نے بھید کو ظاہر کیا اس کی سزا یہی ہے۔

روایت ہے کہ شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ نے فرمایا جس وقت مجھ کر جذبہ ہوا تو منصور حلاج کی زیارت کو گیا جب مراقبہ کیا تو منصور کی روح کو جنت میں پایا اس کے متعلق خدا سے عرض کیا کہ یہ کیا حال ہے کیوں کہ فرعون نے کہا "میں تمہارا رب ہوں" اور منصورؒ نے کہا "میں حق ہوں" دونوں نے ایک دعویٰ کیا لیکن منصور کی روح جنت میں ہے اور فرعون کی دوزخ میں پس مجھ کو غیب سے آواز آئی کہ فرعون نے "خودبینی" میں پڑ کر سب میں اپنا ظہور دیکھا اور میرے ظہور کو گم کر دیا اور منصورؒ نے سب میں میرا ظہور دیکھا اور خود کو گم کر دیا۔ پس ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔

اللہ نے دیا

حضرت امامنامہدی موعود علیہ السلام کے دائرہ میں یہ عمل تھا کہ فقراء متوکلین علی اللہ کی خدمت کی غرض سے اگر کوئی کچھ چیز از قسم غلہ، کپڑا یا نقد وغیرہ پیش کرتا، تو جب تک وہ اپنی زبان سے اللہ نے دیا (یا فی سبیل اللہ) نہ کہتا آپ علیہ السلام اس کو نہ ہاتھ لگاتے تھے، نہ فقراء میں تقسیم فرماتے تھے۔ اور یہی عمل ماشاء اللہ آج بھی دائروں میں جاری وساری ہے۔

اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب یہ معلوم ہے کہ دینے والا اللہ ہی ہے تو کہنے کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دیتے وقت اللہ نے دیا ہے کہنا ضروری ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ "دینا" صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ہے کیوں کہ کسی کو کچھ دینا مختلف مقاصد کے تحت ہوتا ہے۔ یعنی دینے کی مختلف نیتیں ہوتی ہیں مثلاً (۱) کوئی کسی کو خوش کرنے کے لئے دیتا ہے تو (۲) کوئی اپنا کام نکالنے کے لئے دیتا ہے تو (۳) کوئی کسی کو خاموش کرنے کے لئے دیتا ہے تو (۴) کوئی کسی کو تابع بنائے رکھنے کے لئے دیتا ہے تو (۵) کوئی اپنی برتری جتانے کے لئے دیتا ہے۔ تو یہ سب "دینے" اللہ کے سوا کے لئے ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کا اجر قیامت میں نہیں ملتا لیکن جو شخص صرف اللہ کی مرضی اور خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے دیتا ہے اس کا صلہ اور بدلہ اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس کئی گنا ملتا ہے۔

قرآن شریف کے پہلے پارے میں متقین کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک وصف یہ بیان کیا گیا ہے "وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ" ﴿البقرۃ:۳﴾ یعنی ہم نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے وہ (بنام خدا یا فی سبیل اللہ) خرچ کرتے ہیں۔

ویسے خرچ کرنا تو عام ہے۔ جب مال پاس رہتا ہے تو سب خرچ کرتے ہیں۔ لیکن جب اللہ کے نام پر خرچ کرنے کی بات آتی ہے تو آدمی کترا جاتا ہے۔ پہلو تہی اختیار کرتا ہے اور انجان بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میری کمائی ہے اور میری محنت کا صلہ ہے اللہ اس کا جواب دیتا ہے کہ تیرا یہ خیال غلط ہے کہ تو کماتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رزق کے دینے والے ہم ہیں۔ تو جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے کچھ ہمارے نام پر یا ہمارے راستے میں خرچ کرنا تم پر بھاری نہ ہونا چاہئے۔

اور آیت میں خود اللہ نے "ہم نے دیا" ہے کہہ رہا ہے تو بندہ کو بھی چاہئے کہ اس امر کا اعتراف کرے کہ مجھے "اللہ نے دیا ہے" اور ساتھ ہی اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ اس دینے کی توفیق بھی اللہ نے دی ہے۔ کیوں کہ اللہ بہت سے لوگوں کو مال دیتا ہے اور بہت دیتا ہے لیکن ان کو اللہ کے نام پر دینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ تو یہاں دینے والا گویا دو باتوں کا اعتراف کر رہا ہے یعنی ایک یہ کہ اللہ نے مجھے دیا ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ نے مال کے ساتھ مجھے دینے کا جذبہ بھی دیا ہے۔ یہ دونوں باتیں اللہ

نے دیا کہنے میں آجاتی ہیں۔

ایسا کہنے میں ایک حکمت اور بھی ہے وہ یہ کہ عموماً دینے والا اپنے آپ میں بڑائی محسوس کرتا ہے اور جس کو دیتا ہے اس کو کمتر اور حقیر سمجھتا ہے اس کے ذہن میں یہ گھمنڈ پیدا ہوتا ہے کہ "میں دے رہا ہوں" اور اس وقت وہ اپنے اس مالک حقیقی کو بھول جاتا ہے جس نے اس کو مال سے نوازا ہے۔ اس کے بر خلاف اگر وہ دیتے وقت "اللہ نے دیا ہے" کہہ دیتا ہے تو اس سے بڑائی اور غرور کا بت چور چور ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ وہ اللہ کے دئے ہوئے مال میں سے اللہ کا حق ادا کر رہا ہے۔

اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ جب وہ اللہ نے دیا ہے کہہ دیتا ہے تو لینے والے میں پستی اور کمتری کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ دینے والے سے کبھی مرعوب بھی نہیں ہوتا۔ ضرورت پڑنے پر اگر اس دینے والے میں کوئی برائی بھی دیکھے تو اس کو روکنے یا کم از کم ٹوکنے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ اور نہایت بے باکی سے حق بات کہنے پر تیار رہتا ہے۔ اگر کبھی دینے والا یہ احسان جتائے کہ آپ ہمارا کھا کے ہم کو ٹوک رہے ہو "واہ بھائی ہماری بلی ہمارے ساتھ میاؤں میاؤں" تو وہ صاف جواب دے سکتا ہے کہ آپ نے دیتے وقت اللہ نے دیا ہے کہا تھا تو ہم نے "اللہ کا دیا" لیا ہے نہ کہ آپ کا۔

ایک مثال کے ذریعے اس کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ زید نے عمر کو 100 روپے دئے اور کہا کہ آپ اس رقم کو بکر کو دے دیں جو مستحق ہے پھر جب عمر نے بکر کو وہ رقم دی تو کہنا بھول گیا کہ یہ رقم دراصل زید نے آپ کو دینے کے لئے دی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لینے والا دینے والے کے حق میں دعا کرے گا پھر جب عمر کو اپنی بھول کا احساس ہوا اور اس نے دوبارہ جا کر کہا کہ یہ رقم زید نے مجھے آپ تک پہنچانے کے لئے دی تھی تو اب تصویر بدل جائے گی اور لینے والے کی زبان سے زید کے لئے دعا نکلے گی یا اس کے ذہن میں زید کی صورت سامنے آئے گی۔ لیکن جب دینے والا اللہ نے دیا ہے کہہ کر رقم دیتا ہے تو دینے والے کے ذہن میں بھی اللہ رہتا ہے، زبان پر بھی اللہ کا نام آتا ہے اور لینے والے کے ذہن میں بھی "اللہ" آجاتا ہے۔ یہاں زید، عمر وغیرہ کا تصور بھی نہیں آتا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ جو درہم کسی مستحق یا سائل کو دینے کا ارادہ فرماتیں تو پہلے اس کو خوشبو میں بسا دیتیں پھر اس مستحق یا سائل کے حوالے فرماتیں۔ جب لوگوں نے اس تعلق سے پوچھا تو فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب تم سائل کو کچھ دیتی ہو تو وہ پہلے رحمان کے ہاتھ میں جاتا ہے پھر سائل کے ہاتھ

ہیں۔ تو میں چاہتی ہوں کہ جب یہ درہم اللہ کے ہاتھ میں پہلے جاتا ہے تو اسے خوشبو میں بسا دوں۔

اللہ نے دیا کہہ کر دینے میں ایک اور مصلحت یہ بھی ہے کہ لینے والا ہمارا شکریہ ادا کرے ہم اس کی اس سے تمنا بھی نہیں رکھتے۔ اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ کبھی وہ اس کا بدلہ دے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے "إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّـــهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُـــكُورًا" ﴿الانسان:۹﴾۔ یعنی ہم تم کو صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کھلاتے ہیں، نہ تو ہم تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ یہ کہ تم ہمارا شکریہ ادا کرو۔

اب رہا یہ سوال کہ جب سب کو دینے والا اللہ ہی ہے تو اللہ دیا کہنے کی کیا ضرورت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں تو زبان سے اللہ کا نام لینے میں کیا تکلیف ہوتی ہے۔ اس حقیقت کا اظہار کہ دینے والا اللہ ہی ہے، بہت بڑی چیز ہے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے کہ کئی موقعوں پر کسی فارم بھرنے کے وقت پہلے آپ کا نام پوچھا جاتا ہے پھر آپ کے باپ کا نام پوچھا جاتا ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ کر ہر بچے کا کوئی نہ کوئی باپ ہوتا ہی ہے پھر بھی باپ کا نام پوچھا جاتا ہے۔ اور آپ اس کا نام بتاتے ہیں۔ بلکہ عرب میں اور بعض علاقوں میں اگر آپ کسی کا نام دریافت کریں تو وہ اپنے ساتھ اپنے باپ کا نام بھی بتاتا ہے جیسے محمد بن ابی بکر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو غیرہ اگر ہم اس سے کہیں کہ میں نے صرف تمہارا نام پوچھا تھا تم ساتھ میں اپنے باپ کا نام کیوں بتا رہے ہو تو وہ کہے گا کہ جس کی وجہ سے میرا وجود ہوا ہے یہ میرا فرض ہے کہ میں اس کا نام بتاؤں۔ اسی طرح جب ہم کسی کو کچھ دیتے ہیں تو یہ فرض بنتا ہے کہ ہم اس عظیم ہستی کا نام لیں جو ہمارا محسن اعظم ہے اور جس نے ہم کو اس قابل بنایا ہے کہ ہم اس کے نام پر کچھ دیں۔

اللہ نے دیا ہے کہنے میں "میں پنے" کا خاتمہ ہے۔ انا کو فنا کرنا ہے اور خودی کی موت ہے۔ اور یہی چیزیں اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن میں صاف وصریح حکم آیا ہے: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّـــهِ عَلَيْهِ ﴿الأنعام:۱۲۱﴾۔ تم ان چیزوں کو مت کھاؤ، جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان جانوروں کا گوشت مت کھاؤ جن کے ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہے یعنی بسم اللہ اللہ اکبر نہ کہا گیا ہو۔ لیکن اللہ والوں نے اس آیت میں جو "ما" ہے اس کو عام کرتے ہوئے اور اس کو وسیع کرتے ہوئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس چیز پر بھی اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو ہم اس کو نہیں کھاتے۔

(نوٹ) مثنوی مولانا رومی کی شرح کرتے ہوئے جناب کشمیری صاحب نے باطنی معانی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مقصود اس سے تفسیر اور تعیین مراد نہیں ہوتی بلکہ محض تمثیل اور قیاس ہوتا ہے ایک شئ کی حالت کو دوسرے شئ کی

حالت پر، اس کو علم اعتبار کہتے ہیں۔ پس اس کو "تفسیر بالرائے" یا انکار معنی ظاہری کا طعن ان پر نہیں ہو سکتا۔ (ص:۴۰)

اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ کھانے والا کھاتے وقت تو بسم اللہ کہہ کر ہی کھاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی بھی چیز کو خواہ حلال ہو یا حرام یا کسی کی بھی چیز کو جو دوسرے کی ملکیت میں ہو بسم اللہ کہہ کر کھا لینا کیا ہم کو جائز ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو فروٹ کی دکان پر جایئے اور جو میوہ پسند آئے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیجئے، کیا یہ جائز ہے؟ معلوم ہوا کہ آپ بسم اللہ کہہ کر وہی چیز کھا سکتے ہیں جو حلال ہو اور آپ کی ملکیت میں ہو، ملکیت میں آنے کے لئے شرع میں دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ اس کو خرید لیں یا وہ شخص آپ کو ہدیہ کر دے۔ لیکن ہدیہ کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الھدایا ترد" یعنی ہدئے (تحفے) لوٹائے جاتے ہیں مثلاً کسی نے آپ کو کوئی چیز بطور تحفہ دی ہو تو آپ کا فرض ہے کہ آپ بھی اس کو کچھ تحفہ دیں ورنہ فرض ناشناسی سمجھی جائے گی اب ہم نہ خرید رہے ہیں اور نہ اس کی استطاعت ہے کہ بدلے کے طور پر کچھ تحفہ لوٹائیں تو ہماری ملکیت میں وہ چیز آجائے اس کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ آپ اس چیز پر اللہ کا نام لے کر دیدیں۔ یعنی اسکی ملکیت میں دے دیں جو مالک ملک السمٰوٰت والارض ہے۔ جب ایسا ہوا تو اللہ کے بندے اللہ کی ملکیت کو اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں جس طرح بارش کا یا ندی کا پانی، فضا کی ہوا اور جنگل کی گھاس وغیرہ۔ اسی لئے امامنا مہدی موعود علیہ السلام نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ جب تک "اللہ نے دیا" نہ کہا جائے۔ نہ لو اور نہ کھاؤ۔

بسم اللہ شروع کرو، کہنا کفر ہے: بسم اللہ کے معنی "میں شروع کرتا ہوں نام سے اللہ کے" ہے۔ اس کو کسی کام کے شروع کرنے یا کھانا شروع کرنے کے لئے دوسرے کو اجازت دینے کی غرض سے استعمال کرنا، قرآن کی تفسیر بالرائے ہوتی ہے اور من فسّر القرآن برایه فقد کفر منقول ہے۔

اتباع تام

انگوٹھوں پر چلنا: روایت ہے کہ جب حضرت امامنا مہدی موعود علیہ السلام خلد آباد تشریف لے گئے تو سید محمد مومنؓ کے روضے سے حضرت شاہ راجو قتال کے روضے تک پنجوں کے بل چل کر تشریف لے گئے۔ جب آپؑ کے صحابہ نے اس عمل کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے جواب دیا کہ یہاں اتنے اولیاء دفن ہیں کہ میری اس احتیاط کے باوجود کسی کے سر پر میرا پاؤں پڑرہا ہے تو کسی کے سینے پر۔ تو بالکل ایسی ہی ایک روایت دور نبوت میں آنحضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے ایک صحابی تھے جن کا نام ''الجلیبیب'' تھا وہ ہمیشہ مغموم اور رنجیدہ رہتے تھے ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے ٹالنا چاہا۔ پھر آپ ﷺ نے اصرار کیا تو آپ نے حقیقت بیان کی کہ وہ تنہا ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نکاح کیوں نہیں کر لیتے تو انہوں نے کہا کہ میری شکل اور صورت ایسی ہے کہ کون شخص اپنی لڑکی میرے نکاح میں دے گا۔ میں نے اس خوف سے کہ میرا انکار کر دیا جائے گا میں نے اپنا پیام کسی کے گھر نہیں بھیجا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تم اسی وقت فلاں شخص کے پاس جاؤ جو مدینہ کے نواح میں رہتا ہے اور اس کو میرا سلام کہو اور یہ بھی کہو کہ رسول اللہؐ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ اپنی لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کر دیں۔ صحابی نے کہا یا رسول اللہ کیا میری شکل وصورت کو دیکھ کر وہ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے دروازے پر سے ہی واپس کر دیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا تم میری بات سنو۔ ان کے پاس جاؤ ان کو میرا سلام کہو اور تمہارا پیام دو اور یہ کہو کہ میں خود سے نہیں آیا ہوں بلکہ رسول اللہؐ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے پس وہ صحابی ڈرتے ڈرتے وہاں گئے۔ دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی کون ہے جواب دیا الجلیبیب، رسول اللہؐ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ باہر آئے اور پوچھا کیا بات ہے۔ رسول اللہؐ نے کیا فرمایا ہے۔ کہا رسول اللہؐ نے آپ کو سلام کہا ہے اور مجھے آپ کے پاس اس غرض سے بھیجا ہے کہ آپ اپنی لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کر دیں۔ یہ سنتے ہی وہ غصے میں بھر گئے اور کہا کیا تم نے اپنی شکل وصورت دیکھی ہے۔ یہ صورت یہ شکل اور میری بیٹی سے نکاح کی خواہش انہوں نے کہا میں خود نہیں آیا ہوں بلکہ مجھے رسول اللہؐ نے اپنے حکم سے بھیجا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ لیکن اللہ کے رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی میرے بس کی بات نہیں تھی اس لئے میں چلا آیا۔ مالک مکان نہ جانے کیا کیا کہتے رہے اور وہ بھی اونچی آواز میں تو ان کی بیوی بھی دروازے پر آگئی۔ ماجرا پوچھا تو شوہر نے واقعہ بیان کیا یہ سن کر وہ بھی جلال میں آگئیں اور پھر عورتوں کے انداز اور الفاظ میں کافی سنا ڈالیں۔ صحابی اس ذلت ورسوائی کے ساتھ واپس ہونے لگے۔ اتنے میں وہ صاحبزادی جو پردے سے لگی اس گفتگو کو سن رہی تھی اپنے والد سے کہا ابا جان آپ ذرا ان کو آواز دے کر بلایئے۔ ماں اور باپ نے کہا بیٹی تو کیا کرے گی یہ شخص جس کی بدصورتی مثالی ہے تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ لڑکی نے کہا آپ نے سنا نہیں کہ وہ از خود ہمارے پاس نہیں آیا ہے

بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ اس شخص کو تو انکار کر سکتے ہیں لیکن حضورؐ کی بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضورؐ کا ارشاد ہمارے سر آنکھوں پر میں ان سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ ان کو آواز دے کر بلایئے۔ ماں باپ نے بیٹی کی ایمان افروز باتیں سن کر آواز دی کہ میاں ادھر آؤ۔ صحابی جو پہلے سے کھری کھری سن کر شرم کے مارے ہوئے تھے آواز سن کر اور زیادہ گھبرا گئے کہ نہ جانے اب کیا آفت سر پر ٹوٹنے والی ہے دل نے کہا شاید رہی سہی بھڑاس بھی نکالی جائے گی پھر بھی ہمت کر کے پلٹ آئے تو لڑکی نے کہا کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں بندی کا سلام عرض کرو اور کہو آپ نے جو رشتہ بھیجا ہے وہ مجھے منظور ہے۔ بس تاریخ مقرر کر دیجئے۔ میں آپ سے نکاح کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ان صحابی کے کانوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا سن رہے ہیں یا تو کچھ لمحے پہلے مغموم، رنجیدہ اور ملول تھے یا اب لڑکی کا جواب سن کر شاداں و فرحاں۔ اُدھر رسول اللہؐ مسجد میں منتظر تھے۔ چہرہ کی شادابی کہہ رہی تھی کہ نشانہ خطا نہیں ہوا۔ صحابی نے پوری حقیقت سنادی اور یہ مژدہ بھی کہ لڑکی راضی ہوگئی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا اب جلدی کرو اور شادی کے لئے ضروری سامان خرید لو۔ صحابی نے دوسرے تیسرے دن ہی بازار گئے اور ضروری کپڑے وغیرہ خرید لئے ابھی وہ کپڑے کی دوکان پر ہی تھے کہ آواز آئی کہ رسول اللہؐ نے غزوہ کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی صحابی نے شوق شرکت جہاد میں کپڑے دوکاندار کو واپس کر دئے اور ان ہی پیسوں سے جنگ کے آلات و ہتھیار خرید لئے۔ اور رسول اللہؐ کے ساتھ غزوہ میں شریک ہوگئے۔ اللہ کی مرضی کہ اسی غزوہ میں آپ شہید ہوگئے جب آنحضرت کو خبر دی گئی کہ الجلیبیب بھی شہیدوں میں پائے گئے تو رسول اللہ ﷺ کو صدمہ ہوا۔ آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جب ان کو دفن کرنے کے لئے قبرستان لے جایا گیا تو حضور بھی ساتھ چلے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ پنجوں کے بل چل رہے ہیں اس کے بعد جب شہید کو دفن کیا جارہا تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ مسکرا رہے ہیں۔ خود حضور ﷺ نے قبر میں اتر کر شہید کو دفن کیا۔ بعد دفن صحابہ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ آج ہم نے دو نئی باتیں دیکھیں ایک تو یہ کہ آپ ﷺ پنجوں کے بل چل رہے تھے اور دوسری بات یہ کہ آپ ﷺ قبر میں مسکرا رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا جب اس شہید کو قبرستان لے جایا جارہا تھا تو اس قدر کثیر تعداد میں فرشتے شریک جنازہ تھے کہ مجھے پاؤں رکھنے کی جگہ مل نہیں رہی تھی تو میں پنجوں کے بل چل رہا تھا اور جب شہید کو قبر میں رکھا گیا تو اتنی حوریں جنت سے آئی تھیں جن کا اندازہ نہیں تھا اور حوریں مجھ سے کہہ رہی تھیں یا رسول اللہ ﷺ مجھے ان کا جوڑا بنا دیجئے۔ وہ منظر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

اتباع محمدؐ اور اتباع سنت میں فرق

اتباع محمد رسول اللہؐ اور اتباع سنت رسول اللہؐ میں بہت بڑا فرق ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمل ذاتی طور پر فرمایا اس کی اتباع کا نام اتباع محمد رسول اللہؐ ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جو فرمان سائل کے ظرف وسعت اور اس کی حیثیت کے اعتبار سے صادر فرمایا اور جس کی احادیث کی کتابوں میں تخریج محدثین نے فرمائی اس کی اتباع کو اتباع سنت رسول اللہؐ کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ سنت کا اطلاق یا اس کو وسعت دیں تو حدیث کا اطلاق تین باتوں پر ہوتا ہے ایک سنت **فعلی** دوسرے سنت **قولی** اور تیسری **تقریری** یعنی جو کام آنحضرتؐ نے فرمایا وہ سنت فعلی ہے اور جو بات آنحضرتؐ نے فرمائی وہ سنت قولی ہے اور جو کام کسی نے آنحضرتؐ کی موجودگی میں کیا اور آنحضرتؐ نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی اس کو سنت تقریری کہا جاتا ہے۔

آنحضرتؐ کے زمانے میں حضورؐ نے جو کچھ فرمایا یا کہا وہ بہت کم قلمبند ہوا ہے۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ نے خود ارشاد فرمایا کہ لا تكتبوا عني الّا القرآن۔ یعنی قرآن کے سوا مجھ سے کچھ اور نہ لکھو۔ اس سے حضورؐ کا مقصد قرآن کی حفاظت تھا یعنی حضورؐ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ قرآن بھی لکھیں اور حضورؐ کے اقوال یا اعمال کو لکھیں۔ حضورؐ کو یہ اندیشہ ہوا کہ آئندہ زمانے میں کہیں قرآن اور حدیث خلط ملط نہ ہو جائیں۔ بلکہ حضرت عمرؓ سے تو یہ روایت بھی آتی ہے کہ آپؐ نے قرآن کے سوا دوسری چیزوں کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اسلام کے دشمنوں اور مخالفوں کو قرآن میں کسی اور چیز کے ملانے اور دوسرے انبیاء پر نازل شدہ کتابوں میں ان کے متبعین نے جو تحریفات کر دی تھیں اور ان کتابوں اور صحیفوں کو ان کی اصلی شکل میں باقی رہنے نہ دیا تھا۔ وہی گھناؤنی اور مکروہ سازش قرآن شریف کے ساتھ نہ رچائی جائے۔ حضورؐ کے پردہ فرمانے کے تقریباً ۲۰۰ سال بعد احادیث کے جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔ تو لوگوں نے ان احادیث پر عمل کرنا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ جمع احادیث میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اگرچہ سبقت کی اور اس کے لئے جانچ پڑتال چھان بین اور جرح و تعدیل کے ان تمام طریقوں کو اپنایا جو ایک متقی محقق کے لئے ممکن ہو سکتے تھے۔ اور ان بزرگوں نے اپنی تمام تر امکانی قوتوں کو اس کام کے لئے صرف بھی کیا اور وقف بھی۔ چنانچہ انہوں نے راویوں کے لئے چند کڑی شرطیں تجویز کیں۔ پس ان شرائط پر جو راوی اترتے ان کی روایتوں کو لیا اور اپنی کتابوں میں درج کیا اور جو راوی ان کے مقرر کردہ شرائط پر نہیں اترتے انہوں نے اپنی کتابوں میں جگہ نہ دی۔ پھر احادیث کی انہی بنیادوں پر تقسیم بھی عمل میں آئی یعنی صحیح، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ، مشہور، متواتر، ضعیف، متصل، مرسل، مدرج، موضوع وغیرہ، پھر یہ ہوا کہ راوی کے معمولی ضعف کی وجہ سے (خواہ وہ اس میں عملاً موجود ہو یا

اس کے مخالفین نے اس پر الزام لگادیا ہو) بہت سی حدیثوں کو ناقابل اتباع قرار دے دیا گیا۔ اور بعض کو قبول بھی کر لیا گیا۔ یعنی یہ ہوا کہ فرمان اور عمل رسول اللہ کا جو معصوم عن الخطا تھے لیکن شرائط ان کے جو زیادہ سے زیادہ مجتہد تھے لیکن معصوم تو ہر گز نہیں تھے۔ پس معصوم عن الخطاء اور خلیفتہ اللہ کے فرامین اور اعمال کا معیار غیر معصومین کے شرائط بن گئے۔ جس کے نتیجے میں احکام کے اعتبار سے اختلافات ابھر گئے۔ اب یہ ہونے لگا کہ جس شخص کو جو جی چاہا اس پر عمل کرنے لگا۔ اور سند کے لئے ایک حدیث کو پیش کر دیا اور کہنے لگا کہ ہم سنت رسول اللہؐ پر عمل کر رہے ہیں اس کے بعد بات اور بڑھی حتیٰ کہ خلفاء کے عمل کو بھی سنت کا درجہ دیا گیا اور حدیث بھی سامنے آئی۔ عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين۔ غرض یہ کہ سنت کے نام کا استحصال کیا گیا۔ چنانچہ نماز میں اقامت کے الفاظ میں اختلاف شروع ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ اذان کے جو الفاظ ہیں اقامت کے بھی وہی الفاظ ہیں سوائے قد قامت الصلوٰة کے اور بعض کہتے ہیں۔ اور حدیثوں کو پیش کرتے ہیں کہ نہیں اذان کے الفاظ دو دو مرتبہ کہے جانے چاہئیں۔ اور اقامت کے الفاظ صرف ایک مرتبہ۔ نماز میں تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھائیں یا کندھوں تک اس کے بعد ہاتھ سینے تک باندھیں یا ناف کے نیچے۔ عورتوں کو مردوں کی طرح نماز پڑھنی چاہئے یا عورتوں کی نماز (یعنی رکوع، سجود، قاعدہ) الگ ہونی چاہئے۔ دونوں طرف حدیثیں ملیں گی۔

کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلعم میں نے پہلے قربانی دی پھر کنکریاں ماریں۔ آپؐ نے فرمایا حج ہو گیا۔ کسی نے کہا پہلے سر منڈوالیا پھر قربانی دی۔ آپؐ نے فرمایا۔ حج ہو گیا۔ لوگ نئے نئے تھے اسلام کو قبول کیا تھا۔ مسائل سے یا تو ناواقف تھے یا پھر سہو ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا چلو ٹھیک ہے۔ حج ہو گیا۔ یہ بالکل ان کے لئے حکم تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ شارع تھے۔ آپؐ نے ان لوگوں کی وسعت اور ظرف پر نظر کرتے ہوئے حکم صادر فرمایا شاید ان کے پاس دَم کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن خود حضورؐ کا کیا عمل تھا؟ وہ جداگانہ بات ہے۔ اب جو باتیں حدیثوں کی کتابوں میں آئی ہیں وہ ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ ہیں۔ اور غالباً اسی وجہ سے لوگ نعوذ باللہ حدیثوں کے ہی منکر ہو گئے اور کہنے لگے کہ صاحب۔ قرآن کی دلیل دو۔ قرآن کی بات کرو (کیونکہ قرآن پر تو سب کا اتفاق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حدیثوں میں تو بہت اختلاف ہیں اس لئے ہم احادیث پر اعتبار نہیں کرتے) اس کے بر خلاف امامنا مہدی علیہ السلام نے فرمایا۔ "اتباع محمد رسول اللہؐ" ایسا دعویٰ وہی ہستی کر سکتی ہے جو خلیفہ اللہ ہو اور معصوم عن الخطاء ہو۔ اور یہ فرمایا کہ بندہ حدیثوں کی کتابوں کو دیکھ کر رسول اللہ کی اتباع نہیں کرتا بلکہ مشاہدہ کرتے ہوئے۔ روح رسول اللہؐ سے پوچھ کر آپؐ کی اتباع کرتا ہوں۔ اور اس کی دلیل خود آنحضرتؐ کا فرمان ہے۔ "المهدي مني يقفو اثري و لا يخطي" یعنی مھدی مجھ سے ہے میرے نقش قدم پر چلے گا اور خطا نہیں کرے گا۔ یہ گویا آنحضرتؐ کی جانب سے اس بات کی سند ہے کہ مھدی علیہ السلام کی بعثت کا مقصد ہی حضور کے نقش قدم کو اجاگر کرنا تھا جو

امتداد زمانے کی وجہ سے اور بعض جعلی حدیثوں کی وجہ سے تقریباً معدوم ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے دین کی روح مردہ ہو چکی تھی۔

نیز یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ کئی مسائل میں رسول اللہ ﷺ کا عمل ایک تھا۔ اور صحابہ کا عمل دوسرا مثلاً آنحضرتؐ کے تعلق سے حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ **کان رسول اللہ ﷺ لا یدخر شیأً لغد**۔ یعنی رسول اللہ صلعم کل کے لئے کچھ بھی اٹھا کر نہیں رکھتے تھے۔ اور ادھر حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے پاس کثیر مال تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کا عمل عزیمت اور عالیت کا تھا۔ اور صحابہؓ رخصت پر عمل فرماتے تھے۔ پس حضرت مھدی موعودؑ نے بھی عزیمت اور عالیت پر عمل فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ دین عزیمت اور عالیت ہے۔ عزیمت اور عالیت پر قدم رکھو اگر کبھی وہاں سے پھسلیں گے تو رخصت پر ٹک سکیں گے۔ اور اگر رخصت پر ہی قدم رکھو گے اور وہاں سے پھسل جاؤ گے تو ٹھکانہ کیا ہو گا۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مھدی موعودؑ کا عمل اتباع محمد رسول ﷺ کا تھا۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ مھدویت کیا ہے تو جواب دینا چاہیئے کہ رسول اللہ صلعم کے ذاتی عمل کو ہی مھدویت کہتے ہیں۔ یعنی حضرت مھدی علیہ السلام نے رسول اللہ صلعم کے ذاتی عمل کو دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔

ارادہ

دل میں کسی چیز کے حاصل کرنے کے خیال کا ابھرنا یا پیدا ہونا اس کو ارادہ کہتے ہیں اسی کو نیت اور قصد کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کسی بھی کام سے پہلے دل میں نیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر آدمی وہ کام کرتا ہے۔ بظاہر بعض کام تو اچھے ہوتے ہیں لیکن دل میں اس کام کی تہہ میں جو نیت ہوتی ہے وہی اللہ کے پاس بھی اور مخلوق کے پاس معتبر ہوتی ہے۔ اور اس کام کے اچھے یا برے ہونے کا حکم بھی اسی نیت کی بناء پر لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں "إِنَّمَا الأَعْمَالُ بالنِّيَّاتِ" یعنی اعمال کی مقبولیت یا نا مقبولیت کا انحصار نیتوں پر ہوتا ہے، پھر اس کی تشریح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی "فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ و جهاد في سبيله فهجرته الي مانوي، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ الي دُنْيَا يُصِيبُهَا أَو امْرَأَةٍ يتزوجها فَهِجْرَتُهُ إِلَى مانوى إِلَيْهِ" پس جس کی ہجرت اللہ، اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد کی غرض سے ہو تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوگی جس کی اس نے نیت کی ہے اور جس کی ہجرت دنیا کمانے یا کسی عورت سے شادی کی غرض سے ہو تو اس کی ہجرت اسی غرض کے لئے ہوگی۔ یعنی اس کے عمل کی بناء جیسی ہوگی اسی طرح اس کا عمل بھی سمجھا جائے گا۔

پس سارے اعمال بظاہر دینی فرائض کے طور پر ہی کیوں نہ ادا کئے جائیں اگر ان کی نیت خدا کی خوشنودی کا حصول نہ ہو تو وہ بے کار ہی ہوں گے۔ مثلاً وضو کا مقصد گرمیوں میں جسم کو ٹھنڈا رکھنا، نماز کا مقصد ورزش جسمانی، روزہ کا مقصد کھانے پینے کی بچت یا dieting، زکواۃ کی ادائیگی کا مقصد ناموری اور شہرت حاصل کرنا اور حج کا مقصد سیر وسیاحت یا حاجی کا Title لگالینا ہے تو اللہ کے پاس ایسے اعمال کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ ہر کام محض اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کرے، اگر اس کے ضمن میں کوئی دنیاوی نفع حاصل ہو جاتا ہو تو وہ الگ بات ہے۔ لیکن پہلے سے ذہن میں دنیوی نفع وغیرہ کا شائبہ بھی دل کے کسی گوشہ میں نہ رہنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ شہادت جیسی اعلیٰ قربانی بھی اگر مال غنیمت کے حصول یا شہید کہلانے کی غرض سے ہوتی ہو تو اللہ کے پاس اس کی کوئی قدر نہ ہوگی اور اس کو قیامت میں کوئی بدلہ نہ ملے گا۔

اقتداء

کیامہدوی غیر مہدویوں کی مساجد میں نماز ادا کرسکتے ہیں؟اور اگر ادا کرسکتے ہیں تو کیاایک مہدوی، غیر مہدوی امام کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتا ہے؟اگر نہیں تو کیوں؟

الجواب:۔ مہدوی غیر مہدویوں کی مساجد میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔کیونکہ مساجد اللہ کے گھر ہیں۔اوران کی تعمیر کا مقصد ہی اللہ کی عبادت کرنا ہے۔

ایک غیر مہدوی امام کے پیچھے ایک مہدوی کو نماز نہیں پڑھنی چاہیئے۔اس کے دو سبب ہیں۔ایک نقلی ہے اور دوسرا عقلی ہے۔ نقلی سبب یہ ہے کہ حضرت امامنامہدی موعودؑ نے فرمادیا کہ بدنبال منکران مہدی نماز مگزارید، اگر سہواً گذاردہ باشد باز بگر دانید۔یعنی منکران مہدیؑ کے پیچھے نماز مت پڑھو۔اگر بھول سے پڑھ لئے ہوں تو نماز کو لوٹالو۔اس فرمان امام کی روشنی میں مہدوی کو چاہیئے کہ غیر مھدوی کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ نماز میں خصوصاًاقتداء صحیح نہیں ہوسکتی۔چنانچہ اگر امام کوئی قادیانی ہویاشیعی ہو تواس کے پیچھے کسی صحیح عقیدہ رکھنے والے مسلمان کی نماز صحیح نہیں ہوسکتی۔

خود مسلمانوں میں مختلف اماموں کی پیروی کرنے والوں میں یہ عقیدہ رائج بھی ہے اور مسلّم بھی کہ بعض مسائل میں فقہی اختلاف کی بناء پر کسی حنفی مقتدی کی نماز شافعی امام کے پیچھے درست نہیں ہوسکتی۔چنانچہ مسح سر میں ابو حنیفہؒ کے پاس چوتھائی سر کا مسح فرض ہے۔اور امام شافعیؒ کے پاس سر کے ایک دوبال بھی چھولیں توان کا وضو صحیح ہے۔کہتے ہیں کہ اگر امام شافعی ہو اور وہ اپنے مسلک کے مطابق فقط ایک دوبال چھولے تواس کے پاس تو سر کا مسح ہوجائے گا۔لیکن حنفی کے پاس سر کا مسح نہیں ہوگا۔کیونکہ حنفیوں کے پاس کم از کم چوتھائی سر کا مسح فرض ہے۔ایسی صورت میں جب حنفیوں کے پاس چوتھائی سر کا مسح فرض ہے اور شافعی امام نے صرف ایک دوبال چھولئے ہوں تو حنفی نقطہ نظر سے شافعی نے گویاسر کا مسح نہیں کیاجو کہ فرض ہے۔اس اعتبار سے جب وضوپورا نہیں ہوا تواس کی نماز بھی درست و صحیح نہیں ہوگی پس اس کی اقتداء کیسے کی جاسکتی ہے۔

یہ تو ہوئی بحث ایک فقہی مسئلہ میں اختلاف کی۔یہاں جو بات ہے وہ عقیدہ کے اختلاف کی ہے۔یعنی مھدوی کا یہ پکا اعتقاد ہے کہ سید محمد جونپوری مہدی موعودؑ ہیں۔اور غیر مھدوی کا اعتقاد یہ ہے کہ سید محمد جونپوری مھدی موعود نہیں ہیں۔انہوں نے جو دعویٰ کیااس دعوے میں وہ جھوٹے ہیں۔اور مھدی موعود پر ایمان لاناضروریات دین سے ہے۔پس اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی ”امر ضروری“ کو نہیں مانتا تواس کے عقیدہ کی غلطی کی وجہ سے ایک مھدوی کی نماز اس کے پیچھے نہیں ہوسکتی۔اگر یہ کہاجائے کہ فرمان امام میں منکر مھدی کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیاگیاہے۔غیر مھدوی کے پیچھے نماز

پڑھنے سے نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بات ایک ہی ہے خواہ منکر کہو یا غیر مھدوی۔ کیونکہ غیر مھدوی کہنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ وہ شخص حضرت سید محمد جونپوری کو مھدی موعودؑ نہیں مانتا اور ہم مہدوی ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم حضرت سید محمد جونپوری کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپؑ ہی وہ سچے مہدی ہیں جن کے آنے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اگر پھر بھی آپ کو شک ہے تو آپ کسی بھی وقت اس امام سے دریافت کرلیں کہ حضرت سید محمد جونپوری کی مہدیت کے بارے میں اس کا اعتقاد کیا ہے۔ اگر وہ آپ کی مہدیت کا قائل ہے۔ تو آپ ضرور اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔ علاوہ ازیں مخالف مھدی علیہ السلام کے طرف سے وقتاً فوقتاً جو کتابچے، کتابیں، پمفلٹ وغیرہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور حضرت سید محمد جونپوری کی مہدیت کے خلاف جو تحریری پروپگنڈہ کیا جاتا ہے۔ ان کو آپ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اس مسئلہ میں ''انجان'' نہیں ہیں۔ بلکہ ان کو یہ معلوم ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو حضرت سید محمد جونپوری کو مہدی موعود مانتا ہے۔ اور اسی فرقے کو وہ بدعتی گمراہ اور جہنمی کہتے ہیں۔ پھر جب وہ علانیہ انکار کرتے ہیں تو اب ان کے منکر ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔ پھر کیا ایسی صورت میں ان کی اقتداء میں نماز درست صحیح ہو سکتی ہے۔ بجائے منکر کہنے کہ ایک نرم لفظ ''غیر مھدوی'' عام طور پر استعمال کرلیتے ہیں۔ جس طرح مسلمان غیر مسلموں کو ہندو یا کافر و مشرک کہنے کے بجائے غیر قوم کہتے ہیں۔

تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ حضرت مہدی موعودؑ کی بعثت ضروریات دین سے ہے۔ اور سب کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہو چکا ہے کہ جو شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک امر ضروری کا انکار کرے وہ کافر ہے پس اس کے پیچھے نماز کس طرح جائز ہو سکتی ہے، ضروریات دین میں سے کسی ایک امر ضروری کا انکار گویا رسول اللہؐ کو جھٹلانے کے برابر ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانا گویا حضورؐ کو نعوذ باللہ جھوٹا کہنا ہے۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ حضرت مہدیؑ کی بعثت حضرت عیسیٰ روح اللہ کا دوبارہ نزول، خروج دجال جیسے امور مغیبات سے ہیں۔ یعنی آئندہ زمانے سے متعلق ہیں۔ اور جب آنحضرتؐ آئندہ زمانے سے متعلق خبر دیتے ہیں تو یہ یقین کرنا چاہئے کہ یہ باتیں حضورؐ اپنی طرف سے نہیں فرماتے۔ بلکہ اللہ کی جانب سے معلومات حاصل ہونے کے بعد ہی فرماتے ہیں۔ اب کوئی اگر ان امور میں کسی ایک امر کا انکاری ہے تو گویا وہ رسول اللہ ﷺ پر یہ بہتان لگا رہا ہے کہ حضورؐ نے یہ باتیں اپنی طرف سے کہی ہیں۔ جبکہ قرآن کہتا ہے ''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿نجم:۳تا۴﴾'' یعنی رسول اللہؐ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ آپؐ جو کچھ کہتے ہیں اس کی بنیاد وحی ہوتی ہے۔ جو آپؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ پس وحی کا انکار کفر ہے۔ ان امور کی

وجہ سے منکر مھدی کی اقتداء صحیح نہیں ہے۔اس موقع پر اگر کوئی یہ کہے کہ جہاں تک نفس بعثت مہدی کا تعلق ہے کسی کو اس سے انکار نہیں ہے۔ان کو انکار یقین کے ساتھ حضرت محمد جونپوری کے مہدی موعودؑ ہونے کے بارے میں ہے۔ پھر ان کو منکر کس طرح کہا جاسکتا ہے ؟تو اس کا جواب یہ ہے کہ عیسائی بھی نفس بعثت آخری پیغمبر کے منکر نہیں ہیں۔وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ انجیل میں ایک پیغمبر کے آنے کی بشارت دی گئی ہے۔ جس کا نام احمد ہے۔ ہم اس کو مانتے ہیں۔ لیکن مسلمان حضرت محمد کو جو آخری پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے آپ کو ہی اس بشارت کا جو مصداق قرار دیتے ہیں ہم کو اس سے انکار ہے۔تو عیسائیوں کے اس اعتراض کا مسلمان جو جواب دیتے ہیں حضرت مھدی موعودؑ کے ماننے والوں کا ان کو وہی جواب ہے۔

اقرب الطریق

حضرت مہدی علیہ السلام نے اولیاء پیشین کی نسبت فرمایا، ”ہمارے بھائی (اولیاء) نزدیک کا راستہ (اوپر واڑے کا راستہ) چھوڑ کر چکر کے راستے سے چلے اور مقصود حاصل کیا۔ کیونکہ وہ طلب میں سچے تھے اور مقصود خدا تھا“ صحابہ نے عرض کیا، میراں جی نزدیک کا راستہ کونسا ہے اور دور و گردش (چکر) کا راستہ کونسا؟ حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا ”راہ خدا میں بے اختیار کیوں نہ ہوئے۔ کہ شریعت محمدی کے موافق یہی راستہ نزدیک تر تھا۔ انہوں نے اپنے اختیار سے تمام عمر کے روزے کیوں رکھے؟ اور مباح (حلال) چیزوں کو کیوں چھوڑ دیا؟ اور سالہا سال کنووں میں سرنگوں (الٹے) کیوں لٹکے؟ اور بارہ سال کی قید لگا کر روزے کیوں رکھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام نہیں دئے۔ اور حسب فرمان خدا ”وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّـهِ فَهُوَ حَسْبُهُ“ ﴿الطلاق:٣﴾ جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے، (تمام عمر توکل کا روزہ کیوں نہ رکھا؟ ان کو چاہئے تھا کہ بے اختیار ہو جاتے)۔

اقرب الطریق یعنی راہ بے اختیاری کی تعریف میں آپؑ فرماتے ہیں: مارا اختیار دادہ اند کہ از اختیار بے اختیار شویم۔ یعنی ہم کو اختیار دیا گیا ہے کہ ہم اپنے اختیار سے بے اختیار ہو جائیں۔ پھر فرماتے ہیں: ”بے اختیار شو کہ اختیار شوم است۔ بے اختیار ہو جا کہ اختیار (میں) نقصان ہے۔ پھر فرماتے ہیں ”آمدن ما بے اختیاری است، بیائید بے اختیار شوید۔ ہماری آمد بے اختیاری ہے آؤ بے اختیار جاؤ۔

پھر فرماتے ہیں یہ آیت ہر وقت پڑھا کرو ”وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴿القصص:٦٨﴾ یعنی تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ ان کے لئے کوئی اختیار نہیں۔

اخراج

حضرت مہدی علیہ السلام نے جب آیت: **فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا** ﴿آل عمران:۱۹۵﴾ پس جن لوگوں نے اللہ کے راستے میں ہجرت کی جن کو ان کے اوطان سے نکال دیا گیا اور جن کو (میری راہ میں) اذیتیں پہنچائی گئیں اور جنھوں نے قتال کیا اور مارے گئے۔ کا بیان فرمایا تو یہ بھی فرمایا کہ اس آیت میں درج صفات بندے سے متعلق ہیں۔

اس بنیاد پر امام علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے ہجرت بھی کی اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ علماء سو کے اکسانے پر بادشاہوں نے آپؑ کا ان کے علاقوں سے اخراج کا حکم بھی دے دیا۔ جب ایسا ہو تو کبھی مہدی علیہ السلام فرماتے ''مجھ کو خدا کا حکم بھی یہاں سے نکلنے کا ہوا ہے۔ میں خود بخود جاتا ہوں۔ اور کبھی فرماتے کہ تیرے بادشاہ کا حکم تیرے لئے۔ میں میرے بادشاہ کے حکم کے تابع ہوں۔ جب میرے بادشاہ کا حکم ہو گا میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔

اعتراض: لیکن اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کی دھن میں بس یہ کہہ دیا۔

''شیخ (امام علیہ السلام) کی عادت تھی کہ جب حکم اخراج کسی حاکم کا آتا تو بولتے تھے کہ مجھ کو خدا کا حکم بھی یہاں سے نکلنے کا ہوا ہے میں خود جاتا ہوں'' پہلے تو معترض نے اس کو امام علیہ السلام کی عادت کہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ عادت کسے کہتے ہیں۔ جب ایک ہی بات بار بار یا اکثر مواقع پر ہوتی ہے تو اس کو عادت کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے مواقع پر وہی بات عمل میں آئے۔

حالانکہ ہمارے پاس کی ساری کتابوں میں یہی حقیقت لکھی گئی ہے کہ امام علیہ السلام خدا کے حکم کے پابند تھے۔ کسی مقام پر ٹھہرنے کا حکم ہوتا تو آپؑ وہاں ٹھہرتے تھے۔ جتنے دن خدا کو منظور ہوتا اتنے دن ٹھہرتے۔ اور جب وہاں سے ہجرت کا حکم ہوتا تو وہاں سے ہجرت فرماتے۔

اکثر ایسے مقامات سے آپ نے ہجرت فرمائی ہے جہاں سے آپ کو حکم اخراج نہیں ہوا تھا۔

اور ایسے بھی مقامات سے آپ نے ہجرت فرمائی ہے جہاں کے بادشاہوں نے آپ کے وہاں قیام کی تمنا کی تھی۔ چنانچہ جالور اور قندھار میں یہی صورت حال تھی کہ بادشاہان وقت آپ کے قیام کے متمنی تھے لیکن جب حکم خدا ہوا تو آپ نے ہجرت فرمائی۔

اور ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مقام پر حکام کی طرف سے اخراج کا حکم سنایا گیا تو حضرت نے فرمایا" بندہ فرمان خدا کا تابع ہے۔ جب حکم ہو گا اس وقت جائے گا۔ چنانچہ نگر ٹھٹھہ میں ایسا ہی ہوا ہے جیسا کہ مطلع الولایت میں ہے۔

"سندھ کے بادشاہ نے چاہا کہ اپنے ملک سے آپ کو نکال دے۔ قاضی کو بھیجا اور کہلایا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ یہاں سے نکل کر آگے بڑھ جاؤ۔ حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا تیرے بادشاہ کا حکم تیرے لئے ہے، جب بھی میرے بادشاہ کا حکم میرے لئے ہو گا میں یہاں سے جاؤں گا۔ قاضی سندھ نے جب زیادہ حجت کی تو امام علیہ السلام نے آخر میں قطعی فیصلہ یہ سنایا۔

"اپنے بادشاہ سے کہدو کہ میں امر حق کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اگر تو اپنے تمام لشکر و شوکت سامانی کے ساتھ بھی آئے گا تو بندہ اپنے خدا کے حکم سے ان شاء اللہ تجھ پر غالب آئے گا۔"

اس کے باوجود بادشاہ نے اپنے رعب و دبدبہ کو باقی رکھنے کے خیال سے متعدد مرتبہ وہاں سے چلے جانے کے احکامات صادر کئے بلکہ فوج کے ذریعہ گرفتاری یا زبردستی اخراج کے بھی منصوبے بنائے گئے مگر ناکام رہا۔ بلکہ وہاں کا سپہ سالار خود مطیع و تابع ہو گیا۔ بازار بند کر دینے کی تدابیر کی گئیں لیکن ناکامی ہوئی۔ پس ایسا اعتراض کس قدر حقیقت کے خلاف اور آفتاب پر خاک اڑانے کے برابر ہے۔

ہاں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مقام سے آگے جانے کا حکم اللہ کی جانب سے ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی حاکم کا حکم اخراج بھی آپ کو پہنچا تو حضرت نے فرمایا ہم کو ہمارے حاکم کا حکم یہاں سے جانے کا ہو گیا ہے، ہم خود جانے والے ہیں۔

چنانچہ پیران پٹن میں جب مبارز الملک، وائی گجرات کا حکم نامۂ اخراج اپنی آستین میں چھپائے ہوئے آئے تو ان کا حکم نامے کے پیش کرنے سے پہلے ہی امام علیہ السلام نے فرمایا، مبارز الملک تم نے جلدی کی، یہ نیک نامی اپنے سر کیوں لے لی۔ ہم کو ہمارے حاکم (خدا) کا حکم خود یہاں سے چلے جانے کا ہو گیا ہے صحابہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان سے پوچھو کہ یہ دو تین دن سے سفر کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں" اس اتفاقی صورت کو "عادت کہنا محض الزام آفرینی ہے"۔

اگر کسی کو اعتراض ہو کہ کیا امام علیہ السلام کو وقتاً فوقتاً اللہ کا حکم ہوتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کو تو اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ جو بندگان خدا ہوتے ہیں وہ بغیر حکم خداوندی کے کوئی کام جو دین سے متعلق ہو نہیں کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ارشاد خداوندی ہے وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿النجم: ۳تا۴﴾ آپ اپنی خواہش نفسانی سے نہیں کہتے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو آپ کی طرف جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت بھی کی تھی تو اللہ کے حکم سے۔ دوران ہجرت جہاں جہاں آپ نے قیام فرمایا وہ بھی حکم خداوندی سے۔ نیز غزوات، ودیگر واقعات بھی اللہ کے حکم سے ہی ہوئے ہیں۔ حضورؐ کا بولنا بھی حکم الٰہی کے تحت تھا جب اللہ کہتا **قل**۔ تو آپؐ فرماتے۔ اور جب اللہ فرماتا **واصبر**۔ تو آپؐ صبر فرمالیتے۔ جب حکم خدا ہوتا **قم**۔ تو آپؐ اٹھ جاتے۔ غرض کہ ہر کام امر خداوندی سے ہوتا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کی بھی یہی حالت تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بھی بنائی تو اللہ کے حکم سے بلکہ اس کے دیکھتے بنائی۔ قرآن میں اللہ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا "**اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا**" ﴿المؤمنون:۲۷﴾ کشتی بناؤ تو ہمارے دیکھتے بناؤ۔

اکثر اولیاء کرام کا بھی یہی حال رہا وہ جو کچھ کرتے امر خداوندی سے کرتے تھے۔ چنانچہ **نثر الجواهر فی مناقب عبدالقادر** نامی کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت غوثؒ فرماتے ہیں وہ جب مجھے بات کراتے ہیں تو میں کہتا ہوں۔ اور جب مامور ہوتا ہوں تو کام کرتا ہوں۔ الخ

حضرت مہدی علیہ السلام امر اللہ مراد اللہ خلیفہ اللہ ہیں۔ جب حضرت غوث اعظم فرماتے ہیں کہ وہ بات کراتے ہیں تو میں کہتا ہوں، تو خلیفتہ اللہ کا کیا کہنا۔

احکام شرع میں احادیث رسول اللہ ﷺ کا مقام

اس بات پر تو تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ شریعت کے احکام کے ذرائع Sources چار ہیں۔

(۱) قرآن جو کلامِ خدا ہے (۲) احادیث نبی ﷺ (۳) اجماع (۴) قیاس۔ اہل تشیع کے پاس قیاس کے بجائے عقل چوتھا ذریعہ ہے

احکام کا پہلا سرچشمہ تو قرآن شریف ہے۔ اس سے جو حکم ثابت ہو جاتا ہے وہ حرف آخر ہے۔ اس میں کسی شخص یا جماعت کو لب کشائی کی اجازت نہیں ہے۔ حکم خدا کے آگے سب کو سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی اسکے خلاف حکم دے، یا فیصلہ کرے تو قرآن میں اسکو کافر کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّـهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿المائدة:۴۴﴾ جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم (قرآن) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ بن جبلؓ کو ایک مقام پر تبلیغ و تعلیم کی غرض سے، وہاں کے لوگوں کے مطالبہ پر بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو وہاں روانہ کرتے وقت آپ ﷺ نے پوچھا کہ اے معاذ تم وہاں کس طرح فیصلے کروگے؟ حضرت معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں کتاب خدا کے مطابق فیصلے کروں گا۔ پھر آپؐ نے پوچھا کہ اگر کسی مسئلہ کا حل تم قرآن میں نہ پاؤ تو کیا کروگے۔ معاذؓ نے جواب دیا کہ میں آپؐ کی سنت کے مطابق فیصلے کروں گا۔ پھر آپؐ نے دریافت فرمایا اگر تم کو وہاں بھی نہ ملے تو؟ معاذ نے جواب دیا کہ میں اپنی رائے کے مطابق فیصلے کروں گا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بعد احکام معلوم کرنے کا اہم ذریعہ حدیث رسول اللہ ﷺ ہے۔

کسی کو یہاں یہ گمان نہ ہو کہ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے قرآن میں کوئی چھوٹی بڑی رطب و یابس (خشک و تر) چیز ایسی نہیں چھوڑی جس کو ہم نے بیان نہیں کیا۔ یعنی قرآن میں ہر خشک و تر چیز موجود ہے تو پھر آنحضرت ﷺ نے کیوں دریافت فرمایا کہ اگر تم اس میں کوئی چیز نہ پاؤ تو کیا کروگے۔ واضح ہو کہ موجود ہونا ایک بات ہے۔ اور اسکو پانا دوسری بات ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ نے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں قرآن میں نہ پاؤں تو حضورؐ کی سنت سے اس کا جواب حاصل کرلوں گا۔ قرآن کی حیثیت ایک یہ بھی ہے کہ وہ ایک قانونی اور دستورِ کی کتاب ہے (LAWBOOK) لیکن ہر قانون پر عمل کرنے کیلئے موقع و محل کے اعتبار سے کچھ BY LAWS (ضمنی قواعد) بھی بنائے جاتے ہیں۔ اور اس کے چند نظائر بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن تو قانون ہے لیکن اس پر عمل آوری کیسے ہو، احادیث رسول اللہ ﷺ سے اس میں

مدد ملتی ہے۔ اور ان آیات کے الفاظ کا مفہوم و مطلب متعین ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم احادیث رسول اللہ ﷺ کے ذخیرہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں تین قسم کے احادیث ملتے ہیں۔

(۱) وہ احادیث جو کلیۃً قرآن کے پیش کردہ احکام سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اور قرآنی احکام کی تائید بھی کرتی ہیں اور تاکید بھی جیسے توحید، نماز، روزہ، حج وزکواۃ جیسے اوامر خداوندی یا شراب، سود خوری، جھوٹ، زنا و قتل وغیرہ جیسے نواہی

(۲) بعض حدیثیں ایسی ملتی ہیں جو قرآنی آیتوں کی تفسیر اور توضیح کرنے والی ہوتی ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج اور زکواۃ جیسے احکام قرآنی کی تشریح کرتی ہیں یا ان آیات قرآنی میں جو احکام ہیں ان کی فضیلتوں پر روشنی ڈالتی ہیں جیسے ماں باپ کی فرماں برداری، پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت، قریبی رشتہ داروں سے حسنِ سلوک وغیرہ اسی طرح قرآن شریف کی جن آیتوں کے ذریعہ جن امور سے بچنے، ان سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے دنیا اور آخرت میں، ان کے ارتکاب سے کیا کیا نقصانات اور سزائیں ملنے والی ہیں۔ ان کو واضح طور پر ان حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان اوامر کے کیا شرائط ہیں۔ کیا ارکان ہیں۔ اور کونسی چیزیں ان کو باطل کرنے والی ہیں۔ کن چیزوں سے بعض اچھے اعمال بھی ضائع اور فاسد ہو جاتے ہیں بعض احادیث ان امور پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

اسی طرح بعض وہ احادیث بھی ہیں جن میں قرآن میں مبہم طور پر بیان کردہ بعض ضروری امور کی تفسیر اور مجمل طور پر بیان کردہ امور کی تفصیل بیان کی گئی ہے جیسے قرآن میں صرف قیامت، الساعۃ کا ذکر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس تعلق سے تفصیل بیان فرمائی ہے چنانچہ آپؐ نے قیامت کی علامتوں اور اشراط کا ذکر فرمایا ہے حضرت مہدی موعودؑ کی بعثت عیسیٰؑ کا نزول اور دجّال کے خروج کے تعلق سے بھی سینکڑوں احادیث ملتی ہیں۔ قرآن میں میزان، پُل صراط حساب کتاب زقّوم، غِسلِین وغیرہ کا ذکر ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کی تفصیلی کیفیت اپنی احادیث کے ذریعہ بیان فرمائی ہے۔

(۳) بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن سے ایسے احکام ملتے ہیں جن کے بارے میں قرآن بظاہر خاموش نظر آتا ہے

(الف) چنانچہ قرآن میں یہ حکم تو ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اس کی میراث میں اس کا وارث ہوتا ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴿النساء:۱۱﴾ کے تحت لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملتا ہے۔ لیکن اگر بیٹا (یا کوئی وارث) اگر اپنے مورث کو قتل کردے تو وارث مورث کی میراث سے محروم ہو جاتا ہے۔ فقہاء کرام نے حدیث رسول اللہ ﷺ کی بناء پر یہ فتویٰ دیا ہے۔

(ب) مردوں کیلئے ریشمی لباس پہننا حرام ہے۔ اس بارے میں قرآن میں کوئی آیت نہیں ہے۔ البتہ حدیث میں اسکی ممانعت آئی ہے اور فقہاء کرام نے اس حدیث کی بنیاد پر ہی مردوں کو ریشم کا لباس پہننا حرام قرار دیا ہے۔

(ج) کن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کی ایک فہرست اللہ نے قرآن شریف میں دیدی ہے۔ لیکن پھوپی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کو ایک ساتھ نکاح میں لانا حرام ہے۔ اس تعلق سے صرف حدیث رسول اللہ ﷺ نشاندھی کرتی ہے۔ قرآن میں ایسا حکم نہیں ہے اسی طرح دو ایسی عورتیں جن میں سے ایک عورت کو مرد قرار دیا جائے تو دوسری عورت سے اس کا نکاح حرام ہوتا ہے۔ ایک ساتھ کسی مرد کیلئے جائز نہیں ہیں۔ یہ بات بھی فقہاء کرام نے حدیث رسول اللہ ﷺ سے استنباط کرتے ہوئے بیان کی ہے

(د) قرآن میں "حق شفعہ" کے تعلق سے کوئی صریحی حکم نہیں ہے۔ حق شفعہ یعنی پڑوسی کا حق۔ اگر کوئی شخص اپنا کوئی مکان فروخت کرنا چاہے تو اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اپنے پڑوسی سے پوچھے کہ کیا وہ اس کو خریدنا چاہتا ہے۔ اگر وہ اس میں Interested دلچسپی نہ ہو تو پھر وہ دوسروں کو فروخت کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مالک نے پڑوسی کو اندھیرے میں رکھ کر دوسرے کو فروخت کر دے تو پڑوسی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ عدالت میں رجوع ہو کر اس معاملہ کو فسخ کرادے اور خود اسی قیمت پر وہ مکان خرید لے۔ فقہاء نے حدیث رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ فتویٰ دیا ہے۔

(ہ) باپ کے انتقال کے بعد اسکی اولاد کو اسکی میراث کا حقدار، قرآن شریف میں قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا اور بی بی فاطمہؓ لختِ جگر رسول اللہ ﷺ نے "باغ فدک" میں جو رسول اللہ ﷺ کی ملکیت میں تھا، اپنا حق جتایا اور اس میں سے اپنا حصہ طلب کیا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے یہ حدیث سنا کر فاطمۃ الزھراء کو انکا واجبی حق دینے سے انکار کر دیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا نَحنُ معاشـر الاَنبِیاء لَا نَرِثُ وَ لَا نُورِثُ مَا تَرَکنَاہُ صَـــدَقَۃ۔ یعنی اس میں تمام مسلمانوں کا حق ہوتا ہے۔ صحابہ کی جماعت نے اس حدیث کو سُنکر خاموشی اختیار کرلی۔ چنانچہ ایسی ہی روایت حضرت امامنا مہدی موعودؑ سے بھی اس مسئلہ میں آئی ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں۔ غور کرنے پر ایسی اور روایتیں بھی مل سکتی ہیں۔

ابراہیمؑ

؎قرآن شریف میں حضرت ابراہیم کا ذکر ۶۹ مقامات پر آیا ہے

(۱) وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ﴿سورہ بقرہ ۱۲۴﴾ ترجمہ: جب ابراہیمؑ کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ ان سب میں پورے اترے۔ اس کی تفصیل عنوان "امام" کے ذیل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے

(۲) وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ﴿بقرہ ۱۲۵﴾ ترجمہ: اور جب ہم نے اس گھر (خانۂ کعبہ) کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا اور حکم دیا جس مقام پر ابراہیمؑ نے عبادت کی اسکو جائے نماز بنالو۔ حج کے موقع پر ہر سال یہاں لاکھوں افراد کا اجتماع ہوتا ہے او جو شخص وہاں چلا جائے وہ ہر قسم کی زیادتی سے محفوظ اور مامون ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مجرم بھی حرم شریف میں چلا جائے تو اسکو گرفتار نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ وہ حرم سے باہر نہ آجائے۔ اور جس کو حج مبرور نصیب ہو جائے وہ دوزخ سے محفوظ ہے۔ مقام ابراہیمؑ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیمؑ نے (پہلے عبادت کی پھر) خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ اس پتھر پر قدرت خداوندی سے ابراہیمؑ کے قدموں کے نشانات ثبت ہو گئے تھے۔ اس پتھر کے پاس نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر طواف کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ طواف کے بعد واجب الطواف دو رکعت نماز مقام ابراہیم کے پاس پڑھے۔

(۳) وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿بقرۃ ۱۲۵﴾ ترجمہ: اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو ہم نے تاکید کر دی کہ میرے اس گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک و صاف رکھیں۔ مطلب یہ کہ یہ گھر ہر قسم کی ناپاکی سے پاک ہو۔ بتوں کی آلودگی سے بھی پاک ہو اور (یہ بھی کہ ناپاک اس کا طواف نہ کرے) طواف باوضو کرنا چاہیئے۔

(۴) وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ﴿بقرۃ ۱۲۶﴾ ترجمہ: اور جب ابراہیمؑ نے دعا کی اے میرے رب اس جگہ کو امن کا شہر بنا اور اس کے باشندوں میں سے جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں انہیں پھلوں سے رزق عطا فرما۔

اسکے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ جس نے میرا اور قیامت کے دن کا انکار کیا اسکو بھی تھوڑی سی متاع (دنیا) دوں گا مگر آخر کار اُسے دوزخ کی آگ کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

(۵) وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿بقرہ ۱۲۷﴾ ترجمہ: اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اس گھر کی دیواروں کو اُٹھا رہے تھے تو یہ دعا بھی کرتے تھے اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرما بے شک تو سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

دعا کے اور الفاظ یہ تھے اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھ اور ہماری نسل سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رکھ اور ہمیں تو اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر توجہ فرما بے شک تو توجہ کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود ان ہی میں سے ایک پیغمبر پیدا کر جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان (کے دلوں) کو پاک کر بے شک تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

(۶) إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَـٰهَكَ وَإِلَـٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَـٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿بقرہ ۱۳۳﴾ ترجمہ: (بھلا کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ انتقال فرمانے لگے تھے تو) انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم کس کی عبادت کروگے میرے بعد۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کا معبود ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

یہاں یہ بات بتانی مقصود ہے کہ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ میں باپ دادا کی تقلید کی جاسکتی ہے۔ لیکن جو لوگ باپ دادا کے غلط مسلک کی آڑ لیکر ناحق پر جو اڑ جاتے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے چنانچہ اللہ اسکے بعد یہ فرماتا ہے تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿البقرۃ:۱۳۴﴾ یعنی وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی اسکو اسکے اعمال کا بدلہ ملیگا اور تم کو تمہارے اعمال کا۔ تم سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کیا کرتے تھے۔ تم یہ کہہ کر تو بچ نہیں سکتے کہ ہم نے ہمارے باپ دادا کے عمل کی تقلید کی لہٰذا ہم کو معاف کر دیا جائے۔

(۷) وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ ﴿بقرہ ۱۳۰﴾ ترجمہ: اور کون رو گردانی کر سکتا ہے اللہ کے دین سے بجز اس کے جو نہایت نادان اور احمق ہے۔ کیوں کہ ہم نے تو ابراہیم کو دنیا میں منتخب کر لیا تھا اور آخرت میں بھی وہ صالحین میں ہوں گے۔

روایت ہے ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن سلام نے اپنے دو بھتیجوں مہاجر اور سلمہ کو دین اسلام کی دعوت دی اور کہا کہ توریت میں لکھا ہے کہ اللہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ایک پیغمبر بھیجنے والا ہے جس کا نام احمد ہو گا پس جو شخص اس پر ایمان لائے گا وہ

ہدایت پر ہوگا اور جس نے انکار کیا وہ ملعون ہوگا تو سلمہ نے اسلام قبول کیا لیکن مہاجر نے انکار کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

(۸) وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّـهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿البقرہ ۱۳۲﴾ ترجمہ: اور ابراہیم نے اسی بات کی وصیت اپنی اولاد کو کی تھی اور یعقوب نے بھی اپنی اولاد سے یہی کہا اے میرے بچو اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے پس مرتے دم تک مسلمان ہی رہنا۔

یعنی حضرت ابراہیم اور یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو یہی وصیت کی تھی کہ اسلام خدا کا پسندیدہ مذہب ہے پس اسی پر قائم رہو اور اسلام کی حالت میں ہی تم کو مرنا چاہیئے۔

(۹) قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿بقرہ ۱۳۵﴾ ترجمہ: کہدو کہ نہیں۔ ہم نے ابراہیمؑ کی ملت کو اختیار کیا جو سب سے یکسو ہو (کر اللہ کے) ہو گئے تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔

یہود و نصاریٰ یہ کہتے تھے کہ یا تو یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تو تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے اسکے جواب میں اللہ یہ کہہ رہا ہے کہ کہو ہم نے تو ابراہیمؑ کا طریقہ پسند کر لیا ہے اس لئے کہ وہ مشرک نہیں تھے۔

(۱۰) قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ ۔۔﴿البقرہ ۱۳۶﴾ ترجمہ: کہدو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو ابراہیم اور اسماعیل۔۔۔ کی طرف نازل کی گئی۔

(۱۱) أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ۔۔۔ا ﴿بقرہ ۱۴۰﴾۔ ترجمہ: کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد سب یہودی تھے یا نصرانی۔ اللہ فرمارہا ہے ان سے پوچھو کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ کیوں تم جھوٹی گواہی دیتے ہو۔

(۱۲) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔۔۔﴿البقرہ ۲۵۸﴾ ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا اس وجہ سے کہ اللہ نے اسکو بادشاہت دی تھی جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو جِلاتا بھی ہے اور مارتا بھی۔ تو اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں تو ابراہیمؑ نے کہا میرا رب وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے۔۔۔

اللہ نے نمرود کو بادشاہت دی تھی پس وہ مغرور ہو کر خدا بن بیٹھا۔ جب ابراہیمؑ نے اللہ کی وحدانیت کی دعوت دی تو وہ آپ سے مباحثہ پر اتر آیا اور دلیل مانگی تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ میرا خدا زندہ بھی کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے۔ اس نادان کی سمجھ میں یہ دلیل نہیں آئی اس نے کہا کہ میں بھی یہ کام کر سکتا ہوں تو اس نے ایک آزاد اور بے گناہ شخص کو مار ڈالا اور ایک دوسرے شخص کو جسے پھانسی کی سزا ہو چکی تھی آزاد کر دیا۔ تو حضرت ابراہیمؑ نے سورج والی دلیل پیش کی تو وہ مبہوت اور پریشان ہو گیا۔

اگر کوئی شخص یہاں کہے کہ اسکے جواب میں نمرود بھی یہ کہتا کہ کیا تمہارا خدا سورج کو مغرب سے نکالنے پر قادر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے نظام کائنات کے سلسلے میں جو قاعدہ مقرر کیا ہے وہ اپنی جگہ باقی ہے لیکن اگر نمرود بھی خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسکو چاہئے کہ اللہ کے نظام کے قاعدہ کے خلاف کر کے بتائے۔ رہی یہ بات کہ کیا خود اللہ اس پر قادر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ اس پر قادر ہے۔ لیکن کسی کے کہنے سے نہیں کرتا۔ بلکہ وہ جب چاہتا ہے ایسا کرتا ہے اور وہ ضرور کریگا لیکن کب؟ قیامت کے دن جبکہ عالم کا نظام درہم برہم ہو جائیگا۔

(۱۳) وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَىٰ وَلَـٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي۔۔۔۔ ﴿البقرہ ۲۶۰﴾۔ ترجمہ: اور یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم نے (اپنے رب سے کہا) اے میرے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے فرمایا کیا تجھے یقین نہیں۔ کہا کیوں نہیں لیکن (میں دیکھنا اس لئے چاہتا ہوں کہ میرے دل کو کامل اطمینان حاصل ہو جائے)

اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا چار پرندوں کو پکڑو اوران کو اپنے سے مانوس کر لو۔ پھر ان کو مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دو پھر ان سب کو ملا کر ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑ کر یعنی اڑ کر چلے آئیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کا سوال شک کی بنیاد پر نہیں تھا، ان کو تو یقین تھا لیکن علم الیقین۔ اب وہ عین الیقین حاصل کرنا چاہتے تھے جو صرف مشاہدہ پر موقوف تھا اللہ نے ان کے قلب کی تسلّی کے لئے وہ بھی دکھا دیا۔ نکتہ کی بات یہاں یہ ہے کہ انکار کرتے ہوئے جو سوال کیا جاتا ہے اسکی نوعیت الگ ہوتی ہے اور ایمان لانے کے بعد جو سوال کیا جاتا ہے اسکی کیفیت جداگانہ ہوتی ہے۔ منفی طرز عمل عتاب لاتا ہے۔ اور مثبت طرز عمل خطاب اور جواب کا مستحق ہوتا ہے۔

(۱۴) إِنَّ اللَّـهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿آل عمران ۳۳﴾

ترجمہ: اللہ نے آدمؑ، نوحؑ، آل ابراہیمؑ اور آل عمرانؑ کو تمام دنیا والوں کے مقابلے میں (نبوت کیلئے) چُن لیا

(۱۵) يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿آل عمران ۶۵﴾ ترجمہ: اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت بازی کرتے ہو۔ حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیا تم (اتنی بھی) عقل نہیں رکھتے۔

(۱۶) مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَـٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿آل عمران ۶۷﴾ ترجمہ: ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (اللہ) کے ہو رہے تھے اور اسی کے فرماں بردار تھے اور مشرکوں میں (بھی) نہیں تھے۔

(۱۷) إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَـٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّـهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿آل عمران ۶۸﴾ ترجمہ: تمام لوگوں میں ابراہیم سے زیادہ قریب تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کی اتباع کی اور یہ نبی (آخر الزماں) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا دوست ہے۔

(۱۸) قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ۔۔۔ ﴿آل عمران ۸۴﴾ ترجمہ: آپ کہدیجئے ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کتاب ہم پر نازل ہوئی اور جو صحیفے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اُترے۔۔۔۔

(۱۹) قُلْ صَدَقَ اللَّـهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿آل عمران ۹۵﴾ ترجمہ: آپ کہدیجئے کہ اللہ نے سچی بات کہہ دی۔ پس تم دین ابراہیم کی پیروی کرو جو سب سے کٹ کر ایک خدا کے ہو چکے تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔

(۲۰) فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ﴿آل عمران ۹۷﴾ ترجمہ: اس گھر (کعبہ) میں کھلی نشانیاں ہیں ان میں ایک مقام ابراہیم ہے۔

(۲۱) وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴿ابراہیم ۳۵﴾ ترجمہ: اور جب ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب اس شہر کو امن کی جگہ بنادے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے بچائے رکھ۔

(۲۲) وَنَبِّئْهُمْ عَن ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ۔۔۔ ﴿الحجر ۵۱﴾ ترجمہ: ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں ان کو خبر

کر دیجئے

واقعہ یہ ہے کہ فرشتے ابراہیمؑ کے پاس آئے۔ ظاہر ہے کہ وہ انسانوں کی شکل میں تھے۔ انہوں نے ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ ابراہیمؑ نے کہا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا مت ڈرئے ہم آپ کو ایک ہوش مند لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں۔ ابراہیم نے کہا کیا تم مجھ کو (لڑکے کی) خوشخبری دیتے ہو باوجود اس کے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں (کیا کہہ رہے ہو) کس چیز کی خوشخبری دے رہے ہو۔ (یہ سوال استعجاب کا نہیں تھا بلکہ جو سنا تھا اس کا یقین حاصل کرنے کیلئے تھا یعنی آپ Confirm کر لینا چاہتے تھے۔ فرشتوں نے کہا ہم آپ کو سچی خوش خبری دیتے ہیں۔ سو آپ ناامید نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا بھلا کون اپنے رب کی طرف سے مایوس ہو گا۔ بجز گمراہوں کے، پھر پوچھا اے اللہ کے فرستادو تمہاری کیا مہم ہے؟ انہوں نے کہا ہم ایک گنہ گار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں (عذاب کیلئے سوائے لوط کے گھر والوں کے۔ ان سب کو بچالیں گے۔ بجز ان کی بیوی کے کہ اسکی نسبت یہ ہم کو یقین ہو چکا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔

(۲۳) ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿نحل ۱۲۳﴾ ترجمہ: پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ آپ براہیمؑ کے طریقے پر چلو جو ایک سو ہو گئے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے۔

(۲۴) إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿نحل ۱۲۰﴾ ترجمہ: بے شک ابراہیم ایک امت تھے اللہ کے فرماں بردار تھے جو بالکل یکسو تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے

ابراہیمؑ اللہ کے منتخب پیغمبر تھے، اللہ کے عاشق تھے اور سچے فرماں بردار تھے۔ توحید کی دعوت دینے پر مامور تھے اور آپؑ نے اپنے فرائض پوری تندہی کے ساتھ انجام دئے، پھر بھی تنہا ہی رہے، قوم نے آپؑ کی دعوت کو قبول نہیں کیا لیکن اللہ آپ کو امت کے نام سے یاد کر رہا ہے۔ اس لئے کہ (۱) ابراہیمؑ میں کمال نیکی اور خیر کے وہ سارے صفات جمع تھے جو ایک امت میں ہوتے ہیں۔ گویا ابراہیمؑ بذات خود ایک امت تھے۔ (۲) ابراہیمؑ اکیلے توحید کے دین پر تھے اور ان کے مقابل پوری قوم مشرک تھی تو اللہ نے ابراہیمؑ کو امت کے نام سے یاد کیا (۳) آپؑ کی بعثت اس غرض سے ہوئی تھی کہ لوگ آپ کی اقتداء کریں اور آپ لوگوں کی امامت فرمائیں۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا "إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا" (۴) آپؑ کی دعا کے نتیجے میں ہی امت مسلمہ وجود میں آئی، ان سب اقوال میں پہلا قول ہی وزنی اور معنی دار ہے، چونکہ ابراہیمؑ نے اس وقت کی مشرک قوم کا مقابلہ تنہا ہونے کے باوجود، بے سر و سامانی ہونے کے باوجود مقابل میں ایک بااثر، قوت وطاقت والا بادشاہ ہونے کے باوجود بڑی پامردی، استقلال، سوجھ بوجھ اور عزیمت کے ساتھ کیا اور جو کام ایک امت کر سکتی تھی، آپؑ نے اکیلے وہ کام کر دکھایا۔

(۲۵) وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿مریم ۴۱﴾ ترجمہ: اور کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کرو (ان کا واقعہ بھی سناؤ) بے شک وہ سچے نبی تھے۔

صدیق کے معنی بہت زیادہ سچ بولنے والے کے ہیں۔ جو اپنے عمل سے اپنی بات کو سچ کر دکھائے۔ یا وہ راست باز پاک طینت جس کے قلب میں سچائی کو قبول کرنے کی نہایت اعلیٰ اور اکمل صلاحیت موجود ہو جو بات خدا کی طرف سے پہنچے بلا توقف اس کے دل میں اتر جائے۔ شک اور تردد کی گنجائش ہی نہ رہے۔

(۲۶) قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿مریم:۴۶﴾ ترجمہ: اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے بیزار (بد عقیدہ) ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو دین خدائے واحد کی تعلیم دی اور بتوں کی بے حقیقتی اور برائی موثر انداز میں بیان کی اور یہ فرمایا (۱) اے میرے باپ کیوں پوجتا ہے اسکو جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ تیرے کام آسکتا ہے۔ (۲) اے میرے باپ میرے پاس اللہ کی جانب سے توحید، معاد وغیرہ کا صحیح علم آیا ہے اگر تم میری پیروی کرو گے تو میں تم کو سیدھی راہ چلاؤں گا۔ اس کے سوا سارے راستے ٹیڑھے ہیں جن سے نجات نہیں ملتی۔ (۳) اے میرے باپ شیطان کی پرستش مت کرو یعنی اسکے بہکاوے میں آکر بتوں کی پوجا مت کرو۔ کیوں کہ شیطان خود اللہ کا بہت بڑا نافرمان ہے۔ (۴) اے میرے باپ مجھے ڈر ہے کہ (ایسی صورت میں) رحمان (اللہ) کی طرف سے تم پر کوئی وبال نہ آجائے اور تم شیطان کے دوست نہ بن جاؤ۔ اس کے جواب میں ابراہیم کے باپ نے کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے بد عقیدہ اور بے زار ہو گیا ہے۔ اگر تو باز نہ آئے گا تو تجھکو میں سنگسار کروں گا، چل دور ہو جا مجھ سے ایک مدت تک یعنی عمر بھر مجھے اپنی صورت نہ دکھا۔

(۲۷) وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ ﴿مریم:۵۸﴾ ترجمہ: اللہ نے جن پیغمبروں پر انعام کیا ہے وہ آدم کی اولاد سے ہیں اور ان سے ہیں جن کو سوار کر لیا ہم نے نوح کے ساتھ اور ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں اور بعض یعقوبؑ کی اولاد میں ہیں۔

(۲۸) وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ﴿الانبیاء:۵۱﴾ ترجمہ: اور ہم نے (موسیٰ سے) قبل ابراہیم کو (ان کی شان کی مطابق) ہدایت دی تھی اور ان سے ہم خوب واقف ہیں۔

اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو کس قسم کی ہدایت دی تھی اللہ تعالیٰ نے اسکی تفصیل اسطرح بیان فرمائی ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیا واہیات مورتیاں ہیں جن کے تم مجاور بن بیٹھے ہو۔

وہ بولے ہم نے اپنے باپ دادا کو ان ہی کی پرستش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ابراہیمؑ نے فرمایا کہ (تمہاری اس دلیل سے ان کا خدا ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ "تم اور تمہارے باپ دادا صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ قوم والوں نے کہا اے ابراہیم تم جو کچھ کہہ رہے ہو واقعی سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہو کیا تمہارا عقیدہ بھی یہی ہے یا کہ تم محض دل لگی اور مذاق کے طور پر کہہ رہے ہو۔ ابراہیمؑ نے فرمایا بلکہ تمہارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور میں اس پر گواہ ہوں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے (آہستہ سے کہا لیکن شاید کسی ایک آدمی نے یہ بات سن لی) فرمایا قسم خدا کی جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں کی اچھی طرح درگت بناؤں گا۔ چنانچہ آپ نے (موقع پاکر) ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے بجز ایک بت کے (جو ان میں بڑا تھا) تاکہ وہ لوگ اس بڑے بت کے پاس (فریاد لیکر آئیں) کہا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی بلاشک وہ شخص ظالم ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ ایک شخص جس کا نام ابراہیم ہے وہ ہمارے بتوں کی برائی بیان کرتا ہے (اس نے ہی یہ کام کیا ہوگا) قوم نے کہا کہ اسکو سب کے سامنے حاضر کرو تاکہ یہ لوگ بھی اسکو دیکھ لیں اسکے دو معنی ہوسکتے ہیں ایک تو یہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اسی نے یہ حرکت کی ہے اور سب اسکے گواہ ہو جائیں اور دوسرے معنی یہ کہ تاکہ سب اسکو "دیکھ لیں" یعنی اسکو اچھی طرح سزا دیں۔ پھر جب آپ کو طلب کیا گیا تو پوچھا اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی۔ ابراہیم نے فرمایا ان میں جو بڑا ہے اسی نے یہ حرکت کی ہوگی اسی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں۔ پھر تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ابراہیمؑ جو کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔ پتھر کو پوجنے سے کیا حاصل جب وہ اپنی مدد آپ نہیں کرسکتے تو ہماری مدد کیا کریں گے۔ بے شک تم لوگ ہی گنہ گار ہیں۔ پھر شرمندگی کے مارے اپنے سر نیچے کر لئے اور کہا اے ابراہیم تم تو جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں معاً ابراہیم نے کہا پھر تم خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کیوں کرتے ہو جو تمہیں نہ فائدہ دے سکتے ہیں نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور ان پر بھی جنکو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ انہوں نے غصے میں آکر کہا اس کو آگ میں جلادو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

آگ بھڑکائی گئی لکڑیاں خریدنے میں سب لوگوں نے ثواب کا کام سمجھ کر حصہ لیا۔ حتیٰ کہ سوت کاتنے والی ایک ادنیٰ عورت بھی اس میں شریک ہوگئی۔ جب آگ تیار ہوئی تو وہ اتنی تیز تھی کہ کوئی اس کے قریب بھی جا نہیں سکتا تھا۔ ابلیس کے مشورہ پر منجنیق کے ذریعہ الاؤ میں پھینکنے کی تجویز ہوئی۔ خدائی میں کھلبلی مچ گئی فرشتے لرز گئے۔ ہر بڑا فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آیا اور آگ بجھانے کی اجازت چاہی۔ ابراہیم موحد تھے اور متوکل علی اللہ تھے۔ آپ نے اللہ کے سوائے کسی سے بھی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ سب فرشتوں نے پوچھا کیا کوئی حاجت ہے آپ نے فرمایا نہیں آخر میں جبرئیل نے پوچھا تو آپ نے فرمایا اما الیك فلا۔ تو جبرائیل نے فرمایا ہم سے نہیں تو کم از کم اپنے خدا سے مدد چاہو۔ ابراہیمؑ پیکر تسلیم ورضا نے جواب دیا کہ

اندھے و بہرے کو پکار کر فریاد کرتے ہیں میرا خدا تو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی ہے اور علیم بھی ہے جو کچھ ہو رہا ہے اسکی نظروں کے سامنے ہو رہا ہے، پھر اسکو بتانے اور پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس گفتگو میں ابراہیمؑ الاؤ کے قریب پہنچ چکے تھے اور اللہ برابر آپؑ کا امتحان لے رہا تھا۔ ادھر ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا اور اِدھر اللہ کا حکم آگ کو پہنچا (اے آگ تو ابراہیم کے حق میں ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا باعث بھی۔

(۲۹) وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْـرِكْ بِي شَـيْئًا۔۔۔ ﴿الحج ۲۶﴾ ترجمہ: اور جبکہ ہم نے ابراہیم کو کعبہ کی جگہ بتادی اور کہا کہ میرے ساتھ کسی کو بھی شریک مت کرو

اسکی تفصیل اسطرح ہے کہ اللہ نے مزید فرمایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں (نماز میں) کھڑے رہنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے پاک وصاف رکھو۔ اور یہ کہ لوگوں میں حج کی فرضیت کا اعلان کر دو تاکہ وہ تمہاری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر دور دراز راستوں سے سوار ہو کر چلے آئیں تاکہ اپنے فائدوں کی جگہوں پر حاضری دیں اور تاکہ مقررہ دنوں میں ان چوپایوں پر بوقت ذبح اللہ کا نام لیں جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں۔ ان جانوروں میں سے (گوشت) تم بھی کھاؤ اور برے حال کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ پھر ان کو چاہیئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔ آیت نمبر ۲۹۔

(۳۰) وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ﴿حج ۴۳﴾ ترجمہ: اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم۔

رسول اللہ ﷺ کی دلجوئی کی جارہی ہے اور بتایا جارہا ہے کہ اگر آج یہ کفار اور مشرکین اپنے کفر وانکار پر مصر ہیں تو کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہر زمانے میں کفار نے اپنے اپنے زمانے کے پیغمبروں کو جھٹلایا ہے۔ ہم نے ان کو مہلت دی تاکہ وہ سمجھ کر راہ راست پر آجائیں۔ بصورت دیگر ہم نے ان کو عذاب میں جکڑ لیا۔ چنانچہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ابراہیم، قوم لوط، اصحاب مدین بھی جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰؑ کو بھی جھٹلایا گیا۔

(۳۱) مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ ﴿الحج ۷۸﴾ ترجمہ: لازم کرلو اپنے باپ ابراہیم کے دین کو اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے کہہ رہا ہے کہ اس نے تم کو برگزیدہ کیا اور اس نے تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں رکھی۔ تم ابراہیمؑ کے دین کو مضبوطی سے پکڑ رکھو اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ قرآن سے پہلے کی کتابوں میں یعنی تورات وانجیل میں بھی تمہارا نام مسلم تھا۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے اس امت کا نام "امت مسلمہ" رکھا تھا۔ جبکہ اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہا تھا۔ "وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْـلِمَةً لَّكَ" جس کے معنے فرماں بردار امت کے ہیں۔ یہی لقب اس

امت کا ہو گیا۔ اور اس قرآن میں بھی مسلم ہی کہا گیا ہے۔

(۳۲) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ﴿شعراء ۶۹﴾ ترجمہ: اور آپ ان کو ابراہیم کا حال پڑھ کر سنایئے۔

ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے اور اپنے والد سے کہا تم کس کو پوجتے ہو انہوں نے کہا ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان ہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابراہیمؑ نے کہا کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم پکارتے ہو یا کچھ تمہارا بھلا کرتے ہیں یا بُرا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی طرح کرتے دیکھا۔ ابراہیم نے کہا بھلا تم نے ان کو دیکھا جن کی تم پوجا کرتے ہو تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی کہ یہ میرے دشمن ہیں۔ سوائے رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے اور وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے اور وہ مجھے موت دیتا ہے پھر مجھے زندہ کرے گا۔ اور جس سے مجھے اُمید ہے کہ میری بھول چوک، خطا اور تقصیر کو فیصلہ کے دن بخشے گا۔

(۳۳) وَإِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّـهَ وَاتَّقُوهُ ﴿العنکبوت ۱۶﴾۔ ترجمہ: اور ابراہیم کو ہم نے بھیجا تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو۔

(۳۴) وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُو أَهْلِ هَـٰذِهِ الْقَرْيَةِ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿عنکبوت ۳۱﴾۔ ترجمہ: اور جب ہمارے فرشتے ابراہیمؑ کے پاس خوش خبری لیکر آئے تو کہنے لگے ہم اس بستیکے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیوں کہ یہاں کے باشندے گنہ گار ہیں۔

اس آیت شریفہ میں دو متضاد باتیں نظر آتی ہیں پہلی بات یہ کہ فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرزند کی خوش خبری دینے کیلئے آتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ وہی فرشتے ابراہیمؑ کو لوطؑ کی بستی کو ہلاک کرنے کی خبر بھی سنا رہے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ فرشتے ایک قوم کو ان کی بد اعمالی کے سبب تباہ کرنے جا رہے ہیں تو ایک پیغمبر کے پاس ایک قوم کو وجود میں لانے کا پیغام سنا رہے ہیں۔ ایک نبی نے اپنی قوم کو ہلاک کرنے کی بد دعا کی تھی۔ اور ایک نبی نے ایک امت مسلمہ کو وجود میں لانے کی دعا کی تھی اللہ نے ان دونوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرشتوں سے کہا کہ جس بستی کو ہلاک کرنے تم جا رہے ہو اس میں لوط بھی ہیں۔ فرشتوں نے کہا ہم کو معلوم ہے ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچالیں گے بجز ان کی بیوی کے۔ اسکو ہلاک کر دیا جائے گا کیوں کہ اس کا کردار کافرانہ ہے۔

(۳۵) وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنكَ وَمِن نُّوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا

مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿الاحزاب:۷﴾ ترجمہ: اور جب ہم نے پیغمبروں سے اقرار لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے فرزند عیسیٰؑ سے اور تمام سے ہم نے پکا اقرار لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس عہد کا ذکر فرمارہا ہے جو اس نے تمام پیغمبروں سے لیا تھا وہ عہد یہی تھا کہ اللہ کے احکام کی تبلیغ بغیر کسی خوف وڈر کے کرنا چاہیئے اور اس معاملہ میں صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور ان کی جانب سے ملنے والی اذیتوں پر صبر وضبط کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اس خصوص میں پانچ پیغمبروں کے نام خصوصیت سے اس لئے، لئے گئے کہ یہ پانچوں صاحب شریعت اور صاحب کتاب ہیں آنحضرت کا نام سب سے پہلے اسلئے لیا گیا کہ آپ ظہور کے اعتبار سے آخیر میں ہیں لیکن وجود کے اعتبار سے اور شرف وعزت کے اعتبار سے اول اور مقدم ہیں ان کے بعد جن چار پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ تو "امام" ہیں اور عرب میں رہے ہیں نوحؑ صاحب طوفان ہیں۔ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی اُمتیں تو حضور کے زمانے میں بھی تھیں۔ میثاق لینے کا مقصد یہ تھا کہ بعد میں اتمام حجت ہو۔ سچے لوگوں کا سچ ظاہر ہو۔ اور بد باطنوں کی برائی سامنے آجائے اور اس بناء پر ان کو سزا دی جاسکے۔

(۳۶) وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿الصّٰفّٰت ۸۳، ۸۴﴾ ترجمہ: اور ان ہی (نوح) کے طریقے والوں میں ابراہیم بھی تھے جبکہ وہ اپنے رب کے پاس پاک دل لیکر آئے۔

ابراہیمؑ کے تعلق سے یہاں مزید تفصیل بیان کی جارہی ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کن چیزوں کی عبادت کرتے ہو کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا چاہتے ہو۔ بھلا رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اسکے دوسرے ہی دن ان لوگوں کی کوئی عید تھی، ان لوگوں کی عادت تھی کہ عید منانے سے پہلے اپنے جھوٹے معبودوں کے آگے پکا ہوا کھانا (یا مٹھائی) رکھ دیتے تھے تاکہ برکت حاصل ہو، عید کی تقریبات سے فارغ ہو کر یہاں آکر وہ کھانا کھاتے تھے عید کے مقام پر جانے سے پہلے انہوں ابراہیمؑ کو بھی ساتھ چلنے کیلئے کہا تب اس وقت کے طریقے کے مطابق ابراہیمؑ نے تاروں کی طرف دیکھا اور کہا میں بیمار ہوں ایک روایت میں آیا ہے کہ تھوڑی دور تک آپ ان کے ساتھ گئے، راستہ میں پیر کی تکلیف ظاہر کرتے ہوئے واپس آگئے، ادھر وہ لوگ گئے اور ادھر ابراہیمؑ معبودوں پر حملہ کر بیٹھے، سب بتوں کو مار مار کر چورا چورا کر دیا اور ایک بڑے بت کے ہاتھ میں کلہاڑا رکھ دیا ان لوگوں کو وہیں اس واقعہ کی اطلاع مل گئی تھی وہ فوراً دوڑتے ہوئے آئے اور ابراہیمؑ سے گفتگو کی۔ آپ نے جواب دیا کہ تم ایسے معبودوں کو پوجتے ہو جن کو تم خود تراشتے ہو، ردّ وقدح کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ جس نے ہمارے بتوں کو توڑ کر ہمارا دل جلایا ہے اس طرح اسکو بھی جلانا چاہیئے۔ اس مقصد کیلئے ایک خاص چار دیواری بنائی گئی اور اس میں آگ دہکائی گئی ابراہیمؑ کو اس میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ ابراہیمؑ صحیح وسالم

بچ گئے۔ کفار کی ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں اور ان کے سر نیچے ہوگئے۔ اسکے بعد ابراہیمؑ نے وہاں سے شام کی طرف ہجرت فرمائی اور فرمایا میں اپنے رب کی طرف جارہاہوں یعنی اس مقام پر جہاں اللہ کی عبادت سکون اوراطمینان سے کرسکوں۔ اور اللہ کے دین کی تبلیغ آزادی کے ساتھ کرسکوں وہاں اللہ میری مدد کرے گا پھر یہ دعا فرمائی اے پروردگار میں تو اب تیرے لئے وطن گھر بار سب چھوڑ چکاہوں اب ایک فرزند عطافرما جو دین کی تبلیغ واشاعت میں میری مدد کرسکے۔

حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی گئی یعنی ایسے فرزند کی جو آگے چل کہ بردبار، صابر اور صادق الوعد ہو۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ جو بچہ ذبح ہوا وہ کون ہے؟ صحابہ اور مفسرین کی خاصی تعداد یہ کہتی ہے کہ وہ بچہ اسحاق ہے اور دوسرے کثیر لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اسماعیل ہیں اکثروں کا اتفاق اسی پر ہے کہ وہ اسماعیل ہیں، بہرکیف جب وہ بچہ سات سال اور بروایتے تیرہ سال کا ہوا تو باپ نے بیٹے سے استمزاج کیا کہ میں خواب میں تم کو ذبح کررہاہوں۔ بولو تمہاری کیارائے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا خواب کی بنیاد پر ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو ذبح کردیا۔ اس کا جوب یہ ہے کہ انبیاءؑ کا خواب بھی ایک طرح سے وحی ہوتی ہے اسلئے ابراہیمؑ نے اس خواب کو بھی حکم الٰہی سمجھا پھر فوراً اس پر عمل نہیں کیا بلکہ اسکو وسوسہ سمجھ کر دوسرے دن کیلئے ٹال دیا پھر دوسری رات بھی وہی خواب نظر آیا تب ابراہیمؑ کو یقین ہوگیا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ نیز یہ بھی روایت آئی ہے کہ رات میں خواب دیکھا اور دن میں وحی بھی آئی۔ چونکہ معاملہ بیٹے کو قربان کرنے کا تھا اور وہ بھی اپنے ہی ہاتھوں تو اللہ نے شروع میں ہی راست خطاب نہیں فرمایا بلکہ خواب کے ذریعہ پہلے اپنا منشاء ظاہر فرمایا۔ جب ابراہیمؑ دوراتوں میں اس معاملہ سے آگاہ ہوگئے اور اس عظیم واقعہ سے آپ کا دل مانوس ہوگیا تو پھر دن میں بھی حکم ہوا ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ بچے کو لیکر ذبح کے ارادے سے مذبح جانے لگے تو اپنے فرزند دل بند سے پوچھا جان پدر میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کررہاہوں۔ بولو تمہاری کیارائے ہے۔ فرزند نے کہا اباجان آپ کو جو حکم ہوا ہے اس پر عمل کیجئے۔ خدا نے چاہا تو مجھے آپ صبر کرنے والوں میں پاؤ گے۔

پھر دونوں نے اللہ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے آگے باپ کی جانب سے سپردگی کی یہ کیفیت تو خیر معلوم ہے لیکن باپ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی یہ خو، اسماعیلؑ نے کہاں سے سیکھی۔ اسماعیلؑ نے تو کسی مکتب ومدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ پھر یہ آداب فرزندی اور یہ انداز تسلیم ورضائے خداوندی کس نے سکھائے اس کا جواب بقول شاعر: ''یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی؛ سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی''؛ میں ملتا ہے۔ (یعنی فیضان نظر اور صحبت صادقین)

الغرض جب باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا اور چھری پھیر دی تو بجائے اسماعیل کے دنبہ کٹ گیا جو جنت سے اسی

غرض کیلئے بھیجا گیا تھا۔ اللہ نے پکار کر کہا اے ابراہیم تم نے خواب سچا کر دکھایا۔ تمہاری طرف سے آخری لمحہ تک بھی کوئی ہچکچاہٹ، کوئی حیلہ سازی، کوئی تردد نہیں، بلکہ پوری آمادگی اور کامل سپردگی پائی۔ ہم یہی دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا چاہتے تھے۔ بے شک یہ ایک عظیم امتحان تھا جس میں تم پورے اترے اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کے عوض میں دے دیا اور پیچھے آنے والوں میں ان کا ذکر خیر (اور قربانی کا عمل) باقی رکھا۔ فرمایا سلام ہے ابراہیم پر ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک ابراہیم ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ اور ہم نے ان کو اسحاق کی بشارت دی۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ہم نے ان کو اسحاق کی خوش خبری دی وہ نبی اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے۔ اللہ نے جو فرمایا کہ پیچھے آنے والوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا اسی کی تعمیل میں امت مسلمہ میں قربانی کا عمل انشاء اللہ قیامت تک رہے گا چنانچہ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ما هذه الاضاحي يا رسول الله قال سُنةُ ابيكم ابراهيم یعنی یہ قربانیاں کیا ہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ نے فرمایا یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے۔

(۳۷) وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ﴿الصّٰفّٰت:۱۰۴،۱۰۵﴾ ترجمہ: اور ہم نے اسکو پکارا اے ابراہیم تم نے خواب سچا کر دکھایا

(۳۸) سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿الصّٰفّٰت ۱۰۹﴾ ترجمہ: ابراہیم پر سلام ہے

(۳۹) وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ﴿ص ۴۵﴾ ترجمہ: اور ہمارے بندوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کیجئے جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے۔

"ہاتھوں والے اور آنکھوں والے" سے مراد یہ کہ وہ "اوصاف عملیہ" اور "اوصاف علمیہ" کے حامل اور مالک تھے۔ ہاتھ والوں سے مراد یہ کہ وہ اعمال صالحہ کرتے تھے اور آنکھوں والے کا مطلب یہ کہ وہ علم و معرفت رکھتے تھے۔ پیغمبروں کی شان کی اعتبار سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ "فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا "﴿الکھف:۱۱۰﴾۔ کی منزل میں تھے۔

(۴۰) وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ﴿الشوریٰ ۱۳﴾ ترجمہ: اور ہم نے جس کا ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا یہ کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

گر افسوس کہ پیغمبروں کے بعد جو لوگ کتابوں کے وارث ہوئے انہوں نے محض نفسانیت کی وجہ سے تعلیمات کو

بگاڑا۔ توجیہ اور تاویل کے راستوں کے ذریعہ دین واحد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور لوگ بجائے حکم خداوندی کی پیروی کے نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگے۔ اے رسول۔ آپ اختلافات کے اس طوفان میں عزم صمیم کے ساتھ ایک اللہ کی پرستش کی دعوت دیتے رہیئے۔ اور ذرّہ برابر اس راستے سے نہ ہٹیئے۔ اور نہ ان کو منوانے کیلیئے ان کی باتیں سنئے۔ آپ کھلے الفاظ میں کہدیجئے کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ اسکی جانب سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ وہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ میں تو بس اسکے احکام کی اتباع کرتا ہوں۔ میرا کام بس یہی ہے۔ اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارا اختیار ہے قیامت کے دن جب فیصلہ ہو گا تب معلوم ہو گا کہ حق پر کون تھا اور ناحق پر کون؟

(۴۱) وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ﴿الزّخرف ۲۶﴾ ترجمہ: یاد کرو وہ وقت کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے فرمایا میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جنکی تم عبادت کرتے ہو۔ سوائے اس کے جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا۔

(۴۲) هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ﴿الذّاریات ۲۴﴾ ترجمہ: کیا آپ کے پاس ابراہیمؑ کے معزّز مہمانوں کی خبر پہنچی۔

واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ کے پاس معزز فرشتے بطور مہمان آئے اور آپ کو سلام کیا۔ ان کے انداز سلام سے حضرت ابراہیمؑ جان گئے کہ یہ اجنبی ہیں۔ پھر آپ نے اپنے گھر والوں سے کہہ کر کھانا تیار کروایا اور ان کیلیئے ایک فربہ تلا ہوا، بچھڑا لائے اور ان کے قریب رکھا۔ لیکن جب انہوں نے کھانے کیلیئے اپنے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے تو ابراہیمؑ کو تعجب ہوا اور دل میں خوف بھی کہ آخر یہ مہمان کھاتے کیوں نہیں۔ کہیں یہ لوگ بری نیت سے تو نہیں آئے۔ فرشتوں نے کہا ڈرو مت پھر انہوں نے اپنی حقیقت بیان کی اور کہا کہ ہم آپ کو ایک سمجھدار دانا فرزند کی خوش خبری دینے آئے ہیں، تو سارہ (ابراہیم کی بیوی) جو مکان کے ایک گوشہ میں کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھیں یہ خوش خبری سن کر چلاّتی ہوئی آئیں جس میں تعجب بھی تھا اور خوشی بھی، پھر جیسا کہ عورتوں کی عادت ہے یا تو اپنے گالوں کو پیٹا یا اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہا ایک تو بڑھاپا اور دوسرے بانجھ۔ اب تک مجھے اولاد نہیں ہوئی اب کیسے؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ اسی حالت میں ہو گا اور یہ حکم اللہ کا ہے جو بڑی حکمت والا ہے اور ہر بات سے خبردار ہے۔

اس سے فارغ ہو کر ابراہیمؑ نے ان فرشتوں سے پوچھا اے فرشتو تمہارا کیا مدّعا ہے انہوں نے کہا کہ ہم ایک گنہ گار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تا کہ ہم ان پر کنکر کے پتھر برسائیں۔ یہ وہ پتھر ہیں جن پر اللہ کے پاس سے نشان لگا دے گئے ہیں یعنی

ہر پتھر اسی پر پڑے گا جس کو اس سے مرنا ہے۔ پس ہم نے وہاں سے جو ایمان دار تھے ان کو نکال دیا اور بجز ایک گھر کے وہاں ہم نے مسلمانوں کا کوئی گھر نہیں پایا۔

(۴۳) أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ﴿والنجم:۳۶،۳۷﴾ ترجمہ: کیا اس کو خبر نہیں پہنچی اسکی جو صحیفوں میں ہے موسیٰ کے اور ابراہیم کے بھی جس نے اپنا قول و قرار پورا کیا۔

ان صحیفوں میں لکھا ہوا تھا کہ کوئی شخص قیامت کے دن کسی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ اور ہر انسان کو اسکی کوشش اور اسکے عمل کا پھل ملتا ہے۔ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿النجم:۳۹﴾ کی آیت سے بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ایصال ثواب صحیح نہیں ہے (اس کا جواب ایصال ثواب میں دیکھئے) اور یہ کہ ہر انسان کی کوشش اور عمل کو بہت جلد دیکھا جائے گا پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ رب کے پاس ہی سکو پہنچنا ہے اور یہ کہ وہی ہے جو سب کو ہنساتا ہے اور رُلاتا ہے۔ اور وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے۔ اور اسی نے نر و مادہ دو قسم کے جوڑے پیدا کئے یعنی نطفے سے جو رحم میں ڈالا جاتا ہے۔ اور یہ کہ دوبارہ اُٹھانا (قیامت میں) اسی کے ذمہ ہے۔ اور وہی ہے جو مالدار بناتا ہے اور مفلس بھی۔ اللہ نے یہ جو فرمایا کہ ابراہیم نے اپنا قول و قرار پورا کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے پورے امتحانوں میں پورے اترے یہاں تک کہ اپنے باپ کیلئے مغفرت کی دعا کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اُسے بھی پورا کیا۔ لیکن جب اللہ نے آپ کو منع کر دیا تو آپ رک گئے۔

(۴۴) وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُم مُّهْتَدٍ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿الحدید:۲۶﴾ ترجمہ: بے شک ہم نے نوح اور ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور انکی اولاد میں نبوت اور کتاب جاری رکھی ان میں سے بعض تو ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں کے اکثر نافرمان ہیں۔

یہ آفاقی حقیقت ہے کہ ہدایت پانے والے اور مومن کم ہوتے ہیں اور ظالم نافرمان اور گم کردہ راہ زیادہ۔

(۴۵) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ﴿الممتحنۃ:۴﴾ ترجمہ: ابراہیم میں اور ان کے ساتھیوں میں تمہارے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے

ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی جو روش تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے مشرکین سے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہم تمہارے طریقے سے بیزار ہیں حالانکہ ان میں ان کے رشتہ دار بھی تھے۔ ان کے باپ بھی تھے۔ اور بیٹے بھی تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی کوئی رعایت نہیں کی۔ صرف اللہ کے حق کی رعایت کی اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ مت سمجھو کہ ہم رشتہ داری کا خیال

کریں گے یا نسبی رشتہ کا لحاظ کریں گے بلکہ سن لو کہ اب ہم میں بغض وعداوت کی نسبت قائم ہو چکی ہے ہاں اگر تم بھی اللہ کے موحد بن جاؤ تو پھر ہم میں اور تم میں دوستی پیدا ہو سکتی ہے ورنہ نہیں

(۴۶) إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ﴿الممتحنة:۴﴾ ترجمہ :یعنی ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کیلئے عداوت اور بغض پیدا ہو چکا ہے جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔ سوائے ابراہیم کے اس قول کے جو انہوں نے اپنے والد سے کہا تھا میں تمہارے لئے مغفرت مانگوں گا اور میں اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔

مطلب یہ کہ ابراہیمؑ اور ان کے ایماندار رفقاء میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ سوائے ابراہیمؑ کے اس قول کے جو انہوں نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ ”میں خدا سے تمہارے لئے مغفرت مانگوں گا“ وہ تو حضرت ابراہیم نے اپنے ایک وعدہ کی بناء پر استغفار کیا تھا۔ اس وقت تک ان کو معلوم نہیں تھا کہ باپ شرک پر ہی مرے گا جب معلوم ہو چکا تو آپ نے پھر اس کیلئے مغفرت نہیں مانگی۔ اور تم کو تو معلوم ہو چکا ہے تو مشرکوں کیلئے استغفار مت کرو۔ اور ابراہیم نے بھی فقط دعا کی تھی جس کی قبولیت اور عدم قبولیت کا انحصار اللہ کی مرضی پر ہے۔

(۴۷) إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ﴿اعلیٰ:۱۹،۱۸﴾ ترجمہ: یہی بات پہلے صحیفوں میں لکھی ہے یعنی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔

یعنی پہلے کے صحیفوں اور ابراہیمؑ کے صحیفوں میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں کہ بے شک مراد کو پہنچا وہ شخص جو پاک ہوا اور اپنے رب کے نام کو یاد کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔ تم لوگ دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

امین

امین کا لفظ قرآن میں ۱۴ مقامات پر آیا ہے۔ اکثر مقامات پر پیغمبروں کیلئے آیا ہے۔ جس کے معنی امانت دار، قابل اعتماد وغیرہ ہیں۔ چنانچہ حضرت ہودؑ کے تعلق سے آیا ہے کہ آپ نے اپنی قوم سے فرمایا جو ان کو بے وقوف اور احمق کہتی تھی۔

(۱) قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَـٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴿اعراف:۶۸،۶۷﴾ ترجمہ: انہوں نے کہا اے میری قوم مجھ میں کم عقلی نہیں ہے بلکہ میں تو رب العالمین کا پیغمبر ہوں میں تمہیں میرے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور امانت دار ہوں۔

(۲) قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴿یوسف:۵۴﴾ بادشاہ نے کہا تم آج سے ہمارے پاس معزز اور قابل اعتبار ہو۔

(۳) إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴿الشعراء:۱۰۷﴾ (نوحؑ نے کہا) میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔

(۴) إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴿الشعراء:۱۲۵﴾ ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں

(۵) إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴿الشعراء:۱۴۳﴾ جب ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو صالحؑ نے فرمایا میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔

(۶) إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴿الشعراء۱۶۲﴾۔ جب لوط کی قوم نے آپ کو جھٹلایا تو لوطؑ نے فرمایا میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔

(۷) إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴿الشعراء۱۷۸﴾۔ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے کہا کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔

(۸) وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴿الشعراء۱۹۳،۱۹۲﴾۔ اور یہ قرآن پروردگار عالمین کا اتارا ہوا ہے اسکو امانت دار فرشتہ لیکر اترا ہے۔ اس آیت میں امین کا لفظ حضرت جبرئیلؑ کے لئے آیا ہے روح الامین حضرت جبرئیل کا لقب ہے آپ کو روح اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ روح سے مخلوق ہوئے ہیں۔

(۹) قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن تَقُومَ مِن مَّقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ﴿النمل ۳۹﴾۔ جنات میں سے ایک قوی ہیکل جن نے کہا قبل اس کے کہ آپ اپنے اجلاس سے اُٹھیں میں اس (تخت) کو آپ کے پاس حاضر کردوں گا اور میں اسے اُٹھانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں اور امانت دار بھی ہوں۔

واقعہ قرآن میں اسطرح بیان کیا گیا ہے کہ جب ہدہد نے ملکہ سبا کے تعلق سے خبر دی اور ضمناً جہاد کرنے کا مشورہ دیا تو حضرت سلیمانؑ نے اولاً ایک خط بلقیس کے پاس بھیجا اور اسلام کی دعوت دی۔ جب خط اُسے ملا تو اس نے درباریوں سے مشورہ کیا۔ درباریوں نے بین بین مشورہ دیا۔ ملکہ نے بہت سے تحائف حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجے تا کہ یہ معلوم کرے کہ اگر سلیمانؑ کو مال و منال کی ہوس ہے تو وہ ان تحائف کو قبول کر لیں گے۔ دنیا سے راضی ہو جائیں گے اور دین کی فکر نہ کریں گے۔ حضرت سلیمانؑ نے یہ جواب دیا کہ اللہ نے ہم کو اتنا مال دیا ہے جو تمہارے مال سے بہتر ہے۔ تمہارے تحفے تم کو ہی مبارک۔ اور اس سے کہدو کہ ہم ایسی فوجیں لیکر تم پر حملہ کریں گے جن کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے اور تم کو بے عزت اور ذلیل کر کے ان کے ملک سے نکال دیں گے۔ اس جواب سے بلقیس کو یقین ہو گیا کہ سلیمان صرف دنیاوی بادشاہ نہیں ہیں بلکہ پیغمبر بھی ہیں اور جنگ کی صورت میں اللہ کی امداد اور نصرت ان کے ساتھ ہو گی۔ اسکے بعد اس نے اسلام قبول کرتے ہوئے تابعداری کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضری کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ادھر حضرت سلیمانؑ کو بلقیس کی پل پل کی خبریں مل رہی تھیں جب وہ ''مآرب'' سے شام کے قریب آگئی تو حضرت سلیمانؑ نے اس پر اپنی مزید قوت اور اللہ کی عنایت ظاہر کرنا چاہی تو آپ نے کہا ہے کوئی جو بلقیس کے تخت کو اسکے یہاں آنے سے پہلے میرے پاس لے آئے ایک قوی ہیکل جن نے کہا کہ آپ کے اس اجلاس کو برخواست کرنے سے پہلے وہ تخت اُٹھا کر آپ کے پاس لاؤں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں قوی بھی ہوں اور امانت دار بھی۔ اس تخت میں لگے ہیروں اور موتیوں میں میں کوئی خیانت نہیں کروں گا، لیکن سلیمانؑ اس سے بھی جلد منگوانا چاہتے تھے تو آپ کے ایک وزیر آصف بن برخیا نے کہا کہ آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی میں وہ تخت آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا اور بس اتنے ہی میں وہ تخت لا کر آپ کی خدمت میں رکھ دیا۔

(۱۰) قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ﴿القصص ۲۶﴾ ان دونوں میں سے ایک لڑکی بولی اباجان ان کو نوکر رکھ لیجئے کیوں کہ بہتر نوکر (مزدور) جو آپ رکھیں تو وہ ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

یہ دونوں لڑکیاں حضرت شعیبؑ کی بیٹیاں تھیں جو اس گاؤں کے کنویں سے پانی بھرنے گئی تھیں لیکن مردوں کی بھیڑ کی وجہ سے الگ تھلگ بیٹھی رہتی تھیں جب سب مرد فارغ ہو جاتے تو ان کی باری آتی تھی۔ ایسے میں حضرت موسیٰؑ وہاں پہنچے، ان لڑکیوں کی بے بسی اور ان مردوں کی زبردستی کو برداشت نہ کر سکے۔ فوراً ڈول اور رسی لیکر کنویں سے پانی بھر کر ان لڑکیوں کو دے دیا۔ جب لڑکیاں خلاف عادت وقت سے پہلے گھر پہنچیں تو والد ماجد کے پوچھنے پر احوال کہہ سنایا۔ باپ نے موسیٰ کو بلا بھیجا۔

ایک لڑکی نے موسیٰؑ سے کہا کہ میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تا کہ آپ کی خدمت کا معاوضہ دیں۔ موسیٰؑ تشریف لائے اور واقعات بیان کئے کہ وہ کس طرح اپنے ملک سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ شعیبؑ نے کہا کہ ڈرو مت۔ اس بادشاہ کی سرحد ختم ہو گئی۔ اب یہاں کوئی تم کو حیران نہ کریگا۔ اس وقت اس لڑکی نے کہا کہ ابا جان ان کو آپ بحیثیت مزدور رکھ لیجئے کہ ان میں قوت وطاقت بھی ہے اور امانت داری کی صفت بھی ہے۔

(۱۱) أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿دخان:۱۸﴾ خدا کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو میں تمہاری طرف خدا کا امانت دار پیغمبر ہوں۔

(۱۲) إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿دخان:۵۱﴾ بے شک پرہیز گار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔

(۱۳) إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿تکویر:۲۱،۲۰،۱۹﴾ ۔ قرآن فرشتۂ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے جو صاحب قوت عرش کے مالک کے پاس اونچے درجے والا اور وہاں جس کا حکم مانا جاتا ہے اور وہ امات دار بھی ہے۔

(۱۴) وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ﴿التین:۳﴾۔ (یعنی قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی) اور امن والے شہر کی یعنی مکہ مکرمہ کی۔

الیاس علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام میں (آیت نمبر ۸۲ سے آیت نمبر ۸۶ تک) اٹھارہ پیغمبروں کا ذکر فرمایا ہے ان میں حضرت الیاس ؑ کا ذکر زکریاؑ۔ یحییٰؑ اور عیسیٰ ؑ کے ساتھ میں فرمایا ہے اور یہ فرمایا ہے كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ۔ یہ سب نیکو کار تھے۔

اور سورۂ الصّٰفّٰت میں بھی اللہ نے فرمایا۔ وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴿الصّٰفّٰت:۱۲۳﴾ یعنی الیاس (بھی) پیغمبروں میں سے تھے۔

ان کے تعلق سے یہ تفصیل آئی ہے کہ حضرت الیاس ؑ کو شہر بعلبک کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ پس جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم (اللہ سے) ڈرتے کیوں نہیں۔ کیا تم ''بعل'' کو پوجتے ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو یعنی اللہ کو جو تمہارا رب ہے اور تمہارے باپ دادا سب کا رب ہے تو انہوں نے ان کو جھٹلایا سو وہ دوزخ میں حاضر کئے جائیں گے۔ (یہ ہے قرآنی آیات کا ترجمہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ''بعل'' نامی بت کو پوجا کرتے تھے۔ حضرت الیاس ؑ نے حکم خدا سے ان کو توحید کی دعوت دی۔ جنہوں نے مانا اور آپ کی ہدایت کو تسلیم کیا وہ عذاب سے بچ گئے۔

الیاس ؑ کو الیاسین بھی کہتے ہیں جیسے ''طور سینا'' کو ''طور سینین'' کہتے ہیں۔ بعض قاریوں نے ''آل یاسین'' پڑھا ہے جس کے معنی ہوں گے الیاس کے ماننے والے۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے والد کا نام ''یاسین'' ہو۔

قرآن شریف میں بھی '' سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ ''﴿الصّٰفّٰت:۱۳۰﴾ آیا ہے۔ اور فرمایا ہے ''اسی طرح نیکو کاروں کو ایسا ہی (اچھا) بدلہ دیتے ہیں بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

اسمٰعیل علیہ السلام

اسمٰعیلؑ کا ذکر ویسے حضرت ابراہیمؑ کے ذکر کے ضمن میں آچکا ہے۔

اسماعیلؑ کا ذکر قرآن شریف میں ۱۲ جگہ پر آیا ہے۔۔ سات مقامات پر ابراہیمؑ کے ساتھ آیا ہے اور چار مقامات پر دوسرے پیغمبروں کے ساتھ اور ایک جگہ مستقل طور پر آپ کا ذکر ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِندَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا﴿مریم:۵۵﴾۔ اور کتاب میں اسمٰعیل کو بھی یاد کر بے شک وہ وعدہ کا سچا تھا۔ اور رسول نبی تھا اور اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم کرتا تھا اور اپنے رب کے پاس پسندیدہ (اور مقبول) تھا۔

اس سے حضرت اسمٰعیل کی فضیلت حضرت اسحاقؑ پر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اسحٰق کو صرف نبی فرمایا اور اسمٰعیل کو رسول و نبی فرمایا۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراھیم اسمٰعیل۔ اللہ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں سے اسمٰعیلؑ کو چن لیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ عرب کے مورث اعلیٰ اور ہمارے پیغمبر آخر الزماں علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں جو ابراہیمی شریعت دے کر بنی جرہم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا صادق الوعد ہونا مشہور تھا۔ اللہ سے یا بندوں سے جو وعدہ کیا اُسے پورا کیا۔ ایک شخص سے وعدہ کیا کہ جب تک تو آئے میں اسی جگہ پر رہوں گا کہتے ہیں وہ ایک برس نہ آیا۔ آپ وہیں ٹھہرے رہے۔ حضور نبی کریم ﷺ سے منقول ہے کہ قبل از بعثت آپ سے عبداللہ بن ابی الحمساء نے کہا آپ یہیں ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں۔ آپ تین دن تک اُسی جگہ رہے جب وہ واپس آیا تو فرمایا تو نے ہم کو تکلیف دی۔ حسب وعدہ تین دن سے میں یہیں ہوں۔ حضرت اسمٰعیل کے وعدہ کی سچائی اس وقت ظاہر ہوئی جب اپنے باپ ابراہیمؑ سے آپ نے کہا يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴿الصافات:۱۰۲﴾ اور اسی طرح کر کے دکھایا۔ ذبح ہونے کیلئے لیٹ گئے اور اف تک نہ کہا۔ آپ کی خصوصیت یہ بھی اللہ نے بیان فرمائی کہ آپ اپنے اھل و عیال کو نماز و روزہ کی تاکید کرتے تھے کیونکہ ہدایت کے مستحق تو وہ زیادہ ہیں جو آپ کے قریب ہیں۔

اَلْیَسَعَ

قرآن شریف میں انبیاء کے ساتھ الیسع کا بھی ذکر آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیاسؑ کے خلیفے تھے۔ اللہ نے ان کو بھی نبوت عطا فرمائی تھی۔

اٹھارہ آیتوں کا بیان

یہاں ان اٹھارہ آیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں سے بعض حضرت مہدیؑ کی ذاتِ سے متعلق ہیں اور بعض مہدیؑ کی قوم سے۔

واضح ہو کہ ان آیتوں کا بیان خود حضرت مہدیؑ کی طرف منسوب ہے۔ یعنی حضرت مہدیؑ نے قرآن کے بیان کے دوران ان آیتوں کا خود اپنی ذات سے اور اپنی قوم سے متعلق ہونے کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔ ان اٹھارہ آیتوں کو حضرت میاں عبدالغفور سجاوندی رحمتہ اللہ علیہ نے جو خود بھی ایک زبردست عالم تھے اپنے ایک رسالہ میں جمع فرمایا ہے جس کا نام مصنف نے "رسالۂ ہژدہ آیات" رکھا ہے

ذیل میں ان آیتوں کو مع مختصر وضاحت کے درج کیا جاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ رکوع ۱۵ آیت ۱۲۴ میں ہے وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو ان کے رب نے چند باتوں میں تو ابراہیم نے ان کو پورا کر دکھایا اللہ نے فرمایا میں بنانے والا ہوں تجھ کو لوگوں کا امام ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں (بھی امام بنائیو)

حضرت مہدیؑ سے روایت کی گئی ہے آپ نے فرمایا اللہ نے مجھے حکم کیا ہے کہ وہ مسلم امام جس کی ابراہیمؑ نے اپنی ذریت میں سے ہونے کے بارے میں دعا کی ہے وہ فقط تیری ذات ہے نہ کہ کوئی اور یعنی حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی کہ جب تو مجھے امام بنا رہا ہے تو میری ذریت میں سے بھی ایک امام بنا۔

واضح ہو کہ ابراہیمؑ سے تین دعائیں قرآن میں منقول ہوئی ہیں۔ ایک دعا امت مسلمہ کے تعلق سے تھی جیسا کہ قرآن میں آیا ہے ربنا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴿البقرة:۱۲۸﴾ اے ہمارے پروردگار ہم کو (یعنی ابراہیم واسماعیلؑ کو) تیرے فرماں بردار بنا اور ہماری ذریت میں سے بھی ایک مسلم امت برپا فرما اس کے بعد آپ نے خصوصی طور پر ایک رسول کی بعثت کی دعا بھی فرمائی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ﴿البقرة:۱۲۹﴾۔ اے پروردگار اس (امت مسلمہ میں) ایک رسول کو مبعوث فرما جو انہیں میں سے ہو۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی دعا جو رسول کے تعلق سے تھی حضور محمد مصطفی ﷺ کے حق میں قبول ہوئی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں ابرہیمؑ کی دعا ہوں۔

پھر جو تیسری دعا تھی وہ امام کو مبعوث فرمانے کے تعلق سے تھی' چنانچہ جب اللہ نے حضرت ابراہیم کو یہ خوشخبری سنائی کہ میں تجھ کو امام بنانے والا ہوں تو آپ نے فوراً فرمایا مجھے بھی امام بنا اور میری ذرّیت میں سے بھی امام بنا۔

تو حضرت مہدیؑ نے فرمایا کہ مجھے خدا کا حکم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کی، جو دعا ان کی ذرّیت میں سے امام بنانے کے تعلق سے تھی اس سے مراد تیری ذات ہے۔

اس کی تشریح میں حضرت عبدالغفور سجاوندیؒ نے لکھا ہے کیوں کہ آپ عالم ربانی اور کتاب اللہ کے ان اسرار کو کھولنے والے ہیں جو ہمارے نبی کے بعد کسی اور پر نہیں کھولے گئے۔ اور مہدیؑ کا قول دلیل قطعی اور واجب التصدیق ہے۔ اس دعا کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ میرا وعدہ ظالمین کو نہیں پہنچے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ابرہیمؑ سے فرمایا کہ اے ابراہیمؑ میں نے تجھ سے عہد کیا ہے کہ میں تیری ذریت میں حکم ازل سے اطاعت گذار مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے امام بناؤں گا لیکن اس امام کی فائدہ رسانی ظالمین کو نہیں پہنچے گی۔ ظالمین سے مراد انکار کرنے والے ہیں۔ ان کے اس عمل کو ظلم علی النفس کہا گیا ہے۔ اب رہیں وہ باتیں جن کے تعلق سے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ سے امتحان لیا تھا اور جن کو ابراہیمؑ نے پورا کر دیا تھا تو بعض مفسرین نے ان امور کی تعداد دس بتائی ہے پانچ سر سے متعلق اور پانچ دھڑ سے متعلق۔ سر سے متعلق امور میں مانگ نکالنا' ناک میں پانی لینا' کلی کرنا' مونچھ کتروانا اور مسواک کرنا ہے اور دھڑے سے متعلق امور میں بغل کے بال لینا' ناخن تراشنا' زیر ناف بال لینا' ختنہ کرنا اور نجاست پاک کرنا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ باتیں شریعتوں میں سے تیس (۳۰) ہیں۔ جن میں سے دس سورۂ مومن میں قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں اور دس سورۂ احزاب میں ان الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ، کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں اور دس سورہ المعارج میں إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں

حضرت مہدیؑ سے روایت ہے کہ وہ امور چالیس ہیں۔ تیس تو وہ ہیں جن کا ذکر ابن عباسؓ نے فرمایا ہے اور باقی دس وہ امور ہیں جو وَعِبَادُ الرَّحْمَـٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا ﴿الفرقان:۶۳﴾ کے ذریعہ بیان ہوئے ہیں یہ گویا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام مذکورہ اوصاف غیر امام میں جمع نہیں ہوسکتے۔ اور جو شخص میری امامت کی صحت پر دلیل چاہے تو اس کو چاہئے کہ وہ میری ذات میں غور کرے۔ اگر ان باتوں کو (مجھ میں) پائے تو قبول کرے (ملخص از رسالۂ ہژدہ آیات صفحہ ۴ تا ۸)

(۲) دوسری آیت فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّـهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ﴿آل عمران:۲۰﴾۔ اگر وہ تجھ سے جھگڑا کریں، تو کہدے (اے محمد) میں نے اپنی ذات اللہ کے حوالے کر دی۔ اور وہ بھی اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کر دے

گا جو میری پیروی کرنے والا ہے۔

اس خصوص میں حضرت مہدیؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا کہ یہ "من" (جو مَنِ اتَّبَعَنِ میں آیا ہے) خاص ہے اور اس سے مراد صرف تیری ذات ہے، کوئی اور نہیں۔

مصنف رسالہ ہژدہ آیات یہ لکھتے ہیں کہ حق وہی ہے جو امامؑ نے فرمایا ہے کیوں کہ قرینہ اس کی خصوصیت پر آیت کے بیان میں موجود ہے یعنی پیغمبر سے دین کی دعوت سننے کے بعد انکار کرنا۔ خصومت اور دشمنی کرنا اور جھگڑا کرنا کافروں کی جانب سے اور اس کے مقابلے میں آنحضرت ﷺ کا اللہ کے حکم سے راضی برضا ہو جانا ہے۔ پس آپ کے تابع کو بھی چاہئے کہ وہ ایسا ہی ہو، اور وہ ذات مہدیؑ کی ہے گویا آنحضرت یہ فرمارہے ہیں کہ میں نے اللہ کے حکم سے اپنی نبوت کو اور اس کتاب کو تمہارے سامنے پیش کیا لیکن تم لوگ جاننے کے باوجود محض ضد اور عناد کی بناء پر نہ میری نبوت کی تصدیق کرتے ہو اور نہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہو تو ایسی صورت میں، میں اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کر رہا ہوں اسی طرح وہ بھی جو میرا تابع ہے ان ہی حالات میں اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کر دے گا جبکہ اس کے مخالفین اس کے دعویٔ مہدیت کے خلاف اس سے حجت کریں گے اور اس سے جھگڑا کریں گے اس سے معلوم ہوا کہ متبوع کا تابع بھی "مفروض الدعوۃ" اور "مفترض الطاعتہ" ہوگا بلکہ جمیع حالات میں وہ اس کے جیسا ہوگا۔ جیسا کہ کشف الحقائق میں ہے "کہ اسی سے روح مہدی اٹھی جیسا کہ بچہ اپنی ماں سے اٹھا۔ پس نبی کو نبوت دی گئی تو مہدی کو ولایت دی گئی۔ پس مہدی کی ذات، نبی کی ذات کی طرح، مہدی کا گروہ نبی کے گروہ کے مانند، مہدی کا صبر نبی کے صبر کے جیسا اور مہدی کا توکل، نبی کے توکل کے مانند ہے۔ اور اکثر حالات میں مہدی نبی کی طرح ہیں۔ اس امت میں مہدیؑ کے سوائے کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے (رسالۂ ہژدہ آیات صفحہ ۹ تا ۱۱)

(۳) تیسری آیت اللہ کا قول إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ ﴿آل عمران:۱۹۰﴾ ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور لیل ونہار کی گردش میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے۔

روایت کی گئی ہے مہدیؑ سے کہ آپ نے فرمایا اللہ نے مجھے حکم کیا ہے کہ اولی الالباب سے مراد فقط تیری قوم ہے۔ مصنف رسالہ لکھتے ہیں کہ حق وہی ہے جو امامؑ نے فرمایا کیوں کہ یہی لوگ امت کے تمام افراد میں سے اللہ کی مختلف صنعتوں میں غور وفکر کرنے میں ثابت قدم ہیں اور ہر حالت یعنی کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں۔ اور

صداقت کی زبان سے کہنے والے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تونے اس کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا تیری ذات پاک ہے۔ پس بچا ہم کو دوزخ کی آگ سے اور یہی لوگ ان باتوں میں مخصوص ہیں یعنی توکل، تسلیم، بذل، انفاق، مروت اور حلم وغیرہ احوال محمودہ میں۔ اس کی تائید کرتی ہے وہ عبارت جو صاحب مظہر شرح مصابیح نے باب انفاق میں لکھی ہے کہ لوگوں میں بصیرت رکھنے والے، آخرت کی رغبت کرنے والے، دنیا کو چھوڑنے والے اور ایک دن کی قوت پر قناعت کرنے والے اور مال کو کسی وقت ذخیرہ کرکے نہیں رکھنے والے۔ پس اس طرح متوکلین کی جماعت نہیں ہوگی مگر مہدی کے زمانے میں (صفحہ ۱۴ مزید تشریح کے لئے دیکھئے رسالہ ہژدہ آیات)

(۴) چوتھی آیت مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّـهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ۔۔۔الخ ﴿مائدہ ۵۴﴾ اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے (تو کوئی اندیشہ نہیں) عنقریب اللہ ایک قوم کو لائے گا جس سے اللہ محبت کرے گا اور وہ قوم اللہ سے محبت کرے گی حضرت مہدیؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم کیا ہے کہ اس قوم سے مراد صرف تیری قوم ہے نہ کہ کوئی اور۔ مصنف لکھتے ہیں کہ حق وہی ہے جو امامؑ نے فرمایا کیونکہ (۱) یہی معنی لفظ سَوْفَ سے ظاہر ہیں کیوں کہ سَـــوْفَ مستقبل بعید کے لئے وضع ہوا ہے اور وہ وسط امت ہے جو مہدیؑ کے ظہور سے متصل ہے۔ (۲) اور یہی مفہوم حدیث کے الفاظ کا بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مہدیؑ میری اہل بیت سے ہے وسط امت میں (۳) قوم سے مراد اگرچہ بعض مفسرین نے قوم انصار، یا حضرت ابو بکر یا حضرت سلمان کو لیا ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کی نفی کی ہے اور کہا کہ اس سے آنحضرت ﷺ کے بعد کے زمانے میں ایک قوم کا آنا مراد ہے۔ چنانچہ قاضی شہاب الدین نے اپنی تفسیر بحر موّاج میں اسی طرف اشارہ کیا ہے نیز صاحب تفسیر نیشاپوری نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے لعلّ المرَاد مِنه قَوم المَهدِی (شاید اس سے مراد مہدیؑ کی قوم ہے) پس جب حضرت مہدیؑ نے اللہ کے حکم سے یہ بیان فرمایا کہ اس قوم موعود سے مراد قوم مہدیؑ ہے وہی حق ہے (صفحہ ۲۲)

(۵) وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَـٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ﴿انعام:۱۹﴾ اور وحی کیا گیا ہے میری طرف یہ قرآن تاکہ میں ڈراؤں تم کو اس کے ذریعہ اور وہ بھی ڈرائے گا جو پہنچے (میرے مقام کو) حضرت مہدیؑ سے مروی ہے کہ اس آیت میں جو من ہے وہ خاص ہے اور اس سے مراد فقط تیری ذات ہے کوئی اور نہیں مصنف رسالہ ہژدہ آیات کہتے ہیں کہ حق وہی ہے جو امامؑ نے فرمایا کیوں کہ آیت کے معنی میں قرینہ اس کے خاص ہونے پر ظاہر ہے اس طرح کہ وہ معنی دوسرے کے لئے سزاوار نہیں اور اس کے تین وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ یہ کہ إِلَيَّ میں جو یاء ہے اس پر عطف ہو أُوحِيَ إِلَيَّ وَ إِلَي مَن بَلَغَ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ یہ قرآن وحی کیا گیا ہے میری طرف اور اس شخص کی طرف جو میرے مقام اور مرتبہ کو پہنچے۔

پس اگر تو کہے کہ قرآن کا نبی کی طرف وحی کیا جانا تو خاص وعام کو معلوم ہے لیکن مہدی کی طرف وحی کیا جانا کیا معنی رکھتا ہے تو میں کہوں گا کہ مہدی کی طرف وحی معنی کے اعتبار سے ہے مہدی کی طرف معنی قرآن بلاواسطہ وحی کئے جائیں گے چنانچہ اللہ فرماتا ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان) یعنی مہدیؑ کی زبان سے ولایت محمدیہ کے اظہار کے ساتھ دوسری وجہ یہ ہے کہ عطف اس ضمیر مستتر (پوشیدہ) پر ہو جو لِأُنذِرَكُم میں ہے یعنی میں ڈراؤں گا تم کو قرآن کے ذریعہ اور وہ بھی ڈرائے گا تم کو قرآن کے ذریعہ جو میرے مقام کو پہنچے۔

تیسری وجہ یہ ہے عطف ضمیر کم پر ہو جو لِأُنذِرَكُم میں ہے یعنی قرآن کے ذریعہ میں تم کو ڈراؤں گا اور وہ (بھی) ڈرائے گا جو پہنچے (میرے مقام کو) پس اس صورت میں وَمَن بَلَغَ سے مراد مہدیؑ کی ذات ہو گی اور جو ضمیر بلغ میں پوشیدہ ہے قرآن کی طرف راجع ہو گی اور جو ضمیر من کی طرف راجع ہے وہ مقدر ہے یعنی اور جس کو قرآن بطور وراثت پہنچے چنانچہ اللہ فرماتا ہے ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا الخ ﴿فاطر:۳۲﴾ الخ پھر ہم نے وارث بنایا کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے منتخب کر لیا اپنے بندوں میں سے اس بیان میں ایک لطیفہ ہے جس پر وہی مطلع ہو سکتا ہے جو معانی قرآن کے سمندر کا غوّاص ہو اور وہ یہ کہ قوم مہدیؑ کے حق میں ڈرانے والے حقیقتاً نبی ﷺ ہیں کیوں کہ مہدیؑ آپ ﷺ کی ولایت کے مظہر ہیں پس مہدی کا منذر ہونا (ڈرانے والا ہونا) حقیقۃً نبی کا منذر ہونا ہے (ملخص رسالۂ ہژدہ آیات صفحہ ۲۴)

(۶) چھٹی آیت فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَـٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۔﴿انعام:۸۹﴾ اگر یہ کافر ان (قرآنی خبروں) کا انکار کریں تو ہم نے مقرر کیا ہے ان پر ایک قوم کو جو انکا انکار کرنے والی نہیں ہے حضرت مہدیؑ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس قوم سے مراد صرف تیری قوم ہے 'کوئی اور نہیں مصنف رسالہ لکھتے ہیں کہ حق وہی ہے جو امامؑ نے فرمایا۔ یعنی اللہ نے اپنے حبیب کو خبر دی کہ کتاب و حکمت کی قسم سے جو چیزیں انبیاءؑ کو دی گئیں اگر ان کا انکار کریں یہ سب لوگ (هَٰؤُلَاءِ) تو فکر نہ کرو کہ ہم نے ان پر ایک قوم کو (قوم مہدی کو) مقرر کیا ہے جو ان کا انکار کرنے والی نہیں ہو گی بلکہ وہ سب امور کی تصدیق کرنے والی ہو گی جو آپ پر نیز آپ سے پہلے انبیاء پر نازل کی گئی ہیں

(۷) ساتویں آیت يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿انفال:۶۴﴾ اے نبی کافی ہے اللہ تیرے لئے اور اس کے لئے بھی جو تیرا تابع ہے مومنین میں سے۔

حضرت مہدیؑ سے روایت ہے آپ نے فرمایا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہ من خاص ہے اور اس سے مراد فقط تیری ذات ہے نہ کہ تیرا غیر۔ مصنف رسالہ لکھتے ہیں کہ حق وہی ہے جو امام علیہ السلام نے فرمایا کیوں کہ قرینہ اس کے اختصاص پر ظاہر ہے۔ آیت کا بیان یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ و دعوت دین کے سلسلے میں کفار کی جانب سے دھوکہ دہی اور ایذار سانی کے جو واقعات درپیش ہورہے تھے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی اس سلسلے میں تسلّی فرمارہا ہے کہ آپ کے لئے آپ کا خدا کافی ہے اسی طرح آپ کے تابع کے لئے بھی تسلّی چاہئے تھی اور وہ تابع تام حضرت مہدیؑ ہیں آپ کے زمانے میں بھی آپ کے دعوے کے بعد انکار کرنے والوں کی جانب سے سخت ترین عداوتوں اور ایذاؤں کا ہونا ضروری تھا جیسا کہ فتوحات مکیہ میں آپ کے حق میں مذکور ہے کہ جب یہ امام مہدیؑ نکلے گا تو نہیں ہوں گے مہدی کے کھلے دشمن مگر خصوصاً فقہاء۔ کیوں کہ ان کی بزرگی باقی نہ رہے گی اور جب مہدی ان کے عمل کے خلاف حکم کریگا تو وہ اس کو گمراہ سمجھیں گے کیوں کہ ان کا اعتقاد یہ ہوگا کہ اجتہاد کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور نیز ان کا اعتقاد ہے کہ ان کے ائمہ کے بعد اب کسی کو درجۂ اجتہاد نصیب نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کے ہاتھ میں تلوار (معجزہ کی) نہ ہوتی تو فقہاء اس کے قتل کا فتویٰ دیدیتے۔ اور اگر وہ صاحب مال و سلطنت ہوتا تو اس کے مال کے لالچ اور اس کی سلطنت کے خوف سے فقہاء اس کے فرمانبردار ہوجاتے۔ پس معلوم ہوا کہ اہل زمانہ کی مکاری اور ایذارسانی نبی اور مہدیؑ سے خاص ہے اور ان دونوں کے ساتھ غربت مخصوص ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے ان الدّین بدا غریباً و سیعود الدین کما بدأ، یعنی دین شروع ہوا غربت کی حالت میں اور قریب ہے کہ ہوجائے ویسا ہی جیسا کہ شروع ہوا۔

یعنی قریب ہے کہ مہدی کے زمانے میں دین غربت کی حالت میں ہوجائے جیسا کی نبیؐ کے زمانے میں تھا اور غربت سے مراد ہجرت، اخراج ایذاء اور قتل ہے اسی لئے اللہ نے تسلّی کے لئے فرمایا اے نبی تیرے لئے اور تیرے تابع (مہدی) کے لئے اللہ کافی ہے یعنی ہم تیری نبوت کے امور اور تیری ولایت کے احکام کو پورے کریں گے یعنی مخالفین کی ایذار سانی اور مکاری ان دونوں کو کوئی ضرر نہیں پہنچائے گی۔ (صفحہ ۲۷ تا ۲۹)

(۸) آٹھویں آیت ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ﴿ہود:۱﴾۔ پھر تفصیل سے بیان کی جائیں گی حکمت والے باخبر کی جانب سے۔

مصنف رسالہ ہژدہ آیات لکھتے ہیں: حضرت مہدیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اس کو مراد اللہ کے مطابق اس طور پر بیان فرمایا کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط کی گئی ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پھر تفصیل سے بیان کی جائیں گی اس کی آیتیں مہدیؑ کی زبان سے حکیم و خبیر کی جانب سے یعنی اس کتاب کی آیتیں من عند اللہ بحکم ازل ثابت ہیں یعنی نزول قرآن کی

مضبوطی محمد ﷺ سے اور بیان قرآن کی مضبوطی مہدیؑ سے ثابت ہے۔ چنانچہ اللہ کے قول میں ہے نہ ہلا قرآن پڑھنے پر اپنی زبان تا کہ تو جلد اس کو یاد کرلے بے شک ہمارے ذمہ ہے قرآن کا جمع کرنا اور پڑھنا۔ پھر جب ہم قرآن پڑھا کریں تو پیروی کر اس کے پڑھنے کی۔ پس نبی ﷺ کو حکم ہوا تو آپ نے اس کی تعمیل کی۔ پھر اللہ نے بیان قرآن کو اپنی جانب منسوب کیا اور فرمایا پھر تحقیق ہمارے ذمہ قرآن کا بیان ہے۔ یعنی ہم قرآن کو بیان کریں گے مہدی موعودؑ کی زبان سے آخر زمانے میں وہی وارث ہے (اس بیان کا) اور خاتم ہے ولایت محمدیہ کا اور عالم ہے اللہ کی کتاب کے اسرار کا۔ چنانچہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں احادیث اور روایات (صفحہ ۳۰)

(۹) نویں آیت أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ۔۔ الخ ﴿ہود:۱۷﴾ پس کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے حجت پر ہو۔

مصنف رسالہ مذکور لکھتے ہیں امام مہدیؑ نے فرمایا کہ یہ من خاص ہے۔ اور اس سے مراد فقط تیری ذات ہے کوئی اور نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں کہ لفظ من عمومیت کا احتمال رکھتا ہے اور خصوصیت باقتضاء قرینہ ثابت ہوتی ہے جو بیان آیت سے ظاہر ہے۔ اس طرح کہ مہدی موعودؑ کے سوائے کوئی من کا مصداق ہونے کے لائق نہیں ہے اگر اس (من) کا اطلاق افراد مومنین سے فروعام پر کیا جائے تو یہ اطلاق آیت کے معنی کے لحاظ سے درست نہیں ہوگا اور اگر اولیاء میں سے کسی فرد خاص پر کیا جائے تو معنی آیت کے موافق ہوتا ہے اور اولیاء میں فرد خاص مہدیؑ ہی ہیں۔

اور صحیح وہی ہے جو مہدیؑ نے اللہ کے حکم سے فرمایا کہ من سے مراد مہدی کی ذات ہے نہ کہ غیر اور بینۃ سے مراد ولایت مصطفی ﷺ ہے اور وہ باطن مصطفی ﷺ ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ پس کیا وہ شخص جو ولایت مصطفی ﷺ پر ہو ایسے شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اس کے برعکس ہو یعنی دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ یعنی پیچھے آتا ہے اس کے گواہی دینے والا یعنی مہدی کے پروردگار کی طرف سے قرآن مہدی کی گواہی دینے والا ہے اس بات کی کہ مہدیؑ اپنے ہر قول میں سچا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے ہمارے نبی کی سچائی پر گواہی دی اور اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب ہے۔ یعنی قرآن سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب بھی گواہی دینے والی ہے کہ مہدیؑ صادق ہے اور امام ہے جو محمد ﷺ کی امت کو ہلاکت سے بچانے آئے گا۔ أُولَـٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ سے مراد قوم مہدی موعود ہے (جو مہدی پر ایمان لائیں گے) یہ بات "من" سے معلوم ہوتی ہے جیسا کہ اللہ کا قول ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿المؤمنون:۴۹﴾ میں هُمْ کی ضمیر موسیٰ کی قوم کی طرف راجع ہونا موسیٰ کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ آیت میں قوم کا ذکر نہیں ہے۔ آیت کا ترجمہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی

تا کہ لوگ ہدایت پائیں۔ جس طرح اس آیت میں قوم کا ذکر نہ ہونے کے باوجود "ھم" کا مرجع موسیٰ کی وجہ سے ان کی قوم ہے اسی طرح یہاں بھی من کا ذکر آنے کی وجہ سے أُولَئِكَ کا اشارہ قومِ من یعنی مہدی کی قوم کی طرف ہے۔

وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ یعنی مختلف فرقوں میں سے جو کوئی اس من کا یعنی مہدی کا انکار کرے اس حال میں کہ وہ اللہ کی حجت پر ہے پس دوزخ اس کا وعدہ گاہ ہے۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ۔ خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے کہ اے محمد تو شک میں مت رہ بلکہ یقین کر اگرچہ خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن اس سے مراد آپؐ کے ساتھ آپؐ کی امت بھی ہے گویا کہا گیا کہ تم سب اس کے بارے میں شک میں مت رہو۔

إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ بے شک وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے یعنی اس کا وجود حق ہے تمہارے پروردگار کی جانب سے اس کی بعثت حق ہے پس اس پر ایمان لاؤ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے کیوں کہ سنت اللہ اسی طرح جاری ہوئی ہے ہر زمانے میں کہ کم ہیں جو ایمان لاتے ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے۔ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿البقرۃ:۸۸﴾ صفحہ ۳۱ تا ۳۵

(۱۰) دسویں آیت قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ﴿یوسف:۱۰۸﴾

اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں (مخلوق کو) اللہ کی طرف بینائی پر میں اور میرا تابع (بھی بلائے گا) مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت مہدیؑ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے حکم کیا ہے کہ مَنِ اتَّبَعَنِي کا مَن خاص ہے اور اس سے فقط تیری ذات مراد ہے اس میں غیر شریک نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو حضرت مہدیؑ نے فرمایا کیوں کہ اس مَن کے خاص ہونے پر آیت کے بیان میں قرینہ موجود ہے۔ یعنی اس کا عطف اس پوشیدہ ضمیر پر ہے جو ادعو میں ہے آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف بینائی پر اور وہ بھی بلائے گا اللہ کی طرف بینائی پر جو میرا تابع ہے اور یہ عطف اس بات کو چاہتا ہے کہ تابع اور متبوع کی دعوت ایک ہی مرتبہ میں ہو ورنہ دونوں دعوتوں میں تفرقہ لازم آئے گا اور جملہ کے عطف میں مناسبت ہونا وصل کے بہترین مقامات میں سمجھا جاتا ہے۔ پس جس طرح نبی پر دعوت فرض تھی تو اسی طرح آپ کے تابع پر بھی فرض ہونی چاہئے اور وہ تابع جس پر دعوت فرض ہو جس طرح کہ نبی پر فرض تھی تو وہ مہدیؑ کے سوائے کسی اور پر نہیں ہو سکتی کیوں کہ مہدی کی بعثت اسی کام کے لئے ہے جیسا کہ فرمایا آنحضرت ﷺ نے کیسے ہلاک

ہو گی وہ اُمت میں اس کے اوّل میں ہوں اور عیسیٰ اس کے آخر میں ہیں اور مہدی میری اہل بیت سے اس کے درمیان میں ہیں پس جسطرح نبی ﷺ اور عیسیٰؑ اللہ طرف بلانے والے ہیں اسی طرح مہدیؑ بھی اللہ کی طرف بلانے والا ہے۔

اور چونکہ اللہ کا قول مَنِ اتَّبَعَنِي مطلق ہے تو اصول کے اعتبار سے مطلق سے مراد فرد کامل لی جاتی ہے اس لحاظ سے نبی کی اتباع میں جو فرد کامل ہو گا وہ مہدی ہی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ مہدی ہمارے نبی کی ولایت کا خاتم ہے اور اس باب میں دلیل قاطع تو بس مہدیؑ ہی کا قول ہے جس کو قبول کرنا واجب ہے ان ہی دلائل سے جن سے انبیاءؑ کا قول قبول کرنا واجب ہے صفحہ ۳۵ یا ۳۸

(۱۱) گیارہویں آیت ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ الخ ﴿فاطر:۳۲﴾ ترجمہ: پھر ہم نے وارث بنایا کتاب کا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے منتخب کر لیا اپنے بندوں میں سے بعض ان میں کے ظالم النفس ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں کہ مہدیؑ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ وارثین کتاب سے مراد تیری قوم ہے فقط ان کے سوا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں کہ پہلے کی آیت کے سیاق سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ آیت اس طرح ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿فاطر:۳۰،۲۹﴾ جو لوگ تلاوت کرتے ہیں کتاب اللہ کی اور نماز قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اس میں سے جو ہم نے انہیں دیا ہے پوشیدہ اور ظاہر طور پر وہ اُمیدوار ہیں ایسی تجارت کے جو کبھی ہلاک نہیں ہوتی۔ تاکہ ان کو پورا پورا دے ان کا اجر اور ان کو زیادہ بھی دے اپنے فضل سے بیشک وہ بخشنے والا قدردان ہے۔

اسکے بعد اللہ فرماتا ہے جن لوگوں کی نسبت ہم نے تجھ پر وحی نازل کی ان کا وصف ایسا ایسا ہے بیشک اللہ اپنے بندوں کے احوال اور ان باتوں کو جو ان کی شان کے لائق ہیں اور ان امور کو جن کے مستحق ان کے نفوس ہیں البتہ جاننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ پھر اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو خبر دی کہ ہم نے وارث بنایا کتاب کا یعنی وارث بنایا معانی قرآن کا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے منتخب کر لیا تاکہ قرآن کے معانی اور اشارات و رموز کو ظاہر کریں وہ مہدیؑ کی قوم ہے۔

پھر یہ وارثین تین قسم کے ہیں۔ ایک ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ یعنی وہ لوگ جو دنیا اور اس کے لذات اور لوازم ناسوت کو چھوڑ کر مقام ملکوت پر پہنچے ہیں چونکہ ان کے دل میں خطرات و لذتوں کا گذر بھی ہوتا ہے (اگرچہ وہ ان میں نہیں پھنستے) ان کو ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ کہا گیا۔ دوسرے مُّقْتَصِدٌ ہیں جو اللہ کے فضل و کرم سے دنیوی لذتوں پر غالب آگئے ہیں اور مقام ملکوت سے ترقی کر کے

مقام جبروت پر پہنچ گئے ہیں اور تیسرے سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ ہیں یعنی وہ لوگ جو اللہ کی محبت میں سبقت لے جانے والے ہیں اور اللہ میں واصل ہیں اور اللہ کی ذات میں ان کو سیر حاصل ہے۔

(۱۲) بارھویں آیت وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ﴿محمد:۳۸﴾ یعنی اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہارے بدلے ایک قوم کو لائے گا تمہارے سوائے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت مہدی موعودؑ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس قوم سے مراد فقط تیری قوم ہے کوئی اور نہیں میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو آپ نے فرمایا کیوں کہ اس سے پہلے کی آیت کا سیاق عبارت اسی کی تائید کرتا ہے چنانچہ اللہ نے اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا کہ آپ مومنین سے کہدیجئے کہ اے مومنو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو الخ یعنی اگر تم ایسا کروگے تو تم کو تمہارا اجر دیگا اور تم سے تمہارے سارے اموال بجز تھوڑے خرچ کرنے کے نہیں چاہتا کہ تم پر خرچ کرنا شاق گذرے اور اگر تم اتنا آسان خرچ بھی نہ کروگے اور بخالت کروگے تو اللہ بے نیاز ہے۔ وہ تمہارا محتاج نہیں ہے اور تم ہی ہر وقت اسکے محتاج ہو اور اگر ان تمام امور سے جن کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے پھر جاؤ گے تو تمہارے بدلے ایک دوسری قوم کو لائے گا وہ مہدیؑ کی قوم ہے۔ پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔ یعنی وہ قوم اطاعت کرنے والی' اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والی ہوگی اور الہیٰ اوامر کی ادائی میں تم جیسی نہ ہوگی بلکہ وہ تمام دینی حالات میں تم سے اچھی ہوگی' دنیوی اشغال سے پرہیز کرے گی اسکی تائید وہ احادیث کرتی ہیں، جو اس باب میں آئی ہیں خصوصاً وہ حدیث بھی ہے جو تذکرہ قرطبی میں مذکور ہے نبی ﷺ نے انہی کے حق میں فرمایا ہے کہ البتہ عیسیٰؑ ایسی قوم کو پائیں گے جو تم جیسی یا تم سے اچھی ہوگی اس طرح تین دفعہ رسول اللہ نے فرمایا اس کو ابن برجان نے اپنی کتاب الارشاد میں سند سے بیان کیا ہے صفحہ ۴۳،۴۴

(۱۳) تیرھویں آیت خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿الرحمان:۴،۳﴾ پیدا کیا انسان کو اس کو بیان کی تعلیم دی۔

حضرت مصنفؒ لکھتے ہیں مہدیؑ سے روایت ہے آپ نے فرمایا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ الْإِنسَانَ سے مراد تیری ذات ہے میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو آپ نے فرمایا کیوں کہ آیت کے معنی اس کی تائید کرتے ہیں۔ یعنی رحمان نے محمد ﷺ کو تنزیل و ترتیب کے ساتھ قرآن کی تعلیم دی جیسا کہ اللہ کے قول میں ہے وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھ) پھر جب قرآن پڑھا کریں تو پیروی کر اسکے پڑھنے کی یعنی پڑھ ہمارے پڑھنے کے بعد۔ خَلَقَ الْإِنسَانَ یعنی مہدی کو عَلَّمَهُ الْبَيَانَ یعنی اللہ نے مہدی کو قرآن کے بیان کی تعلیم دی جیسا کہ قرآن میں ہے ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿القیامۃ:۱۹﴾ پھر

تحقیق ہمارے ذمہ ہے قرآن کا بیان مہدی موعودؑ کی زبان سے آخر زمانے میں۔ ہمارے سوائے کسی کا یہ کام نہیں۔ صفحہ ۴۴، ۴۵

(۱۴) چودھویں آیت وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ﴿واقعہ: ۱۴﴾ اور تھوڑے آخرین میں سے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت مہدیؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا مجھے حکم ہوتا ہے کہ اللہ کے فرمان اور ایک جماعت ہے الْأَوَّلِينَ سے اس سے امت کے اگلے لوگ مراد ہیں۔ وہ نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اصحاب اور تابعین ہیں اور اللہ کے قول اور ایک جماعت ہے الْآخِرِينَ میں سے۔ اس سے امت کے پچھلے لوگ مراد ہیں اور وہ وفقط تیری قوم ہے صفحہ ۴۵

(۱۵) پندرھویں آیت وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ﴿واقعہ: ۴۰﴾ اور ایک قلیل جماعت ہے آخرین میں سے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت امام مہدیؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کا حکم ہوتا ہے کہ اللہ کے قول وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ سے فقط تیری قوم مراد ہے اور اللہ کے قول ایک جماعت ہے اولین سے اس سے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اصحاب اور تابعین مراد ہیں صفحہ ۴۶۔

(۱۶) سولھویں آیت وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ﴿سورۂ جمعہ ۳﴾ اور بھیجا آخرین میں انہی میں سے جو امئین سے نہیں ملے ہیں۔

مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت امام مہدیؑ سے روایت ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ سے مراد فقط تیری قوم ہے اور رَسُولًا مِّنْهُمْ (ان میں کے رسول مقدر) سے مراد تیری ذات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو مہدی موعود نے فرمایا کیوں کہ آیت کے بیان میں یہ معنی ظاہر ہیں اس لئے کہ اللہ کا قول وَآخَرِينَ مِنْهُمْ عطف ہے الْأُمِّيِّينَ پر معنی یہ ہیں کہ وہ خدا جس نے بھیجا رسول کو امئین میں وہ رسول محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہیں۔ اور بھیجا آخرین میں مرسل کو یعنی مہدی موعود لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ دلالت کرتا ہے آخر زمانے میں آنے والی قوم پر اور وہ مہدی موعود کی قوم ہے۔ جیسا کہ مہدی موعود نے اللہ کی مراد بیان فرمائی ہے اور اس کی تائید کرتی ہے وہ چیز جو تفسیر دیلمی میں اللہ کے قول أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ کے تحت کشف الحقائق کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے چونکہ حضرت محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہی خاتم النبین ہیں۔ اسی مناسبت سے اللہ نے صرف آخَرِينَ مِنْهُمْ فرمایا۔ علانیہ رسولاً نہیں فرمایا۔ کیوں کہ محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد کسی نئے نبی کی گنجائش نہیں تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن میں مہدی کے نام کا ذکر کس لئے واضح طور پر نہیں کیا گیا حالانکہ اللہ نے کسی چیز کا ذکر قرآن میں

نہیں چھوڑا پس مہدی کا نام کیوں چھوڑ دیا تو کہا جائے گا کہ مہدی کے نام کا ذکر نبی ﷺ کی رعایت سے نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ مہدی کی دعوت نبی کی دعوت کے مانند' مہدی کا علم نبی کے علم کے مانند' اور مہدی کا گروہ نبی کے گروہ کے مانند اور مہدی کا حال نبی کے حال کے مانند اور مہدی کی ذات نبی کی ذات کے مانند اور مہدی کا صبر نبی کے صبر کے مانند اور مہدی کا توکل نبی کے توکل کے مانند ہے اور اکثر صورت وسیرت میں مہدی' نبی کے برابر ہے۔ اس طرح مہدی کا ذکر قرآن میں ضمنًا وکنایۃً' موجود ہے۔ پس آخرین میں مبعوث ہستی سے مراد مہدی ہی کی ذات ہے۔ صفحہ ۴۷'۴۸

(۱۷) سترھویں آیت ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴿قیامت:۱۹﴾ پھر ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کا بیان۔

مصنف رسالہ لکھتے ہیں کہ حضرت مہدیؑ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے فرمایا تحقیق ہمارے ذمہ ہے بیان اس کا یعنی مہدی موعود کی زبان سے اور وہ تیری ذات ہے یعنی ہم نے تجھ پر لازم گردانا ہے اس کا بیان۔ میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں کہ یہی معنی سیاق آیت سے ظاہر ہے

اگر یہ کہا جائے کہ یہ قول کیسے درست ہو سکتا ہے کہ قرآن کی تنزیل نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہو اور بیان کی تنزیل مہدی موعودؑ کے ساتھ۔ تو کہا جائے گا کہ یہ بات ہر خاص وعام کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اپنے حبیب ﷺ پر تیئیس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے ضرورت کے وقت نازل فرمایا اور اس کے جمع کرنے اور پڑھنے اور اس کے معانی بیان کرنے کو اپنی جانب منسوب فرمایا چنانچہ اللہ فرماتا ہے تحقیق ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا اس کے بعد اللہ کا قول ہے تحقیق ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان پس نبی ﷺ کے بعد اللہ نے قرآن کو حضرت عثمان بن عفانؓ کے ہاتھوں جمع فرمایا اسی طرح قاریوں سے قرآن پڑھایا' اسی طرح قرآن کا بیان مہدی موعودؑ سے کروایا اور اللہ ہی جانتا ہے اپنی مراد کو کیوں کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اللہ غالب ہے اپنے امر پر لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اللہ نے قرآن کے بیان کو مہدی موعودؑ کی زبان سے فرمایا کیوں کہ مہدی خاتم ولایت مصطفی اور عالم اسرار کتاب اللہ ہیں اور معانی قرآن کا بیان آپ ہی کا منصب ہے۔

چنانچہ عبدالرزاق کاشی نے اپنی تفسیر تاویلات القرآن میں کہا کہ الم قسم اور اس کا جواب محذوف ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ بیشک میں بیان کرنے والا ہوں اس کتاب کو (قرآن کو جو محمد پر نازل ہوا ہے) جس کا وعدہ انبیاء کی زبانوں پر کیا گیا ہے اور انکی کتابوں میں یہ ہے کہ قرآن مہدی کے ساتھ ہو گا آخری زمانے میں اور قرآن کے بیان کو کوئی نہیں جانے گا جیسا کہ اس کو جاننے کا حق ہے مگر مہدیؑ جیسا کہ فرمایا عیسیٰؑ نے کہ ہم تمہارے پاس تنزیل لاتے ہیں رہی تاویل پس لائے گا اس کو فارقلیط آخری زمانے میں۔

شیخ عبدالرزاق نے فارقلیط سے مراد جن کا نام زبانِ عیسیٰؑ سے ادا ہوا ہے محمد مہدی لی ہے۔ اگرچہ دوسروں نے محمد نبی مراد لی ہے اور حق وہی ہے جس کو شیخ عبدالرزاق نے کہا کیوں کہ عیسیٰؑ کا قول کہ ہم تنزیل لاتے ہیں ان تمام انبیاء کو شامل ہے جو آدم سے ہمارے نبی تک ہیں جن پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے۔ جیسا کہ شامل ہے نبی کا قول نحن معاشــر الانبیاء لانرث و لا نورث (یعنی ہم انبیاء کا گروہ ہیں نہ ہم کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ کوئی ہمارا وارث) تمام انبیاء کو پس اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کا حق یہ ہے کہ تنزیل کو لائیں اور مہدی موعود کا حق یہ ہے کہ تاویل کو لائیں اور یہ بات اس عہدہ کی وجہ سے ہے جو اللہ سے مہدی کو ملا ہے۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔ پھر تحقیق ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان یعنی مہدی موعود کی زبان سے آخر زمانے میں نہیں جانے گا قرآن کے بیان کو جیسا کہ اس کو جاننے کا حق ہے مگر مہدیؑ اور مہدی موعود کے تمام اصحاب کا یہی اعتقاد ہے صفحہ ۴۹ تا ۵۳

(۱۸) اٹھارویں آیت وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿سورہ بینہ:۴﴾ اور اختلاف نہیں کیا ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس بینہ آیا

مصنف رسالہ لکھتے ہیں کہ مہدی موعود سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا مجھ کو حکم ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے مراد جن کو کتاب دی گئی تیرے زمانے کے علماء ہیں اور بینۃ سے مراد مہدی موعود ہے وہ تیری ذات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حق وہی ہے جو مہدی موعودؑ نے فرمایا کیوں کہ سیاق آیت اسی معنی پر دلالت کرتا ہے گویا اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو خبر دی کہ تیری امت کے علماء اپنی خواہشات کی موافقت کر کے، کتاب کے احکام اور شریعتوں کے بیان سے مہدی موعودؑ بینہ آنے کے بعد متفرق ہوئے کیوں کہ مہدی نے کتاب کے احکام اور شریعتوں کا بیان ان کے سامنے اتنا ہی کیا جتنا کہ اللہ نے اس کو بیان کرنے کا حکم دیا اور مہدی اجتہادی اختلاف کا تابع نہیں ہے بلکہ ان اختلافات میں فیصلہ کرنے کی حکومت رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں مہدی کی شان میں آیا ہے اللہ اس پر (مہدی پر) دین کو ختم کرے گا جیسا کہ اس کو ہم سے شروع کیا اور جب مہدی نے عقائد و اعمال میں ان کی رائے کے خلاف حکم فرمایا تو انہوں نے بہت اختلاف کیا اور بڑی ہٹ دھرمی کی جیسا کہ اہل کتاب میں کے کفار تجھ سے (اے محمد) اختلاف کرتے تھے صفحہ ۵۴، ۵۵

اعمال کا تولنا

اللہ کا ارشاد ہے۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَـــئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَـئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ﴿الاعراف:۹﴾۔ ترجمہ: اور اس دن اعمال کا وزن حق ہے پس جن لوگوں کے اعمال کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ نجات پانے والے ہیں اور جن کے اعمال کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اس لئے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے۔

اعمال کا وزن بر حق ہے یعنی (قیامت کے دن) انسان کے اعمال تولے جائیں گے۔ اس موقع پر دو اعتراضات کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ اعمال جسم نہیں ہیں کہ جن کو تولا جاسکے تول تو صرف اجسام کا ہوتا ہے۔ اعمال تو عرض ہیں ان کا کوئی جسم نہیں ہوتا ان کو کیسے تولا جاسکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اعمال کا ریکارڈ کیسے رکھا جاسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اعمال کا ریکارڈ رکھنا اب کوئی مشکل کام نہیں رہا۔ آڈیو اور ویڈیو کی ایجاد نے دنیا کو بتادیا کہ آواز اور اعمال کو بھی ریکارڈ کر کے محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور تحقیق کرنے والے جب چاہیں صرف بٹن آن کر کے سن بھی سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔ آوازوں اور حرکتوں سے ان اعمال کی کیفیتوں کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک انسان جب ایسی مشینیں ایجاد کرلیتا ہے جس میں سلولائیڈ کی ریل میں تمام آوازوں اور حرکتوں کو محفوظ کیا جاتا ہے تو کیا اللہ جو اس مشین کو ایجاد کرنے والے کا بھی خالق ہے ایسا کام نہیں کرسکتا۔ وھو علی کل شيءٍ قدیر۔ اب رہی بات تول کی تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف اجسام کو تولنے والی مشین نہیں ہیں بلکہ ایسی مشینیں بھی ایجاد ہوئی ہیں جو آواز اور ہوا کی رفتار Speed کو بھی معلوم کرلیتی ہیں۔ اسی طرح پورے سامان میں ایک سوئی بھی ہو تو اسکو بھی Detect کرلیا جاتا ہے۔ بخار تو عرض ہے۔ تھرمامیٹر کے ذریعہ اس کو بھی ناپا جاتا ہے۔ بدن میں جو انفشار الدّم (Blood Pressure) ہوتا ہے اس کو بھی ناپا جاتا ہے اسی طرح Ultra Sound مشین کے ذریعہ قلب کی حرکت اور اسکی کیفیت اور بعض دوسری چیزیں بھی معلوم کی جانے لگی ہیں تو کیا اللہ قلب کی باطنی کیفیت کو معلوم کرنے کے لئے کچھ انتظام نہیں کرسکتا وہ خدا جو یہ کہتا ہے کہ میں تمہاری ان باتوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں جو تم دل میں چھپاتے ہو۔ اور تمہارے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہاں بھی کوئی گراف ایسا ہو جو یہ بتلادے کہ فلاں عمل خلوص نیت سے کیا گیا تھا یا صرف دکھاوے کیلئے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے کیفیت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ سمجھ میں نہ آئے تو اس کا انکار کرنا شان ایمان کے خلاف ہے (تفسیر نورِ ایمان صفحہ ۳۰۷ سورۂ اعراف)

احسان

قرآن شریف میں احسان کا لفظ ۶ آیتوں میں سات مرتبہ آیا ہے احسان کے معنی، اچھائی خوبی، خوش سلیقگی اور نیکی کے ہیں۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے

(۱) الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴿بقرہ:۲۲۹﴾ طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو شائستہ طریقہ پر اسکو رکھنا چاہیئے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑنا چاہیئے۔

(۲) هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴿الرحمن:۶۰﴾ نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہے۔

إِحْسَانًا کا لفظ بھی قرآن شریف میں ۶ جگہ آیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴿اسراء:۲۳﴾ آپ کے پروردگار نے حکم دیا کہ اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا سلوک کرو یعنی اچھا سلوک کرو۔

محسن۔ اچھا سلوک کرنے والا کسی پر احسان کرنے والا۔

ارشاد ربانی ہے۔ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴿بقرہ:۱۱۲﴾۔ ہاں جس شخص نے اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکا دیا اور وہ نیکو کار بھی ہو تو اس کا بدلہ اس کے پروردگار کے پاس ہے ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسی طرح مُحْسِنُونَ اور مُحْسِنِينَ بھی آیا ہے۔ جن کے معنی ہیں احسان کرنے والے۔ اچھا سلوک کرنے والے کے ہیں۔ اور اچھا سلوک کرنے والی خواتین کے لئے "مُحْسِنَاتِ" بھی قرآن میں ایک جگہ آیا ہے۔ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا۔ پس اللہ نے نیکو کار خواتین کے لئے بڑا بدلہ تیار کر رکھا ہے۔﴿احزاب ۲۹﴾

البتہ حدیث شریف میں احسان کی تشریح جو آئی ہے اسکی تفصیل ہم کو حدیث جبرئیل سے ملتی ہے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ چند صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے کہ یکایک ایک اجنبی حضور کی خدمت میں آیا اور حضور ﷺ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اتنا نزدیک بیٹھا کہ اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں سے ملائے (حضرت عمر فرماتے ہیں) ہم کو تعجب ہوا کہ یہ شخص باہر سے آیا ہوا بھی معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ اسکے کپڑے سفید تھے اگر مسافر ہوتا تو سفر کے اس کے

کپڑوں پر کچھ آثار نظر آتے اور اپنوں میں کا معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ہم میں کا کوئی شخص اس کا شناسا بھی نہیں تھا۔ اس نے پوچھا مَا الإِسْــلامُ يا رَسُــول اللَّهِ۔ آپ نے فرمایاأَنْ تَشْــهَدَ أَنْ لا إِلَهَ إِلا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُــولُهُ، وَتُقِيمَ الصَّلاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ۔ اس نے کہا صَدَقْتَ (یارسول اللہ) پھر اس نے پوچھامَا الإِيمَانُ (یارسول اللہ) آپ نے جواب دیاأَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُــلِهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ۔ پھر اس نے پوچھا مَا الإِحْسَــانُ۔ آپؐ نے جواب دیاأَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ۔ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی اسطرح عبادت کر گویا تو اسکو دیکھ رہا ہے۔ اگر تو اسکو نہیں دیکھتا تو اس یقین کے ساتھ عبادت کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا قیامت کب آنے والی ہے آپ نے جواب دیامَا الْمَسْئُولُ بِأَعْلَمَ بِهَا مِنَ السَّائِلِ۔ جس سے پوچھا جارہا ہے وہ سائل سے زیادہ جانکار نہیں ہے پس وہ شخص چلا گیا۔ اسکے بعد حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون تھا۔ صحابہ نے جواب دیا، اللہ اور اسکا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ جبرئیل تھے جو تمہارے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ تم کو تمہارے دین کی تعلیم دیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے دین اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسلام، اعمال کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایمان عقائد کے مجموعہ کا نام ہے اور احسان ان دونوں کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کا نام ہے۔ اس لئے بعض صوفیاء نے تصوف کو احسان کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ اور سچ پوچھو تو مہدویت کسی نئے مذہب نئی شریعت اور نئے نظام کا نام نہیں ہے بلکہ حضرت امامنا مہدیؑ نے اسلام اور ایمان کو بہترین طریقے پر نہ صرف پیش کیا بلکہ لوگوں کے سامنے اسکے بہترین نقش کو پیش فرماتے ہوئے اسکی حامل ایک جماعت کو تیار کر دیا۔ گویا احسان اعمال اور عقائد میں Quality کا نام ہے۔ عام لوگ Quantity پر زور دیتے تھے مگر مہدیؑ نے Quality پر زیادہ توجہ دینے کی تاکید فرمائی۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسی عبادت کرو کہ گویا تم اسکو دیکھ رہے ہو یا کم از کم اسپر دھیان دو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ تو تم کو چاہئیے کہ ہر کام میں خدا پر نظر رکھو۔ اسکو دیکھو یا اسکو دیکھنے کی طلب پیدا کرو۔

اہل کتاب

اہل کتاب سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ اس لئے کہ یہود حضرت موسیٰؑ کی امت ہیں۔ موسیٰؑ کو کتاب توریت دی گئی تھی۔ اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ روح اللہؑ کی اُمت ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو انجیل دی گئی تھی۔ چونکہ مشرکین کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی اس لئے وہ بے علم بھی تھے اور بے دین بھی۔ اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ کے مقابل ایک طرف مشرکین تھے تو دوسری طرف اہل کتاب تھے۔ مشرکین کو تو خیر نہ علم سے واسطہ تھا نہ دین سے۔ لیکن اہل کتاب سے یہ توقع تھی کہ وہ چونکہ اہل کتاب ہیں اور پیغمبر کو مانتے ہیں تو شاید۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو اور قرآن کے احکام کو سمجھیں گے اور ایمان لائیں گے۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ بجز چند کے اسلام کی مخالفت میں وہ بھی مشرکین سے کچھ کم نہیں تھے۔ بلکہ وہ تو اسلام کی مخالفت میں مشرکوں سے بھی دو ہاتھ اونچے ہی تھے چنانچہ انہوں نے مشرکین کو آنحضرت ﷺ کے خلاف ور غلانے اور جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان کو بہکانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب۔

(۱) یہ چاہتے ہیں کہ تم کو (مسلمانوں کو) کسی طرح ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف لوٹا دیں ﴿ترجمہ: بقرہ آیت:۱۰۹﴾

(۲) یہ کہتے تھے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کے سوا کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ یہ ان کی (خالی) تمنائیں ہیں ان سے کہو کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو کوئی دلیل لاؤ ﴿ترجمہ: بقرہ:۱۱۱﴾

(۳) ان کا آپس میں بھی حسد اور عناد کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف متحد تھے لیکن آپس میں ایک دوسرے کے مخالف اور معاند تھے چنانچہ اللہ کہتا ہے یہود کہتے ہیں کہ عیسائی راہ راست پر نہیں ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہود راستے پر نہیں ہیں حالانکہ یہ دونوں اللہ کی کتاب (توریت وانجیل) پڑھتے ہیں ﴿ترجمہ: بقرہ:۱۱۳﴾

(۴) البتہ چند اہل کتاب ایسے تھے جو اکثریت کے سے نہیں تھے چنانچہ قرآن کہتا ہے۔ "سب اہل کتاب یکساں نہیں تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو راہ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ ریزی بھی کرتے ہیں۔ اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں یہ صالح لوگ ہیں ﴿ترجمہ آل عمران ۱۱۴﴾

(۵) ان میں کے بعض جاہل لوگ وہ تھے جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ

کو بھی یہودی یا نصرانی کہتے تھے (اللہ کہتا ہے) کہو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ ﴿ترجمہ: بقرہ ۱۴۰﴾

(۶) جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ جسکی بناء پر آنحضرت ﷺ اور مسلمان بیت المقدس سے ہٹ کر کعبۃ اللہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھنے لگے تو اہل کتاب نے شور و غوغا بلند کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں پر لعن طعن کرنے لگے اور ایسا کرنے والے اہل کتاب کے علماء ہی تھے۔ قرآن کہتا ہے۔ "اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ (تحویل قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب کی جانب سے ہی ہے اور برحق ہے مگر اسکے باوجود یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے ﴿بقرہ ۱۴۴﴾

(۷) اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہود و نصاریٰ کے لئے کہیں اہل الکتاب کے الفاظ لائے ہیں اور کہیں الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ ﴿آل عمران:۲۳﴾ یعنی وہ لوگ جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے، فرمایا اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک تو انہوں نے ان کو دی گئی کتابوں کا ایک بڑا حصہ ہی گم کر دیا تھا اور دوسرا یہ کہ ان کے پاس جو بھی حصہ رہ گیا تھا وہ اسکی روح سے دور اور بے گانہ ہو چکے تھے۔ لفظوں میں بھی پھیر پھار کر لیا تھا اور ان میں بھی بے جا بحث اور غلط تاویلوں اور از کار رفتہ موشگافیوں کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حقیقت دین سے ناآشنا اور اسکی روح سے نابلد ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے کہ "وہ خود گمراہی کے خریدار بنے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ تم بھی (انہی کی طرح) راہ گم کر دو ﴿النساء ۴۴﴾۔

(۸) خاص کر یہودوں کی ایک بے ایمانی یہ بھی تھی کہ وہ کلام الٰہی میں تحریف کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔ "یہودیوں میں کچھ لوگ ہیں جو (کتاب الٰہی کے) الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں (یا مقامات سے بدل دیتے ہیں) اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہیں مانا اور سنئے، نہ سنوائے جاؤ۔ زبان کو موڑ کر دین میں طعنہ زنی کرتے ہوئے "رَاعِنَا" کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ یوں کہتے کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور صرف اسمع اور انظر کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور یہ بات زیادہ درست بھی ہوتی۔ لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے اس لئے وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑے لوگ ﴿ترجمہ النساء ۴۶﴾۔

اللہ تعالیٰ یہاں بالخصوص، یہودیوں کی ایک خباثت کا ذکر کر رہا ہے کہ یہ لوگ کتاب کے الفاظ کو تک بدل دیتے ہیں اور ان کی شیطنت کی یہ کیفیت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ ان سے خطاب کرتے ہیں تو وہ زور سے کہتے "سنا" اور آہستہ کہتے ہیں "نہیں مانا" یا کہتے ہیں "سُنئے" اور تم نہ سنوائے جاؤ یعنی بُری بات تمہارے سننے میں نہ آئے۔ مگر ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم بہرے بن جاؤ۔ اور زبان کو مڑ وڑ کے کہتے ہیں "رَاعِنَا" جس کا مطلب ایک تو یہ ہوتا ہے کہ ہماری رعایت کیجئے۔ اور اسی لفظ کو ذرا زور دیکر کہیں "راعینا" تو اس کا مطلب ہوتا ہے۔ "اے ہمارے چرواہے" اللہ کہتا ہے کہ بجائے اس کے اگر وہ کہتے ہم نے

سنا اور ہم نے اطاعت کی، اور ذرا سنئے اور ذرا ہم کو بھی دیکھئے تو بہتر ہوتا۔

(۹) اللہ قرآن میں اہل کتاب سے فرماتا ہے "اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس کتاب پر جو ہم نے (محمد ﷺ) پر نازل کی جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے ساتھ ہے۔ قبل اس کے کہ ہم تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں، یا ان پر اس طرح لعنت کر دیں جس طرح کہ ہم نے ہفتے والوں پر لعنت کی تھی۔ اور اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔﴿ترجمہ النساء ۴۷﴾

(۱۰) اہل کتاب کی ایک اور خباثت کو اللہ نے اسطرح بیان فرمایا ہے "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا وہ جبت اور "طاغوت" پر ایمان لائے ہیں اور کافروں سے کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو تم ہی زیادہ صحیح راستے پر ہو۔ جبت کے معنی بتوں کے بھی ہیں اور ہر بے اصل اور بے حقیقت چیز کے بھی ہیں۔ اسی کے دائرے میں ہر وہمی اور خیالی چیز بھی آجاتی ہے مثلاً جادو، کہانت، ٹونا، ٹوٹکے، بدشگونی اور بدفالی، اور طاغوت کے معنی شیطان کے ہیں۔

(۱۱) اہل کتاب کی ایک شیطنت یہ بھی تھی کہ "جب تم نماز کے لئے منادی (اذان) کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں"﴿ترجمہ: المائدۃ ۵۸﴾ یعنی جب مسلمان نماز کے لئے اذان کہتے تھے تو وہ اذان کی آواز اور الفاظ سن کر اسکی نقل کرتے، ازراہ مذاق اس کے الفاظ بدل دیتے اور اس پر آوازے کستے ہیں۔

(۱۲) "اہل کتاب دین میں غلو نہ کرو۔ اور اللہ کی طرف حق کے سوا اور کوئی بات منسوب نہ کرو"۔ غلو کے معنی کسی کی حمایت یا مخالفت میں حد سے آگے بڑھ جانا ہے۔ یہودیوں کا غلو یہ تھا کہ وہ عیسیٰؑ کے انکار اور مخالفت میں حد سے آگے بڑھ گئے تھے اور عیسائیوں کا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی محبت میں حد سے آگے بڑھ گئے تھے۔ یہودیوں نے عیسیٰؑ کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا اور غلط باتوں کو ان کی طرف منسوب کر دیا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی محبت میں بغیر باپ کے ہونے کی وجہ سے عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔

(۱۳) اللہ نے مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کا کھانا حلال قرار دیا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے "آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔ اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے"﴿ترجمہ: المائدہ ۵﴾ اسی طرح اہل کتاب کی عورتیں بھی حلال ہیں یعنی ان سے باضابطہ طور پر نکاح ہوا ہو تو۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے "اور پارسا عورتیں مسلمانوں میں سے اور پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی (وہ بھی حلال ہیں) جبکہ تم نے ان کو ان کا مہر دے دیا ہو اور تم نے ان کو قید نکاح میں لا لیا ہو۔ نہ یہ کہ علانیہ بدکاری کرو یا خفیہ آشنائی کرو۔

﴿ترجمہ المائدہ ۵﴾ ان آیتوں میں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ کھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ان کا کھانا حلال ہو۔ اللہ نے جن مطعومات اور مشروبات کو حرام قرار دیا ہے وہ تو بہر حال حرام ہی رہیں گے۔ اسی طرح اہل کتاب کا ذبیحہ بھی حلال ہے بشرطیکہ وہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتے ہوں۔ اسی طرح اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح بھی کیا جاسکتا ہے (لیکن اپنی لڑکیوں کو ان کے نکاح میں ہرگز نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ قرآن میں ان کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔

نکاح کے تعلق سے چند بنیادی باتیں اللہ نے بیان کردی ہیں ایک تو یہ کہ وہ عورتیں پاکباز ہوں دوسرا یہ کہ مہر کی ادائی ہو (یا وعدہ ہو) تیسرا یہ کہ باضابطہ عقد نکاح میں لایا ہو۔ یہ نہیں کہ علانیہ بدکاری کرو یا خفیہ آشنائی کرلو اور چوتھا یہ کہ نکاح میں وقت کی کوئی قید نہ ہو (نکاح کے وقت گواہوں کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ بھی ایک معاملہ اور معاہدہ ہے)۔

الہام

الہام کے معنی بلاواسطہ نظر و اکتساب کے کوئی حقیقت قلب میں القا ہو جائے یا کوئی آواز غیب سے آئے۔

چنانچہ روایت آئی ہے۔قَالَ أنَا عمر- وَلَم أحرص على أمركم وَ لَكن المتوفّي أوصىٰ اِلَيّ بِذَلِكَ وَ اللّٰهُ الهمه ذلك۔ ترجمہ: حضرت عمرؓ نے فرمایا میں عمر ہوں اور تم پر حاکم بننے کی مجھ کو خواہش نہ تھی لیکن مجھ کو متوفیٰ (حضرت ابو بکرؓ) نے اس کی وصیت کی تھی اور اللہ نے ان کے قلب میں اس کا الہام کیا تھا۔

بعض اولیاء اللہ کا صاحب الہام ہونا منقول ہے۔ الہام کی مخالفت سے گناہ تو نہیں ہوتا مگر ضرر اور نقصان ضرور ہو جاتا ہے۔ یعنی کبھی جان و مال کا نقصان ہوتا ہے اور کبھی ذوق و شوق میں کمی آجاتی ہے مگر یہ وہ الہام ہے جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے جس میں خیر اور نیکی کا حکم دیا جاتا ہے۔ الہام دو طرح کا ہوتا۔ الہام من الرحمان اور الہام من الشیطان۔ چنانچہ قرآن شریف میں سورۂ والشمس میں آیا ہے۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴿الشمس:۸﴾ پس اس نے بدکاری اور پرہیز گاری دونوں باتوں کا القاء کیا یعنی سمجھایا۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خیر و تقویٰ کی باتوں کو اللہ کی طرف سے اور بدکاری اور گناہ کی باتوں کو شیطان کی طرف سے القاء سمجھیں۔

انبیاء کے لئے وحی ہے۔ اور اولیاء اللہ کے لئے الہام اور القاء ہے۔ لیکن قرآن شریف میں وحی کا لفظ غیر انبیاء کیلئے بھی آیا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔

(۱) وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ ﴿النحل:۶۸﴾ پھر تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔

(۲) فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَن سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا﴿مریم:۱۱﴾ پھر ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ صبح اور شام تسبیح (خدا) کرو۔

(۳) وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي﴿المائدۃ:۱۱۱﴾ اور جب میں نے حوارین کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

(۴) وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ﴿القصص:۷﴾ ہم نے موسیٰؑ کی والدہ کی طرف وحی کی کہ اس کو (موسیٰ) کو دودھ پلاؤ۔

یہاں یاد رکھنے کی یہ بات یہ ہے کہ وحی مستلزم نبوت نہیں ہے۔ یعنی جس پر وحی ہو اس کا نبی ہونا لازم نہیں ہے۔ لیکن نبی کے لئے وحی ہونا ضروری ہے اور وہ بھی اس معنی میں کہ اسکو نبوت دی گئی ہے۔

اجابتِ دُعا

اجابت دُعا کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کا ہماری دعاؤں کو قبول کرنا۔ اس میں شک نہیں کہ بے شک اللہ ہی ہے جو ہماری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔ اس کے سوا دعا کا قبول کرنے والا اور کوئی نہیں ہے اس لئے بندوں کو چاہئے کہ صرف اسی کے حضور دعا کریں۔ اللہ نے سورۂ فاتحہ میں بھی اسی نکتہ کی تعلیم دی ہے اور کیا پیارے انداز میں ہم کو دُعا کرنے کا طریقہ بتلایا ہے۔ سبحان اللہ العظیم چنانچہ ارشاد ہے۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ (یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے (وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، اور تیرے سوا کسی اور سے مدد نہیں مانگتے)۔

اس میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ نَسْتَعِينُ سے پہلے نَعْبُدُ آیا ہے اور وہ بھی حصر کے ساتھ یعنی پہلے عبادت اللہ ہی کی کرنی ہے اور پھر مدد بھی اللہ ہی سے مانگنی ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ غلامی سب کی کریں اور مدد مانگنے کا وقت آئے تو اللہ سے مدد مانگیں۔ یہ طریق خدا کو پسند نہیں ہے۔ اللہ نے بے شک ارشاد فرمایا ہے۔ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴿البقرۃ:۱۸۶﴾ میں پکارنے والوں (دعا کرنے والوں) کی دعا (پکار، فریاد، درخواست) کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکاریں (مجھ سے درخواست کریں)

بے شک اللہ نے یہ وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جب ہم کبھی بھی پکاریں۔ دعا کریں، یہ اس کا فرض ہے یا اس پر واجب ہے کہ ہماری دعا قبول کرے۔ واہ عجیب منطق و عجیب فیصلہ ہے۔ ہم اللہ سے یہ سمجھ کر دعا کرتے ہیں کہ وہ مالک ہے۔ لیکن ان دعا کرنے والوں نے اللہ کو بھی ہمارا پابند کر دیا اور اس پر یہ ذمہ داری ڈال دی کہ بس ہم نے پکارا اب تیرا یہ کام ہے کہ ہماری ہر دعا کو تو قبول کر۔ گویا ان کی دعا اس مالک کے حق میں آرڈر (Order) بن گئی۔ سوچئے کتنا غلط فیصلہ ہے۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ادھر دعا ختم کی، منہ پر ہاتھ پھیرے ادھر دعا مقبول ہو جائے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ سے ایک لغزش ہوئی، نادم ہوئے توبہ کی اور اللہ سے قبولیت توبہ کی دعا کی۔ اور فرمایا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿الأعراف:۲۳﴾ اے ہمارے رب ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا پس اگر تو نے ہماری بخشش نہیں کی اور

ہم پر رحم نہیں فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ کیا اس دُعا کے ساتھ ہی دعا قبول ہو گئی۔ یا چالیس سال کے بعد یہ دعا قبول ہوئی۔ جب آدمؑ جیسی ہستی کے حق میں چالیس (۴۰) سال کے بعد دعا قبول ہوئی تو ہما شما کس شمار میں۔

اسی طرح ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی دیواروں کو بلند کرتے وقت جو دعائیں فرمائی تھیں ان میں سے ایک دُعا یہ بھی تھی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُـــولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ﴿البقرۃ:۱۲۹﴾ اے ہمارے پروردگار ان میں تو ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اس مقدس جگہ پر مقدس گھر کی تعمیر کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے ایک پیغمبر کے لئے جو دُعا فرمائی تھی وہ دُعا قبول تو ہو گئی اور اسکی عملی صورت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے ظہور پذیر ہوئی گویا تقریباً (۵) پانچ ہزار سال کے بعد۔ جب ایک عظیم الشان اولوالعزم خلیل اللہ کی دُعا کی قبولیت ایک لمبے عرصے کے بعد ہوئی ہو تو ہم جیسے گناہ گار بندے یہ چاہیں کہ آج دعا کریں اور کل اس کا اثر ظاہر ہو جائے، تو حکمتِ خداوندی کے خلاف سوچ کہلائے گی۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہماری ہر دُعا قبول ہی ہو جائے۔ کیوں کہ ہم جس کے دربار میں عرضداشت پیش کر رہے ہیں وہ حکیم ہے اسکی حکمت کا تقاضا کیا ہے ہم جان نہیں سکتے۔ کس کی دُعا۔ کب اور کتنی دُعا قبول کرنا چاہیئے وہی بہتر جانتا ہے۔ چنانچہ مسلم شریف میں جو روایت آئی ہے وہ اسطرح ہے۔ سَـألتُ رَبِّي ثَلَاثاً فَاعطاني اثنين وَمَنعني وَاحِدَة۔ ترجمہ: میں نے اپنے رب سے تین دُعائیں مانگیں۔ سو دو تو منظور ہوئیں اور ایک نامنظور۔

اجابت دُعا کے لئے دو چیزیں بہت ضروری ہیں (۱) اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ (۲) یقین کامل۔ اگر خدا پر کامل بھروسہ نہ ہو یا دُعا کرتے وقت آدمی خود شک و شبہ کا شکار ہو تو مقبولیت بھی معرض التواء میں پڑ جائے گی۔

نیز یہ بھی اشد ضروری ہے کہ آدمی دو باتوں کا خاص خیال رکھے (۱) صدق مقال (۲) اکل حلال۔ جس آدمی نے اپنی زبان سے کبھی جھوٹ نہ کہا ہو، اللہ اسکی دُعا کو یقناً قبول کرتا ہے اور جس آدمی نے اپنے پیٹ کو حرام غذاء سے نہ بھرا ہو تو اللہ تعالیٰ اسکی دُعا کو بھی قبول فرماتا ہے۔ بلکہ سچے آدمی کی زبان سے نکلی ہوئی بات کو بھی اللہ رائگاں نہیں کرتا۔

چنانچہ حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک عورت حضرت کے پاس اس غرض سے آئی کہ حضرت دربار خداوندی میں یہ دُعا فرمائیں کہ اس کے ایک بچہ ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا جا تجھے اولاد ہو گی۔ اس نے کہا کہ اس سے پہلے میں دو تین بزرگوں کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے کہا، تیری قسمت میں اولاد نہیں ہے۔ مگر آپ فرما رہے ہیں کہ مجھے

اولاد ہو گی۔ حضرت نے فرمایا۔ خاتون تجھے بچے سے مطلب تھا۔ اور وہ تجھے مل گیا۔ اب دوسروں کی باتوں سے تجھے کیا مطلب۔ وہ واپس ہوتے ہوئے پھر ان دو کے پاس گئی۔ انہوں نے کہا کہ ناممکن تجھے اولاد نہیں ہو گی۔ ہم نے لوح محفوظ تک دیکھ ڈالی لیکن تیری قسمت میں اولاد نہیں ہے۔ وہ بیچاری پھر پریشان ہو کر حضرت محبوب سبحانیؒ کی خدمت میں آئی اور کہا کہ آپ تو فرما رہے ہیں کہ مجھے اولاد ہو گی لیکن دوسرے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے لوح محفوظ کو بھی دیکھ لیا ہے اس میں تیرے لئے اولاد نہیں لکھی ہے۔ اس پر حضرت نے جلال میں آکر فرمایا، انہوں نے لوح محفوظ تو دیکھ لی۔ لیکن کیا انہوں نے عبد القادر جیلانیؒ کی زبان بھی دیکھ لی۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے اولاد بندے کے زبان پر لکھدی تھی۔ یعنی اگر میں دُعا کروں گا تو تجھے اولاد ہو گی۔

اصل بات یہی ہے کہ حضرت عبد القادر جیلانیؒ نے زندگی بھر اپنی زبان سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کہ جا تجھے اولاد ہو گی کی رعایت سے اس خاتون کو اولاد عطا فرمائی۔ ورنہ حضرت کی بات جھوٹی ہو جاتی۔

اہل وعیال کے حقوق

اللہ کا ارشاد ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ﴿التحریم:٦﴾ اے ایمان اولو اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ۔

آنحضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَائِهِ و اَولَادِهِ وَ مَا مَلَكت يَمِينه۔ تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنی عورتوں اپنی اولاد اور اپنی لونڈیوں سے اچھا برتاؤ کرتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ المحسن الى نسائه وعياله واولاده يُعطي درجة المجاهد في سبيل الله۔ جو شخص اپنی بیوی، اہل وعیال اور اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے اسکو اللہ کے راستے میں لڑنے والے کا درجہ دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے ایک اور حدیث میں فرمایا: افضل الصدقة بعد الزكواة درهمٌ تنفقه على نفسِكَ تصونُها عن مسئلة الخلق ودرهمٌ تنفق على ولدِك ومَاملكت يمينُك تصونُهم عن الحاجة الي الناس- يكتب اللّٰهُ اجره مضا عفاً سبعين ضعفا (الحدیث)۔ زکواۃ کے بعد بہترین روپیہ وہ ہے جس کو تو اپنے آپ پر خرچ کرتا ہے تاکہ لوگوں سے مانگنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اور وہ روپیہ ہے جسے تو اپنی اولاد اور اپنی باندی پر خرچ کرتا ہے تاکہ ان کو لوگوں کے پاس جانے کی حاجت نہ رہے اللہ تعالیٰ اس کا ثواب ستر گنا زیادہ دیتا ہے۔

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عليكم باللطف والرفق بنساء كُم لا تظلُموهُنَّ ولا تضيّقوا عليهنَّ۔ اپنی عورتوں کے ساتھ لطف ونرمی کا سلوک کرو ان پر ظلم نہ کرو اور نہ ان پر عرصۂ حیات تنگ کرو۔

پھر فرمایا: خيركم خيركُم لاهَله وانا خيركُم لاهلي ما اكرم النساء اِلاّ كريمٌ وما اهانَهُنّ اِلاّ لئيمٌ۔ تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا رہتا ہے اور میں اپنی بیوی کے ساتھ تم سب سے زیادہ اچھا سلوک کرتا ہوں۔ عورتوں کی عزت کرنے والا شریف ہوتا ہے اور عورتوں کی توہین کرنے والا کمینہ ہوتا ہے۔

پھر فرمایا: اول مايحا سبُ الرجُلُ على صلواته ثمّ بعد ذلك على نسائه و اوّل ما تُحاسَب المرأة على صلواتها ثمَّ عن حقِّ زوجها وجيرا نِها۔ آدمی سے سب سے پہلے اسکی نماز کے تعلق سے پوچھ ہوتی ہے پھر اسکی بیوی کے تعلق سے، اور عورت سے سب سے پہلے اسکی نماز کے بارے میں پوچھ ہوتی ہے اسکے بعد اس کے شوہر اور اس کے پڑوسیوں کے

بارے میں اسکے سلوک کے تعلق سے پوچھا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ جب امام مہدیؑ سے آپ کے بعض اصحاب نے کہا کہ بیوی بچوں سے گڑبڑ ہوتی ہے اور ذکر میں دل نہیں لگتا کیا ہم ان کو اپنے سے علیحدہ کر دیں تو آپ نے جواب دیا۔ نہیں بلکہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے ساتھ لیکر جنت میں جاؤ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد پر واجب ہے کہ وہ اپنے اہل بیت کو نماز کا حکم دے اور نماز چھوڑنے پر ان کو مارے، فرمایا عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو اس لئے کہ وہ تمہارے ہاتھوں قیدی ہیں۔ ان کو تم نے اللہ کے وعدہ کے مطابق لیا ہے اور اللہ کے فرمان سے وہ تمہارے لئے حلال ہوئی ہیں۔ پس ان کے کھانے اور کپڑوں کے بارے میں فراخی اختیار کرو تو اللہ بھی تمہارے رزق میں کشادگی دے گا اور تمہاری عمروں میں بھی اضافہ کرے گا۔ جیسے تم رہو گے اللہ بھی اسی طرح تمہارے لئے رہے گا۔

روایت آئی ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے ایک مرتبہ حضرت سارہ کے سلوک کے بارے میں اللہ سے شکایت کی تو اللہ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ میں نے ان کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا ہے۔ اور ٹیڑھی پسلی کو اگر تم سیدھی کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ پس صبر کرو اور ان سے کچھ بے اعتدالی ہو جائے تو اسکو برداشت کرو۔

نیز آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عورت کا حق مرد پر یہ ہے کہ وہ اس کو ضروری باتوں کی تعلیم دے یعنی وضو، اسکی نیت، تیمم، حیض کا غسل، جنابت کا غسل، نفاس (زچگی کے بعد) کا غسل، استحاضہ کا حکم، نماز کے فرائض اور سنتیں، صحیح اعتقاد، غیبت اور چغل خوری سے بچنا نجاست سے دور رہنا، بیکار باتوں سے خاموشی اختیار کرنا۔ ذکر کی پابندی کرنا۔ ہر ایک کا ادب کرنا، گناہوں اور بُری باتوں سے دور رہنا اگر شوہر کو اتنا علم نہیں ہے تو پہلے خود پوچھ کر معلومات حاصل کر لے پھر ان کو تعلیم دے ورنہ ان کو اجازت دے کہ وہ دوسروں سے پوچھ کر علم حاصل کر لیں اور مرد کو یہ جائز نہیں ہے کہ اپنی عورت کو قال اللہ اور قال رسول اللہ کی روشنی میں وعظ و بیان سن کر دینی معلومات حاصل کرنے کے مقامات پر جانے سے روکے اسی لئے آنحضرت نے فرمایا"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ و مُسْلِمَةٍ"۔

آخَرِينَ مِنْهُمْ

سورۂ جمعہ میں اللہ فرماتا ہے وَآخَرِينَ مِنْهُمْ ﴿الجمعۃ:۲﴾ور ان میں سے آخرین کی طرف بھی۔ اس سے پہلے اللہ نے بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا فرمایا ہے۔ یعنی اللہ نے ان پڑھوں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ اس سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہیں۔ اسکے بعد فرماتا ہے کہ اور ان میں سے آخرین کی طرف بھی أُمِّيِّين سے مراد عرب اور آخَرِينَ سے عربوں کے سوا دوسرے لوگ مراد ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جس وقت سورۂ جمعہ نازل ہوا۔ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پس آپ نے سورہ پڑھنا شروع کیا جب آپ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ تک پہنچے تو ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ یہ کون لوگ ہیں جو ہم سے نہیں ملے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ سلمان فارسی کے سر پر رکھا اور فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر ایمان ثریا سے جا لگے تو البتہ اسکی قوم کے لوگ اُسے پالیں گے۔ جب ائمہ حدیث نے اس آیت کی تفسیر صحیح حدیث سے بیان کی تو پھر آخرین سے بجز اہل عجم کے، تابعین یا بعد نبی کے سب کو مراد لینا درست نہیں ہے۔

اس لئے کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص جماعت ہے جو سابقین سے (ایمان میں) لاحق ہو گی یعنی ان کے ہم پلّہ ہو گی۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ آخَرِينَ میں ایسے کون لوگ مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے ہم شان ہوں گے۔ بجز خلیفۃ اللہ کے اصحاب کے کوئی جماعت نہیں ہو سکتی۔ مہدی چونکہ اللہ کا خلیفہ ہے اس لئے آخرین سے مراد خاص اسی کی قوم ہے کیوں کہ خلیفۃ اللہ کے اصحاب کے ہم مرتبہ خلیفۃ اللہ کے اصحاب ہی ہو سکتے ہیں۔

جب آخرین کا عطف، أُمِّيِّين پر مفسرین نے ڈالا اور آخَرِينَ سے عجم مراد لیا تو آخرین میں مبعوث ہونے والا، رسول اللہ کے علاوہ ہوا۔ اور آخرین میں مبعوث ہونے والا خلیفۃ اللہ مہدی کے سوائے اور کوئی نہیں۔ اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آخرین میں عیسیٰ بھی آنے والے ہیں جو خلیفۃ اللہ ہیں تو جواب دیا جائے گا کہ آخَرِينَ مِنْهُمْ سے مراد وہ خلیفۃ اللہ ہے جو آخرین میں مبعوث ہو گا۔ عیسیٰؑ، آخرین میں سے نہیں ہیں، بلکہ اوّلین میں سے ہیں، ان کی ولادت آنحضرتؐ سے پونے چھ سو سال پہلے ہو چکی ہے۔ پس آخرین میں سے مبعوث ہونے والا جو خلیفۃ اللہ ہے وہ صرف مہدی موعودؑ ہی ہیں۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی نے اس کا سب سے بڑا مصداق حضرت ابو حنیفہؒ کو قرار دیا ہے۔ یہیں سے یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ جب آخَرِينَ مِنْهُمْ سے حضرت ابو حنیفہؒ مراد ہو سکتے ہیں جو ایک مجتھد تھے اور معصوم عن الخطا نہیں تھے۔ اور خلیفۃ اللہ تو ہرگز نہیں تھے۔ تو حضرت امام مہدیؑ جو خلیفۃ اللہ، معصوم عن الخطا ہیں۔ اور مامور من اللہ ہیں اور آنحضرت رسول اللہ ﷺ کی پیروی عقل ورائے کی بناء پر نہیں، قیاس و استدلال کی بناء پر نہیں۔ بلکہ مشاہدہ رسول اللہ

ﷺ سے کرتے ہیں، کیوں نہیں ہو سکتے؟؟ بلکہ امام ابو حنیفہؒ کے تعلق سے خیال کا اظہار تو علامہ سیوطی کی ذاتی رائے ہے جو کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ محدثین نے خود حضرت ابو حنیفہ کے مسلک کو اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے تو ابو حنیفہ کے مسلک کو "اصحاب الرّائے" کے مسلک کے نام سے یاد کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے تو ان کا نام تک لینا پسند نہیں کیا۔ جب ضرورت پڑی تو اپنی کتاب بخاری میں صرف "قال بعض الناس" (بعض لوگوں نے کہا) لکھنے پر اکتفاء کیا۔

اس کے بر خلاف رسول اللہ ﷺ سے مہدی موعودؑ کے تعلق سے تین سو سے زیادہ احادیث مروی ہیں۔ جن میں آپ کی بعثت کے بعد آپ سے بیعت کرنے کی بھی تاکید اکید کی گئی ہے۔ آپ کا منصب و مقام بتایا گیا ہے کہ آپ ہی خاتم دین ہیں یختم اللہ بہ الدین کے الفاظ آپ کے تعلق سے آنحضرتؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ پس آخَرِینَ مِنْھُمْ سے وہی ہستی مراد ہوئی ہے جس پر اللہ دین کا اختتام فرمائے گا جیسا کہ أُمِّيِّين سے مراد وہ ہستی ہے جس سے دین کی ابتداء ہوئی تھی جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا کما بَدَأ بنا۔

اس کے علاوہ اس آیت میں ایک خصوصیت یہ بھی کہ جہاں اللہ نے فِي الْأُمِّيِّينَ فرمایا تو اس کے ساتھ "رَسُولًا" بھی فرمایا۔ یعنی " بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا"۔ لیکن جہاں آخرین کا ذکر فرمایا وہاں صرف " وَآخَرِينَ مِنْھُمْ " فرمایا۔ رَسُولًا نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء والرسل ہیں۔ آپ پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔ مزید کسی بنی کی گنجائش نہیں ہے۔ اور مہدی چونکہ باطن رسول اللہ ہیں یعنی مظہرِ ولایت محمدیہ ہیں اس لئے صرف "وَآخَرِينَ مِنْھُمْ" فرمایا۔ صراحتہً رَسُولًا نہیں فرمایا۔

مہدویہ کا اعتقاد بھی اسی وجہ سے یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کسی نبی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے تو وہ کافر ہے۔ اور اسی طرح اگر کوئی اسکی نبوت کو مانے تو وہ بھی کافر ہے۔

ائمہ اربعہ

امام مالکؒ

آپ کا نام ابو عبداللہ مالک بن مالک ہے۔ فقہ مالکی کے مؤسس ہیں۔ مدینۃ الرسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم آپ کا مولد و منشاء اور مدفن ہے امام دارالالھجرۃ کے لقب سے مشہور ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے فقہی ابواب کی ترتیب سے احادیث کا مجموعہ تیار کیا جو ''الموطا'' کے نام سے مشہور ہے۔ طلاق جبری کے فتویٰ پر والئ مدینہ نے آپ کو سخت سزا دی لیکن امام موصوف اعلاء کلمۃ الحق سے باز نہیں آئے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن شریف (کلام اللہ) کے بعد اصح ترین کتاب امام مالک کی ''مُوطا'' ہے۔

امام مالکؒ کی ولادت کے سن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یعنی ۹۱ھ، ۹۴ھ، ۹۷ھ آپ کا وصال مدینہ میں ۱۷۹ھ میں ہوا۔

امام ابو حنیفہؒ

نعمان بن ثابت۔ مقتدائے اکثریت اہل سنت، شرف فقہاء اور عزت علماء ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ مجاہدہ اور عبادت میں ثابت قدم بزرگ تھے۔ اُصول طریقت میں بڑی شان کے مالک تھے۔ پہلے پہلے گوشہ نشینی کا ارادہ کیا اور چاہا کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ پیغمبر خدا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی لحد مبارک میں آپ کے استخواں جمع کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض کو چن رہے ہیں۔ بہت خوف کے عالم میں بیدار ہوئے پھر حضرت محمد بن سیرین سے تعبیر پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو حضور کی سنتوں کو محفوظ کرنے میں بلند مقام حاصل ہو گا۔ (ملاحظہ ہو امام قشیری کی تصنیف کشف المحجوب صفحہ ۱۶۰) اس طرح کی روایت حضرت بخاریؒ کے حوالے سے بھی بیان کی جاتی ہے واللہ اعلم۔

آپ کو خلیفہ منصور نے قاضی بنانا چاہا لیکن آپ نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا (اس لئے ایک مرتبہ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا تھا۔ مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّينٍ ۔ (یعنی جو شخص قاضی بنا بغیر چھری کے ذبح ہوا)

جب خلافت ختم ہو گئی اور بادشاہت کا دور شروع ہوا۔ اسلام اطراف و اکناف پھیلنے لگا تو مسلمانوں کو اعمال کے صحیح طریقے جو سنت کے مطابق ہوں اور اس دور کے حالات کے تحت نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل نکالنے کی غرض سے آپ نے اجتھاد سے کام لیا اور لاکھوں مسئلوں کا حل قرآن، حدیث، اجماع کے علاوہ اپنے اجتھاد سے پیش فرمایا۔ چونکہ آپ نہایت ذہین، فطین، نکتہ شناس اور نکتہ بیں تھے۔ یعنی لکیر کے فقیر نہیں تھے اس لئے آپ کے مسائل کو کوفہ کے باہر کے لوگ قبول

کرنے سے کترانے لگے۔ اور آپکو ''اہل الرّائے'' کا لقب دے دیا۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں فقہ حنفی پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے ممالک میں دیگر مجتھدین کی فقہ کو اپنایا گیا ہے آپ کی ولادت ۸۰ھ میں بغداد میں ہوئی اور آپکا وصال ۱۵۰ھ میں ہوا۔ آپ کے شاگردوں میں حضرت ابویوسف، حضرت امام محمد زیادہ مشہور ہیں ان دونوں شاگردوں نے حضرت امام ابوحنیفہ (جنھیں امام اعظم بھی کہا جاتا ہے) کے ایک تہائی سے زیادہ مسائل میں، آپ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے اجتھاد سے مسائل بیان کئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض مسائل میں امام صاحب نے اپنے شاگردوں کے فتاویٰ کی طرف رجوع بھی کیا ہے۔

واضح ہو کہ جس سال حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا یعنی ۱۵۰ھ اسی سال حضرت امام شافعیؒ کی ولادت ہوئی ہے۔

ابن حنبلؒ

آپ کا پورا نام ابوعبداللہ احمد بن حنبل شیبانی ہے۔ مشہور محدّث اور فقہ حنبلی کے امام، زہدوورع میں عدیم المثال اور صبر و استقامت کے پہاڑ تھے۔ سلطنت اسلامیہ میں جب معتزلہ کا عمل دخل بڑھ گیا اور باشاہ تک رسوخ حاصل کر لیا تو خلق قرآن کے فتنے نے سر اُٹھایا۔ اور بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ قرآن مخلوق ہے۔ علماء سوء نے دنیاداری کے جال میں پھنس کر بادشاہ کی ہمنوائی اختیار کی۔ لیکن حضرت احمد بن حنبل نے بڑی سختی سے اس نظریہ بد کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اس پر غیر معمولی جرأت اور مثالی عزیمت کا مظاہرہ فرمایا۔ اس پر آپ پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ آپ کو قید خانہ میں رکھ کر کوڑے مارے جانے لگے۔ آپ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے، آپ کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دئے گئے اور کوڑوں کی بارش ہونے لگی لیکن آپ ان سے صرف یہ کہتے تھے کہ مجھے منطق وفلسفہ سے نہیں۔ قرآن سے ثابت کرو کہ قرآن جو خدا کا کلام ہے مخلوق ہے چنانچہ فرماتے ایتوني بكلام الله شيئاً، اسی عالم میں آپ کا ازار بند کھل گیا، آپ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، دست غیب نے مدد کی، ازار بند خوبخود بندھ گیا۔ یہ کرامت دیکھ کر ایذاء پسندوں نے آپ کو چھوڑ دیا، آپ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ وصال سے کچھ پہلے لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ ان ظالموں کے حق میں آپ کیا فرماتے ہیں ؟ جواب دیا کچھ نہیں۔ میں ایک زخم کے لئے بھی قیامت کے دن ان سے مخاصمت نہیں کروں گا۔ ورع اور تقویٰ آپ کی خصوصیت تھی۔ احادیث پیغمبر آخریں کے آپ حافظ تھے، آپ سے کسی نے پوچھا اخلاص کیا ہے؟ فرمایا ''اخلاص یہ ہے کہ آفت اعمال سے نجات حاصل ہو''۔ یعنی ہر عمل ریا۔ مکر، فریب اور خود غرضی سے مُعرّا ہو۔ پوچھا توکل کسے کہتے ہیں؟ فرمایا کہ

"ایمان کہ روزی پہنچانے والا اللہ تعالیٰ ہے" پوچھا کہ رضا کیا ہے؟ فرمایا "اپنے تمام امور کو خدا کے حوالے کرنا"۔ علی بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو دو شخصوں کے ذریعہ عزت دی جن کا تیسرا ہمسر نہیں ہے۔ ارتداد کے موقع پر حضرت ابو بکر صدیقؓ اور فتنۂ خلق قرآن میں احمد بن حنبلؒ کے ذریعہ (تاریخ بغداد جلد ۴، صفحہ ۴۱۸)۔

آپ کی ولادت ۱۶۴ھ میں ہوئی اور وفات بغداد میں ۲۱۴ھ میں۔ آپ نے حدیث کی ایک کتاب مسند امام احمد لکھی ہے۔ مسند کے بارے میں خود امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ انہوں نے سات لاکھ سے زائد احادیث میں سے اس مجموعہ حدیث کو منتخب کیا ہے۔ یہ احادیث کا سب سے بڑا مجموعہ ہے اور دیگر مسانید سے صحیح تر ہے۔

امام شافعیؒ

ابن العباس بن عثمان بن شافع بن السائب بن عبید بن عبد زید بن ہاشم بن المطلب بن سید مناف القرشی۔ آپ کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعی ہے۔ یہ سید المرسلین سیدنا محمد بن عبد اللہ کے ساتھ عبد مناف کے ذریعہ ملتے ہیں۔ شافعی قریشی ہیں۔ آپ کی والدہ (مشہور قول کی بناء پر) ایک شریف قبیلہ الازد سے تھیں جن کا نام السیدہ فاطمہ تھا (ام حبیبہ) الازدیہ۔ آپ ماہ رجب ۱۵۰ھ میں شہر غزہ فلسطین میں پیدا ہوئے آپ کے والد مکہ مکرمہ سے مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے فلسطین آگئے تھے۔ آپ امام مالک کے شاگرد بھی رہے ہیں آپ کی عمر کا بیشتر حصہ مکہ، مدینہ، بغداد اور مصر میں گذرا اور آخر کار مصر ہی میں وفات پائی۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ عربی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ اور اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے آپ کی دو کتابوں کتاب الام اور الرسالہ کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ آپ فقہ شافعیہ کے بانی ہیں۔

الحاد

الحاد کے معنی بے دینی کے ہیں جیسے کے اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے" وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ "یعنی: اور جو کوئی بے دینی کا کام شرارت سے کرے گا تو ہم اسکو دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔﴿الحج،۳۵﴾

اور ایک مقام پر اللہ نے فرمایا" وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿الاعراف:۱۸۰﴾ اور اللہ ہی کیلیئے سب اچھے نام ہیں تو تم اسکو انہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں عنقریب ان کو ان کے کئے کی سزا دی جائیگی۔

یہاں اللہ نے يُلْحِدُونَ کے الفاظ راہ راست سے ہٹ جانے کے معنی میں لائے ہیں۔ جب تیر ٹھیک نشانہ پر لگنے کے بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے یعنی نشانہ خطا کر جاتا ہے تو عربی میں کہتے ہیں "الحد السھم الھدف" تیر نشانہ چوک گیا۔ خدا کے نام رکھنے میں الحاد، یہ ہوا تھا کہ مشرکین اللہ کو ایسے ناموں سے پکارتے تھے جو اس کے مرتبہ، شان اور ادب کے خلاف ہوتے۔ اسی کو اللہ الحاد کا نام دے رہا ہے۔ پس جو شخص اللہ، اس کے رسول، قرآن، روز آخرت، تقدیر اور مرنے کے بعد اٹھنے کے اسلامی عقائد سے انحراف کرتا ہے اس کو ملحد کہا جاتا ہے۔ مختصر طور پر جو شخص خدا کا منکر ہو اس کو بھی ملحد اور بے دین کہا جاتا ہے۔

اسی طرح جو شخص دائرہ اسلام میں تھا لیکن بعد میں کسی بھی وجہ سے اسلام سے منحرف ہو کر دوسرا دین اختیار کر لیتا ہے تو اسکو "مُرتد" کہا جاتا ہے مثلاً کمیونیزم ہے، کمیونزم کی بنیاد ہی خدا کے انکار پر رکھی گئی ہے اس لئے کمیونسٹ ملحد ہوتا ہے، مشرک وہ ہے جو ایک خدا کے بجائے کئی خداؤں کو مانتا ہے اور کافر وہ جو حق کو چھپاتا ہے۔۔

امۃ وسط

اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد ہے "وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" ﴿البقرہ:۱۴۳﴾ یعنی: جس طرح کعبہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا قبلہ تھا اسی وجہ سے تمہارا قبلہ بھی اللہ کی جانب سے تجویز ہوا، جب بیت المقدس خدا ہی کی جانب سے قبلہ بنایا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں جب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو تقریباً سولہ یا سترہ مہینوں تک بیت المقدس ہی مسلمانوں کا قبلہ رہا، اس کی وجہ سے یہودیوں اور نصرانیوں کو یہ زعم ہوا کہ آپ نبی ہونے کا دعوی تو کر رہے ہیں تو کیا ہوا قبلہ تو اب بھی ہمارا ہی ہے، جس کی طرف منہ کرکے آپ نماز پڑھ رہے ہیں، آپ کی نبوت نئی ہے، کتاب نئی ہے لیکن قبلہ تو وہی پرانا ہے جو ہمارا تھا۔ تو انہوں نے سمت اور جہت کو ہی بہت اہمیت دی تھی اور یہ سمجھنے لگے تھے ہم ہی افضل ہیں، ہم ہی سب کے پیشوا ہیں، اللہ نے ان کے زعم فاسد کو توڑنے کیلئے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنادیا، اس میں اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی تمنا بھی تھی، اور اللہ کو یہ بتانا بھی تھا اب تمہاری پیشوائی ختم کردی گئی، اب کعبۃ اللہ ہی قبلہ ہے اور قیامت تک رہیگا۔ اور تمہارا یہ خیال کہ سمت اور جہت میں فضیلت ہے صحیح نہیں ہے اللہ نے فرمایا "مشرق بھی اللہ ہی کیلئے ہے اور مغرب بھی" بیت المقدس کو قبلہ اللہ نے ہی بنایا تھا کیا وہ اب کعبۃ اللہ کو قبلہ نہیں بناسکتا۔ بیت المقدس اللہ ہی حکم سے قبلہ بنا تھا۔ اور اب اللہ ہی اپنے حکم سے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا رہا ہے۔ تم کو سمت اور جہت کے نہیں بلکہ ہمارے حکم کے غلام اور بندے بن کر رہنا چاہئے۔ جس کی نظر خدا پر ہے وہ خدا کی عبادت بھی خدا کی مرضی اور اس کے حکم کے پابند ہو کر کرے گا اور جن کی نظر جہت اور سمت پر ہو گی وہ جہت کی پرستش میں خدا کو بھی بھول جائیں گے،

کعبہ کو قبلہ بنا کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ مرکز ارشاد اور دینی اور روحانی سلطنت کا پائے تخت بدل دیا گیا۔ اب جو بات یہاں سے کہی جائیگی اور جو حکم یہاں سے جاری ہو گا وہی سرکاری حکم ہو گا۔ سابق کے احکام منسوخ سمجھے جائیں گے الا یہ کہ مرکز بھی اس کو برقرار رکھے۔

اور جس طرح قبلہ بدل کر یہ اعلان کیا گیا کہ اب تمہاری بالا دستی ختم کر دی گئی اسی طرح یہ بھی کہہ دیا گیا کہ دیگر امتوں کے مقابلہ میں امت محمدیہ کو اللہ نے بہترین اور معتدل امت بنایا ہے۔ اس معنیٰ میں کہ نہ تو اس میں یہودیوں کا افراط ہے اور نہ عیسائیوں کی تفریط اور نہ مشرکین کی گمراہی، احادیث میں آیا ہے کہ جب حشر کے میدان میں اللہ سب کو جمع کریگا اور ہر امت سے پوچھے گا کہ کیا کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تو وہ کہیں گے، نہیں۔ پھر جب ان سے متعلق پیغمبروں سے پوچھے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ جھوٹے ہیں، پھر ان سے کہیگا کہ تمہارے صداقت کے گواہ کون ہیں تو پیغمبر جواب دیں گے کہ محمد

ﷺ اور امت محمدیہ۔ پھر امت محمدیہ کو لایا جائیگا، جب ان سے پوچھا جائیگا کہ تمہیں اس کی خبر کیسے ہوئی، تو وہ (امت) کہیں گے ہمارے پیغمبر نے اور پیغمبر کی کتاب (قرآن) نے ہم کو ان باتوں سے آگاہ کیا، پھر آنحضرت ﷺ کو بلایا جائیگا تو حضور ﷺ اپنی امت کی سچائی کی گواہی دیں گے۔

امت وسط کے معنی امت معتدل کے ہیں، لیکن قرآن میں دوسری جگہ "كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ"﴿آل عمران:۱۱۰﴾ کے الفاظ بھی آئے ہیں اس مناسبت سے امت وسط کے معنی "خَيْرَ أُمَّـةٍ" کے بھی کئے جاسکتے ہیں۔ مقولہ بھی مشہور ہے "خَيْرَ الأُمُورِ اَوسَطِهَا" (تفسیر نور ایمان، ص۲۸،۲۹)۔

انبیاء

انبیاء نبی کی جمع ہے عربی میں نبأ کے معنی خبر کے ہیں اور نبی اس ہستیٔ معظم کو کہتے ہیں جو اللہ کی جانب سے مخلوق کو خبر دیتے ہیں۔

(۱) اللہ کے تعلق سے یعنی اس کی ذات وحدہ لاشریک کے تعلق سے اور اس کی صفات کے تعلق سے۔

(۲) گذشتہ زمانوں میں اللہ کے ماننے والوں کے بارے میں

(۳) اللہ کا اور اس کے رسولوں کا انکار کرنے والوں کے بارے میں۔

(۴) یوم القیامۃ کے بارے میں یعنی حساب، کتاب، حشر و نشر، میزان، صراط، جنت و جہنم کے بارے میں خبر دینے والی ہستیاں۔

ویسے اللہ نے ہر دور میں ہر قوم کیلئے انبیاء مبعوث فرمائے ہیں۔ جن کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں ایک لاکھ اسی ہزار اور بعض کہتے ہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم تمام پیغمبروں پر ایمان لائیں، کسی ایک پیغمبر کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ قرآن شریف میں بھی تمام پیغمبروں کی نہ تعداد آئی ہے اور نہ انکی تفصیل۔ بس اتنا کہا گیا "كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ" یعنی رسول اور، مومنین سب کے سب ایمان لاتے ہیں اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ البتہ ہم ذیل میں ان پیغمبروں کے نام لکھتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

حافظ بن کثیر اور سیوطی نے لکھا ہے کہ قرآن میں ۲۵، انبیاء کے نام آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ابو البشر حضرت آدمؑ، حضرت آدمؑ کا ذکر ۱۱ سورتوں اور ۲۵ آیتوں میں آیا ہے۔

(۲) حضرت نوحؑ، حضرت نوحؑ کا ذکر قرآن مجید کی ۲۸ سورتوں میں ۴ مقامات پر آیا ہے۔

(۳) حضرت ادریسؑ، حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن مجید کی دو سورتوں اور دو آیتوں میں آیا ہے۔

(۴) حضرت ہودؑ، حضرت ہودؑ کا ذکر قرآن مجید کی ۳ سورتوں اور ۷ آیتوں میں آیا ہے۔

(۵) حضرت صالحؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۳ سورتوں میں اور ۸ مقامات پر آیا ہے۔

(۶) حضرت ابراہیمؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۲۵ سورتوں میں اور ۶۳ مقامات پر آیا ہے، ابراہیم کے معنی مشفق اور رحم دل باپ کے ہیں۔

(۷) حضرت اسماعیلؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۸ سورتوں میں اور ۱۲ مقامات پر آیا ہے، اسماعیل کے معنی ہیں اللہ سنتا ہے۔

(۸) حضرت اسحاقؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۱۲ سورتوں میں اور ۱۸ مقامات پر آیا ہے اور عبرانی زبان میں اس کے معنی ہنسنا۔

(۹) حضرت لوط بن ھارانؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۳ سورتوں میں اور ۸ مقامات پر آیا ہے۔

(۱۰) حضرت یعقوب بن اسحاقؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۷ سورتوں میں اور ۱۰ مقامات پر آیا ہے۔

(۱۱) حضرت یوسف بن یعقوبؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۳ سورتوں میں اور ۲۶ مقامات پر آیا ہے

(۱۲) حضرت شعیبؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۴ سورتوں میں اور ۱۰ مقامات پر آیا ہے

(۱۳) حضرت موسیٰ بن عمرانؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۲۶ سورتوں میں اور ۱۰۷ مقامات پر آیا ہے

(۱۴) حضرت ھارون بن عمرانؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۱۱ سورتوں میں اور ۱۴ مقامات پر آیا ہے

(۱۵) حضرت الیاسؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۲ سورتوں میں اور ۶ مقامات پر آیا ہے

(۱۶) حضرت داوٗدؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۹ سورتوں میں اور ۶۷ مقامات پر آیا ہے

(۱۷) حضرت سلیمانؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۷ سورتوں میں اور ۱۶ مقامات پر آیا ہے

(۱۸) حضرت ایوبؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۴ سورتوں میں آیا ہے

(۱۹) حضرت الیسعؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۲ سورتوں میں آیا ہے

(۲۰) حضرت یونس بن متّیؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۶ سورتوں میں آیا ہے

(۲۱) حضرت ذوالکفلؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۲ سورتوں میں آیا ہے

(۲۲) حضرت زکریاؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۴ سورتوں میں اور ۱۸ مقامات پر آیا ہے

(۲۳) حضرت یحییٰؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۴ سورتوں میں آیا ہے

(۲۴) حضرت عیسیٰ بن مریمؑ، آپ کا ذکر قرآن مجید کی ۱۱ سورتوں میں اور ۲۵ مقامات پر آیا ہے اور آپ بغیر باپ کے حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اللہ نے آپ کو اسی مادی جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھالیا۔ قیامت سے پہلے جامع دمشق کے مشرقی منارے پر اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔

(۲۵) حضرت محمد بن عبد اللہ خاتم النبیین ﷺ، آپ کا اسم مبارک ”محمد“ ہے۔ آپ کا ذکر قرآن میں ۴ سورتوں

میں آیا ہے۔ آپ کا دوسرا مشہور نام احمد ہے۔ اسی نام کے ساتھ انجیل میں آپ کی بعثت کی پیشین گوئی آئی ہے۔

حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ مذکور کردہ اسماء کے علاوہ آپ کے دیگر ۱۴ اسماء صفاتی ہیں جن پر اہل علم کا اتفاق ہے اور وہ یہ ہیں۔

(۱)الشاھد(۲)البشیر (۳)النذیر (۴)المبین(۵)السراج المنیر (۶)المذّکر (۷)الرحمۃ(۸)النعمۃ(۹)الدّاعی (۱۰)الشھید(۱۱)الھادی(۱۲)الامین(۱۳)المدّثر (۱۴)المزّمل

صحیح بخاری، کتاب الانبیاء میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ میرے پانچ نام ہیں۔(۱)محمد(۲)احمد(۳)الماحی (۴)الحاشر (۵)العاقب۔

آپ کے اسماء مبارک میں درج ذیل ۴ نام بھی ہیں۔(۱)المصطفیٰ(۲)المختار (۳)الشفیع(۴)الصادق المصدوق

حافظ محمد بن دحیہ اندلسی (متوفیٰ ۵۴۳ھ) نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ۹۹ نام ہیں جیسا کہ اللہ کے ۹۹، اسماء حسنیٰ ہیں۔

قاضی ابو بکر ابن عربیؒ اندلسی (متوفیٰ ۵۴۳ھ) نے عارضۃ الاحوذي شرح ترمذي میں لکھا ہے کہ بعض صوفیاء کا قول ہے کہ اللہ کے ۱۰۰۰ نام ہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بھی ۱۰۰۰ نام ہیں (فتح الباری شرح بخاری کتاب الانبیاء)

اب ہم ان انبیاء کے نام لکھتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں بغیر ناموں کے آیا ہے۔

(۱) یوشع بن نونؑ۔ سورۂ کہف آیت ۶۰ میں حضرت موسیٰؑ کے ایک نوجوان رفیق کا تذکرہ ہوا ہے " وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ۔ بخاری شریف میں کتاب الانبیاء باب حدیث الخضر مع موسیٰؑ میں اس نوجوان کا نام یوشع بن نون بتایا گیا ہے۔ اہل کتاب ان کے نبی ہونے پر متفق ہیں۔

(۲) شمویلؑ۔ سورۂ البقرہ کی آیت ۲۴۶ میں "إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا" میں جس نبی کا ذکر ہوا ہے وہ شمویلؑ ہیں، جیسا کہ مفسرین کی نقل کردہ بہت سی روایات سے ثابت ہے۔

(۳) حزقیلؑ۔ سورۂ البقرہ کی آیت ۲۴۳ "أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ" میں جس واقعہ کی

طرف اشارہ ہوا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ، امام رازی اور علامہ آلوسی نے سلف الصالحین سے کئی روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق حزقیلؑ کی نبوت کے زمانے سے ہے۔ عبرانی زبان میں حزقی (حزق) کے معنی ہیں قدرت اور ایل کے معنی ہیں اللہ یعنی اللہ کی قدرت۔

(۴) حضرت عزیرؑ۔ قرآن شریف میں ایک مرتبہ عزیر کے نام کا ذکر آیا ہے۔ اگرچہ ان کی نبوت کا ذکر نہیں ہے۔" وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ ﴿التوبة:۳۰﴾، یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ جمہور کا قول ہے کہ عزیر نبی تھے۔

(۵) حضرت خضرؑ۔ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ کی جس بندۂ خدا کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہے۔ بخاری شریف میں اس کا نام خضر بتلایا گیا ہے۔ جو جمہور محدّثین کے پاس عموماً (اور صوفیاء کے پاس خصوصاً) اللہ کے نبی تھے۔

اس اعتبار سے قرآن شریف میں ۳۰ (تیس) انبیاء کا ذکر آیا ہے، ۲۵ کا نام کے ساتھ اور ۵ کا نام لئے بغیر۔

اولیاء اللہ اور حضرت مہدی علیہ السلام

(۱) روایت ہے کہ ایک پیر اور ایک مرید مکہ معظمہ جارہے تھے (راستہ میں دریا حائل ہوا) پیر پانی پر مصلیٰ بچھا کر چلنے لگا اور مرید سے کہا آمصلّے پر کھڑا ہو جا میں خدا کہتا ہوں تو پیر کہہ۔ مرید نے بھی خدا کہا تو ڈوبنے لگا۔ پھر پیر نے کہا پیر کہہ۔ تو پھر مرید نے پیر کہا۔ پانی کے اوپر آگیا۔ یہ نقل صحابہؓ نے حضرت مہدی علیہ السلام کے حضور عرض کی حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا، اچھا نہیں کیا، کیوں ڈوبنے نہ دیا (پیر پیر کہہ کر بچنے سے) خدائے تعالی کے نام سے ڈوب جاتا تو شہید ہوتا۔

(۲) حضرت سید عبدالقادرؒ نے فرمایا کہ تمام اولیاءؒ کی گردنوں پر میرا پاؤں ہے (قدمي هذه على رقبة كلِّ وليٍّ) یہ نقل صحابہؓ نے مہدی کے حضور پیش کی۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ سید عبدالقادر بچے تھے۔ اپنی باطنی قوت کو ہضم نہ کر سکے۔ کیوں ایسا نہ کہا کہ تمام اولیاء کا قدم ہماری گردن پر ہے۔ (اس میں نیستی کا اظہار ہے)

(۳) حضرت مہدی علیہ السلام گلبرگہ آئے، حضرت سید محمد گیسو درازؒ کی روح مبارک تین فرسنگ کے فاصلے سے حضرت مہدیؑ کے پاس آئی۔ اور مہدی علیہ السلام کو جوتیوں سمیت گنبد میں لے گئی اور کہا کہ قبر پر چڑھ کر آئیے اور بندہ کی خطا معاف کیجئے کیوں کہ میں نے جذبہ کی حالت میں مہدی (موعود) ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ تھوڑی دیر گفتگو ہوئی اسکے بعد حضرت مہدی علیہ السلام گنبد سے باہر آئے اور شمال کیطرف اشارہ کرکے فرمایا کہ دوزخ کی گرمی بہت آتی ہے۔

(۴) حضرت مہدی علیہ السلام شاہ عالمؒ کے روضے میں آئے اور فرمایا "عشق کی بو آتی ہے"

(۵) نیز فرمایا کہ بھائی سید منجھلے عاشق تھے

(۶) حضرت مہدی علیہ السلام شیخ احمد کھٹوؒ کے روضے میں آئے تو فرمایا "یہاں زہد کی بو آتی ہے"

(۷) روایت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام دولت آباد آئے اور شیخ مومن کے روضے میں قیام فرمایا اور فرمایا ان کا نام سید محمد عارف ہے اور فرمایا دکن کی سرزمین منحوس ہے۔ پھر حضرت تلنگانہ کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا عشق کے بغیر یہ زمین جل گئی ہے واپس ہوگئے اور تلنگانہ نہیں گئے اور بیجاپور کی طرف روانہ ہوئے۔

(۸) حضرت مہدی علیہ السلام شہر بیدر تشریف لیگئے۔ شیخ مومنؒ نے حضرت مہدی علیہ السلام سے ملاقات کی اور اپنے حجرے میں لیجا کر بہت خدمت اور ضیافت کی۔ اس کی بعد پانی گرم کرکے غسل کروایا۔ شیخ نے کہا میراں جی بندہ اپنے ہاتھ سے خوندکار کا بدن دھوتا (مسلتا) ہے۔ حضرت مہدیؑ نے جان لیا کہ شیخ مہر ولایت دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہذا آپ نے کپڑا اٹھا کر

مہرولایت دکھائی۔ حضرت مہدی موعودؑ نے شیخ سے فرمایا۔ تم کامل متوکل ہو، اس کے بعد شیخؒ نے حضرت مہدیؑ کی تصدیق کی، شیخ نے فرمایا اگر خدائے تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا، اے مومن تو کیا لایا؟ تو میں کہوں گا کہ یہ دو آنکھیں لایا ہوں، کہ ان دنوں آنکھوں سے مہرولایت میں نے دیکھی ہیں۔

(۹) حضرت مہدی علیہ السلام جھٹکے پر سوار ہو کر دولت آباد پہنچے۔ تمام اولیاء کی زیارت کی ایک مقام پر قدم مبارک کی ایڑی زمین پر ٹیک کر چل رہے تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ خوندکار کیوں اس طرح چل رہے ہیں تو مہدیؑ نے فرمایا۔ یہاں بہت سے اولیاء اللہؒ ہیں اس کے بعد حضرت مہدیؑ نے ایک جگہ کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھا صحابہؓ نے پوچھا میراں جی یہاں کون ہے۔ حضرت مہدیؑ نے فرمایا یہاں دو اولیاء اللہؒ ایسے کامل ہیں کہ اگر ان کا فیض عالم میں ظاہر ہوتا تو یہاں کے لوگ شیخ برہان الدینؒ اور شیخ زین الدینؒ کی خدمت نہ کرتے۔ تمام لوگ اسی جگہ خدمت کرتے۔

(۱۰) حضرت مہدی علیہ السلام شیخ المعظمین کے روضے میں پہنچ کر اول مرتبہ شیخ برہان الدینؒ کی زیارت کی اسکے بعد شیخ زین الدینؒ کی زیارت کی۔ صحابہؓ نے عرض کیا پیر و مرید کے درمیان فرق ہے؟ مہدیؑ نے فرمایا طالب اور مرشد میں جو فرق ہے وہی ان میں فرق ہے۔

(۱۰) نیز صحابہؓ نے پوچھا کہ بندگی سید راجوؒ اور حضرت سید محمد گیسو درازؒ کے درمیان فرق ہے؟۔ تو مہدیؒ نے فرمایا باپ اور بیٹے کے درمیان جو فرق ہے وہی فرق ان میں ہے۔

(۱۱) روایت ہے کہ بایزید بسطامیؒ نے فرمایا بارہ سال ہوئے بایزید کو بایزید ڈھونڈھتا ہے۔ نہیں دیکھا، صحابہ مہدی نے حضرت مہدیؑ کے حضور میں عرض کیا کہ بایزیدؒ نے ایسا کہا حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا۔ ڈھونڈھنے والا تھا، اگر ڈھونڈھنے والا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔

(۱۲) روایت ہے کہ کسی نے حضرت مہدیؑ کے حضور میں عرض کیا کہ ایک ولی اللہ نے فرمایا بارہ سال نفس نے خربوزہ طلب کیا۔ انہوں نے نہیں دیا حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا اگر خدائے تعالیٰ نے بے واسطہ دیا تو کیوں نہیں کھایا۔ خطرہ کی نفی ہو جاتی۔ خدا کی یاد میں مشغول ہو جاتا کس لئے بارہ سال ایک خطرہ کی قید میں رہا۔

(۱۳) روایت ہے کہ ابن عربیؒ نے فرعون کی بحث میں ملاؤں کو عاجز کیا۔ یہ قصّہ صحابہؓ نے مہدیؑ کے حضور میں عرض کیا مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ ابن عربیؒ نے ملاؤں کے علم کے گمان کو رد کیا۔ وہ گمان یہ کہ فرعون ناجی ہے۔ ملّا اندھے ہو گئے تھے۔ اور نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے حق میں اپنے کلام میں خبر دی ہے۔ فَأَخَذَهُ اللَّـــهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ﴿النازعات: ۲۵﴾ پس اللہ نے اسکو (فرعون کو) دنیا اور آخرت کے عذاب میں دھر پکڑا۔

(۱۴) کسی نے حضرت مہدی علیہ السلام کے حضور میں عرض کیا کہ ابن عربیؒ نے فرمایامیں فرعون کو دوزخ میں نہیں دیکھا۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا خدائے تعالیٰ فرماتا ہے النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ﴿غافر:۴۶﴾ یعنی گھیر لیا فرعون والوں کو آگ نے۔ حاضر کئے جاتے ہیں آتش دوزخ پر صبح وشام۔ ابن عربی کو دوزخ کی سیر درمیانی تھی۔ مرد خدا تھا اس لئے حق کہا۔

(۱۵) روایت ہے کہ صحابہؓ نے مہدی علیہ السلام کے حضور عرض کیا ابن عربیؒ نے فرمایا عرش سے فرش تک ایک شئ ہے۔ سید محمد گیسو درازؒ نے فرمایا ذات وراء الوریٰ ہے۔ اگر ابن عربی ہمارے زمانے میں ہوتے تو میں مسلمان کرتا۔ حضرت مہدیؑ نے فرمایا ابن عربیؒ توحید کے پہلوان تھے۔ سید محمدؒ نے ان کے کلام کو نہیں سمجھا۔ ابن عربیؒ کے پاس سید محمدؒ ایسے ہیں جیسا کہ ایک شیر خوار (بچہ) بزرگ کے پاس۔

(۱۶) روایت ہے کہ ابن عربیؒ نے کہا حق محسوس ہے اور خلق موہوم ہے۔ سید محمد گیسو درازؒ نے کہا حق موہوم ہے اور خلق محسوس ہے اگر ابن عربی ہمارے زمانے میں ہوتے تو (میں) ان کو مسلمان کرتا۔ صحابہؓ نے یہ بات حضرت مہدیؑ کے حضور میں پیش کی حضرت مہدیؑ نے فرمایا ابن عربی توحید کے پہلوان تھے۔ سید محمدؒ نے ان کے کلام کو نہیں سمجھا۔ ابن عربیؒ کے پاس سید محمد ایسے ہیں جیسا کہ ایک شیر خوار، بزرگ کے پاس۔

(۱۷) روایت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ بعضے اولیاء کی طبیعت سانپ اور بچھو کی جیسی تھی کیوں کہ جو شخص سانپ اور بچھو کو مارنے کی کوشش کرتا ہے یا ایذاء دیتا ہے تو وہ اسی وقت اسکو کاٹتے ہیں۔ بعضے اولیاء ایسے تھے کہ کسی شخص نے ان کو تکلیف دی تو ااس پر بددعا کا تیر چلائے۔ پیغمبروں اور اولیاء کا طریق مچھلیوں کی طرح تھا۔ مچھلی کو (سمندر یا دریا میں) کوئی شخص تکلیف دیتا ہے تو خود اس سے دور ہو جاتی ہے اور اسکو پریشان نہیں کرتی۔ اسی طرح پیغمبر اور اولیاء کامل تکلیف کو نہ صرف برداشت کرتے بلکہ تکلیف دینے والے کی بخشش چاہتے ہیں۔

(۱۸) کسی نے حضرت مہدی علیہ السلام کے حضور میں عرض کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردہ کو زندہ کرتے وقت فرماتے قُم باذن الله (اُٹھ اللہ کے حکم سے) اور عین القضاۃ ہمدانی نے مردے کو زندہ کرتے وقت فرمایا "قم باذني" یعنی اٹھ میرے حکم سے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا اگر وہ عیسیٰ علیہ السلام ہوتے تو قُم باذن الله کہتے۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام تمام فنا (فی اللہ) ہو گئے تھے اسی لئے قُم باذن الله کہا اور عین القضاء کو تمام فنا نہیں تھی اس لئے قم باذنی کہا۔

اعتراضات اور ان کے جوابات

شکر خاتون کے دائرہ سے روگردانی اور فرمانِ مہدی موعودؑ پر اعتراض

"وہ خدا سے روگردان ہو کر جارہے ہیں اگر خداوند تعالٰی قوت دے تو جو کچھ بھی ان کے پاس ہے مار کر حاصل کرلوں" انصاف نامہ باب ہشتم میں یہ روایت آئی ہے یہ روایت طویل ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس روز شکر خاتون اور کچھ لوگ کاہہ علاقہ ٹھٹھہ سے واپس (اپنے وطن کی طرف ہوئے حالانکہ انہوں نے مہدیؑ کے ساتھ ہجرت کی تھی اور بلا اجازت وطن واپس ہوگئے تھے) حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ کے پاس انہوں نے کچھ رقم کشتی میں سوار کرنے کے لئے دی تھی۔ بھولے سے اس رقم میں سے دوڈوگرے (نام سکہ) ان کے پاس رہ گئے تھے۔ جب جیب میں ہاتھ ڈالا تو ان سکوں کی حرکت سے معلوم ہوا کہ وہ رہ گئے ہیں۔ جب بندگی میاں شاہ نظامؓ نے ان سکوں کو واپس کرنے کے لئے پھر ان کے پاس جانا چاہا تو مہدیؑ نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو۔ جب حضرت بندگی شاہ نظام نے واقعہ بیان کیا تو حضرت مہدیؑ نے فرمایا وہ دوپیسے کھالو۔ اگر خداوند تعالٰی پوچھے ہمارا دامن پکڑلو۔ وہ خدا سے روگردان ہو کر جارہے ہیں اگر خداوند تعالٰی قوت دے تو جو کچھ بھی ان کے پاس ہے مار کر حاصل کرلوں۔

اسکی تشریح صاحب انصاف نامہ نے باب چہارم میں اسطرح فرمائی ہے "اگر امــــر شود" یعنی اگر اللہ حکم دے۔ یہ لوگ مہدیؑ کے ساتھ ہجرت کرنے کے بعد بغیر آپ کی اجازت کے گجرات کی طرف واپس ہوئے تھے۔ تو حضرت مہدیؑ نے اللہ کے فرمان کی بناء پر ان پر منافقین کا حکم لگایا۔ بعد میں اللہ نے توفیق دی اور انہوں نے بندگی میاں سید خوندمیرؓ کے حضور میں رجوع اختیار کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی ایک جماعت نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ بعد کو اس جماعت نے ہجرت سے انحراف کیا اور (کسی بہانے سے) مکہ معظمہ واپس ہوگئے چنانچہ محمد بن جریر طبری نے آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ ﴿النساء:٨٨﴾ کے ذیل میں مجاہد سے یہ روایت کی ہے۔ ترجمہ: کہا کہ ایک جماعت مکہ سے نکل کر مدینہ آئی ان کو مہاجر ہونے کا زعم تھا اس کے بعد اپنے خیال سے پلٹ گئے نبی ﷺ سے اجازت نہیں مانگی۔ تاکہ وہ اپنا سرمایہ لائیں جس سے وہ تجارت کریں۔ مومنین نے ان کے باب میں اختلاف کیا کوئی کہتا کہ وہ منافق ہیں اور کوئی کہتا کہ وہ مومن ہیں۔ پس اللہ ان کا نفاق بیان کردیا اور ان سے قتال کرنے کا حکم دیا۔

معالم التزیل میں یہ اضافہ ہے "وہ مدینہ سے اسطرح نکلے گویا سیر و تفریح کے لئے جارہے ہوں۔ یہاں تک کہ مدینہ

سے دور ہوگئے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو لکھا کہ ہم لوگ جس ایمان کے ساتھ آپؐ سے جدا ہوئے تھے اس ایمان پر اب بھی باقی ہیں۔ مدینہ سے ہم گھبر اگئے۔ اور اپنی سرزمین (مکہ) کے ہم مشتاق ہوئے۔ پھر یہ لوگ اپنی تجارت کے سلسلے میں ملک شام کو روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی۔ بعض مسلمانوں نے کہا ہم نکل کر ان کو مار ڈالیں اور جو ان کے پاس ہے وہ لے لیں۔ کیوں کہ وہ دین سے پھر گئے ہیں۔ اور ایک جماعت نے کہا تم ایسے لوگوں کو جو تمہارے دین پر (ہونے کا اقرار کررہے) ہیں اس بناء پر کیسے قتل کروگے کہ انہوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا نہیں اور یہ رسول اللہ ﷺ کی نظروں کے سامنے پیش آیا اور آپؐ خاموش رہے۔ فریقین میں سے کسی کو آپؐ روکتے نہیں تھے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

البتہ تفسیر کشاف میں یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے بادیہ (شہر سے باہر) کی طرف جانے کی اجازت چاہی مدینہ کی آب و ہوا کا حیلہ کر کے جب یہ مدینہ سے نکلے تو منزل بہ منزل چلتے ہی رہے یہاں تک کہ مشرکین سے جاملے۔ اس قسم کی اور بھی روایتیں کتب تفسیر میں آئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے سکوت اختیار کیا تھا۔ البتہ مسلمانوں میں اس باب میں دو گروہ ہوگئے تھے تو اللہ نے یہ حکم نازل فرمایا: فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّـهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿نساء:۸۹﴾۔ سو ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں اور اگر وہ اعراض کریں تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ اور ان میں سے کسی کو نہ دوست بناؤ نہ مددگار۔

یہی حال شکر خاتون اور قاضی خاں وغیرہ لوگوں کا تھا کہ انہوں نے حالات کے تحت ہجرت کی تھی پھر ہجرت سے انحراف کیا تھا۔ اس بناء پر مہدیؑ نے ان کے تعلق سے جو فرمایا وہ کلام اللہ کے مطابق ہے۔ جب ان کا پکڑنا۔ ان کو قتل کرنا قرآن کی رو سے حلال ہوا تو ان کا مال بھی ضبط کرنا حلال ہی ٹھہرا۔

اب رہی یہ بات کہ کیا ہجرت ہر زمانہ میں فرض ہے؟ تو اس کا جواب ہجرت کے عنوان کے تحت دیا جاچکا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمایئے کہ اسباب ہجرت جہاں پیدا ہوجائیں تو اس مقام سے ہجرت کرنا فرض ہے۔ مطلق ہجرت قیامت تک باقی ہے۔ البتہ مخصوص ہجرت منقطع ہوچکی ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی نے مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ ﴿الأنفال:۷۲﴾ کے ذیل میں یہ روایت لکھی ہے۔ ترجمہ: حسن نے کہا کہ ہجرت ہمیشہ کے لئے غیر منقطع ہے اب رہا رسول اللہ کا قول لا هجرة بعد الفتح (یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے) تو اس سے ہجرت مخصوصہ مراد ہے اس لئے کہ وہ ہجرت یعنی مکہ سے مدینہ کی طرف۔ ہجرت فتح مکہ کے بعد منقطع ہوگئی۔

مہدویوں کا عیسیٰؑ سے ملاقات کرنا۔

انصاف نامہ میں ایک روایت آئی ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام سے پوچھا گیا کیا یاران مہدی عیسیٰؑ سے ملاقات کریں گے تو مہدیؑ نے جواب دیا کہ بعض لوگ ملاقات کریں گے۔ سوال تھا کہ کیا یاران مہدی، عیسیٰؑ سے ملاقات کریں گے، جواب میں مہدیؑ نے فرمایا(ہاں) بعض کسان مہدی (مہدی کے بعض لوگ) ملاقات کریں گے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان روایتوں سے اصحاب مہدی کے زمانے میں عیسیٰؑ کا نازل ہونا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ ابھی تک عیسیٰؑ نازل نہیں ہوئے۔

اعتراض کرنے والے ''یاران مہدی'' یعنی مہدی کے اصحاب اور ''بعضے کسان مہدی'' بعض مہدوی لوگ'' میں یا تو فرق نہیں کرسکے ہیں یا جان بوجھ کر فرق کرنا نہیں چاہتے ہیں۔

حدیث میں تو صاف آیا ہے مہدی وسط امت میں ہوں گے اور عیسیٰؑ آخر امت میں ہوں گے۔ تو اس حدیث کی رُو سے تو دونوں کا زمانہ الگ الگ ہو گیا اب جو مہدیؑ نے فرمایا اسکی حیثیت پیشین گوئی کی ہے۔ یعنی جب عیسیٰؑ آئیں گے تو اس وقت ہمارے بعض لوگ یعنی مہدوی عیسیٰؑ سے ملاقات کریں گے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہدوی نزول عیسیٰؑ کے وقت تک بھی باقی رہیں گے۔ چنانچہ دوسری روایت میں مہدیؑ نے فرمایا ''کسان ماتا قائم قیامت باشند'' یعنی ہمارے لوگ قیامت قائم ہونے تک رہیں گے۔ اور ایک روایت میں ہے ''میرے لوگ عیسیٰؑ سے ملاقات کریں گے اور میرا فیض قیامت تک رہیگا۔ کیا میرے لوگ اور میرے اصحاب میں کچھ فرق نہیں ہے۔ مہدیؑ نے فرمایا میرے بعض لوگ عیسیٰؑ سے ملاقات کریں گے یہ نہیں فرمایا میرے صحابہ عیسیٰؑ سے ملاقات کریں گے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عیسیٰؑ کے تعلق سے فرمایا: كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيكُمْ۔۔الخ۔ ترجمہ: تمہارا کیا حال ہو گا جبکہ عیسیٰ ابن مریم تم میں نازل ہوں گے۔

اس حدیث میں تو ''أَنْتُمْ'' اور ''فِيكُمْ'' یعنی تمہارا حال ''اور تم میں'' الفاظ آئے ہیں۔ کیا اس بناء پر کوئی عیسائی یہ کہہ سکتا ہے کہ تمہارے رسول نے تو یہ فرمایا تھا کہ تم میں ''عیسیٰ نازل ہوں گے حالانکہ صحابہ جن سے رسول اللہ ﷺ نے خطاب فرمایا تھا، گذر گئے ان کے زمانے میں تو عیسیٰؑ نہیں آئے۔ اسی طرح کی ایک روایت بھی آئی ہے يُوشِكُ مَنْ عَاشَ مِنْكُمْ أَنْ يَلْقَى عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ۔ ترجمہ: تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا قریب ہے کہ وہ عیسیٰ بن مریمؑ سے ملاقات کرے گا۔

پس رسول اللہ ﷺ کے احادیث مبارکہ کی جو توجیہ کی جائے گی فرمان مہدیؑ کی بھی وہی توجیہ ہو گی۔ گویا یوں سمجھو

کہ فرمان مہدیؑ حدیث رسول اللہ کا ترجمہ ہے۔ ان دونوں اللہ کے خلیفوں کو خدا کی طرف سے یہ بات معلوم کروادی گئی تھی کہ عیسیٰؑ قرب قیامت نازل ہوں گے۔ مطلب یہ کہ آپ کے پیرو عیسیٰؑ کے نزول تک دنیا میں رہیں گے۔

نزول عیسیٰؑ نزدیک ہے۔

روایت ہے کہ بندگی میاں سید خوندمیرؓ نے فرمایا کہ آج رات میں کامل توجہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اپنی آنکھوں سے حضرت میرانجی کو دیکھ رہا تھا میں نے پوچھا میرانجی حضرت عیسیٰؑ کس وقت آئیں گے میرانجی نے فرمایا نزدیک۔ میں نے پوچھا کیا آپ کے ساٹھ سال بعد آئیں گے فرمایا نزدیک۔ پھر میں نے پوچھا آپ کے پچاس سال بعد آئیں گے فرمایا نزدیک۔ پھر پوچھا چالیس سال بعد آئیں گے فرمایا نزدیک پھر پوچھا تیس سال بعد آئیں گے فرمایا نزدیک۔ یہ حضرت عیسیٰؑ موجود ہیں پوچھ لو' میاں نے فرمایا میں نے حضرت عیسیٰؑ سے بہت سی باتیں پوچھیں یہ پوچھنا بھول گیا آپ کب تشریف لائیں گے۔

معترضین نے اس روایت پر بھی اعتراض کرتے ہوئے اسکو بد خلقی قرار دیا ہے۔ یہ معاملہ اور کشف کی بات ہے۔ دوسری بات یہ کہ بندگی میاں کے بار بار پوچھنے پر جواب ایک ہی تھا نزدیک یہ جواب قرآن اور حدیث کے مطابق ہے۔ کیونکہ قیامت کے بارے میں بار بار پوچھنے پر بھی اللہ نے یہی جواب دیا ہے چنانچہ قرآن میں آیا ہے لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿الشوریٰ:۱۷﴾ شاید کہ قیامت نزدیک ہے (۲) لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ﴿الاحزاب:۶۳﴾ شاید کہ قیامت نزدیک ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ، وَقَرَنَ بَيْنَ إِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطَى" (صحیح مسلم) یعنی میں اور قیامت اسطرح مبعوث ہوئے ہیں یہ کہتے ہوئے آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا دیا۔ جس طرح قرآن میں اور حدیث میں قیامت کو نزدیک کہا گیا ہے اسی مفہوم میں مہدیؑ نے بھی نزول عیسیٰؑ کو "نزدیک" کہا ہے۔ اس پر اعتراض کیسا؟

اس پر وہی اعتراض کر سکتا ہے جو قرآن و حدیث سے نابلد ہے۔

امامؑ کی پیشین گوئی

روایت ہے کہ قاضی اور خطیب نے سامنے آکر پوچھا کہ تولد خوندکار کس روز ہوا۔ اور دعویٰ خوندکار کس روز اور موت خوندکار کی کس روز ہے فرمایا دوشنبہ۔

اس پر ایک معترض نے اعتراض کیا ہے کہ مطلع الولایت وغیرہ میں آپ کی وفات روز پنجشنبہ ہے لہٰذا پیش گوئی غلط

ہے اور دوسرا یہ کہ اس طرح کی پیشین گوئی "وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ" ﴿لقمان:۳۴﴾ (اور کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کھائے گا اور نہیں جانتا کوئی نفس کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا) کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے روزِ وفات کے بارے میں تمام کتب سیر کا اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے پاس کی کتب سیر میں آپ کی رحلت کی تاریخ کے بارے میں اتفاق ہے کہ آپ کی رحلت ۱۹/ ذی قعدہ ۹۱۰ھ کو ہوئی۔ البتہ دن کے متعلق اختلاف ہے۔

قدیم ترین کتاب سیر مولود میاں عبدالرحمان (سال ولادت ۹۰۸) میں آپ کی رحلت کا دن دوشنبہ ہے۔ البتہ دوسری کتاب میں تاریخ تو وہی ۱۹/ ذی قعدہ ۹۱۰ھ ہے لیکن دن پنجشنبہ آیا ہے۔ اور یہ اختلاف کوئی نیا نہیں ہے۔ آنحضرت خاتم نبوت ﷺ کی وفات کے دن اور تاریخ دونوں کے بارے میں کتب سیر میں اختلاف موجود ہے۔ چنانچہ صاحب اشعۃ اللمعات نے ابن جوزی کے حوالے سے لکھا "ابن جوزی در کتاب الوفا گفتہ کہ ابتداء مرض در شہر صفر بودہ کہ دوشب از آں ماندہ بود، وفات وے دوازدہم ربیع الاول بود" یعنی ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں بیان کیا ہے کہ مرض کا آغاز صفر کے مہینے میں ہوا تھا جبکہ صفر کا مہینہ ختم ہونے میں دو راتیں باقی تھیں۔ اور آپ کی وفات ۱۲/ ربیع الاول کو ہوئی۔

سلیمان تیمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلیمان ہیتمی جو ثقات سے ہیں بہ طور جزم بیان کیا ہے کہ مرض کی ابتداء ۲۲ صفر روزِ شنبہ سے ہوئی اور وفات ۲ ربیع الاول پیر کے دن ہوئی اور اسی قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ ربیع الاول کی دوسری تاریخ کو پیر کا دن ہوا تو ۱۲ ربیع الاول کو جمعرات کا دن ہو گا۔ اس لحاظ سے تاریخ کے اختلاف کے ساتھ دن کا اختلاف بھی ہو گا۔

برخلاف اسکے کتب مہدویہ میں تاریخ کا اتفاق ہے۔ صرف دن کے بارے میں اختلاف ہے۔ جب روایت میں اختلاف ہو تو راویوں کے اختلاف کی بناء پر پیشین گوئی کرنے والے کے خلاف حجت قائم کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

اب رہی یہ بات کہ موت کے دن کی پیش گوئی مَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ (یعنی کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا) کے خلاف نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آیت میں مکان کی نفی کی گئی ہے زمان کی نہیں۔ یعنی کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ کہاں مرے گا۔ یہ نہیں کہ کب مرے گا۔

ہاں جن اہل اللہ کو اللہ کی جانب سے ہی بتلا دیا گیا ہو تو وہ الگ بات ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رحلت کی خبر پہلے سے ہی دے دی تھی۔ چنانچہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دورانِ خطبہ فرمایا۔

"ایها الناس اسمعوا منّي أُبيّن لكم فاني لا ادري لعلى لا القاكم بعد عامي هذا في موقفي هذا "(العقد الفرید، جزو ثانی صفحہ ۵۷)۔ ترجمہ: اے لوگو سنو مجھ سے، تمہارے لئے بیان کرتا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ شاید تم سے اس سال کے بعد نہ مل سکوں اسی جگہ پر۔ کیا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد قرآن کی مندرجہ بالا آیت مَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ کے خلاف ہوگا؟؟

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر یہ صراحت فرمادی ہے کہ مدینہ میرا مدفن ہوگا۔

(۱) چنانچہ سیوطی نے لکھا ہے:اخرج ابو نعیم عن معقل بن یسار قال قال رسول ﷺ المدينة مهاجري و مضجعي من الأرض۔ ترجمہ: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ مدینہ میری ہجرت کی جگہ اور وہ میری (ابدی) لیٹنے کی جگہ ہے۔

(۲) زبیر بن بکر نے اخبار مدینہ میں حسنؓ سے روایت کی ہے کہ رسول للہؐ نے فرمایا"المدينة مهاجري و بها وفاتي و منها محشري واخرج ایضاً "یعنی مدینہ میری ہجرت کی جگہ ہے اور مدینہ میں میری وفات ہوگی اور مدینہ سے میرا حشر ہوگا۔

(۳) اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی خبر دی ہے کہ آپ کا مدفن مسجد نبوی سے قریب ہوگا۔ چنانچہ آپ نے معاذ سے فرمایا۔یا معَاذ انك عسي ان لا تلقاني بعد عامي هذا و لعلّك ان تمّر بمسجدي هذا و قبري (اشعۃ للمعات جلد رابع صفحہ ۴۰۸)۔ ترجمہ: اے معاذ تحقیق کہ تم اس سال کے بعد مجھے نہ پاؤ گے اور شاید کہ تمہارا گذر ہو میری اس مسجد اور میری قبر پر سے۔

اب کیا کوئی رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کر سکتا ہے کہ آپ نے آیت کے خلاف مدینہ میں اپنی وفات ہونے کے بارے میں کیوں خبر دی؟؟

خلاصہ یہ کہ امامنا مہدیؑ کے روزِ حلت کے بارے میں دو روایتیں آئی ہیں۔ تو اختلاف روایت کے ہوتے ہوئے اعتراض کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے جسطرح رسول اللہ ﷺ کی تاریخ رحلت کے بارے میں اختلاف آیا ہے۔ بعض دو ربیع الاوّل کہتے ہیں اور بعض بارہ ربیع الاوّل امامنا مہدیؑ نے شہر مانڈو میں رسول اللہ ﷺ کا عرس دو ربیع الاوّل کو کیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے پاس یہی تاریخ قطعی ہے۔ عام طور پر رسول اللہ ﷺ کی تاریخ ولادت ۱۲ ربیع الاوّل ہی مشہور ہے۔ دفاتر میں چھٹی

اس تاریخ کو دی جاتی ہے لیکن علماء ندوہ اور علماء دیوبند نے ۹ ربیع الاوّل کو آپ کی تاریخ ولادت بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو قصص الانبیاء۔

مہدی موعودؑ نے اپنے بعض اصحاب کو بعض آیات کا مصداق قرار دیا

یہ اعتراض کہ مہدی موعودؑ نے اپنے بعض اصحاب کو بعض آیات کا مصداق قرار دیا ہے۔ اس کو بعض معترضین نے تحریف معنوی قرار دیا ہے۔ یہ اعتراض صرف اعتراض ہے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس اعتراض کو موکّد کرنے کے لئے یہ کہنا کہ اس آیت کا شان نزول ہی کچھ اور ہے۔ اور جس زمانے میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں اس وقت ان لوگوں کا وجود بھی ان کے ماؤں کی ماؤں کے پیٹ میں بھی نہیں تھا، حد درجہ کمینگی کا مظاہرہ ہے۔ اور اس سے بڑھ کر علمی اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن فہمی سے ان کی کوسوں دوری ثابت ہوتی ہے۔ شان نزول کے بارے میں جو روایات آتی ہیں وہ اپنی جگہ بر حق۔ لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ بس اس کا مقصد یہی فرد یا جماعت ہے کیا غلط نہیں ہے۔ مقصد اور ہے اور سبب اور ہے۔ شان نزول کسی ایک سبب کی وجہ سے کسی ایک فرد، کسی ایک جماعت کے متعلق اس وجہ سے ہوتا ہے کہ آیت کے نزول کے وقت وہ حالات اور کیفیات اس وقت موجود تھے۔ پس ان حالات اور کیفیات کی مطابقت و مشابہت جس فرد یا جماعت میں پائی جائے گی اسکو اس کا مصداق قرار دینا، شان نزول کے خلاف نہیں کہا جاسکتا اور نہ اسکو تحریف کا نام دیا جاسکتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ قرآن میں جتنے احکام اور فضائل آئے ہیں وہ عام ہیں اور اوصاف کے ساتھ متصف ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ جس فرد میں یا جس جماعت میں وہ اعمال اور فضائل پائے جائیں گے وہ اس کے مصداق ہوں گے۔ اور چونکہ قرآن مطلق ہے اور قیامت تک کے لئے آیا ہے اسکو مطلق اور قیامت تک کے لئے باقی رکھنا ہی قرآنی اسپرٹ کے مطابق ہے۔

ہاں مفسرین نے اپنی طرف سے بعض آیتوں کو بعض افراد کے لئے مخصوص کیا ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ ایسے حالات اور کیفیات دوسرے مقام پر دوسرے وقت میں دوسروں میں نہیں پائے جاسکتے۔ اس کے علاوہ یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ جب عام مفسرین کسی آیت کا مصداق کسی فرد یا جماعت کو اپنی سمجھ اور رائے کے مطابق قرار دیں تو قبول لیکن مہدی موعودؑ جن کا مقصد ہی قرآن کا بیان کرنا ہے وہ اگر ان آیات میں موجود حالات اور کیفیات کے مطابق یا مشابہ کسی شخص کو یا جماعت کو پائیں اور اسکو یا ان کو ان آیات کا مصداق قرار دیں تو اس پر اعتراض ذیل میں اعتراضات کی چند مثالیں اور اس کا جواب دیا جاتا ہے۔

چنانچہ مہدیؑ نے وَالنَّجْمِ کی بعض آیتیں پڑھ کر فرمایا کہ میراں سید محمودؓ کے حق میں ہیں۔ (یہ روایت تذکرۃ الصالحین میں نہیں ہے) اس سے مراد صرف یہ ہو سکتی ہے کہ بندگی میراں سید محمود کو رسول اللہ ﷺ میں فنا حاصل ہے اور اس کے ذریعہ سیر نبوت کی بشارت دی گئی ہے۔ بندگی میاں سید خوندمیرؓ کے حق میں إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ پڑھنا بھی مروی ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ آپ کے فیض کی نہر جاری رہے گی اور اللہ کی راہ میں بدل مہدی کی حیثیت سے قربانی کا حق ادا کرتے ہوئے شہادت عظمٰی کا درجہ حاصل کریں گے۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کے حق میں اللَّـــهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ پڑھنے سے یہ مراد ہے کہ آپ کو فیض ولایت بلاواسطہ حاصل ہے۔ بندگی میاں سید خوندمیر کو سُلْطَانًا نَّصِيرًا کی بشارت دی گئی۔ اس کے معنی غالب نصرت کے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا۔ کہو وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ﴿الاسراء:۸۰﴾ کے معنی اے اللہ، بنادے میرے لئے غالب نصرت۔

اس لئے کہ لفظ سُلْطَانٍ قرآن شریف میں ۲۴ جگہ آیا ہے اور سُلْطَانًا گیارہ جگہ آیا ہے۔ لیکن کہیں بھی سُلْطَانٍ کے معنی بادشاہ یا صاحب سلطنت کے نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَنصُرُونَ اللَّـــهَ وَرَسُولَهُ ﴿الحشر:۸﴾ نصرت دیتے ہیں اللہ کو اور اسکے رسول کو۔ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔ چنانچہ تفسیر مدارک میں اسی آیت کے ذیل میں ہے۔ اي ينصرون دين اللّٰه و يعينون رســوله۔ اللہ کے دین کو نصرت دیتے ہیں اور اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ کلام اللہ سے ثابت ہے کہ اصحاب رسول، رسول اللہ ﷺ کے ناصر تھے۔ اب اگر بندگی میاں سید خوندمیر مہدیؑ کے اصحاب میں خاص تھے ناصر مہدی کہا جائے تو کیا اعتراض ہے؟

بندگی میاں سید خوندمیر کو حضرت امام مہدیؑ نے حَمَلَهَا الْإِنسَـــانُ ﴿الاحزاب:۷۲﴾ کی بشارت دی ہے۔ اس پر معترض نے نکتہ چینی کرتے ہوئے تین اعتراضات کئے ہیں۔

پہلا اعتراض یہ کہ امامؑ نے مذکورہ آیت میں یعنی إِنَّا عَرَضْـنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّـمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ۔ الخ۔
ترجمہ: ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر نازل کیا پس انہوں نے اسکے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور ایک انسان نے اسکو اُٹھالیا۔ بے شک وہ ظلوم و جہول ہے، السَّـــمَاوَاتِ سے مراد انبیاء الْأَرْضِ سے مراد اولیاء اور الْجِبَالِ سے

علماء مراد لی ہے اور یہ محاورۂ عرب کے خلاف ہے۔ ہم یہاں دو سوال پوچھتے ہیں پہلا یہ کہ کیا صرف اس مقام پر الفاظ قرآنی سے اسطرح مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ یا کہیں بھی صحیح نہیں ہے۔ اور دوسرا یہ کہ کیا اس قسم کا اعتراض صرف ہم سے متعلق ہے یا سب سے ہے۔

امر دوم کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی تفسیروں میں کئی مقامات پر اسی طرح کی مراد بتائی گئی ہے۔ چنانچہ اسی آیت میں سمٰوٰت سے مراد انبیاء، ارض سے مراد اولیاء اور جبال سے مراد علماء ہیں اس کا اظہار مفسرین نے اپنی تفسیروں میں کیا ہے، چنانچہ معترضین صرف تفسیر حسینی کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو اپنے اعتراض کا جواب مل جاتا۔

امر اول کے بارے میں جواب یہ ہے کہ صاحب کشاف نے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ کے تحت لکھا ہے "وسمی العلم كرسياً۔ اور علم کا نام کرسی رکھا۔ نیز صاحب مدارک نے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ کے ذیل میں لکھا ہے۔ اي علمه۔ یعنی کرسی سے مراد علم ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ذم پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ان الفاظ سے بشارت کیسے دی جا سکتی ہے۔ حالانکہ روح الارواح میں آیا ہے۔" ظَلُومًا جَهُولًا اینجا مدح است نہ ذم (ظلوم و جھول۔ یہاں تعریف ہے۔ ذم نہیں)

اس سے مراد یہ ہے (اس) انسان نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور وہ غیر حق سے جاہل تھا۔

یعنی جس بار کے اُٹھانے سے آسمان زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے تو انسان نے اپنے نفس کو نہیں دیکھا بلکہ امر خدا کو دیکھا اور اُٹھانے کی پاداش میں اس پر کیا گذرنے والا ہے اسکی پرواہ کئے بغیر اسکو اُٹھایا۔ یہ تھی اس کے انجام سے بے خبری۔ ملاحظہ ہو تفسیر حسینی،۔

تیسرا اعتراض یہ کہ امانت سے مراد قتال لیا گیا ہے۔ حالانکہ کتب مہدویہ میں امانت سے مراد رؤیت باری اور قتال ہر دو مراد ہیں تفصیل کے لئے دیکھئے "امانت کی تشریح۔

حضرت مہدی موعودؑ کا مدینہ قبر نبیؐ کی زیارت کو نہ جانا۔

یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب حضرت مہدی موعودؑ حج بیت اللہ کیلئے تشریف لیگئے، تو حج ادا کرنے کے بعد آپؑ نے زیارت النبیؐ نہیں کی۔ حالانکہ حضرت مہدی موعودؑ نے مدینہ جانے کیلئے اونٹوں کا کرایہ تک دے دیا تھا۔ مگر امام علیہ السلام

کو رسول اللہ ﷺ کی روح مبارک سے حکم ہوا کہ میں تمہارے ہی پاس ہوں مدینہ آنے کی ضرورت نہیں ہے فوراًہند کو واپس جاؤ، کیونکہ دعویٰ موکد اور حدود خراسان میں داخلہ کا وقت قریب آگیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسے وقت میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی یا نہیں؟ اس سوال کے جواب کو سمجھنے کیلئے اور عمل مہدی موعودؑ کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ زیارت کے معنی کیا ہے؟۔ زیارت کے معنی ملاقات کے ہیں، اور جب ملاقات ہوگئی تو مدینہ جانے کا کیا مطلب، زیارت سے مراد کیا قبر کی زیارت ہے؟ خواہ حضور ﷺ سے ملاقات ہو کہ نہ ہو۔ اس بارے میں احادیث دو قسم کے ہیں۔

(۱) من زارنی۔یعنی جس نے میری زیارت کی۔ (۲)من زار قبری۔یعنی جس نے میری قبر کی زیارت کی۔

جس کو عیاناًو مشافہۃً نبی ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہو، اسکو نبی کی قبر کی زیارت کی کیا حاجت ہے۔ اس کی مثال معراج کا واقعہ ہے۔ حضور ﷺ کو اولاً مسجد اقصیٰ لیجایا گیا۔ مسجد اقصیٰ کے اطراف و جوانب، دور و نزدیک تمام زیارت گاہیں ہیں، چنانچہ بی بی مریم کا گنبد، مسجد اقصیٰ سے باہر ہے، بیت اللحم حضرت عیسیٰؑ کی ولادت گاہ ہے جو دوسری طرف کسی قدر فاصلہ پر ہے۔ ابراہیم خلیل اللہؑ اور آپؑ کے خاندانی پیغمبروں، اسحاقؑ، یوسفؑ کے مزارات مسجد اقصیٰ سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہیں جس کا نام "خلیل الرحمان" ہے، دوسری طرف موسیٰؑ کی قبر تیس متل کے فاصلہ پر ہے، جسکو "موسیٰ نبی" کہتے ہیں۔ تمام سیر کا اتفاق ہے کہ شب معراج میں تمام پیغمبر جمع تھے اور حضور ﷺ نے تمام پیغمبرون سے ملاقات کی اور اپنی امامت میں دو رکعت نماز سب کو پڑھائی، وہاں پر جس کو "محراب محمد" کہا جاتا ہے۔ واقعہ معراج میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ "خاتم الانبیاء نے خلیل الرحمان، موسیٰ نبی، مرقد مریم وغیرہ کی زیارت کی، کیوں کہ جن پیغمبروں سے ملاقات عیاناًو مشافہۃً کرلی گئی، ہو تو پھر ان کے مرقدوں کی زیارت کیا معنی، یہاں بھی بعینہ یہی صورت ہے۔

(۱) نیز اہل دل، بیداری کی حالت میں ملائکہ اور ارواح انبیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان کی آواز سنتے ہیں، اور ان سے فوائد کا اقتباس کرتے ہیں (مواہب لدنیہ)

(۲) بلکہ بعض محدثین نے آنحضرت ﷺ سے احادیث مرویہ کی تصحیح کرلی ہے اور عرض کیا، یارسول اللہ، فلاں شخص نے یہ حدیث آپ سے روایت کی ہے، پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہاں یا نہیں" (مدارج النبوۃ)

من زار قبري بعد وفاتي كمن زارني في حياتي۔یعنی جس نے میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا اس

نے میری حیات میں میری زیارت کی۔

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ جس نے مجھ سے ملاقات نہیں کی، اگر اس نے میری قبر کی زیارت کی تو وہ سمجھ لے کہ اس نے گویا میری ہی زیارت کی، گویا اس باب میں اصل تو زیارت رسولؐ ہی ہے۔ جب زیارت رسول ہو جائے تو قبر کی زیارت کی کیا ضرورت ہے۔ حدیث میں جو آیا ہے "من حجّ البیت و لم یزرني فقد جفاني" یعنی جس نے حج بیت اللہ کیا اور میری زیارت نہیں کی تو گویا اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ مگر حضور مہدی موعودؑ نے زیارت رسول اللہ ﷺ مشافہۃً کرلی، ہاں قبر کی زیارت نہیں کی۔

اگر آنحضرت ﷺ یہ فرماتے کہ "من حج البیت و لم یزر قبري" تو البتہ بات قابل غور بھی ہو سکتی تھی۔ اور ایسا اس لئے نہیں فرمایا، کیونکہ حضور ﷺ کا مقصد قبر کی زیارت نہیں تھا بلکہ حضور کی زیارت تھی۔ مگر جہاں رسول اللہ ﷺ کا مقصد قبر کی زیارت تھا۔ وہاں قبر کا لفظ بھی استعمال فرمایا، چنانچہ

(۱) زَارَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَبر اُمّہِ۔ یعنی حضور ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی۔

(۲) نهیتکم عن زیارة القبور۔ یعنی میں نے تمھیں زیارت قبور سے منع کیا تھا۔

(۳) من زار قبر ابویه۔ یعنی جس نے اپنے ماں باپ کے قبروں کی زیارت کی۔

اس لحاظ سے "لم یزرني" کے معنی "لم یزر قبري" کے لینا صحیح نہیں ہے۔

کیا زید نے حج بیت اللہ کے سلسلے میں تمام ارکان کی بجا آوری کی، لیکن کسی وجہ سے قبر رسولؐ کی زیارت نہیں کی تو کیا اس کا حج نہیں ہو گا۔ ایک روایت میں ہے "ومن لم یزر قبري فقد جفاني" یعنی جس نے میری قبر کی زیارت نہیں کی تو گویا اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں پر حج کا ذکر نہیں ہے۔ اور جہاں حج کا ذکر ہے وہاں پر زیارت قبر کا ذکر نہیں ہے۔

ہاں ایک روایت میں ہے کہ جس کے پاس استطاعت ہے پھر بھی وہ میری زیارت نہ کرے تو اس نے مجھ پر جفا کی۔

اصل سوال تو باقی ہے کہ حج بیت اللہ تو فرض ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا حکم کیا ہے، فرض ہے؟ واجب ہے؟ یا مندوب ہے؟ اکثر علماء نے زیارت رسولؐ کو مندوب قرار دیا ہے چنانچہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ "و اکثر العلماء من السلف و الخلف علی ندبها دون وجوبها" ترجمہ سلف اور خلف کے علماء نے زیارت رسول اللہؐ کو مندوب کہا ہے نہ کہ واجب۔

استغفر اللہ ہمارا مقصد زیارت رسول ﷺ کا استخفاف نہیں ہے، ہمارا تو عقیدہ ہے کہ جس نے اللہ کے گھر کی زیارت کی اس کا ایمانی فرض ہے کہ وہ حضورؐ کی زیارت کی تمنا لیکر مدینہ جائے اور آپؐ کے قبر کی زیارت کرے۔ وہ شاید ہی شقی القلب ہوگا جس کے دل میں حضورؐ کی زیارت کا شوق چٹکیاں نہ بھرتا ہو، لیکن جس شخص کو مکہ ہی میں آنحضرت ﷺ کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہو چکا ہو۔ اور حضور ﷺ نے ہی ایک اہم دینی مقصد کے تحت اپنے حکم سے ایک دینی ضرورت کی تکمیل پر مامور کیا ہو تو اسکی یہ لازمی ذمہ داری، بلکہ اس کیلئے یہ فرض ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کرے۔ کیونکہ اطاعت خدا کی طرح اطاعت رسول بھی فرض ہے۔

ایسی ہی ایک روایت حضرت مولانا عبد الرحمان جامیؒ عاشق رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے آئی ہے، حضرت جامیؒ فارسی کے مشہور زمانہ شاعر تھے۔ اور حضور ﷺ کے عاشق صادق تھے۔

آپؒ نے حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد حضورؐ کی زیارت کی غرض سے مدینہ منوّرہ کا ارادہ فرمایا اور منزل بہ منزل قافلہ مدینہ منورہ کی طرف جانے لگا۔ آتش عشق بھڑکتی جارہی تھی۔ نگاہیں حضور کے روضہء انور کو دیکھنے کیلئے نہ صرف مشتاق تھیں بلکہ بے تاب تھیں۔ قافلہ مدینہ منورہ کے قریب پہنچا، حجاج کرام شب بسری کیلئے اپنے اپنے خیموں میں فروکش تھے۔ اچانک آپؒ نے دیکھا کہ سرکاری ہرکارے ہر خیمہ میں داخل ہو کر کچھ پوچھ رہے ہیں، کچھ دیر بعد وہ لوگ آپؒ کے خیمہ میں بھی آئے اور پوچھا کہ ”کیا اس خیمہ میں عبد الرحمان جامی نام کا کوئی شخص ہے؟“ یہ سن کر حضرت کو بے حد خوشی ہوئی کہ سب کو چھوڑ کر صرف مجھے کیوں پوچھا جارہا ہے؟ کیا میرے نام حضور ﷺ کا کوئی پیغام ہے؟ دل بلیوں اچھلنے لگا، آپؒ نے آگے بڑھ کر کہا کہ ”ہاں میرا نام عبد الرحمان جامی ہے، کیوں کیا بات ہے“ انہوں نے کہا کہ سربراہ مملکت کو حضور ﷺ کا یہ پیغام ملا ہے کہ اس قافلہ میں جو لوگ ہیں ان سب کو میرے پاس صلوٰۃ و سلام پڑھنے کیلئے آنے دو، سوائے عبد الرحمان جامی کے، ان کو میرے پاس آنے سے روک دو۔ یہ سنتے ہی حضرت جامیؒ کی حالت بگڑ گئی۔ ایک تو حضور ﷺ کے پاس جانے سے محرومی اور دوسرا سب کے سامنے پشیمانی، حضرت جامیؒ نے رو رو کر پوچھا کہ آخر مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے؟ کونسا ایسا جرم کیا ہے؟ کہ مجھے حضور ﷺ کی خدمت میں جانے سے روک دیا جارہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں، صرف ہم کو اتنا حکم ملا ہے کہ سب کو آنے دو، مگر جامی کو روک دو۔ جامیؒ نے بہت اصرار کیا، الحاح وزاری کی، منت و سماجت کی مگر ان ہرکاروں نے نہ مانا۔ علی الصبح قافلہ مدینہ کیلئے روانہ ہو گیا۔ اور حضرت جامیؒ اپنی قسمت پر اور اپنی محرومی پر افسوس کرتے رہ گئے۔ اور ناکام ہی روتے دھوتے اپنے وطن واپس آ گئے۔ سال بھر اسی طرح توبہ واستغفار، الحاح وزاری میں گذار دیا۔ پھر دوسرے سال آپؒ نے حج کا ارادہ فرمایا اور رخت سفر باندھا۔ فراغت حج کے بعد پھر مدینہ منورہ کیلئے اپنے معشوق کی زیارت کا جذبہ لیکر، قافلہ کے ہمراہ

ہوئے۔ دوسرے سال بھی مدینہ کے قریب اسی مقام پر وہی واقعہ پیش آیا۔ اور آپ بے نیل مرام ہی واپس آ گئے۔ مگر آپؒ نے ہمت نہیں ہاری۔ پھر تیسرے سال آپؒ نے حج کا ارادہ فرمایا، بعد حج آپؒ نے مدینہ کا رخت سفر باندھا اور اسی مقام پر وہی واقعہ پیش آیا۔ مگر آپؒ کے پوچھنے پر بتلایا گیا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ "یہ نہیں کہ میں اس سے ناراض ہوں، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے میری نعت میں ایک شعر لکھا ہے"

بہ سلام آمدم جوابم دہ　　　　مرہمے بر دل خرابم نہ

یعنی: (اے آقا) میں آپ کی خدمت میں سلام کا تحفہ لایا ہوں (آپ کی خدمت میں السلام علیکم یا رسول اللہ کہہ رہا ہوں) پس آپ مجھے میرے سلام کا جواب دیجئے۔ اور میرے زخمی دل پر مرہم رکھ دیجئے) اس کا یہ شعر مجھے بہت پسند آیا اور اس نے میرے عشق و فراق میں ڈوب کر اس انداز میں لکھا ہے کہ جب وہ میرے قدموں کے پاس کھڑا ہو کر یہ شعر پڑھیگا تو مجھے اپنا ہاتھ قبر سے باہر نکال کر جواب دینا پڑیگا، اس لئے اس کو روک دینے کا حکم دیا اور بس

ع۔ امور مملکت خویش خسرواں دانند

مہدی موعود جیسے آئے تھے اسی طرح گئے۔ کسی نے آپ کو نہیں پہچانا۔

حضرت بندگی میاں سید خوندیر صدیق ولایتؓ کی اس نقل پر اعتراض کیا ہے کہ آپ نے فرمایا مہدی موعود جیسے آئے تھے اسی طرح گئے۔ کسی نے آپ کو نہیں پہچانا۔ جیسا کہ پہچاننا چاہئے تھا۔ اس باب میں آپ نے کلام اللہ کی یہ آیت پڑھی

مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ﴿الأنعام:٩١﴾

اس سے معاند یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ بندگی میاں، امام علیہ السلام کو معبود مانتے تھے۔

افسوس کا مقام ہے کہ معترض کو اتنی بھی عقل نہیں ہے کہ مثالوں کو اور ان کی حقیقتوں کو سمجھ سکے۔ قرآن میں اللہ نے اپنے نور کی مثال مشکوٰۃ سے دی۔ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ ﴿النور:٣٥﴾ کوئی عقل کا اندھا یہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کے نور کی مثال تو ایک طاقچہ کی دی ہے جس میں ایک چراغ ہے۔ یا إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّـهَ يَدُ اللَّـهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ﴿الفتح:١٠﴾ ترجمہ: جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں حقیقت میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ کوئی یہاں اگر یہ سمجھ لے کہ اس آیت سے تو رسول اللہ کا اللہ ہونا ثابت ہوا ہے تو یہ اسکے اندھے پن کی دلیل ہو گی، اس طرح فرمان بندگی میاں بھی ہے کہ کما حقہ جس طرح پہچاننا چاہئے تھا نہیں پہچان سکے۔ مثال کے ذریعہ جو بات بیان کی جاتی ہے اس کو سمجھنا بھی ایک فن ہے۔ قرآن شریف میں مچھروں، مکھیوں وغیرہ سے بھی تمثیل دی گئی ہے مقصد کسی کی تحقیر

نہیں ہے بلکہ اس صورت حال کو سمجھانے کیلیئے اس چیز کی مثال دی جاتی ہے۔ جس کیلیئے آدمی کو زیادہ غور کرنے یا سوچنے کی ضرورت نہ ہو۔

اللہ نے اپنے تعلق سے یہ فرمایا ہے ﴿مَا قَدَرُوا اللَّـهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾(الأنعام:۹۱) یعنی لوگوں نے اللہ کی جیسی قدر کرنی چاہیئے تھی ویسی نہیں کی۔ یہ تو ایک حقیقت ہے لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا مسلمانوں نے، جن میں صحابہ بھی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانا جس طرح پہچاننا چاہیئے تھا۔ یا اس طرح قدر کی جس طرح کرنی چاہیئے تھی یعنی کما حقہ

آج بھی لوگ حضور کو اپنے جیسا بشر کہہ رہے ہیں۔ سچ کہو کہ کیا حضور کی صحیح قدر کرنے کا یہی انداز ہے؟

اسی طرح جب رسول اللہؐ نے فرمایا أَيُّكُمْ مِثْلِي ؟ أَبِيتُ عِندَ رَبِّي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي۔ تم میں کون میری طرح ہے۔ میں اللہ کے پاس رہتا ہوں وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی۔ اگر کوئی عقل کا اندھا اس سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ حضور کا مرتبہ بھی معبودیت کا ہے تو ہم کیا کہیں گے۔

بندگی میاں سید خوندیر نے ایک مرتبہ فرمایا کسی شخص کو خدا ہونا چاہیئے تا کہ وہ خدا کو پہچان سکے۔

یہاں دو باتیں قابل لحاظ ہیں (۱) کسی شخص کو خدا ہونا چاہیئے (۲) تا کہ وہ خدا کو پہچان سکے۔ مطلب یہ کہ انسان کا دل، زبان، بینائی، سماعت، ہاتھ اور پاؤں سب خدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کسی شخص کو اللہ کی ذات میں فنا حاصل نہ ہو اس وقت تک وہ اللہ کو پہچان نہیں سکتا۔ قرآن کی ایک آیت تو رسول اللہؐ کے فعل کو اللہ کا فعل قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّـهَ رَمَىٰ﴾(الأنفال:۱۷) اور آپ نے نہیں پھینکا جس وقت کہ آپ نے پھینکا، بلکہ اللہ نے پھینکا۔ مطلب یہ کہ آپ کا پھینکنا گویا خدا کا پھینکنا تھا۔ کیا اس قسم کا بیان قابل اعتراض ہو سکتا ہے؟

اگر جو کچھ ہم نے امام مہدی سے سنا اسکو بیان کر دیں تو موافقین (ہم کو) سنگسار کرینگے

بندگی میاں سید خوندیر پر اعتراض کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اگر جو کچھ ہم نے امام مہدی سے سنا اسکو بیان کر دیں تو موافقین (ہم کو) سنگسار کرینگے۔

اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جو اسرار و رموز ہم نے مہدی علیہ والسلام سے سنے ہیں اگر وہ عوام کے سامنے بیان کریں گے تو لوگ ہم کو نہیں بخشینگے۔ مگر یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اس لئے کہ دور نبوت میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔

چنانچہ حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی ایک روایت آئی ہے قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَاءَيْنِ ، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هَذَا الْبُلْعُومُ (صحیح بخاری) ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو برتن (علم کے) پائے۔ ایک کو تو میں نے ظاہر کر دیا اور دوسرے کو اگر میں ظاہر کر دوں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے گا۔

کیا اس سے بھی یہ سمجھ لیا جائے گا کہ حضرت ابوھریرہؓ نے رسول اللہؐ سے بعض ایسی باتیں جمع کی تھیں جن کے اظہار پر خود ان کو ڈر تھا کہ مسلمان ان کو نہیں بخشیں گے۔ بلکہ ان کی گردن کاٹ دیں گے؟ یہاں صرف اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ تعلیم کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ عوام کے سامنے عام باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور خاص لوگوں کے سامنے اسرار، رموز و نکات کہے جاسکتے ہیں۔

بندگی میاںؓ کو صدیق ولایت یا صدیق اکبر نہیں کہا جاسکتا

ایک اعتراض حضرت بندگی میاںؓ پر یہ بھی کیا گیا ہے کہ آپ کو صدیق ولایت یا صدیق اکبر نہیں کہا جاسکتا اور اسکے ذیل میں ابن ماجہ کی ایک حدیث پیش کی ہے۔ أَنَا عَبْدُ اللَّهِ وَأَخُو رَسُولِهِ صلى الله عليه وسلم وَأَنَا الصِّدِّيقُ الأَكْبَرُ لاَ يَقُولُهَا بَعْدِي إِلاَّ كَذَّابٌ (سنن ابن ماجۃ) ترجمہ: میں عبد اللہ ہوں اور رسول اللہؐ کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں۔ نہیں کہیگا اسکو میرے بعد کوئی سوائے کذاب کے۔ حالانکہ مذکورہ حدیث میں اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ صَلَّيْتُ قَبْلَ النَّاسِ بِسَبْعِ سِنِينَ یعنی میں نے لوگوں سے سات سال قبل نماز پڑھی ہے۔

افسوس کہ معترض نے یہ الفاظ چھوڑ دیئے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو یہ باور کرادے کہ ضرورت کے بقدر الفاظ نقل کر دئے گئے ہیں۔ حالانکہ متروکہ الفاظ کی ہی بڑی اہمیت ہے اس لئے کہ ان الفاظ کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ علی بھی صدیق اکبر ہیں اس لئے کہ انہوں نے لوگوں سے سات سال قبل (رسول اللہ کے ساتھ) نماز پڑھی ہے۔

اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو بھی صدیق نہیں کہا جاسکتا۔ کیا معاند معترض کا یہی اعتقاد ہے؟ معترض کا کہنا یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے بعد تو کوئی صدیق اکبر نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ حدیث میں اس امر کی تو خبر نہیں دی گئی ہے کہ اول امت کے مراتب بعد کو آنے والوں کو حاصل نہ ہوں گے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصحاب رسول میں ایک صدیق اکبر ہو۔ اسی طرح کیا اصحاب مہدی میں صدیق اکبر نہیں

ہو سکتا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی کیا صدیق اکبر کی گنجائش نہیں ہے۔ جبکہ رسول اللہؐ نے خود فرمادیا کہ آپؐ کے بعد دو جلیل القدر ہستیاں وجود میں آنے والی ہیں۔ ایک حضرت مہدی علیہ السلام (بحیثیت خلیفہ اللہ) اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ کیا ان دونوں کے صحابہ میں کوئی صدیق نہ ہو گا۔

اور سب سے بڑی اور اہم بات تو یہ بھی ہے کہ نہ تو حضرت ابو بکرؓ نے اپنے آپ کو صدیق کہا اور نہ بندگی میاں سید خوندیرؒ نے خود کو صدیق کہا۔ حضرت ابو بکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق کے نام سے یاد فرمایا۔ اور حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کو حضرت مہدی علیہ السلام نے صدیق کے نام سے ان الفاظ میں بشارت دی ”شما صدّیق ولایت ہستید“ ”تم صدیق ولایت ہو“ (نقلیات میاں سید عالم)

کیوں کہ امام علیہ السلام کے دعویٰ موکّد کے بعد سب سے پہلے شاہ خوندیزؓ نے امام علیہ السلام کی تصدیق فرمائی ہے۔ اور یہی اصحاب مہدی میں آپ کے ”صدیق اکبر“ ہونے کے علت ہے چنانچہ بندگی میاں شاہ برہانؒ نے یہ بیان کیا ہے۔

بعد از اظہار دعوی مہدیت امیر سید خوندمیر صدیق اکبر شد (دفتر اول) دعویٰ مہدیت کے اظہار کے بعد امیر سید خوندمیر صدیق اکبر ہوئے۔

عُلِّمت مِن الله بلا واسطة جديد اليوم

حضرت بندگی میاں سید خوندمیر رضی اللہ عنہ نے عقیدہ شریفہ کی ابتداء میں یہ عبارت لکھی ہے قال الامام المهدي صلى الله عليه وسلم عُلِّمت مِن الله بلا واسطة جديد اليوم قل اني عبد الله تابع محمد رسول الله محمد مهدي آخر الزمان وارث نبي الرحمان عالم علم الكتاب والايمان، مبين الحقيقة و الشـريعة والرضـوان (عقیدہ شریفہ)

ترجمہ: فرمایا امام مہدی صلی اللہ علیہ وسلم نے میں بلاواسطہ تعلیم پاتا ہوں اللہ سے ہر روز نئی (تعلیم) کہہ کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تابع محمد مہدی آخر الزماں، وارث بنی الرحمان، علم کتاب اور ایمان کے عالم، حقیقت، شریعت اور رضوان (الٰہی) کے بیان کرنے والے۔

اس عبارت مندرجہ بالا میں تین حصّے ہیں:۔

پہلا حصّہ: قال الامام المہدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ بندگی میاں سید خوندمیرؓ کی عبارت ہے۔

دوسرا حصّہ: علمت من اللہ بلاواسطہ جدید الیوم سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ امام علیہ السلام کا

ارشاد ہے۔

تیسرا حصّہ: محمد مہدی سے شروع ہو کر الرضوان پر ختم ہو جاتا ہے۔اس میں بندگی میاں نے امام علیہ السلام کے مراتب بیان کئے ہیں۔

امام علیہ السلام نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ اللہ کا مجھے حکم یہ ہوتا ہے اور اس حکم کی توضیح آپ نے کسی بھی زبان میں (وہاں کے موقع و محل کے لحاظ سے) کی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ الفاظ جو آپ کی زبان سے نکلے ہوں من و عن اللہ ہی کے الفاظ ہوں۔

وحی کی دو قسمیں ہیں۔(۱) وحی متلو (۲)وحی غیر متلو۔ وحی متلو کے تعلق سے سب کا اعتقاد یہ ہے کہ اسکے الفاظ بھی الہیٰ الفاظ ہیں جن کو قرآن کلام اللہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن غیر متلو وحی کے بارے میں یہ اعتقاد ہے کہ اس کے الفاظ کیا تھے یہ نہیں معلوم۔ لیکن حضور نے اللہ کی اس مراد کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو گا۔ اسی لئے قرآن کے الفاظ کے منکر کو کافر کہیں گے، لیکن حدیث کے الفاظ کے منکر کو کافر نہیں کہیں گے۔

عُلّمِتُ مِن الله بلا واسطة جدید الیوم۔ پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔

(۱) بلا واسطۃ جدید سے واسطہ جدید کی نفی ہو رہی ہے واسطۂ قدیم کی نہیں۔ حالانکہ لفظ جدید واسطہ کی صفت ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ واسطۃ مؤنث ہے اور جدید مذکر ہے۔

نیز یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ جدید الیوم میں جو لفظ ''جدید'' آیا ہے اسکو عُلّمِتُ کی قید قرار دیں تو لفظ جدید پر ایک اور الف کا ہونا ضروری ہے علاوہ اس الف کے جو الیوم میں موجود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو لفظ جدید، واسطہ کی صفت ہے اور نہ جدید کو جدیدا پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ''جدیدة الایام'' ہے۔ چنانچہ صاحب معجم البلدان نے اسی ضمن میں ایک شعر پیش کیا ہے۔

تبکی مغازي الناسِ الّا غزوة بالطالقان جدیدة الایّام

جس طرح جدیدۃ الایام ہے اسی طرح جدید الیوم ہے۔ اس کے معنی ہیں جدید من حیث الیوم اور اس سے مراد جدید فی کل یوم ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اعتراصات بھی کئے گئے ہیں جو نہایت درجہ سطحی ہیں اور ایسے ہیں جنھیں علم سے نابلد اور حسد سے مملو ذہن ہی کر سکتا ہے۔

فتوحات مکیہ کی عبارت اور اصحاب مھدیؑ

حضرت بندگی میاںؓ نے اصحاب مھدیؑ کی فضلیت کے باب میں جو عبارت فتوحات مکیہ سے نقل فرمائی ہے وہ بالعموم اصحاب مھدیؑ اور بالخصوص بندگی میاں سید خوندمیر کے حسب حال نہیں ہے۔

پہلے فتوحات کی عبارت لکھی جاتی ہے پھر اسکی تحقیق "هم على اقدام رجال من الصحابة صدقوا ما عاهدوا الله عليه وهم من الاعاجم مافيهم عربيّ لكن لا يتكلمون الا بالعربيّه لهم حافظ ليس من جنسهم ما عصى الله قط هوا خصّ الوزراء وافضل الامناء"

ترجمہ: (۱) وہ صحابہؑ رسول کے قدم پر ہوں گے، انہوں نے سچ کر دکھایا وہ جس پر اللہ سے وعدہ کیا تھا۔ (۲) وہ عجمی ہوں گے اور ان میں کوئی عربی نہ ہو گا (۳) لیکن تکلم نہیں کرتے ہیں مگر عربی (قرآن) سے (۴) ان کا ایک حافظ ہے (۵) جو ان کی جنس سے نہیں اس نے کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کی۔ (۶) وہ وزراء میں خاص ہے (۷) اور امانت داروں میں افضل ہے۔

تحقیق: (۱) حضرت امام علیہ السلام کے تعلق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "إنّهُ يَقفُو أثرِي وَ لَا يُخطِي"۔ یعنی مہدی میرے نقش قدم پر چلے گا اور کوئی خطا نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے کہ جو صحابہ امام علیہ السلام کے ساتھ تھے ان کا مقام بھی وہی ہو گا جو ان اصحاب کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی نے نجات الرشید میں امام علیہ السلام کے تبع تابعین کے باب میں جو اس کے معاصر تھے بیان کیا ہے اگر ان کا کچھ حال لکھا جائے تو ایک اور تذکرۃ الاولیاء مرتب ہو جائے گا۔

(۲) وہ عجمی ہوں گے ان میں کوئی عرب نہ ہو گا۔ امام علیہ السلام کے برگزیدہ اصحاب عجمی تھے۔ کیونکہ ان کی پیدائش عجم میں ہوئی تھی۔ عرب کے سوا سب پر عجم کا اطلاق ہوتا ہے۔ ورنہ عربوں نے بھی امام علیہ السلام کی تصدیق کی ہے۔ چنانچہ ۹۰۱ھ میں جب مہدی علیہ السلام حج بیت اللہ کیلئے تشریف لے گئے تھے رکن و مقام کے درمیان آپ نے "مَنِ اتَّبعنِي فَهُوَ مُومن" کا دعویٰ فرمایا تو کئی عربوں نے آپ کے دعویٰ کی تصدیق کی تھی۔ اور آپ کے ہاتھ پر بیعت بھی فرمائی تھی۔ جیسا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا ہے يُبَايعُ بَيْنَ الرُّكْنِ وَالْمَقَامِ ۔ رکن یمانی اور مقام ابراھیم کے درمیان مہدی کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔

(۳) وہ عربی کے بغیر تکلم نہیں کریں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عربی ان کی مادری زبان ہو گی۔ اور عربی میں

بات چیت کرلینا آپس میں، کسی طرح وجہ امتیاز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہاں اس سے مراد ان کا وہ خاص وصف ہو گا کہ وہ جب بھی اپنے خصم سے بات کریں گے تو وہ قرآن وحدیث کے ذریعہ استدلال کریں گے اور ظاہر ہے کہ قرآن اور احادیث عربی میں ہیں۔ واضح ہو کہ کلام اور ہے اور علم کلام اور ہے۔ یہاں جس تکلم کی بات کہی جارہی ہے وہ آپسی بات چیت کی نہیں ہے بلکہ ثبوت مہدی موعود علیہ السلام کے باب میں جو کلام ہو گا وہ قرآن واحادیث کی زبان ہی میں ہو گا جو کہ عربی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اصحاب مہدی ازروئے قرآن تکلم کریں گے یہ ان کے بیان قرآن کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ بیان قرآن دائرہ مہدویہ کی خصوصیات سے ہے یہاں تک کہ۔ لفظ بیان تفسیر معانی قرآن کیلئے مختص ہو گیا۔

(۴) اصحاب مہدی کا ایک حافظ ہو گا۔ اس کا مصداق حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ ہیں۔ حافظ اور نگہبان کا کام نصرت عطا کرنا ہے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ناصر دین ہوں گے جیسا کہ امام علیہ السلام نے آپ کے تعلق سے فرمایا۔

برادرم سید خوندیر ذات شما سلطانا نصیر ااست۔ ناصر والایت مصطفیٰ ہستید۔ امام نے فرمایا بھائی سید خوندمیر تم سلطانا نصیرا ہو ولایت مصطفی کے ناصر ہو۔

نقلیات میاں سید عالم میں یہ صراحت ہے کہ امام علیہ السلام نے بندگی میاں سید خوندمیر کو ''ناصرِ دین'' فرمایا ہے۔

(۵) وہ حافظ اصحاب مہدی کے جنس سے نہ ہو گا۔ یہ بھی بندگی میاں سید خوندمیر کے حسب حال ہے۔ اس لئے کہ آپ ''بنی فاطمہ'' سے ہیں۔ امام علیہ السلام کے برگزیدہ اصحاب بارہ ہیں ان میں سے اکثر بنی فاطمہ سے نہیں ہیں۔

(۶) وہ وزراء میں خاص ہو گا۔ یہ بھی بندگی میاں کے حسب حال ہے۔ اس لئے کہ آپ حدیث ارطاۃ کے مصداق ہیں۔ اور اس کے مفہوم کے مطابق امامؑ کی رحلت کے بیس برس بعد آپ کی شہادت واقع ہوئی ہے۔

(۷) وہ امانت داروں میں افضل ہو گا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آپ حامل بار امانت ہوں گے۔ بندگی میاںؓ کا حامل بار امانت ہونا ۹۳۰ھ سے قبل ہی حلقۂ اصحاب کا مسلّمہ تھا۔

(۸) وہ خاص وزیر اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرے گا۔ بحمد اللہ آپ کی زندگی میں شرک، کفر، شک وغیرہ قسم کے کسی امر ممنوع میں آپ کا کوئی حصّہ نہیں رہا۔ بلکہ تلاش مرشد کامل کے سلسلے میں اپنے وقت کے بڑے بڑے مرشدوں کی خدمت میں جب آپ کو لیجایا گیا اور آپ نے ان کی باتوں کو سنا تو آپ نے ان کے طور وطریقوں کو دیکھ کر ان سے بیعت ہوئے

بغیر واپس آ گئے۔

حضرت بندگی میاں کی زندگی، امام علیہ السلام کی صحبت اقدس میں آنے سے پہلے اتنی پاک اور ستودہ صفات کی حامل تھی کہ خود امام علیہ السلام نے ملاقات کے وقت یہ بشارت دی۔ فرمودند برادرم سید خوندمیر چراغ داں و روغن و فتیلہ مستعد کردہ آوردند مگر روشن کردن ماندہ بود بچراغ ولایت روشن کردہ شد (شواہد الولایت) ترجمہ: میراں علیہ السلام نے فرمایا برادرم سید خوندمیر چراغدان روغن فتیلہ تیار کر کے لائے تھے مگر روشن کرنا رہ گیا تھا۔ چراغ ولایت سے روشن کر دیا گیا۔

بندگی میاںؓ کی شہادت کے بعد بندگی میاںؓ کے سر کا نماز پڑھنا (سجدہ کرنا)

واقعہ یہ ہے شہادت کے بعد جب دیگر سروں کے ساتھ آپ کے سر مبارک کو لیجایا جارہا تھا تو شہر میں جابجا ظہر کی اذان دی گئی اس بناء پر پانچوں سر ٹوکرے سے زمین پر آ گئے اور قبلہ رخ ہو کر صف بندی کی۔ بندگی میاں کا سر، سب سروں سے آگے ہو گیا نماز ظہر جماعت کے ساتھ پیشانیوں پر سجدہ کر کے ادا کی۔

نیز حاشیہ شریف میں جو متقدم بھی اور مقدم بھی لکھا ہے: "بندگی میاں کا سر اور برادروں کے سر ٹوکرے میں رکھ کی شہر پٹن لے گئے۔ وہاں نماز کا وقت ہوا تو تمام سر ٹوکرے سے باہر ہو گئے۔ بندگی میاں کا سر آگے ہو گیا اور برادروں کے سروں نے پیچھے ہو کر نماز ادا کی"۔

البتہ ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ کیا فقط سر سجدہ کر سکتا ہے؟ تو ہم ایسے نادانوں کیلئے دو واقعے پیش کرتے ہیں۔ ایک امام حسین علیہ السلام کے سر کا کلام کرنے کا واقعہ۔ جیسا کہ شاہ عبد العزیز نے ابن عساکر کی روایت سے بیان کیا ہے۔ **فانطق الله الراس بلسان ذرب فقال اعجب من اصحاب الكهف قتلي و حملي** (سرّ الشہادتین) ترجمہ: پس گویا کر دیا اللہ نے امام حسین کے سر کو بزبان فصیح پس کہا سر مبارک نے اصحاب کہف کے قصے سے عجیب تر ہے میرا قتل کیا جانا اور مجھکو اُٹھا لئے پھرنا۔

اسی طرح یحییٰ علیہا السلام کے سر مبارک نے بھی بادشاہ سے خطاب کیا "آخر اس بادشاہ مردود نے یحییٰ کو مار ڈالا۔ جب سر مبارک تن سے جدا کیا پھر سر مبارک نے کہا اے بادشاہ اپنی جورو کی بیٹی سے نکاح درست نہیں" (قصص الانبیاء ۳۶۵) ۔ جب امام حسین کے سر مبارک کا کلام کرنا اور یحییٰ علیہ السلام کے سر مبارک کا بادشاہ سے تخاطب کرنا قابل اعتراض نہیں تو شاہ

خوندمیر، بدلۂ مہدی موعود کے سر مبارک کا تکبیر کہنا اور نماز ادا کرنا کس طرح محل اعتراض ہو جائے گا۔

بند گی میاں شاہ نظام دریائے وحدت آشام کے تعلق سے ایک موضوع روایت کا سہارا لیکر اعتراض

حضرت بند گی میاں شاہ نظام دریائے وحدت آشام کے تعلق سے ایک موضوع روایت کا سہارا لیکر یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت نے ایک شخص کو اللہ کے علم قدیم میں مقبول لکھوا دیا حالانکہ اس سے قبل اللہ کے علم قدیم میں اس سے متعلق مردود لکھا ہوا تھا۔

قوم مہدویہ کی کسی معتبر کتاب میں یہ مروی نہیں ہے کہ امام علیہ السلام کے صحابہ نے یا بند گی شاہ نظام نے اللہ کے علم قدیم میں کوئی تبدیلی کروائی ہے۔ حاشیہ شریف میں مہاجرین مہدی کا طریق تلقین اسطرح مروی ہے۔

"نقل ہے کہ مہاجرین (مہدی) کا تلقین کرنا اسطرح تھا۔ ایک شخص نے بند گی میاں شاہ نظام سے عرض کیا، میرے فرزند کو تلقین کرو میاں نے تاخیر کی۔ اس کے بعد اس نے بہت کوشش کی اس کے بعد میاں نے لوح محفوظ پر نظر ڈالی اور ابتداء وانتہا معلوم کی کہ خیریت ہے اس وقت تلقین کی"۔

مذکورہ نقل میں اصحاب مہدی اور خصوصاً شاہ نظام کا طریق تلقین بیان کیا گیا ہے۔ اس میں صرف یہ مذکور ہے کہ اصحاب مہدی پہلے لوح محفوظ پر نظر ڈالتے ابتداء انتہاء معلوم کرتے اور پھر تلقین کرتے۔ ظاہر ہے کہ تلقین اسی کو مفید ہوتی ہے جس کا اہل ایمان سے ہونا ازل میں مقرر کیا گیا ہو۔

یہاں نہ اللہ کے علم قدیم کا ذکر ہے اور نہ اللہ کے علم قدیم میں کوئی تبدیلی مذکور ہے۔ اسطرح شاہ نظام کے خلق کے خلاف استدلال کرنا باطل ہے۔

حضرت بند گی میاں شاہ نظامؓ پر افتراء کا جواب

ایک اور موضوع نقل کا سہارا لیکر حضرت بند گی میاں شاہ نظامؓ پر افتراء کیا گیا ہے کہ آپؓ نے اس امر کی تصدیق فرمائی کہ سکندر ذوالقرنین نے ایک درخت کے پھل سے جماع کیا ہے۔ اور یہ بھی افتراء کیا ہے کہ بند گی شاہ نظام نے بہشت شداد کی تفصیل دی ہے۔

متقدمین کی روایت سے تو بس اسقدر ثابت ہے۔

"جس وقت بند گی میاں شاہ نظام سفر میں تھے، کوہ قاف پہنچے۔ اس جگہ درخت ہیں۔ ان کے پھل چاند کے جیسے

ہیں۔ اس جگہ بندگان خدا سیر کرتے ہیں وہ پھل لاتے ہیں۔ اور پس خوردہ میں کچھ ڈالتے ہیں جس شخص کو دیں اسکو کشف ہوتا ہے۔ بندگی میاں شاہ نظام نے فرمایا بندہ دومرتبہ گیا تھا اس کے بعد نہیں گیا"۔

اسی طرح کی روایت نقلیات میاں سید عالم میں بھی آئی ہے۔

ان قدیم روایتوں میں نہ تو درخت کے پھل سے جماع کرنا مذکور ہے۔ اور نہ بہشت شداد کی تفصیل دی گئی ہے۔ بلکہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ بندگی شاہ نظام نے کوہ قاف کی سیر کی ہے اور وہاں ایسے پُرتاثیر پھلوں کو دیکھا ہے جو چاند کے جیسے ہیں۔

ایسی صورت میں معترض کا جماع والی موضوع نقل سے بندگی میاں شاہ نظام کے خلق کے خلاف استدلال کرنا عین جہالت نہیں تو پھر کیا ہے۔

میاں عبدالرحمان کے تعلق سے ایک نقل پر اعتراض

ایک معترض نے بندگی شاہ نظام کے فرزند میاں عبدالرحمان کے تعلق سے ایک نقل پر اعتراض کیا ہے۔ روایت ہے کہ ایک دن میاں عبدالرحماں (بن حضرت بندگی شاہ نظام) ایک حدیث بروایت ابوذر غفاری پڑھ رہے تھے۔ اس میں اس مقام پر پہنچے کہ فرمایا حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بھائی میرے کہ وہ برابر میرے مرتبہ کے ہیں۔ شاہ نظام نے سن کر فرمایا کہ یہ صفت عام اصحاب کی ہے اور بڑے اصحاب کا مرتبہ اس سے بھی دور اور آگے ہے۔

حدیث میں جو الفاظ ہیں وہ اسطرح ہیں "إِخْوَانِي هُمْ بِمَنزِلَتِي" اس کا ترجمہ معترض نے یہ کیا ہے "بھائی میرے کہ وہ برابر میرے مرتبہ کے ہیں" دیکھئے معترض نے ترجمہ میں اپنی ساری خباثت ذہنی کو استعمال میں لایا۔ اور مہدویہ پر اعتراض کرنے کا موقع حاصل کرلیا۔

معترض اگر محدّثین کے اصول پر اس حدیث کا ترجمہ کرتا تو بات ہی اور ہوتی۔ کیونکہ محدثین نے جہاں کہیں "كَانَ مَعِيَ فِي الجَنَّةِ" فرمایا ہے تو اس سے مساوات اور برابری مراد نہیں کی ہے۔

اسی طرح اس حدیث میں بھی مساوات نہیں ہے۔ مَنْ أَحَبَّنِي كَانَ فِي دَرَجَتِي۔ جو مجھ سے محبت کرے گا وہ میرے درجے میں ہوگا۔ کیا اس حدیث کی بناء پر یہ کہا جائے گا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے گا وہ درجہ اور شرافت اور مرتبہ میں آپ کے برابر ہوگا؟

مؤلف مدارج النبوۃ نے مذکورہ حدیث کے ذیل میں یہ لکھا ہے۔ ترجمہ: ”انس کی حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا جس نے مجھکو محبوب رکھا وہ میرے ساتھ ہو گا جنت میں۔ مخفی نہ رہے کہ ”معیت سے مراد درجہ میں مساوات نہیں ہے“ اگرچہ بعض احادیث میں ”كَانَ فِي دَرَجَتِي“ (میرے درجے میں ہوگا) بھی آیا ہے۔

ان دو روایتوں سے ثابت ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھے گا اس کا یہ مرتبہ ہے کہ وہ آپ کے درجے میں ہوگا۔ یہ مرتبہ بے شک عام اصحاب مہدی کا ہے۔ خاص اصحاب مہدی کا مرتبہ اس سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ یہ رسول اللہؐ سے شدید محبت کرتے تھے۔ اور اس حدیث کا مصداق تھے۔ مِنْ أَشَدِّ أُمَّتِي لِي حُبًّا نَاسٌ يَكُونُونَ بَعْدِي۔ میری امت میں مجھ سے شدت سے محبت کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو میرے بعد ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ مطلق محبت رکھنے والے کے مقابلے میں شدت سے محبت رکھنے والے کا مرتبہ بلند تر ہی ہوگا۔

لیکن اگر کوئی اس حدیث سے یہ مطلب نکالتا ہے کہ رسول اللہ کی منزلت میں ہونے والی جماعت خود رسول اللہ کے برابر یا افضل ہوگی۔ یہ تو اسکی حماقت اور بے وقوفی کی دلیل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ”بِمَنْزِلَتِي“ یا ”كَانَ فِي دَرَجَتِي“ سے مساوات پر کسی طرح استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح ایک حدیث میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضلیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح فرمائی۔ أَنَا وَ أَبُوبَكر فِي دَرْجَةٍ وَاحِدَة۔ میں اور ابو بکر (جنت میں) ایک درجہ میں ہوں گے۔ کیا اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی المرتبت ہیں؟؟ مقصود صرف شرف کا بیان کرنا ہے۔

حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ کی ایک روایت پر اعتراض

ایک اعتراض حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ کی ایک روایت کے تعلق سے بھی کیا گیا ہے۔ روایت ہے کہ ایک روز بی بی منور (غالباً بی بی منورہ ہے) نے کہا میانجی، یوسف کہاں گیا ہے۔ اس لئے کہ میں اسکو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ اسکے بعد شاہ دلاور نے ناخوش ہو کر فرمایا۔ ہوشیار رہو، میاں یوسف کا نام ادب و تعظیم سے لو۔ اس لئے کہ ہر روز ان کو اللہ کا سلام آتا ہے۔ کہا میانجی ہم بھی شاہ عالم کی نواسی ہیں۔ فرمایا شاہ عالم کہاں ہیں۔ اور میاں یوسف کہاں ہیں۔ پھر بی بی نے عرض کیا وہ قطب عالم سے بھی بڑے ہیں؟ فرمایا کئی قطب ہمارے دائرے میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قطب عالم کے جیسے کئی لوگ بندگی میاں شاہ دلاور کے دائرے میں

ہیں۔ مراتب اور درجات کا عطا ہونا خدائی بخشش ہے۔ کسی شخص کا شاہ عالم یا قطب عالم کا درجہ پانا نا ممکن نہیں۔

اہل سنت کے پاس جب "علی قدم موسیٰ "اور"علی قدم عیسیٰ""علی قدم ابراھیم "کے الفاظ صوفیاء کرام کیلئے استعمال کئے جاسکتے ہیں، حالانکہ وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں تو شاہ عالم و قطب عالم کے جیسے افراد کا ہونا کس طرح مستبعد ہو گا۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَادَتْ هَذِهِ الْأُمَّةُ أَنْ تَكُونَ أَنْبِيَاءَ كُلُّهَا (مسند ابوداؤطیالیسی) قریب ہے کہ یہ امت ساری کی ساری انبیاء ہو جائے۔

اس سے آنحضرت کی مراد یہ نہیں کہ وہ سب پیغمبر ہو جائیں گے۔ مطلب اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ امت کے افراد کو مراتب انبیاء حاصل ہو جائیں گے۔

جب امت کا مراتب انبیاء حاصل کرنا ممتنع نہیں ہے تو کسی فرد امت کا شاہ عالم اور قطب عالم کے مراتب حاصل کرنا یا ان سے بڑھ کر مراتب حاصل کرنا نا ممکن کیسے ہو سکتا ہے؟

علاوہ ازیں یہ روایت بھی اس مقام پر قابل غور ہے: زائدہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی کنیز تھی۔ اس سے متعلق رسول اللہؐ نے جو بشارت دی تھی۔ صاحب شواہد النبوۃ نے اسکی اسطرح روایت کی ہے۔"خدائے تعالیٰ زنے راازامتِ من بدرجہ ٔمریم رسانید"۔ خدائے تعالیٰ نے میری امت سے ایک عورت کو مریم کے درجے پر پہنچادیا (شواہد النبوۃ ۲۶۴)

جب حضرت عمرؓ کی کنیز کا بی بی مریم کے درجہ کو پہنچنا قابل اعتراض نہیں تو شاہ دلاور کے خادم کا قطب عالم وغیرہ سے افضل ہونا کس طرح قابل اعتراض ہو سکتا ہے؟؟

ایک بردار لکڑی لینے کی کوشش میں ندی میں گر گئے اور وفات پا گئے

حضرت بندگی میاں ابوالفتح کے دائرہ کے پاس کی ایک ندی میں سیلاب آگیا تھا۔ لوگ اسکو دیکھنے کیلئے دریا کے کنارے کھڑے ہوئے تھے اتفاق سے ایک لکڑی بہتی ہوئی آگئی۔ حضرت کے دائرہ کے ایک بردار لکڑی لینے کی کوشش میں ندی میں گر گئے اور وفات پا گئے۔ اسپر میاں ابوالفتح نے یہ فرمایا کہ وہ حرام موت مرا۔ یہ سنکر حضرت شاہ دلاورؓ نے فرمایا۔ اس برادر کو مقام بایزید دیا جارہا ہے وہ اس کو قبول نہیں کرتے۔

اسپر یہ اعتراض کیا جارہا ہے کہ پرائی بیل کے پھل کو بہتے ہوئے دیکھ کر حرص وعاقبت نااندیشی سے ندی میں (پھل لینے کیلئے) کود پڑے۔

روایت کے الفاظ بتارہے ہیں کہ برادارن دائرہ سیلاب دیکھنے کیلئے کھڑے ہوئے تھے۔ کسی کا مال ومتاع لینے کی غرض سے نہیں۔ قریب سے ککڑی کو بہتے ہوئے پانی میں دیکھ کر لینے کی کوشش کرنا اقتضائے بشریت ہے۔ چنانچہ ایک برادر نے وہ ککڑی لینی چاہی اور اس کوشش میں وہ ندی پر گر پڑے۔ اور بیل ان کے جسم سے لپٹ گئی اور ان کا انتقال ہوگیا۔

معترض نے لکھا ہے ''ککڑی لینے کیلئے ندی میں کود پڑے۔ حالانکہ نقل میں جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں '' در آں افتاد'' اس میں گر پڑے۔ ککڑی لینے کیلے ندی میں ''کود پڑنا'' اور ہے اور ککڑی لینے کی کوشش میں ''گر پڑنا'' اور ہے

اسکے علاوہ ''لقطہ'' (یعنی زمین پر پڑے ہوئے مال) کا اٹھالینا فقہاء کے پاس جائز ہے۔

کنزالعمال میں یہ روایت آئی ہے قال سعد "كنت أمشي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فوجد مقرومة فيها تمرتان، فأخذ تمرة وأعطاني تمرة" ترجمہ: میں رسول اللہؐ کے ساتھ چل رہا تھا پس آپؐ کو ایک کپڑے کا ٹکرا ملا جس میں دو کھجوریں تھیں آپؐ نے ایک کھجور لی اور دوسری مجھے دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے راستے میں پڑی ہوئی چیز اُٹھائی۔ اگر یہ جائز نہ ہوتا تو آپؐ نہ اُٹھاتے۔

اسکے علاوہ ابوداؤد نے یہ روایت کی ہے۔ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ وَجَدَ دِينَارًا فَأَتَى بِهِ فَاطِمَةَ فَسَأَلَتْ عَنْهُ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم فَقَالَ "هذا رِزْقُ اللَّهِ" فَأَكَلَ مِنْهُ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم وَأَكَلَ عَلِيٌّ وَفَاطِمَةُ فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ أَتَتْهُ امْرَأَةٌ تَنْشُدُ الدِّينَارَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم" يَا عَلِيُّ أَدِّ الدِّينَارَ" ترجمہ: ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ علی ابن ابی طالب نے ایک دینار پایا پس اسکو فاطمہ کے پاس لائے پس رسول اللہؐ سے اس بارے میں پوچھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ کی دی ہوئی روزی ہے۔ پس وہ دینار خود رسول اللہؐ، علی اور فاطمہ کے کھانے میں آیا اس کے ہوجانے کے بعد ایک عورت دینار ڈھونڈتے ہوئے آئی رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا اے علی دینار ادا کردو۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت علی نے ایک دینار راستے میں پایا تھا۔ اسکو بی بی فاطمہ کے پاس لایا گیا اور رسول اللہؐ سے دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا رزق ہے یعنی یہ رزق اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے۔

اس حدیث کے ذیل میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے۔"اس حدیث کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے تعریف نہیں کی۔اور بعض علماء کا مذہب ہے کہ قلیل میں تعریف واجب نہیں ہے اور ایک دینار جنس قلیل سے ہے۔

تعریف کا طریقہ یہ ہے کہ سڑک پر کسی چیز کا پانے والا بلند آواز سے کہے کہ وہ شخص جس کی چیز گم ہوگئی اور ضائع ہوگئی ہے آئے اور اسکی صفت بیان کرے۔تو جب دینار پر جنس قلیل کا اطلاق ہو سکتا ہے تو ایک لکڑی پر جنس قلیل کا اطلاق کس طرح نہ ہوگا۔یہاں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا مالک کون ہے؟ اس لحاظ سے لکڑی جو ندی میں بہہ رہی تھی اس پر بھی رزق اللہ کا اطلاق ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ میاں ابوالفتح نے فرمایا کہ وہ حرام موت مرا۔تو شاید اس بناء پر تھا کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ نوجوان لکڑی لینے کیلئے ندی میں قصداً کود پڑا۔حالانکہ اس نے قصداً نہیں کودا۔بلکہ لکڑی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش میں ندی میں (ہو سکتا ہے کہ پیر پھسل کر) گر پڑا۔چنانچہ نقل کے الفاظ "در آب افتاد"(پانی میں گر پڑا) اسی پر دلالت کرتے ہیں۔

اس مقام پر شاہ دلاور نے اس غریق کے بارے میں یہ بشارت دی کہ اس کو مقام بایزید دیا جارہا ہے مگر وہ قبول نہیں کررہا ہے تو قابل اعتراض بات کیا ہے؟ قبول نہیں کرتا کے الفاظ سے یہ مستفید ہوتا ہے کہ وہ (غریق،ہے اور غریق شہید کہلاتا ہے)مراتب عالیہ کے حصول کیلئے دعا کررہا ہے۔

تو اس میں کیا قباحت ہے۔یہ نوجوان تو امام علیہ السلام کے تابعین سے تھے۔ظاہر ہے کہ ان کا مقام تو اولیاء سے بھی بلند ہے۔مزید برآں یہ ہوا کہ وہ غریق ہے اور آنحضرت نے فرمایا ہے الْغَرِقُ شَــهِيدٌ۔یعنی غریق شہید ہے۔پھر اس گفتگو کا تعلق مکاشفات سے ہے،ایسے مکاشفات جن میں شرع کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔قابل اعتراض نہیں ہوتے۔

بندگی میاں شاہ دلاور رضی اللہ عنہ کے تعلق سے ایک روایت پر اعتراض

حضرت بندگی میاں شاہ دلاور رضی اللہ عنہ کے تعلق سے ایک روایت پر اعتراض کرتے ہوئے آپ کے بیان کو آپ کی بد خلقی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

روایت حسب ذیل ہے۔"نقل ہے کہ ایک دن میاں یوسف سورۂ اخلاص کے بیان میں سامع تھے۔جب لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ پر پہنچے تو بندگی میاں شاہ دلاور نے لَمْ چھوڑ کر يَلِدْ وَ يُولَدْ پڑھا میاں یوسف نے لَمْ کے ساتھ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ پڑھا۔پھر شاہ

مذکور نے لَمْ چھوڑ کر پڑھا۔ میاں یوسف نے عرض کی یہ محکمات بے تاویل ہیں۔ میاں عبد الملک نے کہا میاں یوسف خاموش رہو۔ میاں جی ولایت کا شرف بیان کرتے ہیں"۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ میاں عبد الملک سجاوندی نے کہا ہے کہ بندگی میاں شاہ دلاورؓ "شرف ولایت" بیان فرمارہے ہیں۔

اس کے معنی یہ تو نہیں ہوسکتے کہ قرآن میں جو لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ آیا ہے۔ اسکی قراءت صحیح نہیں ہے يَلِدْ وَ يُولَدْ صحیح ہے۔

بندگی میاں شاہ دلاورؓ اس آیت کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ آپ نے تفسیر میں کیا کیا باتیں بیان فرمائیں اسکی تفصیل تو نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ولایت کی شان عروج اور شان نزول کا بیان ہوا ہو۔ ولایت کے معنی حضرت مہدی علیہ السلام نے ذات اللہ بیان فرمائے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ولایت کی **شان عروج** اور ہے اور **شان نزول** اور ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی ہے۔ كنت كنزاً مخفياً فاحببت أن اعرف فخلقت الخلق۔ یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

ظاہر ہے کہ کنز مخفی کی شان لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ہے۔ لیکن جب اس نے پہچان لئے جانے کی خاطر مخلوق کو پیدا کیا تو اس میں يَلِدْ اور يُولَدْ کی شان پیدا ہوئی۔

یہیں سے ولایت محمدی کے بارے میں صوفیاء میں بحث پیدا چلی آرہی ہے کہ "نور محمدی" یا "ولایت محمدی" مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔

بعض جلیل القدر صوفیاء کہتے ہیں کہ ولایت محمدی اور نور محمدی غیر مخلوق ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ایک روشن چراغ سے دوسرا چراغ روشن کیا جائے تو پہلے چراغ کو والد اور دوسرے کو ابن نہیں کہتے۔ یعنی یہاں يَلِدْ اور يُولَدْ کے الفاظ کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح نور محمدی نور اللہ سے ماخوذ ہے پس وہ غیر مخلوق ہے۔

لیکن جب اس نور نے ایک شکل اختیار کی اور اس کے ذریعہ دوسری تخلیقات ظہور پذیر ہوئیں تو ان پر يَلِدْ اور يُولَدْ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت نور محمدی یا ولایت محمدی غیر مخلوق۔ لیکن جب بی بی آمنہ کے بطن سے پیدا ہوئے تو وہ مخلوق ہوئے۔ اسکی ایک اور مثال کے ذریعہ بھی تفہیم کی جاسکتی ہے۔

کسی بھی ملک میں ایک عہدہ صدر کا ہوتا ہے۔ اور اس عہدے پر ایک شخص فائز ہوتا ہے۔ جہاں تک منصب کے اعتبار سے جو صدر ہوتا ہے اور صدارت کی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ اسکی شان لَمْ یَلِدْ اور وَلَمْ یُولَدْ کی ہوتی ہے۔ صدر نہ تو کسی سے جنایا گیا ہے اور نہ اس نے کسی کو جنا ہے۔ ہاں اس منصب و عہدہ پر جو فائز ہوتا ہے۔ وہ جنا بھی گیا ہے اور جنایا بھی گیا ہے۔

اسی طرح ولایت مصطفی غیر مخلوق ہے لَا رَيْبَ فِيهِ۔ لیکن اس منصب اور عہدہ پر جو ہستی فائز ہے وہ محمد اور مہدی ہیں۔ اور یہ جنائے بھی گئے ہیں اور جنے بھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت بندگی شاہ دلاورؓ نے منصب سے ہٹ کر اشخاص پر اور ان سے جو فیض رسانی ہوئی ہے اسپر نظر کرتے ہوئے فرمایا ہے "یَلِدْ وَ یُولَدْ" گویا یہ ایک طویل تفسیر کا ایک حصّہ ہے۔ اسکو تحریف قرار دینا الزام محض ہے۔

لہو ولعب کے تعلق سے

نقل ہے کہ ایک دن کھانبیل میں میاں سید نجی (الملقب بہ خاتم المرشدین) دائرہ کے دروازے کے سامنے کھیل رہے تھے، میاں دولت شاہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بندگی میاں سید خوندمیرؓ کے پاس لائے کہ میانجی یہ تنہا راستہ پر کھیل رہے تھے، ہم انہیں لائے ہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انہیں اُٹھا کر لیجائے۔ میاں نے انہیں آغوش میں لے لیا اور پوچھا سید نجی سچ کہو تم وہاں تنہا تھے اور کون تھا۔ کہا کہ ایک میں تھا اور دوسرا میرا خدا کھیل رہا تھا۔ پس بندگی میاں نے فرمایا اے بھائیو آج کے بعد سے سید نجی کو پھر کوئی تکلیف نہ دے کہ ان کا خدا ہمیشہ ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہے اور ہم نشین ہے۔

اس انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بندگی میاںؓ کے دائرہ میں دین کی تربیت کس اعلیٰ پیمانے پر ہوتی تھی۔ کہ جب ایک بچے سے یہ پوچھا گیا کہ سچ بتاؤ کہ تم تنہا تھے اور کون تھا۔ تو بچے نے بے ساختہ جواب دیا ایک میں تھا اور دوسرا میرا خدا میرے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہ جواب ایک طفل کی زبان سے نکل رہا ہے اندازہ لگایئے کہ بچہ وہ بات کہہ رہا ہے جو خدا نے قرآن شریف میں فرمایا ہے وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ﴿حدید:۴﴾ ترجمہ۔ اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو۔ کیا خدا سے غافل لوگوں کی زبان سے یہ جملہ نکل سکتا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ جب بچے نے حقیقت بیان کی تو دنیادار علماء بھی اسپر اعتراض کررہے ہیں۔ حالانکہ بچے جو کچھ بھی کرتے ہیں اسپر لعب کا ہی اطلاق ہوتا ہے۔ وہ اپنے طور پر گھر بناتے ہیں۔ لڑکیاں گڑیوں کی شادی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن ان کی عمر کے مطابق ان کی ان حرکات کو کھیل ہی کہا جاتا ہے۔

اور خود آنحضرت نے بھی فرمایا الْهُوْا وَالْعَبُوا فَإِنِّي أَكْرَهُ أَنْ يُرَى فِي دِينِكُمْ غِلْظَةٌ (کنزالعمال) لہو ولعب بھی

کرو کیوں کہ میں اس بات کو مکرہ جانتا ہوں کہ تمہارے دین میں سختی اور درشتی نظر آئے۔

بچوں کے لعب ولہو میں حکمت بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان کا کھیل کود ان کے اندر پوشیدہ فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر لعب منع ہوتا حضور بی بی عائشہ کو حبشیوں کا کھیل نہ دکھاتے۔ بعض کھیل ظاہر میں کھیل ہوتے ہیں اور باطن میں حکمت ہوتی ہے۔ چنانچہ تحفہ اثنا عشریہ میں شیخ عبد العزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں:

"دوسری بات یہ کہ حبشیوں کا کھیل کود سپر اور نیزوں کیساتھ تھا کہ کافروں سے لڑنے کی مہارت کیلئے اور جہاد کے آلات کی تیاری کیلیے اس ہنر کی مشق کرتے تھے۔ ظاہر میں یہ کھیل کود تھا اور باطن میں تمام تر حکمت۔ اور گھوڑوں کا دوڑانا اور تیر اندازی بے شک رسول اللہؐ ایسے کھیلوں میں تشریف فرمارہے تھے۔ بعض اوقات آپ نے شرکت بھی کی ہے اور فرمایا ہے کہ فرشتے بھی ایسے کھیلوں میں حاضر ہوتے ہیں"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے کھیلوں میں رسول اللہؐ نے بھی بعض اوقات شرکت فرمائی ہے اور فرشتے بھی ایسے مواقع پر حاضر ہوئے ہیں۔ ایسے لعب کو مذموم کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔

بخاری و مسلم کی روایت سے ثابت ہے کہ یہ کھیل مسجد میں تھا۔ چنانچہ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ وَالْحَبَشَــةُ يَلْعَبُونَ بِالحِرَابِ فِي المَسْجِدِ (اشعتہ اللمعات) اور حبشی چھوٹے نیزوں سے مسجد میں کھیلتے تھے۔

شاہ عبد العزیز نے اس حدیث کے ذیل میں جس میں حضرت عائشہ کا رسول اللہؐ کے گھر میں گڑیاں کھیلنا مذکور ہے یہ بیان کیا ہے

"کمسن لڑکیوں کیلئے گڑیوں کا کھیل تجویز کرنے کا مقصد ان کو امور خانہ داری سیکھنے، سینے پرونے، قطع کرنے اور فرش کے آراستہ کرنے اور مجلس کو زیب و زینت دینے کی مشق کرانا ہے چنانچہ لڑکوں کیلئے لکڑی کے گھوڑے، لکڑی کے نیزے، تلواریں اور تیر و کمان اور اس قسم کی چیزوں کا کھیل حکمتوں کی بناء پر تجویز کیا گیا ہے۔

اس کے جواب میں معترضین کا یہ کہنا کہ اللہ نے تو یہ فرمایا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّـــمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ﴿الدخان:۳۸﴾ ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسکو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہیں۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کوئی فعل عبث نہیں کرتا۔ بلکہ اسکی ہر تخلیق با مقصد ہوتی ہے اس

میں سراسر حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

پھر جب خود رسول اللہؐ نے حضرت بی بی عائشہ کے ساتھ کھیلا ہے تو ایک کمسن بچے کے کھیل کو کس طرح مورد الزام قرار دے سکتے ہیں۔

مدارج النبوۃ میں اس سلسلے میں یہ روایت بھی ملاحظہ ہو ''آنحضرت نے حضرت عائشہ کے ساتھ مسابقت کی یعنی کون آگے بڑھتا ہے کا کھیل کھیلا اور ایک دوسرے کے ساتھ دوڑ لگائی۔ پس بی بی عائشہ آگے بڑھ گئیں۔ دوسرے وقت پھر دونوں دوڑے تو آنحضرت عائشہ سے بڑھ گئے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ عائشہ فربہ اور بھرے جسم کی ہوگئی تھیں تو آنحضرت نے فرمایا میرا یہ تمہارے سے بڑھ جانا بدل ہے تمہارے مجھ سے بڑھ جانے کا۔

جب اللہ فرماتا ہے کہ میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں تو رسول اللہؐ اور عائشہ کے اس مسابقتی کھیل میں کیا اللہ شریک نہیں تھا۔ اسی طرح سید نجی کے ساتھ بھی کیا اللہ شریک نہیں تھا۔ جب اللہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب تم دو ہوتے ہو تو میں تیسرا ہوتا ہوں اور جب تم چار ہوتے ہو تو میں پانچواں ہوتا ہوں۔ اسی حقیقت کو آشکار کرنے کیلئے بندگی میاں نے سید نجی سے پوچھا۔ سچ کہو ایک تو تم ہو دوسرا کون؟ بچے نے جواب دیا دوسرا میرا خدا میرے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس روحانی اور عرفانی نکتہ کو عام ذہن کیا سمجھ سکیگا؟ اللہ نیک سمجھ عطا فرمائے۔

شاہ دلاور کے حجرے کا طواف

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے جن کا نام جاھمہ تھا حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا رادہ ہے کہ میں شریک جہاد ہو جاؤں۔ اور میں آپؐ سے مشورہ چاہتا ہوں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا تمہاری والدہ زندہ ہیں۔ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا ان ہی کی خدمت کرو۔ کیوں کہ جنت ان کے قدموں کے نیچے ہے۔ کیا اس روایت سے رسول اللہؐ پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے جاھمہ کو جہاد میں شریک ہونے سے روکا۔ بلکہ انہیں ہدایت فرمائی کہ وہ اپنی والدہ کی خدمت کریں۔ ان دونوں روایتوں میں فرق ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں شرکت سے اس لئے روکا کہ اس وقت ان کی والدہ کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور وہ صحابی (شاید) خدمت والدہ سے زیادہ جہاد کو اہم سمجھ رہے تھے اسی لئے آنحضرت نے بتایا کہ خدمت والدہ بھی جہاد سے کم نہیں ہے۔ تم خدمت والدہ کو کمتر سمجھ رہے ہو شرکتِ جہاد کے مقابلے میں تمہارا نفس یہ چاہتا ہے کہ جہاد میں شریک ہوں گے تو شاید مال غنیمت مل جائے اور اس دوران والدہ کی خدمت سے بھی بچ جاؤ گے لیکن آنحضرتؐ نے انہیں (اس خاص موقع پر) جس چیز کی ہدایت کی وہ بھی ایک جہاد ہی تھا۔ فرق یہ تھا کہ میدان میں کفار

سے جہاد ہوتا ہے اور ماں کی خدمت میں (جبکہ اسکی شدید ضرورت تھی) نفس سے جہاد ہوتا ہے۔ اور نفس سے جہاد "جہاد اکبر" ہے۔ تلسی نے ایک دوہے میں کیا اچھی بات کہی ہے۔

تلسی رن میں جھونجھنا ایک گھڑی کا کام نت اُٹھ من سے جھونجھنا بن کھانڈے سنگرام

یعنی اے تلسی میدان جنگ میں لڑنا ایک گھڑی کا کام ہے۔ لیکن روزانہ نفس سے مقابلہ کرنا بغیر تلوار کے لڑنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آنحضرتؐ نے ان صحابی کو جہاد اصغر سے روک کر جہاد اکبر کی طرف توجہ دلائی۔

یہاں حضرت سید محمودؓ نے ظاہری اور باطنی استطاعت سبیل، حج کو جانے والے کو، ایک فنا فی اللہ بقا باللہ ہستی کی صحبت میں رہنے کی تاکید فرمائی تا کہ مقصد حج پورا ہو جائے۔ اور ہوا بھی وہی۔

لِكُلِّ نَبِيٍّ نَظِيرٌ فِي أُمَّتِهِ

ایک معترض نے حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت رضی اللہ عنہ پر ایک اعتراض کیا ہے کہ آپ نے اپنے رسالہ بعض الآیات میں یہ روایت لکھی ہے لِكُلِّ نَبِيٍّ نَظِيرٌ فِي أُمَّتِهِ حالانکہ آپ نے جو روایت پیش کی ہے وہ مندرجہ حدیث کے بالکل مطابق ہے۔

مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا لَهُ نَظِيرٌ (کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۹۳) کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس کی نظیر نہ ہو۔

اسکی تائید ایک دوسرے حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ فِي كُلِّ أَرْضٍ نَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ، وَآدَمُ كَآدَمِكُمْ، وَنُوحٌ كَنُوحِكُمْ، وَإِبْرَاهِيمُ كَإِبْرَاهِيمَكُمْ، وَعِيسَى كَعِيسَى (الدرّ المنثور) ہوں گے ہر زمین میں ایک نبی تمہارے نبی کے مانند، تمہارے آدم کے جیسے آدم، تمہارے نوح کے جیسے نوح، تمہارے ابراھیم کے جیسے ابراھیم اور تمہارے عیسٰی کے جیسے عیسٰی۔ اس حدیث سے بھی ہر نبی کی نظیر ثابت ہوتی ہے۔

صاحب زبدۃ الحقائق نے تمہید اصل نہم میں سہل تستری کے حوالے سے یہ روایت کی ہے مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا لَهُ نَظِيرٌ فِي أُمَّتِهِ۔ ترجمہ: کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس کی نظیر اسکی امت میں نہ ہو۔ (زبدۃ الحقائق قلمی فارسی)

پس ثابت ہوا کہ رسالہ 'بعض الآیات میں جو روایت حضرت بندگی میاںؓ نے لکھی ہے احادیث رسول اللہؐ کے مطابق ہے۔ اس کو موضوع قرار دینا جہل مرکب ہے۔

سویت پر اعتراض

ایک معترض کج فہم اور دروغ گو نے حضرت مہدی موعودؑ کے عمل سویت پر یہ کہہ کر اعتراض کیا ہے کہ "بی بی الہدیتی زوجہ گلاں شیخ فوت ہو کر زیر سایہ ڈونگری قریب قلعہ مدفون ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد سے طریقۂ تقسیم بالسویہ کا فتوحات میں شروع ہوا"۔ معترض کا یہ بیان کس قدر دروغ آمیز ہے اسکی دلیل میں ہم کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مقام پر خود معترض کا یہ اعتراف "ہدیہ" کے صفحہ ۲۴ پر اسطرح آیا ہے "سلطان غیاث الدین نے ساٹھ قنطار حضرت کی خدمت میں گذرانے تھے۔ حضرت نے وہ سب قنطار ان ہی لوگوں کو دے دئے جو اس خزانہ کے پیچھے آئے تھے۔ اور ایک قنطار اپنے رفقاء میں بالسّویہ تقسیم کیا" اس سے ثابت ہے کہ تقسیم بالسویہ کا طریقہ ہمیشہ جاری تھا کیونکہ یہ واقعہ بی بی کی وفات سے پہلے کا ہے۔ سچ کہا ہے بزرگوں نے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" حالانکہ حدیث میں مہدیؑ کی علامت یہ آئی ہے کہ وہ مال کو علی السویہ تقسیم کریں گے۔ ہاتھ بھر کر دیں گے، گن کر نہیں دیں گے۔ اور الحمد للہ یہ علامت بھی آپ سے ثابت ہو گئی۔

حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؓ پر اعتراض اور اس کا جواب

حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؓ جو حضرت مہدی موعودؑ کے دربار سے "مقراض بدعت" کے خطاب سے مخاطب ہوئے، جری، بہادر اور انصاف پسند شخصیت کے حامل تھے۔ آپؓ کے والد، بادشاہ کے پاس ایک اونچے منصب پر فائز تھے۔ جب والد کے انتقال کے بعد بادشاہ وقت کی جانب سے ان کو وہ منصب نہیں ملا بلکہ کمتر منصب کی پیش کش ہوئی تو آپؓ نے اسکو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آپؓ نے "واجبی حق" کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب آپؓ کو وہ منصب عطا نہیں ہوا۔ آپؓ نے اسکو حق تلفی سمجھا اور اپنا جائز حق پانے کیلئے بادشاہ وقت سے بغاوت کر دی۔ اور حکومت وقت نے بھی آپ کے خلاف کارروائی شروع کر دی، اس اثناء میں آپؓ نے حکومت کے حامی اور اپنے دشمن حبشی کے لڑکے کو قتل کر دیا، پھر حکومت کی پوری مشینری آپ کے خلاف حرکت میں آگئی اور آپ کو گرفتار کرنے کے احکامات دیدئے گئے، آپ اپنی حکمتی عملی سے برابر ان کا مقابلہ کرتے رہے۔

اس واقعہ کو مخالفین مہدویہ نے غلط طور پر پیش کرنی کی کوشش کی ہے، کہیں تو آپ کو راہزن لکھا، کہیں ڈاکو قرار دیا اور کہیں خونی اور کہیں بھگوڑا، اور یہ بھی لکھا کہ "آپ خون حبشی کے جرم سے بھاگ کر وہاں (مہدی موعودؑ) کے پاس پہنچے اور مرید ہو کر ساتھ ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپؓ تعاقب کرنے والے سرکاری اہلکاروں سے بچ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ

بھاگ رہے تھے۔ تو راستہ میں اچانک آپ کے کانوں میں اذان کی آواز آئی، یہ اذان حضرت مہدی موعودؑ کے دائرے کی اذان تھی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت مہدی موعودؑ کے دائرے کے ایک فقیر کی اذان میں کیا تاثیر تھی کہ جب اسکی زبان سے حی علی الفلاح کے الفاظ نکلے تھے اور ادھر قدرت خداوندی کے کمان سے فلاح کا تیر نکل کر شاہ نعمتؒ کے دل پر اپنا کام کر چکا تھا۔ حضرت شاہ نعمتؒ نے اپنے گھوڑے کو روک لیا۔ ساتھیوں نے کہا نعمت یہ وقت رکنے کا نہیں بلکہ گھوڑے کو اور مہمیز دینے کا ہے۔ وہ دیکھو سپاہیوں کا دستہ پیچھے آرہا ہے۔ لیکن شاہ نعمتؒ نے ان کی ایک نہ سنی، گھوڑے سے اتر کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، دستہ جب قریب آیا اور کہا کہ دیکھو یہ نعمت ہے۔ لیکن دستہ کے افسر نے کہا کہ یہ کوئی مسافر ہوگا، ایسے نازک وقت میں وہ یہاں کیوں بیٹھنے لگا۔ نعمت ان لوگوں میں ہوگا جو آگے جارہے ہیں۔ چلو جلدی کرو، وہ ان ہی لوگوں میں ہوگا۔ چنانچہ دستہ تو آگے بڑھ گیا اور حضرت شاہ نعمتؒ اذاں کی آواز کی سمت روانہ ہو گئے، ایک جماعت کو دیکھا، معمولی لباس میں نورانی چہروں کو دیکھا۔ قریب جاکر ان سے پوچھا کہ اس جماعت کا امیر کون ہے؟ فقراء دائرہ نے حضرت مہدیؑ کے حجرے کی طرف رہبری کی، حضرت وہاں پہنچے، حضرت اسی وقت حجرے سے باہر تشریف لائے اور مبارک زبان سے ارشاد فرمایا "آیئے، تم شاہ نعمت ہو، اپنا نام سن کر دل کی کیفیت اور ہی ہو گئی، فوراً قدموں میں گر پڑے اور تصدیق سے مشرف ہو گئے، پھر تو آخر دم تک آپؑ ہی کی صحبت میں رہے۔ اس عظیم الشان واقعہ میں اذان کے الفاظ کی تاثیر، مہدیؑ کی طرف دل کا میلان، مہدیؑ کی نظر فیض اثر کا کمال اور آپؑ کی صحبت اقدس کا اثر دکھائی دیتا ہے، مگر کن لوگوں کو؟، جن کے پاس نور ایمان ہے۔ لیکن جن کے دل نور ایمان سے خالی ہیں، انہیں تو بس اعتراض کرنے کی سوجھتی ہے۔

حضرت شاہ نعمتؒ، حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد سے ہیں۔ تعجب ہے کہ حضرت شاہ نعمتؒ کے معاصی سے تائب ہونے کے بعد بھی معترضین تصدیق، ترک و توبہ کے بعد پچھلے زمانے کے اعمال و افعال کو یاد کرتے ہوئے برائی سے نام لیتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے گناہ سے توبہ کرلی تو پھر گناہ کا کوئی وبال اس پر نہیں ہے"، خود حضرت عمر فاروقؓ اسلام کے کتنے شدید مخالف تھے، حضور ﷺ کی کتنی برائی بیان کی، اسلام قبول کرنے کی پاداش میں بہن اور بہنوئی کو زدوکوب کیا اور حضور ﷺ کے قتل کے ارادہ سے گھر سے نکلے تھے۔ لیکن جب حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور حضور ﷺ کی نظر آپؓ پر پڑی تو کیا اسلام قبول نہیں کرلیا۔ اسی طرح خالد بن ولیدؓ، عکرمہ، ابوسفیان یہ سب کیا حضور ﷺ اور اسلام کے کٹر دشمن نہیں تھے۔ کیا انہوں نے جنگ بدر، احد وغیرہ میں مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی نہیں کی تھی۔ اور مسلمانوں کو شہید نہیں کیا تھا۔ غزوہ احد میں حضور ﷺ کے دندان مبارک شہید نہیں ہو گئے اور حضور ﷺ کے عزیز چچا حضرت حمزہؓ شہید نہیں ہو گئے،۔ اسی طرح جو لوگ مسلمان ہوئے کیا وہ گنہ گار نہیں تھے، شراب، بدکاری اور کونسا جرم تھا جس

کے وہ مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اور جب یہی لوگ مسلمان ہو گئے تو کیا "صحابہ" نہیں کہلائے اور " رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴿المائدۃ:۱۱۹﴾ " کے اعزاز سے مشرف نہیں ہوئے، اب اگر کوئی مسلمان حضرت عمر فاروقؓ اور خالد بن ولیدؓ کو گالی دے اور یہ کہے کہ میں اس وقت کے اعتبار سے گالی دے رہا ہوں جبکہ وہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے مقابل تھے اور مسلمانوں کو شہید کیا تھا تو کیا ایسا کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔ کیا اسکو گستاخ صحابہ رسول نہیں کہیں گے۔

اسی طرح شاہ نعمتؒ نے معاصی سے توبہ کر لی تو کیا توبہ سے پہلے اعمال کا ذکر کیا جا سکتا ہے اور ان کو مطعون کیا جا سکتا ہے؟

اور خوبی کی بات یہاں یہ بھی ہے کہ جب شاہ نعمتؒ نے حضرت مہدیؑ کے حضور میں توبہ کر لی، تو امامؑ نے فرمایا "بھائی نعمت تم نے اللہ کے حقوق کی جو خلاف ورزی اور حق تلفی کی ہے اللہ تعالیٰ اسکو معاف کرنے پر قادر ہے۔ لیکن تم نے حقوق العباد کے سلسلے میں جو بے اعتدالیاں کی ہیں تو ان کو اللہ بھی معاف نہیں کریگا، جب تک کہ تم خود ان سے معاف نہ کروالو، اسلئے پہلے انکے پاس جاؤ جن کے تم قصوروار ہو"، اس حکم کی تعمیل میں جب شاہ نعمتؒ ان تمام لوگوں سے قصور معاف کرواتے ہوئے جب اس حبشی کے مکان پر پہنچے جس کے بیٹے کو قتل کیا تھا اور فرمایا میں نے تیرے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ اب یہ تلوار ہے اور یہ میرا سر ہے مجھ سے بدلہ لیلے یا معاف کر دے اس نے آپؓ کا چہرہ دیکھا کہ آپ کی حالت ہی دگرگوں ہے چہرۂ انور تجلیات ربانی سے معمور ہے۔ تو اس نے کہا تو وہ نعمت نہیں ہے جس نے میرے بیٹے کو قتل کیا تھا، اب میں تجھے اس شرط پر معاف کرتا ہوں کہ تو مجھے بھی اس مقام پر لے چل جہاں سے تجھے یہ نعمت ملی ہے، پھر آپؓ اس کو ساتھ لیکر امامؑ کی خدمت میں پہنچے، انہوں نے امامؑ سے بیعت و تصدیق کی، ان کا نام سدّی عبد اللہ تھا (تذکرۃ الصالحین)۔

حضرت خواجہ گیسو دراز کے مزار مبارک پر امامؑ کی حاضری اور اس پر اعتراض

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امامؑ نے جب خواجہ گیسو درازؒ کی گنبد کے اندر جا کر زیادہ دیر کر دی تو لوگوں کے پوچھنے پر آپؑ نے فرمایا، "سید محمد گیسو درازؒ کی روح استقبال کر کے بہت حاجت مندی کے ساتھ اپنی قبر میں لا کر بہت کوشش کی کہ نعلین کی گرد جب تک ہماری قبر پر نہ پڑیگی، مہدیت کا دعویٰ جو ہم سے ہوا ہے اس کی خجالت دور نہ ہو گی، اسلئے چند بار تکرار کی گئی، یہاں تک کہ ہم نے ان کی آرزو قبول کی، تین بار جوتیوں کے ساتھ ان کی قبر کے اوپر آمد و رفت کی، اس بناء پر خوش ہو کر ہمیں رخصت کیا، دیر کا سبب یہ تھا، زماں خان صاحب نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ امامؑ خواجہ گیسو درازؒ کے مزار پر قدم رکھا۔

ہمارے پاس کتب سیرت کا اس پر اتفاق نہیں ہے، چنانچہ مولود میاں عبد الرحمان میں یہ واقعہ تو ہے، لیکن قبر پر چلنا

مذکور نہیں ہے، صرف اسقدر بیان ہے کہ آپؑ نعلین پہن کر گنبد میں گئے، چنانچہ روایت میں یہ الفاظ ہیں، نعلین کے ساتھ گنبد میں جارہے تھے، وہاں کے خدام نے عرض کیا، یہ ولی اللہ ہیں، حضرت نعلین چھوڑ دیں، امامؑ نے فرمایا کہ تیری بات سنوں یا تیرے پیر کی۔ اسطرح جنت الولایت میں لکھاہے، ''میراں نعلین سمیت گنبد میں گئے''

اس روایت پرسے مخالفین نے امامؑ کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا، طبیعت میں شر ہو اور دینداری و دیانت داری کا پاس ولحاظ نہ ہو تو آدمی شیطان کو بھی مات دے سکتاہے۔ قبل اس کے کہ اس اعتراض کا جواب دیں، ہم ناظرین کے سامنے چند بنیادی باتیں پیش کر دیناضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) کیاامامناؑ زیارت کے قائل نہیں تھے۔ جیسا کہ بعض فرقوں کا کہناہے ؟

(۲) کیاامامناؑ اولیاء کا احترام نہیں کرتے تھے ؟

(۳) کیاامامناؑ کو نعلین سمیت قبر کی بے حرمتی کرتے ہوئے کہیں بھی اور کبھی بھی دیکھاہے ؟

جواب (۱) امامؑ زیارت قبور کے قائل تھے، کسی کا انتقال ہونے پر آپؑ خود بنفس نفیس قبرستان گئے ہیں اور دفن میں شریک ہوئے ہیں۔ جب آپؑ کا اپنے مریدوں اور معتقدین کے ساتھ یہ سلوک تھاتو، اولیاء اللہ کے ساتھ کیاسلوک ہو گا۔ محتاج بیان نہیں۔

جواب (۲) امامؑ نے اپنے سے ماقبل اولیاء کی تعریف فرمائی ہے، ان میں سے بعض کو آپؑ نے دین کے پہلوانوں کے نام سے یاد کیاہے۔ اور ان کو اچھے ناموں سے یاد فرمایاہے۔

نیز آپؑ نے اپنی ہجرت اور تبلیغ ودعوت مہدیت کے دوران جن مقامات پرسے گذرے ہیں، اگر اثنائے راہ اولیاء کے مقابر کی اطلاع ملی ہے تو آپؑ نے انکی زیارت فرمائی اور ان کے مقامات سے بھی عوام کو آگاہ فرمایاہے۔

یہی نہیں بلکہ آپؑ نے عوام کی قبروں کا بھی احترام کیاہے۔ حالانکہ وہاں قبروں کے نشانات بھی باقی نہیں تھے، چنانچہ حضرت میاں عبدالرحمان نے دولت آباد کے واقعات کے ذیل میں لکھاہے۔

''سید السادات سید راجو کے روضہ سے سید محمد عارف کے روضہ اشرف تک انگوٹھوں پر چل رہے تھے۔ اور زمین پر پورا قدم نہیں رکھتے تھے، میاں سلام اللہؓ نے عرض کیا ''میرانجی، اس طرح کیوں چل رہے ہیں، مرکب پر کیوں سوار نہیں ہوتے ؟'' فرمایا کہ وہاں سے لیکر یہاں تک تمام اولیاء بڑے صاحب کمال (مدفون) ہیں''۔

اسی طرح حاشیہ شریف میں یہ روایت آئی ہے ''حضرت مہدیؑ جھٹکے پر سوار ہو کر دولت آباد پہنچے، تمام اولیاء اللہ کی زیارت کی، ایک مقام پر قدم مبارک کی ایڑھیاں ٹیک کر چل رہے تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا خوندکار کیوں اس طرح چل رہے ہیں۔ تو مہدیؑ نے فرمایا، یہاں بہت سے اولیاء ہیں''۔

ایک روایت میں ہے۔ آپؑ انگھوٹوں پر چل رہے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؑ ایڑھیوں پر چل رہے تھے۔ اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے جوتیاں قبرستان کے باہر ہی نکال دی تھی۔ اور میاں سید سلام اللہؓ کے پوچھنے پر یہ جواب دینا کہ، یہاں بڑے اولیاء اللہ دفن ہیں۔ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ قبر زمین کے برابر ہو گئی تھیں اور ان کے کوئی نشانات بھی نظر نہیں آتے تھے۔

جن گمنام اولیاء کی ایسی قبروں کا آپؑ نے احترام فرمایا جن کے آثار و علامات بھی بظاہر نہیں دکھائی دے رہے تھے، تو یہ بات کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتی، کہ گلبرگہ میں حضرت خواجہ سید محمد گیسو درازؒ کے قبر کی توہین یا بے عزتی یا پامالی آپؑ نے کی ہو، گلبرگہ، حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی وجہ سے مشہور و معروف ہو گیا ہے اور دن رات آپؒ کے مزار کے پاس لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔

واقعہ وہی ہے جو امامؑ نے فرمایا کہ ''حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے ایک مرتبہ اپنے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ، بحالت جذب کر دیا تھا، چونکہ ولی کامل تھے، اللہ نے آپؒ کو اس غلطی سے آگاہ فرمادیا، آپؒ تائب ہو گئے، جب حضرت مہدی موعودؑ کو آپؒ نے دیکھا تو خود آگے بڑھ کر تین میل کی مسافت طے کر کے، آپؒ نے استقبال بھی کیا اور عرض گذار ہوئے کہ ہم سے جو غلطی ہو گئی تھی، ہم نے اللہ سے بھی معافی مانگ لی ہے، اب آپ تشریف لائے ہیں، تو از راہ کرم ہماری گنبد میں نعلین پہن کر تشریف لائیں اور آپ کے نعلین کی گرد ہمارے روضے پر پڑ جائے تو اطمئنان نصیب ہو گا''۔

یہ جو کچھ بھی ہوا، خود امامناؑ نے خود اپنی زبان مبارک سے فرمایا۔ پھر جب آپؑ گنبد کے اندر تشریف لے گئے تو دروازہ خود بخود بند ہو گیا، اندر کیا معاملہ ہوا؟ کس نے دیکھا؟ حضرت مہدیؑ نے ہی فرمایا کہ ''خواجہ نے بھی درخواست کی کہ ہماری تسلی اس سے ہو گی کہ آپ ہمارے مزار پر نعلین پہن کر آئیں، یہ گویا ایک التجاء۔ ایک درخواست اور ایک گذارش تھی، حضرت مہدیؑ نے فوراً یہ درخواست منظور نہیں کی۔ لیکن خواجہ صاحب بضد تھے کہ ایسا ہو تو ''مجھے تسلّی ہو گی''۔

اسی طرح کا ایک واقعہ دور نبوت میں پیش آیا، مگر نوعیت کے اعتبار سے یہ واقعہ تو اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت بلال حبشیؓ کو **یا اسود** کہہ کر پکارا، حضرت بلالؓ کا دل اس سے بہت ملول

ہوا۔ اور حضرت بلالؓ نے حضور ﷺ کے پاس اس امر کی شکایت کی، آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بلایا اور استفسار فرمایا اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تمہیں بلال کا دل اس طرح دُکھانا نہیں چاہئے تھا، حضرت عمرؓ نے اگرچہ اس کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا، مگر جب معاملہ حضور ﷺ تک آگیا تو حضرت عمرؓ نے معافی مانگنے کا ایک انوکھا طرز اختیار کیا، آپؓ نے اپنی گردن زمین پر رکھ دی اور حضرت بلالؓ سے فرمایا، اگر آپ اپنا پاؤں میری گردن پر رکھ کر گذر جائیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے معاف فرمادیا۔ حضرت بلالؓ لرز گئے اور فرمایا "عمر آپ ہمارے سید ہیں" میں نے اللہ کیلئے آپ کو معاف فرمادیا۔ لیکن حضرت عمرؓ اصرار کرتے رہے کہ جب تک میری گردن پر پاؤں رکھ کر آپ گذر نہیں جائیں گے، میں اپنی گردن نہیں اٹھاؤں گا، ایک روایت کے مطابق حضرت بلالؓ کو ایسا ہی کرنا پڑا اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت بلالؓ نے ویسے ہی معاف کر دیا۔

یہاں بات قبر کی نہیں، بلکہ زندہ حضرت عمرؓ کی ہے، جن کی گردن پر حضرت بلالؓ کو اپنا پاؤں رکھ کر گذرنے کی بات ہے، مطلب صرف یہی تھا کہ، جو غلطی ہوگئی تھی، (اگرچہ نادانستہ ہی سہی) اس کی تلافی کی صورت حضرت عمرؓ نے خود تجویز کی تھی، اگر حضرت بلالؓ کو ویسا ہی کرنا پڑا تو اسکو بد خلقی یا توہین تو کسی طرح نہیں کہا جاسکتا، اسی طرح حضرت سید محمد گیسو درازؒ نے غلبہ حال کے تحت مہدی ہونے کا دعوی کر دیا تھا جو غلط تھا، پس غلطی معلوم ہونے کے بعد اگرچہ آپؒ نے ایک دو دن میں اس دعویٰ سے رجوع فرمالیا تھا اور اللہ سے معافی مانگ لی تھی، پھر جب امامؑ نے مہدیت کا دعویٰ بامر اللہ فرمایا تو، حضرت گیسو درازؒ نے خود آپؑ سے اسکی تلافی کی یہی صورت نکالی کہ آپؑ میری گنبد پر نعلین سمیت تشریف لائیں تو میں سمجھوں گا کہ میری غلطی معاف ہوگئی، نیز حضرت مہدیؑ کے فیض سے بہرور ہونے کی تمنا بھی پوری ہو جائیگی۔ جو ہستی دیگر اولیاء کی قبروں کی رعایت کرتے ہوئے، ان کا ادب واحترام ملحوظ رکھ کر پنجوں یا ایڑیوں پر چلی ہے اور یہ فرمایا کہ اس احتیاط کے باوجود کسی ولی کے سینے پر اور کسی ولی کے جسم پر میرا پاؤں پڑ رہا ہے، ایسی ہستی سے گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کے پیش نظر حضرت سید محمد گیسو درازؒ کی قبر کی اہانت کا تصور بھی رہا ہوگا، اور جو بھی ہوا حضرت کی التجاء واستدعاء کو قبول کرتے ہوئے ان کو تسکین بخشنا تھا۔

اسی طرح جب فتح مکہ ہوا اور حضور ﷺ کے حکم سے کعبۃ اللہ میں رکھے ہوئے بتوں کو گرایا جارہا تھا تو کعبۃ اللہ میں سب سے بڑا بت جو سب بتوں کے اوپر، اونچائی پر نصب کیا گیا تھا۔ حضرت ﷺ نے خود اس کو گرانے کی کوشش کی، لیکن آپ ﷺ کا عصا وہاں پر نہیں پہنچتا تھا۔ تو آپ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجھہ سے فرمایا۔ علی تم میرے پر کندھے پر چڑھ کر اس بت کو گرادو، اندازہ لگایئے کہ اس وقت حضرت علیؓ کا حال یہ حکم سن کر کیا ہوا ہوگا۔ کہاں حضرت علیؓ اور کہاں حضور خاتم النبیین محمد مصطفی ﷺ، جو کعبہ کا بھی کعبہ ہیں، حضرت علیؓ نے فرمایا۔ آقا یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے با

صرار حکم دیا، میں جو کہہ رہاہوں ویساہی کرو، مجبوراً حضرت علی، حضور ﷺ کے کندھوں پر چڑھے اور اس بت کو گرادیا، سوال یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے کیا حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی، یہاں قبر بھی نہیں ہے، بلکہ زندہ شخصیت ہے اور معاملہ تنہائی کا بھی نہیں ہے بلکہ علی رؤوس الاشہاد، سب لوگوں کے سامنے، سب لوگوں کی موجودگی میں ہورہاہے۔ حضرت علیؓ نے حکم کی تعمیل میں حضور ﷺ کے کندھوں پر چڑھ کر اس بت کو گرادیا، کیا کوئی نادان اور جاہل یہاں بھی یہ کہیگا کہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ کے مبارک کندھوں پر اپنے پاؤں رکھ کر کھڑے ہوئے اور اس بت کو گرایا، حضرت علیؓ نے حکم رسول ؐ کی اطاعت کی۔ اور ''الامر فوق الادب'' کی رعایت کی۔ اور مہدیؑ نے حضرت گیسو درازؒ کی التجاء اور درخواست کی رعایت کی، نہ اس کو بد خلقی کہا جاسکتا ہے اور نہ اس واقعہ کو۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو جب کہ وہ آپ کے دوش مبارک پر قدم رکھ کر کعبۃ اللہ میں رکھے ہوئے بت گرا رہے تھے اسی طرح مخاطب فرمایا۔ ''اے علی کیا ہی اچھا ہے تمہارا وقت کہ کار حق کرتے ہو، اور کیا ہی اچھا ہے میرا حال کہ بار حق اٹھاتا ہوں'' (مدارج النبوۃ، جلد دوم۔ ص ۲۹۱)

نیز یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قبر پر کھڑے ہونے سے کیا مراد ہے، عربی میں ''اقامت علی القبر'' کہا جاتا ہے، لیکن اگر عجمی لوگ جو محاورہ عرب نہیں جانتے، وہ اس کا ترجمہ ''عملاً قبر پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہونا'' کرتے ہیں تو وہ علوم قرآنیہ سے بے بہرہ ہونے کی دلیل فراہم کرتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، چناچہ قرآن شریف میں اللہ رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرکے دو باتیں فرماتا ہے، ایک تو یہ کہ منافقین کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھیں اور دوسرا یہ ''وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ'' ﴿سورۃ توبہ: ۸۴﴾ اور مت کھڑا ہو اسکی قبر پر۔ کیا اسکے یہ معنی لئے جائیں گے کہ اللہ کسی منافق کی قبر پر (عملاً) کھڑے ہونے سے منع فرمارہاہے۔ اس سے ضمناً کیا یہ معنی نہیں ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے مومنین کی قبروں پر کھڑے ہوتے تھے۔ ایسا تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ پس اس آیت شریفہ کے معنی ہوں گے کہ آپ ایسے لوگوں کی نہ تو نماز جنازہ پڑھیں اور نہ ان کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعائے استغفار (فاتحہ) پڑھیں اور ان کی زیارت کریں۔

اسی طرح حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے یہ تمنا اور درخواست کی تھی کہ آپ میرے گنبد میں جوتے پہن کر تشریف لائیں تا کہ آپ کے جوتوں کی گرد بھی مجھے مل جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے دعویٰ مہدیت کرتے ہوئے جو غلطی کی تھی اس کی بخشش ہو جائیگی اور مجھے ان قدموں کی برکت نصیب ہو جائے۔ (مطلب یہ کہ میری قبر کے پاس جوتوں سمیت کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھیں)

اعتراض کہ حضرت میراں سید محمود (ثانی مہدیؒ) نے ایک کتا پالا تھا

ایک معترض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت میراں سید محمود (ثانی مہدیؒ) نے ایک کتا پالا تھا جو خلاف شرع ہے، چنانچہ روایت پیش کی ہے کہ ایک روز بی بی ملکاںؒ کے گھر کے سامنے لالہ نامی ایک کتا آیا، بی بی نے اسکو اینٹ کے ایک ٹکڑے سے مارا، میراں سید محمودؓ نے اسکو دیکھا اور فرمایا، اگر وہ کتا ہے اسے مارنا چاہئے، لیکن وہ کتا نہیں ہے، اسکو نہیں مارنا چاہئے، بی بی ملکاںؒ نے کہا کہ میراں جی یہ تو بھائی کالو کی طرح ہوا، فرمایا، ہاں اس کا بھائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ (۱) کتا گھر میں نہیں تھا بلکہ گھر کے باہر دائرہ میں رہتا تھا، جسکی حیثیت ایک محلہ یا ایک بستی کی تھی۔

(۲) بی بی ملکاں نے کتے کو صحن کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اینٹ ماری، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدویوں کے ہاں کتے کو نجس ہی سمجھا جاتا ہے، جب صحن خانہ کے سامنے بھی اس کا آنا گوارا نہ ہوا تو اسکو گھر میں رکھنا یا اسکو پالنا کیسے کہا جاسکتا ہے ؟؟

حضرت میراں سید محمودؓ کا یہ کہنا کہ اگر وہ کتا ہو تو مارو، مطلب کہنے کا یہ تھا کہ وہ کتا نہیں ہے، بلکہ ایک جن ہے جو کتے کی صورت میں آیا تھا اور جن کا کتے کی صورت اختیار کرنا احادیث سے ثابت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے حجرے میں تشریف نہیں لائے، پوچھنے پر کہا کہ آپ ﷺ کے پلنگ کے نیچے کتا تھا، مزید تفصیل ثانی مہدیؓ نے بھی بتادی کہ یہ کتا ایسا ہی ہے جیسا کہ امامنا مہدیؑ کے دائرہ میں رہنے والا تھا، اسی لئے آپؓ نے فرمایا کہ یہ کتا اس کا بھائی ہے یعنی جن ہی ہے۔

میاں یوسف حج کرنے کی اجازت چاہی تو بندگی میراں سید محمودؓ نے فرمایا، جاؤ اور میاں دلاور کے حجرہ کا طواف کر کے آؤ

روایت ہے کہ بندگی میراں سید محمودؓ کی خدمت میں میاں یوسف نامی ایک شخص آئے اور کہا اجازت ہو تو حج کر آؤں، آپؓ نے فرمایا، جاؤ اور میاں دلاور کے حجرہ کا طواف کر کے آؤ، اگر تمہارا یہ حج قبول نہ ہو تو پھر حج بیت اللہ کو جاؤ، میاں یوسف نے ایسا ہی کیا، بعد میں میاں یوسف گرتے پڑتے میراں سید محمودؓ کے پاس آئے اور کہا میں نے اپنے خدا کو چشم سر سے دیکھ لیا۔

اس پر یہ اعتراض کہ مہدویہ کے پاس حج کی اہمیت نہیں ہے بلکہ حج کا انکار ہے، کس قدر غلط بات ہے، حج ان لوگوں پر

فرض ہے جو زادراحلہ رکھتے ہیں "مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" ﴿آل عمران:۹۷﴾ حج کیلئے جانے کی شرط ہے، اور حج چند ظاہری ارکان کے ادا کرنے کا نام ہے، لیکن اس کا باطن کیا ہے؟ یہی نا کہ جس کے گھر کو جاکر اس کا طواف کررہے ہیں، اس کا دیدار حاصل کرنے کی تمنا دل میں ہو، ورنہ جو سفر ہوگا وہ صرف سیر وسیاحت کی غرض سے ہوگا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایک خاص مقصد کو لیکر حج کو جانا چاہئے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت میراں سید محمودؓ کو معلوم ہوگیا ہو کہ ان کے پاس زاد راحلہ نہیں ہے۔ پس اگر وہ ایسی حالت مین حج کو جائیں گے تو راستہ بھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اور تیسری بات حج تمام فرائض میں آخری فرض ہے، جو عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ اس کیلئے انسان کو پوری طرح کی تیاری کرلینا چاہئے حتیٰ کہ کفن بھی ساتھ رکھ لیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر جب حضرت سید محمودؓ نے یہ فرمایا کہ جب تمہارا مقصد خدا کو پانا ہے، تو بھائی دلاور کے حجرے کا طواف کرلو، اگر تمہارا حج قبول نہ ہو تو پھر حج بیت اللہ کو جاؤ۔ اس سے حج بیت اللہ کی فرضیت سے انکار کہاں ثابت ہوا؟۔ آپؓ کا اس سے مقصد، زاد راحلہ نہ ہونے کی وجہ سے تکلیف مالایطاق سے بچاکر، مقصد حج سے مستفید کرنا ہے۔ چناچہ فرمایا "اگر یہاں تمہارا مقصد پورا نہ ہو تو پھر حج بیت اللہ کو جاؤ۔ اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے، چنانچہ میاں یوسفؒ، شاہ دلاورؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے مستفیض ہوئے یعنی دیدار حق سے مشرف ہوگئے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ اس وقت حضرت شاہ دلاورؓ حیات تھے، بعض لوگ اس مقام پر یہ شوشہ بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ حضرت شاہ دلاورؓ کے گنبد کا طواف کرنے کی ہدایت دی گئی تھی، یہ ستم بالائے ستم ہے۔

اہل سنت کی کتابوں میں ہے کہ یہ خود (سید محمد جونپوری) شیخ دانیال کے مرید تھے

اہل سنت کی کتابوں میں ہے کہ یہ خود (سید محمد جونپوری) شیخ دانیال کے مرید تھے۔ لیکن ان کی مریدی کا مہدویہ انکار کرتے ہیں؟

جواب: کسی بھی خاندان اور خانوادہ کے تحقیقی حالات ان ہی لوگوں سے معلوم ہوتے ہیں جو اس سلسلے میں داخل ہیں۔ اب جو لوگ اس سلسلے میں داخل نہ ہوں وہ کیسے جان سکتے ہیں کہ کون کس کا مرید ہے اور کون کس کا مرشد ہے۔ اگر غیر متعلق لوگ بغیر تحقیق اپنی طرف سے یا کسی سے کچھ سن کر کچھ کہدیں یا لکھ دیں جو یقیناً بے سند ہے وہ کس طرح قابل قبول ہوگی۔

ہمارے پاس کی جملہ کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ حضرت شیخ دانیال حضرت مہدی علیہ السلام سے مرید ہوئے۔ آپ سے تلقین پائی۔ اور یہ واقعہ کھوکھری مسجد، جونپور کا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

اگر ایسا نہ ہو اور مخالفین و منکرین کا قول سند کی حیثیت رکھتا ہو تو پھر تاریخ کی حیثیت ہی ختم ہو جائے گی۔ سنی سنائی باتوں کو تاریخ نہیں کہتے بلکہ جس زمانے کے واقعات ہوں یا جس شخصیت کے تعلق سے واقعات ہوں وہ اگر اس زمانے میں موجود یا اس شخصیت سے متعلق افراد سنداً بیان کرتے ہوں تو وہ تاریخ کہلاتی ہے۔ اس میں بھی یہ دیکھا جائے گا کہ بیان کرنے والا جوں کا توں بیان کر رہا ہے یا اپنی طرف سے رنگ آمیزی اور من گھڑت واقعات بیان کر رہا ہے۔

چنانچہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی حالات مسلمانوں کے نزدیک صحیح سمجھے جاتے ہیں جو سنداً مسلمانوں کی روایتوں سے ثابت اور اسلامی کتب و تواریخ میں درج ہیں۔ یہود و نصاریٰ یا دوسرے اہل مذاہب کا کوئی بے تحقیق بیان جو ان روایتوں کے مخالف ہو مسلمانوں کے نزدیک صحیح نہیں خیال کیا جائے گا۔ اس کی واضح مثال بعض عیسائی مؤرخین اور مصنفین کے وہ اقوال ہیں جو حضور کے تعلق سے بیان کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ جب حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کا سفر کیا تھا اس وقت بعض راہبوں سے آپ نے انبیاء علیہم السلام کے جو قصے سماعت فرمائے تھے اور ان سے جو معلومات حاصل کی تھیں وہی قرآن میں درج ہیں۔ کیا کوئی مسلمان اس بے اصل قول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے ؟؟ پس مہدویہ بھی اسی طرح ہرگز اس بات کو تسلیم نہیں کرتے جس کی سند ہے نہ تحقیق۔ جب مسئلہ ہم سے متعلق ہے اور ہمارے پاس تحقیق اور سند کے ساتھ جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس کے خلاف کسی بے سند بات کو ہم کس طرح مان سکتے ہیں۔ بے شک ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور سچی بات تو یہی ہے کہ شیخ دانیال رحمتہ اللہ علیہ نے امام مہدی علیہ السلام سے تلقین پائی ہے۔

ابور جازماں خاں کے اعتراضات اور اس کے جوابات

ابور جازماں خاں نامی ایک غیر مہدوی عالم نے اپنے علم کے زعم پر حضرت امامنا مہدی موعود علیہ السلام، مہدیت، مہدویت اور خلفاء کرام و متبعین امام علیہ السلام پر رکیک، نازیبا، علم سے دور، تہذیب سے ناآشنا بلکہ حسد اور بغض سے مملو اعتراضات کئے ہیں۔ علم سے دور اور حقائق سے ناآشنا عوام اس شخص کے جال میں پھنس کر مہدویت کو غلط اور حضرت مہدی علیہ السلام کو مختلف ناموں سے یاد کرنے لگے اور آج بھی جو لوگ مہدویت کے بارے میں غلط اور نامناسب باتیں کہتے ہیں اور لکھتے ہیں ان سب کا مدار الرداور ہدیہ مہدویہ ہی ہے۔ ان میں مندرج باتوں کو، کچھ الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ دہراتے ہیں۔

حالانکہ اس کا جواب سب سے پہلے حضرت العلامتہ عبدالملک سجاوندیؒ نے حضرت بندگی میاں شاہ دلاور خلیفہ پنجم

حضرت امام الکائنات مہدی موعود علیہ السلام کی اجازت اور حکم سے اپنی گرانقدر تصنیف "سراج الابصار" کے ذریعہ دیا۔ اور اس کے بعد بھی بہت سے لوگوں نے اس کے جوابات اپنی اپنی فہم وفکر کے لحاظ سے قرآن شریف اوراحادیث شریفہ کی روشنی میں دئے ہیں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ کوئی جواب الجواب آج تک نہیں آیا۔ صرف اپنے نام کی تشہیر، جھوٹی عزت اوراپنی علمی دکان چمکانے کی غرض سے مسلسل اسی کتاب کے چند اقتباسات یااسی کے پیش کردہ غلط نظریات کو جو ہفوات کی شکل میں ہیں پیش کردینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے شیخ علی نامی شخص نے "الرد" نامی ایک کتابچہ مہدویت کے خلاف لکھااور نہایت ڈھٹائی سے یہ لکھا:

"امام مہدی کے باب میں تو بہت سی حدیثیں وارد ہیں لیکن شیخ کا یہ ادعا ہے کہ وہی شخص مہدی ہوگا جس میں تمام احادیث کے معانی اور علامات پائے جائیں۔ اگر بعض ہی سے مہدی متحقق ہو جائے تو باقی کے ذکر کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

صاحب سراج الابصار کا استدلال ہے کہ جو روایتیں دین کے باب میں وارد ہیں ان میں لیل ونہار کا اختلاف ہے۔ مسئلہ مہدویت بھی تو ایک امر دینی ہے جس کا تعلق عقائد سے ہے۔

اعمال کے تعلق سے بھی جتنی احادیث آئی ہیں مجتھدین نے ان تمام حدیثوں سے تمسک نہیں کیا۔ بعض حدیثوں کو تو انہوں نے اصل ومدار قرار دیاہے، بعض روایتوں کو ترک کردیااور بعض روایتوں کی توجیہ کی۔

اعتراض(۱) شیخ علی کی اتباع میں مؤلف مہدویہ کا بھی کہنا یہی ہے کہ "مہدی کے باب میں جس قدر حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان سب کا مہدی میں پایا جانا ضروری ہے اور عامتہ الناس کو دھوکہ دینے کے لئے ایک مثال یہ دی ہے "کہ مثال اس کی محسوسات میں یہ ہے کہ رسی بالوں کی بسبب اجتماع واتفاق بالوں کے کس قدر قوی اور مضبوط ہوتی ہے۔ حالانکہ بجز بالوں کے اس میں اور کچھ نہیں ہے۔ اور ہر ہر بال علیحدہ نہایت ضعیف تھا(ہدیہ مہدویہ)۔

جواب: اگر معترض کے اس اصول پر عمل کیا جائے اور صحاح ستہ، دیگر مسانید ومعاجم کی وہ تمام روایتیں ایک جاجمع کردی جائیں جو نماز، روزہ، حج وزکواۃ سے متعلق ہیں توایسی بیسیوں رسیاں بن جائیں گی جن میں سے ایک بھی کام کی نہ ہوگی۔ مثلاً شیخ علی مؤلف کنزالعمال نے کتاب الصلوٰۃ میں ساڑھے چار ہزار سے زیادہ حدیثیں درج کی ہیں۔ ان تمام حدیثوں پر بلا استثناء عمل کرکے نماز پڑھنانا ممکن ہو جائے گا۔

اس سے قطع نظر ان حدیثوں میں جو صحاح میں مہدی کے باب میں وارد ہیں اور ان حدیثوں میں جو عقدالدرریا

العرف الوردی جیسے رسالوں میں جمع کی گئیں ہیں کافی اختلاف ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان علماء کا عقیدہ علامات مہدی کی حد تک کسی قدر مختلف ہے۔

انصاف نامہ میں جو میاں ولی یوسفؒ کی تصنیف ہے یہ لکھا ہے کہ خبر واحد کا منکر کافر ہے۔ (یہ انصاف نامہ کے باب دوم میں قول مضمرات کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔)

اب معترض نے اس کا معنی نہ سمجھ کر یہ اعتراض کیا ہے کہ جب تم خود اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ خبر واحد کا منکر کافر ہے تو معلوم ہوا کہ امام مہدی کے باب میں جتنی حدیثیں آئی ہیں وہ سب معتبر ہیں۔ پس ان سب احادیث کے معنی کا مہدی کا دعویٰ کرنے والے میں پایا جانا ضروری ہے؟

معترض کو صرف اعتراض کی دھن ہے وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ خبر واحد سے وہ خبر مراد ہے جس کی تائید دوسری خبروں سے ہوتی ہو یا جو وقوع پذیر ہو کر قطعیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہو۔ اور اسی طرح قیاس سے مراد وہ قیاس ہے جس کا مقیس علیہ قطعی ہو۔

چنانچہ صاحب سراج الابصار کا اس مسئلہ میں استدلال یہ ہے کہ مجتہدین کے اجتھاد پر غور کرو، مسائل دینیہ میں سے کوئی مسئلہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس میں وہ سب متفق ہو گئے ہوں، اور اختلاف نہ کیا ہو۔ اس سلسلہ میں آپ نے جواباً فرمایا: "اگر شیخ بہ نظر انصاف ان صحیح حدیثوں کو دیکھے جو رفع یدین پر دلالت کرتی ہیں تو انہیں اس سے زیادہ پائے گا کہ وہ تحت ضبط داخل ہو سکیں۔ لیکن باوجود اس کے احناف ان کی تاویل کرتے ہیں۔ اور رفع یدین نہیں کرتے۔

اسی طرح جو حدیثیں پانی کی طہارت کے لئے قلتین کی مقدار پر دلالت کرتی ہیں، احناف ان کو ترک کر دیتے ہیں بلکہ پانی کی طہارت کے لئے وہ دہ دردہ (10x10) گز مقرر کرتے ہیں۔ جس کے لئے تمام محدثین کے پاس کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ جس پر اعتماد کیا جا سکے لیکن باوجود اس کے حنفی، قلتین (دو مٹکے) والی حدیث کو چھوڑ کر (10x10) والے قیاس پر عمل کرتے ہیں۔

اسی طرح علماء نے بھی امام مہدی کی علامتوں کے بارے میں اختلاف کیا (لیکن یہ یاد رہے کہ بعثت مہدی علیہ السلام کے بارے میں اختلاف نہیں کیا)

لیکن تشخیص علامات مہدی، قطعی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ایک جماعت نے کوئی رائے ظاہر کرنے سے توقف کیا

جیسا کہ بیہقی کی شعب الایمان سے یہ روایت ہے۔

اختلف الناس في امر المهدي فتوقف جماعة و احالوا العلم الي عالمه و اعتقدوا انه وَاحِد من اَولَاد فَاطِمَة بِنت رَسول الله صَلي الله عَلَيهِ و سَلّم يَخلَقه الله مَتیٰ شَاءَ وَ يَبعَثه نَصرةً لِدِينِه۔

امام مہدی کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہو گیا اس لئے ایک گروہ نے توقف کیا اور اس کے علم کو اس کے عالم کے حوالے کر دیا اور اپنا یہ عقیدہ رکھا کہ وہ اولاد فاطمہ سے ایک شخص ہو گا جسے اللہ جب چاہے گا اپنے دین کی نصرت کے لئے پیدا کرے گا اور مبعوث فرمائے گا۔

شعب الایمان کی روایت کی تائید تفتازانی اس طرح کرتے ہیں:**فذهب العلماء الي انه امام عادل من ولد فاطمة يخلقه الله متیٰ شاء و يبعثه نصرةً لدينه۔** علماء کا مذہب یہ ہے کہ مہدی، اولاد فاطمہ سے امام عادل ہیں اللہ انہیں جب چاہے گا پیدا کرے گا اور اپنے دین کی نصرت کے لئے مبعوث فرمائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام حدیثوں کا قدر مشترک یہی ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے۔

اب رہی یہ بحث کہ اختلافات علامات کی صورت میں مہدی کی صداقت کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ تو حضرت میاں عالم باللہؒ کا بیان یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت کا جو معیار ہے وہی امام کی صداقت کا معیار ہو گا۔

واضح ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت کے تین معیار ہیں (۱) دعویٰ کرنا اور اس پر آخر دم تک ہر قسم کے حالات اور مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے قائم رہنا (۲) معجزات (۳) آپ کے اخلاق۔

چنانچہ حضرت میاں عبدالملک سجاوندیؒ نے اسی پر زور دیا اور فرمایا کہ اخلاق دلیل قطعی ہیں۔ اور جن کا دعویٰ دلیل اخلاق سے ثابت ہو جائے اس کا معارضہ ضمنی روایتوں سے نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ خود قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور بعثت سے قبل کی زندگی کو آپ کی نبوت کے اثبات میں پیش کیا ہے۔

چنانچہ آیت شریفہ **أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ** ﴿المومنون:۶۹﴾ کیا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں جانا۔ اسی طرح قرآن میں آنحضرت کی زبان سے نکلا ہوا یہ مقولہ دہرایا ہے۔ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا** ﴿یونس:۱۶﴾ میں نے تو تم میں ایک عمر بسر کی ہے۔ یعنی میری زندگی کا بیشتر حصہ تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔ تم نے ہمیشہ مجھے اتنا صادق پایا کہ تم نے مجھے ''الصادق'' کے

نام سے یاد کیا۔ پس جو شخص لوگوں سے کبھی جھوٹ نہیں کہا تو کیا وہ اللہ کے تعلق سے جھوٹ کہہ سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں نے لوگوں کی امانتوں میں کبھی خیانت نہیں کی یہاں تک کہ تم نے مجھے "الامین" کے لقب سے پکارا۔ پس جو شخص لوگوں کے معاملات اور اموال میں امانت کو اپنا شعار بناتا ہے تو کیا وہ اللہ کی وحی کے تعلق سے خیانت کر سکتا ہے۔

تو گویا آنحضرت نے اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر اپنے اخلاق عظیمہ اور ملکات فاضلہ کو ہی پیش فرمایا۔

نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے تعلق سے جو احادیث شریفہ آئی ہیں ان کا تعلق پیشین گوئیوں سے ہے اور پیشین گوئیاں کا تعلق بزمانہ آئندہ ہونے کی وجہ سے اخبار مغیبہ کہلاتی ہیں۔ اخبار مغیبہ کی زبان صاف اور صریح نہیں ہوتی بلکہ ان کے معنی متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جو لوگ نکتہ داں، باریک بین اور امور دینیہ میں ماہر ہوتے ہیں وہی ان کی صحیح توجیہ کر سکتے ہیں۔ ایسی باتیں عام لوگوں کے پلے نہیں پڑتیں۔

چنانچہ حضور پُر نور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے توراۃ اور انجیل میں آئی ہوئی پیشین گوئیوں کے تعلق سے یہود و نصاریٰ آج بھی یہی کہتے ہیں کہ ان پیشین گوئیوں کا مصداق "محمد" ہو ہی نہیں سکتے۔ حضور کے حالات زندگی کے ایک ایک جز کا استغفر اللہ آج بھی مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا شخص رسول ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ایک پیشین گوئی جو بائیبل کے سب سے آخر میں مکاشفات یوحنا کی کتاب میں آئی ہے اس کتاب کے شروع میں یہ درس ہے۔

"یسوع مسیح کا مکاشفہ ہوا جو خدا نے اسے دیا تا کہ اپنے بندوں کو وے باتیں جن کا جلد ہونا ضروری ہے، دکھا دے۔ یوحنا کہتا ہے "پھر میں نے آسمان کھلا ہوا دیکھا اور دیکھو (۱) ایک نقرئی گھوڑا اور اس کا سوار (۲) امانت دار اور سچا کہلاتا ہے (۳) اور وہ راستی سے عدالت کرتا ہے (۴) اور وہ لڑتا ہے (۵) اس کی آنکھیں آگ کے شعلوں کے مانند ہیں (۶) اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں (۷) اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا کسی نے نہ جانا (۸) خون میں ڈوبا ہوا لباس وہ پہنے تھا (۹) اور اس کا نام کلام خدا ہے (۱۰) اور وے فوجیں جو آسمان میں ہیں صاف اور سفید اور کتانی لباس پہنے ہوئے نقرئی گھوڑوں پر سوار اور اس کے پیچھے ہولیں (۱۱) اور اس کے منھ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے کہ وہ اس سے قوموں کو مارے (۱۲) اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکمرانی کرے گا (۱۳) اور وہ قادر مطلق کے قہر اور غضب سے کولھو میں روندتا ہے (۱۴) اور اس کے لباس اور ران پر یہ نام لکھا ہے "بادشاہوں کا بادشاہ" اور "خداوندوں کا خداوند" (رحمۃ للعالمین قاضی سلیمان سلمان پوری)

علماء اسلام نے ان علامتوں میں سے ایک ایک علامت کی صحیح تاویل و توجیہ کرتے ہوئے ان کا حضرت کے حال کے

مطابق ہونا بیان کیا ہے۔ لیکن عیسائیوں کا اصرار ہے کہ ان میں سے ایک بھی علامت (حضرت) محمدؐ پر صادق نہیں آتی۔

چونکہ وہ نور ایمان نہ ہونے کی وجہ سے حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ صرف الفاظ کے ظاہری معنی دیکھ رہے ہیں اور اس حقیقت سے آنکھیں چرا رہے ہیں کہ ان پیشین گوئیوں کا تعلق اخبار مغیبہ سے ہے جن میں رموز اور اشاروں میں بات بیان کی جاتی ہے۔

حضرت مہدی علیہ السلام کے باب میں جو احادیث آئی ہیں ان کی کئی قسمیں ہیں (۱) وہ احادیث جو صحاح میں ہیں اور جن میں مہدی علیہ السلام کے نام کی صراحت کی گئی ہے (۲) وہ احادیث جو صحاح میں ہیں لیکن جن میں مہدی کے نام کی صراحت نہیں ہے لیکن لوگوں نے دوسری حدیثوں پر نظر کر کے ان احادیث کو حضرت مہدی علیہ السلام پر اپنی رائے اور قیاس سے محمول کیا ہے (۳) وہ احادیث جو صحاح میں نہیں ہیں لیکن ان میں مہدی کے نام کی صراحت ہے (۴) وہ احادیث جو صحاح میں نہیں ہیں اور ان میں مہدی علیہ السلام کے نام کی صراحت بھی نہیں ہے لیکن لوگوں نے یا تو الفاظ کی مناسبت سے یا اس وجہ سے کہ مخرّجین نے ان کو "باب المھدی" میں درج کر دیا ہے۔ ان احادیث کو مہدی علیہ السلام سے متعلق کر دیا ہے جیسے سفیانی کے تعلق سے حدیث، قسطنطنیہ کے تعلق سے حدیث، خسف والی حدیث، ان احادیث میں مہدی علیہ السلام کا نام تک نہیں ہے صرف "یخرج رجل من امتی یا من اہل بیتی سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے اس کو مہدی سمجھ لیا ہے۔

مہدی علیہ السلام کے تعلق سے صحیح علامت وہی ہو سکتی ہے جو صحیح اور معتبر کتابوں میں نام کے ساتھ مذکور ہوئی ہے۔

صحاح ستہ میں سفیانی کا ذکر ہی نہیں ہے البتہ حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں حضرت ابو ہریرہؓ سے جو روایت لائی ہے اس میں سفیانی کا ذکر ہے لیکن مہدی کا ذکر نہیں ہے صرف يخرج رجل من اهل بيتي کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سفیانی کے زمانے میں اہل بیت سے ایک شخص ہو گا لیکن یہ ضروری نہیں ہے وہ مہدی ہی ہو۔ نیز سفیانی سے متعلق روایتوں پر ائمہ حدیث نے نہ صرف کلام کیا ہے بلکہ ان کو باطل بھی قرار دیا ہے۔

بعض لوگوں نے سفیانی کے مقابلے میں قحطانی مہدی کا بھی ذکر کیا ہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کی آپس کی چپقلش کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اے، ایس، ٹرٹن نے اپنی کتاب میں جو انگریزی میں لکھی ہے اور جس کا نام "اسلام عقیدہ اور عمل" ہے لکھا ہے:

There was a talk of a Sufyani Mehdi, a representative of the elder branch of ummayads who would take a vengeance on the Abbasids and restore the fortunes of his family ,The southern Arabs in their turn looked for a Qahtani Mehdi to restore the ancient glory of that branch

of the nations.

A.S.Tritton.M.A.D.Litt, former professor of Arabic-Islam ,belief and practice Page No:50

یعنی ایک سفیانی مہدی کا بھی ذکر ملتا ہے جو کہ نبی امیہ کی ایک بڑی شاخ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے عباسیوں سے بدلہ لیگا اوراپنے خاندان کی قسمت کو جگائے گا۔ جنوبی عرب اس کے مقابلے میں اپنے دور میں ایک قحطانی مہدی پر نظر رکھے ہوئے ہیں جو قوم کی اس شاخ کی عظمت کو بحال کرے گا۔

ایسی سب روایات اخبار آحاد کی قسم سے ہیں جو عملیات میں بھی ظن کا فائدہ دیتی ہیں نہ کہ یقین کا تو اعتقادیات اور ضروریات دین کے باب میں ایسی روایات پر کس طرح جزم کیا جاسکتا ہے۔

صرف اخبار آحاد کا سہارالے کر مجیٔ مہدی موعود کو غیر اہم قرار دینا جس طرح تواتر کا خلاف اور اجماع کا انکار کرنا ہے اسی طرح حضرت سید محمد جونپوری مہدی موعود علیہ السلام کے دعویٰ مہدیت کا انکار کرنا اپنی دینی بے بصیرتی کا اعلان کرنا ہے۔

شیخ علی متقی اور ان کے متبعین کا یہ کہنا کہ جملہ علامتوں کا پانا جانا مہدی کے تحقق کے لئے ضروری ہے خود اس بات کا اقرار ہے اور اعتراف بھی کہ حضرت سید محمد جونپوری میں بعض ایسی علامات پائی جاتی ہیں جن کا کسی صورت میں انکار نہیں ہو سکتا۔ مثلاً سیادت اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونا دعویٰ مہدیت کرنا۔ کتاب وسنت پر سختی سے عمل کرنا۔ اور مقام ابراہیمؑ کے درمیان بیعت لینا، سنتوں کو زندہ کرنا۔ بدعتوں کا قلع قمع کرنا اور قسط اور عدل کو قائم کرنا وغیرہ۔

واضح ہو کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی سیادت کو شیخ علی متقی (مؤلف الرد) نے تین جگہ تسلیم کیا ہے۔

(۱) اپنے رسالہ برہان میں لکھا ہے

لقد كثرت هذه الطائفة في بلاد الهند يعتقدون شريفاً في الهند اسمه السيد محمد بن السيد خان الجونفوري مات وله نحوار بعين سـنة انه هو المهدي الموعود (البرهان في علامات مهدي آخر الزمان صفحه ۳۰)

ترجمہ: تحقیق کہ یہ جماعت ہندوستان کے شہروں میں کثرت سے ہے جو ایک ذی عزت ہندوستانی ہستی کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد رکھتی ہے جن کا نام السید محمد بن سید خاں جونپوری ہے انہیں وفات پائے ہوئے تقریباً چالیس سال ہوئے ہیں۔

مؤلف نے السید محمد بن السید خاں جو لکھا ہے وہ آپؑ کے والد سید عبد اللہ کی طرف اشارہ ہے جن کو بادشاہ وقت کی

جانب سے ''خان'' کا خطاب عطا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اس مقام پر مؤلف کا سکوت اختیار کرنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ آپ کی سیادت کو تسلیم کرتا ہے۔ گویا آپ کا ہم نام رسول اللہؐ اور آپ کے والد کا ہم نام والد رسول اللہ ہونا مؤلف کے پاس مسلم ہے جو کہ ایک اہم علامت ہے جو صحاح میں ہے۔

(۲) دوسری جگہ اپنے رسالہ ''الرد'' میں حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی سیادت کو اس طرح تسلیم کیا ہے۔

فعلم ان السيد المرحوم ليس بمهدي (پس معلوم ہوا کہ سید مرحوم مہدی نہیں ہیں)

(۳) آپ کا اہل بیت رسول اللہؐ سے فاطمہ زہرہؓ کی اولاد سے ہونا بھی مؤلف الرد کے پاس مسلم ہے چنانچہ لکھا ہے:

''بمجرد علمهم انه (من) اولاد الرسول و اسمه محمد يعتقدون انه هو المهدي۔ یعنی محض یہ معلوم کر کے وہ آنحضرتؐ کی اولاد (آل) سے ہیں اور ان کا نام محمد ہے وہ ان کے مہدی ہونے کے معتقد ہو گئے ہیں۔

کتاب و سنت کے مطابق آپ کے عمل کے بارے میں شیخ علی متقی نے لکھا ہے:

فالمقصود من هذا ان بدعة هذه الطائفة المقرين بمهدوية ذلك السيد المرحوم لا تقتضي انه يكون هو مبتدعاً لا يظن به هذا والله اعلم (الرد)

ترجمہ: مقصود اس بات سے یہ ہے کہ ان لوگوں کی بدعت جو سید مرحوم کی مہدیت کا اقرار کرتے ہیں اس امر کو مقتضی نہیں ہے کہ وہ سید مرحوم بھی بدعتی ہوں۔ ان کے تعلق سے یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا، واللہ اعلم۔

یہاں شیخ علی حضرت مہدی موعود علیہ السلام سے سخت عناد رکھنے کے باوجود یہ گواہی دے رہا ہے کہ آپ کے تعلق سے بدعتی ہونے کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بدعت کہتے ہیں، کتاب و سنت کے خلاف عمل کو، اور دین میں ایسی نئی بات پیدا کرنا جو دین میں داخل نہیں ہے جب مؤلف الرد آپ سے بدعت کی نفی کر رہا ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا ہر عمل کتاب و سنت کے مطابق تھا۔ والفضل ما شهدت به الاعداء۔ یہ بات ایسی ہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین گو آپ کی رسالت و نبوت کے منکر تھے۔ لیکن جب آپ کا چہرۂ انور دیکھتے تو بے ساختہ کہہ اٹھتے:

ماھذا بوجہ کذاب۔ یہ جھوٹے کا چہرہ تو نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ شیخ علی متقی کے پاس جو کہ آپ کا اقرب العہد تھا یہ امر ثابت تھا کہ بعض علامتیں (اور وہ علامتیں جو بہت ہی اہم ہیں) حضرت سید محمد مہدی موعود علیہ السلام میں پائی جاتی تھیں (اور بدعت تو نام کو بھی نہیں تھی) تو اس کو مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ جب تک تمام علامتیں نہیں پائی جاتیں اس وقت تک مہدی کا

تحقق نہیں ہو سکتا۔بقول شاعر:

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ان حوالوں کی روشنی میں یہ کہنا کہ آپؑ میں ایک علامت بھی نہیں پائی جاتی۔یا یہ کہنا کہ جب تک تمام علامتیں نہیں پائی جاتیں اس وقت تک مہدی کا تحقق نہیں ہو سکتا کس قدر بھونڈی اور غلط بات ہے۔

تمام علامتیں کیسے پائی جاسکتی ہیں جب کہ بعض علامتیں تو ایسی ہیں جو ایک دوسرے کی متضاد ہیں۔جیسے مہدی کا مدینہ سے نکل کر مکہ آنا۔مہدی کا خراساں سے نکلنا،مہدی کا مشرق سے نکلنا،مہدی کا عیسیٰ کے ساتھ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اللہ کا دیدار عقلی اعتبار سے جائز ہے

دلیل اس کی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے اس کو دیکھنے کی دعا کی۔رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ﴿الأعراف:۱۴۳﴾اے رب تو مجھے دکھائی دے میں تجھے دیکھوں گا۔موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا خود اللہ تعالیٰ کے دیدار کے ممکن ہونے کی قوی دلیل ہے۔کیوں کہ اگر اللہ کا دیدار دنیا میں ممتنع ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر سے ایسی عالی صدور سفاہت وجہالت متصور ہوتا۔اور اللہ کے کسی پیغمبر سے اس کا ظہور باطل ہے۔اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا" وَلَـٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي﴿الأعراف:۱۴۳﴾۔یعنی پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر ٹھہر گیا تو تو مجھ کو دیکھ لے گا۔تو اللہ نے اس آیت میں پہاڑ کے استقرار کو اپنی رویت پر معلق رکھا۔اور اس پر اس کو شرط قرار دیا۔اور پہاڑ کا اپنی جگہ ٹھہرنا ممکن ہے۔پس جب شرط ممکن ہے تو مشروط بھی ممکن ہوئی۔پس رویت باری ممکن ہوئی۔

اس پر کئی وجوہ سے اعتراض کیا گیا ہے۔سب سے قوی اعتراض یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دیدار کا سوال کیا تھا وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی قوم کی وجہ سے تھا۔کیوں کہ ان کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے مطالبہ پر جواباً یہ مطالبہ کیا تھالَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّـهَ جَهْرَةً﴿البقرۃ:۵۵﴾یعنی ہم آپ پر ہرگز اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہم اللہ کو علانیہ دیکھ نہ لیں۔گو ان کے اس مطالبہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے اپنے لئے دیدار کا مطالبہ کیا۔تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کا دیدار ممتنع ہے۔یعنی ویسے موسیٰ علیہ السلام اس بات کو جانتے تھے کہ دنیا میں ان کو دیدار الٰہی نہیں ہے۔لیکن اپنی جانب سے ان کو یہ جواب دینے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود اللہ سے دیدار کا مطالبہ کریں اور جب اللہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دے کہ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا تو یہ جواب ان لوگوں

کو سنادیں۔

اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اللہ نے اپنے دیدار کو جس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے یعنی استقرار الجبل وہ ممکن ہے پس دیدار بھی ممکن ہوا۔

اور اللہ کا دیدار نقلی اعتبار سے بھی ممکن ہے کیونکہ قرآن میں مومنین کے لئے دیدار کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِـــرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ "﴿القیامۃ:۲۲تا۲۳﴾ اس دن چہرے بشاش ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔

اسی طرح دیدار باری تعالیٰ سنت سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا إِنَّكُمْ سَــتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ یعنی تم عنقریب اپنے پروردگار کو دیکھو گے جس طرح تم چاند کو بدر کی رات کو دیکھتے ہو۔ اور یہ حدیث مشہور ہے۔ رواہ احد و عشــرون من الصــحابۃ رضــوان اللہ علیھم اجمعین اس حدیث کو ۲۱، اکابر صحابہ رضی اللہ عنھم نے روایت کی ہے (شرح عقائد نسفی۔۷۳)

اسی طرح اجماع امت نے بھی آخرت میں دیدار ہونے پر اتفاق کیا ہے اور اس خصوص میں جو آیات آئی ہیں ان کو ظاہر پر ہی محمول کیا ہے۔

البتہ مخالفین دیدار کی جانب سے آیت لا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴿الأنعام:۱۰۳﴾ یعنی ابصار اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ کو پیش کیا جاتا ہے اور اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت سے دیدار ممتنع ثابت ہوتی ہے اس کا جواب اہل سنت کی جانب سے دیا جاتا ہے کہ لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَــارُ سے مراد عموم سلب ہے نہ کہ سلب عموم۔ اور دوسرا جواب اسی آیت سے یہ دیا جاتا ہے کہ ادراک میں اور رویت میں فرق ہے۔ رویت کا اطلاق، مطلق دیکھنے پر ہوتا ہے لیکن ادراک کا اطلاق ایسی رویت پر ہوتا ہے جو تمام جوانب پر احاطہ کرتی ہے۔ ہماری بحث رویت پر ہے احاطہ پر نہیں ہے۔

اعتراض ترک علم

پڑھانا چھڑادیا۔ ایک صاحب شاہ عبد العزیز کے پاس پڑھنے کے لئے آئے تھے ایک روز مطالعہ دیکھ رہے تھے، کتاب کے حروف نظر نہ آئے اور چیزیں تو نظر آئی تھیں لیکن کتاب کے حروف نظر نہ آئیں شاہ صاحب نے اس پر مطلع ہو کر پڑھنا چھڑادیا کہ تم پڑھنا چھوڑ دو، تم اور کام کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ چنانچہ پڑھنا لکھنا چھڑا کر ان کو ذکر و شغل کی تعلیم کی۔

(ص:۱۱۷۔علمی مضامین)

الحاصل: یہ علماء سید صاحب کی خدمت میں آئے، ادھر کے علماء اکثر ایک فنی ہوتے ہیں کوئی معقول میں یکتا ہیں کوئی صرف میں اور کوئی صَرف جانتا ہے کوئی نحوی ہے غرض سب جمع ہو کر آئے اور مختلف سوالات شروع کئے۔ اگر دینیات کے متعلق کوئی سوال کرتے تو سید صاحب داہنی طرف رخ کر کے جواب دیتے تھے اور غیر دینیات کا سوال ہوتا تھا یعنی معقول وغیرہ کا تو بائیں طرف رخ کر کے جواب دیتے تھے۔ اور جواب بھی کیسا؟ اہل علم کے طرز پر۔ مریدین کو سخت حیرت ہوئی کہ سید صاحب کی زبان سے وہ الفاظ نکل رہے ہیں کہ کبھی بھی عمر بھر نہیں سنے تھے۔ جب مجلس ختم ہوئی تو بعض لوگوں کو حکم دیا کہ جواب میں اعانت کرو۔ چنانچہ امام صاحب کی روح میرے داہنی طرف تھی اور شیخ صاحب کی بائیں طرف۔ جو وہ کہتے تھے کہہ دیتا تھا(وعظ الظہور۔ص:۲۳۔ماخوذ از علمی مضامین۔اشرف علی تھانوی ص:۱۱۸)

اعتراضات مدیر ماہنامہ ’’تجلّی‘‘ کا جواب

سوال: میں جس مقام پر رہتا ہوں، مہدی مکتبہ ءفکر یعنی مہدی برادری کے لوگ رہتے ہیں جو سید محمد جونپوری کو مہدی موعود علیہ السلام آخر الزمان مانتے ہیں، ان کا اعتقاد ہے کہ ان کو مہدی موعود آخر الزمان نہ ماننے والے کافر ہیں اور ان کے پیچھے نماز جائز نہیں، نماز ہوتی ہی نہیں، وہ ان کی صداقت کو بتاتے ہوئے حدیث پیش کرتے ہیں، جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

(۱) حضرت محمد مصطفی ﷺ نے اپنی آنے والی امت کیلئے پیش گوئی کی تھی کہ ’اے میری امت جس قت مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو گا اس وقت تم کو بڑے بڑے برفیلے پہاڑ پر سے کیوں نہ گزرنا پڑے، سب کچھ برداشت کرتے ہوئے بیعت میں عجلت کرو۔ فوراً بیعت کرلو۔ یہ میرا حکم ہے۔

(۲) دوسری روایت ابو ہریرہؓ سے ہے کہ فرمایا! رسول اللہ ﷺ نے وہ امت بھلا کیسے ہلاک ہو سکتی ہے۔ جس کے آخر میں عیسیٰ ابن مریم اور درمیان میں میری آل ہے مہدی موعود علیہ السلام آخر الزمان ہوں گے۔

(۳) تیسری حدیث حضرت علی کرم اللہ وجھہ سے ہے پوچھا نبی اکرم ﷺ سے مہدی موعود کب آئیں گے اور ان کی کیا نشانیاں ہیں۔ ارشاد نبوی ہوتا ہے، مہدی میری امت میں بنی ہاشم سے ہو گا اور بندہ کا ہم نام ہو گا، والد و والدہ کے نام میں مطابقت ہو گی اور وہ میرے نقش قدم پر چلے گا، کوئی خطا نہیں کرے گا۔

صحابیوں نہ کہا یا رسول اللہؐ، آپ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ حضرت محمد مصطفی ﷺ مسکراتے ہوئے خاموش

ہوگئے، ان حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مہدی موعودؑ کی وہ ذات مبارک جو ذات نبوت سے اپنا روپ بدل کر ذات ولایت میں نمودار ہوئی۔ مہدیؑ کی زیارت جو قبر مبارک میں مدفون ہیں مساوی ہے حضور اکرم ﷺ کے کیونکہ روپ میں دو ہیں روح ایک ہے۔ یہ خاتم الاولیاء ہے، انھوں نے حوالہ تو نہیں بتایا، آپ اس کا جواب دلائل اور کتاب و سنت سے دیکر راہ حق کی رہنمائی کریں۔

الجواب: اس سے قطع نظر کہ مہدی موعود کے بارے میں جو روایات کتب حدیث میں ملتی ہیں، ان کا منشاء اور مصداق کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جناب سید محمد جونپوری میں آخر کونسے سرخاب کا پر ہے جو انھیں مہدی موعود مانا جائے۔ ہمارے دیوبند میں بھی متعدد سادات موجود ہیں ان میں سے کسی کو کیوں نہ مہدی تسلیم کرلیا جائے۔ دیوبند کے علاوہ اور بھی شہروں میں سادات مل جائیں گے۔ اصلی سادات کے علاوہ نقلی سادات بھی بیشمار ہیں۔ سید ہوناہی اگر دعویٰ مہدی کیلئے کافی ہو تو بڑی آسانی سے ایک ہزار ایک سو ایک مہدی ہندوستان جنت نشان میں پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ رہی والد و والدہ کے نام میں مطابقت تو یہ بھی کوئی مشکل نہیں۔ نام رکھنا تو ہر شخص کے اختیار میں ہے۔ اسکیم بنا کر آپ اگلی ہی نسل میں درجنوں مہدی ظہور میں لاسکتے ہیں۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)۔

بھائی ہم سے آپ کوئی ڈھنگ کی بات پوچھئے۔ خاتم الرسل ﷺ کے بعد کوئی ایسی ہستی پیدا نہیں ہوئی جس پر ایمان لانے کا سوال پیدا ہوتا ہو۔ ایسا شخص جو یہ دعویٰ لیکر اٹھے کہ مانو ورنہ کافر ہوگے، ایسے کتے کے مانند ہے جو ریل گاڑی کو دیکھ کر بھونکتا ہے اور جو لوگ اس مدعی کے بھرے میں آجائیں۔ ان کی باتیں گیدڑوں کے اس شور و غوغا کے مانند ہیں، جسے آپ جاڑوں کی راتوں میں سنتے ہیں، انھیں غل مچانے دیجئے آپ ان سے کوئی واسطہ نہ رکھئیے، اسلام مغلوب اور اقتدار اسلام مفقود ہیں ،اس لئے ہر شخص فرعون بے سامان بنا ہوا ہے۔ اور قرآن و حدیث کو خواہشات کا کھلونا بنالینے کا مشغلہ عام طور پر جاری ہے۔ اس کا علاج دلیل و منطق سے نہیں صرف درہ فاروقی سے ہی ممکن تھا۔ اب یہ درہ نہیں تو صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ (تجلّی، ماہ نومبر ۱۹۶۴ء، ص۳۹،۳۸)

جواب الجواب: سوال کی نوعیت سے ناظرین نے اندازہ لگایا ہوگا کہ سائل کا سوال نہ جاہلانہ ہے نہ معاندانہ، نہ ہی اس سوال سے سائل کی یہ غرض معلوم ہوتی ہے کہ اسے مہدی موعودؑ یا مہدویہ عقائد کی تنقید یا تردید منظور ہے، وہ تو بس حقائق کی خاطر ایک استفسار ہے، جبھی تو اس نے پہلے مہدویہ کے چند عقائد لکھے پھر وہ حدیثیں پیش کیں، جن سے مجئ مہدی پر تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے۔ گویا اسطرح سے سائل نے مجیب کو بالکلیہ لاعلمی کے اندھیروں میں بھٹکنے اور جذبات کے تلاطم میں ہاتھ

پیر مارنے سے بچانے کیلئے اپنی جانب سے چند معلومات کی روشنی بھی فراہم کر دی ہے تا کہ اس کی روشنی میں اور ان ہی خطوط پر مجیب، مسئلہ سے متعلق دیگر ضروری مواد فراہم کرے۔

احادیث نبوی، مفسرین، محدثین، متکلمین اور صوفیاء متقدمین کے کلام کا استقصاء نہیں تو کم از کم ہلکا سا جائزہ لیا جاتا اور سب سے بڑھ کر اسی ہندوستان جنت نشان کے نامور غیر متعصب مورخین کی گرانقدر تالیفات کا مطالعہ کرنے کی معمولی سی کوشش کی جاتی، تو ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مدیر تجلی کے قلم سے ایسا گھٹیا اور غیر ثقہ مضمون نہ نکلا ہوتا جو مذہب شرافت، انسانیت اور صحافت کے دامن پر بد نما دھبہ ہے۔ حق پرستی اور حقیقت پسندی کے مدعی کی جبین پر کلنگ کا ٹیکہ ہے۔ اور فرامین رسولؐ کے ابلاغ اور دفاع کیلئے سر دھڑ کی بازی لگانے اور اس غرض سے پھیپھڑوں کو پوری قوت سے چیخنے والے کے حلق میں ہڈی ہے، خدا معلوم ایسا کیوں ہوا مگر ایسا گھٹیا، اتنا شر انگیز اور اس قدر رکیک تحریر قلم سے نکل ہی گئی تو اس کے سوائے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ مدیر اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ کسی نہ کسی وجہ سے بے قابو ہو گئے تھے۔ اتباع شریعت کے بجائے خواہشات نے دل میں قدم جمائے تھے۔ حق پسندی کے بجائے مسلک پرستی یا گروہ پسندی نے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی ان حالات میں توقع کی جا سکتی ہے۔ مضمون نکلا تو قطع نظر اس کے کہ ماننے والوں پر کیا گذری، خود تجلی کے حلقوں نے بے چینی محسوس کی۔ مدیر کے چاہنے والوں نے ہمیں خطوط لکھے اور اس مضمون سے بیزاری کا یقین دلایا۔ یہ ایسے نا قابل انکار حقائق ہیں جن کو سامنے رکھنے کے بعد ہم مدیر تجلی سے یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ اگر مدیر تجلی اپنی اس پوزیشن کو سامنے رکھ کر جسکو اب تک تجلی کے صفحات پر ظاہر کرتا آیا ہے، اپنے جواب کا غیر جانبداری اور کامل دیانت کے ساتھ مطالعہ کریگا تو خود مدیر کو اپنے آپ سے اپنے مضمون سے اور اپنے قلم سے نفرت پیدا ہو جائیگی۔ لیکن اب ایسا ہونا بھی معمولی بات نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کا احساس بھی تدین کا نتیجہ ء شرافت کا خلاصہ، انسانیت کا خاصہ اور مذہب کی سچی تعلیم ہے، کیا ہم مدیر سے اس کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ یہ معاملہ مدیر اور اس کے خدا کے مابین ہے۔ لیکن اس مضمون کی حقیقت کیا ہے۔ ذیل کی چند سطروں میں ہم بتائے دیتے ہیں۔ تا کہ عوام کو غلط فہمی بھی نہ ہو اور مدیر کے معلومات میں اضافہ بھی۔

حیدرآباد سے ایک سائل نے مہدی موعود علیہ السلام سے متعلق چند احادیث کو (جن میں کچھ کمی بیشی ہے) اسے مہدویوں کی وساطت سے ملی تھیں درج کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ آپ اس کا جواب دلائل اور کتاب و سنت سے دیکر، راہ حق کی رہ نمائی فرمائیں، لیکن افسوس کہ جواب کی ابتداء ہی جس بھونڈے اور بے ڈھنگے پن سے ہوئی ہے وہ تاریخ کے صفحات پر اپنی نظیر آپ ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ”اس سے قطع نظر کہ مہدی موعود کے بارے میں جو روایات کتب حدیث میں ملتی ہیں، ان کا

منشاء اور مصداق کیا ہے" بات کیا ہوئی، ہم تو سمجھنے سے قاصر ہیں، جواب میں مجیب نے جس نقطہ نظر سے فرار اور جس اہم نکتے سے گریز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہی تو دراصل مقصود تھا۔ اسی کے بارے میں تو پوچھنے کی زحمت مول لی گئی تھی۔ مگر مجیب نے اسی سے قطع نظر کر لیا، سائل کی جانب سے تین حدیثوں کے درج کئے جانے کا مقصد یہی تھا کہ سید محمد جونپوری کو مہدئ موعود ماننے والوں کی بنیاد خواہشات نفسانی نہیں بلکہ فرامین رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ایسی صورت میں یا تو احادیث کی ردو قدح کی جاتی، رواۃ سے بحث کی جاتی اور انہیں مجروح و مطعون قرار دیتے ہوئے نا قابل استدلال بتائے جاتے یا دوسری صورت یہ تھی کہ ان کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا منشاء اور مصداق بتایا جاتا، ساتھ یہ بھی کہا جاتا کہ ان روایات کا منشاء اور مصداق، متقدمین کے پاس کیا تھا۔ محدثین نے اس کو کیا سمجھا، متکلمین نے اس سے کیا مراد لی۔ صوفیاء کرام نے اس کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی۔ پھر اس کی تصحیح یا تغلیط کی جاتی اور یہ کہا جاتا کہ ان روایات کا منشاء اور مصداق وہ نہیں ہے جو ان حضرات نے قائم کیا ہے، بلکہ یہ ہے جو عامر عثمانی فاضل دیوبند مدیر تجلی نے قائم کیا ہے، جواب سے تو مدیر تجلی کے تعلق سے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ منکرین مہدی کے اس زمرے سے تعلق رکھتا ہے جس کے امام ابن خلدون اور سر سید وغیرھم کہلاتے ہیں۔

مدیر کے جواب سے حسب ذیل باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔

(۱) مہدی موعود کے بارے میں روایات کتب حدیث میں ملتی ہیں۔

(۲) ان کا منشاء و مصداق قابل غور ہے (حالانکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ان کا منشاء ایسی شخصیت کا ظہور ہے، جو تجدید اسلام کا فرض انجام دے)

(۳) مہدیت کی تصدیق کے لئے سرخاب کا پر ضروری ہے۔

(۴) سیادت، والد ووالدہ کے نام میں مطابقت مہدیت کے لئے ناکافی ہیں۔

(۵) چند احادیث پیش کرنے کے بعد ان کا صحیح منشاء و مصداق، دلائل اور کتاب و سنت سے پوچھنا بے ڈھنگی بات ہے۔

(۶) خاتم الرسل کے بعد قیامت تک کوئی ایسا نبی پیدا نہیں ہوتا ہے جس پر ایمان لانے کا سوال پیدا ہو۔

(۷) جو شخص ایسا دعویٰ لیکر اٹھے کہ مجھے مانو ورنہ کافر ہوگے، وہ مدیر تجلی کی نظر میں کتا ہے۔ اور اس کے ماننے والے گیدڑ ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اولاً اس کتاب و سنت کا نام دریافت کر لیں جس سے مندرجہ بالا نکات مدیر تجلی کو دستیاب ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ سائل نے تو صاف الفاظ میں دریافت کیا تھا کہ آپ اس کا جواب دلائل اور کتاب و سنت سے دیکر راہ حق کی رہنمائی فرمائیں۔ کیا اسی کا نام راہ حق کی رہنمائی ہے؟ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

اب ذیل میں قائم کردہ نکات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(۱) خدا کا شکر ہے کہ جواب میں اس امر کو فراخدلی کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے کہ مہدی موعود کے بارے میں روایات کتب حدیث میں ملتی ہیں، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ان روایات کا حدیث کی دنیا میں کیا پایہ ہے۔ کہ یہ آیا وضعی، جعلی، غریب اور ضعیف ہیں یا حسن، مشہور اور متواتر ہیں ان پر رد و قدح بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں، ان کے رواۃ معرض بحث میں آسکتے ہیں یا نہیں۔ ان روایتوں کا قدر مشترک کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان بنیادی اصولوں پر بھی روشنی ڈالیں تا کہ یہ گوشے تشنہ نہ رہیں۔ جو روایات کتب حدیث میں مہدی موعود کے بارے میں ملتی ہیں ان کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ اگر چہ ان میں بعض علامات اور الفاظ وغیرہ کے لحاظ سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ "اذا تعارضا تساقطا" کے اصول کے تحت کل روایتیں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں، ٹکراتے بھی ہیں تو بعض الفاظ اور علامات اور پھر ٹکرا کر ساقط ہونے کے بعد بھی چند اجزاء ایسے رہتے ہیں۔ جن کو دھکا تک نہیں لگتا۔

چنانچہ چند روایتیں درج ذیل کی جاتی ہے تا کہ ان کے منشاء اور مصداق کا یقین ہو سکے۔

(۱) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم "الْمَهْدِيُّ مِنِّي أَجْلَى الْجَبْهَةِ أَقْنَى الأَنْفِ يَمْلأُ الأَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلاً كَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا وَظُلْمًا يَمْلِكُ سَبْعَ سِنِينَ" (ابو داؤد) ترجمہ: روایت ہے ابو سعید خدریؓ سے انھوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "مہدی مجھ سے ہے روشن پیشانی اور بلند بینی والا، زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیگا، جیسا کہ وہ ظلم و جور سے بھر گئی تھی۔ (دور خلافت) سات سال ہو گا۔

(۲) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ "يَكُونُ فِي أُمَّتِي الْمَهْدِيُّ إِنْ قُصِرَ فَسَبْعٌ وَإِلاَّ فَتِسْعٌ فَتَنْعَمُ فِيهِ أُمَّتِي نَعْمَةً لَمْ يَنْعَمُوا مِثْلَهَا قَطُّ تُؤْتَى أُكُلَهَا وَلاَ تَدَّخِرُ مِنْهُمْ شَيْئًا وَالْمَالُ يَوْمَئِذٍ كُدُوسٌ فَيَقُومُ الرَّجُلُ فَيَقُولُ يَا مَهْدِيُّ أَعْطِنِي فَيَقُولُ خُذْ" (ابن ماجہ) ترجمہ: ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "میری امت میں مہدی ہوں گے، جس کی مدت (امامت) اگر کم ہو تو سات سالہ ہو گی۔ ورنہ نو سال۔ اس (مدت) میں میری امت کو ایسی نعمت دی جائیگی کہ اس طرح کی نعمت کبھی نہ دیگئی ہو گی۔ اس کو کھانے کی چیزیں دے جائیگی اس میں سے وہ کچھ ذخیرہ نہ کریگی، مال اس دن انباروں ہو گا، پس ایک شخص کھڑا ہو گا اور کہے گا اے مہدی مجھے دے پس مہدی کہیگا "لے"۔

(۳) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ "الْمَهْدِيُّ مِنْ عِتْرَتِي مِنْ وَلَدِ فَاطِمَةَ" (ابو داؤد) ترجمہ: ام سلمہ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہتے ہوئے سنا ہے کہ "مہدی میری عترت سے

اولاد فاطمہ سے ہو گا۔

(۴) عَنْ ثوبان قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يقتَتِلُ عند كنزِكم ثلاثةٌ كُلُّهُم ابنُ خليفةٍ لا يصَير إلي واحدِ منهم ثمّ تَطلعُ راياتٌ سُودٌ من قبل المشرق فيقتلونكم قَتلاً لم يَقتُله قومٌ ثمّ يَجيءُ خليفة اللهِ المهديّ (رواہ حاکم و ابو نعیم) ترجمہ۔ثوبان سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا"تمہارے خزانے کے پاس تین شخص خلفاء کی اولاد سے لڑیں گے،ان میں سے کسی کو وہ نہ ملیگا۔پھر سیاہ جھنڈے مشرق کی طرف سے نکلیں گے۔پھر تمہیں ایسا قتل کریں گے کہ کسی قوم نے نہ کیا ہو گا۔پھر خلیفۃ اللہ آئے گا،پس تم جب اس کے متعلق سنو تو اس کے پاس آئو اور اس کی بیعت کرو،اگر چہ تم کو برف پر سے رینگنا پڑے،اس لئے کہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔

(۵) عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، قَالَ كُنَّا عِنْدَ أُمِّ سَلَمَةَ فَتَذَاكَرْنَا الْمَهْدِيَّ فَقَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ "الْمَهْدِيُّ مِنْ وَلَدِ فَاطِمَةَ"(ابن ماجہ)ترجمہ:سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ ہم ام سلمہ کے پاس تھے،پس ہم نے مہدی کا تذکرہ چھیڑا،پس انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مہدی اولاد فاطمہ سے ہے"

(۶) عَنْ على قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ "أمِنَّا الْمَهْدِيّ المَوْعود اما مِنْ غيرنا فَقَالَ لَا بَلْ مِنَّا يَخْتِمُ اللّٰهُ بِهِ الدِّينَ كَمَا فَتَحَهُ بِنا"(ترمذی)ترجمہ:ضرت علی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مہدی ہم سے ہیں یا غیر سے،آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں،بلکہ ہم سے ہیں،اللہ ان سے دین کو پورا کریگا جیسا کہ ہم سے اس کا آغاز فرمایا۔

ان روایات کا پایہ،حدیث کی دنیا میں کیا ہے ذیل کی روایتیں اس پر دال ہیں۔

(۱)قد تظاهرت الاحاديث البالغة حد التواتر معناً في كون المهدي من اهل البيت من ولد فاطمة

(۲)بدانکہ احادیث درباب بودن مہدی از اولاد فاطمہ زہرا بحد تواتر رسیدہ(اشعۃ اللمعات)

مولف ابراز الوہم المکنون نے احادیث مہدی کو متواتر ماننے والوں کی تفصیل اس طرح دی ہے۔

فمن نص على تواتر احاديث المهدى ايضاً الحافظ شمس الدين السخاوي في فتح المغيث والحَافظ جَلال الدين السيوطي في الفَوائد المتكاثرة في الاحاديث المتواترة وَ اختصَاره الازهار المتناثره وَغيرهمَا مَن كتبه وَالعَلامة ابن الحجر الهيتمى في الصواعق المحرقة وغيره من مصنفاته والمحدث زرقاني في شرحه المواهب الدينه وَجَم غفير من الحفاظ النقاد

حاصل یہ کہ احادیث مہدی موعود متواتر المعنی ہونے کے سب قائل ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حدیث متواتر کا حکم کیا ہے۔(۱)**وَلذالك يجب العمل به من خير بحث في رجَاله**(سیوطی فی شرح تقریب نووی)۔ اسی وجہ سے اس کے رجال کی بحث کے بغیر اس پر عمل واجب ہے (۲)**وَالمتواتر لا يبحث فيه عن الرجال بل يجب العمل من غيربحث**۔ خبر متواتر میں رجال کی بحث نہیں کی جاتی بحث کے بغیر اس پر عمل واجب ہے (۳)**العدالة معتبرة في التواتر**(بحر العلوم فی شرح مسلم الثبوت)۔ عدالت خبر متواتر میں متبر ہے۔ اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ ان کا منشا کیا ہے سووہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱)**اخلتف الناس في امر المهدى فتوقف جماعة وَ احالوا العلم إلى عَالمه وَ اعتقد وإنّه وَاحد من أولَاد فاطمة بنت رسُول الله ﷺ يخلقه الله متىٰ شَاء وَ يبعثه نصرةً لدينه**۔ مہدی کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا، پس ایک گروہ نے توقف کیا اور اس کے علم کو اس کے عالم کے حوالے کر دیا اور یہ عقیدہ رکھا کہ وہ اولاد فاطمۃ سے ایک شخص ہو گا جسے اللہ جب چاہے گا اپنے دین کی مدد کے لئے مبعوث فرمائے گا۔

صاحبِ سراج الابصار نے اس کو بیہقی کی شعب الایمان سے نقل کیا ہے

(۲)**فَذَهَبَ العُلمَاءُ إلىٰ إنَّه إمام عَادل من وَلد فاطمة يخلقه الله مَتى شَاءَ وَ يَبْعَثه نصرةً لِدِنِيْهِ** (شرح مقاصد)۔ پس علماء کا مذہب یہ ہے کہ مہدی اولاد فاطمۃ سے امام عادل ہوں گے اللہ انہیں جب چاہے گا پیدا کرے ان کی بعثت نصرت دین کے لئے ہو گی۔

اس کے باوجود مدیر تجلی کا یہ کہنا کہ قطع نظر اس کے۔ اُن کا منشاء ومصداق کیا ہے ہمارے لئے باعثِ حیرت ہے کہ بات کی کھال اور کھال کی کھپلی نکالنے والے مدیر کی نظر میں اتنی صاف اور اس قدر صحیح بات کیونکر نہ آسکی**والله يهدي الى الصواب**۔

(۳) مدیر کا راست سید محمد جونپوری (مہدی موعود) پر حملہ کرنا اور یہ لکھنا کہ آپ میں کونسا سرخاب کا پر ہے اصول دین سے بے خبری کی بین دلیل ہے اس بات کا تو ابھی انکشاف ہوا کہ مہدی موعود کے لئے سرخاب کے پر کی بھی ضرورت ہے۔ پتہ نہیں یہ علامت کونسی کتاب میں درج ہے (اس لئے کہ سائل نے کتاب و سنت سے جواب مانگا تھا) اس سے قطع نظر کہ مہدی موعود کی صداقت کی دلیل سرخاب کا پر ہے کہ نہیں۔۔۔ یہ ہے کہ سرخاب کا پر کس نبی کی نبوت کا معیار قرار پایا تھا۔ سرخاب کا پر اگر اتنا ہی مہتم بالشان نشان ہوتا تو لازماً انبیا علیہم السلام کی صداقت کی دلیل بن جاتا اور نعوذ باللہ ہر نبی کے سر پر

ایک ایک سرخاب کا پر طرۂ کی طرح لگا رہتا۔ کفار نے تو ہر نبی سے عموماً اور خصوصاً خاتم النبیین سے یہی دریافت کیا تھا کہ آپ میں کونسی ایسی چیز ہے جس کی بناء پر ہم آپ کو نبی تسلیم کریں۔ ہماری طرح کے ایک فرد ہماری طرح کھانے پینے والے ہماری طرح بازار میں چلنے پھرنے والے ہماری طرح بیوی بچے رکھنے والے کسی فرد کو ہم کس طرح پیغمبر مان لیں۔

ان کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ تو یہی تھا کہ ان کے ساتھ ایک فرشتہ کیوں نہیں رہتا تاکہ لوگوں سے یہ کہے کہ یہ پیغمبر برحق ہیں۔ جب کسی کی نبوت کے لئے سرخاب کا پر لازمی نہیں تھا اور اس کے باوجود ان کی نبوت برحق تھی تو امر مہدیت کیلئے سرخاب کا پر کیوں اتنا لازمی قرار دیا گیا کہ اس کے بغیر مہدی کو تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا مرتبہ مہدی خاتم الرسل کے مرتبہ سے بڑھکر ہے جو اس کے لئے اتنی کڑی شرط رکھی گئی۔ مقام غور ہے کہ یہ مطالبہ کس رجحان کی غمازی کر رہا ہے۔

ہر نبی کے لئے اولاً دعویٰ شرط ہوتا ہے جس کی دلیل معجزہ بھی ہوتا ہے اور خود نبی کے اخلاق بھی۔ بلکہ دلیلی اخلاق کو معجزہ پر جو تفوق حاصل ہے وہ اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے چنانچہ آیت قرآنی فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿یونس:١٦﴾ اسی پر شاہد ہے جب دلیل اخلاق سے کار نبوت صحیح قرار پاتا ہے تو امر مہدیت کیوں نہیں۔

سید محمد جونپوریؑ نے بامر اللہ دعوی مہدیت فرمایا اور اس کی دلیل میں کتاب اللہ وار سنت رسول اللہ کو پیش فرمایا اس کے متعلق تفصیلات عنوان "دعویٔ مہدیت" کے پہلے سوال کے ضمن میں مل سکتی ہیں۔ حیرت ہے کہ جب ملا عبدالقادر بدایونی سے لیکر مولوی ابو الکلام آزاد تک کسی غیر متعصب مورخ نے حضرت سید محمد جونپوری مہدی موعود کے اخلاق حسنہ کتاب و سنت کی پیروی کے متعلق شکایت آمیز ایک جملہ بھی نہیں لکھا۔ مدیر تجلی کا قلم بایں ہمہ سرخاب کا پر ڈھونڈنے کی فکر میں سرگرداں ہو۔ اگر کسی کو اس کے باوجود اصرار ہی ہے کہ مہدیت کے لئے سرخاب کا پر ہونا ازبس ضروری ہے تو اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی جانب نشاندہی ان الفاظ میں فرمائی ہے یقفو أثری وَلَا يُخطى۔ اور ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خصوصیت سید محمد جونپوری کا ہی طرۂ امتیاز ہے۔ بلا شرکت غیرے۔ چنانچہ شیخ محدث دہلوی نے شیخ احمد سرہندی کے نام ایک مکتوب میں سید محمد مہدی موعود سے متعلق مہدیوں سے سنکر سہی، مگر اسطرح لکھا ہے۔ ہر کمالے کہ محمد رسول اللہ داشت درسید محمد مہدی نیز بود فرق ہمیں است کہ آنجا باصالت بود وایں جا بہ تبعیت رسول وتبعیت رسولؐ بجائے رسیدہ کہ ہچو او شد (مکتوبات شیخ عبدالحق)

(۴) سیادت اور والد ووالدہ کے نام کی مطابقت سے متعلق تفصیلی قیل و قال "المھدی والعلماء" کے دوسرے سوال کے ضمن میں موجود ہے۔ مہدی موعود کے بارے میں جس قدر روایات ملتی ہیں ان سب کا قدر مشترک یہی ہے کہ مہدی

موعود فاطمی النسل ہو پس لازماً وہ سید ہی ہوگا۔ مگر صرف سید ہونا کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یقفو اثری ولا یخطی بھی اہم ترین شرط ہے۔ اگر یہ شرط نہ ہوتی تو مدیر تجلی کے ادعا کے مطابق دیوبند کے سادات میں سے کوئی مہدی بن سکتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ فاطمی النسل ہونے کی شرط سے ہندوستان جنت نشان میں پائے جانے والے ایک ہزار ایک سو نقلی سادات اڑ جاتے ہیں اور یقفو اثری ولا یخطی کی قید سے وہ لوگ جو نسباً سید ہونے کے باوجود خطائوں سے بھرپور اور لغزشوں سے معمور ہوتے ہیں، پرکاہ کی طرح اڑ جاتے ہیں۔

(۵) سائل نے مستند حدیثیں درج کرنے کے بعد دریافت کیا تھا کہ آپ اس کا جواب دلائل اور کتاب و سنت سے دیکر راہ حق کی رہنمائی فرمائیں۔ اس کے جواب میں مدیر تجلی نے لکھا ہے۔ ’’بھائی ہم سے تو آپ کوئی ڈھنگ کی بات پوچھیئے‘‘۔ سمجھ میں نہیں آتا حدیثوں کا درج کرنا بے ڈھنگی بات ہے تو خدا معلوم، ڈھنگ کی بات پھر اور کیا ہو سکتی ہے۔ غالباً ڈھنگ کی بات مدیر تجلی کی نظر میں وہ تحریر ہے جس میں کتا اور اس کی بھوں بھوں، گیدڑ اور ان کے شور و غل جیسے الفاظ پائے جاتے ہوں۔ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ۔

(۶) مدیر کا یہ فیصلہ کہ خاتم الرسل کے بعد قیامت تک کوئی ایسی ہستی پیدا ہونی نہیں ہے جس پر ایمان لانے کا سوال پیدا ہو۔ قابل غور ہے۔ (ہم نے اور خود سائل نے) جو روایتیں درج کی ہیں اُن سے تو صاف طور پر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خود آنحضرت نے اپنے بعد امام مہدی کی بعثت کی خبر دی ہے۔ بیعت کی تاکید فرمائی ہے دوسرے لفظوں میں بعثت مہدی کو ضروریاتِ دین سے شمار کیا ہے۔ جبھی تو سنن ابو داؤد میں یہ الفاظ، ملتے ہیں۔ لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا إِلاَّ يَوْمٌ وَاحد لَطَوَّلَ اللَّهُ ذَلِكَ الْيَوْمَ حَتَّى يَبْعَثَ فِيهِ رَجُلاً مِن أُمتى او مِنْ أَهْلِ بَيْتِي يُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِي وَاسْمُ أَبِيهِ اسْمَ أَبِي۔ آنحضرت ﷺ کا یہ تاکیدی بیان تو مہدی علیہ السلام کے ضروریات دین سے ہونے کے بارے میں نص قاطع ہے۔ آقا تو یہ کہے کہ میرے بعد میری اُمّت کی اصلاح کے لئے ایک ہستی آئیگی۔ برف کے تودوں پر سے بھی رینگ کے جانا پڑے تو جائو اور اس کی بیعت کرو۔ اور اس کے غلام یہ کہیں کہ خاتم الرسل کے بعد کوئی ایسی ہستی پیدا نہیں ہونی ہے۔ جس پر ایمان لانے کا سوال پیدا ہو۔ ببیں تفاوت راہ۔

(۷) ایسا ہر شخص جو یہ دعویٰ لیکر اُٹھے۔ الخ مدیر نے یہاں آکر اپنا قلم توڑ دیا ہے اپنی ساری فہم و فراست، عقل و کیاست کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ جواب کے شروع میں ’’اس سے قطع نظر کہ مہدی موعود کے بارے میں جو روایات کتب حدیث میں ملتی ہیں اُن کا منشاء و مصداق کیا ہے۔‘‘ لکھ کر اپنا روئے سخن بدل دیا تھا۔ مگر آگے چل کر جب مدیر کے قلم سے یہ الفاظ نکلتے

ہیں"۔ ایسا ہر شخص جو یہ دعویٰ لیکر اُٹھے کہ مجھے مانو ورنہ کافر ہوگے ایسے کتے کے مانند ہے الخ گویا یہ ہے منشا اور مصداق ان تمام روایات کا جو کتب احادیث میں مہدی موعود کے بارے میں ملتی ہیں۔ کیا خوب ہے تحقیق کے ساتھ اچھا ہے منشا اور کتنا پیارا ہے مصداق۔ یہ تو اعلانیہ آنحضرت کے فرمان صداقت نشان کی تکذیب ہے آپ ﷺ کی پیشین گوئی کی کھلی تضحیک ہے۔ آپ ﷺ کی جناب اقدس میں زبردست گستاخی اور ناقابل معافی جرم ہے۔

علاوہ ازیں ہر شخص تو ایسا دعویٰ لیکر اُٹھ نہیں سکتا کیونکہ فقط دعویٰ تو کسی کام نہیں ہے دعویٰ تو وہ مسموع ہوتا ہے جسکے ساتھ قوی اور موثر دلائل بھی ہوں۔ پس کیا حسبِ پیش گوئی رسول اللہ ختمی مرتبت ایسا دعوی کرنے والے پر بھی وہی الفاظ چسپاں ہوسکیں گے۔ پھر سید محمد جونپوری کی دعوی و مہدیت، آپ کے احوال، افعال اور اقوال سے متعلق کسی قسم کی تحقیق کئے بغیر ایک دم آپ کی شان میں اس طرح کا ناروا حملہ کر دینا بارگاہ تدین میں انتہائی شرمناک جرم ہے جس کا واحد علاج عمر فاروق کا وہ فیصلہ تھا جو آنحضرت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے حق میں دیا کرتے تھے لیکن چونکہ اسلام مغلوب اور اقتدار اسلام مفقود ہے اس لئے ہر شخص بجا طور پر فرعون بے سامان بنا ہوا ہے اور قرآن و حدیث کو خواہشات کا کھلونا بنا لینے کا مشغلہ عام طور پر جاری ہو گیا ہے۔ آخر میں ہم مدیر تجلی کی ایک تحریر بطور آئینہ پیش کرتے ہیں تاکہ مدیر تجلی اپنے اس جواب کو اپنی اس تحریر سے ملا کر دیکھے جو اسی ماہ نومبر ۱۹۶۴ء کے تجلی کے شمارہ میں موجود ہے (ایک طرف تو مدیر کا یہ بلند بانگ دعویٰ اور دوسری طرف یہ گھٹیا مضمون) تاکہ مدیر اپنے متعلق اور اپنے مضمون کے متعلق صحیح رائے قائم کرسکے۔ مدیر نے ایک خط کے جواب میں اس طرح لکھا ہے۔

''خدا اس دن سے پہلے مجھے موت ہی دیدے جب میں جذبات کے اتباع میں شریعت کو نظر انداز کردوں جس شخص کا مقصدِ زندگی ہی شریعت حقہ کا ابلاغ، دفاع اور حق کی اشاعت ہو وہ بھلا جذبات فاسد کا پیرو بن کر اپنا سارا کیا دھرا کیوں برباد کرنے لگا۔ آپ مطمئین رہیں کہ جو رائے میں نے ظاہر کی ہے اس کے پیچھے نہ کسی جماعت کی غالی محبت ہے، نہ کسی گروہ کی بے جانصرت نہ جذباتی غلو ہے، نہ شریعت سے لاپروائی۔ حضور ﷺ جو کچھ فرمادیں وہ تو غلاموں کے لئے سرمایا جان اور خلاصہ' ایمان ہے اس سے انحراف کرکے کوئی بدنصیب سوائے جہنم کے اور کہاں کی اُمید رکھ سکتا ہے (تجلی دیوبند، بابت ماہ نومبر ۱۹۶۴ء شمارہ نمبر ۱۰ صفحہ ۴۴) کیا مدیر تجلی سے اس بات کی اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ مندرجہ بالا فرامین نبویؐ پر نظر کرتے ہوئے مہدی موعود کے بارے میں اپنا مسلک بدل دیں گے ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ ان کے لئے ان کا ''مطلوب دن'' آگیا ہے اور انہوں نے فرامین نبوی ﷺ سے کھلا انحراف کرکے جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنالیا ہے۔

اعتراض لفظ خاتمین پر

شہر میسور کے مفتی بشیر احمد صاحب مرحوم نے ایک جلسۂ سیرت النبی ﷺ میں دوران تقریر لفظ ''خاتمین'' پر اعتراض کیا تھا جس کا جواب تحریری طور پر یوں دیا چکا ہے۔

الحمد للہ رب المشرقین و رب المغربین والصلوٰۃ والسلام علی الخاتمین الکریمین

کل کی بات ہے کہ مفتی بشیر احمد صاحب نے 'خاتم النبیین'' پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے ایک کتاب میں خاتمین کریمین کے الفاظ دیکھے، اس پر ان کو تعجب ہوا کہ خاتم النبیین تو ایک ہیں، اسکے باوجود ''خاتمین'' کے کیا معنی؟ موصوف ایک مہمان مقرر کی حیثیت سے تقریر کر رہے تھے اور خلق عظیم والی ہستی کی میلاد کی مجلس کو ''مجلس مباحثہ و مناظرہ'' بنا دینا ایک طرح کی بد خلقی تھی۔ لیکن رفع شک کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگئی تھی، اس لئے اس مختصر رسالہ کی ضرورت در پیش ہوئی، تا کہ اس کے ذریعہ بتلایا جائے کہ اہل سنت والجماعت علماء، محدثین، مفسرین، متکلمین اور صوفیاء کرام کی تحریرات میں ''خاتم'' کا لفظ صرف خاتم النبیین کیلئے استعمال ہوا ہے یا رسول اللہ ﷺ کے سوا دوسری ہستی کیلئے بھی؟

جہاں تک محمد رسول اللہ ﷺ کا تعلق ہے قرآن کی رو سے آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا ایک نا قابل انکار حقیقت ہے۔ بلکہ اسی حقیقت پر ایمان کا مدار بھی ہے۔ اس کا ترجمہ ''مہر پیغمبراں'' کیا گیا ہے۔ اور صاحب منتھی الارب نے کہا ہے ''خاتَم'' (بفتح سوم) اور ''خاتِم'' (بکسر سوم) دونوں مہر اور انگوٹھی کے معنی میں ہیں۔

ترمذی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ''بین کَتِفَیْہِ خاتم النبوۃ وھو خاتم النبیین'' یعنی رسول اللہ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپ مہر انبیاء تھے۔

دنیائے اسلام کے مشہور شاعر صحابیٔ رسول حضرت حسّانؓ نے رسول اللہؐ کی نعت میں کہا ہے کہ

غر علیہ للنبوّۃ خاتم   من اللہ نور یلوح و یشھد (مدارج النبوۃ، جلد اول، ص۲۵۷)

ترجمہ: سرور پاک سیرت ان پر نبوت کی مہر ہے، اللہ کی طرف سے نور کی چمکتی ہے اور گواہی دیتی ہے۔

بلا شک ہمارا بھی یہی اعتقاد ہے لیکن اہل سنت والجماعت کے اکابر علماء کی ہی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہاں نبوت ختم ہوتی ہے وہاں ولایت کا ظہور ہوتا ہے، ابو الاولیاء حضرت علیؑ سے یہ دور شروع ہوتا ہے اور اس کا کامل ظہور خاتم ولایت سے ہوتا ہے (صراط مستقیم، ص ۶۴)

(۱) چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے اپنی تفسیر میں آیت قرآنی "إِنَّ رَبَّكُمُ ٱللَّهُ ٱلَّذِي خَلَقَ ٱلسَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ" ﴿الأعراف:۵۴﴾ کے ذیل میں لکھا ہے "وهذه المدة من ابتداء دور الخفاء إلى ابتداء الظهور الذي هو زمان ختم النبوّة وظهور الولاية، كما قال صلى الله عليه وسلم -------- ويتم الظهور بخروج المهدي عليه السلام" یعنی یہ مدت، دور خفاء کی ابتداء سے اس ظہور کی ابتداء تک کی ہے جو نبوت کے ختم اور ولایت کے ظہور کا زمانہ ہے اور اتمام ظہور مہدی علیہ السلام سے ہو گا۔ (سورۂ اعراف، تفسیر ابن عربیؒ، ص ۳۴۰)

(۲) نیز ابن عربیؒ نے عَسَىٰٓ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ﴿الإسراء:۷۹﴾ کے ذیل میں لکھا ہے۔ أي في مقام يجب على الكل حمده وهو مقام ختم الولاية بظهور المهدي عليه السلام۔ (تفسیر ابن عربی، ص ۳۸۲) یعنی ایسا مقام جس میں اسکی حمد سب پر واجب ہو گی اور وہ مقام ختم الولایت ہے جس کا اظہار مہدی علیہ السلام سے ہو گا۔ دیکھئے یہاں ابن عربیؒ نے خاتم کا لفظ نبوت کی طرح ولایت کیلئے استعمال فرمایا ہے۔

(۳) اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجھہ نے ختم الاولیاء کے الفاظ مہدی علیہ السلام کی تعریف میں اس طرح لکھے ہیں۔

الا ان ختم الاولياء شهيد وعين امام العارفين فقيد
هو السيد المهدى من آل محمد هو الصارم الهندى حين يبيد (فتوحات مکیہ، ص ۳۶۶)

ترجمہ: آگاہ ہو جائو کہ ختم الاولیاء حاضر ہیں اور اس امام عارفین کی ذات کا ابھی ظہور نہیں ہوا۔ وہ سید ہیں مہدی ہیں جو آل احمد سے ہیں، نیز وہ ہندی تلوار ہیں جب کہ وہ ہلاک کرے گی۔

(۴) صاحب گلشن راز نے نور محمدی کو تمام انبیاء و اولیاء کے حق میں فیوض کا منبع قرار دیتے ہوئے ان الفاظ میں تشریح کی ہے۔

بود نور نبی خورشید اعظم گہ از موسیٰ پدید و گہ از آدم

یعنی آنحضرت کا نور خورشید اعظم تھا جو کبھی موسیٰ کے ذریعہ جلوہ گر ہوا اور کبھی آدم سے۔

لیکن اس سیر نبوت کا اختتام کہاں ہوا اس کی تشریح یوں کرتے ہیں۔

نبوت را ظہور از آدم آمد کمالش در وجود خاتم آمد

یعنی نبوت کا ظہور آدم سے ہوا اور اس کا کمال خاتم کے وجود سے ہوا (یعنی خاتم الانبیاء)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

ولایت بود باقی تا سفر کرد چو نقطہ در جہاں دور دگر کرد
ظہور کل او باشد بخاتم بدو یابد تمامی دور عالم

یعنی نبوت ہو جانے کے بعد ولایت باقی رہی تاکہ سفر کرے، اور نقطہ کی طرح جہاں میں دوسرا دور کرے، ولایت کا کل ظہور 'ختم الاولیاء' سے ہوگا اور اسی سے دور عالم تمام ہوگا۔

(۵) مفاتیح الاعجاز میں خاتم ولایت کی ذات سے ولایت کا کل ظہور ہونے کی تشریح اس طرح کیگئی ہے۔ یعنی ظہور تمامی ولایت و کمالش بخاتم الاولیاء خواہد بود چہ کمال حقیقت دائرہ در نقطہ ء اخیر بظہور می رسد و خاتم الاولیاء عبارت از محمد مہدی ست کہ موعود حضرت رسالت است علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

(۶) شیخ سعد الدین حموی جوہر اول کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "جوہر اول را کہ حقیقت ذات مصطفی است ہر دو طرف مظہر باید، مظہر کہ ختم نبوتش بر و شد، و مظہرے کہ ختم ولایت بر و شد۔ و ایں مظہر است کہ اورا مہدی گویند و صاحب فرمان و صاحب زمان نامند و سلطان سلاطین اولیاء و اصفیاء است و فیض ہمہ اولیاء جزء فیض اوست"۔

یعنی جوہر اول کو جو مصطفی کی حقیقت ہے دونوں طرف مظہر چاہیئے، ایک مظہر وہ جو آپ کی نبوت اس کے ذریعہ ختم ہوئی اور ایک مظہر وہ جو ختم ولایت اس پر ہو، اور اس آخری مظہر کو مہدی کہتے ہیں اور صاحب فرمان و صاحب زمان نام رکھتے ہیں، وہی اولیاء و اصفیاء کے شہنشاہ ہیں، تمام اولیاء کا فیض آنخضرت کے فیض کا جزء ہے۔

(۷) محب اللہ الہ آبادی نے فیوض کی شرح میں لکھا ہے۔ "انبیاء ازیں راہ کہ اولیاء اللہ باشند نمی بینند حق تعالیٰ را مگر از مشکوٰۃ خاتم الاولیاء"، یعنی انبیاء اس جہت سے کہ وہ اولیاء ہیں نہیں دیکھیں گے اللہ کو مگر خاتم الاولیاء کی مشکوٰۃ سے۔

ان مندرجہ بالا حوالوں سے ثابت ہوا کہ "خاتم" کا لفظ جس طرح نبوت کی کامل منزل کیلئے استعمال ہوا ہے اسی طرح ولایت مصطفی کے کامل ظہور کے وقت بھی خاتم کا استعمال ہوا ہے۔ اور نبوت کے خاتم جس طرح حضور محمد مصطفی ﷺ ہیں اسی طرح ولایت مصطفی ﷺ کے خاتم، حضور مہدی موعود علیہ السلام ہیں۔

اسی لئے دورود و سلام خاتمین کی ذات پر بھیجا جاتا ہے جن میں ایک خاتم نبوت ہیں اور دوسرے خاتم ولایت محمدی ہیں۔

اب رہی یہ بحث کہ کیا خاتم ولایت کے بعد کوئی ولی نہیں، تو اس سوال کے تعلق سے بھی اہل سنت والجماعت کی تحریر کو پیش کریں گے۔

چنانچہ علامہ عبد الرحمن جامی نے نقد النصوص میں جو لکھا ہے اسکا ترجمہ یہ ہے "ولایت کی دو قسمیں ہیں (۱) ولایت مطلقہ (۲) ولایت محمدیہ۔

ولایت محمدی کے چند اقسام ہیں اور مراتب میں متفاوت ہیں اور ہر ایک قسم کیلئے ایک مخصوص نام ہے کہ اس نام سے اسکو ایک نوع کا خاتم الولایت کہہ سکتے ہیں۔ایک وہ خاتم الولایت ہے جس کا تصرف عالم میں معنوی ہے۔ جیسے قطب،ایک خاتم وہ ہے جس کو بظاہر تصرف حاصل ہے جیسے سلطان،ایک خاتم وہ ہے جس کو ظاہراً و باطناً دونوں تصرف حاصل ہیں،وہ امیر المومنین علیؓ ہیں،ایک نوع خاتم وہ ہے جس کے بعد اصلاً و قطعاً کوئی ولی نہ ہو گا وہ عیسیٰؑ ہیں،ایک خاتم ''خاتم خاصہء ولایت محمدی'' ہے وہ مہدی موعود علیہ السلام ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجھہ، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، شیخ محمد تبریزیؒ، محمد بن یحییٰ بن علی الجیلانیؒ، حضرت مولانا عبد الرحمن جامیؒ، شیخ سعد الدین حموی، محب اللہ الہ آبادی جیسے اجلّہ ء متقدمین و متاخرین، ظہور خاتم ولایت محمدی کے معتقد اور اس منصب جلیلہ پر امام مہدی موعود کے فائز ہونے کے معترف ہیں۔

(۸)اس کے علاوہ ''خاتم'' سے مراد خاتم دین بھی ہے۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ جو خاتم النبیین ہیں،امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا''یَخْتَمَ اللہُ بِہِ الدِّیْن کَمَا فَتَحَہُ بِنَا''

خلاصہ یہ کہ ''خاتمین'' سے مراد 'خاتم النبیین ﷺ' اور خاتم ولایت محمدی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہیں۔

اہل علم کو چاہئے کہ وقت کے نازک تقاضوں کے پیش نظر عام جلسوں میں اختلافی مسائل کو چھیڑ کر امن و آشتی کے چمن میں چنگاری ڈالنے اور پہلے سے مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹی ہوئی امت مسلمہ کو مزید افتراق و انتشار کا شکار بنانے کی کوشش نہ کریں،بلکہ ضروت اس بات کی ہے لوگوں کو کتاب و سنت کی راہ بتائیں۔

امید کہ یہ چند سطور اور چند حوالے جو مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔رفع شک و شبہ کیلئے کافی ہوں گے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فیض خاتمین علیہما السلام (خاتم نبوت محمد مصطفی ﷺ اور خاتم ولایت محمدیہ مہدی موعود علیہ السلام) سے بہرور فرمائے، آمین

فقط

راقم الحروف،خادم

الفتقر الی اللہ،س،م،عابد

مورخہ ۱۳۔اپریل ۱۹۷۶ء

نوٹ۔یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ ''صراط مستقیم'' پر نظر پڑی اور اس میں جو درج ہے وہ لائق توجہ ہے۔لکھا ہے کہ

"اور یہ مقام مستقل طور پر تو حضرت خاتم النبوۃ اور فاتح الولایۃ محمد مصطفی ﷺ کے لئے مخصوص ہے اور آپ کی پیروی کی برکت سے اس مقام کا نمونہ بعض بزرگوں کو بھی عطا کیا جاتا ہے اور اصطلاح میں ان کو "خاتِمین" اور "فاتِحین" کا لقب دیا جاتا ہے"(صراط مستقیم ص ۴۳) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی خاتم ہوتے ہیں اور ہر دور میں ایک ایک خاتم اور فاتح ہوتا ہے۔

الجواب (نقل مطابق اصل)

بخدمت گرامی حضرت مولانا سید عابد خوندمیری! دامت معالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ عالی! بتاریخ ۱۱۔ اپریل ۱۹۷۶ء بروز اتوار شب میں سیرت النبی ﷺ کے اجلاس میں احقر کو شرکت کا حکم ملا تھا اور تقریر کا بھی موقع ملا، تقریر کے دوران، میں نے ختم نبوت کے سلسلے میں چند باتیں عرض کی تھیں۔ اور کسی کتاب کے حوالے سے لفظ "خاتمین کریمین" پر کچھ اشارہ کیا تھا کہ ختم نبوت حضور محمد ﷺ کی ہے اور اس لفظ میں کوئی اور شبہ ہوتا ہے۔ اس پر آپ نے جو تفصیلی تحریری جواب مرحمت فرمایا ہے اس سے وضاحت ہوگئی اور ذہن کا شبہ دور ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کے علم نافع سے لوگوں کو نجات آخرت کا ذریعہ عطا فرمائے، اور ہم تمام مسلمانوں کو ایک اور نیک ہوکر تادم زیست دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فقط

محتاج دعا احقر بشیر احمد عفی عنہ

۱۲، اپریل ۱۹۷۶ء

اسباب جنگ (غزوہ بدر ولایت)

یوں تو جب سے حضرت امامنا سید محمد جونپوری نے مہدی موعود ہونے کا دعوی اللہ کے حکم سے فرمایا، اس زمانے کے علماء، فقہاء، ومشائخین جو دنیادار تھے۔ آپؑ کے مخالف ہوگئے، اس لئے کہ آپؑ دور اول کے اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش فر مار ہے تھے، یعنی

(۱) قرآن شریف کے تعلق سے آپؑ نے فرمایا کہ پورا قرآن مربوط ہے اس میں حذف نہیں ہے، اس میں جملۂ معترضہ نہیں ہے، اس میں جملۂ مستانفہ نہیں ہے، اس میں تکرار نہیں ہے، اس میں استثناء منقطع نہیں ہے، حرف زائد نہیں ہے، اور کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔

(۲) حدیث کے تعلق سے آپؑ نے فرمایا کہ بقول آنحضرت ﷺ کے صحیح حدیث وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو، اور چونکہ مہدی کے تعلق سے آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ "المهدی مني يقفو أثري ولا يخطي" مہدی مجھ سے ہے وہ میرے قدم بقدم چلے گا اور خطا نہیں کریگا۔ تو اس فرمان کی رو سے جو حدیث بندہ کی عمل کے مطابق ہے وہ صحیح ہے،

(۳) آپؑ نے فرمایا کہ فقہ کے آئمہ اربعہ کے درمیان حق دائر ہے، تم ان میں سے جس کا قول عزیمت اور عالیت کا ہے اس کو اختیار کرو۔

(۴) آپؑ نے فرمایا کہ میرا مذہب کتاب اللہ اور اتباع محمد رسول اللہ ﷺ ہے،

(۵) آپؑ نے فرمایا کہ اولیاء اللہ نے قریب کا راستہ چھوڑ کر دور کا (پر پیچ) راستہ کیوں اختیار کیا، خود نے کیوں حلال چیزوں کو حرام قرار دیا، کنویں سے الٹے لٹک کر عبادت کی، سال بھر کے روزے رکھے وغیرہ، جب لوگوں نے پوچھا کہ قریب کا راستہ (اوپر واڑہ) کا راستہ کونسا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا کہ خودی کو ترک کر دینا اور راہ خدا میں بے اختیار ہو جانا، اپنے اختیار کو اپنے اختیار سے اللہ کے سپرد کر دینا۔

(۶) آپؑ نے فرمایا کہ جس طرح قرآن میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ "امر" کے صیغے سے فرض ہوئے ہیں اسی طرح "فَاذْكُرُوا اللَّـهَ" ﴿البقرة:۱۹۸﴾ سے ذکر اللہ، "وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" ﴿التوبة:۱۱۹﴾ سے صحبت صادقاں، "تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" ﴿المزمل:۸﴾ سے عزلت فرض ہے، اور جن امور کی ادائی سے عذاب دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے ان کا ترک کرنا بھی فرض ہے، جیسے دنیا، متاع حیات دنیا اور زینت دنیا کے تعلق سے وعید آئی ہے، تو ان کا ترک کرنا بھی فرض ہے، اور اسی طرح

دوسرے فرائض جیسے ہجرت، عشر، وغیرہ بھی ہیں۔

(۷) اور آخر میں یہ کہ مہدیؑ کی تصدیق واجب ہے اور اس کا انکار کفر ہے، جیسا کی حدیث ثوبانؓ میں کہا گیا ہے، "فَبَايِعُوهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ" اور "من انكر المهدي فقد كفر"

جب آپؑ ایسی باتوں کو لوگوں کے روبرو بیان فرماتے تو لوگ جوق در جوق آپؑ کا بیان قرآن سننے ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو جاتے، جگہ نہ ملتی تو درختوں پر چڑھ کر بیان سنتے تھے۔ بیان اسقدر موثر اور جاذب قلوب ہوتا تھا کہ لوگ تو بے ہوش بھی ہو جاتے تھے، اور آپؑ کے بیان کا چرچہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہو جاتا تھا۔ اور لوگ آپؑ کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔

بقول مولوی ابو الکلام آزاد کے "چناچہ اکثر اہل اللہ اور علماء حق کی نسبت منقول ہے کہ سید محمد جونپوری اور انکی جماعت سے حسن ظن رکھتے تھے، یا اقلاان کے بارے میں وقف و سکوت کو کام میں لاتے تھے۔"

حضرت شیخ داؤ جہنی وال اور مولانا جمال الدین کی رائے پہلے گذر چکی ہے۔

شیخ وجیہ الدین گجراتی جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے۔ اور جن کا ترجمہ اخبار الاخیار اور ماثر الکرام میں موجود ہے۔ ان کے سامنے جب سید موصوف اور ان کے بعض اتباع کی تکفیر کا فتوی پیش کیا گیا تو دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جو جماعت دنیا کو چھوڑ کر وقف حق پرستی ہے میرا قلم اسکی مخالفت میں اٹھ نہیں سکتا۔

شیخ علی متقی نے اگرچہ مہدویہ کے بزعم خود غلو اور محدثات کے رد میں رسالہ لکھا لیکن خود سید موصوف کی نسبت لکھتے ہیں کہ کف لسانی اولیٰ ہے۔

شیخ داناپوری کہ اس عہد کے استاذ الاساتذہ تھے اور سید رفیع الدین محدث کہ بہ ایک واسطہ حافظ عسقلانی کے شاگرد تھے۔ اور ان کا حال اوپر گذر چکا ہے۔

شیخ عبد القادر بدایونی ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ "با مہدویہ حسن ظن داشتند"۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا قول شاہ عبد العزیز صاحب نے ایک مکتوب میں نقل کیا ہے کہ "سید محمد عالم حق اور واصل باللہ تھے (تذکرہ)

قدمائے مہدویہ کے تعلق سے خود ابو الکلام آزاد کا بیان ہے "ان لوگوں کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ اور والہانہ

تھے اور ایسے تھے کہ صحابۂ کرامؓ کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الٰہی کی ایک جاں سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتون اور وطن وزمین کی فانی الفتوں کو ایمان ومحبت کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق وغمگسار بن گئے تھے۔ امیر وفقیر، اعلیٰ وادنیٰ، سب ایک حال اور ایک رنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت وخدمت اور احکام شرع کے اجراء وقیام کے اور کسی سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ پھر یہ لکھتے ہیں کہ "جو حالات ناطر فدار ومعتمد مورخوں نے لکھے ہیں اگر وہ سچ ہیں تو یہ لوگ انسان نہیں تھے بلکہ ملاءاعلیٰ کے مقدس فرشتے تھے جن کو خدا نے زمین کی طہارت کیلئے آدمیوں کے ہیکل میں بھیج دیا تھا۔"

جب ایسے صفات رکھنے والے اہل اللہ کے خلاف چند مفسد، شر پسند دنیادار علماء اور مشائخین نے حسد اور بغض کی بناء پر ان کے طریقہ کے خلاف کمربستہ ہوئے اور بادشاہوں کے پاس جاکر انکو الٹی پٹی پڑھا کر انکے خلاف فتوے جاری کرکے ان کو اخراج، ہجرت پر مجبور کیا اور انواع واقسام کے شدائد اور سختیوں کا ان کو نشانہ بنانا شروع کیا، دائرے کے ساتھ ان کے جھونپڑے اور مساجد جلائے گئے، اور ان کے قتل کے فتوے دئے گئے تو ایک زمانے تک تو امامناً اور آپؑ کے صحابہؓ تحمل و بردباری کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن جب سختیاں اور مظالم حد سے آگے تجاوز کرگئے، اس طرح کہ ان باخدا بزرگوں کی جھونپڑیاں جلادی گئی، بعض کو دیوار میں چنوادیا گیا، بعض کو کووں کے پنجوں کے مانند لوہے کے سلاخوں کو آگ میں تپاکر پیشانیوں کو داغ دیا گیا، گویا یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان باخدا افراد کی جانیں اور اموال مباح ہیں۔ کوئی بھی اگر ان کو مارے یا ان کا مال لوٹ لے تو اسکی داد وفریاد سنی نہیں جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب کچھ علماء سوء کے اشاروں پر بے دین حکام کے احکام پر ہوا، یہاں تک کہ ایسے فتوے بھی جاری کئے گئے کہ ایک مہدوی کا قتل سات حج مبرور کا ثواب رکھتا ہے اور دانتی واڑے کے کئی ڈاکوؤں اور لٹیروں کو قتل کرنے کے برابر ہے اور ان فتاویٰ پر عمل بھی شروع ہوگیا۔ تو حضرت بندگی میاں سید خوندمیر، صدیق ولایت، بدلۂ ذات مہدی موعودؑ نے ایک استفتاء لکھ کر ان ہی علماء سے جواب طلب کیا، استفتاء کا مضمون یہ تھا۔ "اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے اور انکے احکام پر عمل کرنے والے مسلمانوں کے قتل کا فتوی اگر کوئی صادر کرے تو اس مفتی پر کیا حکم ہے؟

اس کے جواب میں علماء نے فتویٰ دیا کہ "خود مفتی لائق قتل ہے" اور ایک روایت میں اسطرح جواب کے الفاظ لکھے گئے ہیں "قتل الموذی قبل الایذا"

اس جواب کے آنے کے بعد بندگی میاںؓ نے فرمایا "اب شریعت کی جانب سے حکم مل گیا ہے کہ ان باخدا بزرگوں کا

جو خون ناحق ہوا ہے اس کا قصاص (انتقام) لیا جائے، جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے۔ مَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ﴿الإسراء:۳۳﴾ جو شخص مظلوم قتل کیا جائے ہم نے اس کے ولی کو حاکم بنایا ہے، پس قتل میں اسراف نہ کیا جائے۔

مطلع الولایت میں استفتاء کا مضمون دوسرے الفاظ میں آیا ہے، شاید دوسری مرتبہ پھر بندگی میاںؓ نے ایک خاص واقعہ کے بعد استفتاء بھیجا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ جب علماء سوء کی طرف سے جن کا عوام پر خاص اثر تھا ان مظالم کی روک تھام نہیں کی گئی بلکہ عوام کو اندرونی طور پر اور بھی بھڑکایا جانے لگا اور اسی قسم کے مظالم کا دائرہ اور بھی وسیع ہوتا گیا، اسی دوران انہی علماء کے فتووں کی بناء پر احمد آباد میں دو نگریز لڑکوں کو محض اس جرم میں کہ وہ مہدوی تھے، مجمع عام میں علانیہ شہید کر دیا گیا، اس سے قبل جو مظالم اور قتل ہو رہے تھے۔ وہ یکے دکے مہدویوں پر گلی کوچوں میں ہو جاتے تھے، مگر یہ قتل مجمع عام میں ہوا، اسطرح کہ پہلے ان لڑکوں سے کہا گیا "مہدی کا انکار کرو" جب انہوں نے ان کی بات نہیں سنی اور کہا کہ ہم مہدوی ہیں، ان کو یکے بعد دیگرے قتل کر دیا۔ یہ ظلم و استبداد کی انتہائی صورت تھی، اس سے مہدویہ کی جان اور مال کے ساتھ ایمان کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا تھا، حضرت بندگی میاںؓ کو جب اس دل گداز اور جگر خراش واقعہ کی اطلاع ملی تو آپؓ نے فرمایا "باتباع کتاب و سنت ان مظلوم شہیدوں کا قصاص اور انتقام لینا اب ہم پر ضروری ہو گیا ہے"۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپؓ اسوقت کھانا تناول فرما رہے تھے جب آپؓ کو یہ اطلاع ملی تو آپؓ نے نوالہ صحنک میں ہی رکھ دیا اور فرمایا "یہ میری شہادت کا مقدمہ ہے" اسکے بعد حضرتؓ نے حجت شرعی پوری کرنے کیلئے ان ہی علماء سے اس مضمون کا استفتاء کیا:

"خدا پرست فقراء کی ایک جماعت ایسی ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ ذات حق اور اسکی رضا کے طالب ہیں ان میں سے ہر فرد پابند شریعت، زاہد و پرہیزگار، متوکل علی اللہ و گوشہ نشین، تارک دنیا و طالب مولیٰ اور صفات حسنہ بلکہ اکثر صحابہؓ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف سے متصف ہے، اگر کوئی شخص، کسی موجب شرعی کے بغیر ایسے لوگوں کے یا ان میں سے کسی فرد کے اخراج و قتل کا فتویٰ دے تو ایسے شخص پر شرعاً کیا حکم ہے" (مطلع الولایت)

ان علماء نے اسی استفتاء کی پشت پر لکھدیا "حسب الحکم "اقتلوا الموذی قبل الایذا" موذی کو تمہیں ایذاء پہنچانے سے پہلے قتل کر دو"۔ یہی حکم خود اس مفتی پر عائد ہوتا ہے (مطلع الولایت) جن علماء نے یہ جواب دیا ان میں ملا کبیر جو علماء وقت میں سر برآوردہ تھے اور محضرۂ قتل مہدویہ پر سب سے پہلے اور سب کے اوپر ان ہی کی مہر یا دستخط تھی۔ اس لئے بندگی میاںؓ نے

اپنے خلیفۂ خاص بندگی میاں ملک الہدادؓ کو ان کے پاس بھیج کر ان سے دریافت کیا کہ "جو شخص ایمان مفصل پر دل سے اعتقاد رکھتا ہے اور زبان سے اقرار کرتا ہے، تمام احکام وارکان اور فرائض وواجبات وسنن کا پابند ہے، اہل سنت وجماعت کے عقائد پر ثابت قدم ہے، ایسے شخص کے قتل کا فتوی اسلام میں کونسی دلیل سے جائز ہے ؟" (تاریخ سلیمانی) ملا کبیر نے جواب دیا کہ "ایسے شخص کا وہی حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے "وَإِن تَنتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِن تَعُودُوا نَعُدْ"۔ اگر تم اس ظلم سے باز رہو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم پھر ایسا کروگے تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔

قرآنی حکم اور مفتیان دین متین کے فتوے کے بموجب حضرت بندگی میاںؓ نے مظلومین کا انتقام لینے اور دین متین کی حفاظت کی غرض سے ان مفتیوں کے قتل کا حکم صادر فرمایا جنھوں نے مہدیوں کے قتل کے فتوے پر دستخط کئے تھے۔ پھر جب اس پر عمل کرنا شروع ہوا تو علماء اور قضاۃ پریشان ہوگئے، بادشاہ وقت سلطان مظفر کو غلط واقعات باور کرائے گئے کہ فوج کے نام صدیق ولایت اور آپ کے دائرہ کے فقراء کے قتل وتاراج کا حکم نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ۱۲ شوال المکرم ۹۳۰ھ، چہار شنبہ کے دن عین الملک کی سرکردگی میں ہزاروں سپاہیوں پر مشتمل مسلح لشکر نے بندگی میاںؓ کے دائرہ پر حملہ کردیا، ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ بندگی میاںؓ لاکھوں مریدوں کے پیر ہیں اور اکثر امراء اور رؤسا اور فوجی خدمات انجام دینے والے افراد بھی آپ کے مرید ہیں، شاید مقابلہ بڑا سخت ہوگا۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا یعنی نبرد آزماؤں کی تعداد دوسو (۲۰۰) سے بھی کم تھی، شہید ہونے والوں میں ساٹھ سوار اور چالیس پیادے تھے۔ اور اسلحۂ جنگ میں نئے پرانے چھ بکتر، آٹھ تلواریں، خنجر، تیر وکمان، لاٹھیاں، بس یہی سامان جنگ تھا۔

اس کے مقابلہ میں دشمن کی فوج کا یہ حال تھا کہ سات ہزار سرکاری سلاح پوش، چالیس ہزار حبشی، پانچ ہزار پیادے۔ اٹھارہ علمدار ہاتھی (یعنی وہ تعداد جو چھند شریف میں چاپانیر سے روانگی کے وقت بتائی گئی ہے) اس کے علاوہ احمد آباد سے تین سو جنگی ہاتھی، اسی توپیں، پانسو نقارے، پانسو نفیر، پانسو باردار، نیز امراء سلطنت، عین الملک (عینل) سپہ سالار فوج اور ماتحتی میں سرداراں علو خاں اور جھوجھار خاں کے خانگی افواج کا اضافہ۔ صرف یہی نہیں بلکہ لٹیری فوج کی بھرتی جو ہر ہر مقام سے ہوتی جاتی تھی، اسکے سوا تھی، جملہ فوج تخمینا پینتالیس (۴۵) ہزار شمار کی جاتی تھی (دفتر اول، سراج منیر)

جناب قاضی شاہ تاج نے بندگی میاںؓ کی حزب اللہ کی تعداد دیکھی تو کہا "آپ کے پاس جنگ کیلئے جو جماعت ہے وہ ان دشمنوں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے "آٹے میں نمک" یہ سن کر بندگی میاں سید خوندمیرؓ نے فرمایا "ان شاء اللہ نبی اور مہدی موعودؑ کے صدقے سے (پہلے روز کی) جنگ کے میدان میں "آٹا اڑ جائیگا اور نمک رہ جائیگا" اور جب معرکہ شروع ہوا یعنی ۱۲ شوال المکرم چہار شنبہ کی صبح کو دایرہ کھانبیل پر ۴۵ ہزار کا لشکر جرار حملہ آور ہوا، اور حسب فرمان مہدی موعودؑ فقراء حزب اللہ

نے وہ داد شجاعت دی کہ صرف سات ہی گھنٹوں میں میدان خالی ہو گیا۔ دشمن کی فوج آٹھ ہزار لاشوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی، یہ معجزۂ مہدی موعودؑ نہیں تو پھر کیا تھا۔

بندگی میاںؓ نے ان شہداء کی تجہیز و تکفین کے بعد جن کو "گنج شہداء" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جن کو بندگی میاںؓ نے دائرہ کی حفاظت کیلئے ایک لکیر کھینچ کر اس کے اندر رہنے اور کسی بھی قیمت پر اس لکیر کے باہر نہ جانے کی تاکید کی تھی۔ ملک شرف الدین کی درخواست پر سدراسن تشریف لے گئے۔ ہوا یہ کہ جب دشمن کی فوج، فقراء حزب اللہ کی میدان جنگ میں اولالعزمی اور استقامت کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑی ہوئی، تو ان چالیس فقراء پر ان کی نظر پڑی جو لکیر کے اندر تھے۔ بھگوڑوں نے اسی کو غنیمت جان کر ان نہتوں اور بے سروسامان فقراء کو شہید کر دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

دوسرے دن بروز جمعہ ۱۴ شوال المکرم ۹۳۰؁ھ مطابق ۱۵ آگسٹ 1524؁ء، عین الملک سدراسن پر حملہ آور ہوا۔ اور اس جنگ میں، جیسا کہ مہدی موعودؑ نے میاںؓ کو شہادت کی خوشخبری دی تھی۔ بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایتؓ نے بحیثیت بدلۂ مہدیؑ شہادت کا جام نوش فرمایا، چاشت کا وقت تھا یعنی بوقت ضحی۔

اسطرح مہدی موعودؑ نے جو پیش گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی۔ یعنی پہلے دن فتح اور دوسرے دن شہادت، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا "وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا"۔ پہلے دن قَاتَلُوا کا اظہار ہوا، بیچ میں "واؤ" ہے (ایک دن کا فرق) اور دوسرے دن "قُتِلُوا" کا اظہار ہوا۔ پہلے دن حضرت مہدی موعودؑ کی پیش گوئی کے مطابق بندگی میاںؓ کی سرکردگی میں ساٹھ فقراء حزب اللہ کے مقابلے میں مظفر بے ظفر ہوا۔ اور ساری فوج بھاگ گئی اور بندگی میاںؓ کو فتح نصیب ہوئی، جیسا کہ حضرت مہدیؑ نے فرمایا تھا کہ پہلے دن تمہارے مقابلے میں ساری دنیا آجائے تو بھی تم کو فتح نصیب ہوگی۔ یہ "حجت مہدی تھی" یہ مہدیؑ کا معجزہ تھا اور دوسرے دن آپؓ کی شہادت عمل میں آئی اگرچہ اس دن امراء ورؤسا بھی شریک جنگ تھے۔ یہ شہادت مہدیؑ کے بدل کی حیثیت میں تھی۔ بندگی میاںؓ کی شہادت اور اسکے بعد کی تفصیلات تفصیل کے طالب ہیں، اسکیلئے فقیر کی تالیف "سیرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ" کا مطالعہ مفید رہیگا، مختصراً عرض ہے کہ شہادت کے بعد مقدس سات سروں کو ایک ٹوکرے میں رکھا گیا اور بادشاہ کے پاس لیجانے لگے، راستہ میں پٹن میں عصر کی اذانیں شروع ہوئیں تو بندگی میاںؓ نے سروں کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، یہ دیکھکر لیجانے والے ڈر گئے اور ایک شیطان کے مشورہ پر سروں سے استخواں (ہڈیاں) نکال کر ان میں بھس بھر دیا گیا۔ اور پٹن میں ہی دفن کر دیا گیا اور پوست کو چاپانیر لیجایا گیا اور وہاں پر دفن کیا گیا۔ اسطرح مہدیؑ کی پیش گوئی بھی پوری ہوئی کہ "تن جدا، سر جدا اور پوست جدا" جسدوں کو سدراسن میں، سر کی ہڈیوں کو پٹن میں شریف میں اور پوست کو چاپانیر میں (اسطرح تین جگہ) دفن عمل میں آیا اور حجت مہدی موعودؑ پوری ہوئی۔

اولی الامر

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّـهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ" اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور انکی جو تم میں صاحب امر ہیں۔ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کے ساتھ صاحبان امر کی بھی اطاعت کا حکم اللہ نے دیا۔ روایت ہے کہ یہ آیت حضرت حذیفہؓ کے بارے میں نازل ہوئی، جب آنحضرت ﷺ نے آپؓ کو ایک لڑائی میں سردار بنایا تھا۔ اور ایک روایت ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے ایک جنگ میں خالد بن ولیدؓ کو امیر فوج بنایا تھا۔ ساتھ میں حضرت عمار بن یاسرؓ بھی تھے۔ ایک شخص حضرت عمار کے پاس آیا۔ اور مسلمان ہوگیا اور امان مانگی، عمارؓ نے اسکو امان دیدی۔ جب اسکی ملاقات خالدؓ سے ہوئی تو خالدؓ نے اس کا مال ضبط کرلیا۔ اس نے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور یاسر نے مجھے امان دی ہے۔ پھر عمارؓ اور خالدؓ میں تکرار ہوئی۔ اور خالد نے عمار سے کہا، میرے ہوتے ہوئے تم نے کس طرح اسکو امان دی۔ دونوں آنحضرتؐ کے پاس رجوع ہوئے آنحضرت ﷺ فرمایا کہ یاسر کا امان دینا صحیح ہے لیکن آئندہ کیلئے حضرت یاسرؓ کو تاکید کردی کہ تم کسی کو امان مت دو (اسلئے کہ خالد بن ولیدؓ امیر العسکر ہیں) اصل معاملہ تو یہی ہے، البتہ بعد میں ان علماء وفقہاء کی اطاعت کو اس میں شامل کرلیا گیا جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے ہیں، اسی لئے خلفاء اور امراء کیلئے بھی اسی آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اگر وہ اللہ اور اسکے رسول کے احکام بجالانے کے تعلق سے حکم کرتے ہیں تو ان کی اطاعت کرنی چاہئے، لیکن وہ اگر اللہ اور اسکے رسول اور قرآن کے خلاف کام کرنے کا حکم دیتے ہیں تو وہاں اطاعت لازم نہیں ہے۔

اسی وجہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام اور یزید کے مابین جو معرکہ آرائی ہوئی اس میں لوگ مختلف الرائے ہوگئے۔ بعض کا کہنا تھا کہ کچھ بھی ہو یزید حاکم وقت تھا۔ امام حسین کو اس کے خلاف اٹھنا نہیں چاہئے تھا، اگرچہ وہ فاسق ہی تھا، امام علیہ السلام کا یہ عمل حاکم وقت کے خلاف بغاوت تھی۔ اور نعوذ باللہ ایسے باغی کی سزا قتل ہی تھی۔ لیکن اکثریت یہ کہتی ہے کہ یزید خلیفہ ہی نہیں تھا جسکو عامۃ المسلمین نے چنا تھا، بلکہ وہ قیصر وکسریٰ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے معاویہ کے بعد زبردستی خلیفہ بن بیٹھا تھا۔ اور وہ اسلام کی سپرٹ کے خلاف کام تھا۔ اس غلط طریقہ کے خلاف آواز اور تلوار اٹھانا حق تھا۔ کیونکہ حق کیلئے آپؓ اٹھے تھے۔ اور اسی سلسلے میں آپؓ نے اپنی جان دی۔ تو آپؓ شہید کہلاتے ہیں۔ یہ بالکل اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ تفصیلات کیلئے اس خصوص میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ امام حسینؓ برحق تھے۔ اور یزید پلید ناحق پر، اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کے حکم کے بعد صاحب امر کی اطاعت کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ بات بڑی نازک، قابل غور اور لائق اتباع ہے، جب عام امیر کے تعلق سے اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے تو زیادہ توجہ دینے کی بات یہ

سامنے آتی ہے کہ حضرت مہدی موعودؑ کی اطاعت کے بارے میں کیا طریقۂ عمل ہونا چاہئے۔ حضرت مہدیؑ تو صاحب امر ہیں۔ امر اللہ ہیں، مامور من اللہ ہیں۔ خلیفۃ اللہ ہیں، تابع تام محمد رسول اللہ ہیں۔ خاتم دین ہیں، کیا آپ مفترض الطاعۃ نہیں ہیں ؟ خصوصاجب کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب ان کے بارے میں سنو تو جاؤ اور انکے ہاتھ پر بیعت کرو اگرچہ تم کو برف پر سے رینگتے ہوئے جانا پڑے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کے خلیفے ہیں اور اس بات کو اکابر اہل سنت، محدثین اور صوفیاء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اصولی طور پر اس میں کسی ایسے شخص کو جو مستند اور متدین عالم ہے، اختلاف نہیں ہے، البتہ ایک آدھ مورخ یا اصول تفسیر سے ہٹ کر اپنی فہم کے مطابق تفسیر کرنے ولے نے اس سلسلے میں کچھ لکھ دیا ہو تو دین میں اسکی کوئی حیثیت ہے اور نہ مقام۔ چونکہ مہدوی، حضرت سید محمد جونپوری علیہ السلام کو "مہدی موعود" مانتے ہیں اس لئے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق آپؑ ہی صاحب امر ہیں۔ پس آپؑ کی اطاعت لازم اور فرض قرار پاتی ہے۔

اصحاب کہف

اقسوس یا طرسوس نامی ایک شہر میں ایک بادشاہ تھا۔ جو نہ صرف بت پرست تھا بلکہ بتوں کی پوجا نہ کرنے والوں کو قتل کرتا تھا، اس کے پاس کام کرنے والوں کے چند نوجوان لڑکے ایک اللہ پر ایمان رکھتے اور بت پرستی سے بچتے تھے۔ یہ بات کسی طرح اسکو معلوم ہو گئی، اس نے ان کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے بڑی جرات کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کی بات پیش کی، بادشاہ نے سزا دینے کے بجائے ان کو مہلت دی اور دوسرے شہر کو چلا گیا۔ اس دوران انہوں نے اپنے اپنے گھروں سے اپنے کھانے پینے کیلئے کچھ روپے لے لئے اور ہم خیال ہو کر اس شہر کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لی، بادشاہ کے ہرکارے ڈھونڈتے ہوئے آئے تو انہوں نے خدا سے دعا کی، اللہ نے ان کو سلا دیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہ کے زمانے میں ان کے ساتھ ایک جنگ میں روم کی طرف گئے تھے۔ ہمارا گذر اس غار پر سے ہوا، جس میں اصحاب کہف ہیں، معاویہ نے کہا کہ اگر اللہ ہم کو ان کے بارے میں معلوم کر دے تو ہم انکو دیکھ لیتے، تو ابن عباس نے کہا "اس سے ان کو بھی منع کر دیا گیا جو تم سے بھی بہتر تھے۔ (یعنی رسول اللہ ﷺ) پھر بھی معاویہ نے چند لوگوں کو بھیجا اور کہا کہ جاؤ اور دیکھو۔ بس جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ نے ان پر ایک ایسی گرم ہوا چلا دی، جس نے ان سب کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، قرآن میں بھی یوں آیا ہے "یعنی وہ تین اور چوتھا ان کا کتا، بعض کے پاس پانچ اور چھٹا ان کا کتا، یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں، یہ بھی کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ کہدیجئے میرا پروردگار ان کی گنتی خوب جانتا ہے لوگ انکی گنتی کو بہت کم جانتے ہیں۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ "میں ان قلیل لوگوں میں سے ہوں (جن کو ان کی تعداد کا علم ہے) اور انکی تعداد سات ہے اور اللہ نے سات کے قول کو بیان کرنے کے بعد اس کی تردید نہیں کی۔ یہ بھی ایک اشارہ اس کی صحت کا ہے۔

اصحاب کہف اس غار میں تین سو برس اور انکے اوپر نو برس رہے، اللہ نے صاف طور پر ۳۰۹ برس نہیں کہا بلکہ تین برس پھر انکے اوپر نو برس فرمایا۔ مقصد یہ کہ شمسی سال کے حساب سے تین سو برس اور قمری حساب سے ۳۰۹ ہوتے ہیں۔

اسراف

فضول خرچی کو عربی میں اسراف بھی کہتے ہیں اور تبذیر بھی۔

قرآن شریف میں اللہ نے حکم دیا ہے "وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ" ﴿الاسراء:۲۶،۲۷﴾۔ اور مال کو فضول خرچی سے نہ اڑاؤ، بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قصاص کا حکم دیتے ہوئے بھی فرمایا "ولا یسرف فی القتل "یعنی قصاص لیتے ہوئے صرف قاتل سے بدلہ لینا چاہیئے، یہ نہیں کہ غصہ میں آکر اس کے بھائیوں یا رشتہ داروں تک تمہارا ہاتھ پہنچ جائے۔

قرآن شریف میں اللہ نے کئی مقامات پر اسراف اور مسرفین کی مذمت فرمائی ہے اور کھلے الفاظ میں اسراف سے ممانعت فرمائی ہے۔ چناچہ سورہء غافر میں ارشاد ہے۔

(۱) إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿غافر:۲۸﴾ بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گذر جانے والا اور بہت زیادہ جھوٹا ہے۔

(۲) كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴿غافر:۳۴﴾ اسی طرح اللہ اس شخص کو گمراہ کر دیتا ہے جو حد سے نکلنے والا اور شک کرنے والا ہے۔

(۳) وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿انعام:۱۴۱﴾ اور بے جا خرچ مت کرو، بے شک اللہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۴) كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿اعراف:۳۱﴾ کھاؤ اور پیو اور حد سے آگے مت بڑھو کیونکہ اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۵) وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿یونس:۸۳﴾ بے شک فرعون اپنے ملک میں دبدبہ والا تھا اور حد سے بڑھا ہوا تھا۔

(۶) وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ﴿غافر:۴۳﴾ اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں۔

اور بھی کئی آیتوں میں اللہ نے حد سے نکل جانے والوں کی مذمت کی ہے۔ حد سے نکل جانے والوں میں وہ لوگ شامل ہو جاتے ہیں جو اللہ کے دئے ہوئے مال کو بے جا خرچ کرتے ہیں۔ اللہ نے فضول خرچی کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ بلکہ "أَنَّهُمْ

أَصْحَابُ النَّارِ''بھی فرمادیاہے۔

ضرورت کی حد تک خرچ کرنا ضروری ہے، ہر آدمی کی ضروریات اس کے مقام، مرتبہ، عہدہ وغیرہ کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ پس ان ضروریات کی حد تک خرچ کرنا اسراف میں داخل نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ خرچ ہوتا ہے تو وہ اسراف میں داخل ہوجاتاہے۔ پس خرچ کی قسمیں اسطرح ہیں۔

ضروریات۔ آسائشات۔ تعیشات۔ نمائشات

گھر بنانا ضروریات میں شامل ہے، گھر میں پنکھے، لائٹ، کپڑے دھونے کی مشین، میکسی، بجلی یا گیس کے چولھے، ٹیبل، کرسی، پلنگ، صوفے، فریج وغیرہ آسائشات میں داخل ہیں، اسی طرح موٹر، سائیکل، کار، وغیرہ بھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر تعیشات اور نمائشات پر جو خرچ کیاجاتاہے، وہ اسراف میں داخل ہے۔

شادی وغیرہ کی تقریبات میں، پھول، دعوت، رقعہ جات کی طباعت، دلھا دلھن کے کپڑے، ضروری سامان، جہیز وغیرہ ٹھیک اور قابل برداشت ہے، لیکن دعوت میں مرغن غذائیں، طرح طرح کے پکوان، کئی قسم کے میٹھے، خوبصورت مزین رقعہ جات، ازکاررفتہ رسمیں، بینڈ، باجے اور بہت سی قسم کی رسومات سب اسراف میں داخل ہیں۔

انسان

الرَّحْمٰــنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿الرحمن:۱ تا۴﴾ پس اس آیت میں انسان سے مراد انسان کامل اور جامع انسان ہے۔ ابن کیسان کا خیال ہے کہ انسان سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں اور بعض نے کہا اس سے مراد حضرت آدمؑ ہیں، بعض نے مطلق انسان کہا۔ لیکن حضرت مہدی موعودؑ نے جن کے ذریعہ قرآن شریف کا بیان ہونا خود قرآن سے معلوم ہورہاہے، فرمایا کہ "اس سے، مراد بندہ کی ذات ہے"

چنانچہ حضرت میاں عبد الغفور سجاوندیؒ نے رسالۂ ہژدہ آیات میں لکھاہے "مہدی موعودؑ سے مروی ہے آپؑ نے فرمایا" مجھے اللہ نے حکم فرمایاہے کہ انسان سے مراد تیری ذات ہے، میں کہتا ہوں "حق وہی ہے جو آپؑ نے فرمایا کیوں کہ آیت کے معنی اس کی تاکید کرتے ہیں۔ یعنی رحمان نے محمد ﷺ کو ترتیل و تنزیل کے ساتھ قرآن کی تعلیم دی، جیسا کہ اللہ کے قول میں ہے "ورتل القرآن ترتیلاً" نیز فرمایا "جب ہم قرآن پڑھیں تو آپؐ اسکے پڑھنے کو سنا کیجئے، ہمارے پڑھنے کے بعد پڑھئے ہماری تعلیم سے، پیدا کیا انسان کو یعنی مہدی کو، اسکو بیان کی تعلیم دی یعنی اللہ نے مہدی کو قرآن کا بیان سکھایا (ہژدہ آیات، ص ۴۵)

صاحب روح المعانی نے بھی بیان کی تفسیر، تفصیل علوم اجمالیہ سے کرتے ہوئے اس کا تعلق "ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" ﴿القیامۃ:۱۹﴾ سے کیاہے۔ نیز واضح ہو کہ حضرت مہدی موعودؑ کا سب سے بڑا معجزہ بیان قرآن ہے، آپؑ کے بیان قرآن کی کئی خصوصیات تھیں۔

(۱)　بیان کے دوران، سامعین کے دلوں میں جو سوالات ہوتے تھے ان کے جوابات از خود ان کو مل جایا کرتے تھے۔

(۲)　آپؑ کے بیان کو سننے کیلئے ہزاروں لوگ جمع ہوتے تھے، لیکن دور اور نزدیک بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو آپؑ کی آواز یکساں پہنچتی تھی۔

(۳)　تیسری خصوصیت یہ کہ، آپؑ جس خطے میں جاتے تھے وہاں کی زبان میں بیان فرماتے تھے۔

(۴)　چوتھی خصوصیت یہ کہ آپؑ کے بیان کو من و عن کوئی تحریر نہیں کرسکتا تھا۔

(۵)　پانچویں خصوصیت یہ کہ بیان کے دوران کئی لوگ جذبۂ حق میں بے ہوش ہوجایا کرتے تھے۔

اہل صفّہ

تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے صحن میں صحابہؓ کی ایک جماعت سکونت پذیر تھی، عبادت پر آمادہ، ذکر میں مشغول، تارک دنیا اور زندگی کے کاروبار سے منقطع اور ہمیشہ حضور نبی کریم ﷺ کی صحبت بابرکت سے بہرہ اندوز اور فیض یافتہ، نہ ان لوگوں کے کاروبار تھے یعنی تجارت تھی نہ زراعت، نہ کوئی اور دنیوی مصروفیت، بس ہمیشہ حضور ﷺ کی صحبت اقدس میں رہتے تھے، جب باہر سے وفود آتے یا مقامی صحابہؓ بھی کچھ مسائل دریافت کرتے اور حضور ﷺ اس کا جواب دیتے تو یہ حضرات سن کر یاد رکھتے، اسطرح دین کی ڈھیر سی معلومات ان کو ہو جاتی تھیں۔ اور مدینہ منورہ سے باہر کے لوگ دین اسلام کی ضروری باتوں کو جاننے کیلئے، کسی معلّم کو بھیجنے کی آنحضرتؐ سے درخواست کرتے تو آنحضرتؐ ان ہی اصحاب صفّہ میں سے کسی ایک کو ان کے ساتھ بھیج دیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کو ان کا کردار، دنیا سے ان کی بے رغبتی اور دین سے ان کا لگاؤ اتنا پسند تھا کہ ایک مرتبہ جب آنحضرتؐ نے قریش کے بعض دنیادار لوگوں سے گفتگو کرنے کی غرض سے ان اصحاب صفّہ سے ہلکی سی بے پرواہی برتی تو فوراً اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿انعام،۵۲﴾ دور مت کر و ان لوگوں کو جو صبح شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ اس کی ذات کے طلبگار ہو کر ان کے حساب کی ذمہ داری آپؐ پر کچھ بھی نہیں ہے اور آپؐ کے حساب کی جوابدہی بھی ان کے ذمہ نہیں ہے۔ کہ آپؐ ان کو (اپنی مجلس سے) نکال دیں، (اگر آپؐ ایسا کریں گے تو) آپؐ نا مناسب کام کرنے والوں میں ہو جائیں گے۔

چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن الفرازی جو مولفۃ قلوبھم میں سے تھے ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمیت میں آئے تو آپؐ کے پاس حضرات صہیب، عمار اور بلال رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے یہ لوگ غریب تھے، اور اون کا جبھہ پہنے ہوئے تھے اور ان کے لباس سے پسینے کی بو بھی آرہی تھی، ان لوگوں کو ان کے پاس بٹھنا اچھا معلوم نہیں ہوا، انہوں نے کہا آپ ان کو یہاں سے ہٹا دیجئے، ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، آپ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا، انہوں نے کہا آپ ایسا کیجئے کہ ہمارے لئے ایک خاص مجلس (وقت) مقرر کیجئے، تا کہ لوگوں کو ہمارا مقام معلوم ہو۔ اور آپ کے پاس عرب کے وفود بھی آتے ہیں، ان کو ان غریبوں اور نچلے طبقہ کے لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے، پس جب ہم آئیں تو آپ ان کو اٹھا دیجئے، اور جب ہم اٹھ جائیں تو آپ ان کے ساتھ بیٹھ جایئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہاں یہ ہو سکتا

ہے۔ انہوں نے کہا "آپ اس بارے میں ہم کو ایک قرارداد لکھ دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے کاغذ منگوایا اور حضرت علیؓ کو بلایا، تاکہ قرارداد لکھدیں۔ اس وقت وہ غریب لوگ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ یکایک حضرت جبرئیلؑ اس آیت کو لیکر نازل ہوئے۔ (جو اوپر درج کی گئی ہے) تو رسول اللہ ﷺ نے اس وقت وہ کاغذ پھاڑ ڈالا، اور ان غریبوں کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا "سلام علیکم کتب ربکم علی نفسہ الرحمۃ"۔ اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ ہم آپ کے پاس بیٹھے رہتے جب حضور ﷺ اٹھ جاتے اور ہم کو اسی حال میں چھوڑ دیتے۔ پھر اللہ نے دوسری آیت نازل کی۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿کہف:۲۸﴾ اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھا کیجئے جو صبح و شام (علی الدوام) اپنے رب کا ذکر محض اس کی خوشنودی (یا اسکی ذات) کے غرض سے کرتے ہیں، اور آپ کی نگاہیں دنیوی زندگی کی رونق کی طلب میں ان سے ہٹ نہ پائیں، اور اس شخص کا کہانہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھا ہوا ہے۔

تفسیر میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ عتبہ، شیبہ، ابو جہل اور امیہ وغیرہ صنادید قریش آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، جب کہ آپ ﷺ کے پاس حضرات عمار، بلال، صہیب، سلمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا، آپ ان کو دور کر دیں، تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے، ان کے جبوں سے بدبو آتی ہے، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اصحاب صفّہ کے بارے میں نازل ہوئی جو سات سو فقراء تھے، اور مسجد نبوی میں رہتے تھے، نہ تو تجارت کرتے تھے اور نہ زراعت، بلکہ نماز پڑھتے اور دوسری نماز کے انتظار میں رہتے تھے، صحبت نبویؐ ہی ان کا سرمایہ اور اثاثہ تھا، جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا، "ہر قسم کی تعریف اس اللہ کیلئے سزاوار ہے جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کئے جن کے ساتھ رہنے کا مجھے حکم دیا گیا، اصحاب صفہ کتنے ہیں ن میں اختلاف ہے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شروع میں کم ہوں اور بعد میں بڑھتے رہے ہوں، پھر معلّمین کی حیثیت سے نواح مدینہ میں بھیج دینے کی بناء پر ان کی تعداد کم ہو گئی ہو، ان میں جو مشہور ہیں، وہ اس طرح ہیں۔ حضرت بلالؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عتبہ بن مسعودؓ، حضرت مقداد بن اسودؓ، حضرت خبّاب بن ارتؓ، حضرت صہیب بن سنانؓ، حضرت عتبہ بن غزوانؓ، حضرت زید بن خطابؓ، حضرت ابو کبوشہؓ، حضرت ابو مرثد کنانہؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت عکاشہ بن المحصنؓ، مسعود بن ربیع القاریؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت صفوان بن بیضاءؓ، حضرت ابو درداءؓ، اور حضرت ابولبابہؓ، حضرت عبداللہ بن بدر الجہنیؓ۔ نیز ابوہریرہؓ، حضرت ثوبانؓ، حضرت معاذ بن حارثؓ، حضرت صائب بن خلادؓ، حضرت

ثابت بن ودیعہؓ، حضرت ابو عبیس عویم، حضرت سالم بن عمیر بن ثابتؓ، حضرت کعب بن عمروؓ، حضرت حبیب بن معقلؓ، حضرت عبد اللہ بن انیسؓ، حضرت حجاج بن عمرو اسلمیؓ بھی اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ مگر وہ کبھی کبھی کسب معیشت میں بھی مشغول ہوئے ہیں، مگر مرتبہ سب کا ایک ہے۔

اجتماع مہدی و عیسیٰ علیہما السلام

عام طور پر یہ غلط اعتقاد پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانے میں ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ عیسیٰ علیہ السلام ایسے وقت میں نازل ہوں گے جبکہ مہدی علیہ السلام نماز پڑھانے کی تیاری میں ہوں گے۔ پھر جب عیسیٰؑ نازل ہوں گے تو مہدی علیہ السلام آپ کو دیکھ کر فرمائیں گے کہ آیئے نماز پڑھایئے۔ پھر ایک نماز میں عیسیٰؑ مہدیؑ کی اقتداء کریں گے اور دوسری نماز میں مہدیؑ عیسیٰؑ کی اقتداء کریں گے۔

اس غلط اعتقاد کی بناء پر مہدویہ سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے اعتقاد کے مطابق مہدیؑ آچکے تو لازم تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی آگئے ہوتے۔ لیکن عیسیٰؑ ابھی تک نہیں آئے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے جس مہدیؑ کی تصدیق کی ہے وہی مہدی موعودؑ تھے۔ ذیل میں اسی سوال کا جواب دیا جارہا ہے

واضح ہو کہ اولاً یہ بات پورے وثوق اور کامل اعتماد اور ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مہدیؑ اور عیسیٰؑ کے ایک زمانے میں ہونے کے بارے میں کوئی حدیث ہی نہیں ہے۔ جب ایسی کوئی حدیث مسلم، بخاری یا دیگر کتابوں میں نہیں ہے تو اجتماع مہدیؑ و عیسیٰؑ کا جو عقیدہ ہے وہ من گھڑت ہی ہے صحیح عقیدہ تو وہی ہے جو کتاب و سنت سے ماخوذ اور مستنبط ہوتا ہے۔

آیئے اس ضمن میں جو احادیث آئی ہیں ان پر ایک نظر ڈالیں تا کہ صحیح حقیقت کا ادراک ہو سکے

(۱) عن أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيكُمْ وَإِمَامُكُمْ مِنْكُمْ ترجمہ: ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ (عیسیٰ) ابن مریم تم میں نازل ہوں گے حالانکہ تمہارے امام تم میں سے ہیں۔ اس حدیث میں "وَإِمَامُكُمْ مِنْكُمْ" کے الفاظ آئے ہیں مہدی کا لفظ نہیں ہے۔ امام مطلق ہے اور عام نوعیت کا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس مطلق کو مہدی کے ساتھ مقید اور عام کو خاص کر لیا جاسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ خود حدیث میں امام مقید اور خاص ہو گیا ہے یعنی جب امام کے ساتھ "كُمْ" یعنی "إِمَامُكُمْ" آگیا تو اب یہ عام اضافت کی وجہ سے خاص ہو گیا۔

(۲) اس سلسلے کی دوسری حدیث وہ ہے جس کو ابن ماجہ نے ابوامامہ باہلی سے روایت کی ہے۔ کہ حضرت رسول ﷺ نے ایک طویل خطبہ دیا جس میں دجال کے حالات اور واقعات بیان فرمائے ام شریک نے پوچھا کہ اس وقت عرب کہاں

ہوں گے آپ نے فرمایا بہت تھوڑے ہوں گے۔ بیت المقدس میں رہیں گے۔ ان کا امام ایک مرد صالح ہو گا اس کا ضروری متن اس طرح ہے قَالَ " هُمْ يَوْمَئِذٍ قَلِيلٌ وَجُلُّهُمْ (فی) بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَإِمَامُهُمْ رَجُلٌ صَالِحٌ فَبَيْنَمَا إِمَامُهُمْ قَدْ تَقَدَّمَ يُصَلِّي بِهِمُ الصُّبْحَ إِذْ نَزَلَ عَلَيْهِمْ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ الصُّبْحَ" ترجمہ: فرمایا وہ اس وقت تھوڑے ہوں گے ان میں کے اکثر بیت المقدس میں رہیں گے اور ان کا امام ایک مرد صالح ہو گا اس اثناء میں کہ ان کا امام انہیں صبح کی نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھے گا کہ اچانک عیسیٰ ابن مریم صبح میں نازل ہوں گے اس حدیث میں بھی إِمَامُهُمْ کے الفاظ دو مرتبہ آئے ہیں۔ پہلی جگہ یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ ان کا جو امام ہو گا وہ ایک مرد صالح ہو گا اور دوسری مرتبہ جو إِمَامُهُمْ کا لفظ آیا ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ وہ نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھ گیا ہو گا اس میں ''مہدی'' کا لفظ نہیں ہے۔

(۳)　اس خصوص میں جو تیسری روایت آئی ہے وہ مسلم شریف کی ہے عن جَابِرَ قال قال رَسُولَ اللَّهِ صلی الله علیه وسلم"لاَ تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ " قَالَ فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ علیه السلام فَيَقُولُ أَمِيرُهُمْ تَعَال صَلِّ لَنَا فَيَقُولُ لاَ إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللَّهِ هَذِهِ الأُمَّةَ" (اشعتہ اللمعات جلد چہارم باب نزول عیسیٰ علیہ السلام صفحہ ۳۷۵) ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ میری امت کا ایک گروہ قیامت کے دن تک حق کی مدافعت میں لڑتا رہے گا اور غالب آتا رہے گا کہا پس عیسیٰ بن مریمؑ اتریں گے۔ اس جماعت کا امیر عیسیٰ سے کہے گا آپ آیئے اور ہم کو نماز پڑھایئے۔ پس عیسیٰ کہیں گے نہیں۔ بے شک تم میں سے بعض، بعض پر امیر ہیں۔ اس اعزاز کی وجہ سے جو اللہ نے اس امت کو دیا ہے۔

اس حدیث میں '' أَمِيرُهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں ''المھدی'' کا لفظ نہیں ہے

اس روایت سے ایک اور غلط خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ مہدیؑ کے زمانے میں کل روئے زمین عدل و انصاف سے بھر جائے گی کیونکہ یہ روایت تو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ قیامت کے دن تک دفاعِ حق میں لڑتا رہے گا اور غلبہ بھی پاتا رہے گا۔

دفاع حق میں لڑنا تو اسی وقت متصور ہو سکتا ہے جبکہ ناحق قوتیں برابر اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ حق کے خلاف نبرد آزما ہوں اور حق کے خلاف لڑنے سے بڑھ کر ظلم اور جور اور کیا ہو سکتا ہے۔ آنحضرت نے تو فرمایا کہ یہ معاملہ قیامت تک ہوتا رہے گا۔

مندرجہ بالا ان تینوں حدیثوں میں إمَامكُم یا أَمِيرُهُمْ کے الفاظ تو آئے ہیں لیکن کہیں بھی المھدی کا لفظ نہیں ہے اس

سے ثابت ہوتا ہے کہ صحاح سے ہٹ کر یعنی غیر صحاح کی کسی روایت میں امامکم یا امیر ھم کے بعد ''المھدی'' کا لفظ آگیا ہے تو اس کو ''موضوع'' یا ''الحاقی'' ہی سمجھنا چاہئے۔ یا یہ کہ روایت کرنے والے نے اس لفظ سے ''اپنی مراد'' (نہ کہ رسول اللہ ﷺ کا منشاء) یا اپنا شبہ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ انور شاہ کشمیری' بخاری کی شرح فیض الباری میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں "المتبادر منه الامام المهدي" (فیض الباری جلد ۴ صفحہ ۴۴) ترجمہ اس سے جو مفہوم متبادر ہوتا ہے وہ امام مہدی ہے پھر دوسرے مقام پر لکھتے ہیں والراجح عندی۔۔۔ والمراد منه الامام المهدی تو اس طرح شارحین نے اپنی طرف سے امیر ھم کی مراد بیان کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ اصل حدیث میں تو المھدی کی صراحت نہیں یا یہ کہا جائے گا کہ وہ امیر ہی الگ ہوگا جس کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کا اجتماع ہوگا لیکن یہ بات تو قطعی ہے کہ حضرت مہدیؑ کے ساتھ یا آپ کے زمانے میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول نہیں ہوگا۔

مصنفہ عبدالرزاق میں بھی ایک روایت چند الفاظ کے اختلاف کے ساتھ آئی ہے اس میں تو امیر کے لفظ کا ذکر تک نہیں ہے روایت ملاحظہ ہو۔ اخبرنا عبدالرزاق عن معمر عن ایوب و غیره عن ابن سیرین قال ینزل ابن مریم علیه لامته ممصرتان بین الاذان والاقامة فیقولون له تقدّم فیقول بل یصلّی بکم امامکم انتم امراء بعضکم علی بعض (مصنفہ عبدالرزاق صفحہ ۴۰۰) ترجمہ: حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے اس حال میں کہ آپ کے اوپر دو زرد قسم کے کپڑے ہوں گے اذان اور اقامت کے درمیان (کا وقت ہوگا) لوگ آپ سے کہیں گے نماز کیلئے آگے آیئے وہ فرمائیں گے نہیں بلکہ تمہارا امام نماز پڑھائے گا۔ تمہارے میں کے بعض بعض کے امیر ہیں۔

اس روایت میں تو ''امیر جماعت'' کا ذکر تک نہیں ہے بلکہ نماز کی امامت کے لئے لوگوں (مصلّیوں) کی جانب سے حضرت عیسیٰؑ کو دعوت دینے کی بات کہی گئی ہے نہ امیر کا لفظ ہے نہ امام کا اور نہ مہدی کا۔

نیز مصنفہ عبدرالرزاق میں ایک اور روایت جو تقریباً اسی کے ہم معنی ہے اس طرح آئی ہے۔ کیف بکم اذا نزل فیکم ابن مریم حکما فأمّکم او قال امامکم منکم۔ ترجمہ: تمہارا کیا حال ہوگا جب حضرت عیسیٰؑ حکم بن کر نازل ہوں گے اور تمہاری امامت کریں گے یا یہ فرمایا کہ تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ مصنفہ عبدالرزاق کے محشی حبیب الرحمن اعظمی نے اس کے ذیل میں لکھا ہے اخرجه الشیخان لفظ البخاری و مسلم امامکم منکم۔

اس کے علاوہ اہل سنت اجتماع مہدیؑ و عیسیٰؑ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے ہیں علامہ سعد الدین تفتازانی نے نہایت صراحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے۔ ثم لم یرد فی حاله اي عیسیٰ مع امام الزمان حدیث سویٰ ماروی انه

قال علیه السلام لا یزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق۔۔۔ الخ فما یقال ان عیسیٰ علیه السلام یقتدی بالمهدی او بالعکس شيء لا مستند له فلا ینبغي ان یعول علیه (شرح مقاصد جلد ثانی صفحہ ۳۰۸) ترجمہ: امام الزماں (مہدی علیہ السلام) کے ساتھ عیسیٰؑ ہونے کے بارے میں کوئی حدیث نہیں آئی سوائے اس حدیث کے جس کی روایت ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ لایزال طائفۃ من امتی۔۔۔ الخ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ عیسیٰؑ امام مہدی کی اقتداء کریں گے یا امام مہدیؑ عیسیٰؑ کی اقتداء کریں گے ایک بے اصل بات ہے جس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مندرجہ بالا حوالوں سے حسب ذیل امور معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) صحاح کی کسی روایت میں حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ مہدیؑ کے نام کی صراحت نہیں ہے

(۲) صرف "إِمَامُكُمْ" یا "أَمِيرُهُمْ" کے الفاظ آئے ہیں

(۳) بعد کے لوگوں نے اس سے المھدی مراد لی ہے

(۴) اور بعض شارحین نے ترجمہ میں اپنی جانب سے "المھدی" کے لفظ کا اضافہ کر دیا ہے

(۵) عقائد کی کتاب سے بھی ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مہدی علیہ السلام کا ایک ساتھ جمع ہونا اور ایک دوسرے کی نماز میں اقتداء کرنا بے اصل بھی اور ناقابل اعتبار و توجہ بھی

اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ پھر ان دونوں حضرات یعنی حضرت مہدی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ کونسا ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے حضرت مہدی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانوں کے بارے میں نہایت واضح الفاظ میں صراحت فرمادی ہے حدیث کے الفاظ دیکھئے كَيْفَ تَهْلِكُ أُمَّة أَنَا أَوَّلُهَا والمهْدِيّ فِي وَ سطِهَا وَالْمَسِيحُ فِي آخِرُهَا ولكن بين ذلك فيج أعوج ليسوا مني ولا أنا منهم (الملتقطات ترجمہ مشکوٰۃ باب ثواب ھذہ الامتہ) ترجمہ: کیوں کر ہلاک ہوگی وہ امت جس کے اول میں ہوں، مہدی درمیان میں اور عیسیٰؑ آخر میں ہوں گے۔ لیکن اس کے درمیان ایک ٹیڑھی جماعت ہوگی جو نہ مجھ سے ہوگی اور نہ میں ان سے۔

اس حدیث سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) یہ امت (امت محمدیہ) ہلاک نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اس کے دافع یعنی ہلاکت سے بچانے والی تین اولوالعزم ہستیاں ہیں

(۲) ان میں سے پہلی ہستی جو اس امت کے پہلے حصہ میں ہے وہ خود آنحضرت ﷺ ہیں

(۳) ان میں کی دوسری ہستی جو اس امت کے درمیانی حصہ میں ہے وہ حضرت مہدی علیہ السلام ہیں

(۴) ان میں کی تیسری ہستی جو اس امت کے آخر میں آئیگی وہ حضرت عیسیٰؑ ہوں گے۔

(۵) ان کے درمیان (مہدی اور عیسیٰؑ کے درمیان) ایک ایسی ٹیڑھی جماعت ہوگی جس کے تعلق سے آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ نہ مجھ سے ہوں گے اور نہ میں ان سے یعنی ان کی روش میری سنت کے خلاف ہوگی۔

اس عظیم الشان روایت سے نہ صرف حضرت مہدی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰؑ کے ظہور و نزول کے زمانوں کا تعین ہورہا ہے بلکہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ارفع اور اعلیٰ مقام کا پتہ بھی چل رہا ہے کہ حضور نے حضرت مہدیؑ کو اپنی ذات اقدس اور حضرت عیسیٰؑ کی طرح ''دافع ہلاکت امت محمدیہ'' کی حیثیت سے پیش فرمایا ہے۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ دو پیغمبروں کے درمیان حضرت مہدیؑ کا ذکر آیا ہے تو کیا درمیان میں جس ہستی کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی پیغمبر ہے حاشاء وکلّا۔ مہدیؑ پیغمبر نہیں ہیں نہ آنحضرت ﷺ نے مہدیؑ کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور نہ خود مہدی موعودؑ نے کبھی اپنی نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور نہ ہم مہدوی آپ کو پیغمبر مانتے ہیں۔ حضور محمد مصطفی ﷺ پر نبوت ختم ہوچکی اور لا نبی بعدی کے ذریعہ نبوت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا گیا۔ اب جو چیز باقی تھی وہ امامت اور خلافت تھی آنحضرت ﷺ نے بھی اسی کا ذکر کیا اور حضرت مہدیؑ نے بھی اسی کا دعویٰ فرمایا لیکن دو اولوالعزم پیغمبروں کے درمیان ایک عظیم مہتم بالشان کام کے لئے آنحضرت ﷺ کی زبانِ مبارک سے حضرت مہدیؑ کا ذکر اس حقیقت کو بھی ضرور آشکار کررہا ہے کہ مہدی علیہ السلام گو پیغمبر نہیں لیکن ''ملحق بالانبیاء'' ضرور ہیں جس کی صراحت حضرت ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں کی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ ''ملحق بالانبیاء'' یا ''صاحب بینہ'' ہوئے بغیر مرتبۂ مہدی موعود حاصل ہو نہیں سکتا دیکھئے ایک اور زاویہ سے بھی حضرت مہدیؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ایک وقت میں اجتماع ناممکن ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت مہدیؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں اللہ کے خلیفے ہیں جب وہ آئیں گے تو لازماً ان دونوں سے بیعت کی جائے گی کیونکہ ان دونوں پر ایمان لانا واجب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وقتِ واحد میں دونوں خلیفوں کے ہاتھ پر بیعت کرنا صحیح ہے؟ کیا ایک دجّال کو ختم کرنے کے لئے اللہ دو خلیفوں کو بیک وقت بھیجے گا۔ کیا اللہ کا ایک خلیفہ ایک دشمنِ خدا کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ دوسرا اس کی مدد کے لئے آئے۔ اور جب مہدیؑ کے زمانے میں ہی دجال موجود ہوگا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ دجال کو قتل کریں گے تو مہدیؑ کا وجود اس زمانے میں اضافی ہی ہوگا۔ اس لئے کہ دجال کا قتل تو حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں مقدر ہے۔

دو مستقل خلیفے ایک زمانے میں کس طرح ہوسکتے ہیں جبکہ آنحضرت ﷺ نے بڑی سختی کے ساتھ یہ فرمادیا **إِذَا بُويِعَ الخَلِيفَتَانِ فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا** (منتخب الصحیحین، شیخ یوسف بن اسماعیل النبھانی صفحہ ۱۶) ترجمہ:۔ جب دو خلیفوں کی بیعت

کی جائے تو دونوں میں کے آخر کو قتل کر دو۔ یہ روایت مسلم میں حضرت ابو سعید سے مروی ہے نہایت اہم بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے بعد (کہ جب دو خلیفوں سے وقت واحد میں بیعت لی جائے تو ان دونوں میں کے آخر کو قتل کردو) تو دو خلیفوں کے اجتماع کا جواز بھی ختم ہو گیا۔

اب تو سوچنے کی بات بھی نہیں کہ ایسی صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ کیوں کہ فیصلہ تو حضور صادر فرما چکے ہیں چاہے مہدی پہلے آئیں یا عیسیٰؑ پہلے آئیں۔ کیا ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قتل کرنا جائز ہے۔ اگر قتل نہ کریں تو حضور ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور نعوذ باللہ قتل کریں تو اللہ کے خلیفے کو قتل کرنے کے مجرم بنیں گے۔

حضور ﷺ تو فرماتے ہیں کہ یہ دونوں اپنے اپنے دور میں دافع ہلاکت ہیں اور دونوں کو ایک زمانے میں ماننے والوں پر یہ ذمہ داری آجائے گی کہ دونوں میں سے ایک دافع ہلاکت کو ہی دفع کر دو۔ حالانکہ ان دونوں کی اپنے اپنے وقت میں تصدیق کرنا' ایمان لانا اور ان سے بیعت کرنا واجب ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ حضرت مہدیؑ وسط امت میں اور حضرت عیسیٰؑ آخر امت میں آئیں۔

غرض یہ تو ہوئی خلافت الٰہیہ کی بات خلافت رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی جب آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد انصار اور مہاجرین میں اختلاف رونما ہوا اور مہاجرین کی جماعت کہنے لگی کہ خلیفہ ہم میں سے ہو گا اور انصار کی جماعت نے کہا کہ نہیں بلکہ خلیفہ ہم میں سے ہو گا آخر کار یہ نعرہ بلند ہوا کہ ہم میں سے ایک امیر ہو گا اور تم میں ایک امیر ہو گا تو کیا اس کو جائز رکھا گیا؟ نہیں بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی اور آپ خلیفہ منتخب ہو گئے جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے۔ **لمّا قبض رسول الله ﷺ قالت الانصار منا امير و منكم امير فاتاهم عمر بن الخطاب فقال يا معشر الانصار**۔۔۔۔الخ پورا واقعہ بیان کیا گیا ہے تفصیل کے لئے دیکھئے **تاریخ الخلفاء فصل فی مبایعته** صفحہ ۵

جب خلافت رسالت پناہی کے لئے دو امیر کا فلسفہ غلط اور ناقابل عمل ٹھہرا تو خلافت الٰہیہ کے لئے کس طرح روا رکھا جا سکتا تھا۔ پس حضرت مہدیؑ اور عیسیٰؑ کا بیک وقت دنیا میں اجتماع ناممکن اور خلاف نقل و عقل ہے۔

نیز زیر بحث حدیث میں جو فقرہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس پر تو توجہ ہی نہیں دی گئی یعنی جب حضرت عیسیٰؑ کو نماز پڑھانے کے لئے کہا جائے گا تو آپ فرمائیں گے نہیں **إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ أُمَرَاءُ** (تم میں بعض' بعض کے امیر ہیں) اس کے بعد یہ الفاظ بھی آپ نے فرمائے۔ **تَكْرِمَةَ اللَّهِ هَذِهِ الْأُمَّةَ** (اس بزرگی کی وجہ سے جو اللہ نے اس امت کو دی ہے) یہاں امت محمدی کی رفعت شان بیان کی جا رہی ہے حضرت عیسیٰؑ اگرچہ اپنے وقت کے اولوالعزم صاحبِ کتاب اور صاحب کلمہ پیغمبر

تھے لیکن جب آپ کا دوبارہ نزول ہو گا تو آپ امت محمدیہ میں شمار ہوں گے اب اگر حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اترنے کے بعد (عام مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق) حضرت مہدیؑ کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے تو اس میں امت کی جو تعظیم پائی جاتی ہے اس کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ہمارے اور اہل سنت کے اعتقاد کے مطابق اس موقع پر جو جماعت نماز کے لئے تیار رہے گی اور اس کا امام جو امتِ محمد کا ایک عام فرد ہو گا (جسے حدیث میں مردِ صالح کہا گیا ہے) وہ عیسیٰؑ کو تعظیماً امامت کی پیش کش کریگا۔ مگر حضرت عیسیٰؑ کہیں گے کہ نہیں تم ہی پڑھاؤ اور عیسیٰؑ اس امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو امت کی اس تعظیم و مکرمت کو ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو معمولی سمجھ رکھنے والا بھی یہی فیصلہ کریگا کہ یہ دوسرا پلڑا ہی بھاری ہو گا۔ یعنی عیسیٰؑ جب امت محمدیہ کے ایک عام فرد کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو اس میں اس امت کی مکرمت اور تعظیم زیادہ ہے بہ نسبت اس کے کہ عیسیٰؑ مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو اس میں مکرمت اور تعظیم کیسی؟ ہاں اتنی بات صحیح ہے کہ حضرت مہدیؑ بھی امت محمدی میں داخل ہیں لیکن حضور کے تابع تام اور قدم بر قدم مصطفی ﷺ ہیں اور اس معنی میں ملحق بالانبیاء ہیں اور آپ اللہ کے خلیفہ ہیں جس طرح کہ عیسیٰؑ اللہ کے خلیفے ہیں۔ اس طرح اگر اللہ کا ایک خلیفہ، اللہ کے دوسرے خلیفہ کے پیچھے نماز ادا کرے تو مکرمت نہ ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ جب عیسیٰؑ امت کے ایک عام فرد کی اقتداء میں جو کہ خلیفۃ اللہ نہیں ہے نماز پڑھیں گے تو وہ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هَذِهِ الْأُمَّةَ ہو گی اور ہو گا بھی یہی وہ امام مہدیؑ نہیں ہوں گے۔ جس کے پیچھے عیسیٰؑ نماز پڑھیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مہدیؑ ایک زمانے میں نہیں ہوں گے چنانچہ حاکم نے المستدرک میں یہ روایت درج کی ہے۔ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَدْرَكَ مِنْكُمْ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ فَلْيُقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ ترجمہ: انسؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے تم میں سے جو شخص عیسیٰؑ کو پائے تو ان کو میرا سلام پہنچاؤ۔

اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے عیسیٰؑ کا ذکر فرمایا تو یہ بھی فرمایا کہ تم سے کوئی عیسیٰؑ کو پائے تو ان کو میرا سلام پہنچائے۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ اگر حضرت مہدیؑ بھی ہوتے (جیسا کہ عام مسلمانوں کا اعتقاد ہے) تو کیا اخلاق رسول اللہ سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک زمانے میں اللہ کے دو خلیفے ہوں اور ان میں سے ایک اس درجہ کا ہو کہ وہ دافع ہلاکت امت محمدیہ ہو۔ یقفو اثری ولا یخطی کی شان رکھتا ہو اور اس کا لحاظ (عام مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق) خود عیسیٰؑ اس طرح فرماتے ہوں کہ ان کی موجودگی میں نماز پڑھانے سے انکار کرتے ہوں لیکن آنحضرت ان کو نظر انداز فرماتے ہوئے صرف حضرت عیسیٰؑ کو اپنی جانب سے سلام پہنچانے کی تاکید کرتے ہوں۔ اگر

واقعی عیسیٰؑ کے ساتھ حضرت مہدیؑ بھی ہوتے تو لازماً آنحضرت ﷺ یہ فرماتے کہ تم سے کوئی اگر ان دونوں کو پائے تو ان دونوں کو میرا اسلام پہنچائے۔ مگر چونکہ زمانہ الگ الگ تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے صرف حضرت عیسیٰؑ کا ذکر فرمایا۔ اسی طرح صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

قال رسول اللہ ﷺ كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيكُمْ فامكم ترجمہ: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ تم میں ابن مریم نازل ہوں گے وہ تمہاری امامت کریں گے۔ اسی طرح کی ایک اور روایت ہم نے سابق میں مصنفؒ عبد الرزاق سے درج کی ہے اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ابن مریم ہی امامت کریں گے کوئی دوسرا امام نہ ہوگا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے وامامکم منکم کے ذیل میں لکھا ہے

"مراد بہ امام عیسیٰ ست۔ ومراد بودن اواز شما حکم کردن اوست باحکام شریعت شمانہ بأحکام انجیل ودر روایتے دیگر آمدہ است فامکم بکتاب ربکم وسنۃ نبیکم۔ پس امامت می کند شمارا بکتاب پروردگار شما و سنت پیغمبر شما۔ پس معنی چنیں باشد کہ امامت می کند شمارا عیسیٰ درحال بودن اواز دین وملت شما و حاکم بکتاب و سنت شما" (مصنف عبد الرزاق جلد ۱۱ صفحہ ۳۹۹) ترجمہ: امام سے مراد عیسیٰؑ ہیں۔ ان کے تم میں سے ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہاری شریعت کے احکام کے مطابق حکم دیں گے نہ کہ انجیل کے احکام کے مطابق۔ دوسری روایت میں فامکم بکتاب ربکم وسنۃ نبیکم آیا ہے پس وہ اطاعت کریں گے، تمہارے پروردگار کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت کے مطابق پس معنی یہ ہوں گے کہ عیسیٰؑ تمہاری امامت کریں گے دریں حال کہ وہ تمہارے دین وملت سے ہوں گے تمہاری کتاب و سنت سے حکم کریں گے اسی طرح امام بخاری کی راویت میں بھی امامکم منکم کے الفاظ آئے ہیں ظاہر ہے کہ بخاری کے نزدیک بھی امامکم منکم سے مہدیؑ مراد نہیں تھے۔ اگر مہدیؑ مراد ہوتے تو وہ ایک باب "باب المهدی" کا الگ قائم کرتے اور اس میں یہ حدیث درج کرتے جیسا کہ ان کی عادت ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ مہدیؑ اور عیسیٰؑ کا دنیا میں بیک وقت اجتماع صحاح کی کسی ایک حدیث سے بھی ثابت نہیں ہے اور عقلاً بھی یہ ناممکن ہے اس کے علاوہ عدم اجتماع مہدیؑ و عیسیٰؑ کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ قیامت کے آثار اور علامات کی دو قسمیں ہیں جن کو اشراط صغریٰ اور اشراط کبریٰ کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اشراط کبریٰ میں دس چیزیں بیان فرمائی ہیں جیسا کہ حذیفہؓ کی روایت سے ظاہر ہے۔

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ اطَّلَعَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم عَلَيْنَا وَنَحْنُ نَتَذَاكَرُ فَقَالَ "مَا تَذَاكَرُونَ" قَالُوا نَذْكُرُ السَّاعَةَ قَالَ "إِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتَّى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ" فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّابَّةَ الارض وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُولَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ عليه السلام وَيَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ وَثَلاَثَةَ خُسُوفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ

وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ ۔ترجمہ: حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایسے میں آنحضرت ﷺ بر آمد ہوئے پوچھا کیا باتیں کر رہے ہو کہا ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے فرمایا قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس نشانیوں کو نہ دیکھ لو۔ پھر آپ نے دخان، دجال، دابۃ الارض، آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰؑ بن مریم کا نزول، یاجوج و ماجوج کا خروج، تین خسف یعنی مشرق، مغرب اور جزیرۂ عرب میں زمین کا دھنسنا اور آخر میں یمن سے آگ نکلنے کا ذکر کیا جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانک لے جائے گی۔ اس حدیث میں دس چیزوں کا ذکر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے لیکن ان میں مہدیؑ کے ظہور کا کوئی ذکر نہیں ہے اگر اجتماع مہدی و عیسیٰؑ کا مسئلہ قطعی اور صحیح ہوتا تو آنحضرت ﷺ ضرور ان اشراط کبریٰ میں عیسیٰؑ کے ساتھ مہدیؑ بھی ذکر فرماتے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ظہور مہدیؑ اشراط کبریٰ میں نہیں ہے جبکہ مہدی کا ظہور اشراط صغریٰ میں ہے۔ اشراط کبریٰ سے مراد وہ علامات ہیں جو قیامت سے متصل ظاہر ہوں گے اور اشراط صغریٰ سے مراد وہ علامات ہیں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گے۔ اشراط صغریٰ، اشراط کبریٰ سے پہلے ظاہر ہوں گے۔ پھر وقفہ ہوگا اور قیامت سے متصل اشراط کبریٰ کا ظہور ہوگا البتہ بعض متأخرین نے بعد میں جب ان احادیث کو نقل کیا تو المہدی کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی نے العرف الوردی میں صحیح مسلم کی حدیث میں جو کیف انتم سے شروع ہوتی ہے امامکم کے بعد "المھدی" اور ابن ماجہ والی حدیث میں "امامھم" کے بعد "المھدی" کا اضافہ کر دیا۔ اسی طرح ابو نعیم اصفہانی کی روایت میں "امیرھم" کے بعد "المھدی" کا اضافہ کر کے "امیرھم المھدی" لکھ دیا۔ یہ الفاظ یقیناً اضافی اور الحاقی ہیں جو کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔

چنانچہ جمع بین الصحیحین میں علامہ شیخ ابو عبداللہ محمد بن عبدالحق بن عبدالرحمن نے امامکم المھدی منکم پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ و اما ما ذکر اللفظ موضوعا فی ھذا الحدیث وھو قولھم امامکم المھدی منکم یثبت الامامة للمھدی فی صلواة عیسیٰ فقد ظھر و نشر کذبه بمقابلة الصحیحین اعنی البخاري و مسلم فانه لم یذکر فیھما ولا في منتخابتھما کالمشارق والمصابیح والمشکواة ترجمہ: اس حدیث میں جو لفظ موضوع بیان کیا گیا ہے وہ ان کا قول "امامکم المھدی منکم" ہے جس سے مہدی کے لئے عیسیٰؑ کی نماز میں امامت ثابت ہوتی ہے اس لفظ کا جھوٹا ہونا صحیحین یعنی بخاری و مسلم کے مقابلہ میں ظاہر بھی ہو چکا ہے اور شائع بھی کیوں کہ وہ لفظ "مہدی" ان دونوں یعنی بخاری و مسلم میں مذکور نہیں ہے اور نہ ان کے منتخبات میں ہے جیسے مشارق، مصابیح اور مشکواۃ میں۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ عیسیٰؑ کے ساتھ امام اور امیر کا جو لفظ ہے وہ عام ہے اور اس کے ساتھ جو "المھدی" لکھ دیا گیا ہے وہ بعد کے لوگوں کی کارستانی ہے جو غلط ہے پس مہدی و عیسیٰؑ کے اجتماع کا عقیدہ غلط ہے۔

امام

لفظ امام ممکن ہے حسب ذیل الفاظ سے مشتق ہوا ہو۔ اَمام بمعنی، آگے۔اُمُّ۔اصل بمعنی بنیاد۔اَمَّ، بمعنی، قصد و ارادہ کیا۔

اگر اِمام، اَمام سے مشتق ہے تو امام کا معنی پیشوا کے ہیں، اور اگر ''اُمّ'' سے مشتق مانیں گے تو اس کا معنی معاشرہ کی اثاث اور بنیاد ہوگا، اور اگر ''اَمُّ'' سے مشتق ہوگا تو پھر امام سے مراد وہ شخص ہوگا جس کی پیروی اور اتباع کا عوام قصد اور ارادہ کریں۔''کتاب المفردات فی غرائب القرآن'' میں لفظ امام کا معنی یوں بیان کیا گیا ہے، امام اس چیز کو کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے وہ چیز چاہے انسان ہو، جس کے اقوال و اعمال کی پیروی کی جائے، یا کتاب ہو یا کوئی دوسری چیز۔اس کی پیروی بر حق ہو یا باطل۔ان معنی کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ یعنی امام، امامت، اُمّت خود کوئی مقدس مفہوم نہیں رکھتے، امام وہ ہے جو کسی بھی امت یا جماعت کی امامت یا پیشوائی کے فرائض انجام دے، خواہ وہ عادل و ہدایت یافتہ ہو یا گمراہ و فاسق ہو، اور اس کی امامت باطل ہو، یہ لفظ صرف اسی وقت مقدس مفہوم کا حامل ہوگا، جب کسی ایسے قائد یا پیشوا کیلئے استعمال کیا جائے، جس کی قیادت بر حق ہو۔

قرآن مجید میں لفظ ''امامت'' تو نہیں آیا ہے، البتہ امام، آئمہ اور امت کے الفاظ مقدس و غیر مقدس دونوں مفہوموں میں آئے ہیں۔اور ایک دو جگہ لفظ امام صرف لغوی معنی میں آیا ہے۔

(۱) چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ۔اور دونوں بستیاں (جو اجاڑ دی گئیں) وہ کھلی شاہراہ پر ہیں﴿سورہ حجر:۷۹﴾

(۲) وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ۔اور تمام چیزوں کو ہم نے ایک واضح کتاب میں محفوظ کر لیا ہے﴿یٰسین، ۱۲﴾

(۳) يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ۔اس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے﴿الاسریٰ، ۷۱﴾ یہاں امام اچھے، برے دونوں معنوں میں مشترک ہے۔

(۴) وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ۔اور یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم کو ان کے رب نے مختلف امور سے آزمایا اور وہ ان سب میں کامیاب ہوئے تو اللہ نے فرمایا میں تم کو لوگوں کیلئے امام بناؤں گا، ابراہیمؑ نے کہا میری ذریت (اولاد) میں سے بھی (امام) بنائیو، جواب دیا، میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔﴿بقرہ۔۱۲۴﴾

اس آیت میں اللہ نے جس امام کا ذکر فرمایا ہے وہ امام نور اور امام ہدایت ہے۔

یہ نکتہ بھی یہاں یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ کے جواب میں جو "امام" ہے وہ "وعدہء الٰہی" بھی ہے۔

چناچہ مہدیؑ نے فرمایا کہ "ابراہیمؑ نے اپنی اولاد میں جس امام کی دعا فرمائی تھی وہ امام میں ہی ہوں" اس کی تشریح آئندہ آئے گی۔

امام کی جمع ائمہ ہے قرآن میں ائمہ کا لفظ بھی ہدایت اور ضلالت کے پیشواؤں کیلئے آیا ہے۔ چناچہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان اور الٰہی رہبروں کی امامت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے، وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا ﴿الأنبیاء:٧٣﴾ اور ہم نے انہیں ایسے امام بنائے جو ہمارے حکم (امر) سے لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

اسی طرح اللہ نے ضلالت اور گمراہی کی طرف بلانے والوں کا بھی ذکر اس طرح فرمایا ہے۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ﴿قصص:٤١﴾۔ اور ہمنے انہیں ایسے امام بنائے جو لوگوں کو جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔

اسی طرح اللہ نے ایک آیت میں عھد شکنوں اور دین پر حملے کرنے والوں کیلئے جو صدر اسلام میں مسلمانوں سے بر سرپیکار تھے " أَئِمَّةَ الْكُفْرِ " فرمایا ہے۔ چناچہ ارشاد خداوندی ہے کہ۔ وَإِن نَّكَثُوا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ۔ ﴿توبہ:١٢﴾ یعنی اگر یہ لوگ عھد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑڈالیں اور تمہارے دین پر حملہ کریں تو، کفر کے اماموں سے جنگ کرو۔

حضرت ابراہیمؑ کی جن باتوں سے آزمائش لی گئی، ان کے بارے میں بعض کہتے ہیں وہ دس باتیں تھیں، بعض نے کہا وہ تیس تھیں اور حضرت مہدیؑ نے فرمایا کہ وہ چالیس باتیں تھیں۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ دس باتیں فطرت سے متعلق تھیں، پانچ سر سے تعلق رکھتی ہیں اور پانچ بدن سے۔ مونچھ کترانا، کلی کرنا، ناک صاف کرنا، مسواک کرنا، سر میں مانگ نکالنا، سر سے متعلق ہیں، بدن سے متعلق امور یہ ہیں۔ ناخن کترنا، بغل کے بال لینا، زیر ناف بال لینا، ختنہ، اور پانی سے استنجاء کرنا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ابراہیمؑ کیلئے فرض تھیں اور ہمارے لئے سنت ہیں، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان امور کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو الہام کیا تھا۔ تو آپؑ نے ان امور کی انجام دہی بغیر تفریط اور تنقیص کے کی، اور یہ جو کہا گیا ہے وہ تیس باتیں تھیں، تو ان کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں دس باتیں تو وہ ہیں جو سورہ براءت میں ہیں، چناچہ اللہ کا قول ہے۔ التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ ۔۔۔ الخ اور دوسری دس باتیں سورہء احزاب میں۔ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ ۔۔۔ الخ میں بیان ہوئے ہیں

اور تیسری دس باتیں سورۂ المومنون میں۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۔۔۔ الخ میں مذکور ہوئی ہیں۔ پہلے کے دس اور یہ تیس اسطرح جملہ چالیس باتیں ہوئی۔

یہاں یہ سوال بھی اہمیت کے حامل ہے کہ یہ آزمائش کب ہوئی، آیا نبوت سے پہلے یا نبوت کے بعد۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نبوت سے پہلے کی بات ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ آزمائش نبوت کے بعد ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبوت ملنے کے بعد ہی کا معاملہ ہے، اس لئے کہ تکلیف شرعی وحی کے بعد ہی ہوتی ہے نہ کہ وحی سے پہلے، یعنی پہلے آپؑ کو نبوت عطا کی گئی اور بعد میں آپؑ کو امامت کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ دونوں اقوال میں تطبیق اسطرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ستارے، چاند، سورج وغیرہ امور میں آزمائش کے بعد نبوت عطا کی گئی اور باقی امور کی تکمیل کے بعد "امامت" کا منصب دیا گیا، نبوت اور امامت دو الگ الگ منصب ہیں، نبوت میں تو یہ ہوا کہ جس قوم کی طرف آپ نبی بنا کر بھیجے گئے، آپ کے مخاطب وہ لوگ ہیں کہ آپ کی اتباع اور پیروی ان کیلئے لازمی تھی۔ لیکن جب آپؑ امام بنائے گئے تو آپ بعد میں آنے والے انبیاء کے بھی پیشوا قرار پائے۔ علاوہ ازیں یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ابراہیمؑ کی جانب سے دو مطالبات ہوئے ایک تو اس وقت جب آپؑ نے خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے وقت دعا فرمائی تھی " رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ ۔۔ الخ ﴿البقرۃ:۱۲۹﴾۔ اے ہمارے رب ان میں ایک رسول کو مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں پڑھے، گویا اس دعا میں حضرت ابراہیمؑ نے ایک رسول کے پیدا فرمانے کی دعا کی تھی، جس کے نتیجے میں اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے بحیثیت رسول مبعوث فرمایا، چناچہ اسکی تائید خود آنحضرت ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ "میں ابراہیم کی دعا ہوں، والدہ کا خواب ہوں اور عیسیٰ کی بشارت ہوں" پھر جب اللہ کی آزمائش میں پورے اترے اور اللہ نے آپؑ کو امام اور پیشوا بنایا تو پھر آپؑ نے دعا فرمائی "وَمِن ذُرِّيَّتِي" یعنی میری ذریت (اولاد) میں سے بھی امام بنائیو۔ گویا نبوت کی دعا رسول اللہ ﷺ کے حق میں قبول ہوئی، رہی بات امام کی دعا کی تو اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ "میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچیگا" یعنی تیری ذریت میں جو عادل ہو گا وہ امام ہو گا، رسول اللہ ﷺ کیونکہ خاتم النبیین تھے اس لئے آپؐ کے بعد نبوت کی گنجائش ہی نہیں تھی، البتہ امامت کا منصب تو اللہ نے حضور ہی کی عترت میں سے ایسی ہستی کو جو آپؐ کے قدم بہ قدم اتباع کرنے والی تھی اور وہ بھی اسطرح کہ جس کی شان میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت دی تھی "يَقْفُو أَثْرِي وَ لَا يُخْطِي" میرے نقش قدم پر چلیگا اور کبھی خطا نہیں کریگا۔ اور جس کے حق میں آپؐ نے فرمایا تھا "يَمْلَأُ الأَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلاً" کہ وہ زمین کو قسط و عدل سے بھر دیگا، منصب امامت سے سرفراز فرمایا، چنانچہ حضرت سید محمد جونپوری بن سید عبد اللہ المخاطب بہ مہدی بلسان رسول اللہ

ﷺ خلیفۃ اللہ، بینۃ اللہ، امر اللہ، مراد اللہ، دافع ہلاکت امت محمدیہ نے فرمایا کہ "ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت میں سے جس امام کی دعا کی تھی اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ وہ فقط تیری ذات ہے نہ کہ کوئی اور۔ (رسالۂ ہژدہ آیات، ص۔۴)

عرفانی نقطہ نظر سے بھی اگر دیکھا جائے تو یہاں ایک نہایت ہی لطیف نکتہ بیان کیا گیا ہے، یعنی اللہ کا یہ فرمان کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا، تو سوال یہ ہے کہ ظالم سے مراد کون ہے؟ قرآن پڑھنے والے تو اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قرآن میں شرک کو ہی ظلم کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا "يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّـــهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿لقمان:۱۳﴾ اے میرے پیارے بیٹے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت کر کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ظالم سے مراد مشرک ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ شرک کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً شرک جلی اور شرک خفی، نیز "ریاء" کو بھی شرک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ نے بھی ایک مقام پر خود کو شرک سے بری قرار دیا ہے۔ حالانکہ آپؐ پیغمبر تھے، اور یہ اعلان اس مقام پر ہو رہا ہے جبکہ آپؐ فرما رہے ہیں کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بصیرت کی اساس پر دعوت دے رہا ہوں، میں بھی اور وہ بھی جو میرا تابع (تام) ہے، اسکے ساتھ فرماتے ہیں کہ اللہ کی ذات پاک ہے، میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں (وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ) ﴿یوسف:۱۰۸﴾ پس یہاں جس شرک سے براءت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ وہ عام شرک نہیں ہے بلکہ ایک خاص شرک ہے۔ چونکہ دعوت بصیرت (بینائی) کے بعد یہ جملہ کہا جارہا ہے تو لازماً معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس شرک سے براءت کا اظہار کیا جارہا ہے، جس کا تعلق بینائی سے ہے۔

عام لوگوں کے پاس دو کو ماننا شرک ہے لیکن خاص الخاص کے پاس دو کو دیکھنا شرک ہے، بالفاظ دیگر جس کو مقید بینائی حاصل ہو وہ بھی مشرک ہے، آنحضور ﷺ یہاں اس قسم کے شرک سے براءت ظاہر فرما رہے ہیں کہ مجھے جو دیدار نصیب ہوا ہے وہ مطلق ہے، اور آپ کے تابع تام حضرت مہدی موعودؑ نے ارشاد فرمایا "جو خدا کو مقید دیکھے وہ مشرک ہے" اور اس آیت کا بیان کرتے ہوئے، آپ نے فرمایا "ماہر دو از جملہ ء مشرکاں نئیم "یعنی ہم ہر دو یعنی محمد نبی ﷺ اور محمد مہدی مشرکوں میں سے نہیں ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح حضورؐ جس شرک سے بری تھے حضرت مہدیؑ بھی اس شرک سے محفوظ تھے، اسی طرح آپؑ اس ظلم سے بھی بری تھے، جس پر اطلاقِ شرک ہو سکتا تھا، اس لحاظ سے امامؑ کیلئے اللہ نے جو فرمایا تھا کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچیگا یعنی امام وہ ہو گا جو عادل ہو گا، پس وہ وعدہ حضورؐ کے بعد صرف مہدی موعودؑ پر ہی صادق آئے گا بلا شرکت غیرے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی امام سے متعلق دعا کا مصداق حضرت مہدی موعود علیہ السلام ہی ہیں۔

امّی

اس کے معنی ''ان پڑھ'' کے ہیں، یعنی وہ شخص جو کسی شخص کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو۔

حضور ﷺ کے تعلق سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ''النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ'' ﴿الأعراف:۱۵۷﴾ فرمایا ہے۔

اسکی جمع ''امیون'' و''امیئین'' ہے۔ یہ الفاظ قرآن شریف میں اس وقت کے مخاطبین کیلئے آئے ہیں۔

امی کا لفظ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اسطرح لایا ہے۔الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ۔۔الخ ﴿الأعراف:۱۵۷﴾ وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امّی ہے کہ جس کو پاتے ہیں، لکھا ہوا اپنے پاس توریت اور انجیل میں۔ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کیلئے رسول کے بعد نبی امی کے جو الفاظ آئے ہیں، مفسرین اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''أُمِّي'' یا تو ''أُم'' (بمعنی) کی طرف منسوب ہے یعنی جس طرح بچّہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور کسی کا شاگرد نہیں ہوتا، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ساری عمر کسی مخلوق کے سامنے زانوئے تلمذ (شاگردی) تہ نہیں کیا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ جن علوم و معارف اور حقائق و اسرار کا آپؐ نے افاضہ فرمایا، کسی مخلوق کا حاصلہ نہیں، پس ''نبی امی'' کا لقب اس حیثیت سے آپ کیلئے مایہ ٔصد افتخار ہے۔

یا امّی کی نسبت ''امّ القریٰ'' کی طرف ہو جو کہ مکہ معظمہ کا لقب ہے، جو آپؐ کے پیدائش کی جگہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کیلئے ''ام القریٰ'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔مُّصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴿الانعام۔۹۲﴾ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴿الشوریٰ۔۷﴾ ان دونوں آیتوں میں أُمَّ الْقُرَىٰ سے مکہ معظمہ ہی مراد ہے۔ کیونکہ 'أُمَّ الْقُرَىٰ' بستیوں کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں، مکہ معظمہ تمام عرب کا دینی اور دنیوی مرجع تھا۔ اور جغرافیائی حیثیت سے بھی قدیم دنیا کے وسط میں مرکز کی طرح واقع ہے۔ اور جدید دنیا (امریکہ) اس کے نیچے ہے اور روایات حدیثیہ کے موافق، پانی سے زمین بنائی گئی تو سب سے اول یہی جگہ کھلی تھی۔ ان وجوہ سے مکہ کو ''ام القریٰ'' فرمایا اور اس کے پاس (ومن حولھا) سے مراد یا تو عرب ہے کیوں کہ دنیا میں قرآن کے اول مخاطب وہ ہی تھے۔ ان کے ذریعہ سے باقی دنیا کو خطاب ہوا، یا سارا جہاں مراد ہو، جیسے فرمایا ''لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا'' ﴿الفرقان:۱﴾۔

اسی طرح سورہ شوریٰ میں بھی ''لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا'' سے مراد مکہ معظمہ اور اس کا آس پاس، اطراف و اکناف یا پورا جہاں ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں مکہ معظمہ میں ہی تمام عربوں کا اجتماع اس لئے ہوتا تھا کہ اللہ کا گھر وہیں ہے۔ اور

وہی گھر روئے زمین پر سب سے پہلی عبادت گاہ قرار پائی، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے اللہ نے زمین کو اسی جگہ سے پھیلانا شروع کیا، جہاں خانہ کعبہ واقع ہے۔

پس معلوم ہوا کہ "أُمَّ الْقُرىٰ" کی مناسبت سے حضور ﷺ کو "أُمِّي" کہا گیا ہے۔

اور یہ بات تو عرب کے عموماً اور مکّہ کے خصوصاً تمام لوگ جانتے تھے کہ حضور ﷺ نے عملاً کسی انسان سے کچھ نہیں پڑھا اور کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، اسکے باوجود آپؐ نے دنیا اور دین کی نہ صرف خبریں دیں بلکہ دنیا بھر کے سارے علوم، تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، سائنس، فلسفہ، منطق، اخلاق و کردار، تہذیب و تمدّن، عائلی، خاندانی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی مسائل کو باحسن وجوہ بیان فرمایا، پھر موت اور اسکے حالات، مابعد الموت کے واقعات، حشر، نشر، وزن اعمال، پل صراط، ثواب و عذاب، جنت و دوزخ کے تمام حالات و واقعات کو واشگاف انداز میں بیان فرمایا، تو سوال کرنے والے، یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اس کے باوجود بھی آپؐ کو "أُمِّي" کہا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ روایت بھی آئی ہے کہ حضور لکھنا بھی جانتے تھے۔ چنانچہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ۔

"و في حديث يرویٰ عن معاوية انه كان يكتب بين يديه ﷺ، فقال له "الق الدواة وحرف القلم واقم البآء وفرق السين ولا تعور الميم مع انه عليه السلام لم يكتب ولم يقرا من كتاب الاوّلين"۔ یعنی حضرت معاویہؓ سے حدیث مروی ہے کہ وہ حضور ﷺ کے سامنے لکھا کرتے تھے۔ پس حضورؐ نے ان کو فرمایا کہ "دوات کو اس طرح رکھو، قلم کو پھیرو، 'ب' کو سیدھا کرو، 'سین' میں فرق کرو اور 'میم' کو ٹیڑھا نہ کرو" باوجودیکہ حضور ﷺ نے نہ لکھنا سیکھا اور نہ اگلوں کی کتابوں کو پڑھا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس کے کئی جواب ہوسکتے ہیں۔ اور جواب بھی اس لئے دینا پڑ رہا ہے کہ قرآن میں جو آپؐ کو "نبی امّی" کہا گیا ہے، وہ "حق" ہے، اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اس کا انکار کفر ہے۔

(۱) قرآن میں جو آپؐ کو اللہ نے امّی کہا ہے وہ ظاہر ہے بلکہ اظہر من الشمس ہے، اور سارا عرب اس کا گواہ ہے۔

(۲) اگر آپؐ ایک آدھ سبق بھی کسی انسان سے لے لئے ہوتے اور بعد میں آپؐ قرآن یہ کہہ کر پیش کرتے کہ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوا ہے تو لوگ تنازعہ کھڑا کرتے کہ تم تو فلاں کے پاس پڑھنے کیلئے جاتے تھے۔ شاید اسی کی تعلیم کی وجہ سے اس کلام کو ہمارے سامنے کلام خدا کے نام سے پیش کر رہے ہو۔

(۳) جب آپؐ پر پہلی وحی آئی اور جبرئیلؑ نے فرمایا ''اقرأ'' پڑھ، تو آپؐ نے جواب دیا ''مَا أنَا بقَارِی'' میں پڑھنے والا یعنی پڑھا لکھا نہیں ہوں، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ میں نے آج تک کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا۔

(۴) جب صلح حدیبیہ لکھا جانے لگا تو حضور ﷺ نے صلح نامہ لکھنے کیلئے حضرت علی کرم اللہ وجھہ کو بلایا اور ابتداء میں یہ الفاظ لکھوائے کہ یہ وہ معاہدہ ہے جو ''محمد رسول اللہ (ﷺ) اور۔۔۔۔۔کے مابین طے پایا ہے۔ تو مشرکین کی جانب سے مقرر کیا ہوا 'کمشنر معاہدہ' نے اعتراض کرتے ہوئے کہا 'محمد کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اگر آپ کو محمد رسول اللہ مانتے ہوتے تو بات ہی ختم تھی۔ اصل بات تو یہی ہے کہ ہم محمد کو رسول اللہ نہیں مانتے، محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبد اللہ لکھو تو معاہدہ ہو سکتا ہے۔ اور میں اس پر طرف ثانی کی حیثیت سے دستخط کر سکتا ہوں، مسلمانوں کی طرف سے اسکی سخت مخالفت ہوئی اور بات لڑائی جھگڑے تک آگئی، حضور ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجھہ کو بلایا اور کہا کہ 'محمد' کے بعد رسول اللہ کے لفظ کو کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ یا رسول اللہؐ میں جس بات کو حق سمجھتا ہوں اور میں آپ کو رسول اللہ مان کر ایمان لایا ہوں جو حق ہے اس کو میں اپنے قلم سے کس طرح کاٹ سکتا ہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، اسپر آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، علی۔ تم مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں رسول اللہ لکھا ہوا ہے۔ آپ نے اسکو کاٹ دیا اور پھر اس جگہ پر ابن عبد اللہ لکھوایا، اگر حضور پڑھنا اور لکھنا جانتے ہوتے تو یہ جھنجھٹ ہی پیدا نہ ہوتی۔

اصل بات بس اتنی ہے کہ بظاہر رسول اللہ ﷺ نے کسی انسان سے نہ کچھ پڑھا اور نہ کسی سے لکھنا سیکھا۔ اسی کو اللہ 'امّی' کے نام سے یاد کر رہا ہے، لیکن بہ باطن یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ آپ ﷺ کو اس ہستی نے پڑھایا جو علیم وخبیر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ الرحمان میں خود فرمارہا ہے الرَّحْمَـــنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ۔ رحمان نے قرآن سکھایا، یا قرآن کی تعلیم دی۔ گویا یہاں بھی وہی حقیقت سامنے آرہی ہے کہ حضور ﷺ کو تعلیم اللہ نے دی، کسی انسان نے نہیں دی۔

پھر دوسری جگہ اللہ نے اس حقیقت کو یہ کہہ کر اور موکد فرمادیا۔ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَـكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَـــاءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴿شوریٰ:۵۲﴾ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب (اللہ) کیا ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴿بروج:۲۲،۲۱﴾ ترجمہ: بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی شان والا قرآن ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

پس جب آنحضرت ﷺ کی نظر لوح محفوظ پر پڑتی تھی تو حضورؐ ان الفاظ کے نقوش بھی دیکھ لیتے تھے اور جب معاویہؓ جو کاتب وحی تھے، حضورؐ سے وحی سن کر قرآن لکھتے تھے تو وہ قرآن شریف کے الفاظ سن کر جن نقوش کے ساتھ قرآن کے الفاظ لکھتے تھے تو آنحضرت ﷺ کی نظر پڑتی تھی، تو حضورؐ کو عرش پر لکھے ہوئے قرآنی الفاظ کے نقوش میں اور حضرت معاویہؓ کے لکھے ہوئے الفاظ کے نقوش میں جو فرق نظر آتا تو آپؐ ان کو بتلادیا کرتے تھے کہ حروف کے نقوش کیسے ہونے چاہئیں۔ غالباً یہ "بِسْمِ اللَّـهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ" کی بات ہے اس لئے کہ ویسے عام طور پر "ب" پڑا ہوا ہوتا ہے، لیکن بسم میں جو 'ب' ہے وہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح 'س' اور 'میم' کا بھی معاملہ ہے سین میں دندانے ہوں اور 'م' کو ٹیڑھا مت کرو۔ جیسا آپؐ نے دیکھا تھا، اسی طرح بتلادیا، اسکے علاوہ ایک اور آیت میں بھی اللہ نے آنحضرت ﷺ کو اسی حیثیت سے پیش فرمایا ہے کہ نہ آپؐ پڑھنا جانتے ہیں اور نہ لکھنا، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴿عنکبوت:۴۸﴾ اور آپ اس سے پہلے کوئی کتاب پڑھتے نہیں تھے۔ اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے ضرور شک کرتے۔

خلاصہ یہ کہ، آپ ﷺ امّی تھے، نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا یعنی کسی شخص سے لکھنا، پڑھنا نہیں سیکھا۔ آپؐ کو امّی بنانے میں بڑی مصلحت یہی تھی کہ یہ کافر آپ کے تعلق سے شبہ میں گرفتار نہ ہوجائیں، نزول قرآن سے قبل آپ کی عمر کے چالیس سال ان ہی مکہ والوں میں گذرے، سب جانتے ہیں کہ اس مدت میں نہ آپؐ کسی استاد کے پاس بیٹھے، نہ کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی ہاتھ میں قلم پکڑا۔ ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کو شبہ نکالنے کی جگہ ہوتی کہ شاید اگلی کتابیں پڑھ کر یہ باتیں نوٹ کرلی ہوں گی، ان ہی کو اب آہستہ آہستہ اپنی عبارت میں ڈھال کر سنادیتے ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا بھی غلط ہوتا، کیوں کہ کوئی پڑھا لکھا انسان بلکہ دنیا کے تمام پڑھے لکھے آدمی مل کر بھی ایسی بے نظیر کتاب تیار نہیں کرسکتے۔ تاہم جھوٹوں کو ایک بات بنانے کو موقع ہاتھ لگ جاتا، لیکن جب آپ ﷺ کا امّی ہونا مسلّمات سے ہے تو اس میں سرسری شبہ کی بھی جڑ کٹ گئی، یوں کہنے کو تو دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے، ایک آدھ بات ایسی بھی کر بیٹھتے ہیں، لیکن زندہ حقائق کی موجودگی میں وہ بات کوئی وزن نہیں رکھتی۔

خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کا امّی ہونا یعنی کسی سے پڑھنا لکھنا نہ سیکھنا حقیقت ہے اور اسی وجہ سے آپ ﷺ کو امّی کہا جارہا ہے۔ دوسری طرف عالم الغیب والشھادۃ کی جانب سے تعلیم کی بناء پر آپ ﷺ "ما کان و ما یکون" سے پوری طرح با خبر تھے۔ اس سے بھی کسی کو انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس بزم کائنات کا دستور ہے یہی اللہ صدر اور نظامت رسول کی

ایصال ثواب

اس کو عرف عام میں ''فاتحہ'' کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امام مہدی موعود علیہ السلام، آپؑ کے خلفاء، صحابہ کرام اور اولیاء اللہ، اپنے مرشدین ماں باپ اور عزیز و اقارب کی ارواح کو اپنے کسی نیک عمل، یا نقد یا جنس یا کھانے یا کپڑے کی صورت میں پہنچانا ایک بہت بڑی خیر و برکت اور فضیلت کی بات ہے اس سے ان کی ارواح متوجہ ہوتی ہیں اور ان کے فیوض و برکات نصیب ہوتے ہیں۔ اور یہ ہمارے ماں باپ، مرشدین اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر حق ہے (آئینہ سلوک۔۶۹)

اسی طرح چوتھا دسواں، بیسواں اور چہلم کے مواقع پر میت کے لئے جنس، نقد یا کھانا کپڑا دیا جاتا ہے اس کا مقصد بھی ایصال ثواب ہے اس سے میت کو نفع ہوتا ہے اس کی مغفرت ہوتی ہے اور اس کے عذاب میں کمی ہوتی ہے۔

شریعت میں ایصال ثواب جائز ہے، چاہے نقد رقم دی جائے یا کھانا کھلایا جائے یا کپڑے دے جائیں اس سے نہ صرف میت کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ان کے عذاب میں تخفیف بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ پٹن شریف میں مہدی موعود علیہ السلام تشریف فرما ہوئے تو ملک نجنؓ نے مہدی علیہ السلام کی تصدیق سے مشرف ہونے کے بعد اپنے گھر آپؑ کو دعوت دی۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ یہ دعوت کس سلسلے میں ہے۔ ملک نجنؓ نے جواب دیا کہ آج میری بیوی کا فاتحہ (عرس) ہے۔ مھدی موعودؑ نے فرمایا جب تک کوئی فقیر ایسا کھانا کھاتا ہے۔ مرحوم کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے تعلق سے جو کھانا ایصال ثواب کی غرض سے پکایا جاتا ہے وہ فقیروں اور محتاجوں کو کھلانا چاہیئے نہ کے مالداروں اور برادری والوں کو (اگر وہ غنی ہوں)۔ مگر یاد رہے کہ یہ سب ایصال ثواب کی غرض سے ہونا چاہیئے۔ اور اپنی وسعت اور طاقت کے لحاظ سے۔ صرف نام و نمود کے لئے یا برادری میں نام پیدا کرنے اور ان کے لعن و طعن سے بچنے کے لئے نہ ہو۔ اپنی طاقت سے زیادہ قرض وام لے کر، کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ میت کے گھر میں تین دن تو سوگ کے ہوتے ہیں۔ چوتھا اس لئے کیا جاتا ہے۔ تا کہ اس بات کا اعلان ہو جائے کہ سوگ کے دن ختم ہو گئے، پھر ایصال ثواب کی غرض سے کھانا کھلایا جاتا ہے۔ باہر سے جو لوگ آتے ہیں وہ چوتھے تک رہتے ہیں۔ اور سوگ میں شریک ہو کر اہل میت کی دلجوئی کرتے ہیں جس سے ان کا غم ہلکا ہوتا ہے۔ پھر اس کے دگنے دن یعنی آٹھویں کے بجائے دسویں دن پھر اس کے دگنے دن یا بیں دن کو پھر اس کے دگنے دن چالیس دن کو ایصال ثواب کرتے ہیں۔ یعنی میت کی زیارت کرنا پھر قرآن خوانی کرنا اور میت کی روح کو اس کا ثواب بخشنا اور کھانا کھلا کر اس کا ثواب بخشنا ہے اس کے دگنے دن یعنی اسی (۸۰) دن کے بجائے نود دن یعنی سہ ماہی پھر اس کے تین مہینے بعد ششماہی پھر نو

ماہی پھر برسی پھر اس کے بعد ہر سال بعد برسی (عرس) کیا جاتا ہے۔ اس دوران ہر جمعرات کو میت کی زیارت کی جاتی ہے۔ تاکہ موت سے غفلت نہ ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اکثروا ذکر هازم اللذات" یعنی لذتوں کو توڑنے والی چیز (موت) کو کثرت سے یاد کرو۔ ویسے گھر بیٹھ کر بھی موت کو یاد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قبرستان جانے سے موت کی یاد اور انسانی زندگی کی فنا کی جو کیفیت نظروں کے سامنے آتی ہے۔ وہ عبرت انگیز ہوتی ہے۔ دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ اور دنیا کی بے ثباتی کا عملی نقش آنکھوں کو دکھاتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ایصال ثواب کی اصل کیا ہے؟ تو اس کا جواب قرآن شریف کی آیت۔ "إِنَّ اللَّـهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا" ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر صلوات بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی نبیؐ پر صلواۃ بھیجو اور کثرت سے سلام بھیجو۔ یہ حکم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حد تک نہیں تھا۔ اور صرف صحابہ کرام کی حد تک بھی نہیں تھا۔ بلکہ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد قیامت تک آنے والے ایمان والوں کے لئے ہے۔ صلواۃ و سلام بھیجنے کا مقصد یہی ہے۔ کہ اللہ آپ کے درجات میں اور بلندی عطا فرمائے۔ گویا یہ اللہ سے دعا ہے۔ اسی طرح اللہ نے آنحضرتؐ سے فرمایا۔ "وَاسْتَغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِينَ" یعنی آپؐ مومنین کے لئے اللہ سے مغفرت کی دعا کیجئے۔ نیز دعائے ماثورہ میں (نماز میں) اللهم اغفر للمومنين و المومنات کے بعد الاحياء منهم و الاموات کہتے ہیں۔ یعنی اے اللہ مومنین کو مومنات کو ان میں جو زندہ ہیں ان کو اور جو وفات پا چکے ہیں ان کو بخش دے۔ اسی طرح کوئی بھی نیک کام کریں چاہے وہ بدنی ہو یا مالی اس کا ثواب تو کرنے والے کو ملتا ہے۔ اب اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اس کا ثواب تو فلاں مرحوم کی روح کو بخش دے۔ البتہ اس میں فرق درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی انبیاء کے لئے صلواۃ و سلام بزرگوں کے لئے نزول رحمت اور عام مومنین کے لئے مغفرت و بخشش کی دعاء۔

خلاصہ یہ کہ ایصال ثواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہدی موعود علیہ السلام کے ارواح مبارکہ اور اپنے عزیز و اقارب ماں باپ اور مرشدین سلسلہ کی ارواح کو نقد جنس یا کھانا کپڑے یا حج بدل کی صورت میں پہنچانا بہت بڑی خیر و برکت اور فضیلت کی بات ہے۔ اس سے ان کی ارواح متوجہ ہوتی ہیں ان کے فیوض و برکات نصیب ہوتے ہیں۔ اور یہ ہمارے ماں باپ مرشدین۔ اساتذہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر حق ہے۔

لیکن اس کے لئے چند باتوں کا لحاظ کرنا چاہئے۔ یعنی نیت صرف میت کے ایصال ثواب کی ہو، فقراء کو اور حاجتمندوں کو کھلانا چاہئے۔ جو کچھ کھلایا جارہا ہے وہ حلال مال سے ہو۔ اور کھلانے میں خلوص ہو۔ رسم کا اتباع اور تفاخر ریاکاری مقصود نہ ہو اور

اس میں اسراف بھی نہ ہو اور جہاں تک ہو سکے اغنیاء کو اس میں شریک نہ کرے۔ ایصال ثواب اگر چند لوگوں کو مشترکہ طور پر کیا جائے تو اس کا ثواب سب کو برابر ہی ملے گا۔ ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ جلائے جاتے ہیں مگر پہلے چراغ کی روشنی میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ (مجالس مفتی محمد)

ایمان

حضرت مہدیؑ نے فرمایا۔ ایمان ذاتِ خدا است۔

مومن: مرد خدا بین کو مومن حقیقی کہتے ہیں۔ اور ایسے طالب دیدار خدا کو جس میں طلب کی صفات پائے جانے سے طالب صادق کے درجے کو پہنچ گیا ہے مومن حکمی کہتے ہیں۔

ایمان: حدیث جبریلؑ

أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ من اللّٰهِ۔۔ الخ۔

اسلام اور ایمان میں فرق۔ بعض کہتے ہیں کہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دونوں الگ الگ ہیں۔ اور ہر ایک طبقہ آیت قرآنی سے استدلال کرتا ہے۔

خطابی کہتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ کلام کو مقید کیا جائے، اس طرح کہ مسلم کبھی مومن ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اختلاف نفلی ہے اگر اسلام سے مراد صرف ظاہری انقیاد ہے جس کو انقیاد باطنی اور اذعان قلبی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ تو اسلام ایمان کے مفہوم کے مخالف ہوتا ہے۔ لیکن اسلام سے مراد ظاہری انقیاد ہے جس پر باطنی انقیاد اور تسلیم قلبی کی مہر لگی ہوئی ہو تو پھر اسلام اور ایمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ دونوں متحد ہوں گے۔ (ص:۳۲۔ غایة المواعظ، ومصباح)

ایمان کا بڑھنا گھٹنا: امام ابو حنیفہؒ، آپؐ کے اصحاب، امام الحرمین۔ کے پاس۔ الایمان لا یزید ولا ینقص۔

استدلال: متی قبل الزیادة کان شکا و کفراً۔ امام شافعی، ابن حنبل، مالک بن انس، سفیان ثوری، صحابہ کی کثیر جماعت یزید بزیادة الطاعات و ینقص بنقصانہا للقطع بان ایمان آحاد الامة لیس کایمان ابی بکر الصدیق و نحوہ من الصحابة۔

یزید(ایمان بڑھتا ہے)اسکی دلیل: لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ ﴿الفتح:۴﴾، قوله أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَـٰذِهِ إِيمَانًا ﴿التوبة:۱۲۴﴾۔ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ﴿الأحزاب:۲۲﴾۔ماروواه ابن عمر رضی الله عنه قلنا یا رسول الله أَنَّ الإِيمَانَ يَزِيدُ وَ يَنْقُصُ، قال نعم، يَزِيدُ حتی یدخل صاحبه الجنة و يَنْقُصُ حتیٰ یدخل صاحبه النار۔

قال فی الشیبانیة - و ایماننا قول و فعل ونية - یزداد بالتقویٰ و ینقص بالردی۔

و قال الخطابی:الایمان قول، وهو لا یزید و لا ینقص و عمل و هو یزید و ینقص و اعتقاد و هو یزید و لا ینقص

و قال سفیان بن عینیة:الایمان قول و فعل و یزید و ینقص، فقال اخوه ابراهیم لا تقل ینقص، فغضبت و قال اسکت یا صبی بل ینقص حتی لا یبقیٰ منه شئ

والد لیل علی نقصانه، ان کل ما قبل الزیادة لا بدوان یکون قابلاً للنقصان ضرورة

ایوب علیہ السلام

قرآن شریف میں ایوب علیہ السلام کا ذکر چار مقامات پر آیا ہے۔

ایک سورۂ نساء میں آیت نمبر ۱۶۳ میں پیغمبروں کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح سورۂ انعام میں آیت نمبر ۸۶ میں بھی پیغمبروں کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ (۳) البتہ سورہ انبیاء میں ایوبؑ کا ذکر مستقل طور پر ہوا ہے۔ ارشاد ہے وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِن ضُرٍّ۔۔۔﴿انبیاء ۸۳، ۸۴﴾۔ اور ایوب کو بھی یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے تو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو جو تکلیف تھی وہ دور کر دی اور ان کو ان کا کنبہ دے دیا اور اتنے ہی ان کے ساتھ اور بخشے۔ اپنی رحمت کے سبب اور عبادت گذاروں کیلئے نصیحت کی غرض سے واقعہ یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ ہر طرح خوشحال اور فارغ البال تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مسکین نے آپ سے درخواست کی کہ اس سے ظلم کو دفع کریں۔ مگر آپ نے اسکی مدد نہیں کی پس اللہ نے آپ کو آزمائش میں مبتلا کر دیا مال مویشی سب مر گئے۔ سب اولاد ایک ساتھ دب کر مر گئی اور خود ان کو طرح طرح کی بیماریاں لگ گئیں۔ آنکھ، منہ اور زبان کے سوا سارے جسم میں کیڑے دوڑتے پھرتے تھے۔ اور کوئی آپ کے پاس نہیں آتا تھا۔ بیوی آپ کی خدمت کرتی تھی۔ آپ بیت المقدس کے کچرا ڈالنے کی جگہ پڑے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ شیطان نے ان کی بیوی سے کہا میں زمین کا اللہ ہوں اگر تو مجھے سجدہ کرے تو سب اچھا ہو جائے گا۔ بیوی نے ایوبؑ سے بات کی۔ آپ غصہ ہو گئے اسکو ہانک دیا۔ اور کہا آج سے تیرے ہاتھ کا کھانا اور پانی میرے لئے حرام ہے۔ ایک مرتبہ نماز کو اُٹھنے کی کوشش کی اُٹھ نہ سکے تو دعا کی اے اللہ مجھے تکلیف ہے اور تو رحم کرنے والا ہے اللہ نے کہا زمین پر پاؤں مار معاً چشمہ نکلا۔ آپ نے غسل کیا ساری بیماری دور ہو گئی اور سب چیزیں واپس مل گئیں۔ آپ کے ۲۶ بچے پیدا ہوئے۔

(۴) اللہ نے آپ کا ذکر سورۂ ص میں اسطرح فرمایا ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴿ص، ۴۱، ۴۲، ۴۳﴾۔ ترجمہ: اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھکو رنج و آزار پہنچایا ہے تو ہم نے کہا زمین پر لات مار وہ نہانے کا ٹھنڈا اور پینے کا شیریں پانی نکل آیا اور ہم نے ان کو ان کا کنبہ (واپس) دیا اور اس کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دئے اپنی رحمت سے اور عقل والوں کیلئے نصیحت کی غرض سے۔ یہ آداب گفتگو ہیں کہ اگر کوئی فائدہ یا نفع پہنچے تو اسکی نسبت اللہ کی طرف کریں اور اگر کوئی تکلیف، نقصان، بیماری یا آزار پہنچے تو اسکی نسبت شیطان کی

طرف کریں حالانکہ کرنے والا تو اللہ ہی ہے اسی طرح یہاں بھی ایوبؑ نے اپنی بیماری اور تکلیف کی نسبت شیطان کی طرف فرمائی۔ پھر جب آپ نے اللہ سے دعا فرمائی تو اللہ نے حکم دیا کہ زمین پر لات مارو پانی کا چشمہ نکل آیا آپ اس میں نہائے اور اس کا پانی پیئے۔ تمام آزار دور ہو گئے۔ پھر سارا کنبہ بھی بخشا گیا اور مواشی، مال وغیرہ بھی اس سے کہیں زیادہ نصیب ہوا جو تلف ہو چکا تھا پھر حکم ہوا کہ ایک ایسی جھاڑو لو جس میں سو (۱۰۰) شاخیں ہوں اس سے اپنی بیوی کو ایک مار اس طرح مارو کہ اس کے جسم کے ہر حصے کو وہ شاخیں لگ جائیں تو تمہاری قسم پوری ہو جائے گی۔ اس طرح تم اپنی قسم پوری کر وہاں قسم کو کھانے کے بعد توڑنا مت۔ ہوا یہ تھا کہ ایوبؑ نے ایک مرتبہ قسم کھائی تھی کہ اپنی بیوی کو سو کوڑے ماریں گے۔ اس لئے قسم کو پورا کرنے کا یہ طریقہ بتلایا گیا۔

بینتہ

بینتہ کے معنی روشن دلیل کے ہیں۔ یہ معجزوں کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کا تعلق اللہ کے فرستادوں۔ پیغمبروں اور خلیفوں سے ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن شریف میں بینتہ کا لفظ (۱۹) مقامات پر آیا ہے۔

(۱) سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ﴿البقرہ:۲۱۱﴾ آپ بنی اسرائیل سے پوچھئے کہ ہم نے ان کے پاس کتنی روشن دلیلیں دیں۔

(۲) قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ﴿انعام:۵۷﴾ کہدے (اے رسول) کہ میں اپنے پروردگار کی جانب سے روشن دلیل پر ہوں اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس کو جھٹلاتے ہو۔

(۳) فَقَدْ جَاءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ۔﴿انعام:۱۵۷﴾ تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس روشن دلیل بھی آئی اور ہدایت بھی اور رحمت بھی۔

(۴) قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ هَـٰذِهِ نَاقَةُ اللَّـهِ لَكُمْ آيَةً﴿اعراف:۷۳﴾ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے روشن دلیل آچکی۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے (روشن دلیل) ہے۔

(۵) قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ﴿اعراف:۸۵﴾ تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس روشن دلیل آچکی ہے پس تم ماپ اور تول پورا پورا کرو۔

(۶) قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿اعراف:۱۰۵﴾ میں تمہارے پاس تمہاری رب کے جانب سے روشن دلیل لا چکا ہوں پس (اے فرعون) تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔

(۷) لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ ﴿انفال:۴۲﴾ تاکہ جو مرے وہ قیام حجت (بصیرت) پر مرے۔

(۸) وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ﴿انفال:۴۲﴾ اور جو زندہ رہے وہ قیام حجت کے بعد زندہ رہے، اور اللہ البتہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

(۹) أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ ﴿هود:۱۷﴾ بھلا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی جانب سے روشن دلیل پر ہو اور اس کی جانب سے ایک گواہ اس کا حامی ہو۔

(۱۰) أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي﴿هود:۲۸﴾ دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں۔

(۱۱) قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ ﴿ھود:۵۳﴾ انہوں نے کہا اے ہود تم نے ہمارے سامنے کوئی روشن دلیل تو پیش نہیں کی اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

(۱۲) قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ﴿ھود:۸۸﴾ اے میری قوم دیکھو اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے بہترین روزی عطا فرمائی۔

(۱۳) أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿طٰہٰ:۱۳۳﴾ کیا ان کے پاس اگلے کتابوں میں روشن دلیل نہیں آئی۔

(۱۴) وَلَقَد تَّرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿عنکبوت:۳۵﴾ اور ہم نے اس بستی کے ظاہر نشان رکھ چھوڑے ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے۔

(۱۵) قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً ﴿ھود:۶۳﴾ اے میری قوم، بھلا دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت (نبوت) بخشی ہے۔

(۱۶) أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ﴿فاطر:۴۰﴾ یا ہم نے ان کو کتاب دی ہے کہ وہ اس کی کسی روشن دلیل پر ہیں۔

(۱۷) أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ ﴿محمد:۱۴﴾ بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی جانب سے روشن دلیل پر ہو وہ ان کی طرح ہو سکتا ہے جن کے اعمال بد ان کو اچھے معلوم ہوتے ہوں۔

(۱۸) لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿بینتہ:۱﴾ جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر تھے وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے جب تک کہ ان کے پاس بینہ (روشن دلیل) نہیں آجاتا۔

(۱۹) وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿البینہ:۴﴾ اور اہل کتاب جو متفرق ہوئے ہیں تو بینہ (روشن دلیل) کے ان کے پاس آجانے کے بعد ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں بینتہ کی جمع "بینات" کا لفظ بھی قرآن شریف میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ جیسے وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ ﴿البقرہ:۸۷﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ﴿البقرہ:۹۲﴾

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بینتہ قرآن کی ایک خاص اصطلاح ہے جسے اللہ نے ان روشن اور واضح دلیلوں کے لئے استعمال فرمایا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو اور خلیفوں کو خلافت اور پیغمبری کے ثبوت کے طور پر عطا فرمائے ہیں۔

اس کی تفسیر خازن میں اس طرح کی گئی ہے۔ اني على بصيرة من ربي۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کے معنی "اني على يقين من ربي" کے کئے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی یقین کا اعلیٰ مرتبہ جو عین الیقین کہا جاتا ہے مراد لے سکتے ہیں جو بصیرت کا ہم معنی ہے۔ یہ وہ دلالت ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔

لیکن بعض لوگوں نے یہ نہ سمجھا اور یہ لکھ دیا کہ اس کے معنی فطری اور عقلی شہادت کے ہیں اور یہ ہر شخص میں پہلے سے موجود ہے۔ گویا ایک کافر کے پاس بھی یہ شہادت اس کے اندر موجود ہے اور باہر بھی۔ یہ ترجمہ کس قدر غلط اور ایسی تفسیر کس قدر غلط اور حقیقت سے دور ہے محتاج بیان نہیں۔

نیز یہ معلوم ہوا کہ آیات، بینہ، بینات یہ تو پیغمبروں اور اللہ کے خلیفوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور یہ دلائل ان کو پیغمبری ملنے کے بعد دیئے جاتے ہیں یا پیغمبری کے ساتھ دیئے جاتے ہیں۔ ایک عام آدمی اور ایک کافر کو "بینتہ" کس طرح مل سکتا ہے، اگر اس کو بینہ مل گیا تو پیغمبر کے یہ کہنے میں کیا خصوصیت ہے کہ میں بینہ پر ہوں اگر کسی کو اصرار ہے کہ بینہ کے معنی شہادت کے ہو سکتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ اگر شہادت سے مراد عینی شہادت Eye witness کے ہیں تو پھر صحیح ہے۔ تو پھر سوال ہو گا کہ کیا ایک عام آدمی اور کافر کو وہ عینی شہادت نصیب ہے جو صرف پیغمبروں اور اللہ کے خلیفوں کا حصہ ہے۔

آیات و بینات کی تشریح کے سلسلے میں حضرت استاذی علامہ ابو سعید سید محمود تشریف اللٰہی نے لکھا ہے۔

"قرآن مجید میں آیات و بینات کا استعمال ان ہی امور میں ہوا ہے جو قدرت بشری سے خارج ہوں عام ازیں کہ وہ امور انبیاء سے متعلق اور ان کی نبوت یا خاص قدرت الٰہی پر دال ہوں۔ ان دونوں قسموں پر آیات و بینات کا اطلاق فرمایا ہے کیوں کہ دونوں صورتوں میں آیات و بینات کا صدور خاص قدرت الٰہی سے متعلق ہے۔ اسی لئے آیات و بینات کا انکار قدرت الٰہیہ کے انکار کو مستلزم ہے۔ البتہ قرآن مجید میں ایک مقام ایسا ہے جہاں بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ "بینہ" کا لفظ عام مومنین کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ وہ فی الحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔ یہ آیت جنگ بدر سے متعلق ہے۔ اس جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو فتح حاصل ہوئی وہ غیبی امداد کی اہم مظہر ہے۔ اسی لحاظ سے یہ خوشخبری دی جا رہی ہے کہ اس جنگ میں جو شہید ہوا وہ بینہ پر شہید ہوا اور جو زندہ رہا وہ بینہ پر زندہ رہا" (نقلیات میاں عبد الرشید)

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ انبیاء اور اللہ کے خلیفوں نے جب اپنی دلیل پیش فرمائی تو "عَلَىٰ بَيِّنَةٍ" کے الفاظ استعمال فرمائے چنانچہ کئی پیغمبروں نے "إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي" فرمایا۔ اسی طرح اللہ نے حضرت مہدی علیہ السلام کے حق میں بشارت دی تو اس نے فرمایا "أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ" گو حضرت مہدی علیہ السلام پیغمبر نہیں ہیں لیکن اللہ کے خلیفے ضرور

ہیں۔اس لئے آپ کے لئے بھی عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ کے الفاظ لائے گئے ہیں اور اس پیغمبر یا اس خلیفے کے ساتھ والے مومنین کا جب ذکر ہوا ہے تو "عَن بَيِّنَةٍ" کہا گیا۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں جو ہلاک ہوئے یا جو زندہ رہے ان کے لئے لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ کے الفاظ آئے ہیں یعنی ان کا مرنا (شہید ہونا) اور جینا، بینتہ کی طرف سے تھا۔

اسی طرح غزوۂ بدر ولایت میں جو حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہداء رضی اللہ عنہ سے بحیثیت "بدل مہدی" خلیفتہ اللہ ظہور پذیر ہوا حضرت مہدی علیہ السلام نے "لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ" پڑھ کر فرمایا کہ اے سید خوندمیر یہ تمہاری شان میں ہے۔ چونکہ یہ جنگ دراصل مہدی علیہ السلام کی تھی لیکن اس حکمت الٰہی کے پیش نظر کہ خاتمین پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے حکم سے حضرت مہدی علیہ السلام نے اس جنگ (قَاتَلُوا وَقُتِلُوا کی صفت) کو بندگی میاں رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا تو اس غزوہ کی اصل شان بتانے کے لئے مہدی علیہ السلام نے درج بالا آیت بندگی میاں کی شان میں فرمائی۔ چونکہ آپ مہدی کا بدل تھے اس لئے یہاں "عَلَىٰ بَيِّنَةٍ" کے بجائے "عَن بَيِّنَةٍ" کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

پس آیت أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۔الخ۔ میں حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ اس آیت میں 'مَن' سے مراد بندہ کی ذات ہے۔

چونکہ اس سے پہلے ہی آیت میں اللہ نے ان لوگوں کا ذکر کیا جو نیک عمل بھی غیر اللہ کے لئے یعنی دینوی زندگی کی محبت اور دنیوی زینتوں کی چاہت کے لئے کرتے تھے۔ اللہ اس آیت میں ان کے مقابلے میں ایک ایسی ہستی کا ذکر کر رہا ہے جس کا ہر فعل، قول اور حال اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں وقف ہے۔ فقط نیک اعمال کا کیا ذکر۔ اس کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، لینا دینا اللہ ہی کے لئے ہو۔ بلکہ جو سنتا ہو وہ حق سے سنتا ہو۔ جو دیکھتا ہو وہ حق سے دیکھتا ہو جو بولتا ہو وہ حق سے بولتا ہو اور حق ہی بولتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ کیا وہ لوگ جن کا اوپر ذکر ہوا اس شخص کے برابر ہو جائیں گے جو اللہ کی جانب سے بینہ پر ہو۔ مطلب یہ کہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اس آیت پر رسالہ مکتوب ملتانی میں حضرت مولانا سید محمود صاحب مولوی فاضل اہل دائرہ نو نے معرکتہ الآراء بحث کی ہے اس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں چار الفاظ پر بحث کی ہے۔ (ا) مَن (ب) بَيِّنَةٍ (ج) يَتْلُو (د) شَاهِدٌ۔ مَن کے بارے میں ویسے بہت سے اقوال ہیں جن میں "مَن" کو اکثر عام قرار دیا گیا ہے البتہ ایک تفسیر میں مَن کو

خاص قرار دے کر اس کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا گیا ہے۔اوراس کی دلیل عَلَىٰ بَيِّنَـةٍ سے دی ہے۔حضرت امامنامہدی علیہ السلام نے اس آیت کے تعلق سے بیان کرتے وقت فرمایا:

"از حق تعالیٰ بے واسطہ شنوم کہ ایں آیت در حق تست و مراد از مَن کہ در آیت أَفَمَن كَـانَ مذکور است ذات تست، و مراد از بَيِّنَةٍ ولایت مصطفی است، قولا و فعلا و حالا نکہ تعبیر است از ولایت محمدی دارد کہ ولایت خاص است ز ذات مصطفی است و مراد از شَاهِدٌ قرآن است و مشار الیہ از أُولَـئِكَ اتباع امم و مراد از ضمیر 'بِهِ' ذات مہدیست و مراد از ضمیر "بِهِ" دیگر نیز ذات مہدی علیہ السلام است۔

حضرت مہدیؑ نے اپنی مہدیت کے ثبوت میں یہ آیت پڑھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے بینہ پر ہو اور اس کے پیچھے اس کی طرف سے گواہ (قرآن) ہو اور اس کے پہلے کی کتاب موسیٰ (توریت) جو امام اور رحمت ہے (وہ بھی اس کی) گواہ ہو، کیا وہ اور طالب حیات دنیا دونوں برابر ہو جائیں گے۔وہ لوگ (جو اس وقت مختلف جماعتوں میں بٹے ہوئے ہوں گے اس پر ایمان لائیں گے) اور ان جماعتوں میں کا جو شخص اس سے کفر کرے گا پس اس کی وعدہ گاہ جہنم ہے۔پس اے محمد تو اس کے متعلق شبہ میں نہ رہ، بلاشبہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے۔لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

اور أَفَمَن كَانَ میں جو "مَن" مذکور ہے اس سے مراد تیری ذات ہے اور بینہ سے مراد حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت کی اتباع ہے، قولاً و فعلاً و حالاً۔اور ولایت محمدیہ سے مراد وہی خاص ولایت ہے جو حضرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے مخصوص ہے۔اور شَـاهِدٌ سے مراد قرآن ہے اور ایک روایت میں قرآن اور توریت ہے اور أُولَـــئِكَ کا مشار الیہ اتباع کرنے والی امتیں ہیں۔اور پہلی ضمیر بِـهِ سے مراد مہدی کی ذات ہے۔اور دوسری ضمیر "بِـهِ" سے بھی مہدی کی ذات ہی مراد ہے۔حضرت مہدی علیہ السلام کے اس بیان کے بعد اب ہمیں دیگر تفسیروں میں جو مصداق الفاظ مذکورہ بیان کئے گئے ہیں ان پر توجہ دینے کی چنداں ضرورت ہی نہیں رہتی۔اس لئے کہ حضرت مہدی علیہ السلام خلیفتہ اللہ ہیں۔معصوم عن الخطا ہیں مامور من اللہ ہیں۔مفترض الطاعۃ ہیں اور بیان قرآن آپ کا منصب ہے اس بیان کے مقابلے میں جو تفسیریں ہوں گی وہ غیر صحیح سمجھی جائیں گی۔کیوں کہ وہ قیاس پر مبنی ہوں گی۔

بیان قرآن

حضرت مہدی موعود علیہ السلام کا ایک اہم منصب قرآن کا بیان بھی تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" ﴿القیامۃ:۱۹﴾ یعنی پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔ یعنی مہدی علیہ السلام کی زبان سے۔ فرمایا حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے کہ تحقیق ہمارے ذمہ ہے اگر کہا جائے کہ یہ قول کیسے درست ہو سکتا ہے کہ قرآن کی تنزیل نبیؐ کے ساتھ خاص ہے اور بیان کی تنزیل مہدی موعود کے ساتھ خاص ہے تو کہا جائے گا کہ یہ بات خاص و عام کو معلوم ہے کہ اللہ نے قرآن کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے حسب ضرورت نازل فرمایا۔ اور اس کو جمع کرنے اور پڑھنے اور اس کے معانی بیان کرنے کو اپنی جانب منسوب فرمایا چنانچہ اللہ کے قول میں ہے کہ "إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" تحقیق ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان (نبی کے بعد)۔

اللہ نے فرمایا "إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ" اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔ اس کی تعمیل اور تکمیل کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ نے قرآن کو حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں جمع کروایا۔ اسی طرح حافظوں اور قاریوں کے ذریعہ قرآن پڑھایا۔ اسی طرح قرآن کا بیان مہدی موعود سے ہوا۔ اور اللہ ہی جانتا ہے اس کی مراد کو۔ اور جیسا کہ فرمایا عیسیٰ علیہ السلام نے کہ ہم تمہارے پاس تنزیل (الفاظ) لاتے ہیں رہی تاویل (مراد) پس لائے گا اس کو فارقلیط آخری زمانے میں (نحن نایتکم بالتنزیل و اما التاویل فسیاتي به الفارقلیط في آخرالزماں)۔

شیخ عبدالرزاق نے فارقلیط سے محمد مہدی مراد لی ہے۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ جب جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی قرآن پڑھتے تھے تاکہ بھول نہ جائیں۔ اللہ نے فرمایا، ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ آپ جبرائیل کو سنتے رہیں۔ جب پورا پڑھنا ختم کریں تو آپ پڑھیے۔ آپ ہرگز نہیں بھولیں گے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے ایسا ہی کیا۔

اس وقت تک قرآن ہڈیوں، چمڑوں اور کھالوں پر لکھا جاتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے ذریعہ اللہ نے اس کے جمع کرنے کا کام فرمایا۔ یہ ہوئی صورت ان علینا جمعہ و قرآنہ کی۔ اگرچہ اس کی ابتداء حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ کے توجہ دلانے اور اصرار پر ہوئی تھی۔

اسی طرح پھر اس کے بیان کی ذمہ داری جو اللہ نے لی تھی وہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ذریعہ کرائی۔ اسی طرح اللہ

کا ''ثم ان علینا بیانہ'' کا وعدہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ذریعہ پورا ہوا۔

مہدی علیہ السلام کے بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ''بندہ تفاسیر کا مطالعہ کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ ''علمت من اللہ بلا واسطة جدید الیوم'' یعنی مجھے روزانہ اللہ کی جانب سے بلاواسطہ تعلیم دی جاتی ہے۔ جب امامنا علیہ السلام کے بیان کی یہ شان ہے تو لازماً وہ قطعی الثبوت اور واجب الایمان ہے بخلاف دوسرے مفسروں کی تفسیروں کے کہ وہ یا تو غور وخوض کا نتیجہ ہوتی ہیں یا پھر ان تک پہنچے ہوئے اسلاف کے اقوال ہیں جن میں خطا و لغزش کا امکان ہے۔ مہدی علیہ السلام چونکہ بفحوائے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المهدی مني يقفو اثري ولا يخطي، معصوم عن الخطا ہیں اس لئے آپ کا بیان قطعی حجت ہے۔

بدلہ مہدی موعود

سیدنا مہدی علیہ السلام نے آیت إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ۔ ﴿الأحزاب:۷۲﴾ ترجمہ: ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

یہ آیت پڑھی اور فرمایا: "بھائی سید خوندمیر از السَّمَاوَاتِ سے مراد انبیاء الْأَرْضِ سے مراد اولیاء وَالْجِبَالِ سے مراد علماء ہیں۔ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا امر قتال است وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ذات شما است"

یعنی مہدی علیہ السلام نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا بھائی سید خوندمیر سماوات سے مراد انبیاء، ارض سے مراد اولیاء، جبال (پہاڑوں) سے مراد علماء، فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا سے مراد "امر قتال" ہے اور حَمَلَهَا الْإِنسَانُ سے مراد تمہاری ذات ہے۔

فرمایا: ختم بار ولایت مصطفی بر ذات شما است کما قال اللہ تعالیٰ و حملھا الانسان این نیز ذات شما است۔

اس آیت میں حضرت مہدی علیہ السلام نے امانت کو امر قتال اور حضرت صدیق ولایت کو اس کا حامل فرمایا۔

جس امانت کو انبیاء نہ اٹھا سکے، اولیاء نہ اٹھا سکے، علماء نہ اٹھا سکے اس کو نبی و مہدی کے صدقے سے حضرت صدیق ولایت رضی اللہ عنہ نے اٹھالیا، اس بشارت عظمیٰ سے شہادت مخصوصہ کا بحیثیت بدلہ ذات مہدی موعود واضح طور سے اظہار ہو رہا ہے۔

پہلی مرتبہ حضرت مہدی علیہ السلام کی نظر بندگی میاں پر پڑتے ہی، بندگی میاں رضی اللہ عنہ کو جن حالات سے گذرنا پڑا اور جو کیفیتیں آپ پر وارد ہوئیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

حضرت شاہ خوندمیر رضی اللہ عنہ، حضرت مہدی علیہ السلام کا دیدار پر انوار دیکھتے ہی اور حضرت امام علیہ السلام کی نظر فیض اثر آپ پر پڑتے ہی بے ہوش ہو گئے تھے اس لئے حضرت مہدی علیہ السلام آپ کے نزدیک آئے اور بندگی میاں رضی اللہ عنہ کے کندھے پر دست مبارک رکھ کر فرمایا: بھائی سید خوندمیر ایں روش بے ہوشی از خاندان ما نیست۔ ہوشیار شوید۔ بھائی سید خوندمیر بے ہوشی کی یہ روش ہمارے خاندان کی نہیں ہے۔ ہوشیار ہو جاؤ۔

بندگی میاں سید عالم اپنی نقلیات میں لکھتے ہیں۔ ہشیار باشید۔ شما صدیق ہستید، ایں روش بے ہوشی از خاندان ما یاں نیست۔ یعنی ہوشیار ہو جاؤ تم صدیق ہو بے ہوشی کی یہ روش ہمارے خاندان کی نہیں ہے۔

پھر آپ نے فرمایا: واصلان خدا در صحو مانند، ومستاں در مشاہدہ حق وہشیاراں درکار شریعت و عبادت باشند

سیدنا مہدی علیہ السلام نے اس فرمان میں تین قسم کے لوگ بتلائے ہیں (۱) واصلان (۲) مستان (۳) ہوشیاراں۔ نیز آپ نے ان کی صراحت بھی فرمادی یعنی ہوشیار سے مراد وہ بندگان خدا ہیں جو نماز وروزہ وغیرہ احکام شریعت کے پابند ہیں لیکن عرفان سے بے بہرہ ہیں۔ مستان وہ پاگان خدا ہیں جو حالت جذب کی وجہ سے ہمیشہ اس عالم میں رہتے ہیں اوراحکام شریعت کی پابندی سے متعذر ہیں۔ اور واصلان وہ خاصان خدا ہیں جو باطناً دیدار خدا میں مستغرق ہوتے ہوئے احکام شریعت کی ادائی میں ہوشیار رہتے ہیں۔

چونکہ نظر مبارک مہدی علیہ السلام آپ پر پڑتے ہی آپ پر جذب کا عالم طاری ہو گیا تھا اس لئے مہدی علیہ السلام نے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہوش میں لائے اور فرمایا کہ بے ہوشی کی یہ روش ہمارے خاندان کی نہیں ہے۔ ہشیار ہو جاؤ۔ اس طرح مہدی علیہ السلام نے آپ کو اپنے ہم خاندان ہونے کا شرف بخشا جو کمال اتحاد ویکتائی پر مبنی ہے۔

ہوشیار ہونے کے بعد مہدی علیہ السلام کے استفسار پر فرمایا" پھوٹو آنکھیں جس نے مہدی کوں دیکھا۔ میں نے اپنے خدا کوں دیکھا۔

تذکرۃ الصالحین میں اس طرح لکھا ہے اول وہلہ میں جب بندہ کی نظر مہدی علیہ السلام پر پڑی۔ آنکھ اندھی ہو جائے اگر میں نے آنحضرتؑ کو درمیان میں دیکھا ہو اسی لمحہ میں نے اپنے پروردگار کو دیکھا۔ تو حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا" خدا ہو سو خدا کوں دیکھے۔

تعلیمات میاں سید عالم میں ہے " خدائے راخدا بیند" جو خدا ہو خدا کو دیکھتا ہے۔
خاتم سلیمانی میں ہے " ہر کہ خدا باشد خدائے را بیند" جو خدا ہو خدا کو دیکھتا ہے۔
تذکرۃ الصالحین میں ہے " ہر کہ خدا شود خدائے را بیند" جو خدا ہو گا وہ خدا کو دیکھتا ہے"

پھر حضرت مہدی علیہ السلام نے بندگی میاںؓ سے فرمایا " بھائی سید خوندمیر جو کچھ معاملہ تمہارے ساتھ ہوا کہو" حضرت بندگی میاںؓ نے فرمایا حضور پر سب روشن ہے۔ بندہ کیا عرض کرے۔ مہدی علیہ السلام نے فرمایا۔ ہاں تم جو کچھ کہتے ہو ویسا ہی ہے پھر بھی تم خود اپنی زبان سے کہو تا کہ تمام بھائی سن لیں۔

میاںؓ نے فرمایا"نماز عصر پڑھتے وقت حضور الٰہی سے چار فرشتے آئے اور بندے کے سر پر آرہ رکھ کر بدن کے دو ٹکڑے کر دئے۔ جسم کے سیدھے حصے کو بشری کثافت سے پاک کر کے خوبصورت اور نورانی بنایا اور بائیں حصے کو جس میں سیدھے حصے کی کثافت بھر دی گئی تھی بندے کے روبرو ایک بری صورت میں کھڑا کر دیا پھر ارشاد ہوا۔اے سید خوندمیر تم نے دیکھا کہ ہم نے تمہاری ذات سے کس قدر بشری کثافت دور کی اور کیسی پیاری صورت بنائی اس بات کا تم پر احسان ہے تم اس احسان کے شکریہ میں ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔بندے نے عرض کیا خداوندا بندے کو نہ بی بی ہے نہ اولاد کہ تیرے حضور پیش کرے۔ارشاد ہوا۔ہموں کوں (ہم کو) سوہی لیوے جو راہ ہماری سر دیوے۔

بندے نے عرض کیا بارخدایا ایک سر تو کیا اگر سو سر بھی ہوں تو تیرے نام پر تیرے راستے میں تصدق کر ڈالوں"اس کے بعد بندے کا سر دستِ قدرت سے علیحدہ ہو گیا اور بندے نے عصر، مغرب اور عشا کی نماز بغیر سر کے پڑھی پھر قدرت الٰہی سے بندے کا سر کندھوں پر آ گیا۔

اس وقت ارشاد ہوا"اے سید خوندمیر، یہ تمہارے تن پر امانت کے طور پر رکھا ہے، جب کبھی ہم طلب کریں تم کو دیناہو گا، پھر ارشاد ہوا، تم جو بھی ہماری درگاہ سے چاہو گے، ہم تم کو عنایت کریں گے۔

بندے نے نہایت عاجزی سے عرض کیا"بندہ تجھ سے تیری ذات کے سوا کچھ نہیں چاہتا"ارشاد خداوندی ہوا"ہم نے اپنی ذات تیرے حوالے کی۔ تیری درخواست کو ہم نے قبول کیا۔

حضرت صدیق ولایتؓ سے یہ سن کر مہدی علیہ السلام نے فرمایا:"بھائی سید خوندمیر تم پوری تیاری کے ساتھ آئے ہو۔چراغ داں و بتی و تیل موجود تھا۔صرف سلگانے کا کام باقی تھا۔اب چراغ ولایت محمدیؐ سے روشن کر دیا گیا"۔اس کے بعد اور بھی بشارتیں دی ہیں جن کا ذکر ان کے محل پر کیا جائے گا۔

حضرت بندگی ملک الہداد خلیفہ گروہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت بندگی میراں سید محمد در ناگور"فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا﴿آل عمران:۱۹۵﴾ حجت مہدویت خود بدیں عبارت خواندند،فَالَّذِينَ هَاجَرُوا شد۔وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ شدوَأُوذُوا فِي سَبِيلِي شدوَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا کہ ماندہ است ماشااللہ خواہد شد۔

یعنی ناگور میں (ایک اورروایت میں ہے کہ ٹھٹھہ واقع سندھ میں)فَالَّذِينَ هَاجَرُوا...الخ کا بیان اس طرح

فرمایا۔ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا ہو گیا۔ وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ ہو گیا۔ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي ہو گیا وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا باقی ہے۔ اللہ جب چاہے گا، ہو گا۔ لیکن آپ نے اس کا اظہار نہیں کیا کہ یہ آیت کس کے حق میں ہے۔

جب آپ فراہ مبارک تشریف لے گئے تو علماء خراسان کے کہنے پر عام لوگوں میں یہ مشہور ہوا کہ مہدی کو آگ جلا نہیں سکتی۔ پانی ڈبو نہیں سکتا۔ تلوار کاٹ نہیں سکتی۔ اگر یہ علامتیں پائی نہ جائیں تو وہ مہدی موعود نہیں ہے۔

علماء خراسان کے زیادہ اصرار پر آپ نے فرمایا: ''آج کے دن تک بندہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ صفت موعود کہ قَاتَلُوا وَقُتِلُوا ہے بندہ سے ظاہر ہو گی اور بندہ کو اس صفت کا بھی زیادہ اشتیاق تھا لیکن حق تعالیٰ کا فرمان ہوتا ہے کہ اے سید محمد بر توکسے قادر دست نیست ایں چہارمی صفت ذات توکہ قَاتَلُوا وَقُتِلُوا است بر سیدے شائستہ قائم مقام تو برانگیزم و بدلۂ ذات توکنم و بر آن سید شائستہ سر انجام نمایم''

اے سید محمد تم پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا (اس لئے)(۱) تمہاری ذات کی اس چوتھی صفت کے لئے جو کہ قَاتَلُوا وَقُتِلُوا ہے ایک لائق سید تمہارے قائم مقام کروں گا (۲) اور تمہاری ذات کا بدلہ بناؤں گا (۳) اور اس لائق سید سے (امر قتال کی) انجام دہی کروں گا۔

بندگی میاں سید خوندمیر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس بشارت کی تحقیق کر لینی چاہئے کہ وہ کون صاحب ہیں جن سے ولایت مصطفی کی چوتھی صفت ظاہر ہو گی؟ اگر معلوم ہو جائے تو ان کی ایسی ہی تعظیم کی جائے جیسی کہ حضرت میراں علیہ السلام کی کی جاتی ہے۔ بناء علیہ بندگی میاںؓ نے بندگی میاں یوسف مہاجرؓ سے کہا آپ حضور میراں علیہ السلام میں جا کر دریافت کریں کہ وہ کون صاحب ہیں جن پر مہدی موعودؑ کی چوتھی صفت ختم ہو گی۔ اگر معلوم ہو جائے کہ فلاں صاحب ہیں تو ان کی بھی ویسی ہی تعظیم کی جائے۔ نماز مغرب کے بعد سیدنا مہدی علیہ السلام نے اپنے حجرے کو تشریف لے جانے کا قصد فرمایا اور صحابہؓ بھی روزانہ عادت کے مطابق اپنے اپنے حجروں میں جانا چاہتے تھے اور بعض جا رہے تھے اس وقت بندگی میاں یوسفؓ حضرت ولایت مآب کی خدمت میں آئے۔ حضرت میراں علیہ السلام نے فرمایا میاں یوسف کچھ پوچھنا چاہتے ہو، عرض کیا ہاں خوندکار۔ میرانجی وہ کون بزرگ ہیں جن کی ذات پر حضور موعود علیہ السلام کی چوتھی صفت ختم ہو گی حضرت میراں علیہ السلام نے فرمایا میاں یوسف تمہاری فراست ایسی نہیں ہے (کہ تم اپنی طبیعت سے ایسے امر عظیم کا استفسار کرو) کہو کہ کس نے پوچھا ہے۔ عرض کیا میرانجی! میں نہیں پوچھتا، میاں سید خوندمیر پوچھ رہے ہیں۔ حضرت امامؑ نے فرمایا سید خوندمیر کہاں ہیں۔ عرض کیا۔ یہاں کھڑے ہیں۔ حضرت امام علیہ السلام آگے بڑھے۔ بندگی میاں رضی اللہ عنہ کو اپنے حضور بلایا (حضرت امام علیہ

السلام دو چار ہی قدم بڑھے تھے کہ حضرت صدیق ولایتؓ دوڑ کر خدمت اقدس میں آئے۔ حضرت امام نے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ بھائی سید خوندمیر آہستہ باشید، ایں صفت ذات بندہ بہ شما خواہد شد و شما حامل ایں بار ولایت ہستید۔ آنچہ می پرسید آں باذات شمار خواہد شد۔ ایں کارزار از شما خواہد شد،

نیز روایت ہے کہ بندگی میاں رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ آفتاب آپ کے سر پر بیٹھا۔ اسی طرح کا خواب حضرت بندگی ملک بخن نے بھی دیکھا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت مہدی علیہ السلام نے ملک بخن سے فرمایا کہ تمہاری دنیا کا بار پھر تمہارے سر پہ آئے گا۔ حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا۔ بھائی سید خوندمیر آن آفتاب، ولایت است بار ولایت بر شما خواہد آمد۔ بار من تمام بر سر شما خواہد آمد۔

بندگی میاں سید خوندمیر رضی اللہ عنہ نے کمال عاجزی و انکساری سے عرض کی ایں بار ولایت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم است و گردن بندہ ضعیف است چگونہ بردارد یعنی یہ ولایت مصطفی کا بار ہے اور بندہ کی گردن ضعیف ہے کس طرح اٹھا سکے گی۔

حضرت ولایت مآب علیہ السلام نے فرمایا "اے بھائی سید خوندمیر بندہ را بسیار اشتیاق ایں صفت قاتلوا و قتلوا بود۔ فاما اکنوں فرمان حق تعالیٰ چنیں می شود کہ بہ شما خواہد شد"۔ اے بھائی سید خوندمیر بندہ کو اس صفت قاتلوا و قتلوا کا بہت اشتیاق تھا۔ مگر اب حق تعالیٰ کا فرمان اس طرح ہوتا ہے کہ تم سے وہ ہو گا۔ بندہ قوی و ضعیف چہ داند۔ فرماں چنیں است۔ بندہ قوی و ضعیف کیا جانے۔ فرمان ایسا ہے۔

صفت چہارم قَاتَلُوا وَقُتِلُوا بر شما شود۔ صفت چہارم قاتلوا و قتلوا تم سے ہو گی۔

اسی سلسلہ سخن میں آپ نے فرمایا "خدائے تعالیٰ بار خود نا قابل را نمی دہد۔ و از قابل نمی گذرد"۔ یعنی خدائے تعالیٰ اپنا بار نا قابل کو نہیں دے گا اور قابل کو نہیں چھوڑے گا۔ تم کو اس بار کے قابل پایا اور بار ولایت دیا۔

مثال کے طور پر فرمایا کہ باشاہان مجازی کسی چیز کی ذمہ داری اور بار کسی نالائق کو نہیں دیتے۔ پس حق سبحانہ و تعالیٰ کہ سمیع و بصیر و علیم حقیقی ہے تم کو قابل اور لائق بنا کر اس بار کو تم پر رکھا ہے۔

اس سلسلہ میں بطور معارضہ ایک روایت یہ پیش کی جاتی ہے ایک مرتبہ میاں سید خوندمیرؓ نے میاں نعمت کے ذریعہ عرض کرایا کہ جس شخص پر ق قَاتَلُوا وَقُتِلُوا کی تکمیل ہو گی حضرت اس کا نام فرمادیں تا کہ اس کا ادب مثل ادب حضرت والا

کے کیا جائے۔ میاں نعمتؓ نے حسب ایماء بندگی میاںؓ امام علیہ السلام سے عرض کیا قبلہ جن وانس نے فرمایا جو پوچھ رہا ہے اسی پر صورت پذیر ہوگا۔ جان اے عزیز اس نقل میں حامل بارامانت کا نام ظاہر ہو چکا ہے۔(تاریخ سلیمانی جلد ثانی)

اس روایت سے یہ استدلال کہ اس سوال وجواب سے حضرت شاہ نعمت نے یہ سمجھا کہ وہ ہی اس صفت کے حامل ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے ہی سوال کیا تھا۔ صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ خود روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت شاہ نعمت نے از خود سوال نہیں کیا تھا، بلکہ بندگی میاںؓ نے ان کے ذریعہ اپنا سوال کروایا تھا۔ بندگی شاہ نعمت کی حیثیت ایک درمیانی واسطہ کی تھی۔ اصل سائل تو حضرت بندگی میاں رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لحاظ سے سائل کا اطلاق حقیقت میں بندگی میاں رضی اللہ عنہ پر صادق آتا ہے۔ پس مہدی علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ ''جو پوچھ رہا ہے اسی سے ظاہر ہوگا'' بندگی میاںؓ سے ہی متعلق ہوگا۔

نیز یہ بھی روایت آئی ہے کہ حضرت بندگی میاں شاہ دلاور رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت بندگی میاں شاہ نعمت پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ''امر قتال'' میاں سید خوندمیرؓ سے مخصوص اور مختص ہے۔

مگر چونکہ آپ سوال کا ذریعہ بنے ہیں اس لئے آپ کو بھی شہادت نصیب ہوگی۔ امامنا علیہ السلام کی زبان مبارک کا اثر ضرور ظاہر ہوگا لیکن یہ شہادت عام شہادت ہوگی۔

چنانچہ حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کی شہادت مخصوصہ کے تقریباً پانچ سال بعد حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؓ بھی اکیس فقراء کے ساتھ بحالت ذکر الٰہی صف پر بیٹھے ہوئے بمقام لوگڑھ شریف شہید ہوگئے۔

واضح ہو کہ دونوں شہادتوں میں کافی فرق ہے۔

(۱) شاہ نعمتؓ کی شہادت صف پر ہوئی ہے۔ اور بندگی میاںؓ کی شہادت میدان جنگ میں ہوئی ہے۔ (۲) شاہ نعمتؓ کی شہادت بحالت ذکر الٰہی اچانک ہوئی ہے۔ بندگی میاںؓ کی شہادت باضابطہ منکرانِ مہدی سے قتال کرتے ہوئے ہوئی ہے۔ (۳) حضرت شاہ نعمت ۲۱ فقراء دائرہ کے ساتھ شہید ہوئے، بندگی میاںؓ کی شہادت سو سروں کے ساتھ ہوئی۔ (۴) حضرت شاہ نعمت رضی اللہ عنہ سے قُتِلُوا کا اظہار ہوا ہے۔ حضرت بندگی میاں رضی اللہ عنہ سے قَاتَلُوا وَقُتِلُوا دونوں کا اظہار ہوا ہے۔ جو کہ حسب ارشاد مہدی موعود علیہ السلام ''قَاتَلُوا وَقُتِلُوا'' بندہ کی چوتھی صفت تھی۔

حضرت بندگی میاں شاہ نعمت رضی اللہ عنہ کا سائل ہونے کی بناء پر خود کو صاحب ''قَاتَلُوا وَقُتِلُوا'' سمجھنا، حضرت کی ذاتی رائے تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس کو ''خطاء اجتہادی'' کہا جا سکتا ہے۔

لیکن چونکہ شاہ نعمت رضی اللہ عنہ اللہ کے برگزیدے بندے، مہدی علیہ السلام کے مبشر اور خلیفۂ مہدی علیہ السلام ہونے والے تھے تو اللہ نے ہمیشہ ایسے حضرات کی مدد فرمائی ہے اور ان کو اس خطا پر متنبہ کرتے ہوئے ان کو اس پر دیر تک باقی نہیں رکھابلکہ شرح صدر کرتے ہوئے حقیقت سے آگاہ فرمادیا جیسا کہ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا تھا۔

دور کیوں جائیں حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنھا نے ایک زمانے میں حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہ بن ابوسفیان کے ساتھ تھیں۔ پھر جب مقام ابواء پر وہاں کے کتوں نے جب بی بی عائشہ رضی اللہ عنھا کے ساتھ رہنے والی فوج پر بھونکنا شروع کیا، تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنھا چونک پڑیں اور دریافت فرمایا کہ یہ کونسا مقام ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ "ابواء" ہے۔ بی بی نے فرمایا کہ یہاں سے آگے نہیں بڑھوں گی۔ واپس جانا چاہتی ہوں۔ اس لئے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا "کہ تم پر ابواء کے کتے بھونکیں گے اس وقت تم ناحق پر ہوگی۔"

چنانچہ میاںؓ کی شہادت کے بعد خود حضرت شاہ نعمت رضی اللہ عنہ کو احساس ہوگیا۔ میاں کی شہادت مخصوصہ کے آپ قائل ہوگئے اور اس جنگ میں اپنی عدم شرکت اور عدم موافقت پر افسوس کا اظہار کیا چنانچہ اس سلسلہ میں یہ روایت آئی ہے: و بعد از مدتے میاں نعمت در جالور آمدند و فرمودند کسانیکہ مرا از موافقت سید خوندمیرؓ باز داشتند ایشاں را خدائے تعالیٰ خواہد پرسید۔ ایک مدت کے بعد (بندگی میاں رضی اللہ عنہ کے چہلم کے موقع پر) جالور آئے اور فرمایا جن لوگوں نے مجھے بندگی میاں رضی اللہ عنہ کی موافقت سے باز رکھا، اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

اس کے علاوہ اور کئی روایتیں ایسی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہدی علیہ السلام نے میاں سید خوندمیرؓ کو ہی بدلۂ ذات مہدی ہونے کی بشارات اللہ کے حکم سے دی ہیں۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے:

حضرت امام علیہ السلام نے بارگاہ ملک العلام میں عرض کیا کہ یا اللہ چوتھی صفت جو باقی رہ گئی ہے اگر مجھ پر پوری ہوجائے تو اس کے لئے راضی ہوں۔ اللہ کا فرمان پہنچا کر اے سید محمد ہمارے علم ازلی میں یہ ہے کہ خاتم الانبیاء اور خاتم الاولیاء پر کوئی شخص قادر نہ ہوگا اور تلوار کارگر نہ ہوگی۔ پس ہم نے تجھ کو خاتم ولایت محمدی بنایا ہے اس لئے ہم نے ترا بدل سید خوندمیر کو قرار دیا ہے۔ اس بناء پر حضرت مہدی علیہ السلام نے سید خوندمیر سے فرمایا "یہ کام تم سے ہونے والا ہے"۔

اسی طرح ایک اور روایت ہے: کہ حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ پر

"بار صفت ولایت رکھنے کے وقت فرمایا ہوشیار رہو کہ یہ بار ولایت ہے، سر جدا ہوگا، پوست کھینچا جائے گا، اگر ہاتھی کی

ہڈیاں اور فولاد کا پہلو بھی ہو گا تو اس بار سے بوسیدہ ہو جائے گا۔ پھر فرمایا کہ دنیا دشمن ہو جائے گی، تمہارا کوئی دوست و غم خوار نہ ہو گا۔ حتیٰ کہ تمہارے جامہ کا بند بھی دشمن ہو جائے گا۔ لیکن دل و جاں کو بے فکر اور لاوبال رکھیں۔ کیوں کہ حق تمہاری طرف ہے۔

نیز روایت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے وصال کے چار پانچ دن بعد دو تین مرتبہ تاکید کے ساتھ سادات کبیر بندگی میاں سید خوندمیر کو حضرت مہدی علیہ السلام کی روح پر فتوح سے معلوم کیا گیا کہ تم ملک گجرات کا ارادہ کرو کیوں کہ جو کام تم سے منسوب کیا گیا ہے وہاں ظہور پائے گا۔ پس اس معاملہ کو بندگی میاں سید خوندمیرؓ نے میراں سید محمود رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ آنجناب نے یہ جواب دیا کہ آنحضرت کی روح پر فتوح سے جس چیز پر آپ مامور ہیں اور جس کی تاکید کی گئی ہے اسی پر عمل کریں۔

اس روایت میں ”جو کام تم سے منسوب کیا گیا ہے وہاں ظہور پائے گا“ سے مراد وہی بار امانت ہے۔

نیز وضاحت کے ساتھ یہ روایت بھی آئی ہے کہ حضرت امام علیہ السلام کی رحلت کے بعد ایک ہفتہ کے اندر امام علیہ السلام کی روح مبارک سے جناب صدیق اکبر کو معلوم ہوا کہ تم یہاں سے گجرات چلے جاؤ کیوں کہ اس میں مقصود خدا ہے۔ قَاتَلُوا وَقُتِلُوا جو تمہارا خاص منصب ہے گجرات میں ہی اس کا سرانجام ہو گا، اسی طرح حضرت سید محمود خلف ارشد حضرت امام علیہ السلام کو بھی معلوم ہوا۔ حضرت سید خوندمیرؓ نے ان معلومات کو حضرت سید محمودؓ سے بیان کیا آپ نے فرمایا مجھ کو بھی اسی طرح معلوم ہوا ہے (سوانح مہدی موعود۔ ص:۱۶۱ باب ا/ حصہ دوم)

نیز حضرت سید محمود رضی اللہ عنہ جب فراہ مبارک سے واپس (ہندوستان) آئے تو حضرت سید خوندمیرؓ بھی آپ کے دائرے میں آئے تھے (اور آپ نے وہیں رہنے کا اپنا ارادہ ظاہر فرمایا) تو حضرت سید محمود ثانی مہدی رضی اللہ عنہ نے آپ سے فرمایا۔ ”میں آپ کا خیر خواہ ہوں میرے کہنے پر عمل کریں۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے آپ پر قَاتَلُوا وَقُتِلُوا کا بار رکھا ہے اگر میرے پاس رہو گے تو اس کا امکان محال ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مہدی علیہ السلام کی چوتھی صفت قَاتَلُوا وَقُتِلُوا کا ظہور جو بصورت شہادت بندگی میاں سید خوندمیرؓ ہوا کیا حجت مہدی ہے؟

اس کے تعلق سے حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہؓ کے والد ماجد حضرت بندگی میاں سید یوسفؓ نے مطلع الولایت میں

حضرت مہدی علیہ السلام کا فرمان نقل کیا ہے:

"اللہ جو سمیع و بصیر و علیم حقیقی ہے تم کو لائق اور قابل بنا کر یہ بار ولایت تم پر رکھا ہے۔ لیکن ہوشیار رہنا کیونکہ یہ ولایت محمدیہ کا بار ہے۔ سر جائے گا کمر ٹوٹے گی، پوست کھینچا جائے گا۔ اگر اس وقت تم اپنی ذات سے تنہا ایک طرف ہوں اور تمام دنیا (تمہارے مقابلے میں) دوسری طرف ہو توان شاء اللہ تمہاری ایک ذات کے آگے یہ سب ہزیمت اٹھائیں گے۔ یہ میری مہدیت کی آیت (حجت، معجزہ) ہے جیسا کہ جنگ بدر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حجت (معجزہ) تھی۔

ظاہر ہے کہ مہدی علیہ السلام کا یہ فرمان جو مہدی علیہ السلام کے وصال کے بیس (۲۰) سال بعد واقع ہونے والے واقعہ سے متعلق تھا۔ اخبار مغیبہ سے تھا جن کا علم طاقت بشری سے باہر و خارج ہے۔ اور صرف الٰہی معلومات کی بناء پر ہوتا ہے۔ اسی لئے علماء نے ایسے اخبار مغیبہ کو معجزات میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ۔ الم غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ ﴿روم:۴،۳،۲،۱﴾ الم۔ اہل روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں۔ اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے یعنی چند برسوں میں۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ اہل روم، اہل فارس کے مقابلے میں بد ترین اور کمر توڑ شکست سے دو چار ہو چکے تھے اور سنبھلنے کے کوئی آثار بھی نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن کا یہ اعلان کہ عنقریب وہ غالب آجائیں گے، یقیناً معجزہ ہی تھا۔

یہاں بھی مہدی علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ پہلے دن کی فتح کو صداقت مہدیت کی حجت قرار دیا گیا ہے۔ اعجاز کی اس نوعیت کو علماء کی اصطلاح میں "تحدی" (چیالنج) کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا وقوع ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس خبر شہادت کا وقوع ضروری تھا بلکہ اس کا ظہور حضرت سید خوندمیرؓ کی ذات سے ہونا بھی ضروری تھا۔ اور اسی انداز میں ہونا چاہئے تھا جس انداز میں حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ یعنی اگر اس قتال میں دوسرے کوئی صحابی شریک ہو جاتے تو یہ خبر مغیب جس کے صدور کو امامنا علیہ السلام نے حجت مہدی قرار دیا تھا، کسی حد تک مشتبہ ہو جاتی۔ اسی کی جانب حضرت ثانی مہدی رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا تھا۔ "اگرچہ نزدیک ما باشید ان را امکان محال است۔ یعنی اگر میرے پاس رہو گے تو خبر قتال کے وقوع کا امکان محال ہے۔ اسی وجہ سے اللہ کی طرف سے بھی ایسا انتظام ہو گیا تھا کہ اس جنگ میں حضرت سید خوندمیرؓ کے معاصرین (صحابہ مہدی موعود) اور امراء و روٴسا سے کوئی شریک نہ ہو سکے۔ اور پورا کارزار قتال صرف بندگی میاں رضی اللہ عنہ سے ہوا جیسا کہ حضرت مہری رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ حجت مہدی بر و شد تمام

نیز صاحب مطلع الولایت نے حجت مہدی کی پر زور الفاظ کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔ ترجمہ:

"مہدی علیہ السلام کی چوتھی صفت جو قَاتَلُوا وَقُتِلُوا ہے (۱) وہ حضرت سید خوندمیرؓ کے ذریعہ ظاہر ہوگی (۲) اس کے ظہور سے حجت قائم ہوگی (۳) دین کو قوت حاصل ہوگی (۴) اور یہ صفت خاص سید خوندمیرؓ سے ظاہر ہوگی۔ (۵) اور آپ پر ہی وہ حجت مہدی پوری ہوگی (۶) پس آپ کی ذات، مجملہ خواتم خاتم حجت مہدی ہے۔

حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہؓ نے تحریر فرمایا ہے۔ ترجمہ:

"اس مخبر صادق نے جس طرح خبر دی تھی، من وعن، وقوع پذیر ہوئی، مہدی علیہ السلام کی حجت اس معجزہ پر پوری ہوئی اور اس ایک معجزہ میں کئی معجزے حضرت مہدی علیہ السلام کی مہدیت کے ثبوت میں صادر ہوئے ہیں (افضل المعجزات)

اس موقع پر کسی کی یہ سوچ کہ یہ شہادت حجت کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس میں "اگر" کی شرط کے ساتھ مشروط ہے تو اس کو صرف ذہنی اختراع اور فکری ورزش کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بندگی میاں کے سر پر یہ بار ولایت رکھا اور فرمایا ہوشیار رہنا۔ یہ بار ولایت ہے۔ سر جدا ہوگا، کمر ٹوٹے گی، پوست کھینچا جائے گا، تین جگہ دفن کئے جاؤ گے۔ حضور امامنا نے یہ باتیں بحیثیت مامور من اللہ، امر اللہ مراد اللہ بیان فرمائیں۔ اور آپ کے مخاطب اصلی حضرت بندگی میاں رضی اللہ عنہ تھے۔ ضمناً دوسرے بھی مخاطب رہے۔ بندگی میاں رضی اللہ عنہ تو عاشق صادق تھے، مہدی علیہ السلام کے سلطان نصیر تھے۔ آپ سے تو کسی قسم کا شک و شبہ کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ رہے دوسرے افراد تو وہ بھی کامل معتقدین تھے۔ اس دور میں کسی نے بھی فرمان مہدی میں شک یا شرط کا سوال ہی پیدا نہیں کیا۔ بلکہ سب نے اس فرمان امام کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ آپ کے فرمان کے دو جزء ہیں ایک بندگی میاں رضی اللہ عنہ سے خطاب اور قتال کے پہلے دن مسلح اور طاقت ور تربیت یافتہ شاہی فوج کو بندگی میاں رضی اللہ عنہ کے ہمراہ چند بے سر و ساماں صاحب فقر و فاقہ نفوس قدسیہ کے مقابلے میں شکست فاش ہوئی اور وہ سب میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔ دوسری جنگ میں امراء ورؤسا مسلح سواروں کے باوجود حضرت صدیق ولایت کی مع فقراء شہادت عمل میں آئی۔ جسم مبارک کے تین حصے کئے گئے جو سدراسن، پٹن اور چاپانیر میں دفن کئے گئے۔ تو تمام مومنین معتقدین کے لئے جو پہلے سے ایمان لا چکے تھے۔ مزید اطمینان کا شرف نصیب ہوا۔ اور جو منکرین یا شک وشبہ کا شکار تھے ان کے لئے آخری حجت ثابت ہوئی۔

مہدی موعود علیہ السلام کے اس جنگ کے تعلق سے یہ الفاظ کہ "ایں آیت مہدیت من است، چنانچہ جنگ بدر حجت نبوت پیغمبر علیہ السلام بود"۔ یہ میری مہدیت کی حجت (معجزہ) ہے جیسا کہ

جنگ بدر پیغمبر علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

جنگ بدر کے تعلق سے یہ روایت مشہور ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ تین سو تیرہ جانباز نفوس قدسیہ کی پہلے تو صف بندی کی اور اللہ کے حضور اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر یہ بھی فرمایا۔اِنْ تھزم ھـذِہ الْعِصَابَۃ لَن تُعْبَدْ ابدا۔ اگر (آج) یہ چھوٹی سی جماعت شکست کھاگئی تو تُو قیامت تک نہ پوجا جائے گا۔

یہاں بھی حضور نے ان (حرف شرط) استعمال فرمایا اور اس کے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ اگر ایسا ہو جائے تو (میرا کیا ہے) تو ہمیشہ کے لئے پوجا نہ جائے گا۔ کیا یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس جنگ کی کامیابی کے ساتھ اللہ کی معبودیت مشروط تھی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ مگر کہنے کا مطلب اس سے اتنا تھا کہ تیری معبودیت برحق، اسی طرح اس جنگ میں ہماری کامیابی بھی برحق اور یقینی ہے۔

ہاں جو لوگ مہدی علیہ السلام پر اعتراض کرتے تھے کہ مہدی علیہ السلام کی شہادت بھی از بس ضروری ہے مہدی تو وہی ہو گا جو شہید ہو گا۔ اس کے جواب میں مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ تین صفتوں (ہجرت، اخراج، اور ایذاء فی سبیل اللہ) کی طرح چوتھی صفت (قاتلوا قتلوا) بھی بندہ سے متعلق ہے اور بندہ خود اس کا مشتاق بھی ہے۔ لیکن اللہ کی جانب سے یہ فرمان کہ خاتم نبوت کی طرح خاتم ولایت پر کوئی قادر نہ ہو سکے گا۔ کوئی تلوار ان کو کاٹ نہ سکے گی، اس لئے ہم نے اس صفت کے اظہار کے لئے تیرا بدل سید خوندمیر کو بنایا ہے۔ اس لئے آپ نے اللہ کے حکم سے اس چوتھی صفت کو جو کہ اصل میں مہدی کی صفت تھی، بندگی میاں سید خوندمیر کے حوالے فرمائی۔ اور پھر یہ فرمایا کہ اگر ایسا نہ ہو تو جان لو کہ بندے نے جو کچھ کہا اللہ کے حکم سے کہا۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھو کہ بندے نے جو کچھ کہا، خدا کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے کہا تھا۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ مہدی علیہ السلام کی مہدیت کی صداقت مہدی علیہ السلام کے وصال کے بیس سال بعد ہونے والے ایک واقعہ کے ساتھ مشروط تھی۔

اپنے زمانے میں تو آپ نے سینکڑوں ہزاروں دلائل اپنی مہدیت کی صداقت کے ثبوت میں پیش فرمائیں۔ جن کے دل میں نور ایمان تھا انہوں نے تصدیق کی حین حیات دلائل کے علاوہ اپنے وصال کے بعد بھی ایک عظیم حجت کو دنیا کے سامنے پیش کیا تا کہ ان کے لئے وہ آخری حجت ثابت ہو۔

سر الشہادتین میں جناب عبد العزیز صاحب نے حضور کے درجہ شہادت پر بنفسہ فائز نہ ہونے کی غایت اس طرح بیان کی ہے۔

لکن بقی له کمال لم یحصل بنفسه و هی الشهادة و السرّ فی عدم حصولها بنفسه ﷺ انه لو استشهد في الحرب لادّیٰ ذلک الیٰ کسر شوکة الاسلام واختلال الدّين في نظر العوام ولو استشهد غيلةً وَ سرّاً كما وقع لبعض خلفاءه لم يشتهر امر شهادة بل ولا تمّت الشهادة لانّ تمام الشهادة ان يقتل الرجل في الغربة و الكربة و ان يعقر جواده و يلقیٰ جثته مطروحة و يقتل حوله جمع كثير من اعزّةِ اصحابه واقاربه وان ينهب ماله وان تئوسر نساءه وايتامه كل ذلك في ذات الله(سرّ الشهادتین، ص۔۳۔۴)

(حضورؐ کو سب کمالات تھے) لیکن ایک کمال ایسا تھا جو آپؐ کو بنفسہ حاصل نہیں ہوا اور وہ شہادت ہے اور شہادت بنفسہ حاصل نہ ہونے میں یہ راز ہے کہ اگر چہ آپؐ جنگ میں شہید ہو جاتے تو یہ چیز شوکت اسلام کو توڑنے اور عوام کی نظروں میں دین میں خلل پیدا ہونے کا باعث بن جاتی اور اگر آپؐ ناگہاں اور پوشیدہ طور شہید ہو جاتے جیسا کہ آپؐ بعض خلیفوں کے ساتھ ہوا تو آپؐ کہ شہادت شہرت نہ پاتی بلکہ شہادت پوری ہی نہ ہوتی، اس لئے کہ کامل شہادت یہ ہے کہ آدمی مسافری میں اور کربت میں قتل کیا جائے، اسکے گھوڑے کی کونچیں کاٹی جائیں، اسکی لاش میدان جنگ میں پڑی رہے اور اسکے اطراف بہت سے باعزت لوگ جو اس کے اصحاب اور رشتہ داروں میں سے ہوں قتل کئے جائے اور یہ اس کا مال لوٹ لیا جائے اور اسکی بی بیاں اور اسکے یتیم لڑکے قید کر لئے جائیں اور یہ سب اللہ ہی کے واسطے ہو۔

بیعت

بیعت: بیع کے لغوی معنی بیچ دینے، فروخت کرنے کے ہیں، لیکن اصطلاح میں اس کا اطلاق مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر احکام شرع کی پابندی کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے اعمال پر پابندی کے عہد کو کہتے ہیں۔

اللہ نے قرآن شریف میں ان لوگوں سے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایک امر خاص پر بیعت کی تھی۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے لَّقَدْ رَضِيَ اللَّـــهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴿الفتح:۱۸﴾۔ یعنی اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جبکہ وہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ﴿الفتح:۱۰﴾۔ یعنی جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں (حقیقت میں) وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

ان دونوں آیتوں سے بیعت کا ثبوت ملتا ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ بیعت، بدعت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب القول الجمیل میں فرماتے ہیں رسم بیعت مسنون ہے۔ اور بیعت صرف بیعت خلافت کی حد تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوی میں بیعت کی متعدد صورتیں رائج تھیں۔ مثلاً بیعت اسلام، بیعت ہجرت، بیعت جہاد، بیعت توبہ وغیرہ۔ اور صوفیہ کی مروجہ بیعت، بیعت تقویٰ کی قسم میں داخل ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں تو اس بیعت کی علیحدہ ضرورت ہی نہیں تھی اس لئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب و نفوس شرف صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود ہی نورانی تھے۔ خلفائے راشدین کے بعد فتنہ کے خوف سے اور بیعت خلافت کے ساتھ اشتباہ اور التباس کی بناء پر یہ بیعت موقوف رہی اور صوفیہ اس بیعت کا قائم مقام خرقہ کو سمجھتے رہے، پھر جب ملوک اور سلاطین کا دور آیا اور بیعت خلافت ختم ہو گئی تو صوفیاء کرام نے فرصت کو غنیمت سمجھ کر بیعت کی از سر نو تجدید کی۔ تاکہ مرید مرشد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر یہ وعدہ کرے کہ آج میں نے اپنی جان، اپنا مال، اپنا حال، اپنی خواہش، اپنی آرزو، اپنی تمنا، سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ دی ہے اب ان چیزوں پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ یہ سب آج سے اللہ کے اختیار میں میں نے دے دیا ہے۔ وہ ان چیزوں کو جہاں صرف کرنے کے لئے کہے گا میں وہاں خرچ کروں گا گویا مرشد ایک واسطہ رہتا ہے اور وہ اس معاہدہ کا گواہ بھی رہتا ہے اور یہ بیعت ضمناً اس امر کو بھی شامل رہتی ہے کہ دین کی جو بات مرشد کے ذریعے سے ملتی ہے وہ اس پر عمل کرے گا۔ اور ایسا اس لئے کہ اللہ نے پہلے ہی سے قرآن میں اس بات کو ظاہر کر دیا ہے کہ إِنَّ اللَّـــهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴿التوبۃ:۱۱۱﴾ یعنی اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ دیکھئے یہاں اللہ نے تو اعلان کر دیا ہے کہ ہم

تمہارے جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے تو اب مومنین کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ ہم کو یہ معاملہ منظور ہے اور آج ہم اپنی جانوں کو اور اپنے مالوں کو تیرے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ پس اسی کا نام بیعت ہے۔

اور چونکہ ہم کچھ دے کر اللہ کو حاصل کرنے کا (اور کمتر صورت میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا) ارادہ کرتے ہیں اس لئے ایسا کرنے والے کو ''مرید'' کہتے ہیں۔

تاہم یہاں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ فقط ارادہ کر لینے سے کام پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ مراد کو پانے کے لئے اور جس غرض کے لئے بیعت کی جارہی ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے ضروری اسباب کو اختیار کرنا اور وسائل کو حاصل کرنا اور اللہ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر اپنے رہبر کی اقتداء میں منزل مقصود کی طرف چلنا پڑتا ہے۔ اور مرشد و رہبر کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ راستہ سے بھٹک جانے یا بہک جانے کے اندیشہ سے نہ صرف محفوظ رہے بلکہ راستہ اطمینان اور سہولت کے ساتھ طے ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مرید جو کہ اس راہ سے بے خبر رہتا ہے ایک واقف کار اور ماہر ہستی کے حوالے کر دے جس طرح ایک مریض ایک قابل ڈاکٹر کے حوالے اپنے آپ کو کرتا ہے اور اس کے بعد بے فکر ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شروع سے آخیر تک سارا کام مرید کا ہوتا ہے یعنی راہ طے کرنا مرید کا کام ہے اور مرشد کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی صحیح رہبری کرے، گویا راستہ مرید کو خود چلنا پڑتا ہے۔ البتہ مرشد کا ہاتھ پکڑنا پڑتا ہے۔ اس طرح راستہ طے کرنے سے راہزنوں سے بھی بچ سکتے ہیں اور اگر خدا کو منظور ہو تو منزل پر بھی پہنچ سکتے ہیں۔

یہ معاملہ چونکہ جانبین کے درمیان ہوتا ہے یعنی دو طرفہ معاملہ ہے اس لئے ہر جانب کو اپنی ذمہ داری کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ یعنی مرشد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مرید کو تلقین کرتا رہے۔ اور قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرے اور مرید کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مرشد کی اتباع کے وعدہ کو نباہتا رہے۔

ذیل میں بیعت کے اقسام اور ان کی تشریح کی جاتی ہے:

(۱) **بیعت اسلام**: جب کوئی دین اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اور کفر و شرک سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بیعت لیتے تھے۔ روایت سے ثابت ہے کہ ہجرت سے قبل حج کے موقع پر مدینے سے کچھ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے جس کو بیعت عقبیٰ کہتے ہیں اسی طرح بیعت ثانی کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے۔

(۲) **بیعت جہاد**: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی جنگ کے موقع پر صحابہ کرام سے عہد لیا تھا کہ اگر دشمن

سے مقابلے کی نوبت آئے تو وہ میدان چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے بلکہ جب تک زندہ رہیں گے دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ جیسا کہ آیت میں ہے لَّقَدْ رَضِيَ اللَّـهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ۔الخ (الفتح) حضرت سلمہ بن اکوع اس بیعت میں شریک تھے ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے درخت (سمرہ) کے نیچے کس بات پر بیعت کی تھی تو فرمایا "علی الموت" یہ عمل اللہ کو پسند آیا۔

غزوۂ احزاب میں خندق کو کھودتے وقت صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین نے یہ اشعار پڑھے:

نحن الذين بايعوا محمداً على الجهاد ما بقيناً ابدا۔ ہم وہ ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد پر جب تک باقی رہیں گے بیعت کی ہے۔

(۳) بیعت ہجرت: حارث بن زیاد ساعدی فرماتے ہیں میں یوم خندق میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ لوگوں سے ہجرت پر بیعت لے رہے تھے۔ میرا گمان ہوا کہ لوگ بیعت کے لئے بلائے جارہے ہیں آپ نے فرمایا یہ کون ہے؟ میں نے کہا میرے چچیرے بھائی حوطہ بن یزید یا یزید بھی حوط ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم لوگوں سے بیعت نہیں لیتا۔ لوگ تو تمہاری طرف ہجرت کرکے آتے ہیں۔

(۴) بیعت توبہ: (بیعت طریقت) امت کی تعلیم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ سے بعض اوقات گناہوں کے نہ کرنے پر بیعت لی۔ امام بخاری و مسلم نے حضرت عبادۃ بن صامت سے روایت کی۔ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضى الله عنه قَالَ قَالَ رسول اللَّهِ صلى الله عليه وسلم وحوله عصابته من اصحابه "بَايِعُونِي عَلَى أَنْ لاَ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلاَ تَسْرِقُوا، وَلاَ تَزْنُوا و لا تقتلوا أولادكم ولا تأتوا ببهتان تفترونه بين أيديكم و أرجلكم ولا تعصوا في معروف، فمن وفّى منكم فأجره على الله و من أصاب من ذلك شيئاً فعوقب في الدّنيا فهو كفّارة له، و من أصاب من ذلك شيئاً ثمّ ستره الله، فهو إلى الله إن شاء عفا عنه و إن شاء عاقبه على ذلك متفق عليه۔

اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا تم میرے ہاتھ پر بیعت کرو اور حدیث کے الفاظ ' وحوله عصابته من اصحابه" یعنی آپ کے اطراف صحابہ کی ایک جماعت تھی یہ بتارہے ہیں کہ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے ہی بیعت اسلام سے مشرف ہوچکے تھے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب صحابہ کرام ایمان اور صحبت حاصل کرچکے تھے تو پھر اس بیعت کی کیا

ضرورت تھی۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ امت کی تعلیم کے لئے تھی۔ دوسرے یہ کہ گناہوں سے بچے رہنے کی مزید تعلیم اور تاکید کے لئے تھی یعنی بیعت توبہ اور وَلَا تسْــرِقُوا، وَلاَ تَزْنُوا و لا تقتلوا أولادكم سے ثابت ہوتا ہے کہ کبائر سے اجتناب برتنے کے لئے یہ بیعت تھی۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ صحابہ کو اس بیعت سے کیا فائدہ تھا، اس کا جواب حدیث کے الفاظ دے رہے ہیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا امیدوار بننا تھا اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ کبائر سے بچنا تو ایمان لانے والوں کے لئے کلمہ پڑھ لینے کے بعد ضروری تھا لیکن بیعت کے ذریعہ اور وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر گناہوں سے بچنے کا عہد ایک فالتو عمل نظر آتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف میں سورۂ الممتحنہ میں صحابیات سے اسی قسم کی بیعت کا ذکر ہے، وہاں اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا فَبَايِعْهُنَّ وَاسْــتَغْفِرْ لَهُنَّ ﴿الممتحنہ: ١٢﴾ یعنی اے رسول تم ان عورتوں سے بیعت لو اور ان کے حق میں استغفار کرو۔ معلوم ہوا کہ وہ ان گناہوں سے توبہ تو گھر بیٹھ کر تنہائی میں بھی کر سکتی تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کرنے میں ایک بے بدل فائدہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کے حق میں استغفار کے کلمات بھی ادا ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ واللہ غفور ورحیم کی جانب سے مغفرت کی بارش ہو جاتی۔ اسی بیعت کا نام بیعت طریقت ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت ثابت ہے لیکن خلفاء اور صحابہ کے زمانے میں اس قسم کی بیعت نہیں ملتی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ایک فعل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی موقعوں پر ثابت ہو جاتا ہے تو پھر کسی اور سے نقل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاہم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ایسی روایتیں ملتی ہیں۔ اس لئے تمام اہل طریقت کے پاس مستند سلسلے موجود ہیں۔ خلفائے راشدین جب بیعت لیتے تھے تو اسی میں بیعت توبہ بھی شامل ہوتی تھی۔ خلفائےء کرام کے علاوہ دوسرے صحابہ اس لئے بیعت نہیں لیتے تھے کہ کہیں بیعت خلافت کا شبہ نہ ہو۔ اور فتنے نہ کھڑے ہو جائیں۔ فقط صحبت پر اکتفا کرتے تھے۔

جب خلفائے راشدین کا دور ختم ہوا اور خلافت (دراصل ملوکیت) کا معاملہ مملکت کے انتظام و انصرام اور نظم و نسق تک سمٹ کر رہ گیا تو سلف الصالحین نے بیعت توبہ (بیعت طریقت) والی سنت کو زندہ کیا تو یہ بیعت دراصل سنت ہے، یہ الگ بات ہے کہ اسی سنت پر عمل کرنے سے فرائض زندہ ہوتے ہیں، اور اگر یہ سنت ادا نہ کرے تو وہ اس سنت کی برکتوں سے محروم ہو گا۔ اور ہدایت کی صحیح راہوں پر نفس و شیطان کے مکائد سے بچ کر چلنا نصیب نہ ہو گا۔

البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر عالم اور صوفی بیعت نہیں لے سکتا۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا

ابو بکر صدیقؓ کو امامت سپرد فرمائی اور زندگی میں ہی باطنی نعمت بھی اپنے سینے سے ان کے سینے میں منتقل فرمائی چنانچہ حدیث میں ہے "مَا صَبَّ اللَّهُ فِي صَدْرِي إِلا قَدْ صَبَبْتُهُ فِي صَدْرِ أَبِي بَكْرٍ "یعنی اللہ نے جو کچھ میرے سینے میں ڈالا میں نے اس کو ابو بکر کے سینے میں ڈال دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ بیعت صرف وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کسی ولی یا مرشد کی صحبت میں رہ کر باطنی نعمت حاصل کی ہو۔ اور اس بزرگ نے اس کو اس کام پر مامور کیا ہو اور اس کی اجازت دی ہو۔ اس کے برخلاف جو آدمی از خود بیعت لینا شروع کر دے تو اس کی مثال ٹپکے کے آم کی سی ہے جس کے نسب یا سلسلہ کا پتہ نہیں۔ پس ایسے شخص سے بیعت نہیں کرنی چاہئے۔

بیعت کے سلسلے میں چند باتیں جو عورتوں سے متعلق ہیں بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم قرآنی کی بناء پر عورتوں سے بیعت لی ہے۔ لیکن اتنا فرق ضروری ہے کہ کوئی عورت اپنا ہاتھ اس مرد کے ہاتھ میں نہ دے جس سے بیعت کر رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ عورتوں سے پردے میں بغیر ہاتھ مس کئے بیعت فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے "مَا مَسَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يد امْرَأَة قَطُّ إِلا أَنْ يَأْخُذَ عَلَيْهَا بردة فَإِذَا أَخَذَ عَلَيْهَا فَأَعْطَتْهُ, فَقَالَ: "اذْهَبِي فَقَدْ بَايَعْتُكِ۔ یعنی عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کسی عورت (اجنبیہ) کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ مگر یہ ہوتا تھا کہ آپ اس پر چادر ڈال دیتے تھے۔ پھر آپ اس چادر کو لے لیتے اور اس کو دے دیتے اور کہتے کہ جا میں نے تیری بیعت لے لی۔

لیکن کوئی عورت بیعت نہیں لے سکتی۔ نہ مردوں سے اور نہ عورتوں سے۔ اس میں شک نہیں کہ عورت ولایت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ سکتی ہے۔ مگر شریعت نے رشد و ہدایت کی ذمہ داری اس کے نازک کندھوں پر نہیں ڈالی۔ اسی لئے کوئی عورت نبی بھی نہیں بنائی گئی۔ گو کہ اسے انبیاء کی ماں بننے کا شرف حاصل ہے، اللہ نے نبوت کا منصب مردوں کے کندھوں پر ڈالا اس لئے انبیاء کی وراثت بھی مردوں کے سپرد کی گئی، پس کوئی عورت بیعت نہیں لے سکتی۔ اب رہی بات کہ کیا بیعت کے لئے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کلمات پڑھنے چاہئیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر کلمات پڑھنے چاہئیں کیوں کہ یہ سنت ہے اس پر ضرور عمل کرنا چاہئے۔ لیکن اگر بیعت کرنے والے زیادہ ہوں تو چادر کا ایک کونہ مرشد کے ہاتھ میں دے کر اس چادر کو پھیلائیں اور سب اس کو پکڑ لیں یہ بھی سنت ہے یا اسی طرح ایک رسی کا ایک سرا مرشد کے پاس ہو اور دوسرے سب اسی رسی کو پکڑ لیں تو بھی کافی ہو جائے گا۔

اسی طرح باشعور بچے بھی بیعت کر سکتے ہیں چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بیعت کے لئے لایا گیا عمر سات آٹھ سال کی ہوگی پس نبی کرمؐ نے ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بیعت لی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا غائبانہ بیعت بھی ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں غائبانہ بیعت بھی ہو سکتی ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر درخت کے نیچے بیعت لی تو اس وقت حضرت عثمان غنی رِضی اللہ عنہ کو بھی غائبانہ بیعت میں شامل کر لیا۔ اور اپنے ہی ایک ہاتھ کو عثمان غنی کا ہاتھ قرار دے کر بیعت لی۔ حالانکہ حضرت عثمان غنیؓ اس وقت مکہ میں تھے۔

اسی طرح بیعت لینے والا دور ہو۔ اور وہاں تک پہنچنا آسان نہ ہو تو خط یا ٹیلی فون کے ذریعہ بھی بیعت کی جاسکتی ہے۔

یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ ایک وقت میں خواہ مخواہ ایک سے زیادہ حضرات سے بیعت کی جاتی ہے؟ حالانکہ یہ غلط طریقہ کار ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی شخص کے ہاتھ پر کرنی چاہئے۔ اور بیعت کرنے سے پہلے اس کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لینی چاہئے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ جب دو پیسے کی ہانڈی خریدتے ہو تو اچھی طرح ٹھونک بجا کر لیتے ہو۔ ایک دو پیسے کا تو خیال کرتے ہو۔ لیکن یہاں تو دین کا سودا ہے۔ پس یہاں بھی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لینی چاہئے اس کے بعد اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینا چاہئے۔ ہاں اگر جانچ کر ہی ہم نے بیعت کی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ہم اس کے ظاہر سے دھوکہ کھا گئے تو پھر اس کو چھوڑ کر دوسرے سے بیعت کر لینا چاہئے۔ لیکن کسی کا دل توڑنا نہیں چاہئے۔ یعنی اس کی شکایت وغیرہ نہیں کرنی چاہئے۔ جو لوگ اپنی شان بڑھانے یا اپنے ذوق تجدد کی خاطر جگہ جگہ بیعت کرتے ہیں تو اس کی مثال چمچے کے مانند ہے جو طرح طرح کے کھانوں میں ڈوبا رہا رہتا ہے مگر ذائقے سے محروم رہتا ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا ایک دست گیر و محکم گیر یعنی ایک ہاتھ پکڑو اور مضبوطی سے پکڑو البتہ ایک مرشد کی وفات کے بعد، اگر تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب نہ ہوا ہو تو تجدید بیعت ضروری ہے۔

بہرۂ عام

کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا لفظ ہے۔ لیکن در حقیقت اپنے اندر ایک عظیم الشان معانی کا سمندر رہے۔ یہ مخفف ہے چند الفاظ کا۔ یعنی ''**بہرۂ فیض ولایت محمدیہ مقیدہ ومطلقہ برائے خاص وعام**''۔ اتنا یاد رکھنا اور بولنا دشوار تھا تو اس کا پہلا لفظ ''بہرہ'' اور اس کا آخری لفظ ''عام'' لے لیا گیا۔ اور بہرۂ عام کہنے لگے۔

اسی معنی میں حضرت سید فضل اللہؒ نے ''بار عام'' لکھا ہے۔ یعنی دربارِ فیض میں بار عام کے روز کسی کو روک ٹوک نہیں رہتی۔ فقیر، کاسب، عالم جاہل، امیر، غریب، مرد، عورتیں جوان بوڑھے بچے فیض مہدی سے جو ناریزہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ مرشد اپنے دست مبارک سے دربارِ فیض میں حاضر شدہ ہر فرد کو فیض یاب کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام بہرہء عام یا بار عام رکھا گیا اور اب عام طور پر بہرہء عام ہی مشہور ہے۔ سیدنا مہدی علیہ السلام سے اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ام المؤمنین بی بی الہدیتی (الہ دلووی کہا جانے لگا ہے) نے اپنے وصال کے وقت حضرت امام علیہ السلام کو وصیت کی ''جو کچھ اللہ نے مجھے دیا ہے اس کی سویت کر دیجئے''۔

بی بی کے پاس دولت دنیاوی سے دمڑی بھی نہیں تھی جو کچھ فیض مہدی علیہ السلام تھا جسے حضرت مہدی علیہ السلام نے بی بی کی وصیت کی مطابق دائرہ معلی میں سویت کر دیا یعنی برابر برابر تقسیم فرما دیا۔

صحابہ رضی اللہ عنھم نے حضرت مہدی علیہ السلام کا بہرۂ عام کس طرح کرتے تھے اس کی کیفیت کہیں لکھی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن حضرت خلیفہ گروہؓ کے تذکرہ میں اجماع اور بہرۂ عام کے متعلق تفصیلی حالات ملتے ہیں۔

اجماع: عرس کے اگلے روز اجماع اور بہرۂ عام ہوتا۔ دائرہ کے سب فقیر اعلان عام کے ساتھ جمع ہو جاتے اور اس وقت دائرہ میں جو کام ضروری سمجھا جاتا تھا کر دیتے تے۔ اس میں کاسب حضرات بھی شریک ہوتے تھے۔ مثلاً غریبوں کی خدمت۔ کنواں کھودنا۔ راستے بنانا، جماعت خانہ کی درستگی وغیرہ۔ مختلف کام امداد باہمی کے طور پر کئے جاتے تھے۔ حضرت خلیفہ گروہؓ کے حضور ان کے لئے کھچڑی پکائی جاتی اور سب مل کر کھالیتے تھے۔ فقراء دائرہ کی اس باہمی امداد کو اجماع کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ اجماع کے ایک دوسرے معنی بھی ہیں۔ یعنی اجماع اصول دین کا ایک تیسرا اوراہم رکن ہے۔ دین کے چار اصول ہیں۔ کتاب اللہ۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجماع اور قیاس۔

امور شریعہ کی پہلی اصل تو کتاب اللہ ہے۔ اگر کتاب اللہ سے کسی کام کے متعلق کوئی حکم معلوم نہ ہو سکا تو سنت رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھا جاتا تھا اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ لیکن اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اس مسئلہ کا جواب نہ ملا تو پھر صحابہ وغیرہ کا اجماع ہوتا۔ اور سب کی متفقہ رائے سے جو چیز طے ہو جاتی اس پر عمل کیا جاتا اس کو "اجماع کا فیصلہ" کہا جاتا تھا۔ اور اگر اجماع نہ ہو سکا تو پھر مجتہدین کے قیاس پر عمل کیا جاتا تھا۔

اجماع بھی صحابہ کا تابعین کا تبع تابعین کا ہوتا تھا۔ اجماع کے منکر کو کافر کہا جاتا تھا (یعنی مجتہدین کے متفقہ فیصلہ کا انکار)

صحابہ مہدی علیہ السلام کے وقت بھی اجماع ہوتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی عقیدہ یا عمل میں فرمان مہدی یا (عمل مہدی) کے خلاف نئی بات پیدا ہو جانے پر دائرہ کے سب بھائی یا (دائروں کے مرشدین کرام) اور بھی دیگر بزرگ جمع ہو کر اس کا ازالہ کرتے اور اس کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکتے تھے۔

ایسی اجماع میں حضرت ثانی مہدی رضی اللہ عنہ دائرہ کے لڑکوں کو بھی بلا کر بٹھاتے تا کہ غلط فہمی، بدعات، نئے رواج، غلط عقیدگی، اعمال و عقائد میں کوتاہی کو دور کیا جائے اور مذہب حق سے واقفیت حاصل ہو، لکڑی، پانی کے اجماع کے مقابلہ میں یہ اجماع جو صحیح عقائد اور صحیح عمل کے متعلق ہوتا تھا، بنظر اہمیت اجماع کبیر کہلاتا تھا۔ اور بہرۂ عام اور اجماع کے روز کھچڑی پکائی جاتی تھی لیکن ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ تھوڑا غلہ ہی جمع ہو سکا اس لئے حضرت خلیفہ گروہ رضی اللہ عنہ نے کھچڑی نہ پکوا کر اس کو ابلوایا اور اس کی سویت کر دی وہی صورت ہر بہرۂ عام پر جاری ہو گئی۔

عجب نہیں کہ حضرت خلیفہ گروہؓ ہی کے زمانے میں بہرۂ عام کے روز کہیں سے چند چپاتیاں آگئی ہوں گی، دائرہ معلی میں آپ نے چند روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے (نان ریزہ) اپنے دست مبارک سے کر کے سویت کر دئے ہوں گے۔ اسی پر ان پر بھی ناریزہ کا نام لگ گیا اور یہی نام نسلاً بعد نسل ہر شخص کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔

حضرت خلیفہ گروہؓ نے اپنے وصال سے پہلے پہلے جب کہ دائرہ میں فاقوں پر فاقے تھے دائرہ کے سب فقیروں کو بلایا اور ایمان کی سویت کی۔ سویت کا طریق یہ تھا کہ ہر ایک فقیر حضور میں آکر اپنا دامن پسارتا اور حضرت خلیفہ گروہؓ اپنے ہاتھ کا خالی پسو دامن میں اس طرح انڈیلتے گویا کہ کوئی چیز ڈال رہے ہیں۔ بظاہر پسو بھی خالی اور دامن بھی خالی نظر آتا۔ لیکن فیض دینے والا ہی جانتا کہ کیا دیا اور لینے والا ہی جانتا کہ کیا فیض ملا۔ اس طرح فیض مہدی سویت کرتے کرتے جب حضرت بندگی میراں سید اشرفؒ بن حضرت بندگی میراں سید یعقوب بن بندگی میراں سید محمود ثانی مھدیؓ کی باری آئی تو آپؓ نے فرمایا کہ "لو شہزادے، یہ تمہارے والد کا حصہ" پھر دوسرا پسو ڈالتے وقت فرمایا "لو، یہ تمہارا حصہ"۔

اس وقت آپ کی عمر سات سال کی تھی۔ اور آپ ننھیال میں رہا کرتے تھے۔ غالباً سیدنا امام مھدی موعود علیہ السلام نے اسی طرح بی بیؓ کا فیض سویت کیا ہو گا۔ جس کا تتبع حضرت خلیفہ گروہ رضی اللہ عنہ نے کیا۔ حضرت مہدی موعود علیہ السلام کے وقت میں بہرۂ عام کا لفظ نہیں تھا۔ بعد میں وضع ہوا۔ اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ خلیفہ اپنے مرشد اور اپنے سلسلہ کے مرشدوں کا بہرۂ عام کرتا ہے۔ جن سے اس نے بہرہ لیا۔ بر خلاف اس کے مرشد اپنے خلیفہ کا بہرہ عام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مرشد نے اس سے تھوڑا ہی فیض لیا ہے جو بہرۂ عام کے موقع پر تقسیم کرے۔ سیدنا مھدی موعود علیہ السلام کی ذات اقدس تو دریائے فیض اور مرشد المرشدین تھی۔ اور سب کے سب صحابہؓ آپ کے فیض گیر اور بہرہ مند تھے۔ اس لئے مہدیؑ نے کسی صحابی کا بہرہ ءعام نہیں کیا۔

ام المومنین بی بی الٰہدادی علیھا السلام کا بہرہ عام جن خاندانوں میں کیا جاتا ہے وہ برکتاً اور اس واقعہ کی یادگار قائم رکھنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ خدا ہم سب کو افضل النسوان، خدیجہ ثانی، قاضیِ ولایت ام المومنین بی بی الٰہدادیؓ کے صدقہ میں رکھے۔ اور جو فیض دائرے میں سویت کیا گیا تھا۔ اس سے ہم سبھی بھی بہرہ مند ہوں۔ کیونکہ فیض مہدیؑ مطلق ہے اور جو مطلق ہے اس میں سے کتنا بھی دیا جائے۔ ایک رتی برابر بھی گھٹاؤ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اتنی ہی رہتا ہے جیسا کہ قرآن مجید اور درود شریف پڑھ کر جمع فاتحہ میں ہم صدہا بزرگان دین اور اپنے لواحقین کی ارواح کو بخشتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے اور ہم بھی اتنا ہی ثواب حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ثواب بھی غیر منقطع اور مطلق ہے۔

جو چیزیں معقولات، باطنی محسوسات اور روحانیت سے تعلق رکھتی ہیں وہ اپنی کمالِ لطافت کے باعث ہمیشہ غیر مرئی رہتی ہیں۔ لیکن باوجود نظروں سے اوجھل رہنے کے بھی ان کے اثرات سے ان کے وجود کی تمیز ہو جاتی ہیں۔ مثلاً بچہ کے منہ پر بوسہ دو۔ بوسہ میں جو محبت پوشیدہ ہے بچہ نہیں سمجھ سکتا لیکن محبت کا عکس اس کے دل کے کیمرے (فوکس) پر منعکس ہوتا ہے۔ جس سے وہ خوش ہو کر بے ساختہ ہنستے ہوئے آغوں آغوں کرنے لگ جاتا ہے۔

اس تمثیل میں بوسہ دینے والے کو وہ بزرگ سمجھیں جس کا بہرۂ عام ہے۔ محبت کے عکس کو اپنا مرشد جانیں یا جس مرشد کے دست مبارک سے نان ریزہ لیا جائے اور نان ریزہ یعنی فیض لینے والے کو ہنستا ہوا بچہ سمجھیں۔

املی کا پیڑ ہم سے پانچ فٹ کے فاصلہ پر پڑا ہوا ہے۔ جہاں ہمارا ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتا باوجود اس کے وائر لیس ٹیلی گرافی کی طرح تارِ نظر کے اسٹیشن پر ترشی کی خبر دیتا ہے جس سے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

جس طرح یہاں تارِ نظر واسطہ ہے۔ اسی طرح مرشد بھی واسطہ ہے جو صاحب بہرۂ عام کا فیض صدق عقیدت سے

دامن پسارنے والے کو دیتا ہے۔ تانبے کا طشت لو۔ اوپر مقناطیس اور نیچے سوئی رکھو۔ طشت ایسا ٹھوس اور اس کے مسامات ایسے سخت ملے ہوئے ہیں کہ اندر سے نہ تو پانی نکل سکتا ہے۔ نہ لطیف ہوا۔ بلکہ لطیف ترین روشنی بھی پار نہیں ہو سکتی۔ باوجود اس کے مقناطیسی قوت سوئی کو تھامے ہوئے ہے۔ اور جس طرح ہم مقناطیس کو طشت میں پھراتے ہیں۔ پیندے سے لگی ہوئی سوئی اسی طرح گھومتی ہے کہ گویا مقناطیس اور سوئی کے بیچ میں کوئی چیز حائل ہی نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ سوئی کو مقناطیس سے فیض حاصل کرنے میں کوئی چیز سدراہ نہیں ہو سکتی۔ اب ایک اور مثال بلکہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

احمد آباد میں میاں حاجی مالیؒ کو دفناتے وقت خود مھدی علیہ السلام قبر میں اترتے ہیں۔ اور حاجی مالیؒ کی میت ابھی آپؑ کے ہاتھوں میں ہی تھی کہ فرشتے آکر ہاتھوں ہاتھ ان کی میت لے گئے۔ آپ یہ کیفیت دیکھ کر مسکرائے اور صحابہؓ کے عرض کرنے پر آپ نے اس کی وجہ بھی بیان فرمادی۔ دائرہ معلی کے ایک فقیر نے حضور مہدی موعود علیہ السلام میں عرض کیا۔ "میں آج (چہلم کے روز) حاجی مالیؒ کی زیارت کو گیا تھا۔ دیکھا تو پہلے روز کے پھول ویسے ہی تر و تازہ ہیں" آپ نے فرمایا۔ پھولوں میں تر و تازدگی اور خوشبو اس وجہ سے ہے کہ میت کا کفن ذرا سا زمین کو لگ گیا تھا۔ عاشق خدا کو پھولوں سے خاص انسیت تھی۔ حاجی مالیؒ قبر میں کہاں ہیں! جاؤ، ان کی قبر کھود ڈالو کہ لوگ کہیں پرستش کرنے نہ لگ جائیں۔

دیکھئے کہاں میت کے کفن کا کنارہ اور کہاں قبر پر پھولوں کا ڈھیر۔ کفن اور پھول میں نہ تو جنسیت ہے اور نہ وصلت، بیچ میں قبر کی مٹی کا ڈھیر حائل ہے۔ باوصف اس کے حاجی مالیؒ کا عشق دونوں میں سرایت کر گیا اور باطنی مواصلت پیدا کر دی۔

بہرۂ عام کا نان ریزہ بھی یہی شان رکھتا ہے۔ جس طرح وہاں عشق واسطہ تھا۔ یہاں مرشد کامل واسطہ بن کر اپنی روحانی قوت جاذبہ سے فیضِ صاحب بہرہ عام حاصل کر کے خوانچہ میں داخل کرتا ہے۔ ایک منٹ پہلے ہی چنے جو محض اناج کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب فیض مھدیؑ داخل ہونے سے ناریزہ بن گئے۔ اگرچہ کہ ہم اس فیض کو اپنی چشم ظاہری سے نہیں دیکھ سکتے۔ اور دنیا کی جنجال میں پھنسے رہنے سے چشم باطن بھی اس کی لذت بے کیف کا احساس نہیں کر سکتی۔ پھر بھی ہم کو یقین کامل ہے کہ مرشد کے واسطے سے فیض مھدیؑ مل گیا۔

اس موقع پر ایک اور تمثیل بیان کی جاتی ہے۔ برسات کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ پہلا پانی پڑنے کے تین چار روز بعد ہم نے دیکھا کہ تل کا پودا ہمارے گھر کے صحن میں اگا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی ہمارا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ جاڑوں کے موسم میں ہم نے تلوں میں شکر ملا کر جو کھائے تھے اسی کا ایک دانہ یہاں گر گیا ہو گا۔ جو کامل آٹھ مہینے زمین میں پوشیدہ رہنے کے بعد اب نکل آیا۔ اسی طرح فیضِ مھدیؑ۔ یا فیض صحابہؓ یا ہمارے سلسلہ کے بزرگوں کا تخم فیض جو بہرۂ عام کے ناریزہ سے ہمارے دل

کی زمین میں ایسا گہرا بویا گیا ہے کہ اگر آج نہیں کل نہیں، پانچ سال کے بعد نہیں بلکہ دس سال کے بعد بھی نہ اوگا نہ سہی مرتے وقت توضرور بالضرور اگ اٹھے گا۔ اور ہم اس کا امرت پھل کھا کر زندۂ جاوید ہو جائیں گے۔ چنانچہ بندگی میاں شاہ نظام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "بندۂ خدا کے لئے تین موقعوں پر عطیات الٰہی وارد ہوتے ہیں۔ (۱) فقر وفاقہ کے ایام میں (۲) ہماری بیماری اور تکلیف وایذا کے زمانے میں (۳) انتقال کے وقت۔

گروہ پاک میں کیا ہی پیارا طریقہ ہے بہرۂ عام کے نام سے عطیہ فیض عام کا، جو بلا محنت ومشقت، بلا ذکر وریاضت، بلا محبتِ مرشد، محض پلہ پسار کر ناریزہ لینے سے حاصل ہوتا ہے اگر شرط ہے تو صرف یہی ہے کہ لیتے وقت کمالِ اخلاص اور عقیدت ہو۔ لیکن دوسرے پہلو پر جس طرح یہ فیض بآسانی حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر بد قسمتی سے بے ڈھنگ اسباب پیدا ہو گئے تو جاتے بھی دیر نہیں لگتی اور اس طرح جاتا ہے کہ جس طرح لندن سے دس پندرہ ہزار میل پر زمین کے کسی حصہ میں بھوں چال شروع ہوتے ہی وہاں کی رسد گاہ میں جو آلہ مقناطیس رکھا ہوا ہے۔ اس کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ جبکہ ایک مادی اور فانی چیز میں ہزاروں میل کے فاصلہ پر یہ اثر رکھا ہوا ہے تو روحانی فیض کے سلب ہو جانے سے کیا کچھ خرابی پیدا ہو جاتی ہو گی!!! (سراج منیر از حضرت قطب المرشدین صاحب پالنپوری)

فیض چونکہ غیر مرئی ہے یعنی دکھائی دینے والی چیز نہیں ہے اس لئے ظاہر پرست اس کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح فیض کا عطا کیا جانا ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ میرا کاروبار ہے نہ زراعت میں ہمیشہ آپ کی خدمت اور صحبت میں رہتا ہوں اور جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہی میرا سرمایہ ایمان ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میرا حافظہ کچھ کمزور ہو رہا ہے بہت سی باتیں جو آپ سے سنتا ہوں یاد نہیں رہتیں (جس کا مجھے ملال ہے) حضورؐ نے فرمایا ابو ھریرہ تم اپنا دامن پھیلاؤ۔ اس کے بعد حضور نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا پھر اسی ہاتھ کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے دامن میں رکھ دیا اور اس کے بعد فرمایا اس کو اٹھا لو۔ ابوہریرہؓ نے اس دامن کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سینے سے دامن کو لگاتے ہی مجھے عجیب سی ٹھنڈک سینے میں محسوس ہوئی اور اس کے بعد میرا حافظہ قوی ہو گیا کہ اب حضور سے سنی ہوتی کسی بات کو نہیں بھولتا۔

بدعت

سنت کے مقابلے میں بدعت کا لفظ کہا جاتا ہے۔ یہ بات ذہن نشیں ہونی چاہئے کہ مومن دین کا جو بھی کام کرے وہ قرآن شریف اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کرے۔ اس لئے کہ دین کی یہی دو بنیادیں ہیں۔ پس جو دینی کام ان اصول کے تحت ہوتا ہے وہ مقبول خدا ہوتا ہے۔ اور جو دینی کام ان اصول سے ہٹ کر ہوتا ہے وہ ''من پسند'' ہوتا ہے ''خدا پسند'' اور ''رسول پسند'' نہیں ہوتا۔ اس اصل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کام فرمایا یا آپ کے عہد مبارک میں جس چیز کی ضرورت محسوس کی گئی اور محدود وسائل کی وجہ سے معمولی طور پر وہ کام انجام پایا وہ سنت ہے اور آنحضرت نے جو کام نہیں فرمایا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی، بعد میں لوگوں نے اپنے خیال سے وہ کام کیا تو اس کو بدعت کہتے ہیں۔ یعنی امر دینی میں بندہ کی طرف سے نئی ایجاد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی مروی ہے مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا فَهُوَ بِدعَة۔ یعنی جس نے ہمارے اس امر (دین) میں کوئی نئی چیز نکالی وہ بدعت ہے پھر بدعت کا یہ حکم سنایا کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار۔ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے۔ اسی طرح مشکواۃ شریف باب الاعتصام میں حدیث آئی ہے کہ "مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ"۔ یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں وہ (عقیدہ یا عمل) ایجاد کرے جو دین کے خلاف ہو وہ مردود ہے۔

آج کل لوگوں نے اپنی کوتاہ فہمی اور تنگ نظری کے سبب ہر اس چیز کو جو انہیں نئی نظر آتی ہے بدعت کا حکم نہایت فراخ دلی کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔

قرآن میں بدعت کا لفظ جو استعمال کیا گیا ہے وہ اصلاً دین میں نئی ایجاد کے معنی میں ہے۔

چنانچہ قرآن میں دو جگہ اس لفظ کے مشتقات آئے ہیں۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۷ میں ہے: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا (اور رہبانیت کو خود انہوں نے ایجاد کیا تھا) اور سورۂ احقاف کی آیت ۹ میں ہے قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔ مطلب یہ کہ مجھ سے پہلے بھی رسول آئے ہیں میرا رسول بن کر آنا کوئی نئی ایجاد نہیں ہے۔

پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں (عیسائیوں) نے اپنی طرف سے رہبانیت کو ایجاد کر لیا تھا۔ پھر اس کے بعد اللہ نے جب ان کے ذوق و شوق کو دیکھ کر محض اپنی خوشنودی کے لئے جب ان کو اس کا حکم دیا تو انہوں نے اس کی رعایت جیسی کرنی چاہئے تھی نہیں کی۔

اور دوسری آیت میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اے محمد آپ ان سے کہدیجئے کہ تم آخر میری رسالت کا انکار کیوں کر رہے ہو جبکہ تم اس حقیقت سے واقف ہو کہ مجھ سے پہلے ہزاروں رسول آچکے ہیں۔ہاں اگر یہ معاملہ پہلی بار ہوتا کہ میں تمہاری طرف رسول بن کر آیا ہوں تو تم کہہ سکتے تھے کہ اب تک تو دنیا میں کوئی رسول نہیں بھیجا گیا۔اب تم کو کیوں بھیجا گیا ہے۔

دین کی جو ضروری باتیں تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حسب ضرورت و موقع بیان فرمادیا اوراس کا طریقہ بھی بتلادیا۔اب اگر کوئی اس طریقہ کے خلاف یابلاضرورت دینی ایک نیاطریقہ ایجاد کرتا ہے تواس کو بدعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چنانچہ آنحضرتؐ نے جب مسجد کی ضرورت محسوس کی تو مسجد تعمیر فرمائی۔اوراس وقت کے حالات کے تحت چھت گھاس پھوس کی رہی۔بعد میں حالات اچھے ہوئے تو مسجد کو شاندار طریقے سے بنایا گیا۔ظاہر ہے کہ اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔اسی طرح آنحضرتؐ نے تعلیم وتربیت کی غرض سے مسجد نبوی سے ملحقہ ایک حصے میں ایک چبوترہ بنایا جسکو "صفہ" کہتے ہیں۔وہاں وہ لوگ رہا کرتے تھے جو صرف حضور کے پاس تعلیم وتربیت کی غرض سے آتے تھے اور جن کے نہ مکانات تھے اور نہ کوئی دنیوی مشغلہ۔یعنی نہ وہ تجارت کرتے تھے اور نہ زراعت۔بعد میں اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مدارس بنائے گئے اسی طرح خانقاہیں اور دائرے بنائے گئے تھے،اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔

پہلے سفر کے لئے اونٹ تھے۔بعد میں سائیکل۔موٹر گاڑیاں۔بسیں اور ہوائی جہاز ایجاد کئے گئے۔پس ان کو بھی بدعت نہیں کہہ سکتے۔

خصوصاً وہ امور جن کا تعلق دین سے نہیں ہے ان میں اگر تبدیلی آئے تو اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے۔پہلے کے کھانے،کپڑے،مکانات دکانات وغیرہ کی وضع اور شکل آج کچھ بھی نہیں ہے۔سب طور طریق بدل گئے ہیں لیکن ان کو کوئی بدعت نہیں کہتا۔

نیز مرقاۃ شرح مشکواۃ میں باب الاعتصام بالکتاب والسنتہ میں ہے"قال النووی البدعۃ کل شئ عمل علی غیر مثال سبق۔یعنی بدعت وہ کام ہے جو بغیر گذری مثال کے کیا جاوے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا کام کیا جائے یا ایسا عقیدہ اختیار کیا جائے جس کی مثال حضور علیہ السلام کے زمانے میں

نہ ہو۔(پس ایسا عقیدہ یا عمل مردود ہے)

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چونکہ حدیث میں لفظ "ما" مطلق ہے جس کا اطلاق عقیدے پر بھی ہوتا ہے اور عمل پر بھی۔

پس بدعت کی دو قسمیں ہوئیں (۱) بدعت اعتقادی (۲) بدعت عملی۔ جملہ بدعات خواہ وہ اعتقادی ہوں کہ عملی مردود ہیں۔ لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی عموماً اور خلفاء راشدین کی خصوصاً تعریف فرماتے ہوئے ان کی سنت کو اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے اس لئے اس کو ادباً سنت الخلفاء یا سنت صحابہ کہیں گے۔ حالانکہ حضرت عمر فاروقؓ نے جب تیس تراویح امام کے پیچھے پڑھنے کو کہا تو خود آپ نے فرمایا نعم البدعۃ ھذہ۔ یہ کیا ہی اچھی بدعت ہے۔

بدعات اعتقادیہ میں یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے پر قادر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم جیسے بشر ہیں۔ حضور کو علم غیب یا علم ماکان ومایکون عطا نہیں ہوا تھا۔

بدعات عملیہ میں صلوٰۃ عاشورا، سات بی بیوں کے روزے اور ہر وہ کام جو سنت رسول ﷺ کے خلاف ہے۔

اگر ہر نئی چیز پر بدعت کا اطلاق کرنے لگیں تو بدعات کی اک لمبی چوڑی فہرست بدعتوں کی ہمارے سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر:

ایمان: مسلمان کے بچے بچے کو ایمان مجمل اور ایمان مفصل یاد کرایا جاتا ہے۔ ایمان کی یہ دونوں قسمیں اور ایمان کے یہ دونوں نام بدعت ہیں کیوں کہ قرون ثلاثہ میں ان کا پتہ نہیں تھا، کیا یہ صحیح ہے؟

کلمہ: ہر مسلمان بچہ پانچ کلمہ یاد کرتا ہے۔ ان کی تعداد، ترتیب کہ پہلا کلمہ یہ ہے دوسرا کلمہ یہ ہے بدعت ہے کہ قرون ثلاثہ میں ان کا پتہ نہیں تھا، کیا یہ صحیح ہے؟

قرآن: قرآن شریف کے تیس پارے بنانا۔ ان میں رکوع قائم کرنا۔ قرآنی الفاظ پر اعراب لگانا، اس کی روپہلی، سنہری جلدیں بنانا، قرآن کو بلاک بنا کر چھاپنا یہ سب بدعت ہیں کہ ان کا قرون ثلاثہ میں ذکر بھی نہیں ملتا، کیا یہ صحیح ہے؟

حدیث: احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا۔ احادیث کی اسناد بیان کرنا۔ اسناد پر جرح کرنا۔ احادیث کی قسمیں بنانا کہ یہ صحیح ہے یہ حسن ہے، یہ ضعیف ہے وغیرہ پھر ان میں ترتیب دینا کہ اول نمبر صحیح ہے، دوم نمبر حسن ہے سوم نمبر ضعیف۔ پھر ان کے احکام مقرر کرنا کہ حلال حرام چیزیں صحیح حدیث سے ثابت ہوتی ہیں اور فضائل میں حدیث ضعیف بھی معتبر ہوگی۔ غرض

کہ سارا فن حدیث ایسی بدعت ہے جس کا قرون ثلاثہ میں ذکر بھی نہ تھا، کیا ایسا کہنا صحیح ہے ؟

اصول حدیث: یہ فن تو بالکل بدعت ہے۔ بلکہ اس کا نام بھی بدعت ہے۔ اس کے سارے قواعد و قوانین سب بدعت ہیں۔

فقہ: اسی پر آج کل دین کا دارومدار ہے۔ مگر یہ بھی از اول تا آخر بدعت ہے جس کا قرون ثلاثہ میں ذکر بھی نہیں ملتا۔

اصول فقہ اور علم کلام: یہ علم بھی بالکل بدعت ہے۔ اس کے قواعد وضوابط سب کے سب بدعت ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب بدعات ہیں ؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہاں یہ بدعات ہیں مگر حسنہ ہیں۔ سیۂ نہیں ہیں۔ مگر اس جواب سے دل کو تسلی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بدعت تو بدعت ہے۔

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ بدعت کے معنی کسی شئے کے ایجاد کرنے کے ہیں۔ مذکورہ بالا جو عنوان بنائے گئے ہیں ان میں ایک عنوان پر بھی بدعت کا لفظ یا مفہوم صادق ہی نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ درس و تدریس کے لئے، اغلاط سے بچانے کے لئے۔ مفسدین کے فساد سے محفوظ کرنے کے لئے، سچ کو جھوٹ سے، غلط کو صحیح سے ممتاز کرنے کے لئے، جو طریقے قرآن اوراحادیث میں اختیار کئے ہوئے ہیں ان کو ہی پیش کیا گیا ہے۔ ان کو بدعات کے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ چیزیں تو تھیں لیکن بعد کے زمانے میں ''ان کو'' ہی بہتر طور پر بنا کر، سجا کر، آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کیا گیا ہے اور ایسا رنگ وروغن لگایا گیا ہے کہ قیامت تک وہ چیزیں مفسدہ پردازوں کی خورد وبرد سے محفوظ رہ جائیں۔

جب مہدی علیہ السلام سے کہا گیا کہ لوگوں نے بدعت کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک بدعت حسنہ اور دوسری بدعت سیئیہ۔ تو آپ نے فرمایا وہ کونسی بدعت ہے جو حسنہ ہو سکتی ہے۔ یعنی بدعت تو بدعت ہی ہے، لاریب حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی بعثت کا مقصد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنا اور بدعتوں کو مٹانا تھا۔ آپ سے پہلے جن لوگوں نے بدعت حسنہ کے نام پر جو امور خلاف سنت انجام دیتے تھے آپ نے ان پر چلیپے کا نشان لگا دیا اور حقیقی سنتوں کا احیاء فرمایا۔

بیان

بیان کے معنی ہیں کسی لفظ یا مضمون یا عبارت کو واضح کرنا۔ اللہ نے حضرت مہدی علیہ السلام کو مبین مراد اللہ بنا کر مبعوث فرمایا۔ اللہ نے قرآن میں "ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" ﴿القیامۃ:۱۹﴾ پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے، کے ذریعہ اس کے بیان کی جو ذمہ داری قبول فرمائی تھی اس کی ادائی حضرت مہدی علیہ السلام کی بعثت کے ذریعہ پوری فرمائی۔ اور چونکہ یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی تھی اسی لئے اللہ نے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں رکھا اس لئے مہدی علیہ السلام نے فرمایا "اگر بندہ خلوت میں قرآن کا مطالعہ کر کے معانی سوچ کر باہر آتا ہے اور بیان کرتا ہے، تو بندہ ظالم اور مفتری علی اللہ ہو جائے گا۔ بندہ جو کچھ کہتا، کرتا اور سناتا ہے اللہ کے حکم سے کہتا ہے کرتا اور سناتا ہے۔ بندہ کو اللہ کی طرف سے روزانہ بلا واسطہ تعلیم دی جاتی ہے۔

اس بات کو لے کر مخالفین حضرت مہدی علیہ السلام پر اور مہدویہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ مہدویہ حضرت مہدی علیہ السلام پر اللہ کی جانب سے وحی نازل ہونے کے قائل ہیں۔ اور در پردہ مہدی علیہ السلام کو نبی مانتے ہیں۔ حالانکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ پر نبوت ختم ہو چکی ہے اور قیامت تک کوئی نبی آنے والا نہیں ہے یہ اعتراض محض اعتراض ہے۔ حقائق سے اس کو کوئی نسبت نہیں ہے اس لئے کہ:

(۱) مہدی موعود علیہ السلام نے کسی وقت نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ حالانکہ نبی اور رسول کے لئے "نبوت یا رسالت کا دعوی" کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مہدی علیہ السلام نے دعویٰ "منصب مہدیت" کا فرمایا ہے۔

(۲) نیز یہ بات بھی اہم ہے کہ "نبوت لازمہ وحی نہیں ہے" یعنی جس پر وحی بلا واسطہ ہو جائے تو نبی بن جائے گا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی ہونے کا ذکر خود اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے۔

(۳) اسی طرح شہد کی مکھیوں کو وحی ہونے کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی نبی نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے تعلق سے فرمایا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿یوسف:۱۵﴾ یعنی ہم نے وحی بھیجی یوسف کی طرف کہ تم ان کی بد سلوکی سے انہیں باخبر کرو گے۔ اس وقت یوسف علیہ السلام سترہ برس کے تھے اور نبی نہیں تھے۔ ان وجوہ کی بناء پر اگر مہدی علیہ السلام کے تعلق سے کہیں "وحی" کا لفظ آ بھی جائے تو وہ نبی بنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔

(۴) گویا نبوت لازم وحی نہیں ہے۔ بلکہ وحی لازمۂ نبوت ہے۔ یعنی جس پر وحی ہو گئی ہو اس کا نبی ہونا لازمی نہیں ہے

بلکہ جس کو نبوت دی گئی ہو اس کا صاحب وحی ہونا ضروری ہے۔ وہ بھی وہ وحی جس میں یہ اعلان ہو کہ اللہ نے اس ہستی کو نبوت دی ہے۔

حضرت مہدی علیہ السلام نے اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ یہ ہیں: علمت من الله بلا واســـطتة جديد اليوم۔ یعنی مجھے اللہ کی جانب سے روزانہ نئ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح سے آپ نے اعلان فرمادیا کہ آپ کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ بلا واسطہ جبرئیل ہے۔ چنانچہ آپ نے ان الفاظ میں مزید وضاحت فرمادی۔ "کہ یہاں تعلیم بلا واسطہ جبرئیل ہے"۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں غیر نبی کے لئے قرآن میں وحی کا لفظ آیا ہے اس سے مراد الہام ہے۔

بیان قرآن

اولیاء اللہ کو الہام خداوندی ہونے کے بارے میں کسی کو انکار نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک مرتبہ خدا کے حکم سے فرمایا "قدمي هذه على رقبة كل ولي" میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے، اور اس حکم کا انکار کرنے والا خدا کے پاس ماخوذ بھی ہوا اور معتوب بھی کہ اس کی ولایت سلب کرلی گئی اور اسے خوکبانی (خنزیر چرانا) نصیب ہوئی۔ اس بات کو سب مانتے ہیں۔ کیا یہاں بھی حضرت مہدی علیہ السلام کا مخالف یہ کہے گا کہ شیخ عبداقادر جیلانیؒ بھی نبی تھے۔ کیوں کہ ان کو خدا کا حکم بھی ہوا اور اس حکم کے انکار پر وہ منکر ماخوذ بھی ہوا۔

نیز قابل غور بات یہ بھی ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے جہاں یہ فرمایا علمت من الله بلا واســـطتة جديد اليوم۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا قل اني عبد الله تابع محمد رسول الله۔

خلاصہ کلام یہ کہ نبی پر وحی کا نزول فرشتہ کے واسطے سے ہوتا ہے اور کبھی بلا واسطہ بھی اور اولیاء کرام کو بلا واسطہ جبرئیل محض الہامات وغیرہ سے ہی معارف الٰہیہ اور اسرار روحانی کی تعلیم ہوتی ہے اس لئے ان کو دعویٰ جبرئیل نہیں ہوتا یا دعوی نبوت نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظم فرماتے ہیں: (۱) انبیاء کو نبوت کا نام دیا گیا اور ہم کو لقب یعنی ہمارے لئے نبی کا نام ممنوع کردیا گیا۔ حالانکہ حق تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول کے کلام کے معانی سے ہم کو بھی اسرار کے طور پر خبر دیتا ہے۔

اسی طرح حضرت محی الدین بن عربی حدیث كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّين کی شرح فرماتے ہوئے کہتے ہیں: وغيره من الانبياء ماكان نَبِيًّا إلّاحين بعث و كذالك خاتم الاولياء كان وليًّا و آدم بين الماء والطين وغيره من الاولياء ما كان وليا الا بعد تحصيل شرائط الولايته۔

ازلی نبی ہونے کی خصوصیت حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے ہے آپ کے سوا جتنے انبیاء ہیں وہ نبی اس وقت ہوئے جبکہ ان کی بعثت ہوئی اوراسی طرح خاتم الاولیاء اس وقت سے ولی ہیں جب کہ آدمؑ پانی اور مٹی میں تھے جب کہ دیگر اولیاء اس وقت ولی ہوتے ہیں جبکہ وہ ولایت کے شرائط حاصل کرلیں۔

اس سے صاف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امامنا علیہ السلام کا بیان تعلیم کسبی کا مرہون نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد تعلیم وہبی تھی۔ یعنی خدا کی جانب سے آپ کو بلاواسطہ تعلیم ہوا کرتی تھی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ نے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے فضل ہے اور سید محمد مہدی کو بیان قرآن سے فضل ہے۔ اور آپ وارث قرآن ہیں۔ (انصاف نامہ ۳۷۶)

پس جہاں قرآن کی وراثت ہے یہی فضل کافی ہے (ص:۳۷۷)

اس کے علاوہ سیدنا مہدی علیہ السلام جمیع کتب آسمانی وصحائف انبیاء ازبر ہونے کی نسبت فرماتے ہیں کہ "توریت و انجیل وزبور وفرقان وصحائف بیارید، بندہ آں راازبر می خواند۔ واگر آں راازبر نخواند، مہدی موعود نباشد (معارج الولایت۔ ب:۱۱، مأخوذ از سراج منیر۔ ص:۵۱)

نیز بندگی میاں سید محمود، معارج الولایت میں لکھتے ہیں "چنانچہ فصاحت وبلاغت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدرجہ اعلیٰ مرتبہ اعلیٰ وبمرتبہ کمال بود، وبجوامع الکلم وبدائع حکم مخصوص، وزبان ہمہ قبائل وطوائف ارباب حسب ونسب می دانست، وباہر کس بزبان وے سخن می گفت، ہم چنیں حضرت مہدی علیہ السلام فصیح وبلیغ بود کہ ہمہ علماء وفضلاء زماں متحیر ماندے وبسیار اوقات گفتے کہ بعد از رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ایں چنیں بلیغ وفصیح دردنیا نیامد ووقت بیان حضرت مہدی علیہ السلام سوالات مختلفہ ہمہ کساں حل شدندے۔ وہمہ کس درزبان خود بیان حضرت رامی فہمیدے، وسوالات مشکلہ خود را حل می نمودندے۔

حضرت امام علیہ السلام کے بیان قرآن کے اثر کی نسبت مصنف انصاف نامہ لکھتے ہیں کہ عصر ومغرب کے درمیان بیان قرآن سننے کے بعد نماز مغرب پڑھ کر صحابہ اپنے اپنے حجروں میں جاتے وقت اس استغراق کی وجہ سے جو بیان قرآن سننے کی وجہ سے پیدا ہوتا تھا۔ بعض حضرات راستے ہی میں گر پڑے۔ اور بعض حضرات عالم محویت میں ان کو روندتے جاتے۔ نہ روند نے والوں کو یہ خبر کہ کس کو اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں اور نہ روندے جانے والوں کو یہ معلوم کہ ہم کو روند کر کون جارہے ہیں۔

خبر بسمل کی بسمل کو نہیں پہروں یہ حالت ہے الگ میں لوٹتا ہوں، دل تڑپتا ہے جداگانہ (توحید مرحوم)

امامنا مہدی علیہ السلام جب حج کعبتہ اللہ سے فارغ ہو کر ۹۰۲ھ میں احمد آباد تشریف لائے اور تاج خاں سالار کی مسجد میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے بیان قرآن کا غلغلہ بہت بلند ہوا اور لوگ جوق در جوق تصدیق مہدی علیہ السلام سے مشرف ہونے لگے۔ یہاں تک کہ خود سلطان محمود بیگڑھ کے محلات شاہی میں اس کے بھانجے، اس کی بہنیں، اور بیٹی نے مذہب مہدویہ اختیار کر لیا۔ غریبوں کے ساتھ امیروں کی تعداد بھی بڑھتی گئی تو مشائخوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان کو خوف ہوا کہ اب ہماری عزت وریاست نہیں رہے گی۔

اس کے بعد علماء نے بادشاہ سے کہہ کر وہاں سے آپ کا اخراج کروادیا۔ جب اخراج نامہ حضرت مہدی علیہ السلام کو ملا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ ''آخر اخراج کی وجہ کیا ہے'' تو جواب دیا گیا کہ علماء نے بادشاہ کے پاس شکایت پیش کی ہے کہ آپ حقائق بیان فرماتے ہیں۔ اور جہاں حقائق بیان فرماتے ہیں وہاں سلطان اور سلطنت کو بڑا نقصان ہوتا ہے''۔

یہ سن کر حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا'' یہ نادان کیا جانیں۔ میں شریعت مصطفی بیان کر رہا ہوں۔ اگر میں حقائق بیان کروں گا تو تم جل جاؤ گے (موالید مہدی)

پھر جب مہدی علیہ السلام فراہ مبارک تشریف لے گئے تو وہاں جو بیان ہوا تو خود اصحاب مہدی علیہ السلام کہنے لگے۔

ایسے ایسے نکات اور حقائق پہلے کبھی بیان نہیں ہوئے تھے،

حضرت بندگی میراں سید محمود ثانی مہدی رضی اللہ عنہ کا بیان قرآن:۔ حضرت ثانی مہدی کا بیان قرآن بھی، حضرت مہدی علیہ السلام کی صحبت، سیر نبوت کی بشارت اور نظر فیض اثر سے خاص شان رکھتا تھا۔ آپ کے بیان میں بھی وہی اثر تھا جو حضرت مہدی علیہ السلام کے بیان میں تھا۔ آپ کی تاثیر بیان کے قائل نہ صرف مصدقین مہدی علیہ السلام تھے۔ بلکہ مخالفین میں بھی اس کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ علمائے احمد آباد نے سلطان مظفر ثانی کو جو شکایتی عرضی لکھی تھی وہ اس طرح تھی۔ ''بندگی میراں سید محمود بیان قرآن کے ذریعہ مخلوق کو دعوت الی اللہ کرتے ہیں اور اس کی طرف ترغیب دیتے ہیں اور ان کے پاس اژدھام زیادہ ہوتا ہے۔ اور ان کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ انہوں نے جابجا اپنے خلیفوں کو مقرر فرمایا ہے اور بادشاہوں سے کافی لوگ ان کے معتقد ہو گئے ہیں۔ یہ مسلمانوں (منکران مہدی کو) کافر کہتے ہیں۔ اس بناء پر بادشاہ اسلام کے لئے لازم ہے کہ اس فتنے کو قبل اس کے کہ زیادہ قوت پکڑلے مٹادے۔ اور اس کو دور کرے۔ اگر اسی طریقہ پر یہ معاملہ طول پکڑلے گا تو زیادہ لوگ گمراہ ہو جائیں گے اور اس فساد کو دور کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اور بادشاہوں پر یہ فساد دور کرنا فرض ہے۔''

اسی عرضداشت کی وجہ سے ۹۱۸ھ میں بیڑیاں پہنوائی گئیں اور آپ پر بڑے مظالم ڈھائے گئے۔ بیڑیوں کی وجہ سے آپ کے پاؤں میں ناسور پڑ گئے۔ مگر تبلیغ دین کی اہمیت کے پیش نظر آپ اس ناقابل برداشت تکلیف کے باوجود ڈولی میں بیٹھ کر مسجد میں تشریف لاتے اور حسب اتباع حضرت مہدی موعود، بیان قرآن فرماتے۔ ماشاء اللہ بیان قرآن کی وہ شان تھی کہ سامعین کی آنکھوں میں مہدی علیہ السلام کے بیان کا سماں بندھ جاتا تھا۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیر پر صدیق ولایت سید الشہدا کا بیان قرآن: آپ کے بیان قرآن اوراس کے اثر کی نسبت صرف اتنا کافی ہے کہ احمد آباد میں سانبھر متی کے کنارے وقت واحد میں آپ کا بیان قرآن سن کر لاکھوں لوگ تصدیق مہدی سے مشرف ہوئے۔ اور کل سات لاکھ مہدیوں میں سے تین لاکھ نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی جس کی وجہ سے ملاؤں نے مارے حسد کے بیس سال میں بیس جگہ سے اخراج کروایا۔

آپ کے بیان کی نسبت انتخاب المو الید میں لکھا ہے "دوسری خصوصیت یہ کہ آپ نے حضرت مہدی علیہ السلام کی زبان مبارک سے بیان قرآن الم کے الف سے والناس تک سن کر یاد رکھا تھا۔

حضرت بندگی میاں رضی اللہ عنہ نے بارہا فرمایا "بیان از زبان حضرت مہدی علیہ السلام از الف تا والناس بندہ را یاد است۔ مگر معانی حروف مقطعات و دوسہ آیات دیگر چنانچہ از زبان مہدی علیہ السلام شنیدہ بودم، یاد نیست، و بوقت بیان آں، امر خدائے تعالیٰ می شود۔ اے سید خوندمیر مراد آں آیات آں است، و سید محمد ایں چنیں بیان کردہ بود۔

حضرت بندگی میاں ولی یوسف، انصاف نامہ کے تیرھویں باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ بندگی میاں رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں بیان قرآن کے وقت تفسیریں رکھی جاتیں۔ مشکل آیات آنے پر آپ فرماتے "دیکھو تفسیروں میں کیا لکھا ہے "لوگ پڑھ کر سناتے تو آپ فرماتے "خوب نہ گفتند" اور بعض کی نسبت فرماتے "بارے چیزے گفتند" پھر آپ آنکھیں بند کر لیتے اور کچھ دیر کے بعد کھول کر مشکل مشکل مسائل اس عمدگی سے بیان فرماتے کہ تمام برادران مجلس کی مشکلیں حل ہو جاتیں اور بول اٹھتے۔ معنی قرآن ایں است چنانکہ بندگی میاں می فرمودند۔ بیان قرآن یہ ہے جیسا کہ بندگی میاں فرماتے ہیں۔

In this period religious life seeks its foundation in a kind and melaphysics a logically consistent view of the world with God ,as a part that view ,In the third period melaphysics is

displaced by psychology and religious life develops the ambition to come into direct contract with the ultimate reality ,it is here that religion becomes a matter of personal assimilation of life and power,and the individual achieves a free personality not by releasing himself from the fetters of law ,but by discovering ultimate source of the law within the depths of his own consciousness,As in the words of a muslim sufi "no understanding of the Holy book is possible until it is actually revealed to the believer just as it was revealed to the prophet.{page - 170 ,The reconstruction of religion thoughts in Islam ,By Sir Mohammed Iqbal -1934}

بعثت مہدی موعود علیہ السلام

تمام مسلمان واقف ہیں کہ اہلِ سنت کے دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک متکلمین دوسرے محققین یا صوفیاء کرام۔ ان دونوں کے اُصول باہم مختلف ہیں۔ اگرچہ کہ ان دونوں کا ماخذ قرآن شریف اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ لیکن ان کا طریقۂ استدلال ایک دوسرے سے علحدہ ہے اور ہر ایک کی اصطلاحات اور مسائل جدا جدا ہیں۔ لیکن لاکھوں کروڑوں اہل سنت جو صوفیائے کرام اور اولیائے عظّام سے عقیدت اور اس مسلک کے نکات اور رموز سے واقفیت رکھتے ہیں۔ کبھی ان مسائل کو اہلِ سنت کے خلاف کہہ کر خود کو موردِ الزام قرار دے لینے کی جرأت نہیں کرتے۔ پس حضرت مہدیؑ کی ذات اقدس کے بارے میں خاتمِ دین، خاتمِ الاولیاء اور خاتم ولایت محمدیہ ﷺ کے القابات محققین اہل سنت کے قرار دادہ ہیں۔

یہ عام قاعدہ سب جانتے ہیں کہ کسی شخص خاص کی نسبت جو اطلاقات یا احکام عائد ہوتے ہیں۔ وہ یا تو اس کی ذات سے متعلق ہوتے ہیں یا اس کے کسی منصب و حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں، جو احکام اور اطلاقات کسی منصب و حیثیت سے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ اس منصب سے قطع نظر کر کے کبھی عاید نہیں کئے جاتے۔ مثلاً زید ایک سرکاری اعلیٰ عہدہ دار ہے۔ وہ تمام اختیارات و اعزازات جو اسکو اس عہدہ کی حیثیت سے حاصل ہیں وہ اس کے خاص عہدہ اور مذہب ہی سے متعلق ہوں گے۔ اگر کوئی کہے کہ زید کو یہ اختیارات و اعزازات کیوں اور کس طرح حاصل ہیں۔ تو اس کا جواب یہی ہو گا کہ اس کو اس عہدہ کی وجہ سے حاصل ہیں کہ اس کے عہدہ اور منصب کے یہ لوازمات ہیں۔

اس اُصول پر ہم سب مسلمان حضرت سرور کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفی ﷺ کی ذاتِ اقدس کی نسبت جن فضائل کا اعتقاد رکھتے ہیں مثلاً حضرت کا معصوم عن الخطاء ہونا۔ حضرت کی تصدیق عامۂ خلائق پر فرض اور حضرت کا انکار کفر ہونا وغیرہ، وہ آپ کے خلیفہ اللہ، رسول صادق، پیغمبر برحق اور خاتم النبیّن سید المرسلین ہونے کے حیثیت سے رکھتے ہیں نہ کہ صرف محمد بن عبد اللہ ہونے کے اعتبار سے۔ بعض غیر مسلم حضرات و دیگر اقوام نے حضرت کی اس ذات اقدس کو اس اعلیٰ حیثیت سے قطع نظر کر کے صرف ذاتِ محمد ﷺ پر ان فضائل کا اطلاق کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح مہدویہ بھی جن فضائل و کمالات کو حضرت سید محمد جونپوریؑ کی ذاتِ اقدس سے متعلق ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ آپ کے مہدی موعود، خلیفۃ اللہ، معصوم عن الخطاء یا بہ اصطلاح صوفیاء، خاتم الاولیاء۔ اور آپؑ کی تصدیق فرض اور انکار کفر ہونے کا جو اعتقاد رکھتے ہیں وہ آپ کے مہدی موعود اور خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ پس جن لوگوں نے حضرت کی اعلیٰ اور ممتاز حیثیت و منصب سے ہٹ کر مہدویہ کے عقائد کو محض ذاتِ سید محمد جونپوری سے وابستہ کر کے دکھلانے

کی کوشش کی ہے صحیح نہیں ہے۔ اگر اس کے بجائے یہ بات تحقیق طلب قرار دی جائے کہ حضرت مہدی موعودؑ کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنا صحیح ہے یا نہیں تو اصل معاملہ صاف ہو جاتا ہے کہ یہ عقائد مہدویہ سے مخصوص ہیں۔ یا اکابرین اہل سنت بھی ان عقائد کے قائل ہیں۔

اس ضابطہ کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ خصم کے جس قدر مسلّمات ہوں وہ سب فریق مقابل کے مسلّمات سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ کسی خاص شخص کے بعض اقوال و دلائل کو مناظرہ کے وقت پیش کرنا بطور حجت الزامی کے ہوتا ہے۔

اس سے اس کے دوسرے اقوال و دلائل کا تسلیم کرنا لازمی نہیں آتا یہی وجہ ہے کہ قانوناً بھی متخاصمین میں سے ایک فریق مقابل پر الزام نہیں قائم ہو سکتا۔ تمام مذہبی مسائل میں یہی اُصول ملحوظ رہا ہے اور مناظرہ کا عام قاعدہ بھی یہی ہے۔ اس موقعہ پر جس قدر دلائل ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے بعض تو وہ قطعی دلائل ہیں کہ جن کا ماننا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ جیسے آیاتِ قرآنی اور صحیح احادیث رسالت پناہی۔ ان کے علاوہ غیر صحیح احادیث سے حجت کرنا اور بعض محدثین و علماء کا اپنے ذاتی اقوال و آرا کا پیش کرنا، اس ضابطہ کے موافق ہمارے مسلمات سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ پس جس طرح ہر معتبر و غیر معتبر اسلامی کتاب میں جو بات بھی موجود ہو اس کو کوئی معاند اِسلام پیش کر کے آنحضرت ﷺ ارواحنا فداہ یا مذہب اِسلام پر اعتراض نہیں کر سکتا جب تک اس کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف صحیح نہ ثابت کرے۔ اسی طرح کسی معترض کا کسی بھی مہدوی مولف کی کتاب میں جو بات لکھی ہو اس کو پیش کر کے حضرت مہدیؑ یا مذہب مہدویہ پر کوئی اعتراض کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کی نسبت حضرت امامنا مہدی موعودؑ کی طرف صحیح نہ ثابت ہو یا وہ قول و فعل و عقیدہ مہدویہ کے مسلمات سے نہ ہو۔

اس مختصر تمہید و تبصرہ کے بعد یہ دلچسپ بحث کی جاتی ہے کہ احادیث صحیحہ کی روشنی میں ظہور مہدی موعودؑ کا اعتقاد رکھنا ایک مسلمان کے لئے کہاں تک ضروری ہے۔ گزشتہ زمانہ کے حالات یا آئندہ زمانہ میں ہونے والے واقعات کی اطلاع منجانب اللہ یا ان نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ جو علمِ غیب ازلی سے مویّد ہیں ہم تک پہنچے تو اس کو شرعی اصطلاح میں خبر مغیب کہا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر خبرِ مغیب کا اطلاق ان واقعات پر کیا جاتا ہے جو زمانۂ مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن کا ظہور زمانۂ آئندہ میں ہونے والا ہے۔ ان اخبار مغیب میں بعض تو ایسے ہیں جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی یا اس کی اُمّت کو دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے انبیاء سابقین پر جو کتابیں نازل فرمائیں ہیں۔ ان میں اس قسم کے بے شمار اخبار مغیب پائے جاتے ہیں۔ جن میں خدائے تعالیٰ نے آئندہ کسی واقعہ کی یا کسی نبی کے ظہور کی خبر دی ہے۔ مثلاً خدائے تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی

حضرت بی بی سارہ کے متعلق فرمایا"فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ"﴿ھود:۷۱﴾یعنی ہم نے سارہ کو بشارت دی کہ تم کو اسحاقؑ پیدا ہوں گے۔اور پھر اسحاقؑ کو یعقوبؑ۔

حضرت ابراہیمؑ نے دُعا کی تھی کہ"رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ"﴿الصافات:۱۰۱،۱۰۰﴾ کہ اے میرے رب مجھے ایک صالح لڑکا عطا فرما۔تو ہم نے ان کو خوشخبری دی کہ تم کو ایک حلیم لڑکا(اسماعیلؑ)پیدا ہوں گے۔

اور بعض اخبار مغیب ایسے ہیں کہ وہ خود کسی نبی کا قول ہیں جو انھوں نے اپنے متبعین سے کہا ہے۔مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی وہ پیشین گوئیاں ہیں۔جو انہوں نے حضرت رسول اللہ ﷺ کے ظہور کی نسبت فرمائی ہیں اسی قبیل سے ہیں۔

اسی عادت اللہ اور سنتِ انبیاء کے موافق قرآن شریف اور احادیثِ رسول اکرم ﷺ میں بھی بہت سے اخبار مغیب پائے جاتے ہیں۔مثلاً خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ ﴿الروم:۳،۲،۱﴾ ترجمہ:رومی اہلِ ایران کے مقابلے میں مغلوب ہو گئے ہیں۔لیکن یہ لوگ چند سال میں اہلِ ایران پر پھر غالب آجائیں گے۔اور اس قسم کی خبر مغیب بھی ایسے واقعات کے متعلق دی گئی ہے۔جو نزولِ آیت کے وقت ظہور پذیر نہ ہوئے تھے۔اور بعد میں ان کا ظہور ہونے والا تھا۔چنانچہ اسکی تفصیل آگے آتی ہے۔

احادیثِ رسول اللہ ﷺ میں بھی بے شمار اخبار مغیب موجود ہیں۔مثلاً سراقہؓ کو آپ ﷺ کا ارشاد"کیف اذا البست سِوَارَيْ کسریٰ"یعنی وہ وقت کیسا ہو گا جب تمہیں کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے۔یا فرمایا۔لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ، تُضِيءُ أَعْنَاقَ الْإِبْلِ بِبُصْرَى۔یعنی اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ حجاز میں ایسی آگ نہ لگے جس سے بصریٰ میں اونٹ کی گردنیں دکھائی دیں۔

لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ان اسلامی اخبار مغیب میں بھی خواہ قرآن شریف میں مذکور ہوئے یا احادیثِ رسالت پناہی میں۔ان سب میں اخبار مغیب کے لوازمات مثلاً ایہام،ابہام،اجمال،کنایہ وغیرہ اکثر ملحوظ رہے ہیں۔اور تفصیل و تصریح سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔اسی لئے ان میں سے بعض کی نسبت صحیح رائے کے قائم کرنے میں ماو شما کا کیا ذکر ہے خود جلیل القدر صحابہ بھی قاصر رہے ہیں۔چنانچہ غلبہ ُروم کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ابی بن خلف سے تین سال کی شرط باندھ لی اور حضرت رسول ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ ایران پر غلبہ ُروم کے بارے میں خدائے تعالیٰ نے بضع کا

لفظ استعمال فرمایاہے۔ اور بضع، تین سے نو تک ہے۔ تم مدتِ شرط بڑھادو اور مقدار شرط زیادہ کردو۔ جس پر حضرت صدیقؓ نے شرط کی مدّت تین سال سے نو سال اور مقدار شرط دس (۱۰) اونٹ سے بڑھا کر سو (۱۰۰) اونٹ کردی۔ چنانچہ ے ھ ساتھ ہجری کے اوائل میں صلح حدیبیہ کے دن رومیوں کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہوئی۔ اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے جب رسول اللہ ﷺ سے مکہ معظمہ میں داخل ہونے کی پیشین گوئی سنی تو یہ خیال کرلیا کہ اسی سال ایسا واقعہ ہوگا۔ چنانچہ جب حدیبیہ کی صلح ہوئی اور یہیں سے مکہ گئے بغیر واپسی ٹھہری تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے پھر بغیر دخول مکّہ کے واپسی کیسی؟ تو حضرت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ واقعہ اسی سال ہوگا۔ چنانچہ اس واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ "لَّقَدْ صَدَقَ اللَّـهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللَّهُ" ﴿الفتح:۲۷﴾ ترجمہ: خدائے تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا ہے تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ اس کا ظہور کئی سال کے بعد فتح مکہ کے وقت ہوا تو لوگوں کو یقین ہوا کہ خدا اور رسول ﷺ کا وعدہ سچا تھا۔ اور اس کے ظہور کا یہ وقت تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے سراقہؓ کو کسریٰ (بادشاہِ ایران) کے کنگن پہننے کی جو خبر دی تھی اس میں یہ تصریح نہ تھی کہ کس طرح اور کب یہ واقعہ ہوگا۔ ممکن ہے کسی ضعیف الاعتقاد اور اسبابِ ظاہری پہ نظر رکھنے والے کو بہ اعتبار حالات حاضرہ اس وقت اس پر کامل ایمان اور بھروسہ نہ ہو۔ لیکن جب حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں نے ایران فتح کیا اور مالِ غنیمت مدینہ منورہ میں پہنچا تو اس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے۔ جب حضرت عمرؓ کے روبرو مالِ غنیمت پیش ہوا تو آپ نے سراقہ کو یہ کنگن پہنائے اور فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی سچی کر دکھائی۔ ان ہی چند اخبار مغیب پر جو یہاں ذکر کئے گئے ہیں موقوف نہیں، اس قسم کے اور بہت اخبار مغیب قرآنِ شریف اور احادیث میں مذکور ہیں۔ مثلاً آخر زمانہ میں دین کا ضعیف اور اہلِ زمانہ میں فسادات کا ہونا، علاماتِ قیامت جیسے مغرب سے آفتاب کا طلوع ہونا، دابۃ الارض کا نکلنا، یاجوج ماجوج، صُور کا پھونکا جانا، مُردوں کا قبر سے اُٹھنا، حساب و کتاب وزنِ اعمال، میزان، صراط، جنت و دوزخ، عذاب قبر، حوضِ کوثر، غرض بے شمار امور سب اخبار مغیب ہی ہیں۔ جن کی اطلاع شارع کی طرف سے قبل وقوع دی گئی ہے۔ قریباً تمام اہلِ اِسلام کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ تمام اخبار مغیب جو خدا اور رسول ﷺ نے دیئے ہیں وہ سب حق ہیں اور ان کا ظہور یقینی ہے۔

حضرت مہدی موعودؑ کے ظہور کی نسبت بھی جو احکام واحادیث وارد ہیں وہ بھی خبر مغیب ہی ہیں۔ جو دوسرے اخبار مغیب کی طرح قرآن واحادیث میں خدا اور رسول کی طرف سے اُمت کو دی گئی ہیں۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی میں اس کی طرف ایما کیا گیاہے اور احادیثِ رسالت پناہی میں اس ابہام کی وضاحت اور اس اجمال کا بیان موجود ہے۔ احادیث مہدیؑ دوسرے اسلامی

اخبار مغیب سے اپنی نوعیت اور ماخذ کے اعتبار سے پورے مطابق ہیں۔ اسی طرح یہ اخبار اس لحاظ سے کہ ان کے ذریعہ آئندہ ظہور پذیر ہونے والے مبشر کی بشارت دی گئی ہے۔ ان اخبار مغیب سے جو کتب سابقین میں نبی آخر الزماں روحی فداہ کی بعثت کی نسبت دی گئی ہے۔ پوری مماثلت رکھتے ہیں پس دوسرے اسلامی اور سابقہ اخبار مغیب کی نسبت جس حیثیت سے بحث کی جاتی ہے اور ان سے جس طرح احکام مستخرج ہوتے ہیں۔ ان احادیث مہدیؑ سے بھی اسی طرح بحث اور اسی طرح کا استخراج ہونا چاہئے۔ حضرت خاتم النبیین سرورِ کائنات محمد مصطفی ﷺ کے اخلاق و عادات، اہلِ زمانہ کے حالات، آپ کے پُر از حکمت احکام وارشادات، انبیاء سابقین کی بشارت وغیرہ جن جن وجوہ ودلائل سے استدلال کیا جاتا ہے بعینہ اسی طرح حضرت مہدیؑ کی بعثت اور ضرورت پر بھی ان تمام امور سے بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس وقت ہم صرف خدا اور رسول ﷺ کے احکام سے بحث کریں گے۔ کیونکہ خدا اور رسول کے فرامین ہی منتہائے سوال اور تمام مسلمانوں کے لئے واجب الاعتقاد اور واجب العمل ہے۔ تمام اسلامی عقائد واعمال میں بعض تو ایسے ہیں جن کی تفصیل قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیث شریفہ ہی سے ثابت ہیں۔ مثلاً قرآن شریف میں "وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ" ﴿البقرۃ:۴۳﴾ کا حکم دیا گیا ہے۔ اور احادیث ہی سے تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ نماز کس طرح پڑھی جائے۔ ارکانِ نماز کس ترتیب سے ادا کئے جائیں اور کس چیز کی زکواۃ کس مقدار میں ادا کی جائے۔ اور کون شخص ادا کرے اور کب ادا کرے۔ اسی طرح احکام اسلامی میں ایسی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً معراج مسح خفین عذاب قبر، ترتیب صلوٰۃ وغیرہ کئی مسائل ہیں جو قرآن شریف میں صراحتاً درج نہیں ہیں اور احادیث ہی سے ان کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اگلی سطور میں صرف اصول حدیث اور فرامین رسالت پناہی کی روشنی میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ بعثتِ مہدیؑ سے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان میں اکثر ایسی صحیح اور مستند ہیں کہ ان احادیث کی رو سے مہدیؑ کی بعثت ضروری ہونے کا اعتقاد رکھنا ہر مسلمان کے لئے لازم وضروری ہے۔ پس صرف احادیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں ظہور مہدی موعودؑ کے مسئلہ کو اہل سنت کے اُصول وضوابط کے مطابق واضح کر کے دکھانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مہدی موعودؑ کی بعثت کے بارے میں جو احادیث شریفہ وارد ہیں کہ وہ دوسرے اسلامی احکام و مسائل میں وارد شدہ احادیث سے بہ لحاظِ کثرت روایت و کثرتِ تعداد اور بہ لحاظِ جامعیت بہت زیادہ ہیں۔ ملّا علی قاری کا قول ہے کہ مہدیؑ کی بعثت کے بارے میں تین سو حدیثیں مروی ہیں (المشرب الوردي فى مذهب المهدي) علامہ برزنجی" اشاعة في اشراط الساعة" میں لکھتے ہیں۔

واعلم ان الاحاديث الواردة فيه على اختلاف رواياتها لا تكاد تنحصر و لو تعرضنا تفصيلها لطال الكتاب و خرج عن موضوعها۔ ترجمہ: مہدیؑ کے متعلق جو احادیث مختلف روایتوں سے وارد ہیں ان کا حصر نہیں کیا جاسکتا۔

اگر ہم ان کی تفصیل بیان کریں تو کتاب طویل ہو جائے گی۔ اور یہ کتاب کے موضوع سے خارج ہو جائیگا۔ یہ احادیث مہدیؑ جن کثیر التعداد صحابہ سے مروی ہیں۔ ان میں ایسے جلیل القدر صحابہ بھی ہیں جن کی روایت مرجح سمجھی جاتی ہیں۔ اور یہ کہ صحابہ کی اتنی کثیر تعداد دوسرے مسائل میں کم پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بعثت مہدیؑ کے بارے میں جن اصحاب کرام سے احادیث شریفہ مروی ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

حضرت علی ابن ابی طالب، حسین ابن علی، عبد اللہ ابن مسعود، عبد اللہ ابن عباس، عبد اللہ ابن عمر، حذیفہ، جابر ابن عبد اللہ ابو ہریرہ، سعید ابن المسیب، ابو ایوب انصاری، عمار بن یاسر، ثوبان، ابوذر غفاری، عوف بن مالک، زہری، عائشہ، ام سلمہ، ام حبیبہ، ابو سعید خدری، انس ابن مالک، عبد الرحمن بن عوف، قرۃ ابن ایاس، طلحہ، علی الھلال، کعب، ابو امامہ، عبد اللہ بن حارث، قیس ابن جابر، قرۃ المزنی، ابو الطفیلؓ اجمعین۔ اسی طرح احادیث مہدیؑ کو جن جلیل القدر محدثین نے اپنی اپنی صحاح او رمسانید یا مجموعہ احادیث میں روایت کیا ہے۔ ان کی تعداد تیس پینتیس تک پہنچی ہے۔ اور ان میں مشہور مشہور محدثین اور ائمہ حدیث شامل ہیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبل، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی، طبرانی، حاکم، ابو نعیم، نعیم بن حماد، دار قطنی، ابو یعلیٰ، بزار، ابن عساکر، ابن مندہ، رویانی، ابو خذیمہ، ابو عوانہ، ابو الحسن خزلی، عمرو ابن شیبہ، عامر، ابو بکر مقری، خطیب، ابن سعد، محاملی، ابو عمرو ابن الدانی، ابن الجوزی، ابو غنم الکوفی، ابو الحسن المنادی، ابو بکر الاسکاف، ابن کثیر، قرطبی حسن بن سفیان وغیرہم۔ ان مذکورہ محدثین نے اپنی اپنی تالیفات میں کتاب الفتن یا کتاب القیامہ وغیرہ ابواب وفصول کے تحت احادیث مہدی کا ذکر کیا ہے۔ اور بعض نے ظہور مہدیؑ کا خاص باب باندھا ہے۔

اس کے علاوہ کئی مشہور محدثین اور علماء اہل سنت نے ان احادیث کے خاص مجموعے تیار کئے ہیں۔ اور ان میں صرف ان احادیث کا ذکر کیا ہے جو حضرت مہدی موعودؑ کی شان میں وارد ہیں۔ مثلاً

۱۔ العقد الدرر فی احادیث المھدی المنتظر۔ مؤلفہ فاضل العلامہ یوسف بن یحییٰ ابن علی المقدسی الشافعی۔
۲۔ العرف الوردی فی اخبار المھدی ۔ مؤلفہ علامہ حافظ جلال الدین سیوطی۔
۳۔ القول المختصر فی علامات المھدی المنتظر۔ مؤلفہ شیخ ابن حجر الہیتمی الشافی۔
۴۔ البرہان فی علامات مہدی آخر الزمان۔ مؤلفہ ملا علی متقی۔
۵۔ المشرب الوردی فی مذہب المھدی۔ مؤلفہ ملا علی قاری
۶۔ التوضیح فی تواتر ماجاء فی المھدی المنتظر والمسیح۔ مؤلفہ امام شوکانی۔

احادیث مہدیؑ کے مقابلے میں دوسرے اسلامی عقائد و اعمال سے متعلق جو احادیث وارد ہیں۔ ان کی روایت صرف بعض صحابہ سے کی گئی ہے۔ اور ان احادیث کا بعض بعض محدثین نے ذکر کیا ہے۔ ان کو وہ اہمیت و عظمت حاصل نہیں جو احادیث مہدیؑ کو حاصل ہے۔ غرض ان اخبار و احادیث مہدیؑ کی روایت اور تخریج بھی جلیل القدر محدثین نے اپنی اپنی صحاح اور مسانید میں کی ہے۔

اور بعض مشہور محدثین نے اس موضوع پر خاص رسالے لکھے ہیں۔ اور ان میں صرف احادیث مہدیؑ کا ذکر کیا ہے۔ احادیث مہدیؑ کے مقابلے میں دوسرے اخبار مغیب کی روایت صرف بعض صحابہ سے مروی ہے۔ جن کے ظہور پذیر ہونے پر ہم غیر مسلم اقوام کے مقابلہ میں صحتِ نبوت رسولنا محمد مصطفی ﷺ پر حجت لاتے ہیں۔ جیسے ظہور نارِ حجاز، انقضائے دولتِ کسریٰ حملہ تاتار وغیرہ۔ اس کے مقابل احادیث مہدیؑ کثیر التعداد اجلہّ صحابہ سے مروی ہیں۔

کثرتِ تعداد کے علاوہ کثیر التعداد احادیث کے اعتبار سے بھی دوسرے اخبار مغیب کے مقابلہ میں احادیث مہدیؑ کو امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ دوسرے اخبار مغیب کے بارے میں جس قدر احادیث وارد ہیں ان کے مقابلہ میں اخبار مہدیؑ بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ اوپر لکھا جاچکا ہے کہ صحیح تعداد قرار دینے کی نسبت محدثین مختلف البیان ہیں۔ جس کو جس قدر حدیثیں بہم پہنچیں اس نے اسی قدر تعداد بیان کر دی۔ چنانچہ بعض نے احادیث کی تعداد تین سو تک بتائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور محدثین اور اجلہّ علماء اہل سنت احادیث مہدیؑ کے متواتر ہونے کے قائل ہیں۔ یعنی مہدیؑ کی بعثت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے جو حدیثیں مروی ہیں۔ وہ تواتر معنوی کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔

چنانچہ امام محمد بن احمد الانصاری القرطبی "تذکرۃ القرطبی" میں لکھتے ہیں۔ **قد تواترت الاخبار و استفاضت بكثرة رواتها عن المصطفیٰ ﷺ عن المهدي وانه من اهل بيته۔** ترجمہ: رسول اللہ ﷺ سے مہدیؑ کی نسبت راویوں کی کثرت کے ساتھ متواتر و مستفیض اخبار وارد ہیں۔ اور یہ کہ مہدیؑ آنحضرت ﷺ کے اہل بیت سے ہیں۔

"شیخ ابن حجر الہیتمی القول المختصر فی علامات المہدی المنتظر میں لکھتے ہیں" **قال بعض ائمة الحفّاظ ان المهدی من ذريته عليه السلام تواترت عنه عليه السلام۔** ترجمہ: بعض حفاظِ حدیث کا قول ہے کہ مہدی موعودؑ کا آلِ رسول سے ہونا رسول اللہ ﷺ سے تواتراً مروی ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی "لمعات شرح مشکواۃ" میں لکھتے ہیں۔ **قد وردت فيه احاديث كثيرة متواتر المعنى**

ایضـاً قد تظاهرت الاحاديث البالغة حد التواتر معناً في كون المهدي من اهل البيت ومن ولد فاطمة"ترجمہ: مہدیؑ کے بارے میں متواتر المعنی حدیثیں مروی ہیں۔ نیز مہدیؑ کے اہل بیت رسول اللہ ﷺ ہونے اور اولاد فاطمہ سے ہونے کی حدیثیں تواتر معنوی کی حد کو پہنچ گئی ہیں۔

مُلاّ علی القاری المشرب الوردی فی مذہب المھدی میں لکھتے ہیں۔**قد تواترت الاخبار عن رسـول الله ﷺ وانه من اهل بيته**۔ترجمہ: مہدیؑ کی بعثت اور آپ کے اہل بیت آنخضرت ﷺ سے ہونے کے بارے میں احادیث متواترہ وارد ہیں۔

"علامہ سید محمد بن عبدالرسول البرزنجی المدنی "اشاعۃ فی اشراط الساعۃ" میں لکھتے ہیں۔**ان احاديث وجود المهدی وخروجه في آخرالزمان وانه من عترة رســول الله ﷺ من ولد فاطمة بلغت حد التواتر المعنوي فلا معنىٰ لانكارها و من ثم ورد من كذب بالدجال فقه كفر و من كذب بالمهدي فقد كفر**۔ترجمہ: وجود مہدیؑ اور آپ کے آخر زمانہ میں پیدا ہونے اور آپ کے عترتِ رسول یعنی اولاد فاطمہ سے ہونے کی احادیث تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسی لئے یہ حدیث وارد ہے کہ جس نے دجال کا انکار کیا وہ کافر ہے اور جس نے مہدی کا انکار کیا وہ کافر ہے۔ رواہ ابوالاسکاف فی فوائد الاخبار وابو قاسم السھیلی فی شرح السیر لہ

اس حدیث کو ابو بکر اسکاف نے "فوائد الاخبار" میں اور ابوالقاسم سُہیلی نے اپنی شرح السیر" میں روایت کی ہے

بحر العلوم علامہ عبدالعلی ملک العلماء " اشراط الساعۃ" میں لکھتے ہیں۔ احـادیثے کہ دال اند بر خـروج امام مہـدی کثیـر اند کہ مبلغ آں بتواتر معـنوی رسـیدہ اسـت۔ ترجمہ: جو حدیثیں کہ امام مہدیؑ کی بعثت پر دلالت کرتی ہیں بہت ہیں اور تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ محدثین اور علمائے امت احادیث مہدیؑ کے بارے میں تواتر کے قائل ہیں اور یہ صحیح بھی ہے کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے جو احادیث مروی ہیں اگر ہر طبقہ کے راوی کثیر ہوں (جن کی کم از کم حد چار ہیں) تو ایسی حدیث کو متواتر کہتے ہیں۔ اگر تمام سلسلہ ہائے روایت میں انہی الفاظ سے روایت ہوئی ہو تو ایسی حدیث کو متواتر الفاظ والمعنی کہیں گے۔ اور اگر تمام طُرقِ اسناد میں الفاظ متحد نہ ہوں لیکن سب کا مضمون یا معنی و مطلب متحد ہو تو ایسی احادیث متواتر المعنیٰ کہلاتے ہیں۔ اور ان دونوں احادیث یعنی متواتر باللفظ و متواتر بالمعنی کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ احادیث شریفہ جو وجود مہدی موعودؑ پر دلالت کرنے والی ہیں اپنی کثرت تعداد اور کثرتِ رواۃ کے باعث متواتر کی کسی نہ کسی تعریف میں ضرور داخل ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محدثین اور ائمہ اصول کا یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ حدیث متواتر سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ہر مسلمان اس امر کے یقین کرنے پر مجبور ہے کہ جو الفاظ یا جو مفہوم اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ اسکی نسبت حضرت سرور کائنات محمد مصطفی ﷺ کی طرف صحیح ہے۔ اور اہلِ سُنت کا یہ ضابطہ ہے کہ جس قول و فعل یا امر کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف یقینی طور پر صحیح ثابت ہو جائے۔ تو ہر مسلمان پر اس کی صحت کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی "شرح نخبۃ الفکر" میں لکھتے ہیں۔

وهذا كون المتواتر مفيداً للعلم اليقين هو المعتمد لان خبر التواتر يفيد العلم الضـــروری وهو الذى يضطر الانسان اليه بحيث لا يمكن دفعه۔ ترجمہ: یہ مسئلہ خبر متواتر سے علم یقینی کا فائدہ حاصل ہونا مذہب مختار ہے۔ کیونکہ خبر متواتر سے علم ضروری حاصل ہوتا ہے جس کے ماننے پر آدمی مضطر و مجبور ہے کہ انکار کرنا ممکن نہیں۔

چونکہ حدیث متواتر سے جو مفہوم ثابت ہو رہا ہے اس کی نسبت آنحضرت ﷺ روحی فداہ کی طرف قطعاً صحیح ہوتی ہے۔ اور اس سے ایسا علم یقینی واضطراری حاصل ہوتا ہے کہ اس کا انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لئے اصول حدیث کا مسلّمہ ضابطہ ہے کہ حدیث متواتر کا انکار کفر ہے۔ چنانچہ علامہ نظام الدین شاشی "اصول الشاشی" میں لکھتے ہیں کہ **ثم المتواتر يوجب العلم القطعي ويكون رده كفراً**۔ ترجمہ: حدیث متواتر موجب علم قطعی ہے اور اس کا رد کرنا کفر ہے۔

اس کے برخلاف معتزلہ خبر متواتر سے علم اطمئنانی حاصل ہونے کے قائل ہیں۔ اس کے جواب میں اہل بیت کی طرف سے "ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی" میں لکھا ہے۔ **ومن هٰهنا ظهران العلم الحاصـل بالمتواتر علم قطعي كالعيان لا كما ظن المعتزلة انه يوجب علم طمانينة لاحتمال الكذب**۔ ترجمہ: اس سے ظاہر ہے کہ متواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ معائنہ کی طرح قطعی علم ہے اور معتزلہ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ احتمالِ کذب کی وجہ سے خبر متواتر سے علم اطمنانی حاصل ہوتا ہے۔

اصولِ فقہ کی مشہور کتاب "اصولِ بزدوی" میں معتزلہ کے اس خیال کی نسبت لکھا ہے کہ۔ "**وهـذا القول بان المتواتر يوجب علم طمانينة لا يقين قول باطل يودي الي الكفر**" ترجمہ: یہ کہنا کہ متواتر سے علم اطمنانی حاصل ہوتا ہے، علم یقینی نہیں، باطل قول ہے جو کفر تک پہنچاتا ہے۔

چنانچہ احکام اسلامی میں اس کی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً معراج، مسح خفین، عذابِ قبر، ترتیب صلوٰۃ، غرض کئی مسائل ہیں جو قرآن شریف میں صراحتاً درج نہیں ہیں۔ اور کسی متواتر اللفظ حدیث سے بھی ان کا ثبوت نہیں ہے۔ لیکن جن

متواتر بالمعنی احادیث سے ان کا ثبوت ملتا ہے۔ ان سب کے جزو مشترک سے یہی مفہوم مستنبط ہوتا ہے کہ مسائل مذکورہ یعنی معراج، مسح خفین، عذابِ قبر، ترتیب صلوٰۃ قطعی و یقینی ہیں۔ اس لئے کتب عقائد و علم کلام میں یہ مسائل اس حیثیت سے مذکور ہوئے ہیں کہ ان کی صحت کا اعتقاد رکھنا ہر مسلمان پر لازم اور ان کا انکار موجب کفر ہے۔ پس انہی مسائل کی طرح مہدیؑ کی بعثت بھی احادیث متواترہ سے ثابت ہونے کی وجہ سے ہر مسلمان کے لئے ضروری الاعتقاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریباً تمام اسلامی فرقے الاّ ماشاء اللہ ضرورت بعثتِ مہدی موعودؑ کے معتقد ہیں۔

منطقی طور پر ان اقوال سے یہ مقدمات ثابت ہوتے ہیں کہ۔

(۱) وجود مہدیؑ احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔ (۲) جو بات احادیث متواترہ سے ثابت ہو وہ قطعی و یقینی ہے اس کا رد یا انکار ناممکن اور موجب کفر ہے ان دونوں مقدمات سے یہی نتیجہ بر آمد ہوا کہ "وجود مہدی موعودؑ از روئے احادیث قطعی و یقینی ہے جس کا رد کرنا موجب کفر اور ناممکن ہے۔ پس کوئی مسلمان نہ اس میں تامّل و انکار کر سکتا ہے۔ نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ ظہور مہدی موعودؑ کا عقیدہ ہی سرے سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ حالانکہ اس موعود رسول اللہ کا ظہور ضروری ہونے کی یہ تاکیدات احادیث میں پائی جاتی ہے کہ جب تک اس کا ظہور نہ ہو قیامت نہ آئے گی جب تک وہ مبعوث نہ ہو دنیا ختم نہ ہو گی اگر دنیا ختم ہونے کو ایک دن یا ایک رات ہی باقی رہ جائے تو خدائے تعالیٰ اس ایک دن یا ایک رات ہی کو اتنا دراز فرمادیگا کہ اس میں اس کا ظہور ہو جائے۔ امت کو یہ تاکید فرمائی گئی ہے کہ تمہارے اور اس خلیفۃ اللہ کے درمیان برف بھی حائل ہو تو تم برف پر سے رینگتے ہوئے جاؤ اور اس سے بیعت کرو۔ کیا کسی کی عقل باور کر سکتی ہے کہ مخبر صادق صلعم نے جس ذات کے ظہور کو اس قدر ضروری اور اہم فرمایا ہے وہ ایک غیر ضروری مسٔلہ بن جائے۔ حالانکہ یہ احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔

اُصول حدیث کا ایک اور ضابطہ ہے کہ اخبار متواترہ کے راویوں کے ضعف و قوت سے بحث نہیں کی جاتی بلکہ فاسقوں اور کافروں کی روایت بھی اگر حد تواتر تک پہنچ جائے تو موجب یقین اور موجب عمل ہوتی ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں۔ **المتواتر لا یبحث عن رجالہ بل یجب علیہ العمل لا یجابہ الیقین وان ورد عن الفساق بل عن الکفرۃ**۔ ترجمہ: متواتر کے راویوں سے بحث نہیں کی جاتی بلکہ بغیر بحث کے اس پر عمل کرنا واجب ہے کیونکہ وہ موجبِ یقین ہے اگرچہ فاسقوں بلکہ کافروں سے روایت ہوئی ہو۔

لیکن بعض ایسے اصحاب نے جو نہ محدث ہیں اور نہ اصولِ حدیث سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس مسلمہ ضابطہ کے خلاف احادیث متواترہ میں بھی ضعف و قوت کی بحث کرنے کی غلطی کی ہے۔ اور اپنے زعمِ باطل میں بعض احادیث کے راویوں

کی نسبت جرح وطعن کرکے اور بعض تاریخی واقعات سے احادیث کے مضمون کو تطبیق دینے کی کوشش کرکے نتیجہ نکالا کہ احادیث مہدیؑ بنائی ہوئی اور موضوع ہیں۔ حالانکہ معترضین نے جن وجوہ و دلائل پر اپنی اس غلط رائے کی بنار کھی ہے۔ انہی وجوہ و دلائل پر سرسری طور بھی غور کرنے سے ان کا یہ بیان کئی وجوہ و دلائل پر اپنی اس غلط رائے کی بنار کھی ہے۔ مثلاً:۔ ظہور مہدیؑ کے متعلق جس قدر احادیث وارد ہیں ان کثیر احادیث میں سے چند حدیثوں کی نسبت ان معترضین نے ردوقدح کی ہے۔ اور ان کے راویوں پر جرح وطعن ہونا ظاہر کیا ہے۔ اگر ان کی رائے کے موافق فرضاً و تقدیراً ان احادیث کو مجروح ہی مان لیا جائے تو پھر بھی کئی حدیثیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کی کوئی تغلیط نہیں ہوئی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جب تک کُل کی کُل احادیث جو اس بارے میں وارد ہیں۔ مجروح نہ ثابت ہوں نفس وجود مہدیؑ بے اصل نہیں ثابت ہو سکتا۔ کیونکہ ایک حدیث بھی صحیح ثابت ہو جائے تو نفس وجود ثابت ہونے کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ اکثر فقہی مسائل صرف ایک ایک حدیث ہی سے ثابت کئے گئے ہیں۔ خلافت کا سا اہم مسئلہ جب کہ انصار و مہاجرین میں مابہ النزاع تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صرف ایک حدیث پیش کرنے سے تصفیہ پا گیا اور انصار کو مسکت کر دیا۔ اسی طرح اور بہت سے احکام اور قضایا ایک ایک دو دو حدیث پر ہی مبنی ہیں۔

جن احادیث پر ردوقدح کی گئی ہے ان کے بعض خاص سلسلہ پر بحث کی گئی ہے۔ حالانکہ مہدیؑ کی اکثر حدیثیں ایسی ہیں جن کی متعدد محدثین نے اپنی صحیح و مسانید وغیرہ میں مختلف سلسلۂ روایت سے تخریج کی ہے۔ پس اگر فرض کر لیا جائے کہ معترضین نے جن خاص محدثین کے سلسلہ کو مخدوش ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تو وہ صحیح بھی ہے تو اس سے صرف وہی سلسلۂ روایت ضعیف ثابت ہو گا اور دوسرے سلسلہ ہائے روایت پر جن میں وہ مطعون و مجروح اشخاص داخل نہیں ہیں۔ اس کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ پس جب تک تمام سلسلہ ہائے روایت واسناد مجروح و مخدوش ثابت نہ کئے جائیں نفسِ حدیث مجروح نہیں ہو سکتی اور جب نفسِ حدیث مخدوش نہ ہو وہ مفہوم جو اس حدیث سے مستنبط ہو رہا ہے کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

اکثر طعن وجرح ایسی ہے جو سطحی طور پر غور کرنے سے صحیح قائم نہیں رہ سکتی اور اس جرح کا کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کئی راویوں کی نسبت جرح کے ساتھ ان کی تعدیل بھی معترض نے درج کی ہے۔ جن سے حسب ضابطہ "المثبت مقدم على النافي" جرح کا اثر خود کم ہو جاتا ہے۔ بعض جرحیں ایسی ذکر کی گئی ہیں۔ جن سے خاص احادیث مہدیؑ پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔

مثلاً کہا گیا ہے کہ فلاں حدیث مشکواۃ اور مشہور محدث حاکم کی ہے۔ "مستدرک میں ایک سو حدیثیں موضوع ہیں۔ اس طرح سے خود ثابت ہو رہا ہے۔ کہ حاکم کی مستدرک میں جو کئی ہزار حدیثیں ہیں ان میں ایک سو کے سوا باقی سب صحیح ہیں۔

اور یہ ثابت نہیں کیا گیا ہے کہ یہ حدیث بھی انہی سو حدیثوں میں ہے، اس سے اس خاص حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور اگر اس سے حاکم کی مستدرک کی کُل مندرجہ احادیث کو ضعیف ثابت کرنا مقصود ہو تو یہ اُصول حدیث کے خلاف ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو پھر حدیث کی کوئی کتاب بھی قابلِ استناد نہیں قرار دی جاسکتی کیونکہ کتب صحاح نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ حتیٰ کہ بخاری شریف اور صحیح مسلم میں جو سب سے زیادہ صحیح مانی جاتی ہیں۔ بہت سی ایسی حدیثیں ملتی ہیں۔ پس نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں بعض ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کی بھی تمام احادیث قابلِ وثوق نہ رہیں گی۔ اور یہ اصولِ حدیث کے خلاف ہے۔ اصولِ حدیث کا ایک ضابطہ یہ ہے کہ ''الجرح مقدم علی التعدیل'' اس کے یہ معنی لئے گئے کہ ہر جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ حالانکہ وہی جرح تعدیل پر مقدم و مرجح ہوتی ہے جو مبیّن ہو مبہم نہ ہو۔ جارح (جرح کرنے والا) خود عادل ہو اور جن وجوہ واسباب کی وجہ سے یہ جرح کی گئی ہے ان کا عارف ہو۔ پس جب تک جارحین کی عدالت ثابت نہ کی جائے۔ ان کی جرح موثر و مرجح نہ ہوگی۔

غرض ظہور مہدی موعودؑ کی بشارت جن بے شمار احادیث سے دی گئی ہے وہ احادیث بھی دوسری تمام حدیثوں کی طرح حدیث کی انہی کتابوں میں موجود ہیں۔ جو احادیث کی منبع سمجھی جاتی ہیں۔ معترضین نے مہدیؑ سے متعلقہ جن چند احادیث کے راویوں پر جس قسم کی جرح وطعن کا ذکر کیا ہے خود انہی سے یا انہی کے جیسے راویوں سے جن پر اسی قسم کے طعن ہیں۔ اور بہت سی حدیثیں روایت کی گئی ہیں اور نیز ان احادیث سے احکام کا استخراج کیا گیا ہے۔ جب ایسے ہی راویوں سے روایت کی ہوئی حدیثیں دوسرے احکام میں مقبول سمجھی گئی ہیں تو محض اسی قسم کے مطاعن سے مہدیؑ کی حدیثیں بنائی ہوئی یا موضوع قرار نہیں دی جاسکتیں۔ اگر ایسا کیا جائے تو پھر حنفیہ اور دیگر اہل مذاہب کے بے شمار مسائل من گھڑت کہانی ہوجائیں گے۔ کیونکہ ان کی بنیاد ایسی ہی احادیث پر ہے جن کے راویوں پر اسی قسم کے ضعف وواہی ہونے کا طعن کیا گیا ہے۔ غرض ابن خلدون اور اس کے ہمنوائوں نے بیشمار احادیث مہدیؑ کے منجملہ معدودے چند احادیث پر ردوقدح کرکے ان کو غلط قرار دینے کی جرأت کی اور نتیجہ نکالا کہ احادیث مہدی بنائی ہوئی اور موضوع ہیں اور سرے سے وجود مہدی کا انکار کردیا۔

ابن خلدون کا جواب مہدویوں میں علامہ سید اشرف شمسیؒ نے دیا ہے۔ جو اردو زبان میں ''اصلاح الظنون'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ علماء اہل سنت میں سے ہندوستان کے مشہور و مستند عالم اور پیر طریقت جناب اشرف علی تھانوی نے ابن خلدون کا جواب اُردو میں لکھا جو ان کے مطبوعہ تالیفات میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ شام کے ایک فاضل شیخ محمد بن احمد صدیق نے ابن خلدون کے اعتراضات کا جواب زبانِ عربی میں لکھا جو ''ابراز الوھم المکنون من کلام ابن خلدون'' کے نام سے دمشق میں چھپ کر شائع ہوگیا ہے۔

مولوی مناظر الحسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے بھی ابن خلدون کے بیان کو غلط قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو دھوکہ دہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ مکاتیب امام غزالیؒ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

اس قسم کا مغالطہ جس سے ابن خلدون نے مسلمانوں کے نظریۂ مہدویت کو مضمحل کرنے میں کام لیا تھا۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اس کا تذکرہ کرکے کہ آئندہ مہدیؑ کی شکل میں مسلمانوں کو ایک نجات دہندہ ملے گا۔ اس خیال کو اسنے غیر عقلی قرار دیا ہے۔

اس کے بعد ابن خلدون کے خیال کی معقول تردید کرنے کے بعد لکھا۔

"مہدیؑ کے متعلق حدیث کی کتابوں میں جو روایتیں ہیں ان پر ابن خلدون نے جو اعتراضات کئے ہیں اُن کی بھی محدثانہ حیثیت سے کوئی وقعت نہیں ہے۔ اور مہدی کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ایک مسلمہ عقیدہ ہے۔ (صفحہ ۱۴۳) مورخ ابن خلدون نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ بعثتِ مہدیؑ کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں وہ موضوع ہیں۔ اور اس دعویٰ پر بطور دلیل ان احادیث کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے چند حدیثوں کو منتخب کرکے ایک ایک دو دو راویوں پر جرح کی ہے۔ لیکن بادی النظر میں ہر دیکھنے والے پر واضح ہو سکتا ہے کہ اکثر و بیشتر راویوں پر ضعف وغیرہ کی جرح ظاہر کی گئی ہے۔ حالانکہ اصول حدیث کی رو سے کسی حدیث کا راوی مجروح ہونے سے وہ حدیث ضعیف کہلاتی ہے موضوع اور بنائی ہوئی نہیں ہو جاتی۔ پس رواۃ کے ضعیف ہونے سے حدیث موضوع اور بنائی ہوئی ہونے کا نتیجہ اخذ کرنا صریح غلطی ہے۔ کیونکہ ضعیف حدیث اور موضوع حدیث میں ترتب احکام کے اعتبار سے بہت فرق ہے۔ ہر راوی سے متعلق جو جرح کی گئی ہے۔ وہ بھی کس حد تک صحیح ہے یہ ایک طویل بحث ہے۔ اگر ہر حدیث کی اسناد و روایت اور راویوں کی جرح و تعدیل، احادیث کے ضعف و قوت، تعارض و تطابق کی تفصیلی بحث فن رجال اور اصولِ حدیث کے مطابق کی جائے تو مضمون طویل ہونے کے علاوہ ایک علمی بحث ہونے کی وجہ سے عام طور پر دلچسپ نہیں ہو سکتا۔

غرض ان مباحث مذکورہ سے کسی قدر واضح ہو گیا کہ بعثت مہدیؑ احادیثِ متواتر المعنی سے ثابت ہے اور دوسری احادیث کو وہ اہمیت اور خصوصیت حاصل نہیں ہے جو احادیث مہدیؑ کو حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ائمہ دین کی مرتبہ اصول و عقائد کی کتابوں میں بعثتِ مہدیؑ کا ذکر ضرور پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مسئلہ مہدویت ہر مسلمان کیلئے ضروری الاعتقاد ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے بہت ساری پیشین گوئیاں فرمائی ہیں۔ جن کا وقوع ضروری ہے۔ ان کے منجملہ مہدیؑ کی حدیثیں بھی آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی ہے جس کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اخبار معصوم میں نسخ لازم آئے گا۔ اور اخبار معصوم

میں نسخ ناجائز ہے۔ اس حیثیت سے بھی اس کا وقوع ضروریات دین سے ہے۔ اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ امام مہدیؑ کی آمد کا منتظر ہے۔ لیکن ان لوگوں نے مہدیؑ کی بعثت کو چند علامتوں اور شرطوں پر مشروط کیا ہے۔ جو ایک دوسرے کی ضد ہونے کی وجہ سے ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ایک شخص میں جمع ہو سکیں ورنہ ضدّین کا جمع ہونا لازم آئے گا۔ جو جائز نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مہدیؑ کی بعثت کو جن شرطوں پر مشروط کیا ہے۔ انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ جو اخبار و احادیث آئندہ ایک شخص کی بعثت کو ثابت کرتی ہیں۔ وہ اپنے حقیقی اور لغوی، معانی پر منطوق ہوئی ہیں۔ یا ان کے معانی مجازی ہیں۔ جب اس پر غور نہیں کیا تو لا محالہ مغالطہ میں رہیگا۔

مثلاً بعض حدیثیں یہ بتاتی ہیں کہ مہدیؑ مکہ میں پیدا ہوں گے۔ اور دوسری حدیثیں ثابت کرتی ہیں کہ امامؑ مدینہ میں پیدا ہوں گے۔ ان دونوں میں ضد ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدیؑ اور عیسیٰؑ مل کر آئیں گے۔ اور بعض حدیثوں سے ثابت ہے کہ مہدیؑ کی تشریف آوری کے بہت بعد عیسیٰؑ نازل ہوں گے۔ ان دونوں روایتوں میں ضد ہے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدیؑ کے زمانہ میں سب لوگ مومن و مسلمان ہو جائیں گے۔ اور قرآن مجید کی آیت سے ثابت ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگ ایمان لاتے۔ چنانچہ فرمایا "وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا" ﴿یونس:۹۹﴾ اس آیت سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت اس طرح جاری نہیں ہوئی ہے کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں۔ پس ظاہر ہے کہ ان دونوں مفہوموں میں ضد ہے۔ غرض اس گروہ منتظر نے جن احادیث کو مجیٔ مہدیؑ کے شرائط ٹھہرایا ہے وہ آپس میں اضداد ہیں۔ ان کے معانی پر غور کرنا اشد ضروری ہے۔

احادیث شریفہ کی روشنی میں ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ مہدیؑ جو موعودِ رسول اللہ ﷺ ہیں مبعوث ہوئے اور وفات پائی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ دعویٰ فرمایا کہ میں مہدی موعود ہوں۔ مگر مہدویت کا مسئلہ بعض لوگوں کے زعم فاسد میں اختلافی ہے۔ ایک فریق کا بیان ہے کہ مہدی کوئی دوسرے شخص نہیں بلکہ وہ حضرت عیسیٰؑ ہی ہیں اور چونکہ وہ ہدایت یافتہ ہیں لہٰذا اُن کی شان میں لفظ مہدی وارد ہے۔ چنانچہ اس فریق نے حدیث "لا مهدی الاّ عیسیٰ" سے استدلال کیا ہے۔

دوسرے فریق کا یہ مقولہ ہے کہ قرآن شریف ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے اور دین کامل ہو چکا ہے۔ اس صورت میں ہماری ہدایت کے لئے کسی امام معصوم کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسرا فریق ضرورتِ بعثت کا قائل ہے اور قیامت تک مجیٔ مہدی کا منتظر ہے۔ اس فریق کا بیان ہے کہ جو حدِیثیں مہدی موعودؑ کی بعثت کو ثابت کرتی ہیں ان سے مجیٔ عیسیٰؑ مراد ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ جو سنن

ابن ماجہ میں مروی ہے۔"عن انس ابن مالک عن النبی ﷺ انه قال لا مهدي إلا عيسى ابن مريم"یعنی انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہدی نہیں ہے مگر عیسیٰ ابن مریم۔ اس حدیث کی وجہ سے ان کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور حضرت عیسیٰؑ کو رسول اللہ ﷺ نے مہدیؑ فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث لا مہدی الاّ عیسیٰ ابن مریمؑ قابلِ حجت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے اسناد میں ضعف ہے۔ چنانچہ محدث حاکم کا بیان ہے کہ محمد بن خالد جو اس روایت کے اسناد میں ہے مجہول ہے۔ اور مضطرب بھی۔ کیونکہ کبھی اس اسناد کو حضرت امام شافعیؒ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور کبھی ابان بن صالح کی طرف منسوب کرکے کہتا ہے کہ ابان بن صالح نے حسن بصری سے روایت کی ہے۔ لیکن محدّث ابن صلاح کہتے ہیں کہ ابان بن صالح کو حسن بصری سے سماعت نہیں ہے۔ علامہ ذہبی نے "میزان" میں لکھا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ محمد بن خالد مجہول ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس روایت کا اسناد ضعیف ہے۔ پس لائق تمسک نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے متواتر حدیثیں مروی ہیں کہ مہدیؑ اہل بیت رسول اللہ ﷺ سے ہیں۔ جب یہ امر متواتراً ثابت ہے کہ مہدیؑ اہل بیت رسول اللہ ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کا ابن مریم ہونا بھی خبر منصوص اور متواتر ہے۔ تو اس وجہ سے بھی حدیث لا مہدی الا عیسیٰ ابن مریم ضعیف اور نا قابلِ احتجاج ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حدیث صحیح سے جسکو محدثین سلسلۃ الذہب کہتے ہیں یہ ثابت ہے کہ مہدیؑ وسطِ امت میں ہیں اور عیسیٰؑ آخرِ اُمت میں۔ تو اس سے ثابت ہے کہ حدیث لا مہدی الاّ عیسیٰؑ ابن مریم صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ مہدیؑ اولادِ فاطمہؓ سے وسطِ اُمت میں مبعوث ہوں گے اور حضرت عیسیٰؑ جو ابن مریم ہیں آخر زمانہ میں آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ اس ضعیف بلکہ موضوع حدیث سے استدلال کرکے بعض لوگوں نے جو نہ اولادِ فاطمہ سے ہیں اور نہ عیسیٰؑ ابن مریم سے۔ مہدیت اور مسیحیت کا دعویٰ کیا ہے۔

جن لوگوں کا بیان ہے کہ قرآن شریف ہدایت کیلئے کافی ہے لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے وجود کے بعد کسی امام معصوم کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کردی اور جب دینِ رسول اللہ میں ترقی اور زیادتی نہیں ہو سکتی تو پھر امام مہدیؑ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر قرآن مجید بنفسہِ امت محمدیہ ﷺ کی ہدایت کیلئے کافی ہے تو یہ خیال بداہتہ غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے اکثر احکام مجمل اور مبہم ہیں۔ عام امت محمدیہ ﷺ اس کے مفہومات کے موافق عمل نہیں کرسکتی۔ اس صورت میں قرآن شریف عمل کے لئے کافی نہیں ہے۔ مثلاً قرآن شریف میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز پڑھو۔ زکواۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور حج کرو۔

مگر ان کی تفصیلی حالت بیان نہیں کی گئی۔ پس فرائض مذکورہ پر عمل کرنے کیلئے قرآن مجید کی تعلیم وارشاد کافی نہیں

ہے۔ جب مکلّف نماز پڑھنے کا ارادہ کرے تو ممکن نہیں ہے کہ اس سے یہ فرض ادا ہو سکے۔ کیونکہ اس کو یہ علم نہیں کہ ہر نماز کا وقت کب سے کب تک ہے۔ اگر قرآن شریف میں اوقات کا ذکر ہے بھی تو اس طور پر نہیں ہے کہ ایک جاہل یا متوسط معلومات کا آدمی اوقاتِ صلوٰۃ کے صرف مفہوم کو دیکھ کر نماز پڑھ سکے۔ قرآن مجید سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ ہر نماز کی کتنی رکعتیں ہیں۔ ہر نماز میں فرائضِ داخلی کیا ہیں اور ان کے فرائضِ خارجی کونسے ہیں اور پھر قرآن مجید سے ہیئت نماز کا تفصیلی حال معلوم نہیں ہو سکتا۔

روزہ کی بھی یہی حالت ہے کہ وقت کے اعتبار سے مبہم ہے۔ اگرچہ قرآن شریف میں ابتدائی وانتہائی وقت کا بیان موجود ہے۔ تاہم لیل کی ابتداء میں دخول غایت اور خروج غایت کی بحث کی جاتی ہے۔ وہ نحوی اصول پر مبنی ہے۔ جس سے عام امتِ محمدیہ ﷺ بالکل ناواقف ہے۔ پس روزہ رکھنا اور روزہ کھولنا دشوار ہو گا۔

زکواۃ کی بھی یہی حالت ہے کہ اس کی تفصیل اور ہر ایک جنس کی مقدارِ زکواۃ کا حال قرآن کریم میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ پس آیاتِ زکواۃ سے آدمی ادائے زکواۃ کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ فرض حج ادا کرنے میں بھی بہت سے اختلافات ہیں۔ جن کا بیان کتب فقہ میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حج کی آیتیں ان مناسک وارکان کی تفصیل کیلئے ناکافی ہیں۔

غرض عوام تو عوام ہیں علماء وفضلاء اور ائمہ مجتھدین بھی رسول اللہ ﷺ کے بیان کے بغیر نہ نماز پڑھ سکتے ہیں نہ روزہ رکھ سکتے ہیں نہ زکواۃ دے سکتے ہیں نہ حج کر سکتے ہیں۔ اسی واسطے حدیث رسول اللہ کی روشنی میں ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت نے کتب فتاویٰ کی تدوین کی۔ جس طرح فقہی مسائل کی تعمیل کیلئے عوام کے مقابلے میں ہدایت قرآن کافی نہیں ہے۔ اسی طرح مسائلِ اعتقادی کیلئے بھی قرآن شریف عوام کیلئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ عقائد کے بعض ایسے مسائل ہیں کہ علمائے راسخین بھی انکی تفہیم سے قاصر ہیں۔ اور یہ ضابطہ مقرر کر دیا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان کی کیفیات کی تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ مسئلہ میزان، نامۂ اعمال، عبورِ صراط وغیرہ کی یہی حالت ہے۔ مسائل صفات جو متشابہات ہیں۔ ان میں تو سخت مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔ بعض مسائل ایسے ہیں کہ ائمہ مجتہدین سے بھی ان کا تصفیہ ممکن نہیں بلکہ صحابہ بھی متحیر ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مسئلہ ربا کی پیچیدگیوں کو دیکھ کر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی اور ربا میں شافی بیان نہیں کیا گیا۔ غرض جن لوگوں نے مطلقاً یہ بات کہی کہ قرآن ہدایت کے لئے کافی ہے اور عوام قرآن کو دیکھ کر اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ غلط ہے۔ اگر کمال دین سے یہ غرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو شریعت رسول اللہ ﷺ پر اتاری ہے ارشادات وحقائق کے اعتبار سے کامل ہے تو یہ بات قابلِ تسلیم ہے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کا دین ناسخ ادیان ہے تو ضرور ہے کہ

شریعتِ رسول اللہ ﷺ مذکورہ اعتبارات سے کامل و مکمل ہو، ورنہ اس کا اثر ختمیت پر پڑیگا کیونکہ نقصان ارشاد کی حالت میں اختتام نبوت بے معنی ہے لیکن یہ امر بھی لائق اِظہار ہے کہ کمالِ دین تنزیل کے اعتبار سے مکمل ہے عمل کے اعتبار سے مسلّم نہیں ہے۔ یعنی تکمیل دینِ باعتبار تنزیل ہے باعتبار تاویل نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے احکامِ شریعت کی تبلیغ فرمائی لیکن احکامِ ولایت کی تبلیغ کو جو متعلق بحقیقت تھے۔ امام معصوم حضرت مہدی موعودؑ پر موقوف رکھی۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف کے معانی کو جن کا تعلق احکامِ ولایت محمدی سے ہے خدائے تعالیٰ کے منشاء اور مراد کے موافق بیان کرنا خاص مہدیؑ کا کام ہے۔ صرف مہدویہ کا یہ مذہب نہیں ہے بلکہ محققین اہل سنت کا بھی یہی مذہب ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر محی الدین عربی، صدرالدین قونوی اور عبدالرزاق کاشانی جیسے اولیاء کرام نے "ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" ﴿القیامۃ:۱۹﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بیانِ قرآن جو احکامِ ولایت محمدیہ سے متعلق ہے بزبانِ مہدی ہوگا۔

بات صرف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سینۂ اطہر میں دو علم تھے۔ ایک ظاہر قرآن کا علم جسکو شریعت کہتے ہیں۔ دوسرا باطن قرآن کا علم جسکو حقیقت کہتے ہیں۔ شریعت کا رسولِ کریم ﷺ نے عام بیان فرمایا اور تمام دنیا اس سے فیض یاب ہوئی۔ آج تک ہو رہی ہے۔ اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ مگر علم حقیقت جو سینۂ اقدس میں موج زن تھا اور جو بے واسطۂ جبرائیلؑ مقام " أَوْ أَدْنَىٰ میں لی مع اللہ وقت لا یسعني فیه ملك مقرب ولا نبي مرسل" کی حالت میں سرور کائنات ﷺ کے حوالہ ہوتا تھا اور "فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ" ﴿النجم:۱۰﴾ سے جسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسکا عام بیان نہیں فرمایا اور اس علم کی عام دعوت و تبلیغ نہیں فرمائی چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔ حفظت من رسول الله ﷺ وعائین فامّا احدهما فبثثته وامّا الاخر فلو بثثته لقطع هذا البلعوم۔ ترجمہ: میں رسول اللہ ﷺ سے دو علم حاصل کئے ہیں۔ ایک تو میں نے تمہارے سامنے بیان کر دیا اور اگر دوسرا علم بھی بیان کروں تو تم لوگ میری گردن کاٹ دوگے۔

علامہ شہاب الدین قسطلانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ " المراد به علم الاسرار المصئون عن الاغيار المختصّ بالعلماء بالله من اهل العرفان"یعنی اس علم سے مراد "علم اسرار ہے" جو اغیار سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اور صرف ان علماء باللہ سے مخصوص ہے جو اہلِ عرفان ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ بجز خاص خاص اصحاب کے جن میں صلاحیت واہلیت تھی۔ حضرت نے عام طور پر ان احکام کو بیان نہیں فرمایا۔

محققین اہل سنت بھی قائل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف احکام نبوت کو بیان فرمایا اور احکام ولایت یعنی

حقیقت کی عام دعوت نہیں فرمائی۔ کیونکہ زمانہ نبوت احکام ولایت کے بیان کرنے کا مانع تھا۔ چنانچہ مولانا عبدالرحمن جامیؒ "شرح فصوص الحکم" میں فرماتے ہیں۔ "لانه ﷺ غير مامور بكشف الحقائق والا سرار كخاتم الولاية بل كان ما موراً بسترها" ترجمہ: رسول اللہ خاتم ولایت کی طرح حقائق واسرار کے اظہار پر مامور نہ تھے۔ بلکہ آپ کو مقام تشریع میں اسرارِ ولایت کے چھپانے کا حکم دیا گیا تھا۔

مہدیؑ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات سرتاپا ولایت تھی مگر رسول اللہ ﷺ احکامِ ولایت کے بیان کرنے پر مامور نہ تھے بندہ مامور ہے۔ غرض رسول اللہ ﷺ نے مخصوص اصحاب کو جن میں اہلیت وصلاحیت تھی ان اسرار و حقائق کی تعلیم دی۔ اس تعلیم خصوصی کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ اولیاء کرام کے مشہور خانوادے مثلاً۔ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقش بندیہ وغیرہ سب کسی نہ کسی صحابی مکرم کے واسطے سے ذاتِ اقدس رسالت مآب تک پہنچتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ﷺ نے عام طور پر ان اسرار و حقائق کو بیان نہیں فرمایا بلکہ احکام ولایت کی عام دعوت و تبلیغ کو حضرت مہدیؑ کی ذاتِ اقدس پر موقوف فرمایا۔ اور مہدیؑ نے بھی فرمایا "حق تعالیٰ مارا فرستادہ است مخصوص برائے ایں است کہ آں احکام وبیان کہ تعلق بہ ولایت محمدی دارد" یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے خاص اسی لئے بھیجا ہے کہ وہ احکام وبیان جو ولایتِ محمدیہ ﷺ سے متعلق ہیں مہدی کے ذریعہ ظاہر ہوں۔

غرض آیت "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴿المائدۃ:۳﴾" کے لحاظ سے دینِ اسلام بالکل کامل و مکمل ہے۔ مگر قرآن مجید علم شریعت اور علم حقیقت دونوں کو جامع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے احکام شریعت کی تبلیغ کی اور احکام حقیقت کے بیان کو علی سبیل الدعوۃ مہدیؑ پر موقوف رکھا۔ اسی وجہ سے بعثتِ مہدی ضروریاتِ دین سے ٹھہری۔ اور ایسی ضروری قرار دی کہ اس کے بغیر قیامت نہ آئے گی۔ اور مہدی علیہ السلام سے بیعت کرنے کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ برف پر سے رینگنا پڑے تو تب بھی جاؤ اور ان سے بیعت کرو۔ کیونکہ وہ اللہ کے خلیفہ ہیں اور مہدیؑ کو خاتم دین فرمایا۔ چنانچہ نعیم بن حماد اور ابو نعیم سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے عرض کیا يا رسول الله ﷺ آمنا آلِ محمد المهدي ام من غيرنا قال لا بل منّا يختم الله به الدين كما فتحه بنا۔ کیا مہدی ہم آلِ محمد ہی سے ہوں گے یا ہمارے غیر سے؟ فرمایا نہیں بلکہ آلِ محمد ﷺ سے ہوں گے خدائے تعالیٰ ان پر دین کو ختم کریگا جس طرح ہم سے شروع کیا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہے کہ مہدیؑ خاتم دین رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی جب تک احکامِ ولایت کی عام دعوت و تبلیغ نہ ہو دینِ ختم نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ مہدیؑ کو وفات کے وقت خدائے تعالیٰ کا حکم ہوا کہ آپ اس آیت کا بیان کریں "اکملت لکم دینکم" یعنی آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ جس کا

مطلب یہ ہے کہ جو دین بلحاظ تنزیل مکمل تھا اور جس کی شریعت کے احکام بیان ہو چکے تھے آج احکام ولایت بیان ہو کر بلحاظ تبلیغ بھی مکمل ہو گیا۔

پس جن لوگوں کا خیال ہے کہ دین کامل ہو چکا اب کسی امام معصوم کی یا مہدی موعود کی بعثت کی ضرورت نہیں ہے یہ خیال صحیح نہیں۔ جب تک مہدیؑ کی بعثت نہ ہو۔ دین ختم نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے "یختم اللہ بہ الدین" یعنی خدائے تعالیٰ مہدی پر دین کو ختم کرے گا۔ غرض مہدیؑ احکام ولایت کو بیان کر کے دین کو ختم کریں گے۔

ان دو گروہ کے علاوہ جن کا تفصیلی ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ کہ ان میں ایک گروہ حضرت عیسیٰؑ ہی کو مہدی سمجھتا ہے۔ اور دوسرا گروہ قرآن مجید کے بعد مہدی کی بعثت کو ضروری نہیں سمجھتا۔ تیسرا گروہ ہے جو امام مہدیؑ کے مبعوث ہونے کا منتظر ہے۔ مگر جس امام برحق کا ہم نے اقرار کیا ہے۔ اس کا انکار کرتا ہے۔ انہی لوگوں کا گروہ بہت بڑا ہے۔ اس گروہ کا بعثتِ مہدی کا انتظار کرنا بعض غیر صحیح، ظنیّ اور ضعیف احادیث کا اعتبار کر لینے اور بعض احادیث کی غلط تعبیر کر کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ مثلاً مہدیؑ تمام دنیا کے بادشاہ ہوں گے۔ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ عیسیٰؑ کے ساتھ مل کر دجال کو قتل کریں گے۔ تمام دنیا کو دینِ اسلام اور نورِ ایمان سے منور کر دیں گے وغیرہ جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بعثتِ مہدیؑ کی تین طریقہ سے خبر دی ہے۔

(۱) اوّل یہ ہے کہ مہدیؑ کی بعثت ضروریاتِ دین سے ہے۔

(۲) دوّم یہ کہ مہدیؑ دافعِ ہلاکت اُمّت محمدیہ ہیں۔

(۳) سوم یہ کہ مہدیؑ خلیفۃ اللہ ہیں اور آپ سے بیعت ضروری ہے۔

بعثتِ مہدیؑ ضروریاتِ دین سے ہونے کا بیان یہ ہے کہ دینی امور کی ضروریات نفسانی خیالات پر مرتّب نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کا مرتب ہونا اخبار مغیبہ کے سیاقات اور دلالات اور ان کے صیغوں پر ہوا کرتا ہے۔ پس اگر اخبار مغیبہ میں عام ازیں کہ وہ کسی امر سے متعلق ہوں کوئی تاکیدی حکم یا خبر موجود ہو اور خبر یا حکم امر دین سے ہو یا اس سے متعلق ہو تو وہ ضروریاتِ دین سے شمار کیا جائے گا۔

اس ضابطہ کے مطابق مہدیؑ کی بعثت کے احادیث میں غور کرنا چاہئے۔ کہ انکی دلالت اور ان کا سیاق کس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر اس میں آپ کے پیدا ہونے کی ضرورت ثابت ہو جائے تو بلاشبہ اس بات کا اعتراف واجب ہو گا کہ حضرت مہدیؑ کا آنا اور مہدیت کا دعویٰ کرنا ضرورتِ دین میں داخل ہے۔

پس مناسب ہے کہ مجیٔ مہدیؑ کے بارے میں ان احادیث میں سے کچھ حدیثیں جن میں امام مہدیؑ کی بعثت کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ یہاں بیان کی جائیں۔

امام بیہقی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی ہے:عن النبی ﷺ قال لو لم یبق من الدنیا اِلاَّ یوم یبعث اللہ رجلا من اھل بیتي یملأ ھا عدلاً کما ملئت ظلماً و جوراً۔ترجمہ:رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اگر دنیا کے ایام سے ایک دن بھی باقی رہیگا تو اللہ اسی دن میں میری اہل بیت سے (یعنی فاطمہ الزہراؓ کی اولاد سے) ایک شخص کو پیدا کریگا جو زمین کو عدل (یعنی ایمان) سے اس طرح بھر دیگا جس طرح وہ ظلم وجور (یعنی کفر وعدوان) سے بھری ہوئی تھی۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت کی ہے کہ :إِن رسول اللّٰہ ﷺ قال لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنْیَا إِلاَّ یَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰہُ ذَلِكَ الْیَوْمَ حَتَّى یَلِيَ رَجُلٌ مِنْ أَھْلِ بَیْتِي یُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِي۔ترجمہ:رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اگر دنیا کے ایام سے ایک دن بھی باقی رہ جائے گا۔ تو خدائے تعالیٰ اس دن کو بڑھادیگا تا آنکہ ایک شخص میری اہل بیت سے حاکم (خلیفہ) ہو جائے جس کا نام میرا نام کے موافق ہو گا۔

امام احمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے کہ:عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابن مسعود قال قال رسول اللّٰہُ ﷺ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى یَلِيَ رَجُلٌ مِنْ أَھْلِ بَیْتِي ، یُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِي۔ترجمہ:عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ میری اہل بیت سے ایک شخص جس کا نام میرے نام کے جیسا ہو گا۔ (والی) خلیفہ نہ ہو جائے۔

حافظ ابو نعیم نے صفت مہدی میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ:قال رسول اللّٰہُ ﷺ لا تَذْھَبُ الدُّنْیَاحَتَّى یبعث اللّٰہُ تعالیٰ رجلا مِنْ أَھْلِ بَیْتِ یُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِي واسم أبیه اسم أبي یملاھا قسطاً وعدلاً کما ملئت ظلماً و جوراً۔ترجمہ:رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ دنیا کا اس وقت تک اختتام نہ ہو گا جب تک کہ میری اہل بیت سے ایک شخص مبعوث نہ ہو جائے جس کا نام میرے نام کے جیسا اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کا نام ہو گا۔ یہ شخص دنیا کو عدل اور قسط سے بھر دیگا جیسا کہ وہ ظلم وجور سے بھری ہوئی تھی۔

حافظ ابو نعیم نے حذیفہؓ سے روایت کی ہے کہ :قال رسول اللّٰہُ لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنْیَا إِلاَّ یَوْمٌ واحد یبعث اللّٰہُ فیه رجلا اسْمُهُ اسْمِي و خُلقه خُلقي یکني ابا عبد اللہ۔ترجمہ:رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا اگر دنیا کا ایک دن بھی باقی رہیگا

تو اللہ تعالیٰ ایک شخص کو پیدا کریگا جو میرا ہم نام ہو گا۔ اور میرے خُلق کے مشابہ ہو گا۔ اور ابو عبد اللہ کنیت کرے گا۔

امام احمد نے اپنی مسند میں ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ۔

قال رسول اللہ ﷺ لا تقوم الساعة حتیٰ تملأ الارض ظلماً وعدوانا ثم یخرج رجل من عترتي او من اهل بيتي من يملأها قسطاً وعدلا كما ملئت ظلماً وعدواناً۔ ترجمہ: آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے کہ قیامت قائم نہ ہو گی تا آنکہ دنیا ظلم وعدوان سے نہ بھر جائے گی۔ پھر میری عترت یعنی اہل بیت سے ایک شخص مبعوث ہو گا جو زمین کو عدل سے ایسا بھر دیگا جیسا کہ وہ ظلم سے بھری ہوئی تھی۔

ان احادیث کا قدر مشترک یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اہل بیت سے ایک شخص کا مبعوث ہونا امر ضروری ہے۔ ان احادیث میں شخصِ منتظر کے مختلف اوصاف بتائے گئے ہیں۔ یعنی حضرت علی بن ابی طالبؓ، اور عبد اللہ بن عمرؓ اور ابو سعید خدریؓ کی حدیثوں میں ضرورت بعثت اس صفت کے ساتھ بتلائی گئی ہے کہ وہ شخص جو اہلِ بیت رسول ﷺ سے مبعوث ہونے والا ہے۔ زمین سے ظلم دور کرے گا۔ اور عدل سے بھر دیگا۔ اور حدیث ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے وہ ضرورتِ بعثت کے علاوہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اس کو ولایت وخلافت بھی حاصل ہو گی اور رسول اللہ ﷺ کا ہمنام ہو گا۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت بھی ابو ہریرۃؓ کی روایت کی مثبت ہے کہ جب تک وہ مبعوث نہ ہو گا قیامت نہ آئے گی۔ وہ میری اہل بیت سے ہے اور خلیفہ ہو گا۔ حذیفہؓ کی روایت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ ضرورتِ بعثت کے علاوہ رسول کریم ﷺ کا ہم نام اور ہم خُلق ہو گا۔

ان احادیث میں اگرچہ حضرت مہدیؑ کا اسم گرامی موجود نہیں ہے مگر شخصِ منتظر مہدیؑ کے سوا دوسرا شخص نہیں ہے۔ کیونکہ احادیث مہدی خبرِ مغیب ہیں۔ اور خبرِ مغیب میں ہر جگہ تصریح کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اخبارِ رسول اللہ ﷺ جو تورات وانجیل میں مذکور ہیں۔ ان میں رسول اللہ ﷺ کے نام کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف اشارات وکنایات سے کام لیا گیا ہے چنانچہ تورات میں مذکور ہے کہ "خداوند جبالِ فاران سے دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ خروج فرمائیگا۔ اور نیز خداوند اخوۃِ موسیٰؑ سے ہو گا"، ان میں نام کی صراحت نہیں ہے۔ اسی طرح انجیل کے اخبار بھی جو آنحضرت ﷺ کی شان میں ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے یعنی ان میں بھی رسول اللہ ﷺ کا نام موجود نہیں ہے۔ بلکہ اشارات وکنایات کے پیرایہ میں آنحضرت ﷺ کی آمد کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح ان احادیث میں اگرچہ مہدیؑ کا نام موجود نہیں ہے مگر اس مضمون کی دوسری روایتیں اور ہیں۔ ان میں

مہدی کا نام موجود ہے۔ چنانچہ ان میں بعض روایتیں یہ ہیں۔

امام ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ: عن ام سلمة قالت سمعت رسول الله ﷺ المهدي من عترتي من اولاد فاطمة۔ ترجمہ: ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مہدی میری عترت یعنی اولادِ فاطمہؓ سے ہے

ابو داؤد کی ایک اور حدیث ہے کہ: عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ المهدیُ منّی، اجلی الجبهة، اقنی الانف یملأ الارض قسطاً و عدلاً کما ملئت ظلماً و جوراً و یملک سبع سنین۔ ترجمہ: ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہدی روشن پیشانی والا، اونچی ناک والا ہو گا، زمین کو عدل سے بھر دیگا جیسا کہ ظلم سے بھری ہوئی تھی۔ سات سال مالک رہے گا۔

امام احمد، ابو داؤد اور ابو نعیم نے روایت کی ہے کہ: عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ أبشّركم بالمهدي يبعث في امتي على اختلاف من الناس و زلزال فيملأ الارض قسطاً و عدلاً کما ملأت ظلماً وجوراً۔ ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو مہدی کی خوشخبری دیتا ہوں جو لوگوں میں اختلاف اور تزلزل واقع ہونے کے وقت میری اُمت میں مبعوث ہوں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوئی تھی۔

ان حدیثوں سے ثابت ہے کہ وہ شخص منتظر دراصل مہدی ہیں۔ کیونکہ جو اوصاف اس شخص منتظر کے ہیں وہ مندرجہ بالا احادیث میں بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ چنانچہ قسط و عدل سے زمین کا بھر جانا اور شخص منتظر کا اولاد فاطمہؓ سے ہونا احادیث ضرورتِ بعثت اور ان احادیث میں موجود ہیں۔ غرض شخصِ منتظر سے مہدی مراد ہیں۔ اس کے علاوہ ائمہ حدیث نے ضرورت بعثتِ شخص منتظر کی احادیث کو باب المہدی میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حافظ ابو نعیم اور دار قطنی وغیرہ نے ایسا ہی کیا ہے۔ پس نقّادانِ حدیث کی تعیین و تشخیص تصریح سے کم نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہل بیت رسول اللہ ﷺ سے جو شخص موعود بالبعث ہے اسکا وجود ضروری ہے اور احادیثِ ضرورت بعثت میں اگرچہ اسم گرامی جناب مہدیؑ کا موجود نہیں ہے۔ مگر شخص منتظر دراصل مہدی کے سوا دوسرا شخص نہیں ہے۔ غرض مہدیؑ کی بعثت ضروریات دین سے ہے۔ اور چونکہ مہدیؑ کی ذاتِ اقدس دافع ہلاکت امت ہے۔ اس وجہ سے بھی بعثتِ امام مہدیؑ ضروری قرار پاتی ہے۔ چنانچہ امام احمد نے اپنی مسند میں عبد اللہ بن عباسؓ سے اور کنز العمال میں حضرت علیؓ سے اور نیز مشکواۃ میں باختلاف الفاظ یہ روایت ہے۔

قال رسول الله ﷺ لن تهلك أمة انا في اوّلها و عيسىٰ ابن مريم في آخرها والمهدي في وسطها۔ ترجمہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ امت ہرگز ہلاک نہ ہوگی جس کے اوّل میں میں ہوں اور عیسیٰ ابن مریم اسکے آخر میں ہیں اور مہدی درمیانِ امت میں ہیں۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ مہدیؑ دافع ہلاکت اُمّت ہیں یعنی رسول ﷺ نے اپنی ذات کی طرح مہدیؑ کو دافع ہلاکت فرمایا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کی طرح دافع ہلاکت اُمّت کا ظہور بھی ضروری ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ امت کے وسط میں ہوگا۔ اس حدیث صحیح سے اجتماعِ مہدیؑ و عیسیٰؑ کے تخیل کی خاص طور پر نفی ہو رہی ہے۔

پہلے لکھا جاچکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعثتِ مہدی کی تین طریقہ سے خبر دی ہے۔ ایک یہ کہ بعثتِ مہدیؑ ضروریات دین سے ہے۔ دوم یہ کہ مہدی دافع ہلاکت اُمّت ہیں۔ ان دو کا بیان تو ہو چکا۔ تیسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ مہدی خلیفۃ اللہ ہیں۔ اور آپ سے بیعت ضروری ہے۔ چنانچہ محدث حاکم، ابن ماجہ اور ابو نعیم نے روایت کی ہے کہ

عن ثوبان قال قال رسول الله ﷺ يَقْتَتِلُ عِنْدَ كَنْزِكُمْ ثَلاثَةٌ كُلُّهُمُ ابْنُ خَلِيفَةٍ ثُمَّ لاَ يَصِيرُ إِلَى وَاحِدٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَطْلُعُ الرَّايَاتُ السُّودُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ فَيَقْتُلُونَكُمْ قَتْلاً لَمْ يُقْتَلْهُ قَوْمٌ" ثُمَّ ذَكَرَ شَيْئًا لاَ أَحْفَظُهُ ثم يجئ خليفة الله المهدي فَإِذَا سمعتم به فأتوه فَبَايِعُوهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ فَإِنَّهُ خَلِيفَةُ اللَّهِ الْمَهْدِيُّ"۔ ترجمہ: ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے خزانہ کے پاس تین آدمی جو خلیفہ کی اولاد سے ہوں گے جھگڑیں گے لیکن ایک بھی اس پر قابض نہ ہو سکے گا پھر اسکے بعد مشرق کی طرف سے جھنڈیاں نمودار ہوں گی۔ پس وہ لوگ تم کو ایسا قتل کریں گے کہ اب تک کسی قوم نے ایسا قتل نہ کیا ہوگا۔ پھر اسکے بعد خدا کے خلیفہ مہدی آئیں گے۔ جب تم کو مہدی کی خبر ملے تو ان کے پاس جاؤ اور ان سے بیعت کرو اگرچہ تم کو برف پر سے رینگتے ہوئے جانا پڑے کیونکہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدیؑ ہیں۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ مہدی خلیفۃ اللہ ہیں اور آپ کے ہاتھ پر بیعت واجب ہے کیونکہ اس حدیث شریف میں لفظ ''فبایعوہ'' موجود ہے۔ اور لفظ بایعوہ صیغۂ امر ہے اور صیغۂ امر جب کسی قرینہ صارفہ کے بغیر کہا جائے تو اس سے وجوب و فرض مراد ہوتا ہے۔ غرض اس حدیث سے منصوصاً ثابت ہو رہا ہے کہ مہدیؑ سے بیعت فرض ہے۔ چنانچہ فبایعوہ کے الفاظ اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور ولو حبواً علی الثلج سے اس فرضیت کی مزید تاکید ہوتی ہے۔ اور فانّہٗ خلیفۃ اللہ کے الفاظ اس فرض کی توجیہ پر دلالت کرتے ہیں۔ پس مہدی کا خلیفۃ اللہ ہونا اور آپ سے بیعت فرض و لازم ہونا اس حدیث سے ثابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو خلیفۃ اللہ ہوگا خطا سے معصوم ہوگا۔ اسی کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے۔ المہدی منی یقفو اثری ولا یخطی۔ یعنی مہدی میری اولاد سے ہیں۔ میرے نقشِ قدم پر چلیں گے اور خطا نہ کریں گے اور نیز حدیث ''لن تھلک اُمّتی'' جو

اوپر گزری اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مہدیؑ امت محمدیہ ﷺ سے ہلاکت کو دور کریں گے۔ اس صورت میں بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت ضروری ہے۔ اور آپ کی اتباع فرض ہے۔ ورنہ ہلاکت کی نفی دشوار ہے۔ کیونکہ وسطِ امت میں آپ کی بعثت جو حدیثِ مذکور میں منصوص ہوئی ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ اُمّت محمدیہ آپ کی اقتدا کرے اور آپ کے فرامین قدسیہ پر عمل کرے ورنہ محض بعثت غیر ضروری ہے۔ پس آپ کی اقتداء نفی ہلاکت کا سبب ہے۔ پس تاوقتیکہ آپ کی اقتداء نہ کی جائے ہلاکت کی نفی ناممکن ہے۔ غرض اس جہت سے بھی آپ کی اتباع فرض ہے۔

ان احادیث شریفہ سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ یعنی امام مہدیؑ خاتمِ دین ہیں، خلیفۃ اللہ ہیں۔ تابع تام رسول اللہ ہیں، خطا سے معصوم ہیں۔ رسول اللہ کی طرح دافع ہلاکتِ اُمت ہیں۔ دنیا آپ کی بعثت کے بغیر ختم نہ ہوگی اور رسول اللہ ﷺ کے ہمنام ہوں گے۔ غرض ان حدیثوں کا خلاصہ یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ایک ذاتِ مقدس کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ جو خلیفۃ اللہ خاتم دینِ رسول اللہ دافع ہلاکتِ اُمّت، رسول اللہ کا ہم نام اور مہدی کے لقب سے ملقب ہے۔

غرض مہدیؑ کی بعثت کے بارے میں جس قدر احادیث شریفہ وارد ہیں۔ ان سب کا قدر مشترک یہی ایک امر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد فاطمۃ الزہراؓ کی اولاد سے ایک امام معصوم کی بعثت ضروری ہے جو ناصرِ دینِ رسول اللہ ﷺ اور دافع ہلاکت امتِ محمدیہ ﷺ ہوگا۔ کیونکہ آپ کی بعثت کے تعلق سے جس قدر علائم وآثار مروی ہیں۔ ان سب میں صرف مہدیؑ کا اولادِ فاطمہؓ سے ہونا احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ابوداؤد نے روایت کی ہے

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يقول الْمَهْدِيُّ مِنْ عِتْرَتِي مِنْ وَلَدِ فَاطِمَةَ۔ ترجمہ: ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مہدی میری عترت سے یعنی اولادِ فاطمہؓ سے ہے۔

ابن ماجہ نے روایت کی ہے: عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ كُنَّا عِنْدَ أُمِّ سَلَمَةَ فَتَذَاكَرْنَا الْمَهْدِيَّ فَقَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم يَقُولُ "الْمَهْدِيُّ مِنْ وَلَدِ فَاطِمَةَ"۔ ترجمہ: سعید بن المسّیب نے کہا کہ ہم ام سلمہؓ کے پاس تھے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سُنا کہ مہدی اولادِ فاطمہؓ سے ہے

ابو نعیم نے روایت کی ہے کہ: ان النبی ﷺ قال لفاطمة المهدي من ولدك (العرف الوردي)۔ ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فاطمہؓ سے فرمایا کہ مہدی تیری اولاد سے ہے۔

ابن عساکر نے روایت کی ہے کہ: ان النبي ﷺ قال ابشّري يا فاطمة المهدي منك۔ ترجمہ: رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا کہ فاطمہ، تجھے بشارت ہو کہ مہدی تجھ سے ہے۔

ملا علی قاری نے المشرب الوردی فی مذہب المہدی میں لکھا ہے کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدیؑ امام حسن کی اولاد سے ہیں اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ امام حسینؑ کی اولاد سے ہیں۔ مثلاً طبرانی نے معجم کبیر میں اور ابو نعیم نے علی ہلالی سے روایت کی ہے کہ: قال رسول الله ﷺ والذي بعثني بالحق ان منهما يعني الحسن و الحسين مهدي هذه الامة۔ ترجمہ: اس خدا کی قسم ہے جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے اس اُمت کے مہدی ان دونوں یعنی حسنؑ و حسینؑ کی اولاد سے ہوں گے۔

ابو داؤد نے اور نعیم بن حماد نے کتاب الفتن میں حضرت علیؑ سے روایت کی ہے: انه نَظَرَ إِلَى ابْنِهِ الْحَسَنِ فَقَالَ إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ كَمَا سَمَّاهُ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم وَسَيَخْرُجُ مِنْ صُلْبِهِ رَجُلٌ يُسَمَّى بِاسْمِ نَبِيِّكُمْ۔ ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے فرزند امام حسن کو دیکھا اور فرمایا کہ یہ میرا فرزند سید ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، قریب میں اس کے صلب سے ایک شخص نکلے گا جس کا نام تمہارے نبی کا نام ہو گا۔

صاحب عِقد الدرر نے اور امام سیوطی نے العرف الوردی میں لکھا ہے کہ: عن ابی وائل قال نظر الي الحسين فقال إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ كَمَا سَمَّاهُ رسول الله ﷺ سَيَخْرُجُ مِنْ صُلْبِهِ رَجُلٌ بِاسْمِ نَبِيِّكُمْ۔ ترجمہ: اس حدیث کا بھی وہی ترجمہ ہے جو اوپر کی حدیث کا ہے صرف حسن اور حسین کا فرق ہے۔

حافظ ابو القاسم نے اپنی معجم میں اور حافظ ابو نعیم اصبہانی اور حافظ ابو عبد اللہ نعیم بن حماد نے کتاب الفتن میں روایت کی ہے کہ: عن ابن عمر قال يخرج رجل من ولد الحسين من قبل المشرق ولوا ستقبلته الجبال لهدمها واتخذ فيها طرقا۔ ترجمہ: عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا حسینؑ کی اولاد سے ایک شخص مشرق کی طرف سے نکلے گا۔ اگر پہاڑ بھی اس کے سامنے آجائیں گے تو ان کو گرا دیگا اور ان میں راستہ پیدا کریگا۔

اس اختلافِ روایات کی وجہ سے شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے لمعات شرح مشکواۃ میں لکھا ہے کہ: قد تظاهرت الاحاديث البالغة حد التواتر في كون المهدي من اهل البيت من ولد فاطمة وقد ورد في بعض الاحاديث كونه من اولاد الحسن و في بعضها من اولاد الحسين سلام الله عليهم اجمعين۔ ترجمہ: احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ امام مہدیؑ اہل بیت سے یعنی اولادِ فاطمہ سے ہیں۔ بعض حدیثوں میں اولادِ حسن سے اور بعض میں اولادِ حسینؑ سے ہونے کا ذکر

ہے۔ اور بعض غریب احادیث میں ہے کہ مہدی اولادِ عباسؓ سے ہیں۔وقد ورد في الاحاديث الغريبة انه من ولد العباس۔

ابن حجر ہیتمی لکھتے ہیں کہ:و لا منافاة بينها اذ لا مانع من اجتماع الاحوالات في شخص من جهات مختلفه۔ ترجمہ: ان میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ ایک شخص میں مختلف احوال متعدد جتہوں سے پایا جانا ممکن ہے۔

اس غریب اور شاذ روایت سے قطع نظر کہ مہدیؑ عباسی ہیں۔ آپ کی اولادِ فاطمہؑ سے ہونا قطعی ویقینی ہے علمائے امت کا اسی پر اتفاق ہے۔ چنانچہ علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں۔"ذهب العلماء الي انّه امام عادل من ولد فاطمة" ترجمہ: علماء کا اتفاق ہے کہ مہدیؑ امام عادل اور اولادِ فاطمہؑ سے ہیں۔ چونکہ امامنا حضرت مہدیؑ امام حسینؑ کی اولاد سے ہیں اس لئے وہی حدیث صحیح ہے جس میں امام حسینؑ کی اولاد سے ہونے کا ذکر ہے مہدیؑ کے حلیہ کے بارے میں جو حدیثیں آئی ہیں ان میں چند یہ ہیں۔

رویانی اور ابو نعیم نے حصرت حذیفہؓ سے روایت کی ہے کہ :قال رسول الله ﷺ المهدي رجل من ولدي لونه لون عربي وجسمه اسرائيلي على خده الايمن خال كانه كوكب دري۔ ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہدی میری اولاد سے ایک شخص ہیں ان کا رنگ عربی اور جسم اسرائیلی ہو گا۔ ان کے دائیں رخسار پر ایک روشن خال ستارہ کی طرح چمکتا رہے گا۔

حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے روایت ہے کہ:قال المهدي كث اللحية اكحل العينين في وجهه خال في كتفه علامة النبي ﷺ۔ ترجمہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ مہدی گھنی داڑھی اور سرمگیں آنکھوں والے ہوں گے۔ چہرہ پر خال اور شانہ پر نبی ﷺ کی علامت ہو گی۔

ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ: عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله ﷺ المهدیُ منّی، اجلی الجبهة، اقنی الانف یملأ الارض قسطاً و عدلاً کما ملئت ظلماً و جوراً و یملک سبع سنین۔ ترجمہ: ابو سعید خدریؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہدی مجھ سے ہیں۔ روشن پیشانی والے۔ بلند بینی ہو گی۔ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ جس طرح وہ ظلم وجور سے بھر گئی تھی سات سال تک (اس امر کے) مالک رہیں گے۔

ان احادیث میں جو حلیہ بیان کیا گیا ہے بعینہ یہی حلیہ امامنا مہدیؑ کا تھا جس کا ذکر ہماری کتب نقلیات میں موجود ہے

ابوداؤد کی اس مذکورہ حدیث میں حلیہ کے علاوہ دو باتیں اور بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ مہدیؑ زمین کو قسط وعدل سے بھر دیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہدیؑ کی دعوت سات سال رہے گی۔

زمین کو قسط وعدل سے بھرنے کی بحث بعد میں کی جائے گی۔ مدت دعوت سات سال رہنے کے متعلق اس قدر بیان کرنا ضروری ہے کہ مہدیؑ کے زمانۂ دعوت میں اختلاف ہے جس طرح اس حدیث میں مدت دعوت ۷ سال بیان کی گئی ہے اس طرح دوسری حدیثوں سے مدتِ دعوت ۵ سال اور نو(۹) سال بھی معلوم ہوتی ہے۔

بعض غریب حدیثوں میں ۶ سال، ۲۰ سال، اور ۴۰ سال بھی ذکر کی گئی ہے۔

یہ سب اخبار احاد ہیں۔ ان میں وہی خبر صحیح ہوگی جس کا ظہور ہو جائے اور وہ پانچ سال ہے۔ کیونکہ امامنا مہدیؑ کا زمانۂ دعوت جس کو دعوی موکدہ کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ پانچ سال رہا ہے۔ اسی مدت میں آپ نے دعویٰ مہدیت تاکیدی طور پر فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جس نے میری تصدیق کی وہ مومن ہے اور جس نے انکار کیا وہ کافر ہے۔ بلکہ سات سال، اور نو سال کی مدت بھی صحیح قرار پاتی ہے کیونکہ سب سے پہلے حضرتؑ نے مکہ معظمہ میں ۹۰۱ھ میں دعویٰ فرمایا، جس سے مدت دعوت نو سال ہوتی ہے، پھر احمد آباد میں ۹۰۳ھ میں دعوی مہدیت کا اعادہ فرمایا اور وفات شریف ۹۱۰ھ تک سات سال دعوت رہی۔

امام ترمذی ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں: قال خشينا ان يكون بعد نبينا حدث فسأ لنا النبي ﷺ فقال ان في امتي المهدي يخرج يعيش خمساً او سبعاً او تسعاً (الخ) ۔ترجمہ: ابوسعید خدریؓ نے کہا کہ ہم کو ڈر ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی فتنہ کھڑا ہو جائے۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تو فرمایا کہ مہدی میری امت میں پیدا ہوگا اور وہ ۵ برس یا ۷ برس یا ۹ برس زندہ رہے گا (یعنی دعوت کرے گا)

۷ سال اور ۹ سال کی مدت کا ذکر ایک اور حدیث میں بھی آیا ہے۔ مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہیں۔ فرماتے ہیں۔ قال رسول الله ﷺ لو لم يبق من الدنيا إلا ليلة لطول الله تلك الليلة حتى يملك رجل من أهل بيتي يواطئ اسمه اسمي و اسم أبيه اسم أبي يملا الارض قسطاً و عدلاً كما ملئت ظلماً و جوراً و يقسم المال بالسوية و يجعل الله الغنى في قلوب هذه الأمة فيمكث سبعاً أو تسعاً لا خير في العيش الحياة بعد المهدي۔ ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دنیا کی ایک رات بھی باقی رہ جائے تو اس ایک رات کو اللہ تعالیٰ اتنی دراز کر دیگا کہ اس میں میری اہل بیت سے ایک شخص مالک ہو جائے گا جس کا نام میرے نام کے جیسا اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے جیسا ہوگا۔ زمین کو قسط وعدل سے بھر دیگا۔ جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوئی تھی۔ اور مال بالسّویہ تقسیم

کریگا اور اللہ تعالیٰ اس زمانے میں اس اُمت کے قلوب کو غنی کردیگا وہ سات سال یا نو سال مالک رہے گا۔ پھر مہدی کے بعد زندگی میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

اس حدیث سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً

(۱) مہدیؑ اہل بیت رسول اللہ ﷺ سے ہیں۔

(۲) آپ تمام دنیا کے مالک ہوں گے یعنی آپ کی دعوت عام افراد انسانی پر ہوگی۔

(۳) آپ کا نام رسول اللہ ﷺ کا نام اور آپ کے والدین کا نام رسول اللہ ﷺ کے والدین کے نام کے جیسا ہوگا۔

(۴) اموال کو بالسویہّ تقسیم فرمائیں گے

(۵) آپ کے زمانہ میں لوگ متاعِ دنیا سے مستغنی رہیں گے۔

(۶) سات برس یا نو برس آپ مالک رہیں گے۔

پس ان تمام اوصاف سے آپ متصف تھے۔ آپ کے زمانہ میں تقسیم بالسویہّ ہوتی تھی۔ اور آپ کے متبعین میں تقسیم بالسویہ کا عمل در آمد جاری ہے۔ اور چونکہ آپ ﷺ نے ترک دنیا کو فرض فرمادیا ہے۔ اس لئے جب آپ کے مصدقین ترکِ دُنیا کرتے ہیں۔ تو ان کے دل غنی ہوجاتے ہیں۔ دُنیا کی محبت ان کے دل سے فنا ہوجاتی ہے اور مالِ دُنیا سے ان کو بے نیازی ہوجاتی ہے۔ ان کے دل حسرت و یاس سے پاک ہیں۔ نہ وہ ماہوار لیتے ہیں نہ منصب و جاگیر رکھتے ہیں۔ اپنے بوسیدہ لباس اور فقر و فاقہ میں مست ہیں۔ یہ فیض اور یہ قناعت آپ کی تصدیق کا نتیجہ ہے اور اب بھی آپ کے مصدقین فقراء میں موجود ہے۔

باقی آثار و علامات اخبار احاد سے مستنبط ہیں اور ان کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔

اسی کی طرف امامنا حضرت مہدیؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔ ''در احادیث اختلاف بسیار است۔ ایں صحیح شدن مشکل است۔ ہر حدیثے کہ موافق با کتاب خدا و حالِ ایں بندہ باشد آں صحیح است''۔ یعنی احادیث میں بہت اختلاف ہے اور ان کا صحیح ہونا مشکل ہے۔ جو حدیث قرآن شریف اور بندہ کے حال کے موافق ہو وہ صحیح ہے (عقیدہ شریفہ)

پس مہدیؑ کا صرف اولاد فاطمہؓ سے ہونا قطعی اور یقینی ہے۔

برزخ

برزخ دو چیزوں کے درمیان حجاب یا آڑ کو کہتے ہیں۔ مرنے کے بعد قیامت قائم ہونے تک انسان پر جو زمانہ گذرتا ہے اسکو برزخ کہا جاتا ہے۔ اللہ برزخ کا ذکر قرآن شریف میں تین مقامات پر کیا ہے۔(۱) وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿مومنون:۱۰۰﴾ اور انکے پیچھے برزخ ہے اس دن تک جب وہ اُٹھائے جائیں گے (۲) مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴿الرحمن:۱۹، ۲۰﴾ اس نے دو دریا چلائے جو آپس میں مل جاتے ہیں دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے وہ اس سے آگے تجاوز نہیں کرسکتے۔(۳) وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا ﴿الفرقان:۵۳﴾ اوران کے درمیان ایک پردہ اور مضبوط آڑ رکھ دی۔ اصل میں عالم تین ہیں۔ عالم دنیاء عالم برزخ، عالم آخرت، عالم دنیا اور عالم آخرت کے درمیان جو عالم ہے وہ عالم برزخ ہے۔ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو قیامت تک اس پر کیا گذرتی ہے کوئی زندہ شخص اسکو جان نہیں سکتا۔ اسی لئے اس درمیانی حجاب کو برزخ کہا جاتا ہے یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ دنیا میں روح جسم کے تابع ہے اور برزخ میں جسم روح کے تابع ہے۔

بنی اسرائیل

بنی اسرائیل کا لفظ قرآن شریف میں ۴۰ مقامات پر آیا ہے۔ جن میں ان پر اللہ کی جانب سے کئے گئے انعامات، دیگر قوموں پر ان کی برتری ان میں ان کی رہبری کیلئے مبعوث کئے گئے پیغمبروں کا ذکر، ان کی عہد شکنیاں، ان کی نافرمانیاں، ان کی سرتابیاں، اللہ کی کتابوں میں ان کی تحریف و تصحیف، ان کی سماجی معاشرتی اور اخلاقی برائیاں، ان پر اللہ کی جانب سے ان کے اعمال بد کی پاداش میں نازل کئے گئے مختلف قسم کی سزاؤں اور عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسرائیل کے معنی عبد اللہ یا بندۂ خدا کے ہیں۔ ایل کے معنی اللہ اور اسرا کے معنی عبد ہیں۔ یہ حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا جو ان کو اللہ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ یعقوبؑ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ ان ہی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

(۱) بنی اسرائیل کو اللہ نے نہ صرف اپنی بہت بڑی نعمت سے نوازا تھا بلکہ ان کو دنیا کی دیگر قوموں پر فضیلت عطا کی تھی چنانچہ ارشاد ہے۔ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴿بقرہ:۴۷﴾
ترجمہ: اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور اس بات کو بھی کہ میں نے تمہیں عالم والوں پر فضیلت دی تھی۔ یعنی بنی اسرائیل میں اللہ نے بہت سے پیغمبروں کو مبعوث کرتے ہوئے انہیں دین حق کی طرف رہنمائی فرمائی تھی اور اس وقت کے تمام اقوام عالم کا امام اور رہنما بنا دیا گیا تھا۔ تا کہ وہ دوسروں کو راہ حق کی طرف دعوت دے سکیں۔ اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقامات پر بھی بیان فرمائی ہے۔

(۲) من جملہ احسانات خداوندی کے جو بنی اسرائیل پر اللہ نے کئے تھے۔ اللہ نے چند کا ذکر اس طرح فرمایا ہے۔

(۳) یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے نجات بخشی۔ وہ تم کو بدترین عذاب دیتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

(ب) یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا اور تم کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کر دیا اور وہ بھی تمہاری نظروں کے سامنے

(ج) یاد کرو وہ وقت جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس رات (اور دن) کا وعدہ لیا اور تم نے ان کے پیچھے (ان کی غیر حاضری میں) بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم نے ظلم کیا تھا۔ پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف کر دیا تا کہ تم شکر

گذار بنے رہو

(د) اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور معجزے عطا کئے تا کہ تم ہدایت پاؤ

(ہ) اور یاد کرو وہ وقت جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر بڑا ظلم کیا ہے پس تم اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو قتل کر ڈالو، تمہارے خالق کے پاس یہی بہتر چیز ہے (ہوا یہ تھا کہ بچھڑے کو بعض لوگوں نے سجدہ کیا تھا اور بعض نے نہیں کیا تو توبہ کی یہ صورت بتائی گئی کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو سجدہ نہیں کیا وہ ان کو قتل کریں جنہوں نے سجدہ کیا تھا)۔

(و) اور یاد کرو وہ وقت جبکہ تم نے موسیٰؑ سے کہا جب تک ہم خدا کو علانیہ دیکھ نہیں لیتے تم پر ہم کو یقین نہیں آتا تو تم کو بجلی نے گھیر لیا تمہارے دیکھتے دیکھتے پھر تمہارے مر جانے کے بعد ہم نے تم کو زندہ کیا تا کہ تم شکر گذار بندے ہو جاؤ۔

(ز) تم پر ہم نے بادل کا سایہ کئے رکھا اور تم پر منّ و سلویٰ اتارتے رہے۔

(ح) اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے کہا اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے تم چاہو فراغت کے ساتھ کھاؤ مگر دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور حِطةٌ حِطّةٌ کہتے ہوئے جانا، ہم تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے پس جو ظالم تھے انہوں نے جو بات ان کو کہی گئی تھی اسکو بدل کر دوسرا لفظ کہدیا، یعنی حنطة، حنطة کہا۔ پس ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا کیوں کہ وہ نافرمانیاں کر رہے تھے۔

(ط) اور یاد کرو وہ وقت جبکہ موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے (خدا سے) پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو جب آپ نے ایسا کیا تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور سب نے اپنے اپنے گھاٹ سے پانی پیا۔

(ی) اور یاد کرو وہ وقت جب تم نے موسیٰؑ سے کہا ہم ایک طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے زمین کی پیداوار (میں سے) ساگ بھاجی، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز دے۔ موسیٰؑ نے فرمایا تم ایک بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز لیتے ہو۔ (اگر ایسا ہے تو) تم کسی شہر میں چلے جاؤ۔ تم جو مانگتے ہو وہاں مل جائے گا۔ پھر ذلت اور محتاجی ان پر مسلط کر دی گئی اور اللہ کے غضب میں بھی وہ گرفتار ہو گئے۔ کیوں کہ وہ اللہ کی آیتوں کا

انکار کرتے تھے۔ اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

(ک) یہودی صرف اپنے طبقہ کو نجات کا حقدار سمجھتے تھے اور کہتے تھے "ہم چونکہ اللہ کے دوست اور بیٹے ہیں" اس لئے ہم دوزخ میں چند گنتی کے دن رہیں گے۔ اللہ اسکی تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہمارے پاس نجات کا جو معیار ہے وہ صرف ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ شخصیت پرستی اور گروہ بندی، وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿بقرہ:۸۲﴾ اور جو لوگ ایمان لائیں اور عمل صالح کریں وہ جنّتی ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اور فرمایا بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿بقرہ:۸۱﴾۔ ترجمہ: ہاں جو برے کام کریں اور اس کے گناہ اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

(ل) اللہ نے اولاد یعقوبؑ سے اقرار لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے بھی اچھی باتیں کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر چند لوگوں کے سوا تم سب اس عہد سے پلٹ گئے اور منھ پھیر لیا۔

(م) اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم سے اقرار لیا تھا کہ آپس میں کشت وخون نہ کرنا اور ایک دوسرے کو بے گھر نہ کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم خود اس کے گواہ بھی ہو پھر تم وہی ہو جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور بعض لوگوں کو ان کے گھروں سے ان پر گناہ اور زیادتی سے چڑھائی کرکے ان کو نکال بھی دیتے ہو۔ اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو فدیہ دے کر انہیں چھڑا بھی لیتے ہو۔ حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔ کیا تم کتاب کے بعض احکام تو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو ایسی حرکت کریں ان کی سزا اسکے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں ڈال دئے جائیں۔

(ن) جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لیکر آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تو تم سرکش ہو جاتے ہو اور (ان میں کے) ایک گروہ کو تم نے جھٹلا دیا اور ایک گروہ کو تم نے قتل کر دیا۔ (س) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿بقرہ:۶۵﴾۔ تم کو ان لوگوں کا قصہ معلوم ہی ہے جنھوں نے ہفتہ کے دن کا اصول توڑا تھا ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اسطرح کہ تم پر دھتکار اور پھٹکار پڑے۔

ہفتہ کا دن: بنی اسرائیل کے لئے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کے دن کو عبادت اور آرام کے لئے مخصوص رکھیں۔ اور اس دن کسی بھی قسم کا دنیوی کام حتیٰ کہ کھانا پکانے کا کام بھی نہ کریں۔ لیکن جان بوجھ کر علی الاعلان سبت (ہفتہ کا دن) کی بے حرمتی کرنے لگے یعنی وہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر گھر کے چھوٹے حوضوں سے مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ تو اللہ کے غضب کا شکار ہو گئے۔ ایک رات جب وہ گھر بند کر کے سو گئے تو دوسری صبح ان کے گھروں کے دروازے نہیں کھلے۔ لوگوں نے اوپر چڑھ کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ جو لوگ ان میں جوان تھے وہ بندر بنا دئے گئے تھے اور جو عمر رسیدہ تھے وہ سوّر بنا دئے گئے تھے۔ یہی حال تین دن تک رہا۔ بالآخر وہ اسی حال میں وہیں مر گئے۔ بنی اسرائیل کے تعلق سے دیگر مضامین حضرت موسیٰؑ کے عنوان کے ذیل میں درج کئے گئے ہیں وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

بندگی میاں شاہ برہانؒ

حضرت بندگی میاں سید برہان الدینؒ حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہداءؓ کے فرزند حضرت بندگی میاں سید شہاب الدین شہاب الحقؓ کے نبیرہ ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب خود آپ نے اپنی مہتم بالشان تألیف انیف شواہد الولایت میں اس طرح بیان کیا ہے۔ سید برہان الدین بن امیر سید اللہ بخش بن امیر سید یحیٰی الدین بن امیر سید المرشدین امیر سید شہاب الحق والملۃ والدین بن امیر المؤمنین حاکم المتقین سلطان نصیر بدر منیر حضرت میراں سید خوندمیرؓ اجمعین۔

حضرت بندگی میاں سید برہان الدین کے حالات پر ایک مختصر اور جامع رسالہ مولوی سید اللہ بخش صاحب توحیدؔ نے ۱۳۴۸ھ میں لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ اس میں حضرت ممدوحؒ کی پیدائش سے لیکر وفات تک کے حالات کے مختصراً ذکر کے ساتھ حضرت ممدوح کی تصانیف کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

آپ کے علم و فضل کے تبحر کا ثبوت آپ کی تصنیفات و تألیفات ہیں جن کی تعداد تین سو سے بھی زیادہ بیان کی گئی ہے۔ آپ کے مصنفہ کتب جن میں بعض نسخے خود آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور آج بھی موجود ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) دلائل المبین علی سبیل المؤ منین (۲) حديقة الحقائق، حقيقة الدقائق (دو ضخیم جلدوں میں جس کو عرف عام میں دفتر اوّل و دوّم کہتے ہیں) (۳) تذكرة العلماء المصدّقين (۴) رسالۃ حجۃ المتين (۵) عشر المكتوب نحر المرغوب (۶) مکتوب بنام کامیاب خاں حاکم (۷) علوم اربعہ (۸) حلّ المشكلات في ثبوت المهدي الموعود (۹) مکتوب بنام ابو القاسم قاضی فرہ مبارک (۱۰) رسالہ اثبات دیدار باری تعالیٰ (۱۱) رسالہ در بحث ابطال رفع اليدين في الدّعاء بعد الصلٰوة المفروضة (۱۲) شواهد الولايت (۱۳) نصائح (۱۴) شواهد المهديت (۱۵) منهاج التقويم (یہ منہاج التقویم میاں عالم باللہؒ کی تصنیف کے علاوہ ہے)۔ یہ وہ تصانیف ہیں جو قوم میں متداول ہیں اور ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ جس قدر تصانیف ہیں ان کا ذکر سِیر و تواریخ میں ملتا ہے۔ مگر ان کے قلمی نسخے ناپید ہیں۔

بولا چالا معاف کرنا

اسکی اصل یہ ہے کہ حقوق کی دو قسمیں ہیں ایک حقوق اللہ اور دوسری حقوق العباد۔

حقوق اللہ سے مراد وہ تمام احکام ہیں جن کے کرنے یا نہ کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ جن کو اوامر اور نواہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اوامر سے مراد مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، حج، ذکر اللہ، تقویٰ، صحبت صادقین، دنیا سے بے رغبتی، سچائی اور اخلاص وغیرہ کو اپنانا اور نواہی سے مراد شراب، جوا، حرامکاری، سود لینا، بخیلی، خواہشات کی اتباع، کبر، حسد، غرور اور حرص وغیرہ سے بچنا ہے۔

جہاں تک حقوق اللہ کا تعلق ہے ان کی ادائی ہر مسلمان پر واجب ہے لیکن اگر کبھی کسی سے ان کی ادائی میں کوتاہی ہو جاتی ہے تو توبہ کرنے پر اللہ ان کو معاف کر دیتا ہے، بشر طیکہ توبہ صدق دل سے ہوئی ہو۔

لیکن جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ ان کو معاف نہیں کرتا۔ حقوق العباد میں کسی کا مال ہڑپ کرنا، ظلم کرنا، کسی کو زبان یا ہاتھ سے ایذا پہنچانا، کسی کا دل دُکھانا وغیرہ ہیں۔ ان کا تعلق چونکہ بندوں سے ہوتا ہے اس لئے اللہ خود ان کو معاف نہیں کرتا جب تک کہ خود وہ بندہ جس کو تکلیف پہنچی ہے معاف نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ نے جواب دیا مفلس وہ ہے جس کے پاس کچھ مال نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایک شخص اللہ کے پاس بہت سی نیکیوں کے انبار لیکر آتا ہے۔ اور اسی وقت دوسری طرف سے لوگوں کے حقوق اور مطالبات بھی ہوتے ہیں ایک ایک مطالبہ پر اسکی ایک ایک نیکی اسکو دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سب نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں لیکن اس پر مطالبات باقی رہتے ہیں تو اب ہوتا یہ ہے کہ مطالبہ کرنے والوں کی بدیاں اس کے حصے میں آنے لگتی ہیں۔ حتی کہ اس کے پاس بدیوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص سب سے زیادہ مفلس ہے۔ کیوں کہ یہ تو اپنے ساتھ نیکیاں لے کر آیا تھا لیکن قیامت میں اس کے پلے بدیاں آگئیں۔ اس صورت حال سے بچنے اور قیامت کے دن "مفلس" بننے سے بچنے کی واحد صورت یہی ہے کہ دنیا ہی میں ہر اس شخص سے اپنی اور اسکی موت سے پہلے دے دلا کر یا معافی مانگ کر گلو خلاصی کر لی جائے، جس کی حق تلفی کی گئی ہے۔

حضرت امام حسینؓ نے بھی عاشورہ کے دن جنگ کے میدان کو جانے سے پہلے اپنے گھر والوں کو وصیت فرمانے کے بعد چونکہ اس امر کا یقین تھا کہ آج شہادت تو ہونے والی ہے، سب سے یہ کہا ہو کہ مجھ سے اگر کچھ بولا چالی ہو گئی ہو تو آپ معاف کر دیں۔ اور میں نے بھی آپ کا بولا چالا معاف کر دیا ہے۔ اسی کی اتباع میں مہدویہ کے پاس یہ طریقہ چلا آرہا ہے۔ اگر اس موقع پر یہ کہا جائے کہ وہاں تو کربلا کا منظر تھا، امام حسین کو اپنی شہادت نظر آرہی تھی لیکن آج وہ منظر نہیں ہے۔ نہ کربلا ہے، نہ

میدان جنگ ہے اور نہ شہادت سامنے ہے۔ پھر اس عمل کا کیا جواز ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب قرآن میں آیا ہے کہ ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور کس کی موت کب آتی ہے اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ لیکن یہ علم تو سب کو ہے کہ کسی بھی وقت کسی کی بھی موت آسکتی ہے۔ تو اس طرح اس عظیم سانحۂ دلفگار کی یاد منانے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بجائے غلط رسوم ورواج اور بے ہودہ طریقوں کو اپنانے کے امام حسینؓ کی اس سنت کو تازہ کرلیں اور اپنے اپنے بوجھ کو ہلکا کرلیں۔ کم از کم سال میں ایک مرتبہ بھی ایسا ہو جائے تو بہت سا وزن کم ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ قیامت عاشورا کے دن ہی ہو گی۔ اب پتہ نہیں قیامت کس عاشورا کے دن واقع ہو گی۔ لیکن چونکہ اس کا وقت مقرر نہیں ہے تو وہ کسی بھی عاشورا کو قائم ہو سکتی ہے۔ اس لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ہر عاشورا کو یہ سمجھیں کہ شاید آج ہی قیامت برپا ہو جائے۔ تو کیا ہم قیامت میں مفلس بن جائیں؟ اس اندیشہ سے بھی اگر ہر یوم عاشورا کو بندوں کے تعلق سے جو حق تلفیاں ہوئی ہیں اگر ان سے معاف کروالی جائیں تو حقوق العباد کی حد تک (محفوظ Safe Side) رہ سکتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اگر روزہ رکھیں اور اللہ کی جناب میں خلوص دل کے ساتھ روتے ہوئے گڑ گڑاتے ہوئے مغفرت مانگیں تو اللہ جو غفور رحیم ہے وہ بھی معاف کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

بخل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ﴿محمد:۳۸﴾۔ اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: البخيل بعيدٌ من الله بعيدٌ من الجنةِ بعيدٌ مِن الناسِ قريبٌ من النار۔ کنجوس اللہ سے دور ہے۔ جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے دوزخ کے قریب ہے۔ شرعی اعتبار سے یا محبت و مروت کے لحاظ سے کسی کی ضرورت پوری کرنے سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس مد میں خرچ نہ کرنا اور تنگ دلی اختیار کرنا بخل ہے۔ اگر شریعت کا تقاضا ہو لیکن کسی نے اُسے پورا نہ کیا تو وہ گنا گار ہے۔ لیکن محبت و مرّوت اور وقت کے تقاضے کے خلاف اس نے خرچ نہ کیا تو وہ گناہ گار تو نہ ہو گا لیکن مذمت کے قابل تو ضرور ہو گا۔ بخیل کی تین (۳) قسمیں ہیں۔

(۱) ایک تو وہ ہے جو خود تو اپنی ضرورت پوری کرتا ہے لیکن دوسروں کی ضرورت کو خواہ شرعی تقاضا ہی کیوں نہ ہو پوری نہیں کرتا

(۲) **لئیم** وہ ہے جو نہ خود اپنی ضرورت پوری کرتا ہے نہ دوسروں کی ضرورت پوری کرتا ہے۔

(۳) **مُمسِک** وہ ہے جو نہ خود کھاتا ہے نہ دوسروں کو کھلاتا ہے اور نہ دوسرا کسی کی مدد کرتا ہے تو اسکو دیکھ سکتا ہے بلکہ اپنی طرف سے کسی کی مدد کرنے سے دوسروں کو مختلف حیلوں سے روکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴿آل عمران:۱۸۰﴾ ترجمہ: اور ہر گز خیال نہ کریں وہ لوگ جو اس چیز کو خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ وہ اچھی چیز ہے۔ بلکہ (یہ بات) ان کے لئے بہت بُری ہے (کیوں کہ اس کا انجام یہ ہو گا) کہ قیامت کے دن یہ لوگ طوق پہنائے جائیں گے اس (مال) کا (سانپ بنا کر) جس میں انہوں نے بخل کیا تھا۔

طوق کیسا ہو گا اسکی کیفیت رسول اللہؐ نے اسطرح بیان فرمائی ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس کو اللہ مال دے اور وہ اسکی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس کا وہ مال قیامت کے روز ایک زہریلا سانپ بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا اور وہ اسکی باچھیں پکڑلے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں۔ نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لوگ بخل کی وجہ سے حرام کو حلال کر لیا کرتے ہیں۔ بخل کے سبب فسق و فجور پھیلتا ہے۔ اور فرمایا اسلام کو جتنا بخل مٹاتا ہے اتنی

کوئی اور چیز نہیں مٹاتی۔

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''اپنے آپ کو بخل سے بچاؤ کہ اسی نے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا'' بخل میں آخرت کی تباہی ہے اور دنیا میں بدنامی ہے۔ نیز یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بخل کر کے لاکھ مال کو بچا کر رکھیں۔ لیکن ایک دن تو اُسے یہاں چھوڑ کر جانا ہی ہے۔ اور وہ جہاں جا رہا ہے وہاں یہ مال تو کام نہیں آئیگا۔ پھر وہ مال کس کام کا، جو اُسے وہاں کام نہ دے جہاں وہ جا رہا ہے۔ بلکہ اُلٹا اس سے زبردست پوچھ ہو گی اور اسکا خمیازہ بھگتنا ہی پڑے گا۔ پس آدمی کو چاہئے کہ مال کی حقیقت کو سمجھے۔ اللہ کے تقاضے کو پورا کرے غریبوں مسکینوں محتاجوں کی مدد کرے۔

باطنِ مرشد

بعض صوفیاء کرام یہ کہتے ہیں کہ باطنِ پیر ہر جگہ ہے۔ اسکو بعض لوگ غلط طور پر سمجھتے بھی ہیں اور پیش بھی کرتے ہیں چنانچہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ "پیر ہر جگہ ہے" اس پر مستزاد یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ پیر ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اس پر وہ لوگ جو اپنے کو خالص موٗحد کہتے ہیں ہنگامہ برپا کرتے ہیں کہ یہ شرک ہے۔ حقیقت بس اتنی ہے کہ کہیں افراط ہے تو کہیں تفریط ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ المرأ مع من أحبّ: انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔ گفت جانم از محباں دور نیست لیک بیروں آمدن دستور نیست

مطلب یہ کہ میری جان اہل محبت سے دور نہیں۔ لیکن باہر نکلنے کا بھی دستور نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اگر پیر سے کامل محبت ہو تو ظاہری دوری مانع فیض نہیں ہے۔ حدیث بالا اسکی موٗید ہے۔ یہی محبت معیت روحانی ہے۔ مگر یہ اس کیلئے ہے جسے تعلیم کی ضرورت نہ ہو بلکہ تقویت نسبت درکار ہو، تعلیم کے لئے قربت جسمانی چاہئے۔ اگرچہ بطور خرق عادت و کرامت کے کبھی پیر نظر بھی آجاتے ہیں۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ جب پیر کی شکل نظر آجائے تو وہ سچ مُچ پیر ہی ہو۔ بعض اوقات کوئی فرشتہ وغیرہ اس شکل میں نظر آجاتا ہے۔

باطن شیخ سے مراد فیض اور نور ہوتا ہے۔ چونکہ مرشد کامل میں اسم ہادی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور اسم الٰہی زمان و مکان کی قید سے مبّرا و منزّہ ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ باطن مرشد ہر جگہ موجود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صفت ہادی، صفت مرشد کا فیض کسی زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور چونکہ مرید، مرشد کی عطا کردہ تعلیم سے بہرہ ور ہوا ہے اور اب بھی فیض حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اسکی طرف نسبت کر دی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی یہ کہے کہ آج بھی مرشد ہر جگہ موجود ہیں۔ اور وہ ہماری پکار کو سن کر بہ نفس نفیس خود مدد کو آجاتے ہیں تو یہ شرک ہے۔ اس لئے ایسی ذات صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے۔

بخشش و نجات

گروہ مقدسہ میں بخشش و نجات سے دیدار خدا ہی مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سرکار سے بخشش دیدار ہی خاص بخشش ہے۔ اسی طرح نجات کے معنی تشبیہات، تعیّنات، اضافات، تقیّدات، عروج و نزول سے نجات حاصل کرنے کے ہیں۔ پس جب ان حجابوں سے نجات حاصل ہو گئی تو کونسی چیز مانع رویت اللہ رہی۔

بہتان

بہتان کا لفظ قرآن مجید میں دو جگہ پر آیا ہے۔

(۱) وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَـٰذَا سُبْحَانَكَ هَـٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ﴿النور:۱۶﴾ اور جب تم نے سنا تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہم کو لائق نہیں کہ ایسی بات زبان پر بھی لائیں، اللہ تو پاک ہے، یہ تو بڑا بہتان ہے۔

(۲) إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّـهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ﴿الممتحنہ:۱۲﴾ اے پیغمبر، جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کیلئے آئیں کہ وہ خدا کے ساتھ نہ شریک کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ بہتان کی اولاد لائیں گی جس کو اپنی ہی (اپنے شوہر کے نطفہ سے جننا) ثابت کریں گی۔ اور ”بُهْتَانًا“ کا لفظ قرآن شریف میں چار مقامات پر آیا ہے، تین سورۂ نساء میں اور ایک سورۂ احزاب میں۔

بہتان کسی پر جھوٹا الزام لگانا ہے، اسی کو تہمت بھی کہتے ہیں، لیکن سب سے بڑی تہمت وہ بہتان ہے جو کسی پاکدامن عورت کو بدکاری کے الزام سے متّہم کیا جائے۔ اسکو اللہ ”بہتان عظیم“ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کو ”واقعہ افک“ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

واقعہ افک: حضرت ام المومنین عائشہؓ حرم محترم رسول اللہ ﷺ تھیں۔ آپؓ کی شان میں اس قسم کی تہمت بعض ناہنجار لوگوں نے جو منافقین تھے، لگادی۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک غزوہ سے لوٹتے وقت ایک جگہ سب کا پڑاؤ ہوا تھا۔ پھر رات میں کوچ کا حکم ہوا، سب چل پڑے۔ حضرت عائشہؓ جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھیں یا تو کسی ضرورت سے ذرا دور گئی ہوئی تھیں۔ یا ان کے گلے کا ہار گم ہو گیا تھا۔ جس کی تلاش میں دیر ہو گئی۔ جب آپؓ فارغ ہو کر آئیں تو قافلہ جا چکا تھا۔ ایسے میں گرا پڑا سامان اٹھانے والا ایک سوار مع اونٹ کے جو ہمیشہ سب کے پیچھے رہتا ہے۔ وہ وہاں آیا۔ دیکھا کہ بی بی عائشہؓ کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون زور سے پڑھا، آپؓ جاگ گئیں اس نے اونٹ کو بٹھایا آپؓ سوار ہو گئیں، پھر قافلہ سے جا ملیں۔ لیکن اتنے عرصہ میں منافقین نے بی بی عائشہؓ پر تہمت لگادی۔ بی بیؓ کو اسکی خبر بھی نہیں ہوئی، آپؓ کی طبیعت بھی قدرے ٹھیک نہیں تھی۔ اسلامی کیمپ میں عبد اللہ بن ابیّ بن سلول نے یہ تہمت آگ کی طرح پھیلادی۔ کچھ لوگ اس کا شکار ہو گئے، کچھ لوگ خاموش ہو گئے، کچھ لوگوں نے کہا یہ بہتان ہے، ان باتوں سے رسول اللہ ﷺ بھی متاثر ہوئے۔ آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کرلی۔ پھر بی بی عائشہؓ کا خیمہ الگ کر دیا گیا۔ آپ ﷺ بی بیؓ کے پاس جاتے لیکن وہ لطف ومہربانی نہیں جو پہلے تھی۔ بی بیؓ

نے اپنے ماں باپ کے پاس جانے کی اجازت چاہی، اجازت دے دی گئی، حاجت کیلئے رات کے وقت بی بی عائشہؓ، ام مسطح کے ساتھ جنگل کو گئی تھیں۔ ام مسطح کی چادر پاؤں میں آگئی تو انہوں نے کہا "خرابی ہو مسطح کی" عائشہؓ نے کہا، ایسا کیوں کہتی ہو وہ تو بدری صحابی ہیں، ام مسطح نے کہا آپؓ کو خبر نہیں، مسطح کیا کہتا ہے۔ بی بیؓ نے کہا مجھے معلوم نہیں، پھر ام مسطح نے سب کچھ کہہ سنایا۔ بی بیؓ رونے لگی، پھر گھر آئیں۔ ماں باپ سمجھاتے رہے لیکن تین دن تک روتی رہی، پھر اٹھارہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اور بی بی عائشہؓ کی طہارت اور لوگوں کا بہتان ظاہر کیا گیا۔ اس بہتان میں سب سے زیادہ حصہ عبد اللہ بن ابی بن سلول کا تھا۔ اس کے ساتھ مسطح، حسان اور حمنۃ تھے۔ قرآنی حکم کے تحت سب کو اسّی اسّی درّے مارے گئے، چنانچہ اللہ ارشاد فرماتا ہے۔ ترجمہ "جو لوگ یہ بہتان لائے ہیں (یعنی حضرت عائشہؓ پر) تم ہی میں سے ایک گروہ ہے تم اپنے حق میں اس کو برا مت سمجھو۔ وہ تمہارے لئے اچھا ہے۔ ان میں سے ہر شخص پر اتنا وبال ہوگا جتنا کے اس نے گناہ کیا ہے۔ اور جس نے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اسکو تو بڑا عذاب ہوگا۔ (آیت نمبر ۱۱) یہ بات بی بی عائشہؓ، آپؓ کے خاندان والوں اور خود آنحضرت ﷺ کیلئے کہی جارہی ہے کہ اگرچہ اس بہتان سے قلبی اور روحی دکھ پہنچا ہے پوزیشن کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن غلط بات غلط ہی ہوتی ہے جب اللہ نے وحی کے ذریعہ قرآن شریف میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اس افواہ کی تردید کردی اور اسکو محض بہتان قرار دیتے ہوئے آپؓ کی پاکی بیان کردی تو گویا ایک بہت بڑا شرف دیا گیا، اس لحاظ سے اسکو برا مت سمجھو کیوں کی اسکی تہ میں بہت بڑا شرف پنہاں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انکی مزید زجر و توبیخ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَـٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ﴿النور:۱۲﴾ جب تم نے بات سنی تھی تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے آپس میں نیک گمان کیوں نہیں کیا اور کیوں یہ نہ کہا "یہ صریح بہتان ہے" یعنی ایک گناہ تو تم نے یہ کیا کہ محض سنی سنائی بات پر جو کہ منافقین کی جانب سے اڑائی گئی تھی۔ یقین کرلیا اور وہ بھی بغیر تحقیق کے، دوسرا گناہ یہ کیا کہ ایسی بے سند بات کو لوگوں کے درمیان پھیلا دیا، تیسرا گناہ یہ کہ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تم کس کے بارے میں یہ افواہ پھیلا رہے ہو۔ حضرت عائشہؓ کے بارے میں جو تمہارے رسول ﷺ کی حرم محترم ہے اور تمہاری ماں ہے۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس سے حضور ﷺ کے دل کو کس قدر تکلیف ہوگی اور آپؐ کے ذہن کو کس قدر جھٹکا لگا ہوگا۔

پھر ایسی تہمت لگانے والوں کیلئے جو شرعی حکم ہے اسکی پابجائی نہ کرنے پر ان کی مزید مذمت کرتے ہوئے اسکی بے حقیقتی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یہ لوگ اپنے دعویٰ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے، تو جب یہ مدّعی گواہ نہ لائے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں، اگر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اسکی رحمت نہ ہوتی تو جس بات کا چرچہ تم کرتے تھے اسکی وجہ سے تم پر سخت عذاب نازل ہوتا جب تم اس جھوٹ کا تذکرہ اپنی زبانوں سے ایک دوسرے سے کررہے تھے۔ اور

اپنے منہ سے ایسی باتیں کر رہے تھے، جن کا تم کو مطلق علم نہیں تھا اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ کہ وہ اللہ کے پاس بڑی بھاری بات تھی (آیت نمبر،۱۳،۱۴)

پھر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے اگر تم مومن ہو تو پھر دوبارہ ایسا کام کبھی نہ کرو" (آیت نمبر،۱۷)

اور آخر میں جب اللہ نے فرمایا الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ﴿النور:۲۶﴾۔ گندی عورتیں گندے مردوں کیلئے اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے اور پاک عورتیں پاک مردوں کیلئے اور پاک مرد پاک عورتوں کیلئے ہیں، یہ لوگ بری ہیں ان باتوں سے جو یہ (منافق) بکتے ہیں۔

جملہ اٹھارہ آیتوں کے ذریعہ حضرت بی بی عائشہؓ کی طہارت، پاکیزگی اور براءت کا اعلان اللہ تعالیٰ نے فرمادیا۔ جب یہ آیتیں نازل ہوئی اور بی بی عائشہؓ کی طہارت کا اعلان ہو گیا تو آپؓ کے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنی بیٹی سے فرمایا "عائشہ رسول اللہ ﷺ کا شکر ادا کرو" تو بی بی عائشہؓ نے فرمایا "ان کا شکر کیوں ادا کروں، میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میری پاکیزگی کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ذریعہ پوری امت کو مطلع کیا بھی تو قرآنی آیات کے ذریعہ کیا۔ میں اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی کہ اللہ میری طہارت کے تعلق سے قرآن میں بیان فرمائیگا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اللہ آپ کو میری طہارت کا حال وحی خفی کے ذریعہ کر دیگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے میری طہارت کے تعلق سے قرآن کی آیتیں نازل فرمائیں، پس اس کا مجھے شکر ادا کرنا چاہئے، اللہ نے ایسے لوگوں کیلئے جو پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور اپنی اس تہمت پر گواہ بھی پیش نہیں کرتے، سزا مقرر کر دی ہے۔ چناچہ ارشاد ربانی ہے وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿النور:۴﴾ اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ (اپنے دعویٰ پر) نہیں لاتے تو ان کو اسّی درے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو، کیوں کہ وہ فاسق ہیں۔

لیکن اگر ایسے لوگ توبہ کر لیں اور اپنے اخلاق کی اصلاح کر لیں تو اللہ بھی ان کے حال پر مہربانی فرمائیگا۔ چناچہ ارشاد ہے۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿النور:۵﴾ مگر ان میں سے جو لوگ توبہ کر لیتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں تو اللہ بھی بخشنے والا اور مہربان ہے۔

یہ تو تھی عام عورتوں پر تہمت اور بہتان کی بات، اس کے بعد اللہ ان لوگوں کا ذکر فرماتا ہے جو اپنی بیویوں پر تہمت بد کاری لگاتے ہیں۔ چناچہ ارشاد ربانی ہے۔وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ﴿النور:٦،٧﴾ جو لوگ اپنی بیویوں پر بد کاری کی تہمت لگاتے ہیں اور خود ان کے سوا اس کے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان دونوں میں سے ایک کی شہادت یہ ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر کہ بے شک وہ سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت اگر وہ جھوٹا ہے۔

وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَن تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِن كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ﴿النور:٨،٩﴾ اور عورت کو سزا سے یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ پہلے چار باریوں گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر کہ وہ (شوہر) جھوٹا ہے، اور پانچویں باریوں کہے کہ اگر وہ شخص (شوہر) سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔

اسکو اصطلاح میں "لعان" کہا جاتا ہے۔

پسخوردہ

پس خوردہ کے لغوی معنی ''اُلّش'' بچاہوا کھانا یا پانی، جسے عرف عام میں ''جھوٹا'' بھی کہتے ہیں۔

فقہی نقطہ ء نظر سے مومن کا جھوٹا پاک ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا''سؤر المؤمن شفاء''۔ مومن کا جھوٹا شفاء ہے

رسول اللہ ﷺ سے کئی ایک روایتیں ایسی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بچوں کو، بڑوں کو، جو کچھ بیمار تھے یا زخمی تھے اپنا جھوٹا عنایت فرمایا یا اپنا لعاب دہن مرحمت فرمایا۔

شفاء ہونے کا سبب بھی لعاب دہن ہی ہے، چنانچہ بعض امراض چشم کے سلسلہ میں اطباء نے آنکھوں میں خود اپنا لعاب دہن لگانا تجویز کیا ہے۔ اور جب بات انبیاء علیہم السلام اور حضور پر نور رسالت مآب ﷺ کے لعاب دہن کی ہو تو پھر کیا پوچھنا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے لعاب دہن مبارک کے سلسلہ میں کئی روایتیں آئی ہیں۔

(۱) جب حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مدینے جانے کے بعد مہاجرین میں یہ اول مولود تھے، حضرت عبد اللہ کی والدہ حضرت اسماءؓ جو ابو بکر صدیقؓ کی صاحبزادی تھیں، نومولود کو لیکر آپ ﷺ کی خدمت میں آئیں اور آپ ﷺ کے قدموں میں ڈالدیا، آپ ﷺ نے کھجور منگوا کر چبائی اور بچے کے منہ میں ڈالدیا، پھر برکت کی دعا فرمائی۔

(۲) حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ہاں جب لڑکا پیدا ہوا تو وہ آپ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے منہ میں کھجور ڈال کر اس کے منہ میں ڈالدیا، بچے کا نام رکھا اور برکت کی دعا کی، آپ ﷺ بعض بچوں کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالتے اور بعض کی آنکھوں اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے تھے (بخاری)

یہ تو تھا آنحضرت ﷺ کا عمل، لیکن بعد کے زمانے میں دوسرا عمل شروع ہو گیا یعنی مشائخین دنیا پرست اور دکھاوے کے صوفیاء نے اپنی کرامتوں اور مافوق العادت کے مظاہروں کے ذریعہ (حضورؐ کے عمل، پسخوردی کو چھوڑ دیا)، لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھانسنے لگے، چنانچہ تعویذ، گنڈے، جنات اور موکلین کو تابع کرنے کے عملیات میں مشغول ہو گئے، اس طرح لوگ اوہام پرستی کا شکار ہوتے گئے۔ اور یہ وباء ہر عام و خواص میں پھیل گئی۔ حالانکہ یہ اعمال شریعت محمدی کی علانیہ خلاف ورزی تھی، چونکہ امامؑ کی بعثت شرع محمدی کی اتباع اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے احیاء کیلئے تھی، اس لئے آپؑ نے

حضورؐ کی سنت پسخوردہ کو زندہ کیا، جس کے ذریعہ ہر بلا، اذیت اور تکلیف سے نجات بھی ملتی تھی اور برکت بھی حاصل ہوتی تھی، بلکہ نور ایمان اور دولت تصدیق سے بھی مشرف ہونے کے مواقع بھی نصیب ہوتے تھے اور یہ کیفیت محض صالحیت اور فضل خداوندی اور لطف الٰہی سے حاصل ہو سکتی ہے، اس لئے آپؑ کے مصدقین اور صدقہ خواروں کا بھی یہی عمل ہے۔

چنانچہ روایت ہے کہ شہر چاپانیر میں ایک رئیس حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، کچھ (منتر) پڑھ کر پھونکنے کی درخواست کی، آپؓ نے فرمایا، ہم (منتر وغیرہ) پڑھنا نہیں جانتے، اگر چاہتے ہو تو پسخوردہ دوں گا۔ اور شفاء تو اللہ کی جانب سے ہے (انصاف نامہ، باب ۲۰)

اسی طرح روایت ہے ایک مشرک نے اپنی عورت کی درد زہ کی وجہ سے پسخوردہ طلب کیا، حضرت مہدیؑ نے دے دیا، (اس عورت کو پلایا گیا) آخر وہ مرگئی، کافروں نے اپنے طریقہ کے مطابق جلانا چاہا، نعش نہ جلی حضرت مہدیؑ کو اس کی خبر پہنچی، آپؑ نے فرمایا، وہ نہ جلے گی، ان سے کہہ دو کہ وہ دفن کر دیں۔ آخر ان لوگوں نے دفن کر دیا، نیز ایک روایت میں ہے کہ ایک روز دائرہ میں "محافظ" ایک کتے نے سانپ دیکھا، اور دوڑ کر منہ میں پکڑ لیا، سانپ نے کتے کی زبان ڈس لی، کتا حضرت مہدی موعودؑ کے پاس زبان لٹکایا ہوا آیا، حضرت مہدی موعودؑ نے دریافت فرمایا "اس کتے کو کیا ہوا" صحابہؓ نے عرض کیا سانپ نے ڈس لیا، حضرت مہدیؑ نے اپنا لعاب دہن اس کی زبان پر ڈالدیا، اسی وقت سانپ کا زہر دفع ہو گیا۔

اسی طرح ایک روز حضرت مہدیؑ کے آگے ایک آسیب زدہ شخص لایا گیا، حضرتؑ نے اپنی زبان سے اس جن سے سوال کیا، تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں جنات کا بادشاہ ہوں۔ آپؑ نے اپنا پسخوردہ پلایا، جب پانی حلق میں پہنچا تو اسی وقت وہ چیخ اٹھا اور التماس کرنے لگا کہ، پسخوردہ اور دیجئے، یہ پانی جسم کے کچھ حصے میں پہنچا ہے، وہ مسلمان ہو گیا، اگر تمام جسم میں یہ پانی سرایت کر جائے گا تو بالکل مسلمان ہو جائے گا، دوبارہ پسخوردہ دیا گیا، پیتے ہی وہ کلمہ پڑھا اور آسیب زدہ کو صحت نصیب ہو گئی (نقلیات میاں عبد الرشید مع تشریحات، ص ۱۷۲)۔

پنڈلی

عربی میں اسکو ساق کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں اس کا ذکر اسطرح آیا ہے۔ يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿القلم:۴۲﴾ / جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور کفار کو سجدے کیلئے بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔

پنڈلی کھولی جانا ایک محاورہ ہے۔ جس کے معنی کام کی سختی اور مصیبت کا آنا ہے۔ آدمی جب سخت کام کرتا ہے یا اسے مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنے کپڑے پنڈلی سے اوپر کر لیتا ہے۔ تاکہ وہ زیادہ مستعدی کے ساتھ کام کر سکے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ قیامت کا دن قابل ذکر ہے جب وہاں کافروں کو سجدہ کیلئے بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ ان کی پیٹھ تختہ ہو جائے گی۔ لیکن مومن خدا کی تجلّی کے سامنے اس لئے سجدہ کر لیں گے کہ دنیا میں انہوں نے اللہ کے حکم سے اللہ کو سجدہ کیا تھا ساق کی تجلّی میں یہ اثر ہو گا کہ سب سجدہ کرنے پر مائل ہو جائیں گے لیکن کافروں کی رسوائی ہو گی۔ ساق کی تجلّی کیسی ہو گی اسکی گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس پر ایمان رکھنا فرض ہے۔ اسکی کیفیت کا علم صرف اللہ کو ہے۔ بخاری کی راویت میں ''یکشِفُ رُبُّنا عن ساقہ'' آیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا پروردگار اپنی پنڈلی کھولے گا۔ یہاں بھی ساق کا لفظ متشابہات سے ہے جیسا کہ اللہ کا ہاتھ یا چہرہ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں مطلب وہی ہے کہ ذات کی تجلّی ہو گی اس لئے کہ نہ تو اللہ کو جسم ہے، نہ اعضاء ہیں۔ وقت یا کام کی شدّت ظاہر کرنے کیلئے لفظِ ساق کا استعمال ہمارے پاس کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قیامت میں ایک ساعت ایسی آئے گی جو بہت زیادہ سخت ہو گی اور یہ وقت وہ ہو گا جبکہ ساق کی تجلّی ظاہر ہو گی۔ کفار یہ کہتے تھے کہ ہمارے ساتھ مسلمانوں کے جیسا سلوک ہو گا۔ اس کے جواب میں اللہ نے یہ فرمایا کہ ہر گز نہیں۔ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس کا امتحان اس وقت ہو گا جب پروردگار کے ساق کی تجلّی ہو گی اور کافروں کو سجدے کیلئے بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ یعنی چاہنے کے باوجود سجدہ کرنے پر قادر نہ ہوں گے کیوں کہ ان کی پیٹھ تابنے کے تختے کی طرح ہو جائے گی او ران کے گھٹنے بھی مُڑ نہ سکیں گے۔ اس کے بر خلاف مومن فوراً سجدہ میں گر پڑیں گے۔ جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ دنیا میں اللہ اکبر کے ساتھ نمازوں میں سجدہ کر لیا کرتے تھے۔

یہ آیت ان لوگوں کیلئے وعید ہے جو اذان اور اقامت میں حیّ علی الصلوٰۃ اور حیّ علی الفلاح سن کر بھی جماعتوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ وہ اللہ کی تجلّی ظاہر ہونے کے بعد بھی وہاں اس دن اور اس وقت سجدہ نہ کر سکیں گے۔ بلکہ وہ لوگ بھی جو ریاکاری کے تحت سجدہ کرتے تھے وہاں نہ کر سکیں گے۔ البتہ وہ لوگ جو صدق دل سے اور کامل ایمان

کی حالت میں دنیا میں سجدے کرتے تھے وہاں بھی سجدہ کرلیں گے۔ جب منافقین سجدہ نہ کرپائیں گے تو مشرکین کس طرح سجدہ کریں گے۔ تب مومنین اور مشرکین اوران کے ساتھ منافقین میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہو جائے گا۔ یہاں ایک اور بات بھی حدیث کی روشنی میں مفسرین نے لکھی ہے کہ جب کافر اس تجلّی کو دیکھیں گے تو انکار کر دیں گے اور کہیں گے **نعوذ باللہِ منك**۔ اس لئے کہ وہ رب کو ایسی صورت میں دیکھیں گے جو ان کے خیال کے برعکس ہو گی۔ لیکن مومنین جنھوں نے یا تو دنیا میں چشم سر یا چشم قلب یا خواب میں اللہ کو دیکھا ہو گا، وہ سجدہ میں دوبارہ چلے جائیں گے۔

پدماوت

پدماوت ہندی کے ایک مشہور شاعر ملک محمد جائسی کی نظم ہے، ملک محمد جائسی مہدوی تھے، ان کی سنہ پیدائش ۱۴۷۷ء اور سنہ انتقال ۱۵۴۲ء بتایا جاتا ہے، (روزنامہ انقلاب بمبئی کے ادبی البم مورخہ ۴۔ دسمبر ۲۰۱۱ء یکشنبہ)

صاحب خزینۃ الاصفیاء میں لکھا ہے "ملک محمد جائسی کا لقب محقق ہندی ہے، (حضرت سید) محمد مہدیؑ کے خلیفہ شیخ الہداد کے مرید و خلیفہ ہیں، ان کے کلام سے جو مفہوم ہوتا ہے، یہی ہے، اپنی کتابوں میں ان کی بہت تعریف کی ہے، جائسی نے پدماوت میں اپنے مرشدوں کا سلسلہ اس طرح بیان کیا ہے"

میرا معشوق سید اشرف اور پیر سکھائے اس نے مجھ کو راہ تاثیر

ہیں ان کے شیخ برہان مرشد و پیر جو لائے راہ پر مجھ کو بہ تاثیر

وہ الہداد پیر ان کے نکو ہیں جو دنیا میں روشن سرخرو ہیں

ہوئے سید محمد انکے مخدوم کیا صحبت نے کامل، نیک مقسوم

(پدماوت ترجمہ اردو۔ ص ۳۸، ۴۰۔ طبع نول کشور۔ ۱۸۷۳ء)

تیسرے شعر میں حضرت بندگی ملک الہدادؒ کا ذکر کیا گیا ہے، یہ وہی ہیں جن کے متعلق ملا عبد القادر بدایونی نے نجات الرشید میں بیان کیا ہے کہ شیخ برہان کالپی کو تین دن میں مقرب بارگاہ الٰہی بنادیا تھا۔

صاحب شجرہ چشتیہ کے بیان سے بھی آپ کا سلسلہ حضرت بندگی میاں الہداد سے ملتا ہے، چناچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء میں مذکور ہے "صاحب شجرہ چشتیہ کا بیان ہے کہ وہ یعنی ملک محمد جائسی آخر عمر میں الہداد کے مرید ہوئے اور تھوڑی ہی زمانے میں کاملین وقت سے ہوگئے، جائسی کی شاعری عرفان کا مخزن معنی گئی ہے، یہ سب مہدویہ تعلیم کا اثر تھا، انہوں نے اوائل عمر میں مسلم اور ہندو تہذیب و ثقافت کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، لیکن تصوف کی چھاپ غالب رہی، جس کی وجہ سے انہیں بے مثال حسن، تخیل کی گہرائی اور فنی چابک دستی سے متصف فن پاروں کی تخلیق میں مدد ملی، جائسی ایک صوفی شاعر تھے، چناچہ خدا کی وحدانیت اور انسانی اخوت کی تعلیم ان کے کلام کا اہم عنصر رہا ہے، جائسی نے اپنے فن پاروں میں زندگی اور محبت کا ایک انوکھا تصور پیش کیا ہے، جو اس کا رشتہ تصوف کی روایت اور سولہویں اور سترہویں صدی میں ہندوستان میں پھلنے پھولنے والی (، بھکتی تحریک) سے قائم کر دیتا ہے، زیر خط الفاظ، یم اسعد الدین صاحب کے ہیں، ان الفاظ سے انکی مہدویت سے تعصب کی ذہنیت آشکار ہوتی ہے، حالانکہ اس زمانے میں جو تحریک پھل پھول رہی تھی، اور جس نے درباروں میں رسائی حاصل کرلی تھی،

وہ ”مہدویت کی تحریک“ تھی جائسی یہ بات بالکل واضح کر دیتے ہیں کہ عشق مجازی اتنا جامع اور کثیر الجہات ہوتا ہے کہ اس میں عشق حقیقی کے بھی پہلوں مل جاتے ہیں، جائسی کو تقریباً پچیس کتابوں کا مصنف مانا جاتا ہے، جن میں مشہور ”پدماوت، چتراوت، کھروانامہ، مرائی نامہ، قہرہ نامہ (کہرہ نامہ)، مہرنامہ (مہرانامہ)، مسئلہ نامہ، اکھراوت اور کنہاوت“ شامل ہیں۔(روزنامہ انقلاب اور نزہۃ الخواطر، الجزء الرابع، ص ۳۲۷)

اب تک ان کی صرف چھ کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں پدماوت سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ پختہ فن پارہ ہے، اس رزمیہ کا قصہ چتوڑ گڑھ کے راجہ رتن سین اور سنگھالدیپ کی شہزادی پدماوتی کی محبت کے محور پر گھومتا ہے،

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ملک محمد جائسی اکبر بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے، یہ حد درجہ خمیدہ پشت ہوگئے، بادشاہ ان کو دیکھکر ہنس پڑا، تو محمد جائسی نے کہا اے بادشاہ، تم برتن پر ہنستے ہو یا کمہار پر، بادشاہ نے یہ بات سن کر ان کی فطانت پر بڑی تعریف کی۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے ان سے متعلق یہ لکھا ہے ”**كان من الشعراء المفلقين في اللغة الهندية**۔ہندی زبان کے عجیب کلام کہنے ولاے شاعروں میں سے تھے۔

ملک محمد جائسی نے امیٹھی میں وفات پائی، اس لئے کہ آپ کے خاندان کا آخری عمر میں جائس سے امیٹھی جانا ثابت ہے، سری سرن واستونے ”ہندی کے نقش اولین“ کے عنوان کے ذیل میں جائسی سے متعلق یہ لکھا ہے۔امیٹھی کے راجہ نے اس کی بہت قدر کی، جائسی نے امیٹھی میں انتقال کیا، وہاں اب تک اس کی قبر موجود ہے (رسالۂ اردو، جولائی ۱۹۴۳ء ص ۳۱۶ ماخوذ از مقدمہ سراج الابصار، ص ۲۴۹)

قاضی قاضن اور شاہ عبد اللطیف بھٹائی۔ جس طرح ملک محمد جائسی کو ہندی شاعری کا آدم کہا جاتا ہے، اسی طرح قاضی قاضن کو سندھی شاعری کا آدم کہا جاتا ہے، یہ دونوں حضرات مہدوی تحریک سے وابستہ تھے، اور مہدویہ عقائد کو اپنا طرہ امتیاز سمجھتے تھے، اور انکی اشاعت میں مشغول تھے، مہدوی تحریک کی نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ مذہب وعقیدہ کی تبلیغ کیلئے مقامی زبان کو ذریعہ بنانے کی ابتداء برصغیر میں سب سے پہلے مہدوی تحریک نے کی، یہ دونوں اپنی شاعری میں زندگی کے مسائل کو نمایاں کرتے ہیں اور کچلے ہوئے انسانوں کو زندہ رہنے کیلئے جدوجہد کا پیغام دیتے ہیں، ان کا کلام ہر مسلک اور ہر عقیدہ کے افراد کیلئے پیغام محبت ہے، ایثار، قربانی، راست بازی، اور ثابت قدمی کا درس ہے، شاہ صاحب کو مادر وطن سے عشق تھا، وطن کی سرزمین، وطن کے رہواسی، وطن کی ندیاں، وطن کے موسم، پھل پھول اناج پرندے، چرندے، خارزار اور ریگذار ان کے

محبوب ہیں، عشق و حسن کی داستانوں میں عزم، حوصلہ اور استقلال کا درس اس خوبصورتی سے دیا ہے کہ سامع کے حواس اور اس کی روح میں زندگی کے یہ اعلیٰ اقدار رچ بس جاتے ہیں، نمونہ کلام پیش ہے۔

تشنگی تشنگی بجھاتی ہے تشنگی تشنگی بڑھاتی ہے پھر تشنگی محبت کی غیر محدود ہو جاتی ہے

وہ منزل ہی کیا جو حاصل ہو جائے؟۔ وصل کی تمنا عشق کی توہین ہے

(۲) دیکھ کر جلوہ ہائے رنگارنگ حسن کا اعتبار کون کرے

اے خوشا لذت فراق یار خواہش وصل یار کون کرے

زندگی کشتہء محبت ہے موت کا انتظار کون کرے (ماخوذ از ماہنامہ ''الانسان'' کراچی، ص ۲۳)

پاس انفاس

پاس انفاس کے معنی سانسوں کی نگرانی، اس بات کا دھیان کہ کوئی سانس اللہ کے ذکر سے خالی نہ ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کل نفس یخرج بغیر ذکر اللہ فھو میّت" یعنی جو سانس اللہ کے ذکر کے بغیر نکلے وہ مردہ ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ انفاس پاس دار اگر مرد عارفی۔ یعنی اگر مرد عارف ہے تو سانسوں کی نگرانی اور پاسداری کر۔

مہدویہ کی تعلیم ذکر پاس انفاس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مہدوی ناک کو ذکر کا آلہ بناتے ہیں۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ نے اپنے ایک رسالہ میں اس کا تذکرہ یوں فرمایا ہے۔ "متبعین سید محمد مہدی علیہ السلام پر (بعض لوگ) جو الزام عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے ناک کو آلۂ ذکر قرار دیا ہے، "محض غلط" ہے۔ اس کے بعد آپؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو واضح کرتے ہوئے یہ آیات بیان کی ہیں۔ وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ﴿اعراف:۲۰۵﴾ ترجمہ۔ اور صبح و شام ذکر کرو اپنے رب کا عاجزی اور خوف کی حالت میں نہ کہ کھلی آواز میں اور غافلوں میں شامل نہ ہو جاؤ۔

نیز یہ آیت بھی درج کی ہے إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا﴿مریم:۳﴾۔ جبکہ انہوں نے اپنے رب کو پوشیدہ طور پر پکارا۔ اسکی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "چوں مصطفی ﷺ و پیغمبراں دیگر مامور بذکر خفی باشند، پس معلوم شد کہ ذکر خفی اولیٰ تر است، از ہمہ اذکار و آلتِ ذکر قلب است، و تا آں کہ یاد حق در دل قرار نگیرد ذاکر از صفات غفلت بیروں نیاید، و قرار دادن ذکر حق را بغیر پاسداری نفس محال باشد و بغیر ذکر پاس انفاس دل از خواطر و اوھام پاک نشود، زیرا چہ منشا و مستقر قلب است۔ ترجمہ: جب محمد مصطفی ﷺ و دیگر پیغمبراں ذکر خفی پر مامور ہیں تو معلوم ہو کہ ذکر خفی تمام اذکار میں اولیٰ تر ہے۔ اور آلۂ ذکر قلب ہے۔ جب تک یاد حق دل میں قرار نہ پائے ذاکر صفات غفلت سے بچ نہیں سکتا، اور بغیر پاس انفاس کے ذکر کا قائم ہونا محال ہے۔ اور پاسداریٔ نفس کے بغیر دل خطرات اور اوھام سے پاک نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ سانس کا منشا و مستقر قلب ہے۔

اس کے بعد آگے چل فرماتے ہیں۔ "نفس مقید بہ بینی نیست بلکہ اورا دخل در جمع اعضاء است و ہم ازیں جہت ہمہ روندگان راہِ حق و جویندگان ذات مطلق ذکر خفی را اولیٰ تر داشتہ اند، زیرا کہ بے ذکر خفی و ذکر پاس انفاس وجود ذاکر زلوث وریا و عجب پاک نشود و ذکر دوام حاصل نیاید، از جہت آں کہ اگر ذکر حق را بت زبان آرد گاہے باشد کہ ذاکر بخایت و بخوردن و بخسپیدن مشغول شود و چوں مشغول بچیزے شود از یاد حق باز ماند و از جملہ غافلاں باشد و غفلت صفت مومن نیست۔

یعنی سانس ناک میں مقید نہیں رہتی، اس کا دخل تو تمام اعضاء جسمانیہ میں ہے، اسی لئے سالکین راہ حق اور طالبین ذات مطلق نے ذکر خفی کو اولیٰ تر قرار دیا، کیونکہ ذکر خفی اور ذکر پاس انفاس کے بغیر ذاکر کا وجود لوث، ریا و عجب سے پاک نہیں ہو سکتا، اور ذکر دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ذکر حق زبان سے کیا جائے تو چونکہ ذاکر کبھی مصروف گفتگو ہوگا، کبھی کھانے اور سونے میں مشغول ہوگا اور جب کبھی دوسری مشغولیت ہوگی، زبان کے ذریعے یاد حق سے باز رہیگا اور غافلین میں شمار ہو جائیگا، حالانکہ غفلت مومن کی صفت نہیں ہے۔

اس کے بعد دوران بحث حدیث شریف "کُلُّ نَفس یَخْرج بغَیرِ ذِکر اللہِ فَھُوَ مَیِّت" پیش کرکے فرماتے ہیں۔ ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کے فرمان میں حکمت یہ ہے کہ سانس کو چونکہ دل میں اور تمام اعضاء میں دخل ہے۔ جب سانس ذکر حق کے ساتھ تمام اعضاء میں سرایت کرے گی اور ذکر کے فیض سے حیات کا اثر تمام اعضاء میں ہوگا تو ذاکر کے دل میں ایمان کا درخت اگائیگا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ" ایمان کا درخت اس طرح اگاتا ہے۔ جس طرح کہ پانی سبزی اگاتا ہے۔ اے عزیز! تو جان لے مقصد یہی ہے کہ سانس کی پاسداری سے ذکر اللہ دل میں قرار پائے اور سانس ذکر اللہ کے ساتھ اندر جاتی اور باہر آتی ہے، خواہ منھ کے ذریعہ یا ناک کے ذریعہ، یہ دونون سانس کے راستے ہیں، سانس محض اس راستے سے گذرنے کی وجہ سے ناک ذکر کا آلہ نہیں قرار دی جاسکتی، کیوں کہ سانس تو بذات خود مطلق ہے اور متبعین حضرت سید محمد مہدی علیہ السلام کا مقصد یہی ہے کہ سانس کی پاسداری کے ذریعہ ذکر اللہ کو قلب میں قائم کیا جائے اور ذکر خدا سے ہی قلب کو اطمئنان نصیب ہو سکتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ" ﴿الرعد:۲۸﴾۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی قلوب مطمئن ہوتے ہیں۔ اور یہی حصول دیدار کا ذریعہ بھی ہے۔

نیز یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ ایک موقع پر کسی نے چار بڑی کتب سماویہ کے نزول کی ماہیت کی نسبت حضرت مہدی علیہ السلام سے سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا۔ "مراد از توریت وزبور وانجیل وفرقان بیک کلمہ اندک، لا الہ الا اللہ است" اس میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ کلمہ طیبہ میں "نفی غیر اللہ" مقدّم ہے اور "اثبات الا اللہ" موخر ہے، بالفاظ دیگر غیر حق کی نفی جس قوت کی ہوگی، اللہ کا اثبات اسی قدر موثر ہوگا۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ فرماتے ہیں کہ "ذکر خفی اولیٰ تر ہے تمام اذکار سے اور آلہ ذکر خفی کا دل ہے، جب تک کہ یاد حق دل میں قرار نہ پکڑے ذاکر صفات غفلت سے ہر گز باہر ہو نہیں سکتا۔ اور قرار پکڑنا دل کا بغیر پاسداریء نفس کے محال ہے اور بغیر پاس انفاس کے دل خواطر واوھام سے پاک نہیں ہو سکتا، کیونکہ منشاو مستقر نفس کا قلب ہے۔

اے عزیز بغیر ذکر خفی کے پاسبانی دل کی میسّر نہیں ہوتی اور ذاکر خطرات لایعنی اور وساوس شیطانی سے خلاصی نہیں پاتا۔ چنانچہ مرغوب القلوب میں خواجہ شمس الدین تبریزیؒ فرماتے ہیں۔

پاسبان دل شو اندر کلّ حال تا نیاید ہیچ دزداں را محال

ہر خیال غیر حق راڈزد داں ایں ریاضت سالکاں رامزد داں

یعنی ہر حال میں تو دل کا پاسبان ہو جا تا کہ کسی چور کو داخل ہونے کی مجال نہ ہو۔ غیر حق کے ہر حال کو چور سمجھ اور اس ریاضت کو سالکوں کیلئے اجرت سمجھ۔

توبہ

توبہ کے لغوی معنی ہیں رجوع کرنا۔ باز آجانا۔ پلٹنا۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کے کر لینے کے بعد جسے کرنے سے حق تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، محض حق تعالیٰ کے خوف سے باز آجانا توبہ ہے۔ اگر اس سے ایسی کوئی چیز سرزد ہو چکی ہو تو پھر ندامت و شرمندگی کے احساس سے اس کا اعادہ نہ کرنے کے عزم صمیم سے اس سے باز آجانا توبہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فعل بد سے پشیمانی توبہ ہے۔

سالکان حق کا پہلا قدم توبہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّـهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا** ﴿التحریم:۸﴾ اے ایمان والو حق تعالیٰ کے حضور سچی توبہ کرو۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا **وَتُوبُوا إِلَى اللَّـهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ**۔ (النور:۳۱﴾۔ اے ایمان والو سب اللہ کے حضور توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

نیز یاد رہے کہ توبہ تین قسم کی ہے: عام۔ خاص۔ خاص الخاص۔ عام توبہ زبان سے ہے۔ خاص توبہ دل سے ہے۔ خاص الخاص توبہ جان سے ہے۔ اگر کوئی شخص کس امر نامشروع کا ارتکاب کرے پھر ندامت کے احساس کے ساتھ اور آئندہ نہ کرنے کے ارادے کے ساتھ اس سے باز آجائے اور پھر چند روز کے بعد پھر وہ کام کرے، یعنی اپنی توبہ کو توڑ دے اور غیر مشروع کاموں میں مشغول ہو جائے تو ایسی توبہ کو توبہ منافقاں اور توبہ گدایاں کہتے ہیں اللہ تعالیٰ تمام مومنوں کو ایسی توبہ سے محفوظ رکھے۔ خاص توبہ یہ کہ گنہ گار زبان سے اقرار کرے اور دل سے اس توبہ پر استوار بھی رہے۔

خاص الخاص توبہ یہ ہے کہ شب و روز میں چوبیس گھنٹے یعنی 21,300 دم جو شمار کے گئے ہیں ان میں سے ایک دم بھی بغیر ذکر الٰہی کے نکلے تو اسے بھی گناہ سمجھے اور اس سے توبہ کرے اور ذکر میں مشغول رہے۔

عام توبہ وہ توبہ ہے جو زبان سے کی جاتی ہے۔ یعنی زبان سے اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ جو گناہ سرزد ہو گئے ہیں ان سے توبہ کرتا ہوں اور آئندہ خلاف شرع اور مخالف حکم خدا کوئی کام نہ کروں گا۔ چند روز بعد پھر توبہ کو توڑ کر ان ہی غیر مشروع کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ ایسی توبہ کو توبہ منافقاں کہتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منھا۔ توبہ خاص وہ توبہ ہے جو دل سے کی جاتی ہے یعنی زبان سے توبہ کا اقرار بھی کرے اور دل سے اس پر قائم رہنے کی کوشش بھی کرے۔ توبہ خاص الخاص وہ توبہ ہے جو شب و روز کی ساعتوں میں سے کسی ساعت میں کوئی دم بغیر اللہ کے ذکر کے نکلے تو اسے گناہ کبیرہ سمجھے اور اس سے توبہ کرتے ہوئے ذکر دوام حاصل کرلے۔

اسی طرح حضرت فضیل بن عیاض اپنے زمانے کے مشہور ڈاکو تھے، بلکہ ڈاکوؤں کے سردار تھے۔ ایک دن ایک قافلہ لوٹ رہے تھے اسی قافلہ کا ایک شخص بڑی محویت کے ساتھ قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب فضیل اس کے قریب پہنچے تو وہ یہ آیت تلاوت کر رہا تھا 'أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّـهِ' ﴿الحدید:۱۶﴾ یعنی کیا اب بھی ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ وہ اللہ کے ذکر یعنی اس کی نصیحت سے ان کے دل نرم ہو جائیں بس یہ سننا تھا کہ دل نرم ہو گیا دل میں خوف الٰہی نے جوش مارا۔ ادھر ھادی حقیقی نے ہدایت کا تیر چھوڑا اور بس فضیل کے دل میں پیوست ہو گیا۔ فضیل خود شکار ہو گئے اسی وقت پکار کر کہا ہاں اب وقت آگیا توبہ کر لی۔ لوٹا ہوا مال واپس کر دیا اور پاک دیندارانہ زندگی شروع کر دی۔ اچھی صحبت اختیار کر لی اور دربار خداوندی سے ولایت کا مقام عطا ہوا۔ مشہور زمانہ صوفی اور ولی کامل بن گئے۔

دور ولایت میں حضرت بندگی میاں شاہ نعمت کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ کس طرح وہ پہلے لوٹ مار کرتے تھے۔ مصاحب بادشاہ کے اکلوتے اور چہیتے بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔ سارے شہر میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے ان کی گرفتاری کے لئے وارنٹ نکل گیا تھا۔ لیکن اچانک یہ واقعہ ہوا کہ امامنا حضرت مہدی موعود علیہ السلام کے دائرے کے ایک فقیر کی اذان کی آواز سن کر اپنی گذشتہ زندگی سے توبہ کر لی اور امامنا علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر تصدیق و بیعت سے مشرف ہو گئے۔ نعمت سے ''شاہ نعمت'' اور ''خوانِ نعمت'' بن گئے۔ اور حضرت مہدی علیہ السلام کے خلیفہ سوم قرار دیئے گئے۔ غرض کہ ہر سالک کے لئے توبہ پہلا قدم ہے۔ پھر مقام ترک آتا ہے۔ صحبت صادق سے رنگ نکھر تا ہے۔ ذکر سے پَر ملتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہباز بن کر لاہوت اور ہاہوت کی سیر کرنے لگتا ہے۔ اللہ ہم سب کو توبۂ نصوح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا مِنْ شَـيءٍ أَحبُّ إلي الله مَن شـاب تائِبُ۔ حق تعالیٰ کو توبہ کرنے والے نوجوان سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں اسی طرح یہ بھی فرمایا التَّائِبُ مِنْ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ۔ توبہ کرنے والا اس شخص کے مانند ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔

پھر آپ نے فرمایا: إذَا أَحبّ الله عَبْداً لَمْ يَضِـرهُ شَـيأ۔ جب اللہ کسی کو دوست رکھتا ہے تو گناہ سے اس کو نقصان نہیں ہوتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کو گناہ پر باقی نہیں رکھتا بلکہ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا إِنَّ اللَّـهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿البقرۃ:۲۲۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو دوست

رکھتا ہے۔ تو صحابہ نے عرض کیا توبہ کی کیا علامت ہے تو فرمایا ''ندامت و پشیمانی'' مطلب یہ کہ گناہ کے سرزد ہوتے ہی شرمندگی محسوس کرے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہو کر اس گناہ کو ترک کرے اور آئندہ نہ کرنے کا پکا ارادہ کرلے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَـٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿النساء:۱۸﴾ یعنی توبہ (کی قبولیت) ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو گناہ کرتے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ کسی کے مرنے کا وقت آجاتا ہے تو کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور نہ توبہ ان کے لئے ہے جو کفر کی حالت میں مرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: كُلُّكُمْ خَطَّائُون وَ خَير الخَطّائِين التَّوّابُون۔ یعنی تم سب کے سب خطاکار ہو۔ اور بہترین خطاکار توبہ کرنے والے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ خطا اور غلطی تو سب سے ہوتی ہے لیکن خاطی کو چاہئے کہ فوراً اس غلطی اور خطا سے توبہ کرلے اور ہمیشہ اپنی اس توبہ کی حفاظت کرے۔ غلطی، خطا، نسیان وغیرہ انسان سے تو ہوتا ہے لیکن یہ اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اس کا موثر علاج توبہ کے ذریعہ بتلایا ہے۔

حضور ختم الانبیاء البتہ خطا سے معصوم ہیں کہ اللہ نے آپ کو خطا سے دور رکھا۔ اور حضرت مہدی موعود علیہ السلام بھی معصوم عن الخطا ہیں۔ اس لئے کہ آپ خلیفتہ اللہ ہونے کی بناء پر معصوم عن الخطا ہیں، اس کی گواہی خود حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ فرمایا، إِنَّهُ يَقفُو أثرِي وَ لَا يُخْطِي۔ یعنی مہدی میرے نقش قدم پر چلیں گے اور خطا نہیں کریں گے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ توبہ میں 3 شرائط ہیں۔ (۱) گناہ کو ترک کرنا (۲) جو گناہ ہوا ہے اس پر شرمسار ہونا (۳) جب تک زندہ رہے پھر دوبارہ وہ گناہ نہ کرنے کا پکا ارادہ کرنا۔

سچی توبہ کرنے والوں کی چند علامتیں ہیں جیسے دل کی نرمی، زیادہ رونا، نیک اور صادقوں کی صحبت میں اکثر رہنا، برے لوگوں سے دور رہنا، اور برے مقامات سے علیحدگی اختیار کرنا۔

لغزش پر ندامت اور شرمندگی کے بھی تین اسباب ہوتے ہیں۔

(۱) عذاب کا خوف دل پر طاری ہو جائے برے افعال کی وجہ سے دل ملول اور مغموم ہو جائے اس طرح ندامت

کا احساس ہو۔اس صورت میں توبہ کرنے والے کو ''تائب'' کہتے ہیں۔

(۲) نعمت کی خواہش ہو۔اور یہ احساس ہو کہ نافرمانی اور غلط کام کرنے سے نعمت حاصل نہیں ہوتی۔اس صورت میں توبہ کرنے والے کو ''منیب'' کہتے ہیں۔

(۳) روز قیامت رسوائی کا خوف ہو اور اس خوف کی وجہ ندامت کا احساس ہو تو اس صورت میں توبہ کرنے والے کو ''اوّاب'' کہتے ہیں۔

توبہ عام مومنوں کے لئے ہے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّـهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ﴿التحریم:۸﴾۔ انابت اولیاء اور مقربان حق کا شیوہ ہے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے۔ مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَـٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿ق:۳۳﴾ یعنی جو شخص خدائے رحیم سے بن دیکھے ڈرے اور جس کے پہلو میں حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا دل ہے۔

اوبیۃ۔ انبیاء و مرسلین کا مقام ہے۔جب کہ اللہ نے فرمایا نعم العبد انہ اواب، بہت اچھا ہے وہ بندہ جو اللہ کی طرف بہت رجوع کرے۔

توبہ کرنے والے کو تو گناہ کی یاد کا تو کیا ذکر، اپنی خودی سے بھی توبہ کرنا یعنی دست بردار ہونا چاہئے۔اسی طرح غیر اللہ کا ذکر بھی اللہ سے اعراض کرنا ہے اور غیر اللہ کے ذکر سے بھی انسان کو توبہ کی ضرورت ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا ''میں نے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا مگر اس چیز سے بڑھ کر مجھے کسی چیز نے فائدہ نہیں دیا'' جب میں نے اپنے حبیب (خدا) سے کہا میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تو جواب ملا تیرا وجود اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے مقابل کسی اور جرم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔عربی میں جو مصرعہ ہے وہ اس طرح ہے: ''وجودك ذنب لا يقاس به ذنب''۔

امامنا مہدی علیہ السلام نے فرمایا ''زیستن بجاں آنرا ہستی و خودی گویند''۔یعنی جان سے جینا اسی کو ہستی اور خودی کہتے ہیں۔یعنی اپنی ہستی اور خودی کو فراموش کرنا ہی سب سے بڑی توبہ ہے۔

پس توبہ کی 3 قسمیں ہوئیں۔(۱) توبہ گناہ سے نیکی کی طرف (۲) توبہ نیکی سے بلند تر نیکی کی طرف (۳) توبہ خودی سے خدا کی طرف۔

(۱) خطا اور گناہ سے نیکی کی طرف توبہ کی مثال۔اللہ نے فرمایا: وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا

أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّـهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ ﴿آل عمران:۱۳۵﴾ اور وہ لوگ جن سے کوئی فعل بد سرزد ہوا یا انہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا پھر حق تعالیٰ کو یاد کیا اور گناہوں کی معافی مانگی۔

(۲) نیکی سے بلند تر نیکی کی طرف توبہ کی مثال: موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿الأعراف:۱۴۳﴾ پاک ہے تیری ذات میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں ایمان لانے والوں میں پہلا ہوں۔ مطلب یہ کہ میں نے بے اختیار ہونے کے بجائے اپنے اختیار سے جو دیدار کو طلب کیا۔ اس سے توبہ کرتا ہوں۔ محبت میں اپنا اختیار باقی نہیں رہتا۔ محبت میں تو بے اختیار ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اختیار سے مطالبہ کیا تھا پس آپ نے اس سے توبہ کی۔

(۳) بلند تر مقام کے حصول پر پس ماندہ بلند مقام سے توبہ اور پچھلے تمام مقامات اور احوال سے توبہ کرنے کی مثال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات ہمیشہ کیا ہر دم روبہ ترقی تھے۔ جب آپ بلند مقام سے بلند تر پر پہنچے تو اس سے پچھلے مقام سے استغفار اور اس کو دیکھنے سے توبہ فرماتے۔ واللہ اعلم (کشف المحجوب ص:۴۰۵تا۴۰۰)

نیز یہ بات بھی دھیان میں رہنی چاہیئے کہ گناہ کے ساتھ ہی توبہ کر لینی چاہیئے۔ اس کو بعد پر نہیں ٹالنی چاہیئے۔ ورنہ اگر ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جائے تو اس کا وقفہ لمبا ہوتا جائے گا۔ اور انسان توبہ سے ہی محروم ہو جاتا ہے۔ شیطان اس کو آئندہ کے لئے ٹالنے پر اکسادے گا پھر اس کو فرصت ہی نہ ملے گی عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ آدمی یہ سوچتا ہے کل توبہ کرلوں گا پرسوں کرلوں گا۔ جمعہ کے دن کو کرلوں گا پھر رمضان میں کرلوں گا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ موت سرپر کھڑی ہے۔ پتہ نہیں کب آجائے۔ اور بے توبہ ہی آدمی مر جائے۔ اس لئے موجودہ وقت کو ہی غنیمت سمجھ کر فوراً توبہ کرلینی چاہیئے۔

پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ مجھ سے اتنے بڑے گناہ سرزد ہوئے ہیں کیا اللہ میری توبہ قبول فرمالے گا؟ یہ خیال بھی شیطانی وسوسہ ہے۔ انسان کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ گو میرے گناہ بڑے ہیں لیکن اللہ کی رحمت کی چادر میرے گناہوں سے بھی وسیع ہے وہ خود کو غفار الذنوب کہتا ہے۔ پس مجھے اس کے دربار میں ندامت کے ساتھ توبہ کرلینی چاہیئے۔

چنانچہ ایک شاعر نے اس موقع کیلئے ایک رباعی کہی ہے۔

باز آ باز آنچہ ہستی باز آ، گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ   ایں درگہ مادر گہ نومیدی نیست، صد بار توبہ شکستی باز آ

مطلب یہ کہ تو جو کچھ بھی ہے اور (کیا ہے) اس سے باز آجا۔ اگر تو کافر ہے۔ یہودی ہے بت پرست ہے پھر بھی باز آ یعنی توبہ کر یہ میری بارگاہ نا امیدی کی بارگاہ نہیں ہے اگر تو نے سو بار توبہ توڑی ہے (فکر مت کر) باز آجا یعنی پھر توبہ کرلے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلوص دل سے توبہ کرنے والوں کو اللہ اپنے در سے دھتکار نہیں دیتا مگر خلوص دل سے آئندہ گنہ نہ کرنے کے ارادہ سے توبہ کرنی چاہئے نہ کہ توبہ توڑنے کی نیت سے۔ پھر جو گنہ گار خلوص دل سے توبہ کرتے ہیں اللہ نہ صرف ان کی توبہ کو قبول کرتا ہے بلکہ انہیں اعلیٰ مراتب بھی عطا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض توبہ کرنے والوں کو ولایت کا درجہ بھی اس نے عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ "حبیب عجمی بہت بڑے سود خوار تھے بڑے مالدار تھے بڑی سختی سے سود وصول کرتے تھے دل نہایت سخت ہو چکا تھا لوگوں میں بدنام تھے۔ ایک دن کہیں جا رہے تھے راستہ میں چند بچے کھیل رہے تھے جوں ہی بچوں نے حبیب عجمی کو دیکھا تو انہوں نے کہا دیکھو حبیب عجمی آ رہا ہے اس کو راستہ دے دو اور دور ہو جاؤ، یہ سود خور ہے اگر اس کی دھول بھی ہم پر پڑ جائے گی تو خدا ہم سے پوچھے گا یہ سن کر حبیب عجمی کے دل کو دھکا لگا۔ دل نے کہا حبیب یہ تیری زندگی یہ تیرا مال یہ سب کس کام کا۔ چھوٹے اور معصوم بچے تجھ سے نفرت کر رہے ہیں اور تجھ سے دور بھاگ رہے ہیں۔ جب دنیا میں یہ حال ہے تو قیامت میں کیا ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی دل نرم ہو گیا گناہ کا شدید احساس ہوا۔ اسی راستہ کی ایک خانقاہ پر نظر پڑی بس وہاں گئے دل کھول کر روئے ندامت و شرمندگی سے سچے دل سے توبہ کی اور نئی اور پاک زندگی شروع کرنے کا عزم کر لیا۔ پھر اسی راستے سے واپس ہوئے۔ وہی بچے جو وہیں کھیل رہے تھے تب پھر انہوں نے حبیب عجمی کو دیکھا تو پکار پکار کر کہنے لگے دوستو ہٹ جاؤ حبیب عجمی کو راستہ دو ہاں دیکھو کہ کہیں ہماری دھول بھی ان پر نہ پڑنے پائے وہ اب توبہ کر کے پاک وصاف ہو کر آ رہے ہیں اگر ہماری دھول بھی ان پر پڑ جائے گی تو خدا ہم سے پوچھے گا۔ حبیب عجمی نے میدان ولایت کے شہسوار بن کر ہزاروں کی رہبری فرمائی۔

ترک دنیا

فرائض ولایت میں سے ایک اہم فرض ترک دنیا ہے۔ جس کے معنی دنیا کو چھوڑنے کے ہیں۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے ترک دنیا کو فرض قرار دیا ہے بایں الفاظ کہ ورائے ترک دنیا ایمان نیست یعنی ترک دنیا کے بغیر ایمان نہیں ہے

اس نقل مبارک پر بعض ظاہر بیں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ جس نے دنیا ترک نہیں کی اسے ایمان ہی نصیب نہیں ہے حالانکہ ان کا اس قسم کا سوچنا اور کہنا اس لئے غلط ہے اس لئے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ میں بھی اسی قسم کے کلام کے نمونے موجود ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا **لا إِيمَانَ لِمَنْ لا أَمَانَةَ لَهُ** یعنی جس کے پاس امانت نہیں اسے ایمان نہیں۔ **لا دِيْنَ لِمَنْ لا ديانةَ لَهُ** یعنی جن کے پاس دیانت نہیں اسے دین ہی نہیں۔

تو ان احادیث سے جو مفہوم نکالا جاتا ہے تو ویسا ہی مفہوم حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی متذکرہ بالا نقل شریف کا بھی لینا چاہئے یہ تو رہی ایک بات دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ یہ نقل حضرت مہدی علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلی ہے تو اس کا مفہوم بھی آنحضرت کی زبان مبارک سے معلوم کرنا چاہئے یعنی "ورائے ترک دنیا ایمان نیست" میں لفظ ایمان کا مفہوم حضور مہدی علیہ السلام کے پاس کیا ہے؟ معلوم کرنا چاہئے اسی وقت اس نقل شریف کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ حضور مہدی علیہ السلام نے ایک مرتبہ فرمایا "ایمان ذات خدا است" ایمان خدا کی ذات ہے۔ اس لحاظ سے نقل کے معنی یہ ہوئے کہ "ورائے ترک دنیا ایمان نیست" یعنی ترک دنیا کے بغیر خدا کی ذات کا حصول نہیں ہوسکتا ظاہر ہے کہ کسی شخص کو اس سے انکار بھی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ترک دنیا کے معنی حضور ﷺ کی نظر میں کیا ہیں۔ نقلیات کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے ترک دنیا کے معنی عمل صالح کے فرمائے ہیں اس لحاظ سے آپ کی نقل شریف کا مفہوم یہ نکلا کہ عمل صالح کے بغیر خدا کی ذات تک رسائی حاصل ہو نہیں سکتی۔

چنانچہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اعمال صالحہ کی تفسیر ترک دنیا سے کی ہے (المقدمہ الثالثہ) **إن الاعمال الصالحة عبارة عن الاعمال التي تحمل النفس على ترك الدنيا و طلب الآخرة۔** ترجمہ اعمال صالحہ ان اعمال سے عبارت ہے جو نفس کو ترک دنیا اور طلب آخرۃ پر ابھارتے ہیں (الجزء الرابع صفحہ ۵۴۸) علاوہ ازیں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ تمام اسلامی احکام اور تعلیمات کا ماخذ قرآن شریف اور احادیث رسول اللہ ﷺ ہیں ان دو سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں وہ تمام مسلمانوں کے لئے واجب الاعتقاد اور واجب العمل ہوتے ہیں دنیا کے تعلق سے قرآن اور احادیث صحیحہ میں کیا صراحت ملتی ہے

ہم انشاء اللہ ذیل میں لکھیں گے تاکہ ان کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اتنی بات تو یقینی ہے کہ قرآن اور احادیث میں دنیا کی مذمّت ہی آئی ہے اور جو لوگ دنیا کے مرید' طالب اور دنیوی زندگی اور دنیاوی مال ومتاع پر مغرور اور اس سے مطمئن ہو رہے ہیں ان کو انجام بد سے یا تو ڈرایا گیا ہے یا ان پر سخت ترین عذاب کی وعید آئی ہے۔ دنیا کے تعلق سے قرآن شریف کی آیتوں کا مطالعہ کریں تو ہم کو دو قسم کی آیتیں ملتی ہیں۔(۱) حیات دنیا (۲) متاع دنیا

حیات دنیا کے تعلق سے جو آیتیں آئی ہیں وہ اس طرح ہیں۔

(۱) إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ أُولَـٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ ﴿سورہ یونس:۸﴾ ترجمہ: جن لوگوں کو ہمارے دیدار کی آرزو نہیں ہے اور وہ دنیاوی زندگی سے راضی ہو گئے ہیں اور اس سے مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہماری آیتوں سے غافل ہو گئے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

(۲) مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿سورۂ ھود:۱۶،۱۵﴾ ترجمہ: جو لوگ دنیا کی زندگی اور اسکی زینت کے خواہش مند ہیں ہم ان کے اعمال کا بدلہ یہیں دنیا میں پورا پورا بھر دیتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی طرح گھاٹے میں نہیں رہیں گے لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں سوائے دوزخ کے کچھ بھی نہیں ہے انہوں نے دنیا میں جو کچھ (نیک) عمل کئے وہ سب اکارت ہو جائیں گے اور ان کا کیا دھرا سب لغو ہو جائے گا۔

(۳) فَأَمَّا مَن طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ۔ ﴿النازعات:۳۷تا۳۹﴾ ترجمہ: پس جس شخص نے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی کو اختیار کیا تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

یہ اور اس طرح کی دیگر بہت سی آیتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی کے مرید اور طالب کے لئے اس سے راضی ہونے والوں کے لئے اور اس سے مطمئن ہو جانے والے کے لئے اللہ نے دوزخ کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ بات ثابت ہے کہ اللہ نے جس کا وعدہ دوزخ بتایا ہے اس سے بچنا' اسکو ترک کرنا فرض ہے۔ پس حیات دنیا کو ترک کرنا فرض قرار پایا۔

اب رہا یہ سوال کہ حیات دنیا کیا ہے۔ اس کی تعریف قرآن شریف سے معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ﴿سورۂ حدید:۲۰﴾ ترجمہ: جان لو کہ دنیا کی زندگی (۱) کھیل (۲) تماشا (۳) ظاہری طمطراق (۴) آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا (۵) ایک دوسرے

سے بڑھ کر مال واولاد کے خواستگار ہونا ہے۔ گویا حیات دنیا ان پانچ چیزوں کا نام ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی اللہ اور اس کے رسول کے پاس کچھ قیمت ہے؟ کیا قرآن اور احادیث میں ان میں کسی ایک چیز کی طرف رغبت دلائی گئی ہے۔ یا کسی پیغمبر کی تعلیم ان میں سے کسی ایک چیز کو حاصل کرنے کے بارے میں دی گئی ہے یا یہ سچ ہے کہ قرآن میں احادیث کے مجموعوں میں بلکہ انبیاء پیشین کی تعلیمات میں تک ان کی برائی اور مذمت بیان کی گئی ہے پھر ان چیزوں کو ترک کرنا چاہئے یا اختیار؟؟

ہر صحیح العقل مگر دیندار اور دیانت دار شخص یہ جواب دے گا کہ ان کو ترک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس مہدی موعود علیہ السلام نے بھی ان ہی آیات کی بناء پر بحکم خدا دنیوی زندگی کی مذمت کرتے ہوئے اس کو ترک کرنے کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا دنیا کی زندگی کا وجود کفر ہے یعنی جان سے جینا کہ جس کو ہستی اور خودی کہتے ہیں اور یہ پانچوں چیزیں خودی کی ہی پیداوار ہیں اسی لئے آپ نے حیات دنیا کو حرام قرار دیا۔ اس کے بعد ہم دنیا کی دوسری شق متاع حیات دنیا کو دیکھتے ہیں جس کی طرف نشاندہی قرآن نے کی ہے

چنانچہ قرآن میں آیا ہے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ﴿آل عمران:۱۴﴾

ترجمہ: لوگوں کو مزین کر دی گئی ان مرغوب چیزوں کی محبت، عورتیں، بیٹے، سونے کے خزانے، چاندی کے ڈھیر عمدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتیاں (حالانکہ) یہ تو دنیا کی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں اور ہمیشہ کا اچھا ٹھکانہ تو بس اللہ کے پاس ہے۔

گویا ان سات چیزوں کے ساتھ بقدر ضرورت تعلق مباح ہے۔ آگے حرام اور کفر ہے۔

چنانچہ مہدی علیہ السلام نے فرمایا جو شخص اس کی (متاع حیات دنیا کی) خواہش رکھے اور اس میں مشغول رہے وہ کافر ہے (انصاف نامہ) پس خلاصہ ان دونوں قسم کی آیتوں کا یہی رہا کہ حبّ دنیا۔ حب حیواۃ دنیا اور حبّ متاع دنیا مذموم ہے اور اس میں مشغول اور اس کا مرتکب دوزخی ہے اور جس کا وعدہ گاہ دوزخ ہے وہ کافر ہے۔ پس کیا ان کو ترک کرنا فرض نہیں ہوا۔

مزید برآں بادنیٰ تامل یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ "محض ترک" فی نفسہ کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے بلکہ کوئی شخص کسی چیز کو محض ترک نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی کسی چیز کو ترک کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں کسی چیز کے حصول کا ارادہ یا نیت یا خواہش و جذبہ ہوتا ہے۔ کفر و شرک کو ترک کرتا ہے تو اسلام کو قبول کرنا مقصد ہوتا ہے وطن، کاروبار، بیوی بچے چھوڑتا ہے (اگر وہ

دارالکفر ہے) تو دار الاسلام جانا مقصد ہوتا ہے۔ معاصی کو ترک کرتا ہے تاکہ خوشنودی خدا حاصل کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح دنیا ترک کرتا ہے تو اس کا مقصد آخرت کو اختیار کرنا یا اس کو ترجیح دینا ہوتا ہے لیکن چونکہ عملاً وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتا ہے اس لئے اس کو تارک دنیا کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہ حکم سارے پیغمبروں کو دیا گیا ہے ہر پیغمبر کی بعثت کا مقصد ہی لوگوں کو دنیا سے چھڑانا اور آخرت کو ترجیح دینے اور اسکو اختیار کرنیکی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ بل توثرون الحیوٰۃ الدنیا والآخرۃ خیر وابقیٰ ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم وموسیٰ

بلکہ تم تو دنیاوی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور زیادہ باقی رہنے والی بھی اور یہ حکم پہلے کے صحف میں بھی (دیا گیا) ہے یعنی ابراھیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کا حکم انبیاء پیشین کے صحیفوں اور کتابوں میں بھی دیا گیا تھا۔ بالخصوص ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مشرکین مکہ خو کو ابراہیمی کہتے تھے اور یہود حضرت موسیٰؑ کو مانتے اور توریت پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتے تھے۔

یہاں انجیل کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ عیسائیوں نے اپنی طرف سے ''رہبانیت'' کو اختیار کر لیا تھا ویسے بھی عیسائیوں کا رجحان' یہودیوں کی طرح دنیا کی طرف نہیں تھا

آیئے اب آنحضرت محمد مصطفی ختمی مرتبت ﷺ کے عمل اور آپ سے مروی احادیث کا اس سلسلے میں جائزہ لیں۔ آنحضرت ﷺ نے نبوت پر فائز ہونے سے پہلے اگرچہ تجارت کی لیکن آپکا وہ عمل محمد بن عبداللہ کی حیثیت سے تھا محمد رسول اللہ ﷺ کی حیثیت سے نہیں تھا۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے نبوت ملنے کے بعد نہ تو کسی پیشہ کو اختیار کیا اور نہ زراعت کی اس باب میں تو دورائے نہیں ہو سکتیں اللہ کے نام پر جو کچھ آتا تھا آپ اس کو کھاتے تھے ورنہ فقر وفاقہ ہی آپ کا معمول تھا الا یہ کہ ''فئے'' یا مال غنیمت سے جو کچھ آپ کو ملتا تھا اس کو آپ اپنے لئے اپنی ازواج مطہّرات کے لئے اور اپنے اقرباء کے لئے صرف کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کو دنیا اس قدر ناپسند تھی کہ اس نے اپنے حبیب کو دنیاوی چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے بھی منع کر دیا تھا چنانچہ ارشاد باری ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴿طه:۱۳۱﴾ ترجمہ: ہم نے ان لوگوں کو جو مال ومتاع مختلف قسم کا دیا ہے آپ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے کہ وہ دنیاوی زندگی کی (صرف) رونق ہے۔ پھر اللہ نے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کو بھی حکم دیا کہ یا تو وہ دنیاوی زندگی کو اختیار کر لیں یا پھر اللہ اور

اس کے رسول کو اختیار کریں چنانچہ ارشاد ہے یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّـهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّـهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿احزاب:۲۹،۲۸﴾ ترجمہ: اے نبی آپ اپنی بیویوں سے کہدیجئے کہ اگر تم حیات دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو ں تو آؤ میں تم کو مال متاع دے کر بہتر طریقے پر تم کو آزاد کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی طلبگار ہوں تو پھر تم میں سے جو محسنات ہیں ان کے لئے اللہ نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

گویا اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے گھر میں بھی ایسے افراد کا رہنا پسند نہیں فرمایا جو دنیا اور اس کی زینت کے طلبگار ہیں۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ لوگ یہ جان لیں کہ جب آنحضرت ﷺ کے گھر والوں کو تک اللہ طلب دنیا کے معاملے میں نہیں بخشتا تو پھر ہم کس قطار و شمار میں۔ ہم کو تو اس سے زیادہ دنیا اور اس کی زینت سے دور رہنا چاہیئے، نیز آنحضرت ﷺ نے دنیا کی مذمت کے سلسلے میں جو ارشاد فرمایا ہے اس کو نظر کے سامنے رکھیں تو حقیقت واشگاف ہوتی نظر آتی ہے چنانچہ آپ نے فرمایا مالی وللدنیا مجھے دنیا سے کیا واسطہ۔ آپ نے فرمایا الدُّنیا جِیْفَةٌ وَ طَالِبُوهَا كِلَابٌ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اترکو الدنیا لاھلھا دنیا کو دنیاداروں کے لئے چھوڑ دو۔

آپ نے فرمایا ترک الدنیا أمرّ مِنَ الصَّبر۔ دنیا کو ترک کرنا ایلوے سے بھی زیادہ کڑوا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے عمل اور آپ کے ارشادات گرامی سے بھی ترک دنیا کی تعلیم ملتی ہے۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے تو پھر انسان اس عالم میں کیا کرے کیوں کر زندگی بسر کرے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کے معنی ماسوی اللہ کے ہیں جو کام ماسوی اللہ کے لئے ہو وہ دنیا کے لئے ہے اس کو ترک کرنا چاہیئے۔ گویا ترک دنیا کا معنی دنیا کا ارادہ نہ کرنا۔ اسکو پسند نہ کرنا آخرت پر دنیا کو ترجیح نہ دینا دنیا سے محبت نہ رکھنا۔ دنیا پر مغرور نہ ہونا۔ دنیا سے مطمئن اور راضی نہ ہونا۔ دنیا کو کھیل اور تماشہ نہ بنانے کے ہیں اور صوفیاء کی نظر میں دنیا ہستی اور مستی کو کہتے ہیں پس ان کے نقطہ نظر سے ترک دنیا کے معنی ترک خودی' ترک ہستی و مستی کے ہیں۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا الدُّنیَا نَفسُكَ وَ إذَا أَفْنَیْتَهَا فَلَا دُنیَا لَكَ۔ دنیا تیرا نفس ہے جب تو نے نفس کو فنا کر دیا تو پھر تیرے پاس دنیا نہیں ہے۔ اللہ اور اسکے رسول نے جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا ہے بیشک وہ کام کئے جاسکتے ہیں بشر طیکہ اللہ سے غفلت نہ ہو بالفاظ دیگر تمام جائز کام کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن دل میں اس حد تک انہاک اور مشغولیت نہ ہو اور ان سے اس حد تک محبت نہ ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر غالب ہو جائے اور اللہ سے غفلت پیدا ہو جائے کیونکہ اللہ نے وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ﴿الاعراف:۲۰۵﴾ فرمایا ہے۔ یعنی تو غافلوں میں نہ ہو جا۔ پس غفلت حرام ہے اور جو چیز غفلت کا باعث ہے وہ بھی

حرام ہو گی۔

قرآن شریف اور احادیث شریفہ کی واضح تعلیمات کے باوجود خلفاء راشدین کے بعد جب بنو امیہ اور بنو عباس کی شخصی اور موروثی حکومتیں قائم ہوئیں اور ہوس گیری اور توسیع پسندی سے سرشار والیانِ ریاست نے "زر پرستی" اور "دنیا پرستی" کی تمام حدیں پار کر دیں تو صوفیاء کی ایک جماعت نے ان لوگوں سے اور ان کے طریق حیات سے منھ موڑ کر قرآن اور احادیث کی بیان کردہ تعلیمات کی روشنی میں سادہ اور دینداری کی زندگی کی راہ اپنائی۔ ایسی راہ جس میں دنیا سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ جس میں دنیا داروں سے کوئی تعلق نہیں تھا جس میں نفس وخواہش کا کوئی دخل نہیں تھا جس میں ہستی اور خودی کی کوئی خو بو نہیں تھی۔ اقطاع عالم میں لاکھوں صوفیاء نے اس طریق کو اپنایا اور آج اسلام کی جو کرنیں کہیں کہیں نظر آرہی ہیں وہ سب ان مقدس ہستیوں کی ہی رہین منت ہیں۔

لیکن جاہ پسند علماء اور زر پرست مشائخین نے اس طبقہ کو اپنے حلقوم میں چبھنے والا کانٹا سمجھا اور اُن کے طریقے کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا۔ ان لوگوں نے عوام کو یہ کہہ کر دھوکہ دینے کی کوشش کی کہ اللہ نے دنیا کو انسان کے لئے بنایا ہے۔ انسان کو اس بات کا پورا پورا حق ہے کہ کائنات کی ہر شیء سے مستفید بھی ہو اور لطف اندوز بھی۔ اللہ نے دنیا کی تمام نعمتیں انسان کے لئے بنائی ہیں۔ ان سے بہرہ اندوز نہ ہونا گویا ایک طرح سے کفرانِ نعمت کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے **وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ**﴿الضحیٰ:۱۱﴾ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں کو (اختیار کرتے ہوئے) بیان کر۔

عوام الناس جو پہلے سے ہی دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ رہتے ہیں ان کی باتوں کو سن کر سر دُھنتے ہیں اور ان کی ہی بات کو "حق" اور "سچ" سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان علماء ومشائخین کا یہ استدلال نہایت درجہ سفیہانہ بھی ہے اور سوقیانہ بھی۔ اس لئے کہ

(۱) جب اللہ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر اللہ نے اپنے حبیب خاتم النبیین ﷺ کو کیوں دنیا سے محروم رکھا کیوں اللہ نے آنحضرت ﷺ پر دنیا کی نعمتوں کے دروازے کھول نہیں دیئے یہ کیوں ہوا کہ آپ کے گھر ہفتوں چولہا نہیں سلگتا تھا۔ کیوں آپ ﷺ نے الفقر فخری کا نعرہ لگایا۔ سرور عالم کا کیا بستر تھا جس کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ رو پڑتے ہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے یہ ضرور فرمایا کہ ہم نے سورج چاند ستاروں پہاڑوں اور زمین اور اس کی ہر شئے کو تمہارے تابع کر دیا ہے لیکن اس سے معلوم یہ ہوا کہ وہ سب چیزیں ہمارے نوکر اور خادم ہیں۔ پس ہمارا کام یہ ہے کہ ان سے بقدر

ضرورت کام لیں۔ اور ان پر اپنی سرداری باقی رکھیں۔ نہ یہ کہ ہم ان کی نوکری کرنے لگ جائیں ان کو آقا بنادیں اور ہم روز و شب ان کو حاصل کرنے کی فکر میں لگ جائیں۔ اس طرح تو بات الٹی ہو جاتی ہے اور یہی دنیا والے کر رہے ہیں۔ حرص الدنیا عذاب الموت کھاتے ہیں کم اور مانگتے ہیں بہت۔

(۲) دوسری بات یہ پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لارھبانیۃ فی الاسلام فرما کر دنیا کو چھوڑنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ استدلال تو دھوکہ ہی کی بدترین مثال ہے۔ کیوں کہ گفتگو ہو رہی ہے "ترک دنیا" کی جس کی تعریف اوپر بیان کی گئی ہے اور حدیث پیش کی جارہی ہے وہ جس میں رہبانیت سے منع کیا جارہا ہے۔

چلئے پہلے یہ معلوم کرلیں کہ رہبانیت کیا ہے تاکہ دھوکہ دہی کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

رہبانیت کے معنی ہیں فطری خواہشات کو کچلنا۔ فطری قوتوں کو معطل کرنا۔ کسی عضو کو بے حس و بے کار کر دینا۔ خصی وغیرہ ہو جانا لیکن اپنی فطری قوتوں کو جائز طریقے سے استعمال کرنا اور ناجائز طریقوں سے پرہیز کرنا، دنیا کو ہیچ اور دین کو اہم سمجھنا۔ دنیاوی زینت اور آسائش سے یکسو ہو کر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہونا، رہبانیت نہیں بلکہ اس کو تو زھد فی الدنیا کہا جاتا ہے۔

حضرت مہدی علیہ السلام نے ترک دنیا کی تعلیم دی ہے جس کو زھد فی الدنیا کہا جاسکتا ہے۔ مہدویہ کے پاس بھی رہبانیت جائز نہیں ہے۔ حیات دنیا اور متاع حیات دنیا کی جو تعریف قرآن شریف سے اوپر بیان کی گئی ہے اور آنحضرت ﷺ نے دنیا کے بارے میں جو ارشاد فرمایا اور خود آنحضرت نے جس طریق حیات کو اپنایا ہے نعوذ باللہ کیا اس پر رہبانیت کا اطلاق کرنے کی کسی گستاخ کو اجازت دی جاسکتی ہے۔ قرآن نے جو بیان کیا ہے وہ ترک دنیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جو کہا اور کیا وہ ترک دنیا ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے بھی قرآن کے حکم کے مطابق ہی ترک دنیا کو فرض قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کے بغیر "وصول الی اللہ" جو تمام عبادتوں کی جان ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں   ایں خیالست و محالست و جنوں

خلاصہ یہ کہ نفسانی خواہشات کو مارنا ترک دنیا ہے اور فطری خواہشات کو مارنا رہبانیت ہے۔

(۳) تیسری بات یہ پیش کی جاتی ہے کہ اللہ نے قرآن میں " وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا "﴿القصص:۷۷﴾ فرمایا ہے۔ ترجمہ اس طرح کرتے ہیں "تو دنیا سے اپنا حصہ لینا مت بھول، گویا یہ لوگ عام لوگوں کو یہ باور

کرانا چاہتے ہیں کہ اللہ خود قرآن میں دنیا کو حاصل کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ **استغفر اللہ العظیم**

اگر یہ بات کسی عابد زاہد اور فقیر کو کہی جاتی تو پھر بھی کچھ بات بن سکتی تھی لیکن قرآن میں یہ جو آیت آئی ہے وہ قارون کے ذکر کے سلسلے میں آئی ہے۔ وہ قارون جو موسیٰؑ کا رشتہ دار ہونے کے باوجود بے اندازہ دولت کا مالک تھا اور اتنا بڑا دولت مند تھا کہ اس کے خزانوں کی چابیاں کئی زور آور مرد اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ اس پر بھی اس کو مال کی حرص تھی اور وہ اپنے مال پر جو اللہ کی عطا تھی بجائے اللہ کا شکر ادا کرنے اور اس کی زکواۃ نکالنے اور دیگر غرباء اور مستحقین پر خرچ کرنے کے، اس پر اتراتا تھا اور اس کو اپنے ہی ہنر اور زور بازو کا نتیجہ سمجھتا تھا تو اس کی ان الفاظ میں تنبیہ کی جارہی ہے۔ **وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّـهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّـهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ** ﴿القصص:۷۷﴾ یعنی اللہ نے تجھے جتنا دیا ہے اس سے عالم آخرت کی جستجو کر اور دنیا سے اپنا حصہ (آخرت میں لے جانا) مت بھول۔ اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (بندگان خدا کے ساتھ) احسان کر اور دنیا میں فساد مت مچا۔

اس آیت میں اللہ نے چار امور بیان فرمائے ہیں۔

(۱) اللہ نے جو مال و دولت عطا فرمائی ہے اس سے آخرت کی جستجو کرنی چاہئے کیونکہ انسان کو تو بہر حال مرنا ہے اور دنیا کی دولت ساتھ لے جائی بھی نہیں جاسکتی بلکہ وہ یہیں دھری رہ جائے گی۔ ہاں جو کچھ اس مال سے آخرت کے لئے اچھے کام کئے ہوں گے تو بس وہ مال اس کے کام آسکے گا۔

(۲) اس بات کو مت بھولو کہ دنیا سے تم کو کیا حصہ ملنے والا ہے۔ یعنی آدمی لاکھوں کروڑوں روپئے کمائے۔ ان گنت بنگلے ہوں سواری کے عمدہ سامان ہوں برتنے کی بہترین چیزیں ہوں لیکن جب موت آتی ہے تو انسان اس دنیا سے کیا ساتھ لیکر جاتا ہے؟ یہی نا کہ کفن کا دو گز کپڑا اور قبر کی ۶ فیٹ کی جگہ اس کے حصے میں آتی ہے۔ باقی سب یہیں دھرا رہ جاتا ہے تو اللہ یہ فرما رہا ہے کہ دنیا کے اس حصے کو مت بھول جو تجھے یہاں ملنے والا ہے جب کہ تو آخرت کا سفر اختیار کرتا ہے چونکہ اس سے پہلے دار آخرۃ کا ذکر آیا ہے تو یہ توجیہ اس مناسبت سے اور زیادہ موزوں اور مناسب ہو گی۔

(۳) جس طرح اللہ نے تجھ پر مال و دولت کی فراوانی کے ذریعہ احسان فرمایا ہے اسی طرح تجھ پر بھی یہ امر لازمی ہے کہ تو بھی محتاجوں اور مستحقوں کے ساتھ احسان کا سلوک کرے۔ اس لئے کہ پہلے تو بھی محتاج محض تھا۔ پیدا ہوتے وقت کچھ ساتھ نہیں لایا تھا جو کچھ ملا ہے وہ محض اللہ کے فضل و احسان سے ملا ہے۔ پس تجھ کو چاہئے کہ تو دوسرے محتاجوں پر احسان کرے۔

(۴) یہ مال و دولت جو کہ اللہ کی عطا ہے اس کے ذریعہ زمین میں فساد مچانا لوگوں پر ظلم و تعدی کرنا کسی طرح روا نہیں ہے بلکہ اللہ کی عطا پر اس کا شکر ادا کرنا اور زمین پر خاکساری کی زندگی بسر کرنی چاہئے۔

دیکھئے آیت کا مطلب تو یہ ہے لیکن دنیاداروں نے کس طرح آیت کے مفہوم کو ہی بدل کر رکھ دیا اور اس سے وہ مطلب لے لیا جو اللہ کے منشاء کے بالکل برعکس ہے یہ حقیقت ہے کہ یرقان کے بیمار کو دنیا کی ہر چیز زرد نظر آتی ہے اور بخار زدہ انسان کو میٹھا پانی بھی کڑوا لگتا ہے۔ اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے چند باتیں لکھی گئی ہیں اگر کوئی تفصیل معلوم کرنا چاہے تو حرف 'ح' کے مضامین میں ''حقیقت ترک دنیا'' کا مطالعہ کرے۔

ترک دنیا کی ماہیت

نوع اول۔ ایثار الموجود، ترک المفقود، برودۃ القلب عن المال و الجاہ

نوع دوم۔ اخلاق ذم 1 یمہ کو اخلاق حمیدہ سے بدل دینا

نوع سوم۔ موتوا قبل ان تموتو ایعنی تخلقوا باخلاق اللہ حاصل کرتے ہوئے فنافی اللہ ہو جانا اور پھر باقی باللہ ہونا

باقی باللہ کے معنی یہ ہے کہ حق کو دیکھنے میں خود حجاب میں نہ رہے۔ اور خود کو دیکھنے میں حق پوشیدہ نہ رہے۔ حضرت میراںؑ نے فرمایا ''ورائے ترک دنیا ایمان نیست'' نیز واضح ہو کہ مہدی موعودؑ نے ہستی اور خودی کو دنیا فرمایا اور ایمان کو ذات خدا فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ''بجز ترک ہستی و خودی، دیدار غیر ممکن ہے۔

تصحیح

حضرت مہدیؑ نے فرمایا۔ پیش ایں بندہ تصحیح می شود، ہر کہ ایں جا قبول شد او مقبول خدا است، وہر کہ پیش ایں ذات صحیح نہ شد، اوعند اللہ مردود است۔ ترجمہ: اس بندہ کے حضور تصحیح ہوتی ہے۔ جو یہاں مقبول ہوا۔ وہ خدا کے پاس بھی مقبول ہے۔ اور جو اس بندہ کے نزدیک صحیح نہ ہوا وہ خدا کے پاس بھی مردود ہے۔ اس نقل شریف پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ اہل سنت کا اعتقاد نہیں ہے۔ اور کسی کو کیا ضرورت ہے کہ سید محمد جونپوری کے پاس بشمول انبیاء علیہم السلام کسی کی بھی قیامت کے دن تصحیح ہو۔

یا تو معترض اہل سنت والجماعت کے اعتقاد سے بالکل ناواقف ہے۔ یا جان بوجھ کر سادہ لوح عوام کو اپنے مکر و فریب کے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جب مہدیؑ یہ فرماتے ہیں کہ پیش ایں بندہ "یعنی اس بندے کے سامنے" تو سوال یہ ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ کیا آپ عام بندوں کی طرح ایک بندہ ہیں؟ یا آپ نے مہدیؑ خاتم ولایت محمد، خلیفۃ اللہ، معصوم عن الخطا کی حیثیت سے فرمایا ہے۔ محققین اہل سنت کا تو اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین وغیرہ مشکاۃ محمدیہ یعنی ولایت محمدیہ یا باطن آنحضرت ﷺ سے اخذ فیض کرتے ہیں اور اخذ نور کرتے ہیں اور یہ بھی تمام صوفیاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مہدی موعودؑ کی ذات خاتم ولایت محمدیہ ہے چنانچہ فصوص میں لکھا ہے۔

فکل نبيٍ من لدن آدم الی آخر النبیﷺ ما منهم احد یاخذ اِلاّ من مشکوٰۃ خاتم النبیین وان تأخر و جود طینته فانه لحقیقته موجود وهو قوله کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین وغیره من الانبیاء ماکان نبیاً اِلاّ حین بعث۔ ترجمہ: پس آدمؑ سے لیکر آخری نبی تک جس قدر پیغمبر گذرے ہیں ان میں سے ہر ایک نبی مشکوٰۃ خاتم النبیین ہی سے فیض اخذ کرتا ہے اگرچہ آپکا وجود عنصری متأخر ہے لیکن آپ اپنی حقیقت سے یعنی حقیقت محمدی کے اعتبار سے موجود ہیں۔ چنانچہ آپ کا یہ فرمان ہے کہ میں اس وقت نبی تھا جب کہ آدم پانی اور کیچڑ میں تھے آپ کے سوا جو نبی گذرے ہیں وہ سب اپنی بعثت کے وقت نبی ہوئے ہیں۔

نیز فتوحات کے چوبیس ویں باب میں لکھا ہے۔

وامّا القطب الواحد فهو روح محمد وهو المُمِدّ لجمیع الانبیاء والرسل والاقطاب من حین نشأة الانسانی الی یوم القیامة۔ ترجمہ: لیکن قطب واحد روح محمدی ہے جو تمام انبیاء رسل اور اقطاب کو ابتدائی خلقت انسانی سے

قیامت تک مدد دینے والی ہے۔

اسی طرح یواقیت کے ۳۴۳ویں مبحث میں لکھا ہے۔

فان قلت هل ثم احد من البشر ینال علما فی الدنیا من غیر واسطة محمدﷺ فالجواب کما قال الشیخ فی باب (۴۹) لیس احد ینال علماً فی الدنیا الا وهو من باطنیة محمدﷺ سواء الانبیاء والعلماء المتقدمون علی مبعثه والمتأخرون عنه۔ ترجمہ: اگر کوئی کہے کہ دنیا بھر میں کوئی انسان ایسا ہے جو محمد ﷺ کے واسطے کے بغیر علم حاصل کر سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیخ نے باب (۴۹) میں کہا ہے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو باطن محمد ﷺ سے علم حاصل نہ کرتا ہو خواہ وہ انبیاء یا علماء ہوں اور خواہ وہ حضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے گذرے ہوں یا آپ کے بعد

ان اقوال سے ظاہر ہے کہ خلقت آدم سے قیامت کے دن تک تمام انبیاء، رسل، اقطاب اور علماء متقدمین ومتأخرین مومنین ومومنات غرض کہ سب کے سب مشکوٰۃ محمد ﷺ (یا باطن محمد ﷺ) سے اخذ علم یا اخذ نور کرتے ہیں۔ اور کوئی بھی اس واسطۂ باطن محمد سے مستثنیٰ نہیں ہے اسکے باوجود کسی معترض کا یہ کہنا کہ ''اہل سنت، ملائکہ اور بشر میں کسی کو اس قابل نہیں جانتے کہ حضرات انبیاء مرسلین اس سے نور لیویں'' کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ درج بالا حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام انبیاء ومرسلین، اقطاب وعلماء سب کے سب خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی مشکوٰۃ یا باطن سے نور یا علم حاصل کرتے ہیں۔ خواہ وہ حضرت ﷺ سے پہلے کے ہوں یا بعد کے۔

اب اس کے بعد دیکھئے کہ اس اخذ نور سے خاتم الاولیاء یا خاتم ولایت محمدیہ کا کیا تعلق ہے۔ فصوص الحکم میں لکھا ہے

و کذالک خاتم الاولیاء کان ولیاً و آدم بین الماء والطین وغیره من الاولیاء ما کان ولیاً الا بعد تحصیل شرائط الولایة من الاخلاق الالٰهیه و الاتصاف بها من کون الله یسمّیٰ بالولی الحمید فخاتم الرسل من حیثیة ولایته نسبة مع الخاتم الولایة نسبة الانبیاء والرسل معه (فص سئیشیه)۔ ترجمہ: اسی طرح خاتم الاولیاء بھی اس وقت ولی تھے جب کہ آدمؑ آب و گل میں تھے اور دوسرے اولیاء کی یہ حالت ہے کہ وہ شرائط ولایت مثلاً اخلاق الٰہیہ سے متخلق اور متصف ہونے کے بعد ولی ہوئے ہیں اس وجہ سے کہ اللہ کا نام ولی حمید ہے۔ پس خاتم الرسل کو اپنی ولایت کی جہت سے خاتم ولایت سے وہی نسبت ہے جو دوسرے انبیاء ورسولوں کو خاتم الاولیاء کے ساتھ ہے۔

نقد النصوص شرح فصوص میں لکھا ہے۔

نسبت خاتم الرسل باخاتم الاولیاء ہمچو نسبت انبیاء ورسل است باختم الولایت چنانچہ رسل می بینند از مشکواۃ خاتم الولایت، ہمچناں خاتم الرسل می بینند انچہ می بیند از مشکوٰۃ خاتم الاولیاء۔ ترجمہ: خاتم الرسل کی نسبت خاتم الاولیاء کے ساتھ ویسی ہی ہے جیسی کہ انبیاء ورسل کی نسبت خاتم الاولیاء کے ساتھ ہے چنانچہ پیغمبر مشکوٰۃ خاتم الولایت سے دیکھتے ہیں اسی طرح خاتم الرسل بھی جو بھی دیکھتے ہیں مشکوٰۃ خاتم الاولیاء سے دیکھتے ہیں۔

ان اقوال سے ثابت ہوا کہ خاتم الولایت کی ولایت دوسرے اولیاء کی ولایت کی طرح کسبی نہیں ہے بلکہ خاتم الاولیاء کی ولایت ''وہبی'' ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاءؑ کو خزانہ ٔخاتم الاولیاء سے نور حاصل ہے اور اس نور کے لینے میں خاتم الانبیاء کو بھی وہی نسبت ہے جو دوسرے انبیاء کو حاصل ہے اور یہ اتنی سچی حقیقت ہے کہ معترض نے بھی خود اس بات کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔ ''خاتم الاولیاء مقامِ ولایت میں قدم محمدی پر ہیں۔ اور ولایت ان کی ہم رنگ ولایت محمد یہ کے ہے کہ اسی کا عکس و ظل ہے۔ پس خاتم الاولیاء کو فضل جزوی اس مقدمہ میں نہ رہا بلکہ وصف خاص میں حضرت رسالت کے شریک ہوئے۔ لیکن بطور شرکت طفیلی و تابع کے ساتھ اصل و متبوع کے اور چونکہ اس فرع اور ظل کو ساتھ اصل کے نہایت مشابہت اور ہم رنگی حاصل ہوئی ہے، احکام اصل کے بھی اس پر جاری ہوتے ہیں یہاں تک کہ جولوگ اصل سے اصالۃً مستفید ہیں اس فرع کے بھی مستفید کہلاتے ہیں بطور مجاز کے۔ یہاں تک کہ انبیاء و مرسلین بلکہ خود حضرت خاتم المرسلین بھی کہ ولایت محمدیہ یعنی باطن محمدی سے مستفید ہیں اس کے اس مظہر اور ظل سے مجازاً مستفید کہلاتے ہیں۔ اور مناط افادہ کا اصل ہے اور بس۔ نیز معترض نے ایک جگہ پر خاتم الاولیاء کو ولایت محمدی کے مظہر اور خزینہ ٔولایت کے خزانچی تسلیم کیا ہے۔ اور داؤد قیصری کے حوالے سے خاتم الاولیاء سے جو استفادہ خاتم الانبیاء کو ہے اسکو سلطان اور خزانچی سے تشبیہ دی ہے اور لکھا ہے کہ ''سلطان اپنے خزانچی سے کچھ لیوے تو عیب نہیں ہے کہ وہ خزانہ اسی کا ہے۔

اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ معترض کو بھی اس بات کا اقرار اور اعتراف ہے کہ خاتم الاولیاء کی ذات، ولایت محمدی کے خزانہ کا خزانچی ہے اور تمام انبیاء و مرسلین اسی خزانے سے جو باطن محمدی ہے فیض یاب ہوئے ہیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ عالم ارواح میں اگر حکم دے کہ جس خزانے سے تم نے نور حاصل کیا ہے اس سے مقابلہ کر کے تصحیح کرو اور خاتم الاولیاء (باطن خاتم الرسل) اپنے نزدیک ان کی تصحیح ہونے کا دعویٰ کرے تو اس میں کیا خلاف لازم آیا۔ اور اگر ایسا اعتقاد بھی رکھا جائے تو یہ اعتقاد اہل سنت کے اعتقاد سے جو ان تمام امور کے قائل اور معتقد ہیں کس طرح مخالف ہوا۔

نیز اس سے اس حقیقت کو بھی واضح کرنا مقصود ہے کہ جو انبیاء ورسل در حقیقت مشکوٰۃ خاتم الرسل سے اخذ فیض اور اخذ نور کئے ہوں گے وہ خاتم الرسل کے توسطّ سے اپنے اصل منبع یعنی مشکوٰۃ خاتم الولایت کو جان جائیں گے اور وہاں سے اپنے دعووں کی سند ان کو مل جائے گی۔ لیکن جن جھوٹے مدّعیان نبوت نے اپنے طور پر دعویٰ کیا ہو گا وہ دربار خاتم الولایت میں پیش ہونے سے ہی گھبرا جائیں گے۔ اس طرح جو "اولیاء" بھی اپنے زمانے میں مخلوق کے سامنے اپنے ولی ہونے کا ڈھونگ رچائے ہوں گے۔ وہ قیامت کے دن خاتم الاولیاء کے سامنے نہ آسکیں گے۔ اس طرح جھوٹے نبیوں اور جھوٹے ولیوں کی حقیقت وہاں کھل جائے گی اور وہ مردود قرار پائیں گے۔ لیکن جو سچے پیغمبر اور ولی ہوں گے وہ بے باکی کے ساتھ وہاں سے اپنی قبولیت کی سند حاصل کرلیں گے۔

لیکن غلام احمد قادیانی، اسود عنسی، مسلیمہ، سجاح وغیرہ جنہوں نے اپنے اپنے دور میں "نبی" ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ اور اسی طرح جن لوگوں نے "مہدی" ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا، وہ بھی مردود ہوں گے۔ (اور جن بزرگوں نے جذبہ کی حالت میں دعویٰ تو کیا لیکن بعد میں نائب ہوگئے وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔)

توجیہات

بعض اہل اللہ کی تقریروں و تحریروں میں بعض مضامین و نکات ظاہر کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی توجیہ اور ان کی مراد سننے کے بعد وہ بالکل صحیح اور مطابق واقعہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہیں ایسا کلام نظر آئے یا سننے میں آئے تو جھٹ سے ان کا انکار کر دینا یا کہنے والوں پر فتوے صادر کر دینا خلاف حقیقت بھی ہے اور خلاف ادب بھی ہے بزرگوں کے کلام میں جو معنویت اور مقصدیت پنہاں ہوتی ہے اسکو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ان کے کلام کو صحیح رُخ اور صحیح سمت میں لیجانے کی سعی کرنی چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر اسکی حقیقت بھی سمجھ میں آجائے گی۔

(۱) چانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے اسی طرح کی ایک روایت یوں آئی ہے۔ عَنْ أبِي هُرَيرة أنّهُ دَخَلَ السُّوْقَ فَقالَ أرَاكُمْ هٰهُنَا وَ مِيرَاثُ مُحَمَّدٌ ﷺ يُقَسّمُ فِي المَسْجِدِ فَذَهَبُوا وَانصرفُوا وَ قَالُوا مَا رَأينا شيئاً يقسّم وَ رَاينَا قَوْماً يَقْرأونَ القُرْآن قَالَ فَذَلِكَ مِيرَاثُ نَبِيّكُمْ ﷺ (رواہ رزین)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ وہ بازار تشریف لائے اور لوگوں سے فرمایا کہ میں تم کو یہاں دیکھتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی میراث مسجد میں تقسیم ہو رہی ہے یہ سن کر لوگ ادھر گئے اور پھر لوٹ آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے تو کچھ بھی تقسیم ہوتے نہیں دیکھا صرف ایک قوم کو دیکھا کہ قرآن پڑھنے میں لگے ہوئے ہیں آپ نے فرمایا یہی تو تمہارے نبی ﷺ کی میراث ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہؓ کا یہ قول کہ مسجد نبوی میں میراث محمدی تقسیم ہو رہی ہے تو لوگوں نے اس سے میراث ظاہری (مالی) مراد لی۔ اس لئے وہ بازار سے اُٹھ کر مسجد نبوی بھی چلے گئے اور جو دیکھا اس کو بھی بیان کر دیا اور یہ بھی کہا کہ وہاں تو کچھ تقسیم نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن جب اسکی توجیہ اور تفسیر حضرت ابوہریرہؓ نے بیان فرمائی تو حقیقت کا ادراک ہوا کہ نبی ﷺ کی میراث کی تقسیم سے مراد، قرآن کی تعلیم تھی۔

(۲) اسی طرح آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ ایک خط کھینچ کر اسکی نسبت یہ فرمایا کہ یہ انسان ہے اور ایک خط اس سے دور کھینچ کر فرمایا کہ یہ اسکی موت ہے اور ایک خط اس سے دور کھینچ کر فرمایا کہ یہ انسان کی آرزو ہے۔ پس انسان اسی حالت میں رہتا ہے کہ (آرزو پوری کروں) اچانک یہ پاس والی چیز یعنی موت آپہنچتی ہے۔

(۳) اللہ کی ذات و صفات کے تعلق سے بھی ایسی ہی باتیں ہم کو بزرگوں کے کلام میں ملتی ہیں۔ خصوصاً شعراء کے کلام میں ذات و صفات خداوندی کے بارے میں کئی مثالیں ملتی ہیں۔ کہیں دریا کا اطلاق آیا ہے، کہیں آفتاب و مہتاب کا، نیز آنحضرت ﷺ کے لئے بھی سراج منیر، قمر منیر، بدر الدجیٰ، شمس الضحیٰ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ صحابہ کے لئے نجوم کے

الفاظ آئے ہیں اس سے مقصود تمثیل و تشبیہ ہے، تاکہ ہماری فہمائش ہوجائے چنانچہ اللہ نورالسمٰوٰت والارض، مَثَلُ نورہ کمشکوٰۃٍ (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اسکے نور کی مثال قندیل کی طرح ہے فیھا مصباح۔ کہ اس میں ایک چراغ ہے۔

(۴) اس طرح ایک حدیث میں آیا ہے جو بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "اے اللہ مجھ کو گناہوں سے پاک کردے، پانی، برف اور اولہ سے (بِالمَاءِ وَ الثلج وَ البَرد)۔ اس سے رحمتِ الٰہی مراد ہے۔

(۵) قرآن شریف کی تفسیر کے سلسلے میں بھی ایسی ہی روایتیں ہم کو ملتی ہیں۔ بعض الفاظ کی تفسیر میں ایسے معانی بیان کئے گئے ہیں جو خلاف ظاہر معلوم ہوتی ہیں تو کچھ ذہنیتیں یہ اعتقاد کرلیتی ہیں کہ قرآن کی یہی تفسیر صحیح ہے اور علماء ظاہر نے جو تفسیر کی ہے وہ غلط ہے۔ اور بعض لوگ یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ خلاف حقیقت ہے، ان پر طعن و تشنیع کی زبان دراز کرنے لگ جاتے ہیں اور اُسے "تفسیر بالرائے" کہتے ہیں اور یہ لکھ مارتے ہیں کہ یہ قرآن میں تحریف ہے۔ حالانکہ ان کا ایسا کہنا بھی خلاف حقیقت اور خلاف ادب ہے۔

(۶) چنانچہ مہدیؑ نے ایک مرتبہ بیان قرآن کے دوران جب "لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ" ﴿آل عمران:۹۲﴾ کی آیت شریفہ پڑھی تو فرمایا کہ یہاں عام مفسرین نے برّ سے نیکی مراد لی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں برّ سے ذات خداوندی مراد ہے اور اللہ کا منشا یہی ہے کہ جب تک تم اپنی محبوب چیز (اللہ کی راہ میں) قربان نہ کردو گے اس وقت تک تم خدا کی ذات کو نہیں پاؤ گے اسی طرح حضرت امامنا مہدیؑ سے روایت آئی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ ایمان خدا کی ذات ہے۔ امانت خدا کی ذات ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ حضور کی خدمت میں اپنی تلوار پیش کردی۔ آنحضرت کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ یہ مجھے زیادہ عزیز ہے۔ آپ نے فرمایا کیوں؟ کہا اس سے میں اپنی جان کی حفاظت کرتا ہوں تو حضور نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ تمہاری پسندیدہ چیز تو تمہارے پاس ہی ہے۔ تب عمرؓ نے فرمایا کہ اب اللہ کی ذات مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

اسی طرح ہماری قومی روایات میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ میر ذوالنون حاکم فراہ نے پہلے حضرت کے ساتھ گستاخی کے ساتھ پیش آیا۔ پھر لَن تَنَالُوا الْبِرَّ کی آیت کا بیان سنکر تائب ہوا۔ اور اپنی تلوار اور گھوڑے کو آپ کی خدمت اقدس میں پیش کردیا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا ہے۔ تو کہا کہ یہ دونوں چیزیں مجھے زیادہ محبوب ہیں۔ اور ان کو میں آپ کے حوالے کررہا ہوں۔

حضرت مہدیؑ نے فرمایا۔

کہ یہ دونوں تم کو کیوں محبوب ہیں۔ میر ذوالنون نے کہا کہ ان سے میں اپنی جان کی حفاظت کرتا ہوں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ محبوب تر چیز تو اب بھی تمہارے پاس ہے۔ جب تک تم اسکو خدا کے حوالے نہیں کر دو گے اس وقت تک تم خدا کو نہ پہنچو گے۔ انہوں نے کہا کہ اب اللہ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

(۷) قرآنی آیات کے تعلق سے بھی یہی اصول پیش نظر رہنا چاہئے کہ اگرچہ مفسّرین نے بعض آیتوں کے سلسلے میں شان نزول بیان کیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ آیت ان ہی کے تعلق سے ہے اور ان ہی سے مختص ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں صحیح عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ آیت کا مورَد خاص ہو تو ہو لیکن اس کا مفہوم عام ہے اور وہ صفت جس میں پائی جائے اس پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے وَطَهِّرْ بَيْتِيَ ﴿الحج:۲۶﴾ یعنی حضرت ابراہیم واسماعیلؑ سے خطاب ہے کہ میرے گھر (کعبہ) کو تم دونوں پاک کرو۔ اس میں بظاہرِ محکوم بھی خاص ہے اور محکوم لہ بھی خاص ہے یعنی ابراہیم واسماعیلؑ اور اللہ کا گھر لیکن حکم عام ہے۔

اس پر سے اگر انتقال ذہنی یہ ہو جائے کہ انسان میں بھی ایک چیز کعبہ کے مشابہ ہے اور وہ "قلب" ہے کیوں کہ جسطرح کعبہ پر انوار الٰہی کا نزول ہوتا ہے اسی طرح قلب پر بھی انوار الٰہیہ نازل ہوتے ہیں۔ اور یہ قیاس کیا جائے کہ جس طرح کعبہ کی تطہیر ضروری ہے کیوں کہ وہ مورد تجلّیات الٰہی ہے اسی طرح چونکہ قلب بھی مورَد تجلّیات الٰہیہ ہے پس اسکی بھی پاکی ضروری ہے۔ تو اس قسم کی توجیہ کو غلط یا تفسیر بالرائے نہیں کہا جاسکتا۔ اسکو علم اعتبار کہتے ہیں جسکی اجازت فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ ﴿الحشر:۲﴾ میں موجود ہے۔

(۸) اسی طرح قرآن میں یتیموں کا مال ان کو اس وقت تک نہ دینے کا حکم ہے جب تک کہ وہ سن رشد کو نہ پہنچ جائیں بالفاظ دیگر بالغ نہ جائیں۔ یہ تو ظاہری حکم ہے۔ لیکن اگر ذہن اس جانب منتقل ہو جائے کہ جب ظاہری مال یتیموں کو بالغ ہونے تک نہیں دیا جاسکتا تو اسرار ورموز دین جو دین کا اصل سرمایہ ہے وہ کس طرح ایسے لوگوں کو دیا جاسکتا ہے جو عقل اور دین دونوں طرف سے یتیم ہیں۔ یعنی نہ ان کے پاس عقل سلیم ہے اور نہ دین کی سمجھ ہے۔ یعنی یتیم الطرفین ہیں۔ تو یہ بھی توجیہ میں داخل ہے۔ اسکو غلط نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی پوشیدہ ہے کہ بالغ کس کو کہا جاتا ہے؟ شریعت کا بالغ الگ ہے اور طریقت میں بالغ ہونا الگ ہے۔ شریعت میں بالغ اسکو کہتے ہیں جس سے "منی" خارج ہو جائے۔ اور طریقت میں بالغ اسکو کہتے ہیں جو "منی" سے باہر ہو جائے۔ یعنی جس سے انانیت، خودی اور "میں پنا" نکل جائے۔ جو ایسا ہو اسکو دین کے راز کی باتیں بتائی

جاسکتی ہیں۔

اسی کو بعض اہل اللہ سے اور بالخصوص حضرت علیؓ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے یہ الگ بات ہے کہ بعض اہل ظاہر نے اسکو تسلیم نہیں کیا ہے ہر آدمی اس چیز کو دیکھتا ہے جہاں تک اسکی نظر جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بات تو سب کے لئے قابل تسلیم ہونی چاہئے کہ سب افراد یکساں نہیں ہوتے۔ بعض باریک باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو عوام سمجھ نہیں پاتے۔ اوسط درجہ کے عالم سمجھ لیتے ہیں۔ اور بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں جن کو علماء راسخین ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اوسط درجہ کے علماء کی وہاں مجال نہیں۔ اور بعض دقائق ایسے ہوتے ہیں جن کو انبیاءؑ یا وہ جو ملحق بالانبیاء ہیں وہ جان سکتے ہیں۔

(۹) قرآنی آیت۔ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّـهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا الخ ﴿الفتح:۲۹﴾ کے سلسلے میں مفسرین نے یہ تفسیر کی ہے کہ والذین معہ سے مراد حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ سے مراد حضرت عمر فاروقؓ ہیں، رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ سے مراد حضرت عثمان غنیؓ ہیں اور تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا سے مراد حضرت علی المرتضیٰؓ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس آیت کے الفاظ سے بس یہی ہستیاں مراد ہیں۔ اور اسکے بعد کچھ نہیں تو اس کا جواب یہی ہے کہ مورَد خاص ہو تو ہو لیکن اس کا مفہوم قیامت تک آنے والوں پر ہو گا جبکہ ان میں مذکورہ صفات پائی جائیں۔

(۱۰) اس پر قیاس کرتے ہوئے اگر کوئی حضرت مہدیؑ کے بیان پر اعتراض کرے کہ حضرت نے بیان قرآن کے دوران بعض آتیوں کو اپنے بعض صحابہ کے حق میں ہونا فرمایا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ قرآن کے نزول کے آٹھ یا نو سو سال کے بعد اس کا مصداق کس طرح ہو سکتا ہے تو اس کا یہی جواب دیا جاتا ہے کہ مہدیؑ کے دور میں ان آیات کا مصداق جو ہستیاں، مذکورہ صفات کی حامل تھیں، مہدیؑ نے لوگوں پر ان کے مقام کو ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ جب آپ نے وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ﴿النجم:۱﴾ کا بیان فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ اس وقت اس سے مراد (حضرت) سید محمود ہیں۔

اور جب حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہداءؓ کے تعلق سے "فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا ﴿آل عمران:۱۹۵﴾" کا بیان فرمایا تو یہ فرمایا کہ اس میں جو چوتھی صفت ہے اس کا اظہار تمہاری ذات سے ہو گا۔ پہلے دن تمہاری فتح ہو گی اور دوسرے دن تم شہید ہو جاؤ گے۔ اس کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ میاں کی شہادت تک یہ آیت معلق رہی اور اب اس کا ظہور ہوا۔

نیز جب امامؑ نے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّـهِ الخ۔﴿النور:۳۷﴾ کی آیت تلاوت فرمائی اور اس کا بیان فرمایا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا مصداق حضرت بندگی میاں شاہ نظام دریائے وحدت آشامؓ ہیں۔ تو اس سے مراد بھی یہی ہے کہ حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ خدا کی ذات کی طلب میں اتنے سچے اور پکّے تھے کہ آپ نے اپنی سلطنت کو تج دیا۔ اور خدا کی طلب میں نکل کھڑے ہوئے یہاں تک کہ آپ کی ملاقات حضرت مہدیؑ سے ہوئی۔ اور حضرت مہدیؑ کی نظر فیض اثر سے آپ کو خدا کا دیدار ہو گیا۔ اسی طرف امامؑ نے اشارہ کرتے ہوئے اس آیت کو بندگی شاہ نظامؓ کے حق میں فرمایا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت تک وہ آیت بس یوں ہی رہی۔ اسی طرح دیگر واقعات اور اشارات بھی ہیں۔

(۱۱) اسی طرح ایک مخالف اور معاند مہدویہ نے لکھا ہے کہ یہ لوگ سید محمود مذکور الصدر پسر مہدی کو "مہدی ثانی" بھی کہتے ہیں۔ اور میاں خوندمیر داماد مہدی کو بدلہ ٔ مہدی بھی بولتے ہیں۔ ان کے بیٹے سید محمود (خاتم المرشدین) نواسہ ٔ مہدی کو حسین ولایت کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ لڑکپن میں خدا ہمیشہ کھیلا کرتا تھا جیسا کہ پنج فضائل میں ہے (ہدیہ مہدویہ مؤلفہ زماں خاں)

یہ سب الفاظ "القاب" ہیں اور مصطلحات ہیں۔ اس قسم کے القاب اور مصطلحات جیسے محبوب سبحانی، محبوب الٰہی وغیرہ کثرت سے موجود ہیں جو مستقل عقائد اسلامی میں شمار نہیں ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس قسم کے القاب سے کونسا اصول اسلامی ٹوٹ رہا ہے۔ عقائد اسلامیہ پر کس طرح کی ضرب پڑ رہی ہے؟ علماء اصول کا تو یہ ضابطہ ہے۔ إِطْلَاقُ اسم الشيء على مَا يشابه فِي أَكْثَرُ خواصه و صفاته جائزٌ حسنٌ۔ کسی چیز کے نام کا اطلاق دوسری چیز پر کرنا جو پہلی چیز سے اکثر خواص وصفات میں مشابہ ہے جائز اور حَسَن ہے۔

پس یہ اطلاقات اور القاب وغیرہ بھی اسی ضابطہ کے تحت درست ہو سکتے ہیں۔ ان سے مشابہت و مماثلت مقصود ہوتی ہے 'عینیت' مراد نہیں ہوتی چنانچہ اس قسم کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجھہ سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَة هَارُونَ مِنْ مُوسىٰ إِلّا انه لَا نَبِيَّ بَعْدِي۔ تم میرے پاس وہی منزلت رکھتے ہو جو ھارون کی موسیٰ کے پاس تھی (علیہما السلام) مگر یہ کہ میرے بعد نبی نہیں ہے۔

کیا یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے داماد حضرت علی کو ھارون کا مقام عطا فرمادیا۔ حالانکہ

ھارون تو نبی تھے۔ اور علیؑ نبی نہیں تھے۔ اسے کج فہمی اور عناد کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ سید نجی (سید محمود خاتم المرشدین) کے ساتھ بچپن میں خدا کھیلتا تھا۔ اس روایت کے تعلق سے صاحب کحل الجواہر علاّمہ سید نصرت صاحب نے بڑا مدلّل جواب دیا ہے۔ و ھو ھکذا

اوّلاً یہ کہ مؤلف نے یہ روایت پنج فضائل کے حوالے سے لکھی ہے۔ حالانکہ اسی کتاب کے مقدمے میں یہ تصریح کردی گئی ہے کہ متأخرین کی جو روایتیں، متقدمین کی روایتوں کے مطابق نہیں ہوتیں وہ اس قدر قابل استناد نہیں سمجھی جاتیں۔ ''یہ روایت بھی متقدمین کی کتابوں میں نہیں دیکھی گئی ہے'' اس قسم کی غریب روایتوں سے کسی مذہب پر حملہ کرنا اصول مناظرہ کے خلاف ہے۔

ثانیاً۔ خود مؤلف صاحب کو اعتراف ہے کہ یہ لڑکپن کا واقعہ ہے۔ اگر آداب شریعت کے خلاف ہونا مؤلف صاحب کی آنکھوں میں کھٹک رہا ہے تو اسی شریعت کے احکام کا یہ پہلو بھی قابل لحاظ ضرور ہے کہ زمانۂ طفولیت میں کوئی مکلّف نہیں ہوتا اور اس وقت کی باتوں پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوسکتا (شریعت کی تکلیف بالغ ہونے کے بعد ہی ہے) پھر مؤلف کا اس پر طنزاً اعتراض کرنا شریعت کے صریح احکام کی خلاف ورزی ہے۔ ثالثاً لفظ کھیل ایام طفولیت کی ایک عام اصطلاح اور تعبیر ہے۔ کہ اطفال ہر بات کو کھیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر طبقہ کی اصطلاح خاص میں کسی لفظ سے جو مراد اور مطلب ہوتا ہے اس کے خلاف دوسرے طبقے کو دوسرے معنی لیکر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ایسے موقع پر لفظ نہیں بلکہ اصل مطلب مقصود ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو مولانا رومیؒ نے اسطرح بیان کیا ہے۔

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم

(ہر کسی کو ہم نے ایک سیرت دی ہے ہر کسی کو ایک اصطلاح دی ہے)

در حق او نیک و در حق تو بد در حق او خوب و در حق تو رد

(اس کے حق میں نیک، اور تیرے حق میں بد، اس کے حق میں اچھی اور تیرے حق میں گرد)

در حق او نور در حق تو نار در حق او ورد در حق تو خار

(اسکے حق میں نور اور تیرے حق میں آگ، اسکے حق میں گلاب کا پھول اور تیرے حق میں کانٹا)

در حق او مدح در حق تو ذم در حق او شہد و در حق تو سم

(اس کے حق میں تعریف اور تیرے حق میں مذمت، اس کے حق میں شہد اور تیرے حق میں زہر)

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح　　　سندھیاں را اصطلاح سِند مدح

(ہندیوں کو ہند کی اصطلاح میں تعریف، سندھیوں کو سندھ کی اصطلاح میں تعریف)

رابعاً یہ کہ ان وجوہ کے علاوہ صوفیائے کرام کے نزدیک مغلوب الحال عاشقان حق جو بحر عشق میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں وہ خیال معشوق میں ایسے محو و مستغرق رہتے ہیں کہ الفاظ و عبارت کی طرف انکی توجہ مطلق نہیں ہوتی بلکہ ان کے لئے ظاہری آداب کی ضرورت نہیں ہے جو دوسروں کے لئے ضروری ہیں۔

مولانا رومی کے اس شعر کی شرح میں: مذہب عشق از ہمہ ملت جدا است　　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

ملک العلماء نے لکھا ہے۔ عاشق بہ ہیچ وجہ جز معشوق خود توجہ ندارد پس اگر آداب نباشد ضرر نہ دارد اگر چہ غیر اورا آداب ضروری است پس عاشق ذی حال را حاجت آداب نیست واو را ہیچ فوات آداب غمناک نمی کند۔

مولانا رومی مثنوی میں لکھتے ہیں کہ موسیٰؑ نے ایک بکریاں چرانے والے کو دیکھا جو یہ کہہ رہا تھا اے میرے اللہ تو کہاں ہے اگر تو میرے پاس آئے تو میں تیری خدمت کروں گا، تیری جوتیاں اور کپڑے سیوں گا۔ تیرے سر میں کنگھی کروں گا۔ تو اگر بیمار ہو جائے تو میں تیری تیمار داری کروں گا۔ سونے کے وقت تیری جگہ جھاڑ کر صاف کروں گا۔ میری تمام بکریاں تجھ پر قربان۔ میں تجھے گھی، پنیر دودھ لا دوں گا۔ موسیٰؑ نے اس کی یہ باتیں سن کر اسکو ڈانٹا کہ یہ کیا کفر کی باتیں ہیں اللہ ان سب سے بے نیاز ہے اور مبرّا ہے چرواہے نے کہا تم نے میری زبان بند کر دی اور پریشان ہو کر کپڑے نوچتا ہوا جنگل میں چلا گیا۔

ادھر موسیٰؑ کو وحی آئی کہ تم نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ تم بندوں کو ہم سے جدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ ملانے کے لئے بھیجے گئے ہو ہر شخص اپنی اپنی اصطلاح کے مطابق باتیں کرتا ہے۔ ہم ظاہری الفاظ کو نہیں بلکہ اندرونی اور قلبی حالات کو دیکھتے ہیں۔ اے موسیٰ آداب داں لوگ اور ہیں اور سوختہ جاں عاشق اور ہیں۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ ویران گاؤں میں خراج و عشر کے احکام نہیں ہوتے، خون اگرچہ نجس ہے لیکن شہید اس سے مستثنٰی ہے۔ اس لئے اس کا خون پانی سے زیادہ پاک ہے۔ اس وحی کے ہوتے ہی موسیٰؑ اس چرواہے کی تلاش میں نکلے اور اس کو پالیا تو اس سے فرمایا کہ تجھے آداب کی ضرورت نہیں تیرا دل جو چاہے تجھے کہنے کی اجازت ہے۔ اس نے کہا موسیٰ میں اس وقت اس حالت سے ترقی کر گیا ہوں، میری حالت بیان سے بالا ہو گئی ہے۔

یہ واقعہ اس قسم کی محویت اور استغراق کی بہترین مثال ہے جس سے مفید نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔ پس حضرت سید محمود خاتم المرشدین کا لڑکپن میں جو عالم سر مستی اور تکلیفات شرعی سے آزادی کا زمانہ ہے دائمی حضور " إِنَّ اللَّــــــهَ مَعَنَا

﴿التوبۃ:۴۰﴾ "اللہ ہمارے ساتھ ہے کو کھیل سے تعبیر کرنا صحیح بھی خیال کیا جائے تو وہ بھی اسی محویت اور استغراقیت کی مثال ہو سکتا ہے۔ جو الفاظ و عبارات کے آداب سے مستثنیٰ اور کسی طنز و اعتراض سے بالاتر ہے۔

خامساً، یہ کہ یہ بحث صوفیائے محققین کے اصول پر تھی اس کے علاوہ اور بھی مثالیں اولیاء اللہ کے حالات میں ملتی ہیں لیکن اہل ظاہر کے اصول پر بھی اس قسم کی ایسی مثالیں اور ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے کوئی مسلمان اور خصوصاً اہل سنت انکار نہیں کر سکتے۔ مثلاً امام مسلمؒ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: يَا ابْنَ آدَمَ، مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي قَالَ: يَا رَبِّ كَيْفَ أَعُودُكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ: أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ عَبْدِي فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ؟ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ عُدْتَهُ لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ. يَا ابْنَ آدَمَ: اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي، قَالَ: يَا رَبِّ وَكَيْفَ أُطْعِمُكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ: أَمَا عَلِمْتَ أَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ؟ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ أَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي. يَا ابْنَ آدَمَ: اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِي، قَالَ: يَا رَبِّ كَيْفَ أَسْقِيكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهِ، أَمَا إِنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي" (صحیح مسلم جلد ثانی باب فضل عیادۃ المریض)۔

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا اے ابن آدم میں بیمار ہو گیا تھا تو نے میری عیادت نہیں کی بندہ کہے گا میں تیری بیمار پرسی کس طرح کر سکتا ہوں جبکہ تو رب العالمین ہے۔ فرمایا، کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا تو، تو نے اسکی بیمار پرسی نہیں کی اگر تو اس کی بیمار پرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے نہیں کھلایا وہ کہے گا، میں تجھ کو کسی طرح کھلاتا حالانکہ تو رب العالمین ہے۔ فرمائے گا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے اس کو نہیں کھلایا اگر تو نے اس کو کھلایا ہوتا تو اسکو میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے نہیں پلایا وہ کہے گا میں تجھ کو کیسے پلاتا جبکہ تو رب العالمین ہے فرمائے گا، کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا، تو تو نے اس کو نہیں پلایا اگر تو نے اس کو پلایا ہوتا تو اسکو میرے پاس پاتا۔

تفسیر۔ تأویل۔ تحریف

تفسیر: تفسیر کے معنی پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے وهو كشف ما غطي وهو بيان المعاني المعقولة۔ یعنی ڈھانپی ہوئی چیز کو ظاہر کرنا۔ معانی معقولہ کا بیان کرنا پس جو چیز کسی شیء کی معرفت اور اس کے معنی بتلاتی ہے وہ تفسیر کہلاتی ہے۔ تفسیر کیلئے نقل کی ضرورت ہے۔ مطلب یہ کے قرآن کی تفسیر محض اپنی رائے سے کرنا حرام ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تفسیر اُسے کہتے ہیں کہ قرآن کے وہ احوال بیان کرنا جو کہ عقل سے معلوم نہ ہوں۔ جیسے آیات کا شان نزول یا آیات کا نسخ اگر کوئی شخص حوالہ کے بغیر اپنی رائے سے کہدے کہ فلاں آیت منسوخ ہے یا فلاں آیت کا یہ شان نزول ہے یہ معتبر نہیں۔ اور کہنے والا گنہگار ہو گا۔

چنانچہ مشکواۃ کتاب العلم فصل دوم میں ہے من قال في القرآن برايه فليتبوء مقعده من النار۔ یعنی جو شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو وہ اپنی جگہ جہنم میں بنالے۔ نیز اسی مشکواۃ میں اسی جگہ ہے من قال في القرآن برائيه فاصاب فقد اخطاء۔ یعنی جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ صحیح بھی کہا تو اس نے غلطی کی۔

تأویل قرآن یہ ہے کہ آیات قرآنیہ کے مضامین اور ان کی باریکیاں بیان کرے۔ اور صرفی و نحوی قواعد سے اس میں طرح طرح کے نکات نکالے۔ یہ اہل علم کیلئے جائز ہے۔ ان میں نقل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا ثبوت قرآنی آیات، احادیث نبویہ اور اقوال فقہاء سے ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّـهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿النساء: ۸۲﴾۔ یعنی کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ غیر خدا کے پاس سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔

تفسیر روح البیان میں اس آیت کے تحت یتدبّرون کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ يتامّلون و يتبصـــرون ما فيه۔ یعنی کیوں نہیں غور کرتے اس کے معنی میں اور کیوں نہیں تامل سے دیکھتے ان خوبیوں کو جو قرآن میں ہیں۔

مشکواۃ کتاب القصاص فصل اول میں ہے کہ کسی نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس قرآن کے سوا کچھ اور بھی عطیہ مصطفی ﷺ ہے۔ تو آپ نے جواب دیا۔ ما عندنا إلّا ما في القرآن إلا فهما يعطىٰ رجل في كتابه۔ یعنی ہمارے پاس اس قرآن کے سوا اور کچھ نہیں ہاں وہ فہم اور علم ہے جس کسی شخص کو کتاب الٰہی کے مطابق عطا کر دی جاتی ہے۔

اسی حدیث کے تحت مرقاۃ میں ہے و المراد منه ما يســـتنبط به المعاني ويُدرك به الاشـــارات والعلوم

الخفیه۔ اس فہم سے مراد وہ علم ہے جس سے قرآن کے معنی مستنبط کئے جائیں اور جس سے اشارات معلوم ہوں اور چھپے ہوئے علوم کا پتہ لگے۔

جمل حاشیہ جلالین میں ہے اصل التفسیر الکشف' واصل التاویل الرجوع۔ یعنی تفسیر کے لغوی معنی ہیں ظاہر کرنا۔ اور تاءویل کے معنی ہیں لوٹنا۔

خلاصہ بحث یہ ہے تفسیر نقل مسموع کا نام ہے۔ اور تأویل فہم معنی کا۔

امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ قرآن کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی۔ علماء ظاہری معنی کی تحقیق کرتے ہیں اور صوفیاء کرام باطنی معنی کی۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا اگر میں چاہوں تو سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ۷۰ اونٹ بھر دوں۔

تحریف: قرآن کے ایسے معنی یا مطلب بیان کرنا جو کہ اجماع امت یا عقیدۂ اسلامیہ کے خلاف ہو اور یہ کہے کہ اس آیت کے معنی وہ نہیں ہیں بلکہ یہ معنی ہیں جو میں کہتا ہوں یہ صریح کفر ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے کہا کہ خاتم النبین کے معنی ہیں، اصلی نبی، اور جو لوگ آخری نبی کے معنی لیتے ہیں وہ عوام کا خیال ہے جو غلط ہے۔

حالانکہ خود آنحضرت ﷺ کے فرمان لا نبي بعدي، سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ ہی آخری نبی ہیں۔ اسی پر ہر دور میں سب کا اجماع اور اتفاق ہے کہ خاتم النبین کے معنی ہیں آخری نبی۔ حضورؐ کے زمانے میں یا آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آسکتا۔ اس کے خلاف جو کہتا ہے وہ تحریف ہے۔

اگلی امتوں میں لوگوں نے اپنے انبیاء کرام پر جو کتابیں یا صحیفے نازل ہوئے تھے ان انبیاء کے اس دنیا سے پردہ کرنے کے بعد ان کے الفاظ کو ہی بدل دیا تھا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے، يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ﴿النساء:۴۶﴾۔ لوگوں نے اللہ کے کلام کو ہی اس کے مقام سے بدل ڈالا تھا۔

لیکن اللہ نے چونکہ اپنے اس آخری کلام کی حفاظت کی ذمہ داری خود ہی لی تھی۔ اس لئے قرآن کے الفاظ لوگوں کی دست برد سے تو محفوظ رہ گئے۔ لیکن معانی میں انہوں نے اپنا زور لگانے کی کوشش کر ڈالی اور تفسیر کے نام سے جو چاہا لکھ دیا۔ اگرچہ وہ منشاء خداوندی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اسی لئے اللہ نے حضرت مہدی موعود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے جو قرآن کا بیان فرمایا وہ اللہ کی مراد تھا۔ اللہ کی جانب سے آپ کو جو مراد بلا واسطہ ملتی تھی، آپ اسکو بیان فرماتے تھے۔ تفصیل انشاء اللہ بیان کے موضوع کے تحت آئے گی۔

تاویل

کیا قرآن شریف کی تاویل وتوجیہ کی جاسکتی ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو صدیوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔اور امت محمدیہ میں اس مسئلہ پر دو فرقے بن گئے ہیں۔ایک فرقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن میں تاویل جائز ہے اور دوسرا فرقہ کہتاہے کہ قرآنی آیات کی تاویل جائز نہیں ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن میں دو طرح کی آیات ہیں۔ایک محکمات اور دوسری متشابہات۔ محکم کے معنی مضبوط اور پائدار کے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان میں توکسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔اگرچہ بعض گمراہ فرقے ان محکمات میں بھی تاویل کرتے ہوئے راہ ہدایت سے کوسوں دور ہو گئے ہیں مثلاً کسی کو لَا إِلٰهَ إِلَّا الله مُحَمَّدٌ رَّسُولُ الله میں بھی شرک نظر آتا ہے۔اور کوئی نماز، روزہ، زکواۃ اور حج کے لغوی اور مرادی معنی لیکر ان کو ادا نہیں کرتا۔اللہ ایسے لوگوں سے ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔نعوذ بالله من هذا الضلال۔اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو متشابہات میں تاویل کو جائز قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں محکمات اور متشابہات والی آیات کا ذکر اسطرح فرمایاہے۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿آل عمران:۷﴾۔

ترجمہ۔وہی اللہ ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی اس میں (چند) آیات محکمات ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہات ہیں (لیکن) جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اسکی تاویل کی جستجو میں حالانکہ اس کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔البتہ جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں اسپر ہمارا ایمان ہے۔یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں (اور حق یہی ہے کہ) اہل دانش ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نجران کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے چند باتیں پوچھیں آپ نے ان کا جواب دیا آخر میں انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ مانتے ہیں۔آپ نے فرمایا ہاں۔انہوں نے کہا بس ہمارے لئے یہ الفاظ کافی ہیں۔اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں فرما رہاہے کہ آیات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک محکمات اور دوسری متشابہات۔ محکمات آیات وہ ہیں جنکی مراد اور معنی متعین ہیں۔ان میں کوئی اشکال نہیں ہوتا۔الفاظ سنتے ہی معنی معلوم ہو جاتے ہیں لغت سے بھی مطلب واضح ہو جاتا ہے اور وہ ذو معنی بھی نہیں

ہوتے ان میں کوئی ابہام بھی نہیں ہوتا یہی آیتیں دین کی بنیاد اور احکام کی اصل اور جڑ ہوتی ہیں رہی دوسری قسم یعنی متشابہات تو وہ آیتیں ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کئی معانی کے متحمل ہوتے ہیں سیاق وسباق سے ان کے معنی متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان کا مطلب سمجھنے کیلئے محکمات کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔

محکمات جن معانی کی تائید کریں انہیں قبول کرنا ہے ورنہ نہیں۔ خواہ مخواہ ہمہ دانی کا دعوی کرکے ان کے ایسے معانی نکالنا جن کی تائید محکمات سے نہ ہوتی ہو تو اسی کو قرآن دلوں کے ٹیڑھے پن کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس سلسلے میں صحیح کوشش کرنے کے بعد بھی مراد سمجھ میں نہ آئے تو اسکو اللہ کے حوالے کر دینا ہی بہتر ہے۔

اور یہ کہدینا اچھی بات ہے ایمان کی سلامتی کی بات ہے کہ اللہ ہی اس کی مراد کو بہتر جانتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ متشابہات ہمارے اپنے اعتبار سے ہیں نہ کہ اللہ کے علم کے اعتبار سے۔ وہ تو ان معانی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ بھی واقف تھے ورنہ ایسا کلام جو مخاطب کے سمجھ میں نا آئے مہمل کلام ہو جائے (نعوذ باللہ) قرآن میں یہ جو آیت آئی ہے اس میں ''الا اللہ'' پر وقف لازم کی نشانی دی گئی ہے، یعنی متشابہات کا علم صرف اللہ ہی کو ہے، البتہ جو راسخین فی العلم ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے اور سارا کلام اللہ کی جانب سے ہے، یہ اکثر علماء وفقہاء کا قول ہے، لیکن امام شافعیؒ اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس آیت میں الا اللہ پر وقف نہیں کرتے اور ''و الراسخون في العلم'' کا عطف اللہ پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ متشابہات کا علم اللہ کو بھی ہے اور الراسخون في العلم کو بھی ہے جو لوگ الا اللہ پر وقف کرتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ نے اتباع متشابہات کو تیڑھے لوگوں کا حصّہ قرار دیا ہے۔ پس راسخین کا حصّہ تسلیم وایمان ٹھہرا، شارح اصول الشاشی نے اس سلسلہ میں ایک درمیانی بات کہی ہے وہ کہتے ہیں کہ ''یہ بحث نزاع لفظی ہے، اس لئے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ راسخین بھی اس کی تاویل جانتے ہیں تو اس سے ان کی مراد تاویل ظنی ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ راسخین فی العلم اس کی تاویل نہیں جانتے تو اس سے انکی مراد تاویل حقیقی ہے، یعنی وہ تاویل جس پر اعتقاد رکھنا واجب ہے، پس اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ نے حضور اکرم ﷺ کو متشابہات کی تاویل سے واقف کر دیا تھا، اور اسی طرح ''مبیّن قرآن'' حضرت امام مہدیؑ کو بھی اللہ نے واقف فرما دیا تھا پھر ان دونوں ہستیوں نے حسب موقع، حسب ضرورت اور حسب استعداد جن کو مناسب سمجھا اس کی تاویل سے آگاہ فرمایا۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ ایمان والوں کی آزمائش مقصود ہے کہ کون ہے جو کہتا ہے کہ محکمات ہوں کہ متشابہات سب آیات اللہ تعالیٰ کی ہیں جن کا مطلب صاف ہے ان پر ہم عمل کرتے ہیں

اور جن کا مطلب صاف نہیں ہے ہم ان پر بھی ایمان لاتے ہیں لیکن غلط تاویلات کے پیچھے نہیں پڑتے۔ یہی شان ایمان ہے۔

۱) محکم آیتوں کی مثال، أَقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَآتُوا الزَّكَاةَ، وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا۔ وغیرہ ہیں۔

اور متشابہات کی کئی قسمیں ہیں۔

۱) حروف مقطعات۔ جیسے، الم، حم، کھیعص۔ ان کے حقیقی معانی صرف اللہ کو ہی معلوم ہیں یا ان کو معلوم ہیں جنھیں اللہ نے معلوم فرمایا ہے اور ان کے سوا جو معانی کسی نے بیان کئے ہیں تو وہ اسکے مرادی معنی ہیں۔ جو اعتباری ہیں۔ قطعی نہیں اور نہ ان پر تفسیر رائے کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

۲) اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ، وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وغیرہ۔

۳) يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ، فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ وغیرہ۔

۴) هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وغیرہ۔

ان میں سے بعض کے معنی تو معلوم ہی نہیں ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ جن کے معنی تو معلوم ہیں لیکن ان کی کیفیت مجھول ہے۔ اس لئے اہل سنت کا اعتقاد یہ ہے کہ ان کے معنی معلوم ہیں ان کی کیفیت مجھول ہے۔ ان پر ایمان لانا واجب ہے اور ان کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔

مگر کچھ ذہنیتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایسی باتوں کے تعلق سے بھی جن کا مفہوم صاف اور واضح ہے۔ غلط تاویلات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی ان کے دل کے ٹیڑھے پن کی علامت ہے اور اس سے ان کا مقصد فتنوں کو برپا کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں کے بعد ہی دعا سکھائی ہے کہ اے لوگوں اللہ سے دعا کرو کہ اے اللہ جب تونے ہم کو سیدھا راستہ دکھا دیا تو اب ہمارے دلوں میں کجی مت پیدا کر اور اپنی جانب سے ہم کو رحمت عطا فرما بے شک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے۔

تاویل کی مثال۔ (علمی مضامین ۱۲۶) میں نے ایک رسالہ میں دیکھا کہ ایک صاحب نے فرمایا سود حلال ہے۔ اور یہ جو قرآن میں ربوٰ کا حرام ہونا آیا ہے۔ یہ لفظ ربا بضمّ الراء ہے۔ جو ربودن سے مشتق ہے۔ یعنی غصب اور لوٹ یہ حرام ہے نہ کہ سود اور مولویوں نے اپنی رائے سے اعراب لگا دئے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے صحابہ کرام اور علماء سلف کو کہ انہوں نے رسم الخط کو محفوظ اور باقی رکھنے کو واجب

فرمایا۔ پس یہ لفظ ربودن سے ہوتا تو عربی رسم خط میں کیوں ہوتا یہ تو فارسی لفظ ہے اور فارسی میں رہا اس معنی مصدری میں آتا ہی نہیں۔ گویا لوگ یہ جانتے ہیں کہ تاویل کا سہارا لے کر احکام شرعیہ کی بیخ کنی کر دیں۔

خلاصہ یہ کہ محکمات تو صاف ہیں ان پر عمل کریں۔ متشابہات میں بھی انسان کو غلط تاویلات یا تاویلات بعیدہ کے گڑھوں میں گرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایمان لائیں اور مراد کو اللہ کی طرف سونپ دیں۔

حضرت مہدی علیہ السلام کی بعثت کا مقصد ہی اللہ کی مراد کو بیان کرنا تھا۔ آپ نے دین خدا اور شریعت مصطفی ﷺ سے تعلق رکھنے والی باتوں کو بیان فرمایا۔ جن میں تاویل۔ تحویل۔ تبدیل اور تفسیر کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ آپ نے بارہا فرمایا بندہ جو کچھ کہہ رہا ہے حکم خدا سے کہہ رہا ہے۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ نے ایسی ہی اعتقادی باتوں کو لکھ کر جو آپ نے حضرت مہدی علیہ السلام سے سنی تھیں۔ صحابۂ مہدی علیہ السلام کے اجماع میں پیش فرمایا کہ اگر کچھ کمی یا بیشی ہو تو اسکی تصحیح ہو جائے۔ جب صحابہ نے سنا اور اجماعی فیصلہ دیا کہ یہ سب حق ہے۔ تو آپ نے پھر عقیدۂ شریفہ میں لکھا، اب یہ چاہئے کہ لوگ اس میں تأویل یا تحویل سے دور رہیں۔

تو زماں خان کی رگ مخالفت بھڑک اُٹھی اور اس نے یہ لکھ دیا کہ قرآن و حدیث میں تو تأویل و توجیہ کی گنجائش ہے لیکن مہدویوں کے پاس ان کے امام مہدی علیہ السلام کے اقوال وافعال کی تاویل نہیں ہو سکتی۔

ہم پوچھتے ہیں کہ، کیا اجماع، اصول دین سے ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے اور بے شک ہے تو کیا اجماع کا منکر کافر نہیں ہے۔ کیا اجماع کے فیصلے میں تاوٴیل اور توجیہ کی گنجائش ہے؟ جب حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیقِ ولایتؓ کی تحریر پر اس وقت موجود تمام صحابہ نے اتفاق کر لیا تو کیا وہ اجماعی فیصلہ نہیں ہے۔ کیا اس سے انحراف کی گنجائش ہے۔؟

تہجد

کیا تہجد کی نماز کیلئے مرشد کی اجازت ضروری ہے۔کیا اجازت کے بغیر تہجد کی نماز پڑھی نہیں جاسکتی؟

تہجد کی نماز خاص ہے۔اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو اس نماز کے پڑھنے کا حکم قرآن کے ذریعہ دیا ہے۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ﴿الإسراء:۷۹﴾۔اور رات میں نیند سے اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھ جو کہ تجھ پر خاص ایک زائد نماز ہے۔تو یہ نماز عام نمازوں کی طرح نہیں ہے۔اسکے کئی شرائط ہیں۔مثلاً یہ کہ سو کر اٹھ کر پڑھنا ہے۔(ایسا نہیں ہوسکتا رات دیر تک جاگتے رہے اور خیال کیا کہ اب تہجد پڑھ کر سوجائیں گے)رسول اللہ ؐ کا یہی عمل تھا۔اگرچہ روایت میں آیا ہے کہ آپؐ فجر کی سنت کے بعد لیٹ جایا کرتے تھے۔جب لوگوں نے اس بارے میں پوچھا تو آپؐ نے جواب دیا عيناي تنامان والقلب يقظان۔یعنی میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل جاگتا رہتا ہے۔خیر یہ تو آپؐ کی خصوصیت تھی ہمارا حال تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔پھر تہجد کی نماز پڑھنی شروع کریں تو ہمیشہ پڑھنی ہوتی ہے۔یعنی اس پر مداومت کرنی پڑتی ہے۔ایسا نہیں ہوسکتا کہ کبھی پڑھ لیں اور کبھی نہ پڑھیں۔

تہجد جب سے آپؐ نے پڑھنا شروع فرمایا صرف ایک مرتبہ قضا ہوئی ہے۔وہ بھی ایک سفر سے واپسی کے موقع پر ایک مقام پر دیر سے پہنچے تھے۔وہاں خیمے لگائے تھے۔اور آپؐ نے حضرت بلالؓ کو اگرچہ تاکید کردی تھی کہ مجھے وقت پر جگادینا۔لیکن ہوا یہ کہ جب سورج کی شعاعیں آپؐ کے چہرہ انور پر پڑیں تو اس قافلے میں سب سے پہلے بیدار ہونے والے رسول اللہ ﷺ ہی تھے۔

آپؐ نے حضرت بلالؓ کو بلا کر پوچھا کہ تم نے مجھے جگایا نہیں۔تو حضرت بلالؓ نے جواب دیا حضورؐ جس نے آپؐ کو سلایا اس نے مجھے بھی سلادیا۔پھر آپؐ نے دوسری جگہ جاکر فجر کی باجماعت قضا نماز پڑھی۔پھر فجر کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک ذکر کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔نیز یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ نمازِ تہجد کی کتنی رکعتیں ہیں۔ان رکعتوں میں کونسی آیتیں یا سورتیں کس ترتیب سے پڑھنی ہیں احادیث کی کتابیں آپ دیکھیں گے تو آپ کو مختلف روایتں ملیں گی۔کسی روایت میں آٹھ رکعتیں ملیں گی۔کسی روایت میں چار کا ذکر ہے تو کسی روایت میں دو رکعت کا ذکر ہے تو کسی روایت میں بارہ رکعتوں کا ذکر ہے۔پھر وتر کی نماز کب پڑھنی چاہئے کیا عشاء کی نماز کے بعد وتر پڑھ لینی چاہئے اور پھر تہجد کی نماز نیند سے بیدار ہو کر پڑھنی چاہئے۔حالانکہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ تم وتر کو رات کی آخری نماز بناؤ۔کیا عشاء کی نماز کے ساتھ بھی وتر پڑھ لیں اور پھر تہجد کے بعد بھی وتر پڑھیں۔اس طرح وتر دو مرتبہ پڑھنی پڑے گی۔حالانکہ ایک حدیث میں آیا ہے۔لَا وِتْرَان فِي لَيْلَةٍ۔ایک

رات میں دووتر نہیں ہیں۔ نیز تہجد کی نماز پوشیدہ طور پر پڑھنی چاہئے (گھر میں) یا علانیہ مسجد یا جماعت خانہ میں پڑھنی چاہئے۔علانیہ پڑھنے کی صورت میں ریاکاری کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

ان تمام وجوہ کی بناء پر کہا گیا کہ مرشد سے اجازت لے کر تہجد کی نماز پڑھنی چاہئے۔ کیونکہ مرشد مرید کے مزاج اسکی طبیعت اور اسکی سکت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ نیز اسکی عمر اور اسکے دیگر اشغال وغیرہ کی بھی جان کاری رکھتا ہے۔ اگر کبھی مرید جوش میں آکر تہجد شروع کرنے کا ارادہ بھی کرلیتا ہے تو مرشد اسکی تفہیم کر سکتا ہے۔ کہ اسکے کیا شرائط ہیں اور اسکے کیا تقاضے ہیں۔ اور وہ کیا انکی تکمیل کر سکتا ہے۔ یا نہیں۔ پہلے وہ چند دن آزما سکتا ہے کہ مرید پابندی کے ساتھ وقت پر اٹھ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ گرمی۔ سردی، اور بارش کے موسم میں اسکی نیند اور بیداری کا کیا عمل رہتا ہے۔ فقیر کے والدؒ فرماتے تھے کہ حضرت کے مرشد حضرت فقیر عارف باللہ سید قطب الدین عرف خوب میاں صاحب پالن پوریؒ حیدر آبادی اکیلی کی مسجد کے حجرہ میں قیام فرماتے تھے۔ جب والد صاحبؒ نے حضرت سے اجازت مانگی تو مرشد قبلہ نے فرمایا۔ فقیر حجرے کے اندر سوئے گا اور تم حجرے کے باہر رہو گے۔ تمہاری ڈیوٹی یہ ہو گی کہ میرے تہجد کیلئے اٹھنے سے پہلے میں چائے پیا کرتا ہوں تو تم وضو کر کے میری چائے کی کیتلی کو ہاتھ لگاؤ گے اس طرح سے پورے چھ مہینے ڈیوٹی رہی۔ جب بلاناغہ یہ خدمت انجام دی گئی تو حضرت نے والدؒ صاحب کو اجازت دی۔ اس کا منشاء یہی تھا کہ نیند سے بیدار ہونا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ورنہ یوں تو آدمی ارادہ کرے تو آخری شب تک جاگ لیتا ہے۔ لیکن سو کر اٹھنا بڑا مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر مرشد سے اجازت نہیں لی جاسکتی بلکہ اس مرشد سے اجازت لینی ہے جو پابندِ تہجد ہو۔

ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد چھوڑ دینا یا کبھی پڑھنا اور کبھی ناغہ کر دینا اس طرح کے عمل سے بجائے فائدہ کے نقصان کا احتمال ہے۔ یعنی عبادتِ خاص اور خالص کے ساتھ کھیل کا معاملہ ہو جاتا ہے۔ جو نہیں ہونا چاہئے۔ حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے اسکی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ اس سے جو فیضِ باطنی حاصل ہوتا ہے۔ اسکی بات ہی کچھ اور ہے۔

تقلید

تقلید کے دو معنی ہیں ایک تو معنی لغوی ہیں اور دوسرے شرعی۔ لغوی معنی ہیں قلادہ در گردن بستن یعنی گلے میں پٹہ ڈالنا۔ تقلید شرعی یہ ہے کہ کسی مجتہد کے قول و فعل کی لازماً اتباع کرنا یہ جان کر کہ اس کا کلام اور اس کا کام ہمارے لئے حجت ہے۔

اور سلوک میں اپنے مرشد کے احکام کی بلا حیل و حجت اتباع کرنا کہ مقصد اعلیٰ یعنی خدا تک رسائی حاصل ہو سکے۔

چنانچہ حاشیہ جامی باب متابعت رسول اللہ ﷺ میں ص ٨٦ پر شرح مختصر المنار سے نقل کیا کہ **التقليد اتباع الرجل غيره فيما سمعه يقول او في فعله على زعم انه محقق بلا نظر في الدليل**۔یعنی کسی شخص کا اپنے غیر کی اطاعت کرنا اس میں جو اس کو کہتے ہوئے یا کرتے ہوئے سن لے۔ یہ سمجھکر کہ وہ اہل تحقیق میں سے ہے بغیر دلیل میں نظر کئے ہوئے۔

نیز امام غزالیؒ کتاب **المستصفیٰ** جلد دوم ص ٣٨٧ میں فرماتے ہیں **التقليد هو قبول قول بلا حجة**۔اسی طرح مسلم الثبوت میں ہے **التقليد العمل بقول الغير من غير حجة**۔یعنی غیر کے قول پر بغیر حجت طلب کئے عمل کرنے کو تقلید کہتے ہیں۔

اللہ کا ارشاد ہے **أَطِيعُوا اللَّـهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ**﴿النساء:٥٩﴾یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو اس آیت میں دو جگہ اطیعوا کا لفظ آیا ہے۔ ایک اللہ کیلئے اور دوسرا رسول اور صاحبان امر کیلئے۔

جہاں تک **أَطِيعُوا اللَّـهَ** کا تعلق ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا حکم مانو۔یعنی اللہ کی صرف اس کے فرمان کے مطابق ہی اطاعت کی جائے گی نہ کہ اس کے فعل میں اطاعت کی جائے گی۔ کیونکہ اللہ فاعل مختار ہے۔ وہ مارتا بھی ہے اور جلاتا بھی ہے۔

البتہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے بعد آپ کی امت میں جو صاحبان امر یعنی امر دین میں جو آپ کے خلیفے اور صاحبان رشد و ہدایت ہوں گے ان کی اطاعت ان کے قول و فعل میں کرنی ضروری اور لازمی ہو گی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی تقلید نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ صرف اطاعت ہی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی بھی اطاعت کی جاسکتی ہے اور اتباع بھی کی جاسکتی ہے۔ اس مقام پر تقلید کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ پس یہ کہا

جائے گا ہم اللہ کے بندے ہیں اور رسولؐ کے امتی ہیں کیونکہ اللہ قانون بنانے والا ہے اور اپنے خلیفے پر نازل کرنے والا ہے۔ پس اس پر تو کوئی دلیل پوچھی ہی نہیں جاسکتی اور اللہ کا خلیفہ اللہ کے اس حکم کو سنانے والا اور اس پر عمل کرنے والا ہے۔ پس اس پر بھی اس سے دلیل پوچھی نہیں جاسکتی ہاں توحید اور رسالت پر دلیل پوچھی جاسکتی ہے۔ اور مان لینے کے بعد پھر دلیل پوچھی ہی نہیں جاسکتی۔ ہاں ان کے بعد اگر دوسرے لوگ مسائل بیان کریں تو ان سے دلیل پوچھی جاسکتی ہے۔ اور تحقیق کے بعد کسی امام کی پیروی کی جانی چاہئے لیکن کب؟ جب اس امام کی تحقیق اچھی طرح کرلینے کے بعد آپ کو یقین ہو جائے کہ یہ جو کچھ مسائل بیان کررہاہے وہ واقعی قرآن اور احادیث اور مسائل اجماعیہ سے پوری طرح واقف ہے۔ اس میں اسقدر علمی لیاقت و قابلیت ہو کہ قرآنی اشارات و رموز سمجھ سکے۔ اور کلام کے مقصد کو پہچان سکے اس سے مسائل نکال سکے، علم صرف و نحو و بلاغت وغیرہ میں اسکو مہارت حاصل ہو۔ احکام کی تمام آیتوں اور احادیث پر اسکی نظر ہو۔ اس کے علاوہ ذکی اور خوش فہم ہو۔ اسی کو مجتھد کہتے ہیں۔ اور جو ایسا نہیں ہے اسکو مقلد ہوئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

ایک بات یہاں پر یہ ذہن نشین ہونی چاہئے کہ جہاں نصوص آگئی ہوں وہاں تقلید جائز نہیں ہے۔ ہاں جہاں نصوص نہ ہوں وہاں تقلید جائز ہے مثلاً فرائض اسلام، نماز کی رکعات، رکوع سجود، روزے صبح سے شام تک۔ ان میں کھانا پینا اور مجامعت کی حرمت وغیرہ قرآنی نصوص سے ثابت ہیں ان میں تقلید کا کوئی مقام ہے نہ ضرورت۔ البتہ ان احکام کی ادائی میں مختلف احوال حالات اور مواقع کی بناء پر جو مسائل پیش آئیں تو ان کی ادائی کی بہتر صورت کیا ہوسکتی ہے؟ ایسے سوالات کا صحیح جواب حاصل کرنے کے لئے کسی مجتھد کے قول کو جو اختیار کیا جاتا ہے اسکو تقلید کہتے ہیں۔

آج کل ہمارے عام علماء کا کام بس یہ ہے کہ کتابوں سے مسائل دیکھ کر لوگوں کو بتائیں۔ اور بس نفسانی خواہشات کے تحت، یا اپنے آپ کو لوگوں میں مشہور کرنے، یا لوگوں کو ان کی مرضی و خواہش کے مطابق مسئلے بیان کرکے ان کو خوش کرنے کی غرض سے اجماع کے متفقہ اور منظورہ اور اسلاف سے تواتر کے ساتھ تعامل کے خلاف جو کوئی حکم دے گا وہ غلط ہوگا اور اسی پر بدعت کا حکم لگایا جائے گا۔ جس سے پرہیز کرنا ازحد ضروری ہے۔

تقلید دو طرح کی ہوتی ہے تقلیدِ شرعی اور تقلیدِ غیر شرعی۔ تقلیدِ شرعی، شریعت کے احکام میں کسی کی پیروی کرنے کو کہتے ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکواۃ وغیرہ احکام کے مسائل میں آئمہ دین کی اطاعت کی جاتی ہے اور تقلیدِ غیر شرعی، دنیا کے امور میں کسی کی پیروی کرنا جیسے علم طب میں اطباء بو علی سینا کی اور شعراء میں داغ، امیر میر اور غالب وغیرہ کی، یا نحو یا صرف میں لوگ سیبویہ یا خلیل کی پیروی کرتے ہیں۔ صوفیاء کرام جو وظائف اور اوراد اور اعمال سیر و سلوک میں اپنے مشائخ کے قول و فعل

کی پیروی کرتے ہیں وہ تقلید دینی یا تقلید فی الطریقت ہے تقلید غیر شرعی اگر شریعت کے خلاف ہے تو وہ حرام ہے۔ اگر اسلام کے خلاف نہ ہو تو جائز ہے۔

حرام تقلید کے بارے میں قرآن جابجا ممانعت کرتا ہے اور ایسی تقلید کرنے والوں کی برائی بیان کرتا ہے۔ اسکی مثالیں۔

۱) وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿الکھف:۲۸﴾۔ اور اسکی اطاعت مت کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا۔

۲) وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴿لقمان:۱۵﴾۔ اور اگر وہ (والدین) تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرا شریک ٹھہرا اسکو جس کا تجھے علم نہیں تو تو ان کی اطاعت مت کر۔

۳) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَاأَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿المائدۃ:۱۰۴﴾ اور جب ان سے کہا جائے کہ آؤ اسکی طرف جو اللہ نے نازل کیا اور رسولؐ کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے کافی ہے وہ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ جانیں اور ہدایت نصیب نہ ہوں۔

۴) وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ﴿البقرۃ:۱۷۰﴾۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اسکی اتباع کرو جو اللہ نے نازل فرمایا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔

ان آیتوں میں مشرکین اور کافرین کی برائی بیان کی گئی ہے جو اللہ اس کی کتاب اور اسکے رسولؐ کے خلاف (یعنی اسلام و ایمان کے خلاف) اپنے ان باپ دادا کی پیروی کو ہی اختیار کرنے کی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ یعنی جو شریعتِ مصطفی کے خلاف اور اسکے مقابلے میں اپنے کافر اور جاہل باپ دادا کے حرام کاموں کو ہی کافی سمجھ رہے تھے اور اسلامی اور ایمانی دعوت کے مقابلے میں اپنے باپ دادا کے مشرکانہ رسوم کی ہی اتباع کرنے کو کافی سمجھ رہے تھے خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔

رہی شرعی تقلید اور ائمہ دین و مرشدان طریقت کی اطاعت و اتباع سے ان آیات کو کوئی تعلق ہے نہ مناسبت۔ ان آیتوں سے ائمہ کرام یا مرشدان طریقت کی تقلید کو شرک یا حرام کہنا بے دینی ہے۔

شرعی مسائل تین طرح کے ہیں(۱)عقائد(۲)وہ احکام جو صراحۃً قرآن پاک یا احادیثِ شریفہ سے ثابت ہوں۔اور اجتہاد کو ان میں دخل نہ ہو۔(۳)وہ احکام جو قرآن یا احادیث سے استنباط اور اجتہاد کر کے نکالے گئے ہوں۔

عقائد تو وہ ہیں جو قرآن احادیث اور ہمارے پاس فرمودات اما مناعلیہ السلام سے اور اجماع صحابہ ٔنبوت وولایت سے روایتاً منقول ہوئے ہوں اور ہر زمانے میں بلا نکیر مسلّم اور مقبول ہوئے ہوں۔ان کے ماننے کو نہ تو تقلید کہہ سکتے ہیں اور نہ ان پر کسی کو تنقید کرنے کا حق دیا جاسکتا ہے اس لئے یہ اصول ہیں۔

البتہ فروع اور عملیات میں تقلید جائز ہے۔

تقلید کا واجب ہونا قرآنی آیات، احادیثِ صحیحہ، عمل امت اور اقوال مفسرین ومرشدین طریقت سے ثابت ہے۔

(۱)اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴿سورۂ فاتحہ﴾ اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ان کا راستہ جن پر تونے انعام کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیدھا راستہ وہی ہے جس پر اللہ کے نیک بندے چلے ہوں اور وہ نیک بندے یعنی وہ بندے جن پر اللہ نے انعام و احسان کیا ہے ان کی نشاندھی خود اللہ نے اسطرح بیان کی ہے۔ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴿النساء:۶۹﴾۔یعنی جن بندوں پر اللہ نے انعام واکرام سے نوازا ہے وہ بندے ہیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

یہاں البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کیلئے تقلید جائز نہیں ہے۔اس لئے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے بارے میں خود آنحضرت ﷺ نے صراحت فرمادی ہے کہ وہ اللہ کے خلیفے ہوں گے۔وہ میرے نقشِ قدم پر چلیں گے اور اس میں کبھی خطا نہیں کریں گے۔ نیز فقہاء نے بھی اسکی تصریح کر دی ہے کہ مہدی علیہ السلام پر فقہاء کی تقلید حرام ہے انشاءاللہ اسکی تفصیل آئندہ آئے گی۔

(۲) وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ﴿لقمان:۱۵﴾ اسکے راستے کی اتباع کر جو میری طرف رجوع لایا۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف رجوع لانے والوں کی اتباع کرو یعنی تقلید ضروری ہے

(۳) يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ﴿الاسراء:۷۱﴾ جس دن سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ہر انسان کو اس کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔یعنی اس امام کے ساتھ جسکی وہ

پیروی اور تقلید کرتا تھا اور جس کا کوئی امام یا رہبر ہی نہیں ہو گا۔ اسکو کس کے ساتھ بلایا جائے گا اس کے بارے میں صوفیاء کرام فرماتے ہیں جس کا کوئی امام (مرشد) نہ ہو اس کا امام اور مرشد شیطان ہے۔

یہ تو چند منقولی دلائل ہیں۔ اگر تفصیل میں جائیں تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر عقلی دلائل پر نظر ڈالیں تو بھی ان کی تعداد کا شمار مشکل ہی ہو گا۔ کیونکہ دنیا کا کوئی کام بھی تقلید اور پیروی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہر علم کا حصول اس علم کے قواعد اور اصول جانے بغیر ناممکن ہے۔ اور ضوابط و قواعد کا علم ان کے بنانے والوں کی تقلید کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ہر علم میں، ہنر میں، تجارت میں، زراعت میں، صنعت و حرفت میں ماہرین کی تقلید از بس ضروری ہے اس کے بغیر نہ تو کام ہوتا ہے اور نہ اس میں کامیابی ملتی ہے۔

ایک روایت تو ایسی ملتی ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس زمانے کے ایک مخصوص دنیاوی کام میں صحابہ سے فرمایا کہ تم پہلے جیسا کرتے تھے ویسا ہی کرو۔ چنانچہ روایت ہے کہ لوگ کھجور کے نر پھول کو مادہ کے پھول پر مارتے تھے جسکی وجہ سے کھجوروں کی فصل اچھی ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ دیکھا اور سنا تو فرمایا کہ ایسامت کرو۔ فصل اچھی ہو جائے گی۔ لوگوں نے اس مرتبہ وہ عمل نہیں کیا۔ فصل اچھی نہیں ہوئی۔ تب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس امر کی شکایت کی۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا پہلے تم جیسا کرتے تھے ویسا ہی کرو اور ارشاد فرمایا أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ۔ تم تمہاری دنیا کے امور کے بارے میں زیادہ جانتے ہو۔ لوگوں نے پہلے کے عمل کی پیروی کی یہ تو دنیا کے امور کی بات ہوئی اب دیکھئے کہ دینی امور میں بھی پیروی و تقلید کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس میں بھی ماہرین کی پیروی و تقلید ضروری ہے۔

چنانچہ قراءت قرآن میں قاریوں کی تقلید ہوتی ہے قراء سبعہ مشہور ہیں پس وہ جس طرح پڑھتے تھے اسی طرح قرآن پڑھا جاتا ہے۔

قرآنِ شریف کو جمع کرنے میں ساری امت نے اپنے بزرگوں کی تقلید کی۔ حضورؐ کے زمانے میں تو قرآن ایک کتاب کی شکل میں جمع نہیں کیا گیا تھا بلکہ متفرق اجزاء کی شکل میں تھا۔ پھر قرآن کی تیس پاروں کی تقسیم بہت بعد میں عمل میں آئی۔ قرآن کے الفاظ پر زیر و زبر اور پیش بھی بعد میں لگائے گئے۔ قرآن میں منزلوں کی ترتیب آیتوں پر رموز او قاف وغیرہ بعد کے بزرگوں کی تقلید ہے۔ پھر قرآن شریف کی چھپائی جلد سازی وغیرہ بھی اسکی ہی مثالیں ہیں۔

فن حدیث بھی تقلید سے بھرا ہوا ہے۔ کوئی حدیث اس لئے ضعیف ہے، مرفوع ہے، متصل ہے کہ فلاں محدث نے

اس کو ایسا کہا ہے۔ نمازوں میں تقلید ہے۔ یعنی یہ نماز سنت ہے۔ یہ واجب ہے۔ بلکہ نماز کی رکعتوں میں بھی تقلید ہے۔ نمازِ تراویح کسی کے پاس (۲۰) رکعتیں ہیں تو کسی کے پاس آٹھ (۸) رکعتیں ہیں۔ وتر کی نماز کسی کے پاس (۳) رکعات ہیں تو کسی کے پاس ایک رکعت۔ تہجد کی نماز کسی کے پاس (۱۲) رکعتیں ہیں تو کسی کے پاس کم از کم (۲) رکعت۔ یہ سب تقلیدی احکام نہیں تو اور کیا ہے۔

نماز جماعت سے ہوتی ہے تو ایک امام کی اقتداء میں۔ خلیفہ مقرر کرتے ہیں تو ایک، بادشاہ ہوتا ہے تو ایک، اسی طرح مرشد بھی ہوتا ہے تو ایک۔

فرق صرف اتنا ہے کہ راہ طریقت میں جس کو جو طریقہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور وہ جس مرشد سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور جس سلسلے سے وہ وابستہ ہونا چاہتا ہے وہ اسکی تقلید اور پیروی کرتا ہے۔

کیوں کہ طالب اور مرید کا مقصد خدا کو پانا ہوتا ہے۔ پس وہ بھی جانتا ہے کہ کسی کی پیروی کئے بغیر از خود وہ خدا کو پا نہیں سکتا۔ خدا کو پانے کیلئے راستہ ضروری ہے اور راستہ میں رہبر کا ہونا ضروری ہے۔ چلتا تو مرید ہی ہے لیکن ہاتھ پیر کا پکڑنا چاہئے تا کہ شیاطین کے مکر و فریب کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے تقلید بزرگاں فرض است۔

لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسی بات ہے۔ یہ تقلید کس طرح فرض ہو گئی۔ یہ سوال محض جذباتی ہے اور لوگوں کو دھوکہ میں ڈالنے اور صحیح راستے سے ورغلا کر غلط راستہ پر ڈال دینے کا ایک شیطانی منصوبہ ہے۔

فرض کے کئی معانی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکواۃ وغیرہ یہ سب فرائض ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے۔

لیکن فرض کے ایک ہی معنی نہیں ہیں بلکہ فرض کے معنی لازمی اور ضروری کے بھی آتے ہیں مثلاً کسی کو راستہ چلتے ہو ئے ٹھوکر لگ جائے تو ہم کہتے ہیں کہ راستہ دیکھ کر چلنا فرض ہے۔ کسی کے ساتھ کاروبار کریں وہ اگر دھوکہ دے تو کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کے حالات اور عادات کو جان لینا آپکا فرض تھا۔ تو یہاں فرض کے وہ معنی نہیں جو نماز روزہ وغیرہ احکام کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ جب آپ کو خدا کو پانا ہے تو آپ کو چاہئے کہ اچھے رہبر کو اپنا مرشد اور رہبر بنائیں۔ پہلے تحقیق کرنا فرض ہے کہ وہ آدمی کیسا ہے۔ کیا قرآن اور سنت پر عامل ہے۔ کیا تقویٰ شعار ہے کیا وہ سلوک کے راستوں سے

واقف ہے۔ہاتھ میں ہاتھ دینے سے پہلے ان سب باتوں کا جان لینا مرید پر فرض ہے۔پھر تحقیق کر لینے کے بعد جب اطمئنان نصیب ہوا اور دل نے گواہی دی کہ اس مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دینا چاہئے تو اس کے مرید ہونا بھی ضروری ہے۔اور جب بیعت ہو گئے تو کیا اسکی صحبت میں رہنا اسکے اعمال کی اتباع کرنا، اسکی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرنا ضروری اور لازمی نہیں۔اگر مرید ہر بات میں مرشد پر اعتراض شروع کرے عمل میں کوتاہی کرے یا عمل میں مخالفت کرے تو اسکو کیا حاصل ہو گا۔اور مرشد کہاں تک اس ایک آدمی کے پیچھے اپنا سر کھپائے گا۔تو ایسے وقت پر ایک ہی جواب دیا جاتا ہے کہ دیکھو تقلید بزرگاں فرض است۔اگر تم کو راستہ چلنا ہے تو پیچھے پیچھے چلو۔اور یہ ضروری ہے اگر تم کو ہم پر اعتقاد ہے اور اعتماد ہے۔اور اگر نہیں ہے تو اپنا دوسرا راستہ دیکھنے میں تم آزاد ہو۔دیکھئے یہ کتنی صاف سیدھی اور سچی بات ہے لیکن برا ہو نا سمجھی کا غلط فہمی کا یا شر پسندی کا کہ بات کا بتنگڑ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

تراویح

تراویح بلاشک سنت ہے رسول اللہ ﷺ کے عمل کے تعلق سے جو روایت زیادہ مشہور ہے وہ یہی ہے کہ آپؐ نے رمضان شریف کی پہلی تین راتوں میں خود امام بن کر اس وقت جو لوگ حاضر تھے ان کو نماز پڑھائی۔ پھر جب اس نماز کا چرچا اور شہرہ ہوا اور لوگ چوتھی رات مسجد نبوی میں جمع ہو کر آپؐ کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن آپؐ باہر تشریف نہیں لائے۔ البتہ فجر کی نماز کے بعد آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ کل رات جو تمہارا حال تھا وہ مجھ پہ پوشیدہ نہیں ہے لیکن میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہو جائے۔ صحیح مسلم کی اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

۱) رسول اللہ ﷺ نے پہلی تین راتیں خود امام بن کر جماعت سے نماز پڑھائی۔

۲) چوتھی رات کو آپؐ نے وہ نماز نہیں پڑھائی۔ اور ہر سال یہی عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپؐ کا وصال ہو گیا۔ پھر جب حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو آپ نے بھی اسی پر عمل فرمایا۔ پھر آپؓ کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو آپ کی خلافت کے پہلے زمانے میں بھی آپ نے اسی پر عمل کیا۔ اسکے بعد آپ نے دیکھا کہ لوگ مسجد میں الگ الگ نماز پڑھ رہے ہیں تو آپ نے سوچا کہ کیوں نہ ان سب کو ایک امام کے پیچھے کر دوں۔ تب آپ نے حضرت ابی بن کعب سے فرمایا تم آگے بڑھ کر ان کو نماز پڑھاؤ۔ چنانچہ فقہ کی سب کتابوں میں یہی لکھا ہے۔ مثلاً در مختار میں ہے۔ **التراویح سنة لمواظبة الخلفاء الراشدین**، یعنی تراویح سنت ہے کیونکہ خلفاء راشدین نے اس پر مداومت فرمائی۔ پھر اسکی تشریح میں یوں لکھا ہے۔ خلفاء راشدین سے اکثر مراد ہیں۔ کیونکہ تراویح کی مداومت عہدِ مبارک حضرت عمرؓ کے درمیان میں ہوئی۔ اور اس کے بعد سے آج تک صحابہ اور علماء سب اس پر متفق چلے آئے۔ کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور سعید بن منصور نے بروایت عروہ روایت کیا کہ حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ کو مَردوں کا امام کیا تھا۔ اور تمیم داری عورتوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ (دیکھو ترجمہ اردو دُرِّ مختار جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب الوتر والنوافل صفحہ ۳۲۴)۔

مضمون بالا سے معلوم ہوا کہ (۱) تراویح سنت ہے کیونکہ خلفاء راشدین نے اس پر مداومت فرمائی یعنی پورا مہینہ تراویح پڑھتے رہے۔ (۲) پھر خلفاء راشدین سے کیا مراد ہے یہ بھی سمجھا دیا کہ اس سے اکثر خلفاء راشدین مراد ہیں۔ یعنی حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ۔ (۳) گویا حضرت عمرؓ کی خلافت کے پہلے حصّے اور اس سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پورا مہینہ جماعت سے نماز تراویح پڑھنے کا عمل نہیں تھا۔ اگر ہے تو کوئی ثابت کرے کہ رسول اللہ ﷺ پورا مہینہ جماعت سے پڑھاتے تھے۔ یا حضرت ابو بکرؓ پورا مہینہ جماعت سے پڑھائے تھے۔ مان لیا کہ رسول

اللہ ﷺ نے اس خوف سے کہ مسلمانوں کا یہ جوش و خروش دیکھ کر کہیں اللہ اس نماز کو فرض قرار دے گا تو مسلمان اس کو ادا نہ کر سکیں گے۔ اور گنہگار ہو جائیں گے۔ پورا مہینہ جماعت سے تراویح نہیں پڑھی۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو اب وہ محل ہی نہیں رہا۔ اب وہ خدشہ ہی نہ رہا تو ابو بکر صدیقؓ نے کیوں پورا مہینہ جماعت سے تراویح نہیں پڑھائی؟ اس لئے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ صاف فرماتے تھے کہ جس کام کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا میں کیوں کر وہ کام کر سکتا ہوں۔ اور خود حضرت عمرؓ نے بھی اپنی خلافت کے پہلے حصّے میں تراویح جماعت سے نہیں پڑھی۔ (۴) اور سب سے بڑی اور نکتہ کی بات یہ ہے کہ خود حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ کو تو فرمایا کہ ان کو نماز پڑھاؤ۔ لیکن حضرت عمرؓ کا نماز پڑھنا یا پڑھانا ثابت نہیں ہے۔ (۵) اور حضرت عمرؓ کا یہ فرمان کہ نعمۃ البدعۃ ھذہ یا نعم البدعۃ ھذہ یہ کیا ہی اچھی بدعت ہے۔ یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ یہ ایسا نیا کام ہے جس کا وجود یعنی مہینہ بھر جماعت سے تراویح پڑھنے کا عمل آنحضرتؐ کے زمانے میں نہیں تھا۔ اسی طرح شرح وقایہ حاشیہ چلپی میں ہے۔

إنما كانت التراويح سنة لانه واظب عليها الخلفاء الراشدين والنبي عليه السلام بيّن العذر في ترك المواظبة وهو مخافة ان يكتب علينا۔ (باب صلواۃ الوتر والنوافل صفحہ ۴۹)۔ یعنی تراویح سنت ہوئی کیونکہ خلفاء راشدین نے اس پر مداومت فرمائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ترکِ مداومت کا عذر بیان فرما دیا اور وہ تھا ہم پر فرض ہو جانے کا خوف، اس حوالے سے بھی معلوم ہوا کہ مداومت یعنی پورا مہینہ پڑھنا خلفاء راشدین کی سنت ہے حضرت عمرؓ کے زمانے سے۔ رسول اللہ ؐ نے مداومت نہیں فرمائی۔

آج سے ایک سو سال (۱۰۰) پہلے جناب مولوی سید عبدالحی لکھنوی کے فتاویٰ کا مجموعہ طبع ہوا ہے۔ اس میں ایک سائل کے جواب میں مسلم کی ایک حدیث جو حضرت عائشہؓ سے آئی ہے اسکا حوالہ اس طرح دیا ہے۔

عن عائشه ان رسول الله ﷺ خرج من جوف الليل فصلّي في المسجد فصلّي الصلواة ناس فاصبح الناس يتحدثون بذالك فاجتمع اكثر منهم فخرج في الليلة الثانية فصلّوا الصلواة فاصبح الناس يذكرون فكثر اهل المسجد في الثالثة فخرج فصلوا الصلواة-فلما كانت الليلة الرابعة عجز المسجد عن اهله فلم يخرج اليهم حتىٰ خرج لصلواة الفجر فلما قضى الفجر اقبل على الناس ثم تشهد فقال اما بعد فانه لم يخف على شانكم الليلة لكنى خشيت ان تفرض عليكم صلواة الليل فتعجزوا عنها۔ (اخرجہ مسلم)۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیچ رات میں نکلے پھر آپ نے مسجد میں نماز پڑھی اور آپ کی اقتداء میں لوگوں نے نماز پڑھی۔ پھر جب صبح میں لوگ اس کا تذکرہ کرنے لگے تو زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ پس دوسری

رات میں آنحضرتؐ باہر تشریف لائے اور لوگوں نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی پھر صبح میں لوگ اس کا تذکرہ کرنے لگے تو تیسری رات میں مسجد میں لوگ زیادہ جمع ہوگئے۔ پس آپؐ باہر تشریف لائے تو لوگوں نے آپؐ کی اقتداء میں نماز پڑھی پھر جب چوتھی رات آئی تو مصلیوں کیلئے مسجد تنگ ہوگئی تو آپؐ باہر نہیں آئے۔ یہاں تک کہ فجر ہوگئی اور آپؐ فجر کی نماز کیلئے آئے جب نماز فجر ادا فرمائی تو آپؐ لوگوں کے پاس آئے۔ شہادتین کے بعد فرمایا کل رات تمہارا کیا حال تھا مجھ سے مخفی نہیں ہے لیکن مجھے اس امر کا خوف ہوگیا کہ کہیں یہ رات کی نماز تم پر فرض نہ ہو جائے اور تم اسکو ادا نہ کر سکو۔ مسلم نے اسکی تخریج کی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے تین رات ہی جماعت سے نماز پڑھی ہے۔ چوتھی رات میں آپؐ باہر تشریف نہ لائے اور اسکی وجہ بھی بیان کر دی کہ فرض ہو جانے کے خوف اور امت پر مشقت کے خیال سے آپؐ باہر تشریف نہیں لائے۔

آنحضرت کا صلّوا في بيوتكم۔ یعنی تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو صحیح اور آنحضرتؐ خود اپنے گھر میں نماز پڑھتے تھے اس سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا آنحضرتؐ نے چوتھی رات کو گھر سے باہر نکل کر مسجد میں کثیر تعداد میں جمع شدہ لوگوں کو نماز پڑھائی؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ آنحضرت نے تین راتیں مسجد میں امام بن کر (جماعت کے ساتھ) نماز پڑھائی۔ اور چوتھی رات آپؐ نے نماز نہیں پڑھائی۔ بس یہی حال ابو بکر صدیقؓ کا بھی رہا۔ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے صدر میں بھی رہا بعد میں حضرت عمرؓ نے سب کو ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی ترغیب دی۔ اور اسکو اچھی بدعت (نیا کام) کے نام سے یاد کیا۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی محبوب سبحانی نے تراویح کے تعلق سے اپنی تصنیف غنیۃ الطالبین میں یوں لکھا ہے۔ وصلواة التراويح سنة النبي ﷺ صلٰها ليلة وقيل ليلتين و قيل ثلاثاً ثم انتظروه ولم يخرج وقال لو خرجت لفرضت عليكم ثم انها استديمت في ايام عمر فلذالك أُضيفت اليه لانه ابتداها۔ صفحہ ۴۸۶۔

تراویح رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے آپؐ نے ایک رات یا دو راتیں اور کہا گیا تین راتیں پڑھیں۔ پھر لوگوں نے آپؐ کا انتظار کیا لیکن آپؐ باہر نہیں آئے اور فرمایا میں اگر نکل گیا ہوتا تو تم پر فرض ہو جاتی۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہمیشہ (پورا مہینہ) پڑھی گئی۔ اسی وجہ سے ان کی طرف منسوب ہوئی کیونکہ انہوں نے اسکو شروع کیا اور یہ بھی لکھا ہے کہ آنحضرتؐ صحابہ کو ماہ رمضان کے زندہ رکھنے میں ترغیب دیا کرتے تھے۔ لیکن ان کو عزیمت کے ساتھ حکم نہیں فرماتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے اور معاملہ اسی طرح تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کے شروع میں (دیکھو غنیۃ الطالبین صفحہ ۸۷)
۔

حضرت عمرؓ نے پورا مہینہ نماز تراویح جماعت کے ساتھ شروع کروائی اسکی واضح دلیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ

روایت ہے۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے تراویح مجھ سے ایک حدیث سن کر اختیار کی صحابہ نے عرض کیا اے امیر المومنین وہ کونسی حدیث ہے۔ فرمایا میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا کہ اللہ کیلئے عرش کے گرد ایک جگہ ہے جسکو حظیرۃ القدس کہتے ہیں۔ اور وہ نور سے ہے۔ اس میں کتنے فرشتے ہیں ان کی گنتی اللہ کے سوائے کوئی نہیں جانتا وہ اللہ کی عبادت ایسی کرتے ہیں کہ ایک لمحہ سستی نہیں کرتے۔ پس جب ماہِ رمضان کی راتیں آتی ہیں تو وہ اپنے رب سے اجازت مانگتے ہیں کہ زمین کی طرف اتریں۔ بنی آدم کے ساتھ نماز پڑھیں تو جو شخص محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں سے ان سے لگایا جس سے وہ لگیں تو وہ ایسا نیک بخت ہو جائیگا کہ پھر کبھی گمراہ نہ ہو گا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب بات ایسی ہے تو ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں تو تراویح کے لئے جمع کیا اور اسکو سنت ٹہرایا اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت علیؓ جب ماہِ رمضان کی پہلی رات میں نکلے اور قرآن مسجدوں میں سنا تو فرمایا اللہ حضرت عمرؓ کی قبر کو روشن فرمادے جیسے انہوں نے اللہ کی مسجدوں کو قرآن سے روشن کیا۔ اور اسی طرح کی روایت حضرت عثمانؓ سے بھی آئی ہے۔ دیکھو غنیۃ الطالبین صفحہ ۴۸۸)۔

ان روایتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت محبوب سبحانیؒ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پورا مہینہ تراویح پڑھانے کی ابتداء حضرت عمرؓ نے فرمائی۔ اسکے باوجود اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہ یا تو تاریخ سے ناواقف ہے یا ضدی ہے۔

یہ بات ہی غلط ہے کہ عورتوں کا داخلہ مسجد میں جائز نہیں۔ ہاں جو عورتیں ناپاکی کی حالت میں ہوں جیسے حیض نفاس وغیرہ تو ایسے عورتوں کا داخلہ مسجد میں منع ہے۔ لیکن جو عورتیں پاک ہوں تو وہ مسجد جاسکتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو عورتیں پنج وقتہ نمازوں کیلئے مسجد نبوی جاتی تھیں۔ نیز صف بندی کے سلسلے میں جب یہ حکم ہے کہ پہلے مرد کھڑے ہوں پھر بچے کھڑے ہوں اور ان کے پیچھے عورتوں کی صف ہو تو خود اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں مسجد کو جاسکتی ہیں۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے جب یہ حکم دیا کہ نماز ختم ہوتے ہی مرد باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ جب تک کہ عورتیں باہر نہ نکل جائیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں نمازوں میں مسجد نبوی کو آیا کرتی تھیں۔ لیکن جب اخلاقی حالات بدلتے گئے۔ اور برائیوں کا خدشہ بڑھنے لگا تو صرف فجر اور عشاء میں عورتوں کو اجازت دی گئی کہ وہ مسجد کو جائیں اس لئے کہ ان دونوں نمازوں کے وقت اندھیرا رہتا ہے اور چہرے نظر نہیں آتے۔ فساد کا خدشہ کم رہتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ تو فرماتی ہیں کہ آج کل جو ہو رہا ہے اگر حضورؐ کے زمانے میں ہوتا تو حضورؐ عورتوں کو مسجد میں آنے سے شاید منع کر دیتے۔

مہدویہ کے پاس صرف تراویح جو عشاء کے وقت ادا کی جاتی ہے اور باضابطہ پردہ کا معقول انتظام کیا جاتا ہے عورتیں مسجد کے صحن میں نماز ادا کرتی ہیں اور اس میں شرع کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔

تصوف

مستند اسلامی تعلیمات کے تعلق سے اگر دیکھا جائے تو ہمیں چار مشہور طبقات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک تو **مفسرین** کرام ہیں جنہوں نے قرآن مجید کی تفاسیر اپنے نقطہ ء نظر سے احادیث رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سامنے رکھ کر۔ شان نزول بیان کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہیں۔ دوسرا طبقہ **محدثین** کرام کا ہے جنہوں نے ان تھک محنت کرتے ہوئے پوری جانفشانی کے ساتھ احادیث کے مجموعے ضبط تحریر میں لائے تیسرا طبقہ **فقہاء** کرام کا ہے جنہوں نے قرآن، حدیث اور اجماع کو سامنے رکھکر پوری دیانت داری کے ساتھ مسائل میں اجتھاد فرمایا اور افرادامت کیلئے اعمال کو درست طریقے پر ادا کرنے کی راہیں کھولیں اور چوتھا طبقہ **صوفیاء** کا ہے جن کی نظریں زیادہ تر باطن پر رہیں اور ان طریقوں کو واضح فرمایا جن سے ایک انسان ظاہر کی پاکی کے ساتھ باطن کی طہارت پر بھی اپنی ہمت صرف کر سکتا ہے۔ خصوصاًوہ اعمال جن کا تعلق قلب سے ہے۔

جسطرح انسان کا ایک قالب ہوتا ہے اور ایک قلب ہوتا ہے اسی طرح اعمال کا بھی ایک قالب ہوتا ہے اور ایک قلب ہوتا ہے۔ اکثر فقہاء کی نظر قالب پر مرکوز رہی تو صوفیاء کی توجہ ''قلب'' پر رہی، محدثین نے اقوال رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ''کی چھان بین کی اور فقہاء نے افعال رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو سامنے رکھا تو صوفیاء نے ''احوال رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم'' پر دھیان دیا، دیگر علوم میں ''مطالعہ'' ساز وسامان کی حیثیت رکھتا ہے لیکن تصوف میں ''مشاہدہ'' اور مکاشفہ'' جان کا مقام رکھتا ہے چنانچہ فقہ میں سوال ہوتا ہے کہ کس قدر مال میں کتنا مال دینا چاہیے لیکن تصوف میں پوچھا جاتا ہے کہ کتنے مال میں اپنے لئے کیا رکھا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کے ایک مرتبہ جب رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ایک غزوہ کیلئے صحابہ کرام سے تعاون کی اپیل کی تو صحابہ کرامؓ نے حسب حیثیت آنحضرت کی خدمت اپنا مال میں پیش فرمایا تو آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے پوچھا کہ عمر تم میرے پاس کتنا لائے ہو اور اہل وعیال کیلئے کیا رکھا ہے، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں نے اپنے پورے مال کے دو حصّے کئے ہیں ایک حصّہ (آدھا) اللہ کی راہ میں آپ کی خدمت میں لایا ہوں اور دوسرا حصّہ (آدھا) اپنے اہل وعیال کیلئے رکھ چھوڑا ہے، اسکے بعد جب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنا مال حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی خدمت میں پیش کیا جو یقیناً حضرت عمرؓ کے مقابلے میں کم ہی تھا تو وہی سوال حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ابو بکرؓ سے دھرایا اے ابو بکر تم کتنا مال یہاں لائے ہو اور کتنا مال اپنیے اہل وعیال کیلئے رکھے ہو تو حضرت ابو بکرؓ نے جو جواب دیا تاریخ کے سینہ میں تا قیامت محفوظ ہے، آپ نے جواب دیا جو کچھ گھر میں تھا وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں آپ کی خدمت میں لایا ہوں اور اہل وعیال کیلئے ''اللہ اور اسکے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو'' رکھا ہوں، شاعر نے اسکو یوں منظوم کیا ہے۔

پروانے کو چراغ وبلبل کو پھول بس　　صدیقؓ کیلئے خدا اور رسول بس۔

یہ ہے ایک عنوان تصوف یعنی ایثار الموجود، یعنی اللہ اور اسکے رسول کے مطالبہ پر جو کچھ موجود ہے وہ سب کا سب دے دینا اور اپنے لئے کچھ بھی نہ رکھنا۔

یہ اور اس جیسی بہت سی مثالیں ہیں جو حضور ﷺ کے حین حیات ہی میں، صحابہ کرام سے وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں جن کا منبع حضور ﷺ ہی کی سیرت اقدس کے تابناک اوراق ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ، فقہ میں پوچھا جاتا ہے **هل صلّيت**۔ کیا تو نے نماز پڑھی تصوف میں کہا جاتا ہے۔ **قُمْ فَصَلّ لِاِنَّكَ لَم تَصَلّ** کھڑا ہو، اور نماز پڑھ کیونکہ نماز نہیں پڑھی، اس میں جو رمز ہے وہ پڑھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہے یہاں نماز تو پڑھی گئی تھی اور خود حضور ﷺ نے اس شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا، پھر جب وہ جانے لگا تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا او جانے والے، آ، نماز پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اس نمازی کا کہنا بھی صحیح تھا اور حضور ﷺ کا فرمانا بھی صحیح ہے، حضور ﷺ کے فرمان کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ تو نے ایسی نماز نہیں پڑھی جیسی کہ پڑھنی چاہیئے تھی بالفاظ دیگر حضور ﷺ یہ نکتہ ذہین نشین فرمانا چاہتے تھے کہ نماز میں حضور قلب ہونا چاہیئے نماز میں دل حاضر نہ ہو تو وہ کامل نماز نہیں ہے چنانچہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا **لَا صَلٰوۃَ إلّا بِحُضُورِ القَلْب**۔ دل کی حاضری کے بغیر نماز (کامل) نہیں ہوتی یہ بھی تصوف کا ایک عنوان ہے۔

یہ تو تھا ایک ہلکا سا مختصر تعارف، اب آگے دیکھیں گے کہ تصوف کا لفظ کہاں سے آیا، یہ کس سے مشتق ہے۔

تو اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، اکثریت اس طرف گئی ہے تصوف کا مادّہ صوف ہے لیکن بعض دوسرے لوگوں نے اس کے دیگر مادّے بھی بتائے ہیں، چنانچہ صوفی کو بعض لوگ "الصفّۃ" الصف" "صوفہ" "صوفۃ القفا" (گردن کے بال) "صفوۃ" "صفا" اور "سوف" سے مشتق بتاتے ہیں۔

ان میں سے ہر ایک کے پاس ان کے اپنے دلائل اور شواہد ہیں، چنانچہ جو لوگ صوفی "صفہ" سے مشتق مانتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو چند لوگ ان میں ایسے تھے جنہوں نے اس صفہ یعنی چبوترہ پر ہی رہنے کو ترجیح دی تھی ان کے پاس کاروبار تھے نہ زمین جسپر وہ کھیتی باڑی کرتے، بس انہوں نے کسب وغیرہ کو ترک کر کے مسجد میں ہی رہنے لگے، اور حضور اکرم ﷺ کی صحبت اقدس ہی ان کا سرمایہ تھی تو جو لوگ اس طرح دنیاوی کاروبار سے بالکلیہ الگ تھلگ رہ کر توکل علیٰ اللہ کو ہی اپنا پیشہ بنالیا تھا ان کو صوفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح جو لوگ دین کے کام میں سب سے آگے رہتے تھے اور عبادت وریاضت، ذکر اور فکر میں صف اول پر اپنا قدم رکھتے تھے وہ صوفی کہلانے لگے

نیز صوفہ کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ جاہلیت میں صوفہ کے نام سے ایک قوم تھی جو اللہ کیلئے یکسو ہو گئی تھی اور جس نے خانہ کعبہ کی خدمت کیلئے اپنے آپ کو وقف کیا تھا، پس جن لوگوں نے ان سے مشابہت اختیار کی وہ صوفہ کہلائے۔ صوفی کی قوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ خانہ کعبہ کے مجاور تھے اور حاجیوں کیلئے آرام و آسائش کا انتظام کرنا ان کے ذمہ تھا۔ ان میں سب سے پہلے غوث بن مر کا نام صوفہ پڑا۔ غوث کی ماں بے اولاد تھی اسنے نذر مانی کہ اگر خدا نے اسے لڑکا عطا کیا تو وہ اسے خانہ کعبہ کی خدمت کیلئے وقف کرے گی۔ لڑکا ہوا تو اس کا نام غوث رکھا گیا۔ یہی غوث آگے چل کر صوفہ کہلایا، بعد میں اسکی اولاد بھی صوفہ کے نام سے مشہور ہوئی، اور یہی لوگ خانہ کعبہ کے مجاور اور حاجیوں کی خدمت کرتے تھے۔

امام ابو القاسم قشیری کا خیال ہے کہ صوفی صفوۃ سے لیا گیا ہے، امام موصوف کے بیان مطابق کے ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ترجمہ: "دنیا کی صفائی جاتی رہی اور کدورت باقی رہی پس موت آج ہر انسان کیلئے تحفہ ہے۔"

ایک طبقہ کی رائے ہے کہ صوفی "صفا" سے مشتق ہے صوفیہ کی بڑی تعداد اس رائے کی قائل ہے، چنانچہ بشر حافی کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس نے اللہ کیلئے اپنے دل کو صاف کیا، شیخ علی ہجویری بھی اسی جانب مائل نظر آتے ہیں چنانچہ وہ اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں لکھتے ہیں۔ ترجمہ "ان تمام تعریفوں میں صفا ہی پسندیدہ ہے اسکی ضد کدر ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا کی صفائی رخصت ہو گئی اور اسکی کدورت باقی رہ گئی۔ چونکہ لطیف اشیاء کا نام صفائی اور کثیف اشیاء کا نام کدورت رکھا جاتا ہے اور یہ لوگ اپنے معاملات کو مہذب کرتے ہیں اور بشری طبیعت کی آفتوں سے بچے ہوئے رہتے ہیں تو ان کو "صوفی" کہا جاتا ہے"۔

شیخ زکریا انصاری صوفی کو صفا سے ماخوذ سمجھتے ہیں چنانچہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں "صوفی فوعل کے وزن پر ہے اور یہ مصافاۃ سے ماخوذ ہے یعنی وہ بندہ جسے حق نے صاف کیا۔ اور اسپر ایک نکتہ شناس نے یہ کہا۔ "جسے محبت نے صاف کیا وہ صافی ہے اور جسے دوست نے صاف کیا وہ صوفی ہے۔ مورخین یونانی لفظ سوف سے صوفی کو ماخوذ بتائے ہیں۔ ابو ریحان البیرونی اور علامہ شبلی نعمانی کی بھی یہی رائے ہے کہ اصل لفظ سوف تھا۔ عربی میں ترجمہ کرتے وقت اسکو 'صاد' سے بدل دیا گیا، یونانی لوگ ان حکماء کیلئے یہ لفظ استعمال کرتے تھے جو زہد و عبادت کے علاوہ غور و فکر کے ساتھ زندگی گذارنے میں مشہور تھے۔

اسی طرح بعض لوگوں نے صوفانہ (ایک ترکاری کا نام) صوفتہ القفا (گدی کے بال) سے مشتق و ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ یہ لوگ ترک حیوانات کرتے تھے اور سبزی وغیرہ کھاتے تھے اور سر کے بال منڈھوائے بغیر لمبے کرتے اور گدی پر چھوڑ دیتے تھے۔ بعض محققین نے اسکی وجہ تسمیہ یہ بیان کی کہ یہ لوگ صوف (اون) کا لباس پہنتے تھے اس سے صو

فی کا لفظ بنا ہے۔ قواعد عربی کے لحاظ سے تو یہ نسبت درست ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر صوفی صوف کا لباس پہنے۔ بڑے بڑے جلیل القدر اصفیاء ایسے گذرے ہیں جو صوف کا لباس نہیں پہنتے تھے۔

اہل صفا تین جماعتوں میں تقسیم ہوسکتے ہیں۔ (۱) صوفی (۲) متصوف (۳) مستوصف۔ صوفی وہ ہے جسکی انا، فنا ہو جاتی ہے۔ حق اسکی زندگی ہوتی ہے۔ وہ آلات بشریت سے آزاد ہوتا ہے۔ اور صحیح معنوں حقیقت حقائق سے آگاہ ہوتا ہے۔ متصوف وہ ہے جو اس مقام کو مجاہدہ سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور اس کوشش میں صوفیاء کی مثال کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو درست کرنے میں مصروف ہو۔ اور مستوصف وہ ہے جو زر وہ روپے، پیسے، طاقت اور دنیوی جاہ و مرتبہ حاصل کرنے کیلئے صوفیاء کی نقّالی کر رہا ہو اور پہلی دونوں صورتوں میں بے خبر ہو۔ چناچہ کہا گیا ہے کہ مستوصف، صوفیاء کے نزدیک مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے، اور عام لوگوں کیلئے بھیڑئے کی طرح۔ الغرض صوفی "صاحب وصول"، متصوف "صاحب اصول" اور مستوصف "صاحب فصول" ہوتا ہے۔ گویا اللہ سے جسے 'وصل' نصیب ہو، اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے تمام مقاصد سے ہاتھ دھو لئے۔ اور جو 'اصل' کے قابل تھا وہ (شریعت کی پوری پابندی کے ساتھ) راہ طریقت کے احوال پر ثابت قدم رہا۔ اور جس کے حق میں 'فصل' یعنی جدائی مقدر تھی۔ وہ ظاہر داری میں کھو گیا۔ ہر شائستہ چیز سے نامراد رہا۔ حقیقت سے محجوب رہا اور اسی حجاب میں اسے وصل اور اصل سے محروم کر دیا۔

ان کے علاوہ صوفیاء میں بعض لوگ "ملامتیہ اور" "قلندریہ" بھی کہلانے لگے۔ ملامتیہ وہ لوگ ہیں جو بظاہر میں ایسے کام کرتے ہیں جن کی لوگ ملامت کرتے ہیں اور قلندریہ وہ لوگ ہیں۔ جو صوفیہ سے مشابہ ہوتے ہوئے عبادت کو ترک کرتے ہیں۔

صوفیہ کو مختلف شہروں اور علاقوں میں الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں انہیں مختلف نام دئے گئے ہیں۔ انہیں اہل شام "فقراء" کہتے تھے۔ وہ اتنی غذا کھاتے تھے، جو انکی پشت سیدھی رکھنے کیلئےضروری ہو۔ اسلئے انہیں "جوعیہ" (بھوکے) بھی کہا جاتا ہے۔ اہل بصرہ انہیں "الفقریہ" اور "الفکریہ" کہتے ہیں۔ خراسان میں انہیں "المغاربہ" کہا جاتا تھا۔ املاک ترک کرنے کی بناء پر فقراء اور ترک وطن کی بنیاد پر مغاربہ کا نام دیا گیا۔ کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ انہیں "سیاحین" اور جنگلوں اور غاروں میں زندگی بسر کرنیکی وجہ سے "شکفتیہ" کا نام دیا گیا۔ کیونکہ ان لوگوں کی زبان میں 'شکفت' غار کو کہتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں کو نور ایمان سے منوّر کیا۔ اسلئے یہ نوریہ بھی کہلانے لگے۔ اسکے علاوہ انہیں "درویش"، "دوستان خدا"، خاصان خدا"، "مردان خدا"، اہل نظر"، "اہل دل"، "اہل صفا"، "اہل طریقت"، "ارباب حال"، "ارباب باطن"، "ارباب صلاح"، "صوفیاء کرام"، "سالکین"، "عارفین"، "محققین"، "اصفیاء"، "اخیار"، "ابرار" بھی

کہاجاتا ہے۔ تاہم انہیں "ذکری"، "باطنی" اور "رہبان" کا نام دینے سے پرہیز کیا گیا ہے۔ کیونکہ ذکری نام کا ایک فرقہ موجود ہے۔ باطنی یا باطنیہ بھی ایک نام کا فرقہ موجود ہے۔ رہبان تو عیسائی تارکین دنیا کا نام ہے۔ اور رہبانیت اسلام میں ممنوع ہے۔

افلاطون کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ وہ فلسفہ کو آسمان سے زمین پر لے آئے۔ اسی طرح شیخ ذوالنون مصریؒ کے تعلق سے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ تصوف کو آسمان سے زمین پر لے آئے۔ صوفیاء کے احوال و مقامات کی ترتیب کے تعلق سے حضرت ذوالنون مصریؒ نے مصر میں سب سے پہلے لب کشائی کی۔ جس پر انہیں زندیق کہا گیا۔ بغداد میں عشق و محبت، ذکر، صفا اور انس کے بارے میں سب سے پہلے شیخ ابو حمزہ بغدادیؒ نے گفتگو کی۔ بغداد میں حقائق، توحید اور اشارات پر حضرت سرّی سقطیؒ نے زبان کھولی۔ فنا اور بقا کے معاملے میں سب سے پہلے حضرت شیخ ابو سعید الخزازؒ نے کلام کیا۔ تصوف کی تدوین سب سے پہلے شیخ جنید بغدادیؒ نے فرمائی۔ تصوف کے تعلق سے سب سے پہلے شیخ ابو بکر شبلیؒ نے منبر پر بیان فرمایا۔ فنا اور وحدۃ الوجود کا اظہار سب سے پہلے بایزید بسطامیؒ کی زبان سے ہوا۔ تصوف کی پہلی کتاب شیخ حارث محاسبی نے "**الرعاية في الاخلاق والزهد**" کے نام سے لکھی۔ (لیکن یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک اور امام احمد بن حنبلؒ نے کتاب "الزہد" کے نام سے کتابیں لکھی ہیں) فارس زبان میں سب سے پہلے مستند تصنیف "**كشف المحجوب**" ہے۔ جو شیخ علی ہجویریؒ نے لکھی ہے۔

سب سے پہلے فارسی میں صوفیانہ شاعری شیخ ابو سعید ابو الخیر نے کی۔ سب سے پہلے صوفیانہ تفسیر شیخ سہل بن عبد اللہ تستریؒ نے لکھی۔ جس کا نام "تفسیر القران العظیم" ہے۔ ختم ولایت کا نظریہ سب سے پہلے شیخ محمد بن علی حکیم ترمذی (۲۳۰ھ) نے پیش کیا۔ نیز انہوں نے ختم ولایت کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ جس پر انہیں ترمذ سے نکالا گیا۔ اور ان پر زندقہ کا اتہام لگایا گیا۔ صوفیہ میں سب سے پہلے حسین بن منصور حلّاج کو صولی دی گئی۔

بغداد کے گردونواح میں براثہ کے مقام پر سب سے پہلے شیخ ابو شعیب البرانی (۱۹۷ھ) نے خس کی جھونپڑی بنائی۔ اور اس میں عبادت کیلئے خلوت نشین ہوگئے۔ ایک امیر لڑکی جس کا نام جوہرہ تھا، اسکو شیخ کا یہ طرز زندگی پسند آیا۔ اس نے شیخ سے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا، کہ وہ آپ سے شادی کرکے آپ کی خدمت میں رہنا چاہتی ہے۔ چنانچہ آپ کے شرائط کے تحت اس نے اپنا مال واسباب سے علیحدگی اختیار کی۔ اور وہ بھی شوہر کے ساتھ اسی جھونپڑی میں گوشہ نشین ہوگئی۔ صوفیہ کیلئے سب سے پہلے خانقاہ (شام) میں تعمیر ہوئی۔ اس کے تعلق سے حکایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک عیسائی امیر نے جو شکار کرنے جارہا تھا راستہ میں دو درویشوں کو دیکھا، دونوں محبت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے اور زمیں پر بیٹھ گئے۔ دونوں نے اپنا اپنا کھانا مل کر کھایا۔ اور جب وہ کھانے لگے تو امیر ان کی الفت و محبت سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے ایک درویش کو بلا کر پوچھا کہ یہ کون تھا۔ اس نے

جواب دیا کہ میں نہیں جانیا۔ امیر نے پوچھا کہ یہ تمہارا کیا لگتا ہے۔ اس درویش نے کہا کہ کچھ نہیں۔ پھر امیر نے پوچھا کہ اسکا وطن کونسا ہے۔ درویش نے کہا میں نہیں جانتا، امیر نے کہا کہ پھر اس طرح محبت اور میل ملاپ کا کیا معنی ہے۔ درویش نے کہا کہ یہ ہمارا طریقہ ہے۔ امیر نے کہا کہ تمہاری کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم ایک دوسرے سے ملتے ہو۔ درویش نے کہا نہیں۔ امیر نے کہا کہ میں تمہارے لئے ایک مکان بناؤ گا، جہاں تم دونوں ایک دوسرے سے ملاقات کر سکو۔ چنانچہ اسی مقام پر ایک خانقاہ تعمیر کی۔ اس طرح یہ پہلی خانقاہ ہے جو عالم اسلام میں تعمیر ہوئی۔ اور اسے ایک عیسائی امیر نے بنائی۔ یہ دوسری صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ (ماخوز از نفحات الانس۔ تذکرہ اولیاء۔ حلیۃ اولیاء۔ سفینۃ اولیاء۔ مطالعہ تصوف) خانقاہ کا اطلاق پہلے پہل فرقہ کرامیہ کے زاہدوں کی اجتماع گاہوں تک محدود رہا۔ صوفیاء اس وقت تک مسجدوں اور رباطوں میں قیام کرتے تھے۔ بعد میں صوفیاء کے عبادت گاہوں کیلئے ''زاویہ''، ''تکیہ''، ''دائرہ'' کیطرح خانقاہ بھی استعمال ہونے لگے۔ صوفیہ کے پاس خانقاہ کو بیت العبادت کی حیثیت حاصل ہے۔ مسجد اور مدرسہ کی طرح ''زاویہ'' ''تکیہ'' ''رباط'' یا ''خانقاہ'' نے بھی مسلم معاشرہ کی تعمیر میں ہمیشہ اہم رول ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدت مند بادشاہ اور امراء خانقاہوں کے قائم کرنے اور انکا خرچ چلانے میں ہمیش ہی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔

ارادت۔ تصوف میں شیخ، پیر یا رہبر کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اور یہ شیخ ہی کی ذات ہے جو مجالست کے دوران مرید کی تربیت اور تہذیب، غیبت میں بذریعہ خواب یا کشف اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ حیات بشری کے ایک ایک لمحہ میں شیخ مرید کا خضر راہ ہوتا ہے۔ مرید بھی اپنے علم، انا، عقل وخودی سے دست بردار ہو کر شیخ کے سامنے ایسی مکمل خودسپردگی کرتا ہے کہ کسی معاملہ میں وہ صاحب اختیار نہیں ہو شیخ کے سامنے مرید کی وہی حیثیت ہوتی ہے، جو غسّال کے ہاتھ میں مردہ کی ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے الٹتا پلٹتا رہے۔ (لطائف اشرفی) اہل تصوف کا کہنا ہے کہ درویشی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ کسی شیخ وقت (مرشد یا پیر) سے بیعت نہ کیجائے۔ کیونکہ طریقت کے خاردار راستے میں سالک کو قدم قدم پر، اس راہ کے چوروں، لٹیروں اور قطّاع الطریق (ڈاکوؤں) کے ہتھے چڑھنے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی حدیث ''الرفیق ثم الطریق'' نقل کی جاتی ہے۔ نیز اس سلسلہ میں اہل تصوف ایک حدیث بھی نقل کرتے ہیں ''۔ من لیس لہ شیخ فشیخہ ابلیس''، یعنی جس کا کوئی پیر نہیں اسکا پیر ابلیس ہے۔ (یہی وجہ ہے انکے پاس کسی شیخ سے بیعت کرنا جسے عرف عام میں پیر کرنا کہتے ہیں، لازمی [واجب] ہے)۔ غالبا یہ صوفیہ کا قول ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ سے یہ قول منسوب ہے ''من لم یکن لہ استاذ فامامہ الشیطان''، یعنی جس کا کوئی استاذ نہیں ہے تو اس کا امام شیطان ہے۔

طالب کیلئے راہ طریقت میں پیر و مرشد کا ہونا ازبس لازمی و ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر نہ تو وہ سلامتی کے ساتھ راستہ چل سکتا ہے اور نہ اس راستہ میں پیش آنے والے خطرات ووساوس سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ منزل مقصود کی طرف جانا اور پہنچنا تو دور کی بات ہوئی۔ چنانچہ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اس بارے میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرو　　　از سر خود اندریں صحرا مرو

ہر کہ او بے مرشد در راہ شد　　　اوز غولاں گمرہ در چاہ شد

یعنی راہ چلنے کیلئے ساتھی چاہیئے، تنہا مت جا۔ اس صحرا میں اکیلا مت جا۔ اس لئے کہ اس راستے میں بغیر مرشد کے جو بھی چلا اسے شیطان نے گمراہ کر دیا اور (ہلاکت کے) کنویں میں گر گیا۔

صوفیہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسان بلحاظ علم وتفقّہ اور باعتبار زہد وورع کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو وہ پیر یا شیخ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ چناچہ ابو حنیفہؒ جو امام اعظم کے لقب سے مشہور ہیں باہمہ علم وتفقّہ حضرت امام جعفر صادق سے بیعت کی تھی۔ مسلسل دو سال ابو حنیفہؒ حضرت جعفر صادقؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور جب لوگ آپ پر اعتراض کرتے کہ آپ باایں ہمہ علم و تفقّہ ایک فقیر کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں تو امام اعظمؒ نے ان کو جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس احادیث ہیں۔ اور جس کے پاس میں جاتا ہوں وہ مجھے "صاحب حدیث" سے ملاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کو ہبیرہ بصریؒ سے ارادت تھی۔ آپ نے ان سے بیعت کی تھی۔ حضرت احمد بن حنبلؒ نے حضرت بشر حافیؒ سے بیعت کی تھی۔ حضرت محمد (شاگرد امام اعظمؒ) نے حضرت داؤد طائی سے بیعت کی تھی۔ اور حضرت امام ابو یوسفؒ حضرت حاتم اصمؒ کے مرید تھے۔ شیخ کے وجود کو اہل تصوف کے یہاں وہی حیثیت حاصل ہے جو قوم میں نبی کی ہوتی ہے۔ گویا جسطرح امت، ہدایت ورہنمائی کیلئے نبی کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح طالب بھی شیخ کا محتاج ہوتا ہے۔ صوفیہ کے بقول نبوت کے بعد "نیابت نبوت" سے فاضل کوئی درجہ نہیں ہے۔ اور یہ نیابت، خلق کو رسول اللہؐ کے طریقہ پر حق تعالیٰ کی دعوت دینا ہے۔ علماء تصوف کے مطابق حدیث میں آیا ہے "الشیخ فی قومہ کالنبي في أُمته "

البتہ یہ بات ضروری ہے کہ شیخ یعنی کامل مرشد کی تلاش میں کافی محنت صرف کرے۔ کیونکہ یہی مرحلہ سب سے اہم مرحلہ ہے۔ اس لئے کہ جانچ اور پرکھ کے بغیر اگر کسی کی ظاہری شان وشوکت اور رعب ودبدبہ یا رجوع خلق سے متاثر ہو کر کسی غلط آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے تو نتیجہ سوائے گمراہی کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اسی لئے حضرت سعدیؒ نے فرمایا "بہت سے ابلیس آدمی کی صورت میں رہتے ہیں، پس تم کو ہر کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دینا چاہیئے۔ جو کچھ تحقیق اور تدقیق کرنی ہے وہ پیر بنانے سے پہلے کرنی چاہیئے۔ جب تحقیق کے بعد وہ کھرا ثابت ہو تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینا چاہیئے۔ جسطرح کے کمہار کے

پاس جاکر ایک ہانڈی یا لوٹا خرید نا چاہتے ہیں، تو پہلے انہیں ٹھونک بجا کر اطمنان کر لینے کے بعد ہی خریدتے ہیں اگر اس میں کوئی تڑک وغیرہ معلوم ہو تو اگر چہ وہ ایک آدھا روپیہ کی ہو تو بھی اسے واپس کر دیتے ہیں۔ اور دوسرا لے لیتے ہیں۔ جب دنیا کی ایک حقیر شیء کی یہ حالت ہیں تو دین کا سودا کرتے وقت کسقدر تحقیق کی ضرورت ہو گی محتاج بیان نہیں۔ اسطرح اگر کسی شخص کو بظاہر اچھی حالت میں دیکھ کر کہ وہ اچھا خاصا تندرست موٹا تازہ ہے، لڑکی کو اس کے عقد نکاح میں دے دیتے ہیں، لیکن جب دوسری صبح لڑکی سے اسکی دوسری کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ تو اس عقد کو فاسق کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ عقد کا اصل مقصد ہی ''آبستن'' ہے۔ لیکن جب اس لڑکے میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ تو عقد کا جو مقصد تھا۔ وہ حاصل نہ ہونے کی بناء پر عقد کو باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ بالکل اسی طرح بیعت بھی ایک عقد ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مرید مرشد سے ''مستفید'' اور ''مستفیض'' ہو۔ جب مرشد کی جانب سے ''افادہ'' اور ''افاضہ'' کا تصور ہی نہیں ہے۔ تو مرید کو چاہئے کہ اس بیعت کو توڑ دے اور جہاں سے مقصد کی تکمیل ہوتی ہو وہاں رجوع ہو جائے۔ اور اس کی صحبت میں رہکر اس کی خدمت کرتے ہوئے، شریعت مصطفیؐ کی پوری پابندی کرتے ہوئے۔ نفس کے تزکیہ اور قلب کے تصفیہ کے مراحل طے کرے، پھر تجلیہ روح کی راہوں میں گامزن ہو۔ اس راہ میں محنت تو ہوتی ہی ہے۔ سب سے بڑی شرط محبت اور عقیدت کی پختگی ہوتی ہے۔ اسطرح کے اس پورے سفر میں مرشد کے تعلق سے کوئی شک، کوئی شبہ، کوئی وسوسہ، اور کوئی خطرہ پیدا نہ ہو۔ حکم کی خلاف ورزی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے طالب کیلئے ایک طریقہ دعا کا یہ بتلایا ہے۔ کہ طالب نصف شب کو جاگ کر دو رکعت نماز پڑھے، سجدہ کرے اور اس میں الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعا پڑھے (ترجمہ) ''اے میرے رب مجھے اپنے مقرب بندوں میں سے کسی بندے کی طرف رہنمائی کر، جو مجھے تیری طرف رہنمائی کرے اور تجھ تک پہنچنے کا طریقہ بتادے۔'' اللہ تعالیٰ اس دعا کے نتیجے میں اسے اپنے اولیاء میں سے ضرور کسی مرشد کی طرف رہنمائی کریگا۔ جو اسکا رہبر ہو۔ طالب کو جب ایسا پیر میسر آئے جو اسکی نگاہ میں معیار پر پورا اترے۔ اور جو اپنی پاکیزگی سیرت شریعت محمدیؐ کی پیروی کیلئے معروف ہو۔ تو اسے اپنے نفس کو پاک کر کے شیخ کی خدمت میں جانا چاہئے۔

صوفیہ کے ہر سلسلے میں بلکہ ہر شیخ کے یہاں بیعت کا طریقہ جداگانہ ہے۔ مرید سے شیخ السجادہ (جسے فارسی میں ''پیر''، ترکی میں ''بابا'' اور عام طور سے ''مرشد'' کہتے ہیں) کے سامنے گواہوں کے زمرے میں بیعت لی جاتی ہے۔ اسکو تلقین بھی کہاں جاتا ہے۔ اور پیالہ پینا بھی کہا جاتا ہے۔ پھر خانقاہ، تکیہ یا دائرہ میں چالیس روز کیلئے خلوت یا عزلت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جسے عربی میں اربعینہ اور فارسی میں چھلہ کہتے ہیں۔ مرید اصل میں گناہوں سے توبہ کرنے اور اپنی کوتاہیوں سے عذر خواہی کرتے ہوئے، آئندہ احکام شرع کی پوری طرح پابندی کرتے ہوئے رذائلہ نفسانیہ اور قلبی امراض سے دامن بچا کر اللہ اور اسکے رسول کی

مرضیات سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے کی مہم کا نام ہے۔ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کی درخواست پر حکم الٰہی کے تحت عورتوں سے بھی بیعت لی تھی، اسلئے صوفیہ کے پاس بھی یہ طریقہ رائج ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مرشد حضور کی اتباع میں عورتوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا۔ بلکہ شرعی احکام اور دیگر طریقت کی ضروری باتیں کہدیتا ہے۔ اور ان سے بیعت کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کے پیالے میں خاتون اپنے ہاتھ یا انگلی ڈبو دیتی ہے۔ اس کے بعد اسی پانی میں مرشد اپنا ہاتھ یا انگلی ڈبو دیتا ہے۔ اور یہ جو کچھ ہوتا ہے، درمیان میں پردہ حائل ہوتا ہے۔ نامحرم کو دیکھنا اور اسکو چھونا سخت منع ہے۔ کیونکہ بعد کے زمانوں میں بعض جاہل اور نفس پرست پیروں کی خلاف شرع حرکتوں سے بے اعتدالیاں بلکہ گھناؤنے جرائم وجود میں آئے۔ اسلئے لوگوں نے اس پورے سسٹم کو ہی نہ صرف اپنی تنقید اور اعتراض کا ہدف بنالیا بلکہ اسکی افادیت کے ہی منکر ہوگئے۔ یہ ایک مسلمہ ضابطہ ہے کہ اللہ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ حلال ہیں سوائے انکے جنکو اللہ نے (اور اسکے آخری پیغمبرؐ) نے حرام قرار دیا۔ حلال کو اختیار کرنا چاہئے اور حرام سے بچنا چاہئے۔ اسی طرح دنیا میں جتنے علوم وفنون ہیں وہ سب مستحسن ہیں۔ لیکن یہ علوم وفنون جب غلط ہاتھوں میں آجائیں یا ان کے جاننے والے انکا استعمال غلط مقاصد کیلئے کرنے لگ جائیں تو بعض کج فہم لوگ، ان علوم کے غلط استعمال یا مضر اثرات ونتائج کو دیکھتے ہوئے، ان علوم کو ہی "غلط" اور "از کار رفتہ" کہہ دیتے ہیں۔ تدریس، ڈاکٹری، انجینئرنگ، کمپیوٹر۔ انٹرنیٹ، سیل فون، سیاست، تجارت وغیرہ مختلف شعبۂ حیات اچھے ہیں مگر جب یہ شعبے غلط لوگوں کی دسترس میں آجائیں، اور وہ لوگ ان سے ناجائز فائدے حاصل کرنے، لوگوں کو دھوکہ دینے اور پیسے لوٹنے کے بہانے کے طور پر استعمال کرنے لگیں تو لوگ ان سے ہی نہیں بلکہ ان علوم سے ہی متنفر ہوجاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال فن تصوف کا ہوا۔ صوفی تو سر سے پا تک صفائی کا مرقع ہوتا ہے۔ لیکن جب لوگ اس فن کا نام لیکر یا انکا سارنگ ڈھنگ اختیار کرتے ہوئے لوگوں کو دھوکہ دینے لگے اور بجائے نفس وخواہش کو کچلنے کے، نفس وخواہش کے غلام بن گئے۔ تو سماج اور معاشرہ پر اسکے بھیانک اثرات مرتب ہونے لگے۔ اور اس طرح یہ فن بھی بدنام ہوکر رہ گیا۔ اور جب آدمی کسی چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے تو اس سے بیزاری اور دوری ظاہر کرنے کیلئے مختلف وجوہ اور متعدد اسباب بھی تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہی حال فن تصوف کا ہوا۔ چناچہ تصوف کے مخالفین نے تصوف کے تعلق سے کئی وجوہ سے نہ صرف اختلاف ظاہر کیا ہے بلکہ اسکی حد درجہ مخالفت کا اظہار کیا ہے۔ حتیٰ کہ اسکو غیر شرعی، کتاب وسنت سے ہٹی ہوئی، ہندو مت، بدھ مت، عیسائیت اور یہودیت سے ماخوذ اور ان کی نری پیروی قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں ہم انکے اعتراضات اور صوفیاء کے جوابات قلم بند کریں گے۔ تاکہ مسئلہ کی صحیح صورت حال نظروں میں آجائے۔ یہاں اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ "اختلاف رائے" اور چیز ہے اور "مخالفت بے جا" اور چیز ہے۔ اختلاف رائے اگر سنجیدہ اور اعتدال پسند ہو تو اسکو گوارا بھی کرلیا جاسکتا ہے۔ لکن مخالفت برائے مخالفت سے توبہ ہی

بھلی۔

تصوف پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے اور بڑی شد و مد کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اسکا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ نہیں بلکہ بدعت ہے۔ ایک اجنبی چیز ہے جسے اسلام پر زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے۔ اور یہ اعتراض کرنے والے بھی متحد الخیال نہیں ہے۔ بلکہ معترضین خود آپس میں مختلف ہیں۔ چنانچہ اعتراض کرنے والوں کا ایک طبقہ جس میں مستشرقین کے علماء بھی شامل ہیں، یہ کہتا ہے کہ تصوف کا ماخذ ہندوؤں کے وید ہیں۔ وہ بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ تصوف میں چلّہ کشی و ریاضت وغیرہ کا طریقہ ہندو جوگیوں اور سادھوؤں سے لیا گیا ہے۔ اس طبقہ کے سرخیل ہارٹن (Horton)، بلوشیٹ (Blochet) اور ماسی نان (Massignon) ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کا شمار محققوں میں کیا جاتا ہے۔ شاید انکو معلوم نہیں کہ مسلمان صوفیاء کے رہبر اور ہادی نبی کریم ﷺ نے غار حرا میں سب سے ہٹ کر، سب سے کٹ کر چلّہ کشی کی تھی اور بعد دعویٰ نبوت حکم قرآنی 'و تبتّل الیہ تبتیلا' کے تحت کچھ اوقات کو صرف ذکر الٰہی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ذکر الٰہی کی مداومت۔ ذکر کثیر کی ہدایت کے متعلق متعدد احکام قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بصراحت موجود ہیں۔ اور رسول اللہؐ کی مبارک زندگی ہی میں اصحاب صفہ کی ایک اللہ والی جماعت تھی جس نے حضور ہی کی اتباع میں اپنی ابتداء کرتے ہوئے صفہ پر اپنی زندگی گذار دی تھی۔ اور یہ سب اس وقت ہوا تھا جبکہ ہندوؤں کی تہذیب و تمدّن کے بارے میں جزیرۂ عرب کے باشندوں کو سطحی قسم کی معلومات بھی میسّر نہیں تھیں۔ اور جب انکے مذہب کی بنیاد بت پرستی کو شرک اور لعنت سمجھتے تھے تو ان کے دیگر اعمال کو کیسے پسند اور اختیار کیا جاتا تھا۔ اس لئے صوفیاء کرام کی ریاضتوں کو ہندو جوگیوں کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض مستشرقین نے یہ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے کہ اسلام میں بعض امور ہندوؤں سے ماخوذ ہیں، اسکی مثالیں یوں دیتے ہیں کہ اسلام میں حجر اسود کو مقدّس پتھر سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ ہندوؤں میں ہے، زمزم کے پانی کو مقدّس سمجھا جاتا ہے جیسا کہ گنگا جل کو ہندوؤں میں ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا ایسا کہنا صحیح ہے؟؟

ایک دوسرا طبقہ معترضین کا یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں میں (صوفیاء میں) زہد و تبتّل کا طریقہ بدھ مت سے ماخوذ ہے۔ گولڈ زیہر (Gold Ziher) اور اولیری (O'Leary) جیسے پایہ کے مستشرقین بھی یہ کہتے نہیں تھکتے کہ صوفیاء نے گوتم بدھ کی تقلید میں ہی دنیا سے قطع تعلق کیا تھا۔ جسطرح اس نے تخت و تاج کو ترک کر کے فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی اسی طرح مسلمان صوفیاء نے بھی اپنے گھروں کے عیش و آرام، راحت و آسائش کو ترک کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں آکر بسیرا کیا۔ لیکن اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے ان لوگوں نے یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ گوتم بدھ خدا کے وجود کا منکر تھا۔ وہ تو نفس انسانی ہی کو سب کچھ خیال کرتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمان اللہ کی ذات اور اسکی صفات اور اسکی وحدانیت پر پختہ

ایمان رکھتے ہیں اوران کی یہ ریاضتیں مقصود بالذات نہیں بلکہ بارگاہ الٰہی مے شرف باریابی حاصل کرنیکے ذرائع تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی تصوف در اصل یونانی تصوف کا آئینہ دار ہے۔چونکہ عرب ہر میدان میں ایرانیوں سے کمتر تھے۔انہوں نے ان سے سب کچھ سیکھ لیا۔مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ جس زمانے کی بات کر رہے ہیں وہ اسلام سے پہلے کا زمانہ تھا۔لیکن اسلام آنے کے بعد مسلمانوں نے ایرانیوں کو سب کچھ دیا ہے۔ان سے لیا نہیں۔جب قرآن کریم کے فیضان سے عرب مسلمانوں کی جھولیاں علم وحکمت کے جواہرات سے بھر گئیں تو وہ اپنے گھروں سے نکل کر دنیا کے تمام گوشوں میں بڑی دریادلی اور فیاضی سے ان جواہرات کو لٹایا۔تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ اہل فارس نے عرب مسلمانوں کو دینی، تہذیبی اور علمی اعتبار سے متاثر کیا۔بلکہ یہ عرب ہی تھے جنھوں نے اپنے فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اہل ایران کے عقائد، نظریات، افکار اور تہذیب کے نقوش کو یکسر بدل دیا۔مسلمانوں ہی کی بدولت اہل فارس نے آتش پرستی کو چھوڑ کر وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرنے لگے۔دنیا کا امر مسلم ہے کہ مفتوح قوم فاتح قوم کے اثرات کو قبول کرتی ہے۔ان کی تہذیب وتمدّن کو اپناتی ہے۔ایسا کبھی نہیں ہوا کہ فاتح قوم نے مفتوح قوم کے نقوش تہذیب وتمدّن کی پیروی کی۔پروفیسر براؤن کا یہ کہنا غلط ہے کہ ایرانی افکار اور نظریات نے مسلمانوں کو متاثر کیا۔اور انہی سے اسلام کا تصوف مأخوذ ہے۔اگر کہیں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام کا تصوف ایران سے ماخوذ اور مستعار ہے۔اسلام کا تصوف اسلام سے مأخوز ہے۔قرآن شریف سے مأخوذ ہے۔نبی کریم ﷺ کی سیرت سے مأخوذ ہے۔اہل صفہ کی سیرت سے مستعار ہے۔اور وہ ہر اعتبار سے ایک الگ اور جداگانہ چیز ہے۔

اسی طرح یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلامی تصوف پر عیسائی تصوف کی گہری چھاپ ہے۔چنانچہ وہ کہتا ہے کہ چونکہ ایک زمانہ سے عیسائیوں اور عربوں میں باہمی اختلاط تھا۔عیسائیوں کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے امی عربوں پر جو کہ ایک جاہل مطلق اور غیر متمدن قوم تھی۔بہر نوع فوقیت حاصل تھی۔پس مسلمان صوفیوں نے عیسائی راہبوں سے تصوف سیکھا۔اور اس کو اپنایا۔اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام سے پہلے یقینا یہ بات تھی۔لیکن شمع اسلام کے منوّر ہونے کے بعد جبکہ وحی الٰہی کی تعلیمات نے افکار و نظریات کی دنیا میں ہی نہیں بلکہ عقائد اور مذاہبی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔اور عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات کے تعلق سے اصلاحات کا ایک سیلاب بہادیا۔اور ظاہری رنگ ونور اور سطحی شان وشوکت میں زندگی بسر کرنے والوں کا تختہ الٹتے ہوئے واضح طور پر ابدی صداقتوں کے رموز اور اسرار سے روشناس کر دیا۔اور دنیا کی فانی لذتوں میں غرق رہنے والوں کو متنبہ کر دیا اور قرآن شریف کی بیسیوں آیتوں کے ذریعہ زہد و تقویٰ کا حکم دیا۔دنیا کی بے ثباتی کا نقش لوح قلب پر ثبت کیا۔اور دنیا پر پر مٹنے والے بادشاہوں اور کبر وانا کی مستی میں چور رہنے والوں کی تباہی اور بربادیکی داستانیں سنادیں، تو

آخر اس کا مطلب اور مقصود کیا تھا۔ کیا سب داستانیں صرف زیب قرطاس و قلم تھیں یا ان کے ذریعہ لوگوں کو عموماً ایسے لوگوں اور ایسے اعمال سے دور رہنے کا ایک پیغام تھا۔

اللہ نے ارشاد فرمایا ''تم جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب، زینت، ایک دوسرے پر اترانے اور مال و اولاد میں زیادتی پر فخر کرنے کا نام ہے۔ جیسے بارش ہے کہ اسکی پیداوار کاشت کاروں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ خشک ہو جاتی ہے۔ سو تو اسکو زرد دیکھتا ہے۔ پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں عذاب شدید ہے۔ اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی بہتر چیز ہے۔ اور نہیں ہے دنیا مگر دھوکے کا سامان۔ نیز بخاری اور مسلم میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا 'اپنے بعد میں تم پر جس چیز کے بارے میں ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم پر دنیا کی زینت اور خوشحالی کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ پس مقام غور ہے کہ جس قوم کے پاس وعظ و نصیحت کے ایسے موئثر مواعظ بھرے سامان موجود ہوں تو انہیں بے راہ بلکہ گمراہ راہبوں کی تقلید کی کیا ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ ان کے پاس تعلیمات ربانی کے صحیح وسائل اور واسطے بھی نہ ہوں۔ اور منزل مقصود سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بے یقینی کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہوں۔ ہاں اگر دنیا، اسکی متاع اور اسکی زینت یا اس میں مشغول اور منہمک ہونے یا اس پر راضی ہونے والوں کے بارے میں وعیدیں نہ آئی ہوتیں اور صوفیاء کرام ایسے کام کرتے ہوتے تو بے شک یہ کہا جا سکتا تھا کہ صوفیاء عیسائی راہبوں کی تقلید کر رہے ہیں اور اسلام کی تعلیمات سے منھ موڑ رہے ہیں۔ نیز عبادات کی تلقین اور ذکر اللہ کی ترغیب کے تعلق سے قرآن مجید کی بے شمار آیتیں موجود ہیں تو اس تعلق سے دوسروں کی دریوزہ گری کی کیا ضرورت ہے؟ سورۂ اعراف میں ارشاد ربانی ہے کہ ''اپنے رب کو یاد کر اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ، زور کی آواز کی نسبت کم آواز سے صبح اور شام، اور غافلوں میں سے مت ہو جانا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اے ایمان والوں تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو۔ اور صبح و شام اسکی تسبیح کرتے رہو۔ اور قرآن کی یہ آیت تو کیا دل نواز ہے کہ ''تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا''۔ یہ اور اس جیسے احکام الٰہی کی اتباع میں صوفیاء اگر ہمہ تن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہوں تو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تقلید دیکھا دیکھی اور سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کر کے کچھ کہہ دینا اور تحقیق اور تدقیق کے بعد نتیجہ نکالنا دونوں الگ باتیں ہیں۔ وہی نکلس جو پہلے دوسروں کی تقلید میں اسلام کے تصوف کو عیسائیوں کا عطیہ کہتے رہے۔ بعد میں ''انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اینتھک'' میں تصوف کے بارے میں کہتے ہیں کہ کہنا یہ کہ تصوف اسلام میں باہر سے آیا، قطعاً قابل تسلیم نہیں۔ بلکہ روز اول ہی سے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ تھا (اصحاب صفہ) جو تلاوت قرآن اور مطالعہ حدیث میں مشغول رہتا تھا۔ ان کے تمام افکار و نظریات کا مبلغ قرآن و سنت کے بغیر کچھ نہیں تھا۔ صوفیاء کیلئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے اشارات پر عمل پیرا ہونا ہی کامیابی کیلئے شرط اول ہے۔ چناچہ شیخ جنید بغدادیؒ کا قول ہے ''یہ راہ تو وہی شخص پا سکتا ہے۔ جس

کے دائیں ہاتھ میں قرآن پاک ہو اور بائیں ہاتھ میں سنت مصطفیٰ اور ان دونوں شمعوں کی روشنی میں وہ قدم بڑھاتا ہے۔ تاکہ نہ شبھات کے گڑھوں میں گرے اور نہ بدعت کے اندھیروں میں پھنسے"۔ بلکہ صوفیاء کا مقدار شریعت ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ نے کیلئے قوت القلوب، رسالۂ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف، فوائد الفواد وغیرہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کتابوں کے ہر صفحہ پر کتاب و سنت پر عمل کرنے کی تاکید ملے گی۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص تصوف کو شریعت کے خلاف کہتا ہے تو اسکی مرضی اور جو شخص صوفی ہونے کا دعویٰ کرے لیکن اسکا قول، عمل اور حال شریعت کے خلاف ہے۔ تو وہ "بہروپیہ" ہے۔

اعتراض دوم: اعتراض کرنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو لوگ ناخواندہ اور جاہل ہیں، انکا مسلک تصوف ہے۔ جو لوگ تعلیم یافتہ اور تحقیق میں ماہر اور علوم دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں وہ تصوف کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ یہ الزام انکی کم نظری اور حقیقت سے لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ اکابر صوفیاء علم و فضل سے اتنے آراستہ تھے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں لائق و فائق سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ہر قول کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے مأخوذ اور انکا ہر عمل عشق خدا اور محبت رسول کا آئینہ دار تھا۔ آئمہ وقت بھی ان سے بیعت کرتے تھا اور انکی صحبت سے مستفید اور مستنیر ہوتے تھے۔ ان کی بیش قیمت تصنیفات و تألیفات جو کتاب و سنت سے مملو و مستفاد ہیں، طالبان حق کے واسطے آج بھی رہنما ہیں۔ علامہ ابن جوزی جو صوفیاء پر تنقید کرنے میں شہرت رکھتے ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "صوفیاء متقدمین علوم قرآن، فقہ حدیث اور تفسیر میں امام ہوا کرتے تھے۔

اعتراض سوم: صوفیوں نے راہبوں کی طرح دنیا اور اسکے علائق سے ترک تعلق کر لیا تھا۔ اسطرح اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں سے جو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا فرمائی ہیں وہ دست کش ہو گئے تھے۔ حالانکہ رسول اللہ نے فرمایا "لا رهبانية في الاسلام"۔

اس میں شک نہیں کہ صوفیاء کرام سب سے کٹ کر ہر قسم کے علائق کو قطع کرتے ہوئے خلوت گزیں ہو گئے تھے۔ اچھے کھانے، اچھا پہننے، عیش و آرام اور رات کو نیند وغیرہ دیگر راحتوں کو ترک کر دئے تھے لیکن ان کا یہ مقصد حیات نہیں تھا بلکہ وہ اپنے نفس کو زیر کرنے کی غرض سے وقتی طور پر ان مجاہدات و مشقتوں کو اختیار کیا تھا۔ اس سے ان کا نقطۂ نظر تصفیہ نفس اور تزکیہ قلب کے ساتھ تجلیہ روح تھا۔ پھر جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے، نفس کی خواہشات ختم ہو جاتیں اور نور عشق سے ان کے سینے منور ہو جاتے اور محاسن اخلاق ان کی فطرت ثانیہ بن جاتے، تو پھر رزم گاہ حیات میں اسلام کا پرچم اٹھاتے ہوئے قدم رنجہ ہوتے، دنیا کے گوشے گوشے میں فقط زبان سے نہین بلکہ اپنے حسن عمل سے اسلام کے پیغام کو دلوں میں اتارتے ہوئے۔ انکو صرف باتونی اسلام اور قانونی اسلام نہیں بلکہ عرفانی اسلام سے متعارف کراتے تھے۔ آج جب کہ ہم صرف

علم کو ہی تبلیغ اسلام کیلئے کافی سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنی زبانوں کو اور دوسروں کے کانوں کو تکلیف دیتے رہتے ہیں تو ہماری تبلیغ کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہ کلام میں اثر اور نہ وعظ و نصیحت کا کوئی نتیجہ نکل رہا ہے۔ گویا کہ ہم ﴿لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ الصف: ۲ کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ پہلے رسول اللہؐ مبعوث ہوئے پھر قرآن نازل ہوا اور وہ بھی ۲۳ سال کی مدت میں نجماً نجماً نازل ہوا تا کہ حضور ﷺ اس مدت میں قرآنی تعلیمات اور احکام کا پیکر بنکر دنیا کے سامنے عملی نمونے پیش فرمائیں اور ان نقوش سے لبریز ایک جماعت کو تیار فرمائیں۔ پھر جب یہ جماعت مختلف خطوں اور ملکوں میں پہنچی تو وہاں کے لوگ ان کی عسکری طاقتوں سے مغلوب تو ہوئے لیکن ان کے حسن عمل سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کتاب سے کم، زندگی سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اور بدل جاتی ہے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا "بے شک تمہارے لئے حضور رسول اللہؐ کی سیرت میں بہترین نمونے ہیں۔" رسول اللہؐ نے کیا دنیا اختیار کی؟۔ کیا دنیا سے محبت کی؟۔ کیا دنیا میں اپنے وصال تک عیش و عشرت کی زندگی بسر کی؟۔ کیا آپ نے مال جمع فرمایا؟۔ کیا آپ نے دنیوی سامان حیات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا؟۔ کیا آپ نے اپنے لئے عالیشان گھر، فلک بوس بنگلہ، وسیع و عریض کوٹھی بنوائی؟، آپ کا لباس کیا تھا؟۔ بستر کیا تھا؟۔ آپ کی غذا کیا تھی؟۔ جب تک آپ اس دنیائے فانی میں رہے فقیر کی طرح رہے۔ اور دعا فرمائی تو یہ "اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکینی کی موت دے اور میرا حشر مسکینوں کے ساتھ فرما۔ مگر آپ نے عقد فرمایا۔ آپ کے اہل و عیال رہے، ان کا نان و نفقہ کا انتظام فرمایا۔

رہی بات عیسائیوں کی تو رہبانیت ان کے پاس مقصد حیات ہے۔ وہ نہ تو شادی بیاہ کرتے ہیں اور نہ انکے اہل و عیال ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسی کو وہ نجات سمجھتے ہیں۔ اور صوفیاء اسکو طریق سمجھتے ہیں، یعنی اللہ کو پانے کا راستہ، اللہ کو حاصل کرنے کا ذریعہ۔ اسکے علاوہ ایک بین فرق صوفیاء کے ترک اور عیسائیوں کی رہبانیت میں یہ ہے کہ رہبانیت "طبعی خواہشات" کو مارنے کا نام ہے۔ اور صوفیاء کا ترک "نفسانی خواہشات" کو مارنے کا نام ہے۔ پھر دونوں کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ طبعی خواہشات کو مارنے کا حکم کسی مذہب میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ عیسائیت بھی۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ رہبانیت کا ہم نے حکم نہیں دیا تھا بلکہ خود انہوں نے اس کو اختیار کیا تھا۔ اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کا حکم کسی مذہب میں نہیں ہے۔ پس اسلام میں اسکی اجازت کیسی دی جا سکتی ہے۔ اللہ نے تو جنت کو ان کا ٹھکانا بتایا ہے۔ جو لوگ نفس کو خواہشات سے روکتے ہیں چناچہ ارشاد ربانی ہے " ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ النازعات: ۴۱،۴۰۔

اعتراض چہارم: تصوف اور صوفیاء پر یہ اعتراض ہر کس و ناکس کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے کہ اور اس زمانے میں تو یہ اعتراض بڑی شدت سے کیا جا رہا ہے (ہر وہ شخص جو تھوڑا بہت پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو گیا ہے وہ اہل تصوف اور اللہ والوں پر زبان درازی کرنے لگ گیا ہے) وہ اعتراض یہ ہے کہ تصوف ایک افیون ہے، جس کو اپنا کر اور جس کی تعلیم دے کر قوم و ملت

کے قوائے عمل مضمحل بلکہ مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ رزم گاہ حیات مین انسان صرف سعی و کوشش سے ہی آگے بڑھتا ہے اور اپنے وجود کو ثابت کرتا ہے۔ صبر و توکل کی تعلیم سے انسانی قویٰ کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ تصوف کی بنائی روپہلی اور سنہری زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کریں اور تصوف کی پیدا کردہ خواب آلود فضا سے نکل کر حقائق کی تلخیوں سے دوچار ہونے کیلئے تیار ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال اور یہ عبارت آرائی خوبصورت بھی ہے اور دل خوش کن بھی۔ لیکن حقیقت سے دور ہے بلکہ منہ بولتی حقیقت یہ ہے کہ جن صوفیاء پر اعتراض کیا جارہا ہے کہ قرآنی تعلیمات سے ہٹے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے جو روش اختیار کی اور برسوں اس پر عمل کرتے رہے۔ وہ راہ رسول اللہ ﷺ سے جدا گانہ ہے، لیکن تاریخ کے صفحات اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ان صوفیاء نے جہاں بھی قدم رکھا ملت کے مردہ جسموں میں نئی روح پھونکی۔ خزاں رسیدہ گلشنوں کو بہار سے آشنا کیا۔ بلکہ بنجر زمینوں کو تک گل زاروں میں بدل دیا، عبد اور رب کے رشتے کو مضبوط کیا اور صرف دنیا اور دنیاویات پر مر مٹنے والوں کی آنکھوں میں عشق خدا اور محبت رسول کی جوت لگائی اور میدان عمل کا مرد مجاہد بنا دیا۔ جن مقدس ہستیوں نے کفر کے ایوانوں کو نور توحید سے منور کر دیا، وہ ان فقر منش صوفیاء کے سوا اور کون تھے۔ پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے، ہند و پاکستان میں توحید کا پرچم لہرانے والے، مسجدوں اور مدرسوں میں ”لا الہ الا اللہ“ کی روح پرور صدائیں بلند کرنے والے جو آج کڑوڑوں کی تعداد میں نظر آتے ہیں یہ ان ہی فقراء کی فیض اثر نظروں کی کرشمہ سازی نہیں تو اور کیا ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور بنگال سے گجرات تک ہر چھوٹے بڑے شہر، نگر، گاؤں میں جو مسلم آبادی نظر آرہی ہے وہ کن کے قدموں کی رہین منت ہے، یہ اپنے وطن سے بے وطن ہوئے، مال و اسباب کو چھوڑا، املاک کو تج دیا، دوست احباب، اقارب و رشتہ داروں کو الوداع کہا اور تن تنہا بتکدوں کا رخ کیا۔ اگرچہ مصائب در پیش آئے، مشکلات کا سامنا کیا، لیکن کفر کی کالی راتوں کو اسلام کے روز روشن سے بدل کر رکھدیا، نہ ان کے پاس ساز و سامان تھا نہ لاؤ لشکر، نہ آلات حرب و جنگ، مگر ایک ضرب لا الہ الا اللہ سے ساری دنیا دنگ۔ ان کے ساتھ کیا تھا؟ فقط ایک مصلّٰی کاندھے پر، ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں سنت رسول اللہ ﷺ، ان کے ہتھیار تھے۔ مصائب میں صبر، کامیابی پر شکر، دل میں قناعت، توشہ توکل کا، پیشہ ہجرت کا، صحبت صادقین کاملین کی، لباس موٹا ڈھاٹا، مگر چہروں پر بے نیازی کی بے پناہ چمک، قلب خشیت الٰہی سے معمور، اور زبانوں پر اللہ اللہ کا ورد، جہاں گئے انقلاب عظیم برپا ہوا۔ یہ کیوں ہوا۔ کس کی وجہ سے ہوا، تاریخ کہتی ہے کہ یہ ان ہی صوفیاء کا حسن عمل، ان کی خانقاہی زندگی، ان کی فاقہ مستی، ان کی دنیا سے بے رغبتی، اور ان کا اللہ پر بھروسہ، نتیجہ یہ ہوا کی ایک دنیا نے عقیدت کی جبینوں کو ان کے قدموں پر رکھدیا۔ اور جہاں مسلم حکومتیں تھیں وہاں بھی ان فقراء نے اسلام کی

سچی اور حقیقی تصویر کو پیش کیا، دنیا کے نشہ میں دھت لوگوں نے امارت، وزارت، قضاوت کے مسندوں کو چھوڑ کر ان بوریا نشینوں کی خدمت وصحبت کو ترجیح دی، اور اپنی پوری عمران کے سایہ میں گذار دی، ایک اور خاص نکتہ جو یہاں نظر آتا ہے وہ یہ ہے اسلام کی پوری تاریخ کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کیجئے تو آپ کی نظر اس حقیقت سے دوچار ہوگی کہ غیر صوفیاء (خواہ وہ اپنے وقت کے جیّد علماء اور مستند قاضی اور مفتی ہی کیوں نہ ہو) اور صوفیاء کے مابین ایک طرفہ راستہ (one way traffic) ہے۔ یعنی علماء، فضلاء، امراء اور سلاطین اپنی مسندوں اور تخت وتاج کو چھوڑ کر صوفیاء کا مسلک اختیار کیا، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ صوفیاء میں سے کسی نے اپنے مسلک کو چھوڑ کر پھر دنیا کے کسی منصب کو اختیار کیا ہو۔ کیا حضرت ابراہیم ادھمؒ کا واقعہ کہ انہوں نے تخت وتاج کو چھوڑ کر فقیرانہ روش اختیار کی تھی، تاریخ کے صفحات میں محفوظ نہیں؟ یہ تو ایک مثال ہے، ویسے ہزاروں لوگوں نے یہی طرز عمل کو اپنایا تھا۔ جب ان کے دل میں حق کو پانے کی لگن، کسی اللہ والے کی صحبت اور نظر فیض اثر کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ پھر ان صوفیاء میں سے کتنوں نے بت کدہء دہر میں اسلام کا پرچم لہرایا اور کفر وشرک کے اندھیروں کو اللہ اکبر کے نعروں سے دور کر دیا۔ اور اسلام کے نور کی روشنی سے اس ملک وخطہ کو جگمگا دیا۔ حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مثال آج بھی اجمیر کا دہرا رہا ہے۔ اسی طرح جب چنگیزی طوفان نے اسلامی دنیا کو تہ و بالا کرتے ہوئے ہزاروں آباد شہروں کو ویران اور لاکھوں بے گناہوں کو تہ تیغ کر دیا۔ بغداد کی اینٹ اینٹ سے بجادی، تو کس نے اس طوفان بلاخیز کا منہ موڑا۔ کس نے اسلام کے دشمنوں کو، اسلام کی شمع کا پروانہ بنادیا۔ وہ انہی صوفیاء کے گروہ کا ایک فرد تھا۔ ایک خراسانی بزرگ جو سلسلہء عالیہ قادریہ سے نسبت رکھتے تھے۔ اشارہء غیبی کے تحت ہلاکو خاں کے بیٹے تگودار خاں کو دعوت اسلام دینے کیلئے تشریف لائے، وہ شکار سے واپس آرہا تھا۔ اپنے محل کے دروازے پر ایک درویش کو دیکھ کر اس نے ازراہ تمسخر پوچھا کہ اے درویش بتا تیری ڈاڑھی کے بال اچھے ہیں یا میرے کتے کی دم؟ اس بے ہودہ سوال پر آپ قطعاََ برہم نہیں ہوئے، بڑے تحمل سے فرمایا، اگر میں اپنی جاں نثاری ووفاداری سے اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرلوں تو میری ڈاڑھی کے بال اچھے ہیں ورنہ آپ کے کتے کی دُم اچھی ہے جو آپ کی فرماں برداری کرتا ہے اور آپ کیلئے شکار کی خدمت انجام دیتا ہے، تگودار خاں اس غیر متوقع جواب سے بہت متاثر ہوا اور آپ کی مہمان کی حیثیت سے ٹہرایا۔ گفتگو ہوئی، وہ آپ سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ در پردہ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ لیکن اپنی قوم کی مخالفت کے خوف سے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کیا۔ پھر انہیں یہ کہہ کر رخصت کیا کہ سردست آپ تشریف لے جائیں، میں اپنی قوم کو ذہن سازی کے بعد اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرلوں گا۔ چنانچہ وطن واپس ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا انتقال ہوگیا۔ وفات سے پہلے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ وہ تگودار خاں کے پاس جائے اور اسے اپنا وعدہ یاد دلائے، جب وہ تگودار خاں کے پاس پہنچے، اپنا تعارف کراتے ہوئے، اپنے آنے کی وجہ بتائی تو اس

نے کہا کہ دوسرے تمام سردار اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں لیکن ایک سردار اس پر آمادہ نہیں ہے، اگر وہ راہ راست پر آجائے تو یہ مشکل آسان ہوسکتی ہے۔ آپ نے اس سردار کو بلایا اور اس کے سامنے دین حق پیش کیا، اس نے کہا میری ساری عمر میدان جنگ میں گذری ہے میں علمی دلائل کو سمجھ نہیں سکتا۔ میرا ایک ہی مطالبہ ہے کہ یہ درویش اگر میرے پہلوان سے مقابلہ کرے اگر اسے پچھاڑ دے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ تگودار خاں نے آپ کا نحیف ولاغر جسم دیکھ کر اس مطالبہ کو رد کرنا چاہا لیکن آپ نے اس کا چیلنج منظور کر لیا۔ مقابلہ کیلئے دن اور تاریخ اور جگہ کا تعین کیا گیا۔ بے شمار مخلوق یہ عجیب وغریب دنگل دیکھنے کیلئے جمع ہوگئی، ایک طرف نحیف و کمزور پیر فرتوت اور دوسری طرف ایک پیل تن گرانڈیل نوجوان، جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو آپ نے اس زور سے اپنے مقابل کو ایک طمانچہ مارا کہ وہ غش کھا کر زمین پر آگرا۔ وہ سردار حسب وعدہ میدان میں آیا اور آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنے مسلمان ہونے کا وعدہ کیا۔ تگودار خان نے بھی اپنے اسلام کا اظہار کیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ ہلاکوں خان کا ایک چچازاد بھائی تھا جس کا نام 'برکہ' تھا۔ اسے بھی حضرت شمس الدین باخوری نے مشرف بہ اسلام کیا، فتح قسطنطینیہ اسلامی فتوحات کی تاریخ کا ایک لافانی واقعہ ہے اس کا سہرا بائیس سالہ سلطان محمد کے سر رہا۔ اور جس ہستی نے اس مہم پر اس کو ابھارا وہ حضرت عاق شمس الدین تھے، جو سلطان محمد کے پیر طریقت تھے۔ جن صوفیاء کرام کی تعلیمات اور انکی مساعی جمیلہ کے صدقے دنیا میں اسلام پھیلا، قلع اور شہر فتح ہوئے، قوموں اور ملکوں کے مقدر سنور گئے ان کے بارے میں اسی ملت کے افراد اگر یہ کہیں کہ تصوف ایک افیون ہے، یہ غور وفکر کی قوتوں کو شل کر دیتا ہے، قوائے عمل کو اپاہج بنا دیتا ہے تو اس زیادتی کا شکوہ کس سے کیا جائے۔

آیئے بیگانوں سے پوچھیں کہ وہ صوفیاء کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ ''یورپ کے مستشرق جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کر سکا بلکہ بقول پرفیسر ہٹی (Hitti) اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں بھی مذہبی اسلام نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ہالینڈ کے ایک فاضل ''لوکے گارد'' نے دبے الفاظ میں اس بات پر استعجاب کا اظہار کیا کہ گو اسلام کا سیاسی زوال تو بار ہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا'' (تاریخ مشائخ چشتی۔ ص،۹)

پروفیسر موصوف نے ایک مشہور مستشرق ''ایچ، اے، آر گب (GIBB) کی ایک تقریر کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کی مجلس کے سامنے کی تھی۔ گب نے کہا ''تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ اسلام کے کلچر کا شدت کے ساتھ مقابلہ کیا گیا لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا انداز فکر فوراً اسکی مدد کو آجاتا

ہے۔ اور اسکو اتنی قوت و توانائی بخش دیتا ہے کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی"۔ عصر حاضر مادیّت گزیدہ ہے، ہر شخص مادّی ثروت، مادّی لذائذ، مادّی مسرتوں اور مادّی جاہ و منصب کے حصول کیلئے دیوانہ وار مصروف عمل ہے۔ اس دور میں اسے قطعاً اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ پاکیزہ اخلاقی قدریں کس طرح پامال ہو رہی ہیں۔ روحانیت کا رخ زیبا کیوں کر مسخ ہو رہا ہے۔ دل کی دنیا حرص و حسد، طمع و لالچ، بغض و کینہ کی آلائشوں سے کس قدر متعفن ہو رہی ہے۔ اگر یہ دیوانگی ہمیں کسی اچھے انجام سے دوچار کر دیتی تو ہم قطعاً اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرتے، لیکن ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم بڑی سرعت کے ساتھ زوال و انحطاط کے گڑھے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ملت کے بہی خواہوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی علمی، عملی اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی ملت کو اس گڑھے میں گرنے سے بچائیں، اس کا موثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ان پاکیزہ فطرت ہستیوں کی زندگی کا مرقع پیش کریں، جہاں للّٰہیت، استغناء، عالی حوصلگی، جراُت، سخاوت اور ہر انسان سے بے پناہ ہمدردی کے انوار قلب و نظر کو روشنی بخش رہے ہوں۔ اور یہ ساری خوبیاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ صوفیاء کرام کے سوانح حیات میں ہی دستیاب ہو سکی ہیں۔

پوری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صوفیاء کے پیش رو اصحاب صفہ ہیں۔ چنانچہ صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ تصوف کا ایک ایک رکن انبیاء کرام کی سیرت کا آئینہ دار ہے۔ یعنی سخاوت ابراہیمؑ، رضا اسحاقؑ، صبر ایوبؑ، اشارہ زکریاؑ، تجرّد عیسیٰؑ، صوف پوشیءموسیٰؑ، سیاحت عیسیٰؑ، اور فقر محمدیؐ اسکی خصوصیات ہیں۔ (مطالعہ تصوف، ص۱۲۶)

قیر کہتا ہے کہ جب اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو "انک لعلی خلق عظیم" فرمادیا تو اس سے ثابت ہوا کہ تمام پیغمبروں کے جملہ خصائص، سوائے تجرد کے، رسول اللہ ﷺ میں جمع تھے۔ اسی لئے شاعر نے کہا ہے کہ حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضاء دارند = آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری اس لحاظ سے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اصحاب صفہ کے سامنے حضور خاتم النبیین افضل المرسلین حضرت محمد مصطفی ﷺ کے حسن عمل کا نقش اور آپؐ کی سیرت طیبہ کے نقوش تھے۔ صوفیہ کے بیان کے مطابق اصحاب صفہ اپنے بود و باش اور طرز زندگی کے لحاظ سے مجسّم تصوّف تھے۔ چنانچہ تصوف کی کتابوں میں اصحاب صفہ کا تذکرہ ایک مستقل عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ خصوصاً حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عمّار بن یاسرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کی زہد و ورع کی بناء پر سرخیل گروہ صوفیہ کہا جاتا ہے۔

اصحاب صفہ کی تعداد، تعارف اور طریقۂ حیات سے متعلق زیادہ مواد، مورخین کے مقابلے میں، صوفیہ کے پاس ملتا ہے۔ ان کے ناموں کو جمع کرنے کی پہلی کوشش شیخ ابوسعید اور دوسری کوشش شیخ عبد الرحمان سلّمی نے کی۔ شیخ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں اپنی طرف سے مزید آٹھ اسماء کا ذکر کیا۔ امام حاکم نیشاپوری نے مستدرک میں چھتیس اصحاب کا ذکر کیا

ہے۔ جامعہ سلفیہ بنارس سے فروری ۱۹۸۷ء میں ایک مخطوطہ شائع ہوا ہے جس میں ایک سو ساٹھ اصحاب صفہ کے نام ہیں۔ محشیٰ نے اس میں مزید ناموں کا اضافہ کرتے ہوئے اسکی تعداد ایک سو گیارہ تک پہنچائی ہے، بعض روایات میں ان کی تعداد اس سے زیادہ بتلائی جاتی ہے۔

صفہ مسجد نبوی سے متصل ایک چبوترہ کو کہتے ہیں۔ اور یہ مسجد کے عقبی حصّے میں شمال کی طرف واقع ہے۔ اس جگہ کو چھپر ڈال کر ٹھہرنے کے لائق بنائی گئی تھی۔ یہاں فقراء، مہاجرین میں سے وہ لوگ ٹھہرتے تھے جن کا مدینہ میں کوئی رشتہ دار یا واقف کار نہیں ہوتا تھا۔ ان کیلئے مدینہ کی نئی بستی میں کسب معاش یا تجارت فوری طور پر شروع کرنے کا بھی امکان نہیں تھا۔ نہ ان کے پاس زمین تھی کہ زراعت کر سکیں، عہد نبوی میں ایسے ہنگامی حالات کا سلسلہ برسوں تک رہا۔ اگر کسی کو رہائش میسر ہو جاتی یا ان کی شادی ہو جاتی تو وہ صفہ چھوڑ کر، بیوی کے ساتھ دوسری جگہ قیام کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی بھی رہتی تھی۔، خلاصہ یہ کہ اصحاب صفہ کی زندگی عُسرت اور تنگدستی کی تھی۔ حضرت طلحہؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ اصحاب صفہ کو روزانہ ایک مد (پیمانہ) کھجوریں دو آدمیوں کو اور ایک قسم کا موٹا کپڑا دیتے تھے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دن کی کوئی نماز پڑھانے کے بعد سلام پھیرا تو اصحاب صفہ نے دائیں بائیں سے زور زور سے آوازیں دیں کہ کھجوروں نے ہمارے پیٹ کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ اور یہ کپڑے بھی پھٹ گئے ہیں۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ منبر پر چڑھے اور حمد و ثنا کے بعد ان تکالیف کا ذکر فرمایا جو دین کی راہ میں آپؐ کو اٹھانی پڑیں۔ اسی ذیل میں یہ بھی فرمایا کہ ایک وقت مجھ پر اور میرے ساتھی (غالباً حضرت بلالؓ) پر ایسا بھی آیا کہ دس سے زیادہ دنوں تک اراک (ایک خاردار درخت جس میں انگور کے خوشوں کی طرح پھل نکل آتے ہیں اور جو اونٹوں کے چارہ کے کام آتا ہے) کے پھل کے علاوہ ہمارے پاس کھانے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ ہم مکّہ سے اپنے بھائیوں (انصار) کے پاس آئے، ان کی غذا زیادہ تر کھجور ہی ہے، انہوں نے اسی سے ہماری خدمت کی۔ خدا کی قسم، اگر میں اس حیثیت میں ہوتا کہ تمہیں گوشت اور روٹی کھلا سکتا تو پیٹ بھر کھلا دیتا، ایک دن وہ بھی آئیگا کہ تمہارے سامنے صبح کو ایک برتن اور شام کو دوسرا برتن آئیگا۔ اصحاب صفہ نے پوچھا کہ اس وقت ہم بہتر حالت میں ہوں گے، یا آج ہماری حالت بہتر ہے۔ آپؐ نے فرمایا آج تم بہتر حالت میں ہو۔ اس لئے کہ تم آج ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو، اسوقت تم ایک دوسرے کے دشمن ہونگے۔ اور ایک دوسرے کی گردن کاٹو گے (المستدرک) ابو نصر سراج طوسی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس واقعہ میں معذرت فرمائی۔ ان کی شکایت کا رد نہیں کیا۔ اور نہ انہیں کسی کام یا تجارت کے ذریعہ کسب معاش کا حکم دیا۔ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھاتے تو اصحاب صفہ بھوک کی نقاہت کی وجہ سے گر پڑتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اعرابی یہ سمجھتے تھے کہ ان پر جنوں کا اثر ہے۔ رسول اللہ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے۔ ”اگر تمیں معلوم ہو جائے کہ اللہ

کے پاس تمہارے لئے کون کون سی نعمتیں ہیں تو تم دعا کرتے کہ تمہارا فقر وفاقہ اور بڑھ جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ خدا کی قسم میری حالت یہ تھی کہ بھوک کی وجہ سے زمین پر گر پڑتا اور پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتا تھا، ایک روز بھوک سے پریشان ہو کر راستہ میں بیٹھ گیا، حضرت ابو بکرؓ وہاں سے گذرے تو میں نے ایک آیت کا ان سے مطلب پوچھا، میرا مقصد یہ تھا کہ وہ میری حالت کا اندازہ لگا کر مجھے اپنے گھر لیجا کر کھانا کھلا دیں، لیکن وہ میری ضرورت کو نہ سمجھ سکے اور چل دئے۔ اتنے میں حضرت عمر فارقؓ کا بھی ادھر سے گذر ہوا۔ تو میں نے اسی آیت کا مطلب اسی مقصد سے پوچھا۔ انہوں نے بھی آیت کا مطلب بیان کر دیا اور چلے گئے، مگر جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھا تو آپؐ کو فوراً میری حالت کا احساس ہو گیا اور فرمایا، ابو ہریرہ میرے ساتھ چلو۔ آپؐ گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ میں بھی اجازت لیکر گھر میں داخل ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ دودھ کا پیالہ رکھا ہوا ہے۔ تو دریافت فرمایا "کہاں سے آیا ہے" گھر والوں نے جواب دیا فلاں نے آپؐ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا ہے۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا۔ ابو ہریرہ جاؤ اصحاب صفہ کو بلا لاؤ، میں نے سوچا کہ اس تھوڑے سے دودھ کا اصحاب صفہ کے درمیان کیا ہو گا۔ حکم کی تعمیل میں اصحاب صفہ کو بلا لایا۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ دودھ انہیں پیش کرو۔ میں ان میں سے ایک ایک کو پیالہ دیتا جاتا تھا اور وہ پوری طرح جی بھر کے پی کر پیالہ میرے حوالے کرتا جاتا تھا۔ جب سب لوگ پی چکے تو میں نے آپؐ کی خدمت میں پیش کیا، پیالہ ہاتھ میں لیکر آپؐ مسکرائے اور فرمایا "اب ہم اور تم باقی رہ گئے ہیں، بیٹھو اور پیو" میں نے بھی پی لیا، آپؐ نے فرمایا "اور پیو" میں نے پیا، آپؐ یہی فرماتے رہے اور پیو۔ میں نے عرض کیا "اب بالکل گنجائش نہیں" آپؐ نے پیالہ ہاتھ میں لیا اور جو بچا تھا وہ پی لیا۔

اصحاب صفہ کا لباس بھی مختصر ہوتا تھا، بس اتنا کہ بے ستری نہ ہو۔

اصحاب صفہ اسلام کے مہمان تھے۔ ان کو "ضیوف الاسلام" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا، آنحضرت ﷺ خود ان کی دلجوئی کا خاص خیال رکھتے تے۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ اور بی بی فاطمہؓ خدمت اقدس میں آئے۔ اپنی محنت و مشقت کا ذکر، بی بی فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکّی پیسنے کی وجہ سے جو چھالے پڑ گئے تھے ان کو بتلاتے ہوئے عرض کیا کہ اس وقت قیدی آئے ہوئے ہیں ہم کو بھی ایک غلام (یا لونڈی) عطا کیجئے، آپؐ نے فرمایا۔ خدا کی قسم میں اصحاب صفہ کو محروم کر کے تم دونوں کو غلام نہیں دے سکتا۔ میں ان غلاموں کو فروخت کروں گا اور ان کی قیمت اصحاب صفہ پر خرچ کروں گا۔ وہ دونوں واپس چلے گئے تو آنحضرت ان کے گھر تشریف لے گئے اور سوتے وقت تسبیح پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا "یہ تسبیح غلام سے بہتر ہے" یہی تسبیح، تسبیح فاطمہ کے نام سے مشہور ہے۔ آنحضرت ﷺ انصار کو حکم دیتے تھے کہ وہ ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جا کر کھانا کھلائیں، انصار اصحاب صفہ کیلئے مسجد نبوی میں کھجور کے خوشے لٹکایا کرتے تھے۔ اصحاب صفہ میں سے کسی کو بھوک لگتی تو وہ خوشہ کے

پاس آکر چھڑی سے کچے پکے کھجور گرا لیتے۔ بعض لوگوں کی طرف سے بے پروائی ہوتی تو وہ کچھ خراب خوشے لٹکا دیتے، تو اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ ترجمہ۔ اے ایمان والو۔ جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لئے نکالا ہے، اس میں سے بہتر حصّہ خرچ کرو۔ اور اللہ کی راہ میں بری (ردی) چیز خرچ کرنے کی کوشش مت کرو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم اسے ہر گز نہ لوگے، الّا یہ کہ تم اسکے لینے میں اغماض برت جاؤ"

اصحاب صفہ کو دوسرے صحابہ کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کرنے اور سیکھنے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ وہ شب وروز علمی مذاکرہ کرتے، قرآن کی تعلیم حاصل کرتے اور دینی مسائل سیکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ خود ان کے درمیان بیٹھ کر واقعات سناتے اور وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ اصحاب صفہ آپ سے مسائل پوچھتے تو آپ جواب دیتے تھے۔ اسطرح صفہ کو عہد نبوی کی پہلی درس گاہ (یونیورسٹی) کی حیثیت حاصل تھی۔

شیخ علی ہجویری نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں بیان کیا ہے کہ اصحاب صفہ کا مشغلہ عبادت تھا۔ انہیں زندگی کے کاموں سے لگاؤ نہ تھا۔ انہوں نے دنیا کو ترک کیا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ کسب معاش سے بھی دور رہتے تھے۔ شیخ ابو نصر سراج طوسی کا بیان ہے کہ اللہ نے قرآن میں کئی مقامات پر اصحاب صفہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صفہ پر قیام کے دوران ان کی زندگی فقر و فاقہ، تنگ دستی اور ناداری کی تصویر تھی۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ ان کی یہ غربت اختیاری تھی یا اضطراری؟ اصحاب صفہ کی شروع کی زندگی سے آخر تک ان کی زندگی پر نظر رکھنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ ان میں بھی دو گروہ تھے۔ یعنی بعض لوگوں نے آخر وقت تک ارتکاز مال (مال جمع کرنا) کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے کسی منصب اور عہدہ کو قبول نہیں کیا۔ جیسے حضرت ابوذر غفاریؓ اور اصحاب صفہ میں سے چند لوگوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں عامل اور گورنری کے عہدے کو قبول فرمایا تھا۔ لیکن آقائے دوجہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا اثر کیسے زائل ہو سکتا تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ جب فقراء کی فہرست طلب کی تو اس میں اپنے گورنر کا نام پایا۔ حیران ہو کر پوچھا کہ انہیں۔ بیت المال سے جو رقم ملتی ہے وہ کیا ہوتی ہے؟ جواب ملا کہ پہلے ہی دن غریبوں میں تقسیم کر کے فارغ ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کچھ رقم تنخواہ کے علاوہ دی۔ تاکہ اسے مصرف میں لائیں۔ لیکن انہوں نے اسے بھی تقسیم کر دیا۔ الغرض صفہ پر بیٹھنے والے ان فاقہ مستوں، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اسکی ذات کے طالبوں، آخری پیغمبر محبوب خدا ﷺ کی صحبت اقدس اور نظر فیض اثر سے مستفید اور مستفیض ہونے والے ویسے اپنے آپ کو دنیا سے دور رکھا اور شریعت مصطفی ﷺ کی پیروی کو حرز جاں سمجھا تو اللہ کے ہاں ان کے جو مراتب و درجات ہیں وہ تو ہیں ہی دنیا میں بھی ان کا ذکر جمیل قیامت تک ہوتا رہیگا۔ قیصر روم کا نام ونشان مٹ گیا۔ لیکن ایک رومی غلام حضرت صہیبؓ عشق و ایمان کی علامت بن

گیا۔ کسریٰ فارس کا نام لینے والا کوئی نہیں لیکن فارسی نژاد سلمان فارسیؓ کے نام پر لاکھوں بچوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ حبش اور شاہان حبش کا ذکر سنتے ہی ذہن غلامی کی طرف دوڑ جاتا ہے۔ لیکن دنیا کے کونے کونے اور لیل و نہار کے لمحے لمحے میں نماز کیلئے اذان کی آواز سنتے ہی کروڑوں انسانوں کے دلوں میں نہ صرف مسجد نبوی میں دی گئی اذاں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بلکہ فتح مکّہ کے بعد خانہء کعبہ کی چھت پر دی جانے والی صدائے اللہ اکبر کی گونج بھی ایمان کا جلا بخشتی ہے۔

علم باطن: صوفیاء کا اس امر پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ احباب ذوق و حال کو ایک مخصوص علم عطا کرتا ہے۔ جسے "علم لدنّی" اور "علم باطن" کہتے ہیں۔ چنانچہ شیخ ابو طالب مکّی 'قوت القلوب' نامی اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں۔ "وہ علم نافع ہے جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہے۔ اور یہی ان دونوں کے درمیان واسطہ لقاء ہے۔ صوفیاء کے پاس ایک خاص علم ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ، خضرؑ کے تعلق سے فرماتا ہے۔ "وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا﴿الکھف:۶۵﴾" یعنی اور ہم نے ان کو (خضر کو) اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا کیا۔ ان کے پاس علم بھی وہی ہے جو کشف و شہود کے ذریعہ ہو، نہ کہ نظر و فکر اور ظن اور تخمین کی وساطت سے۔

شیخ طوسی کا کہنا ہے کہ "اس علم کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ ان کے مطابق تمام علوم کا مقصد یہی علم حقائق ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ سمندر میں مل جاتا ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ تم اسے "علم قلوب" "علم معارف" "علم اسرار" "علم باطن" "علم تصوف" "علم احوال" اور "علم معاملات" جو چاہے کہو، مگر معنی ایک ہی ہیں۔

شیخ ابو بکر کلاباذی کا بیان ہے کہ "یہ بلند ترین علوم 'علوم خواطر'، 'علوم مشاہدات' اور 'علوم مکاشفات' کہے جاتے ہیں۔ یہ اشارہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور صرف صوفیاء کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس علم کو 'علم اشارہ' کا نام اس لئے دیا گیا ہے۔ کہ دلوں کے مشاہدات اور باطنی مکاشفات کی تشریح تحقیقی طور پر (الفاظ سے) نہیں کی جاسکتی۔ ان مقامات کو وہی شخص جان سکتا ہے۔ جو ان مقامات میں اترا ہو۔ اس مخصوص علم کی تشریح اس واقعہ سے کی جاتی ہے کہ شیخ بایزید بسطامیؒ کے پاس اسی علاقے کے ایک فقیہ آئے اور دونوں کے درمیان یہ مکالمہ ہوا۔

فقیہ: حضرت آپ کے بارے میں ہم نے ایسی باتیں سنی ہیں جو عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔

شیخ: اور جو باتیں آپ نے نہیں سنی وہ اور بھی عجیب ہیں۔

فقیہ: آپ نے یہ باتیں کن سے اور کہاں سے سیکھی ہیں۔

شیخ: میرا علم عطاء خداوندی ہے اور وہاں سے آیا ہے جہاں پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "جس شخص نے اس علم پر عمل کیا جو وہ جانتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے وہ علم عطا کرتا ہے جسے وہ نہیں جانتا ہے۔ اور جہاں پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "علم

دو ہیں، ایک علم ظاہر ہے جو مخلوق پر اللہ کی حجت ہے اور دوسرا علم باطن ہے جو علم نافع ہے۔ اے فقیہ تمہارا علم تعلیم کے ذریعہ ایک زبان سے دوسری زبان تک منتقل ہوا ہے، عمل کے ذریعہ نہیں۔ اور میرا علم اللہ سے ملا ہے۔ میرا علم اس کے الہامات سے ہے۔

فقیہ: میرا علم ثقاوت سے ماخوذ ہے۔ اکابر رواۃ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے جبرئیلؑ سے اور انہوں نے خدا سے لیا ہے۔

شیخ: رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک علم ایسا بھی تھا جس سے جبرئیلؑ اور میکائیلؑ بے خبر تھے۔

فقیہ: اچھا تو میں اس علم کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔

شیخ: میں اس حد تک آپ کیلئے اسے ثابت کروں گا، جس حد تک آپ کا دل اسکے جاننے کی تاب لا سکتا ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام کیا۔ پھر آنحضرت ﷺ کے ساتھ کلام کیا (شب معراج میں) آپؐ نے اسے روبرو دیکھا۔ انبیاء سے وحی کی شکل میں کلام کیا۔

فقیہ: ہاں

شیخ: کیا آپ نہیں جانتے کہ صدیقین اور اولیاء کا کلام اللہ کی طرف سے ان کیلئے الہام ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ انہیں دانائی کی باتیں عطا کرتا ہے۔ امت ان سے فیض حاصل کرتی ہے۔ میرے دعوی کی تائید میں جو دلائل ہیں ان میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی طرف اللہ کے الہام کا واقعہ ہے۔ خدا نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ موسیٰ کو صندوق میں بند کر دو اور دریا میں ڈال دو۔ موسیٰؑ کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔

اسی طرح خدا نے حضرت خضرؑ کو کشتی کو توڑنے، لڑکے کو مارنے اور دیوار کو مضبوط کرنے کے بارے میں الہام کیا۔ چنانچہ ایسا ہی خضرؑ نے کیا۔ اور پوچھنے پر موسیٰؑ سے کہا کہ میں نے یہ کام اپنے آپ سے نہیں کئے۔ یعنی اللہ نے انہیں ایسا کرنے کے بارے میں فرمایا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کو جیل میں الہام کیا، نیز حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بستر مرگ پر حضرت عائشہ سے فرمایا کہ بنت خارجہ (ابو بکرؓ کی بیوی) کے پیٹ میں لڑکی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ مرض وفات میں حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو چیزیں تمہیں ہبہ دی ہیں اس میں تمہارے لئے، دو بھائیوں اور دو بہنوں کا حصّہ ہے۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کے دو بھائی اور ایک بہن تھیں۔ اس لئے وہ حیران ہوئیں، انہوں نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔ تو حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ بنت خارجہ (حضرت ابو بکرؓ کی بیوی) کے پیٹ میں بچہ ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ وہ بچہ لڑکی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے انتقال کے بعد جب وضع حمل ہوا تو لڑکی پیدا ہوئی۔ گویا حضرت ابو بکرؓ کو بذریعہ

الہام معلوم ہوا تھا کہ ان کی بیوی کے پیٹ میں لڑکی ہے۔ اسی طرح کا الہام خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کو ہوا تھا۔ یعنی جب عہد فاروقی میں مسلمان نہاوند کے مقام پر جہاد میں مشغول تھے۔ اچانک لشکر اسلام کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ مدینہ منورہ میں اسوقت حضرت عمرؓ خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ کے دوران انہوں نے "یا ســارية الجبل" کے الفاظ باآواز بلند کہے۔ اور پھر خطبہ جاری رکھا۔ نہاوند کے معرکے میں مصروف مسلمانوں نے یہ آواز سنی، اسطرح کہ گویا کوئی قریب ہی پکار رہا ہے۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور فتح یاب ہوئے، اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔ فقیہ (یہ سن کر کھڑا ہو گیا اور کہا) آپ نے مجھے اصل چیز عطا کی اور میرے سینے کو شفا بخشی۔

شیخ بسطامیؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ خدا اور بندہ کے درمیان ایسا علم ہے جو جبرئیل اور میکائیل جیسے فرشتوں کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ تنہا بسطامیؒ ہی نہیں بلکہ تمام صوفیہ اس پر متفق ہیں کہ اس علم کیلئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے۔

امام غزالیؒ کہتے ہیں "یہ علوم کتابوں میں لکھے نہیں جاتے بلکہ اللہ ان میں سے تھوڑا حصّہ بندہ کو عطا کرتا ہے وہ دوسروں سے ان کا بیان نہیں کرتا، سوائے ان لوگوں کے جو اس کے اہل ہوں۔ اور وہ اس کے شریک راز رہتے ہیں۔ یہ وہ پوشیدہ علم ہے جسکی طرف رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں اشارہ کیا۔ ترجمہ: بعض علوم پوشیدہ راز کی صورت میں ہوتے ہیں۔ جنھیں صرف وہ لوگ جانتے ہیں جنھیں اللہ کی معرفت حاصل ہے۔ جب وہ اس بارے میں کلام کرتے ہیں تو صرف وہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جو اللہ کے معاملے میں دھوکے میں ہیں۔ چنانچہ صوفیہ اسے کتابوں کا مطالعہ کر کے حاصل نہیں کرتے۔ اس کے حصول کیلئے ضروری ہے کہ سالک ماسوی اللہ سے قطع تعلق کر کے ارادت اختیار کرے۔ اور کسی شیخ کا دامن پکڑ لے۔ صوفیہ کے بقول حواس باطنی کو ترقی دے کر ہی غیر مادی حقائق کا علم ممکن الحصول ہے۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں جس طرح عالم محسوسات یعنی عالم جسمانی کیلئے دل کی طرف حواس خمسہ کے پانچ دروازے ہیں اسی طرح عالم ملکوت یا عالم روحانی کی طرف بھی دل میں ایک دروازہ ہے۔ چونکہ سب لوگ یکساں نہیں ہوتے اس لئے اس خاص علم کو بھی صرف مخصوص لوگوں کے سامنے بیان کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ صوفیہ بقول یہ وہ جوہر ہیں جو ناقدروں کے بازار میں لائے نہیں جاسکتے۔ کبھی یہ باتیں عام لوگوں کے سامنے آجاتی ہیں تو کم فہمی کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

صوفیہ حقائق کے عدم اظہار کیلئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن یاد کئے یعنی دو قسم کے علم حاصل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے شائع کر دیا۔ اور اگر دوسرے کو ظاہر کروں گا تو میری گردن کاٹی جائے گی۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ آپؓ نے آیت "اللَّـــهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴿الطلاق: ۱۲﴾" کی تفسیر بیان نہیں بتائی اور کہا اگر میں اسکی تفسیر کروں تو تم مجھے سنگسار کروگے، دوسری روایت میں ہے کہ تم کہوگے کہ عبد اللہ بن عباس کافر ہے، علم لدنی اور علم شریعت کا باہمی ربط (یا ان کے درمیان باہمی نسبت) صدیوں سے موضوع بحث بنارہا ہے۔ ایک طرف علماء شریعت کو صوفیہ نے ہمیشہ علماء ظاہر کا نام دے کر ان کی تحقیر کی ہے تو دسری طرف بعض علماء شریعت نے علم لدنی کے حاملین (صوفیہ) کو تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ علم لدنی کے حاملین، علماء ظاہری کے اعتراض سے بچنے کیلئے دعوی کرتے ہیں کہ علم باطن، علم شریعت سے کوئی مختلف نہیں ہے، لیکن اگر گہرائی میں جائیں تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ارباب حال کے یہاں طریقت کا معاملہ شریعت سے کچھ الگ سا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہ سمجھے جائیں کہ اہل طریقت کی شریعت یا ان کا مذہب ہی الگ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ظاہر صرف ظاہری حد تک جیسا آیا ہے اس پر عمل کرتے ہیں اور اہل طریقت اس ظاہر کے ساتھ ساتھ اسکے مزید گہرے معنی بتاتے ہیں، چنانچہ اسکی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ قرآن میں آیا ہے کہ "یتیموں کو ان کا مال اس وقت تک ان کے حوالے مت کرو جب تک کہ وہ سن رشد کو نہ پہنچ جائیں۔ اہل ظاہر اس کے ظاہری معنی پر عمل کرتے ہیں اور اہل باطن یا ارباب طریقت کہتے ہیں کہ یہاں مال سے مراد علم معرفت ہے اور یتیم سے مراد وہ لوگ ہیں جو معرفت سے کورے ہیں۔ پس اس کا مطلب یہ نکالتے ہیں کہ معرفت کے اسرار و رموز کو نا اہلوں کے سامنے جو ان کی حفاظت کر نہیں سکتے، بیان مت کرو۔

بعض صوفیاء نے علم باطن کو "علم الملکوت" اور "علم ظاہر کو "علم الملک" سے تعبیر کیا ہے۔ امام قشیری کے بقول "شریعت التزام عبودیت" ہے اور "حقیقت مشاہدۂ ربوبیت" ہے۔ شریعت یہ ہے کہ تم اسکی عبادت کرو اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ کرو۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں۔ "اللہ تک پہنچانے والے دو راستے ہیں ایک کی تو وحی اور تعلیمات انبیاء نے تلقین کی ہے اور دوسرا وہ راستہ ہے جس کا تعین الہام اور اولیاء کے معارف سے ہوا ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ خدا رسیدگی کی دو راہیں ہیں ایک راہ تو وہ ہے جو نبی کے ذریعہ لوگوں تک پہنچی اور دوسری وہ جو اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان ہے۔، اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا علم لدنی یا علم باطن کے نظریہ کی کوئی مستحکم بنیاد ہے، کیا اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو کوئی خاص علم عطا فرمایا تھا۔ جسے آپؐ نے صرف چند مخصوص صحابہ تک پہنچایا؟ مولانا جلالالدین رومیؒ کی بیان کی ہوئی ایک روایت کے مطابق معراج میں اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو ستّر ہزار اسرار عطا فرمائے اور یہ بھی فرمایا کہ ان میں ۳۵ ہزار اسرار کے بارے میں آپ کو اختیار ہے کہ اپنے خیار صحابہ میں سے جس کو چاہے بتادیں اور باقی ۳۵ ہزار اسرار کسی کو نہ بتائیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان میں سے بعض اسرار بعض صحابہؓ کو بتائے اور باقی اپنے خزانۂ غیب میں چھپا رکھے۔ صحابہ میں سے جن حضرات کو وہ مخصوص علم دیا گیا تھا۔ ان

میں سے ایک نام حضرت ابو بکرؓ کا لیا جاتا ہے۔ شیخ ابو بکر واسطی کا قول ہے کہ اس امت میں سب سے پہلے صوفیانہ کلام حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زبان سے ادا ہوا، جس سے اہل فہم نے ایسے لطائف کا استخراج کیا جو عقلاء کیلئے باعث وساوس ہیں، حضرت شیخ واسطی کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے کہ جب آپ نے حضرت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں خدا کی راہ میں اپنا سارا اثاثہ پیش کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم نے اپنے اہل وعیال کیلئے کیا چھوڑا۔ حضرت صدیقؓ نے جواب دیا، اللہ اور اس کا رسول۔ صدیق اکبر کا پہلے اللہ کا نام لینا اور پھر رسول اللہ ﷺ، حقائق تفرید میں اہل توحید کیلئے ایک اشارہ ہے، نیز حضرت صدیق اکبرؓ کے تعلق سے یہ واقعہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کہ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد صحابہؓ میں بے چینی پھیل گئی اور حضرت عمر فاروقؓ نے جو کہا وہ سب کو معلوم ہے، لیکن صدیق اکبرؓ کے پایۂ ثبات کو اس وقت بھی لغزش نہیں ہوئی، چنانچہ اس نازک وقت میں بھی آپ نے مسجد نبوی میں پریشان مسلمانوں کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ جو شخص محمد رسول اللہ ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمد ﷺ کا وصال ہو گیا، اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ کو کبھی موت نہیں آئی۔ شیخ ابو نصر سراج طوسی بھی اس واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اہل لطائف کیلئے اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ حضرت صدیقؓ توحید میں ثابت قدم تھے۔ اور ان کی وجہ سے دیگر صحابہؓ بھی ثابت قدم ہو گئے۔ شیخ ابو بکر شبلی کے قول کے مطابق صدیق اکبرؓ کو فقر میں ارباب باطن کا امام مانا گیا ہے۔ ایک عالم نے شیخ موصوف سے بغرض امتحان پوچھا کہ زکواۃ کتنی دینی چاہئے تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ کے مذہب میں دو سو درہم میں سے پانچ درہم، ہمارے مذہب میں تو آدمی کو کسی چیز کا مالک ہی نہیں ہونا چاہئے تاکہ زکواۃ کا مشغلہ ہی نہ رہے۔ عالم نے پوچھا، اس میں آپ کا امام کون ہے؟ شیخ نے جواب دیا، ابو بکر صدیقؓ جنھوں نے اپنا سارا مال خدا کی راہ میں دے دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے اپنے اہل وعیال کیلئے کیا چھوڑا تو جواب دیا اللہ اور اسکا رسول۔ حضرت ابو بکرؓ کو علم لدنی کا حامل یا اہل فقر کا امام ثابت کرنے کیلئے ان نکات کے علاوہ ایک حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، چنانچہ کشف المحجوب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ابو بکر کو تم لوگوں پر جو فضیلت حاصل ہے وہ کثرت نماز کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک چیز کی بناء پر جو ان کے سینے میں ڈالی گئی ہے۔ بعض نقادان حدیث نے اسکی صحت پر اعتراض کیا ہے۔ علم باطن کے سلسلے میں ایک اور نام حضرت حذیفہؓ الیمان کا لیا جاتا ہے، یہ مشہور صحابی ہیں جنھیں صاحب سرّ رسول اللہ ﷺ بھی کہا جاتا ہے، ان کو عالم علم المنافقین بھی کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ علم ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ کو حضرت حذیفہ الیمانؓ کا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ علم الباطن کی تشریح کے تعلق سے صوفیاء کے پاس جو مختلف روایتیں ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ "علم باطن اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ جسے وہ اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے، مخلوق میں کوئی اس سے واقف نہیں ہوتا۔ لیکن بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ حضرت ابو حذیفہ کو رسول اللہ ﷺ نے

جس علم کی تعلیم دی تھی۔ وہ ”علم الفتن“ اور ”علم المنافقین“ کا تھا۔ خود حذیفہؓ کا بیان ہے کہ میرے دوستوں نے (رسول اللہؐ) خیر اور میں شر کا علم حاصل کیا، یعنی شر سے بچنے کیلئے وہ آنحضرت ﷺ سے شر کے بارے میں سوال کرتے تھے، جبکہ دوسرے صحابہ خیر کے متعلق پوچھا کرتے تھے، اہل تصوف کے پاس حضرت علیؓ کو جو مقام حاصل ہے اس میں سے کوئی دوسرا صحابی ان کا شریک و سہیم نہیں ہے، حضرت رومی کہتے ہیں کہ معراج کی رات میں آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ستّر ہزار اسرار کا علم عطا فرمایا تھا۔ ان میں سے دس ہزار اسرار آپ نے حضرت علیؓ کو عطا کئے۔ ان اسرار یقین سے مالا مال ہونے کے بعد نعرہ لگاتے ہوئے آپ صحرا کی طرف نکلے اور اسی حالت میں کہا کہ ”اگر ہم پر سے پردہ ہٹا بھی دیا جائے تو بھی ہمارے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ بہر کیف حضرت علیؓ کو تصوف میں ”محرم اسرار“ کی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ چار یہودی حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے پیغمبر دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔ ہم آپ سے چند سوال پوچھیں گے، اگر آپ نے صحیح جواب دئے تو آپ کا دین بر حق، نہیں تو باطل، حضرت عمرؓ نے کہا، پوچھو۔ انہوں نے یہ سوال پوچھے۔ دوزخ کا دروازہ کا قفل کیا ہے؟ اور اس کی کنجی کیا ہے؟ جنت کے درازہ کا قفل کیا ہے؟ اور اس کی کنجی کیا ہے؟ کون زندہ مقبور تھا۔ جسے اسکی قبر زمین میں لئے پھرتی تھی۔؟ آدم کے علاوہ کون مولود ہے جو ماں باپ کے بغیر پیدا ہوا؟ حضرت عمرؓ نے سوچتے ہوئے کہا کہ اگر محمد ﷺ کو چند باتیں معلوم نہیں ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ یہودی ہنسے اور تمسخر اڑانے لگے، جب حضرت علیؓ کو اس بات کی خبر ہوئی تو حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کا جامہ زیب تن کیا اور رسول اللہ ﷺ کی دستار سر پر رکھی، دوڑتے ہوئے آئے اور حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھ گئے، حضرت علیؓ نے پوچھا، پوچھو کیا پوچھنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ پر علم کے ہزار دروازے اور ہر دروازے سے دوسرے ہزار دروازے کھولے ہیں۔

یہودی: دوزخ کا دروازہ کا قفل کیا ہے؟

حضرت علیؓ: کلمہ لَا إِلٰه إِلَّا الله مُحَمَّد رَسُول الله، دوزخ کا قفل ہے۔

یہودی: اس قفل کی کنجی کیا ہے؟

حضرت علیؓ: الاشراك بالله (اللہ کا شرک ٹھہرانا) اس قفل کی کنجی ہے۔

یہودی: جنت کے دروازہ کا قفل کیا ہے؟

حضرت علیؓ: الاشراك بالله، جنت کے دروازہ کا قفل ہے۔

یہودی: اس قفل کی کنجی کیا ہے؟

حضرت علیؓ: کلمہ لَا إِلٰه إِلَّا الله مُحَمَّد رَسُول الله اس کی کنجی ہے۔

یہودی: کون مقبور تھا جسے اسکی قبر لئے پھرتی تھی؟

حضرت علیؓ: وہ حضرت یونسؑ تھے جو مچھلی کے پیٹ میں تھے اور مچھلی دریا میں پھرتی تھی۔

یہودی: آدم کے علاوہ وہ کون مولود ہے جو ماں باپ کے بغیر پیدا ہوا؟

حضرت علیؓ: حضرت صالحؑ کی اونٹنی جو چٹان سے پیدا ہوئی۔

تین یہودی جواب سن کر مسلمان ہوگئے، مگر چوتھے نے کہا کہ اگر آپ میرے آباء واجداد کے نام، میرے وطن کے بادشاہ اور میرے شہر کے حالات بتائیں گے تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ حضرت علیؓ نے یہ تمام چیزیں بتادیں، چنانچہ وہ بھی مسلمان ہو گیا(جوامع الکلم)

ان روایات کی بناء پر صوفیاء ہر دور میں دعوی کرتے رہتے ہیں کہ حضرت علیؓ ان کے پیشوا اور مقتدا ہیں۔ حضرت جنید بغدادی کہتے ہیں کہ "شيخنا في الاصول و البلاء علي المرتضىٰ "۔ اصول اور آزمائش میں ہمارے شیخ حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں۔

شیخ ابو نصر سراج طوسی، حضرت علیؓ کے بارے میں کہتے ہیں "یہ وہ شخص ہیں جنھیں علم لدنی دیا گیا ہے اور علم لدنی وہ علم ہے جو خاص طور سے حضرت خضرؑ کو ملا تھا۔

شیخ ہجویری کہتے ہیں "پس اہل طریقت، حقائق عبارات، دقائق اشارات اور معلومات دنیا اور آخرت سے علیحدہ ہونے اور تقدیر حق کے دائرہ میں مشاہدہ کرنے میں ان ہی کی اقتداء کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اس امت کے پہلے صوفی ہیں، پہلے مجذوب ہیں اور پہلے عارف ہیں (فیوض الحرمین) اور سب سے بڑھ کر حضور خاتم النبیین ﷺ کی حضرت علیؓ کے حق میں یہ بشارت تو تمام بشارتوں کی انگوٹھی میں نگینہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا "أَنَا مَدِينَةُ العِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا" میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ اسی مخصوص علم کی بناء پر حضرت علیؓ کو صحابہؓ میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کو کوئی مشکل پیش آتی تھی تو وہ حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کرتے تھے، چنانچہ مصر کے مشہور صوفی شاعر شیخ عمر بن الفارض نے جو سلطان العاشقین کے لقب سے معروف ہیں۔ حضرت علیؓ کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

و اوضح بالتاويل ما كان مشكلاً   علي بعلم ناله بالوصية

ترجمہ۔ جو امر مشکل ہوتا تو حضرت علیؓ نے اپنے اس علم کے ذریعہ جو آپ کو وصیتاً ملا تھا، دلیل کے ساتھ، اسکی وضاحت فرمادی۔ فارس کے ایک نامور شیعہ عالم "ابن عجیبہ" کے بقول اس علم یعنی تصوف کے اصل واضع، نبی کریم ﷺ

ہیں۔ انہیں وحی و الہام کے ذریعہ اللہ نے یہ علم دیا، پس جبرئیلؑ پہلے شریعت لے کر نازل ہوئے، جب شریعت نے قرار پایا تو دوسری بار حقیقت لے کر نازل ہوئے۔ اس کیلئے بعض حضرات مخصوص ہوئے اور سب سے پہلے جس شخص نے اس کے بارے میں کلام کیا اور اسے معرض اظہار میں لایا وہ سیدنا علیؓ ہیں۔ ان سے یہ علم حسن بصریؒ نے حاصل کیا۔ لیکن بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ تصوف اور اس سے متعلق تقریباً بہت سے ابواب میں محدثین اور علماء تصوف کے مابین ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ بات علم باطن کی ہو کہ ارادت کی، تلقین کی ہو کہ خرقہ کہ، محدثین اور علماء تصوف میں ۲۶ کا آنکڑا نظر آتا ہے، صوفیاء کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ، حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں۔ محدثین کہتے ہیں کہ ان دونوں کی ملاقات مشکوک ہے۔

جلال الدین سیوطی نے "اتحاد الفرقه بوصـــل الخرقه" کے نام سے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے حضرت حسن بصریؒ کو حضرت علیؓ کا شاگرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جب شاہ ولی اللہ صاحب نے حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت حسن بصریؒ کی ملاقات کو صغر سنی کی بناء مشکوک قرار دیا تو سلسلہ ء چشتیہ کے ایک بزرگ شیخ فخر الدین چشتی دہلوی نے ان کی تردید میں "فخر الحسن" نام کی کتاب لکھ کر ان کی ملاقات کو ثابت کیا، لیکن محدثین اور اصحاب اسماء الرجال کو برابر ان سے اختلاف رہا۔ البتہ ایک حدیث ایسی ضرور ہے جس پر علماء نے سکوت اختیار کیا ہے یا کم از کم اسے موضوع قرار نہیں دیا، وہ حدیث یہ ہے۔ "مَثَلُ أُمَّتِي كَالمطر لَا يَدرِي أَوَّلَهُ خَير أم آخرهُ" ترجمہ۔ میری امت کی مثال بارش کی ہے جس کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ اس کا پہلا حصّہ بہتر ہے یا آخری۔

مسند ابو یعلی میں ہے کہ اسے حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے سنا ہے، بعض علماء کے نزدیک چونکہ اس کے راوی ثقہ ہیں اس لئے ان دونوں کے درمیان ملاقات ثابت ہوتی ہے۔ بعض اہل علم اور صوفیہ کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو وصیت کی تھی کہ "میرا خرقہ اویس قرنی کو پہنچایا جائے اور ان سے میری امت کیلئے دعائے مغفرت کیلئے کہا جائے" چنانچہ حضرت فاروقؓ نے یا حضرت علیؓ نے اور دیگر روایتوں کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت علیؓ کو ساتھ لیکر حضرت اویس قرنی کو یہ خرقہ پہنچایا اور امت کے حق میں مغفرت کی دعا کی درخواست کی۔ اور اللہ نے آپ کی دعا سے قبائل ربیعہ و مضر کے بھیڑوں کے بالوں کی تعداد سے امت محمدیہ کی بخشش فرمائی، اس سے پہلے حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالے سے جو اثر لکھا گیا ہے اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "میں نے آنحضرت ﷺ سے علم کے دو ظرف یاد کئے۔ ایک کو عوام میں شائع کیا لیکن اگر دوسرے کو شائع کروں گا تو میری گردن کاٹی جائیگی۔ صوفیہ کا کہنا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جس ظرف کی اشاعت نہیں کی وہ 'علم باطن' ہے اس اثر کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ ملّا علی قاری نے ایک ظرف علم سے اخلاق و احکام سے متعلق علم ظاہر مراد لیا ہے۔ اور دوسری قسم جسے ابو ہریرہؓ نے شایع نہیں کیا۔ علم باطن ہے۔ اسکی شرح یوں کی گئی ہے کہ ابو

ہریرہؓ کا یہ کہنا کہ اگر اس علم کی تفصیلات لوگوں کے سامنے بیان کروں تو میرا حلقوم کاٹا جائیگا، اس وجہ سے تھا کہ حقیقت توحید کے اسرار کی تعبیر علی وجہ المراد مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس نے بھی اس معاملہ میں لب کشائی کی اس پر کفر اور الحاد کا الزام آیا۔ کیوں کہ عوام کا فہم و ذہن مقصود اصلی کے ادارک سے قاصر ہوتا ہے۔ اور صوفیہ کا قول ہے۔ ''صدور الاحرار قبور الابرار'' یعنی احرار کے سینے اسرار کے گنجینے ہوتے ہیں، امام قسطلانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں، ''یا اس سے مراد وہ مخفی علوم ہوں جو اہل عرفان و مشاہدات اور کاملین میں سے عارفین باللہ کو علم شرائع اور رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے احکام پر عمل کرنے اور شریعت کی حد میں رہنے کے نتیجہ میں خاص طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں وہی کامیاب ہوتے ہیں جو بحر مجاہدات میں غواصی کرتے ہیں۔ اور ان ہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو انوار مشاہدات کیلئے منتخب ہوئے ہوں۔ اور بعض علماء نے حضرت ابوہریرہؓ کے بیان کردہ اس دوسرے علم کو قیامت کے اشراط، احوال کے تغیر اور آخر زمانے میں وقوع میں آنے والی پیشین گوئیوں پر محمول کیا ہے۔ جن پر عقل و شعور سے عاری لوگ انکار و اعتراض کرسکتے ہیں۔

تسبیح وذکر

تسبیح کے معنی اللہ کی پاکی بیان کرنے کے ہیں۔ سبحان اللہ کہنا بھی تسبیح کرنا ہی ہے۔ چنانچہ اللہ قرآن میں فرماتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿الأحزاب:۴۱,۴۲﴾۔یعنی اے ایمان والو اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح وشام اللہ کی پاکی بیان کرو۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے ذکر کرنے کا حکم دیا پھر تسبیح کا حکم کیوں دے رہا ہے۔ جبکہ دونوں ایک ہی معنی کے الفاظ ہیں اور جب ایسا ہے تو پھر دونوں الفاظ میں سے ایک زائد ہو گا۔ اور قرآن میں زائد لفظ کا آنا عیب سمجھا جائے گا حالانکہ اللہ کا کلام ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ کا کلام ہر قسم کے عیب اور نقص سے منزّہ اور مبرّا ہے۔ اور اس میں تکرار لفظی یا معنوی بھی نہیں ہے۔ لیکن یہاں جو ذکر اور تسبیح کے الفاظ آئے ہیں وہ جداگانہ معنی رکھتے ہیں۔ پس ذکر اور چیز ہے اور تسبیح اور چیز ہے۔

یعنی ذکر خاصہ دل کا ہے اور تسبیح خاصہ زبان کا ہے۔ جو چیز زبان سے صادر ہوتی ہے اسکو تسبیح کہتے ہیں۔ اور جو دل سے جاری ہوتی ہے اسکو ذکر کہتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں نفاق اور کذب کے الفاظ آئے ہیں۔ حالانکہ دونوں کے معنی، دروغ، کے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ نفاق خاصہ دل کا ہے اور کذب خاصہ زبان کا ہے۔ پس تسبیح اور ذکر میں معنوی اعتبار سے ویسا ہی فرق ہے جیسا کہ معنوی اعتبار سے نفاق اور کذب میں ہے یعنی ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسرے کا تعلق زبان سے ہے۔

تصنّع

تصنّع جس کے معنی بناوٹ کے ہیں، یعنی آدمی خود کو اس چیز کے ساتھ ظاہر کرے جو اس میں نہیں ہے، جیسے میک اپ کرتے ہوئے اپنے آپ کو خوبصورت ظاہر کرے۔ پھر جب منھ دھوڈالے تو کالا بھجنگ۔

ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر، موٹا دھاٹا لباس، پگڑی وغیرہ پہن کر صوفی ظاہر کرے حالانکہ وہ اندر سے کوفی ثابت ہو۔ بلکہ نماز اور درود شریف کی کثرت ظاہر کرتے ہوئے متقی ہونے کا رعب جمائے اور پیری مریدی کا دھندا بھی شروع کردے۔ حالانکہ نہ تو اس کو نسبت حاصل ہے اور نہ سلوک کے تعلق سے کچھ معلومات ہیں۔ یہ سب نرا دھوکہ دینا ہے۔ چنانچہ ایسو کے تعلق سے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

زنہار از آں قوم نباشی کہ فروشند حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

یعنی تو اس قوم میں سے نہ ہو جانا جو خدا کو سجدوں اور نبی ﷺ کو درود سے دھوکہ دیتے ہیں۔

ماحصل یہ ہے کہ یہ دینداری کی صورت تو ہے مگر دینداری کی حقیقت نہیں ہے۔

جیسا کہ کہا گیا ہے۔ گر بصورت آدمی انساں بُدے احمدؐ و بوجہل یکساں بُدے

اینکہ می بینی خلاف آدم اند نیشتند آدم غلاف آدمؑ

ترجمہ۔ اگر آدمی شکل و صورت سے آدمی ہوتا تو محمد ﷺ اور بوجہل برابر ہوتے، جن لوگوں میں تو آدمیت نہیں دیکھتا وہ بظاہر تو آدمی ہیں لیکن حقیقت میں وہ آدمی نہیں ہیں۔ بلکہ آدمی کا مکھوٹا اپنے چہرے پر لگالیا ہے۔

اسی طرح اعمال کی بھی حالت ہے، یعنی بظاہر اچھے اعمال کا مظاہرہ تاکہ لوگوں کو پھانس لے اور در حقیقت غلاظت کا ڈھیر۔

جب ظاہری طور پر کوئی شخص "آدمی" یا "انسان" ظاہر کرے حالانکہ وہ انسانیت اور آدمیت کے تقاضوں سے بہت دور ہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو شخص "عالم" نہ ہو اور اپنے آپ کو خواہ مخواہ کی، ڈگریوں اور سندوں کے غلاف میں ظاہر کرے تو اسکو شیطان ہی سمجھنا چاہئے۔ بزرگوں نے تو یہاں تک کہا ہے۔ بر ہَوا پَری مگسے باشد۔ یعنی اگر تو کرامت کے زور پر ہوا پر بھی اڑوگے تو تم مکھی بن جاؤ گے۔ یعنی ہوا پر اڑنا کوئی کمال کی بات اس لئے نہیں ہے کہ اللہ کی ایک ادنیٰ مخلوق بھی ہوا پر اڑتی ہے۔

اسی طرح۔ بر آب روی خسے باشی۔ اگر تو پانی پر چلتا ہے تو کیا ہوا، یوں سمجھ لے کہ تو اک تنکا ہو گیا کیونکہ تنکا بھی

پانی میں ڈوبے بغیر پانی کی سطح پر بہتا اور تیر تا ہے۔

ہاں خوبی کی بات یہ ہے کہ "دل بدست آر کہ کسے باشی" یعنی اپنے دل کو اپنے ہاتھ میں لے لے، اسپر قابو پالے، تب تو انسان ہو گا (خواجہ عبد اللہ انصاری)

حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے کہا کہ ایک قوم ہے جو کہتی ہے۔ "نحن وصلنا فلا حاجة لنا الی الصلوٰة والصیام" یعنی ہم واصل ہو گئے ہیں (ہم پہنچے ہوئے ہیں) لہٰذا ہم کو نماز اور روزوں کی حاجت نہیں ہے، یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے جواب میں فرمایا" صدقوا فی الوصول ولٰکن الی السقر" یہ جو کہتے ہیں کہ ہم پہنچ گئے، سچ ہے، لیکن وہ واصل جہنم ہوئے ہیں نہ کہ واصل خدا۔ (فوائد الفواد)

خلاصہ یہ کہ اعمال کی قبولیت کا انحصار صرف "کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی اتباع" پر ہے۔ ہدایت کے ان دونوں عظیم سر چشموں کو چھوڑ کر، آدمی کچھ بن کر دکھائے وہ شریعت کی منزل یعنی خدا سے دور ہے اور شیطان سے نزدیک ہے۔ خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہر گز بمنزل نخواہد رسید

تبلیغ

امر بالمعروف ونهي عن المنكر۔ ارشاد خداوندی۔ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴿المائدة:٦٧﴾۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴿آل عمران:١٠٤﴾

حضرت بدر منیر شاہ خوندمیرؓ فرماتے ہیں۔ جو حق بات ہے کہتے رہیں۔ اگر کر نہیں سکتے تو یہ ہمارا قصور عمل اور ہماری بدقسمتی ہے۔ لیکن جو کچھ بیان حضرت میراں سید محمد مہدیؑ سے سنا ہے دوسروں کو سنائیں اگر علانیہ بول نہیں سکتے تو کم از کم اپنی بی بی کو ہی سنا دیں تا کہ اس آیت کی وعید میں نہ آئیں۔ ولا تکتموا الشھادۃ (انصاف نامہ)۔ نیز آپ نے فرمایا۔ حق پوشی کفر ہے۔

حدیث میں آیا ہے۔ الساکت عن الحق فھو شیطان اخرس۔ جو شخص حق بات کہنے سے خاموش رہتا ہے وہ گونگا شیطان ہے۔

تجلّی

ظہور کو کہتے ہیں۔ تجلی کی کئی قسمیں ہیں۔ اور ہر ایک کے آثار جدا جدا ہیں۔

تجلی ذاتی: اس کا اثر یہ ہے کہ اگر سالک کے وجود کے صفات و آثار باقی ہیں۔ تو وہ اس تجلی سے بیہوش ہو جاتا ہے چنانچہ موسیٰؑ طور پر بے ہوش ہو گئے۔ اسکے بر خلاف اگر وجود کے آثار وصفات بالکل فانی ہو جاتے ہیں تو وہ ذات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

تجلی صفات: اسکی بھی دو قسمیں ہیں۔ جلالی و جمالی۔ اگر صفات جلالی تجلی کریں تو سالک پر خشوع و خضوع کا غلبہ ہوتا ہے اور اگر صفات جمالی تجلی کریں تو سرور ولطف حاصل ہوتا ہے۔

تجلی افعالی۔ اس کا اثر یہ ہے کہ سالک کی نظر کسی مدح وذم، نفع و نقصان اور ردو قبول پر نہیں رہتی علاوہ ازایں تجلی روحانی اور تجلی ربانی میں فرق و امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ سالک کی گمراہی کا اندیشہ قوی رہتا ہے۔

توجہ

اسکی دو صورتیں ہیں۔ مرشد مرید کی اصلاح کی خاطر یا اس میں ذوق شوق، محبت، عشق، خوف وخشیت وغیرہ، اخلاق حسنہ کے حصول کیلئے حق تعالیٰ سے دعا کرے اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ بھی موقع بہ موقع اسکی جانب متوجہ رہے۔

دوسرا طریقہ مرشد اپنے دل کو تمام خطرات وخیالات سے خالی کر کے خاص طور پر مرید کی طرف توجہ کرے۔

تمثیل

کوئی ذات اپنی حالت وصفات کے بقاء کے ساتھ دوسری صورت میں ظہور کرے۔ جیسا کہ حضرت جبرئیلؑ کبھی کبھی دحیہ کلبی کی صورت میں آتے تھے۔ اس دوسری صورت کو مثالی صورت کہتے ہیں۔

تلقین

جو کچھ مرشد سے سنے یا پائے یا جو چیز اپنے مرشد سے طالب کو پہنچے وہی قبول کرے۔ وہی دیکھے اسی کو بجالائے۔ اس میں کچھ شک وشبہ نہ کرے اور اس میں کچھ کمی بیشی بھی نہ کرے۔

تجرید

دنیوی اور اخروی اغراض کو ترک کرنا تجرید ہے۔

تفرید

کسی چیز کو اپنی طرف نسبت نہ کرنا تفرید ہے۔

تشبیہ

تشبیہ اس کو کہتے ہیں جو ظاہر کے پانچ حواس سے معلوم ہو یعنی جس کو آنکھ دیکھے۔ کان سنے، زبان چکھے یا کلام کرے، بدن کو لگے جس سے سردی، گرمی محسوس ہو، ناک سونگھے یہ سب تشبیہ میں داخل ہیں۔ اسکو مرتبہ ظہور۔ اسم الظاہر اور عالم صورت کہتے ہیں۔

ذات کی دوسری شان **تنزیہ** ہے۔ یہ ایسی لطیف ہے کہ ہماری عقل اور فکر اور خیال سے بھی او جھل ہے۔ اسکو مرتبہ بطون غیب ہویت اور اسم الباطن کہتے ہیں ہمارے جسم میں روح تنزیہ ہے اور جسم تشبیہ ہے بے ہوشی اور بے خودی کی حالت تنزیہ ہے۔ ہوش اور ہوشیاری کی حالت تشبیہ ہے نیند تنزیہ ہے اور بیداری تشبیہ ہے۔

تشبیہ کو فنا ہے۔ تنزیہ کو فنا نہیں ہے۔ اسی لئے تشبیہ کو، نیست ہست نما کہتے ہیں یعنی دیکھنے میں موجود حقیقت میں کچھ نہیں۔ اور تنزیہ کو ہست نیست نما، کہتے ہیں یعنی دیکھنے میں کچھ نہیں اور حقیقت میں موجود۔

تسمیہ خوانی

چونکہ ہر مسلمان کی یہ تمنااور خواہش ہوتی ہے بلکہ وہ اسکو اپنا دینی و ایمانی فریضہ سمجھتا ہے کہ جب بچہ چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہو جائے۔یعنی اس عمر کو پہنچ جائے کہ بات سمجھ سکتا ہو اور سنی ہوئی بات کو دہرا سکتا ہو تو اسکی ابتداء قرآن کی تلاوت سے ہونی چاہئے۔اور قرآن کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے ہوتی ہے۔

اس لئے اس دن بچہ کو سورۂ فاتحہ سے قرآنی تعلیم کی ابتداء کی جاتی ہے۔اور اس غرض کیلئے مرشد یا کسی نیک صالح اور باعمل اللہ کے بندے کے ذریعہ سورۂ فاتحہ کی آیتیں پڑھائی جاتی ہیں۔تاکہ اس بچے کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور مرشد یا صالح بندہ بھی جب آمین کہے تو بچے کی زندگی کو ہدایت نصیب ہو جائے۔پس معلوم ہوا کہ یہ تسمیہ خوانی رسم نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ، مکتب نشینی، ہے یعنی مدرسہ میں سبق پڑھانے کیلئے بٹھانے کا پہلا موقع ہے۔اور اس کا افتتاح سورۂ فاتحہ سے کیا جاتا ہے۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی اچھا قدر والا کام الحمد اللہ اور دوسری روایت میں بسم اللہ سے شروع نہیں کیا جاتا وہ ناقص (ابتر) ہوتا ہے۔

بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی (اور ختم نہ ہونی چاہئے) بلکہ اسکے بعد اسکو دوسرے دن سے مکتب میں بٹھا دینا چاہئے، تا کہ بچہ پورا قرآن پڑھ لے۔ظاہر ہے کہ سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔اس میں اللہ کی تعریف ہے۔اس میں اللہ کے صفات کا ذکر ہے قیامت کے دن کا ذکر ہے۔بندے اور خدا کے درمیان جو نسبت ہے اس کا تذکرہ ہے اور اللہ سے صراط مستقیم کیلئے دعا ہے اچھے لوگوں کے راستے پر چلانے اور برے لوگوں کے راستے سے بچانے کی درخواست ہے۔اور آخر میں جب وہ معصوم بچہ اپنی معصوم زبان سے آمین کہتا ہے جس کے معنی ہیں اے اللہ میری دعا کو قبول فرما۔اور بچے کے ساتھ سننے والے بھی جب آمین کہتے ہیں تو اس وقت وہ دعا بچے کے ساتھ ساتھ سب کے حق میں قبول ہوتی ہے۔اسی لئے اس موقع پر سورۂ فاتحہ مہدویوں کے پاس پڑھاتے ہیں۔چنانچہ ہمارے پاس روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت سید محمد (مہدی علیہ السلام) کی عمر چار سال چار ماہ اور چار دن کی ہوئی تو آپ کے والد ماجد حضرت سید عبد اللہ ؓ نے آپ کی تسمیہ خوانی کا حسب دستور اہتمام فرمایا۔شہر کے مشہور، معزز اور معروف لوگوں کو دعوت دی گئی۔ضیافت کا بھی انتظام کیا گیا۔جب حضرت کو مسند پر بٹھایا گیا اور بسم اللہ پڑھانے کیلئے حضرت شیخ دانیال کو جو اس وقت کے متبحر عالم استاذ الاساتذہ اور صوفی منش بزرگ اور عارف باللہ تھے تو حضرت سید محمد ؑ نے اچانک اُٹھ کر تعظیم کی (اس مجلس میں حضرت خواجہ خضر علیہ السلام بھی تشریف فرما تھے) پھر حضرت خواجہ دانیال نے حضرت خواجہ سے فرمایا کہ آپ بسم اللہ پڑھایئے۔تو حضرت خواجہ خضر نے فرمایا آپ بسم اللہ پڑھایئے، بندہ آمین کہنے کیلئے

آیا ہے۔ چناچہ خواجہ دانیالؒ نے بسم اللہ پڑھائی اور خواجہ خضر نے آمین کہی۔

بعض لوگوں کے پاس بچے کو تسمیہ خوانی کے موقع پر اقراء باسم ربّک پڑھایا جاتا ہے۔ اور دلیل اسکی یہ دی جاتی ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتداء اقراء باسم ربّک سے ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک مجلس میں یہی بات وجہ نزاع بن گئی تھی۔ اتفاق سے فقیر کو بھی اس مجلس میں مدعو کیا گیا تھا۔ جب صاحب خانہ نے اس کاتب الحروف فقیر سے کہا کہ بچے کو اقراء باسم ربک پڑھانا چاہیئے یا سورۂ فاتحہ۔ تو فقیر نے جواب دیا آپ اپنے بچے کو پیغمبر بنانا چاہتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ کا امتی یہ سنتے ہی بچے کے دادا نے کہا کہ بس مسئلہ حل ہو گیا۔ پھر سورۂ فاتحہ پڑھایا گیا۔ پھر فقیر نے دوسروں کے سامنے اسکی تشریح کی کہ اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ پر جو پہلی وحی اللہ کی جانب سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے آئی وہ اقراء باسم ربک کی پانچ آیتوں پر مشتمل تھی۔ اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً ۲۳ سال کے عرصہ میں پورا قرآن شریف نازل ہوا۔ اب اگر کسی کو قرآن پڑھنا ہے تو اسکو چاہیئے کہ وہ اسی ترتیب سے پڑھے جس ترتیب سے رسول اللہ ﷺ نے لکھوایا ہے۔ پس اب اگر آپ قرآن کھولیں گے تو آپ کی نظر سب سے پہلے صفحہ پر پڑے گی جس پر سورۂ فاتحہ لکھا ہوا ہے۔ پس اسی سے قرآن کی تلاوت کی ابتداء ہونی چاہیئے۔

تسویت

مھدویہ کا عقیدہ ہے کہ امامنا یعنی سید محمد جونپوری مہدی موعودؑ، ہمسر رسول اللہ ﷺ ہیں۔ دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی معترضین نے عوام کو دھوکہ دینے کی زبردست کوشش کی ہے یعنی جو امور اور احکام کسی منصب کی حیثیت سے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ تمام اطلاقات اسی منصب کی حیثیت سے جاری کئے جاتے ہیں۔ اس منصب سے قطعِ نظر کرکے صاحب منصب کی ذاتی حیثیت یا محض اسکے نام یا شخصیت سے وہ اطلاقات متعلق نہیں ہوتے۔ مثلاً حضرت نبینا محمد ﷺ کیلئے نبی آخر الزمان افضل الانبیاء وخاتم الانبیاء والرسل کی حیثیت سے جن جن فضائل کا ہم اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ تمام اطلاقات اسی منصب رسالت وختمیت سے متعلق ہیں۔ اور ان تمام احکام کا اطلاق اسی خاص جہت سے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت سید محمد جونپوری کی نسبت مہدویہ جو کچھ اعتقاد رکھتے ہیں وہ آپ کے مھدی موعودؑ یا خاتم الاولیاء یا خاتم ولایتِ محمدیہ یا باطنِ محمد ﷺ ہونے کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ لیکن معترضین نے مہدویہ کے عقائد کو اس اعلیٰ اور ممتاز حیثیت سے قطع نظر کرکے (یعنی صرف نام سید محمد جونپوری ظاہر کرکے) دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر اسکے بجائے یہ بات تحقیق طلب قرار دی جائے کہ حضرت مہدی موعودؑ یا خاتم الاولیاء و خاتمِ ولایت محمدیہ کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنا صحیح ہے یا نہیں تو اصل معاملہ صاف ہو جاتا ہے کہ یہ اعتقاد صرف مہدویہ کا ہی ہے یا محققین صوفیاء کرام اور اکابرینِ امت بھی اس کے قائل ہیں۔ یہاں دھوکہ یہ لکھ کر دیا گیا ہے کہ مہدویہ کا اعتقاد ہے کہ سید محمد جونپوری رسول اللہ ﷺ کے ہم سر ہیں۔ یعنی اس جملہ کے پہلے حصے میں سید محمد جونپوریؑ لکھا گیا جو ایک نام ہے اور دوسرے جز میں رسول اللہ لکھا گیا جو کہ ایک منصب ہے۔ اور اب یہ پوچھتے ہیں کہ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ تو عام آدمی بھی یہی کہے گا کہ کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ کوئی سید محمد جو اتفاق سے سید عبد اللہ کا بیٹا ہے اور جونپور میں پیدا ہوا ہے۔ اور ایسے نام کے بہت لوگ ہو سکتے ہیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے برابر یا ہمسر یا ان کی نظیر نہیں ہو سکتا۔ اور ہمارا اعتقاد بھی یہی ہے لیکن یہاں بات صرف سید محمد جونپوری اور محمد رسول اللہ کے مابین کی نہیں ہے بلکہ یہاں جو بات ہے وہ خاتم ولایتِ محمدیہ یا خاتم الاولیاء جس کو احادیث میں خاتمِ دین بھی کہا گیا ہے اسکی نسبت خاتم الانبیاء حضور محمد ﷺ سے کیا ہے۔ اور اس نسبت کے بارے میں محققین صوفیاء اور اکابرینِ امت کا کیا عقیدہ ہے۔ گویا اب یہ سوال پوچھا جانا چاہیئے کہ محققین صوفیاء اور اکابرینِ امت کے عقیدہ میں خاتم الاولیاء، خاتمِ ولایتِ محمدیہ اور خاتم الانبیاء کے مابین کیا نسبت ہے تو جو آپ کو صحیح جواب ملے گا وہ مھدویہ کا عقیدہ ہے۔ اب دیکھیں کہ اکابرینِ امت اور محققین صوفیاء کا فضیلتِ مھدی کے بارے میں کیا عقیدہ ہے۔

۱) حضرت عوف بن منبہؓ سے روایت ہے۔ قال کنا نتحدث انه یکون في هذه الامة خليفة لا يفضل

عليه ابوبكر و عمر۔ ترجمہ: عوف بن منبہ کہتے ہیں کہ ہم یہ گفتگو کرتے تھے کہ اس امت میں ایک خلیفہ ہو گا جس سے ابو بکرؓ وعمرؓ افضل نہ ہوں گے۔

۲) محمد بن سیرینؒ سے روایت آئی ہے جس سے عوف بن منبہ کی روایت کی اور زیادہ توضیح ہوتی ہے۔ عن محمد بن سـيرين قال قيل له المهدي خير ام ابوبكر و عمر قال وهو خير منهما و يعدل النبي و في رواية انه ذكر فتنة تكون فقال إذا كان كذالك فاجلسوا في بيوتكم حتیٰ تسمعوا على الناس، بخير من ابي بكر و عمر قيل خير من ابي بكر و عمر قال قد كان يفضـل على بعض الأنبياء-اخرجهما الحافظ نعيم بن حماد في كتاب الفتن-دیکھو عقد الدرر فی اخبار المھدی المنتظر باب ہفتم۔

محمد بن سیرینؒ سے روایت ہے کہ آپ سے پوچھا گیا مھدی بہتر ہے یا ابو بکر و عمر آپ نے کہا مہدی ان دونوں سے بہتر ہے اور نبی کے برابر ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے آئندہ ہونے والے فتنوں کا ذکر کیا اور کہا کہ جب ایسا ہو تو تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو یہاں تک کہ ابو بکر اور عمرؓ سے بہتر شخص کے آنے کی خبر لوگوں سے سن لو۔ لوگوں نے کہا کیا ابو بکر اور عمر سے بہتر وہ ہو گا کہا کہ وہ بعض انبیاء سے افضل ہو گا (اس میں خاتم الانبیاء کا ذکر نہیں ہے)۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات تابعین کے دور میں ہی مشہور ہو گئی تھی۔ محققین صوفیاء کے اصول پہ اس مسئلہ کی تحقیق اور بھی واضح ہے۔ چناچہ گلشن راز میں سوال چہارم کے ضمن میں لکھا ہے۔

ظہور کل اوباشد بخاتم بدو یابد تمامی دور عالم

وجود اولیاء اور اچو عضواند کہ او کل است وایشاں ہمچوں جزء اند

(مفاتیح الاعجاز شرح گلشن راز ص ۱۹-۸۸)

یعنی، ولایت کا کامل ظھور خاتم اولیاء سے ہو گا اور اسی سے دور عالم تمامیت کو پہنچے گا تمام اولیاء خاتم الاولیاء کی نسبت کرتے اعضاء کے جیسے ہیں کیونکہ وہ کل ہے اور یہ سب اولیاء اسکے اجزا کے مانند ہیں۔ ہم چونکہ حضرت سید محمد جونپوری کو مہدیؑ اور خاتم الاولیاء کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں تو لازماً وہ تمام فضائل اور کمالات آپ کی ذات سے وابستہ ہو جاتے ہیں جن کا اطلاق احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں اکابر اہل سنت اور محققین صوفیاء امت نے اس منصب جلیل کے حامل کے حق میں دیا ہے۔ اس جہت ختمیت اور ولایتِ عظمیٰ کو پیشِ نظر رکھنا لازمی ہے۔ اب آیئے دیکھیں کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔

۱) حضرت مھدی خلیفۃ اللہ ہیں۔ چناچہ ابن ماجہ میں حضرت ثوبانؓ سے جو حدیث آئی ہے وہ علانیہ اس جہت کا

اعلان کرتی ہے۔ کہ حدیث کے الفاظ ہیں۔فاذا سمتعموہ فبایعوہ و لو حبواً علی الثلج فانه خلیفة الله المهدي(سنن ابن ماجہ) پس جب تم اسکے بارے میں سنو تو اس سے بیعت کرو اگر چہ تم کو برف پر سے رینگ کر جانا پڑے اس لئے کہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔یہ روایت موضوع یا ضعیف نہیں ہے۔کیونکہ اسکو کسی نے ابن ماجہ کے موضوعات میں شمار نہیں کیا۔ (ما تمس الي الحاجه لمن يطالع ابن ماجه) نیز اسکے متابعات ابو داؤد میں کتاب المہدی ص ۲۳ جلد دوم میں موجود ہیں علاوہ ازیں حاکم کی مستدرک جلد ۴ ص ۵،۶ اس کا متابع موجود ہے۔

۲) حضرت مہدی معصوم عن الخطاء ہیں: اس لئے کہ آپ خلیفۃ اللہ ہیں اور جو خلیفۃ اللہ ہو تا ہے وہ لازماً معصوم عن الخطاء ہوتا ہے۔خود آنحضرتؐ نے جو معصوم عن الخطاء ہیں حضرت مہدیؑ کے بارے میں إِنَّهُ يَقْفُو أَثْرِي وَ لَا يُخْطِي (وہ میرے نقشِ قدم پر چلے گا اور خطا نہیں کرے گا) کے ذریعہ آپؑ کے معصوم ہونے کی بشارت دی ہے۔

۳) حضرت مہدیؑ دافعِ ہلاکتِ امتِ محمدی ہیں۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے۔کیف تهلك امة أنا اوّلها و المهدي في وسطها و المسيح في آخرها(مشکواۃ باب ثواب ہذہ الامۃ)۔

اس روایت سے تین باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔(۱) حضرت مہدیؑ بھی دافع ہلاکتِ امتِ محمدیہ ہیں۔(۲) حضرت مہدیؑ وسطِ امت میں ہیں یعنی آنحضرتؐ کے بعد اور عیسیٰؑ سے پہلے۔(۳) دفع ہلاکتِ امتِ محمدیہ میں مہدیؑ رسول اللہ ﷺ کے مانند ہیں یعنی پیغمبر نہ ہونے کے باوجود ملحق بالانبیاء ہیں۔(۴) حضرت مہدیؑ خاتمِ دین ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے۔

عَنْ عَلي رَضِي الله عَنهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُول الله أمِنَّا اٰلِ مُحَمَّد المَهْدِي ام مِنْ غَيرِنَا قَالَ بَلْ مِنَّا يَخْتَمَ الله بِهِ الدِّينَ كَمَا فَتَحَ بِنَا۔یعنی، حضرت علیؓ نے آنحضرتؐ سے پوچھا مہدی ہم آلِ محمد سے ہیں یا ہمارے غیر سے؟۔ آپؐ نے فرمایا بلکہ ہم سے۔ اللہ ان پر دین کو ختم کرے گا جیسا کہ ہم سے اسکی ابتداء فرمائی۔

اس حدیث کی نعیم بن حماد اور ابو نعیم نے تخریج کی ہے۔ طبرانی نے بھی معجم اوسط میں یہی روایت الفاظ کے اختلاف کے ساتھ درج کی ہے۔الفاظ اس طرح ہیں۔عن علی قال رسول الله ﷺ أمِنَّا المَهْدِي ام مِنْ غَيرِنَا يَا رَسُول الله ؟ فقال بَلْ مِنَّا، بِنَا يَخْتَمَ الله كَمَا فَتَحَ بِنَا۔ ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ مہدی ہم میں سے ہیں یا ہمارے غیر سے۔ فرمایا نہیں بلکہ ہم سے ہی ہیں۔ ہم سے ہی اللہ (دین کا) اختتام فرمائے گا۔ جس طرح کہ ہم سے شروع کیا۔

اس روایت میں تو رسول اللہ ﷺ نے ابتداء اور ختم کیلئے بِنَا کا لفظ ہی استعمال فرمایا ہے۔ یعنی افتتاح بھی ہم سے ہے اور اختتام بھی ہم سے ہو گا، فرق صرف ظاہر اور باطن کا ہے۔ یہاں غیریت نہیں ہے۔ یہ بات سب کے پاس مسلم ہے کہ حضور خاتم النبیین اور افضل الانبیاء ہیں کوئی نبی آپ کے برابر نہیں ہے۔ الحمد اللہ مہدویہ کا بھی یہی عقیدہ ہے اور جو شخص اس کا منکر ہے وہ کافر ہے۔ اب یہاں جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا آنحضرتؐ کی کوئی نظیر ممکن بھی ہے یا نہیں جہاں تک باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل یا اسکی کوئی نظیر نہیں ہے۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴿الشوری:۱۱﴾ اسکے مانند کوئی چیز نہیں۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ واجب الوجود ہے اور اسکے سوا کوئی شیء واجب الوجود نہیں ہے۔ اس لئے بھی اسکی کوئی مثیل اور نظیر ممکن نہیں ہے، اور یہی توحید خالص ہے۔

اس سے خود یہ بات نکلتی ہے کہ اس کے سوا دوسروں کیلئے نظیرِ ممکن ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ حضورؐ کا وجود کیا ہے۔ یعنی واجب ہے یا ممکن ہے یا ممتنع ہے اس لئے کہ وجود کی تین ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ حضورؐ کا وجود واجب تو نہیں ہو سکتا ورنہ یہ لازم آئے گا کہ اللہ کی ذات بھی واجب ہے اور حضورؐ کی ذات بھی واجب ہو گی تو دو خدا ہو جائیں گے جو باطل ہے۔ اسی طرح تیسری شق بھی یعنی آپ کا وجود ممتنع ہو یہ بھی باطل ہے اس لئے کہ جس کا وجود ممتنع ہو گا وہ خارج میں پایا ہی نہیں جائے گا۔ حالانکہ حضور محمد ﷺ موجود ہوئے ہیں۔ پس یہ شق بھی باطل ہو گئی۔ اب رہی دوسری اور درمیانی شق یعنی حضورؐ کے وجود کا ممکن ہونا اور یہ صحیح ہے۔ اور یہی سب کے پاس بھی متفق علیہ ہے کہ جو ممکن ہے اسکی نظیر بھی ممکن پس ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کی نظیر ممکن ہے۔ اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو منطق و فلسفہ کی بحث ہوئی۔ قرآن اور حدیث سے کیا اسکی کوئی سند مل سکتی ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ اس بارے میں اصل تو قرآن و حدیث ہی ہے۔ منطق اور فلسفہ تو ان دونوں کے خادم ہیں اگر یہ بحث قرآن اور حدیث میں نہ آئی ہوتی تو منطق اور فلسفہ کو اس میدان میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوتی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سورہ طلاق کی ایک آیت ہے۔ اللَّـهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿الطلاق:۱۲﴾

یعنی اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمینیں بھی اسی قدر ہے اور ان کے درمیان اسی کا حکم اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر نہیں بتائی اور کہا کہ اگر میں اسکی تفسیر کہوں تو تم مجھے سنگسار کروگے، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم مجھے کہوگے کہ

عبد اللہ بن عباس کافر ہے۔(احیاء علوم الدین ص ۳۵) اور بروایت عمر بن علی عن وکیع عن اعمش عن ابراہیم بن مہاجر عن مجاہد عن ابن عباس آیا ہے کہ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ اگر میں اسکی تفسیر تم سے بیان کروں تو تم کفر کرو گے۔ اور تمہارا کفر یہ ہو گا کہ تم اسے جھٹلاؤ گے (جامع البیان فی تفسیر القرآن سورہ طلاق ص ۹۹) اور اسی کتاب میں دوسری روایت یہ آئی کہ ایک آدمی نے ان سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ کیا بھروسہ کہ میں تمہیں اس کا مطلب بتاؤں اور تم کافر نہ ہو جاؤ گے۔ سورہ طلاق کی اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے وہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے۔ جو اثر بن عباس کے نام سے مشہور ہے۔ اور موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ چنانچہ حاکم نیشاپوری روایت کرتے ہیں أخبرنا أحمد بن يعقوب الثقفي حدثنا عبيد بن غنام عن نخعي ابن علي ابن حكيم حدثنا شريك عن عطاء السائب عن ابي الضحىٰ عن ابن عباس انه قال الله الذي خلق سبع سمٰوٰت ومن الأرض مثلهن-قال سبع ارضين في كل أرض نبي كنبيكم- و آدم كادمكم و نوح كنوحكم وابراهيم كابراهيمكم و عيسىٰ كعيسىٰ (ہذا حدیث صحیح الاسناد لم یخرجاہ۔ المستدرک للحاکم کتاب التفسیر سورہ طلاق (جلد ۳، ۴)۔

ابن عباس سے انہوں نے اللّـهُ الَّذِي۔۔ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا زمینیں سات ہیں۔ ہر زمین میں تمہارے نبی کی طرح نبی۔ آدم کی طرح آدم، نوح کی طرح نوح، ابراہیم کی طرح ابراہیم اور عیسیٰ کے مانند عیسیٰ ہیں۔ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن بخاری اور مسلم نے اسکی تخریج نہیں کی۔ اسی طرح ایک اور روایت دوسری سند کے ساتھ مستدرک میں موجود ہے۔ ان دونوں روایتوں کو امام بیہقی نے بھی ان ہی اسناد اور متون کے ساتھ نقل کیا ہے۔ امام بیہقی کا دور ۴۵۸۔۳۸۳ کا ہے گویا اہل ظاہر یعنی محدثین اور متکلمین کے پاس یہ روایت بلا نکیر پہنچی ہے۔

اہل باطن یعنی اہل کشف کے نزدیک بھی حضرت عبد اللہ بن عباس کے اس اثر میں کوئی کلام نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی اس سلسلے میں اپنا ایک ذاتی واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ساتھ جن کو میں پہچانتا نہیں تھا خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں انہوں نے ہم کو دو بیت پڑھ کر سنائے جن میں سے ایک بیت ہم کو یاد ہے۔ لقد طفنا كما طفتم سنينا بهذا البيت طراً اجمعينا۔

ہم برسہا برس سے اس گھر کا طواف کرتے آئے ہیں۔ جس طرح کہ تم اسکا طواف کرتے رہے ہو۔ ان میں سے ایک نے مجھے ایسے نام سے پکارا جسے میں جانتا نہیں تھا۔ پھر اس نے ہم سے کہا کہ میں تمہارے قدیم اجداد میں سے ہوں میں نے پوچھا کہ آپ کو مرے ہوئے کتنی مدت ہوئی اس نے جواب دیا چالیس ہزار سے کچھ زیادہ (بروایتے چالیس ہزار دو سو اسی سال) میں

نے کہا کہ ابوالبشر آدمؑ کو اتنی مدت نہیں ہوئی۔ اس نے کہا تم کس آدم کی بات کرتے ہو۔ یہ آدم جو تم سے قریب گزرے ہیں یا دوسرے آدم اسی پر مجھے آنحضرت ﷺ کی حدیث یاد آئی کہ خدا نے ایک لاکھ آدم پیدا کئے۔ (الفتوحات المکیہ باب ۳۹۰ جلد ۳ ص ۵۴۹) برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی و علمی تاریخ پر اس اثر ابن عباس کے اثرات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس پر بحث کے دوران ایک درجن سے زائد کتابیں اور رسالے تصنیف کئے گئے۔ چناچہ اس موضوع پر مولوی عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی نے **دفع الوسواس في أثر ابن عباس زجر الناس على انكار أثر ابن عباس** اور **الآيات البينات على وجود الأنبياء** لکھیں مولوی عبد الغفور کانپوری اور دوسرے علماء نے فتویٰ بے نظیر کے نام سے مولوی عبدالحی لکھنوی کے جواب میں ایک رسالہ لکھا شاہ اسماعیل نے **رساله في إمكان النظير** کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس کے جواب میں **رساله في إمتناع النظير** کے نام سے فضل حق خیر آبادی نے لکھا۔ مولوی سراج الدین بجنوری نے فضل حق خیر آبادی کے جواب میں ایک رسالہ تحریر کیا اور ـــــ، الانتصار، کے نام سے ایک کتاب لکھی (عبدالحی الحسنی۔ الشقافتہ الاسلامیتہ فی الھند تقویم ابوالحسن ندوی ص ۲۴۵) علاوہ ازیں **الکلام الاحسن** مؤلفہ مولوی ہدایت علی۔ **تنبیه الجهال بالهام الباسط المتعال** مؤلفہ مولوی حافظ بخش بدایونی، **قول الفصیح**، مؤلفہ فصیح الدین بدایونی، **افادات صمدیه** مؤلفہ عبدالصمد سہسوانی **کشف الالتباس في أثر ابن عباس-قسطاس في موازنهء أثر ابن عباس** مؤلفہ شیخ محمد محدث تھانوی بھی (اس سلسلے میں تصنیف کی گئی (مطالعہ تصوف ص ۲۲۷) ابن عباس کا یہ اثر اگرچہ صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ لیکن حاکم نیشاپوری نے اسکو صحیح کہا ہے۔ **تفسیر جامع البیان المعروف تفسیر طبری** میں یہ اثر موجود ہے علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس اثر کو نقل کیا ہے علامہ قسطلانی نے بھی ابن کثیر کی اتباع کی ہے۔ (ارشاد الباری شرح صحیح بخاری جلد ۵، ص ۲۵۲) تفسیر روح المعانی میں لکھا گیا ہے کہ اس حدیث کو صحیح ماننے میں عقلاً و شرعاً کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ (ابوالفضل شہاب الدین سید محمد آلوسی روح المعانی سورۂ طلاق ص ۳۲) علامہ عبدالحی لکھنوی (۱۳۰۴) نے لکھا ہے کہ طبقات الارض میں انبیاء کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرتؐ افضل الانبیاء و خاتم المرسلین نہیں ہیں۔ یہ اثر صحیح ہے اور اسے صحیح ماننے میں عقلاً و شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ (دافع الوسواس مطبع یوسفی بار دوم ص ۳)۔

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مصطفی ﷺ کی نظیر ممکن ہے اور ایسا ماننے میں عقلاً و شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ ایسی صورت میں نظیرِ مصطفی کون ہو سکتا ہے۔ جواب صاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نظیر وہی شخصیت ہو سکتی ہے۔ جس کی طرف نشاندہی خود آنحضرتؐ نے بحکم خدا فرمائی ہو۔ اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ گواہ

ہیں کہ ایسی جس شخصیت عظمیٰ کی طرف آنحضرتؐ نے نشان دہی فرمائی ہے۔وہ ہستی صرف اور صرف حضرت مہدیؑ کی ہے۔چنانچہ آنحضرتؐ نے حضرت مہدیؑ کے تعلق سے فرمایا کہ اس کا نام میرا نام اسکے والد کا نام میرے والد کا نام۔اسکی ماں کا نام میری ماں کا نام ہو گا۔پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ وہ اخلاق اور صورت میں میرے مشابہ ہو گا۔چنانچہ شاہ رفیع الدین دہلوی نے حضرت مہدیؑ کا جو حلیہ احادیث مصطفیٰؐ کی روشنی میں بیان کیا ہے۔اسکو بدر عالم میرٹھی نے اپنی کتاب ترجمان السنتہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔حضرت مہدی موعودؑ اولادِ فاطمۃ الزھراء میں سے ہیں۔آپ کا قد و قامت قدرے دراز، بدن چست، رنگ کھلا ہوا۔اور چہرہ پیغمبر خدا ﷺ سے مشابہ ہو گا نیز آپ کے اخلاق پیغمبر خدا ﷺ سے پوری مشابہت رکھتے ہوں گے۔ (ترجمان السنتہ جلد ۴ ص ۳۷۲) پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔اللہ ان سے دین کا اختتام فرمائے گا۔جس طرح کہ ہم سے اسکا افتتاح فرمایا۔(یعنی حضرت مہدیؑ خاتم دین ہوں گے جسطرح کہ آنحضرتؐ خاتم الانبیاء ہیں) نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہدی مجھ سے ہے۔میرے نقشِ قدم پر چلے گا کبھی خطا نہیں کرے گا۔یعنی معصوم ہو گا جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ معصوم عن الخطاء تھے)۔نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہدی اللہ کا خلیفہ ہے۔چنانچہ ثوبانؓ سے جو روایت آئی ہے اس میں صاف الفاظ میں یہ ہدایت کیگئی ہے کہ جب وہ آئیں تو تم ان کے پاس آؤ اور ان سے بیت کرو۔اگر چہ تم کو برف پر سے گذرنا پڑے۔اس لئے کہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔(اور آنحضرتؐ بھی تو نبی ہونے کے اعتبار سے اللہ کے خلیفے ہیں) پھر فرمایا کہ میری امت کس طرح ہلاک ہو گی جس کے اول میں میں ہوں اور وسط میں مہدی ہیں۔اور آخر میں مسیح ہیں۔گویا کہ حضرت مہدیؑ وسط امت میں اسی طرح امتِ محمدی کو ہلاکت سے بچائیں گے، جس طرح کہ خود آنحضرتؐ نے اول حصہ میں بچایا تھا۔

کیا مندرجہ بالا فرامین ختمی مرتبت رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مہدیؑ مندرجہ بالا جہات سے نظیر رسول اللہ ﷺ ہیں۔جب قرآن کی تفسیروں سے آنحضرتؐ کی احادیث سے صحابہ کرام کے آثار سے نقلاً اور اصولی اعتبار سے عقلاً اور علماء کے اقوال سے شرعاً اور صوفیہ کے احوال سے کشفاً نظیرِ رسول اللہ ﷺ ممکن ہے۔اور وہ صرف مہدیؑ ہی ہیں تو اس بات میں صرف مہدویہ کو مخصوص کرتے ہوئے ان پر الزام رکھنا بے معنی بھی ہے اور دین کے علوم سے بے بہرہ ہونے کی دلیل بھی۔متکلمین کے علاوہ صوفیاء و محققین بھی اس بات کے قائل اور معتقد ہیں کہ امتِ محمد رسول اللہ ﷺ میں آپ کی نظیر یعنی ہم مرتبہ شخص ہونا ممکن ہے۔چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

۱)　گفت پیمبر کہ ہست از امتم　کو بود ہم گوہر و ہم ہمتم۔

ترجمہ: آخری پیغمبرؐ نے فرمایا میری امت سے ایک ایسا شخص ہو گا جو میرا ہم نسب اور ہم ہمت ہو گا۔

۲) حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنی مناجات میں جب اللہ سے دعا فرمائی ہے تو حضرت مہدیؑ کو بھی واسطہ اور وسیلہ بنایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "یارب بحق مہدی وہادی کہ ذات او مانند مصطفی است سالار اتقیاء"۔ ترجمہ۔ اے اللہ میری دعا کو قبول فرما مہدی اور ہادی کے واسطے سے کہ جسکی ذات مصطفی کے مانند، کاروان متقیوں کا سالار ہے۔

۳) اسی طرح حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے اپنی گرانقدر تصنیف۔ منطق الطیر۔ میں حضرت مہدیؑ کا ذکر اسطرح فرمایا ہے۔ آخرش مہدی و آل مرتضیٰ رکن ایمانند و آل مصطفی۔ یعنی، اسکے آخر میں مہدی ہیں جو مرتضیٰ کی آل سے ہیں وہ ایمان کے رکن ہیں اور مصطفی کی آل سے ہیں۔

ہر کہ بغض اہل بیتت داشتہ بعد تو تخم شقاوت داشتہ۔ یعنی، جو شخص تیرے اہل بیت کا بغض رکھتا ہے تیرے بعد وہ شقاوت کا بیج (اپنے سینے میں) بوتا ہے۔

ہمارا بھی اعتقاد وہی ہے جو اہل سنت کے اکابرین اور صوفیاء کرام کا حضرت خاتم الاولیاء کے بارے میں ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا حوالوں سے ثابت ہو رہا ہے۔ بحث کا موضوع تسویت خاتمین ہے یعنی خاتم الانبیاء اور خاتم ولایت محمدیہ میں بالفاظ دیگر ظاہر و باطن میں نسبت کی بحث ہے۔ اسکو چھوڑ کر نہایت عیاری اور چالاکی سے بلکہ بد دیانتی سے اس منصب جلیل کو چھوڑ کر یہ لکھنا کہ کیا سید محمد جونپوری رسول اللہ ﷺ کے برابر ہو سکتے ہیں۔ اور خود ہی جواب دیتے ہیں کہ نہیں۔ اور ایسا اعتقاد رکھنا کفر ہے۔

دیکھو کہ اس قسم کی دریدہ دہنی اور گستاخی کا ہدف کن کن بزرگ ہستیوں کو بنایا جارہا ہے۔ (یعنی رسولؐ صحابہؓ کرام، تابعین، اکابرین اہل سنت، محققین صوفیاء کرام اور اولیاء عظام) اس سے بھی بڑی بدبختی کوئی ہو سکتی ہے کہ ایک ولی کے تعلق سے عداوت اور دشمنی اللہ سے جنگ کرنے کے مترادف ہے تو خاتم الاولیاء کے تعلق سے بد گوئی اور ہرزہ سرائی کا انجام کیا ہو گا، کہنے کی ضرورت نہیں ہے

قرآنِ شریف میں احادیث رسول اللہ ﷺ میں معہ یا معي یا في درجته واحدة یاهم بمنزلتي یاهم اخواني۔ کے الفاظ آئے ہیں۔

اسی طرح إِنَّ اللَّـهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿البقرة:۱۵۳﴾ إِنَّ اللَّـهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا ﴿النحل:۱۲۸﴾ آیا ہے۔ نیز علماء أُمّتي كأنبياء بني إسرائيل آیا ہے۔

ان کا ترجمہ مفسرین اور محدثین کے طرز پر کرنا چاہئے نہ کہ من مانا ترجمہ کیا جائے۔ پھر اس پر اپنی جانب سے آیات کا بے موقع و محل اطلاق کرتے ہوئے حکم لگایا جائے۔ حالانکہ عام آدمی کو قرآن اور حدیث سے استدلال کرنے کا حق ہی نہیں ہے اسکی تشریح اکابرین اہل سنت نے کی ہے۔ اور عام آدمی کس کو کہتے ہیں۔ اسکی تعریف بھی کر دی ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرنے کا حق کس کو ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ انه لا يجوز للعامي أن يتمسك بالأحاديث والمستدل الذي لم يبلغ درجة الاجتهاد فهو منزلة العامي۔ ترجمہ۔ عام لوگوں کو احادیث سے تمسک کرنا جائز نہیں ہے اور (وہ استدلال کرنے والا عالم) جو درجۂ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو، وہ بھی عوام کی منزل میں ہے۔

ابن قیم نے اعلام الموقنین میں لکھا ہے کہ ”لا يجوز لِأحد أن ياخذ من الكتاب والسنة ما لم يجتمع فيه شروط الإجتهاد من جميع العلوم“۔ ترجمہ۔ کسی شخص کو کتاب و سنت سے احکام اخذ کرنا جائز نہیں ہے جب تک اس میں جملہ علوم کے شرائط اجتہاد مجتمع نہ ہوں۔ ان اقوال کی موجودگی میں کسی عام شخص کا دعویٰ کرنا کہ وہ کسی کے عقائد کو اپنے طور پر قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر پرکھ سکتا ہے اپنی حد سے آگے بڑھ کر کلام کرنا ہے۔ جس کا اسکو کوئی حق نہیں ہے۔

ہم نے سابق میں ابن سیرینؒ کی دو روایتیں پیش کی ہیں۔ ان کے تعلق سے محدثین اور دیگر اکابرین کی آراء کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ابن سیرینؒ کی روایت کا کسی نے انکار نہیں کیا۔ البتہ ان کی تاویل کرنے کی ضرور کوشش کی ہے اس طرح کہ جس سے وہ روایتیں مجروح نہ ہوں۔

۱) چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے مذکورہ صدر دونوں روایتوں کو نقل کرکے اپنا تبصرہ یوں تحریر کیا ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں حدیثوں کی وہی تاویل کی جائے گی۔ جو اس حدیث سے کی جاتی ہے کہ حضورؐ نے صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا۔ آخری زمانے میں نیک عمل کرنے والے کیلئے تم میں سے پچاس کے برابر اجر و ثواب ہوگا۔ (اسلام میں امام مہدی کا تصور مولانا حافظ محمد ظفر اقبال، ص ۵۲ الحاوی للفتاویٰ جلد ۲ ص ۱۳)۔

۲) علامہ ابن حجر ہیتمی مکی نے بھی علامہ سیوطی کی تاویل کو قبول کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ امام مہدی کی افضلیت اور ثواب کا اضافہ ایک امر نسبی ہے اس لئے کہ کبھی کبھار مفضول میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو افضل

میں نہیں ہوتیں اسی وجہ سے تو طاؤس نے امام مہدی کا زمانہ پانے کی تمنا کی ہے۔(القول المختصر فی علامات المہدی المنتظر ص، ۱۷)۔

۳)　علامہ سید محمد برزنجی اس سلسلے میں اپنی تحقیق یوں رقم فرماتے ہیں۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ باہمی فضیلت کی جہات مختلف ہوسکتی ہیں۔اس لئے ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم کسی ایک فرد کو مطلق فضیلت دے دیں۔ہاں اگر آنحضرتؐ ہی کسی کو کلی فضیلت دے دیں تو اور بات ہے ورنہ درست نہیں کیوں کہ ہر مفضول میں کسی نہ کسی جہت سے کوئی ایسی چیز پائی جاتی ہے جو افضل میں نہیں ہوتی۔(الاشاعتہ ص۲۳۸)۔

۴)　علامہ علی قاری نے اپنی کتاب المشرب الوردی فی مذہب المہدی میں تحریر فرمایاامام مہدی کی افضیلت پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ حضورؐ نے ان کو خلیفۃ اللہ فرمایاہے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کو زیادہ سے زیادہ خلیفہ رسول اللہ کہا جاتاہے۔(الاشاعۃ ص۲۳۸)ماخوذ از اسلام میں مہدی کا تصور۔مولانا محمد ظفر اقبال ص ۵۴۔۵۳۔۵۲)

ان مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں ایک بات جو مشترک ہے وہ یہ ہے کہ کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا۔

البتہ اسکی تأویلیں کی ہیں اور لکھاہے کہ ہاں اگر حضورؐ ہی کسی کو کلّی فضیلت دے دیں تو اور بات ہے، پس یہی بات اس باب میں قول فیصل ہے اور وہ یہ ہے جیسا کہ ملا علی قاری نے لکھاہے ”امام مہدی کی فضیلت پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ حضورؐ نے ان کو خلیفۃ اللہ فرمایاہے۔اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کو زیادہ سے زیادہ خلیفہ رسول اللہ کہا جاسکتاہے“ بر خلاف ان تمام حقیقتوں کے آپ دیکھئے کہ ختم رسالت و نبوت کے تعلق سے محمد قاسم نانوتوی بانیء دارالعلوم دیوبند کس عقیدہ کے حامل ہیں۔دیکھئے اور ان پر قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر حکم لگایئے، چنانچہ وہ اپنے عقیدہ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں بالفرض آپؐ کے زمانے میں کہیں اور کوئی نبی ہو۔جب بھی آپ کا خاتم نبی ہونا بدستور باقی رہتاہے۔اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی بھی کوئی نبی پیدا ہو تو بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ سب میں آخری ہیں مگر اہل فہم پر روشن ہے کہ تقدیم یا تاخیر زمانہ میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔(تحذیر الناس مطبوعہ ص ۲۸) اتنا ہی نہیں۔محمد قاسم نانوتوی تو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سری رام چندر اور سری کشن جی مامور من اللہ ہونے میں رسول اللہؐ کے برابر ہیں۔(مباحثہ شاہ جہاں پوری مطبوعہ ۴ اور صفحہ ۷۶) کیا اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے؟ یہ نہ تو اہل سنت کا ہے اور نہ ہی مہدویہ کا۔اس لئے کہ مہدویہ کے عقائد تو وہی ہیں جو اہل سنت کے اکابر اور محققین صوفیاء امت کے ہیں۔ان میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔چنانچہ خاتمِ ولایت کو خاتمِ نبوت کے ساتھ جو نسبت ہے اسکو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے۔

خاتم ولایت کو خاتمِ نبوت کے ساتھ نسبت تامہ حاصل ہے۔ اگر چہ باعتبار تعین و بلحاظ ظاہر خاتمین میں امتیاز پایا جاتا ہے اور آدمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ و عیسیٰ غیر محمد (محمد سے جدا جدا اور سوا) ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے تمام انبیاء نور محمدی کے مظہر ہیں۔ اور ازل سے ابد تک دائرہ وجود کا مرکز حقیقت محمدی کے خورشید اعظم کے سوا نہیں۔ نبوت ختم ہونے سے پہلے ہر زمانے میں انبیاء کے مظاہر اور نشاءت، حسب تفاوت استعداد اس کا ظہور ہوتا رہا اور نبوت ختم ہو جانے کے بعد وجود اولیاء میں وہ نور ظاہر ہے۔ چونکہ سّر ولایت اور کمال محمدی تمام کاملین میں دائر ہے اسلئے صاحب گلشن راز نے فرمایا ہے نور نبی کبھی موسیٰ سے ظاہر ہوا اور کبھی آدم سے۔ آدم کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی ذات مطلع آفتاب نبوت کا مبدأ نقاط واقع ہوئی ہے آپ کو تمام انبیاء کے ساتھ پدری نسبت حاصل ہے۔ لیکن معنوی لحاظ سے آدم حقیقت محمدی کے ساتھ نسبت فرزندی رکھتے ہیں۔ گلشن راز میں حقیقت محمدی یا ولایت محمدی یا نور محمدی کا فیضان جاری وساری رہنے کا بیان اس طرح کیا ہے۔

"نبوت را ظہور از آدم آمد کمالش در وجود خاتم آمد" ولایت بود باقی تا سفر کرد چو نقطہ در جہاں دورِ دگر کرد

"ظہور کل او باشد بخاتم بدو یابد تمامی دور عالم" وجود اولیا او را چو عضو اند کہ او کل ست وایشاں ہمچو جزاند

"چو او با خواجہ دارد نسبت تام ازو با ظاہر آید رحمت عام" شود او مقتدائے ہر دو عالم خلیفہ گردد از اولاد آدم

ان اشعار کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نبوت کا ظہور اول آدم سے ہوا اور نبوت حضرت خاتم الانبیاء کے وجود باجود میں کمال کو پہنچی نبوت ختم ہونے کے بعد ولایت باقی رہی اور نقطہ کی طرح جہاں میں دوسرا دور کیا ولایت کا کامل ظہور خاتم الاولیاء سے ہوگا اور اسی سے دور عالم تمام ہوگا۔ تمام اولیاء خاتم الاولیاء کے اعضاء کے جیسے ہیں کیوں کہ وہ کل ہے اور یہ تمام اولیاء اجزاء کے مانند ہیں چونکہ خاتم الاولیاء کو آنحضرتؐ سرورِ کائناتؐ سے نسبت تامہ حاصل ہے۔ اسلئے آپ سے رحمت عالم ظاہر ہوگی وہ خاتم الاولیاء ہر دو عالم کا مقتدا اور اولادِ آدم سے خلیفہ ہوگا۔

مفاتیح الاعجاز میں خاتم الاولیاء کی ذات سے ولایت کا کل ظہور ہونے کی یہ تشریح کی گئی ہے۔

ظہور تمام ولایت وکمالش بخاتم اولیاء خواہد بود چہ کمال حقیقت دائرہ در نقطۂ آخیر بظہور می رسد وخاتم الاولیاء عبارت از محمد مہدی است کہ موعود حضرت رسالت است۔ یعنی ولایت کا تمامی ظہور اور کمال خاتم الاولیاء کی ذات سے ہوگا۔ کیونکہ دائرہ کی حقیقت نقطۂ اخیر سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور خاتم الاولیاء سے مراد محمد مہدیؑ ہیں جو حضرت رسالت مآب ﷺ کے موعود ہیں۔

توکل

حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے توکل کو فرائض ولایت میں سے ایک فرض قرار دیا ہے۔اس لئے کہ اللہ نے قرآن شریف میں ایمان والوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا ہے۔اور یہ شرعی ضابطہ ہے کہ اللہ نے قرآن شریف میں امر کے صیغہ کے ذریعہ جس چیز کا حکم دیا ہے وہ فرض کہلاتا ہے چنانچہ اللہ نے فرمایا، وَأَقِيمُوا الصَّــلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴿البقرۃ:۴۳﴾یعنی نماز کو قائم کرو اور زکواۃ ادا کرو۔تو اس طرز بیان سے نماز اور زکواۃ کی فرضیت کا حکم ہی مستفاد ہوتا ہے توکل کے لغوی معنی ہیں بھروسہ کرنا۔اور اللہ تعالیٰ جس چیز کو پسند کرتا ہے اور جس چیز کا حکم دیتا ہے وہ اللہ پر بھروسہ کرنا ہے۔کیونکہ وہی ذات بھروسہ کے قابل ہے کیونکہ وہ ہستی باقی رہنے والی ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے۔اس کے سوا جتنی چیزیں ہیں ایک تو وہ خود فانی ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ ہمہ جہتی قدرت نہیں رکھتیں۔آدمی جب دوسری چیزوں پر بھروسہ کرتا ہے تو بعض اوقات ان کی طرف سے ناکامی بھی مل جاتی ہے۔لیکن جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔انبیاء علیہ السلام سے بڑھ کر دانائے توکل کون ہو سکتا ہے اس لئے توکل کی تعلیم اس کا اظہار اور اس پر عمل ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے توکل کا اظہار اسطرح فرمایا۔

۱) يَا قَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّـهِ فَعَلَى اللَّـهِ تَوَكَّلْتُ﴿یونس:۷۱﴾اے میری قوم اگر میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی آیات سے نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے تو میرا بھرسہ اللہ پر ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے سامنے پیغام خداوندی کو پیش کیا اور آپ کی قوم نے ماننے سے انکار کیا اور کہا تم ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں لائے اس پر ہود علیہ السلام نے فرمایا۔

۲) إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّـهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ﴿ہود:۵۶﴾میں اللہ پر جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بھروسہ رکھتا ہوں ۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو ہدایت قبول کرنے سے منکر پایا تو فرمایا۔

۳) وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّـــــهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴿ہود۸۸﴾۔اور مجھے توفیق کا ملنا اللہ ہی کی جانب سے ہے۔میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے توکل کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا۔

۴) يَا قَوْمِ إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّـهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّسْلِمِينَ﴿یونس:۸۴﴾۔اے میری قوم کے لوگو اگر تم خدا پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ رکھو اگر تم فرماں بردار ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور محمد مصطفی ﷺ کو بھی قرآن مجید میں متعدد جگہ اللہ پر توکل کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

۵) وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّـهِ إِنَّ اللَّـهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿آل عمران:۱۵۹﴾اور دینی کام میں ان سے مشورہ لیا کرو اور جب پکا ارادہ کرلو تو خدا پر بھروسہ کرو (اور وہ کام کرڈالو)۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّـهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿انفال:۶۱﴾اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

منافقین آپ ﷺ کی خدمت میں ہوتے تو کہتے ہم آپ کے فرماں بردار ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے چلے جاتے توراتوں کو مشورہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ اس سے آپ کو باخبر کرتے ہوئے فرمایا۔

۶) فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّـهِ وَكَفَىٰ بِاللَّـهِ وَكِيلًا﴿نساء:۸۱﴾ان کا کچھ خیال نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہی کافی کارساز ہے۔

اس طرح آپ ﷺ سے اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر لوگ آپ سے پھر جائیں تو آپؐ کو ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں آپ ان سے کہدیں۔

۷) حَسْبِيَ اللَّـهُ لَا إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴿التوبۃ:۱۲۹﴾اللہ میرے لئے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

توکل کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں صوفیہ کے اتنے اقوال نقل کئے گئے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ شیخ سہل بن عبد اللہ تستری کہتے ہیں۔ اوّل مقامات التوکل ان یکون العبد بین یدي اللہ تعالیٰ کالمیت بین یدي الغاسل یقلبه کیف اراد لا یکون له حرکة و لا تدبیر (عوارف المعارف علی حاشی الاحیاء۔ ج،۴:ص۳۷۳،۳۷۴۔)
توکل کا پہلا مقام یہ ہے کہ بندہ اللہ کے سامنے اس طرح ہو جائے جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں، وہ اسے جسطرح چاہتا ہے پلٹاتا ہے، اس مردہ میں نہ کوئی حرکت ہوتی ہے نہ کوئی تدبیر۔

شیخ ذوالنون مصری کے نزدیک، ترک تدبیر اور اپنے اختیار و قوت سے باہر نکل جانے کا نام توکل ہے۔ (الرسالہ

القشیریہ ص ۹۹)۔

حضرت ابو سلیمان دارانی کا قول ہے۔زاہدوں کا آخری قدم متوکلین کا پہلا قدم ہوتا ہے۔(طبقات صوفیہ ص ۸۰)۔

شیخ ابو علی دقاق کے پاس توکل کے ۳درجے ہیں۔

التوکل صفة المومنين والتسليم، صفة الأولياء و التفويض صفة الموحدين-فالتوكل صفة العوام و التسليم صفة الخواص و التفويض صفة خواص الخواص(الرسالۃ القشیریہ)ترجمہ:توکل مومنین کی صفت ہے،تسلیم اولیاء کی صفت ہے،تفویض موحدین کی صفت ہے،پس توکل عوام کی صفت ہے۔تسلیم خواص کی صفت ہے اور تفویض خوص الخواص کی صفت ہے۔

چناچہ وہ کہتے ہیں کہ توکل انبیاء کی،تسلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور تفویض نبی کریم ﷺ کی صفت ہے۔

صوفیاء کرام تلاش معاش تو کیا کرتے اسکے متعلق سوال بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔شیخ حاتم اصمؒ سے ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے۔انہوں نے جواب میں قرآن کی آیت پڑھی۔ وَلِلَّـــهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ﴿المنافقون:۷﴾۔زمین وآسمان کے خزانے اللہ ہی کے ہیں لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔

۸)نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّـــهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ أُولَـــئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴿الأنفال:۲،۴،۳﴾ترجمہ۔بے شک ایمان والے وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیات ان مومنوں کا ایمان بڑھادیتی ہیں اور وہ مومنین اپنے رب پر توکل کرتے ہیں وہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ (فی سبیل اللہ) کرتے ہیں،یہی لوگ حقیقی اور سچّے مومن ہیں،جن کیلئے ان کے رب کے پاس مرتبے ہیں،بخشش ہے اور رزق کریم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ توکل کو اللہ نے مومنوں کی صفات میں شمار کیا ہے اور ایسی صفات رکھنے والوں کو ہی۔ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴿الأنفال:۴﴾ بھی فرمایا ہے۔اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایمان اور توکل میں گہرا تعلق ہے یعنی جیسے جیسے ایمان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے توکل کے مرتبے میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔مومن عام ہے تو اس کا توکل بھی عام ہوگا اور اگر مومن خاص ہوگا تو توکل بھی خاص اور اعلی مرتبہ کا ہوگا۔

جیسا کہ اللہ نے فرمایا" إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿آل عمران:۱۵۹﴾"۔اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔اور دوسری جگہ بڑے شاندار الفاظ میں ارشاد ہوا ہے۔وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴿المائدۃ:۲۳﴾۔اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔اس آیت میں تو اللہ نے توکل کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔

ان تمام آیات ربانی کے مطالعہ سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ مومن پر توکل فرض ہے۔یہ اور بات ہے کہ جس درجہ کا ایمان ہو گا اسی درجہ کا توکل ہو گا یا جس درجہ کا توکل ہو گا اسی درجہ کا ایمان ہو گا اسی لئے حضرت مہدی علیہ السلام نے خدا کے حکم سے جو قرآن میں موجود ہے توکل کو فرض فرمایا ہے۔اوراللہ نے بالخصوص رسول اللہ ﷺ کو توکل اختیار کرنے کا حکم جن الفاظ میں دیا ہے، وہ قابل غور ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ رَّبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴿المزمل:۹﴾۔(اللہ ہی) مشرق اور مغرب کا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس اسی کو وکیل بنالو۔اس آیت میں اللہ نے تین باتیں بیان فرمائی ہیں۔(۱) للہ ہی مشرق و مغرب کا رب ہے۔(۲)اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔(۳) پس اسی کو اپنا وکیل بناؤ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ یہاں رسول اللہ ﷺ کو للہ ہی پر بھروسہ کرنے کا حکم دینا چاہتا ہے مگر اس سے پہلے اللہ نے دو باتیں ایسی بیان فرمائیں جو توکل کے حکم کی وجہ موجہ ہیں۔ایک یہ ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے جسکی طرف رجوع ورغبت ہو سکے۔اب یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اگر اسی پر بھروسہ کر لیا جائے تو ہماری معاش کا کیا ہو گا۔تو آیت کے پہلے حصّے میں اس کا جواب دے دیا کہ رب المشرق والمغرب۔یعنی وہ تو مشرق (اہل مشرق) اور مغرب (اہل مغرب) کا پالن ہار ہے۔جب وہ سکو پال رہا ہے تو کیا تم کو بھول جائے گا۔ہر گز نہیں اللہ تم کو ضرور تمہارا رزق جو اس کے پاس مقدر ہے ضرور پہنچائے گا تم اس پر بھروسہ تو کرو۔

اب رہی یہ بات کہ تدبیر و فکر معاش اور توکل میں کیا نسبت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ۔

۱) یا تو انسان تدبیر کرے، معاش کی فکر کرے اور اسباب کو اختیار کرے اور اسباب کو ہی سب کچھ جانے۔

۲) یا انسان تدبیر بھی کرے، معاش کی فکر بھی کرے اور اسباب کو بھی اختیار کرے اور اللہ پر بھروسہ بھی کرے۔

۳) یا انسان صرف للہ پر بھروسہ کرے۔نہ تدبیر کرے اور نہ اسباب کو اختیار کرے بلکہ مسبب الاسباب پر نظر رکھے۔اس میں پہلی صورت تو ہر گز مومن کیلئے روا نہیں ہے۔

دوسری صورت جائز ہے۔ صحیح اور جائز اسباب اختیار کرے۔ لیکن مسبب الاسباب سے غفلت نہ ہو۔ اسکی اجازت ہے اسی کو رخصت کہتے ہیں۔

اور تیسری صورت یہ کہ آدمی اسباب سے قطع نظر کرے۔ اور صرف مسبب الاسباب کو دھیان میں رکھے یہ توکل کا انتہائی بلند مقام ہے جس کو عزیمت اور عالیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا دین عزیمت ہے اگر اس پر عمل نہ ہو سکے تو رخصت پر عمل ہو سکتا ہے۔

چنانچہ روایت ہے۔ بعض لوگوں نے حضرت مہدی علیہ السلام سے عرض کیا کہ کیا رخصت بھی دین میں داخل ہے۔ آپؑ نے فرمایا دین تو عزیمت ہے (جس پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے) کیونکہ اگر کسی وقت عزیمت پر عمل سے باز رہے اور (نیچے) اتر آئے تو رخصت میں (قدم قائم) رہ سکے اگر (رخصت پر عمل کو کافی سمجھ لیا جائے اور) رخصت سے کسی وقت اتر آئے تو (دین کا) ٹھکانہ کہاں باقی رہ سکیگا۔ (انصاف نامہ باب ۵)۔

پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فقراء کے پاس زندگی کا اصول یہی ہے کہ وہ کچھ نہ کر کے اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں غلط نظریہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ فقراء کی زندگی کا محور ذات خدا پر بھروسہ ہوتا ہے۔

بس یہ ظرف کی بات ہے۔ کسی کا ظرف چھوٹا ہوتا ہے اور کسی کا بڑا۔ کسی شخص کے پیر میں کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو واویلا کرتا ہے اور کسی کا گھر اجڑ جاتا ہے تو اُف بھی نہیں کرتا۔ جن کا خیال روٹی میں رہتا ہے۔ وہ اس کو پانے کے لئے محنت ومشقت دن رات کرتے ہیں اور جن کی دھن خدا کو پانے کی ہوتی ہے ان کا خیال نہ بھوک کی طرف جاتا ہے اور نہ پیاس کا ان کو احساس ہوتا ہے۔ یہ صرف عشق ومحبت کی باتیں ہیں۔ جن کو اللہ کا عشق ہوتا ہے وہ صرف اللہ کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور جو روٹی کے بندے ہوتے ہیں وہ صرف روزی روٹی کی فکر اور تلاش میں اپنی عمر عزیز گنوا دیتے ہیں۔

حالانکہ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّـهِ رِزْقُهَا ﴿ھود:٦﴾، زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کے رزق (کی ذمہ داری) اللہ پر نہ ہو۔

حضرت مہدی علیہ السلام نے اس نکتہ کو بہتر انداز میں سمجھایا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ توکل وہ نہیں ہے جو رزق کیلئے کیا جائے۔ کیونکہ رزق کے تعلق سے خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ کوئی جاندار زمین میں ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ پر نہ ہو۔ یہ وعدہ خدا کا ہے۔ اگر تو اس وعدہ پر ایمان رکھے گا تو تو مومن ہے۔ ورنہ تو کافر

ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ رزق یعنی روزی کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہے بہر صورت وہ تو ملنے والی ہے۔ ہاں اللہ پر بھروسہ اسکے کرم، فضل اس کے دیدار کے تعلق سے ہونا چاہئے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ﴿الطلاق:۳﴾ ۔"اور جس نے اللہ پر بھروسہ کیا تو وہ اس کیلئے کافی ہے" اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

اِشراف نفس۔ اِشراف نفس بھی توکل کے خلاف ہے۔ اشراف نفس کے معنی نفس کا کسی غیر سے کسی چیز کے حصول کا انتظار کرنا یا اس کا امیدوار ہونا ہے۔ اور یہ چیز توکل علی اللہ کے خلاف ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فقراء دائرہ کو ایسی چیز سے بھی منع فرمایا ہے۔ اور یہ چیز ایسی ہے جسے حضور خاتم الانبیاء علیہ السلام نے بھی پسند نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جو چیز اشراف نفس یعنی انتظار نفس کے بعد ملے اللہ اس میں برکت نہ دے"۔

مہدویہ کے اس عمل کو اغیار نے بھی پسند کرتے ہوئے اسکی تعریف کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں، بزرگوں نے ایسی چیزوں سے سخت اہتمام کے ساتھ پرہیز کیا ہے کیونکہ حضورؐ کی بددعا جس چیز میں شامل ہو وہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے (معرفت الٰہیہ، حکیم محمد اختر صاحب ص ۱۵۳، ۱۵۲)۔

رزق کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگ اللہ پر کامل بھروسہ کروگے تو اللہ تم کو رزق ایسا ہی عطا کرے گا جس طرح کہ پرندوں کو ان کا رزق دیا جاتا ہے۔ پرندے صبح میں بھوکے پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکل کر جاتے ہیں اور شام میں پیٹ بھرے ہوئے واپس آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ توکل یقین اور معرفت خداوندی کا پھل ہے۔ یقین اور معرفت جس درجہ کی ہوگی توکل بھی اسی درجہ کا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا بچہ اپنی ماں پر بھروسہ کرتا ہے اگر اس کو بھوک لگے، یا کچھ تکلیف ہو یا اس کے کپڑے گیلے ہوگئے ہوں تو وہ صرف روکر اپنی ماں کو آگاہ کردیتا ہے پھر ماں سب کچھ دیکھ لیتی ہے۔ گویا رونا اسکی تدبیر ہے۔ (حالانکہ اسکو اس کا خیال بھی نہیں رہتا)۔ اسی طرح ایک مریض ایک ڈاکٹر کے پاس رجوع ہوکر اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔ پھر اسکی طرف سے جو دوا، انجکشن تجویز ہوتا ہے۔ اس کے تعلق سے وہ ڈاکٹر پر بھروسہ کرتا ہے اسی طرح ایک مقدمہ کیلئے ایک وکیل پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ دیکھئے ان تمام صورتوں میں تدبیر تو اختیار کی جارہی ہے لیکن پھر، توکل، تو دوسروں پر ہی ہوتا ہے، آخری دو صورتوں میں تو ڈاکٹر اور وکیل کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ کوشش کرنا ہمارا کام ہے۔ کامیاب کرنے والا اور شفا دینے والا اللہ ہی ہے۔ لیکن ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے۔ جہاں کچھ تدبیر اختیار نہیں کی جاتی، سارا معاملہ توکل پر رہتا ہے۔ اور بحمد اللہ وہ کام پورا ہوجاتا ہے۔ تدبیر اس لئے اختیار نہیں کی جاتی کہ تدبیر اختیار کرنے والا ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ایک آدمی مرجاتا ہے۔ اب

اس کا سدھارا کرنا نہلانا، کفن دفن کا کام ضروری ہوتا ہے۔ لوگ مُردے کو دیکھ کر (اگرچہ وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو) چھوڑ نہیں دیتے۔ سب مل کر اخراجات برداشت کرتے ہوئے اس کام کو انجام دیتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ مر چکا ہے اور زندوں کے حوالے ہو چکا ہے۔

اسی طرح عرفاء جیتے جی مر جاتے ہیں بقول رسول اللہ ﷺ مُوْتُوا قَبلَ أنْ تَمُوتُوا۔ یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ تو یہ لوگ بھی اپنی جانب سے تدبیر نہیں کرتے بلکہ جملہ معاملات کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں، جو حیّ لا یموت ہے۔ مطلب یہ کہ توکل کاہلی اور سستی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اپنے آپ کو، اپنے جملہ امور کو، اپنے خواہشات، مطالبات، احساسات اور اپنے جذبات سبکو کلیتہ حوالے کر دیتے ہیں اس ہستی کے جو کہ زندہ ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ تدابیر کو کامیاب کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جانے لگا تو فرشتوں نے التجا کی کہ آپ نے تو سوال نہیں کیا۔ ہم آپ کی اس نازک وقت میں مدد کریں گے آپ نے فرمایا نہیں۔ ضرورت نہیں یکے بعد دیگرے بڑے بڑے فرشتوں نے مدد کرنے کی درخواست کی آخر میں جبرئیل علیہ السلام نے بھی درخواست کی مگر آپ نے ایک ہی جواب دیا، اما إليك فلا، میں تمہاری طرف نظر احتیاج اُٹھاؤں یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ اللہ کو پکاریئے۔ آپ نے جواب دیا اسکو پکارنا چاہئے جو نہ دیکھتا ہو نہ سنتا ہو۔ جب وہ خود دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے تو اسکو کیا پکاروں، اسکو جو منظور ہو گا مجھے بھی منظور ہے، آخر کار اللہ نے آگ کو حکم دیا اے آگ تو ابراہیم علیہ السلام کے حق میں ٹھنڈی بھی ہو جا اور سلامتی کا باعث بھی۔ یہ توکل کی اعلی مثال اور اعلیٰ شان نہیں تو اور کیا ہے۔ اور یہ واقعہ قرآن شریف میں موجود ہے۔

توکل کا اعلیٰ مرتبہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کا خیال بھی دل میں آجائے۔ چنانچہ وہ عبادت یعنی بندگی بھی کرتے ہیں تو صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور صرف اس کے حکم کی تعمیل کی غرض سے۔ نہ ان کو جنت کی خواہش ہوتی ہے اور نہ دوزخ کا ڈر۔ وہ نماز پڑھتے ہیں تو نیت یہی کرتے ہیں نَوَيتُ أن أُصَلِّي لله تَعَالىٰ میں للہ کیلئے نماز پڑھتا ہوں پھر اس میں غیر اللہ کے خیال کو بھی اپنے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتے۔

سجدوں کے عوض فردوس ملے یہ تو مجھے منظور نہیں   بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں کوئی مزدور نہیں

اس پر علماء ظاہر اعتراض کرتے ہیں کہ جب اللہ نے اچھے کام کرنے پر جنت کا وعدہ کیا ہے اور برے اعمال پر دوزخ سے ڈرایا ہے تو پھر استغناء ظاہر نہ کیا جائے۔

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ کام نہ کرنے والوں کیلئے ترغیب اور ترہیب ہے۔ تا کہ کم از کم جنت کے شوق اور دوزخ کے خوف سے ہی کام شروع کر دیں۔ لیکن جب کام کرتے کرتے صرف کام سے ہی نہیں بلکہ جس کیلئے کام کر رہے ہیں اس سے عشق پیدا ہو جائے تو ان کی نظر بالغ ہو جاتی ہے اور بالغ نظر صرف ذات کا اشتیاق رکھتی ہے۔اس کے سوا کسی اور چیز سے اسکو سکون نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں یہ فرمایا ہے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّـهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّـهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ وَاللَّـهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿النور:۳۸،۳۷﴾ ایسے مردان خدا کو اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکواۃ دینے سے نہ خرید غافل کر سکتی ہے اور نہ فروخت وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں بہت سے دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی تا کہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دے اور اپنے فضل سے زیادہ عطا کرے۔

اس آیت میں اچھے اعمال کی اچھی جزا کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس کے فوراً بعد یہ بھی فرمایا وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ﴿النساء:۱۷۳﴾، یعنی اللہ اپنے فضل سے زیادہ عطا کرے گا۔ اعمال کی جزاء تو جنت ہے جس کا وعدہ جگہ جگہ قرآن میں کیا گیا ہے لیکن يَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ سے مراد اللہ کا دیدار ہے۔ تو جو لوگ اللہ سے اس کے فضل کے طور پر جو زیادہ کا وعدہ کیا جارہا ہے اگر اس کے طالب ہوں تو اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اعمال کی جزاء (اگر اعمال قبول ہوں تو) جنت ہے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے، وہ عدل ہے لیکن زیادہ کا جو وعدہ ہے وہ فضل ہے۔ تو کچھ لوگ اس فضل کے طلبگار ہیں جس کا وعدہ اللہ ہی نے کیا ہے تو اس میں استکبار، اللہ سے بے نیازی وغیرہ کا عنصر کہاں سے آ گیا۔

اسی طرح ارشاد خداوندی ہے لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ﴿یونس ۲۶﴾ جن لوگوں نے نیکوکاری کی ان کیلئے بھلائی (جنت) ہے اور مزید فضل یعنی رویت۔ حسنیٰ سے مراد جنت ہے اور زیادہ سے مراد دیدارِ خداوندی ہے۔

تو جو لوگ دیدارِ خداوندی چاہتے ہیں ان سے بیزاری کیوں؟ وہ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہاں اللہ کی رویت ہوتی ہے وہ ہی سب سے بڑی جنت ہے تو اس سے جنت کا انکار کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ جنت اعمال حسنہ کا بدل ہے لیکن رویت محض اللہ کا فضل ہے جس کا حصول توکل پر منحصر و موقوف ہے۔

تعزیت

کسی کے انتقال پر اہل میت کو جو صدمہ اور رنج ہوتا ہے جو کہ ایک فطری چیز ہے ان کو تسلی دینے اور ان کے غم کو ہلکا کرنے کو تعزیت کہتے ہیں۔ اسکی مدّت انتقال کے دن سے تین دن تک کی ہے۔ اسکے بعد مکروہ ہے۔ہاں اگر تعزیت کرنے والا یا جسکی تعزیت کرنی ہے وہ شہر سے غائب تھا اور بعد میں آیا تو تین دن کے بعد بھی تعزیت کی سکتی ہے۔

تعزیت کے الفاظ یہ ہونے چاہئے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری میت کو بخشدے اسکے گناہوں اور لغزشوں سے درگزر کرے اور اپنی رحمت میں اسکو ڈھانپ لے۔ اور اس کے انتقال اور جدائی سے جو صدمہ آپ کو (متعلقین کو) ہوا ہے اللہ اس پر صبر کرنے کی توفیق دے اور اسکی موت کی وجہ صبر کرنے پر آپ کو اجر عطا فرمائے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے جو الفاظ مروی ہیں وہ اس طرح ہیں۔إنَّ لله مَا أخَذَ وَ لَهُ مَا أعطىٰ وَ كُلّ شَيئٍ عِندَهُ بَاجلٍ مسمّىٰ۔یعنی للہ ہی کیلئے ہے وہ جو اس نے لے لیا اور اسی کیلئے ہے وہ جو اس نے عطا کیا اور اللہ نے ہر چیز ایک مقررہ مدت کیلئے بنائی ہے۔

تفویض

تفویض کے معنی سونپ دینے کے ہیں۔ جب ہم کسی کام کو دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ کام اسکے تفویض کر دیا ہے۔ اللہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ بندہ بھی اپنے کام میرے حوالے کر دے مجھے سونپ دے۔ اور میرے سپرد کر دے۔

انبیاء علیہم السلام کا طریق یہی تھا کہ وہ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿غافر:۴۴﴾۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ بندوں کا نگران ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔إذَا أصبَحت فَلَا تحدّث نفسُك بالمساء- وَ إذَا أمسيت فَلَا تحدّث نَفسك بالصباح۔ جب صبح ہو تو شام کے تعلق سے اپنے دل میں خیال نہ کر اور شام ہو تو صبح کے تعلق سے نہ خیال کر۔

مطلب یہ کہ نہ صرف کام کو بلکہ اپنے آپ کو بھی اللہ کے سپرد کر دینا چاہئے کہ وہ جو چاہے کرے۔ اپنی طرف سے کوئی نظام یا کوئی تجویز پیش نہ کرے۔ کہ میں یہ ہو جاؤں یا میں ایسا جاؤں۔ یا میرا یہ کام اسطرح ہو جائے اور اس طرح پر نہ ہو جیسے مرض، صحت، موت، حیات، فقر، غنا، وغیرہ امور میں اللہ جو چاہے کرے ہمیں منظور ہے۔

تفویض کے بعد انسان کو کچھ اختیار باقی نہیں رہتا۔ جب ایک ہسپتال میں ایک مریض کو داخل کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ مریض کو ڈاکٹر یا ڈاکٹروں کو سونپ دیتے ہیں (I.C.U) میں داخل کر دینے کے بعد تو مریض کے قریبی رشتہ داروں کو بھی اس وارڈ کے اندر جانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ وہاں پر جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اسی طرح نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہم کو اپنے خالق و مالک کے حوالے کر دینا چاہئے۔ کچھ لوگ پوری تدبیر کرتے ہیں اور صرف نتیجے پر کہتے ہیں کہ للہ نے جو چاہا کیا۔ لیکن چند بندے ایسے ہوتے ہیں جو شروع سے ہی للہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں تدبیر کا کچھ دخل نہیں ہوتا وہاں تو تسلیم اور تفویض کئے بغیر چارہ ہی نہیں رہتا۔ البتہ کچھ امور ایسے ہوتے ہیں جن میں بندہ کچھ تدبیر کر لیتا ہے۔ لیکن جن کا ایمان اعلی منزل کا ہوتا ہے وہ خود کو للہ ہی کے حوالے کر دیتے ہیں اور اپنی جانب سے کسی خواہش کا اظہار نہیں کرتے چنانچہ ایک شاعر نے اس کی کیا خوب عکاسی کی ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو، ہر چہ کنی رضائے تو۔ ترجمہ: اگر تو زندہ رکھتا ہے تو تیری عطا ہے اور اگر تو مارتا ہے تو میں تجھ پر فدا ہوں۔ دل تیرا عاشق ہو چکا ہے تو جو بھی کرے تیری مرضی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بچوں کو غلہ لانے کیلئے مصر روانہ کیا فرمایا شہر میں داخل ہو تو الگ الگ دروازوں سے جاؤ پھر فرمایا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

تفویض کے معنی ہی یہ ہیں کہ بے اختیار ہو جائیں۔ اپنے پاس کچھ اختیار نہ رکھیں۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا بے اختیار شو۔ اختیار شوم است، پھر ایک مقام پر فرمایا۔ جو بے اختیار ہوتا ہے وہ بختیار ہے۔

تسبیح

تسبیح کے معنی اللہ کی پاکی بیان کرنا یعنی سبحان اللہ کہنا ہے۔اللہ نے قرآن میں مومنوں کو حکم دیا ہے۔ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴿الأحزاب:۴۲﴾۔یعنی صبح وشام اللہ کی پاکی بیان کرو۔

نیز تسبیح کے معنی سودانوں کا ایک ہار ہوتا ہے جس پر سبحان اللہ یا اللہ اللہ وغیرہ لوگ پڑھتے ہیں۔وظیفہ پڑھنے والے عموماًسودانوں کی تسبیح کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور ورد کرتے ہیں۔

مہدویہ کے پاس جب تسبیح کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد وہ الفاظ ہیں جو مصلّی عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد مرشد کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو کر مرشد کے ساتھ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ امام کہتا ہے۔لَا اِلٰه اِلَّا اللهُ تو مقتدی کہتے ہیں،مُحَمَّدٌ رَّسُولُ الله۔پھر امام کہتا ہے اللهُ اِلٰهُنَا،تو مقتدی کہتے ہیں۔مُحَمَّدٌ نَبِيّنَا۔پھر امام کہتا ہے،أَلقُرْآنُ وَ المَهْدِيُّ إِمَامُنَا۔تو مقتدی کہتے ہیں، آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا۔

اسپر بعض ناواقف لوگ اعتراض کرتے ہیں اور کہنے والے تو یہ تک کہدیتے ہیں کہ یہ مہدویوں کا کلمہ ہے۔

آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان تین فقروں میں چار حقیقتوں پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے کی بات کہی جارہی ہے یعنی اللہ، محمد، قرآن اور مہدی سب کا تو اتفاق ہے کہ اللہ ہمارا معبود بر حق ہے۔اسکے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔اور محمد ﷺ ہمارے نبی ہیں۔اس دوسرے فقرے کے ذریعہ اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں علانیہ طور پر ظاہر کیا جاتا ہے کہ محمد ﷺ ہمارے آخری نبی ہیں یعنی آپ ہی خاتم النبین ہیں۔اگر مہدوی اس حقیقت کا اظہار کریں تو اسپر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔اسپر اعتراض تو وہ کر سکتا ہے جس کو حضورؐ کے خاتم نبی ہونے پر شک ہے۔

اب رہی تیسرے فقرے کی بات یعنی أَلقُرْآنُ وَ المَهْدِيُّ إِمَامُنَا (قرآن اور مہدی ہمارے امام ہیں) یہ بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآن امام ہے اسکو خود قرآن تسلیم کرتا ہے۔بلکہ اللہ کی کتاب ہر دور کے لئے امام کی حیثیت رکھتی ہے۔چنانچہ قرآن میں توریت کے بارے میں آیا ہے ومن قبلہ کتاب موسیٰ اماماًورحمۃ۔اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو امام ورحمت تھی۔اسی طرح قرآن بھی خود امام ہے۔جسکی اتباع کرنے کا اللہ نے خود آنحضرتؐ کو حکم دیا ہے۔چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ﴿یونس:۱۰۹﴾یعنی آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے آپ اسکی اتباع کیجئے۔اور نیز یہ بھی آیا ہے کہ جو لوگ قرآن کے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ان کو قرآن کافر کے نام سے یاد کرتا ہے چنانچہ قرآن میں

آیاہے وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿المائدۃ:۴۴﴾۔یعنی جولوگ اللہ کے نازل کردہ احکام (احکام قرآنی) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔ مندرجہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن یقیناًامام ہے۔اب بات آتی ہے مہدی کی جس کو سن کر یا طغروں میں دیکھ کر لوگ چونک جاتے ہیں اور ہماری تسبیح پر اعتراض کرنے کی سب سے بڑی وجہ تو یہی لفظ، مہدی، ہے۔حالانکہ یہ نادانی یا ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ جن لوگوں کو عقائد، یا ایمانیات کا علم ہے وہ کبھی اسپر اعتراض نہیں کرسکتے۔اس لئے کہ مہدی علیہ السلام کی بعثت ضروریاتِ دین سے ہے۔اس پر تمام فرقوں کا اتفاق ہے۔اور سب کا اتفاق اس بات پر بھی ہے کہ ضروریات دین میں سے کسی ایک ضرورتِ دین کا انکار کرنے والے کو کافر کہا جاتا ہے۔

اور یہ ضرورت دین کیوں ہوئی اس لئے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی بعثت کے بارے میں نہ صرف قرآن میں اشارات موجود ہیں بلکہ احادیث متواترہ میں کافی تفصیلات موجود ہیں۔ جن میں مہدی علیہ السلام کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لانے کو لازمی اور ضروری قرار دیا گیا ہے۔کیوں کہ مہدی علیہ السلام کی بعثت کا وعدہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اس لئے مہدی کو مہدی موعودؑ کہتے ہیں یعنی وہ مہدی جس کے آنے کا وعدہ (ختمی مرتبت ﷺ) کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ مہدی اللہ کے خلیفے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔فَإِنَّهُ خَلِيفَةُ الله المَهْدِي، مہدی علیہ السلام پر بیعت کرنا فرض ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، فَبَايَعُوهُ وَ لَو حَبْواً على الثَّلج۔یعنی آپ سے بیعت کرو اگرچہ تم کو برف پر سے رینگتے ہوئے جانا پڑے۔

مہدی علیہ السلام دافع ہلاکت امت محمدیہ ہیں۔ جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے۔ کہ وہ امت کیسے ہلاک ہوگی جس کے اول میں ہوں اور درمیان میں مہدی ہیں اور آخر میں عیسیٰ بن مریم ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اعتراضات کرنے والے حضرات کو ان میں سے کونسی بات کا انکار ہوسکتا ہے اور کونسی بات پر شبہ کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔کیوں کہ یہاں کسی خاص ہستی کے تعلق سے نہیں کہا جارہا ہے اگر ایسا ہوتا تو کہہ سکتے تھے کہ ہم فلاں ہستی کو مہدی موعود نہیں مانتے اس لئے تمہاری اس تسبیح کے اس فقرہ پر اعتراض ہے۔ دیکھئے یہاں یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ القرآن والسید محمد مہدی امامنا، اگر ایسا ہوتا تو اعتراض کی گنجائش متصور ہوسکتی تھی۔ لیکن یہاں تو ایک عام اور ضروری عقیدہ کی بات کہی جارہی ہے کہ قرآن کی طرح مہدی ہمارے امام ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ تمام فرقے جو آخر زمانے میں مہدی کے آنے کے بارے میں صحیح اعتقاد رکھتے ہیں ان کو تو ایسا کہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ یہ تیسرا فقرہ بھی ایمانیات پر مشتمل ہے جس سے انکار کی کسی کیلئے بھی گنجائش نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے۔ تو کچھ دیر کے بعد دو فرشتے آتے ہیں اور میت سے تین سوال کرتے ہیں۔(۱) مَنْ رَّبُّكَ۔ تیرا رب کون ہے۔(۲) مَا دِينُكَ۔ تیرا دین کیا ہے۔(۳) حضورؐ کی شبیہ بتا کر پوچھتے ہیں کہ کیا ان کو جانتا ہے۔ جو مومن ہے وہ ٹھیک ٹھیک جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام ہے۔ اور یہ ہستی ہمارے پیغمبر ہیں۔ تسبیح میں ان امور کی تلقین کے سوا اور کیا کہا جارہا ہے۔ اب رہی بات قرآن اور مہدی کی تو یہ بھی مسلمان کیلئے بہت ضروری ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اپنے بعد دو بھاری چیزیں چھوڑے جارہا ہوں۔ جب تک تم ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے۔ ہر گز گمراہ نہ ہو گے۔ ایک تو اللہ کی کتاب ہے اور دوسری میری عترت۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ہر گز جدا نہیں ہونگے جب تک کہ وہ میرے پاس حوض کوثر پر نہ آجائیں۔ اور عترت تو ویسے بہت وسیع لفظ ہے لیکن جب عترت۔ مطلق کہی گئی ہے تو اس کا مصداق اسکی فرد کامل ہوتی ہے اور حدیث سے ثابت ہے کہ مہدی علیہ السلام آنحضرت ﷺ کی عترت کی فرد کامل ہے اس لئے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا أَلمَهدِيُّ مِنِّي يَقْفُو أثْرِي وَ لَا يُخْطِي یعنی مہدی مجھ سے ہے وہ میرے نقشِ قدم پر چلے گا اور خطا نہیں کرے گا۔

گویا اس تیسرے فقرہ کے ذریعہ ایمان کے حصول کا سبب اور ایمان کی سلامتی اور دنیا کی فلاح اور اخروی نجات کا ذریعہ بتلایا جارہا ہے اور یہ تاکید کی جارہی ہے کہ ان دونوں پر ایمان لاؤ اور ان کی تصدیق کرتے ہوئے ان کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرو تو دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے امن بھی ہے اور عافیت بھی۔ اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو شخص روزانہ بعد نماز عشاء یہ کہتا ہے تو اس کو اچھی طرح یہ سبق یاد ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں جب فرشتے سوال کریں گے تو انکو جواب دینا آسان ہو جاتا ہے۔ اسکی ابتداء اسطرح ہوئی کہ مہدوی دائروں میں نوبت کا اہتمام ہوتا تھا یعنی باری باری سے اللہ کا ذکر کیا جاتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ عشاء کے بعد سے تہجد تک رات کو ۳ حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور ذاکرین کی بھی تین جماعتیں بنائی جاتی تھیں۔ رات کے پہلے حصّے میں پہلی جماعت ذکر اللہ میں بیٹھتی تھی۔ جب اس کا وقت ختم ہو جاتا تو دوسری جماعت کو نام لیکر یا کسی اور ذریعہ سے جگایا نہیں جاتا تھا بلکہ مرشد دائرہ کہتا لَا اِلٰه اِلَّا اللهُ تو پہلی جماعت کے ذاکرین جن کا وقت ختم ہو جاتا وہ کہتے مُحَمَّدٌ رَّسُولُ الله ﷺ۔ یہ آواز سن کر دوسری جماعت بیدار ہو جاتی اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جاتی اور پہلی جماعت سو جاتی۔ دوسری جماعت کی نوبت کا وقت ختم ہو جاتا تو پھر مرشد کہتے اللهُ اِلٰهُنَا۔ تو ذاکرین کہتے مُحَمَّدٌ نَبِيّنَا۔ یہ سن کر تیسری جماعت بیدار ہو جاتی۔ اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جاتی اور دوسری جماعت سو جاتی۔ پھر جب تیسری نوبت ختم ہو جاتی تو مرشد کہتے۔

أَلْقُرْآنُ وَ الْمَهْدِيُّ إِمَامُنَاتوذاکرین کہتے ہیں آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا۔ یہ سن کر سب سوئے ہوئے بیدار ہو جاتے اور وضوء کرنے کے بعد نماز تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ پھر سب مل کر فجر کی نماز پڑھتے۔

اور یہ تسبیح حقیقت میں تجدید ایمان کا نام ہے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، دیکھو ہم میں کوئی غیر تو نہیں ہے صحابہ نے فرمایا کوئی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا دروازے بند کر دو۔ پھر آپ نے فرمایا" جَدِّدُوا إِيْمَانَكُمْ"۔یعنی تم اپنے ایمان کی تجدید کرو۔ صحابہ نے فرمایا" كَيْفَ نُجَدِّدُ إِيْمَانَنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ"ہم اپنے ایمان کی کسطرح تجدید کریں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" قُوْلُوْا لَا اِلٰه إِلَّا الله"۔وَ رَفَعَ صُوتَہٗ۔ آپ نے فرمایا کہو لا الہ الا اللہ۔ یہ کہتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی مبارک آواز کو بلند فرمایا۔ اسکے بعد صحابہ کرام سونے کیلئے اپنے اپنے گھروں کو تشریف لیگئے اس میں ایک اہم ترین نکتہ یہ بھی ہے کہ اسطرح تسبیح کہنے کے بعد جب سونے کیلئے گھر چلے جائیں اور ان میں سے کسی کا (خدانخواستہ) انتقال ہو جائے تو اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گا اور دنیا میں بھی اس کے حسن خاتمہ کی گواہی مرشد اور مصلی دیں گے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسکو جنت (فردوس) کی بشارت دی ہے۔ جس کا آخری کلمہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہو۔

تجدّد امثال

جسقدر موجودات ہیں وہ اپنے وجود میں ہمیشہ بلکہ ہر لمحہ فیضان الہیٰ کے محتاج ہیں۔ ایک لمحہ کیلئے اگر وجود باری تعالیٰ سے اس وجود کی حفاظت نہ ہو تو وہ فوراً نیست ونابود ہو جائے۔ اہل کشف کی تحقیقات کے مطابق ہر وجود ہر آن میں جدا ہوتا ہے۔ مگر اتصال وتشابہ موجودات کی وجہ سے اس کو اس تبدیلی اور تغائر وجود کی تمیز نہیں ہوتی۔ اور نہ درمیانی عدم کا احساس ہوتا ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے بتی کے سر پر جو آگ کا شعلہ ہے اس میں چراغ سے ہر وقت نیا تیل آتا ہے اور وہ جل کر فنا ہوتا ہے اور ساتھ ہی دوسرا تیل آتا ہے۔ اسطرح تمام تیل ختم ہوتا ہے۔ مگر دیکھنے والے کو ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ پہلا کب ختم ہوا اور کب دوسرا آیا اسکو تجدّد امثال کہتے ہیں۔

تعزیرات

معاشرہ کو پاک وصاف رکھنے کیلئے اچھے کاموں کی تلقین اور برے کاموں سے احتراز کی تعلیم ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ نے معاشرہ کو پاک رکھنے کیلئے قرآن شریف میں اوامر اور نواہی بیان فرمائے ہیں۔ لیکن انسان سب یکساں نہیں ہوتے۔ بعض لوگ فطرتاً اچھے ہوتے ہیں۔ جب ان کی تفہیم کی جاتی ہے تو وہ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جن پر وعظ وتذکیر اور فہمائش کارگر نہیں ہوتی۔ان کیلئے سزائیں تجویز کی جاتی ہیں۔اسی کو قانون تعزیرات کہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام کتابوں میں برائیوں سے روکنے کیلئے غلط کاروں کو سزا دینے کا حکم دیا ہے اور سزائیں بھی بتلائی ہیں۔مثلاً

اللہ فرماتا ہے:وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّـهِ وَاللَّـهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿المائدہ:۳۸﴾ ترجمہ: اور جو مرد یا عورت چوری کرے تو ان دونوں کے (داہنے) ہاتھ کاٹ ڈالو (یہ) ان کے کرتوت کا بدلہ ہے اور اللہ کی جانب سے سزا بھی ہے اور اللہ سب پر غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

مطلب یہ کہ چوری کی سزا چور کا سیدھا ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ مگر کچھ لوگ انسانیت کی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور قرآن کے اس حکم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بہت بڑی اور بری سزا ہے۔چند روپیوں کی خاطر یا چند قیمتی چیزوں کیلئے ایک انسان کا ہاتھ کاٹ دینا سراسر ظلم ہے (نعوذ باللہ) کچھ مغرب زدہ مسلمان بھی دبے الفاظ میں ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ چور کو جب یہ معلوم ہے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کہ چوری ثابت ہو جانے پر زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کی جیل کی سزا ہو گی پھر آزاد۔ پھر ایک لمبا ہاتھ ماروں گا پھر پکڑا گیا تو پھر چھ مہینے کی سزا ہو گی۔ اس طرح اس کو تو تھوڑی تکلیف ہو گی۔ لیکن جن کا مال چرایا گیا ہے ان کی تو پوری پونجی ختم ہو گئی۔اور وہ راستے کے ہو کر رہ گئے۔ آخر ان کا کیا ہو گا جن کی دنیا لٹ گئی نہ ان پر افسوس ہے اور نہ ان کے ساتھ کوئی سلوک اور نہ کوئی تلافی اور جس کا ایک ہاتھ کٹا اس کے ساتھ ساری دنیا کی ہمدردیاں۔اس کے برخلاف، حکم خدا کے تحت اگر ایک چور کا ہاتھ ایک مرتبہ کاٹ دیا جائے تو اس کے دو فائدے ہوں گے۔ایک تو یہ کہ وہ پھر ایسا کام نہیں کرے گا بلکہ وہ کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ جہاں بھی جائے گا لوگ اسکو دیکھ کی احتیاط برتیں گے۔اور دوسرا یہ کہ اس سزا کو دیکھ کر پھر کسی دوسرے کے دل میں خیال تک نہ آئے گا کہ چوری کی جائے جن ممالک میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے وہاں برسوں میں اکا دکا چوری کے واقعات ہوتے ہیں۔اور جہاں صرف جیل کی سزا ہے وہاں چوریاں رات تو رات دن کو بھی ہونے لگی ہیں۔

اسی طرح زنا کے سلسلے میں بھی تعزیری حکم یہ ہے کہ اگر غیر شادی شدہ ہوں تو سو کوڑے مارے جائیں۔ اور اگر

شادی شدہ ہوں تو سنگسار کیا جائے۔ چنانچہ روایت ہے کہ خیبر کے ایک شریف گھرانے کے ایک مرد اور ایک عورت زنا کے مرتکب ہوگئے۔ حالانکہ توریت میں زنا کی سزا سنگساری تھی لیکن سماج میں ان کے مقام کی وجہ سے وہ سنگساری کی حد جاری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر مشورہ ہوا کہ یثرب (مدینۂ منورہ) کے اس شخص کے پاس مقدمہ لے کر جائیں کیوں کہ ان کے پاس کوڑے کی سزا ہے۔ رجم کی نہیں الغرض بنی قریظہ کے چند لوگوں کو حضور کے پاس بھیجا گیا اور ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ اگر وہ (رسول اللہؐ) کوڑے کی سزا سنائیں تو مان لو۔ اور اگر سنگساری کی سزا سنائیں تو مت مانو۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم لوگ میرے فیصلہ کو مانو گے۔ انہوں نے اقرار کیا۔ اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام "رجم" کا حکم لائے اور آپؐ نے ان کو وہ حکم سنایا تو وہ لوگ اپنے قرار سے پھر گئے۔ حضور نے پوچھا کہ فدک میں رہنے والا "ابن صوریا" تم میں کیسا شخص ہے انہوں نے کہا کہ توریت کا جاننے والا آج روئے زمین پر اس جیسا کوئی نہیں آپ نے فرمایا اس کو بلالاؤ۔ وہ آیا تو آپ نے اس کو خدا کی قسم دے کر پوچھا کہ توریت میں زنا کی سزا کیا ہے۔ اس نے کہا جب آپ نے خدا کی قسم دی ہے تو میں غلط بات نہیں کہہ سکتا۔ توریت میں زنا کی سزا رجم ہے۔ پھر اس نے پوری حقیقت بیان کی کہ کس طرح ایک بادشاہ کے چچا کے بیٹے نے ایک مرتبہ زنا کیا تھا تو اس کا لحاظ کرتے ہوئے رجم کی سزا کو جاری نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ حکم سنایا کہ کوڑے مارے جائیں اس کا منہ کالا کیا جائے اور اس کو گدھے کی دم کی طرف منھ کر کے اسپر بٹھایا جائے اور شہر میں گشت کروایا جائے اس کے بعد حضور نے ان دونوں پر رجم کی حد جاری فرمائی اور فرمایا" اے اللہ میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو دنیا میں زندہ کیا۔ جبکہ لوگوں نے اس کو مردہ کر دیا تھا۔

(۲) **قتل**: انسانی جان قابل احترام ہے خواہ وہ کسی کی بھی ہو۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ جب جان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو پھر کسی کو اس بات کا نہ اختیار ہے اور نہ حق کہ اللہ کی دی ہوئی جان کو بلا سبب اور جان بوجھ کر تلف کرے۔

چنانچہ اللہ نے فرمایا: كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ﴿مائدہ:۳۲﴾ ترجمہ:۔ بنی اسرائیل پر ہم نے یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا یعنی نہ کسی کے خون کے بدلے میں نہ زمین میں فساد پھیلانے کے جرم میں تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک کی جان بچائی اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

قتل کے بدلہ قتل تو قصاص ہے۔ زمین میں فساد پھیلانا۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ نے اسکو قتل ناحق کے برابر قرار دیا ہے۔ زمین میں فساد پھیلانے کی کئی صورتیں ہیں یعنی رہزنی (دنیاوی اور دینوی) ڈکیتی، لوٹ مار، ارتداد، اور غلط پروپیگنڈہ

وغیرہ۔ ان کیلئے چار سزائیں تجویز ہوئی ہیں۔ حاکم وقت کو اجازت ہے کہ ان میں سے جسے وہ حالات کے اعتبار سے تجویز کرے وہ سزا نافذ کرے۔

ڈکیتی کے سلسلے میں یہ تفصیل آئی ہے کہ ڈاکو نے صرف قتل کیا، مال نہ لوٹا کا تو اس کیلیے قتل ہے۔

قتل بھی کیا اور مال بھی چھین لیا تو اس کیلئے سولی کی سزا ہے۔

صرف مال چھین لیا مگر قتل نہیں کیا تو داہنا ہاتھ اور بایاں پیر کاٹ دیا جائے۔

نہ مال چھین سکا اور نہ قتل کر سکا۔ ارادہ تو پورا تھا اور تیاری بھی تھی لیکن وہ گرفتار ہو گیا تو اسکو دوسرے مقام پر لے جاکر چھوڑ دیا جائے یعنی جلاوطن کر دینا چاہیئے۔

لیکن اگر وہ گرفتار ہونے سے پہلے غائب ہو جائے تو جو اللہ کے حدود ہیں وہ اللہ معاف کر دے گا لیکن جو حقوق العباد ہیں وہ توبہ سے معاف نہ ہوں گے۔ ان کا ضمان دینا پڑے گا۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے۔ إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّـــهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْــــعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَـــادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَـــلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ﴿مائدہ ۳۳﴾ ترجمہ: لوگ اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا سولی پر چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دئے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔

اسکے بعد قتل خطا کا حکم سناتے ہوئے اللہ فرماتا ہے۔ وَمَـا كَـانَ لِـمُـؤْمِـنٍ أَن يَـقْـتُـلَ مُـؤْمِـنًـا إِلَّا خَطَأً وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍوَدِيَةٌ مُّسَـــلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّـــدَّقُوا ﴿النساء:۹۲﴾ ترجمہ: کسی مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی مومن کو (عمداً) قتل کرے الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے اور وہ اسکو قتل کر دے۔ اور جو کوئی بھی چوک سے کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو وہ (بطور کفارہ) ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خونبہا دے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں (تو ان کا اختیار ہے)

(۱) یہ ہوئی قتل خطا کی صورت۔

قتل کی دوسری صورت یہ بیان کی جارہی ہے۔

(۲) اگر مقتول تمہارے دشمن کی جماعت سے ہو اور مقتول مومن ہو تو صرف ایک مسلمان غلام یا لونڈی آزاد کرنا چاہیئے۔

(۳) اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خونبہا دینا اور ایک مسلمان غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کسی کو یہ میسر نہ ہو تو وہ دو مہینے متواتر روزے رکھے۔ یہ کفارہ خدا کی طرف سے توبہ قبول کرنے کا ہے۔

(۴) اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اسکی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ کا اس پر غضب نازل ہو گا۔ اللہ اسپر لعنت کرے گا اور اللہ نے اس کیلئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اوپر جو مضمون گذرا اس کے تعلق سے قرآن شریف میں جو آیتیں ہیں وہ درج ذیل کی جاتی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿النساء ۹۲، ۹۳﴾ ان دونوں آیات کا ترجمہ اوپر دے دیا گیا ہے۔

جان بوجھ کر کسی کلمہ گو کو قتل کرنا تو گناہ عظیم ہے۔ اس کیلئے جہنم دائمی ہے اللہ کا غضب ہے اللہ کی لعنت ہے اور اللہ کا بڑا عذاب ہے، اور اس کیلئے قصاص ہے۔

اس کے بعد قتل کی دو اور صورتیں ہیں (۱) قتل شبہ عمد۔ (۲) قتل خطا۔ شبہ عمد یہ ہے کہ کسی مسلمان کو جان بوجھ کر تو قتل نہیں کیا مگر یہ ہوا کہ ایک تھپڑ مارا جس سے عموماً آدمی نہیں مرتا لیکن وہ شخص محض ایک تھپڑ سے مر گیا۔ تو اسکو شبہ عمد کہتے ہیں اور دوسرا قتل خطا ہے۔ یعنی کسی شکار کا نشانہ لیا۔ اتفاق سے ایک شخص درمیان میں آ گیا اور گولی کا نشانہ بن کر مر گیا۔ یا کسی شخص کا اسلام معلوم نہ ہو سکا اسکی ہیئت یا کپڑوں سے غیر مسلم معلوم ہوا اور اسکو قتل کر دیا گیا حالانکہ وہ مسلمان تھا۔

ایسے مقتول کیلئے دِیت دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ دِیت کے معنی compensation کے ہیں یعنی خونبہا۔ اس میں بھی اگر مقتول کے وارثین خونبہا نہ لیں اور معاف کر دیں تو جائز ہے۔

لیکن اگر وہ خونبہا لینا چاہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) اسکی برادری مسلم ہو گی یا غیر مسلم (کافر) اگر غیر مسلم ہے تو ان سے مصالحت اور معاہدہ ہے یا دشمنی۔ پہلی دو صورتوں میں خون بہا compensation دینا پڑے گا اور آخری صورت میں نہیں۔

قتل عمد میں قصاص ہے۔ قتل شبہ عمد میں کفارہ نہیں۔ البتہ دیت واجب ہے۔ اور قتل خطاء میں کفارہ بھی ہے اور دیت بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خونبہا کی مقدار سو اونٹ، یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہے۔ اگر دوسری شکل میں کوئی خون بہا دینا چاہے۔ تو اسکی مقدار بیان کردہ چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ معین کی جائے گی۔

مسلسل دو مہینے روزر کھنا اسطرح ضروری ہے کہ درمیان میں ایک روزہ کا بھی ناغہ نہ ہو۔ اگر ایک روزہ بھی ناغہ ہو گیا تو پھر شروع سے دو مہینے کے مسلسل روزے رکھنے چاہئیں۔

انسانی جان کا احترام اللہ کے پاس اسقدر ہے کہ اس نے فرمایا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّـــــهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ﴿الاِسراء:۳۳/انعام:۱۵۱﴾۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ

دوسروں کو ناحق قتل کرنے کو تو اللہ کیسے برداشت کرے گا جبکہ اللہ نے خودکشی کو تک حرام قرار دیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ "حق کے ساتھ" قتل کرنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسکی پانچ صورتیں ہیں۔

(۱) قتل عمد کیا ہو تو اسکے قصاص میں اسکی جان لے سکتے ہیں۔

(۲) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتا ہو۔ اللہ کے دین کی راہ میں مزاحم ہو رہا ہو۔

(۳) روئے زمین پر عموماً اور اسلامی مملکت میں خصوصاً فتنہ اور فساد پھیلاتا ہو اور اپنے فرقہ اور مسلک کے مقابل دیگر فرقوں اور مسلک والوں کو قتل کرنے کے فتوے جاری کرتا ہو۔

(۴) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا مرتکب ہو۔

(۵) دین حق سے مرتد ہو گیا ہو

اس کے علاوہ قتل کی اور دو صورتیں ہیں جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔

(۱) ایک صورت تو یہ ہے کہ لوگ (مشرکین) اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے تعلق سے امتناعی حکم اسطرح دیا ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ﴿الاِسراء:۳۱﴾ ترجمہ: اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے خوف اور اندیشہ سے قتل مت کرو۔ ہم ان کو رزق دیتے ہیں اور تم

کو بھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا قتل بھاری غلطی ہے۔

مشرکین چونکہ اپنی لڑکیوں کو محض اس عار کی وجہ سے کہ دوسری جگہ بیاہ کر دی جائے گی یا یہ عار کہ دوسرے اسکو اپنی ہوس کا نشانہ بنائیں گے۔زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالی نے اس سے منع فرمایا۔ایک صحابی نے ایک مرتبہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دختر کو پیار کررہے ہیں۔انہوں نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ میں نے اپنی کئی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا۔ آخری لڑکی کا یہ واقعہ بیان کیا کہ میں اپنی معصوم چھوٹی عمر کی لڑکی کو نہلا دھلا کر۔اچھے کپڑے پہنا کر اپنے ساتھ لے چلا۔بچی بہت خوش خوش تھی۔ پوچھتی تھی کہ کہاں لیجارہے ہیں تو جواب دیا کہ ایک دعوت میں پھر جب اس کو ایک جگہ لے گیا، بچی کو بٹھا کر ایک گڑھا کھودا۔ پھر بچی کو اس میں لٹایا اور اوپر سے مٹی ڈالنے لگا۔ بچی مجھے پکار رہی تھی لیکن میں نے اسکی پروانہیں کی اور اسکوزندہ دفن کر دیا۔ اللہ تعالی نے اس سے منع فرمایا۔

قتل اولاد کی صورت یہ ہے کہ آج بھی اسکے تعلق سے بڑے زور وشور سے پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے وہ یہ کہ جب حمل ہوتا ہے تو پہلے سے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ معلوم کر لینے کی کوشش ہوتی ہے کہ جنین (وہ جو ماں کے پیٹ میں ہے) لڑکا ہے یا لڑکی۔جب معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکی ہے تو فوراً ''اسقاط حمل'' کر دیا جاتا ہے Abolition ظاہر ہے کہ یہ بھی قتل نفس کی ایک صورت ہے۔جو منع ہے۔ اور تیسری صورت یہ کہ ''ایک عام نعرہ یہ لگایا جارہا ہے کہ(we two and ours two)یعنی ہم دواو رہمارے دو۔ بس جب تیسرے کے تعلق سے گمان ہونے لگتا ہے تو اس کا اسقاط کروایا جاتا ہے۔ اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہماری آمدنی محدود ہے۔بچے زیادہ ہوں گے تو ان کی پرورش کون کرے گا۔

اللہ اس کا جواب دیتا ہے کہ ہم ان کو رزق دیں گے جسطرح کہ تم کو دیتے ہیں۔رزق کی ذمہ داری ہماری ہے۔

جب اللہ رب العالمین ہے تو کیا ان کے بچوں کو نہیں پالے گا؟۔

اللہ نے صاف کہا ہے ﴿وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّـهِ رِزْقُهَا﴾(ھود:٦)۔زمین پر جتنی مخلوق ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔ مگر افسوس کہ انسان کو اور بعض مسلمانوں کو بھی خدا پر بھروسہ نہیں رہا۔

ثلۃ

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَـٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ﴿الواقعۃ: ۱۳،۱۲،۱۱،۱۰﴾ ترجمہ: اور آگے نکل جانے والے کیا ہی آگے نکل جانے والے ہیں، یہی لوگ ہمارے مقرب ہیں، وہ نعمت (دیدار) کی بہشتوں میں ہیں، بڑی جماعت ہے اگلوں میں اور تھوڑے ہیں پچھلوں میں سے۔

اور اسی سورت میں یہ آیتیں آئی ہیں، وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ﴿الواقعۃ:۲۷﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ﴿الواقعۃ: ۴۰،۳۹﴾ ترجمہ۔ داہنی جانب والے کیا ہے داہنی جانب والے، جماعت کثیر ہے اگلوں میں سے اور جماعت کثیر ہے پچھلوں میں سے۔

ایک روز حضرت مہدیؑ نے بمقام فراہ عصر اور مغرب کے درمیان بیان قرآن کے وقت مذکورہ بالا آیتیں پڑھیں اور فرمایا "مراد از سابقون لاہوتیاں ہیں کہ تجلی ذات کو پہنچے ہیں"۔ پھر فرماتے ہیں کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو بعثت خاتم الاولیاء تک ظہور پذیر ہوں گے، اور فرمایا "خواجہ بایزید بسطامی، خواجہ ابراہیم ادھم، خواجہ شبلی، خواجہ جنید بغدادی و بی بی رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیھم اس جماعت میں داخل ہیں، پھر فرمایا ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ سے مراد وہ لوگ ہیں کہ بعثت خاتم الانبیاء سے بعثت خاتم الاولیاء اور بعثت خاتم الاولیاء سے قیامت تک ظہور پذیر ہوں گے۔

حضرت امامؑ کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ سَابِقُونَ یعنی لاہوتی اور أَصْحَابُ الْيَمِينِ یعنی ملکوتی اور جبروتی کا سلسلہ قیامت تک جاری رہیگا۔

ثقلین

حدیث ثقلین: ثقل کے معنی بھاری، گراں کے آتے ہیں، ثقلین کے معنی دو بھاری چیزوں کے ہیں، آنحضرت ﷺ سے جو دو بھاری گراں قدر چیزوں کے بارے میں جو حدیث آئی ہے اسے حدیث ثقلین کے نام سے یاد کرتے ہیں، چناچہ حدیث شریف میں اس طرح ہے۔"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ لَنْ تُضِلُّوا مَسْتَمْسَكْتُمْ بِهِمَا۔ ترجمہ، اے لوگو میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، اگر تم ان کو مظبوطی کے ساتھ پکڑے رہوگے، تو تم کبھی گمراہ نہ ہوگے، ایک کتاب خداا اور دوسرے میری اہل بیت، ترمذی اور نسائی نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے، (کنزالعمال، جلد اول، ص ۴۴، باب اعتصام بالکتاب والسنۃ)

یہ بھی آپؐ نے ارشاد فرمایا، میں نے تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑیں، اگر تم ان سے محبت کروگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، ایک کتاب خدا جو ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک کھینچی ہوئی ہے اور دوسرے میری عترت واہل بیت، یہ دونوں کبھی جدانہ ہونگے، یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں، دیکھنا میرے بعد تم ان سے کس طرح پیش آتے ہو، (ترمذی نے زید بن ارقم سے روایت کی ہے، کنزالعمال، جلد ا، ص ۴۴)

یہ بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم میں اپنے دو جانشین چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتاب خدا جو ایک دراز رسی ہے، آسمان سے لیکر زمین تک، دوسرے میری عترت اور اہل بیت، یہ دونوں کبھی جدانہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں، (امام احمد، زید بن ثابت سے دو صحیح طریقوں سے اس کی روایت کی ہے، پہلے مسند ص ۱۸۲ پر اور دوسرے ص ۱۸۹ پر۔ جلد ۵)

یہ بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، کتاب خداا اور میرے اہل بیت، یہ دونوں کبھی جدانہ ہوں گے، یہاں تک حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔ امام حاکم مستدرک جلد ۳ ص ۱۴۸ پر اس کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "یہ حدیث شیخین امام بخاری و مسلم کے شرائط کے لحاظ سے تو صحیح ہے لیکن ان دونوں نے اس کو درج نہیں کیا۔

یہ بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ "قریب ہے کہ میں بلایا جاؤں (میں وفات پاجاؤں) اور مجھے جانا پڑے، میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک خدائے بزرگ وبرتر کی کتاب دوسری میری عترت۔ کتاب خدا تو ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک دراز ہے، اور میری عترت میرے اہل بیت ہیں، خداوند علیم وخبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں کبھی جدانہ ہوں گے، (کنزالعمال، جلد ا، ص ۴۷)

صاحب صواعق محرقہ لکھتے ہیں، چونکہ یہ حدیث تمسک کثیر طریقوں سے مروی ہے، اور بیس سے زیادہ صحابہؓ نے اس کی روایت کی ہے، اسپر یہ شبہ کیا گیا ہے گو یہ حدیث بکثرت طریق سے مروی تو ہے، کہیں یہ بات ہے کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں فرمایا، کہیں یہ ہے کہ مدینہ میں جبکہ آپؐ بستر مرگ تھے، ارشاد فرمایا، جبکہ آپ کا حجرہ اصحاب سے بھرا ہوا تھا، کہیں یہ ہے کہ غدیر خم میں فرمایا، کہیں یہ ہے کہ جب آپؐ طائف سے واپس ہوئے ہیں تو آپؐ نے فرمایا۔ لیکن یہ شبہ درست نہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کلام اللہ اور اہل بیت کی عظمت و جلالت کا لحاظ کرتے ہوئے اور لوگوں کو ان کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دلانے کیلئے ان تمام مواقع پر اس حدیث کو بتکرار ارشاد فرمایا ہو، تاکہ پہلے سے اگر کسی کے کانوں میں یہ بات نہ پڑی ہو تو، اب پڑ جائے، پہلے کسی نے نہ سنا ہو تو اب سن لے (صواعق محرقہ، فصل اول، ص ۸۹)

اہل بیت کا مصداق

یہ منزلت صرف ان ہی کیلئے ہوگی جو خدا کی حجت اور اس کی طرف سے درجہ امامت پر فائز ہو، بعض لوگ کہتے ہیں کہ غالباً اہل بیت جنہیں رسول اللہ ﷺ نے امان فرمایا ہے، ان سے مراد علماء اہل بیت ہیں اس لئے کہ انہیں سے ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے، جیسے ستاروں سے لوگ ہدایت پاتے ہیں اور جو ہمارے درمیان سے ہٹ جائیں تو روئے زمین کے باشندوں کو آیات الٰہی کا سمان ہو گا، جس کا انسے وعدہ کیا گیا ہے، ابن حجر کہتے ہیں، یہ اس وقت ہو گا جب مہدیؑ تشریف لائیں گے، جیسا کہ احادیث میں بھی ہے (صواعق، باب ۱۱، ص ۹۱)

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے بعد دو گراں قدر چیزیں چھوڑی ہیں اور یہ تاکید فرمائی ہے کہ

(۱) جب تم ان دونوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے تو تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

(۲) یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، جب تک کہ وہ حوض کوثر پر مجھ سے نہ آملیں۔

(۳) عترت و اہل بیت تو بہت ہیں، لیکن ان میں جو کامل و اکمل ہو گا وہی عترت کامل فرد ہو گی۔ جس کو دیکھیں تو قرآن اور حضور ﷺ کی صورت اور سیرت نظر آئے اور وہ ہستی صرف امامنا مہدی موعودؑ کی ہے، اس لئے ہم عشاء کے بعد روزانہ جو تسبیح کے الفاظ دہراتے ہیں اس میں اسی حقیقت کو آشکارا کرتے ہیں، ''القرآن والمہدی امامنا۔ آمنا و صدقنا'' یعنی اے رسول، اے آقا، اے خاتم پیغمبراں، آپؐ نے ہماری نجات کیلئے جو نسخہ تجویز فرمایا تھا، یعنی ''القرآن و عترتی''، بالفاظ دیگر ''القرآن والمہدی'' تو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے اس کی تصدیق کی۔

جذبہ کے حالات

جب رائے دلپت امام مہدی علیہ السلام کے ہاتھوں مارا گیا اور آپ کے تلوار کی ضرب اس کے دل پر پڑی اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا تو آپ نے اس کے دل پر اس بت کی تصویر دیکھی جس کی وہ پوجا کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جب باطل کا یہ اثر ہے تو حق کا اثر کیا ہو گا۔

معاً آپ پر جذبہ حق طاری ہو گیا۔ اور یہ جذبہ حق بارہ سال رہا۔ ان بارہ برسوں میں سات سال ایسے گذرے کہ آپ نے کھانے پینے کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہیں فرمائی۔ بعد کے پانچ برسوں میں جو غذا آپ نے استعمال فرمائی اس کی مقدار ساڑھے سترہ سیر بیان کی جاتی ہے۔ لیکن جذبہ کے ان برسوں میں آپ سے ایک وقت کی بھی فرض نماز قضاء نہیں ہوئی۔ اس پر مخالفین عموماً اور صاحب ہدیہ مہدویہ نے یوں اعتراض کیا ہے۔

"غرض کہ سات برس تک کچھ ہوش و حواس بجانہ تھے۔ مگر فرائض نماز ادا کرتے تھے۔ کتب مہدویہ مانند مطلع الولایت وغیرہ میں خلاف عقل وعادت بشری یہ بات بھی لکھی ہے کہ اس سات برسوں میں ایک ذرہ طعام اور ایک قطرہ پانی بھی نہیں چکھا۔

جواب۔ معترض نے کچھ عرصہ تک بغیر کچھ کھائے پیئے زندہ رہنے کو خلاف عقل وعادت سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف عادت۔

خلاف عقل نہ ہونے کے بارے میں شیخ بو علی سینا نے "اشارات" کے نمط عاشر میں لکھا ہے:

ترجمہ: جب تمہیں یہ خبر ملے کہ کسی عارف کی عادتی مدت سے زیادہ مقرر غذا چھوٹ گئی ہے تو اس کو "سچ" جانو اور اس کو طبیعیات کا مشہور مسئلہ سمجھو۔ یہ یاد رکھو کہ جب آدمی کے قویٰ، موادردیہ کو ہضم اور مواد محمودہ کو متحرک نہ کریں تو اس کے مواد محمودہ محفوظ رہتے ہیں اور تحلیل نہیں ہوتے اور ان کا بدل ملنے سے مستغنی رہتے ہیں۔ بس جس کی یہ کیفیت ہو اس کی غذا، اتنی طویل المدت تک منقطع ہو جاتی ہے کہ اس حالت کے بغیر اس قدر مدت بلکہ اس کا دسواں حصہ بھی غذا نہ ملے تو ہلاک ہو جائے حالانکہ وہ اس کے باوجود محفوظ اور زندہ رہتا ہے۔

اسی ضمن میں محقق طوسی نے لکھا ہے:

"غذا کا چھوٹ جانا کبھی نادر عوارض کے سبب سے ہوتا ہے جو یا تو جسمانی عوارض ہوتے ہیں جیسے گرم امراض یا نفسانی

عوارض جیسے خوف وغیرہ۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ غذاء کا عوارض کی وجہ سے چھوٹ جانا ممتنع نہیں ہے بلکہ ایسا ہو سکتا ہے اسی لئے شیخ نے اس کے امکان پر متنبہ کیا ہے، اللہ کی معرفت غذاء سے باز رہنے کی مقتضی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب نفس بالکلیہ عالم قدس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو جسمانی قوتوں اور جسمانی افعال جیسے ہضم، شہوت اور تغذیہ اور ان کے متعلقات کے چھوڑ دینے پر ملتزم ہوتا ہے۔

امام فخر الدین رازی نے شرح اشارات میں لکھا ہے:

"اس کا معنی یہ ہے کہ عارف کی غذا کم ہونا ضروری ہے اگر یہ کہا جائے کہ کبھی عارف اس قلیل غذا کو بھی چھوڑ دیتا ہے تو اسکو بعید العقل نہ سمجھو۔ بلکہ اس کا سبب اصول طبیعیات میں معلوم ہے۔ جب ایسا ہو تو ممتنع نہیں ہے کہ عارف کا نفس اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق اور جسمانی علائق سے بالکلیہ یکسو ہونے کی وجہ اجزائے اصلی کی تحلیل سے قوائے طبیعیہ کے مناسب ہیئت حاصل ہونے کا سبب بن جائے۔ پس ایسی حالت میں اس کو بھوک نہ ہوگی اور یہ کیوں کہ بعید از عقل سمجھا جائے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ شدید خوف کی وجہ سے اکثر اوقات شہوت ساقط ہو جاتی ہے اور ہضم کا فساد اور قوائے طبیعیہ کے افعال میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ جب ایسا ہونا جائز ہے تو عارف کے لئے کیوں جائز نہیں۔ بلکہ بدرجہ اولی جائز ہے اس لئے کہ اس صورت میں نفس کمال پر ہوتا ہے۔ پھر بعید نہیں کہ نفس اپنے کامل ہونے کی وجہ سے مزاج اصلی کو تحلیل کے وقت محفوظ رکھنے کی قوت رکھے۔ یہ فعل گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تفسیر ہے "أَبِيتُ عِنْدَ رَبِّي يُطعِمُنِی وَ يسقِينِي" یعنی میں اپنے پروردگار کے حضور میں رہتا ہوں وہی مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔

نیز حضور کا یہ عمل بھی احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی روز مسلسل روزہ (صوم وصال) رکھتے تھے۔ بعض صحابہ نے بھی صوم وصال رکھنا چاہا تو حضورؐ نے انہیں منع فرمادیا اور کہا میں اپنے پروردگار کے حضور میں رہتا ہوں وہی مجھے کھلاتا ہے اور وہی مجھے پلاتا ہے۔ تمہاری حالت میری جیسی نہیں ہے۔ کیا معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ کس قسم کا کھانا اور پینا تھا۔ کیا یہ عقل وعادت کے مطابق تھا۔

حضرت مہدی علیہ السلام کا مندرجہ بالا واقعہ بھی اسی نوعیت کا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے ساتھ اس حقیقت کو بھی کھلے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "حضرت مہدی علیہ السلام اس جذبے کے عالم میں مستغرق ہونے کے باوجود ہر نماز کے وقت ہوشیار ہوتے اور نماز ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ آپ نماز کے لئے ہوشیار ہوئے، کچھ کھانے پینے کے لئے عرض کیا گیا تو فرمایا:

"آنچہ قوت بندہ است بہ بندہ می رسد (شواہد الولایت) یعنی جو کچھ بندہ کی غذا ہے، بندہ کو پہنچ جاتی ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے روایت تو بیان کر دی گئی ہے۔ مزید مثالیں بھی اس ضمن میں پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام، اہل سنت کے اعتقاد میں زندہ ہیں لیکن ان کے لئے کون روزانہ غذا فراہم کر رہا ہے؟ اگر عقل کے غلام اور عادت پرست لوگ ان صورتوں کو عقل و عادت بشری کے خلاف کہیں تو معترض اہل سنت کی طرف سے اس کا کیا جواب دے سکے گا۔

مولانا رومیؒ اس غذا کی جو ان حالتوں میں ان کو ملتی ہے، یہ حقیقت بیان کی ہے۔

قوت اصلی بشر نور خدا است   بشر کے لئے اصلی غذا نور خدا ہے

قوت حیوانی مر او را ناسزا است   حیوانی غذا اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔

دوسری جگہ اس عقدہ کی اس طرح گرہ کشائی فرماتے ہیں

قوت جبرئیل از مطبخ نہ بود   بود از دیدار خلاق ودود

ہم ہم چناں ایں قوت ابدالِ حق   ہم ز حق داں نہ طعام ونہ طبق

جبرئیل کی قوت مطبخ سے نہیں تھی۔ بلکہ خلاق و دود (اللہ) کے دیدار سے تھی۔ اسی طرح ابدال حق کی یہ قوت کو بھی حق کی طرف سے سمجھو، (جس کا تعلق) نہ کھانے سے ہے نہ طبق (خوان) سے۔

اب رہی بات خلاف عادت ہونے کی تو ذیل میں اس کی بھی ہلکی سی تشریح کر دی جاتی ہے۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ معجزہ یا کرامت کہتے ہی ہیں ان افعال کو جو خلاف عادت ہوتے ہیں جن کو اصطلاح میں "خوارق عادت" کہا جاتا ہے۔ پس اما منا علیہ السلام کا یہ واقعہ بھی خوارق عادت بشری کا ایک حصہ ہوا۔ اس پر تعجب کی کیا بات ہے؟

اس سلسلے میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیسیوں واقعات کو جو در اصل خوارق عادات تھے اور جن کو معجزات بنی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پیش کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ہمارا ایمان تو یہ ہے کہ حضورؐ کا ایک ایک فعل معجزہ ہی تھا۔ لیکن ہم بحر ذخار کا احاطہ کرنے سے عاجز ہیں۔ اس لئے بعض افراد امت کے واقعات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تا کہ قطروں کو دیکھ کر دریا کا قیاس کر لیا جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ترک غذاء کا واقعہ اہل سنت کے نزدیک محال نہیں ہے۔ بلکہ مختلف طور پر اوروں سے

بھی ظہور میں آیا ہے۔ چنانچہ ''مدارج النبوۃ'' میں لکھا ہے:

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ وہ صوم وصال پندرہ دن تک رکھتے تھے۔ اور ابراہیم تیمیؒ سے روایت ہے جو کہ تابعی تھے کہ آپ چالیس دنوں میں ایک انگور یا چند دانے کھاتے تھے۔

نیز عوارف میں لکھا ہے کہ بعض لوگ بغرض ریاضت چالیس دن کے طے روزے (بغیر سحری وافطار کے) رکھنے کی طاقت رکھتے تھے کہ چالیس دن ان کے پاس ایک دن کے روزہ کے حکم میں تھے۔

فصل الخطاب میں کشف المحجوب سے نقل کیا گیا ہے:

بزرگوں میں سے ایک نے کہا کہ ایک درویش مکہ آیا اور کعبۃ اللہ کے مشاہدہ میں ایک سال بیٹھا رہا کہ نہ کھانا کھایا نہ پانی پیا۔ نہ سویا اور نہ اس کو طہارت کی ضرورت پڑی۔

اسی طرح نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امام یافعی کہتے ہیں کہ ایک مشائخ سے روایت آئی ہے کہ میں نے خوارزم میں ایک عورت دیکھی کہ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔

اسی طرح امام یافعی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے

"مصر کے اطراف میں ایک عورت ایک جگہ پر قیام پذیر تھی کہ نہ تو سرما میں نہ گرما میں وہ اس جگہ سے کہیں گئی اور ان تیس سال میں نہ کچھ کھایا نہ پیا"۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کو لذت دیدار الٰہی حاصل ہوتی ہے انہیں نفسانی حظوظ سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔

یہ واقعات جو اولیاء سے متعلق ہیں جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی محض یہ بتانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں تاکہ معترضین کو معلوم ہو جائے کہ جن کو وہ خلاف عقل و عادت کہہ رہے ہیں وہ ان کے کھانے پینے کی عقل و عادت کے خلاف ہوں تو ہوں لیکن اللہ والوں کی بات ہی جداگانہ ہے۔ خود پر ان کو قیاس نہ کریں۔ لکھنے میں شیر اور شیر (دودھ) یکساں دکھائی دیتے ہیں لیکن ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ واقعات تو عام اولیاء کے ہیں تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خاتم الاولیاء کا کیا مقام ہو گا۔

جذبہ حق کے تعلق سے واقعات پر اعتراضات اور ان کے جوابات

ایک روز بی بی الہدادی (الہ دیتی) رضی اللہ عنھا نے کہا کہ کیا سبب ہے کہ بے ہوش رہتے ہو اور تحمل نہیں کر سکتے ہو۔ بولے کہ اس قدر تجلی ربوبیت کی ہوتی ہے کہ ان دریاؤں کا ایک قطرہ کسی ولی کامل یا نبی مرسل کو دیا جائے وہ تمام عمر کبھی ہوش میں نہ آوے۔ سبحان اللہ اس غفلت و جذب میں بھی یہی دھن تھی کہ حضرات انبیاء کی تنقیص اور اپنی تفضیل کا دم مارنا۔

جواب: حضرت امامنا علیہ السلام نے جو فرمایا امر واقعی کا اظہار تھا۔ اس سے پیغمبروں کی تنقیص مراد لینا کج فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا انا سید ولد آدم ولا فخر۔ میں اولاد آدم کا سردار ہوں، اور اس پر فخر نہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں امر واقعی کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرے پیش نظر اس پر فخر نہیں ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے موقع پر فرمایا لي مع الله وقت لا يسعني فيه ملك مقرب و لا نبي مرسل۔ یعنی مجھے اللہ کے ساتھ ایسا وقت بھی آتا ہے جس میں کسی مقرب فرشتہ اور کسی نبی مرسل کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اس سے امر واقعی کا اظہار ہی تو ہے۔ اگر کوئی معاند یہ سمجھے کہ اس جملے کے ذریعہ حضور مقرب فرشتوں اور انبیائے مرسلین کی تنقیص اور سب پر اپنی فضیلت جتانا مقصود ہے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ معترض کی خباثت ذہنی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقع پر فرمایا: فضلت على الأنبياء بستٍ۔ یعنی مجھے انبیاء پر چھ باتوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی ہے۔ اس سے مراد بھی امر واقعی کا اظہار ہے۔ دیگر انبیاء کی تنقیص مراد نہیں۔

اسی طرح یہاں بھی امام علیہ السلام نے امر واقعی کا اظہار فرمایا ہے۔ نہ اپنی تفضیل کا اظہار ہے اور نہ انبیاء علیہم السلام کی تنقیص کا بیان۔

امر واقعی کیا تھا؟ وہ بس یہ کہ آپ مقام ولایت محمدی کے خاتم ہیں۔ جس میں ہر وقت نئی نئی تجلیات ذاتی ہوتی ہیں۔ اور دوسری ولایتوں میں اسماء وصفات کی تجلیات ہوتی ہیں۔ تجلیات اسماء وصفات کا مقام اور ہوتا ہے اور تجلیات ذات کا مقام اور ہوتا ہے، جیسا کہ مشہور شعر ہے: موسیٰ زہوش رفت بیک تجلی صفات تو عین ذات می نگری در تبسمے۔

اور اے رسول تم نے تو بحالت تبسم عین ذات کو دیکھا اور موسیٰ علیہ السلام پر ربوبیت کی تجلی ہوئی تو وہ بے ہوش

ہو گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا ﴿الاَعراف:۱۴۳﴾۔ جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کو چکنا چور کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اس تجلی میں بھی مفسرین نے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ اسماء صفات کی بر ملا تجلی نہیں تھی بلکہ نور عرش تھا یا نور رب، ستر حجابات سے بمقدار سوراخ سوزن ظاہر ہوا تھا اور اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ پہاڑ پارہ پارہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پس جب ایک صفت کی تجلی کا یہ حال تھا تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تجلی ذاتی کی کیا کیفیت ہو گی۔ اسی کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لی مع اللہ وقت لایسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل کے ذریعہ بیان فرمایا۔ اسی طرح امام علیہ السلام نے بھی امر واقعہ کا اظہار فرمایا ہے۔

مگر افسوس کا مقام ہے کہ معترض نے اپنی ناواقفیت کی بناء پر یا دیدہ و دانستہ گستاخی و بد گوئی کی وجہ، کہ وہ اس اعلیٰ ترین مقام جذب اور عالم محویت کو غفلت کہہ رہا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ یہ مقام اللہ تعالیٰ کا فضل گراں مایہ تھا۔ اور خود اللہ نے ارشاد فرمایا۔ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿الضحیٰ:۱۱﴾۔ تم اپنے پروردگار کی اس نعمت کو جو تم پر مبذول ہوئی ہے بیان کرو۔ پس اگر امام علیہ السلام نے قرآن کے اس حکم کی تعمیل میں امر واقعی کا اظہار فرمایا تو اعتراض کی کیا بات ہے۔

اسی قبیل کی ایک روایت حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے آئی ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے وعظ کے دوران فرمایا۔ إنّ قَدمِي هَذِهِ على رَقبة كُلّ أوْلِيَاءِ اللهِ۔ یعنی میرا یہ قدم تمام اولیاء کے گردن پر ہے۔

کیا یہاں بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے یہ کہہ کر دیگر تمام اولیاء کی تنقیص اور اپنی فضیلت بیان کی ہے۔

بلکہ اس واقعہ میں تو یہ بھی مردی ہے کہ اس زمانے کے ایک ولی شیخ صنعان نے جب ان کے قدم کو قبول نہیں کیا تو اس بناء پر خنزیروں کے قدم اپنے کندھوں پر رکھے اور خوک بانی کی تھی۔

جنایات

حج میں حاجی سے جو کمی بیشی ہو جاتی ہے یا افعال حج میں تقدیم، تاخیر یا ترک ہو جاتا ہے اس کو جنایت کہا جاتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں عبادت میں جو نقص پیدا ہوتا ہے اس کو دور کس طرح کیا جاسکتا ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے اس باب میں اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) اگر بحالت احرام خوشبو کا استعمال ہو تو اس پر کفارہ ہے، وہ اس طرح کہ اگر ایک پورے عضو یعنی سر، ران یا پنڈلی پر خوشبو لگائی جائے یا اس سے زیادہ پر تو اس پر دم واجب ہے۔ اور اگر ایک عضو سے کم پر خوشبو لگائی جائے تو اس پر صدقہ واجب ہے۔

☆ واضح ہو کہ دم سے مراد خون بہانا ہے یعنی ایک بکرے کی قربانی ہے۔

اور صدقہ سے مراد گیہوں نصف صاع یعنی دو (۲) کے جی یا چار (۴) کے جی، کھجور کشمش وغیرہ۔

(۲) اگر سیا ہوا کپڑا اپہنے یا سر کو کپڑے سے ڈھانپ لے اگر ایک دن پورا ایسا کیا تو اس پر دم واجب ہے۔

(۳) اور اگر تھوڑی دیر کے لئے ہو صدقہ واجب ہے۔

(۴) اگر کسی نے دونوں ہاتھوں یا پیروں کے ناخن کاٹے تو اس پر دم ہے۔

(۵) اور اگر ایک ہاتھ یا ایک پیر کے ناخن کاٹے تو اس پر بھی دم ہے۔

(۶) اور اگر کسی نے پانچ ناخنوں سے کم ناخن کاٹے تو اس پر صدقہ ہے۔ لیکن امام محمد فرماتے ہیں کہ اس پر دم ہے۔

(۷) اور اگر کسی نے خوشبو لگائی یا سر منڈھوالیا یا بغیر عذر کے لباس پہن لیا تو اس کو اختیار ہے کہ یا تو وہ ایک بکری ذبح کرے یا چھ مسکینوں کو 3 صاع کھانا کھلائے یا اگر چاہے تو 3 دن کے روزے رکھے، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے۔ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ﴿البقرة:۱۹۶﴾ پس تم میں سے جو کوئی مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ سر منڈھوائے) تو اس پر فدیہ ہے یا تو روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی دے۔

(۸) اگر کسی نے بیوی کا بوسہ لیا یا اس کو شہوت سے چھوا تو اس پر دم ہے۔ خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

(۹) اگر کسی نے وقوف عرفات سے پہلے حالت احرام میں اپنی بیوی سے مباشرت کی، تو اس کا حج فاسد ہو گیا، اس پر بکری کی قربانی واجب ہے اور اپنے حج کے افعال کو جاری رکھے اس شخص کی طرح جس کا حج فاسد نہ ہوا ہو اور اس پر قضاء (آئندہ سال) بھی واجب ہے۔ اور آئندہ سال بیوی کو بھی حج میں ساتھ رکھنا ضروری ہو گا۔

(۱۰)اور اگر کسی نے وقوف عرفات کے بعد بیوی سے مباشرت کی تو اس کا حج تو فاسد نہیں ہو گا لیکن اس پر دنبہ (ایک اونٹ) کی قربانی واجب ہو گی۔

(۱۱)اور اگر کسی نے حلق کے بعد ہمبستری کی تو اس پر ایک بکری کی قربانی واحب ہو گی۔

(۱۲)اور اگر کسی نے طواف قدوم بغیر طہارت کے کیا تو اس پر صدقہ واجب ہے۔

(۱۳)اگر کسی نے طواف زیارت طہارت کے بغیر کیا تو اس پر بکری واجب ہے۔

(۱۴)اگر کسی نے طواف صدر (طواف وداع) بغیر طہارت کے کیا تو اس پر صدقہ واجب ہے۔

(۱۵)اگر کسی نے طواف زیارت میں سے 3 چکر یا اس سے کم چھوڑ دیا تو اس پر بکری واجب ہے۔

(۱۶)اگر کسی نے طواف زیارت کے چار چکر چھوڑ دئے تو وہ ہمیشہ محرم ہی رہے گا جب تک کہ وہ طواف نہیں کر لے گا۔

(۱۷)اگر کسی نے طواف وداع کے 3 چکر چھوڑ دئے تو اس پر صدقہ واجب ہے

(۱۸)اگر کسی نے طواف صدر (وداع) کے چار چکر یا پورا طواف چھوڑ دئے تو اس پر بکری واجب ہے۔

(۱۹)اگر کسی نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی چھوڑ دی تو اس پر بکری واجب ہے۔ مگر اس کا حج پورا ہوا۔

(۲۰)اور اگر کسی نے امام سے پہلے عرفات سے نکل گیا تو اس پر دم واجب ہے

(۲۱)اگر کسی نے وقوف مزدلفہ چھوڑ دیا تو اس پر دم واجب ہے۔

(۲۲)اگر کسی نے پورے رمی جمار (کنکریاں پھینکنا) کو چھوڑ دیا تو اس پر دم واجب ہے

(۲۳)اگر کسی نے ایک دن رمی جمار نہیں کی تو اس پر صدقہ ہے۔

(۲۴)اگر کسی نے یوم النحر (قربانی کے دن) جمرہ عقبہ پر رمی جمار نہیں کی تو اس پر دم واجب ہے۔

(۲۵)اگر کسی نے ایام النحر کے گذر جانے تک حلق یا قصر نہیں کیا تو اس پر دم واجب ہے۔

(۲۶)اگر کسی نے طواف زیارت کو موئخر کر دیا تو اس پر بھی دم واجب ہے

(۲۷)اگر کسی نے جوں مار دی تو وہ کچھ صدقہ دے دے۔

(۲۸)اگر کسی نے مچھر، پسو، اور چیچڑی مارا تو اس پر کچھ نہیں ہے احتیاطاً کچھ صدقہ دے دے۔

(۲۹)اگر محرم نے کسی کا شکار کر لیا۔ تو اس کا ذبیحہ مردار ہے۔ لیکن اگر کسی غیر محرم نے شکار کیا تو اس کا گوشت محرم کھا سکتا ہے۔

(۳۰)حج افراد کرنے والے پر جن چیزوں کے کرنے سے ایک دم لازم آتا ہے تو قران (حج و عمرہ ملا کر) کرنے والے پر دو دم لازم آتے ہیں۔ایک دم عمرہ کا اور ایک دم حج کا۔

(۳۱)اگر بغیر احرام کے میقات سے آگے بڑھ جائے تو اس پر دم واجب ہے۔

(۳۲) محرم کے لئے مرغی، یا بطخ کا انڈا توڑنا بھی جائز نہیں ہے اس پر دم واجب ہے۔مطلب یہ کہ انڈا خرید کر اس کا آملیٹ بنا کر کھانے سے دم واجب ہے۔کیوں کہ انڈے میں جان ہے۔لیکن اگر کوئی حلال آدمی انڈے کا آملیٹ لا کر دے تو کھایا جاسکتا ہے

(۳۳)اگر کوئی ٹڈی مار دے تو کچھ صدقہ دے دے۔

اگر کسی نے حج کا احرام باندھا لیکن اس سے وقوف عرفات فوت ہو گیا۔یہاں تک دسویں ذی الحجہ کی فجر طلوع ہو گئی تو اس کا حج فوت ہو گیا۔اس کو چاہئے کہ وہ طواف کرے۔سعی کرے اور حلال ہو جائے اورآئندہ سال اس حج کی قضاء کرے اور بعض کے پاس اس پر دم واجب ہے۔

البتہ عمرہ فوت نہیں ہوتا۔اس لئے کہ اس کے ایام مقرر نہیں ہیں۔عمرہ سال بھر کیا جاسکتا ہے پانچ دن کے سوائے کہ ان میں عمرہ مکروہ ہے۔یوم عرفہ۔یوم النحر۔اور ایام تشریق کے 3 دن۔

عمرہ سنت ہے۔جس میں صرف 3 افعال ہیں۔احرام، طواف،صفاو مروہ کی سعی۔

جہاد

وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ﴿البقرة:۲۱۸﴾ "جہاد کے معنی کوشش میں مبالغہ کے ہیں۔ یہاں مراد ہے اللہ کے راستے میں۔ اللہ کے دشمنوں سے جہاد کر۔ اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے مت ڈرو۔ مفسرین نے جہاد کا حق یہ بیان فرمایا ہے کہ جہاد صدق نیت سے ہو۔ اور خالص اللہ کے لئے ہو۔ تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ نیز جہاد سے مراد جہاد بالنفس بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اسی کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس آرہے تھے تو فرمایا رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر۔ یعنی ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس ہوئے۔ اس فرمان میں آنحضرت ﷺ نے کفار کے ساتھ لڑنے کو جہاد اصغر اور نفس وھوی کے ساتھ لڑنے کو جہاد اکبر فرمایا ہے۔ حضرت امامنا مہدی موعودؑ سے بھی اسی قسم کی روایت آئی ہے۔ چنانچہ آپ سے شاعر کا یہ شعر منقول ہے۔

تلسی رن میں جھو جھنا ایک گھڑی کا کام   نت اُٹھ من سے جھو جھنا بن کھانڈے سنگرام

یعنی اے تلسی میدان جنگ میں لڑنا ایک گھڑی کا کام ہے اور ہمیشہ نفس سے جھگڑتے رہنا بغیر ہتھیار کے جنگ ہے۔
پھر جب سیدنا امام مہدیؑ فرماتے ہیں مومن اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنے والا ہوتا ہے۔

جبرئیلؑ

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جبرئیل کا نام تین مقامات پر لایا ہے چنانچہ

(۱) قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّـهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿بقرہ:۹۷﴾ کہ دیجئے کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہے محض اس وجہ سے کہ اس نے اللہ کے حکم سے اس کتاب کو آپ کے قلب پر نازل کیا جو تصدیق کرنے والی ہے پہلی کتابوں کی اور ایمان لانے والوں کیلئے ہدایت وبشارت ہے۔

(۲) مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّـهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّـهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ﴿بقرہ:۹۸﴾ جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔

(۳) وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّـهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ﴿تحریم:۴﴾ اگر پیغمبر کے مقابلے میں تم ایک دوسرے کی مدد کروگے تو اللہ بھی آپ کا کارساز ہے اور جبرئیل اور نیک مسلمان اور فرشتے بھی ان کے مددگار ہیں۔

پہلی دو آیتوں میں جبرئیل کے تعلق سے یہودیوں کی بدگمانی اور بدگوئی کی طرف اشارہ ہے، یہود کہتے تھے جبرئیل ہمارا دشمن ہے۔ اس نے کئی بار ہم سے دشمنی کی ہے۔ اس کے سوا اگر دوسرا فرشتہ وحی لاتا تو ہم مان لیتے، اس کے جواب میں اللہ یہ فرماتا ہے کہ فرشتے معصوم ہوتے ہیں، وہ وہی کام کرتے ہیں جس کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان سے دشمنی کیا معنی ---!! سنو جو ان کا دشمن ہوگا اللہ اس کا دشمن ہوگا۔

سورۂ تحریم میں اللہ نے فرشتوں کے تعلق سے بیان فرمایا ہے۔ "لَّا يَعْصُونَ اللَّـهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ" ﴿التحریم:۶﴾ یعنی اللہ کے حکم کی مطلق نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو دیا جاتا ہے وہ برابر اس کو بجالاتے ہیں۔

اور تیسری آیت کے ذریعہ بی بی عائشہؓ اور بی بی حفصہؓ پر یہ واضح کردینا تھا کہ تم دونوں ہمارے پیغمبر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے محاذ آرائی کروں گی تو جان لو کہ پیغمبر تنہا نہیں ہیں، بلکہ اللہ ان کا دوست ہے، مالک ہے اور آقا ہے اور جبرئیل بھی ان کے مددگار ہیں اور نیک مومنین بھی ان کے کارساز ہیں اور تمام فرشتے بھی ان کے مددگار ہیں۔

واقعہ یہ ہے، جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ سے حضرت ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے

تھے۔ حضور ﷺ کی لونڈی تھیں اور جن سے مباشرت جائز تھی وہ ایک دن حضور ﷺ کے پاس تشریف لائیں اس وقت حضورؐ بی بی حفصہؓ کے گھر تشریف فرما تھے اور حضرت حفصہؓ حضور ﷺ کی اجازت سے اپنے والد حضرت عمر فاروقؓ کے گھر گئی تھیں۔ جب آپؓ واپس اپنے گھر آئیں تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ آپؓ باہر بیٹھ گئیں، جب دروازہ کھلا اور ماریہ قبطیہؓ باہر تشریف لائیں تو حضرت حفصہؓ کو برا لگا، آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا "آج میری باری کا دن ہے، گھر بھی میرا، اور بستر بھی میرا، اور ماریہ قبطیہ یہاں۔ آپؐ نے فرمایا، وہ میری لونڈی ہیں اور میرے لئے حلال ہے، خیر میں اگر ان کو میرے اوپر حرام قرار دے لوں تو کیا تم راضی ہو جاؤ گی، انہوں نے کہا، ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ بات (کہ میں نے ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا ہے) اپنی حد تک رکھو، کسی سے مت کہو اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میرے بعد تمہارے والد اور عائشہ کے والد دونوں میرے خلیفہ ہوں گے۔ مگر یہ بات بھی کسی سے مت کہو، لیکن ادھر حضور ﷺ باہر تشریف لے گئے اور ادھر بی بی حفصہؓ نے بی بی عائشہؓ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور یہ خوشخبری سنادی کہ آنحضرت ﷺ نے ماریہ قبطیہ سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے اور ادھر اللہ نے حضور ﷺ کو یہ بات معلوم کر دی۔ کہ بی بی حفصہؓ نے بی بی عائشہؓ سے یہ بات کہہ دی۔ حضور ﷺ نے بی بی حفصہ سے فرمایا تم نے وہ راز کی بات دوسروں سے کہہ دی۔ پوچھا کہ آپ کو کس نے یہ بتایا، غالباً ان کا گمان بی بی عائشہؓ کی طرف گیا ہو گا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، مجھے اس بات کی خبر اس نے دی جو علیم و خبیر ہے، اس بات سے حضور ﷺ کو تکلیف ہوئی۔ اور آپؐ نے بی بی حفصہؓ کو طلاق دینے تک کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن جبرئیلؑ نے آپؐ کو اس ارادہ سے روک دیا۔ بی بی حفصہؓ اور بی بی عائشہؓ دونوں کی حرکت سے حضور ﷺ کو تکلیف ہوئی تھی۔ تو اللہ ان دونوں سے کہہ رہا ہے کہ اگر تم دونوں توبہ کر لو تو بہتر ہے، کیوں کہ تمہارے دل حق کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اگر تم دونوں کو اپنی شرافت، نجابت اور خاندان اور والدین پر ناز ہے اور اسی طرح حضور ﷺ کے مقابلہ میں عائلی طور پر ہی سہی سازشیں رچاتی رہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتی رہیں تو حضور کا کچھ نہیں بگڑے گا کیوں کہ پیغمبر کا کارساز حقیقی تو اللہ ہے، پھر جبرئیل اور نیک مسلمان (خصوصاً حضرت ابو بکرؓ اور عمر فاروقؓ) اور تمام فرشتے بھی حضور کے مددگار ہیں، البتہ نقصان تمہارا ہو گا کہ حضورؐ اگر تم کو طلاق دے دیں گے تو تم حضور کی زوجیت کے شرف سے محروم ہو جاؤ گی اور اللہ حضور کو تم سے بہتر بیویاں دے دے گا (یہ ہے خلاصہ اس آیت کا اور اس کے بعد کی آیتوں کا)۔

حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل، حضرت عزرائیل یہ چاروں فرشتے دیگر تمام فرشتوں میں بزرگ اور معظم ہیں، اس لئے کہ ان کے حوالے جو امور ہیں وہ معظم ہیں۔ خصوصاً حضرت جبرئیلؑ کا کام اللہ کی جانب سے پیغمبروں کو سفارت و رسالت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نبوت کیلئے جس ہستی کا انتخاب فرمالیتا تھا اس کی طرف رسالت کا پیغام

دینا بھی جبرئیل کی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح غار حرا میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی اور قرآن کے نزول کی ابتداء ہوئی تو، جبرئیلؑ کے ذریعہ ہی ہوئی۔

اس کا ذکر اللہ نے سورۂ شعراء میں اسطرح فرمایاہے۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿الشعراء:۱۹۳، ۱۹۴﴾ اس قرآن کو لیکر روح الامین (جبرئیل) اترا ہے۔ آپ کے دل پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں (نبی ہو جائیں)۔ اس کے علاوہ حضرت زکریاؑ اور بی بی مریم کے پاس بھی جبرئیل کے آنے کا ذکر قرآن میں ملتاہے۔

اس آیت میں اللہ نے جبرئیل کو امانت دار فرشتے کے نام سے یاد فرمایاہے، سبحان اللہ، قرآن شریف کتاب مبین ہے، لانے والے روح الامین ہے اور جس پر کتاب اتری وہ رسول امین ہے۔

جبرئیلؑ کبھی کبھی بشر کی شکل میں بھی آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تھے۔ فرشتے چونکہ ارواح مجرّدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ لیکن جب اللہ نے چاہاتو وہ بشکل بشر ہی آتے تھے۔ چناچہ حضور کے پاس آپ دحیہ کلبی کی شکل میں آئے تھے۔ جو بہت خوبصورت وجیہ اور شکیل تھے۔

جن

اللہ نے فرشتوں کو نور سے، انسانوں کو مٹی سے اور جنات کو آگ سے پیدا کیا۔ چناچہ سورۂ الرحمان میں اللہ نے فرمایا خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ﴿الرحمن:۱۴﴾۔ اللہ نے انسان کو ٹھیکرے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

فرشتوں کو تو کوئی اختیار نہیں ہے، اس لئے وہ احکام خداوندی سے سرتابی بھی نہیں کرتے، یفعلون مایومرون، ان کو جو کرنے کا حکم دیا جاتا ہے وہ وہی کرتے ہیں، اسلئے مکلّف بہ شرع نہیں ہیں۔ البتہ انسان اور جن دونوں مکلّف ہیں یعنی ان کو شرع کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ جس طرح انسانوں میں مختلف المذاہب ہیں اسی طرح جنات بھی ہیں۔ یعنی ان میں بعض مسلم ہیں اور بعض نہیں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت انسانوں اور جنات دونوں مخلوق کیلئے ہوئی ہے۔

جنات کا ذکر قرآن شریف میں پہلے سورۂ احقاف میں آیا ہے، پھر سورۂ جن میں بھی انکے ایمان لانے کی تفصیل آئی ہے۔ چناچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّـهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ وَمَن لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّـهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءُ أُولَـٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿الأحقاف:۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲﴾ جب ہم نے جنوں میں سے چند افراد کو آپ کی طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، پس جب وہ قریب آئے، تو آپس میں کہا خاموش رہو، جب پڑھنا تمام ہوا تو وہ اپنی قوم کی طرف دوڑے تاکہ اپنی قوم کو ڈرائیں، کہنے لگے، اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب سنی جو موسیٰؑ کے بعد نازل ہوئی ہے اور حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف دعوت دیتی ہے، اے ہماری قوم اللہ کے داعی کی بات مان لو اور اس پر ایمان لاؤ تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ میں رکھے گا اور جو شخص اللہ کے داعی کی بات نہیں مانے گا تو وہ زمین میں خدا کو عاجز کرنے والا تو ہے نہیں اور اس کیلئے خدا کے سوا دوست بھی نہیں ہیں، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے جنات کی رسائی آسمانوں تک ہوتی تھی۔ وہاں سے وہ فرشتوں کی باتیں تھوڑی بہت سن لیتے تھے۔ اور زمین پر جادوگروں اور کاہنوں کو بتلادیتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی دکان غیب دانی چمک جاتی تھی؛ لیکن بعثت محمدیؐ کے بعد آسمان پر سخت پہرے لگ گئے، اگر جن

کسی طرح آسمانوں تک پہنچ بھی جاتے تا کہ چوری چھپے کچھ بات سن لیں تو شہاب ثاقب کے ذریعہ ان پر مار پڑتی۔ اور وہ زمین کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے۔ البتہ ان کو یہ فکر تھی کہ دنیا میں ایسی کون سی بات ہوگئی ہے کہ جس کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوا ہے۔ اس کی تلاش میں جنگلوں اور شہروں میں پھرا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ چند اصحاب کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن کی قرأت ہو رہی تھی۔ ایسے میں جنات کے ایک قافلہ کا وہاں سے گذر ہوا، انہوں نے جب یہ عجیب کلام سنا (ماشاء اللہ و سبحان اللہ) فجر کا سہانی اور نورانی وقت، اللہ کا کلام اور محمد عربی کی قرأت ان سب چیزوں نے ان کے دلوں میں قرآن کی عظمت کے ساتھ ہیبت بٹھادی، آپس میں کہا خاموش رہو۔ جب قرأت ختم ہوئی تو کلام الٰہی کے اسیر بے دام ہو چکے تھے۔ دل میں ایمان پیدا ہو گیا اور یقین کی دولت کو لیکر کچھ کہے بغیر ہی اپنی قوم کے پاس گئے۔ قرآن کی تعریف کی اور اپنا واقعہ سنایا اور لوگوں کو بھی اسے قبول کرنے کی دعوت دی۔ اور ترغیباً یہ بھی کہا کہ یہ کوئی نیا کلام نہیں ہے۔ بلکہ توریت میں جو احکام خداوندی ہیں تقریباً وہی باتیں، وہی نصیحتیں اس کلام میں بھی ہیں۔ یہ کلام اور جس کی طرف یہ کلام نازل ہوا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے، سیدھے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ایسے داعی کی دعوت کو قبول کر لینا چاہئے، تو اسلام سے پہلے جو کچھ گناہ ہم سے سرزد ہو چکے ہیں اللہ ان کو بخش دیگا۔

یہ حال آنحضرت ﷺ کو معلوم نہ ہوا۔ ایک درخت نے آپ ؐ کو یہ واقعہ سنایا، بعد میں وحی کے ذریعہ اسکی حقیقت آپ کو بتلادی گئی۔ اس کا ذکر سورۂ جن میں اسی طرح آیا ہے۔

جائز وناجائز

مردوں کیلئے ریشمی لباس جائز نہیں ہے۔ اگرچہ وہ لباس بدن سے لگا ہوا نہ ہو۔ یعنی اسکے اور بدن کے درمیان دوسرا لباس بھی ہو۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حریر اور دیبا یعنی ریشم (کے لباس) سے منع فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اسکو وہی پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔

البتہ عورتوں کیلئے ریشم، حریر، دیبا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث آئی ہے، کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر اس حال میں تشریف لائے کہ آپ کے ایک ہاتھ میں ریشم تھا اور دوسرے ہاتھ میں سونا اور فرمایا یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اور میری امت کی عورتوں کیلئے حلال ہیں۔

حضرت ابو حنیفہؒ کے پاس اس تکیہ کا ٹیکا لگانا جائز ہے جس کا غلاف ریشم کا ہے۔ لیکن امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے پاس وہ بھی مکروہ ہے۔ البتہ میدان جنگ میں ریشمی لباس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ مسئلہ صاحبین کا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے پاس وہ بھی جائز نہیں ہے۔ جواز کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تلوار ریشم کے لباس پر سے پھسل جاتی ہے۔

مردوں کیلئے سونے اور چاندی کا کوئی زیور جائز نہیں ہے۔ لیکن انگوٹھی، کمرپٹہ اور تلوار کا قبضہ جو چاندی کا ہے اس میں حرج نہیں ہے بشرطیکہ چاندی مثقال برابر ہو اس سے زیادہ ہو تو جائز نہیں۔ اگر انگوٹھی چاندی کی ہو اور اس کا نگینہ یاقوت، فیروز زمرد کے مشابہ ایک قیمتی پتھر (زبرجد) جس میں اس کا نام یا اللہ کے ناموں میں سے کوئی نام کندہ ہوا ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر بیت الخلا میں جانا ہو تو اسکو جیب میں رکھ لینا چاہئے اگر انگوٹھی پیتل یا پتھر کی ہو تو جائز نہیں۔

اور خجندی میں ہے کہ پتھر، پیتل، سیسہ، تانبا ان سے بنی ہوئی انگوٹھی مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے مکروہ ہے۔ کیونکہ یہ دوزخیوں کا لباس ہے۔ البتہ عقیق کی اجازت ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تختموا بالعقیق فانه مبارك" عقیق کی انگوٹھی پہنو کیونکہ وہ برکت والی ہے۔

عورتوں کیلئے سونے اور چاندی کے زیورات پہننا جائز ہے۔

اسی طرح بچوں (لڑکوں) کیلئے ریشم اور سونا مکروہ ہے۔ اس لئے جس طرح مردوں کیلئے وہ حرام ہے اسی طرح پہنانا بھی حرام ہے جس طرح شراب پینا حرام ہے اسی طرح پلانا بھی حرام ہے۔ اگر بچوں کو پہنائیں گے تو پہنانے والے گناہ گار ہوں گے بچیوں کیلئے کوئی بات نہیں ہے۔

مردوں اور عورتوں کیلئے سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا جائز نہیں ہے اسی طرح سر کو لگانے کا تیل اور خوشبو کا تیل سونے چاندی کی برتنوں میں سے استعمال ناجائز ہے۔ سونے چاندی کے چمچوں کا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔ شیشہ، بلور اور عقیق کے برتنوں کا استعمال جائز ہے۔

حضرت ابو حنیفہؒ کے پاس چاندی کے ملمع کئے ہوئے برتن سے پانی پینا، ملمع کی ہوئی زین پر سوار ہونا، ملمع کی ہوئی کرسی پر بیٹھنا جائز ہے۔ لیکن احتیاط افضل ہے۔ کیوں کہ اس میں تفاخر کا مادہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔

قرآن شریف کو سونے کے پانی سے لکھنا اسی طرح مسجد کو اس سے آراستہ کرنا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد قرآن شریف کلام اللہ اور اللہ کے گھر (مسجد) کی تعظیم و تشریف ہے۔

لیکن اس میں باریکی یہ ہے کہ کام مسجد کے وقف میں سے نہیں ہونا چاہئے۔ اگر وقف سے نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

خصی شدہ لوگوں کو خادم بنانا یا ان سے خدمت لینا مکروہ ہے۔ لیکن جانوروں کو خصی کرنا جائز ہے۔

خچر کی سواری جائز ہے حالانکہ اسکی پیدائش گھوڑے اور گدھی سے ہوتی ہے۔

دنیوی معاملات میں فاسق کا قول بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن دینی معاملات میں عادل کا قول ہی قبول کرنا چاہئے۔

کسی مرد کو، کسی اجنبی عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا دیکھنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ﴿النور:۳۱﴾ عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنی زینت کے مواضع کو ظاہر نہ کریں سوائے ان کے جو عادۃً ظاہر ہو جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ و عباسؓ فرماتے ہیں اس سے مراد سرمہ اور انگوٹھی کی زینت کی جگہ یعنی آنکھ اور انگلیاں، آنکھ سے مراد چہرہ، اور انگلیوں سے مراد ہتھیلیاں۔ اور یوں بھی خرید و فروخت اور لینے دینے میں ان دونوں کی حاجت ہوتی ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ بازو پر بھی نظر پڑ سکتی ہے۔ اس لئے کہ عورت پکاتے وقت یا کپڑے دھوتے وقت بازو کھلے رکھتی ہے۔

حاکم و قاضی کو فیصلے کے وقت، اور گواہ کو گواہی دیتے وقت عورت کے چہرے کی طرف دیکھنے کی اجازت ہے۔ اگرچہ اسکو اندیشۂ شہوت ہو۔

علاج کرنے والے کو عورت کے مرض کی جگہ دیکھنا جائز ہے۔

ایک مرد دوسرے مرد کے پورے بدن کو دیکھ سکتا ہے مگر ناف سے لیکر گھٹنے تک نہیں دیکھ سکتا۔ عورت بھی مرد کا وہ حصّہ دیکھ سکتی ہے جو ایک مرد دیکھ سکتا ہے۔

اور عورت بھی دوسری عورت کے بدن کا وہ حصّہ دیکھ سکتی ہے جسقدر کہ ایک مرد، دوسرے مرد کے بدن کا حصّہ دیکھ سکتا ہے۔ ایک مرد اپنے محرموں کا چہرہ، سر، پنڈلیاں اور بازو دیکھ سکتا ہے۔ لیکن ان کی پیٹھ، پیٹ اور ران نہیں دیکھ سکتا۔ محرم سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے ہمیشہ کیلئے نکاح حرام ہے اور اس کے وجوہ تین ہیں۔

(۱) نسب جیسے ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی، دادی، پوتی، نواسی۔

(۲) سبب جیسے دودھ کا رشتہ ہو۔

(۳) سسرال جیسے ساس (بیوی کی موجودگی میں) سالی اور اسی طرح ایسی ہر دو عورتوں سے نکاح کرنا جن میں سے اگر ایک کو مرد تصور کیا جائے تو ان میں آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ جیسے پھوپھی اور بھتیجی۔ اگر پھوپھی کو مرد تصور کریں تو چچا ہو جائے گا اور چچا اور بھتیجی میں نکاح جائز نہیں ہے۔ اور اگر بھتیجی کو مرد تصور کریں تو وہ بھتیجہ ہو جائے گا۔ پھوپھی اور بھتیجے میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

انسانوں اور جانوروں کی غذا کے قابل چیزوں کا احتکار کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ احتکار کے غلہ کو خرید کر گودام میں اس نیت سے رکھ چھوڑنا اور فروخت نہ کرنا کہ جب قیمت بڑھے گی تب فروخت کریں گے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف بھی ہوتی ہے اور پریشانی بھی۔

اسی طرح فتنہ کے زمانے میں ہتھیار کا فروخت کرنا بھی مکروہ ہے۔

چار پیر چودہ خانوادے

اکثر صوفیہ کے نزدیک خرقہ تصوف یا خرقہ فقر، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان چار حضرات کو ملا ہے۔

(ا) حضرت حسنؓ ۳ھ تا ۵۰ھ (ب) حضرت حسینؓ ۴ھ تا ۶۱ھ (ج) حضرت کُمیل ابن زیادؒ ۸۶ھ (د) حضرت حسن بصریؒ ہر چاروں حضرات چہار پیر کہلاتے ہیں۔ مر آۃ الاسرار (۱:۱۸) اور یہی حضرت علیؓ کے خلفاء مانے جاتے ہیں۔

تصوف میں مشہور چہار دہ خانوادے انہیں سے نکلے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) خانوادہ زیدیاں، حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد شیخ عبد الواحد بن زید ۱۷۷ھ سیر و سلوک کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے ان سے جو لوگ مرید ہوئے وہ "زیدیاں" کہلانے لگے۔

(۲) خانوادہ عیاضیاں، جو لوگ حضرت فضیل بن عیاضؒ سے منسوب ہوئے وہ عیاضیاں کہلانے لگے۔ عیاضیاں ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں۔ نکاح نہیں کرتے مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کرتے۔

(۳) خانوادۂ ادھمیاں، حضرت ابراہیم بن ادھم کو حضرتؑ اور حضرت امام محمد باقر سے نسبت ارادت تھی۔ ہمیشہ سفر میں رہتے اور مجرد زندگی گذارتے تھے۔

(۴) خانوادۂ ہبیریاں یہ وہ صوفیہ ہیں جو حضرت ہبیرہ بصری سے منسوب تھے۔ ہبیریاں ہمیشہ باوضو رہتے، شہر اور بستیوں میں قیام نہیں کرتے۔ پاسبانی دل کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ فتوح کسی سے قبول نہیں کرتے۔ ہر تین یا چار روز کے بعد لیوہ یا جنگلی گھاس پر افطار کرتے ہیں۔

(۵) خانوادۂ چشتیاں، چشتیاں خواجہ علو دینوری (۲۹۸ھ) سے وابستہ ہیں۔ خواجہ علو دینوری کے مرید خواجہ ابو اسحاق چشتی (۳۲۹ھ) ہیں جو شام کے رہنے والے تھے۔ جب آپ خواجہ علو دینوری کی خدمت میں آئے تو خواجہ نے پوچھا کہاں سے آئے۔ جواب دیا شام سے۔ اس پر خواجہ علو دینوری نے کہا تم آج سے چشتی کہلاؤ گے۔ پھر خلافت دے کر چشت (خراسان) روانہ کر دیا۔ وہاں کے ایک رئیس خواجہ احمد چشتی آپ کے مرید ہو گئے۔

اپنے بعد انہوں نے اپنے فرزند خواجہ محمد چشتی (۴۳۱) کو خلافت عطا کی، خواجہ محمد چشتی سے خلافت ان کے خواہر زادہ خواجہ ناصر الدین چشتی ابو یوسف چشتی ۴۵۹ھ اور ان کے فرزند خواجہ قطب الدین مودود چشتی (۵۶۷ھ) کو پہنچی۔ یہ "پنج خواجگان چشت" کہلاتے ہیں۔ یہ خانوادہ خواجہ معین الدین چشتی (۶۳۳ھ) کے توسط سے بر صغیر پہنچا۔ یہ لوگ سماع کو پسند

کرتے ہیں اور پیروں کا عرس مناتے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بر صغیر ہند و پاک کے مشہور اور نامور بزرگ ہیں۔ آپ کا مولد سجستان، منشا خراسان اور مدفن اجمیر ہندوستان ہے۔ آپ کے دادا کا شمار حسینی سادات میں ہوتا ہے۔ آپ نے سمرقند و بخارا میں علوم دینیہ کی تکمیل کرتے ہوئے عراق و عرب کا قصد کیا نیشاپور کے قصبہ ہارون پہنچ کر حضرت شیخ عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورے بیس سال شیخ موصوف کی خدمت میں رہے پھر چھ ماہ تک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے پھر لاہور اور وہاں سے دہلی آئے اور اجمیر کو اپنی دینی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور وہی آپ کا مدفن ہے۔

(۶) خانوادہ ن عجمیاں یا حبیبیاں، جو صوفیا حضرت حبیب عجمی سے مرید ہوئے وہ عجمیاں یا حبیبیاں کہلانے لگے۔ حضرت عبد الرحمان بن عوف جو رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی تھے ان کے خاندان کے دو متقی اور پرہیز گار بھائی حضرت حبیب عجمی کے مرید ہوئے۔ اپنے مرشد کے حکم پر بارہ سال تک غار حرا میں عبادت الٰہی میں مشغول رہے۔ زندگی مجرد تھی۔ لوگوں سے کنارہ کش رہے حضرت کے حکم پر تین دن یا سات دن کے بعد ایک کھجور یا تین کھجور سے افطار کرتے تھے۔

(۷) خانوادۂ طیفوریاں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت امام جعفر صادقؒ (۱۴۸ھ) کی خدمت میں بارہ سال رہے۔ جو صوفیاء شیخ بایزید بسطامی سے منسوب ہوئے وہ طیفوریاں کہلاتے ہیں۔ یہ سات یا دس دن کے بعد افطار کرتے ہیں۔ اہل دنیا سے گریزاں رہتے ہیں۔

(۸) خانوادۂ کرخیاں۔ حصرت معروف کرخی (۲۰۰ھ) سے منسوب صوفیاء کرخیاں کہلاتے ہیں حضرت معروف کرخیؒ حضرت امام علی رضا کے غلام تھے کرخیاں دنیا سے نفور اور خوفِ خدا سے ہر وقت گریاں رہتے ہیں۔

(۹) خانوادۂ سقطیاں۔ حضرت معروف کرخی کے مرید شیخ سرّی سقطیؒ سے جو صوفیاء منسوب ہیں وہ کرخیاں کہلاتے ہیں۔ برامکہ کے مشہور خاندان کے تین اشخاص عزیز بن یحییٰ برمکی، عمران بن فضل برمکی اور علی بن عبد اللہ برمکی نے شیخ سرّی سقطی کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ لوگ صائم الدہر اور قائم اللیل رہتے ہیں۔ اکثر اعتکاف میں رہتے ہیں تین روز کے بعد خلوت سے نکل کر دوستوں کے ساتھ روزہ کھولتے ہیں۔ حلقہ بنا کر ذکر کرتے ہیں۔

(۱۰) خانوادۂ جنیدیاں، صوفیاء کا جو طبقہ جو حضرت جنید بغدادی سے نسبت رکھتا ہے وہ جنیدیاں کے نام سے معروف ہے۔ جنیدیاں توکل کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

(۱۱) خانوادۂ گاذرونیاں۔ حضرت عبداللہ بن خفیف کے مرید شیخ ابواسحاق گاذرونی (۴۲۶ھ) سے جو صوفیاء منسوب ہیں گاذرونیاں کہلاتے ہیں گاذرونیاں سر منڈھا کر حق کا کام کرتے ہیں۔

(۱۲) خانوادۂ فردوسیاں، شیخ نجم الدین کبریٰ (۶۱۸ھ) فردوس کے رہنے والے تھے۔ شیخ ابوالنجیب سہروردی کے مرید ہوئے۔ مرشد نے خلافت عطا کرکے کہا کہ تم مشائخ فردوس میں سے ہو خانوادۂ فردوسیاں میں دو فرقے ہیں ایک فردوسیہ اور دوسرا اکبریہ فردوسیاں رقص کرتے ہیں سماع اور وجد کو پسند کرتے ہیں۔ ذکر جلی کرتے ہیں۔ کافر و مسلم غنی اور فقیر میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔

(۱۳) خانوادۂ طوسیاں، شیخ علاالدین طوسی سے جو صوفیہ منسوب ہیں وہ طوسیاں کہلاتے ہیں۔ یہ بھی رقص، سماع اور وجد کو پسند کرتے ہیں۔

(۱۴) خانوادۂ سہروردیاں۔ شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی سے منسوب صوفیہ سہروردیاں کہلاتے ہیں اگرچہ چودہ خانوادوں کو زیادہ شہرت نصیب ہے لیکن خانوادوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ لطائف اشرفی میں ان سلسلوں کی تعداد ۱۸ اور ۳۹ تک بتائی گئی ہے۔ خلیق احمد نظامی نے اپنی تصنیف تاریخ مشائخ بہشت میں ۱۷۳ سلسلوں کے نام دئے ہیں۔

جس طرح فقہ میں ائمہ اربعہ کے مسالک و مذاہب کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے اسی طرح صوفیہ کے یہ فرقے الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات کبھی باہمی رسہ کشی کی صورت اختیار نہیں کرتے جس طرح کہ فقہی اختلافات کے حاملین میں ہوتا ہے۔ یعنی آپسی بحث و مناظرہ یا قال و قلت یا قال و اقول یاقلنا کذا و قال خصمنا کذا۔

شیخ علی ہجویری نے اپنے رسالہ کشف المحجوب میں تصوف کے بارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے جس میں دس فرقے مقبول اور دو فرقے مردود ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) محاسبیہ (۲) قصاریہ (۳) طیفوریہ (۴) جنیدیہ (۵) نوریہ (۶) سہیلیہ (۷) حکیمیہ (۸) خزازیہ (۹) خفیفیہ (۱۰) سیاریہ (۱۱) حلمانیہ۔ ایک گمراہ فرقہ جو شیخ ابوحلمان الفارسی الدمشقی کی طرف منسوب ہے اس کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا خوبصورت اشخاص کے اندر موجود ہے (۱۲) حلاجیہ۔ جو غلط طور پر حسین بن منصور حلاج کی طرف منسوب ہے یہ الحاد اور ترک شریعت کے لئے بدنام ہے۔ کیوں کہ منصور حلاج تو پکے موحد تھے۔ یہ اور بات ہے کہ حالت سکر میں ان کی زبان سے "انا الحق" صادر ہوا تھا۔ لیکن ان کے اس "انا" کو "فرعون" کے انا سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ یہ انا وہ ہے جس پر اللہ کی رحمت ہے اور فرعون کے انا پر اللہ کی لعنت ہے۔

حج

حج کے لغوی معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔ شرع میں حج کے معنی بیت اللہ کا ارادہ کرنے کے ہیں جس میں اللہ اور اس کے گھر کی تعظیم بھی ہے اور حج کا ایک اہم رکن عظیم یعنی طواف کعبتہ اللہ بھی ہے۔

عبادتیں تین قسم کی ہوتی ہیں (۱) بدنی جیسے نماز اور روزہ۔ (۲) مالی جیسے زکوٰۃ (۳) بدنی اور مالی دونوں کا مرکب حج ہے جس میں بدنی عبادت بھی ہوتی ہے اور مالی بھی۔

حج فرض ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا: وَلِلّٰـهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ ﴿آل عمران:۹۷﴾۔ اور اللہ کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ وہ (اللہ کے) گھر کا ارادہ کریں۔

جس وقت زادراہ میسر ہو جائے تو حج کرنے میں انسان کو تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'': جس شخص کے پاس اللہ کے گھر جانے کا زاد وراحلہ میسر آجائے پھر بھی وہ حج نہ کرے تو اللہ کو اس کی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔

حج میں فرائض 3 تین ہیں۔ (۱) احرام (۲) وقوف عرفات (۳) طواف کعبۃ اللہ (طواف زیارت)

حج کے واجبات پانچ ہیں (۱) وقوف مزدلفہ (۲) رمی جمار (کنکریاں مارنا) (۳) حلق (سر کے بال مونڈھوانا یا بال چھوٹے کرنا) (۴) صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا (۵) طواف صدر۔ (سوائے حائضہ کے، کہ وہ بعد میں کرے)

حج پوری عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ کیونکہ حج کا سبب بیت اللہ ہے۔ اور وہ ایک ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے جو مسلم میں آئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا ہے۔ پس تم حج کرو۔ پس ایک شخص نے کہا کیا ہر سال حج کرنا ہے یا رسول اللہ۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ اس شخص نے تین مرتبہ ایسا ہی کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں کہتا ہاں تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم نہ کرسکتے۔ (ردمختار)

حج مسلمان آزاد عاقل بالغ تندرست پر فرض ہے بشرطیکہ وہ جانے آنے کی استطاعت رکھتا ہو اور جاکر آنے تک اپنے اہل وعیال کا نفقہ برداشت کرنے کا اہل ہو اور راستہ امن وامان کا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ

(۱) بچے پر حج فرض نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مکلف ہی نہیں ہے اگر ماں باپ کسی بچے کو اپنے ساتھ سفر حج میں رکھ بھی لیں تو بچہ بڑا بالغ ہونے کے بعد اگر زاد ورا حلہ کی قدرت رکھتا ہو تو اس پر حج فرض ہوتا ہے۔

(۲) غلام پر حج فرض نہیں ہے۔ کیونکہ حج بدنی عبادت بھی ہے اور مالی عبادت بھی۔ جب تک مال موجود نہ ہو سفر حج نہیں ہو سکتا۔

(۳) دیوانوں پر حج فرض نہیں ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "رفع القلم عن ثلاثة عن الصبي حتیٰ يحتلم - و عن المجنون حتیٰ يفيق - و عن النائم حتي يستيقظ۔ یعنی تین قسم کے لوگ مرفوع القلم ہیں (۱) بچہ جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے (۲) دیوانہ جب تک کہ اس کی دیوانگی دور نہ ہو جائے (۳) سونے والا جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے۔

(۴) صحیح الاعضاء والبدن ہونا چاہیئے ایسا بیمار جو چل پھر نہیں سکتا۔ یا جس کے ہاتھ اور پیر کٹے ہوئے ہوں یا مفلوج ہو یا ایسا بوڑھا جو خود سے کسی سواری پر بیٹھ نہیں سکتا۔ یا قیدی ہو اس پر حج فرض نہیں ہے۔

(۵) امام ابو حنیفہ کے پاس اندھے پر حج فرض نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ کوئی رہبر ہو۔ (رد مختار) مگر اس کے مال میں حج واجب ہے۔ لیکن امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے پاس اس پر حج واجب ہے اگر اس کو رہنما دستیاب ہو اور اس کے پاس زادو راحلہ ہو اور جو اس کے سفر میں اس کی خدمت کی تکلیف برداشت کرتا ہو۔ اور کوئی اس کی طرف سے حج کرے اس کے لئے کافی نہ ہوگا۔

عورت کے لئے حج میں اس کا شوہر یا اس کا محرم ہونا چاہیئے تا کہ ہر قسم کے فتنے سے محفوظ رہ سکے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ حاجیہ کے شہر اور مکہ کے درمیان، پیدل یا اونٹ کی سواری کے لحاظ سے تین دن یا اس سے زیادہ کی مسافت ہو اور اس سے کم ہو تو محرم کی شرط نہیں ہے۔

مواقیت۔ میقات وہ مقام ہے جہاں سے انسان احرام کے بغیر آگے بڑھ نہیں سکتا۔ مواقیت حسب ذیل ہیں۔

اھل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ۔ اہل عراق کے لئے ذات عرق۔ اہل شام کے لئے جحفہ۔ اہل نجد کے لئے قرن۔ اہل یمن کے لئے یلملم۔ ہندوستانیوں کے لئے میقات یلملم ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص میقات سے پہلے بھی احرام باندھ لیتا ہے تو جائز ہے۔

اور جو شخص مکہ میں ہے تو اس کی میقات حج میں حرم ہے۔ اور عمرہ میں حل ہے۔ اور افضل "تنعیم" ہے۔ اور اگر کسی مکی نے حج کا احرام حل میں اور عمرہ کا احرام حرم میں باندھا تو اس پر دم واجب ہے۔

اور جو شخص جو باہر سے حج و عمرہ کے لئے آرہا ہے اگر میقات سے بغیر احرام کے گذر گیا تو اس پر دم واجب ہے۔

مسائل عورتوں کے: عورت بھی وہی افعال ادا کرے جیسے کہ مرد کرتے ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے:

(۱) عورت اپنے سر کو کھلا نہ رکھے۔ یہاں تک کہ اس کے سر کے بال بھی نظر نہیں آنے چاہئیں۔ (۲) عورت اپنا منہ کھلا رکھے۔ یعنی اس کے سر اور ناک پر کپڑا نہیں ہونا چاہئے۔ (۳) عورت ہر قسم کا لباس پہن سکتی ہے۔ مردوں کی طرح مخصوص دو چادریں نہیں۔ لیکن اس کا احرام یہ ہے کہ منھ، ہتھیلیوں اور پاؤں کے سوا اس کا پورا جسم کپڑوں میں ڈھکا رہے۔ (۴) عورت تلبیہ میں آواز بلند نہ کرے۔ (۵) عورت طواف میں رمل نہ کرے (۶) عورت صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت میلین اخضرین کے درمیان نہ دوڑے۔ بلکہ معمولی رفتار سے چلے۔ (۷) عورت حلق (سر منڈھوانا) نہ کرے۔ بلکہ قصر کرے۔ اس طرح کہ اپنے بالوں کی چوٹی کو انی کی طرف سے ایک انچ قینچی سے کترائے۔ (۸) عورت خود اپنے بال نہیں کتر سکتی۔ بلکہ کوئی دوسری عورت جو حلال ہو چکی ہے وہ کتر سکتی ہے۔ نوٹ: یہی حال مردوں کا بھی ہے۔ یعنی وہ خود اپنے طور پر حلق یا قصر نہیں کر سکتے۔ بلکہ دوسروں سے جو حلال ہو چکے ہیں ان سے کرواسکتے ہیں۔ اگر میاں حلال ہو چکا ہے تو وہ اپنی بیوی کے بال، یا عورت حلال ہو چکی ہے تو وہ اپنے میاں کے بال کتر سکتی ہے۔ (۹) اگر عورت کو احرام باندھنے کے بعد حیض آجائے تو وہ نماز کے سوا دوسرے افعال انجام دے سکتی ہے۔ لیکن مسجد حرام میں داخل نہیں ہو سکتی۔ پاک ہونے کے بعد غسل کرے اور طواف زیارت کرلے۔ (۱۰) اگر مکہ سے مدینہ روانہ ہوتے وقت یا وطن واپس ہوتے وقت عورت کو حیض آجائے اور وہ طواف صدر یا طواف وداع نہ کر سکے تو اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر پاک ہے تو طواف وداع کرنا چاہئے۔

مردوں کو تو مکہ سے نکلنے کے وقت طواف وداع (طواف صدر) ضرور کرنا چاہئے۔ اور اس طواف میں خاص طور پر اللہ سے الحاح اور زاری کے ساتھ دعا کرنی چاہئے کہ وہ اس طواف کو زندگی کا آخری طواف نہ بنائے۔ بلکہ بار بار موقع دے کہ وہ اس مقدس گھر کی زیارت کرتا رہے اور محبوب سے جدا ہوتے وقت جو کیفیت دل کی ہوتی ہے انہی کیفیات کے ساتھ اللہ کے گھر سے رخصت ہونا چاہئے۔

یعنی اللہ اکبر لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر۔ اللھم انت السلام و منك السلام و الیك یعود السلام فحیینا ربنا بالسلام اللھم ایماناً بك و تصدیقاً بکتا بك و وفاء لعھدك و اتباعاً لسنته نبیك محمد ﷺ۔

اگر یاد نہ رہے تو صرف اللہ اکبر اللہ اکبر کہا کریں اور اللہ کی عظمت و بڑائی اور اس کے جلال و جبروت کو پوری طرح اپنے دل میں ملاحظہ کریں ورنہ اگر الفاظ پر دھیان دیں گے تو قلب کی رقت نہ رہے گی۔

جب کعبۃ اللہ پر پہلی مرتبہ نظر پڑے تو اللہ اکبر کے ساتھ صرف یہ دعا کریں کہ اے اللہ تیرے گھر کی عزت اور عظمت کو اور زیادہ کر اور جو شخص تیرے گھر کی عظمت اور شان کی عزت کرتا ہے تو اس کو اور عزت عطا فرما۔

اور جب کعبۃ اللہ کے قریب جائے تو اللہ اکبر اللہ اکبر کہتے ہوئے حجر اسود کے پاس آجائے۔ حجر اسود کو اپنے منھ کے سامنے رکھے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر کہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھائے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن سات مقامات پر اپنے ہاتھوں کو اٹھانے کا حکم دیا ہے ان میں حجر اسود کے سامنے بھی ہاتھ اٹھانے کا حکم ہے اور اپنے دونوں ہونٹوں کو حجر اسود پر رکھیں اور اس کا بوسہ لیں۔ بوسہ کی صورت یہ ہے کہ اپنے دونوں ہتھیلیوں کو حجر اسود پر رکھیں اور اپنے منھ کو اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھیں اور حجر اسود کا بوسہ لیں (اگر ممکن ہو ورنہ دور سے ہی استلام کرلیں۔

طواف میں بوسہ یا استلام کا وہی مقام ہے جو نماز میں تکبیر تحریمہ کا ہے جس سے آدمی طواف کی ابتداء کرتا ہے۔ اس کے تعلق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیبعثن هذا الحجر یوم القیامة وله عینان ینظر بهما و لسان ینطق به یشهد لمن استلمه و استقبله بالحق۔ قیامت کے دن یہ پتھر اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھتا ہے اور ایسی زبان ہوگی جس سے وہ بولتا ہے تو وہ ہر اس شخص کی گواہی دے گا جس نے اس کا بوسہ لیا ہے اور اس کا استقبال کیا ہے۔

اور اگر حجر اسود کو بوسہ نہ دے سکیں و استلام ہی کافی ہے۔ استلام یہ ہے کہ اپنے دونوں ہتھیلیوں کو حجر اسود کی طرف کریں اور اپنے ہتھیلیوں کو چوم لیں، وہیں طواف کی نیت کر کے طواف شروع کریں کعبۃ اللہ کے دروازے کی جانب سے طواف شروع کریں۔ اتنا دھیان رہے کہ جب تک حجر اسود کے سامنے رہیں منھ اپنا اس کی طرف رہے پھر جب طواف شروع کریں تو اپنا باہاں مونڈھا کعبہ کی طرف کردیں۔

کعبہ کی طرف دوران طواف نہ منھ کریں نہ پیٹھ۔ بلکہ پورے سات چکروں میں صرف اپنا بایاں مونڈھا کعبۃ اللہ کی طرف کریں البتہ ان سات چکروں کے دوران پھر جب حجر اسود کے پاس آجائیں تو پھر اپنا منھ اس کی طرف کرلیں۔ اور طواف شروع کرنے سے پہلے اضطباع کریں۔

اضطباع یہ ہے کہ اپنی چادر کا وہ حصہ جو سیدھے مونڈھے پر ہے اس کو سیدھے بغل کے نیچے سے لے کر بائیں مونڈھے پر ڈال لیں۔ اور سیدھا مونڈھا ظاہر کر دیں۔ اور سات چکر طواف شروع کریں۔

طواف شروع کرتے وقت نیت کر لیں کہ اے اللہ میں تیرے اس گھر کے سات چکر طواف کی نیت کرتا ہوں۔ تو اس کو آسان فرما۔ اسے قبول فرما اور اس میں مجھے برکت عطا فرما۔

طواف کرتے وقت حطیم کو بھی شامل کر لیں۔ اس لئے کہ حطیم بھی کعبۃ اللہ کا ہی حصہ تھا۔ دوبارہ اس کی تعمیر کے وقت درکار رقم نہ ہونے کی وجہ سے اتنا حصہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس لئے طواف میں اس کو بھی شامل کر لینا چاہئے۔ یہی وہ حصہ ہے جس میں میزاب (پرنالہ) ہے جس کو میزاب رحمت کہتے ہیں، اس کو "حظیرۂ اسماعیل" بھی کہتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص حطیم میں اس کے لئے بد دعا کرتا ہے جس نے اس پر ظلم کیا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

پہلی 3 چکروں میں رمل کریں۔ والرمل سرعة المشي مع تقارب الخطي و هز الكتفين كالمبارز يتبختر في الصفين و ذلك مع الاضطباع۔ رمل یہ ہے جلدی چلنا قدموں کو نزدیک رکھنا۔ مونڈھوں کو ہلانا جس طرح کہ میدان جنگ میں جنگ لڑنے والا اکڑ کر چلتا ہے اور ایسی چال اضطباع کے ساتھ ہو۔ رمل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب مسلمان مدینہ سے آکر عمرہ کرنے لگے تو مشرکین نے کہا یثرب (مدینہ) کی آب و ہوا مسلمانوں کو راس نہیں آئی۔ مدینہ کی گرمی نے مسلمانوں کو لاغر کر دیا ہے تو آنحضر صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے رمل کا حکم دیا۔

حج کی تین قسمیں ہیں۔ حج افراد۔ حج تمتع۔ حج قران

حج افراد: صرف اکیلا حج جس میں عمرہ نہ ہو۔ یہ مقامی افراد کے لئے ہے۔

حج تمتع: وہ سفر حج ہے جس میں پہلے عمرہ ادا کیا جائے اور حلال ہو جائے پھر 8 ذی الحجہ کو حج کی نیت سے احرام باندھا جائے۔

حج قران: وہ حج ہے جس میں عمرہ کے ساتھ ہی حج کی نیت سے احرام باندھا جائے۔ عمرہ کی ادائی کے بعد حلال نہ ہو بلکہ اسی احرام سے حج کے مناسک بھی ادا کئے جائیں۔ اس کے بعد ہی سر منڈھوا کر حلال ہو۔ حج قران افضل ہے۔

احرام: جب عازم حج احرام باندھے تو پہلے غسل کر لے۔ اپنے بدن کو اچھی طرح پاک و صاف کر لے۔ (اگر غسل ممکن نہ ہو تو وضو کرے لیکن غسل کرنا افضل ہے۔ پھر دو پاک صاف کپڑے پہنے۔ نئے ہوں تو اچھا ہے ورنہ دھوئے ہوئے ہوں

۔ایک تو بطور تہہ بند باندھ لے اور دوسرے کپڑے کو چادر کے طور پر بدن پر ڈال دے۔ان کپڑوں کو خوشبو بھی لگا سکتا ہے(احرام کی نیت سے پہلے)اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھے۔پھر اپنے سر پر سے کپڑا ہٹا کر عمرہ کی نیت کرے۔

اللهم اني اريد العمرة فيسرها لي وتقبل مني و بارك لي فيها۔اے اللہ میں عمرہ کا ارادہ کرتا ہوں پس تو اسے میرے لئے آسان فرما اور اسے میری جانب سے قبول فرما اور اس میں میرے لئے برکت عطا فرما۔

اس کے بعد تلبیہ پڑھے:لبيك اللهم لبيك - لبيك لا شريك لك لبيك - ان الحمد و النعمة لك و الملك لا شريك لك۔ان کلمات سے کوئی کلمہ نہ چھوڑا جائے۔

جب لبیک کہہ لیا گیا تو گویا اس شخص نے احرام باندھ لیا۔تو اب ایسے شخص پر وہ تمام چیزیں ممنوع ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔چنانچہ اللہ نے فرمایا: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ﴿البقرۃ:۱۹۷﴾یعنی رفث نہ ہو۔فسوق نہ ہو۔لڑائی جھگڑا نہ ہو۔(۱) رَفَثَ کے معنی۔مباشرت، فحش کلام، یا عورتوں کے سامنے مباشرت والی گفتگو۔(۲) فُسُوقَ:اللہ کی نافرمانی، معصیت و گناہ کے کام۔(۳) جِدَالَ:اپنے ساتھیوں سے اسی طرح دوسروں سے لڑائی جھگڑا۔(۴) کسی جانور کا شکار نہ کرے۔کسی جانور کو ذبح نہ کرے۔(۵)کسی شکاری کو جانور کی طرف اشارہ نہ کرے کہ وہ وہاں ہے۔(۶) قمیص نہ پہنے (۷)پائجامہ نہ پہنے (۸)عمامہ و شملہ نہ پہنے(۹)ٹوپی خواہ کسی بھی قسم کی ہو نہ پہنے(۱۰)قبا و عبا بھی نہ پہنے(۱۱)جوتے نہ پہنے بلکہ صرف نعلین پہنے۔(۱۲) سر کو نہ ڈھانپے(۱۳) اپنے منھ کو نہ ڈھانپے(۱۴)خوشبو نہ لگائے۔(۱۵) نہ سر کے بال منڈھائے نہ جسم کے بال نوچے(۱۶) ڈاڑھی نہ کترائے نہ چھوٹی کرے۔(۱۷) نہ ناخن کاٹے(۱۸) نہ رنگین کپڑے پہنے (۱۹) سر کو اور ڈاڑھی کو خوشبودار صابون سے نہ دھوئے۔

وقت کا زیادہ حصہ تلبیہ کہنے میں گذارے۔احرام کی حالت میں تلبیہ کا وہی مقام ہے جو نماز میں تکبیر کا ہوتا ہے یعنی جس طرح نماز میں ایک حالت سے دوسری حالت میں جاتے ہیں تو تکبیر کہتے ہیں۔اسی طرح حالت احرام میں حرکت بدلتی ہے تو تلبیہ پڑھ لینا چاہئے۔

اور تلبیہ پڑھتے وقت آواز بلند کرنا چاہئے۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:أفضل الحج العج و الثج۔یعنی افضل حج وہ ہے جس میں تلبیہ بلند آواز میں کہا جائے اور قربانی ہو۔

جب مکہ میں داخل ہوں تو سامان وغیرہ اتارنے کے بعد پہلا کام یہ ہو کہ مسجد حرام کا قصد کریں اور سنت یہ ہے کہ

باب السلام سے حرم شریف میں داخل ہوں۔ اس دروازے سے داخل ہوتے ہیں تو بالکل مقابل میں کعبہ شریف کا دروازہ نظر آتا ہے۔ اور جب کعبتہ اللہ نظر آئے تو تکبیر و تہلیل شروع کر دیں۔

اس کے بعد اگرچہ وہ سبب باقی نہ رہا پھر بھی وہی حکم باقی رہا جس طرح کہ ظہر اور عصر کی فرض نمازوں میں قرأت قرآن جہری کے وقت مشرکین شور و غوغا کرتے تھے تو اس سے بچنے کے لئے سری (آہستہ) قرأت کا حکم دیا گیا۔ پھر جب وہ سبب باقی نہ رہا تب بھی ظہر اور عصر میں قرأت کو سری ہی رکھا گیا۔

پس سات چکروں میں سے پہلے تین چکروں میں رمل کرے۔ اور باقی 4 چکروں میں معمولی رفتار سے چلے۔

اور ہر چکر میں جب حجر اسود کے پاس آئے تو حجر اسود کو اگر موقع ملے تو بوسہ لے ورنہ استلام کرے اور جب سات چکر پورے ہو جائیں تو حجر اسود کا استلام کرنے کے بعد وہاں سے ہٹ کر مقام ابراہیم پر آئے اور دو رکعت نماز پڑھے۔ یہ واجب طواف ہے اگر وہاں جگہ نہ پائے تو مسجد حرام میں کہیں بھی یہ دو رکعتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

پھر چاہ زمزم پر جا کر کعبہ کی طرف منھ کر کے پیٹ بھر کر زمزم کا پانی پیئے۔ اور اس وقت اللہ سے ایمان و دیدار کی دعا کرے۔ اس کے بعد صفا نامی پہاڑی پر چڑھے۔ اس طرح کہ بیت اللہ نظر آتا رہے کیوں کہ صفا پر چڑھنے کا اصل مقصود ہی استقبال کعبہ ہے۔ اور تکبیر و تہلیل کرے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور دعا کرے۔

پھر وہاں سے مروہ کی طرف چلتے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہوئے جائے۔ درمیان میں سبز رنگ کی روشنی آتی ہے۔ وہاں سے دوسرے سبز رنگ کی روشنی آنے تک دوڑے۔ پھر وہاں سے معمولی رفتار سے چلتے ہوئے مروہ تک جائے۔ وہاں بھی قبلہ رخ ہو کر تکبیر و تہلیل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھے اور اور دعا کرے۔ یہ ایک چکر ہوئی۔ یعنی صفا سے مروہ تک ایک چکر ہے۔

پھر مروہ سے اسی طرح صفا تک آئے۔ یہ دو چکر ہوئے۔ اسی طرح سات چکر پورے کرے۔ مروہ پر ساتویں چکر پوری ہو جاتی ہے۔ پھر وہاں سے باہر نکل کر سر منڈوائے یا بال کترائے۔ اب احرام ختم ہوتا ہے۔ اگر طواف قدوم کرنا ہے تو مروہ کی سعی کے بعد بال نہ منڈھوائے بلکہ پھر کعبتہ اللہ کی طرف جائے۔ پھر طواف قدوم کی نیت سے کعبہ کے سات چکر اضطباع اور رمل کے ساتھ کرے۔ پھر دو رکعت نماز مقام ابراہیم پر پڑھے اور صفا و مروہ کی سعی سات چکر کرے۔ اس کے بعد سر کے بال منڈھوائے یا کتروائے۔ اب احرام اتر چکا اور حلال ہو گیا۔

طواف قدوم سنت ہے۔ یہ صرف باہر سے آنے والوں کے لئے ہے۔ مکہ اور حل میں رہنے والوں کے لئے طواف

قدوم نہیں ہے۔ پھر ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ کو حرم سے ہی حج کی نیت سے احرام باندھے۔

اگر طواف قدوم نہ کیا ہو اس احرام سے طواف بھی کرے اور صفا مروہ کی سعی بھی کرے مگر بال نہ منڈھوائے۔ مکہ سے منیٰ جائے۔ پھر نویں ذی الحجہ کو عرفات کے میدان کو جائے اور ظہر کے بعد سے عرفات کے میدان میں ظہر۔ عصر کی نماز پڑھے۔ لوگ زیادہ ہوتے ہیں اس لئے اپنے اپنے مقام پر ہی ظہر کے وقت ظہر کی نماز اور عصر کے وقت عصر کی نماز پڑھے۔ اور خوب عاجزی کے ساتھ رورو کر گڑ گڑا کر اللہ سے مغفرت طلب کرے۔ اور مغرب کا وقت ہو جائے تو عرفات میں مغرب کی نماز نہ پڑھے۔ بلکہ وہاں سے مزدلفہ چلے جائے۔ مزدلفہ پہنچنے کے بعد وہاں مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ وقتیہ نماز کی نیت سے پڑھے۔

(نوٹ) اگرچہ وہاں مغرب کا وقت نہیں رہتا پھر بھی قضاء کی نیت نہ کرے۔ بلکہ وقتیہ نماز کی نیت سے پہلے مغرب کی نماز پڑھے۔ پھر اسی جگہ عشاء کی نماز پڑھے۔ اور دعا و استغفار میں رات گذارے پھر اول وقت فجر کی نماز پڑھ کر پھر منیٰ کی طرف جائے۔ منیٰ میں پہلا کام ایک شیطان کو سات کنکریاں مارنا ہے۔ ہر کنکری پھینکتے وقت رَجماً لِلْشَیْطَانِ رَضِي لِلرَّحْمَانِ بولے اور وہاں کھڑے نہ ہو بلکہ واپس اپنے مقام پر آئے اور قربانی کرے۔

متمتع اور قران کرنے والوں کے لئے قربانی ہے۔ حج افراد والوں کے لئے قربانی نہیں ہے۔ قربانی ہر ایک آدمی کی طرف سے ایک بکرا ہے اور اگر جانور بڑا ہے تو سات حاجی مل کر ایک جانور یعنی اونٹ یا گائے دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہی بال منڈھوا کر یا کترا کر حلال ہو جائیں گے۔ اب حاجی پر احرام کی کوئی پابندی نہیں رہتی مگر اس کی عورت اس پر حلال نہیں ہوتی۔

پھر اسی دن یا دوسرے دن وہ مکہ جائے اور حج کا اہم ترین رکن اور سب سے بڑا فرض طواف کعبہ کرنا ہے۔ اس طواف کو طواف زیارت، طواف افاضہ اور طواف نساء بھی کہتے ہیں۔ یہ طواف سادہ کپڑوں میں ہوتا ہے۔

اگر طواف قدوم کے بعد صفا مروہ کی سعی کر لی گئی ہے تو اس طواف کے بعد پھر سعی کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر اس وقت سعی نہیں کی ہے تو اس طواف کے بعد صفا مروہ کی سعی کرنی چاہیئے اور مکہ میں اپنے گھر کو نہ جائے۔ بلکہ پھر سیدھا منیٰ چلا جائے۔ اور گیارہویں تاریخ کو زوال کے بعد جو سنت وقت ہے، تینوں شیطانوں کو سات سات کنکریاں مارے۔ بارھویں ذی الحجہ کو پھر زوال کے بعد تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارے۔ اب حج ختم ہو گیا۔

(اگر تیرھویں ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں رہنے کا موقع ملے تو تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارے)

حج قران: حج افراد و تمتع سے افضل ہے۔ حج قران میں یہ نیت کرنی پڑتی ہے۔ أَللّٰهُمَّ إِنِّي اريد العمرة و الحج

فیســـرھما لي و تقبلھما مني۔ اے اللہ میں عمرہ اور حج کی نیت کرتا ہوں۔ تو ان دونوں کو میرے لئے آسان فرما اور میری طرف سے دونوں کو قبول فرما۔

اس حج میں عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام سے نہیں نکلتا جب تک کہ حج کا وقت نہ آ جائے۔ چونکہ اس میں پابندیاں زیادہ ہوتی ہیں اسی لئے اس میں ثواب بھی زیادہ ہے۔ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ سر نہ منڈھوائے نہ بال کترائے بلکہ حالت احرام ہی میں رہے۔ پھر جب حج کے ارکان ادا ہو جائیں تو وہ حلال ہو سکتا ہے۔

آج کل جو لوگ باہر سے حج کے لئے جاتے ہیں ان میں کی اکثریت حج تمتع ہی کرتی ہے۔ یعنی پہلے عمرہ کر لیتے ہیں پھر حلال ہو جاتے ہیں پھر جب حج کا وقت آتا ہے تو حج کے لئے احرام باندھتے ہیں۔ درمیانی مدت میں وہ حلال حالت میں رہ سکتے ہیں۔ یعنی ان پر احرام کی پابندیاں نہیں رہتیں۔

جو شخص حج قران یا حج تمتع کرتا ہے، اس پر قربانی واجب ہے۔ اور جو شخص قربانی دینے کی استطاعت نہیں رکھتا ہو اس کو دس روزے رکھنے پڑتے ہیں، ۳ روزے دوران حج اس طرح کہ تیسرا روزہ یوم عرفہ کا ہو۔ اور باقی سات (۷) روزے وطن واپس آنے کے بعد جن لوگوں پر قربانی واجب ہے وہ جب تک قربانی نہیں دیتے وہ حلال نہیں ہو سکتے۔

کیا فریضۂ حج ادا کرنے کیلئے مرشد کی اجازت لینی ضروری ہے جب کہ حج فرض ہے اور اللہ کا حکم ہے؟

بے شک حج فرض ہے اور اللہ کا حکم ہے، باوجود اس کے اس بارے میں غور کریں تو جو بات کہی جا رہی ہے وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ حج عمر بھر میں ایک ہی دفعہ فرض ہے۔ اس کے لئے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ بیوی بچوں کو، کاروبار کو، وطن کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ جانے سے پہلے سب کے حقوق، قرض وغیرہ کی ادائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اور حج کے مناسک بھی بہت ہیں۔ پہلے عمرہ ادا کرنا ہوتا ہے پھر حلال ہونے کے بعد مکہ میں رہنا پھر احرام حج باندھنا اور حج کے دیگر مراسم و مناسک ان کے اوقات پر ادا کرنا پھر حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی غرض سے مدینۂ منورہ جانا، حضور ﷺ کی زیارت اور خدمت میں حاضر ہونے کے آداب وغیرہ ایسے امور ہیں جو عام آدمی کی معلومات میں نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے کہا گیا کہ زندگی بھر میں ایک دفعہ ہی فرض ہے تو حج کیلئے جانے والے کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ حج و عمرہ سے متعلق تمام فرائض، واجبات، سنن اور ادائی کے طریقوں کو اچھی طرح سیکھ لے۔ ذہن نشین کر لے اور یہ بھی سمجھ لے کہ یہ سفر صرف سیر و سیاحت کا نہیں بلکہ اس کیلئے ضروری توشہ یعنی سامان ساتھ رکھ لینا ہے۔ علاوہ دیگر چیزوں کے سب سے بڑا توشہ تقویٰ اور عشق کا ہوتا ہے۔ تو جب تک یہ ساری باتیں معلوم نہ ہو جائیں تو حج سے حاجی کو کیا نصیب ہو گا۔ اور یہ سب باتیں

مرشد کی خدمت میں جاکر جب اپنا ارادہ ظاہر کرے گا تو مرشد اسکو تمام متعلقہ باتیں سمجھائیں گے۔ اور باضابطہ اسکی تربیت کریں گے۔ پھر کہیں گے کہ تم اب مکمل طور پر لیس ہوچکے ہو اب رختِ سفر باندھ سکتے ہو۔ چنانچہ آج کے اس تعلیم یافتہ زمانے میں جبکہ حج اور عمرہ کے تعلق سے سینکڑوں کتابیں شائع ہورہی ہیں جن میں مناسکِ حج اور عمرہ کے تعلق سے تفصیلات لکھی اور بیان کی جارہی ہیں۔ پھر بھی ایک گاؤں اور شہر میں حج کیمپ کا انعقاد ہر سال ہوتا ہی رہتا ہے۔ جس میں حج کے تعلق سے احکام عازمین حج کو بتائے اور سمجھائے جاتے ہیں۔ اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے کی دعوت اور اپیل کی جاتی ہے۔ پھر حکومت کی طرف سے خدّام کا تقرر بھی کیا جاتا ہے۔ نیز وہاں مکہ اور مدینہ میں مطّوف اور مزوّر بھی رہتے ہیں۔ ان سب انتظامات کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ حاجی سے مناسک حج کی ادائی میں کوئی غلطی نہ ہو۔ کوئی خامی نہ رہ جائے بلکہ صحیح وقت پر صحیح طریقے پر جملہ مناسک ادا ہوں۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ مناسک حج کی تفہیم میں بھی مختلف مذاہب اور ملکوں کے ماننے والے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ اور بعض ضروری امور میں چھوٹ دیتے ہیں۔ یا رخصت پر عمل کرتے ہیں اور ''چلتا ہے'' کہہ دیتے ہیں۔ تو ان سب امور میں صحیح ترین طریقہ کیا ہے۔ حج کتنے قسم کا ہوتا ہے۔ ان میں افضل قسم کونسی ہے۔ اسکے کیا تقاضے ہیں۔ دورانِ حج عمرہ کس طرح رہنا چاہئے۔ بلکہ احرام صحیح طریقہ پر کس طرح باندھنا چاہئے۔ دورانِ احرام کونسی چیزیں ممنوع ہوجاتی ہیں۔ اگر بیوی ساتھ ہو تو کیا احکام ہیں۔ نیز طواف کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ کب کرنا چاہئے اور کب نہیں۔ منیٰ سے طواف زیارت کیلئے مکہ آئیں تو کیا وہاں اپنے گھر کو جاسکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ گنہگار فقیر حج کی غرض سے جب بھی سفر حج کرتا ہے تو وہاں بہت سے اپنے اور دوسرے لوگ حج کے مسائل پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ پہلے تیاری اپنے مرشد کے پاس کرلو جب ہر قسم کی معلومات سے لیس ہوجاؤ تو سفر حج کرو تاکہ اطمینان کے ساتھ حج کرسکو اور تمہارے دل کو یقین بھی آجائے کہ میں نے صحیح طریقے سے حج کیا ہے۔ ان تمام امور کی رعایت کیلئے اپنے مرشد سے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم و حکمتیں اور عرفانی نکتے جان لینے کے ایک لمبے سبق کو اجازتِ مرشد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسکی بس اتنی حقیقت ہے۔ اب بتاؤ۔ کہ کیا یہ ضروری ہے کہ نہیں؟۔ اگر کچھ معلومات نہیں ہیں۔ اللہ نے پیسہ دیا۔ ارادہ کرلیا اور دوسروں کی دیکھا دیکھی ارکان جیسے میسر آئے ادا کرلئے تو کیا حج صحیح ہوجائے گا۔ یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ کونسی غلطی یا سہو پر حج ہی ناتمام ہوجاتا ہے۔ کہاں دَم واجب ہوتا ہے۔ وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ آدابِ حج و عمرہ اور آدابِ زیارت رسول اللہ ﷺ کو سیکھنے کی غرض سے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے اور وہاں سے سرٹیفیکٹ مل جانے کے عمل کو ''اجازت مرشد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہ ضروری ہے۔

حروف مقطعات

حروف مقطعات، متشابہات کی ہی ایک قسم ہیں، جن کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ متشابہات پر ایمان لانا چاہیئے اور ان کی کیفیت چونکہ مجہول ہے اس لئے ان کے علم حقیقی کو اللہ ہی کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ متشابہات کا علم صرف اللہ ہی کو ہے، (اور اللہ نے جن کو ان پر مطلع فرمایا ہے وہ ہی اللہ سے معلومات کی بناء پر ان کے معانی کو جانتے ہیں۔ جیسے حضرت رسول اللہ ﷺ اور مبین قرآن حضرت مہدی موعودؑ۔ یہ دونوں ہی ان کی حقیقی مراد کو جانتے ہیں۔ دیگر راسخین في العلم تو وہ علم اور کشف کی بنیاد پر ان کے معانی بیان کرتے ہیں تو وہ قطعی اور یقینی نہیں کہلاتے۔ لیکن انہوں نے اپنے طور پر ان حروف مقطعات کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے ان کی مراد نہ تو فتنے پیدا کرنے کی ہوتی ہے اور نہ اپنی رائے سے کلامِ خداوندی کے مقصد کو فوت کرنے کی ہوتی ہے۔ اور نہ ان کو اسپر اصرار ہوتا ہے کہ یہی مطلب قطعی ہے۔ اسکو تفسیر بالرائے کے نام سے بھی یاد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ تو ان کی طرف سے ہوتا ہے جن کے دلوں میں زیغ (ٹیڑھاپن) ہوتا ہے۔ جو اہل اللہ اپنی ساری زندگی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اتباع میں منہمک ہو کر گذارتے ہیں ان کے تعلق سے غلط بات نہ تو منسوب کی جاسکتی ہے اور نہ اسکا تصور بھی کیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ بہت سے مفسرین نے حروف مقطعات کے سلسلے میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ الف سے مراد اللہ، ل سے مراد جبرائیل اور م سے مراد محمد (ﷺ) یعنی اللہ نے جبرئیل کے ذریعہ محمد پر قرآن نازل فرمایا۔ ربیع بن انس نے کہا کہ الف سے مراد اللہ ل سے مراد لطیف اور م سے مراد مجید ہے۔ یہ تینوں اللہ کے نام ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ الم سے مراد انا اللہ اعلم ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے نام ہیں جن کو الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ الر، حٰمٓ ،ن (اگرچہ الگ الگ سورتوں کے اوائل میں آئے ہیں) ان تینوں کو ملائیں تو "الرحمان" بن جاتا ہے۔ حالانکہ الر کے بعد کئی سورتیں ہیں اسکے بعد ۲۴،۲۵،۶۲ ویں پارہ میں حٰـــمٓ آیا ہے پھر انتیسویں پارہ میں نٓ آیا ہے پھر بھی حضرت ابن عباسؓ نے ان کے مجموعہ کو الرحمان کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ اسی اصول کی روشنی میں الم کو صرف ایک آیت کے بعد هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ سے ملائیں تو الم ----- هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ یعنی المهدي لِلْمُتَّقِينَ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف کی ابتداء ہی اس عظیم موعود ہستی سے ہوتی ہے جس کا منصب ہی اللہ سے ڈرنے والوں کو ہدایت دینا یعنی خدا تک پہنچانا ہے۔

نیز یہ بھی نکتہ ہے کہ المهدي و ذٰلِكَ الْكِتَابُ دونوں متقیوں کیلئے ہدایت کا ذریعہ ہیں اور دونوں میں تحقیق کرنے والوں کیلئے کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن عربیؒ جنہیں شیخ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، فرماتے ہیں۔

الموعود بانه يكون مع المهدي في آخرالزمان لا يقرأه كما هو بالحقيقة إلّا هو۔یعنی وہ کتاب جس کے تعلق سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ آخر زمانے میں مہدی کے ساتھ ہو گی، اس کتاب کی تلاوت کا حق، حقیقت کے اعتبار سے مہدیؑ کے سوا اور کوئی ادا نہیں کرے گا(تفسیر ابن عربی صفحہ ۱۰)

(۲) آلمّٓص۔ مفسرین نے اسکے معانی بیان کئے ہیں۔ ایک یہ الف سے مراد اللہ ل سے مراد لطیف، م سے مراد مجید، اور ص سے مراد صادق یعنی اللہ کی صفات کا بیان ہوا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ المصوّر کا مخفف ہے۔ کتاب کی مناسبت سے المصنّف کا بھی مخفف ہو سکتا ہے۔

(۳)آلرا (یونس)ابن عباسؓ اور ضحاک وغیرہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد أنا الله أرى۔ میں اللہ ہوں دیکھتا ہوں۔ اور اگر اُریٰ پڑھا جائے تو مطلب ہے میں اللہ ہوں دکھائی دیتا ہوں۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ الر حم ن ان تینوں کو ملائیں تو الرحمن ہے۔

(۴)آلمّٓرا (الرعد)حضرت ابن عباسؓ جنہیں رئیس المفسرین کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں اسکا مطلب ہے(أنا الله اعلم و ارى)یعنی میں ہی اللہ ہوں میں جانتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ اور اگر اُریٰ پڑھائے جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ میں دکھائی دیتا ہوں۔ حضرت عطا کی ایک روایت ہے کہ اس سے مراد ہے أنا الله الملك الرحمان

(۵) طٰہٰ(۶)طٰسٓمّٓ۔ط سے مراد طاہر،س سے مراد سید،میم سے مراد محیط ہے۔ اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ قسمیہ الفاظ ہیں یعنی آنحضرت کے ناموں کی قسم کھائی گئی ہے۔

(۷)طٰسٓ:۔ یہ آنحضرت کے دوناموں سے مرکب ہے ط سے مراد طاہر اور سین سے مراد سید ہے۔

(۸)یٰسٓ۔س سے مراد یا سید الخلق ہے یا،یا انسان ہے اور اس سے مراد انسان کامل ہے۔

(۹)صٓ۔ص سے مراد صدق الله ہے۔ یا یہ کہ اس میں اللہ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی صمد۔صانع صادق۔ بعض لوگوں نے صاد کو ماضی کے طور پڑھا ہے یعنی صاد محمدٌ قلوب الخلق۔یعنی محمد نے (اپنی سیرت سے) مخلوق کے دلوں کو جیت لیا۔

(۱۰)حٰمٓ:(سورۂ مومن) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک مغز ہوتا ہے۔ قرآن کا مغز حوامیم (حامیم کی جمع) ہے۔ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حوامیم قرآن کا دیباچہ ہے۔ سمرۃ بن جندب کہتے ہیں کہ حوامیم جنت کی کیاریوں میں ایک کیاری ہے۔ حٰمٓ سے اشارہ ہے اس فیض کی جانب جو رحمان کی طرف سے قلب محمد ﷺ کو عطا ہوا ہے۔ نکتہ کی بات یہ

ہے کہ رحمن اور محمد ﷺ دونوں ناموں کے وسط میں ح اور میم ہیں حٰمٓ سے حقیقت محمد کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

(۱۱)حٰمٓ ۔عٓسٓقٓ شیخ اکبر ابن العربی نے حٰمٓ(سورۂ مومن) کے بارے میں فرمایا۔

حٰمٓ - ایّ حَقٌ المتجب محمدﷺ فهو حق بالحقيقة محمدٌ بالخلقيةیعنی حق محمد میں چھپا ہوا ہے۔ پس آپ حقیقت میں حق ہیں اور خلقت میں محمد ہیں (تفسیر ابن عربی ج ۲ ص ۹۸)

دوسری جگہ حٰمٓ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ حٰمٓ ظهور الحق بالصورةِ المحمديﷺ۔یعنی حٰمٓ کا مطلب ہے کہ اللہ کا ظہور صورت محمدی میں ہے۔(ج ۲ ص ۱۰۲)

حٰمٓ۔عٓسٓقٓ کی تشریح اسطرح کی گئی ہے۔ایّ حق ظهر بمحمّدِ ظهور علمه بسلامة قَلْب فالحق محمدٌ ﷺ ظاهراً وباطنا۔۔یعنی حق محمد ﷺ کے ساتھ ظاہر ہوا۔ جیسا کہ علم الٰہی کا ظہور سلامتی قلب کے ساتھ ہے۔ پس ظاہر اور باطن میں حق محمد ہے۔ حضرت مہدیؑ نے فرمایا اس سے مراد حيّ محمد بعشق ہے۔ حضرت محمد ﷺ عشق سے زندہ ہوئے (زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے)۔(ق)اشــاره الي القلب المحمدی۔ق سے قلب محمدی کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ عرش الٰہی ہے جو کہ ہر شئی کو محیط ہے۔هو العرش الإلٰهي المحيط بالكل (تفسیر ابن عربی ج ۲ ص ۲۰۱)

حٰمٓ(زخرف) قسم کھاتا ہوں حق کی جو اول وجود ہے اور محمد کی جو آخر وجود ہے یا یہ کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کے ناموں سے ایک نام کی قسم ہے اس میں نکتہ یہ بھی ہے کہ ح سے مراد حق ہے۔ اور میم سے مراد دو حقیقتیں ہیں پہلی میم سے مراد محمد نبی اور دوسری میم سے مراد محمد مہدی دونوں میموں کے درمیان ''ی'' ہے جس کے عدد دس ہوتے ہیں۔ گویا دوسری میم (مہدی) کا ظہور پہلی میم (محمد) کے بعد دسویں صدی میں ہوگا۔

ق- والقرآن المجيد۔ اشارۃً قسم ہے قلب محمدی کی طرف جس پر قرآن نازل ہوا۔ چنانچہ اسکے بعد ہی قرآن کی بھی قسم کھائی جارہی ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد اللہ کے ان ناموں کی قسم ہے جو حرف قاف (ق) سے شروع ہوتے ہیں۔ جیسے قدیر، قادر، قوی، قیوم قابض، قدوس۔

ن والقلم ۔ن بھی حروف مقطعات سے ہے۔ نون کے معنی لغت کے دوات کے ہیں یعنی نوری دوات۔ ن کی تفسیر بعض مفسرین نے لوح سے کی ہے قلم کی مناسبت سے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ الرحمان کا نون ہے نیز ابن عربی نے نون سے نفس کلیہ مراد لیا ہے اور قلم سے مراد عقل کلّی ہے۔ نون کے معنی مچھلی کے بھی آتے ہیں۔ اس سے مراد وہ مچھلی ہے جس کی پیٹھ پر زمین رکھی گئی ہے۔

حقیقت ذکر

ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں' اور یہ لفظ فراموشی (بھول) کی ضد ہے۔ چنانچہ **الذکر ضد النسیان** کہا جاتا ہے کسی چیز کے یاد کرنے کو ذکر کہتے ہیں لیکن ذکر کو خدا کے ساتھ کچھ ایسی نسبت حاصل ہو گئی ہے کہ اگر خدا کا لفظ نہ بھی کہا جائے تو اس سے ذکر خدا ہی مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کو ذکر دوام حاصل ہے۔ ہر شخص پر ذکر کثیر فرض ہے۔

ذکر کرنے والے کو ذاکر کہتے ہیں جیسا کہ فرمان اماماً میں ہے۔ آٹھ پہر کا ذاکر مومن کامل ہے اور جس کا ذکر کیا جاتا ہے اسے مذکور کہتے ہیں۔

ذکر اور قرآن: قرآن مجید میں اللہ کو یاد کرنے کا حکم ایک سے زائد مقامات پر ملتا ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّـهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا**﴿الأحزاب:۴۲،۴۱﴾۔ ترجمہ: اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد کرو اور اسکی تسبیح صبح وشام کیا کرو۔

(۲) **وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ**﴿الأنفال:۴۵﴾۔ ترجمہ: اور اللہ کو زیادہ یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

(۳) **وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً**﴿الأعراف:۲۰۵﴾۔ ترجمہ: اور یاد کرو اپنے رب کو اپنے دل میں زاری و خوف کے ساتھ۔

(۴) **ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ** ﴿الأعراف:۵۵﴾۔ ترجمہ: پکارو اپنے پروردگار عاجزی اور پوشیدگی کے ساتھ۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(۵) **فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ** ﴿البقرة:۱۵۲﴾۔ ترجمہ: پس یاد کرو تم مجھ کو' میں تمہیں یاد کروں گا' اور شکر کرو میرا اور کفرانِ نعمت مت کرو۔

(۶) **يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ**﴿آل عمران:۱۹۱﴾۔ ترجمہ: یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے۔

(۷) **فَاذْكُرُوا اللَّـهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ**﴿النساء:۱۰۳﴾۔ ترجمہ: پس یاد کرو اللہ کو کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے۔

(۸) **وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ**﴿العنکبوت:۴۵﴾۔ ترجمہ: اور البتہ اللہ کی یاد بڑی چیز ہے۔

(۹) وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّكَ ﴿المزمل:۸﴾ ﴿الانسان:۲۵﴾۔ ترجمہ: اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر۔

اوپر لکھی ہوئی آیتوں سے اتنا تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے کتنے مقامات پر کس کس انداز سے خود کو یاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان آیات میں ذکر کا حکم مومنوں کو بھی ہے اور آنحضرت (صاحب قرآن) کو بھی ہے۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے کہ قرآن میں تکرار نہیں ہونی چاہئے تھی اس لئے کہ تکرار تو فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے۔ اور فُصحا اور بُلغاء اپنی تقریروں اور تحریروں میں تکرار سے بچتے اور تکرار کو موجب عیب سمجھتے ہیں۔ جب مخلوق کے کلام میں یہ بات ہے تو پھر خالق کے کلام میں یہ چیز بدرجہ اولیٰ ہونی چاہئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض کلمات بلکہ بعض آیتوں اور بعض احکام کی تکرار قرآن میں ملتی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ دراصل یہ بات تکرار کی نہیں ہے۔ تکرار واقعی موجب عیب اور بیزاری کا باعث ہے لیکن کلام اللہ میں جہاں جہاں تکرار کی قسم کی چیز نظر آتی ہے وہاں جب بصیرت کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت وہاں "نری تکرار" نہیں ہے۔ بلکہ ایسی تکرار ہے جس کے الفاظ میں یا سیاق و سباق میں لفظاً' معناً' دلالتہ' زورِ کلام کے اعتبار سے حسن معانی کے اعتبار سے' حکم کے انداز' نوعیت اور نتیجہ کے اعتبار سے ادائی کے شرائط اسباب اور مقامات کے اعتبار سے نہایت درجہ واضح فرق پایا جاتا ہے۔ پس اسکو تکرار کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ تکرار تو اس وقت کہیں گے جبکہ بے مقصد و معنی پورا ایک جملہ یا ایک حکم جو پہلے بیان کیا گیا تھا' دوبارہ یا بار بار دہرایا جائے۔ قرآن میں واقیمو الصلوۃ واتو الزکوۃ فرمایا گیا ہے۔ لیکن ہر مقام پر غور کرو تو پتہ چلیگا کہ یہ نری تکرار نہیں ہے' بلکہ ہر مقام پر اس کا ایک نیا رنگ ہے' اور اگر چہ بظاہر ذات ایک ہی ہے لیکن اس کے جلوے ہر مقام پر جدا جدا ہیں۔

ہم نے ذکر کے تعلق سے جو آیتیں اُوپر نقل کی ہیں ان پر بھی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام کی نوعیت ایک سی نہیں ہے۔ ہے تو حکم ذکر خدا کرنے کا ہی' لیکن ہر مقام پر اس حکم کی ایک نئی شان اور ایک جداگانہ جلوہ نظر آتا ہے جس کو کوئی صاحب عقل تکرار کے نام سے یاد نہیں کر سکتا ذیل میں اس کی مختصر تشریح کی جاتی ہے تاکہ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت بھی مل جائے اور ذکر کے تعلق سے حکم خدا کے مختلف جلوے بھی نظر آجائیں۔

چنانچہ (ا) پہلی آیت میں خدا کو یاد کرنے کا جس طرح حکم دیا گیا ہے اس سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ (ا) ذکر کرنے کا حکم بصیغہ امر دیا گیا ہے جو قرینے سے خالی ہونے کی صورت میں فرض و وجوب کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذکر فرض ہے۔ (۲) پھر ذِکْراً مصدر لا کر اسکی تاکید کیگئی ہے (۳) ذکراً کے ساتھ کثیراً کی صفت لا کر اس کی مزید تاکید فرمادی ہے۔

(۲) دوسری آیت میں بھی اگرچہ اذکرواللہ کثیراً کہہ کر ذکر کثیر کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے بعد اس کی علت بتائی جارہی ہے۔ لعلکم تفلحون تاکہ تم فلاح پاؤ۔ یہاں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ ذکر کثیر پر فلاح کا انحصار رکھ کر ذکر اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔

(۳) تیسری آیت میں ذکر کا حکم دیا گیا ہے لیکن یہاں اس کا طریقہ بیان کیا جارہا ہے کہ ذکر کس طرح کرنا چاہئے چنانچہ حکم دیا گیا کہ ذکر دل ہی دل میں تضرع وزاری اور خوف کے ساتھ کرو۔

(۴) چوتھی آیت میں خدا کو پکارنے کا صحیح ڈھنگ بتایا جارہا ہے کہ خدا کو زاری اور پوشیدگی کے ساتھ پکارنا چاہئے اور اس معاملہ میں حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا یعنی بلند آواز سے ذکر مت کرو۔

(۵) پانچویں آیت میں ذکر کا حکم ہے مگر یہاں اس کا ثمرہ بیان کیا جارہا ہے کہ اگر تم مجھ کو یاد کروگے تو میں اس کے جواب میں تم کو یاد کروں گا۔

(۶،۷) چھٹی اور ساتویں آیت میں ذکر کے حکم کو دوام کا رنگ دیا جاکر یہ کہا جارہا ہے کہ اللہ کو کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے ہر حالت میں یاد کرو باالفاظ دیگر ذکر کثیر سے آگے ذکر دوام کا حکم سنایا جارہا ہے۔

(۸) آٹھویں آیت میں نماز اور ذکر دونوں کا ذکر کرتے ہوئے نماز کی اہمیت بیان فرمانے کے بعد ذکر کا مقام بیان کیا جارہا ہے کہ یاد رکھو اللہ کا ذکر بھی بڑی چیز ہے۔ اور بعض مفسروں نے یہاں تک کہا ہے کہ ذکر نماز سے افضل ہے۔

(۹) نویں آیت میں (اللہ) اسم ذات کا ذکر کرنے کا حکم دیا جارہا ہے تاکہ صفات کی پیچ در پیچ پگڈنڈیوں سے بچ کر۔ کم سے کم وقت میں ذات تک رسائی حاصل ہو۔ (نوٹ) جو لوگ ذکر سے غفلت برتتے ہیں ان کا انجام کیا ہے؟ اس بارے میں قرآن کی آیتوں کا ذکر آئندہ صفحات پر کیا جائے گا۔

اس مختصر تشریح سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی یاد، بندوں کے دلوں میں قائم کرنے کیلئے کتنی اہمیت، اہتمام اور کس عجیب انداز سے احکام دیئے ہیں۔ اس ضمن میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ (۱) ذکر کثیر (۲) ذکر دوام، ذیل میں ان پر مختصر بحث کی جاتی ہے۔

ذکر کثیر: یعنی کثرت سے اللہ کو یاد کرنا، اسکی کئی صورتیں بیان کی گئی ہیں لیکن ان تمام صورتوں کا قدر مشترک یہی ہے کہ بندہ کسی وقت پر بھی خدا کو نہ بھولے، بلکہ اوقات میں سے ہر وقت احوال میں سے ہر حال، اور حالات میں سے ہر حالت میں خدا کو یاد کرے۔

چنانچہ مجاہد کا ذکر کثیر کی تعریف میں یہ قول منقول ہے کہ ذکر کثیر یہ ہے کہ تو خدا کو کبھی نہ بھولے اور ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ اس سے مراد اللہ کا اپنے بندوں کو یہ حکم ہے کہ تم اپنے دلوں میں اپنی زبانوں سے اور دیگر تمام اعضاء سے اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد کرو اور کسی حالت میں بھی تمہارے بدن اسکی یاد سے خالی نہ رہیں۔ تفسیر حسینی میں ذکر کثیر کے ذیل میں لکھا ہے۔ "در محبا مع احوال بذکر او اشتغال کنید" یعنی تمام احوال میں اسی کی یاد میں مشغول رہو۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

در ذکر خدا مباش یک دم غافل کز ذکر بود خیر دو عالم حاصل
ذکر است کہ اہل شوق را ہمہ وقت آسائش جاں باشد و آرائش دل

یعنی ذکر خدا سے ایک دم بھی غافل مت رہو۔ کیونکہ ذکر سے دو عالم کی بھلائی حاصل ہوتی ہے۔ ذکر ہی ہمیشہ اہل شوق کی ذات، جان کی آسائش اور دل کی آرائش ہوتا ہے۔

اسلمی قدس سرہ' نے فرمایا کہ ذکر کثیر سے مراد دل کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ ذکر دوام دل سے ہی ممکن ہے' زبان سے نہیں ہو سکتا۔

لطائف قشیری میں بیان کیا گیا ہے کہ ذکر کثیر سے اللہ کا اشارہ اللہ سے محبت کرنے کی طرف ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جارہا ہے اللہ سے محبت کرو اس لئے کہ نشان دوستی ذکر فراداں میں مقرر و مسلم ہے۔ دوستی میں' زبان اس کے ذکر سے غافل یا دل اسکی فکر سے خالی نہیں ہوتا۔ شاعر نے اسی مطلب کو یوں بیان کیا ہے۔

در ہیچ مکاں نیم ز فکرت خالی در ہیچ زماں نیم ز ذکرت حاصل

"اس آیت میں یہ تنبیہ ہے کہ بندے کو کوئی کام اللہ کی یاد سے باز نہیں رکھ سکتا۔

ابن الصلاح سے پوچھا گیا کہ ذکر کی وہ مقدار کیا ہے جس سے بندہ کا شمار **الذاکرین اللہ کثیراً** میں ہو جائے تو آپ نے فرمایا" ذکر پر صبح و شام مختلف اوقات میں جب بندہ مداومت کرتا ہے تو وہ ذاکر کثیر ہو جاتا ہے لیکن اس بیان میں ایک اجمال ہے جو تفصیل چاہتا ہے ایک ابہام ہے جو وضاحت کا طالب ہے اور وہ تفصیل و توضیح ہم کو حضرت مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درج ذیل فرمان سے ملتی ہے'' نقل ہے کہ حضرت مہدیؑ نے پانچ پہر کے ذکر کو ذکر کثیر فرمایا ہے اور ذکر کثیر اس ترتیب سے فرمایا کہ اول صبح سے ڈیڑھ پہر تک اور ظہر کے بعد سے عشاء کے وقت تک خدا کے ذکر میں رہیں۔ اسی طرح حضرت میرانسید محمود ثانی مہدیؓ نے ذکر کثیر کے بارے میں امامنا کی ترتیب پوچھنے پر صحابہ کرام نے جو جواب دیا ہے وہ درج ذیل ہے۔ نقل ہے

حضرت مہدیؑ نے فرمایا کہ ذکر کثیر کرو۔ میرانسید محمودؓ نے فرمایا کہ حضرت مہدیؑ نے ذکر کثیر کس ترتیب سے فرمایا' تمام صحابہ نے عرض کیا کہ اس ترتیب سے کہ اول صبح سے ڈیڑھ پہر تک حجرہ میں رہو اور دو شخص ایک جگہ مت بیٹھو ظہر کے بعد سے عصر تک ذکر میں مشغول رہو۔ عصر کی نماز کے بعد سے مغرب تک قرآن شریف کا بیان سنو' مغرب کی نماز کے بعد سے عشاء تک ذکر کرو اس کے بعد میراں سید محمود نے فرمایا اگر کوئی شخص ڈیڑھ پہر کے درمیان حجرے سے باہر آئے تو اس کے حجرے کو توڑ دو' اور ہاتھ پکڑ کر دائرے کے باہر کر دو۔ اگرچہ یہ بندہ ہو تو ایسا ہی کرو تمام صحابہ نے قبول فرمایا (حاشیہ صہ ۷۳) لیکن اس سلسلے میں کم از کم عمل کی کیا صورت ہو سکتی ہے اس کا بیان ذیل کی نقل میں کیا گیا ہے۔

نقل ہے کہ ایک بزرگوار نے فرمایا کہ جو شخص ان چھ اوقات میں خدائے تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ اسکی ہر دن اور رات کی بندگی کو ضائع نہیں کرتا۔ پہلا وقت فجر کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک دوسرا وقت عصر سے عشاء تک تیسرا کھانے کے وقت چوتھا عورت کے پاس جانے کے وقت' پانچواں قضاحاجت کے وقت چھٹا سوتے وقت۔

ذکر دوام: مندرجہ بالا تحقیق سے ذکر کثیر کے بارے میں پڑھنے والوں کو ایک حد تک معلومات تو حاصل ہو چکے ہونگے۔ اب ذکر دوام کے بارے میں مختصراً لکھا جاتا ہے اس لئے کہ ذکر کثیر کی طرح ذکر دوام کا حکم بھی قرآن شریف سے ہی ماخوذ ہے۔ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ﴿النساء:۱۰۳﴾۔ ترجمہ: پس یاد کرو اللہ کو کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے۔ سے مراد اکثر مفسرین کے پاس ذکر دوام ہی ہے اس لئے کہ اس آیت میں انسان کی تین حالتیں بیان کی جا کر ان میں ذکر خدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور انسان کی حرکت کا تعلق ان تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت کے ساتھ بالضرور ہوتا ہے۔ گویا یہ حکم ہو رہا ہے کہ تم اللہ کو ہمیشہ یاد کرو۔ نیز یہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان کیلئے ان تین حالتوں کے علاوہ چوتھی حالت ہوتی تو وہ بھی مذکور ہوتی اور اس میں بھی اللہ کو یاد کرنے کا حکم دیا جاتا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ ذکر دوام ہی اللہ کا مقصود ہے۔ چاہے انسان کی حالت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی کھڑے ہوئے' بیٹھے ہوئے' لیٹے ہوئے اسی طرح سفر ہو کہ حضر' تندرستی ہو کہ بیماری مالداری ہو کہ فقر' ہر حالت میں خدا کو یاد کرو۔ نیز اللہ کو یاد کرنے کے تعلق سے "بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ" کے الفاظ بھی قرآن میں آئے ہیں۔ اس سے مراد بھی صبح اور شام کے مختلف اوقات ہی ہیں اور معناً یہ کہنا ہے اللہ کو ہر وقت یاد کرو۔ گویا وقت کے اعتبار سے کوئی قید یا کوئی حد نہیں ہے بلکہ دن ہو کہ رات ہمیشہ اللہ کو یاد کرو۔ علمائے متکلمین نے اس آیت شریفہ سے دو استدلال کئے ہیں۔

(۱) ذکر خدا فرض ہے اور فرضوں کی طرح، اس لئے کہ حکم امر کے صیغے سے دیا گیا ہے۔

(۲) ذکر دائمی فرض ہے نہ کہ مؤقتی۔ اسلئے کہ دوسرے فرائض کیلئے وقت مقرر ہے ان اوقات میں ہی ان فرائض کی ادائی ہوسکتی ہے اس کے بعد قضاء کا حکم لگتا ہے لیکن ذکر ایسا فرض ہے جو فرض ہی فرض ہے۔ بہر حالت' بہر وقت اور بہر جگہ دوسرے فرائض کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن میں بُكْرَةً وَأَصِيلًا، بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ کے الفاظ آئے ہیں جن سے مراد دوام اور ہمیشگی ہی ہے اسی طرح وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ کی تفسیر بھی اور ہمیشہ اللہ کی یاد میں رہ سے کیگئی ہے۔

نیز قرآن میں ذکر کا حکم دینے کے بعد تنبیہی حکم وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ﴿الأعراف:۲۰۵﴾ بھی ہے' یعنی تو غافلوں میں سے مت ہو جا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اس سے بچنے کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک لمحہ کیلئے بھی خدا کی یاد سے غفلت نہ کی جائے ورنہ ایک لمحہ کی غفلت پر بھی غفلت کا حکم صادق آتا ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ گویا اور تو غافلوں میں سے مت ہو جا کے معنی دوسرے الفاظ میں یوں ہیں۔ اور تو ہمیشہ اللہ کو یاد کر۔

اسی لئے حضور مہدی علیہ السلام نے بھی آٹھ پہر کے ذاکر (ذکر دوام کی پابندی کرنے والے) کو مومن کامل فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمان مہدی ہے جس نے تین پہر اللہ ذکر کیا' منافق ہے جس نے چار پہر اللہ ذکر کیا' مشرک ہے اور جس نے پانچ پہر ذکر کیا' مومن ناقص ہے اور جس نے آٹھ پہر ذکر کیا مومن کامل ہے (حاشیہ صہ ۴)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس نقل کی بھی ہلکی سی شرح کردیں تاکہ کسی قسم کی خلش نہ رہے۔ دن رات کے کل آٹھ پہر میں پانچ پہر نصف سے زائد ہوتے ہیں اور چار پہر نصف ہوتے ہیں۔ تین پہر نصف سے بھی کم ہوتے ہیں پس جو شخص تین پہر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ نصف سے بھی کم اوقات میں اللہ کو یاد کرنے والا ہے اور پانچ پہر یعنی زیادہ غیر اللہ کو یاد کرنے والا ہوا۔ اسکو ذکر قلیل بھی کہتے ہیں اور قرآن نے صاف طور پر ذکر قلیل کو منافقین کی صفت قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّـهَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿النساء:۱۴۲﴾ نہیں یاد کرتے اللہ کو منافقین مگر تھوڑا (نصف سے بھی کم) اب جو شخص چار پہر اللہ کو یاد کرتا ہے گویا اس نے دوسرے چار پہر غیر اللہ کو یاد کیا' یعنی اس کے دل میں اللہ اور غیر اللہ کی محبت برابر برابر رہی۔ اسی کو مشرک کہتے ہیں جو خدا کے ساتھ غیر اللہ کو بھی شریک عبادت کرتا یا معبود سمجھتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے اور بعض لوگ وہ ہیں جو غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں اور غیر اللہ سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی کہ اللہ سے رکھنی چاہئے۔ پس یہ صفت مشرکین کی ہے۔ اور جو شخص پانچ پہر اللہ کو یاد کرتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ زیادہ حصہ اللہ کو یاد کرنے والا ہے اور اللہ کی محبت' بہ نسبت غیر اللہ کے' اسکے دل میں زیادہ ہے (اگرچہ غیر اللہ کی محبت کی نفی نہیں ہے)۔ پس اس کو مومن ناقص قرار دیا ہے اس لئے کہ

اس میں پانچ پہر ذکر کی وجہ ایمان ہے لیکن تین پہر غفلت کی وجہ نقصان ہے لیکن جو آٹھ پہر کا ذاکر ہے وہ مومن کامل ہے اس لئے کہ ذکر دوام کے تعلق سے حکم خداوندی کی پوری تعمیل ہو رہی ہے اور ولا تکن من الغافلین پر پورا عمل ہو کر ایمان کامل نصیب ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ ذکر دوام ہو کہ ذکر کثیر ایک انسان سے کس طرح ممکن ہے؟ جبکہ اسے زندگی کے بہت سے تقاضے بھی رہتے ہیں اور دوسرے فطری امور میں اس کی مشغولیت بھی ضروری ہے۔ یہ تو اس صورت میں ممکن ہے جبکہ آدمی دنیا کا کوئی اور کام نہ کرے کوئی ذمہ داری قبول نہ کرے' پس مصلے پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہے لیکن اسکی ہمت کرنے والے کتنے نفوس ہوں گے؟ اور باقی لوگ جو اپنے اپنے کاروبار میں ہونگے ان کا کیا ہوگا ان کو کس نام سے پکارا جائیگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کا حکم ایمان والوں کیلئے عام ہے مجموعی خطاب کا مطلب تو یہی ہے کہ اس حکم پر سب عمل کر سکتے ہیں بلا استثناء لیکن جو غلطی ہو رہی ہے وہ حکم کی قوت اور اسکی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔

جو لوگ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ مصلے پر بیٹھ کر اور چادر اوڑھ کر ہی ذکر کیا جاسکتا ہے اس کے بغیر نہیں تو ظاہر ہے نہ قرآنی حکم کا یہ مطلب ہے اور نہ یہ کام ہر کس و ناکس سے ممکن ہے قرآن کا مطالبہ تو یہ ہے کہ بس اللہ کو یاد کرو۔ چاہے تم کیسی ہی حالت میں کیوں نہ ہو اس سے مقصد کسی کام سے روکنا یا ایک ہی حالت میں خدا کو یاد کرنے کا حکم دینا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم جو چاہو کرو مگر مجھے یاد کرو یعنی کام کرتے ہوئے مجھے بھول نہ جاؤ بلکہ عین کام کی حالت میں بھی مجھے یاد کرو۔ سب سے بڑی غلط کاری تو یہی ہے کہ انسان ''کار'' کے وقت ''یار'' کو بھول جائے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ ''یار'' کے لئے ''کار'' کو بھول جائے یا پھر ''دست بکار دل بہ یار'' پر عمل کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمہ تن توجہ کی خاطر سب سے کٹ کر اللہ سے جُڑ جانا مصلے پر بیٹھ کر مراقبہ وہ مشاہدہ کرتے ہوئے ذکر اللہ میں منہمک و مشغول ہو جانا بڑے کمال کی بات ہے لیکن سب اس کی ہمت نہیں کر سکتے اور وہی کر سکتے ہیں جن کو کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے لیکن تجارت' ملازمت' صنعت و حرفت وغیرہ زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے وہ بھلا کیونکر اس طریقہ کار کو اپنا سکتے ہیں پھر وہ کس طرح ذکر کے پابند ہو سکتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ذکر سے مراد ذکر لسانی تو ہے نہیں کہ آدمی اس میں مشغول ہو کر دوسرے تمام کاموں سے رک جائے حکم ہے تو دل میں یاد کرنے اور پوشیدہ طور پر یاد کرنے کا ہے جس کی وجہ سے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ تجارت کرتے کرتے' ہل چلاتے چلاتے' مشین گھماتے گھماتے' کپڑا بنتے بنتے' لکڑی کاٹتے کاٹتے' مرض کی تشخیص کرتے کرتے اور نسخہ دوا تجویز کرتے کرتے، موکل سے کیفیت سنتے سنتے اور نظائر کی تلاش کرتے کرتے غرضکہ ہر کام کے وقت پر' انسان چاہے تو' ذکر خدا کیا جاسکتا ہے۔ ذکر یا تو ان الفاظ اور تصورات کے ساتھ

کرے جنکی تلقین اپنے مرشدوں سے ہوئی ہے یا دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ ہر کام کے وقت امر و نہی پر نظر رکھے' کام کرنے کا حکم ہے تو کرے' ورنہ رک جائے کام جس طریق پر کرنے کا حکم ہے اسی طریق پر کرے' اور غلط طریقوں کو چھوڑ دے یہ سب ذکر ہی تو ہے اسی وجہ سے امام غزالی نے کیمیائے سعادت میں بڑی اچھی بات لکھی ہے۔ "ذکر حقیقی یہ ہے کہ امر و نہی کے وقت حق تعالیٰ کی یاد کی جائے اور برائی سے دامن کو بچالیا جائے' اور نیکی کے کام میں دست و قدم کو آگے بڑھا دیا جائے (صہ ۱۱۶)

امام غزالی نے قرآن کی آیت ہی سے یہ بات ثابت کی ہے کہ کوئی کام انسان کو ذکر اللہ سے باز نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ آیت شریفہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّـهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾(الآنفال:۴۵) کے ذیل میں لکھتے ہیں "اس آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ کوئی کام بندے کو ذکر خدا سے باز نہ رکھے" (کیمیائے سعادت صفحہ ۲۰۲) مسرت و کامیابی کے مواقع ہوں کہ حسرت و ناکامی کے' رحمتوں کے نزول کا وقت ہو کہ زحمتوں کے ورود کا' تندرستی کی کیفیت ہو کہ مرض کی' جوانی کا عالم ہو کہ بڑھاپے کا' عیش کا' ہنگامہ ہو کہ طیش کا غرض کہ ہر حال میں خدا کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ خوشحالی کی صورتوں میں شکر کے ذریعہ اور بدحالی کے ایام میں صبر کے ذریعہ بقول شاعر:

تو بہر جائے کہ باشی روز و شب — یک نفس غافل مباش از ذکر رب

درخوشی ذکر تو شکر نعمت است — در بلاہا التجا با حضرت است

واضح ہو کہ ذکر دوام کا مقصد یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آدمی زبان سے تو ذکر کرتا رہے اور دیگر اعضاء و جوارح برابر خدا کی ناخوشی و نافرمانی کے کام انجام دیتے رہیں یا پھر اس ذکر کو ہی لوگوں کو دھوکا دینے کا ذریعہ بنالے۔ یہ تو سراسر دنیا سازی ہی نہیں بلکہ دنیاداری ہے۔ جس کا دوسرا نام قرآن کی اصطلاح میں کفر بھی ہوتا ہے۔

ذکر کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہر کام مرضی مولیٰ کے تحت ہو اور ہر عضو خدا کی یاد میں رہے کسی بھی عضو سے کوئی کام ایسا سرزد نہ ہو جس میں حکم خدا کی خلاف ورزی لازم آتی ہو۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ہر عضو کا ذکر بھی جداگانہ بیان کر دیا جائے۔ ذکر اعضا کی سات قسمیں ہیں۔

(۱) ذکر بالیدین: ہاتھوں کا ذکر ضعیفوں کی مدد کرنا۔ ظالم اور مظلوم بھائی کی اعانت کرنا۔ مظلوم کی اعانت تو معلوم ہے مگر ظالم کی مدد اسطرح کی جاسکتی ہے کہ اسکو ظلم کرنے سے باز رکھا جائے۔

(۲) ذکر بالرجلین: پیروں کا ذکر علماء ربانیین۔ فقرائِ صالحین اور مرشدین کاملین کی طرف جانا تا کہ ان کی خدمت اور صحبت

سے روحانی فیض حاصل کیا جائے۔ سلف الصالحین اور اولیاء کرام کی زیارت قبور کے لئے سفر کرنا بھی ذکر بالرجلین ہے۔

(۳)ذکر بالعینین: آنکھ کا ذکر اپنے گناہوں پر ندامت کرنا اور شرمندگی سے گریہ وزاری کرنا اور خدا کی دید کی طلب میں لگے رہنا۔

(۴)ذکر بالاذنین: کانوں کا ذکر۔ کلام اللہ' اس کے اسرار ورموز پر مشتمل بیان' علماءِ صالحین اور مرشدین صادقین سے سننا۔

(۵) ذکر باللسان: تلاوت قرآن مجید فہم معنی کے ساتھ کرنا۔

(۶) ذکر بالقلب: دنیا سے جو کہ دار لفناء ہے قطع تعلق کرتے ہوئے' دارالبقاء یعنی آخرت کی طرف رجوع کرنا۔

(۷) ذکر بالروح: ذاکر کا اپنے مذکور کے دیدار کا ہمیشہ مشتاق رہنا۔

اعضاء وجوارح کا مندرجہ بالا ذکر کی پابندی کرلینا بھی ذکر دوام ہی کی صورت ہے قبل ازامامناؑ اصحاب طریقت کے پاس ذکر کی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) ذکر لسانی (۲) ذکر نفسی (۳) ذکر قلبی (۴) ذکر روحی (۵) ذکر سری (۶) ذکر خفی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سلسلے میں ذکر اخفی بھی ہے۔ دیگر خانوادوں اور سلسلہ ہائے طریقت میں ذکر کی ابتداء ذکر لسانی جہری سے ہوتی ہے اور اسکی انتہاء ذکر خفی پر مگر مہدویہ کے پاس ذکر کی ابتداء ذکر خفی سے ہوتی ہے اور اسکی انتہا بینائی ہے اس لئے کہ مہدی علیہ السلام نے فرمایا "وہ چکر کے راستے سے آئے' بندہ اوپر واڑے کا راستہ لایا ہے" مہدویہ کے پاس ذکر لسانی وغیرہ اذکار ہیں نہ ان کی تعلیم ہوتی ہے۔ امامنا نے سیدینؓ کو جو تعلیم دی وہ ذکر روحی' سری وغیرہ کی نہیں بلکہ تعلیم ولایت مقیدہ' تعلیم نبوتِ مقیدہ: تعلیم بلاواسطہ تعلیم تصدیق **لَا هُو إِلَّا هُو**۔ تعلیم فیض مقید' عرفان محمد وغیرہ سے تعلیم مرتبہ بلاواسطہ تک کی تھی یادرہے کہ ذکر جلی چند اسباب کی بناء پر مہدویہ کے پاس ممنوع ہے۔

(۱) قرآن کا حکم ہے اور یاد کر اپنے رب کو اپنے دل میں تضرع وزاری اور خوف کے ساتھ۔ ذکر جلی میں اسکی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

(۲) قرآن کا حکم اور پکارو اپنے رب کو تضرع وزاری اور پوشیدگی کے ساتھ۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں پسند نہیں کرتا۔

ان دونوں آیتوں میں اللہ کو یاد کرنے کے بارے میں جو حدود بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک تو تضرع وزاری ہے اور دوسری پوشیدگی اور اس کے بعد جو فرمان ہے وہ تہدیدی' تخویفی اور تنبیہی ہے یعنی یہ کہا جارہا ہے کہ جو شخص ذکر اور دعا کے سلسلے میں ان حدود سے بڑھنے کی کوشش کریگا وہ اچھی طرح سن لے کہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا اللہ اکبر' خدا کی ناپسندیدگی سے بڑھ کر اور کیا سزا ہو سکتی ہے۔

(۳)اور ذکر خفی میں ان دونوں باتوں کی پابندی ہو جاتی ہے۔(۱) تضرع بھی ہے اور پوشیدگی بھی (۲) آیت قرآنی' اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اپنی آواز کو' نبی کی آواز سے اونچی مت کرو اور نبی کے ساتھ اس طرح زور زور سے بات مت کرو جس طرح کے تم آپس میں کرتے ہو (ورنہ) تمہارے اعمال اکارت جائیں گے اور تمہیں اسکی خبر تک نہ ہو گی۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باآواز بلند گفتگو منع ہے اور اعمال کے حبطہ ہو جانے کا باعث بن جاتی ہے' تو خدا کے ساتھ نیاز کی حالت میں اپنی آواز کو کس قدر پست اور طریق ادب کو کس حد تک ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ذکر جلی لازماً ممنوع ہے اور ذکر خفی ہی مامور ہے۔

(۴) بعض لوگ ذکر جہری کرتے ہیں اور ذکر کے ساتھ گردن موڑ کر قلب پر ضرب لگاتے ہیں اور اس کا یہ فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مقصود دل کی سختی کو نرمی سے بدلنا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ دل کی سختی غفلت سے پیدا ہوتی ہے پس اسکو دور کرنے کی طریقہ بلند آواز سے ذکر کرنا اور دل پر ضرب لگانا نہیں ہے۔ بلکہ دل کا حق کی طرف سب سے کٹ کر' کامل متوجہ ہو جانا' اور دل میں خشوع خضوع اور خوف خشیت کا پیدا ہونا ہے اور دل میں یہ صفات ذکر خفی سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ذکر جہری سے۔

(۵) ایک غزوہ سے واپسی کے موقع پر آنحضرت نے صحابہ کرام کو باآواز بلند ذکر کرتے سنا تو آپ کا چہرہ جلال کے سبب سرخ ہو گیا اور فرمایا اپنے دل میں ذکر کرو۔ اس لئے کہ تم نہ تو کسی بہرے کو پکار رہے ہو اور نہ غائب کو (بلکہ) تم تو اس کو پکار رہے جو قریب ہے' سننے والا ہے بلکہ وہ تمہارے ساتھ ہی ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ذکر جہری سے منع فرما کر ذکر کا صحیح طریقہ بتایا گیا ہے یعنی اپنے دل میں خدا کو یاد کرنا۔ مندرجہ بالا دلائل سے اصول کے طور پر اتنی بات تو سب کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے پاس ذکر جہری' جلی اور لسانی ممنوع اور ناپسندیدہ ہے پس لازماً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ذکر اس طریقے پر ہونا چاہئے جس میں خشوع' خضوع اور پوشیدگی ہو' اس لئے کہ یہی طریقہ محبوب خدا اور رسولِ خدا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اس سے مراد ذکر خفی ہے خصوصاً جبکہ آنحضرتؐ نے خيرُ الذِكر الخفي فرمایا ہے۔

ذکر اور اسکے متعلقات: ذکر کے بارے میں قرآنی آیات سے استدلال کے بعد ذیل میں احادیث رسول کے ذریعہ ذکر اور اسکے متعلقات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اسلئے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ فرامین خدا (کلام اللہ) کی تشریح ہوتی ہے۔

ذکر اللہ اور احادیث

(۱) آنحضرت سے پوچھا گیا تمام اعمال میں بہترین عمل کونسا ہے۔ آپ نے فرمایا تجھے ایسے وقت میں موت آئے جب کہ تیری زبان خدا کی یاد میں تر ہو۔

(۲) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر۔ خدا کے پاس زیادہ پسندیدہ' اور باعتبار درجات کے سب سے بلند۔ سونا چاندی صدقہ دینے اور خدا کی راہ میں دشمنانِ خدا سے جنگ کرنے سے۔ اگر چہ تم ان کو مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں۔ بہتر ہے لوگوں نے کہا وہ کیا چیز ہے یا رسول اللہ ﷺ آپ نے فرمایا ذکر اللہ۔

(۳) آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے کہ جس شخص کو میرا ذکر مجھ سے دعا کرنے اور مانگنے کا موقع نہ دے تو میں اسکو مانگنے والے سے کہیں زیادہ دیتا ہوں۔

(۴) آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ کو یاد کرنے والا غافلوں کے درمیان ایسا بھی ہے جیسا زندہ مردوں کے درمیان یا سر سبز درخت خشک گھاس میں یا وہ غازی جو جنگ میں لڑتا ہے بھاگنے والوں میں۔

(۵) آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو اللہ کو زیادہ یاد کرتا ہے اللہ اس کو دوست بنالیتا ہے۔

(۶) آنحضرت ﷺ نے فرمایا معراج کی شب میں نے ایک شخص کو عرش کے نور میں گم دیکھا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے۔ کیا یہ فرشتہ ہے۔ جواب ملا نہیں۔ پھر پوچھا کیا نبی ہے۔ کہا گیا نہیں میں نے پوچھا پھر کون ہے۔ جواب ملا یہ وہ شخص ہے جو دنیا میں اسطرح رہتا تھا کہ اسکی زبان خدا کی یاد میں تر رہتی تھی اور اس کا دل مسجدوں سے معلق۔

(۷) جو شخص جنت کے چمنوں کا تماشائی بننا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ ذکر کثیر کرے۔

(۸) فرمایا آنحضرت ﷺ نے جب تم جنت کے چمنوں پر سے گذرو تو خوب لطف اندوز ہو۔ پوچھا گیا جنت کے چمن کونسے ہیں۔ فرمایا ذکر کے حلقے۔

(۹) روایت ہے کہ ایک بندہ ذکر کی مجلسوں میں پہاڑ جیسے گناہ لیکر آتا ہے۔ پھر وہاں سے جب اُٹھتا ہے تو ان گناہوں میں سے اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں رہتا۔

(۱۰) روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ کا ذکر ایمان کا جھنڈا' نفاق سے برأت' شیطان کے مقابلے کے لئے ہتھیار اور دوزخ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔

(۱۱) حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے اور وہ آنحضرت سے روایت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسی قوموں کو اُٹھائے گا جن کے چہروں پر نور ہوگا اور وہ موتیوں کے منبروں پر ہوں گے لوگ ان پر رشک کریں گے۔ حالانکہ نہ وہ انبیاء ہوں گے نہ شہداء۔ پس ایک اعرابی نے اپنے گھٹنوں پر کھڑے ہوکر پوچھا اے اللہ کے رسول آپ ان کا وصف ہمارے لئے بیان کردیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ لوگ اللہ سے محبت کرنے والے (یا اللہ واسطے کی محبت کرنیوالے) مختلف قبائل اور متعدد دیار وامصار کے ہوں گے لیکن اللہ کا ذکر کرنے کے لئے سب ایک جگہ جمع ہوجائیں گے۔ روایت کی اہمیت کے پیش نظر اسپر ہلکی سی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس روایت میں ایک قوم کے تعلق سے بشارت دی گئی ہے جن کے چہروں کے نور اور موتیوں کے منبروں پر ان کی بیٹھک کے پیش نظر لوگ ان پر رشک کرتے ہوں گے' رشک کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ یہ نہ تو انبیاء ہیں اور نہ شہداء ہیں اس کے باوجود خدا کے پاس ان کا اِس قدر اعزاز واکرام کیوں پھر اسی مجلس میں ایک اعرابی نے ہمت کرکے پوچھ لیا ذرا ہم کو ان کے اوصاف تو بیان فرمادیں کہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ لوگ اللہ سے محبت کرنے والے۔ آپس میں ایک دوسرے سے بھی اللہ کے لئے محبت کرنے والے۔ مختلف قبیلوں اور خاندانوں پر مشتمل ہوں گے جو مختلف شہروں اور مقامات سے آئے ہوں گے' یعنی ایک دوسرے سے نسل' نسب' زبان ملک وطن' قبیلہ خاندان وغیرہ کے اعتبار سے یکسر اجنبی ہوں گے لیکن اس کے باوجود جو چیز انکو ایک جگہ پر جمع کرنے والی ہوگی وہ اللہ کا ذکر ہوگی۔ ایک جگہ بیٹھ کر وہ سب مل کر اللہ کو یاد کریں گے اور انہیں کوئی اجنبیت وغیریت کا احساس تک نہ ہوگا۔ حدیث کے الفاظ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ روایت اور اس میں درج قوم کی بشارت حضرت مہدی موعودؑ کی قوم سے متعلق ہے اس لئے کہ (ا) آپ کی تعلیم عشق ومحبت کی تھی جس کی وجہ سے آپ کے صحابہ محض اللہ سے محبت کرنے والے اور اللہ ہی کے لئے آپس میں محبت کرنے والے تھے۔ (ب) چہروں پر نور کا ہونا' تہجد کی نماز کی پابندی' اور ذکر الٰہی کا ثمرہ ہے جو بلاشک شعارِ مہدویہ ہے۔ (ج) انبیاء وشہداء نہ ہونے کے باوجود' بارگاہ خداوندی میں غیر معمولی عظمت وتوقیر کا سبب بھی یہی ہے کہ یہ جماعت اللہ کے خلیفے مہدی موعودؑ کی جماعت ہے' جس کے دیکھنے اور ملنے کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے **واشوقا الي لقاء إخواني** کے الفاظ سے کی تھی (مجھے میرے بھائیوں سے ملنے کا شوق ہے)۔ (د) مختلف قبائل اور مختلف امصار ودیار کے ہونا بھی مہدویہ کے حسبِ حال ہے۔ اس لئے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی پوری زندگی تبلیغی سفر میں ہوئی۔ ہر مقام پر بیشمار لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ بھی ہجرت کرجاتے تھے روایت کا یہ حصہ تو مہدی علیہ السلام کے صحابہ کے اس قدر حسبِ حال ہے کہ شاید ہی کسی نبی اور اسکی امت کے حق میں اس قوت کے ساتھ یہ ثابت ہوسکتا ہے اس لئے کہ حضرت امامناؑ نے جونپور سے ہجرت کرنے کے بعد ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کے اکثر و

بیشتر علاقہ جات پاکستان 'ایران' افغانستان اور عرب وغیرہ کے مختلف مقامات کا تبلیغی دورہ فرمانے کے بعد بعمر ترسٹھ سال بمقام فراہ (افغانستان) واصل حق ہوئے ہیں۔ اس ۲۳ سال کی مدت سفر میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنے شہروں کتنے قریوں اور کتنے دیار وامصار کے لوگ کس قدر قبیلوں اور خاندانوں کے لوگ آپ کے پاس جمع ہوئے ہوں گے۔ بلاخوفِ تردید اس حقیقت کو عالمی ریکارڈ کہا جاسکتا ہے نہ اس کے پہلے ایسی تبلیغ اس قوت سے ہوئی اور نہ اس کے بعد کوئی امکان ہے۔ صرف ایک جگہ کی روایت اس کے ثبوت میں لکھی جاتی ہے۔ جو اتفاق سے ہماری قومی روایتوں کے سرمائے میں آگئی ہے۔

نقل ہے حضرت مہدی موعود علیہ السلام ایک جگہ گنبد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سترہ صحابہ بھی ایک گنبد میں تھے ایک کا نام ایک نہیں جانتا تھا' اس طرح خدا کی یاد میں مشغول تھے۔ دوسرا کچھ خیال نہ تھا مگر خدائے تعالیٰ کی یاد تھی۔ (حاشیہ صفحہ ۱۱۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ایک گنبد میں سترہ صحابہ کا اجتماع تھا۔ اس حالت میں کہ ایک کا نام ایک نہیں جانتا تھا یعنی ایک دوسرے سے قطعاً اجنبی ظاہر ہے کہ خاندان اور قبیلے بھی مختلف ہوں گے اور دیار اور امصار بھی جدا گانہ ہی اور سب کا اجتماع ایک جگہ پر صرف ذکر خدا کیلئے ہوا تھا۔ حدیث میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ نقل کا آخری حصہ بھی قابل غور ہے۔ دوسرا کچھ خیال نہ تھا۔ مگر خدائے تعالیٰ کی یاد تھی۔ مطلب یہ کہ اگر چاہتے تو ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کرنے کے مواقع تھے۔ ایک دوسرے کا نام 'نشان' خاندان' قبیلہ' وطن گاؤں وغیرہ کے بارے میں معلومات کا تبادلہ ہو سکتا تھا مگر ان لوگوں کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی' جو اس کام کی اجازت دیتی پہچان اور شناخت تھی تو بس اتنی کہ سب میں معرفتِ خداوندی کا دیا روشن ہے سب اس کی یاد میں محو اور مستغرق ہیں۔

ذکر اللہ اور اقوال اہل اللہ: حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اللہ تجلی فرماتا ہے ذاکرین کیلئے ذکر اور تلاوت قرآن کے وقت۔ یہ روایت بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے بڑی اہم ہے اس لئے کہ اس میں ذاکر کے لئے بوقتِ ذکر بینائی خدا نصیب ہونے کی خبر دی جارہی ہے اس کے ساتھ ساتھ تلاوتِ قرآن کا بھی ذکر ہے جہاں تک ذاکر کو تجلی خدا ہونے کا تعلق ہے حضرت امامناؑ کی روایت اسکی تائید کرتی ہے چنانچہ نقل شریف ہے "بندہ جو کچھ کہتا ہے ویسا ہی کرو یعنی خدا کا ذکر کرو تا کہ خدائے تعالیٰ کی بینائی حاصل ہو" (حاشیہ صہ ۷۶)۔ فرمان امامناؑ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ذکر سے بینائی نصیب ہوتی ہے۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہداءؓ سے بھی جو نقل آئی ہے اس میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ قرآن کو جس طرح پڑھنے کا حق ہے اس طرح بھی پڑھیں تب بھی بندے اور خدا کے

درمیان نور کا پردہ حائل رہتا ہے اور ذکر خدا سے وہ پردہ بھی جل جاتا ہے (بے حجاب دیدار ہوتا ہے)

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ بہشت میں اہل بہشت کسی چیز پر افسوس و حسرت نہیں کریں گے مگر اس ساعت پر جو دنیا میں ان پر گزری تھی جس میں انہوں نے خدا کو یاد نہ کیا تھا۔ بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ ہر ایک نبی کو اسکی عبادت اور طاعت کے اعتبار سے ایک مقام عطا ہوا ہے چنانچہ آدمؑ کو مقام توبہ' حضرت داؤدؑ کو مقام حزن' حضرت یحیٰؑ کو مقام خوف' حضرت موسیٰؑ کو مقام انابت (رجوع) تسلیم اور آنحضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم نبوت کو مقام ذکر۔ قول محقق اللہ کا ذکر حلال ہے جس میں حرام کا شائبہ نہیں اور اللہ کے غیر کا ذکر حرام ہے۔ جس میں کچھ حلال نہیں اور ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ بوقت ذکر' مذکور (اللہ) کے سوائے سب کو بھول جائے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نزہۃ الخواطر میں فرماتے ہیں اے مردہ دل لوگو اپنے رب کا ہمیشہ ذکر کرو۔ اور اللہ کی کتاب کی تلاوت' اس کے رسول کی صفت اور ذکر کی مجلسوں میں حاضری کی ہمیشہ پابندی کرو' اس سے تمہارے دل زندہ ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ مردہ زمین' بارش پڑنے کی وجہ سے سرسبز ہو جاتی ہے ذکر کے دوام سے دنیا اور آخرت میں بھلائی بھی دوامی ملتی ہے۔ جب دل صحیح ہو جاتا ہے تو ذکر قائم ہو جاتا ہے پس اس کی آنکھیں سوتی ہیں اور اس کا دل اپنے پروردگار کے ذکر میں لگا رہتا ہے۔ ابو علی دقاق فرماتے ہیں۔ ذکر منشور ولایت ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے جس کو ذکر کی توفیق ہو جاتی ہے وہ بالضرور صاحب ولایت ہو جاتا ہے۔

حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا خدا نے آپ کی امت کو ایسی چیز دی ہے جو کسی اُمت کو نہیں دی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کیا ہے کہا فاذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کرتا ہوں۔

فضائل ذکر: اگرچہ قرآن اور احادیث سے ذکر کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بھی ایک حد تک ذکر کے فضائل کے بارے میں معلومات مل سکتے ہیں لیکن علیحدہ عنوان کے تحت چند اہم اور خاص فضائل کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا کہ ذکر سے ہی بینائی نصیب ہوتی ہے چنانچہ حاشیہ میں آپ سے جو نقل آئی ہے وہ اس طرح ہے "جو کچھ بندہ کہتا ہے ویسا ہی کرو یعنی خدائے تعالیٰ کا ذکر کرو تا کہ خدائے تعالیٰ کی بینائی حاصل کرو۔ (صفحہ ۴۷)

(۲) حضرت ابو سعید الخزاز کا قول ہے کہ جب اللہ کسی بندے کو اپنا دوست بنانا چاہتا ہے تو اس پر ذکر کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ جب وہ ذکر سے لذت یاب ہوتا ہے تو اس پر "قرب کا دروازہ کھول دیتا ہے پھر اسکو" اُس کی مجلسوں "تک اُٹھالیتا ہے' پھر "توحید" کی کرسی پر بٹھاتا ہے۔ پھر اس سے "پردوں" کو ہٹا دیتا ہے پھر اس کو فردانیت کے گھر میں داخل کرتا ہے اور عظمت

وجلال کو ظاہر فرماتا ہے۔ الخ

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا اے اللہ تو قریب ہے کہ میں سر گوشی کروں یا دور کہ میں تجھ کو پکاروں تو اللہ نے وحی کے ذریعہ معلوم فرمایا اے موسیٰ میں، مجھے یاد کرنے والے کا ہم نشین ہوں، پھر آپ نے فرمایا اے رب ہم بعض اوقات ایسی حالت (جنابت) میں رہتے ہیں کہ تجھے اس میں یاد کرنے کو تیری بندگی کے خلاف سمجھتے ہیں تو اللہ نے جواب دیا۔ ''ہر حال میں مجھکو یاد کرو'' امامنا علیہ السلام کا فرمان مبارک ''ہر حال رب سنبھال'' خلیفۃ اللّٰہی شان کا مظہر ہے۔

(۴) اس کے علاوہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ عبادتوں کا مقصد ہی ذکر ہے اگرچہ عبادت کا مقصد اقصیٰ عرفان حق اور لقاء رب ہے لیکن عرفان اور لقاء کی بنیاد ذکر اللہ کا قیام ودوام ہے۔ جب تک دوامی ذکر خدا قائم و حاصل نہ ہو جائے وہ عبادت معرفتِ خداوندی کا خزانہ نہیں دلا سکتی عبادت، معرفت کی کنجی ضرور ہے لیکن ذکر دوام اسکے دندانے ہیں۔ جس سے لقاء رب کی متاع عزیز ہاتھ آتی ہے۔

اسلام کی بناء پانچ چیزوں پر ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پانچوں کی جان بھی ذکرِ خداوندی ہے چنانچہ کلمہ تو اصل ذکر ہے اور نماز اسلام کا ستون ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا الصلوٰۃُ عِمَادُ الدِّین لیکن نماز کا مقصد بھی تو خدا کو یاد کرنا ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکرِي یعنی تو نماز کو قائم کر میری یاد کیلئے پھر یہ بات بھی مسلم ہے کہ ذکر کے بغیر جو نماز ہوتی ہے اس پر حرکتوں کا تو اطلاق ہو جائے گا لیکن نماز کا اطلاق تو اس پر کسی طرح درست ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ نماز پروردگار سے مناجات ہے۔ جب یاد ہی نہ ہو تو مناجات کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے، اسی طرح قرآن پڑھنا افضل تر عبادت ہے اس اعتبار سے کہ اللہ کے کلام کی تلاوت متکلم کو یاد دلانے والی ہے۔ اس میں جو کچھ مذکور ہے اس سے ''اسکی'' یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ روزہ کا مقصود کسرِ شہوت ہے لیکن جب تک دل شہوتوں کی کدورت سے پاک وصاف نہیں ہوتا، دل قرار گاہ ذکر نہیں ہوتا، اور جب تک دل شہوتوں کی گندگی سے آلودہ رہیگا، ذکر حق تعالیٰ اس سے ناممکن ہی رہیگا اور اگر ہو بھی جائے تو اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ زکوٰۃ کا مقصد، مال کی محبت کو دل سے نکال کر، دل میں حق کی یاد قائم کرنا ہے۔ جب تک دل میں مال کی محبت رہتی ہے اس وقت تک اللہ کی محبت دل میں جگہ نہیں پا سکتی اور آدمی ہمیشہ اسی کو یاد کرتا ہے جسکی محبت اس کے دل میں رہتی ہے اسی لئے دل سے مال کی محبت کو نکال کر وہ بھی اللہ ہی کے نام سے اللہ کی محبت اور اسکی یاد دل میں قائم کیجاتی ہے۔

حج کا مقصود ظاہری تو طواف بیت اللہ ہے اسکا اصل محرک بھی ذکر خداوند خانہ ہے بایں طور کہ اس کے دیدار اور اس کے ملنے کی آرزو و تمنا ہی تھی جو اس کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہر قسم کی محبتوں الفتوں اور دلچسپیوں کو ترک کرتے ہوئے ایک

طویل صبر آزما اور کٹھن سفر پر آمادہ کر سکتی ہے اسی طرح فرائض ولایت کا مقصد بھی یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ خدا کو یاد کرنے کا موقع دینا ہے تا کہ ذکر کے ذریعہ "فنا و بقاء" کی منزلیں اسپر آسان ہو جائیں ترک دنیا کا مقصد یہی ہے کہ سب کو چھوڑنا تا کہ اللہ کی یاد میں آسانی ہو۔ عزلت کا مطلب بھی مخلوق سے دوری ہے تا کہ حق کی قربت بذریعہ ذکر ہو سکے صحبت صادقین کا منشاء ذکر دوام میں سہولت ہے وَ هَلُمَّ جَرًّا۔ پس ثابت ہوا کہ تمام عبادتوں کا لب لباب اور جملہ سعادتوں کا دروازہ ذکر ہی ہے۔

(۵) بلکہ اصل مسلمانی کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ ہے اور یہ عین ذکر ہے اور تمام عبادتیں اسی ذکر کی تائید کرتی ہیں۔

(۶) بعضے اہل اللہ نے توحیات کی تفسیر ذکر سے اور موت کی تفسیر غفلت سے کی ہے اور یہ محض مبالغہ نہیں ہے بلکہ آنحضرت ﷺ سے مروی یہ قول اسی کی تائید کرتا ہے كُلُّ نَفَسٍ يَخْرُجُ بِغَيرِ ذِكْرُ اللهِ فَهُوَ مَيِّتٌ ہر سانس جو اللہ کے ذکر کے بغیر نکلتی ہے وہ مردہ ہے۔

(۷) ذکر اللہ ہی اطمینان قلب کے حصول کا واحد کامیاب ذریعہ ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔ أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴿الرعد:۲۸﴾۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔ اس آیت شریفہ میں اللہ نے پہلے تو حرف تنبیہ "أَلَا" لایا ہے جس کے معنی آگاہ ہو جاؤ' خبردار ہو جاؤ' کے ہیں' اور ایک بڑی اہم اور چونکا دینے والی بات کہنی ہو تو اس قسم کا انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے پھر دوسرا یہ کہ متعلق فعل کو، فعل سے مقدم لا کر' ذکر اللہ کی لفظی اور معنوی اہمیت کا اظہار فرمایا ہے۔

اللہ نے جہاں ذکر کو فرض قرار دیا ہے وہیں یہ بات بھی لازماً آجاتی ہے کہ فراموشی اور غفلت حرام ہے اس کے باوجود' اللہ نے قرآن میں غفلت اور غفلت شعاروں کی شدید مذمت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے

(۱) یاد کرو مجھ کو' میں تم کو یاد کروں گا، میرا شکر کرو اور کفر مت کرو (سورہ بقرہ) اس آیت میں شکر کو ذکر کے مقام پر بیان کرتے ہوئے' کفر نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا مطلب غفلت سے بچنا ہے۔

(۲) کھلے الفاظ میں صبح و شام ذکر کرنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا اور تو غافلوں میں سے مت ہو جا (اعراف) جس طرح امر کے صیغے سے فرض و وجوب ثابت ہوتا ہے اسی طرح نہی کے صیغے سے حرمت ثابت ہوتی ہے پس وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ سے ثابت ہوتا ہے کہ غفلت حرام ہے۔ واضح ہو کہ جس طرح مطلق ذکر سے ذکر خدا ہی مراد ہے اسی طرح مطلق غفلت سے غفلت از خدا ہی مراد ہے۔

(۳) ذکر سے غافل افراد کی اطاعت نہ کرنے کا صریح حکم اللہ نے آنحضرت ﷺ کو اور آپ کے ذریعہ ہر فرد کو دیا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے اور مت اطاعت قبول کرو ان کی جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ﴿آل عمران﴾

(۴) جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے چشم پوشی کرے اسکو سخت عذاب میں داخل کرے گا ﴿سورۃ الجن﴾

(۵) پس بد بختی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل خدا کی یاد سے غفلت کی وجہ سخت ہوگئے ہیں، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں ﴿سورۃ الزمر﴾

(۶) جو شخص میرے ذکر سے روگردانی کرے تو اس کیلئے تنگ زندگی ہے اور ہم قیامت کے دن اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔ ﴿سورۃ الطہٰ﴾

(۷) اے ایمان والو، تمہارا مال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کے ذکر سے غافل نہ کر دے۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہی لوگ گھاٹے میں ہیں۔

(۸) جو شخص اللہ کے ذکر سے غافل ہوتا ہے تو اس پر ہم شیطان کو متعین کر دیتے ہیں جو اس کے ساتھ رہتا ہے۔

(۹) حضرت مہدی علیہ السلام نے لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارىٰ (نماز کے قریب مت ہو جبکہ تم نشہ میں ہو) کی آیت سے سکارىٰ سے دنیا کی مستی مرادلی ہے اور جن اشخاص نے خدا کی یاد کرو فراموش کر دیا شیطان نے ان کے منھ میں لگام دی ہے۔

(۱۰) نقل ہے ایک ولی اللہ شیخ شبلی کی ملاقات کے لئے آئے بلی نے آواز دی کہ شبلی مر گیا۔ اس اولیاللہ کے دل میں خیال آیا کہ جب آیاہوں تو کم از کم تعزیت کرکے واپس جاؤں۔ جب وہ آئے تو شیخ کو سلامت پایا۔ ملاقات کی اور کہا بلی نے تو اس طرح آواز دی شیخ نے کہا بندہ اس وقت خدا کی یاد کو بھول گیا تھا۔ اس سبب سے بلی نے سچ کہا (حاشیہ)

مندرجہ بالا قرآنی آیت اس حقیقت کا ببانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ اللہ کی یاد سے غفلت کرنے والے کافر ہیں، سخت دل اور اس دنیا میں تنگ زندگی کے مالک اور قیامت کے دن اندھے ہیں، نقصان اُٹھانے والے ہیں اوران پر شیطان مسلط ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الغَفْلَۃِ، رَبَّنَا أعْطِنَا تَوْفِیق ذِکرِکَ

ذکر خفی: قرآن کے جو حوالے اوپر دیئے جاچکے ہیں ان سے اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ غفلت حرام اور ممنوع ہے۔ ذکر خدا فرض ہے اور وہ بھی پوشیدہ جس کو اصطلاح میں ذکر خفی کہتے ہیں احادیث میں بھی ذکر خفی کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا أفضل الذكر (الذكر) الخفي بہترین ذکر ذکرِ خفی ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں اذكُرُوا الله ذِكراً حَامِداً الخ کہا گیا ذکر حامد کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا ذکر خفی' اسی طرح حاشیہ میں اسکی ہم معنی حدیث اس طرح آئی ہے کہا گیا پسندیدہ ذکر کونسا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ذکر خفی ایک قول ہے کہ ذکر خفی کو فرشتہ بھی نہیں لکھتا اس لئے کہ وہ اس سے آگاہ نہیں ہوتا۔ پس ذکر خفی تو بندہ اور خدا کے درمیان ہے (صفحہ ۱۴۹)

نقل کے علاوہ عقل کا فیصلہ بھی ذکر خفی کے افضل ہونے پر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ذکر خفی کا آلہ دل ہے۔ جب تک حق کی یاد کو دل میں قرار نہ ہو ذاکر صفاتِ غفلت سے باہر آنہیں سکتا اور دل میں یادِ حق کے قیام و قرار کے لئے پاس انفاس ضروری ہے بغیر پاس انفاس کے قلبِ خواطر' ہوا جس' اوہام اور وساوس سے پاک نہیں ہو سکتا۔

صاحبانِ بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جس طرح حدیث لَا صَلٰوۃَ إلّا بِالطُّهُوْرِ (طہارت کے بغیر نماز نہیں) آئی ہے۔ اسی طرح ایک حدیث لَا صَلٰوۃَ إلّا بِحُضُوْرِ القَلْبِ (حضوری قلب کے بغیر نماز نہیں) آئی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جب تک دل میں خشوع و خضوع نہ ہو وہ نماز نماز ہی نہیں ہوتی۔ یعنی بحالتِ نماز' نمازی کے دل کا خیالاتِ نفسانی اور خطراتِ شیطانی سے پاک ہونا از بس ضروری ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ذکر خفی ہی ہے۔ ورنہ نماز میں دیگر اعضاء ایک جگہ پر رہتے ہیں اور زبان مصروفِ تلاوت' تسبیح اور ثنا رہتی ہے پھر بھی یہ کہنا کہ یہ سب چیزیں اس وقت کار آمد اور بار آور ہوں گی جبکہ دل بھی حاضر ہو۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ نماز کو نماز بنانے والی چیز دل سے خدا کی یاد ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دم وارد اور دم صادر کا خیال رہے اور ہر آنے جانے والی سانس میں نفی اور اثبات کے طریقے پر خدا کا ذکر کرے۔ مہدویہ اسی مقصد کے لئے لَا إلٰهَ إلّا الله کا استعمال کرتے ہیں البتہ حسب ارشاد و تلقین امام علیہ السلام لَا إلٰهَ کیساتھ ''ہوں نہیں'' اور إلّا الله کے ساتھ توں ہے) کا اضافہ کرتے یں اور یہ ذکر بغیر آواز و حروف کے ہوتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ لَا إلٰهَ کے ذریعہ شرک جلی کی نفی ہو کر توحید شرعی حاصل ہو جاتی ہے لیکن ظاہری بتوں کے علاوہ باطنی بت بھی ہوتے ہیں جن میں سب سے بڑا بت خود انسان کی خودی اور اسکی انانیت ہے' جب تک اسکی نفی نہیں کی جاتی اسوقت تک نہ تو شرک خفی کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ توحید حقیقی حاصل ہو سکتی ہے اسی لئے لَا إلٰهَ کے ساتھ ہوں نہیں یعنی ''میں نہیں'' کا تصور کیا جاتا ہے تاکہ خدا کے مقابلہ میں اپنے ظاہری' وہمی اور اضافی وجود کی بھی نفی ہو، ورنہ اپنا وجود خود ایک بڑا گناہ ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے تیرا وجود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اسکے مقابلے میں دوسرا گناہ قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پس جب اس وہمی ''ہونے'' کی نفی کر دی جاتی ہے تو توحید حقیقی کے مقام تک رسائی ہوتی ہے اور جو اوپر توں ہے اور ہوں نہیں کے الفاظ لکھے گئے ہیں بعض لوگوں کو بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً ذکر کے موقع

پر ان الفاظ کا استعمال ذہنوں میں علامت سوال بن کر رہ جاتا ہے لیکن غور کرنے سے معنوی اعتبار سے بھی ان کی اہمیت اتنی ہے کہ بحالتِ مناجات یہ الفاظ خود رسالت مآب ختمی مرتبت حضور پر نور ﷺ کی زبان سے بھی نکلے ہیں چنانچہ حاشیہ شریف (صفحہ ۲۳۳) پر ہے (کلام قدسی قال اللہ تعالٰی - انا و انت یا محمد وما سواك خلقت لاجلك قال رسول اللہ اِلٰهي انت ولا انا وما سواك تركت لَاجلك ،قال انتم راضون على قضاء اللہ، قالوا، نعم يا رسول اللہ۔ بمعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد میں ہوں اور تو ہے اور تیرے سوا جو کچھ ہے میں نے تیرے لئے پیدا کیا ہے رسول اللہ نے کہا یا اللہ میں نہیں ہوں اور جو کچھ تیرے سوا ہے وہ سب میں نے تیری وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ ذکر خفی وہی ہے جس کو کراما کاتبین بھی نہیں سن سکتے جیسا کہ کنز العمال میں حدیث مروی ہے وہ ذکر جس کو کراما کاتبین بھی نہیں سن سکتے اس ذکر سے جس کو کراما کاتبین سن سکتے ہیں ستر درجہ افضل ہے۔ خلاصہ یہ کہ ذکر اللہ کے بارے میں اللہ نے بصیغہ امر حکم دیا ہے جس کا منشاء فرض اور وجوب ہے' قرآن میں کئی جگہ اس حکم کی معنوی تکرار ہے اور کئی مقامات پر اسکی تاکید ہے۔ اس سے غفلت کرنے والوں کی سخت مذمت کیجا کر سخت وعیدوں کا مستحق بتایا گیا ہے اور ذکر سے مراد ذکر خفی ہونے اور کلمہ طیبہ کے ساتھ ہوں نہیں اور توں ہے کا اضافہ ہونے کے بارے میں کلام قدسی دال ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ انسان ہر وقت ہر جگہ اور ہر حال میں خدا کو یاد کرے اور یہ کام پاس انفاس کے بغیر نہیں ہو سکتا حضرت بندگی میاںؒ رسالہ عقیدہ شریفہ میں فرماتے ہیں "جبکہ فرمانِ خدا سے حضرت محمد مصطفی ﷺ اور دیگر پیغمبر ذکر خفی پر مامور تھے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ ذکر خفی تمام قسم کے اذکار سے افضل ہے (شرح عقیدہ ص ۱۷۴) اور اسی وجہ سے مہدی علیہ السلام نے ہر کاسب و فقیر کو ذکر خفی کی ہی تلقین فرمائی ہے اس لئے کہ آپ کو بھی آنحضرت ﷺ سے خواجہ خضر کے ذریعہ جو امانتیں ملی تھیں ان میں ایک ذکر خفی بھی تھا جس کی تلقین آپ نے خود خواجہ خضر کو فرمائی بعد شیخ دانیال بھی اسی ذکر سے ملقّن ہوئے ایک مقام پر مہدی علیہ السلام نے فرمایا "ذکر خفی ایمان است" (شرح عقیدہ ص ۱۷۴)۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل درج حدیث ہر سانس جو بغیر ذکر اللہ کے نکلتی ہے وہ مردہ ہے کی بھی مختصر شرح کی جائے اس فرمان میں حکمت یہ ہے کہ سانس دل میں اور نیز تمام اعضاء میں پہنچتا رہتا ہے پس جب سانس ذکر اللہ کے ساتھ تمام اعضاء میں سرایت کرتا ہے تو ذکر کے عمل سے جسم کے تمام اعضاء میں پیدا ہوتا اور ذاکر کے دل میں ایمان کا درخت اُگاتا ہے جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا لَا اله يُنبتُ الإيمان كما يُنبِتُ الماء البقل یعنی جس طرح پانی سبزی اگاتا ہے اسی طرح لَا إلٰهَ إلَّا الله (ذکر) ایمان کا (درخت) اُگاتا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ دم کے ذریعہ ذکر اللہ کی پابندی ہو۔ خواہ منھ کے ذریعہ یا ناک کے ذریعہ ہمارے پاس فقط ناک ذریعہ ذکر نہیں ہے کیونکہ دم مطلق ہے۔

سائنٹفک توجیہ : انسان کی زندگی کے لئے دونوں سانس ضروری ہیں۔ ایک اندر جانے والا سانس اور دوسرا باہر آنے والا' ان میں سے ایک بھی نہ رہے تو آدمی مر جاتا ہے اور سانس سے ہوتا یہ ہے کہ انسان کے جسم کے اندر موجود خون کی غلاظت کو اندر جانے والی پاک ہوا ہی خود جذب کر کے اسکو پاک کرتی ہے ہوتا یہ ہے کہ ایک طرف دل میں خون جمع ہوتا ہے۔ اسلئے کہ دل کے پمپ کے ذریعہ ہی خون جسم کے مختلف اعضاء تک پہنچتا ہے اور ادھر جب آدمی سانس لیتا ہے تو باہر کی پاک ہوا جس میں آکسیجن زیادہ مقدار میں رہتی ہے جسم کے اندر پھیپھڑوں میں جاتی ہے پس دل میں موجود غلیظ خون اور پھیپھڑوں میں موجود پاک ہوا کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے یعنی خون کی غلاظت کو ہوا جذب کر لیتی ہے اور ہوا کی پاکی کو خون لے لیتا ہے۔ اِس طرح ہر مرتبہ سانس لینے سے قدرتی طور پر خون کی غلاظت ختم ہو کر خون پاک اور صحت مند ہوتا رہتا ہے اسی لئے باہر نکلنے والی ہوا غلیظ کہلاتی ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جس برتن سے کچھ پیتے ہو اس میں پھونک مت مارو (سانس مت چھوڑو) جس طرح جسمانی اعتبار سے انسان کے بدن کے خون کو پاک کرنے کے لئے سانس کو استعمال کیا گیا اسی طرح مہدی علیہ السلام نے بحکم خدا و بحکم کلامِ خدا فرض ذکر کی ادائی کے لئے ہی سانس کو روحانی اعتبار سے ان کے جملہ گندہ خیالات اور شیطانی اور نفسانی وسوسوں کو ختم کرنے کا ذریعہ بنایا اور توجہ دل پر ہی مرکوز رکھی جس طرح کہ خون وہیں سے پاک ہوتا ہے اسی طرح خیالات و خواہشات کا منبع بھی وہی ہے جب وہ لو تھڑا پاک ہو جاتا ہے تو سارا بدن پاک ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے سانس کے ذریعہ اگر اللہ کا نام اندر لیا جائے تو غیر اللہ کا اثر ختم ہو جائیگا اور پاک خون کے ذریعہ جس طرح آکسیجن ہر عضو کے رگ وریشہ میں پہنچ رہی ہے اسی طرح اللہ کا نام بھی پورے جسم میں سرایت کر جاتا ہے یعنی "روان روان" سے صرف اللہ کی آواز آتی ہے۔ نہ اپنی خبر، نہ اپنے غیر کی پس مذکور ہی مذکور ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ ﴿الکھف:۲۴﴾ اور اس حد تک اپنے پروردگار کو یاد کر کہ تو اس کے غیر کو بھول جائے اب اسکے غیر کی نفی کے لئے لَا إِلٰهَ کی شمشیر کی ضرورت ہے جیسا کہ کہا گیا ہے

لا ترا از تو رہائی می دہد   با خدایت آشنائی می دہد

یعنی لَا تجھ کو تجھ سے رہائی دلاتا ہے اور خدا سے تیری دوستی کراتا ہے' جب لَا کی تلوار خودی دنیا بلکہ ماسویٰ اللہ پر چل جاتی ہے تو إِلَّا اللہ کا اثبات بجمیع الوجوہ ہو جاتا ہے اور یہی ذکر حقیقی ہے چند ضروری باتیں بطور اُصول کے لکھ دی گئی ہیں تا کہ مبتدی حضرات فائدہ حاصل کریں۔ جن حضرات کو مزید معلومات کا شوق ہے وہ اپنے مرشدین کرام سے رجوع ہوں۔

آخر میں خدائے رب الملائکتہ والارواح کی بارگاہ اقدس میں دعا ہے کہ اللہ ہم سبکو ذکر حقیقی دوامی کی توفیق عطا فرمائے اور خاتمہ ایمان پر ہو۔

حقیقت ترکِ دُنیا

دنیا میں خدا جانے کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن کا نام سن کر ہی لوگ گھبرا اٹھتے ہیں محض اس لئے کہ وہ ان کی حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اولاً تو حقیقت سے بے خبری ان اشیاء سے دور رکھنے کا باعث ہوتی ہے اور دوسرے یہہ کہ بعض غلط تحقیقات کی وجہ وہ غلط راستے پر چل پڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان اشیاء کی اصلیت اور حقیقت کم از کم ان کے حق میں پردۂ خفا میں رہ جاتی ہے۔ اور جب اسی حالت پر ایک زمانہ گذر جاتا ہے تہ یہہ مسٔلے ان کی فکر و نظر کے دائرے سے ہی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان پر نہ تو کسی قسم کی تحقیق کی خواہش ہی ہوتی ہے اور نہ سابقہ تحقیقات پر کسی تنقید کو گوارا کیا جاتا ہے۔ گویا جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اس پر مزید قیل و قال کی بھی ان کے پاس گنجایش باقی نہیں رہتی۔

من جملہ ان مسائل کے ایک مسٔلہ ترک دنیا کا بھی ہے۔ ترک دنیا کا نام سنتے ہی نہ جانے کتنے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور کتنے دل بیٹھنے لگتے ہیں۔ کتنے تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہنے والے سے متعلق اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا کر لیتے ہیں۔ گویا اپنی زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ بھائی اس ترقی پسند زمانے میں تمہاری زبان سے یہ الفاظ۔ ہمیں آپ سے بڑی گہری ہمدردی ہے۔ آپ سے، آپ کی عقل سے، آپ کے مذہب سے آپ کی فکر و نظر سے، آپ کے علم سے اور (غالباً) آپ کے بال بچوں سے بھی۔

پھر بعض کٹر قسم کے جو مذہبی لوگ ہوتے ہیں وہ تو دھڑا دھڑ آیتیں پیش کرنے لگتے ہیں اور حدیث ''لا رهبانيةَ في الإسـلام'' کہتے ہوئے فاتحانہ انداز میں ترکِ دنیا کے قائل پر نظر ڈالتے ہیں اور جو طبقہ پروردۂ ترقی یافتہ ماحول ہوتا ہے اس کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ وہ زمانے کے تجربات سائنس کے نت نئے ایجادات علم و فن کی ترقی اور کائنات کے مختلف گوشوں میں رقصاں زندگی کے حسین مناظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ دریافت کرنے لگتا ہے کہ کیا خدا نے یہ سب چیزیں اس لئے بنائی ہیں کہ انسان ان سب سے منھ موڑ کر ''گوشہ روشن'' ہو جائے۔ کیا یہ سورج، یہ چاند' یہ تارے' یہ حسین مناظر' یہ دلفریب نظارے۔ یہ دریا یہ مد و جزر۔ یہ باغ۔ یہ عورتیں۔ یہ کھیتیاں اللہ نے بے مقصد پیدا کئے ہیں؟ کیا یہ سب انسان کی خدمت کے لئے نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر جب انسان ہی ان سب سے اپنا دامن چھڑا لے تو پھر کیا ہو گا؟؟

واقعہ یہ ہے کہ زمانہ ایک حالت پر کبھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے تقاضے اور اندازے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جس کی وجہ لوگوں کی فکر و نظر کے پیمانے بھی اکثر و بیشتر متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں جو چیز مستحسن سمجھی جاتی تھی بعد کے زمانے میں وہی چیز قبیح بن جاتی ہے۔ اور کسی زمانے میں جس شئی کے متعلق قباحت کا حکم لگایا جاتا تھا وہ آج کل کے دور میں باعث افتخار

بن جاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہہ ہے کہ کسی بات کی قبولیت اور عدم قبولیت میں زمانے کی "رو" کو زیادہ دخل رہتا ہے۔ روحانیت کے دور میں "مادیت" سے نفرت یقینی تھی اور مادیت کے دور میں روحانیت کی گفتگو قدامت پرستی کا لقب پاتی ہے۔ موجودہ دور کے بارے میں بلاشک وشبہ بلکہ بلاخوف تردید یہہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہہ نہ صرف مادہ پسند ہے بلکہ مادہ پرست بھی ہے۔ جب یہہ بات ہے تو ظاہر ہے کہ اس ماحول میں اسی بات پر دھیان دیا جائے گا جس میں مادیت پائی جاتی ہے اور جس بات کی بنیاد میں مادیت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ لوگ اُسے سمجھنا تو کُجا سننے میں بھی تامل کریں گے۔

موجودہ دور نے ترک دنیا کے مسئلہ کے بارے میں بس یہی روّیہ اختیار کیا ہے۔ آج کل کے ماحول میں ترک دنیا پر گفتگو تو رہی ایک طرف ہم اس کا نام بھی لیں گے تو لوگ ہمیں حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔ بالکل اس طرح کہ گویا ہم پُرانی قبروں سے ابھی ابھی اُٹھ کر ان کے سامنے آدھمکے ہیں۔ اور جہاں تک حقائق کا تعلق ہے ہم انہیں ایسا سمجھنے پر مجبور اور معذور سمجھتے ہیں۔

اس لئے کہ اس کی ایک وجہ تو ان کا ماحول ہے۔ جس کے ترازو میں وہ ہر شئ کو تولنا جانتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہہ ہے کہ ترک دنیا کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے سے وہ ہمیشہ قاصر رہے ہیں۔ یعنی یا تو یہ بات ہے کہ ترکِ دنیا کا نام سنتے ہی انہوں نے یہ اندازہ کرلیا ہے کہ یہہ رہبانیت کی سی تعلیم ہے۔ یا پھر ان کے سامنے ترک دنیا کے قائلین اور متعقدین اور اس پر عمل کرنے والوں نے ترکِ دنیا کی تعبیر کچھ اس طرح پیش کی ہے جس کی وجہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ترک دنیا سے مراد علم اور عمل کی وہ عمارت ہے جو زندگی سے گریز اور فرار کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔

ان ہی وجوہات کی بناء پر بعض احباب نے یہہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ترک دنیا کی حقیقت پر خامہ فرسائی کی جائے بات کو راقم الحروف نے جس طرح سوچا اور سمجھا ہے اپنے انداز میں پیش کرنے کی جراءت کی ہے۔ یہہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ بس وہی قول صحیح ہے جو میرے دماغ کے سانچے میں ڈھل کر نوکِ قلم سے نکلا ہے۔ خطا اور نسیان تو انسانیت کی خمیر ہے۔ لیکن جب قرآن اور حدیث کے واضح ارشادات اور زمانے کے تجربات سامنے آتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ اپنی بات بالکلیہ غلط بھی نہیں ہے۔ صحیح فیصلہ تو بس ناظرین ہی کرسکتے ہیں کہ میں نے اس مضمون کو کس حد تک سمجھا ہے۔ خدا کرے کہ میں جس چیز کو جس انداز میں سمجھا ہوں اسی انداز میں سمجھانے میں کامیاب ہوجاؤں۔ وما توفيقي إلّا بِاللهِ، عليهِ توكلتُ و إليه أُنيبُ۔

نفسِ دنیا اور حیاتِ دُنیا

ترکِ دنیا ایک مرکب لفظ ہے۔ جو ترک اور دنیا پر مشتمل ہے۔ اسلئے مناسب یہہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان دونوں

کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق کرلی جائے تاکہ دونوں کے مرکب لفظ ترک دنیا کا حقیقی مفہوم ذہن نشین ہونے میں غلطی کا احتمال نہ رہے۔ ترک دنیا ترکُ الدُنیا کے معنیٰ "دنیا کو ترک کرنا" یا دُنیا کو چھوڑنا، ہیں۔

ذیل میں اولاً دنیا اور پھر "ترک" سے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ دنیا لغت کے اعتبار سے **فُعْلٰي** کے وزن پر ہے۔ یہہ موئنث کا صیغہ ہے اور دراصل یہہ صفت ہے جس کا موصوف محذوف ہے۔ یعنی **الدَّارُ الدُّنیا** کثرت استعمال کی وجہ سے صفت موصوف سے مستغنی ہوگئی۔ اس کا ضد اخریٰ ہے۔ اور عموماً دنیا کے مقابلے میں آخرت ہی مراد ہوتی ہے۔

چونکہ یہ عالم جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں ہم سے قریب ہے اس لئے اسے دار دنیا کہتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ دار (گھر) جو ہم سے دور ہے (یعنی جو ہماری ان نظروں سے او جھل اور بعد مرگ ملنے والا ہے) اُسے دار آخرت کا نام دیا جاتا ہے اور اس کا نام عقبیٰ بھی رکھا جاتا ہے۔ بہر کیف یہہ امر ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ دنیا اور آخرت میں تلازم ذہنی ہے۔ ایک کے ذکر کے ساتھ دوسرے کا ذکر بھی کم از کم ذہن میں سہی مگر ضروری اور یقینی ہے۔

دنیا کی من مانی تعریف کرنے کے بجائے بہتر یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے خالق سے ہی "دنیا" اور اسکے "متعلقات" کے متعلق معلومات حاصل کئے جائیں۔ چنانچہ جب ہم اس غرض کے لئے کلام خالق میں دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں تو قرآن کی متعد آیتیں ہمیں ایسی ملتی ہیں جہاں دنیا کا ذکر مختلف انداز میں کیا گیا ہے۔ قرآن کا تحقیقی مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ قرآن میں دنیا کے مفہوم کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ دنیا اور دنیاویات کو جامع ہے اور اس کے ہر ذرہ کو محیط بھی۔

اس انداز بیان کی خصوصیت یہہ ہے کہ دنیا اور دنیاویات کے بارے میں مختلف لوگوں کے مختلف خیالات کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی اس امر کی بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ ان کے بارے میں کونسا نقطۂ نظر صحت کا حامل ہے اور کونسا غلط۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

دنیا یا دنیاویات کو تین قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں (۱) نفسِ دنیا (۲) حیاتِ دنیا (۳) متاعِ دنیا یا متاعِ حیات دنیا۔ ہماری اس تقسیم کو ہم جامع تقسیم کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ دنیا کا اطلاق جس شئ پر صحیح ہوگا وہ ان تینوں قسموں سے کسی نہ کسی قسم میں ضرور داخل ہوجائے گی۔ اور کسی ایسی شئ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جس پر دنیا کا اطلاق تو صحیح معنوں میں ہوتا ہو لیکن ان تینوں قسموں میں سے کسی ایک قسم میں شامل نہ ہو۔

نفسِ دنیا: جہاں تک نفسِ دنیا کا تعلق ہے ہم علم اور تجربہ کی روشنی میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نفسِ دنیا بری

نہیں ہے۔ نفسِ دنیا پر نہ تو اچھائی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے نہ برائی کا اور دنیا کیا دنیا کی ہر چیز کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر یہی ہے کہ کوئی شئ فی نفسہٖ نہ اچھی ہے نہ بُری۔ اچھائی اور برائی جو شئ میں پیدا ہوتی ہے وہ اصل شئ کے متعلق اختیار کردہ نقطۂ نظر کی وجہ سے ہوتی ہے یا اس کے طریق استعمال کے سبب سے، کسی شئے کے متعلق نقطۂ نظر اچھا قائم کیا گیا ہوگا تو وہ شئ بھی اچھی ہوگی۔ لیکن اُسی شئ کے غلط نقطۂ نظر کی وجہ سے وہ برائی سے ہمکنار ہونے میں ظاہر ہے کہ دیر بھی نہیں لگتی۔ اسی طرح کوئی شئ اس کے طریق استعمال کی وجہ سے اچھی یا بُری کہلاتی ہے۔ بعض اچھی چیزوں کو غلط طور پر غلط مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا تو وہ یقینا بری ہو جائیں گی۔ اور بعض بظاہر بُری چیزوں کو صحیح طور پر صحیح مقاصد کے لئے عمل میں لایا جائے تو وہ یقینا اچھی سمجھی جائیں گی۔

جان، مال اور آبرو کی حفاظت کے لئے اگر شمشیر کا استعمال کیا جائے تو شمشیر اچھی کہلائے گی اور فتنہ انگیزی اور فساد پروری کے ناپاک مقاصد کی خاطر اگر نعرۂ تکبیر بلند کیا جائے تو ظاہر ہے کہ نعرۂ تکبیر جیسی اچھی چیز بھی قبیح سمجھی جائیگی۔ حالانکہ شمشیر کا کام خون کرنا ہے۔ جو بظاہر بری بات ہے۔ اور نعرۂ تکبیر اچھے اور ایمانی کلمات سے مرکب ہے جس کے مستحسن ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جاسکتا لیکن جب یہہ دونوں چیزیں دو مختلف مقاصد کیلئے استعمال کی جاتی ہیں تو صرف طریق استعمال کی بنیاد پر بظاہر بُری چیز، عقل و شرع کی نظر میں مستحسن ہو جاتی ہے اور بظاہر اچھی چیز، قبیح بن جاتی ہے۔ پس نفس دنیا کا بھی یہی حال ہے کہ نفسِ دنیا بری نہیں یہہ چاند، سورج، ستارے، آسمان، زمین، سونا، چاندی، کھیتیاں، فرزند، زن، نباتات، حیوانات، آخر ان میں بُرائی کیا ہے برائی ان کے متعلق اختیار کردہ نقطہ نظر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس سے صاف طور پر یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان کے متعلق صحیح نقطہ نظر اختیار کیا جائے تو یہ چیزیں ہمیشہ اچھی ہی رہیں گی، اب اس مقصد کے لئے ان اشیاء کے متعلق ان کے خالق کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ تا کہ نقطۂ نظر کے تعین میں آسانی پیدا ہو سکے۔ جب انسان کا نقطۂ نظر دنیا سے متعلق اس کے خالق کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو جائے گا تو پھر نظریات میں کوئی تصادم نہ ہوگا۔ اور ہر شئ اچھی ہی رہے گی لیکن اس کے بر خلاف اگر انسان، خالق کے نقطہ نظرُ سے ہٹ کر ایک جداگانہ نقطۂ نظر دنیا سے متعلق قائم کرے تو ایسی صورت میں تصادم یقینی ہے۔ یہی تصادم دراصل خیر و شر کا نام پاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے متعدد خلیفوں کو دنیا میں بھیجا۔ تا کہ وہ اپنے قول و عمل سے کائنات کے متعلق خالق کائنات کے نقطۂ نظر کو پیش کریں اور اپنے عمل کے ذریعہ اس کی کامل وضاحت بھی کر دیں۔

اگر نفس دنیا بری ہوتی یا دنیا میں پیدا شدہ اشیاء میں خرابی ہوتی تو اللہ ان چیزوں کا ذکر بندوں پر بطور احسان کے نہ کرتا ۔ پس ان چیزوں کا بندوں کے لئے پیدا کیا جانا اللہ کی طرف سے بندوں پر ایک زبردست احسان ہے۔ اور اس احسان کے

اعتراف کی بہترین شکل یہہ ہے کہ انسان ان کے خالق اور اپنے محسن کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردے۔ اس کو اپنا معبود حقیقی قرار دے۔ اس کے حکم کے مقابلے میں اپنا حکم نہ چلائے۔ کائنات سے متعلق خالق کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر اپنا علحدہ نقطۂ نظر قائم نہ کرے۔ کہ یہی عین عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں قرآن میں اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے وہاں بندوں کے سامنے اپنے احسانات کی تفصیل بھی رکھی ہے۔ مثلاً: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّـهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ**﴿البقرۃ:۲۱﴾۔ ترجمہ: اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا۔ تاکہ تم اللہ سے ڈرسکو۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسماں کو چھت بنایا۔ اور آسمان سے بارش برسائی اور اس سے بطور رزق کے پھل پیدا کئے۔ پس اللہ کے ساتھ شریک مت بناؤ۔ اور حال یہہ ہے کہ تم جانتے ہو۔

چلتے چلتے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور دار دنیا کے فرق کو بھی ظاہر کردیا جائے۔ تاکہ بات کو سمجھنے میں کسی قسم کا اشکال باقی نہ رہے۔ دنیا اور دار دنیا میں فرق نہ کرنا اور دونوں سے ایک ہی مفہوم مراد لینا دراصل اس مسٔلہ کی حقیقت اور منزل مقصود تک رسائی کی ایک اہم ترین رکاوٹ ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوجائے کہ دنیا اور دار دنیا ایک ہی مفہوم کے دو الگ الفاظ نہیں ہیں بلکہ دو جداگانہ مفاہیم کے لئے جو آپس میں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں دو الگ الفاظ ہیں تو پھر حقیقت تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہوگی۔ مسٔلہ اپنے کل پہلوؤں کے ساتھ نکھر کر سامنے آجائے گا اور مزید قیل و قال کی گنجایش باقی نہ رہے گی۔ دار دنیا سے مراد وہ کرۂ ارضی ہے جہاں انسان اپنی عارضی اور مستعار زندگی مدت معلومہ تک بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے مفہوم کو اگر وسعت دی جائے تو کرۂ سماوی اپنے جمیع اجرام کے ساتھ اس مفہوم میں شریک ہوسکتا ہے۔

لیکن دنیا کا مفہوم اس سے قطعاً مختلف ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات پر آئے گی۔ یہاں بطور خلاصہ کے اتنا کہا جاسکتا ہے کہ دنیا سے مراد "غیر اللہ" ہے۔ ان دونوں تعریفوں کو سامنے رکھیں تو معنوی اعتبار سے ان میں جو بُعد پایا جاتا ہے وہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے مزید توضیح انشاءاللہ آئندہ آئیگی۔ اس لحاظ سے نفسِ دنیا (اور ایک قدم آگے بڑھ کر کہیں تو) یا دار دنیا کسی طرح من جمیع الوجوہ بُرے نہیں ہوسکتے کہ ان کو ترک کرنے کی تعلیم دی جائے۔ بلکہ ہمارے بیان کردہ معنوں کی رو سے اس کو ترک کرنے کی تعلیم دینا دراصل زندگی سے فرار اختیار کرنے، رشتۂ حیات کو منقطع کرنے یا بالفاظ دیگر خودکشی کی تعلیم دینے

کی مترادف ہو گا۔ ایسی تعلیم نہ کسی مذہب میں پائی جاتی ہے اور نہ عقل کی ترازو ہی میں ٹھیک اترتی ہے۔ خلاصۂ بحث یہہ ہے کہ ترک دنیا سے "ترک نفس دنیا" یا ترکِ دار دنیا مراد نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا سمجھے تو وہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ اور اس کو حقیقت سمجھ کر جو ترک دنیا کو ہی لغو قرار دے یا ایسی تعلیم پر اعتراض کر بیٹھے تو خود ایسا اعتراض لغو، باطل بے بنیاد اور بے اصل ہو جائے گا۔

پھر یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ اگر نفس دنیا بری ہوتی تو خدا اس کو انسان کے لئے پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔ اسی طرح اگر دار دنیا ہی بری ہوتی تو انسان اس کے حوالے ہی نہ کیا جاتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انسان پیدا کیا گیا اور بھیجا گیا تو اسی دار دنیا میں اور تخلیق انسان سے قدرت کی جو مراد ہے اس کی تکمیل بھی ہوتی ہے تو اسی دار دنیا میں انسان اچھے برے جو بھی کام کرتا ہے وہ دار دنیا میں ہی کرتا ہے۔ اسلئے کہ دار دنیا ہی دار العمل ہے۔ دارالآخرت تو دار الجزاء ہے۔ وہاں عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہیں سے یہ نکتہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ "دار دنیا" اور ہے اور "دنیاداری" اور ہے، عقل اور شرع کی نظر میں جو چیز مذموم ہے وہ دنیاداری ہے نہ کہ دار دنیا۔

دار دنیا کی جو چیز حقانیت اور للّٰہیت کے جذبے سے عاری ہوتی یا خالق کائنات کے منشاء کے خلاف عمل کا ذریعہ بنتی ہے وہ دنیاداری کہلاتی ہے اور ایسا جذبہ جذبہ دنیاداری کہلاتا ہے اور یہی جذبہ مذموم ہے اور حکم جو دیا گیا ہے وہ اسی دنیاداری کو ترک کرنے کا ہے۔ نہ کہ دار دنیا کو ہی خیر باد کہکر شہر خموشاں کو آباد کرنے کا۔ فافهم فانه بين۔

اِس موقع پر یہ بیان بھی بے جا نہ ہو گا کہ قرآن کریم میں جابجا آخرت پر ہی زور دیا گیا ہے۔ دار دنیا کے مقابلے میں دار آخرت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اور ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ قرآن کا یہہ بیان بھی دراصل اسی جانب دلالت کرتا ہے کہ دار دنیا میں رہ کر انسان کو اسی کے لئے ہو نہیں جانا چاہئے۔ کیوں کہ اسی کے لئے ہو جانا ہی "دنیاداری" ہے۔ اور دنیا میں رہ کر آخرت کی یعنی مابعد الموت کی زندگی کے پیش نظر کام کرنا نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ کمال انسانیت بھی۔ کیونکہ انسان کو یہ بات معلوم ہے کہ دنیا میں اس کی زندگی چندروزہ ہے اس کے بعد بہر حال اُسے موت سے دوچار ہونا ہے۔ اور وہاں خدا کے پاس جواب دہی سے کسی طرح اُسے مفر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں انسان کا اپنی زندگی اور خود دنیا کی ناپائیداری کا خیال کرتے ہوئے ہمیشہ کی زندگی کو پیشِ نظر رکھنا جو اُسے مابعد الموت ملنے والی ہے۔ انسانیت کا کمال بھی ہے اور منشاء خداوندی کی تکمیل بھی۔

اور جو شخص صرف دنیا کا ارادہ کرے گا اور اس کے پاس آخرت کا تصور بھی نہ ہو گا تو ایسے شخص کو دنیا میں حسب ارادہ

وخواہش تو مل جائے گا لیکن آخرت میں وہ گھاٹے میں رہے گا۔

جیسا کہ ارشادِ باری ہے: مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ﴿الاِسراء:۱۸﴾ ترجمہ: جو شخص عاجلہ (دنیا) کا طالب ہو تو ہم جو چاہتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں اسی دنیا میں (سردست) دیدیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ ٹھہرائی ہے۔ جس میں وہ مذموم اور راندۂ درگاہ ہو کر داخل ہو گا۔

حیاتِ دنیا: نفسِ دنیا کے بارے میں ایک حد تک معلومات حاصل ہو جانے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیات دنیا کے بارے بھی قرآن کریم کی روشنی میں غور کیا جائے۔ حیاتِ دنیا کیا ہے؟ اس کے تعلق سے قرآن مجید میں جامع الفاظ میں یہہ تعریف ملتی ہے۔

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿الحدید:۲۰﴾ ترجمہ: جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل تماشہ زینت ظاہری، آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے زیادتی کے خواستگار ہونا ہے۔ حیات دنیا کی مثال برسات کی سی ہے کہ زمین پر برستی ہے اور کھیتی لہلہانے لگتی ہے اور کاشت کار کھیتی کو دیکھ کر خوش ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ پک کر زرد ہو جاتی ہے پھر وہ روندی جاتی ہے اور آخرت میں اہل دنیا کیلئے شدید عذاب اور مومنوں کے لئے اللہ کی جانب سے معافی اور خوشنودی ہے دنیا کی زندگی تو نری دھوکے ٹٹی ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوا کہ حیات دنیا کا اطلاق حسب ذیل پانچ چیزوں پر ہوتا ہے۔(۱) کھیل (۲) تماشا (۳) ظاہری طمطراق (۴) آپس میں (خواہ کسی وجہ سے ہو) ایک دوسرے پر فخر کرنا۔ (۵) مال و اولاد میں ایک دوسرے پر زیادتی کے طالب ہونا۔

ظاہر ہے کہ جو شخص ان چیزوں کے پیچھے پڑے گا، قطع نظر اس کے کہ اس کی حرص و ہوس کی پیاس کسی نقطہ پر پہنچنے کے بعد ختم بھی ہو گی یا نہیں وہ اپنے مقاصد کے حصول کے وقت کیا آخرت کا تصور بھی کر پائے گا؟ کیا اُسے حلال و حرام میں فرق کرنے کی مہلت بھی مل سکیگی۔ کیا وہ ان چیزوں کے حصول کی دھن میں اندھا نہیں ہو جائیگا؟ ایسے شخص کو نہ شریعت کا پاس ہو گا نہ دین کا لحاظ، نہ اخلاقی اقدار کی پابندی اس کا شعار ہو گی نہ سماجی ضوابط کا وہ خیال رکھ سکے گا نہ حلال کی تمیز ہو گی نہ حرام کی، لہو و لعب اور زینت کی خاطر اُسے وقت کی بربادی کا شعور ہو گا نہ روپیئے کی تضیع کا۔، تفاخر اور تکاثر کے جذبات سے وہ اس قدر

معمور ہو گا کہ اس کی راہ میں محسوس ہونے والی ہر رکاوٹ کو سختی کے ساتھ دور کئے بغیر چین سے نہ بیٹھے گا۔ اس درجہ اندھا اور بہرا بن جائیگا کہ نہ بیواؤں کی مظلومیت کو دیکھے گا، نہ یتیموں کی آہ وبکا کو سنیگا۔ غریبوں کے بچے بھوک سے بلکتے ہوں اس کی بلا سے مجبور، معذور اور اپاہج، نکبت وافلاس کا شکار ہو کر اس کے سامنے بھیک مانگتے ہوں مگر اُسے کیا غم چلچلاتی دھوپ میں مزدور، ان تھک محنت کرتے ہوں اور راتوں میں جاڑے کی تاب نہ لاکر سکڑ سکڑ کر مر جاتے ہوں، اس کا کیا قصور نہ کوئی روح فرسا منظر اس کو متاثر کر سکے گا نہ کسی کی دلدوز چیخ اس کے دل میں رحم وکرم کے جذبہ کو حرکت دے سکے گی۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ ان چیزوں کی طرف ذرہ برابر بھی دھیان دے گا تو اس کی منزل مقصود تک پہنچنے میں اُسے اور دیر لگ جائے گی یا کوئی اور اس پر سبقت لے جائے گا۔

مگر وہ اس حقیقت کو بھول رہا ہے کہ کھیتی کتنی ہی سر سبز وشاداب کیوں نہ ہو ایک نہ ایک دن اُسے روندا ہی جائیگا۔ اسی طرح دنیا کی مادی ترقی اور دنیادار کی ظاہری خوشحالی کا عالم ہے کہ ایک نہ ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جانا ہی پڑے گا۔ کوئی چیز اس کے ساتھ نہیں آئے گی۔ چنانچہ قرآنی فیصلہ: وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ۔ دینوی زندگی تو نری دھوکے کی ٹٹی ہے۔ تو اس مسٔلہ میں حرف آخر ہے۔ اس سے بڑھکر حیات دنیوی کی تفسیر اور کن الفاظ سے کی جاسکتی ہے؟؟ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے حیات دنیوی اور اسکی زینت کے طالبوں اور مریدوں کو سخت الفاظ میں وعید سنائی ہے چنانچہ ارشاد ہے:

مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴿ھود:١٥﴾ جو شخص دنیا کی زندگی اور اسکی زینت کی خواہش رکھے تو ہم ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا دنیا میں ہی دیدیتے ہیں۔ اور وہ دنیا میں کچھ بھی گھاٹے میں نہ رہیں گے۔ یہ لوگ وہ ہیں جن کیلئے آخرت میں دوزخ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جو عمل انہوں نے دنیا میں کئے وہ آخرت میں حبط ہو جائیں گے اور ان کا کیا دھرا سب اکارت جائیگا۔

خلاصہ یہ کہ دنیا سے مُراد اگر حیات دینا ہو تو قرآن شریف کی مندرجہ بالا آیت واعلموا انما الحیوۃ الدنیا الخ سے حیات دنیا کے مختلف گوشے بھی معلوم ہوئے اور یہ حقیقت بھی کھُلی کہ دنیوی زندگی صرف دھوکے کا سامان ہے نیز سورۂ ہود کی آیت من کان یرید الحیوۃ الدنیا الخ سے اس امر پر روشنی پڑی کہ حیات دنیا اور زینت دنیا کا ارادہ کرنے والوں کے نہ صرف دنیوی اعمال اکارت جائیں گے بلکہ آخرت میں بھی سوائے آگ کے انہیں کچھ نہ ملے گا۔

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حیات دنیوی کو اختیار کرنا اس کا ارادہ کرنا اس کی زینت کی

خواہش کرنا یا آخرت کے مقابلے میں اس کو ترجیح دینا کفر ہے۔ اس لئے کہ دوزخ کا عذاب اور آگ کی خوشخبری تو صرف کفار کے حق میں ہی دی جاتی ہے۔

متاعِ حیاتِ دنیا: نفس دنیا اور حیاتِ دنیا کے بعد جو تیسری شق رہ جاتی ہے وہ ہے متاعِ حیاتِ دنیا۔ اس کے بارے میں دینی نقطۂ نظر سے رائے قائم کرنا کوئی دشوار امر نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جب حیات دنیوی ہی مردود ہوگی تو اس کا جو متاع ہوگا وہ بھی لازماً مردود اور یقیناً مذموم ہی ہوگا۔ مزید اطمینان قلب کیلئے قرآن شریف میں جب تلاش کی جاتی ہے تو جستجو کے دامن میں حسبِ ذیل موتی ملتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴿آل عمران:۱۴﴾ ترجمہ: لوگوں کے لئے عورتوں، بچوں، سونے چاندی کے ڈھیروں، عمدہ گھوڑوں مویشیوں اور کھیتی کی محبت مزین کی گئی۔ (حالانکہ) یہ تو دنیوی زندگی کے (چند روزہ) فائدے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت شریف سے معلوم ہوا کہ متاع حیاتِ دنیا کا اطلاق حسبِ ذیل چیزوں پر ہوتا ہے۔ (۱) عورتوں کی محبت (۲) اولاد کی محبت (۳) سونے کے خزانوں کی محبت (۴) چاندی کے ڈھیروں کی محبت (۵) عمدہ گھوڑوں کی محبت (۶) مویشیوں کی محبت (۷) کھیتی کی محبت۔ نیز یہہ بھی معلوم ہوا کہ ان چیزوں میں انسان کے لئے غیر معمولی کشش موجود ہے۔ جس کی وجہ انسان ان کی جانب خود بخود کھچتا چلا جاتا ہے۔ اور ان کے حصول کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا بیٹھا ہے۔ واضح باد کہ آیت شریفہ کا ہر گز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ انسان کو قرآن فطرت سے بغاوت کرنے یا فطرت کے خلاف کام کرنے پر اُبھارتا ہے۔ بہترین مذہب کی نشانی یہی ہے کہ وہ فطرت کے اصول کے مطابق ہو۔ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کی بنیاد بننے والی آخری آسمانی کتاب کس طرح انسانی فطرت کے خلاف تعلیم دے سکتی ہے۔ ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا کوئی اصول فطرت کے مغائر نہیں ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے قرآن کا منشأ یہہ نہیں کہ انسان اپنی عورتوں، اپنے بچوں، اپنی کمائی کے روپیوں، سکوں، زیورات، گھوڑوں، مویشیوں، اور اپنی کھیتوں سے کوئی تعلق نہ رکھے، یا ان سے نفرت کر بیٹھے۔ اس قسم کا نتیجہ نکالنا نادانی اور کج فہمی ہے۔ ان سات چیزوں کے ساتھ انسان تعلق تو رکھ سکتا ہے مگر بقدر ضرورت کہ اس سے کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں ضرورت سے آگے کی منزل خواہش نفسانی اور حرص کی ہے جو اہوائے شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی کو حرام قرار دیا گیا ہے،

اور اسی کے طالب کو نار جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی زندگی کے لئے ان چیزوں کی افادیت اور اہمیت تو بہر حال مسلم ہے۔ پس جب تک ان کی افادیت اور اعانت کا پہلو نمایاں ہو رہے گا اس حد تک وہ مباح قرار پائیں گی۔ لیکن جب وہ "مقصدیت" "محبوبیت" اور "مخدومیت" کا مقام حاصل کر لیں گی وہ حرام بھی قرار پائیں گی اور کفر کا باعث بھی۔ عورتوں، بچوں اور اسی طرح اپنی کمائی ہوئی یا باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہوئی ہر چیز سے انسان کو جو محبت ہوتی ہے وہ اضطراری محبت ہے۔ اضطراری محبت فطری ہوتی ہے۔ اور فطری محبت سے نہ انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کو ترک کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ آیت کا منشأ بھی یہہ نہیں ہے۔ آیت کا جو منشاء ہے وہ یہ کہ انسان کے پاس ان چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے۔ مگر یہہ سب چیزیں دنیوی زندگی میں چندروزہ فائدہ کی ہیں۔ بہترین ٹھکانہ اللہ کے پاس ہے۔

پس اگر ان چیزوں کی محبت خدا اور رسول کی محبت پر غالب آجائے تو اس سے بڑھ کر ضلالت اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے!!! ماحصل یہہ کہ اگر دنیا سے متاع حیات دنیا مراد لیں تو اس کا بھی اختیار کرنا یعنی خدا کے مقابلے میں اس کو ترجیح دینا باعث کفر ہے۔ جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہہ نکلتا ہے کہ جس کا اختیار کرنا باعث کفر ہے اس کا ترک موجب ایمان ہے۔ وذلک ما کنا نبغی۔

اب تک جو کچھ بحث کی گئی اس سے ناظرین کو یہہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہوئی ہوگی کہ قرآن حکیم میں دنیا کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوا ہے اور کس طرح ہوا ہے؟ وہ سب چیزیں خدا کے پاس کیا درجہ رکھتی ہیں؟ اور ان کے بارے میں کس قسم کا نقطۂ نظر اختیار کرنا صحیح ہے اور سب سے بڑھکر یہہ کہ ان چیزوں سے کس حد تک محبت کرنے کا جواز مل سکتا ہے؟؟

فلسفۂ ترک: دنیا کے بارے میں اجمالاً نقطۂ نظر معلوم کر لینے کے بعد اب جو چیز رہ جاتی ہے وہ ترک سے متعلق گفتگو ہے۔ لہٰذا ذیل میں ترک سے متعلق بحث کی جاتی ہے ترک کے معنی چھوڑنے کے ہیں۔ لیکن یہاں جو چیز قابل غور ہے وہ یہہ کہ جب کبھی لفظ ترک استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ذہن میں دو باتیں آتی ہیں۔ ایک تو یہہ کس چیز کو ترک کیا جارہا ہے۔ اور دوسری یہہ کہ کیوں ترک کیا جارہا ہے یا اس کے ترک سے کن مقاصد کا حصول مطلوب ہے۔

جب تک ان دونوں چیزوں کو سامنے نہ رکھا جائے گا ترک کی حقیقت کھل کر ظاہر نہ ہو سکے گی جس کی وجہ ترک خود ایک لایعنی اور بے مقصد چیز بن کر رہ جائے گی۔ اس اجمال کی تفصیل یہہ ہے کہ ایک شخص کے سامنے دو متضاد راستے رہتے ہیں۔ اب اس شخص کو اختیار دیا جاتا ہے کہ ان دونوں متخالف راستوں میں سے جس راستے کا چاہے انتخاب کرلے۔ پس وہ شخص خود کو عطا کردہ اختیار کی بناء پر دونوں راستوں پر کافی غور وخوض کرنے کے بعد یعنی ان راستوں کے کیفیات، ان کی تکلیفات، ان کے

فاصلوں اور ان کی منزلوں پر نظر کرتے ہوئے اپنے لئے ایک راستہ کا انتخاب کرتا ہے۔ جسکے معنی دوسرے لفظوں میں یہہ ہیں کہ اس شخص نے ایک راستہ کو ترک کیا اور دوسرے کو انتخاب کیا۔ اظہار بیان کے وقت جس پہلو کو اجاگر کرنا ہوتا ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے۔ کہیں تو اختیار کردہ راہ کی خوبیوں کو منظر عام پر لانا مقصود ہوتا ہے تو فقط اختیار کے بیان کو ترجیح دی جاتی ہے اور کبھی ترک کردہ راستے کی بُرائیاں بتلانا مطلوب ہوتا ہے تو ان کو بیان کیا جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اختیار کردہ اور ترک کردہ یا پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں طریقوں کو یکے بعد دیگرے بیان کیا جاتا ہے تاکہ کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔

اس خصوص میں جو بات یاد رکھنی ہے وہ یہ کہ جب کبھی یہ کہا جائے گا کہ اس چیز کو اختیار کیا گیا ہے تو اس کا تلازم ذہنی یہی ہوگا کہ دوسری چیز کو ترک کر دیا گیا ہے۔ اور اسی طرح لفظ ترک کہا جائے گا تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ دوسری چیز کا حصول مقصود ہونے کی بناء پر اس کو ترک کیا جارہا ہے۔ یہ ایسی صاف اور اتنی سیدھی بات ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں اس کے بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ جن چیزوں کی ہمارے پاس اہمیت ہوتی ہے ان کو اختیار کیا جاتا ہے اور جو چیزیں ہمارے پاس وقیع نہیں ہوتیں یا نسبتاً کم وقعت رکھتی ہیں تو ان کو ترک کر دیا جاتا ہے۔

جن لوگوں کی نظر میں دولت کمانا اہم مسئلہ بنا رہتا ہے وہ اسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں بیان کردہ حلت و حرمت کے احکام، اخلاقی اقدار کا لحاظ، سماجی پابندیوں کی بندش، شخصی کردار کا پاس، رحم و کرم کے جذبات آرام کا خیال، صحت کی فکر، فرائض کے ترک ہونے کا احساس غرض کہ ہر اس شئی کو جو اس کی راہ میں رکاوٹ بنتی نظر آتی ہے ترک کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بر خلاف جن کی نظر میں خوشنودی خدا ہوتی ہے۔ وہ فقط ان اصول و احکام کو اختیار کرتے ہیں جن کے کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ان کے سوا باقی چیزوں کو خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ، پُرکشش اور آرام دہ کیوں نہ ہوں ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتے۔ اعتراض اور تنقید کون نہیں کرتا۔ تنقید بجا بھی ہوتی ہے اور بے جا بھی، اعتراض کرنے والے ہر کس و ناکس سبھی ہوتے ہیں لیکن جو شخصیت اہمیت کی حامل ہوتی ہے اسی کے اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے۔ باقی لوگ جن کا کوئی وزن یا اثر نہیں ہوتا انہیں بکواس کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان کا اعتراض در خور اعتنا نہیں ہوتا۔

پھر شخصیتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کونسی بات اہمیت رکھتی ہے اور کونسی نہیں۔ ایک قابل شخص سے بھی اگر بے معنی تنقید یا غیر صالح اعتراض وارد ہو تو ان سنا کر دیا جاتا ہے اور جواب دینے کی زحمت مول نہیں لی جاتی۔ اس کے بر خلاف جو بات واقعی وقیع ہو البتہ اس کا مدلل جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پس یہہ ہر شخص کا اپنا نقطہ نظر ہے کہ وہ کس کو اختیار کرے یا کس کو ترک کرے۔ لیکن اس اختیار و ترک کی کشمکش کے نتیجے میں جو پہلو سامنے آتا ہے اس سے دل کے

اندر پرورش پانے والے جذبات کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگتی۔ یعنی کون کیا اختیار کر رہا ہے اور کیوں؟ اور کون کیا ترک کر رہا ہے اور کس لئے؟؟ انسان کی عقل سلیم کا فرض یہی ہے کہ ہر شئی کی قیمت کا صحیح اندازہ لگائے۔ یہہ نہیں کہ کھوٹی اور چمکتی چیز کے لئے اپنی عمر بھر کا سرمایا لگادے۔ اور آخر میں کف افسوس ملتا بیٹھ جائے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ترک کی قیمت کیا ہے؟ ہم نے اوپر جو بحث کی ہے اس سے بآسانی یہہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مطلق ترک کی کوئی قیمت نہیں ہے اس لئے کہ مطلق ترک کا جذبہ تو صرف حالتِ جنون میں بیدار ہوتا ہے۔ مجنون ہی کسی مقصد کے بغیر کسی چیز کو ترک کر دیتا ہے اس ترک کی نہ دین میں کوئی اہمیت ہے نہ عقل کے پاس اور اس قسم کا ترک ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا موضوع تو وہ ''ترک'' ہے جس کے مقابلے میں ''اختیار'' ہے۔

اس اعتبار سے ترک کی قیمت اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتی جب تک اختیار کردہ شئی کی قیمت معلوم نہ ہو جائے۔ اختیار کی جانے والی چیز اگر اعلیٰ ہو گی تو ترک کی قیمت بھی اعلیٰ ہو گی۔ اور اگر اختیار کی جانیوالی چیز ادنیٰ ہو گی تو ترک بھی ادنیٰ درجہ کا ہو گا۔ پھر انسان کو مختلف منازل کے پیش نظر کئی ایک ترک سے واسطہ پڑے گا پہلے جس چیز کے حصول کی خاطر ایک چیز کو ترک کیا گیا تھا۔ اس چیز کے حاصل ہو جانے کے بعد اس سے اعلیٰ چیز کے حصول کی خواہش اس حاصل کردہ چیز کو بھی ترک کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔

ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک سے یہی مقصود ہے۔ یعنی عقبیٰ کی خاطر دنیا ترک کی جاتی ہے۔ پھر فکر و نظر کی مزید ترقی کے پیشِ نظر طلبِ مولیٰ کی خاطر عقبیٰ کو بھی ترک کیا جاتا ہے، اس سے آگے کی منزل بے اختیاری کی ہے جس کی ترکِ ترک سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اس مختصر میں اس کے تفاصیل کی گنجائش نہیں۔ ع، سفینہ چاہئیے اس بحر بیکراں کے لئے۔ نیز غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ترک ہی سب سے اعلیٰ و افضل مقام ہے۔ اس مقام پر جس کا قدم جس قدر جما رہے گا اسی قدر اس کا درجہ بلند ہو گا۔ اور جو مقام ترک سے دور ہوتا جائیگا وہ بالآخر گرتے گرتے مقامِ انسانیت سے بھی گر جائیگا۔ چنانچہ عبادات پر بھی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل عبادات میں بھی جو چیز بنیادی طور پر کارفرما ہے وہ ترک ہے ہر عبادت میں حصول مقصد کے پیشِ نظر کسی نہ کسی ترک کا ارتکاب فرض گردانا گیا ہے۔ بلکہ مزید غور کرنے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً اور اصولاً ترک ہی مطلوب اور مقصود ہوتا ہے۔ مکمل ترک کرنے کے بعد ثمرات کا حصول تو یقینی ہی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم نماز کو ہی لیں تو بآسانی یہہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ نماز اگرچہ تعبد، فروتنی خاکساری، عاجزی کے اظہار کا بہترین طریقہ ہے۔ لیکن اس کی ہیئت یہہ بتلاتی ہے کہ نہ صرف اعضاء و جوارح بلکہ دل و دماغ کو بھی ''ماسوی اللہ''

سے ہٹا کر دربار خداوندی میں حاضر ہونے کا نام نماز ہے۔ گویا کانوں تک دونوں ہاتھوں کا اٹھانا بھی غیر اللہ سے ہاتھ دھونا ہوا۔ اور اس کے بعد ساری کیفیت یعنی تسبیح ،تہلیل ، تکبیرات ، قرائت تشہد درود وغیرہ کا مقصد زبان کو ذکر اللہ میں مصروف رکھنا ہے۔ اس سے بڑھ کر خشوع و خضوع کو نماز کی جان کہنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ حالت نماز میں خیالات اور جذبات کو بھی غیر اللہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔ مطلب یہہ کہ ''ترک خیال غیر اللہ'' ضروری ہے (کیوں کہ خشوع و خضوع کی بہترین تفسیر یہی ہو سکتی ہے) تب کہیں چل کر دربار الہیٰ میں حضوری نصیب ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ کہ تکبیر تحریمہ کے بعد وہ تمام چیزیں جو خارج از نماز اوقات میں حلال ہوتی ہیں ایک مصلّی کے حق میں حرام قرار دی گئی ہے۔ مثلاً کھانا، پینا، سلام کرنا یا جواب دینا، کسی سے بات کرنا حتیٰ کہ اِدھر اُدھر دیکھنا بلکہ غیر اللہ کا خیال کرنا بھی منافی جانِ نماز سمجھا گیا ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نماز ''ترک فعل برائے غیر اللہ'' اور ترک خیال غیر اللہ'' سے معبر ہے روزہ کے معنی ہی کھانا، پینا اور جماع کا طلوع صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت کے ساتھ ترک کرنے کے ہیں۔ پھر روزے کے حقیقی مفہوم میں محققین نے وسعت پیدا کرتے ہوئے کہا کہ ہر عضو کا بھی روزہ ہوتا ہے، یعنی ہر عضو کو چاہیئے کہ وہ بھی ترک کے مقام پر آجائے۔ یعنی ہاتھ دست درازی ترک کر دے۔ پیر غلط مقام پر جانا ترک کر دے۔ آنکھ غیر حق کو دیکھنا ترک کر دے، زبان غیر حق (جھوٹ۔ تہمت۔ بدزبانی) کہنا ترک کر دے۔ کان غیر حق سننا ترک کر دے۔ دماغ غیر حق سوچنا ترک کر دے۔ اور دل خلاف حق چاہنا ترک کر دے۔ تا کہ انسان سر تا پا مظہر حق بن جائے۔ اور اس کے لئے یہہ ضروری ہے کہ ترک غیر حق کیا جائے۔

زکات میں بھی یہی ترک کا جذبہ کار فرما ہے۔ زکات مال کی محبت ترک کرنے کے مطالبہ کا نام ہے۔ حج میں تو ''جذبہٗ ترک'' اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ اس فرض کی تکمیل کی خاطر انسان کو کئی چیزیں ترک کرنی پڑتی ہیں (۱) ترک حُب مال (۲) ترک وطن (۳) ترک اہل و عیال (۴) ترک آرام و آسائش (۵) ترک کاروبار و مشاغل دنیوی (۶) ترک لباس (زینت) (۷) ترک لذت (شکار) وغیرہ۔ اگر یہہ کہا جائے کہ جہاد سب عبادتوں سے افضل ہے۔ بلکہ ان سب عبادتوں کا مقصد بھی جہاد کیلئے انسان کو تیار کرنا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ جہاد کو بھی مقام ترک پر سے گذرے بغیر چارہ نہیں، حج کی طرح جہاد میں بھی انسان کو کئی ترک سے سابقہ پڑتا ہے۔ بلکہ اس میں ترکِ جان کا مطالبہ تو سر پر سوار ہی رہتا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ضمناً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ فرائض کا منشاء انسان کو بعض مرغوب چیزوں کے ترک کا پابند بنانا ہے۔ پس ان عبادات کی ادائی کے وقت واقعی اگر ان اشیاء کے ترک کا مفہوم اپنے صحیح معنیٰ میں صادق آتا ہو تو ایسی

عبادت میں لذت بھی ملتی ہے اور اس کے مقبول ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا۔ لیکن اگر عبادات کی ادائی کے وقت بھی ان اشیاء کی محبت دل میں جاگزیں رہے جن کا ترک ہی باعث فرضیت بنا تھا تو نہ اس قسم کی عبادت میں لذت ملے گی اور نہ اس کی قبولیت کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ایسی عبادت پر عبادت سے کہیں زیادہ عادت کا اطلاق صحیح ہو گا۔

مثلاً ایک نماز تو وہ ہے جس میں مصلی کے تلوے سے اندر دھنسا ہوا تیر نکالا جارہا ہے لیکن مصلی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اور ایک نماز وہ ہے جس میں مصلی کو بھولی ہوئی ساری باتیں یاد آتی ہوں۔ نماز زاہداں سجدہ سجود است :: نماز عاشقاں ترک وجود است

اسی طرح روزہ میں اگر ترک کا وہ مفہوم صحیح معنٰی میں صادق نہ آئے تو ایسے روزہ دار میں اور ایک بھوکے شخص میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ اسی طرح زکات اور حج کے فرائض کی ادائی کے وقت ترک حُبِّ مال نہ ہو بلکہ نام کی شہرت اور سیر و تفریح پیش نظر رہے تو اگرچہ فرضیت ساقط ہو جائے گی لیکن جن فوائد کا حصول اس قسم کی عبادتوں سے مراد ہے وہ حاصل نہ ہو سکیں گے۔

خلاصۂ بحث یہ کہ ترک کو عبادات بلکہ فرائض میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ بہ نظر غائر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ترک ہی جانِ عبادت ہے اس سلسلے میں مزید غور و خوض سے "نظریہ ترک" ایک ایسے انتہائی اعلیٰ اور برتر مقام پر نظر آتا ہے کہ اس کے بعد مزید کسی بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی اب تک عبادات اور ان میں بھی فرائض کی تحقیق سے اس امر کا پتہ چلا تھا کہ ان کی اصل غرض بعض اشیاء کا ترک ہے (وہ اشیاء جو موجب غفلت ہوتی ہیں)

لیکن اس سے ایک قدم اور آگے بڑھکر جب ہم مسئلہ توحید کو لیتے ہیں تو وہاں بھی نظریہ ترک ہی کارفرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ دین کی بنیاد توحید ہے، اور توحید کے اظہار کیلئے جو کلمہ ہر دور میں فرض گردانا گیا ہے وہ بھی نظریہ ترک سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ پہلے ترک کا اظہار ہے پھر اختیار ہے، پہلے نفی ہے اور بعد میں اثبات۔ کلمہ توحید، رسالت و نبوت کی تاریخ گواہ ہے، ہر دور میں لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ رہا۔ لَا إِلٰهَ کے ذریعہ معبودان باطلہ کو ترک کیا گیا اور إِلَّا اللهُ کے ذریعہ معبود برحق کا اثبات کیا گیا۔

ہر زمانے میں رسول و نبی کے مبعوث کئے جانے کی اصل غرض یہی تھی کہ لوگ جو حقیقی معبود کو چھوڑ کر یا اس کو بھول کر دیگر معبودان باطلہ کی بڑائی مانتے، ان کے سامنے جھکتے اور ان سے عبادت کا رشتہ قائم کرتے تھے ان کو یہہ ذہن نشین کرنا تھا کہ طاعت اور عبادت کے لائق وہ معبود برحق ہے جو خالق کائنات ہے۔ اسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا چاہئیے اور اسی کے آستانہ مقدس پر جبین نیاز کو رکھنا چاہئیے۔ اس کیلئے یہہ ضروری تھا کہ انسانی دل و دماغ پر پہلے ہی سے جن معبودوں کی

عزت و عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اس کو دور کیا جائے، خدا کے سوا جملہ معبود ان باطلہ کی نفی کی جائے اور اس کے بعد إِلَّا اللہ کا نقش ان کے دل پر قائم کیا جائے۔

ورنہ جو لوگ ۳۶۰ بتوں کو پوجتے تھے اگر ان کے لئے ایک اور إلٰهَ (اللہ) کا اضافہ ہو جاتا تو اس کی بھی پرستش کر لینا یا اس سے منت مراد مانگ لینا کوئی مشکل کام تو نہیں تھا۔ مگر رسالت کا کام معبودِ ان باطلہ کے ساتھ معبودِ برحق کا اثبات مطلوب نہیں تھا۔ توحید کا منشاء تو معبودِ ان باطلہ کی تردید اور لَا إِلٰهَ کا اثبات تھا کفار کی جانب سے بھی اس کلمہ کی مدافعت نے جو بدترین قسم کی مخالفت کا روپ دھارا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام قبول کرنے کے لئے آباواجداد کے زمانے سے اُس وقت تک جن بتوں کی وہ پرستش کرتے چلے آرہے تھے ان کو ترک کرنا لازمی تھا۔ اسی لئے لَا إِلٰهَ کو کلمہ کا جزء اول قرار دیا گیا تھا اور إِلَّا اللہ اس کا جزء ثانی تھا۔

نفی کے بغیر، فقط اثبات سے توحید کا مفہوم پورا نہیں ہوتا۔ غیر کی نفی کے ساتھ جب حق کا اثبات کیا جاتا ہے تو وہ توحید کامل بھی ہوتی ہے اور خالص بھی۔ خلاصہ یہ کہ کلمۂ توحید بھی۔ جس میں خدائے وحدہٗ لاشریک کا اقرار مطلوب ہے۔ نظریۂ ترک سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ پہلے غیر کا ترک ضروری ہے تاکہ إِلَّا اللہ کا نقش اچھی طرح قائم ودائم رہ سکے۔

دنیا سے متعلق مومن کا نقطۂ نظر: اب تک جو کچھ بحث ہوئی اس سے ناظرین کو یہہ معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہی ہوگی کہ دنیا سے متعلق قرآنی نقطہ نظر کیا ہے؟ حیاتِ دنیا کسے کہتے ہیں۔ متاع حیات دنیا کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ان کی کیا حیثیت بیان کی گئی ہے۔ ان احکام کی موجودگی میں ایک مومن کا ان کے متعلق نقطۂ نظر کیا ہونا چاہئیے۔ بلکہ صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ کیا قرآن میں حیات دنیا اور متاع حیات دنیا کو اختیار کرنے، اس سے راضی ہونے یا اس پر مطمئن ہو رہنے کا حکم دیا گیا ہے یا ان کے پیچھے پڑنے والوں، ان کو ترجیح دینے والوں یا ان کی طلب کرنے والوں کے حق میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ وہ وعیدیں جو صرف کفار کیلئے مخصوص ہیں۔ نیز نظریہ ترک سے متعلق جو کچھ بحث کی گئی ہے اس سے بھی ناظرین نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ترک خواہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو کتنا اہم ہے، عبادات میں اس کا کیا مقام ہے اور خود مسئلہ توحید میں اس کی کتنی قوت ہے۔ ترک سے متعلق جو کچھ بحث کی گئی ہے اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ لوگ جو عام طور پر فلسفۂ ترک سے بے خبری کی بناء پر لفظ ترک دنیا پر ایسے اچھل پڑتے ہیں جیسے کسی کی گود میں بے خبری کے عالم میں اچانک سانپ گر گیا ہو۔ ان کے کان نہ صرف اس سے مانوس ہو جائیں بلکہ اس کا مقام اس کی اہمیت اور اس کا فلسفہ بھی اچھی طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے۔ تاکہ اگر کہیں اور کبھی لفظ ترک دنیا ان کی سماعت میں آئے تو بجائے اچھلنے کے اس پر ٹھنڈے دل

سے غور کریں۔

اگر ایسانہ کیا جاتا تو ڈر تھا کہ لوگ فقط ترک دنیا کا نام سن کر ہی چونک جاتے اور جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اس کو رہبانیت کا رنگ دینے لگتے، اور اپنے طور پر جو نظریہ قائم کر لیا گیا ہے کہ دین اسلام میں ترک دنیا کی کوئی تعلیم نہیں ہے، اسی پر اکتفا کر لیا جاتا اور اس کے متعلق مزید کسی گفتگو کو سننے اور سمجھنے کی زحمت بھی مول نہ لی جاتی۔ دنیا اور ترک کی علٰحدہ علٰحدہ تشریح کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حسب ذیل امور پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ دنیا سے متعلق مومن کو کیا نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہئیے؟ نیز جو حکم ملتاہے وہ احکامِ شریعت میں سے کس نوعیت کا حکم ہے؟ یعنی فرض وواجب کا حکم ہے یا مستحب ومباح کا؟

خود آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ ٔکرام کی سیرت سے میں اس کے متعلق کیا نقوش ملتے ہیں؟ دنیا کو اختیار کیا جاسکتاہے تو کس حد تک؟ اور اگر ترک کا حکم ملتاہے تو اس کے معنیٰ کیاہیں؟ کیا ایسی تعلیم عیسائیوں کی رہبانیت اور جوگیوں کے بن باس کے مماثل قرار دی جائے گی؟ یا اس کا مفہوم کچھ اور ہو گا؟؟؟

جب ہم یہ معلوم کرنے کے لئے، کہ دنیا سے متعلق خالق دنیا کے ارشادات و فرامین کیا ہیں، کلام اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کی بیسیوں آیتیں ہمیں ایسی ملتی ہیں جن کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ دنیا دار الامتحان ہے۔ متاع حیات دنیا قلیل ہے دھوکے کی ٹٹی ہے، آخرت کے مقابلے میں حیات دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ دنیا کا طالب اور مرید ہمیشہ ہدایت سے محروم رہتاہے۔ اس کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ اور آخر کار اس کا ٹھکانہ دوزخ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ذیل میں ہم قرآن کی چند آیتیں جو مندرجہ بالا احکام کی حامل ہیں، درج کرتے ہیں۔ (۱) دنیا دار الامتحان ہے۔ قرآن شریف میں جہاں کہیں کسی کو دنیا کے دیئے جانے کا ذکر ہے۔ وہاں اس امر پر ضرور روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ تم کس طرزِ عمل کو اپنا تے ہو۔ مثلاً قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿الأعراف:۱۲۹﴾ قریب ہے کہ اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے پھر یہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ (۲) ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿یونس:۱۴﴾۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو زمین کا وارث بنایا تا کہ ہم دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔

دنیا سے متعلق خالق دنیا کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے بعد جب ہم حیات دنیا کی حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو درج ذیل آیتیں ملتی ہیں۔

(۱) إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ

حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ﴿یونس:۲۴﴾ ترجمہ: دنیا کی زندگی کی مثال اس بارش کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان سے برسایا پس اس سے زمین کی پیداوار جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں اچھی طرح اُگ گئی یہاں تک کہ جب زمین (باعتبار پیداوار) اپنی بہار پر تھی اور سرسبز ہو چکی تھی اور اس کے مالک یہ سمجھ رہے تھے کہ اس سے فائدہ اُٹھانے پر ہم قادر ہیں یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اُسے ایسا غارت کر دیا گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔

اِس آیت شریفہ میں دنیا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی کو جس خوبصورت عام فہم دل نشین انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔(۲) وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ﴿یونس:۴۵﴾ ترجمہ: جس روز اللہ ان کو اکھٹا کرے گا دنیا کی زندگی انہیں یوں محسوس ہو گی جیسے یہ گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کیلئے ٹھہرے تھے۔

اب رہی یہ بات کہ حیاتِ دنیا کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے؟ تو قرآن کی اس آیت سے یہہ تشنگی بھی دور ہو جاتی ہے۔

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿الحدید:۲۰﴾ ترجمہ: جان لو کہ حیات دنیوی کھیل تماشا ظاہری طمراق۔ آپس میں ایکدوسرے پر فخر کرنا، اموال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے خواستگار ہونا ہے۔ حیات دنیا کی مثال برسات کی سی ہے کہ برستے ہی کھیتی لہلہانے لگتی ہے اور کافر اس کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ پک کر زرد ہو جاتی ہے۔ پھر اس کو روندا جاتا ہے، آخرت میں اہل دنیا کو سخت عذاب اور مومنوں کو گناہوں کی معافی اور اللہ کی خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو نری دھوکے کی ٹٹی ہے۔

دنیا اور حیاتِ دنیا سے متعلق قرآنی آیات کی تنویر میں مع امثلہ مواد مل جانے کے بعد مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ متاع حیاتِ دنیا کے تعلق سے ارشادات باریٔ تعالٰی کو چشم تحقیق کا سرمہ بنائیں اس لئے کہ جیسا پچھلے صفحات پر بیان کیا گیا ہے کہ دنیا سے مراد یہی تین چیزیں مفہوم ہو سکتی ہیں (۱) نفس دنیا (۲) حیات دنیا اور (۳) متاع حیات دنیا۔ ان میں سے دو کے متعلق مجملاً بیان گذر چکا، اب ذیل میں تیسری شق کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے۔

کلام مجید میں متاع حیات دنیا کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ

وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ﴿آل عمران:۱۴﴾ ترجمہ: لوگوں کیلئے عورتوں، اوراولاد، سونے کے خزانوں، چاندی کے ڈھیروں عمدہ عمدہ گھوڑوں مویشیوں اور کھیتیوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے۔ حالانکہ یہہ تو دنیا کی زندگی کے چند روزہ مزے ہیں۔ اچھاٹھکانہ تو اللہ کے ہی پاس ہے۔

اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہوا ہے ان کا نام قرآن نے متاعِ حیاتِ دنیار کھا ہے۔ اب دیکھنا یہہ ہے کہ قرآنی میزان میں اس کی قدر وقیمت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے۔(۱) أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿التوبة:۳۸﴾ ترجمہ: کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دینوی زندگی کو پسند کر لیا ہے تو سن لو کہ دنیوی زندگی کا یہ سازو سامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔

(۲) وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا إِنَّمَا عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿النحل:۹۵﴾ ترجمہ: اللہ کے عہد کو تھوڑی سی قیمت کے بدلے مت بیچ ڈالو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہونے والا ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔(۳) وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِيالْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ﴿الرعد:۲۶﴾ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ﴿النساء:۷۷﴾ ترجمہ: دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں متاع قلیل کے سوا کچھ نہیں۔ کہہ دو کہ دنیا کا متاع قلیل ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن نے متاع دنیا کو جس میں عورتیں، اولاد اصناف اموال کی ڈھیریں شامل ہیں قلیل کے نام سے یاد کیا ہے۔ اگر اس ''قلیل'' کی بھی قیمت کا اندازہ لگانے کی غرض سے قرآن کھولیں تو، ہمیں یہاں بھی مایوسی کا سامنا کرنا نہ پڑیگا۔

وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ﴿الرعد:۱۸﴾ ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول نہیں کی اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہو جائیں اور اتنی اور فراہم کر لیں تو خدا کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سب کو فدیہ میں دیدینے پر تیار ہو جائیں گے۔ مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ نہ صرف خدا کے پاس دنیا اور متاع دنیا قلیل ہے بلکہ خود انسان پر ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ خود اسکی نظروں میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔ اگر چہ یہہ معاملہ آخرت سے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس جیسی مثالیں بہت سی دنیا میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ کسی شخص کی جان یا آبرو خطرہ میں پڑ جاتی ہے تو وہ اپنا سب کچھ دے کر بھی اس کی حفاظت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

متاع دنیا کی قیمت ''ایک کٹورہ پانی'': اسی ضمن کا یہہ واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہارون رشید ایک

مرتبہ شکار کی غرض سے نکلے اور شکار کی تلاش میں بہت دور پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے۔ اسی دوران انہیں شدت کی پیاس محسوس ہوئی۔ مگر آس پاس کہیں پانی دکھائی نہیں دیا۔ اُدھر پیاس کی شدت سے امیر المومنین کا حال برا ہو رہا تھا۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈھنے کے بعد پانی کا ایک کٹورا خدمت میں پیش کیا گیا۔ ہارون الرشید پینے ہی والے تھے کہ عبداللہ بن مبارک (امیر المومنین فی الحدیث) نے انہیں ٹوک دیا اور پوچھا کہ آپ کی پیاس کا کیا عالم ہے؟ جواب دیا کہ مجھے اس شدت کی پیاس ہے کہ اگر اس ایک کٹورے پانی کی قیمت کے بطور مجھ سے کوئی آدھی سلطنت مانگے تو میں دینے کو تیار ہوں۔

عبداللہ بن مبارک نے فرمایا آپ پی لو۔ پانی پی لینے کے بعد پھر فرمایا اگر یہہ ایک کٹورا پانی جو ابھی آپ نے پیا ہے اس کی نکاسی قدرتی اصول پر جیسے ہونی چاہئیے نہ ہو بلکہ پانی پیٹ میں ہی رہ جائے تو اس کو نکالنے کے لئے آپ کیا کریں گے۔ جواب دیا بقیہ آدھی سلطنت دے ڈالوں گا۔ اس پر عبداللہ بن مبارک نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی اتنی بڑی اتنی لمبی اتنی رعب وداب کی سلطنت کی قیمت پانی کا ایک کٹورا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کے باوجود اگر کوئی دین و آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتا یا اس کو اختیار کرتا ہے تو ظاہر ہے یہ اس کی حماقت بے بصری اور کوتاہ نظری بھی ہے اور خدا کی ناخوشی کے سبب عذاب شدید کو علانیہ دعوت بھی۔ ہم ذیل میں وہ آیتیں درج کرتے ہیں جو حیاتِ دنیا یا متاع حیات دنیا کے طالب یا مرید یا اسی میں مشغول ہونے اور اس سے فرحت پانے یا مطمئن ہونے والے کے بارے میں وارد ہیں۔ (۱) مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿ھود:۱۵،۱۶﴾ ترجمہ: جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کے طالب ہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ہم ان کو یہیں دیدیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کیلئے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا سب ملیا میٹ ہو گیا اور ان کا کیا دھرا محض باطل ہے۔

(۲) مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ﴿الاسراء:۱۸﴾ ترجمہ: جو کوئی عاجلہ (دنیا) کا خواہش مند ہو تو اُسے ہم یہیں دیدیتے ہیں۔ جو دینا چاہیں اور جسے دینا چاہیں پھر اسکی قسمت میں جہنم لکھدیتے ہیں جس میں وہ ملامت زدہ اور محروم رحمت ہو کر داخل ہوگا۔

(۳) ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّـهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿النحل:۱۰۷﴾

ترجمہ: یہہ اس لئے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا۔ اور اللہ ایسے لوگوں کو راہِ نجات نہیں

دکھاتا۔

(۴)إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ أُولَئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴿یونس:۸،۷﴾ ترجمہ: جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہوگئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ یہ سبب ان کے کرتوت کے۔

(۵) وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا أُولَـٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ﴿ابراھیم:۳،۲﴾ ترجمہ: اور سخت تباہ کن سزا ہے قبول حق سے انکار کرنے والوں کے لئے جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں ٹیڑھا پن ڈھونڈتے ہیں۔ یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

(٦) فَأَمَّا مَن طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴿النازعات:۳۹،۳۸،۳۷﴾ ترجمہ: جس نے سرکشی کی اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔اِس سے بڑھ کر دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی بے حقیقتی اور مرید دنیا کی اصل ہدایت سے محرومی اور طالب متاع دنیا کی آخرت میں بے سروسامانی سے متعلق اور کیا کہا جاسکتا تھا۔

مندرجہ بالا آیتوں سے یہ بات تو اظہر من الشمس ہوگئی کہ طالب دنیا کا ٹھکانہ سوائے جہنم کے اور کچھ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جہنم ٹھکانا کسی مومن کا تو نہیں ہوسکتا!!! فاعتبروا یا اولی الابصار۔

نفس مسئلہ: نیز یہ اصول مسلم ہے کہ قرآن میں جن اعمال وعقائد کی سزا جہنم قرار دی گئی ہے ان سے بچنا ضروری اور لازمی ہے بلکہ شریعت کی اصطلاح میں فرض ہے۔ اسی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ قرآن جس طرز عمل وعقیدہ کی سزاء جہنم قرار دیتا ہے اس کا ترک فرض ہے تو یہہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔

اسی طرح جب "طالب دنیا" "مرید دنیا" "مشغول فی الدنیا" "راضی بالدنیا" اور "مطمئن بالدنیا"، کی سزا جہنم قرار دی گئی ہے۔ تو اس سے بچنا واجب ہوا (یا اس کا ترک فرض ہوا) ترک کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ دنیا سے وابستگی اس طور پر ہو کہ اس پر مندرجہ بالا احکام کا اطلاق نہ ہوسکے۔ اس نقطۂ نظر کی بناء پر یہہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے لئے یہہ ضروری ہے کہ وہ عملاً ہی نہیں ارادۃً بھی طلب دنیا، ارادۂ دنیا، اشتغال بالدنیا، رضا بالدنیا اور اطمنان بالدنیا سے پرہیز کرے۔ اور اس کو ترک

کر دے۔ پس قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں بداھتہً اس امر کا علم ہوتا ہے کہ دنیا سے متعلق قرآن میں "ترک" کی تعلیم دی گئی ہے نہ کہ "طلب و اختیار کی"۔ و ذَلِك ما كُنَّا نبغي۔ اب اگر ذہن میں یہہ بات آئے کہ دنیوی زندگی اور اس کا طمطراق خوش حالی اور فارغ البالی اور اللہ کی نعمتیں ہیں۔ اموال و اولاد بھی اللہ کی ہی عطاء ہے۔ پھر ان چیزوں سے اعراض کرنا کیا نعمت خداوندی سے اعراض کے مترادف نہ ہوگا۔ اللہ کے فضل و عطاء کو رد کرنے کے مماثل نہ ہوگا۔ حالانکہ اس نے تاکیداً کہا ہے "اس سے اس کے فضل عظیم کو مانگا کرو"۔ ہم کہتے ہیں کہ یہہ سب چیزیں اللہ ہی کی نعمتیں ہیں۔ اس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ لیکن ان نعمتوں کے سلسلے میں چند باتیں خصوصی طور پر قابلِ غور معلوم ہوتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ نعمتیں آیا عمومی ہیں یا خصوصی' دوسرے یہہ کہ یہہ خود مقصود بالذات ہیں کہ نہیں۔ تیسرے یہہ کہ جس جماعت یا جس فرد کو یہہ نعمتیں عطا کی گئی ہیں اس کی وجہ اللہ کی ان سے خوشنودی ہے یا اس کی وجہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔

قرآن شریف کے مطالعہ سے اور ہمارے روز مرہ تجربہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دنیوی نعمتیں عمومی نعمتیں ہیں۔ یعنی ان نعمتوں سے سر فراز کئے جانے کیلئے مومن و کافر میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ بلکہ دیکھا یہہ گیا کہ کفار کو ہی اس قسم کی نعمتیں بہ نسبت مومنوں کے زیادہ دی جاتی رہیں۔ اور آج تک بھی یہی حال ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان چیزوں کو مطلقاً نعمت کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر واقعتہً نعمت ہی ہوتیں تو کبھی اللہ تعالیٰ کافروں کو ان سے نہ نوازتا۔ لیکن جب معاملہ ایسا نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہہ مطلق نعمت نہیں ہیں۔ اور نعمت سے زیادہ طاقت ور کوئی اور پہلو اِن میں مضمر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلو امتحان اور آزمائش کا ہے۔

یعنی ان نعمتوں کے عطا کرنے سے خدا کا مقصد یہہ جاننا ہوتا ہے کہ اس کے پانے والے کس طرزِ عمل اور طرزِ عقیدہ کو اپناتے ہیں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ انسان تنگی میں تو خدا کو پکارتا ہے' انسانیت کا لحاظ کرتا ہے، ہمدردی و غمگساری کے جذبات کا اظہار کرتا ہے لیکن جوں ہی تنگدستی خوش حالی سے بدل جاتی ہے اس کے سارے صفات بھی اکثر بدل جاتے ہیں اب وہ اپنی قوتِ بازو پر ناز کرتا ہے، انسانیت سے اس کو دور کا بھی تعلق نہیں رہتا۔ فقط اپنے مفادات سے ہمدردی کے علاوہ وہ کسی اور کی ہمدردی کا قائل ہی نظر نہیں آتا۔ اسی حقیقت کو قرآن میں اسطرح پیش کیا گیا ہے۔ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴿التغابن: ۱۵﴾ بے شک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش ہے۔ دوسرے مقام پر تنبیہ کی گئی ہے لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّـهِ ﴿المنافقون: ۹﴾ یعنی تمہاری اولاد اور اموال تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔ پس معلوم ہوا کہ

اس قسم کی دنیوی نعمتیں عطا کرنے کا مقصود آزمائش ہے پھر جو چیز فتنہ اور آزمائش کا سبب ہوا اس کو ""مطلق نعمت" کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ امتحان میں رحمت و زحمت کامیابی اور ناکامی دونوں پہلو امکانی ہوتے ہیں۔ یعنی اگر ان نعمتوں پر انسان کی نظر جائے، اِن سے محبت کرنے کے بجائے "اس" سے محبت پیدا ہو تو البتہ ایسی صورت میں ان چیزوں پر نعمت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

اور اگر معاملہ اس کے بر عکس ہو تو کیا انجام کے اعتبار سے بھی اس پر نعمت کا اطلاق کیا جا سکے گا۔ یہہ بات اور ہے کہ کہنے والے ہر حال میں نعمت ہی تصور کر لیں۔ لیکن قرآن کی اصطلاح میں دنیوی نعمتوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکیگا۔ ایک تو "متاع حَسَن" اور دوسرے کو "متاع غرور"۔ اِس کے علاوہ یہہ قرآنی آیت تو اس باب میں قولِ فیصل ہے۔ وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّـهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿التوبة:٨٥﴾ ترجمہ: ان کی مالداری اور کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ مال و اولاد کے ذریعہ ان کو اسی دنیا میں سزا دے۔ اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

اِسی طرح یہ آیت قرآنی بھی قابلِ غور ہے وَعَدَ اللَّـهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُم بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُم بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا أُولَـٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿التوبة:٦٨﴾ ترجمہ: منافق مردوں، عورتوں اور کافروں سے اللہ نے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہی ان کے لئے کافی ہے ان پر اللہ کی لعنت ہے، اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے تم لوگوں کے طور طریق تمہارے پیش رووں کے مانند ہیں جو تم سے زیادہ قوت والے اور تم سے زیادہ مال و دولت والے تھے پھر انہوں نے دنیا میں اپنے مزے لوٹ لئے تم بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹ لو جس طرح انہوں نے لوٹے تھے۔ اور ویسی ہی بحثوں میں الجھے رہو جیسی بحثوں میں وہ الجھے ہوئے تھے، آخر کار دنیا اور آخرت میں ان کا کیا دھرا سب ضائع ہو گیا اور وہی لوگ اب خسارے میں ہیں۔

مندرجہ بالا آیات قرآنی سے حسب ذیل امور مفہوم ہوتے ہیں۔ (۱) دنیوی نعمتیں دو قسم کی ہیں (ا) متاع حسن و متاع غرور (۲) ان کے عطا کئے جانے میں اعتقادی یا عملی حسن و قبح کی تمیز نہیں کی جاتی (۳) ان سے سر فراز ہونے والے مقبول بار گاہِ خداوندی نہیں سمجھے جاتے (۴) ان کے عطا کئے جانے کا واحد مقصد ان کی آزمائش اور امتحان ہوا کرتا ہے۔

ان امور سے آگاہی کے بعد اب اس ذہنی سوال کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ عقل سلیم یہہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان

کو چاہیئے کہ وہ اپنی حیات دنیوی کے کل دور کو خواہ وہ تنگدستی میں گذرے یا خوش حالی میں، آزمائشی دور سمجھے۔ اور کوشش اس بات کی کرے کہ وہ کسی حالت میں حدود اللہ سے متجاوز نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ یہی عین منشاء ایزدی ہے اور جس شخص کو یہ بصیرت حاصل ہو جائے وہ یقینا "فضل عظیم" "خیر کثیر" اور "نعمت عظمیٰ" کا مالک ہے۔ وَمَن یُؤتَ الحکمۃَ فقد اوتیَ خیراً کثیراً۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی کسی آیت میں طلب دنیا یا اختیار دنیا کی ترغیب نہیں دی گئی ہے بلکہ اس پر آخرت کو ترجیح دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس کے برخلاف عقیدہ رکھنے اور عمل کرنے والے کو جہنم اور عذاب شدید کی وعید سنائی گئی ہے۔ مزید غور کرنے سے یہہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہہ حکم صرف آخری الہامی کتاب قرآن ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر ہدایت منزلہ میں خواہ وہ کتب کی شکل میں ہو یا صحیفوں کی صورت میں یہہ حکم پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے اور خوبی یہہ ہے کہ اگلے کتب سماوی وصحائف آسمانی میں اس حکم کے پائے جانے کی تصدیق خود قرآن سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ إِنَّ هَـٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ

﴿الأعلیٰ: ۱۹،۱۸،۱۷،۱۶﴾ ترجمہ: بلکہ تم حیات دنیوی کو اختیار کرتے ہو۔ حالانکہ اخروی زندگی بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی تحقیق یہ (حکم) اگلے صحیفوں میں بھی ہے۔ ابراہیم وموسیٰ کے صحیفوں میں۔

اس آیت سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو اختیار نہ کرنے کا حکم ہر نبی اور ہر رسول کی دعوت کا جزء لا ینفک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خلق عظیم کے کسی گوشہ سے ہمیں دنیا پرستی تو رہی ایک طرف دنیا طلبی کی بو کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ خلق عظیم کے دامن کا ہر گوشہ اس کے گرد غبار سے بھی پاک نظر آتا ہے۔ ورنہ آنحضرت اگر چاہتے تو کیا کچھ نہ کر سکتے تھے، اگر آپ چاہتے تو اس شان کی زندگی بسر کر سکتے تھے جس کے مقابلے میں قیصر وکسریٰ کی شاہانہ زندگی کے سارے ٹھاٹ باٹ، جو، اب ضرب المثل کی شکل اختیار کر لئے ہیں، ہیچ ہو کر رہ جاتے۔

نبوت سے پہلے اعلیٰ درجہ کا متدین تاجر، دعوت نبوت کے بعد مکہ میں تیرہ سال رہا۔ مگر کوئی بتا سکتا ہے کہ آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ حالانکہ اُس پُر فتن دور میں آپ کو کن کن چیزوں کی پیش کش نہیں کی گئی۔ پھر مدینہ جانے کے بعد آپ کی زندگی کا کیا عالم رہا۔ اکثر اوقات کھجور اور پانی پر زندگی بسر ہوئی۔ ایک ایک ہفتہ چولہوں میں آگ نہیں سلگتی تھی اور یہہ حال اس شخص کا ہے جو ایک طرف تو سلاطین اور شہنشاہوں کے نام اطاعت کے خطوط لکھتا ہے اور دوسری طرف خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا ہے۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴿البقرۃ:۲۰۱﴾، کے مفہوم کو آپ سے بڑھ کر اور کون سمجھ سکتا تھا؟ کیا آپ نے یہ دعا

نہیں کی ہوگی، کیا آپ سے بڑھ کر کوئی مستجاب الدعوات بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ایک تنگ حجرے میں وصال پانا اور اپنے ترکہ میں کچھ نہ چھوڑنا بلکہ جو کچھ چھوڑا اس کے بارے میں "نحن معاشر الانبیاء لا نرِث وَلاَ نورث ماترکناه صدقةٌ" فرمانا کس حکم کی تعمیل میں تھا۔

آج ہر شخص اپنی اپنی دنیا بنانے اور دنیا طلبی کے اپنے اختیار کردہ رویہ کو صحیح ثابت کرنے کی دھن میں اسی آیتِ شریفہ سے استدلال کرنے کی ڈھونڈی کوشش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جب قرآن میں دعا سکھلائی گئی ہے کہ تم دنیا کا حسنہ اپنے رب سے مانگو تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا نہ مانگیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دنیا ملنے کی صورت میں بہر حال یہہ امکان باقی رہتا ہے کہ نفس و شیطان ہم کو خدا کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے پر ورغلائے بغیر نہ رہیں گے۔ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ﴿یوسف:۵۳﴾۔ مگر رسول اللہ کے ہاں تو اس امکان کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لئے کہ آپ کے شیطان نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اب وہ نیک کام میں اعانت کے سوا کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ آپ کا نفس "نفس مطمئنہ" بن چکا تھا۔ جس کی طرف راست حق سے خطاب ہو رہا تھا۔ "ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیۃً۔ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

نفس و شیطان کی طرف سے کسی قسم کے خدشہ کے نہ ہونے کے باوجود آنحضرت نے دنیوی زندگی کو کیوں اختیار نہیں فرمایا، اسکی وجہ، باطنی نظروں میں جداگانہ سہی، لیکن ظاہری نظروں میں جو وجہ آسکتی ہے وہ یہ کہ اس طرح جینے سے آپ کا مقصد دوسروں کو تعلیم دینا تھا کہ وہ بھی باتباع آنحضرت اسی طرز کی زندگی اپنائیں۔

اگر آپ نفس و شیطان کے خدشے سے بے خوف ہو کر بھی دنیا کی طرف مائل ہو جاتے، شاہانہ زندگی بسر فرماتے اور تخت و تاج کو اپناتے تو یہی چیز دوسروں کے لئے قابل تقلید اور لائق اتباع بن جاتی۔ لوگ آنحضرت ﷺ کا نام اور آپ کے طرزِ عمل کی مثال دے کر وہ سب کچھ کرنے لگ جاتے جو ان کا نفس چاہتا۔ پھر مندرجہ بالا آیت میں بھی جس چیز کی طلب کی جارہی ہے وہ دنیا نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کا حسنہ ہے۔ اور ساتھ ہی آخر میں جس چیز کی مانگ کی جارہی ہے وہ "وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿البقرۃ:۲۰۱﴾" ہے۔

آیت کے ان دونوں حصوں کو سامنے رکھیں تو دنیا کا حسنہ بآسانی سمجھ میں آتا ہے یعنی اس سے مراد دنیا سے متعلق وہ لگاؤ اور وابستگی ہے جس پر عذاب نار لازم نہ آتا ہو۔ اور پچھلے صفحات پر قرآن کی جو آیتیں درج کی گئی ہیں ان سے یہہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن میں عذاب نار کی وعید اُن لوگوں کے حق میں سنائی گئی ہے جو دنیا کے طالب اور اس کے شیدائی ہوتے ہیں۔ اس سے اس درجہ خوش ہوتے ہیں کہ آخرت کو بھول ہی جاتے ہیں۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَـــنَةً ﴿البقرۃ:۲۰۱﴾ کے قرآنی الفاظ کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے دعا مانگی جو یقیناً آپ کے حق میں مقبول ہوئی۔ لیکن اس کا اظہار کس رنگ میں ہوا رسالت مآب ﷺ نے اپنی زبانِ حقیقت ترجمان سے فرمایا۔ ''الفقر فخري''۔ علاوہ ازیں آپ کی حیات پاک کے تعلق سے کتب حدیث میں یہہ مقبول اور مستند روایتیں ملتی ہیں۔ كان رسـول الله ﷺ لا يَدّخِرُ شـيائً لِغدٍ(۲) خيَّره ربُّه تعالىٰ بينَ ان يكونَ نبياً ومَلِكاً او نبيًّا و عبداً- فاختار الثاني۔ آنحضرت ﷺ کل کے لئے کوئی چیز اُٹھانہ رکھتے تھے۔ اللہ نے رسول کو اختیار دیا کہ یا تو وہ نبی اور بادشاہ بنیں یا نبی اور بندہ تو آپ نے دوسری شق کو پسند فرمایا۔

یہ تو تھا آنحضرت رسالت مآب ختمی مرتبت ﷺ کا ذاتی عمل اب اگر کوئی یہ کہے کہ یہ عمل آپ کی ذات سے مختص بھی تھا اور مخصوص بھی، اور قاعدہ ہے کہ خصوصی عمل لائق تقلید نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو حکم یا فرمان شارع چاہئیے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہہ عمل ذاتی سہی لیکن تھا احکام قرآن کی روشنی میں۔ بلکہ بلا خوف تردید یہہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آپ کا یہ عمل دنیا سے متعلق قرآنی احکام کی سچی اور جیتی جاگتی تفسیر تھا۔ تو کیا اس صورت میں بھی آپ کی اتباع واجب نہ ہوگی۔ اگر نہیں ہوگی تو آپ کے ہر عمل، زندگی کے ہر گوشہ سے متعلق یہہ کہا جاسکے گا کہ وہ آنحضرت کا ذاتی عمل تھا۔ نتیجہ یہہ ہوگا کہ آنحضرت کا کوئی فعل واجب الاتباع نہ ٹھہرے گا۔ اور اسطرح دین میں ایک بہت بڑا اخلاء پیدا ہو جائے گا۔ دین کے احکام مسخ ہو جائیں گے اور سب سے بڑھ کر رسول کی حیثیت ختم ہو جائیگی۔

حالانکہ آپ کی اطاعت، اطاعت خداوندی ہے۔ مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّـــهَ ﴿النساء:۸۰﴾ عمل اور قول میں اگر کچھ فرق پڑ جائے تو فوقیت عمل کو ہی ہونی چاہئیے۔ اس لئے کہ عمل کا قدم ہمیشہ عزیمت پر رہتا ہے۔ اور قول کا کبھی عزیمت پر اور کبھی بتقاضائے افراد واحوال رخصت پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن دین دراصل عزیمت اور عالیت کا نام ہے نہ کہ رخصت کا۔ پس آنحضرت کا جو عمل ہوگا وہ عزیمت کا ہی سرمایہ دار ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ دنیا سے متعلق آنحضرت ﷺ کے ارشادات گرامی اور فرامین مبارک تو تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں اس باب کی بیسیوں روایتیں ملتی ہیں۔

مگر اس سلسلے میں جو تلخ حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ اور اس قبیل کے مضامین یعنی زہد، ترک دنیا، اخبار مغیبہ پر مشتمل اور باطن سے تعلق رکھنے والی روایات کا شیوع سوائے ایک طبقے کے جس کو عرفِ عام میں طبقہ صوفیاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، دیگر حلقوں میں عام نہ ہو سکا، تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوینِ حدیث بلکہ روایت حدیث کے عہد اول میں ہی

اس پر کچھ اس طرح کی پابندیاں عاید کی گئی تھیں کہ اس قسم کی احادیث بیان کرتے ہوئے لوگ خوف محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں، حضرت ابوہریرۃ کی مندرجہ ذیل روایت اس حالت کی پوری عکاسی کرتی ہے۔حفظت من رسول الله ﷺ وعائين فامّا احدهما فبثثته وامّا الآخر فلو بثثته لَقُطِعَ بي الحلقوم۔میں نے آنحضرت ﷺ سے (علم کے) دو برتن حفظ کئے ہیں۔ان میں سے ایک کو تو میں نے پھیلا دیا ہے۔دوسرا اگر اس کو میں پھیلاتا تو میرا گلہ کاٹ دیا جاتا۔

روایت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوہریرہ نے یہ بات دور خلافت فاروق اعظم میں فرمائی ہے۔یہہ خیال نہ کیا جائے کہ حضرت عمرؓ راویت حدیث کے مخالف تھے۔حاشا وکلاّ۔حضرت عمر کی رائے یہہ تھی اگر حدیث کی روایت پر سختی نہ برتی جائے اور اس سلسلے کو ڈھیل دیدی جائے تو ممکن ہے اور لوگ بھی صحابہ کے ساتھ ساتھ، آنحضرت کے نام سے روایتیں گھڑ کر بیان کرنا شروع کر دیں گے۔اور اسطرح حدیث رطب ویابس کا پشتارہ بن جائیگی۔جس کی وجہ سے آیندہ چل کر صحیح کو ضعیف یا موضوع سے جدا کرنا انتہائی دشوار ہو جائے گا۔

تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کی عنانِ توجہ اس سلسلے میں اعمال سے زیادہ عقیدہ پر ہوتی تھی۔(دور جانے کی ضرورت نہیں خود آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی جب کہ آنحضرت ﷺ نے کچھ قلم بند کرنے کی غرض سے قلم اور کاغذ منگوایا تھا تو حضرت عمر نے صاف الفاظ میں کہدیا تھا کہ ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے) یہی وجہ تھی کہ اس قبیل کی روایتوں کا اشتہار بر سرِ عام نہ ہو سکا یہاں تک کہ اس دور میں "سفینوں" میں بھی بہت کم منتقل ہو سکا۔واحد صورت یہی تھی کہ سینوں سے سینوں میں منتقل ہو جائے۔البتہ بعد میں جب یہہ پابندیاں نہیں رہیں، اور کتابت و تحریر کے مواقع حاصل ہو گئے تو پھر ایسی روایتوں کو کتابوں میں جگہ مل سکی۔اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث کے سلسلے میں مختلف طبقے بن گئے۔یعنی محدثین، متکلمین، محققین، صوفیا، وغیرھم۔اس کی بنیاد کیا ہے۔تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

خلاصہ بحث یہ کہ زیر بحث مضمون کے تعلق سے آنحضرت ﷺ کے فرامین کافی تعداد میں موجود ہیں۔جن میں سے چند درج ذیل کئے جاتے ہیں۔(۱)أُتركوا الدنيا لِأهلِها۔دنیا کو دنیاوالوں کے لئے چھوڑ دو۔(۲)الدنيا جيفةٌ وطالبوها كلابٌ ۔دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔(۳)الدنيا لكم والعقبٰي لكم، والمولٰي لي ولِمن اتبعني۔دنیا تمہارے لئے ہے، عقبیٰ تمہارے لئے ہے۔مولیٰ (اللہ) میرے لئے اور اس کے لئے ہے جس نے میری اتباع (تام) کی (۴) حُبّ الدنيا رأس كّلِ خطيئة وترك الدنيا راس كل عبادة۔دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔اور دنیا کی محبت کا ترک کرنا ہر عبادت کی جڑ ہے۔(۵)الدنيا سجن المومنين وجنة الكافرين۔دنیا مومنوں کا قید خانہ اور کافروں کی جنت ہے۔

مندرجہ بالا روایتوں میں جہاں جہاں دنیا کا لفظ آیا ہے۔ وہاں دنیا سے نفس دنیا تو مراد نہیں ہوسکتی، لازمی بات ہے کہ اس سے مراد "حب دنیا" ہے۔ جس کی صراحت حدیث میں کردی گئی۔ اسی کو ترک کردینے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ أُترکوا الدنیا (دنیا ترک کرو) سے دنیا کی محبت ترک کرنا ہی مقصود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہؓ کرام کی زندگی باستثناء چند انتہائی سادہ، ظاہری شان و شوکت سے مُبّرا اور دنیوی طمطراق سے کوسوں دور تھی۔ پھر ان میں جن کو "انوار رسول" اور "احوال رسول" کو قریب سے دیکھنے اور ان کی حفاظت کرنے کا امتیاز برسوں حاصل رہا۔ ان کی حیات تو مثالی حیات نظر آتی ہے۔ خصوصاً اصحاب صفہ یعنی آٹھوں پہر رسول کی صحبت بابرکت سے مستفیض ہونے والی جماعت، پھر ان میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی دنیا بیزاری، خلیفۂ وقت کے سامنے اظہار حق اور اس کے جرم میں خلیفہ کی جانب سے تجویز کی ہوئی سزاء کو بخوشی قبول کرلینا لیکن اظہار حق سے باز نہ آنا، اسلامی تاریخ کے وہ درخشاں ابواب ہیں جن پر سے حیات پاکِ رسول ﷺ پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کہ جب ان کی زندگی ایسی رہی ہے تو پھر آنحضرت کی زندگی کے نقوش کیسے رہے ہوں گے۔

پس جن حضرات نے اس طرز زندگی کو اپنایا وہ فقیر اور صوفی منش کہلانے لگے، اور یہیں سے طبقہ، صوفیا کا آغاز ہونے لگا۔ اسی طبقہ میں بہت سے اولیاء اللہ پیدا ہوئے۔ چنانچہ حسن بصری سے لیکر حضرت سیدنا سید محمد مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام کی بعثت تک جتنے اولیاء اللہ گذرے ہیں شاید ہی ان میں کوئی ولی ایسا ہو جس نے دنیا اختیار کی ہو یا جس نے دنیا اختیار کرنے کی ترغیب دی ہو۔ سب کی تعلیم ایک ہی رہی۔ یعنی دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہونا۔ سبھوں نے دنیا کو لعین اور مطعون قرار دیا۔ سبھوں نے دنیا سے ڈرایا۔ اس سے پرہیز کرنے کی تعلیم دی خود ان کی زندگی ان کی تعلیمات کا آئینہ تھی۔ دنیا ان کے پیچھے دوڑتی آتی تھی مگر وہ اس کو دھتکارتے تھے۔ ان کو دولت و حکومت، مال و منال، منصب و جاگیر، جاہ و مرتبت کسی بھی چیز کی خواہش تھی نہ اس کی طرف رغبت۔ نتیجہ یہ تھا کہ بڑے بڑے امراء، جاگیر دار، تاجدار سلطنت، ارکانِ حکومت سب کے سب ان کے قدموں پر جھکتے تھے، ان کے مقدس دربار میں جاتے ہوئے گھبراتے تھے، ان کے سامنے بات کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے تھے۔

دنیا سے متعلق قرآن، حدیث اور تصوف کی روشنی میں احکام معلوم ہوجانے کے بعد یہ سوال کہ "دنیا کے بارے میں کس قسم کا رویہ نجات دہندہ ہے اور کونسا مہلک"؟ مشکل نہیں رہتا۔ البتہ اس سلسلے میں جو بات خصوصی طور پر منظر عام پر آئی ہے وہ ہے "ترکِ دنیا کی صحیح اور غلط تعبیر" اس لئے کہ مندرجہ بالا قرآنی احکام کی روشنی میں دنیا سے محبت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لازماً اس کی محبت کا ترک کرنا ہی عقل سلیم کا تقاضا ہوگا۔ لیکن یہہ ترک دنیا کس قسم کی ہوگی آیا رہبانیت سے اس کے

ڈانڈے مل جائیں گے ؟؟ رہبانیت تو اسلام میں ناجائز ہے۔ تو پھر کیا ہندو مت کی بن باس کی یہہ بھی ایک دوسری شکل کہلائے گی جو ممنوع ہے ؟ اگر نہیں تو پھر ترک دنیا کی صحیح تعبیر کیا ہے ؟ یہ ہے اس وقت کا اہم ترین سوال۔ جب اس سوال کا بہترین اور تشفی بخش جواب قول اور عمل کے ذریعہ پیش کیا جائے گا بلکہ تو ترک دنیا سے اب جو تنافر ہے شاید وہ دور بھی ہو جائے، یقین ہے کہ محبت سے بدل بھی جائے گا۔ اور اس وقت دنیا کا جو فیصلہ ہو گا اس کی عبارت اس سے مختلف نہ ہو گی ''آج کی اس پریشان کن دنیا کے مہیب خطرناک اور کبھی نہ ختم ہونے والے مسائل کا دل لگتا حل اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ لوگوں کو دنیا طلبی کے بجائے ترک دنیا کی صحیح تعبیر کی عملی تعلیم دی جائے۔ ورنہ دنیا طلبی، یہ ہوس تو ایسی ہے کہ قبر کی مٹی ہی اس کا پیٹ بھر سکتی ہے۔

ترکِ دنیا کے تعلق سے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس کو رہبانیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ خواہ مخواہ لوگوں کی کم نظری اور کج فہمی ہے کہ انہوں نے ترکِ دنیا کو رہبانیت کا مترادف (ہم معنی) قرار دے لیا۔ اور رہبانیت کی طرح ترک دنیا کو بھی حرام سمجھ لیا گیا، یہ فہم و نظر کی ستم ظریفی ہے اور فکر کا ایک زبردست دھوکہ لیکن اس کا سیلاب اس قدر بڑھا اور چڑھا کہ خس و خاشاک کا تو کچھ حساب ہی نہیں، بعض مضبوط اور مستحکم درختوں کو بھی اس کے بہاؤ کے ساتھ تنکوں کی طرح بہتے ہوئے دیکھا گیا۔ حالانکہ ترکِ دنیا اور ہے اور رہبانیت اور۔

ترکِ دنیا میں فطری خواہشات کو ترک کرنے کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اس کے فطری تقاضوں کی تکمیل کے جائز طریقوں کی جانب رہبری کی جاتی ہے۔ ترک دنیا میں تو صرف نفسانی خواہشات کو ترک کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ہم یقین کے ساتھ کہنے کے موقف میں ہیں کہ شاید ہی کوئی مذہب ایسا ہو گا۔ جو انسان کو نفسانی خواہشات کے احترام کا درس دیتا ہو۔ البتہ رہبانیت نام ہے اس طرز زندگی کا جہاں انسان کو اپنی فطری خواہشات کو بھی دبانا پڑتا ہے اور چونکہ مذہب کو فطری ہونا چاہیئے۔ اس لئے فطرت یا فطرتی تقاضوں کے خلاف جو حکم دیا جائے گا وہ نہ تو مستحسن ہو گا، اور نہ اس کے جواز کی سند کسی طرح مل سکے گی۔ اور نہ وہ عوام میں مقبول بھی ہو سکیگا۔ مذہب تو بس وہی ہے جس کے قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ ایسا مذہب ہی عالمگیر مذہب بن سکتا ہے۔

ترکِ دنیا سے متعلق قرآنی آیات اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں پچھلے صفحات پر جو بحث کی گئی ہے اس سے ترک دنیا کا تفصیلی مفہوم تو ناظرین کے ذہن میں آگیا ہو گا۔ لیکن ہم ذیل میں اس کی صحیح اور غلط تعبیر سے متعلق چند بنیادی باتوں کو پیش کرتے ہیں تا کہ صحیح تعبیر، غلط تعبیر سے ممتاز ہو جائے اور ترک دنیا سے متعلق عموماً جو غلط فہمی پیدا ہو گئی

ہے وہ رفع ہو جائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے الدنیا نفسک فاذا افنیتھا فلا دنیا لك۔ دنیا تیرا نفس ہے، جب تو اپنے نفس کو فنا کر دے گا پھر تیرے لئے دنیا نہیں ہے۔ کیا اس سے ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں مل رہی ہے!!!

اس حدیث میں جو نکتہ قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے مراد نفس ہے۔ اور نفس کو مارنا ضروری ہے نفس کے بارے میں تو شاید ہی کوئی مذہب ہو گا جو اس کی پیروی کرنے کی تلقین کرتا ہو، اب تک جتنے مذہب آئے سب نے یہی کہا کہ نفس کی غلامی سے پرہیز واجب ہے۔ اس لئے کہ انسان جسم اور روح سے مرکب ہے، نفس اور ضمیر سے معبّر ہے۔ دونوں کے تقاضے جدا گانہ ہیں۔ اور دونوں کی غذائیں بھی علٰحدہ ہیں۔ ان دونوں میں ہمیشہ سے کشمکش جاری ہے جس کو معرکۂ حق و باطل سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ نفس تو ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے۔ اور اسکی کبھی نہ ختم ہونے والی خواہشات کا سلسلہ تو شب دیجور سے زیادہ بھیانک اور "زلف معشوق" سے بھی زیادہ دراز بلکہ پوری عمر کو محیط رہتا ہے۔ جو شخص اس کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔ وہ جیتے جاگتے، سلامتی سر کے ساتھ شاید ہی واپس آنے کا نام لیتا ہے۔

قرآن میں سورۂ یوسف میں آیا ہے۔ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي ﴿یوسف:۵۳﴾ نفسِ امارہ وہی ہے جو برائیوں کا حکم دیتا ہے۔ اس کو مارنا بڑے سے بڑے موذی کو مارنے سے بھی بڑا کام ہے۔ چنانچہ ذوق نے کہا۔

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا نہنگ واژدھا و شیر نر مارا تو کیا مارا

اس کے مقابلے میں نفس مطمئنہ آتا ہے جس میں حق سے راست خطاب پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ ﴿الفجر:۲۷﴾ حیاتِ دنیا اور متاع حیات دنیا کے تعلق سے جو توضیحات قرآنی حوالوں کے ذریعہ اوپر لکھی گئی ہیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان چیزوں کے حصول کی تحریک کا منبع نفس ہی ہے۔ اگرچہ ان میں بعض چیزیں وہ ہیں جو انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ جیسے سکہ، مال، اولاد، سواری کے جانور، عورتیں اور کھیتیاں وغیرہ۔

ان چیزوں کا محض وجود یا ان سے بقدر ضرورت تمتع کا نام نہ دنیا ہے نہ اس میں نفس کی خواہش کو زیادہ دخل رہتا ہے مال کا تفاخر، بے اندازہ مال کے حصول کی طمع اولاد کی کثرت پر تفاخر، سواری کے جانوروں کی عمدگی اور کثرت پر تفاخر، حرام اور ناجائز طریقوں سے عورتوں سے اختلاط، یا بیوی کی محبت میں دیگر محبتوں کا خون، کھیتوں، زمینوں اور جائیدادوں سے غیر معمولی

محبت، ان سے حاصل ہونے والی پیداوار اور منافع پر بے جا اکڑ، نفس کی تحریک ہے، ان سب چیزوں میں غیر معمولی انہماک اور اس درجہ شغف کہ انسان کو نماز روزہ جیسے فرائض کا بھی مطلق خیال نہ ہو، نفس ہی کا کرشمہ ہے اور ہر چیز جب وہ اس نقطہ پر پہنچ جائے جہاں خدا سے غفلت پیدا ہونے لگے وہ دنیا بن جاتی ہے۔ اور اس کا ترک فرض ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ خدا سے غفلت حرام ہے۔ اور جو چیز موجب غفلت ہے وہ بھی حرام ہے۔

بُت کی تعریف حدیث شریف میں اسطرح کی گئی ہے۔ کل ماشغلك عَن الحقِ فَهُوَ صَنمكَ۔ ہر وہ چیز جو تجھے حق سے غافل کر دے وہ تیرا صنم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پتھر برا نہیں ہے۔ لیکن اس سے اس درجہ محبت کہ خدا سے غفلت کا موجب ہو جائے وہ حرام قرار پاتی ہے اور اس وقت اس پتھر کو پتھر کے بجائے صنم کے نام سے پکاریں گے۔ اسی طرح مال، اولاد، زر، زیور، سونا چاندی، عورتیں، کھیتیاں، جانور وغیرہ کا رکھنا جائز ہے۔ لیکن ان کی ایک حد مقرر ہے۔ یعنی ان کو ان کے ناموں سے ہی پکارا جائے گا جب تک کہ وہ خدا سے غافل نہ کر دیں۔ لیکن جب انسان ان سے اتنی محبت کرنے لگ جائے اور ان کے حصول یا ان کی خوشنودی میں اس قدر مشغول اور منہمک ہو جائے کہ ان کے سوائے کوئی اور اس کی نظر میں سماتا ہی نہ ہو تو ان پر صنم کا اطلاق ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ پرستش صرف خدا کی ہونی چاہئیے۔ خدا کے سوا کسی اور کی پرستش کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح حیات دنیا اور متاع حیاتِ دنیا کی محبت میں انسان کا اس قدر گرفتار ہو جانا کہ وہ "عملاً" اس کا بندہ بن جائے کفر و شرک نہیں تو اور کیا ہے۔ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک اقلیم میں دو بادشاہوں کی گنجائش نہیں ہوتی اسی طرح ایک قلب میں دو برابر کی محبتوں کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے "اللہ نے ایک جوف میں دو دِل نہیں پیدا کئے۔

مطلب یہ کہ ایک دل میں ایک ہی محبت ہونی چاہئیے اور وہ محبت خدا ہے۔ اس معنی میں دوسرے کی معیت یا شرکت ہی اصل شرک ہے (اگر چہ اس کا نام شرک خفی رکھا جاتا ہے) یاد رہے کہ خدا سے محبت کی بناء پر خدا کے پاس سے آنے والی ہستی یا آنے والی کتاب سے محبت ہو تو یہ اس کے مغائر نہیں ہو گی بلکہ اس کے منشا کی تکمیل کا ذریعہ ہی متصور ہو گی۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ --- ﴿التوبة:۲۴﴾ سے یہی حقیقت مستفاد ہوتی ہے۔ یعنی کہدو اگر تمہارے آباء، تمہارے بیٹے، تمہاری بیویاں، تمہارے قبیلے، تمہارے کمائے ہوئے اموال تمہاری وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور تمہاری وہ عمارتیں جو تمہیں پسند ہیں (یہ سب چیزیں) تمہارے پاس، خدا، اس کے رسول، اور اس کے راستے میں جہاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ تمہارے پاس آجائے۔

مندرجہ بالا آیت میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے انسان کی محبت فطری ہونے کی وجہ سے یقینی ہے۔ ان میں تین بلکہ چار اول الذکر سے تو محبت کرنے اور صلہ رحمی کرنے کے متعلق قطعی احکام موجود ہیں۔ اور بقیہ مؤخر الذکر چیزیں انسان کی بود وباش کیلئے ضروری ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حکم یہ دیا گیا ہے کہ ان کی محبت، خدا، رسول اور جہاد کی محبت سے بڑھنے نہ پائے ورنہ عذاب الٰہی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ بات یہہ ہے کہ محبت دو قسم کی ہے (۱) اضطراری محبت (۲) اختیاری محبت، خونی رشتوں اور شدید ضرورتوں کی بناء پر جو محبت ہوتی ہے وہ اضطراری محبت ہے۔ اس کے ترک کا حکم نہیں دیا گیا ہے کیوں کہ ایسا حکم خلاف فطرت ہوتا اور اسلام کا کوئی حکم خلاف فطرت نہیں ہے۔

بلکہ جس محبت کو ترک کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ان چیزوں سے "اختیاراً" اور "مقابلتہ" محبت ہے۔ یعنی اگر کبھی ایسا موقع آجائے کہ باپ، بیٹوں، بیویوں، مال اور دولت کے تقاضے ایک طرف ہوں اور خدا، رسول اور جہاد فی سبیل اللہ کے مطالبے دوسری طرف تو اب انسان کو چاہیئے کہ اضطراری محبت کو اختیاری محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادے۔ جو غیر فانی بندھنوں کا سرچشمہ ہے اِسی طرف حدیث شریف کا اشارہ ہے: لا یؤمن أحدکم حتیٰ اکونَ أحبَّ الیهِ مِن وَّلدِہ و والدِہ و الناسِ اجمعین۔ ترجمہ۔ تم میں سے کوئی اسوقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے پاس اس کی اولاد، اس کے والد اور دیگر لوگوں سے محبوب ترین نہ ہو جاؤں۔ کامل ایمان کی نشانی یہی ہے کہ ان رشتوں کی اضطراری محبت کے مقابلے میں آنحضرت کی محبت کو ترجیح دی جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوگا کہ دوسروں کی محبت کو مقابلتہً ترک کرنا ہوگا۔ خصوصاً جب کہ وہ اختیاری محبت کے مدّ مقابل آجائیں۔ کیوں کہ یہی جذبہ ٔ دین داری ہے۔

اس کے خلاف جو عمل ہوگا اس کے لئے عذاب الہٰی کے انتظار کی وعید آئی ہے۔ وہی پکی دنیاداری کہلائے گی جس کا محرک نفس ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ الدنیا نفسـک فاذا افنیتها فلا دنیا لك۔ دنیا تیرا نفس ہے۔ جب تو اس کو فنا کردے گا تو پھر تیرے لئے کوئی دنیا نہیں۔ ترک دنیا یا ترک نفس ایک جامع لفظ ہے۔ اس کے تحت مختلف شعبے اور مختلف افراد ہوتے ہیں۔ جب تک ان کی محبت کو دین کے مقابلے میں ترک نہیں کیا جائے گا اس وقت تک نہ جذبہ ٔ دینداری فروغ پاسکتا ہے اور نہ کمال ایمان ہی نصیب ہو سکتا ہے۔

ترک دنیا کی مختلف شاخوں کی مختصراً توضیح ذیل میں کی جاتی ہے تاکہ حقیقت منکشف ہو سکے۔

(۱) ترک خودی: انسان کا اپنے "میں پن" کو ترک کرنا۔ میں پن یا خودی کا احساس ایمان کے حق میں زہر قاتل سے کم نہیں ہے۔ یہ تو ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان خودی سے جس قدر قریب ہوتا جائے گا خدا سے اسی قدر دور ہوتا جائے

گا، اسی لئے کلمہ طیبہّ میں لا اِلہ الا اللّٰہ کہا جاتا ہے۔ تا کہ ''لا'' کے ذریعہ ہر اس چیز کی نفی کی جاسکے جو اپنے طور پر موجود ہونے اور ہستی کہلانے کی حقدار بن جائے۔ پس جب تک ''لا'' کی تیغ خودی، خود پرستی خود ستائی، خود نمائی کے بتوں پر نہیں پڑے گی اس وقت تک اِلا اللہ کا صحیح مفہوم بھی دل و دماغ میں جگہ نہ پاسکے گا۔

(۲) ترکِ عزت و لذت: مشاہدہ ہے کہ انسان اپنے فرسودہ وقار اور جھوٹی عزت پیدا کرنے یا اس کو بر قرار رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ اس کو اپنی عزت اور اپنا وقار اتنا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ذرہ برابر کمی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اور اسکو بر قرار رکھنے کے لئے اگر اپنے حقیقی مقام سے ہٹنے کی ضرورت پڑ جائے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرنے، کافرانہ قوتوں کا ساتھ دینے یا کم از کم ان کی ہاں میں ہاں ملانے کی ضرورت پڑ جائے تو وہ سب کچھ خوشی سے قبول کرلے گا۔ ظاہر ہے کہ یہہ جذبۂ دین داری تو نہیں کہلائے گا۔ اس قسم کے طرز عمل کے پیچھے نفس کا ہاتھ نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کو اگر دنیا نہ کہیں تو پھر دنیاداری کس شئے کا نام ہے؟

مسلم کو تو یہ سمجھنا ہے کہ اِنّ العزّۃ للّٰہ جمعیاً (ہر قسم کی عزت تو اللہ ہی کو سزاوار ہے) پس اس کی طرف سے جو سرفرازی ملی وہی حقیقی عزت ہے، اس کے راستے میں کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیلنی پڑے، ذلت و رسوائی کا بر سر بازار سامنا کرنا پڑے تو ایک مسلم کی نظر میں یہہ سب چیزیں بے عزتی اور ذلت نہیں ہوں گی۔ بلکہ وہ توان سب کی تہ میں حقیقی اور لافانی عزت دیکھیگا۔ اب رہی لذت سووہ بھی کئی قسم کی ہوتی ہے کھانے پینے کی لذت، لباس کی لذت امیروں اور مال داروں سے ملاقات کی لذت، کتب بینی کی لذت سیر و تفریح (بلا مقصد تبلیغ) کی لذت اور کلام کی لذت یہہ سب چیزیں اگر تلذذ کے لئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سے دین کے منشاء کی تکمیل کی بجائے نفس کی آسودگی کو راہ ملتی ہے، نفس کی آسودگی، جذبۂ حق پرستی کے صریحاً مخالف ہے، پس اس کا ترک بھی لازمی ہوا۔ جب تک یہہ چیزیں ضرورت کی حد تک ہوں اور بامقصد ہوں (فقط حصول لذت مقصود نہ ہو) تو یہہ مفید مطلب ہونے کے لحاظ سے مستحسن سمجھی جائیں گی۔ بہر حال لذت سے ذلت تک فاصلہ بہت زیادہ نہیں ہے۔

(۳) ترک شرک جلی و خفی: اس کے متعلق پچھلے صفحات پر لکھا جاچکا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ انّ الشرک لظُلمٌ عظیمٌ۔ ۴۔ ترک کفر: خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ باطنی کفر حق پوشی اور اظہار خودی ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد باری ہے۔ لِمَ تلبسونَ الحق بالباطل وتکتمونَ الحق وانتم تعلمون (بقر) ۵۔ اسی طرح ترک رسم، ترک عادت، ترک بدعت، ترک ریا، ترک اخلاق ذمیمہ، ترک گناہ ظاہری و باطنی کا تعلق ترک دنیا سے ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں میں نفس کی ہی کار

فرمائی رہتی ہے۔

ان سب چیزوں کو ترک کرنے کے معنی یہی ہوں گے کہ ہر محاذ پر نفس کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جا کر اس کو شکست فاش دی جائے۔ ایمان کے کامل ثمرات سے محظوظ ہونے کا یہی طریقہ ہے۔ مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر ہی حضرت سید نا وامامنا سید محمد مہدی موعود علیہ السلام نے فرمایا"وجودِ حیاتِ دنیا کفر است" زیستن بجاں آں را ہستی وخودی گویند یعنی وجود حیاتِ دنیا کفر ہے۔ جان سے جینا اسی کو ہستی اور خودی کہتے ہیں۔ جینے جینے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایک جینا تو وہ ہے جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ جو ہر لحہ اپنی زبانِ حال سے "إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴿الأنعام: ١٦٢﴾" کہتا ہے یہ جینا حرام نہیں ہے۔ حرام تو بس اس کی زندگی ہے جو اپنی جان سے جیتا ہے یعنی اس کے سامنے فقط اس کی اپنی جان، اپنی ہستی اور اپنی خودی رہتی ہے۔ اور وہ اس کے تحفظ کے خاطر ہر خطرہ مول لینے کو تیار رہتا ہے۔ بخلاف زیست اولیٰ کے کہ اس کے سامنے اپنی زیست نہیں رہتی بلکہ وہ تو اپنی زیست کو اپنی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ زمین میں امن وامان قائم کرنے اور خلق اللہ کی خدمت کرنے کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

پہلی صورت میں زندگی ہی مقصود بن جاتی ہے۔ اور دوسری صورت میں زندگی مقصود نہیں بنتی بلکہ اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی لئے یہ اس کے پاس عزیز نہیں رہتی، بلکہ عزیز تو اس کو اپنا مقصود ہوتا ہے یہاں تک کہ یا تو اپنی زندگی میں اُس مقصود کو حاصل کرے گا۔ یا پھر اس کے حصول میں اگر ضرورت پڑ جائے تو اپنی جان قربان کردے گا۔

ورائے ترکِ دنیا ایمان نیست: خلاصہ یہ کہ دنیا (وجود حیاتِ دنیا، متاع حیات دنیا، اس کی محبت یا نفس کی محبت) کو ترک کئے بغیر کامل ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ اسی مطلب کو حضور مہدی موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اسطرح بیان فرمادیا ہے۔ "ورائے ترک دنیا ایمان نیست" ترجمہ ترک دنیا کے بغیر ایمان نہیں۔ ظاہر بین نظریں اور حقیقت سے عاری دل و دماغ حضور کی زبانِ حقیقت ترجمان سے نکلے ہوئے اس جملے کے متحمل نہ ہوسکے۔ کرب و بے چینی کے عالم میں پکار اُٹھے کہ کیا ترک دنیا کے بغیر ایمان نصیب ہی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ بعض سطحی دماغوں نے اسطرح استدلال کرنے کی کوشش کی کہ جنھوں نے دنیا ترک نہیں کی کیا وہ سب بے ایمان ہیں۔ ایمان کا معاملہ تو خدا کے ہاتھ ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ کون ایمان دار ہے، اور کون بے ایمان، مومن اور کافر کہنے کا حق تو صرف خدائے تعالیٰ کو ہے۔ البتہ اس کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ایمان و کفر کے احکام کو، جو کتاب اور سنت سے ملتے ہیں کسی قسم کا اضافہ کئے بغیر من و عن سنانے کا حق البتہ دوسروں کو حاصل ہے۔ وہ بھی تعین اور تشخیص کے بغیر۔ کسی کا نام لے کر قطعیت کے ساتھ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں مومن ہے اور فلاں کافر۔ ہاں یوں کہہ سکتا ہے

فَأَمَّا مَن طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ۔ اور من انکر المهدي فقد کفَرَ۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد کتاب و سنت کے احکام کو سنا دینا ہے۔ نہ کہ کسی پر تشخص و تعین کے ساتھ اپنی جانب سے کفر کا حکم لگانا ہے۔

ہم نے پچھلے صفحات پر جن قرآنی آیات کو لکھا ہے اور ان کے ضمن میں جو توضیح کی ہے، اس کی روشنی میں جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ظاہر ہے وہ ورائے ترک دنیا ایمان نیست کے مغائر نہیں ہو سکتا۔ انکشاف حقیقت کی غرض سے ذیل میں اس کی مزید تشریح کی جاتی ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رکھنی ہے کہ اسطرح کا طرزِ بیان کوئی اجنبی یا نادر نہیں ہے۔ کتاب و سنت کے پڑھنے والے اس قسم کے طرز بیان سے مانوس ہیں۔ چنانچہ ذیل میں اسی قبیل کی چند روایتیں درج کی جاتی ہیں۔

(ا) لا ایمان لمن لا امانة له۔ ایمان نہیں اس شخص کو جسے پاس امانت نہیں (ب) لا دينَ لَمن لا عَهدَ له۔ دین نہیں اس شخص کو جسے پاس عہد نہیں۔ (ج) لا يؤمنِ أحَدُكُم حتي أكوَنَ احبَّ اليه من وَلدِهِ و والده و الناسِ اجمعين۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے پاس اس کی اولاد اسکے والد اور دیگر لوگوں سے زیادہ محبوب ترین نہ ہو جاؤ۔ ان سب روایتوں میں ایمان کا انحصار چند امور پر کیا گیا ہے۔ اور ان کے معدوم ہونے کی صورت میں ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ پہلی روایت میں کہا گیا جس کے پاس امانت داری نہیں اس کے پاس ایمان نہیں، دوسری روایت میں ہے جو وعدہ کا لحاظ نہیں کرتا اس کے پاس دین نہیں، تیسری روایت میں ہے جب تک آنحضرت ﷺ کسی شخص کے نزدیک اس کی اولاد، ماں باپ اور دیگر لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جائیں وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب اس قسم کا طرز بیان مشہور ہے اس سے دل و دماغ مانوس بھی ہیں۔ اور اس کو قبول بھی کرتے ہیں تو پھر قرآن شریف میں جس چیز کی انتہا درجہ بُرائی بیان کی گئی ہے یہاں تک کہ اس کے مرید و طالب کو دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے اس کے ترک نہ کرنے پر اگر ایمان نہ ہونے کا حکم لگایا جائے تو یہ بات کس طرح معرضِ بحث میں آسکتی ہے۔

اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ مندرجہ بالا روایتوں میں "لا ایمان" سے "کمال ایمان" کی نفی مراد ہے تو ہم کہتے ہیں کہ زیر بحث نقل ورائے ترک دنیا ایمان نیست کی توضیح بھی تو اسی انداز سے کی جاسکتی ہے۔ یعنی ترک دنیا کے بغیر ایمان کامل نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور بات دراصل ہے بھی یہی۔ چنانچہ اس فرمانِ واجب الاذعان کی تشریح میں جو لفظ زیادہ قابل فکر و نظر ہے وہ ہے لفظ "ایمان" اور چونکہ یہ نقل، مہدی موعود علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی ہے۔ اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ کی تشریح بھی آپ کے فرمودات و تشریحات کے مطابق ہی کی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے جب ہم "ایمان"

کی تشریح کے لئے امامناعلیہ السلام کے فرامین پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہہ روایت نظر آتی ہے۔

"ایمان ذات خدا است"۔ اس لحاظ سے نقل شریف کے معنی یہ ہوئے "ورائے ترک دنیا ایمان (ذاتِ خدا) نیست، ترک دنیا کے بغیر خدا کی ذات تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ قرآنی آیت لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ﴿آل عمران: ۹۲﴾ تم ہرگز "برّ" کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کردو۔ اس آیت میں بھی بِر کے حصول کے لئے یہی شرط رکھی گئی ہے کہ محبتوں کو قربان کیا جائے اور انسان کو جن جن چیزوں سے محبت ہوتی ہے ان کا ذکر آیت قرآنی میں اس طرح کیا جاچکا ہے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ﴿آل عمران: ۱۴﴾۔ لوگوں کیلئے عورتوں، لڑکوں، سونے کے خزانوں، چاندی کے ڈھیروں نشان لگائے ہوئے گھوڑوں، جانوروں اور کھیتوں کی محبت مزین کردی گئی ہے۔

اور ان چیزوں کا نام "متاع حیات دنیا" رکھا گیا ہے۔ ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے بداھتہً یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ پہلی آیت میں مِمَّا تُحِبُّونَ میں جو بات مجمل انداز میں کہی گئی تھی اس کی تفصیل اس دوسری آیت میں کردی گئی ہے۔ گویا کہ "برّ" کو حاصل کرنے کے لئے مماتحبون کو خرچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کی تعمیل کی راہیں متاع حیاتِ دنیا کی محبت ترک کرنے کی صورت میں ہی مل سکتی ہیں۔ اور یہی منشاء ایزدی بھی ہے۔ اب سوال یہہ ہے کہ بر کیا ہے۔ مفسرین سے بر کے متعلق مختلف اقوال منقول ہوئے ہیں۔ زیادہ مشہور و مشترک یہہ ہے کہ بر سے مراد "ہر قسم کی نیکی" ہے حضور امامنا مہدی موعود علیہ الصلاۃ والسلام نے جن کا منصب ہی بیان قرآن تھا۔ اس آیت کے بیان کے موقع پر فرمایا کہ برّ سے مراد خدا کی ذات ہے۔

جب "بر" سے مراد خدا کی ذات اور "مِمَّا تُحِبُّونَ" سے مراد متاع حیات دنیا قرار پاتا ہے تو اس کا مطلب یہی نکلا کہ جب تک متاع حیات دنیا کو خرچ نہ کروگے (یعنی اس کی محبت ترک نہ کروگے) خدا کی ذات پا نہ سکوگے۔

اسی مطلب کو مہدی موعود علیہ السلام نے فارسی زبان میں اسطرح فرمایا "ورائے ترکِ دنیا ایمان نیست" تو اس میں اعتراض کیوں خصوصاً جب کہ مہدی علیہ السلام سے ایمان کے معنی میں "خدا کی ذات" منقول ہے۔ روایت ہے کہ مہدی علیہ السلام جب عصر و مغرب کے درمیان لَن تَنَالُوا الْبِرَّ کا بیان فرمارہے تھے، ایک امیر نے اپنا گھوڑا اور شمشیر آپ کے حضور پیش کی۔ اور کہا کہ یہ میری محبوب اور پسندیدہ چیزیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کیوں، جواب دیا اس لئے کہ یہہ میری جان کی محافظ ہیں۔ آپ نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ عزیز اور محبوب تر چیز اب بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ جب تک تم اس کو

خدا کی راہ میں نہ دو گے اس وقت تک خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی وہ چیز جس کی طرف آنحضرت نے اشارہ فرمایا تھا وہ ''جان'' ہے۔ اسی لئے مہدی علیہ السلام نے فرمایا۔ ''جان سے جینا کہ اس کو ہستی و خودی کہتے ہیں''۔ یعنی جب تک یہ چیز موجود رہے گی اس وقت تک خدا کی ذات حاصل نہ ہو گی۔ یہی ترک دنیا ہے۔ فرمان رسول ﷺ کی روشنی میں جب یہ بات سامنے آچکی کہ دنیا سے مراد نفس ہے اور نفس کے فنا ہونے کے بعد دنیا باقی نہیں رہتی۔ تو اب یہ سوال پھر بھی باقی رہ سکتا ہے کہ دنیا کو ترک کرنے یا نفس کو فنا کرنے کے طریقے کیا ہیں اور ان میں کونسا بہتر ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے جب ہم کائنات میں انسان کے مقام کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا میں اللہ کا خلیفہ بن کر آیا ہے۔ ساری کائنات اپنے اپنے مفوضہ خدمات کسی قسم کی کمی بیشی کے بغیر انجام دے رہی ہے۔ اور سب کے سب انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ قدرت کی جانب سے انسان کو عبقری صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں جن کے ذریعہ وہ پوری کائنات کے جس حصے پر ہو سکے، حکومت کر سکتا ہے۔ اور ان کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن کیا کائنات پر قبضہ کرنے اور اس پر حکومت کرنے کے معنی یہہ ہیں کہ انسان اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لے۔ اور اس کے بل بوتے اپنی من مانی کرنا شروع کر دے، اور کائنات کے اپنے مقبوضہ حصے کے منافع سے دوسروں کو محروم کرنے کا مجرمانہ اور غیر انسانی اقدام کر بیٹھے۔

کیا قدرت کی جانب سے انسان کو خلافت کا تاج اسی لئے عطا کیا گیا ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کا تاج انسان کے سر پر اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی صلاحتیوں، اپنی توانائیوں اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعہ کائنات سے ملنے والی ہر قسم کی دولت کو اپنے قبضے میں تو رکھے۔ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ زید، عمر یا بکر ہے۔ اور یہہ چیز اسکی ذاتی ملکیت ہے۔ اور اس اعتبار سے نہیں کہ اس کی ملکیت کا حق صرف اسکو اور اس کے وارثوں کو مل جائے۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ ''زمین پر خدا کا خلیفہ ہے'' اور جس طرح خدا کی کائنات میں سب برابر کے شریک ہیں۔ اسی طرح خلیفہ یہہ سمجھے کہ اس کو بھی بنی نوع انسان کے تعلق سے وہی کرنا چاہئیے جو خلافت اور نیابت کا تقاضا ہے۔ یعنی کسی شئی پر ''میرا'' یا ''میری'' کا لیبل نہ لگائے۔ بلکہ یہہ سمجھے کہ اس کا حقیقی مالک خدا ہے اور اس کے منافع میں تمام کا حق ہے۔ جب اس قسم کا تصور انسانی ذہن میں بیدار ہو گا تو خود بخود بین الطبقاتی تو کجا بین الاقوامی کشمکشوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ آج کل افراد سے لے کر اقوام تک کے اندر جو باہمی جھگڑے پائے جاتے ہیں، حسد، بغض اور آپسی رقابتوں کی چنگاریاں نظر آتی ہیں ان سب کی تہ میں یہی اصول کارفرما ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کو اور ہر قوم اپنے قومی مفاد کو دوسرے افراد اور اقوام کے مفاد پر ترجیح دینے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے اور ساتھ ہی یہہ بھی مقصد ہوتا ہے کہ عملاً دوسروں کو منافع حاصل کرنے کے حقوق سے محروم کیا جا کر ان کو اپنا دست نگر بنالیا جائے، تا کہ ان کا ہمہ جہتی استحصال کیا جا سکے۔

مہدویت اور کمیونزم: اسی طرز فکر کی چنگاریاں ہوا کھاتے کھاتے اب آتش فشاں پہاڑ بن گئی ہیں۔ اور اب پوری دنیا اس نقطہ پر آگئی ہے کہ جہاں کہیں زمین کا کوئی حصہ نرم ہو جائے اور معمولی سا بھی سوراخ نظر آئے تو اندر ہی اندر برسوں کا تپتا ہوا لاوا اس 'قوت کے ساتھ بہہ نکلیگا کہ شاید ہی روئے زمین کا کوئی حصہ اس کی زد سے محروم رہ جائے۔ اسی اجارہ داری کی ذہنیت کو ختم کرنے کے لئے جو انسانی ردّ عمل دنیا نے دیکھا اور آج بھی دیکھ رہی ہے۔ وہ کمیونزم ہے۔ جس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسانوں میں مساوات ہو، اعلیٰ ادنیٰ میں تفریق نہ ہو، ہر ایک کو اس کی ضروریات پوری کرنے کے کل مواقع حاصل ہوں، کوئی کسی کا استحصال نہ کر سکے۔ ملکی یا قومی پیداوار میں ملک و قوم کے کل افراد کا حصہ ہو۔ کوئی شئی کسی کی ذاتی ملک نہ بنے، بلکہ کل اشیاء کل قوم کی ملک سمجھی جائیں اور اس کے منافع سے سب محظوظ ہوں۔

اس نظام زندگی کی بنیاد کارل مارکس نے ڈالی، اب یہ نظام غیر صحیح اور ناپسندیدہ طریقوں سے سہی، دنیا کے ایک قابل لحاظ حصے میں مقبول ہو چکا ہے، بلکہ اسی بنیاد پر حکومتیں بھی قائم ہو چکی ہیں۔ اور اب ادھر اُدھر پیر مارنے کی پوری کوشش میں لگا ہوا ہے۔ غریب، مزدور اور محنت کش طبقہ اس نظام میں اپنی فلاح و بہود کے سنہری خواب دیکھتا ہے۔ اس سے ہمارا مقصد کیمونزم کی تعریف نہیں ہے۔ ہم کو تو کیمونزم سے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے وہی نسبت ہے جو ۲۶ کے عدد میں ہے۔ عقیدۃً بیریوں کہ کیمونزم میں خدا کے نام کی ہی گنجائش نہیں ہے۔ اور ہم تو پکے مؤحد ہیں۔ عملاً مقابلہ اس طرح کہ وہ بعض اچھے اصولوں کو انتہائی سفاکانہ، ظالمانہ اور بے رحمانہ اصول کا جامہ پہناتے ہیں۔ تعمیر کی بنیاد پر تخریب کے محل تعمیر کرتے ہیں۔ کارل مارکس کے متعلق اقبال نے خوب کہا تھا۔ قلب او مومن و دماغش کافر است۔

اور بفضل خدا ہمارا قلب بھی مومن ہے اور دماغ بھی۔ اس طرح کیمونزم سے ہمارا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد یہہ ہے کہ کیمونزم کے وجود کا باعث مالدارانہ ذہنیت اجارہ داری، شخصی ملکیت، معاشی استحصال اور دولت کی غیر مساوی تقسیم بتلایا جاتا ہے ان ہی وجوہ کی بناء پر دولت کی صحیح تقسیم مستحقین میں نہ ہو سکی تھی۔ جس کے نتیجہ میں دنیا کی آبادی کا ایک بڑا طبقہ واجبی حصے سے بھی محروم ہو کر غم و غصہ میں مبتلا ہے اور غم و غصہ کے ان ہی جذبات نے اشترا کی اصول کی طرف لوگوں کے رجحانوں کو طبعی طور پر منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہو گی کہ موجودہ دنیا اپنے آپ کو دو نظاموں میں بٹی ہوئی دیکھ رہی ہے۔ ایک نظام کا نام سرمایہ داری ہے اور دوسرے نظام کا نام اشترا کیت ہے۔

دونوں میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہہ ہے کہ سرمایہ داری پیدائش دولت پر زور دیتی ہے۔ اور اشترا کیت دولت کی تقسیم پر سارا زور صرف کرتی ہے۔ مہدویت جائز پیدائش کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن صحیح اور مساوی تقسیم پر زیادہ زور

دیتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام نے دولت کی صحیح پیدائش اور صحیح تقسیم کے اصول کا نہ صرف پرچار کیا بلکہ ان پر عمل کرتے ہوئے ایک ابدی نظام کو بطور دین، دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

آسمانی اور عالمگیر مذہب کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں نہ صرف موجودہ مسائل کا حل ہو بلکہ اس کے بنیادی اصول میں یہہ لچک بھی ہو کہ آئندہ وقوع پذیر ہونے والی دھما کو صورت حال کے دفعیہ کا مکمل سامان بھی ہو تقسیم دولت کے اسلامی اعلیٰ اصول سے انحراف کی کوکھ سے کیمونزم پیدا ہوا ہے۔ فرق یہہ ہے کہ اسلام اخلاق و کردار افہام و تفہیم کے ذریعہ اپنے اصول کا پرچار کرتا ہے۔ اور کیمونزم اس کے برخلاف طاقت و قوت کے بل بوتے لوٹ مار، قتل غارت گری جیسے تخریبی کاروائیوں کے ماحول میں زبردستی اپنے اصول کو لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔

امامنا مہدی موعود علیہ السلام نے امر خداوندی کی بناء پر آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ترک دنیا کو اسی لئے فرض فرمایا اور اس کی عملاً تعلیم بھی دی۔ آپ کے دور میں زندگی دائروں میں ہوتی تھی۔ صاحب دائرہ مرشد وقت ہی دائرہ کے جملہ انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ دائرہ میں کوئی چیز کسی کی ملکیت نہ ہوتی تھی۔ دائرہ میں فی سبیل اللہ جو کچھ آجاتا تمام افراد پر علی السویہ تقسیم ہوجاتا تھا۔ اس طریق تقسیم کو اصطلاح مہدویت میں ''سویت'' کہتے ہیں۔ اسلام کے عہد اول پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو کم و بیش یہی نقشہ وہاں بھی نظر آتا ہے، آنحضرت ﷺ کے پاس کئی ہزار درہم آتے ہیں آپ مسجد نبوی کے صحن میں پتھر کے پاس رکھواتے ہیں اور جب تک کل مال تقسیم نہیں ہوجاتا آپ گھر کے اندر تشریف نہیں لے جاتے۔ اور جب جاتے ہیں تو دامن کو جھٹک دیتے ہیں تاکہ اس کی گرد وغبار بھی دامن پر نہ رہے۔ نیز آنحضرت ﷺ کے دور کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے ایک چبوترہ تعمیر کروایا تھا جو صفہ کے نام سے موسوم تھا۔ اسپر وہ صحابہ رہتے تھے جن کو دنیوی کاروبار سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا یہاں تک کہ وہ کوئی کسب بھی نہیں کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو تاریخ اصحاب صفہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان کے مشاغل آنحضرت کی خدمت میں رہنا، آنحضرت سے دین کی تعلیم حاصل کرنا، اور ذکر و فکر میں لگے رہنا تھا۔

البتہ مدینہ کے اطراف وجوانب سے اگر وفود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لانے کی غرض سے آتے اور واپسی کے وقت آپ سے کسی معلم کی درخواست کرتے تو آنحضرت ﷺ ان ہی اصحاب صفہ میں سے کسی کا انتخاب فرما کر بہ حیثیت معلم دین بھیج دیا کرتے تھے۔ ان اصحاب صفہ کا ذاتی ذریعہ معاش تو کچھ نہیں تھا۔ کہیں سے اللہ کے نام کی کوئی چیز آجاتی تو وہ اسی پر اکتفا کر لیتے تھے۔ لوگ سوکھی کھجوریں لاکر مسجد نبوی کی چھت سے لٹکا دیتے، اگر ان کو بھوک محسوس ہوتی تو یہ جا کر دیکھ لیتے اگر کھجور لٹکے ہوتے تو کھالیتے ورنہ صبر و شکر ہی ان کی غذا تھی۔

بالفاظ دیگر اسلام کے عہد اول میں صفہ کی جو کیفیت تھی بعینہ وہی شان امام مہدی علیہ السلام کے پاس دائرہ میں ملتی تھی۔ اگر اس موقع پر کوئی یہہ کہے کہ ہم مندرجہ اصول کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ: (۱) اسلام شخصی ملکیت و ذاتی دولت کا مخالف نہیں ہے ورنہ احکامِ میراث قرآن میں مذکور نہ ہوتے۔ (۲) قرآن میں دولت خرچ کرنے کے طریقے اور حدود بیان کئے جاچکے ہیں۔ اسراف کی مذمت کی گئی ہے۔ اور کُل مال کو خرچ کر دینے کے بعد دونوں ہاتھوں کو گردن میں ڈالکر بیٹھ جانے سے منع کیا گیا ہے۔ (۳) وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ﴿القصص:۷۷﴾ کے ذریعہ دنیا کے حصے کو نہ بھولنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ اسلام میں شخصی ملکیت کی اجازت ہے، صحابہ کرام کے پاس شخصی جائیداد اور شخصی دولت ہوا کرتی تھی۔ لیکن قابل غور نکتہ یہہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی صحبت بابرکت میں رہنے کی وجہ سے صحابہ کے دل میں مال کی محبت نہیں ہوتی تھی۔ خدا کی عطا کی ہوئی دولت کو وہ اپنے زور بازو اپنی حسن تدبیر کا نتیجہ سمجھنے کے بجائے خدا کا عطیہ سمجھتے تھے۔ اُس پوری دولت میں سے خود کا حصہ صرف اس مقدار کو سمجھتے تھے جو ان کی سادہ زندگی کے لئے ضروری تھی۔ باقی کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ یہہ خدا کی امانت ہے اور وہ اس کے امین ہیں۔

پھر ان کو اس بات کی تعلیم دی جاچکی تھی کہ امانت میں خیانت کا نہ انہیں حق ہے۔ اور نہ اس جرم کی پاداش میں ملنے والی سزا سے وہ کسی طرح بچ سکتے ہیں۔ حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمان بن عوف اسلامی دنیا کے متمول ترین افراد میں شمار ہوتے تھے، لیکن اس کے باجود مال کے متعلق ان کا نظریہ وہی تھا جو ابھی ہم نے لکھا ہے۔ چنانچہ جب کبھی خدا اور اسکے رسول کی جانب سے اسلامی ضروریات کے لئے مطالبہ ہوتا تھا یہہ صحابہ سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ اور سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی حالت یہہ تھی کہ اگر ان کی پوری دولت ترازو کے ایک پلے میں اور خدا اور سول کی محبت دوسرے پلے میں رکھی جاتی تو یقیناً خدا اور رسول کی محبت والا پلہ ہی بھاری ہوتا۔ اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو لینے کا اختیار دیا جاتا تو لازماً وہ اپنی پوری دولت سے بخوشی دست کش ہو جاتے، انہیں ہرگز رنج اس بات کا نہ ہوتا کہ انہوں نے کیا چھوڑا بلکہ وہ مسرت سے لبریز ہو جاتے کہ انہوں نے غیر فانی دولت ایمان کا سرچشمہ پالیا ہے۔ اور اس کڑی آزمائش میں پورے ہوئے ہیں۔

ماحصل یہ کہ ان کو دولت سے محبت نہیں ہوتی تھی۔ اور ترکِ دنیا سے ہماری مراد بھی یہی ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کو حضرت امامنا وسیدنا مہدی علیہ السلام نے اسطرح بیان کیا ہے۔ اگر کسی کے پاس کنویں بھر سونا ہو اور اس کی طرف اس کا خیال نہیں جاتا تو وہ پکا تارک ہے۔ اور کسی کے پاس کچھ نہیں ہے اور اس کا پورا خیال پیسے میں ہے تو وہ پکا دنیادار ہے۔

امامنا کے اس فرمان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ترک دنیا کے معنی ترک محبت دنیا ہے۔ اور اس کا کامل تعلق دل سے

ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے متعلق یہہ نقل آئی ہے کہ ایک مرتبہ مجمع اصحاب میں آپ کو یہہ خبر سنائی گئی کہ آپ کے سامانِ تجارت کا جہاز سمندر میں ڈوب گیا۔ آپ نے تھوڑی دیر گردن جھکائی۔ اور پھر اوپر سر اُٹھا کر فرمایا "الحمد اللہ"۔ اس کے کچھ دن بعد پھر مجمع صحابہ میں کسی نے یہہ خوش خبری سنائی کہ جہاز ڈوبنے کی اطلاع غلط تھی۔ جہاز صحیح سالم بندر گاہ پر پہنچا، اور تجارت میں منافع بھی خوب ہی ملا۔ آپ نے پھر گردن جھکائی، سر اوپر اُٹھایا اور "الحمد اللہ" فرمایا۔ اصحاب کو حیرت ہوئی۔ دریافت کرنے پر فرمایا نہ تو مجھے جہاز ڈوبنے کا رنج ہوا نہ اس کی نفع بخش تجارت سے خوشی، بلکہ ہر موقع پر میں نے اپنے دل کو دیکھا۔ نہ پہلی خبر پر دل متغیر ہوا اور نہ دوسری خبر سے متاثر۔ دونوں موقعوں پر دل کی حالت یکساں تھی۔ دل کی اس حالت پر میں نے الحمد اللہ کہکر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ یہہ ہے ترک دنیا۔ قرآن میں میراث کے احکام کا پایا جانا ہمارے مطلب کے مخالف نہیں ہے۔ احکام میراث بیان کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دولت جو ایک شخص کے پاس جمع ہو کر رہ گئی ہو اس کے مستحقین میں تقسیم ہو کر وہ گردش میں آجائے۔ تاکہ پھر کوئی ایک شخص بطور وارث اس کا والی و مالک نہ بن سکے۔ اس لئے کہ دولت کا جمع ہو جانا شریعت کے پاس امر مستحسن نہیں ہے۔ اسلامی نظام معیشت میں تو ہر ممکن طریقے پر کوشش کی گئی ہے کہ دولت برابر چکر لگاتی رہے۔ چنانچہ آیت قرآنی ہے۔

لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ ﴿الحشر:۷﴾ تاکہ دولت کی گردش صرف تمہارے مالداروں میں ہی نہ ہوا کرے۔

اسی وجہ سے زکات کا حکم دیا گیا۔ اور اس کے لئے مال پر ایک سال گذرنے کی شرط لگائی گئی۔ اسی لئے زیورات پر بھی زکات کا حکم لگایا گیا۔ اس لئے کہ زیور منجمد دولت ہے، اور منجمد دولت نہ تو مالک کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اور نہ معاشرہ کو، بلکہ الٹے کثیر نقصانات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح حج کو بھی فرض گردانا گیا تاکہ مال سمیت ہر قسم کی محبت دل سے نکل جائے۔ سزاؤں کے باب میں غلام کو آزاد کرنا، مسکینوں کو کھانا کھلانا، دم دینا، مسجد بنانا، قرض حسنہ دینا، میراث کے احکام بیان کرنا، ماںباپ، اولاد اور بیویوں کے حقوق ادا کرنا وغیرہ اسی وجہ سے مشروع ہوئے کہ دولت ایک کے پاس جمع نہ رہے بلکہ دوسرے بھی اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

سویت (مال کی تقسیم): شریعت میں میراث کے احکام جو بیان کئے گئے ہیں ان کا مطلب یہہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پیچھے مال چھوڑ کر مرجائے تو وہ مال متروکہ سمجھا جائے گا۔ یعنی اس مال پر اب بجائے اُس کے شریعت کا قبضہ ہے۔ اور شریعت مال متروکہ کو اس کے رشتہ داروں میں باصـــول الأقرب فالأقرب تقسیم کرتی ہے تاکہ اس مال کے حصول کی خاطر پیدا ہونے والے فسادات اور باہمی رنجشوں کا بھی قلع قمع کیا جاسکے اور سارے مستحق رشتہ دار اپنی اپنی قرابت کے لحاظ سے مال

متروکہ سے اپنا مبینہ حصہ بھی پاسکیں۔ غرض کہ احکام میراث بیان کرنے کا مقصد میت کے رشتہ داروں اور متعلقین سے غصب، حق تلفی، قطع رحمی، جھوٹ، خیانت اور قتل جیسے امراض خبیثہ کو ختم کرنا ہے جو ایک شخص کے پاس مال جمع ہونے کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ میراث کے احکام بیان کرنے سے مقصود مالِ متروکہ کی متعلقہ افراد میں صحیح تقسیم ہے۔اس کا مطلب ہرگز یہہ نہیں کہ ہر شخص لازماً اپنے پیچھے مال چھوڑ کر مرے۔ بالفاظ دیگر مال متروکہ کی حسب قواعد شرعیہ تقسیم واجب ہے نہ کہ مال کو چھوڑ کر مرنا واجب ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حینِ حیات، ضرورتِ دین پر اپنی ساری پونجی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نذر گذار دی۔ اس سے بڑھ کر مثال ہمارے سامنے تو آنحضرت ﷺ کی ہے۔ آپ نے زندگی بھر کوئی مال جمع نہیں فرمایا۔حالانکہ آپ کو اس کے مواقع حاصل تھے۔ پھر جو مال چھوڑا اس کے متعلق یہہ فرمایا"ما ترکناہ صدقة"ہم نے جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے۔یعنی یہ عامۃ المسلمین کا حصہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نبی تھے۔ لیکن کسی نے نبی کے اس اسوۂ حسنہ کی اتباع کی تو کیا اسپر خلاف ورزی کا فتویٰ صادر کیا جائے گا۔

رہی دوسری بات یعنی قرآن میں مال خرچ کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں، اسراف سے روکا گیا ہے اور مال کو اس طرح خرچ کر دینے سے بھی منع کیا گیا ہے کہ اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن میں ڈال کر بیٹھنا پڑے۔ سو یہہ بھی ہمارے دعوی کے مخالف نہیں ہے۔ اسلئے کہ قرآن میں مال خرچ کرنے کے جو طریقے بیان کئے گئے ہیں وہ اتنے ہیں اور ایسے ہیں کہ اگر انسان ان کی کامل رعایت کرے تو شاید ہی مال کی محبت اس کے دل میں جگہ پاسکے۔ بلکہ شاید ہی مال کو جمع کرنے کا اس کو موقع حاصل ہو سکے۔ اس باب میں سب سے پہلا سوال تو یہی ہے کہ ہر ایک کو کتنا صرف کرنا چاہئیے، اس سلسلے میں قرآن کی دو آیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

(۱)وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ﴿البقرۃ:۲۱۹﴾ اے پیغمبر لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے کہ زیادتی خرچ کریں یعنی ضرورت سے فاضل مال خرچ کریں۔ اس آیت شریفہ کی تفسیر میں مفسرین نے بہت سی بحثیں کی ہیں۔ قرآن کے سیدھے سادھے انداز تخاطب سے اتنی بات تو ہر ایک کے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اپنی ہر قسم کی ضروریات سے جو چیز فاضل ہو اُسے صرف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔جب یہ بات ہوئی تو مال جمع ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوگا۔

(۲) وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴿الفرقان:۶۷﴾ وہ جب خرچ کرتے

ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ اسراف کرتے ہیں بلکہ اس کے درمیان ان کا خرچ اعتدال کا ہوتا ہے۔ اس آیت شریفہ میں خرچ کرنے کا طریق درمیانی یا اعتدالی بیان کیا گیا ہے۔ غرض کہ "عَفْوَ" اور "قوام" کو قرآن نے صرف دولت کا مدار اور معیار گردانا ہے۔ ظاہر ہے کہ عفو اور قوام کی حالتوں کے بیان سے رقم صرف کرنے کا تعین نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ضرورتوں سے فاضل حصے پر غور کرے اور اپنی اعتدال حالت پر نظر رکھتے ہوئے اس کو صرف کر دے۔ صرف کرنے والا اپنی وسعت کے موافق ہی اپنی دولت کو صرف کرے گا۔ ینفق ذو سعة من سعتهِ (طلاق) وسعت والا اپنی وسعت کے لحاظ سے صرف کرے۔ عفو اور قوام کی حدود سے جو بڑھ جائے گا البتہ وہ غیر معتدل کہلائے گا۔

قرآنی لفظ الْعَفْوَ بہت زیادہ غور کے قابل ہے۔ اس سے انسان کی ایمانی شان کا اظہار ہوتا ہے۔ جس شخص کے دل میں خدا، رسول، جہاد اور مذہبی ضرورت کا لحاظ قوی ہوگا وہ اپنی ضرورتوں کو بہت ہی مختصر کرے گا۔ بلکہ اپنی ضرورتوں پر بھی ان کو ترجیح دے گا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے جب اپنا پورا مال لا کر حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کیا تھا اس وقت آپ نے اپنے گھر میں کیا رکھا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جب آگے بڑھ کر پوچھا کہ گھر میں کیا رکھے ہو۔ جواب دیا گھر میں جو کچھ تھا یہاں لایا ہوں۔ اور اللہ و رسول کی محبت کو گھر میں رکھا ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسراف ہے اور حکم کی خلاف ورزی ہے۔

آپ نے تو اصل ضرورت ہی ان چیزوں کو سمجھا۔ اس لئے پہلے ان پر خرچ کر دیا۔ اگر خدا اور رسول کے اس مطالبے سے کچھ بچتا تو شاید وہ اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے رکھ چھوڑتے۔ کمال تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی سوائے تعریف کے اور کچھ نہیں کہا۔ پس معلوم ہوا کہ ضرورتوں اور ضرورتوں میں بھی فرق ہوا کرتا ہے۔ وقت ضرورت سب کچھ لٹانا ہی دولت کا مصرف ہے، دولت انسان کی جان کی آسائش و راحت کا ذریعہ ہے۔ وقتِ ضرورت کیا اسی کو خدا کی راہ میں قربان نہیں کیا جا سکتا۔

اسراف اور فضول خرچی یا تبذیر سے جو ممانعت آئی ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ مگر اس کی تعبیر کیا یہ ہوگی کہ کوئی اپنے مال کو جا و بے جا صرف کرے، ضرورت کی تکمیل کے لئے روپیہ پانی کی طرح اندھا دھند بہائے۔ اپنی جانب سے خواہ مخواہ آرائش و زیبائش کے سامان پر ضروریات کی طرح روپیہ خرچ کرے۔ اور ایسے کاموں پر روپیہ خرچ ہو جس سے کسی کو سوائے حظِ نفس یا شہرت کے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو البتہ ان سب صورتوں میں صرف کیا ہوا پیسہ حرام قرار پائے گا۔

لیکن جس مقام پر اپاہجوں، لنگڑوں، معذوروں، بیواؤں، یتیموں، محتاجوں، فقیروں اور مسکینوں کی فوج رہتی ہو کیا اپنی ضرورت سے فاضل دولت ان پر خرچ کی جائے تو اس پر بھی اسراف کا اطلاق ہو سکے گا۔ حضرت حسن نے حضرت

معاویہ کو جو لکھا تھا ”لَا إسـراف في خير“۔ اس کے پہلے حضرت معاویہ نے حضرت حسن کو روپیہ طلب کرنے پر لکھا تھا۔ ”لَا خيرَ في إسرافِ“۔

(۳) رہی تیسری بات قرآنی آیت ﴿وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص:۷۷) اس آیت شریفہ سے عام طور پر یہی استدلال کیا جاتا ہے کہ اس میں دنیا کو نہ بھولنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔

دنیا کو یاد دلایا گیا ضرور ہے مگر اس انداز میں نہیں جس انداز میں کہ لوگوں نے اُسے سمجھ رکھا ہے۔ قرآن کا جو انداز ہے وہ اپنی جگہ صحیح اٹل اور سب سے بڑھ کر دنیا سے متعلق بیان کردہ حقیقتوں سے کامل مطابقت رکھتا ہے۔ پچھلے صفحات پر ہم نے بیان کیا ہے کہ قرآن نے دنیا کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے، دنیا کے طالب اور اس کے مرید کے لئے کیسی کیسی وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ قرآن کے اس انداز بیان اور دنیا سے متعلق الہٰی نقطۂ نظر کو معلوم کرلینے کے بعد اس امر کا تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ خدا کبھی بھی دنیا کو یاد رکھنے کا حکم دے سکتا ہے۔!!

﴿وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص:۷۷) کے ذریعہ دنیا کو نہ بھولنے کا حکم تنبیہی ہے۔ اس کا مطلب یہہ ہے کہ اے مخاطب دنیا سے جو حصہ تجھے ملنے والا ہے اُسے مت بھول۔

انسان کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ چاہے تم دنیا کمالو آرام و عیش کی زندگی بسر کرلو لیکن خبردار اپنے اس حصے پر بھی ہمیشہ نظر رکھو جو دنیا میں فقط تمہارا بلا شرکت غیرے ہو سکتا ہے۔ یعنی دو گز کپڑا اور دو گز زمین۔ بس لمبی چوڑی دنیا سے انسان کو جو حصہ مل سکتا ہے وہ بس اتنا ہی ہے۔ اس سے زیادہ کے متعلق اس کا یہہ دعویٰ کہ یہہ ملک میرا ہے غلط ہے۔ نہ ملک اس کا، نہ حکومت اس کی۔ نہ دولت اس کی نہ جائیداد اس کی۔ اس کے مرنے کے بعد ہی وہ سب چیزیں دوسروں کی ملکیت میں آجاتی ہیں ۔ گویا کہ یہہ اس کی ملکیت میں تھی ہی نہیں۔ اس آیت میں اسی نقشہ کو پیش کیا گیا ہے۔

اس سے یہ استدلال کرنا کہ اس آیت میں دنیا کے حصے کو نہ بھولنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی دنیا اور اس کی ضرورتوں کو ہمیشہ یاد رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ خلاف اسلوب قرآن ہے۔

خلاصۂ بیان: خلاصہ یہہ کہ ترکِ دنیا سے مراد ترک حب دنیا ہے۔ ترکِ خواہش نفس ہے۔ ترک ادّعائے ملک ہے۔ اور یہہ حکم جو مہدی موعود علیہ السلام نے قرآنی آیات کی روشنی میں فرض فرمایا ہے کوئی نیا اور مہدی علیہ السلام کا ذاتی حکم نہیں ہے۔ بلکہ ترک دنیا کی فرضیت کے احکام کا ماخذ قرآن شریف ہے۔ مہدی علیہ السلام نے فقط ان کو دہرا کر ان کا بیان فرمایا ہے۔ اور اس اسوۂ حسنہ کا نقشہ پیش کیا ہے جس کی اتباع کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ یعنی ختمی مرتبت رسالت مآب محمد مصطفی ﷺ۔

اس کے بر خلاف ترکِ دنیا کی جو تشریح ہو گی وہ غلط تعبیر ہو گی۔ اگر غلط تعبیر پر سے کوئی اصول ترک دنیا پر معترض ہو تو یہہ اعتراض جواب دہی کے قابل نہیں ہو گا۔

اعتراض تو وہ صحیح ہو گا جو ترک دنیا کے اصول پر ہو۔ بعض تارکین دنیا کی غلط فہمی یعنی بعض لوگوں نے ترک دنیا کو غلط سمجھا اور اس کی غلط انداز میں فہمائش کی۔ یا ترکِ دنیا سے ان کی مراد کچھ اور ہے تو یہہ ان کا اپنا ذاتی مسلک ہے۔ اس مسلک پر سے ہمارے پیش کردہ ترکِ دنیا پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر کوئی ترکِ دنیا کو رہبانیت کے مساوی قرار دے تو یہہ قول صحیح نہیں ہو گا۔ اور یہہ ترکِ دنیا کی غلط تعبیر ہو گی۔ اگر کوئی ترکِ دنیا تو کرے لیکن دل سے مال کی محبت نہ گئی ہو تو یہہ ترکِ دنیا کی غلط تعبیر ہو گی۔ اگر کوئی ترکِ دنیا کا دعویٰ کرے لیکن وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کا غلام ہے، اس کا نفس فنا ہونے کے بجائے روز بروز باقی رہنے کی کوشش کر رہا ہے، جابجا اور بجا و بے جا طریقوں سے حاصل کی ہوئی ملکیتوں کا مالک بنا بیٹھا ہو، بنیوں کی طرح ان کے کرائے وصول کرتا پھرتا ہو۔ ان سے حاصل ہونے والی دولت کی دائروں کے مستحقین میں صحیح تقسیم نہ ہوتی ہو۔ یا ترکِ دنیا کے دعویٰ کرنے کے بعد اس دعویٰ کو توڑنے والے افعال کا مرتکب ہوتا ہو یا جس مقصد کے لئے دنیا ترک کرتا ہو وہ مقصد ہی سرے سے پیشِ نظر نہ ہو۔ بلکہ بطور پیشہ کے ترکِ دنیا کرتا ہو۔ یا حصول دولت یا جاہ و مرتبت یا پیری مُریدی کا ذریعہ سمجھکر ترکِ دنیا کرتا ہو تو خدا کے پاس اس ترک کی قیمت صِفر کے برابر ہو گی۔

آخری بات اس سلسلے میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ مہدویوں کے پاس ترکِ دنیا فرض ہونے سے یہہ خیال نہ ہو کہ شاید مہدوی کسب کو حرام سمجھتے ہیں۔ مہدویہ کے پاس کسب حرام نہیں ہے۔ جب اس بارے میں آنحضرت مہدی موعود علیہ السلام سے علماء نے پوچھا کہ کیا آپ کسب کو حرام قرار دیتے ہو آپ نے فرمایا مومن کے لئے کسب حلال ہے مومن ہونا چاہئیے۔ اور قرآن میں غور کرنا چاہئیے کہ مومن کسے کہتے ہیں (مولود صفحہ ۹۰)

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔ "بندہ بھی کہتا ہے کہ بامر اللہ و بحکم کتاب خدا مومن کے لئے ذکر اللہ فرض ہے۔ جو چیز مانع ذکر ہے وہ ممنوع ہے۔ کیا علم پڑھنا، کیا کسب کرنا کیا، مخلوق سے دوستی رکھنا، کیا کھانا، کیا سونا، غفلت حرام ہے اور جو چیز موجب غفلت ہے وہ بھی حرام ہے۔ (المہدی والعلماء صفحہ ۱۵)

لیکن جو لوگ بفحوائے آیت ﴿وَعَلَى اللَّـهِ فَتَوَكَّلُوا﴾ (المائدۃ:۲۳) حصول دیدار باری تعالیٰ اور اشاعت و تبلیغ دین کی جدوجہد میں اس درجہ مصروف ہوں کہ کسب معاش بھی نہ کرے تو یہ طریقہ کار بھی کسی طرح قابل مواخذہ نہیں بن سکتا۔ خصوصاً جب کہ آنحضرت ﷺ نے دعویٰ رسالت کے بعد اپنی معاش کے لئے کسی قسم کا کسب نہیں فرمایا۔

حدود اللہ

حد کے لغوی معنی کنارہ۔ سرحد احاطہ۔ باڑ یا وہ جگہ جہاں تک جانے کی اجازت ہے۔

حد کے ایک معنی اس سزاء کے بھی ہیں جو احکام شریعت کے مطابق کسی امر نامشروع پر دی جائے۔

قرآن شریف، کلام الٰہی ہونے کے ناطے انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس جامع الاصول کتاب میں ہر انسان کو ایک کامیاب اور خوشحال و مطمئن زندگی بسر کرنے کے حدود مقرر کر دئے گئے ہیں۔ اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ کہ اگر ان حدود سے آگے بڑھنے اور ان کو توڑنے کی بات تو کیا ان کے قریب بھی جانے کی کوشش کیجائے تو دنیا میں نقصان اور آخرت میں زبردست خسارہ ہو گا۔

یہ اللہ رحمان ورحیم کی مہربانی ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو کام کرنے کی آزادی دیتے ہوئے، حدیں بھی مقرر فرمادیں تاکہ دنیا میں بھی زندگی پُرسکون ہو اور اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (۱۱) گیارہ مقامات پر "حدود اللہ" کے الفاظ لائے ہیں۔ اور تاکید فرمائی ہے کہ ان حدود کو پھلانگنے سے احتراز کریں۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے۔أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا﴿البقرۃ:۱۸۷﴾ ترجمہ: روزوں کی راتوں میں حلال کر دیا گیا ہے اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے۔ وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کی پوشاک اللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے ہی حق میں خیانت کر رہے تھے سو اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور تم سے درگذر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں سے مباشرت کرو اور اللہ نے تمہارے لئے جو (اولاد) تجویز کر دی ہے اسکی آرزو کرو، کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری شب کی سیہ دھاری سے الگ نمایاں نظر آجائے۔ پھر رات تک اپنا روزہ پورا کرو اور جب تم مسجد میں اعتکاف کرتے ہو تو اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کے حدود ہیں ان کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔

اس آیت میں اللہ نے روزے اور روزہ داروں کے لئے چند حدود مقرر کئے ہیں اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ ان حدود کے قریب بھی نہیں جانا چاہئیے۔ کیوں کہ یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر کوئی حدود کے قریب چلا جائے گا تو پھر حدود پھلانگ بھی جائے گا۔

طلاق و خلع کے سلسلے میں بھی اللہ نے کچھ حدود مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے إِلَّا أَن يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّـهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّـهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّـهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّـهِ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿بقرہ:۲۲۹﴾ ترجمہ: بجز اس صورت میں کہ اگر میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ اگر تم کو اندیشہ ہے کہ وہ دونوں اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ایسی صورت میں عورت اپنی رہائی کیلئے شوہر کو کچھ دے ڈالے تو اسپر کچھ گناہ نہیں۔ یہ اللہ کے حدود ہیں پس تم ان سے آگے مت بڑھو۔ اور جو لوگ اللہ کے حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں وہی ظاہم ہیں

درج بالا آیت میں اللہ نے میاں بیوی کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں، دونوں پر اور ثالثوں پر کیا ذمہ داری آتی ہے اور اس سلسلے میں اللہ نے کیا حدود مقرر فرمائے ہیں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر ان کی خلاف ورزی کو اللہ تعالیٰ نے حدود اللہ کو توڑنے کا الزام ان پر عائد کرتے ہوئے ان کو ظالم قرار دیا ہے

فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّـهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّـهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴿بقرہ ۲۳۰﴾ ترجمہ: پس اگر شوہر (دو طلاق کے بعد تیسری) طلاق دے تو اس کے بعد جب تک وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس سے پہلے شوہر کیلئے حلال نہ ہو گی۔ پھر اگر دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے اور اگر یہ دونوں یہ خیال کرتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود قائم رکھ سکیں گے تو ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کے حدود ہیں جنھیں اللہ ان لوگوں کیلئے بیان کرتا ہے جو دانش رکھتے ہیں۔ مذکور بالا آیت میں اللہ نے طلاق مغلظہ کے احکام بیان کئے ہیں۔ اور ان کو حدود اللہ کے نام سے یاد فرمایا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حدود کا لحاظ کرنے اور ان کی پابندی کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّـهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴿توبہ ۱۱۲﴾ ترجمہ: وہ توبہ کرنے والے، بندگی کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا حکم کرنے والے اور بری باتوں سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے اور دوسرے مومنوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف پسندیدہ صفات کا ذکر کرتے ہوئے حدود اللہ کی حفاظت کرنے والوں کو بھی ان ہی لوگوں میں شامل کرتے ہوئے ان کی تعریف کی ہے۔

نیز سورۂ مجادلہ میں اللہ نے حدود اللہ کا ذکر اسطرح فرمایا ہے۔ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا فَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ذَٰلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّـهِ وَرَسُولِهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّـهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ

أَلِيمٌ﴿مجادلہ:۴﴾ ترجمہ: پس جس کو غلام (آزاد کرنے کیلئے) نہ ملے تو اُسے دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھنے ہیں ہم بستر ہونے سے پہلے اور جس کو اسکی بھی استطاعت نہیں ہے تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یہ (حکم) اس لئے ہے کہ تم اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لے آؤ اور یہ اللہ کے حدود ہیں۔ اور انکار کرنے والوں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ یہ آیت ظہار کے مسئلے سے تعلق رکھتی ہے۔

ظہار کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات ابدیہ (جن سے ہمیشہ نکاح حرام ہے جیسے ماں، بہن وغیرہ) کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دے جسکی طرف دیکھنا اسکو منع ہے جیسے یوں کہے کہ تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ، یا تو مجھ پر ایسی ہے جیسی میری بہن کی ران اس عورت سے اس شوہر کی مقاربت (ہم بستری) نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس کا کفارہ ادا نہ کر دے۔ اور وہ کفارہ ہے ایک غلام کو آزاد کرنا اگر اسکی استطاعت نہیں ہے تو مسلسل ساٹھ روزے رکھنا اور اگر اسکی بھی قدرت نہیں ہے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ کفارہ ادا کرنے سے پہلے جماع اور دواعی جماع یعنی بوس و کنار بھی جائز نہیں ہے کفارہ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ ایسے لوگوں کو نصیحت ہو، اور وہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کریں۔ اور دوسرے سننے والے بھی اس قسم کی حرکت سے دور رہیں۔

ایام جاہلیت میں اگر کوئی شخص اپنی عورت کو ماں کہہ دیتا تو وہ اس پر ہمیشہ کیلئے حرام ہو جایا کرتی تھی۔ اب حکم دیا جا رہا ہے کہ پچھلی جاہلیت کے دور کی باتوں کو چھوڑو اور اب اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ اور ان کے احکام پر عمل کرو۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ اللہ نے بعض معاشرتی معاملات میں جو احکام دئے ہیں، ان کو حدود اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور ان حدود اللہ کا انکار کرنے والوں کے لئے دردناک عذاب کی خبر بھی سنائی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک مومن کو اللہ کے حدود کی پوری پوری حفاظت کرنی چاہئیے۔

نیز اللہ تعالیٰ سورۂ طلاق میں بھی چند احکام بیان کرنے کے بعد ان کو حدود اللہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّـهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّـهِ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّـهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴿طلاق:۱﴾ ترجمہ: اے پیغمبر جب تم عورتوں کو طلاق دیتے ہو تو زمانۂ عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار کرو۔ اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے۔ نہ تو تم ہی ان کو (ایام عدّت میں) ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود ہی نکلیں۔ الا یہ کہ وہ کوئی صریح بے حیائی کریں (تو نکالا جا سکتا ہے) یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے طلاق، عدت اور اس سے متعلق احکام دئے ہیں۔ اور ان کو حدود اللہ کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ اور جو لوگ

حدود اللہ کو پھلانگنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو ظالم قرار دیا ہے۔ پس مسلمانوں کو چاہئیے کہ اللہ نے جن حدود کو بیان فرمایا ہے ان کی پابندی کریں۔

اسی طرح اللہ نے وصیت اور تقسیم میراث کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴿سورۂ نساء ۱۲، ۱۳، ۱۴﴾۔ ترجمہ: جو مال تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں تو اس میں سے تمہارا حصہ نصف ہے اگر ان کے اولاد نہ ہو اور اگر ان کے اولاد ہو تو تمہارا حصہ ترکے کا چوتھائی ہوگا۔ جبکہ وصیت جو انہوں نے کی ہے پوری کر دی جائے اور جو قرض انہوں نے لیا ہے ادا کر دیا جائے اور جو مال تم چھوڑ کر مرتے ہو تو اس میں سے ان کو ایک چوتھائی حصہ ملیگا اگر تمہارے اولاد نہ ہو۔ اور اگر تمہیں اولاد ہو تو اس مال کا آٹھوں حصہ ان کو ملیگا۔ یہ بھی تمہاری وصیت کے تعمیل اور تمہارے قرض کی ادائی کے بعد۔ اور اگر میراث ایسے شخص کی ہے خواہ وہ مرد ہے یا عورت جسکی نہ اصل ہے (ماں باپ) اور نہ نسل (بیٹے، بیٹی) مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ اجرائے وصیت اور ادائی قرض کے بعد کسی کا نقصان نہ کیا جائے۔

یہ اللہ کا فرمان ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے یہ اللہ کے حدود ہیں اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسکو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود سے متجاوز ہو جائے گا اللہ اسکو دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کیلئے ذلّت کا عذاب ہوگا۔

ان آیتوں میں بھی اللہ نے میراث کی تقسیم کے حدود بیان فرمائے ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرتے ہیں تو اللہ ان کو جنت عطا فرمائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے بر خلاف جو لوگ اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں گے اللہ ان کو دوزخ میں داخل کرے گا جہاں ان کو ذلت آمیز عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

حدود دائرہ

حدود دائرہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ترکِ دنیا: اس سے مراد (۱) ترکِ خودی (۲) ترکِ عزت (۳) ترکِ لذّت (۴) ترک شرک جلی و خفی (۵) ترک کفر ظاہری و باطنی (۶) ترکِ نفاق (۷) ترکِ رسم (۸) ترکِ بدعت (۹) ترکِ عادت (۱۰) ترکِ ریا (۱۱) ترکِ اخلاق ذمیمہ (۱۲) ترکِ گناہ ظاہری و باطنی

ترکِ حیات دنیا: اس سے مراد (۱) کھیل (۲) تماشا (۳) زینت (۴) باہمی فخر (۵) کثرت اولاد و اموال کی تمنا اور مظاہرہ۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا۔ أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ﴿الحدید:۲۰﴾۔

ترکِ متاع حیات دنیا: اس سے مراد (۱) عورتیں (۲) بیٹے (۳) چاندی کے ڈھیر (۴) سونے کے خزانے (۵) گھوڑے (۶) چوپائے (۷) کھیتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴿آل عمران:۱۴﴾۔

ترک علائق: اس سے مراد (۱) باپ (۲) ماں (۳) بھائی (۴) بیٹے (۵) بیویاں (۶) کنبہ (۷) مال (۸) تجارت (۹) مکان جبکہ یہ سب ایمان اور ہجرت کے راستے میں حائل ہوں۔

صحبت صادقاں (۱) تعلیم ذکر اللہ (۲) حصول علم معرفت (۳) اجماع (۴) سویت (۵) عشر (۶) امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۶) عزلت از خلق یعنی ماسوی اللہ سے پرہیز (۱) خلوت (۲) خاموشی (۳) غیر جنس سے نہ ملنا (۴) کوشش حصول عشق (۵) قید قدم یعنی دائرہ سے باہر نہ جانا۔

توکل (۱) ترکِ طمع (۲) ترکِ سوال (۳) ترکِ فتوح معینہ یا معلولہ (۴) ترکِ تدبیر (۵) تسلیم (۶) رضا (۷) صبر (۸) قناعت۔

ذکر کثیر و ذکر دوام: (۱) نوبت (۲) روزانہ بیان قرآن سننا (۳) اپنے اپنے حجروں میں پانچ پہر کی تکمیل کرنا (۴) رضا (۷) صبر (۸) قناعت۔

طلب دیدار خدا: یعنی حصول صفات طالب صادق (۱) اپنے دل کی توجہ بجز اللہ سے اُٹھالینا (۲) اپنے دل کی توجہ خدا کی

طرف لگائے رکھنا(۳) رات دن خدا کے دھیان میں لگے رہنا(۴) دنیا سے الگ ہو جانا(۵) خلق سے علیحدگی رکھنا(۶) اپنے سے نکل آنے کی کوشش کرنا۔

جہاد فی سبیل اللہ۔(۱) شمشیر آہن سے کفار کے ساتھ (۲) تیغ فقر سے نفس کے ساتھ۔

مندرجہ بالا امور کی اجماعی تشریح۔

ترکِ خودی: سیدنا مہدیؑ فرماتے ہیں خُدا اور بندے کے بیچ میں بندہ ہی کی ذات پردہ ہے (انصاف نامہ)

بندگی ملک الہداد خلیفہ ء گروہ رضی اللہ عنہ نے کعبۃ اللہ کی دیوار کے غلاف پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر خدا سے یہ التجا کی کہ "خداوند تیرے اور الہداد کے بیچ میں الہداد نہ رہے۔(دفتر دوم)

ترکِ عزت ولذت: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّـهِ جَمِيعًا﴿یونس:۶۵﴾ (سب قسم کی) عزت اللہ ہی کو سزوار ہے۔ سیدنا مہدی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ عزت اور لذت کو چھوڑو اور دم و قدم کی نگہبانی کرو۔ پھر فرماتے ہیں کہ عزت اور لذت نفس کے دو شہپر ہیں (انصاف نامہ)۔

کھانے پینے کی لذت کی نسبت فرماتے ہیں "تم کو بھوجن ہم کو پیو" (انصاف نامہ)

لذت لباس اور شوق ملاقات کی نسبت پوربی بھاشا میں فرماتے ہیں۔ چوپائی

پھاٹا پہریں ٹوکا کھائیں	راول دیول کبھو نہ جائیں

ہم رے آئی یاہی ریت	پانی لوریں اور مسیت

پھٹا پرانا کپڑا پہن لیں، روکھا سوکھا (اور کم) کھائیں، کسی وقت بھی امیروں کے گھر اور بت خانوں (غیر متشرع مکانوں میں) نہ جائیں۔ بس ہمارا طریق ہی ہے کہ (سفر اور حضر میں) پانی اور مسجد (یہ دو چیزیں) دیکھیں۔

لذت کتب بینی کی نسبت فرماتے ہیں "کتابوں سے خدا نہیں ملتا"۔ ذکر میں کوشش کرو تا کہ کچھ بھی حالت پیدا ہو۔

لذت سیر و تفریح کی نسبت فرماتے ہیں۔ "باہر کیا دیکھتے ہو سب کچھ تم میں ہے۔ اندر کی سیر کرو"۔

لذت کلام کی نسبت فرماتے ہیں۔ دینی باتوں سے بھی خدا نہیں ملتا۔ عمل سے ملتا ہے بس عمل کرو وغیرہ

ترکِ شرک خفی و جلی: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان الشرک لظلم عظیم۔ تحقیق کہ شرک بڑا ظلم ہے

شرک خفی کی نسبت امام علیہ السلام فرماتے ہیں۔ جو شخص خدا کو مقید دیکھے مشرک ہے۔ ما رأیت شیئاً إلّا و قد رأیت الله فیه کی نسبت فرمایا مقید دید ہے

ترکِ کفر ظاہری و باطنی: شریعت کے کفر تو ظاہر ہیں طریقت میں بڑا کفر یہی ہے کہ حق کو چھپائے اور اپنے کو ظاہر کرے۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿البقرۃ:۴۲﴾۔ اور مت ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ اور جانتے ہوئے حق کو مت چھپاؤ۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ فرماتے ہیں حق پوشی کفر ہے۔ اور سید نامہدیؑ نے اسی سلسلے میں یہ شعر پڑھا ہے

هر آنکه غافل از حق یک زماں است — درآں دم کافر است اما نہاں است

کسے کو غافل پیوستہ باشد — دراسلام بروے بستہ باشد

ترکِ نفاق۔ فرماتے ہیں بخل اور نفاق سے دین کو ہزیمت ہوتی ہے

ترکِ رسم: فرماتے ہیں مہدی کو خدا نے اس وقت بھیجا جبکہ دین کے معانی دنیا سے اُٹھ گئے تھے۔ معنی دین رسم ،عادت اور بدعت، ان تینوں باتوں سے چلے جاتے ہیں۔ (انصاف نامہ)۔ پھر فرماتے ہیں "دین عزیمت ہے رخصت نہیں ہے"

ترک عادت

ترکِ بدعت۔ پھر فرماتے ہیں ہر کہ رسم وعادت وبدعت کند اورا بہرہ از اینجانہ رسد۔

ترک ریاء۔ رخصت کسب و شہ گدائی کے ضمن میں سیدنامہدی علیہ السلام فرماتے ہیں "فقیر اگر بھوک سے بے قرار ہو گیا ہے تو ایک درم (چونّی) یا ایک دو چیتل (دو چار پیسے) کسب کر لے۔ یا شہ گدائی کرے۔ اگر اتنی بھی سوداگری یا کسب یا شاہ گدائی، عبادت کی غرض سے قوت لایموت یا لباس ستر عورت نہ ہو بلکہ ریا اور دنیاوی ریاست کے خیال سے کرتا ہو اور مقصود غیر خدا ہے تو باوجود سخت سخت ریاضت اور فاقوں کی شدت اُٹھاتے اور برہنہ رہتے ہوئے ہمیشہ کیلئے دوزخ میں رہے گا اور اس کا حال اس آیت کے مصداق ہوگا۔ مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ (ھود:۱۵﴾

ترکِ اخلاق ذمیمہ: نماز، روزہ، زکواۃ ذکر اللہ، حج عزلت، توکل، فقر علم وعظ وغیرہ جو کہ افعال حمیدہ ہیں اگر ریا اور شہرت کے ارادے یا کسی دنیاوی غرض سے کئے جائیں تو وہ اخلاق ذمیمہ میں شمار ہوں گے۔

ترکِ گناہ ظاہری وباطنی۔ ذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ﴿الأنعام:۱۲۰﴾ ظاہری اور باطنی گناہ چھوڑدو

سیدنا مہدیؑ فرماتے ہیں۔ ترجمہ: ہر روز اپنا دل دھو تارہ، کپڑے دھو یا مت دھو، دل غیر حق کے خیال کے پرہیز سے صاف ہوتا ہے۔ اے طالب خدا جب تک دیدارِ خدا سے دل روشن اور چشم بینا پیدا نہ ہو آرام اور بے فکری کی نیند سے مت سو۔ ترکِ حیات دنیا، ترکِ متاع حیات دنیا کے بارے میں دوسرے مقام پر تفصیل لکھدی گئی ہے۔ ترکِ علائق، ترکِ علائق کا حکم آپؑ نے اس آیت سے بیان فرمایا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّـهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّـهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّـهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴿التوبة:۲۴،۲۳﴾ ترجمہ: اے لوگو، جو ایمان لائے ہو اگر تمہارے باپ، تمہارے بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں تو ان کو دوست نہ بناؤ۔ اگر تم سے کوئی ایسوں سے دوستی رکھے تو ایسی ہی لوگ ظالم ہیں۔ آپ کہدیجئے کہ اگر تمہارے باپ، اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تم کو پسند ہیں (اگر یہ سب چیزیں) اللہ، اور اسکے رسول اور اللہ کے راستے ہیں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو (صبر) اور انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ کو جو کچھ کرنا ہے، کرے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح حکم دیا ہے کہ ایمانی رشتے کے مقابلے میں دیگر تمام دنیاوی رشتوں کو ہیچ سمجھو اور ضمناً اللہ اسکے رسول اور فی سبیل اللہ جہاد کے مقابلے میں دنیا کی تمام ان چیزوں کو جو انسان کیلئے محبوب ہوتی ہیں۔ ناچیز سمجھنے اور ان کو ترکِ کرنے کا حکم دیا ہے لیکن منجملہ دیگر آیتوں کے اس آیت کو بھی مفسرین اور مجتھدین نے منسوخ مانا ہے۔ لیکن مہدیؑ نے فرمایا۔

در قرآن ہیچ آیت منسوخ نیست وجملۂ معترضہ ومستانفہ ومعلّلہ وحرف زائد ہم نیست (انصاف نامہ باب پندرہ) یعنی قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور جملۂ معترضہ، مستانفہ، المعلّلہ اور حرف زائد بھی نہیں ہے۔

حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ فرماتے ہیں "حق بات کہتے رہو۔ اگر ہم سے اتباع نہیں ہوسکتی تو یہ قصور عمل ہے۔ بندگی میاںؓ نے یہ اس لئے فرمایا کہ جب لوگ آیات قرآن پر عمل آوری کو مشکل سمجھ کر اس سے اپنا دامن بچانے کی نیت سے قرآنی احکام کی تاویل کرلیا کرتے تھے اور مختلف علمی حیلوں سے اپنے آپ کو احکام قرآنیہ کے دائرے سے باہر کرلیا کرتے تھے

چنانچہ ایک حیلہ یہ بھی تھا کہ قرآنی آیت کو ہی منسوخ کہدیا کرتے تھے۔ اور اپنے کو اس سے بری کر لیا کرتے تھے۔ ایک شاعر نے ایسے ہی موقع کیلئے کہا ہے۔ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

حضرت مہدیؑ نے مفسرین اور فقہاء کی ان تمام موشگافیوں اور بد عنوانیوں کی تردید فرمائی اور ''بیان قرآن'' کا جو منصب اللہ نے آپ کو عنایت فرمایا تھا آپ نے اسکے تحت ''مراد اللہ'' کو بیان فرمایا۔ اسکی تشریح مختلف عنوانوں کے تحت آپ کو ملے گی انشاء اللہ۔

حقوق العباد

اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا۔وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴿النساء:٣٦﴾ ترجمہ:اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور قرابت داروں، یتیموں اور محتاجوں اور پڑوس میں رہنے والوں اور اجنبی ہمسایوں اور پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

(۱)الصدقة على القرابة صدقة و صلَةٌ۔رشتہ داروں پر خرچ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رُحمی بھی

(۲)ما زال جبريل يوصيني بالجارحتىٰ خَشيتُ ان يورّثه۔حضرت جبرئیلؑ پڑوسی کے تعلق سے مجھے اس قدر وصیت کرتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید وہ پڑوسی کو وارث بنادیں گے۔

اس طرح آپ فرماتے ہیں کہ کسی عمل کا صلہ دنیا میں اتنا جلد نہیں ملتا جتنا کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے ملتا ہے۔

قرآن کی آیتوں اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رُحمی سے انسان کی روزی میں برکت ہوتی ہے اور اسکی عمر بھی بڑھتی ہے۔کیونکہ ان رشتہ داروں کی دعائیں اسکے شامل حال ہوتی ہیں۔

پڑوسیوں کے حقوق درج ذیل کئے جاتے ہیں۔پڑوسی بیمار ہو تو اسکی مزاج پرسی کرنی چاہئے۔جب اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو اسکی تعزیت و تسلی کرے اس کی خوشی میں شریک ہو، ہاتھ بٹائے، مبارکباد کہے۔سب سے بُڑا حق یہ ہے اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے یا ہم کو کوئی نقصان پہنچے تو درگذر کرے۔اس سے بدلہ لینے کا خیال نہ کرے۔گھر میں کچھ لائے تو اس سے چھپا کر لائے۔یا اس میں سے کچھ حصہ اسکو دے۔اس کے رازوں کو معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے۔اگر معلوم ہو جائے تو دوسروں تک نہ پہنچائے۔وہ مکان پر نہ ہو تو اسکے گھر کی دیکھ بھال کرے۔اسکی عورتوں پر نظر نہ ڈالے۔اس کے بچوں پر مہربانی کرے۔پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسکی طرف سے اگر کچھ زیادتی ہو جائے تو اسکو برداشت کرے اور انتقامی کارروائی نہ کرے۔چنانچہ ایک صحابی نے حضور ﷺ کے سامنے آکر اپنے پڑوسی کی شکایت کہ وہ تکلیف دیتا ہے۔آپ نے فرمایا صبر کر۔پھر دوبارہ اس نے شکایت کی پھر تیسری مرتبہ انہوں نے ایسا ہی کیا آپ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا صبر کر چوتھی بار آپ نے

فرمایا کہ اپنے گھر کا سامان نکال کر راستہ پر ڈال دو۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا لوگ آتے اور وجہ پوچھتے تو وہ صحابی کہہ دیتے کہ میرا پڑوسی مجھے تنگ کر رہا ہے۔ گھر میں سکون سے رہنے نہیں دیتا۔ حضور کے حکم پر میں نے ایسا کیا ہے۔ یہ سن کر لوگ اس پڑوسی کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ یہاں تک کہ پڑوسی خود بھی تنگ آگیا۔ اپنے آپ پر ملامت کرنے لگا اور نہایت شرمندگی سے کہا بھائی۔ اپنا سامان آپ اپنے گھر میں رکھ لو۔ خدا کی قسم میں آپ کو کبھی تکلیف نہیں دوں گا۔

حظیرہ

قوم مہدویہ میں قبرستان کیلئے "حظیرہ" کا لفظ زیادہ رائج ہے۔ اس میں "حظیرۃ القدس" کے معنی کی رعایت معلوم ہوتی ہے (کحل الجواہر حصہ دوم ص ۱۶۴ احاشیہ)۔ حظیرۃ القدس کی شرح "حجة الله البالغه" میں اسطرح کی گئی ہے۔ وافاضلهم تجتمع انوارهم، و تتداخَلُ فيما بينها عند الروح الّذى و صفه النبيّ ﷺ بكثر الوجوه والألْسِنةِ فتصير هنالك كشیء واحد و تسمّٰى "حظيرة القدس" (شاہ ولی اللہ دہلوی)۔ حظیرہ کے لغوی معنی ہیں باڑھ، گھر کا صحن، مکان کے آگے کی وہ جگہ جہاں مسافر آتے وقت اپنا سامان رکھتا ہے۔ اور قدس کے معنی ہیں پاکیزہ۔ پس حظیرۃ القدس کے معنی ہیں پاکیزہ باڑھ، اردو میں اسی کو "دربار" اور بارگاہ عالی کہتے ہیں اور کبھی دربار اور بارگاہ عالی بول کر "اللہ کی ذات مراد لیتے ہیں (رحمۃ اللہ الواسعہ۔۔۔ ص ۲۱۵) اولیاء اللہ اہل دل بلکہ اہل اللہ کو جہاں دفن کیا جاتا اس جگہ کو ہمارے پاس "حظیرہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مریدین اور معتقدین کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کو ان ہی کے حظیرہ میں دفن کیا جائے۔

اور جہاں اولیاء اللہ اور فرشتہ صفت بزرگ نہیں ہیں تو اسکو قبرستان کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

حجاب

حجاب کے معنی پردہ کے ہیں۔ قرآن شریف میں یہ لفظ سات مقامات پر آیا ہے۔ ان تمام مقامات پر حجاب کے معنی پردہ کے ہی ہیں اور پردہ وہ چیز ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے۔

(۱) وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ﴿الأعراف:۴۶﴾ ترجمہ: ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو اسکی علامت سے پہچان لیں گے۔

(۲) فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَن ذِكْرِ رَبِّي حَتَّىٰ تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿ص ۳۲﴾۔ ترجمہ: میں مال کی محبت میں لگ کر میرے رب کی یاد سے غافل ہو گیا۔ یہاں تک کہ (آفتاب) پردے میں چھپ گیا۔

(۳) وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ﴿الاحزاب ۵۳﴾ ترجمہ: جب تم پیغمبر کی بی بیوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کیلئے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔

اس آیت کے ذریعہ مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے گھر میں بے دھڑک جانے سے منع کر دیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ اگر کوئی چیز مانگنی بھی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگنا چاہیئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی ضرورت کے تحت مسلمان عورتوں کو اگر گھروں کے باہر جانا پڑے تو حکم دیا کہ اپنے اوپر چادر لٹکا لیا کریں یہ بات ان کیلئے زیادہ شناخت کا موجب ہوگی تو کوئی ان کو نہ ستائے گا۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿الاحزاب ۵۹﴾۔ ترجمہ: اے پیغمبر آپ اپنی بیویوں سے اپنی بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدیجئے کہ وہ (باہر نکلیں تو) اپنے اوپر چادر لٹکا لیا کریں۔ یہ بات ان کیلئے زیادہ شناخت کا موجب ہوگی تو کوئی ان کو نہ ستائے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ مشرکین اور منافقین کی عادت تھی کہ خواہ مخواہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے بارے میں برا بھلا کہتے، ان پر تہمتیں لگاتے۔ اور جب وہ ضرورت کے تحت گھروں سے باہر نکلتیں تو ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اسطرح مسلمانوں کو ایذاء پہنچاتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا تو کہہ دیتے کہ ہم نے پہچانا نہیں ہم کوئی عام عورت سمجھے تھے۔ تو ایسے مفاسد کے سدّباب کیلئے عام طور پر تمام عورتوں کو حکم دیا گیا کہ بدن تو

چھپا رہتا ہے اب اپنی دامینوں کو بھی چہروں پر لٹکالیں تا کہ شریروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شریف زادیاں ہیں۔ نیک بخت اور پارسا ہیں۔ پھر ان کو چھیڑنے کی ہمت نہ ہوگی۔ پس یہ حکم دیا گیا کہ جب باہر نکلیں تو گھونگٹ نکال لیا کریں۔

اسکے باوجود اگر بد نظر، منافق اور حرام کاری کے روگی اور مدینہ میں جھوٹی خبریں اُڑانے والے اپنی بُری حرکتوں سے باز نہ آئیں تو اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے تا کہ آپ ان کو مدینہ سے نکال دیں اور اگر چند دن وہ رہیں گے بھی تو ملعون اور ذلیل ہو کر رہیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَّئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا مَّلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ﴿الأحزاب:۶۱،۶۰﴾ ترجمہ: اگر منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق ہے اور جو لوگ مدینہ میں جھوٹی افواہیں اُڑاتے ہیں۔ باز نہ آئیں تو ہم ضرور آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے پھر یہ لوگ آپ کے پڑوس میں بجز چند دنوں کے نہ رہ سکیں گے وہ بھی پھٹکارے ہوئے۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑ دھکڑ ہوگی اور جان سے مار دئے جائیں گے۔

آج دفتروں میں بازاروں میں۔ بسوں میں ہوائی جہازوں میں، کالجوں اور اسکولوں میں بے حیائی، فحاشی، چھیڑ چھاڑ اور جنسی بے اعتدالیوں کے جو طوفان اُٹھ رہے ہیں ان کا سدّباب صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ پہلے وارننگ دیں۔ پھر شہر بدر کریں اور آخر میں ان کو پکڑیں اور ان کا کام تمام کریں۔ قرآن شریف میں تو یہی نسخے ان امراض کیلئے بتائے گئے ہیں۔ لیکن آج کا مغرب زدہ معاشرہ نہ تو عورتوں کو پردہ میں رکھتا ہے۔ اور نہ عورتوں کی عزت سے کھیلنے والوں کو سخت سزا دیتا ہے۔ نتیجہ یہی ہے کہ بے حیائی فیشن بن گئی ہے اور حرام کاری فطرت ثانیہ۔ بجز ان افراد کے جنہیں اللہ رسول اور قرآن کے احکام کا پاس ولحاظ ہے۔ اور اپنی عزت پیاری ہے۔

حیات بعد الموت

حیات اور موت دونوں لازم وملزوم ہیں۔ جہاں حیات ہے وہیں موت کا آنا بھی برحق ہے اور جہاں موت ہے کیا پھر وہاں حیات آتی ہے۔ اس تعلق سے لوگ مختلف الخیال بلکہ مختلف العقیدہ ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ موت ذی حیات کی زندگی کی انتہاء ہے۔ مرتے ہیں پھر مٹ جاتے ہیں اسکے بعد پھر زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مگر اہل حق کا کہنا ہے کہ موت انجام اور انتہاء نہیں ہے۔ بلکہ وہ نئی زندگی کا آغاز ہے۔ موت خواب گراں نہیں ہے بلکہ خواب غفلت سے بیداری کا نام ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ الناسُ نیامٌ اذا ماتوا اِستیقظوا۔ ترجمہ: لوگ سورہے ہیں جب موت آئے گی تو بیدار ہوں گے۔ گویا اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ موت کے بعد ایک بہت ہی طویل اور نہ ختم ہونے والی زندگی انکا انتظار کررہی ہے۔ جس میں یا تو ان کے لئے ابدی نعمتیں ہوں گی یا پھر حسب اعمال دردناک عذاب ہوگا۔

اُخروی زندگی ہی درحقیقت حقیقی زندگی ہے۔ کوتاہ نظر لوگ اُسے دیکھ نہیں سکتے اور ناقص عقل والے اس کے بارے میں دی گئی اطلاعات پر یقین نہیں کرتے۔ لیکن دیدۂ بینا رکھنے والا اور عقل اور ادراک کی دولت سے بہرہ یاب شخص اچھی طرح سمجھتا ہے کہ انسانی زندگی کے کئی مراحل ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہی انسان اپنے آپ میں سمٹا سکڑا بطن مادر میں پوشیدہ اور اس چھوٹی سی دنیا کی پناہ میں زندہ تھا۔ اور اسی بطن مادر کے اندر کی زندگی کو "زندگی" سمجھتا تھا اگر اسکو وہاں سے نکالنے کی بات اس سے کی جاتی تو انکار کردیتا اور اسکو اپنی موت سمجھتا۔ (مگر چونکہ وہ اس حالت میں نہیں تھا) یعنی نہ سمجھ سکتا نہ بول سکتا تھا، اس لئے خاموش تھا۔ مگر اتنا تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ باہر آتے ہی رونا شروع کردیتا ہے۔ اب اس کے دو ہی مطلب ہوسکتے ہیں کہ یا تو وہ اپنی جنت سے جہاں وہ آرام سے تھا نکالے جانے پر روتا ہے یا یہ کہ اس دنیا میں جو دار التکلیف ہے، دھکیلے جانے پر روتا ہے۔ حالانکہ یہ اسکی ولادت ہے۔ یعنی بطن مادر کے تنگ وتاریک ماحول سے ایک وسیع روشن اور آرام دہ ماحول یعنی دنیا میں آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم مرنے کو اس دنیا سے نکالا جانا خیال کرتے ہیں۔

وہ بھی درحقیقت ہماری ایک نئی ولادت ہے اور بہت ہی پُر آسائش دنیا کی طرف یعنی عالم برزخ کی طرف منتقل ہونا ہے۔ عالم برزخ جو اس مادی اور فانی دنیا اور اخروی ابدی جہاں کے مابین ایک پڑاؤ ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ موت جسم کو آتی ہے۔ جسم کیا ہے انسان کی قمیص جب بوسیدہ اور میلی ہوجاتی ہے تو اُسے اتار دیا جاتا ہے۔ یا جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس پر لپٹا خول (آنول) ہٹا کر ضائع کردیا جاتا ہے۔ دراصل یہ جسم ایک قمیص سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جسے پہنا جاتا ہے اور اتار دیا جاتا ہے۔ آدمی مرتا ہے تو صرف جسم مٹی میں دفن کیا جاتا ہے۔

کافر صرف اس عارضی زندگی کی حفاظت کرتا ہے لیکن مومن پہلے موت کی تیاری اس طرح کرتا ہے کہ اللہ کے حضور توبہ واستغفار کرتا ہے اور لوگوں کے حقوق ادا کر کے ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ پھر آخرت کو یاد رکھتا ہے اور اس دن سے خائف رہتا ہے جس دن چہرے بدل جاتے ہیں اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ آخرت یقینی ہے خواہ کوئی مانے یا نہ مانے انسان کو اس سے دو چار ہونا ہی پڑتا ہے۔ پھر انسان نے دنیا میں جو کچھ کیا اس کا حساب ہوتا ہے۔ اچھے اعمال اور نیکیوں کی جزا ملتی ہے اور غلط اعمال اور گناہوں کی سزا ملتی ہے۔

حدیث کے اُصول اور اصطلاحات

سید شریف جرجانی نے اپنے ایک رسالہ بنام اُصول الحدیث میں یہ اُصول اور اصطلاحات لکھے ہیں۔

متن حدیث: اس سے مراد حدیث کے الفاظ ہیں۔

حدیث۔ عام ازیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہو کہ فعل۔ اسی طرح صحابی یا تابعی کے قول و فعل پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے

سند۔ ایک حدیث کے راویوں کے سلسلے کو سَنَدْ کہتے ہیں

اِسناد۔ حدیث کو اس کے قائل تک پہنچانے کو اسناد کہتے ہیں

حافظ۔ وہ شخص ہے جس کا علم ایک لاکھ حدیثوں کا احاطہ کیا ہے

الحجۃ۔ وہ شخص ہے جس کا علم تین لاکھ حدیثوں کا احاطہ کیا ہے

الحاکم۔ وہ شخص ہے جس کا علم تمام حدیثوں کا احاطہ، متن، اسناد، جرح، تعدیل اور تاریخ کے اعتبار سے کیا ہے

خبر متواتر۔ جس کی روایت (ہر دور میں) کثرت کے اعتبار سے اس مقام کو پہنچ چکی ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق محال ہو۔ جیسے قرآن، اور پنجوقتہ نمازیں۔

آحاد۔ جو تواتر کی حد تک نہ پہنچے۔ اور وہ مستفیض (مشہور) بھی ہو سکتی ہے یا اسکے سوا بھی حدیث پر جو حکم لگایا جاتا ہے وہ متن حدیث کی بناء پر نہیں بلکہ اسکے اسناد کی بناء پر ہے۔ یعنی قوت اور ضعف یا بین بین۔ اس میں راویوں کے اوصاف یعنی عدالت، ضبط، حفظ کے ہونے یا نہ ہونے کا لحاظ کیا جاتا ہے یا اسناد کے اعتبار سے یعنی اتصال، انقطاع، ارسال اور اضطراب، پس حدیث ان وجوہ کی بناء پر صحیح، حسن اور ضعیف کہلاتی ہے۔ یہ تقسیم اس وقت ہوتی ہے جب متن کی طرف نظر کی جاتی ہے۔ لیکن جب نظر رایوں کے اوصاف کی طرف جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ ثقہ، عادل، ضابط ہے یا غیر ثقہ ہے۔ یا متہم ہے یا مجہول ہے یا جھوٹا ہے۔

حدیث کے اقسام اور انواع۔

الصحیح۔ وہ حدیث جس کی سند متصل ہو یعنی اسکو عادل اور ضابط نے نقل کیا ہو اور اس میں کسی قسم کا شذوذ یا کوئی اور

علت نہ ہو۔ اور متصل سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی بھی وجہ سے مقطوع نہ ہو۔ عدل سے مراد یہ ہے کہ وہ نہ تو مستورالعدالت ہو اور نہ مجروح ہو۔ اور ضابط سے مراد یہ ہے کہ وہ حافظ بیدار مغز ہو۔ شذود سے مراد وہ روایت ہے جس کو ثقہ، لوگوں کی روایت کے خلاف روایت کرتے ہوں۔ اور علت سے مراد کچھ ایسے اسباب اس میں ہوں جو چھوٹے ہوں مگر قدح کرنے والے ہوں۔ صحیح کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے امام بخاریؒ نے اور اسکے بعد امام مسلمؒ نے اپنی کتابیں لکھیں۔ اور دونوں کتابیں، کتاب اللہ کے بعد اصح الکتب ہیں۔ لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے مالک کی کتاب موطا سے زیادہ صحیح تر کتاب، اللہ کی کتاب کے بعد نہیں دیکھی۔

حَسَن۔ وہ حدیث جس کی اِسناد میں کوئی متّھم نہ ہو۔ اور نہ وہ شاذ ہو۔

ضعیف۔ وہ حدیث ہے جس میں صحیح اور حسن کے شروط جمع نہ ہوں۔

متصل۔ وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہے خواہ وہ رسول اللہ ﷺ تک مرفوع ہو یا موقوف ہو۔

مرفوع۔ وہ حدیث ہے جسکی نسبت رسول اللہ ﷺ تک ہو۔ قولاً یا فعلاً یا تقریراً۔ خواہ وہ متصل ہو کہ منقطع ہو۔ پس متصل کبھی مرفوع بھی ہو سکتی ہے اور کبھی غیر مرفوع بھی۔ اور مرفوع کبھی متصل بھی ہو سکتی ہے اور غیر متصل بھی۔ اور مسند وہ ہے جو متصل بھی ہو اور مرفوع بھی۔

مُعَنْعَن۔ وہ روایت ہے جس کی سند میں فلان عن فلان کہا جاتا ہے

معلق۔ وہ روایت ہے جس کے مبدأ اسناد میں ایک راوی حذف کر دیا گیا ہو۔ پس اول اسناد میں حذف ہوا ہے تو وہ معلّق ہے اور اگر درمیان میں ہوا ہے وہ منقطع ہے۔ اور اگر آخر میں ہوا ہے تو وہ مرسَل ہے۔

مُدرُج۔ حدیث میں بعض راویوں کا کلام درج کیا جائے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی حدیث کا حصہ ہے۔

مشہور۔ وہ روایت جو بالخصوص صاحبان حدیث کے پاس یوں مشہور ہے کہ اسکو کثیر راویوں نے نقل کیا ہے۔ جیسے انما الاعمال بالنیّات۔ یا جیسے امام احمد نے کہا حدیث۔ للسائل حق وان جاءَ علی فرسٍ (مانگنے والے کا بھی (صدقہ میں) حق ہے اگر چہ وہ گھوڑے پر ہو۔

غریب اور عزیز۔ اگر کسی سے حدیث عدالت اور ضبط کی وجہ سے لیجاتی ہے لیکن لینے والا منفرد ہے اس حدیث میں تو اسکو غریب کہتے ہیں لیکن اگر اس سے دو یا تین افراد روایت کریں تو اس کو عزیز کہا جاتا ہے۔ اور اگر ایک جماعت اس سے

روایت کریں تو اسکو مشہور کہتے ہیں۔

موقوف۔ وہ روایت ہے جو کسی سے مروی ہو خواہ متصل ہو کہ منقطع۔ اور ایسی روایت حجت نہیں ہے۔

مقطوع۔ تابعین سے جو روایت قولاً یا فعلاً آئی ہے۔ یہ بھی حجت نہیں ہے۔

مرسَل۔ قول تابعی ہے جو کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا۔ یا ایسا کیا

منقطع۔ وہ روایت ہے جس کی اسناد متصل نہیں ہے خواہ وجہ کچھ بھی ہو،

مدلس۔ جس میں راوی نے اپنے کسی عیب کو چھپایا ہے۔ خواہ وہ اسناد میں ہو۔ جیسے وہ اپنے کسی ایسے معاصر سے کوئی روایت بیان کرے جس سے اس نے وہ روایت نہیں سنی، اس انداز میں کہ سننے والا یہ سمجھے کہ اس نے اس سے سنا ہی ہو گا۔ ایسے شخص کے لئے حدثنا کہنا صحیح نہ ہو گا۔ اسکو چاہئے کہ وہ اسطرح کہے قال فلان۔ یا فلاں سے اسطرح روایت آئی ہے وغیرہ۔

حقوق

کسی بھی معاشرہ میں امن وامان اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب معاشرہ کا ہر فرد وہ حقوق ادا کرتا رہے جو اس پر دوسرے کے تعلق سے واجب ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان حقوق کی ادائی میں فرق پڑ جاتا ہے یا ڈھیل ہوتی ہے تو معاشرہ میں فساد رونما ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے اسی غرض سے قرآن شریف اور احادیث رسول ﷺ میں حقوق کی ادائی پر زور دیتے ہوئے حقوق کا بیان فرمایا ہے۔ جن کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

جس طرح اولاد پر والدین کے حقوق عائد ہوتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زائد حقوق اولاد کے والدین عائد پر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ دنیا میں اولاد پہلے آتی ہے جب والدین اپنی اولاد کے حقوق صحیح طریقے پر ادا کردیں تو پھر اولاد سے بھی یہی قومی اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی والدین کے حقوق کی پاس داری کریں گے۔ لیکن اگر والدین اولاد کے تعلق سے اپنے پر عائد حقوق سے بے پروائی یا غفلت برتیں گے تو لازماً اولاد بھی وہی شیوہ اختیار کرے گی اسلئے والدین کو چاہئے کہ اللہ نے جب انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا ہے تو وہ اس نعمت کی قدر کریں۔ قدر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ ان سے غیر معمولی پیار و محبت کریں۔ ان کی ہر ضد کو اور ہر مانگ کو پوری کریں۔ اچھے سے اچھے کپڑے پہنائیں۔ اچھے کھانے کھلائیں اور منہ مانگے روپیے دیں۔ یہ بھی کریں مگر اللہ اور اسکے رسولؐ نے ان کی تربیت کے تعلق سے جو احکام دئے ہیں ان کی بھی پوری پوری رعایت کرنی چاہئے۔ چنانچہ ماں باپ پر اولاد کے تعلق سے بنیادی حقوق یہ ہیں۔

(۱) بچہ پیدا ہو تو پہلے اس کے سیدھے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہیں۔ اور یہ کام کسی بزرگ اور پارسا شخص سے کرائیں تاکہ بچے پر اچھے اثرات ہوں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بچہ تو ابھی پیدا ہوا ہے۔ اذان اور اقامت کہنے سے اُسے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ تو آواز بھی برابر سن نہیں سکتا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو اس کا ذہن اور دل بالکل کورا ہوتا ہے جس طرح سلولائڈ کی ریل رہتی ہے اور جب سی ڈی میں ریل رکھی جاکر بٹن آن کردیا جاتا ہے تو جو کچھ بات ہوتی ہے وہ اس ریل میں محفوظ ہوجاتی ہے اگرچہ ریل اس سے متاثر نہیں ہوتی۔ پھر جب ہم دوبارہ سننا چاہیں تو بٹن آن کرنے کے ساتھ ہی وہی آواز ہمیں سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح بچے کا ذہن بھی اسکو قبول کرلیتا ہے۔ اور دھیرے دھیرے اس کا اثر بچے پر برابر پڑنے لگتا ہے۔ اس طرح گھر والوں کو بھی یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر حال میں انسان کو نماز کا دھیان دینا چاہئے۔ اور بچے کی پیدائش پر ہی خدا کے شکر کی اس سے اچھی کیا صورت ہوسکتی ہے کہ اذان اور اقامت کہی جائے۔ اللہ اور اسکے آخری رسولؐ کی گواہی دی جائے اور نماز کی دعوت دی جائے۔

(۲) پھر اس بزرگ سے تحنیک کروائے۔ یعنی کھجور چبا کر بچے کہ منہ سے لگائیں تا کہ وہ اُسے چوس لے۔ یہ بھی حضورؐ کی سنت ہے۔

(۳) بچہ کا نام رکھا جائے۔ اللہ کے ناموں میں سے ہو مگر اس کے ساتھ "عبد" کا اضافہ کریں۔ جیسے عبد اللہ، عبد الرحمان، عبد الرحیم وغیرہ اسی طرح انبیاء کرام اولیاء عظام اور بزرگان دین کے ناموں پر رکھا جائے اس لئے کہ بچے کی زندگی پر نام کا بھی اثر پڑتا ہے۔

(۴) پیدائش کے ساتویں دن بچہ ہو تو ختنہ بھی کرا دیں اور گنجائش ہو تو عقیقہ بھی کر دیں۔

(۵) والدین جب بچہ بات سننے سمجھنے اور ہماری کہی ہوئی بات کو دہرا سکتا ہو تو اسلامی آداب سکھائیں۔ چھوٹی موٹی دعاؤں کی تعلیم دیں اور جب چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہو جائے تو مکتب میں بٹھائیں اور اسکی تسمیہ خوانی کریں۔ تا کہ اسی عمر سے قرآن شریف پڑھنے کی دُھن میں لگ جائے۔ اور سورۂ فاتحہ سے ابتداء کی جائے۔ اور کسی بزرگ سے یہ کام لیا جائے ، اور جب بچہ اپنی معصوم زبان سے اللہ کی تعریف کرے۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کے ساتھ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا کر کے وَلَا الضَّالِّينَ پر پہنچے تو سب حاضرین اسکے ساتھ آمین کہیں۔ تا کہ بچے کو بھی اور آمین کہنے والوں کو بھی اللہ صراط مستقیم پر چلائے اور الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کے راستے سے بچائے۔ اور پھر دینی تعلیم کا انتظام کریں کھانے پینے کے آداب، والدین اور اُستاد، بزرگوں اور مرشد کے آداب کی تعلیم بھی دیا کریں تا کہ بچہ آداب سے واقف ہو جائے۔

ماں باپ بچے کے سامنے اچھی زبان استعمال کرتے رہیں تا کہ بچہ حقیقت میں اپنے والدین کی نقل کرتا ہے۔ پس جیسے ماں باپ ہوں گے بچہ بھی ویسا ہی ہو گا۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے، Man is Manners۔ بس اس کا ہمیشہ خیال رکھیں، اچھی صحبت میں رکھیں اور بچے کو سونے کا نوالہ کھلائیں مگر اس پر شیر کی نظر رکھیں۔ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسکو نماز پڑھنے کا حکم دیں۔ اور اس کا بستر الگ کر دیں۔ اور جب وہ دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اسکو ماریں تا کہ مار کے ڈر سے نماز پڑھنے لگ جائے۔

(۶) اور جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائے تو اچھی طرح جانچ پڑتال کے بعد دینی گھرانے میں اسکی شادی کر دیں۔

حکم عدولی

خدا کی حکم عدولی اور اس سے سر تابی۔

معترضوں کا اعتراض کہ مہدی موعودؑ نے خدا کی حکم عدولی اور اس سے سر تابی کی ہے۔ جبکہ اوّل وھلہ میں حکم کی بجا آوری اور تعمیل ارشاد کرنی چاہئے تھی تو اس پر ایک دو منٹ نہیں ایک دو ماہ سال نہیں بلکہ پورے اٹھارہ سال گذر گئے تو خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی کیا کسی بر گزیدہ بندہ کو جائز ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ہمیشہ اعتراض کی بنیاد کسی شخص کے قول یا اس کی رائے پر نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ اعتراض کسی مستند کتاب کے حوالے سے کیا جاتا ہے آپ کے اعتراض کی بنیاد ایک ماہنامہ میں ایک مضمون نگار کے ایک جملے پر ہے۔ وہ بھی سیاق وسباق سے عاری۔ اگر آپ نے واقعہ پورا لکھا ہوتا تو شاید ذہنی خلش ہی پیدا نہ ہوتی۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ موصوف نے غلط لکھا یا آپ نے غلط حوالہ دیا۔ بے شک مضمون نگار نے جو لکھا ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے چنانچہ نور ولایت میں بحوالہ شواہد الولایت آپؑ کے دعویٰ کے تعلق سے لکھا ہے کہ۔

بندہ را ہژدہ سال امر غیر موکد بود کہ تو مہدی موعود ہستی دعویٰ بکن واظہار بکن بندہ ہضم کردم۔ پنج سال است کہ امر موکد شدہ است وعتاب می شود کہ اے سید محمد تو مہدی موعود ہستی اظہار کن۔ (شواہد الولایت۔ باب ۲۸) ترجمہ: امام نے فرمایا اٹھارہ سال بندہ کو غیر موکد حکم ہوتا رہا کہ تو مہدی موعود ہے دعویٰ کر اور اظہار کر۔ بندہ نے اس کو ہضم کیا پانچ سال ہوتے ہیں کہ امر موکد ہوتا ہے اور عتاب ہوتا ہے کہ اے سید محمد تو مہدی موعود ہے اظہار کر

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کو دعویٰ موکد سے پہلے جو کہ بڑلی میں آپ نے فرمایا۔ حکم غیر موکد ہوتا رہا۔ اس بناء پر آپ بھی اپنی مہدویت کا اظہار غیر موکد طریقے پر ہی فرماتے رہے۔ چنانچہ بندہ ہضم کردم کے الفاظ سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم نے مندرجہ ذیل حوالے مورخین کے دئے ہیں۔ ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدی موعودؑ نے بڑلی سے پہلے بھی مختلف مقامات پر مہدیت کا دعویٰ فرمایا ہے یعنی داناپور میں، مکہ مکرمہ میں، حرم شریف میں، احمد آباد میں تاج خاں سالار کی مسجد میں آپ نے جو دعویٰ فرمایا وہ سب درست ہے اور تواریخ سے ثابت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بڑلی میں جو دعویٰ فرمایا وہ موکد ہے یعنی تاکیدی حکم کی بناء پر ہوا ہے۔ جس میں آپ نے مہدی موعود کا انکار کرنے والے پر شرع کا

حکم ظاہر فرمایا اور اس سے پہلے آپ نے غیر موکد طریقے پر اپنے مہدی ہونے کا اعلان جابجا فرمایا لیکن اس میں انکارِ مہدی کے بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں لگایا۔

جس زمانے میں آپ نے غیر موکد طریقے پر دعویٰ مہدیت فرمایا یعنی انکار مہدی کے بارے میں شرع کا حکم نہیں سنایا تو اس کے تعلق سے یہ کہنا کہ یہ حکم عدولی اور سرتابی ہے۔ دین و دانش سے دوری کی دلیل ہے۔ عقل و درایت کے ترازو اور نقل وروایت کی میزان میں ہم اس جیسی روایتوں کو رکھ کر آپ سے پوچھیں گے کیا آپ کو یہاں تو عدول حکمی اور سرتابی کا فرمان جاری کر دینا آسان معلوم ہوا لیکن یہ نہ سوچا کہ آپ کے اس حکم کا اثر کئی صحابہ ٔ کرام، پیغمبران اولوالعزم اور خود حضور ختمی مرتبت ﷺ پر بھی آجائے گا۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسول جب بھی کوئی حکم دیں تو کسی مومن اور عورت کو اس بارے میں کوئی اختیار نہیں رہتا۔ یعنی اس کی تعمیل از بس ضروری ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّـهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّـهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ﴿الأحزاب: ٣٦﴾ جب اللہ اور اسکے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کریں تو کسی مومن مرد اور عورت کو اس معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تحفہ ٔ اثنا عشریہ میں یہ روایت لکھی ہے۔ بروایت بخاری و مسلم از ابن عباسؓ آمدہ کہ آنحضرت ﷺ در مرض موت خود، درروز پنج شنبہ قبل از وفات چہار روز صحابہ را کہ در حجرۂ مبارک حاضر بودند خطاب فرمودند کہ نزد من کاغذے ودواتے و قلمی بیارید تا من برائے شما کتابے بنویسم کہ بعد از وفات من گمراہ نشوید۔ پس اختلاف کردند حاضراں در آوردن ونہ آوردن و عمر گفت کہ کفایت میکند مارا قرآن مجید کہ نزد ما است (تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۲۹۳) بخاری و مسلم میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے مرضِ موت میں اپنے وصال سے چار روز قبل جمعرات کے دن صحابہ سے جو کہ حجرہ مبارک میں حاضر تھے فرمایا کہ میرے پاس کاغذ، دوات اور قلم لاؤ۔ تاکہ میں تمہارے لئے ایک ایسا مضمون لکھدوں کہ تم میری وفات کے بعد گمراہ نہ ہوں۔ پس حاضرین نے مطلوبہ چیزیں لانے یا نہ لانے کے بارے میں اختلاف کیا۔ عمرؓ نے فرمایا کہ ہمارے پاس جو قرآنِ مجید ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔

کیا اس روایت کی بناء پر آپ صحابہ کرامؓ پر عموماً اور حضرت عمرؓ پر خصوصاً حکم عدولی اور سرتابی کا حکم لگائیں گے۔ جنہوں نے قلم دوات اور کاغذ لانے کے سلسلے میں مرض موت میں دئے جانے والے آنحضرت ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی

کی تھی؟ یا یہ فرمائیں گے کہ دراصل صحابہ اور عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کی اس وقت کی مرض کی حالت کا خیال کرتے ہوئے یہ خیال کیا کہ اس وقت حضور ﷺ کو درد اور تکلیف ہے اور بہت زیادہ ہے۔ ایسے وقت میں پھر آپ ﷺ کو تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔ کہئے کہ صحابہ اور عمرؓ کا یہ عمل حکم عدولی یا سر تابی ہے۔ یا بغرض مصلحت ہے۔ اس قبیل کی ایک روایت شاہ صاحب نے حضرت علیؓ کے تعلق سے بخاری کے حوالے سے لکھی ہے۔ "آنحضرت شب ہنگامہ بخانہ امیر وزہراء تشریف بردوایشانرا از خوابگاہ برداشت وبرائے ادائے نماز تہجد تاکید بسیار فرمود کہ قوما فصلیا۔ حضرت امیر گفت کہ واللہ لا نصلي إلّا ما کتب الله لنا یعنی قسم بخدا کہ ماہرگز نماز نخواہیم خواند الا آنچہ مقدر کردہ است خدائے تعالیٰ برائے ماوانما انفسنا بید اللہ یعنی دلہائے مادر دست خدا است۔ اگر توفیق نماز تہجد مید اد میخوانیم۔ پس آنحضرت در خانۂ ایشاں برگشت (تحفہ اثنا عشریہ باب دہم صفحہ ۲۹۵)

آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ رات کے وقت حضرت علیؓ وزہرا کے گھر گئے اور ان کو خوابگاہ سے اٹھایا اور تہجد کی نماز کی ادائی کے بارے میں سخت تاکید کی کہ اٹھو اور نماز پڑھو حضرت علیؓ نے کہا، قسم خدا کی ہم تو وہی نماز پڑھیں گے جو اللہ نے ہم پر فرض فرمائی ہے۔ اور ہمارے دل تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں تہجد کی نماز کی توفیق دی تو ہم پڑھیں گے۔ پھر آنحضرت ﷺ ان کے گھر سے واپس ہو گئے۔

کیا اس روایت کی بنیاد پر حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ اور فاطمہؓ کے تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں نے آنحضرت ﷺ کی حکم عدولی کی۔ اور آپ کے حکم سے سر تابی کی؟ یا اس کی کچھ تاویل کی جائیگی اور کہا جائے گا کہ یہ انکار، حکم عدولی اور سر تابی نہیں ہے بلکہ اپنے حالات کے تحت عرض مصلحتی ہے۔

اسی طرح ایک تیسری روایت بھی دیکھئے:۔

"در صحیح بخاری موجود است کہ در غزوہ حدیبیہ چوں صلح نامہ درمیان پیغمبر و کفار نوشتہ می شد، حضرت امیرؓ لفظ رسول اللہ در القاب آنحضرت ﷺ رقم فرمودہ بود۔ رئیسانِ کفار از ترقیم ایں لقب مانع آمدند و گفتند اگر ما ایں لقب را مسلم می داشتیم باوے چرا جنگ می کردیم آنحضرت ﷺ امیر را ہرچند فرمودند کہ ایں لفظ را محو کن۔ حضرت امیر بنابر کمال ایمان محو نفرمود و مخالفت امر رسول نمود تا آنکہ آنحضرت ﷺ صلح نامہ از دست امیر گرفتند بدست مبارک محو فرمود۔ (تحفہ اثنا عشریہ باب دہم صفحہ ۲۹۵)

صحیح بخاری میں ہے کہ غزوہ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ اور کفار کے درمیان صلح نامہ لکھا گیا تو حضرت علیؓ نے لفظ رسول اللہ آنحضرت کے القاب میں لکھا تھا۔ سردار ان کفار اس لقب کے لکھنے سے مانع ہوئے اور کہا کہ اگر ہم اس لقب کو

تسلیم کرتے تو ان کے ساتھ جنگ کیوں کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے ہر چند فرمایا کہ اس لفظ کو مٹادو۔ حضرت امیر نے کمالِ ایمان کی بناپر محو نہیں فرمایا اور آنحضرت ﷺ کے فرمان کا خلاف کیا یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے صلح نامہ لیکر اپنے دستِ مبارک سے محو فرمادیا۔

کیا آپ یہاں بھی یہ کہیں گے کہ تاکید کے باوجود حضرت علیؓ نے حضور ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور آپ کے حکم سے سر تابی کی؟ اگر نہیں تو اس کو آپ کیا نام دیں گے۔

اس روایت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے "رسول اللہ" کے الفاظ محو فرمادیئے جب کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنحضرت ﷺ کو "رسول اللہ" فرمایا گیا تھا۔

کیا اس طرح آپ ﷺ نے خود اپنی رسالت کا اور اللہ کے حکم کا انکار فرمایا تھا؟ اس کی کیا توجیہ کی جائیگی؟ ہم تو ان روایتوں میں موجود قرائن کی بناء پر ان پر حکم عدولی یا سر تابی کے احکام صادر کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے بلکہ ہم یہ کہیں گے یہاں عرض مصلحتی کام کر رہی ہے۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے ان روایتوں کو لکھنے کے بعد آخر میں خود لکھا ہے۔ "نزد اہل سنت ایں قسم امور را مخالفت پیغمبر نمی گویند و نمی دانند" اہل سنت کے نزدیک اس قسم کے امور کو پیغمبر کی مخالفت نہیں کہتے اور نہیں سمجھتے۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ جو صورت بظاہر مخالفت امر پیغمبر کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ درحقیقت مخالفت امر رسول یا حکم عدولی یا سر تابی نہیں ہے۔ بلکہ کہیں عرض مصلحتی ہے۔ کہیں مشورہ ہے اور کہیں کمال ایمان کا مظاہرہ ہے جب ہی تو آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی مخالفتوں پر ملامت نہیں فرمائی۔

یہ تو تھیں وہ روایات جن میں آنحضرت ﷺ کے احکام کی مخالفت کا ذکر تھا۔ اب ہم وہ روایات پیش کرتے ہیں جن میں پیغمبروں کی جانب سے امر خداوندی پر معروضہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس جانے اور توحید کی دعوت دینے کا حکم ان الفاظ میں دیا۔ وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ أَلَا يَتَّقُونَ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنبٌ فَأَخَافُ أَن يَقْتُلُونِ قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُم مُّسْتَمِعُونَ ﴿الشعراء:۱۵﴾ ترجمہ: جب آپ کے رب نے موسیٰ کو حکم دیا کہ ظالم قوم کی طرف یعنی فرعون کی قوم کی طرف جاؤ کیا یہ لوگ ہم سے نہیں ڈرتے، موسیٰؑ نے عرض کیا اے رب مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ مجھے جھٹلادیں گے اور میرا سینہ تنگ ہونے لگتا ہے۔ اور میری زبان بھی برابر نہیں چلتی پس ہارون کو بھی یہ

حکم بھیجئے۔ اور مجھ پر قوم فرعون کا ایک مقدمہ بھی ہے مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اللہ نے فرمایا ہر گز نہیں۔ تم دونوں ہماری نشانیاں لیکر جاؤ ہم تمہارے ساتھ خوب سنتے ہیں۔

دیکھئے ان آیات ربانی میں واضح کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو بلاواسطہ حکم دے رہا ہے اور حضرت موسیٰؑ اللہ سے اپنی مشکلات کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیا آپ یہاں بھی یہی کہیں گے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے بلکہ اولوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰؑ، اللہ کی بلاواسطہ وحی کی عدول حکمی فرمارہے ہیں۔ یا امر خداوندی سے سرتابی کر رہے ہیں۔ ایسا کہنا تو بڑی بات ہے۔ ایسا سوچنا بھی الحاد اور زندقہ ہے۔ یہاں تو حضرت موسیٰؑ، اللہ کے مقصد کو صحیح طریقے پر پورا کرنے کیلئے مزید امداد کے خواہاں ہو رہے ہیں اور فرعون کے پاس جانے کے بعد جو حالات پیدا ہو سکتے تھے اور خود ان کی جو کمزوریاں تھیں ان کو اللہ کے دربار میں پیش فرمارہے ہیں۔ تاکہ دعوت کو موثر انداز میں پیش کرنے کی راہ میں کوئی خلل واقع نہ ہو اس کو دفع مشقت یا عرضِ مصلحتی کہتے ہیں۔ افسوس کہ آپ نے اس جیسے معاملہ کو عدولِ حکمی یا سرتابی کا نام دے دیا۔ اس کے علاوہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی امت سے مشقت کو دفع کرنے کی غرض سے دربار خداوندی میں بار بار معروضے پیش کئے ہیں۔ جبکہ اللہ کی جانب سے بلاواسطہ اور راست حکم نمازوں اور روزوں کی فرضیت کے بارے میں ہوا تھا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے لکھا ہے۔ ”جناب پیغمبر خاتم المرسلین در شبِ معراج بمشورہ پیغمبر دیگر کہ از عہدہ اولوالعزم است یعنی حضرت موسیٰؑ (۹) نو بار مراجعت فرمود و عرض کرد کہ این حکم راامت من تحمل نمی تواند کرد۔ ذکر ذالک ابن بابویہ فی کتاب المعراج (تحفہ اثنا عشریہ باب دہم صفحہ ۲۹۶)

جناب پیغمبر خاتم المرسلین نے شبِ معراج میں ایک دوسرے اولوالعزم پیغمبر یعنی حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے نو (۹) بار دربارِ خداوندی میں مراجعت کی اور عرض کیا کہ اس حکم کو میری امت برداشت نہ کر سکیگی۔ ابن بابویہ نے کتاب معراج میں اس کو ذکر کیا ہے۔

ان روایات کو لکھنے کے بعد شاہ صاحب نے اس قسم کے معروضے پیش کرنے پر اعتراض کرنے والوں کے بارے میں یہ حکم لگایا ہے۔ ”اگر معاذاللہ ایں امر ردّ وحی باشد از پیغمبراں چہ قلم صادر شود وایں رارد وحی گفتن بغیر از ملحدی وزندیقی نمی آید“ (تحفہ اثنا عشریہ باب دہم صفحہ ۲۹۶) اگر **معاذ اللہ** یہ معاملہ اگر ردوحی کا ہوتا تو پیغمبروں سے کس طرح صادر ہو سکتا ہے۔ اسکو ردوحی کہنا ملحدی وزندیقی ہے۔ دیکھئے کہ یہاں بھی خود مہدی موعودؑ نے اس کی صراحت فرمادی ہے کہ بندہ کو اٹھارہ سال حکم غیر موکد تھا کہ تو مہدی موعودؑ ہے دعویٰ کر اور اظہار کر، بندہ نے اس کو ہضم کیا۔ پانچ سال ہوتے ہیں امر موکد ہوتا ہے اور عتاب

ہوتا ہے کہ اے سید محمد تو مہدی موعود ہے۔ اظہار کر۔

حضرت مہدیؑ نے جو فرمایا"بندہ ہضم کرد" اس کی وضاحت ذیل کی عبارت سے ہوتی ہے جو امامؑ کے دعویٰ کے تعلق سے مطلع الولایت میں مرقوم ہے۔ پس بعجز وانکساری عرض کردند کہ اے بار خدایا من ایں بارِ ولایت محمد رالائق نیم۔ واز حق تعالیٰ ہمیں فرمان شد کہ ترا خاتمِ ولایت محمدی کردیم۔ تا مدتے بدیں نوع تکرار شد۔ بعدہ از حضرت احکم الحاکمین فرمان بلوازم محبت التزام یافت کہ ماعلیم و سمیع وبصیریم لائق یافتہ بار نہادیم۔ (مطلع الولایت صفحہ ۵۸)

پس امام مہدیؑ نے عجز وانکساری سے عرض کیا کہ اے بار خدایا میں بار ولایت محمدی کے لائق نہیں ہوں حق تعالیٰ کی طرف سے یہی فرمان ہوا کہ ہم نے تجھ کو ولایت محمدی کا خاتم کیا ہے۔ ایک عرصہ تک اس قسم کی تکرار رہی۔ اس کے بعد احکم الحاکمین کی درگاہ سے بطریق محبت فرمان صادر ہوا کہ ہم، علیم، سمیع اور بصیر ہیں لائق پاکر بار رکھے ہیں۔

یہاں جو تکرار ہوئی ہے وہ از قسم انکار، رد، عدول حکمی، سرتابی و استکبار نہیں ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے پیش کردہ روایتوں سے معلوم ہوچکا ہے۔ حضرت مہدیؑ کا معروضہ پیش کرنا کسر نفسی کے ساتھ امت محمدی کے حق میں غایت شفقت کے سبب ہوا ہے یعنی دعویٰ موکد کے بعد تصدیق کرنے والے ہی مومن ہوں گے اور انکار کرنے والے آیت وحدیث کی وعید کی زد میں آجائیں گے۔

چنانچہ مطلع الولایت میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ایں عرض بواسطہ کمال رحمت وغایت شفقت علی خلق اللہ وقوع یافتہ (مطلع الولایت صفحہ ۵۹) امام مہدیؑ کی یہ عرض خلق اللہ پر نہایت شفقت اور کمالِ رحمت کے سبب واقع ہوئی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ابتدائی تین سال چپکے چپکے خاص لوگوں میں تبلیغ فرمائی لیکن جب علانیہ تبلیغ کرنے کا موکد حکم ہوا تو آپ نے علانیہ تبلیغ فرمائی۔ جیسا کہ مدارج النبوہ میں ہے۔

تاسہ سال حال برایں منوال بود و مامور بود آنحضرت باخفاء ایں امر وصبر بر آں۔ پس آنحضرت ﷺ بخفیہ دعوت میکرد۔ تانازل شد آیت کریمہ "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴿الحجر: ٩٤﴾"۔ یعنی اظہار کن آنچہ امر کردہ شدی بداں آشکار کن دعوت را۔ وبگرداں روئے خود را از مشرکین۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۳۸،۳۷) ترجمہ: تین سال تک اسی طرح کی حالت تھی اور آنحضرت ﷺ اس امر کے پوشیدہ رکھنے اور اسپر صبر کرنے پر مامور تھے۔ پس آنحضرت ﷺ نے پوشیدہ طور پر ہی دعوت دی۔ یہاں تک کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین۔ یعنی تجھے جس

امر کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا اظہار کر۔ اپنی دعوت کو آشکار کر اور مشرکین سے اعراض کر۔

تفسیر حسینی میں فاصدع بماتومر کے ذیل میں لکھا ہے۔ "نقل است کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ بعد از بعثت مردم راخفیہ دعوت می فرمودند تاسہ سال بگذشت جبرائیلؑ آمد وایں آیت آورد کہ فاصدع بماتومر پس آشکار کن وبظاہر قیام نمائی بما تومر بآنچہ ترا فرمودہ انداز اوامر ونواھی"۔ (تفسیر حسینی سورۃ الحجر صفحہ ۲۹۶) ترجمہ: روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ بعثت کے بعد لوگوں کو پوشیدہ طور پر دعوت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ تین سال گذر گئے تو جبرائیلؑ آئے اور یہ آیت لائے۔ "فاصدع" پس آشکار کر اور ظاہر میں قائم کر "بماتومر" وہ سب کچھ جو تجھ کو اوامر ونواھی سے دیا گیا ہے۔

تفسیر حسینی کی روایت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ تاکیدی حکم کے آنے تک پوشیدہ طور پر ہی دعوت دیا کرتا تھے (باالفاظ دیگر ہضم کرتے تھے) پھر جب تاکیدی حکم آگیا تو آپ نے مشرکین کی پرواکئے بغیر علی الاعلان سب کو دعوت دی حضور ﷺ کی دعوت کے تعلق سے رحمۃ للعالمین میں لکھا ہے۔ "نبی کریم ﷺ نبوت کے ابتدائی تین سال چپکے چپکے سمجھایا کرتے تھے۔ (رحمۃ للعالمین قاضی سلیمان سلمان پوری صفحہ ۳۳)

کیا آپ یہاں بھی یہی کہیں گے کہ آنحضرت ﷺ نے (معاذ اللہ) تین سال تک عدول حکمی کی یا (ثم نعوذ باللہ) حکم خدا سے سرتابی کی حاصل بحث یہ کہ امامؑ نے دعوی موکدہ، تاکیدی حکم کے بعد فرمایا البتہ دعویٰ غیر موکد مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ فرمایا۔ چنانچہ سابق میں دئے گئے حوالوں سے ثابت ہے۔ صاحب نزھۃ الخواطر نے تو بڑلی کے دعویٰ کو چوتھا دعویٰ شمار کیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "ثم الي قرية برلي على ثلاثة اميال من فتن ودعىٰ فيها مرة رابعة انه مهدي (نزھۃ الخواطر جلد رابع صفحہ ۳۲۳)۔ ترجمہ: پھر روانہ ہوئے بڑلی کی طرف جو پٹن سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اور وہاں چوتھی مرتبہ دعویٰ کیا کہ آپؑ ہی مہدی ہیں پس امامؑ کا بارگاہ الٰہیٰ میں جو معروضہ تھا۔ اسکو حکم عدولی یا سرتابی کہنا سخت بے ادبی اور گستاخی ہی نہیں بلکہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے الفاظ میں الحاد اور زندقہ ہے۔

حکمت

اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں رسول اللہ ﷺ کے حوالے کی تھیں ان میں ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ آپ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں۔ کتاب سے مراد تو وہ الٰہی کتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ جبرئیلؑ تیئیس ۲۳ سال کی مدت میں عطا ہوئی تھی، جس کو "قرآن مجید" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول نے کتاب اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سنایا اور کاتبین وحی کے ذریعہ اسکو محفوظ بھی کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ فرماتا ہے کہ وہ لوگوں کو حکمت کی بھی تعلیم دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴿البقرۃ:۱۲۹﴾۔ وہ انکو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

حکمت کی تشریح مختلف لوگوں نے الگ الگ انداز میں کی ہے۔ چناچہ ابن منظور آفریقی التوفیٰ ۱۳ھ حکمت کی تشریح میں لکھتے ہیں "والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم" یعنی حکمت بہترین علم کے زریعہ بہترین چیز کو جاننے کا علم ہے۔ (لسان العرب، جلد ۱۵، ص ۳۰)

اور امام راغب لکھتے "والحكمة اصابة الحق (مفردات القرآن) یعنی حکمت حق کو پالینا (سچائی کو سمجھ لینا)

ابن جریر نے اسکی تعریف اس طرح کی ہے "والصواب من القول عندنا في الحكمة انها العلم باحكام التي لا يدرك علمها الا ببيان الرسول و هو عندي ماخوذ من الحكم الذي بمعني الفصل بين الحق و الباطل" (تفسیر ابن جریر۔ ۱۲۹) ہمارے نزدیک درست بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام کے علم کا نام ہے جو رسول ﷺ کے بیان کے بغیر معلوم نہیں کئے جاسکتے اور میرے پاس حکمت کا لفظ 'حکم' سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں حق اور باطل کے درمیان فرق اور امتیاز قائم کرنا۔

قرآن شریف میں حکمت کا لفظ بیس، ۲۰ جگہ آیا ہے اور اکثر مقامات پر اس سے پہلے کتاب کا لفظ بھی آیا ہے اس سے بعض مفسرین نے لفظ کتاب کی تفسیر قرآن سے اور حکمت کی تفسیر سنت رسول اللہ ﷺ سے کی ہے۔

چناچہ امام شافعیؒ نے بھی اپنی کتاب "الرسالہ" میں حکمت سے "سنت رسول" ہی مراد لی ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ کیونکہ قرآن میں کتاب کے بعد حکمت کا ذکر بطور عطف کیا گیا ہے اور اللہ نے اپنا یہ احسان یاد دلایا ہے کہ اس نے کتاب و حکمت دونوں کی تعلیم دینے کیلئے اپنا رسول بھیجا ہے تو اس کے علاوہ دوسری بات جائز نہیں ہے کہ حکمت سے مراد سنت رسول ہے (الرسالہ للشافعی، جلد ۱۔ ص ۴۵)

مزید غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ قرآن (کتاب) عطا فرمایا اور اس کتاب میں جو احکام ہیں ان میں جو اسرار و غوامض، عجیب و غریب فوائد، نکات، مصلحتیں پوشیدہ ہین، ان کا بیان بھی صرف رسول اللہ ﷺ ہی کر سکتے تھے، اور یہ کام بھی رسول اللہ ﷺ نے ہی انجام دیا۔ اس لئے اللہ نے بطور احسان کے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نہ صرف تم پر آیتوں کو پڑھ کر سناتے ہیں بلکہ اس کتاب میں جو رموز واسرار اسکی تہ میں پوشیدہ ہیں وہ بھی تم کو بتلاتے ہیں، عام طور پر حکمت کا ترجمہ ''دانائی'' کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو دین کی دعوت کا حکم بھی دیا ہے تو حکمت کے ساتھ دینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے ''ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن'' یعنی آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور نصیحتوں کے زریعہ بلایئے اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کی جئیے، تفسیر نور ایمان میں اس طرح اس کی تفسیر کی گئی ہے ''دعوت کے تین طریقہ بتلائے جارہے ہیں، جو مخاطبین کے ظرف اور عقل کے اعتبار سے ہیں یعنی حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن۔ حکمت سے مراد وہ دلائل ہیں جو حق کو واضح کرنے والے ہیں اور شکوک و شبہات کو دور کرنے والے ہیں ،موعظہ حسنہ سے مراد ترغیب و ترہیب کے انداز سے پند و نصیحت کرنا، مخاطب کے ساتھ ہمدردی، شفقت، مہربانی، نرمی اور دلسوزی کے ساتھ بات کرنا اور جدال کرنا ایسے طریقہ سے جس میں سختی اور شدت نہ ہو بلکہ نرمی ہی نرمی ہو (نور ایمان، ص ۳۸۸)

حجراسود

ازرقی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ حجراسود کو خداوند تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ اسلام کے ساتھ جنت سے اتارا تھا تا کہ آدم اس سے تسکین و تسلی حاصل کر سکیں اور ابن اسحاق راوی ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے حجراسود کو طوفانِ نوح کے وقت جبل ابو قبیس پر رکھ دیا تھا۔ پھر جب ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام حجراسود آپ کو دے گئے اور آپ نے حجراسود کو خانہ کعبہ میں اسکی اصلی جگہ پر نصب کر دیا۔ پھر جب قبیلہ بنو بکر بن عبد مناف اور غبشان بن خزاعہ نے ہم لوگوں کو مکہ سے چلے جانے پر مجبور کیا تو عمرو بن حارث بن مضامعی جرہمی نے حجراسود کو چاہ زمزم میں ڈال دیا اور خود اپنے لوگوں کے ساتھ یمن چلا گیا۔ اسکے بعد حجراسود کو چاہ زمزم سے نکال لیا گیا اور خانہ کعبہ میں اسکی جگہ نصب کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے عہد میں خانہ کعبہ کے اندر آتشزدگی ہوئی تو حجراسود آگ کی تپش یا شعلوں سے پھٹ گیا۔ اور تین ٹکڑے ہو گئے اور ایک ریزہ علیحدہ ہو گیا جو خاندان کے لوگوں میں سے کسی کے پاس رہا۔

عبد اللہ بن زبیرؓ نے حجر اسود کے ٹکڑوں کو چاندی سے جوڑ دیا ۱۸۹ھ میں ہارون رشید عباسی نے عمرہ کیا اور حکم دیا کہ جس پتھر کے اندر حجر اسود نصب ہے اس کے اندر الماس کی کیلیں نصب کی جائیں اور حجر اسود کو اس میں جڑ دیا جائے اور خالی جگہ میں چاندی بھر دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس کے بعد ۳۱۸ھ میں ابو طاہر قرمطی کا لشکر جرار لیکر آیا اور ساتویں ذی الحجہ کو مکہ پہنچ کر طواف کرنے والوں اور نماز گذار لوگوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ ابو طاہر اور اسکے لشکر نے ۳۰ ہزار آدمیوں سے زیادہ کو قتل کیا جن میں سے اکثر کو چاہ زمزم اور مسجد کے اندر غسل و کفن کے بغیر دفن کیا گیا۔ پھر ان دشمنان خدا نے حُجاج اور مکہ والوں کو لوٹ لیا۔ ابو طاہر گیارہ دن مکہ کے اندر رہا ۱۴ ذی الحجہ کو حجر اسود کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ حجر کو لے گیا اور خانۂ کعبہ چار دن کم ۲۲ برس تک حجر اسود سے خالی رہا۔ بغداد کے خلیفۂ وقت نے قرامطہ کو ۵۰ ہزار دینار دے کر حجر اسود کو لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اور قرامطہ نے کہا ہم نے خدا کی قدرت سے حجر اسود کو لیا ہے اور اسی کی مشیت سے اسکو ہم واپس کریں گے۔ آخر دسویں ذی الحجہ ۳۳۹ھ کو سبر بن حسن قرمطی نے حجر اسود کو خانۂ کعبہ میں نصب کر دیا۔ پھر ۳۴۰ھ میں خانہ کعبہ کے دربانوں نے حجر اسود کو اکھاڑ کر خانۂ کعبہ کے اندر رکھ دیا تاکہ وہ وہاں محفوظ رہے۔ اور ایک چاندی کے طوق میں اسکو منڈھ دیا گیا اور پھر حجر اسود کو اسکی جگہ پر نصب کر دیا گیا۔

۴۱۳ھ میں ایک شخص نے حجر اسود پر تین چوٹیں ماریں۔ جن سے حجر اسود پر خراشیں پڑ گئیں اور چند ریزے ناخن کے برابر اُکھڑ گئے۔ شیبہ نے ان ریزوں کو جمع کیا اور مشک ولاکھ کے اندر گوندھ کر حجر اسود کے اندر بھر دیا۔

اس وقت یہ وہی حجر اسود ہے جو ۴۱۳ھ کے واقعہ کے بعد سے اپنی اصلی حالت پر چلا آتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات ضروری مرمت ہوتی رہی ہے۔ ماخوذ از پیشوا ماہ صفر و ربیع الاول ۱۳۵۴ھ۔

حق میراث

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت میں ہمیشہ عورت کا حصّہ مرد کے مقابلے میں نصف رکھا گیا ہے۔ یہ محض غلط فہمی بھی ہے اور مسائل سے ناواقفیت بھی اگر عورت کے حصّے کے بارے میں شریعت نے تقسیم میراث کے موقع پر جو حکم دئے ہیں ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے خلاف محض ایک پروپگینڈہ ہے۔ ذیل میں اس کی تفصیل دی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم درجہ مرد و عورت اور رشتہ داروں کے سلسلے میں چار صورتیں پائی جاتی ہیں۔

ا۔ وہ صورت جس میں عورت کا حق میراث، مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔

۲۔ وہ صورت جس میں مرد اور عورت کا حصّہ برابر ہے۔

۳۔ وہ صورت جس میں مرد کا حصّہ کم "اور اسی درجہ کی رشتہ دار" عورت کا حصّہ زیادہ ہے۔

۴۔ وہ صورتیں جن میں صرف عورت وارث ہوتی ہے، اور اسی درجہ کا مرد رشتہ دار وارث نہیں ہوتا۔

(ا) مندرجہ ذیل صورتوں میں عورت کا حصّہ مرد کے مقابلے میں آدھا (نصف) ہوتا ہے۔

(الیف) باپ کے مقابلے میں ماں کا، بشرطیکہ متوفیٰ نے کوئی اولاد یا شوہر و بیوی کو نہ چھوڑا ہو۔

(ب) حقیقی بھائی کے ساتھ حقیقی بہن یا علاتی بھائی کے ساتھ علاتی بہن کا

(ج) زوجین میں سے ایک مر جائے اور دوسرے کو چھوڑ جائے اس صورت میں بھی بیوی کے ترکے میں سے جو شوہر کو ملے گا اس کے مقابلے میں شوہر کے ترکہ میں بیوی کا حصہ نصف ہو گا، جیسے لاولد بیوی کے مرنے پر شوہر کو نصف ملے گا اور لاولد شوہر کے مرنے پر شوہر کے ترکہ میں سے بیوی کو چوتھائی۔ اسی طرح صاحب اولاد شوہر کے مال میں سے بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا اور صاحب اولاد بیوی کے مال میں سے شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

(۲) دونوں کا حصّہ برابر: کچھ صورتوں میں ایک ہی درجے کے مرد اور عورت رشتہ دار کے حصّے برابر ہوتے ہیں۔ جیسے

(الیف) میت کا ایک لڑکا ہو اور ماں باپ ہوں تو باپ کو بھی چھٹا حصّہ ملے گا اور ماں کو بھی چھٹا حصّہ ملیگا (یعنی برابر)

(ب) میت کی صرف دو بیٹیاں ہوں، اس صورت میں بھی بیٹیوں کو دو تہائی حصّہ ملیگا، ماں اور باپ دونوں کو چھٹا حصّہ ملیگا (برابر)

(ج) مرنے والی نے باپ، بیٹا اور نانی کو چھوڑا ہو تو باپ اور نانی دونوں کو چھٹا حصّہ ملے گا حالانکہ باپ کے مقابلے میں

نانی کا رشتہ دور کا ہے۔ (اور وہ عورت ہے)

(د) اخیافی یعنی ماں کا شریک بھائی اور بہنوں کا حصّہ ہمیشہ برابر ہوتا ہے۔

(ح) بعض صورتوں میں تنہا مرد رشتہ دار ہو یا عورت، پورے ترکے کی حقدار ہو گی جیسے کسی نے صرف باپ کو چھوڑا تو عصبہ ہونے کی بناء پر باپ پورے ترکہ کا حقدار ہو گا۔ یا صرف ماں کو چھوڑا ہو تو ایک تہائی اس کا اصلی حصہ ہو گا اور "دو تہائی" بطور "رد" اسے ملیگا۔

یا صرف ایک بیٹا چھوڑا ہو تو وہ عصبہ ہونے کی بنا پر پورے ترکے کا حقدار ہو گا اور اگر صرف ایک بیٹی چھوڑی ہو تو نصف اس کا اصل حصہ ہو گا اور باقی نصف بطور "رد" اسے مل جائے گا۔

اس طرح کی متعدد صورتیں ہیں جن میں حقیقی بہن کا حقیقی بھائی کے ساتھ یا اخیافی بہن کا اخیافی بھائی کے ساتھ برابر کا حصّہ ہوتا ہے۔

(۳) بعض صورتوں میں عورت کا حصّہ مرد سے "بڑھ جاتا ہے" کیونکہ بیٹی کا حصہ ذوی الفروض میں ہونے کی حیثیت سے بعض دفعہ نصف یا تہائی بھی ہو جاتا ہے۔ بیٹے کا حصہ ذوی الفروض میں ہونے کی حیثیت سے نصف یا تہائی نہیں ہے۔ البتہ اصطلاح میراث کے اعتبار سے "عصبہ" میں ہونے کی حیثیت سے تقسیم حصص کے بعد بچا ہوا حصّہ اسے مل جاتا ہے۔ یہ حصّہ بعض اوقات عورت کے اس حصے سے کم ہو جاتا ہے جو اسے "اصحاب فروض" میں ہونے کی حیثیت سے ملتا ہے جیسے فرض کیجئے کہ ایک عورت نے اپنی وفات کے وقت ساٹھ (۶۰) ایکٹر زمین چھوڑی اور شوہر، والد، ماں اور دو بیٹیوں کو چھوڑا تو ہر بیٹی کو سولہ (۱۶) ایکڑ زمین ملے گی۔ اور اگر اسی صورت میں دو بیٹیوں کے بجائے "دو بیٹوں" کو چھوڑا تو ہر بیٹے کا حصہ ساڑھے بارہ ایکڑ ہو گا۔ اسی طرح اگر ایک نے ترکہ میں (۱۵۶) ایکڑ اراضی چھوڑی اور اس کے ورثاء میں شوہر، والد، ماں اور بیٹی ہیں تو بیٹی کا حصہ ۷۲ ایکٹر ہو گا اور اس صورت میں اگر بیٹی کے بجائے بیٹا ہے تو اس کا حصہ ۶۵ ایکٹر ہو گا۔ چنانچہ اس طرح کی متعدد صورتیں ہیں جن میں مرد کے مقابلے میں عورت کا حصہ زیادہ ہو گا۔

(۴) صرف عورت وارث ہوتی ہے۔

بعض ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں مرد کو حصہ نہیں ملتا۔ لیکن اگر اسی کی ہم درجہ عورت رشتہ دار ہو تو وہ میراث میں حصہ پاتی ہے۔ جیسے کسی عورت نے پسماندگاں میں شوہر، باپ، ماں، بیٹی اور پوتی کو چھوڑا تو پوتی چھٹے حصے کی مستحق ہوتی ہے۔ اور اگر پوتی کے بجائے پوتا ہو تو اُسے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اسی طرح اگر مرنے والی نے شوہر، حقیقی بہن اور علاتی بہن کو چھوڑا

ہے تو علاتی بہن چھٹے حصے کی حقدار ہوتی ہے اور اگر علاتی بہن کے بجائے علاتی بھائی ہو تو اسے کوئی حصہ نہیں ملتا۔

غرض کہ شریعت میں بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن میں بمقابلے مرد کے، عورت کا حصّہ برابر یا زیادہ ہوتا ہے یا عورت حصّہ دار ہوتی ہے اسی کا ہم درجہ مرد رشتہ دار محروم ہوتا ہے۔ڈاکٹر صلاح الدین سلطان مصری نژاد فاصل ہیں جو جامعیہ اسلامیہ امریکہ میں استاذ ہیں انہوں نے اس موضوع پر ''میراث المرأہ وقضیته المساوات'' کے عنوان سے قلم اُٹھایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ تیس سے زیادہ حالتیں ایسی ہیں جن میں عورت، مرد کے برابر یا اس سے زیادہ حصّہ پاتی ہے یا وہ تنہا حصہ دار ہوتی ہے اور مرد محروم ہوتا ہے۔ جبکہ چار متعیّنہ حالتیں ایسی ہیں جن میں عورت کا حصّہ بہ مقابلہ مرد کے آدھا ہوتا ہے۔

چار متعین صورتوں میں مرد کو زیادہ حصّہ اس لئے ملتا ہے کہ مرد پر سارے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری ہے، عورت پر خود اپنی کفالت کی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ پھر بھی عورت کی فطری کمزوری کی رعایت کرتے ہوئے اُسے نصف کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔(ماخوذ از شمع فروزاں جناب خالد سیف اللہ رحمانی)۔

حضور پاک ﷺ کے صاحب زادے و صاحب زادیاں

صاحب زادے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تین صاحب زادے اللہ نے دئے تھے لیکن اللہ کی مرضی کہ تینوں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ تفصیل یوں ہے۔

(۱) سیدنا قاسمؓ فرزند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ آپ کے بڑے صاحب زادے تھے۔ انہیں سے آپ کی کنیت ابو القاسم ہوئی۔ قبل بعثت حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنھا کے بطن سے مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ جب عمر دو سال کی ہوئی تو آپ کی وفات ہو گئی۔

(۲) سدنا ابراہیمؓ۔ یہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے۔ آپ ماہ ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ایک سال چھ ماہ آٹھ روز کی عمر شریف پاکر ۱۶/ ربیع الاول ۱۰ھ کو انتقال فرمایا۔ مدینہ منورہ جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(۳) سیدنا حضرت عبد اللہؓ۔ آپ کا لقب طیب وطاہر تھا۔ آنحضرت کو نبوت ملنے کے بعد مکہ معظمہ میں حضرت خدیجتہ الکبریٰؓ کے بطن مبارک سے تولد ہوئے۔ نبوت کے دسویں سال جب آپ ایک سال چھ ماہ کے تھے وفات پاگئے۔

صاحب زادیاں

(۱) حضرت فاطمتہ الزہراء رضی اللہ عنھا۔ آپ حضور کی چہیتی صاحب زادی تھیں۔ آپ حضرت خدیجتہ الکبریٰؓ کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ حضورؐ کو آپ سے بے حد محبت تھی آپ کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ آپ کی نسبت حضورؐ نے فرمایا کہ آپ جنت میں سب بی بیوں کی سردار ہیں۔ نیز فرمایا "فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کا زہد و تقویٰ بے مثال تھا آپ کا نکاح اللہ کے حکم سے حضرت علی کرم اللہ وجھہ سے ۱۵ سال کی عمر میں ہوا۔ آپ سے چھ اولاد ہوئیں۔ (۱) حضرت امام حسنؓ (۲) حضرت امام حسینؓ (۳) حضرت محسن (۴) حضرت بی بی رقیہؓ (۵) حضرت زینبؓ (۶) حضرت ام کلثومؓ

حضرت فاطمہ زہراء کی وفات، آنحضرتؐ کی وفات کے ۶ ماہ بعد ۳/ رمضان المبارک ۱۱ھ میں ہوئی۔

(۲) حضرت بی بی زینب رضی اللہ عنھا۔ آپ رسول اللہؐ کی سب سے بڑی صاحب زادی ہیں۔ یہ بھی حضرت خدیجتہ الکبریٰ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئیں۔ آپ کی ولادت بعثت سے تقریباً دس سال پہلے ہوئی جبکہ حضور کی عمر شریف ۳۰ سال کی تھی۔ ان کا نکاح بی بی خدیجہؓ کے بھانجے ابو العاص بن الربیع کے ساتھ ہوا تھا۔ ان سے ایک لڑکا علی اور ایک لڑکی اُمامہ پیدا ہوئے۔ حضرت زینب کا انتقال ۸ھ میں ہوا۔

(۳) حضرت بی بی رقیہ رضی اللہ عنھا۔ آپ بھی بی بی خدیجتہ الکبریٰ کے بطن سے بعثت سے سات سال قبل پیدا ہوئیں۔ ان کا نکاح عتبہ بن ابو لہب سے ہوا تھا۔ مگر تبت یدا ابی لہب کی آیت نازل ہونے کے بعد عقبہ نے آپ کو طلاق دے

دی۔ پھر آپ کا عقد مبارک حضرت عثمان غنی سے آنحضرت نے فرمادیا۔ اور ان سے ایک لڑکا عبد اللہ پیدا ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ کیلئے بدر تشریف لئے گئے تو آپ کے جانے کے بعد مدینہ منورہ میں بی بی رقیہ ۲ھ میں خرابی صحت کی وجہ سے وفات پائیں۔

(۴) حضرت بی بی ام کلثوم رضی اللہ عنہا۔ بی بی خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ آپ کی مکہ معظمہ میں ولادت ہوئی۔ آپ کا عقد بھی ابولہب کے ایک بیٹے عتیبہ سے ہوا تھا۔ ابھی آپ کی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی کہ حضورؐ کو پیغمبری مل گئی۔ ابولہب اور اس کا بیٹا دونوں کافر تھے باپ نے اپنے بیٹے کو مجبور کیا کہ حضور کی صاحب زادی کو طلاق دے دے۔ اس نے باپ کے کہنے پر عمل کیا۔ اور طلاق دے دی۔ چونکہ حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا تھا اسلئے آنحضرتؐ نے اپنی اس صاحبزادی کا نکاح حضرت عثمان غنیؓ سے فرمادیا۔ آپ نے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔ آپ کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شادی کے ۵ سال بعد مدینہ منورہ میں آپ نے اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔

آپ کے دو چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ (شہید جنگ احد) اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ۔ اور آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ان تینوں نے اسلام قبول فرمایا۔

حظیرہ

الحظیرہ جسکی جمع الحظائر ہے۔ ہر وہ چیز جو تمہارے اور دوسرے کے درمیان میں حائل ہو۔ باڑہ (مصباح اللغات ۔ ۱۶۲) قوم مہدویہ میں ''قبرستان'' کیلئے ''حظیرہ'' زیادہ رائج ہے۔ اس میں ''حظیرۃ القدس'' کے معنی کی رعایت معلوم ہوتی ہے ۔ کیوں کہ احادیث میں مومنین کی قبریں جنت کا نمونہ ہونا ثابت ہے۔ نیز لغت عرب کے لحاظ سے اس لفظ کو قبرستان سے یہ مناسبت پائی جاتی ہے کہ ''حظیرہ'' اس مقام کو کہتے ہیں۔ جہاں جانور دن بھر (یا زندگی بھر) ادھر ادھر چرنے کے بعد رات میں بند کر دئے جاتے ہیں۔ چونکہ قبرستان بھی وہ مقام ہے جہاں آدمی دن بھر ادھر ادھر پھرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے بند کر دیا جاتا ہے۔

میر آقا محمد علی شوستری جو میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے اتالیق اور بڑے فاضل ادیب تھے، علامہ العصر مولانا سید اشرف صاحب شمسی مہدوی سے جن سے پر خلوص مراسم رکھتے تھے، فرماتے تھے کہ اس سے زیادہ موزوں لفظ قبرستان کیلئے نہیں ہو سکتا (شہاب بن نصرت۔ بر حاشیہ کحل الجواہر حصہ دوم، ص ۱۶۴)۔

خطبۂ نکاح

نکاح میں خطبہ سنت ہے۔ قوم مہدویہ میں اکثر و بیشتر مقامات پر حضرت علاّمہ بندگی میاں سید عبد الملک سجاوندی عالم باللہؒ نے جو خطبہ تحریر فرمایا ہے، وہی پڑھا جاتا ہے۔ اس خطبہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شرط طلاق تخئیر بالفاظ صریح حضرت نے لکھدی ہے قبل اس کے کہ خطبہ لکھا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کا بھی کچھ ذکر خیر کیا جائے۔ تاریخ سلیمانی میں ہے حضرت میاں عبد الملک سجاوندیؒ احمد نگر کی طرف نکل آئے اور حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ خلیفہ پنجم حضرت امام مہدیؑ کے دست مبارک پر تصدیق کی اور عالم باللہ کا لقب پایا۔ آپ ملک سجاوند کے باشندے تھے اس لئے آپ کو سجاوندی کہتے ہیں۔ حضرت سجاوندیؒ پیر کامل کی تلاش میں پھرتے پھراتے احمد نگر (سلطنت نظام شاہیہ) میں بمقام بھنگار پہنچے اس گائوں بھنگار کے قریب حضرت بندگی شاہ دلاورؓ کا دائرہ تھا۔

ایک روز حضرت شاہ دلاورؓ کے دائرہ کے بچے لکڑیاں لانے کے لئے جنگل گئے تھے۔ یہ بچے پابندی کے ساتھ نماز بھی ادا کرتے تھے اور اپنے مرشد کا بیان قرآن بھی سنتے تھے۔ جب جنگل میں نماز کا وقت ہو گیا تو انہوں نے جماعت سے نماز ادا کی، اور ایک بچہ نے قرآن شریف کا وعظ شروع کر دیا۔ اور اپنے مرشد معظم سے سنی ہوئی باتیں جو کچھ یاد تھیں کہنے لگا۔ اتفاقاً میاں عبد الملک سجاوندیؒ نے جو بحالت ہجرت ادھر سے گذر رہے تھے۔ ان بچوں کی یہ حالت دیکھی اور وعظ میں کہی گئیں بعض باتوں کو سنکر دل تڑپ اُٹھا۔ آپ نے ان بچوں سے ان کا نام ونشان پوچھا۔ ان بچوں نے سب کیفیت کہہ دی، آپ ان بچوں کے ساتھ دائرے میں آگئے۔ اور حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ کے قدموں پر گر پڑے اور کہنے لگے کہ میری بیعت قبول فرمایئے۔ حضرت علامہ نے فرمایا "تم علامہ ہو اور بندہ اُمّی" ہے۔ بندہ قل کو کل کہتا ہے (جیسا کہ عام طور پر مہاراشٹرا اور گجرات وغیرہ علاقوں میں "ق" کی ادائی "ک" سے کرتے ہیں جیسے قلم کو کلم اور قمیص کو کمیص) پھر تمہاری اس بندے سے کیسے نبھے گی، حضرت بندگی عبد الملک سجاوندیؒ نے عرض کیا کہ اس ناچیز نے پہلے ہی اپنا تمام علم ظاہری بالائے طاق رکھ دیا ہے اور اب اپنے قُل کو آپ کے کُل پر تصدق کر دیتا ہے۔ اب حضرت جو کچھ فرمائیں گے اس پر قائم رہے گا۔ حضرتؓ نے اپنا پسخوردہ عطا فرمایا۔ بس پھر وہ سارا علم جو قیل و قال سے بھرا ہوا تھا محو ہو گیا۔ پھر حضرت نے تصدیق مہدیؑ سے مشرف فرما کر بیعت لی۔ اور ذکر خفی کی تعلیم دے کر فرمایا اب تم میرے فقیروں میں بیٹھنے کے لائق ہو گئے ہو۔ حضرت بندگی شاہ دلاورؓ نے فرمایا کہ ایک وقت حضرت مہدیؑ نے بندہ کے تعلق سے یہ بشارت دی تھی کہ "بھائی دلاور کے سامنے علماء ظاہری و باطنی دوزانو بیٹھیں گے۔ یہ بشارت حضرت میاں عبد الملک سجاوندی پر صادق آگئی کیونکہ میاں عبد الملک سجاوندیؒ علاّمہ بھی تھے اور پیر طریقت بھی۔

ایک شخص نے جس کا نام علی تھا جو بعد میں علی متقی کہلانے لگا۔ حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ سے بیعت کی تھی اور آپ کے وعظ و بیان کی مجلس میں بھی حاضر رہتا تھا۔ حضرت شاہ دلاورؓ نے دوران بیان ایک موقع پر فرمایا کہ عنّین (نامرد) کو ایمان نہیں ہے۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ علی متقی عنّین تھا۔ اس بات سے وہ سخت رنجیدہ ہوا اور بعد ختم وعظ و بیان اس نے حضرت کے خلفاء و فقراء سے کہا کہ میں یہاں ایمان حاصل کرنے آیا تھا لیکن بر خلاف اس کے یہاں میرا ایمان چھین لیا گیا۔ جب خلفاء حضرت نے آپ سے یہ بات کہی تو آپؓ نے فرمایا کہ میں نے دین کے عنّین کا ذکر کیا تھا لیکن اس نے نہیں سمجھا۔

علی متقی نے جو قوم میں علی مفتری کے نام سے مشہور ہوا، جوش عداوت میں مذہب مہدویہ کو ہی نہیں چھوڑا بلکہ مذہب پر سخت حملے کئے، ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کے پاس جاکر مہدویہ کے خلاف فتوے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب یہاں کے علماء نے جو مہدویہ کے اصول اور طور وطریقوں سے اچھی طرح واقف تھے مہدویہ کے خلاف فتوے دینے سے گریز کیا تو مکہ مکرمہ چلا گیا۔ اور خلاف حقیقت، جھوٹے سوالات مرتب کرکے وہاں کے علماء کے پاس طالب فتویٰ بنا۔ مفتی، سوالات کے پابند ہوتے ہیں۔ پس انہوں نے اس مفتری کے سوالات کے تحت وہ جواب دئے جو اس کے حسب منشاء تھے وہ جواب لیکر وہ ہندوستان واپس آگیا اور یہاں اسکی تشہیر کرنی شروع کی۔ حضرت بندگی میاں شاہ دولارؓ نے میاں عبدالملک سجاوندیؒ کو ان فتوؤں کی تردید کے لئے فرمایا حضرت میاں عبدالملکؒ نے عرض کیا کہ بوقت بیعت حضرت کا پسخوردہ پیتے ہی میرا علم ظاہری سلب ہوگیا۔

حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ نے استظہار علم ظاہری کے لئے پھر پس خوردہ عطا فرمایا۔ پسخوردہ پیتے ہی میاں عبدالملک سجاوندی کا علم ظاہر اور زندہ ہوگیا۔ اسی وجہ سے قوم میں آپ کو عالم باللہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ علم اس وقت ان کو من جانب اللہ عطا ہوا ہے یہ لقب بعد میں اتنا مشہور ہوگیا کہ لوگ اس لقب کو حضرت کا نام ہی سمجھنے لگے۔

پس اس کے بعد آپ نے علی متقی کے من گھڑت فتوؤں اور دیگر جھوٹے الزامات کی تردید میں ایک رسالہ نہایت ہی فصیح و بلیغ عربی زبان میں لکھا جس کا نام ''سراج الابصار'' ہے۔ اس کے بعد دو اور رسالے مذہب مہدویہ کی تائید اور اثبات میں بزبان عربی لکھے۔ ایک رسالہ کا نام سراج الملّۃ ہے اور دوسرے کا نام منہاج التقویم ہے۔ ان رسالوں سے آپ کی علمی شان، عربی زبان پر قدرت اور فصاحت وبلاغت پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف ''عجمی'' نہیں بلکہ خالص عربی ہے۔ خوبی کی بات یہ بھی ہے کہ آپ نے یہ رسالے فقط حافظے کی مدد سے لکھے ہیں۔ کیوں کہ بحالت ہجرت مسلسل آپ بالکل بے سروسامان تھے۔ ان رسالوں کے بعد آپؒ نے خطبہ نکاح لکھا ہے جو فارسی زبان میں ہے جسکی فصاحت وبلاغت، عبارت

آرائی ورنگینی متقدمین کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔

تاریخ سلیمانی میں ہے کہ شاہ عبد الرشید کے دو بیٹے تھے ایک میاں عبد الملک سجاوندیؒ اور دوسرے میاں عبد الغفور سجاوندیؒ میاں عبد الملک سجاوندی کو ۱۴ علوم حاصل تھے اور آپ اپنے علم و فضل میں بہت مشہور تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ میاں عبد الملک بن میاں عبد المجید بن شاہ عبد الملک بن شاہ نور محمد بن شاہ برہان بن شاہ یٰسین بن شاہ نور محمد بن شاہ قطب الدین بن شاہ جلال الدین بن شاہ نظام بن حاجی معین بن حاجی صمد بن خواجہ یونس بن خواجہ طحامون (؟) سجاوندی بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین ابی عبد اللہ الحسین بن امیر المومنین علی مرتضیٰ اسد اللہ الغالبؓ بیان کیا جاتا ہے کہ میاں عبد الملک سجاوندی کے دل میں دنیا سے نفرت پیدا ہوگئی اور خدا طلبی کا شوق پیدا ہوگیا اور پیر کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے پھرتے پھرتے آپ احمد نگر کی طرف نکل آئے۔

خطبۂ نکاح

حمد بر کمال وثناء بے مثال بحضرت ذوالجلال کہ ثنائے اوست اللّٰہُ جمیل یُحِبُّ الجمال تعالت آلاءہ وتقدّست اَسْمائہُ کہ درذکرِ محامد ذات قدیم و مدائح تقدس صفاتِ مُستدیم نوعروسانِ طبائع بگلزار صنائع چوں بلابل فصیح و صلاصل ملیح بر تخت زفاف درجلوہ بلسان حال ایں مقال می سرایند کما قالَ اللہ تعالیٰ سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ﴿یس:۳٦﴾۔

خطاب بہ وکیل: بشرائط ایجاب وقبول بقول رسول مقبول ﷺ کہ فرمود النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَن رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيس مِنِّي۔ بحضور شرفاء کرام بدولت شریف مُشرّفُ اَقدام پرسیدہ می آید کہ حکم وکالت مرترا ثابت است حکم وکالت مرترا ثابت است حکم وکالت مرترا ثابت است۔

ترجمہ: کامل حمد اور بے مثل تعریف درگاہ ذوالجلال میں کہ تعریف اسی کی ہے اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ اسکی نعمتیں اعلیٰ اور اس کے نام مقدس ہیں۔ ذات قدیم کی تعریفوں اور ہمیشہ رہنے والی صفات کی مدح میں، طبیعتوں کی نئی دلہنیں صنعتوں کے گلشن میں خوش الحان بلبلوں اور خوش رنگ فاختائوں کی طرح دلہن کی رخصتی کے تخت پر ظاہر ہو کر لسان حال سے اس آیت کو گا رہی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ) وہ ذات پاک ہے جس نے سب کے جوڑے پیدا کئے ان چیزوں میں سے جن کو زمین اگاتی ہے اور ان کی جانوں سے اور ان

چیزوں سے جن کو تم نہیں جانتے۔

خطاب بہ وکیل: ایجاب و قبول کے شرائط کے بموجب فرمان رسول مقبول ﷺ نکاح میری سنت ہے جس نے اس سے انکار کیا وہ میرا نہیں ہے۔ شرفاء کرام کے سامنے آپ کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ کیا وکالت کا حکم آپ کو حاصل ہے (یعنی آپ کی وکالت صحیح اور ثابت ہے۔ کیا آپ کی وکالت صحیح اور ثابت ہے۔ کیا آپ کی وکالت صحیح اور ثابت ہے۔ اس کے جواب میں وکیل کہے۔ ''آرے ثابت است'' ہاں میری وکالت صحیح اور ثابت ہے۔

خطاب بہ وکیل: نفس مسماۃ فلاں بنت فلاں رابہ بدل مہر (۔۔۔۔) بہ فلاں بن وفلاں بایں شرط کہ ششماہ درحال اقامت یا یکسال درحالت سفر اگر ذات میاں مذکور بمسماۃ خود رانر ساند پس اختیار مسماۃ مذکورہ بدست او باشد۔ بایں شرط و بایں مہر بزنی کردہ دادی بایں شرط و بایں مہر بزنی کردہ دادی۔ وکیل گوید آرے کردہ دادم۔ آرے کردہ دادم

ترجمہ: مسّماۃ فلاں بنت فلاں کو بہ بدل مہر (۔۔۔۔) فلاں بن فلاں کے نکاح میں اس شرط کے ساتھ کہ اگر میاں مذکور نے اقامت کی حالت میں چھ مہنیوں کے اندر اور سفر کی صورت میں ایک سال کے اندر اپنی ذات، اپنی بیوی کو نہیں پہنچائی تو اس عورت کا اختیار (خلع یا طلاق) اس کے ہاتھ میں ہو گا۔ کیا آپ نے اس شرط سے اور اس مہر کے عوض اس عورت کو اس مرد کے نکاح میں دیا ہے۔

تو کیا آپ نے اس شرط سے اور اس مہر کے عوض اس عورت کو اس مرد کے نکاح میں دیا ہے۔ کیا آپ نے اس شرط سے اور اس مہر کے عوض اس عورت کو اس مرد کے نکاح میں دیا تو تینوں وقت وکیل کہے۔ ہاں میں نے دیا ہے۔ ہاں میں نے دیا ہے۔ ہاں میں نے دیا ہے۔

اس کے بعد نوشاہ سے خطاب کرتے ہوئے خطیب پوچھے (اے کہ تو حرّی و عاقلی و بالغی در مجلس مسلماناں حاضر آمدہ ای نفس مسّماۃ فلاں بنت فلان رابدل مہر () بدیں شرط کہ ششماہ درحالت اقامت یا یکسال درحالت سفر اگر ذات تو بہ مسّماۃ مذکورہ نرسد پس اختیار او بدست او باشد پس بدیں شرط و بدیں مہر بزنی خواستی و قبول کردی۔

ترجمہ: اے نوشاہ کہ تو آزاد ہے عاقل ہے اور بالغ ہے مسلمانوں کی مجلس میں حاضر ہوا ہے مسّماۃ فلاں بنت فلاں کو مہر () کے عوض اس شرط سے کہ چھ مہینے ایک جگہ رہنے کی حالت میں یا ایک سال سفر میں رہنے کیحالت میں اگر تو مسمّاۃ مذکورہ سے ملاقات نہیں کریگا تو اس کا اختیار اسکو حاصل ہو گا۔ پس اس مہر اور اس شرط سے کیا تو نے اسکو قبول کیا؟ کیا تو نے اس مہر اور اس شرط کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ کیا تو نے اسکو اس مہر اور اس شرط کے ساتھ قبول کیا۔

توجواب میں شوہر کہے کہ "ہاں میں نے اسکو قبول کیا" "ہاں میں نے اسکو قبول کیا" "ہاں میں نے اسکو قبول کیا"

پھر خطیب نوشاہ سے زوجۂ کے متعلق حقوق شرعیہ کی تلقین کرے

(۱) جو مہر باندھا گیا ہے اسکے مطالبہ پر اسکو ادا کرے یا وعدہ کرے اور وعدہ وفا کرے۔

(۲) بیوی کا نان ونفقہ، شوہر کے ذمہ ہے۔ پس کسب حلال سے اسکو ادا کرے

(۳) بیوی کو اس کے ماں باپ کے پاس بھیجنے کے سلسلے میں ممانعت نہ کرے۔ ان کے بُلاوے پر خوشی ورضامندی سے بھیجے اور بُلائے۔

(۴) بیوی چونکہ دائرۂ دین اسلام کی ہے۔ اگر وہ اپنی ضرورت یا کسب یا ملازمت کے سلسلے میں اسے کہیں لیجائے تو نیک پڑوس اور دیندار ماحول میں رکھے اور پردہ کا بھی خاص خیال رکھے۔

اس کے بعد دعائیں پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت آدم ووحوّا علیهما السلام

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت ابراهیم و ساره وهاجرة علیهم السلام

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت ایوب و رحیماً علیهما السلام

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت موسیٰ و صفورا علیهما السلام

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضـرت محمد رسـول الله و حضـرت خدیجه الکبریٰ و عائشـه صدیقه علیهم السلام

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت علی المرتضیٰ و فاطمة الزهراء رضی الله عنهما

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت سید محمد مهدي موعود أمرالله مراد لله خلیفة الله وبی بی الهدادی و بی بی ملکاں علیهم السلام

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت بندگی میاں میراں سید محمود ثاني مهدي و بی بی کدبانو رضي الله عنهما

اَللّٰهُمَّ ألّف بینهما کما ألّفت بین حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشهداء و بی بی عائشه و فاطمه رضی الله عنهما

اَللّٰهُمَّ ألّف بينهما كما ألّفت بين حضـرت بندگی میاں شـاه نعمت مقراض بدعت و بی بی خونزا نصرت رضی الله عنهما

اَللّٰهُمَّ ألّف بينهما كما ألّفت بين حضـرت بندگی میاں شـاه نظام دریائے وحـدت آشام و بی بی فیروزه رضي الله عنهما

اَللّٰهُمَّ ألّف بينهما كما ألّفت بين حضرت بندگی میاں شاه دلاور و بی بی راج متی رضی الله عنهما

اس کے بعد دلھا کو مبارکباد کہے اور یہ مسنون دعا پڑھے۔

بَارَكَ اللهُ لَكَ وَ بَارَكَ اللهُ عَلَيْكَ وَ جَمَعَ بَيْنَكُمَا بِالْخَيرِ

خشوع

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴿المؤمنون:۱﴾ وہ مومن کامیاب ہو گئے جو اپنی نمازوں میں عاجزی اختیار کرتے ہوئے پر سکون رہتے ہیں۔

خشوع کے معنی عاجزی کرنے، ڈرتے رہنے، پست رہنے تواضع اختیار کرنے اور ساکن رہنے کے ہیں۔ خشوع کا تعلق افعال قلب سے بھی ہے اور افعال جوارح سے بھی جیسے ساکن رہنا، ادھر ادھر نہ دیکھنا نیچی نگاہ رکھنا، خوف اور خدا کے حضور کھڑے ہونے کی ہیبت اپنے دل میں پیدا کرنا ہے۔ نماز میں بہترین ہیئت یہی ہے کہ نماز میں نہایت درجہ تذلّل اور غایت درجہ خضوع کا اظہار کرے۔ اور اپنے دل میں بھی سوائے معبود حقیقی کے اور کوئی خیال دل میں نہ لائے۔ صرف سجدہ کی جگہ پر نظر رکھے اور دائیں بائیں التفات نہ کرے۔ حتیٰ کہ گوشۂ چشم سے بھی ادھر اُدھر نہ دیکھے۔

چنانچہ بعض صحابہ کرامؓ کے تعلق سے منقول ہے کہ وہ نماز میں اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ گویا بیجان لکڑی ہیں حضور نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔ لَا صَلٰوۃَ إِلَّا بِحُضُورِ القَلب۔ دل کی حاضری کے بغیر نماز نہیں ہوتی، مطلب یہ کہ اعضاء وجوارح پر تو خشوع کی کیفیت ہو جائے لیکن دل میں بھی خشوع ہونا چاہیئے۔ یعنی جس کے دربار میں کھڑے ہیں اس کے سوا کوئی اور خیال بھی دل میں نہ آنا چاہیئے۔

اب دل میں خیال آنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نمازی اپنے دل میں اپنے اختیار سے غیر اللہ کا خیال لائے۔ اور ختم نماز تک اس کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ تو اس خشوع کے خلاف ہے جس پر مومن کی نجات اور کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نماز میں خود بخود کوئی خیال غیر اختیاری طور پر آجاتا ہے۔ چونکہ یہ انسانی اختیار سے باہر ہے اس کو روکنے پر انسان مکلّف نہیں ہے۔ شیطان کسی نہ کسی طرح نماز میں داخل ہو کر مصلّی کے دل میں وساوس پیدا کرنے کی پوری کوشش کرلیتا ہے۔ اگرچہ اسکو روکنا بھی ضروری ہے اور اسکو روکنے کے لئے چند طریقے ہیں۔

(۱) ہمیشہ اپنے دل میں خوف اور خشیت الٰہی کو غالب رکھے۔

(۲) جو کچھ نماز میں پڑھتا ہے اسکو فقط اپنی یاد سے نہ پڑھے۔ بلکہ اسبات کا خیال کرے کہ میں یہ لفظ ادا کر رہا ہوں مثلاً الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

(۳) جو پڑھ رہا ہے اس کے معنی پر بھی نظر رہے۔ اگر انعام وجزا کی آیت ہو دل میں خوشی کا احساس ہو اور اگر عذاب

اور سزا کا بیان ہو تو دل میں ڈر اور خوف پیدا ہو۔

(۴) یہ خیال کرے کہ شاید یہ میری زندگی کی آخری نماز ہو۔ اس کو ہر جہت سے کامل ہونی چاہئے۔ تمام تر احتیاط کے باوجود اگر شیطان وساوس پیدا کرے تو نہ گھبرانا چاہئے اور نہ تنگ دل ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ شیطان کی چال یہی ہوتی ہے کہ مصلّی کسی طرح گھبرا جائے اور ملول ہو کر یہ خیال کرے کہ جب نماز میں خطرات اور وساس پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں تو ایسی نماز سے کیا حاصل۔ اس لئے نماز پڑھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر آدمی ایسا کرے گا تو شیطان کی مراد پوری ہو جاتی ہے اور آدمی بے نمازی بن کر مستحق عذاب بن جاتا ہے۔ آدمی کو تو کہنا چاہئے کہ تو کچھ بھی کرلے میں تو نماز نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ تو خود بیزار ہو کر مجھے بہکانا چھوڑ دے۔ اسکی مثال اس بلے باز Batsman کی ہے جو کرکٹ کے میدان میں تیاری کے ساتھ آکر وکٹ Wicket کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ادھر گیارہ کھلاڑی اسکو میدان سے ہٹانے Out کرنے کے لئے پوری کوشش کرتے ہیں۔ گیند باز Bowler ہر قسم کی گیندیں جیسے فاسٹ، سلو، باؤنسر، اسپن، گوگلی، لیگ بریک، دوسرا پھینکتا ہے، LBW کے مواقع رہتے ہیں اور Catch کی تیاری رہتی ہے۔ لیکن باشعور اور ماہر بلے باز وہ ہوتا ہے جو ایسے خطرناک مواقع پر رن نہیں بناتا بلکہ صرف اپنی وکٹ بچالیتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جب گیند باز تھک جائے گا اور کوئی Loose Ball ڈالے گا تو میں رن بنالوں گا اور میانیجر اور کپتان کی طرف سے بھی یہی ہدایت ملتی ہے کہ بھلے سے رن نہ بنے لیکن وکٹ مت گنوائو۔

اسی طرح جب نمازی وضوء کر کے نماز میں نیت باندھ کر کھڑے ہوتا ہے تو شیطان اسکو چیالنج سمجھکر اُسکو نماز سے باہر کرنے کے لئے پورے حربے استعمال کرتا ہے۔ لیکن ہشیار نمازی وہ ہوتا ہے جو اس طرح کی شیطانی چالوں سے گھبراتا نہیں اور کہتا ہے کہ تو مجھے نماز سے باز رکھنے کے لئے چاہے جیسی کوششیں اور داؤ پیچ استعمال کرلے لیکن میں بد دل ہو کر نماز کو نہیں چھوڑوں گا۔ اور اللہ سے یہی دعا کروں گا کہ یااللہ مجھے شیطان کے ہمزات سے بچالے۔ بے شک اللہ تعالی ایسے شخص کو نماز میں خشوع پیدا کر دیتا ہے۔

(شاید کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ واہ کیا بات ہے کہ عبادت کی مثال کرکٹ کے کھیل سے دی جارہی ہے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ مثال کا اصل مقصد صرف صورت حال کو پیش کرنا ہوتا ہے اور بس ورنہ کہاں اہم ترین فرض اور عبادت اور ایک کھیل اللہ معاف فرمائے آمین۔ اللہ تعالیٰ نے اسکی اہمیت اس طرح بھی بیان فرمائی ہے۔ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّـــهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿الحدید:۱۶﴾ کیا ایمان والوں کے لئے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور جو

دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جُھک جائیں اور (وہ) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ان پر زمانۂ دراز گذر گیا پس ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہو گئے۔

یہاں اللہ نے ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت بیان کی ہے اور ذکر اللہ کے ساتھ ساری عبادتیں آ گئیں۔ اور خشوع کے نہ ہونے پر اللہ نے کیسی سخت وعید بیان کی ہے۔ ایک تو ایسے لوگوں کو یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دی ہے اور دوسری وعید یہ ہے کہ اس کا ثمرہ یہ بیان کیا ہے کہ ان کے دل سخت ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خشوع کی ضد قساوت قلبی (دل کی سختی) ہے اور قساوت قلبی اتنی بری چیز ہے کہ قرآن مجید میں ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّـهِ أُولَـٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴿الزمر:۲۲﴾ ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کی یاد (سے غفلت کے سبب) سے سخت ہو گئے ہیں ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ إِنَّ أَبْعَدَ شيئٍ مِنَ اللّٰہِ القَلبُ القَاسِي۔ بے شک اللہ سے سب سے زیادہ دُور قساوت والا دل ہے۔

خاتم

ختم نبوت

مرتبہ حضور ﷺ کا خاتمیت ذاتی ہے۔کیوں کہ نبی کریمؐ وصف نبوت کے ساتھ ''موصوف بالذات'' ہیں اور دوسرے سب انبیاء کرام علیہم السلام موصوف بالعرض ہیں۔اور آپ کے واسطے سے ہیں۔جیسا کہ عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے۔اور اسکے ذریعے سے تمام کواکب، قمر وغیرہ و دیگر اشیاء ارضیہ متصف بالنور ہوتیں ہیں۔یہی حال وصف نبوت کا ہے۔اسی وجہ سے حضور ﷺ کو سب سے پہلے نبوت ملی ہے۔اورآیت میثاق ''وَإِذْ أَخَذَ اللَّـهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ'' ﴿آل عمران:۸۱﴾ سے واضح ہے۔نبی کریمؐ جیسا کہ اللہ کے رسول ہیں، ''نبی الانبیاء'' بھی ہیں۔تمام انبیاء کی جماعت کو ایکطرف رکھا گیا اور حضور ﷺ کو ایکطرف۔اور سب سے حضور ﷺ پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہدوپیمان لیا گیا۔پھر آیت میں ''ثُمَّ جاءَكُمْ'' فرماکر یہ بھی تصریح کردی گئی کی حضور ﷺ کا زمانۂ ظہور سب سے آخر میں ہوگا۔

لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا صف بندی کرکے امام کا منتظر رہنا اور حضور ﷺ کی امامت کرنا بھی اس باب میں واضح اشارہ ہے۔نیز آیت ''واسئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا'' میں بھی ہے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ابن عباسؓ کے مطابق یہ آیت لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی۔پھر بنی اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کیلئے تشریف لانا اور شریعت محمدیہ پر عمل فرمانا، حضور ﷺ کے افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے۔واضح ہو کہ نزول عیسیٰؑ اسلام کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔

خاتمیت زمانی یعنی آپؐ کا زمانۂ نبوت اس عالم مشاہدہ میں تمام انبیاء کے آخر میں ہے۔آپؐ کے بعد نبوت کسی کو تفویض نہ ہوگی۔ساتویں جلد، روح المعانی میں حضرت ابی بن کعبؓ سے مرفوعا مروی ہے ''بدی بی الخلق وکنت آخرھم فی البعث'' یعنی مجھ سے مخلوق کی پیدائش کی ابتداء کی گئی، لیکن میری بعثت سب سے آخر میں ہوگی۔اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے ''كُنْتُ أَوَّلَ النَّبِيِّين فِي الخَلقِ وَ آخَرُهُمْ فِي البعث'' یعنی میری خلقت تمام انبیاء سے پہلے ہوئی اور بعثت سب کے بعد۔

ختم الاولیاء

شیخ ابوعبداللہ محمد بن علی بن حسن الحکیم ترمذی نے ختم الاولیاء کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں مصنف نے ولی، نبی، ختم النبوۃ، خاتم الانبیاء، ختم الولایت، خاتم الاولیاء کے تعلق سے مختلف فصلوں میں تفصیلی بحث بھی کی ہے اور

اعتراض کرنے والوں کے جواب بھی دئے ہیں۔

چناچہ الفصل السابع میں ختم الاولیاء کے عنوان پر بحث کی ہے۔

اسی طرح الفصل الثالث عشر (تیرھویں فصل) میں خاتم الاولیاء کی صفت، مقام اور ان کی مناجات کے تعلق سے بحث کی ہے۔ الفصل الخامس والعشرون (۲۵ ویں فصل) میں خاتم الاولیاء، صفاتہ، اور معنیء ختم الولایت سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۶۱ پر تیرھویں سوال یعنی "من الذی یستحق خاتم الاولیاء، کما استحق محمد ﷺ خاتم النبوة ؟" یعنی خاتم الاولیاء کا مستحق کون ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ خاتم النبوۃ کے مستحق ہیں؟ اس کے جواب میں اسی صفحہ کے حاشیہ میں یہ لکھا ہے۔ "فلنقل في الجواب الختم ختمان ختم يختم الله به الولاية العامة، و ختم يختم الله به الولاية المحمديه و اما ختم الولاية على الاطلاق فهو عيسىٰ، فهو الولى با لنبوة المطلقة في زمان هذه الامة، و قد حيل بينه و بين نبوة التشريع و الرسالة فينزل في آخر الزمان وارثا خاتما لا ولي بعده-بنبوة مطلقة، كما ان محمدا ﷺ خاتم النبوة، لا نبوة تشريع بعده-و انه كان بعده مثل عيسىٰ من اولي العزم من الرسل و خواص الانبياء-ولكن زال حكمه من هذا المقام (نبوة التشريع) لحكم الزمان عليه--فكان اول هذا الامر نبي و هو آدم و آخره نبي و هو عيسىٰ فيكون له يوم القيامة حشران، حشر معنا و حشر مع الرسل و الانبياء""و كما ان الله ختم بمحمد ﷺ، نبوة الشرائع، كذالك ختم الله بالختم المحمدي الولاية التي تحصل من وراثة المحمدي، لا التي تحصل من سائر الانبياء، فان من الانبياء من يرث ابراهيم و موسىٰ و عيسىٰ، فهٰولاء يوجدون بعد هذا الختم المحمدي وبعده لا يوجد ولي على قلب محمد ﷺهذا معني خاتم الولاية المحمدية-و اما ختم الولاية العامة الذى لا يوجد بعده ولي، فهو عيسىٰ (ص۔۱۶۱) ترجمہ۔ اسکے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ الختم دو ختم ہیں، ایک ختم جس کے ذریعہ اللہ ولایت عامہ کو ختم کرتا ہے۔ اور ایک ختم وہ جس کے ذریعہ اللہ ولایت محمدیہ کو ختم کرتا ہے۔ پس ختم ولایت مطلقہ وہ عیسیٰؑ ہیں۔ پس وہ ولی ہیں نبوت مطلقہ سے اس امت کے زمانے میں، پس ان کے اور نبوت تشریع و رسالت کے درمیان زمانہ حائل ہو گیا ہے۔ پس وہ آخر زمانے میں نازل ہوں گے، وارث اور خاتم کی حیثیت سے، ان کے بعد کوئی ولی نہیں ہو گا۔ اور جس طرح محمد ﷺ خاتم نبوت ہیں کہ ان کے بعد کوئی نبوت تشریعی نہیں ہے، اگر چہ انکے بعد عیسیٰؑ کے جیسے نبی ہیں جو کہ اپنے زمانے میں اولا العزم رسولوں میں اور خاص نبیوں میں سے تھے، لیکن انکا وہ اگلے مقام کا حکم زائل ہو چکا ہو گا، پس وہ ولی کی حیثیت سے نازل ہوں گے لیکن نبوت مطلقہ کے ساتھ جس میں اولیاء محمدی شریک ہوں گے، پس وہ (عیسیٰ)ؑ ہم میں سے ہوں گے، اور وہ ہمارے سردار ہوں گے۔

پس اس امر کی ابتداء بھی نبی سے ہوئی اور وہ آدم ہیں اور اس کے آخر میں بھی نبی ہیں اور وہ عیسیٰؑ ہیں۔یعنی نبوت اختصاص۔پس عیسیٰؑ کے لئے دو حشر ہوں گے قیامت کے دن،ایک حشر ہمارے ساتھ ہو گا اور ایک حشر انبیاء ورسل کے ساتھ۔

اور اللہ جس طرح محمد ﷺ کے ذریعہ نبوت شرائع کو ختم فرمائیگا اسی طرح ختم محمدی کے ذریعہ ولایت کو ختم فرمائیگا، جو وراثت محمدی سے حاصل ہوتی ہے۔نہ کہ وہ دیگر تمام انبیاء سے حاصل ہوتی ہے۔کیونکہ اولیاء میں سے بعض وہ ہیں جو ابراہیمؑ کے وارث ہیں اور بعض موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے،جو ختم محمدی کے بعد پائے جائیں گے۔لیکن ان کے (عیسیٰؑ کے) بعد کوئی ولی قلب محمد ﷺ پر نہ پایا جائیگا اور یہی معنی ہیں خاتم ولایت محمدیہ کے۔لیکن ختم ولایت عامہ وہ ہے جس کے بعد کوئی ولی نہیں پایا جائیگا اور وہ عیسیٰؑ۔

نیز اسی کتاب کے ص ۳۴۴ پر لکھا ہے کہ "**فکان حجة الله عليهم و على سائر الموحدين من بعدهم و كان شفيعهم يوم القيامة، فهو سيدهم و ساد الاولياء، كما ساد محمد ﷺ الانبياء، فينصب له مقام الشفاعة**"

ترجمہ۔پس وہ (خاتم ولایت محمدیہ) تمام اولیاء پر اور ان کے بعد آنے والے موحدین پر اللہ کی حجت ہے اور وہ قیامت کے دن ان کی شفاعت کرنے والے ہیں۔پس وہ انکے اور اولیاء کے سردار ہیں جیسا کہ محمد ﷺ انبیاء کے سردار ہیں اور انکے لئے مقام شفاعت قائم کیا جائیگا۔

اسی کتاب کے تیرھویں باب میں خاتم الاولیاء کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ **قال قائل و ما صفة ذالك الولي الذي له امامة الولاية ورياستها وختم الولاية ؟** کہنے والے نے کہا ہے کہ اس ولی کی صفت کیا ہے جس کیلئے ولایت کی امامت ہے اور ولایت کی ریاست ہے اور ختم الولایت ہے؟ تو اسکے جواب میں لکھتے ہیں **ذالك من الانبياء قريب، يكاد يلحقهم**۔وہ انبیاء سے قریب ہے اور قریب ہے کہ وہ ان سے ملحق ہو جائے۔

اسیطرح اس کتاب کے انیتس ویں (۲۹) فصل میں ایک اہم سوال کا جواب دیتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ کیا مہدیؑ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے افضل یا ان کے برابر ہو سکتے ہیں؟

چناچہ وہ لکھتے ہیں،**قال له قائل-فهل يجوز ان يكون في هذا الزمان من يوازى ابابكر و عمر رضي الله عنهم** تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں "**ان كنت تعني في العمل فلا، و ان كنت تعني في الدرجات فغير مدفوع و ذالك ان الدرجات بوسائل القلوب**۔ اگر اس سے مراد عمل میں ہے تو نہیں اور اگر درجات میں ہے تو ہاں اس لئے کہ درجات قلوب کے وسائل سے ہے۔**أو ليس المهدي كائنا فى آخر الزمان**۔کیا مہدی آخر زمانے میں ہونے والے نہیں

ہیں او ليس كائنا في الزمان من له ختم الولاية۔ کیا زمانے میں وہ ہستی ہونے والی نہیں ہے جو خاتم ولایت ہے وهو حجة الله على جميع الأولياء يوم الموقف۔ اور وہ قیامت کے دن تمام اولیاء پر اللہ کی حجت ہیں كما ان محمدا ﷺ آخر الأنبياء ۔جس طرح محمد ﷺ آخری نبی ہیں فاعطي ختم النبوة فهو حجة الله على جميع الأنبياء۔ ان کو ختم نبوت دی گئی پس وہ تمام انبیاء پر اللہ کی حجت ہیں۔ كذالك هذا الولي الذي هو آخر الأولياء في آخر الزمان۔ اسی طرح یہ ولی جو آخر زمانے میں ہے آخر اولیاء ہے۔

اس پر پھر یہ اعتراض ہوا کہ فاين حديث رسول الله ﷺ " خرجت من باب الجنة فاتيت الميزان فوضعت فى كفة و امتي في كفة، فرجحت بالامة، ثم وضع ابو بكر مكانه فرجح بالامة ثم وضع عمر مكان ابي بكر فرجح بالامة قال الشيخ هذا وزن الاعمال لا وزن ما في القلوب، اين يذهب بكم يا عجم-ما هذا الا من غبارة افهامكم" ترجمہ۔ پھر اس حدیث کا کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں جنت کے دروازہ سے نکلا تو میزان لایا گیا، ایک پلڑے میں میں اور ایک پلڑے میں میری امت کو رکھا گیا، تو میرا پلڑا میری امت کے پلڑے سے بھاری ہو گیا، پھر ابو بکر کو میری جگہ پر رکھا گیا تو ابو بکر کا پلڑا امت پر بھاری ہو گیا، پھر ابو بکر کی جگہ پر حضرت عمرؓ کو رکھا گیا تو عمر کا پلڑا امت کے پلڑے کے مقابلے میں بھاری ہو گیا تو شیخ نے اس کا جواب دیا کہ یہ اعمال کا وزن ہے نہ کہ اس (اخلاص) کا وزن جو دلوں میں ہوتا ہے۔ اے عجم کے لوگ تم کہاں جا رہے ہو، اس کا سبب تمہاری کج فہمی ہے الا ترى انه يقول خرجت من باب الجنة، فالجنة للاعمال و الدرجات للقلوب و الوزن للاعمال لا لما في القلوب-ان الميزان لا يتسع لما في القلوب، فالميزان عدله و ما في القلوب عظمته و كيف توزن العظمة وقد جاء في الخبر ان العبد يتحير عند الميزان فيقول له الملك هل تفقد شيئا من عملك قال، بلىٰ، شهادة ان لا اله الا الله قال انها اعظم من ان توضع في الميزان و انما تقدم الأنبياء الخلق بالنبوة لا بالأعمال و الأولياء بالصديقية لا بالأعمال و انما تقدم محمد ﷺ سائر الأنبياء بما في قلبه لا بالأعمال فقد كان عمره يسيرا و لو كان بالأعمال لكان عمل عشرين سنة يدق في جنب عمر نوح۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ آپؐ نے فرمایا "میں جنت سے نکلا پس جنت اعمال کیلئے ہے۔ اور درجات دلوں کیلئے ہیں۔ اور وزن اعمال کیلئے ہیں، نہ کے اسکے لئے جو دلوں میں ہوتا ہے۔ ترازوں میں، جو دلوں میں ہے اس کیلئے وسعت نہیں ہے۔ پس میزان اسکا عدل ہے۔ اور دلوں میں جو ہے (اخلاص) اسکی عظمت ہے۔ پس عظمت کو کس طرح تولا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خبر میں آیا ہے کہ ایک بندہ میزان کے پاس حیرت زدہ ہوا تو فرشتہ نے پوچھا کہ کیا تیرے اعمال میں سے کوئی چیز نہیں پا رہا ہے۔ اس نے کہا، ہاں۔ شہادۃ ان لا الہ الا اللہ، تو فرشتے نے کہا کہ وہ ترازو میں رکھے جانے سے بھی بہت بڑی چیز ہے۔

بے شک انبیاء کو خلق پر تقدم نبوت کی وجہ سے ہے اعمال کی بناء پر نہیں، اسی طرح اولیاء کو جو تقدم حاصل ہے وہ صدیقیت کی بناء پر ہے اعمال کی وجہ سے نہیں اور آنحضرت ﷺ کو جو تمام انبیاء پر فوقیت حاصل ہے وہ اسکی وجہ سے ہے جو آپ کے دل میں ہے نہ کہ اعمال کی وجہ سے۔ کیوں کہ آپؐ کی عمر کم تھی، اگر اعمال کی وجہ سے ہوتی تو آپ کا بیس سال کا عمل، حضرت نوحؑ کی عمر کے مقابلے میں بہت ہی کم ہوتا۔

اس عبارت سے جو باتیں مفہوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) جسطرح آنحضرت ﷺ خاتم نبوت ہیں اسی طرح حضرت مہدی علیہ السلام خاتم ولایت ہیں۔

(۲) آنحضرت ﷺ جس طرح انبیاء کے سردار ہیں اسی طرح حضرت مہدیؑ اولیاء کے سردار ہیں۔

(۳) جس طرح حضور محمد ﷺ کو دیگر انبیاء پر فوقیت، اعمال کی بناء پر نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے جو آپؐ کے دل میں ہے۔ اسی طرح حضرت مہدیؑ کو دیگر اولیاء پر تقدم، اعمال کی بناء پر نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے جو آپ کے دل میں ہے۔

(۴) آنحضرت ﷺ خاتم نبوت تشریعی ہیں، حضرت مہدی علیہ السلام خاتم ولایت محمدیہ ہیں۔ یعنی کوئی ولی قلب محمد پر نہیں ہے صرف محمد مہدیؑ ہی قلب محمد پر ہیں۔

(۵) مہدی علیہ السلام کے بعد دوسرے انبیاء کے قلب پر ولی ہوسکتے ہیں، عیسیٰؑ کے آنے تک، عیسیٰؑ کے بعد ولایت مطلقہ کا دروازہ بھی بند ہوجائیگا یعنی کوئی مطلق ولی بھی نہیں ہوگا۔

خاتم نبوت، خاتم ولایت، خاتم المرشدین

صاحب منتھی الارب نے کہاہے خاتَم (بفتح سوم) اور خاتِم (بکسر سوم) دونوں مہر اور انگوٹھی کے معنی میں ہیں۔ ترمذی نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے "بین کتفیه خاتم النبوة و هو خاتم النبیین" یعنی رسول اللہ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپؐ مہر انبیاء ہیں۔

دنیائے اسلام کے مشہور شاعر صحابی رسول اللہؐ حضرت حسان بن ثابتؓ نے رسول اللہ ﷺ کی نعت میں کہاہے کہ اغر علیہ للنبوۃ خاتم۔ من الله من نور یلوح و یشـــهد (مدارج النبوۃ، جلد اول، ص ۲۵۷) ترجمہ۔ سرور پاک سیرت ان پر نبوت کی مہر ہے، اللہ کی طرف سے نور کی چمکتی ہے اور گواہی دیتی ہے۔

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ طبقۂ انبیاء میں محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہی خاتم الانبیاء ہے لا غیر۔ یہی ہمارا اعتقاد ہے۔ اسی طرح اہل سنت والجماعت کے اکابر علماء کی ہی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جہاں نبوت ختم ہوتی ہے وہاں ولایت کا ظہور ہوتا ہے۔ ابو الاولیاء علیؓ سے یہ دور شروع ہوتا ہے اور اس کا کامل ظہور خاتم ولایت سے ہوتا ہے (تفسیر ابن عربی۔ ص ۳۴۰)

(۱) چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے اپنی تفسیر میں آیت قرآنی۔ ''إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّـــهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِـــتَّةِ أَيَّامٍ﴿الأعراف:۵۴﴾'' کے ذیل میں لکھا ہے۔ ''و هذه المدة من ابتداء دور الخفاء الي إبتداء ظهور الذي هو زمان ختم النبوة و ظهور الولاية---------- و يتم الظهور بخروج المهدي عليه الســـلام۔ یعنی یہ مدت دور خفاء کی ابتداء سے اس ظہور کی ابتداء تک کی ہے جو نبوت کے ختم اور ولایت کے ظہور کا زمانہ ہے اور اتمام ظہور، مہدیؑ کے خروج سے ہوگا۔

(۲) نیز ابن عربیؒ نے ''عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا'' کے ذیل میں لکھا ہے۔ اي في مقام يجب على الكل حمده و هو مقام ختم الولايت بظهور المهدي عليه الســـلام (تفسیر ابن عربی، ص ۳۴۰ سورہ اعراف) یعنی ایسا مقام جس میں اسکی حمد سب پر واجب ہوگی اور وہ خاتم الولایت ہے، جس کا اظہار مہدیؑ سے ہوگا۔ دیکھئے یہاں ابن عربیؒ نے خاتم کا لفظ نبوت کی طرح ولایت کیلئے بھی استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شیخ اکبرؒ نے ختم الاولیاء کے الفاظ مہدی موعودؑ کی تعریف میں اسطرح کہے ہیں۔

(۳) الا ان ختم الاولياء شهيد وعين امام العارفين فقيد

هو السيد المهدى من آل احمد هو الصارم الهندى حين يبيد (فتوحات مکیہ، جزء دوم ص ۳۶۶)

ترجمہ۔ آگاہ ہو جائو کہ ختم الاولیاء حاضر ہیں۔ اور امام العارفین کی ذات کا ابھی ظہور نہیں ہوا، وہ سید ہیں مہدی ہیں جو آل احمد سے ہیں، نیز وہ ہندی تلوار ہیں۔ جبکہ وہ ہلاک کرے گی۔ ملاحظہ ہو ان اشعار میں ختم الاولیاء کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(۴) صاحب گلشن راز نے نور محمدی کو تمام انبیاء اور اولیاء کے حق میں فیوض کا منبع قرار دیتے ہوئے ان الفاظ میں تشریح کی ہے۔

بود نور نبی خورشید اعظم گہ از موسیٰ پدید و گہ از آدم

یعنی آنحضرت ﷺ کا نور خورشید اعظم تھا جو کبھی موسیٰ کے ذریعہ جلوہ گر ہوا اور کبھی آدم سے۔

لیکن اس سیر نبوت کا اختتام کہاں ہوا، اسکی تشریح یوں کرتے ہیں۔

نبوت راظہور از آدم آمد کمالش در وجود خاتم آمد

یعنی نبوت کا ظہور آدم سے ہوا اور اس کا کمال خاتم کے وجود سے ہوا۔ (یعنی خاتم الانبیاء)

اس کے بعد لکھتے ہیں: ولایت بود باقی تا سفر کرد چو نقطہ در جہاں دور دگر کرد

یعنی نبوت ختم ہو جانے کے بعد ولایت باقی رہی تا کہ سفر کرے اور نقطہ کی طرح جہاں میں دوسرا دور کرے۔

ظہور کل او باشد بخاتم بدو یابد تمامی دور عالم

یعنی ولایت کا ظہور کل ختم الاولیاء سے ہو گا اور اسی سے دور عالم تمام ہو گا۔

(۵) مفاتیح الاعجاز میں خاتم ولایت کی ذات سے ولایت کا کل ظہور ہونے کی یہ تشریح کیگئی ہے "ظہور تمام ولایت و کمالش بخاتم الاولیاء خواہد بود، چہ کمال حقیقت دائرہ در نقطۂ اخیر بظہور می رسد۔ وخاتم الاولیاء عبارت از محمد مہدی است کہ موعود حضرت رسالت است۔

(٦) شیخ سعد الدین حموی، جوہر اول کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ "جوہر اول را کہ حقیقت ذات مصطفی است ہر دو طرف مظہر باید، مظہرے کہ ختم نبوتش بر او شد و مظہرے کہ ختم ولایت بر او شود؛ وایں مظہر یست کہ اورا مہدی گویند وصاحب فرمان وصاحب زمان نامند۔ وسلطان سلاطین اولیاء واصفیاء است۔ وفیض ہمہ اولیاء جزء فیض اوست۔ یعنی جوہر اول کو جو محمد مصطفی کی حقیقت ہے دونوں طرف مظہر چاہئے۔ ایک مظہر وہ جو آپؐ کی نبوت اسکے ذریعہ ختم ہوئی اور ایک مظہر وہ جو ختم ولایت اس پر ہو گی۔ اور اس آخری مظہر کو مہدی کہتے ہیں اور صاحب زمان و صاحب فرمان نام رکھتے ہیں، وہی اولیاء اور اصفیاء کے شہنشاہ ہیں۔ تمام اولیاء کا فیض آنحضرت کے فیض کا جز ہے۔

(۷) محب اللہ الہٰ آبادی نے فصوص کی شرح میں لکھا ہے " انبیاء را از ایں راہ کہ اولیاء اللہ باشند نمی بینند حق تعالیٰ را مگر از مشکوٰۃ خاتم الاولیاء" یعنی انبیاء اس جہت سے کہ وہ اولیاء ہیں نہیں دیکھیں گے اللہ کو مگر خاتم الاولیاء کی مشکوٰۃ سے۔

ان مندرجہ بالا حوالوں سے ثابت ہوا کہ خاتم کا لفظ جس طرح نبوت کی کامل منزل کیلئے استعمال ہوا ہے اسی طرح ولایت مصطفی کے کامل ظہور کے وقت بھی خاتم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور نبوت کے خاتم جس طرح حضور محمد ﷺ ہیں اسی

طرح ولایت مصطفی کے خاتم حضور مہدی موعود علیہ السلام ہیں۔ اسی لئے درود وسلام خاتمین کی ذات پر بھیجا جاتا ہے۔ جن میں سے ایک خاتم نبوت ہیں اور دوسرے خاتم ولایت محمدی ہیں۔

اب رہی یہ بحث کہ کیا خاتم ولایت کے بعد کوئی ولی نہیں، تو اس سوال کے تعلق سے بھی ہم اہل سنت والجماعت کی تحریر کو پیش کریں گے۔ چناچہ علامہ عبد الرحمان جامیؒ نے نقد النصوص میں جو لکھا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ولایت دو قسم کی ہے۔ ایک ولایت مطلقہ دوسری ولایت محمدیہ۔ ولایت محمدیہ کے چند اقسام ہیں جو مراتب میں متفاوت ہیں۔ ہر ایک قسم کیلئے ایک مخصوص نام ہے۔ کہ اس نام سے اسکو ایک نوع کا خاتم الولایت کہہ سکتے ہیں۔ ایک وہ خاتم الولایت ہے جس کا تصرف عالم میں معنوی ہے جیسے قطب، ایک وہ ہے جس کو بظاہر تصرف حاصل ہے جیسے سلطان، ایک خاتم وہ ہے جس کو ظاہرا و باطنا دونوں تصرف حاصل ہوں وہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجھہ، ایک نوع خاتم وہ ہے جس کے بعد اصلا و قطعا کوئی ولی نہیں ہوگا وہ حضرت عیسیٰؑ ہیں اور ایک خاتم، خاتم خاصہ ولایت محمدی ہے وہ امام مہدی موعودؑ ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، شیخ محمد تبریزی، محمد بن یحییٰ بن علی الجیلانی، حضرت مولانا عبد الرحمان جامیؒ، شیخ سعد الدین حموی، محب اللہ الہ آبادی جیسے اجلہ متقدمین و متاخرین، ظہور خاتم ولایت محمدیہ کے معتقد اور اس منصب جلیلہ پر امام مہدی موعودؑ کے فائز ہونے کے معترف ہیں۔

(۸) اس کے علاوہ خاتم سے مراد خاتم دین بھی ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ جو خاتم النبیین ہیں امام مہدی موعودؑ کے بارے میں فرمایا۔ یختم اللہ بہ الدین کما فتحہ بنا۔ یعنی مہدی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دین کو ختم کریگا جیسا کہ اللہ نے ہم سے دین کا افتتاح فرمایا تھا۔

خلاصہ یہ کہ خاتمین سے مراد خاتم النبیین ﷺ و خاتم ولایت محمدیہ ﷺ ہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں اللہ نے آپ پر نبوت کا دروازہ بند فرمادیا، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا، اگر کسی نے آپؐ کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا یا کریگا تو وہ کاذب ہے اور وہ کافر ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمادیا "مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَـٰكِن رَّسُولَ اللَّـهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ﴿الأحزاب:۴۰﴾"۔ ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ اسکے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لَا نَبِي بَعْدِي" میرے بعد کوئی نبی نہیں (نہ ظلی، نہ بروزی) یہی مہدویہ کا ایمان ہے۔

اور حضرت مہدیؑ نے اللہ کے حکم سے "مہدی" ہونے کا دعویٰ فرمایا، پوری زندگی میں کبھی آپ نے نبی ہونے کا

دعویٰ نہیں فرمایا بلکہ اپنے مہدی ہونے کی دلیل کے طور پر فرمایا "مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ ﷺ"

نیز آپؑ نے فرمایا بندہ کوئی نئی شریعت نہیں لایا، پھر ایک مرتبہ فرمایا "بندہ شریعت محمدی بیان کرتا ہے۔

لیکن اس کے بر خلاف کچھ لوگوں نے خاتم النبیین کی الگ الگ تاویلیں شروع کی ہیں۔ ایک مرزا غلام احمد قادیانی ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ور کہا کہ میری نبوت ظلی اور بروزی ہے۔ علماء نے اس کا تعاقب کیا اور اسکو خارج از اسلام قرار دیا۔ دیوبند سے بھی ایک کتاب صراط مستقیم شائع ہوئی ہے۔ اس میں خاتم نبوت پر بحث کے ذیل میں لکھا ہے "اور یہ مقام مستقل طور پر خاتم النبوۃ اور فاتح الولایۃ محمد مصطفی ﷺ کیلئے مخصوص ہے۔ اور آپ کی پیروی کی برکت سے اس مقام کا نمونہ بعض بزرگوں کو بھی عطا کیا جاتا ہے۔ اور اصطلاح میں ان کو "خاتمین" اور "فاتحین" کا لقب دیا جاتا ہے (صراط مستقیم ص ۴۳)۔ اس عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی خاتم ہوتے ہیں اور ہر دور میں ایک ایک خاتم اور فاتح ہوتا ہے۔

نوٹ: میسور میں ۱۲، اپریل ۱۹۷۲ء میں میلاد النبیؐ کا ایک جلسہ فقیر راقم الحروف کی صدارت میں ہوا تھا۔ جس میں مولوی بشیر احمد صاحب نے مہدویہ کی کسی کتاب میں مندرجہ لفظ "خاتمین" کے حوالے سے اعتراض کیا تھا، فقیر نے اس کا جواب تحریری طور پر دیا تھا، موصوف نے اسکو پڑھ کر تحریری جواب دیتے ہوئے شبہ رفع ہونے اور اچھی طرح وضاحت ہو جانے پر شکریہ بھی ادا کیا اور دعائیں بھی دیں۔ جس کی اصل فقیر کے پاس محفوظ ہے۔ مع دستخط و تاریخ۔

خاتم المرشدین

حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہداءؓ کے فرزند ارجمند نے جو حضرت فاطمہ بنت حضرت امامنا مہدیؑ کے بطن سے پیدا ہوئے اور جن کا نام بندگی میاںؓ نے سید محمود رکھا تھا، اپنے دور میں "خاتم المرشدین" کا دعویٰ فرمایا تھا، آپؓ کی عرفیت "سید نجی" تھی، اس لئے قوم میں آپ سیدن جی خاتم المرشدین کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی زیارت گاہ جالور شریف راجستھان میں ہے۔ ماشاء اللہ روضہ مبارک مرجع خلائق ہے۔

آپؓ کی سیدھی آنکھ میں کلمہ طیبہ اور بائیں آنکھ میں تسبیح لکھی ہوئی تھی۔ بچپن میں ہی حضرت مہدیؑ نے حضرتؓ کو ایک عظیم بشارت سے نوازا تھا۔ روایت ہے کہ ایک دن ثانی مہدیؓ اور بی بی فاطمہؓ (بھائی اور بہن) مہدیؑ کی چارپائی کے نیچے کھیلنے لگے، کھیل کھیل میں حضرت ثانی مہدیؓ نے اپنی ہمشیرہ بی بی فاطمہؓ کے شکم پر ٹکورے مار مار کر ہنسا رہے تھے۔ حضرت امام مہدیؑ نے یہ دیکھکر فرمایا، بھائی سید محمود۔ اس دختر کے شکم پر ٹکورے مت مارو، کہ خدائے تعالیٰ ان کے شکم سے ایک فرزند پیدا کریگا جو اپنے زمانے میں ہمارے زمانے کے عمل کو قائم کریگا۔ اور یہ فاطمہ ولایت ہے۔ اس سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا کہ آخر وقت

میں میرے مدعا کو ثابت و قائم کریگا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس دختر سے ایسا فرزند پیدا ہوگا کہ اس سے میرا دین قرار پائیگا۔

چناچہ آپ نے اپنے دور میں جب آپ کے سوا تابعین میں سے کوئی اور اہل فضل نہیں تھا۔ آپ نے خاتم المرشدین کا دعویٰ فرمایا، اس کا مقصد مرکزیت اعتقادی پیدا کرنا تھا۔ تاکہ اعتقادیات اور عملیات کو بدعات اور خرافات سے محفوظ کرلیا جائے۔ کیوں کہ مرکز سے دوری کی وجہ اس بات کا قوی اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کی عقائد اور اعمال میں کمزوری اور سستی پیدا ہوجائے اور الگ الگ مقامات پر الگ الگ اعتقادات اور اعمال کا شیوع ہوجائیگا۔ چناچہ اس وقت جو مرشدین تھے وہ سب نے آکر آپ سے علاقہ باندھا۔ اور اعتقادی اعتبار سے مہدویت بکھرنے سے بچ گئی۔ چونکہ مخالفین کے ارادوں کو دھکا لگا تھا اور وہ اپنے گھنائونے عزائم کو پورے کرنے میں ناکام ہوگئے تھے۔ بالآخر آپؓ پر ایک معاندنے جبکہ آپؓ نماز تہجد کے بعد ذکر اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ برچھے کا وار کیا۔ آہٹ پاکر آپؓ نے ہاتھ سے روکا، برچھے نے ہتھیلی کو زخمی کردیا۔ لیکن برچھہ چونکہ زہر آلود تھا، زخم چنگانہ ہوا۔ زہر پورے جسم میں پھیل گیا اور آپؓ ۱۵ محرم الحرام کو ۹۹۶ھ میں اللہ سے جاملے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ جب آپ نے خاتم المرشدین ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو پھر آپ کے بعد مرشدی کا سلسلہ کیسے جاری رہ سکتا ہے تو اس کا جواب دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لئے کہ گذشتہ سطور میں ہی خاتم کی حقیقت بیان کی جاچکی ہے یعنی اس دعویٰ کا مقصد پیروں و مرشدوں کے سلسلوں کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ ایک اعتقادی و عملی پلیٹ فارم پر لانا تھا اور بس۔

چناچہ اسی طرح کے خاتم بعد میں بھی ہوئے ہیں چناچہ کسی کو انکے مرتبہ کے لحاظ سے ''خاتم المحدثین''، ''خاتم الفقہاء'' وغیرہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ نیز آپ نے فیض مقید اور دین دریبہ ہونے کا بھی اعلان فرمایا۔ اس کا مقصد بھی وہی تھا جو اوپر مذکور ہے (ملخص از سراج منیر)۔

خلع

میاں بیوی میں اگر سخت ناچاقی پیدا ہو جائے اور مرد کسی طرح اسے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو عورت مرد سے علٰیحد گی اختیار کر لینے کیلئے دوسرا جو شرعی طریقہ اختیار کر سکتی ہے وہ خلع ہے۔

قرآن میں اس کے تعلق سے اسطرح حکم آیا ہے کہ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّـهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿البقرۃ:۲۲۹﴾ترجمہ:اگر تم کو اندیشہ ہے کہ وہ دونوں اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ایسی صورت میں عورت اپنی رہائی کیلئے اپنے شوہر کو کچھ دے ڈالے تو اس پر کچھ گناہ نہیں، یہ اللہ کے حدود ہیں پس تم ان سے آگے نہ بڑھو اور جو لوگ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں وہی لوگ ظالم ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت خود اپنی طرف سے ایسا فیصلہ نہیں کر سکتی، بلکہ اسکو چاہئے کہ طرفین کے لوگوں کو صلح وصفائی کیلئے بیچ میں ڈالے اور جب وہ طرفین کے ذمہ دار بھی اس نتیجہ پر پہنچیں کہ شوہر اور بیوی میں اتفاق نہیں ہو سکتا اور مرد اپنی بیوی کو بھی طلاق دینے پر تیار نہیں ہے تو ثالث حضرات خلع کا فیصلہ کریں۔

خلع کے معنی عورت اپنا حق مہر چھوڑ کر یا اپنے پاس سے کچھ دے دلا کر مرد کو راضی کر کے جو طلاق مرد سے حاصل کرتی ہے اسکو ''خلع'' کہتے ہیں، یہ طلاق بائن ہوتی ہے۔

عدت کے دن گذرنے کے بعد پھر اگر دونوں رضا اور رغبت کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

خضر

قرآن شریف میں خضرؑ کا ذکر اسطرح آیا ہے "فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا﴿الکھف: ۶۵﴾ "پس وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جسکو ہم نے اپنی (خاص) رحمت (نبوت یا رویت) دی تھی اور ہم نے اسکو اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا۔ ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے مراد حضرت خضر علیہ السلام ہیں، اس بارے میں اختلاف ہے کہ خضر نبی ہیں یا ولی۔

وہ دلائل جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر نبی ہیں اسطرح بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) خضرؑ کیلئے "عبدا من عبادنا" کے الفاظ قرآن میں آئے ہیں اور ایسا طرز بیان انبیاء علیہم السلام کیلئے اختیار کیا گیا ہے۔

(۲) اللہ نے ان کی تعریف میں "اٰتیناہ من اُیتنار حمتہ من عندنا" فرمایا ہے، یہ وصف بھی اللہ نے پیغمبروں کیلئے بیان فرمایا ہے۔

(۳) اللہ نے خضرؑ کیلئے "علمناہ من لدنا علما" فرمایا ہے یعنی ہم نے ان کو علم لدنی کی تعلیم دی۔ علم لدنی مخصوص پیغمبروں کو ہی دیا جاتا ہے۔ علم لدنی سے مراد علوم اسرار ہیں۔ اور آتیناہ رحمتہ سے مراد علم اخبار اور آثار ہیں۔

(۴) اللہ نے اپنے جلیل القدر پیغمبر موسیٰؑ کو ان کے پاس علم اسرار سے متعلق امور دیکھنے کیلئے بھیجا تھا۔

ان میں سے دو موخر الذکر امور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضرؑ تکوینی امور میں اسرار الٰہی سے آپ کو مطلع کرواتے ہوئے اللہ کے فیصلوں کو جاری اور نافذ کرنے پر مامور تھے۔ اور اتنی بڑی ذمہ داری کسی عام آدمی کو نہیں دی جاسکتی، اور صرف پیغمبر بھی یہ کام نہیں کرسکتے، کیوں کہ پیغمبروں کا کام تو صرف احکام الٰہیہ کو بندوں تک پہنچادینے کا ہوتا ہے۔ یعنی تشریعی امور ان سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان دونوں زاویوں کو سامنے رکھیں تو بطور قدر مشترک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت خضرؑ اللہ کے خلیفوں میں سے ایک خلیفہ تھے جو مامور من اللہ تھے۔ اور آپ پر نبوت سے زیادہ ولایت غالب تھی، اسی لئے موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس بھیجا تھا کہ اخبار نبوت اور آثار رسالت کے ساتھ ساتھ انوار ولایت اور اسرار ولایت کو بھی دیکھ لیں۔ اور "میں سب سے زیادہ جانتا ہوں" کہنے والے کو معلوم ہو جائے کہ اونچا مقام انا کا نہیں بلکہ فنا کا ہے۔

دیدار

دیدار خدا: بچشم سر در دنیا دیدنی است باید دید۔ وبرویت حق تعالیٰ ھم خود گواہی داد باذن خدا او حجت مصطفی ﷺ۔

متکلمین اسلام میں مسئلہ دیدار کی نسبت دو مذہب ہیں۔

(۱) دنیا میں محال ہے آخرت میں ہو گا: دنیا میں انسان جو مقید الحواس اور ضعیف الخلق ہے۔ جلالی وجمالی کی اس اطلاقی شان کی تجلیات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

(۲) محال نہیں ہے: اگر محال ہوتا تو حضرت موسیٰؑ دیکھنے کی آرزو نہ کرتے۔ امر محال کی آرزو شان نبوت کے خلاف ہے۔ پس ممکن ہے مگر وقوع محال ہے۔

وَمَن كَانَ فِي هَـٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿الإسراء:۷۲﴾۔ جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے پس وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا اور راستے سے زیادہ بھٹکا ہوا ہو گا۔

اس آیت میں جو اندھاپن مذکور ہے وہ دیدار یا طلب دیدار نہ ہونے کی کیفیت ہے۔

فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿الکھف:۱۱۰﴾۔ یہاں اللہ کا وعدہ مطلق ہے، بندہ بھی مطلق کہتا ہے۔ پس وقوع دیدار کو زمان ومکان کے ساتھ مقید کرنا غلط ہے۔ (شواہد الولایت)

ایک ملا نے سیدنا امامؑ سے اثناء بحث کہا دیدار تو مرنے کے بعد ہو گا۔ آپ نے فرمایا بندہ نے کب کہا جیتے جی ہو گا بندہ بھی یہی کہتا ہے (کہ مرنے کے بعد ہو گا) تم نے حدیث مُوتُوا قَبلَ أنْ تَمُوتُوا پڑھی ہے؟ ملا نے کہا "ہاں" تو پس جو شخص مرنے سے پہلے مر جاتا ہے اسی کو دیدار حاصل ہوتا ہے۔

ایک ملا نے امامؑ سے کہا کہ دیدار خدا دنیا میں جائز نہیں۔ حضرت نے پوچھا کسی نے جائز بھی بتلایا ہے؟ ملا نے کہاں "ہاں" آپ نے فرمایا ہم نے تو بصیروں کا مذہب اختیار کیا ہے۔ تم اندھوں کا مذہب اختیار کرو۔

آنحضرتؐ کے دیدار کی کیفیت۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ - مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ﴿النجم:۸،۱۷﴾ (پھر قریب ہوا اور قریب ہوا، نظر نہ بہکی اور نہ حد سے آگے بڑھی)

دید محمد نہ بچشم دگر، بلکہ بدیں چشم سرایں چشم سر۔ پھر فرماتے ہیں ہمہ دیدہ گشتہ چو نرگس تنش نگشتہ یکے خار پیراہنش۔

پٹن میں ملا شہمیر کے نماز جمعہ کے بعد استفسار پر ثانی امیر حضرت شاہ خوند میرؓ نے فرمایا۔ "ہاں میں نے خدا کو دیکھا ہے" (دفتر اول میاں برہانؒ)

دیدار سے محروم یا طلب سے عاری لوگوں کے لئے وعید۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا ﴿الأنعام:۳۱﴾ ترجمہ۔ جو لوگ اللہ کے دیدار کو جھٹلاتے تھے وہ نقصان میں رہے، جب ان کے پاس اچانک قیامت آئی، انہوں نے کہا کہ ہائے افسوس کہ ہم نے اس کے بارے میں کوتاہی کی۔

منکرین رویت: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ﴿فصلت:۵۳،۵۴﴾۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے دیدار کے معاملہ میں شک میں تھے۔

برہر یکے مرد و زن طلب دیدار خدا فرض است۔ تا آنکہ بچشم سر یا بچشم دل یا در خواب خدائے را نہ بیند مومن نہ باشد۔ مگر طالب صادق کہ روئے دل خود را از غیر حق گردانده است و روئے دل خود را بسوئے مولا آورده است۔ و ہموارہ مشغول بخدا است۔ و از دنیا و از خلق عزلت گرفتہ است و ہمت از خود بیرون آمدن می کند۔ ایں چنیں کس را حکم ایمان کرد۔

ترجمہ۔ ہر مرد و زن پر دیدار خدا کی طلب فرض ہے، جب تک چشم سر یا چشم دل یا خواب میں خدا کو نہ دیکھے مومن نہ ہو گا، مگر طالب صادق جو اپنے روئے دل کو غیر حق سے پھیرنے والا نہ ہو، اور اپنے دل کے چہرے کو اللہ کی طرف لایا ہو اور ہمیشہ خدا کے ساتھ مشغول ہو اور دنیا و خلق سے دوری کیا ہوا ہو اور خود سے باہر آنے کی ہمّت کرے، ایسے شخص پر ایمان کا حکم فرمایا۔

دعا

دعوت دینا: دعا کے معنی بلانے یا پکارنے کے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے وَاللَّـهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ ﴿یونس:۲۵﴾۔ یعنی اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے ﴿یونس آیت ۲۵﴾

وَاللَّـهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ﴿البقرہ ۲۲۱﴾ اور اللہ تعالیٰ جنت و بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنی اجازت سے۔ لیکن دعا کا لفظ بندوں کی طرف کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے گذارش کرنا، درخواست کرنا، عاجزی کے ساتھ اسے پکارنا۔

اللہ نے قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴿النحل:۱۲۵﴾۔ اے رسول تم (لوگوں کو) اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور بہتر نصیحت کے ساتھ بلاؤ۔

اور عام مومنوں کو حکم دیا۔ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿اعراف ۵۵﴾ یعنی اپنے رب کو زاری کے ساتھ پوشیدہ طور پر پکارو بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: فَادْعُوا اللَّـهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ﴿غافر ۱۴﴾ پس اپنے رب کو پکارو دین کو اسی کیلئے خالص کرتے ہوئے۔

ان آیات ربانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہایت عاجزی کے ساتھ پوشیدہ طور پر اور کامل اخلاص کے ساتھ پکارنا چاہیئے۔ انسان سر تا پا محتاج ہے انسان کوئی کام محض اپنے بل بوتے پر کر نہیں سکتا اور اگر کر بھی لے تو کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ کی مدد اسکے شامل حال نہ ہو اللہ تعالیٰ کو انسان کی عاجزی زیادہ پسند ہے۔ وہ خود کہتا ہے ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴿غافر:۶۰﴾ تم مجھے پکارو۔ مجھ سے درخواست کرو میں تمہاری پکار کو تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں۔

پس مہدویہ بھی اللہ کے پاس اللہ کے حضور نہایت عاجزی، خلوص، خشوع و خضوع کے ساتھ نہایت ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دعا کرتے ہیں اور دعا میں ان حدود کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں جو اللہ نے اپنی مقدس کتاب میں بیان فرمائے ہیں۔

لیکن مہدویہ کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کرتے جس طرح آج کل عمومی طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مہدویہ پر یہ طعن کیا جاتا ہے کہ مہدویہ کے پاس دعا ہی نہیں ہے یا مہدوی دعا ہی نہیں کرتے۔

فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کرنے سے یہ فیصلہ کرلینا کہ مہدویوں کے پاس دعا کی اہمیت ہی نہیں ہے نہ صرف غلط ہے بلکہ علمی بے بضاعتی اور احکام دین سے بے خبری کا مظاہرہ ہے اس لئے کہ مہدوی

(۱) نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں خواہ منفرد ہوں کہ مقتدی اور سورۂ فاتحہ کا ایک نام سورۂ دعا بھی ہے پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مہدویوں کے پاس دعا کی اہمیت نہیں ہے دعا کی اہمیت تو ان کے پاس معلوم نہیں ہوتی جن کا مذہب یہ ہے کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیئے۔ مہدویہ کے پاس تو مقتدی کیلئے سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا صَــلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرا بِفَاتِحَۃِ الکِتَاب۔ یعنی اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔ اگر چہ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ اسطرح کیا کہ اس شخص کی نماز کامل نہیں ہوتی جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔ چلئے مان لیا کہ یہ ترجمہ بھی ٹھیک ہے لیکن ناقص نماز پڑھنے سے کامل نماز پڑھنا تو بہتر ہی ہے۔

(۲) مہدویہ بھی سلام کے ذریعہ اپنی نماز ختم کرنے سے پہلے درود ابراہیمی اور دعائے ماثورہ پڑھتے ہیں۔ درود بھی تو دعا ہی ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ اللہ سے دعا کی جاتی ہے کہ اَللّٰھُمَّ یعنی اے اللہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل پر صلوۃ نازل فرما اور اسی طرح برکات نازل فرما، جسطرح کہ تو نے ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیمؑ پر نازل فرمائے تھے۔

اس کے بعد دعاء ماثور پڑھتے ہیں دعائے ماثور کیا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِي وَ لِوَالِدَي الخ۔ اے اللہ مجھے میرے والدین کو مومن استاذوں کو، مرشدوں کو، جو میرے گھر میں بحالت ایمان داخل ہوا، تمام مومنین و مومنات کو تمام مسلمین و مسلمات کو خواہ وہ بقیہ حیات ہوں یا اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں، ان سب کو بخش دے۔ ان کی مغفرت فرما۔ پھر یہ کہنا کہ مہدویہ دعا نہیں کرتے سراسر بہتان ہے۔

(۳) مہدویہ ہر فرض نماز کے بعد وہ الفاظ آہستہ پڑھتے ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فرض نمازوں کے بعد پڑھتے تھے۔ اور آپ کی اتباع میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی معمول یہی تھا۔ چنانچہ مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت آئی ہے ترجمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز (کے پوری ہونے) کے بعد پلٹتے تھے تو تین بار استغفار پڑھتے پھر فرماتے "اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یاذاالجلال والاکرام"۔ بحمد اللہ مہدویہ بھی یہی عمل کرتے ہیں۔

اس روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرض نمازوں کے بعد اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَام الخ۔ پڑھتے تھے۔ اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرنے کیلئے بیٹھتے بھی ہوں تو اس کا جواب اس حدیث سے ملتا ہے جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آئی ہے چنانچہ آپ فرماتی ہیں (ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم (نماز کے بعد) نہیں بیٹھتے تھے مگر بجز اس قدر کہ آپ اللھم انت السلام کہہ لیں۔

دیکھئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز کے بعد بس اتنی مقدار بیٹھتے تھے کہ آپ أللّھُمَّ أنْتَ السَّـلَام ...الخ پڑھ لیں۔ روایت کے الفاظ (لَمْ یَقْعَدْ) یعنی آپ نہیں بیٹھتے تھے تو بتارہے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرتؐ کے اس عمل کو بارہا دیکھا ہے چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کا حجرہ مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا اسی لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے اسکی حیثیت فقط ''روایت'' کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ''رؤیت'' کی ہے۔ یعنی آپ نے جو عمل حضور سے بار بار دیکھا ہے اسکو بیان فرمایا ہے اب اس کے تناظر میں آج کل کے اس عمل کو سامنے رکھیں تو فرض نماز کے بعد امام صاحب اور مقتدی حضرات کافی دیر تک بیٹھتے ہیں اور بڑی لمبی چوڑی دعائیں کرتے ہیں اور ایسا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اس حد تک کہ وہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جس نے نماز کے بعد دعا نہیں مانگی اس کی نماز ناقص ہے۔ دیکھئے ان کے ایسا کہنے کی زد میں کون آرہے ہیں۔ مہدویہ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کل فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی دعائیں مانگنے کا جو عمل ہورہا ہے وہ ''بدعت'' ہے اس لئے کہ آنحضرت کے زمانے میں اور آنحضرت کے بعد کے زمانے میں یعنی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی یہ عمل نہیں تھا۔ اس تعلق سے کوئی صحیح حدیث بھی مروی نہیں ہے۔ اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ایک احادیث سے ثابت ہے تو ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم کو اس سے انکار نہیں ہے لیکن یہاں بحث تو فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی ہے اور اس سلسلے میں کوئی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی کوئی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ اور جہاں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی روایت آئی ہے وہاں فرض نمازوں کا ذکر نہیں ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر جہراً دعا کرنا خلاف حکم قرآنی ہے قرآن میں دعا کے جو آداب وحدود بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَـرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿اعراف ۵۵﴾ یعنی اپنے رب سے دعا مانگو تضرع کے ساتھ (عاجزی اور زاری کے ساتھ) اور پوشیدہ طور پر اس آیت میں دعا کے دو آداب بیان کئے گئے ہیں یعنی دعا تضرع وزاری کے ساتھ ہو اور دعا پوشیدہ طور پر ہو۔

اب اگر کسی نے دعا کے سلسلے میں ان دونوں حدود اور آداب کا لحاظ نہیں رکھا یعنی دعا میں تضرع نہیں کی اور دعا میں

پوشیدگی ملحوظ نہیں رکھی تو وہ گویا دعا کے حدود و آداب سے باہر ہو گیا اور آیت میں صاف کہا گیا ہے کہ اللہ حدود سے متجاوز ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے سے ان دونوں مذکورہ حدود قرآنی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

اور دعا میں تضرع کے ساتھ پوشیدگی کی قید اس لئے رکھی گئی ہے کہ پوشیدگی اخلاص کی علامت ہے۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے اور زور زور سے دعا کرنے میں اخفاء کے بجائے اظہار کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔

اب رہی بات تضرع کی تو وہ اپنے کمال کے ساتھ صرف سجدے میں پایا جاتا ہے جب ہی تو حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جب سجدے میں ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اللہ کے حکم میں دعا کے جو حدود بیان کئے گئے ہیں وہ صرف سجدہ میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ سجدہ تضرع کی ہیئت کا نام ہے جس میں بندہ اپنے اشرف الاعضاء یعنی چہرے کو اسفل ترین چیز یعنی زمین پر اوندھا رکھ دیتا ہے اور اپنی انتہائی پستی، عاجزی اور خاکساری کی صورت سے سبحان ربی الاعلی کہتے ہوئے اپنے پروردگار کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف کرتا ہے نیز سجدے میں جو دعا ہوتی ہے وہ پوشیدہ ہوتی ہے۔

اس لئے مہدویہ کے پاس سجدے میں دعا کی جاتی ہے ہاتھ اٹھا کر نہیں کی جاتی۔

البتہ جن خاص مقامات اور مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی ہے آنحضرت کی اتباع میں مہدویہ بھی وہاں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں۔ اور وہ مواقع جیسا کہ فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں آٹھ ہیں جن کا خلاصہ **فقعس صمعج** ہوتا ہے۔

(۱) یعنی **ف** سے مراد افتتاح صلوۃ (تکبیر تحریمہ کیلئے ہاتھ اٹھانا)۔

(۲) **ق** سے مراد وتر میں دعائے قنوت کیلئے ہاتھ اٹھانا۔

(۳) **ع** سے مراد عیدین کی نماز میں تکبیرات زائدہ کیلئے ہاتھ اٹھانا۔

(۴) **س** سے مراد استلام حجر اسود، حجر اسود کے استلام کیلئے دور سے ہاتھ اٹھانا۔

(۵) **ص** سے مراد صفا کی پہاڑی پر ہاتھ اٹھانا۔

(۶) **م** سے مراد مروہ پر ہاتھ اٹھانا۔

(۷) **ع** سے مراد عرفات کے میدان میں ہاتھ اٹھانا۔

(۸) **ج** سے مراد جمرات پر ہاتھ اٹھانا۔

الغرض مہدویہ کے پاس فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کرتے اور ان کے اس عمل کی بنیاد کتاب الٰہی اور عمل رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ سجدے میں جا کر دعا کرتے ہیں اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أقْرَبُ مَا يَكُون العَبدُ مِنْ رَبِّه وَ هُو سَاجِد فَاكثروا الدُعَاء فيه۔ یعنی بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے پس تم سجدے میں ہی کثرت سے دعا کرو۔

اس کے علاوہ نماز استسقاء (بارش کی دعا) اور زیارت قبور کے مواقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی ہے۔ حضورؐ کی اتباع میں مہدویہ بھی ان مواقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں چونکہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے اس لئے مہدویہ بھی فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کرتے۔

دستار

مرشد اپنے خلیفے کو افعال ارشاد کی اجازت دے کر اپنا جانشین یا اپنا خلیفہ مجاز گر دانتے ہوئے اپنی پگڑی، دستار، خرقہ یا مخصوص ٹوپی جو عطا کرتا ہے وہ دستار بندی کہلاتی ہے۔ وہ اس بات کی علامت ہے کہ مرشد نے اس کو افعال ارشاد کی اجازت دی ہے۔

مہدویہ کے پاس میت کو بھی دستار (پگڑی) باندھتے ہیں جبکہ وہ باضابطہ مرشد سے بیعت ہوتا ہے یا اس سے اپنا علاقہ باندھتا ہے۔ میت کے لئے دستار باندھنا جائز ہے۔ بعض لوگ ہمارے پاس کے اس طریقے پر اعتراض کرتے اور اس کو بدعت اور ناجائز کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی کم علمی ہے۔ چنانچہ فتاویٰ برہنہ میں لکھا ہے، مستحب است دستار بر قول صحیح، اور اجانب راست پسندیدہ"۔ یعنی میت کو دستار باندھنا مستحب ہے صحیح قول کی بناپر اور دستار کو سیدھے طرف سے باندھنا چاہیئے ملاحظہ ہو فتاویٰ برہنہ ص356۔

دجال

عربی میں دجل کے معنی مکر وفریب کے ہیں۔ دجال اسم مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی بہت زیادہ مکار اور فریبی قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت دجال کا خروج بھی ہے دجال کفر وضلالت کا منبع ہے جس سے تمام انبیاء نے اپنی امتوں کوڈرایاہے اور اس سے بچنے کی تعلیم دی ہے یہاں تک کہ ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے اے اللہ میں تیری پناہ مانگتاہوں زندگی اور موت کے فتنے سے عذاب قبر سے اور میں تیری پناہ مانگتاہوں مسیح دجال کے فتنے سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ دجال کے نکلنے کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ خطباء منبر پر اس کا ذکر کرنا بھول جائیں گے یعنی اس سے نہیں ڈرائیں گے اور اس سے بچنے کی تعلیم نہیں دیں گے۔ کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دجال کی ماں اس کو مصر کے ایک مقام قوص میں جنم دیگی۔اس کی پیدائش اور اس کے خروج کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہو گا۔

ترمذی میں ہے کہ وہ خراسان سے نکلے گا اس کے حلیے کے بارے میں مختلف اقوال آئے ہیں ایک قول میں اس کو جوان بتایا گیاہے دوسرے قول میں اسکو عمر والا اور سرخ رنگ کا بتایا گیاہے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ گندمی رنگ کا کانا ہو گا اس کی سیدھی آنکھ نہیں ہو گی اور یہ کہ وہ پست قد ہو گا کافی گھنی ڈاڑھی والا اور خاصہ جسم والا ہو گا اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ک ف ر (کفر) الگ الگ حروف لکھے ہوئے ہوں گے جن کو ہر مسلم خواہ وہ پڑھا لکھاہو یا نہ ہو پڑھ لے گا اور کافر اس کو پڑھ نہ سکے گا۔ اس کی اولاد نہ ہو گی۔ وہ بہت طویل مسافت طے کریگا۔ لیکن مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔

یہ بھی کہا گیاہے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور کہے گا میں اللہ ہوں تو مسلمان اس سے علیحدہ ہو جائیں گے اس سے پہلے ایک بڑی مخلوق اس کے ساتھ ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال کاناہے اور اللہ کانا نہیں ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ دجال کو مسیح اس لئے کہاجاتاہے کہ اس کی ایک آنکھ بالکل صاف کر دی گئی ہو گی۔ (ممسوح العین) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جب وہ کسی بیمار پر مسح کرتے تھے تو وہ صحت یاب ہو جاتا تھا۔ دجال کو اللہ کی طرف سے یہ قوت ملے گی کہ وہ لوگوں کو قتل بھی کرے گا اور زندہ بھی وہ لوگوں میں بے شمار مال ودولت تقسیم کرے گا جس کی لالچ میں لوگ اس کے پیچھے پیچھے رہیں گے۔ اس کی اتباع کرنے والوں میں سے زیادہ تر یہودی، عورتیں اور بدوی ہوں گے۔ حدیث میں آیاہے کہ آنحضرت نے فرمایا جس نے اس کو پایا تو چاہیئے کہ وہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیتیں پڑھے۔ (تو وہ دجال کے فتنے سے محفوظ ہو جائے گا) اس کے بعد اللہ حضرت عیسیٰ کو بھیجے گا یعنی وہ دمشق کے مشرقی حصے میں سفید مینار سے اتریں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی دجال کو قتل کریں گے۔

دین ایک اور شریعتیں مختلف

یہ بات سب جانتے ہیں کہ دین اللہ کا ہے۔ اور شریعت پیغمبر کی ہوتی ہے۔ اور تمام پیغمبر اللہ ہی کے مقرر کردہ ہوتے ہیں کوئی پیغمبر محنت مشقت و عبادت کے ذریعہ پیغمبری کے مقام و منصب کو حاصل نہیں کرتا۔ اس لئے کہ پیغمبری وہبی ہوتی ہے۔ کسبی نہیں ہوتی۔ اللہ جس کو چاہتا ہے پیغمبری دیتا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین تو اللہ کا ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ پھر اس دین کی نمائندگی کرنے والے، اس دین کی اشاعت کرنے والے، اس کی تبلیغ کرنے والے پیغمبر بھی جب اللہ ہی کے پاس سے مقرر کردہ ہوتے ہیں تو ان کی شریعتوں میں ان کے احکام ارشاد و تبلیغ میں فرق کیوں ہوتا ہے۔ ایک پیغمبر کی شریعت میں جو جائز ہے دوسرے پیغمبر کی شریعت میں وہ حرام کیوں ہو جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن شریف میں تو اللہ تعالیٰ نے شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ﴿الشوری:۱۳﴾ اللہ نے تمہارے لئے دین کا وہ راستہ مقرر فرمایا جس کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور اے رسول (جسکو) ہم نے آپ پر بذریعہ وحی نازل کیا اور اسی راستے کی ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے بھی سفارش کی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام آسمانی ادیان کی اساس اور بنیاد ایک ہی ہے اور تمام پیغمبروں کے احکام ارشاد اور اصول ہدایت بھی باہم مشترک ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان احکام کے نفوذ اور ان کے اصول کی توضیح و تشریح کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ رہا ہے۔

ایسا کیوں؟ یہ سوال اکثر سوچنے والوں کے ذہنوں کے دروازوں پر دستک دیتا رہتا ہے۔ جب ان کو اس کا صحیح جواب ملتا نظر نہیں آتا تو وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دین اور نبوت اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ بلکہ ہر دور میں جب برائی بڑھ گئی۔ سماج گندہ ہو گیا۔ معاشرے میں غلط کاری عام ہو گئی تو چند حساس اور درد مند افراد ہر دور میں سماج کی اصلاح کرنے اور معاشرے کو سدھارنے کی غرض سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس وقت کے حالات کے تحت چند اصولوں کو وضع کیا اور اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ انہیں یہ، ڈر تھا کہ اگر ہم ان اصول کو عامیانہ سطح پر پیش کریں گے تو لوگ یہ کہہ کر انکار کر دیں گے کہ یہ تو ہم جیسا ہی ایک شخص ہے۔ ہم کیوں اس کی بات مانیں۔ جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کو ہم پر کسی بھی زاویہ سے کوئی برتری یا فضیلت نہیں ہے۔ شاید اس طرح وہ ہم پر اپنے آپ کو مسلط کرنا چاہتا ہے یا ہم کو اس بہانے اپنا غلام اور تابع کرنا چاہتا ہے اس خدشہ کے پیش نظر ان درد مند افراد نے قومی افراد کی دکھتی رگ کو پکڑا یعنی لوگ عملاً برے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اللہ کی پرستش کا جذبہ تو کسی نہ کسی طرح ان میں پایا جاتا ہے۔ اور وہ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں تو ان افراد نے قوم کی اسی دکھتی

رگ کو پکڑتے ہوئے کہا کہ ہم عام آدمی نہیں ہیں بلکہ خدا کی جانب سے آئے ہوئے ہیں۔ اور خدا نے ہم کو تمہاری اصلاح اور ہدایت کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ پس تم کو چاہئے کہ ہمارے ان پیش کردہ احکام کو قبول کرو اور ان پر عمل کرو۔ ورنہ تم سخت نقصانات سے دو چار ہو جاؤ گے۔ گویا ان مفکروں کی نظر میں مذہب خدا کا دین اور آئین نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سماجی ضرورت ہے۔ اور اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں انبیاء کرام کی شریعتوں کے اختلاف کو پیش کرتے ہیں۔

حالانکہ معاملہ ویسا نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے کہ دین ایک ہی ہے اور وہ ہے لا الہ الا اللہ تمام پیغمبروں نے اسی کلمہ کی تبلیغ کی ہے۔ اور ہر پیغمبر نے صاف لفظوں میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ میں اللہ کی واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔ اللہ نے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ اور اس کا پیغام تمہارے نام یہ ہے کہ تم اللہ کو ایک مانو اور اس کی خالص عبادت کرو اور میری اطاعت و اتباع کرو۔ ان تمام امور میں جن کو میں تمہارے سامنے اللہ کے حکم کے مطابق پیش کرتا ہوں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شریعتوں میں اختلاف بھی ہے تو وہ انسانی سوچ و فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ کے احکام کا اظہار تھا جو پیغمبروں کی طرف بذریعہ وحی بھیجے گئے تھے۔ اب رہی یہ بات کہ شریعتوں میں اختلاف کیوں ہوتا رہا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب بھی مختلف اور متعدد ہیں۔

(۱) اس کا پہلا سبب اس وقت کا ماحول، اس قوم کا مزاج، اور اس کی فکری سطح اور ان لوگوں کی ذہنی استعداد ہے۔ چونکہ انبیاء کی تشریف آوری کا مقصد لوگوں کی ہدایت کرنا تھا۔ تو لازمی طور پر یہ ہونا چاہئے تھا کہ احکام کی نوعیت، لوگوں کی فکری سطح اور معاشرتی ماحول کی مطابق ہو۔ ابتدائی زمانوں میں ایک تو آبادیاں فاصلے پر تھیں اور جو بھی تھیں ان میں آپس کے روابط اور تعلقات بہت محدود تھے۔ تہذیب و تمدن سے کوسوں دور لوگوں کا اجتماعی نظام اور سماجی ربط وسیع نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے بہت ہی مختصر قوانین ان کی زندگی کے لئے کافی تھے۔ ضرورتیں صرف کھانا، کپڑا، مکان اور شادی بیاہ کی حد تک تھیں۔ لگے بندھے چند اصول کافی تھے۔ تو ان کی طرف بھیجے گئے پیغمبروں کی شریعتیں بہت ہی سادہ اور مختصر تھیں۔

(۲) پھر جب معاشرہ ترقی کرتا گیا، نئی نئی ایجادات ہونے لگیں۔ آبادیاں بڑھنے لگیں۔ تقاضے اور ذمہ داریاں وسیع تر ہوتی گئیں۔ روز مرہ زندگی کے علاوہ دیگر معاشی اور معاشرتی نظام میں آراء میں اختلاف رونما ہونے لگا خواہشات سر ابھارنے لگیں۔ مسابقتی دور شروع ہوا۔ دیگر مقامات سے افکار اور عقائد کی در آمد ہونے لگی۔ اور خود غرض سربراہوں۔ مطلب پرست حکام کے مظالم کے لوگ شکار ہونے لگے۔ عقائد میں تبدیلی ہونے لگی اور من مانی رواجوں کو مذہب کے رنگ میں پیش کیا جانے لگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین اور دین کی کتابوں میں تحریف اور تبدیلی کے کیڑے گھن کی طرح اس کو چاٹنے لگے۔ اور بچے

کچھے آثار کی غلط تاویلات ہونے لگیں تو اس زمانے میں جو پیغمبر آئے انہوں نے توحید کے ساتھ یہ پیغام بھی دیا کہ اگلے پیغمبروں نے کیا پیغام دیا تھا اور بعد والوں نے اس میں اپنی طرف سے کیا کیا گل کھلائے تھے۔

(۳) اس کا تیسرا سبب مختلف انبیاء کے زمانے میں موجود گمراہیوں اور بے راہ رویوں کی نوعیت کا اختلاف تھا۔ وہاں گمراہی کا جو اصل سبب تھا، شریعت کے ذریعہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں ظلم و ستم اپنی انتہاء پر تھا۔ لوگوں کو غلام بنالینا" ان سے بیگار لینا ایک عام بات تھی۔ بنی اسرائیل کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اس کے جواب میں جو شریعت عطا کی گئی اس میں عوام سے کہا گیا کہ موجودہ صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ذلت کی چادر کو اتار پھینک کر عزت کا لباس پہننا چاہیئے۔ اور ظالم و جابر حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا چاہیئے۔ تا کہ ایک پر سکون اور باعزت زندگی کا حصول ممکن ہو سکے، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں مادیات کا رجحان زیادہ بڑھا ہوا تھا، لوٹ کھسوٹ، قتل و خون، مار دھاڑ زندگی کے اصول بن گئے تھے۔ حکم دیا گیا کہ دنیاداری لعنت ہے۔ پس دنیاداری سے کنارہ کشی، تقویٰ اور روحانیت پر توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔

اس سے قبل حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ وغیرہ پیغمبروں کے زمانوں میں ان کی مخاطب قوموں میں جو مختلف سماج اور انسان دشمنی جیسے اعمال بلا روک ٹوک دھڑلے کے ساتھ کئے جارہے تھے۔ ان کی شریعتوں کے ذمہ ان کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور جب وہ نہ مانے تو ان میں سے بعض قوموں کو ہی نابود کر دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ قوموں کو حیرت انگیز طریقوں سے نابود کرنا کسی بشر کے بس کی بات تو نہیں تھی۔ اور چونکہ مذہبِ اسلام کے آخری اور قطعی پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب پوری دنیا کے لوگ تھے۔ آپ چونکہ کسی خاص خطہ ملک، زمین، زبان، رنگ و نسل کے لئے نہیں تھے تو آپ کو جو شریعت دی گئی، اس میں تمام بنی نوع انسان میں جو برائیاں اور بدکاریاں موجود تھیں یا پیدا ہو سکتی تھیں۔ ان سب کا علاج اس میں رکھ دیا گیا۔ پھر بھی امتداد زمانہ کی خرابیوں، بدعتوں، رسوم اور رواجوں کے در آنے کا اندیشہ پیدا ہوا تو اس کے علاج کے لئے بالفاظ دیگر اس ہلاکت سے بچانے کے لئے حضور ختمی مرتبت نے بحکم خدا ایک ہستی کی بعثت کی پیشین گوئی فرمائی جس کی آمد سے اسلام کے چمن میں خود بخود اگ جانے والی کانٹی بھرانٹی کے خاتمہ کا بھی نسخہ ہاتھ میں آجائے۔ چنانچہ حضرت سید محمد مھدی موعودؑ (۹۱۰۔۸۴۷) نے اعلان فرمایا کہ جو شخص رسم، عادت، اور بدعت کو اختیار کرے گا۔ اس کو دین (اسلام۔ ایمان اور احسان) کا بہرہ نہیں ملے گا۔

دعویٰ مہدیت

علماء کے مہدی موعود سے سوالات اور ان کے جوابات

سوال علماء: آپ خود کو مہدی موعود کہلاتے ہیں۔

جواب امامؑ: بندہ نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوتا ہے کہ تو مہدی موعود ہے اور ہم نے تجھے مہدی آخر الزماں کیا ہے۔ شواہد ۱۷۷، مولود ۸۸، انصاف نامہ ۱۲

مطلع الولایت میں بھی یہی سوال علماء ہرات کے سوالات کے ضمن میں آیا ہے لیکن کسی قدر اختلاف الفاظ کے ساتھ یعنی آپ خود کو مہدی موعود کہتے ہیں پس کس بناء پر کہتے ہیں۔؟

جواب میں وہی مرقوم ہے کہ بندہ نہیں کہتا ہے خدا کا فرمان ہوتا ہے کہ اے سید محمد تو مہدی موعود آخر الزماں ہے علماء کے سوال کی اہمیت معلوم کئے بغیر جواب کی اہمیت نوعیت اور نزاکت پردۂ خفا میں رہتی ہے اس لئے پہلے سوال کی اہمیت اور نوعیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے جس سے خود بخود امام علیہ السلام کے جواب کی نزاکت سمجھ میں آجائیگی۔

(۱) سوال عوام کا نہیں بلکہ علماء کی ایک جماعت کا ہے۔ یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ عوام کے نقطۂ نظر اور علماء کے نقطۂ نظر میں بیّن فرق ہوتا ہے نیز یہ سوال جب علماء کی ایک جماعت نے امام علیہ السلام سے کیا ہے تو اگرچہ ظاہر بیں نظروں میں آسان اور معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایک اہم ترین اور وقیع سوال ہے اور ایسا ہے جسکی اہمیت کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(۲) علماء گجرات اور علماء ہرات کے سوالات میں منجملہ اقدار مشترکہ کے یہ سوال بھی ایک قدر مشترک ہے یعنی جس طرح علماء گجرات نے یہ سوال امام علیہ السلام سے کیا ہے علماء ہرات کا پہلا سوال بھی یہی ہے اس سے بھی اس سوال کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

(۳) علماء ہرات نے سلطان مرزا حسین کے ایماء پر کتب خانہ شاہی کا کامل دو ماہ تک مطالعہ کرنے کے بعد امام علیہ السلام سے مہدیت پر گفتگو کرنے کے لئے جو چار سوال مرتب کئے تھے یہ سوال ان میں پہلے نمبر کا تھا۔ علماء ہرات نے تو چاروں سوالات (جن میں یہ سوال بھی شامل ہے) کے جوابات کو اپنے طور پر مشخص کر لیا تھا کہ اگر آپ فلاں جواب دیں گے تو حقیقت میں مہدی موعود ہوں گے ورنہ نہیں۔ اس سے بھی اس سوال کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) اس سوال کا سب سے نازک پہلو تو یہ تھا کہ مرتبہ مہدی کو عالمانہ ڈھنگ سے سوال کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ اور سوائے مہدی موعود کے کسی اور جید عالم یا لغوی مہدی کو مغالطہ دینے کے لئے کافی تھا۔

(۵) سوالیہ جملے کے الفاظ کی ترکیب میں علم کا سارازور جھونکا گیا تھا۔ اور اس طرح سوال کیا گیا تھا جس کا جواب بظاہر سوائے "ہاں" یا "نہیں" کے اور کچھ نہیں بن سکتا تھا اور اسطرح کا جواب دینے والا بہر صورت دام میں پھنستا تھا۔

یہ تو تھی اس چھوٹے سے سوال کی نوعیت۔

اب امام علیہ السلام کے جواب کو ملاحظہ کیجئے۔ "بندہ نہیں کہتا ہے بلکہ اللہ کا فرمان ہوتا ہے کہ تو مہدی موعود ہے اور ہم نے تجھے مہدی آخر الزماں کیا ہے۔ اس مختصر جواب میں حسب ذیل نکات پوشیدہ ہیں۔

(۱) جواب سوال کی طرح بالکل سادہ ہے جواب میں کوئی عالمانہ استدلال نہیں ہے

(۲) جواب دو اجزاء پر مشتمل ہے پہلے جزءً بندہ نہیں کہتا ہے' سے علماء کے سوال میں پنہاں اس زعم باطل کی نفی کی گئی تھی کہ آپ خود کو باتباعِ نفس مہدی موعود کہتے ہیں۔ اور دوسرے جزء میں اس امر کا اثبات تھا کہ آپ نے مہدی موعود ہونے کا دعوی بامر الہیٰ کیا ہے۔ جو دراصل علماء کے سوال کے آخری جزءً پس از کجا میگوئید (پس کس بناء پر کہتے ہو) کا حقیقی جواب تھا۔

(۳) جواب میں امام مہدی موعود کا مرتبہ بتلایا گیا ہے کہ مہدی موعود کا، خلیفۃ اللہ اور صاحب بینہ ہونے کے لحاظ سے مامور من اللہ ہونا ضروری ہے پس اس کا دعویٰ بھی بامر الٰہی ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ سابق میں انبیاء و مرسلین اور اللہ کے خلیفوں کا دعوی بامر الٰہی ہوا تھا۔

چونکہ امر واقعی یہی تھا کہ اٹھارہ سال تک حکم خداوندی کو آپ ہضم فرمانے کے بعد تاکیدی حکم کی تعمیل میں ۹۰۵ھ میں دعوی کیا تھا۔ اس لئے آپ نے صاف طور پر حقیقت بیان کردی کہ بندہ نہیں کہتا ہے بلکہ اللہ کا فرمان ہوتا ہے کہ تو مہدی موعود ہے۔ اور ہم نے تجھے مہدی آخر الزماں کیا ہے، تو دعویٰ کر۔ امام علیہ السلام کے سوا کوئی اور جید عالم یا لغوی مہدی ہوتا تو ہرگز یہ جواب نہ دے پاتا۔

جواب چونکہ بالکل صحیح اور معقول تھا اس لئے علماء نے اس پر مزید بحث نہیں کی بلکہ دوسرے سوالات کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جواب کی سب سے بڑی نزاکت یہ ہوتی ہے کہ جواب پر سے پھر کسی قسم کی بحث کا دروازہ نہ کھلے، کسی قسم کے وقیع

اعتراض یا معقول قیل و قال کی گنجائش نہ نکلے اور جواب اس سوال کے حق میں حرف آخر ہو جائے۔ اِمام علیہ السلام کا جواب اسی نوعیت کا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ معترض اگر چاہتا تو اس پر بھی اعتراض کر سکتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس طرح کے سوال یا اعتراض سے دین کی بنیادیں ہل جاتی تھیں اور خود قرآن اور آنحضرت کی نبوت بھی تو معرض بحث میں آجاتی تھی اس لئے کہ آنحضرت نے بھی نبوت کا دعوی فرمایا تھا تو اسکی بنیاد صرف حکم خداوندی تھی۔

سوال کرنے والے اہل علم تھے اس قسم کی فاش غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ سوائے مہدی موعود علیہ السلام کے اس طرح کا جواب کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا جواب دوسرا ہی ہوتا اس سوال کے جوابات دوسرے طریقے پر بھی دئے جاسکتے تھے لیکن وہ اس باب میں حرف آخر نہیں بن سکتے تھے۔ مثلاً ہاں میں نے دعوی کیا ہے۔ اس بناء پر کہ میں سید محمد ہوں۔ میرا باپ کا نام عبد اللہ اور میری ماں کا نام آمنہ ہے۔ مگر اس پر سوال کیا جاسکتا تھا کہ آپ کے باپ کا نام تو سید خان ہے، پھر آپ مہدی کیسے؟ اس طرح پھر جواب دیا جاتا اور اس پر سوال کی گنجائش نکل آتی وھلم جرّا اور بحث طویل ہو جاتی۔ یا یہ کہ میں نے مہدی ہونے کا دعوی کیا ہے اس لئے کہ مجھ میں شرائط مہدیت موجود ہیں۔ اسپر سوال ہوتا کہ شرائط تو بہت ہیں۔ بعض آپ پر صادق نہیں آتے اور دلیل میں وہ شرائط پیش کئے جاتے جو مختلف فیہ ہیں یا جن کے معنی سمجھنے میں انہوں نے غلطی کی ہے۔ یا وہ شرائط سرے سے امام مہدی سے متعلق ہی نہیں ہیں۔ بلکہ کسی اور امام سے متعلق ہیں۔ یا یہ کہ وہ ایسے امور ہیں جو قیامت سے متصل زمانے میں وقوع پذیر ہونے والے ہیں وغیرہ تو ایسی صورت میں جواب تو دیا جاسکتا تھا لیکن پھر بحث طویل ہو جاتی اور دیگر سامعین اور شرکاء محفل یہ تاثر لیتے کہ علماء آپ کی دلیل میں "فی" نکال رہے ہیں اور ہر دلیل کو دلیل سے کاٹ رہے ہیں۔

پھر سب کچھ ہو کر اگر بحث میں جیت بھی ہو جاتی تو کم از کم علماء کو اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا کہ آپ (امام علیہ السلام) بھی ایک علمی، اصولی اور استدلالی آدمی ہیں، مامور من اللہ نہیں ہیں۔

اس کے بر خلاف امامنا علیہ السلام کا جواب یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کا دعویٰ بامر الہیٰ ہے۔ تابع نفس و ہویٰ نہیں۔ اور علماء کے پیش نظر بھی یہی تھا کہ اگر آپ یہ جواب دیں گے تو حقیقی مہدی ہوں گے ورنہ نہیں۔ اگر مہدی علیہ السلام کا یہ جواب ثبوت مہدیت کے لئے ناکافی ہے تو کسی نبی کی نبوت حتی کہ خاتم النبین کی نبوت کا دعویٰ بھی معرض بحث میں آجائے گا۔ اس لئے کہ انبیاء کے پاس اس سوال کا کہ آپ کس بناء پر خود کو نبی کہتے ہیں۔ یہی جواب تھا کہ خدا نے ان کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔ جب

نبوت کے باب میں ایسا جواب قابل تسلیم ہے تو ہم یہ پوچھتے ہیں کہ مہدیت کے باب میں ایسا جواب قابل تسلیم کیوں نہیں ہو سکتا۔

دُوسرا سوال۔عبد اللہ کی توضیح

سوال علماء: مہدی کا نام محمد بن عبد اللہ ہو گا آپ کا نام محمد بن سید خان ہے۔

جواب امامؑ: اِمام علیہ السلام سے علماء کے اس سوال کا جواب چار طرح سے مروی ہے یا تو آپ نے علماء کے اس سوال کے جواب میں چاروں جملے کہے ہیں لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ ہر جملہ ایک مستقل جواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا یہ (اور میرے پاس یہی صورت مرجح ہے) کہ یہ جوابات ایک وقت میں نہیں دیئے گئے بلکہ مختلف اوقات میں علماء کے مختلف وفود نے امام علیہ السلام سے گفتگو کی ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے اور خصوصاً سائلین کے ذہنی پسِ منظر کی مناسبت سے مختلف اوقات میں مختلف جوابات دیے ہیں۔

چنانچہ انصاف نامہ کی روایتوں سے ہمارے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انصاف نامہ میں یہ چاروں جوابات ایک ہی سوال کے ضمن میں درج نہیں ہیں۔ بلکہ ہر جواب ایک مستقل سوال کے ضمن میں درج کیا گیا ہے۔ جس سے اسبات پر روشنی پڑتی ہے کہ اس قسم کا سوال چار مرتبہ چار مختلف مقامات میں چار مختلف ذہنیت رکھنے والے افراد نے کیا ہے۔ آپ نے انہیں چار ایسے جواب دئے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایسے ہیں جو ایک طرف تو سَائلین کے زعم کی کامل نفی کرتے ہیں تو دوسرے طرف آپ کے دعویٰ کا کامل اثبات لیکن شواہد الولایت میں جو نقل آئی ہے اس میں یہ جوابات ایک ہی سوال کے ذیل میں درج کئے گئے ہیں۔

ذیل میں امام علیہ السلام کے وہ جوابات درج کرتے ہیں جو انصاف نامہ میں مرقوم ہیں۔

(۱) ملاؤں نے میراں علیہ السلام سے کہا کہ مہدی محمد بن عبد اللہ ہوں گے آپ کے والد کا نام سید خاں ہے اس کے بعد حضرت میراں نے فرمایا کہ خدا سے کہو کہ اس نے سید خاں کے بیٹے کو کس لئے مہدی بنا دیا (ص ۱۲)۔

(۲) ملا معین الدین نے علماء کے ذریعہ جو چار سوال بھیجے تھے ان میں دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ کے والد کا نام کیا ہے۔ میراں نے فرمایا میرے والد کا نام سید خاں ہے پس ملاؤں نے کہا اسم نبی محمد بن عبد اللہ ہے اور اسم مہدی بھی محمد بن عبد اللہ ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کے ساتھ جنگ کرو کہ سید خاں کے بیٹے کو تو نے کس طرح مہدی کر دیا۔

(۳) ملاؤں نے کہا نام مہدی، محمد بن عبد اللہ ہو گا، اور تمہارے باپ کا نام سید خاں ہے، اسکے بعد میر اں علیہ السلام نے فرمایا کیا خدائے تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ سید خاں کے بیٹے کو مہدی کر دے۔

(۴) ملاؤں نے میر اں علیہ السلام کے سامنے حدیث رسول اللہ يؤاطِي اسْمُهُ اسْمِي وَ اسْمُ أَبِيهِ اسمُ أَبِي (وہ میرا ہمنام ہو گا اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کا نام ہو گا) پیش کی اور کہا آپ کے باپ کا نام تو سید خاں ہے حضرت میر اں علیہ السلام نے فرمایا کہ آنحضرت کے باپ تو مرد کافر تھے وہ عبد اللہ کیسے ہونگے، بلکہ محمد رسول اللہ ہی محمد عبد اللہ ہوں گے، اور مہدی بھی محمد عبد اللہ ہوں گے۔ لفظ ابن سہو کتابت ہے کہ محمد بن عبد اللہ لکھا گیا ہے۔

امامنا مہدی موعود علیہ السلام کے والد ماجد کا نام سید عبد اللہ تھا۔ اور آپ کا سرکاری خطاب ''سید خاں'' تھا جسکی وجہ آپ سید خاں کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ لفظ سید خود آپ کی سیادت کی دلیل ہے۔ نیز علماء بھی اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ آپ سادات بنی فاطمہ سے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امامنا علیہ السلام کے خلاف ان علماء نے بادشاہان وقت کے پاس جو عریضے لکھے اور شکایتیں پیش کیں تو ان میں صاف طور پر یہ لکھتے اور کہتے تھے کہ ''ایک سید جو اپنے آپ کو مہدی موعود کہتا ہے۔'' وغیرہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامنا علیہ السلام کی سیادت ان کے پاس بھی مسلم تھی۔

اسکے باوجود جان بوجھ کر علماء نے امام علیہ السلام کے نسب کے بارے میں گفتگو کی، سید خان کے خطاب کی شہرت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے اور اس پر اپنے زعم میں قوی اعتراض قائم کرنے کی کوشش کی۔

امام علیہ السلام اس امر سے باخبر تھے کہ علماء آپ کے والد ماجد کا نام سیّد عبد اللہ اور خطاب خان ہونے سے بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن جب علماء نے عمداً خطاب کو بمنزلہ اسم قرار دے کر اس پر سے اعتراض کیا تو امام علیہ السلام کے پاس اس کے جواب کے دو ہی طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ آپ صاف طور پر یہ فرماتے کہ آپ کے والد کا نام سید عبد اللہ ہے اور خان آپ کا سرکاری خطاب ہے۔

اور دوسرا طریقہ یہ کہ ان کے پیش کردہ نام کو ہی فرضاً تسلیم کرتے ہوئے انہیں جواب دیتے اور مہدیت جیسے عظیم اور اہم مسئلہ کی تحقیق کے باب میں وہ اپنی غلط کاری اور غلط بینی کی روایتی روش کے سہارے ''صحیح اصول'' کو ترک کرتے ہوئے ''نزاع لفظی'' اور ''حق پوشی'' کے جس غلط اصول کو اپنا رہے تھے اس پر انہیں متنبہ فرماتے اور انہیں اس حقیقت سے آگاہ کرتے کہ جس علامت کو وہ شرط مہدیت سمجھ کر آپ کی مہدیت کی نفی کرنا چاہتے ہیں در حقیقت وہ شرط مہدیت ہی نہیں ہے پہلی صورت تو اس وقت پیش ہوتی جبکہ علماءِ امام علیہ السلام کی ولدیت سے قطعاً ناواقف ہوتے اور تحقیق حال کی خاطر آپ کے والد کا

نام دریافت کرتے۔ ایسی صورت میں امام علیہ السلام کا یہ ارشاد بجاہوتا کہ آپ کے والد کا نام سید عبد اللہ ہے۔ یہاں توصورت حال مختلف تھی۔ یعنی علماء آپ کی ولدیت سے ناواقف نہیں تھے۔ بلکہ جان بوجھ کر لفظ سید خاں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کررہے تھے۔

قطع نظر اسکے حدیث رسول اللہ پیش کرتے ہوئے علماء کا صاف طور پر یہ کہنا کہ ”نبی کا نام محمد بن عبد اللہ تھا۔ مہدی کا نام بھی محمد بن عبد اللہ ہونا چاہیئے، اور آپ کے والد کا نام سید خان ہے“ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تواپنے طور پر آپ کے والد کا نام سید خاں ہونے کو قطعی جانتے تھے اور اس میں انہیں نہ کسی قسم کا شبہ تھا اور نہ یہ بات ان کے پاس قابلِ بحث تھی۔

یہی وجہ تھی کہ امامنا علیہ السلام نے بھی ان سے یہ کہہ کر تعرض نہیں فرمایا کہ آپ کے والد کا نام سید عبد اللہ ہے۔ بلکہ آپ نے بر سبیل تنزل ان کے ادّعا کے موافق اپنے والد کا نام سید خاں کو تسلیم کرتے ہوئے جواب دیا ہے۔

علماء کے سوال کی بنیاد یہ تھی کہ باپ کا نام عبد اللہ ہونے کو شرط مہدیت قرار دیا گیا تھا۔ یعنی اگر آپ کے باپ کا نام عَبد اللہ ہو تو آپ مہدی ہوں گے ورنہ نہیں یہی وجہ تھی کہ علماء نے وہ حدیث پیش کی جس میں رسول و مہدی اور ان دونوں کے والدین کا ہمنام ہونا بیان کیا گیا ہے تا کہ اپنے سوال کو وقیع کر سکیں۔ حالانکہ یہ ایک علامت تھی جو بدرجہ اتم برغف انف علماء، امام علیہ السلام میں موجود تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ صرف مجیٔ مہدی متواتر المعنی ہے۔ اور روایت کا یہ حصّہ يواطي اسمه اسمي واسم ابيه اسم ابي نہ تو متواتر المعنی ہے اور نہ متواتر الالفاظ اور نہ صحاح میں اس معنی کی کوئی روایت پائی جاتی ہے یہ بات اور ہے کہ ہمارے امام علیہ السلام اس کے بھی کامل مصداق ہیں امامنا علیہ السلام کے جوابات پر سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ یہ جوابات تیڑھے ہیں جیسا کہ بعض معاندین نے اپنی کج فہمی سے ایسا سمجھ رکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر صحیح، درست اور سیدھے اور کیا جوابات ہوسکتے تھے خصوصاً جبکہ سائلین نے عمداً حق پوشی کی روش اختیار کی تھی۔ امام علیہ السلام کے جوابات مبنی بر حقائق تھے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کا طرز جواب کیوں اختیار کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سوال کرنے والے عوام نہیں تھے بلکہ وہ علماء تھے جنھوں نے جان بوجھ کر حقیقت پر پردہ ڈالنے کے ناپاک جذبہ کے تحت حق پوشی کی جاہلانہ روش اختیار کی تھی۔ ان کے مقابلے میں امام علیہ السلام کا یہ طرز جواب ﴿وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾(النحل:۱۲۵) کی بہترین تفسیر تھا۔

چنانچہ امام علیہ السلام کا یہ جواب کہ کیا خدائے تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سید خان کے بیٹے کو مہدی کردے ”اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کا دعویٰ تابع نفس نہیں ہے بلکہ بربنائے امر الٰہی ہے اور خدا کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

منجملہ ان کے یہ بھی کہ اگر وہ چاہے تو سید خان کے بیٹے کو مہدی بنا سکتا ہے، اور یہ امر اس کے حیطۂ اختیار سے باہر نہیں ہے، قرآنی آیت ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر اس باب میں نص تصریح ہے۔ علماء یہ جانتے تھے کہ آپ کے والد کا نام عبد اللہ ہے۔ اسکے باوجود ہٹ دھرمی سے اولاً تو آپ کے والد کا نام سید خان قرار دئے تھے اور پھر یہ پوچھ رہے تھے کہ آپ مہدی کیسے؟ امامنا علیہ السلام نے ان کے قول کو مان کر یہ فرمایا کہ کیا خدا اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سید خان کے بیٹے کو مہدی کر دے؟" ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿الحدید:۲۱﴾ پہلے اور دوسرے جواب میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ آپ کا دعویٰ بر بنائے نفس نہیں بلکہ بامر الٰہی ہے۔ اگر اس پر کسی کو اعتراض ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ خدا پر اعتراض کرے، اس سے پوچھے یا اگر ہو سکے تو اس سے جنگ کرے کہ تو نے سید خان کے بیٹے کو کس لئے مہدی بنا دیا۔

اس جواب میں ضمناً اس جانب بھی اشارہ تھا کہ ان کا یہ سوال تو محض ایک قسم کا مجاولہ ہے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی اس امر کو بخوبی جانتے تھے کہ آپ عبد اللہ کے فرزند ہیں۔

البتہ چوتھا جواب ان تینوں جوابوں سے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ فیصلہ کن بھی ہے۔ نیز تشریح طلب بھی۔ اس لئے کہ اس جواب میں کئی حقیقتیں ملتی ہیں اور سب سے بڑھ کر اس جواب میں "عبد اللہ" کی حقیقت بیان کی گئی ہے چوتھا جواب چار اجزاء پر مشتمل ہے۔ (۱) محمد رسول اللہ ﷺ کے باپ مرد کافر تھے۔ (۲) وہ عبد اللہ کیسے ہوں گے۔ (۳) دراصل محمد عبد اللہ تھے، مہدی بھی عبد اللہ ہونگے۔ (۴) لفظ ابن سہو کتابت ہے۔

آپ کا یہ فرمان کہ آنحضرت ﷺ کے باپ مرد کافر تھے کسی طرح محل اعتراض نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اہل سُنت محدثین اور متکلمین کے پاس یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ آنحضرت کے والدین کافر ہی تھے اس لئے کہ وہ بت پرست تھے اور ان کی موت بھی کفر پر ہی واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ مشکوٰۃ کے باب الزیارۃ میں ابو ہریرہؓ سے یہ روایت آئی ہے کہ آنحضرت نے اپنے ماں کی قبر کی زیارت کی۔ آپ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی آپ نے رُلا دیا۔ پھر آنحضرت نے فرمایا کہ میں نے میرے رب سے میری ماں کی مغفرت کی اجازت مانگی مگر مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے قبر کی زیارت کی اجازت مانگی جس کی مجھے اجازت مل گئی پس قبروں کی زیارت کرو اس لئے کہ وہ تذکرۂ موت ہے۔

جلال الدین سیوطی نے اپنے رسالوں میں (مولف ہدیہ مہدویہ نے جنکی تعداد دس بتلائی ہے) یہ ثابت کرنے کی بہت کوشش کی ہے کہ آنحضرت کے والدین کو مرنے کے بعد زندہ کیا گیا وہ آپ پر ایمان لائے، اسلام سے مشرف ہوئے۔ اور پھر اپنی قبروں میں واپس چلے گئے۔

حیرت ہے کہ مرنے کے بعد کا اسلام سیوطی کے پاس کیسے معتبر ہو گیا۔؟اگر ان کے اس قول کو مان لیا جائے تو دنیا میں کوئی کافر نہ ہو گا۔ اس لئے کہ مرنے کے بعد کفار پر بھی جبکہ اپنے مذہب کا بطلان ظاہر ہو جائے گا وہ توبہ کرلیں گے۔ قرآن میں تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار تو یہ تمنا کریں گے کہ اگر انہیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں بھیجدیا جائے تو وہ اللہ کے خلیفوں اور اس کے پاس سے آنے والی تعلیمات کا انکار نہ کریں گے۔ کیا یہ سب مومن ہو جائیں گے ؟۔

حیرت بر حیرت یہ بھی ہے کہ جب قوموں پر عذاب کے آثار اور افراد پر نزع کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے تو اس وقت کی توبہ نہ قابلِ قبول ہوتی ہے اور نا اس وقت کا ایمان قابل تسلیم۔ پھر مرنے کے بعد کا ایمان کس طرح قابل استناد ہو جائیگا۔

علاوہ ازیں آنحضرت کے والدین آنحضرت پر ایمان لانے پر مکلف ہی نہیں تھے اس لئے کہ آپ کے نبوت کا دعویٰ کرنے سے بہت پہلے ہی وہ دنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ پھر جس امر پر وہ مکلف ہی نہیں تھے۔ مرنے کے بعد اس پر انہیں تکلیف دینے کے کیا معنی ؟ اگر وہ معذب تھے تو صرف اس لئے کہ آنحضرت ﷺ سے ماقبل کے انبیاء پر وہ ایمان نہیں لائے تھے۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور نجات مل گئی (اور وہ ایمان بھی مرنے کے بعد)

(۲) مرد کافر پر عبد اللہ کا اطلاق کیسے ہو گا؟ اسکی تحقیق یہ ہے کہ یوں تو خَلقی اعتبار سے ہر بندہ پر عبد کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اللہ کے پاس سب سے بڑا درجہ اس بندے کا ہے جو خُلقی اعتبار سے اس قابل ہو جائے کہ اس پر عبد اللہ کا اطلاق ہو سکے اور امام علیہ السلام کا منشاء بھی یہی تھا۔ عبد اللہ کی نفی سے امام علیہ السلام کی مراد علمیت کی نفی نہیں تھی جیسا کہ بعض کج فہوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ آپ کی مراد ان اوصاف سے تھی جن پر عبد اللہ کا صحیح معنی میں اطلاق جائز قرار دیا جاسکتا تھا۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ امام علیہ السلام نے فرمایا عبد اللہ چوں باشد آنحضرت کے والد مرد کافر تھے۔ وہ عبد اللہ کیسے ہو جائیں گے۔ مطلب یہ کہ مرد کافر اور عبد اللہ دونوں متضاد اوصاف کے حامل ہیں۔ مرد کافر پر عبد اللہ کا اطلاق کیسے ہو گا۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی کالے آدمی کا نام چاند رکھ دیا جائے اور کوئی دوسرا اس پر یہ اعتراض کرے کہ کالا آدمی چاند کیسے ہو گا۔ کہنے والے کا مطلب علمیت کی نفی کرنا نہیں ہے بلکہ اس کے ذہن میں تو بس وہ وصف ہے جو چاند کی خصوصیت ہے چونکہ چاند کی خصوصیت اس کالے میں مفقود ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ کالا آدمی چاند کیسے ہو جائیگا۔ حسین یا جمیل شخص پر چاند کا اطلاق صحیح ہو گا۔ ایسے مواقع پر ذہن اوصاف کی طرف ہی متبادر ہوتا ہے۔ اعلام کی طرف نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ امام علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے والد کا نام عبد اللہ ہونے سے انکار کیا تھا محض اس لئے کہ خود آپ کے والد کا نام عبد اللہ نہیں تھا۔

عربی کا قاعدہ ہے کہ جب لفظ مطلق کہا جاتا ہے تو اس سے مُراد فرد کامل ہی ہوتی ہے پس اس قاعدہ کی رو سے بھی عبداللہ سے مراد اللہ کا عبد کامل ہی ہوا پس مرد کافر پر عبد کامل کا اطلاق کس طرح صحیح ہوگا۔ عبد کامل کا اطلاق تو مومن کامل پر ہی صحیح ہوگا۔

(۳) اسی لئے امام علیہ السلام نے فرمایا کہ دراصل محمد عبداللہ تھے۔ مہدی بھی عبداللّٰہ ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے لئے جو گواہی دی جاتی ہے اس مقام پر رسالت پر عبدیت کو مقدم رکھا گیا ہے اس لئے کہ رسالت و نبوت کے عطا کئے جانے کی شرط بھی ''عبدیت'' ہی ہے۔

نیز معراج کا واقعہ قرآن شریف میں سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الخ﴿الاسراء:۱﴾ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقام مدح ہے اور مقام مدح میں اولاً وہ وصف بیان کیا جاتا ہے جو ممدوح کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے نیز معراج ایک خصوصی اعزاز ہے اور اعزاز کے موقع پر اسی خصوصیت کا اظہار کیا جاتا ہے جس کا کہ اعزاز پانے والا حامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آیت میں أَسْرَىٰ برسوله یا أَسْرَىٰ بنبیه یا أَسْرَىٰ بمحمد کے بجائے أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ کہا گیا ہے۔ کیونکہ مقام عبدیت ہر مقام سے بلند و بالا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے عبداللّٰہ ہونے کی گواہی خود قرآن نے دی ہے جیسا کہ سورۂ جن میں ہے لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّـهِ ﴿الجن:۱۹﴾۔ تمام مفسرین نے یہاں عبداللہ سے آنحضرت کی ذاتِ اقدس ہی مراد لی ہے۔ نیز مولانا رومی نے بھی اسی معنی میں لفظ عبداللہ کو آنحضرت ﷺ کے لئے استعمال کیا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

حلقوم عبداللہ سے مُراد یہاں حلقوم محمد ﷺ ہی ہے۔

علامہ اقبال کے اس مصرعہ سے بھی یہی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

عبد دیگر عبدہُ چیزے دگر۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بھی عبدہ کا لفظ انہی معنی میں استعمال کیا ہے۔

ضرورت پڑگئی تھی اک نمونہ پیش کرنے کی۔ ثبات عبدۂ ہفتاد گونہ پیش کرنے کی (شاہنامہ جلد سوم صفحہ ۲۲)

حاصلِ کلام یہ کہ لفظ کے حقیقی معنی کے لحاظ سے امام علیہ السلام نے فرمایا کہ محمد عبد اللہ تھے اور مہدی کا بھی عبد اللہ (عبد کامل) ہونا ضروری اور شرط مہدیت ہے۔ جس طرح کہ عبد کامل ہونا شرط رسالت تھا۔ اور جس طرح رسول اللہ کے باپ کا نام عبد اللہ ہونے کے باوجود آپ حقیقی معنوں میں عبد اللہ نہ بن سکے اور نجات نہ پاسکے اور نتیجتاً اس بات کا آنحضرت کی نبوت پر کسی قسم کا اثر مرتب نہ ہوسکا تو بھلا مہدی کے باپ کا نام (ولو بالفرض) سید خان ہوجانے سے مہدی کی مہدیت کس طرح متاثر ہوجائیگی۔

خلاصہ یہ کہ عبد اللہ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو عبد اللہ۔ بحیثیت عَلَم بلا لحاظ حقیقت و وصف حَاصل، اور دُوسری عبد اللہ بحیثیت حقیقت و وصف حاصل بلا لحاظ عَلَم۔

ظاہر ہے کہ یہاں بحث عبد اللہ کی حقیقت کے بارے میں تھی علمیت کے متعلق نہیں۔ سوال یہی تھا کہ آیا اسم با مسمیٰ بھی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اسم با مسمیٰ نہیں تھا۔

(۴) حقیقت کے اعتبار سے تو خود آنحضرت اس کے مصداق اتم تھے اس لحاظ سے محمد کو عبد اللہ نہ کہکر (جس کے کہ وہ حقیقی مصداق ہیں) محمد بن عبد اللہ کہنا (جس پر کہ عبد اللہ کا اطلاق صحیح نہ ہو) سہو کتابت نہیں تو پھر کیا ہے۔ خود آنحضرت ﷺ نے خود کو ''محمد بن عبد اللہ'' ہونے کے باوجود ''محمد عبد اللہ'' فرمایا ہے۔ چنانچہ بادشاہ روم کو آپ نے جو خط لکھا ہے اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں **من محمد عبد الله اِلیٰ هرقل عظيم الروم**

ہرقل کو خط لکھنے کا سبب بھی محمد کا ابن عبد اللہ ہونا نہیں تھا بلکہ محمد کا عبد اللہ ہونا تھا، اور لوگوں کا انکار بھی محمد بن عبد اللہ ہونے کے لحاظ سے نہیں تھا بلکہ محمد عبد اللہ ہونے کے لحاظ سے تھا۔ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے لکھے جانے کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے حکم سے حضرت علی نے جب

هذا ما قاضي عليه محمد رسول الله یہ وہ عہد نامہ ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے صلح کیا ہے تحریر فرمایا تو سہل نے ان الفاظ میں اعتراض کیا تھا۔

وَاللهِ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ رَسُولُ اللهِ مَا صَددنَاكَ عَنِ البَيتِ وَ لَا قَاتلنَاكَ وَلَكِنِ اكْتُبْ مُحَمَّدُ بْنِ عَبْدُ اللهِ۔ قسم بخدا اگر ہم کو یقین ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ ہم آپ سے جنگ کرتے۔ (اس لئے) محمد بن عبد اللہ لکھو۔ اس کا جواب میں آنحضرت نے فرمایا۔ **فَقَالَ النَّبِي وَاللهُ أَنِّي رَسُولُ اللهِ وَ أن كَذَّبْتُمُونِي**

أكتُبْ مُحَمَّد بن عبد الله قسم ہے اللہ کی میں ہی اللہ کا (سچا) رسول ہوں اگرچہ تم مجھے جھٹلاتے ہو محمد بن عبداللہ لکھو۔

اس حدیث سے درج ذیل امور مفہوم ہوتے ہیں۔

(۱) آنحضرت نے خود کو محمد رسول اللہ لکھا (ابن عبداللہ نہیں لکھا) (۲) کفار نے محمد رسول اللہ کا انکار کیا اور محمد بن عبداللہ لکھنے پر زور دیا۔ (۳) آنحضرت کو یہ بات ناگوار گذری اور مجبوراً آپ نے محمد بن عبداللہ لکھا۔ محمد بن عبداللہ لکھنے پر زور دینا تو کفار کا شیوہ ہے۔ کوئی امتی جو آنحضرت کی پیروی کرتا ہے یا کرنے کا دعویٰ کرتا ہے آنحضرت کے طریق تحریر کو چھوڑ کر سہل کے طریق تحریر کو اپنائے تو اُسے اُصولاً اور اصلاً اتباع کفر کہنا چاہیئے تھا لیکن کم از کم اور دبے دبے الفاظ میں اسی چیز کو سہو کتابت کہا جائے تو اعتراض کی کیا بات ہے۔ فاعتبروا يا اولى الابصـار۔ اَب رہا عبداللہ بحیثیت علم وہ امر اتفاقی ہے۔ لیکن اس سے دین کے باب میں سند کیسے لیجا سکتی ہے۔

اس جواب سے اِمام علیہ السلام کا منشاء آنحضرت کے نسب کی نفی کرنا نہیں تھا بلکہ اس امر پر تنبیہ مقصود تھی کہ نبوت اور مہدیت کے لئے نبوت اور مہدیت کا دعویٰ کرنے والوں کا عبداللہ ہونا شرط ہے، نہ کہ ان کے باپ کا۔

خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ نبی کا نام جس طرح محمد بن عبداللہ تھا اسی طرح مہدی کا نام بھی محمد بن عبداللہ ہے۔ کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ وهو المطلوب

تیسرا سوال - مہدی پر تمام لوگ ایمان لائینگے

سوال علماء۔ مہدی پر تمام لوگ ایمان لائینگے اور کوئی بھی منکر نہ ہوگا۔

جواب: اِمام علیہ السلام نے فرمایا کہ مومنین ایمان لائیں گے یا کفار۔ علماء نے جواب دیا کہ مومنین۔ اسکے بعد آنحضرت نے فرمایا کہ سب مومنین ایمان لاچکے اور فرمانبردار ہوچکے (انصاف نامہ صفحہ ۱۴) یہی روایت شواہد الولایت صفحہ ۱۷۷، مولود میاں عبدالرحمان صفحہ ۸۸ میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔

علماء کے اس سوال سے مقصد اس امر کا اظہار تھا کہ مہدی تو وہی ہوگا جس پر کل مخلوق ایمان لائیگی اور کوئی بھی اس کا منکر نہ ہوگا۔ لیکن آپ نے جو مہدیت کا دعویٰ فرمایا ہے۔ اس پر ایمان لانے والے بہ نسبت منکرین کے کم ہیں۔ پھر آپ مہدی کیسے۔

یہ علماء کی دسیسہ کاری، فتنہ انگیزی اور حق پوشی کا کامل مظاہرہ تھا جو انہوں نے سادہ لوح عوام کے سامنے عالمانہ انداز

میں کیا تھا تاکہ عوام کل مخلوق کے ایمان لانے کو شرط مہدیت سمجھ لیں۔ یہ بات تو قرین قیاس نہیں کہ علماء نے قرآن کی آیتوں اور اللہ کے خلیفوں کے ساتھ مخلوق کے سلوک کا سرسری طور پر سہی، مطالعہ نہ کیا ہو گا۔

اِمام مہدی موعود علیہ السلام منجملہ خلفاء اللہ کے اللہ کے خلیفے تھے تاریخ عالم شاہد ہے کہ اللہ کے کسی خلیفے پر کل مخلوق ایمان نہیں لائی۔ اور انبیاء علیہم السلام تو خاص خاص خطوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کم از کم اس خطے کے بسنے والے تمام افراد مرد وزن نے بحیثیت انبیاء ان کو تسلیم کیا تھا۔

آنحضرت ﷺ ساری دُنیا کے لئے مبعوث ہوئے تھے لیکن مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں کتنے نفوس آپ پر ایمان لائے تھے ہجرت کے اسباب اور خود ہجرت کے واقعے میں اس کا بہترین اور مکمل جواب پنہاں ہے۔ اگر کوئی اس وقت آنحضرت ﷺ سے دریافت کرتا کہ آپ تو ساری دُنیا سے کفر و شرک کے مٹانے کے لئے مبعوث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ (قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّـهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ﴿الاعراف:۱۵۸﴾ تو پھر آپ پر کتنے لوگ ایمان لائے ہیں اور یہ زید بن ارقم کے گھر میں نماز جیسا اہم ترین فریضہ چھپ چھپ کر کیوں ادا کیا جارہا ہے؟ بھلا چالیس کی تعداد بھی کوئی تعداد ہے!! تو اس وقت آنحضرت ﷺ کیا جواب عطا فرماتے یا آپ کی طرف سے اس قسم کے سوال کا آج جو جواب دیا جائیگا ظاہر ہے کہ مہدی علیہ السلام کا جواب بھی اس سے مختلف نہ ہو گا۔

آنحِضرت کا کام بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ ﴿المائدۃ:۶۷﴾ کی تعمیل میں تبلیغ کرنا تھا اور بس۔ ایمان لانا یا نہ لانا یہ مخلوق کا کام تھا۔ اسی طرح ساری دُنیا کے لئے ہدایت کا پیغام پہنچانا اور کل مخلوق کو اسلام، ایمان اور احسان کی دعوت دینا یہ مہدی کا منصب تھا۔ اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا یہ مخلوق کا کام ہے۔ حیرت تو یہی ہے کہ مخلوق کے فریضہ کی نسبت مہدیؑ سے استفسار کیا جارہا ہے!! حالانکہ تبلیغ دین میں مہدی علیہ السلام نے جن دور دراز مقامات کا سفر فرمایا تھا وہ آج تک الٰہی مبلغین کی تاریخ کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔

مکہ کی زندگی میں تو خیر ۴۰ افراد ایمان لائے تھے اس کے بعد مدنی زندگی میں ایمان لانے والوں کی تعداد میں گو اضافہ ہوا مگر جس وقت آفتاب نبوت انسانی نظروں سے اوجھل ہوا ہے تو مومنین کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ کیا اس وقت روئے زمین پر کل اتنے ہی افراد زندہ تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا بلکہ منکرین کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی۔

پھر جب منکرین اور مخالفین کی کثرت سے آنحضرت کی نبوت اور رسالت متاثر نہ ہو سکی اور آپ بھاری اکثریت کی

مخالفت کے باوجود خاتم النبین اور رحمتہ اللعالمین تسلیم کئے گئے تو کیا یہ دلیل مہدی علیہ السلام کے باب میں کام نہ آئے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ دین ومذہب کے باب میں قلت وکثرت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو ایک شیطانی وسوسہ ہے جو انسان کو نہ صرف گمراہ کرتا ہے بلکہ عین حالت گمراہی میں برسرحق ہونے کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اسکے برعکس حق وباطل کے مابین کشمکش کی تاریخ تو یہ بتلاتی ہے کہ حق ہمیشہ بجانب اقلیت ہی رہا۔ اور اکثریت نے طاقت کے بل بوتے حق کو کچلنے میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھی۔ قرآنی آیات، قلیلامایومنون اور اکثرہم الفاسقون اس باب میں قوی شاہد ہیں۔

اگر ایمان لانے والوں کی قلت وکثرت کو ہی انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی صحت کا معیار گردانا جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس معیار پر کوئی نبی نہیں اتریگا اور نتیجتاً رسالت نبوت اور ہدایت کے واقعات جن میں الٰہی کتابوں کی آیتیں اور معجزات بھی شامل ہیں (نعوذباللہ) ہوش ربا افسانوں کا مجموعہ بن جائیں گے مگر امام علیہ السلام کے جواب کی خوبی اور کمال یہی ہے کہ آپ نے اس کا جواب خود ان کے منھ سے اگلوایا۔ چنانچہ آپ نے دریافت فرمایا کہ مخلوق تو ایمان لائیگی لیکن یہ بتاؤ کہ مومن ایمان لائیں گے یا کفار۔

علماء نے جواب دیا کہ مومنین۔ آپ نے فرمایا مومنین تو ایمان لاچکے اور فرمانبردار ہو چکے۔ رہا وہ زمرہ جو کفار کا ہے وہ تو کسی صورت ایمان نہیں لاسکتا۔

اِمام علیہ السلام کا جواب آیت قرآنی آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ﴿البقرۃ:۲۸۵﴾ سے مستفاد ہے۔ پس جواب مہدی پر جو اعتراض ہو گا بعینہ وہی اعتراض قرآن کی اس آیت پر بھی وارد ہو جائیگا لہٰذا یہ دعویٰ کہ مہدی علیہ السلام پر کُل مخلوق ایمان لائیگی۔ عقل تاریخ خلفاء الٰہیٰ۔ مشیت ایزدی اور متنوع فطرت انسانی کے خلاف ہے جو باطل ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّـهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ﴿المائدۃ:۴۸﴾ تو اس باب میں نص صریح ہے۔ اسی طرح يَمْلَاءُ الأَرضَ قَسطاً وَ عَدلاً سے مراد بلا لَوْمَةَ لَائِمٍ مذہب حق کی روشن تعلیمات کو دُنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ نہ کہ روئے زمین کی کُل مخلوق کو جبر واکراہ کے ذریعہ منوانا ہے۔

چوتھا سوال - قضاء وقدر

سوال علماء: قال اللہ تعالیٰ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّـهُ ﴿الانسان:۳۰﴾ ﴿التکویر:۲۹﴾ اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہ جو خدا کو منظور ہو۔ پس چاہئے کہ جو کچھ بندہ چاہتا ہے ہو جائے حالانکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انہیں بندہ چاہتا

ہے اور وہ نہیں ہوتیں۔

جواب: امام علیہ السلام: شریعت کے علم میں تھوڑی واقفیت رکھنے والا بھی ایسا سوال نہ کرے گا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ بندوں کے اقوال اور افعال اللہ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوتے۔ (انصاف نام صفحہ ۱۳، مولود صفحہ ۸۹۔ شواہد الولایت صفحہ ۱۷۸ علماء کا یہ سوال جو اگرچہ معمولی تھا امامنا علیہ السلام سے محض اس غرض سے کیا گیا تھا تاکہ آپ کا امتحان لیں کہ آپ کے علمِ علوم قرآنیہ اور مسائل کلامیہ میں کیا پایہ ہے۔ یہ بات تو کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ علماء اس آیت کے معنی مطلقا نہیں جانتے تھے۔

پہلے تین سوالوں کے تشفی بخش جوابات سے جب عُلماء کو اندازہ ہو گیا کہ آپ کسی طرح ان کے دام میں پھنسنے والے نہیں ہیں اور ہر سوال کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں اس انداز سے دے رہے ہیں کہ اس پر سے مزید بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو انہوں نے عمداًروئے سخن کو بدلنے کو ہی بہتر جانا اور سوال ایک قرآنی آیت کے مفہوم کے بارے میں کیا تاکہ اس کی تشریح اور توضیح پر اگر ذرا سا بھی موقع ہاتھ لگے تو بحث شروع کر دیں اور اس کے لئے انہوں نے جس آیت کا انتخاب کیا اور اس آیت پر سے جس انداز کا کلامی سوال مرتب کیا اس سے ان کی فریب آمیز ہوشیاری کا پتہ چلتا ہے۔

واضح ہو کہ اس سوال پر کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے یا مجبور اسلامی مکتب خیال تین جماعتوں میں منقسم ہے ایک تو وہ جو اس امر کے قائل ہیں کہ انسان اپنے افعال کا خالق ہے اُسے قدریہ کہتے ہیں دوسرے وہ جو اس امر کا قائل ہے کہ انسان اور انسان کے افعال کا خالق بھی خدا ہے اور انسان کو ان افعال کے صدور میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہے۔ یہ جماعت جبریہ کہلاتی ہے۔

تیسری جماعت کا مسلک یہ ہے کہ تمام افعال کا خالق اللہ ہی ہے لیکن انسان سے جو افعال صَادر ہوتے ہیں۔ اس میں بندے کے اختیار کو بھی دخل رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا خالق افعال ہے اور بندہ کاسب افعال ظاہر ہے کہ خلق اور چیز ہے اور کسب اور چیز۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جملہ افعال اللہ کی مشیت، ارادے اور اسکی قضاوقدر سے ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ وہی بات وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ کے ذریعہ بیان کی گئی ہے۔

چونکہ یہ مسئلہ قضاوقدر سے متعلق ہے اس لئے ذیل میں قضاء وقدر کی مختصراً تعریف کی جاتی ہے تاکہ تفہیم میں سہولت ہو۔ قضا یہ ہے کہ اللہ نے ازل میں کسی چیز کا ارادہ کر لیا تھا کہ یہ فلان وقت میں یوں ہو گی، اور تقدیر یہ ہے کہ کسی چیز کے بارے میں ازل میں اللہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ فلان وقت میں فلاں مکان میں بُری یا بھلی یا نافع یا مضر ہو گی اور اس سے اس کے

کرنے والے کو ثواب یا عتاب ملیگا۔ ان مندرجہ بالا تعریفات کی رو سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ اللہ نے ازل میں ہر انسان کے متعلق وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو اس سے صادر ہونے والا ہے۔ اب انسان دُنیا میں جو کچھ کرتا، یا جس کا ارادہ کرتا یا جو چیز چاہتا ہے وہ اسی لکھے کے برابر ہوتا ہے۔ اسی مضمون کو وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّـهُ سے بیان کیا گیا ہے۔ اب یہ خیال یا یہ سوال کہ بندہ جو چاہتا ہے اُسے ہو جانا چاہئے تھا حالانکہ بندہ بہت سی چیزوں کو چاہتا ہے جو نہیں ہوتیں اسلامیات سے کوسوں دوری کا پتہ دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر بندہ کوئی چیز چاہے اور وہ پُوری نہ ہو تو اس کی صاف طور پر یہ تعبیر کی جائیگی کہ خدا نے ازل میں یہ لکھدیا تھا کہ بندہ فلاں چیز چاہے گا اور وہ چیز اس کی خواہش کے مُطابق وقوع پذیر نہ ہوگی۔ پس یہ صورت وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّـهُ کی کامل تفسیر ہوگی۔ یعنی بندوں کے افعال و اقوال حتیٰ کہ ان کے مرادات و خیالات بھی اللہ کی مشیت و ارادے کے موافق ہی ہوتے ہیں۔

عُلماء کے سوال کا یہ انداز ان کی دینیات سے بے خبری پر دلالت کر رہا تھا اس لئے امام علیہ السلام نے فرمایا "بندہ تو یہ سمجھتا تھا کہ ان ملاؤں کو کچھ علم ہے۔ لیکن اب (اس سوال کے بعد) معلوم ہوا کہ وہ کچھ علم نہیں رکھتے۔ اور فرمایا:

"خدائے تعالیٰ کی مرضی یہی تھی کہ یہ شخص ایسا چاہے گا اور اس کی خواہش مطلوب کو نہیں پہنچیگی۔ (انصاف نامہ صفحہ ۱۳) نیز یہ بات بھی ناظرین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ علماء نے امام علیہ السلام سے وہ سوال کیا ہے جس کے بارے میں آنحضرت نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ پہلی اُمتوں کے لئے گمراہی اسی قیل و قال سے ملی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا اَلِھَذا بعثت کیا میں اسی لئے مبعوث ہوا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ زجر و توبیخ پر دلالت کرتے ہیں۔

اسکے باوجود علماء نے امام علیہ السلام سے اس مسئلہ میں گفتگو کی ہے۔ لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ قرآن کی ایک آیت کو اس بحث کا عنوان بناتے ہوئے، تاکہ اس وعید سے بچ سکیں۔ وَاللَّهُ يَعلم مَا فِي صُدُورِ

پانچواں سوال - نبوت وولایت

سوال علماء: آپ ولایت کو نبوت پر فضیلت دیتے ہیں۔

جواب امام علیہ السلام: بندہ فضیلت دیتا ہے یا رسول اللہ نے فضیلت دی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا أَلوِلَايَةُ أَفْضَلُ مِنَ النُّبُوَةِ۔ پھر علماء نے کہا کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے۔ اسکے جواب میں آنخضرت نے فرمایا کہ میں نے کس وقت کہا کہ میری ولایت آنحضرت ﷺ کی نبوت سے افضل ہے۔ یا میں نبی سے افضل

ہوں۔ یا کسی ولی کو کسی نبی پر فضل ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کچھ جانتے بھی ہو کہ نبوت کے معنی کیا ہیں اور ولایت کے معنی کیا۔ (شواہد الولایت صفحہ ۱۷۸، مولود صفحہ ۸۹) یہ امر کہ ولایت نبوت سے افضل ہے علماء کے مسلمات سے ہے جیسا کہ محققین نے تصریح فرمائی ہے لیکن سوال میں جو طرز اختیار کیا گیا تھا اس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ولایت کو نبوت سے افضل قرار دینے والے امام علیہ السلام ہیں۔ اسی لئے آپ نے علماء سے یہ سوال فرمایا کہ بندہ فضیلت دیتا ہے یا رسول اللہ نے فضیلت دی ہے۔ ساتھ ہی آپ نے حدیث أَلوِلَايَةُ أَفْضَلُ مِنَ النَّبُوَةِ پڑھ دی تاکہ سند ہو۔ علماء بھی اس حدیث سے بے خبر نہیں تھے۔ لیکن بالکلیہ خاموشی اختیار کرلینا ہزیمت کی علامت تھی اس لئے خواہ مخواہ یوں گویا ہوئے کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت کی ولایت آنحضرت کی نبوت سے افضل ہے۔

حدیث کی ان الفاظ کے ذریعہ تشریح سے دراصل علماء کا مقصد مندرجہ بالا حدیث کے بارے میں امام علیہ السلام کا نقطۂ نظر معلوم کرنا تھا کہ آپ نبوت و ولایت میں کس قسم کی نسبت کو روا رکھتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ بلحاظ ولی کامل ہونے کے الولایۃ افضل من النبوۃ کی روشنی میں خود کو کسی نبی پر فضیلت دیتے ہوں۔

اسی لئے جواب میں امام علیہ السلام نے تفصیل کے ساتھ ان کے جملہ شکوک وشبہات کو رفع فرمادیا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: "بندہ کب کہتا ہے کہ میری ولایت آنحضرت کی نبوت سے افضل ہے یا میں نبی سے افضل ہوں۔ یا کسی ولی کو کسی نبی پر فضل ہے۔" کسی ولی کا نبی کے درجے کو نہ پہنچنے کا سبب اکثر تصوف وکلام کی کتابوں مثلاً شرح مقاصد و مواقف میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کو خلیفۃ اللہ اور مبعوث من اللہ ہونے کے سبب احکام دین اور اسرار ذات وصفات الٰہی کی تعلیم بواسطہ ملک یا بیواسطہ ملک ہوتی ہے اس لئے کہ عصمت علم و عمل میں لازم ہے بخلاف ولی کے کہ اسکو بغیر وساطت نبی کوئی بات حاصل نہیں ہوتی اور علم و عمل اسکا ظنی ہوتا ہے۔ حدیث أَلوِلَايَةُ أَفْضَلُ مِنَ النَّبُوَةِ مطلق ہونے کے اعتبار سے تخصیص اور تعمیم دونوں صورتوں کی متحمل تھی لیکن جب علماء نے آنحضرت کی ولایت اور نبوت سے اسکی تخصیص کردی تو امام علیہ السلام نے اپنے جواب میں تعمیمی صورتوں کی نفی فرمادی۔ لیکن علماء کی اسطرح تخصیص سے فائدہ یہ ہوا کہ اس سے ولایت محمدیہ کی شان اور اسکے خاتم کا مرتبہ ظاہر ہو گیا اور چونکہ امام مہدی علیہ السلام باتفاق علماء خلیفۃ اللہ۔ مبعوث من اللہ۔ داعی الی اللہ بینۃ اللہ، خاتم ولایت محمدیہ ہیں۔ اور یہ مراتب عام اولیاء سے بدرجہا بلند و بالا ہیں۔ اس لئے آپ پر یہ قاعدہ کہ کوئی ولی کسی نبی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا قطعاً چسپاں نہیں ہوسکتا بلکہ اسکے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس ہستی کا آنحضرت ﷺ نے وعدہ فرمایا ہے۔ وہ ہر جہت میں آپ سے مماثلت تامہ کی حامل ہے۔

اور یہ اعتقاد صرف مہدویہ کا نہیں ہے۔ بلکہ اہل سنت کے وہ تمام فرقے جو وجود مہدی کے قائل ہیں وہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ امام مہدی کی ذات خلیفۃ اللہ مبعوث من اللہ۔ داعی الی اللہ علی بصیرۃ، بینتہ اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ خاتم ولایت محمدیہ بھی ہے۔ چنانچہ صوفیاء محققین کا مذہب یہ ہے کہ نور محمدی جسکو ولایت محمدی یا باطن محمدی یا حقیقت محمدی یا روح اعظم یا عقل کل یا جوہر اول وغیرہ ناموں سے تعبیر کرتے ہیں تمام فیوض کا منبع ہے، جملہ اولیائے کرام بلکہ تمام انبیاء علیہ السلام اسی نور حقیقی کے مظہر ہیں یعنی یہ حقیقت جملہ حقائق نبوت اور کُل حقائق ولایت کو شامل ہے۔ نبوت اس کا ظاہر ہے، اور خاتم نبوت من حیث التشخص العنصریۃ اسکے خاتم ہیں، اور ولایت اس کا باطن ہے اور اسکے مظہر خاتم الاولیاء ہیں من حیث وجود عنصری گلشن راز میں حقیقت محمدی کا بیان اس طرح کیا گیا ہے۔

نبوت را ظہور از آدم آمد کمالش در وجود خاتم آمد
ولایت بود باقی تا سفر کرد چو نقطہ در جہاں دور دگر کرد
ظہور کل او باشد بہ خاتم بدو یابد تمامی دور عالم
وجود اولیاء اورا چو عضواند کہ او کل است وایشاں ہمچو جزواند
چو او با خواجہ دارد نسبت تام ازو با ظاہر آید رحمت عام
شود او مقتدائے ہر دو عَالم خلیفہ گردد از اولاد آدم

اِن اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوت کا ظہور حضرت آدم سے ہوا اور وہ آنحضرت کے وجود باجود سے مرتبہ وکمال پر پہنچی نبوت کے بعد ولایت جو باقی رہ گئی تھی نقطہ کی طرح دُنیا میں دوسرا دور لگائی۔ ولایت کا کامل اور کل ظہور خاتم الولیاء سے ہو گا اور اسی سے دور عالم پورا ہو گا تمام اولیاء خاتم اولیاء کی نسبت اعضاء کی طرح ہیں۔ اس لئے کہ وہ کل ہے اور یہ اولیا اسکے جز ہیں۔ چونکہ خاتم الاولیاء کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ نسبت تامہ حاصل ہے اس لئے اس سے رحمت عالم ظاہر ہو گی۔ وہ (خاتم الاولیاء) ہر دو عالم کا پیشوا اور اولاد آدم سے خلیفہ ہو گا۔ مفاتیح الاعجاز شرح گلشن راز میں خاتم اولیاء سے ولایت کے ظہور کل ہونے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ولایت کا تمامی ظہور اور کمال خاتم اولیاء کی ذات سے ہو گا کیوں کہ دائرہ کی حقیقت کا کمال دائرہ کے نقطۂ آخیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور خاتم الاولیاء سے مراد محمد مہدی علیہ السلام ہیں جو موعود رسالت پناہ ﷺ ہیں۔

اور یہ خاتم الاولیاء وہ ہے کہ جس کی مشکواۃ سے ہی اولیاء اور انبیاء کو خدا کا دیدار ہو سکیگا جیسا کہ ابن العربی نے لکھا

ہے۔ومَا يراهُ أحد من الأنبياء و الرّسل إلّا مِن مِشكوٰة الرّسول الخاتم و لا يراه أحد مِن الأولياء اِلّا مِن مشكوٰة الوَلِي الخاتم حتي ان الرسل لا يرونه متي راوه إلّا مِن مشكوٰة خاتم الأولياء فان الرسالة والنبوة اعني نبوة التشريع و الرسالة تنقطعان و الولاية لا تنقطع أبداً۔ فالمرسلون من كونهم أولياء لا يرون ما ذكرناه إلّا مِن مشكوٰة خاتم ألاولِيَاء فكيف من دونهم من ألاولياء۔

اور انبیاءاور رسولوں میں سے کوئی بغیر مشکوٰۃ رسولِ خاتم کے خدا کو نہیں دیکھتا، اسی طرح اولیاء میں سے کوئی ولی، خاتم ولی کی مشکات کے بغیر اللہ کو نہیں دیکھتا، یہاں تک کہ انبیاء بھی جب دیکھیں گے تو مشکات خاتم الاولیاء سے ہی دیکھیں گے، اس لئے کہ نبوت تشریعی اور رسالت مقطع ہونے والی ہے، اور ولایت کبھی منقطع نہیں ہوتی پس رسول بھی ولی ہونے کے اعتباء سے بغیر مشکات خاتم الاولیاء کے اللہ کو نہیں دیکھیں گے۔ پھر وہ اولیاء کس طرح دیکھیں گے جو درجہ میں انبیاء سے کم ہیں۔ نیز یہ بھی لکھا ہے

فخاتم الرسل من حيث ولايته نسبتهُ مع خاتم الولاية نسبة الأنبياء و الرسل معه فانه الولي الرسول النبي و خاتم الأولياء الولي الوارث الآخذ من اصل المشاهد للمراتب ترجمہ۔پس خاتم رسل کو بھی اپنی ولایت کی حیثیت سے خاتم ولایت کے ساتھ نسبت ہے جسطرح کہ دیگر انبیاء اور رسولوں کو خاتم ولایت کے ساتھ ہے، اس لئے کہ خاتم الرسل، ولی اور رسول اور نبی ہیں اور خاتم الاولیاء ولی، وارث اور اصل مشاہد سے لینے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاتم الاولیاء سے علم (سکوتی، یقینی) لیتے ہیں اس لئے کہ خاتم الولی اصل مشاہد یعنی ذاتِ باری سے فیض حاصل کرتے ہیں اسی جہت کی بناء پر آنحضرت نے اپنی ولایت اپنی نبوت پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ خاتم نبوت و خاتم ولایت کی مندرجہ بالا مختصر تقریر اس لئے کی گئی کہ ایک تو اس کے بغیر نبوت ولایت کی بحث نامکمل ہو جاتی اور دُوسرے یہ کہ امام مہدی موعود علیہ السلام خاتم ولایت کو آنحضرت خاتم نبوت سے جو نسبت حاصل ہے وہ ختم ولایت کی بحث کے بغیر نہ مفہوم ہو سکتی ہے اور نہ متعین۔

خاتم ولایت محمدیہ، ختم ولایت، خاتم الاولیاء کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ ان کا تعلق بلکہ ان کا استنباط ختم دین سے ہے اور امام مہدی علیہ السلام کا خاتم دین ہونا احادیث سے ثابت ہے جیسے يَخْتِمَ اللهُ بِهِ الدِّينَ كَمَا فَتَحَ بِنَا۔ اللہ اس سے دین کو ختم کریگا جیسا کہ ہم سے شروع کیا۔ حاصل کلام یہ کہ جس طرح نبوت کا ایک خاتم ہے اسی طرح ولایت کا بھی ایک خاتم ہے۔ انبیاء علم یقینی کو جس طرح خاتم النبیین سے اخذ کرتے ہیں اسی طرح اولیاء خاتم الاولیاء سے اخذ کرتے ہیں بلکہ کل انبیاء اور اولیاء بھی اسی مشکات خاتم الولایت سے اخذ کرتے اور اسی سے خدا کا دیدار حاصل کرتے ہیں مشکوٰۃ خاتم الولایت دراصل باطن مشکوٰۃ خاتم

النبوۃ ہے۔

خود خاتم الرسل بھی علم سکوتی اور دیدار کو اپنے باطن یعنی مشکوۃ خاتم ولایت محمدیہ سے حاصل کرتے ہیں اور یہ مرتبہ جمیع اولیاء سے بزرگ تر ہے۔ بلکہ بعض انبیاء سے بھی بڑھ کر ہے اور آنحضرت ﷺ کے مساوی ہے۔ جیسا حدیث ابن سیرین میں ہے۔

عن محمد بن سيرين قال قيل له المهدي خيرام ابوبكر و عمر قال هو خير منهما و يعدل النبي۔

ترجمہ: محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ مہدی بہتر ہے یا ابو بکر و عمر آپ نے فرمایا مہدی ان دونوں سے بہتر ہے اور نبی ﷺ کے برابر ہے۔

اور یہ قول صرف مہدویہ کا نہیں بلکہ اکابرین اہل سنت اور محققین صوفیاء اور ثقہ محدثین کا ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ ولایت کن وجوہ کی بنا پر نبوت سے افضل قرار پاتی ہے تفسیر عمدہ کے حوالے سے ان کا ذکر قومی کتب میں اس طرح کیا گیا ہے۔ (۱) ولایت صفت خالق کی ہے اور نبوت صفت مخلوق کی ہے۔ (۲) ولایت اشتغال مع الحق ہے، اور نبوت اشتغال مع الخلق ہے۔ (۳) ولایت باطن ہے، اور نبوت ظاہر ہے۔ (۴) ولایت خاصہ ہے، اور نبوت عامہ ہے۔ (۵) ولایت لانہایت ہے، اور نبوت کے لئے انتہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام علیہ السلام نے جب حدیث کا مفہوم سنایا تو عُلماء نے اعتراض کیا جب حدیث سند میں پیش فرمائی تو علماء نے حدیث کے معنی بیان کئے یہ سمجھ کر کہ یہ معنی آپ کے منشاء کے مُطابق نہیں ہیں لیکن جب آپ نے ان کے معانی کو ہی بر قرار رکھکر اسکی مزید تشریح فرمائی تو علماء کو چپ ہونا پڑا اور وہ دوسرے سوال کی طرف متوجہ ہو گئے۔

چھٹا سوال - ایمان کا بڑھنا اور گھٹنا

سوال علماء۔ آپ ایمان کو بڑھتا اور گھٹتا کہتے ہو اور امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ایمان بڑھتا اور گھٹتا نہیں (**الإيمان لَا يَزِيدُ وَ لَا يَنْقص**)

جواب امام علیہ السلام: **قال الله تعالىٰ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ**﴿الأنفال:۲﴾ اور جو کچھ ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے اس میں آپ نے اپنے ایمان کی خبر دی ہے۔ کیونکہ امام اعظم کا ایمان کامل ہو چکا تھا کمال کے بعد بڑھتا گھٹتا نہیں۔ (مولود صفحہ ۸۹، صحفہ ۹۰ شواہد الولایت صفحہ ۱۷۹)

علماء کے سوال سے حسب ذیل تین باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔

(۱) علماء کو یہ بات معلوم تھی کہ امامنا علیہ السلام ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے قائل ہیں۔ ورنہ سوال کی نوعیت یوں ہوتی کہ ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے بارے میں آپکا مسلک کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علماء نے اس طرح کا سوال نہیں کیا تھا۔

(۲) علماء نے ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے قول کو امام علیہ السلام کا قول قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہی بات علماء کے سوال "آپ ایمان کو بڑھتا اور گھٹتا کہتے ہو" سے مفہوم ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ قول آپ کا ذاتی ہے اور کتاب و سنت میں اس باب میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

(۳) پہلے تو علماء نے اس کو امامنا کا قول قرار دیا پھر اسکے مقابلے میں امام ابو حنیفہ کا قول پیش کیا تا کہ عوام کو غلط طور پر یہ باور کروایا جائے کہ آپ کا یہ قول امام اعظم کے فرمان کے صریحاً خلاف ہے۔

اس کے جواب میں امامنا علیہ السلام کو پہلے تو علماء کے اس زعم کی نفی کرنا تھی کہ ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے صرف آپ ہی قائل ہیں۔ اسی لئے امامنا علیہ السلام نے جواب میں قرآن شریف کی وہ آیت پیش فرمائی جو اس باب میں نص صریح ہے یعنی وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا (اور جب ان پر اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان میں زیادتی کرتی ہیں) مطلب یہ تھا کہ اس طرح کا قول آپ کا ذاتی قول نہیں ہے بلکہ یہ تو دراصل وہ قرآنی فیصلہ ہے جو کسی طرح معرض بحث میں آ نہیں سکتا۔ اسکے بعد چونکہ علماء نے اپنے زعم میں امام علیہ السلام کے اس قول کو کاٹنے کے لئے ابو حنیفہؒ کا قول پیش کیا تھا تو اس کا جواب امام علیہ السلام نے اس طرح دیا کہ نہ تو قرآن کی خلاف ورزی لازم آئے اور نہ امام ابو حنیفہؒ کی شان میں کوئی حرف آئے۔

علماء کا اس طرح سے سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یا تو آپؑ اپنے مسلک پر قائم رہیں گے اور اس کا اثبات فرمائیں گے تو امام اعظم کے فرمان کو جھٹلانا پڑیگا اور آپ کے قول کی تغلیط کرنی پڑیگی، یا امام اعظم کے فرمان کے پیش نظر آپ کو مرعوب ہو کر اپنا مسلک بدلنا پڑیگا۔ دونوں صورتوں میں انکا مطلب نکل سکتا تھا۔ پہلی صورت میں عوام کے جذبات کو بھڑکایا جاسکتا تھا کہ دیکھو یہ تمہارے امام کی تغلیط کر رہے ہیں دوسری صورت میں خود امام کو اپنے مسلک سے ہٹ جانا پڑتا تھا۔ اور یہ دونوں صورتیں ان کیلئے مفید مطلب تھیں۔ لیکن امامنا علیہ السلام نے جواب کا جو طرز اختیار فرمایا اس سے علماء کو اپنے مقصد میں زبردست ناکامی ہوئی۔ اور امامنا علیہ السلام کے لئے انہوں نے لفظی گورکھ دھندے کا جو جال تیار کیا تھا وہ بیت عنکبوت ثابت ہو گیا۔

امام علیہ السلام نے ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے اثبات میں تو قرآن کی آیت کو پیش فرما دیا۔ لیکن جواب کی نزاکت یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے قول کی توجیہ بھی کی ہے۔ واقعی امام ابو حنیفہ کے قول کی جو حسین توجیہ امام علیہ السلام نے فرمائی ہے حق اور انصاف یہ ہے کہ یہ بس آپ کا ہی حصہ ہے۔ آپؑ نے ابو حنیفہ کی تغلیط نہیں فرمائی یہ نہیں کہا کہ آپ نے یہاں مجتھدانہ غلطی کی ہے بلکہ آپ نے فرمایا ابو حنیفہ نے اپنے ایمان کی خبر دی ہے یعنی چونکہ آپ ایمان کے درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے اور کمال کے بعد زیادت و نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے آپ نے فرمایا "الإيمان لَا يَزِيدُ وَ لَا يَنْقص" یہ ایک نفسیانی پہلو ہے جس سے ماہرین نفسیات بے خبر نہیں ہیں کہ انسان کے الفاظ اس کے مقام کی نشاندھی کرنے میں خطا نہیں کرتے۔ ایک پکے موحد نے جب "سُبْحَانِي مَا أَعْظَمَ شَانِي" کا نعرہ لگایا تو اس کی یہ توجیہ کی گئی کہ توحید ان کا مسلک ہے اور یہ دعویٰ ان کے مقام کا آئینہ دار ہے۔ بالکل اسی طرح امامنا علیہ السلام نے امام ابو حنیفہ کے اس قول کی توجیہ فرمائی ہے کہ اس قول میں امام نے اپنے ایمان کی خبر دی ہے۔ ابو حنیفہ غواص قرآن اور سنت کی انتہا درجہ پیروی کرنے والے تھے۔ ان کے حق میں یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ انہوں نے قرآنی آیت "زَادَتْهُمْ إِيمَانًا" کی عمداً خلاف ورزی کی ہے۔ قطع نظر اس کے امام ابو حنیفہ نے اپنے مذہب کے بارے میں یہ بھی فرمایا: هذا رأى وهو احسن ما قدرنا عليه فمن جاءنا باحسن من قولنا فهو اولى بالصواب منا (المناقب للموفق صفحہ ۷۶) ترجمہ: یہ ایک رائے ہے۔ اور ہماری بساط کے اعتبار سے بہتر ہے لیکن اگر کوئی ہمارے اس قول سے بہتر قول پیش کرے تو وہ ہمارے قول سے زیادہ صحیح ہے۔

لیکن جب آپ کے ایک قول کے مقابلے میں قرآن شریف کی ایک آیت ملتی ہے تو ہم ابو حنیفہ کے فرمان کی بناء پر آیت کے مفہوم کو ہی آپ کا مذہب قرار دیتے ہیں اور آپ کے اس فرمان کو باتباع امام مہدی علیہ السلام آپ کے مقام کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ امام اعظم کے متبعین کے لئے صحیح طریق کار تو یہ تھا کہ وہ اولاً امام مہدی علیہ السلام سے ایمان کی زیادت و نقصان کے بارے میں دلیل طلب کرتے اور اس کے بعد امام اعظم کا قول پیش کرتے، اور ساتھ ہی اس امر کے خواہاں ہوتے کہ قرآنی آیت کے صریح حکم کی موجودگی کے باوجود امام اعظم کے فرمان کا کیا مطلب ہے؟ اس طرز سوال کو چھوڑ کر علماء نے جو طریق اختیار کیا اس سے تو امام ابو حنیفہ کی بدخدمتی کی جھلک معلوم ہوتی ہے!! اس لئے کہ ایسی صورت میں امام اعظم کا قول صاف طور پر قرآنی آیت کے خلاف بیٹھتا ہے۔ اسی لئے امامنا علیہ السلام نے امام اعظم کی طرف سے زبردست اور بہترین مدافعت فرمائی اور آپ کے قول کی توجیہ اس طرح فرمائی ہے کہ قرآن کا خلاف لازم آنے نہ پائے۔

ذیل میں وہ اصولی نقطہ بیان کیا جاتا ہے۔ جہاں سے ایمان میں کمی وبیشی کے بارے میں مختلف خطوط ہیں یہ مسئلہ

دراصل تفسیر ایمان کی فرع ہے۔ ایمان کی تعریف تین طرح سے کیگئی ہے۔(۱) ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے۔(۲) اعمال یا تصدیق اور اعمال کے مجموعہ کا نام ہے۔(۳) معرفت کا نام ہے۔

پس جن لوگوں نے ایمان کو تصدیق کہا ہے ان میں بھی ایمان کے کمی و بیشی کو قبول کرنے کے باب میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت بندگی شاہ خوندمیر نے المعیار و بعض الایات میں بیان کیا ہے۔ ایک کا مَسلک یہ ہے کہ ایمان جس کی تعریف تصدیق سے کی جاتی ہے کمی اور بیشی کو قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ واجب جو چیز ہے وہ یقین ہی ہے اور اس میں کمی بیشی کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ نہ ذات کے اعتبار سے اور نہ تعلق کے اعتبار سے۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے اور یہی حق ہے کہ ایمان بمعنی تصدیق کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔ ذات کے اعتبار سے بھی اور متعلق کے اعتبار سے بھی۔ ذات کے اعتبار سے اس طرح کی تصدیق کیفیات نفسانیہ سے ہے جو قوت و ضعف کو قبول کرتے ہیں پس تصدیق بھی قوت اور ضعف کو قبول کرتی ہے۔

یہ کہنا کہ واجب یقین ہی ہے اور یقین تفاوت کو قبول نہیں کرتا قابل تسلیم نہیں ہے اس لئے کہ اس قاعدہ کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ امتی اور نبی کا ایمان مساوی ہو جائے حالانکہ یہ امر اجماعاً باطل ہے۔ تصدیق کے قوت و ضعف کو قبول کرنے کے بارے میں ابراھیم علیہ السلام کا واقعہ نص قاطع ہے۔ ابراھیمؑ نے جب خُدا سے کہا کہ تو مُردوں کو کیونکر جِلاتا ہے تو ارشاد ہوا "أَوَلَمْ تُؤْمِن" ﴿البقرۃ:۲۶۰﴾ (کیا تجھے یقین نہیں) اور ابراہیمؑ نے اس کے جواب میں کہا بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ، یقین تو ہے مگر مزید اطمینان خاطر چاہتا ہوں۔ اس مکالمے سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ تصدیق کمی بیشی کر قبول کرتی ہے۔

اب رہا باعتبار متعلق کے تو اس صورت میں بھی ایمان بمعنی تصدیق کمی بیشی کو قبول کرتا ہے وہ اس طرح کہ تصدیق جس طرح اجمالی ہوتی ہے اسی طرح تفصیلی بھی ہوتی ہے۔ تصدیق اجمالی میں ان تمام چیزوں پر، جن کا علم آنحضرت ﷺ سے بالضرورۃ معلوم ہوا ہے ایمان لایا جاتا ہے لیکن جب فرداً فرداً ایک ایک چیز سامنے آتی جائے یا اس کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا جائے تو یہ تصدیق تصدیق تفصیلی ہوتی ہے۔ اور یہ تصدیق تفصیلی ایمان مجمل یا تصدیق اجمالی کا جزء ہوتی ہے۔ لیکن یہ قضیہ تو بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ تصدیقات تفصیلیہ زیادتی کو قبول کرتی ہیں اور ایمان میں زیادتی کے بھی یہی معنی ہیں جس پر قرآنی آیت "وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا" دال ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان یا تصدیق باعتبار ذات کے کمی بیشی کو قبول کرنے کے بارے میں قرآنی آیت وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ

قَلْبِي نص صریح ہے، اور باعتبار متعلق کے زیادت ونقصان کو قبول کرنے کے بارے میں وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا حکم قطعی ہے۔

علماء کا ایک گروہ جس میں جلیل القدر محدثین بھی شامل ہیں ایمان کی تعریف میں اعمال کو بھی داخل کرتا ہے اس گروہ کے پاس اعمال حقیقت ایمان کا رکن ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تارک اعمال ان کے پاس مومن نہیں کہلاتے۔ اعمال کی کمی بیشی سے ایمان کی زیادت و نقصان کے یہی لوگ قائل ہیں۔ چنانچہ علامہ قسطلانی نے بخاری کی شرح میں الإيمان يزيد بالطاعات وينقص بالمعصية لکھاہے۔ حالانکہ ایمان اور اعمال دونوں دو مختلف حقیقتیں ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کے باب میں قرآن بھی ناطق ہے مثلاً

(ا) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ﴿البقرۃ:۲۷۷﴾ میں ایمان پر عمل کا عطف کیا گیاہے، اور قاعدہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ ایکدوسرے کے مغائر ہوتے ہیں ورنہ عطف صحیح نہ ہوگا۔

(ب) وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴿طہ:۱۱۲﴾ میں ایمان کو صحت اعمال کی شرط قرار دیا گیاہے۔ ظاہر ہے کہ شرط مشروط سے الگ ہوا کرتی ہے۔

(ج) وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا ﴿الحجرات:۹﴾ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض معاصی کے ارتکاب کے باوجود ایمان کا اطلاق کیا گیاہے۔ اگر اعمال ایمان کا رکن ہوتے تو معاصی کے ارتکاب پر ایمان کی نفی کیجاتی پس یہ قول کہ اعمال حقیقت ایمان کا جزء ہیں غلط ہے۔

لیکن ایک دوسری جماعت جس میں امام شافعیؒ بھی ہیں اس امر کی قائل ہے کہ اعمال ایمان کا رکن ہیں۔ اس لحاظ سے تارک اعمال حقیقت ایمان سے خارج نہیں ہوتے۔ اس باب میں امام ابو حنیفہؒ کا مشہور قول "الإيمان لَا يَزِيدُ وَ لَا يَنْقص" زبان زد خاص وعام ہے اور اسکی یہی تعبیر کی جاتی ہے کہ امام ابو حنیفہ ایمان میں کمی اور بیشی کے قائل نہیں ہیں۔

لیکن شبلی نے سیرت نعمان میں اس قول کی تشریح اس طرح کی ہے۔ "الإيمان لَا يَزِيدُ وَ لَا يَنْقص" یعنی ایمان کم وبیش نہیں ہوسکتا بے شبہ یہ امام صاحب کا قول ہے لیکن اسکی تعبیر میں لوگوں نے غلطی کی ہے نہ صرف محدثین اور شافعیہ نے بلکہ خود احناف نے بھی۔ ایمان کی کمی اور زیادتی دو لحاظ سے ہوسکتی ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ وہ مقولہ کیف سے ہے جس میں شدت وضعف ممکن ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایمان یقین کا نام ہے اور یقین کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا سے یہ کہا اے خدا تو مردوں کو کیوں کر جلاتا ہے تو ارشاد ہوا أَوَلَمْ تُؤْمِن یعنی کیا اب تک تجھے یقین نہیں آیا۔ عرض کیا کہ یقین ضرور ہے وَلَـٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي اور زیادہ اطمینان خاطر چاہتا ہوں۔ خدا نے متعدد آیتوں میں صاف تصریح کر دی ہے کہ ایمان میں ترقی ہوتی ہے زادتھم ایمانا اس مسئلہ میں نص صریح ہے۔ لیکن ابو حنیفہ کو بلحاظ اس معنی کے نہ انکار ہے نہ یہ امر اس وقت زیر بحث تھا۔ امام صاحب کے دعویٰ کا منشاء اور ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ جن لوگوں نے عمل کو جزء ایمان قرار دیا ان کا مذہب ہے کہ ایمان بلحاظ مقدار کے زیادہ اور کم ہوتا ہے۔ جو شخص اعمال کا زیادہ پابند ہے وہ زیادہ مومن ہے"۔

اس کے بعد بحث کا نتیجہ یہ لکھتے ہیں۔ "غرض اِمام صاحب کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ایمان بلحاظ کیفیت یعنی شدت و ضعف کے زیادہ و کم نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ایمان مقدار کے اعتبار سے کم و بیش نہیں ہوتا۔"

پھر آگے چل کر اسی کتاب میں یہ تحریر ملتی ہے "اِمام صاحب اس بات کے بھی قائل تھے کہ متعلق ایمان میں کچھ تفاوت نہیں ہے یعنی معتقدات کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں ایمان کے لئے جن مسائل پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ سب کے لئے یکساں ہیں صحابہ اور عام مسلمان اس لحاظ سے برابر ہیں کہ دونوں ایک ہی چیز یعنی توحید و نبوت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ فرق ہے تو اعتقاد کی شدت و ضعف میں ہے۔" (سیرت نعمان صفحہ ۷۴، ۷۵)

مندرجہ بالا اقتباس کا خلاصہ یہ کہ امام ابو حنیفہ کا مسلک الإیمان لَا یَزِیدُ وَ لَا یَنْقص ہے باعتبار ذات کے بھی اور بلحاظ متعلق کے بھی، لیکن شبلی نے اس قول کی جو توجیہ کی ہے وہ ان کی اپنی دماغی کاوش ہے اور توجیہ القول بما لا یرضی به قائله ہے۔ جہاں تک ثبوت کا تعلق ہے البتہ وہ شبلی کی تعبیر کے بالکل برعکس ملتا ہے اور اس سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ایمان بمعنی تصدیق بھی زیادت و نقصان کو قبول کرنے کے امام صاحب قائل نہیں تھے۔

چنانچہ امام ابو حنیفہ نے عثمان بن بتی کے مکتوب کے جواب میں طولانی خط لکھا ہے اس کے مندرجات اور شبلی کی پر زور وکالت کو سامنے رکھیں تو صاف طور پر مدعی سست، گواہ چست کا معاملہ دکھائی دیتا ہے۔

شبلی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ایمان، بمعنی تصدیق و یقین، قوت و ضعف کو قبول کرنے کے امام صاحب قائل ہیں لیکن امام صاحب کے خط سے اس کے برعکس حقیقت ملتی ہے۔ عثمان بن بتی کے نام مکتوب میں امام صاحب یہ لکھتے ہیں "عمل اور تصدیق کا دوجدا گانہ چیز ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے کیوں کہ دین و مذہب سب کا ایک ہی ہے"۔ (سیرۃ النعمان صفحہ ۷۳)

شبلی نے امام صاحب کے قول **الإیمان لَا یَزِیدُ وَ لَا یَنْقص** کو اعمال کے جزء ایمان نہ ہونے کی صورت کے ساتھ متعلق کیا ہے اور لکھا ہے ان کے نزدیک جب اعمال جزء ایمان نہیں تو ایمان کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی" حالانکہ امام صاحب کا مکتوب اسکی تکذیب کرتا ہے امام صاحب نے تو یہ لکھا ہے کہ "تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے" (سیرۃ النعمان صفحہ ۷۳)

مکتوب کی اس عبارت سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب بلحاظ تصدیق نہیں بلکہ باعتبار اعمال فرق مراتب کے قائل ہیں اور یہ بات شبلی کے بیان کے خلاف ہے۔ قطع نظر اس کے امام صاحب کا قول "میرا ایمان اور ابو بکر کا ایمان برابر ہے"۔ ان کے مسلک پر حجت ہے۔ سوال یہ ہے کہ دونوں کے ایمان کی یہ برابری تصدیق کے لحاظ سے ہے یا اعمال کے لحاظ سے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اعمال کے لحاظ سے ہے تو شبلی کی یہ توجیہ کہ امام صاحب بلحاظ اعمال کے ایمان کی کمی بیشی کے قائل نہیں تھے اس کے خلاف بیٹھتی ہے۔ پس صورت اولیٰ یعنی تصدیق کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ اور ابو بکر صدیق کے ایمان کی برابری متعین ہوتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ صورت بھی شبلی کی توجیہ کی وجہ ٹک نہیں سکتی۔ اس لئے کہ شبلی نے تو یہ لکھا ہے "امام صاحب بلحاظ یقین کے ایمان کی زیادت و نقصان کے منکر نہیں تھے"۔ (سیرۃ النعمان صفحہ ۷۵)

خصوصاً امام صاحب کے قول "تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے" سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ یقین کے لحاظ سے بھی ایمان کی زیادت و نقصان کے منکر تھے۔

ابو بکر صدیق کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کا ایمان امت کے تمام افراد (بجز آنحضرت ﷺ، امام مہدی اور عیسیٰ علیہم السلام) کے ایمان سے بڑھ کر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ حدیث میں آیا ہے "تم لوگوں پر ابو بکر کو جو ترجیح ہے وہ کثرت صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہے جو ان کے دل میں ہے"۔

اس حدیث سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ وجہ فضیلت تصدیق قلبی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی اور بیشی تصدیق کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن امام صاحب کا قول ہے کہ "تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے"۔ جیسا کہ عثمان بن بتی کے مکتوب کے حوالے سے اوپر بیان کیا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے مسئلہ کی حد تک امام صاحب کا قول "**الإیمان لَا یَزِیدُ وَ لَا یَنْقص**" قرآنی آیت **زَادَتْهُمْ إِيمَانًا** کے خلاف ہے اور اس کی تشریح میں امام صاحب کا قول حدیث کے خلاف پڑتا ہے۔ اس لئے کہ امام صاحب کا قول ہے "کہ تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے"۔

اور حدیث کہتی ہے "تم لوگوں پر ابو بکر کو جو ترجیح ہے وہ کثرت صلوم وصلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہے جو اس کے دل میں ہے یہ بات تو قرین قیاس نہیں کہ امام ابو حنیفہ اس آیت سے بے خبر تھے یا یہ حدیث آپ تک نہیں پہنچی تھی۔ پھر آپ کے قول "الإيمان لَا يَزِيدُ وَ لَا يَنْقص" کی صحیح تعبیر کیا ہونی چاہئے۔ ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے اس قول کی بہترین توجیہ و تعبیر وہی ہے جو امامنا علیہ السلام سے مروی ہے یعنی "آپ نے اپنے ایمان کی خبر دی ہے چونکہ آپ کا ایمان کامل ہو چکا تھا اور کمال کے بعد ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے"۔

اس توجیہ سے نہ تو قرآن کا خلاف لازم آتا ہے اور نہ امام سے مجتھدانہ غلطی کا ارتکاب۔ امام مہدی علیہ السلام کے فرمان میں جو بات ہے اسی کی جھلک امام ابو حنیفہ کے اس قول میں ملتی ہے۔ "میرا ایمان اور ابو بکر کا ایمان برابر ہے"۔

ظاہر ہے کہ ابو بکر کا ایمان کامل ہونے کی خبر حدیث کے ذریعہ دے دی گئی تھی۔ اس کے بعد امام ابو حنیفہ کا یہ قول کہ میرا ایمان اور ابو بکر کا ایمان برابر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ بھی کامل الایمان ہیں،

خلاصہ یہ کہ "الإيمان لَا يَزِيدُ وَ لَا يَنْقص" کے ذریعہ امام ابو حنیفہ نے اپنے ایمان کی خبر دی ہے، اور ایمان بفحوائے آیت قرآنی بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔

(۳) بعض قدریہ کا مذہب یہ ہے کہ ایمان معرفت کا نام ہے۔ ہمارے علماء نے اس کے فساد پر اتفاق کیا ہے۔ کیوں کہ اہل کتاب محمد ﷺ کی نبوت کی ایسی ہی معرفت رکھتے تھے جیسا کہ اپنے اولاد کی، باوجود اس کے تصدیق نہ کرنے کی وجہ سے ان کا کفر یقینی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ بعض کفار حق کی یقینا معرفت رکھتے تھے لیکن دشمنی اور غرور کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ﴿النمل:۱۴﴾

ساتواں سوال - کسبِ حلال

سوال علماء: آپ کسب کو حرام کہتے ہو؟

جواب اِمام علیہ السلام: مومن کے لئے کسب حلال ہے۔ مومن ہونا چاہئے اور قرآن میں غور کرنا چاہئے کہ مومن کسے کہتے ہیں۔ (مولود صفحہ ۹۰، شواہد صفحہ ۱۷۹)

علماء نے جس ڈھنگ سے یہ سوال کیا ہے اس سے صاف طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ امام علیہ السلام نفس کسب کے مطلقاً حرام ہونے کے قائل ہیں۔ حالانکہ ہم دعوی کے ساتھ یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ امام علیہ السلام کا کوئی فرمان اس باب

میں موجود نہیں جس سے کسب کے مطلقاً حرام ہونے پر دلالتہً یا اشارۃً روشنی پڑتی ہو۔ خصوصاً جب آپ نے اپنے فرزند میراں سید محمودؓ کو آپ کی درخواست پر کسب کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی اور ساتھ ہی یہ کہا تھا ''جہاں کہیں رہو بایادِ خدا رہو، یہ بات کیسے باور کی جاسکتی ہے کہ آپ نے مطلقاً کسب کو حرام قرار دیا تھا۔ کسب سے متعلق مہدویہ کے مسلک کی توضیح حسب ذیل روایت سے ملتی ہے۔

''بعض لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ آپ علم پڑھنے سے منع کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو رسول اللہ نے منع نہیں فرمایا بندہ کس طرح منع کر سکتا ہے۔ بندہ یہی کہتا ہے کہ بامر اللہ و بحکم کتاب خدا مومن کے لئے ذکر اللہ فرض ہے۔ جو چیز مانع ذکر ہے وہ ممنوع ہے۔ کیا علم پڑھنا اور کیا کسب کرنا کیا مخلوق سے دوستی رکھنا، کیا کھانا کیا سونا غفلت حرام ہے جو چیز موجب غفلت ہے وہ بھی حرام ہے۔

اس روایت پر سے نفس کسب کی حرمت پر کسی طرح استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس روایت میں کسب کی وہ حد بتلائی ہے۔ جس کے ذریعہ کسب حرام کو کسب حلال سے بآسانی جدا کیا جاسکتا ہے شریعت کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کے ذہن میں وہ حد فاصل بٹھادی جائے جو حلال اور حرام کو جدا کرتی ہو۔ تا کہ انسان ان امور میں بھی جنکی اجازت شریعت کی جانب سے مل چکی ہو۔ حدود کی حفاظت کرنے اور حدود سے متجاوز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اس لئے کہ بعض جائز افعال بھی جب حدود سے متجاوز ہو جاتے ہیں تو ان پر حرمت کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

پس مندرجہ بالا روایت میں مانع ذکر اور موجب غفلت حد فاصل قرار پائی ہے۔ پس جو کسب اس حد کو پھلانگ کر مانع ذکر اللہ اور موجب غفلت بن جائے گا وہ ممنوع ہو گا اور جو کسب ایسا نہ ہو گا، ہرگز ممنوع نہ ہو گا۔ اس سے نفس کسب کی حرمت کا حکم صحیح نہیں ہے۔ اسکی حرمت کا باعث کسب نہیں ہے بلکہ کسب کا مانع ذکر اللہ اور موجب غفلت ہو جانا ہے۔ آیت قرآنی ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّـهِ﴾(المنافقون:۹)(اے ایمان والو تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دے) کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اموال اور اولاد میں تم ایسا مشغول نہ ہو جاؤ کہ خدا کو ہی فراموش کر بیٹھو۔ اس سے یہ مطلب تو ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ اموال و اولاد ہی ناجائز یا حرام ہیں۔ اولاد اور اموال حرام نہیں ہیں بلکہ ان میں اس درجہ مشغولیت کہ اس کی وجہ سے ذکر سے ہی غفلت پیدا ہو جائے حرام ہے۔ یہ بات کہ کن امور کی پابندی سے کسب مانع ذکر اور موجب غفلت ہونے نہیں پاتا اسکی توضیح مندرجہ ذیل روایتوں سے ملتی ہے۔ ''پھر فرمایا کہ شریعت میں کسب اور تجارت کرنے کی رخصت ہے وہ یہ کہ کاسب اور تاجر کی نیت یہ ہونی چاہئے کہ عبادت کر سکے اور احکام کی پیروی

کرنے اور ممنوعات سے پرہیز کرنے کی قوت ہو ایسا نہ ہو کہ حرص اور خیانت میں پڑ جائے۔ پھر فرمایا کہ اگر کاسب کے پیش نظر یہ بات نہ ہو تو اس کے دل میں تفاخر اور تکاثر گذرے گا۔ (حاشیہ شریف صفحہ ۴۴) امام علیہ السلام کے اس فرمان سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) ایک تو یہ کہ تجارت وکسب کی شریعت میں اجازت ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ تاجر اور کاسب کو چند حدود کی پابندی کرنی لازم ہے تا کہ بقدر کفاف کسب کرسکے اور حرص وخیانت سے بچ سکے۔

اِمام علیہ السلام کا یہ فرمان دراصل آنحضرت ﷺ کی حدیث اجملوافی الطلب کی بہترین تفسیر ہے جو کسی طرح معرض بحث میں نہیں آسکتا۔ ذیل میں کسب کے وہ حدود درج کئے جاتا ہیں جو کسب کے بارے میں امام علیہ السلام سے مروی ہیں۔

پھر پوچھا کہ کسب کے حدود کیا ہیں حضرت مہدی نے فرمایا۔

(۱) پہلی حد یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ کرے کسب پر نظر نہ کرے۔ (۲) دوسری حد یہ ہے کہ پنجوقتہ نماز با جماعت ادا کرے۔ (۳) تیسری حد یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرے۔ (۴) چوتھی حد یہ ہے کہ حرص نہ کرے، تھوڑی غذا اور ستر عورت پر اکتفا کرے۔ (۵) پانچویں حد یہ ہے کہ پورا عشر خدا کی راہ میں دے۔ (۶) چھٹی حد یہ ہے کہ طالبان خدا کی صحبت میں رہے۔ (۷) ساتویں حد یہ ہے کہ ہمیشہ اپنی ذات پر ملامت کرے۔ (۸) آٹھویں حد یہ ہے کہ ہر دو وقت کی حفاظت کرے یعنی فجر کی نماز سے طلوع آفتاب تک اور عصر کی نماز سے عشاء تک اللہ کا ذکر کرے۔ (۹) نویں حد یہ ہے کہ اذاں کے بعد کام کرنا جائز نہیں۔ اگر کام کرے تو وہ کسب حرام ہو گا۔ (۱۰) دسویں حد یہ ہے کہ زبان سے جھوٹ نہ کہے جو کچھ قرآن میں آیا ہے سب پر عمل کرے۔ ممنوعات سے پرہیز کرے۔ الخ (حاشیہ صفحہ ۴۵) کسب کے حدود بیان کرنے سے امام علیہ السلام کا مقصد کسب کو حرام سے بچانا تھا نہ کسب کو حرام قرار دینا۔

حدیث رسول ﷺ طلب الکسب الحلال فریضة بعد الفریضة" سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ایمان کے بعد (کاسب کے لئے) طلب کسب حلال فرض ہے۔ اس سے طلب کسب مطلق کے فرض ہونے پر استدلال کرنا حماقت ہے اس لئے کہ حدیث میں کسب مطلق نہیں ہے بلکہ کسب حلال ہے۔ جسکے معنی یہ ہیں طالب کسب کیلئے حلال کی تلاش فرض ہے۔

حدیث کے لفظ الفریضة کی تشریح اشعۃ اللمعات میں ایمان سے کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے حدیث کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایمان کے بعد کسب کا حلال ہونا فرض ہے جو امام علیہ السلام کے فرمان مومن کے لئے کسب حلال ہے کا ہم معنی ہے۔ کسب

کے باب میں کتب احادیث میں آنحضرت ﷺ سے جو روایتیں آئی ہیں ان کا مفہوم بھی ''کسب کا حلال ہونا فرض ہے'' ''کسب کا فرض ہونا'' نہیں۔

اگر اس حدیث سے مطلق کسب کی فرضیت ثابت کیجائے تو لازم یہ آتا ہے کہ ہر شخص فریضۂ دینی کے بعد کسب کی تلاش میں مصروف ہو جائے۔ حالانکہ اس حدیث کے قائل یعنی آنحضرت ﷺ کی مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ آپ نے فریضہ ءدینی کے بعد تلاش معاش کے سلسلے کا کوئی کام نہیں فرمایا کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ فریضۂ دینی کی ادائی کے بعد مکہ میں آنحضرتؐ کا پیشہ کیا تھا؟ اگر طلب کسب فریضۂ دینی ہوتا تو آنحضرت ﷺ سے یہ فرض ہرگز ساقط نہ ہوتا آپ تلاش معاش کے کسی نہ کسی شعبہ میں مصروف کار ہو جاتے۔ لیکن جب آپ نے مکہ میں کسی قسم کا کسب نہیں فرمایا تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ طلب کسب فرض نہیں ہے۔ ہاں کسب کا حلال ہونا البتہ فرض ہے۔ اور یہی حدیث کا مفہوم بھی ہے۔ اس سلسلے میں آنحضرتؐ کی حدیث ''جعل رزقي تحت رمحی'' قابل غور ہے اس حدیث کی بناء پر عام طور پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ جہاد آنحضرتؐ کا کسب تھا۔ اگر جہاد پر مجازاً کسب کا اطلاق کیا جاتا ہے تو یہ بات البتہ مسلم ہے لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ جہاد کو آنحضرتؐ نے اپنا ذریعہ معاش بنایا تھا تو یہ امر آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی کے مماثل ہے۔ اس لئے کہ کسب کے معنی صاحب اشعتہ اللمعات نے ''کسب بمعنی جستن رزق ودویدن در طلب آں یعنی رزق کی تلاش اور اسکی طلب میں دوڑ دھوپ کرنا (فی الصراح) کسب ورزیدن و گرد آوردن ودر اصل بمعنی جمع است'' لکھا ہے۔

اگر جہاد کو آنحضرتؐ کا کسب قرار دیا جائے تو مندرجہ بالا کسب کی تعریف کی رو سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا جہاد احقاق حق اور قیام بالعدل کے لئے نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد رزق کی تلاش تھی اور ضمناً مال کا جمع کرنا تھا۔

اور ان دونوں باتوں کی نفی آنحضرت نے خود اپنی طرف سے فرمادی ہے۔ امر اول کے بارے میں تو قرآن یہ کہتا ہے۔ ''وَمَا أَسْـــأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿الشعراء:۱۰۹﴾ (میں تم سے اجرت نہیں مانگتا ہوں میرا اجر اللہ کے ذمہ ہے) قطع نظر اس کے ایسا کہنا آپ کی شان رسالت میں زبردست توہین ہے کہ آنحضرتؐ نے تلاش رزق اور مال جمع کرنے کے لئے جہاد کیا تھا۔ امر دوم کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا۔ مَا أوحىَ اليّ أن أجْمَعُ المالَ وَ أكُون مِن التاجرين۔ مجھے اس بات کی وحی نہیں کی گئی کہ میں مال جمع کروں اور تاجروں میں سے ہو جاؤں۔ حاصل کلام یہ کہ جہاد پر مجازاً کسب حلال کا اطلاق تو کیا جاسکتا ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اس حدیث کی رو سے کسب حقیقی مراد نہیں ہو سکتا۔

امام علیہ السلام نے کسب کے جو حدود بیان فرمائے ہیں اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کی تلاش رزق کے تعلق سے

کی جانے والی کوششوں اور کاوشوں کی اصلاح ہوجائے تا کہ وہ حرمت کی سرحد میں داخل ہونے سے بچ جائیں۔ اس لئے کہ تلاش رزق کے سلسلے میں کیجانے والی کوشش کبھی تو ضرورت کی حد تک ہوتی ہے، اور کبھی ضرورت سے فاضل اور خواہش کے تابع ہوتی ہے۔ جہاں ضرورت پیش نظر رہتی ہے وہاں بھی انسان کو چاہئے کہ اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر کسب کرے، اور وہ بھی اس طرح کہ شریعت کے آداب وحدود کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔

لیکن جو کوشش ضرورت سے فاضل اور خواہش کے تابع ہوتی ہے ایسی حالت میں انسان کی نظر ضرورت کے بجائے خواہش پر ہوتی ہے اور خواہش کا کسی مقام پر ٹکاؤ نہیں ہوتا۔ اس کا باب تو اتنا وسیع ہے کہ ایک خواہش ابھی پوری ہونے نہیں پاتی کہ دوسری خواہش جنم لینے لگتی ہے اور ایک خواہش کی کیا بات ہے یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک دل کے مہمان خانے میں ہزاروں خواہشات کے قافلے کے قافلے بسیرا کر بیٹھے ہیں۔ اور ان سب کی تکمیل کے لئے انسان جو کسب کرتا ہے ظاہر ہے کہ وہ ہمہ وقتی اور ہر جہتی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود انسان کی کئی خواہشات تشنۂ تکمیل ہی رہ جاتی ہیں۔ اس لئے کہ انسان کی عمر محدود ہے اور خواہشات کا سلسلہ لا محدود پس خواہشات کا تابع انسان جو کسب کرتا ہے وہ نہ تو حلال وحرام میں فرق ملحوظ رکھتا ہے اور نہ اوقات کی پابندی کا لحاظ۔ اس کے سامنے تو بس یہ مسئلہ رہتا ہے کہ آیا اسکی خواہش پوری ہوئی کہ نہیں!!

"مومن کے لئے کسب حلال ہے" کا مطلب بھی یہی ہے کہ مومن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ وہ جائز اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر کسب کرے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ تو فرائض ترک ہوں اور نہ محرمات کا ارتکاب۔ حدیث میں "أَلْكَاسِبُ حَبِيْبُ الله" جو آیا ہے وہ بھی اسی معنی میں ہے۔ ورنہ اگر کاسب کو عام معنی پر رکھیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دنیا بھر کے لوگ جو کسب کر رہے ہیں وہ سب کے سب حبیب اللہ بن جائیں خواہ وہ مومن ہوں کہ کافر۔ چاہے وہ کسب حلال کرتے ہوں کہ کسب حرام۔ حالانکہ معمولی عقل رکھنے والا بھی اس معنی کو تسلیم نہیں کریگا۔ پس حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ کسب اایسا ہونا چاہئے کہ جس کے سبب اللہ کی محبت حاصل ہوجائے اور وہ کسب جو مفضي الي محبة الله ہے وہ مومن کا کسب ہی ہوتا ہے نہ کہ غیر کا۔

پس مہدی علیہ السلام کا فرمان کہ "مومن کے لئے کسب حلال ہے" سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ کسب حلال ہے دوسرے یہ کہ کاسب کو مومن ہونا ضروری ہے اور حدیث الکاسب حبیب اللہ کا مفہوم بھی تقریباً یہی ہے یعنی ایک تو اس سے جواز پر روشنی پڑتی ہے دُوسرے یہ کہ کسب ایسا ہونا چاہئے کہ جسکی وجہ سے کاسب حبیب اللہ بن سکے، نہ کہ دُنیا کا غلام۔ امام علیہ السلام کا فرمان "مومن ہونا چاہئے" ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو زبان سے کلمہ طیبہ کی ادائی کے بعد خود کو مومن

سمجھنے لگتے ہیں۔ اور قرآن کی اس آیت سے قطعاً بے خبر ہیں، قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَـٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا ...﴿الحجرات:۱۴﴾ کلمہ طیبہ کی ادائی سے انسان دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ رہا ایمان کا معاملہ وہ تو اس وقت آتا ہے جب دل زبان کے ساتھ موافقت کرے۔ مزید تاکید کے لئے آپ نے فرمایا کہ قرآن میں غور کرنا چاہئے کہ مومن کس کو کہتے ہیں۔

ذیل میں چند صفات درج کئے جاتے ہیں جو مومن کے حق میں قرآن میں بیان کئے گئے ہیں۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ﴿المؤمنون:۱ تا ۵﴾ ترجمہ: یقیناً فلاح پاگئے وہ مومنین جو اپنی نماز خشوع و خضوع سے ادا کرتے ہیں۔ جو از کار رفتہ امور سے اعراض کرتے ہیں جو زکات ادا کرتے ہیں جو اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے سوائے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس انکے سوا جو چاہے گا وہ حد سے بڑھنے والا ہے۔ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی رعایت کرنیوالے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ان آیات میں مومن کے جو صفات بتلائے گئے ہیں تقریباً وہ تمام صفات کسب کے حدود کے ضمن میں امام علیہ السلام نے بیان فرمائے ہیں۔ مہدویہ کے ہاں ترک کسب کا جو عمل ہے اس پر بھی کسی قسم کا صحیح اعتراض نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ ایک تو مہدویہ کے پاس کسب حرام نہیں ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اور دوسرے یہ عمل مبنی بر عالیت ہے جس پر آنحضرت ﷺ کی سیرت شاہد عادل بلکہ برہان قطعی ہے۔ ترک کسب کا تعلق اعلیٰ مراتب توکل سے ہے پس مہدویہ کے ہاں جو لوگ اعلیٰ مراتب توکل پر فائز ہوتے ہیں اور فقر و فاقہ پر صبر وضبط کی پوری اہلیت رکھتے ہیں وہ ترک کسب کرتے ہیں نیز ریاضت نفس، ارشاد خلق، تبلیغ دین اور اقامت مذہب جیسے اہم امور دین کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں اتنا وقت ہی نہیں مل سکتا کہ وہ تلاش رزق کے سلسلے میں کچھ کسب کر سکیں اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل توکل کرتے ہوئے ترک کسب واسباب کرنا بجائے خود صفت محمودہ ہے۔ قرآن واحادیث میں ایسے جری لوگوں کی تعریف کی گئی ہے۔

صاحب اشعۃ اللمعات نے توکل کی تعریف کے ذیل میں لکھا ہے۔

وبعضے تفسیر کردہ ان توکل رابہ	اور بعض لوگوں نے توکل کی تعریف
بیرون آمدن از کسب واسباب	میں "اللہ کی رزاقیت پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے
بجہت وثوق برزاقیت پروردگار تعالی	اسباب اور کسب سے کنارہ کش ہونا" لکھا ہے۔

(باب التوکل بالصبر صفحہ ۲۵۴)

پس مہدویہ کے پاس جو لوگ ترک کسب واسباب کرتے ہیں اس کا سبب اللہ کی رزاقیت پر کامل وثوق ہوتا ہے اور یہ عمل انبیاء اور اولیاء کا خاصہ اور پسندیدہ عمل ہے۔ قطع نظر اسکے احتراز بھی کیا جاتا ہے تو اسباب ظنیہ اور وھمیہ سے کیا جاتا ہے، اسباب یقینیہ سے نہیں علاوہ ازیں اولاد سے ان تارکین کسب کے تعلقات باقی رہتے ہیں۔ اور حدیث کی رو سے اولاد پر بھی کسب کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ان ولدہ من کسبہ انسان کی اولاد اس کے کسب سے ہے)۔

خلاصہ یہ کہ مہدویہ کے پاس کسب حرام نہیں ہے۔ مہدویہ کے پاس ترک کسب کا عمل مبنی بر عالیت ہے جو متوکلین کے لئے مخصوص ہے کسب کی اجازت ہے مگر چند شرعی حدود اور قیود کے ساتھ اور یہ حدود کوئی نئے حدود نہیں ہیں بلکہ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ﴿النور:۳۷﴾ سے ماخوذ اور مستنبط ہیں۔

آٹھواں سوال - رؤیت باری تعالیٰ

سوال علماء: آپ کہتے ہو کہ دار دنیا میں جو کہ دار فنا ہے چشم سر سے خدائے تعالیٰ کو دیکھنا چاہئے۔

جواب امام علیہ السلام: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا ہے اور راہ سے بہت دور بھٹکا ہوا ہے علماء نے پھر پوچھا کہ اہل سنت والجماعت کے علماء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ اس آیت شریفہ سے مراد آخرت میں خدا کو دیکھنا ہے۔ اِمام نے فرمایا کہ خدا کا وعدہ مطلق ہے ہم بھی مطلق کہتے ہیں اور سنت والجماعت نے بھی دار دُنیا میں دیدار خدا کو ناجائز اور ناممکن نہیں کہا ہے۔ ان کے کلام کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔ (مولود صفحہ ۹۰، شواہد صفحہ ۱۸۰)

اِمام علیہ السلام کی بعثت کے منجملہ مقاصد کے ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ مخلوق کو چشم سر سے دار دُنیا میں خدا کو دکھلایا جائے جیسا کہ آپ نے فرمایا "تصدیق بندہ بینائی خدا" اور دوسرے موقع پر فرمایا "آمدن بندہ بینائی خدا"۔

چونکہ آپ اسی منصب جلیل پر فائز تھے آپ نے جابجا اسکی تبلیغ فرمائی، اور جو لوگ آپ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے وہ بحمد اللہ دیدار باری سے مشرف بھی ہوئے۔ حسبِ فرمان امام مہدی موعود علیہ السلام مہدویہ کے پاس مومن وہ ہے جو چشم سر سے یا چشم دل سے یا خواب میں خدا کو دیکھے۔ نیز طالب صادق پر بھی مومن کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اِسی بناء پر علماء نے یہ سوال مرتب کیا تھا لیکن اس قدر ہوشیاری کے ساتھ کہ دعوت دیدار کو آپ کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔ تاکہ یہ بات عوام کے ذہن نشین ہو جائے کہ دیدار کی دعوت آپ اپنی جانب سے دے رہے ہیں۔ نہ تو آپ سے پہلے کسی نے اسطرح کی دعوت دی ہے۔

اور نہ اس کا کوئی جواز قرآن اور حدیث سے مل سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ علماء نے اپنے سوال کو "آپ کہتے ہو"۔ سے شروع کیا تھا۔

جواب میں امام علیہ السلام نے علمی اور عقلی دلائل سے قائل معقول کرنے کے بجائے قرآن شریف کی وہ آیت پیش فرمائی جس میں صاف طور پر یہ مضمون بیان کیا گیا تھا کہ جو یہاں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ واضح ہو کہ اندھے کا اطلاق جس طرح اس پر ہوتا ہے جس کی بینائی نہ ہو، اسی طرح مجازاً اس پر بھی ہوتا ہے جو آنکھ رکھنے کے باوجود اندھوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہو۔

خدا کی ہستی سب سے زیادہ ظاہر ہستی ہے۔ اس کو دیکھنے کی کوشش بھی نہ کرنا اندھا پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اور مندرجہ بالا آیت میں اسی بصیرت کا اندھا پن بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ پہلے معنی کے لحاظ سے قرآن کی بلاغت کا معرضِ بحث میں آنے کا قوی اندیشہ ہے آیت قرآنی پیش کرنے کی وجہ دراصل علماء کے اس زعم کی نفی کرنا تھا کہ دعوت دیدار آپ بربنائے نفس دے رہے ہیں تاکہ وہ یہ نکتہ سمجھ لیں کہ آپ کی دعوت بامر الٰہی اور عین اتباع حکم قرآنی ہے۔

یوں بھی امام علیہ السلام کا دعوی "مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ" تھا۔ پچھلے سوالوں کے جواب میں ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ امام علیہ السلام نے آیت قرآنی یا حدیث رسول اللہ ہی پیش فرمائی ہے۔ دیدار خداوندی کے جواز میں جب امام علیہ السلام نے قرآنی آیت پیش فرمائی تو علماء کو بحث کا ایک اور موقع ہاتھ لگتا نظر آیا جسے انہوں نے ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً یہ کہا علماء سنت والجماعت کے پاس تو اس سے مراد آخرت میں دیدار ہے۔ (نہ کہ دار دنیا میں) اس کا جواب امام علیہ السلام نے دو طرح سے دیا ہے۔

(۱) آیت میں وعدہ مطلق ہے، بندہ بھی مطلق کہتا ہے "اصولیین کا یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ مطلق کو اطلاق پر ہی رکھنا چاہئے۔ چنانچہ المطلق یجری علی اطلاقہ اہل علم کے ہاں مقبول و مشہور ہے۔ قرآن کے مطلق کو مقید کرنا دراصل تحریف معنوی ہے اور تحریف خواہ لفظی ہو کہ معنوی موجب وعید ہے، اور یہود و نصاریٰ کا پیشہ ہے۔ أَللّٰهُمَّ احْفِظْنَا مِنه

(۲) دوسرے یہ کہ آپ نے فرمایا کہ علماء اہل سنت والجماعت نے دار دنیا میں دیدار خداوندی کو ناجائز یا ناممکن نہیں کہا ہے۔ ان کے کلام کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے کہ دراصل انہوں نے کیا کہا ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ علماء سنت والجماعت نے دار دنیا میں دیدار الٰہی کو ناجائز یا ناممکن نہیں کہا۔ جواز اور امکان کے سب ہی قائل ہیں البتہ وقوع کے بارے میں انہیں اختلاف ہے۔ بعض وقوع کے قائل ہیں اور بعض نہیں لیکن کسی شی کے وقوع پذیر نہ ہونے سے اس کا جواز اور امکان کس طرح معرض

بحث میں آجائے گا۔ وقوع اور بات ہے اور امکان اور۔ البتہ جواز خود اس بات کی دلیل ہے کہ شئی وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔

رویت باری دار دُنیا میں عقلا ممکن اور جائز ہونے کی تائید میں شرح مواقف میں لکھا ہے۔ اجتمعت الأئمة من اصحابنا علی ان رؤیته تعالیٰ في الدنیا و الآخرة جائزة عقلا و اختلفوا في جوازها نقلاً سمعاً في الدنیا ترجمہ: ہمارے ائمہ نے اس امر پر اجماع کیا ہے کہ رویت باری تعالیٰ دینا اور آخرت میں عقلا ممکن ہے اور اختلاف کیا ہے نقلاً اور سماعاً دار دنیا میں اسکے جواز کے بارے میں

ظاہر ہے کہ اختلاف خود اس امر کے جائز اور ممکن ہونے کی دلیل ہے چنانچہ شرح عقائد میں لکھا ہے۔ "یہ دُنیا میں رویت باری کے ممکن ہونے پر مُشعر ہے اور اسی لئے صحابہ نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ آنحضرت نے شب معراج میں اپنے پروردگار کو دیکھا یا نہیں۔ کسی امر کے وقوع کے بارے میں اختلاف ہی اسکے امکان کی دلیل ہے۔"

نیز آخرت میں دیدار جائز ہونے اور دُنیا میں ناجائز ہونے کا دعویٰ غلط محض ہے۔ اس لئے کہ اس سے خدائے تعالیٰ کا عجز لازم آتا ہے۔ حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب اللہ پر کسی چیز کا اطلاق کسی وقت میں کیا جاتا ہے تو وہ تمام اوقات میں بھی جائز ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ کا کوئی وصف حادث نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اہل سنت والجماعت میں دار دُنیا میں رویت باری کے جواز کے باب میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ البتہ کچھ اختلاف اس پر پایا بھی جاتا ہے تو وہ وقوع کے بارے میں ہے لیکن عدم وقوع امکان ذاتی کے منافی نہیں ہے اور عدم وقوع کا دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت کو خدا کا دیدار بچشم سر ہوا، اور دیگر اولیاء اللہ کو بھی بچشم قلب دیدار حاصل ہونے کی بے شمار روایتیں ملتی ہیں۔

پس مسئلہ دیدار میں امام علیہ السلام کے فرمان پر اعتراض مذہب سے بے خبری کی دلیل ہوگی۔ دیدار باری جیسے سیدھے سادھے لیکن اہم دینی مسئلہ کو متکلمین کی فلسفیانہ موشگافیوں نے معمہ بنادیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یونانیوں کے فلسفہ نے جب عروج پایا تو متکلمین نے ان فلاسفہ کا جواب دینے کے لئے فلسفہ سکیھنا شروع کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ فلسفہ ان پر اسطرح چھا گیا کہ وہ ہر حقیقت کو فلسفہ کی میزان میں تولنے لگے، جو حکم اس میزان پر پورا اترتا اس کو قبول کر لیتے ورنہ اسے رد کر دیتے۔ حالانکہ قرآن کریم میں ایسی کئی آیتیں ملتی ہیں جن میں رویت باری کو نمایاں حیثیت سے پیش کیا گیا ہے مثلاً۔

وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿الإسراء:۷۲﴾ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿الکھف:۱۱۰﴾۔ علاوہ ازیں لقاء رب کے منکرین کو قرآن نے کفار کے زمرہ میں داخل کیا ہے۔ مثلاً إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا

غَافِلُونَ أُولَـٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴿یونس:۷﴾ ترجمہ: جو لوگ ہمارے دیدار کی اُمید نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی پر خوش ہو کر اسی پر مطمئن ہو گئے ہیں اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ ان کے ان کرتوت کا بدلہ دوزخ ہے۔

رؤیت باری دار دنیا میں ناجائز ہونے کے مسلک کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ (۱) وہ آیتیں جن میں رویت باری صریحاً مذکور ہے انکی تاویل کی گئی ہے۔ (۲) عقلی اصول جو دیدار کے مخالف ہیں۔ (۳) قرآن کی بعض آیتوں سے رویت باری کے ناممکن ہونے پر استدلال۔

(۱) وہ آیتیں جن میں رویت باری صراحت کے ساتھ مذکور ہے ان کی اس طرح تاوٴیل کی جاتی ہے کہ رؤیت سے مُراد آخرت میں ہے نہ کہ دار دنیا میں۔ اس کا جواب اوپر گذر چکا ہے۔

مگر افسوس تو اس بات پر ہے کہ جب آخرت میں خدا کا دیدار انسان کے لئے باعث کمال بن سکتا ہے تو دُنیا میں کیوں نہیں بن سکتا۔ حالانکہ انسانی کمال بدرجہٗ اولیٰ تو اسوقت ہو گا جبکہ وہ دار دنیا میں دُنیا کی ہاہمی کے باوجود مظاہر قدرت پر نظر رکھتے اور مصنوعات پر فکر کرتے ہوئے ان کے خالق کے جلوہٗ جہاں آراء سے مشرف ہو جائے۔

یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ کسی شئے کو دیکھنے کے بعد اس کے خالق یا صَانع کا کھوج لگاتا ہے، اور اس کا نام معلوم کرتا اور اُسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جلسوں میں شعراء کلام پڑھتے ہیں۔ دور بیٹھے ہوئے جو حضرات ان کا کلام سنتے ہیں ایڑیوں کے بل سہی مگر کھڑے ہو کر شعراء کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی حال مقررین کے بارے میں بھی ہوتا ہے، اور جب یہ بات انسانی فطرت میں داخل ہے تو اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا قدرت کی غزل اتنی پھیکی ہے کہ لوگوں میں اسکے خالق کو دیکھنے کی تڑپ ہی پیدا نہیں ہوتی۔ کیا کلام الٰہی اتنا بے جان اور سوز سے اتنا خالی ہے کہ اس کے نازل کرنے والے کی طرف ذہن متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسا ہی ہو تو یہ بات فطرت کے خلاف ہو گی اور انسان کبھی فطرت سے بغاوت نہیں کر سکتا پس معلوم ہوا کہ انسان میں خدا کو دیکھنے کی تڑپ اور طلب موجود ہے۔ یہ بات اور ہے کہ غفلت کی موٹی تہہ چڑھنے کی وجہ بعض لوگوں میں یہ حس خوابیدہ اور بعض میں مردہ ہو گئی ہو۔ لیکن اسکی وجہ یہ کلیہ تو قائم نہیں کیا جا سکتا کہ انسان میں خالق کو دیکھنے کی طلب ہی نہیں ہے۔

قطع نظر اسکے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تاویل کی وہاں ضرورت پیش آئیگی جہاں کلام کے معانی میں دشواری لاحق ہو اور جہاں معنی بن سکتے ہوں وہاں تاویل کی کیا ضرورت ہو گی؟

مزید برآں مطلق کو اسکے اطلاق پر ہی رکھنا چاہئے۔ شارع نے جسے مطلق کہا ہے اسکو مقید کرنے کا کسی کو کیا حق پہنچ سکتا ہے۔ مطلق کو مقید کرنا تو کلام الٰہی میں تحریف معنوی کے مترادف ہے جو کہ یہودونصاریٰ کا شعار ہے۔

رؤیت باری کو آخرت کے ساتھ متعلق کرنے میں تحریف معنوی کی یہی صورت درپیش ہوتی ہے۔ جس سے احتراز کرنا واجب ہے۔

(۲) فلاسفہ کا یہ کہنا ہے کہ رویت کے چند شرائط ہیں جن کے پائے جانے پر ہی رویت حاصل ہوتی ہے۔

(۱) مرئی رائی کے مقابل ہو۔ (۲) مرئی بہت زیادہ لطیف نہ ہو۔ (۳) مرئی رائی سے زیادہ دور نہ ہو۔ (۴) مرئی اور رائی کے درمیان کوئی شئی حائل نہ ہو۔ (۵) رائی میں دیکھنے کی صلاحیت ہو اور دیکھنے کا ارادہ ہو۔ (۶) مرئی بہت زیادہ چھوٹی نہ ہو۔

یہ ہیں رویت کے شرائط جنکی بناء پر فلاسفہ نے رویت باری کا انکار کیا ہے۔ کیوں کہ ان میں سے ایک شرط بھی نہ مرئی میں پائی جاتی ہے اور نہ رائی میں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ رویت کے یہ شرائط جو استقرائی ہیں یعنی ممکنات پر غور کرنے کے بعد اخذ کئے گئے ہیں ہمارے پاس بھی مسلم ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ممکن کی رویت کے مندرجہ بالا شرائط ہی بعینہ ذات واجب تعالیٰ کی رؤیت کے لئے شرائط بن جائیں گے؟

فلاسفہ خود اس امر کے قائل ہیں کہ ممکن اور ہے اور واجب اور۔ پس جو چیز ممکن کی رویت کے لئے شرط ہو گی کیا ضروری ہے کہ وہ واجب تعالیٰ کی رویت کے لئے بھی شرط بن جائے۔ خصوصاً جبکہ ممکن اور واجب میں اسدرجہ تفاوت ہے کہ ممکن میں عدم اور وجود دونوں مساوی میں اور واجب میں وجود واجب ہے اور عدم محال ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ رویت کے مندرجہ بالا شرائط ممکنات کی حد تک تو قابل تسلیم ہیں لیکن یہاں جو گفتگو کی جارہی ہے وہ واجب تعالیٰ سے متعلق ہے۔ ممکنات کے شرائط اور لوازم کا اطلاق کسی طرح واجب پر نہیں ہو سکتا۔ پس ہمارا یہ دعویٰ کہ دنیا میں دیدار باری جائز ہے وہ اپنی جگہ ثابت اور باقی ہے۔

(۳) منکرین رویت قرآن کی بعض ایسی آیتوں کو اپنے زعم میں مفید مطلب سمجھ کر رویت باری کی نفی پر استدلالاً پیش کرتے ہیں جن میں رویت باری کی ممانعت کا دلالتہ یا اشارۃً کوئی حکم نہیں پایا جاتا۔

منکرین رویت کی دلیل اول قرآنی آیت لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ﴿الأنعام:۱۰۳﴾ ہے جنکے معنی

یہ ہیں کہ ابصار اس کا ادراک نہیں کرسکتے، اور وہ (اللہ) ابصار کا ادراک کرتا ہے۔ حیرت تو یہی ہے کہ اس آیت کو جس میں بندوں کی جانب سے حق کا ادراک کرنے کی نفی اور حق کی جانب سے بندوں کا ادراک کرنے کا اثبات کیا جارہا ہے رویت باری کے ناجائز ہونے کی دلیل کے طور پر کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے اس آیت میں نہ تو رویت کا کوئی لفظ ہے اور نہ معناً رویت کی نفی کی جارہی ہے۔ ہاں البتہ نفی جو کی جارہی ہے وہ ادراک کی ہے۔ لیکن ادراک کی نفی سے رویت کی نفی کیسے ہوجائیگی۔ ادراک کی نفی، رویت کی نفی کو مستلزم نہیں ہے اس لئے کہ ادراک کے معنی من جمیع الوجوہ احاطہ کرنے کے ہیں، اور رویت کے معنی دیکھنے کے ہیں ہم روزانہ بیسیوں چیزوں کو دیکھتے ہیں لیکن شاید ایک کے متعلق بھی ادراک کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ ہم ہر چیز کا ہر جہتی مطالعہ نہیں کرسکتے۔ لیکن کسی چیز کا ادراک نہ کرنے کی وجہ یہ دعویٰ کر بیٹھنا کہ ہم نے کسی چیز کو نہیں دیکھا یا ہم کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے ظاہر ہے کہ انتہائی مضحکہ خیز دعویٰ ہوگا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رویت کا ذریعہ آنکھ ہے اور ادراک کا ذریعہ عقل، ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی کیسے ہوجائیگی، جبکہ دونوں میں تلازم نہیں ہے۔

ایک اندھا جو کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتا کسی شئی کے متعلق ادراک کا دعویٰ کرسکتا ہے جبکہ اس نے اپنے تمام ممکنہ ذرائع سے اس شئی سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرلئے ہوں۔ اس صورت میں ادراک تو حاصل ہے لیکن بغیر رویت کے۔

جب ادراک اور رویت کے ذرائع بھی مختلف ہیں اور دونوں میں نسبت بھی کچھ اسطرح پائی جاتی ہے کہ نہ تو ایک کے وجود سے دوسرے کا وجود لازم آتا ہے اور نہ ایک کی نفی سے دُوسرے کی نفی، پھر آیت میں بندوں کیجانب سے حق کے ادراک کی نفی سے یہ استدلال کسطرح کیا جاسکتا ہے کہ بندے حق تعالیٰ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ بات یہ صحیح ہے کہ بندے حق کا ادراک نہیں کرسکتے اس لئے کہ ادراک میں کنہ حقیقت کو جاننا پڑتا ہے اور رویت کیلئے یہ شرط نہیں ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ادراک ناممکن ہے اور یہ بات کسی جہت سے ہمارے اس دعویٰ کے مخالف نہیں ہے کہ واجب تعالیٰ کا دیدار جائز بھی ہے اور ممکن بھی۔

دار دُنیا میں رویت باری کے انکار کی دوسری اہم بنیاد۔ فرمان خداندی "لَن تَرَانِي" ﴿الأعراف:۱۴۳﴾ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال "رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ" ﴿الأعراف:۱۴۳﴾ کے جواب میں کہا گیا تھا۔ آیت سے منکرین رویت کا استدلال یہ ہے کہ دیدار باری اگر دنیا میں جائز ہوتا تو حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ان کی درخواست پر لن ترانی کے ذریعہ جواب نہ دیا جاتا۔ جب اولوالعزم نبی کو لن ترانی کا جواب ملا تو پھر عوام کس قطار و شمار میں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ لن ترانی سے رویت کے امکان کی نفی ہرگز مراد نہیں لی جاسکتی اس لئے لن ترانی کے معنی ہیں تم مجھے ہرگز نہ دیکھو گے کسی خاص شخص کے نہ دیکھنے کی وجہ یہ کلیہ تو قائم نہیں ہوجاتا کہ وہ شئ مطلقاً نظر آنے والی ہی نہیں ہے یا کوئی اور شخص اُسے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ یہ بات تو اس وقت ہوتی ہے جبکہ بجائے لن ترانی کے جواب میں "لَن أُرَى" کہا جاتا۔ یعنی میں ہرگز دکھائی نہیں دیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ لن اری نہیں کہا گیا۔ لن ترانی کہا گیا جس کے معنی حضرت موسیٰ کی جَانب سے دیکھنے کی نفی ہے اور وہ بھی بزمانۂ مستقبل، خدا کی جانب سے دکھائی دئے جانے کی نفی نہیں ہے۔

دُوسری وجہ لَن تَرَانِي کہنے کی یہ ہے کہ جب موسیٰ کی قوم نے حضرت موسیٰ سے صَاف الفاظ کہا "لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً ﴿البقرۃ:۵۵﴾" (ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تاوقتیکہ ہم خدا کو علانیہ دیکھ نہ لیں) تو موسیٰ نے کچھ تو اپنی خواہش کی بناء پر اور کچھ ان کے اس مطالبہ کے پیش نظر "رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ" فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں جو بھی جواب دیا جائے گا۔ اسکے اصل مخاطب وہی ہونگے جو اس کا مُطالبہ کر رہے تھے پس یہاں مطالبہ چونکہ قوم کا تھا جسے موسیٰ نے بارگاہ خداوندی میں پیش فرمایا تھا۔ اب جب اس کے جواب میں لَن تَرَانِي کہا گیا تو دراصل اسکے مخاطب وہ لوگ تھے جو دیدار کے بطور شرط طلبگار تھے۔ نہ کہ حضرت موسیٰ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو دراصل ایک واسطہ تھے۔ جن کے ذمہ کلام خداوندی کو بندوں تک پہنچانا تھا۔ چوں کہ سَائلین نے "لَن نُّؤْمِنَ لَكَ" میں "لَن" کے ذریعہ نفی کی تاکید کی تھی، اسی لئے جواب میں بھی "لَن تَرَانِي" کہا گیا اور "لَن" کے ذریعہ نفی کی گئی۔ یہ تو تھا قوم کو جواب۔ لیکن مطالبہ کرنے والے حضرت موسیٰ علیہ اسلام بھی تھے۔ جنھوں نے اپنی جانب سے یہ سوال کیا تھا اور ان کو کچھ جواب دینا بھی ضروری تھا تو ان کے لئے "وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ" کا جواب دیا گیا۔ لَن تَرَانِي کے ذریعہ حضرت موسیٰ کو جو زخم لگا تھا وَلَٰكِنِ انظُرْ الخ اسکے حق میں مرہم ثابت ہوا۔ اور حضرت موسیٰ کو خدا کا دیدار حاصل ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دیدار کی درخواست خود اس بات کی دلیل ہے کہ باریٔ تعالیٰ جائز الرویۃ ہے اس لئے کہ اگر وہ جائز الرویۃ نہ ہوتا اور محال ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال طلب محال ہوتا۔ اور طلب محال کا صدور ہرگز کسی پیغمبر سے ہو نہیں سکتا۔ طلب محال تو فعل عبث ہے جو پیغمبر کی شان کے منافی ہے۔ آیت وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي بھی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ جائز الرویۃ ہے۔ اس لئے کہ رویت کو استقرار جبل سے متعلق کیا گیا ہے اور استقرار جبل فی نفسہ ممکن ہے اور امر ممکن پر جو شئ معلق کی جاتی ہے وہ بھی ممکن ہوتی ہے۔ پس اس لحاظ سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ باری تعالیٰ جائز الرویۃ ہے۔ اسی لئے صاحب مدارک نے اس آیت کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے۔

لن ترانی بالسوال بعین فانیة بل بالعطاء و النوال بعین باقیة وھو دلیل لنا ایضاً لانه لم یقل لن أری لیکون نفیاً للجواز۔ ترجمہ: اے موسیٰ تم سوال کے ذریعہ اپنی فانی آنکھ سے مجھے ہر گز نہ دیکھو گے بلکہ ہمارے فضل و عطاء سے تم اپنی چشم باقی سے ہم کو دیکھو گے اور یہ ہمارے لئے دلیل ہے کیونکہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا میں ہر گز نہیں دیکھا جاؤنگا (ایسی صورت میں) جواز دیدار کی نفی ہو جاتی۔

علاوہ ازیں مرتبۂ احسان کی تشریح میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (اللہ کی عبادت کر اس طرح کہ گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے اور یہ نہ ہو سکے تو اس طرح کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے) تو ببانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ خدائے تعالیٰ دُنیا میں جائز الرویتہ ہے۔

رہے وہ احادیث جن میں بندے کا مرنے کے بعد حق کو دیکھنا بیان کیا گیا ہے۔ وہ بھی ہمارے اس دعویٰ کے مخالف نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان احادیث میں موت سے مراد وہ موت مجازی نہیں ہے جسے ہم انتقال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد موت حقیقی ہے جس کے معنی ہیں انسان کا ہستی اور بشریت کی قید سے آزاد ہو جانا۔ دنیا اور اہل دنیا سے ہٹ جانا اور فناء تام کا مرتبہ حاصل کر لینا۔ پس حدیث: قال النبی ﷺ لا یری ربه حتی یموت۔ اوران اللّٰہ لا یری فی الدنیا و لا یراہ احد من الخلق۔ ترجمہ: آنحضرت نے فرمایا تم میں سے کوئی مرنے تک اپنے رب کو نہیں دیکھے گا۔ اللہ دُنیا (مقام خودی) میں نہیں دیکھا جاتا اور کوئی مخلوق اسکو نہیں دیکھ سکتی۔ وغیرہ سے مراد یہی ہے کہ جو شخص خدا کو طلب کرے اور خدا کے دیدار کا طالب ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ دنیا اور اہل دُنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔ بشریت کی صفت سے نکل جائے اور فنا کا مرتبہ حاصل کرے۔

اسی موت کی ترغیب آنحضرتؐ نے اپنے فرمان "مُوْتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوْتُوا" کے ذریعہ دی ہے یعنی خودی، ہستی، بشریت اور خودی ہی دراصل دُنیا ہے۔ جب خودی مر جائے تو پھر کوئی دُنیا نہیں۔ حاصل یہ کہ رویت باری دار دنیا میں جائز ہے۔ جس پر آیات قرآنی اور احادیث نبوی دلیل ہیں۔ اور اہل سنت والجماعت کے علماء کا بھی یہی مسلک ہے جو عقائد کی کتابوں کا جزء لانیفک ہے۔

نواں سوال - آیات خوف ورجاء

سوال علماء: آپ اُمید اور رحمت کی آیتیں بہت کم بیان کرتے ہیں اور قہر و غضب کی زیادہ جس سے بندہ نا اُمید ہو جاتا ہے۔

جواب امام علیہ السلام: آنحضرت نے فرمایا "أَخُوكَ مَنْ حَذَّرَكَ لاَ مَنْ غَرَّكَ" تیرا بھائی وہ ہے جو تجھے ڈرائے نہ کہ وہ جو تجھے دھوکہ دے۔ (مولود صفحہ ۹۱، شواہد ۱۸۱)

علماء امام علیہ السلام سے امر مہدیت کے بارے میں گفتگو کرنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں آئے تھے۔ انہیں اصولاً چاہئے تو یہ تھا کہ وہ امر مہدیت سے تعلق رکھنے والے امور پر گفتگو کرتے۔ بجائے اس کے علماء نے جو سوالات پیش کئے ہیں ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ عمداً گفتگو اور بحث کے میدان کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ اثنائے گفتگو اگر انہیں کوئی بات قابل گرفت نظر آجائے تو اس کو خوب اچھالیں اور آپ کے خلاف بطور حربہ استعمال کر سکیں چنانچہ مندرجہ بالا سوال اسی نوعیت کا ہے جسے امر مہدیت کی تحقیق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

امام علیہ السلام کا بیان قرآن جو مراد اللہ پر مشتمل تھا اتنا پر کشش اور پر سوز ہوتا تھا کہ لوگ آپ کا بیان سننے کے لئے دور دراز مقامات سے آپ کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ اور جو شخص ایک مرتبہ آپ کا بیان سُن لیتا وہ بس آپکا دیوانہ ہو جاتا تھا۔ پھر بعثت مہدی کا زمانہ ہر لحاظ سے عموماً اور دینی اعتبار سے خصوصاً ابتر تھا۔ علماء اور سلاطین نے اس دینی فضا کو مکدر کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی جسے آنحضرتؐ اور خلفائے راشدینؓ نے کڑی محنت اور سخت جانفشانی کے ساتھ پیدا کیا تھا۔ قرآن کو ایک مقدس کتاب کی صورت دے دی گئی تھی اور اسکی من مانی تاویلات کی جارہی تھیں۔ احادیث کی بھرمار تھی۔ موضوع اور غیر صحیح احادیث سے اپنے اختیار کردہ مسلک کی تائید حاصل کرلی جاتی تھی، علماء، سلاطین کے چشم وابرو کے اشاروں پر رقص فرماہوتے تھے۔ نیز اپنے حلوے مانڈے کے لئے مجالس وعظ و بیان میں ایسی حدیثیں پیش کرتے تھے جن سے عوام یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور تھے کہ انسان کا خمیر ہی گناہ ہے، لیکن خدا بھی غفور اور رحیم ہے کلمۂ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کا قائل بہر نوع نجات یافتہ ہے وغیرہ۔ اس طرح کی دل خوش کن باتوں سے عوام کا دل لبھا دیا جاتا تھا۔ اس طریق وعظ سے عوام بھی خوش ہو جاتے اور ان علماء کو بھی اپنی روٹی پر دال کھینچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔

لیکن امام علیہ السلام کو تو دور اول کے اِسلام کو پیش کرنا تھا۔ اور اس غرض کیلئے ان تمام رسوم، عادات اور بدعات پر ہتھوڑے چلانے تھے جو اسلامی زندگی کی رگوں میں خون کی طرح سرایت کر گئے تھے۔ ان تمام مزعومات اور متعقدات کی نفی کرنا تھا جن کو وہ کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ چونکہ امام علیہ السلام کے مخاطب وہ مُسلمان تھے جو اُمید و رحمت کی آیتوں کا بیان سن کر فقط کلمۂ طیبہ کی ادائی کو اپنے لئے کافی سمجھنے اور بقیہ اعمال و فرائض کو ترک کرنے کے باوجود رسول اللہ کی شفاعت اور خدا کی غفورالرحیمی پر کامل اعتماد کئے بیٹھے تھے۔ اس لئے ضرورت داعی تھی کہ آپ ان کے کردار کا جائزہ لیتے، ان کے اخلاق و

عادات پر کڑی نکتہ چینی فرماتے قرآن کاوہ صحیح مفہوم بیان فرماتے جو مراد اللہ ہے۔ احادیث میں سے وہ حدیثیں پیش فرماتے جو صحیح ہوتیں۔ ائمہ کے مسائل کے اختلاف کو رفع فرماتے اور وہ غیر ضروری باتیں جو دین میں داخل ہوگئی ہوں ان کو خارج ازاسلام کرتے ہوئے دین کی وہ صحیح تصویر پیش فرماتے جسے آنحضرتؐ نے پیش فرمایا تھا۔ اور مذہب کی وہ روح زمانہ کے سامنے رکھتے جو قرآن میں موجود ہے۔ چنانچہ جابجا آپ نے یہی فرمایا۔ لیکن آپ کا یہ مسلک علماء کے مسلک کے بالکل مغائر تھا۔ لوگ تو یہ سمجھے تھے کہ ہم جس طریق پر زندگی بسر کررہے ہیں بس وہی صحیح ہے۔ اس لئے کہ ان کے مسلک پر علماء نے کبھی تنقید نہیں کی تھی۔ ان کے اعمال و کردار پر علماء نے انہیں ٹوکا بھی تو نہیں تھا۔ اب جب امام علیہ السلام کا بیان سنتے تو ایسا معلوم ہونے لگتا کہ مذہب اِسلام کے مقابلہ میں ان کے مذہب کا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ ان کے رسوم ورواج عادات وبدعات، اخلاق و کردار، نقطہ ہائے فکر و نظر اور معتقدات واعمال سب کچھ قرآن و حدیث کے یکسر مخالف اور بالکل مغائر ہیں۔ ایسی صورت میں عوام کے دلوں میں یا تو یہ بات آنی ضروری تھی کہ ان کے علماء خود مذہب حق سے بیگانہ ہیں، یا پھر یہ کہ انہوں نے عمداً عوام کو جہالت کے تاریک پردوں میں رکھا ہے تا کہِ ان کی شکم پری کا سامان مہیا ہوسکے۔ بہر نوع یہ بات تو یقینی تھی کہ امام علیہ السلام کے بیان قرآن سے جہاں عوام معلومات دین حق سے مالامال ہوتے اور مذہب سے قریب ہوکر خوش ہوتے تھے وہیں چند علماء سُوا ایسے بھی تھے جنھیں اپنی موت نظر آتی تھی اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اسی طرح کے مواعظ حسنہ اور بیان قرآن کا سلسلہ اگر چند دن تک دراز ہوجائے تو پھر ان کی مشیخیت وعلم کی دکان بیٹھ جائیگی اور انہیں نہ صرف بھوکوں مرنا پڑیگا بلکہ عوام کی نظروں میں ان کا رہاسہا باقی وقار بھی ختم ہوجائے گا۔

خلاصہ یہ کہ اپنے مسلک کو سنبھالنے کے لئے علماء نے یہ سوال کیا تھا۔ اِمام علیہ السلام نے حدیث سے جو جواب دیا ہے خود اس سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان علماء نے دراصل عوام کو زبردست دھوکہ میں رکھا تھا۔ چکنی چپڑی باتیں کردیتے تا کہ مرغن غذاؤں کا لطف اُٹھاسکیں اور اگر کوئی پوچھنے کی جرأت بھی کرتا تو صاف طور پر جواب دیتے کہ یہ باتیں علماء کے لئے مخصوص ہیں عوام ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتے عوام کا کام تو یہی ہے کہ علماء کے مسلک کی پیروی کرلیا کریں اور بس۔

امام علیہ السلام نے جو حدیث پیش فرمائی اسکا مفہوم یہ ہے کہ تیرا بھائی (دوست) حقیقت میں وہ ہے جو تجھے خدا سے ڈرائے نہ کہ وہ جو تجھے دھوکہ میں رکھے۔ دوستی دنیوی لحاظ سے بھی ہوتی ہے اور اخروی لحاظ سے بھی۔ دنیوی دوستی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوست کو ایسی باتیں بتائی جائیں جن سے دوست کو فائدہ حاصل ہوتا ہو اور ان امور سے روکا جائے یا متنبہ کیا جائے جن کے سبب دوست کی صحت، عزت اور کاروبار وغیرہ متاثر ہوتے ہوں۔ اخروی دوستی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دوست کو ان باتوں

کی ترغیب دی جائے جن سے خدا اور رسول خوش ہوتے ہیں اور ان امور سے روکا جائے جن سے وہ غضب الٰہی کا شکار ہوتا ہو۔

اور اگر کبھی مقابلہ دنیوی تقاضوں اور مذہبی مطالبوں میں پڑ جائے تو صحیح اور حقیقی دوست کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ دین کے مقابلے میں دنیاوی فائدوں کو ترک کرنے کی تاکید کرے۔ کیونکہ اسمیں فانی اور کم مدت کے مفاد کے مقابلے میں باقی اور دیرپا منافع کے حصول کی ترغیب پائی جاتی ہے گمراہ لوگوں کے سامنے دل خوش کن باتوں اور فقط امید ورجاء کی آیتوں سے شیطان یہ وسوسہ دلا سکتا ہے کہ جب خدا غفور رحیم ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے بجائے اگر قہر و غضب کی آیتوں کا بیان ہو تو انسان کا ضمیر بیدار بھی ہو سکتا ہے اور عمل کی جانب راغب بھی ہو پہلی صورت دھوکے کی ہے اور دوسری صورت حقیقی دوستی کی ہے۔

نیز علماء کے سوال سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ امام علیہ السلام اُمید ورجاء کی آیتیں بھی بیان فرماتے تھے اور قہر و غضب کی بھی لیکن چونکہ علماء کا وعظ و بیان صرف اُمید رجاء کی آیتوں سے بھرپور ہوتا تھا اور قہر و غضب کی ایک آیت بھی مذکور نہیں ہوتی تھی اور امام علیہ السلام کے بیان قرآن میں اُمید ورجاؑ کے ساتھ قہر و غضب کی آیتیں بھی بیان ہوتی تھیں تو انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُمید ورجاء کی آیتیں کم بیان ہوتی تھیں اور قہر و غضب کی زیادہ۔

کلام الٰہی کا طرز بھی یہی ہے کہ مومنوں کے ساتھ کفار کا اور نیک خصلتوں کے ساتھ بری عادتوں کا بھی بیان کیا گیا ہے۔ آیات رحمت کے ساتھ ساتھ آیات قہر بھی قرآن شریف میں جابجا ملتے ہیں۔ اِمام علیہ السلام کے بیان میں بھی اُمید ورجاء کی آیتیں بھی بیان ہوتی تھیں اور قہر و غضب کی بھی۔ اس کا اعتراف خود علماء کو تھا، پھر اعتراض کیا معنی۔

ہاں اعتراض اس صورت میں صحیح ہو سکتا تھا جبکہ امام علیہ السلام صرف قہر و غضب کی آیتوں کا بیان فرماتے اور اُمید ورجاء سے متعلق ایک آیت بھی آپ کی زبان پر نہ آئی ہوتی۔ حالانکہ بات ایسی نہیں تھی۔ البتہ قابل اعتراض اور حق کے پاس لائق مواخذہ تو یہ علماء ہیں جنھوں نے سلاطین، امراء اور دولت مندوں کی خوشامد اور چاپلوسی کی قربان گاہ پر قہر و غضب کی ساری آیتوں کی بھینٹ چڑھادی تھی۔ امید ورجاء کی آیتوں کی مالا ان کے گلے میں ڈال کر خوابِ غفلت سے چونکنے کا ایک ادنی موقع بھی انہیں نہیں دیا تھا۔ حدیث میں الأيمان بين الخوف والرجاء (ایمان خوف اور اُمید کے درمیان ہے) آیا ہے۔ جہاں صرف رجاء ہی رجاء ہو وہاں ایمان کہاں سے آسکیگا۔ اور علماء کا طریق بیان یہی تھا لیکن امام علیہ السلام کے بیان میں جس طرح خوف کی آیتیں بیان کی جاتی تھیں اسی طرح اُمید کی آیتوں کا بھی بیان ہوتا تھا۔ چنانچہ علماء نے خود اس کی گواہی دی ہے۔

دسواں سوال - تحصیلِ علم

سوال علماء: آپ علم پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔

جواب امام علیہ السلام: بندہ محمد رسول اللہ کی پیروی کرنے والا ہے جو کچھ محمد رسول اللہ نے منع نہیں کیا بندہ کیوں کر منع کر سکتا ہے بندہ خدا اور حکم کتاب خدا سے اللہ کے ذکر دوام کو فرض کہتا ہے۔ جو چیز کہ اللہ کے ذکر کو منع کرنے والی ہے وہ ممنوع ہے کیا علم پڑھنا اور کیا کسب کرنا اور کیا مخلوق سے دوستی رکھنا، کیا کھانا، کیا سونا، غفلت حرام ہے۔ جو چیز غفلت کا سبب ہے وہ بھی حرام ہے۔ (مولود صفحہ ۹۱، شواہد صفحہ ۱۸۰)

حیرت تو یہی ہے کہ امامنا علیہ السلام سے تحصیل علم کی مطلق ممانعت کے بارے میں کوئی صریح حکم یا ادنی اشارہ پائے نہ جانے کے باوجود علماء نے یہ قضیہ کیسے فرض کر لیا کہ امام علیہ السلام تحصیل علم سے منع کرتے ہیں ہم تو یقین کے ساتھ یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ ایسی کوئی روایت امام علیہ السلام سے مروی نہیں ہے جس کا مقصد تحصیل علم سے مطلقا ممانعت ہو۔ بر خلاف اس کے علم ضروری حاصل کرنے کی تاکید سے متعلق البتہ روایت ضرور ملتی ہے۔ جیسا کہ روایت ہے۔

"میراں علیہ السلام نے فرمایا کہ علم لابدی (ضروری) چاہیئے تا کہ نماز روزہ اور اسکے مانند دیگر افعال واعمال درستگی کے ساتھ ادا ہوں"۔ کیا تحصیل علم ضروری کی تاکید کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ امام علیہ السلام تحصیل علم سے منع فرماتے ہیں۔؟

ہم نے جو روایت اوپر درج کی ہے اس میں جو حکم پایا جاتا ہے وہ عمومی شان کا حامل ہے اور کسی مذہب کی بنیاد عام احکام ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور ان پر سے ہی مذہب کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ مخصوص احکام جو مخصوص اوقات یا مخصوص اشخاص سے متعلق ہوتے ہیں اور مخصوص وجوہ و مقاصد کے پیش نظر بیان کئے جاتے ہیں وہ نہ تو مذہب کی بنیاد بن سکتے ہیں اور نہ ان پر سے کسی قسم کی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اور نہ ان میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ عام احکام کو منسوخ کر سکیں عام احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے مخصوص احکام کو مذہب کی بنیاد قرار دیکر ان پر سے استدلال قائم کرنا علم و دیانت کی توہین ہے۔

ہم ذیل میں وہ مخصوص روایتیں درج کرتے ہیں جن پر سے علماء کو یہ گمان ہوا تھا کہ امام علیہ السلام تحصیل علم سے منع کرتے ہیں۔ روایات کی تشریح سے معلوم ہو گا کہ علماء کا گمان "إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ" ﴿الحجرات: ۱۲﴾ کا مصداق تھا۔

(۱) ایک روز میراں سید محمود تمہید پڑھ رہے تھے، حضرت میراں نے پوچھا کیا پڑھتے ہو، میراں سید محمود نے عرض کیا۔ تمہید پڑھتا ہوں۔ حضرت میراں نے فرمایا (اس کو) چھوڑو، ذکر کی کوشش کرو تا کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ تم اس کو

سمجھ سکو۔ (انصاف نامہ صفحہ ۱۳۹)

اس روایت سے کسی طرح یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ امام علیہ السلام نے تحصیل علم سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ آپکے فرزند میراں سید محمود کا تمہید پڑھنا خود مشعر ہے کہ آپ نوشت وخواند سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگر مہدویہ کے پاس تحصیل علم کی مطلق ممانعت ہوتی تو میراں سید محمود کے ہاتھ میں کتاب کہاں سے آسکتی تھی۔ امام علیہ السلام نے میراں سید محمود کو تمہید کے مطالعہ سے روکا تو اس سے افضل اور اعلیٰ چیز ذکر اللہ کی طرف رہبری فرمائی یعنی ممانعت مطلقاً نہیں تھی بلکہ ذکر اللہ کے مقابلے میں تھی۔

دوسری اہم بات امام علیہ السلام کے فرمان کا آخری جزء ''اس کو چھوڑو اور ذکر کی کوشش کرو تا کہ تم میں وہ حالت پیدا ہوجائے کہ تم اس کو سمجھ سکو'' ہے۔ اس جملے میں منع کا سبب بتلایا گیا ہے کہ اصل چیز مطالعہ کتب نہیں ہے بلکہ فہم کی صلاحیت ہے۔ اور فہم کی صلاحیت کا انحصار باطن کی کشادگی پر ہوتا ہے۔ اور باطن کی کشادگی کتب بینی سے نہیں بلکہ ذکر اللہ سے ہوتی ہے۔ پس میراں علیہ السلام کا میراں سید محمود کو تمہید کے مطالعے سے روک کر ذکر اللہ میں مشغول ہونے کی تاکید کرنا تاکہ باطن کی کشادگی کی وجہ سے مندرجات تمہید کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے تحصیل علم سے ممانعت کی حد میں کس طرح داخل ہوجائے گا۔ ایک دوسری روایت میں بھی جو اسی کا ہم معنی ہے میراں سید محمودؓ کو کوشش علم سے اس لئے روکا گیا تھا کہ آپ ذکر اللہ سے غافل نہ ہوں روایت یہ ہے۔

(۲) میراں سید محمودؓ جب کبھی ذکر کے لئے میاں ابوبکر اور میاں سید سلام اللہ کے کوچے میں جاتے تو یہ دونوں حضرات تحصیل علم کی کوشش میں مصروف رہتے۔ میراں سید محمود نے میراں علیہ السلام سے یہ بات کہی کہ یہ دونوں اس طرح کرتے ہیں۔ میراں نے فرمایا کہ تم ان کے کوچے میں مت جاؤ۔ یادِ خدا میں رہو تاکہ باطن کشادہ ہوجائے۔ (انصاف نامہ صفحہ ۱۳۹)

یہاں بھی منع مطلقاً نہیں ہے بلکہ ذکر کے مقابلے میں ہے۔ اور اس کی غایت بھی باطن کی کشادگی ہے۔

(۳) نہروالہ میں بندگی میاں شاہ نظامؓ کے ہاتھ میں کتاب میزان دیکھ کر میراں علیہ السلام نے دریافت فرمایا میاں نظام تم کیا پڑھ رہے ہو میاں نظامؓ نے فرمایا میراں جی میزان پڑھتا ہوں۔ حضرت میراںؑ نے ان کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور منع فرمایا اور کہا مت پڑھو۔ چند دن کے بعد جب ناگور پہنچے پھر میاں نظامؓ نے اپنے ہاتھ میں کتاب لی میراں علیہ السلام نے پھر منع فرمایا۔ جب میراں علیہ السلام خراسان میں تشریف فرما تھے۔ بندگی میاں شاہ نظام کے دل سے پڑھنے کی خواہش منقطع

ہو چکی تھی۔ ایک مدت کے بعد میراں علیہ السلام نے میاں نظامؓ سے فرمایا کہ کچھ علم حدیث پڑھو (یعنی چونکہ آپ کامل ہو چکے تھے اس لئے پڑھنا نقصان رساں نہیں ہو سکتا تھا۔) اس روایت سے حسبِ ذیل امور مستخرج ہوتے ہیں۔ (ا) نہروالہ میں میاں نظامؓ میزان پڑھ رہے تھے، میراں علیہ السلام نے منع فرمایا۔ (ب) پھر ناگور میں میاں نظامؓ کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو پھر آپ نے منع فرمایا (ج) خراسان پہنچنے کے ایک مدت بعد جبکہ شاہ نظامؓ کے دل سے پڑھنے کی خواہش، کامل ہونے کے سبب، منقطع ہو چکی تھی میراں علیہ السلام نے فرمایا کچھ علم حدیث پڑھو۔

اب معلوم ہوا کہ نہروالہ اور ناگور میں میاں شاہ نظام کو میزان سے صرف اسی لئے روکا گیا تھا کہ آپ علمی الجھن کا شکار ہو کر کہیں ذکر اللہ سے غافل نہ ہو جائیں۔ اس لئے کہ ان دونوں مقامات میں آپ میں پڑھنے کی ہوس تھی جس کی تکمیل کی واحد صورت یہی ہو سکتی تھی کہ آپ اس میں ہمہ تن مشغول ہو جائیں اور اس کی وجہ ذکر اللہ کا فوت ہونا امر یقینی تھا۔

لیکن جب شاہ نظامؓ خراسان پہنچے تو اب آپ میں وہ ہوس باقی نہیں رہی تھی اس لئے کہ آپ کامل ہو چکے تھے۔ اسی بناء پر امام علیہ السلام نے فرمایا کہ کچھ علم حدیث پڑھو۔ اس لئے کہ منتھی کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اسی لئے میاں دلی جی مؤلف انصاف نامہ نے روایت کے بعد "یعنی چونکہ کامل شدن خواندن زیاں ندارد" کے الفاظ سے پورے واقعہ کی تشریح کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس روایت سے بھی تحصیل علم سے مطلق ممانعت پر روشنی نہیں پڑتی۔ سالک کی صلاحیت کے پیشِ نظر کسی وقت روکا گیا اور پھر بعد کو مناسب حال اور مُفید مطلب کتب کے مطالعہ کا حکم دیا گیا۔ اس سے تحصیل علم کی مطلق ممانعت پر کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے۔

(۴) حضرت بندگی شاہ نعمت سے منقول ہے کہ آپ حضرت میراں کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے اگر اجازت ہو تو ہم کچھ پڑھ لینگے، حضرت میراںؑ نے منع کیا اور فرمایا اگر تم کچھ علم پڑھے ہوتے تو اس بندہ کو بحیثیت مہدی قبول نہ کئے ہوتے (انصاف نامہ صفحہ ۱۳۸) اس روایت میں تحصیل علم سے ممانعت عمومی نہیں بلکہ خصوصی ہے حضرت میراں علیہ السلام کے مخاطب حضرت بندگی شاہ نعمتؓ ہیں اور شاہ نعمتؓ کے مخصوص حالات، ذہنی پسِ منظر، دماغی صلاحیت کے پیش نظر امام علیہ السلام سے ملاقات اور تصدیق سے ماقبل کی زندگی پر جن لوگوں کی نظر ہے انہیں امام علیہ السلام کے اس فرمان میں کوئی "فی" نظر نہ آئیگی۔

طبیب حاذق کو یہ حق پہنچتا ہے کہ مریض کے حالات کے پیش نظر مریض کو کسی چیز سے پرہیز کرنے کا حکم دے۔

اگر چہ وہ چیز اوروں کی نظر میں کتنی ہی مُفید کیوں نہ ہو۔ استسقاء کے مریض کو اگر طبیب پانی سے روک دے تو کیا اس پر کسی قسم کا اعتراض ہو سکیگا۔ اگر کوئی چھوٹا بچہ کسی خوشنما چاقو کو ہاتھ میں لینا چاہے تو شفیق ماں باپ جو اس کی ہر آرزو کو پوری کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہیں کرتے، چاقو کو اس کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ بچہ چاقو کے صحیح استعمال سے ناواقف ہے۔ لیکن کوئی شخص ماں باپ کے اس فعل پر حرف زنی نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح علم کی حیثیت بھی ایک ہتھیار کی سی ہے۔ پس مناسب حالات، مناسب اوقات اور مناسب اشخاص کے ہاتھوں میں رہنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ بجائے اصلاح کے بگاڑ کا پہلو غالب ہو جاتا ہے یہاں بھی بعینہ یہی حالت تھی۔ یعنی باطن کی کشادگی کے بغیر علم نقصان رساں بھی ہو سکتا تھا اس لئے امام علیہ السلام نے منع فرمایا۔

خلاصہ یہ کہ یہ حکم خصوصی تھا نہ کہ عمومی، اور حکم خاص کسی طرح کسی مذہب کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

(۵) حضرت میراں علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا میرانجی اگر حکم ہو تو وقت قیلولہ ہم کچھ پڑھیں۔ حضرت میراںؑ نے فرمایا کہ اس وقت پر بھی مت پڑھو، بلکہ سو جاؤ۔

قیلولہ کے وقت کچھ پڑھنے کی اجازت طلب کرنا اس بات کا قرینہ ہے کہ شخص مذکور نے اس سے پہلے بھی امام علیہ السلام سے کچھ پڑھنے کے بارے میں اجازت طلب کی تھی اور جواب نفی میں پایا تھا، پھر شخص مذکور نے قیلولہ کے وقت کچھ پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا اس خیال سے کہ یہ وقت تو ذکر کا نہیں ہے۔ بلکہ سونے کا ہے، سونے کے اس وقت میں اگر پڑھنے کی اجازت چاہی جائے تو امام علیہ السلام کو اجازت دینے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس میں ذکر اللہ تو فوت نہیں ہوتا۔

لیکن امام علیہ السلام نے سائل سے فرمایا کہ اس وقت پر بھی مت پڑھو، اور سو جاؤ۔ اس واقعہ سے بظاہر تحصیل علم کی ممانعت پر تشدد کا اظہار ہوتا ہے اور عام آدمی یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ امام علیہ السلام تحصیل علم کے سخت ترین مخالف تھے۔ حد یہ ہے کہ قیلولہ کے وقت پر بھی کچھ پڑھنے سے آپؑ نے منع فرمایا ہے۔ حالانکہ یہ خیال ایک سطحی خیال ہے۔ اس لئے کہ اولا امام علیہ السلام تحصیل علم کے مخالف نہیں تھے۔ اور دوسرے جو لوگ آپ سے پڑھنے کی اِجازت طلب کر رہے تھے وہ سب کے سب نوشت وخواند سے اچھی طرح واقف تھے، وہ صرف کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ امام علیہ السلام نے انہیں کتب بینی سے منع فرمایا ہے اور وہ بھی ذکر اللہ کے مقابلے میں۔

رہا قیلولہ کے وقت کچھ پڑھنے سے منع کرنا اس لئے تھا کہ قیلولہ کی اصل غرض وغایت یہی ہوتی ہے کہ دن میں کچھ آرام کر لیا جائے تا کہ رات میں خدا کی عبادت دل جمعی اور اطمینان قلب کے ساتھ کی جا سکے اور نیند یا تھکن وغیرہ کا غلبہ نہ ہونے

پائے۔ اسی لئے قیلولہ کو سنت کہتے ہیں یہی وجہ تھی کہ آنحضرت قیام لیل کے لئے دن میں کچھ دیر آرام فرمایا کرتے تھے۔

رات میں خدا کا ذکر کرنے والے اگر قیلولہ کے وقت کوئی دوسرا اہم دماغی کام کرنے بیٹھ جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ رات میں وہ خدا کا ذکر سکون اور دل جمعی کے ساتھ نہ کر سکیں گے۔ دماغی تھکاوٹ اور ذہنی بوجھ کی وجہ نیند کا غلبہ زیادہ ہو جائیگا اور پھر ان سے ذکر اللہ جیسا فرض فوت ہو جائے گا۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے قیلوا فان الشیطان لا یقیل۔ قیلولہ کرو اس لئے کہ شیطان قیلولہ نہیں کرتا۔ وقت قیلولہ کام کرنے کی اجازت چاہنا دراصل وسوسۂ شیطانی تھا جسکی وجہ ذکر اللہ پر ضرب پڑتی تھی۔ اسی لئے امام علیہ السلام نے سائل سے فرمایا کہ تم اس وقت پر بھی مت پڑھو بلکہ سو جاؤ۔ مصالح کے پیش نظر مقتدا، امام یا نبی کا کوئی ایسا حکم معرض بحث میں نہیں لایا جاسکتا۔ اللہ کا خلیفہ جس شخص کے لئے جو چیز اس کے حال کی مناسبت سے تجویز کرتا ہے۔ اسی میں اس کی بہتری پوشیدہ رہتی ہے۔ اسی قبیل کا ایک حکم مندرجۂ ذیل حدیث میں مذکور ہے۔ عن ابن عمرو قال اتي النبي ﷺ رجل يريد الجهاد فقال احي والداك قال نعم قال ففيهما فجاهد۔ ترجمہ: ابن عمر سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ کے پاس ایک شخص جہاد کی نیت سے آیا۔ آپ نے فرمایا کیا تیرے والدین زندہ ہیں اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا ان دونوں کی خدمت میں ہی جہاد کر۔ (مسند ابو حنیفہ صفحہ ۱۲۷)

کیا اس روایت پر سے کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت نے جہاد سے منع فرمایا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو تو صاف الفاظ میں ﴿حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ﴾ ﴿الأنفال: ٦٥﴾ (مومنوں کو لڑائی کی ترغیب دو) کا حکم دیا گیا تھا۔ کیا آپ کا مندرجہ بالا عمل حکم خداوندی کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ نہیں۔ پھر آپ نے جہاد جیسے عظیم ترین فرض سے منع کیوں فرمایا۔ اسکا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ اسوقت پر اس شخص کیلئے والدین کی خدمت ہی اہم تھی جس کو وہ ایک معمولی چیز اور جہاد کو ایک بڑی چیز سمجھ رہا تھا اور آنحضرتؐ کا منشا یہ نکتہ ذہن نشین کرنا تھا کہ ماں باپ کی خدمت بھی بہت بڑی چیز ہے اس سے کسی طرح یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ جہاد والدین کی خدمت سے کم ہے یا آں حضرت ﷺ نے جہاد سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح امام علیہ السلام نے تحصیل علم بلکہ صاف الفاظ میں مطالعہ کتب سے جو منع فرمایا ہے وہ ایک تو مطلقاً نہیں تھا اور دُوسرے اگر روکا بھی تو ان کو جو پڑھے لکھے تھے اور وہ بھی ذکر اللہ کے مقابلے میں۔ جب ماں باپ کی خدمت کی اہمیت ذہن نشین کرنے کی خاطر آنحضرت ﷺ کا ایک شخص کو جہاد جیسی عظیم ترین عبادت سے روکنا مورِدِ الزام نہیں بن سکتا تو اللہ کے جملہ فرائض میں اہم ترین اور ہمہ وقتی فرض ذکر اللہ کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر امام علیہ السلام کا چند اصحاب کو مطالعہ کتب سے روکنا کس طرح مورِدِ الزام ہو جائے گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

علم کے بارے میں مہدویہ کا مسلک معلوم ہونے کے بعد امام علیہ السلام کا جواب ملاحظہ ہو، جواب تین باتوں پر مشتمل ہے۔

(۱) آپ نے فرمایا بندہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے والا ہے جو کچھ محمد رسول اللہ ﷺ نے منع نہیں فرمایا بندہ کیسے منع کر سکتا ہے۔ اس سے یہ کہنا مقصود تھا کہ تحصیل علم کے آپ مخالف نہیں ہیں، اور اس بارے میں جو الزام آپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ محض بے بنیاد ہے۔

(۲) بندہ امر حق اور حکم کتاب خدا سے اللہ کے ذکر دوام کو فرض کہتا ہے اس جملے سے یہ کہنا مقصود تھا کہ اگر تم نے میرے کسی جملے یا کسی عبارت سے تحصیل علم کی مطلق ممانعت مراد لی ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر میں روکا بھی ہوں تو ذکر دوام کی وجہ سے، جو کہ بحکم باری اور بحکم کتاب خدا فرض ہے

(۳) جو چیز اللہ کے ذکر سے مانع ہے وہ ممنوع ہے۔ کیا علم پڑھنا اور کیا کسب کرنا اور کیا مخلوق سے دوستی رکھنا، کیا کھانا کیا سونا، غفلت حرام ہے، جو موجبِ غفلت ہے وہ بھی حرام ہے۔

امام علیہ السلام کے جواب کا یہ حصّہ قابلِ غور ہے۔ اس لئے کہ امام علیہ السلام نے کسی خاص شئ یا مخصوص اشیاء کو حرام قرار نہیں دیا۔ بلکہ یہ اصولی کلیہ پیش فرمایا کہ ذکر اللہ ازروئے قرآن فرض ہے پس جو مانع ذکر ہے وہ ممنوع ہے۔ دُوسرے لفظوں میں حرمت کا سبب مخصوص افعال نہیں بلکہ ان میں مشغولیت کی وہ حد جو مانع ذکر بن جاتی ہے وہ ممنوع ہے اور حرام ہے مثال کے طور پر آپ نے کسب، علم، مخلوق سے دوستی، کھانا سونا وغیرہ افعال کا ذکر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب افعال درست اور جائز ہیں لیکن ان میں اس درجہ مشغولیت کہ ذکر اللہ متروک ہو جائے حرام قرار پاتی ہے اور جو چیز غفلت کا موجب ہوتی ہے اس پر بھی ازروئے قاعدہ حرمت کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ علم، کسب، مخلوق سے دوستی کھانا اور سونا وغیرہ افعال جب تک مانع ذکر اور موجب غفلت نہیں بنتے اس وقت تک وہ جائز رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ منع کی حد کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ حرام ہو جاتے ہیں۔

اصولیین کا یہ ضابطہ بھی مسلمہ ہے کہ کوئی شئ فی نفسہ نہ حسن ہے نہ قبیح، شی میں حسن، قبح یا حلت وحرمت کا حکم اسکے متعلقات پر سے لگایا جاتا ہے پس یہاں بھی مطلق علم، کسب، مخلوق سے دوستی کھانا سونا وغیرہ افعال ممنوع نہیں ہیں۔ ان پر ممانعت کا حکم ان کے متعلقات کی وجہ لگایا جاتا ہے اور وہ متعلق ذکر اللہ سے مانع ہوتا ہے یعنی دوسرے لفظوں میں جو علم اور کسب مانع ذکر ہے وہ ممنوع ہوا مطلق علم اور مطلق کسب وغیرہ ممنوع نہ ہوں گے۔

انسان کی پیدائش کا اصل مقصد خدا شناسی اور خدارسی ہے پس انسان کو وہ علم حاصل کرنا چاہیئے جو اسے خدا سے قریب کرتا ہو اور اس حد تک کرنا چاہیئے جب تک کہ وہ ذکر کا مانع اور غفلت کا موجب نہ ہو۔ ورنہ وہ علم أَلعِلْمُ حِجَابُ اللهِ الأَكْبَرُ کا مصداق بن جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ جب علم کی تعریف میں حِجَابُ اللهِ الأَكْبَرُ کہنا موردِ اعتراض نہیں رہا تو ایسے علم کی تحصیل سے ممانعت کس طرح موردالزام بن جائیگی، جو مانع ذکر اللہ اور موجب غفلت ہو۔

روایت ہے کہ ملک معروف اور میاں نظام غالب دونوں امام علیہ السلام کی خدمت میں کچھ کتابی علم حاصل کرنے کے لئے اجازت طلب کرنے کی غرض سے آئے، آپ نے بلا استفسار یہ بیتیں پڑھیں۔

علمی بطلب کہ باتو ماند	ایسا علم طلب کر جو تیرے ساتھ رہے
آن دم کہ ترا ز تو رہاند	اور وہ دم (بھی) جو تجھے تجھ سے رہائی دلائے
تا علم فریضہ رانخوانی	تو جب تک علم فریضہ نہ سیکھے گا۔
تحقیق صفات حق ندانی	حق کے صفات کی تحقیق نہ جانے گا۔

ان ابیات میں تحصیل علم کی ممانعت کے بجائے جذبۂ تحصیل علم کی اصلاح کا پہلو غالب ہے۔ یہاں نہ صرف یہ بتلایا جارہا ہے کہ کونسا علم ضروری ہے بلکہ اس امر کی بھی تاکید کی جارہی ہے کہ علم کے ساتھ ذکر اللہ بھی بہت ضروری ہے تاکہ انسان حاصل کردہ علم سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرسکے اور مہلکات سے خود کو بچاسکے۔

مہدویہ پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں قرآن پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ حالانکہ یہ بے بنیاد الزام ہے جسکی تشریح حسبِ ذیل ہے۔ نقل ہے کہ کھانبیل میں ملک بخن نے شاہ خوندمیرؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ فلاں شخص قرآن بہت پڑھتا ہے۔ کیا پڑھنے سے فائدہ ہوتا ہے؟ بندگی میاں نے فرمایا اگر قرآن کو اسطرح پڑھیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے تب بھی بندے اور خدا کے درمیان نور کا پردہ حائل ہوجاتا ہے۔ اور خدا کی یاد سے وہ پردہ بھی پھٹ جاتا ہے۔ اس روایت پر سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مہدویہ کے پاس علم پڑھنا تو کجا قرآن خوانی کی بھی ممانعت ہے۔ حالانکہ یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ اس لئے کہ امام علیہ السلام کا دعوی ہی " مذہب ما کتاب اللہ و اتباع محمد رسول ﷺ تھا۔ جس کا مذہب ہی کتاب اللہ ہو وہ قرآن پڑھنے سے کس طرح منع کرسکتا ہے۔ دُوسرے یہ کہ امامنا علیہ السلام نے قرآن کو عشق نامہ فرمایا ہے تاکہ لوگ قرآن کی طرف توجہ، انہماک بلکہ محبت کے ساتھ مائل ہوسکیں۔

تیسرے یہ کہ امام علیہ السلام کی تبلیغ مذہب واقامت دین کا واحد ذریعہ بیان کلام اللہ تھا۔ چناچہ آپؑ نے سوائے

قرآن کے کسی اور کتاب اللہ کا بیان کسی وقت نہیں کیا۔ ان حقائق کی موجودگی میں یہ دعویٰ کہ مہدویہ کے پاس قرآن پڑھنا ممنوع ہے، بے بنیاد ہے، مندرجہ بالا نقل سے بھی قرآن کی تلاوت کی ممانعت پر کسی طرح استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ روایت سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملک بخن نے حضرت بندگی شاہ خوندمیرؓ کی خدمت میں ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے جو قرآن زیادہ پڑھتا ہے یہ پوچھا کہ کیا پڑھنے سے کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے؟ سوال کی نوعیت کے پیش نظر ہر شخص کا ذہن اسی جانب متبادر ہوتا ہے کہ سائل کا مقصد یہ پوچھنا تھا کہ کیا محض پڑھنے سے (یعنی بلا فہم معنی) انسان کو کچھ فائدہ حاصل ہوتا ہے (ورنہ معنی اور مطلب سمجھ کر پڑھنے سے متعلق سوال کرنے کی ہی کیا ضرورت تھی۔ اس کا فائدہ تو یقینیات سے ہے) ظاہر ہے کہ کوئی متدین عالم ہرگز یہ جواب نہ دے گا کہ ہاں قرآن کی بے فہم معنی تلاوت انسان کے لئے مفید ہے۔ قرآن دستور حیات ہے۔ وہ پڑھا بھی جاتا ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے معانی و مطالب کی روشنی میں راہِ عمل کو متعین کر سکیں۔ ایسی تلاوت البتہ سودمند ہوگی لیکن اگر کوئی معنی و مطلب کو سمجھے بغیر صبح سے شام تک صرف قرآن پڑھتا رہے لیکن اس کے ایک لفظ کا معنی بھی اُسے معلوم نہ ہو تو کیا ایسی تلاوت بھی اس کے حق میں سودمند ہوجائیگی۔ نقل کے الفاظ ''فلان شخص بسیار قرآن میخواند، چیزے از خواندن فائدہ می شود'' سے دراصل یہی بات دریافت کرنا تھی۔ یعنی محض تلاوتِ قرآن بلا فہم معنی' یا محض تلاوت با فہم معنی لیکن بلا عمل۔ کا کیا حکم ہے۔

صورت مسئول عنہا کی نزاکت اور نوعیت کے پیش نظر حضرت شاہ خوندمیرؓ کا جواب اگر قرآن کی تلاوت (محض) اس طرح کی جائے جیسا کہ اس کا حق ہے تب بھی خدا اور بندے کے درمیان نور کا پردہ حائل ہوجاتا ہے'' قرآن پڑھنے سے ممانعت پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ محض تلاوت قرآن سے قرب خداوندی اور لقاء رب جیسے اہم مقاصد انسان کو حاصل ہو نہیں سکتے۔ چنانچہ اس کے بعد جواب کا یہ حصہ ''یاد خدا سے وہ پردہ بھی پھٹ جاتا ہے۔ اسی نکتہ کی تشریح اور ذکر اللہ کی اہمیت کو متضمن ہے۔ چونکہ قرآن کے الفاظ کا خالق بھی خدائے تعالیٰ ہے اس لئے الفاظ کی بھی حرمت کا لحاظ کرتے ہوئے شاہ خوندمیر نے ''پردۂ نور'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

بخلاف دیگر کتابوں کے مطالعے کیلئے ''سیاہی دیکھنے'' کے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ جیسا کہ راویت ہے کہ ''جو شخص زیادہ سیاہی دیکھتا ہے وہ زیادہ خوار ہوتا ہے''۔

اس روایت کے معنی بھی یہی ہیں کہ جذبۂ عمل سے صرف نظر کرتے ہوئے محض کتب بینی کا مشغلہ انسان میں جدلی قوت عطا کرتا اور عجب و کبر کے اوصاف پیدا کرتا ہے اور عجب و کبر رسوائی اور خواری کے باعث ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر نقل

کے معنی یہ ہوئے کہ "جو شخص (معرفت حق کے جذبہ کے قطع نظر) زیادہ سیاہی دیکھتا ہے (محض کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے) (اس میں عجب پیدا ہوتا ہے اور اس عجب کی وجہ وہ) خوار ہوتا ہے۔ تحصیل علم ہو کہ قرآن خوانی اگر معرفت حق کے جذبہ کے ساتھ ہو (جس کا اظہار ذکر اللہ سے ہوتا ہے) تو البتہ وہ مفید مطلب ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ معرفت حق کے جذبے کے بغیر اگر کتابوں کا مطالعہ ہو تو ایسا انسان ذلیل وخوار ہو گا، اور اگر اس جذبہ کے بغیر قرآن خوانی ہو تو خدا اور بندے کے درمیان نور کا پردہ حائل رہے گا۔ پس یہ نقل شریف بھی کسی طرح مورد اعتراض نہیں ہو سکتی۔

حضرت بندگی شاہ خوندمیرؓ نے علم کے بارے میں مہدوی مسلک کی جو توضیح فرمائی ہے وہ اس باب میں قول فیصل ہے آپ نے اپنی گرانقدر تالیف "المعیار و بعض الآیات" میں تحریر فرمایا ہے۔

"چنانچہ مخالفوں میں سے ایک مخالف کہتا ہے کہ سید محمد (مہدی موعود) کے اصحاب تمام کتابوں کے منکر ہیں اور قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور کسب کو حرام جانتے ہیں اور پورا کلمہ نہیں پڑھتے اور ان میں سے ہر ایک خدا کے دیدار کا دعوی کرتا ہے اور ناک کو خدا کے ذکر کا آلہ بنایا ہے۔ ان تمام باتوں کو انہوں نے سید محمد کے صحابہ کی طرف جو منسوب کیا ہے محض جھوٹ ہے۔ کیوں کہ صحابہ حق کے طالب ہیں۔ اور حق کی طلب کیلئے تمام کتابوں کا مُطالعہ کرتے ہیں، جو بات کہ کتاب خدا اور احادیث رسول کے موافق ان کتابوں میں پاتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں (صفحہ ۲۲)

نیز امام علیہ السلام نے جہاں بعض کتابوں کے مطالعہ سے منع کیا ہے وہیں مبتدیوں اور منتہیوں کی استعداد کے پیشِ نظر ایک نصاب تجویز فرما کر بعض کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دی ہے جو حق کی طلب کی راہ میں معاون ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ فرمایا "اگر ہمارے لوگ کتابیں پڑھیں تو مبتدی کو چاہئے کہ شیخ نور کی کتاب انیس الغرباء اور شیخ شمس الدین کا رَسالہ مرغوب القلوب پڑھے اور منتھی کو چاہئے کہ سادات حسینی کا کلام زاد المسافرین اور نزہتہ الارواح پڑھے" (شواہد صفحہ ۱۵۷)

گیارھواں سوال - تلاش مرشد کامل

سوال علماء۔ آپ کے لوگ بے ادبی کرتے ہیں، استادوں اور پیروں سے پھر گئے ہیں۔ بلکہ ان سے بیزار ہو گئے ہیں اور ان پر عیب لگاتے ہیں۔ (مولود صفحہ ۹۱، ۹۲)

جواب اِمام علیہ السلام۔ شاید تم مسئلہ شرعی بھول گئے۔ شرع میں کیوں کر ہے اگر کوئی شخص اپنی لڑکی عنین کے عقد میں دیدے اسکے عنین ہونے کا حال چند روز پوشیدہ رہا۔ کچھ مدت کے بعد تحقیق ہوئی کہ وہ عنین ہے تو شرع میں جدائی کرتے ہیں یا نہیں اور جو سامان کہ بے عیب ہونے کے گمان سے خریدتے ہیں اگر عیب شرعی ظاہر ہو جائے تو واپس دیتے ہیں یا

نہیں۔ دین کا مقصود دنیا کے مقصود سے بھی بہت کم ہو گیا۔ حاصل ہو یا نہ ہو تعلق نہیں توڑنا چاہئے اور بیزار نہیں ہونا چاہئے اور دین کا مقصود دوسری جگہ سے طلب نہیں کرنا چاہئے کیا اچھی ہے دین کی طلب؟، کیا اچھی ہے خدا کے دیدار کی طلب؟، کیا اچھی ہے آخرت کی طلب؟ کہ دنیوی مقصود کی طلب میں علحدگی اور بیزاری کو روا رکھتے ہیں اور دین کے مقصود حاصل ہونے میں روا نہیں رکھتے۔(مولود صفحہ ۹۱، ۹۲، شواہد) اس سوال کو بھی امر مہدیت کی تحقیق سے دور کی بھی نسبت نہیں تھی۔ اسکے باوجود اس طرح کا سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ امامنا علیہ السلام بیان قرآن کے ذریعہ ''مراد اللہ'' فرمارہے تھے اور دورِ اول کے اسلام کو پیش فرمارہے تھے۔ جسکی وجہ دور دور تک آپ ہی کے چرچے تھے ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی آپ کے متعلق احوال داخبار پہنچ جاتے تھے اور لوگ بے تابی کے ساتھ آپ کے منتظر رہتے تھے بیان قرآن سننے کیلئے دور دراز سے لوگ اس کثرت کے ساتھ آتے تھے کہ بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ دیواروں اور درختوں پر چڑھ کر لوگ بیان قرآن سنتے تھے۔ بیان کی جاذبیت سب کو مخمور کر دیتی تھی اس لئے کہ یہاں ایسی باتیں سنائی جاتی تھیں جن کا ان کے کانوں پر کبھی گذر بھی نہیں ہوا تھا اور جب دینی معلومات سے مالامال اور شراب مذہب حق سے سرشار ہو کر اپنے اپنے مقامات کو واپس ہوتے اور وہاں اپنے اپنے مرشدوں یا عالموں کا تصور کرتے تو ان کا دل کہتا کہ اصل مذہب وہی ہے جسے امام علیہ السلام نے بیان کیا تھا نہ کہ وہ جسے آج تک ہم اپنے علماء اور مرشدین سے سنتے آئے ہیں۔ نتیجتاً مذہب کے ان نام نہاد عالموں اور بھٹکانے والے مرشدوں سے نفرت پیدا ہو جاتی۔ اب ان کی صورتیں انہیں مکروہ معلوم ہونے لگتیں وہ یہ سمجھتے کہ یہ شیاطین ہیں جو رہبروں اور مرشدوں کا بھیس بدل کر ان کے دین و مذہب کو غارت کر رہے ہیں جبہ اور عمامہ کے اندر انہیں خون کے پیاسے بھیڑئے نظر آتے۔

ان حالات کے تحت سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ امام علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ آفتاب ولایت کے طلوع ہونے کے بعد ٹمٹماتی بتیوں کو بجھ جانا چاہئے تھا، سو وہ بجھ گئیں اس پر احتجاج کیا معنی؟؟

امام علیہ السلام نے اگر مکر و فریب کے ذریعہ یا انہیں ورغلا کر یا انہیں تحریص دلا کر یا ترہیب و ترغیب کے ہتھکنڈوں کے ذریعہ لوگوں کو اپنے حلقے میں داخل فرماتے تو البتہ یہ بات قابل اعتراض تھی۔ حالانکہ بات ایسی نہیں تھی، اور علماء خود اس کے قائل تھے۔ چنانچہ ان کے سوال ''آپ کے لوگ بے ادبی کرتے ہیں۔ استادوں اور پیروں سے پھر گئے ہیں بلکہ ان سے بیزار ہو گئے ہیں اور ان پر عیب لگاتے ہیں'' سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان دنیا پرست علماء اور گمراہ مشائخین سے بیزار ہو گئے تھے۔

لوگ اپنے استادوں اور مرشدوں سے کیوں بیزار ہو گئے تھے اس کا صحیح جواب تو انہیں لوگوں سے حاصل کرنا چاہئے تھا۔ بجائے اس کے علماء نے اس سوال کا جواب امام علیہ السلام سے حاصل کرنا چاہا۔ حیرت ہے کہ لوگوں کے کسی فعل سے متعلق توضیح امام علیہ السلام سے حاصل کیجارہی ہے۔

اس کا اصولی جواب تو یہی تھا کہ لوگوں کے فعل سے متعلق مجھ سے کیوں دریافت کیا جارہا ہے۔ جاؤ اور خود ان سے پوچھ لو کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ غالباً اسی لئے علماء نے ''آپ کے لوگ'' بے ادبی کرتے ہیں سے سوال شروع کیا تاکہ یہ کہا جائے کہ ایسا کرنے والے آپ کے لوگ ہیں، اور آپ ان کے امام ہیں۔

حالانکہ امام علیہ السلام جونپور میں پیدا ہوئے تھے۔ تبلیغ دین کی خاطر آپ دیگر مقامات کو تشریف بھی لے گئے تو ایک اجنبی کی حیثیت سے ایسی صورت میں مختلف مقامات کے لوگ ''آپ کے لوگ'' کس طرح ہو جائیں گے، ہاں یہ لوگ امام کے اسوقت ہوئے جب انہوں نے مذہب کی سچی تعلیمات کو آپ کی زبان مبارک سے سُننے کے بعد معرفت حق کے جذبہ کے تحت ناکارہ اور ٹیڑھے راستوں کو چھوڑ کر صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے والے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ایسی صورت میں بھی پہلے انہوں نے اپنے مرشدوں کو چھوڑا اور بعد میں امام کے ہوئے۔

بہر کیف علماء اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑرہے تھے لیکن امام علیہ السلام نے جواب دینے کی اس لئے زحمت گوارا فرمائی تاکہ اعتقادات باطلہ کی نفی ہو جائے اور مذہب کے صحیح اصول اچھی طرح اجاگر ہو جائیں۔ عام طور پر یہی مشہور تھا اور۔ آج بھی ہے۔ کہ ایک مرتبہ کسی ایک مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دیدینے کے بعد پیر کے مرنے تک کسی دُوسرے پیر کی طرف ہاتھ دراز کرنا تو کجا آنکھ بھی اُٹھا کر نہیں دیکھنا چاہئے۔ عوام اس غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کا شکار تھے جس کی وجہ وہ اپنے آبائی مرشدین کی اولاد کو ہی خواہ وہ کتنی ہی ناقص، جاہل، مذہب سے بے بہرہ آوارہ بدچلن اور عیش کی دلدادہ سہی، اپنا مرشد ماننے پر مجبور تھے۔ مرشد کے حین حیات مرشد کے بدلنے کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ گجرات کی ایک مثل ''باپ کا بدلنا اور مرشد کا بدلنا ایک ہے'' اس غلط اور گمراہ کن اعتقاد کی پوری پوری عکاسی کرنے کیلئے کافی ہے اس سوال سے علماء کا مقصد یہ تھا کہ عوام مرشدوں کے چھوڑنے اور ان سے بیزار ہونے کو بے ادبی سمجھیں اور آئندہ اس قسم کے فعل سے احتراز کریں۔

اس کے جواب میں امام علیہ السلام نے اِن سے دریافت فرمایا کہ ایک شخص نے اپنی لڑکی کا عقد کسی مستوارلحال شخص سے کر دیا۔ چند دن کے بعد تحقیق ہو کہ وہ عنین ہے۔ کیا شریعت میں لڑکی کو اس سے جدا نہیں کرتے، اسی طرح کسی دکان سے

کوئی سَامان عیب سے بری سمجھ کر لایا جاتا ہے جب عیب شرعی پر اطلاع ہوتی ہے تو کیا اُسے واپس نہیں کیا جاتا۔ کیا یہ افعال شریعت کے خلاف سمجھے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ نہیں، بلکہ شریعت نے ان حالات میں فسخ نکاح اور فسخ بیع کے احکام دئے ہیں۔ اس لئے کہ جن مقاصد کے پیش نظر یہ معالے کئے گئے تھے جب وہ مفقود ہو جائیں تو ایسے معاملوں کو بھی فسخ کر دینا چاہیئے۔ اصل مقصد صرف نکاح یا بیع وہ شراء نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو وہ ذرائع ہیں جن سے مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور جب مقاصد فوت ہو جائیں تو لازماً ایسے معالے بھی فسخ کر دئے جاتے ہیں بالکل اسی طرح حق کا راستہ معلوم کرنے، دین حق کے احکام سے واقفیت حاصل کرنے، اصلاح نفس اور تزکیہ قلب کے وسَائل تلاش کرنے اور اوامر و نواہی سے آگاہ ہو کر قرب خداوندی اور لقاءِ رب جیسے اہم ترین مقاصد کے حصول کے پیشِ نظر کسی مرشد یا پیر کے ہاتھ پر بیعت کی جاتی ہے اور جب اس ذریعہ سے وہ مقاصد حاصل ہوتے دکھائی نہ دیں تو اصولاً کیا کاروائی کیجائیگی۔ ظاہر ہے کہ جب معمولی دنیوی امور میں فسخ معاملہ کا حکم دیا جاتا ہے تو دین کے اس اہم کام میں بھی اسی ضابطہ پر عمل ہونا چاہیئے اس لئے کہ اصل مقصد بیعت یا مرشد نہیں ہے۔ بلکہ مرشد کے ذریعہ قرب خداوندی ہے اور جب یہ مقصد حاصل نہ ہو تو یہ سمجھا جائیگا کہ یہ ذریعہ موصل الی المطلوب نہیں ہے۔ اسکو چھوڑ کر دُوسرا ذریعہ اختیار کرنا چاہیئے جو موصل الی المطلوب ہو۔ آخر اسمیں برائی کی کیا بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مطلب پرستی اور دُنیا سَازی کے جذبات انسان سے فکر و نظر کا سَرمایہ چھین کر اندھیروں میں بھٹکنے کیلئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ورنہ کیا بات ہے کہ نکاح و بیع میں عدم حصول مقصد کی وجہ فسخ معاملہ کا فتویٰ دیا جاتا ہے لیکن دین کے اہم کام میں اگر مقصد بر آری نہ ہو تو اس ناقص ذریعہ کو کیوں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اسی لئے امام علیہ السلام نے فرمایا کیا دین کا کام دنیا کے کام سے بھی گیا گزرا ہے۔ کیا اسی کا نام خدا کی طلب ہے۔ کیا اسی کو آخرت کی محبت کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ از کار رفتہ اور ناکارہ مرشدین کو چھوڑ کر مرشد کامل کے ہاتھ پر بیعت کرنا بے ادبی نہیں بلکہ عین دین ہے۔ اور مقصد کو حاصل نہ ہوتا دیکھ کر بھی ان سے ہی لگے بندھے رہنا نہ صرف بے دینی اور جہالت ہے بلکہ کفار کی تقلید ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت توحید و رسالت پر کفار کا سخت ترین اعتراض بھی یہی تھا "أَ نَتْرُكُ اٰلِهَتَنَا"۔ کیا ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔

وہاں تو آنحضرت ﷺ معبودان باطلہ کی برائی بیان کرتے تھے۔ اور یہاں خود ان کے ماننے والے ان سے بیزار تھے۔ پس علماء کا یہ اعتراض کفار کے اعتراض بد سے بھی بدرجہا بدتر تھا۔

بارھواں سوال - مذہب مہدی

سوال علماء: آپ سے بحث کیسے کرسکتے ہیں کیوں کہ آپ مقید مذہب نہیں رکھتے آپ جو کچھ کہتے ہیں مطلق قرآن سے

کہتے ہیں اور ہم قرآن سمجھ نہیں سکتے۔ اور ہم امام اعظم کا مقید مذہب رکھتے ہیں۔

جواب امام علیہ السلام: ہاں میں کسی مذہب کا مقید نہیں ہوں۔ ہمارا مذہب اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی پیروی ہے۔ تم مقید مذہب پر ہی قائم رہو اور کہو کہ جو شخص امام اعظم کے مذہب سے باہر ہو جائے اور مذہب کے خلاف عمل کرے تو اس کا حکم کیا ہے نادان مذہب کے معنی کیا جانتے ہیں۔ مذہب کے معنی امام اعظم کا عمل ہے نہ کہ قول اور پیغمبر کی سنت پیغمبر کا عمل ہے نہ کہ پیغمبر کی گفتار۔ تمام شرعی معاملات جو کتب فقہ میں لکھے گئے ہیں پیغمبر کی گفتار ہے نہ کہ پیغمبر کا عمل، امام اعظم کا مذہب امام کا عمل ہے جو مشہور ہے۔ (مولود صفحہ ۹۲، شواہد صفحہ ۱۸۱) علماء اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ مہدی موعود کی شان میں آں حضرت نے یقفو اثری ولا یخطی فرمایا ہے۔ علماء اصولیین کے ضابطے المجتہد قد یصیب وقد یخطیی سے بھی باخبر تھے اور نتیجتاً یہ نکتہ بھی ان کے ذہن میں تھا کہ مہدی موعود ائمہ اور مجتہدین کے اقوال کے پابند نہیں ہونگے۔ بالفاظ دیگر علماء مرتبہ مہدی سے واقف تھے۔ اس کے باوجود انجان بن کر سوال کئے تھے۔ اس خیال سے کہ اگر آپ حقیقی مہدی نہ ہونگے تو دھوکہ کھا جائیں گے۔

چونکہ آپ ہی مہدی موعود تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ ہاں میں کسی مذہب کا مقید نہیں ہوں۔ میرا مذہب کتاب اللہ اور اتباع محمد رسول اللہ ہے۔ مہدی موعود خلیفتہ اللہ اور داعی الی اللہ ہونے کے اعتبار سے ان کا ہر فعل حکم خدا اور حکم کتاب خدا اور روح رسول اللہ سے دریافت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور وہ معصوم عن الخطا بھی ہیں پس ایسی صورت میں مہدی موعود ائمہ اور مجتہدین کی پیروی کیسے کر سکتے ہیں۔ جن کے احکام اور فیصلے خطا اور صواب دونوں کے محتمل رہتے ہیں۔ مہدی موعود کے بارے میں تو یہ کہا گیا ہے کہ مجتہدین کے مختلف فیہ اقوال میں وہی قول حق ہے جو امام مہدی کے قول اور فعل کے مُطابق ہے اور امام مہدی کی بعثت کے منجملہ متعدد اغراض یہ بھی ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے ائمہ کے باہمی اختلافات رفع ہو جائیں اور وہ راستہ متعین ہو جائے جو مراد اللہ ہے اسی لئے آپ نے فرمایا کہ ہاں میں کسی مذہب کا مقید نہیں ہوں۔ پھر اس ذہنی اور ضمنی سوال کے جواب میں کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرا مذہب کتاب اللہ اور اتباع محمد رسول اللہ ہے۔

چونکہ اس وقت دُنیائے اسلام چار بڑے بڑے مذہبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کوئی حنفی کہلاتا تو کوئی شافعی کوئی مالک کو اپنا امام مانتا تو کوئی احمد بن حنبل کی پیروی کرتا۔ اب اگر امام مہدی موعود بھی ان چاروں اماموں میں سے کسی ایک کی پیروی کرتے تو آپ بھی اسی گروہ سے گنے جاتے اور دُوسرے گروہوں یا مذہب والوں پر آپ کی تعلیمات کا بلکہ آپؑ کے دعویٰ کا اثر نہ ہوتا۔ وہ صاف طور پر یہ کہدیتے کہ آپ فلاں امام کے پیرو ہیں۔ اور ہم فلاں امام کے۔ اگر آپ ہمارے امام کے تابع ہوتے تو ہمیں

آپ کی اتباع کرنے میں عذر نہ ہوتا۔ یہ بات ایسی ہی ہے جیسے آنحضرت ﷺ کے یہودی یا نصرانی ہونے کے خیالات کی تردید ماکان یھودیا ولا نصرانیا کے ذریعہ کی گئی تھی۔ اس لئے اگر آپ خود کو یہودی کہتے تو یہودی آپ پر ایمان لاتے مگر عیسائیوں کو اعتراض پیدا ہوتا اور اگر عیسائی ہوتے تو یہ بات یہودیوں کیلئے قابلِ تسلیم نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ صاف الفاظ میں آپ کا مذہبی موقف بیان کر دیا گیا کہ نہ تو آپ یہودی ہیں اور نہ نصرانی بلکہ آپ تو ملت ابراہیمی کے پیرو ہیں۔

اور جس طرح یہودیت اور نصرانیت میں موجود سختیوں اور پابندیوں کو رفع کرنے کیلئے آنحضرت تشریف لائے تھے بالکل اسی طرح مجتہدین اُمت کے آپسی اختلافت کو رفع کرنا امام مہدی کا منصب تھا اور جس طرح موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کی نبوت کو برحق اور انکو عطا کردہ کتابوں کی تصدیق و توثیق آنحضرت نے فرمائی تھی بالکل اسی طرح ان چاروں ائمہ کے اجتھاد اور دینی کوششوں کو بھی اِمام مہدی نے سراہا اور ان میں کسی ایک کی بھی تغلیط نہیں فرمائی۔ چنانچہ صوم وصلاۃ کے متعلق جب آپ سے استفسار کیا جانے لگا تو آپ نے فرمادیا کہ بھائیوں نے موشگافی کی ہے۔ ان میں سے جو مسٔلہ عزیمت اور عالیت کا پہلو لئے ہوئے ہے اس کو اختیار کرلو۔ یہ حکم تو عوام کیلئے تھا۔ لیکن امام مہدی کا مذہب کتاب اللہ اور اتباع رسول اللہ تھا۔ اس لئے کہ نہ تو عوام راست خدا اور روح رسول سے احکام حاصل کرسکتے ہیں اور نہ مہدی معصوم عن الخطاء، ائمہ مجتہدین کی اقتدا کرسکتا ہے۔

مہدی موعود اس دین کو کامل کرنے کے لئے تشریف لائے تھے جس کی ابتداء آنحضرتؐ نے کی تھی اس لحاظ سے بھی آپ کی دعوت کو عام ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ مخصوص بنیادوں پر کئے جانے والی دعوت مخصوص گروہوں میں تو موثر ہوسکتی ہے لیکن دیگر مکاتب خیال میں اس کا گذر مشکل سے ہوسکتا ہے بخلاف اس کے جو دعوت عام بنیادوں پر کی جاتی ہے وہ سب کے لئے یکساں طور پر قابل قبول اور لائق توجہ ہوتی ہے۔ مذاہب میں بٹی ہوئی دُنیا کو اختلافی سطح سے نکال کر ایک ایسے نقطہ پر لانا جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے اماموں کے لئے بھی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس مرکز کی طرف لوگوں کو دعوت دینا آپ کا منصب بھی تھا اور وقت کا اہم ترین تقاضا بھی اور وہ مرکز کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ تھا جہاں سے مختلف اختلافی خطوط چلے تھے۔ اسی لئے آپ نے کتاب اللہ اور اتباعِ محمد رسول اللہ کو اپنا مذہب قرار دیا تاکہ ائمہ مجتہدین کے اختلافی مسائل سے لوگوں کی نظریں بلند ہوکر ان مراکز تک پہنچ جائیں جہاں سے کہ اختلافی خطوط نکلے تھے تاکہ ایک طرف تو انہیں ان اختلافی خطوط کی حقیقت بھی معلوم ہوجائے تو دوسری طرف ان مختلف خطوط میں سے صحیح ترین خط کا بھی علم ہوجائے۔ چونکہ علماء نے یہ کہا تھا کہ وہ امام اعظم کا مقید مذہب رکھتے ہیں اسلئے امام علیہ السلام نے فرمایا تم مذہب مقید پر ہی قائم رہو اور کہو کہ جو شخص امام کے مذہب کے خلاف عمل کرے اور اس سے باہر ہوجائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ مطلب یہ کہ پہلے تم مذہب کے معنی ہی نہیں

جانتے پھر تمہیں یہ خبر ہی نہیں کہ امام کا مذہب کیا ہے۔ تم جس کی اتباع کرتے ہو وہ امام کا مذہب نہیں ہے۔ اس لئے کہ تم تو امام کے قول اور گفتار کی اتباع کرتے ہو امام کے عمل کی نہیں۔ پھر تمہارا یہ دعویٰ کہ تم مذہب مقید پر ہو صحیح نہیں ہے اِس کے بعد امام علیہ السلام نے مذہب اور سنت کی تشریح فرمائی کہ امام اعظم کا مذہب دراصل امام صاحب کا عمل ہے نہ کہ امام کا قول اسی طرح پیغمبر کی سنت پیغمبر کا عمل ہے نہ کہ قول۔ امام علیہ السلام کے یہ الفاظ اس حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ مذہب اور سُنت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں نے مذہب اور سُنت کو اقوال سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ اقوال کی اتباع کو مذہب امام، سُنت رَسول کا نام دینا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ قول کئی چیزوں کا تابع ہوتا ہے۔ جن میں حالات، زمانہ، واقعہ کی کیفیات، سوالات کی نوعیت سائل کا ذہنی پس منظر، سَائل میں عمل کرنے کی ہمت، وسَائل اور ذرائع کی کمیابی اور فراوانی وغیرہ عناصر شامل ہیں۔ بعض اوقات تو عموم بلوٰی بھی ایک اہم موثر کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے، جس کی وجہ ایک ایسا قول بھی مجتھد اور مفتی کی زبان سے نکلتا ہے جو عوام کی مرضی کے مطابق تو ہوتا ہے لیکن قائل کے مسلک کے بالکل مغائر۔ مصلحت اور دفع حرج کیلئے مفتی یا مجتھد بعض اوقات کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کے بر خلاف عمل کا تعلق انسان کی ذات سے ہوتا ہے۔

ایک شخص اصول کی روشنی میں غور و فکر کرتا ہے اور ایک نتیجہ پر پہنچتا ہے پھر پوری سرگرمی کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو جاتا ہے چونکہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے اس لئے نہ تو رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں اور نہ کسی خارجی اثر کا کچھ دخل۔ لیکن قول میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اسلئے کہ قول مجتھد یا گفتار نبی کو عوام سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ عوام کی ہمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے احکام دینے پڑتے ہیں اس لئے قول میں کئی امور دخیل ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ عمل ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان کے مذہب کی صحیح اور سچی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے احوال اور اقوال کو سامنے رکھیں تو بیسیوں ایسے احکام اور واقعات ملتے ہیں جو ایک دوسرے سے قطعًا مختلف ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آنحضرت کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ قول میں عوام کا اور بعض اوقات سائل کا لحاظ ہوتا ہے اس لئے نرمی اور رخصت کا عنصر زیادہ رہتا ہے اور عمل میں معاملہ ذات کا رہتا ہے اس لئے عزیمت اور عَالیت کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔

معاملات شرعیہ اکثر و بیشتر رخصتیں ہیں۔ آنحضرت کا عمل اکثر و بیشتر عالیت اور عزیمت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ پس آنحضرت کا مذہب عزیمت و عالیت قرار پایا ہے نہ کہ رخصت اور امام مہدی کا مذہب بھی عزیمت اور عالیت ہی ہوتا ہے نہ کہ رخصت۔

خود ائمہ کے اقوال و افعال میں بھی ایسی ہی بے شمار مثالیں ملتی ہیں یعنی ایک امام کا قول کچھ ہوتا ہے تو اس کا عمل کچھ،

اس لئے کہ قول کا تعلق عوام سے رہتا ہے اس لئے وہ بات بیان کی جاتی ہے جس میں ان کے لئے سہولت ہو کیوں کہ عوام میں عمل کرنے کی قوت یکساں نہیں ہوتی کسی میں ضعف رہتا ہے تو کسی میں قوت۔ دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے حکم بیان کرنے کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بات بیان کی جاتی ہے جس پر سب عمل کر سکیں لیکن عمل کا تعلق چونکہ امام کی ذات سے رہتا ہے پس انتہائی احوط اور اتقی پہلو ہی ان کے سامنے رہتا ہے، اور انہیں اسپر عمل کرنے کی پوری آزادی بھی حاصل رہتی ہے۔ چانچہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو حنیفہؒ اپنے اصحاب کے ساتھ کہیں جارہے تھے، اتفاق سے ایک گائے نے پیشاب کر دیا جس کی کچھ چھینٹیں ایک صاحب کے پاجامے پر اڑ گئیں لیکن وہ ایسی تھیں جو نظر نہیں آتی تھیں، ان کے پوچھنے پر امام صاحب نے فرمایا یہ نظر نہیں آرہی ہیں۔ اس لئے دھونے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن دوسری مرتبہ جب ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور خود امام صاحبؒ کے پائینچوں پر ایسی چھینٹیں اڑیں تو امام صاحب نے گھر پہنچنے کے بعد وہ حصّہ دھویا، جب پوچھا گیا کہ پہلے تو آپؒ نے فرمایا تھا کہ دھونے کی ضرورت نہیں لیکن اس مرتبہ آپ نے دھویا تو امام صاحبؒ نے جواب دیا، وہ رخصت تھا اور یہ عزیمت ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذہب کے معنی امام کا عمل اور سنت کے معنی پیغمبر کی سنت عملی ہے اور امام مہدی کا مذہب وہ راستہ ہے جو امر حق، حکم کتاب خدا اور روح رسول اللہ سے راست معلومات پر مبنی ہے۔ اس راستہ سے جس کا راستہ ملیگا وہ صحیح ہو گا، اب اس پر مقید مذہب کا اطلاق صحیح نہ ہو گا۔ بلکہ وہ مذہب مطلق مذہب کا نام پائیگا۔

تیرھواں سوال - تکفیر مُسلم

سوال علماء: آپ مُسلمان کو کافر کہتے ہیں اور مومن بننے کا حکم کرتے ہیں۔

جواب امام علیہ السلام: ہم نے اللہ کی کتاب کو پیش کیا ہے۔ جس کسی کو اللہ کی کتاب کافر کہتی ہے ہم بھی اُسے کافر کہتے ہیں خود سے کوئی بات نہیں کہتے۔ ہم اللہ کی کتاب کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور مخلوق کو، اللہ کو ایک جاننے اور اللہ کی بزرگی ماننے کی دعوت دیتے ہیں اور ہم اللہ کی طرف سے اسی کام پر مامور ہیں اور علماء جو ہماری مخالفت کرتے ہیں معلوم نہیں ہوتا کہ انکی مخالفت کا سبب کیا ہے۔ اگر بندہ سے سہو یا غلطی ہوئی ہو ان پر فرض ہے کہ ہم کو آگاہ کریں۔ اور اتفاق کریں تاکہ اللہ کی کتاب پر عمل کیا جائے اور اللہ کی کتاب پر دعوت دیجائے۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے اگر تم جھگڑ پڑو کسی امر دین میں تو رجوع کرو اللہ کی طرف یعنی اللہ کی کتاب کی طرف جو شخص اللہ کی کتاب کے باہر قدم رکھے، وہ توبہ کرے، اور اگر توبہ نہ کرے تو وہ واجب القتل ہے۔ (مولود صفحہ ۹۳، شواہد صفحہ ۱۸۲)

گذشتہ سوالات کی طرح اس سوال کو بھی امر مہدیت کی تحقیق سے کچھ لگاؤ نہیں ہے۔ اس سوال میں بھی علماء نے تکفیر مُسلم کے مسئلہ کو آپ ہی کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ عوام کو غلط طور پر یہ باور کراتے ہوئے کہ یہ اپنے نہ ماننے والے اہل قبلہ مُسلمانوں کو کافر کہتے ہیں اور انہیں مومن بننے کا حکم دیتے ہیں۔، ان کے دلوں میں آپ کی نسبت بد ظنی پیدا کر دیں۔

تکفیر مُسلم کے باب میں چند باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) دینیات کا ایک معمولی طالب علم بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ مسئلہ تکفیر کا تعلق اعتقاد سے ہے۔ اگرچہ بعض اعمال شنیعہ کے ارتکاب یا بعض فرائض کے ترک پر بھی ایمان کی نفی یا کفر کا اطلاق کیا گیا ہے لیکن ایسے احکام تشدیدی اور تغلیظی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اعمال کے سلسلے میں امام مہدی کے جو فرامین ایمان کی نفی یا کفر کے اطلاق کو متضمن ہیں وہ بھی اسی قبیل سے ہیں، اور فرامین امام علیہ السلام میں نفی ایمان اور اطلاق کفر کی وہی توجیہ کی جائیگی جو حدیث لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، یا لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا أَدب لَهُ اور ان جیسی دیگر احادیث کی، جن میں ایمان کی نفی کیگئی ہے، کی جاتی ہے، یعنی لَا إِيمَانَ سے کمال ایمان کی نفی مراد ہے، اور "فَقَدْ كَفَرَ" سے یہ مراد ہے کہ وہ مقام کفر کے قریب ہے۔

(۲) ایمان اور کفر چونکہ شرعی اصطلاحیں ہیں۔ اس لئے ایمان و کفر کے بارے میں قطعی احکام دینے کا حق صرف شارع کو پہنچتا ہے، موجبات ایمان و کفر کے بیان کرنے کے صرف شارع ہی مجاز ہوتے ہیں نہ کہ غیر۔

(۳) شارع کے علاوہ دیگر لوگ خواہ وہ صحابہ ہی کیوں نہ ہوں اپنی طرف سے کسی کو کافر کہنے کے مجاز نہیں ہیں لیکن ساتھ ہی ہر دور کے ہر ایک مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ خدا کی کتاب جس شخص کو کافر کہتی ہے اُسے کافر کہے۔

(۴) ایسی صورت میں زید کا کسی شخص کو ازروئے قرآن کافر ہونے کی بناء پر کافر کہنا زید کا ذاتی حکم نہیں ہوگا۔ اصل حکم تکفیر تو قرآن کی جانب سے ہوتا ہے زید، عمرو بکر وغیرہ اشخاص اس قرآنی حکم کے اطلاق کرنے والے اور حکم کے سُنانے والے ہوں گے۔ تکفیر کے قول کی نسبت کسی صورت ان کی طرف نہیں کی جائیگی۔

ان ہی وجوہ کی بناء پر، جب علماء نے امام علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ مُسلمان کو کافر کہتے ہیں تو آپ نے فرمایا "ہم نے خدا کی کتاب کو پیش کیا ہے۔ جس کسی کو اللہ کی کتاب کافر کہتی ہے۔ ہم بھی کافر کہتے ہیں خود سے کوئی بات نہیں کہتے"۔

اس موقع پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام مہدی نے تو اپنے منکر کو کافر کہا ہے۔ اس کے جواز کی کیا صورت ہے؟ جو

اباً عرض ہے کہ اس صورت میں بھی امام علیہ السلام کا حکم تکفیر اپنی جانب سے نہیں بلکہ شارع علیہ السلام کی اتباع میں ہے من انکر المھدی فقد کفر آنحضرت کا قول ہے۔ امام علیہ السلام نے اسی قول کی بناء پر منکر مہدی کو کافر فرمایا ہے۔ گروہ مہدویہ میں آج تک بھی اسی پر عمل چلا آرہا ہے کہ وہ اپنی جانب سے بلاعبارت شخصی طور پر کسی کو کافر نہیں کہتے۔ اگر کہنے کی ضرورت ہو تو حدیث کی عبارت پڑھ دیتے ہیں۔ جیسا کہ انصاف نامہ باب دہم میں مرقوم ہے۔

"بھدری والی قریہ میں اکثر مہاجران مہدی محضرہ کئے تھے۔ میاں سید خوندمیر، میاں نعمت۔ میاں نظام ملک جیو، میاں دلاور، میاں لاڑ امام و میاں لاڑشہ بلکہ تمام مہاجران مہدی حاضر تھے اور گفتگو یہ تھی کہ "بے عبارت کوئی کسی کو کافر نہ کہے یعنی منکرانِ مہدی کو (صفحہ ۱۷) اس مسئلہ کی توضیح اسی باب کی دُوسری روایت میں اسطرح کیگئی ہے۔ و نیز معلوم باد کہ بھدری والے موضع میں تمام اصحاب مہدی محضرہ کئے تھے، اور سبھوں نے یہ فرمایا تھا کہ ہم کو بھی یہی چاہئے کہ بغیر عبارت کسی کو کافر نہ کہیں، اور میاں سید خوندمیر و میاں نعمت و دیگر مہاجرین نے فرمایا کہ اگر کسی کو عبارت (کہنا) نہ آئے تو وہ کیا کرے۔ کیا وہ حق پوشی کرے اسکے بعد بعض مہاجرین نے فرمایا اگر زیادہ نہیں جانتا تو کم از کم اس قدر حدیث یاد کرلے اور پڑھ دے" کما قال علیه السلام من أنكر المهدي فقد كفر" اور قوله تعالیٰ" وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ"﴿هود: ١٧﴾۔ درین مجلس این ناقل حاضر بود۔

اس روایت میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) بھدری والی قریہ میں جو اجماع ہوا تھا اس میں اکثر بلکہ تمام مہاجران مہدی شریک تھے جن میں خلفاء امام بھی شامل تھے۔
(۲) مُولف کتاب بھی مجلس میں شریک تھے۔ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ گویا اجماع کی روئداد ہے۔
(۳) متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ کوئی کسی کو (منکر مہدی کو) بغیر عبارت کافر نہ کہے۔
(۴) زیادہ نہ جانے تو کم از کم ایک حدیث یا ایک آیت یاد کرے اور اُسے پڑھ دے۔

حاصل یہ ہے کہ تکفیر مُسلم منکر مہدی میں گروہ مہدویہ میں انتہائی احتیاط ملحوظ ہے۔ "یعنی تعین اور تشخص کے ساتھ بے عبارت" بلا سندا اور بے ضرورت کسی کو کافر نہیں کہتے"۔ مباحثہ کے دوران اگر کہنے کی نوبت آجائے تب بھی بلا تعین و تشخص، عبارت اور سند کے ساتھ کہتے ہیں۔ یعنی حدیث یا آیت پڑھ دیتے ہیں۔ اپنی جانب سے کوئی حکم نہیں لگاتے۔ اور امامنا کی تعلیم بھی یہی تھی کہ کسی کو بلا عبارت کافر نہ کہا جائے چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ کو یہ اطلاع ملی کہ بعض لوگ شہر کو جاتے ہیں اور لوگوں کو کافر کہتے ہیں تو آپ نے انہیں مارنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ روایت ہے کہ خراسان میں میراں علیہ السلام کی خدمت

میں بعض اصحاب نے عرض کیا کہ بعض بھائی شہر کو جاتے ہیں اور مخلوق (منکر مہدی) کو کافر کہتے ہیں۔ میراں علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو مارو پھر فرمایا کہ ان بے چاروں کو اس وجہ سے مارتے ہیں کہ یہ کہنا نہیں جانتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام پر یہ بات شاق گذرتی تھی کہ آپ کے اصحاب میں سے کوئی کسی منکر مہدی کو بے عبارت کافر کہدے اسی لئے آپ نے ایسے لوگوں کو مارنے کا حکم دیا تھا اور مارنے کی وجہ بھی آپ نے یہ بیان فرمائی۔ ''بیچاروں کو اس جہت سے مارتے ہیں کہ کہنا نہیں جانتے۔''

اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ منکر مہدی کو کافر نہ سمجھو یا نہ کہو' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بات ڈھنگ سے کہو۔ یعنی قرآن اور حدیث کی سند کے ساتھ کہو۔ اپنی جانب سے مت کہو۔ پس مارنے کا جو حکم تھا وہ گفتن کی وجہ نہیں تھا کیوں کہ وہ تو ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ بلکہ گفتن نمی دانند کے سبب تھا۔ یعنی بلا حوالۂ قرآن و حدیث اپنی جانب سے کہنے کی بناء پر تھا۔ رہی یہ بحث کہ کیا مہدی موعود کا انکار موجب کفر ہے۔ سو اس کا جواب تفسیر، حدیث، کلام اور عقائد کی متعدد، مشہور، مستند اور مسلّم کتابوں میں مفصلاً اور مدللاً موجود ہے۔ اس باب میں تو کسی کو اختلاف نہیں کہ ضروریات دین کا انکار موجب کفر ہے۔ اہل تسنن اور تشیع کے وہ تمام فرقے جو وجود مہدی کو قرآن اور احادیث متواترہ کی رُو سے ضروری مانتے ہیں، جس کا وعدہ آنحضرت ﷺ نے کیا ہے اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اہلِ اسلام نے وجود مہدی کو ضروریاتِ دین سے شمار کیا ہے۔ ضروریات دین اور مَاجاءبہ الرسُول کا انکار کفر ہونے پر سب کا اتفاق ہے پس مہدی کا انکار بھی یقیناً کفر ہوگا۔

چونکہ حضرت سید محمدؒ جونپوری نے بحالت کمال صحت و ہوشیاری بامر اللہ مہدی موعود ہونے کا دعویٰ فرمایا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی تصدیق واجب ہے اور آپکا انکار کفر۔ چنانچہ امام علیہ السلام نے میاں سید سلام اللہ و میاں سید کریم اللہ کے اس سوال پر کہ کیا آپ کا انکار کفر ہے۔ فرمایاہاں ہمارا انکار کفر ہے اور اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا اور اپنی ذات کو دکھا کر فرمایا کہ اس ذات کا انکار کفر ہے۔ اسی طرح دوسری روایت میں ہے۔

میراں علیہ السلام نے اپنی دونوں انگلیوں سے اپنا پوست پکڑ کر فرمایا کہ یہ پوست و گوشت بندہ کا ہے جو کوئی اس ذات مہدیت کا منکر ہے وہ کافر ہے ان دونوں روایتوں سے حسب ذیل امور مفہوم ہوتے ہیں۔

(۱) سید محمد جونپوری نے اللہ کے حکم سے خود کو مہدی موعود فرمایا ہے۔

(۲) اپنے منکر (مہدیت کے منکر) بفحوائے حدیث بلکہ بنقل الفاظ حدیث کو کافر کہا ہے۔

(۳) کفر کا اطلاق شخصی طور پر نہیں بلکہ عمومی طور پر ہے یعنی جو کوئی آپ کی مہدیت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ اور

ضابطہ بھی یہی ہے کہ کفر و ایمان کا حکم اشخاص کے بجائے، عقائد اور اوصاف پر سے لگایا جاتا ہے۔ ایک ہی شخص مختلف اوقات میں متضاد اوصاف کی وجہ کافر بھی ہو سکتا ہے اور مومن بھی۔ اِمام علیہ السلام کو اپنے مہدی موعود ہونے کا یقین کامل تھا۔ اسی لئے آپ نے اپنا پوست پکڑ کر فرمایا کہ جو کوئی اس ذات کی مہدیت کا منکر ہے وہ کافر ہے۔

(۱) چنانچہ اللہ کے ہر خلیفے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اولاً اُسے خلافت الٰہیہ پر کامل یقین ہو۔ نہ تو کسی قسم کی تحریص و ترغیب اُسے اپنے مشن سے باز رکھ سکتی ہو اور نہ کوئی تخویف و ترہیب اس کے پائے ثبات میں لغزش کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور یہ مسئلہ نہ ایجاد مہدویہ ہے اور نہ ان کے ساتھ مخصوص، بلکہ ہر فرقہ اپنے اپنے متعقد علیہ مہدی کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کی تصدیق واجب ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔

(۲) ظہور مہدی موعود کے بارے میں جو احادیث، حدیث کی مختلف کتابوں میں وارد ہیں وہ حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں۔ جیسا کہ اشعتہ اللمعات میں مذکور ہے ”مہدی کے اولاد فاطمہ سے ہونے کے باب میں حدیثیں حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں“ اور حدیث متواتر کا انکار کفر ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

(۳) مہدی موعود کی ذات اشراط و علامات قیامت سے ہے جیسا کہ یواقیت میں ہے۔ قیامت کے وہ تمام علامات حق ہیں جن کی شارع نے خبر دی ہے وہ سب کے سب قیامت سے پہلے وقوع پذیر ہو جائیں گی۔ جیسے مہدی کا ظہور، پھر دجال کا خروج، پھر عیسیٰ کا نزول۔ اشراط الساعتہ حق ہیں۔ پس مہدی کا انکار اشراط الساعۃ کا انکار ہوا۔ اور اشراط الساعۃ کا انکار کفر ہے۔

(۴) امام مہدی علیہ السلام صاحب بینہ اور خلیفۃ اللہ ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ کس طرح ہلاک ہو گی اُمت جسکے اول حصّہ میں میں ہوں، اور عیسیٰ اسکے آخر میں ہیں اور مہدی اس کے وسط میں ہیں۔ اس حدیث میں مہدی کا ذکر دافع ہلاکت اُمت محمدیہ ہونے کے لحاظ سے رسول اللہ اور عیسیٰ علیہم السلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اللہ کے خلیفوں کا انکار کفر ہے۔ اسی طرح مہدی کا انکار بھی کفر ہو گا۔ اہل سنت کے پاس تو امامت شیخین کا اِنکار کفر ہے۔ کیا خلیفۃ اللہ معصوم عن الخطا، دافع ہلاکت امت محمدیہ کی امامت کا انکار کفر نہ ہو گا۔ اِمام مہدی کے ظہور کے متعلق تو بیسیوں حدیثیں موجود ہیں۔ جن میں نام، کنیت، لقب، اوصاف، مراتب وغیرہ کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اہل اسلام وجود مہدی کو قرآن و حدیث کی روشنی میں ضروری اور ضروریات دین سے مانتے آئے ہیں۔ اور ہر ایک جماعت اپنے معتقد علیہ مہدی کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتی ہے کہ اسکی تصدیق واجب اور اس کا انکار کفر ہے۔

چونکہ حضرت سید محمد جونپوری نے بامر اللہ مہدی موعود ہونے کا دعویٰ فرمایا اور تا وفات اس پر قائم رہے اس لئے

آپ نے اپنے منکر کو کافر فرمایا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ مہدوی چونکہ آپ (حضرت سید محمد جونپوری) کو مہدی موعودؑ مانتے ہیں اسلئے ان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ آپ کی تصدیق امت پر واجب ہے، اور آپ کا انکار کفر ہے۔ لیکن تکفیر کا حکم دینے میں اس قدر احتیاط رکھتے ہیں کہ کسی کو بلاضرورت بلاسند وحوالہ، تعین اور تشخص کے ساتھ اپنی جانب سے کفر کا فتویٰ نہیں دیتے۔ ضرورت پڑتی ہے تو سند اور حوالہ کے ساتھ تعین اور تشخص کے بغیر کہتے ہیں۔ یعنی آیت پڑھ دیتے ہیں یا حدیث سُنا دیتے ہیں۔

چودھواں سوال - مہدی موعود پر کوئی قادر نہ ہوگا

سوال علماء: مہدی کی علامات سے یہ ہے کہ مہدی پر شمشیر کام نہ کریگی۔

جواب امام علیہ السلام: امام علیہ السلام نے فرمایا کہ شمشیر کا کام کاٹنے کا ہے لیکن مہدی موعود پر شمشیر قادر نہ ہوگی اور قادر نہیں ہوسکتی اور یہ آیت پڑھی "﴿أَفِي اللَّـــهِ شَكٌّ﴾ (ابراھیم:١٠) کیا اللہ میں شک ہے۔ اگرچہ بندہ کی مہدیت میں شک کرتے ہو تو اللہ کے ایک ہونے میں تو شک نہیں ہر مرد و زن پر اللہ کی طلب فرض عین ہے۔ آؤ اللہ کی بندگی میں مشغول ہو جائیں، اللہ اس بندہ کی مہدیت کو تم پر ظاہر کر دے گا (مولود صفحہ ٩٤) فرہ میں بھی اِمام علیہ السلام سے یہی سوال کیا گیا تھا۔ لیکن وہاں سوال کرنے والے حاکم فرہ میر ذوالنون تھے۔ سوال اور اس پر مبنی پورا واقعہ حسبِ ذیل ہے۔

جب آنحضرتؑ نے بیان قرآن کے بعد میر ذوالنون سے فرمایا نزدیک آؤ۔ پھر فرمایا زیادہ نزدیک آؤ (میر نے) بہت زیادہ قریب آکر عرض کیا اگر خوندکار لغوی مہدی ہیں تو معقول ہے۔ اگر اصطلاحی ہیں تو دلیل دکھانا چاہئے۔ آپ نے فرمایا دلیل دکھانا اللہ کا کام ہے۔ اور بندہ کا کام تبلیغ ہے پھر میر ذوالنون نے کہا حدیث میں آیا ہے کہ مہدی پر شمشیر کام نہ کرے گی۔ امام نے فرمایا شمشیر کا کام کاٹنا، پانی کا کام غرق کرنا اور آگ کا کام جلانا ہے لیکن (حدیث کا مطلب یہ ہے) کہ مہدی پر کوئی قادر نہ ہوگا۔ لو آزمالو کہکر آپ نے اپنی شمشیر ان کے سامنے رکھدی۔ میر ذوالنون شمشیر لیکر اُٹھے اور ہاتھ اونچا کیا، ان کا ہاتھ سیخ ہوگیا، پھر دوسرے ہاتھ میں شمشیر لیکر اُٹھے وہ ہاتھ بھی سیخ ہوگیا۔ چہرہ سبز ہوکر بے ہوش ہوگئے۔ حضرت مہدی موعود نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہشیار کیا۔ اسی طرح تین بار حملہ کئے۔ پھر ادب اور تواضع سے آنحضرت کے سَامنے شمشیر رکھ دی۔ اس کے بعد ایک عقل مند وزیر نے جن کا نام مولانا نور کوزگر تھا، بلند آواز سے کہا اگر مہدی آنا ہے تو بس یہی ذات مہدی موعود ہے۔ ورنہ مہدی ہرگز نہیں آئیگا۔ میں نے آپ کی تصدیق کی میر ذوالنون نے کہا میں نے بھی تصدیق کی، میں اس مہدی کا مصدق ہوں اور مہدی کا نوکر، ناصر اور غلام ہوں، جہاں تلوار چلانے کی ضرورت ہوگی تلوار چلاؤں گا۔ اور مہدی کے مخالفوں کو قتل کروں گا۔ حضرت

مہدی نے فرمایا اپنے نفس پر تلوار مار کہ گمراہی میں نہ ڈالے، مہدی اور مہدویوں کا ناصر خدا ہے۔(مولود صفحہ ۱۷۸)

شواہد الولایت میں بھی یہی روایت آئی ہے لیکن اسقدر اختلاف کے ساتھ کہ تلوار چلانے کے فعل کو ایک حبشی کی طرف منسوب کیا گیا ہے جسے میر ذوالنون نے پہلے ہی سے اس کام پر مامور کیا تھا۔ نقل کے الفاظ یہ ہیں ''میر ذوالنون نے اس گفتگو سے قبل ہی ایک حبشی کو کہدیا تھا کہ جب میں آنحضرت سے یہ سوال کروں، آپ پر وار کر دینا۔ اگر آنحضرت حق پر ہوں گے تو تیر اوار کارگر نہ ہوگا، اور اگر آپ کا دعویٰ دروغ ہوگا تو سر کٹ جائیگا۔ الغرض جب امام علیہ السلام نے فرمایا کہ مہدی کو مارنے پر کوئی قادر نہ ہوگا۔ تو وہی حبشی جو اشارہ پا چکا تھا فوراً تلوار کھینچ کر ہاتھ اُٹھایا تا کہ آنحضرت پر وہ وار کر دے لیکن وہ کر نہ سکا اس لئے کہ اس کا ہاتھ شل ہو گیا اور آنحضرت بدستور نصیحت میں لگے رہے۔ کوئی تغیر آپ کے چہرۂ مبارک پر دکھائی نہیں دیا۔ الخ

شمشیر خواہ میر ذوالنون چلائیں یا ان کا مامور حبشی، لیکن اس واقعہ کا انجام ہاتھ کا شل ہونا اور امام پر وار کا کارگر نہ ہونا ہے۔ اور یہی بات امام علیہ السلام نے بھی فرمائی تھی کہ شمشیر کا کام کاٹنا، پانی کا کام غرق کرنا اور آگ کا کام جلانا ہے۔ لیکن یہاں اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مہدی موعود پر کوئی قادر نہ ہو سکیگا۔ اس پورے واقعہ میں دو باتیں اہم ہیں جنکی توضیح کے بعد اس واقعہ میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

(۱) ایک تو یہ کہ جب آگ کا کام جلانا، پانی کا کام غرق کرنا اور شمشیر کا کام کاٹنا ہے تو پھر عدم قدرت اور کارگر نہ ہونے کے کیا معنی ہیں اور اسکی صورتیں کیا ہیں۔

(۲) قادر نہ ہونے اور وار کارگر نہ ہونے کا معاملہ آیا امام علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہے یا اس کے کچھ نظائر خلفاء اللہ کی تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

امر اول کی توضیح اللہ آگ، پانی اور شمشیر کا خالق ہے اسی نے ان میں جلانے، ڈبانے اور کاٹنے کی قوتیں ودیعت کی ہیں ان چیزوں میں بنی نوع انسان کیلئے بہت سے منافع ہیں بلکہ اول الذکر دو چیزوں سے انسان کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے اور آخر الذکر یعنی شمشیر سے انسان بوقت مقابلہ اپنی مدافعت کرتا ہے۔ لیکن جب انسان ان چیزوں کا ناجائز استعمال شروع کر دے اور خصوصاً حق پرستوں کے خلاف ان کو استعمال کرنے لگے تو وہی خالق قلب ماہیت یا سلب خاصیت کے ذریعہ ان چیزوں کو غیر موثر بھی کر سکتا ہے۔

تجربہ کی روشنی میں اس کی مزید توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ آگ، پانی اور شمشیر اپنے کام میں خطا نہیں کرتے بشرطیکہ

یہ اپنی اصلی حالت پر رہیں، انہیں آزادنہ کام کرنے کا موقع ملے، اور ان کے موارد پوری طرح ان کی گرفت میں آجائیں لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو ظاہر ہے کہ نتائج بھی مختلف ہی برآمد ہوں گے۔ یعنی اگر یہ چیزیں اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہیں بلکہ ان کی ماہیت بدل جائے۔ جیسے نارنمرود "يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا" ﴿الأنبياء:٦٩﴾ کے حکم کی تعمیل میں ابراہیم علیہ السلام کیلئے ٹھنڈک اور سلامتی کے سبب نمونۂ گلشن بن گئی تھی۔ (اگر آگ ہوتی تو یقینا جلائے بغیر نہ رہ سکتی تھی) یا ان کی خاصیت سلب کرلی جائے۔ جیسے خالد بن ولید کے حق میں زہر کی سمیت سلب کرلی گئی تھی۔ یا آزادنہ کام کا موقع نہ ملے جیسے نیل میں حضرت موسیٰ اور انکی جماعت کیلئے راستہ پڑ گیا تھا اور پانی اس راستہ کے دونوں طرف پہاڑ کی چوٹیوں کی طرح بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ یا ان کے موارد پوری طرح ان کے گرفت میں نہ ہوں جیسے آنحضرت ﷺ اور امام مہدی کے رعب وخوف سے شمشیر سمیت اُٹھے ہوئے ہاتھ شل ہوگئے تھے۔

امر دوم کی تشریح: امر اول کی توضیح کے ضمن میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ نے اپنے خلیفوں اور صاحبان بیّنات سے جن کو دشمنوں کے نرغے سے بچانا چاہا ہے ان پر یہ چیزیں غیر موثر بن کر رہ گئیں اور اسطرح ان چیزوں کے ذریعہ کوئی ان پر قادر نہ ہوسکا۔

آنحضرت ﷺ سے متعلق بھی ایسا ہی ایک واقعہ جو امام علیہ السلام کے اس واقعہ سے مشابہت تامہ اور مماثلت کاملہ رکھتا ہے۔ صاحب مشکوٰۃ نے باب التوکل والصبر کے ذیل میں درج کیا ہے۔ وھوھٰذا۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ وہ آنحضرت کے ساتھ نجد کی طرف غزوہ کیلئے گئے۔ جب آنحضرت نے وہاں سے مراجعت فرمائی تو قافلہ کے لوگ بھی واپس پلٹے (دوران واپسی) دوپہر کے وقت ایک خاردار وادی پر سے گذر ہوا۔ آنحضرت ﷺ وہاں اترپڑے اور ساتھ ہی آپ کے لوگ بھی درختوں کا سایہ لینے کے لئے اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ آنحضرت سمرہ نامی ایک درخت کے نیچے تشریف لائے اور اپنی تلوار اس درخت سے لگادی۔ پھر ہم سو گئے۔ پس یکایک آنحضرت نے ہمیں آواز دی۔ اور اس وقت آپ کے پاس ایک اعرابی تھا۔ پھر آنحضرت نے فرمایا کہ اس نے میری تلوار مجھ پر حملہ کرنے کی نیت سے کھینچ لی۔ اس حال میں کہ میں سورہا تھا۔ پس جب میں بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے پھر اس نے کہا (اے محمد) تجھے مجھ سے کون بچائیگا۔ میں نے کہا اللہ۔ آنحضرت نے تین مرتبہ اللہ کہا، اور اس سے تعرض نہیں فرمایا اور بیٹھ گئے۔

ابو بکر اسماعیل نے اپنی صحیح میں اسقدر اضافہ کیا ہے "اعرابی نے کہا تجھے مجھ سے کون بچائے گا۔ آپ نے فرمایا اللہ۔

پس تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آنحضرت نے وہ شمشیر اپنے ہاتھ میں لے لی اور فرمایا تجھے کون مجھ سے بچائیگا۔ اس نے کہا تلوار اچھی طرح لینے والا بن جا (یعنی غصہ سے تلوار ہاتھ میں لینے والا اور لطف و کرم سے رہا کرنے والا) الخ

اس روایت سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت خاتم نبوت پر شمشیر کارگر نہ ہو سکی۔ اللہ کا نام سنکر اعرابی اسقدر مرعوب ہو گیا کہ تلوار خود اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ (جلد رابع صفحہ ۲۶۲)

خاتم ولایت پر بھی میر ذوالنون یا حبشی کا حملہ کارگر نہ ہو سکا۔ ہاتھ شمیشر سمیت سیخ ہو گیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا جنگِ احد میں زخمی ہونا، حتیٰ کہ آپ کے دندانِ مُبارک کا شہید ہونا اس بات پر شاہد عادل ہے کہ شمشیر وسنان آپ پر کارگر ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ واقعات ہمارے دعویٰ کے ابطال کیلئے ناکافی ہیں۔ زخم کا لگنا اور ہے اور کسی کا قادر ہونا اور ہے۔ قادر ہونے کے معنی بالکلیہ قابو میں کر لینے اور نتیجتاً ہلاک کرنے کے ہوتے ہیں بحث شمشیر وسنان سے زخم لگنے کے بارے میں نہیں ہے۔ اسلئے کہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ بحث تو یہ ہے کہ کیا کوئی ان چیزوں کے ذریعہ آپ پر قادر بھی ہو سکا۔ دُوسرے لفظوں میں آپ کو ہلاک کرنے اور قتل کرنے یا کسی طرح آپ کی جان لینے کی ناپاک کوششوں میں کیا کوئی کامیاب بھی ہو سکا۔ تاریخ اِسلام میں اس کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

اگر ایسا ہوتا تو آپ شہادت کا جام بھی نوش فرمائے ہوتے لیکن چونکہ منشاایزدی میں یہ بات تھی کہ کوئی آپ پر قادر نہ ہو گا۔ اس لئے آپ نے میدان جنگ میں شہادت نہیں پائی۔ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز نے سرّالشہادتین میں لکھا ہے۔

ولكن بقى له كمال لم يحصل له بنفسه و هي الشهادة (صفحہ ۳) لیکن ایک کمال ایسا باقی رہ گیا تھا جو آپ کو بذاتہ حاصل نہ ہوا تھا اور وہ شہادت ہے اور یہ کمال حاصل نہ ہونے کی وجہ کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اُسے اس طرح بیان کیا ہے۔ و السرّفي عدم حصولها له بنفسه ﷺ انه لو استشهد في الحرب لأدّي ذلك الي كسر شوكة الاسلام و اختلال الدين في نظر العوام۔ آنحضرت کو شہادت کا کمال بذاتہ حاصل نہ ہونے کا راز یہ تھا کہ اگر آپ شہید ہو جاتے تو یہ بات شوکت اسلام کے ٹوٹ جانے اور عوام کی نظروں میں دین میں خلل پیدا ہو جانے کا باعث بن جاتی۔

اسکی توضیح تحریر الشہادتین میں اسطرح کیگئی ہے۔ یعنی عوام کے ایمان میں اس خیال سے خلل آجاتا کہ اگر یہ سچے نبی ہوتے تو کافروں کے ہاتھ سے کیوں مارے جاتے۔

خلاصہ یہ کہ خاتم نبوت پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ اسلئے کہ آپ پر کسی کا قادر ہونا (اسی طرح شہادت پانا)

مغلوبیت کی علامت ہے۔ اور مغلوبیت خاتم نبوت کی شان کے منافی ہے۔ اہل سنت والجماعت کے علماء تو مغلوبیت کو خلافتِ راشدہ کے بھی منافی خیال کرتے ہیں (دیکھو سرّ الشہادتین) چہ جائیکہ مرتبۂ خاتم نبوت۔ پس اسی سبب سے خاتم ولایت محمدیہ پر بھی کوئی قادر نہیں ہو سکتا تھا اور عملاً ہونے بھی نہ پایا اور یہی مطلب اس حدیث کا بھی ہے جس میں مہدی پر شمشیر کا کارگر نہ ہونا بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امام علیہ السلام نے فالذین ہاجروا۔ الخ کے بیان کے موقع پر فرمایا فَالَّذِينَ هَاجَرُوا شد، وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ شد، وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي شد، وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا ماندہ است خواہد شد،

امام علیہ السلام نے ان چاروں صفتوں کو اپنی ذات سے متعلق فرمایا لیکن ان میں سے تین صفات کا ظہور تو آپ سے اصالتہً اور آپ کے ساتھیوں سے تبعاً ہوا۔ (اسی لئے امام علیہ السلام نے ان تینوں صفات کیلئے شد کا لفظ استعمال فرمایا) البتہ چوتھی صفت جو قَاتَلُوا وَقُتِلُوا کا مظہر تھی، آپ سے پوری نہیں ہو سکتی تھی اسلئے کہ آپ پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا بار بامرِ الٰہی حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایتؓ پر رکھا اور اسی لئے اس آخری صفت کے لئے ماندہ است خواہد شد کے الفاظ فرمائے اور بعد میں اسکی توضیح فرمادی کہ اسکا ظہور حضرت بندگی شاہ خوندمیرؓ کے ذریعہ ہو گا۔

داؤد و سلیمان علیہ السلام

وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ ﴿البقرۃ:۲۵۱﴾ اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کچھ عرصہ تک بنی اسرائیل کا کام درست رہا۔ پھر جب ان کی نیت بگڑی تب ان پر ایک غنیم کافر بادشاہ مسمّٰی جالوت ان پر مسلط ہو گیا، اس نے ان کو شہر سے نکال دیا۔ ان کو لوٹ لیا، بنی اسرائیل بھاگ کر بیت المقدس میں جمع ہوئے۔ اس وقت حضرت اشموئیلؑ پیغمبر تھے۔ ان سے درخواست کی کہ کوئی بادشاہ ہم پر مقرر کر دو تا کہ ہم اسکے ساتھ ہو کر دشمن کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کر سکیں۔ طالوت کی قوم میں پہلے سے کوئی سلطنت نہیں تھی "غریب اور محنتی آدمی تھے۔ مال و دولت نہ ہونے کی بناء پر بنی اسرائیل کی نظر میں وہ بادشاہ بننے کے قابل نہیں تھے۔ نبی نے فرمایا کہ سلطنت کیلئے وہ شخص موزوں ہے جس میں عقل بھی زیادہ ہو اور بدن کے اعتبار سے وہ قوی ہو۔ جب یہ بات سُنی تو کہا کہ کیا اس کے سوا اور کوئی دلیل ہے تو بتاؤ۔ پیغمبر نے اللہ سے دعا کی اور طالوت کی سلطنت کی دوسری نشانی یہ بتائی کہ وہ تابوت جس میں موسیٰ اور ہارون اور ان کی اولاد کے تبرکات تھے اسکو فرشتے اُٹھالائیں گے۔ یہ وہ صندوق تھا جسے موسیٰؑ و غیرہ انبیاء بنی اسرائیل لڑائی میں آگے رکھتے تھے اللہ اسکی برکت سے انہیں فتح عطا کرتا تھا۔ جب یہ نشانی مل گئی تو سب نے طالوت کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اب طالوت نے کہا کہ جو جوان طاقت ور اور بے فکر ہو وہ ان کے ساتھ چلے۔ تو اسّی (۸۰) ہزار ایسے آدمی نکلے۔ پھر طالوت نے ان کو آزمانا چاہا۔ ایک منزل میں پانی نہ ملا۔ دوسری منزل میں ایک نہر ملی۔ طالوت نے حکم دیا کہ جو ایک چلّو سے زیادہ پانی پیوے وہ میرے ساتھ نہ چلے۔ اس آزمائش میں صرف تین سو تیرہ کامیاب ہوئے باقی سب نے پیٹ بھر کر پانی پی لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانی پینے والوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم کو جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ اور جنہوں نے پانی حکم کے مطابق پیا تھا اور جن کا خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملاقات کرنا ہے وہ کہنے لگے کہ کتنی ہی چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب آجاتی ہے۔

جب جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے میں یہ تین سو تیرہ مردان خدا آئے تو انہوں نے اللہ سے دُعا کی اے اللہ ہمارے دلوں میں صبر (اور استقامت) ڈال دے، ہمارے قدموں کو جمائے رکھ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ان تین سو تیرہ میں حضرت داؤد کے والد اور ان کے چھ بھائی اور خود حضرت داؤد بھی تھے۔ حضرت داؤد کو راہ میں تین پتھر ملے اور بولے اُٹھالے ہم کو ہم جالوت کو قتل کریں گے۔ جب مقابلہ شروع ہوا خود جالوت باہر نکلا اور کہا میں اکیلا تم سب کیلئے کافی ہوں۔ میرے سامنے آتے جاؤ۔ حضرت اشموئیل نے حضرت داؤد کے باپ کو بلایا کہ اپنے بیٹے مجھکو دکھلا اس نے

چھ بیٹے دِکھلائے جو قد آور تھے لیکن حضرت داؤد کو نہیں دکھایا اس لئے کہ ان کا قد چھوٹا تھا اور وہ بکریاں چراتے تھے۔ پیغمبر نے ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تو جالوت کو مارے گا انہوں نے کہا ماروں گا۔ پس پھر وہ جالوت کے سامنے گئے اور ان ہی تین پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر مارا۔ جالوت زرہ بکتر میں ڈوبا ہوا تھا صرف اس کا ماتھا کھلا تھا۔ تینوں پتھر اس کے ماتھے پر لگے اور پیچھے کو نکل گئے۔ یہ دیکھ کر جالوت کا لشکر بھاگا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

پھر طالوت نے اپنی بیٹی حضرت داؤد کے عقد نکاح میں دیدی۔ طالوت کے بعد داؤد ہی بادشاہ ہوئے۔

سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۶۳ میں اللہ نے فرمایا۔وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا۔ اور ہم نے داؤد کو زبور (کتاب) دی۔

سورۂ مائدہ آیت ۷۸ میں ہے کہ بنی اسرائیل میں جن لوگوں نے کفر کیا ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت کی گئی۔

سورۂ انعام میں پیغمبروں کی فہرست میں داؤدؑ کا نام آیا ہے آیت نمبر ۸۴

سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ۵۵ میں اللہ نے فرمایا وآتینا داؤد زبورا۔ ہم نے داؤد کو زبور دی

سورۂ انبیاء میں آیت نمبر ۷۸ میں اللہ نے حضرت داؤد کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:وَدَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْشَاهِدِينَ ﴿الأنبياء:۷۸﴾

اور داؤد اور سلیمان کا حال بھی سن لیجئے جب وہ ایک کھیتی کے معاملے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں (رات میں گھس کر) فصل چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے۔

حضرت داؤدؑ خوبصورت گورا رنگ کشادہ چشم تھے۔ اللہ نے نبوت اور بادشاہت عطا کی تھی۔ ۱۳ بیٹے تھے۔ جن میں سلیمان بھی تھے آپ اکثر امور میں سلیمانؑ سے ان کی کم سنی ہی میں ان کی عقل مندی کے سبب مشورہ کرتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کی چند بکریاں ایک رات میں ایک کھیت کو چر گئیں۔ مقدمہ داؤدؑ کے پاس پیش ہوا آپ نے یہ فیصلہ سنایا کہ (چونکہ بکریوں اور پیداوار کی قیمت یکساں تھی) بکریاں کھیت والے کے حوالے کر دی جائیں۔ جب طرفین فیصلہ سن کر جانے لگے تو حضرت سلیمانؑ نے فرمایا اس سے اچھا فیصلہ میرے پاس ہے۔ وہ یہ کہ بکریاں کھیت والے کو دی جائیں تاکہ وہ ان کے دودھ، بچے، بال وغیرہ سے مستفید ہوتا رہے اور کھیت بکریوں والے کو دیا جائے۔ تاکہ وہ اسکو پانی دیں اور اسکی دیکھ بال کریں۔ پھر جب وہ کھیت اس حالت پر آجائے جس میں کہ بکریاں چر گئی تھیں تو اب پھر دونوں کا تبادلہ کر دیا جائے۔ اس طرح

دونوں کا فائدہ ہو گا اور کسی کو بھی ہمیشہ کا نقصان نہ ہو گا۔ فیصلے دونوں صحیح تھے لیکن سلیمانؑ کا فیصلہ وحی الٰہی کے مطابق تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کے تعلق سے فرماتا ہے۔ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ ﴿الأنبياء:٧٩﴾۔ پھر ہم نے سلیمان کو فیصلہ سمجھا دیا۔ (اگرچہ داؤدؑ کا فیصلہ بھی صحیح تھا لیکن سلیمان کا فیصلہ زیادہ صحیح تھا)

اور اللہ داؤد کے تعلق سے ایک اور خصوصیت کا ذکر فرماتا ہے۔ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُودَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِينَ ﴿انبیاء:٧٩﴾ اور ہم نے داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں کو تابع کر دیا تھا تو وہ تسبیح کیا کرتے تھے اور پرندوں کو بھی تابع کر دیا تھا اور یہ سب کچھ ہم نے کیا تھا۔

حضرت داؤدؑ بے انتہا خوش آواز تھے۔ اس پر پیغمبرانہ تاثیر مستزاد۔ حالت یہ ہوتی تھی کہ جب جوش میں آ کر زبور پڑھتے یا خدا کی تسبیح و تحمید کرتے تو پہاڑ اور پرندے بھی ان کے ساتھ آواز سے تسبیح پڑھنے لگتے تھے۔

"كُنَّا فَاعِلِينَ" کے ذریعہ ایک سوال ذہنی کا جواب دیا جارہا ہے کہ تعجب نہ کرو کہ پتھر اور پرند کیسے بولتے اور تسبیح پڑھتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ ہمارا کیا ہوا تھا۔ جب ہماری قوت لامحدود ہے تو اسکے سامنے یہ باتیں مستبعد نہیں ہو سکتیں۔

مزید اللہ تعالیٰ داؤدؑ کے تعلق سے فرماتا ہے: وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنتُمْ شَاكِرُونَ ﴿انبیاء:٨٠﴾ ترجمہ: اور ہم نے ان کو زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی تا کہ وہ تم کو لڑائی کے ضرر سے بچا سکے۔ پس کیا تم شکر کرتے ہو۔ یعنی حضرت داؤد کے ہاتھ میں اللہ نے لوہے کو نرم کر دیا تھا۔ جسے موڑ کر وہ ہلکی، مضبوط اور جدید قسم کی زرہیں تیار کرتے تھے جو لڑائی میں کام آتیں۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ ﴿انبیاء۔٨١﴾ اور ہم نے تیز ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا تھا جو ان کے حکم سے اس ملک تک چلتی تھی جس میں ہم نے برکت دی تھی۔ اور ہم ہر چیز سے واقف ہیں۔

حضرت سلیمانؑ نے اللہ سے دعا کی تھی۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ﴿ص:٣٥﴾ اے میرے رب معاف فرما اور مجھ کو وہ بادشاہت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو، بے شک تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔ تو اللہ نے ہوا اور جن کو ان کیلئے مسخر کر دئے تھے۔ حضرت سلیمانؑ نے ایک تخت تیار کروایا تھا جس پر وہ مع ارکان سلطنت بیٹھ جاتے اور ضروری سامان بھی اس پر رکھ لیا جاتا تھا۔ پھر آپ ہوا کو حکم دیتے وہ آتی، زور سے اس

تخت کو اُٹھاتی پھر دور جاکر نرم ہو کر ان کی ضرورت کے مناسب چلتی جیسا کہ اللہ نے قرآن میں ہی دوسری جگہ فرمایا۔ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ﴿ص:٣٦﴾ نرم نرم جہاں وہ (سلیمانؑ) پہنچنا چاہتے۔

یعنی یمن سے شام کو اور شام سے یمن کو جو کہ اصل میں ایک مہینہ کی مسافت تھی، صرف دو پہر میں پہنچا دیتی تھی۔ غالباً اسی عمل کو سامنے رکھ کر ہوائی جہازوں کو ایجاد کیا گیا ہے۔ جس کا سفر بھی ہواہیں ہی ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی بعض پست ذہنیتیں قرآن میں بیان کردہ ایسے واقعات کا انکار کرتے ہیں۔ کیا یورپ جو کام اسٹیم، فیول، الکٹرک سے کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے ایک پیغمبر کیلئے اپنی قدرت سے نہیں کر سکتا۔ نیز اللہ نے حضرت سلیمانؑ کیلئے جنات (شیاطین) کو تابع کر دیا تھا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے

وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَن يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ ﴿انبیاء ٨٢﴾ ترجمہ: اور بعض شیطانوں (جنوں) کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا جو ان کیلئے غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کے نگہبان تھے۔ یہاں شیاطین سے مراد سرکش جن ہیں۔ ان سے حضرت سلیمانؑ دریا میں غوطے لگواتے تا کہ موتی اور جواہر دریا کی تہ میں سے نکالیں اور دوسرے کاموں سے مراد یہ کہ ان سے عمارات میں بھاری کام کرواتے مثلاً حوض کے برابر تانبے کے لگن، کنویں برابر بڑی دیگیں اُٹھانا۔ حمام، چکی اور شیشے بنانا اور سفر میں ساتھ رکھنا ان ہی کا کام تھا۔ عمارتوں میں بڑے بڑے سے محراب وغیرہ بھی وہی بناتے تھے۔ اور ایسے زبردست کام کرنے والے شیطانوں اور جنوں کو ہم نے ہی اپنے کامل اقتدار و اختیار سے حضرت سلیمانؑ کے تابع کر دیا تھا اور ان کی قید میں جکڑ کر رکھا تھا اسی وجہ سے وہ ان کے جملہ احکام کی بلا چوں وچرا تعمیل کرتے تھے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا۔۔۔ ﴿النمل ١٥﴾ ترجمہ: اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو ایک علم بخشا

حضرت داؤدؑ کو پرندوں اور پہاڑوں کی تسبیح سننے کا علم دیا اور حضرت سلیمانؑ کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم عطا فرمایا تو انہوں نے کہا سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی پھر اللہ فرماتا ہے۔ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ ﴿النمل:١٦﴾۔ سلیمانؑ داؤدؑ کے قائم مقام ہوئے۔ اور کہا اے لوگو ہمیں (اللہ کی طرف سے) پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے (اور جناب محمود الحسن صاحب نے القرآن الکریم میں اسکا ترجمہ یوں کیا ہے "ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی صفحہ ٥٠٣) اور ہمیں دیا گیا (دین و دنیا کی) ہر چیز میں سے اور یہ بے شک یہ اللہ کا صاف احسان ہے۔

پرندوں کی بولی سے مراد ان کی آواز کا مفہوم ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک پرندہ نے آواز نکالی، سلیمانؑ نے پوچھا کیا

تم سمجھتے ہو کہ یہ کیا کہہ رہا ہے لوگوں نے کہا نہیں آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے "لِدُوا لِلْمَوْتِ، وَابْنُوا لِلْخَرَابِ" پیدا کرو موت کیلئے اور عمارتیں بناؤ اُجاڑ ہونے کیلئے۔ اسی طرح ایک اور پرندے نے آواز لگائی آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے "کاش مخلوق پیدا نہ ہوئی ہوتی"۔ اسی طرح مور نے پکارا تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے "كَمَا تدينْ تُدان"۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اسی طرح ہُدہُد کی آواز پر آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ۔ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

جب سلیمانؑ کسی جانب کوچ کرتے تو انسانوں، جنوں اور پرندوں کے لشکروں سے حسب ضرورت نفری اپنے ساتھ لیجاتے اور ان کی جماعتوں میں بھی ایک خاص نظم وضبط ہوتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے قاعدہ کے خلاف آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ اگر کوئی بڑھ جاتا تو اسکو سزا دی جاتی تھی۔ چنانچہ آپ کے لشکر کا جاتے جاتے جب ایک ایسے میدان پر سے گذر ہوا جہاں چیونٹیوں کی بستی تھی۔ تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ کہیں تم کو سلیمان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے۔ تو سلیمانؑ اسکی بات پر پہلے تو مسکرائے بعد میں ہنس پڑے۔ اسی وقت حضرت سلیمانؑ نے جو دعا فرمائی اللہ نے قرآن میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ﴿النمل:۱۹﴾ ترجمہ: اے میرے رب مجھے توفیق عطا فرما کہ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے اس کا شکریہ ادا کروں اور یہ کہ وہ نیک کام کروں جو تو پسند کرے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

اس کے بعد ہدہد کا ذکر آیا ہے جسے عرش کے عنوان کے ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ سبا میں حضرت داؤد و سلیمانؑ کا ذکر اسطرح فرمایا ہے: وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴿سبا: ۱۰، ۱۱﴾ اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے فضیلت بخشی تھی، اے پہاڑو ان کے ساتھ تسبیح کرو اور اسی طرح پرندوں کو بھی حکم دیا تھا اور ہم نے ان کے لئے لوہے کو نرم کر دیا تھا کہ تم چوڑی زرہیں بنانا۔ اور کڑیوں کو اندازے سے جوڑو اور نیک عمل کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو میں دیکھتا ہوں۔

اور پھر اسی سورت میں سلیمانؑ کا ذکر اسطرح فرماتا ہے: وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَن يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ﴿سبا: ۱۲﴾ ترجمہ: اور سلیمان کیلئے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اسکی صبح کی منزل بھی ایک ماہ کی ہوتی اور شام کی منزل بھی ایک ماہ کی

ہوتی اور ہم نے ان کیلئے تانبے کا چشمہ بہادیا اور جنات میں ایسے بھی تھے جو ان کے رب کے حکم سے ان کے سامنے کام کرتے تھے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے پھرے گا اسکو ہم دوزخ کا عذاب چکھائیں گے۔

یعنی ہوا آپ کے تخت کو لیکر ایک مہینے کی مسافت آدھے دن میں طے کرتی تھی اسی طرح شام میں بھی اور آپ کے تابعدار جن بڑی بڑی دیگیں اور لگن بناتے تھے جن میں ایک لشکر کا کھانا پکتا تھا۔

حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جن مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تعمیر کر رہے تھے اور سلیمانؑ ان کی نگرانی کرتے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ موت قریب ہے تو آپ شیشے کے ایک مکان کے اندر بند ہو گئے اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے ایسے میں آپ کی روح قبض کر لی گئی۔ جنوں کو یہ بات معلوم نہ ہو سکی۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ آپ حسب عادت عبادت ہی میں مصروف ہیں اور ان کے کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اُدھر بیت المقدس کی عمارت پوری ہو گئی اور ادھر آپکا عصا جسے گھن کا کیڑا کھائے جا رہا تھا گر پڑا۔ تب جنوں کو معلوم ہوا کہ ہم تو یوں ہی کام کر رہے تھے۔ ان پر اپنی غیب دانی کے دعویٰ کا بھی بھانڈا پھوٹ پڑا اور دوسروں کو بھی معلوم ہوا کہ ان کی غیب دانی کے دعوے جھوٹے تھے۔ تب جنات نے کہا اگر ہم کو پہلے ہی سے سلیمانؑ کی موت کا علم ہو جاتا تو ہم اتنے دن اسطرح ذلت اور غلامی میں نہ رہتے۔ مگر اللہ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ نیک بندوں کے ہاتھوں جو کام شروع ہوتے ہیں وہ بہر حال پورے ہوتے ہیں اور اللہ ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے اگرچہ وہ دنیا میں زندہ نہ رہیں۔ اللہ نے حضرت داؤدؑ کا ذکر سورۂ ص میں بھی فرمایا ہے اور اس میں بھی عجیب اور کار آمد باتیں بیان فرمائی ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿ص:١٧﴾۔ ترجمہ: اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کیجئے جو قوت والے تھے اور بہت رجوع کرنے والے تھے۔ اور پھر اللہ ان کے تعلق سے فرماتا ہے "ہم نے پہاڑوں کو ان کے تابع کر دیا کہ ان کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کریں اور پرندوں کو بھی کہ وہ جمع ہو جاتے تھے سب ان کے فرماں بردار تھے۔ اور ہم نے ان کی سلطنت کو مستحکم کیا اور ہم نے ان کو حکمت اور فیصلہ کرنے کی تقریر عطا کی۔ اللہ نے ان سے بھی امتحان لیا اسکی تفصیل میں یہ واقعہ قرآن میں آیا ہے۔

داؤدؑ نے دنوں کو مخصوص کام کیلئے تقسیم کر دیا تھا۔ ایک دن دربار سجاتے اور مقدمات فیصل کرتے ایک دن اہل وعیال کے ساتھ رہتے اور ایک دن خلوت خانے میں اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ اس دن کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دربانوں کو اس بات کا تاکیدی حکم دے رکھا تھا ایک دن جب وہ عبادت خانے میں تھے کئی لوگ دیوار پھاند کر آپ

کے عبادت خانے میں آ گئے، داؤدؑ گھبرا گئے کہ یہ کون مخلوق ہے میری رعایا تو اندر آنے سے رہی کیوں کہ دروازے پر دربان موجود ہیں۔ دیوار پھاند کر اندر آنا بھی عجیب بات ہے انہوں نے کہا گھبرایئے گا نہیں ہم میں ایک بات میں جھگڑا ہو گیا ہے آپ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ کیجئے۔ اور اس معاملے میں کسی کی رعایت نہ کیجئے۔ بات یہ ہے کہ میرے اس بھائی کے پاس ننانوے (۹۹)، دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے۔ اب یہ مجھ سے یہ چاہتا ہے کہ یہ ایک بھی اس کے حوالے کر دوں۔ اس کے سوا اس میں یہ بات بھی ہے کہ یہ گفتگو میں مجھے دبالیتا ہے۔ داؤدؑ نے فرمایا اگر تیرا یہ بھائی ایسا کرتا ہے تو بے شک وہ تجھ پر زیادتی کرتا ہے۔ اور اکثر شرکاء کی یہ عادت ہے کہ جو زور دار ہوتا ہے وہ کمزور کا حصہ ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔ بجز ان شرکاء(Partners) کے جو ایمان اور عمل صالح کی نعمت اور دولت سے مالا مال ہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اس قصے کے بعد داؤدؑ کو خیال آیا کہ میرے حق میں یہ ایک فتنہ اور امتحان تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اپنی خطا معاف کرانے کیلئے نہایت عاجزی کے ساتھ خدا کے سامنے جھک پڑے۔ آخر کار خدا نے وہ خطا معاف کر دی۔

داؤدؑ کی وہ خطا کیا تھی اس بارے میں تفسیروں میں بہت سے اقوال آئے ہیں۔ جن میں بعض تو ایسے ہیں جو شان پیغمبری کے خلاف ہیں البتہ ایک خطا یہ بیان کی جاتی ہے کہ داؤدؑ نہ صرف خود غیر معمولی طور پر اللہ کی تسبیح بیان کرتے تھے اور اللہ کی عبادت کرتے تھے بلکہ اپنے گھر میں بھی یہ انتظام کر رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں کوئی ساعت اللہ کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے اللہ سے کہا دن اور رات میں کوئی ساعت ایسی نہیں جس میں داؤد کے گھر والے تیری عبادت نہیں کرتے۔ یہ حقیقت تھی مگر اللہ کو یہ اظہار پسند نہ آیا اس نے کہا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہمارا فضل و احسان ہے۔ اگر ہماری نظر ہٹ گئی تو کچھ بھی نہیں۔ قسم ہے میرے جلال کی کہ ایک دن میں مجھے تیرے نفس کے حوالے کر دوں گا۔ داؤدؑ نے کہا کہ اس دن کی مجھے خبر کر دینا۔ بس اسی دن فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ فتنہ یہ کہ غیر معمولی طریقے سے چند آدمی ایک معمولی بات کا جھگڑا لیکر عبادت خانے میں گھس آئے جس کی وجہ سے داؤدؑ کا خیال اور نظر دونوں غیر اللہ میں مشغول ہو گئے اور وہ دعویٰ کہ کوئی ساعت ایسی نہیں گذرتی جس میں تیری عبادت نہ ہوتی ہو، ہوا ہو گئی۔ اللہ نے حضرت داؤدؑ کو سلیمانؑ جیسا فرزند عطا کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُودَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿ص:۳۰﴾ ترجمہ: اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا وہ بہت اچھا بندہ تھا کہ اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع ہونے والا تھا۔ اس آیت کے ذیل میں اللہ حضرت سلیمان کے ایک خاص واقعہ کا ذکر فرماتا ہے جو انّہ اوّاب کی تشریح و توضیح ہے۔ جب حضرت سلیمانؑ کے سامنے ایک دن اصیل اور تیز رفتار گھوڑے پیش کئے

گئے جو آپ نے جہاد کیلئے تیار رکھے تھے تو آپ ان کے معائنے میں اسقدر مشغول ہو گئے کہ عصر کی نماز کا وقت کب آیا پتہ ہی نہ چل سکا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا تو آپ کو عصر کی نماز (یا تسبیح) کے فوت ہو جانے پر کافی رنج ہوا اور کہنے لگے کہ مال کی محبت میں اللہ کی یاد سے میں غافل ہو گیا پھر آپ نے (اسکے ازالہ کیلئے) دوبارہ ان کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اور ان سب کو قتل کر دیا۔ یہ گویا ایک قسم کا کفارہ تھا اور یہ بتانا تھا کہ جس مال کی محبت نے یا اس میں مشغولیت نے اللہ کی یاد سے غافل کر دیا اسے نظروں کے سامنے سے ہی ہٹا دینا چاہئے۔ (ص:۳۲)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے تعلق سے ایک اور آزمائش کا ذکر اسی سورۂ ص میں فرمایا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴿ص:۳۴﴾ ترجمہ: اور ہم نے سلیمانؑ کی آزمائش کی اور ان کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا پھر انہوں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ اور دعا کی اے میرے رب میری مغفرت فرما اور مجھ کو ایسی بادشاہت عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو (ایسی حکومت) شایاں نہ ہو بیشک تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے حرم میں نناوے (۹۹) یا سو (۱۰۰) بیویاں تھیں۔ آپ نے ایک دن قسم کھائی کہ میں آج رات سب کے پاس شب بسری کروں گا اور ہر ایک سے ایک بیٹا ہو گا جو جہاد میں حصہ لے گا۔ فرشتہ نے کہا انشاء اللہ کہنا چاہئے۔ آپ نے زبان سے نہیں کہا۔ اللہ کی قدرت کہ کسی بیوی سے کچھ پیدا نہ ہوا سوائے ایک بیوی کے کہ اس سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا۔ دایہ نے اس ادھورے بچے کو لا کر آپ کی کرسی پر ڈال دیا جس کو قرآن میں اللہ نے ''دھڑ'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا۔ یعنی ہم نے ان کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا کہ لو یہ تمہاری قسم کا نتیجہ ہے۔ (اوپر ہم نے جو واقعہ لکھا ہے اس کا ماخذ حدیث صحیح ہے۔) یہ دیکھ کر حضرت سلیمانؑ نہایت ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور زبان سے ''انشاء اللہ'' نہ کہنے پر استغفار کیا۔ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ اگر سلیمانؑ ''انشاء اللہ'' کہہ لیتے تو بے شک اللہ ویسا ہی کرتا جو ان کی تمنا تھی۔

دوزخ

اللہ اور ہر وہ چیز جو حق ہے اس کا انکار کرنے والے اور اس کے جھٹلانے والوں کیلئے بطور سزا اللہ نے جو جگہ مقرر فرمائی ہے اس کا نام دوزخ (جہنم) ہے، انسان کو جو چیز تکلیف دیتی ہے اسی کا نام عذاب ہے، پس جہنم گرم بھی ہوتی ہے اور انتہاء درجہ سرد بھی ہو سکتی ہے، جہنم کے مستحقین وہ لوگ ہیں جو احکام خدا کی نافرمانی کرتے ہیں، مثلاً اللہ کا انکار کرنا، اللہ کے کلام کا انکار کرنا، اللہ کی آیتوں کو جھٹلانا، برائی کمانے والا، اور وہ جو خطاؤں میں گھرا ہوا ہے وہ صاحب اختیار و اقتدار جس کی ساری تگ ودو زمین میں فساد مچانے، کھیتیوں کو غارت کرنے اور نسلوں کو برباد کرنے کیلئے ہوتی ہے، اور وہ جو لوگوں کو صحیح راستہ سے بھٹکا کر کفر وظلمت اور ناحق کے راستے پر کھینچ لیجاتے ہیں اور سود کھانے والا اللہ کے ساتھ شریکوں کو ماننے والا، اللہ کے غضب کا شکار ہونے والا دوسرے کا مال باطل طریقہ سے کھانے والا، دوسرے کو قتل کرنے والا، خودکشی کرنے والا، راہ راست معلوم ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی (یا آپؐ کے حکم کی) مخالفت کرنے اور ایمان والوں کے راستے سے ہٹ کر دوسرے (غیر مومنین کے) راستے پر چلنے والا، یتیموں کا مال کھانے والا، یہ سب جہنم کے مستحق ہیں۔

دوزخ کے سات دروازے ہیں، جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔:"لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ" ﴿الحجر:۴۴﴾ یعنی دوزخ کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ کیلئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے، جہنم کے یہ دروازے ان گمراہیوں اور معصیتوں کے لحاظ سے ہیں جن پر چل کر آدمی اپنے لئے دوزخ کی راہ کھولتا ہے، مثلاً کوئی دہریت کے راستے سے دوزخ میں جاتا ہے، کوئی شرک کے راستے سے، کوئی نفاق کے راستے سے، کوئی نفس پرستی، فسق وفجور کے راستے سے، کوئی ظلم وستم اور خلق آزاری کے راستے سے، کوئی تبلیغ ضلالت وکفر کے راستے سے اور کوئی اشاعت فحش ومنکر کے راستے سے (تفہیم القرآن)۔

حضرت ابن عباسؓ کے مطابق دوزخ بھی سات ہیں۔ جہنم، سعیر، لظیٰ، حطمۃ، جحیم، سقر، اور ھاویہ۔ اور سات دروازے اسلیئے ہیں کہ انسان کے حواس پانچ ہیں، جنھیں حواس خمسہ کہتے ہیں، اور دو قوتیں ہیں، آدمی انکے ہی غلط استعمال سے دوزخ کا مستحق بنتا ہے۔

حواس خمسہ یا پانچ حواس ظاہری بھی ہیں اور باطنی بھی، ظاہری حواس خمسہ آنکھ سے دیکھنا، ناک سے سونگھنا، کان سے سننا، زبان سے چکھنا، اور ایک حاسّہ چھونا، اور بعض لوگوں کے پاس باطن کے اعتبار سے بھی پانچ قوتیں ہیں جنکا دماغ مرکز ہے یعنی قوت خیال، قوت فکر، قوت حفظ، قوت تذکر، اور قوت توہم۔ ان تمام حواس اور قوتوں کا امیر اور بادشاہ دل ہے۔

قوت شہویہ یعنی کھانے پینے اور حیوانی خواہش پوری کرنے کی خواہش کا نام ہے، اور قوت غضبیہ دوسروں پر غلبہ پانے کی قوت کا نام ہے، امام غزالیؒ نے حواس خمسہ اور قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ کی تشریح ایک مثال کے ذریعہ کی ہے، فرماتے ہیں کہ ''تن گویا ایک شہر ہے دست و پا اور اعضاء گویا شہر کے پیشہ ور ہیں اور شہوت گویا عامل خراج ہے (ٹیکس وصول کرنے والی قوت) اور قوت غضبیہ گویا شہر کا کوتوال ہے۔ دل شہر کا بادشاہ ہے اور عقل (دماغ) اس بادشاہ کا وزیر ہے۔

قوت شہویہ ہمیشہ وزیر کی مخالفت کرتی ہے اور اس بات کی خواہاں رہتی ہیں کہ مملکت میں جو بھی مال ہو اس کو کسی نہ کسی بہانے سے خرچ کر دیا جائے۔ اور قوت غضبیہ یعنی کوتوال شہر ہے جو بڑا شریر، سخت اور تند و تیز ہے، یہ ہمیشہ مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ چاہتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کے مطابق سات دروازوں سے جہنم میں جانے والوں کی تفصیل اس طرح ہے۔ اللہ کے سوا مدعی ربوبیت کیلئے ''جہنم''، آگ کے پجاریوں کیلئے ''لظیٰ'' اصنام پرستوں کیلئے ''حطمۃ'' یہودیوں کیلئے ''سقر'' نصاریٰ کیلئے ''سعیر'' صابئین کیلئے ''جحیم''، موحدین گنہ گاروں کیلئے ''ھاویۃ''۔

دعویٰ مہدیت

حضرت مہدی موعودؑ نے **پہلا** دعویٰ **۹۰۱ھ** میں مکہ مکرمہ میں جب آپؑ حج کیلئے تشریف لےگئے تھے رکن یمانی و مقام ابراہیم کے درمیان فرمایا تھا۔ پھر حضرت مہدی موعودؑ نے **دوسرا** دعویٰ **۹۰۳ھ** میں احمد آباد میں تاج خاں سالار کی مسجد میں فرمایا۔ پھر حضرت مہدی موعودؑ نے **تیسرا** دعویٰ جو دعویٰء موکد کہلاتا ہے **۹۰۵ھ** میں بمقام بڑلی فرمایا۔

روایت میں آیا ہے کہ آپؑ نے بمقام بڑلی پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ فرمایا تھا اس لئے نماز قصر فرمایا کرتے تھے۔ پندرھویں دن آپؑ وہاں سے کوچ کا ارادہ فرمارہے تھے کہ اچانک آپؑ کا چہرہ متغیر ہونے لگا، پھر آپؑ نے فرمایا کہ "اب خدا کا حکم ہورہاہے کہ ہم نے تجھ کو مہدی موعود کیا ہے، لوگوں کے سامنے اس کا اظہار فرما۔" تفصیل آگے آئے گی۔

اس حقیقت کو معترضین نے غلط الفاظ کا جامہ پہنانے کی ناپاک کوشش کی ہے اور غلط بیانی اور افتراء پردازی کی حد کردی ہے۔

اعتراض: چنانچہ لکھا ہے کہ "چونکہ مدت سے مریدین شیخ کے درپے تھے کہ دعوی مہدیت کرواور بار بار اس کے خواہاں تھے اور شیخ ہر چند ٹالتے چلے جاتے تھے یہ لوگ تقاضہ نہیں چھوڑتے تھے۔ چنانچہ بپاس خاطر ان کے اس سے پہلے دعویٰ کیا تھا لیکن بعد اس کے سکوت اختیار کیا تھا۔ اس پر چند اں اصرار تھا جبکہ سب نے کمال اصرار کیا شیخ بھی تیار ہوگئے۔

جواب۔ یہ ساری باتیں اس انداز میں ہماری کسی کتاب میں نہیں ہے۔ سارا افسانہ من گھڑت ہے اور خباثت باطنی کی دلیل ہے۔ چناچہ ہمارے پاس جو روایتیں آئی ہیں ان میں لکھا ہے۔ "بعد از اقامت در مقام بڑلی پانزدہ روز خطاب باعتاب شد "الا ان القضا فقد مضي ان صبرت فانت ماجورو ان جزعت فانت مهجور" ایضا فرمودند۔ بندہ را صحت است، مرض نیست، عقل است، جنوں نیست، غنا است، فقر نیست، ہوشیار است بیہوش نیست۔ مع ذالک فرمودند کہ فرمان حق تعالیٰ می شود کہ اے سید محمد تو مہدی موعود ہستی آشکار کن و خلق را بمن دعوت کن۔

ان روایتون سے صاف ظاہر ہورہاہے کہ آپ علیہ السلام نے اللہ کے فرمان سے دعویٰ مہدیت فرمایا، مریدین کے اصرار، تقاضہ یا پاس خاطر سے نہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ جھوٹے کو حافظہ نہیں رہتا، چنانچہ معترض نے اپنی ایک بدنام زمانہ کتاب میں خود اسطرح اعتراف کیا ہے۔ "مطلع الولایت میں لکھا ہے کہ اول بارہ برس تک امر الٰہی ہوتارہااور میراںؑ وسوسہ نفس وشیطان سمجھ کر ٹالتے رہے اور بعد بارہ برس کے خطاب باعتاب ہوا کہ ہم روبرو سے فرماتے ہیں تو اس کو غیر اللہ سے سمجھتا ہے، بعد اسکے بھی شیخ موصوف اپنی لیاقت وغیرہ کا عذر پیش کرکے آٹھ برس اور ٹالتے رہے، بعد بیس برس کے خطاب باعتاب ہوا

کہ قضائے الٰہی جاری ہو چکی، اگر قبول کریگا ماجور ہو گا ورنہ مہجور ہو گا (دیکھو ہدیہ مہدویہ صفحہ ۱۲) شاید معترض کو مالیخولیا کا مرض لاحق ہے، بہکی بہکی باتیں کرتا رہتا ہے۔ چناچہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ خود امام علیہ السلام فرماتے ہیں بندہ نے اٹھارہ سال (یا بیس سال) تک اللہ کے حکم کو ہضم کرتا رہا (جسے معترض نے حکم عدولی کا نام دیا) پھر کہتا ہے مریدین کے اصرار و تقاضہ اور پاس خاطر سے دعویٰ کیا ہے، اب ناظرین خود فیصلہ کریں جب امامؑ نے مریدوں کے اصرار، تقاضہ اور ان کے پاس خاطر سے دعویٰ کیا ہے تو عدول حکمی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اور اگر معترض کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہونا تسلیم ہے اور اسکے باوجود دعوی نہ کرنے کی بناء پر بزعم خود عدول حکمی کا الزام لگایا جارہا ہے تو مریدوں کے اصرار، تقاضہ اور پاس خاطر سے دعویٰ کرنے کا الزام غلط ہو جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت مہدی موعودؑ کے دعویٰ سے پہلے بعض صحابہ کرامؓ امامؑ کو من جانب اللہ حضرتؑ کے مہدی موعود ہونے کا انکشاف ہوا، اور انہوں نے حضرت امامؑ سے اپنی معلومات کا ذکر کیا کہ ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ آپؑ ہی کی ذات مہدی موعودؑ ہے، تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے ذکر و فکر میں مشغول رہو، جب اس کا وقت آئے گا اللہ تعالیٰ خود ظاہر فرمادیگا۔ چنانچہ بی بی الہداتیؓ، بندگی میاں سلام اللہؓ، بندگی میاں یوسف سہیتؓ وغیرہ سے ایسی روایتیں آئی ہیں۔

حضرت بندگی میاں یوسف سہیت کی روایت میں تو یہ بھی صراحت ہے کہ "جب آپ کو اس کا یقین ہو گیا تو آپ نے امامؑ سے عرض کیا کہ آپ دعویٰ فرمائیں، بندہ اپنے معلومات کی حجت لوگوں کے سامنے پیش کریگا اور اگر حضرت دعویٰ نہیں فر ماتے تو چونکہ مجھ پر حق ظاہر ہو گیا ہے، تو میں اسکو تمام لوگوں کے سامنے پیش کر دوں گا۔ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اپنی حجت آپ پوری کریگا، ابھی اس کا وقت باقی ہے، اگر تم قبل از وقت اس کو ظاہر کرنا چاہو گے تو اللہ تمہاری زبان بند کر دیگا، چناچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ میاں یوسفؓ کی زبان بند ہو گئی (مطلع الولایت، شواہد الولایت وغیرہ)

یہ واقعات، مریدین کے اصرار اور تقاضہ پر دعویٰ کرنے کی غلط بیانی کی دلیل اور معترضین کے اعتراضات کی تردید ہیں۔ لیکن اگر کسی کو اصرار ہے کہ امامؑ نے صحابہؓ کے انکشافات کو سن کر دعویٰ کیا تو ہم پوچھتے ہیں کہ درج ذیل واقعات پر بھی وہ لوگ وہی رائے دیں گے اور اسی قسم کا فیصلہ صادر فرمائیں گے؟

(۱) روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو دوران سفر ایک راہب نے دیکھا اور لوگوں سے پوچھا وہ کون ہیں؟ لوگوں نے پوچھا کیوں؟ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ نبی ہونے والا ہے، لوگوں کے استفسار پر اس نے کہا کہ میں اس قافلہ کو دور سے دیکھ رہا تھا، میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر بادل سایہ کیا ہوا ہے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نبی ہو گا۔

(۲) جب رسول اللہ ﷺ کو پہلی وحی آئی اور آپؐ گھبرائے ہوئے گھر تشریف لا کر بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ سے فرمایا "زملوني زملوني" مجھے چادر اڑادو، مجھے چادر اڑاؤ، پھر حضرت خدیجہؓ کے پوچھنے پر آپؐ نے اپنے یہ تاثرات پیش کئے "إِنِّي خَشِيْتُ على نَفْسِي" مجھے اپنی جان کا ڈر ہے، حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی۔ اور فرمایا کہ آپ کا رب آپ کو ضائع نہیں کریگا، میں اپنے چچا ورقہ بن نوفل سے اس باب میں دریافت کروں گی، چونکہ وہ انجیل کے عالم تھے، اس لئے آپ نے ان سے پوری کیفیت بیان کی اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت حال کے بعد فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ وہی ناموس اکبر ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آیا تھا، تمہارے لئے خوشخبری ہے، یہ فرشتہ جس کے پاس بھیجا جاتا ہے وہ نبی ہوتا ہے۔ پھر فرمایا "کاش میں اس وقت زندہ رہتا جبکہ لوگ تم کو مکہ سے نکال دیں گے، تو رسول اللہ ﷺ نے تعجب سے فرمایا تھا "أو هم مخرجي" کیا وہ لوگ مجھے (مکہ سے) نکالدیں گے۔

کیا ان دونوں واقعات سے جن کو یہاں مختصرا بیان کیا گیا ہے کوئی دشمن رسول یہ کہہ سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ سن کر اپنے نبی ہونے کا دعویٰ فرمادیا، أستغر الله العظيم۔

(۳) اسی طرح بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کی رائے وخواہش کی بناء پر بعض اوقات احکام دئے ہیں، بلکہ اللہ نے بھی آیتیں نازل فرمائی ہیں، چناچہ تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ: عن عبد الله بن عمر ان بلالا كان يقول إذا اذن اشهد ان لا اله إلّا الله، حي على الصلوٰة، فقال عمر قل في اثرها اشهد ان محمدا رسول الله فقال رسول الله ﷺ قل كما قال عمر "یعنی عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بلال اذان میں اشهد ان لا اله إلّا الله کے بعد ہی حي على الصلوٰة کہا کرتے تھے، عمرؓ نے کہا کہ اشهد ان لا اله إلّا الله کے بعد اشهد ان محمدا رسول الله بھی کہو۔ رسول اللہ ﷺ نے بلال کو فرمایا "عمر جس طرح کہتے ہیں ویسا کہو۔ حالانکہ دوسری روایت سے ثابت ہے کہ اذان کے الفاظ کا تعین بتعلیم جبرئیلؑ ہوا ہے۔ گویا اس روایت کے نظر کرتے عمرؓ کی رائے سے جبرئیل کی تعلیم میں ترمیم واصلاح ہوئی ہے۔

نیز تفسیر کبیر بھی ہے: و كان المشركون يشربون الخمر وهي حلال لهم ثم ان عمر و معاذا ونفرا من الصحابة قالوا يا رسول الله افتنا في الخمر فانها مذهبة العقل ومسلبة للمال، فتنزل فيها قوله تعالٰى، يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ﴿البقرة:۲۱۹﴾ " مشرکین عرب شراب پیا کرتے تھے اور اس کو حلال جانتے تھے۔ حضرت عمر و معاذ اور صحابہؓ کی ایک جماعت نے رسول اللہ

ﷺ سے عرض کیا کہ آپؐ ہم کو شراب کی نسبت حکم دیجئے کیونکہ وہ عقل کو زائل اور مال کو ضائع کرنے والی ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی "اے محمد (ﷺ) لوگ تم سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہدو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ منافع بھی ہیں۔ لیکن ان کا گناہ ان کی منفعت سے بڑا ہے۔

تاریخ الخلفاء میں حضرت عمرؓ کی یہ روایت آئی ہے "میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کی بی بیوں کے روبرو نیک اور بد سبھی آتے جاتے ہیں آپ انہیں پردہ کا حکم دیتے تو اچھا ہوتا۔ پس اسی وقت آیت حجاب (پردہ کی آیت) نازل ہوئی۔

ان روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ احکام صحابہؓ رسول اللہ ﷺ کی خواہش پر نازل ہوئے ہیں۔ اگر معترض کا یہ بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے تو کیا یہاں بھی یہی کہا جائیگا کہ کلام اللہ کے بعض احکام صحابہؓ کرامؓ کی رائے اور خواہش پر نازل ہوئے ہیں، نعوذ باللہ شاید ہی کوئی کافر اور معاند اسلام و رسول اللہؐ یہ کہے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ بپاس خاطر اصحاب کرامؓ، احکام دیا کرتے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بھی ان ہی کی خواہش کے مطابق آیتیں نازل کرتا تھا۔ صحیح بات تو یہی ہے کہ نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ بات کہ حضور مہدی موعودؑ نے اپنے صحابہؓ کرامؓ کی خواہش اور اصرار پر اور ان کے پاس خاطر کیلئے مہدیت کا دعویٰ فرمایا ہے، دعویٰ کے وقت نہ خواہش صحابہؓ کا اظہار ہے اور نہ ان کی طرف سے دعویٰ پر اصرار۔ بلکہ جو دعویٰ ہوا ہے وہ اللہ کی قطعی اور تاکیدی حکم اور خطاب باعتاب پر ہوا ہے۔ اسپر مزید یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ میاں سید خوندمیرؓ اور تمام صحابہؓ کرامؓ جو کہ تین سو ساٹھ تھے اپنا عین مقصود جان کر پکارے "آمنا و صدقنا" اس کا جواب بس اتنا ہی ہے کہ ہر زمانے میں ہر خلیفۃ اللہ کے احکام پر مومنین کا طبقہ "آمنا و صدقنا" ہی کہتا آیا ہے۔

جن کے دلوں میں صداقت ایمانی اور بشاشت روحانی ہوتی ہے وہ اپنے مقتدا کی ہر بات پر "آمنا و صدقنا" ہی کہتے آئے ہیں قرآن میں بھی اسکی شہادت موجود ہے کہ مومنون کی شان یہ ہوتی ہے کہ ان کے زبان سے "سمعنا و أطعنا" ہی نکلتا ہے، لیکن جو کافر ہوتے ہیں یا منافق ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں "سمعنا و عصينا" ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔

نیز جو خالص مومن ہوتے ہیں وہ تو متشابہات پر بھی ویسے ہی ایمان لاتے ہیں جیسے کہ محکمات پر، اور کہتے ہیں "آمنا كل من عند ربنا" ہم ایمان لائے، سب اللہ کی جانب سے ہے۔ لیکن جن کے دلوں میں تیڑھا پن ہوتا ہے وہ تاویلات تلاش کرتے رہ جاتے ہیں، چناچہ جب مہدی موعودؑ نے دعویٰ فرمایا تو سب نے بلند آواز سے آمنا و صدقنا کہا۔

اللہ نے قرآن میں بھی یہی حکم دیا ہے "أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ" ﴿الأحقاف:۳۱﴾ اللہ کیطرف بلانے والے (کی دعوت کو) کو قبول کرو اور اسکی آواز پر لبیک کہو۔ پس حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ اور آپؓ کے ساتھ جو افراد تھے چونکہ وہ سب مومن تھے اسلئے انہوں نے خلیفۃ اللہ المہدی کے دعویٰ کا جواب مومنانہ شان سے "آمنا و صدقنا" کہہ کر دیا۔ کیوں کہ مومنین کا یہی آئین ہے اور عاشقین کا یہی دستور ہے۔

دائمی حضوری

(۱) ولی جس آن میں بھی حضوری حق کیلئے اپنے آپ میں توجہ کرے تو بغیر کسی کوشش کے دل میں حضور حق کی یاد داشتیں آنا شروع ہو جائیں۔

(۲) حضور دوام کی تعریف یہ ہے کہ وہ ولی سے ان معنوں میں کبھی منقطع نہ ہو جیسے بصیر (دیکھنے والے) سے بصارت (نظر) کسی لمحہ جدا نہیں ہو سکتی۔

ذکر کثیر

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں متعدد مقامات پر اپنے بندوں کو ذکر کثیر کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور بصیغۂ امر حکم صادر فرمایا ہے۔ یہ ضابطہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ امر کے صیغوں سے کوئی حکم دیتا ہے تو وہ بندوں کے حق میں فرض ہو جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ﴿البقرة:۴۳﴾۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اس حکم سے نماز اور زکواۃ فرض ہے۔

اسی طرح اللہ نے ذکر کے تعلق سے فرمایا ہے: فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ﴿النساء:۱۰۳﴾۔ اللہ کو یاد کرو کھڑے کھڑے بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے۔ جب یہاں بھی امر کا صیغہ ہے تو ضابطہ کی رو سے کیا ذکر اللہ فرض نہیں ہے؟؟

اس آیت کی تفسیر خازن میں اس طرح آئی ہے۔ وقال اكثر المفسرين المراد به المداومة على الذكر في غالب الاحوال لان الانســان قل ان يخلو من احدي هذه الثلاث الحالات وهي القيام والقعود و كونه نائماً على جنبه (تفسیر خازن صفحہ ۳۹۱) اکثر مفسرین نے کہا کہ اس سے مراد ذکر کی مداومت ہے غالب احوال میں کیونکہ انسان ان تین حالتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یعنی قیام قعود اور پہلو کے بل سوتے ہوئے۔ لیکن بغوی نے اپنی تفسیر میں بجائے اکثر المفسرین کے ''سائر المفسرین'' کے الفاظ لکھے ہیں۔ چنانچہ خازن کے حاشیہ پر جو بغوی کی تفسیر شائع ہوئی ہے صفحہ ۳۹۱ پر یہ لکھا ہے وقال سائر المفسرین ارادبہ المداومۃ تمام مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ اللہ نے اس سے ذکر کی مداومت مراد لی ہے۔ نیز اس سلسلے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے۔ قالت کان رسول اللہ یذکر اللہ عزوجل فی کل احیانہ آنحضرت ﷺ اپنے کل اوقات میں اللہ عزوجل کا ذکر کرتے تھے نیز حضرت ابو ھریرہؓ سے اسی صفحہ پر یہ روایت لکھی گئی ہے۔

إن رسـول الله صـلى الله عليه وسـلم قال: "من قعد مقعداً لم يذكر الله تعالى فيه، كانت عليه من الله تعالى ترة، وإنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ومن اضطجع مضجعاً لا يذكر الله تعالى فيه، كانت عليه من الله ترة وما مشـــى احد مشـــياً لا يذكر الله تعالى فيه، كانت عليه من الله ترة - اخرجه أبوداود والترة النقص۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی جگہ بیٹھا اور اس بیٹھک میں اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا تو اس پر اللہ کی جانب سے ترۃ ہے اور جو شخص کسی جگہ لیٹا اور اللہ کو یاد نہیں کیا تو اس پر اللہ کی جانب سے ترۃ ہے اور جو شخص کہیں چلا اور چلنے میں اللہ کو یاد نہیں کیا تو اس پر اللہ کی جانب سے ترۃ ہے اس کی تخریج ابو داؤد نے کی۔ ترۃ کے معنی نقص کے ہیں حکم خداوندی اور عمل خاتم المرسلین سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر ہر حال میں فرض ہے۔

اسی طرح اللہ نے سورۂ احزاب میں فرمایا۔ ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّـــهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿الأحزاب:۴۱﴾۔

اے ایمان والوں اللہ کو کثرت سے یاد کرو اس کے ذیل میں خازن میں لکھا ہے: قال ابن عباس لم یفرض اللہ عز و جلّ علی عباده فریضة إلّا جعل لها حداً معلوما ثمّ عذر اهلها في حال العذر غیر الذکر فانه لم یجعل له حداً ینتهي الیه و لم یعذر أحداً في ترکه إلّا مغلوباً علی عقله و امرهم به في الاحوال کلها فقال تعالٰی فاذکروا الله قیاماً و قعوداً و علی جنوبکم و قال تعالٰي اذکروا الله ذکراً کثیراً یعني بالیل و النهار في البرّ و البحرِ و في الصحة و السقم و في السرّ وّ العلانیة قیل الذکر الکثیر ان لا ینساه أبداً (تفسیر خازن صفحہ ۲۱۸) ابن عباس نے کہا ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں پر کوئی فرض عائد کیا تو اس کی ایک معلوم حد بھی رکھی پھر عذر کی حالت میں اس کے عذر کو قبول بھی کیا سوائے ذکر کے کہ اللہ نے اس کے لئے نہ کوئی حدرکھی اور نہ اس کے ترک پر کسی کو معذور قرار دیا سوائے دیوانے کے۔ اس نے کل احوال میں ذکر کرنے کا لوگوں کو حکم دیا اس طرح کہ اللہ کا ذکر کرو کھڑے ہوئے‘ بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے اور اللہ نے فرمایا اللہ کو کثرت سے یاد کرو یعنی رات میں دن میں خشکی میں سمندر میں‘ صحت میں بیماری میں‘ پوشیدہ طور پر اور علانیہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذکر کثیر یہ ہے کہ بندہ کبھی اللہ کو نہ بھولے۔

پھر وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿الأحزاب:۴۲﴾ کے ذیل میں لکھا ہے: فیه اشارة الي المداومة لان ذکر الطرفین یفهم منه الوسط ایضاً۔ اس میں مداومت (ہمیشگی) کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ جب طرفین کا ذکر ہو تو وسط بھی اس میں مفہوم ہو جاتا ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے بحکم خدا اور بحکم کتاب خدا ذکر اللہ کو فرض فرمایا کہ ہر مرد وزن پر اللہ کو یاد کرنا فرض ہے۔ نیز آپ نے سب اذکار میں سے ذکر خفی کی تلقین فرمائی ہے۔ کیوں کہ ایک تو یہ کہ اس میں اخلاص کامل پایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ریا کے شائبہ سے بھی ذاکر بچ جاتا ہے تیسرا یہ کے جب ذکر میں زبان اور ہونٹ نہ ہلیں تو ایسا ذکر ہر پاک‘ ناپاک‘ محتلم‘ حائض اور جنبی تک کر سکتا ہے۔ کیوں کہ ذکر خفی جو نفی واثبات پر مشتمل ہے پاس انفاس کے ساتھ کیا جاتا ہے ہر وقت ہر حالت ہر مقام پر اور ہر کام کرتے ہوئے یہ ذکر کیا جاتا ہے۔

(نوٹ): نفس سے صرف ناک ہی مراد نہیں ہے بلکہ وہ سارے اعضاء میں جاری وساری ہے

واضح ہو کہ ذکر کی کئی قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ (۱) ذکر لسانی (۲) ذکر جہری (۳) ذکر قلبی (۴) ذکر روحی (۵) ذکر سرّی (۶) ذکر خفی۔ ان تمام اذکار میں حضرت مہدی علیہ السلام نے صرف ذکر خفی کی تعلیم دی ہے۔ اور یہ فرمایا ”اوروں کی انتہا بندے کی ابتداء ہے“

ذکر اللہ کو اکبر الفروض بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ جملہ فرائض پر ذکر اللہ حادی ہے بلکہ جملہ فرائض کی جان، ذکر اللہ ہی ہے اگر اللہ کی یاد نہ ہو تو نہ نماز نہ روزہ نہ زکواۃ اور نہ حج ان سب عبادات میں اللہ کی یاد لازمی اور ضروری ہے۔ نماز کے تعلق سے

تو اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا۔ اقم الصلوٰۃ لذکری۔ نماز کو قائم کر میری یاد کے لئے۔ روزہ میں بھی اللہ کی یاد ضروری ہے اگر اللہ کی یاد نہ ہو تو وہ فقط بھوک اور پیاس ہے۔ زکواۃ میں بھی اللہ کے حکم کو یاد کرنا ضروری۔ یا تو زکواۃ کی رقم نکالتے وقت یا زکواۃ کی رقم دیتے وقت زکواۃ کی نیت ضروری ہے۔ مہدویہ کے پاس تو زکواۃ دیتے وقت بھی اللہ نے دیا ہے کہتے ہیں۔

عمرہ اور حج میں تو تلبیہ کے بغیر احرام مکمل نہیں ہوتا نیز اللہ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا ولا تکن من الغافلین۔ اور تو غافلوں سے مت ہو جا اس سے معلوم ہوا کہ غفلت منھی عنہ ہے یعنی غفلت سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اللہ سے غافل نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ ہمیشہ اللہ کو یاد کیا جائے۔ مومن کی یہ شان ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ سے غافل ہو۔ جس لمحہ وہ اللہ سے غافل ہوتا ہے اس لمحے وہ کافر ہو جاتا ہے کیوں کہ غفلت کا فر کا شعار ہے جیسا کہ شعر ہے۔

ہر آں کو غافل از وے یک زماں است در آن دم کافر است اما نہاں است

ہر وہ شخص جو ایک دم کے لئے بھی اللہ سے غافل ہے۔ اس دم میں وہ کافر ہے لیکن پوشیدہ طور پر

(۱) ذکر اللہ سے انسان کو اطمینان قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللَّـهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿رعد:۲۸﴾

(۲) ذکر اللہ سے انسان کے دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّـهِ ﴿الحدید:۱۶﴾ ترجمہ: کیا ایمان لانے والوں کیلئے وہ وقت نہیں آیا کہ جو قرآن نازل ہوا ہے اس کے سننے کے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں۔

(۳) جس آدمی کے دل پر شیطان غلبہ پالیتا ہے وہی اللہ کے ذکر کو بھول جاتا ہے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے: اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ﴿مجادلہ:۱۹﴾ ترجمہ: ان پر شیطان نے قبضہ کر لیا ہے اور اللہ کو یاد کرنا ہی بھلا دیا ہے۔

(۴) ذکر اللہ سے اعراض کرنے پر اللہ کا عذاب آتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے: وَمَن يُعْرِضْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿جن ۱۷﴾ ترجمہ: اور جو شخص اپنے رب کے ذکر سے منھ پھیرے گا وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کریگا۔

(۵) ذکر اللہ سے غافل اشخاص کی پیروی نہیں کرنی چاہئے چنانچہ اللہ فرماتا ہے: وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ﴿الکھف ۲۸﴾ ترجمہ۔ اور اس کی بات کو نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کی اتباع کرتا ہے تو آپ بھی اس سے اعراض کیجئے۔

دوسری آیت میں بھی تقریباً یہی حکم ہے۔

(٦) فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿النجم ٢٩﴾ ترجمہ: اور جو ہماری یاد سے منھ پھیر لیا اور صرف دنیوی زندگی کا خواہاں ہو، اس سے اعراض کیجئے۔

ذکر اللہ سے اعراض کرنے والے کو معیشت کی تنگی لاحق ہوتی ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے

(٧) وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا ﴿طٰہٰ ١٢٤﴾ ترجمہ: جو شخص میری یاد سے منھ پھیرے گا، تو اس کیلئے تنگی کا جینا ہو گا۔

اوپر درج کی ہوئی آیتوں کے مضامین سے معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی بآسانی معلوم کر سکتا ہے کہ ذکر اللہ کس قدر اہم اور کتنا ضروری ہے اسی بناء پر حضرت مہدی علیہ السلام نے ولایت کے اعلیٰ مرتب حاصل کرنے والوں کے لئے ذکر اللہ کو فرض فرمایا۔ قرآن کے علاوہ احادیث کے ذخیرہ میں ذکر اللہ کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں بے شمار حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ذوالکفل علیہ السلام

ذوالکفلؑ کا ذکر قرآن شریف میں دو جگہ آیا ہے اور وہ بھی پیغمبروں کے ساتھ چنانچہ اللہ فرماتا ہے

(١) وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُم مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿انبیاء ٨٥،٨٦﴾ اور یاد کرو اسماعیل اور ذوالکفل کو بھی۔ یہ سب صبر کرنے والے تھے ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ بلا شبہ وہ نیکو کار تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی برس قید میں رہے اور اللہ کیلئے یہ محنت اُٹھائی۔ بعض لوگوں نے ان کے نبی ہونے پر شک کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ محض ایک مرد صالح تھے۔ لیکن اللہ نے اپنے کلام میں دو جگہ پیغمبروں کے ساتھ نام لیکر ذکر کیا ہے تو ان کے نبی ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

(٢) وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿ص:٤٧﴾ اور یاد کرو اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو۔ یہ سب خوبیوں والے اور نیک تھے۔

ذوالنون علیہ السلام

اصل میں ذوالنون ہے عربی قاعدہ کے لحاظ سے مفعولی حالت میں ذاالنون ہو جاتا ہے۔ نون کے معنی مچھلی کے ہیں ذوالنون کے معنی ''مچھلی والا'' ہوتے ہیں۔ قرآن شریف میں ذوالنون کا ذکر ایک جگہ پر آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔
وَذَا النُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ---- ﴿الأنبیاء:۸۷﴾ ترجمہ: اور یاد کرو مچھلی والے (یونس) کو بھی جب وہ اپنی قوم سے، ایمان نہ لانے کی بناء پر ناراض ہو کر غصے کیحالت میں چلے گئے اور سمجھا کہ ہم ان کو پکڑ نہ سکیں گے پھر اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے اور بیشک میں قصوروار ہوں۔ تو ہم نے ان کی دعا سن لی اور ان کو غم سے نجات دی۔ اور اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یونسؑ کی امت نے آپ کی بات نہیں مانی، آپ وحی الٰہی کا انتظار کئے بغیر ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ راستہ میں دریا ملا۔ وہاں کشتی تھی۔ آپ اس میں سوار ہو گئے۔ درمیان میں کشتی رک گئی۔ ملاّح نے کہا کہ اس میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ آپ نے کہاہاں وہ میں ہی ہوں پھر بھی قرعہ اندازی ہوئی آپ کا نام تین مرتبہ نکلا۔ آپ کو دریا میں ڈال دیا گیا۔ فوراً اللہ کے حکم سے مچھلی آپ کو نگل گئی آپ نے دعا کی۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی مچھلی نے سمندر کے کنارے آپ کو ڈال دیا۔ کہتے ہیں کہ صبح میں مچھلی آپ کو نگلی تھی شام میں ڈال گئی بعض کہتے ہیں تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ بعض کہتے ہیں سات دن اور بعض کہتے ہیں۔ ۴۰ دن۔ لوگ آپ کو ڈھونڈ ھتے تھے۔ عذاب کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ پھر وہ قوم ایمان لائی اور اللہ نے اس عذاب کو ٹال دیا۔

ذوالقرنین

حضرت رسول اللہ ﷺ سے آپ کی نبوت کی آزمائش کی غرض سے جو تین سوالات کئے گئے تھے اس میں کا ایک سوال ذوالقرنین کے تعلق سے تھا۔ چنانچہ اللہ نے اس کا جواب بطور وحی اس طرح دیا ہے، فرماتا ہے:" وَيَسْـأَلُونَكَ عَن ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَـأَتْلُو عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا -----الخ ﴿الکھف:۸۳﴾ اس جواب کی تفصیل اس طرح قرآن میں آئی ہے، یعنی یہ لوگ آپؐ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجئے کہ میں ان کا کسی قدر حال تم پر پڑھکر سناتا ہوں، ہم نے انکو روئے زمین پر حکومت دی تھی اور ہم نے انکو ہر قسم کا سامان دیا تھا، پھر انھوں نے رخت سفر باندھا، یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ پر پہنچے تو انھوں نے آفتاب کو ایک کیچڑ کے چشمے میں ڈوبتا ہوا دیکھا (یعنی ایسی جگہ، جہاں نہ آدمی کا گذر ہو سکتا تھا اور نہ کشتی کا) اور وہیں انھوں نے ایک قوم دیکھی۔ ہم نے کہا۔ اے ذوالقرنین، یا تو ان کو سزا دو یا ان کے معاملہ میں خوبی اختیار کرو (اسلئے کہ عادل حاکموں کا یہی برتاؤ ہوتا ہے کہ وہ برے اور گمراہ لوگوں کو سزا دیتے ہیں اور اچھوں کی قدر کرتے ہیں) ذوالقرنین نے کہا کہ جو ظلم (کفر) کریگا ہم اسے سزا دیں گے، پھر جب وہ اپنے رب کی طرف لوٹیگا تو وہ اس کو سخت سزا دیگا اور جو ایمان لائیگا اور نیک کام کریگا، تو اس کو بدلے میں اچھائی ملیگی، اور ہم اسکو اپنے برتاؤ میں آسانی دیں گے۔ پھر انھوں نے ایک اور سامان سفر تیار کیا یہاں تک کہ جب وہ سورج طلوع ہونے کے مقام پر پہنچے تو آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے ہوئے دیکھا جن کیلئے ہم نے سورج کے اس طرف کوئی آڑ نہیں بنائی تھی (شاید وہ قوم کوئی جنگلی تھی کہ ان کو مکان وغیرہ بنانا نہیں آتا تھا) یہ حقیقت ایسی ہے اور ذوالقرنین کے پاس جو سامان تھا اس کی ہم کو پوری خبر تھی، پھر انھوں نے ایک اور سامان سفر کیا یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے بیچ پہنچے تو اسکے ورے ایسے لوگوں کو دیکھا جو کسی بات کو سمجھنے کے قابل نہیں تھے (زبان بھی مختلف تھی اور سمجھ میں بھی کچے تھے) ان لوگوں نے کہا اے ذوالقرنین، یہ یاجوج وماجوج (اس) سرزمین میں فساد مچاتے رہتے ہیں سو کیا ہم آپ کیلئے (بذریعہ چندہ) کچھ خرچ مقرر کردیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنادیں، ذوالقرنین نے کہا جو کچھ مال اللہ نے مجھے دیا ہے وہ بہت ہے، تم محنت میں میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے بیچ ایک موٹی دیوار بنادوں گا، تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ، یہاں تک جب انھوں نے پہاڑوں کے درمیان کے حصہ کو ان سے برابر کردیا تو کہا دھونکو یہاں تک کہ جب وہ لال انگارہ کردیا گیا، کہا اب میرے پاس تانبہ لاؤ۔ پگھلا کر اس پر ڈالدوں، پھر نہ وہ چھیڑ سکتے تھے اور نہ نقب لگا سکتے تھے، کہا یہ میرے رب کی مہربانی ہے، جب میرے پروردگار کا وعدہ آپہنچے گا تو اس کو ڈھا کر زمین کے برابر کردے گا۔ اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔ (یہ ترجمہ ہے آیت نمبر ۸۳ سے آیت نمبر ۹۸ تک)

ذوالقرنین کون تھے ان کا نام کیا تھا۔ ان کو ذوالقرنین کیوں کہا گیا۔ اس کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام ''موزبان'' ہے اور بعض نے اسکندر بتایا ہے اور بعض ابو کرب۔ ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں بھی روایتوں میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے سورج کے طلوع و غروب ہونے کی دونوں جگہوں کو دیکھا۔ اس لئے ان کا نام ذوالقرنین ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ فارس اور روم (دو عظیم الشان سلطنتوں) کے بادشاہ تھے اس لئے یہ نام دیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے نور اور ظلمت کو دیکھا اس بناء پر یہ نام ملا۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے گیسو لمبے تھے۔ جن کو وہ عمامہ کے اندر کر لیتے تھے۔ اس لئے ذوالقرنین نام پڑ گیا۔

پھر اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ نبی تھے یا ولی۔ بعض کے پاس یہ ولی تھے، بعض کے پاس یہ نبی تھے۔ دلیل ان کی یہ ہے کہ ان کو خطاب خداوندی ہوا ''يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ'' اور خطاب خداوندی نبی کو ہوتا ہے۔ لیکن اکثریت کا اس بات پر اتفاق کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھے۔ اللہ سے محبت کرتے تھے اور اللہ کے دین کا کام کرتے تھے تو اللہ نے بھی ان کو پسند کیا۔

اہل تصوف کے پاس ذوالقرنین سے مراد یا تو قلب ہے یا مرشد کامل۔ یاجوج ماجوج سے مراد ہوا جس وہمیہ اور وساوس خیالیہ ہیں۔ ارض سے مراد بدن ہے، سورج سے مراد روح۔ دیوار سے مراد قانون شرعی۔ مال سے مراد علوم الٰہیہ، قوت سے مراد طاعت اور عمل، وعدہ کے وقت سے مراد یا تو موت کا وقت ہے یا قیامت کا۔

ظاہر کے اعتبار سے یاجوج وماجوج کونسی قوم ہے۔ انسانوں کی یا جنوں کی یا دونوں کے مابین کوئی مخلوق ہے اس کا فیصلہ اب تک نہیں ہو سکا۔

اسی طرح وہ قوم اب کہاں ہے، قطعیت کے ساتھ کہا نہیں جا سکتا۔ اور وہ دیوار (سدّ) جو ذوالقرنین نے بنائی وہ کہاں ہے۔ اس کا بھی قطعی علم نہیں ہے۔ البتہ یہ تمام باتیں چوں کہ اللہ کے کلام (قرآن) میں آئی ہیں اس لئے ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ چوں کہ نصّ قطعی سے ثابت ہیں ان باتوں کا انکار کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ نزول عیسیٰؑ کے بعد جب دجّال کا قتل عیسیٰؑ کے ہاتھوں ہو گا تو یہ قوم دریا کے موجوں کی طرح ابل پڑے گی اور وہ اتنی کثیر التعداد ہو گی کہ دنیا والے اس کا مقابلہ نہ کر پائیں گے، وہ لوگ دیوار توڑ کر باہر نکل پڑیں گے۔ حضرت مسیحؑ بحکم خدا، اللہ کے خاص بندوں کو لیکر کوہ طور پر چلے جائیں گے اور یاجوج وماجوج کی ہلاکت کے لئے اللہ سے دعا کریں گے اللہ کی جانب سے یاجوج وماجوج پر ایک غیبی وبا مسلط ہو گی جس کے نتیجے میں وہ سب مر جائیں گے۔

ذبیحہ

ذبیحہ: حلال کرنا (صحیح طریقہ سے گلا کاٹنا)

مسلمان اور کتابی یعنی اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا ذبیحہ حلال ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔"وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴿المائدۃ:۵﴾"یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔
لیکن مرتد، مجوسی، بت پرست اور محرم (احرام باندھا ہوا شخص) کا ذبیحہ (اس کے ہاتھ کا کٹا ہوا) جائز نہیں ہے۔ اس کا گوشت کھانا نہیں چاہیئے، اور اگر ذابح (حلالی) کرنے والا جان بوجھ کر جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر نہیں کہا، تو وہ مردار ہے اس کا گوشت نہیں کھانا چاہیئے۔ اور اگر وہ تسمیہ کہنا بھول گیا، حالانکہ اس کے دل میں تھا تو وہ گوشت کھایا جاسکتا ہے (یہ بعض کے پاس ہے)۔ ذبح کا مقام حلق اور لبّہ کے درمیان ہے یعنی حلق اور سینے کے اوپر کا حصہ۔

ذبح کرنے میں جو رگیں کاٹی جاتی ہیں، وہ چار ہیں، (۱) حلق، سانس کی نالی (۲) مریٔ، کھانے کی نالی (۳، ۴) ودجان، خون کی دونالیاں، اگر یہ کٹ جائیں تو کھانا حلال ہے۔ ان میں سے اکثر بھی کٹ جائیں تو گوشت حلال ہے۔

ذبح ہر تیز دھاردار چیز سے ہے، جس سے خون بہہ نکلے، سوائے قائم دانت اور قائم ناخن کے۔ اور مستحب یہ ہے کہ چھری، چاقو وغیرہ کو تیز کیا جائے۔

اور اگر ذبح اس طرح کیا جائے کہ سر علاحدہ ہو جائے تو وہ مکروہ ہے، اور اگر ذبح گردن کی طرف سے کیا جائے اور وہ زندہ ہو تو، پھر اسکی رگیں کاٹ دی جائیں تو جائز ہے، مگر مکروہ ہے۔ اور اگر اس دوران یعنی اس کی رگیں کاٹنے سے پہلے وہ مر جائے، تو اس کا گوشت نہ کھایا جائے۔

اونٹ میں مستحب نحر ہے اور اسکو ذبح کیا جائے تو جائز ہے، مگر مکروہ ہے۔ نحر سے مراد اونٹ کھڑا کر کے اس کے سینے کے بالائی حصہ پر تیز دھاردار چیز سے مارنا، اونٹ کیلئے نحر ہی افضل ہے۔

جیسا کہ قرآن میں آیا ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿الکوثر:۲﴾ پس آپ اپنے پروردگار کیلئے نماز پڑھئے اور قربانی دیجئے۔

گائے اور بکری وغیرہ میں ذبح سنت ہے، ان کو لٹا کر ذبح کرنا چاہیئے۔ ہر صورت میں جانور کا منہ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے۔ گائے کیلئے ذبح کا حکم اللہ نے قرآن میں دیا ہے۔"إِنَّ اللَّـهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا بَقَرَةً" ﴿البقرۃ:۶۷﴾ اللہ نے تم کو حکم دیا کہ گائے کو ذبح کرو۔ اور بکریوں کیلئے اللہ نے حکم دیا "وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ" ﴿الصافات:۱۰۷﴾ اور ہم نے ایک ذبح

عظیم سے ان کو چھڑالیا اور بچالیا۔ اگر کسی نے اونٹنی نحر کی یا گائے یا بکری ذبح کی پھر اس کے پیٹ میں مردہ بچہ پایا تو وہ بچہ نہ کھایا جائے، یہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، اس لئے کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا۔ "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ" ﴿المائدة:٣﴾ تم پر مری ہوئی چیز حرام کردی گئی ہے۔ اور جنین پیٹ میں مر گیا ہے تو اس پر بھی (مردہ) کا اطلاق ہوگا، اور اگر جنین زندہ نکلا، پھر مر گیا تو وہ کھایا نہیں جائیگا۔ لیکن اگر وہ زندہ نکلا تو اسکو بھی ذبح کردینا چاہئے۔

دانتوں اور پنجوں سے شکار کرنے والے تمام پرندوں اور جانوروں کا گوشت حرام ہے، دانت سے شکار کرنے والے حیوانوں میں شیر، چیتا، بھیڑئے، لومڑی، کتا، ہاتھی، تیندوا، بچھو، بلی اور یربوع، چوہے کے مانند ایک جانور جس کی اگلی ٹانگیں چھوٹی اور پچھلی بڑی اور دم لمبی ہوتی ہے یہ سب حرام ہیں۔

حضرت ابو حنیفہؒ کے پاس کوے کے بارے میں اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ "ولا باس باكل غراب الزرع" یعنی وہ کوا جو دانے کھاتا ہے اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن "الغراب الابقع" کو نہیں کھانا چاہئے۔ کھیتی کے کوے کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ چونکہ دانے کھاتا ہے اور مردار نہیں کھاتا، اسلئے اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

غراب ابقع کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں، ایک قسم وہ جو دانے چگتا ہے اور مردار نہیں کھاتا، وہ مکروہ نہیں ہے، دوسرا کوا وہ جو صرف مردار کھاتا ہے، اسی کو غراب ابقع کے نام سے صاحب قدوری نے یاد کیا ہے، یہ مکروہ ہے، اور تیسری قسم کا کوا وہ ہے جو دانے بھی چگتا ہے اور مردار بھی کھاتا ہے یہ ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور حضرت ابو یوسفؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔ مہدویہ کے پاس چونکہ عزیمت وعالیت پر بلا تاویل عمل کیا جاتا ہے، اسلئے ہر قسم کا کوا حرام ہے۔

گوہ (ضب) کا کھانا مکروہ ہے، اسی طرح بجو اور حشرات الارض کا کھانا ناجائز ہے اور گدھا، خچر کا گوشت بھی جائز نہیں ہے، گھوڑے کا گوشت حضرت ابو حنیفہؒ کے پاس مکروہ ہے، خرگوش کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔

آدمی اور سور کو ذبح بھی کیا جائے تو ان کا گوشت حرام ہے۔ آدمی کا اس کی عظمت اور حرمت کے اعتبار سے اور سور اس لئے کہ اللہ نے اس کو حرام قرار دیا ہے، پانی کے جانوروں میں سے صرف مچھلی جائز ہے اس میں بھی جو مر کر اوپر آجاتی ہے وہ مکروہ ہے، بام مچھلی کھائی جاسکتی ہے۔

رایات سود

معترضین مہدویہ، حضرت ثوبانؓ سے مروی حدیث کا غلط مطلب یا غلط تاویل کرتے ہوئے حضرت مہدی موعودؑ کی مہدیت کے دعویٰ پر اعتراض کرتے ہیں، چنانچہ ذیل میں حدیث کو پیش کرتے ہوئے اسکی صحیح توجیہ کی جاتی ہے۔ تاکہ حدیث کا صحیح مصداق اور مطلب سمجھ میں آسکے۔

عَنْ ثَوْبَانَ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم "يَقْتَتِلُ عِنْدَ كَنْزِكُمْ ثَلاَثَةٌ كُلُّهُمُ ابْنُ خَلِيفَةٍ ثُمَّ لاَ يَصِيرُ إِلَى وَاحِدٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَطْلُعُ الرَّايَاتُ السُّودُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ فَيَقْتُلُونَكُمْ قَتْلاً لَمْ يُقْتَلْهُ قَوْمٌ" ثُمَّ ذَكَرَ شَيْئًا لاَ أَحْفَظُهُ فَقَالَ "فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَبَايِعُوهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ فَإِنَّهُ خَلِيفَةُ اللَّهِ الْمَهْدِيُّ (ابن ماجہ) ترجمہ۔ ثوبان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تمہارے کنز کے پاس (کنز کیلئے) تین آدمی کارزار کریں گے۔ وہ تینوں خلیفے کے بیٹے ہوں گے۔ پس وہ کنز کسی ایک کا بھی نہ ہو گا۔ پھر سیاہ جھنڈے مشرق کی طرف سے طلوع ہوں گے، وہ تمہیں ایسا قتل کریں گے کہ کسی قوم نے دوسری قوم کو اس طرح قتل نہ کیا ہو گا۔ پھر کچھ ذکر کیا جو مجھے یاد نہیں ہے۔ پھر کہا کہ جب تم اسے دیکھو تو اس سے بیعت کرو اگرچہ تم کو برف پر سے رینگنا ہو کیونکہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔

اس حدیث میں چند امور قابل غور ہیں۔

(۱) ایک خلیفہ کے تین بیٹوں کا کنز کیلئے لڑنا۔ کنز کے معنی اس چیز کے ہیں جس سے مال کی حفاظت کی جاتی ہے۔ عام طور پر اسے خزانہ بھی کہا جاتا ہیں۔ چنانچہ حدیث قدسی میں آیا ہے اللہ نے فرمایا "کُنْتُ کَنزا مخفیا فَاحببْتَ ان اُعرف فَخَلَقْتُ الخلقَ" یعنی اللہ نے فرمایا میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، پس میں نے چاہا کہ میری پہچان ہو، پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خزانہ صرف اس چیز یا جگہ کا نام نہیں ہے جہاں مال، دولت، سونا، چاندی چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ بلکہ ہر وہ قیمتی چیز ہے جسکی حفاظت منظور ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ذات وحدت کو خزانہ قرار دیا ہے تو اس سے کم تر چیز یعنی خلافت کیلئے بھی کنز کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جب خلیفے کے تینوں بیٹے ایک چیز کیلئے لڑ رہے ہیں تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جھگڑا محض خلافت کیلئے ہی ہو گا۔

چنانچہ تاریخ ببانگ دہل کہتی ہے کہ "حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، آپ کی اولاد نے خلافت کیلئے جدوجہد فرمائی ہے۔ تاریخ داں حضرات سے یہ بات بھی مخفی نہ ہو گی کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ہی امیر معاویہ نے خلافت کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔ بہر کیف امام حسنؓ نے خلافت حاصل کی مگر اپنی زندگی میں ہی آپ کو دستبردار ہونا پڑا اور خلافت امیر معاویہ نے

حاصل کرلی۔

دوسرے امام حسینؓ نے خلافت کیلئے جدوجہد کی۔ پہلے کوفیوں نے ساتھ دینا کا وعدہ کیا پھر مکر گئے، حضرت امام حسینؓ نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر آپؓ کربلا کے واقعہ میں شہید کر دئے گئے۔ اسی طرح مختار نے جو بنی امیہ سے مقابلہ کیا وہ محمد بن حنفیہ سے منسوب ہو گا کہ مختار ان کو مہدی سمجھتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ خلافت ان کو حاصل ہو۔ لیکن مختار مارا گیا۔ اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے محمد بن حنفیہ کو کہلا بھیجا۔ قد قتل الله الكذاب الذى كنت تدّعي نصـــرته و اجمع عليَّ اهل العراقين فبايع لي (طبقات ابن سعد) تحقیق کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے کذاب کو قتل کرادیا جسکی مدد کا تم کو دعوی تھا، عراق عرب اور عراق عجم کے مسلمان میری خلافت پر متفق ہو گئے ہیں۔ اب تم بھی میری بیعت کرو۔

(۲) اور خلافت کا ان میں سے کسی کو نہ ملنا۔ پس اوپر کے بیان سے ثابت ہو گیا کہ حضرت علیؓ کے تینوں بیٹوں نے خلافت کیلئے بڑی سخت جدوجہد کی، یہاں تک کہ قتال بھی کرنا پڑا۔ لیکن ان تینوں میں سے کسی کے ہاتھ خلافت نہ آئی۔

(۳) پھر مشرق کی جانب سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے، بنی عباس کی خلافت کا ظہور اس پیش گوئی کا مصداق ہے۔ اس تحریک کا آغاز خراسان سے ہوا۔ خراسان عرب کے مشرق میں ہے، سیاہ جھنڈے حکومت عباس کا شعار رہا کئے ہیں۔ بنی عباس کے حامیوں نے بنی امیہ کو چن چن کر قتل کیا۔

(۴) پھر راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد کچھ ذکر کیا گیا لیکن میں اسکو یاد نہ رکھ سکا۔

(۵) اسکے بعد " فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَبَايِعُوهُ۔ جب تم اسکو دیکھو تو اسکی بیعت کرو" کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن یہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ کس کو دیکھو اور کس کی بیعت کرو۔ یعنی "ہ" جو ضمیر ہے اس کا مرجع نہیں ہے۔

(٦) الفاظ حدیث میں نہ مہدی کا ذکر ہے اور نہ مہدی کا مشرق سے نکلنا اور نہ ان کے ساتھ سیاہ جھنڈوں کا رہنا ثابت ہے۔

البتہ حاکم اور ابو نعیم کی روایت سے متروکہ عبارت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے، "ثم يجيءُ خليفة الله المهدي، فاذا سمعتم به فأتوه فَبَايِعُوهُ ---الى آخره۔ پس اس چھوٹے ہوئے فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "بَايِعُوهُ" میں جو ضمیر 'ہ' ہے اس کا مرجع خَلِيفَةُ اللَّهِ الْمَهْدِيُّ ہے۔

(۷) واضح ہو کہ لفظ "ثم" طلوع رایات اور ظہور مہدی کے درمیان میں آیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "طلوع

رایات" کے بعد "مہدی کا ظہور" ہو گا۔ "رایات کے ساتھ" نہیں۔ اور "ثم" تراخی بعیدہ کیلئے آتا ہے یعنی ایک لمبے عرصے کے بعد۔

چنانچہ اللہ فرماتا ہے "ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ﴿البقرة:۲۸﴾ "یعنی اللہ تم کو موت دیتا ہے پھر تم کو زندہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں موت دینے کے بعد قیامت میں اٹھاتا ہے، مارنے اور اٹھانے کے درمیان ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے حدیث کا یہ فقرہ بھی حضرت امامنا سید محمد جونپوری مہدی موعودؑ کے حسب حال ہے اس لئے کہ خلافت عباسیہ کی تحریک کے تقریباً سو سال کے بعد آپؑ کی ولادت ہوئی ہے۔ جب ہزاروں سال کیلئے لفظ "ثم" آسکتا ہے جیسا کہ اللہ نے قرآن میں خود فرمایا ہے تو سات سو سال بعد مہدی کیلئے " ثم" کا لفظ کس طرح حارج ہو سکتا ہے۔

(۸) حدیث میں مہدی علیہ السلام کیلئے "خَلِيفَةُ اللَّهِ" کا لفظ مذکور ہے، یہ بھی آپؑ کے حسب حال ہے، کیوں کہ خدا کے خلیفوں اور انبیاء کے صفات آپؑ میں پائے جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مہدی علیہ السلام سے قبل کی جن علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے (وہ حضرت مہدی علیہ السلام سے متعلق نہیں ہیں) بلکہ ان کا ظہور ہو چکا تھا، اسی وجہ سے شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان علامات کو مہدی عباسی سے متعلق کرنا پڑا، چنانچہ لکھا ہے۔

"مراد از مہدی خلیفہ بنی عباس است نہ کہ امام مہدی کہ در آخر الزماں ظہور نماید" (ازالۃ الخفاء، مقصد اول، فصل پنجم) یعنی اس حدیث میں مہدی سے مراد خلیفہ بنی عباس ہے، نہ کہ امام مہدیؑ جن کا ظہور آخر زمانے میں ہو گا۔

بہر حال اس حدیث سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث کی بناء پر استدلال کرنا کہ امام مہدی علیہ السلام کے ساتھ کالے جھنڈے ہوں گے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بیان کے تحت بھی صحیح نہیں ہے۔

اب رہی وہ حدیث جو امام احمد بن حنبل اور بیہقی نے ثوبانؓ سے روایت کی ہے-قال قال رسول الله ﷺ اذا رايتم الرّايات السود قد جاءت من قبل خراسان فاتوها فان فيها خليفة الله المهدي (اشعۃ اللمعات، جلد رابع)
ترجمہ۔ ثوبانؓ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کالے جھنڈوں کو دیکھو کہ خراسان کی طرف سے آئے ہیں ان کے پاس آؤ، کیونکہ ان میں اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔

معترضین نے ضمیر "ھا" کا مرجع جھنڈوں کو قرار دیا ہے، جو غلط ہے۔ اس لئے کہ عربی قاعدہ کی رو سے ضمیر کا مرجع اسم قریب ہی ہوتا ہے۔ پس روایت میں خراسان کے بعد "فاتوھا" آیا ہے، پس "ھا" کا مرجع خراسان ہی ہونا چاہئے جو کہ

"ھا" کے قریب ہے نہ کہ رایات سود جو کہ اسم بعید ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ خراسان تو مذکر ہے، اسکی ضمیر "ھا" مونث کیسے ہو سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عربی میں قصبہ، شہر اور ملک کیلئے ضمیر "ھا" ہی استعمال کرتے ہیں۔

(۹) فإذا رایتموھا کے معنی صرف دیکھنے کے ہی نہیں آتے۔ بلکہ عربی میں "جانتے اور سننے" کیلئے رؤیت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا "أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ"۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا۔ حالانکہ اصحاب فیل کا واقعہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے پہلے کا ہے۔ اس لحاظ سے "أَلَمْ تَرَ" کا یہ مفہوم ہوگا۔ کیا آپ نے جانا نہیں، کیا آپ نے سنا نہیں۔

چنانچہ صاحب مدارک نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے۔ سمعت الاخبار به متواتراً۔ اس سے متعلق آپ نے متواتر خبریں سنی ہیں۔ (تفسیر مدارک)

نیز صاحب مواہب علیہ نے اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔ "آیا ندانستی کہ چگونہ کرد پروردگا تو۔ کیا آپ نے نہیں جانا کہ آپ کے پروردگار نے کیا کیا۔

پس مذکورہ حدیث میں "إِذَا رَأَيْتُم الرَّايَاتُ السُّوْد" کے یہ معنی ہوں گے کہ جب تم سنو یا جان لو کہ خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے آئے ہیں۔، تو تم خراسان کی طرف جاؤ، اس لئے کہ خراسان میں مہدی، اللہ کے خلیفہ کا ظہور ہوگا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام مہدیؑ کی ذات سے کالے جھنڈوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت آئی ہے۔ اذا اقبلت الرایات السود فاکرموا الفرس فان دولتکم منھم۔ جب کالے جھنڈے سامنے آئیں تو فارسیوں کی عزت کرو، کیونکہ تمہاری حکومت ان ہی سے ہوگی۔ (کنز العمال) اس حدیث میں تو کالے جھنڈے کا سامنے آنا مذکور ہے۔ لیکن امام مہدیؑ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اہل فارس کی تعظیم و تکریم کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالے جھنڈوں کا تعلق اہل فارس یعنی ایرانیوں سے ہے۔ امام مہدیؑ سے نہیں۔ ابو مسلم خراسانی نے بنی عباس کی تائید میں جو کالے جھنڈے بلند کئے تھے، وہ اس پیش گوئی کا مصداق ہے۔

(۳) عبدالحق محدث دہلوی نے بھی رسول اللہ ﷺ کے معجزات کے ذیل میں لکھا ہے۔ خبر داد بخروج بنی عباس بہ علم ہائے سیاہ (مدارج النبوۃ)۔ (رسول اللہ ﷺ نے) کالے جھنڈوں کے ساتھ بنی عباس کے خروج کی خبر دی۔

علاوہ ازیں یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جب کوئی چیز شرط کے ساتھ ذکر کی جائے تو فوراً اس کی جزا کا پایا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔إذا ضيعت الأمانة فانتظروا الساعة(اشعۃ اللمعات) جب امانت ضائع کی جائے گی تو قیامت کے منتظر رہنا۔ امانت کے ضائع کئے جانے اور قیام قیامت کے درمیان نہ جانے کتنے ہزار برس لگ جائیں گے۔ اسی طرح طلوع رایات اور ظہور مہدیؑ کے درمیان ایک مدت کا گذرنا تسلیم کیا جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ حدیث مذکور بالا اسکی تائید کرتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام احمد کی روایت سے بھی امام مہدیؑ کے ساتھ کالے جھنڈوں کا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جہاں کالے جھنڈوں کا ذکر ہے وہاں امام مہدیؑ کا ذکر نہیں ہے۔ نیز کالے جھنڈوں کا فلسطین کے علاقہ میں نصیب کیا جانا مذکور ہے، چنانچہ حدیث کے الفاظ اسطرح ہیں۔تخرج من خراسان رايات سود فلا يردها شيء حتىٰ تنصب بايلياء(کنز العمال) خراسان سے کالے جھنڈے نکلیں گے پس نہیں رد کرے گی، ان کو کوئی چیز یہاں تک کہ وہ نصب کئے جائیں گے ایلیاء پر۔ ایلیا شہر بیت القدس کا نام ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ بنی عباس نے دریائے زاب کی لڑائی کے بعد علاقہ ٔ فلسطین پر بھی قبضہ کیا تھا۔ نیز اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ کالے جھنڈوں کا تعلق بنی عباس کے خروج سے ہے۔ مہدی کے ظہور سے نہیں۔

نیز سیوطی نے رسالہ "العرف الوردي في اخبار المهدي" میں "ياتي قوم من قبل المشرق معهم رايات سود" (ایک قوم آئے گی مشرق کی طرف سے ان کے ساتھ ہوں گے کالے جھنڈے) کے ذیل میں لکھا ہے۔

قال الحافظ عماد الدين ابن كثير في هذا السياق اشارة الي ملك بني عباس و فيه دلالة على ان المهدي يكون بعد دولة بني عباس (العرف الوردی) اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کالے جھنڈوں کا تعلق امام مہدیؑ سے نہیں ہے۔ بلکہ بنی عباس سے ہے اور بنی عباس کی خلافت گذر جانے کے بعد امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو گا۔ یہ بھی امام علیہ السلام کے حسب حال ہے اس لئے کہ آپ کی ولادت خلافت عباسیہ کے گذر جانے کے تقریباً دو سو سال بعد ہوئی ہے۔

روح بمعنیٰ وحی

قرآن شریف میں روح کا لفظ وحی کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربّانی ہے

(۱) يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ أَنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ﴿النحل:۲﴾ ترجمہ: وہ فرشتوں کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں سے جس پر چاہے نازل کرتا ہے کہ (لوگوں کو) خبر دار کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس مجھ سے ہی ڈرتے رہو۔ یہاں لفظ روح، وحی کے لئے آیا ہے، کیوں کہ وحی نبی کے لئے "روح نبوت" ہے جس طرح عام طور پر روح سے جسم کو زندگی ملتی ہے اسی طرح وحی الٰہی کے ذریعہ جو احکام نازل ہوتے ہیں ان سے ظلمت و جہالت میں مبتلا مردہ قلوب کو علم و آگہی کی روح ملنے سے حیات نصیب ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کیلئے روح کا لفظ خود قرآن مجید میں آیا ہے۔ نیز جبرئیلؑ کے لئے روح کا لفظ آیا ہے۔

(۲) يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿غافر:۱۵﴾ ترجمہ: وہ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس بندے پر چاہے حکم (وحی) نازل کرتا ہے تاکہ لوگوں کے اکھٹے ہونے کے دن سے ڈرائے۔

(۳) وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ ﴿الشوریٰ:۵۲﴾ ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تیری طرف روح (وحی) بھیجی اپنے حکم سے۔ تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔

روح المعانی میں روح سے مراد جبرئیل لکھا ہے۔

یہاں اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کسی بشر سے کلام کرتا ہے۔ اور اگر کرتا ہے تو اسکی کیا صورت ہوتی ہے؟

سورۂ شوریٰ کی جس آیت کو ہم نے اوپر درج کیا ہے اس کے بعد کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی دیا ہے اور اس کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴿شوریٰ:۵۱﴾۔ ترجمہ: کسی بشر کیلئے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (وحی) کے ذریعہ یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو چاہے القاء کرے بے شک وہ برتر اور حکمت والا ہے۔

اللہ نے یہاں بشر سے کلام کرنے کے ۳ طریقے بتائے ہیں ایک وحی جس کے معنی القاء في القلب کے ہیں۔ خواہ نیند میں ہو یا بیداری میں اور القاء، الہام سے عام ہے۔ موسیٰؑ کی والدہ کو جو وحی کی گئی تھی وہ الہام ہے اور حضرت ابراہیمؑ کو جو وحی

ہوئی وہ نیند میں القاء تھا نہ کہ الہام۔ اور زبور کی وحی بیداری میں القاء تھا۔ اور الہام کلام نفسی کی صورت نہیں چاہتا۔ اور دوسرا طریقہ، کلام کو اس طرح سننا کہ سامع اسکو نہ دیکھے جس سے وہ بات کر رہا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ سے ہوا اسی کو پردے کے پیچھے سے کہا گیا ہے۔ اور تیسرا طریقہ فرشتہ کو بھیجنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اکثر ہوا۔ (معتزلہ کا کہنا ہے کہ بات کرتے وقت اسی لئے رویت جائز نہیں ہے)

اکثر علماء کا اتفاق ہے کہ لیلۃ المعراج میں آنحضرت نے اللہ کو دیکھا اور یہ بھی سب کو تسلیم ہے کہ اللہ سے بغیر واسطہ کے آپ سے گفتگو ہوئی ہے۔ جب کلام وحی کے ذریعہ ہو تو رویت جائز ہے۔ اس لئے کہ وحی وہ کلام ہے جو تیزی سے ہوتا ہے اور وہ منافی رویت نہیں ہے (روح المعانی صفحہ ۵۶)۔ اللہ کا کلام سننے میں جو چیز مانع ہے وہ بشریت ہے جب کسی بندے سے بشریت فنا ہو جاتی ہے تو اللہ اس سے اسی طرح بات کرتا ہے جس طرح کہ وہ ارواح مجرّدہ سے کلام کرتا ہے۔ اس لئے حضرت مہدیؑ نے فرمایا شریعت بعد از فنائے بشریت۔ اولیاء پر فرشتے وحی لیکر نہیں آتے۔ یہ تو انبیاءؑ کی خصوصیت ہے۔ البتہ اولیاء کو وحی ہوتی ہے بغیر واسطے کے اور کبھی واسطے سے بھی ہوتی ہے۔ انبیاء وحی کے وقت فرشتے کو دیکھتے بھی ہیں لیکن ولی اس فرشتے کو نہیں دیکھ سکتا جبکہ وہ القاء کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا کلام سنتا تو ہے مگر اس فرشتے کو دیکھ نہیں سکتا۔ اور اگر وہ فرشتے کو دیکھتا ہے تو اس سے بات نہیں کر سکتا۔ اب جو منقطع ہے وہ ''وحی تشریع'' ہے لیکن ''وحی تعریف'' یعنی وہ جو سنت رسول کے مجمل امور کی پہچان کرائے وہ اس امت میں باقی ہے۔ اور اولیاء کو بھی اللہ کی جانب سے القاء یا وحی خاص کی حالت میں ترجمہ دیا جاتا ہے۔ پس وہ ترجمہ حروف لفظیہ کی صورتوں کا موجد ہوتا ہے۔ اور ان صورتوں کی روح اللہ کا کلام ہوتا ہے۔ نہ کہ دوسرے کا (تفسیر روح المعانی صفحہ ۶۲)

جیسا کہ حضرت مہدیؑ نے بڑلی کے مقام پر دعویٰ موکّد کے موقع پر فرمایا کہ یہ اللہ کا حکم ہوتا ہے کہ ہم نے تجھے مہدی بنایا ہے تو دعویٰ کر، پس یہ ضروری نہیں کہ الفاظ بھی اللہ کے ہوں۔ اللہ کے حکم کے مطلب کو حضرت مہدی موعودؑ نے مخاطبین کے حال پر نظر کرتے ہوئے ان کو سمجھانے کی غرض سے ان کی ہی زبان میں بیان فرمایا ہے۔ صرف قرآن شریف کی یہ خصوصیت ہے کہ اسکے الفاظ بھی اللہ کے ہی ہیں اور اسکے لانے والے بھی جبرئیل امینؑ ہیں۔ اسی کو وحی متلو کہتے ہیں اب رہی وحی غیر متلو وہ کبھی جبرئیل کے واسطے سے ہوئی ہے اور کبھی واسطے کے بغیر ہوئی ہے۔

رجاء

رجاء کے معنی امید کے ہیں۔ اللہ نے قرآن شریف میں فرمایا۔ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿کہف:۱۱۰﴾۔ جو شخص اپنے پروردگار کے دیدار کی امید رکھتا ہے تو اسکو چاہئے کہ وہ عمل صالح کرے اور اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ گردانے۔

اس آیت میں اللہ نے اللہ سے ملنے اور اللہ کے دیدار کی امید رکھنے والوں سے دو باتوں کا مطالبہ فرمایا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ عمل صالح کریں اور دوسرا یہ کہ اللہ ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی اچھی اور محبوب چیز کی امید رکھنے کو رجاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن خالی امید ہو اور اس کے حصول کیلئے جو چیزیں شرط ہیں ان کو نہ کیا جائے تو اسکو ہوس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کھیت میں بیج بونے کے بعد فصل کی امید صحیح ہے۔ خالی زمین سے فصل کی امید رکھنا غلط ہے، ایک مسلمان کو اللہ سے امید رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی مغفرت نجات اور دیدار سے نوازے گا لیکن اس کے لئے اللہ نے جو شرائط بیان کئے ہیں ان کی پابندی بھی ضروری ہے۔ رجاء کے مقابلے میں خوف ہے ان دونوں کا تعلق زمانۂ مستقبل سے ہے۔ آئندہ زمانے میں کسی اچھی چیز کی امید کو رجاء کہتے ہیں اور آئندہ زمانے میں بری چیز کے پیش آنے کے خیال کو خوف کہتے ہیں۔ پس انسان کو اللہ سے رحمت کی اُمید رکھنی چاہئے۔ لیکن وہ کام بھی کرنے چاہئیں جو رحمت کے متقاضی ہیں۔ اور اللہ ہی سے سزا کا خوف بھی رکھنا چاہئے لیکن ان امور سے پرہیز بھی کرنا چاہئے جو عذاب کے مستلزم ہیں۔ اس لئے رسول اللہؐ نے فرمایا۔ الایمان بین الخوف والرجاء۔ یعنی ایمان خوف (سزاء) اور اُمید (بخشش) کے درمیان ہے۔ پس سب کچھ امور ممنوعہ کر کے بخشش کی امید رکھنا اور کچھ اعمال صالحہ نہ کر کے سزا کا خوف نہ رکھنا ایمان کے منافی ہے۔ انسان کو اللہ کی رحمت سے نااُمید ہونا بھی کفر ہے چنانچہ اللہ نے فرمایا۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہو۔ لیکن اسکے معنی یہ بھی نہیں کہ کچھ بھی عمل صالح نہ کریں اور شرک (وبدعت) کے اعمال میں مبتلا رہیں اور اللہ سے بخشش کی اُمید رکھیں۔ ایسا کرنا غلط ہے۔ نیک کام کریں۔ قصور اور گناہ سرزد ہو تو توبہ کریں پھر اللہ سے بخشش کی اُمید صحیح طریق کار ہے۔

رشوت

قرآن شریف میں "رشوت" کا لفظ تو نہیں ہے لیکن بہت ہی نفیس انداز میں اسکی اور اسکی دیگر بہنوں کی مذمت کرتے ہوئے، اس سے منع فرمایا ہے، چناچہ اللہ کا ارشاد ہے۔ "وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿بقرہ:۱۸۸﴾ اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس اس کو پہنچاؤ تاکہ تم ظلم وزیادتی سے لوگوں کے مال کا کچھ حصہ جان بوجھ کر کھا جاؤ۔

دوسروں کا مال باطل طریقہ سے کھانے کی کئی صورتیں ہیں۔ ظلم وزیادتی، لوٹ مار، ڈاکہ زنی اور غصب کرنا۔(۲) امانت میں خیانت کرنا۔(۳) فیصلہ کرنے کے لئے رشوت لینا۔(۴) جھوٹی گواہی دیکر پیسہ لینا۔(۵) جوا کھیلنا۔ (۶) گانے کی اجرت لینا۔

ان سب صورتوں میں غیر کا مال حاصل کیا جاتا ہے اور یہ سب باطل طریقے ہیں۔ اس لئے ان سے منع کیا گیا ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ آجکل رشوت کا بازار اتنا گرم ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ پیون (peon) سے لیکر پریزیڈنٹ (president) صدر تک ہر محکمہ میں صرف رشوت کی حکومت چل رہی ہے۔ مشاہدہ تو یہ ہے کہ کاغذوں پر وزن رکھو تو وہ اڑتا نہیں لیکن آج یہ ماحول دفاتر میں ہے کہ آپ کے فائلوں پر وزن (روپیہ) رکھو تو وہ اڑ کر افسر بالا تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور نہ رکھو تو وہ برسوں وہیں پڑے رہتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ آجکل عدالتوں میں بھی اسی کا رواج ہے۔ انصاف منہ تکتا رہ جاتا ہے اور رشوت قہقہہ لگا کر اپنا کام نکال لیتی ہے۔ اللہ نے اسی لئے فرمایا "اور نہ حاکموں کے پاس اس کو پہنچاؤ تاکہ تم ظلم وزیادتی سے لوگوں کے مال کا کچھ حصہ جان بوجھ کر کھاؤ" مطلب یہ کہ تم خود جانتے ہو کہ یہ مال دوسرے شخص کا ہے۔ یہ جاب (ملازمت) دوسرے شخص کیلئے منظور ہوا ہے۔ اس کا فیصلہ دوسرے شخص کیلئے ہونے والا ہے۔ یہ شخص مجرم ہے اور اسکو یہ سزا ہونے والی ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن ان سب صورتوں میں افسران بالا ذمہ دار وزیروں اور کورٹ کے ججوں اور شرعی عدالتوں کے پاس پیش ہو کر رشوت دیکر اپنے حق میں کام کروالینا یا فیصلے نافذ کروالینا اور اسطرح دوسرے کا مال ہڑپ کر جانا، رشوت دیکر اپنا کام کروالینا اور دوسرے کا حق مار دینا حد درجہ کا ظلم اور ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے۔ زمین یا ایک گھر کے تم ہی مالک ہو لیکن سرکاری طور پر اس کا کوئی ثبوت تمہارے پاس موجود نہیں ہے اور دوسرا شخص اس پر قبضہ کر لیتا ہے اور جھوٹے ثبوت عدالت میں پیش کرتا ہے۔ ماہر وکیل کو مقدمہ لڑنے کیلئے اچھی فیس دیکر مقرر کرتا ہے اور جج کو بھی خرید لیتا ہے اور وکیل اپنی چرب زبانی سے ایسے دلائل پیش کرتا ہے کہ جج اس کے موکل کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے حق دار محروم ہوتا ہے اور ظالم

مقدمہ جیت لیتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ قانونی طور پر وہ جگہ اس کی ہو گئی لیکن رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ”اس نے دوزخ کا ایک ٹکڑا اپنے حصہ میں لے لیا“، اس لئے کہ آخرت میں احکم الحاکمین تو صحیح فیصلہ کریگا اور ظالم کو اسکا بدلہ ضرور دیگا۔

رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمادیا کہ ”میں بہر حال ایک انسان ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کی بہ نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعہ سے حاصل کی تو در اصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے“(تفہیم القرآن،۱۴۸)

رہبانیت

عربی میں "رھب" کے معنی ڈرنے کے ہیں، عیسائیوں کے پاس راہب اس شخص کو کہتے ہیں جو دنیا، دنیا کے تقاضوں حتیٰ کہ فطری ضرورتوں اور تقاضوں کو ترک کر کے خدا کی طرف یکسو ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

راہب کی جمع رہبان ہے لیکن ادعا الگ چیز ہے اور اس پر عمل دوسری چیز ہے، اس کے علاوہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے جو طریقہ بتایا ہے اور زندگی کی جو راہ بتائی ہے اور خود زندگی بھر عمل کرتے ہوئے اس کے نقوش چھوڑے ہیں وہ اللہ کے پاس مستحسن اور مقبول ہیں۔ اس سچی راہ کو چھوڑ کر اگر کوئی آدمی دوسری راہ اپنی طرف سے نکالتا ہے اور اس پر گامزن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ بدعت ہونے کی وجہ سے گمراہی ہے۔ اور یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اس قسم کی راہ عمل کو اختیار کرنے والے لمبے عرصہ تک اس پر قائم بھی نہیں رہ سکتے۔ چناچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

(۱) إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴿توبہ:۳۴﴾ اہل کتاب کے بہت سے عالم اور درویش، لوگوں کے مال ناحق کھالیتے ہیں۔ چونکہ ان کی ظاہری وضع قطع، طریقہ بود و باش سب سے الگ ہوتا ہے اور اپنے نمائشی عمل سے خود کو دوسروں سے الگ رکھتے ہیں اور بالخصوص بیوی بچے نہیں رکھتے تو سادہ لوح لوگ ان کو نہ صرف خدا والے سمجھتے ہیں بلکہ کمزور عقیدہ کے لوگ انہیں خدا بھی بنالیتے ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

(۲) اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّـهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ﴿توبہ:۳۱﴾ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنالیا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو بھی رب بنالیا ہے، کا مطلب یہ ہے کہ ان کے علماء و مشائخین جو حکم سناتے ہیں یہ لوگ بلاچوں وچرا ان کے حکم مان کر اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کو ایسی سند سمجھتے ہیں جیسی کہ اللہ کی کتاب ہی کی بات ہے۔ اگرچہ وہ لوگ شرع حقیقی کے خلاف ہی کیوں نہ کہیں۔ ان کی تو یہ عادت تھی کہ چند ٹکوں کے عوض یا جاہ و مرتبہ کے لحاظ سے احکام بتایا کرتے تھے۔ چونکہ ان لوگوں نے ان علماء و مشائخین کی باتوں کو وہ درجہ دے دیا تھا جو شارع کا ہوتا ہے اس لئے کہا گیا کہ انہوں نے انکو اپنا رب بنالیا۔ چنانچہ اس آیت کو سن کر جب عدی بن حاتم نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم تو علماء و مشائخین کو رب نہیں مانتے تو آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ جس کو حلال قرار دیتے ہیں تم اس کو حلال سمجھتے ہو اور وہ جس کو حرام ٹھہراتے ہیں تم بھی اسکو حرام ٹھہراتے ہو۔ بس یہی رویہ رب بنانے کا ہے۔

سب ایسے نہیں ہوتے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق پرست نیک خو اللہ سے ڈرنے والے اور رحم دل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے مسلمانوں کے سامنے تین گروہوں کا نقشہ کھینچا ہے اور بتلایا ہے کہ وہ کیسے تھے اور کیوں ویسے ہو گئے تھے

؛چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

(۳) لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿المائدہ:۸۲﴾ اے پیغمبر آپ دیکھیں گے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ دشمنی کرنے والے یہود ہیں اور وہ لوگ ہیں جو شرک کرتے ہیں اور باعتبار دوستی کے مسلمانوں سے قریب تر آپ ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصریٰ ہیں یہ اس لئے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور یہ کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ مشرکین اور یہود مسلمانوں کے کٹر مخالف اور دشمن ہیں، یہود اسلئے کہ ان کی دنیا پرستی، جاہ پرستی اور ان کے حسد اور تکبر نے ان کو حق قبول کرنے سے روک دیا؛ سود کھانے کی وجہ سے ان کے دلوں میں رحم دلی اور عاجزی نہ رہی۔ اس کے بر خلاف مشرکین امی تھے وہ محض اپنے باپ دادا کی تقلید کرتے تھے اس لئے اسلام کو وہ نیا دین سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن نصرانی ایسے نہیں تھے اسلئے کہ ان میں عالم تھے جو حق بات کو سمجھتے تھے اور ان میں زاہد اور رہبان بھی تھے جس کی وجہ سے وہ دنیا اور حرص سے آزاد تھے اور فطرتا وہ رحم دل تھے جس کی بناء پر حق کا قبول کرنے کا جذبہ ان میں نسبتاً زیادہ تھا۔ چناچہ نو (۹) عیسائیوں کا ایک وفد حضور ﷺ کی خدمت میں آیا، حضور ﷺ نے قرآن کی آیتوں کو پڑھ کر سنایا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور انہوں نے بے ساختہ کہا "امنا" یعنی ہم ایمان لائے۔

(۴) وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّـهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿الحدید:۲۷﴾ اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کے دلوں میں شفقت اور رحمت ڈالدی اور رہبانیت کو خود انہوں نے ایجاد کر لیا تھا (اسکے بعد) ہم نے انکو اسکا حکم دیا بھی تھا تو صرف اس غرض سے کے وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کر لیں۔ پس انہوں نے اس کی بھی رعایت نہیں کی جیسی کہ کرنی چاہیئے تھی، پس ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہم نے انکو انکا اجر دیا اور انمیں کے اکثر خارج از طاعت ہیں۔

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ رہبانیت کو پہلے خود انہوں نے اختیار کیا پھر ہم نے ان کو حکم دیا کہ وہ اسے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اختیار کریں۔ لیکن انہوں نے اس کا بھی حق ادا نہیں کیا۔ یہی تفسیر ہے مجاہد وغیرہ مفسرین کی (روح المعانی جلد ۲۷، ص ۱۹۱)

لیکن یاد رہے کہ اسلام میں رہبانیت جائز نہیں ہے، البتہ دنیا کو ترک کرنے کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ دونوں میں

فرق یہ ہے کہ رہبانیت فطری تقاضوں کو مارنے کا نام ہے، اور ترک دنیا نفسانی خواہشات کو مارنے کا۔ اسلام فطری تقاضوں کو مارنے کا حکم نہیں دیتا، یعنی کھانا، پینا، لباس، بیوی بچہ رکھنا وغیرہ۔ لیکن نفسانی خواہشات کو مارنے کا حکم دیتا ہے۔ جو نہ صرف انسان کی انسانیت کو برباد کردیتی ہیں بلکہ پورے انسانی ڈھانچہ اور نظام کو تباہ کردیتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الدنیا نفسك فاذا أفنیتها فلا دنیا لك" دنیا تیرا نفس ہے۔ جب تو نے اسکو (نفس کو) فنا کردیا تو پھر تیرے پاس کوئی دنیا ہی نہیں ہے۔

حضرت مہدیؑ نے فرمایا "دم دیئے ہوئے مرغ کھاؤ اور باریک صاف ستھرے کپڑے پہنو، پالکی اور گھوڑے پر سواری کرو پر بے اختیار ہو جاؤ۔" یعنی اپنے اختیار کو خدا کے حوالے کرو۔ ایک موقع پر جب حضرت مہدیؑ کے اصحاب نے شکایت کی کہ بیوی بچوں کی وجہ سے ذکر کی محفلوں میں خلل ہو رہا ہے اگر اجازت ہو تو ان کو علٰحدہ کردیا جائے، حکم ہوا جنت میں جاؤ تو بیوی بچوں کو بھی ساتھ لیجاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عبادت بھی ہو ذکر کی پابندی بھی ہو اور اہل و عیال کی ذمہ داریوں کا بھی پورا خیال رہے۔ کیا اسکو کوئی رہبانیت کہہ سکتا ہے؟ اس کی مزید تشریح "ترک دنیا" کے ضمن، میں دیکھی جاسکتی ہے۔

روح

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴿الإسراء:۸۵﴾اور پوچھتے ہیں (یہ لوگ) روح کے بارے میں، آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور نہیں دیا گیا تم کو علم مگر تھوڑا سا۔

یہودیوں کے سکھانے پر قریش نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتیں پوچھی تھیں۔ اصحاف کہف، ذوالقرنین اور روح کے تعلق سے۔ اور آپس میں کہا تھا کہ اگر محمدؐ ان تینوں باتوں کا جواب دیں یا جواب نہ دیں تو وہ نبی نہیں ہیں۔ اگر بعض کا جواب دیں اور بعض کا جواب نہ دیں تو وہ نبی ہیں، آنحضرت ﷺ نے بحکم خدا اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں جواب دیا لیکن روح کے بارے میں آپؐ کا جواب مبہم تھا۔ جس سے ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ آپؐ سچے نبی ہیں۔ روح کی حقیقت نہیں بتلائی گئی اس لئے کہ وہ ان کی سمجھ سے باہر کی چیز تھی۔ وہ روح جس کے بدن میں داخل ہونے سے آدمی زندہ اور بدن سے نکل جانے سے آدمی مردہ ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ اور اسی کے حکم سے جاتی ہے۔

روح کے تعلق سے بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ہے کہ "میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مدینہ منورہ کے ایک بنجر اور غیر آباد راستہ سے گذر رہا تھا، آپؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ تھی، آپؐ یہودیوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گذرے رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے کہا کہ اس سے روح کے متعلق سوال کرو۔ دوسرے نے کہا مت پوچھو کہیں ایسا جواب نہ دے دے جس کو تم پسند نہ کرتے ہو۔ لیکن دوسرے نے کہا ہم ضرور پوچھیں گے، چنانچہ ان میں سے ایک نے اٹھ کر کہا۔ ابو القاسم، روح کیا چیز ہے۔ آپ خاموش ہوگئے، میں نے دل میں سوچا کہ آپ پر وحی آرہی ہے، میں کھڑا ہوگیا۔ جب آپ سے نزول وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو فرمایا "يَسْـــأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ـــــ الخ۔ نسائیؒ نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں قریش نے یہودیوں کے مشورے پر یہ سوال کیا تھا۔ ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ ممکن ہے نزول آیت مکرر ہوا ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسی سوال کے جواب میں یہ آیت پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوچکی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے یہودیوں کے سوال کے جواب میں یہ آیت فوراً کیوں نہ پڑھی اور نزول وحی کا انتظار کیوں کیا؟ حالانکہ بخاری کی مذکورہ روایت میں آیا ہے کہ آپ وحی کے انتظار میں خاموش ہوگئے تھے۔

بعض مفسرین نے اس کا جواب دیا ہے کہ انتظار کی وجہ شاید روح کے متعلق کچھ مزید وضاحت کی خواہش تھی، لیکن اللہ نے وہی مکی آیت دوبارہ نازل فرمادی اور مزید وضاحت نہیں فرمائی۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس آیت میں روح سے مراد

روح انسانی ہے۔

اللہ کی جانب سے مبہم جواب اس لئے دیا گیا کہ دین میں جن چیزوں کا جاننا اور ماننا ضروری ہے، ان سے تو یہ لوگ اعراض کرتے ہیں اور جن چیزوں کا سمجھنا اور ان کی ماہیت کو جاننا ضروری نہیں ہے، ان میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں اور سوال جواب کا دروازہ کھولتے ہیں اور ازکار بحثوں سے ان کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ اور جو چیزیں ان کی دنیاوی فلاح اور دینی بھلائی کیلئے ضروری ہیں ان کی طرف خیال تک نہیں جاتا۔ جب ان کے سامنے وحی خداوندی اور روح قرآنی موجود ہے جس سے وہ اپنی ایمانی اور روحانی زندگی حاصل کرسکتے ہیں اور اس نسخۂ کیمیا اور شفاء روحانی سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں تو اس کے بجائے غیر ضروری باتوں اور لا حاصل بحثوں میں اپنے دماغوں کو کھپاتے ہوئے اپنی عمر عزیز تباہ کر رہے ہیں۔ روح انسانی کیا ہے؟ جوہر یا عرض، مادّی ہے یا غیر مادّی یا مجرّد، بسیط ہے یا مرکب، اس قسم کے غامض اور عام آدمی کیلئے غیر ضروری سوالات کرنا اور وہ بھی محض نبی کو جانچنے کیلئے سوال کرنا، محض وقت گذاری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

روح کی اصل ماہیت اور کنہ کا قطعی علم حاصل کرنا انسان کے بس سے باہر ہے، اس لئے کہ وہ غیر مرئی اور غیر محسوس چیز ہے، اور عقل کا دائرہ کار مادّیات اور محسوسات ہے اور عقلی بحث کے ذریعہ کوئی انسان روح کی ماہیت اور حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا، اس لئے کہ جسم کثیف ہے اور روح لطیف ہے، جسم کا تعلق عالم خلق سے ہے اور روح کا تعلق عالم امر سے ہے جسم مخلوق ہے اور روح مأمور ہے۔ روح جسم تو نہیں بن سکتی، البتہ جسم روح کی طرح لطیف بن سکتا ہے۔ جب کہ وہ اس کیلئے ضروری مراحل طے کرے پھر اس پر اللہ کا فضل ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو جو معراج نصیب ہوئی تھی وہ روح مع الجسد ہی تھی۔ اور صوفیاء کے پاس آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث مشہور ہے کہ آپؐ نے فرمایا "أرواحنا أجسادنا، أجسادنا أرواحنا"، یہ نہایت دقیق اور باریک بات ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے۔

علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں "قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" کی تفسیر میں ۹ صفحات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں مشہور و متداول قول دو ہیں۔

(۱) روح انسانی جسم نہیں ہے۔ بلکہ جوہر مجرّد ہے (غیر مادّی) جسم کا ایک حصہ بھی نہیں ہے (غیر متصل بالجسم نہیں ہے) اور منفصل عن الجسم یعنی بالکل خارج بھی نہیں ہے اور یہی جوہر مجرّد جسم میں تصرّف کرتا ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ بھی ہے کہ روح مخلوق ہے۔ اس سلسلے میں بھی دو مکاتب فکر مسلمانوں میں موجود ہیں، ایک طبقہ کہتا ہے کہ روح مخلوق ہے اور دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ روح مخلوق نہیں ہے، جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ روح مخلوق ہے وہ سورۂ

اخلاص سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ صرف اللہ کی ذات غیر مخلوق ہے باقی سب چیزیں مخلوق ہیں۔اس لئے کہ اللہ نے اپنے تعلق سے فرمایا"لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ"،نہ اس نے جنا اور نہ وہ جنا یا گیا۔نیز اللہ ہی سب چیزوں کا خالق ہے تو روح اسی طرح نور بھی ہے اور مخلوق بھی ہے۔

لیکن جو لوگ روح کو مخلوق نہیں کہتے وہ استدلال کرتے ہیں قرآن شریف کی اس آیت سے جس میں اللہ نے فرشتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے"إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ" ﴿ص:۷۱،۷۲﴾ میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں جب میں اس کو (اچھی طرح) درست کر دوں اور اس میں اپنی روح پھونکوں تو تم اسکو سجدہ کرو۔اس آیت میں اللہ نے آدم کے جسم کیلئے مٹی سے بنانے کا ذکر کیا ہے، لیکن جب روح کی بات آئی تو اللہ نے اس کیلئے "خلق" پیدا کرنے کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں تو گویا، اللہ نے جسم کیلئے خلق کا لفظ استعمال فرمایا اور روح کیلئے پھونکنے کا لفظ استعمال فرمایا تو معلوم ہوا کہ جسم مخلوق ہے اور روح مخلوق نہیں ہے۔

یہی حال نور کا بھی ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے"اللَّـــهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ"﴿النور:۳۵﴾ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، یعنی اللہ کے نور سے زمین اور آسمان منور ہوئے ہیں، سورج اور چاند، دن اور رات روشن ہوئے ہیں، لیکن کسی نے سورج اور چاند کو ماں باپ کے نام سے یاد نہیں کیا اور نہ آسمانوں اور زمینوں کو ان کی اولاد کہا۔

رضا

اللہ کا رشاد ہے "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ" ﴿التوبة:٧٢﴾ یعنی اور اللہ کی خوشنودی بڑی چیز ہے۔

ایک ہوتا ہے نوکر اور ایک ہوتا ہے غلام۔ نوکر صرف وہ خدمت انجام دیتا ہے جو اسکے تفویض کی جاتی ہے، اور نوکر کا کام اجرت اور معاوضہ کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن جو غلام ہوتا ہے اسکے ذمہ کوئی خاص خدمت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے آقا کے حکم سے، آقا کے سب امور میں خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ آقا کی نیابت اور خلافت کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اور غلام معاوضہ اور اجرت کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اسکی تو تمنا یہی ہوتی ہے کہ اس کے کام سے آقا خوش ہو جائے۔

اسی طرح انسان، اللہ کا نوکر نہیں ہے، بلکہ اللہ نے اسکو اشرف المخلوقات بنا کر اپنا نائب اور سب پر حاکم بنایا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے کائنات میں تصرف کرنے کا انسان کو اختیار بھی دیا ہے۔ انسان کے سوا اللہ نے کسی اور کو تصرف کرنے کا مجاز نہیں گردانا اور نہ اسکو اختیار دیا ہے۔ اسی لئے باز پرس بھی قیامت کے دن انسان سے زیادہ ہوتی ہے۔ پس غلام یا نائب جو بھی کام کرتا ہے وہ اپنے آقا کی خوشنودی کیلئے کرتا ہے اور اللہ یہی کہتا ہے "رضوان من اللہ اکبر" یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہی بہت بڑی چیز ہے۔

ویسے اللہ نے اچھے کام کے عوض جنت، حور و قصور کا وعدہ فرمایا ہے، لیکن یہ کم ہمت لوگوں کیلئے ہے، عالی ہمت لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو صرف مالک کی خوشنودی چاہتے ہیں، ان کے سامنے معاوضہ، اجرت، مبادلہ کی بات کی جاتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ صرف آپ کی خوشنودی حاصل کرنے اور آپ کے دل میں جگہ بنانے کیلئے کیا۔

چناچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَـٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ﴿البينة:٧﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے، یہی لوگ بہترین مخلوق ہیں، ان کی جزا ان کے رب کے پاس ہمیشہ کے باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے، یہ ان کیلئے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ان آیات سے یہ بات صاف معلوم ہو رہی ہے کہ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جن سے اللہ راضی ہو گیا ہے اور یہ کوئی معمولی انعام نہیں ہے، اس میں رضامندی دونوں طرف سے بتلائی جا رہی ہے لیکن ابتداء اللہ کے طرف سے ہو رہی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا ہے۔ اور پہلے ہی بتلا دیا گیا ہے کہ بندوں کیلئے اللہ کا سب سے بڑا انعام "رضوان من اللہ" ہے اسی لئے اللہ نے اس "رضوان من اللہ" کو "اکبر" فرمایا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ''اکبر'' کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے ؟ اللہ نے دوسری جگہ اس کا جواب مرحمت فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ﴿العنکبوت:۴۵﴾۔ بے شک نماز بے حیائی اور مکروہ و ناپسندیدہ کاموں سے روکتی ہے اور البتہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے۔ اس سے معلوم ہوا ''رضوان من اللہ اکبر'' کو حاصل کرنے کا ذریعہ ''وَلَذِكْرُ اللَّـــهِ أَكْبَرُ'' ہے۔ اسی لئے قرآن میں کئی مقامات پر اے ایمان والو اللہ کو یاد کرو (اذْكُرُوا اللَّهَ) فرمایا ہے۔ اسی بنیاد پر مہدی موعودؑ نے قرآنی آیات کی روشنی میں ذکر اللہ کو فرض قرار دیا ہے۔

اعمال میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ خود سے اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں، اس کیلئے اللہ کے فضل کی ضرورت ہے۔ جو ''عمل'' پر بھروسہ کرتا ہے وہ ناکام ہوتا ہے لیکن جو عمل کے ساتھ فضل کا طالب ہوتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے ''کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں نہ جائیگا بلکہ محض اللہ کے فضل سے جائیگا، یہ سن کر بی بی عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ، کیا آپ بھی نہیں، تو آنحضرت ﷺ نے جواب دیا، نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے مجھے ڈھانپ لیگا'' ولٰكن تغمدني الله برحمته و بفضله''۔

اب اگر یہاں یہ سوال ہو کہ اعمال کا صلہ تو جنت ہے پھر اللہ جن سے راضی ہوگا تو ان کو کیا ملیگا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ جن سے راضی ہوگا، انہیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمائیگا، چونکہ دیدار الٰہی ہی اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے، اسی لئے اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو معراج میں اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔ اسی بناء پر مہدویوں کے پاس طلب دیدار خدا فرض ہے۔

یہاں ایک بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ رضا افضل ہے یا دعا۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ دونوں میں تضاد نہیں ہے، اسلئے بھی کہ دعا کرنے کی اجازت دی گئی ہے چنانچہ قرآن شریف میں اللہ نے فرمایا، ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ﴿الاعراف:۵۵﴾۔ یعنی اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ اور پوشیدہ طور پر پکارو۔ اس آیت میں نہ صرف یہ کہ دعا کی اجازت ہے بلکہ دعا کے آداب بھی بیان کئے جارہے ہے کہ دعا میں عاجزی ہونی چاہئے اور پوشیدگی ہونی چاہئے۔

لیکن رضا کا مقام، دعا کے مقام سے افضل و برتر ہے، جیسا کہ اللہ نے خود فرمایا ''وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّـــهِ أَكْبَرُ'' اکبر کے معنی صرف ''بڑا'' کے نہیں ہوتے، چونکہ یہ تفضیل کا صیغہ ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''سب سے بڑا''، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' یعنی نماز نیند سے بہتر ہے۔ یہاں بھی اکبر کے بعد من فلاں سمجھنا چاہئے، لیکن یہاں ''من فلاں'' یعنی ''فلاں سے'' نہیں ہے تو اس ماحول کے اعتبار سے سمجھا جاسکتا ہے کہ رضوان کس سے بہتر ہے، ماحول خود پکار کر کہہ رہا ہے کہ دعا کب کی جاتی ہے، تکلیف کے وقت۔ اب مکلّف کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یا تو اس تکلیف کو اللہ کی مشیئت سمجھ کر خاموش رہے اور اسکی مرضی سے راضی ہوجائے یا دعا کرے کہ تو ہی اس تکلیف کو دور فرما۔

مکلّفین دو قسم کے ہوتے ہیں ایک قسم وہ جو تکلیف کے وقت بے چین ہو کر دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ اس تکلیف کو دور فرما۔ یا اس کی ضرورت کو پوری فرما، دوسری قسم وہ جو اللہ کی جانب سے ملنے والی چیز کو یہ سمجھ کر سہہ لیتے ہیں کہ یہ اس اللہ کی طرف سے ہے جو رحمان ورحیم ہے۔ یہ اللہ کی مرضی ہے اور اسکی مشیئت ہے، اس کے فیصلے سے راضی ہو جاتے ہیں، اور اسکے خلاف اللہ سے بھی دعا نہیں کرتے، وہ دعا کو بھی اللہ کے فیصلے کے خلاف احتجاج سمجھ کر بے ادبی تصوّر کرتے ہیں، بلکہ اسکی طرف سے ملنے والی ہر اذیت اور ضرب کو چیں بہ جبیں ہوئے بغیر خوشی سے یہ کہتے ہوئے سہہ لیتے ہیں کہ اس سے تو خوش ہوتا ہے تو پھر یہی سہی۔ ایک شاعر نے اس احساس کو اس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

تو آن قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی　　　　من آن بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم

ترجمہ: تو وہ قاتل ہے کہ تماشہ دیکھنے کے لئے میرا خون بہاتا ہے اور میں وہ بسمل ہوں کہ خوں خوار خنجر کے نیچے رقص کرتا ہوں۔

یہیں سے ابراہیمؑ کے ایسے وقت جبکہ آپ کو نمرود کی بھڑکائی ہوئی آگ میں پھینکا جارہا تھا، جبرئیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور عزرائیلؑ کی جانب سے امداد کی پیشکش کو قبول نہ کرنا اور آخر میں جبرئیلؑ کے یہ کہنے پر کہ اگر آپ ہماری مدد قبول نہیں کرتے تو کم از کم اللہ سے دعا کرو اور اسی سے مدد چاہو تو اس سے بھی انکار کر دینا اللہ کی رضا پر راضی ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا، اس کو پکارا جاتا ہے جو دیکھتا نہیں اور سنتا نہیں۔ میرا رب تو سمیع ہے، بصیر ہے علیم ہے پھر اسکو پکارنے کی ضرورت کیا ہے؟ آخر میں نادر الوقوع واقعہ ہوا کہ خود اللہ کو کہنا پڑا "يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿الأنبياء: ٦٩﴾"۔ اے آگ تو ابراہیم کیلئے ٹھنڈی بھی ہو جا اور سلامتی کا باعث بھی۔ ایسا کیوں ہوا، اسکے تعلق سے ایک لطیف نکتہ بھی میرے دل میں ڈالا گیا ہے، یعنی جب ابراہیمؑ کا نمرود سے مکالمہ ہوا تو ابراہیمؑ نے فرمایا کہ میرا خدا وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے، تو نمرود نے جواب دیا تھا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں، چنانچہ اس نے ایک نردوش کو پکڑ کر قتل کروادیا اور ایک سولی پر چڑھنے والے کو آزاد کر کے اس کی جان بخشدی، تو یہاں ایسے وقت میں جب نمرود، حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جلا کر ماردینا چاہتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اس پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مارنے والا اور زندگی دینے والا تو نہیں ہے بلکہ وہ خدا ہے جو رب العالمین ہے، چناچہ آپ آخری وقت تک اپنے اس یقین اور ایمان پر قائم رہے اور اللہ نے ہی آپ کیلئے نار نمرود کو گلزار میں بدل دیا، خلاصہ بحث یہ کہ دعا سے رضا کا مقام بہت بلند ہے، اگرچہ دعا کی بھی اجازت ہے۔

رؤیائے صالحہ (اچھے خواب)

سچا خواب، پسندیدہ اور اچھا حال ہے۔ قرآن شریف اور احادیث رسول اللہ ﷺ سے اس کا وقوع ثابت ہے۔

(۱) چناچہ حضرت ابراہیمؑ کا خواب تو مشہور ہے اور قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے۔ إِنِّيٓ أَرَىٰ فِي ٱلْمَنَامِ أَنِّيٓ أَذْبَحُكَ فَٱنظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ﴿الصافات:۱۰۲﴾ (اے میرے پیارے بیٹے) میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، پس تیری کیا رائے ہے۔

(۲) اسی طرح حضرت یوسفؑ نے جو خواب دیکھا تھا قرآن شریف میں اس کا ذکر اسطرح آیا ہے کہ۔ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ﴿یوسف:۴﴾۔ اے ابا جان میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو خواب میں دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

نیز روایت میں آیا ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ ماالمبشرات (مبشرات کیا ہیں) آپ نے فرمایا "الرویا الصالحہ" (اچھے خواب) اور یہی تفسیر ہے اللہ کے قول "لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴿یونس:۶۴﴾" یعنی ان کیلئے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں۔

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لاَ يَرَى رُؤْيَا إِلاَّ جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ - الحديث اخرجه البخاري۔ رسول اللہ ﷺ کی وحی کی ابتداء اچھے خوابوں سے ہوئی اور جو خواب دیکھتے تھے مثل نور صبح کے اس کا ظہور ہو جاتا تھا۔

حضرت ابن سیرینؒ سے روایت ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) حدیث النفس (خیالات)۔ (۲) تخویف الشیطان (شیطان جو مکروہ امور دکھاتا ہے ڈرانے کے خیال سے) (۳) بشارت من اللہ (اللہ کی جانب سے خوش خبری)۔

نیز جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین بار تھتکار دے (یعنی تھو تھو کہدے) اور تین بار "اعوز باللہ من الشـــیطان الرجیم" پڑھ لے۔ اور جس کروٹ پر تھا اسکو بدل دے۔ (مشکوۃ)

بعض لوگ خوابوں کے ہی متمنی رہتے ہیں، اچھے خواب نظر آئیں تو اس پر نازاں ہوتے ہیں اور برے خواب پر نالاں ہو جاتے ہیں، انسان کو یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہئے کہ بیداری کی حالت میں اسکی کیفیت کیا رہتی ہے، کیا وہ شرع کی پابندی اور ذکر اللہ کی پاسداری پر ہے یا نہیں، اگر بیداری میں اس کا حال مقبول خدا ہے تو یقیناً اس کا خواب بھی اچھا ہی ہو گا۔

اور اگر خواب دیکھا ہو تو اسکی تعبیر اس کے جاننے والے اور صالح شخص سے پوچھنی چاہئے، ہر کس و نا کس سے تعبیر پوچھنے سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔

رایات سود

حدیث میں رایات سود کے الفاظ ہیں، فوج، لشکر، سپاہ کے نہیں۔ کالے نشان اور فوج لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ فوج اور نشان مہدیت کی علامت نہیں ہو گی۔

عَنْ ثَوْبَانَ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "يَقْتَتِلُ عِنْدَ كَنْزِكُمْ ثَلاَثَةٌ كُلُّهُمُ ابْنُ خَلِيفَةٍ ثُمَّ لاَ يَصِيرُ إِلَى وَاحِدٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَطْلُعُ الرَّايَاتُ السُّودُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ فَيَقْتُلُونَكُمْ قَتْلاً لَمْ يُقْتَلْهُ قَوْمٌ ثم يجىء خَلِيفَةُ اللَّهِ الْمَهْدِيُّ فَإِذَا سمعتم به فاتوه فَبَايِعُوهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ فَإِنَّهُ خَلِيفَةُ اللَّهِ الْمَهْدِيُّ"۔

(۱) تین اولاد خلیفہ کا جنگ کرنا، (۲) کالے نشان نکلنا (۳) مسلمانوں کا ایسا قتل عام جسکی اس سے پہلے نظیر نہ ہو۔ (۴) خلیفۃ اللہ المہدی علیہ السلام کا ظہور۔ کالے جھنڈوں کے بعد مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو گا۔ من قبل خراسان کے معنی۔ في خراسان ہیں، کیوں کہ "مِن" جب ظروف پر داخل ہوتا ہے تو في کے معنی دیتا ہے، جیسے إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ ﴿الجمعة:۹﴾، بمعنی في، پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ خراسان میں آئیں گے۔ کیوں کہ نہ کالے نشان کے معنی لینا درست ہے اور نہ کالے نشانوں کو امامؑ کی ذات سے تعلق ہے اور نہ خراسان کی طرف سے آنا حدیث کا مطلب ہے۔ رأیتم کے معنی سمعتم ہی لینا صحیح ہے۔ " أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ" کے معنی کیا تم نے نہیں سنا کے ہیں۔ سود کے معنی سیادت، شرف، فضل، کرم، علم و تحمل والے کے بھی ہیں۔

چنانچہ مجمع البحار میں ہے۔ "قال ابن عمر ما رأيت بعد رسول الله اسودمن معاوية (حلیم و سخی) جاءت کے بجائے دوسری روایت میں "تطلع الرأيات السود" آیا ہے۔ اس میں تطلع کے معنی آنے کے کئے ہیں۔ کنز سے مراد خلافت

حدیث ثوبان سے اہل سنت کی مراد: مراد از مہدی خلیفۂ بنی عباس است نہ کہ امام مہدی کہ در آخر زماں می آید۔ خلافت عباسیہ کا ظہور اس پیشگوئی کی مصداق ہے۔ کیونکہ اس تحریک کا آغاز خراسان سے ہوا۔ اور خراسان عرب کے مشرق میں ہے۔ سیاہ جھنڈوں سے بنی عباس کا شعار، بنو عباس کے حامیوں نے بنو امیہ کو چن چن کر قتل کیا، ابو مسلم خراسانی نے بنی عباس کی تائید کی۔

زیارتِ قبور

زیارت عربی لفظ ہے۔ جس کے معنی ملاقات کے ہیں۔ جس کو انگریزی میں "Visit" کہا جاتا ہے۔ زیارت قبور کے معنی ہوئے زیارت اہل قبور۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ قبر تو مٹی کا ڈھیر ہے اس سے ملاقات کے کیا معنی۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں زیارت قبر کے معنی زیارت صاحب قبر کے ہوتے ہیں۔ اور اس کا مقصد اس کی روح سے ملاقات کرنی ہوتی ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ جسم کے لئے موت ہے لیکن روح کے لئے موت نہیں ہے۔ اس لئے کہ جسم ''عالم خلق'' سے ہے اور روح کا تعلق ''عالم امر'' سے ہے۔

زیارت قبور کرنی چاہئے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس تعلق سے احادیث قولی بھی ہیں اور عملی بھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت البقیع تشریف لے جانا اور شہداء کی زیارت کے لئے جانا مشہور روایتوں سے ثابت ہے۔ نیز آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ فرمایا ''اکثروا ذکرھا ذم اللذات'' یعنی لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کرو، جس کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہے کہ نہ معلوم میں کب مر جاؤں تو دنیا کی لذتوں اور شہوتوں میں اس کا دل کبھی نہیں لگے گا۔ اس خیال کا پیدا ہونا ہی ایک بڑی کامیابی، اور بہت سی نعمتوں کے حصول کا پیش خیمہ ہے۔ اگر آدمی کو موت یا سکرات موت کا خیال آجائے تو دنیا بھر کا عیش و آرام بے کیف اور ہر خوشی بے لطف ہو جائے گی۔ آدمی جب کسی کی قبر پر جاتا ہے تو اس کے سامنے دنیا کی بے ثباتی کا ایک عملی نقشہ آجاتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کچھ بھی کر و اس منزل پر تو بہر صورت آنا ہی ہے۔ پس زیارت قبور کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب تمہیں کہتا ہوں کہ اب زیارت کرو۔ کیوں کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

نہی (منع) کی بناء اس مصلحت سے تھی کہ ابتداء ''زیارت قبور کی آزادی عام طور پر غیر اللہ کی عبادت تک پہنچا دیتی تھی۔ لیکن جب اسلامی تعلیمات نے دلوں میں جگہ پکڑلی توحید ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔ (الحجتہ البالغہ ج ۲۔ ص:۲۵۹)

زیارت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قبرستان میں جائیں (مہدویہ کے پاس قبرستان کے بجائے حظیرہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں (تو کہیں السلام علیکم یا اھل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم لنا سلف و نحن بالاثر۔ یعنی اے اہل قبور تم پر سلامتی ہو، اللہ ہم کو اور تم کو بخشے۔ تم ہمارے سے آگے چلے گئے اور ہم تمہارے پیچھے ہیں) اور اگر شہید کی قبر ہو تو یوں

کہے "سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبي الدار"

قبلے کی طرف پیٹھ کر کے صاحب قبر کے سینے کے مقابل کھڑے ہو کر سورۂ فاتحہ اور جو کچھ قرآن یاد ہے وہ یا سورۂ اخلاص تین بار اور درود شریف تین بار پڑھ کر اس کا ثواب صاحب قبر کو بخش دے۔

اگر عام مومن ہو تو ان کو ثواب پہنچائے اور ان کے لئے مغفرت کی دعا کرے اور اگر صاحب قبر بزرگ ہوں تو ان سے روحانی فیض حاصل کرنے کی نیت کرے۔ اگر زیارت کرنے والے کی روح میں صفائی اور طہارت ہو اور صاحب قبر کی روح سے مناسبت ہو تو یقیناً فیض بھی حاصل ہوتا ہے اور اس کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ زائر کی روح میں لطافت ہو تو صاحب قبر کی روح سے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ اور ہم کلامی کا شرف بھی نصیب ہوتا ہے۔

اس موقع پر زیارت کا انکار کرنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ زیارت کرنے سے مردہ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس لئے کہ قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے: لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿النجم:٣٩﴾۔ یعنی انسان کو صرف اس کے کئے کا پھل ملتا ہے یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ اور در حقیقت ان کی حد درجہ کنجوسی اور بخیلی کی علامت ہے۔ وہ اپنے قریبی رشتہ دار مرحومین کے لئے کھانا کپڑا یا نقد وغیرہ سے کیا ایصال ثواب کریں گے وہ قبر پر جا کر اس کی مغفرت کی دعا بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے وہ اوپر بیان کردہ آیت کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسرے کم علم لوگوں کو بھی بھٹکانے اور بہکانے کا ٹھیکہ لے لیتے ہیں۔ حالانکہ آیت کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ دنیا دارالعمل ہے جو کچھ کرنا ہے اسی زندگی میں ہی کر لینا ہے۔ اس کے بعد جو گھر ملے گا وہ دارالجزاء ہے۔ وہاں انسان کو کچھ عمل کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ قرآن میں ہی ہے کہ کفار یہ کہیں گے کہ اگر ہم کو دوبارہ زندگی مل جائے تو ہم اچھے کام کریں گے تو کہا جائے گا کہ عمل کا دور ختم ہو گیا۔ اب یہ جزا اور بدلہ کا دن ہے۔ یہاں اب تمہارے لئے عمل کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ آدمی جب مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر باقیات الصالحات اس کے کام آئیں گے۔ اور وہ تین ہیں: کنواں کھدوانا جس سے لوگ پانی پئیں۔ مسجد یا سرائے وغیرہ بنوانا اور نیک اولاد چھوڑنا یا کوئی علمی خدمت جس سے لوگ فائدہ حاصل کریں۔ نیک اولاد اگر اپنے والدین کے ایصال ثواب کی غرض سے جو بھی اچھا کام کریں گی تو اس کا ثواب برابر والدین کو ملتا رہے گا۔

رہی یہ بات کہ کیا اصحاب قبور سے فیضان بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کے بس کی بات نہیں ہے کیوں کہ اس کے لئے روح کی صفائی اور صاحب قبر کی روح سے کامل مناسبت ضروری ہے۔ لیکن وہ فیض جو فیض تربیت کہلاتا ہے اور جو مرید کو درجہ کمال تک پہنچا دیتا ہے شاذ و نادر ہے۔ ہاں فنا اور بقاء کے بعد جب باطنی مناسبت حاصل ہو جاتی ہے تو اولیاء

کرام اور مرشدین عظام کے قبور سے فیضان حاصل کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ حضرت امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ آپ جب حضرت امام ابو حنیفہؒ کی مرقد کے پاس بیٹھتے تھے تو ایک ایک رات میں فقہ کے 80 مسائل حل ہو جایا کرتے تھے۔ حاصل کلام یہ ہے صاحب قبر کے فیضان سے تکمیل سلوک اور طے مقامات سے ہٹ کر دوسرے قسم کی برکات اور فیضان جیسے نسبت میں رسوخ چاہنا۔ یا کوئی باطنی مشکل در پیش ہو۔ یا قبض کی حالت پیدا ہوئی ہو یا کوئی اچھی حالت پیدا ہو کر ختم ہو گئی ہو تو ایسے معاملات میں بشرط استعداد یقیناً اپنے مرشد سلسلہ یا دوسرے اہل اللہ بزرگوں کے قبور سے فیض حاصل ہو سکتا ہے۔ اور سینکڑوں واقعات اس پر شاہد ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ زیارت کا مسنون طریقہ کیا ہے ؟ مسنون طریقہ تو پچھلے صفحات پر لکھ دیا گیا ہے کہ قبرستان (حظیرہ) میں جائیں تو کس طرح داخل ہونا چاہئے۔ اب عام قبر کے پاس جائیں تو قبلہ کی طرف پشت کر کے اس طرح کھڑے ہو ں کہ صاحب قبر کا چہرہ یا سینہ مقابل ہو۔ پھر سورۂ فاتحہ، قرآن کا جو حصہ یاد ہے وہ یا قل ھو اللہ احد تین مرتبہ اور درود شریف تین مرتبہ پڑھیں اور اس کا ثواب مرحوم کی روح کو بخش دیں۔

اگر صاحب قبر خاص بزرگ ہے تو پائیں سے داخل ہو اور پائیں بھی قبلہ رخ ہو کر بیٹھیں قدم بوسی کریں اور ذکر اللہ میں بیٹھ جائیں۔ درود شریف پڑھیں۔ سلسلہ پڑھیں اور ذکر اللہ کرتے ہوئے بیٹھ جائیں ہر قسم کے دنیوی خیالات کی نفی کریں اور ذکر اللہ میں منہمک ہو جائیں۔ اور اللہ سے دعا کریں کہ اس صاحب قبر کو جو فیض نصیب ہوا ہے اس کی کچھ چھینٹیں مجھ کو بھی نصیب ہوں۔ جب تک اطمینان رہے بیٹھے رہیں اور جب طبیعت میں انقباض پیدا ہو تو اٹھ جائیں پھر سینے کے پاس کھڑے ہو کر درود شریف و فاتحہ پڑھیں۔ پھر پورے ادب و احترام کے ساتھ قدم بوسی کرتے ہوئے باہر آجائیں۔ شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی نے یہ طریقہ بھی لکھا ہے: "بزرگوں سے استمداد (مدد حاصل کرنا) کا طریقہ یہ ہے کہ اس بزرگ کی قبر کے سرہانے کی جانب قبر پر انگلی رکھے اور شروع سورۂ فاتحہ سے مفلحون تک پڑھے پھر قبر کی پائینتی کی طرف جاے اور آمن الرسول آخر تک پڑھے اور زبان سے کہے اے میرے حضرت فلاں کام کے لئے درگاہ الٰہی میں التجا و دعا کرتا ہوں آپ بھی دعا کریں۔ (کمالات عزیزی۔ ص:۴۷۔۴۸ سعید کمپنی ادب منزل)

اصل بات تو مزارات پر حاضری، ان سے استمداد، اکتساب فیض اور کشف قبور وغیرہ ہے۔ باقی رہا مزارات کو مستقل حاجت روا سمجھنا تو کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو اسے شرک نہ سمجھتا ہو۔ (انیس العارفین، شاہ ولی اللہ دہلوی)

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع صحابہ میں فرمایا" الا ان القلوب تصدا کما یصداء الحدید -

قیل فما جلاءھا یارسول اللہ - قال تلاوۃ القراٰن و زیارۃ القبور "یعنی آگاہ ہو جاؤ کہ جس طرح لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے اسی طرح دل بھی زنگ خوردہ ہو جاتے ہیں۔ صحابہ نے پوچھا یارسول اللہؐ پھر وہ زنگ کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا: قرآن کی تلاوت اور زیارت قبور کے ذریعہ دلوں کا زنگ دور کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ گذر رہے تھے کہ آپ نے دو قبریں دیکھیں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ یہ کس کی قبریں ہیں، پھر آپ نے ایک درخت کی ایک شاخ توڑی۔ اس کے دو حصے کئے اور ہر ایک کی قبر پر ایک ایک ٹکڑا رکھ دیا اور کھڑے ہو کر دعا فرمائی پھر آپ نے فرمایا کہ ان دونوں پر عذاب ہو رہا تھا۔ اور ان دونوں پر عذاب کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ ان میں سے ایک چغل خور تھا اور دوسرا پیشاب سے بچتا نہیں تھا۔ پھر فرمایا کہ یہ دونوں شاخیں جب تک تر رہیں گی ان پر عذاب موقوف رہے گا۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے میں بھی خوشبو بسی ہوئی تھی اس لئے یہ یقینی بات ہے کہ جو شاخیں آپ کے دست مبارک سے مس ہوئی ہوں گی وہ خوشبودار ہو گئی ہوں گی... اسی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ قبروں پر پھول ڈالے جائیں۔ یہ اس لئے بھی کہ عرب میں پھول کہاں اگتے تھے۔ وہ تو صحراہی تھا اس لئے آنحضرتؐ نے درخت کی ٹہنی کو توڑ کر قبروں پر رکھ دیا تھا۔ ہندوستان میں ماشاء اللہ پھول بکثرت اگتے ہیں۔ اور بآسانی سستے داموں مل بھی جاتے ہیں تو لوگوں نے قبروں کی زیارت کے لئے پھولوں کا استعمال شروع کیا۔ لیکن کم فہم لوگ نہ صرف پھول سے انکار کرتے ہیں بلکہ زیارت کا ہی انکار کرنے لگ گئے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (۱) زیارت کرنے کا حکم دیا۔ (۲) زیارت کے فائدے بتائے ایک تو یہ کہ اس سے زیارت کرنے والوں کے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ جس کی زیارت کی جاتی ہے اس پر عذاب بھی ہو رہا ہو تو وہ موقوف ہو جاتا ہے۔

ہمارے لئے حضرت امام مہدی موعود علیہ السلام کا عمل توجحت کبریٰ ہے۔ چنانچہ حضرت مہدی علیہ السلام نے بہت سے اولیاء کرام کی زیارت فرمائی۔ بعض اولیاء نے تو آپ سے قبروں پر آکر زیارت کرنے کی استدعا کی ہے۔ اور اثناء ہجرت جن مقامات پر سے آپ کا گذر ہوا ہے وہاں کے اولیاء کے مزاروں کی آپ نے زیارت فرمائی ہے اور بعض اولیاء اللہ کے مقامات کی خبر بھی دی ہے۔

زنا

زنا، اس کے معنی کسی نامحرم سے بلا نکاح اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے تعلق سے پہلے یہ حکم دیا: وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴿نساء:۱۵﴾ اے مسلمانو، تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہو ان پر (اپنوں) مسلمان مردوں میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو اگر وہ ان کی بدکاری کی گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روک رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا کام تمام کردے، یا یہ کہ اللہ ان کیلئے کوئی راستہ نکالے۔

یہ حکم ابتدائی زمانے میں تھا، گھروں کی قید اس لئے لگائی گئی کہ اس زمانے کے قبائلی نظام میں جیل خانوں کا انتظام نہیں تھا، مگر بعد میں جب جیل خانے بنائے گئے تو ان کو جیل خانے میں بند کیا جانے لگا، جس کا مطلب یہی تھا کہ یہ بیماری دوسروں تک پہنچنے نہ پائے۔ یہ سزا نہیں تھی بلکہ غلط کام اور فحش حرکت کے سدّباب کا ایک موئثر اقدام تھا۔

اسی لئے اللہ نے اس کے فوراً بعد میں "أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴿النساء:۱۵﴾" بھی فرمادیا۔ یعنی سر دست یہ تدارک ہے۔ اس پر عمل کرو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا یہ کہ اللہ ان کیلئے کوئی راستہ نکالے، گویا اس آیت کے آخری حصّہ میں یہ بھی فرمادیا گیا کہ اس تعلق سے آئندہ احکام آئیں گے، پھر سورۂ بنی اسرائیل میں زنا کے تعلق سے سخت حکم دیا گیا کہ زنا اتنا گھناؤنا جرم ہے کہ اسکے قریب بھی تم کو پھٹکنا نہیں چاہیئے۔ چناچہ ارشاد باری ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿الإسراء:۳۲﴾۔ اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو، بے شک وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔ قریب بھی نہ جاؤ کہ معنی ہیں کہ اس کے مبادی، مقدمات اور دواعی (اس کی طرف بلانے والی حرکتیں) سے بھی پرہیز کرو۔ جیسے غیر عورت کو گھور کر دیکھنا، ان کے ساتھ تنہائی میں رہنا، بوس و کنار کرنا وغیرہ۔

زنا سے اس لئے روکا گیا کہ اس کے سبب نسب میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ کسی کی بہو، بیٹی کی عزت و ناموس محفوظ نہیں رہ سکتی۔ آپس میں اسکی وجہ سے قتل و خون کی واردات عمل میں آتی ہیں، معاشرہ میں فساد پیدا ہوتا ہے، اور معاشرہ میں ایسے افراد خواہ مرد ہو یا عورتیں بری نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور کوئی ان سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔

ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ یارسول اللہ۔ میں سب احکام کو مانتا ہوں مگر مجھے زنا کی اجازت دیجئے، اس پر صحابہ کرامؓ بھڑک اٹھے اور کہا، اے گستاخ چپ رہ۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنے پاس

بلایا اور فرمایا، کیا تو یہ حرکت اپنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی کیلئے پسند کرتا ہے۔ اس نے کہا، میں آپ پر سے قربان ہو جاؤں، ہر گز نہیں۔ آپؐ نے فرمایا اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اس حرکت کو گوارہ نہیں کرتے، وہ نادم ہوا، آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس کے دل کو پاک اور شرم گاہ کو محفوظ رکھنے کیلئے اللہ سے دعا فرمائی، دعا کی برکت سے وہ شخص اس لعنت سے محفوظ ہو گیا۔

اس کے بعد سورۂ نور میں اللہ نے زنا کی سزا سنائی ہے: **الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّـهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ** ﴿النور:٢﴾ بدکاری کرنے والی عورتیں اور بدکاری کرنے والے مرد، سو مارو ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے اور تم کو اللہ کے دین کے معاملہ میں ان دونوں پر ذرا رحم نہ کرنا چاہئے، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو بھی حاضر رہنا چاہئے۔

اس سے یہ حکم ملا کہ اگر کوئی آزاد، بالغ مرد اور عورت بدکاری کے مرتکب ہو جائیں تو ان کو سو کوڑے مارنا چاہئے، اگر وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ اگر وہ شادی شدہ ہوں اور یہ گناہ کر رہے ہوں تو انکی سزا سنگساری ہے۔

یہ بھی حکم دیا گیا کہ، خبر دار اللہ کی جانب سے مقرر کردہ سزا کو جاری کرنے میں تم کو ترس نہ آنا چاہئے کہ تم اس میں کمی کرو (نہ غصہ کرنا چاہئے کہ اس میں زیادتی کرو) بندوں کے حق سے زیادہ اللہ کے حق کا خیال تم پر غالب رہنا چاہئے کہ اسکی وجہ سے سماج اور معاشرہ برائیوں سے پاک ہو سکتا ہے اور اللہ کی رضامندی بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

نیز یہ بھی حکم دیا گیا کہ یہ سزا تنہائی اور چوری چھپے نہ دی جائے بلکہ مجمع عام میں دی جائے تاکہ مجرم کی رسوائی ہو اور دیکھنے والوں کے لئے سامان عبرت ہو۔ اللہ نے سورۂ نساء میں وعدہ کیا تھا کہ ان کیلئے کوئی راستہ نکالیگا تو سورۂ نور میں ان کیلئے اللہ نے یہ راستہ اس طرح نکالا ہے۔ کیونکہ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ غلطی سے وہ دونوں گناہ کا ارتکاب تو کر چکے ہیں، اب آئندہ وہ زندگی کیسے گذاریں۔ **الزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذَٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ** ﴿النور:٣﴾ زانی مرد تو زانیہ یا مشرک عورت کے سوا کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتا اور بدکار عورت سے کوئی نکاح نہیں کر سکتا مگر بدکار مرد یا مشرک اور یہ مومنوں پر حرام ہیں۔

کیا زانی اور زانیہ ایک دوسرے سے نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ میں کافی اختلاف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں سختی کے ساتھ منع کیا گیا تھا۔ یعنی ایک زانی ایک پاک دامن عورت سے نکاح نہ کرے، اسی طرح کسی زانیہ سے بھی

کوئی صالح مرد نکاح نہ کرے۔ کیوں کہ ان دونوں میں کوئی مجانست نہیں ہے۔ ایک بدکاری کی طرف مائل ہے اور دوسرا نیکی اور عفت کی طرف۔ زانی اللہ کی حکم کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے شرک کے حکم میں داخل ہو گیا ہے، اسی لئے حکم دیا گیا کہ کسی زانیہ سے کوئی زانی نکاح کرے یا مشرک۔ یہ حکم تہدیدی ہے اور سماج میں عزت اور وقار کو باقی رکھنے کیلئے دیا گیا ہے لیکن ایسے دونوں آپس میں نکاح کرلیں تو نکاح ہو سکتا ہے۔ بعض مفسرین نے "و حرم ذلك على المومنين" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایسا نکاح (یعنی زانی کا پاک دامن سے یا زانیہ کا مرد صالح سے) مومنین پر حرام کر دیا گیا ہے۔

زقّوم

أَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿الصافات:٦٢﴾

اللہ نے کافروں کیلئے زقوم کا درخت پیدا کیا ہے۔ یہ نہایت بدنما اور بدصورت شیطان کے سر کی طرح ہے۔ یا سانپ کے پھن کی طرح ہے۔ بڑا کڑوا اور بدمزہ ہے۔ دوزخ کی جڑ میں سے اللہ نے اسکو نکالا ہے۔ جب دوزخی بھوکے ہوں گے اور کھانا مانگیں گے تو یہی ان کو کھانے کیلئے دیا جائے گا۔ اور وہ مجبوراً اسی سے اپنا پیٹ بھریں گے۔ پھر جب پانی مانگیں تو دوزخ میں جلنے والے مجرموں کے بدنوں سے نکلنے والا کھولتا ہوا پیپ ان کو پلایا جائے گا۔ حالانکہ ان کے پاس ڈرانے والے پیغمبر آئے تھے۔ جنھوں نے ان کو نصیحت بھی کی تھی لیکن ان لوگوں نے اپنے گمراہ باپ دادا کی اندھی تقلید میں ان کی نصیحت نہیں سنی تھی۔ اور اپنا یہ انجام دیکھ لیں گے۔

زکریاؑ

زکریا کا لفظ قرآن شریف میں سات مقامات پر آیا ہے۔

(۱) وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ﴿آل عمران:۳۷﴾ اور اس لڑکی (مریم) کی اچھی طرح پرورش کی اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔

(۲،۳) كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا – هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ﴿آل عمران:۳۷،۳۸﴾ جب کبھی زکریا عبادت گاہ میں اس کے پاس جاتے تو اس کے پاس کھانا موجود پاتے اسی وقت زکریا نے اپنے رب سے دعا کی۔

(۴) وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿انعام:۸۵﴾ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس سب صالحین میں سے ہیں۔

(۵) ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا ﴿مریم ۲﴾ یہ ذکر ہے تیرے پروردگار کی رحمت کا جو اس کے بندے زکریا پر ہوا۔

(۶) يَا زَكَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَل لَّهُ مِن قَبْلُ سَمِيًّا ﴿مریم:۷﴾ اور زکریا ہم تم کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے، اس سے پہلے ہم نے کسی کو اسکا ہم نام نہیں بنایا۔

(۷) وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ﴿الانبیاء:۸۹﴾ اور یاد کرو زکریا کو بھی جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب مجھے اکیلا (لاوارث) نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے۔

حضرت زکریاؑ بی بی مریم کے خالو تھے، مریم کی سرپرستی کیلئے ان کو ہی منتخب کیا گیا تھا۔ چونکہ مریم عبادت خانے میں ہی رہتی تھیں۔ سودا سلف لانے والا آپ کے پاس کوئی نہیں تھا اور نہ آپ بازار کو جاتی تھیں اس کے باوجود جب زکریاؑ ان کے پاس جاتے تو وہاں آپ موسم سرما میں موسم گرما کے پھل دیکھتے اور گرما میں سرما کے پھل پاتے، جب آپ مریم سے پوچھتے کہ یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے تو وہ کہتیں یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے، اس وقت تک حضرت زکریاؑ بے اولاد تھے۔ جب یہ دیکھا تو معاً خیال پیدا ہوا کہ اللہ مجھے بھی بے موسم کا میوہ دے سکتا ہے۔ یعنی بڑھاپے میں اولاد دے سکتا ہے۔ پس اسی وقت آپ نے اللہ سے دعا کی "اے میرے پروردگار مجھے اپنی جانب سے صالح اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔ وہ ابھی عبادت گاہ میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ فرشتوں نے ان کو آواز دی (زکریا) خدا تمہیں (فرزند) یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰؑ) کی تصدیق کریں گے، وہ سردار ہوں گے، عورتوں سے بے جار غبت نہ رکھیں گے اور پیغمبر بھی ہوں گے، یہ سن کر زکریاؑ نے کہا، اے میرے رب میرے ہاں لڑکا کیوں کر پیدا ہوگا

جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو اللہ نے کہا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کہا اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرما۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن تک اشاروں کے سوا بات نہ کر سکے گا، یعنی حمد خدا، ثناء، ذکر اور شکر زبان کے ذریعہ آپ کر سکتے تھے۔ لیکن جب مخلوق سے بات کرنے کا ارادہ فرماتے، وہ نہیں کر سکتے تھے۔

زبور

زبور کا لفظ قرآن میں ایک جگہ آیا ہے اور زبوراًدو جگہ آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿الانبیاء:۱۰۵﴾ اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿النساء:۱۶۳﴾ اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿الاسراء:۵۵﴾ اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت دی اور داؤد کو زبور عطا کی۔

اللہ نے پیغمبروں کو کتابیں اور صحیفے عنایت فرمائے ہیں، کتابوں میں چار کتابیں مشہور ہیں، توریت، انجیل، زبور اور قرآن۔ توریت حضرت موسیٰؑ کی ہے، انجیل حضرت عیسیٰؑ کی ہے، زبور حضرت داؤدؑ کی اور قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی۔ قرآن کے سوا ساری کتابیں منسوخ ہیں۔ اس لئے کہ ان کی امت نے ان کتابوں میں بہت کچھ تحریف اور تصحیف سے کام لیا ہے، وہ کتابیں اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہیں۔ ہاں کچھ احکام ایسے ہیں جو صحیح ہیں۔ جن کا ذکر قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔ ہم کو یہ حکم ہے کہ تمام پیغمبروں پر اور ان پر نازل کردہ کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لائیں، لیکن عمل صرف قرآنی تعلیمات اور احکام پر کریں۔ اس لئے کہ قرآن شریف ہر قسم کی تحریف اور تصحیف سے پاک ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ خود اللہ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ وعدہ الٰہی اسطرح آیا ہے، "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" ﴿الحجر:۹﴾ یعنی، بے شک ہم نے ہی ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اسکے محافظ ہیں۔

سویّت

سویّت کے معنی ہیں مال کی برابر تقسیم۔ امامنا مہدی موعود علیہ السلام کی یہ نشانی احادیث میں آئی ہے کہ مہدی مال کی برابر تقسیم کرے گا۔ "یقسم المال علی السویۃ" چنانچہ ہمارے پاس جو روایتیں حضرت مہدی علیہ السلام کی سیرت کے تعلق سے ہماری قومی کتابوں میں آئی ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے پاس جو بھی مال آتا تھا آپ اس کو موجود اور حاضر لوگوں میں برابر تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آزمائش کے طور پر ایک تل کا دانہ آپ کی خدمت میں پیش کیا (یہ دیکھنے کے لئے کہ مہدیؑ اس کی تقسیم ایک جم غفیر میں برابر برابر کس طرح فرمائیں گے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا اس تل کے دانے کو پیس کر پانی میں ملا دیا جائے اور وہ پانی سب کو پلایا جائے۔

اس فقیر کے ذہن میں ایک عرصہ سے یہ خیال آتا رہتا تھا کہ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کیا ایسی کوئی روایت مروی ہے۔ جس میں آپ نے ایک نہایت ہی قلیل چیز کی اس طرح سب میں برابر برابر تقسیم فرمادی ہے۔ الحمد للہ، اللہ کا شکر و احسان ہے کہ تصوف کی عظیم اور شہیر شخصیت حضرت علی ہجویری نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" کے صفحہ ۴۳۶ پر ایک راویت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تعلق سے قلم بند کی ہے۔

اس کے الفاظ ہیں "روایت ہے کہ فرانروائے حبشہ نے دو سیر مشک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے سب کا سب مشک پانی میں ڈال دیا اور حاضر سب اصحاب پر چھڑک دیا۔

دیکھا آپ نے کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سویت کا انتظام فرمایا۔ مشک کی خوشبو سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہاں اس کی مقدار اتنی نہیں تھی کہ تمام لوگوں میں برابر برابر تقسیم ہو سکے، تو آپ نے اس کو پانی میں ڈال کر سب لوگوں پر چھڑک دیا تاکہ سب اس سے برابر برابر متمتع ہو جائیں اور حضرت مہدی علیہ السلام کے پاس تل کا دانہ آیا جو کھائی جانے والی چیز تھی تو آپ نے اسے پیس کر پانی میں ڈالنے اور اس کو سب میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ سبحان اللہ کیا اتباع تام ہے۔

امامؑ کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں آپ "بجز رسالت مآبؐ ایک انفرادی شان کے مالک ہیں۔ آپ اپنی پوری حیات طیبہ میں، وہ تمام مال جو آپ کی خدمت میں بطور فتوح للہ آتا تھا، فقراء میں برابر برابر تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ خواہ وہ مال شاہی خزانے سے اونٹوں یا گاڑیوں پر آیا ہو یا تل کا دانہ ہو۔

سلطان غیاث الدین تغلق کے پاس سے بے شمار فتوح آپ کی خدمت میں آئی۔ مگر آپ نے وہ سب کی سب فقراء اور

سائلین میں تقسیم فرمادی۔ آخر میں ایک بیش قیمت تسبیح رہ گئی تھی جسے امامناؑ نے ایک دفالی کے سوال کرنے پر انگلی میں پھرا کر اس طرح پھینکا کہ وہ تسبیح اس کے کاسہ میں گری۔ میاں سید سلام اللہ نے عرض کیا کہ میرانجی وہ تسبیح ایک لاکھ محمودی کی ہے۔ آپ نے جواب دیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴿النساء:۷۷﴾ جب پوری دنیا کی متاع قلیل ہے تو اس کے مقابلے میں اس تسبیح کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

سویت کا یہاں تک اہتمام کیا جاتا تھا کہ حضرت ثانی مہدی و حضرت امیر کبیرؓ و نیز دیگر صحابہؓ سویت کے وقت اکثر اوقات خود اوپر بیٹھ کر سویت کرواتے۔ اور کہیں سے کھانا آنے پر بھوک کی وجہ سے روتے بچے کو بھی تقسیم سے پہلے ایک لقمہ بھی نہ دیا جاتا۔ فتوح کی نسبت مہدیؑ فرماتے ہیں، خدا بندے کو (مجھ کو) فقیروں کے واسطے سے دیتا ہے۔ اس لئے حسب ایماء مرشد کی فتوح میں کل فقیران دائرہ کا حق سمجھا جاتا تھا۔

سویت: عن ابي موسىٰ-ان الاشعر يين اذا ارملوا في الغزو وقل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد ثم اقتسموه بينهم في اناء واحد بالسوية فهم مني و انا منهم (زبدۃ البخاری۔۲۵۶) حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "قبیلہ اشعر کے لوگ جب جہاد میں مفلس ہو جاتے ہیں یا مدینہ میں ان کے اہل وعیال کا کھانا کم ہو جاتا ہے تو جو (سامان غذا) ان کے پاس موجود ہوتا وہ اس کو ایک کپڑے میں جمع کر لیتے ہیں اور اس کو باہم ایک برتن سے برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ پس وہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

یہی عمل ہمارے پاس بزرگان دین کے 'بہرہ ءعام' کے موقع پر آج بھی نظر آتا ہے، چنانچہ کسی بزرگ کے بہرۂعام کے موقع پر مختلف گھروں سے مختلف اجناس یعنی گیہوں، چنے اور لوبے (باقلاء) وغیرہ اُبال کر مرشد کے پاس لاتے ہیں، پھر مرشدِ دائرہ، ان سکو ایک بڑی سینی میں ملا دیتے ہیں، اور پھر تمام حاضرین کو بلا امتیاز امیر و غریب علیٰ السویۃ اپنے ہاتھوں سے ان کے بچھائے ہوئے کپڑے میں تقسیم کرتے ہیں۔

سماع موتی وحیات انبیاء

قرآن مجید کی آیت "إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ ﴿النمل:۸۰﴾"۔اور دوسری جگہ "ومآانت بمسمع من فی القبور"۔ میں نفی "وجود سماع" نہیں ہے۔بلکہ نفی انتفاع ہے۔حدیث انسؓ، زندوں کے اعمال مردہ اقرباء پر پیش ہوتے ہیں۔اگر اچھے اعمال ہوتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں۔برے ہوتے ہیں تو وہ رنجیدہ اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ تو ان کو ہدایت دے۔اور ہدایت کے بغیر ان کو موت نہ دے۔

فقہاء نے قبر مبارک پر سلام عرض کرتے وقت شفاعت کا سوال کرنے کو لکھا ہے۔

سماع کے علاوہ مردوں کے کلام سننے کے بھی واقعات ملتے ہیں۔ترمذی میں ہے ایک صحابی نے ایک جگہ خیمہ لگایا۔تھوڑی دیر کے بعد اس جگہ اندر سے سورۂ ملک پڑھنے کی آواز آئی۔وہ صحابی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اور واقعہ سنایا تو آپ نے تصویب فرمائی۔اس طرح زید بن خارجہ صحابی کی موت کا واقعہ ہے۔جو حضرت عثمان کے دور خلافت میں پیش آیا۔کہ انتقال سے کافی دیر کے بعد کفن منہ سے ہٹایا اور باتیں کیں۔(تہذیب، عمدۃ الاخبار)

۱) جس طرح عام مومنین پر عرض اعمال ہوتے ہیں۔سرکار کائنات کی جناب میں بھی ان کی امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔علامہ سیوطی نے رسالہ حیات الانبیاء میں نقل کیا ہے کہ استاد اکبر منصور عبد القادر بن طاہر بغدادی شیخ شافعیہ نے فرمایا "ہمارے محققین متکلمین کا یہ فیصلہ ہے کہ حضرت نبی کریمؐ بعد وفات کے زندہ ہیں۔اور آپ اپنی امت کے نیک اعمال پر مطلع ہو کر خوش ہوتے ہیں۔اور برے اعمال سے رنجیدہ پھر "رد روح" کے معانی بیان فرماتے ہوئے ایک جواب یہ بھی دیا کہ اس سے مراد حضورؐ کا دوسرے مشاغل مبارکہ یعنی اعمال امت کا ملاحظہ، برائیوں سے ان کے لئے استغفار، مصائب کے زوال کی دعا وغیرہ سے توجہ ہٹا کر سلام پڑھنے والے کے لئے توجہ فرمانا ہے۔کیوں کہ سلام افضل اعمال اور اجل قربات ہے۔

۲) جامع صغیر میں حدیث ہے کہ جمعہ کے روز انبیاء علیہم السلام اور والدین پر اعمال پیش ہوتے ہیں۔اور ایک حدیث میں ہے خاتم الانبیاء پر آپ کی امت کے اعمال روزانہ صبح وشام پیش ہوتے ہیں۔مسند بزار میں سند جید کے ساتھ حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میری زندگی تمہارے لئے بہتر ہے کہ براہ راست میری باتیں تم تک اور تمہاری باتیں مجھ تک پہنچتی ہیں۔اور میری وفات کے بعد تمہارے واسطے بہتر ہی ہو گی کہ تمہارے اعمال مجھ پر پیش ہوتے رہیں گے تو تمہاری نیکیوں پر میں خدا کا شکر ادا کروں گا اور برائیوں پر خدا سے تمہارے لئے استغفار کروں گا۔(شرح المواہب)

۳) نبی کریمؐ کی جناب میں درود و سلام کا پیش ہونا اور قریب والوں سے خود سننا اور جواب دینا اس کے بارے میں بکثرت احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔ جن سے مسئلہ حیات النبی پر روشنی پڑتی ہے۔

۴) اور آیت " وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رُّسُلِنَا ﴿الزخرف:۴۵﴾ "کو بڑے بڑے مفسروں نے واقعہ اسرا پر محمول کیا ہے۔ اور انبیاء کی حیات پر استدلال کیا ہے،

۵) عدم توریث مال سے بھی حیات حضور انورؐ پر استدلال ہوا ہے۔ (۱) حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ "فدک وغیرہ جائیداد" حضورؐ کی ملک نہ تھا۔ بلکہ وہ بیت المال تھا۔ پھر میراث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ملک تھی تب بھی آیت میں حکم میراث دوسروں کے لئے ہے نہ کہ حضور کے لئے کیونکہ دوسرے احکام مثلاً چار سے زائد نکاح وغیرہ کا عدم جواز وغیرہ بھی دوسروں کے لئے ہیں۔ تو اب ترکہ تقسیم نہ ہونا اس لئے ہے کہ آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ "ونبي الله حي يرزق"

تیسرے اگر تسلیم بھی کر لیں کہ آیت مذکورہ کے احکام عام ہیں جس میں آپ بھی شامل ہیں تو "نحن معاشر الانبياء" والی حدیث مشہور ہے۔

۶) حضورؐ کی ازواج مطہرات سے دوسروں کا نکاح حرام ہونا بھی آپ کی حیات پر دال ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب، تفسیر مظہری میں (۴۰۸) آیت "وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّـهِ وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَدًا ﴿الأحزاب:۵۳﴾ کے ذیل میں لکھتے ہیں: "اور یہ بھی درست ہے کہ یہ حکم اس لئے نازل ہوا کہ نبی کریمؐ اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ اسی وجہ سے حضورؐ کا ترکہ مورث نہیں ہوا اور نہ آپ کی ازواج بیوہ ہوئیں"۔

۷) سرور کائناتؐ کی ازواج مطہرات پر احکام بیوگی۔ عدت وغیرہ بھی جاری نہیں ہوئے۔

۸) ازواج مطہرات کا نفقہ اور خدام کے مصارف حضرت صدیقؓ نے آپ کے مال یا بیت المال سے ادا کئے۔ علامہ سبکی نے اس موقع پر فرمایا کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ آپ کی حیات مبارکہ کے اثرات احکام دینوی میں بھی ہیں۔ اور اس سے انبیاء علیہم السلام کی حیات شہداء کی حیات سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ (شفاء السقام 142)

۹) إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ﴿الزمر:۳۰﴾ سے استدلال کیا گیا ہے کہ حضورؐ کی موت دوسروں کی موت سے ممتاز ہے۔ جس طرح آپ کی قوم دوسروں کی قوم سے ممتاز تھی۔ حالانکہ "النوم اخ الموت" صحیح ہے۔ لیکن جس طرح نوم کے

اثرات آپ پر وہ نہیں تھے۔جو دوسروں پر ہوتے ہیں۔اسی لئے آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔یعنی غفلت نہیں ہوتی۔اوراسی وجہ سے نوم انبیاء کو ناقص وضوء قرار نہیں دیا گیا۔اسی طرح موت کے اثرات بھی انبیاء پر وہ نہیں ہوتے جو دوسروں پر ہوتے ہیں۔

۱۰)سلامت اجساد انبیاء بھی جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔حیات انبیاء کے لئے دلیل ہے۔کیونکہ سلامت اجساد کی خاصیت عام وخاص مومنین کے لئے بھی ثابت نہیں ہے۔خلاصہ یہ کہ انبیاء کو موت آتی ہے لیکن وہ مزیل حیات نہیں بنتی۔پس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حیات جسمانی پردۂ موت کے نیچے مستور ہے(115)

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ کچھ بھی ہو موت تو واقع ہوگئی پھر آپ کی ملک تقسیم کیوں نہیں ہوئی۔تو اس کا یہ جواب ہے کہ میراث کا حکم موت مستمرہ پر ہے نہ کہ غیر مستمرہ پر۔حضورؐ کی موت ’’آنی‘‘ تھی ’’زمانی" نہیں تھی۔بس ایک لمحہ کے لئے موت وارد ہوئی تھی۔روح کا رشتہ بدن سے منقطع ہوا تھا۔پھر آپ کو زندگی عطا کردی گئی۔پھر روح کا رشتہ بدن سے جڑ گیا۔خلاصہ یہ کہ حضورؐ اپنی قبر میں زندہ ہیں۔اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے۔بلا مکلف ہونے کے اور یہ حیات مخصوص ہے۔آنحضرتؐ اور تمام انبیاء اور شھداء کے ساتھ برزخی نہیں ہے۔جو حاصل ہے تمام مسلمانوں کو بلکہ سب آدمیوں کو۔نیز علامہ سیوطی نے رسالہ انبیاء الاذکیاء ’’بحیوٰۃ الانبیاء‘‘ میں یہ تصریحاً لکھا ہے۔کہ علامہ سبکی نے فرمایا انبیاء وشھداء کی قبروں میں حیات ایسی ہے جیسے دنیا میں تھی۔اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا اس کی دلیل ہے کیوں کہ نماز زندہ جسم چاہتی ہے (۱۱۸۔ملفوظات)

سجدۂ شکرانہ

بعض فقہاء نے سجدہ شکر کو مکروہ لکھا ہے۔حالانکہ ثابت ہے کہ احیاناً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ شکرانہ ادا کیا ہے۔جب حدیثوں میں ’’خر ساجدا‘‘ صاف وارد ہے۔گو اس میں تاویل صلی صلوٰۃ کی گئی ہے۔لیکن اس میں شک نہیں کہ تاویل بعید ہے۔سیدھی بات یہی ہے کہ آپ نے سجدہ شکر ادا کیا ہے۔اور کبھی نہیں بھی کیا۔

پس فقہاء نے اس سے سمجھا ہے کہ سجدہ شکر مقاصد دین میں سے نہیں ہے۔فی نفسہ مندوب ہے۔لیکن مفسدہ یہ دیکھا کہ اس کو ضروری سمجھنے لگیں گے اور اس کو اپنی حد پر نہ رکھیں گے۔اس نے اس کو مکروہ ٹھہرا دیا۔(وعظ ص:۸۷۔علمی مضامین ص۱۰۹)

سجدۂ شکرانہ یا سجدۂ مناجات

سجدۂ شکرانہ ہو کہ سجدۂ مناجات ہر دو سجدے جائز ہیں، خواہ اکیلا صرف سجدہ کیا جائے یا دو رکعت نماز کے بعد کیا جائے، چنانچہ شرع محمدی میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ کسی نعمت کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدۂ شکر بجالانا مستحسن ہے، بدعت تو ہرگز نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس پر گواہ ہے چنانچہ فتاویٰ برہنہ میں لکھا ہے "چوں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم رانعمتے می رسیدے می فرمودے۔ الحمد لله الذي تتم الصالحات بنعمته، بعدہ دو رکعت میگذارد یا سجدہ میکرد" جب پیغمبرؐ کو کوئی نعمت پہنچتی تو آپ فرماتے "سب تعریفیں اللہ کے لئے سزاوار ہیں جس کی نعمت سے نیک کام پورے ہوتے ہیں، اس کے بعد آپ دو رکعت ادا کرتے یا سجدہ (شکر) کرتے۔

کنز الدقائق جو فقہ کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ سجدۂ شکر امام ابو حنیفہ کے پاس مکروہ ہے کیوں کہ اس میں تقرب الی اللہ نہیں ہے۔ لیکن صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے پاس یہ سجدہ باعث قرب الٰہی ہے۔ پس جائز ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قبلہ رو ہو کر تکبیر کہے۔ اور سجدہ کرے۔

اسی کتاب کے حاشیہ میں لکھا ہے "پس نزد ہمہ جائز است سجدۂ شکرانہ "یعنی سب کے پاس سجدۂ شکرانہ جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے (فتاویٰ برہنہ صفحہ 288)۔ اب رہی بات سجدہ مناجات کی تو مذکورہ بالا کتاب کے اسی صفحہ پر لکھا ہے "وسجدۂ مناجات بعد از نماز منع نیست" یعنی نماز کے بعد سجدۂ مناجات منع نہیں ہے۔

پس مہدویہ کا یہ عمل کہ وضوء کے فوراً بعد تحیۃ الوضوء پڑھتے ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد "سجدۂ شکرانہ" ادا کرتے ہیں، یہ "احیاء سنت" ہے نہ کہ "بدعت"، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

نیز شب قدر میں "دوگانہ" کی ادائیگی کے بعد بھی مہدویہ کے پاس جو سجدہ کیا جاتا ہے وہ "سجدۂ مناجات" ہے، جس میں اللہ تعالیٰ سے "دیدار" کی دعا کی جاتی ہے۔

سالک مجذوب و مجذوب سالک

عبادت اور ریاضت و مجاہدہ سے سالک میں اللہ تعالیٰ سے قرب کی جو استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد محض فضل خداوندی سے اس کے قلب کو بالفعل ایک خاص تعلق جذبی مطلوب حقیقی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو سالک مجذوب کہتے ہیں۔

اور کبھی محض جذبہ غیبی سے یا کسی بزرگ کی توجہ و ہمت سے اول نسبت حاصل ہو جاتی ہے پھر وہ سلوک کا راستہ طے کرتا ہے اس کو مجذوب سالک کہا جاتا ہے۔

پہلے کو سالک مجذوب، مرید اور محب بھی کہتے ہیں اور دوسرے کو مجذوب سالک، مراد اور محبوب کہتے ہیں۔

سفر در وطن

اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی صفات بشریہ اور اخلاق ردیہ کو چھوڑ کر صفات الٰہیہ اور اخلاق فاضلہ کو حاصل کرے۔ یعنی طلب جاہ و جلال، مال و منال، و بغض و کینہ، حسد و تکبر وغیرہ سے دل کو پاک کرے۔ کیونکہ جب تک یہ خصائل ذمیمہ دل میں ہوں گے، اپنے اصلی وطن کی جانب سفر مشکل ہو جائے گا۔ چہ جائے کہ نور خدا دل میں سما سکے۔

شاہ بو علی قلندرؒ فرماتے ہیں: صد تمنا در دلے داری فضول — کے کند نور خدا در دل نزول

اور مولانا رومیؒ فرماتے ہیں: ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں — ایں خیالست و محالست و جنوں

تو خدا کو بھی چاہے اور ذلیل دنیا کو بھی، یہ محض خیال، جنوں اور محال بات ہے۔ خدا کے سوا جس چیز کی محبت ہے۔ اصل بت وہی ہے۔ جب تک اس بت کو نہ توڑے گا اور دل کے بت خانے کو بتوں سے پاک کر کے خانہ خدا نہ بنائے گا اللہ کے پاس وہ بت پرست ہی کہلائے گا۔ تخلقوا باخلاق اللہ کا بھی یہی مفہوم ہے۔

سفر در وطن سے مراد سیر آفاقی کو چھوڑ کر سیر انفسی کی طرف مراجعت ہے۔

سورۂ فاتحہ

سورۂ فاتحہ امام کے پیچھے مقتدی کو پڑھنا چاہئے یا نہیں۔ ائمہ اربعہ یعنی چاروں اماموں کے مابین مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پاس قرأۃ فاتحہ خلف الامام جائز نہیں ہے۔ البتہ امام شافعی کے پاس پڑھنا ضروری ہے۔ اسی طرح دوسرے اماموں کے پاس بھی۔ یوں بھی امام ابو حنیفہؒ کے پاس مصلی کو سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ لیکن امام شافعی کے پاس فرض ہے۔

حضرت امامنا سیدنا مھدی موعودؑ نے مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری قرار دیا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا لا صلوٰۃ إلّا بفاتحۃ الکتاب یا لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ امّ الکتاب یا امّ القرآن۔ یعنی سورۂ فاتحہ (کی تلاوت) کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے بھی اسی کا حکم دیا ہے۔ جب آپؑ سے پوچھا گیا کہ امام ابو حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے سے بہتر منھ میں کنکریوں کا بھر لینا ہے تو امام علیہ السلام نے جواب دیا کہ کلی کرنے سے کنکریاں نکل جائیں گی لیکن گئی ہوئی نماز نہیں آئے گی۔ اس سے کم عقل لوگ یہ خیال نہ کریں کہ مھدی علیہ السلام نے امام شافعی کے مسلک کی اتباع کی ہے۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ مھدی علیہ السلام اللہ کے خلیفے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع تام ہیں۔ اور امام شافعی (اسی طرح دیگر ائمہ) مجتہد ہیں۔ اللہ کا خلیفہ مجتہد کی کس طرح اتباع کر سکتا ہے۔ اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف کی وجہ امت میں جو افتراق پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مہدی علیہ السلام کے ذریعہ اس اختلاف کو ختم کر دے گا۔ اور ان چاروں میں جو حق ہے اسے ظاہر فرمادے گا۔ اس سے نعوذ باللہ کسی امام کی تحقیر مقصود نہیں ہے۔ مجتہد کو اگر وہ غلطی بھی کر جائے تو اللہ کے پاس اسے ثواب ملے گا۔ چنانچہ مہدویہ کا اعتقاد یہ ہے کہ حق چاروں مسلکوں میں دائر ہے۔ البتہ جو قول اور جو عمل حضرت امام مھدی علیہ السلام سے مروی ہے وہ حق ہے اور فیصلہ کن ہے اور حضرت مھدی موعود علیہ السلام نے فرمایا "مذہب ما کتاب اللہ و اتباع محمد رسول اللہ"۔

سفیانی

يكون اختلاف عند موت خليفة، فينحرج رجل من اهل المدينة هارباً الي مكة فياتيه ناس من اهل مكة فيخرجونه وهو كاره فيبايعونه بين الركن و المقام و يبعث اليه بعث من الشام فيخسف بهم بالبيداء بين مكة والمدينة فاذا راءه الناس ذالك اتاه ابدال الشام و عصائب اهل العراق فيبايعونه فينشاء رجل من قريش اخواله كلب فيبعث اليه بعث فيظهرون عليهم و ذالك كلب و لمن لم تشهد غنيمة كلب، فيقسم المال و يعمل في الناس بسنة نبيه ﷺ و يلقي الاسلام بجرانه الي الارض فيلبث سبع سنين ثم يتوفي و يصلي عليه المسلمون (الملتقطات شرح مشکوٰۃ باب اشراط الساعۃ مطبع احمدی لاہور ۱۳۲۱ھ صفحہ ۷۸)

ام سلمہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ ایک خلیفہ کے انتقال کے وقت اختلاف ہو گا۔ تو اہل مدینہ سے ایک شخص بھاگ کر مکہ چلا جائے گا۔ اہل مکہ اس کے پاس آئیں گے۔ اور اس کو نکال کر زبردستی سے جب کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہو گا۔ رکن و مقام کے درمیان اس سے بیعت کریں گے۔ لوگ یہ حال دیکھیں گے تو ملک شام سے ایک لشکر اس کی طرف بھیجا جائے گا۔ تو وہ لشکر مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام بیدا میں دھنسا دیا جائے گا۔ اس کے بعد شام کے ابدال اور عراق کے اولیاء آکر اس سے بیعت کریں گے۔ پھر اس کے بعد ایک قریشی نسل شخص جس کی ننھیال قبیلہ کلب ہو گی۔ پس وہ ان سے جنگ کرنے کے لئے ایک لشکر بھیجے گا لوگ حملہ آور شخص پر غالب ہوں گے۔ یہی کلب ہے اور خسارہ ہے۔ اس شخص کے لئے جو کلب کی غنیمت میں شامل نہ ہو۔ اس کے بعد خلیفہ خوب داد و دہش کرے گا اور لوگوں کو ان کے نبی کی سنت پر چلائے گا۔ اور اسلام مکمل طور پر زمین میں مستحکم ہو جائے گا پھر وہ سات سال کے بعد انتقال کرے گا اور مسلمان اس کی نماز جنازہ ادا کریں گے۔

دیکھئے اس حدیث میں لفظ ''مھدی'' ہی نہیں ہے تو اس میں جو باتیں درج کی گئی ہیں۔ ان کا انطباق حضرت سید محمد جونپوری مہدی موعودؑ پر کس طرح ہو سکے گا۔ اگر شارحین حدیث نے۔ یخرج رجل۔ یا رجل من قریش سے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ مہدیؑ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد لفظ مہدی کا اضافہ کر دیا ہے۔ تو یہ ان کی طرف سے ''الحاقی اضافہ'' ہے۔ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

''مزید تشریح ذیل میں کی جا رہی ہے۔''

يكون اختلاف عند موت خليفة (ا) یک خلیفہ کی موت کے وقت (شاید جانشینی کے مسئلے میں) اختلاف رونما ہو گا حضرت مہدیؑ کا تعلق آخر زمانے سے ہے۔ آخر زمانے میں خلافت کہاں ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا ''میرے بعد

خلافت (۳۰) سال تک ہے۔ پھر اس کے بعد ''امراء'' ہوں گے پھر اس کے بعد ملوک اور جبابرہ ہوں گے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث آئی ہے۔عن معاذ بن جبل رضي الله عنه قال رسول الله صلي الله عليه وسلم ان هذا الامر بداء نبوة رحمة ثم يكون خلافة و رحمة ثم ملكا عضوضاً(مشکوٰۃ باب تغیر الناس کا تتمہ)

تحقیق یہ امر دین شروع ہوا نبوت اور رحمت سے پھر ہو گی خلافت و رحمت پھر ہو گی پھاڑ کھانے والی بادشاہت۔ ظاہر ہے کہ نبوت اور رحمت کا دور آنحضرتؐ پر ختم ہوا۔ خلافت اور رحمت کا دور خلفاء راشدینؓ پر ختم ہوا۔ جس کی جانب آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا۔الخلافة من بعدي ثلاثون سنة، اس کے بعد ظالم بادشاہت ہوئی۔ اس لحاظ سے یہاں خلیفہ سے مراد حکومت سلطانی ہی ہو گی جس کی جانشینی کے لئے اختلاف ہو گا۔ تو ایک شخص اہل مدینہ سے مکہ بھاگ جائے گا۔

حضرت مہدیؑ کو اس فقرہ سے کیا تعلق ؟۔ مہدیؑ تو اللہ کا خلیفہ ہو گا۔ اور آنحضرت ﷺ مھدی موعودؑ کے لئے جو اللہ کا خلیفہ ہے ھارباً الي مكة۔ مکہ کی طرف بھاگتے ہوئے کے الفاظ کس طرح استعمال فرما سکتے ہیں۔ جبکہ حضورؐ نے آپ کے تعلق سے یہ فرمایا۔انه يقفو أثري و لا يخطي اور صحابہ کرامؓ نے آپؑ کے تعلق سے یہ فرمایا۔يشبهه في الخلق۔ ایسے عظیم الشان الفاظ جس ہستی کے لئے استعمال کئے گئے ہوں۔ وہاں ھاربا الی مکہ (مدینہ سے بھاگ کر مکہ کی طرف جائے گا) وہ بھی پناہ لینے اور جان بچانے کے لئے) کے الفاظ کسی طرح مناسب نہیں۔ آنحضرتؐ نے جب اللہ کے حکم سے مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو سوائے یہودیوں اور نصرانیوں کے کون، مسلمان یہ کہنے کی جرأت کرے گا آنحضرت اپنی جان بچانے اور پناہ لینے کے لئے مکہ سے مدینہ کی طرف بھاگ گئے۔ نعوذ باللہ۔ثم نعوذ بالله۔ ہاں۔ اس حدیث سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ والوں میں سے ایک شخص مدینہ سے بھاگ کر مکہ جائے گا۔ اور وہاں رکن و مقام کے درمیان لوگ اس سے بیعت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیعت خلافت الٰہیہ یا مہدیت موعودہ کی نہیں ہے۔ بلکہ حکومت سلطانیہ کی ہے۔ جس کا تعلق حضرت مہدیؑ سے کسی طرح نہیں ہے۔ اس عرصہ میں اس مدنی شخص سے ایک شامی لشکر لڑنے کیلئے آئے گا۔ جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک بیابان میں (یا بیدا نامی ایک مقام پر) دھنسا دیا جائے گا۔

حدیث کا یہ حصہ بھی حضرت مہدیؑ سے متعلق نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس شامی لشکر کا خسف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں ہوا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔

عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ ابْنِ الْقِبْطِيَّةِ، قَالَ دَخَلَ الْحَارِثُ بْنُ أَبِي رَبِيعَةَ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ صَفْوَانَ وَأَنَا مَعَهُمَا، عَلَى أُمِّ سَلَمَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ فَسَأَلاَهَا عَنِ الْجَيْشِ الَّذِي يُخْسَفُ بِهِ وَكَانَ ذَلِكَ فِي أَيَّامِ ابْنِ الزُّبَيْرِ فَقَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

صلی اللہ علیہ وسلم "يَعُوذُ عَائِذٌ بِالْبَيْتِ فَيُبْعَثُ إِلَيْهِ بَعْثٌ فَإِذَا كَانُوا بِبَيْدَاءَ مِنَ الأَرْضِ خُسِفَ بِهِمْ" فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَكَيْفَ بِمَنْ كَانَ كَارِهًا قَالَ " يُخْسَفُ بِهِ مَعَهُمْ وَلَكِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى نِيَّتِهِ"(صحیح مسلم کتاب الفتن واشراط الساعتہ)۔ترجمہ: عبید اللہ بن قبطیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ حارث بن ابی ربیعتہ اور عبد اللہ بن صفوان ام سلمہ ام المومنینؓ کے پاس آئے اور میں ان دونوں کے ساتھ تھا۔ان دونوں نے ام سلمہؓ سے لشکر کے بارے میں پوچھا جو زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔اور یہ واقعہ ابن الزبیرؓ کے زمانے میں پیش آیا۔پس ام سلمہؓ نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک پناہ گیرندہ بیت اللہ میں پناہ لے گا۔اس کی طرف ایک لشکر بھیجا جائے گا اور جب وہ زمین کے اس حصے میں ہو گا تو وہ دھنسا دیا جائے گا۔میں نے کہا یا رسول اللہؐ اس شخص کا حال کیا ہو گا۔جو کراہت سے اس لشکر میں ہو گا۔فرمایا وہ بھی ان کے ساتھ خسف میں مبتلا ہو گا۔لیکن قیامت کے دن اپنی نیت کے مطابق اٹھایا جائے گا۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ خسف لشکر حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ (ا۔۷۳ھ) کے زمانے میں ہوا۔خسف کے معنی عملاً زمین میں دھنسنے کے بھی ہوتے ہیں۔اور مجازاً پسپائی۔شکست اور رسوائی کے بھی۔چونکہ آنحضرتؐ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ آپ کی امت میں خسف نہ ہو اور آپ کی دعا مقبول بھی ہوئی تھی۔اس لئے مجازی معنی ہی صحیح ہوں گے۔

صحیح مسلم میں اسی معنی کی ایک اور حدیث اس طرح آئی ہے۔أَنَّ عَائِشَةَ، قَالَتْ عَبِثَ رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِي مَنَامِهِ فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ صَنَعْتَ شَيْئًا فِي مَنَامِكَ لَمْ تَكُنْ تَفْعَلُهُ فَقَالَ "الْعَجَبُ إِنَّ نَاسًا مِنْ أُمَّتِي يَؤُمُّونَ بِالْبَيْتِ بِرَجُلٍ مِنْ قُرَيْشٍ قَدْ لَجَأَ بِالْبَيْتِ حَتَّى إِذَا كَانُوا بِالْبَيْدَاءِ خُسِفَ بِهِمْ"(صحیح مسلم۔کتاب الفتن واشراط الساعہ)ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند میں ہل گئے۔اور مضطرب ہو گئے تو میں نے پوچھا کہ آج آپ نے ایسا کام کیا جو آپ نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا۔فرمایا تعجب ہے کہ میری امت کے لوگ قریش کے ایک آدمی کو قتل کرنے کے لئے بیت اللہ کا قصد کریں گے۔جب کہ اس نے بیت اللہ میں پناہ لی ہو گی۔یہاں تک کہ یہ لشکر جب بیدا تک پہنچے گا تو خسف میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

ان روایتوں میں دور دور تک بھی حضرت مھدیؑ کا ذکر تو کجا اشارہ تک نہیں ہے صرف رجل من قریش کے الفاظ سے یہ حتمی نتیجہ نکالنا کہ اس سے حضرت مہدیؑ مراد ہیں۔سخت غلطی ہے۔یہ واقعہ ابن زبیرؓ کے زمانے سے متعلق ہے۔جنہوں نے مکہ کو مرکز بنا کر نو(۹) سال تک حکومت کی۔عبد الملک بن مروان کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے۔(اعلام جلد ۴ صفحہ ۲۱۸) اور یہ جنگ کیسی تھی۔حضرت ابن عمرؓ سے اس کی کیفیت سنئے۔حضرت ابن عمرؓ کے پاس دو آدمیوں نے اس بات کی شکایت کی

کہ وہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی جنگ سے الگ تھلگ رہے۔ اور اس میں حصہ نہیں لیا تو حضرت ابن عمرؓ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے۔ پوری روایت یوں آتی ہے:

فقالا ان الناس صنعوا ما تریٰ و انت ابن عمر صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فما یمنعك ان تخرج، فقال یمنعني ان اللہ حرم دم اخي المسلم قال الم یقل اللہ فقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنة و یکون الدین کله للہ، فقال ابن عمر رضي اللہ عنی قد قاتلنا حتیٰ لم تکن فتنة و انتم تریدون ان تقاتلوا حتیٰ تکون فتنة و یکون الدین لغیر اللہ (اشعتہ اللمعات۔ باب مناقب قریش صفحہ ٦٤) ترجمہ: دونوں نے کہا کہ لوگوں نے جو کیا آپ دیکھ رہے ہیں حالانکہ آپ عمر کے بیٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ پھر آپ کو کس چیز نے جنگ میں شریک ہونے سے منع کیا۔ جواب دیا مجھے اس چیز نے روکا کہ اللہ نے مجھے میرے مسلم بھائی کا خون حرام کیا ہے۔ دونوں نے کہا کہ کیا اللہ نے یہ نہیں کہا کہ ان سے لڑو حتیٰ کہ فتنہ نہ رہے۔ اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔ تو ابن عمرؓ نے کہا تحقیق ہم نے قتال کیا۔ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا تم چاہتے ہو کہ تم اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ فتنہ باقی رہے اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے۔

شاہ عبد الحق محدث دہلوی اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

جنگ شما سر دنیا و بادشاہی است نہ بہ سبب حق و ترویج دین (حوالہ سابقہ)

یعنی تمھاری جنگ دنیا اور بادشاہی کے لئے ہے نہ کہ حق اور دین کی ترویج کی خاطر۔

نیز یہ بات بھی مھدیؑ کے تعلق سے غلط ہی ہے کہ لوگ زبردستی ان کو ان کے مکان سے نکال کر ان سے بیعت کریں گے جب کہ وہ خود اس کو پسند نہ کرتے ہوں۔ کیونکہ یخرج المھدي کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ دعوت دے گا بے شک مہدی صاحب دعوت ہے۔ ایک ایسی ہستی جس پر ایمان لانا واجب ہے جس کی بعثت ضروریات دین سے ہے۔ جس کا وجود اشراط ساعتہ سے ہے کیا وہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ وہ خود اپنے مقام اور منصب کا اظہار نہ کرے اور لوگ زبردستی اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ جب دعویٰ ہی نہیں تو بیعت کس کی اور کیسی؟

اب رہا یہ سوال کہ لوگ اس کو کس طرح پہچان لیں گے اور اس کی شناخت کا ذریعہ کیا ہوگا۔ تو ہم جواب دیتے ہیں کہ اس کی دعوت ہی اس کی شناخت کا ذریعہ ہوگی چونکہ مھدی کو دعوت دینا ضروری ہے۔ بلکہ خلیفتہ اللہ کے لئے دعویٰ کرنا بھی ضروری ہے۔ پس جب وہ دعویٰ کرے گا اور لوگوں کو دعوت دے گا تو لوگ اس سے بیعت کریں گے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں کو دعوت دی تو لوگوں نے مانا۔ لوگ پہلے داعی کو مانیں گے پھر اس کی دعوت کو قبول کریں گے۔ چنانچہ مھدی موعودؑ نے رکن و مقام کے درمیان کھڑے ہو کر عوام و خواص کے سامنے اپنی مھدیت کا اعلان فرمایا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ ”یبایع بین الرکن و المقام لا یوقظ نائماً و لا یھریق دماً (عقد الدرء)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ مہدیؑ سے رکن و مقام کے درمیان بیعت لی جائے گی۔ مہدی نہ جگائے گا کسی سوتے ہوئے کو اور نہ کسی کا خون بہائے گا۔

پس معلوم ہوا کہ وہ رجل من قریش الگ شخص ہے۔ جس کے قتل کے ارادے سے لوگ (لشکر) اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اور جس کے ہاتھ پر رکن و مقام کے درمیان بیعت ہوئی تھی۔ وہ ابن زبیر تھے۔ اور یہ ہستی جن کے ہاتھ پر بیعت رکن و مقام کے درمیان کی گئی جداگانہ ہے اور مہدی موعودؑ وہ ہے جسے کشت و خون سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ نیز یہ کہا جاتا ہے کہ مہدی مدینہ سے مکہ جائیں گے۔ جب کہ حضرت سید محمد جونپوری (مہدی علیہ السلام) جونپور (ہندوستان) سے مکہ گئے تھے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اصولی بات پیش کر دیں کہ حضرت مہدیؑ کے بارے میں جو علامات احادیث شریفہ میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ علامات جن کا ذکر احادیث متواترہ یا مشہورہ میں ہوا ہے اور دوسری وہ جو احادیث احاد میں مذکور ہوتی ہیں۔ جن علامات اور شرائط کا ذکر احادیث متواترہ یا مشہورہ میں ہوا ہے ان کا مدعی مھدیت میں پایا جانا ضروری ہے۔ اور اسی پر اہل سنت کے اکابر کا اتفاق ہے۔ رہے وہ علامات جو احادیث آحاد میں مذکور ہوتی ہیں ان کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے۔ ”قد تظاھرت الاحادیث البالغته حد التواتر معناً في كون المدعي من اهل البيت من ولد فاطمة (لمعات شرح مشکوٰۃ) ترجمہ: مہدی اہل بیت میں فاطمہ کی اولاد سے ہوں گے اس معنی میں احادیث ایک دوسرے کی تائید میں حد متواتر کو پہنچ چکی ہیں۔ اسی طرح اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے۔ ”بداں کہ احادیث درباب بودن مہدی از اولاد فاطمہ بحد تواتر رسیدہ اند (اشعتہ اللمعات، کلتاب الفتن صفحہ ۳۴۲) جاننا چاہئے کہ مھدی کے اولاد فاطمہ سے ہونے کے بارے میں حدیثیں حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں۔

رہی دوسری علامات چونکہ وہ اخبار مغیبہ سے ہیں اس لئے ان کے معانی پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ ان میں کی بعض آپس میں متضاد ہیں۔ اس لئے ان سب کا ایک ہستی میں پایا جانا ضروری نہیں اور ایسا ہونا عملاً ممکن بھی نہیں ہے۔

اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ ان سب کا پایا جانا مدعی مہدیت میں ضروری ہے تو یہ بات مہمل ہو جائے گی۔ اس لئے کہ وہ تمام علامات جو مختلف احادیث میں مذکور ہیں۔ اور آپس میں بعض متضاد ہیں وہ سب کی سب ایک ہی شخص میں کیسے پائی

جائیں گی۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ کہ مھدی کا مدینہ میں ظہور ہو گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ مکہ میں خروج کرے گا۔ تیسری روایت میں ہے کہ مشرق سے نکلے گا۔ چوتھی روایت میں ہے کہ خراسان سے آئے گا۔

اب آپ ہی بتلائیے گا کہ کیا یہ سب علامات ایک ہی شخص میں جمع ہو سکتی ہیں؟ نیز یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ المدینہ سے مدینتہ الرسول ہی مراد لینا قطعی نہیں ہے۔ آنحضرتؐ کو اگر مدینہ الرسول یا مدینہ منورہ کا ذکر کرنا ہی منظور ہوتا تو آپ یا تو طابہ فرماتے یا مدینتی فرماتے۔ اس لئے کہ حضورؐ کو یہ نام یثرب کے مقابلے میں زیادہ پسند تھا۔ مگر جب آپ نے مدینہ فرمایا اور یہ خبر مغیب بھی ہے تو اس سے مراد مطلق مدینہ ہی ہو سکتا ہے۔ جس کے معنی شہر کے ہوتے ہیں۔ اس صورت میں حدیث کے یہ معنی ہوں گے کہ مھدی کسی شہر سے مکہ میں داخل ہوں گے۔ اور رکن و مقام کے درمیان لوگ آپ کی دعوت پر آپ سے بیعت کریں گے۔ اور یہ عموم مجاز ہو گا۔ کیونکہ مطلق مدینہ۔ طابہ پر بھی صادق آتا ہے۔ اس طرح مجاز اخبار مغیبہ میں موجود ہے۔

چنانچہ توریت میں جو آنحضرتؐ کی خبر دی گئی ہے یوں کہا گیا ہے۔ **قال الله لموسیٰ انی مقیم لھم نبیا من بنی اخوتھم**۔ اللہ نے موسیٰؑ سے کہا کہ میں یہود کے بھائیوں میں سے ان کے لئے ایک پیغمبر پیدا کروں گا۔ اس خبر مغیب میں اگر نبی اخوۃ سے متعارف معانی مراد لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اولاد یعقوب سے ایک پیغمبر کو اللہ پیدا کرے گا۔ اس صورت میں توریت کا یہ فقرہ آنحضرتؐ پر صادق نہیں آئے گا۔ کیونکہ آنحضرتؐ تو بنی اسماعیل سے ہیں۔ اس کی تاویل اس طرح کی جاتی ہے کہ یہاں اخوۃ مطلق ہے۔ اس کا اطلاق قریب اور بعید دونوں پر ہو سکتا ہے۔ پس یہاں اخوۃ بعیدہ ہی مراد ہے۔ پس آنحضرتؐ کا اسماعیلؑ کی اولاد سے ہونا اس وجہ سے اس روایت کے خلاف نہیں ہے کہ اسماعیل اور اسحاق آپس میں بھائی ہیں۔ اور اخوۃ کے معنی ان دونوں پیغمبروں کی اولاد پر یکساں صادق آئیں گے۔

قرآن شریف میں "المدینہ" ۱۴ر مقامات پر آیا ہے ان میں سے صرف چار مقامات پر یعنی سورۂ توبہ آیت نمبر (۱۰۱) اور آیت نمبر (۱۲۰) سورۂ احزاب آیت نمبر (۶۰) اور سورۂ منافقون آیت نمبر (۸) میں المدینہ سے مدینتہ النبیؐ مراد ہے۔ باقی دس مقامات پر المدینہ سے مراد دوسرے شہر ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں جہاں مدینہ کا لفظ آیا ہے اس سے لازماً مدینہ النبیؐ مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ اس سے مطلق شہر بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں بھی جو لفظ مدینہ آیا ہے۔ وہ مطلق ہے۔ اس سے بڑا شہر ہی مراد ہوتا ہے اور یقیناً حضرت مھدیؑ شہر جونپور سے نکل کر مکہ مکرمہ پہنچے ہیں۔ اور اس زمانے میں جونپور اتنا بڑا مشہور شہر تھا۔ کہ اس پر ہر لحاظ سے

مدینہ کا لفظ صادق آتا تھا۔

بعض لوگوں نے تو حدیث بھی صحیح نہیں لکھی۔ ترجمہ میں تقدیم و تاخیر سے کام لیا چنانچہ لکھا کہ رکن و مقام کے درمیان ان سے بیعت کریں گے کے بعد قوسین میں یہ لکھ دیا کہ (جب ان کی خلافت کی خبر عام ہو گی) تو ملک شام سے ایک لشکر ان سے جنگ کرنے کے لئے روانہ ہو گا جو مدینہ اور مکہ کے درمیان چٹیل میدان میں دھنسا دیا جائے گا۔ اس کے بعد شام کے ابدال۔ حالانکہ حدیث میں یہ ہے کہ رکن و مقام میں اس سے بیعت ہونے کے بعد ایک لشکر شام سے بھیجا جائے گا۔ جو مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام بیدا میں یا چٹیل میدان میں دھنسا دیا جائے گا۔ اس کے بعد حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔ "فاذا راء الناس ذالك"۔ جس کے معنی ہوتے ہیں کہ جب لوگ یہ حال دیکھیں گے اور یہ حال کیا ہے۔ اس کی تشریح ملتقطات شرح مشکواۃ میں اس طرح کی گئی ہیں۔ یعنی "خبر ہلاکت ہونے سفیانی کی" جب یہ بات ہے تو اس روایت کا امام مہدیؑ کے ظہور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس لئے صحاح ستہ میں سفیانی کا ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ حاکم نے مستدرک میں ابوہریرہؓ سے جو روایت درج کی ہے اس میں سفیانی کا ذکر تو ہے لیکن مھدی کا ذکر نہیں۔ صرف "یخرج رجل من اہل بیتی" کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے سفیانی کے زمانے میں اہل بیت سے ایک شخص ہو گا لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مھدی موعودؑ ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ وہ مھدی لغوی ہو۔

اے یس ٹرٹن نے تو اس سلسلے میں بالکل ہی الگ نظریہ پیش کیا ہے۔ یعنی بنوامیہ اور بنوعباس کی آپس کی چپقلش نے سفیانی مھدی اور قحطانی مہدی کو جنم دیا ہے۔ تا کہ وہ ایک دوسرے سے انتقام بھی لے سکیں اور اپنی عظمت رفتہ کو بھی واپس لا سکیں۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں:

There was talk of a Sufyani Mehdi a repersentative of elder branch of ummads who take vengence on the Abbasids and restore the fortunes of his family, the southern Arabs in their turn looked for a Qahthani Mehdi to restore the ancient glory of that branch of the nations

(A.S.Tretton M.A. Dlitt Former professor of Arabic, Islamic belief & practice pa-55)

اس کے بعد لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں پورا عرب ان کے زیر نگیں ہو گا۔ جب کہ مکہ میں کسی نے ان سے بیعت نہیں لی۔ بلکہ تمام علماء مکہ نے ان کے پیرووں کے قتل کا فتویٰ دیا ہے۔ چہ جائیکہ وہ پورے عالم اسلام کے خلیفہ ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انجیل میں پیش گوئی "رئیس العالم" کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ کیا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سارا عالم آپ کے زیر نگیں آگیا تھا؟رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو حجاز اور یمن کے بعض حصے تک اسلام کے نور سے محروم تھے۔اگر مخالف یہ اعتراض کرے کہ آپ "رئیس العالم" کیسے ہو گئے تو اس سوال کا جو جواب ہو گا۔یہاں بھی وہی جواب ہے۔ یہاں حکومت اور سلطنت مراد ہی نہیں ہے۔ تو زبردستی کیوں مھدی کو ساری دنیا کا بادشاہ بنانے پر اصرار کیا جارہا ہے ہاں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بادشاہت عامہ اور "ریاست تامہ" حاصل تھی۔اسی طرح مہدیؑ کو بھی حکومت اور سلطنت اسی معنی میں حاصل تھی۔اور آنحضرتؐ کی یہ بادشاہت کیسی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبان سے سنئے لکھا ہے:"مراد بہ بادشاہی دین و نبوت است (اشعتہ اللمعات جلد ۴ ص ۴۷۸) ترجمہ :بادشاہی سے مراد دین ونبوت ہے۔اسی طرح قرآنی آیت" هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿التوبة:۳۳﴾﴿الصف:۹﴾۔ترجمہ:وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔اگرچہ مشرکین اس کو ناپسند کرتے ہوں۔کیا عملاً دین اسلام،دنیا کے سارے مذاہب پر ظاہراًاور عملاً غالب آگیا اور دوسرے تمام ادیان مغلوب اور نابود ہو گئے۔

اس کی تاویل تو یہی کی جائے گی کہ ازروئے تحقیق و دلائل یقیناً مذہب اسلام نے دوسرے مذاہب پر غلبہ پالیا۔نیز اس موقع پر یہ کہنا کہ پورا عرب یعنی سارا عالم آپؐ کے زیر نگیں ہو گا۔یہ بھی کئی وجوہ سے محال نظر آتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ معانی قرآن مجید کے سخت مخالف ہے۔

تفصیل درج ذیل ہے:

سارا عالم زیر نگیں ہونے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ساری زمین کے سارے افراد، امت واحدہ ہو جائیں۔حالانکہ قرآن اس کے خلاف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے۔" وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ﴿هود:۱۱۸،۱۱۹﴾ اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک امت بنادیتا حالانکہ ہمیشہ لوگ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے۔بجز ان لوگوں کے جن پر تیرا پروردگار رحم کرے۔اور اسی کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں تو اللہ صاف بیان کر رہا ہے کہ لوگ امت واحدہ بن ہی نہیں سکتے اور یہ کہ اختلاف ان کے درمیان ہمیشہ رہے گا۔پھر مھدی کے زمانے میں سارا عالم کس طرح آپ کے زیر نگیں آجائے گا؟نیز اگر کسی معترض کا کہنا مان لیں تو لازم آئے گا کہ دنیا کے سب لوگ آپ پر ایمان لائیں گے حالانکہ یہ بات بھی قرآنی صداقت کے خلاف ہے۔چنانچہ اللہ نے فر

مایاہے۔" وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا (یونس۹۹)ترجمہ:اگر تیرا پروردگار چاہتا تو زمین پر موجود تمام لوگ ایمان لے آتے۔

پس جب سب افراد انسانی کا ایمان لانا اللہ کی مشیت میں نہیں ہے تو سب لوگ ہدایت مھدی سے کس طرح فیضیاب ہو جائیں گے۔ اور کس طرح "راہ عدالت" کو اختیار کر لیں گے۔ زیر نگیں آنے کے معنی تو یہی ہیں کہ وہ سب جو آپ کے تابع ہو جائیں گے۔ اوراوامر و نواہی پر عمل کرنے لگیں گے۔ اور یہ اسی وقت ہو گا جب لوگ آمر اور ناہی کے تابع اور فرمانبر دار ہوں گے۔ لیکن جب وہ اسی پر ایمان نہیں لائیں گے۔ تو اس کے اقوال اور افعال پر کیوں کر عمل کرنے لگیں گے۔

پس ان آیات قرآنی کو سامنے رکھتے ہوئے ان احادیث کی تاویل جن میں "یملأء اور یلی" کے الفاظ آئے ہیں۔ اس طرح کرنی چاہیئے کہ ان احادیث کی قرآنی آیات سے مطابقت ہو جائے۔

حضرت امام مھدیؑ کی تکذیب کی رو میں قرآنی آیات کی حقیقتوں اور صداقتوں کی تکذیب کا وبال برداشت کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں مھدیؑ سلطان اور امیر نہیں ہیں۔ جس طرح کہ دوسرے سلاطین اور امراء ہوتے ہیں۔ مھدیؑ تو اللہ کے خلیفے ہیں دیگر خلفاء اللہ کی طرح۔ پس اللہ کے خلیفوں کی جو شان ہوتی ہے۔ حضرت مھدی موعودؑ کی وہی شان ہونی چاہیئے۔

پس جب حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جن کی بعثت تمام انس و جان کے لئے ہوئی تھی اور تمام قطعات ارض کے لئے ہوئی تھی۔ سارا عالم زیر نگیں نہیں آیا تو مھدیؑ کے زمانے میں یہ کس طرح ہو گا۔

وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّـهِ تَبْدِيلًا﴿الأحزاب:٦٢﴾۔ اللہ کی سنت میں تو کسی طرح کی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو کفار نے عرب کی بادشاہت پیش کی تھی۔ جسے آنحضرتؐ نے ٹھکرا دیا تھا۔ نیز اللہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا تھا کہ یا تو آپ بادشاہ اور نبی بنیں یا پھر فقیر اور نبی۔ آنحضرتؐ نے بادشاہ اور نبی بننے کے بجائے۔ نبی اور فقیر بننے کو ترجیح دی تھی۔ پس متبوع کا جو حال تھا تابع یعنی حضرت مہدیؑ کا بھی وہی حال ہے۔

سوگ

نکاح نعمت خداوندی ہے۔ اس کے ٹوٹنے پر عورت کو عدت گذارنی واجب ہے۔ اور عدت یا تو طلاق مغلظہ یا خلع سے ہوتی ہے۔ یا پھر شوہر کے انتقال سے۔ طلاق کی عدت تو تین ناپاکیاں ہیں جسے عرف عام میں تین مہینے کہتے ہیں اور بیوہ کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ اور یہ عدت واجب ہے۔ اس میں ایک گھنٹہ کی بھی کمی نہیں ہو سکتی۔ اور جو عورتیں اپنی طرف سے عدت میں کمی کر لیتی ہیں وہ گنہگار ہیں۔

عدت وفات شوہر میں عورت کو چاہئے کہ وہ بناؤ سنگھار نہ کرے۔ خوشبو اور خوشبودار تیل کا استعمال نہ کرے۔ البتہ موٹے دندانے والی کنگھی استعمال کر سکتی ہے۔ رنگین کپڑے نہ پہنے البتہ سیاہ یا سفید لباس پہن سکتی ہے۔ نا محرم سے پردہ کرے۔ سرمہ اور مہندی کا استعمال نہ کرے۔ کیونکہ سوگ کے معنی ترک زینت کے ہیں۔ طلاق سے جو عدت واجب ہوتی ہے اس میں مطلقہ عورت گھر سے باہر نہیں نکل سکتی۔ البتہ شوہر کے انتقال سے جو عدت عورت پر واجب ہوتی ہے اس میں بیوہ اگر انتہائی غریب ہے اور اس کا نان نفقہ خود اس پر ہے تو دن میں باہر نکل سکتی ہے۔ اور رات میں بھی مگر اس بات کا خیال رکھے کہ رات کا زیادہ حصہ اپنے ہی مکان میں رہے۔ کسی دوسرے کے مکان میں رات بسر نہ کرے۔ طلاق والیوں کے تعلق سے اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس کو گھر سے باہر نہ نکالیں اور ان کو بھی خدا کا حکم ہے کہ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ طلاق سے جو عدت ہوتی ہے ان میں عورت کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن بیوہ کے نان ونفقہ کا کوئی ذمہ دار نہیں ہے اس لئے اپنے گذر معاش کے لئے وہ باہر نکل سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ صاحب مال ہے یا صاحب اولاد ہے تو وہ بھی باہر نہیں نکل سکتی۔ اسی طرح اگر بیوہ کے زمینات ہیں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے تو اپنی زمینات پر جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر وہ ملازم سرکار ہے اور اس کو پوری عدت کے دنوں کی چھٹی نہیں مل سکتی وہ بناؤ سنگھار کئے بغیر اپنی خدمت پر جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس کا گذر معاش اسی سے وابستہ ہے۔ مگر رات کو گھر واپس آجانا چاہئے۔ عدت والی عورتیں اجنبی مردوں سے ضرور پردہ کریں گی البتہ نابالغ بچوں سے پردہ کی ضرورت نہیں ہے۔ حاملہ عورتوں سے پردہ کی بات تو مضحکہ خیز ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شوہر کے سوا اگر دوسرے اقارب میں سے کسی کا انتقال ہو تو گھر میں صرف تین دن کا سوگ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کا نہیں۔ اسی لئے ہمارے پاس ''چوتھا کرتے ہیں'' گویا چوتھا کرنا اس بات کا اعلان ہے کہ ہمارا سوگ ختم ہو گیا۔ پھول تیل خوشبو اور بگھارا ہوا کھانا وغیرہ کا استعمال اسی غرض سے کیا جاتا ہے۔

سید سعد اللہ غازیؒ

حضرت بندگی میاں سید شریف الملقب بہ تشریف اللہ کے تین فرزند ہوئے (۱) میاں سید سعد اللہؒ (۲) میاں سید عبد الوہابؒ (۳) میاں سید عبد اللطیفؒ۔ بندگی میاں سید سعد اللہ غازیؒ کی ولادت علاقہ گجرات کھانبیل میں ہوئی۔ ٹھیک طور پر سنہ ولادت تو معلوم نہیں لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ۹۵۰ھ کے آس پاس پیدا ہوئے ہیں۔

آپ حضرت بندگی میراں سید عبد الحی المخاطب بہ روشن منورؒ کے تربیت ہیں۔ جب آپ اپنے تایا حضرت بندگی میاں سید شہاب الدین شہاب الحقؒ سے مرید ہونے کیلئے آئے اور فرمایا "چچا باوا مجھے آپ کی ذات سے عقیدت و محبت ہے تلقین فرمایئے"۔ حضرت شہاب الحقؒ نے فرمایا بابا مجھے جس ذات سے عقیدت ہے تم کو ان کے یہاں تلقین کے لئے بھیجتا ہوں۔

پھر آپ حضرت شہاب الحقؒ اور سید نجی خاتم المرشدین کی صحبتوں میں برسوں گذارے ہیں۔ ۹۸۸ھ میں جب حضرت تشریف حقؒ نے جل گائوں میں رحلت فرمائی۔ تو آپ نے وہاں سے ہجرت فرما کر بیجاپور تشریف لائے اور محلہ افضل پورہ میں اپنا دائرہ قائم فرمایا۔ آپ کا قیام وہاں عرصہ دراز تک رہا ۱۰۲۴ھ میں وہیں آپکا وصال ہوا۔ دوران قیام بیجاپور آپ کے وعظ و بیان کا شہرہ بیجاپور اور اسکے اطراف واکناف میں ہوا۔ ہزاروں بندگان خدا آپ کے بیان قرآن سے متاثر ہو کر تصدیق مہدیؑ سے مشرف ہوئے۔

صاحب تاریخ سلیمانی رقم طراز ہیں میاں سید سعد اللہ را حق تعالیٰ ذہن و قار و فراست بے شمار و شجاعت بکمال عطا کردہ بود۔ واحدے را طاقت نبود آنحضرت بہ ابحاث پر دازد۔ ترجمہ: خدائے تعالیٰ نے میاں سید سعد اللہؒ کو کمال ذہن و بردباری فراست و شجاعت عطا کی تھی کسی شخص کی طاقت نہ ہوتی تھی کہ آپؒ سے مباحثہ کرے۔

آپ حضرت سید نجی خاتم المرشدین کے بڑے مقبول و منظور رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت تشریف حقؒ کے انتقال پر حضرت سید نجیؒ نے جو خط حضرت میاں سید سعد اللہ کو ارقام فرمایا ہے وہ بھائیوں کی آپسی موّدت و محبت کا پتہ دیتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

ترجمہ: برادر عزیز میاں سید سعد اللہ لائق و مقبول ربّ دو جہاں خداوند تعالیٰ تجھے مہدیؑ اور میاںؓ کے حضور میں سُرخرو کرے تو سب بچوں میں لائق و فاضل ہے۔ سید محمود (سید نجی) بن میاں سید خوندمیرؓ کی طرف سے سلام و دعا۔ معلوم ہو کہ جالور میں سید تشریف اللہ کی وفات کی خبر سن کر بے حد رنج و ملال ہوا۔ یقین جانو کہ سید محمود وفات پائے اور تمہارے پدر

تشریف اللہ زندہ ہیں۔ انشاء اللہ سویت میں جو تمہارا حصہ ہو گا۔ پہنچایا جائے گا۔ بندہ کیلئے یہ لازم تھا کہ وہاں آ کر پرسہ دیتا لیکن دکن بہت دور ہے فقیر کا وہاں آنا جانا دشوار ہے خوب بھائی کو میری طرف سے پرسہ دیجئیو۔ چالیس روپے روانہ کئے جاتے ہیں۔ دس روپیئے اور دستار تمہارے لئے ہیں۔ دس روپے اور جامہ لطف اللہ کے لئے، دس روپے پائجامہ وجوتے سید عبدالوہاب کے لئے۔ باقی دس روپے فقراء میں تقسیم کر دئے جائیں تمام حاضرین مجلس کو سلام پہنچے والدعا۔

سود

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ﴿آل عمران:١٣٠﴾۔ اے ایمان والوں سود کو بڑھا چڑھا کر مت کھائو۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔ ی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴿البقرة:٢٧٨﴾۔ اے ایمان والوں اللہ سے ڈرو اور جو سود لوگوں کے ذمہ رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اسکے رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معراج کی شب میں نے اپنے اوپر کڑک اور بجلی کی آواز سنی اور ایسے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے پیٹ سانپوں اور بچھوئوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا اے جبرئیل یہ کون ہیں فرمایا سود خوار۔ نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس نے سود کھایا اگرچہ ایک درہم ہی کیوں نہ ہو گویا اس نے اسلام کی حالت میں اپنی ماں سے زنا کیا۔ ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس نے سود کھایا اللہ اس کے پیٹ کو اتنی ہی آگ سے بھر دے گا جس حساب سے اس نے سود کھایا ہے۔ اور اللہ اس کے کسی عمل کو قبول نہیں کرے گا اور وہ شخص ہمیشہ اللہ کے غضب اور اسکی لعنت کا شکار رہے گا۔ قرآن شریف کی درج بالا آیات اور حضور پُرنور ﷺ کی احادیث میں سود کے کھانے والوں کی اتنی شدید مذمت دیکھنے کے بعد کسی مسلمان کو سود کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ سود کھانے والے، اللہ کی لعنت اور غضب کا ہمیشہ شکار رہتے ہیں۔ سود کھانے والوں کے دل میں رحم و کرم کا ایک ذرہ بھی نہیں رہتا۔ اور ان کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں۔ سود کھانے والوں کے چہروں پر بھی رونق نہیں ہوتی۔ سود کھانے والے آخری عمر میں کنگال ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ نے فرمایا ہے۔ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ﴿البقرة:٢٧٦﴾۔ یعنی اللہ صدقات کو بڑھاتا ہے اور سود کو گھٹاتا ہے۔ پس مسلمانوں کو چاہئے کہ حلال کمائی کو اپنائیں اور حرام کمائی سے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دور رکھیں۔

سلام

سلام اسم ہے تسلیم سے۔ اسکے معنی ہیں عیوب سے سلامتی اور نقائص سے براءت۔ اور سلام اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّـــلَامُ الْمُؤْمِنُ ---الخ ﴿الحشر:۲۳﴾۔ السلام علیک کے معنی کیا ہیں؟ اس کے بارے میں متعدد اقوال آئے ہیں۔

(۱) السلام علیک کے معنی ہیں اللہ تمہارے حال پر مطلع ہے۔ پس تو غافل مت ہو۔

(۲) اللہ کا نام تجھ پر ہے یعنی تو اسکی حفاظت و نگرانی میں ہے۔

(۳) اور اکثر لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ السلام علیک کے معنی ہیں کہ تو میری طرف سے امن میں ہے اور مجھے بھی تیری جانب سے امن میں رکھ۔ اسکی ابتداء شروع میں مسلم و کافر میں تمیز کے لئے تھی۔ گویا اس کے ذریعہ اسلام کا اعلان تھا۔ پھر اس کے بعد یہ طریقہ آپس میں ملنے کیلئے جاری ہو گیا ویسے اسکی ابتداء حضرت آدمؑ کی پیدائش کے فوراً بعد سے ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے آدم کو اپنی (یا ان کی) صورت پر پیدا فرمایا۔ ان کی قامت کی درازی ساٹھ گز تھی۔ پھر اللہ نے ان سے فرمایا کہ ان پر سلام کرو (مراد فرشتوں کی جماعت تھی) جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر سنو کہ وہ کس طرح تمہارے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ (پس وہ جواب) تمہارے اور تمہاری ذریت کے لئے (سلام و جواب کا طریقہ) ہو گا۔ پس آدم علیہ السلام تشریف لے گئے اور فرمایا السلام علیکم۔ تو فرشتوں نے جواب دیا السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کونسا اسلام بہتر ہے۔ یعنی مسلمانی کے کونسے آداب و خصال بہتر ہیں آپ نے فرمایا"ان تطعم الطعام و تُقرئُ الســـلام علی من عرفت ومن لم تعرف۔ یعنی تو کھانا کھلا (لوگوں کو) اور سلام کر ان کو جن سے تو آشنا ہے یا بیگانہ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام حق اسلام ہے نہ کہ حق صحبت و آشنائی۔ حضرت ابو ھریرۃؓ سے اسی ضمن میں جو حدیث آئی ہے وہ بھی اسکی مؤید ہے۔ چنانچہ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ للمؤمن علی المؤمن سِت خصـال یعیده اذا مَرِض ویشـهده اذا مات، ویجیبُه اذا دعا۔ وُیسّلِمّ علیه اذا لقیه ویشـمته اذا عَطَسَ وینصح له اذا غابَ اوشـــهِد۔ ترجمہ: ایک مومن کے دوسرے مومن پر چھ خصلتیں ثابت (بمعنی واجب) ہیں (۱) جب وہ بیمار ہو تو اسکی عیادت کرنا (۲) جب وہ مر جائے تو اسکی نماز جنازہ، جنازے کے ساتھ چلنے اور دفن میں حاضر ہونا (۳) جب وہ کھانے کی دعوت دے تو اس کو قبول کرنا (۴) جب اس سے ملاقات ہو تو سلام کرنا یا جواب دینا (۵) جب وہ چھینکے اور الحمد اللہ کہے تو اس کا

جواب میں یرحمک اللہ کہنا(اگر وہ الحمد اللہ نہ کہے تو وہ جواب کا مستحق نہ ہو گا)(٦) مسلمان کی حاضری یا غیر حاضری میں اس کے لئے خیر خواہی کرنا(اگر حاضر ہے تو چاپلوسی اور منافقی نہ کرے اور اگر غیر حاضر ہے تو اسکی غیبت وبد گوئی نہ کرے)۔

نیز روایتوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں کو بھی سلام کیا ہے۔ اور عورتوں کی جماعت پر بھی سلام کیا۔ نیز آنحضرت نے فرمایا کہ اگر مشرکین، یہود و نصاریٰ تمہیں سلام کریں تو ان کے جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہدو یہ روایت حضرت انسؓ سے آئی ہے۔ ایک روایت یہ بھی آئی ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور کی خدمت میں آئی اور کہا ''السام علیکم'' جس کے معنی ہیں تم پر موت آئے۔ یہ سنتے ہی عائشہ صدیقہؓ نے جواب میں فرمایا ''بل علیکم السام و اللعنة'' بلکہ تم پر ہی موت بھی آئے اور لعنت بھی۔

پس آنحضرت نے فرمایا یا عائشة ان الله رفيقٌ يحبّ الرفق في كل امر یعنی اے عائشہ اللہ تعالیٰ مہربان اور لطیف ہے اور ہر کام میں نرمی اور لطف کو پسند کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب تم گھروں میں داخل ہو تو السلام علیکم کہا کرو(تا کہ گھر والوں پر سلامتی ہو) اور جب گھر سے باہر جاؤ تو بھی ان کو سلام کے ساتھ وداع کرو۔ نیز آنحضرتؐ نے فرمایا۔ یہود و نصاریٰ کی مشابہت اختیار مت کرو۔ یہودیوں کا سلام انگلیوں سے ہوتا ہے اور نصاریٰ کا سلام ہتھیلی سے ہوتا ہے (اور ہمارا سلام ''السلام علیکم'' سے) اگر ہم کسی بچے یا بھائی کو کسی کے پاس بھیجتے ہیں تو ان سے بھی یہ کہنا چاہئے کہ ان کو ہمارے طرف سے سلام کہو۔ اور جواب دینے والے کو چاہئے کہ وہ کہے تم کو بھی اور ان کو بھی ''السلام علیکم'' اس سلسلے میں قرآن میں اللہ نے بہتر طریقہ بتلایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ﴿النساء: ٨٦﴾۔ اور جب کوئی تم کو احترام سے سلام کرے تو تم اس کا جواب اس سے بہتر طریقے سے دو یا ان ہی الفاظ کو دہرا دو۔ قرآن شریف میں ''سلام'' کا لفظ ٣٤ مرتبہ اور سلاماً کا لفظ ٩ مرتبہ آیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں پر سلام بھیجا ہے۔ اور بعض پیغمبروں پر تو نام کے ساتھ سلام کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿الصافات:١٠٩﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ ﴿الصافات:٧٩﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿الصافات:١٢٠﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ ﴿الصافات: ١٣٠﴾ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿الصافات:١٨١﴾۔ پھر اللہ نے اپنے تمام منتخب بندوں پر بھی سلام بھیجا ہے سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ فرشتے بھی جنتیوں کا استقبال سلام کے ذریعہ ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴿الزمر:٧٣﴾ ترجمہ: تم پر سلام ہو بہت ہی اچھے مزے میں ہو پس جنت میں ہو ہمیشہ کے لئے داخل ہو جائو۔

خلاصہ یہ کہ اللہ کی جانب سے بھی نہ صرف اپنے پیغمبروں کے لئے بلکہ اپنے منتخب اور پاکیزہ اور چنندہ بندوں کے لئے

بھی سلام کا لفظ آیا ہے فرشتے بھی نیک لوگوں کا استقبال سلام کے لفظ سے ہی کرتے ہیں۔ پس ہم کو بھی چاہئے کہ جب ہم ایک دوسرے سے ملاقات کریں تو

GoodMorning,Goodnoon,Goodafternoon,Goodevening,Goodnight

اور خیریت، کھالیئے، کا جاریں، کیا قصہ"، کے الفاظ ترک کرکے صرف السلام علیکم کہیں اور اسی کو رواج دیں۔ بچوں کو اس کی تعلیم دیں کیونکہ۔

سلام سے حکم خدا کی اطاعت و فرماں برداری ہوتی ہے۔ سلام سے رسول آخرین ﷺ کی اتباع ہوتی ہے۔ سلام سے دلی کدورت اور رنجش دور ہوتی ہے۔ سلام سے آپسی محبت بڑھتی ہے۔ سلام سے بے گانگی آشنائی میں بدل جاتی ہے۔

سلام، صلوٰۃ، رضوان، رحمۃ: یہ چاروں الفاظ خبریہ بھی ہیں اور دعائیہ بھی۔ اگر یہ الفاظ اللہ کی جانب سے ہوں تو یقینا بلا شک و شبہ خبریہ ہیں یعنی ان کے حق میں اللہ کی جانب سے خوش خبری ہے۔ کہ اللہ کا ان پر سلام ہے، اللہ کی جانب سے ان پر سلامتی ہے، اللہ کا ان پر درود ہے، اللہ کی ان پر خوش نودی اور رضامندی ہے، اور اللہ کی انپر رحمت ہے۔ لیکن اگر بندوں کی جانب سے یہ الفاظ کہے جارہے ہیں تو ان کے معنی دعا کے ہوتے ہیں، کیوں کہ بندہ اپنی جانب سے دوسرے کو وہی دیتا ہے جس کا وہ مالک ہے۔ جو چیز اس کی ملکیت میں نہ ہو، لیکن وہ دینا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خلوص دل سے بارگاہ ایزدی میں دعا کرے کہ اللہ جو سب چیزوں کا ملک ہے اپنی جانب سے اس بندے کو سلامتی عطا فرمائے۔

پیغمبروں پر اللہ تعالیٰ نے یقینا "سلام" نازل فرمایا ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے " سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ ﴿الصافات: ۷۹﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿الصافات: ۱۰۹﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿الصافات: ۱۲۰﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ ﴿الصافات: ۱۳۰﴾ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿الصافات: ۱۸۱﴾" وغیرہ

اللہ کی جانب سے ان پاکان خدا کو سلام سے نوازا گیا جس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اللہ کی جانب سے سلام کے یہی مستحق ہیں۔ بلکہ قرآن شریف کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر بھی مخفی نہیں ہے کہ اللہ نے سلام کا مستحق بعض ان لوگوں کو بھی گردانا ہے جو پیغمبر نہیں ہیں، چناچہ ارشاد خداوندی ہے

(۱) وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ﴿انعام، ۵۴﴾ اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو آپ ان سے کہو "سلام علیکم"۔

(۲) دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ﴿یونس، ۱۰﴾ (جنت کے باغوں میں ان کی دعا

ہو گی) پاک ذات ہے تیری یا اللہ اور ان کی ملاقات ہو گی سلام سے۔

(۳) قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ ﴿ھود،۴۸﴾ حکم ہوا۔ اے نوح اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور تمہارے ساتھ کی جماعتوں پر نازل ہوئی۔

(۴) وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ ﴿ھود،۶۹﴾ اور جب ہمارے فرشتے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لیکر آئے اور بولے سلام، (جواباً) ابراہیم نے سلام کہا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے ابراہیمؑ کو ملاقات کے وقت سلام کہا، اور ابراہیمؑ نے جواباً سلام کہا۔ گویا یہاں سلام کا لفظ ملاقات پر کلام سے پہلے سلام (بطور تحیت) کہا گیا۔

(۵) سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿رعد،۲۴﴾ تم پر سلامتی ہو بدلہ میں اس کے کہ تم ثابت قدم رہے سو عاقبت کا گھر بہت اچھا ہے۔ یہاں یہ بتلایا جارہا ہے کہ جنت کے باغوں میں فرشتے، مومنوں کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔

(۶) تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ﴿ابراہیم،۲۳﴾ وہاں ملاقات پر سلام کہا جائیگا۔

(۷) وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿مریم،۱۵﴾ سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن ان کا انتقال ہو گا اور جس دن وہ زندہ اٹھائے جائیں گے۔

(۸) قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ ﴿نمل،۵۹﴾ آپ کہہ دیجئے، سب تعریف اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جن کو اس نے چن لیا۔

(۹) سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿یٰسین،۵۸﴾ ان کے مہربان رب کی طرف سے (ان کو) سلام فرمایا جائیگا۔

مندرجہ بالا آیتوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ مومنوں کیلئے ملاقات پر، نیز جنت میں ملاقات پر، فرشتوں سے ملاقات پر اور اللہ کے نیک بندوں پر مطلقاً سلام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، نیز یہ بھی کہ سلام پیغمبروں کیلئے مخصوص نہیں ہے۔

اسلام میں عام طور پر مسلمانوں کو بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ جب آپس میں ملیں تو کلام سے پہلے السلام علیکم بطور تحیت کہیں اور اس کے جواب میں بھی و علیکم السلام کہنا چاہیئے۔ نیز احادیث میں آیا ہے کہ السلام علیکم کے جواب میں و علیکم السلام و رحمۃ اللہ کہے اور جب سامنے والا السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو جواب میں و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ سلام کا لفظ پیغمبروں کیلئے مخصوص نہیں ہے۔ دراصل یہ حکم ربانی کی تعمیل کی صورت ہے جو قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے۔

واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا او ردوھا ﴿نساء،۸۶﴾ اور جب تم کو احترام کے ساتھ سلام کیا جائے تو تم بھی سلام کرو اس سے اچھا یا انہی الفاظ کو لوٹا دو۔

صلوٰۃ: اب اس کے بعد صلوٰۃ کے بارے میں معلوم کریں کہ قرآن میں صلوٰۃ کا استعمال کہاں، کس طرح اور کس کیلئے ہوا ہے۔ قرآن شریف میں صلواۃ کا لفظ ویسے ۶۷ مقامات پر آیا ہے، ان میں سے ۶۳ مقامات پر صلواۃ یا صلوات کا لفظ نمازوں کیلئے آیا ہے باقی مقامات پر صلوٰۃ یا صلوات کا لفظ دوسرے معنوں کیلئے آیا ہے۔

(۱) وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴿التوبۃ:۱۰۳﴾ اور ان کو دعا دیجئے بیشک آپؐ کی دعا ان کے حق میں تسکین کا باعث ہے۔ یہاں نماز جنازہ بھی مراد ہے۔

(۲) وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ ﴿توبہ:۹۹﴾ اور جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کی قربت اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(۳) أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿البقرہ:۱۵۷﴾ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانیاں اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔

(۴) إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿احزاب:۵۶﴾ اللہ اور اسکے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو، تم بھی ان پر رحمت کی دعا کرو اور خوب سلام بھی بھیجا کرو۔

(۵) هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴿الأحزاب:۴۳﴾ وہی تو ہے جو خود بھی اور اسکے فرشتے بھی تم پر رحمت بھیجتے ہیں تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں اور اللہ مومنوں پر مہربان ہے۔

واضح ہو کہ اللہ کی جانب سے صلوات سے مراد اس کی رحمت ہے اور فرشتوں کی طرف سے صلواۃ سے مراد مومنوں کیلئے استغفار ہے۔

(۶) وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ﴿توبہ:۸۴﴾ اور ان منافقین میں سے کوئی مرجائے تو ان میں سے کسی پر نماز (جنازہ) آپؐ نہ پڑھیں اور نہ کبھی ان کی قبر پر (برائے فاتحہ) کھڑے ہوں۔

ان آیات میں سے تیسری آیت میں صاف کہا جا رہا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانیاں ہیں

اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت یافتہ لوگوں کیلئے اللہ کی جانب سے صلوات بھی ہیں اور رحمت کے بھی وہ مستحق ہیں۔ ہدایت یافتہ لوگوں میں وہ ہستی جو رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے، اتنی اور ایسی کہ احادیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے اسکو "مہدی" (ہدایت یافتہ) کے نام سے یاد فرمایاہے۔ وہ صلوات اور سلام کی زیادہ مستحق ہے، اسلئے حضرت مہدی موعود کے ساتھ "علیہ السلام" لکھا جاتا ہے، اور جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور "علیہ السلام" کے بجائے کچھ لوگ "رضی اللہ عنہ" یا "رحمۃ اللہ علیہ" لکھنے پر اصرار کرتے ہیں وہ قرآن کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہیں۔

رضی اللہ عنہ: اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا۔

(۱) قَالَ اللَّـهُ هَـٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿المائدۃ:۱۱۹﴾ اللہ فرمائیگا آج وہ دن ہے کہ سچے لوگوں کو ان کی سچائی فائدہ دیگی ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں، یہ بڑی کامیابی ہے۔

(۲) وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿التوبۃ:۱۰۰﴾ جن لوگوں نے ایمان میں سبقت کی مہاجرین میں سے اور انصار میں سے اور جنھوں نے نیکوکاری میں ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کیلئے ایسے باغ تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

(۳) لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّـهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَـٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَـٰئِكَ حِزْبُ اللَّـهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّـهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿المجادلۃ:۲۲﴾ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپؐ ان لوگوں کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ان سے دوستی کر رہے ہوں جو اللہ اور اسکے رسول کے مخالف ہے، اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان کے ہی لوگ ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھدیا ہے اور انکی تائید بھی اپنی ذات سے فرمائی ہے۔ اور ان کو ایسے باغوں میں

داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوچکا اور وہ لوگ بھی اس سے راضی ہوگئے۔ پس یہی لوگ اللہ کی جماعت ہیں، آگاہ ہو جاؤ اللہ کی جماعت ہی فلاح پانی والی ہے۔

(۴) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَـئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ﴿البینۃ:۷،۸﴾ جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے وہ لوگ بہترین خلایق ہیں ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہمیشہ کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے، یہ صلہ ان کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

مندرجہ بالا آیتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کرنے والوں کیلئے ان کا صلہ دو طریقوں سے دیتا ہے، ایک تو یہ کہ ان کو وہ باغ ملیں گے جن کی نیچے نہریں جاری ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور دوسری یہ بات کہ اللہ ان سے راضی ہو گا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے، گویا" رَّضِيَ اللَّـهُ عَنْهُ یا عَنْهُمْ "کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اور یہ الٰہی فیصلہ ہے، جن میں نہ زمانے کی قید ہے اور نہ مکان کی، نہ نسب و خاندان کا لحاظ ہے اور نہ دولت و حکومت کا، یہ ہے قرآن کا فیصلہ۔ لیکن عجمیوں کا طرز ہی اور ہے انہوں نے اپنی طرف سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ صحابہ کیلئے "رضی اللہ عنھم" اور تابعین، تبع تابعین اور دوسرے ائمہ و اولیاء اور صلحاء کیلئے "رحمۃ اللہ علیھم" لکھا جانا چاہئے۔ حالانکہ قرآن شریف میں اللہ کی خوشنودی (رضوان) اس کی رحمت اور دائمی نعمتوں والی جنتوں کی خوشخبری مخصوص اوصاف رکھنے والوں کیلئے دی ہے، چناچہ ارشاد باریٔ تعالیٰ ہے۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّـهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّـهِ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا إِنَّ اللَّـهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿توبہ:۲۰،۲۱،۲۲﴾ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنی جانوں اور مالوں سے لڑے ان کیلئے اللہ کے پاس بڑے درجے ہیں اور وہی لوگ مراد پانے والے ہیں، ان کا رب انکو خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت کی اور (اپنی) خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں انکو دائمی نعمت ہو گی (دیدار) وہ ان میں ہمیشے ہمیشہ رہیں گے، بے شک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

ان آیتوں میں اللہ ایمان لانے والوں اور ہجرت کرنے والوں اور اللہ کے راستے میں جان اور مال سے لڑنے والوں کے حق میں فرماتا ہے کہ

(۱) ان کیلئے بڑے درجے ہیں۔

(۲) وہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

(۳) ان کا رب انکو خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت کی۔

(۴) خوشخبری دیتا ہے اپنی خوشنودی (رضوان) کی۔

(۵) ایسی جنتوں کی جن میں دائمی نعمت ہوگی (دیدار کی)۔

(٦) جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

پس رضوان اللہ (رضی اللہ عنھم) رحمت اللہ اور دائمی نعمت کی خوشخبری کسی خاص وقت و زمانے کیلئے محدود نہیں ہے۔ لیکن متاخرین نے اس میں فرق کرتے ہوئے ان کو زمانوں میں اور طبقوں میں بانٹ دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ صلوات و سلام کا ستعمال حضرت مہدیؑ کے لئے بھی جائز ہے، اسی طرح رضی اللہ عنھم اور رحمۃ اللہ علیھم کا استعمال بھی قرآن میں بیان کردہ اوصاف کے حاملین کیلئے جائز ہے۔

جب اللہ فرماتا ہے " هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ، تو جب عام مومنین امت کیلئے اللہ يُصَلِّي عَلَيْكُمْ فرماتا ہے تو حضرت مہدیؑ کیلئے جو خلیفۃ اللہ ہیں، آل رسول اللہ ﷺ سے ہیں صلوات و سلام کے الفاظ کا استعمال کس طرح قابل اعتراض ہو سکتا ہے۔

سلوک

شریعت، طریقت، حقیقت: شریعت و طریقت کے ہادی، رہبر اور راہ نما حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم ہیں۔ جو کچھ آپ نے فرمایا جو کچھ آپ نے عمل کیا اس کا اتباع کرنے کو شریعت پر عمل کرنا کہتے ہیں۔ اور جو کچھ آپ کا قلبی تعلق ذات باری تعالیٰ سے رہتا تھا اور جس نیت اور اخلاص سے آپ ہر کام کرتے تھے اس کا اتباع اور اس کا حاصل کرنا سلوک طریقت کہلاتا ہے۔ اور جو اسکو حاصل کرنے کیلئے محنت، مشقت اور جدوجہد کرتا ہے اسکو 'سالک" کہتے ہیں۔

پس سلوک الی اللہ کے معنی ہیں اللہ تک پہنچنے کا راستہ طے کرنا حق کو پانے کی طلب کے ساتھ۔ یہ وہ علم ہے جس کی طلب زبان اور جسم کو نہیں بلکہ دل اور روح کو ہوتی ہے۔ اسی علم کا نام علم باطن، علم قلب، حکمت اور فقر ہے اور اس کے جو مقامات ہیں ان کو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کہتے ہیں۔ اس علم سے اپنی شناخت ہوتی ہے اور عرفان الہیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کے فاضل کو سالک، صوفی، فقیر، درویش اور انسان کامل کہتے ہیں۔ قرآن اور حدیث میں جس علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے وہ یہی علم معرفت ذات باری تعالیٰ ہے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "اس راہ کو طے کرنے کیلئے تین درجے ہیں۔ شریعت، طریقت اور حقیقت، آدمی تین چیزوں کا مجموعہ ہے نفس، دل، روح، ہر ایک کیلئے ایک راستہ مقرر کیا گیا ہے۔ نفس کیلئے شریعت، دل کیلئے طریقت، اور روح کیلئے حقیقت کا راستہ بنایا گیا ہے۔ ناسوت۔ ملکوت۔ جبروت

عالم شہادت یا عالم ظاہر یعنی زمین و آسمان کے درمیان جو جہاں ہے اسکو عالم ناسوت کہتے ہیں یہ شریعت یعنی جسم کا راستہ ہے یعنی نماز، روزہ وغیرہ

عالم امر: عالم غیب، عالم معنی، عالم باطن کو عالم ملکوت کہتے ہیں یہ طریقت یعنی دل کا راستہ ہے اعمال قلبی حضور وغیرہ

عالم ارواح: عالم غیب الغیب عالم کلیات کو عالم جبروت کہتے ہیں۔ یہ حقیقت یعنی روح کا راستہ ہے۔ اعمال روح شہود، معرفت وغیرہ

اب یہاں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ سالک کسے کہتے ہیں۔ سالک تو وہی ہے جو شریعت مطہرہ کا اتباع کرے ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ کیوں کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے۔ اور ایک باطن، مثلاً شریعت کا ایک حکم نماز ہے۔ اس کا ظاہر تو وہ ارکان نماز ہیں جو سب ادا کرتے ہیں۔ اور اس کا باطن اس کا خشوع، خضوع اور دھیان کا اللہ کی طرف لگانا ہے اور اس کے دربار میں اپنی حاضری کا احساس ہے۔ یا جیسے ایک حکم طہارت ہے اس کا ظاہر تو بدن، کپڑے اور جگہ کی پاکی ہے۔ اور اس کا باطن

قلب اور روح کی طہارت ہے۔یعنی حسد، تکبر، طمع، بخل غصّہ، شہوت وغیرہ کی گندگی سے اپنے قلب کو پاک کرنا ہے۔تو اگر کوئی شخص اپنے عمل میں شریعت کے ظاہری او رباطنی دونوں تقاضوں کو پورا کررہا ہے او راسکی نیت بھی حق تعالی کی رضاوخوشنودی حاصل کرنا ہے تو وہ شخص سالک ہے۔اور اگر وہ صرف ظاہری اعمال پر اکتفا کرتا ہے اور باطن شریعت سے اسکو کوئی حصہ نہیں ملتا اور وہ اس کا طالب بھی نہیں ہے تو وہ سالک نہیں ہے۔

گویا شریعت کے باطنی رخ کو طریقت کہتے ہیں۔حضرت ابونصر سراج متوفی ۸۷۳ھ اپنی مشہور زمانہ کتاب "اللمع" میں لکھتے ہیں۔ "علم کی دو قسمیں ہیں ظاہری او رباطنی۔جس علم کا تعلق زبان اور جسم کے دوسرے اعضاء سے ہے اسکو علم ظاہری کہتے ہیں۔اور اس کا نام شریعت ہے مثلاً عبادات میں طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔یا احکام میں طلاق، فرائض میں قصاص وغیرہ۔

اور جب اس کا اثر ظاہر سے گذر کر قلب اور باطن تک محیط ہو جاتا ہے تو اس علم کو باطن یا طریقت سے موسوم کرتے ہیں۔اور یہاں احکام وعبادات کے بجائے مقامات کی اصطلاحات رائج ہیں۔مثلاً تصدیق، اخلاص، صبر، توکل محبت، ذوق وشوق وغیرہ اور اس تفریق کی سند قرآن مجید سے ملتی ہے۔چنانچہ ارشاد باری ہے۔ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً﴿لقمان: ۲۰﴾ یعنی اس نے اپنی نعمتیں تم پر پوری کیں ظاہری بھی اور باطنی بھی۔دنیا میں ہر موجود کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ایک ظاہری او ردوسرا باطنی اسی طرح قرآن کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے اس باطنی پہلو کا نام طریقت ہے۔یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے کوئی الگ شئی نہیں ہے۔بلکہ ان ہی کے مغز اور باطن کا نام ہے۔تصوف اسلام عبد الماجد دریابادی)

شیخ یحیٰی میزی لکھتے ہیں "طریقت کی راہ بھی شریعت ہی سے نکلی ہے۔شریعت میں توحید طہارت، نماز، روزہ، حج زکوۃ اور دوسرے احکام اور معاملات کا بیان ہے طریقت ان معاملات کی حقیقت دریافت کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ اعمال کو قلبی صفائی سے آراستہ کرو۔اخلاق کو نفسانی کدورتوں سے پاک کرو جیسے ریاکاری، شہوت، ظلم، جفا اور شرک وکفر وغیرہ اسطرح نہ سمجھے ہوں تو سمجھو کہ ظاہر طہارت وتہذیب سے جس امر کو تعلق ہے وہ شریعت ہے اور تزکیہ باطن اور تصفیۂ قلب سے جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے کپڑوں اور جسم کو دھو کر ایسا پاک کرنا جس سے نماز درست ہو۔شریعت، دل کو بشری کدورتوں سے پاک رکھنا طریقت، ہر نماز کیلئے وضو کرنا شریعت کا ایک امر ہے اور ہمیشہ باوضو رہنا طریقت کا تقاضہ ہے۔نماز میں قبلہ رو ہونا شریعت، اور دل کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا طریقت، شریعت میں اگر صحیح عذر ہو تو رخصت پر عمل جائز ہے جیسے سفر میں روزہ نہ رکھنا (بعد

میں قضا کرنا) جائز ہے مگر طریقت کہتی ہے کہ رخصت ضعیف جانوں کیلئے ہے چنانچہ اہل طریقت صاحبِ عزیمت ہوتے ہیں۔ رخصت اور مباح کی راہ سے اپنے آپ کو باز رکھتے ہیں۔ حلال چیزوں کو بھی ڈرڈر کے استعمال کرتے ہیں۔ حرص، طمع سے کنارہ کش رہتے ہیں (مکتوبات صدی) شیخ ابوالقاسم قشیری لکھتے ہیں۔ شریعت بندگی اور عبودیت کا نام ہے اور حقیقت مشاہدہ ربوبیت کا نام ہے، اور جو شریعت، حقیقت کے بغیر ہو وہ نامکمل اور جس حقیقت کی شریعت تائید نہ کرے وہ لاحاصل، کیوں کہ حقیقت شریعت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی (رسالہ قشیریہ)۔

سیر

حضرت بندگی سید خوندمیرؓ سے منقول ہے آپ نے فرمایا کہ شہر فراہ میں بندہ مہدی کی خدمت میں حاضر تھا اور مصطفی کی ولایت کے فضل کا بیان تھا اس کے بعد مہدیؑ نے فرمایا کہ فرمان خدا ہوتا ہے اے سید محمد جس جگہ مصطفی کی ولایت کا خاتم ہے اس جگہ کئی اشخاص انبیاء کے قائم مقام ہوں گے اور بعض اشخاص کو مہدی نے ابراہیم کی سیر فرمایا، اور بعض کو سیر موسیٰ فرمایا۔ اس کے بعد بندگی میاں سید خوندمیر نے عرض کیا کیا کسی کو خاتمین کی سیر ہے تو فرمایا ہاں تم کو بندہ کی ذات میں سیر حاصل ہے اور بھائی سید محمودؓ کو محمد نبی کی ذات میں سیر ہے۔

سیر الی اللہ۔ سیر فی اللہ: سیر الی اللہ محدود ہے، سیر فی اللہ غیر محدود ہے۔ نفسانی امراض سے بالکلیہ شفاء ہونے کے بعد اخلاق حمیدہ حاصل ہوتے ہیں۔ اور انوار ذکر سے قلب آراستہ ہو جائے اور اللہ کے ساتھ تعلق اور نسبت پیدا ہو جائے اس مقام پر سیر الی اللہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے۔ یہاں خدا کی ذات وصفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگتا ہے۔ یہ سیر غیر محدود ہے۔ چنانچہ اسی کیفیت کی طرف اشارہ اس طرح کیا گیا ہے۔

بیزارم از آں کہنہ خدائے کہ تو داری ہر لحظہ مرا تازہ خدائے دیگر است

سنن

سنت نمازوں کا بیان: فقہ کی کتابوں میں سنت نمازوں کیلئے "باب النوافل" باندھا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں بیان ان سنتوں کا ہے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نمازوں کے پہلے، یا فرض نمازوں کے بعد میں پڑھی ہیں۔

نفل کے معنٰی زیادہ کے ہیں۔ پس نفل کے معنی یہاں ان نمازوں کے ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کے علاوہ پڑھی ہیں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض اللہ نمازوں کے علاوہ اور نمازیں پڑھی ہیں وہ "سنت رسول اللہ" کی نیت سے ادا کی جاتی ہیں۔ البتہ وہ نمازیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھیں اور بندہ اپنی طرف سے ادا کرنے لگا ہے۔ ان کو نوافل کا نام دیا گیا ہے۔

مہدویہ کے پاس سنت کی ادائی کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن جو نمازیں بعد میں اضافہ کرلی گئیں ان کو ادا کرنے سے افضل یہ سمجھتے ہیں کہ ان اوقات میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ کیونکہ اللہ کا ذکر ہر وقت کرنا چاہیئے۔ حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے نفل نمازوں کے پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

سنت نمازیں کتنی ہیں۔ ان کی رکعتیں کتنی ہیں اور ان کے اوقات کیا ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک سے اس کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ مَن ثابَرَ (واظب) علی اثنی عشرة رکعة في اللیل والیوم نبي اللہ تعالیٰ لہ بیتاً في الجنة رکعتین قبل الفجر، واربع رکعات قبل الظھر- و رکعتین بعدھا ورکعتین بعد المغرب ورکعتین بعد العشاء۔ ترجمہ: جس شخص نے دن اور رات میں بارہ رکعتیں ہمیشہ پڑھیں تو اللہ تعالی اس کیلئے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔ فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں، ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور نماز کے بعد دو رکعت، مغرب کے بعد دو رکعت اور عشاء کے بعد دو رکعت۔ ان کو سنت موکدہ بھی کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عصر سے پہلے چار رکعت اور عشاء سے پہلے بھی چار رکعت کی روایتیں آئی ہیں۔ ان کو غیر موکدہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے پاس خاص خاص مواقع پر یعنی شب معراج۔ شب برأت، شب قدر یا بزرگوں کے بہرۂ عام اوراعراس کے مواقع پر ان سنتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔

جو سنتیں فرض سے پہلے پڑھی جاتی ہیں ان کو "سنن قبلیه" کہا جاتا ہے اور جو سنتیں فرض کے بعد پڑھی جاتی ہیں انکو "سنن بعدیه" کہا جاتا ہے۔ تو نمازی کو چاہیئے کہ ان کو ایسا ہی ادا کرے جیسی کہ وہ ہیں یعنی قبلیه کو "بعدیه" کرنا صحیح نہیں

ہے۔قبلیہ کو فرض سے پہلے ہی ادا کرنا چاہئے۔ اپنی سستی، یا غفلت، یا بے پروائی سے دیر سے مسجد میں آکر جماعت میں شامل ہو جانا اور قبلیہ کو بعد میں پڑھنا صحیح نہیں ہے: یہ بھی واضح ہو کہ سنت نمازوں کی قضا بھی نہیں ہے۔

ستاروں کے پیدا کرنے کے مقاصد

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ستاروں کے پیدا کرنے کے مقاصد بیان فرمائے ہیں۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ﴿الملک:۵﴾ اور ہم نے قریب کے آسمان کو (چراغوں) ستاروں سے رونق دی اور ہم نے انکو شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا۔ گویا ستاروں کو اللہ نے تین مقاصد کے تحت پیدا فرمایا ہے،

(۱) آسمان کی زینت

(۲) شیطانوں کو مار بگھانا جو آسمانوں کے پاس فرشتوں کی باتوں کو چوری چھپے سننے کے ارادہ سے چلے جاتے ہیں۔

(۳) وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴿النحل:۱۶﴾۔ اور ستاروں سے وہ (لوگ) راستے معلوم کر لیتے ہیں، فرمایا ہے۔

گویا ان تین مقاصد کے تحت اللہ نے ستاروں کو پیدا فرمایا ہے۔

اگر یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ ستاروں کو جب آسمان کی زینت بنایا ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ باقی رہیں اور شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا گیا ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ زائل ہو جائیں۔ پھر ان دونوں کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیطانوں کو مارنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے جسموں کو (اجرام کو) پھینکا جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کواکب سے شعلے نکلتے ہیں جو ان شیطانوں کو مارتے یا جلاتے ہیں، جسطرح کے بندوق اپنی جگہ رہتی ہے، لیکن اس میں سے گولی نکل کر اپنے نشانے پر جاتی اور اسے ہلاک کرتی ہے۔

سلاطین وامراء

(جنھوں نے حضرت امامنامہدی موعودؑ کی تصدیق کی)

(۱) سلطان حسین شرقی، جونپور: سلطان حسین شرقی نہایت عادل، عالم باعمل اور زاہد وپرہیز گار بادشاہ تھا، اس زمانے کا یہ حال تھا کہ اسلامی سلطنتوں میں عام طور پر طوائف الملوکی پیدا ہوگئی تھی، بڑی بڑی سلطنتیں ٹوٹ ٹوٹ کر چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں بن گئی تھی، چنانچہ شاہان بہمنیہ کی بڑی سلطنت ٹوٹ کر چھوٹی پانچ خود مختار حکومتوں میں منقسم ہوگئی تھی یعنی بیدر سلطنت بریدیہ۔ حیدر آباد سلطنت قطب شاہیہ۔ احمد نگر سلطنت نظام شاہیہ۔ برار سلطنت عماد شاہیہ، بیجاپور سلطنت عادل شاہیہ بالفاظ دیگر آپسی مناقشات اور طلب جاہ وحصول اقتدار کے سبب کوئی حکومت خود کو مستقل نہیں سمجھ رہی تھی، پھر آپس میں بھی اعتماد کا خطرہ تھا۔ شاید یہی اسباب تھے کہ سلطان حسین شرقی اپنی ہمسایہ اسلامی حکومتوں میں اگر چہ بڑی قوت والا سلطان سمجھا جاتا تھا، لیکن رائے دلپت والئی گوڑ (اودھ) کا باج گذار بن گیا تھا۔ حضرت مہدیؑ کے وعظ وبیان، ارشاد وتذکیر کے جب چرچے جونپور میں ہونے لگے تو سلطان حسین شرقی بھی آپ کا شیفتہ ہوگیا۔ روایتوں میں آیا ہے کہ اس نے ایک خواب دیکھا کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ سید محمد (مہدی موعودؑ) سے دین کی نصیحت حاصل کر۔ اسی دوران ایک وعظ میں امامناؑ نے فرمایا مطیع کفر ہونا جائز نہیں ہے۔ بادشاہ نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ حضرت کا ارشاد حق ہے، لیکن اگر میں رائے دلپت کو خراج نہ دوں تو وہ مجھ پر حملہ کردے گا۔ اسکی قوت مجھ سے بڑی ہے۔ اگر حضرت اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھیں تو میں ہرگز مطیع کفر نہیں رہوں گا، حضرت مہدی موعودؑ نے فرمایا "خدائے تعالیٰ اپنے دین کا آپ ناصر ہے"۔ سلطان نے خراج دینے سے انکار کردیا۔ رائے دلپت اپنی ستر ہزار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، سلطان کے پاس تیس ہزار سپاہی تھے۔ پہلے ہی حملے میں سلطان کی فوج پریشان ہوگئی۔

ادھر حضرت مہدی موعودؑ نے پندرہ سو بیراگیوں کے ساتھ میدان جنگ سے ذراہٹ کر ایک جگہ پر جو جنگی نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل تھی، ٹھہرے ہوئے تھے۔ سلطان نے جب نقشۂ جنگ کو اسطرح دیکھا تو اس نے امامؑ کی خدمت میں عرض کروایا کہ اب ہم کو شکست ہوا چاہتی ہے، آپؑ بھی میدان جنگ سے واپس ہوجائیں، مگر امامناؑ یہی فرماتے تھے۔ "ان شاء اللہ فتح ہماری ہے، تم قائم رہو۔ یعنی میدان مت چھوڑو۔

بیراگیوں کا دستہ جو مہدی موعودؑ کے ہمراہ تھا وہ اپنی جگہ برابر مستعد تھا، بیراگیوں سے مراد وہ نوجوان سپاہی تھے جن کے عورت اور بچے نہیں ہوتے تھے اس لئے ان نوجوانوں پر مشتمل فوج بے جگری سے لڑتی تھی۔

غرض جب سلطان کی فوج تاب مقابلہ نہ لاکر روبہ فرار ہوگئی تو حضرت مہدیؑ نے رائے دلپت کے خلاف پیش قدمی کی اور اپنا گھوڑا آگے بڑھادیا، رائے دلپت کی فوج میں ایک بڑا ہاتھی تھا جو تربیت یافتہ تھا وہ اپنی سونڈ میں ایک بڑی زنجیر رائے دلپت کی عماری کے آگے اس زور سے ہلاتا ہوا دوڑتا تھا کہ اسکی زنجیر کے ضرب سے سوار اور پیدل دونوں چوپٹ ہو جاتے تھے۔ وہ جدھر کارخ کرتا تھا میدان خالی ہو جاتا تھا، جب یہ ہاتھی امامناؓ پر حملہ آور ہوا، تو حضرت نے بسم اللہ کہہ کر ایک تیر چلایا جو اس ہاتھی کے سر میں ڈوب گیا، وہ ہاتھی چلاکر اپنی ہی فوج کو روندتا ہوا آگے جاکر گرا اور مر گیا، حضرت امامناؓ کے پندرہ سو سواروں کی شمشیریں برسنے لگیں۔ رائے دلپت کی فوج کے قدم اکھڑ گئے، رائے دلپت غضبناک ہو کر عماری سے اتر گیا، اور گھوڑے پر سوار ہو کر شمشیر بکف حضرت امامناؓ پر حملہ آور ہوا، امامناؓ نے آیت شریفہ "ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین"، پڑھ کر ایک ہی ضرب سے رائے دلپت کے دو ٹکڑے کر دیئے، اسطرح کہ اس کا دل باہر نکل آیا۔ اس پر اس بت کی تصویر دیکھی جس کی وہ پرستش کرتا تھا، جب آپؑ کی نظر اس تصویر پر پڑی تو آنحضرتؑ نے فرمایا کہ "جب باطل کا یہ اثر ہو تو حق کا کیا کچھ اثر نہ ہوگا" معاً آپ پر جذبۂ حق طاری ہو گیا۔

اسکے بعد سلطان کی فوج نے رائے دلپت رائے کے لشکر کی اچھی خبر لی، سلطان کی ہزیمت خوردہ فوج بھی ٹوٹ پڑی اور سلطان کو کامیابی نصیب ہوئی۔ یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امامؑ نے اپنے ہمراہ بیراگیوں کی فوج کو سلطان کے لشکر سے الگ کیوں رکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی روح پر فتوح سے امامؑ کو فتح کا مژدہ مل گیا تھا۔ اگر آپ مع بیراگیوں کے، سلطان کی فوج کے ساتھ ہو جاتے تو فتح کا سہرا سلطان کی فوج کے سر جاتا۔ درحقیقت یہ فتح امامؑ کے دست مبارک اور آپ کے وجود مبارک سے تھی۔ اس لئے اس خصوصیت کو باقی رکھنے کیلئے آپ نے اپنے دستے کو اس فوج سے الگ رکھا۔ اور جب سلطان کی فوج کو ہزیمت ہوئی تو آپؑ نے اس مقام سے جہاں آپؑ ٹھہرے ہوئے تھے، اور جو فوجی نقطۂ نظر سے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ پیش قدمی کی اور جب فتح نصیب ہوئی تو سلطان کو بھی یہ کہنا پڑا کہ اس فتح کا سہرا آپؑ کے سر ہے۔ جسکی بشارت روح رسول اللہ ﷺ سے آپ کو ملی تھی۔

آپ کو جو جذبہ ہوا تھا، وہ بارہ سال رہا، لیکن اذان کی آواز سے آپؑ کو ہوش آتا تھا۔ فرض نماز کی ادائی کے بعد پھر جذبۂ حق طاری ہو جاتا تھا۔ پہلے سات سال تک آپ نے کچھ نہیں کھایا، البتہ بعد کے پانچ سال میں کچھ غذا آپؑ نے استعمال فرمائی، جب بارہ سال کا جذبہ پورا ہوا۔ اور آپ پورے ہوش میں آگئے تو اللہ کا حکم ہوا۔ "اے سید محمد ہمارے لئے ہجرت کرو، اور دعوت الی اللہ بھی دو۔ جب آپ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا تو سلطان حسین شرقی نے جس بے تابی، عاجزی اور الحاح کے ساتھ

آپ کو روکنے کی کوشش کی وہ محتاج بیان نہیں، لیکن آپ نے اس کی درخواست کو نامنظور کیا۔ اور حکم الٰہی کے تحت ہجرت فرمائی۔ جون پور سے پہلی منزل داناپور، پھر وہاں سے کالپی، چندیری، چاپانیر ہوتے ہوئے ملک مانڈو میں نزول اجلال فرمایا۔

(۲) سلطان غیاث الدین خلجی: چونکہ حضرت امامنا مہدی موعودؑ کے ساتھ مہاجرین کی کافی تعداد ہوتی تھی اس لئے آپ ہمیشہ آبادیوں سے باہر ہی قیام فرماتے تھے، چناچہ آپ نے شہر مانڈو کے باہر دو کوس کے فاصلے پر قیام فرمایا، واضح ہو کہ مانڈو سلاطین خلجیہ کا دار السلطنت تھا، آپ کی تشریف آوری اور دعوت الی اللہ، بیان قرآن کی دھوم سارے شہر میں مچ گئی کہ حضرت مہدیؑ تشریف لائے ہیں۔

سلطان غیاث الدین کو ان کے فرزند نصیر الدین نے قید کر رکھا تھا، اس لئے وہ خود تو بغرض تحقیق نہ آسکے لیکن دانشمندانہ حیلے سے اپنے دو معتمد علیہ افراد کے ذریعہ عرض کروایا کہ بندہ شرف قدم بوسی حاصل کرنے سے قاصر ہے، براہ سر فرازی اپنے خدماء سے کسی کو روانہ کیا جائے تا کہ بندہ ان کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کر سکے، امامناؑ نے حضرت بندگی میاں سید سلام اللہؓ (برادر نسبتی امامؑ) اور حضرت میاں ابو بکرؓ کو روانہ فرمایا۔ سلطان غیاث الدین نے تشفی بخش تحقیق کے بعد کہہ دیا کہ "بیشک یہی مقدس ذات پیغمبر صفات مہدی موعودؑ ہے۔ میں نے تصدیق کی، آپ حضرات گواہ رہنا۔

اس کے بعد حضرت میاں سلام اللہؓ اور میاں ابو بکرؓ کے ساتھ اپنے وزیر خزانہ حضرت میاں الہداد حمیدؓ کے ذریعہ اشرفیوں کے ساٹھ قنطار (چمڑے کے بستے) خچروں پر لاد کر اور ایک تسبیح مروارید جسکی قیمت ایک کڑوڑ سکہ محمودی تھی، حضرت امامناؑ کے حضور للہ نذر گزرانی، چونکہ شہر کے بہت سے فقیر و محتاج اشرفیون کے ساتھ آئے تھے کہ کچھ مانگ لیں، حضرت امامناؑ نے تمام اشرفیاں ان میں تقسیم فرمادیں (اسطرح اس حدیث رسول اللہ ﷺ پر بھی عمل ہو گیا جس میں مہدی کی یہ علامت بتائی گئی تھی کہ مہدی مال کو گن کر تقسیم نہیں کرے گا بلکہ پسوؤں سے دے گا)

ایک بزرگ نے کہا کہ ان اشرفیوں کے مستحق تو مہاجرین ہیں جو متوکل علی اللہ ہیں، امامناؑ نے فرمایا کہ اشرفیوں کے طالب اشرفیوں کے ساتھ آئے تھے اس لئے ان کو انکی مطلوبہ چیز دیدی گئیں۔ میرے مہاجرین طالب ذات خدا ہیں۔ اس لئے وہ اشرفیاں انکو نہیں دی گئی۔ البتہ وہ تسبیح مروارید باقی رہ گئی تھی، امامؑ ہمیشہ با ہتھیار رہتے تھے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت تھی۔ جب آپؑ کو اس تسبیح کی خبر ہوئی تو آپ اس کو گوشہ کمان سے اٹھا کر ہلا رہے تھے کہ ایک دف زن آگیا اور اس نے سوال کیا کہ اس دربار سے سبکو ملا، مجھے بھی کچھ عطا ہو۔ امامؑ نے جوں ہی گوشہ کمان سے وہ تسبیح اس کی طرف پھینک کر اسکی جھولی میں ڈالدی۔ تو حضرت میاں سلام اللہؓ نے عرض کیا کہ یہ تسبیح لاقیمت تھی۔ حضرت امامناؑ نے یہ آیت پڑھی "قل متاع الدنیا قلیل"

اور فرمایا تم اسکولا قیمت کہتے ہو، جبکہ اللہ پوری دنیا کے متاع کو قلیل کہہ رہا ہے۔ تو اس کے مقابلے میں اس تسبیح کی کیا قیمت ہے ؟ سلطان نے اپنی تین آرزوؤں کو امامؑ کی خدمت میں پیش کروایا۔ ”جینا مظلومی میں، موت شہادت پر، خاتمہ ایمان پر، مہدی موعودؑ نے فرمایا اللہ نے ان تینوں باتوں کو قبول فرمالیا۔ میاں الہداد حمیدؓ نے جب یہ کیفیت دیکھی تو وزارت چھوڑ دی، ترک دنیا کر کے مہاجرین میں شامل ہو گئے، تفصیلی بیان امراء کے ضمن میں آئیگا۔ ان شاء اللہ۔

(۳) برہان نظام شاہ بحری: برہان نظام شاہ بحری بن احمد نظام شاہ بحری بن نظام الملک بحری، نظام الملک بحری نے اپنی خدمات کے ذریعہ محمد شاہ بہمنی کے دور میں نظام الملک کا خطاب حاصل کیا تھا، چونکہ ابتداء میں نظام الملک کے تفویض شکار خانہ ”باز“ و ”بحری“ تھا۔ اس لئے لفظ بحری ان کے خطاب کا جزء ہو گیا اور اس کے خاندان میں ہر بادشہ کے نام کے ساتھ لفظ ”بحری“ شامل ہو گیا۔ نظام الملک بحری کا فرزند احمد نظام شاہ بحری، محمود شاہ بہمنی کے مقابلے میں فتح حاصل کر کے احمد نگر کا خود مختار بادشاہ بن گیا۔ جس مقام پر فتح حاصل کی تھی، بیادگار فتح وہاں ایک باغ کی بناڈالی۔ اور اس کا نام ”باغ نظام“ رکھا۔

جب امامنا مہدیؑ احمد نگر تشریف لائے تو احمد نظام شاہ بحری اسی باغ سے اسی وقت حاضر خدمت ہو کر بیعت سے مشرف ہو گیا۔ چونکہ احمد نظام شاہ بحری اس وقت تک لاولد تھا، اسلئے یہ تمنائے فرزند ادب سے خاموش بیٹھا رہا؛ کہ حضرت سے عرض کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ امامؑ نے بعد وعظ و بیان پان کا پسخوردہ احمد نظام کو عطا فرمایا۔ احمد نظام شاہ سمجھ گئے کہ دلی مراد بر آگئی، نہایت مسرت کے ساتھ کچھ خود بھی کھالیا اور کچھ محل سرا جا کر اپنی حرم کو بھی کھلا دیا، حضرت سے مزید قیام کرنے کی درخواست بھی کی۔ مگر آپ نے نامنظور کیا اور بیدر کی طرف روانہ ہو گئے، بفضل خدائے تعالیٰ اسی شب احمد نظام شاہ کی بیگم حاملہ ہو گئیں اور اس کے بعد برہان نظام شاہ بحری پیدا ہوئے، جس وقت برہان نظام شاہ بحری تخت نشیں ہوئے ہیں اس وقت امامناؑ کا وصال فراہ مبارک میں ہو گیا تھا۔

احمد نگر میں ویسے تو بہت سے مہدوی تھے جن سے مہدیؑ کے حالات وہ واقعات کا علم ہوا ہو گا؛ لیکن احمد نظام شاہ بحری نے بھی اپنے فرزند اور جانشین سے اپنی تصدیق مہدی اور پسخوردہ کی برکت سے اس کا پیدا ہونا وغیرہ بیان کیا ہو گا۔ اس لئے برہان نظام شاہ بحری نے تخت نشیں ہوتے ہی وہاں کے مہدویوں سے امامناؑ کی اولاد، آل، صحابہ کا حال، احوال اور ان کے مقامات سکونت دریافت کر کے بذریعہ حضرت خوند ملکؓ، ملک گجرات سے آل، اولاد اور صحابہ مہدیؑ کو نہایت اشتیاق و احترام سے سب سے پہلے حدود ملک دکن میں یعنی اپنے دار السلطنت احمد نگر میں بلالیا اور حضرت امامناؑ کے نبیرہ (پوتے) حضرت بندگی میاں سید میرانجیؒ (بن حضرت بندگی میاں سید حمیدؓ) سے اپنی دختر نیک اختر کا عقد نکاح نہایت عقیدت مندی سے اور بے حد

اصرار سے کر دیا۔ احمد نگر میں حضرت امامناؑ کی اولاد اور صحابہؓ کا بہت بڑا حظیرہ ہے۔

(۴) سلطان محمود بیگڑہ: بے گڈھ کے معنی گجراتی میں دو قلعوں کے ہوتے ہیں۔ چونکہ سلطان محمود دو قلعوں کا مالک ہو گیا تھا۔ اس لئے اسکو بیگڈھ کہا جانے لگا۔ امام مہدیؑ جب چاپا نیر پہنچے تو وہاں سلطان محمود بیگڑہ کا بھی قیام تھا۔ آپ کے بیان قرآن کے فضائل سن کر سلطان نے اپنے دو معتمد امراء سلیم خان اور فرہاد الملک کو مع چند علماء کے روانہ کیا، گفتگو کے بعد سلیم خاں اور فرہاد الملک دونوں امامؑ کے مرید ہو گئے۔ سلطان محمود نے بھی آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کی خواہش ظاہر کی لیکن علماء نے بادشاہ کو روک دیا کیوں کہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں سلطان بھی امامؑ کا مرید نہ ہو جائے البتہ سلطان کی بہنیں راجے سون اور راجے مرادی تو حضور مہدیؑ کی مرید ہو چکی تھیں۔

چناچہ مرأۃ سکندری کے مؤلف نے لکھا ہے ترجمہ "سلطان محمود بیگڑہ نے بھی سید مذکور (امامؑ) سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا، وزراء مانع ہوئے، مبادا سید مذکور کی باتیں سلطان کو متاثر کر دیں اور مہمات سلطنت میں تعطل پیدا ہو جائے۔

اسی طرح عبد اللہ محمد بن عمر مکی نے بھی بیان کیا ہے۔ "وغير مرة احب السلطان ان يراه فالتمس اركان ملكه ان لا يفعل و صـــرفوه عنه و ذلك لانه كان له قبول يجذب زائره و يحمله على التجرد من الدنيا" کئی مرتبہ سلطان محمود ان سے ملنا چاہا لیکن ارکان سلطنت نے ان سے نہ ملنے کی التماس کی اور سلطان محمود نے کو اس ارادہ سے روکدیا اس لئے کہ ان میں ایسا فیض قبول تھا جو ملنے والے کو کھینچ لیتا تھا اور اسکو دنیا سے علٰحدہ ہو جانے پر آمادہ کرتا تھا۔ بہر حال سلطان محمود بیگڑہ کا امامؑ کا معتقد ہونا ثابت ہے۔

چناچہ عبد القادر بدایونی کے بیان سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ، حضرت مہدیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی صحبت میں رہے "سلطان محمود بیگڑہ جو سلطان مظفر گجراتی کا باپ تھا وہ ایک مفسر، عالم اور عادل بادشاہ تھا، حضرت مہدیؑ سے ملا اور ان کی صحبت میں رہا" ابو الکلام آزاد نے تذکرہ میں لکھا ہے "سلطان محمود کلاں صورت دیکھتے ہی معتقد ہو گیا" (تذکرہ صفحہ ۳۰)۔

(۵) مرزا سلطان حسین بادشاہ خراسان: ہماری کتابوں میں یہ آیا ہے کہ میر ذو النون نے حضرت مہدیؑ کی تصدیق کرنے کے بعد کے واقعات سے متعلق ایک معروضہ مرزا سلطان حسین کی خدمت میں گذرانا تھا۔ نویں صدی ہجری میں ہرات، علماء کا زبردست مرکز تھا، مرزا سلطان حسین نے تحقیق مہدیت کیلئے چار سو سواروں کے ساتھ علماء بھیجے تھے۔ ان علماء نے شیخ الاسلام کو کہلا بھیجا کہ یہ جن کے مہدی ہونے کی ہم نے تصدیق کی ہے۔، اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں اور وہ علم جو ہم

نے برسوں پڑھا تھا، اس جگہ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، جو علماء مہدیؑ کی خدمت میں روانہ کئے گئے تھے۔ وہ یہ تھے (۱)۔ علامہ ملا علی فیاض (۲) علامہ ملا علی شیر وانی (۳) علامہ ملا علی گل (۴) علامہ ملا مخدوم

یہ تمام علماء علم تفسیر و حدیث میں استاد کامل تھے۔ اور تدبیر، دانش مندی، فراست اور امور سلطنت انجام دینے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ سلطان کے حکم پر ہی ان علماء کو مہدی موعودؑ کی خدمت میں تحقیق مہدیت کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ سلطان نے ملا علی فیاض کو میر مناظرہ مقرر فرمایا۔

ان علماء نے شاہی کتب خانہ اور علماء شہر کی کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ دو مہینوں تک باہمی فرضی مناظرہ کرکے چار سوال تجویز کئے اگر چہ یہ سوالات بظاہر نہایت معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن در اصل دعویٰ مہدیت و خلیفۃ اللہ کو پرکھنے کی کسوٹی تھے۔ ہر ایک سوال میں ایک نازک پہلو رکھا تھا کہ بجز خلیفۃ اللہ کے دوسرے سے اس کا صحیح جواب ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سلطان نے ان سوالات کو دیکھا تو بہت خوشنودی ظاہر کی اور ان چاروں علماء کو فرہ جانے کا حکم دیا۔

وہ چار سوالات یہ تھے

(۱) پہلا سوال یہ تھا کہ آپ نے جو دعویٰ مہدیت فرمایا ہے وہ کہاں سے فرمایا، یعنی کس آیت و حدیث کی بناء پر فرمایا ہے، سوال تو بالکل صاف تھا، اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ فلاں آیت و حدیث سے کیا جاتا ہے، وہ علماء تکذیب دعویٰ کیلئے یہی جواب چاہتے تھے (کیوں کہ ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں آیت و فلاں حدیث کی بناء پر دعویٰ مہدیت کرتا ہوں) اسلئے کہ اس قسم کا دعویٰ باطل ہے۔ لیکن امام مہدی موعودؑ نے فرمایا "بندہ خدا کے حکم سے دعویٰ کر رہا ہے" علماء نے کہا کہ یہی شان خلیفۃ اللہ کی ہوتی ہے۔

(۲) دوسرا سوال یہ تھا کہ "آپ کس مذہب پر ہیں۔ یعنی اسلام کے کس فرقے سے ہیں، اگر اہل سنت والجماعت سے ہیں تو کس امام کے پیرو ہیں، یہ سوال بھی بہت صاف تھا اس سے ان علماء کا مقصد یہ تھا کہ حضرت کی زبان سے کسی ایک فرقہ کا نام سن لیں جو کہ تکذیب دعویٰ کیلئے بڑی دلیل ہے کیوں کہ مہدی جو خدا کا خلیفہ ہے وہ کسی فرقہ میں مقید نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی مجتھد کا پیرو نہیں ہو سکتا، بلکہ سب اسکے تابع ہوتے ہیں وہ تو صرف قرآن اور رسول اللہ ﷺ کا تابع ہوتا ہے وہ تمام فرقوں کے باہمی اختلاف کو مٹانے والا ہے۔ حضرت مہدی موعودؑ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا، بندہ مذہب مصطفیٰ رکھتا ہے کسی مذہب میں مقید نہیں ہے۔ علماء نے کہا کہ یہی جواب صحیح ہے کیونکہ مجتھد غیر معصوم ہیں اور مہدی جو خدا کا خلیفہ ہے وہ معصوم ہوتا ہے، پس معصوم، غیر معصوم کا تابع نہیں ہو سکتا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "المهدي مني يقفو أثري و لا

یخطي"

(۳) تیسرا سوال: آپ وعظ وبیان کس تفسیر سے کرتے ہیں، حضرت مہدیؑ نے جواب دیا کہ "بندہ بحکم خدا مراد اللہ کو بیان کرتا ہے جو تفسیر کہ اس بندہ کے بیان کے مطابق ہو وہ صحیح ہے ورنہ وہ غلط ہے۔

اب ان علماء کو حضرت مہدیؑ کے مہدی ہونے کا یقین ہو گیا تھا، کہا کہ واقعی تفسیریں، مفسرین کے ظنیات سے بھری ہوئی ہیں اور مجتہدین کی رائے، صواب وخطا سے مخلوط ہے۔

(۴) چوتھا سوال یہ تھا کہ ہم نے سنا ہے کہ حضرت دعویٰ رویت اللہ یعنی دار دنیا میں سر کی آنکھوں سے خدا کے دیدار کے جواز کا دعویٰ کرتے ہیں، امامؑ نے اس کے جواب میں چند آیتیں پڑھیں، جن میں سے دو آیتیں، یہاں لکھی جاتی ہیں

(الیف)فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴿الکھف:۱۱۰﴾ جو کوئی اپنے رب کی لقاء (دیدار) کی امید رکھتا ہے اسکو چاہیئے کہ وہ عمل صالح (ترک دنیا) کرے اور اپنے پرور دگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے

(ب)وَمَن كَانَ فِي هَـٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا﴿الاسراء:۷۲﴾ جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے پس وہ آخرت میں بھی اندھا ہے اور راستے سے زیادہ بھٹکا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ بھی آپؑ نے قرآن کی کئی ایک آیتیں پڑھیں اور ان سے رویت اللہ کے جواز کی دلیلیں دیں۔ تفصیل کیلئے دیکھیں ہمارا رسالہ "المہدی والعلماء"

خلاصہ یہ کہ ملا علی فیاض نے نہ صرف تصدیق مہدیؑ کی بلکہ آپ کی صحبت میں ہی رہنا پسند کیا، باقی علماء نے سلطان سے عرض کیا کہ ہم نے از روئے قول وفعل، علم وعمل ہر طرح سے تحقیق کی یہی معلوم ہوا کہ یہی ذات مہدی موعود امام آخر الزمان ہے، سلطان نے اسی وقت تصدیق کی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی نیت سے ہرات سے کوچ بھی کیا لیکن عمر اور ضعف کی وجہ سے ہرات سے دس منزل طے کئے تھے کہ دار دنیا سے انتقال فرمایا۔

امراء

(۱) زبدۃ الملک حاکم جالور: ان کا نام عثمان خان ہے۔ زبدۃ الملک آپ کا خطاب ہے۔ آپ کے آباء واجداد صوبۂ بہار کے حاکم تھے۔ جب حضرت مہدیؑ ۹۰۶ھ یا ۹۰۷ھ میں جالور تشریف لیگئے تو انہوں نے آپ کا بیان قرآن سنکر دین مہدی کی

تصدیق کی، ان کے ساتھ ان کی تمام رعیت اور تمام فوج نے مہدوی مذہب اختیار کیا۔ اس جگہ تقریباً نو سو علماء بعد تحقیق تصدیق سے مشرف ہوئے۔ سابق فرمانروائے ریاست پالن پور ان ہی کی اولاد میں سے ہے۔

(۲) دریا خان مدار المہام ٹھٹہ: صاحب تحفۃ الکرام نے بیان کیا ہے کہ دریا خاں کا نام پہلے قبولہ خاں تھا۔ اصل میں یہ سید زادہ ہیں۔ حوادث زمانہ سے قید ہو گئے تھے، جام نظام الدین کے دیوان نے انہیں خرید لیا تھا ایک دن جام نظام الدین شکار کھیلنے نکلا، دھوپ تیز تھی اور تھکا ہوا تھا، پینے کیلئے پانی مانگا، قبولہ خان پانی لے آئے اور اس میں تھوڑا سا خس ڈالکر جام کو دیا، تاکہ جام آہستہ آہستہ پی لے، دریافت کرنے پر کہا کہ میں نے پانی میں خس اس لئے ڈالا تھا کہ آپ اس حرارت میں پانی آہستہ آہستہ پئیں، ایک دم نہ پی لیں کیوں کہ یہ ضرر رساں ہوتا ہے، اس وقت جام نے دریا خاں کا خطاب دیا۔ اسکے بعد صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ "جب میر سید محمد جونپوری ٹھٹہ میں آئے، باوجودیکہ جام علماء کی تحریک پر معتقدانہ پیش نہ آیا، لیکن خلوص دل سے ان کا مرید ہو گیا اور صاحب الزماں (امام مہدی موعودؑ) کے رضاء خاطر سے بہرۂ وافی حاصل کیا۔ (تحفۃ الکرام، جلد سوم، صفحہ ۵۴)

(۳) شاہ بیگ حاکم قندھار: یہ میر ذوالنون کے بیٹے ہیں، مرزا سلطان حسین نے انکو قندھار کا حاکم مقرر کیا تھا۔ جب مہدیؑ قندھار تشریف لائے تو وہاں کے بعض علماء نے شاہ بیگ سے کہا کہ انہیں جامع مسجد بلا کر تحقیق کرنی چاہیئے۔ سرکاری ہر کارے جب آپ کو بلانے کیلئے آئے، تو حضرت مہدیؑ اور آپ کے اصحابؓ کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ حضرت امامؑ نے صبر کر لیا اور ان کے ساتھ جامع مسجد جا کر قبلہ رو صف اول میں بیٹھ گئے۔ شاہ بیگ بھی آئے لیکن وہ مست و مخمور تھے۔ مرزا شہ بیگ اس وقت چار قسم کے نشہ میں چور تھے، جوانی، حکمرانی، تبحر علمی، شراب ولایتی۔ جب وہ جامع مسجد آئے تو جھومتے ہوئے آئے، مہاجرین میں سے ایک نے کہا کہ شہ بیگ نوجوان اور نشہ میں چور ہے، اسلئے ذرا نرم گفتگو کیجئے۔ حضرت اماماً نے عتاب آمیز الفاظ میں فرمایا "کیا ہو گیا، جب اس بندہ کے سامنے مستان دنیا ہشیار ہو جاتے ہیں تو یہ مستی بول (شراب) کب تک رہیگی۔ جب مرزا شہ بیگ مسجد میں داخل ہوئے تو سیدھا حضورؑ کے سامنے بیٹھ گئے۔ علماء و فضلاء شور و غل مچانے لگے اور سخت الفاظ میں کہا "ایں مرد ہندی خود را مہدی موعود می پندارد" یعنی یہ ہند کا آدمی اپنے آپ کو مہدی موعود سمجھتا ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ شہ بیگ کو فوراً غصہ آجائے اور بلا حجت و دلیل قتل کا حکم صادر کر دے۔ چونکہ ساتھ میں جلاد بھی تھا لیکن مرزا شہ بیگ نے فرمایا ذرا خاموش رہو، میں سن تو لوں کہ یہ مرد (مہدی) کیا کہتا ہے، پھر جو بھی کرنا ہے کروں گا۔ حضرت مہدیؑ نے "أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ﴿ہود:۱۷﴾" کا بیان فرمایا، جو ثبوت مہدی میں

ہے۔یعنی من سے مراد ذات مہدی موعودؑ ہے۔

مرزاشہ بیگ نے ابھی تھوڑاسا وعظ سنا تھا کہ ان کے دل پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ اور حضرت امامناؑ کے قدوم مبارک پر اپنا سر رگڑ کر نہایت گریہ وزاری سے عفو خطا چاہی۔ حضرت امامؑ نے ختم رکوع سے پہلے کوئی بات نہیں کی، کیوں کہ ختم رکوع سے پہلے بات کرنا خلاف سنت ہے، اسلئے بعد ختم رکوع مرزا شہ بیگ کے سر کو اپنے دست مبارک سے اٹھایا، خطا معاف کی۔ پھر تمام علماء وفضلاء بھی آپ کے بیان سے متاثر ہو کر آپؑ کے قدموں پر گر پڑے اور تصدیق سے مشرف ہو گئے۔

پھر جب امامؑ وہاں سے اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے جو آبادی سے باہر تھی، مرزا شہ بیگ امامؑ کے گھوڑے کی رکاب تھامے ہوئے، فرود گاہ تک آکر تلقین ذکر خفی پائی اور تین روز تک مہاجرین کی شاہانہ مہمانی کی۔ اور بہت سارو پیہ امامؑ کے حضور میں للہ نذر گذرانا۔ تین دن کے بعد امامناؑ نے دعوت قبول نہیں فرمائی اور حدیث کے حوالے سے فرمایا"الضیافة ثلاثة ایام"۔ مہمانی تین دن کی ہے اور کچھ روپیہ وغیرہ نہیں لیا۔ یہاں ہر روز مہدویوں کی تعداد بڑھتی گئی؛جب امامناؑ نے حکم خدا سے وہاں سے کوچ کا ارادہ کیا تو مرزاشہ بیگ سخت پریشان ہو گئے اور نہایت بے تابی اور عاجزی سے آپؑ کو روکنا چاہا۔ آپؑ نے فرمایا خدا کا حکم ہو چکا ہے اب بندہ نہیں رہ سکتا۔ شہ بیگ خدا کا نام سن کر عاجز ہو گئے اور امامناؑ نے یہاں سے کوچ فرمایا۔ مرزاشہ بیگ نے رکاب تھامے ہوئے چار میل تک چل کر نہایت گریہ وزاری سے رخصت چاہی۔ ویسے تو قندھار میں بیشمار لوگ اور کثرت سے علماء وفضلاء مہدوی ہو گئے تھے۔ مگر مشاہیر قندھار جو پیشوائے قوم تھے جنھوں نے سخت مخالفت کے باوجود وعظ وبیان قرآن سن کر تصدیق سے مشرف ہو کر طلب خدا میں ترک وطن کر کے ہجرت اختیار کی۔ ان کے بعض اسماء گرامی یہ ہیں (۱) حضرت علامہ میاں محمد کاشانیؒ (۲) حضرت علامہ میاں دانش خراسانیؒ (۳) حضرت علامہ میاں حاجی عبد اللہؒ (۴) حضرت علامہ میاں عبد الہاشمؒ (۵) حضرت علامہ میاں عبد القادرؒ (۶) حضرت علامہ میاں اشرف ہانسویؒ (۷) حضرت علامہ میاں کبیر خاںؒ (۸) حضرت علامہ میاں شریف محمدؒ (۹) حضرت علامہ میاں کمال خانؒ (تلخیص از رسالہء حضرت سید محمد تقی مجتہدی)۔ شاہ بیگ بڑے عالم وفاضل تھے، اللہ نے انکو فضائل علمی سے بھرپور نوازا تھا۔ چناچہ مورخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ "چنانچہ شرح بر"عقائد نسفی"و"شرح بر"کافیہ"وحاشیہ بر"مطالع منطق"نوشتہ است"

(۴) مرزاشاہ حسن مہدوی: مرزاشاہ بیگ کے فرزند مرزاشاہ حسن بھی مہدوی تھے۔ انہوں نے مہدویوں کو قاضی مقرر کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے قاضی محمد اوچہ کو ٹھٹھہ کا قاضی مقرر کیا تھا۔ اسی طرح مرزاشاہ حسن نے قاضی قاضن کو بکر کا

قاضی مقرر کیا تھا۔ (تحفتہ الکرام)

(۵) سرور خاں افسر فوج: حضرت اماناؑ ہجرت فرماتے ہوئے اکیس سال میں قندھار تشریف لائے، یہاں کچھ دن رہ کر یہاں سے قصبہ "کوہ دلارام ہوتے ہوئے تقریبا چھ مہینے کے عرصہ میں فراہ مبارک پہنچے، بیرون شہر حاجی سکندر کی سرائے میں نزول اجلال فرمایا۔ حضرت اماناؑ کی تشریف آوری کی اطلاع قاضی شہر فراہ کو ہوئی، چناچہ حضرت مہدیؑ اور تمام مہاجرین باتباع محمد رسول اللہ ﷺ باہتھیار رہتے تھے اسلئے قاضی شہر نے سرور خاں افسر فوج کو ان سے ہتھیار چھین لینے کا حکم دے دیا۔ سرور خاں نے سپاہیوں کے ساتھ آکر مہاجرین سے ہتھیار طلب کئے، مہاجرین نے انکار کر دیا، امامؑ نے فرمایا "بندہ نہ تو اپنے نفس کا تابع ہے اور نہ تمہارا، بلکہ خدا کا تابع ہے حکم خدا ہے کہ ہتھیار دیدو" اور خود آپؑ نے اپنی تلوار دیدی، پھر سب مہاجرین نے بھی ایسا ہی کیا۔ سپاہیوں نے نہ صرف ہتھیار چھین لئے بلکہ جو کچھ دوسرا سامان تھا وہ بھی لے لیا۔

اسی شب سرور خاں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت سرور کائنات ﷺ نہایت عتاب سے ارشاد فرمارہے ہیں کہ "کل تو نے جو بے ادبی میرے فرزند کی کی ہے گویا وہ مجھ سے کی ہے" اور انگلی کے اشارہ سے سرور خاں کے پلنگ کو صحن میں پھینک دیا، جب سرور خاں چونک کر اٹھے تو خود کو اپنے صحن میں پایا۔ اس حال میں کہ وہ نیچے پڑے ہیں۔ اور پلنگ انکے اوپر، ساتھ ہی سرور خاں کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ عزیز و اقارب نے بہت کچھ علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا، سرور خاں نے عزیزوں سے کہا کہ "یہ اسی جھاڑ کا پھل ہے جس کو کل میں نے بویا تھا" بجز حضرت کی شفاعت کے میری شفا ممکن نہیں ہے۔ تم مجھے کسی طرح وہاں پہنچا دو۔ سرور خاں نے نہایت عاجزی و گریہ وزاری کے ساتھ معافی مانگی۔ حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ نے بھی سفارش کی۔ حضرت مہدیؑ نے پانی کا پسخوردہ عنایت فرمایا اسی وقت سرور خاں کو شفا نصیب ہو گئی۔ سرور خاں نے کمال انفعال سے عرض کیا کہ "کل حضرت کے مہاجرین کی کیا کیا چیزیں چھین لی گئی تھیں۔ ان کی فہرست عطا ہو تا کہ وہ تمام چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اماناؑ نے فرمایا "ہماری ملک سے کوئی چیز نہیں گئی جو چیز ہماری ہے اسے کوئی چھین نہین سکتا" یعنی ذکر دوست و فکر وصال اوست"، یعنی اللہ کا ذکر اور اس کے وصال کی فکر۔ سرور خاں نے نہایت صدق دل سے تصدیق کی اور تلقین ذکر خفی پائی۔

(۶) میر ذو النون حاکم فراہ: چند روز کے بعد سرور خاں نے میر ذو النون گورنر فراہ (پدر مرزا شاہ بیگ ارغون) کو حضرت اماناؑ کی تشریف آوری کی اطلاع دی۔ میر ذو النون نے جواب دیا کہ میں خود تحقیق کیلئے آتا ہوں۔ کوئی اچھا مقام میرے لئے آراستہ کیا جائے اور آلات سیاست یعنی طوق و زنجیریں وہاں رکھدئے جائیں اگر دعویٰ غلط ہو گا تو مدعیء مہدی کا سر اتار لوں

گا۔ میر ذوالنون شاہانہ کروفر سے گھوڑادوڑاتے ہوئے، مہاجرین کے قریب آکر گھوڑے سے اترے۔ چونکہ مہاجرین ایک ناہموار جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسلئے میر ذوالنون مارے غیظ وغضب کے مہاجرین کو ہٹاتے ہوئے امامناؑ کے پاس بیٹھنے کیلئے آرہے تھے۔ کہ مہدیؑ نے فرمایا "میر ذوالنون جہاں جگہ مل جائے بیٹھ جاؤ۔ میر ذوالنون پر ہیبت طاری ہوگئی، جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے۔ امامؑ نے بیان قرآن شروع فرمایا، تھوڑا ہی وعظ ہوا تھا کہ میر ذوالنون نے عرض کیا کہ "میں نے حدیث شریف میں دیکھا ہے کہ امام مہدی پر تیغ کارگر نہ ہوگی۔" حضرت امامناؑ نے اپنی تلوار انکے حوالے کی اور فرمایا "آزمالو"۔ میر ذوالنون نے فورا تلوار نیام میں سے کھینچ کر وار کرنے کیلئے ہاتھ اٹھایا تھا کہ ہاتھ شل ہوگیا۔ اور چکرا کر زمین پر گر گئے۔ چہرہ کا رنگ بدل گیا، بے ہوش ہوگئے۔ امامناؑ نے اپنا دست مبارک میر ذوالنون کے چہرہ پر پھیرا۔ وہ ہشیار ہوگئے، حضرت امامؑ نے فرمایا "اے میر اور آزمالو"، میر ذوالنون نے پھر دوسری مرتبہ دوسرا وار چلانے کیلئے ہاتھ اٹھایا تھا کہ ہاتھ پھر شل ہوگیا۔ اور بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اور حضرت امامؑ نے پھر ہاتھ پھیر کر میر ذوالنون کو ہوشیار فرمایا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی کیفیت ہوئی۔ میر ذوالنون نے تلوار رکھدی اور امامناؑ کے قدموں پر گر پڑے۔ امامؑ نے فرمایا "اے میر ذوالنون، آتش کا کام جلانا، پانی کا کام ڈبونا، اور تلوار کا کام کاٹنا ہے، لیکن حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ مہدی پر کوئی قادر نہ ہوگا۔ میر ذوالنون نے اسی وقت تصدیق کی اور نہایت جوش سے عرض کیا "ہم مہدی موعودؑ کے نوکر ہیں، ناصر ہیں، مہدی موعودؑ کے آگے رہ کر شمشیر زنی کریں گے۔ امامناؑ نے فرمایا "مہدی کا ناصر خدا ہے۔ تم اپنے نفس پر شمشیر زنی کرو۔ (یعنی راہ خدا میں نفس کشی کرو)۔

(۷) میاں الہداد حمیدؓ: آپ سلطان غیاث الدین خلجی کے امراء سے تھے۔ آپ ہی کے ذریعہ سلطان غیاث الدین خلجی نے بہت سا مال، امامناؑ کی خدمت میں گذرانا تھا، لیکن امامناؑ نے اسی وقت اس کو اسکے طالبوں اور فقیروں میں تقسیم فرمادیا تھا۔ جب میاں الہداد حمیدؓ نے دنیا سے ایسی نفرت اور توکل تام کا یہ عالم دیکھا تو بے حد متاثر ہوئے اور بے اختیار ہوکر وزارت چھوڑدی اور ترک دنیا کرکے مہاجرین میں شامل ہوگئے، آپ اپنے زمانے میں بڑے علامہ تھے، فارسی پر اتنا عبور تھا کہ امامؑ کی شان میں ایک بڑا دیوان حروف غیر منقوط میں لکھا، مثال کے طور پر الحمد للصمد کہ امام اولی الامم۔ اہلا وسہلا آمدہ امسال در حرم صاحب نزھۃ الخواطر نے میاں الہداد حمیدؓ کی تصانیف میں رسالۂ بار امانت اور رسالۂ اثبات مہدیؑ کا ذکر کیا ہے (حصہ ء چہارم، ص ۴۰)

(۸) فرہاد الملک و سلیم خان: یہ دووہ امراء تھے جنھیں سلطان محمود بیگڑہ نے مع دو علماء کے، مہدیؑ کی تحقیق کیلئے چاپانیر بھیجے تھے جب مہدی موعودؑ کا ورود باسعود وہاں ہوا تھا، جس وقت یہ دو امراء، امامؑ کے پاس آئے اس وقت بہت سی مخلوق جو مسجد

اور صحن میں بیٹھی ہوئی تھی، امامؑ کا بیان سننے میں اس قدر محو تھی کہ کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی، یہ بات علماء کو شاق گذری، لیکن فرہاد الملک اور سلیم خان نے بعد تحقیق، تصدیق کی، ان کی گواہی پر سلطان محمود بیگڑہ بھی، مہدی موعودؑ کا گرویدہ ہوگیا تھا اور ایک روایت کے مطابق سلطان، امامؑ کی خدمت میں حاضر ہونا ثابت ہے، جس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے تصدیق کی۔

(۹) مبارز الملک: مبارز الملک، ملک یعقوب کے فرزند ہیں، ملک یعقوب، ملک سلیمان باڑی وال کے داماد ہیں، ملک سلیمان پٹن علاقۂ گجرات کے صوبہ دار تھے، زندگی میں ہی ملک سلیمان نے اپنا منصب اپنے اکلوتے داماد کے نام منتقل کر دیا تھا، ان کے قبیلہ کے تمام افراد، پٹن میں ہی امامناؑ کی تصدیق سے مشرّف ہو چکے تھے، خود مبارز الملک عمر کے آخیر حصّہ میں تصدیق سے مشرف ہوئے۔

قارئین کو اس سے اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ مہدویت کو قبول کرنے والوں میں بادشاہ، امراء، منصب دار، جاگیر دار، فوج کے افسر، تاجر پیشہ، علماء، فضلاء اور قضاۃ بھی تھے، عوام کا تو حساب ہی نہیں تھا، لیکن معاندین مذہب مہدویہ نے سادہ لوح لوگوں کو بھڑکانے اور بہکانے کی غرض سے لکھ دیا کہ ''صرف جہلاء نے آپؑ کو مہدی موعود مانا ہے'' اس کو پرلے درجہ کی بد دیانتی اور خیانت علمی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے، افسوس تو اس بات کا بھی ہے کہ ایسا لکھنے والے طبقہ عوام میں سے نہیں بلکہ خود کو مورخ بھی کہتے ہیں۔

شرح صدر

اللہ کا ارشاد ہے: أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ﴿الشرح:۱،۲،۳﴾۔ اے محمد کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی۔

شرح صدر ایک تو حسی ہے اور دوسرا معنوی۔ ہمارا ایمان یہ ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مراحل سے گذرے ہیں۔ یعنی عملاً آپ کا سینہ بھی کھول دیا گیا۔ چنانچہ روایت ہے بچپن میں جب آپ دائی حلیمہ رضی اللہ عنھا کے پاس تھے اور دودھ شریک بھائی کے ساتھ بکریاں چرا رہے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس آئے آپ کو پکڑا۔ زمین پر لٹایا اور سینہ چاک کیا۔ اور گوشت کا ایک لوتھڑا نکال لیا۔ اور کہا یہ شیطان کا حصہ ہے۔ پھر دل کو سونے کے طشت میں زمزم سے دھویا پھر اس کی جگہ رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر بچے حلیمہ کے پاس گئے اور کہا کہ تمہارا بیٹا محمد قتل کر دیا گیا۔ آپ آئیں تو دیکھا آپ صحیح و سالم تھے۔ البتہ آپ کا رنگ بدل گیا تھا۔ یہ تو ہوا عملاً شرح صدر۔

معنوی یوں کہ سینہ کھولنے سے مراد اس میں وسعت پیدا کرنا، اس کو نرم اور ملائم کرنا تا کہ نبوت کے علوم اور معارف کے سمندر اس میں اتار سکیں۔ حوصلہ کو بڑا کرنا تھا تا کہ دشمنوں کے نرغے میں رہ کر عالی ہمتی اور استقلال کے ساتھ کافروں اور مشرکوں کی اذیتوں کو سہتے ہوئے نبوت و رسالت کے فرائض خوش اخلاقی، خوش اسلوبی اور عالی حوصلگی کے ساتھ انجام دے سکیں۔

ایک دو حضرات کو چھوڑ کر جو نیچری ہیں اکثر بلکہ تمام مفسرین نے عملاً شرح صدر کو تسلیم کیا ہے۔

- چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب فرماتے ہیں، حوصلہ کشادہ کیا بڑا کام اٹھانے کو اور ظاہر میں بھی فرشتوں نے حضرت کا سینہ چاک کیا۔ دل سے سیاہی نکال کر دھو ڈالا۔
- شاہ عبد العزیز صاحب فتح العزیزین میں فرماتے ہیں "شرح صدر حسی نمونہ ء شرح صدر معنوی بود"
- شاہ ولی اللہ صاحب سرور المحزون میں فرماتے ہیں، ونزدیک حلیمہ شگافتند سینہ ء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را و پر کردند آند بدانش وایمان
- اور جلاء العیون نظم سرور المحزون میں ہے
- بود نہ نزدیک حلیمہ کہ تا سینہ او گشت بحق آشنا
- یک دو ملائک ز سپہر بلند آمدہ نزدیک شہ ارجمند

- صدر شریفش چو قمر کرد شق ساختہ مشحون زانوار حق
- شیخ عبد الحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں "و قضیہ شق صدر شریف و غسل قلب وے صلی اللہ علیہ وسلم پیش نیز حلیمہ واقع شد۔
- مولوی سید محمد صدیق حسن خان ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں "شرح صدر کیا ہے یعنی حوصلہ کشادہ کیا اتنا بڑا کام اٹھانے کو اور ظاہر میں بھی فرشتوں نے حضرت کا سینہ چاک کیا۔
- قرۃ العیون شرح سرور محزون مصنفہ نواب محمد علی خان میں ہے "حکمت اس شق صدر میں یہ تھی کہ حکماء اور اطباء اس سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شق ہونا سینہ اور دل کا موت ہے کہ زندگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی ہے سو پروردگار نے اپنی قدرت ظاہر کی اور عقلاً لوگ اس میں تاویل کرتے ہیں کہ مراد اس سے پاک کرنا باطن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس جہاں کی برائیوں سے۔ اور اہل ایمان اس کی تصدیق کرتے ہیں بے تاویل اور انکار کے۔ اور ایسا ہی ہے سیرۃ ابن ہشام اور سیرت احمدی اور مواہب لدنیہ، وزرقانی اور تاریخ خمس اور تفسیر در منشور وغیرہ کتب تفاسیر وسیر وتواریخ میں وامام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں **فی شرح الصدر قولان** یعنی شرح صدر میں دو قول ہیں۔

الاول—ما روی ان جبرئیل علیه السلام اتاه و شق صدره و اخرج قلبه و غسله و انقاه من المعاصی ثم ملاه علما و ایمانا و وضعه في صدره۔ یعنی جبرئیل علیہ السلام حضور کے پاس آئے اور آپ کے سینے کو چاک کیا دل کو نکالا، اس کو گناہوں سے صاف کیا پھر اس میں علم وایمان بھرا اور اس کو آپ کے سینے میں رکھ دیا۔

والثانی—ان المراد من شرح الصدر ما یرجع الی المعرفة و الطاعة۔ یعنی دوسرا یہ کہ شرح صدر سے مراد وہ امور ہیں جن کا مرجع معرفت اور اطاعت کی طرف ہے۔

واضح ہو کہ اس روایت پر اعتراضات بھی وارد ہوئے ہیں:

پہلا اعتراض: **ان هذه الواقعة انما وقعت في حال صغره علیه السلام و ذالك من المعجزات فلا یجوز ان تتقدم بنبوته۔** یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے بچپن کا ہے اور منجملہ معجزات کے ہے پس اس کو نبوت سے پہلے نہ ہو چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے: **ان تقدیم المعجزة علی زمان البعثة جائز عندنا و ذالك عندنا یسمیٰ بالارهاص ومثله في حق الرسول کثیر۔** بعثت کے زمانے سے پہلے معجزے کا ہونا ہمارے پاس جائز ہے اس کو ارھاص کہتے ہیں اور اس کی

مثالیں آنحضرتؐ کے حق میں بہت ہیں۔

دوسرا اعتراض:ان تاثیر الغسل في ازالة الاجسام و المعاصي ليست بأجسام - فلا يكون للغسل فيها اثر۔ دھونے کی تاثیر اجسام میں ہوا کرتی ہے اور گناہ اجسام نہیں ہیں پس دھونے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔

تیسرا اعتراض:انه لا يصح ان يملاء القلب علما بل الله يخلق فيه یہ صحیح نہیں ہے کہ دل علم سے بھرا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ علم کو اس میں پیدا کرتا ہے۔

دوسرے اور تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے:

فلا يبعد ان يكون حصول ذلك الدم الاسود الذي غسلوه من قلب الرسول عليه السلام علامة للقلب الذي يميل الى المعاصي و يحجم عن الطاعة فاذا ازالوه عنه كان ذلك علامة لكون صاحبه مواظبا على الطاعات محترزا عن السيات۔ یہ کوئی بعید بات نہیں کہ وہ سیاہ خون جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے نکال کر دھوڈالا ہو۔ معاصی کی طرف جھکنے اور طاعت سے رکنے کی علامت رہی ہو پس جب اس کو اس سے دور کر دیا تو یہ طاعت پر جمے رہے اور برائیوں سے بچنے کی علامت ہو گئی۔ (تفسیر کبیر، رازی)

شاہد

صاحب جمال کو کہتے ہیں اس کے مشاہدہ سے سالک کے قلب میں تغیر پیدا نہ ہو تو یہ اس کے فنائے نفس کی علامت ہے۔ اور تغیر پیدا ہونا حیات نفس کی علامت ہے۔

شقاوت

حق تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہنا۔

شجرۃ المرشدین حضرت شاہ یعقوبؓ

حضرت میراں سید محمود ثانیٔ مہدیؓ کے فرزند ار جمند اور امامنا علیہ السلام کے مبشّر ہیں۔ حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایتؓ سے بھی آپ کو فرزند معنوی یعنی داماد ہونے کی نسبت حاصل ہے۔ حضرت شاہ یعقوبؓ کی ولادت باسعادت رادھن پور (بھیلوٹ) علاقہ گجرات میں ہوئی۔ آپکی عمر چھ یا سات سال کی تھی کہ آپ کے والد بزرگوار کی رحلت ہوگئی۔ بچپن امامناؑ کی حرم محترم حضرت بی بی ملکاںؓ کے سایۂ عاطفت میں گذرا، ابتدائی تربیت حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ کے تفویض رہی اور آپ حضرت بندگی شاہ نعمتؓ سے بھی تلقین ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کی شادی حضرت سید الشہداء صدیق ولایتؓ کی صاحبزادی حضرت راجے رقیہؓ سے حضرت بندگی ملک الہداد خلیفہ ؑگروہؓ نے فرمائی جن کے بطن سے حضرت بندگی میاں سید اشرفؒ اور بندگی میں سید اسحاقؒ پیدا ہوئے اس رشتہ کے قائم ہو جانے کے بعد آپ حضرت خلیفہ ؑگروہ کے دائرہ معلّی میں تشریف فرمارہے۔ چند سال بعد آپ نے دکن کی طرف ہجرت فرمائی۔ یہ زمانہ ۹۴۰ھ کے کچھ بعد کا ہے ان دنوں حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ کا دائرۂ مبارک ''بھنگار'' ضلع احمد نگر میں تھا۔ آپ حضرت شاہ دلاورؓ کی صحبت فیض اثر میں کچھ دن گذارے۔ اسی زمانے میں حضرت شاہ نعمتؓ کا دائرۂ مبارک بھی اسی قرب و نواح میں تھا۔ ان دونوں بزرگوں کے ایماء اور اصرار پر حضرت شاہ یعقوبؓ نے اپنا علیحدہ دائرہ ''جیور'' (احمد نگر) میں قائم فرمایا۔ یہیں پر آپ کی اہلیہ محترمہ راجے رقیہؓ نے اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ اور یہیں پر آپ مدفون ہیں۔ یہ مقام بھی مہدویوں کی زیارت گاہ ہے۔

حضرت راجے رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضرت شاہ یعقوبؓ نے دوسری شادی گوہر شاہ پولادیؒ کی صاحبزادی بوا صاحبہ بی بی سے فرمائی جن کے بطن سے حضرت بندگی میاں سید یوسفؒ اور بندگی میاں سید خوندمیرؒ پیدا ہوئے۔ آپ کی تیسری بیوی نواب عالم خاں میواتی کی دختر نیک اختر بی بی آقا ملکؒ ہیں جن سے حضرت بندگی میاں سید ابراہیمؒ اور بندگی میاں سید محمودؒ ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں کی پیدائش ۹۶۰ھ کے بعد پائی جاتی ہے۔ مذکورہ چھ فرزندوں کے علاوہ دو اور فرزند دو علیحدہ بیویوں سے ہوئے ہیں ایک بندگی میاں سید عالم جو بی بی سارہ بنت میاں زین العابدین عرف ننھے میاں صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ حضرت سید مصطفیؒ سب سے چھوٹے اور آخری فرزند ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ منجھلے صاحبہ بی بی حضرت ملک اسماعیل بن حضرت ملک حمادؒ کی بیٹی ہیں۔

حضرت شاہ یعقوبؓ کو مہدویوں میں ''شجرۃ المرشدین'' سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ ہے کہ کہ اللہ نے آپ کو آٹھ فرزند اور چار دختر عنایت فرمائے۔ ان ہی فرزندان عالی مقام اور دختران ذوات احترام سے اکثر و بیشتر سادات گھرانے اور

صاحبانِ رشد وہدایت وابستہ ہیں۔ جن کا سلسلۂ فیض، صحبت اور سند آج تک جاری وساری ہے۔ حضرت شاہ یعقوبؒ کے ان فرزندوں اور دختروں کو ایک بشارت کی بناء پر ''بنی اسرائیل'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دولت آباد ان دنوں مہدوی امراء ورؤسا کے دوش بدوش فقراء اور صاحبان رشد وہدایت بزرگوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ حضرت میاں سید عبدالکریم نوریؒ اور حضرت میاں وزیر الدینؒ جیسے مہدوی علماء یہاں تشریف فرماتھے۔ حضرت شاہ یعقوبؒ کی آمد جہاں ہزاروں عاشقان مہدیؑ اور جان نثار ان دین کیلئے باعث برکت وسعادت تھی وہیں بعض عاقبت نا اندیش مشائخین کے لئے تکلیف دہ ہوگئی کیوں کہ اس شعلہ دین کے آگے ان کے چراغ ماند پڑ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے دل میں آتش حسد بھڑک اُٹھی۔ شاہ علی نامی ایک شیخ کے بیٹوں نے آپ کے خلاف ایک منصوبہ باندھا۔ اپنے گھر دعوت دی اور پس خوردہ حاصل کرنے کے بہانے سے شربت میں زہر ملادیا اس مشروب کا آپ نے صرف ایک ہی گھونٹ لیا جو ہلاہل ثابت ہوا۔ اس واقعہ کے تین روز کے اندر ہی آپ کی شہادت واقع ہوگئی اس بناء پر آپ کو ''حسن ولایت'' بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت شاہ یعقوبؒ کی سیرت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اکثر وبیشتر فرزندوں کو اپنے سے علیحدہ فرما کر دوسرے بزرگوں کے یہاں تربیت کروائی۔ چنانچہ آپ نے اپنے بڑے فرزند حضرت بندگی میاں سید اشرفؒ کو حضرت بندگی میاں سید شہاب الدین شہاب الحقؒ سے تربیت کروائی۔ اور حضرت بندگی میاں سید اسحاقؒ کو حضرت میاں سید عبدالکریم نوریؒ سے تربیت کروائی۔ اسی طرح فرزند سوم اور چہارم حضرت بندگی میاں سید یوسفؒ اور حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؒ (بنی اسرائیل) حضرت خاتم المرشدین بندگی میاں سید محمود عرف سید نجیؒ کی مشکواۃ فیض سے بہرہ ور ہوئے۔ آپ کے آٹھ فرزندوں میں سے دو یا تین فرزندوں کو آپ سے تربیت دینی حاصل ہے۔ حضرت بندگی میاں سید عالم ساتویں فرزند حضرت خاتم کار بندگی میاں سید نور محمد کے فقیر اور تربیت ہیں۔ سب سے چھوٹے فرزند حضرت بندگی میاں سید مصطفیؒ کی نسبت اختلاف ہے۔ تاریخ سلیمانی میں ہے کہ آپ کو اپنے والدہ ماجد ہی سے واسطۂ دینی رہا ہے۔ لیکن بعض اس سے متفق نہیں ہیں۔

آپکا حظیرہ اور روضۂ مبارک دولت آباد میں ہے۔ حظیرۂ مبارک میں چوکھنڈی کے اندر حضرت شاہ یعقوبؒ کے دونوں بازو دو فرزند آسودہ ہیں۔ سیدھے جانب حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؒ کا مزار مبارک ہے۔ جو حضرت شاہ نصرتؒ اور حضرت شاہ ابراہیمؒ کے پدر بزرگوار ہیں۔ بائیں جانب حضرت بندگی میاں سید اسحاقؒ ہیں جو اسحاقیوں کے جدّ اعلیٰ ہیں۔

حضرت بندگی میاں سید اشرف ؒ

حضرت میاں سید اشرف ؒ بارہ بنی اسرائیل حضرت میراں سید یعقوب ؒ کے فرزند اکبر اور حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت ؓ کی صاحبزادی راجے رقیہ ؒ کے بطن سے ہیں۔ آپ بندگی ملک الہداد کے حضور میں پیدا ہوئے ۹۳۸ھ یا ۹۳۹ھ سن پیدائش ہے۔ آپ کا بچپن حضرت ملک الہداد ؓ کی نظروں میں گذرا ہے آپ حضرت ملک الہداد ؓ کے بہت مقبول اور منظور نظر رہے ہیں۔ حضرت خلیفہ ٔ گروہ ؓ کی رحلت کے وقت آپ کی عمر شریف ۷ یا ۸ سال کی تھی۔ اس عمر میں آپ کو حضرت خلیفہ ٔ گروہ ؓ سے خصوصی سویت ملتی رہی ہے۔

حضرت ملک الہٰداد ؓ کے بعد آپ کی تربیت و تلقین حضرت بندگی میاں سید شہاب الحق ؓ سے رہی ہے۔ حضرت شہاب الحق ؓ کے وصال کے بعد آپ اپنے پدر بزرگوار کی خدمت میں دولت آباد آگئے۔

دولت آباد سے اواخر دسویں یا اوائل گیارھویں صدی ہجری میں آپ نے بیجاپور کی طرف ہجرت فرمائی۔ آپکا آخری دائرہ رائے باغ نواحی بیجاپور میں رہا۔ یہیں پر آپ کا وصال ہوا۔ غالباً ۱۰۰۷ھ آپکا سنہ ٔ وصال ہے۔ اس میں بعض لوگوں کا اختلاف ہے۔

شراب

شراب کو ام الخبائث کہا جاتا ہے۔ یعنی تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ۔ یہ اتنی بُری چیز ہے کہ اس کا عادی نشہ کی حالت میں ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور بہو بیٹی کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ اس قسم کے نشہ میں بدمست رہنے والے اپنا ہر راز دوسروں پر ظاہر کر دیتے ہیں اور سر شام ہی جب ان کو شراب کی طلب ہوتی ہے تو اگر ان کے پاس شراب خریدنے کیلئے پیسے نہ ہوں تو وہ اپنے ماں باپ بھائی بہن اور اپنی بیوی کو بھی قتل کر کے روپیہ حاصل کر لیتے ہیں۔ قرآن میں اس کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ پہلی آیت۔ یسئلونک عن الخمر والمیسر۔۔۔ الخ ہے اس میں صرف اتنا کہا گیا کہ ان کے نفع سے ان کا نقصان زیادہ بڑا ہے۔ پھر دوسری آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَى--- الخ﴿النساء:۴۳﴾ نازل ہوئی اس میں یہ کہا گیا کہ شراب پیئے ہوئے ہوں تو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ تیسری آیت میں کہا گیا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴿المائدة:۹۰﴾ یعنی اے ایمان والو شراب، جوا، بت اور قرعے کی تیر، یہ سب ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔ پس تم ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

پھر اسکے بعد کی آیت میں اللہ نے فرمایا۔ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ﴿المائدة:۹۱﴾ یعنی شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ تم میں عداوت اور بغض ڈال دے شراب اور جوّے کے ذریعہ سے۔ اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ سو کیا تم اب بھی باز نہ آؤ گے۔ مطلب یہ کہ جب آدمی کو نشہ کی حالت میں اپنا ہوش نہیں رہتا تو وہ کب اللہ کی یاد کرے گا اور کس طرح نماز پڑھے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''نشہ'' والی تمام چیزیں حرام ہیں۔ نشہ پینے والوں کو اللہ تعالیٰ ''طينة الخبال'' پلائے گا۔ صحابہؓ نے دریافت کیا ''طينة الخبال'' کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا دوزخیوں کا پسینہ، پیپ اور فضلات جو گڑھے میں جمع ہوں گے (صحیح مسلم)۔

شاہ قاسم مجتہد گروہؒ

حضرت شاہ یعقوب حسن ولایت کے تیسرے فرزند حضرت بندگی میاں سید یوسفؒ کے نور نظر سید نجی خاتم المرشدینؒ کی دختر نیک اختر حضرت بوا صاحبہ بی بی کے لخت جگر اور حضرت خاتم کار بندگی میاں سید نور محمدؒ کے منظور و مبشّر، حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہؒ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپؒ حضرت مہدیؑ کے پوتے کے پوتے اور نواسے کے نواسے ہیں۔

آپؒ کی ولادت ۹۸۹ھ میں علاقہ گجرات (غالباً کھانبیل) میں ہوئی، بچپن کے چھ، سات سال حضرت سید نجی خاتم المرشدینؒ کی نگاہ معرفت نواز میں بسر ہوئے، اسکے بعد اپنے والد ماجد کی صحبت بابرکت میں کوئی تین سال رہے، پدر بزرگوار کے بعد آپؒ حضرت خاتم کارؒ میاں سید نور محمد کی صحبت اقدس میں کوئی چھ سال رہے، جہاں آپ "مجتہد گروہ" کے لقب سے سرفراز ہوئے، آپؒ کی یہ بھی خصوصیت رہی کہ آپ کو نانا یعنی خاتم المرشدین اور ماموں یعنی خاتم کار کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں ان دونوں بزرگوں کی صحبت اقدس سے فیض حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

آپؒ کے والد حضرت بندگی میاں سید یوسفؒ خود صاحب علم و فضل بزرگ تھے "مطلع الولایت" آپ ہی کی تصنیف ہے۔ صاحب تاریخ سلیمانی لکھتے ہیں کہ باہر کے علماء بھی آپ سے اکثر مسائل فقہی حل کرنے کیلئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ آپ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، جو قوم میں دائر وسائر ہیں، مثلاً (۱) مجمع الآیات (۲) خطاب بقوم مہدیؑ (۳) دلیل المتین (۴) اسامی المصدقین (۵) تصدیق الآیات (۶) شفاء المومنین (۷) ماہیت التقلید (۸) میزان العقائد (۹) صلوٰۃ اللیلۃ القدر (۱۰) القسطاس المستقیم (۱۱) تکمیل الایمان (۱۲) معدن الادب (۱۳) صحبت صادقین (۱۴) جامع الاصول (۱۵) محکمات (۱۶) لطمۃ المصدقین (۱۷) فضیلت افضل القوم (۱۸) ام الدلائل (۱۹) نور العیون (۲۰) افضل معجزات المہدی (۲۱) محضر العلماء۔

آپؒ کی ذات منبع دین، سرچشمۂ علم و معرفت ہے، آپؒ کا حظیرہ مشیرہ باد میں مرجع خاص و عام ہے، آپؒ کا آستانہ لاکھوں مہدویوں کا مرکز ارادت و مرجع عقیدت ہے۔ آپؒ کا وصال بروز یک شنبہ ظہر کے وقت ۱۷ محرم الحرام ۱۰۴۳ھ کو ہوا، آپؒ کے جنازہ پر آپؒ کے فرزند حضرت میاں سید یعقوب نے امامت فرمائی۔

شاہ نصرت مخصوص الزماںؒ

حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہ کے بعد حیدر آباد دکن تشریف لانے والی دوسری اہم شخصیت حضرت مخصوص الزماں بندگی میاں شاہ نصرتؒ کی ہے آپ فرزند ہیں حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؒ کے جو حضرت بندگی میاں شاہ یعقوب حسن ولایتؒ کے چوتھے صاحب زادے ہیں حضرت بندگی میاں سید خوندمیر کی پہلی بیوی چاند خاں صاحبہ بی بی بنت ملک دولت شاہ گجراتی کے بطن سے تین فرزند اور دو دختر ہیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد جب میاں سید خوندمیرؒ نے دوسرا نکاح کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپ کے پیر و مرشد حضرت سید نجی خاتم مرشدؒ نے فرمایا "خانجی بھائی۔ تم کار خیر کر لو، پھر فرمایا" اس کار خیر میں مصلحت ایزدی ہے پھر اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ارشاد فرمایا "خداوند تعالیٰ تمہیں مجھ جیسا ایک فرزند عطا کرے گا۔ اس کے دائرے کے رہنے والے مجھے دکھائی دے رہے ہیں۔ پیر و مرشد کے اس ارشاد کے بعد آپ نے دوسرا نکاح ملک شاہ پولادی کی دختر حضرت امۃ الرحیم کے ساتھ فرمایا۔ ان ہی سے حضرت بندگی میاں شاہ نصرتؒ کی ولادت باسعادت ۱۰۰۴ھ میں ہوئی۔ آپ کا مقام مولد دولت آباد ہے اور بعض کے پاس جالور ہے۔ حضرت شاہ نصرتؒ اپنے والد حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؒ کی صحبت اقدس میں تقریباً ۲۰ یا ۲۱ سال رہے۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد حضرت شاہ نصرتؒ نے اپنا واسطہ اپنے عم محترم حضرت بندگی میاں سید یوسفؒ سے قائم فرمایا۔ اسکے دو مہینوں کے بعد ہی جب حضرت بندگی میاں سید یوسف رحلت فرما گئے تو حضرت شاہ نصرتؒ نے حضرت خاتم کارؒ سے علاقہ فرمایا۔ ان دنوں حضرت خاتم کارؒ دھاراسیون (عثمان آباد) میں تشریف رکھتے تھے۔ تو آپ دولت آباد سے دھاراسیون حضرت بندگی میاں سید نور محمد خاتم کارؒ کی صحبت اقدس میں رہنے کی نیت سے آتے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ کوئی چھ سال چلا۔ پیر و مرشد کی دوری آپ پر گراں گذرتی تھی۔ اور آپ بے چین بھی ہو جاتے تھے۔ اکثر و بیشتر خط و کتابت سے احوال معلوم کر لیا کرتے تھے۔ ایک مکتوب میں حضرت شاہ نصرتؒ اپنے پیر و مرشد حضرت بندگی میاں سید نور محمد خاتم کارؒ سے اس طرح مخاطب ہیں۔

"کتا تیرے دوار کا تو تیا ہے میرا ناؤں   دُھت دھت کہے تو باؤلا تُت تُت کہے تو آؤں

یعنی تیرے در کا کتا ہوں۔ تو اگر دھتکارے تو دیوانہ ہو جاؤں اور پچکارے تو نزدیک آؤں۔ اس خط کو دیکھ کر حصرت خاتم کارؒ نے فرمایا "نصرت جی نے میرا دل موہ لیا ہے" جب حضرت میاں سید نور محمد خاتم کارؒ دھاراسیون (عثمان آباد) سے ہجرت فرما کر منچیپہ کی سمت چلے تو آپ کی ڈولی لے چلنے والے خلفاء میں حضرت بندگی میاں سید عالمؒ (فرزند حضرت شاہ یعقوب حسن ولایتؒ) حضرت بندگی میاں شاہ قاسم مجتہد گروہ (بھانجے) حضرت بندگی میاں شاہ نصرت مخصوص الزماںؒ (خلیفے) حضرت

میاں سید زین العابدینؒ (داماد) وغیر ھم تھے۔

حضرت خاتم کار کے وصال کے بعد آپ دولت آباد واپس آگئے۔ لیکن وہاں کے سیاسی حالات بدل جانے کی وجہ سے پہلے حضرت شاہ قاسمؒ پھر شاہ نصرتؒ وہاں سے ہٹ گئے۔ پھر آپ روسہ، یلگندل (کریم نگر) مرکوک، دائرہ چیلا ساگر ہوتے ہوئے لال گڑھی کے قریب علی آباد تشریف لائے۔ یہیں پر آپ کی والدہ محترمہ حضرت بی بی امتہ الرحیم نے رحلت فرمائی۔ اس موقع پر آپ نے موضع لال گڑھی میں تھوڑی سی زمین خرید کر والدہ ماجدہ کی تدفین فرمائی۔ یہی وہ مقام ہے جس کو آپ نے اپنے لئے بھی پسند فرمایا۔ علی آباد سے آپ گولکنڈہ تشریف لے آئے۔ پھر رود موسیٰ کے کنارے ٹونہ گوڑہ نامی موضع میں کچھ دن آپ کا دائرہ رہا۔ آخرش موضع چنچلم کی زمین پسند آئی اس خطہ اراضی کو آپ کی ذات تقدس مآب کی رہائش کی عزت برسوں تک حاصل رہی۔ روایت ہے کہ سلطان عبد اللہ قطب شاہ نے موضع چنچلم میں ایک وسیع رقبہ دائرہ کے لئے نذر کیا تھا۔ یہی دائرہ چنچل گوڑہ کے نام سے موسوم ہوا اور آج تک بھی اسی نام سے مشہور و معروف ہے۔ آپ کی رحلت ۲۹/ صفر ۱۰۷۹ھ کو دائرۂ چنچل گوڑہ میں ہوئی اور حسبِ وصیت آپکا جسد اطہر حظیرۂ لال گڑھی لے جایا گیا جہاں پر آپ کی والدہ ماجدہ آسودہ ہیں۔

آپ کا حظیرہ مبارک قوم میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے یعنی اسکو لال گڑھی بھی کہتے ہیں اور کلسنور اور گلسگور بھی۔ حضرت شاہ نصرتؒ کے وصال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت سید نجی خاتم المرشدینؓ کے مبشر ہیں آپ کی ایک آنکھ میں کلمہ اور دوسری آنکھ میں تسبیح تھی اسکو تشبیہ کہئے یا اور۔ حضرت مجتھد گروہؒ کے وصال کے بعد کوئی ۳۵ سال تک آپ بقید حیات رہے۔ چونکہ اس وقت کے زمانے کی بلند پایہ بے مثال شخصیت آپ ہی کی تھی اس لئے آپ کو حین حیات ہی مخصوص الزماں کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

آپ کے خلفاء میں حضرت میاں سید ابراہیمؒ (سلطان حظیرہ بسیط پورہ) حضرت میاں سید نجم الدین (برادرزادہ حضرت شاہ نصرتؒ) حضرت میاں سید میراں جیؒ حضرت بڑے شاہ میاں صاحب خاندان ید اللہی کے جد اعلیٰ، حضرت میاں سید یٰسینؒ میاں سید عبد الرشید سجاوندیؒ مصنف رسالۂ رونق المتقین میاں سید روح اللہ جیسے بزرگ تھے۔

شاہ ابرہیمؒ

۱۰۱۴ھ تا ۱۰۸۹ھ: آپ حضرت شاہ یعقوب حسن ولایتؒ کے پوتے اور بندگی میاں سید خوندمیر (بارہ بنی اسرائیل) کے چوتھے فرزند ہیں اور حضرت شاہ نصرت مخصوص الزمانؒ کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ کا مولد دولت آباد شریف ہے۔ آپ ابھی گیارہ سال کے تھے کہ پدر بزگوار کی رحلت ہوگئی۔ آپ کی پرورش والدہ محترمہ بی بی امتہ الرحیم اور بڑے بھائی حضرت شاہ نصرتؒ کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ حصرت شاہ نصرتؒ سے دس سال چھوٹے ہیں۔

آپ حضرت بندگی میاں سید علی ستون دینؒ (فرزند حضرت سید نجی خاتم المرشدینؒ) کے تربیت ہیں۔ اور حضرت سید نور محمد خاتم کارؒ سے بھی آپ کو فیضان صحبت رہا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حضرت سید نور محمد خاتم کارؒ لیٹے ہوئے تھے اور شاہ ابراہیمؒ آپ کے پاؤں دبارہے تھے حضرت خاتم کار نے آپ سے پوچھا باواصاحب (یہ آپ کی عرفیت تھی) تجھکو کیا چاہئے۔ جواباً حضرت شاہ ابراہیمؒ نے فرمایا "خوندکار مجھے جنت چاہئے" اس پر حضرت خاتم کار مسکرا اُٹھے اور یوں فرمایا ارے بچے جنت کیا مانگتا ہے جنت والے کو مانگ تاکہ تو دوسروں کو جنت دلا سکے" یہ تھی بچوں کی تربیت ذہنی۔

آپ اپنے بڑے بھائی کے فقیر ہیں۔ حضرت شاہ نصرتؒ کے خلفائے گرامی میں آپ کو مخصوص مقام ورتبہ حاصل ہے۔ آپ کا آستانہ مبارک انوار الٰہی سے درخشاں وتاباں ہے۔ اور متلاشیان حق ومعرفت کے لئے بارگاہ فیض وکرم ہر دم کھلا ہوا ہے۔ گرنہ بیند بروز شپرہ چشم، چشمہ آفتاب راچہ گناہ۔

کہتے ہیں کہ آپ کی ہر نماز دیدار الٰہی کے ساتھ ہوتی تھی۔ آپ اپنے دور کے قطب الاقطاب تھے۔ حضرت بندگی میاں شہ ابراہیمؒ کی اولاد نرینہ سے کوئی نہیں ہے۔ البتہ آپ کی آل کا سلسلہ چل رہا ہے۔ رود موسیٰ کے کنارے آپ کا آستانہ مبارک بڑا پر کیف اور سہانا ہے۔ یہاں قلب کو سکون ملتا ہے اور روح کو اطمینان۔

(نوٹ) ان بزرگوں کے حالات تاریخ سلیمانی اور دکن میں مہدوی بزرگوں کی آمد، ایک تاریخی جائزہ از حضرت سید عبدالکریم اسحاقیؒ سے مأخوذ ہیں)

<u>نوٹ: بندگی شاہ دلاورؓ کے بعد یہ تذکرے لکھیں</u>

(۲) بندگی ملک برہان الدین: احمد آباد میں صاحب منصب صاحب علم وفضل تھے۔ حضرت مہدیؑ کا بیان سنکر مرید ہوگئے۔ مہدیؑ نے آپ کو اپنی دامادی سے ممتاز فرمایا۔ آپ کا سال وفات ۹۱۵ھ ہے اور مدفن اچیڑ موتیڑہ ہے جو احمد آباد سے

تین میل شمال مشرق میں ہے۔

(۷) بندگی ملک گوہر: آپ بادشاہ بنگالہ کے خزانہ دار تھے اور بروایتے بادشاہ گجرات کے وزیروں میں تھے۔ پھر سلطان غیاث الدین بادشاہ مانڈو کی ملازمت اختیار کی۔ چند روز میں مقرب امراء میں شمار ہونے لگا بادشاہ سے اجازت لیکر حج کے لئے روانہ ہوئے گجرات میں اتفاقا ایک روز مہدیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیان سنا ترک دنیا کر کے ساتھ ہو گئے ۹۱۴ھ میں شہر ٹھٹھ میں وفات پائی۔

(۸) بندگی ملک جی حاکم ناگور: آپ مغل قوم سے تھے۔ جب حضرت مہدیؑ ناگور تشریف لائے تو ملک چونکہ خود عالم تھے، علماء کی ایک جماعت کے ساتھ مباحثہ کے لئے آئے۔ مہدیؑ نے آپ کے آتے ہی آپ کو شہزادۂ لاہوت فرمایا۔ یہ سن کر آپ بے اختیار ہو گئے اور ہوشیار ہونے پر تصدیق سے مشرف ہو گئے۔ ترکِ دنیا کر کے اہل و عیال کے ساتھ حضرت مہدیؑ کے ہم سفر ہو گئے۔ برہان نظام الملک کے زمانے میں دکن تشریف لائے۔ آپ شیخ فرید شکر گنجؒ کی اولاد سے ہیں دہلی میں سجادہ تھے امراء اور حکام ان کے مرید تھے۔ آپ بڑے متقی اور پرہیز گار تھے. آپ کا دائرہ مین پورا احمد آباد میں تھا ۹۱۸ھ یا ۹۱۹ھ میں سلطان مظفر کے زمانے میں شہید کر دئے گئے۔

(۱۰) بندگی ملک معرفؒ بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہد حامل بار امانتؓ کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ آپ صاحب جاد و منصب تھے ہشن میں بیان قرآن سن کر مہدوی ہو گئے۔ پھر اپنے گھر کی صورت نہ دیکھی آپ کے ساتھ آپکے بھائی ملک برہان الدین نے بھی مہدوی مذہب اختیار کیا تھا۔ اسکے چھ ماہ بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ نے آکر ملنے کے لئے انہیں خط لکھا تو آپ نے جواب دیا کہ جس طرح برہان الدین آپ کے حق میں مر گیا اسی طرح معروف بھی مر گیا۔

(۱۱) بندگی میاں یوسفؒ: احمد آباد کے اعیان اور علماء میں سے تھے۔ احمد آباد ہی میں تصدیق مہدی سے مشرف ہوئے خراسان سفر میں سخت تکلیف برداشت کی لیکن چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔ نواح احمد آباد میں چندولہ تالاب پر آپ کا مدفن ہے۔

(۱۲) بندگی شاہ امین محمدؒ: آپ حضرت بندگی شاہ عبدالمجید نوریؒ کے بھائی ہیں گجرات میں اپنے بھائی کے ساتھ دین مہدی کی تصدیق کی مہدیؑ کی رحلت کے بعد بہت سارا ملک پھرے۔ اور مہدوی مذہب کی تبلیغ کی۔ آپ کا بیان قرآن سنکر ہزاروں لوگ تصدیق مہدیؑ سے مشرف ہو گئے دولت آباد (دکن) ۹۳۰ھ میں وفات پائی۔

شب براءت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا۔ حم وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ﴿الدخان:۱تا۵﴾ حم۔ یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں نازل فرمایا ہم ہی نازل کرنے والے ہیں جس میں ہر حکمت والا فیصلہ ہمارے حکم سے تقسیم کیا جاتا ہے ہم ہی بھیجنے والے ہیں۔

مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس رات سے مراد شعبان کی پندرھویں شب ہے جس میں اللہ کی جانب سے آئندہ سال کے لئے بندوں کے حق میں اہم فیصلے، ان کی عمر، ان کے رزق، ان کی سعادت و شقاوت وغیرہ کے تعلق سے کئے جاکر متعلقہ فرشتوں کے حوالے کر دئے جاتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے شعبان کے مہینے کے تعلق سے فرمایا۔

الشعبان شهري و رمضان شهر امتي۔ شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان میری اُمت کا مہینہ ہے۔

شعبان هو المكفر و رمضان هو المطهّر۔ شعبان کا مہینہ کفارہ کا ہے اور رمضان کا مہینہ پاک کرنے والا ہے۔

وعن أُسَامة بن زيدٍ قال قلت يا رسول الله رأيتُك تصوم من شعبان صوماً لا تصومه في شيءٍ من الشهور إلّا في شهر رمضان قال ذلك شهرٌ يغفل عنه الناس بين رجبَ و رمضان - ترفعُ فيه اعمال الناس فأُحبّ اَن يرفع عملي و انا صائمٌ۔ حضرت اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ آپ شعبان کے مہینے میں اتنے روزے رکھتے ہیں جتنے کسی اور مہینے میں سوائے رمضان کے نہیں رکھتے۔ آپ نے فرمایا یہ وہ مہینہ ہے جو رجب اور رمضان کے درمیان ہے لوگ اس سے غافل ہیں اسی مہینے میں انسانوں کے اعمال اللہ کے پاس پیش کئے جاتے ہیں۔ تو میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال اللہ کے پاس پیش ہوں تو میں روزے کی حالت میں رہوں۔

وعن النبي ﷺ فضل رجب على سائر الشهور كفضل القرآن على سائر الكلام و فضل شعبان على سائرا لشهور كفضلي على سائر الانبياء و فضل رمضان على سائر الشهور كفضل الله على خلقه۔ نیز آنحضرتؐ نے فرمایا رجب کے مہینے کی فضیلت تمام مہینوں پر ایسی ہے جیسی قرآن کی فضیلت دیگر کلاموں پر ہے اور شعبان کی فضیلت دیگر مہینوں پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تمام انبیاء پر ہے اور رمضان کی فضیلت تمام مہینوں پر ایسی ہے جیسی اللہ کی فضیلت اسکی تمام مخلوق پر ہے۔

وعن ابی هریرة عن النبي ﷺ قال جاءنی جبرئیل لیلة النصف من شعبان و قال یا محمد ارفعْ رأسك الی السّماءِ قلت ما هذه اللّیلة قال هذه لیلةٌ یفتح الله فیها ثلاثِ مأة باب من ابواب الرحمة یغفر اللهُ لجمیع من لایشرك به شیاءً إلّا ان یکون ساحراً او کاهناً او مُصِرّا علی الزنا او مدَمِنْ الخمر۔ حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ میرے پاس نصف شعبان کی رات کو آئے اور کہا اے محمد اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایئے، میں نے پوچھا یہ کونسی رات ہے کہا یہ وہ رات ہے جس میں اللہ رحمت کے تین سو دروازے کھولتا ہے اللہ ان سب کو بخشتا ہے جو اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتے سوائے جادو گر، کاہن، زنا پر اصرار کرنے والے اور شرابی کے۔

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ شعبان کی پندرھویں رات کو اپنی تمام تر رحمتوں کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے، ''ہے کوئی بخشش چاہنے والا؟ کہ میں اسکو بخشدوں۔ ہے کوئی روزی طلب کرنے والا؟ کہ میں اُسے روزی دوں۔ ہے کوئی مریض جو دعا کرے؟ تو اس کو صحت دوں اور عافیت دوں۔ ہے کوئی ایسا ہے کوئی ویسا یہ معاملہ صبح تک جاری رہتا ہے''۔

لوگو! ہم نے دیکھا ہے کہ بھیک مانگنے والے، دینے والے کے گھر پر جاکر بھیک مانگتے ہیں۔ پھر بھی کوئی دیتا ہے اور کوئی نہیں دیتا۔ لیکن اس رات میں آقا خود اپنے غلاموں، اپنے بھکاریوں بلکہ مجرموں کو آواز دیتا ہے، یہ اس کی شان کریمی ہے کتنے بد بخت ہوں گے وہ لوگ جو ایسے سنہرے موقع سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ بلکہ آتش بازیوں اور کھیل کود میں مصروف رہ کر رات جاگتے ہیں اور پھر غافل نیند سو جاتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس رات میں گنہ گاروں اور مجرموں کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہوں پھر سجدے میں گر کر اپنے مالک حقیقی سے مغفرت طلب کریں رزق وروزی مانگیں۔ صحت و عافیت طلب کریں۔ سعادت کی درخواست کریں۔ نیز اس رات میں اپنے ساتھ ساتھ جو لوگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ان کے لئے بھی مغفرت کی دعا کریں۔ کیونکہ رسول مقبول ﷺ نے اس رات میں جنت البقیع اور (یا) شھداء احد کی زیارت کی ہے۔ نیز پندرھویں شعبان کا روزہ بھی رکھا جاسکتا ہے۔

شہوت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿النازعات:۴۰،۴۱﴾ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا پس تحقیق اس کے لئے جنت ٹھکانہ ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ وامّا المهلكات فهوىٰ متبَعٌ و شحٌّ مطاعٌ واعجاب المرء بنفسه وهى اشدّهن۔ پس مہلکات سوءوہ خواہش ہے جسکی پیروی کی جائے اور بخل ہے جسکی اطاعت کی جائے اور آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا اور یہ سب سے بڑھ کر ہے۔

شہوت جس کے معنی خواہش نفسانی کے ہیں اسکے کئی درجے ہیں۔ اس کا سب سے اعلیٰ درجہ تو شرک و کفر کا ہے۔ جو خارج از اسلام ہے۔ اس کا ایک درجہ بدعت کہلاتا ہے جو علوم اور عقائد کے تعلق سے بگاڑ اور نئی چیزیں پیدا کرتا ہے اور دوسرا درجہ اعمال میں سے متعلق ہو کر انسان کو شریعت مطہرہ کے خلاف معاصی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ بات تو یاد رکھنے کی ہے کہ ہر ''هَوَىٰ''(خواہش نفسانی) انسان کو صراط مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ﴿ص:۲۶﴾۔ اور خواہش نفسانی کا اتباع مت کر کیونکہ یہ تم کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دے گی۔

باہوا وآرزو کم باش دوست	چوں يُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ اوست
تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست	چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست
تازہ کن ایماں نہ از گفت زباں	اے ہوا را تازہ کردہ، در نہاں

اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی تو انسان کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھنا ہے۔ اور اس پر عمل کرنا ہے۔ آج کل کے بعض عاقبت نااندیش لوگ جو تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے ہیں اور سمجھ کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے تو حضورؐ کا یہ فرمان سَوْطَ العَذَاب ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ عقل کو ہی اپنا رہنما بنا کر شریعت کا راستہ طے کرنے کی کوشش میں اپنا سر لال کر رہے ہیں۔ حالانکہ اگر عقل کے مطابق ہی چلنے کی بات ہوتی تو شرع کو نازل اور واضح کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ بعض لوگ اپنی عقل میں اسقدر سڑ گئے ہیں کہ شریعت کی باتوں اور اس کے احکام کو بھی اپنی ناکارہ بوسیدہ بلکہ بعض اوقات دوسروں کی مستعار عقل کے ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور صریح گمراہی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکانے اور بہکانے کی خدمت اپنے مردود ازلی استاد کی پیروی میں کرتے ہیں۔ اللہ ان سے ہم کو بچائے۔ وہ

ارشاد گرامی یہ ہے۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبعاً لِمَا جِئتُ بِهِ۔ کوئی شخص مسلمان نہیں ہو تا جب تک کہ اسکی خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جائے جس کو میں لایا ہوں۔ پس انسان کو چاہئے کہ وہ اتنا سمجھ لے کہ صرف کلمہ پڑھنے سے مسلمان نہیں بن جاتا، بلکہ اپنی خواہش کو شریعت کی دہلیز پر جھکانے سے بنتا ہے اس کا مطلب ہرگز یہ بھی نہیں ہے کہ فطری خواہشات کو ختم کر دیا جائے۔ فطری اور طبعی خواہشات کی تکمیل بھی انسان کی ذمہ داری ہے مگر احکام شرع کے تحت۔ احکام شرعیہ سے حدود سے متجاوز ہو کر جو خواہش پوری کیجائے گی وہ حرام ہو گی۔ اسکو خواہش کی تکمیل نہیں بلکہ "شہوت رانی" کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

کھانا، پینا اور جنسی خواہش تو فطری تقاضہ ہے۔ اللہ نے فرمایا كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ﴿الأعراف:۳۱﴾۔ یعنی کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو۔ عورتوں کی خواہش کے بارے میں چار بیویوں کی اجازت بھی دی ہے تو "عدل" کی شرط کے ساتھ۔ ورنہ "واحدة" کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے۔

شہید

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے۔وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَـٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ﴿البقرۃ:۱۵۴﴾۔اور ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں مارے جائیں تم مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔اس آیت شریفہ سے ثابت ہے کہ اللہ کے راستے میں قتل ہو جانے والے شہید کہلاتے ہیں، بظاہر ہماری نظروں میں وہ میت ہیں، مگر وہ اللہ کی نظر میں زندہ ہیں، لیکن عوام میں اتنا شعور نہیں ہے کہ ان کی زندگی کو سمجھ سکے۔

شہید اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ کے راستے میں کافروں سے جہاد کرتے ہوئے میدان جنگ میں مارا جائے۔یا کسی معرکہ (میدان جنگ میں) اسکی لاش پائی جائے اور اس پر آثار جراحت (زخموں کے نشان) ہوں۔یہ حقیقی شہید ہیں۔اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو نہ کفنایا جائے البتہ اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کو دفن کر دیا جائے۔شہید کو غسل دینے کی ضرورت نہیں ہے، حتیٰ کہ اس کے بدن پر لگے ہوئے خون کو بھی دھویا نہ جائے اور نہ اس کے کپڑے نکالے جائیں، البتہ اس کے بدن پر جو آلات حرب، زائد لباس، جوتے وغیرہ ہوں تو ان کو نکال لیا جائے۔

اور کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان نے ناحق قتل کیا ہو تو وہ بھی شہید کے حکم میں ہے، لیکن اسکو غسلایا جائے گا، لیکن بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اسکو بھی غسل نہیں دیا جائیگا۔

لیکن اگر کوئی ایسا ہو کہ میدان جنگ میں زیادہ زخمی ہو گیا ہو پھر وہ کھایا، یا پیا اور اسکو میدان جنگ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا اور وہ زندہ ہی رہا یہاں تک کہ اس پر ایک نماز کا وقت گذر گیا اس حال میں کہ وہ ہوش و حواس میں رہا تو اس کو غسل دیا جائے گا، اسکو "مُرتث" کہتے ہیں، لیکن اگر کوئی باغی ہو یا لٹیرا ہو تو اس پر نماز نہیں پڑھی جائے گی۔

شہید کو صرف غسل نہیں دیا جائیگا باقی احکام میت اس پر جاری ہوں گے یعنی اسکی میراث تقسیم کی جائیگی، اسکی بیوی پر عدت جاری ہو گی، اسکا چوتھا، دسواں، بیسواں اور چہلم کیا جائیگا، اسی طرح برسی اور عرس بھی ہو گا۔

شہید کو غسل کیوں نہیں دیا جاتا اسکو ابوالکلام آزاد نے اپنی گرانقدر تصنیف "تذکرہ" میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے اس عظیم اور جرأت مندانہ عمل کا نقشہ اپنی پر اثر زبان میں بیان کیا ہے۔جب آپ کو "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" کہنے کی وجہ سے اس وقت کے تین بادشاہوں نے علماء سو کے ورغلانے پر اذیت کا شکار بنایا تھا اور آپ کی پیٹھ پر مسلسل کوڑے

برسائے جارہے تھے، اور کہا جارہا تھا کہ آپ اس عقیدہ سے باز آجائیں تو گلو خلاصی ہوگی۔ لیکن اما احمد بن حنبلؒ برابر ان تکلیفوں کو سہ رہے تھے۔ مگر نا حق کلمہ انکی زبان کہنے کیلئے تیار نہیں تھی، علماء سو نے کئی دلیلیں دیں، مگر حضرت امام احمدؒ ایک ہی بات کہتے تھے کہ "**اعطوني شيئاً من كتاب الله و سنة رسولهﷺ حتىٰ اقول به**"یعنی مجھے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے کوئی دلیل پیش کرو تو میں وہ بات کہوں گا جو تم کہہ رہے ہو۔" حالانکہ امام احمد بن حنبلؒ قید میں تھے، اور صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا۔ تو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے، یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چور ہوگئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہوگیا۔ خود کہتے ہیں کہ جب ہوش آیا تو چند آدمی پانی لائے اور کہا کہ پی لو مگر میں نے انکار کر دیا کہ روزہ توڑ نہیں سکتا، وہاں سے مجھ کو اسحاق بن ابراہیم کے مکان میں لیگئے، ظہر کی نماز کا وقت آگیا تھا، ابن سماعہ نے امامت کی اور میں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ابن سماعہ نے کہا، تم نے نماز پڑھی، حالانکہ خون تمہارے کپڑوں پر بہ رہا ہے۔ یعنی دم جاری و کثیر کے بعد طہارت کہاں رہی۔ میں نے جواب دیا "**قد صلى عمر و جرحه يثعب دماً**" (یعنی حضرت عمرؓ نے نماز پڑھی جبکہ ان کے زخم سے خون بہ رہا تھا) ھاں میں نے وہی کیا جو حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے اور قاتل نے زخمی کیا مگر اسی حالت میں انہوں نے نماز پوری کی۔

ابن سماعہ کے جواب میں حضرت امام احمدؒ نے حضرت عمرؓ کی جو نظیر پیش کی تو یہ ان کی تشفی کیلئے کافی تھی، مگر میں کہتا ہوں کہ جو خون اسوقت امام احمد بن حنبلؒ کے زخموں سے بہ رہا تھا اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہو سکتی تو پھر دنیا میں اور کونسی چیز ایسی ہے جو انسان کو پاک کر سکتی ہے اور کونسا پانی ہے جو طاہر اور مطہر ہو سکتا ہے، اگر یہ ناپاک ہے تو دنیا کی تمام پاکیاں اس ناپاکی پر قربان اور دنیا کی ساری طہارتیں اس پر نچھاور، یہ کیا بات ہے کہ پاک سے پاک اور مقدس سے مقدس انسان کی میت کیلئے غسل ضروری ٹھہرا "**اغسلوا بماءٍ و سدرٍ و كفنوه في ثوبين**" (بخاری) مگر شہیدان حق کیلئے یہ بات ہوئی کہ ان کی پاکی شرمندۂ آب غسل نہیں، بلکہ ان کے خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کو بھی ان سے الگ نہ کیجئے۔ "**يدفنوا في ثيابهم و دمائهم**" اور اسی لباس گلگوں اور خلعت رنگیں میں وہاں جانے دیجئے، جہاں انکا انتظار کیا جارہا ہے اور جہاں خون عشق کے دھبوں سے بڑھ کر شاید کوئی اور نقش و نگار عمل مقبول اور محبوب نہیں۔ **عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ** ﴿آل عمران: ۱۶۹، ۱۷۰﴾۔ اللہ اللہ۔ یہاں طہارت جسم و لباس کا کیا سوال ہے؟ امام احمد بن حنبلؒ نے تمام عمر میں اگر کوئی پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی تو یقیناً وہ ظہر کی نماز تھی۔ ان کی تمام عمر کی نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئی تھیں اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جسکو راہ حق کے ثبات میں بہنے والے خون سے مقدس و مطہر کر دیا تھا، سبحان

اللہ جس کے عشق میں چار چار بو جھل بیڑیاں پاؤں میں پہن لی تھیں، جسکی خاطر سارا جسم زخموں سے چور اور خون سے رنگین ہو رہا تھا، اسی کے آگے جبین نیاز جھکی ہوئی، اسی کے ذکر میں قلب ولسان لذت یاب تسبیح وتحمید، اسی کے جلوۂ جمال میں چشم شوق وقف نظارہ و دید اور اسی کی یاد میں روح مضطر محو و سرشار عشق و خود فراموشی۔ (تذکرہ، ص۱۲۲، ۱۲۳۔ البلاغ، پریس کلکتہ)

شعائر

شعائر کی معنی "نشانیاں" ہیں، شعائر اللہ کے معنی "اللہ کی نشانیاں"۔ شعائر کا لفظ قرآن شریف میں چار مقامات پر آیا ہے

(۱)إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿بقرہ:۱۵۸﴾ صفاومروہ (کی پہاڑیاں) اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر ان دونوں کا طواف کرنے میں کچھ گناہ نہیں اور جو کوئی نیک کام کرے، تو اللہ قدر شناس اور دانا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بتلایا جارہا ہے کہ صفا اور مروہ جو اللہ کے شعائر میں داخل ہیں ان میں سعی کرنا حج اور عمرہ میں ضروری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل اللہ کے صابر بندوں حضرت ھاجرہ اور انکے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ کے آثار میں سے ہے، صفا اور مروہ مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں۔ اہل عرب حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے ہمیشہ کعبۃ اللہ کا حج کرتے، تو ان دونوں پہاڑیوں کا بھی طواف کرتے تھے، بعد میں کفر وشرک کے زمانے میں ان دونوں پہاڑیوں پر کفار نے دو بت رکھدیئے، ان کی تعظیم کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ، یہ طواف ان کی تعظیم کیلئے تھا۔ اور جب لوگ مسلمان ہوگئے اور بت پرستی سے تائب ہوگئے، تو خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو ان بتوں کی تعظیم کیلئے تھا، جب بتوں کی تعظیم حرام ہوگئی تو صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیئے۔ یہ ان کو معلوم نہ تھا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو اصل میں حج کیلئے تھا۔ بعد میں کفار نے اپنی جہالت سے وہاں بت رکھ چھوڑے تھے۔ انصار مدینہ چونکہ کفر کے زمانے میں بھی صفا اور مروہ کے طواف کو برا جانتے تھے تو اسلام کے بعد بھی ان کو اس طواف میں خلجان ہوگیا، اور آپؐ سے عرض کیا کہ ہم پہلے سے اس کو مذموم جانتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور فریق اول وثانی دونوں کو بتلادیا گیا کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کوئی گناہ یا خرابی نہیں ہے۔ یہ تو اصل میں اللہ کی نشانیاں ہیں، ان کا طواف (سعی) کرنا چاہیئے۔

(۲)يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴿المائدہ:۲﴾ اے ایمان والو۔ بے حرمتی نہ کرو اللہ کے نشانیوں کی اور نہ عزت والے مہینہ کی اور نہ قربانی کے جانور کی اور ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹّے باندھے ہوئے ہوں اور نہ ان لوگوں کی جو اپنے پروردگار کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہو کر عزت والے گھر (کعبہ) کا ارادہ کرنے والے ہیں۔ کیونکہ کافروں نے مسلمانوں کو حج سے روک دیا تھا تو بعض مسلمان یہ سوچ رہے تھے کہ جوابًا ہم بھی ان کو حج سے روک دیں۔ اور بزمانۂ حج ان کے قافلوں پر

چھاپے ماریں تو اللہ نے اسپر روک لگادی، کہ اگر وہ برا کام کر رہے ہیں تو تم کو ویسا ہی برا کام نہیں کرنا چاہیئے۔ ضابطہ کے طور پر اللہ نے یہ فرمایا کہ "کسی بھی نیکی اور تقویٰ کے کام میں مدد کرنی چاہیئے اور برائی اور زیادتی کے کام میں مدد نہیں کرنی چاہیئے، اگر انھوں نے تم کو حج سے روکا اور تم نے بھی ان کو حج سے روکا تو دونوں برابر ہو جائیں گے، تم کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے۔

(۳) وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّـهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴿حج:۳۲﴾ اور جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے تو وہ دل کی پرہیز گاری کی بات ہے۔

اللہ کے شعائر قربانی کے جانور ہیں، یا وہ چھ چیزیں ہیں (۱) صفا و مروہ (۲) قربانی کے جانور (۳) کنکریاں مارنے کی جگہ (۴) مسجد حرام (۵) عرفات کا میدان (۶) رکن۔ اس سے مراد رکن یمانی ہے اور وہ رکن جس میں حجر اسود ہے۔

یہ بتانا مقصود ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم شرک میں داخل نہیں ہیں، جس کے دل میں پرہیز گاری اور خدائے واحد کا ڈر ہو گا وہ اس کے نام سے لگی چیزوں کا ادب ضرور کریگا۔ بلکہ عین توحید کے آثار ہیں یہ ادب کرنا۔ کیونکہ خدا کا عاشق ہر اس چیز کی قدر اور ادب کرتا ہے۔ جو بالخصوص اس کی طرف منسوب ہو جائے۔

(۴) وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّـهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ﴿حج:۳۶﴾ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لئے اللہ کی نشانیاں بنائی ہیں، ان میں تمہارے لئے بھلائی ہے۔ اللہ کی نیاز کے طور پر مواشی (اونٹ، گائے، بیل، بکری) قربان کرنا ہر دین سماوی میں عبادت ہے۔ اگر یہ عبادت غیر اللہ کے نام سے کی جائے تو شرک ہو جائے گا۔ (ماخوذ از القرآن الکریم۔ ترجمہ جناب محمود الحسن صاحب اور تفسیر جناب شبیر احمد صاحب عثمانی)۔

شاعری

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ ﴿یس:٦٩﴾۔ اور ہم نے اس کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ وہ چیز اس کیلئے شایاں ہے۔

آنحضرت ﷺ کو اللہ نے شاعر نہیں بنایا۔ حالانکہ اس وقت عرب بھر میں عموماً اور قریش میں خصوصاً لونڈیاں تک شعر کہتی تھی۔ لیکن اللہ نے آپؐ میں شاعری کا چسکہ عطا نہیں فرمایا، اسلئے کے اگر آپؐ شاعر ہوتے اور بعد میں قرآن سناتے تو لوگ کہہ سکتے تھے کہ شاعری سے ترقی کر کے اب نبوت تک پہنچ گئے ہیں۔ شاعری کا کمال الفاظ کی موزونیت، تخیل، محاکات، نکتہ آفرینی، بلند خیالی اور مبالغہ آمیزی ہے، جس کی وجہ سے وقتی طور پر احساسات میں جوش و گرمی پیدا ہوتی ہے اور پھر صبح میں وہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ اسی زود اثری کی وجہ سے شاعری اور خطابت کو جادوگری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، قرآن میں چونکہ غیر معمولی تاثیر ہے اسلئے لوگوں نے اس کو بھی شعر کے نام سے یاد کیا تھا، حالانکہ نہ اس میں مبالغہ ہے اور نہ دروغ گوئی جو شاعری کی جان ہوتی ہے۔ قرآن میں ازلی حقیقتوں اور ابدی صداقتوں سے بحث کی گئی ہے اور لوگوں کو برائیوں سے بچا کر نیک اعمال کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کتاب کا شاعری کے دیوان سے کیا مقابلہ۔ اگر دنیا بھر کے شاعر جمع ہو کر بھی اس کا مقابلہ کرنے کی عمر بھر کوشش کریں تو اسکی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ اور پھر تاثیر کا یہ حال کے زندگی بھر انسان کے دل میں جاگزیں اور دماغوں پر حاوی اور بھاری۔

آنحضرت ﷺ خود تو شعر کیا کہتے، دوسروں کے اشعار بھی آپؐ کو برابر یاد نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شاعر کا مصرع اس طرح دہرایا ”كفى بالشيب و الاسلام للمرأ ناهياً“ تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا ”میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں شاعر کا مصرع ایسا نہیں، جیسا کہ آپؐ نے پڑھا، بلکہ صحیح مصرع اس طرح ہے ”كَفىٰ بِالإِسْلَامِ وَ الشيب للمرا ناهياً“۔ یعنی اسلام اور بڑھاپا (کسی غلط کام کو) روکنے کیلئے کافی ہیں۔

اسی طرح ایک اور موقع پر آپؐ نے یہ مصرع پڑھا ”وَ يَاتِيكَ مَن لَم تَزود بِالأخبار“ تو پھر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا ”یا رسول اللہ مصرع ایسا نہیں ہے بلکہ یوں ہے ”و ياتيك بالاخبار من لم تزود“۔

ہاں کبھی کبھی آپؐ کی زبان مبارک سے جوش و جذبہ کے عالم میں مسجع الفاظ نکل گئے ہیں۔ چناچہ جب ایک غزوہ میں آپؐ کی انگلی زخمی ہو گئی، تو آپ نے فرمایا ”هل انت الا اصبع دميت وفي سبيل الله ما لقيت“۔ یعنی تو، تو ایک انگلی ہے جو

خون آلود ہو گئی ہے اور تجھے جو کچھ ملا ہے اللہ کے راستے میں ملا ہے، نیز غزوہ حنین میں آپؐ نے فرمایا۔انا النبي لا كذب - انا بن عبد المطلب یعنی میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں، میں عبد المطّلب کا بیٹا ہوں۔

اسی طرح غزوہ خندق کے موقع پر فرمایا:اللهم ان العيش عيش الآخرة، فاكرم الانصار و المهاجرة یعنی اے اللہ حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، پس تو انصار اور مہاجرین کو نواز دے۔ چونکہ یہ سب بغیر ارادہ کے نکلے ہیں تو انکو اشعار نہیں کہا جا سکتا۔

شان تجلّی

اللہ تعالیٰ کا سورۂ الرحمان میں ارشاد ہے۔ "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَـــأْنٍ ﴿الرحمن:۲۹﴾"۔ ہر روز اسکی ایک نئ شان ہے۔ یہودیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہفتہ کے دن کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔(بلکہ وہ دن اس کے آرام کا دن ہے) اللہ جواب دیتا ہے کہ ہر روز اسکی کئی شانیں ہیں، مثلاً وہی مارتا ہے۔ وہی جلاتا ہے۔ وہی ہے جو عزت دیتا ہے اور ذلت دیتا ہے۔ وہی ہے جو مریض کو شفا دیتا ہے اور تندرست کو بیمار کرتا ہے۔ پکارنے والے کی دعا کو سنتا ہے۔ کسی کی تکلیف کو دور کرتا۔ سائل کو عطا کرتا ہے، مغفرت مانگنے والے کو بخش دیتا ہے۔ اس طرح ہر روز اسکی کئی شانیں ہیں۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ہر لمحہ اسکی کئی شانیں ہیں۔ ہر لمحہ اسکی الگ شان ہے۔ چنانچہ جس لمحہ وہ کسی کو موت دیتا ہے تو اسی لمحہ میں وہ کسی کو زندگی عطا کرتا ہے۔ جس لمحہ میں وہ کسی کو بیماری سے شفا دیتا ہے تو اسی لمحہ میں وہ کسی کو بیمار کرتا ہے، اسی طرح ایک ہی لمحہ میں وہ کئی لوگوں کو اوپر چڑھاتا ہے اور کئی افراد کو تنزل کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ اسکی شانوں کا ایک انسان احاطہ بھی نہیں کر سکتا۔

لیکن یہ ساری باتیں صرف ایک عارف ہی جان سکتا ہے، بلکہ وہ دیکھ بھی سکتا ہے۔ رہے عوام جو جانوروں کی طرح بس کھاتے پیتے رہتے ہیں، وہ ان باتوں کو کیسے جان سکتے ہیں۔

صرف عارفین خدا ہی سمجھتے ہیں کہ اس پوری کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کے حکم سے ہی ہو رہا ہے۔ اور ان مختلف احوال کو اللہ ہی کی شان سمجھتے بھی ہیں اور ان کو اللہ کی تجلیات کا نام دیتے ہیں۔ عارفین اللہ کی ایک تجلی پر قانع نہیں ہوتے بلکہ ہر لمحہ ایک نئ تجلی اور ایک نئ شان دیکھنا چاہتے ہیں۔ چناچہ حضرت مہدیؑ نے اس ضمن میں فرمایا۔

بیزارم از آں کہنہ خدائے کہ تو داری　　　ہر لحظہ مرا تازہ خدائے دیگر است

یہ ایک عارف باللہ کا شعر ہے جسے مہدیؑ نے پڑھا ہے۔ نیز اس کا ثبوت ان فرشتوں سے بھی ملتا ہے جو بہ یک وقت دو کام کرنے کیلیئے دو پیغمبروں کے پاس آئے تھے۔ یعنی حضرت ابراھمؑ کے پاس ان کو ایک فرزند کی خوش خبری دینے کیلیئے جس کے ذریعہ ایک مسلم امت برپا ہونے والی تھی اور حضرت لوطؑ کی طرف تا کہ ان کی نافرمان قوم کو ہلاک کر دیں۔

اسی طرح ایک نقل آئی ہے کہ حضرت بندگی میاںؓ نے اپنے خلیفہ حضرت بندگی میاں الہداد خلیفہؒ گروہؓ سے پوچھا کہ "بھائی دادو کچھ دیکھ رہے ہو" آپ نے جواب دیا خوندکار کے صدقہ سے دیکھ رہا ہوں، پھر آپ نے پوچھا "کیا دیکھ رہے ہو۔ جواب دیا دونوں طرف (مہدوی فقراء حزب اللہ اور مخالف لشکر مظفر) حق کا ظہور دیکھ رہا ہوں۔ پوچھا وہ کس طرح ؟ تو

جواب دیا کہ ایک طرف مہر خداوندی اور دوسری طرف قہر خداوندی (ایک طرف جمال الٰہی اور دوسری طرف جلال الٰہی)۔

لیکن افسوس کہ بعض نادانوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھ کر حضرت مہدیؑ پر اعتراض کر دیا کہ ''مہدی اور مہدویوں کے پاس کئی خدا ہیں، پرانے خدا بھی ہیں اور نئے بھی'' براین عقل و دانش بباید گریست (ایسی عقل و دانش پر رویا ہی جاسکتا ہے)۔

شکر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿البقرۃ:۱۵۲﴾ پس تم مجھے یاد کرو، میں تم کو یاد کرتا ہوں اور میرا شکر کرو اور (میری نعمتوں کی) ناقدری مت کرو۔

کسی نعمت کو اللہ کا انعام سمجھ کر اس کی قدر کرنا شکر کہلاتا ہے، اس کا ضد کفر ہے یعنی اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی ناقدری کرنا۔ شکر گذاری کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ اس منعم حقیقی کی تعریف کرنا اور دوسرا یہ کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو گناہوں میں استعمال نہ کرنا بلکہ اس نعمت کو اللہ کی رضامندی کے کاموں میں استعمال کرنا۔

اللہ نے انسان کو کئی نعمتیں عطا فرمائی ہیں مثلاً آنکھ، اس کا شکر، یہ ہے کہ آنکھ کو اللہ کی کتاب اور علم دین کی کتابوں کو دیکھے اور آسمان، زمین، جھاڑ، پہاڑ، سورج اور چاند ستارے وغیرہ کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے کہ اللہ نے ہمارے فائدوں کیلئے کیسی کیسی عظیم اور بے شمار نعمتیں پیدا کی ہیں۔ اور ان آنکھوں کو نامحرموں کو دیکھنے سے بچائے رکھے۔ کان ایک نعمت ہے اس کا استعمال قرآن کی تلاوت، اور ایسے مواعظ حسنہ کو سننے میں استعمال کرے جس سے دنیا اور آخرت میں فائدہ ہو، ہجو، لغو، غیبت، شکایت اور فضول کلام کو سننے سے کان کو روکے۔

زبان بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اللہ نے تمام مخلوقات میں انسانوں کو زبان سے نوازا ہے پس اسکو خدا کی حمد و ثنا اور اظہار تشکر میں مشغول رکھے، زبان سے گالی گلوچ، جھوٹ، تہمت تراشی اور الزام آفرینی، طعنہ زنی، بہتان طرازی، بدگوئی نہ کرے۔ اللہ نے قرآن میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ ”لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴿ابراھیم:۷﴾“ (اے لوگو) اگر تم میرا شکر کروگے تو میں تمہیں مزید نعمتیں دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری اور ناقدر شناسی کی تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی انسان کو ملتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ملتا ہے۔ پس انسان کو چاہئے کہ اس کو اللہ کا انعام سمجھ کر اس کا شکر ادا کرنا چاہئے، اگر ایسا ہوگا تو اللہ اسے مزید عطا فرمائے گا لیکن اس کے بر عکس اگر انسان یہ سمجھنے لگے کہ اس میں اللہ کا کیا ہے، یہ تو میری محنت کا نتیجہ ہے تو جب ایسا ہوا تو اللہ فرماتا ہے کہ دیکھ اب تو تو یہ کہہ رہا ہے کہ یہ میری محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے لیکن کل کو دیکھ لینا کہ اچانک تیری یہ محنت، یہ کد و کاوش سب کی سب دھری رہ جائیگی اور تو اپنے آپ کو جو آسمان پر سمجھ رہا تھا زمین پر آجائیگا۔

ہاتھ پیر دل دماغ، پیٹ، جگر، پھیپھڑے، گردے، ہوا کی نالی، غذا کی نالی، وغیرہ اعضاء اللہ کی نعمتیں ہیں۔ انسان سوچے تو معلوم ہوگا کہ ہر سانس اللہ کی نعمت ہے اور ہر سانس میں اللہ کا ذکر اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا فرض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا شکر ادا کرنا گویا شرک کی نفی کرنا ہے اس لئے مہدویہ کے پاس شکر کی تعریف ترک الشرک سے کیگئی ہے۔

شرع محمدی ﷺ

شرع کے لغوی معنی طریق اور راستہ کے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں شرع کا لفظ اسی معنی میں چار جگہ آیا ہے۔

چنانچہ سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر تیرہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

(۱) شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ﴿شوریٰ:۱۳﴾ اسی نے تمہارے لئے دین کا وہ راستہ مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے (اے محمد) وحی کے ذریعہ آپ کے پاس بھیجا ہے اور جس کا ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا وہ یہ کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

(۲) أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ ﴿شوریٰ:۲۱﴾ (یہاں شرعوا جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔) کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کیلئے دین کا ایک راستہ مقرر کیا ہے جس کا خدا نے حکم نہیں دیا۔

(۳) لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ﴿المائدۃ:۴۸﴾ تم میں سے ہر ایک (فرقے) کیلئے ہم نے ایک خاص شریعت اور ایک خاص طریقہ مقرر کیا ہے۔ یہاں بھی لفظ شرعۃ۔ شریعت اور راستے کے معنی میں ہے۔

(۴) ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿جاثیۃ:۱۸﴾ پھر ہم نے تم کو (اے محمدؐ) دین کے ایک راستے پر کر دیا سو آپ اسی راستے پر چلیئے اور ان جہلاء کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔

مندرجہ بالا چار آیتوں میں شرع، شریعت، شرعۃ، شرعوا کا لفظ آیا ہے، تین آیتوں میں اللہ نے خود کو شریعت مقرر کرنے والا بتایا ہے اور ایک آیت میں اللہ کی بیان کردہ اس شریعت سے ہٹ کر جو اللہ نے پیغمبروں کے ذریعہ بھیجی ہے۔ دوسروں کے راستوں اور شریعتوں پر چلنے والوں سے سختی کے ساتھ پوچھتا ہے کہ کیا ان کیلئے اللہ کے سوا بھی شریک ہیں جنھوں نے ان کیلئے کوئی شریعت بنائی ہے۔ اس انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ واحد ہستی ہے جو شریعت کو مقرر کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس شریعت کو وہ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ اسی لئے اللہ نے خود رسول اللہ ﷺ کو بھی اس بات کا پابند کر دیا کہ آپ بھی اس شریعت کی اتباع کریں۔ اور اس کو چھوڑ کر خواہشات کی پیروی کرنے والے جہلاء کی پیروی نہ کریں۔

یہاں تک تو اتنا معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے شریعت وہی تھی۔ جس کا حکم اللہ نے آپؐ کو بذریعہ وحی دیا تھا۔ گویا شریعت کا منبع قرآن شریف ہی ہے۔

پس آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کیلئے شریعت حکم الٰہی تھی، اب یہ سوال کہ مومنوں کیلئے شریعت کا منبع کیا ہے تو اللہ نے دوسری آیت کے ذریعہ اس سوال کا جواب مرحمت فرمایا ہے "وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ﴿الحشر: ۷﴾" "یعنی رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم جو کچھ تم کو دیں اس کو لیلو اور جس چیز سے وہ تم کو منع کر دیں تو تم اس سے رک جاؤ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول کیلئے تو شریعت کا ماخذ و منبع قرآن شریف ہے جو وحی الٰہی ہے۔ لاغیر اور ہمارے لئے اللہ کی کتاب کا حکم بھی شریعت ہے اور حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا عمل اور قول بھی ہمارے لئے شریعت ہی ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔

نیز قرآن میں اللہ نے آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے "وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ﴿فاطر: ۳۱﴾" یعنی شریعت وہ ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے۔

اور وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی متلوٗ اور دوسری وحی غیر متلوٗ، وہ وحی جو پڑھی جاتی ہے۔ یعنی قرآن شریف وہ وحی متلوٗ ہے اور جو پڑھی نہیں جاتی مگر اس کو بھی اللہ نے آپ ؐ کو وحی کے ذریعہ حکم دیا ہے وہ ہے قول و عمل رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم، اسکو "وحی غیر متلو" کہتے ہیں۔ جیسا کہ خود رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا "إِنِّي أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَ أُوْتِي مِثْلَهُ مَعَهُ" مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کا مثل بھی دیا گیا۔ قرآن تو ظاہر ہے لیکن اوتی مثلہ معہ سے مراد آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا فرمان اور آپ کا عمل مبارک ہے۔

اس طرح ہمارے لئے شریعت معلوم کرنے کا ایک اور زینہ ملا۔ پس صحابۂ کرام پہلے تو قرآن شریف میں دیکھتے جو حکم ملتا اس پر عمل کرتے اور اگر ان کو قرآن سے وہ راستہ سجھائی نہ دیتا یا قرآن کے الفاظ سے وہ حکم پانے میں متردد یا قاصر ہوتے یا اس پر عمل کرنے کی کیفیت ان کو معلوم نہ ہوتی تو وہ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی تعلیمات اور آپ ؐ کے عمل کو اختیار فرمالیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے بنیادی اصول اس وقت تک دو ہی تھے اور اسی پر صحابۂ کرام علیہم الرضوان کا عمل تھا۔

رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے وصال کے فوراً بعد جب خلافت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور سقیفۂ بنی ساعدہ میں گفتگو ہونے لگی، انصار یہ چاہتے تھے کہ ان میں سے خلیفہ ہونا چاہیئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی مخالفت کی۔ پھر انصار کی طرف سے یہ کہا گیا "منّا الأمير و منكم الأمير" تو ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے "الخلافة من قريش" یہ سن کر سب خاموش ہوگئے، اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ خبر واحد بھی معتبر اور قابل حجت ہے۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد جب ابو بکر صدیقؓ خلیفہ ہوگئے اور بی بی فاطمہؓ نے بطور میراث باغ فدک کا مطالبہ کیا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے "نحن معشـــر الانبیاء لانرث ولا نورث، ما ترکناہ صـدقۃ" یعنی ہم انبیاء کی جماعت نا تو کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ کسی کو وارث بناتے ہیں، ہم جو کچھ (اپنے بعد) چھوڑتے ہیں وہ (تمام مسلمانوں کیلئے) صدقہ ہے۔ اس حدیث کے بیان کرنے والے بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ ہی ہیں۔ سب نے اس کو قبول کیا، چونکہ ان پیش آمدہ مسئلوں کے بارے میں قرآن میں کوئی حکم نہیں تھا (بالخصوص مسئلہ ثانی میں آنحضرت کی میراث کے بارے میں) تو صحابہؓ کرام نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روایت کو قبول کیا۔

کیونکہ صحابہء کرام کی مقدس جماعت کو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی رسول اللہ ﷺ سے رفاقت، نیز آپؓ کی صداقت اور عدالت پر اعتماد کامل تھا۔ اس لئے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ پھر جب آبادی بڑھنے لگی اور دائرہ اسلام پھیلنے لگا، نت نئے مسئلے پیدا ہونے لگے، تو جو مسئلہ درپیش ہوتا اس کا جواب قرآن میں ڈھونڈھا جاتا، پھر احادیث کے ذخیرہ میں سے تلاش کیا جاتا۔ جس صحابی کو جو حدیث یاد ہوتی وہ آکر کہتے۔ ورنہ مسائل کو جاننے والے صحابہ کا اجماع ہوتا اور اس میں جو چیز طے ہوتی اس سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا۔ اس طرح بعد میں اجماع کو بھی 'قرآن وحدیث کے بعد' اصول شرع میں داخل کیا گیا، لیکن اس کی تعریف میں "اتفاق المجتھدین" کی شرط کو رکھا گیا۔ یہ نہیں کہ عام لوگ کسی جگہ پر بیٹھ کر کوئی بات طے کرلیں تو، اس کو اجماع کا نام دیا گیا۔

اور جب اس اجماع سے بھی مسئلہ حل نہ ہوسکے تو قیاس کو بھی اصول شریعت میں داخل کیا گیا۔ قیاس میں علت کو دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مسئلہ پیش ہوا، اور قرآن وحدیث اور اجماع سے اس کا کوئی جواب نہ ملے تو یہ دیکھا جائیگا کہ اس سے ملتی جلتی چیز کا کیا حکم ہے اور اس کا حکم کی علت کیا ہے۔ اگر وہی علّت اس صورت مسؤلہ میں بھی پائی جائے تو اسکا جو حکم ہوگا اس کا بھی وہی حکم ہوگا۔ علّت مشترکہ کی بنا پر۔ جیسے تاڑی (سیندھی) کا حکم کیا ہے؟ کیا وہ پی سکتے ہیں یا نہیں حضورؐ اور صحابہؓ کے زمانے میں وہ نہیں تھی۔ یہ بعد کے زمانے کی پیداوار ہے یا دوسرے مقام کی پیداوار ہے۔ اس کا کیا حکم ہونا چاہئے۔ تو مجتھدین نے قیاس کیا شراب پر۔ اور کہا کہ شراب اس لئے حرام ہے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے پس یہ حکم لگایا گیا کہ جس چیز سے نشہ ہوتا ہے وہ حرام ہے اور کہا کہ "کل مسکرِ حرام" ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ خلاصہ بحث کا یہ نکلا کہ پہلے قرآن، پھر حدیث اگر ان دونوں میں مسئلہ معلوم نہ ہو تو اجماع مجتھدین پھر آخر میں قیاس۔

لیکن بعد کے زمانے میں لوگوں نے قرآن وحدیث سے ہٹ کر بلکہ اجماع کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے صرف اپنی

من مانی پسند کے مجتھد کے مذہب کو اختیار کر لیا۔ اور اسی کی پیروی کرنے لگے۔ اس طرح چار مذاہب بلکہ صحیح یہ ہے کہ چار مسالک وجود میں آگئے۔ اس طرح مسالک نے شریعت کا مقام حاصل کر لیا۔ لیکن اس کا غلط مطلب یہ نہ نکالا جائے کہ ان ائمہ ء مجتھدین نے کوئی نئی شریعت پیش کی ہے۔ **حاشا و کلاّ**، ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔ اس لئے کہ شریعت وہی ہے جس کے احکام قرآن شریف اور فرامین رسول اللہ ﷺ میں موجود ہیں۔ ان بزرگوں نے قرآنی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کو ہی مد نظر رکھ کر احکام بھی اخذ کئے ہیں۔ اور انکی قوت بھی بیان کی ہے، چناچہ قرآن میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہ فرض ہے۔ یہ واجب ہے یا یہ سنت ہے۔ یہ مندوب ہے، یہ مباح ہے۔ فقہاء نے احکام کی جو سات قسمیں بیان فرمائی ہیں یہ سب اصطلاحی الفاظ ہیں۔ عبادات میں فرض واجب سنت کی تصریح بہت کم کی گئی ہے بلکہ علماء امت اور ائمہ ٔمجتھدین نے شارعؑ کے احکام کی اہمیت اور تاکیدات وغیرہ قرائن کے نظر کرتے قیاس اور اجتہاد کی بنیاد پر کسی فعل کو فرض، واجب، سنت یا مستحب قرار دیا ہے۔ اسی لئے ایک ہی فعل بعض ائمہ کے نزدیک فرض ہے تو دوسرے ائمہ کے پاس وہی فعل واجب یا سنت یا مستحب ہے۔

چناچہ پورے سر کا مسح اور موالات (پے در پے اعضاء وضو کا دھونا) امام مالکؒ کے پاس وضو میں فرض ہے اور امام ابو حنیفہؒ اس کو مستحب کہتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ کے پاس چوتھائی سر کا مسح فرض ہے۔ اس سے کم ہو تو وضو نہیں ہوتا، اور امام شافعیؒ کے پاس سر کے دو تین بالوں کا مسح کر لیں تو وضو ہو جائیگا۔ سورۂ فاتحہ کی قرات امام شافعیؒ کے پاس فرض ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے، امام شافعیؒ کے پاس مقتدی کیلئے سورۂ فاتحہ کی قرأت فرض ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے پاس منع ہے۔

اسی طرح ربوٰ (سود) حرام ہے، اس تعلق سے قرآن میں حکم موجود ہے۔ لیکن کن چیزوں میں سود حرام ہے۔ فقہاء میں اس بارے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ حضرت ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سود کیلئے جنس اور قدر ضروری ہے۔ یعنی ایک سیر چاول کے مقابلے میں دو سیر چاول سود ہے۔ اور امام شافعیؒ کے پاس اقتیات اور ادّخار ہے۔ یعنی جو چیزیں کھائی جاتی ہوں اور جن چیزوں کا ذخیرہ کیا جاتا ہو تو ان میں برابر کا سودا حلال ہے۔ ایک کم اور ایک زیادہ ہو تو وہ سود ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ ''آیات قرآنی اور احادیث رسول اللہ ﷺ میں اصولی احکام جو مذکور ہیں شریعت محمدیہ ہیں یا بعض افراد امت محمدیہ جسے محدّثین، مفسّرین، ائمہ مجتھدین اور صوفیاء کرام کے ان اقوال کو شریعت محمدیہ کہتے ہیں جو خدا اور رسول خدا کے احکام اور فرامین سے رائے اور قیاس کے ذریعہ مستخرج ہوئے ہیں؟ ان دونوں میں فرق ہے یا نہیں؟ عین شریعت کونسے مسائل ہیں؟

اگر ائمہ مجتھدین کے اقوال اور ان کی رائے و قیاس سے نکالے ہوئے مسائل ''عین شریعت'' ہیں تو معاملہ الٹ

جائے گا۔ خصوصاً جبکہ فقہاء کے ان احکام میں اختلافات کثیرہ موجود ہیں۔ پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان اختلافات کو رفع کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

اتنی بات تو یقیناً کہی جا سکتی ہے کہ ایک امام کے مسئلہ کو اگر دوسرے امام نے نہ مانا اور الگ سے اپنا حکم سنایا تو اس کو "نسخ شریعت" تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ اسی ایک شریعت کے مجتہد ہیں۔ شریعت تازہ کے لانے والے نہیں ہیں۔ اور اقوال کا ماخذ قرآن و حدیث ہی ہیں۔ تو جب قرآن و حدیث سے مستخرجہ احکام کی قوت کسی کے پاس فرض، واجب اور سنت ہو سکتی ہے اور اس کو نسخ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ نسخ کیلئے تازہ شریعت اور کتاب جدید کی ضرورت ہوتی ہے؟ تو پھر امامنا علیہ السلام نے اگر "یا ایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیرا" سے ذکر الٰہی کو فرض اور "کونوا مع الصادقین" سے صحبت صادقین کو فرض قرار دیا تو کیا کوئی عقل مند اسکو نسخ شریعت کہہ سکتا ہے۔

محض اس بناء پر کہ مجتہدین میں سے بعض نے ذکر اللہ کو اور صحبت صادقین کو اپنی رائے، قیاس یا بعض دیگر مجبوریوں کی بناء پر مستحب قرار دیا ہے۔ کیا یہی حکم امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک یا امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ پر بھی عائد کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے بیان کردہ حکم کے خلاف کسی امر کو فرض، واجب یا سنت کہا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نسخ کے معنی بعض احکام شرعیہ کو، دوسرے احکام شرعیہ سے تبدیل کرنا یا ان کا ازالہ کرنا ہے۔ اور اس کیلئے دوسری شریعت کا ہونا لازم ہے۔ اور دوسری شریعت کیلئے کتاب جدید کے نازل ہونے کی ضرورت ہے۔ جب نہ کتاب جدید ہے، نہ دوسری شریعت موجود ہے تو امامناؑ کی جانب سے احکام خدا کے سلسلہ میں کسی حکم کی قوت بیان کرنا کس طرح نسخ کہلایا جا سکتا ہے؟؟

امامؑ نے تو بحیثیت خلیفۃ اللہ، بیّنۃ اللہ، مبیّن کلام اللہ، بأمر الٰہی بعض احکام کی قوت اور تاکیدی حیثیت بیان فرمائی ہے۔ اپنی جانب سے، اپنی عقل سے، اپنے علم سے، اپنے زور استدلال سے کچھ نہیں فرمایا۔ چنانچہ حاکم خراسان کے حکم پر منتخب علماء نے حضرت مہدیؑ کے دعویٰ مہدیت کی تحقیق کرنے کی غرض سے آپ کے پاس آئے اور پہلا سوال یہی کیا کہ آپ کس مذہب پر ہیں؟ تو حضرت مہدیؑ نے جواب دیا کہ "مذہب ما کتاب اللہ و اتباع محمد الرسول اللہ" اسکی تفصیل اپنے مقام پر آپ دیکھ سکیں گے۔

حضرت بندگی میاں شاہ برہانؒ نے شواہد الولایت میں، سفر سندھ کے واقعات کے تحت ملا صلاح الدینؓ کا ایک مکالمہ جو امامناؑ کے ساتھ ہوا تھا لکھا ہے جس میں مہدیؑ کا یہ فرمان بھی ہے، "ما شریعت نو نیاوردیم، شریعت رسول

اللّٰہ ﷺ را تغیر مذادیم، و در اتباع شریعت در میان ما و شما ہیچ فرقے نیست ''یعنی ہم نئی شریعت نہیں لائے، ہم نے شریعت رسول اللہ ﷺ نہیں بدلا۔ شریعت کی اتباع میں ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ بھی فرق نہیں ہے۔

نیز علماء کے سوال پر آپنے فرمایا'' مذہب ما کتاب اللہ و اتباع محمد رسول اللہ، علّمت من الله بلا واسطة جديد اليوم، قل انيّ عبد الله، تابع محمد رسول الله ''یعنی ہمارا مذہب اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ کی اتباع ہے۔ مجھے روزانہ بلا واسطہ اللہ کی جانب سے تعلیم دی جاتی ہے۔ کہدو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور محمد رسول اللہ ﷺ کا تابع ہوں۔

نبی پر وحی کا نزول کبھی فرشتے کے واسطے سے ہوتا ہے اور کبھی بلا واسطہ اور یہ بلا واسطہ وحی نبوت کی تخصیصات سے نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ کی جانب سے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ کو بھی وحی ہونے کی خبر خود اللہ نے قرآن میں دی ہے۔

اسی طرح شہد کی مکھیوں کو وحی منجانب اللہ ہوئی ہے۔ اسی طرح زمین کی طرف بھی وحی منجانب اللہ ہونے کی خبر اللہ قرآن میں دے رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربّانی ہے ''وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ﴿الزلزلة:۳، ۵، ۴﴾'' جب انسان کہے گا کہ اس (زمین) کو کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنی خبریں بیان کرے گی کہ آپکے پروردگار نے اس کو یہ وحی فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ، شہد کی مکھی اور زمین ''پیغمبر'' نہیں ہیں۔

اسی طرح اولیاء کو بھی اللہ کی جانب سے وحی کی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ احتیاطاً اور احتراماً اب اس کو الہام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ کی جانب سے بلا واسطہ جبرئیلؑ، الہامات کے ذریعہ معارف الٰہیہ اور اسرار و معانی کی تفہیم انہیں کی جاتی رہی۔ اسی لئے ان کو دعوائے جبرئیل یا دعوئے نبوت نہیں ہوتا۔ (اور انہیں یہ جو مقام ملتا ہے وہ بھی حضور کی اتباع ہی کا صدقہ ہوتا ہے اور حضور کی کامل اتباع کا ہی فیض ہوتا ہے)

(۱) خلاصہ یہ نکلا کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے شرع، احکام قرآنیہ ہیں جو وحیء متلو ہے۔ نیز وہ احکام بھی جو وحی غیر متلوء کے ذریعہ منجانب اللہ آپ کو ملا کرتے تھے۔

(۲) صحابہء کرام کیلئے شریعت احکام خداوندی بصورت قرآن اور فرامین رسول اللہ ﷺ

(۳) اختلاف صحابہ کی صورت میں جلیل القدر علم و فضل کے حامل فقیہ و متدیّن و بزرگ صحابہ کا اجماع۔

(۴) جب صحابہ کا بھی زمانہ نہیں رہا اور احادیث کثرت کے ساتھ رونما ہوئیں تو مجتھدین کا طبقہ پیدا ہوا۔ اور مجتھدین نے اپنے اجتھاد اور قیاس کے ذریعہ پیش آنے والے مسائل کو بیان فرمایا۔

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اجتھادی مسائل قیاس کا نتیجہ تھے اور اجتہاد کا دور ۸۰ھ کے بعد سے شروع ہوا۔ حضرت نعمان ثابت کوفی ابو حنیفہ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی اور آپ کا وصال ۱۵۰ھ میں ہوا۔ پس ظاہر ہے کے آپ کے مسائل اجتہادیہ ۱۰۰ھ یا ۱۲۰ھ کے بعد سامنے آئے۔

پھر حضرت شافعیؒ کی ولادت ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ اسی طرح حضرت مالکؒ اور حضرت امام احمد بن حنبل اسکے بعد۔

پھر ان حضرات اور مقدس ذوات کے باہمی مختلف احکام کی بناء پر شریعت ہی کے ۴ راستے پیدا ہو گئے۔ اور جن مقامات پر ان کے امام رہے وہاں کے لوگوں نے اپنے اپنے مجتھد کو اپنا امام اور پیشوا بنالیا۔ اسطرح چار فقہی مسالک عالم وجود میں آ گئے۔

مگر ان کی حیثیت مسلمہ شرع کی طرح تو نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو ہرگز ان میں اختلاف نہ ہوتا۔ ہاں ان کے ماننے والوں کا "غالب ظن" یہی تھا اور ہے کہ ہمارے امام نے جو مسائل بیان کئے ہیں وہ صحیح ہیں اسی طرح دیگر تین بھی اس طرح کے دعویدار ہیں۔ اختلاف نے اس وقت شدت اختیار کرلی، جب ماننے والوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے امام کے مسائل صحیح ہیں اور دوسرے امام کے صحیح نہیں ہیں۔ حالانکہ سب اماموں نے قرآن و حدیث کو سامنے رکھ کر ہی اجتھاد اور قیاس کے ذریعہ مسائل بیان کئے تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان مسائل کے استنباط اور استخراج میں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور خطا کا صدور بھی ممکن تھا۔

اسی لئے اس بات پر بھی سبھی متفق ہیں کہ "المجتهد قد يصيب وقد يخطي" یعنی مجتھد صحیح مسئلہ بھی بیان کرتا ہے اور کبھی خطا بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ ہمارے اس بیان سے کسی کے دل میں بھی یہ خیال نہ گذرے کہ ہم ان کی محنتوں و کاوشوں کی ناقدری کر رہے ہیں حاشا و کلاّ۔ اللہ ان بزرگوں کی قبروں کو اپنے انوار سے بھر دے، کہ انہوں نے امت مسلمہ کیلئے دنیا کی سدھ بدھ کھو کر دین کے پاپڑ بیلے ہیں۔ لیکن ان کے معتقدین اور متوسلین نے اپنے اپنے مسلک کی اتباع میں شدت اختیار کرلی، اور صاف طور پر یہ کہنے لگے کہ حق وہی ہے جو ہمارے امام نے کہا ہے۔ دیکھئے بات شروع کہاں سے ہوئی تھی اور کہاں ختم ہو رہی ہے۔

مگر سوال اب بھی باقی رہ جاتا ہے کہ چار راستے مختلف اور چاروں صحیح؟ کیا ایک قرآن، ایک رسول چار راستوں کی طرف رہنمائی کرسکتے ہیں؟ صحیح راستہ تو بس ایک ہی ہے اور ایک ہی ہونا چاہیئے، اور جب چار راستے ہیں تو اب اس کا صحیح حل کیا ہوگا اور اس کو کون بیان کریگا؟ تو اس سوال کا جواب حضور کریم ﷺ نے اپنے حیات مبارکہ میں ہی دیدیا تھا، چنانچہ آپؐ نے فرمایا۔"المهدي مني يقفو أثري ولا يخطي "مہدی مجھ سے ہے میرے نقش قدم پر چلیگا اور کبھی خطا نہیں کریگا۔ اور یہ گواہی و شہادت کون دے رہا ہے۔ وہ ہستی معظم جس نے قرآن کی اور اللہ کے حکم کی بے خطا پیروی عمر بھر کی ہے۔ گویا ایک معصوم عن الخطا ہستی نے ایک معصوم عن الخطا ہستی کے تعلق سے پیش گوئی فرماتے ہوئے امت کو بشارت دی ہے کہ ایک ہستی ایسی آئیگی جو تم کو ان تمام اختلافات سے نجات دلائے گی۔ وہم و گمان سے نکالے گی اور اجتہاد و قیاس کے گنجلک راستوں سے ہٹاکر قرآن و سنت کے واضح اور یقینی اور قطعی راستے پر گامزن فرمائیگی۔ اسی لئے آپؑ نے علماء کے اس سوال پر کہ آپ کس مذہب کے ہیں، جواب دیا کہ "مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ" وہ یہی جواب سننا چاہتے تھے اسلئے کہ وہ بھی اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ مہدی جو اللہ کا خلیفہ اور تابع تام محمد رسول اللہ ﷺ اور معصوم عن الخطا ہے وہ کسی امام مجتھد کی کس طرح تقلید کریگا۔ وہ مجتھد جو کبھی صواب پر ہے تو کبھی خطا کرتا ہے۔ وہ مجتھد جو معصوم نہیں ہے، وہ مجتھد جس کے آنے کی پیشین گوئی حضور ﷺ نے نہیں فرمائی، اس کی اتباع وہ مہدی کس طرح کریگا جو معصوم عن الخطا ہے جس کے آنے کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے اور جو مسئلے بیان کرتا ہے تو حدیثوں کو پڑھ کر نہیں بلکہ حدیثیں جس ہستی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اس ہستی کی طرف متوجہ ہوکر اور اسی ہستی کی روح مبارک سے مشاہدہ کے ذریعہ پوچھ کر بیان کرتا ہے۔

یہ ہمارا بیان کوئی عقیدت کی بناء پر نہیں ہے بلکہ حقیقت کی بنیاد پر ہے۔ بلکہ یہی اعتقاد متقدمین اہل سنت کا ہے اور یہی اعتقاد متدین فقہاء کرام کا بھی ہے۔ اس سلسلہ میں مہدویہ کا یہ عقیدہ ہے کہ چاروں امام یعنی حضرت ابو حنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام مالکؒ، اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ برحق ہیں۔ مذہب حق ان چاروں ائمہ کے درمیان دائر ہے، یہ اسوقت تک کی بات ہے جب تک امام مہدیؑ کی تشریف آوری نہیں ہوئی تھی البتہ آپؑ کی تشریف آوری کے بعد جو مسئلہ شرعیہ حضرت مہدیؑ فرماتے ہیں وہ برحق ہے۔ اس لئے فقہاء کرام قرآن اور احادیث اور اجماع کی روشنی میں اپنی رائے اور قیاس سے مسائل بیان فرماتے ہیں اور حضرت امام مہدیؑ قرآنی احکام کے سلسلہ میں بلا واسطہ الہام الٰہی اور روح رسول اللہ ﷺ کے مشاہدہ پر مبنی اطلاع دہی پر مسائل بیان فرماتے ہیں، اسی لئے۔

(۱) آپ کے فرمان میں رائے، اجتہاد اور قیاس کا گذر تک نہیں ہے۔

(۲) حضرت امام مہدیؑ خلیفۃ اللہ ہیں (چناچہ حضرت ثوبانؓ سے مروی حدیث سے ثابت ہے) اور ائمہ کرام خلیفۃ اللہ نہیں ہیں، بلکہ مجتہدین کرام ہیں۔

(۳) امامؑ معصوم عن الخطا ہیں اور ائمہ کرام مصوم عن الخطا نہیں ہیں، وہ جو کچھ مسائل بیان کرتے ہیں وہ عقل، قیاس اور اجتھاد کی بنیاد پر کرتے ہیں اسی لئے ایک ہی مسئلہ میں ایک چیز کو ایک امام فرض قرار دیتا ہے تو دوسرا امام واجب کہتا ہے اور تیسرا امام ممنوع قرار دیتا ہے۔ اور مہدیؑ جو معصوم ہیں تو اس کی شہادت ایک معصوم عن الخطا ہستی نے یہ کہہ کر دی کہ ''المهدي مني يقفو أثري ولا يخطي''

(۴) چونکہ ائمہ کرام مجتہدین ہیں اور مجتہد کے تعلق سے اس امر پر سب متفق ہیں کہ ''المجتهد قد يصيب وقد يخطي'' یعنی مجتھد کا حکم کبھی صحیح بھی ہوتا ہے اور کبھی خطا بھی کر جاتا ہے۔

امام مہدیؑ کے اعلیٰ منصب اور عظیم الشان مقام کے پیش نظر آپؑ کے احکام عین شریعت محمدیؐ اور آپ کے مخالف اقوال کمزور اور مرجوح ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ (۱) میزان شعرانی میں لکھا ہے۔ المسائل المستخرجة من اقوال العلماء في كل دور من ادوار الزمان الىٰ ان يخرج المهدي، فيبطل في عصره التقليد بالعمل بقول من قبله من المذاهب كما صرح به اهل الكشف۔ یعنی زمانے کے مختلف ادوار میں علماء کے اقوال سے جو مسائل نکالے جاتے ہیں (وہ قابل عمل ہیں) یہاں تک کہ مہدی کا خروج ہو جائے، پس آپ (مہدی علیہ السلام) کے زمانے میں ما قبل کے مذاہب (مسالک) میں سے کسی (امام) کے قول پر عمل کی تقلید باطل ہو جائیگی۔

(۲) يكون قول الامام المهدي حجة يخطي مخالفه۔ یعنی امام مہدیؑ کا قول حجت ہو گا اور آپؑ کا مخالف خطا کرنے والا ہو گا (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت)

(۳) امام طحطاوی لکھتے ہیں: فما يحكم المهدي الا بما يلقى اليه الملك من عند الله ليسدده، و ذالك هو الشرع الحقيقي المحمدي الذى لو كان محمدا حيا و رفعت تلك النازلة لم يحكم فيها الا بحكم المهدي فيعلم من ذالك هو الشرع المحمدي۔ یعنی پس حکم نہیں دیتے مہدی مگر وہی جس کا القاء ان کی طرف اللہ کی جانب سے ایک فرشتہ کرتا ہے تا کہ ان کو صحیح راہ بتلادے اور وہ ہی شرع حقیقی محمدی ہے کہ اگر حضرت محمد ﷺ زندہ رہتے اور وہ مسئلہ ان کے پاس پیش کیا جاتا تو وہ بھی وہی حکم دیتے جو مہدیؑ نے دیا ہے، پس اس سے معلوم ہوا کہ وہی شرع محمدی ہے۔

ملا علی قاری نے "المشرب الوردی فی مذہب المہدی" میں لکھا ہے جس کو طحطاوی محشی در مختار نے مقدمہ نامی کتاب میں نقل کیا ہے (ماخوذ از کحل الجواہر، ص ۵۵) وکذا من الافتراءات ان الامام المهدي يقلد اباحنيفة لانه مجتهد مطلق لا يجوز له التقليد۔ یعنی افترا کردہ چیزوں میں یہ بھی ہے کہ امام مہدیؑ ابو حنیفہؒ کی تقلید کریں گے، کیوں کہ امام مہدی مجتہد مطلق ہیں ان کیلئے تقلید جائز نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر امام مہدیؑ کا مجتہدین کی تقلید نہ کرنے کا سبب یوں بیان کیا ہے۔ ومنها ان عيسىٰ عليه السلام معصوم مطلقاً و المهدي معصوم في الاحكام و ابو حنيفة مجتهد و المجتهد قد يخطي و قد يصيب ولذا خالفاه صاحباه في اكثر قوله، فكيف يقلد من لا يخطى قط من يخطي و يصيب- ان ہی وجوہ سے یہ بھی ہے کہ عیسیٰؑ مطلقا معصوم ہیں اور مہدیؑ بھی احکام میں معصوم ہیں اور ابو حنیفہ مجتہد ہیں اور مجتہد کبھی خطا کرتا ہے اور کبھی صواب۔ اسی لئے ابو حنیفہؒ کے شاگردوں نے آپ کے ثلث سے زیادہ اقوال میں آپ کا خلاف کیا ہے، پس جو شخص کبھی خطا نہیں کرتا وہ اس شخص کی تقلید کیسے کریگا جس میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہو۔

لیکن ملا علی قاری نے مہدیؑ کی نسبت جو "مجتہد مطلق" کا اطلاق کیا ہے وہ ہمارے پاس صحیح نہیں ہے کیونکہ آپؑ کی ذات اقدس حضرت سرور کائنات ﷺ کے فرمان سے اللہ کا خلیفہ اور حکم عصمت میں "ملحق بالأنبياء" ہے۔ چناچہ طحطاوی نے بھی بحوالہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ اسکی تصریح اور ملا علی قاری کے اس قول کی تردید کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ ثم رد ايضاً (على قارى) قول القائل ان المهدي يقلد ابا حنيفة بالدلائل الشافية لكنه قرر انه مجتهد مطلق و هو يخالف عن ما قال الشيخ محى الدين (ابن عربى) في الفتوحات ان المهدي لا يعلم القياس ليحكم به و انما يعلمه ليجتنبه۔ یعنی ملا علی قاری نے اس شخص کے قول کا دلائل شافیہ سے رد کیا ہے، جو یہ کہتا ہے کہ مہدیؑ ابو حنیفہ کی تقلید کریں گے مگر ملا علی قاری نے مہدی کو مجتہد قرار دیا ہے اور یہ قول شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے اس قول کے مخالف ہے جو فتوحات میں لکھا ہے کہ مہدیؑ قیاس کو اس لئے نہیں جانتے کہ اس کے مطابق حکم کریں، بلکہ اس لئے جانتے ہیں کہ اس سے پرہیز کریں۔ فما يحكم المهدي الا بما يلقى اليه الملك من عند الله تعالىٰ الذى بعثه الله تعالىٰ ليسدده و ذالك هو الشرع الحقيقى المحمدى الذى لو كان محمدً حياً و رفعت اليه تلك النازلة لم يحكم فيها الا بحكم المهدي فيعلم انَّ ذالك هو الشرع المحمدي فيحرم عليه القياس مع وجود النصوص التي منحه الله تعالىٰ اياها ولذا قال ﷺ في صفته يقفو أثري ولا يخطي فعرفنا انه متبع ولا مشرع (الىٰ هٰهنا كلام الفتوحات) فعلىٰ هذا المهدي ليس بمجتهد- اذا المجتهد يحكم بالقياس و هو (المهدي) يحرم عليه الحكم بالقياس ولان المجتهد يخطي و هو لا يخطي

قطّ، فانه معصوم في احکامه بشهادة النبي ﷺ فهو مبني علیٰ عدم جواز الاجتهاد في حق الانبیاء علیهم الصلوٰة و السلام و هو التحقیق و باللّٰه التوفیق۔ پس مہدی وہی حکم کریں گے جس کو وہ فرشتہ الہام کریگا جو آپ کو سیدھی راہ بتانے کیلئے اللہ نے بھیجا ہے۔ اور یہی 'حقیقی شرع محمدی' ہے۔ کہ اگر رسول اللہ ﷺ زندہ رہتے اور یہ مسئلہ آپ کے پاس پیش ہوتا تو آپؐ وہی حکم فرماتے جو مہدی علیہ السلام نے فرمایا ہے، پس اس سے معلوم ہوا کہ وہی شرع محمدی ہے، غرض مہدی پر ان آیات کے ہوتے ہوئے جو اللہ نے آپ کو دی ہیں قیاس حرام ہے، اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مہدی میری قدم بہ قدم پیروی کریگا اور خطا نہیں کریگا، اس سے ہم نے جانا کہ مہدی ''تابع'' ہیں ''مشرع'' نہیں ہیں، یہاں تک فتوحات کا کلام ہے پس اس سے ظاہر ہے کہ مہدی مجتھد نہیں ہیں کیونکہ مجتھد قیاس سے حکم کرتا ہے اور مہدی پر قیاس حرام ہے اور اس لئے بھی کہ مجتھد خطا کرتا ہے اور مہدی کبھی خطا نہیں کریں گے۔ آپؑ اپنے احکام میں نبی ﷺ کی گواہی سے خطا سے معصوم ہیں، پس یہ بات اس امر پر مبنی ہے کہ انبیاء کے حق میں اجتھاد درست نہیں ہے اور یہی (اس امر میں) تحقیق ہے اور اللہ ہی سے توفیق حاصل ہوتی ہے۔

نیز یواقیت کے باب میں (۶۵) میں شیخ کے حوالے سے ایک مقام پر یہ لکھا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہدی علیہ السلام پر بلکہ تمام اہل اللہ پر قیاس حرام ہے چنانچہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔ یحرم علی المهدي القیاس بل حرّم بعض المحققین علی جمیع اهل اللّٰه القیاس لکون رسول اللّٰه ﷺ مشهوداً علیهم فاذا شکّوا في حدیث او حکم رجعوا الیه في ذالك فیخبرهم بامرالحق یقظة و مشافهة و صاحب هذا المشهد لا یحتاج الی تقلید احدٍ من الأئمة غیر رسول اللّٰه ﷺ۔ مہدی علیہ السلام پر قیاس حرام ہے بلکہ بعض محققین نے تمام اہل اللہ پر قیاس حرام کہا ہے کیوں کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ کسی حدیث یا حکم میں شبہ کرتے ہیں تو آنحضرت ﷺ کی طرف اس بارے میں رجوع کرتے ہیں پس رسول اللہ ﷺ ان کو بیداری میں بالمشافہہ امر حق کی اطلاع فرماتے ہیں اور ایسا مشاہدہ والا شخص رسول اللہ ﷺ کے سوا ائمہ میں سے کسی کی تقلید کا محتاج نہیں ہے۔ اس عبارت سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ جب عام اہل اللہ پر قیاس حرام ہے کیوں کہ یہ ہستیاں کسی معاملہ میں شک و شبہ کی صورت رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر بیداری میں بالمشافہ حق کی اطلاع پالیتے ہیں تو پھر حضرت مہدی علیہ السلام پر کس طرح قیاس جائز ہو گا، اور آپ علیہ السلام کس طرح صاحبان قیاس کی تقلید کریں گے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے خود ان کے بارے میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ آپ کے نقش قدم کی بلا خطا پیروی کریں گے۔

بعض احناف نے مذہب ابو حنیفہؒ کی یہاں تک کی تعریف اور مدح کی ہے کہ یہ بھی لکھ دیا کہ: قد جعل اللّٰه الحکم

لاصحابه و اتباعه من زمنه الیٰ هذا الایام الی ان یحکم بمذهب عیسیٰ علیه السلام(ترجمہ اردو در مختار جلد اول دیباچہ، ص ۲۴) اور اللہ نے ٹھہرایا ہے حکم شریعت و سیاست کا تصرف میں امام کے اصحاب اور اتباع کے لئے امام کے زمانے سے ان دنوں تک تا آنکہ امام کے مذہب کے مطابق عیسیٰؑ حکم کریں گے۔

اس حکم کی سختی کو دیکھتے ہوئے حلبی محشی نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حضرت مسیح اجتھاد کریں گے اور ان کا اجتھاد ابو حنیفہ کے اجتھاد کے موافق پڑیگا۔

دیکھئے ایک شدنہ شد دو شد، یعنی یہ ثابت کرنے کے کیلئے کہ ابو حنیفہؒ کا اجتھاد اتنا قوی ہو گا کہ حضرت عیسیٰؑ کیلئے بھی سوائے اسکے کوئی گنجائش نہ ہو گی کہ ابو حنیفہ کی اتباع کریں، حاشیہ نگار نے اس پر طرہ یہ لگا دیا کہ خود عیسیٰؑ بھی اجتھاد کریں گے اور ان کا اجتھاد وہی ہو گا جو امام ابو حنیفہ کا تھا۔

اب ان کو کون سمجھائے کہ عیسیٰؑ پیغمبر ہیں۔ "ہیں" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کو نبوت سے معزول نہیں کیا گیا؛ بلکہ صرف ان کو اٹھالیا گیا ہے۔ جب وہ دوبارہ اتریں گے تو نبی کی حیثیت سے ہی رہے گی۔ یہ اور بات ہے کہ آپؑ اپنی شریعت پر عمل نہیں کریں گے بلکہ "خاتم النبیینؐ" کی شریعت پر عمل کریں گے۔ وہ کس طرح ابو حنیفہؒ کی تقلید کریں گے ؟؟ پھر معاملہ کو بڑھا کر بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا، جیسا کہ "ذخائر مہمات کے مصنف نے صاحب اشاعت سے نقل کیا ہے کہ "بعضے جہال حنیفیوں نے دعویٰ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور مہدی علیہ السلام دونوں بزرگ مذہب حنفی کے مقلد ہوں گے اور ملا علی قاری نے اپنی کتاب المشرب الوردی فی مذہب المہدی میں اس کا خوب رد کیا ہے اور امام مہدی کو مجتھد مطلق کہا ہے، لیکن صاحب فتوحات ان کے اجتھاد کے منکر ہیں۔ کیوں کہ ان کو شریعت کے احکام خدا کی طرف سے تعلیم ہوں گے بواسطہ ملک (ص ۲۴) خلاصہ یہ کہ مہدی علیہ السلام کے فرامین ہی حقیقی شرع محمدی ہیں، اس لئے کہ آپ کو احکام شرع کی تعلیم خدا کی طرف سے بواسطہ فرشتہ ہوتی ہے اور حضور ﷺ سے مشاہدۃً اور مشافہۃً ہوتی ہے۔ حضرت امامنا مہدی علیہ السلام نے اپنے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود ائمہ کرام کی تنقیص نہیں فرمائی، بلکہ مسائل شرعیہ دریافت کئے جانے پر فرمایا "بھائیوں (ائمہ) نے مسائل میں موشگافی فرمائی ہے جو مسئلہ عالیت اور عزیمت کا ہے اس کو اختیار کرلو"۔ مہدوی بھی ان ائمہ کرام کی دینی اور علمی کاوشوں، کوششوں اور کنج کاویوں کی قدر کرتے ہیں، اللہ ان کی قبروں کو اپنے انوار سے بھر دے۔ آمین

شیطان

شیطان کا نام ابلیس تھا جس کے معنی مایوس ہونے والے کے ہیں۔ اور اسکو عزازیل بھی کہا جاتا ہے، شاید اس کا نام عزازیل تھا، پھر ابلیس ہوا اور جب اللہ کے حکم کی نافرمانی کی تو اللہ نے اسکو اپنی رحمت سے دور کر دیا پھر تو اس کا نام شیطان ہی ہو گیا۔ شیطان ایک وجود رکھنے والی شخصیت کا نام ہے محض ایک وہمی یا تصوراتی خاکہ نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ وہ مرئی (دکھائی دینے والا) نہیں ہے جیسا کہ جنات اور فرشتے ہیں۔

اللہ نے قرآن شریف میں جہاں جہاں آدم علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے وہاں ابلیس کا نام بھی آیا ہے۔ اس لئے کہ وہی نامراد ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیوں تونے آدم کو سجدہ نہیں کیا تو جواب دیا کہ میں ان سے بہتر ہوں، تونے مجھے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا، تو اسی وقت اللہ نے اس سے کہا، یہاں سے نکل جا، تو مردود ہے اور تجھ پر قیامت تک میری لعنت ہے۔ اس نے اللہ کی عزت کی قسم کھا کر کہا میں تیرے بندوں کو ہر محاذ پر سے گمراہ کروں گا اللہ نے جواب دیا کہ جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلیگا۔ اسی وقت سے شیطان نے بنی آدم کو بہکانا شروع کر دیا اس لئے کہ

(۱) فرشتوں کے ساتھ رہتے ہوئے اللہ کے بعض فیصلوں سے آگاہی حاصل ہونے کی بناء پر جو گھمنڈ پیدا ہوا تھا۔ حکم خداوندی پر فرشتوں کے ساتھ آدم کو سجدہ نہ کرنے پاداش میں نہ صرف چور چور ہو گیا بلکہ اللہ سے یہ حجت کی کہ میں مسجود بننے کے لائق ہوں نہ کہ وہ، اس لئے کہ میری پیدائش آگ سے ہوئی ہے جو بلندی چاہتی ہے اور اسکی خلقت مٹی سے ہوئی ہے جو مائل بہ پستی ہے گویا انکار حکم خداوندی، تکبر اور حسد کی وجہ سے تھا تو اللہ نے اسکو ملعون قرار دیا اور ذلیل کر دیا۔ تو اس نے بھی یہ ٹھان لی کہ جسکی وجہ سے مجھے جس مقام سے ہانکا گیا ہے میں اسکو کبھی پھر اس مقام میں داخل ہونے نہیں دوں گا۔ چناچہ اللہ نے کئی آیتوں کے ذریعہ مسلمانوں کو آگاہ فرمادیا کہ۔ خبردار۔ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ کسی حال میں اسکی تابعداری نہ کرو۔ اسکی بات نہ مانو، اسکے راستے پر نہ چلو، اسکے جھانسے میں نہ آؤ، وغیرہ۔ اللہ نے شیطان کے تعلق سے کیا کہا ہے اور اللہ کے بندوں کے ساتھ وہ کیا کرتا ہے، ٦٨ آیتوں میں اس کا بیان کیا ہے۔ چنانچہ

(۱) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ﴿بقرہ:٣٦﴾ پس شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان دونوں کو جس حالت میں تھے وہاں سے نکال دیا۔

(۲) يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

﴿بقرہ:۱۶۸﴾ اے ایمان والو زمین میں جو چیزیں حلال ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اسی آیت کے بعد یہ بھی فرمایا کہ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّـهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴿بقرہ:۱۶۹﴾ وہ تم کو برائی اور بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے اور یہ بھی حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کی نسبت سے وہ باتیں کہو جن کا تم کو علم نہیں ہے۔

(۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿البقرہ۔۲۰۸﴾ اے ایمان والو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی مت کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۴) الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم﴿البقرۃ:۲۶۸﴾ شیطان تم کو تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کے کاموں کا حکم دیتا ہے۔

(۵) الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ﴿بقرہ:۲۷۵﴾ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (اپنی قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جس طرح کہ وہ شخص جس کو کوئی جن لپٹ کر دیوانہ بنادیا ہو۔

(۶) وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿آل عمران:۳۶﴾ اور میں اسکو اور اسکی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود (کے فتنے) سے۔

(۷) إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا﴿آل عمران:۱۵۵﴾ تم میں سے جو لوگ دونوں جماعتوں کے مقابلے (احد کی لڑائی) کے دن پیٹھ پھیر لئے تھے واقعہ یہ ہے کہ شیطان نے ان کے بعض اعمال کے سبب ان کے قدموں کو ڈگمگا دیا تھا۔

(۸) إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴿آل عمران:۱۷۵﴾ یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے، پس اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔

(۹) وَمَن يَكُنِالشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا﴿النساء:۳۸﴾ اور شیطان جس کا ساتھی ہو جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ برا ساتھی ہے۔

(۱۰) وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴿النساء:۶۰﴾ شیطان تو ان کو بھٹکا کر راستے سے بہت دور لیجانا چاہتا ہے۔

(۱۱)فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴿نساء:۷٦﴾ پس شیطان کے مددگاروں سے لڑو، بے شک شیطان کا مکر وفریب، کمزور اور بودا ہوتا ہے۔

(۱۲) وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّـهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿نساء:۸۳﴾ اگر تم لوگوں پر اللہ کی فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کی پیروی کرتے، بجز چند لوگوں کے۔

(۱۳) وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّـهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا﴿نساء:۱۱۹﴾ اور جس نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنالیا تو وہ صریح گھاٹے میں پڑ گیا۔

(۱۴) يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴿نساء،۱۲۰﴾ (شیطان) ان سے وعدہ کرتا ہے اور ان کو امیدیں دلاتا ہے اور شیطان جو ان سے وعدہ کرتا ہے وہ صرف دھوکہ ہے۔

(۱۵)إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِالشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿المائدہ:۹۰﴾ اے ایمان والو، بے شک شراب، جوا، بت اور قرعہ کے تیر (یہ سب) ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔ پس تم ان سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(۱٦) إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ﴿المائدہ:۹۱﴾ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈالدے، شراب اور جوے کے ذریعہ سے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، سو کیا اب بھی تم باز نہ آؤ گے۔

(۱۷) فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَـٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿انعام:۴۳﴾ پس جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو انھوں نے کیوں عاجزی نہیں کی مگر ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور وہ جو اعمال کرتے تھے شیطان نے انہیں (ان کی نظروں میں) خوشنما کر دکھایا۔

(۱۸)وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴿الانعام:٦۸﴾ اور جب آپ دیکھو کہ وہ ہماری آیتوں کے بارے میں بکواس کرتے ہیں تو آپ ان سے الگ ہو جایئے یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مصروف ہو جائیں اور اگر شیطان آپ کو (یہ بات) بھلادے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھیۓ۔

(۱۹) كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِإِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿انعام:۱۴۲﴾ اللہ نے تم کو جو

روزی دی ہے وہ کھاؤ اور شیطان کی پیروی مت کرو کیوں کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۲۰) وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿اعراف: ۲۲﴾ اور جب انکے رب نے انہیں پکارا اور کہا کیا میں نے تم کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے آدمؑ و حواؑ سے یہ فرمایا تھا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور تم دونوں جہاں سے چاہو، کھاؤ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ گنہگار ہو جاؤ گے

(۲۱) پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکایا تا کہ ان دونوں کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائے ہوئے تھے ان کے روبرو کھولدے۔ اور کہا تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت کے پاس جانے سے صرف اس لئے منع کیا تھا کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ یا تم کو ہمیشہ کی زندگی نہ ملجائے اور شیطان نے دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں پس اس نے دونوں کو دھوکہ سے نیچے گرا دیا اور جب ان دونوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان دونوں کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھل گئیں اور جنت کے درختوں کے پتے اپنے اوپر چپکانے لگے، تب انکے رب نے انہیں پکارا۔ (نوٹ: اس آیت میں شیطان کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے)۔

(۲۳) يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ﴿اعراف: ۲۷﴾ اے بنی آدم۔ شیطان تم کو فتنہ میں نہ ڈالدے، جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے باہر کرا دیا، اس حالت میں کہ ان کے لباس ان سے اتروا دئے تھے تا کہ ان کی شرم گاہیں ان کے سامنے کھول کر دکھادیں وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

(۲۴) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿الاعراف: ۱۷۵﴾ اے پیغمبر آپ انکو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں پھر تو وہ ان کی حدوں سے باہر نکل گیا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا پس نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بلعم باورا کے بارے میں ہے جو بڑا عالم اور درویش صفت انسان تھا لیکن ایک خوبصورت عورت کے جھانسے میں آگیا۔ پھر دنیا کی حرص کی چکر میں پھنس کر اپنا سب کچھ برباد کر لیا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو اس علم کے ذریعہ اللہ کے پاس بلند مرتبہ بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے نفس کی پکار پر پستی کی طرف جھکنا پسند کر لیا اور اسکے مانند ہو گیا جو ہمیشہ اپنی زبان

لٹکائے ہوئے ہانپتا ہے اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپتا ہے اور اگر تو اسے یوں ہی چھوڑ دے تب بھی ہانپتا ہے اس آیت میں ان اہل علم کیلئے سخت وعید ہے جو دین کو دنیا کیلئے استعمال کرتے ہیں اس حد تک کہ بالآخر دنیا کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور اس دوڑ میں دین کو کاٹنے کی بات آتی ہے تو دین کو بھی کاٹ دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے پیش نظر شاید دنیا دار کو کتے کی مثال اپنی ایک حدیث میں دی ہے چنانچہ فرمایا "الدنیا جیفة و طالبوھا کلاب" دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔ یہی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا کو ترک کئے بغیر کمال دین حاصل نہیں ہوتا۔

(۲۵) وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿اعراف:۲۰۰﴾ اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسے آپ کے دل میں پیدا ہو تو آپ اللہ کی پناہ مانگیے، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ واضح ہو کہ نزغ وسوسہ سے کم درجہ کا ہے۔

(۲۶) إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ﴿اعراف:۲۰۱﴾ جو لوگ پرہیز گار ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی خطرہ بھی محسوس ہوتا ہے تو وہ چونک جاتے ہیں پس وہ دل کی آنکھ سے دیکھنے لگتے ہیں۔

(۲۷) إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿انفال:۱۱﴾ یاد کرو جب اللہ نے تمہاری تسکین کیلئے اپنی جانب سے تم پر اونگھ طاری کر دی اور آسمان سے تم پر پانی برسایا تاکہ اس کے ذریعہ تم کو (چھوٹے، بڑے حدث سے) پاک کر دے اور شیطانی نجاست کو تم سے دور کر دے اور تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے قدم جما دے۔

(۲۸) وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ ﴿انفال:۴۸﴾ اور جب شیطان نے انکے اعمال کو (ان کی نظروں میں) خوشنما کر دیا۔

یہ غزوہ بدر کا واقعہ ہے کہ شیطان اپنے لشکر کے ساتھ سراقہ بن مالک اشجعی کی صورت میں نمودار ہو کے کفار مکہ کو جب کہ وہ مکہ سے نکل کر بدر کی طرف جارہے تھے اپنی مدد کا یقین دلایا اور کہا کہ آج تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں ہے۔ اور میں تمہارا حامی ہوں مگر جب صف آرائی ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے مٹھی بھر خاک کافروں کی طرف پھینکی تو شیطان جو ایک کافر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا اپنے ہاتھ کھینچ کر بھاگنے لگا، مشرکین نے کہا تم تو ہمارے مددگار ہو، کہا اب میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں، میں ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے، یعنی اس نے یا جبرئیلؑ کو دیکھ لیا تھا یا فرشتوں کی فوج کو۔

(۲۹) إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿یوسف:۵﴾ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

(۳۰) فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ﴿یوسف:۴۲﴾ پس یوسفؑ کا ذکر اپنے بادشاہ کے سامنے کرنے سے شیطان نے بھلا دیا پس وہ جیل میں کئی برس رہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کو ناحق جیل میں قید کر دیا گیا تو آپ کے ساتھ دو اور قیدی بھی جیل میں آئے، دونوں نے اپنا اپنا ایک خواب سنا کر تعبیر پوچھی۔ یوسفؑ نے ایک کے بارے میں فرمایا کہ تو قید سے رہا ہو جائیگا ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جب تم بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا کہ ایک اور بے گناہ اور مظلوم آدمی بھی قید میں ہے، لیکن وہ شخص اپنی رہائی کی خوشی میں بادشاہ کے سامنے یہ بات کہنا بھول گیا جس کی وجہ سے یوسفؑ کو پانچ یا سات یا بارہ برس قید میں رہنا پڑا، یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ شیطان اچھی باتوں کو بھلا دیتا ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یوسفؑ کا ایک ساتھی جو ایک عام قیدی تھا اس سے۔ مدد مانگنا عزیمت کے خلاف تھا اگرچہ سخت دشواریوں میں عام آدمی کیلئے جائز ہے لیکن یوسفؑ پیغمبر تھے، پیغمبر کی نظر تو ہمیشہ اور ہر کام میں اللہ پر رہنی چاہیئے۔ اور اسی سے مدد مانگنی چاہیئے، پھر کیوں یوسفؑ نے اللہ کو چھوڑ جو ان کا رب تھا جس کے بارے میں انہوں نے قید خانے میں چند دن قبل قیدیوں سے پوچھا تھا کہ ایک رب اچھا ہے یا متعدد ارباب؟ تو اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ یوسفؑ کو شیطان نے اپنے رب (اللہ) سے درخواست (ذکر) کرنے سے بھلا دیا اور ساتھی سے درخواست کی کہ تو اپنے مالک (بادشاہ) کے سامنے میرا ذکر کر۔

کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا 'اللہ یوسف پر رحم کرے اگر انہوں نے یہ جملہ نہ کہا ہوتا تو اتنے سال قید میں نہ رہتے جتنے سال وہ رہے۔

یہ بھی روایت آئی ہے کہ اللہ کی جانب سے یوسفؑ کو خطاب ہوا "اتخذت من دونی وکیلا" کیا تو نے میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل بنالیا۔ یعنی اے یوسف تمہارا مقام، تمہارا منصب اور تمہاری شان یہ نہیں کہ تم اپنے جیسے کسی آدمی سے مدد کی امید رکھو۔ یہ عتاب نہیں ہے بلکہ خطاب ہے جس کے ذریعہ "صاحب نبوت" کے بلند کردار کی نشان دہی کی جارہی ہے۔

(۳۱) وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ﴿یوسف:۱۰۰﴾ اللہ نے مجھ پر احسان کیا کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور تم کو گاؤں سے لایا، حالانکہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈالدیا تھا۔

اس مقام پر یوسفؑ نے اللہ کے تین احسانات کا ذکر کیا ہے۔

(۱) قید خانے سے باعزت بری ہونا، حالانکہ حالات ناموافق تھے اور بری ہونے کے امکانات معدوم تھے۔

(۲) اللہ نے میرے بھائیوں سے مجھ کو ملا دیا حالانکہ شیطان کی کارروائیوں کی وجہ سے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں

جدائی ہو گئی تھی۔ حسد، بغض اور عناد کی وجہ سے دشمنی ہو گئی تھی، لیکن اللہ نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ ہم پھر بھائی بھائی ہو گئے۔

(۳) اللہ نے آپؑ کے ماں باپ کو گاؤں سے نکال کر شہر لایا تاکہ زندگی دل جمعی کے ساتھ گذرے۔

یوسفؑ نے اپنے بھائیوں پر ان کے کرتوت کا الزام نہیں لگایا، ان کی شکایت نہیں کی بلکہ ان کی جانب سے کی گئی کار روائیوں کو شیطان کی جانب منسوب کر دیا۔

(۳۲) وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُم مَّا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنتُم بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِن قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿ابراہیم:۲۲﴾ جب سب مقدمات کے فیصلہ ہو جائیں گے تو شیطان کہے گا جو وعدہ اللہ نے تم سے کیا تھا وہ سچا تھا اور جو وعدہ میں نے تم سے کیا تھا میں نے اس کے خلاف کیا۔ اور میرا تم پر کچھ زور تو نہیں تھا بجز اس کے کہ میں نے تم کو (باطل کی طرف) بلایا تھا تم نے میرا کہا مان لیا تو تم آج مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمہاری مدد کو پہنچوں گا اور نہ تم میری فریاد کو، میں اس سے بھی انکار کرتا ہوں کہ تم نے مجھے اس پہلے خدا کا شریک گردانا تھا یقینا ظالموں کیلئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت میں شیطان کے کرتوت بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) خود تسلیم کریگا کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا، لیکن میرا وعدہ جھوٹا تھا، خود میں نے اپنے وعدوں کا خلاف کیا۔

(۲) خود کہے گا کہ میرا کام بس اتنا تھا کہ میں نے تم کو باطل کی دعوت دی تھی۔ میرا تم پر کچھ زور تو نہیں تھا کہ ضرور میری بات مانو۔ تم نے خود اپنی خوشی سے میری بات مانی تھی، پس آج مجھ پر ملامت مت کرو، تم خود اپنے آپ پر ملامت کرو کہ خدا کی پکار کو چھوڑ کر میرے بلانے کو پسند کیا۔

(۳) یہ بات بھی غلط ہے کہ تم نے مجھے خدا کا شریک ٹھہرایا تھا۔

(۳۳) وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿الحجر:۱۷﴾ اور ہم نے آسمان کو ہر مردود شیطان سے محفوظ رکھا۔

اس سے پہلے اللہ فرماتا ہے کہ "ہم نے آسمان میں بروج بنائے ہیں اور دیکھنے والوں کیلئے ان کو آراستہ کیا ہے اور ہر مردود شیطان سے ان کو محفوظ رکھا ہے بجز اس کے کہ کوئی چوری چھپے سن لے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ لپکتا ہے۔

بروج: سورج اپنے سفر کے دوران جن مقامات میں داخل ہوتا ہے ان کو بروج کہتے ہیں اس کا واحد برج ہے جس کا ترجمہ قلعہ سے بھی کیا جاتا ہے، بروج بارہ ہیں۔ حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو،

حوت۔ اور یہ بروج اٹھائیس (۲۸) منزلوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اور ہر منزل کے ۳۶۰ درجے ہوتے ہیں، جسے سورج ایک سال میں طے کرتا ہے۔

ویسے شیطانوں کی رسائی آسمانوں تک ہوتی ہے عالم بالا میں جو فیصلے ہوتے ہیں ان کی اطلاع فرشتوں کو دی جاتی ہے، اگرچہ پوری حفاظت کی جاتی ہے کہ ان تک بات نہ پہنچے، پھر بھی ایک آدھ بات سن لیتے ہیں تو اس میں اپنی طرف سے بھی بہت کچھ ملا کر کاہنوں اور جادوگروں تک پہنچادیتے ہیں، پھر وہ لوگ مرچ مسالہ لگا کر لوگوں سے کہتے ہیں، ان میں کی ایک آدھ بات سچ نکلتی ہے تو وہ لوگ ''غیب داں'' کے نام سے مشہور ہو جاتے ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں شیطانوں کو تیسرے آسمان پر روک دیا گیا تھا، پھر آنحضرت ﷺ کی ولادت کے بعد تو تمام آسمانوں سے روک دیا گیا، جب شیاطین نے اسکا ذکر ابلیس سے کیا تو اس نے کہا کہ شاید زمین میں بڑا واقعہ ہوا ہے۔ اس نے شیاطین کو اس کا سبب معلوم کرنے کے لئے بھیجا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قرآن پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس نے کہا بس یہی بات ہے۔ ان انتظامات کے باوجود شیاطین کا سلسلہ آسمانوں تک بندھا رہتا ہے، فرشتے جو آپس میں بات کرتے ہیں تو یہ چوری سے سن کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان پر آگ کا شعلہ پھینکا جاتا ہے جو یا تو اسکو جلا دیتا ہے یا زخمی کر دیتا ہے۔

(۳۴) تَاللَّـهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿النحل:۶۳﴾ اللہ کی قسم ہم نے آپؐ سے پہلے امتوں کی طرف پیغمبر بھیجے تو شیطان نے ان کے اعمال کو ان کیلئے خوشنما کرکے دکھایا پس وہ آج بھی ان کا دوست ہے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

مطلب یہ کہ شیطان کا کام ہی یہی رہا ہے کہ وہ ہر امت کو اس کے پیغمبر کی خلاف ورزی کرنے کی دعوت دی اور خود ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں آراستہ کرکے دکھایا اور (اے رسولؐ) آج بھی وہ ان کا دوست بنا ہوا ہے لیکن نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ شیطان کی بات پر عمل کرنے والوں کیلئے دردناک عذاب ہے۔

(۳۵) فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّـهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿النحل:۹۸﴾ پس جب آپؐ پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہر اچھے کام میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو قرآنی تلاوت کے تعلق سے بھی شیطانی رکاوٹ درپیش ہوتی ہے۔ اسی لئے حکم دیا گیا ہے کہ جب تلاوت قرآن کا ارادہ فرمائیں تو مردود شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیں۔ شیطان کی جانب سے تلاوت قرآن کے وقت کئی رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں مثلاً تلاوت کو بعد کیلئے ملتوی کردینا۔ مختصر تلاوت کرنا، چند مخصوص سورتوں کی تلاوت جھٹ پٹ کرلینا، بغیر غور و فکر کے تلاوت کرلینا۔ اور ایسی تلاوت کو

تضئیع اوقات سمجھنا، سمجھکر پڑھیں تو اس میں ازکار رفتہ، اعتراضات اور وسوسے ڈالنا، قرآنی آیات کو عقل کی ترازو میں تولنا وغیرہ۔

(۳۶)وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿بنی اسرائیل:۲۷﴾ اور شیطان اپنے پرورد گار کا ناشکرا ہے

اس سے پہلے اسی آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ رشتہ داروں، محتاجوں اور مسافروں کو (اپنے مال میں سے) ان کا حق ادا کرو اور مال کو فضول خرچیوں میں نہ اڑاؤ۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔

(۳۷) وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿بنی اسرائیل:۵۳﴾ اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے کیوں کہ شیطان (بدکلامی سے) لوگوں میں جھڑپ پیدا کرواتا ہے، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

اس آیت میں تاکید کی جارہی ہے کہ آپس میں گفتگو میں تہذیب شائستگی اور نرمی کا پہلو اختیار کیا جائے، ورنہ شیطان غلط قسم کی گفتگو کے ذریعہ آپس میں لڑادیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔

اس آیت میں دو مرتبہ شیطان کا ذکر آگیا ہے۔

(۳۸)وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّـيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا﴿بنی اسرائیل ۶۴﴾ اور شیطان ان سے جو بھی وعدے کرتا ہے وہ سب دھوکا ہے۔

اس سے پہلے اللہ نے آیت میں وہ واقعہ بیان فرمایا کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور کہنے لگا کہ یہی تو ہے جس کو تونے مجھ پر فضیلت دی اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑوں کے سوا اسکی تمام اولاد کو اپنے بس میں کرلوں گا۔ اللہ نے فرمایا، جا، ان میں سے جو شخص تیری پیروی کرے گا تو سب کی سزا جہنم ہے، اور وہ ان کی پوری سزا ہے۔ اور ان میں سے تو جنکو بہکا سکے اپنی چیخ و پکار سے بہکالے اور ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کو چڑھالے۔ اور ان کے اموال اور اولاد میں شریک ہوجا اور ان سے وعدے بھی کرلے۔

شیطان کے آلہ کار یہ دو ہی چیزیں ہیں۔ مال اور اولاد، مال میں اگر اللہ کا حق اور بندوں کے جو حقوق ہیں وہ ادا نہ کئے جائیں اور اس پر مستزاد اسراف میں مال خرچ کیا جائے۔ اولاد میں شامل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اولاد کی صحیح تربیت کا انتظام نہ کیا جائے تو وہ شیطانی پول بن جاتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص بوقت جماع بسم اللہ نہ کہے تو شیطان اس میں دخیل ہوجاتا ہے۔

(۳۹)فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ﴿کہف ۶۳﴾ تو میں (وہیں) مچھلی بھول گیا۔ اور

آپ سے اس کا تذکرہ کرنے سے شیطان نے مجھے بھلا دیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ وعظ فرمارہے تھے، ایک شخص نے پوچھا آج لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والا کون ہے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا "میں" اس پر بطور عتاب کے وحی آئی کہ میرا ایک بندہ ایسا ہے جو تم سے زیادہ جاننے والا ہے، موسیٰؑ کو اس سے ملنے کا شوق ہوا، پتہ پوچھا تو جواب ملا ایک بے جان مچھلی لے کر سفر کرو۔ جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہیں وہ شخص ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت یوشعؑ کو اپنے ساتھ لے لیا تا کہ سفر میں بھی ساتھ رہیں اور جب وہ مقام آجائے تو آپ کو یاد دلا دیں۔ راستے میں ایک مقام پر تھکن کا احساس ہوا تو موسیٰؑ سو گئے، اس اثناء میں یوشعؑ نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا کہ تلی ہوئی مچھلی اللہ کی قدرت سے زنبیل سے نکلی اور عجیب طریقہ سے سمندر میں سرنگ بناتی ہوئی چلی گئی، یوشعؑ نے خیال کیا کہ جب موسیٰؑ بیدار ہوں گے تو اس واقعہ کا ذکر کریں گے، لیکن جب موسیٰؑ بیدار ہوئے تو یوشعؑ وہ بات بتانا بھول گئے اور رواروی میں دونوں اس مقام سے آگے بڑھ گئے کہا جاتا ہے کہ جب موسیٰؑ نے یوشعؑ سے فرمایا تھا کہ مچھلی پر نظر رکھو تو یوشعؑ نے فرمایا تھا، یہ کونسی بڑی بات ہے (لیکن اتنی چھوٹی سی بات بھی وہ یاد نہ رکھ سکے) اس لئے تاکید کی جارہی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی انسان کو اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے اور ہر کام میں اللہ کی نصرت اور مدد مانگنی چاہئے۔

دو دریا کے ملنے کی جگہ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کے پاس دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے مل کر سمندر میں گرنے کی جگہ ہے۔ بعض لوگ بحر فارس اور بحر روم کہتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں کسی جگہ نہیں ملتے۔ بعض آفریقہ کے دوسرے دو دریا کہتے ہیں۔ لیکن واقعی کی نوعیت کے پیش نظر یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جس جگہ وہ مچھلی سمندر میں راستہ بنا کر نکل گئی وہی جگہ وہ ہے جہاں بحر نبوت یعنی موسیٰؑ اور بحر ولایت یعنی حضرت خضرؑ ملتے ہیں۔ اللہ نے موسیٰؑ سے "اس عالم" کا پتہ بتایا تھا تو یہی کہا تھا کہ جس جگہ دو دریا ملتے ہیں وہیں وہ ہستی ملے گی۔ تعجب کا مقام یہ بھی ہے کہ جب موسیٰؑ اللہ سے ہم کلام ہونے کیلئے کوہ طور پر گئے، چالیس دنوں میں کچھ بھی نہ کھایا نہ پیا، نہ تھکن کا احساس ہوا، یہاں تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد تھکن کا احساس ہو رہا ہے اور بھوک بھی لگ رہی ہے ایسا کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طور پر جانے کا موسیٰؑ کا جو سفر تھا وہ "سفر طرب" تھا یعنی اللہ سے ہم کلام ہونے کی خوشی تھی اور یہ سفر "سفر طلب" تھا یعنی ایک شخص سے ملنے کی طلب تھی۔ اس لئے تھکن کا احساس بھی ہوا اور بھوک بھی لگی۔

پھر جب دونوں آگے بڑھے تو موسیٰؑ نے یوشعؑ سے فرمایا ہمارا ناشتہ (مچھلی) لاؤ، اس سفر میں ہم کو تکلیف ہو رہی ہے تو اس وقت یوشعؑ نے کہا دیکھئے جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے وہیں میں نے جو دیکھا وہ آپ کو بتانا بھول گیا۔ اور آپ سے اس کا تذکرہ کرنے سے شیطان نے مجھے بھلا دیا اور اس مچھلی نے (زندہ ہو کر) سمندر میں اپنا راستہ عجب طریقے سے

بنالیا۔، موسیٰؑ نے فرمایاوہی تو وہ مقام تھاجو ہم چاہتے تھے۔

(۴۰) يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَـٰنِ عَصِيًّا﴿مریم:۴۴﴾ اے میرے باپ شیطان کی پرستش مت کرو، بے شک شیطان، رحمان کا نافرمان ہے۔

مطلب یہ کہ بتوں کا پوجنا شیطان کے بہکانے سے ہوتا ہے، اور اس سے شیطان خوش ہوتا ہے اور رحمان ناراض۔ پس بتوں کی پرستش گویا شیطان کی ہی پرستش ہوتی ہے۔ اور شیطان تو وہ ہے جس نے آدمؑ کو سجدہ نہ کرتے ہوئے اللہ کی نافرمانی کی ہے۔ تو جس نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس کی پاداش میں مردود اور لعنتی ہوگیا پس کیا یہ بات بنی آدم کیلئے ڈوب مرنے کی بات نہیں ہے کہ جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، وہ اس کے فرماں بردار بن جائیں۔

(۴۱) يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَـٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا﴿مریم:۴۵﴾ اے ابا جان میں ڈرتا ہوں کہ کہیں رحمان (اللہ) کا عذاب تم پر نہ آجائے اس کے بعد تم شیطان کے ساتھی اور دوست نہ بن جاؤ۔ یعنی تم پر جب اللہ کی جانب سے عذاب یا وبال آجائیگا تو لا محالہ تم کو پھر بتوں کی طرف ہی رجوع ہونا پڑیگا بس تم شیطان ہی کے دوست بن جاؤ گے۔

(۴۳) فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ﴿طٰہٰ:۱۲۰،۱۲۱﴾ پس شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا کیا میں تم کو ایسا درخت بتاؤں جس میں سدا کی زندگی ہو اور ایسی بادشاہت بھی جو کبھی فنا نہ ہو، تو دونوں نے اس درخت کا پھل کھالیا تو ان پر ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور اپنے بدنوں پر جنت کے (درخت کے) پتے چپکانے لگے اور آدمؑ نے اپنے رب کا حکم ماننے میں کوتاہی کی اور مطلوب سے بے راہ ہو گئے۔

مطلب یہ کہ اللہ نے جو، ان پر نورانی لباس رکھا تھا حکم کی خلاف ورزی سے اتر گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پورے جسم پر ناخن تھے لیکن خلاف ورزی کے بعد وہ لباس ناخنی چھین لیا گیا، اب صرف ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے سروں پر وہ رہ گیا۔

(۴۴) وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ﴿الحج:۳﴾ بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کی شان کے بارے میں بغیر علم کے جھگڑتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

یعنی کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کی ذات، صفات، اس کے افعال، اس کے احکام، اسکی طرف سے دی جانے والی خبروں کے بارے میں جھگڑتے ہیں، کٹ حجتی کرتے ہیں، چنانچہ قیامت کے تعلق سے، مہدیؑ کی بعثت کے تعلق سے، مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے تعلق سے، جزا، سزا، میزان، پل صراط، جنت و دوزخ کے بارے میں، شکوک و شبہات پھیلاتے

ہیں، یا آدمیوں یا جنات میں سے جو شیطان اپنی طرف بلائے تو اسکی طرف لپکتے ہیں اسی کی بات کو صحیح سمجھتے ہیں اور اسی کی راہ پر چل پڑتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوزخ کا ایندھن بن جاتے ہیں۔

(۴۵) وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴿الحج:۵۲﴾ (اے رسول) آپ سے پہلے کوئی رسول یا کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا کہ جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اسکی آرزو میں وسوسہ (اپنی جانب سے) ڈال دیتا تھا۔ تو جو وسوسہ شیطان ڈالتا تھا اللہ دور کر دیتا تھا، پھر اللہ اپنی آیتوں کو محکم اور مضبوط کر دیتا تھا اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسروں کے درمیان کچھ اختلاف ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ کے ذریعہ جو وحی نازل فرمائی ہے تو اسمیں کسی شیطان کی جانب سے درمیان میں کچھ ملاوٹ کرنے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جبرئیلؑ امین ہیں اور خود آنحضرت ﷺ بھی امین ہیں اور تیسری بات ہے کہ رسول اللہؐ کی بعثت کے بعد جب شیاطین کی آسمانوں پر پرواز منقطع ہو گئی اور اگر کوئی پہلے آسمان تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو شہاب ثاقب کے ذریعہ اسکو بھگا دینے یا جلا دینے کی محکم بات قرآن شریف میں آگئی ہے تو یہ خیال بھی محض ایک وسوسہ ہے جو کہ باطل ہے کہ اس وحی الٰہی میں شیاطین اپنی طرف سے کچھ ملا دیتا ہے، ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وحی اپنی جگہ قطعی ہے اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اس وحی کی ذریعہ اگر کوئی واقعہ نہ کے حکم بیان کیا جا رہا ہے تو یہ واقعہ کب وقوع پذیر ہو گا، اس کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ کی تمنا اور اللہ کی منشاء کے وقت بھی اختلاف ہو سکتا ہے تو یہ اختلاف اصل وحی یا وحی کے الفاظ میں نہیں ہو گا بلکہ اس کے وقوع کی مدت اور وقت میں ہو گا مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ مکہ مکرمہ تشریف لیگئے اور عمرہ ادا کر رہے ہیں، لیکن آپ نے سمجھا شاید اسی سال ہو گا، آپ تشریف بھی لیگئے لیکن حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا، آپ واپس تشریف لائے پھر دوسرے سال آپ نے عمرہ ادا کیا، یہ فرق وحی کے الفاظ کا نہیں ہو گا بلکہ اس کے اظہار کے وقت میں ہو گا یعنی وہ بات کب meteralise ہو گی؟ بعض لوگوں نے اپنی طرف سے ایک دور کی کوڑی لائی اور کہا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا ہے، چنانچہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سورۂ والنجم کی آیت "أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ" پڑھی تو درمیان میں شیطان نے آواز لگائی "تلك الغرانيق العلىٰ و ان شفاعتهنّ لترتجىٰ"۔ اس سورہ کے آخر میں آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا تو مشرکین نے بھی سجدہ کیا کہ اس میں ان کے معبودوں کا اچھائی کے ساتھ ذکر ہوا ہے، اور جب یہ بات پھیلی تو آپؐ کو حضرت جبرئیل کے ذریعہ معلوم کر دیا گیا کہ وحی الٰہی کیا ہے اور شیطانی وسوسہ کیا تھا۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بالکل بے کار ہے۔ کیوں کہ پیغمبروں پر شیطانوں کا تسلط نہیں ہو سکتا، وہ تو اسی وجہ سے معصوم کہلاتے ہیں پھر آنحضرتؐ کا مقام تو بہت بلند ہے اتنا بلند کہ آپ کا شیطان

مسلمان ہو گیا تھا آنحضرت ﷺ نے خود فرمایا "اسلم شیطانی" میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے اور جب اللہ نے یہ فرمایا" إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ﴿الحجر:۴۲﴾ "جب عام (مقبول) بندوں کے حق میں اللہ یہ بات فرمارہا ہے تو حضورؐ کی شان کے کیا کہنے، وحی، تبلیغ اور امور دین میں شیطانوں اور جنوں کا ہرگز پیغمبروں پر تسلط نہیں ہو سکتا، ۱۹۸۸ء میں اسی روایت کو بنیاد بنا کر ہندوستانی نژاد ایک برطانوی شہری نے جس کا نام سلمان رشدی ہے اور جس کی بیوی انگریز ہے 'شیطانی آیات (satanic versus)' نامی ایک ناول لکھی جس میں اسلام، حضور اقدسؐ، آپؐ کی ازواج مطہرات، کعبۃ اللہ اور قرآن شریف کی زبردست توہین کی گئی۔ اس کتاب پر انگریزوں کی طرف سے اس کو ایک بڑا انعام بھی دیا گیا، دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا، حکومت ہند نے اس کتاب کے یہاں داخلے پر پابندی لگادی۔ اور دوسرے مسلمان ملکوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایران نے تو اس مصنف کو واجب القتل قرار دے دیا اور آج تک وہ کتاب مطرود اور اس کا مصنف ملعون ہے۔

اور اگر کسی کو اصرار ہو کہ جب آیت میں صاف یہ بات ہے کہ شیطان، رسول اللہؐ کے پڑھنے میں اپنے طرف سے کچھ ملا دیا کرتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین کی عادت تھی کہ جب آپؐ قرآن پڑھتے اور سناتے تھے تو وہ مشرکین اپنے ساتھیوں سے کہتے تھے کہ شور و غوغا کرو (الغوفیہ) کے الفاظ قرآن میں آئے ہیں تاکہ مسلمانوں کو ٹھیک طور پر وہ آیات سنائی نہ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ سورہء نجم کی آیتوں کی تلاوت کے وقت مشرکین اکٹھا ہو کر گڑبڑ کر رہے ہوں اور جب حضورؐ نے پڑھا "أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ" تو شیطان نے درمیان میں آواز میں آواز ملا کر یا اسی آواز میں یہ بھی پڑھ دیا ہو "تلك الغرانيق العلىٰ و ان شفاعتهن لترتجىٰ" (وہ بڑے بت (معبود) ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے) (نعوذ باللہ)۔ اس کو وحی میں ملاوٹ کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ چونکہ یہ شیطانی حرکت تھی تو اللہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جب رسول پڑھتے ہیں تو شیطان اسی آواز میں اپنے طرف سے اسی وزن میں کچھ ملا کر آواز لگا دیتا ہے لیکن اللہ کہتا ہے کہ اللہ، شیطان کی آواز اور اس کے کلمات جو باطل ہیں ان کو منسوخ ہی نہیں بلکہ محو کر دیتا ہے اور اپنی وحی کے الفاظ کو محکم اور مضبوط کرتے ہوئے اعلان کر دیتا ہے کہ وہ جو تم نے سنا تھا وہ شیطان کی آواز اور اس کے کلمات تھے۔ ہماری وحی اپنی جگہ برحق ہے۔ اسی حقیقت کو اللہ اس طرح بیان فرماتا ہے " فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ" اب رہا یہ سوال کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو اپنے مخلص اور باایمان بندوں کی آزمائش مقصود ہے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ایمان میں پکے ہیں اور کون ایسے ہیں جن کے دل میں نفاق کی بیماری ہے اور کون ہیں وہ جن کے دل سخت ہیں۔

(۴۶) لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي

شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ الحج:۵۳﴿ (اور یہ اس لئے ہوا) تاکہ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسہ کو اللہ ایسے لوگوں کیلئے آزمائش بنادے جن کے دل میں نفاق کی بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور ظالم پرلے درجے کی مخالفت میں ہیں۔اس کا بیان اوپر کی آیتوں میں ہو چکا ہے۔

(۴۷،۴۸) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَن يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ﴾ نور:۲۱﴿ اے ایمان والوں شیطان کے نقش قدم کی پیروی مت کرو اور جو شخص شیطان کے نقش قدم کی پیروی کرتا ہے تو وہ ہمیشہ بے حیائی اور برائی کو حکم دیتا ہے۔

(۴۹) لَّقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا﴾ الفرقان،۲۹﴿ اس نے میرے پاس نصیحت آنے کے بعد مجھے بہکادیا اور شیطان آدمی کو دغا دینے والا ہے۔یعنی شیطان کا کام آدمی کو دھوکہ دینا اور رسوا کرنا ہوتا ہے۔

(۵۰) وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴾ نمل:۲۴﴿ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے انکے اعمال کو ان کی نظر میں آراستہ کر دیا ہے اور انکو (صحیح) راستے سے روک رکھا ہے پس وہ راہ نہیں پاتے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ سلیمانؑ نے اڑنے والی ایک فوج کا جائزہ لیا، ہدہد نظر نہ آیا فرمایا کیا بات ہے ہدہد کو میں نہیں دیکھتا آیا پرندوں کے جھنڈ میں مجھے نظر نہیں آتا یا حقیقت میں غیر حاضر ہے، پرندوں سے حضرت سلیمانؑ مختلف کام لیتے تھے مثلاً ہوائی سفر میں ان کے پر باندھ کر اوپر سایہ کرتے ہوئے جانا یا ضرورت کے وقت پانی وغیرہ کی کھوج لگانا یا نامہ بری کرنا وغیرہ۔ ممکن ہو اس وقت ہدہد کی خاص ضرورت پیش آئی ہو مشہور ہے کہ جس جگہ زمین کے نیچے پانی قریب ہو ہدہد کو محسوس ہو جاتا ہے، ہدہد کے تعلق سے یہ بھی مشہور ہے کہ زمین میں جس جگہ مٹی کے نیچے کیچوا ہو تو اسے محسوس ہوتا ہے اور وہ زمین کھود کر اسے نکال لیتا ہے۔ بہر کیف تھوڑی دیر کے بعد وہ آیا اور کہا کہ میں ایسی خبر لایا ہو جس کی آپ کو اطلاع نہیں ہے یعنی میں آپ کے پاس سبا سے ایک قوم کی خبر لایا ہوں، سبا ایک قوم کا نام ہے، تفصیل یہ بتائی کی اس قوم کی ملکہ ہے جو ان پر حکومت کرتی ہے اور اس ملکہ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے، حسن، جمال، مال و منال، حکومت، فوج، اسلحہ سامان وغیرہ سب کچھ ہے اور اس کا ایک تخت بھی ہے جو عظیم بھی ہے اور بے نظیر بھی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم مشرک اور آفتاب پرست ہے۔ بے جا رسوم و بدعات میں وہ گھرے ہوئے ہیں لیکن شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کی نظر میں خوشنما بنا دیا ہے اس لئے وہ راہ ہدایت سے بے بہرہ ہیں۔ گویا ہدہد نے سلیمانؑ کو اس کی طرف دعوت اسلام و ایمان کی ترغیب دی۔

(۵۱)فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿القصص:۱۵﴾ پھر موسیٰ نے اس کو مکہ مارا اور اس کا کام تمام کر دیا کہا یہ شیطان کا کام ہے بے شک وہ دشمن ہے اور صریح بہکانے والا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز دیکھا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں ایک اسرائیلی اور دوسرا قبطی، اسرائیلی نے موسیٰؑ کو دیکھ کر فریاد کی کہ مجھے اس قبطی کے ظلم سے چھڑاؤ۔ کہتے ہیں قبطی فرعون کے مطبخ کا آدمی تھا۔ موسیٰؑ پہلے سے ہی قبطیوں کے ظلم و ستم کو جانتے تھے اس وقت اپنی آنکھوں سے اس کا ظلم دیکھ کر آپ کی رگ حمیت بھڑک اٹھی ممکن ہو موسیٰؑ کے سمجھانے بجھانے پر بھی اس نے موسیٰؑ کو بھی سخت سست سنایا ہو، غرض موسیٰؑ نے اس کی گوش مالی کے طور پر ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ ایک ہی گھونسہ میں وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ موسیٰؑ کو کیا معلوم تھا کہ وہ ایک گھونسہ سے ہی مر جائیگا۔ افسوس کیا کہ ناحق خون ہو گیا۔ اور زبان سے کہا تو یہی کہ اس عمل میں شیطان کا دخل ہے۔ اور اللہ فرما رہا ہے کہ بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن بھی ہے اور گمراہ کرنے والا بھی ہے۔

(۵۲) وَعَادًا وَثَمُودَ وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ﴿عنکبوت:۳۸﴾ اور ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو اور یہ بات ان کے گھروں سے (جو تباہ ہو چکے ہیں) تم پر ظاہر ہو چکی ہے، اور شیطان نے انکے اعمال (بد) مستحسن کر کے دکھایا اور انکو سیدھے راستے سے روک دیا، حالانکہ وہ ہشیار تھے۔

یعنی وہ دنیوی معاملات میں ہشیار تھے اور عقل مند بھی، لیکن مذہبی معاملات میں شیطان کی مار میں آ گئے تھے۔ اور سیدھے راستے پر نہ آ سکے۔

(۵۳) وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿لقمان:۲۱﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی اتباع کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو چلیں گے اس پر جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے اگرچہ شیطان ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلاتا ہے۔

مطلب یہ کہ جب ان کو صحیح راستے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم تو اپنے باپ دادوں کی اندھی تقلید کریں گے، دیکھو یہ نادان کس کا مقابلہ کس سے کر رہے ہیں۔ کلام اللہ کا مقابلہ جہلاء کے فعل سے۔ اللہ کا کلام سلامتی کی طرف بلاتا ہے، جہلاء کا فعل دوزخ کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

(۵۵)إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ﴿فاطر:۶﴾ بے شک شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے پس اسکو دشمن سمجھتے رہو۔

(۵۶) أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿یس:۶۰﴾ اے اولاد آدم،

کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرو وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ یعنی شیطان کے وسوسوں کی اتباع کرتے ہوئے اللہ کی نافرمانی مت کرو کیوں کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

(۵۷) إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِّن كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ﴿الصّٰفّٰت:٦،٧﴾ ہم نے آسمان دنیا کو کواکب کی زینت سے آراستہ کیا اور شیطان سرکش سے اسکی حفاظت کی۔ یعنی شیاطین اب عالم بالا کی طرف کان بھی نہیں لگا سکتے اور ہر طرف سے وہ مار کر دھکے دیے جاتے ہیں اور وہاں ان کیلئے دائمی عذاب ہوگا، بجز اس صورت کے جو کوئی فرشتوں کی کسی بات کو چوری چھپے جھپٹ لے تو جلتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

(۵۸) وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ﴿ص:٤١﴾ اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے۔ اس آیت کے ذریعہ آداب سکھلائے جارہے ہیں، ہمارا اعتقاد تو یہی ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ کے حکم سے ہی ہوتا ہے لیکن بزرگوں اور خاصان خدا کی بات ہی اور ہے۔ ان کے یہ آداب ہیں کہ جب کوئی اچھا کام ان سے ہوتا ہے یا ان کو خوشی، کامیابی منفعت یا صحت ملتی ہے تو اسکی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرتے ہیں، اس کے بر خلاف کوئی اذیت، تکلیف، رنجش اور بیماری ہوتی ہے تو اس کی نسبت شیطان کی طرف کرتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں شاید مجھ سے کچھ، بے احتیاطی یا بے اعتدالی اور اللہ کی نافرمانی ہوگئی ہے اور اس کا سبب شیطان ہی ہوسکتا ہے تو اسکو شیطان ہی کی کارستانی سمجھتے ہیں یہاں بھی ایوبؑ نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

(۵۹) وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿فصلت:٣٦﴾ اور اگر شیطان کیطرف سے آپ کو کچھ وسوسہ آنے لگے تو آپ اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اچھائی اور برائی برابر نہیں ہوتے برائی کو اچھائی کے ذریعہ دفع کرنا چاہئے یعنی غیض و غضب کی حالت میں صبر کرنا، جہل کا مقابلہ علم کے ذریعہ کرنا، برائی کا جواب عفو سے دینا چاہئے۔ یہ اللہ کا حکم تھا جو اوپر درج کردہ آیت میں دیا گیا تھا۔ اب اللہ یہ کہتا ہے کہ اگر شیطان یہ وسوسے پیدا کرے کہ یہ کیا بات ہوئی تم کو چاہئے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں تو آپ اس کا شکار نہ ہوجائیں بلکہ اللہ کی پناہ میں آجائیں اور اللہ سے اسی بات کی دعا کریں کہ اے اللہ، میں شیطان مردود سے تیری پناہ مانگتا ہوں، بے شک اللہ آپ کی دعا بھی سنتا ہے اور آپ کے دل کی حالت کو بھی جانتا ہے۔

(۶۰) وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿الزخرف:٦١، ٦٢﴾ اور وہ (عیسیٰؑ) تو قیامت کی ایک نشانی ہیں (اے لوگو) اس میں شک نہ کرو اور میری اتباع کرو۔ اور یہی سیدھا راستہ ہے اور کہیں شیطان تمہیں روک نہ دے، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں فرمارہا ہے کہ وہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، حضرت عیسیٰؑ یوں بھی اللہ کی نشانی کئی اعتبارات سے ہیں۔

(۱) ان کی پیدائش ہی عجیب وغریب طریقہ سے ہوئی یعنی بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔

(۲) ان کا آسمان پر اٹھالیا جانا بھی عجیب طریقہ سے ہوا۔

(۳) وہ جب دوبارہ زمین پر آئیں گے تو وہ بھی عجیب طریقہ سے ہوگا۔

(۴) بلکہ وہ تو قیامت کی نشانی ہیں یعنی جب ان کا نزول ہوگا تو سمجھ لو کہ قیامت قریب آچکی ہے۔ چناچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ’’قریب ہے کہ تم میں عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے، حاکم اور عادل کی حیثیت سے وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو موقوف کردیں گے‘‘، دوسری روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ دجال کو قتل کریں گے۔ پھر اسکے بعد زمین میں چالیس سال رہیں گے پھر وصال فرمائیں گے اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔

(۶۱) إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ﴿محمد: ۲۵﴾ جو لوگ پیٹھ دیکر پھر گئے بعد اس کے کہ ان پر ہدایت ظاہر ہوچکی، شیطان نے انکو یہ کام آسان کردیا اور انہیں دور کی کوڑی بتادی ہے۔ مطلب یہ کہ منافقین اسلام کا اقرار کرنے کے بعد وقت آنے پر منھ پھیر لیتے ہیں اور جنگ میں شریک نہیں ہوتے کیوں؟ اس لئے کہ شیطان ان کو پٹی پڑھاتا ہے کہ جنگ میں جاؤ گے تو مرجاؤ گے اور نہ جاؤ گے تو لمبی عمر پاؤ گے۔ اس طرح شیطان انکو دور دراز کے وعدہ کرتا ہے اور راہ حق سے دور کردیتا ہے۔

(۶۲) إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴿مجادلہ: ۱۰﴾ یہ کانا پھوسی شیطان کا کام ہے تاکہ ایمان والے رنجیدہ ہوجائے اور اللہ کی اجازت کے بغیر (یہ شیطان) ان کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اس آیت کے ذریعہ اللہ یہ بتلارہا ہے کہ منافقین کی سرگوشی کا مقصد مسلمانوں کو رنج پہنچانا، پریشان کرنا اور ذہنوں میں تناؤ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ چناچہ وہ سوچنے لگتے ہیں یہ ہمارے بارے میں کیا کرنے والے ہیں اللہ ان مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی سازش کا شکار ہوکر ایسا کررہے ہیں۔ لیکن یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے کیوں کہ نفع ونقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کی اجازت کے بغیر یہ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اور جب تم مومن ہو تو بس اللہ پر بھروسہ کرو۔ اور جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اللہ ان کو نامراد نہیں کرتا۔

(۶۳) اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ

الْخَاسِــــرُونَ ﴾مجادلہ:۱۹﴿ شیطان نے ان پر اپنا قبضہ جمالیا ہے اور اللہ کو یاد کرنا ہی بھلا دیا ہے یہ لوگ شیطان کا لشکر ہیں، آگاہ ہو جاؤ کے شیطان کا لشکر ہی نقصان اٹھانے والا ہے۔

اس آیت میں شیطان کا لفظ تین مرتبہ آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے دل ودماغ پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے اسے کچھ یاد نہیں رہتا یہاں تک کہ وہ خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ دنیا اور خصوصاً آخرت میں ذلت اور ناکامی ان کے حصہ میں آتی ہے اور نجات کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

(۶۴) كَمَثَلِ الشَّــيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَـانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّــــهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴾حشر:۱۲﴿ شیطان کی سی مثال ہے ان لوگوں کی جو انسان سے کہتا رہا کہ کافر ہو جا، پھر جب وہ کافر ہو گیا تو کہنے لگا مجھے تجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو رب العالمین ہے۔

یہ بتانا مقصود ہے کہ شیطان بھڑکانے کی حد تک ساتھ دیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ وہ پوری طرح چنگل میں پھنس گیا ہے تو اس سے الگ ہو جاتا ہے اور صاف کہدیتا ہے کہ مجھے تم سے کیا واسطہ، اب تم خود بھگتو، چنانچہ جنگ بدر میں کافروں کو ورغلایا اور میدان جنگ میں ساتھ رہا، جب مسلمانوں کی مدد کیلئے آئے ہوئے فرشتوں کو دیکھا تو بھاگ گیا، اسی طرح یہودیوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا۔ جب یہودیوں کو جلاوطن کر دیا گیا تو صاف الگ ہو گیا۔

(۶۵) وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴾تکویر:۲۵﴿ اور وہ مردود شیطان کا کلام نہیں ہے۔

یہاں اللہ قرآن شریف کی حقیقت بیان کر رہا ہے چنانچہ کہتا ہے کہ قرآن معزز فرشتہ کے ذریعہ بھیجا ہوا کلام ہے، جو صاحب قوت عرش کے مالک کے پاس اونچے درجہ والا ہے اور وہاں جس کا حکم مانا جاتا ہے اور پھر امانت دار ہے۔ شیطاناً دو جگہ آیا ہے اور شیاطین ۱۷ جگہ آیا ہے اور شَيَاطِينِهِمْ ایک جگہ آیا ہے۔

شفاعت

شفاعت کے تعلق سے قرآن مجید میں جو آیتیں آئی ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اور سفارش کرنے والے درخواست کرسکتے ہیں۔ لیکن اس درخواست کو صرف اللہ ہی قبول کرسکتا ہے، یاوہ درخواست بھی اللہ کی منظوری ہی سے کی جاسکتی ہے۔ جیساکے اللہ نے فرمایا" لِّلَّـهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا﴿الزمر:۴۴﴾"۔ سفارش (کی درخواست کو قبول کرنے) کا حق پورے کا پورا اللہ ہی کیلئے ہے۔

نیز یہ بھی قابل غور ہے کہ قیامت کے ہنگامہ پرور دن جب سب کے سب اللہ کے دربار میں حیران وپریشان رہیں گے، سب کو اپنی ہی نجات کی فکر لگی رہے گی، وہاں سب اپنے ہی پسینے میں غرق ہوں گے، اور ہر ایک کی یہی تمناہوگی کہ آج مجھے چھٹکارامل جائے۔ تو اس صورت حال میں کون کس کی طرف دیکھے گا اور کس کی سفارش کی طرف دھیان دے گا۔

ہاں اللہ کے جو محبوب بندے ہوں گے اور جو اللہ کے فضل بے پایاں سے نجات پا چکے ہوں گے وہ البتہ اللہ سے دوسروں کے بارے میں درخواست کرسکتے ہیں وہ بھی اللہ کی اجازت سے۔ اور جب اللہ اجازت دے گا تو ان کی درخواست بھی مقبول بارگاہ خداوندی ہوگی۔ ورنہ۔"اوخویشتن گم است کرار ہبری کند" والی مثال صادق آئے گی۔

البتہ حضور پر نور خاتم النبیین محمد مصطفی ﷺ کا معاملہ نرالہ، انوکھا اور منفرد ہوگا۔ اس لئے کہ آپ معصوم ہیں، تو آپ کو سفارش کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ حدیہ ہوگی کہ جملہ انبیاء بھی لوگوں کو حشر کے دن آپ ہی کے آستانے کی طرف رہبری کریں گے۔ عالم یہ ہوگا کہ ساری مخلوق، رحم وکرم کی بھیک حاصل کرنے کے لئے اللہ کی طرف متوجہ رہے گی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب کی طرف متوجہ ہوگا کہ، "بتا تیری رضا کیا ہے"۔ اسی طرح حضرت خاتم ولایت محمدیہ ﷺ بھی معصوم عن الخطا کی حیثیت سے بحکم خداوبہ اتباع محمد ﷺ شفاعت کریں گے۔

شفاعت: صلاح الارواح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے دس شفاعتیں ہیں۔ (۱) شفاعت عامہ (۲) ایک قوم کو دوزخ میں داخل ہونے سے نجات کی شفاعت (۳) دوزخ سے ایک قوم کو نکالنے کے بارے میں شفاعت (۴) ایک قوم کو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہونے کے بارے میں شفاعت (۵) جنت میں ایک قوم کے درجات میں زیادتی کے بارے میں شفاعت (۶) اپنے چچا ابو طالب کے تعلق سے تخفیفے کے بارے میں شفاعت (۷) اس شخص کے بارے میں شفاعت جس نے آپ ﷺ کی قبر کی زیارت کی (۸) بعض گنہ گاروں کو دوزخ سے نکالنے کے متعلق شفاعت (۹) مسلمانوں کے بچوں کے بارے میں شفاعت۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی امت کے حق میں شفاعت کا تعلق ہے، اس سے شاید ہی کوئی انکار کر سکتا ہے۔ لیکن بعض دوسروں کی جانب سے شفاعت کا سختی سے انکار کرتے ہیں، لیکن ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "شفاعت کرنے والے پیغمبر، فرشتے، شہداء، صالحین اور مومنین ہیں۔ لیکن چار طبقہ دوزخ میں رہ جائیں گے، جن کو کوئی شفاعت کام نہ دے سکے گی۔ یہ کہکر ابن مسعودؓ نے یہ آیت پڑھی، جس میں کہا گیا ہے کہ جب مجرموں سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے ہو تو وہ جواب دیں گے۔ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿المدثر:۴۳ تا ۴۶﴾ ترجمہ: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور باطل والوں کے ساتھ ملکر (حق کا) انکار کرتے تھے اور ہم قیامت کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ قرآن شریف میں ان آیات کا ذریعہ شفاعت سے محروم طبقات کا ذکر فرمایا ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی شفاعت ہی نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ زخرف میں ارشاد فرمایا ہے کہ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿الزخرف:۸۶﴾ اور جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے سوائے انکے جو علم و یقین کے ساتھ حق کی گواہی دیں گے۔ گویا علم و یقین کے ساتھ حق کی گواہی دینے والوں کیلئے سفارش کا حق رکھتے ہیں۔

لیکن بعض لوگ اپنی ناسمجھی سے قرآن کی ایک یا دو آیتوں سے استدلال کرتے ہوئے شفاعت کی عمومی نفی کرتے ہے اور یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿البقرة:۱۲۳﴾ ترجمہ: اور ڈرو اس دن سے جب کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئیگا اور نہ اس سے کوئی بدلہ قبول کیا جائیگا اور نہ کسی کی سفارش کچھ کام دے گی اور نہ انکی کسی طرح سے مدد کی جائیگی۔

حالانکہ اس آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں، اور اس سے پہلے جو آیت ہے اس میں اللہ نے ان ہی سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿البقرة:۱۲۲﴾ اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تم کو نوازا، اور یہ کہ میں نے تم کو تمام جہاں والوں پر فضیلت بخشی۔

اسکے بعد اور اسکے ساتھ ہی اللہ ان سے فرمارہا ہے کہ "اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کام نہ آئیگا، نہ کسی بدلہ قبول ہوگا اور نہ کسی کی سفارش کام آئیگی اور نہ کسی کی مدد کی جائیگی۔ چونکہ بنی اسرائیل، حضور ﷺ کا انکار کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہمارہ پیچھے بڑی بڑی قوتیں ہیں، وسائل ہیں، حمایتی ہیں جو ہم کو قیامت کے دن ہماری شفاعت کریں گے اور ہم کو بچالیں گے تو اللہ

تعالیٰ ان سے فرمارہاہے کہ تمہاری سوچ غلط ہے، وہ دن ایسا ہے کہ حق کا انکار کرنے والوں کی کوئی مدد نہ ہوگی، کوئی سفارش کام نہ آئیگی، تم خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہو اس لئے بیدار ہو جاؤ اور حقیقت کا انکار نہ کرو۔ کیوں کہ شفاعت پوری کی پوری اللہ کے ہاتھ اور اس کے اختیار میں ہے۔ وہ شفاعت کا حق جس کو چاہے گا دیگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں، پیغمبروں شہداء، علماء، حفاظ، صالحین اور معصوموں کو شفاعت کا حق دیا ہے۔

شَرَط

" شرط" عربی زبان میں دو طرح سے آتا ہے اور اس صورت میں اسکے معنی بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔

ایک "شَرُط" (سکون راء سے) اسکے معنی ہیں ایک چیز کو دوسرے کے ساتھ وابستہ کرنا۔ کہا جاتا ہے اگر یہ ہو گا تو ایسا ہو گا، اسکی جمع "شروط" ہے۔ اور دوسرا "شَرَط" (راء کو زبر دیکر) اسکے معنی علامت اور نشانی کے ہیں اور اسکی جمع "اشراط" ہے۔

پس اشراط ساعۃ (قیامت) کے معنی قیامت کی نشانیوں کے ہیں۔ اور علماء کرام نے اشراط ساعۃ کی تفسیر ان چھوٹے امور سے کی ہے جو قیامت ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہوتے ہیں، مثلاً، لونڈی کا اپنے آقا کو جننا، لمبے چوڑے مکانوں کی تعمیر، کثرت جہل وزنا، شرب خمر، مردوں کی قلّت اور عورتوں کی کثرت، امانتوں کا ضائع کرنا اور جنگوں کی کثرت۔

اور اشراط ساعۃ کی اس طور پر تفسیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ علامات کبریٰ جو متّصل قیامت واقع ہوں گے، ان کا دوسرے باب میں ذکر کیا جائیگا۔ (کتاب الفتن، باب اشراط الساعۃ، فصل ا، ص ۱۳۳۱۔ اشعۃ اللمعات ترجمہ مشکوٰۃ جلد رابع)

حضرت مہدی علیہ السلام کا ذکر ان علامات میں ہے جو علامات صغریٰ کہلاتے ہیں یعنی جو قیامت سے "پہلے" ظاہر ہوں گے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ان علامات میں ہے جو علامات کبریٰ کہلاتے ہیں یعنی جو قیامت سے "متصل" ہیں۔ جب یہ نکتہ اور حقیقت ذہن نشین ہو جائے گی تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو گا کہ مہدی اور عیسیٰ علیہم السلام کا ایک زمانے میں اجتماع ہو گا۔

شطحیات یا شطحات

تصوف میں شطحات یا شطحیات (شطح کی جمع) ان خاص کلمات یا اقوال کو کہتے ہیں جو مغلوب الحال صوفی کی زبان سے عالم سکر یا فنا یا ذوق و مستی کی حالت میں نکلتے ہیں۔ بعض بزرگ اس حالت کو "جمع الجمع" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کلمات کی ادائی کے وقت صوفی عام طور پر آداب شریعت کا لحاظ نہیں رکھ پاتا، اسلئے یہ کلمات غیر شرعی دعووں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلا الوہیت یا ربوبیت کا دعویٰ کرنا، اپنے آپ کو پیغمبروں پر فوقیت دینا۔، تخلیق عالم کے سلسلے میں اپنی ذات کو محرک قرار دینا یا قرآن یا کعبہ کے بارے میں توہین آمیز باتیں کرنا، ان غیر معمول دعووں نے علماء اور اصحاب فتویٰ کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہے۔ دونوں طبقوں میں ایک چپقلش پیدا ہوتی رہی، کٹر ملاؤں اور مفتیوں نے ان کی سرزنش کی اور ان کے خلاف فتوے صادر کئے۔ ان کو کافر کہا گیا، ان کے قتل کے فتوے بھی دئے یا ان کو سولی پر لٹکایا گیا۔ مگر صوفیاء محققین نے ان کی طرف سے دفاع کیا، انکے اقوال کی تاویل کی اور ان کی طرف سے دفاع کیا تو شرعی احکام کا سہارا لیکر ہی کیا۔

جن صوفیاء کرام کا نام شطحیات کے سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں (۱) بایزید بسطامیؒ (۲) حسین بن منصور حلاجؒ (۳) ابو بکر بن عبد اللہ نساجی طوسیؒ (۴۸۷) (۴) شیخ احمد غزالیؒ (۵) سہل بن عبد اللہ تستریؒ (۶) ابو بکر واسطیؒ (۷) ابو بکر شبلیؒ (۸) شیخ ابو الحسن خرقانیؒ (۴۶۵ھ) وغیرہم۔ ان شطحیات کے مرتکب صوفیاء کی تعداد اوپر بیان کردہ فہرست سے کہیں زیادہ ہے۔ ذیل میں چند شطحیات کا ذکر کیا جاتا ہے

(۱) **تاللہ ان لوائی اعظم من لواء محمد ﷺ**۔ خدا کی قسم میرا جھنڈا، محمدؐ کے جھنڈے سے بڑا ہے۔

(۲) **خضت بحراً وقف الأنبیاء علی ساحله**۔ میں نے سمندر میں غوطہ لگایا انبیاء جس کے ساحل پر کھڑے ہیں (النور من کلمات ابی طیفور مشمولہ شطحیات الصوفیہ)

(۳) شیخ سے لوگوں نے کہا کہ کہتے ہیں کہ لوح محفوظ میں ہر چیز موجود ہے، انہوں نے جواب دیا "لوح محفوظ میں ہی ہوں"

(۴) شیخ کے متعلق منقول ہے کہ ان کے گھر ایک آدمی آیا اور دروازہ پر دستک دی، اندر سے آواز آئی کس کی تلاش ہے؟ آدمی نے کہا کہ میں بایزید کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اس پر شیخ نے اندر سے جواب دیا "چلے جاؤ گھر میں خدا کے سوا کوئی نہیں ہے"۔

(۵) ایک شخص نے ان کے سامنے قرآن کی آیت پڑھی "ان بطش ربک لشدید"۔ بے شک خدا کی پکڑ مضبوط ہے۔

یہ سن کر بایزید نے کہا ”و حیاته ان بطشي اشد من بطشه “۔قسم ہے اسکی میری پکڑ اس کی پکڑ سے بھی زیادہ سخت ہے۔

(۶) ایک دن فجر کی نماز پڑھ کر اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔”إنّي انا لا إله إلّا انا فاعبدون“۔میں میں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو۔ یہ سن کر لوگوں نے انہیں مجنون کہا اور چھوڑ دیا(تلبیس ابلیس، ص ۳۴۵۔ تذکرۃ الاولیاء، ص۸۷)

(۷)”سبحاني، سبحاني، ما أعظم شاني“۔پاک ہے میری ذات، پاک ہے میری ذات، میری شان کتنی بلند ہے۔

(۸) حسین بن منصور حلاجؒ کے شطحات۔ تاریخ میں شاید ہی کسی انسان کو اپنے قول کی اتنی بھاری قیمت چکانی پڑی جتنی کہ حلاج کو، اس الم رسیدہ شخص کو ان کے اقوال کی پاداش میں سولی دی گئی۔ جو شطحات کے ذیل میں آتے ہیں، ان شطحات کو بھی ایک طویل فہرست ہے جو مسلمان مورخوں نے فراہم کی ہے۔(مطالعہ تصوف، ص۴۱۷) ابن جوزی کے یہ قول اس نے پہلے نبوت کا دعویٰ کیا اور بعد میں خدائی کا، اس کے دعوی ربوبیت کے ثبوت میں شطحیہ کلمہ ”انا الحق“پیش کیا جاتا ہے۔

(۹) شیخ ابوالحسن نوری سے بھی شطحات منقول ہیں۔ غلام خلیل نے شیخ نوری کے خلاف یہ الزام لگایا تھا کہ وہ کہتے ہیں ”میں اللہ سے عشق کرتا ہوں اور وہ مجھ سے عشق کرتا ہے“ اس کا جواب نوری نے یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی قرآن میں کہا ہے ”يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ“۔

(۱۰) شیخ جنید بغدادیؒ کے شطحات: اگرچہ صوفیوں میں شیخ بغدادی کا مقام انتہائی بلند ہے، لیکن ان سے بھی شطحات نقل کئے گئے ہیں۔ ان کا ایک مشہور شطح اس طرح منقول ہے۔ليس في جبتي سوى الله۔میرے جبہ میں سوائے اللہ کے کچھ نہیں ہے۔

(۱۱) ابو بکر شبلیؒ: ایک آدمی نے ان سے پوچھا آپ کون ہیں ؟ تو شیخ شبلی نے جواب دیا۔”النقطة التي تحت الباء“۔میں وہ نقطہ ہوں جو (بسم اللہ) کی ’ب‘ کے نیچے ہے۔ شیخ سہل بن عبد اللہ تستریؒ بھی شطحات کیلئے مشہور ہیں، ان کا مشہور شطح ہے کہ ”میں اپنے وقت کے اولیاء کیلئے حجت ہوں (shorter encyclopedia of islam ,p.533) “

ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ”وہ کہا کرتے تھے کہ بندہ پر ہر سانس کے ساتھ توبہ فرض ہے“

ایک مرتبہ سلطان محمود غزنوی نے آپ کو دربار میں طلب کیا اور قاصد سے کہا اگر وہ آنے سے معزوری ظاہر کریں تو انکو قرآن کی آیت ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ﴿النساء:۵۹﴾“ پڑھ کر سناؤ۔ نے بادشاہ کا پیغام سنایا

تو شیخ نے آنے سے معذوری ظاہر کی تو قاصد نے قرآن کی مذکورہ آیت سنائی، تو شیخ نے کہا ”محمود سے کہو میں أَطِيعُوا اللَّـهَ میں ایسا مستغرق ہوں کہ أَطِيعُوا الرَّسُولَ ہی سے شرمندہ ہوں اور أُولِي الْأَمْرِ کی بات ہی نہیں۔

پھر ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان کے سامنے قرآن کی یہ آیت پڑھی ”ان بطش ربک لشدید (البروج)“ بے شک تمہارے رب کی پکڑ سخت ہے۔ یہ سن کر شیخ خرقانی نے کہا ”میری پکڑ تو اس پکڑ سے بھی سخت ہے۔ وہ دنیا اور اہل دنیا کو پکڑتا ہے اور میں اس کے دامن کبریائی کو پکڑتا ہوں۔ ان کا سب سے عجیب و غریب شطح یہ ہے کہ ”میں خدا سے صرف دو سال چھوٹا ہوں (shorter encyclopedia of islam ,p.533) “اسی طرح حضرت بہلول کے تعلق سے بھی ایک شطح اس صورت سے مروی ہے۔ چہ خوش گفت بہلول فرخندہ فال۔ کہ من از خدا بیش بودم دو سال (اس شطح میں دو سال بڑا ہونا مذکور ہے، واللہ اعلم) عين القضاة همداني۔ یہ ہمدان کے صاحب کرامات بزرگ تھے، آپ کے مکتوبات کو ادب تصوف میں کافی اہمیت حاصل ہے (فوائد الفواد، ص ۸۳، ۸۴)

آپ کی جانب یہ شطح منسوب ہے ”جسے تم خدا جانتے ہو وہ ہمارے نزدیک محمد ﷺ ہیں اور جسے تم محمد ﷺ جانتے ہو وہ ہمارے پاس خدا ہے“۔ اور ان ہی شیخ سے یہ اشعار بھی منقول ہیں۔ اے پسر لا الـه الا الله۔ خود ز شرک خفی است آئینہ دار چیست شرک جلی رسول اللہ۔ خویشتن را ازیں دو شرک بر آر (انفاس العارفین، ص ۱۰۲)

شطحات کے رد و قبول سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اصل صوفیاء نے کہا تلاش کی ہے؟ اہل تصوف کے نزدیک شطحات کا صدور سب سے پہلے حضرت علیؓ کی زبان سے ہوا۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ ایک دفعہ خطبہ دے رہے تھے کہ اسی اثناء میں باطنی جوش کے تحت ان کی زبان سے یہ کلمات نکلے۔ ”انا نقطة الباء، انا جنب الله الذی فرطتم فيه، انا القلم، انا اللوح، اناالعرش، انا الكرسي، انا السمٰوٰت والارضون السبع“ میں بسم اللہ کی ’ب‘ کا نقطہ ہوں، میں اللہ کا پہلو ہوں جس میں تم نے کوتاہی کی، میں قلم ہوں، میں لوح محفوظ ہوں، میں عرش ہوں، میں کرسی ہوں، میں سات آسمان ہوں میں سات زمین ہوں (الکواکب الدریہ، ص ۴۳۔ مقدمہ کنوز اسرار القدیم ص ۷) لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ بہت سے صوفیاء نے حسین بن منصور حلاجؒ کی تعریف کی ہے، لیکن ان کا خیال ہے کہ حلاج کے شطحات ایک موحد کی شایان شان نہیں لگتے۔ متاخرین نے عام طور پر حلاج کو قبول کیا ہے۔ فارسی زبان کے شعراء جو صوفی بھی تھے۔ حلاج کو اپنی دلکش شاعری کے ذریعہ ادب تصوف میں ایک لافانی مقام عطا کیا۔ چناچہ شیخ فرید الدین عطارؒ، مولانائے رومؒ، حافظ شیرازیؒ، مولانا جامیؒ وغیرہم کی شاعری میں حلاج کو ایسے کردار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جو علماء ظاہر کے برعکس سر دار ورسن اسرار توحید بیان کرنے کی

ہمت رکھتا ہے۔ یہیں سے فارسی شعراء کو علماء شریعت یا فقہاء پر طنز کرنے کا بہترین موقع فراہم ہوتا ہے۔ عہد عالم گیر میں جب مشہور مجذوب ''سرمد'' کو قتل کیا جانے لگا تو قتل ہونے سے پہلے انہوں نے یہ شعر پڑھا

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد　　　　من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

ایک عمر ہو گئی کہ منصور کا شہرہ پرانا ہو گیا۔ میں از سر نو دار و رسن (سولی) کو جلوہ دے رہا ہوں

متاخرین صوفیاء نے دلائل اور مثالیں دے کر حلاج کے شطحات کی توجیہ کی ہے۔ ان کی کہنا ہے ''منتہائے عشق میں فنا کے عالم میں ''دوئی'' ختم ہو جاتی ہے۔ اور عاشق کو سوائے محبوب کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اس عالم میں وہ تمام اشیاء حتیٰ کہ ''اپنے وجود'' سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسکی قوت تمیز مفقود ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجنون کے سامنے لیلیٰ لائی گئی تو اس سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا ''لیلیٰ یہی ہے جس کے عشق میں تم وارفتہ ہوئے ہو'' اس پر مجنون نے کہا ''لیلیٰ میں خود ہوں''۔

شیخ محمود شبستری جنھوں نے ''گلشن راز'' کے نام سے مثنوی لکھی ہے، اس میں وہ حلاج اور انکے دعوی ''انا الحق'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

در آ در وادی ایمن کہ ناگاہ　　　　درختے گویدت إِنِّي انا الله

روا باشد انا الله از درختے　　　　چرا نبود روا از نیک بختے

ترجمہ۔ وادی ایمن میں اچانک تجھ سے ایک درخت انی انا اللہ کہتا ہے، جب ایک درخت سے انا الله روا ہو سکتا ہے تو ایک نیک بخت سے کیوں روا نہیں ہو سکتا۔

صوم (روزہ)

اللہ جل شانہ نے قرآن میں فرمایا "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴿البقرۃ:۱۸۳﴾"۔اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔پھر آگے جہاں ماہ رمضان کی تعریف کرتا ہے وہاں فرماتا ہے:فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ۔یعنی تم میں سے جو شخص رمضان کو پائے تو اس کو چاہیئے کہ رمضان (کے پورے دنوں کا) روزہ رکھے۔

صوم کے معنی امساک یعنی کسی بھی چیز سے رکنے کے ہیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ سے فرمایا فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا ﴿مریم:۲۶﴾ یعنی تم کہدو کہ میں نے رحمان (اللہ) کے لئے روزہ کی نذر مانی ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں نے حضرت مریم علیھا السلام سے پوچھا کہ یہ بچہ کیسے ہوا۔تو اللہ نے حضرت مریم سے فرمایا کہ تم کہدو کہ میں نے بات نہ کرنے کا روزہ رکھا ہے۔

لیکن شریعت محمدیؐ میں روزہ سے مراد مخصوص چیزوں سے یعنی شہوت بطن اور شہوت فرج سے مخصوص وقت تک یعنی طلوع فجر سے غروب آفتاب تک وصف مخصوص کے ساتھ یعنی قرب خداوندی کے مقصد سے رکے رہنے کا نام روزہ ہے۔البتہ عورتوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حیض و نفاس سے پاک ہوں۔

روزے چھ قسم کے ہیں۔ان میں سے تین قسم کے روزے وہ ہیں جن کی نیت رات ہی میں کر لینی چاہیئے۔اس کے بغیر روزہ نہیں ہوتا اور وہ ہیں (۱) قضاء رمضان (۲) نذر مطلق (۳) کفارے کے روزے۔اور تین وہ ہیں جن میں رات ہی میں نیت کرنا افضل ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا تو زوال سے پہلے بھی نیت کر لی جا سکتی ہے۔اور وہ ہیں:(۱) رمضان کے روزے (۲) نذر معین (۳) نفل روزے۔اسی طرح ظہار کے روزوں کا بھی یہی حکم ہے۔

لوگوں کو چاہیئے کہ شعبان کی ۲۹ تاریخ کو ہی چاند دیکھنے کی کوشش کریں۔اگر چاند نظر آجائے تو رمضان کے روزے رکھنا شروع کر دیں۔اور اگر بادل چھائے ہوئے ہوں اور چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے مہینے کے تیس دن پورے کریں پھر روزے رکھیں۔

اور ایک شخص نے چاند دیکھنے کی گواہی دی مگر قاضی یا امام نے اس کی شہادت قبول نہیں کی تو اس چاند کو دیکھنے والے کو چاہیئے کہ وہ اکیلا ہی روزہ رکھے۔اس لئے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:صُـوْمُوا الرؤیته۔چاند دیکھنے پر روزہ رکھو۔نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رؤیت ہلال رمضان میں ایک شخص کی گواہی کو قبول فرمایا ہے۔

اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو امام کو چاہئے کہ ایک شخص عادل کی گواہی رویت ہلال کے سلسلے میں قبول کرے۔ چاہے وہ مرد ہو کہ عورت آزاد ہو کہ غلام۔ لیکن اگر مطلع صاف ہو (یعنی مطلع ابر آلود نہ ہو) تو ایک شخص کی گواہی قابل قبول نہ ہوگی جب تک کہ ایک جماعت کثیر چاند نہ دیکھ لے جس سے کہ لوگوں کو ان کی اطلاع سے یقین حاصل ہو جائے۔ جماعت کثیر سے مراد حضرت ابو یوسفؒ کے پاس پچاس آدمی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شہر کی ہر مسجد میں ایک یا دو آدمی چاند دیکھ لیں۔ صحیح یہ ہے کہ اس کو امام کی رائے کے حوالے کر دیا جائے۔

روزہ کا وقت فجر ثانی سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَكُلُوا وَاشْـرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴿البقرۃ:۱۸۷﴾۔ یعنی کھاؤ اور پیو۔ یہاں تک کہ سفید دھاگا کالے دھاگے سے ممتاز ہو جائے پھر روزوں کو شام تک پورا کرو۔

اگر کوئی شخص بھول کر روزہ کی حالت میں کھالے یا پی لے یا دوسری صورت ہو جائے تو روزہ افطار نہ کرے۔

اگر کوئی شخص سو گیا اور حالت روزہ میں احتلام ہو جائے تو افطار نہ کرے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ قے۔ حجامت (خون نکالنا) اور احتلام۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی طرف دیکھے اور احتلام ہو جائے۔ یا تیل لگائے، یا سرمہ لگائے یا بیوی کا بوسہ لے مگر عضو مخصوص میں حرکت نہ ہو اور انزال نہ ہو تو روزہ نہ ٹوٹے گا۔ لیکن اگر بوسہ لینے یا چھونے سے انزال ہو جائے تو اس پر روزہ کی قضا لازم ہوگی۔ کیوں کہ ایسی صورت میں مباشرت کے معنی پائے جائیں گے۔ لیکن اس پر کفارہ لازم نہ ہوگا۔

اور اگر خود بخود قے ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ لیکن کسی نے اپنی طرف سے قے کی اور وہ منھ بھر کر ہوگئی تو اس پر قضا لازم ہے۔ اگر کسی شخص نے سنگریزہ یا گٹھلی نگل گیا تو اس پر قضاء ہے۔

اور اگر کسی نے جان بوجھ کر مباشرت کی، یا کھایا، یا پیا یا دوا کھائی تو اس پر قضاء بھی ہے اور کفارہ بھی۔ اور یہ کفارہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ظہار کا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہا یا رسول اللہ میں ہلاک ہو گیا میں ہلاک ہو گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے کیا کیا؟ تو اس نے کہا کہ میں رمضان میں دن کے وقت روزہ کی حالت میں میں جان بوجھ کر اپنی بیوی سے مباشرت کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک غلام کو آزاد کر۔ اس نے کہا کہ میرے پاس کوئی غلام نہیں ہے (اور نہ میں اس کی قدرت رکھتا ہوں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو مسلسل دو مہینے کے روزے رکھ (اس طرح کہ درمیان میں ایک روزہ بھی ناغہ نہ ہو) انہوں نے کہا مجھ پر جو بپتا پڑی ہے وہ ایک روزے ہی کی وجہ سے پڑی ہے (تو میں دو مہینوں کے روزے وہ بھی مسلسل کیسے رکھ سکتا ہوں) تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کفارہ ادا کرنے کی یہ صورت ہے۔ ظہار کے کفارہ کی صورت کی طرح۔

اگر کسی نے ناس (نسوار) لی، یا کان میں کوئی دوا ٹپکائی یا کوئی ایسی دوا کا استعمال کیا جو پیٹ یا دماغ میں جاتی ہے تو اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر کسی نے اپنے منھ سے کوئی چیز چکھی تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ مگر ایسا کرنا مکروہ ہے۔ اور کسی عورت کے لئے اپنے بچے کے لئے کوئی چیز چبا کر دینا مکروہ ہے۔ لیکن مجبوری کی حالت میں چبا کر دے سکتی ہے اپنے بچے کی صیانت کی خاطر۔

اگر کوئی شخ مریض ہے، اس کو اندیشہ ہے کہ اگر روزہ رکھے گا تو مرض بڑھ جائے گا تو وہ روزہ نہ رکھے اور اس کی قضاء کرلے۔ اسی طرح اگر مسافر ایسا ہے کہ روزہ رکھنے سے اس کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ لیکن اگر وہ نہ رکھے اور بعد میں قضاء کرلے تو جائز ہے۔ قرآن میں بھی حکم یوں آیا ہے: وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴿البقرة:۱۸۵﴾ یعنی اگر کوئی شخص مریض ہے یا مسافر ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ بعد میں گنتی سے روزے رکھ لے۔ پھر اس کے بعد ارشاد ہے: فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ﴿البقرة:۱۸۴﴾ گویا پہلا حکم رخصت پر مبنی ہے اور دوسرا حکم عزیمت اور عالیت کا ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا دین عزیمت و عالیت ہے۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے عالیت اور عزیمت کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اگر اس پر سے پھسلیں گے تو رخصت پر آئیں گے۔ لیکن اگر قدم رخصت پر ہی رکھیں گے اور خدانخواستہ وہاں سے پھسلیں گے تو ٹھکانہ کہاں ہوگا؟؟

اگر رمضان کے کئی روزے چھوٹ گئے ہوں تو بعد میں قضاء اکٹھے بھی رکھ سکتے ہیں اور تفریق کرتے ہوئے بھی رکھ سکتے ہیں۔ اگر پہلے رمضان کے قضاء روزے باقی تھے کہ پھر دوسرا رمضان کا مہینہ آگیا تو دوسرے رمضان کے ہی روزے رکھے۔ اور بعد میں پہلے رمضان کے روزوں کی قضاء کرے۔

حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی آیا کو اگر بچے کے بارے میں خدشہ ہو تو ان کے لئے روزہ چھوڑنا اور بعد میں قضاء کرلینا جائز ہے۔ آیا تو اپنے معاہدہ کی بنا پر مجبور ہوتی ہے اس لئے وہ روزہ چھوڑ سکتی ہے۔ لیکن ماں کا حکم اس سے الگ ہے۔ کیوں کہ دودھ پلانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ اگر رمضان میں روزہ رکھ لے تو یہ باپ کی ذمہ داری ہے کہ بچے کے لئے آیا کا انتظام کرے۔

شیخ فانی یعنی وہ شخص جو بہت بوڑھا اور کمزور ہے جسے روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے تو وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلا سکتا ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ﴿البقرة:۱۸۴﴾ یعنی جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہیں (اور روزہ نہیں رکھتے تو) ان کے لئے فدیہ دینا ہے مسکین کو کھانا کھلا کر۔ یہ ترجمہ کرنا اور اس کا الٹا مطلب لینا

صحیح نہیں ہے۔

اصل میں **یُطِیقُونَہُ**، باب افعال سے ہے۔ اور باب افعال میں سلب کی خاصیت ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے۔ ان کے لئے فدیہ ہے (اس کی تفصیلی بحث تفسیر نور ایمان میں دیکھی جا سکتی ہے جو مؤلف ہذا کی ہے)

اور کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس پر روزوں کی قضاء تھی اور اس نے وصیت کی کہ اس کا فدیہ دیا جائے تو ولی کو چاہئے کہ اس کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے ہر روزے کے بدلے نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جوار یا کھجور ایک مسکین کو دے دے۔

اگر کوئی لڑکا رمضان میں کسی دن بالغ ہو جائے یا کافر مسلمان ہو جائے تو دن کا باقی حصہ وہ کچھ نہ کھائے نہ پئے۔ البتہ دوسرے دن روزہ رکھے۔ اس پر قضا بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی عورت رمضان میں حائضہ ہو جائے یا نفاس والی (زچگی) ہو جائے تو روزہ چھوڑ دے۔ اور جب ہو پاک ہو جائے تو روزوں کی قضا کرلے۔

اگر کوئی مسافر رمضان میں دن کو واپس آجائے یا کوئی حائضہ عورت پاک ہو جائے تو وہ کھانے سے اپنے آپ کو روکے رکھیں احترام رمضان میں۔ یہ اس صورت میں ہے کہ وہ مسافر زوال اور کھانے کے بعد آئے۔ لیکن اگر زوال اور کھانے سے پہلے آئے تو اس کو روزہ رکھ لینا چاہئے۔

اور اگر کوئی عورت زوال سے پہلے حیض سے پاک ہو جائے اور روزے کی نیت کرلے تو نہ اس کا فرض روزہ ہو گا نہ نفل۔ اس لئے کہ وہ روزہ کے اول وقت روزہ کے قابل ہی نہیں تھی۔

اگر کسی شخص نے سحری کھائی یہ سمجھ کر یہ طلوع فجر نہیں ہوا یا اس نے افطار کر لیا یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو گیا پھر اس پر یہ واضح ہو گیا کہ فجر کا وقت شروع ہو چکا تھا یا سورج غروب نہیں ہوا تھا تو اس کا چاہئے کہ وہ اس روزے کی قضاء کرے۔ اس پر کفارہ نہیں ہے۔

اگر واحد (اکیلے) شخص نے شوال کا چاند دیکھا تو وہ روزہ نہ چھوڑے۔ اور جب مطلع ابر آلود ہو تو امام کو چاہئے کہ وہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے رؤیت ہلال کا حکم دے۔ اور اگر مطلع ابر آلود نہ ہو تو امام کو چاہئے کہ ایک کثیر جماعت کی رؤیت کو قبول کرے۔

صحبت صادقین

اللہ کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّـهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿التوبة:۱۱۹﴾ ترجمہ: اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔

یہ آیت کسی خاص زمانہ سے مختص نہیں ہے بلکہ عام ہے۔ اس پر عمل کو بھی عام ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ خطاب ایمان والوں سے ہے۔ اور ایمان والے قیامت تک بھی ہوں گے۔ اب رہی یہ بات کہ صادقین کون ہیں؟ اس کا جواب تفسیر کشاف میں اس آیت کے ذیل میں یوں دیا گیا ہے۔

هم الذين صدقوا في دين الله نية و قولا و فعلا (تفسیر کشاف)۔ ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جو دین میں باعتبار نیت، قول اور فعل سچے ہیں۔ اس آیت میں دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک تو اتقوا اللہ ہے جس کے معنی اللہ سے ڈرنے کے ہیں اور دوسرا کونوا مع الصادقین۔ یعنی سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

اس عمومی تاکیدی حکم کی بناء پر جو صیغہ امر کے ساتھ دیا گیا ہے اور جس کی قوت فرض کی ہے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے صحبت صادقین کو فرائض ولایت میں سے ایک فرض قرار دیا ہے تاکہ مومن، نظریات میں، تصورات، اعتقادات اور اعمال میں، اللہ کے احکام اور شریعت محمدیؐ کی پابندی کے حدود سے خارج نہ ہو جائے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح تقویٰ فرض ہے اسی طرح صحبت صادقین بھی فرض ہے۔

جب اللہ یا اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو اللہ کے غلام یا رسول کے امتی کو سوائے اس حکم کی پابجائی کے اور کچھ راستہ نہیں رہتا۔ لیکن بعض طبیعتیں عقلی طور پر بھی ان احکام کی تشریح کا تقاضہ کرتی ہیں جن کے بغیر ان کو تسلی نہیں ہوتی اس لئے ذیل میں ہلکی سی تشریح بھی کر دی جاتی ہے۔

انسان اس دنیا میں تنہا زندگی بسر کر نہیں سکتا۔ اس کو اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے کئی لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کئی لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے غرض کہ آدمی سماج کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو دوسرے کئی انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بچپن میں بچے دوسرے بچوں کے ساتھ اسکول اور مدرسہ میں دوسرے طلباء کے ساتھ، جوانی میں دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ، شادی میں اپنے جوڑے اور دوسرے خاندان اور قبیلے کے ساتھ، مکان میں پڑوسیوں کے ساتھ، غرض کہ ہر موقع پر دوسروں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اور اکثر یہی

ہوتا ہے کہ آدمی جن کے ساتھ رہتا، اٹھتا بیٹھتا ہے اس کے اثرات اس پر ضرور پڑتے ہیں۔ اس لئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو پہلے تم اللہ سے ڈرو اور اس کے بعد اس ڈر اور خوف کو باقی رکھنے کے لئے جو ایمان کا ایک ضروری جزو ہے، اچھے، نیک اور سچوں کی صحبت اختیار کرو تو ایمان کی جو شمع تمہارے دل میں ہے وہ برابر جلتی ہی رہے بلکہ اس صحبت کی وجہ سے اس کی لَو اور بڑھتی بھی رہے گی۔ اس کے بر خلاف اگر غلط لوگوں کی صحبت تم اختیار کروگے تو اندیشہ ہے کہ اس ایمانی شمع کی لَو نہ صرف مدھم ہو جائے گی بلکہ اللہ نہ کرے بجھ بھی جائے گی۔ اس لئے کہ صحبت کا ایک خاص اثر ہوتا ہے اور صحبت غیر محسوس طریقے پر اپنے اثرات دل و دماغ پر ڈالتی رہتی ہے مثال کے طور پر جس شخص نے کبھی بیڑی سگریٹ نہیں پیا ہو، اسے سگریٹ کا دھواں بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا بلکہ ایسے وقت میں وہ اپنی ناک پر کپڑا رکھ لے گا۔ لیکن اگر کبھی ضرورت پڑے اور ایسے آدمی کے پاس جانا اور بیٹھنا ہی پڑے جس کے بغیر کام نہیں نکلتا جیسے کہ پولیس انسپکٹر یا وکیل یا ڈاکٹر تو مجبوراً اس کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ اگر یہ میل جول کچھ زیادہ ہی ہو جائے تو اب دھویں سے گھبراہٹ یا نفرت محسوس نہیں ہوگی۔ پھر کبھی ایسے ہی دوستوں کے جھرمٹ میں چلے جائے جو سگریٹ کے عادی ہیں اور انہوں نے ترغیب دی کہ اس میں کیا حرج ہے، اس سے اعلیٰ سوسائٹی کے فرد معلوم ہوں گے ورنہ لوگ تم کو پرانے زمانے کا "دقیانوسی" سمجھیں گے تو کراہت کے ساتھ ہی سہی آدمی اس کو کبھی کبھار اختیار کر لے گا۔ پھر وہ اس کا عادی بن جائے گا۔ یہی حال دوسری عادتوں اور طریقوں کا بھی ہوتا ہے اور یہی حال اعتقادات اور اعمال کا بھی ہوتا ہے اسی لئے اللہ نے صادقین کی صحبت میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ صحبت کا اثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تک حکم دیا ہے کہ آپ اپنے آپ کو ان لوگوں میں روکے رکھئے جو اپنے پروردگار کو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر صبح و شام یاد کرتے ہیں۔ اور کبھی بھی آپ دنیا کی زینت کے خواہاں بن کر ان کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف نہ دیکھئے۔ دیکھئے کہ کدھر حضور پاک ﷺ کی سیرت، دنیا سے بیزاری ہے۔ خدا طلبی کا جذبہ ہے۔ انتہائی سادہ زندگی اور فقیروں و مسکینوں کے ساتھ مع فقر و فاقہ کے رہنا ہے۔ اس کے باوجود اللہ کا حکم ہے کہ دنیاداروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا اور ذاکرین کی صحبت سے نہ ہٹنا۔ سبحان اللہ رسول کی امت کو تعلیم دینے کا کیا عظیم الشان طریقہ اور کتنی پیاری حکمت عملی ہے کہ پہلے خود پیغمبر کو حکم دیا جارہا ہے تاکہ دوسرے امتی اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ اچھی صحبت اتنی بڑی چیز ہے کہ اللہ نے جب پیغمبر کو اس کا حکم دیا ہے تو ہم کو تو اس سے زیادہ اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل۔ ترجمہ: آدمی اپنے دوست کے دین پر رہتا ہے۔ پس تم دیکھو کہ کس کو دوست بنا رہے ہو۔

اکثر لوگ یہی غلطی کر بیٹھتے ہیں پہلے تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو کسی کے مذہب سے کیا واسطہ ہم کو تو صرف دوستی سے

غرض ہے اس کے افعال اور اعمال سے کیا واسطہ۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں غیر معمولی تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ اور ایک وقت تو ایسا بھی آجاتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے عقیدے اور مذہب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ جن کے ''آباء اور اجداد'' کٹر مذہبی تھے محض چند دنوں یا چند مہینوں کی دوستی سے ان کی مذہبیت میں کمزوری پیدا ہونے لگ جاتی ہے۔ مذہب اور عقیدہ کی پکڑ مضبوط نہیں رہتی۔ میل جول سے بڑھ کر بیٹا بیٹی کے لین دین تک بات پہنچ جاتی ہے پھر اس کے بعد عقیدہ میں جھول پیدا ہونے لگتا ہے۔

لوگ آج کل بڑی ڈگریوں کو دیکھ کر اور کبھی مالی خوشحالی کے پیش نظر رشتے استوار کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ سب سے بڑی نعمت تصدیق کی ہے اور سب سے بڑا مال اور دولت، دولت ایمان ہے۔ اور یہ دولت صحبت صادقین سے حاصل ہوتی ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم کے لئے زبان کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن صحبت اپنا خاموش اثر دکھاتی ہے۔ صحبت زبان سے بے نیاز ہے۔ جس کی صحبت میں رہتے ہیں اس کی نشست و برخواست، اس کی گفتار، اس کا کردار دوسروں کو ضرور متاثر کرتا ہے۔ تعلیم سے کیا کرنا چاہئے معلوم ہوتا ہے لیکن صحبت سے کیسا کرنا چاہئے۔ اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ کو جو بلند درجہ نصیب ہوا وہ صرف صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیب ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے تو ایک بہترین مثال صحبت کی دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عطار کی دکان پر جاؤ تو باوجود اس کے کہ تم نے کچھ بھی عطر نہیں خریدا مگر جب تک تم وہاں بیٹھے رہو گے عطر کی خوشبو تو برابر آتی رہے گی اسی طرح کوئلے کی دکان پر جاؤ گے تو کم از کم کپڑوں پر کچھ نہ کچھ کالک لگ جائے گی۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمہ نے فرمایا: صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند

ایک شخص کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور یہ دعا اس کے لبوں پر تھی، اے اللہ میرے بھائیوں کی اصلاح فرما۔ لوگوں نے کہا اس بلند و مقدس مقام پر اپنے لئے دعا کیوں نہیں کرتا۔ اس نے جواب دیا ''وہ میرے بھائی ہیں۔ جن کے پاس لوٹ کر میں جاؤں گا۔ اگر وہ درست ہوئے تو میں بھی ان کی صحبت میں درست ہو جاؤں گا۔ اگر وہ خراب ہوئے تو میں بھی لامحالہ خراب ہو جاؤں گا (کشف المحجوب ۴۶۴)

اہل احسان نے اولیاء صالحین اور مرشدین صادقین کی صحبت کی اہمیت اس طرح بیان کی ہے۔

ایک ساعت صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے والوں کے لئے چند ہدایتیں دی ہیں جو کہ قرآن میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿الحجرات:۱﴾ ترجمہ: اے

ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے تم سبقت نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

اسی طرح دوسری آیت میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آداب بیان کئے ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿الحجرات:۲﴾ ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند مت کرو اور جس طرح تم آپس میں زور زور سے باتیں کرتے ہو اس طرح زور زور سے باتیں مت کرو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ اور تم کو خبر تک نہ ہوگی۔

پہلی درج کردہ آیت میں یہ ہدایت دی گئی کہ کسی بھی معاملہ میں حضورؐ سے آگے نہ بڑھیں یعنی بات کرنے، مشورہ دینے اور اپنا مشورہ پیش کرنے میں سبقت نہ کریں۔ پوچھا جائے تو بات کریں۔ اور بعد کی آیت میں گفتگو کا سلیقہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ کے حضور کوئی شخص نہ ہی بلند آواز میں بات کرے بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اپنی آواز حضور کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے ورنہ یہ اعمال کے اکارت ہو جانے کا باعث بن جائے گا۔ وہ بھی بے خبری کے عالم میں۔

ان ہی آیتوں کو سامنے رکھ کر صوفیاء کرامؒ اور مرشدین عظام نے صحبت کے آداب مریدین کے لئے بیان کئے ہیں اس لئے کہ مرشدین نائبین مرشد حقیقی ہیں۔

چنانچہ حضرت بندگی میاں شاہ برہان رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں چند آداب صحبت بیان کئے ہیں:

مرشد کے آگے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں حکم نہ دیا جائے۔ بار بار سوالات نہ کئے جائیں وغیرہ۔

بری صحبت سے کیا نتائج بر آمد ہوتے ہیں قرآنی آیات کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت سعدی شیرازیؒ نے دو اشعار میں خلاصہ دے دیا ہے۔

سگ اصحاب کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت ومردم شد
پسر نوح بابداں بنشست — خاندان نبوتش گم شد

اصحاب کہف کے ساتھ رہنے والا ایک کتا جب نیک لوگوں کی صحبت میں رہا تو اس کا شمار بھی نیک لوگوں میں ہو گیا۔ (اور آنحضرت کے فرمان کے مطابق وہ جنت میں جائے گا)

اس کے برخلاف نوح علیہ السلام کا بیٹا برے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تو وہ نبوت کے خاندان سے بے بہرہ ہو گیا (کافروں کے ساتھ طوفان میں ڈوب گیا)۔

صحبت مرشد

"الرجل علی دین خلیله، فلینظر احدکم من یخالل" عن ابی ھریرۃ رضـــي اللہ عنه - "المرء مع من أحبّ، علیکم بمجالســة العلماء و اســتماع کلام الحکماء، فان اللہ یحیی القلب المیت بنور الحکمة کما تحی الارض المیت بماء المطر (ترغیب وترھیب)

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا　　او نشیند در حضور اولیاء

عقل گوید شش جہت حد یست بیروں راہ نیست　　عشق گوید ہست راہے رفتہ ام من بارہا

العقل عقیلة الرجال، والعشق محالة العقال، والعقل یقول لاتحاضر، والعشق یقول لاتبالی

عقل می گوید کہ خود را پیش کن　　عشق می گوید کہ ترک خویش کن

دل جبھی دل ہے کہ اس میں یاد جانانہ رہے　　گھر جبھی گھر ہے کہ اس میں صاحب خانہ رہے

صد کتاب وصد ورق در نار کن　　سینہ را از نور حق گلزار کن

ہر کہ در دنیست ازیں عشق رنگ　　نزد خدا نیست بجز چوب وسنگ (رومی)

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت وناموس ما　　اے کہ افلاطون وجالیشوس ما

عشق ہی سب ہے، عشق اول عشق آخر عشق کل، عشق نخل و عشق شاخ و عشق گل

ہر کہ عاشق شد جمال دوست را　　اوست سید جملہ موجودات را

عشق شد ایجاد عالم را سبب　　گوش کن احببت ان اعرف زرب

سنو دو ہی لفظوں میں مجھ سے یہ راز　　شریعت وضو ہے طریقت نماز

شریعت در محفل مصطفی　　طریقت عروج دل مصطفی

شریعت میں ہے صورت فتح بدر　　طریقت میں ہے معنی شرح صدر

شریعت میں ہے قیل و قال حبیب　　طریقت میں حسن وجمال حبیب

نبوت کے اندر ہیں دونوں ہی رنگ　　عبث ہے یہ صوفی وملا کی جنگ

چون تو کردی ذات مرشد را قبول　　ہم خدا آمد ز ذاتش ہم رسول

نفس نتواں کشت الا ذات پیر　　دامن آں نفس کش محکم بگیر

اہل اللہ نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ ایک چیونٹی بیت اللہ کی زیارت کرنا چاہتی تھی مگر راستے میں دریا، صحرا، جنگل وغیرہ تھے۔اس چیونٹی نے ایک دن بیت اللہ میں رہنے والے ایک کبوتر کو دیکھا تو اس کے پاؤں سے چمٹ گئی، کبوتر اڑ کر خانۂ کعبہ پہنچا تو چیونٹی نے بھی بیت اللہ کی زیارت کرلی۔

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسید دست برپائے کبوتر دادو ناگاہ رسید

اصحاب کہف کے کتے نے چند دن صلحاء کی صحبت اختیار کی تو اس کے ساتھ جنت کا وعدہ ہوا۔

سگ اصحاب کہف روزئ چند پئے نیکاں گرفت و مردم شد

یک زمانہ صحبتے باولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

علامات شیخ: درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

مرشد کامل میں تین چیزیں(۱)التجا في عن دار الغرور(۲) الانابة الى دار الخلود (۳)الاستعداد للموت قبل نزوله

شیخ کامل بظاہر عام انسانوں کا سا ہوتا ہے۔مگر باطن میں عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔مثلاً تلخ نور شیریں پانی کی صورت ایک مگر سیرت مختلف، عابد و فاسق نے ایک روٹی کھائی، مگر ایک میں شہوت پیدا ہوئی اور دوسرے میں عشق الٰہی موجزن، دو ہرنوں نے ایک گھاس کھائی۔ایک سے مینگنیاں اور دوسرے میں کستوری۔ بھڑ اور مگس نے ایک ایک پھول چوسا، ایک میں زہر بنا اور دوسرے میں شہد، الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں، لیکن ملا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

مرشد کامل ہے تو فوراً اس کا دامن تھام لینا چاہئے اسکی صحبت کو کیمیا احمر سمجھے۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

آداب مرشد۔ لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّـــــهِ وَرَسُــولِهِ ﴿الحجرات:۱﴾ اللہ اور اسکے رسول سے سبقت نہ کرو۔ دوسری جگہ ”لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ،ان آیات کا مقصد مومنین کو آداب کی تعلیم دینا ہے۔

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

مرشد کی ظاہری حالت، حیثیت، قومیت، حشمت و شوکت وغیرہ پر نظر نہ کریں، مرشد کو اپنے حق میں سب سے انفع

سمجھے۔ مثال، ایک ماں سے بچے کو جو پیار و محبت اور شفقت مل سکتی ہے وہ کسی اور عورت سے نہیں مل سکتی۔ مثل مشہور ہے کہ ماں کی محبت وہ ہمالیہ کا پہاڑ ہے جس کی بلندیوں تک کوئی پہنچ نہیں سکتا، وہ گہرا سمندر ہے جسکی گہرائی کو کوئی ناپ نہیں سکتا، ماں کی ممتا وہ سدا بہار پھول ہے جسپر کوئی خزاں اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ پس سالک کو چاہئے کہ ہر جائی نہ بنے اور حصول فیض کیلئے اپنے مرشد کے سوا کسی دوسری طرف متوجہ نہ ہو۔

صدیق

صدیق وہ ولی اللہ ہے کہ نبی پر جو کچھ نازل ہوتا ہے اس کا دل خود بخود اسکی تصدیق کرے۔ یعنی صدیق آئینہ نبوت ہوتا ہے۔ اور علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں صدیق کی یہ تعریف کی ہے۔

(۱) **الذي لا يخالف قاله حاله**، صدیق وہ ہے جسکے قول اور جس کے حال میں فرق نہیں ہوتا۔ جو زبان پر ہے وہی دل میں ہے۔ جتنا ایمان انکی زبان پر ہوتا ہے اتنا ہی ان کے قلب میں ہوتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقام صدیقیت کے بارے میں آیا ہے کہ ایک دن حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "جب میں دوزخ اور جنت کو دیکھوں گا تو میرا ایمان ایک ذرہ نہیں بڑھیگا، اتنا ایمان مجھے دنیا ہی میں حاصل ہے۔ بصدقۂ صحبت نبی ﷺ "**اذا رايت النار و الجنة، يوم المحشر ما ازددت يقينا** "جب میں قیامت کے دن دوزخ اور جنت کو دیکھوں گا تو میرے یقین میں ایک ذرہ برابر اضافہ نہیں ہو گا۔ اتنا یقین تو مجھے دنیا ہی میں حاصل ہے۔

(۲) **الذي لا يتغير باطنه من ظاهره**، جس کا باطن اتنا زبردست اور قوی ایمان رکھتا ہو کہ ظاہری حالات سے متاثر نہ ہوتا ہو۔

(۳) **الذی يبذل الكونين في رضاء محبوبه**، صدیق وہ ہے جو دونوں جہاں اپنے محبوب پر فدا کر دیتا ہے۔

صحاح ستہ

صحیح مسلم

امام مسلمؒ نے آنحضرت ﷺ کے صحیح احادیث کو امام بخاریؒ کے طرز پر ہی فقہی ابواب کے تحت جمع کیا ہے۔ جامع مسلم کا شمار بھی صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔ اور صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کو ہی شہرت حاصل ہے۔ اور مسلمانوں کی اکثریت کا ان دونوں کی صحت پر اتفاق ہے اور ان دونوں کو قبولیت عامہ بھی حاصل ہے۔

لیکن حاکم نیشاپوری نے المستدرک کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے جس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ جو حدیثیں، بخاری و مسلم کے بیان کردہ شرائط کے تحت صحیح تھیں لیکن انہوں نے اس کے باوجود ان حدیثوں کو چھوڑ دیا ہے، انہوں نے اپنی کتاب المستدرک میں ان حدیثوں کو لکھا ہے۔

ولادت امام مسلم ۲۰۶ھ میں نیشاپور میں ہوئی اور آپ کی وفات ۲۶۱ھ میں بعمر ۵۵ سال ہوئی۔ آپ نے احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کے سلسلے میں دور دراز کے مقامات کا سفر فرمایا مثلاً عراق۔ حجاز اور مصر وغیرہ۔

آپ کی تصانیف میں صحیح مسلم کے علاوہ، مسند کبیر (جس میں رواۃ کے اسماء ہیں) کتاب الاسماء والکنیٰ، کتاب العلل اور کتاب الاقران مشہور ہیں۔

آپ نے صحیح مسلم کے تعلق سے یہ فرمایا کہ میں نے تین لاکھ حدیثوں میں سے اس جامع کا انتخاب کیا ہے۔ پیر کے دن نصر آباد میں، جو نیشاپور سے کچھ فاصلے پر ہے، آپ کو دفن کیا گیا۔

جامع ترمذی

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن ضحاک السلّمی مشہور محدث اور عالم دین ہیں آپ کی نسبت ترمذ سے ہے۔ آپ کے دادا مروزی الاصل کسی وجہ سے ترمذ آکر آباد ہوگئے۔ آپ کے ابتدائی حالات زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات میسّر نہیں ہیں کہا جاتا ہے کہ پیدائشی نابینا تھے بعض روایات میں ہے کہ آخر میں نابینا ہوگئے تھے۔ آپ نے احادیث جمع کرنے کے کے لئے خراسان، عراق اور حجاز کے طویل سفر کئے۔ آپ کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، علی بن حجر اور محمد بن بشار خاص طور پر مشہور ہیں۔ آپ کا حافظہ بلا کا تھا۔ حاکم نے عمرو بن ملک کا ایک قول بیان کیا ہے کہ امام بخاریؒ کے بعد ابو عیسیٰ علم، حافظہ اور زہد وورع میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے حافظہ کے بارے میں ایک روایت ہے

کہ آپ فرماتے تھے کہ میں نے اپنے شیخ کی روایات سے دو اجزا ان سے نقل کئے۔ لیکن اب تک انہیں پڑھ کر سنانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

راستے میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے شیخ سے ان اجزاء کی قراءت کی درخواست کی۔ جسے آپ نے قبول فرمالیا اور کہا اجزاء کو ہاتھ میں رکھیں میں پڑھتا جاتا ہوں اور تم مقابلہ کرتے جاؤ۔ میں نے جب ان اجزاء کو تلاش کیا تو وہ اتفاقاً میرے پاس نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے دو سادہ کاغذ ہاتھ میں پکڑے اور سننے میں مشغول ہو گیا۔ اسی طرح شیخ کی نظر ان کاغذوں پر پڑی اور وہ ناراض ہو کر فرمانے لگے کیا تو مجھ سے مذاق کرتا ہے۔ پس میں نے انہیں تمام قصہ کہہ سنایا اور عرض کی کہ اگرچہ وہ اجزاء میرے پاس نہیں ہیں تاہم لکھے ہوئے اجزاء سے مجھے زیادہ یاد اور محفوظ ہے۔ شیخ نے فرمایا اچھا سناؤ تو میں نے وہ سب احادیث سنا دیں شیخ نے تعجب کیا تو میں نے عرض کی اب کی بار پھر امتحان لے لیں تو انہوں نے چالیس احادیث اور پڑھیں جنہیں میں نے صحیح صحیح سنا دیا۔ تو شیخ نے فرمایا میں نے تجھ جیسا محنتی اور قوی الحافظہ نہیں دیکھا۔ امام ترمذی نے بعض مقامات پر اپنی مستقل رائے پیش کی ہے۔ امام ترمذی مقلد نہیں تھے بلکہ خود امام اور مجتہد تھے آپ کی تصانیف میں الجامع الترمذی (ترمذی شریف) کتاب العمل الصغیر۔ العلل الکبیر۔ کتاب التاریخ، کتاب الزید، کتاب الاسماء والکنٰی کتاب شمائل النبوۃ شامل ہیں۔ جامع ترمذی آپ کی مشہور ترین کتاب ہے۔

آپ کی ولادت ۲۰۹ھ اور وصال ۲۷۵ھ بروایتے ۲۷۹ھ ہے۔

نسائی

امام نسائی کا نام ابو عبد الرحمان بن شعیب ہے۔ خراسان کے شہر نساء میں پیدا ہوئے تو نسائی مشہور ہو گئے۔ آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے صحیح احادیث کا مجموعہ تیار فرمایا جس کا شمار ان صحاح ستہ میں ہوتا ہے جو اہل سنت والجماعت کے پاس مقبول ہیں۔

آپ کی پیدائش ۲۱۵ھ ہے۔ سنن نسائی کے علاوہ آپ کی تصانیف میں "خصائص علیؓ"، مسند امام مالک، فضائل صحابہؓ رسول، کتاب الجرح والتعدیل، اسماء الرواۃ اور مناسک حج ہیں۔

آپ ایک مرتبہ دمشق کی ایک مسجد میں حضرت علیؓ کی منقبت میں اپنی کتاب "خصائص علیؓ" کے اقتباسات سنا رہے تھے تو بعض لوگ طیش میں آ گئے۔ اور مارنا پیٹنا شروع کر دیا، زخمی حالت میں آپ نے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ صفا و مروہ کے درمیان علالت کی حالت میں ہی آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔ بتاریخ ۱۳ صفر ۳۰۳ھ۔ سنن اس کتاب احادیث نبوی کو کہتے ہیں

جس کے ابواب کی ترتیب فقہ کی کتابوں کے مطابق ہو، بعض علماء حدیث، سنن نسائی کو بخاری و مسلم پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

امام نسائی نے، سنن نسائی کی ترتیب میں وہی اسلوب اختیار کیا جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی تالیفات میں اختیار کیا۔ علماء حدیث نے امام نسائی کی اخذ کردہ احادیث کو تین اقسام میں بیان کی ہیں۔ ایک قسم ان احادیث کی ہے جنہیں امام بخاری و مسلم نے بھی اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو امام نسائی نے اپنی سنن میں درج کی ہیں لیکن امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی کتابوں میں درج نہیں کیں حالانکہ وہ امام بخاری و مسلم کی مقرر کردہ شرطوں پر پوری اترتی ہیں۔ تیسری قسم ان احادیث پر مشتمل ہے جو مذکورہ بالا دونوں اقسام میں نہیں آتیں۔

نسائی شریف میں کم وبیش ساڑھے پانچ ہزار احادیث رقم کی گئی ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود یہ کتاب زندہ ہے۔ صحاح ستہ میں اس کا شمار ہے اور مدارس اسلامیہ میں اسکی تعلیم و تدریس ہوتی ہے اور ایک سے زائد مشہور شخصیتوں نے اسکی شرحیں لکھی ہے جن میں مشہور حافظ جلال الدین سیوطی کی شرح ہے۔

بخاری شریف

صحیح بخاری شریف کتب حدیث میں مشہور اور مقبول ترین کتاب ہے۔ جس کے مؤلف شیخ الاسلام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرۃ بن بَرْدِزْبۃ، یہ فارسی ہے جس کے معنی الزّراع (کسان) ہیں۔ بردربہ مجوسی تھے۔ اسی حالت میں وہ مرگئے البتہ ان کے بیٹے مغیرہ اسلام لے آئے۔ امام بخاریؒ کی پیدائش ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں بعد نمازِ جمعہ ہوئی۔ اور آپ کی وفات شنبہ کے دن عید الفطر کی رات نماز عشاء کے وقت ہوئی اور عید الفطر کے دن ظہر کے نماز کے بعد ۲۵۶ھ میں ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۶۲ سال کی تھی آپ کی تدفین خرتنگ میں ہوئی جو سمرقند سے ۲ فرسخ کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے آپ کو کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ روایت ہے کہ جب آپ کو قبر میں رکھا گیا تو آپ کی قبر سے مشک کی سی خوشبو آنے لگی۔ پھر تو ایک مدت تک لوگ آپ کی قبر شریف پر آتے جاتے تھے اور آپ کی قبر مبارک کی مٹی بھی لیجاتے تھے۔

آپ سے یہ مروی ہے کہ آپ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دولاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد تھیں۔

امام بخاری کی تالیفِ صحیح بخاری کے بارے میں اکثر علماء کہتے ہیں کہ یہ کتاب، کلام اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صحیح مسلم اصح ترین کتاب ہے اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ موطا امام مالک، کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب ہے۔ امام بخاری نے اپنی یہ کتاب سولہ سال میں مکمل فرمائی، نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کسی حدیث کو کتاب میں

داخل کرنے سے پہلے میں غسل کرتا۔ دو رکعت نماز پڑھتا پھر اسکو لکھتا تھا۔

آپ کی کتاب میں مکررات کے ساتھ حدیثوں کی تعداد ۷۲۷۵ ہے اور بغیر تکرار کے چار ہزار حدیثیں ہیں۔ اسکو نووی نے تہذیب میں اور حافظ ابن حجر نے اپنے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ما ادخلتُ فی الکتاب الجامع اِلاّ ما صَحَّ وترکتُ کثیراً من الصحاح لحال الطول یعنی میں نے اپنی جامع میں صرف صحیح حدیث درج کی ہے اور صحیح حدیثوں میں سے اکثر کو ترک کر دیا ہے، طوالت کی وجہ سے اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بخاری شریف میں جو حدیثیں ہیں وہ صحیح ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا کہ انہوں نے جن حدیثوں کو اپنی کتاب میں درج نہیں کیا وہ غیر صحیح ہیں۔ سراسر غلط ہے۔ امام بخاریؒ نے اعمال کے سلسلے میں حضور نے کیا فرمایا اور کس طرح عمل فرمایا ان کو فقہ کے ابواب کی شکل میں ترتیب کے ساتھ لکھا ہے۔ عقائد کے تعلق سے جو امور تفصیلی ہیں بخاریؒ نے ان کو اس لئے جمع نہیں کیا کہ اس وقت ان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی تفصیل اس کے مقام پر دیکھئے۔

ابن ماجہ

پورا نام ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ الربیع القزوینی (ایران) ہے آپ کی پیدائش ۲۰۹ھ میں ہوئی اور وفات ۲۷۳ھ میں ہوئی آپ کی تصانیف میں کتاب السنن، تفسیر اور تاریخ ابن ماجہ ہیں۔

آپ کے مجموعہ سنن کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے۔ آپ نے بھی فقہی عناوین کی ترتیب سے یہ مجموعہ لکھا ہے جس میں احادیث کی تعداد چار ہزار بتائی گئی ہے شیخ محمد فؤاد عبدالباقی نے ان احادیث کی تعداد چار ہزار دوسو (۴۲۰۰) بتائی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں صحیح حسن کے ساتھ ضعیف احادیث بھی ہیں۔ اور امام ابو الفرج ابن جوزی نے تقریباً تیس احادیث پر جرح کرتے ہوئے ان کو موضوح قرار دیا ہے۔ ابن کثیر نے اس مجموعہ احادیث کی عمومی طور پر تعریف کی ہے بجز چند احادیث کے۔

امام الحدیث ابوداؤد

حضرت ابوداؤد کی ولادت ۲۰۲ھ میں ہوئی اور وفات ۲۷۵ھ میں بصرہ میں ہوئی۔ اور بعض کے پاس ۲۷۷ھ ہے آپ نے احادیث کے جمع کرنے کے سلسلے میں مختلف مقامات کا سفر بھی کیا۔ ابوداؤد نے خود بیان کیا ہے کہ میں نے پچاس ہزار حدیثوں میں سے اپنی سنن میں چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) احادیث کو جمع کیا ہے۔ آپ کے اساتذہ میں امام احمد بن حنبل القنبی بھی ہیں۔

ضرورت مرشد

اللہ نے کتاب اللہ ورجال اللہ ہر دور میں بھیجے اوران کو بندوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ اللہ نے کبھی کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کیا جب تک کہ اتمام حجت کیلئے نبی کو نہیں بھیج دیا۔"وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿الإسراء:۱۵﴾" یہ کہ ہر انسان کو تربیت کیلئے ایک مربی اور تزکیہ کیلئے ایک مزکی کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید سے اس کے دلائل

(۱) وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ ﴿لقمان:۱۵﴾ تفسیر جلالین وَاتَّبِعْ سَبِيلَ (طريق) مَنْ أَنَابَ (رجع) إِلَيَّ (بالطاعة)۔ جلالین ص (۳۴۷) تفسیر عثمانی میں ترجمہ یوں ہے۔ یعنی پیغمبروں اور مخلص بندوں کی راہ چل (عثمانی ص ۵۴۸)

تفسیر مواہب الرحمان میں اس آیت کے تحت فرمایا۔" اور تو ایسے شخص کی راہ چل جو ہمہ تن میری جانب جھکا ہے۔ یعنی اولاً پیغمبرؑ ہیں۔ اور ثانیاً آپ کے صالحین امت ہیں۔ (مواہب الرحمن ۸۳)

دلیل نمبر (۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّـهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿المائدۃ:۳۵﴾ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اسکی طرف جانے کا وسیلہ ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرو۔ امید کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ ابن کثیر۔ الوسیلۃ التی یوصل بھا الی تحصیل المقصود۔

ابن کیثر عربی ص ۵۴ جلالین میں ہے" ومایقربکم الیہ من طاعتہ ۱۹ الہذا محققین تفسیر کا فرمان ہے کہ الوسیلہ سے مرشد مراد ہے۔ جو سبب بنتا ہے اللہ کے قرب کا اور انسان کی اصلاح کا اور جاہدوا فی سبیلہ میں نفس کے خلاف مجاہدہ ہے۔ ذکر و فکر ودیگر (اشغال تصوف) کی طرف اشارہ ہے۔

حدیث میں ہے" المجاهد من جاهد نفسه في طاعته الله (مشکواۃ)۔ غور کرو کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے اللہ۔ مگر بادل وسیلہ بن جاتا ہے۔ اولاد کون دیتا ہے؟ اللہ مگر ماں باپ وسیلہ بن جاتے ہیں۔ دل میں انوار کون ڈالتا ہے۔ اللہ۔ مگر پیرو مرشد اس کا وسیلہ۔ حضرت عمرؓ کو ہدایت اسلام کی طرف کس نے دی۔ اللہ۔ مگر وسیلہ حضرت رسول اللہؐ بنے۔

دلیل نمبر (۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿التوبة:۱۱۹﴾۔ علامہ بن کثیر۔ صادقین کی تفسیر میں قال ھم ابو بکر و عمر و اصحابھا۔ (ابن کثیر عربی۔ ص ۴۰۷)۔

مشائخین طریقت کے سلسلے واسطہ بہ واسطہ حضرت علی اور حضرت ابو بکر صدیق سے ملتے ہیں۔اس جگہ قرآن میں علماء وصلحاء کی بجائے صادقین کا لفظ اختیار کرکے عالم اور صالح کی پہچان بتلادی کہ صالح وہی شخص ہو سکتا ہے۔ جسکا ظاہر وباطن یکساں ہو۔نیت وارادے کا بھی سچا ہو۔ قول کا بھی سچا ہو عمل کا بھی سچا ہو۔ آج کے دور میں صادقین کا مصداق مشائخین عظام ہی ہیں۔

دلیل نمبر(۴) امام رازی اپنی تفسیر میں أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔لم یکتف علیٰ (اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ) بل قال صراط الذين انعمت علهيم وهذا يدل على ان المريد لا سبيل له الى الوصول الى مقامات الهداية والمكاشفته الا اذا اقتدى بشيخ يهديه الى سواء السبيل ويُجنّبه عن مواقع الا غاليط والا ضاليل وذالك لان النقص غالب على الخلق وعقولهم غير وافية بادراك الحق وتميز الصواب عن الغلط فلابدمن كامل يقتدى به الناقص حتىٰ يتقوى عقل ذلك الناقص بنور عقل الى مدارج السعادات ومعارج الكمالات - تفسير كبير- اللہ نے صرف اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے الفاظ پر کفایت نہیں کی بلکہ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ بھی ساتھ فرمایا۔یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مرید کے مقامات ہدایت ومکاشفہ تک پہنچنے کی سوائے اس کی کوئی صورت نہیں کہ وہ ایسا شیخ ورہنما کی اقتداء کرے۔ جو اسے سیدھے راستہ چلائے اور گمراہیوں اور غلطیوں کے مواقع سے بچائے اور یہ اس بنا پر ضروری ہے کہ اکثر مخلوق پر نقص اور کوتاہی غالب ہے۔اور ان کے عقول واذھان کے حق تک پہنچنے میں اور صواب کو غلط سے تمیز کرنے میں پورے نہیں اترتے تو پھر ایسے کامل کی اقتدا ضروری ہے جو ناقص کی رہنمائی کرے تاکہ ناقص کی عقل کامل کے نور سے قوت پکڑے۔ایسا ہی کرنے سے ناقص انسان سعادتوں کے مدارج اور کمالات کے معارج کو عبور کر سکتا ہے۔پس مرشد ومربی کی ضرورت کیلئے یہ دلیل اتمام حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

دلیل نمبر(۵) ارشاد باری ہے۔وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ ﴿نساء:۶۴﴾ اس آیت میں دلالت ہے کہ بندہ گنہگار اگر کسی بندۂ صالح وپرہیزگار سے دعا کرائے تو قابل قبولیت ہوتی ہے۔اور جو لوگ اس زمانے میں پیروں کے مرید ہوتے ہیں وہ بھی یہی تو یہ ہے۔(تفسیر مواہب الرحمان) آج کے دور میں آیات بالا سے ثابت ہوا کہ جو بندہ گنہ گار کسی شیخ کامل متبع شریعت وسنت کو تلاش کرے وہ ابتغوا الیہ الوسیلہ پر عمل کرے گا۔ اور اگر اس شیخ کامل کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ تو إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ پر عمل کرے گا۔اگر شیخ کامل کی صحبت میں بیٹھے گا تو کونوا مع الصادقین پر عمل کرے گا۔اور اگر شیخ کامل کے پند ونصائح پر عمل کرے گا تو واتبع سبیل من اناب الیّ۔ پر عمل کرنے والوں میں شمار ہوگا۔یہی راستہ ”صِرَاطَ الَّذِينَ

أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا مصداق ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آج کے دور میں صاحب شریعت مشائخ کم ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان تلاش ہی چھوڑ دے۔ یا ان کی ضرورت کا ہی انکار کر دے۔

چناچہ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں۔ اسلکوا سبیل الحق ولا تستوحشوا من قلة اهله۔ اہل حق کے راستے کو اختیار کرو اور اہل حق کی قلت سے مت گھبراؤ۔ امام شافعی فرماتے ہیں۔ اتبع طرق الھدیٰ ولا یضرک قلۃ المساکین وایاک طریق الضلالۃ۔

احادیث سے استدلال: انسانی فطرت ہے کہ وہ نفوس سے جتنا اثر لیتی ہے۔ نقوش سے اتنا اثر نہیں لیتی گو کہ صحابہ کرام کے سامنے قرآن کی آیتوں کا نزول ہوتا تھا مگر اسکے باوجود ان پر خشیت و حضوری کی جو کیفیت پائی جاتی تھی وہ حضورؐ کی صحبت کا اثر تھا۔ اور جو کیفیت حضور کی حضوری میں پائی جاتی تھی۔ وہ غیر حاضری میں نہیں تھی چند مثالیں۔

(۱) عن انس قال کما کان الیوم الذي دخل فیه رسول الله ﷺ المدینة اضاء منها کل شيءٍ فلما کان الیوم الذي مات فیه اظلم فیها کل شـيءٍ وما نفضـنا ایدینا عن التراب وانالفی دفنه حتیٰ انکرنا قلوبنا۔ کہ جس روز رسول اللہ مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینہ کی ہر چیز منور ہوگئی تھی اور جس دن آپؐ کا وصال ہوا تو مدینہ کی ہر چیز تاریک ہوگئی تھی۔ اور ہم آپ کے دفن کے بعد ہاتھ سے مٹی بھی نہ جھاڑ پائے تھے کہ ہم نے اپنے قلوب میں تغیر پایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح صحابہؓ کرام مشکواۃ نبوت سے اکتساب فیض کیا کرتے تھے۔ آج بھی مرید ان باصفا اپنے مرشدین کی صحبت سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔

(۲) مسلم شریف: ایک مرتبہ حضرت حنظلہ یہ کہتے ہوئے گھر سے نکلے کہ (نافق حنظلة) یعنی حنظلہ منافق ہو گیا، راستے میں حضرت ابو بکر سے ملاقات ہوئی وہ یہ سن کر فرمانے لگے کہ کیا کہہ رہے ہو۔ ہرگز نہیں۔ حضرت حنظلہ نے صورت حال بیان کی کہ جب ہم لوگ حضور کی خدمت میں ہوتے ہیں اور حضور دوزخ و جنت کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ہم لوگ ایسے ہو جاتے ہیں گویا وہ دونوں سامنے ہیں۔ جب حضور کے پاس سے گھر واپس جاتے ہیں تو بیوی بچوں اور جائیداد کے دھندوں میں پھنس کر اسکو بھول جاتے ہیں۔ ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ یہ کیفیت تو ہم کو بھی پیش آتی ہے۔ پس دونوں حضرات نے حضرت رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر صورتِ حال بیان کی تو نبی کریمؐ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جسکے قبضے میں مری جان ہے۔ اگر تمھارا ہر وقت وہی حال رہے جیسا میرے سامنے ہوتا ہے تو فرشتے تم سے بستروں اور راستوں پر مصافحہ کرنے لگیں لیکن بات یہ ہے کہ حنظلہ 'گاہے گاہے' یعنی گاہے حضوری کی کیفیت عروج پر ہوتی ہے۔ اور گاہے اس میں کمی آجاتی ہے۔ تاکہ معاشرتی

نظام درست رہے، فیضان صحبت کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

(۳) حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کو نظر لگ گئی تو حضورؐ نے فرمایا العین حق۔ ترمذی۔ کتاب الآداب۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس میں حسد ہو۔ عداوت ہو۔ بغض ہو کینہ ہو وہ نظر تو اپنا اثر دکھا سکتی ہے تو جس نظر میں شفقت ہو، محبت ہو، رحمت ہو، اخلاص ہو، وہ نظر کیوں نہ اثر کرے یہ اللہ والوں کی نظر ہی ہوتی ہے جو گناہوں میں لتھڑے ہوئے انسان میں احساسِ ندامت پیدا کرتی ہے اور رب کے دربار میں رب کا سوالی بنا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

نگاہ ولی میں وہ تاثیر دیکھی بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

(۴) حدیث میں ہے کہ نبی علیہ السلام نے ہجرت کے وقت عبد اللہ بن ارقات کو کافر ہونے کے باوجود ظاہری سفر کا رہبر بنایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آج کے دور میں سالک اگر وصول الی اللہ کے راستے پر چلنے کیلئے کسی مومن کامل کو رہبر مقرر کرے تو کیا اعتراض۔

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر دپس بیا

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

یعنی اے دوست اگر تو اس سفر کا شوق رکھتا ہے تو رہبر کا دامن پکڑ (کیونکہ) جو شخص بغیر رفیق کے عشق کی راہ میں آتا ہے تو اسکی عمر گذر جائیگی لیکن وہ عشق سے آگاہ نہ ہو گا۔

عقلی دلیل: انسان کی عقل کے پردے میں نفس و شیطان انسان کے اعمال کو مزین کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ گمراہی کے باوجود انسان خود کو ہدایت پر سمجھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کی آیت ہے "وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿الاعراف: ۳۰﴾ جسطرح درخت کو اپنے پھل وزن دار نہیں معلوم ہوتے اسی طرح انسان کو اپنے عیوب بے وزن محسوس ہوتے لہذا اصلاح وتربیت کیلئے کسی مربی کی ضرورت پڑتی ہے۔

دلیل (۱) ایک طالب علم امتحان کا پرچہ حل کرتا ہے اور سمجھتا ہے وہ صحیح ہے لیکن ممتحن کی نظر میں وہ غلط ہوتا ہے۔ اور طالب علم اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح دینی بات بھی ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھی سمجھ کر عمل کرتا ہے۔ لیکن مرشد کامل اسکو بتلاتا ہے کہ اس سے یہ غلطی ہوئی ہے۔ پس گمراہی کے گڑھے میں گرنے کے خطرے سے بچنے کیلئے مرشد کی رہنمائی ضروری ہے۔

(۲) دنیا میں ہر کام کرنے کیلئے سیکھنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ کُرتے کا بٹن بھی ٹانکنا ہو تو طریقہ سیکھنا پڑتا ہے۔ تو کیا دین کو صحیح طریقے پر کرنے کیلئے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جبکہ آنحضرتؐ نے فرمایا "انما بعثت معلماً"۔ حتی کہ صحابہ نے فرمایا "تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن" آج کے گمراہی کے دور میں ہمیں بغیر سیکھے دین کہاں سے آئے گا۔ پس ثابت ہوا کہ مرشد سے دین سیکھنا پڑے گا۔

(۳) آنحضرتؐ نے فرمایا "انما العلم بالتعلم" علم سیکھنے سے آتا ہے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہر چیز میں خود سیکھ لوں گا۔ اسی طرح ہم دین کو خود بخود نہیں سیکھ سکتے۔

(۴) اگر کوئی پودا مالی کے ہاتھوں پروان چڑھے تو سیدھا بھی ہوتا ہے۔ دیدہ زیب اور جاذب نظر بھی جبکہ خودرو پودا کبھی ٹیڑا بھی ہوتا ہے۔ شاخیں فالتو پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور بے سلیقہ لٹکی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کوئی شخص مرشد سے تربیت پاتا ہے تو اسکی شخصیت حسن اخلاق وآداب کی وجہ سے دیدہ زیب اور معتدل ہوتی ہے۔ شریعت نے تربیت پانے کو اتنی اہمیت دی کہ سکھائے ہوئے کتے کے شکار کو بھی کچھ شرائط کے ساتھ حلال کر دیا۔ پس سالک کو شیخ کامل کے زیر تربیت دین کو سیکھنا چاہئے۔

چوں تو کردی ذات مرشد را قبول　　ہم خدا آمد ز ذاتش ہم رسول

نفس نتواں کشت الا ذات پیر　　دامن آن نفس کش محکم بگیر

جب تو نے پیر کی ذات کو قبول کر لیا اس سے تجھے خدا بھی مل گیا اور رسول بھی۔ اس نافرمان نفس کو پیر کی ذات کے سوا کوئی مار نہیں سکتا۔ تو اس نفس کو مارنے والے پیر کا دامن مضبوط پکڑ۔

(۵) اہل اللہ نے لکھا ہے ایک چیونٹی بیت اللہ کی زیارت کرنا چاہتی تھی مگر راستے میں دریا۔ پہاڑ اور صحرا تھے۔ اس چیونٹی نے ایک دن بیت اللہ میں رہنے والے کبوتر کو دیکھا تو اس کے پاؤں پر چڑھ گئی۔ کبوتر اڑ کر خانہ کعبہ پہنچا تو چیونٹی بھی بیت اللہ کی زیارت کر لی۔

مور مسکیں ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد　　دست بر پائے کبوتر دار وناگاہ رسید

(۶) اصحاب کہف کے کتے نے چند دن صلحاء کی صحبت اختیار کی تو وہ بھی جنت میں پہنچے گا۔

سگے اصحاب کہف روزے چند　　پے نیکاں گرفت و مردم شد

(۷) عارف نے کیا اچھی اور دل لگتی بات کہی ہے۔

یک زمانے صحبتے با اولیاء　　　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا۔

(۸) حضرت حسن بصریؒ نے ۸ بدریوں سے علمِ ظاہری حاصل کیا تاہم حضرت علیؓ سے علم باطن حاصل کیا اور انوار ولایت کا اکتساب کیا۔ حضرت ابو حنیفہ اور امام مالک نے حضرت جعفر صادقؓ سے دو سال فیض پایا اور فرمایا "لولا السنتان لھلک النعمان" امام احمد حنبل اپنے وقت کے ولی کامل حضرت بشر حافیؒ کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ ایک دن طلباء نے پوچھا حضرت آپ اتنے بڑے عالم اور فقیہ ہو کر ایسے شخص کے پاس جاتے ہیں جو عالم نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا جو تاریخی ہے میں عالم بکتاب اللہ ہوں اور وہ عالم باللہ ہیں۔ عالم باللہ کو عالم بکتاب اللہ پر یقینا فضیلت نصیب ہے۔

امام رازیؒ کی بیعت نجم الدین کبریٰ سے تھی۔ حضرت مولانا روم شمس تبریز سے بیعت تھے۔ خود فرماتے تھے

مولوی ہر گز نشد مولائے روم　　　تا غلام شمس تبریزے نشد

البتہ مرشد میں خصوصاً مندرجہ ذیل صفات ہونی چاہئے۔ صاحب نسبت ہو۔ صاحبِ علم ہو۔ صاحب تصرف ہو۔ اور صاحبِ ارشاد ہو (یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ متبع کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہو۔ کیونکہ یہ تو بنیادی نکتے ہیں۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق　　　　جو تجھے حاضر و موجود سے بے زار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست　　　　زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے　　　　فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

ویسے مرشد کامل تو عام انسانوں کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ ان سے کچھ الگ قسم کا ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو کہتے تھے کہ ھل انت الا بشر مثلنا۔ بلکہ تمام منکروں نے تمام انبیاء کو کہا "ھل انتم الا بشر مثلنا۔ لیکن ان کو اتنی سمجھ کہاں کہ جو بظاہر سب کی طرح نظر آتا ہے۔ وہ بباطن ان سے کتنا مختلف ہے۔ جیسے تلخ اور شیرین پانی کی صورت ایک مگر سیرت مختلف۔ فاسق اور نیک آدمی نے ایک ہی روٹی کھائی مگر ایک میں شہوت پیدا ہوئی اور دوسرے میں عشقِ الٰہی۔ زمین نے دو پودے اُگائے ایک بانس بنا اور دوسرا گنّا۔ دو ہرنوں نے ایک ہی گھاس کھائی ایک سے مینگنیاں اور دوسرے سے کستوری بنی۔ بھڑ اور مگس نے ایک پھول چوسا۔ ایک میں زہر بنا اور دوسرے سے شھد بنا۔ مرشدِ کامل بھی ظاہر میں تو عام انسان کی طرح ہوتا ہے مگر حقیقت میں مختلف ہوتا ہے۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن۔ ملا کی اذان اور مجاہد کی اذاں اور۔

پرواز ہے دونوں کی اسی دہر میں لیکن۔ کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور۔

طلاق

طلاق میں تین امور اہم ہیں۔(۱) اہل طلاق (۲) محل طلاق (۳) رکن طلاق۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

اہل طلاق: ہر وہ شوہر ہوتا ہے جو عاقل بالغ اور جاگتا ہوا ہو۔ اس تعریف سے وہ تمام افراد طلاق دینے کی اہلیت سے خارج ہو جاتے ہیں جن میں مذکورہ صفات نہیں ہوتے یعنی لڑکا، مجنون، معتوہ، مُبَرسم، مغمیٰ علیہ، مدہوش اور سوتا ہوا۔ جیسا کہ درمختار جلد دوّم کتاب الطلاق صفحہ ۹۴، ۹۵ پر لکھا ہے۔ ویقع طلاق کل زوج بالغ و عاقل و لو تقدیراً (الخ) ولا یقع طلاق المولیٰ علی امرأۃ عبدہ ولا المجنون والصبی ولو مراھقاً، والمعتوہ والمبرسم والمغمیٰ علیہ (مدھوش) والنائم۔ ترجمہ: اور طلاق واقع ہو گی ہر شوہر کی جو بالغ اور عاقل ہو (الخ)۔ اور نہیں واقع ہو گی، طلاق آقا کی اسکے غلام کی بیوی پر، اور نہ مجنون کی (جسکی عقل چلی گئی ہو) اور نہ لڑکے کی اگرچہ وہ قریب البلوغ ہو گیا ہو اور نہ معتوہ کی یعنی وہ شخص جسکے حواس میں خلل واقع ہو گیا ہو۔ جو قلیل الفہم پریشان کلام اور فاسد التدبیر ہو، اور نہ مبرِسم کی۔ (جنون کی طرح ایک بیماری ہے جو جگر اور انتڑیوں کے درمیان والے پردے میں پیدا ہوتی ہے جس سے بے ہوشی لاحق ہو جاتی ہے) اور نہ مغمیٰ علیہ کی یعنی وہ جس پر غشی طاری ہو جائے اور نہ مدہوش کی یعنی اس شخص کی جسکی عقل چلی گئی ہو اور وہ حیران رہتا ہو۔ اور نہ نائم کی یعنی سونے والے کی اس لئے کہ نیند میں اسکا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔

غرض اجماع فقہاء کا اس امر پر ہوا ہے کہ طلاق غیر عاقل کی اور اسکی جسکے ہوش و حواس بجا نہیں ہیں اسکی طلاق نہیں ہوتی۔ سوائے مست کے یعنی اگر کوئی نشہ میں طلاق کہہ دے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس نے الٰہی حکم کی خلاف ورزی کی ہے، اسی طرح قدوری میں لکھا ہے "اگر کوئی خاوند اپنی عورت کو طلاق دے تو واقع ہو گی یا نہیں۔ ہاں اگر وہ خاوند عاقل اور بالغ ہو گا تو پڑ جائے گی آزاد ہو یا غلام۔ مسئلہ اگر دیوانہ یا لڑکا یا سوتا ہوا آدمی نے طلاق دے تو طلاق واقع ہو گی یا نہیں ہو گی (دیکھو قدوری کتاب الطلاق صفحہ ۱۷۳)

فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں لکھا ہے ویقع طلاق کل زوجِ اذا کان عاقلاً بالغاً ولا یقع طلاق الصبی والمجنون والنائم لقولہ علیہ السلام کل طلاق جائز الاطلاق الصبی والمجنون ولان الاھلیہ بالعقل الممیّز وھما عدیم العقل والنائم عدیم الاختیار (ہدایہ صفحہ ۲۴۱ کتاب الطلاق)۔

اسی طرح مشہور کتاب درّمختار جلد دوّم صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے "واھلہ زوج عاقل بالغ مستیقظٌ اور اہل طلاق کا زوج ہے جو عاقل بالغ اور جاگتا ہو۔ فقہ کی مشہور اور متداول کتابوں سے ظاہر ہے کہ طلاق کا اہل وہ شوہر ہے جو طلاق دینے کے وقت

بالغ ہے، جاگتا ہوا ہے اور عقل سلیم کا مالک ہے۔ اور اسکے ہوش و حواس بجا ہیں۔ اور وہ صاحب اختیار ہے۔ یہیں سے گواہی کی اہمیت بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ طلاق میں دوسری اہم چیز محلّ طلاق ہے۔ یعنی جس پر طلاق واقع ہوتی ہے۔

محل طلاق: چنانچہ در مختار جلد دوّم صفحہ ۹۱ کتاب الطلاق میں لکھا ہے۔ ''و محلّه المنكوحة'' یعنی محل، طلاق کا منکوحہ ہے۔ جس پر طلاق واقع ہوتی ہے سو وہ منکوحہ عورت ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے طلاق کے وقت اس عورت کا اس مرد کے نکاح میں باقی رہنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ہدایہ میں لکھا ہے لأَنَّ الطلاق يستدعي قيام النكاح۔ اس لئے کہ طلاق نکاح کے بقاء کو چاہتا ہے۔ یعنی نکاح باقی رہے گا تو طلاق واقع ہو گی ورنہ نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اس عورت کا اسکی منکوحہ ہونا ضروری ہے۔ بلکہ وقتِ طلاق تک اس کا اس کے نکاح میں باقی رہنے کا ثبوت بھی ضروری ہے۔ عقد نکاح ہونے اور اسکے وقتِ طلاق تک باقی رہنے کے ثبوت میں جو چیزیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اگر کسی شوہر نے اپنی بیوی سے غصہ کی حالت میں تین طلاقیں بیک وقت دیدیں یعنی کہا تجھے طلاق دیا، تجھے طلاق دیا، تجھے طلاق دیا۔ یا یہ کہا کہ تجھے تین طلاق دیں تو کیا وہ عورت اس شوہر سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی۔ یا پھر اس سے دوبارہ نکاح کیا جاسکتا ہے؟

جواب: واضح ہو کہ طلاق کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) طلاق سنت (۲) طلاق بدعت

طلاق سنت: یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایسے وقت میں جبکہ وہ حیض سے پاک ہو۔ اور ایسے طہر (پاکی) میں جس میں اس کے ساتھ ہم بستری نہ کی ہو تو اُسے ایک طلاق دے۔ یہ طلاق رجعی کہلاتی ہے۔ یعنی اسکی عدت کے اندر اُسے پھر ہاتھ بھی لگائے تو وہ اسکی بیوی بن جائے گی اور اگر عدّت گذر جائے تو وہ طلاق بائن ہو گی یعنی اسکے نکاح سے الگ ہو جائیگی مگر نکاح جدید اور مہر جدید کے ذریعہ پھر اُسے نکاح میں لایا جاسکتا ہے۔ اور اگر اس نے دوسرے مہینے میں پھر ایک طلاق دی تو یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہو گی لیکن یہ بھی رجعی ہو گی اگر اس نے پھر اسکو اپنے پاس بلایا (عدّت کے اندر) اور اگر عدّت کے دن گذر گئے اور اس نے پھر طلاق دی تو یہ طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔ اب کسی قیمت پر وہ عورت اس مرد کے لئے حلال نہیں ہو گی تاوقتیکہ حلالہ نہ ہو جائے۔ یعنی وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اسکے ساتھ رات گذارے ہمبستری ہو۔ پھر وہ اسے طلاق دے۔ عدّت گذارے تو پھر اسکے بعد وہ پہلے مرد کے نکاح میں آسکتی ہے۔ یہ ہے طلاق دینے کا صحیح طریقہ جس کا حکم اللہ نے قرآن میں فرمایا۔ اسی کو طلاق سُنت کہتے ہیں۔

طلاق بدعت ہے کہ مرد اپنی عورت کو کسی بھی وقت تین طلاقیں ایک بار گی یا تو طلاق، طلاق، طلاق تین مرتبہ کہہ

کر دے۔ یا تجھے تین طلاق ہیں کہہ دے تو اہل سنت والجماعت کے پاس فوراً طلاق مغلظہ پڑ جائیگی اور حلالہ کے بغیر وہ عورت سابقہ شوہر کیلئے حلال نہیں ہو گی۔ ایسی طلاق دینے والا سخت گنہگار ہو گا۔

اہل حدیث اور اہل تشیع کے پاس طلاق بدعت یعنی بیک وقت تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق شمار ہو گی۔ اہل سنت کی دلیل وہ روایت ہے۔ جو عجلانی سے صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ عجلانی نے تین طلاق بدونِ اجازت آنحضرت ﷺ کے دی۔ اور آنحضرت ﷺ نے اس پر انکار نہ فرمایا۔

ان کی دوسری دلیل وہ روایت ہے۔ جو نسائی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ملی کہ ایک مرد نے تین طلاقیں ایک بارگی دیں تو آپ ﷺ غضب میں کھڑے ہوگئے اور فرمایا میرے ہوتے ہوئے کتاب اللہ سے کھیل ہوتا ہے۔ یعنی قرآن میں ایکبارگی تین طلاق کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح ابن عمرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا یارسول اللہ اگر تین طلاق دوں تو کیسا ہیگا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تونے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری عورت تجھ سے جدا ہو گئی (ترجمہ اردو در مختار جلد دوم کتاب الطلاق صفحہ ۹۱۔۹۰) اسی طرح شرح وقایہ مع حاشیہ چلپی کتاب الطلاق صفحہ ۱۰۸ پر ہے۔ وان نوی الکّل فی ساعة صحت ای النیة حتیٰ تقع الثلاث فی الحال خلافاً لزفر, یعنی اگر کسی نے تین طلاق کہہ کر تین کی نیت کو تو اسکی نیت صحیح ہو گی اور اسی وقت تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اس میں امام زفر کا اختلاف ے۔ اس طرح فتاویٰ عالمگیری المعروف بہ فتاوٰی ھندیہ میں کتاب الطلاق صفحہ ۱۴۹ پر ہے۔ اور اگر اپنی جورو سے کہا۔ انت طالق وانت طالق، وانتِ طالق اور اسکو کوئی شرط پر معلق نہیں کیا پس اگر مدخولہ ہو، تین طلاق واقع ہو جائیں گی۔ لوگوں میں یہ بات غلط طور پر مشہور ہو گئی ہے۔ کہ غصہ کی حالت میں طلاق دی ہے تو کیا طلاق واقع ہو گی۔ یہ ایک مضحکہ خیز سوال ہے۔ اس لئے کہ کیا کوئی شخص اپنی بیوی سے ہنستے اور پیار و محبت کی حالت میں طلاق دے سکتا ہے۔ طلاق کا لفظ انتہائی نفرت اور غصہ کی حالت میں زبان سے نکلتا ہے۔ اس لئے کہ طلاق کے معنی نکاح کی نعمت کو دھتکارنے کے ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان معمولی زبانی جھڑپ یا کچھ اختلاف ہو تو بات طلاق تک نہیں جاتی۔ طلاق اس وقت دیجاتی ہے جب بیوی سے نفرت اپنی انتہاء پر پہنچ جائے یا غیظ و غضب اپنی آخری حد پر۔ مگر لوگوں کو چاہئے کہ اس لفظ کو اپنے الفاظ کے ذخیرے سے نکال دیں اور بھول کر بھی اس لفظ کا استعمال نہ کریں۔ اختلافات اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ عورت طیش دلانے والی بات کہہ سکتی ہے۔ مرد کو چاہیئے کہ اپنے ہوش وحواس کو نہ کھوئے اور طلاق کہہ کر اپنی زندگی نہ اُجاڑے۔ ہاں اگر عورت حد شرع واخلاق سے باہر ہو گئی ہے۔ (Out of Line) تو پہلے اسے سمجھانا چاہئے اگر وہ نہ مانے پھر دوسرا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اسطرح کہ دونوں طرف کے لوگوں میں سے ثالثین کو

مقرر کیا جائے۔ اور وہ ثالث حضرات دونوں سے حالات دریافت کریں اور صلح وصفائی کی راہ نکالیں اور دونوں کو محبت کے ساتھ زندگی گذارنے کی تلقین کریں۔ اگر ان کو یہ محسوس ہو کہ صلح وصفائی دشوار ہے اور دونوں میں سے ایک بھی مل جُل کر زندگی بسر کرنے کیلئے تیار نہیں ہے تو پھر سنت طریقے پر طلاق کی راہ بتلائیں۔ وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں۔

رکن طلاق : تیسری اہم بات رکن طلاق ہے جیسا کہ در مختار جلد دوم صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے 'ورکنه لفظ مخصوص خالٍ عن الاستشناء' اور رکن طلاق کا لفظ مخصوص ہے۔ جو خالی ہو استشناء سے، یعنی لفظ طلاق کے ساتھ انشاء اللہ نہ ہو۔ پس اب صورت مسئول عنھا میں بصورتِ صدق جب زید نے اپنی منکوحہ ہندہ کو جو وقت طلاق تک غیر مدخول بھا ہے۔ علیحدہ علیحدہ تین بار لفظ طلاق بول کر تین طلاق دی ہے تو ازروئے حکم شرع محمدی پہلی بار لفظ طلاق بولنے کے ساتھ ہی اس پر ایک طلاق پڑ جاتی ہے۔ بغیر عدت کے اور وہ طلاق بائن ہو گی یعنی اسکے نکاح سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ عدت نہیں ہے اس لئے دوسری اور تیسری طلاق لغو (بے کار) ہو جائے گی۔

چنانچہ در مختار کتاب الطلاق باب الطلاق غیر مدخول بہا صفحہ ۱۱۲، ۱۱۳ پر لکھا ہے۔ وإنّ فرّق لوصفٍ او خبر او حمل عطف اوغیرہ بانت بالاولی الی عدّة ولذا لم تقع الثانیة بخلاف الموطؤة حیث یقع الکل "یعنی اگر تین طلاق کو جدا جدا کہیگا بذکر وصف یعنی یوں کہے گا انت طالق واحدۃ واحدۃ واحدۃ یا بذکر خبر تفریق کی چنانچہ یوں کہا انت طالقٌ، طالقٌ یا بذکر چند اقوال تفریق کی چنانچہ یوں کہا انتِ طالق و انتِ طالق، انت طالق وغیرہ، تو ان تینوں صورتوں میں پہلے لفظ سے طلاق بائن غیر مدخولہ پر پڑ جائے گی بغیر عدّت کے۔ اس پر طلاق ثانی نہیں پڑتی تو ثالث بطریق اولیٰ واقع نہ ہو گی۔ بخلاف مدخولہ کے کہ اسپر دوسری اور تیسری سب طلاقیں ہو جاتی ہیں۔ احسن المسائل کامل ترجمہ کنز الدقائق میں لکھا ہے "اور بائن وہ طلاق ہے جس سے نکاح اسی وقت جاتا رہتا ہے" اور اسکے حاشیہ پر لکھا ہے" مگر ہاں یہ طلاق دینے والا اگر چاہے اور عورت کی مرضی ہو تو یہ عدّت ہی میں اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ اس عدت میں کوئی دوسرا شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہدایۃ میں لکھا ہے فان فرّق الطلاق بانت بالاولیٰ و لم تقع الثانیة والثالثة اگر غیر مدخول بہا کو تین طلاقیں جدا جدا کر کے کہے تو پہلی طلاق سے وہ بائن ہو جائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہو گی۔ اور مبائنہ (یعنی طلاق بائن والی عورت) سے نکاح کے بارے میں در مختار جلد دوم ۱۶۶ صفحہ پر لکھا ہے، "وینکح مبائنة بمادون الثلٰث في العدةِ و بعدھا بالاجماع"، اور نکاح کرنے زوجۂ مطلقہ بائنہ سے تین طلاق سے کمتر میں یعنی اگر ایک طلاق بائن ہوئی یا دو طلاق تو عدت کے اندر (وہی شوہر) بدلیل اجماع نکاح جائز ہے اور بعد عدت کے بھی۔

اب رہی یہ بات کہ طلاق کب واجب ہوتی ہے تو قرآن اس بارے میں بڑی لمبی چوڑی تفصیل بیان کرتا ہے کہ اگر عورتوں کی طرف سے نافرمانی کا اندیشہ ہو تو ان کو نصیحت کرنا چاہئے۔ ان کو مارنا چاہئے ان کے بستر الگ کرنا چاہئے۔ طرفین کے لوگوں کو۔ بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرنا چاہئے لیکن اگر درمیانی لوگ بھی عاجز آجائیں اور ان کو یقین ہو جائے کہ وہ دونوں اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو طلاق دلانے کا حکم دیا گیا ہے۔

یعنی قرآن کے الفاظ میں اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ﴿البقرة: ۲۲۹﴾ یعنی یا تو معروف طریقے سے ان کو رکھو یا احسان کے ساتھ ان کو چھوڑ دو اس سے ثابت ہوا کہ جب امساک بالمعروف فوت ہوتا ہے تو طلاق دینے کی نوبت آتی ہے۔ جیسا کہ درمختار کتاب الطلاق صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے۔"ویجب لوفات الامساك بالمعروف" اور طلاق واجب ہے اگر فوت ہو دستور کے مطابق رکھنا۔ پھر آگے چل کر لکھا ہے صفحہ ۹۱ "ومن محاسنه التخلّص من المکارہ اور طلاق کی خوبیوں سے یہ ہے کہ بسبب طلاق کے مکروہات سے نجات ہوتی ہے یعنی مرد طلاق سے عورت کی بد خلقی سے بچتا ہے۔

طلب دیدار خدا

حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا "خدا کو سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہے، دیکھنا چاہئے"۔ نیز حکم کیا کہ ہر ایک مرد اور عورت پر خدا کے دیدار کی طلب فرض ہے جب تک سر کی آنکھ یا دل کی آنکھ یا خواب میں خدا کو نہ دیکھے مومن نہ ہوگا مگر طالب صادق جس نے اپنے دل کے منھ کو مولیٰ کی طرف کر دیا ہے اور ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہتا ہے اور دنیا و خلق سے عزلت اختیار کیا ہے اور اپنے سے باہر ہونے کی ہمت رکھتا ہے (ایسے شخص پر بھی ایمان کا حکم کیا ہے) اور نیز فرمایا ایمان خدا کی ذات ہے۔

فرائض ولایت سے طلب دیدار خدا بھی اہم ترین فرض ہے۔ دیدار باری تعالیٰ کے بارے میں بحث، موسیٰؑ کے واقعہ میں نیز لا تدرکہ الابصار کے ذیل میں تفصیلاً کی جاچکی ہے۔ وہاں دیکھی جاسکتی ہے البتہ عقلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی یہ عادت ہے کہ جب بھی کسی مصنوع (چیز) کو دیکھتا ہے اور وہ چیز اس کو پسند آتی ہے تو دیکھنے کے بعد خاموش نہیں رہتا بلکہ اس کا (Make) پوچھتا ہے۔ یعنی یہ چیز کہاں کی، کونسی کمپنی کی ہے وغیرہ اسی طرح جب انسان مشاعرہ میں شریک ہوتا ہے تو شاعروں سے اشعار سنتا ہے۔ حالانکہ شعر کا تعلق سماعت سے ہوتا ہے تو شعر سن کر خاموش نہیں رہتا بلکہ "شاعر" کو دیکھنے کی طلب اس میں پیدا ہوتی ہے اور وہ کسی صورت میں اس شاعر کی ایک جھلک ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ انسان اپنی فطرت سے بغاوت نہیں کرسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ایک انسان کی بنائی ہوئی ایک چیز کو دیکھنے کے بعد اس کا Made in دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو اللہ کی اس بھری کائنات میں مختلف النوع چیزوں کو دیکھنے کے بعد انسان کے دل میں یہ جذبہ نہیں ابھرتا، کہ جس نے ان تمام چیزوں کو بنایا ہے وہ کیسا ہوگا؟ کیا ایک انسان کے کلام کو سننے کے بعد اس کے مصنف یا خالق کو دیکھنے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے تو بے مثال کلام یعنی قرآن مجید پڑھنے یا سننے کے بعد یہ خواہش سر نہیں ابھارتی کہ جب یہ کلام اتنا خوبصورت اور حکیمانہ ہے تو اس کا مصنف کیسا ہوگا۔ کیا اس کو دیکھنے کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر نہیں ہوتا تو فطرت کے خلاف بات ہے اور اگر ہوتا ہے اور یقینا ہوتا ہے تو اسی کو حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ اسکو دیکھنے کی طلب پیدا کر وہ دیکھا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کے شرائط یہ ہیں کہ اعمال صالحہ (ترک دنیا) کریں اور اس معبود برحق کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔

حضرت شیخ مصطفی گجراتیؒ سے اکبر اعظم کے دربار میں علماء کے جو مناظرے ہوئے ان مناظروں میں ایک مجلس میں علماء نے حضرت سے رویت باری کے بارے میں گفتگو کی۔ حضرت نے قرآن اور احادیث سے دلائل پیش فرمائے۔ لیکن علماء

نے ماننے سے انکار کر دیا اور مختلف قسم کی لاحاصل تاویلات کا سہارا لیا۔ تو حضرت نے اکبر سے کہا کہ آج رات ان علماء کی شاہی محل میں ہی دعوت کی جائے اور مرغن غذاؤں کا انتظام ہو لیکن کھانے کے بعد کسی بہانے پانی پینے کے لئے نہ دیا جائے اور رات میں سونے کا انتظام بھی یہیں کیا جائے۔ حسبہ عمل ہوا، علماء نے شاہی خاصے سے خوب کھایا۔ مرغن کھانے کھانے کے بعد پیاس ستانے لگی۔ لیکن پانی نہیں دیا گیا بالآخر سب پانی پانی کہتے ہوئے سو گئے۔ صبح میں علماء کو بلایا گیا۔ اور شیخ مصطفی گجراتیؒ نے ان علماء سے پوچھا کہ بھائیو، رات میں کس کس نے کیا کیا خواب دیکھا۔ ایک عالم نے کہا میں نے خواب میں دیکھا میرے گھر کے سامنے نہر بہہ رہی ہے اور میں اس سے پانی پی رہا ہوں۔ کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ بارش خوب ہو رہی ہے اور میں اس میں بھیگ بھی رہا ہوں اور چلو میں پانی لیکر پی بھی رہا ہوں۔ کسی نے کچھ کہا تو کسی نے کچھ، مگر ہر ایک کے خواب میں قدر مشترک پانی تھا۔ یہ سن کر شیخؒ نے کہا کہ تم سب کو ایک رات پانی نہیں ملا۔ پیاس شدت کی تھی تو سب پانی پانی کہتے ہوئے سو گئے تو سب کو خواب میں پانی نظر آیا۔ اور جب اللہ والے ساری عمر ساری رات اللہ اللہ کہتے رہتے ہیں تو کیا ان کو اللہ نظر نہیں آتا۔ یہ سن کر علماء نادم ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ طلب اور تڑپ ضروری ہے پھر اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔ اللہ ہی مراد پوری کرنے والا ہے ومن یتو کل علی اللہ فھو حسبہ۔

طریقت

طریقت اصلاح نفس کے علم کا نام ہے۔ جس طرح علم شریعت ضروری اور لازمی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر علم طریقت لازمی اور ضروری ہے۔ شریعت میں اوامر یعنی نماز، روزہ، حج، زکواۃ وغیرہ عبادات اسی طرح والدین کے ساتھ حسن سلوک، بیویوں کے ساتھ برتاؤ، اولاد کی صحیح تربیت، تجارت، مزارعت، نکاح، طلاق، خلع وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اور نواہی جیسے سود، شراب، زنا، چوری، ظلم وغیرہ کی ممانعت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور طریقت میں دل کو تمام اعمال کا محور بنا کر اسکی اصلاح پر زور دیا جاتا ہے۔

یوں بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ظاہری اعمال کی تاکید کی گئی ہے۔ اس طرح بعض باطنی اعمال پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اور ان کے تعلق سے بھی اللہ نے نہ صرف سرسری احکام دئے ہیں بلکہ نماز، روزوں کی طرح تاکیدی احکام جاری فرمائے ہیں۔ چنانچہ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ﴿البقرۃ:۴۳﴾ فرمایا اور اس سے نماز روزہ فرض قرار پائے اس لئے کہ ان کا حکم اللہ نے بصیغۂ امر فرمایا۔ اسی طرح اللہ نے وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا ﴿الأنفال:۴۵﴾ فرمایا۔ اور يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ ﴿البقرۃ:۲۷۸﴾ فرمایا اور كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿التوبۃ:۱۱۹﴾ فرمایا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے امر کے صیغے ہی لائے ہیں۔ پس جسطرح أَقِيمُوا الصَّلَاةَ سے نماز فرض ہوئی۔ اٰتوالزکواۃ سے زکواۃ فرض ہوئی۔ کیا وَاذْكُرُوا اللَّهَ سے ذکر فرض نہیں ہوتا۔ اتَّقُوا اللَّهَ سے تقویٰ فرض نہیں ہوتا۔ كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ سے صحبت صادقین فرض نہیں ہوتی۔ فرق صرف اتنا ہے نماز روزہ اور حج وزکواۃ کا تعلق جسم کے اعضاء سے ہے اور ذکر، تقوی اور صحبت صادقین کا تعلق دل سے ہے۔ اور دل تو تمام اعضاء کا بادشاہ ہے۔ جب دل سنبھل جاتا ہے تو تمام اعضاء جو اس کے غلام ہیں وہ بھی سُدھر جاتے ہیں۔

طریقت کے بغیر شریعت کے سارے اعمال، اگر انسان دنیا میں کر بھی لے، تو قیامت میں اس کو کوئی اجر نہیں ملے گا۔ بلکہ وہ سب اعمال اسکے منھ پر مار دئے جائیں گے۔ اعمال میں نیت اصل چیز ہے اور نیت کا مقام دل ہے۔ جب نیت ہی صحیح نہ ہوگی تو اعمال کس طرح اللہ کے پاس مقبول اور معتبر ہوں گے۔ قرآن شریف اللہ کا ایک جامع کلام ہے۔ اس میں اللہ نے ہر چیز بیان کردی ہے۔ بعض امور تو ظاہری نظر سے معلوم ہو جاتے ہیں اور بعض امور کے جاننے کیلئے گہری نظر ضروری ہوتی ہے۔

اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس طرح خطاب فرمایا۔ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ – هَٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿الجاثیۃ:۱۸،۲۰﴾ ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقے (شریعت) پر کر دیا۔ سو آپ اسی طریقے کی اتباع کیجئے اور جاہلوں کی خواہشوں پر نہ جائیے۔ یہ

شریعت لوگوں کیلئے باطنی روشنی (بھی) ہے اور ہدایت بھی اور یقین کرنے والوں کے لئے رحمت بھی ہے۔

بَصَائِرُ: بصیرت کی جمع ہے اور بصیرت باطنی روشنی کو کہتے ہیں۔ اور بصر ظاہری روشنی کو کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت بصائر ہے یعنی باطن کو روشن کرنے والی ہے۔ اور ہدایت ہے یعنی عام لوگوں کیلئے اراءۃ الطریق، یعنی راستہ دکھاتی ہے اور خواص کے لئے منزل مقصود تک پہنچانے والی ہے ایصال الی المطلوب، اور یہ جو کچھ ہے وہ اللہ کی رحمت سے ہی ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے جن کو یقین کا درجہ حاصل ہے۔

گویا یہ بتانا اور سمجھانا مقصود ہے کہ شریعت تو راستہ ہے مگر کب تک راستہ ہی چلتے رہو گے۔ راستہ پر چلنے کا اصل مقصد تو منزل پر پہنچنا ہے۔ ظاہری آنکھوں کے ساتھ دل کی آنکھیں بھی کھلی رکھو، اللہ کی رحمت پر یقین کرو بے شک جس کے راستے پر جس کو پانے کے لئے چل رہے ہو تو ایک نہ ایک دن منزل پر پہنچ کر اس کا دیدار بھی حاصل کر لو گے۔

شریعت کی حکم رانی ظاہری اعمال پر ہوتی ہے جو اعضاء سے سرزد ہوتے ہیں لیکن طریقت کا راج دل پر ہوتا ہے جہاں نیت پیدا ہوتی ہے تو جب تک نیت صحیح نہ ہو گی اس وقت تک اعمال بھی صحت کا حکم نہ پا سکیں گے یا کم از کم مقصد حاصل نہ کر سکیں گے۔ تو جس طرح اعمال کی صحت کیلئے جس علم کو جاننے کی ضرورت ہے اسکو "علم فقہ" کہتے ہیں اسی طرح نیت کی تصحیح کے لئے جو علم حاصل کیا جاتا ہے اسکو تصوف، احسان یا طریقت یا اصلاح نفس کے علم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ نیت کا مقام قلب ہے۔ اس لئے قلب کی اصلاح کے علم کو بھی طریقت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿یونس:٦٢﴾ ترجمہ: آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے اولیاء پر نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ولایت کا مدار دو چیزوں پر ہے ایک ایمان اور دوسرا تقویٰ۔ پس یہ دونوں چیزیں بھی فرض قرار پائیں اور یہ دونوں چیزیں اصلاح باطن کے بغیر حاصل نہیں ہو تیں۔ کیوں کہ ایمان کے رہنے کی جگہ قلب ہے۔ جیسا کہ اللہ نے منافقوں کے تعلق سے فرمایا۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ﴿الحجرات:١٤﴾ اور ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اب رہا تقویٰ، تو اس کا محل بھی قلب ہی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ التقویٰ ھٰهُنا واشارَ اِلیٰ صدرہ (مسلم)۔ تقویٰ یہاں ہے اور اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمایا، پس معلوم ہوا کہ باطن کی اصلاح یا قلب کا تزکیہ بھی فرض ہے۔

چنانچہ اللہ فرماتا ہے "قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ﴿الشمس:١٠﴾" بے شک جس نے نفس کو

پاک کیا وہ کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا وہ ناکام رہا۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے یَوْمَ لَا یَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّـهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿الشعراء:۸۸﴾ اس دن مال اور بیٹے کام نہیں آئیں گے کسی کے بجز اس شخص کے جو اللہ کے پاس قلب سلیم لیکر آیا۔

لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ طریقت بعد کی پیداوار ہے۔ آنحضرت کے زمانے میں نہیں تھی۔ خلفاء راشدین کے دور میں بھی اس کا ذکر نہیں تھا۔ جو کچھ ہے وہ صرف شریعت ہی ہے۔ یہ صرف قرآن اور احادیث شریفہ اور رسول اللہ ﷺ کے ذاتی عمل سے ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ قرآن نے بھی اصلاح باطن پر زور دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اسکی اہمیت بیان فرمائی ہے۔

ہاں جس طرح تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم بحیثیت "علوم" اس عہد مبارک میں نہیں تھے۔ اسی طرح علم طریقت بھی نہیں تھا۔ جس طرح بعد میں مفسرین نے اصول تفسیر، محدثین نے اصول حدیث اور فقہاء کرام نے اصول فقہ مرتب و مدوّن فرمائے اسی طرح اصلاح باطن، تزکیۂ نفس، تصحیح النیۃ کے اصول بزرگان دین اور صوفیاء کرام نے مدّون اور مرتب فرمائے۔

جس طرح مدرسوں میں قرآن، حدیث اور فقہ کا درس دیا جانے لگا، اسی طرح خانقاہوں میں طریقت کا درس دیا جانے لگا، جس طرح فقہ کا درس لینے والے فقیہ، تفسیر میں درک پانے اور لکھنے والے مفسر اور حدیث میں عبور حاصل کرنے والے محدّث کہلائے اسی طرح طریقت کا یعنی اصلاح باطن میں درجۂ کمال حاصل کرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے "صوفی" کہلانے لگے۔

ظالم

قرآن شریف میں ظلم کے معنی شرک کے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ لقمان میں آیا ہے کہ حضرت لقمان حکیم نے اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿لقمان:۱۳﴾ ترجمہ اے میرے پیارے بیٹے تو اللہ کے ساتھ شرک مت کر یعنی کسی کو اس کا ساجھی مت بنا کیونکہ شرک بڑا ظلم ہے۔ اسی طرح ظلم کے معنی کسی چیز کو اسکی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ رکھنے کے ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے الظلم وضع الشیءِ علی غیر و ضعه، ظلم کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) ظلم لنفسہ (۲) ظلم علی غیرہ۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے " ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿فاطر:۳۲﴾ " پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔ پھر ان میں کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی ان میں سے میانہ رو ہے اور کوئی ان میں سے اللہ کی توفیق سے آگے نکل جانے والا ہے۔ یہی بڑا فضل ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ کہ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وہ ہے جو ایمان صحیح کے باوجود گناہوں میں مشغول ہے۔ یا جن کے سئیات حسنات سے زیادہ ہیں۔ مُّقْتَصِدٌ وہ جو درمیانی ہیں۔ نہ گناہوں میں مشغول اور نہ نیکیوں میں اعلیٰ درجے کے، یعنی جن کے سیات اور حسنات کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔ اور سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ وہ جو نیکیوں سے بہت زیادہ جڑے ہوئے یعنی جن کی حسنات کا پلڑا بہت بھاری ہے۔

حضرت امامنا مہدی موعودؑ نے اس آیت کا بیان اسطرح فرمایا ہے ظالم نفسہ سے مراد ملکوتی ہیں جن میں ناسوتیت کا تھوڑا اثر باقی ہے مقتصد سے مراد جبروتی ہیں جن میں ملکوتیت کا تھوڑا اثر باقی ہے اور سابق بالخیرات سے مراد لاہوتی ہیں۔ ان مراتب میں وارثت اور برگزیدگی اللہ کا بڑا فضل ہے۔ نیز آپ نے ایک مطلب یہ بھی بیان فرمایا ظالم نفسہ سے مراد فنا چشیدہ (اندک فنا) ہے۔ مقتصد سے مراد نیم فنا ہے اور سابق بالخیرات سے مراد تمام فنا یا فانی فی اللہ ہے، ان تین جماعتوں میں ایک کو علم الیقین دوسرے کو عین الیقین اور تیسرے کو حق الیقین حاصل رہتا ہے۔

ظہار

ظہار کے معنی ہیں کوئی شخص اپنی بیوی کو محرّمات ابدیہ (وہ رشتے جن سے ہمیشہ کیلئے نکاح حرام ہے) جیسے ماں، بہن کی ذات سے یا ان کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دے جسکی طرف دیکھنا اسکو منع ہے۔ جیسے یوں کہے کہ تو میری ماں کی طرح ہے یا تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ یا تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری بہن کی ران، تو اس بیوی سے اس شوہر کی مقاربت نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ کفارہ ادا نہ کرے۔ اور وہ کفارہ ہے (۱) ایک غلام کو آزاد کرنا۔ (۲) اور اگر اسکی بھی قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا (۳) اور اگر اسکی استطاعت نہ ہو مسلسل ساٹھ روزے رکھنا۔

کفارہ ادا کرنے سے پہلے بیوی سے جماع (ہم بستری) اور دواعی جماع یعنی بوسہ وغیرہ لینا بھی جائز نہیں ہے، کفارہ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے تا کہ ایسے لوگوں کو نصیحت ہو۔ وہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کریں، اور دوسرے سننے والے بھی اس قسم کی حرکت سے پرہیز کریں۔

ایام جاہلیت میں اگر کوئی اپنی عورت کو ماں کہہ دیتا تو وہ اس پر ہمیشہ کیلئے حرام ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن قرآن کے ذریعہ حکم دیا گیا کہ پچھلی جاہلیت کے دور کی باتوں کو چھوڑو، اب اللہ اور اس کے رسول ؐ کے احکام پر عمل کرو۔

رسول ا اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اوس نامی ایک صحابی نے اپنی بیوی خولہ سے کہا کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے۔ پھر اپنی بیوی سے قربت چاہی، بیوی نے انکار کر دیا۔ اور آنحضرت کے پاس شکایت لے کر آئی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اب کیسے اس سے مل سکتی ہو۔ تو کہنے لگی کہ بچے چھوٹے ہیں۔ گھر برباد اور بچے پریشان ہوں گے۔ اس پر ظہار کے مسئلہ کا حکم نازل ہوا، کہ ماں تو وہی ہے جس نے تم کو جنا لیکن تم ایسی نامعقول بات کیوں کرتے ہو۔ پھر اس کا کفارہ بتایا گیا۔

عشق

عشق کی نسبت سید نا مہدی علیہ السلام فرماتے ہیں: "بار امانت عشق ذات حق بود، ہر یک بقدر حوصلہ خویش حمل کرد۔ و بہ لقاء اللہ تعالیٰ مشرف شد، اما کما حقہ ایں دو تن بر داشتند یکے خاتم النبی دوم خاتم الولی صلی اللہ علیہما و سلم"

آپ کی عادت مبارک تھی کہ جو لوگ آپ کی خدمت اقدس میں طلب خدا کی غرض سے آتے اکثر اوقات آپ ان سے دریافت فرماتے کہ "بھائی تم میں کتنا عشق ہے؟" وہ کہتے کہ جان و تن اور زن و فرزند سب کے سب نام خدا پر فدا ہیں۔ آپ فرماتے "محبت اور عشق خدا ان چیزوں سے بدرجہا افضل ہے۔ پھر زیادہ صراحت کی غرض سے یہ تمثیل بیان فرماتے کہ "ایک شخص کا لڑکا گم ہو گیا اس کے والدین کے دل میں طرح طرح کے گمان پیدا ہوتے ہیں کہ نہیں معلوم چور لے گئے یا کنویں میں گر گیا یا جانور کھا گیا۔ اس وقت اس کا کیا حال ہو گا۔ طالبان خدا عرض کرتے میراں جی، والدین کو اپنے فرزند کی محبت میں کھانا پانی سب زہر ہو جاتا اور نیند اڑ جاتی ہے۔ اور جب تک بیٹے کی خبر نہ ملے اس کی تلاش میں سر گرداں رہتے ہیں۔ مہدی علیہ السلام اس وقت فرماتے: "بھائیو خدا کی طلب اور اس کے عشق میں ان والدین کے جیسے ہونا چاہئے جو شب و روز بیٹے کی طلب میں بے قرار رہتے ہیں۔ پھر فرماتے کہ: بیٹے کا عشق تو بہت بڑا عشق ہے۔ لیکن ایک سوئی گم ہو جانے پر اس کی تلاش میں کیسے بے قرار ہو جاتے ہو، اتنا عشق بھی اگر خدا کے ساتھ ہو تو خدا کو پہنچ جاؤ گے۔ پھر فرماتے: عشق بذات خود پاک ہے۔ اس کو کسی حالت میں ناپاکی لگتی ہی نہیں۔

مثال کے طور پر فرماتے: مردار خوار (ڈھیڑ) مردار جانور کا گوشت چولہے پر پکا رہا ہے اس چولھے کے نیچے سے کسی نے آگ لی۔ اور حلال کھانا پکایا تو جائز ہے۔ کسی قسم کا خوف نہیں ہے۔ کیونکہ آگ دراصل پاک ہے۔ اگرچہ مردار گوشت کی ہانڈی کے نیچے ہو۔ اس کو کوئی ناپاکی لگ نہیں سکتی۔ اسی طرح جو عشق خواہشات نفسانی اور گناہوں میں سالہا سال خرچ کیا ہے وہی عشق خدا کی طلب میں صرف کیا جائے تو مقصود حاصل ہو جائے گا۔

اسی مطلب کو حضرت سید فضل اللہؒ اس طرح لکھتے ہیں کہ سید نا مہدی علیہ السلام فرماتے ہیں: "تم نے کسی سے عشق کیا ہے؟ بس وہی عشق راہ خدا میں لگا دو۔ وصال خدا سے مشرف ہو جاؤ گے۔ (سراج منیر)

قرآن شریف میں لفظ عشق نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگرچہ لوگ اس کے تعلق سے مختلف توجیہات کرتے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ چونکہ زمانہ جاہلیت میں عرب شعراء نے اس کا استعمال صحیح معنی میں نہیں کیا تھا بلکہ اس کا استعمال غلط معنی ہی کے لئے کیا تھا اس لئے اللہ نے اس لفظ کا استعمال اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ لیکن

اس کا جو مطلب ہے یعنی "شدت کی محبت" اسے اللہ نے اپنی کتاب میں مومنوں کی صفت کے طور پر تعریفی انداز میں بیان فرمایا ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ﴿البقرۃ:۱۶۵﴾ جو لوگ مومن ہیں وہ اللہ سے شدت سے محبت کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ عشق ایک بیل ہے جو دیواروں میں اگتی ہے اور دیوار سے ہی چمٹی رہتی ہے۔ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ اور جب وہ بڑھتی ہے تو بھی دیوار سے ہی چمٹی رہتی ہے۔ چونکہ عاشق کے قلب نظر اور دماغ اور فکر میں معشوق ہی رہتا ہے اس لئے اس تعلق کو عشق کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ محبت میں "انا" باقی رہتی ہے۔ لیکن عشق میں "فنا" کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

"حم عسق" کا بیان کرتے ہوئے مہدی علیہ السلام نے فرمایا اس سے مراد "حی محمد بعشق" ہے یعنی محمدؐ عشق سے زندہ ہیں۔ نیز فرمان مہدیؑ ہے، عشق ذات خدا است۔

عقل و عشق

حضرت امام غزالیؒ نے عقل کی بزرگی، اقسام اور حقیقت پر احیاء العلوم میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں "عقل علم کا منبع، مطلع اور اصل ہے۔ عقل کی نسبت ایسی ہے جیسے پھل کی نسبت درخت سے یا نور کی نسبت آفتاب سے یہ وہ صفت باطنی ہے جس سے آدمی چوپایوں سے ممتاز ہوتا ہے اور جس کے باعث علوم نظری کو قبول کرنے اور حق تعالیٰ کی مصنوعات میں فکر کرنے کی اس کو اس سے استعداد حاصل ہوتی ہے۔ اور اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی لیاقت آتی ہے۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہر چیز کا ایک تکیہ ہے اور ایمان کا تکیہ عقل ہے۔ انسان کی عبادت اس کی عقل کے مطابق ہوتی ہے اسی لئے بدکار دوزخ میں یوں کہیں گے " لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿الملک:۱۰﴾" یعنی اگر ہم دنیا میں سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے (احیاء العلوم)

حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں "میں نے تقریباً ستر کتابوں میں پڑھا ہے کہ تخلیق آدم کی ابتداء سے اب تک تمام دنیا والوں کو جتنی عقل دی گئی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے تمام عالم کے ریگزاروں کے مقابلے میں ایک ذرہ (عوارف)

عقل کی قسمیں: حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا عقل کی تین (۳) قسمیں ہیں۔ عقل معاش، عقل معاد، عقل نور۔

عقل معاش : کی نظر کوتاہ ہے۔ یہ عقل دنیا داروں اور دولت مندوں اور بے دینوں کو وافر مقدار میں دی گئی ہے۔ جس کی مدد سے لوگ دنیا کے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ تجارت، لین دین، صنعت و حرفت، ایجادات، اختراعات، سرداری اور سلطنت، غرض کہ اپنے بدن اور شکم کی لذت و آسائش کے حصول کے لئے عقل معاش ہر وقت کوشاں رہتی ہے۔ اور آخرت کے امور میں یہ عقل بالکل اندھی ہے۔

عقل معاد: دوسری قسم عقل معاد ہے۔ اس کی نظر تیز ہوتی ہے۔ یہ عقل نیک اور صالحین کو عطا کی گئی ہے۔ جس سے وہ امور آخرت میں غور وخوض کرتے ہیں اور فانی لذتوں کو چھوڑ کر باقی رہنے والی نعمتوں کی طرف دوڑتے ہیں۔

عقل نور : تیسری عقل، عقل نور ہے جو انبیاء اور اللہ کے خلیفوں کو عطا کی جاتی ہے۔ نہ وہاں دنیا کا گذر ہوتا ہے اور نہ آخرت کا، وہ تو بس حکم الٰہی کے تابع ہوتے ہیں۔ کیا کرنا چاہئے اور کیسے کرنا چاہئے۔ ان تمام معاملات میں وہ صرف حکم الٰہی پر نظر رکھتے ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتے۔

پس طالب خدا کو چاہئے کہ آخرت اور غیب کے معاملوں میں بحث و مباحثہ کرنے والوں کے ساتھ مناظرہ و مکالمہ نہ کرے۔ تاویلات اور شکوک و شبہات کے دروازے نہ کھولے۔ اعتقاد اور اتباع کے راستے سے باہر نہ جائے اور منقول کو معقول کا تابع نہ بنائے۔ کیوں کہ جو شخص بھی گمراہی کے گڑھے میں گرا ہے وہ اپنی عقل پر اعتماد اور رائے پر گھمنڈ کرنے کی بنا گرا ہے۔ اگر عقل غیب کے بھیدوں کو سمجھنے اور مبدا و معاد کے اسرار کو جاننے کی استعداد رکھتی تو پھر انبیاء علیہم السلام اور ہمارے پیارے رسولؐ کی بعثت کا کیا مقصد تھا۔ عقل انسانی اس قابل نہیں کہ وہ آخرت کے حالات کی تفصیل اور اعمال کے بھیدوں کی کیفیت اور ان کی تعداد ان کی وضع قطع، ان کے اوقات کا تعین اور ان کے اجزاء کی خصوصیت، آسمان سے آتی ہوئی وحی کے بغیر معلوم کرلے۔ جب کہ حالت یہ ہے کہ اس معاملے میں کشف و وجدان تک حیران و پریشان ہیں تو پھر عقل کس شمار میں۔

نبی کی سچائی اور حق کو سمجھنے کے لئے عقل کی نہیں بلکہ نور ایمان و نور ہدایت کی ضرورت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عقل ہونی چاہئے تا کہ اس سے نبی کی سچائی اور اس کے معجزات کے بارے میں فکر و نظر سے کام لیا جا سکے اور عقل کے سوا کسی اور ذریعہ سے اسے سمجھا نہیں جاسکتا۔ بس عقل ہی اصل ہے۔ خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے بلکہ ہدایت ہونی چاہئے تا کہ نور ایمان حاصل ہو اور منزل مقصود تک رسائی ہو سکے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بہت سے کفار قریش ایسے بھی تھے جو کافی عقل مند تھے۔ مگر انوار معجزات کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی نبی کی سچائی کو نہ سمجھ سکے۔ کس قدر بدبختی کی بات ہے کہ سورج طلوع ہو اور اس کی روشنی سارے عالم میں پھیل جائے اس وقت کوئی شخص اپنی آنکھ بند کرلے اور بحث میں پڑ جائے

اور تحقیق کرنے لگے کہ اس کا نور کہاں سے آیا (مرج البحرین)

عشق کے مقابلے میں جس عقل کی مذمت آئی ہے وہ وہی عقل معاش ہے جو ہر کام میں ظاہر نفع ونقصان کو دیکھتی ہے اور روحانیت کی دنیا سے بالکل اندھی ہے۔ روحانیت کے مدارج تو اتنے بلند وارفع ہیں کہ عقل معاد بھی وہاں حیران وپریشان ہے کبھی کبھی اس عالم شہادت یعنی اس دنیا میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو عقل کی گرفت میں نہیں آتے تو جب عالم ناسوت میں عقل کا یہ حال ہے تو پھر عالم ملکوت، جبروت اور لاہوت کے امور میں تو یہ بالکل اندھی اور بہری ہے۔

جیسا کہ قرآن میں آیا ہے " يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُون ﴿الروم:۷﴾
یعنی یہ لوگ حیات دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے تو غافل ہی ہیں۔

عقل گوید شش جہت حدست بیروں راہ نیست عشق گوید ہست راہے رفتہ ام من بارہا

ترجمہ: عقل کہتی ہے کہ ہر چھ سمت حد لگی ہوئی ہے، اس کے باہر (خدا کی طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں) عشق کہتا ہے کہ راستہ ہے۔ میں تو بارہا جاچکا ہوں)

ایک عربی شاعر کہتا ہے:

العقل عقیلة الرجال والعشق محالة العقال

یعنی عقل آدمی کو پابند کرتی ہے، عشق ان پابندیوں کو دور کرتا ہے۔

والعقل یقول لا تخاطر والعشق یقول لا تبال

عقل کہتی ہے کہ اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈال۔ اور عشق کہتا ہے پروانہ کر

ایک فارسی شاعر کہتا ہے:

عقل گوید دنیا و عقبیٰ بجو عشق می گوید بجز مولا مجو

عقل کہتی ہے کہ دنیا اور آخرت کی تلاش کر اور عشق کہتا ہے سوائے محبوب کے اور کچھ مت ڈھونڈ۔

عقل می گوید کہ خود را پیش کن عشق می گوید کہ ترک خویش کن

عقل کا تقاضا ہے کہ اپنے آپ کو سنوارو اور عشق کی ضد ہے کہ اپنے آپ کو مٹادو

عقل ہر کام کو نفع ونقصان کی ترازو میں تولتی ہے اور سود وزیاں کے پیمانے سے ناپتی ہے۔ عشق اپنے مقصود کے سامنے ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مناظرہ، مکالمہ، بحث و تمحیص، منطق، فلسفہ اور عقلی موشگافیوں سے کسی نے خدا کے دربار تک رسائی حاصل نہیں کی جس طرح آئینہ شفاف ہوتا ہے تو ہر مقابل شئی کے عکس کی قبولیت کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب انسان کی لوح دل ہر قسم کی کثافت خواہش، ارادہ اور نقش ماسوا سے صاف ہو جاتی ہے تو پھر انوار قدسی و تجلیات الٰہی اس میں عکس ریز ہو جاتی ہیں۔

نسیت کل طریق کنت اعرفہ الا طریقا یودینی الی بیوتکم

یعنی میں سوائے اس راستے کے جو تمھارے گھر تک جاتا ہے سب راستوں کو بھول گیا ہوں

دل جبھی دل ہے کہ اس میں یاد جانانہ رہے

گھر جبھی گھر ہے کہ اس میں صاحب خانہ رہے

صد کتاب و صد ورق درنار کن سینہ راازنور حق گلزار کن

سو کتابوں اور سو اوراق کو آگ میں ڈال۔ اپنے سینے کو نور حق سے گلزار کر لے

حضرت نظام الدین محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ عقل اور عشق دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علماء و حکماء اہل عقل ہیں اور فقیر اور درویش اہل عشق ہیں۔ علماء کے عشق پر عقل غالب ہے اور درویشوں کی عقل پر عشق غالب ہے مگر انبیاء علیہم السلام عقل اور عشق دونوں پر غالب ہوتے ہیں۔

عشق کے تعلق سے ایک بزرگ فرماتے ہیں:

ہر کہ درو نیست ازیں عشق رنگ نزد خدا نیست بجز چوب و سنگ

یعنی جس میں عشق کی کسک نہیں وہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک لکڑی اور پتھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

شیخ ابو المواہب شاذلی فرماتے ہیں کہ عشق قطب ہے اور ساری نیکیاں اسی کے گرد گھومتی ہیں۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کو جب عشق کی دولت نصیب ہوئی تو انہوں نے کہا:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما اے کہ افلاطون و جالینوس ما

کسی نے کہا کہ سب عشق ہی عشق ہے ہر شے سے عشق پھوٹ رہا ہے

عشق اول عشق آخر عشق کل عشق نخل و عشق شاخ و عشق گل

عشق وہ شعلہ ہے جو اگر بھڑک اٹھے تو نفس کی تمام نجاستوں اور گندگیوں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد اوز حرص و عیب کلی پاک شد

یہی وجہ ہے کہ جس کو عشق حقیقی حاصل ہے وہ ساری کائنات کا بادشاہ ہے

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را اوست سید جملہ موجودات را

حضرت شیخ فریدالدین عطار فرماتے ہیں:

عشق شد ایجاد عالم را سبب گوش کن احببت ان اعرف زرب

یہ عشق ہے جس کے سبب کائنات وجود میں آئی، کیا تم نے وہ حدیث نہیں سنی کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا، عشق دین کی اساس ہے اور یقین کی راہ میں رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

عشق آمد وروۃ الوثقیٰ ئے دیں عشق باشد رہبر راہ یقیں

نیز کہتا ہے عشق دریائیست بے حد و کراں عشق بیرونست از شرح و بیاں

یعنی عشق ایک ایسا دریا ہے جس کی نہ حد ہے نہ کنارہ اور اس کی حقیقت شرح و بیاں سے باہر ہے۔

حضرت امامنا مہدی علیہ السلام سے عشق کے تعلق سے ایک نقل اس طرح آئی ہے جس میں آپ نے عشق کو ایک شہباز سے تشبیہ دی ہے۔

عروج وزوال

سالک جب مراتب سلوک طے کرتا ہوا مرتبہ فنا پر پہنچتا ہے تو ہر مرتبہ میں تجلیات اسمائی و صفاتی کا انکشاف اور مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں عروج کہتے ہیں۔ اس کے بعد بھی سالک ترقی احوال کا متمنی رہتا ہے۔ لیکن بعض کو حسب تمنا ان کے احوال فنا میں ترقی ہوتی ہے لیکن سلسلہ افاضہ جاری نہیں رہتا۔ اور بعض کو افاضہ ہو جاتا ہے اور ایسے لوگ مسند ارشاد پر متمکن ہو کر خلق اللہ کو فیض پہنچاتے ہیں۔ اس کو بقاء و نزول کہتے ہیں۔

عشر

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ------الخ ﴾البقرة: ۲٦۷﴾ اس آیت شریف میں اللہ نے پاک کمائیوں میں سے اور دوسرے زمین کی پیداوار میں سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے مگر یہ بیان نہیں کیا کہ کتنا خرچ کرنا چاہیئے۔ زمین کی پیداوار میں سے تو حدیث رسول اللہ ﷺ "ما اخرجتہ الارض ففیہ العشر" (زمین سے جو پیدا ہوا اس میں عشر [دسواں حصّہ] ہے) کے تحت پیداوار کا دسواں حصّہ لیا جاتا ہے۔ اور چونکہ "مَا أَخْرَجْنَا" کا عطف "مَا كَسَبْتُمْ" پر ہوا ہے اور قاعدہ کے تحت معطوف علیہ اور معطوف دونوں کا حکم ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے "مَا كَسَبْتُمْ" (تم جو کماتے ہو) میں سے بھی وہی لیا جائیگا جو "مَا أَخْرَجْنَا لَكُم" سے لیا جاتا ہے، یعنی دسواں حصّہ۔

چنانچہ آیت ھذا و حدیث ھذا کے تحت حضرت امامنا مہدی موعودؑ نے عشر کو 'فرائض ولایت' میں سے ایک فرض قرار دیا۔ اور مہدی موعودؑ نے فرمایا "جو کچھ خدائے تعالیٰ تمہیں دے اس میں سے عشر ادا کرو تھوڑا ہو یا بہت۔

فرمان امامنا مہدی موعودؑ: خدا دس دانے دے تو ایک دانہ (عشر کی نیت سے) چیونٹی کو ڈال دو۔

فرمان: عشر کے مستحق دائرے کے فقرائے متوکل و فاقہ کش ہیں۔ اہل فراغ و تعین خوار فقیر نہیں کیونکہ عشر جو مال کا میل ہے اس کو آتش فقر ہی جلا سکتی ہے۔ شکم سیر کے لئے سخت مضر ہے۔ بے خبری میں کھالے تو معاف ہے۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں تجسس میں مت پڑو۔ اگر معلوم ہو جائے کہ مال حرام ہے تو مت لو۔ فتوح سے عشر نکالتے وقت دیکھا جاتا ہے اگر دائرہ میں سخت فقر و فاقہ ہے تو عشر بھی ساتھ ساتھ سویت کر دیا جاتا، ورنہ اٹھا کر رکھ دیا جاتا، پھر تنگی ہونے پر صرف مضطروں میں سویت کیا جاتا۔

واضح ہو کہ یہ عشر، زکواۃ کا بدل نہیں ہے بلکہ زکواۃ کے سوا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان فی المال حقا سوی الزکواۃ" یعنی مال میں زکواۃ کے سوا بھی حق ہے۔

واضح ہو کہ عشر ہر نئی کمائی (New Income) پر ہے اور زکواۃ سال میں ایک مرتبہ خرچ و اخراجات کے بعد جو مال بچا رہتا ہے (Saving) اس پر عائد ہوتا ہے۔

عینیت و غیریت

یہ دو اصطلاحیں بھی مسئلہ وحدۃ الوجود کی بڑی اہم اصطلاحات ہیں۔ عین کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک جیسا ہونا۔ صوفیاء وجودیہ خالق اور مخلوق میں عینیت ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ واجب الوجود کے سوا اور کوئی وجود نہیں۔ اور جو کچھ عالم میں نظر آرہا ہے وہ حق تعالیٰ کے وجود سے کوئی الگ وجود نہیں رکھتا۔ مخلوق چونکہ خالق کی صفت کا مظہر ہے۔ اور صفت موصوف سے جدا نہیں ہو سکتی اس لئے مخلوق سے خالق جدا نہیں۔ چنانچہ مولانا جامی لائحہ بست و پنجم میں فرماتے ہیں: ”پس یہ کائنات حق تعالیٰ کا مظہر ہے اور حق تعالیٰ اس کا باطن ہے۔ یہ کائنات ظہور سے پہلے عین حق تعالیٰ تھی اور حق تعالیٰ بعد از ظہور عین کائنات ہے۔ حقیقت میں ہستی ایک ہے اور ظہور، بطون اور اول و آخر ہونا محض اعتباری و اضافی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ﴿الحدید:۳﴾ خالق اور مخلوق کی اس نسبت عینیت کو بعض گمراہ اور جہلاء نے لغوی اور معنوی سمجھا۔ اور خود گمراہ ہوئے اور ہزاروں کو گمراہ کیا۔ اور مولانا جامی کے اس شعر کو خوب اچھالا۔

ہم سایہ و ہم نشین و ہمراہ ہمہ اوست　　　در دلق گدا و اطلس شہ ہمہ اوست

اوراس شعر کی طرف سے اندھے ہو گئے۔ ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد۔ گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔

وحدۃ الوجود کی تشریح کرتے ہوئے حاجی امداد اللہ کہتے ہیں۔ کیفیت عینیت و غیریت کو جاننا واجب ہے۔ کیونکہ جب تک اس سے واقفیت نہ ہو گی مسئلہ وحدۃ الوجود کی کیفیت سمجھ میں نہ آئے گی۔ جو لوگ مسئلہ وحدۃ الوجود میں غور و خوض کرنے کی وجہ سے زندیقیت میں پڑ کر گمراہ ہوئے وہ بہ سبب مسئلہ عینیت و غیریت نہ جاننے کی وجہ سے ہوئے۔ اور جس شخص نے اولا یہ دو امر تحقیق کر لئے دیگر تمام مسائل کا جاننا اس کے لئے آسان ہو گیا۔ عینیت و غیریت۔ عبد و رب میں متحقق ہیں۔ وہ ایک وجہ سے اور یہ ایک وجہ سے، مثلاً کوئی شخص اپنے سامنے کئی آئینے رکھ لے تو ہر آئینہ میں ذات و صفات اس کی بعینہ نمودار ہوں گی۔ مثلاً شادمانی، غمگین، مستی گریہ وغیرہ بھی آئینے کے عکس میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس سبب سے کہہ سکتے ہیں کہ عکس اس شخص کا عین ہے۔ مگر یہ عینیت اصطلاحی اور اعتباری ہے۔ لغوی نہیں۔ اگر لغوی ہوتی جو کیفیت عکس پر گذرتی وہی شخص پر بھی گذرتی۔ لیکن اگر عکس پر پتھر مارا جائے یا کوئی نجاست ڈالی جائے تو شخص کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ نہ نجاست کا اس پر کوئی اثر ہو گا۔ بلکہ وہ اپنے حال پر ان نقصانات سے مبرا و منزہ ہی رہے گا۔ تو اس طرح سے غیریت اصطلاحی ثابت ہوتی ہے۔ پس عینیت و غیریت شخص اور عکس دونوں میں پائی گئیں۔ اس طرح عبد و رب میں بھی عینیت و غیریت دونوں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال۔ بندہ قبل وجود خود باطن خدا تھا۔ اور خدا ظاہر بندہ۔ کنت کنزاً مخفیاً اس کی دلیل ہے۔ حقائق کونیہ ذات

مطلق میں مندرج و مخفی تھے۔ اور صرف اپنی ذات پر ظاہر تھے۔ پھر ذات نے جب چاہا کہ ظہور دوسری نہج پر ہو تو اعیان کو ان کے لباس قابلیت میں اپنی تجلی کے جلوے سے ظاہر فرمایا۔ اور خود شدت ظہور سے ان کی نگاہ سے مخفی ہو گیا۔ جیسے کہ تخم کہ درخت مع تمام شاخوں۔ پتوں اور پھل پھول کے۔ اس میں چھپا ہوا تھا۔ گویا کہ تخم بالفعل تھا اور شجر بالقوۃ۔ جب تخم نے اپنے باطن کو ظاہر کیا خود چھپ گیا۔ اب جو کوئی دیکھتا ہے تو درخت کو ہی دیکھتا ہے۔ تخم دکھائی نہیں دیتا۔ اگر غور کرو تو تخم درخت کی صورت پر ظاہر ہوا۔

ہر چند کہ ایک وجہ سے تخم اور درخت ایک ہے۔ جدائی نہیں عینیت پائی جاتی ہے۔ لیکن دلائل جدائی اور غیریت کے بھی اس میں موجود ہیں اور واقعی ہیں۔ حفظ مراتب اس میں ضرور ہیں۔ کیونکہ صورت شکل تاثیر اور خواص تخم کے اور ہیں درخت کے اجزاء اور۔ اگرچہ ازروئے عینیت تخم اور درخت ایک ہیں۔ لیکن یہ وحدت اور عینیت اعتباری اور اصطلاحی ہے نہ باعتبار حلول اور نہ اتحاد کے۔

عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن شریف میں 25 مقامات پر آیا ہے۔ ان میں جن مقامات میں آپ کی خصوصیات کا بیان ہے ان کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں آیت نمبر ۸۷ میں اللہ نے فرمایا: وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ﴿البقرۃ:۸۷﴾۔ ترجمہ: ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے معجزے دئے اور پاک روح کے ذریعہ ان کی مدد کی۔ مردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑھی کو چنگا کرنا اور غیب کی خبریں بتانا اور نابینا کو بینا کرنا۔ حضرت عیسی علیہ السلام کے معجزات ہیں۔ اور روح القدس کے معنی جبرئیلؑ کے ہیں جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے یا اسم اعظم جسکی وجہ سے آپ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے سورۂ آل عمران میں آیت نمبر ۴۴ سے لیکر آیت نمبر ۶۰ تک بیان فرمایاہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّـهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ---- ﴿آل عمران:۴۵﴾ ترجمہ: جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک کلمہ یا حکم یا فیض یا بیٹے کی جس کا نام مسیح ابن مریم ہو گا۔

بعد میں یہ تشریح فرمائی کہ وہ دنیا اور آخرت میں باآبرو ہو گا اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہو گا۔ قرآن کی بلاغت دیکھئے کہ یہاں اللہ فرزند ہی عطا فرمارہا ہے لیکن لفظ کلمہ فرمارہاہے۔ اس لئے کہ معروف طریقے سے عیسیٰ پیدا ہوتے تو ان کو فرزند کہتا لیکن یہاں بغیر باپ کے فقط اسکی قدرت کا ملہ اور اس کے لفظ "کُنْ" سے ہورہاہے تو اللہ نے کلمہ کے نام سے یاد کیاہے۔ لیکن اس کے باوجود عیسائیوں نے عیسیٰؑ کو "ابن اللہ" بنادیا (نعوذ بالله من ذلك)۔ مسیح عبرانی زبان میں "ماشیح" یا "مشیحا" تھا جس کے معنی مبارک کے ہیں جو عربی زبان میں آکر "مسیح" ہوگیا۔ لیکن "دجال" کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ بالاجماع عربی لفظ ہے اس کے معنی کئی ہیں جو اسکے مقام پر بیان ہوں گے۔

مسیح کا دوسرا نام یالقب عیسیٰ ہے۔ جو اصل عبرانی زبان میں ایشوع تھا۔ عربی زبان میں عیسیٰ ہو گیا۔ جس کے معنی "سید" کے ہیں۔ پھر مزید فرمایا کہ وہ دنیا اور آخرت میں "باآبرو" ہوں گے یعنی ایسا نہیں ہو گا کہ صرف ماں سے پیدا ہونے اور باپ نہ ہونے کی وجہ سے وہ دنیا میں بے آبرو ہوں گے اور لوگوں میں وہ غلط نام سے پکارے جائیں گے۔ نہیں ایسا نہیں ہو گا بلکہ وہ دنیا میں بھی باعزت ہوں گے اور آخرت میں بھی ان کا مقام بلند ہو گا اور اللہ کے مقربین میں سے ہوں گے۔ وہ کس طرح اس کا بیان آئندہ آئے گا۔

مزید یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ ماں کی گود میں اور بڑے ہو کر (یکساں دونوں حالتوں میں) لوگوں سے بات کریں گے اور نیکو کاروں میں ہوں گے یہ بشارت سن کر حضرت مریم کو تعجب ہوا اور کہنے لگیں "اے میرے رب میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو گا جبکہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ فرمایا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسکو کہتا ہے "ہو" پس وہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ انہیں کتاب و حکمت اور توریت و انجیل سکھائے گا۔ اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے جائیں گے اور (وہ کہیں گے) میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی لیکر آیا ہوں۔ اور وہ نشانی یہ ہے کہ (۱) میں تمہارے سامنے مٹی سے پرند کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے (سچ مُچ) کا پرندہ بن جائے گا (۲) اور مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کر دیتا ہوں (۳) اور اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں (۴) اور تم جو کچھ کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو وہ سب کچھ تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اگر تم صاحب ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لئے (اللہ کی) نشانی ہے۔ اور جو تورات مجھ سے پہلے نازل ہوئی ہے اسکی تصدیق کرتا ہوں اور (میں اسلئے بھی بھیجا گیا ہوں) کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام تھیں ان کو تمہارے لئے حلال کر دوں اور میں تمہارے پاس اللہ کی نشانی لیکر آیا ہوں پس اللہ سے ڈرو (مجھے خدا کا بیٹا نہ بناؤ) اور میری اطاعت کرو بے شک اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے تم سب اسی کی عبادت کرو (اسکی عبادت میں مجھے شامل مت کرو) یہی سیدھا راستہ ہے۔ پھر جب عیسیٰؑ نے اپنی قوم کی طرف سے کفر اور نافرمانی کو محسوس کیا تو آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہے حواری بول اُٹھے کہ ہم اللہ کی راہ میں آپ کے مددگار ہیں۔ حواری کے معنی دھوبی کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے دو اشخاص جو آپ کے تابع ہوئے وہ بلحاظ پیشہ دھوبی تھے حضرت عیسیٰؑ نے ان سے فرمایا کپڑے کیا دھوتے ہو آؤ میں تم کو دل دھونا سکھا دوں یہ سن کر وہ آپ کے ساتھ ہو گئے اس کے بعد جو بھی آپ کے ساتھ ہو گیا اس کا نام حواری پڑ گیا۔ یہود کے علماء نے اس وقت کے بادشاہ کو بہکایا کہ یہ شخص ملحد ہے توریت کے خلاف حکم دیتا ہے۔ اس نے آپ کو پکڑنے کیلئے اپنے آدمی بھیجے جب وہ لوگ وہاں پہنچے جہاں عیسیٰؑ تھے تو آپ کے تمام ساتھی وہاں سے کھسک گئے پس اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو (اوپر) آسمانوں پر اُٹھا لیا اور ایک آدمی کو آپ کی صورت کا بنا کر وہیں رہنے دیا۔ سو لوگوں نے اسی کو عیسیٰ سمجھ کر پکڑ لیا اور بادشاہ کے پاس لے گئے۔ اور بادشاہ نے اسکو سولی پر لٹکا دیا۔ ہمارا اعتقاد یہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی نہیں دی گئی بلکہ اللہ نے آپ کو زندہ اوپر اُٹھا لیا پھر قیامت کے قریب دنیا میں آپ اللہ کے حکم سے نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ سے جو حدیث آئی ہے اس میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا وہ امت کیسے ہلاک ہو گی جس کے اول میں ہوں اور مہدی اس کے درمیان میں ہیں اور مسیح اس کے آخر میں ہیں اور اس کے درمیان ٹیڑھے لوگ ہوں گے جو نہ مجھ سے ہیں اور نہ میں ان سے ہوں۔ (اشعۃ اللمعات جلد چہارم صفحہ ۷۵۴) اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱)

حضرت عیسیٰ زندہ ہیں اور قرب قیامت مہدیؑ کے بعد آئیں گے۔ اور یہ کہنا غلط ہے کہ عیسیٰؑ کا انتقال ہو گیا یا آپ کو سولی پر لٹکایا گیا (۲) مہدیؑ وسط امت میں آئیں گے اور عیسیٰؑ آخر میں آسمان سے اتریں گے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ عیسیٰؑ اور مہدیؑ ایک ساتھ آئیں گے یا ایک ہی زمانے میں ہوں گے یا ایک جگہ دونوں کا اجتماع ہو گا۔ محمد اللہ حضرت مہدیؑ ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۰۱ھ میں مکہ میں مہدی ہونے کا دعویٰ فرمایا اور ۹۱۰ھ میں بمقام فراہ (افغانستان) آپکا وصال ہوا۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف جو مذموم تدبیر کی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ناکام فرمادیا اس کا ذکر اللہ تدبیر کرنے والا ہے۔ وہ تدبیر کیا تھی اللہ نے یوں فرمایا۔ إِذْ قَالَ اللَّـــهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿آل عمران:۵۵﴾ ترجمہ: ایسے وقت میں اللہ نے کہا میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اُٹھالوں گا اور کافروں سے تم کو پاک کروں گا اور تمہاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک تمہارا انکار کرنے والوں پر غالب رکھوں گا پھر تم سب کو میری طرف لوٹنا ہے۔ تو تمہارے درمیان جو بھی اختلافات ہوں گے ان کا فیصلہ کروں گا۔

آیت میں مُتَوَفِّيكَ آیا ہے۔ جو توفّی سے مشتق ہے۔ پس مُتَوَفِّيكَ کے معنی ہوں گے (۱) میں تجھے پکڑنے والا ہوں اور میری طرف اُٹھانے والا ہوں بغیر موت کے جیسا کہ عرب میں بولا جاتا ہے تو فیت الشيء یعنی اخذته و قبضتهٔ تامّاً۔ مقصد یہ کہ تیرے دشمن بری نیت سے تیرے قریب نہ آسکیں گے (۲) دوسرے معنی توفی کے نیند کے ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے اللَّـــهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ﴿الزمر:۴۲﴾ اس آیت میں اللہ نے وفات کو نیند کے معنی میں لیا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ پر نیند طاری ہوگئی اور اللہ نے آپ کو اُٹھالیا جبکہ آپ سوئے ہوئے تھے تاکہ آپ کو کوئی خوف نہ ہو۔ تو معنی یہ ہوئے کہ میں تجھ کو سُلانے والا ہوں اور اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں۔ (۳) تیسرے معنی توفی کے موت کے ہیں۔ مطلب یہ کہ میں تجھ پر موت طاری کر دوں گا پھر تجھ کو اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں۔ وھب بن منبہؒ نے کہا کہ اللہ نے عیسیٰؑ پر تین منٹ کیلئے موت طاری کر دی تھی پھر آپ کو زندہ کیا اور اپنی طرف اُٹھالیا۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا قرآن میں عیسیٰؑ کے دوبارہ نازل ہونے کے بارے میں کوئی اشارہ ہے تو اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے۔ کہ ہاں اللہ کا یہ فرمان کہ وہ کہولت کی حالت میں لوگوں سے بات کریں گے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پھر آپ دنیا میں آئیں گے۔ کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ کو جب آسمان پر اُٹھالیا گیا تو اسوقت ان کی عمر ۳۳ سال کی تھی جسکو کہولت کی عمر نہیں کہا جاسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پھر آپ دوبارہ آئیں گے اس عمر کو پہنچیں گے صلیب کو توڑیں گے۔ خنزیر کو قتل کریں

گے اور جزیہ کو موقوف کریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ شادی کریں گے۔ پھر آپ وفات پائیں گے۔ اور آنحضرت کے حجرۂ مبارکہ میں دفن کئے جائیں گے۔ اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ، دونوں نبیوں (حضرت رسول اللہ اور حضرت عیسیٰؑ) کے درمیان قیامت کے دن اٹھیں گے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو مع روح وجسد اُٹھالیا اور قرب قیامت پھر آپ نازل ہوں گے۔

عیسائی آنحضرت ﷺ سے اس بات پر جھگڑتے تھے کہ عیسیٰؑ اللہ کا بندہ نہیں بلکہ اللہ کا بیٹا ہے۔ آخر میں یہ کہتے کہ چلو مان لیا کہ عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے نہیں ہیں۔ تو بتاؤ وہ کس کے بیٹے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب یوں دیتا ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴿آل عمران:۵۹﴾ ترجمہ: بے شک اللہ کے پاس عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے کہ اس نے ان کو پہلے مٹی سے پیدا کیا پھر حکم دیا (انسان) ہوجا تو وہ (انسان) ہو گئے۔ یعنی یہ تو سب جانتے ہیں کہ آدمؑ کے نہ تو باپ تھے اور نہ ماں۔ یہاں تو صرف باپ نہیں ہیں۔ تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں آیت نمبر ۱۷۱ میں بھی حضرت عیسیٰؑ کا ذکر اسطرح کیا ہے۔

رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ﴿النساء:۱۷۱﴾ ترجمہ: مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول اور اس کا ایک کلمہ (بشارت) ہیں جس کو اس نے مریم تک پہنچایا اور اسکی طرف سے ایک روح ہیں پس اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ اللہ تین ہیں۔ اسی طرح اللہ سورۂ مائدہ میں آیت نمبر ۴۶ میں حضرت عیسیٰ کی بعثت اور آپ کو انجیل دئے جانے کا بیان فرمایا ہے۔

نیز اسی سورۂ میں آیت نمبر ۷۲ میں صاف ارشاد فرمایا "وہ لوگ کافر ہیں جنہوں نے کہا کہ مریم کے بیٹے عیسیٰ ہی اللہ ہیں حالانکہ مسیح نے تو کہا تھا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے اور جان لو کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے گا اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اس سورۂ میں آیت نمبر ۷۵ میں اللہ فرماتا ہے:" مسیح ابن مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر گذر چکے اور ان کی والدہ (محترمہ) راست باز تھیں۔ یہ دونوں کھانا کھاتے تھے (اس لئے انسان بھی تھے)۔ مطلب یہ کہ اگر خدا ہوتے تو کھانا نہ کھاتے۔

پھر اس سورت میں آیت نمبر ۱۱۰ سے ۱۱۸ تک حضرت عیسیٰؑ کا ذکر فرمایا ہے اور اللہ کی طرف سے جو معجزے عطا کئے

گئے تھے وہ بھی بیان ہوئے ہیں البتہ ایک خاص بات (معجزہ) کا ذکر اللہ نے آیت نمبر ۱۱۲ تا ۱۱۵ میں فرمایا ہے وہ یہ ہے۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَن يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ------------- أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿المائدۃ:۱۱۲تا۱۱۵﴾ ترجمہ: جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا تمہارا پروردگار ہم پر آسمان سے (کھانے کا) خوان اتار سکتا ہے تو عیسیٰ نے کہا اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ سے ڈرو۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں۔ اور جان لیں کہ تم نے ہم سے سچ کہا اور ہم اس خوان کے نزول پر گواہ رہیں تب عیسیٰؑ نے دعا کی اے ہمارے پرودگار ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما وہ ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کیلئے (عید) خوشی کا موقع بن جائے اور تیری طرف سے ایک نشانی بھی اور ہم کو رزق عطا فرما تو بہترین رزق دینے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا میں تم پر ضرور خوان نازل کروں گا لیکن اس کے بعد تم میں سے جو شخص کفر کرے گا تو میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ عالمین میں کسی کیلئے بھی تجویز نہ ہوا ہو گا۔

لیکن وہی ہوا کہ انہوں نے پھر کفر کیا تو اللہ نے اس خوان کو اُٹھالیا اور ان کو سوّر بنا دیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جو خوان اترا وہ لال رنگ کا تھا جس کے نیچے اور اوپر بادل تھے۔ لوگوں کی نظروں کے سامنے وہ خوان آیا وہ دن اتوار کا تھا (اسی لئے شاید عیسائیوں نے اتوار کے دن کو اپنا مقدس اور چھٹی کا دن بنالیا) پھر حضرت عیسیٰ نے غسل کیا دو رکعت نماز پڑھی جبکہ آپ صوف کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ رویا اور تولیہ اپنے منہ سے ہٹایا اور بسم اللہ خیر الرازقین کہہ کر اس میں سے کھایا۔ لوگوں سے کہا اس میں خیانت نہ کرو۔ اور کل کیلئے کچھ اُٹھا کر نہ رکھو۔ اس خوان میں روٹی بھی تھی اور گوشت بھی۔ مگر لوگوں نے کل کے لئے اُٹھا کر رکھ لیا۔ جسکی وجہ سے وہ خوان اُٹھالیا گیا حضرت ابن عمر فرماتے ہیں قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب منافقین، خوان عیسیٰ کا انکار کرنے والوں اور اہل فرعون کو دیا جائے گا 'واللہ اعلم' جب ان لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا کہ کیا آپ کا رب خوان اتار سکتا ہے؟ عیسیٰؑ کو یہ انداز اچھا معلوم نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس میں اللہ کو آزمانے کا لہجہ تھا۔ اس لئے حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا اللہ سے ڈرو۔ مومنوں کو ایسی بات نہیں کرنی چاہئیے۔ تو انہوں نے اپنی اصلاح کرلی اور کہا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم بغیر محنت کے رزق کھائیں اور اللہ کی عبادت زیادہ شوق وذوق سے کر سکیں اور جس جنت کا وعدہ آپ کر رہے ہیں اس کا نمونہ بھی دنیا میں ہی دیکھ لیں اور اس کے گواہ بن جائیں۔ (آیت نمبر ۱۱۴) پھر اللہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ سے عیسائیوں پر الزام حجت کے طور پر پوچھیگا۔

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ -------- الْغُيُوبِ

﴿مائدۃ:۱۱۶﴾ ترجمہ: اور جب اللہ فرمائے گا اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود قرار دو۔

تو وہ کہیں گے تو پاک ہے مجھ سے یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں اگر میں نے ایسا کہا ہو گا تو تجھ کو ضرور معلوم ہو گا جو بات میرے دل میں ہے تو اُسے ضرور جانتا ہے۔ لیکن جو بات تیرے دل میں ہے میں اسے نہیں جانتا بے شک تو ہی غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے تو ان سے صرف وہی کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے اور جب تک میں ان کے درمیان (دنیا میں) رہا، میں ان کے حالات کی خبر رکھتا رہا لیکن جب تو نے مجھے دنیا سے اُٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگران تھا اور تو ہر چیز سے باخبر ہے۔ اگر تو ان کو عذاب دے گا تو وہ تیرے بندے ہیں اور گر تو ان کو بخش دے تو، تو بے شک غلبہ والا ہے اور تیرا کام حکمت سے بھرا ہوتا ہے (۱۱۷، ۱۱۸)۔ اللہ نے سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰؑ کے تعلق سے بعض حقائق کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ آیت ۳۰ تا ۳۶ ملاحظہ ہو۔ جب مریم حضرت عیسیٰؑ کو آپ کی ولادت کے بعد گود میں اُٹھائے ہوئے لوگوں کے پاس آئیں، تو لوگوں نے حضرت مریم کے کردار پر کیچڑ اُچھالا اور آپ کو برا بھلا کہا اور ملزم قرار دینے کیلئے پوچھا کہ بول یہ بچہ کس کا ہے۔ مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اسی سے پوچھ لو تو لوگ بھڑک اُٹھے اور کہا کہ ہم کیوں کر اس سے بات کر سکتے ہیں جو ابھی گود میں بچہ ہے۔ لوگوں کے اس جملہ کے ادا ہوتے ہی عیسیٰؑ ایسی فصیح زبان میں جسے سب سمجھ سکتے ہیں بول اُٹھے "قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّـــــهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ---الخ" ﴿مریم:۳۰﴾ یعنی عیسیٰؑ نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھ کو اس نے کتاب دی ہے اور مجھ کو اس نے نبی بنایا اور جہاں کہیں رہوں اس نے مجھ کو برکت والا بنایا اور اس نے مجھ کو نماز کی تاکید کی اور زکواۃ کی بھی جب تک میں زندہ رہوں۔ اور اپنی ماں سے اچھا سلوک کرنے والا۔ اور اللہ نے مجھے زبردست اور بدبخت نہیں بنایا اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے زندہ کر کے اُٹھایا جائے۔ یہ ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا سچی بات (اللہ کا فرمان، اللہ کی روح، کلمۃ اللہ، اللہ کا فیض) جس میں لوگ جھگڑتے ہیں (مریم آیت ۲۷ تا ۳۴)

علاوہ ازیں سورۂ انعام آیت ۸۵، سورۂ مریم آیت نمبر ۳۴، سورۂ احزاب آیت نمبر ۷ سورۂ شوریٰ آیت نمبر ۱۳، سورۂ زخرف آیت نمبر ۵۷ تا ۶۶ میں حضرت عیسیٰؑ کا ذکر آیا ہے۔ ان میں بالخصوص آیت نمبر ۶۱ میں اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو قیامت کی نشانی قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ هَـٰـــذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿الزخرف: ۶۱﴾۔ یعنی وہ تو قیامت کی ایک نشانی ہیں۔ تو کہہ دو اے لوگو اس میں شک نہ کرو اور میری اتباع کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ یوں دیکھا جائے تو حضرت عیسیٰؑ کئی اعتبارات سے اللہ کی نشانی ہیں ایک تو یہ کہ آپ کی پیدائش ہی عجیب طریقے سے ہوئی۔ بلکہ ان کا

دوبارہ نزول خود قیامت کی نشانی ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قریب کی بات ہے کہ تم میں عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے حکمُ اور عادل کی حیثیت سے۔ وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو موقوف کر دیں گے۔ پھر اس کے بعد زمین پر چالیس سال رہیں گے پھر وصال فرمائیں گے اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ اسکی مزید تفصیل "عیسیٰ اور مہدی کا اجتماع" کے عنوان کے ذیل میں دیکھی جاسکتی ہے نیز سورۂ حدید آیت نمبر ۲۷ اور سورۂ الصف میں آیت نمبر ۶ اور آیت نمبر ۱۴ میں عیسیٰ کا ذکر آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی مسلسل نافرمانیاں، حکم عدولیاں اور حق سے انحراف کی کئی مثالیں بتلائی ہیں چنانچہ سورۂ نساء میں آیت نمبر ۵۴ تا ۱۶۰ تک ان کی بہت سی شر انگیز حرکتوں کو بیان کیا ہے۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّـهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَـٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللَّـهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّـهُ عَزِيزًا حَكِيمًا وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿نساء:۱۵۶تا۱۵۹﴾ ترجمہ: اور ان کے کفر کے سبب اور مریم پر ایک عظیم بہتان باندھنے کے سبب اور ان کے یہ کہنے کے سبب کہ مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو جو اللہ کے پیغمبر تھے ہم نے قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ عیسیٰ کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی۔ جو لوگ عیسیٰؑ کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ ان کے حال کی نسبت شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں ان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں ہے بجز گمان کی پیروی کے اور یقینا انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اُٹھالیا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوں گے۔

ان آیات میں اللہ نے یہودیوں کے جرائم کی ایک فہرست دیتے ہوئے خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے تعلق ان کے مزعومات کے برعکس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے ان آیات میں اللہ نے ان کے کرتوت کو اسطرح بیان کیا ہے

(۱) انہوں نے عیسیٰؑ کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا۔

(۲) انہوں نے حضرت مریم پر ناحق تہمت لگائی۔

(۳) انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہا کہ ہاں ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو جو اللہ کے پیغمبر تھے قتل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حالانکہ انہوں نے نہ عیسیٰؑ کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر لٹکایا۔ بلکہ عیسیٰؑ کے شبہ میں انہوں نے ایک اپنے ہی آدمی کو سولی دے دی۔ اللہ نے عیسیٰؑ کو اوپر زندہ اُٹھالیا۔ وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور اہل کتاب میں کا ہر

ایک فرد ان کے انتقال سے پہلے ان پر ایمان لائے گا۔ اس آخری جملے کے معنی میں مفسرین نے دو احتمال پیش کئے ہیں ایک یہ کہ اہل کتاب کا ہر فرد حضرت عیسیٰؑ کے مرنے سے پہلے آپ پر ایمان لائے گا۔ اور دوسرا یہ کہ اہل کتاب کا ہر فرد اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے گا۔ لیکن ایک بات تو طے ہے کہ عیسیٰ مرے نہیں اور دوسری بات یہ کہ آپ دوبارہ زندہ حالت میں قرب قیامت دنیا میں نازل ہوں گے۔ پھر جو لوگ اس زمانے میں زندہ رہیں گے وہ آپ کو زندہ دیکھ کر اپنے موروثی غلط عقیدے سے توبہ کرتے ہوئے فوراً اپنے مرنے سے پہلے آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور جو لوگ بعد میں مگر عیسیٰؑ کی زندگی میں ہی پیدا ہوں گے وہ حضرت عیسیٰؑ کے اس دنیا سے وصال کرنے سے پہلے آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

عرفات

مکہ کے قریب ایک بہت بڑا میدان ہے جسے میدان عرفات کہتے ہیں۔ حج کے جو تین فرائض ہیں۔ احرام باندھنا۔ وقوف عرفات نویں ذی الحجہ کو ظہر کے بعد سے مغرب کے بعد تک اس میدان میں ٹھہرنا اور اللہ کے حضور ذکر کرتے ہوئے گڑ گڑا کر مغفرت طلب کرنا۔ مگر وہاں مغرب کی نماز نہ پڑھنا اس دن مغرب کی نماز مزدلفہ جا کر پڑھنی چاہیئے وہ بھی ادا کی نیت سے، اگرچہ مغرب کا وقت نہ ہو۔ اگر کسی شخص کو وقوف عرفات نصیب نہ ہو تو اسکا حج نہیں ہوتا۔ آئندہ سال اسکو قضا کرنی چاہیئے۔ تیسرا فرض طواف کعبہ ہے جس کو طواف افاضہ، اور طواف نساء بھی کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ جب اللہ نے آدم اور حواؑ کو جنت سے نیچے زمین پر اتار دیا تو دونوں کو الگ الگ مقام پر اتارا۔ حّوا جدّہ میں اتاری گئی اور آدمؑ کو سراندیپ میں۔ دونوں برسوں تک روتے رہے اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہے ایک تو جنت سے محرومی اور دوسرے ایک دوسرے کی جدائی۔ غرض اللہ نے توبہ قبول فرمائی اور ''عرفات'' کے میدان میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ یعنی دونوں کا از سر نو تعارف ہوا۔ اس لئے اس جگہ کا نام ''عرفات'' ہو گیا۔

زمانہ کفر میں ایک غلطی یہ ہوتی تھی کہ مکہ کے لوگ عرفات تک نہ جاتے تھے کیونکہ عرفات حرم سے باہر ہے بلکہ حرم کی حد یعنی مزدلفہ میں ٹھہر جاتے تھے اور قریش مکہ کے سوا اور سب لوگ عرفات تک جاتے پھر وہاں سے طواف کیلئے مکہ کو واپس آتے تھے۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا: فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّـهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ﴿البقرة:۱۹۸﴾
ترجمہ: پھر جب تم طواف کیلئے عرفات سے واپس ہونے لگو تو مشعر حرام (مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر کرو۔ جب طواف کیلئے مکہ واپس ہونے لگو تو تم بھی وہیں جا کر وہاں سے لوٹو یعنی عرفات سے۔

علم

مطلق علم کے معنی جاننے کے ہیں۔ ہر جاننے والے کو عالم نہیں کہتے۔ اور نہ اسکی عزت و عظمت ہوتی ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز کا علم رکھتا ہے۔ معلوم چیز جیسی ہوتی ہے، اسکے جاننے والے کی اسی اعتبار سے قدر و منزلت ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن کا جاننے والا، احادیث کا جاننے والا اور فقہ کا جاننے والا طریقت و معرفت کا جاننے والا، اسکی تعظیم و تکریم بھی اسی مناسبت سے کی جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ شراب، جوا، بدکاری، چوری وغیرہ کا جاننے والا ہے تو نہ اسکی قدر ہوگی اور نہ عزت، نہ اُسے عالم کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ قرآن شریف میں اللہ نے علماء کی تعریف اسطرح بیان کی ہے۔

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ﴿المجادلة:١١﴾ اللہ تعالیٰ بلند کرتا ہے درجے ایمان لانے والوں کے اور ان کے جو علم دئے گئے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿الزمر:٩﴾ اے پیغمبر آپ کہدیجئے کیا برابر ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم کا رتبہ غیر اہل علم سے بڑا ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ فضل العالم على العابد كفضلي على ادناكم۔ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں کے ادنیٰ آدمی پر۔

نیز آپ نے فرمایا میں بانٹنے والا ہوں (علم کا) اور اللہ دینے والا ہے۔ علم کی جو تعریف کی گئی ہے اس کا مقصد اور منشاء یہ ہے کہ آدمی صحیح عمل کر سکے۔ ورنہ نرا علم جس کے ساتھ عمل نہ ہو وہ بے برگ و بار درخت ہے۔ علم کے بغیر جو عبادت بھی کی جاتی ہے وہ عبادت کی محض صورت ہوتی ہے۔ حقیقت نہیں ہوتی۔ عبادت محض ایک بے جان پُتلا ہے۔ اور علم سے اس میں روح آتی ہے۔ علم کے معنی یہ بھی نہیں کہ وہ محض الفاظ صحیح طریقے سے ادا کرنا جان لے۔ یا یہ کہ صرف ان کا ترجمہ بھی جانتا ہو۔ بلکہ علم ایک ”نور“ ہے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ ﴿الأنعام:١٢٢﴾۔ اور ہم نے کر دیا اس کے لئے ایک نور جس کو لیکر وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی علم وہ ہے جس سے اللہ کی معرفت حاصل ہو۔ اور اگر علم آجائے اور عمل نہ ہو تو وہ علم اس کیلئے وبال بن جاتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے العلم مع العمل كمال والعمل بلاعلم ضلال و العلم بلا عمل وبال۔ علم عمل کے ساتھ کمال ہے۔ عمل بغیر علم کے گمراہی ہے اور علم بغیر عمل کے وبال ہے۔ چنانچہ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے: علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است۔ جو علم حق کی راہ نہ دکھائے وہ جہالت ہے۔

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت	علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھائے
زنگِ گمراہی زِدل بردایدت	گمراہی کے زنگ کو تیرے دل سے دور کرسکے
علم نبود غیر علم عاشقی	علم عشق ہی در حقیقت علم ہے
مابقی تلبیس ابلیس شقی	اس کے سوا جو ہے وہ ابلیس بدبخت کا مکر و فریب ہے
علم چوں بر دل زنی یارے بود	علم جب دل میں پیوست ہو گا دوست ہو گا
علم چوں بر تنے زنی مارے بود	اور علم اگر صرف بدن کی حد تک رہے گا وہ مانند سانپ کے ہو گا

علوم کی دو قسمیں ہے ایک علم عقلی، دوسرا علم وہبی۔

جہاں علم وہبی ہے وہاں علم عقلی بیکار ہے۔ بلکہ اسکی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کمال ایمان یہی ہے کہ علم وہبی (وحی) کی دہلیز پر علم عقلی کو قتل کر دیا جائے۔ اب یہ سوال کہ انسان کو کس قدر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ اس کا جواب امامنا مہدیؑ نے دیا ہے کہ ہر آدمی کو اتنا علم ضرور حاصل کرنا چاہیئے جو لابُدی ہو۔ یعنی جس سے نماز اور روزہ و دیگر احکام شرع صحیح اور مسنون طریقے پر ادا کئے جاسکیں۔ علم اللہ کا نور ہے۔ اور اللہ اپنا نور اسی کو عنایت کرتا ہے جو پاکباز ہے اور اس نور کی روشنی میں صحیح راستے پر چلتا ہے اور دوسروں کی رہبری کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص گنہ گار ہے اللہ اس کو علم عطا نہیں کرتا۔ اگر لفظی اور ظاہری علم کی سند وہ حاصل بھی کرلے تو اپنی غلط کاری کی وجہ سے بدنام زمانہ ہو جاتا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے اپنے استاد حضرت وکیعؒ سے اپنے سوء حافظہ کی شکایت کی کہ محنت تو بہت کرتا ہوں لیکن یاد نہیں رہتا تو حضرت وکیع نے انہیں جو نصیحت فرمائی اسکو حضرت امام شافعیؒ نے دو اشعار میں قلم بند کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

شکوتُ الی وکیع سوئَ حفظی	فاوصانی الیٰ ترک المعاصی
لان العلم نورٌ من الہ	ونور اللہ لا یعطیٰ لعاصی

ترجمہ: میں نے (اُستاد) وکیع سے اپنے سوء حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہوں کو ترک کرنے کی نصیحت کی کیونکہ علم اللہ کا نور ہے اور اللہ کا نور گناہ گار کو نہیں دیا جاتا۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ طلب علم کو جب رسول اللہ ﷺ نے ہر مسلم مرد اور مسلمہ عورت پر فرض قرار دیا ہے تو جن لوگوں نے علم حاصل نہیں کیا کیا وہ گنہ گار ہیں تو اس کا جواب ہم کو امامنا مہدیؑ کے اس فرمان سے ملتا ہے کہ "علم لابدی حاصل کرو" اور علم لابدی سے مراد نماز روزہ وغیرہ فرائض صحت کے ساتھ ادا کرنے کا علم ہے۔ اور اتنا علم تو فرضِ عین ہے۔

اور اس کے سوا تفصیلی علم فرض کفایہ ہے۔ یعنی بعض حاصل کر لیں تو سب کی طرف سے کفایت کرے گا۔ پھر یہ سوال کہ علم کیسے حاصل کیا جائے؟ تو جواب یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ (۱) کتابوں کے ذریعہ (۲) صحبت کے ذریعہ۔ جن لوگوں کو کتابوں کے ذریعہ علم ضروری حاصل ہو سکتا ہے انہیں چاہیئے کہ وہ باضابطہ کسی استاد سے علم حاصل کریں۔ اور اگر کسی کو وہ مواقع میسر نہ ہوں تو انہیں چاہیئے کہ نیک اور پابند صوم و صلٰوۃ جاننے والوں کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کریں۔ بلکہ کتابوں کے ذریعہ علم حاصل کرنے والوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے مربی، معلم اور مرشد کی صحبت میں اس کی تصحیح، عمل کے ذریعہ کر لیں۔ عورتوں کو بھی علم ضروری (لابدی) ضروری ہے ان کو یا تو خود شوہر تعلیم دے۔ یا خود نہ جانتا ہو تو جاننے والوں سے سیکھ کر تعلیم دے۔ یا پھر ان کو اجازت دے کہ وہ مواعظ کے ذریعہ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کی حد تک معلومات حاصل کریں، عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کی حد تک معلومات حاصل کرنا ازبس ضروری لازمی اور فرض ہے۔ اسی طرح والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کو بھی عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کی تعلیم دیں اور افعال قبیحہ اور اعمال ممنوعہ اور بری صحبت سے دور رہنے کی ہدایت کرتے رہیں۔ تاکہ قیامت کے دن مواخذہ سے بچیں۔

عُجب

عجب کے معنی ہیں انسان کا یہ چاہنا کہ وہ دوسروں سے ممتاز ہو کر رہے۔ اللہ نے اسکو اگر کمال عطا فرمایا ہے تو اس کو اپنی طرف منسوب کرنا اور کبھی یہ خوف بھی نہ کرنا کہ شاید یہ نعمت یا کمال سلب ہو جائے یا مجھ سے چھین لی جائے۔ اسکو اسطرح بھی سمجھا یا جاسکتا ہے کہ انسان اپنی نظر میں آپ ہی پسندیدہ ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ یہ برائی بھی اس میں آجائے کہ وہ اپنے مقابلہ میں دوسروں کو کم اور حقیر سمجھے۔ تو اسکو تکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور وہ بھی بہت بڑا گناہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ **وامّا المهلكات فهوى متبّعٌ وشحّ مّطاع واعجاب المرأ بنفسه وهى اشدّهن**۔ رہے مہلکات سو وہ خواہش ہے جسکی پیروی کیجائے اور بخل ہے جس کی اطاعت کی جائے اور آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا اور یہ سب سے بڑھ کر ہے۔

اگر اللہ نے انسان کو کوئی نعمت دی ہے۔ تو یہ انسان کا فریضہ ہے کہ اس کا شکر ادا کرے، اس کا احسان مانے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور ہمیشہ اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں یہ نعمت مجھ سے چھین نہ لی جائے۔

علماء

علماء ربانی اور علماء سوء

فردوس میں ہے عن انس عن النبی ﷺ "ان لله مدینة تحت العرش من مسـک اذفر علی بها ملك ینادي كل یوم الا من زار عالماً فقد زار الأنبیاء، ومن زار الانبیاء فقد زار الرب ومن زار الرّب فله الجنة۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عرش کے نیچے اللہ کا ایک شہر ہے جس کے دروازے پر ایک فرشتہ ہے جو ہر روز آواز لگاتا ہے، آگاہ ہو جاؤ کہ جس نے کسی عالم سے ملاقات کی گویا اس نے انبیاء سے ملاقات کی، اور جس نے انبیاء سے ملاقات کی اس نے رب سے ملاقات کی اور جس نے رب سے ملاقات کی اس کیلئے جنت ہے۔

اور تنبیہ الغافلین میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ جس نے ایک عالم سے ملاقات کی گویا اس نے مجھ سے ملاقات کی اور جس نے کسی عالم سے مصافحہ کیا گویا اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور جس نے عالم کے ساتھ مجالست کی گویا اس نے میرے ساتھ مجالست کی اور جس نے دنیا میں مجھ سے مجالست کی تو اللہ تعالیٰ اسکو قیامت کے دن جنت میں اسکو بٹھائے گا۔

شرح عقائد نسفی (تفتازانی) میں آنحضرت ﷺ سے یہ مروی ہے کہ جب کوئی عالم یا متعلم کسی گاؤں پر سے گذرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس قبرستان سے چالیس دن تک عذاب اٹھالیتا ہے۔

ربیع الانوار میں آنحضرت ﷺ سے یہ روایت آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو تین چیزوں سے زینت دی ہے، شمس، قمر، کواکب، اور دنیا کو تین چیزوں سے زینت بخشی ہے علماء، بارش سلطان عادل۔

نسفی کی زھر ریاض میں ہے کہ اہل طاعت حوض کوثر سے پیالے لیں گے۔ مگر اہل علم کہ ان کو رسول اللہ ﷺ اپنے چلّو سے پانی دیں گے۔ عیون المجالس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام سے عالم کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ وہ دنیا اور آخرت میں آپ کی امت کا چراغ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان الملائكة لتضع اجنحتها لطالب العلم رضا بما یضع "یعنی فرشتے اپنے پروں کو طالب علم کیلئے بچھا دیتے ہیں۔ اسی کے تعلق سے امام نووی کی بستان العارفین میں یہ روایت آئی ہے کہ ایک شخص نے یہ حدیث سنی تو اس نے اپنے جوتوں میں لوہے کی میخیں ٹھونک لیں اور کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے ذریعہ ملائکہ کے پروں کو

کچل دوں تو اسی وقت اسکے پیروں میں کھجلی کا مرض پیدا ہو گیا۔

نیز حدیث میں آیا ہے کہ "العلماء ورثة الانبياء" یعنی علماء، انبیاء کے وارث ہیں، لیکن اس حدیث کے بعد جو الفاظ ہیں وہ بڑے سخت اور وحشت ناک ہیں، یعنی یہ کہا گیا ہے کہ "العلماء ورثة الأنبياء، مالم يخالطوا الملوك" یعنی علماء، انبیاء کے وارث ہیں جب تک کہ وہ بادشاہوں اور امیروں (مالداروں) سے مل نہ جائیں، پھر کہا گیا کہ جب وہ ان سے مل جائیں یعنی ان سے ربط وضبط ہو جائے تو ان سے دور رہو، "فليحذروهم لانهم لصوص الدين و قطاع الطريق" کیوں کہ وہ دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔ انفاس العارفین میں یہ روایت ان الفاظ میں آئی ہے۔ "العلماء امناء الدين، ما لم يخالطوا الملوك فاذا خالطوهم فهم لصوص الدين "(ص،۵۵) پس معلوم ہوا کہ اوپر جن علماء کی تعریف کی گئی ہے وہ ان علماء کی تعریف ہے جو علماء باللہ اور علماء حقانی ہیں، لیکن جو علماء محض پڑھ لیتے ہیں اور اسناد وڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں اور جو کچھ علم سے حاصل ہوا ہے اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ اس کے برخلاف دولت اور عہدے حاصل کرتے ہوئے شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ان کو حدیث میں دین کے چوروں اور ڈاکوؤں اور لٹیروں کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو ان سے محفوظ رکھے، آمین۔

نزھۃ المجالس میں آیا ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو علم حاصل کرتا ہے اور اسکے مطابق عمل نہیں کرتا اس عورت کی ہے جو پوشیدہ طور پر زنا کرتی ہے۔ اور حاملہ ہو جاتی ہے، پھر اسکا حمل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور وہ دنیا میں رسوا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی عالم اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو اسکو اللہ قیامت کے دن رسوا اور ذلیل کرتا ہے۔

اوزاعی کہتے ہیں "اشتكت النواويس ماتجده من نتف جيف الكفار فاوحى الله اليها بطون علماء السّوء انتن مما انتم فيه" نصرانیوں کے قبرستانوں (قبرستان والوں) نے مردار کافروں کے جثوں کی بدبو کی شکایت کی تو اللہ نے ان کی طرف وحی کی کہ علماء سوء کے پیٹوں کی بدبو اس بدبو سے بھی زیادہ ہو گی جس سے تم دوچار ہو رہے ہو۔ (ماخوذ از نزھۃ المجالس ومنتخب النفائس)

عدل وقسط

عدل: اسکے معنی پورا معاوضہ ہے اور انصاف کے معنی میں بھی اسکا استعمال ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں اللہ نے ان دونوں معنوں میں یہ لفظ لایا ہے۔

(۱) چنانچہ اللہ نے اسطرح فرمایا ہے۔ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا ﴿المائدۃ:۸﴾ یعنی انصاف کیا کرو وہ تقوی سے زیادہ قریب ہے۔

(۲) فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ﴿الأنعام:۱۵۲﴾ اور جب تم بات کرو تو انصاف (کے ساتھ) بات کرو اگرچہ وہ شخص قرابت دار ہی ہو۔ اللہ نے معاوضہ کے معنی میں عدل کا الفاظ اس طرح لایا ہے۔

(۳) وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿بقرہ:۴۸﴾ اور نہ ان سے کسی طرح کا بدل قبول کیا جائے گا اور نہ وہ لوگ مدد حاصل کر سکیں گے۔

(۴) دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَإِن تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ﴿انعام:۷۰﴾ اور اگر وہ (نفس) ہر چیز بطور فدیہ دینا چاہے تو قبول نہ ہو گی۔

(۵) هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿النحل:۷۶﴾ یعنی جو شخص کسی کام کا نہیں وہ کیا اسکے برابر ہو سکتا ہے جو لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے۔ اور وہ خود سیدھے راستہ پر ہے۔ یعنی بت اور بت پرست ایک طرف اور حضور محمد مصطفی ﷺ دوسری طرف کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

(۶) إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿النحل:۹۰﴾۔ بے شک اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور اہل قرابت کو مال دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور ناپسند کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے اور تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

اس آیات میں اللہ تعالیٰ نے تین کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے یعنی عدل، احسان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک اور تین امور سے منع کیا ہے یعنی بے حیائی اور ناپسندیدہ امور اور سرکشی۔ اوامر اور نواہی کے سلسلے میں یہ ایسی جامع آیت ہے کہ کہنے اولوں نے یہاں تک کہا ہے کہ قرآن میں سے یہی ایک آیت آئی ہوتی تو کافی تھا۔ کیوں کہ اس آیت میں انسان کے قولی، فعلی اور مالی سبھی حالات کا احاطہ کیا گیا ہے عدل سے تمام اقوال، احسان سے تمام افعال اور ایتاء ذی القربیٰ سے مالیات کے

متعلق احکام دیئے گئے ہیں۔ اور ان کے مقابل فحشاء، منکر اور بغی کے ذریعہ قولی، فعلی اور مالی بدعنوانیوں سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ عدل سے مراد شہادۃ ان لا إلٰهَ إلّا الله ہے۔ اور احسان سے مراد افعال میں اخلاص پیدا کرنا یعنی اس طرح عبادت کرنا چاہئیے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ان تعبد الله كأنك تراه و ان لم تكن تراه فانه يراك۔ یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسکو نہ دیکھ سکا تو یہ یقین کر وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ إيتاء ذي القربیٰ کے ذریعہ قرابت داروں کو مالی امداد کا حکم دیا گیا ہے تا کہ دینے والوں کے دل سے مال کی محبت نکل جائے اور دوسری طرف ضرورت مند قرابت داروں کی ضرورتیں پوری ہوں اور ان کے دل سے دعا نکلے اور محبت میں اضافہ ہو اس طرح ایک اچھا سماج قائم ہو سکے۔ اسی طرح برائیاں بھی تین قسم کی ہوتی ہیں قولی جس کو فحشاء کہا گیا ہے یعنی بدگوئی۔ فعلی جس کو منکر کہا گیا ہے ہر قسم کے ناپسندیدہ کام اور مالی جس کو ظلم اور زیادتی کہا جاتا ہے اسکو بغی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سماج اور معاشرہ کی تعمیر کیلئے اور اسکو پاکیزہ بنانے کیلئے ان تینوں قسم کی بُرائیوں کو دور کرنا ضروری ہے۔

(۷) فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّـهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿الحجرات:۹﴾ ترجمہ: اگر وہ (لڑاکو) جماعت رجوع کرے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف سے کام لو بیشک انصاف کرنے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے

اس آیت کے سلسلے میں ایک روایت آئی ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک سواری پر سوار ہو کر ایک مقام پر گئے وہاں عبد اللہ بن اُبی تھا اس نے ناک پر کپڑا رکھ لیا اور کہا ذرا دور ہی رہنا۔ آپ کی سواری سے بدبو آرہی ہے اس پر مسلمان صحابی نے جواب دیا کہ حضور کی سواری کی خوشبو تیری بو سے زیادہ اچھی ہے۔ اس پر عبد اللہ بن ابی کے ایک آدمی کو غصہ آگیا اور اس نے کچھ کہا پھر بات بڑھ گئی یہاں تک بات ہاتھ لات جوتی چپل تک پہنچ گئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بہر کیف حکم یہ ہے کہ اگر جھگڑا ہو جائے تو آپس میں صلح وصفائی کرادیں اور اگر ایک فریق نہ مانے اور زیادتی کرنے لگے تو خاموش بیٹھ کر تماشا نہ دیکھیں بلکہ سب مل کر زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑیں تا کہ وہ صلح وصفائی پر آمادہ ہو جائے۔ پھر بھی صلح میں انصاف کا پورا خیال رکھا جائے، غصہ کے تحت زیادتی اور ناانصافی کو راہ نہ دینی چاہیئے اس لئے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(۸) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿انعام:۱۱۵﴾ اور آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے لحاظ سے پورا ہے اس کے کلام کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

عبدیت

بظاہر اس کے معنی بندگی اور غلامی کے ہیں۔ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ** ﴿الذاریات:۵۶﴾ ترجمہ: اور جن وانس کو میں نے اسی واسطے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

اب بندۂ مومن کیلئے "**عبد**" بننے کی صورت یہی ہے کہ وہ ایمان اور عمل کے میدان میں کامل ہو جائے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی ہر بات کو بے چوں وچرا ماننا اور پورا کرنا اور اسکی رضا اور خوشی میں اپنی خوشی، خواہش اور مرضی کو فنا کر دینا۔ شانِ عبدیت ہے۔ انسانی غلامی سے تو انسان آزاد ہو سکتا ہے لیکن اللہ کی غلامی سے آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اسکی غلامی سے آزادی کی صورت یہی ہے کہ نعوذ باللہ ہم اس کے بندے نہ رہیں اور وہ خدا ہمارا خدا نہ رہے۔ **استغفر اللہ العظیم**۔

انسان کو اللہ نے دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہی بیان فرمایا ہے کہ وہ میری بندگی کرے۔ اور یہی عبدیت کی شان بھی ہے۔ عبدیت کی شان کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ اوامر اور نواہی کو پورا کرے۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ عام طور پر عبادت کا جو مفہوم انسانی ذہنوں میں ہے اسکو ادا کرنے سے انسان عبدیت کے فرائض کی ادائی سے سبکدوش نہیں ہو جاتا۔

کیوں کہ اوامر اور نواہی کا تعلق زیادہ تر افعال اور اعمال (اور احوال) کے ساتھ ہے خواہ وہ اصطلاحی عبادات ہوں، یا معاملات یا معاشرت واخلاق وسیاسیات ہوں، سب کو پورا کرنا عبدیت یا بندگی ہے۔ اور کمال عبدیت یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے اپنے اختیار سے بے اختیار ہو جائے (جیسا کہ مہدیؑ نے فرمایا۔ بے اختیار ہو جا، بختیار ہو جا) اور حق تعالیٰ جو تصرف اس بندے کے اندر کرے اس پر راضی رہے۔ نیز یہ بات بھی جو یہاں یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ ہم کو اوامر ونواہی کے اسرار ومصالح معلوم کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ نہ اسکی فکر میں پڑنا چاہئے بس جو حکم ہو بے چوں وچرا ماننا، پورا کرنا اور اسکو مصلحت وحکمت پر مبنی جاننا چاہئے۔ بلکہ اگر خلاف مصلحت بھی ہو تب بھی دم مارنے کی گنجائش نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ ہم عبد و غلام ہیں۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان بندہ ہے غلام ہے تو اسکو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ نوکر نہیں ہے۔ نوکر کا حکم الگ ہوتا ہے اور غلام کا الگ۔ نوکر کا کام متعین ہوتا ہے اور اسکی مزدوری بھی متعین ہوتی ہے۔ لیکن غلام ایسا نہیں ہوتا وہ تو مالک کا حکم بردار ہوتا ہے۔ اسکی ڈیوٹی چوبیس گھنٹوں کی ہوتی ہے اور غلام اپنے آقا سے مزدوری اور تنخواہ بھی نہیں مانگتا۔ وہ جو دیتا ہے لے لیتا ہے اور نہیں بھی دیتا تو بھی صبر کرتا ہے اور مانگتا بھی نہیں۔ اسکی تمام تر توجہ بس اس امر پر ہوتی ہے کہ مالک اس سے ہمیشہ راضی

رہے۔ وہ اپنے آقا کی ہلکی سی خفگی اور ناراضی کو بھی اپنے لئے جہنم تصور کرتا ہے اور اسکی رضامندی اور خوشنودی اور اسکے قرب کو ہی اپنی جنت سمجھتا ہے۔ یہ تو عام بندوں کی بات ہے۔ لیکن جو بندے خاص ہوتے ہیں ان کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ وہ اس کے لئے اپنی تمام تر خواہشات کو بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اور بس اسی کے وصال کی فکر میں رہتے ہیں اور ہر حال میں اسی کا ذکر کرتے ہیں۔

ان میں چند بندے وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ خود "اپنے بندے" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ان پر بلکہ ان کے ہر عمل و حرکت پر اسکی نظر رہتی ہے اور ان کی ہمیشہ نگرانی ہوتی رہتی ہے۔ خلاف اولیٰ، ادنیٰ کام بھی ان سے ہوتا ہے تو ان کی سرزنش کی جاتی ہے۔ ان میں حضور محمد مصطفی ﷺ کا مقام تو خاص الخاص ہے۔ آپ کو اللہ نے ﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ﴾ (الاِسراء: ۱) کے نام سے یاد فرمایاہے اور عبدہ سے ساری دنیا جان گئی کہ اس سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ "عبد" کی شان الگ ہے اور "عبدہ" کی شان الگ ہے۔

اسی طرح حضرت مہدی موعودؑ کی شان بھی ہے۔ کہ آپ نے خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو قرآن کا پابند اور محمد رسول اللہ ﷺ کا تابع قرار دیا۔ اور حضور کی اپنے ہر قول، فعل اور حال میں بے خطا پیروی فرمائی اور اعلان فرمایا مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ ﷺ۔

آپ کا قدم رسول اللہ ﷺ کے قدم پر رہا۔ عبدیت تفویض کلّی ہے۔

عوالم

اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات ذی مادّہ اور ذی مقدار پیدا کی ہیں۔ ان کو مادّیات کہتے ہیں۔ تمام اجسام علویہّ و سفلیہ ایسے ہی ہیں۔ اور بعض مخلوقات مادہ اور مقدار سے مجرّد یعنی خالی ہیں ان کو مجرّدات کہتے ہیں۔ تمام ارواح انسانیہ و دیگر لطائف جیسے قلب، سرّ، خفی اور اخفیٰ ایسے ہی ہیں، یہی مراد ہے صوفیہ کے اس قول کی کہ لطائف فوق العرش ہیں۔ مادّیات کو "عالم خلق" اور مجرّدات کو "عالم امر" کہتے ہیں۔ اور عالم مثال ان ہی دونوں عالموں (عالم خلق و عالم امر) کے بین بین ہے یعنی غیر مادی ہونے میں عالم امر کے مشابہ ہے اور مقداری ہونے میں عالم خلق کے مشابہ ہے۔

نبوت کا تعلق عالم خلق سے ہے اور ولایت کا تعلق عالم امر سے ہے۔ بدن کا تعلق عالم خلق سے ہے اور روح کا تعلق عالم امر سے ہے۔ 'عالم خلق' محدود ہے اور 'عالم امر' غیر محدود ہے۔ ایک اور عالم ہے "عالم معنیٰ" عارف کے باطن کو عالم معنیٰ کہتے ہیں۔

عجم

عرب کے سوا دوسرے ممالک کو عجم کہا جاتا ہے۔ عربوں کا یہ دستور تھا کہ غیر عرب کو عجم کہتے تھے اور غیر عرب کے باشندوں کے "عجمی" "اعجمی" اور اسکی جمع میں اعجمین کہتے تھے۔ چناچہ قرآن شریف میں بھی یہ الفاظ چار مقامات پر آئے ہیں۔

(۱) لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ﴿نحل:۱۰۳﴾ جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔

ایک اعتراض منکرین قرآن کا یہ بھی تھا کہ حضور ﷺ امی ہونے کے باوجود جو ایسا بہترین کلام پیش کرتے ہیں، تو اسکی حقیقت یہ ہے کہ ایک عجمی شخص آپؐ کو یہ ساری باتیں سکھاتا ہے اور وہ ہمارے جیسا ہی آدمی ہے لیکن حضور ﷺ اسکو بطور "وحی" پیش کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، چنانچہ روایتوں میں آیا ہے کہ حضور ﷺ ایک عجمی شخص کو تعلیم دیتے تھے اور اسی غرض سے آپؐ کا اس کے پاس آنا جانا تھا، وہ تورات اور انجیل کا جاننے والا تھا، اسکا نام "بلعام" تھا، بس اتنی سی بات پر یہ کہنے لگے کہ حضور ﷺ بلعام سے سیکھ کر یہ آیتیں پیش کرتے ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ "یعیش" نامی ایک شخص کے پاس قرآن کی تعلیم دینے کیلئے جایا کرتے تھے، وہ بھی تورات اور انجیل پڑھا کرتا تھا، پھر کیا تھا، کافر کہنے لگے حضور ﷺ یعیش سے سیکھ کر آیتیں پیش کرتے ہیں۔ نیز ایک روایت میں ہے کہ "جبر" نامی ایک شخص تورات کا پڑھنے والا تھا، حضور ﷺ کو جب کفار مکہ ستاتے تھے تو آپؐ اس کے پاس تشریف لیجاتے تھے، تاکہ ان کی ایذاؤں سے کچھ دیر بچ جائیں تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آپؐ جبر سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اللہ اس کا جواب دے رہا ہے کہ ان کی سمجھ تو دیکھو کہ علم حاصل کرنے کی نسبت جس شخص (یا جن اشخاص) کی طرف کی جارہی ہے اس کی زبان تو عجمی ہے اور قرآن تو صریح اور فصیح عربی زبان میں ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عجمی زبان والا ایسی فصیح عربی زبان میں بات کرے اور کلام وزبان کا یہ عالم ہے کہ وہ ساری دنیا کو قیامت کیلئے چیلنج دیا جارہا ہے کہ اگر یہ کسی آدمی کا کلام ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اس جیسی ایک سورت یا ایک آیت ہی بنا کر پیش کر دو۔ لیکن دنیا والے آج تک ایسا کلام بنانے سے قاصر ہیں اور ان شاء اللہ قیامت تک عاجز رہیں گے۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب کافروں کا یہ خیال تھا، کہ حضور یہ کلام فلاں شخص سے سیکھ کر پیش کر رہے ہیں تو یہ کام ان کیلئے آسان تھا کہ وہ بھی اس کے پاس جا کر اس جیسا کلام "بنوا کر" پیش کر سکتے تھے۔

(۳،۲) وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ﴿فصلت، ۴۴﴾ اگر ہم اسکو عجمی زبان کا قرآن بناتے تو لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں، یہ کیا بات ہے کہ کتاب عجمی اور رسول عربی۔

کافروں کا کہنا یہ تھا کہ اگر پیغمبر عجمی زبان میں کتاب پیش کرتے تو ہم اسکو ان کا معجزہ سمجھتے، ان کی زبان تو عربی ہے پھر عربی زبان میں قرآن آئے تو معجزہ کیسا؟ اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ اگر ہم عجمی زبان میں قرآن نازل کرتے تو یہ اعتراض کرتے کہ بھائی یہ کیا تماشہ ہے رسول عربی اور کتاب عجمی۔ پھر ہم اس کتاب کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں وہ کچھ بھی کہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ قرآن میں ان لوگوں کیلئے ہدایت کا سامان ہے اور ہر قسم کی قلبی اور روحانی بیماریوں کا علاج ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

(۴) وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِم مَّا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿شعراء:۱۹۹،۱۹۸﴾ اور اگر اسکو کسی عجمی (غیر عربی) پر نازل کرتے اور وہ اسے ان پر پڑھ کر سناتا تو وہ اسے کبھی نہ مانتے۔ ان لوگوں کا عجیب حال ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تو کہتے ہیں کہ آپ نے اسکو گھڑ لیا ہے یا آپ دوسروں سے سیکھ کر ہم کو سنا رہے ہیں، اگر ہم اسکو کسی عجمی زبان پر نازل کرتے تو بھی یہ کہتے کہ کیا کسی عربی پر نازل نہیں ہو سکتا تھا، ایک عجمی پر عربی زبان میں کیوں نازل کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

عذابِ قبر

عذابِ قبر کے وجوہ(۱) والدین کی نافرمانی(۲) بغیر وضو نماز پڑھنا(۳) جنابت کی حالت میں رہنا(۴) قبر پر نجاست کرنا(۵) پیشاب سے احتیاط نہ کرنا(۶) غیبت کرنا(۷) سود خواری(۸) رشوت لینا(۹) بدکاری (زنا)(۱۰) چوری (۱۱) شراب نوشی (۱۲) خیانت کرنا(۱۳) دھوکہ دینا(۱۴) تکبر کی چال (۱۵) کسی مسلمان کو قتل کرنا

واضح ہو کہ عذاب قبر حق ہے تمام کافروں کیلئے اور بعض گنہ گار مومنوں کیلئے، بعض اس لئے کہا گیا ہے کہ بعض مومنین ایسے بھی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ عذاب دینا نہیں چاہتا۔ چنانچہ عقائد نسفی میں لکھا ہے۔"وخصّ البعض لان منهم من لا يريد الله تعالىٰ تعذيبه فلا يُعذب" اسکی شرح میں لکھا ہے کہ "قال ابن عباس رضى الله عنه ثلاث يعصمهم الله تعالىٰ من عذاب القبر، الموذن و الشهيد و المتوفىٰ يوم الجمعة او ليله" یعنی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ تین اشخاص ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ عذاب قبر سے بچائے گا، موذن، شہید اور جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں جس کا انتقال ہوا ہو۔

اسی طرح جو اہل ایمان و طاعت ہیں ان کیلئے نعمتیں دی جائیں گی۔ البتہ کافروں کو قیامت کے دن تک قبر میں عذاب دیا جائیگا، البتہ جمعہ کے دن اور ہر رمضان کے مہینے میں، نبی کریم ﷺ کے احترام میں ان پر سے بھی عذاب دور کر دیا جائیگا۔

البتہ جو مومن اطاعت گذار ہوں گے ان کیلئے عذاب قبر تو نہ ہو گا لیکن ان کیلئے "ضِغطَةَ" ہو گا۔ یعنی قبر کی دونوں طرف کی دیواریں ان کو طاقت سے بھینچیں گی یعنی ان سے ملیں گی۔ یہ ملنا بھی دو طرح سے ہوتا ہے۔، صالحین اور اطاعت گذاروں کیلئے ایسے ملیں گی جیسے دوست آپس میں گلے ملتے ہیں، لیکن کافروں سے ایسے ملیں گی کہ ایک طرف کی پسلیاں دوسری طرف اور دوسری طرف کی پسلیاں اسطرف نکل جائیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر بتلایا۔

نیز اللہ کا ارشاد ہے کہ "النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿غافر:۴۶﴾" یہاں "يُعْرَضُونَ" سے مراد قیامت کے دن سے پہلے ہونے والے عذاب ہے یعنی قبر میں۔ کیونکہ اس کے بعد میں اللہ فرماتا ہے۔ اور جس دن قیامت قائم ہو گی (کہا جائیگا) آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کرو۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "استنزھوا عن البول فان عامّۃ عذاب القبر منہ۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پیشاب کی ناپاکی سے بچو کیوں کہ عمومی طور پر عذاب قبر اس سے ہوتا ہے۔

منکر و نکیر کا سوال بھی بر حق ہے۔ منکر اور نکیر دو فرشتے ہیں جو نہایت ہیبت ناک ہیئت اور خوف ناک شکل کے ہیں، ان میں نکیر، منکر سے زیادہ ہیبت ناک ہے۔ یہ دونوں جب قبر میں میّت کو رکھا جاتا ہے اور میّت کے ساتھ جانے والے جب واپس ہو جاتے ہیں تو ان کے چالیس قدم دور ہونے پر یہ فرشتے قبر میں داخل ہو کر سوال کرتے ہیں کہ (۱) تیرا رب کون ہے؟ (۲) تیرا دین کیا ہے؟ (۳) تیرا نبی کون ہے؟ جب میّت جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ میرا دین اسلام ہے اور میرے نبی حضور محمد مصطفی ﷺ ہیں تو وہ کہتے کہ ہم کو معلوم تھا کہ تو یہی جواب دیگا۔ پھر اسکی قبر کو 70 x 70 گز وسیع کر دیا جائیگا اور کہا جائیگا سو جا۔ وہ کہے گا میں اپنے گھر والوں کے پاس جا کر اسکی خبر دینا چاہتا ہوں، تو وہ فرشتے کہیں گے "نم کنومۃ العروس" یعنی تو اسطرح سو جا جیسا کہ دلہن (پہلی رات کو) سو جاتی ہے۔ کہ اسکو سوائے اسکے محبوب کے کوئی نہیں جگا سکیگا اور اگر وہ میّت منافق ہو گا تو فرشتوں کے سوالات کے جواب میں کہے گا کہ میں لوگوں سے ایسا سنتا تھا تو میں بھی ان کے ساتھ ان ہی کی طرح کہتا تھا، تو فرشتے کہیں گے کہ ہم جانتے ہیں کہ تو ایسا ہی کہیگا پس وہ قبر کی زمین سے کہیں گے کہ تو اس پر مل جا، تو قبر کے دونوں (اطراف) اس پر چمٹ جائے گی اور اس کو بھینچ کر رکھ دے گی۔

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا "القبر روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النار" یعنی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گھڑھا ہے۔

عروج وزوال

سالک جب مراتب سلوک طے کرتا ہوا مرتبہ فنا پر پہنچتا ہے تو مرتبہ میں تجلیات اسمائی اور صفاتی کا انکشاف اور مشاہدہ ہوتا ہے، اسکو اصطلاح میں عروج کہتے ہیں، اسکے بعد بھی سالک ترقئ درجات کا متمنی رہتا ہے، لیکن بعض کو حسب تمنا ان کے احوال فنا میں ترقی ہوتی ہے لیکن سلسلۂ افاضہ جاری نہیں رہتا، اور بعض کو افاضہ ہو جاتا ہے اور ایسے لوگ مسند ارشاد پر متمکن ہو کر خلق اللہ کو فیض پہنچاتے ہیں، اسکو بقاء نزول کہتے ہیں۔

عملیات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو شفاء اور مومن کیلئے رحمت قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿اسراء:۸۲﴾ اور ہم نے قرآن میں وہ نازل کیا ہے جو شفاء ہے اور مومنین کیلئے رحمت ہے۔

اصل میں قرآن مجید دل کی بیماریوں (کفر، شرک نفاق وغیرہ) کیلئے شفاء ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ﴿یونس:۵۷﴾ (قرآن) شفاء ہے دل کی بیماریوں کیلئے۔

اب یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا یہ جسم انسانی کیلئے بھی باعثِ شفاء ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید سے شفاء جسمانی بھی حاصل ہوتی ہے (تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۳۱۶ نیل الاوطار جلد ۸ ص ۲۱۲)

رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ بچھو گزیدہ شخص پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی (نیل الاوطار جلد ۸ ۲۱۵) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ فلق و سورۂ ناس کے ذریعہ شفاء جسمانی کا ذکر موجود ہے۔

اسی طرح بعض بیماریوں سے شفاء کیلئے دعائیں بھی حضورؐ سے منقول ہیں۔ بعض دعائیں مطلق بیماریوں کیلئے ہیں اور بعض دعائیں متعین بیماریوں کے لئے۔ مشہور محدث امام ابوزکریا نووی نے ماثور دعاؤں اور اذکار کو "کتاب الاذکار" کے نام سے جمع فرمایا ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور اس میں ایسی بہت سی دعائیں موجود ہیں۔

نیز یہ بات عقل و خرد کے خلاف بھی نہیں۔ جن مادی دواؤں کو ہم کھاتے ہیں اور ان سے صحت یاب ہوتے ہیں ان میں یہ خصوصیت اور نافعیت خالق کائنات ہی کی پیدا کردہ ہے۔ تو اللہ اگر وہی تاثیر وصلاحیت الفاظ اور کلمات میں پیدا کردے تو یقیناً یہ بھی باعث تعجب نہیں ہے۔

نیز اس پر بعض انسانی تجربات بھی شاہد ہیں۔ بہت سے مواقع پر کسی آیت کے پڑھنے یا دم کرنے یا کسی دعا کے پڑھنے کی وجہ سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ اور انسان عملاً اس کا تجربہ کرتا ہے۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ دعائیں قرآنی آیات اور اللہ کے اسماء حسنیٰ بھی شفاء کی تاثیر رکھتے ہیں۔ اور یہ اسباب کے درجے میں ہیں، اصل شفاء اللہ ہی کی مشیت اور اسی کے حکم سے ہے۔

روحانی عمل کے ذریعہ علاج کی مختلف صورتیں ہیں دعا کرنا، کوئی آیت، ذکر، یا دعاء پڑھ کر دم کرنا۔ قرآن مجید کی آیت، دعاء یا اللہ تعالی کے اسماء حسنیٰ لکھنا اور اُسے دھو کر پینا اور لکھا ہوا تعویذ گلے میں لٹکانا۔

جہاں تک شفاء کی دعا کی بات ہے، خواہ اپنے لئے ہو یا دوسرے کیلئے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔
ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم اپنے اہل خانہ پر دایاں ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ دعا فرمائے تھے۔

اللّهمّ ربّ الناس اذهب الباس واشفِ انت الشافی لاشفاء إلاشفاءك، شفاء لا يغادر سقماً۔(بخاری شریف حدیث نمبر ۵۳۵۱، باب دعاء العائذ اللمریض) ترجمہ: اے اللہ انسانیت کے پروردگار، تکالیف کو دور کر دیجئے، اور شفاء عطا فرمایئے کہ آپ ہی شفاء عطا فرماسکتے ہیں ایسی شفاء جو کسی بیماری کو نہ چھوڑے۔

حضرت عثمان ابوالعاص سے مروی ہے کہ مجھے اسلام قبول فرمانے کے بعد سے جسم میں درد کا احساس رہتا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا جہاں پر تکلیف ہو وہاں ہاتھ رکھو تین دفعہ بسم اللہ کہو اور سات دفعہ یہ پڑھو۔

أعوذ بعزة الله وقدرته من شــــر ما أجد وأحاذرُ(مسلم،حدیث نمبر ۲۲۰۲،باب استحباب وضع یدہِ علی موضع الالم مع الدّعاء) ترجمہ: میں اللہ تعالی کے غلبہ اور قدرت کی پناہ میں آتا ہوان چیزوں کے شر سے جن سے میں دوچار ہوں اور جن سے میں ڈرتا ہوں۔

دوسری صورت پڑھ کر دم کرنے اور پھونکنے کی یہ بھی حدیث سے ثابت ہے، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سونے کے وقت معمول مبارک تھا کہ سوتے وقت قُلْ هُوَ اللَّـــهُ أَحَدٌ،قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر اپنے اوپر دَم فرماتے(بخاری حدیث نمبر ۵۰۱۷،باب فضل المعوذات)

حضرت عائشہؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ جب گھر کے لوگوں میں کوئی بیمار پڑتا تو اس پر بھی آپ معوذات یعنی سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھ کر دم فرمایا کرتے تھے، پھر جب آپ مرض وفات کی حالت میں تھے تو حضرت عائشہؓ آپ پر دم کیا کرتی تھیں (مسلم حدیث نمبر ۵۷۶۰) پھونکنے اور دم کرنے کو حدیث میں (رُقیہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔اور صراحۃ آپ سے اسکی اجازت ثابت ہے۔

حضرت عوف بن مالکؓ روای ہیں کہ ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا وہ مجھ پر پیش کرو کہ اگر اس میں کوئی مشرکانہ بات نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لاَ بَأْسَ بِالرُّقَى مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ شِرْكٌ(مسلم ۵٦٨٨)تو جب براہ راست جھاڑ پھونک کی اجازت ہے تو اگر پانی پر دم کیا

جائے اور اُسے مریض کو پلایا جائے یا تیل پر دَم کیا جائے اور اس سے جسم کو مالش کی جائے تو یہ صورت بھی درست ہونی چاہئے۔

یہ صورت کہ کسی برتن پر قرآن مجید کی کوئی آیت یا دعا زعفران یا کسی اور شئ سے لکھی جائے اور اُسے دھو کر پلایا جائے تو یہ بھی ثابت ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ایک طویل دعا نقل کی ہے جسکی ابتداء "بسـم الله لا اله الا الله الحليم الحكيم، سـبحان رب العرش العظيم الحمدِ لله ربّ العالمين" سے ہوتی ہے کہ اس دعا کو صاف برتن پر لکھ کر اُسے پلایا جائے اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ناف سے متصل چھینٹیں ماری جائیں اسی سے استدلال کرتے ہوئے علامہ موصوف لکھتے ہیں۔ ويجوز في ان يكتب للمصاب وغيره مِن المرضىٰ شيئاً مِن كتاب اللهِ وذكره بالمداد المباح ويُغسل ويُسقىٰ (فتاوی ابن تیمیہ ۱۹/ ٦٤) یعنی بیمار اور مبتلائے مصیبت شخص کیلئے اللہ کی کتاب یا ذکر میں سے کچھ جائز روشنائی سے لکھنا، دھونا اور پلانا جائز ہے۔

البتہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ذکر کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ جس چیز سے لکھا جائے وہ پاک ہو، جس چیز پر لکھا جائے وہ بھی پاک ہو تا کہ قرآن مجید کی بے احترامی نہ ہو کیوں کہ قرآن کی بے حرمتی سخت گناہ ہے۔ بلکہ جانتے بوجھتے ایسا کرنے میں کفر کا اندیشہ ہے۔ لہذا خون سے قرآنی آیات واذکار کا لکھنا جائز نہیں ہے۔

عمل کی چوتھی صورت لکھا ہوا تعویذ ہے۔ لکھا ہوا تعویذ گلے میں لٹکانا جائز ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تعویذ گلے میں لٹکانا بازو یا کسی اور حصے میں باندھنا جائز نہیں ہے۔ دوسری رائے اس کے جائز ہونے کی ہے۔ بشرطیکہ مشرکانہ کلمات سے خالی ہو اور یہی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیاطین وغیرہ سے حفاظت کی دعا بتائی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عمر ابن العاص اپنے بچوں کو یہ دعا باضابطہ یاد دلاتے تھے اور جو ان میں سے بڑے نہیں ہوئے تھے ان کیلئے دعا لکھ کر ان کو پہنا دیتے تھے۔

ومن لم يدرك كتبها وعلقها عليه۔ مصنف بن ابی شیبہ ۸/ ۳۹

علامہ ابن ابی شیبہ نے مختلف تابعین سے نقل کیا ہے وہ تعویذ لکھنے اور پہنانے کے قائل تھے۔ مشہور محدث سعید ابن المسیّب سے نقل کرتے ہیں کہ اگر چمڑے پر لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ عطاء، مجاہد، محمد ابن سیرین ضحاک بڑے پایہ کے تابعی علماء گذرے ہیں اور صحابہ کے صحبت یافتہ ہیں ان سب سے لکھے ہوئے تعویذ کا جواز منقول ہے۔ حضرت عائشہؓ اور ائمہ مجتہدین

میں سے امام احمد کی طرف بھی یہی بات منسوب کی گئی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے عورت کے دردزہ (زچگی) کے سلسلے میں جو دعا لکھی ہے اور دھو کر پلانے کی بات فرمائی ہے اس میں کاغذ پر لکھنے اور بازو میں باندھنے کا بھی ذکر آیا ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے لکھے ہوئے تعویذ کا جواز ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا جھاڑ پھونک، تعویذ (تمیمہ) لٹکانا شرک ہے۔ اور اسی کی وجہ سے بعض اہل علم اسکو مطلقاً منع کرتے ہیں۔ لیکن حدیث کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا منشا اور تھا۔ اس روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ ایک یہودی کے پاس جھاڑ پھونک کیلئے جایا کرتی تھیں اسی بابت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ تنبیہ فرمائی تھی (دیکھئے ابوداؤد حدیث نمبر ۳۸۸۳) اس لئے آپ کا منشا غیر مسلموں کے پاس جھاڑ پھونک کرانے اور ان سے تعویذ لینے کی ممانعت کا تھا۔ کیونکہ ان سے علاج کرانے میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ مشرکانہ کلمات کا استعمال کرتے ہوں۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جھاڑ پھونک کو بھی شرک قرار دیا تھا۔ حالانکہ پھونکنا اور دم کرنا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔

جھاڑ پھونک ہو لکھ کر اور دھو کر پلانا ہو یا لکھا ہو تعویذ ہو ہر صورت میں چند باتیں ضروری ہیں جن کو حافظ ابن حجر نے اسطرح لکھا ہے۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تین باتیں پائی جائیں تو جھاڑ پھونک جائز ہے۔

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو یا اللہ کے اسماء اور صفات کا ذکر کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ عربی زبان میں ہو یا ایسی زبان میں ہو جس کا معنی سمجھ میں آتا ہو۔

تیسرے یہ کہ اس بات کا یقین ہو کہ یہ جھاڑ پھونک بذات خود مفید اور موثر نہیں ہے اصل موثر اللہ کی ذات ہے (فتح الباری ۱۰/ ۱۹۵)

اللہ کے کلام اور اسماء وصفات کی شرط اس لئے رکھی گئی ہے کہ بندہ اللہ ہی سے مدد اور شفاء کا طلب گار ہو۔ اور شرک کا شائبہ تک پیدا نہ ہو۔ عربی زبان میں ہونا اور اس کے مفہوم سے آگہی بھی اسی لئے ضروری ہے کہ کوئی مشرکانہ کلمہ شامل نہ ہو جائے تیسری شرط اس لئے ہے کہ انسان کا خدا پر یقین رہے۔ گویا اصل یہی ہے کہ جھاڑ پھونک اور تعویذ شرک سے خالی ہو جیسا کہ رسول اللہ نے خود فرمایا۔ لَا بَأْسَ بِالرُّقَى مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ شِـــرْكٌ۔ اسی سے یہ بات بھی نکل آئی کہ غیر مسلموں کے پاس تعویذ اور عمل کیلئے نہیں جانا چاہئے کیونکہ اس صورت میں مشرکانہ تعویذ اور جھاڑ پھونک میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہے

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت گذر چکی کہ انہوں نے اپنی اہلیہ کو اسی وجہ سے منع فرمایا تھا۔

ہاں مسلمان عامل غیر مسلموں کا علاج کر سکتا ہے چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بھی ثابت ہے کہ مسلمانوں کے ایک قافلہ نے ایک غیر مسلم سردار قبیلہ کا علاج کیا تھا(نیل الاوطار ۸ / ۲۱۵)

سب سے زیادہ اہم مسئلہ عامل حضرات کے طرز عمل اور ان کے رویہ کا ہے اس سلسلے میں چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(۱) کسی عامل کی غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا جائز نہیں ہے (۲) کسی غیر محرم کو ہاتھ لگانا بھی مطلقاً جائز نہیں ہے (۳) جھوٹ سے پرہیز انتہائی ضروری ہے (۴) لوگوں کے دلوں میں دوسرے رشتہ داروں کی طرف سے وہم پیدا کرنا یا ان کی غیبت کرنے سے بھی پرہیز ضروری ہے۔ (۵) تعویذ ودیگر عملیات پر بڑھا چڑھا کر اجرت لینا یہ بھی شرعاً اور اخلاقاً معیوب ہے۔ اگرچہ بعض فقہاء نے اسکو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن بعض فقہاء نے اس سے منع کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہ قرآن پر اجرت لینے کے مترادف ہے۔ ماخوذ از شمع فروزاں

جن حضرات نے جھاڑ پھونک اور تعویذ کو منع کیا ہے ان کا اس سے مقصد صرف اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ لوگوں کا یقین اللہ کی ذات کے بجائے ان عملیات اور بعض دفعہ عمل کرنے والے باباؤں پر قائم نہ ہو جائے۔ اس سے خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ لوگوں میں ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کسی تکلیف پریشانی یا مصیبت میں ان کی نظر خدا کی طرف جانے کے بجائے عملیات اور عاملوں پر جانے لگتی ہے اور وہ انہی کو مشکل کُشا اور دافع ہلاکت سمجھنے لگتے ہیں۔ اور بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی بلکہ اگر مسلم عاملوں سے مطلب نہیں نکلتا تو وہ غیر مسلموں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور انکی جانب سے جو بھی احکام صادر ہوتے ہیں اور جو بھی اعمال وہ بتاتے ہیں، وہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، خواہ وہ افعال مشرکانہ ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز یہ بھی ہوتا ہے کہ غیر مسلم عاملین اپنا ٹھکانہ مندروں میں بناتے ہیں تو سادہ لوح لوگ، اپنی مطلب بر آری کیلئے، وہاں بھی جانے سے نہیں جھجکتے، حالانکہ ایسا کرنا کفر و شرک کی سرحد میں داخل ہو جانا ہوتا ہے۔

یہ جو باتیں اوپر رقم ہوئی ہیں، ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جائز ہے۔ یا اسکی رخصت ہے۔

لیکن جن لوگوں کی نظر عالیت اور عزیمت پر ہے، انہوں نے اسکی سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے اور اسکو ناجائز کہا ہے۔ امامنا مہدی علیہ اسلام سے اور آپ کے اصحاب سے جو روایتیں ہمارے پاس آئی ہیں ان سے بھی ممانعت کا حکم ہی ملتا ہے۔

چنانچہ حضرت بندگی میاں شاہ نعمت رضی اللہ عنہ خلیفۂ سوم حضر مہدی علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہو کر عرض کیا کہ اسکی گردن میں سخت درد ہے۔ کچھ پڑھ کر پھونک ماریں۔ حضرت شاہ نعمتؓ نے فرمایا بندہ پھونک مارنا نہیں جانتا پھر آپ نے پسخوردہ دیا، اس نے اسکو گردن پر ملا تو درد غائب ہو گیا۔

مہدویہ کے پاس چونکہ عزیمت اور عالیت پر عمل ہوتا ہے اس لئے رخصتی امور پر دھیان نہیں جاتا تھا چونکہ مہدی علیہ السلام نے فرمایا دین عزیمت اور عالیت ہے۔ پھر فرمایا اپنا قدم عزیمت و عالیت پر رکھو، اگر کبھی پھسلو گے تو رخصت پر آجاؤ گے۔ اور اگر رخصت پر قدم رکھو گے اور وہاں سے پھسلو گے تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔

اسکی متبادل صورت مہدویہ کے پاس، پس خوردہ ہے۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا سؤر المؤمن شفاء۔ یعنی مومن کا جھوٹا (اُلش یا پانی پی کر، یا کھانا کھا کر چھوڑا ہوا پانی یا کھانا) شفاء ہے۔ اس حدیث شریف میں لفظ ''مومن'' توجہ کا طالب ہے ویسے فقہاء کے پاس ''سور الآدمی طاھر'' ہے یعنی آدمی کا جھوٹا پاک ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''مومن'' کے جھوٹے کو شفاء فرمایا ہے۔ جب عام مومن کا جھوٹا باعث شفاء ہے تو اللہ والوں کا جھوٹا تو بدرجۂ اولیٰ شفاء ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت مہدی علیہ السلام نے لوگوں کو عزیمت اور عالیت کی راہ دکھاتے ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک کے تحت پس خوردہ عطا کرنے کو پسند فرمایا۔

ایمان کا ایک ادنی درجہ ہے وہ ہے اماطة الاذیٰ عن الطریق۔ یعنی راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا اور اعلیٰ درجہ لَا إِلٰهَ إِلَّا الله ہے۔ پس جو مومن ایمان کے ادنی درجے پر ہوتے ہیں وہ تکلیف کو دور کرنے کیلئے جائز اور مباح اسباب کو اختیار کر لیتے ہیں لیکن جن کا ایمان اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے وہ اپنی نظر، تکلیف پر نہ رکھتے ہوئے، بجائے اسباب پر نظر کرنے کے، مسّبب الاسباب پر نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان قرآنی آیت مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّـهِ ﴿التغابن:۱۱﴾ پر ہوتا ہے۔ تو ان کا یہ بھی یقین و ایمان ہوتا ہے کہ جس نے تکلیف دی ہے، وہی اسکو دور کرنے والا ہے۔ اور وہی دور کرے گا۔ اسکی جانب سے دی ہوئی تکلیف کو میں کسی اور سبب سے کیوں دور کروں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں ۷۰ ہزار ایسے لوگ جنت میں جائیں گے جو نہ دوا استعمال کریں گے اور نہ فال لیں گے۔ اسی لئے عالی ہمت لوگ ایسے اعمال کو پسند نہیں کرتے دائرہ مہدویہ میں مرشدین کرام سے پس خوردہ لینے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور پس خوردہ کو ''اُمّ العلاج'' کہا جاتا ہے۔

اور ان اعمال سے جو ممانعت کی جاتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ یہ توہمات میں داخل ہے، خصوصاً فال لینے کا

عمل تو بہت ہی قبیح ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ چیزیں عزلت عن الخلق اور اوقات ذکر اللہ کی پابندی کو توڑنے کے علاوہ مسبّب حقیقی سے نظر اٹھا کر اسباب توہمات اور وسائط مجازی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ جس کے باعث اس کا عامل رضاء الہی، توکل وتسلیم کے بلند مرتبے سے گر جاتا ہے، اس لئے ہر قسم کی بیماری کیلئے ہمارے پاس پس خوردہ کا عمل ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

(۱) آسیب کا اثر اور پسخوردہ۔ ام المومنین بی بی بھکیا، جو کالپی یا چندیری کے راجا کی کنوری تھی، آسیب کے اثر کی وجہ بالکل برہنہ اور خاموش رہا کرتی تھیں۔ سیدنا مہدی علیہ السلام کے پانی کا پسخوردہ پیتے ہی جن بدن سے نکل گیا۔ اس نے کپڑے مانگ کر پہن لئے اور بالکل اچھی ہوگئی۔ راجا اور متعلقین نے کہا اس لڑکی نے ایک مسلمان کا مکھ جھوٹ (پسخوردہ) پیا ہے اس لئے ہمارے دھرم کی نہ رہی۔ یہ کہہ کر حضرت مہدی علیہ السلام کی خدمت میں بھیجدی گئیں۔

(۲) ایک کتا اثناء سفر مہدی علیہ السلام اور اصحاب مہدیؑ کے ساتھ ہوگیا۔ ایک مرتبہ ایک سانپ نے اسکی زبان کو کاٹ لیا۔ وہ بھاگتا ہوا حضور کی خدمت میں آیا۔ آپ نے پوچھا کہ کتے کو کیا ہوا۔ صحابہ نے کہا کہ سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ آپ نے پسخوردہ کر کے اپنے ہاتھ سے اس کے حلق میں ڈالا۔ وہ فوراً اچھا ہو گیا۔

(۳) چاپانیر میں ایک امیر ظہر کی نماز کے بعد مہدی علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میری گردن ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ آپ کچھ پڑھ کر اس پر پھونکیں حضرت نے فرمایا بندہ پڑھنا پڑھانا نہیں جانتا تم کسی ملّا کے پاس جاؤ وہ پڑھ کر پھونک دے گا۔ اگر تمہارا دل چاہے تو بندہ پسخوردہ دے گا اگر خدا چاہے تو تم اچھے ہو جاؤ گے۔ امیر نے پسخوردہ پیا اور کچھ گردن پر بھی لگایا فوراً گردن اچھی ہوگئی۔

(۴) ایک شخص حضرت بندگی میاں شاہ نظامؒ کے حضور آیا اور عرض کرنے لگا کہ میرے کان میں کنکھجورا (گوم، ہزار پا) گھس گیا ہے اور بڑی تکلیف دے رہا ہے، آپ نے پسخوردہ دیا۔ پیتے ہی کنکھجورا نکل گیا۔

یہی وجہ تھی کہ صحابۂ نبوت اور علماء اہل اللہ بھی اس باب میں مختلف الرائے نظر آئے ہیں۔ جن کی نظر عزیمت اور عالیت پر ہے انہوں نے اسکو ناجائز کہا اور جن کی نظر رخصت (اور خدمت خلق) پر رہی تو انہوں نے جواز کا فتویٰ دیا۔ لیکن شرائط کے ساتھ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی خدا کی ذات کو موئثر جانے۔ خدمت خلق پیش نظر ہو۔ اجرت اور معاوضہ کا تعین نہ ہو۔ اور نہ بڑھ چڑھ کر وصول کیا جائے۔ پیشہ نہ بنالیا جائے۔ نامحرم عورتوں سے کبھی تنہائی نہ ہو۔ ان کے جسم کو مس نہ کیا جائے۔ جھوٹ کہہ کر مرض کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر پیش نہ کیا جائے۔ رشتہ داروں میں پھوٹ اور اختلاف پیدا کرتے ہوئے بد ظنی کا شکار نہ بنایا جائے۔

عرفان نفس

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿الذاریات:۵۶﴾" میں نے پیدا نہیں کیا جن و انس کو مگر میری عبادت کیلئے۔ یہاں لیعبدون کی تفسیر لیعرفون" سے کی گئی ہے، یعنی جن وانسانوں کو میری معرفت کیلئے پیدا کیا ہے۔

علم کے معنی جاننا اور عرفان کے معنی پہچاننا ہے۔ اللہ کو جاننے والا عالم اور اللہ کو پہچاننے والا عارف، عالم ہزاروں ہو سکتے ہیں مگر عارف باللہ بہت کم ہوتے ہیں۔ پھر ان عارفین کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں جو ان کے بحسب عرفان ہیں۔ لیکن معرفت کسی درجہ کی بھی ہو نعمت الٰہی ہے اس سے محرومی دین و دنیا میں خسارہ کا موجب ہے، چناچہ ارشاد خداوندی ہے "وَمَن كَانَ فِي هَـٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿الإسراء:۷۲﴾" یعنی جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا اور راستے سے زیادہ بھٹکا ہوا ہو گا۔ جتنی معرفت اور بصیرت حق تعالیٰ کے متعلق مرتے وقت اس دنیا سے لیجائیگا اس کے بقدر حق تعالیٰ کا قرب اور دیدار نصیب ہو گا اور جو عرفان کے بغیر خالی ہاتھ جائیگا، اس کیلئے ہمیشہ عذاب ہو گا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان پر اپنے علم و استعداد کے مطابق اللہ کی معرفت حاصل کرنا واجب ہے، سالکین کے تو سارے مجاہدے اور ریاضتیں اس لئے ہوتی ہیں کہ حق تعالیٰ کا عرفان نصیب ہو۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عرفان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے، اس سلسلے میں کتب صوفیہ میں ایک پہلا اصول یہ ملتا ہے کہ "من عرف نفســـه فقد عرف ربه" یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا" پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے نفس کو کسطرح پہچانیں۔ اس کا جواب حضرت امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "کیمیائے سعادت" میں اسطرح دیا ہے۔

انسان دو چیزوں سے پیدا کیا گیا ہے، ایک ظاہری جسم ہے جسے ظاہر کی آنکھ دیکھتی ہے، اور دوسری چیز روح ہے جس کو نفس یا دل اور جان کہتے ہیں، اسکو ہم اپنی ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے، یہی حقیقت انسان ہے اور یہ حقیقت اس عالم سے نہیں بلکہ عالم امر سے ہے۔ اس کی صفت اللہ کی معرفت اور اس کے جمال کا مشاہدہ ہے، اسی سے خطاب ہے اور اسی پر ثواب و عذاب ہے، اس کے صفات اور حقیقت کو جاننا اللہ کی معرفت کی کنجی ہے۔ جو صفات درندوں اور چوپائیوں کو دی گئی ہیں وہی انسان کو بھی عطا ہوئی ہیں مگر اک صفت انسان کو اضافی دی گئی ہے وہ "جوہر عقل" ہے۔ اسی کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات ہے۔ تاکہ وہ اسی عقل کے ذریعہ اللہ کی معرفت حاصل کرے۔ اس کے صفات کو جانیں اور اپنے نفس کو شہوت اور غضب سے

نجات دلائے۔

ایک اور جگہ امام غزالیؒ "ان الله خلق آدم على صــــورته" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "پس انسان کو چاہیئے کہ اس شہنشاہ کا شکر ادا کرے جس نے اسے پیدا کیا اسکو اپنی بادشاہی کا نمونہ بنایا، اسکے دل کو عرش کی طرح بنایا، دماغ کو کرسی اور خزانۂ خیالات کو لوح محفوظ کی طرح بنایا، آنکھ، کان اور تمام حواس کو اسکے فرشتے بنایا، دماغ کے گنبد کو جو منبع اعصاب ہے اس کیلیئے آسمان اور ستاروں کی طرح بنایا، اور اسکی روح کو بے چون و چگوں بنایا اور تمام اعضاء پر بادشاہ بنایا، پھر اس سے کہا "فاعرف نفسك يا انسان تعرف ربك" اے انسان تو اپنے نفس کو پہچان لے تو تو اپنے رب کو پہچان جائے گا۔

ایک اور جگہ امام غزالیؒ نے عرفان نفس کے ضمن میں لقمہ چبانے سے لیکر، خون بننے اور جزء بدن ہونے تک انسان کے اعضاء جس طرح کام کرتے ہیں۔ اور جس طرح اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں، ان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ تا کہ ان میں غور کیا جائے تا کہ انسان کی صفت خلاقیت کا عرفان نصیب ہو۔

اسی طرح تعلیم غوثیہ کی یہ عبارت بھی قابل غور ہے "آپ کہتے ہیں میرا جسم، میری روح تو معلوم ہوا کہ یہ سب آپ کی چیزیں ہیں اور آپ کچھ اور ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جسم کے اندر روح، روح کے اندر انا ہے اور یہ انا ہی آپ ہیں، اور یہ انا اس "انائے حقیقی" کی بازگشت ہے۔ اب اس انا کو پہچانئے تب "من عرف نفسه فقد عرف ربه" بھید کھلیگا۔

حضرت علی کرم اللہ وجھہ نے جو اشعار معرفت نفس کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں اس میں بھی افکار و معانی کا ایک سمندر چھپا ہوا ہے۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

يا ولدى فكرك فيك يكفيك	فليس شيء خارجا منك
ودوائك فيك وما تشعر	دوائك فيك وما تبصر
و تزعم انك جسم صغير	و فيك انطوىٰ العالم الاكبر
وانت ام الكتاب الذى	ما حرفة يظهر المضمر

ترجمہ۔ اے فرزند تیری فکر تیری ذات میں تیرے لئے کافی ہے کیوں کہ کوئی شیء تجھ سے خارج نہیں ہے تیرا درد تیرے اندر ہے اور تو نہیں جانتا اور تیری دوا بھی تجھ ہی میں ہے مگر تو نہیں دیکھتا اور تجھ کو یہ گمان ہے کہ تو چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر ایک بڑا عالم چھپا ہوا ہے اور تو وہ ام الکتاب ہے جو اپنے حرفوں سے دل کی بات جانتا ہے۔

حقیقت محمدی، حقیقت انسانی، عالم ارواح، عالم خیال پھر آخر میں یہ جسم کثیف تیرے رہنے کیلیئے تجھ کو عطا ہوا کہ تو

اپنی اصل کو بھول جائے، اس جسم کثیف نے اپنی کثافت کا اثر تجھ پر ڈال کر تجھ کو اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ اور تو کہنے لگا میرا جسم ہے، میں فلاں کا باپ ہوں، فلاں باپ کا بیٹا ہوں، میں بھوکا ہوں، میں پیاسہ ہوں، میں ننگا ہوں، میں یہ ہوں، میں وہ ہوں۔ اے فرزند نہ تو جسم ہے نہ تیرا کوئی جسم ہے نہ تو کسی کا باپ ہے، نہ کسی کا بیٹا، نہ بھوکا ہے، نہ پیاسہ، جو کچھ ان صفات سے موصوف ہے۔ وہ صرف یہ جسم ہی ہے باپ ہے تو جسم بیٹا ہے تو جسم، سارے عیب جسم ہی میں ہیں تجھ میں کوئی عیب نہیں ہے۔ تو روح پاک و صاف ہے، تو خلیفۃ اللہ ہے، یہ جسم ایک اعتباری اور خیالی لباس ہے، جس کو تو نے اپنے ہزاروں لباس بدل ڈالے تو اک دن تیرا یہ لباس بھی تو اتار دیگا؛ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے تیرا کوئی نقصان نہیں، تو جیسا تھا ویسا ہی رہیگا۔ پس تو اس جسم سے اپنا رشتہ توڑ تا کہ اپنے اصلی وطن پہنچکر آرام پائے۔

عرفان الٰہی کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "من عرف نفسه بالعجز فقد عرب ربه با لقدرة" جس نے اپنے عجز اور بے چارگی کو پہچان لیا، اس نے اللہ کو قادر کی حیثیت سے جان لیا۔ یہ بھی کہ "من عرف نفسه باالجهل فقد عرف ربه بالعلم" جسکو اپنے علم کا جہل ہو گیا، اسکو اللہ کے علم کا بھی عرفان ہو گیا"

حضرت شیخ یحیٰ منیریؒ فرماتے ہیں "اہل طریقت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "اول درجة العبد فی المعرفة، هجرانه لنفسه" پہلا درجہ معرفت کا بندہ کا اپنے نفس سے دور ہو جانا ہے، یعنی اللہ کی معرفت، اپنی ذات سے بیزاری ہے۔ جب تک اپنی ذات سے بیزاری کو نہ پہچانوگے خدا کی معرفت کا مرتبہ نہ پاؤ گے، تمام لوگوں کی نظر اپنے اوپر اس لئے پڑتی ہے، کہ خود ان کا وجود معرفت الٰہی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردان خدا سارا غصہ اپنے اوپر اتارتے ہیں ملامت کرتے ہیں تو اپنے نفس کو، زجر و توبیخ کرتے ہیں تو اپنے نفس کی، تلوار اٹھاتے ہیں تو اپنے نفس پر تا کہ اس رکاوٹ کو دور کریں۔ اور دل بارگاہ خداوندی میں پہنچ سکے، یا پھر راہ طلب میں خاکستر ہو جائے (مکتوبات صدی)

یہ بھی واضح ہو کہ یہ معرفت بھی حق تعالیٰ کی توفیق و عنایت پر منحصر ہے، کہ جسکو چاہے اسکو اسکے ظرف اور استعداد کے مطابق عطا فرمائے۔ یہاں کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔ یہاں طائر خیال کے پر بھی جلتے ہیں، عقلیں حیران ہیں اور زبانیں گنگ۔ حد یہ ہے کہ سردار العارفین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، ماعرفناک حق معرفتک "اے اللہ ہم نے تجھے جیسا پہچاننا چاہئے ویسا نہیں پہچانا"

اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے فرمان کی شان بھی دیکھئے کہ آپ نے فرمایا "العجز عن درك الادراك ادراك" یعنی اللہ کے عرفان سے اپنے آپ کو عاجز سمجھنا ہی اسکا عرفان ہے۔ حضرت امامنا مہدیؑ نے فرمایا جو اس سلسلہ میں قول فیصل ہے، "جاں ہے ہے کر جانے۔ واں نیں نیں کر جان، جاں نیں نیں کر جانے واں ہے ہے کر جان۔ اسی میں ہے پرمان"۔

عاشورہ

ماہ محرم کی دس تاریخ کو یوم عاشورہ کہا جاتا ہے، ویسے محرم کو محرم الحرام کہتے ہیں، اس لئے کہ ایام جاہلیت میں بھی اس مہینے میں لڑائی بند کردی جاتی تھی (لیکن افسوس کہ یزید نے اسی مہینے میں رسول اللہ ﷺ کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؓ کو مع اصحاب کے ناحق شہید کردیا)۔

عاشورہ کا دن اپنے اندر کئی فضائل رکھتا ہے۔

(۱) اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم وحوا علیہم السلام کی توبہ قبول فرمائی۔

(۲) اسی دن اللہ نے حضرت نوحؑ کو اور کشتی میں جو لوگ آپؑ کے ساتھ سوار تھے، ان کو طوفان سے بچالیا۔

(۳) اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو آسمان پر اٹھالیا۔

(۴) اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کو نار نمرود سے بچالیا۔

(۵) اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے باہر نکالا۔

(۶) اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر اپنے کلام سے سرفراز فرمایا۔

(۷) اسی دن اللہ تعالیٰ نے دریا کو پھاڑ کر حضرت موسیٰؑ کو اور آپؑ کے ساتھ جو بنی اسرائیل تھے ان کو فرعون کے ظالمانہ پنجے سے بچالیا۔

(۸) اور اسی دن اسی دریا میں فرعون اور اس کے عظیم لشکر کو غرقاب کردیا۔

(۹) اسی دن اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کے یہودیوں کے ناپاک منصوبہ کو ناکام کردیا اور عیسیٰؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔

(۱۰) اور اسی دن آنحضرت ﷺ کے نواسہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کے لخت جگر، جنت کے نوجوانوں کے سردار حضرت امام حسین علیہ السلام کو محض اس وجہ سے کہ آپؓ نے یزید پلید کی خلافت کو ماننے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کردیا تھا، عبید اللہ بن زیاد کے حکم پر، عمرو بن سعد وقاص کے اشارہ پر کربلا کی تپتی سرزمین پر بھوکا پیاسہ رکھ کر شہید کردیا، اور آپؑ کا سر اقدس اس وقت تن سے جدا کردیا گیا جب کہ آپؑ سجدہ میں تھے۔ آپؑ کے ساتھ ان نفوس قدسیہ کو بھی جن میں اہل بیت کے نیکوکار افراد بھی تھے اور آپؑ کا ساتھ دینے والے دوسرے مسلمان بھی تھے، بیدردی اور سفاکی کے ساتھ شہید کردیا گیا۔

ماہ رمضان کے روزے فرض ہونے تک لوگ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، جب رمضان المبارک کے روزے فرض کر دئے گئے تو عاشورہ کی فرضیت ختم ہوگئی۔ اب وہ مستحب کی حیثیت رکھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، عاشورہ کا ایک روزہ نہ رکھو۔ یا تو نو اور دس تاریخ کے روزے رکھو یا پھر دسویں اور گیارھویں تاریخ کو (دو روزے) رکھو، تاکہ یہودیوں کی مخالفت ہو۔

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عاشورہ کے دن جو شخص اپنے اہل و عیال کیلئے دستر خوان وسیع کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ سال بھر کیلئے اس کے رزق میں برکت اور وسعت عطا فرماتا ہے، اسی طرح یہ حدیث بھی آئی ہے کہ قیامت بھی عاشورہ کے دن قائم ہوگی۔ اسی دن قوم مہدویہ میں یوم عاشورہ کی صبح سے ہی لوگ ایک دوسرے کے پاس جا کر اپنا (بولا چالا معاف کرتے اور کرواتے ہیں) یعنی یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے واسطہ آپ میرا بولا چالا معاف کیجئے، میں نے بھی آپ کا بولا چالا معاف کر دیا۔

عرش

عرش کے معنی تخت کے ہیں عرش کا لفظ قرآن شریف میں بائیس مرتبہ آیا ہے، ان میں سے بیس مرتبہ عرش کا لفظ اللہ کے تخت کے لئے ہے اور دو مرتبہ جو عرش آیا ہے وہ دوسروں کیلئے ہے یعنی ایک بلقیس کے تخت کیلئے اور دوسرے کا تعلق اس عرش (تخت) سے ہے جس پر حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو بٹھا دیا اور اس کے بعد سب نے حضرت یوسفؑ کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

اللہ نے عرش کیلئے کہیں عرش عظیم کہا، کہیں عرش مجید کہا اور کہیں عرش کریم کہا۔

اللہ جب فرماتا ہے کہ وہ مالک الملک ہے پھر ایک جگہ فرماتا ہے، "لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴿المائدۃ:۴۰﴾" اس سے یہی بتانا مقصود ہے کہ وہ صرف خالق نہیں ہے بلکہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اس کا حاکم بھی ہے ہر چیز پر اس کی حکومت ہے اس کا اختیار ہے اس کا اقتدار ہے اسی کی بادشاہت ہے اور وہ بھی دائمی، دوسروں کی بادشاہت عارضی ہے اور زمان و مکان کے اعتبار سے محدود ہے لیکن اللہ کی بادشاہت (اس کی حکومت واقتدار) زمان و مکان کے اعتبار سے غیر محدود ہے۔

چونکہ اللہ قرآن شریف میں بندوں سے مخاطب ہے اس لئے اس کے بیان کا انداز ایسا ہی ہے، جو ان کی سمجھ میں آسکے، جب اللہ نے کہا "قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ﴿آل عمران:۲۶﴾" کہدیجئے کہ یا اللہ تو مالک ملک ہے جس کو چاہتا ہے ملک بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے، تو سوال پیدا ہوا کہ ہر بادشاہ کا ایک تخت ہوتا ہے جس پر وہ بیٹھ کر حکومت کرتا ہے احکام صادر کرتا ہے، فیصلہ کرتا ہے، حکومت کے سارے انتظامات کرتا ہے، رعایا کی فریادیں سنتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

تو اللہ کا تخت کہاں ہے؟ تو اللہ ان سے کہتا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر یعنی تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔

جب اللہ کو جسم نہیں ہے تو بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے اہل سنت و الجماعت کا اعتقاد صحیح یہی ہے کہ "اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴿الأعراف:۵۴﴾" اللہ نے فرمادیا۔

ہم اسپر ایمان لاتے ہیں۔ اسکے معنی معلوم ہیں، اسکی کیفیت مجہول ہے، (یعنی ہم نہیں جانتے) اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انتظام مملکت کے لئے، موجودہ اور وجود میں آنے والے امور کیلئے تدابیر

کے مرکز کا نام عرش ہے، اس کے انوار اور تجلیات جو سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے مرکز کا نام عرش ہے۔

جن مقامات پر عرش کا لفظ آیا ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے

سورت نمبر	سورت کا نام	آیت نمبر
۷	اعراف	۵۴
۹	توبہ	۱۲۹
۱۰	یونس	۳
۱۳	رعد	۲
۱۷	الاسراء	۴۲
۲۰	طٰہٰ	۵
۲۱	انبیاء	۲۲
۲۲	مومنون	۸۶

سورت نمبر	سورت کا نام	آیت نمبر
۲۳	مومنون	۱۱۶
۲۵	فرقان	۵۹
۲۷	نمل	۲۳
۲۷	نمل	۲۶
۳۳	سجدہ	۴
۳۹	نور	۷۵
۴۳	زخرف	۸۲

سورت نمبر	سورت کا نام	آیت نمبر
۴۰	مومن	۷
۴۰	مومن	۱۵
۵۷	حدید	۴
۶۹	الحاقۃ	۱۷
۸۱	تکویر	۲۰
۸۵	بروج	۱۵
۲۷	نمل	۴۳
۱۱	ھود	۷

عالیت ور خصت

کسی بھی معاشرہ میں سب افراد ایک ہی حال اور مقام کے نہیں ہوتے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو تھوڑی سی تکلیف اور مشقت برداشت نہیں کرپاتے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو بڑی بڑی مصیبت اور بلاء کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرلیتے ہیں، اپنی کسی بات یا عمل سے اس کا اظہار بھی نہیں ہونے نہیں دیتے۔

چناچہ آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ آپ ﷺ نے انتہاء درجہ مصائب اور کلفتوں کو کامل انبساط کے ساتھ برداشت کیا اور کسی سے نہ ان کا اظہار کیا اور نہ ان سے چارہ جوئی چاہی۔

غزوہء بدر کے موقع پر جو سنگین صورت حال تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ایک ہزار کا لشکر جرار جو لوہے کے ذرہ و بکتر میں ڈوبا ہوا اور یقینی کامیابی کے نشہ میں چور تھا، اور اسے کے مقابلہ میں نہتے، بے سروسامان تین سو تیرہ نفوس، لیکن اس نازک صورت حال میں بھی حضور ﷺ نے دربار خداوندی میں سجدہ ریز ہوکر دعا بھی کی تو اس کے الفاظ یہ تھے۔ اللّٰھم ان تھزم ھذہ العصابة لن تعبد ابداً۔ اے اللہ اگر یہ چھوٹی سی جماعت شکست کھا گئی تو، تو کبھی پوجا نہ جائیگا۔ اس موقع پر اپنی کامیابی اور فتح کی دعا اور کافروں کی شکست وریخت کی دعا کی بھی رخصت تھی، مگر عالیت کا تقاضہ یہ تھا کہ اللہ کے دربار میں نازک صورت حال کی تصویر کھینچ دی جائے اور فیصلہ اللہ پر ہی چھوڑ دیا جائے، اور آپ ﷺ نے عالیت پر ہی عمل فرمایا۔ قرآن شریف میں لوگوں کے حالات کے پیش نظر رخصت اور عالیت کے احکام بھی ملتے ہیں اور رخصتی احکام کے ساتھ ساتھ عالیت کے مقام کی بھی اپنی پسندیدگی کے ساتھ واضح الفاظ میں نشاندہی کردی گئی ہے۔

چنانچہ رمضان شریف کے روزوں کو جہاں فرض قرار دیا وہیں یہ حکم بھی ملتا ہے۔ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴿البقرۃ:۱۸۴﴾۔ پس تم میں سے جو مریض ہو یا سفر پر ہو (اور روزے نہ رکھے) تو اس کو چاہئے کہ چھوڑے ہوئے روزوں کی قضاء بعد میں گنتی کے ساتھ کرلے۔ یہ حکم رخصتی ہے۔

لیکن اس میں عالیت یہ ہے کہ رمضان کے مہینے کی عظمت اور شرف کے پیش نظر بیماری اور سفر کی حالت میں بھی روزے رکھ لیں، کیونکہ رمضان کے مہینے کے ایک دن کے روزہ کا ثواب غیر رمضان میں سال بھر روزے رکھنے سے بڑھکر ہے۔

چنانچہ روایت میں آیا ہے مہدیؑ کے سفر خراسان میں جو کہ ماہ رمضان میں ہوا تھا، آپؑ کے صحابہؓ روزے رکھے ہوئے تھے، دوران سفر ایک صحابی روزے کی وجہ سے بے تاب اور نڈھال ہوگئے، چاہا کہ روزہ کھول دیں اور بعد میں قضا کرلیں،

دوسرے صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ جب امامؑ ساتھ ہیں، تو آپؑ سے اس بارے میں دریافت کرلیں، جب اس معاملے میں آپؑ سے لوگ رجوع ہوئے اور صورت حال کو سامنے رکھا تو آپؑ نے فرمایا "ان کو میرے پاس لاؤ" جب ان صحابی کو آپؑ کے پاس لایا گیا تو، آپؑ نے فرمایا کہ "پانی کے چند قطروں کی وجہ سے آپ بیتاب ہوگئے ہو" بس نظر کا ملنا تھا کہ سیرابی ہوگئی طبیعت میں چستی و چالاکی پیدا ہوگئی اور روزہ جاری رہا۔ گویا یہ بتلانا تھا کہ ان حالات میں رخصت تو روزہ افطار کرنے کی ہے، لیکن عالیت یہی ہے کہ روزہ نہ توڑے، چنانچہ آپؑ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "دین عزیمت اور عالیت ہے، اگر عالیت پر قدم رکھو گے اور وہاں سے پاؤں پھسلے گا تو رخصت پر آٹکو گے، اور اگر پہلے ہی رخصت پر قدم رکھو گے اور وہاں سے پھسلو گے تو پھر کس مقام پر جاؤ گے؟" اسی طرح ارشاد خداوندی ہے، وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ﴿البقرۃ:۱۸۴﴾ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھیں تو، روزے کے بدلے مسکین کو کھانا کھلائیں اور جو خوشی سے نیکی کرے تو وہ اس کے حق میں بہتر ہے (اگر تم سمجھو تو) روزہ رکھنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔

اس آیت میں پہلے تو انتہاء درجے ضعیفوں کیلئے روزوں کے بدلے فدیہ مسکین کا حکم دیا گیا، جو ایک رخصتیی عمل ہے لیکن اس کے بعد یہ کہا گیا کہ اور جو خوشی سے نیکی کرے (یہاں مراد روزے رکھنے سے ہے) تو وہ اس کے حق میں بہتر ہے، یہاں عالیت کا حکم عام طور دیا گیا، اور پھر خاص طور پیش آمدہ مسئلہ پر واضح الفاظ میں عالیتی حکم دے دیا گیا، "وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ" یعنی تمہارا روزہ رکھنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔

بعض مفسرین نے "وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ" کی آیت کو منسوخ مانا ہے، اور "فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴿البقرۃ:۱۸۵﴾" کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے، حضرت مہدیؑ نے فرمایا کہ قرآن شریف کی جو آیات اس وقت پڑھی جاتی ہیں، ان میں سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے، پورے قرآن پر عمل کرنا چاہئے، حضرت ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ عزیمت ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے یہ لکھا ہے کہ، بعض اکابر نے "فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ" سے صدقہ فطر مراد لیا ہے، معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں، وہ ایک مسکین کے کھانے کی مقدار اس کو دیدے، تو اب یہ آیت منسوخ نہ ہوگی، ترتیب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ صحیح ہے، کیونکہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" کہہ کر سب کو حکم دیا گیا کہ تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، پھر صاحبان عذر کیلئے حکم بیان ہوا، "فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ" یعنی تم میں جو مریض یا مسافر ہے تو اس کو چاہئے کہ اس نے جتنے روزے چھوڑے ہیں، اتنے دن کے روزے بعد میں قضاء کرلے۔ پھر ان کا ذکر کیا جارہا ہے جو روزے رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یعنی شیخ کبیر اور عجوزہ

کبیرہ (بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت) تو ان کیلئے یہ حکم دیا گیا کہ، انھیں چاہئے کہ وہ فدیہ دے یعنی ایک مسکین (دو وقت کا) کھانا کھلا دے۔ اس طرح ترتیب بھی باقی رہے گی اور آیت منسوخ بھی نہیں ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن میں بھی عالیت پر عمل کرنے کو بہتر مانا گیا ہے گو رخصت کا حکم بھی سنایا گیا ہے۔ اسی طرح حج میں بھی خوشبو دار پھل کھانا بحالت احرام رخصت ہے، لیکن نہ کھانا عالیت ہے۔ حج یا عمرہ ختم ہونے پر قصر (بال چھوٹے کرانا) رخصت ہے لیکن حلق (سر منڈھوانا) عالیت ہے۔

اسی طرح فقر و فاقہ کی وجہ سے اضطراری کیفیت پیدا ہو جانے پر بھی امامؑ نے سوال کرنے سے منع فرمایا۔ جو کہ عالیت کی شان ہے۔ اگر چہ ایسی حالت میں سوال کرنا رخصت ہے لیکن آپؑ نے ایسے وقت میں بھی سوال کرنے سے منع فرمایا ہے۔

چناچہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت مہدیؑ نے فرمایا کہ "متوکل، اضطرار کی حالت میں ہو جائے تو مردار کھالے لیکن سوال نہ کرے" (شواہد الولایت، باب، ۳۳)

اسی طرح نماز میں بھی قیام اگر متعذر ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ اور اسی طرح رکوع و سجود متعذر ہوں تو اشارہ سے نماز پڑھنے کی رخصت ہے۔ لیکن جہاں تک ممکن ہو کھڑے ہو کر با قاعدہ رکوع و سجود کرتے ہوئے نماز پڑھنا عالیت ہے۔ معمولی اعذار کی بناء پر بیٹھ کر نماز پڑھنا عالیت کے خلاف ہے۔ اگر چہ رخصت ہے۔

اسی طرح فقر و فاقہ کی شدید ترین حالت میں بھی مردار کھانا رخصت ہے، مگر کوئی فقیر متوکل علی اللہ نہ سوال کرے، نہ پیسے دو پیسے کا کسب کرے اور نہ مردار کھائے اور مر جائے تو وہ شہید ہی کہلائے گا، کیونکہ اس نے عالیت ہی کو اختیار کیا، رخصت کو پسند نہیں کیا، اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب خدا کی طرف سے مردار کھانے کی رخصت دی گئی ہے تو اس کو یہ پہلو اختیار کر لینا چاہئے تھا، لیکن اس نے جب خدا کی جانب سے عطا کردہ رخصت کو قبول نہیں کیا اور مر گیا تو وہ اللہ کے پاس ماخوذ ہو گا۔

چنانچہ اللہ نے فرمایا کہ اس نے مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، حرام قرار دیا ہے، پھر فرمایا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّـهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿البقرۃ:۱۷۳﴾ یعنی جو شخص بھوک سے بے تاب ہو جائے تو وہ چیزیں کھا سکتا ہے لیکن اس میں دو چیزیں نہ ہونی چاہئے، ایک "بَاغٍ" دوسرا "عَادٍ" یعنی وہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور نہ حد سے باہر نکل جائے، اس پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی اس کو کھانے کی اجازت تو ہے، لیکن کھانے میں نہ لذت محسوس کرے اور نہ جان بچانے کیلئے، جس قدر کھانے کی

ضرورت ہے اس سے زیادہ نہ کھائے۔ ظاہر ہے کہ یہ دنوں شرطیں بہت ہی اہم، ضروری اور کٹھن ہیں، تین دن کا بھوکا شخص کیا ان دنوں شرطوں کی پابندی کرسکیگا، اس کی جان بچنے کیلیئے جس قدر چاہیئے اگر اس سے ایک لقمہ بھی وہ زیادہ کھالے یا کھانے کے دوران کراہت کے بجائے لطف ومزہ کا اسکو خیال آجائے تو وہ حکم الٰہی کا یقینا نافرمان ہی کہلائیگا، اسی لئے اللہ نے خود اسکے بعد فرمایاہے "إِنَّ اللَّـهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ" یعنی اگر ان شرطوں کی پابندی کے ساتھ کھالیا جائے تو یہ بھی سمجھو کہ تم نے غلط ہی کیا، لیکن حالات کی سختی اور تمہاری مجبوری کے پیش نظر، اللہ تم کو بخشدے گا، اس لئے کہ وہ مہربان ہے۔

اسی طرح اللہ نے سورہء انعام میں فرمایا۔ کھانوں میں حرمت نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہو الہو یا سور کا گوشت کیونکہ یہ سب گندے ہیں یو وہ جانور جس پر بطور شرک کے غیر اللہ کا نام لیا جائیگا، پھر اگر کوئی بے تاب ہو جائے تو نہ طالب لذت ہو اور نہ (ضرورت کی) حد سے بڑھنے والا ہو، تو (کھا سکتا ہے) کیونکہ آپ کا رب بخشنے والا مہربان ہے۔

آیت یہ ہے قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿الأنعام: ١٤٥﴾ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ فاقہ اور بھوک سے بے تاب ہو جائے اور مرنے کے قریب ہو جائے تو ان ممنوعہ اور محرّمہ چیزوں میں سے کھانے کی اجازت ہے، مگر دو شرطوں کے ساتھ ایک یہ کہ طالب لذّت نہ ہو اور دوسرا یہ کہ حد سے بڑھکر یعنی پیٹ بھر کر نہ کھائے، بس اتنا کھائے جس سے اسکی جان بچ سکتی ہو، لیکن اس پر بھی اللہ نے کہا کہ یہ ہے تو نافرمانی ہی اسی لئے اللہ ایسی حالت میں بخشنے والا اور مہربان ہے، ظاہر ہے کہ یہ رخصتی فعل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورہ نحل میں فرمایا۔ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّـهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّـهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿النحل: ١١٥﴾ اس کا ترجمہ بھی وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے، اس میں بھی اللہ نے وہی حکم اور وہی شرطیں بیان کی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ حکم بھی رخصت ہے بندوں کے حال پر کرم فرماتے ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ احکام میں عالیت کا بھی پہلو رہتا ہے اور رخصت کا بھی، چونکہ سب انسان یکساں نہیں ہوتے، ان کے ظرف اور ہمتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، اسلیئے اللہ نے بھی ان دونوں پر نظر کرتے ہوئے احکام میں دونوں پہلو رکھے ہیں، جن کی ہمتیں بلند ہوتی ہیں وہ عالیت پر ہی عمل کرتے ہیں، وہ رخصت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، مگر جن کی ہمتیں پست ہوتی ہیں وہ رخصت کے پہلو سے مستفید ہو جاتے ہیں۔

اگر اس موقع پر یہ کہا جائے کہ کیا قرآن میں بھی عالیت کو اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ بے شک موجود ہے، اگر قرآن شریف میں اسکی طرف اشارہ نہ ہوتا تو حضرت مہدی علیہ السلام عالیت کو اختیار کرنے کا حکم نے فر ماتے اور یہ نہ فرماتے کہ "دین عزیمت وعالیت ہے" چنانچہ اللہ کاارشاد ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَـئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّـهُ وَأُولَـئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿الزمر:١٨﴾ آپ بشارت دیجئے ان لوگوں کو جو بات کو اچھی طرح سنتے اور ان کی بہتر باتوں کی پیروی کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور یہی لوگ صاحبان عقل ہیں۔

بہتر باتوں پر عمل کرتے ہیں کا مطلب یہی ہے کہ ایک حکم تو رخصت کا ہوتا ہے اور ایک حکم عالیت و عزیمت کا ہوتا ہے، تو میرے بعض مخلص بندے رخصتی عمل کو اختیار نہیں کرتے بلکہ جو عمل عزیمت و عالیت کا ہوتا ہے اس کو اختیار کرتے ہیں، حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا "دین عزیمت وعالیت ہے، عالیت پر قدم رکھو، اگر وہاں سے پھسلو گے یا گروگے تو رخصت پر رہوگے، اگر تم نے رخصت پر ہی قدم رکھا اور وہاں سے پھسل گئے تو ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ دوزخ میں" (نور ایمان، ص ٦٣١)

جس طرح اعمال میں عزیمت و عالیت کا پہلو ہے اسی طرح اسکے مقابلہ میں رخصت کے پہلو بھی ہے اب یہ ان کے ظرف اور ہمت پر منحصر ہے کہ وہ کس کا انتخاب کرتے ہیں، اسی طرح جزاء اور طلب کا بھی معاملہ ہوتا ہے، جس کا جیسا ظرف ہوتا ہے اس کی ویسی طلب ہوتی ہے، اہل رخصت جنت پر راضی ہو جاتے ہیں لیکن اہل عزیمت و عالیت جو عالی ظرف اور اعلیٰ ہمت کے ہوتے ہیں وہ جنت سے راضی نہیں ہوتے بلکہ صاف کہدیتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ عمل کئے ہیں وہ جنت کی خواہش اور دوزخ کے خوف سے نہیں، بلکہ ہمارا مقصود تو دیدار خداوندی ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا وہ حصول ذات خداوندی کیلئے کیا ہے۔ پس ہم کو ہمارا مطلوب اور ہمارا معشوق چاہئے، اس سلسلے میں یہ اشعار کتنے پیارے ہیں

هشت جنت گر دهندت سر بسر — تو مشو راضی از آنها در گذر

عالی همت باش و دل با حق به بند — تو همائے قاب قربی رو بلند

رو بلند و رو بلند و رو بلند

یعنی اگر تجھے آٹھوں جنتیں دی جائیں تو، تو راضی مت ہو ان سے در گذر کر، بلند ہمت والا بن اور دل کو حق سے وابستہ کر، تو قاب قربی کا ہما ہے، آگے بڑھ آگے بڑھ اور آگے بڑھ اور آگے بڑھ

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اعمال صالحہ کرنے والوں کیلئے جنت کا، اس کے حور و قصور کا، بلند و بالا منزلوں کا، شیریں چشموں کا اور بہتر نعمتوں کا وعدہ فرمایا ہے، اور اس کے ساتھ ہی "لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ﴿یونس:۲۶﴾" بھی فرمایا ہے۔ حسنیٰ تو جنت ہے اور زیادہ سے مراد دیدار خداوندی ہے، پس عالی ہمت لوگوں کو یہاں بھی عالیت پر نظر رکھتے ہوئے، رخصت کو درگذر کرنا چاہیئے اور دیدار کے طالب ہونا چاہیئے۔

علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ تمام مخلوقات میں اللہ نے انسانوں کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، تمام مخلوقات میں جنت بھی ایک مخلوق ہے، تو کیا انسان جو تمام مخلوقات میں (highest grade) اشرف المخلوقات ہے اپنے سے کم تر مخلوق کی تمنا کرے اور بڑے گریڈ والا ہو کر ایک چھوٹی چیز کو بطور انعام قبول کرلے)۔ انسان تو اللہ کا نائب ہے، اسکو چاہیئے کہ اپنے اللہ سے بس اسکی ذات کو طلب کرے۔ اس لئے کہ اللہ جس کا ہو جاتا ہے، ساری چیزیں اس کی ہو جاتی ہیں۔

حاشا و کلّا اس کا مطلب نہ وعدہ الٰہی کا انکار ہے نہ احتقار ہے، بلکہ یہ کہنا ہے کہ اللہ سے اونچی چیز مانگو، وہ مل جائے تو پھر کیا کہنا، اگر نہ ملے تو جنت ہی غنیمت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اسئلوا الله الفردوس" اللہ سے جنت الفردوس مانگو، کیوں؟ اس لئے کہ دیدار خداوندی، جنت الفردوس ہی میں ہوتا ہے۔

علوم اولین و آخرین

شمس تبریز، اور مولانا عراقی دونوں ہم عصر تھے اور ایک بزرگ کے مرید تھے۔ مولانا عراقی بڑے شاعر تھے اور اپنے واردات قلبی نظم میں بیان کرتے تھے اور شمس تبریز شاعر نہ تھے۔ ایک اور شیخ نے کہا کہ شمس تبریز تم ایسی نظم بیان نہیں کرتے۔ شمس تبریز نے مغموم ہو کر فرمایا کہ حضرت مجھ کو ایسی نظم نہیں آتی۔ فرمایا کہ مغموم مت ہو تمہاری اتباع میں ایک ایسا شخص ہو گا کہ تمام علوم اولین اور آخرین کے دفتر کھول دے گا۔ چنانچہ جب اس بشارت کا وقت آیا اور حضرت شمس تبریز کو الہام ہوا کہ جلال الدین کو جا کر تربیت کرو۔ مولانا رومیؒ بڑے عالم تھے، علوم اور کتب کی خدمت میں رات دن مشغول رہتے تھے۔ بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے کہ شمس تبریز آئے اور بیٹھ گئے اور مولانا سے پوچھا کہ یہ تمہارے سامنے کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا کتابیں ہیں۔ حضرت شمس تبریز نے فرمایا کہ یہ تو علم قال ہی ہے کچھ علم حال بھی حاصل کرو، یہ کہہ کر تمام کتابیں سامنے جو حوض تھا اس میں پھینک دیں۔ جلال الدین رومیؒ شور مچانے لگے۔ شمس تبریزؒ نے وہ کتابیں حوض میں سے نکال کر دے دیں جو بالکل خشک تھیں۔ (ص:۱۰۴، مضامین علمی)

غریب

ایک مشہور حدیث ہے: بَدَأَ الإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ ترجمہ:اسلام کی ابتداء غربت کی حالت میں ہوئی اور وہ پھر غربت کی طرف لوٹے گا۔پس خوش خبری ہو غریبوں کے لئے۔اس حدیث میں غریب اور غرباء کے الفاظ قابل غور اور لائق توجہ ہیں۔عربی زبان میں غربت کے معنی وطن سے دوری کے ہیں۔اسی لئے غریب الوطن اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے وطن سے دور ہو گیا ہو۔چنانچہ لغت کی مشہور کتاب صراح میں لکھا ہے غریب، غربت، بالضم۔دور از جائے خود۔"فہو غریب"جمع غرباء(ص:۸۱، جلد اول)

ایک دوسری حدیث میں بھی غریب کا لفظ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے کن في الدنيا كانك غريب او عابر سبيل و عدّ نفسك من اهل القبور ترجمہ:تو دنیا میں اس طرح رہ گویا کہ تو وطن سے دور ہے۔یارہ گیر ہے اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کر۔اس حدیث میں بھی غریب کا لفظ وطن سے دور رہنے والے کے لئے استعمال ہوا ہے۔

غرباء غریب کی جمع ہے۔"پس خوشخبری"اس حدیث میں ان لوگوں کو دی گئی ہے جو اپنے وطن سے دور ہو گئے ہیں یا کئے گئے ہیں۔

غریب اور غرباء کے الفاظ چونکہ اردو میں امیر اور امراء کے مقابل میں استعمال ہوتے ہیں۔اس لئے عربی زبان سے ناواقف لوگ اپنی تحریروں و تقریروں میں اس حدیث کا منشاء یہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام غریبو ں سے شروع ہوا۔وہ پھر غریبوں کی طرف لوٹے گا۔پس غریبوں کے لئے خوشخبری ہو۔

سچ تو یہ ہے کہ اس حدیث کا منشاء اور غرباء کا مصداق متعین کرنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت۔اسلام کی ابتدائی تاریخ، خوشخبری دینے والے کا مقام۔خوشخبری دیئے جانے والوں کی عظمت اور خوشخبری کی وجہ جاننا بے حد ضروری ہے۔ذیل میں اس کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔اسلام کی ابتداء غربت میں ہوئی۔جس کے معنی عربی میں وطن سے دوری کے ہیں۔اب اسلام کی تاریخ پڑھنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کو خواہ وہ امیر ہوں کہ فقیر بے انتہا مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔یہاں تک کہ ان سے تنگ آکر مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں پہلے حبشہ کی طرف پھر مدینہ کی طرف خدا کے حکم سے ہجرت کرنی پڑی، وطن سے ان کی یہ دوری خالصتہ"لوجہ اللہ"تھی۔دنیا کی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی۔اس وقت مسلمان جو تعداد میں چالیس تھے دارارقم میں جمع ہو کر نماز پڑھتے تھے۔کعبۃ اللہ میں نماز پڑھنے کی بھی انہیں اجازت نہیں تھی۔تو تبلیغ، تنظیم، تعمیر اور تسخیر جیسے امور کا کیا ذکر۔لیکن جب مسلمان مدینہ منورہ چلے گئے تو وہاں آزادی اور

اطمینان کے ساتھ فرائض کی ادائیگی کا موقع ملا۔ پھر غزوات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور مسلمان ایک قابل لحاظ قوت بن گئے۔ مدینہ میں ہی مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر۔ عسکری طاقت مستحکم اور معاشی اور معاشرتی نظام اطمینان بخش ہوا۔ گویا اسلام کی جڑیں مضبوط ہونے پھلنے اور پھولنے کی تاریخ مدینے سے ہی مدون و مرتب ہونے لگی۔ اور مدینہ، مکہ والوں کا جن میں خود آنحضرتؐ بھی شامل تھے وطن نہیں تھا۔ واقعی پھول کی قدر۔ گلستان کے اندر اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ گلستان کے باہر ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی جانب آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ بَدَأَ الإِسْلاَمُ غَرِيبًا کے الفاظ سے۔ کیا اس کے بر خلاف اگر یہ کہا جائے کہ اسلام غریبوں سے شروع ہوا تو یہ بات تاریخی حقائق کے خلاف پڑتی ہے۔ اس لئے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ الکبریٰ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا۔ اور کسی صورت سے ان کو غریب (فقیر) نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ امیر اور متمول تھے اسلام کی ابتدائی کیفیت اور غربت از وطن میں اس کی ارتقائی شان ملاحظہ کرنے کے بعد آنحضرتؐ کی اس پیشین گوئی پر غور کریں۔ "وَسَيَعُودُ غَرِيبًا" اور قریب میں وہ غریب (یعنی وطن سے دوری) کی طرف لوٹے گا تو معلوم ہو گا کہ آنحضرتؐ در اصل اسلام کی "نشاۃ ثانیہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس امر کا اظہار فرما رہے ہیں کہ اسلام اپنی نشاۃ ثانیہ میں بھی اسی طرح غربت از وطن کی طرف رجوع کرے گا جس طرح کہ وہ اپنی نشاۃ اولیٰ میں رہ چکا ہے، یعنی جس اسلام کو ابتداء میں غربت کا سامنا ہوا تھا اسی اسلام کو بعد میں بھی غربت دیکھنی پڑے گی۔ اور اسلام کی "نشاۃ ثانیہ" کب ہو گی اس کا اظہار آنحضرتؐ نے اس طرح فرمایا ہے۔ "مھدی ہم سے ہیں اللہ ان کے ذریعہ دین کا اختتام فرمائے گا۔ جس طرح کہ ہمارے ذریعہ اس کا افتتاح فرمایا تھا۔ اس حدیث میں نہ صرف نشاۃ ثانیہ کا اظہار ہے بلکہ اس کے سربراہ کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں نشاۃ ثانیہ کے سربراہ کی شان اس طرح بیان ہوئی ہے۔ مھدی مجھ سے ہے۔ میرے نقش قدم پر چلے گا۔ اور کبھی خطا نہ کرے گا۔ اور وہ نشاۃ ثانیہ میں کیا کریں گے؟ فرمایا لوگوں کو اللہ کی طرف علی وجہ البصیرۃ بلائیں گے۔ سنتوں کو زندہ کریں گے۔ بدعتوں کو میٹ دیں گے۔ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ جب کہ وہ ظلم و جور سے بھری ہوئی ہو گی وغیرہ وغیرہ۔ پس سیعود غریباً کے الفاظ سے آنحضرتؐ نے ایک عظیم اور مہتم بالشان واقعہ اور اس کی شان اور کیفیت بیان کی ہے۔ یعنی بعثتِ مہدی موعود علیہ السلام اور اس کا حال۔

تاریخ گواہ ہے کہ مھدی موعود علیہ السلام نے مسلمانوں کو رسوم، عادات اور بدعات کے چنگل سے چھڑانے اور توحید حقیقی اور دور اول کے اسلام سے آشنا کرنے کے سلسلے میں جو حقیقت میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ موعودہ تھی جونپور سے ہجرت فرمائی۔ یعنی اپنے وطن کو چھوڑ دیا۔ اس طرح کہ زندگی میں پھر جونپور کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ آپ نے نہ صرف ہندوستان کے طول و عرض میں مسافت طے کرتے ہوئے اسلام کی تبلیغ فرمائی بلکہ مکۃ المکرمہ میں بھی آپ نے یہی فریضہ انجام دیا۔ امامنا

علیہ السلام نے فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا ﴿آل عمران:۱۹۵﴾ کی آیت شریفہ پڑھ کر فرمایا کہ یہ چاروں صفات (ہجرت، اخراج، ایذا فی سبیل اللہ، قتل وشھادت) بندے سے متعلق ہیں۔ چنانچہ پہلی تین صفات کا اظہار ذات امامنا علیہ السلام سے اصالتاً ہوا۔ اور چوتھی صفت کا ظہور بدل ذات مہدی حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت رضی اللہ عنہ سے حسب فرمان امامؑ ہوا۔ گویا مہدویت کی ساری تاریخ غربت از وطن ہی میں ہوئی ہے۔ اور اسی جانب آنحضرتؐ نے وسیعود غریباً کے ذریعہ اشارہ فرمایا ہے۔

جس طرح خاتم نبوتؐ کی ولادت مکہ میں ہوئی اور اسلام کی نشو و نما مدینہ میں ہوئی۔ اسی طرح خاتم ولایت کی ولادت جونپور میں ہوئی اور مہدویت کی فیض رسانیاں مختلف مقامات پر عموماً اور گجرات پر خصوصاً ہوئیں۔ امامنا علیہ السلام کی ہجرت کی یہ شان تھی کہ آپؑ بجز دو چار مقامات کے جہاں ۱۸ مہینے قیام رہا ہمیشہ رواں دواں رہے۔ آپ کے بیانِ قرآن اور فیض اقدس سے جو لوگ متاثر ہوتے تھے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ ہو جاتے اسی طرح آپ فراہ مبارک (افغانستان) پہنچتے ہیں تو مختلف ممالک کے بے شمار لوگ (جن میں سلاطین، امراء، علماء، مشائخین، جاگیر دار اور عوام شامل تھے) آپ کے ساتھ تھے۔ جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنے اپنے وطن کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اور آپ کے ساتھ مسلسل مہاجر بنے ہوئے تھے۔ ایسے مقدس مہاجرین جنہوں نے اللہ کے خلیفے کی اتباع میں۔ تبلیغ اسلام کے لئے ہجرت کی زندگی اختیار کی ہو اور قدم قدم پر دھن، دولت، جائیداد، اور املاک بیوی بچے، مسند، مشیخیت، امارت، وزارت وغیرہ کو چھوڑ کر کتاب و سنت کی تبلیغ اور عشق و محبت الٰہی کے ایمان افروز نقوش بکھیرے ہوں یقیناً اس قابل ہیں کہ آنحضرتؐ کی زبان مبارک ان کی مدح و ثناء میں زمزمہ سنج ہو۔ اس لئے کہ یہی وہ ہجرت ہے جو دور اول کے اسلام کی یاد تازہ کرنے والی ہے۔ اس لئے آنحضرتؐ نے فرمایا ''فطوبیٰ للغرباء'' پس خوشخبری ہو ان کے لئے جو وطن سے دور ہیں۔

اب یہ بات اک ادنیٰ فہم رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ محض وطن سے دوری کوئی کمال کی بات نہیں ہو سکتی ہاں وطن سے جو دوری اللہ کے لئے، رسول اللہ کے لئے، دین حق کی تبلیغ کے لئے ہو، جس میں فقر و فاقہ کی صعوبت اور سبّ و ضرب کی اذیت ہو۔ جس میں نہ صرف یہ کہ ایک نماز کئی مقامات پر پڑھنا نصیب ہو۔ بلکہ ایک ہستی کو تین جگہ دفن ہونا مقدر ہو وہ البتہ خدا اور اس کے رسول کے پاس مستحق تعریف و توصیف ہو سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بداء الاسلام غریباً سے مراد دورِ اول کے اسلام کے مہاجرین ہیں۔ اور ''وَسَيَعُودُ غَرِيبًا'' سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ (مہدویت) مراد ہے۔ جو غربت میں ہی پروان چڑھی اور فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ سے تمام مہاجرین مھدی موعود علیہ السلام

مراد ہیں۔ جنھوں نے عشق و محبت الٰہی کی آگ میں دوسری تمام فانی الفتوں کی طرح وطن عزیز کی محبت کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اور عموماً بے وطن ہو کر رہ گئے تھے۔

گویا اس حدیث سے مھدی موعودؑ۔ تاریخِ مھدویت اور مھدویوں کی طرف مختصر لیکن جامع الفاظ میں اشارہ ہے۔

غزوۂ ہند

(بحیثیت پیش گوئی خاتم الانبیاء اور خاتم حجت خاتم الاولیاء علیہما الصلاۃ و السلام)

آنحضرت رسالت مآب ﷺ کی منجملہ دیگر خصوصیات کے یہہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ آپ نے زمانۂ مستقبل میں ہونے والے اہم واقعات کی پیش گوئی فرمائی ہے اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا جارہا ہے آپ کی پیش گوئیاں ایک ایک کر کے حرف بحرف صحیح ثابت ہورہی ہیں اسی لئے ان اخبار کو علماء نے معجزات میں شمار کیا ہے۔

امامنا مہدی موعود علیہ السلام کی بعثت سے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ چونکہ بعثِ مہدی موعود کا تعلق ضروریات دین سے تھا اس لئے ناممکن تھا کہ آنحضرت ﷺ اس سلسلے میں لب کشائی نہ فرماتے۔ بعض احادیث میں خاندان کی صراحت ہے تو بعض میں بطن کی بعض میں مرتبہ مہدی بیان کیا گیا ہے تو بعض میں صفاتِ مہدی، بعض مولد کی طرف نشاندھی کرتی ہے تو بعض زمانہ خروج کی طرف، بعض سے صورت شناسی ہوتی ہے تو بعض سے سیرت کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں منجملہ ان کے ایک پیش گوئی غزوۂ ہند بھی ہے۔ یہ آنحضرت ﷺ کا ایک وعدہ بھی ہے اور معجزہ بھی۔ جس سے آپ کی رسالت پر حجت لی جاسکتی ہے۔ اسی طرح حضور مہدی موعود علیہ الصلاۃ و السلام کا بھی یہ وعدہ بھی ہے اور معجزہ بھی، جس سے حضور کی مہدیت پر حجت لی جاسکتی ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات پر آئے گی۔

ضمناً اس روایت سے مہدی علیہ السلام اور آپ کی جماعت کا ہند میں ہونا بھی ثابت ہوتا ہے روایت حسب ذیل ہے۔ **عن ثوبان مولیٰ رسول اللہ ﷺ قال عصابتان من امتي احرزهما اللہ من النار عصابة تغزو الهند و عصابة تكون مع عيسىٰ ابن مريم عليهما السلام**۔ ترجمہ: ثوبان سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرت ﷺ نے میری امت کی دو جماعتیں ایسی ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچالیا ہے ایک تو وہ جماعت جو ہند میں لڑے گی اور دوسری وہ جو عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ ہو گی۔

اس روایت میں آنحضرت ﷺ نے ایسی دو جماعتوں کے متعلق خبر دی ہے جن کو دوزخ کی آگ سے بچالیا گیا ہے۔

ایک جماعت کے متعلق تو یہ صراحت آئی ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جس کے سربراہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام ہیں۔ رہی دوسری جماعت سو اس کے متعلق صرف یہ مذکور ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جو ہند میں غزوہ کرے گی۔ اس جماعت کے سربراہ کا نام نہیں بتلایا گیا۔

لیکن جب اس حدیث پر غور کیا جاتا ہے تو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جماعت بھی ایسی ہی ہونی چاہئے جیسی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ہے اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام خلیفۃ اللہ اور مامور من اللہ ہیں تو لازماً دوسری جماعت بھی ایسی ہی ہونی چاہئے جس کا سربراہ خلیفۃ اللہ اور مامور من اللہ ہو۔

اور اس نہج پر غور کرنے کا اصل محرک دونوں جماعتوں کا وہ مآل اور انجام ہے جو روایت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے یعنی دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنا اور ساتھ ہی دونوں کا آنحضرتؐ کی امت سے ہونا۔ بالفاظ دیگر اس روایت میں گو دو جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان دونوں کا ایک انجام یعنی ہلاکت سے محفوظ رہنا بتایا گیا ہے ہلاکت سے پوری ایک جماعت اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب کہ اس کا سربراہ منصب دافع ہلاکت امت محمدیہ پر فائز ہو، اس طریق سے سوچتے ہوئے جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو ایک حدیث ملتی ہے جس سے اس جماعت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس کا ذکر عیسیٰ علیہ السلام کی جماعت کے ساتھ ایک حکم کے تحت کیا گیا ہے یعنی ''کیسے ہلاک ہوگی میری امت جس کے پہلے میں ہوں' اس کے آخر میں عیسیٰ اور مہدی جو مجھ میں سے ہیں اس کے وسط میں ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دافع ہلاکت امتِ محمدیہ ہونے میں عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جن ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک تو خود آنحضرت ﷺ ہیں اور دوسرے امام مہدی موعود علیہ السلام ہیں۔

آنحضرت ﷺ خود مراد نہیں ہوسکتے اس لئے کہ ایک تو آپ قائل ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ نے ہند پر لشکر کشی نہیں فرمائی۔ اب رہ گئی دو ہستیاں' ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے امام مہدی علیہ السلام۔ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر مندرجہ بالا حدیث میں صراحت کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ البتہ امام مہدی علیہ السلام کی طرف اشارہ اس طرح کر دیا گیا ہے کہ ان کی جماعت ہند میں غزوہ کرے گی۔ پس عصابۃ مع عیسیٰ کے ساتھ جس جماعت کا ذکر **عصابة تغز والهند** کے ذریعہ جو کیا گیا اس سے مراد امام مہدی علیہ السلام کی ہی جماعت ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ مہدی موعودؑ خلیفۃ اللہ بھی ہیں مامور من اللہ بھی ہیں اور دافع ہلاکتِ امتِ محمدیہ کے منصب پر بھی فائز ہیں یہ خیال کہ ہند میں لڑنے والی جماعت کا مصداق محمود غزنوی اور اسکا لشکر ہے جس نے ہندوستان پر کم و بیش سترہ حملے کئے' غلط بھی ہے اور باطل بھی۔

نہیں معلوم وہ کون مسلمان ہو گا جو محمود غزنوی اور اس کے لشکر کو عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی جماعت کے برابر مقام دینے کو جائز قرار دے گا۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا محمود غزنوی اور اس کے ملک گیری اور اکتناز دولت کے نفسانی تقاضوں کے تحت ہند پر کئے جانے والے سترہ حملوں اور بالخصوص سومنات کے مندر پر حملے کی حیثیت ایک صحیح مسلمان کی نظر میں وہی ہے جو عیسیٰ علیہ السلام جیسے خلیفۃ اللہ اور مامور من اللہ کی جماعت کی ہو سکتی ہے؟

کیا محمود غزنوی، عیسیٰ علیہ السلام کی طرح خلیفۃ اللہ اور مامور من اللہ تھا۔ اگر نہیں تھا اور یقینا نہیں تھا تو کیا محض ہندوستان پر مسلسل لشکر کشی کرنے کی وجہ سے وہ اس قابل ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر اور اس کے ساتھ لڑنے والوں پر دوزخ کی آگ حرام کر دی؟

معترض نے یہ نہ دیکھا کہ ہند میں لڑنے والی جماعت کا ذکر کون کر رہا ہے کس جماعت کے ساتھ کر رہا ہے اور اس کا مآل و انجام کار کیا ہے؟ ہند میں غزوہ کرنے والی جماعت کا ذکر آنحضرت ﷺ کی زبان حقیقت ترجمان سے ہو رہا ہے نہ تو آپ نے کہیں مال و منال کی خاطر حملہ کیا اور نہ کبھی بے جا تشدد کو روا رکھا ایسی صورت میں محمود غزنوی کے پیاپے حملوں اور لوٹ کھسوٹ کی کاروائیوں کو آنحضرت ﷺ کی پیش گوئی "تغزو الهند" کے تحت قرار دینا اور نتیجتاً اس پوری جماعت پر دوزخ کی آگ حرام قرار دینا کیا شانِ رسالت میں گستاخی کا موجب نہیں ہے!!! مگر برا ہو نفسانیت کا کہ صحیح بات نوکِ قلم پر لائی نہیں جا سکتی۔

ماہنامہ آستانہ دہلی بابتہ ماہِ جون ۱۹۵۲ء صفحہ ۳۷ پر معجزات کے عنوان کے ذیل میں غزوۂ ہند کی حدیث کو پیش کیا گیا ہے لیکن ان الفاظ کے ساتھ "گو کہ امام نسائی کی پیدائش سے دو سو سال پیشتر حضور نے یہ پیش گوئی فرمائی اور ہندوستان پر بصورتِ جہاد پہلا حملہ حضرت سلطان محمود غزنوی رحمتہ اللہ علیہ کا ۳۹۳ھ میں امام موصوف کے وصال کے نوے سال بعد ہوا۔ بالفاظ دیگر حدیث کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضور پر نور نے چار سو برس پہلے ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے کی پیش گوئی فرمائی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔" اس تحقیق پر ناطقہ سر بگریباں نہ ہو تو کیا کرے۔

لطف تو یہ ہے کہ محولہ پرچے میں روایت بجائے ثوبان کے ابوہریرۃ سے مروی درج کی گئی ہے حالانکہ ابوہریرہ سے اسی غزوۂ ہند کے تعلق سے جو روایت آئی ہے اس کی موجودگی میں تو ایک ادنیٰ نظر رکھنے والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے مراد محمود غزنوی کی جنگ ہو سکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ہند میں غزوہ کرنے ولی جماعت کے کیا اوصاف بتائے ہیں اور اس کا کیا درجہ اور مرتبہ بیان فرمایا

ہے خود ابوہریرہؓ کے الفاظ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ سنن کبریٰ اور نسائی میں مرقوم ہے۔عن ابي هريرة رضي الله عنه قال وعدنا رسول الله ﷺ غزوة الهند فان ادركتها انفق فيها نفسي ومالي فان اقتل كنت من افضل الشهداء فان ارجع فانا ابو هريرة المحرّر۔ترجمہ:ابوھریرۃ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ ہند کا ہم سے وعدہ فرمایا اگر اس غزوہ کو میں پاؤں تو میری جان اور میرا مال اس میں قربان کردوں اور اگر میں اس میں قتل کیا جاؤں تو میرا شمار افضل شہداء میں ہوگا اور اگر (غازی بن کر) واپس آؤں تو میں وہ ابوہریرۃ ہوں جو دوزخ کی آگ سے آزاد کر دیا گیا ہے۔

اس روایت سے بھی ہند میں ہونے والے غزوہ کا ثبوت ملتا ہے۔

صراحت تو نہیں کہ اس غزوہ کی کیا خصوصیات رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں اور اس میں شریک ہونے والوں کے کیا مراتب ارشاد فرمائے ہیں لیکن ابوھریرۃ جیسے صحابی رسول کی (جنہوں نے صفہ پر اپنی اسلامی زندگی کاٹ دی اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کو دنیا ومافیہا پر ترجیح دیتے ہوئے مکمل دنیا ترک کی تھی) اس غزوہ میں شریک ہونے کی بے تاب تمنا' اس غزوہ کی خصوصیات اور غزوہ کرنے والوں کے مراتب کی نشاندھی کرنے کے لئے کچھ کم دلیل نہیں ہے۔

اس لئے کہ حضرت ابوہریرۃ رسالت مآب ﷺ کی صحبت بابرکت کی چاشنی اور لذت سے بہرہ یاب تھے ان کے لئے کوئی ایسی صحبت ومعیت جو اس درجے سے گھٹی ہوئی ہو انکے لئے جذب وکشش اور اطمینان قلبی کا باعث نہیں بن سکتی۔ اگر ایسا نہ ہو تو بلاشک یہ بات صحابہ کے ذوق اور مذاق کی توہین کا موجب ہو جائے گی۔

حضرت ابوہریرۃ جیسی زبردست ہستی کی اس غزوہ میں شریک ہونے اور شہادت پانے کی تمنا یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ جماعت کوئی معمولی جماعت نہیں ہے۔

چنانچہ ابوہریرہ کی روایت کے آخری الفاظ ''اگر میں قتل کیا جاؤں تو میرا شمار افضل شہداء میں ہوگا اور اگر (غازی بن کر) واپس لوٹوں تو میں وہ ابوہریرۃ ہوں جو دوزخ کی آگ سے آزاد کر دیا گیا ہے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس جنگ میں حصہ لینے والوں پر دوزخ کی آگ حرام ہونے کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح قطعاً اور حتماً بیان فرمایا ہے کہ ابوہریرہؓ کے دل میں بے ساختہ اس کو پانے اور اس میں شہید ہونے یا غازی بن جانے کی تمنا تڑپ جاتی ہے۔

اس روایت میں ''المحرّر'' کا لفظ حضرت ثوبان سے مروی حدیث کے الفاظ ''عصابتان من امتي حرّرهما الله من النار'' سے ماخوذ ہے۔ ایک روایت میں احرزھما آیا ہے اور دوسری روایت ''حرّرهما'' کے الفاظ سے آئی ہے۔ سرسری طور پر

"غزوہ ہند" پر نظر ڈالتے ہوئے محمود غزنوی کو اس کا مصداق بنادینا آسان ہے۔

لیکن ابو ہریرہ کا تاثر آپ کی تمنا اور خود حدیث کے الفاظ اس خیال کو حقیقت سے کوسوں دور رکھنے کے لئے بہت کافی ہیں ورنہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا ابو ھریرہ نے یہ تمنا ظاہر کی کہ آپ محمود غزنوی کے ساتھ سومنات پر حملہ کریں اور وہاں سے زر و جواہر حاصل کریں؟ اور کیا ابو ہریرہ کی صحبت کا ذوق اتنا گرا ہوا تھا کہ آپ خاتم الانبیاء کی صحبت میں رہنے کے بعد جس نے "الفقر فخری" کا نعرہ لگایا تھا ایک جابر اور دنیا پرست بادشاہ محمود غزنوی کی معیت و صحبت کی تمنا ظاہر فرماتے؟ کیا محمود غزنوی کی جنگ ایسی تھی کہ جس میں شریک ہو کر ایک صحابی اپنی جان اور مال سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ نظر آتا ہے؟ ایسی صورت میں ان لوگوں کا کیا حشر ہو گا جو ہندوستان میں رہنے کے باوجود محمود غزنوی کی جنگ میں شریک نہ ہوئے ہوں!!! اور کیا محمود غزنوی کی جنگ میں مرنے والے سب افضل شہداء ہیں اور جو ان میں سے بچ گئے ہوں کیا ان سب پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔

پھر جب عام فوجیوں کا یہ مرتبہ ہے تو قابل غور مقام ہے کہ محمود غزنوی کا کیا مقام ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ابو ہریرہ اس کی ماتحتی میں لڑنے کی تمنا کر رہے ہیں درآنحالیکہ اس سے پہلے وہ آنحضرت ﷺ کی سرکردگی میں تھے۔ اس لحاظ سے کیا محمود غزنوی نعوذ باللہ حضرت ابو ہریرہ سے افضل اور آنحضرت ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے مساوی قرار نہیں پاتا؟ کیا کسی مسلمان کا یہ عقیدہ ہو سکتا ہے؟؟

صاف صاف بات تو یہی ہے کہ ہند میں لڑنے والی جماعت سے مراد امام مہدی موعود کی جماعت ہے اور بلاشبہ امام مہدی موعود علیہ السلام آنحضرت ﷺ اور عیسیٰ السلام کی طرح دافع ہلاکتِ امت محمدیہ ہیں' جس کی تشریح خود آنحضرت نے فرمائی ہے اس میں واضح نکتہ یہ بھی ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کی بعثت ہند میں ہو گی۔ مگر کیا امام مہدی موعود علیہ السلام کے دور میں ہند میں یہ موعود غزوہ ہوا؟ اور کیا اس پر غزوہ کی تعریف کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے؟ اور اگر ہوا تو کہاں' کس طرح اور کس کے ذریعہ؟ مضمون سے حسب ذیل امور مفہوم ہوتے ہیں۔ (۱) آنحضرت ﷺ نے ہندوستان میں ہونے والی ایک جنگ کا وعدہ فرمایا ہے۔ (۲) حضرت ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی اس جنگ میں بہ دل و جان شرکت کی تمنا ظاہر فرمائے ہیں۔ (۳) موعودہ جنگ کرنے والی جماعت کا ذکر عیسیٰ بن مریم کی جماعت کے ساتھ کیا گیا ہے جس کا انجام دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنا ہے۔ (۴) محمود غزنوی کی جنگ پر غزوۂ ہند کا اطلاق کسی پہلو نہیں ہو سکتا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ غزوہ ہندوستان میں کب ہوا' کیسے ہوا اور کس کے ذریعہ ہوا۔

امامنامہدی موعود علیہ السلام کی سیرت طیبہ سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات کسی طرح پوشیدہ نہیں ہے کہ امامنامہدی علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ جنگ میں شرکت فرمائی ہے۔ لیکن اس جنگ کے حالات، واقعات اور وقت کے لحاظ سے اس جنگ پر غزوۂ ہند کا اطلاق کسی طرح نہیں ہو سکتا اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جنگ دراصل سلطان حسین شرقی اور رائے دلپت والیٔ گوڑ کے درمیان ہوئی تھی اگرچہ اس لڑائی کا محرک امامنا علیہ السلام کا بیان قرآن تھا جس میں آپ نے مسلم کے لئے مطیع الکفر ہونے کو ناجائز قرار دیا تھا۔ اس پر سلطان حسین شرقی نے یہ عرض کیا تھا کہ وہ والیٔ گوڑ کا باجگذار ہے اگر باج روک دے گا تو لڑائی یقینی ہے اور اس کے پاس اس کی مدافعت کا پورا سامان بھی تیار نہیں ہے اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ خدا اپنے دین کا آپ ناصر ہے۔ الغرض جب سلطان اور راجہ کی فوجوں کے درمیان گھمسان کارن پڑا اور سلطان کی فوج تتر بتر ہوگئی اور شکست کے قریب ہوگئی تو سلطان نے امام علیہ السلام سے جو چند بیراگیوں کو لے کر ایک الگ اونچے مقام پر تیار کھڑے تھے' کہلا بھیجا کہ ہم کو شکست ہوگئی ہے اب آپ بھی میدان سے ہٹ جائیں لیکن آپ اپنے ساتھیوں سمیت اسی مقام پر اطمینان کے ساتھ ڈٹے رہے جب راجہ کا لشکر راجہ کے ہاتھی سمیت آپ کی جانب بڑھا تو آپ نے بسم اللہ کہہ کر قدم آگے بڑھایا اور ہاتھی پر تیر پھینکا جس کی وجہ راجہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور شکست فتح میں بدل گئی۔ ان تاریخی حالات کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جنگ امام علیہ السلام اور راجہ دلپت کے درمیان ہوئی تھی جنگ تو دراصل سلطان حسین شرقی اور راجہ کے درمیان ہوئی تھی اور امام علیہ السلام معاون و مددگار کی حیثیت سے شریک جنگ ہوئے تھے اس لئے کہ اس کا مقصد حمایت اسلام تھا۔

اگرچہ باطن کے اعتبار سے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس جنگ میں کامیابی کا اصلی سبب "امام علیہ السلام کا وجود باجود" ہی تھا لیکن ظاہر کے اعتبار سے یہ جنگ سلطان کی تھی اس لئے کہ اس نے رائے دلپت کے خلاف اس کی کافرانہ کارائیوں کی وجہ حمایت اسلام میں تلوار اٹھائی تھی اور فوج کا سربراہ بھی سلطان ہی تھا۔

امام علیہ السلام کی جنگ ہوتی تو راست مقابلہ اولاً راجہ کی فوجوں سے آپ کا ہی ہوتا۔ اور سلطان بحیثیت ایک مددگار کے شریک ہوتا حالانکہ واقعتاً ایسا نہیں ہے۔

(۲) اگر بر سبیل تنزل یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ جنگ آپ کی ہی تھی تو یہ بات قابل غور ہو جاتی ہے کہ اس جنگ کے وقت امام علیہ السلام نے اپنے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ نہیں فرمایا تھا اس لحاظ سے بھی آپ کی اس جنگ پر نہ مہدیؑ کی جنگ کا اطلاق ہو سکتا ہے اور نہ اس موعودہ غزوہ کا۔

ہاں اگر آپ کے دعویٰ کے بعد جنگ ہوئی ہوتی تو یقیناً اس جنگ پر غزوہ ہند کا اطلاق صحیح ہوتا کیوں کہ ایسی صورت میں اس جنگ کرنے والی جماعت کے سربراہ آپ ہی ہوتے۔

اور یہ بات تو یقینی ہے کہ امام علیہ السلام نے ۹۰۵ھ میں دعویٰ موکد فرمایا (جس کی اساس پر مقبل مومن، منکر کافر کا عقیدہ آج تک بلا اختلاف ہر مہدوی کے دل میں جگہ پایا ہوا ہے) اور ۹۱۰ھ میں بمقام فراہ آپ کا وصال ہوا اور اس درمیانی مدت میں کسی مقام اور کسی وقت پر بھی آپ نے کسی سے جنگ نہیں فرمائی۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں ہندوستان میں لڑنے والی جماعت سے مراد مہدی کی جماعت کا ہندوستان میں لڑنا جو ثابت کیا گیا تھا وہ غلط ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ امام علیہ السلام نے تو اپنی مہدیت کی زندگی میں کوئی جنگ نہیں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی استدلال تو اسی بات کا متقاضی ہے کہ امام علیہ السلام کی زندگی میں ہی آپ کی سرکردگی میں ہی غزوۂ ہند ہو جاتا لیکن مشیت ایزدی کا تقاضا یہ تھا کہ آپ سے اصالتاً یہ غزوہ ہند نہ ہو بلکہ آپ کے بعد آپ ہی کی منتخب کردہ ایسی ہستی کے ذریعہ ہو جس کو آپ نے اپنی زندگی میں ہی اپنی ذات کا بدل قرار دیا ہو اور جس کا چرچا اپنوں اور پرایوں میں کافی دور تک ہو گیا ہو۔

اور اللہ کی جانب سے بجائے مہدی علیہ السلام کے آپ کی ذات کے بدل سے یہ معرکہ سر ہونے کے انتظام کا سبب دراصل وہ الٰہی فیصلہ تھا کہ خاتمین علیہما السلام پر کوئی قادر نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ پر بھی کسی کو قدرت حاصل نہ ہو سکی تھی جس کی وجہ سے شہادت کا کمال آپ کو بنفسہ حاصل نہ ہو سکا تھا جیسا کہ سرّ الشہادتین صفحہ ۳ پر لکھا ہے۔ لکن بقی له كمال لم يحصل له بنفسه وهى الشهادة لیکن آپ میں جو کمال باقی رہ گیا تھا اور آپ کو بنفسہ حاصل نہ ہو سکا تھا وہ شہادت ہے۔ اور یہ کمال بنفسہ آپ کو حاصل نہ ہونے کا سبب کیا تھا اس کے متعلق شاہ عبد العزیز دہلوی نے اس طرح لکھا ہے۔ والسّر في عدم حصولها له بنفسه ﷺ ان لو استشهد في الحرب لادّى ذلك الىٰ كسر شوكة الاسلام واختلال الدين في نظر العوام اور آنحضرت ﷺ کو یہ کمال بنفسہ حاصل نہ ہونے میں راز یہ تھا کہ اگر آپ جنگ میں شہید ہو جاتے تو یہ امر اسلام کی شوکت ٹوٹنے اور عوام کی نظروں میں دین میں اختلال پیدا ہونے کا باعث بن جاتا۔

پس جس طرح خاتم الانبیاء پر کسی کو مشیت ایزدی کے تحت تقویت دین کی وجہ قدرت حاصل نہیں ہوئی اسی طرح خاتم الاولیاء پر بھی ان ہی وجوہات کی بناء پر کسی کو قدرت حاصل نہ ہونا فیصلہ الٰہی تھا اور غزوۂ ہند میں قَاتَلُوا کے ساتھ قُتِلُوا کا معاملہ بھی ضروری تھا جیسا کہ امامنا علیہ السلام نے فَالَّذِينَ هَاجَرُوا کی آیت پڑھ کر ان چاروں صفتوں کو اپنی اور اپنی قوم کی

صفات قرار دی تھیں اس صراحت کے ساتھ کہ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا ہو چکا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ ہو چکا، وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي ہو چکا قَاتَلُوا وَقُتِلُوا باقی ہے اللہ جب چاہے گا ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام علیہ السلام نے ان چاروں صفتوں کو خود سے بھی متعلق فرمایا تھا اور قوم سے بھی، مگر اس میں نکتہ کی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ صفات امام علیہ السلام سے "اصالتاً" وابستہ ہیں اور قوم سے "تبعاً"

مگر جب تین صفتیں خود آنحضرتؐ کی زندگی میں ادا ہو چکیں تو اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ان کا ظہور آپ سے اصالتاً ہوا تھا اور آپ کے ساتھیوں سے تبعاً۔

لیکن جیسا کہ خود امام علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ چوتھی صفت باقی رہ گئی ہے پس اس کے متعلق اتنا یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ صفت جو آپ سے ہی اصولاً متعلق تھی آپ سے "اصالتہ" ادا نہ ہو سکی اس لئے کہ علم ازلی میں ایسا ہی تھا حالانکہ امام علیہ السلام کی بڑی آرزو تھی کہ مندرجہ بالا تین صفتوں کی طرح چوتھی صفت (قَاتَلُوا وَقُتِلُوا) بھی آپ سے ہی ادا ہو جائے جیسا کہ نقل میں مذکور ہے حضرت امام علیہ السلام نے بارگاہِ ملک العلام میں عرض کیا یا اللہ چوتھی صفت جو باقی رہ گئی ہے اگر مجھ سے پوری ہو جائے تو اس کے لئے راضی ہوں اللہ تعالیٰ کا فرمان پہنچا کہ اے سید محمد ہمارے علم ازلی میں یہ ہے کہ خاتم الانبیاء اور خاتم الاولیاء پر کوئی شخص قادر نہ ہو گا اور تلوار کام نہ کرے گی پس ہم نے تجھ کو خاتم ولایت محمد بنایا ہے اس لئے ہم نے تیرا بدل سید خوندمیرؓ کو بنایا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ چوتھی صفت، تمنا کے باوجود امام علیہ السلام سے پوری نہ ہوئی بلکہ حکم الٰہی سے اس صفت کے اظہار کے لئے بندگی میاں سید خوندمیرؓ کو امام علیہ السلام کی ذات کا بدل قرار دیا گیا۔

نیز یہ روایت یہ بھی کہتی ہے کہ چونکہ چوتھی صفت قاتلوا وقتلوا کا مظہر تھی جس میں مارنا بھی تھا اور مارا جانا بھی اور یہ علم ازلی کے خلاف امام علیہ السلام سے اصالتہً کسی طرح ادا نہیں ہو سکتی تھی جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ سے ادا نہیں ہوئی تھی اس لئے لازمی تھا کہ اس کی تکمیل کے لئے کسی کو آپ کی ذات کا بدل قرار دیا جاتا جس سے یہ صفت باحسن وجوہ وقوع پذیر ہوتی چنانچہ اس غرض کے لئے حضرت بندگی میاںؓ کی ذات بابرکات پہلے ہی منظور نظر قدرت ہو چکی تھی اس لئے امام علیہ السلام نے تخصیص بعد تعمیم کے اصول پر حسب موقع اس عظیم الشان معاملہ کا اظہار بار بار فرمایا۔

کبھی تو فرمایا کہ "بر سر ایں غریب چہا چہا خواہد شد" اور کبھی فرمایا "بے چارہ بریں سید چہا چہا خواہد شد" اور کسی وقت فرمایا "اللہ تعالیٰ جو سمیع بصیر اور علیم حقیقی ہے تم کو لائق اور قابل بنا کر یہ بار ولایت تم پر رکھا ہے لیکن ہوشیار رہو کیونکہ یہ ولایت محمدیہ کا بار ہے سر جائے گا کمر ٹوٹے گی پوست کھینچا جائے گا اس وقت مدد صرف اپنے خدا سے ہی چاہنا (مطلع الولایت)

یہاں یہ بات لائق غور ہے کہ قَاتَلُوا وَقُتِلُوا کی صفت بحکم خدا بندگی میاںؓ کے حوالے کرنے کی روایت خبر واحد نہیں ہے بلکہ حین حیات مہدی علیہ السلام اور خصوصاً فراہ مبارک میں اس صفت کی تشریح اور تعیین کی وجہ سے یہ روایت بین الصحابہ اس قدر مشہور ہوچکی تھی کہ اس بشارت کے راویوں میں بعض امہات المصدقین بھی ہیں اور جلیل القدر خلفاء کرام بھی عظیم الشان صحابۂ امام بھی ہیں اور رفیع المرتبت مہاجرین عظام بھی نیز یہ بات بھی نہیں کہ اس بشارت کا علم صرف دائرہ کی حد تک محدود تھا بلکہ دائرے کے باہر بھی اس امر کی کافی شہرت ہوچکی تھی جیسا کہ صاحب انصاف نامہ نے لکھا ہے حضرت کی شہادت سے پہلے اکثر مخالفین پٹن اعتراض کرتے تھے کہ حضرت سید محمد نے اپنی چوتھی صفت جو امر قتال ہے اپنے خلیفۂ خاص میاں سید خوندمیر کے تفویض کی تھی ابھی تک میاں سے اس صفت کا اظہار نہیں ہوا شاید میاں بھی یہ صفت اپنے کسی خلیفۂ خاص کے تفویض کردیں گے اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا میاں نے سن کر ارشاد فرمایا ایسا نہیں ہوگا حضرت مہدی علیہ السلام نے اپنی صفت بندہ پر رکھی ہے اگر اس کا ظہور نہ ہو تو امام کے قول کی تکذیب لازم آئے گی چند دن اور ٹھہرو صبر کرو اور دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ ہند کا جو وعدہ فرمایا ہے اس سے مراد مہدیؑ کی جماعت ہے لیکن یہ وعدہ اس معنی میں اجمالی ہے کہ اس میں جنگ کی کیفیت اور نیتجہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی یعنی یہ کہ جنگ کرنے والے فقط کافروں کو ماریں گے یا پھر ان کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کریں گے لیکن جس آیت کو امام علیہ السلام نے خود سے متعلق فرمایا ہے اس میں چار صفات کا ذکر ہے جن میں چوتھی صفت قَاتَلُوا وَقُتِلُوا ہے یعنی مارنے اور مارے جانے کی صراحت ہے گویا غزوہ ہند میں کیفیت کا جو اجمال تھا قَاتَلُوا وَقُتِلُوا اسکی تفصیل ہے اور چونکہ قاتلوا وقتلوا کو امام علیہ السلام نے خود سے متعلق فرمایا ہے تو لازماً نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ہندوستان میں غزوہ کرنے والی جماعت کا اشارہ بھی آپ کی جماعت کی ہی جانب ہے۔

لیکن چونکہ خاتمین علیہما السلام پر کسی کو قدرت حاصل نہ ہونا علم خدا میں تھا اس لئے اس صفت کو اللہ نے بزبانِ ولایت پناہ علیہ السلام بندگی میاں کے حوالے کیا۔ اور بندگی میاںؓ کے ذریعہ اس صفت کا ظہور، امام علیہ السلام کے وصال کے بیس سال بعد اسی طرح ہوا جس طرح کہ امام علیہ السلام نے اس کے متعلق پیش گوئی کی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کو کس کی شہادت کہا جائے گا؟؟ امر قتال تو اصولاً بندگی میاں سے متعلق نہیں تھا وہ تو مہدی علیہ السلام سے متعلق تھا بندگی میاں تو حکم خدا کی بناء پر بدل مہدی کی حیثیت سے اس صفت کی ادائی پر مامور ہوئے تھے۔

اس کا جواب اس کے سوائے اور کیا دیا جاسکتا ہے کہ امر قتال تو تھا مہدی کا ہی، لیکن بندگی میاںؓ کو آپ کی ذات کا بدل

تکوینی مصالح کے تحت' قرار دیا گیا اور بدل کے ذریعہ مبدل منہ کی صفت کا اظہار ہوا۔

کسی مقدمہ میں وکیل مقرر کرنے کی صورت میں جب وکیل کا ہر لفظ موکل کا سمجھا جاتا ہے تو مبدل منہ کی جگہ بدل کی کاروائی اس کی ذات کی کاروائی کیسے سمجھی جا سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ بدل کا تقرر حکم خدا سے ہوا ہو ظاہر ہے کہ یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ کاروائی دراصل مبدل منہ کی ہی ہے۔ یعنی مہدی علیہ السلام کی نہ کہ بدل کی یعنی بندگی میاںؓ کی۔

اس واقعہ سے نہ صرف مہدی علیہ السلام میں بندگی میاں کی فنائیت تامہ پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس سے سیر ولایت کی بندگی میاںؓ کو جو بشارت دی گئی ہے اس کی شان بھی اجاگر ہوتی ہے۔

یہیں سے وہ اہم سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ کیا اس جنگ پر غزوۂ کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے۔ ما قبل کی بحث سے اتنا تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قاتلوا و قتلوا کی صفت خاصہ ٔمہدیٔ موعود امر اللہ' مراد اللہ خلیفۃ اللہ تھی۔ مشیت ایزدی کے تحت اس صفت کارزار کو حکم خدا سے امام علیہ السلام نے بندگی میاںؓ کے حوالے فرمائی۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو صفتِ کارزار خلیفۃ اللہ سے متعلق تھی اس کو کس نام سے یاد کیا جائیگا۔ اس کا نام لڑائی' جنگ اور حرب ہو گا یا غزوہ کا اطلاق اس پر صحیح ہو گا ظاہر ہے کہ معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی بأدنی تامل یہ کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا کہ جو امر قتال خلیفہ اللہ سے متعلق ہو گا وہ مذہبی اصطلاح میں یقیناً غزوہ کا نام پائے گا اور جس مقام پر وہ وقوع پذیر ہو گا اس کے نام سے موسوم ہو گا۔ پس اس ضابطہ کی رو سے خلیفۃ اللہ سے متعلق مخصوص اور مختص جس صفت **قَاتَلُوا وَقُتِلُوا** کا ظہور' ہندوستان میں ہوا ہے اس کا نام غزوۂ ہند ہی ہو گا۔ یہ بات اور ہے کہ تکوینی مصالح کے پیش نظر اس صفت کی ادائی اصل کے بجائے' بدل سے ہوئی ہو۔ لیکن خلیفۃ اللہ کی صفت قتال کی ادائی اگر حکم خداُ سے بدل کے ذریعہ ہو تو وہ معرکہ ٔعام کیسے ہو جائے گا۔ اور ''بدل'' اگر قتلوا کا مظہر بن جائے تو اس شہادت پر ''عام شہادت'' کا اطلاق کس طرح درست ہو سکے گا۔

اس مقام پر تو منطق اور دیانت دونوں کا یہی فیصلہ ہو گا کہ چونکہ صفت قاتلوا و قتلوا' مہدی علیہ السلام سے مخصوص بھی تھی اور مختص بھی اس لئے اس خصوص میں ہونے والا معرکہ بھی غزوہ کہلائے گا اور اس ضمن میں ہونے والی شہادت بھی ''شہادت مخصوصہ'' کہلائے گی۔

یہ بحث جو اوپر گذری صرف اس وجہ سے کی گئی کہ بعض ذہن عجمی نقطۂ نظر کے تحت غزوہ کی تعریف صرف اس جنگ سے کرتے ہیں جس میں آنحضرت ﷺ بنفس نفیس شریک ہوں حالانکہ عربی میں لفظ ''غزا'' عام ہے اور اس میں ایسی کوئی قید نہیں ہے۔ چنانچہ غازی بھی غزا سے مشتق ہے اور ہر اس شخص پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جو مذہبی جنگ سے زندہ واپس ہوا

ہو۔ اس کا استعمال بہت عام ہے علاوہ ازیں حدیث میں آیا ہے تغزوا تغتنموا (جنگ کرو مالِ غنیمت پاؤ گے) یہاں بھی غزوہ عام معنی میں ہے بطور نمونہ یہ دو مثالیں ہیں صاحبانِ علم و مطالعہ کے لئے اس سے زیادہ مثالیں عربی میں مل سکتی ہیں۔

اور اگر اصرار ہی ہے کہ غزوہ کا اطلاق صرف اس جنگ پر ہوتا ہے جس میں آنحضرت ﷺ شریک ہوئے ہوں تو پوچھا جائے گا جو جنگ حضرت مہدی علیہ السلام سے متعلق ہے اس کو کیا نام دیا جائے گا جو لوگ مہدی علیہ السلام کو آنحضرت سے مراتب میں کم سمجھیں گے ان سے تو جواب کی امید نہیں۔ لیکن جو لوگ مہدی علیہ السلام کو ہمسر رسول اللہ ﷺ مانتے ہیں۔ وہ تو بے ساختہ کہیں گے کہ جس طرح وہ غزوہ ہے اسی طرح یہ بھی غزوہ ہی ہے۔

نیز غزوۂ ہند کے الفاظ آنحضرت ﷺ کے ہیں آنحضرت ﷺ کو تو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جس جنگ کے ہندوستان میں بزمانہ آئندہ ہونے سے متعلق آپ پیش گوئی فرما رہے ہیں اس میں آپ شریک نہ ہو سکیں گے اس کے باوجود آپ نے اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ ہندوستان میں ہونے والی جنگ کو غزوۂ ہند کے نام سے یاد فرمایا ہے اگر کسی کو اس پر اعتراض ہے تو کیا یہ اعتراض جناب رسول میں اعتراض کرنے کے مترادف نہیں ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ حرب' سریہ' غزوہ وغیرہ الفاظ میں فرق بعد کے مؤرخین اور سیرت نگاروں کا پیدا کردہ ہے۔ زمانہ بعد کے مؤرخین کی اصطلاحات کی میزان میں آنحضرت ﷺ کے فرمانِ مبارک کو تولنے کی کوشش کو' جو سراسر حماقت ہے علم و دیانت کی جانب سے کیا داد مل سکتی ہے۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یا تو آنحضرت ﷺ کی جنگ کے سوا کسی اور جنگ کو غزوہ کہنے کے لئے تیار نہیں۔ یا پھر نیچے اترتے ہیں تو محمود غزنوی کی جنگ کو بھی غزوہ کہہ لیتے ہیں۔ اور سلطان حسین شرقی کی جنگ کو بھی لیکن طبیعت نہیں آتی تو بندگی میاںؓ کے معرکے کی جانب حالانکہ بدل موعود اور مقبول معبود ہونے کے لحاظ سے جنگ کھانبیل وسدراسن ہی صفت قاتلوا و قتلوا، کا مظہر بھی ہے اور غزوۂ ہند کا مصداق اتم بھی۔

یہ بحث ناقص اور نامکمل رہ جائے گی اگر اس ضمن کی روایتوں کا وہ حصہ نظر انداز کر دیا جائے جو اس پورے واقعہ کی جان بنا ہوا ہے یعنی امام علیہ السلام نے قَـاتَلُوا وَقُتِلُوا کی صفت کو سرسری طور پر بندگی میاں کے تفویض نہیں فرمایا کہ ادا ہو جائے تو بھی ٹھیک ہے اور نہ بھی ہو تو کچھ پروا نہیں بلکہ آپ نے اس صفت کے ظہور کو اپنی مہدیت کی آیت اور حجت قرار دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو بطور تحدّی کے پیش کیا ہے چنانچہ آپ نے اس معرکہ سے متعلق یہ صراحت فرمائی ہے کہ اگر پہلے دن تم تنہا ہوں گے اور پوری دنیا تمہارے مقابل ہو گی تو وہ ہزیمت اٹھائے گی اور دوسرے دن تم کو شہادت نصیب ہو گی۔ یہ تشریح گویا قاتلوا و قتلوا کی تفسیر تھی۔ یعنی پہلے دن قاتلوا کا ظہور ہونا تھا اور دوسرے دن قتلوا کا یہی بات تحدّی کے طور پر اس

طرح فرمائی ''اگر بندہ مہدیٔ موعود ہے تو اس صفت کا اظہار تم سے ہو گا'' اس چھوٹے سے جملے میں کتنی سادگی اور بے ساختگی ہے اور کس قدر سچائی ہے کسی سادہ کلام میں زور بیان کی اس سے اچھی مثال شاید ہی پیش کی جاسکتی ہے۔

یہاں یہ بات واضح کرناضروری ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے زندگی بھر جہاں مطابقت از حکم خدا و کلام خدا اور موافقت با اتباع رسولِ خدا کو اپنی مہدیت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا وہیں ضروریات دینی کے تقاضے کے تحت اپنے بعد بھی دو چیزوں کو آیت اور حجت کے طور پر پیش فرمایا۔ اس طرح کہ اگر یہ دونوں باتیں اسی طرح وقوع پذیر ہوں جس طرح کہ کہی گئی تھیں تو آپ کی مہدیت برحق ہے ایک امر تو آپ کے وصال کے فوری بعد سے متعلق تھا اور دوسرا وصال کے تقریباً بیس سال بعد سے۔

امر اول یہ تھا کہ ہماری قبر کھول کر دیکھو اگر بندہ قبر میں رہے تو بندہ مہدی نہیں (اگر نہ رہے تو بندہ مہدیٔ برحق ہے)

اور امر دوم یہ اگر بندہ مہدی موعود ہے تو قاتلوا و قتلوا کی صفت تم سے ظاہر ہو گی۔

بحمد اللہ یہ دونوں امور حسب پیش گوئی امام علیہ السلام وقوع پذیر ہوئے یعنی آپ قبر میں نہیں پائے گئے اور امر قتال کا ظہور بندگی میاںؓ کے ذریعہ ہوا۔ اسی وجہ سے قوم میں متفقہ طور پر ان امور کو آپ کے معجزات میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہِ قاسمؒ نے اس طرح ارقام فرمایا ہے ''اور بندگی میاں کی جنگ' جنگ بدر کے مانند حق ہے جس نے یقین سے کہا کہ بندگی میاں کی جنگ معجزۂ بدر کے مانند نہیں ہے تو وہ ''منافق'' ہے اور جو مطلقاً اس (شہادت مخصوصہ) کا منکر ہوا وہ کافر ہے بالاتفاق کیوں کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے اپنے زمانۂ حیات میں تفصیلی طور پر وقوع جنگ کے بارے میں بندگی میاں سید خوندمیر ہی کے حق میں وصیت فرمائی تھی اور اپنی صفت چہارم (قَاتَلُوا وَقُتِلُوا) کے ظہور کے لئے قتال کا اشارہ بندگی میاںؓ کی ذات ہی کی طرف فرمایا تھا۔ اور نیز میراں سید محمود ثانی مہدی کی گواہی سے بھی یہی بات ثابت ہے اور یہ خبر مشہور ہے (بحوالۂ صراط الایمان صفحہ ۱۶۷) بالفاظ دیگر قَاتَلُوا وَقُتِلُوا والا معرکہ مہدی موعود کے لئے وہی مقام رکھتا ہے جو آنحضرت رسول اللہ ﷺ کے لئے بدر کا معرکہ جس طرح جنگ بدر آنحضرت ﷺ کی آیت' حجت اور معجزہ تھا۔ اسی طرح اس صفت کا وقوع پذیر ہونا بھی حضور مہدی موعود کے لئے آیت' حجت اور معجزہ ہے۔

جس طرح اس لڑائی کو بدر کے مقام پر ہونے کے لحاظ سے غزوۂ بدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح یہ معرکہ ہندوستان میں ہونے کی مناسبت سے بزبانِ رسالت پناہ مخبر صادق حضور پرنور محمد مصطفی ﷺ ''غزوۂ ہند'' کے نام سے موسوم ہے۔

غزوات میں صحابہ کی تعداد

غزوۂ بدر میں ۳۱۳۔ غزوۂ حدیبیہ میں ۱۵۰۰۔ فتح مکہ میں دس ہزار۔ غزوۂ حنین میں بارہ ہزار۔ حجۃ الوداع میں چالیس ہزار۔ غزوۂ تبوک میں ستر ہزار۔ وفات نبی کے وقت ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہؓ تھے۔

غضب

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿آل عمران:۱۳۴﴾ اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے اور اللہ ایسے نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔

بدلہ لینے کے لئے دل کے خون کا جوش مارنا غضب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بڑا پہلوان اور طاقت ور وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑے۔ بلکہ پہلوان اور قوی وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ ایک روایت میں ہے کہ قوی وہ ہے جو غصہ کا مالک ہو۔ یہ نہ ہو کہ غصہ کے منشا کے مطابق فوراً عمل کرے۔ غصہ آجائے تو اعوذ باللہ پڑھے پانی پیئے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، سب سے بہتر یہ ہے کہ ٹھنڈے پانی سے وضو کرلے۔

غیرت

حق تعالیٰ سے غافل کرنے والی چیز سے نفرت ہو جانا

غیب کا علم

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ علم غیب کی صفت تو اللہ ہی کیلئے خاص ہے، یعنی عالم الغیب بالذات ہونا، صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اس، میں کوئی شریک نہیں ہے، اب یہ اس کا اختیار ہے کہ اپنے اس علم میں سے جس کو جتنا چاہے عطا فرمادے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ نے اپنے حبیب کو سب سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے۔ قرآن شریف میں دونوں طرح کی آیتیں ہیں۔ کچھ غیر خدا کیلئے علم غیب کی نفی کرتے ہیں اور کچھ بشرط عطا ثابت بھی کرتی ہیں جیسے۔"فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ ﴿الجن:۲۶،۲۷﴾ یعنی اللہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا، بجز اس رسول کے جس سے وہ راضی ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جس کو پسند کرتا ہے اسکو علم غیب سے بہرور فرماتا ہے اور حضور ﷺ سے تو

اللہ نے کوئی بات بھی نہیں چھپائی ہے، چنانچہ صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں "میرا اعتقاد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے اس وقت تک رخصت نہیں ہوئے جب تک کہ اللہ کی ذات، صفات و دنیاو آخرت میں پیش آنے والے اہم معاملات سے آپ کو بذریعہ وحی باخبر نہ کر دیا ہو، رہا اشخاص و افراد کے جزوی شخصی حالات اور معاملات کا علم کہ زید کل کیا کام کریگا اور اس کا انجام کیا ہو گا، عمر یا بکر اپنے گھروں میں کیا کیا کام کر رہے ہیں یا کریں گے ان کا علم نہ کوئی کمال ہے اور نہ ان کے نہ ہونے سے کمال نبوت میں کوئی فرق آتا ہے (معارف القرآن، جلد ہشتم)

اس باب میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوئی ہیں، لیکن ہمارے پاس جو صحیح مسلک ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیب ذاتی ہے اور اللہ نے اپنے رسولوں کو اس وقت کے حالات کے تحت جس قدر علم ضروری معلوم ہوا، عطا کر دیا اور آنحضرت ﷺ کو چونکہ خاتم النبیین ہیں اس لئے ماکان اور مایکون یعنی جو ہوا اور جو ہونے والا ہے، وہ سب کچھ بتلا دیا، یعنی حضور کا علم عطائی ہے، اس پر تو شاید ہی کسی کو اعتراض ہو۔

حضور پاک ﷺ کو اللہ نے سب کچھ بتا دیا تھا اور کوئی چیز آپ سے مخفی نہیں تھی، جو لوگ اس مسئلہ میں متردد ہیں یا مخالف ہیں یا معترض ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ اصل میں انہوں نے حضور پاک ﷺ کے مقام کو ہی نہیں سمجھا۔ اگر حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے مقام کو سمجھتے تو شاید حضورؐ کے علم غیب کا انکار کرنے کی جرأت نہ کرتے، جب حضورؐ کو معراج نصیب ہوئی اور آپ دیدار خداوندی سے مشرف ہوگئے تو کیا چیز تھی جو آپ سے مخفی رہ گئی، معراج عطا کرنے والا بھی اللہ اور ہر چیز پر مطلع کرنے والا بھی اللہ، جب ذات کا دیدار ہو گیا تو کیا صفات ذات سے جدا تھے؟

حضورؐ تو خیر حضورؐ ہیں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے چاہنے والوں کو بھی وہ اعلیٰ مقام عطا فرمایا ہے کہ ان سے بھی کوئی چیز مخفی نہ رہی۔ ساری کائنات ان کی نظر میں رائی کا دانہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں

نظرت الیٰ بلاد اللہ جمیعا کخردلۃ علی حکم اتصال

یعنی ہم نے اللہ کے سارے شہروں کو اسطرح دیکھا جیسے رائی کے دانے ملے ہوئے ہیں۔ (جاء الحق وزھق الباطل، ص ۸۱) ہمارے پاس روایت آئی ہے کہ حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ کے آگے کائنات اس طرح تھی جیسے ہتھیلی میں رائی کا دانہ۔ جب حضورؐ کے اتباع کرنے والوں کا یہ مقام ہے تو سوچئے کہ حضور اقدسؐ کا کیا مقام ہو گا۔

یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضورؐ کو علم غیب نہ ہونے کی دلیلیں قرآنی آیات سے بھی ہیں اور احادیث سے بھی، چنانچہ ایک آیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے فرماتا ہے کہ قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّـهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ

﴿الأنعام: ۵۰﴾ ترجمہ: اے رسول، آپ کہدیجئے کہ، میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب جانتا ہوں۔ مفسرین نے چار طریقوں پر اس کی توجیہیں کی ہیں۔ اولا یہ کہ علم غیب ذاتی کی نفی ہے، دوم یہ کہ کل علم کی نفی ہے، سوم یہ کہ یہ کلام تواضع اور انکسار کے طور پر بیان کیا گیا ہے، چہارم یہ کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں دعویٰ نہیں کرتا کہ میں غیب جانتا ہوں یعنی دعویٰ علم غیب کی نفی ہے۔ نہ کہ علم غیب کی۔ اسی طرح حدیث جبرئیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو علم غیب نہیں تھا، چنانچہ روایت ہے، کہ جب جبرئیلؑ نے "اخبرني عن الساعة" یعنی مجھے قیامت کے بارے میں خبر دیجئے۔ تو آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جواب دیا "ما المسئول عنها باعلم من السائل" یعنی ہم اس بارے میں سائل سے زیادہ جاننے والے نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کو قیامت کا علم نہیں تھا۔ مگر یہ دلیل بھی ان کے دعویٰ کو ثابت نہیں کرتی۔ اس لئے کہ

(۱) حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نہیں جانتا، اگر یہ جواب ہوتا تو بات اور تھی۔

(۲) آپؐ نے جاننے کی نفی نہیں کی یعنی یہ نہیں فرمایا "لا اعلم" (میں نہیں جانتا) بلکہ زیادتی علم کی نفی فرمائی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اے جبرئیل، اس بارے میں میرا اور تمہارا علم برابر ہے۔ یعنی مجھ کو بھی علم ہے اور تم کو بھی، لیکن اس مجمع میں یہ راز ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔

(۳) یہ جواب سن کر حضرت جبرئیل نے فرمایا "فاخبرني عن اماراتها" پس آپؐ قیامت کی نشانیاں ہی بتادیجئے، اس پر حضورؐ نے چند نشانیاں بیان فرمائیں، کہ اولاد نافرمان ہوگی اور کمینے لوگ عزت پائیں گے، وغیرہ وغیرہ، قابل غور بات یہ ہے کہ جس کو قیامت کا بالکل علم نہ ہو اس سے نشانیاں پوچھنا کیا معنی؟ نشان اور پتہ تو جاننے والے سے ہی پوچھتے ہیں، پس اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو قیامت کے بارے میں پورے معلومات تھے لیکن ان کا اظہار منشاء خداوندی نہیں تھا تو آپؐ نے وقت کے تعلق سے قطعی جواب نہیں دیا، اس لئے کہ اللہ نے بھی وقت کے تعلق سے قطعی بات نہیں بتائی۔

غلط بیانی مورخین کی

(۱) تاریخ فرشتہ میں امام مہدیؑ کی دعوت کا سنہ ۹۶۰ھ مذکور ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں، جہاں جہاں اس تاریخ کا متن اور ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں یہی سنہ مذکور ہے۔ چنانچہ چند الفاظ کے اختلاف کے ساتھ صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ "واضح ہو کہ مہدویہ کا اعتقاد یہ ہے کہ ایک شخص حنفی مذہب سید محمد نام نے ہندوستان میں ۹۶۰ھ میں دعویٰ کیا کہ میں مہدی موعود بلسان شرع ہوں" حالانکہ مہدیؑ کی رحلت کا سال ۹۱۰ھ ہے۔ اس قسم کی غلط بیانی کیوں ہوئی، اس کے تین اسباب ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک تو یہ کہ فرشتہ نے سہواً غلطی کی ہو۔ (۲) دوسری یہ کہ نقل کرنے والوں نے ۹۱۰ھ کو ۹۶۰ھ کر دیا ہو۔ اور (۳) تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فرشتہ مہدیوں کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا اور زخمی بھی ہوا تھا، اس وجہ سے جان بوجھ کر اس نے غلط تاریخ لکھدی۔ تاکہ عوام گمراہ ہو جائیں۔ بعد والوں نے اسکی دوسری تاریخوں سے ملا کر تصحیح کئے بغیر اسکی اتباع کر لی۔

ہندوستان کے مورخین میں سب سے زیادہ شاہ نواز "صاحب مآثر الامراء" نے مہدویہ کے تعلق سے غلط بیانی سے کام لیا۔ دیکھو مآثر الامراء جلد اول، ص ۱۲۴۔۱۲۵۔ مولف نے اس میں کئی باتیں خلاف واقعہ بیان کی ہے۔

(ا) امامؑ نے ۹۶۰ھ میں مہدویت کا دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ آپ کی رحلت اس سے ۵۰ سال قبل ۹۱۰ھ میں ہوئی ہے۔

(ب) یہ لکھا ہے کہ امامؑ نے ہندوستان سے ایران کا سفر کیا تاکہ اس راستے سے حجاز جائیں، حالانکہ امامؑ ہندوستان سے حجاز گئے تھے۔ حجاز سے ہندوستان واپس آکر براہ سندھ، قندھار اور خراسان تشریف لیگئے ہیں۔

(ج) یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ سید محمد جونپوری نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، مہدی موعود ہونے کا نہیں۔ یہ بھی صریحاً غلط ہے۔ حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایتؓ نے جن کی شہادت ۹۳۰ھ میں ہوئی ہے، اپنے رسالہ عقیدہ شریفہ میں صاف لکھا ہے کہ "جب مخالفوں کی جانب سے حدیث یملاء الارض پیش کیگئی تو امامؑ نے فرمایا" ہمہ مومناں ایمان آوردہ اند و اطاعت کردند "یعنی سب مومن ایمان لائے اور اطاعت کی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ مخالفین مہدویہ بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ آپ مہدی موعودؑ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نیز عقلی دلیل یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں علماء کی جانب سے جو شدید مخالفت رونما ہوئی، بادشاہوں کو بھڑکایا گیا، ایذاء رسانی اور ظلم وجور کا بازار گرم کیا گیا وہ لغوی مہدی ہونے کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ انھوں نے یہ سمجھکر ہی مخالفت پر کمر باندھی تھی اور مہدیؑ کے باب میں آئی ہوئی حدیثوں کو پیش کیا تھا کہ یہ مہدی موعودؑ ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اب یہ کہنا کہ آپ نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مہدی موعود ہونے کا نہیں، حقیقت پر پردہ ڈالنے کی مذموم کوشش ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مہدی کے معنی ہدایت یافتہ کے ہیں۔تو کوئی بھی ہدایت یافتہ ہو سکتا ہے۔اس کیلئے رسول اللہ ﷺ کی ۳۰۰ سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے، اس پر ایمان لانے کی تاکید کرنے اور اسکے انکار کرنے والے پر کفر کا حکم صادر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جہاں جہاں "المہدی" فرمایا ہے اس سے مراد "مہدی موعود" ہے، اس لئے کہ المہدی میں جو "الف، لام" آیا ہے وہ "الف لام عہدی" ہے۔یعنی وہ مہدی جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

(د) مولف مآثر الامراء نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ عقائد مہدویہ، مذاہب اربعہ کے اصول و فروع کے مخالف ہیں۔جب کہ مہدویہ کا کوئی عقیدہ قرآن اور اتباع رسول اللہ ﷺ سے ہٹ کر نہیں ہے۔مہدی موعودؑ نے تو اپنے دعویٰ کا اثبات ہی دو باتوں پر رکھا ہے۔"مذہب ما کتاب اللہ و اتباع محمد رسول اللہ (ﷺ)" ۔اب رہے فرائض ولایت تو یہ کلام اللہ کی صریح آیتوں پر مبنی ہیں اور آنحضرتؐ نے خود ان پر عمل فرمایا ہے۔

(ھ) اس کتاب میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ صرف جہلاء نے آپ کو مہدی موعود مانا ہے۔

اس کا جواب آپ کو ان سلاطین اور امراء کی تصدیق سے مل جاتا ہے جو ہم نے اس باب میں لکھا ہے۔

بعد میں آنے والے نام نہاد مورخین نے فن تاریخ کے اصولوں سے ہٹ کر، اپنے منشا کے موافق جہاں سے جو کچھ رطب ویابس مواد مل گیا اسکو ہی اساس سمجھ کر غلط واقعات اور غلط سنین کے ساتھ اپنی اپنی تاریخیں مرتب کر لیں۔لیکن بحمد اللہ ایسے ناطر فدار اور غیر متعصب مورخین بھی ہیں، جنھوں نے اگرچہ مہدیؑ کے دعویٰ کی بھی تصدیق نہیں کی لیکن حقائق کو برابر پیش کرنے میں کوئی تساہل، غفلت اور بد دیانتی کا شکار نہیں ہوئے۔ان شاء اللہ اسکی تفصیل اس کے مقام پر آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

فقر

لفظ فقر تنگدستی، غربت اور مفلسی کے معنوں میں آتا ہے۔ یہی مفہوم قرآن میں متعدد مقامات پر ملتا ہے تاہم ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فقر کو اپنے لئے فخر قرار دیا ہے ظاہر ہے کہ فقر کے مذکورہ بالا معنی تو آپ کی اس حدیث میں لئے نہیں جاسکتے کہ اس معنی میں تحقیر پائی جاتی ہے۔

اسی لئے فقر کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) فقر اضطراری (۲) فقر اختیاری۔

فقر اختیاری قابل فخر ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا الفقر فخری۔ اور فقر اضطراری قابل مذمت۔ فقر اختیاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان تعیش، تکلف آسائش، آرام اور زیبائش کے تمام مواقع و ذرائع حاصل ہونے کے باوجود درویشانہ زندگی بسر کرے۔ ان تمام چیزوں کو فانی، ہیچ اور خدا سے غافل کرنے والی چیزیں سمجھے۔ ان کی طرف دھیان بھی نہ دے، دولت جمع کرنے پر ایثار کو ترجیح دے۔ اس کی مثال حضورؐ کی سیرت طیبہ ہے۔ آپ کی زندگی درویشی اور فقیری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگرچہ آپ کے ہاتھ میں خزانوں کی کنجیاں تھیں۔ بادشاہ عرب و عجم تھے لیکن گھاس پھونس کا ایک جھونپڑا۔ پیوندزدہ لباس، روکھا سوکھا کھانا آپ کا متاع تھا اگر اس کو متاع کہہ سکیں۔

لیکن اگر انسان پر سستی، بے کاری، بیروزگاری اور احدی پن کی وجہ سے زندگی تنگ ہو جائے۔ بھوک پیاس اور غربت و ناداری کی زندگی اس پر مسلط ہو جائے تو وہ زندگی اس پر عذاب کہلائے گی۔ اور اگر وہ از خود دنیا اور اس کی خواہشات، لوازمات اور اس کے طمطراق سے اپنے آپ کو دور رکھے تو وہ زندگی سراپا سکون و اطمینان والی ہوتی ہے۔

سرکار دو عالمؐ نے اپنی امت پر فقر و تنگدستی کا خدشہ ظاہر نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ دنیا تم پر پھیلا دی جائے گی۔ اور تم اس کی طرف راغب ہو جاؤ گے۔ جیسا کہ تم سے پہلے کے لوگ راغب ہو چکے تھے پس وہ تم کو اسی طرح ہلاک کر دے گی جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں کو اس نے ہلاک کر دیا تھا۔ پس یہ دنیا، اس کا متاع، اس کی زینت یہ چیزیں ہلاکت اور فتنہ کا باعث ہیں۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور صحابہ کرامؓ کو بھی فقر اختیار کرنے کی تلقین کی۔ حالت یہ تھی کہ ہفتوں چولھا ٹھنڈا رہا۔ صاحبزادی کے ہاتھوں کام کرنے کی وجہ سے گھٹے پڑ گئے مگر غلام عطا کرنے کے معاملے میں بدر کے یتیموں کو ترجیح دی۔ خود فاقے سے رہے مگر کوشش رہی کہ کوئی سائل دروازے سے خالی ہاتھ جانے نہ پائے۔ روزے سے رہے اور جب افطار کا وقت آیا کھانے کے لئے جو میسر تھا سامنے آیا۔ اتنے میں ایک سائل نے دروازے پر آواز لگائی۔ سائل کو دے دیا پھر دوسرے دن روزے سے رہے۔ دوسرے دن بھی یہی حال رہا اور تیسرے دن بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ یہ سب

فقر اختیاری کے نمونے ہیں۔ فقر دراصل غناء قلب کا نام ہے۔ فقیر دراصل دل کو دنیا کی محبت سے خالی اور بے نیاز رکھتا ہے۔

فقیر وہ ہے کہ خدا پر بھروسہ کرے اور جو کچھ خدا دے اس پر راضی ہو جائے۔

فقیر الی اللہ جب دنیا سے غنی بن کر فرش خاک پر بیٹھتا ہے تو وہ خود کو سدرہ نشین تصور کرتا ہے اس کی آنکھ سیر، اس کا ذہن مطمئن، اور اس کا دل غنی ہوتا ہے۔ شیخ ابو القاسم قشیری لکھتے ہیں شیخ ابو علی دقاق کے پاس ایک فقیر آیا جس نے ٹاٹ کا کرتہ اور ٹاٹ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ساتھیوں میں سے ایک نے تفریح طبع کے طور پر کہا کہ یہ ٹاٹ کتنے میں خریدا ہے فقیر نے جواب دیا۔ دنیا دے کر خریدا ہے اور بیچنے والے نے مجھ سے کہا اسے پھر میرے ہاتھ بیچ دو اور آخرت لے لو مگر میں نے نہیں بیچا۔ ایسے موقع پر ایک شاعر نے کیا اچھی بات کہی ہے:

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ یعنی قیمت اور بڑھا دو کہ وہ ابھی سستی ہے۔

دنیا اگر فقیر خدامست کے قدموں میں ہوتی ہے تو پیش نظر آخرت بھی نہیں ہوتی بلکہ اسے پس پشت رکھا جاتا ہے اس کی نگاہ تو مالک دنیا اور مالک یوم الدین پر ہوتی ہے۔ یہاں ایک نکتہ بھی قابل غور ہے۔ ایک حدیث اس سلسلے میں یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ الفقر سواد الوجه في الدارين۔ یعنی فقر دنیا و آخرت میں منھ کی سیاہی ہے۔ بعض نادان لوگ تو اس کو حدیث ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اس کی وجہ وہ اس کی عبارت اور اس کا ترجمہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کہنا ان کی غلط فہمی ہے۔ دراصل گڑبڑ سواد الوجه کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ حالانکہ سواد کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ سواد کے معنی بہت زیادہ سرسبزی اور شادابی کے آتے ہیں۔ جب کوئی چیز بہت زیادہ سرسبز ہو جاتی ہے تو وہ سیاہ ہی نظر آتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں سورۂ الرحمان میں فرماتا ہے وَمِن دُونِهِمَا جَنَّتَانِ – مُدْهَامَّتَانِ ﴿الرحمن:۶۲،۶۸﴾ ان دو جنتوں کے علاوہ اور بھی دو باغ ہیں جو بہت زیادہ سیاہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں بھی سواد الوجه سے مراد چہرے کی سیاہی نہیں ہے بلکہ چہرے کی سرسبزی اور شادابی ہے۔ پس الفقر سواد الوجه في الدارين کے معنی یہ ہوئے کہ فقر دارین میں چہرے کی شادابی ہے۔

مولانا عبد الرحمان جامی رحمتہ اللہ علیہ نے فقر کامل کی منزل یہ بتائی ہے:

آں را کہ فنا شیوہ و فقر آئین است نے کشف و یقیں، نہ معرفت نے دیں است

ترجمہ: جس شخص کا شیوہ فنا اور فقر آئین ہے، اسکو نہ کشف سے سروکار ہے، نہ یقین سے، نہ معرفت سے، نہ دین سے۔

رفت اوز میاں ہمیں خدا ماند خدا الفقر اذا تم ھو اللہ ایں است

(کیوں کہ) جب وہ درمیان سے اٹھ گیا تو صرف خدا ہی رہا، فقر جب کامل ہو گیا وہی اللہ ہے کا یہی معنیٰ ہے۔ (نوائح جامی۔ لائحہ ہشتم ص:۸)

حضرت امامنا مہدی موعود علیہ السلام نے بھی ساری زندگی المفتقر الی اللہ کی حالت میں ہی گذاری جس طرح آپ کے آقا اور متبوع حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گذاری تھی۔

آپ کا طریقہ کار بھی یہی تھا کہ جو بھی راہ خدا فتوح آتی تھی آپ اسی وقت اس کی علی السویہ تقسیم فرمادیتے تھے۔ کل کے لئے بھی کچھ اٹھا کر نہیں رکھتے تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخر شیئاً لغد (ترمذی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے کچھ بھی بچا کر نہ رکھتے تھے۔ آپ کے صحابہ کی تربیت بھی اسی انداز پر ہوئی تھی جس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ بھی اسی روش پر زندگی بسر کرتے تھے۔ کئی کئی دن کے فاقے لیکن کیا مجال کہ چہرے پر اضطرار کا کوئی حال۔ کشادہ چمکتی پیشانی اور روشن چہرہ اور دلوں میں اطمینان۔ علامہ شمسی صاحب نے اس فقر و فاقہ کا نقشہ اس انداز میں کھینچا ہے:

دن جو فاقے میں کٹا، رات خوشی میں گذری پیٹ بھر کھایا تو لوٹا کئے انگاروں پر

غرض کہ مہدی علیہ السلام نے دنیا کے سامنے اپنے عمل کے ذریعہ فقر و فاقہ کا وہی نقش پیش فرمایا جو آنحضرتؐ نے اپنی پوری زندگی میں پیش فرمایا تھا۔

فناء

فنا کے معنی اپنے باطن پر ہستی ظہور حق کے غلبہ کی وجہ سے اس کے سوا کسی کا شعور نہ رہے۔ اور فنائے فنا یہ ہے کہ اس بے شعوری کا بھی شعور نہ رہے۔ اس لئے کہ صاحب فنا کو اگر خود کی فنا کا شعور ہو گا تو وہ صاحب فنا نہ ہو گا۔ اس لئے کہ صفت اور موصوف حق تعالیٰ کے ماسویٰ ہوں گے۔ پس اس کا شعور فنا کے منافی ہو گا۔ (تصوف اسلام۔ ص:۱۵۵)

مقام فنا فی اللہ: ایک صوفی فانی فی اللہ نے فرمایا ایک مرتبہ میں اپنے اسماء وصفات کی طرف متوجہ ہوا تو ننانوے ناموں سے بھی زیادہ پائے اور کچھ اور توجہ کی تو چار ہزار سے زیادہ پائے، پھر اور تجسس کیا تو اپنے اسماء وصفات کی کوئی حد و شمار نہ پائی، جب اس مقام پر پہنچا تو اس حالت میں، میں اپنی ذات کو دیکھا کہ میں کائنات کو پیدا بھی کر رہا ہوں اور مار بھی رہا ہوں، ارباب ولایت پر ایسی حالتیں اکثر گزرتی رہتی ہیں

فیض

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا بزرگوں سے جو صاحبان فیض تھے فیض ملتا ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناصاحبان فیض بزرگوں سے جو لوگ فیضیاب ہیں ان سے طالبوں کو فیض ملتا ہے مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ آپ کو ان سے اعتقاد ہو۔اعتقاد اور یقین بہت بڑی دولت ہے۔اور اعتقاد پیدا ہوتا ہے اعتماد سے۔اگر آپ کے دامن دل میں اعتقاد اور اعتماد نہ ہو تو فیض حاصل نہیں کرسکتے۔فیض باادب کو ملتا ہے،جو بے ادب ہو اسے فیض حاصل نہیں ہوتا۔فیض خدمت سے حاصل ہوتا ہے بغیر خدمت کے حاصل نہیں ہوتا۔فیض "طلب" کیا جاتا ہے "غصب" نہیں کیا جاتا۔فیض "عطا" ہے اسے خطا کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔فیض "نوازش" ہے جو "طالب" کے حصے میں آتی ہے۔یہ "نمائش" نہیں ہے جسے سب دیکھتے رہیں۔

فیض نظر آنے والی چیز نہیں۔البتہ اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔فیض کی مثال برقی رو، Electricity سے دی جا سکتی ہے جسے دیکھا نہیں جاسکتا۔لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔آج جابجا برقی رو کے اثرات ہر جگہ اور ہر وقت دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔بلب اسی سے روشن ہوتا ہے۔فریج اسی سے کام کرتا ہے۔ہیٹر Heater اسی سے گرم ہوتا ہے۔پنکھا Fan اسی سے حرکت کرتا ہے۔ساری مشینری، تمام کارخانے اسی کی بدولت کام کرتے ہیں۔چولہا اسی سے گرم ہوتا ہے۔لیکن وہ برقی رو کسی کو نظر نہیں آتی اور خوبی یہ کہ اس کو چھو بھی نہیں سکتے۔اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے اسٹور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ان مثالوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ بجلی متضاد کام بھی کرتی ہے۔یعنی گرم بھی کرتی ہے اور ٹھنڈا بھی۔گرمی میں Fan کے ذریعہ ہوا پھینکتی ہے اور گرمی کو دور کرتی ہے۔ہیٹر کو چالو کردو تو سرما میں آپ کو گرم کردیتی ہے۔برف کو ہیٹر پر رکھو تو پانی بنادیتی ہے۔اور پانی کو فریج میں رکھو تو برف بنادیتی ہے۔

اسی طرح فیض بھی ٹھنڈے آدمی کو گرم یعنی چست و چالاک کردیتا ہے۔سرکش اور باغی کو نرم کردیتا ہے، گمراہ کو ہدایت عطا کرتا ہے فیض امی کو عالم، بزدل کو بہادر، بخیل کو سخی بنادیتا ہے۔معمولی آدمی کو صاحب کمال بنادیتا ہے، حضرت عمر فاروقؓ جیسی سخت گیر شخصیت، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی تو فدائی اور جان نثار ہستی بن گئی۔حضرت بندگی میاں عبدالملک سجاوندیؒ مشہور تابعی جو اپنے زمانے کے علامہ تھے، جب بندگی میاں شاہ دلاور رضی اللہ عنہ کے بیان کو سن کر حضرت کے مرید ہوگئے اور پس خوردہ پیا تو سارا ظاہری اور کتابی علم محو ہوگیا۔لیکن جب شیخ علی نے مہدویت کے خلاف رد مہدویت نامی کتاب لکھی، اور اس کا جواب دینے کا آپ نے ارادہ فرمایا تو آپ نے محسوس کیا کہ آپ کا سارا علم محو ہوچکا ہے۔پھر حضرت شاہ دلاور رضی اللہ عنہ نے آپ کو پسخوردہ عنایت فرمایا معاًنہ صرف کتابوں کی عبارتیں نظر کے سامنے آگئیں بلکہ ان

کتابوں کے مصنفین کی ارواح بھی آپ کے سامنے حاضر ہو گئیں تا کہ آپ کو مدد کر سکیں لیکن یہ نکتہ بھی نظر کے سامنے رہنا چاہئے کہ الیکٹریسٹی (بجلی) خود بخود آپ کے گھر میں نہیں آجاتی، بلکہ اس کا ایک سسٹم ہے۔ یعنی پہلے تو اس کا ایک خزانہ ہے Power house وہاں درخواست دینی پڑتی ہے۔ پھر اپنے گھر میں وائرنگ کرنی پڑتی ہے جس کا تعلق اس خزانے سے ہوتا ہے تب کہیں جا کر آپ کے گھر میں بجلی آتی ہے۔ اگر وائرنگ ڈھیلی ہو تو کبھی بجلی آتی ہے اور کبھی نہیں آتی۔ Zig Zag ہوتی رہتی ہے۔

گھر میں بجلی آئی ہے لیکن گھر نہیں جلتا۔ اس لئے کہ وہ ننگے تاروں کے ذریعہ نہیں آتی (Nacked wires) بلکہ گھر کے تاروں پر پلاسٹک کا خول چڑھا دیا جاتا ہے پس آپ ایسے وائروں کو پکڑ بھی سکتے ہیں (اگر وہ تار ننگے ہوتے تو آدمی اسی وقت ختم بھی ہو جاتا ہے) اسی لئے بزرگوں نے فیض کی تقسیم کے وقت فیض کو کسی چیز میں شامل و داخل کر کے دیا۔ تا کہ لینے والے اس کو آسانی کے ساتھ لے سکیں۔ (یعنی پسخوردہ، استعمال کا کپڑا، پگڑی، نان ریزہ وغیرہ کی شکل میں) پھر وہ ایلکٹریسٹی زیادہ ضرورت پر High tention کی ہوتی ہے جس میں کھینچ لینے کی طاقت زیادہ ہوتی ہے اور عام گھروں میں جو آتی ہے وہ کم طاقت کی ہوتی ہے جسے Domestic کہا جاتا ہے۔ اسی طرح فیض دینے والے، لینے والے کی طاقت اور استعداد (Capacity& Capability) دیکھ کر فیض دیتے ہیں۔ تا کہ بھک سے اڑ نہ جائے۔ پھر گھروں میں ایک چھوٹا سا تار بھی لگا دیتے ہیں جس کو فیوز کہا جاتا ہے۔ سارا نظام ٹھیک ہے لیکن فیوز نہ لگائیں تو روشنی نہیں ہوتی۔ مرشد گویا فیوز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہی فیوز ہے جس کا تعلق خزانہ سے ہوتا ہے اور گھر میں بجلی لاتا ہے۔

اسی طرح مرشد اپنے مرشدین سے جو روحانی خزانہ Power house سے تعلق رکھتے ہیں فیض اخذ کرتا ہے اور دوسروں کو دیتا ہے۔ گویا اس سسٹم میں ربط اور تعلق بڑی اہم چیز ہے اسی کو نسبت کہتے ہیں۔ بغیر نسبت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی Voltage (اولٹیج) بڑھ جائے تو گھر کے بلب، ٹی وی وغیرہ جل جاتے ہیں تو اس کے لئے Stabelizer آلہ لگاتے ہیں جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی والٹیج بڑھ جائے تو وہ اس کو روک کر حسب ضرورت ہی فراہم کرتا ہے تا کہ نقصان نہ ہو۔ مرشد بھی اس طرح کا کام کرتا ہے۔ حضرت میاں بھیکؒ کو جب حضرت مہدی علیہ السلام نے حضرت عیسیٰؑ کے مقام کی بشارت دی تو آپ نے ایک مردے کو زندہ کر دیا ہندو لوگ آپ کے پیچھے پڑ گئے اور آپ کو خدا کا اوتار سمجھ گئے۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے صوم وصال رکھ کر اس سلسلے کو بند کر دیا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے بعد اگر آپ کے گھر میں بلب روشن نہ ہو تو اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بلب کی بتی جھڑی

ہوئی ہوتی ہے۔ تو وہ بلب کیسے سلگ سکے گا۔ اسی طرح سمجھئے کہ تمام سسٹم ٹھیک ہے۔ لیکن دل کے بلب کی بتی جھڑی ہوئی ہے۔ یعنی اعتقاد اور اعتماد کی بتی درست نہیں ہے تو دل کا بلب کیسے روشن ہو گا۔ اگر دل کے اعتقاد کی بتی روشن ہو تو زیرو بلب بھی لگاؤ تو ہلکی اور مدھم روشنی مل جائے گی۔ لیکن اگر بتیاں جھڑی ہوئی ہوں تو ایک ہزار کینڈل کا بلب بھی لگاؤ گے تو وہ بے کار ہو گا۔

فراست

شرع کی پابندی، فکر صحیح اور ذکر اللہ کی پابندی کے سبب دل میں ایسی صفائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ واقعات کا صحیح ادراک کرنے لگ جاتی ہے یہ ایک وجدانی کیفیت ہے۔ بظاہر اس کا کوئی سبب نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا إتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله۔ یعنی مومن کی فراست سے ڈرو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ گویا فراست بھی کشف کا ایک شعبہ ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ ایک جوگی مسلمانوں کے بھیس میں اللہ کے ایک ولی کی مجلس میں آیا اور پوچھا کہ إتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله کے کیا معنی ہیں تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اسکو پکڑو۔ اور اس کے کپڑے دور کر و اور اسکے سر پر جو دستار ہے اسکو بھی نکال دو۔ جب آپ کے مریدین نے ایسا کیا تو اسکے کپڑوں کے نیچے زنار اور دستار کے نیچے جٹو (ہندوئوں کے بال) نکلے۔ آپ نے فرمایا اس حدیث کے معنی یہی ہیں۔ آدمی اپنی زبان سے اس کے خلاف کہتا اور ظاہر کرتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے۔ مومن اور اللہ کے ولی کی نظر اسکے دل میں جو چیز ہوتی ہے وہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اسکو پالیتی ہے۔ یہ کام بصارت کا نہیں بلکہ بصیرت کا ہوتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے ایک مرتبہ جب آپ نماز جمعہ کے لئے مسجد نبوی تشریف لائے تو آپ نے ایک شخص کو وضوء کرتے ہوئے دیکھا اور پھر جب خطبہ دینے کیلئے منبر پر چڑھے اور خطبہ شروع فرمایا تو آپ نے کہا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ ہمارے پاس ایسی حالت میں آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مسجد کو آتے وقت ان کی نظر بد ایک عورت پر پڑ گئی تھی) اہل اللہ کو سبحان اللہ اس کا بڑا وافر حصہ ملتا ہے۔

حضرت ابو حنیفہؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں کسی شخص کے وضوء کے پانی کے قطروں کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ اس نے ان اعضاء سے کیا گناہ کئے ہیں۔ لوگوں نے تفتیش حال کے لئے ایک شخص کو بند حمام میں وضو کرنے کیلئے کہا اس کا پانی نالی کے ذریعہ باہر آرہا تھا۔ آپ حمام کے باہر نالی کے پاس کھڑے ہوئے تھے جب اس نے کلی کی اور پانی باہر آیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ شخص اپنی ماں یا باپ سے جھگڑا کر کے آیا ہے جب وہ شخص وضو کر کے باہر آیا اور لوگوں نے پوچھا کہ تم مسجد آتے وقت گھر میں کیا کر رہے تھے تو اس نے کہا کہ کسی بات پر میرا میرے والدین سے جھگڑا ہوا تھا۔

یہ تو خیر عام اولیاء اللہ کی بات ہے حضرت مہدی موعودؑ نے کئی مرتبہ اجنبیوں کو جب وہ آپؑ کے پاس آئے تو آپ نے ان کو ان کے نام سے پکارا۔ چنانچہ آپ نے حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایتؓ کو جب آپ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مہدیؑ نے فرمایا "بیائید برادرم سید خوندمیر"۔ آیئے میرے بھائی سید خوندمیر۔

اسی طرح جب حضرت ملک بخن حضرت مہدیؑ کی خدمت اقدس میں تشریف لائے تو دور سے دیکھ کر ہی آپ نے فرمایا آیئے ملک برخوردار حضرت ملک بخن بہت پریشان ہوئے کیونکہ وہ لوگوں میں یہاں تک کہ حکومت کے دفاتر میں بھی ملک بخن کے نام سے مشہور تھے۔ لیکن حضرت مہدیؑ نے آپ کو آپ کے اصلی نام ملک برخودار کے نام سے پکارا تھا۔ آپ کی پیدائش کے بعد آپ کا اصل نام "ملک برخوردار" رکھا گیا تھا۔ لیکن بعد میں پیار سے گھر والوں نے آپ کو ملک بخن کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ بس کیا تھا یہی نام لوگوں میں مشہور ہو گیا۔ لیکن مہدی موعودؑ نے آپ کو آپ کے اصل نام سے پکارا جو کہ ملک برخوردار تھا۔ اور اس نام سے پٹن میں کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ بے شک مہدیؑ، اللہ کے خلیفے، امر اللہ اور مراد اللہ تھے آپ سے ایسا ہونا امر مستبعد نہیں ہے۔

فلاح

فلاح کے معنی کامیابی، سرخروئی، بھلائی، جیت کے ہیں، اور بامراد ہونے کے بھی ہیں۔

قرآن شریف میں اس کے مختلف صیغے آئے ہیں، مثلاً، أَفْلَحَ، يفلح، يفلحون، تفلحون، مُفْلِحُونَ۔ ان سب میں فلاح کا ہی مادہ ہے، جس کے معنی بیان ہوئے ہیں۔ کامیابی، سرخروئی اور بھلائی کس کو نصیب ہوتی ہے، اس کے تعلق سے اللہ نے موقع، محل اور اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے متعدد صفات کا ذکر فرمایا ہے، چنانچہ أَفْلَحَ یعنی کامیاب ہوا، کون؟ تو اللہ فرماتا ہے

(۱) قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ﴿الأعلیٰ:۱۴، ۱۵﴾ بے شک بھلا ہوا اس کا جس نے ظاہری، باطنی، حسّی اور معنوی نجاستوں سے پاک ہوا اور عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔

(۲) قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ﴿الشمس:۹، ۱۰﴾ مراد کو پہنچا وہ جس نے نفس کو اچھے اعمال سے سنوارا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو خاک میں ملا دیا۔

(۳) قَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلَىٰ ﴿طٰہٰ:۶۴﴾ وہ شخص جیت گیا جو غالب رہا۔

(۴) قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿المؤمنون:۱﴾ وہ مومن کامیاب ہو گئے، اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

(۱) الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ۔ جو اپنی نماز میں خشوع، سکون اور پستی و عاجزی کو اختیار کرتے ہیں۔

(۲) وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ۔ جو فضول اور بیکار باتوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں ان پر دھیان نہیں دیتے۔

(۳) وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ۔ جو زکوۃ دیا کرتے ہیں، زکوۃ دینے کے فرض پر برابر عمل کرتے ہیں۔

(۴) وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ۔ جو اپنی شرم گاہوں کی (حرام) سے حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور باندیوں کے، کہ ایسی صورت میں ان پر ملامت نہیں ہوگی، پس ان کے سوائے اگر کوئی اور کو ڈھونڈھے تو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

(۵) وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا پاس و لحاظ کرتے ہیں۔

(۶) وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کو اوقات اور شروط کی رعایت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ آیتوں سے معلوم ہو گیا کہ فلاح کن لوگوں کو ملتی ہے۔

اسی طرح الْمُفْلِحُونَ کے اوصاف بھی قرآن شریف میں بیان فرمائے ہیں، الْمُفْلِحُونَ کا لفظ قرآن میں ۱۲ مقامات پر آیا ہے۔

(۱) وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿البقرۃ:۵﴾ اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں، اس سے پہلے اللہ نے قرآن کے تعلق سے فرمایا ہے کہ قرآن ہدایت کرنے والا ہے، ان لوگوں کو جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور ان کو جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور ہم نے انکو جو روزی دی ہے اس میں سے (اللہ) خرچ کرتے ہیں اور وحی پر ایمان لاتے ہیں خواہ وہ آپؐ کے پہلے پیغمبروں پر آئے ہو یا جو آپؐ پر نازل ہو رہی ہو اور جو آخرت کو یقینی جانتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی جانب سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں، یعنی اعتقاد صحیح اور عمل صالح جس کے پاس ہے وہ کامیاب ہیں اور مراد کو پانے والے ہیں۔

(۲) وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿آل عمران:۱۰۴﴾ اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو خیر کی دعوت دے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برائیوں سے منع کرے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے فلاح پانے والوں کے تین اوصاف بتائے ہیں (۱) دعوت الی الخیر (۲) نیک کاموں کا حکم (۳) برائی سے منع کرنا۔

(۳) وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿الأعراف:۸﴾ اور اس دن اعمال کا تولنا برحق ہے پس جن لوگوں کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(۴) فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿الأعراف:۱۵۷﴾ پس جو لوگ (نبی محترم محمد رسول اللہ ﷺ) پر ایمان لائے اور ان کی حمایت کی اور ان کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(۴) لَـكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ وَأُولَـئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿التوبۃ:۸۸﴾ لیکن (اللہ کے) رسول اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ایمان لائے وہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ (راہ خدا میں) لڑے اور ان ہی لوگوں کیلئے بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے مُفْلِحُونَ ان لوگوں کو کہا ہے جو اللہ کے رسول کے ساتھ اللہ کے دین کو قائم کرنے اور اسے باقی رکھنے کے سلسلے میں نہ اپنی جانوں کی پرواکی اور نہ اپنے مالوں کو خرچ کرنے سے دریغ کیا۔

(٦)فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَـــئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿المؤمنون:١٠٢﴾ پس جن کے (نیک اعمال کے) پلڑے بھاری ہو گئے وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(٧) إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿النور:٥١﴾ اس آیت میں مفلحون کی یہ خصوصیت بتائی جارہی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ، جو ان کے کسی بھی معاملہ میں ہو، سن کر کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کا فیصلہ سن لیا اور ہم اس فیصلہ پر عمل کریں گے۔

(٨) فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّـــهِ وَأُولَـــئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿الروم:٣٨﴾ پس، دو تم قرابت داروں کو ان کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو، یہ ان کے حق میں بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں فلاح پانے والوں کے یہ اوصاف بیان کئے جارہے ہیں کہ جو لوگ اس حقیقت کو جان کر کہ رزق دینا اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ایک مقدار سے دیتا ہے اور سب نعمتوں کا مالک اللہ ہی ہے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے اللہ ہی کی خوشنودی اور اس کے لقاء اور دیدار کے حصول کی غرض سے قرابت داروں، محتاجوں اور مسافروں کی مدد کرتے ہیں تو ان کو دنیا اور آخرت میں بھلائی نصیب ہو گی اور وہی لوگ اللہ کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔

(٩)الم تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُون أُولَـــئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَـــئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُون ﴿لقمان:٥﴾ الٓمٓ۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں، ہدایت اور رحمت ہے ان نیکو کاروں کیلئے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور یہی لوگ اپنے رب کی جانب سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(١٠) لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّـــهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّـــهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَـئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن

تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَـٰئِكَ حِزْبُ اللَّـهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّـهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿المجادلۃ:۲۲﴾ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسوں سے دوستی کر رہے ہیں جو اللہ اور اسکے رسول کے مخالف ہیں اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان کے ہی لوگ ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور ان کی تائید اپنی ذات سے یا جبرئیلؑ سے فرمائی ہے اور وہ ان کو ایسی بہشتوں میں داخل کریگا جن کے نیچے سے نہریں جاری رہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے، یہی لوگ اللہ کی جماعت ہیں، آگاہ ہو جاؤ اللہ کا گروہ مراد کو پہنچے گا۔

(۱۱) وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿الحشر:۹﴾ اور جو لوگ پہلے ہی سے مدینہ منورہ کو اور یمان کو پکڑے ہوئے ہیں (انصار) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کو جو مال ملتا ہے اس کے سبب یہ اپنے دلوں میں تنگی نہیں پاتے اور ان کو اپنی جان سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان پر فقر و فاقہ ہی کیوں نہ ہو اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(۱۲) إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّـهُ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ فَاتَّقُوا اللَّـهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿التغابن:۱۵،۱۶﴾ بے شک تمہارا مال اور تمہاری اولاد آزمائش کا سبب ہیں اور اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے، پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو اور سنو اور مانو، اور خرچ کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے بچا لیا گیا پس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں

(۱۳) فَأَمَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ﴿القصص:۶۷﴾ پس جس نے توبہ کی، ایمان لایا اور عمل صالح کیا تو قریب ہے کہ وہ فلاح و نجات پانے والوں میں سے ہو گا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کی توبہ، ایمان اور نیک عمل، نجات اور فلاح کے بنیادی ستونوں میں سے ہیں۔

فتنہ

فتنہ عربی لفظ ہے اس کے معنی ہیں آزمائش، گمراہی، کفر، رسوائی، شرک، رنج، دیوانگی، عبرت، عذاب مرض، مال واولاد، اختلاف آراء، اور وقوع جنگ وجدال، آفت (مصباح اللغات)

قرآن شریف میں یہ لفظ تیس مقامات پر آیا ہے۔ جیسے إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴿التغابن:١٥﴾ بے شک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش ہے فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿نور:٦٣﴾ اللہ کے رسول کی حکم کی مخالفت کرنے والوں کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ ان پر کوئی آفت آجائے یا کوئی دردناک عذب ملے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، المائدہ، انفال، توبہ، یونس، الاسراء، الحج، النور، الفرقان، العنکبوت، الاحزاب، الصٰفٰت، الزمر، القمر، الممتحنہ، التغابن، المدثر، میں فتنہ کا لفظ آیا ہے۔

قرآن شریف میں فتنہ کو قتل سے زیادہ مذموم قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں اس کا اظہار دو مقامات پر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ اللہ فرماتا ہے وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴿البقرہ:١٩١﴾ فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ﴿البقرہ:٢١٧﴾ فتنہ قتل سے بھی بڑا (گناہ) ہے۔ فتنہ کو قتل سے بھی زیادہ مذموم اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ (١) قتل میں ایک آدمی کی جان جاتی ہے لیکن فتنہ کی لپیٹ میں قبائل، خاندان، اور قومیں آجاتی ہیں۔ (٢) قتل ایک آنی (وقتی) جرم ہے، لیکن فتنہ کی عمر دراز ہوتی ہے۔ (٣) قتل ایک فوری جذبہ (غصہ) کے تحت کیا جاتا ہے لیکن فتنہ کئی شر پسندوں کی سوچ بچار اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (٤) قتل کے بعد قاتل شرمسار اور نادم بھی ہوجاتا ہے اور اپنے کئے پر پریشان اور پشیمان ہوتا ہے، لیکن فتنہ باز خوش ہوتے ہیں اور اپنے کئے پر شاداں وفرحاں ہوتے ہیں۔ (٥) قتل شخصی گناہ ہے لیکن فتنہ اجتماعی جرم ہے۔ (٦) قاتل نظروں کے سامنے رہتا ہے لیکن فتنہ باز پردوں کے پیچھے رہ کر اپنا کام کرتے ہیں۔

اسی لئے اللہ نے فرمایا وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ﴿البقرہ:١٩٣﴾ اور مشرکوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہء شرک باقی نہ رہے اور دین اللہ کیلئے ہوجائے۔

یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے اور مشرکوں سے ہی لڑنے حکم دیا جارہا ہے، لیکن کب؟؟ صرف اسی صورت میں جبکہ وہ تم سے لڑیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ "فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ" ﴿البقرہ:١٩١﴾ یعنی اگر وہ تم سے لڑیں تو پھر تم بھی ان کو قتل کرو، یہ نہیں کہ خواہ مخواہ، کھڑے کھڑے کوئی مشرک نظر آجائے تو تم اسے قتل کردو۔ پھر اس کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ اگر وہ تم سے لڑنے سے باز آجائیں تو ظالموں کے علاوہ دوسروں پر زیادتی جائز نہیں ہے، خلاصہ یہ کہ نہ تمہاری جانب سے ابتداء ہو

اور نہ ان کے باز آنے کے بعد بھی تم اپنی جنگی کارروائی جاری رکھو۔ قرآن میں آیا ہے ''المال و النبون فتنة''یعنی مال اور اولاد فتنہ ہے۔اور حدیث میں آیا ہےالْمَالُ وَالْبَنُونَ الْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ ؟اس کا کیا جواب ہے۔

(الجواب) دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں۔فرق صرف محبت اور استعمال کی وجہ سے ہے۔جب مال اچھے طریقے سے نہ کمایا جائے اور مال کو بے دریغ ناحق امور میں خرچ کریں تو مال یقینا فتنہ بن جاتا ہے۔اسی طرح اگر اولاد کی محبت میں آدمی اندھا ہو جائے۔اس کی ہر ناجائز خواہش پوری کرتا جائے اور سب سے بڑھ کر اس کی صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام نہ ہو تو وہ اولاد بھی آدمی کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔لیکن جو مال صحیح طریقے سے کمایا جائے اس میں اللہ کا اور بندوں کا حق تقسیم کیا جائے اور فضول خرچی سے بچا جائے۔اور علم کے حصول کے لئے یا علم حاصل کرنے والوں پر خرچ کیا جائے۔اس مال سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے کام کئے جائیں تو وہ مال باقیات صالحات کہلاتا ہے۔اس کی مثال کشتی اور دریا کی ہے۔جب پانی باہر ہو کشتی میں داخل نہ ہو تو وہ سلامتی کا باعث ہے۔لیکن وہی پانی جب کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو موجب ہلاکت ہے۔اسی طرح اگر مال اور اولاد کی محبت دل کی کشتی (جس میں خدا اور رسولؐ کی محبت ہوتی ہے) سے باہر ہو تو وہ باقیات صالحات میں شمار ہو گی اور اگر مال اور اولاد کی محبت دل کی کشتی کے اندر جائے یعنی خدا اور رسولؐ کی محبت پر غالب آجائے تو مال اور اولاد فتنہ بن جاتے ہیں۔

فطرت

اللہ کا ارشاد ہے: فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّـهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّـهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ﴿روم:۳۰﴾ دین حنیف کی طرف رخ کرو، قانون فطرت کی طرف متوجہ ہو، اس پاک فطرت کی طرف جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے، اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: فطرهم الله على التوحيد یعنی اللہ نے اپنی فطرت پر یعنی توحید پر پیدا کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خدا پرستی کی فطرت پر پیدا فرمایا ہے۔ اس لئے خدا کی فطرت ہی توحید ہے۔

اسی مطلب کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں اسطرح بیان فرمایا ہے: كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه وينصّرانه ويمجّسانه۔ ہر نو مولود فطرت (خدا پرستی) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسکو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے توحید کی دعوت فطری طریقے سے دی ہے وچنانچہ ارشاد ربانی ہے: فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّـهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ﴿عنکبوت،۶۵﴾ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہو جاتے ہیں تو خلوص دل سے خدا کو پکارتے ہیں۔

بعض بزرگوں کی روایات میں بھی اس کا وجود ملتا ہے مثلاً ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ اسے خدا کی معرفت کرائیں، تو امامؑ نے پوچھا، کیا کبھی کشتی پر سوار ہوئے ہو؟؟ اس نے کہا ہاں۔ پھر آپؑ نے پوچھا کیا تمہیں ایسا اتفاق بھی پیش آیا کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور نجات کا کوئی ذریعہ نہ ہو؟ اس نے کہا، ہاں۔ پھر آپ نے پوچھا نجات سے ناامیدی کے آخری لمحات میں تمہاری امید کسی ایسے وجود کی طرف تھی جو تمہیں اس خطرہ سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس نے کہا، ہاں۔ آپ نے فرمایا وہی وجود خدا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا شناسی کی فطرت خدا کی بنائی ہوئی ہے، بندوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور اس بات میں بھی کوئی وزن نہیں ہے کہ خدا کی معرفت تقلیدی ہے یعنی انسان معاشرہ یا خاندان کے ماحول کی تقلید و پیروی کے ذریعہ خدا کو تسلیم کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی معرفت فطری طور پر ہر شخص کے باطن میں موجود ہے۔ آیات الٰہیہ پر غور و فکر کرنے سے یا عقل صحیح سے مدد لینے سے یا نیک اور صالحین کی صحبت میں رہنے سے یہ اجمالی فطری معرفت، ایمان اور تفصیلی

معرفت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ آدمی پر جب کوئی مصیبت آتی ہے یا کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو وہ اسے دور کرنے کے سہارے ڈھونڈھتا ہے، ان سے امداد کا طالب ہوتا ہے لیکن جب امداد نہیں ملتی یا امداد کے باوجود وہ پریشانی دور نہیں ہوتی، وہ مصیبت ٹلنے کا نام نہیں لیتی یا ایسا وقت آجاتا ہے کہ کہیں سے کوئی امید کی کرن بھی نظر نہیں آتی تو اس وقت اسکی نظریں آسمان کی طرف خود بخود اٹھ جاتی ہیں اور بے ساختہ وہ خدا کو گریہ وزاری کے ساتھ پکارنے لگتا ہے اور بے ساختہ کہتا ہے۔اے خدا اب تو ہی ہے جو مجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے، اسی کو فطری طلب اور خدا جوئی کہا جاتا ہے اور یہ چیز ہر شخص میں موجود ہے۔لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض دنیاوی سہارے، شروع میں آڑے آجاتے ہیں اور انسان اپنے خدا سے غافل ہوجاتا ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کو اللہ نے قرآن میں اسطرح بیان کیا ہے: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّـهِ فَيَقُولُ أَأَنتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَـٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنبَغِي لَنَا أَن نَّتَّخِذَ مِن دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَـٰكِن مَّتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ﴿فرقان:۱۷،۱۸﴾ جس دن اللہ ان کو اور جن کو یہ کافر اللہ کے سوا پوجتے تھے ان سب کو جمع کریگا اور فرمائیگا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود گمراہ ہوگئے تھے، وہ کہیں گے تو پاک ہے ہماری کیا مجال کہ تیرے سوا اوروں کو ہم کارساز بناتے، لیکن تونے ہی ان کو اور ان کے باپ دادوں کو خوب نعمتیں دیں، یہاں تک کہ وہ تیری یاد کو ہی بھلا بیٹھے اور یہ لوگ ہلاک ہوگئے۔

مطلب یہ کہ یہ لوگ اصل میں اور فطرتاً گمراہ نہیں تھے لیکن جب تونے ہی ان کو بے فکر زندگی دی، دنیاوی انعامات سے نوازا تو اس پر وہ اترانے لگے اور نہ حق کو سنا اور نہ حق کو دیکھا، اور اپنی من موجی زندگی میں انہوں نے تجھکو بھلا دیا اور اس دنیاوی سامان کو ہی سب کچھ اور اپنی کمائی سمجھ بیٹھے اور گمراہی کا راستہ خود انہوں نے اختیار کرلیا اور آخرکار ہلاک ہوگئے۔

آدمی بیمار ہوتا ہے، ڈاکٹر کے پاس رجوع ہوتا ہے، ڈاکٹروں کو دواؤں پر بھروسہ ہوتا ہے، لیکن جب مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی تو ڈاکٹر جواب دے دیتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ ہم سے جو ہو سکتا تھا ہم نے کرلیا۔اب صرف ''اوپر والا'' ہی بچا سکتا ہے۔تو ایک ماہر ڈاکٹر کا جواب اصل میں اس کی فطرت کا جواب تھا جو اسے خدا کی طرف راغب کر رہا تھا ورنہ جب تک سامان رہتا ہے آدمی ایمان کی طرف سے غفلت برتتا ہے اور فطرت کی آواز پر دھیان نہیں دیتا، لیکن جب سامان بے کار ہوجاتا ہے اور موت قریب آجاتی ہے تو ایک ملحد کا دھیان بھی خدا کی طرف ہوجاتا ہے۔اور اسکی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلتے ہیں۔اے اللہ اب تو ہی ہے تیرے سوا کوئی نہیں۔

ایک ملحد کا واقعہ ہے کہ وہ ساری زندگی خدا کا سختی کے ساتھ انکار کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے اپنے کمرے کے باہری حصے

میں ایک بورڈ آویزاں کرر کھاتھا، جس پر لکھاتھا "GOD IS NO WHERE" خدا کہیں بھی نہیں ہے۔اس کا ایک دوست اس کے آخری وقت پر اس سے ملنے گیااس کے ساتھ اس کی بیوی اور ایک لڑکا تھا۔ماںباپ تو کمرے میں بیمار کے پاس تھے،بچہ باہر کھیل رہاتھا،اچانک بچہ کی نظر اس بورڈ پر پڑی اور بچے کی زبان سے یہ نکلا "GOD IS NOW HERE" ہوا یہ تھا کہ بچے "NO WHERE" کو "NOW HERE" پڑھا تھا۔یہ الفاظ سنتے ہی مریض ملحد چونکا اور کہا بالکل صحیح ہے،اب صرف خدا ہی ہے اور وہ یہاں ہے اسطرح وہ مومن ہو گیا۔

خلاصہ یہ کہ خدا پرستی انسان کی فطرت میں داخل ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی،ہاں ماںباپ کی غلط تربیت،غلط ماحول،بری صحبت جیسے خارجی اور بیرونی عناصر فطرت کے تقاضوں کو دبانے کی کوشش کر لیتے ہیں،اس میں بھی یہ ہوتا ہے کہ اس فطرت کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے،مثلاً کہیں گھنٹی بجائی جاتی ہے، کہیں اذان کہی جاتی ہے، کہیں سے ناقوس کی آواز آتی ہے وغیرہ وغیرہ۔مگر یہ سب اس ایک ہستی کو پکارنے اور اسے یاد کرنے کے طریقے ہیں۔چناچہ صوفیاء کہتے ہیں۔

ملت عشق از ہمہ ملت جدا است۔یعنی عشق کی ملت تمام ملّتوں سے جدا ہے۔

عاشقاں را مذہب وملت خدا است۔یعنی عاشقوں کا مذہب اور ان کی ملّت خدا ہے۔

آخری وقت تو سب کو خالق ومالک کی ہی یاد آتی ہے اور سب اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،اس لئے کہ فطرت پر کوئی چیز غالب نہیں ہوتی۔چناچہ لندن میں ”بکھنگم پیالس“ میں ایک مرتبہ وہاں کے وزیر اعظم مسٹر چرچل، بادشاہ سے ملنے کیلئے محل کو گئے۔چائے آئی محل میں ٹیبل کے پاس ہی ایک بلی خاموش تماشائی کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔بادشاہ نے کہا کہ ”یہ ہے صحبت کا اثر اور تربیت کا کرشمہ“ چرچل یہ سن کر خاموش ہوگئے۔دوسری مرتبہ جب چرچل پھر بادشاہ کے پاس گئے، وہی ماحول رہا، وہی چائے نوشی، وہی بلی کی آمد اور وہی خاموشی۔اچانک چرچل نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی چوہیا نکالی اور چھوڑ دی۔بلی کی نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کو اس نے پکڑ لیا۔چرچل نے کہا”یہ ہے فطرت کا اعجاز“۔

مختصر یہ کہ انسانی فطرت میں توحید کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، چنانچہ قرآن شریف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ جب اللہ نے تمام ارواح کو جمع کر کے ان سے پوچھا”أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ“﴿الأعراف:۱۷۲﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، تو سب نے کہاہاں کیوں نہیں“۔

انسانی فطرت اچھائی اور خیر کو پسند کرتی ہے، برائی، بدی اور شر کو ناپسند کرتی ہے، انسانی فطرت ترقی اور عروج کی طالب ہے اور وہ ہر لحظہ آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ایک ہی دائرہ میں ایک ہی جگہ ٹکے رہنا، انسان کی فطرت میں داخل نہیں ہے، نیز انسانی فطرت میں شرم وحیا کا مادہ بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

فطرہ

فَطَرَ کے معنی کھلنے کے ہیں اور افطار کے معنی کھولنے کے ہیں، رمضان کے مہینے میں روزانہ تو شام میں افطار کر لیتے ہیں اور جب پورا مہینہ گذر جاتا ہے تو روزہ دار مہینے بھر کے روزوں کا افطار، عید کی نماز کو جانے سے پہلے ۳ چھوارے کھا کر فطرہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس یہی طریقہ رائج ہے۔

فطرہ کی ادائی کے سلسلہ میں آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کئی ایک احادیث آئی ہیں۔

(۱) **عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال فرض رسول اللہ ﷺ زکوٰۃ الفطر صاعا من تمر و صاعا من شعیر علی العبد و الحرّ و الذکر و الانثیٰ و الصغیر و الکبیر من المسلمین، و امر بھا ان تودّی قبل خروج الناس الی الصلوٰۃ** (مشکوٰۃ) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے واجب ٹھہرایا صدقۂ فطر کو غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے ہر مسلمان پر ایک صاع کھجور یا جو اور حکم فرمایا کہ نماز عید کیلئے نکلنے سے پہلے اس کو ادا کیا جائے۔

(۲) **عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال في آخر رمضان أَخْرِجُوا صَدَقَةَ صَوْمِكُمْ فرض رسول اللہ ﷺ ھذہ الصدقۃ صاعاً من تمر او شعیر او نصف صاع من قمح علی کل حرّ او مملوك ذکرا و انثیٰ، صغیر او کبیر** (ابو داؤد، نسائی) حضرت ابن عباسؓ نے رمضان کے آخر میں لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے روزوں کا صدقہ ادا کرو، کیونکہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کو ہر مسلمان پر مقرر فرمایا ہے، خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا، ہر ایک کی طرف سے ایک صاع کھجور یا جو یا نصف صاع گیہوں۔

ایک صاع مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقدار ایک چھوٹے کنبے کے یک دن کے گذارے کیلئے کافی ہے۔

یوم الفطر میں صدقہ فطر ادا کرنے سے روزہ داروں کی تطہیر اور روزوں کی تکمیل مقصود ہے، یعنی روزوں میں جو بے ہودہ باتیں اور برا کلام صادر ہو جاتا ہے اس کا گناہ، صدقہ سے دھل جاتا ہے۔ اسکی نظیر نمازوں میں سنن موکدہ ہیں۔ ان سے بھی نماز کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا "**ھن متممات**" یا "**ھن مکملات**" فرمایا یعنی نمازوں کے بعد کی سنتیں فرض نمازوں کی تکمیل اور تتمیم کرنے والی ہیں۔

اگر کسی نے عذر شرعی کی وجہ سے روزے نہیں رکھے تو اس کو بھی فطرہ ادا کرنا ضروری ہے۔

باپ کو چاہئے کہ اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے فطرہ ادا کرے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بچہ رمضان شریف کی آخری رات میں جسکے بعد عید ہونے والی ہے پیدا ہو تو اس کی طرف سے بھی فطرہ ادا کیا جائے۔

فوز

فوز کے معنی کامیابی کے ہیں۔ قرآن شریف میں فوز عظیم، فوز مبین یعنی بڑی کامیابی اور کھلی کامیابی (۱۹) مرتبہ آیا ہے فوزاً ۳ جگہ آیا ہے اور الفائزون چار جگہ آیا ہے۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا ہے۔

(۱) تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿نساء:۱۳﴾ ترجمہ: یہ اللہ کے حدود (احکام) ہیں اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسکو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

یعنی اس دنیا میں اللہ اور اسکے رسول کی ایسی اطاعت کہ اللہ جس سے خوش ہو جائے اور آخرت میں اسکو اچھا بدلہ دے۔ بڑی کامیابی ہے۔

(۲) قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿المائدہ:۱۱۹﴾ ترجمہ: اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ سچے لوگوں کو ان کی سچائی مدد دے گی ان کیلئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں یہ بڑی کامیابی ہے۔

(۳) وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿توبہ:۷۲﴾ ترجمہ: اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے بہشتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نفیس مکانات (کا بھی) جو ہمیشہ کے باغوں میں ہوں گے (وعدہ کیا ہے) اور اللہ کی رضامندی بڑی چیز ہے یہی بڑی کامیابی ہے۔

(۴) قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ مَّن يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿انعام:۱۵،۱۶﴾ ترجمہ: آپ کہہ دیجئے اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے اس روز جس شخص سے عذاب ٹال دیا گیا تو یہ سمجھو کہ اس پر اللہ نے رحم کیا اور یہ کھلی کامیابی ہے۔

یہ آیت تو دل کو دہلا دینے والی آیت ہے جس میں رسول اللہ کی زبان مبارک سے یہ کہلوایا جارہا ہے کہ اے پیغمبر آپ کہدیجئے کہ "اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں گا تو مجھے بھی بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ جب آنحضرت کا یہ حال ہے جو

معصوم عن الخطاہیں اور شفیع المذنبین ہیں تو ہم اگر اللہ کی نافرمانی کریں گے تو ہمارا کیا حال ہو گا؟ اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس دن کے عذاب عظیم سے بچنا ہی کامیابی ہے۔

(۵) وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّـهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿توبہ:۱۰۰﴾ ترجمہ: مہاجرین اور انصار سے جو پہلے ایمان لائے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے ان کی بہتر طریقے سے اتباع کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے، اللہ نے ان کیلئے ایسی بہشتیں تیار کر رکھی ہیں، جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے

(۶) الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّـهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿یونس:۶۴﴾ ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے ان کیلئے دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتیں بدلتی نہیں اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

(۷) قَالَ تَاللَّـهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ إِنَّ هَـٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿الصافات:۵۶ تا ۶۰﴾ وہ کہے گا خدا کی قسم تو نے تو مجھے ہلاک ہی کر دیا تھا اگر میرے رب کی مہربانی نہ ہوتی تو میں بھی ان لوگوں میں ہوتا جو عذاب کیلئے حاضر کئے گئے ہیں۔ کیا (یہ سچ نہیں) کہ اب کو مرنا نہیں ہے۔ بجز پہلی بار مرنے کے اور ہمیں عذاب بھی نہیں ہونے کا ہے۔ بے شک یہ بڑی کامیابی ہے۔

اسکی تفصیل یہ ہے کہ ایک محفل نشاط میں سب دوست احباب جمع ہوں گے شراب و کباب کا دور چلتا ہو گا اور آپس میں ادھر اُدھر کی باتیں بلکہ پرانے زمانے کی باتیں بھی ہو رہی ہوں گی۔ ایسے میں ایک شخص کہے گا کہ میرا ایک دوست تھا جو آخرت پر میرے یقین کر لینے پر مجھے ملامت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کیا تو بھی احمق ہو گیا ہے کیا مرنے کے بعد جب گل سڑ جائیں گے، ہڈیاں تک بوسیدہ ہو جائیں گی تو کیا پھر دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور ہم نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ لیا جائے گا آؤ ذرا جھانک کر دیکھیں کہ اس کا کیا حال ہے پھر وہ جھانک کر دیکھے گا کہ وہ دوزخ کے بیچ پڑا ہوا ہے تو جنّتی ساتھی اس سے کہے گا کہ تو نے تو مجھے ہلاک ہی کر دیا تھا۔ یہ اللہ کا فضل ہوا کہ میں بچ گیا ورنہ میں بھی آج تیری طرح پکڑے ہوؤں میں آتا اور عذاب کا مزہ چکھتا ہوتا۔ وہ اس وقت خوشی کے مارے کہے گا کہ اب پھر موت ہم کو آنے والی نہیں ہے یعنی پہلی مرتبہ جو موت آچکی اسکے سوا اب موت نہیں ہے اب ہم اس عیش والی زندگی سے پھر نکلنے والے نہیں ہیں اور ہم پر اب کوئی عذاب بھی آنے والا نہیں ہے۔ پھر تو

سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔ اور جب بات ایسی ہے تو اس کیلئے دنیا میں ایمان کی حالت میں اعمال صالحہ کے ساتھ ہر قسم کی محنت اور قربانی گوارا کر لینی چاہیئے۔

(۸) وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ وَمَن تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿المومن:۹﴾ ترجمہ: اور ان کو برائیوں سے بچالے اور تو نے اس روز جس کو برائیوں سے بچالیا تو تو نے اس پر مہربانی کی اور یہی بڑی کامیابی ہے

اس کی تفصیل کیلئے اس سے اوپر کی دو آیتوں کو دیکھنا پڑے گا۔ عرش الٰہی کو اُٹھانے والے اور اس کے اطراف چکر لگانے والے بے شمار فرشتے جہاں اللہ کی تعریف تحمید و تسبیح میں لگے رہتے ہیں وہیں ایمان والوں کیلئے اللہ سے بخشش مانگتے ہیں سبحان اللہ کیا عظیم الشان آیت ہے اور توبہ کرنے والے ایمان والوں کی کس قدر عزت افزائی ہے کہ خاک پر رہنے والوں کیلئے استغفار وہ مخلوق کر رہی ہے جو عالم بالا میں ہی نہیں بلکہ عرش اعظم کے قریب ہے دعا بھی کس شان کی ہے اے پرورد گار تیرا علم سبکو محیط ہے تو جانتا ہے کہ کس کس نے کیا کیا اور تو ان کی فطرت اور ان کے ماحول سے بھی واقف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تیری رحمت کے بھی تقاضے ہیں پس آج تو ان تمام لوگوں کی توبہ قبول فرما اور جو تیرے راستے پر چلے ہیں ان کو بخش دے اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالے اے پرورد گار ان کو ہمیشہ کی جنتوں میں داخل فرما اور ان کے باپ، دادا، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد کو بھی جو نیک نہیں ان کو بھی ان کے ساتھ رکھ۔ اور ایسا کرنا تجھے کچھ مشکل بھی نہیں ہے کیوں کہ تو زبر دست بھی ہے اور حکمت والا بھی اور ان کو برائیوں سے بچالے اس لئے کہ تیری سب سے بڑی مہربانی کی صورت یہی ہے کہ تو ان کو قیامت کے دن کی برائیوں (عذاب) سے بچالے۔ اور یہی تو سب سے بڑی کامیابی ہے۔

(۹) لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿الدخان:۵۶،۵۷﴾ وہ وہاں بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہیں چکھیں گے اور اللہ ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالیگا یہ آپؐ پر آپ کے رب کا احسان ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

یہاں متقیوں کا حال بتلایا جارہا ہے کہ "بے شک پرہیز گار لوگ امن کے مقام میں رہیں گے۔ باغوں اور چشموں (کے پاس) ہوں گے۔ باریک اور دبیز ریشم کا لباس پہنیں گے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اور ہم ان کو گوری گوری اور بڑی بڑی آنکھوں والی عورتوں سے بیاہ کریں گے وہاں اطمینان سے وہ ہر قسم کے میوے طلب کریں گے (بعد کا حال اوپر بیان کیا گیا ہے) خلاصہ یہ کہ اللہ کے عذاب سے رستگاری اور نجات سے بڑھ کر اللہ کا فضل اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی کامیابی بھی یہی ہے۔

(۱۰) فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿الجاثیہ: ۳۰﴾ ترجمہ: پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے سو اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا یہی کھلی ہوئی کامیابی ہے

(۱۱) يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿الحدید: ۱۲﴾ جس دن تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کے ایمان کا نور ان کے آگے اور ان کے داہنی طرف چل رہا ہے آج تمہارے لئے خوش خبری ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہیں ان میں تم ہمیشہ رہو گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

ایمان والوں کیلئے پل صراط پر چلنے سے پہلے ان کے آگے اور داہنی جانب ایمان اور عمل صالح کا نور ہو گا جس کی روشنی میں وہ چلتے جائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے چاروں طرف نور ہو۔ بعض کہہ کر کل مراد لیا جاتا ہو۔ یہ نور ایمان اخلاص اور عمل صالح کے اعتبار سے ہو گا۔ کسی کا نور کھجور کے درخت کے برابر ہو گا۔ اور کسی کا آدمی کے قد کے برابر اور کسی کا نور اس کے انگوٹھے کی مقدار کا جو کبھی سلگتا ہو گا اور بجھتا ہو گا۔ اسی طرح کا نور حسب فرمان آنحضرتؐ مدینہ منورہ سے عدن تک ہو گا۔ اور کسی کا ایک آدمی کے قدموں کے مابین ہو گا۔

(۱۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿الصف: ۱۰ تا ۱۲﴾ ترجمہ: اے ایمان والو۔ کیا تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے۔ یعنی تم اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اللہ کے راستے میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور ہمیشہ کی جنتوں میں عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایمان اور اللہ کے راستے میں جان ومال کی قربانی کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ انہوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا بلکہ در حقیقت ان لوگوں نے سب سے بڑی کامیابی حاصل کی ہے کہ ان کی اس قربانی کے بدلے میں ان کو مغفرت بھی ملیگی۔ جنت بھی ملے گی اور ان جنتوں میں ان کو اچھے عالیشان مکانات بھی ملیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

(۱۳) وَمَن يُؤْمِن بِاللَّـــــهِ وَيَعْمَلْ صَـالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَـيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿تغابن:۹﴾ ترجمہ: اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اللہ اسکی برائیوں کو دور کرے گا اور اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں بھی اللہ نے ایمان اور عمل صالح کو بڑی کامیابی اور مراد پالینا کہا ہے۔

(۱۴) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّـــالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُالْكَبِيرُ ﴿البروج:۱۱﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہی بڑی کامیابی ہے۔

اسی طرح لفظ **فوزاً** قرآن میں تین مقامات پر آیا ہے یعنی سورۂ نساء میں آیت نمبر ۷۳، سورۂ احزاب میں آیت نمبر ۷۱ اور سورہ الفتح میں آیت نمبر ۵ میں اسکے معنی بھی کامیابی، نجات، مراد کو پہنچنے کے ہیں۔

اسی طرح **الفائزون** (کامیاب ہونے والے) کا لفظ چار مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ توبہ میں آیت نمبر ۲۰، سورۂ المومنون میں آیت نمبر ۱۱۴ سورۂ نور میں آیت نمبر ۵۲ اور سورۂ حشر میں آیت نمبر ۳۱ میں۔ اسکے معنی ہیں کامیابی حاصل کرنے والے۔ مراد کو پہنچ جانے والے۔

فرشتے

فرشتے اللہ کی نوارنی مخلوق ہیں اور بعض کے پاس ارواح مجردہ ہیں۔اس لئے ان پر نر اور مادہ وغیرہ کی بحث ہی بے کار ہے۔عربی زبان میں مَلِک کے معنی بادشاہ کے ہیں۔اور مَلَک کے معنی فرشتے کے ہیں۔مَلِک کی جمع ملوک آتی ہے اور مَلك کی جمع ملائکۃ قرآن میں ملائكة کا لفظ مختلف مقامات پر ۲۸ جگہ آیا ہے۔

اللہ کی قدرت کے کارخانے میں ان کا مقام مختلف امور کی انجام دہی میں اس کے ماتحتوں کا ہے۔جن کا کام احکام کی پابجائی ہے۔اللہ نے اپنے کلام میں ان کے تعلق سے فرمایاہے"اللہ نے ان کو جو حکم دیاہے اس میں نافرمانی نہیں کرتے۔اور وہی کام کرتے ہیں جن کاان کو حکم دیا گیاہے"۔

ان کی صحیح تعداد کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہے۔چونکہ اللہ آسمانوں اور زمینوں (سمندر بھی ان میں شامل ہیں) اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا خالق اور مالک ہے۔اس لئے اس پوری کائنات کے نظام کیلئے اللہ نے فرشتوں کو پیدا کیاہے۔ان میں چار فرشتے بڑے ہیں۔جبرئیل۔میکائیل۔اسرافیل اور عزرائیل۔

اللہ تعالی کے پیغاموں کو خاص بندوں تک پہنچانے کا کام حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذمہ ہے۔

بارش برسانے کا کام حضرت میکائیل علیہ السلام کے ذمہ۔صور پھونکنے کا کام حضرت اسرافیل کے ذمہ اور ارواح قبض کرنے کا کام حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ذمہ ہے۔

فرشتوں کے منصب،مقام اور مرتبہ کے لحاظ سے فرشتوں کے بھی اقسام ہیں۔

(۱) کچھ فرشتے وہ ہیں جو عرش کے اُٹھانے والے ہیں جنھیں حَمَلة العرش کہتے ہیں۔

(۲) کچھ فرشتے وہ ہیں جو عرش کے نیچے ہیں ان کو "ملاء اعلی" کہتے ہیں۔

(۳) ملاء اعلیٰ کے ذریعہ دیگر فرشتوں کو اللہ کے احکام اور فیصلے پہنچتے ہیں۔

(۴) پھر ان کے ذریعہ سماء دنیا کے فرشتوں تک وہ احکام پسندیدگی یا ناپسندگی کے فیصلے معلوم کروائے جاتے ہیں۔

(۵) دوزخ پر مقرر کئے ہوئے فرشتے جیساکہ اللہ فرماتا ہے وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا﴿زمر:۷۱﴾ ترجمہ: اور کافروں کو گروہ گروہ بناکر جہنم کی طرف لیجایا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور ان سے ان کے داروغے (فرشتے) کہیں گے۔

(۶)اسی طرح جنت پر بھی مقرر کئے ہوئے فرشتے ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ﴿زمر:۷۳﴾ ترجمہ: جولوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں انہیں گروہ گروہ بنا کر جنت کی طرف روانہ کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ جنت کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے پہلے ہی سے کھلے ہوئے ہوں گے وہاں کے محافظ فرشتے ان سے کہیں گے تم پر سلام۔

(۷)زندگی کے مختلف شعبوں کیلئے الگ الگ فرشتے مقرر ہیں۔ اور وہ اپنے شعبے کا ہی کام کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو اسی حد تک معلومات ہوتے ہیں۔

(۸)ارواح قبض کرنے کیلئے بھی حضرت عزرائیل کی ماتحتی میں مختلف فرشتے ہیں

(۹)فرشتے انسانوں کی ہر ایک حرکت اور ہر ایک بات پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کا ریکارڈ Record بھی اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے ویرسل علیکم حفظۃ۔ ترجمہ: اللہ تم پر نگرانی کرنے والے (فرشتے) بھیجتا ہے۔

(۱۰)اور جب یہ فرشتے ایسے مسلمانوں کی روح قبض کرنے کیلئے آتے ہیں جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا یعنی کافروں کے غلبہ کے مقام پر رہنے کی وجہ سے نہ دین کی بات کھل کر کرسکتے تھے اور نہ آزادی کے ساتھ دینی مراسم کی ادائی ہوسکتی تھی تو ان سے پوچھیں گے۔ کہ یہ تمہارا کیا حال ہے وہ کہیں گے ہم مسلمان ہیں لیکن ملک میں عاجزو کمزور ہیں۔ بس خاموشی سے جی لیتے ہیں تو فرشتے کہیں گے کہ اس طرح دب کر رہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی؟ تم آخر وہاں کیوں نہیں چلے گئے۔ جہاں تم آزادی کے ساتھ اپنے دینی احکام پر عمل کرسکتے تھے، کیوں عاجزوں اور کمزوروں کی طرح اسی مقام پر پڑے رہے۔ یعنی تم کو ایسے وقت پر ایسے مقام سے ہجرت فرض تھی۔ لیکن تم نے فرض کا عملاً انکار کیا۔ گویا تم کافر ہو۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔ مگر وہ عورتیں، بچے اور بوڑھے جو تمہارے تابع تھے اور جو نہ تو چل سکتے تھے اور نہ ان کے پاس سازوسامان تھا اور نہ ان کو راستہ ہی معلوم تھا البتہ وہ لوگ معافی کے قابل ہیں۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا (اسکا ترجمہ اوپر لکھ دیا گیا ہے)

اور کافروں اور جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کی روح جب فرشتے نکالتے ہیں تو اللہ اس کا ہیبت ناک منظر اس طرح پیش کرتا ہے۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَن قَالَ سَأُنزِلُ

مِثْلَ مَا أَنزَلَ اللَّـهُ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّـهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ﴿انعام:۹۳﴾ترجمہ: اور اُس سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہیں آئی۔ اور جو یہ کہے جیسا کلام اللہ نے نازل کیا ہے اسی طرح کا کلام میں بھی لاتا ہوں اور کاش اے پیغمبر ان ظالموں کو آپ اس وقت دیکھتے جب وہ موت کی سختی میں مبتلا ہوں اور فرشتے (موت کے) ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں (اور کہہ رہے ہوں) نکالو اپنی جانیں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس لئے کہ تم اللہ پر ناحق جھوٹ بولا کرتے تھے اور اس کی آیتوں سے تکبر کیا کرتے تھے۔

اس آیت میں اللہ نے دو باتیں بیان کی ہیں۔ (۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ وحی نہیں آئی لیکن جھوٹ بولا جا رہا ہے وہ بھی اللہ پر کہ اس نے مجھ پر وحی نازل کی اور دوسری ناحق بات یہ بھی کہہ رہا ہے کہ تم پر جس طرح کی وحی آئی ہے اسی طرح مجھ پر بھی آئی ہے اور میں بھی اسی طرح کا کلام پیش کرتا ہوں تو اللہ کہتا ہے کہ ایسے ظالموں سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو سکتا ہے۔ ایک سچا پیغمبر تو کبھی اللہ پر جھوٹ نہیں باندھ سکتا۔ جب وہ دنیا میں کسی انسان پر جھوٹ نہیں باندھتا تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھے گا اور دوسری بات یہ کہ وہ جھوٹا نبی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی نبی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو وہ نہ صرف مفتری ہے بلکہ کافر ہے۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جو نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اور اپنے جن ھفوات کو آیات کی شکل میں پیش کرنے کی مذموم اور بدبختانہ کوشش کی ہے وہ جھوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے۔ قرآنی آیت مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَـٰكِن رَّسُولَ اللَّـهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّـهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿الأحزاب:۴۰﴾ کی صریحاً مخالفت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ''لا نبي بعدي'' سے علانیہ متضاد ہے۔ اس کا حشر کیا ہو گا اللہ نے آیت کے دوسرے جزء میں اسکی حقیقت بیان کی ہے جس کا ترجمہ اوپر گذر چکا ہے کہ ایسے ظالموں کو جب ان کی موت کا وقت آئے گا اور سکرات کی حالت میں ہوں گے اور اپنے دفاع کی پوزیشن میں بھی نہ ہوں گے تو فرشتے آئیں گے اور اپنے ہاتھ ان کی طرف بڑھا کر کہیں گے نکالو اپنی جان۔ آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس وجہ سے کہ تم اللہ پر ناحق جھوٹ کہا کرتے تھے اور اللہ کی سچی آیتوں سے تکبر برتتے تھے۔ اسکے برخلاف سچے مومنوں سے ان کی روح ایسی نکالی جائے گی جیسے مسکہ میں یا آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔

(۱۱) ہر آدمی کے سیدھے اور بائیں کندھوں پر بھی فرشتے ہیں جو اسکے اعمال لکھتے رہتے ہیں۔ جنھیں ''كِرَامًا كَاتِبِينَ''

﴿الاِنفطار:١١﴾ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(١٢) قبر میں بھی پوچھ کیلئے دو فرشتے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں من ربک۔ مادینک۔یعنی تمہارا پروردگار کون ہے اور تمہارا دین کیا ہے اور تیسرا سوال یہ کرتے ہیں کہ تم اس شخص کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے ہو اور حضور کی شبیہ بتائی جاتی ہے۔جو مومن ہوتا ہے وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔میرا دین اسلام ہے اور یہ ہستی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جو اللہ کے سچے اور آخری رسول ہیں۔تو فرشتے اس سے کہتے ہیں "نم کنوم العروس"۔سوجاؤ جیسے دلھن سوجاتی ہے کہ اسکو سوائے اسکے شوہر کے کوئی نہیں جگائے گا یا disturb نہیں کرے گا۔اور جو کافر ہو گا وہ ہائے ہائے کہے گا اور کوئی جواب نہیں دے گا تو اسکو گرزوں سے مارا جائے گا۔

(١٣) کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر ایک فرشتہ مقرر نہیں ہے چنانچہ ارشاد ہے: إِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (الطارق ٤﴾ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر نگہبان مقرر نہیں (یہ فرشتہ انسان کی حفاظت کرتا ہے)

(١٤) اللہ نے سقر (جہنم) پر ١٩ فرشتے (داروغے) مقرر فرمائے ہیں۔کیوں؟ اسکے بارے میں اللہ فرماتا ہے۔ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ﴿المدّثّر:٣١،٣٠﴾ ترجمہ: اسپر (١٩) انیس فرشتے (داروغے) ہیں اور ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے ہی بنائے ہیں اور ان کی تعداد کافروں کی آزمائش کے لئے مقرر کی ہے۔اور اس لئے بھی کہ اہل کتاب یقین کرلیں اور مومنوں کا ایمان اور زیادہ ہو۔

قلب

قرآن شریف میں آیا ہے۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿الشعراء:۱۹۳،۱۹۴﴾ اُسکو امانتدار فرشتہ لیکر اُترا ہے آپ کے قلب پر تا کہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔

قلب پر اس لئے نازل کیا گیا کہ تمام اعضاء میں اصل مخاطب قلب (دل) ہی ہے اور وہی ہے جو سمجھتا ہے اور حفاظت کرتا ہے اور پورے اعضاء میں وہی ہے جو اگر اچھا ہو جائے تو تمام جسد اچھا ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسد بگڑ جاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے اور یہ بھی مسلّم ہے کہ حزن وملال خوشی و مسرّت کا مقام دل ہی ہے۔ دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اعضاء پر اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے گویا سردار مطلق قلب ہے اور قلب ہی موضع عقل ہے۔ پس اصل مکلف قلب ہی ہے۔ کیونکہ تکالیف شرعیہ، عقل و فہم کے ساتھ مشروط ہیں، قلب کے کان بھی ہوتے ہیں اور آنکھ بھی، جو ظاہری کانوں اور آنکھوں سے کہیں زیادہ سنتے اور دیکھتے ہیں۔ اگر کسی کے دل کے کان نہ ہوں اور آنکھیں نہ ہوں تو ظاہری کان اور آنکھ رکھنے کے باوجود، اسکو ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کافروں کے حق میں فرماتا ہے۔ وَلَـٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ ﴿الحج:۴۶﴾ (لیکن ان کے دل اندھے ہیں)

قلب کی دو قسموں کا ذکر: اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے

(۱) إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿شعراء:۸۹﴾ مگر جو اللہ کے پاس پاک وصاف دل لے کر آتا ہے۔

(۲) قلب منیب، اس کا ذکر اس طرح آیا ہے مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَـٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿ق:۳۳﴾ جو شخص بن دیکھے اللہ سے ڈرتا ہے اور رجوع کرنے والا دل لیکر اللہ کے پاس آتا ہے۔

قربانی

قربانی ہر مسلمان آزاد مقیم اور صاحب استطاعت پر قربانی کے دنوں میں واجب ہے کہ وہ اپنی طرف سے ایک بکرا، بکری، چھیلا، چھیلی مینڈھا دے۔ یا سات افراد کی طرف سے ایک اونٹ، گائے، بیل، بھینس ذبح کرے۔ فقیر پر قربانی واجب نہیں ہے، لیکن اگر کرے تو مستحب ہے۔

قربانی کا وقت: قربانی کے دن (دسویں ذی الحجہ کی فجر کے طلوع سے شروع ہوتا ہے۔ اور بارھویں ذی الحجہ کی عصر تک رہتا ہے لیکن پہلے دن قربانی کرنا افضل ہے۔ لیکن شہروں میں جب تک عید کی نماز نہیں ہوجاتی اس وقت تک قربانی جائز نہیں ہے۔ البتہ گاؤں اور قریہ جات میں جائز ہے۔ قربانی کا جانور اگر اندھا، کانا، لنگڑا ایسا کہ وہ خود سے قربان گاہ تک چل کر نہیں جاسکتا، بہت زیادہ دبلا کہ جس میں صرف ہڈی اور چمڑا ہو (گوشت نہ ہو) تو جائز نہیں ہے۔

اسی طرح اگر اس کا کان کٹا ہوا ہو یا دُم کٹی ہوئی یا اسکے کان یا دُم کا زیادہ حصہ نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔ بہر کیف قربانی کے جانور میں کوئی واضح عیب یا نقص نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی جانور پیدائشی بغیر سینگ کا ہو تو جائز ہے۔ اسی طرح خصی کیا ہوا ہو تو جائز ہے بلکہ زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ اس کا گوشت زیادہ لذیذ اور اچھا ہوتا ہے۔ قربانی کے لئے بکری، مینڈھا وغیرہ ایک سال کا ہو۔ گائے، بیل وغیرہ (۲) سال کا ہو۔ اونٹ (۵) سال کا ہو۔

دنبہ اگر چھے مہینے کا ہو مگر ایک سال کا معلوم ہوتا ہو تو اسکی قربانی بھی جائز ہے۔ قربانی کے گوشت کے ۳ حصّے کئے جائیں۔ ایک حصّہ اپنے لئے، ایک حصّہ اقرباء اور رشتہ داروں کے لئے اور ایک حصّہ غریبوں اور مسکینوں کے لئے، تاکہ وہ لوگ بھی عید قربان کی خوشی میں شریک ہوسکیں۔ قربانی کا گوشت جو اپنے حصّے کا ہے ذخیرہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ رسول ﷺ نے فرمایا کلوا وتزوّدوا وادّخروا، ترجمہ: کھاؤ اور اس کا ذخیرہ بھی کرو۔

مگر مستحب یہ ہے کہ دوسروں کو دیا جانے والا حصّہ ایک تہائی سے کم نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالی نے قرآن میں فرمایا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴿الحج:۳۶﴾، یعنی قربانی کے گوشت میں سے کھاؤ اور مانگنے والے کو اور اسکو جو مانگتا تو نہیں لیکن اپنے آپ کو پیش کرتا ہے، دو۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ کھانا بھی ہے اور قانع اور معتر کو کھلانا بھی ہے۔ لیکن اگر سب کا سب صدقہ کر دیا جائے تو افضل ہے۔ صدقہ کی کھال صدقہ کرنا چاہئے۔ یا اگر چاہے تو توشہ دان، بیٹھنے کا چمڑہ وغیرہ بنالیا جاسکتا ہے۔ صدقہ کی

کھال کی رقم مسجد کی تعمیر، میت کی تجہیز و تکفین یا کسی دینی یا دنیوی خدمت کے معاوضہ میں نہیں دینی چاہئے۔ جیسے امام وخطیب و موذن کی خدمت کے عوض، یا کسی دینی مدرسہ کے مدرس کی تنخواہ میں نہیں دینی چاہئے۔ ہاں ایسے مدارس جہاں طلبہ کے طعام کا انتظام ہو تو یہ کہہ کر دینا چاہئے کہ صرف اسی مد میں خرچ کی جائے۔ قربانی کے ذبح کے لئے افضل یہ ہے کہ جس کی طرف سے قربانی دی جارہی ہے وہ اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ بشر طیکہ وہ اچھی طرح ذبح شرعی حکم کے تحت کر سکتا ہے۔ ورنہ کسی جان کار سے ذبح کرائے۔ چنانچہ روایت آئی ہے کہ رسول ﷺ نے ایک سو (۱۰۰) اونٹ اپنے ساتھ لے گئے۔ جن میں سے ۶۳ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح فرمائے اور باقی اونٹ حضرت علیؓ سے ذبح کروائے۔

اور جس کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے اسے چاہئے کہ ذبح کے وقت اپنی قربانی کے جانور کے سامنے کھڑا ہو اور دیکھے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے بی بی فاطمہؓ سے قربانی کے وقت فرمایا۔ يا فاطمة بنت محمد قومي فاشهدي اضحيتك فانه يغفر لك باوّل قطره يقطر من دمها كل ذنب عملتيه و قولي ان صلاتي و نسكي و محياي و مماتي لله رب العالمين لا شريك له - الخ ترجمہ: اے فاطمہ بنت محمد کھڑی ہو جا اور تیری قربانی کو دیکھ اس لئے اسکے خون کے پہلے قطرہ کے عوض تیرا ہر گناہ بخش دیا جائے گا اور کہہ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ ﴿الأنعام:۶،۱۶۲﴾۔

روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ قیامت کے دن اسکو اسکی لگام اور اسکے خون کے ساتھ لایا جائے گا اور تیرے ترازو میں رکھا جائے گا اور ستر (۷۰) گنا۔ یہ سن کر حضرت ابو سعید خدریؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ صرف آل محمد کیلئے خاص کر ہے یا ان کے لئے اور عام مسلمان کے لئے ہے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا۔ لآل محمد خاصة و للمسلمين عامة۔ آل محمد کے لئے خاص کر اور عام مسلمانوں کے لئے بھی۔

قربانی کا اصل مقصود قرب الٰہی حاصل کرنا ہے اور یہ حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے۔ آپ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اللہ کے حکم کی بناء پر اپنے فرزند دل بند حضرت اسمائیلؑ کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ چھری بھی چلادی لیکن منظور خداوندی کچھ اور تھا۔ بلکہ ایک بڑی آزمائش تھی جس میں ابراہیمؑ کامیاب ہو گئے۔ اور معصوم فرزند حضرت اسماعیلؑ نے بھی اس معاملہ میں والد کا ساتھ دیا۔ اور کس قدر رقت بھرے الفاظ میں اپنے والد ماجد سے فرمایا۔ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴿الصافات:۱۰۲﴾ ترجمہ: اے ابا جان آپ کو جو حکم دیا گیا ہے وہ کر بھی ڈالئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

یہ سب ابراہیمؑ جیسے عاشق خدا کی نظر فیض اثر کا ہی صدقہ تھا۔ سبحان اللہ

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی   سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی

بعض نسخوں میں آیا ہے کہ آدمی کو اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے بھی قربانی دینی چاہیئے۔ شاید انہوں نے فطرہ پر اسکو قیاس کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی صاحب استطاعت اپنے چھوٹے بچوں کی طرف سے بھی دیتا ہے تو ماشاء اللہ، فطرہ بچوں کا باپ پر واجب ہے۔ قربانی واجب نہیں ہے۔ اگر قربانی کا جانور ذبح کیا گیا اور اس میں سے جنین زندہ نکلا تو اسکو بھی ذبح کر دینا چاہیئے۔

قرآن اور مہدی

بعض لوگ ہم سے یہ پوچھتے ہیں کہ قرآن شریف میں ”مہدی“ کا نام نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں ہر چھوٹی بڑی خشک وتر چیز کا ذکر ہے۔ پھر حضرت مہدیؑ پر جب ایمان لانا فرض وضروری ہے۔ تو قرآن میں ان کا ذکر ضرور ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہم پورا قرآن پڑھتے ہیں تو ایک جگہ بھی ہم کو مہدیؑ کا نام نہیں ملتا؟ اس کا جواب کیا ہے؟۔

اس سوال کے کئی جوابات ہیں۔ (۱) پہلا جواب تو یہ ہے کہ قرآن اُصول سے بحث کرتا ہے۔ اشخاص اور ناموں سے نہیں۔ اس میں بنیادی باتیں وہ بھی اجمالاً بیان ہوتی ہیں۔ تفصیلات رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ (۲) آپ کتب الہیہ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ اگلے زمانے کے پیغمبروں کا ناموں کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ آئندہ آنے والے پیغمبر کا نام کے ساتھ کبھی ذکر نہیں کرتا۔ صرف اس قدر کہہ دیا جاتا تھا کہ آئندہ ایک ہادی۔ رہنما یا پیغمبر، رسول آئے گا۔ چنانچہ ابراہیمؑ کے بعد کون کون پیغمبر آنے والے ہیں۔ صحف ابراہیم میں اسکا ذکر نہیں کیا گیا۔ نوحؑ کے بعد کس کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے گا۔ اس کا ذکر نوحؑ کے صحیفے میں نہیں کیا گیا۔ اس طرح موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ البتہ حضرت عیسیٰؑ کو جو کتاب انجیل دی گئی۔ اس میں ”احمد“ کے آنے کا ذکر ہے چنانچہ قرآن میں بھی وہی بات اس طرح دہرائی گئی ”وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ﴿الصف:٦﴾“ ”خوشخبری دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا جس کا نام احمد ہوگا“۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی عظمت اور ختمیت کے پیش نظر حضرت عیسیٰؑ کے ذریعہ ایک رسول کے آنے کی خوشخبری حسب عمل در آمد قدیم دی تو نام کی صراحت کے ساتھ دی۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ عیسائی تو صاف کہتے ہیں کہ پیشین گوئی احمد کے نام کی ہے۔ جب احمد نام کا پیغمبر آئیگا تو ہم اس کو مانیں گے۔ اے مسلمانو! تم نے محمد کو پیغمبر مان لیا ہے۔ یہ پیش گوئی کے خلاف ہے۔ اس کا جواب علماء اسلام نے بہتر طور پر دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ اُصول تو اپنی جگہ پر ہے کہ اللہ گذرے ہوئے پیغمبروں کا ذکر کرتا ہے اور آئندہ آنے والے پیغمبر کے تعلق سے خبر دے دیتا ہے۔ نام کے بغیر اور اس کا سبب یہ ہے کہ ایمان ایک آزمائشی منزل ہے۔ حسبِ وعدہ جب پیغمبر مبعوث ہوتا ہے اور وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور بُرائیوں سے روکتا ہے اور وہ خود صاف ستھری زندگی اور پاک وپاکیزہ اخلاق کا مالک ہوتا ہے اور اپنی دعوت کے معاوضہ میں لوگوں سے کوئی اجرت بھی طلب نہیں کرتا تو لوگ جن کے دلوں میں سچائی کی طلب اور اچھائی کی امنگ ہوتی ہے۔ وہ اسکو قبول کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی پُرانی روش کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے وہ نہ صرف انکار کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے جھگڑا کرتے اور اسکی دعوت کی راہ میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

ایمان کو آزمائشی منزل کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اگر توریت اور انجیل میں صاف طور پر یہ بیان کر دیا جاتا کہ عرب کے شہر مکہ میں آمنہ کے بطن سے عبداللہ کا فرزند عبدالمطلب کا پوتا قریش کے خاندان اور بنو ہاشم کے قبیلے سے ایک پیغمبر ہو گا تو ظاہر ہے کسی کو اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہتی۔ پھر ایمان لانے والوں اور پیغمبروں کا ساتھ دینے والوں کے لئے جو اجر و ثواب، مرتبہ اور درجہ کا وعدہ ہے۔ وہ غیر ضروری ہو جاتا۔ اس طرح انکار کرنے والوں کو جو سزا عذاب اور ذلت کی جو وعید بیان کی گئی ہے۔ اسکی بھی کوئی ضرورت ہی نہ رہتی۔ امتحان یہی ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اپنی آخرت کو سامنے رکھ کر حق کے پیغام کو قبول کرتے ہیں۔ اور وہ کون ہیں جو اسی دنیا پر فریفتہ ہو کر آخرت کو صرف کھیل سمجھتے ہیں۔ جب پیغمبروں کے سلسلے میں یہ طریق اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے تو کیا مہدی موعودؑ کے لئے اللہ تعالیٰ اس سے ہٹ کر اور طریقہ اختیار کر لیتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے۔ لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّـهِ تَبْدِيلًا ﴿الاحزاب:٦٢﴾۔ اے رسول اللہ آپ ﷺ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلفاء کے لئے جو طریقہ سابق میں اختیار کیا تھا۔ وہی طریقہ حضرت مہدی موعودؑ کے لئے بھی جو اللہ تعالیٰ کے خلیفے ہیں۔ اختیار کیا۔ اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ مہدی موعودؑ رسول یا پیغمبر نہیں ہیں۔ جب پیغمبروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے نام کی صراحت نہیں کی تو مہدی موعودؑ کے لئے اللہ وہ طریقہ کیسے اختیار کر لیتا قرآن میں قیامت کا ذکر ہے البتہ حضور ﷺ نے اُمت پر شفقت فرماتے ہوئے قیامت کی نشانیوں کا ذکر فرمایا اور ان نشانیوں میں ایک بڑی نشانی حضرت مہدی موعودؑ کی بعثت کی بھی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس سلسلے میں جو بھی فرمایا وہ اپنی طرف سے نہیں فرمایا۔ بلکہ اللہ کی جانب سے معلومات کی بناء پر ہی فرمایا۔ کیونکہ قیامت اور اسکی علامات و آثار اور نشانیوں کا تعلق امور غیب سے ہے۔ حضور ﷺ ایسی باتوں کو اس وقت تک بیان فرما ہی نہیں سکتے جب تک کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے معلومات حاصل نہ ہو گئے ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اپنی اُمت کو آئندہ زمانے میں ہلاکت سے بچانے کی غرض سے مہدی موعودؑ کے آنے کے تعلق سے پیشین گوئی فرمادی۔ تاکہ جب مہدیؑ تشریف لائیں تو لوگ آپؑ پر ایمان لائیں۔ اور انکار کی روش کو اختیار کرتے ہوئے اللہ کے پاس مأخوذ نہ ہوں۔ چنانچہ آپ نے ۳۰ سو سے زیادہ حدیثوں کے ذریعہ بعثت مہدیؑ کی خوشخبری سنائی۔ پس آنے والی ہستی کا نام رسول اللہ ﷺ نے مہدی رکھا۔ جسکے معنی ہیں ہدایت یافتہ یعنی وہ ہستی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت یافتہ ہو گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قیامت کے قریب آنے والی ہستی کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے مہدی کے نام سے فرمایا۔ تو اب اگر مہدی کا نام دیکھنا مطلوب ہو تو اسکو احادیث رسول اللہ ﷺ میں دیکھنا چاہیئے؟ نہ کہ قرآن میں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلی ہوئی بات کو اگر حدیث کے بجائے قرآن میں ڈھونڈیں گے تو قرآن میں وہ نام کہاں ملے گا۔ اور یہ ڈھونڈھنا

صحیح نہیں ہو گا۔ اور اس پر یہ کہنا چونکہ قرآن میں یہ نام نہیں ہے لہٰذا اس پر ایمان لانا بھی ضرری نہیں ہے غلط استدلال ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کے تعلق سے سب سے پہلے جناب اختر کاشمیری صاحب نے یہ سوال اٹھایا کہ مہدیؑ کی بعثت غیر ضروری ہے اس لئے کہ قرآن میں اسکا ذکر نہیں ہے۔ ان ہی کی اتباع میں جناب مودودی صاحب نے بھی لکھ دیا کہ جب قرآن میں بعثت مہدی کے تعلق سے کوئی ذکر نہیں ہے تو یہ اعتقاد بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ فقط علمی حیثیت سے یہ مسئلہ چھیڑا نہیں گیا ہے۔ بلکہ اس غلط خیال پر جو عمارت تعمیر کی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن میں مہدیؑ کا ذکر نہیں، اب رہے احادیث تو چونکہ احادیث میں اختلافات کثیرہ ہیں۔ لہٰذا یہ نظریہ ہی غلط ہے۔ نعوذ باللہ۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کا مقام بھی دین کے احکام میں بلند ہے۔ احادیث کی حیثیت BY-LAW کی ہے۔ یعنی قرآن میں جو اصول ہیں احادیث سے ہی ان کی تشریح ہوتی ہے اگر احادیث کو نظر انداز کر دیا جائے تو نہ نماز کا صحیح طریقہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اور نہ نمازوں کے رکعتوں کا علم ہو سکتا ہے۔ قرآن میں تراویح کے نام کی صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ہے۔ قرآن میں وتر کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن میں زکواۃ کا نصاب مذکور نہیں ہے۔ قرآن میں حج کا طریقہ بھی بیان نہیں کیا گیا ہے۔ ان سب باتوں کی تفصیل احادیث سے ہی معلوم ہوتی ہے۔ پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو قرآن ہی کافی ہے۔ حدیث کی ضرورت نہیں۔ تو کیا ایسا شخص مسلمان بھی کہلائے جانے کا مستحق ہے؟ اور کیا ایسا شخص نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ صحیح طریقے سے ادا کر سکتا ہے؟؟

حدیث کا مقام تو اتنا بلند ہے کہ قرآن اپنا مفہوم سمجھانے میں حدیث کا جتنا محتاج ہے۔ حدیث اپنا مفہوم سمجھانے میں اتنی قرآن کی محتاج نہیں ہے۔ اور خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ﴿الحشر: ۷﴾ یعنی رسول تم کو جو کچھ عطا کریں اس کو لے لو اور وہ جس چیز سے منع کریں اس سے باز آجاؤ۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حدیث سے جو بات ثابت ہوتی ہے اس کا ماننا ضروری نہیں ہے۔ ایسا کہنے والا تو وہی ہو سکتا ہے۔ جسے ایمان نہیں ہے۔ اگر اس موقع پر یہ کہا جائے کہ ہم کو حدیث کا انکار نہیں ہے بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ حدیثوں میں بہت اختلاف ہے۔ اور محدثین نے حدیثوں کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ یعنی صحیح، حسن، غریب، ضعیف اور موضوع وغیرہ۔ اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ حدیث سے کوئی بات قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی جیسا کہ قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔ تو اس کا ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ جب تم اس بات کو مان رہے ہو کہ اہل اصول اور محدثین نے حدیثوں کے قبول کرنے کے بارے میں کچھ اُصول مقرر کئے ہیں ان اُصول کے مطابق جو احادیث صحیح قرار پاتی ہیں تو ان کا ماننا تو ضروری اور لازم ہے۔

آیئے اب ہم آپ کو بتائیں کہ حضرت مہدیؑ کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں محدثین اور اُصولین کے پاس انکا کیا

مقام ہے؟ تو سُنئے کہ سب کا (بجز ایک دو کے جن کا محدّثین کے پاس کوئی مقام نہیں ہے) اس پر اتفاق ہے کہ مہدیؑ کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں۔ وہ ہر دور میں اتنے زیادہ صحابہ سے مروی ہیں۔ کہ ان احادیث کو "احادیث متواترہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ احادیث متواترہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ قطعی ہوتی ہے اور یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ اسکا انکار کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مہدی موعودؑ کی بعثت کے متعلق جو احادیث آئی ہیں۔ وہ بڑے بڑے صحابہ و صحابیات سے مروی ہیں۔ اور حدیث کی بہت سی کتابوں میں وہ مذکور ہوئی ہیں اور وہ سب احادیث متواترہ ہیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان کا انکار کفر ہے۔ خصوصاً جبکہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان بھی منقول ہوا ہے۔ "من انكر المهدي فقد كفر" یعنی جس نے مہدی کا انکار کیا گویا اس نے کفر کیا یعنی گویا رسول اللہ ﷺ نے جو پیش گوئی منجانب اللہ فرمائی وہ اسکا انکار کر رہا ہے اور رسول اللہ کی تکذیب کر رہا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والا کافر ہی ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن شریف میں حضرت مہدیؑ کا نام جو نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ کی عادت کے مطابق ہی نہیں آیا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ مہدی موعودؑ کے تعلق سے قرآن میں اشارے بھی نہیں ہیں۔ قرآنِ شریف میں بیسیوں مقامات پر مہدی موعودؑ کے بارے میں۔ آپؑ کے بعثت کی غرض و غایت کے بارے میں۔ آپؑ کے مقام رفیع کے بارے میں۔ آپؑ کی بعثت کے زمانے کے بارے میں، آپؑ کے اصحاب کے صفات و اخلاق کے بارے میں، مخلوق کا آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اس کے بارے میں واضح اشارے موجود ہیں۔ جن کی طرف بعض مفسرین نے نشاندہی فرمائی ہے۔ اور حضرت مہدیؑ نے اپنے بیان کے دوران ان امور کی واضح الفاظ میں صراحت بھی فرمائی ہے۔ اور قرآنِ شریف کے شارح اوّل حضور محمد رسول اللہ ﷺ نے کئی مرتبہ حضرت مہدیؑ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

قسط

حضرت امام مہدیؑ کے زمانے میں ساری دنیا عدل وانصاف سے بھر جائے گی۔ جس حدیث شریف کے الفاظ سے یہ معنی نکالے گئے ہیں وہ یہ ہے۔یملاء الأرض قسطاً وعدلاً ۔اور اکثر لوگ یہی معنی لیتے ہوئے بیان کرتے ہیں اور انہی معنی سے عوام کو یہ غلط بات باور کرانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ کہ مہدیؑ کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ روئے زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ اور چونکہ حضرت سید محمد جونپوری (مہدی موعود) کے زمانے میں ایسا نہیں ہوا۔ اسلئے آپ مہدی نہیں ہیں۔ حالانکہ جو مفروضہ قائم کیا گیا ہے، وہی غلط ہے۔یعنی الأرض سے ساری زمین مراد لینا۔ اس لئے کہ الأرض میں جو الف لام ہے وہ استغراقی نہیں ہے۔ جس کے معنی کُل روئے زمین کے آتے ہیں۔ بلکہ یہاں **الف لام عہدِ خارجی** ہے۔ جس کے معنی زمین کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ پس یملاء الأرض کے یہ معنی ہوں گے کہ جس خطہ زمین میں ظلم اور جور ہو اس حصہّ زمین پر اگر امام داخل ہوں یا وہاں آپؑ کی دعوت اور تعلیمات پہنچیں اور اس خطے کے افراد انسانی، امامؑ کی ہدایت ودعوت کو قبول کریں تو اس خطے میں اور اسکے ماننے والوں میں عدالت پھیلے گی اور ظلم وجور کا خاتمہ ہوگا۔

قرآن شریف میں جہاں جہاں "الأرض" الف لام کے ساتھ "الأرض" آیا ہے تو کہیں **الف لام استغراقی** بھی آیا ہے اور کہیں **الف لام عہدی** بھی۔ چنانچہ قرآن شریف میں السمٰوٰت کے ساتھ جب لفظ "الأرض" آیا ہے تو وہاں معنی استغراق (کل) ہی کے آتے ہیں۔ جیسے خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴿الانعام:۷۵﴾وغیرہ۔ لیکن جہاں "الأرض" السَّمَاوَاتِ کے بغیر آیا ہے وہاں الف لام کا استغراقی ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ وہاں الف لام عہدی ہے۔ یعنی کل روئے زمین مراد نہیں ہے۔ بلکہ زمین کا ایک حصہ یا ایک خطہ یا ایک شہر مراد ہے چنانچہ سورۂ مائدہ میں يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ﴿المائدۃ:۲۶﴾ (ملک میں سرمارے پھریں گے) آیا ہے۔ یہاں الأرض ملک کے معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ میں ہی الأرض صرف اس جگہ کے معنی میں آیا ہے چنانچہ۔ "إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّـهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ﴿المائدۃ:۳۳﴾" ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اسکے رسول سے لڑائی کرتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے دوڑتے ہیں۔ انکی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا وہ سولی پر چڑھائے جائیں یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے یا دور کردئے جائیں اس جگہ سے یعنی جلا وطن کردئے جائیں۔ یہاں الأرض سے مراد پوری روئے زمین نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتی، بلکہ زمین کا ایک خطہ یا ملک مراد ہے۔

اسی طرح سورۂ یوسف میں بھی الارض آیا ہے۔ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ﴿یوسف ۵۵﴾ ترجمہ: "ملک" کے

خزانوں کا مجھے امین بنادو۔ یہاں بھی الأرض کے معنی پوری دنیا کے نہیں بلکہ اس ملک کے ہیں اسی قبیل کی بہت سی آیتیں ملتی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ الأرض سے مراد کل روئے زمین نہیں ہے۔ بلکہ ایک آیت میں تو الأرض سے جنت مراد ہے جیسا کہ سورۂ زمر میں ہے۔ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ﴿الزمر:۷۴﴾ اور وارث کیا ہم کو اس زمین کا کہ جہاں چاہے ہم گھر بنالیں بہشت میں۔ مولوی شبیر احمد عثمانی نے اس زمین سے جنت مراد لی ہے (دیکھئے اس آیت کے ضمن کا حاشیہ) خلاصہ یہ کہ الأرض سے روئے زمین ہی مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ حضرت مہدیؑ کے تعلق سے جو حدیث آئی ہے۔ اس میں یملاء الأرض قسطاً و عدلاً آیا ہے۔ اس سے بھی کُل روئے زمین مراد لیناأصولی غلطی ہے۔ اس سے تو صرف وہ خطہ مراد ہو سکتا ہے۔ جہاں آپ پہنچے ہوں۔ یا آپ کی دعوت اور تعلیمات پہنچی ہوں۔ اور جہاں کے لوگ آپ کو اور آپ کی تعلیمات کو قبول بھی کئے ہوں لیکن اس کے بر خلاف اگر اس خطے کے لوگ جان بوجھ کر یا علامتوں کے ظاہری الفاظ کے چکر میں پڑ کر آپ کی دعوت اور آپ کی تعلیمات کی روشنی سے محروم ہوگئے ہوں تو یہ ان کا قصور ہے۔ ایسی صورت میں وہاں عدالت کہاں پائی جائے گی۔ چنانچہ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿الأنبياء:۱۰۷﴾"۔ نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر عالمین کیلئے رحمت بنا کر۔ اسکی تفسیر میں جناب شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں۔ یعنی آپ تو سارے جہاں کیلئے رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ اگر کوئی بدبخت اس رحمت عامہ سے خود ہی منتفع نہ ہو یہ اسکا قصور ہے۔ آفتاب عالم تاب سے روشنی اور گرمی کا فیض ہر طرف پہنچتا ہے۔ لیکن کوئی شخص اپنے اوپر تمام دروازے اور سوراخ بند کرلے تو یہ اسکی دیوانگی ہوگی۔ آفتاب عالم تاب کے عمومِ فیض میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔

بالکل یہی صورت یملاء الأرض قسطاً وعدلاً کی بھی ہے۔ گذشتہ صفحات میں یہ اچھی طرح واضح کیا جاچکا ہے کہ کس طرح حضرت مہدیؑ نے اپنے قدوم ہدایت لزوم سے کتاب و سنت سے بے بہرہ خطوں کو عدل و قسط سے معمور فرمادیا۔ اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب اور افغانستان میں قدوم ہدایت لزوم سے کتاب و سنت کا پرچم لہرایا تھا۔ اور حقیقی اسلام سے دنیا کو روشناس فرمادیا تھا۔ چنانچہ آپ کی بعثت اور آپ کی دعوت کے چرچے ماشاء اللہ دنیا بھر میں ہوگئے تھے۔ اور عوام اور خواص سے گذر کر آپ کا پیغام حق سلاطین اور شہنشاہوں کے ایوانوں اور درباروں میں بھی زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ بھی آپ کے دست حق پرست پر ایمان لاچکے تھے۔ دین کے ظاہر ہونے، باطل کے نابود ہونے، حق کے فروغ پانے اور دلائل قرآنی کی اساس پر اہل دنیا پر غلبہ پانے کے اعتبار سے یہی زمین کا عدل و انصاف سے بھر جانا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" یمحوبي الکفر" (اللہ میرے ذریعہ کفر کو مٹاتا ہے) کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام روئے زمین سے کفر نابود ہوگیا۔ نہیں بلکہ اس کا

مطلب یہ ہے کہ یا تو عرب سے نابود ہو گیا یا دلیل کا ایسا غلبہ ہو گیا کہ گویا کفر مٹ گیا۔ یملاء الأرض میں بھی وہی تاویل کی جائے گی۔ جو یمحوبي الکفر میں کی جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ مکہ میں کسی نے آپ سے بیعت نہیں کی۔ بلکہ تمام علماء مکہ نے ان کے پیرووں کے کفر کا فتویٰ دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اتنا تو آپ مانتے ہیں کہ امام نے مکہ میں رکن و مقام کے درمیان دعویٰ مہدیت فرمایا۔ نجات الرشید، تاریخ اولیاء گجرات میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ہمارے پاس کی کتابوں میں یہ بھی ہے کہ اس وقت حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ اور قاضی علاء الدین بدریؓ دونوں نے آمنا و صدقنا کہہ کر بیعت کی۔ دیگر اصحاب اور ان کے علاوہ بعض لوگوں نے توجہ کی کہ بیعت کریں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ کیا صرف دو کی گواہی کافی ہے۔ تو اسکا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ ویسے شریعت میں کسی دعویٰ کی گواہی کا نصاب بھی دو مردوں کی گواہی ہے۔ لیکن جہاں تک خلیفۃ اللہ کے دعویٰ کا سوال ہے وہاں یہ قاعدہ ہے کہ سننے والے اس دعویٰ کو مانیں یا نہ مانیں اس سے خلیفۃ اللہ کی دعوت اور اس کے دعوی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے "وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿الشعراء:۲۱۴﴾" کے حکم کی تعمیل میں تمام قبیلے والوں کی دعوت فرمانے کے بعد اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو دیکھئے کہ کتنے لوگوں نے آپ کے دعویٰ کو تسلیم کیا۔ کیا کوئی کافر اسکو بنیاد بنا کر رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے دعویٰ کو چیلنج کر سکتا ہے۔ اور یہ کہہ سکتا ہے کہ اس مجمع میں سے کسی ایک نے بھی جب آپ کے دعویٰ کو نہیں مانا تو آپ نبی کیسے؟ نعوذ باللہ

نیز اولین میں تو تین کا ہی ذکر ملتا ہے۔ مردوں میں حضرت ابو بکرؓ عورتوں میں خدیجہ الکبریٰؓ اور لڑکوں میں حضرت علیؓ علاوہ ازیں یہ روایت بھی آپ کی نظر سے گذری ہوگی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "وان من الأنبياء نبياً ماصدقه من امته إلّا رجل واحد" (اشعۃ اللمعات جلد رابع صفحہ ۴۶۷) ترجمہ: تحقیق کہ انبیاء میں سے ایک نبی وہ ہے جن کی تصدیق ان کی امت میں سے صرف ایک ہی شخص نے کی۔ ہمارے پاس تو یہ بات ثابت ہے کہ اس دعویٰ کے بعد پہلے دو اصحاب نے امامؑ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اسکے بعد دوسرے عربوں نے بھی بیعت کی۔ اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ علماء مکہ نے حضرت مہدیؑ کے پیرووں کے قتل کا فتویٰ دیا۔ مگر جناب عالی۔ مکہ کی تاریخ تو کہہ رہی ہے کہ مکہ کے خواص سرداروں نے آپس میں مشورت کے بعد خود ختمی مرتبت ﷺ کے قتل کا فرمان جاری کیا۔ اور عملاً اس ارادے سے آپ ﷺ کے مکان کا محاصرہ بھی کر لیا۔ کیا مکہ والوں کا یہ اقدام حضور ﷺ کی نبوت کا قادح ہے؟ نہیں تو ہم پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ حضور خاص مکہ کے رہنے والے تھے۔ اور مکہ والوں نے خود حضور ﷺ کے قتل کا اقدام کر لیا۔ اللہ نے ان کے ناپاک ارادے کو ناکام کر دیا۔ اور آپ کی نبوت برحق۔ لیکن حضرت امام مہدیؑ ہندوستان سے مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں دعویٰ فرمایا لوگوں نے بیعت کی،

آپ سلامتی کے ساتھ واپس آئے اور اپنا مشن جاری رکھا۔ مکہ کے علماء نے آپ کے پیروؤں کے قتل کا فتویٰ دیا تو یہ بات مہدیت کیلئے کیسے قادح بن سکتی ہے؟ کافروں کی جانب سے ایمان والوں کی ایذاء رسانیاں تو اسلامی تاریخ کا سنگ بنیاد ہے۔ آپ اللہ کے خلفاء (انبیاء علیہم السلام) کی تاریخ دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ کفار نے انبیاء کے ساتھ اور ان کے متبعین کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا، کس قدر ایذائیں دیں۔ دھمکیاں دیں، گالیاں سنائیں۔ اور خود پیغمبروں میں سے بعض کو قتل کیا بعض کو بیچ میں سے چیر ڈالا۔ بعض کو جلاڈالنے کا اقدام کیا۔ یہ راہیں تو خلافت الٰہیہ اور اسکے متبعین کیلئے مانوس راہیں ہیں۔ کیا مکہ والوں نے رسول اللہ ﷺ اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ سلام وکلام، خرید و فروخت کو بند نہیں کر دیا تھا۔ تین سال تک شعب ابی طالب میں سب سے کٹ کر الگ رہنے پر مجبور نہیں کیا، ان کو بے رحمی کے ساتھ زدو کوب نہیں کیا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ مہدی کے زمانے میں تو عدل و انصاف سے زمین کو بھرنا چاہئے تھا۔ پھر یہ ظلم وجور کیسا تو ہم یہ جواب دیتے ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ رحمۃ للعالمین تھے۔ اسکے باوجود آپ ﷺ کے ساتھ اور آپ کے پیروؤں کے ساتھ مکہ والوں کی جانب سے یہ زحمت کیسی؟ جس طرح خود مکہ والوں کی زحمت، رحمۃ للعالمینی پر اثر انداز نہیں ہوئی اسی طرح علماء مکہ کی جانب سے مہدیؑ کے پیروؤں کے قتل کا فتویٰ یملاء الأرض قسطاً وعدلاً کے منافی نہیں ہوتا۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ یملا ء الأرض قسطاً وعدلاً کے معنی کل روئے زمین پر امن قائم ہوجانے کے لینا بھی صحیح نہیں ہے۔

یہ نری عجمیت ہے۔ عربی میں یہ معنی نہیں آتے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ نے رحمت کے جو معنی بیان فرمائے ہیں۔ جسکو مولوی شبیر احمد عثمانی نے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿الأنبیاء:۱۰۷﴾ کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ اسکو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ رحمت کے انداز کیا کیا ہوتے ہیں۔ اور رحمت کی کتنی شانیں ہیں۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے عام اخلاق کے علاوہ جن کافروں پر آپ جہاد کرتے تھے وہ بھی مجموعہ عالم کیلئے سراسر رحمت تھا۔ کیوں کہ اس کے ذریعہ سے اس رحمت کبریٰ کی حفاظت ہوتی تھی۔ جس کے حامل بن کر آپ آئے تھے۔ اور بہت سے اندھے جو آنکھیں بنوانے سے بھاگتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی آنکھوں میں خواہ مخواہ ایمان کی روشنی پہنچ جاتی تھی۔ ایک حدیث میں ”والذی نفس محمد بیده لا قتلنهم و لا صلبنهم و لا هدينهم وهم كارهون اني رحمة بعثني الله و لا يتوفاني حتىٰ يظهر الله دينه“ (ابن کثیر) ان الفاظ سے آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا مفہوم زیادہ وسعت کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے (القرآن الکریم ترجمہ محمود الحسن وتفسیر شبیر احمد عثمانی صفحہ ۴۴۱)

گویا قتل کرنا، سولی پر چڑھانا اور ہاتھ پیر کاٹنا بھی رحمت ہے۔ نیز حدیث کا آخری فقرہ ولا يتوفاني حتىٰ يظهر الله

دینه اور اللہ مجھے وفات نہیں دیگا یہاں تک کہ اللہ اپنے دین کو غالب نہ کر دے کی آپ کیا تاویل کریں گے۔ یہ معنی تو صحیح نہیں ہوسکتے کہ حضور کی وفات سے پہلے کل روئے زمین پر فقط اسلام ہی کا راج تھا بلکہ آپ اسکی جو تاویل کریں گے۔ یملاء الأرض قسطا وعدلاً کی بھی تاویل ہماری جانب سے وہی ہو گی۔ اور یہ معنی لینا درست نہیں ہو سکتا کہ پیدائش کے ساتھ ہی یا دعویٰ کے ساتھ ہی فوراً غلبہ ہو جائیگا (اور وہ بھی حکومت، سلطنت اور بادشاہت کے اعتبار سے، اور اگر حکومت اور سلطنت بھی مراد لیں تو اسکے معنی ہوں گے روحانی اور دینی حکومت، سلطنت اور بادشاہت کے)۔

قف

روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو معراج نصیب ہوئی اور آپ ﷺ سدرۃ المنتہٰی سے آگے بڑھے تو ایک مقام پر آپ ﷺ سے کہا گیا "قف یا محمد فان ربك یصلي في المحراب" ترجمہ: اے محمد ﷺ آپ ٹھہرئے کہ آپ ﷺ کا رب محراب میں نماز پڑھ رہا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اللہ کی تو ہم سب نماز پڑھتے ہیں مگر اللہ کس کی نماز پڑھتا ہے؟

(الجواب) دراصل آپ نے جو ترجمہ "یصلي في المحراب" کا اللہ محراب میں نماز پڑھ رہا ہے کیا ہے۔ وہی غلط ہے اسی وجہ سے آپ کو شبہ ہوا ہے۔ اور آپ کے دل میں سوال پیدا ہوا ہے۔ اگر یصلی کا ترجمہ صحیح طور پر کیا جائے تو پھر اعتراض یا سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ عربی میں صلواۃ کے معنی ایک نہیں ہیں بلکہ کئی ہیں۔ صلواۃ کا لفظ جسکی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اس نسبت کے اعتبار سے صلواۃ کے معنی متعین ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں صلواۃ کی نسبت کبھی اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ کہیں فرشتوں کی طرف کی گئی ہے۔ اور کہیں مومنین کی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً قرآنِ شریف کی آیت " إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿الأحزاب:٥٦﴾ " ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ بے شک اللہ پیغمبر پر رحمت (درود) بھیجتا ہے اور فرشتے بھی رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ اور اے ایمان والوں تم بھی نبی پر درود بھیجو اور کثرت سے سلام بھیجو (سورۂ احزاب) اسی طرح اسی سورۂ احزاب میں ہے " هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ﴿الأحزاب:٤٣﴾ " وہی اللہ تو ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اسی طرح فرشتے بھی تاکہ اللہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ یہاں یصلی یا یصلّون یا صلّوا سے مراد نماز پڑھنا نہیں ہے۔ بلکہ رحمت بھیجنا ہے۔ یا اللہ سے رحمت بھیجنے کی دعا کرنی ہے۔ صلواۃ کا لفظ جب اللہ کی طرف منسوب ہو تو اسکے معنی رحمت بھیجنے کے ہوتے ہیں۔ اور

فرشتوں کی طرف ہو تو بھی رحمت کی دُعا کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور بندوں کی طرف ہو تو درود و سلام بھیجنے کے ہوتے ہیں۔ پس اس حدیث میں جو "فان ربك يصــلّى في المحراب" آیا ہے۔ اسکے معنی یہ نہیں کہ اللہ محراب میں نماز پڑھ رہا ہے۔ جیسا کہ بعض عام لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی ہیں کہ اللہ بطور خاص آپ پر متوجہ ہے۔ آپ پر اپنی رحمتِ خاص بھیج رہا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ تک تو جبرئیلؑ ساتھ تھے اسکے بعد آپ اکیلے ہی بڑھتے گئے آگے کی طرف بڑھنے کیلئے ایک خاص استعداد کی ضرورت تھی۔ اور اس کیلئے خاص الخاص توجہ کی ضرورت تھی۔ خاص رحمت کی ضرورت تھی۔ اس کیلئے ارشاد فرمایا گیا۔

"فان ربك يصــلّى في المحراب" اس طرح صلّی جو نماز کے معنی میں آتا ہے اس کا صلہ After Position جب بدلتا ہے تو اسکے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ جیسے اگر بندہ کہے اُصلی للّٰہ تعالیٰ تو اسکے معنی ہیں۔ میں اللہ کیلئے نماز پڑھتا ہوں اور اگر بندہ کہے اُصِلّی بالناس تو اسکے معنی ہیں۔ میں لوگوں کو نماز پڑھاتا ہوں۔ اور اگر کہے "اُصِلّی علیه" تو اسکے معنی ہیں۔ میں اسکی نمازِ جنازہ پڑھتا ہوں۔

قرض

جب کوئی آدمی کسی ضرورت پر کسی سے کچھ روپیئے لیتا ہے اس وعدہ کے ساتھ کہ وہ اس مدت میں جس کو وہ بیان کرتا ہے، واپس لوٹا دیگا تو اسکو قرض کہتے ہیں۔ اور لینے والے کو چاہئے کہ اس مدت کے ختم ہونے پر اسکو وہ روپئے واپس لوٹا دے اور اس کا شکریہ ادا کرے۔ اس معاملہ میں رقم جتنی لی تھی اتنی ہی لوٹانی پڑے گی۔ درمیانی مدت یا بعد ختم مدت کچھ زیادہ رقم کی ادائی کی شرط سود کہلائے گی۔ اور سود قرآن کے حکم سے حرام ہے۔ البتہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اگر خوش حال آدمی کسی دوسرے کو جو تنگدست ہے، اسکے مطالبہ پر اگر اس کے پاس دینے کی قوت وطاقت ہے جو مالی امداد کی جاتی ہے تو اسکو قرض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اللہ نے اسکو قرض حسنہ کے نام سے یاد کیا ہے جس کی تعریف قرآن میں آئی ہے چنانچہ اللہ فرماتا ہے۔ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّـهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ﴿البقرہ:۲۴۵﴾ ترجمہ: کون شخص ہے ایسا جو اللہ کو اچھا قرض (قرض حَسَن) دیتا ہے تو اللہ اسکو کئی گنا زیادہ کرتا ہے۔

قرض حسنہ ایسے قرض کو کہتے ہیں جو قرض دے کر (۱) تقاضانہ کرے (۲) قرض لینے والے پر احسان نہ جتائے۔ (۳) اس سے کوئی بدلہ نہ چاہے (۴) اُسے حقیر نہ سمجھے۔

لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ معاملہ الٹ گیا ہے، لوگ قرض لیتے وقت 'بکری' بن جاتے ہیں اور دیتے وقت 'بھیڑئے' بن جاتے ہیں۔ اکثر دشمنیاں قرض سے ہو جاتی ہیں، چناچہ عربی کا مشہور مقولہ ہے "القرض مقراض المحبة" یعنی قرض محبت کی قینچی ہے۔ قرض لینے والوں کو چاہئے کہ وہ اس بات پر دھیان دیں کہ قرض کی ادائی اس پر واجب ہے، وہ اگر یہاں نہ دیگا تو قیامت کے دن بہر صورت اس کو ادا کرنا پڑیگا۔ اسکی صورت یہ ہوگی کہ یا تو اسکی نیکیاں 'دائن' کو دی جائیں گی یا 'دائن' کی برائیاں 'مدیون' کے حصّے میں آئیں گی۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حضور ایک جنازہ لایا گیا تاکہ نماز جنازہ پڑھی جائے، حضورؐ نے اچانک دریافت فرمایا کہ کیا اس میت پر کسی کا قرض ہے؟ کہا گیا کہ ہاں، حضور ﷺ نے فرمایا، کیا کوئی اس کو ادا کریگا؟ جواب میں خاموشی تھی، حضور ﷺ نے فرمایا، تم لوگ اس کی نماز جنازہ پڑھ کر، دفن کردو۔ مطلب یہ کہ حضورؐ نے اسکی نماز جنازہ نہیں پڑھی اور وہ آپؐ کی امامت سے محروم رہ گیا۔ حالانکہ اللہ نے آپؐ کو قرآن شریف میں حکم دیا ہے کہ " صَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴿التوبة:۱۰۳﴾"، آپ ان کی نماز جنازہ پڑھئے کیونکہ آپ کی نماز جنازہ (میں ان کے حق میں دعا) ان کے حق میں سکون کا باعث ہے۔

قدمبوسی

قدم بوسی کے معنی ہیں قدم کو چومنا۔ جس طرح دستِ بوسی کے معنی ہیں ہاتھ کو چومنا۔ یہ سوال مدّت مدید سے کیا جاتا ہے کہ کیا قدم بوسی کا عمل جائز ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمل سجدہ کے مشابہ ہے۔ دست بوسی کے تعلق سے اعتراض نہیں ہوتا اس لئے کہ دست بوسی کے معنی ہیں کسی بزرگ یا عالم یا مرشد کے دونوں ہاتھوں کو لینا۔ ان کو اپنے منھ سے لگا کر چومنا۔ اس طرح قدم بوسی کے معنی ہوتے ہیں کسی بزرگ کے قدموں پر منھ کو رکھ کر چومنا۔ اب بتایئے کہ کہیں یہ عمل ہو رہا ہے کہ کوئی مرید اپنے مرشد کے قدموں پر اپنے منھ کو رکھ کر چوم رہا ہے۔ یہ تو بالکل ایک جھوٹ اور خلاف واقعہ بات ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ کچھ فاصلے سے ہی ذرا ٹیڑھے ہو کر قدمبوسی عرض ہے کہہ دیتے ہیں۔ اب تو خطوط کے ذریعہ اور فون کے ذریعہ بھی قدمبوس کہہ دیتے ہیں حالانکہ مرشد کے قدم کہاں ہیں اور کہنے والا شاید کرسی پر بیٹھا ہو یا بستر پر لیٹا ہو، اس کے جواز کے بارے میں علماء نے ایک حدیث سے استدلال کیا ہے۔ جو مشکوٰۃ شریف میں آئی ہے۔

عن ذراع وكان في وفد عبد القيس قال لمّا قدمنا المدينة فجعلنا نتبادر من رواحلنا فنقبلُ يد رسول الله ﷺ ورجله۔ ترجمہ: حضرت ذراع سے روایت ہے اور یہ وفد عبد القیس میں تھے فرماتے ہیں کہ ہم جب مدینہ (منورہ) آئے تو اپنی سواریوں سے اترنے میں جلدی کرنے لگے پس ہم حضور ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں چومتے تھے۔ (باب المصافحہ والمعانقہ)

اسی مشکواۃ میں باب الکبائر وعلامات النفاق میں حضرت صفوان ابن عسّال سے روایت ہے فقبّل يديه ورجليه۔ پس انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر چومے۔ اگر یہ ناجائز ہوتا تو خود آنحضرت ﷺ ان کو منع فرمادیتے۔ چنانچہ اشعۃ اللمعات میں شاہ عبد الحق محدّث دہلوی نے اسکی شرح میں لکھا ہے "ازیں جا تجویز پائے بوسی معلوم شد (اشعۃ اللمعات ترجمہ مشکوٰۃ جلد رابع ص ۲۷)۔ ترجمہ: یہیں سے قدم بوسی کی اجازت معلوم ہوئی۔ پھر لکھتے ہیں در بعضے احادیث بوسیدن بعضے از صحابہ پائے آں سرور ﷺ آمدہ چنانکہ در فصل ثانی از حدیث وفد عبد القیس بیاید۔

بعض احادیث میں بعض صحابہ کا حضور کے پاؤں چومنے کی روایت آئی ہے جیسا کہ فصل ثانی میں وفد عبد القیس کی روایت آئے گی۔ اور خوبی کی بات یہ ہے آنحضرت ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا۔

نیز حضرت صہیب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عباسؓ کے پیروں کو چومتے تھے (اخرج البخاری فی الادب صفحہ ۱۴۴) ماخوذ از حیات الصحابہ صفحہ ۵۸۵ حصّہ ششم مولفہ، جناب محمد یوسف صاحب کاندھلوی)

یہ فعل دراصل ایک اضطراری فعل ہے جیسا کہ آپ کسی مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں، شعراء اپنا کلام سناتے ہیں ایسے میں جب کسی شاعر کا کوئی شعر مضمون، مطلب اور بندش کے اعتبار سے بڑھیا اور دل کو چھو لینے والا ہوتا ہے تو سارا مجمع واہ واہ سبحان اللہ کیا بات ہے، دوبارہ ارشاد وغیرہ کہتا ہے۔ سننے والوں اور داد دینے والوں کے ہاتھ خود بخود اُٹھ جاتے ہیں۔ لوگ جھومنے لگ جاتے ہیں بعض لوگ تو گھٹنوں پر کھڑے ہو کر شعر کی اور شاعر کی تعریف کرتے ہیں اور سراہتے ہیں گویا یہ سارا عمل کسی پلان یا منصوبے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ دل و دماغ کو متاثر کرنے والے ایک بے ساختہ جذبے کے تحت ہوتا ہے۔ اسی طرح جب مرشد کی خدمت اور صحبت میں بیٹھتے ہیں، دینی مسائل پر عموماً اور طریقت و معرفت کے عناوین پر خصوصاً گفتگو ہوتی ہے یا کچھ اشکالات پیش ہوتے ہیں اور مرشد جب تفہیم کرتے ہیں اور دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے تو فوراً ہاتھ مرشد کے قدموں کی طرف بڑھ جاتے ہیں اور قدم بوسی کر لی جاتی ہے گویا یہ اس بات کا اظہار اور اعتراف ہے کہ یہ نکات اور اسرار حضرت کے قدموں کی برکت سے نصیب ہوئے ہیں یا مرید، مرشد کی صحبت میں رہ کر پہلے دائرہ دین میں آتا ہے پھر وہ سلوک کے مقامات طے کرتے ہوئے ناسوت سے نکل کر ملکوت، جبروت اور لاہوت کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ جو ترقی ہو رہی ہے مرشد کے قدموں میں بیٹھنے سے ہی ہو رہی ہے پس وہ مرشد کے قدموں کو ہاتھ لگا کر اپنے ہی ہاتھوں کو چوم لیتا ہے۔ درحقیقت یہ اپنے ہی ہاتھوں کو چومتا ہے مگر پہلے ان ہاتھوں کو مرشد کے قدموں سے مس کرتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو جب یہ معلوم ہوتا کہ فلاں صحابی نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے تو وہ ان کے پاس جاتے اور ان کے ہاتھوں کو نہ صرف چومتے بلکہ ان کو اپنے سروں پر رکھتے۔ ان کے ہاتھوں کو چھوتے اور اپنے منہ اور سینوں پر رکھ لیتے تھے۔ جن روایتوں میں حضور کے تعلق سے یہ آیا ہے کہ جب بعض صحابہ نے اجازت چاہی کہ قدم بوسی کریں تو آپ نے منع فرمادیا۔ تو یہ حضور کی جانب سے کسر نفسی کا معاملہ تھا۔ اب رہی بات سجدہ کی یا سجدہ سے مشابہت کی۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ سجدہ کی تعریف کیا ہے۔ اور اس کے کیا احکام ہیں؟

شریعت میں سجدہ یہ ہے کہ زمین پر سات اعضاء رکھیں۔ دونوں پنجے، دونوں گھٹنے، دونوں ہاتھ اور چہرہ (ناک اور پیشانی) پھر اس میں سجدہ کی نیت ہو۔ اگر سجدہ کی نیت کے بغیر کوئی شخص زمین پر اوندھا پڑ جائے تو وہ سجدہ نہیں ہوتا۔

اور اگر کوئی شخص جھکتا ہو کسی کام کے لئے اور وہ کام تعظیم کیلئے ہے۔ جیسے کسی بزرگ کی جوتیاں سیدھی کرنا یا اس کے پاؤں چومنا کہ اس میں بھی اگرچہ جھکنا ہے مگر جوتے سیدھے کرنے اور پاؤں چومنے کے لئے ہے اور وہ کام تعظیم بزرگ کے لئے ہے یہ حلال ہے اور جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ چومنا الگ ہے اور پوجنا الگ ہے چومنے کو سجدہ نہیں کہا جاتا۔ البتہ پوجنا یقیناً سجدہ ہے

جو غیر اللہ کے لئے بغرض عبادت حرام ہے (شریعت وطریقت۔ جناب اشرف علی تھانوی)

نیز یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حدیث کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا۔ یا آپ نے جو کیا۔ یا آپ کی موجودگی اور حاضری میں کسی نے کچھ کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔

اس تعریف کی رو سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وفد بنو عبد القیس نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں چومے (اور آنحضرت ﷺ نے اس عمل پر نکیر نہیں فرمائی) اب رہی یہ بات کہ آنحضرت نے ان لوگوں کو سجدہ کرنے سے منع فرمایا جو تعظیماً ہی سہی آپ کے لئے کرنا چاہتے تھے وہ حکم اپنی جگہ برحق ہے اس لئے کہ اس میں سجدہ کا لفظ موجود ہے۔ اسی طرح آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر غیر اللہ کے لئے سجدہ روا ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ یہاں لفظ ''سجدہ'' نمایاں ہے۔ ایسی روایتوں سے قدمبوسی کے عدم جواز پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ حاشا وکلا ہمارا مقصد اس سے قدمبوسی کو رواج دینا نہیں ہے۔ السلام علیکم و رحمة الله و برکاته بہترین دعاء اور تحیت ہے لیکن قدمبوسی جو خاص لوگوں کے لئے کی جاتی ہے وہ اپنی جگہ پر ہے، مخصوص لوگوں کیلئے اور مخصوص اوقات کے لئے ہے۔

قرآن

قرآن اللہ تعالیٰ کا وہ مقدس کلام ہے جسے اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ (۲۳) سال میں نجمًا نجمًا (بذریعہ وحی) نازل فرمایا۔ اسکی پہلی پانچ آیتیں غار حرِا میں نازل ہوئیں پھر وقتاً فوقتاً حسب ضرورت و حسب منشاءِ خداوندی آیتیں نازل ہوتی رہیں۔ قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اسی پر تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہی قرآن کے بہت سے نام بتائے ہیں چنانچہ سورۂ بقرہ کی پہلی آیت میں ہی اللہ نے اسے کتاب کے نام سے یاد کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴿البقرۃ:۲﴾۔ وہ کتاب جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے (مزید فرماتا ہے) وہ اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے ہدایت (دینے والی) ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿یونس ۵۷﴾ اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت آچکی ہے اور وہ دلوں کے روگ کی شفاء ہے۔ اور مومنین کے لئے ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) قرآن لوگوں کو اچھی باتوں کی نصیحت کرتا ہے

(۲) قرآن دلوں کی بیماریوں کیلئے شفا ہے

(۳) قرآن ایمان والوں کے لئے ہدایت ہے۔ ایک دوسرے مقام پر بھی اللہ نے قرآن کو ذریعہ ہدایت بتایا ہے چنانچہ ارشاد ہے إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ ﴿الإسراء:۹﴾ بے شک یہ قرآن اس راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو بہت سیدھا ہے

(۴) قرآن مومنین کے لئے رحمت ہے۔

قرآن کا ذکر قرآن شریف میں ۶۸ مقامات پر آیا ہے کہیں القرآن آیا ہے اور کہیں قرآناً آیا ہے۔

قبلہ

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بیت المقدس ہی قبلہ تھا۔ یعنی اسکی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، عبادت کرتے تھے۔ گویا پیغمبروں کو ماننے والی امتیں ہی لوگوں کی امام تھیں۔ اور اس مقام کو ہی مرکزیت حاصل تھی۔ خود آنحضرت ﷺ بھی مدینہ تشریف لیجانے کے ۱۶ یا ۱۷ مہینے بعد تک بھی بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ مگر آنحضرت کی یہ تمنا تھی، دلی خواہش تھی کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنادیا جائے جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ قَدْ نَرٰىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴿البقرۃ:۱۴۴﴾۔ ترجمہ: ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا منہ آسمان کی طرف اُٹھ رہا ہے پس ہم اس قبلے کی طرف تمہیں پھیر دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ پس تم اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔

اہل کتاب یہ اعتراض کرنے لگے کہ پہلے قبلے سے کیوں منہ پھیر لیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ اللہ نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں بلکہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اللہ کسی سمت و جہت میں نہیں ہے۔ بندوں کا کام حکم الٰہی کی پابندی کرنا ہے۔ جب تک توریت وانجیل زبور وغیرہ قابل عمل تھیں ان کے ماننے والوں کے لئے انکا قبلہ وہ تھا جو ان پیغمبروں کے لئے مقرر کیا گیا تھا تا کہ ان کی سرداری کا اور اس مقام کی مرکزیت کا اعلان ہوتا رہے۔ لیکن وہ کتابیں منسوخ اب ہو گئیں اور خاتم النبیین تشریف لا چکے تو اب سرداری حضور کی اور حضور کے ماننے والوں کی ہو گی اور مرکزیت کی جگہ وہ ہو گی جسے اللہ نے حضور کے لئے اور حضور کی امت کے لئے حضور ہی کی پسند کے مطابق مقرر فرمایا ہے۔ گویا قبلہ کی تحویل کے ذریعہ اس امر کا اعلان ہے کہ قوموں کی سرداری منتقل ہو چکی ہے مسلمانوں کی طرف اور دین کا مرکز بھی اب بیت المقدس نہیں ہے بلکہ کعبۃ اللہ ہے۔

ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کے جلوے تو ہر جگہ پر ہیں۔ مگر خاص تجلّیات کا مرکز اب کعبۃ اللہ ہی ہے ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابراہیمؑ کا قبلہ کعبۃ اللہ ہی تھا۔ بعد میں جب عرب میں بت پرستی شروع ہو گئی تو اللہ نے پیغمبروں کو فلسطین شام وغیرہ کے خطوں میں مبعوث فرمایا تو بیت المقدس کو اس وقت کے حالات کے تحت قبلہ بنایا گیا وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں گویا خانہ کعبہ کی تعمیر کے تیرہ سو سال بعد بیت المقدس کی تعمیر ہوئی۔ پھر جب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عرب میں (مکہ) ہوئی تو پھر کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا اس لئے کہ دینی سلطنت کا پایہ تخت کعبۃ اللہ ہی تھا۔ الٰہی احکام کا نزول رسول اللہ ﷺ پر ہی ہوتا تھا اور حضور کا مقام بھی نبوت ملنے کے بعد (۱۳) تیرہ سال تک مکہ مکرمہ ہی رہا۔ اسکے بعد حضور کو حالات کے تحت مدینہ کو ہجرت کرنی پڑی لیکن "بیت اللہ" تو مکہ ہی میں رہا۔ اس لئے کہ وہی دارالسلطنت اسلامیہ ہے۔ جو

تبدیل نہیں ہو سکتا کیوں کہ آنحضرت ﷺ ہی خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد چونکہ کسی نئے نبی کے آنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اس لئے دارالسلطنت الٰہیہ کی تبدیلی کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ مختلف پیغمبروں کے زمانے میں قبلے بھی بدلتے رہے۔ جیسا کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے لِکُلّ وِجْھۃٌ ھُوَ مُوَلِّیھا۔ یعنی ہر قوم (پیغمبر صاحب شریعت) کے لئے ایک رخ (قبلہ) ہے کہ وہ اسی کی طرف اپنا منہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہود کا قبلہ "صخرہ بیت المقدس" تھا اور نصاریٰ کا قبلہ بیت المقدس کی مشرقی جانب تھا جہاں عیسیٰؑ کا نفخ روح ہوا تھا۔

کعبۃ اللہ کو مسجد حرام اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہاں قتل و قتال کرنا۔ جانوروں کا شکار کرنا اور وہاں کی گھاس درخت وغیرہ کاٹنا حرام ہے۔ اور کسی مسجد کی اتنی حرمت اور عزت نہیں جتنی کہ اس مسجد کی ہے۔ جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو آپ مسجد بنی سلمہ میں باجماعت ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ دو رکعت نماز بیت المقدس کی طرف پڑھ چکے تھے۔ جب نماز ہی میں وحی آئی تو آپ نے اور آپکی اقتداء میں سب نے کعبہ کی طرف منھ پھیر لیا۔ اور باقی دو رکعتیں پوری کیں۔ اس مسجد کا نام مسجد القبلتین یعنی دو قبلوں والی مسجد ہو گیا۔

ویسے قبلہ کی تبدیلی کے تعلق سے وحی ایسے وقت آئی جبکہ ظہر کی نماز آپ ﷺ پڑھا رہے تھے دو رکعتیں ہو چکی تھیں۔ تیسری رکعت میں آپ کعبۃ اللہ کی طرف پھر گئے مگر ظاہر ہے کہ آپ کا امام ہونے کی حیثیت سے صرف پلٹ جانا کافی نہیں تھا۔ ایسی صورت میں امام سب مصلیوں بلکہ مقتدیوں کے پیچھے ہو جاتا اس غرض کیلئے آپ کو چل کر مقتدیوں کے آگے جانا پڑا۔ اسی طرح مصلیوں کو بھی تھوڑا بہت ہٹ کر یا چل کر اپنا منھ کعبہ کی طرف کرنا پڑا۔ لیکن چونکہ یہ سب وحی الٰہی کے مطابق تھا اسی لئے ان حرکتوں سے کسی کی نماز نہیں ٹوٹی۔ بیت المقدس مدینہ سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔

پھر یہ کہا گیا کہ تم جہاں کہیں رہو اپنا منہ کعبہ کی طرف (نماز کیلئے کرو) اس کا مطلب یہ ہے کہ تم شہر میں ہو، گاؤں میں ہو سفر میں ہو حضر میں، جنگل میں ہو کہ سمندر میں (اسی طرح فضاء میں) نماز کے لئے اپنا منھ کعبہ کی طرف کرو۔ اگر کعبہ کی سمت جنگل وغیرہ میں معلوم نہ ہو سکے تو یا تو وہاں کے مقامی لوگوں سے دریافت کر لینا چاہئے کہ سورج کس سمت میں غروب ہوتا ہے یہ ہندوستان پاکستان وغیرہ کے باشندوں کے لئے ہے اس لئے کہ ہمارا قبلہ اسی طرف ہے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو تحرّی کرنا چاہئے یعنی اپنے طور پر قیاس کرنا چاہئے کہ قبلہ کس سمت میں ہو سکتا ہے۔ پس جدھر خیال غالب ہو، ادھر منہ کر کے نماز پڑھ لینی چاہئیے۔ نماز صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر بعد نماز کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ تحری کے بعد جو نماز پڑھی گئی تھی وہ سمت صحیح نہیں تھی تو نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہ ہو گی۔ اور اگر بغیر تحری کے نماز پڑھ لی گئی ہو بعد میں پتہ چلا کہ ہم نے غلط سمت میں

نماز پڑھی ہے تو نماز کا اعادہ ضروری ہو گا اس لئے قبلہ کا تعین فرض ہے۔

تعین قبلہ کا مقصد ساری دنیا کے مسلمانوں کو صرف ایک مرکز کی طرف متوجہ کر دینا ہے اور وہ ہے کعبۃ اللہ۔ مگر خیال رہے کہ جہت کعبہ کے طرف منھ کرتے ہوئے بھی سجدہ صرف اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ اگر کسی نے کعبہ کی مقابل کھڑے ہو کر یہ تصور کرے کہ میرا یہ سجدہ کعبۃ اللہ کو ہے اسکی نماز صحیح نہیں ہو گی اسی لئے نماز کی نیت میں متوجھا الی جھۃ الکعبۃ الشریفۃ کہا جاتا ہے۔ اور اگر جہت قبلہ کی طرف منھ کرنا متعذر ہو تو جس طرف ممکن ہو ادھر منھ کر کے نماز پڑھ لینی چاہئے۔ اس بہانے سے نماز کو قضا نہیں کرنا چاہئے۔

قضاء وقدر

قرآن شریف میں تقدیر کا ذکر متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ مثلاً:

(۱) وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿الحجر ۲۱﴾۔ ترجمہ: کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

(۲) إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿القمر ۴۹﴾ ترجمہ: ہم نے ہر چیز ایک مقدار کے ساتھ پیدا کی ہے۔

(۳) وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا ﴿فصلت: ۱۰﴾ ترجمہ: اس (زمین) کے اندر برکتیں رکھ دیں اور اسکے اندر ٹھیک اندازسے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔

(۴) وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ ﴿یس: ۳۹﴾ ترجمہ: اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقدر کر دی ہیں۔

(۵) وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ﴿الفرقان ۲﴾ ترجمہ: ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسکی ایک تقدیر مقرر کی

(۶) وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ ﴿الرعد ۸﴾ ترجمہ: ہر چیز کے لئے اس کے پاس ایک مقدار ہے۔

ان آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر یعنی تقدیر سے مراد وہ ضوابط اور قواعد ہیں جو اللہ نے اس کائنات کیلئے مقرر فرمائے ہیں۔ اور وہ نظم و نسق سے جس کے مطابق یہاں کا سارا نظام چل رہا ہے اور وہ قوانین طبعیہ ہیں جو یہاں جاری وساری ہیں۔ گویا یہاں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے ایک مقرر اور معین اندازے کے مطابق پیدا کیا گیا ہے اور ہر چیز کا ایک خاص تناسب رکھا گیا ہے۔ بنا بریں جو چیز بھی یہاں موجود ہے اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کی مقدار اس کے ذرات (Atoms) کی تعداد اور ان عناصر کی نوعیت، کیفیت اور کمیت طے کر دی گئی ہے جن سے وہ مرکب ہے۔ نیز یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا

ہے ایک عنصر کے دوسرے عنصر سے ملنے کی صورت میں کیا چیز وجود میں آئے گی اور علیحدہ ہونے کی صورت میں کیا نتیجہ بر آمد ہو گا۔ نیز اس پر طاری ہونے والی حرکت وسکون کی کیفیتوں کا اندازہ بھی ازل ہی سے متعین اور مقرر کر دیا گیا تھا۔

قضا اور قدر کا فرق اور اسکی مثال "وللہ المثل الاعلیٰ" موجودہ دور میں جو عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں ان پر ایک تحریر آویزاں کر دی جاتی ہے کہ اس کا نقشہ اور اسکیم فلاں انجینیر کی تیار کردہ ہے۔ اور تعمیراتی کام کا اہتمام اور تیاری کی نگرانی فلاں ٹھیکیدار کی ہے۔ گویا انجینیر نقشہ تیار کرتا ہے، تعمیر کی بلندی متعین کرتا ہے۔ دیواروں کا حجم مقرر کرتا ہے اور اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ کتنا لوہا، سیمنٹ اور اینٹوں وغیرہ کا استعمال ہو گا۔ نیز ان کا باہمی تناسب (Ratio) کیا ہو گا۔ اس میں کتنی کھڑکیاں، دروازے اور روشندان ہونے چاہیں۔ یہ تو گویا "تقدیر" ہے۔

اور ٹھیکیدار، انجنیر کی مقرر کردہ مقداروں کو عملی شکل دیتا ہے اور عمارت کھڑی کر دیتا ہے یہ قضا کی مثال ہے۔ کائنات کے معاملے میں یہ دونوں امور یعنی قضا اور قدر، محض حق تعالیٰ کے اختیار اور قبضے میں ہیں۔

اب جس طرح ایک انجینیر کو اختیار ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تعمیر کی بعض تفصیلات میں جزوی ترامیم کر سکے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت بے پایاں سے دعا اور صدقہ وغیرہ کو بعض مقدارات اور مقدرات میں ردوبدل کا ذریعہ بنادیا ہے اور وہ بھی تقدیر ہی ہے۔ یعنی تقدیر طے کرنے کا اختیار کامل بھی صرف اسی کو ہے اور صدقہ ودعا کے ذریعہ اس میں تغیّر وتبدّل کی قدرت بھی محض اسی کی مشیت مطلقہ کو حاصل ہے۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ تقدیر کے عام معنی ہیں جو عام طور پر مراد لئے جاتے ہیں۔ اور ان کا اطلاق تمام موجودات پر ہوتا ہے۔ مگر چونکہ مخلوقات میں سے ایک مخلوق انسان بھی ہے۔ اور اسی انسان بلکہ حضرت انسان کی وجہ سے یہ مسٔلہ تقدیر کچھ الجھ جاتا ہے۔ یعنی وہ مسٔلہ جس سے سارا جھگڑا پیدا ہوتا ہے انسان کے ثواب وعذاب کا مسٔلہ ہے۔ اس پر طرح طرح کی بحثوں اور مناظروں کے دروازے کھل گئے اور اسی پر بحث کرتے ہوئے لوگوں نے بال کی کھال اُتارنے کی کوشش کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب ہر وقوع میں آنے والا واقعہ پہلے سے لکھا ہوا ہے اور اللہ کے علم میں پہلے سے موجود ہے۔ اور اللہ کی سنت بدل نہیں سکتی تو پھر ثواب وعذاب کے کیا معنی؟؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ہم یہ دیکھیں کہ انسان کیا ہے۔ اور اللہ کی قدرت وصفات کیا ہیں؟

انسانی زندگی کے دو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں (۱) انسان آزاد وخود مختار ہے (۲) انسان مجبور ہے۔

(۱) انسان آزاد و خود مختار ہے: انسان کے پاس عقل ہے جسکی وجہ سے وہ مادی معاملات میں فیصلے کرتا ہے۔ خیر وشر، صحیح و غلط میں امتیاز کرتا ہے، پھر اُسے قوت ارادہ دی گئی ہے جس کی بناء پر اُسے قدرت حاصل ہے کہ خیر وشر میں جس پر چاہے عمل کرے۔ چنانچہ ہر صاحب عقل انسان یہ ادراک رکھتا ہے کہ نماز نیک کام ہے اور زنا بدکاری ہے۔ اور انسان میں یہ قدرت بھی ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر جائے تو دائیں جانب مسجد کی طرف جائے اور نماز ادا کرے یا بائیں جانب بدکاری کے اڈے کی طرف جائے اور زنا کا ارتکاب کرے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ اس میں کسی کو شک ہو سکتا ہے؟

اسی طرح اگر میرے ہاتھ صحیح وسالم ہوں تو میں انہیں اپنے اختیار سے اُٹھا سکتا ہوں اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اب ان صحیح وسالم ہاتھوں کو اُٹھا کر میں کسی فقیر کو خیرات کے طور پر روپیئے بھی دے سکتا ہوں اور انہی ہاتھوں سے کسی بے گناہ کو ڈنڈا بھی مار سکتا ہوں۔ کیا یہ بھی ایک واقعہ نہیں ہے۔ فقیر کو خیرات دینا ایک نیکی ہے جس کی وجہ سے انسان ثواب کا مستحق ہو گا (جس کے تعلق سے وعدہ کیا گیا ہے) اور دوسرا عمل یعنی بے گناہ کو مارنا ایک بُرا کام ہے جو باعث سزا و عذاب ہے۔

اسی طرح ایک طالب علم اگر چاہے تو اپنی راتیں کھیل و تفریح میں گذارے اور چاہے تو کتابوں کا مطالعہ اور امتحان کی تیاری کرے۔ اگر یہ بات درست ہے تو کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ کھیل کود میں وقت ضائع کرنے والا طالب علم کا فیل ہونا ظلم ہے یا محنت کرنے والے طالب علم کی کامیابی ناانصافی ہے۔

(۲) انسان مجبور ہے: اب دوسرا پہلو انسانی زندگی کا یہ ہے کہ انسان مجبور ہے۔ میں اپنے ہاتھ کو اس بناء پر حرکت میں لا سکتا ہوں کہ اللہ نے اس کے عضلات ایسے بنائے ہیں کہ وہ میرے ارادے کے تابع ہیں۔ جس طرف چاہوں حرکت دے سکتا ہوں (اس میں بھی فرق یہ ہے کہ ہاتھ سامنے سے مڑتے ہیں اور پاؤں پیچھے کی طرف) یہاں انسان آزاد بھی ہے اور مجبور بھی ہے لیکن کیا انسان اپنے دل و دماغ یا معدے کے عضلات پر بھی اپنا حکم چلا سکتا ہے؟؟

اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ تو مختار کل ہے نہ مجبور محض ہے۔ ہاں انسان ان تمام معاملات میں جو بشری حدود کے اندر ہیں آزاد اور مختار ہے۔ اور انسان اگر بعض معاملات میں یا بعض حالات میں مجبور ہے تو اس سے اسکی صفت اختیار کی نفی نہیں ہوتی جس طرح کہ کار اور پتھر کے درمیان یہ فرق ہے کہ کار کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ چل نہیں سکتی۔ مگر اس کا چلنا انجن کی قوت اور طاقت برداشت کے مطابق ہو گا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سیڑھیوں پر چڑھ جائے یا دیوار پھاڑ دے۔ وہ صرف سڑک پر چل سکتی ہے۔ اب اگر اسکی راہ میں کوئی رکاوٹ آجائے جس سے وہ آگے چل نہ سکے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں چلنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور وہ پتھر ہے۔ کار کار ہی رہے گی۔ نہ چلنے کے اسباب عارضی اور

خارجی ہیں۔

اسی طرح انسان کو زندگی میں ایسے کئی عوارض لاحق ہو جاتے ہیں جو اسکی قوت ارادہ کو معطل کر دیتے ہیں۔ یا ایسی رکاوٹیں پیش آجاتی ہے یا ایسے موانع اثر انداز ہوتے ہیں جن کو دور کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ آزاد اور خود مختار بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ انسان ہے اور اپنے حدود بشری کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے اختیارات کو استعمال کر سکتا ہے خدا نہیں کہ جو چاہے کر سکے۔ ثواب و عذاب اختیار کے ساتھ ہے۔

اگر انسان سے فی الواقع اس کا اختیار چھن جائے تو وہ مستحق عذاب و سزا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص کسی جرم پر مجبور کر دیا جائے تو اُسے سزا نہیں دی جائے گی (جیسے قرآن میں شرک جیسے عظیم گناہ کے بارے میں آیا ہے۔ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ ﴿النحل:١٠٦﴾۔ یعنی شرک گناہ عظیم ہے لیکن جس شخص کو مجبور کر دیا جائے وہ بظاہر کلمہ کفر کہدے لیکن اس کا دل توحید پر مطمئن ہے تو اسکو چھوٹ دی جائیگی) یہی وجہ ہے کہ انسان اگر نیکی کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے اور اگر بدی کرتا ہے تو وہ سزا پاتا ہے۔

علماء علم کلام نے سب سے بڑی ٹھوکر یہ کھائی ہے کہ انہوں نے اللہ کے عدل کو انسانی عدل پر قیاس کر لیا ہے۔ اور اسکے عدل مطلق کو انسانی پیمانوں سے ناپا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں جس چیز کو ظلم سمجھ رہا ہوں وہ در حقیقت "عین عدل" ہو ایک بیمار بچہ انجکشن کی سوئی کو جو ڈاکٹر اس کے جسم میں داخل کرتا ہے ظلم سمجھتا ہے حالانکہ یہ عمل اس کے باپ کے نقطۂ نگاہ سے عدل ہے۔ دراصل انداز فکر کا فرق ہے۔ بچہ اس درد کو دیکھتا ہے جو ٹیکہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور باپ کی نظر اس فائدے پر ہے جو اس ٹیکے سے بچے کو پہنچنے والا ہے۔ ہم انسان اکثر کسی معاملہ کا صرف ایک پہلو دیکھتے ہیں اور ناقص معلومات کی بناء پر غلط فیصلے صادر کر دیتے ہیں۔ مثلاً آپ اور آپ کا ساتھی کسی صحرا میں تھک کر بیٹھ گئے ہوں۔ آپ کے پاس سے ایک کار گذرتی ہے۔ کار والا ازراہ ترحم آپ کو کار میں سوار کر لیتا ہے۔ اثناء راہ آپکا ساتھی جیب سے چاقو نکال کر کار کی گدیاں پھاڑ دیتا ہے۔ کیا آپ اس کی اس حرکت کو ظلم خیال نہ کریں گے۔ لیکن آپ کو معلوم ہو جائے کہ کچھ آگے راستے میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ بیٹھا ہے وہ جب ایک صحیح و سالم کار دیکھیں گے تو سب کچھ چھین کر کار بھی بھگا لے جائیں گے۔ لیکن اگر کار داغدار ہو تو وہ چھوڑ دیں گے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کیا آپ کا نقطۂ نظر بدل نہیں جائے گا اور آپ کے خیال میں یہ ظلم نہیں بلکہ عدل (اور احسان) نہ بن جائے گا۔ دراصل حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کی نوعیت بھی یہی تھی جب وہ موسیٰؑ کے ساتھ کشتی میں بیٹھے تھے اور حضرت خضرؑ نے کشتی کو داغدار کر دیا تھا۔ اس واقعہ کو اللہ نے قرآن میں اسی لئے بیان کیا ہے تاکہ ہم کو یہ سمجھائے کہ کسی واقعہ کے تمام پہلوؤں

پر غور کئے بغیر اور تمام معلومات حاصل کئے بغیر صرف ظاہری صورت کو دیکھ کر جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔

قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان مجبور ہے اُسے کوئی اختیار نہیں ہے۔ مثلاً

(۱) هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ﴿آل عمران ٦﴾ وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔ گویا وہ جنین مجبور محض ہے۔ نہ لڑکی ہو تو لڑکا بن سکتا ہے۔ نہ کالا ہو تو گورا وغیرہ وغیرہ

(۲) وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ﴿القصص ٦٨﴾ تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کا انتخاب کرلیتا ہے اس میں لوگوں کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح کائنات پر اثر انداز ہونے والے اسباب کا ذکر ہے جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔

(۳) أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿واقعہ: ٦٣ تا ٦٥﴾ کبھی تم نے سوچا یہ بھی کہ جو تم بوتے ہو ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں، ہم چاہیں تو ان کھیتیوں کو بھس بنا کر رکھ دیں۔

(۴) وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ﴿الانعام ١٧﴾ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اسکے سوائے کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے۔

(۵) یا وہ آیات جو کسی کے نیک یا بد ہونے کے ایسے اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو انسان کے بس میں نہیں ہیں۔ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴿الشمس: ٧، ٨﴾ نفس انسانی اور اس ذات کی قسم جس نے اُسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور اسکی پرہیز گاری اسی پر الہام کر دی۔

یا وہ آیات جن میں لفظ ہدایت تلقین و رہنمائی کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً۔ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴿البلد ١٠﴾ ۔ اور کیا ہم نے اسے دونوں راستے (نہیں) دکھائے

نیز یہ آیت: إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴿الانسان: ٣﴾۔ ہم نے اُسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ ان آیتوں سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ایسے امور پر انسان سے مؤاخذہ نہیں فرمائے گا جو اسکی قدرت اور بس میں نہیں ہیں۔ اور دراصل یہی وہ آیات ہیں جن پر صراط مستقیم سے انحراف کرنے والے فرقوں نے اپنے اپنے موقف اور مسلک کی بنیادیں اُٹھائی ہیں۔ قرآن میں کئی مقامات پر یہ حقیقت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ انسان کو ارادہ اور اختیار دیا گیا ہے۔ اور اسی ارداہ و اختیار کی بنا پر وہ ثواب و عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم پڑھتے

ہیں۔ یُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ﴿البقرہ۲۶﴾ اللہ (قرآن) سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھاتا ہے۔ تو یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ گمراہی اور ہدایت ایک طے شدہ معاملہ ہے۔ اللہ نے پہلے ہی سے اپنے بندوں میں سے بعض کیلئے گمراہی اور بعض کیلئے ہدایت اس طرح مقدر فرمادی کہ کچھ کو ہدایت دے دی اور کچھ کو گمراہ کر دیا۔

لیکن جب یہ آیت پڑھیں گے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴿البقرہ۲﴾۔ ہدایت ہے پرہیز گاروں کے لئے یا یہ آیت وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿البقرہ۲۶﴾۔ اور گمراہی میں وہ ان ہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ ہدایت و گمراہی اللہ کی طرف سے مسلّط نہیں کی جاتی بلکہ یہ دونوں امر کسی شخص کے اپنے اعمال و کردار کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ متقی ہے تو قرآن اسے ہدایت دے گا اور اگر وہ فاسق ہے تو وہ گمراہ ہو جائے گا۔ اس موقع پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مجھے کیا معلوم کہ اللہ نے مجھے متقیوں میں لکھا تھا یا فاسقوں میں لکھ دیا تھا۔ تو جب یہ آیات بھی پڑھیں گے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔

(۱) لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿البقرہ۳﴾ ہدایت ان پرہیز گاروں کیلئے ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا اس میں سے (راہِ اللہ) خرچ کرتے ہیں۔

(۲) إِلَّا الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّـهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّـهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ﴿بقرہ۲۷﴾۔ گمراہی میں ان ہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں اللہ کے عہد کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔

اب یہاں بات صاف ہوگئی کہ معاملہ مجبور کرنے کا نہیں ہے بلکہ ہدایت و ضلالت کا اصل تعلق انسان کے ان اعمال سے ہے جو اس کے اپنے اختیار، قدرت اور ارادے کے تابع ہیں۔

اسکے معنی یہ ہوئے کہ آپ یہ قدرت بھی رکھتے ہیں کہ غیب پر ایمان لائیں، نماز قائم کریں اور اللہ کی راہ میں خرچ بھی کریں۔ اور یہ طاقت بھی رکھتے ہیں کہ اللہ کے عہد کو توڑ دیں جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں قطع کر دیں اور زمین میں فساد برپا کریں گویا ان باتوں کے کرنے کی بھی قدرت آپ کو ہے اور ترک کر دینے کا بھی آپ اختیار رکھتے ہیں اب اگر آپ پہلی تین باتیں کرتے ہیں تو آپ متقی ہو جائیں گے اور ہدایت پانے کے مستحق اور اگر دوسرے تین اعمال کا ارتکاب کریں گے تو آپ فاسق کہلائیں گے اور گمراہی کے مستحق۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ بحث چھیڑتے ہیں کہ آیا جب کوئی شخص کسی بُرائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ کی مشیت سے کرتا ہے یا اسکی مشیت کے بغیر؟ کیا اس میں یہ قدرت تھی کہ ایسا نہ کرتا؟ کیا اپنے اعمال کا خالق انسان خود ہے؟ اسی قسم کے اور کئی مہمل اعتراضات جن پر علم کلام کی کتابوں میں بحثوں کے انبار لگے ہوئے ہیں یہ سب لاحاصل بحثیں ہیں۔

اصل اور بنیادی بات یہ ہے کہ خالق کو مخلوق پر۔ اللہ کو بندہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اور انسانی عقل، اللہ کی ذات، صفات اور افعال کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنے سے قاصر ہے۔ کوئی اس کے حضور یا اس کے کسی حکم یا کام پر "کیوں" اور "کیسے" کہنے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ ہمارے اعمال و افعال کا مؤاخذہ کرے گا۔

نیز یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ عادل مطلق ہے۔ اس کے عدل میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے ہمیں یہ اختیار بھی دیا ہے کہ ہم اپنے متعلق سوچیں۔ اللہ کی شان اور اسکی قدرت کو سوچیں یعنی اپنی عقل کا بہتر استعمال کریں۔ یہ بات تو بڑی مضحکہ خیز ہے کہ اللہ نے ہمیں عقل دی، اپنے احکام عطا کئے اور یہ فرمایا تم ذرا سوچو، غور و فکر کرو کہ ہدایت اور فلاح اس میں ہے یا نہیں تو ہم نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ہماری عقل کے مطابق تیرے احکام ناقابل عمل ہیں یا ان میں نقص ہے وغیرہ۔ گویا اللہ کی دی ہوئی عقل کو ہم نے اس کے ہی خلاف استعمال کر لیا۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ کسی نے آپ کو چھری دی کہ آپ سبزی، ترکاری اور گوشت یا پھل کاٹیں، لیکن آپ نے چھری دینے والے کو ہی کاٹ دیا اس سے بڑھ کر بد اخلاقی اور احسان فراموشی اور کیا ہو سکتی ہے۔

تقدیر کی حجت: بعض لوگ اپنے گناہوں کیلئے تقدیر کو حجت بناتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی زانی سے پوچھتے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرے مقدر میں ایسا ہی لکھا تھا۔ مگر ایسے جوابات انتہائی فضول اور لغو ہیں۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) حساب اور عذاب اعمال کی وجہ سے ہوگا یا پھر ان اسباب و وجوہ کو ملحوظ رکھا جائے گا جو کسی عمل کا باعث بنتے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ شخص جو تقدیر کو بہانہ بنا رہا ہے کیا اس نے ارتکاب زنا سے پہلے لوح محفوظ کی تحریر پڑھ لی تھی اور وہاں لکھا ہوا دیکھ لیا تھا کہ زنا اس کا مقدر ہے۔ (یعنی یہ شخص زنا کرے گا) اور اسی تقدیر کو پورا کرنے کیلئے اس نے زنا کیا ہے؟ ظاہر ہے یہ بات نہیں ہے بلکہ زنا اسکی اپنی خواہش نفس کی پیروی، فوری لذت کے حصول اور شیطان کی دعوت قبول کرنے کیلئے کیا ہے۔

نزول قرآن کے دور میں بھی بعض مشرکوں نے اسی قسم کی حجت بازی کی تھی اور کہا تھا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا ﴿انعام ۱۴۸﴾۔ ترجمہ، اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے، جواب میں اللہ نے کہا۔ ان سے کہدیجئے کیا تمہارے پاس کوئی علم

ہے جسے تم ہمارے سامنے پیش کر سکو، یعنی تمہیں شرک کرنے سے پہلے کہاں سے معلوم ہو گیا کہ شرک کرنا تمہاری تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔

(۲) پھر ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ تقدیر کو حجت بنانے والے لوگ اپنی بات میں سچے ہیں تو انہیں دوسری تمام چیزیں مثلاً فقر، بھوک، بیماری، دوستوں اور عزیزوں کی جدائی مال و دولت کا نقصان وغیرہ ہر بات کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر راضی ہو جانا چاہئے۔ لیکن دیکھنے میں تو یہی آیا ہے کہ ان باتوں کو یہ لوگ تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر راضی بہ رضا نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ سب باتیں در حقیقت مقدر ہوتی ہیں۔ مگر ان امور میں تقدیر کا سہارا نہیں لیتے۔ بلکہ مال جمع کرنے، بیماری کا علاج کرنے اور بھوک دور کرنے کے لئے کام اور کوشش کرتے ہیں۔ کوئی قریبی رشتہ دار مر جاتا ہے تو رنجیدہ ہوتے اور ماتم کرتے ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ کہ (۱) تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے اتنا کہ اس کا انکار کفر ہے (۲) اللہ نے ہماری تقدیر ہمارے پیدا ہونے سے بہت پہلے لکھدی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے (۳) جب ہم دنیا میں آگئے اور یہاں کے مختلف حالات اور بدلتے ماحول میں زندگی بسر کرنی ہے تو کس نظام کے تحت زندگی بسر کریں گے (۴) اگر قدم قدم پر پیش آنے والے مسئلہ کا حل جو نوشتۂ تقدیر میں ہے اس کو دیکھ کر عمل کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے خدا بھی ایسے لوگوں سے ہرگز سوال نہیں کرے گا (۵) لیکن اس بات کی مطلق خبر نہیں کہ اللہ نے کیا لکھا ہے اور ہمارے سامنے مسئلہ آکھڑا ہوا تو ہم کو کیا کرنا چاہئے اس کا جواب یہ ہوگا نا کہ ہمارے خدا نے پیش آمدہ حالات میں صحیح طریقے پر عہدہ بر آ ہونے کے لئے جو احکام قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دئے گئے ہیں ان پر عمل کریں۔ کیوں کہ حکم تو معلوم ہے اور تقدیر معلوم نہیں ہے۔ تو معلوم کو چھوڑ کر نا معلوم کی طرف لپکنا صریح گمراہی اور نقصان دہ ہے اور اسی پر عذاب ہوتا ہے۔

قضاء الفوائت

کسی فرض کو اس کے مقررہ وقت پر کرنا ''ادا'' ہے۔ اور وقت کے نکل جانے کے بعد اس کے مثل کو ادا کرنا ''قضا'' ہے۔ ظاہر ہے کہ ''اصل'' کو ادا کرنے یں اور ''مثل'' کے ادا کرنے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ پھر بھی اللہ کا یہ احسان ہے کہ قضاء کو بھی قبول کرلیتا ہے۔ اگر پانچ وقت کی نمازوں کی حد تک نمازیں قضا ہوگئی ہوں تو ان نمازوں کی قضاء میں ترتیب ضروری ہے۔ اگر ان سے زیادہ نمازیں قضاء ہوگئی ہوں تو ترتیب واجب نہیں ہے۔

اگر بہت سی نمازیں قضا ہوگئی ہوں تو ان کی ادائی کے احکام اس طرح ہیں۔

(۱) نیت اس طرح کرے کہ میری عمر میں جو پہلی فجر کی نماز فوت ہوگئی ہے میں اسکی قضا پڑھ رہا ہوں۔ یا میری عمر میں جو آخری فجر کی نماز فوت ہوگئی ہے میں اسکی قضا پڑھ رہا ہوں۔ اس طرح کی وہ نیت کرتے ہوئے قضا نماز پڑھے۔ اسی طرح دوسری نمازوں کی بھی نیت اسی طرح کرے۔ اور قضا کرنے کا اچھا اور آسان طریقہ یہ ہے کہ ہر ادا کے ساتھ ایک قضا بھی پڑھ لے۔ اس کا طریقہ یہ ہے۔ فجر کے بعد چونکہ کوئی نماز طلوع آفتاب تک نہیں ہے اس لئے گذشتہ فجر کی قضاء ادا سے پہلے پڑھ لے۔ ظہر کی نماز کے بعد دو رکعت سنت پڑھ لے پھر ظہر کی قضاء نماز پڑھے۔

عصر کی نماز کے بعد چونکہ مغرب تک کوئی نماز نہیں ہے اس لئے پہلے قضا پڑھے پھر ادا پڑھے۔ مغرب کی نماز کے بعد دو رکعت سنت پڑھے پھر مغرب کی قضاء پڑھے۔ عشاء کی نماز کے بعد دو رکعت سنت پڑھے۔ پھر عشاء کی قضا پڑھے۔ پھر وتر کی قضا پڑھے۔ پھر ادا کی وتر پڑھے۔ اگر دو رمضان کے روزے چھوٹ گئے ہیں تو تعیین کرے کہ پہلے رمضان کے روزے جو قضا ہوگئے ہیں وہ رکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد دوسرے رمضان کے روزوں کی قضا کرے۔

بہر کیف قضاء میں تعیین ضروری ہے۔ قضا نمازیں پوری عمر میں کبھی بھی پڑھ سکتے ہیں بجز ان اوقات کے جن میں نماز مکروہ تحریمی ہے۔ یعنی طلوع، غروب اور وقت استواء۔ اسی طرح رمضان کے مہینے کے روزوں کی قضا پورے سال میں کبھی بھی رکھ سکتے بجز عید الفطر، عید الاضحی (دس ذی الحجہ) ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ کے ان دنوں میں روزہ حرام ہے۔

قسم

قسم کی تین قسمیں ہیں(۱)قسم غموس(۲)قسم منعقدہ(۳)قسم لغو

(۱)غموس وہ قسم ہے جو کسی امر ماضی کیلئے کھائی جاتی ہے جس میں وہ عمداً جھوٹ کا ارادہ کرتا ہے مثلاً یہ کہ قسم ہے میں نے ایسا نہیں کیا۔اس قسم کا حکم یہ ہے کہ ایسا کرنے والا گنہ گار ہوتا ہے اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے سوائے توبہ اور استغفار کے۔

(۲)قسم منعقدہ: وہ قسم ہے جو بزمانۂ آئندہ کسی کام کے کرنے یا نا کرنے کے بارے میں کھائی جاتی ہے پس جب وہ اس قسم کو توڑتا ہے تو اس کو کفارہ لازم آتا ہے۔

(۳)لغوی قسم وہ ہے جو کسی امر ماضی کیلئے کھائی جاتی ہے اور اس کا گمان بھی وہی ہے جو وہ کہہ رہا ہے،حالانکہ معاملہ اس کے گمان کے خلاف ہے اس طرح وہ تمام قسمیں جو ایک انسان عادتاً بغیر ارادہ کے کھاتا رہتا ہے،ایسی تمام قسمیں لغوی ہیں، امید کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ ایسی قسموں کے بارے میں قسم کھانے والے سے مواخذہ نہیں کریگا۔

وہ قسم جو اللہ کے نام سے لیکر یا اللہ کے ناموں میں سے کسی نام کے ساتھ جیسے رحمان،رحیم یا اللہ کی ذات کے صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ جیسے اللہ کی عزت کی قسم یا اللہ کے جلال یا اسکی کبریائی کی قسم کہے تو وہ قسم کہلاتی ہے۔

اور اگر کوئی شخص اللہ کے غیر کے ساتھ قسم کھائے تو وہ قسم نہیں ہوتی،جیسے کہے ''نبی کی قسم''،قرآن کی قسم،کعبہ کی قسم،تو قسم نہیں ہوتی،لیکن امام عینی نے کہا کہ چونکہ آج کل قرآن کی قسم عام ہوگئی ہے اس لئے قرآن کی قسم بھی صحیح ہے،(در مختار)اور اگر کوئی شخص یوں کہے کہ اگر میں نے یہ کام کیا تو میں یہودی ہوں یا نصرانی ہوں یا مجوسی ہوں یا مشرک ہوں یا کافر ہوں تو وہ قسم ہو جائیگی۔

قسم کا کفارہ: یا تو ایک غلام کو آزاد کرنا ہے یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنانا ہے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے،لیکن اگر کوئی شخص یہ نہ کر سکتا ہو تو اس کو چاہیئے کہ مسلسل تین دن کے روزے رکھے۔

لیکن وہ قسم جس کا مقصد نیکی اور تقویٰ کے کاموں کو نہ کرنا اور اصلاح بین الناس کے امور انجام دینے سے باز رہنا ہو تو اللہ کہتا ہے

تو ایسے کاموں کیلئے اللہ کے نام کو آڑ نہ بناؤ،مطلب یہ کہ ایسی قسموں کو توڑ دینا چاہیئے اور اس کے بعد فوراً کفارہ بھی ادا کرنا چاہیئے،مثلاً کسی شخص نے قسم کھائی کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا،اپنے ماں باپ سے کبھی بات نہیں کروں گا یا مسجد میں قدم

نہیں رکھوں گا وغیرہ وغیرہ، تو اس شخص کو چاہئے کہ فوراً وہ کام کرے اور کفارہ دیدے، لیکن جو قسمیں لوگوں کی زبان سے بطور تکیہ کلام کے بلا ارادہ نکل جاتی ہیں تو شریعت میں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے نہ کفارہ ہے اور نہ ان پر مواخذہ۔

چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے "لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّـهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَـٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ ﴿المائدة:۸۹﴾ ترجمہ۔ اللہ تمہاری بیکار لغوی قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرتا، لیکن ان قسموں پر ضرور مواخذہ کریگا جن کو تم نے پختہ اور پکا کر لیا ہے، سو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجہ کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا ہے یا ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا ہے، اور جس کو یہ میسر نہ آئے تو وہ تین دن کے روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب کہ تم قسم کھاتے ہو (اور توڑتے ہو)۔

قرب نوافل و قرب فرائض

جب بندہ اللہ کے راستے میں عبادت، ریاضت، محنت و مجاہدہ کرتا ہے تو نتیجتاً اسکے صفات رذیلہ یعنی طمع، حرص، شہوت اور غضب جیسے برائی پر آمادہ کرنے والے صفات دور ہو جاتے ہیں۔ اور لازما اللہ کی پسندیدہ چیزوں سے محبت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور طبیعت میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اچھے اعمال خود بخود صادر ہونے لگتے ہیں اور برے و ناپسندیدۂ حق اعمال معدوم ہو جاتے ہیں، ایسے شخص کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ "ولا يزال عبدي يتقرب الى بالنوافل حتىٰ احبه فاذا احببته كنت سمعه الذى يسمع به و بصره الذى يبصربه و يده التي يبطش به ورجله التي يمشي بها" (بخاری) اور میرا بندہ مجھ سے بذریعہ نوافل قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسکو محبوب بنالیتا ہوں جب میں اسکو محبوب بنالیتا ہوں، تو میں اسکے کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اسکی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اسکا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو پکڑتا ہے اور اسکا پاؤں بنجاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسکے جوارح سے کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ پس گویا میں ہی اس کے اعضاء بن جاتا ہوں۔ چونکہ مجازا اس حدیث میں حق تعالیٰ کو "آلہ" اور بندہ کو فاعل کہا گیا ہے۔ اور اس حدیث میں اس مرتبہ کا حصول نوافل پر ہے۔ (واضح ہو کہ یہاں نوافل سے مراد، نوافل کی نمازیں نہیں ہیں، جیسا کہ عام لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے اصل میں نفل کے معنی زیادتی کے ہیں۔ پس ہر وہ چیز جو فرائض پر زائد ہے وہ نفل کہلاتی ہے۔ اسی لئے کتب فقہ میں جہاں سنتوں کا بیان آیا ہے وہ باب النوافل کے تحت ہی آیا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اعمال میں حضور کی کثرت کے ساتھ اتباع ہے اور

اسکے لئے انسان کو سخت محنت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔یعنی فرض نمازوں کے علاوہ سنتوں کی پابندی، تہجد کا التزام، اشراق، چاشت، تحیۃ الوضوء، تحیۃ المسجد وغیرہ نمازیں۔فرض روزوں کے علاوہ مسنون روزے، ذکر کی پابندی، کثرت مراقبات، تقلیل شہوات وغیرہ، صوفیاء کرام حدیث کی پیروی میں اس مرتبہ کو قرب نوافل کہتے ہیں اور چونکہ اس میں صفات نامرضیہ اور افعال رذیلہ کا ازالہ ہوتا ہے اسکو فناء صفات بھی کہتے ہیں۔

دوسرا قرب اعلیٰ درجہ کا ہے یعنی بندہ کی ہستی، خدا کے آگے ایسی مضمحل ہو جائے کہ اپنی قدرت، اپنا اختیار، اپنا ارادہ اللہ کی قدرت، اسکے اختیار اور اسکے ارادہ کے مقابلے میں کالعدم ہو جائے، اور فانی ہو جائے اور افعال و اعمال میں آلہ کے مانند ہو جائے اور ہر کام میں اللہ کو ہی موثر جانے، اس مرتبہ میں اللہ فاعل ہو جاتا ہے اور بندہ آلہ، یہ اول سے اعلیٰ ہے، کیونکہ اول کا مرتبہ بیان کیا گیا کہ اس میں صرف فناء رذائل تھا۔فنائے اختیار نہ تھا۔اور اس میں فنائے اختیار ہے اس لئے یہ اس سے اعلیٰ ہے اور حدیث میں قرب فرائض کو قرب نوافل سے اعلیٰ و افضل کہا گیا ہے، چناچہ درج بالا حدیث کا سب سے پہلا جزء یہ ہے کہ، "وما تقرب الی عبدي بشيء احب الی مما افترضت علیہ (بخاری)اور میرا بندہ، میرا قرب کسی ایسی چیز سے حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ادائے فرض سے زیادہ محبوب ہو۔اسی لئے صوفیاء کرام نے اس حدیث کی رو سے اس کو "قرب فرائض" کے نام سے یاد کیا ہے۔اور چونکہ اس میں سالک کا اختیار بھی باقی نہیں رہتا اور اپنی ذات کو بھی اس کی ذات میں فنا کر دیتا ہے اس لئے اسکو "فنائے ذات" بھی کہتے ہیں امامنا مہدیؑ نے اس کو اختیار کرنے کی تعلیم دی اور فرمایا

(۱)اختیار شوم است۔اختیار بُرا ہے

(۲)بے اختیار شو، بختیار شو۔بے اختیار ہو جاؤ، بختیار ہو جاؤ۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے ایک بار حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا، عرض کیا۔یارب دلّنی علی اقرب الطریق الیك یعنی خداوند مجھے اپنے تک پہنچے کا نزدیک ترین راستہ بتلا۔جواب میں ارشاد ہوا"یا أبا یزید، دع نفسك و تعال"یعنی اپنے آپ کو چھوڑدے اور آجا۔یہ مرتبہ اسی وقت نصیب ہوگا کہ اپنے اوپر نظر رکھنا چھوڑدیں، اپنے کو نیست و نابود سمجھیں، تکبر کو دماغ سے نکالدیں، خدا اور رسول کے احکام میں جھگڑا نہ کریں، کیونکہ خدا اور بندہ کے درمیان یہی خود حائل ہے۔جب یہ نکل جائے تو بس وصال ہے اور جب تک یہ باقی ہے اس وقت تک وصل نہیں ہو سکتا۔حضرت مہدی موعودؑ نے فرمایا"بندہ اوپر واڑے کا راستہ لایا ہے"(اقرب الطریق)

قاتلواو قتلواپر ایک اعتراض کا جواب

حضرت مہدی موعودؑ نے آیت ''فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا ﴿آل عمران:۱۹۵﴾'' کے بیان کے موقع پر یہ فرمایا کہ پہلے تین صفتوں کا ظہور ہو چکا، البتہ چوتھی صفت کا ظہور جو باقی ہے۔ان شاء اللہ اس کا بھی ظہور ہو گا۔ پھر اسکے بعد آپ نے فرمایا اس صفت کا ظہور بندہ سے نہیں ہو گا بلکہ حضرت (بندگی میاں) سید خوندمیر سے ہو گا۔ کہ یہی منشائے خداوندی ہے اور امر الٰہی بھی، چنانچہ اس سے پہلے صفحات پر مضمون آچکا ہے کہ مہدیؑ نے بار گاہ الٰہی میں عرض کیا کہ یا اللہ چوتھی صفت جو باقی رہ گئی ہے اگر مجھ پر پوری ہو جائے تو اس کیلئے راضی ہوں، حق تعالیٰ کا فرمان پہنچا کہ ''اے سید محمد ہمارے علم ازلی میں یہ ہے کہ خاتم الانبیاء اور خاتم الاولیاء پر کوئی شخص قادر نہ ہو گا اور تلوار کارگر نہ ہو گی، پس ہم نے تجھ کو خاتم ولایت محمدیہ بنایا ہے۔ اسلئے ہم نے تیرا بدل سید خوندمیرؓ کو بنایا ہے۔ اسی لئے حضرت مہدی موعود ﷺ نے میاں سید خوندمیرؓ سے فرمایا کہ یہ کام تم سے ہونے والا ہے۔

بطور جملۂ معترضہ یہاں ایک نکتہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے اس نکتہ کو معترضین نے اس لئے اٹھایا ہے کہ اس کے ذریعہ اولاً حضرت مہدیؑ کو اور بعد میں حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کی ذات کو رسول اللہ ﷺ کی سنت کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا جائے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث پیش کی گئی ہے جو یہ ہے۔''لا تتمنوا لقاء العدو۔ دشمن سے جنگ کی تمنا مت کرو، اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے۔

(۱) پہلا تو یہ کہ جب آیت میں چار صفتوں کا بیان ہوا ہے، تو کیا ان صفات کا ظہور ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری ہے تو اسکی تمنا کرنا حدیث کی کسطرح خلاف ورزی تصور کی جائیگی؟

اسی لئے حضرت مہدیؑ کی بھی دلی آرزو تھی کہ جس طرح ہجرت، اخراج، اور ایذاء فی سبیل اللہ کی تکمیل اور تعمیل آپؑ سے اصالۃً (اور آپؑ کے اصحاب سے تبعاً ہوئی) اسی طرح چوتھی صفت کا ظہور بھی آپ سے ہو؛ لیکن مشیت ایزدی ایسی نہیں تھی۔ کیوں؟ اس کا سبب بھی بتادیا گیا اور اسکا بدل بھی ظاہر کر دیا گیا۔ یعنی چوتھی صفت کا ظہور آپؑ کے بدل حضرت میاں سید خوندمیرؓ سے ہو گا۔

نیز حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ نے اپنی طرف سے شہادت کی تمنا نہیں کی تھی، ہاں مگر جب حکم الٰہی اور امر خداوندی سے حضرت مہدی موعودؑ نے اپنا بار، اپنی صفت بندگی میاںؓ کے حوالے فرمائی۔ اور یہ بھی فرمایا ''ہوشیار رہو، اس دن سب تمہارے دشمن ہو جائیں گے، ہاتھی کی پسلیاں اور فولاد کے بازو بھی ہوں گے تو گھس جائیں گی اور پگھل جائیں گی۔ تمہارا سر

جدا، تن جدا اور پوست جدا ہو گا۔ اور یہ بندہ کی حجت ہو گی" تو اگر بندگی میاںؑ نے اس پیشین گوئی کی تکمیل کی تمنا کی تو اسکو بندگی میاںؑ کی تمنا کسطرح کہا جائیگا؟

اور اگر بفرض محال تصور بھی کر لیا جائے تو شہادت کی تمنا رسول اللہ ﷺ کی سنت اور اتباع ہے۔ چناچہ حدیث میں آیاہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "لوددت اني قتلت في سبيل الله ثم احييت، ثم قتلت ثم احييت، ثم قتلت ثم احييت ثلاثا" آنحضرت ﷺ نے نہایت شوق کی حالت میں فرمایا کہ "میں اس امر کو پسند کرتا ہوں کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، اور زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں اور زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خدا کی راہ میں شہید ہونے کا کسقدر شوق تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں آیا ہے "من سال الله الشهادة بالصدق (قلبه) بلغه الله منازل الشهداء وان يمت على فراشه (مسلم) جو شخص اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے شہادت کی درخواست کرے اللہ اسکو مقامات شہداء پر پہنچائیگا، اگرچہ وہ اپنے بستر پر مرے۔

امام نووی نے شرح مسلم میں لکھاہے کہ فيه استحباب طلب الشهادة۔ اس حدیث میں طلب شہادت مستحب ہونے کا اشارہ ہے۔ نیز امام نووی نے لقاء العدو کی تمنا جس وجہ سے منع ہے اسکی توجیح یہ کی ہے۔

"انما نهى عن تمنى لقاء العدو لما فيه من صورة الاعجاب و الاتكال على النفس و الوثوق بالقوة و هو نوع بغى و قد ضمن الله تعالىٰ لمن بغى عليه ان ينصره و لانه يتضمن قلة الاهتمام بالعدو و احتقاره۔ تمنائے لقائے عدو کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ اس میں اپنی ذات اور قوت پر غرور اور بھروسہ کی صورت پائی جاتی ہے اور یہ ایک طرح کی سرکشی ہے، اور جس پر ظلم کیا جائے۔ اللہ اسکی مدد کرنے کا ضامن ہے۔ تمنائے لقائے عدو سے اس لئے بھی منع کیا گیا کہ وہ دشمن کے لئے کم اہتمام کرنے اور وہ دشمن کو اور حقیر جاننے کو متضمن ہے، و هذا يخالف الاحتياط و الحزم و الا فالقتال كله فضيلة وعبادة (کحل الجواہر، ص۵۹، جلد دوم) اور یہ حزم و احتیاط کے خلاف ہے، ورنہ قتال تو کل کا کل فضیلت اور عبادت ہے۔ پس لا تتمنوا لقاء العدو کا قول ان لڑائیوں سے متعلق ہو گا جو نفسانی خواہشات سے تعلق رکھتی ہیں (حاشیہ بر صفحہ ۵۹)

اس کے علاوہ معترض کی یہ بے دینی بھی دیدنی ہے کہ اس نے لاتتمنوا کی پوری حدیث نقل نہیں کی۔ بلکہ اپنا مطلب

نکالنے کیلئے حدیث کا ایک حصہ نقل کر دیا اور باقی جملے چھوڑ دئے، چنانچہ پوری حدیث اس طرح آئی ہے "لا تتمنوا لقاء العدو واسئلوا الله العافیة فاذا لقیتم فاصبروا واعلموا ان الجنة تحت ظلال السیوف" دشمن سے مڈ بھیڑ ہونے کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگو جب دشمن سے مڈ بھیڑ ہو جائے تو صبر و استقامت اختیار کرو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

نیز واضح ہو کہ حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کے ذریعہ جس خبر قتال کی پیشین گوئی حضرت مہدیؑ نے فرمائی تھی وہ عام نہیں تھی بلکہ آپ کیلئے خاص تھی۔ اور اس کو شہادت مخصوصہ بھی اسلئے کہتے ہیں کہ

(۱) حضرت مہدی موعودؑ کے بدل کے طور پر یہ شہادت عمل میں آئی تھی

(۲) اس معرکۂ قتال اور اس پیشین گوئی کو امامناؑ نے بطور تحدی پیش فرمایا تھا۔ یعنی پہلے دن کی کامیابی اور دوسرے دن بندگی میاںؓ اور آپ کے ہمراہیوں کی شہادت۔

سبحان اللہ خلیفۃ اللہ کی زبان مبارک سے کیگئی پیشین گوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی۔

حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ حضرت امامؑ نے نہ صرف اپنی حیات مبارکہ میں سینکڑوں اور ہزارہا آیات وبیّنات اپنے دعوئ مہدیت کی صداقت میں پیش فرمائیں، جن کے حصہ میں ایمان تھا وہ ایمان لائے اور جن کی تقدیر پھوٹی تھی وہ تصدیق سے نہ صرف باز رہے بلکہ علانیہ مخالفت پر کمر باندھ لی۔ بلکہ آپ نے امت مسلمہ پر رحم فرماتے ہوئے اپنے وصال کے بعد بھی دو حجتیں چھوڑیں۔ تاکہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد مہدی موعودؑ کی صداقت پر ایمان لائیں اور قیامت کے دن خلیفۃ اللہ کے انکار کی پاداش میں ماخوذ ہونے سے اپنے آپ کو بچائیں۔ ایک تو یہ فرمایا کہ بندہ کی رحلت پر جب بندہ کو خبر میں رکھو تو دیکھو اگر جسد نہ پاؤ تو جانو کہ بندہ کا دعوی حق تھا۔ اور دوسرا یہ کہ حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ سے بحیثیت بدلۂ ذات قَاتَلُوا وَقُتِلُوا کا ظہور ہوگا، اور اس مقاتلہ میں پہلے روز اگر تمام دنیا کے لوگ مقابل ہو جائیں۔ حضرت بندگی میاںؓ کی فتح ہوگی اور دوسرے دن بندگی میاںؓ کی شہادت عمل میں آئے گی اور تین جگہ آپ کا مدفن ہوگا۔ اسکو مہدیت کی صداقت کی آیت یا حجت فرمایا، اس پر تمام مومنین ایمان لائے اور یقین کر لیا کہ بے شک ایسا ہی ہوگا اور جب امامناؑ کے وصال کے بعد لحد میں جسد مبارک نہ پایا گیا اور حسب بشارت دوم بندگی میاںؓ کے ساتھ منکرین و مخالفین کی مسلح زرہ پوش، طاقت ور شاہی فوج کو چند بے سر و سامان، صاحبان فقر و فاقہ، نفوس قدسیہ کے مقابلہ میں ہزیمت ہوئی اور دوسری جنگ میں یعنی چودہ شوال المعظم ۹۳۰ھ بعض امراء (مثلاً ملک شرف الدین جاگیر دار سدراسن) و دیگر مسلح سواریوں کی امداد کی باوجود حضرت بندگی میاں صدیق ولایتؓ کی مع رفقاء شہادت

ہو گئی اور جسم مبارک کے تین حصہ کئے جاکر چاپانیر، پٹن اور سدراسن تین جگہ سپرد خاک کئے گئے تو تمام مومنوں کو تو جو پہلے سے یقین کر چکے تھے مزید اطمئنان ہوا اور منکروں کے مقابلہ میں آخری مہتم بالشان حجت قائم ہوئی۔ چنانچہ تمام متقدمین مہدویہ نے بندگی میاں سید خوندمیرؓ کی شہادت کو ''حجت مہدی موعودؑ'' تسلیم کیا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت بندگی میاں شاہ قاسم مجتہد گروہؓ کے والد ماجد حضرت بندگی میاں سید یوسفؓ نے ''مطلع الولایت'' میں حضرت مہدیؑ کا فرمان نقل کیا ہے۔ ترجمہ۔ ''اللہ تعالیٰ جو سمیع و بصیر و علیم حقیقی ہے تم کو قابل و لائق بنا کر یہ بار ولایت تم پر رکھا ہے۔ سر جائیگا، کمر ٹوٹے گی، پوست کھینچا جائیگا اس وقت صرف اپنے خدا ہی سے مدد چاہنا'' پھر آپؑ نے فرمایا ''اگر اس جنگ کے اول روز تم اپنی ذات سے تنہا ایک طرف ہوں اور تمام دنیا (تمہارے مقابلہ میں) دوسری طرف ہو، تو ان شاء اللہ تمہاری ایک ذات کے آگے یہ سب ہزیمت اٹھائیں گے۔ یہ میری مہدیت کا معجزہ ہے، جیسا کہ جنگ بدر پیغمبر ﷺ کا معجزہ تھا (مطلع الولایت)

اسی طرح صاحب مطلع الولایت نے لکھا ہے حضرت مہدی موعودؑ کی حجت (معجزہ) کے حامل ہونے کی وجہ حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ بھی حضرت مہدیؑ کی آیات و بینات (معجزہ) سے ہو گئے ہیں۔ حضرت ملک مہریؒ کے دیوان کا ایک مصرعہ یہ ہے: حجت مہدی بروشد تمام

قَاتَلُوا وَقُتِلُوا

حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت حامل بار امانت بدلہٗ ذات مہدیؑ کے بارے میں جو خبر دی تھی وہ اتنی مہتم بالشان ہے کہ کئی جلیل القدر صحابہٗ مہدی موعودؑ نے اس پیشین گوئی کا ذکر کیا ہے۔ حضرت مہدیؑ کی خدمت میں پہلی دفعہ حضرت بندگی میاںؓ کے حاضر ہونے کا واقعہ سوانح مہدی موعودؑ مولفہٗ حضرت فقیر سید ولی صاحب سے نقل کیا جاتا ہے۔ اس کتاب پر علامۃ العصر مولوی سید نصرت صاحب اور علامۃ العصر مولوی سید اشرف صاحب شمسی نے تقریظ لکھی ہے اور اسکی روایت کو نہایت صحیح اور قابل وثوق اور لائق تمسک قرار دیا ہے۔ "روایت ہے کہ ایک مرتبہ (پہلی دفعہ حاضر خدمت ہونے کے بعد) سید خوندمیرؓ سے نماز مغرب کے بعد جناب سیدنا مہدی موعودؑ نے فرمایا کہ "سید خوندمیر۔ بیان کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کس طرح فضل واحسان فرمایا ہے۔ عرض کیا کہ حضرت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ فرمایا کہ تم بیان کرو تاکہ دوسرے لوگ سنیں۔ کہا پہلی مرتبہ جبکہ میری نظر حضرت پر پڑی (تجلی ذاتی چمکی) میری آنکھ پھوٹ جائے اگر میں نے حضرت کو درمیان میں دیکھا ہو۔ اسی وقت میں نے اپنے خدا کو دیکھا۔ فرمایا درست ہے۔ جو خدا ہو (یعنی قیدی بشری و ہستی اور خودی سے باہر ہو کر مطلق ہو) خدا کو دیکھے۔ اور جس وقت عصر کی نماز کی نیت باندھی اللہ کا حکم ہوا کہ تو نے میری درگاہ میں کیا نذر گذرانی ہے۔ عرض کیا کہ جو تیری نذر کے لائق ہو گذرانوں، حکم ہوا جو لائق بندہ ہوتا ہے۔ وہ ہماری راہ میں سر دیتا ہے۔ عرض کیا یہ ایک سر کیا ہے اگر سو سر ہوں تجھ پر فدا کرنے کو حاضر ہوں۔ پھر میں نے اپنے تن کو بے سر دیکھا۔ اور بعد نماز سر کو پایا۔ اس کے بعد بندہ نے عرض کیا کہ پروردگار! کیا بندے کی نذر قبول نہیں ہوئی، حکم ہوا یہ ہماری امانت ہے وقت پر لیں گے (سوانح مہدی موعودؑ، ص ۱۵۷)

یہ روایت دوسری قدیم کتب نقلیات میں بھی موجود ہے اور پنج فضائل میں اس کے آخری الفاظ یہ ہیں

ترجمہ: "حضرت مہدیؑ نے دریافت کیا کہ میاں سید خوندمیر وہ کیا معاملہ تھا؟ عرض کیا کہ خوندکار پر سب روشن ہے۔ فرمایا تم اپنی زبان سے کہو، تاکہ اجماع شاہد رہے، بندگی میاںؓ نے ماجرائے مذکور بیان کیا۔ حضرت مہدیؑ نے فرمایا ہاں سچ ہے ایسا ہی ہوگا (پنج فضائل)، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت سید خوندمیرؓ کے سر کی قربانی اللہ نے قبول فرمائی اور حضرت مہدیؑ نے سب حاضرین کو اس بشارت خداوندی سے آگاہ ہونے کا موقع دیا، اور آپ نے بذات خود تصدیق فرمائی اور جماعت صحابہ کو بحیثیت اجماع گواہ بنایا۔ اس لئے یہ روایت خبر مشہور اور خلیفۃ اللہ کی توثیق کی وجہ قطعیت کا حکم رکھتی ہے۔ اگرچہ بدلہٗ ذات مہدیؑ ہونے کی اسمیں تصریح نہیں ہے لیکن سید خوندمیرؓ کی شہادت کی خبر کی حد تک محکم اور واضح روایت ہے۔

حالانکہ بعد کی روایات سے بدلہٗ ذات مہدی کی تخصیص و تصریح بھی ہو چکی ہے۔ چناچہ ذیل کی روایات اس امر کی شاہد ہیں سفر خراسان میں حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کے پہنچنے سے قبل ہی حضرت امامنا مہدیؑ نے آیت شریفہ "فَالَّذِينَ هَاجَرُوا" کی اہمیت پر بیان شروع فرمادیا، چنانچہ روایت ہے کہ (۱) "نقل است از بندگی ملک الہداد خلیفہٗ گروہؓ کہ حضرت میرانؑ فرمودند "فَالَّذِينَ هَاجَرُوا" شد "وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ" شد "وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي" شد "وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا" ماندہ است، ماشاءاللہ خواہد شد (تاریخ سلیمانی، جلد ثانی)۔ "حضرت بندگی ملک الہداد خلیفہٗ گروہؓ سے روایت ہے کہ حضرت مہدی موعودؑ نے فرمایا "فَالَّذِينَ هَاجَرُوا" ہوچکا، "وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ" ہوچکا، "وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي" ہوچکا، "وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا" باقی ہے۔ ان شاءاللہ ہو جائے گا۔

(۲) حضرت مہدیؑ نے ناگور میں بھی ایک دفعہ اس آیت پر بیان فرمایا، آپ نے یہ آیت پڑھی اور بیان یوں فرمایا فَالَّذِينَ هَاجَرُوا" ہوچکا، "وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ" ہوچکا، "وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي" ہوچکا، "وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا" باقی ہے، اللہ جب چاہے گا ہوگا، حضرت مہدی کی زوجہٗ محترمہ نے عرض کیا "کہ میرانجی وہ جماعت دائرہ میں نظر نہیں آرہی ہے، آپ نے فرمایا ہاں وہ لوگ ابھی نہیں آئے ہیں آجائیں گے۔ (یہ روایت حضرت سید خوندمیرؓ کے فرہ مبارک پہنچنے سے قبل کی ہے)

(۳) سندھ میں بھی ایک دفعہ آپ نے اس آیت شریفہ پر بیان فرمایا: نقل است کہ در مقام سندھ آیت فالذین ھاجرواواخرجوامن دیارھم واوذوافی سبیلی و قاتلواو قتلوا بیان کردہ فرمودند کہ ایک صفت کارزار ماندہ است، ماشاءاللہ خواہد شد و بعد ازیں بارہا ہمیں فرمودند تا بفرح رسیدند و بندگی میاں سید خوندمیرؓ آمدند (مطلع الولایت) نقل ہے کہ مقام سندھ میں آیت "فالذین ھاجرواواخرجوامن دیارھم واوذوافی سبیلی و قاتلواو قتلوا" پر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ صفت کارزار باقی رہ گئی ہے۔ اللہ جب چاہیگا پوری ہوگی اسکے بعد آپؑ فرح مبارک پہنچنے تک بار بار یہی فرماتے رہے حتیٰ کہ بندگی میاںؓ فرہ آگئے۔

(۴) حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ فرہ پہنچ جانے کے بعد حضرت مہدیؑ اس آیت پر نہایت واضح اور پر اثر بیان فرمانے لگے کہ "وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا" کے حامل کی فلاں فلاں خصوصیات ہوں گی۔ چنانچہ تاریخ سلیمانی میں جو عبارت ہے اسکا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ "بندگی میاںؓ کے فرہ پہنچنے کے بعد چند بار قاتلواو قتلوا کی صفت چہارمی کے شرف پر امام الابرارؑ کی زبان گوہر بار سے بیان شروع ہوا اس حد تک کہ قاتلواو قتلوا کے شرف کے بیان میں (نام کی) شرح باقی رہ گئی۔ جس کی وجہ سامعین کو حامل بار صفت چہارمی کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، حتیٰ کہ میاں (سید خوندمیرؓ) نے میاں نعمتؓ کے ذریعہ عرض کرایا کہ "جس شخص پر قاتلواو قتلوا کی تکمیل ہوگی حضرتؑ اس کا نام فرمادیں تاکہ اس کا ادب مثل ادب والا کیا جائے، میاں نعمتؓ نے حسب

ایمائے بندگی میاںؒ، امامؑ سے عرض کیا، ''قبلۂ جن وانس نے فرمایا، جو پوچھ رہاہے اسی پر صورت پذیر ہو گا، جان اے عزیز اس نقل میں حامل بار امانت کا نام ظاہر ہو چکا ہے (تاریخ سلیمانی، جلد ثانی)

اس روایت سے یہ استدلال کرنا کی حضرت شاہ نعمتؒ نے یہ سمجھا کہ اس صفت کے حامل خود ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے حضرتؑ سے سوال کیا تھا، صحیح نہیں ہے، کیونکہ روایت میں ''حسب ایمائے بندگی میاںؒ از امامؑ عرض کردند'' کے الفاظ صاف ہیں، نیز یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت شاہ نعمتؒ حضرت سید خوندمیرؒ کے فرستادہ تھے۔ دراصل محرک تو حضرت سید خوندمیرؒ ہی تھے۔ اس لحاظ سے سائل کا اطلاق فی الحقیقت حضرت سید خوندمیرؒ پر ہی ہوتا ہے۔

(۵) اور حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؒ نے بھی خود حضرت میاں شاہ نعمتؒ پر واضح کر دیا تھا کہ ''خبر قتال کی نوعیت، میاں سید خوندمیر سے مخصوص ہے'' اور چونکہ آپ بھی سوال کا ذریعہ بنے تھے اس لئے آپ کو بھی شہادت کا موقع ملیگا، حضرت مہدیؑ کی زبان مبارک کا اثر ضرور ظاہر ہو گا لیکن یہ شہادت، شہادت عامہ کے حکم میں ہو گی۔

اب رہی یہ بحث کہ حضرت شاہ نعمتؒ کا یہ خیال کہ یہ خبر قتال خود ان کے حق میں ہے اس لئے کہ وہ خود سائل تھے۔ اور اس سلسلے میں آپ نے حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؒ کی تصریح کو بھی قبول نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ

(۱) حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؒ کا جو خیال تھا وہ انکی ذاتی رائے تھی۔ ان کے تعلق سے حضرت مہدیؑ نے نام لیکر کوئی صراحت نہیں کی تھی۔ جیسا کہ حضرت بندگی میاںؒ کے حق میں کی تھی۔

(۲) کہ جب حضرت بندگی میاںؒ کی شہادت ۹۳۰ھ میں ہوئی تو شاہ نعمتؒ خود نہ صرف اسکے قائل ہو گئے بلکہ اس قتال میں اپنی عدم شرکت اور عدم موافقت پر اظہار افسوس کیا۔ چنانچہ روایت ہے ''بعد از مدتے میاں نعمتؒ در جالور آمدند واز دکن بازگشتند فرمودند کسانیکہ مرا از موافقت سید خوندمیر باز داشتند ایشاں را خدائے تعالیٰ خواہد پرسید'' یعنی ایک عرصہ کے بعد میاں نعمت دکن سے جالور واپس آئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے مجھ کو سید خوندمیرؒ کی موافقت سے باز رکھا ان سے خدائے تعالیٰ پوچھے گا۔ لہٰذا حضرت میاں نعمتؒ کی ذاتی رائے کو (جس کی تصدیق مہدیؑ سے نہ ہوئی ہو حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؒ کے حامل صفت چہارمی ہونیکی اس خبر سے ٹکرانا، جسکی تصدیق مہدیؑ سے ہوئی ہو، کسی طرح صحیح نہیں ہے اور مفید مطلب تو ہو ہی نہیں سکتی، اسلئے کہ بندگی میاں سید خوندمیرؒ کا چوتھی صفت کا حامل ہونا صرف میاں نعمتؒ کی مذکورہ بالا روایت پر ہی مبنی اور منحصر نہیں ہے، بلکہ ایک دوسری روایت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسری مرتبہ حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؒ نے اسی طرح کا سوال حضرت میاں یوسفؒ کے

ذریعہ بھی کروایا تھا۔ اس وقت مہدیؑ نے جو جواب دیا تھا اس سے حقیقت واضح ہو گئی تھی، چنانچہ روایت ہے کہ

(۶) شاہ نعمتؓ سے جواب سننے کے بعد صدیق ولایتؓ کا مدعا اس وقت پورا ہوا جبکہ آپ نے میاں یوسفؓ کے ذریعہ حضرت سے عرض کرایا کہ حامل بار امانت کون ہے؟ تا کہ اسکی تعظیم کی جائے۔ میاں یوسفؓ حسب ارشاد صدیق ولایتؓ خاتم ولایتؑ سے عرض کیا، حضرتؑ نے بلند آواز سے فرمایا، کون پوچھتا ہے؟ میاں یوسفؓ نے ڈرتے لرزتے کہا کہ "میں نہیں پوچھ رہا ہوں، سید خوندمیرؓ پوچھتے ہیں۔ اس وقت مخبر صادق نے صدیق ولایتؓ کو بلا کر فرمایا "برادرم سید خوندمیر وہ تمہاری ذات ہے (تاریخ سلیمانی) چند جملوں کی کمی و بیشی کے ساتھ مطلع الولایت میں بھی اسی مضمون کی روایت موجود ہے۔

(۷) اس کے علاوہ حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ، بدلہ ٔذات مہدیؑ کی روایات بھی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مہدیؑ نے میاں سید خوندمیرؓ کو بدلہ ٔذات مہدیؑ ہونے کی بشارت اللہ کے حکم سے دی ہے۔ چناچہ تاریخ سلیمانی میں یہ روایت آئی ہے کہ: حضرت مہدیؑ نے بارگاہ ملک العلام میں عرض کیا کہ یا اللہ چوتھی صفت جو باقی رہ گئی ہے اگر مجھ پر پوری ہو جائے تو اس کیلئے راضی ہوں۔ ایزد تعالیٰ کا فرمان پہنچا کہ "اے سید محمد ہمارے علم ازلی میں یہ ہے کہ خاتم الانبیاء و خاتم الاولیاء پر کوئی شخص قادر نہ ہو اور تلوار کارگر نہ ہو، پس ہم نے تجھ کو خاتم ولایت محمدی بنایا ہے اس لئے ہم نے تیرا بدل سید خوندمیر کو قرار دیا ہے۔ اسی بناء پر حضرت مہدیؑ نے میاں سید خوندمیرؓ سے فرمایا "یہ کام تم سے ہونے والا ہے"۔ اس روایت سے تو علانیہ واضح ہو گیا کہ صفت قَاتَلُوا وَقُتِلُوا یا صفت چہارمی کا ظہور حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ سے ہی ہو گا اور وہ بھی "بدلہ ٔذات مہدیؑ" کی جہت سے ہو گا، حسب فرمان امام مہدیؑ، وہ فرمان جسکی نسبت مہدیؑ نے اللہ جل شانہ کی طرف فرمائی ہے، اور اس فرمان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اللہ نے کس بناء پر حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ کو مہدیؑ کا بدل قرار دیا ہے، اسے بھی بیان کر دیا ہے۔

نیز آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مہدیؑ کی چوتھی صفت جو "قَاتَلُوا وَقُتِلُوا" ہے وہ حضرت سید خوندمیرؓ ہی کے ذریعہ ظاہر ہو گی اس کے ظہور سے حجت قائم ہو گی، دین کو قوت حاصل ہو گی اور یہ صفت خاص سید خوندمیرؓ سے ظاہر ہو گی اور آپ ہی پر وہ حجت پوری ہو گی۔ (اور اب یہ پیشین گوئی پوری ہو چکی) اس لئے آپ کی ذات، منجملہ ٔخواتم، خاتم حجت مہدیؑ ہے۔

اور حضرت شاہ قاسم مجتہد گروہؒ نے تحریر فرمایا ہے: "اس مخبر صادق نے جس طرح خبر دی تھی من و عن وقوع پذیر ہوئی، مہدیؑ کی حجت اس معجزہ پر پوری ہوئی اور اس ایک معجزہ میں کئی معجزے حضرت مہدیؑ کی مہدیت کے ثبوت میں صادر ہوئے ہیں (افضل المعجزات)۔

حاصل یہ کہ حضرت مہدیؑ نے اس جنگ کو اپنی حجت کے طور پر پیش فرمایا تھا اور مزید تاکیداً یہ بھی فرمایا تھا کہ ''اگر ایسا ہو تو جان لو کہ بندہ نے جو کچھ کہا اللہ کے حکم سے کہا اور ایسا اگر نہ ہوا تو سمجھو کہ بندہ نے اپنے نفس کی طرف سے کہا تھا۔'' اس بات کو لیکر بعض بیمار ذہن جو تحدی، آیت، معجزہ اور حجت کی اصطلاحات سے بے خبر ہیں ''شرط و مشروط'' کے چکر میں پڑ کر بے اطمئنانی اور بے یقینی کا شکار ہوئے ہیں، مہدیؑ نے جو فرمایا ہے وہ اپنی مہدیت کی شرط کے طور پر نہیں بلکہ اپنے فرمان کو مزید ''موکد'' کرنے کیلئے فرمایا تھا، مگر افسوس کہ کچھ لوگ ''موکد'' کو ''مقید'' کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ انداز بیان تاکیدی ہے، چنانچہ قرآن شریف میں بھی اسی طرح کا کلام آیا ہوا ہے جس کا مقصد اپنی بات کو موکد کرنا ہے۔

چناچہ ارشاد خداوندی ہے وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿بقرہ، ۲۳، ۲۴﴾ اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر نازل کی ہے تو اس طرح کی ایک سورت تو بنالاؤ اور اللہ کے سوا تمہارے مددگاروں کو بھی بلالو اگر تم سچے ہو اور اگر ایسا نہ کر سکو اور یقیناً تم ایسا نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

کیا اس آیت سے یہ استدلال کیا جائیگا کہ کافروں کیطرف سے سورۃ، یا آیت آنے تک قرآن کا منزل من اللہ ہونا مشروط ہے، یہ کلمات سن کر جن کو ایمان لانا تھا وہ ایمان لاچکے اور جو لوگ ایمان لا چکے تھے ان کے دلوں کو مزید طمانینت و تقویت حاصل ہوئی۔ اسی طرح جنگ بدر کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی تعداد، تیاری، قلت ساز و سامان اور اسکے مقابلے میں مشرکوں کا جم غفیر، لشکر عظیم، اونٹوں اور گھوڑوں کی کثرت، سامان رسد وغلہ کی بہتات کو دیکھ کر، بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو کر یہ دعا فرمائی ''اللهم ان تهزم هذه العصابة لن تعبد ابدا'' اے اللہ اگر یہ تھوڑی سی جماعت کو آج شکست ہوگئی تو، تو کبھی بھی پوجا نہ جائے گا'' ذرا الفاظ دیکھئے شرط اور مشروط دیکھئے اور فیصلہ کیجئے، صاف طور پر کہا جارہا ہے کہ اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت شکست خوردہ ہو جائے تو (ہمارا کیا ہم تو مر جائیں گے) لیکن تیرا کیا ہوگا۔ تو اس کے بعد پھر کبھی پوجا نہ جائیگا۔ تیری عبادت قیامت تک نہ ہوگی (کیوں کہ میں تو آخری پیغمبر ہوں، میرے بعد پھر کوئی پیغمبر بھی نہیں ہے، جو تیری توحید کی دعوت دیگا) مطلب صرف یہ تھا کہ آج اس تھوڑی سی جماعت کو جو تیری ہے فتح یاب فرما۔ اس کے مقابلہ میں مہدیؑ نے جو فرمایا وہ توحید و رسالت کو للکارا نہیں، بلکہ اپنی ذات کی حد تک فرمایا اور وہ بھی سامعین سے کہ ''اگر ایسا ہوا جیسا کہ میں خدا کے حکم سے کہہ رہا ہوں، تو جان لو کہ 'بندہ نے جو کہا وہ (بحیثیت مہدی موعود خلیفۃ اللہ) سچ ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو سمجھو کہ بندہ

نے جو کہا اپنے نفس کی طرف سے کہا تھا۔

جب آنحضرت ﷺ کی دعا قابل اعتراض نہیں تو مہدی موعودؑ کا فرمان کس طرح قابل اعتراض ہو سکتا ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا اس وقت کے حال کے تحت تھی اور مہدی موعودؑ کی پیشین گوئی آئندہ زمانے سے متعلق۔

غرض آیت، حجت اور پیشین گوئی کو شرط قرار دینا کم نظری کی علامت ہے اور بس۔ پھر جو ہوا وہ بھی دنیا نے دیکھ لیا، کہ پہلے روز کی جنگ میں عینل کا لشکر عظیم جو بے شمار آلات حرب سے لیس تھا۔ ساٹھ فقراء بے نوا کے مقابلہ میں ٹک نہ سکا اور بے شمار لاشوں کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر لیا۔

(۸) اسی طرح حضرت مہدی موعودؑ نے بندگی میاںؓ کے حوالے بار صفت ولایت کرنے کے وقت فرمایا۔ ہشیار باشید کہ ایں بار ولایت است سر جدا شود و پوست بکند واگر استخوان پیل وپہلوئے فولاد باشد تا دریں بار بوسیدہ شود، باز فرمودند کہ جہان دشمن شود و دوست و غمخوار شما کسے نماند حتیٰ کہ بند جامۂ شما آں ہم دشمن شما شود اما در دل وجاں بے فکر ولا وبال باشند کہ حق طرف شما است (تاریخ سلیمانی) ہوشیار ہو کہ یہ بار ولایت ہے۔ سر جدا ہوگا، پوست کھینچا جائیگا، اگر ہاتھی کی ہڈیاں اور فولاد کا پہلو بھی ہو تو اس بار سے بوسیدہ ہو جائیگا پھر فرمایا دنیا دشمن ہو جائیگی، تمہارا دوست اور غم خوار کوئی نہ رہے گا حتیٰ کہ تمہارے جامے کا بند بھی دشمن ہو جائیگا لیکن دل وجان کو بے فکر ولا وبال رہیں گے کیوں کہ حق تمہاری طرف ہے۔

(۹) اسی طرح کی روایت آئی ہے کہ: حضرت مہدیؑ کی رحلت کے چار پانچ دن بعد دو تین مرتبہ تاکید کے ساتھ سادات کبیر بندگی میاں سید خوندمیرؓ کو حضرت مہدیؑ کی روح پر فتوح سے معلوم کیا گیا کہ تم ملک گجرات کا ارادہ کرو، کیوں کہ تم سے جو کام منسوب کیا گیا ہے وہاں ظہور پائے گا، پس بندگی میاںؓ اس معاملہ کو سید السادات میراں سید محمودؓ (ثانی مہدی) سے عرض کیا، آنجناب نے یہ جواب باصواب دیا کہ آنحضرت مہدیؑ کی روح پر فتوح سے جس چیز پر آپ مامور ہیں اور جس کی تاکید کی گئی ہے وہی عمل کریں (مطلع الولایت)

اس روایت میں ''تا بکاریکہ نسبت شما کردہ ایم آنجا ظہور خواہد شد'' کے الفاظ اسی بار امانت (بار ولایت) کی طرف دلالت کرتے ہیں، جسکی خبر پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ اور سوانح مہدی موعودؑ میں یہ روایت اسطرح بیان ہوئی ہے کہ ''روایت ہے کہ بعد رحلت فرمانے جناب سیدنا مہدیؑ کے ایک ہفتہ کے اندر جناب صدیق ولایتؓ کو امام مہدیؑ کی روح مبارک سے معلوم ہوا کہ تم یہاں سے گجرات چلے جاؤ کیونکہ اس میں مقصود خدا ہے ''قَاتَلُوا وَقُتِلُوا'' جو خاص تمہارا منصب ہے گجرات میں اس کا سر انجام ہوگا، اسی طرح جناب سید محمودؓ خلف ارشد سیدنا مہدی موعودؑ کو بھی معلوم ہوا، جناب سید خوندمیرؓ نے ان معلومات کو

جناب سید محمودؓ سے بیان کیا، آپؓ نے کہا "مجھ کو اسی طرح معلوم ہوا ہے"(سوانح مہدی موعودؑ باب ا حصہ دوم ص ۱۶۱)

(۱۰) اور حضرت سید محمودؓ (ثانی مہدی) جب فراہ مبارک سے ہندوستان واپس آئے تو حضرت سید خوندمیرؓ بھی آپؓ کے دائرہ میں آئے تھے، حضرت سید محمودؓ نے ان کو واپس کرتے وقت جو کچھ فرمایا اس کا ایک جملہ یہ بھی ہے کہ: "مانیک خواہ شماایم گفتۂ مابکنید کہ حضرت میراںؑ بر شما بار "قَاتَلُوا وَقُتِلُوا" دادہ اند، اگرچہ نزد ما باشید آں راامکان محال است (پنج فضائل) میں آپکا خیر خواہ ہوں، میرے کہنے پر عمل کرو کیونکہ حضرت مہدیؑ نے آپ پر "قَاتَلُوا وَقُتِلُوا" کا بار رکھا ہے اگر میرے پاس رہو گے تو اسکا امکان محال ہے۔

اوپر جتنی روایات بیان کی گئی ہیں ان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت سید خوندمیرؓ حامل بار امانت، بدلۂ ذات مہدی موعودؑ ہیں اور جلیل القدر صحابۂ کرام کے اسماء گرامی ان روایات میں بحیثیت راوی مذکور ہیں جن کو اس بات کا علم تھا مثلا حضرت سید محمود ثانی مہدیؓ، حضرت سید خوندمیرؓ، حضرت شاہ نعمتؓ، حضرت شاہ دلاورؓ، حضرت میاں یوسفؓ، حضرت ام المومنین بی بی بونجیؓ۔ اور خصوصا آیت "فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ ---------" کے بیان میں حامل بار امانت کی مہتم بالشان خصوصیات بیان ہونے لگیں تو صحابۂ کرامؓ میں اشتیاق پیدا ہو گیا تھا کہ حامل بار امانت کون ہیں معلوم کیا جائے اور جب حضرت شاہ نعمتؓ، حضرت میاں یوسفؓ اور ام المومنین بی بی بونجیؓ کے سوال کے جواب میں حضرت سید خوندمیرؓ کی تخصیص ہوگئی تو کیا اب بھی کسی کو شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے۔؟

نیز یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ اصول حدیث کا ایک ضابطہ ہے کہ جب کوئی روایت ضعیف ہو اور متعدد طریقوں سے اسکی تائید ہو جائے تو وہ حسن کے درجہ میں شمار کی جاتی ہے اور وہ خبر متواتر المعنی احادیث کے مماثل سمجھی جاتی ہے، پس خبر شہادت حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ خبر مشہور، قطعی الصدور اور قطعی الدلالۃ کی شان رکھتی ہیں۔

قیامت

قیامت کا دن وہ دن ہے جس دن سب مردے اٹھ کھڑے ہو کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے، قیامت کا لفظ ہر قوم اور ہر زبان میں مستعمل ہے، جب کبھی کوئی بڑی مصیبت، آفت، وبا، بلا، طوفان، طغیانی، زلزلہ میں اجتماعی ہلاکتیں ہوتی ہیں تو لوگ اسکو قیامت کے نام سے یاد کرتے ہیں، اللہ نے تمام انسانوں کو دنیا میں پیدا کیا، ان کی رہنمائی کیلئے انبیاء بھیجے، ہدایت کیلئے، کتابیں عطا کی، صحیفے نازل کئے، پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنی اپنی امتیوں کو اللہ کی توحید، رسالت پر ایمان، اچھے اعمال کی ادائی اور برائیوں سے پرہیز کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس دنیا میں تم آزاد نہیں ہو، لیکن یہ نہ سمجھو کہ تم اللہ اور اسکے رسول کے احکام کی نافرمانی کے بعد تم کو یوں ہی چھوڑ دیا جائیگا، بلکہ اللہ نے آخرت کا دن مقرر کیا ہے وہاں تمہارے اچھے اور برے اعمال کے ساتھ تم اللہ کے حضور پیش کئے جاؤ گے، تمہارا حساب لیا جائیگا اور تمہارے درمیان فیصلہ کیا جائیگا، اسی کو قیامت، یوم الدین، حشر، بدلہ کا دن، سزا و جزا کا دن، پوچھ کا دن، یوم الحساب، فیصلے کی گھڑی، اللہ سے ملاقات کا دن بھی کہا جاتا ہے، اللہ نے قرآن شریف میں ان تمام ناموں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایمان کی بنیادی باتوں میں سے ایک بات جس کو ماننا ضروری ہے اور جس کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا، آخرت کے دن پر ایمان لانا ہے۔ چناچہ اللہ کا ارشاد ہے، وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴿البقرۃ:۴﴾۔یعنی وہ آخرت (کے دن) پر یقین رکھتے ہیں۔

(۱) اور اس دن کا آنا برحق ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ﴿انعام:۱۳۴﴾ ۔تم سے جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور آنے والی ہے اور تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔

(۲) قیامت کے دن ہی انسانوں کے درمیان تمام اختلافات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائیگا، چاہے وہ اختلافات مذہبی ہوں کہ مسلکی، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴿بقرہ،۱۱۳﴾۔وہ جن امور میں اختلاف کرتے ہیں، اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائیگا۔

(۳) یہ دنیا دار العمل ہے، یہاں انسان جو چاہتا ہے، جیسا چاہتا ہے، کرتا ہے۔اس کا عمل کیسا تھا؟ اس کی نیت کیا تھی؟ اس کا اجر کیا ہے دنیا میں اس کا اظہار نہیں ہوتا، اچھے اعمال کرنے والے تکلیف میں رہتے ہیں اور نافرمانی کرنے والے عیش و آرام میں، آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، تو اللہ ان کو بتلاتا ہے، کہ بدلہ، اجر و جزا دینے کیلئے میں نے ایک دن مقرر کیا ہے، جہاں تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ اور اجر ملے گا، چنانچہ ارشاد ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴿آل عمران:۱۸۵﴾ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور قیامت کے دن (تمہارے اعمال کا) پورا پورا بدلہ تم کو دیا جائیگا۔

(۴) قیامت کا دن آنا یقینی ہے، بلا شک اور بلا شبہ، اس دن کے بارے میں شک و شبہ کرنا کفر ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿الأنعام:۱۲﴾ وہ تم سب کو قیامت کے اس دن جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں، لیکن جب لوگوں نے خود کو خسارہ میں ڈالا، ایمان نہیں لاتے۔

(۵) قیامت کا دن سب کو جمع کرنے والا دن ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ﴿انعام:۱۲۸﴾۔ اس دن اللہ ان سکبو جمع کریگا۔

(۶) اس دن کی ہیبت ایسی ہوگی کہ کسی کو زبان ہلانے کی بھی ہمت نہ ہوگی، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿ھود:۱۰۵﴾ جب وہ دن آئیگا تو کوئی اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہ کر سکے گا ان میں بعض بد بخت ہوں گے اور بعض نیک بخت ہوں گے۔

(۷) اس دن نہ تو کسی شخص میں ہمت ہوگی کہ وہ اپنا مقدمہ لڑ سکے اور نہ کوئی ماہر وکیل ہی اسکی جانب سے اس کے کیس میں اپنی چرب زبانی سے دفاع کر سکے گا، چناچہ ارشاد ہے۔ فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿النساء:۱۰۹﴾ پس قیامت کے دن، ان کی طرف سے کون اللہ سے لڑے گا، یا کون ان کا وکیل بنے گا۔

(۸) فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ﴿النساء،۱۴۱﴾ پس اللہ مومنوں اور کافروں کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کریگا اور اللہ نے کافروں کیلیئے مسلمانوں پر غالب آنے کی کوئی گنجائش ہرگز نہیں چھوڑی۔

(۹) قیامت کے دن نہ کسی کی سفارش کام آئے گی اور نہ کوئی فدیہ، معاوضہ اور بدلہ لیکر خلاصی حاصل کر سکیگا، خواہ وہ معاوضہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿مائدہ:۳۶﴾ جن لوگوں نے کفر کیا، اگر ان کے پاس دنیا بھر کی چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی اور چیزیں بھی ہوں تاکہ وہ سب کا سب فدیہ دے کر قیامت کے دن عذاب سے بچ جائیں تو وہ ان سے قبول نہیں کیا جائیگا اور ان کیلیئے دردناک عذاب ہے۔

(۱۰) دنیا میں انسان جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے اور کر گذرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ کس نے سنا اور کس نے دیکھا، اللہ فرماتا ہے کہ قیامیت کے دن تو نے جو کچھ کہا یا کیا یا کروایا اس کا ریکارڈ ہمارے پاس ہے اور ان اعمال کا ہار بنا کر تیرے گلے میں ڈال

دیا جائیگا، جسے تو کھلا ہوا پائیگا، چنانچہ فرماتا ہے۔ وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا﴿بنی اسرائیل،۱۳﴾ اور ہم نے ہر انسان کے عمل کو اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے اور قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ نکال کر اس کو دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔

(۱۱) اب رہا یہ سوال کہ قیامت کا دن کب آئیگا تو اللہ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے۔ وَيَوْمَ يَقُولُ كُن فَيَكُونُ قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ﴿انعام:۷۳﴾ اور جس دن وہ کہیگا (قیامت کا دن ہو گا) ہو جا، پس اس دن وہ ہو جائے گا، اس کا فرمان حق ہے اور جس دن صور پھونکا جائیگا، بادشاہت اسی کی ہو گی۔ مطلب یہ کہ وہ جب چاہے گا قیامت کا دن آ جائیگا، یعنی دن اللہ کے پاس مقرر ہے مگر اس کا علم تم کو نہیں دیا جائیگا کہ اسی میں مصلحت ہے۔

(۱۲) دوسری جگہ اللہ نے اس کو اور وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے، ارشاد ہے۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴿اعراف:۱۸۷﴾ یہ لوگ آپؐ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کب واقع ہو گی، آپ جواب دیجئے کہ اس کا علم تو میرے پروردگار کو ہی ہے اس کے وقت کو اس کے سوا کوئی ظاہر نہ کریگا، آسمانوں اور زمین میں ایک بڑا بھاری حادثہ ہو گا، وہ (قیامت) تم پر اچانک آپڑے گی، یہ لوگ آپ سے اسطرح پوچھتے ہیں گویا آپ اس سے بخوبی واقف ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس آکر قرابت کا واسطہ دیکر، پوچھا کہ آپ ہمیں خفیہ طور پر بتا دیجئے کہ قیامت کب آنے والی ہے، اللہ نے اس کا جواب دیا کہ اے پیغمبر آپ کہدیجئے کہ قیامت کا علم تو صرف اللہ کو ہے، اللہ ہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کریگا، حدیث جبرئیل میں بھی آیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کو یہ جواب دیا، جب انہوں نے آپ سے پوچھا "متی الساعة" آپؐ نے فرمایا "ماالمسئول عنها باعلم من السائل" یعنی جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے اس کے بارے میں زیادہ واقف نہیں ہے، قیامت کے وقت کو پوشیدہ رکھنے کا سبب یہ ہے کہ بندوں کے دلوں میں اسکا ڈر اور خوف رہے، اس سے ڈر کر انقیاد اور اطاعت کی راہ کو قبول کریں اور برائیوں سے بچتے رہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت قائم ہو گی جب کے دو آدمی کپڑا خریدنے کی نیت سے کپڑا کھولیں گے، پھر اسکو لپیٹ بھی نہ سکیں گے کہ قیامت آ جائیگی، ایک آدمی پورے دنوں کی گابھن اونٹنی کا دودھ ہاتھوں میں لیگا اس کو چکھا بھی نہ ہو گا کہ قیامت آ جائیگی، ایک آدمی اپنے حوض کی مرمت اور داغ دوزی کر رہا ہو گا، اس میں پانی بھر نہ پائیگا کہ قیامت قائم ہو جائیگی۔ یعنی قیامت

انسانوں کی غفلت میں اچانک آجائیگی۔ آنحضرت ﷺ صرف اسی بات کو بتانے کے مجاز تھے، جس کے بتانے کا اللہ نے حکم دیا تھا اور جن باتوں سے آپؐ کو واقف تو کروایا گیا لیکن ان کے اظہار پر آپؐ مامور نہیں تھے، آپؐ نے واشگاف انداز میں اور قطعیت کے ساتھ بیان نہیں فرمایا، کیونکہ ایمان کی شان یہی ہے کہ غیب پر ایمان لایا جائے۔

(۱۳) قیامت کے دن کافروں کو کس طرح لایا جائیگا، اس کا نقشہ اللہ نے اسطرح کھینچا ہے، ارشاد ربانی ہے۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا مَّأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا ﴿بنی اسرائیل:۹۷﴾ اور ہم ان کو قیامت کے دن اوندھے منہ، اندھے اور گونگے اور بہرے (بنا کر) اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، جب اس کی آگ بجھنے لگے گی، تب ہم ان پر اور بھڑکا دیں گے۔

(۱۴) قیامت کے دن ظالموں کا حشر کیسا ہو گا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ﴿ابراہیم:۴۲،۴۳﴾ اللہ ان ظالموں کو اس دن تک مہلت دے رہا ہے جس میں ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی، اپنے سر اوپر اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہوں گے، ان کی نظریں ان کی طرف پھر کر نہیں آئیگی (بس ایک ہی طرف ٹک ٹکی باندھ کر دیکھتے ہوں گے) اور ان کے دل اڑ رہے ہون گے۔

(۱۵) جب قیامت آئیگی تو کائنات کا عالم کیا ہو گا؟ اس کا جواب اللہ دیتا ہے۔ يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ كَلَّا لَا وَزَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ﴿القیامۃ:٦ تا ١٢﴾۔ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہو گا (کہدیجئے) جب آنکھیں پتھرا جائیں گی اور چاند بے نور ہو جائیگا، سورج اور چاند جمع کر دئے جائیں گے، اس دن انسان کہے گا، اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے۔ بے شک کہیں پناہ نہیں اس روز تیرے رب کے پاس ہی ٹھکانہ ہے۔

(۱٦) اللہ کے پاس قیامت کا آنا اس قدر سچی حقیقت ہے کہ اللہ اس کی قسم کھاتا ہے، فرماتا ہے لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴿القیامۃ:١﴾۔ میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ جملہ "لا" سے شروع ہو رہا ہے، ترجمہ میں "لا" کو چھوڑ دیا جاتا ہے، اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ "لا" حرف زائد ہے، اسلئے اس کا ترجمہ "نہیں" نہیں کرتے۔ ورنہ بات الٹ جائے گی، یعنی معنی یہ ہوں گے۔ میں قیامت کے دن کی قسم نہیں کھاتا، حالانکہ اللہ کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں، اسلئے مفسرین نے "لا" کو حرف زائد

کہا، اس کے تعلق سے تفصیلی بحث ''حرف زائد کے عنوان میں ملاحظہ ہو۔

(۱۷) اللہ نے سورۂ مرسلٰت میں قیامت کا ذکر اس طرح فرمایا ہے۔ إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ ﴿المرسلات:۷﴾۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہو گی یعنی قیامت۔ اس کا وقوع کیسا ہو گا فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ لِيَوْمِ الْفَصْلِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿المرسلٰت:۸ تا ۱۵﴾ جب تاروں کی چمک جاتی رہے گی اور جب آسمان پھٹ جائیگا، اور جب پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے اور جب تمام پیغمبر وقت مقررہ پر جمع کئے جائیں گے، کس دن کیلئے معاملہ ملتوی کیا گیا تھا، فیصلہ کے دن کیلئے، اور آپ کو کیا خبر کہ فیصلہ کا دن کیا ہے۔ اس دن جھٹلانے والوں کیلئے ہلاکت ہے۔

(۱۸) ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ﴿النبأ:۳۹﴾ وہ دن حق ہے یعنی قیامت کا دن۔

(۱۹) اس دن کیا ہو گا؟ اللہ اسکا خاکہ اس طرح کھینچتا ہے۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴿النازعات:۶ تا ۹﴾۔ اس دن ہلا دینے والی چیز ہلا دے گی، اس کے پیچھے آنے والی چیز آئے گی، اس دن بہت سے دل مضطرب ہوں گے، ان کی آنکھیں نیچی ہوں گی۔

(۲۰) قیامت کے ہولناک واقعات کا تذکرہ قرآن میں اس طرح آیا ہے إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ﴿تکویر ۱ تا ۱۴﴾ جب سورج لپیٹ دیا جائیگا اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینوں کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور جب وحشی جانور (گھبراہٹ کے مارے) جمع ہو جائیں گے اور جب تمام دریا بھڑکا دئے جائیں گے اور جب روحیں بدنوں سے ملا دی جائیں گی اور جب اس لڑکی سے جسے دفن کیا گیا تھا پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی اور جب اعمال کے دفتر کھولیں جائیں گے اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی اور جب جنت قریب لائی جائے گی، تب ہر شخص کو معلوم ہو گا کہ وہ کیا لیکر آیا ہے۔

(۲۱) إِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿الانفطار:۱ تا ۵﴾ جب آسمان پھٹ جائیگا اور جب سب تارے جھڑ جائیں گے اور جب دریا ابل

پڑیں گے اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی، تب ہر شخص کو معلوم ہو گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا تھا اور پیچھے کیا چھوڑا ہے۔

(۲۲) قیامت کے دن کو اللہ نے یوم عظیم بھی کہا ہے أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿المطففین:۶﴾ وہ ایک بڑے دن کیلئے اٹھائے جائیں گے، جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

(۲۳) قیامت کے دن کو اللہ نے یوم الدین بھی فرمایا ہے، چناچہ ارشاد ہے مالک یوم الدین۔ (اللہ) جزا کے دن کا مالک ہے۔ پھر فرماتا ہے وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَـــيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّـهِ﴿الانفطار، ۱۷ تا ۱۹﴾ اور کیا آپ جانتے ہیں کہ جزا کا دن کیا ہے، پھر (سنو) کیا آپ کو معلوم ہے کہ جزا کا دن کیا ہے، وہ دن ایسا ہے کہ اس میں کوئی شخص دوسرے کیلئے کچھ نفع نہ دے گا اور اس دن حکم صرف اللہ ہی کا ہو گا۔ یعنی وہ دن نفسا نفسی کا ہو گا اور فیصلہ اللہ کا ہو گا۔

(۲۴) مزید اس دن کی ہولناکی کی کیفیت قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔ إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿انشقاق:۱ تا ۵﴾ اور جن آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم بجالائے گا اور وہ اسی لائق ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور اس میں جو کچھ ہے نکال ڈالے گی اور خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کا حکم بجالائے گی اور اس کو لازم بھی یہی ہے۔

(۲۵) اللہ نے قیامت کے خبر کو نباء عظیم فرمایا ہے، ارشاد ربانی ہے۔ عَمَّ يَتَسَـــاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ﴿النبا: ۱، ۲﴾۔ ہاں یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں، اس بڑے واقعے کے بارے میں (جس کے بارے میں یہ لوگ مختلف الخیال ہیں)

(۲۶) وہ دن فیصلہ کا ہو گا، جیسا کہ ارشاد ہے إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا﴿النباء:۱۷﴾۔ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

قصاص

قصاص کے معنی کے خون کے بدلے میں خون کے ہیں۔یعنی اگر کسی نے کسی کو قتل کر دیا تو اس کے بدلے میں قاتل کو بھی قتل کی سزا دی جائے۔اسی طرح اگر ظالم نے مظلوم کے کسی عضو کو نقصان پہنچایا ہے تو ظالم کے اس عضو کو بھی اتنا ہی نقصان پہنچایا جائے۔ مگر ایسا کام وہ خود ہی نہ کرے گا بلکہ عدالت اس کا فیصلہ کرے گی۔

چنانچہ ارشاد ربانی یہ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ﴿بقرۃ۱۷۸﴾ اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا جاتا ہے مقتولوں کے بارے میں۔ آزاد کے بدلے آزاد۔ غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہاں اگر قاتل کو (مقتول کے) بھائی کی جانب سے (قصاص میں) کچھ معاف کر دیا جائے تو پسندیدہ طور سے مطالبہ کرنا اور قاتل کو خوبی کے ساتھ ادا کر دینا چاہیئے۔

یہودیوں کے پاس صرف قصاص کا حکم تھا اور یہ حکم توریت میں بطور واجب تھا۔ نصاریٰ کیلئے قصاص کا حکم نہیں تھا۔ یا تو دِیَت (خون بہا) کا حکم تھا یا معاف کر دینے کا۔

لیکن امت مسلمہ کیلئے اللہ نے قصاص، دیت اور معافی میں سے کسی بھی امر کو اختیار کرنے حکم دیا ہے تا کہ امت کو آسانی ہو۔ جب ایک آدمی کسی آدمی کو ناحق قتل کرتا ہے تو شرع کی رو سے قاتل کو بھی قتل کر دیا جاسکتا ہے۔ اسی کو قصاص کہتے ہیں اس طرح قصاص کے نتیجے میں دو قتل ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿البقرۃ:۱۷۹﴾۔ اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے امید کہ تم قتل سے بچو گے۔

ناواقف لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں تو دو موت ہوتے ہیں اسکو زندگی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب قاتل کو یہ معلوم ہو جائے کہ قصاص میں اسکی جان بھی جائے گی تو وہ اقدام قتل کی ہمت نہ کرے گا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب دوسرے لوگوں کو بھی اس قانون کا علم ہو گا تو وہ بھی اس قسم کے اقدام سے گھبرا کر دور رہیں گے اسطرح قتل کے واقعات بھی بہت کم ہوں گے۔ اسی کو قرآن زندگی کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اسکی مزید تفصیل سورۂ مائدہ میں اسطرح اللہ نے بیان کی ہے۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ﴿المائدۃ:

﴿۴۵﴾۔ ترجمہ: اور ہم نے ان پر کتاب توریت میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ۔ لیکن جو شخص معاف کر دے تو وہ اس کیلئے (اسکے گناہوں کا) کفارہ ہو گا۔

یہ خیال نہ گذرے کہ توریت میں اللہ نے جو حکم دیا تھا اللہ اس کا ذکر کر رہا ہے اس لئے ہم پر یہ حکم لاگو نہیں ہوتا۔ ایسا خیال کرنا بھی غلط ہے۔ جب اللہ قرآن میں اس کا ذکر کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اے ایمان والوں تم کو بھی یہ حکم دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اس حکم کی پیروی نہیں کی۔ لیکن تم اسکو مانو اور اسپر عمل کرو۔ ایک بات اور یاد رکھنے کی یہ ہے کہ قاتل کو قصاص میں مارنے کا حکم تو دیا جا رہا ہے لیکن قاتل نے قتل کا (جان سے مارنے کا) جو طریقہ اختیار کیا تھا، ہم کو وہی طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہئے مثلاً قاتل نے کسی کو سولی پر لٹکا دیا۔ کسی کا گلا گھونٹ دیا۔ کسی کو بلندی پر سے گرا دیا۔ کسی کو کنویں یا سمندر میں ڈھکیل دیا۔ کسی کو زہر دے دیا وغیرہ تو قاتل کو جان سے مارنے کے وہی طریقے اختیار نہیں کریں گے۔ قاتل چاہے جو طریقہ اختیار کرے۔ قصاص میں ایک ہی طریقہ ہے کہ بس اسکو قتل کر دیا جائے۔

ہاں اگر مقتول کے بھائی یا ورثاء اگر خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو انہیں اسکی بھی اجازت ہے اگر وہ معاف بھی کر دیں تو معاف کرنے والوں کے حق میں یہ معافی ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی۔

قارون

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا اور فرعون کا غالباً وزیر مالیات بھی تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت خوب سمیٹی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ علم کیمیا سے بھی واقف تھا جس کی مدد سے سونا بھی بنایا کرتا تھا۔ اور اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ وہ اس کو جن صندوقوں میں رکھتا تھا اسکی کنجیاں بڑی طاقت والے چالیس مرد اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ فرعون کی غرقابی کے بعد وہ سوچنے لگا کہ موسیٰ وھارون علیھا السلام تو نبی بن گئے۔ مجھے کچھ نہیں ملا۔ موسیٰؑ سے شکایت کی۔ موسیٰؑ نے جواب دیا کہ اللہ نے جسے چاہا نبوت دی۔ اس میں میرا کیا اختیار، وہیں سے اس کے دل میں نفاق کی بیماری پیدا ہو گئی اور موسیٰؑ کی نافرمانی کرنے لگا۔ سب سے پہلی نافرمانی اس نے یہ کی کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اپنی چادروں کے چار گوشوں میں چار ہرے رنگ کے تاگے لگاؤ بروایتے آسمانی رنگ کے۔ تاکہ ان پر جب تمہاری نظر پڑے تو تم اللہ کو یاد کر سکو تو سب نے اس حکم کی تعمیل کی مگر قارون نے نہیں کی۔ جب موسیٰؑ نے پوچھا تو جواب دیا کہ مالک اپنے غلاموں میں تمیز کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں۔ میں کیوں کروں؟ پھر جب دوسری مرتبہ حکم خدا سے موسیٰؑ نے زکوۃ کی فرضیت کا اعلان کیا تو اس نے پہلے مان لیا

پھر گھر جا کر زکوۃ کا حصہ نکالا تو بہت بڑا معلوم ہوا۔ اس نے بنی اسرائیل کو جمع کیا، ان کی دعوت کی پھر کہا موسیٰؑ اب تک جو حکم دیتے تھے ہم مانتے رہے۔ اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اموال بھی ہڑپ کر جائیں۔ بولو کیا تمہیں منظور ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر اس نے ایک گندی اسکیم سوچی کہ ایک فاحشہ عورت کو کافی مال دے کر اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ سب کے سامنے یہ اعلان کرے کہ موسیٰؑ اسکے ساتھ ملوث ہوئے ہیں۔ جب حضرت موسیٰؑ حدود بیان کرنے کیلئے کھڑے ہوئے تو مختلف جرائم کے حدود بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ زانی اگر شادی شدہ ہو تو اسکی سزا یہ ہے کہ اُسے سنگسار کیا جائے تو قارون نے پوچھا کیا۔ آپ کو بھی اگر وہ حرکت آپ کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں اسی وقت وہ فاحشہ عورت پیش ہوئی اور آپ پر جھوٹی تہمت لگادی۔ موسیٰؑ نے اللہ کے نام کی سخت قسمیں دے کر اس عورت سے کہا کہ سچ بتا۔ وہ ڈر گئی، اور اس نے ساری سازش بیان کر دی اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور اس کو بد دعا دی۔ اللہ نے زمین کو آپ کے تابع کر دیا۔ آپ نے زمین کو کہا کہ اسکو نگل جا زمین نے قارون کے پیر پکڑ لئے پھر کہا نگل جا۔ زمین پنڈلیوں تک نگل گئی۔ پھر کہا اور تو گھٹنوں تک نگل گئی۔ یعنی وہ دھنس گیا۔ پریشان ہوا۔ رحم و کرم کی بھیک مانگتا رہا حضرت موسیٰؑ برابر زمین کو وہی حکم دیتے رہے۔ یہاں تک کہ زمین کھُل گئی اور وہ زمین میں دھنستا چلا گیا اور شاید قیامت تک دھنستا ہی رہے گا۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا شاید موسیٰ اسکی دولت کے مالک ہو جائیں گے تو آپ نے زمین کو حکم دیا کہ اسکی دولت کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے پھر یہ ہوا کہ اس کے سر پر ہی اسکی دولت بھی لائی گئی اور اندر دھنسا دی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قصص میں یہ واقعہ بیان کیا ہے: إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ ﴿قصص ٧٦﴾ بے شک قارون موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا پھر وہ شرارت کرنے لگا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دئے تھے کہ ان کی کنجیاں اُٹھانے سے ایک طاقت ور جماعت تھک جاتی تھی۔

قبض وبسط

قبض کے لغوی معنی رکاوٹ کے ہیں، لیکن دینی اصطلاح میں قبض کا مطلب قلب سالک پر جو واردات ہوتے ہیں ان کا منقطع ہوجانا یاان کارک جانا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا خوف اور اندیشہ ہے۔

اس کی تعریف یوں بھی کی جاتی ہے کہ محبوب کی تجلی جلالی یعنی آثار عظمت واستغناء کے فی الحال وارد ہونے سے قلب کا گرفتہ ہونا قبض کہلاتا ہے۔ اور قبض کے مقابل جو کیفیت ہے وہ حالت بسط کہلاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے لطف وفضل کے آثار کے ورود سے قلب کو جو سرور وفرحت نصیب ہوتی ہے وہ حالت بسط ہے۔

حضرت رسول اللہ ﷺ خود اس حال سے گذر چکے ہیں، چناچہ ابتدائی وحی کے بعد چند دن تک وحی نہیں آئی، اس زمانے میں حضورؐ رنجیدہ اور پریشاں رہتے تھے، کیونکہ اللہ کی جانب سے آپؐ کے قلب اطہر پر اللہ کا کلام آنا، حضرت جبرئیلؑ کا آپؐ کے پاس آنا آپؐ کو خدا کی طرف سے سلام سنانا، یہ ایسی دل کش اور فرحت خیز باتیں تھیں، جن سے حضورؐ کے قلب کو انبساط ومسرت نصیب ہوتی تھی۔ لیکن جب وہ بات اچانک رک گئی تو دل میں انقباضی کیفیت پیدا ہوگئی۔ پھر کافروں کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا، کہنے لگے کہ محمد کا اللہ، اس سے ناراض ہوگیا۔ کوئی کہتا کہ محمد کے اللہ نے محمد کو چھوڑ دیا۔ کوئی کہتا اللہ اب محمد سے بیزار ہوگیا، ایک طرف وحی کا انقطاع اور دوسری طرف مشرکین کے طعنے، آنحضرت ﷺ کو سخت کوفت ہونے لگی، تو اللہ نے سورۂ والضحیٰ نازل فرمائی۔ جس میں صاف الفاظ میں کہا گیا۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ﴿الضحیٰ:۵﴾ آپؐ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے ناراض ہوا، اور آخرت آپ کیلئے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے اور عنقریب آپؐ کا رب آپ کو (علم اولین وآخرین کی) نعمت دیگا، سو آپ خوش ہوجائیں گے۔

دیکھئے یہاں قبض کا سبب بھی ہے۔ اور قبض کی حالت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ اور اسکے بعد ہی بسط کی کیفیت اور اس کا سبب بھی بیان کیا جارہا ہے، وحی کے وقتی ہی سہی انقطاع کے سبب حضورؐ کس درجہ غمگین، ملول، رنجیدہ اور دل گرفتہ تھے اسکی کیفیت ایک حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے، جو طویل ہے اور جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها في حديث طويل، ان النبي ﷺ حَزِنَ حزناً غَدَا مِنْهُ مِرَارًا كَيْ يَتَرَدَّى مِنْ رُءُوسِ شَوَاهِقِ الْجِبَالِ، فَكُلَّمَا أَوْفَى بِذِرْوَةِ جَبَلٍ لِكَيْ يُلْقِيَ مِنْهُ نَفْسَهُ، تَبَدَّى لَهُ جِبْرِيلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ(ﷺ) إِنَّكَ رَسُولُ اللَّهِ حَقًّا. فَيَسْكُنُ لِذَلِكَ جَأْشُهُ وَتَقِرُّ نَفْسُهُ (رواہ بخاری) ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک طویل

حدیث میں روایت ہے کہ رسول اللہؐ (ابتداء نبوت میں جبکہ وحی میں توقف ہوا) اس درجہ مغموم ہوئے کہ غم کے سبب کئی بار اس ارادہ سے تشریف لے گئے کہ پہاڑ کی بلندی پر سے گر کر جان دے دیں، سو جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر اپنے گرانے کی غرض سے چڑھتے یا چڑھنے کا ارادہ فرماتے تو، جبرئیلؑ آپؐ کو نظر آتے، اور فرماتے۔ اے محمد ﷺ (مغموم مت ہو) آپ سچ مچ اللہ کے رسول ہیں، پس اس سے آپؐ کے قلب کو سکون ہو جاتا اور جی ٹھہر جاتا۔ نیز ملاحظہ ہو شریعت و طریقت از افادات جناب اشرف علی تھانوی، پانچویں فصل، قبض و بسط، ص ۳۶۹۔

حدیث سے تو صرف قبض کا حال معلوم ہوتا ہے، لیکن قرآن شریف بھی بسط کی کیفیت بھی بیان کر دی گئی ہے، کہ یہ قبض عارضی ہے اور الٰہی مصلحتوں کی بناء پر ہے، لیکن یہ رہنے والی کیفیت نہیں ہے، اس کے بعد کشادگی ہوگی۔ چنانچہ اللہ نے بشارت دی کہ۔ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ کے تحت ہر لمحہ آپ ﷺ کو نئی تجلّی اور نئی شان ملنے والی ہے۔

قرب

نماز کا فائدہ: حق تعالیٰ فرماتا ہے "وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب ﴿العلق:۱۹﴾ "یعنی سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ پس نماز کا اصل مقصود قرب رب ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

قرب نہ زپستی ببالا رفتن است بلکہ قرب از قید ہستی رستن است

یعنی قرب اس کا نام نہیں ہے کہ نیچے سے اوپر کو چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ قید ہستی سے چھوٹ جاؤ اس لئے کہ اوپر جانا یعنی قرب جب ہوتا کہ خدا کا مکان اوپر ہوتا، خدا تو مکان سے پاک ہے پس اس کا قرب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دو۔ اسی کو وصل کہتے ہیں۔ بعض لوگ وصل کے خدا جانے کیا معنی سمجھتے ہیں۔ وصل کے معنی اہل دل سے پوچھئے۔ شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں: تعلق حجاب است وبے حاصلی چو پیوندھا بگسلی واصلی۔

یعنی تعلق ہی اصل میں پردہ ہے اور لا حاصل ہے، جب تو اس کے کو کر دیگا تو تجھے وصل ہو جائیگا۔

کیا قرآن میں اعراب کی خطاء ہے

بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن میں تین مقامات ایسے نظر آتے ہیں جہاں باعتبار نحوی قاعدوں اور اعراب کے ''لحن'' پایا جاتا ہے۔ یعنی عام نحوی قواعد سے ہٹ کر اعراب پائے جاتے ہیں وہ آیتیں درج ذیل ہیں۔

(۱) لَّـٰكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ ﴿نساء ۱۶۲﴾ اس آیت میں الرَّاسِخُونَ، الْمُؤْمِنُونَ اور الْمُؤْتُونَ کی طرح الْمُقِيمُونَ الصَّلَاةَ آنا چاہئے تھا لیکن خلاف قاعدہ درمیان میں خط کشیدہ الفاظ ''الْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ'' آیا ہے۔

(۲) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿مائدہ ۶۹﴾ بے شک جو لوگ مومن ہیں اور جو یہودی ہیں اور فرقہ صابی اور نصاریٰ ہیں جو کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور عمل صالح کیا تو ایسے لوگوں پر نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت میں ''والصَّـابِئِينَ'' آنا چاہئے تھا کیوں کہ انّ کا اسم منصوب ہوتا ہے، لیکن یہاں ''الصَّـابِئُونَ'' آیا ہے جو قواعد نحو کے خلاف ہے۔

(۳) إِنْ هَـٰذَانِ لَسَاحِرَانِ ﴿طٰہٰ ۶۳﴾ یہ دونوں البتہ جادو گر ہیں۔ یہاں بھی ''إِن هَـٰذَانِ'' ان کا اسم ہے جسے منصوب ہونا چاہئے تھا۔

پہلی آیت کے بارے میں الْمُقِيمِينَ الصَّـلَاةَ نصب کی حالت میں جو آیا ہے اس کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے ہے۔ حضرت عائشہؓ اور ابان بن عثمانؓ سے یہ قول منسوب ہے کہ ''یہ کاتب کی غلطی ہے والْمُقِيمُونَ الصَّـلَاةَ لکھنا چاہئے'' روایت کے الفاظ یوں ہیں ''انه غلط من الكاتب ينبغي ان يكتب والمقيمون الصلوة''

اور اسیطرح إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ اور إِنْ هَـٰذَانِ لَسَاحِرَانِ کی دونوں آیتوں کے بارے میں کہتے ہیں ''ذلك خطاء من الكاتب'' یعنی یہ کاتب کی غلطی ہے اس کے بارے میں حضرت عثمان غنیؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا ''ان في المصحف لحنا ستقيمه العرب بالسنتها فقيل له الا تغيّره فقال دعوه فانه لا يحل حراما ولا يحرم حلالا''۔ یعنی آپ نے فرمایا کہ مصحف میں غلطی رہ گئی ہے عرب لوگ اپنی زبان کے اعتبار سے اس کو درست کر لیں گے۔ جب ان سے کہا گیا کہ کیا آپ اس کو نہیں بدلیں گے تو جواب دیا۔ اس کو چھوڑو کیونکہ وہ نہ تو کسی

حلال کو حرام کرتا ہے اور نہ کسی حرام کو حلال کرتا ہے۔ لیکن عام اصحاب اور اہل علم نے کہا ہے وہ صحیح لفظ ہے اس میں کاتب یا کسی دوسرے کی غلطی نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ اور ابان بن عثمانؓ کی روایت کے تعلق سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ ایسی بات ان سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ انہوں نے قرآن کو جمع کیا ہے اور وہ اہل لغت تھے۔ فصیح اللسان تھے پس وہ کس طرح اللہ کی کتاب میں کسی غلطی کو یہ کہہ کر چھوڑ سکتے تھے کہ اس کو دوسرے لوگ درست کرلیں گے۔ ان کی طرف ایسا قول منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس کے نصب کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کو مدح کے اعتبار سے نصب دیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے اس کو فعل مقدر کی بناء پر نصب دیا گیا ہے مطلب یہ کہ اس سے پہلے "اعني" مقدر ہے پس مطلب یوں ہوا۔ اعني المقيمين الصلوة وهم موتون الزكواة۔

اسی طرح دوسری درج کردہ آیت میں الصابئون آیا ہے۔ اس کے ذیل میں تفسیر خازن میں اس طرح لکھا ہے "والصابئون ظاهر الاعراب يقتضى ان يقال والصابئين" یعنی ظاہر اعراب کا تقاضا یہ ہے کہ والصابئین کہا جائے۔ قراءت سبع میں سے ابی بن کعب، ابن مسعود اور ابن کثیر کی قراءت اسی طرح یعنی والصابئین ہی آئی ہے۔ لیکن جمہور نے الصابئون ہی پڑھا ہے۔ خلیل اور سیبویہ کا مذہب بھی یہی ہے اس لفظ کو نیت کے اعتبار سے مؤخر کرتے ہوئے۔ (خازن صفحہ ۶۳ جلد ثانی)

إِنْ هَـٰذَانِ لَسَاحِرَانِ۔ یہ 'ان' مخففہ ہے۔ اس لحاظ سے نحوی قواعد کی رو سے "هذين" ہونا چاہئے تھا لیکن قرآن میں هذان آیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی عائشہؓ کا قول ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے لیکن اکثروں کا کہنا یہ ہے کہ صحیح ہے اس لئے کہ ایسا کہنا حارث بن کعب، خثعم اور کنانہ کی لغت ہے یعنی ان کی زبان جیسے اتاني الزيدان۔ رائيت الزيدان، اور مررت بالزيدان ہے اور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ لم تزود مني بين اذناه صــربة۔ حالانکہ قواعد کے رو سے بین اذنیہ کہنا چاہئے تھا۔ اسی طرح دوسرا شاعر کہتا ہے ان اباها وابا اباها قد بلغا في المجد غايتاها۔ یہاں بھی پہلے مصرع میں ابیھا کے بجائے اباھا کہا گیا ہے کیوں کہ ان کی عادت تھی کہ وہ یاء ساکن کو الف بنادیتے تھے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ اصل میں انہ هذان لساحران تھا۔ مگر (ہ) کو حذف کردیا گیا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں "ان" کے معنی نعم (ہاں) کے ہیں چنانچہ روایت ہے کہ ایک سائل نے حضرت ابن زبیرؓ سے کچھ مانگا۔ آپ نے نہیں دیا تو اس نے کہا اللہ اس اونٹنی پر لعنت کرے جو مجھے تیرے پاس لائی آپ نے کہا ان و صاحبتها یعنی ہاں اور اس کے مالک پر بھی۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ قرآن سات قراءتوں پر نازل ہوا ہے۔ اور علماء نے اس کی توضیح اس طرح فرمائی ہے کہ اس کا مقصد ''تخفیف اور تسہیل'' ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں حدیث آئی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہشام بن حکیم بن حزام کو (نماز میں) سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے سنا کہ وہ ان الفاظ سے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ جن الفاظ میں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے نہیں پڑھایا تھا۔ میں تو حالت نماز میں ہی ان پر حملہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔ پھر میں نے سلام پھیرنے تک انتظار کیا۔ جب سلام پھیرا تو میں نے ان کی چادر پکڑ کر ان کو کھینچا۔ پھر میں نے پوچھا کہ یہ سورت جو تم نے پڑھی تم کو کس نے پڑھائی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے پڑھائی۔ میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے دوسرے الفاظ سے پڑھایا ہے پھر میں ان کو لیکر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور کہا کہ میں نے ان کو سورۂ فرقان ان الفاظ میں پڑھتے ہوئے سنا جو ان الفاظ سے مختلف ہیں جن سے آپ نے مجھے پڑھایا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ان کو چھوڑ دو پھر فرمایا ہشام تم پڑھو تو ہشامؓ نے آنحضرت کو پڑھ کر سنایا تو فرمایا اسی طرح قرآن نازل ہوا ہے۔ پھر فرمایا تم پڑھو تو عمرؓ نے ان الفاظ سے پڑھا جنکی تعلیم آنحضرت ﷺ نے دی تھی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا اسی طرح قرآن نازل ہوا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤ ما تیسّر منه**۔ یعنی قرآن سات قراءتوں پر نازل ہوا ہے۔ پس تم کو جس میں آسانی ہو اس طرح پڑھو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مختلف قراءتوں میں نازل ہوا ہے۔ لیکن اختلافات سے بچنے کے لئے قریش کی ایک قراءت پر جمہور کا اتفاق ہوا۔ اور اس کو محفوظ کر لیا گیا۔ اور اب وہی پڑھا جا رہا ہے۔ البتہ دوسری قراءتوں کو صرف بطور اختلاف کے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اب نمازوں میں جو قرآن پڑھا جاتا ہے اور پڑھا جا سکتا ہے وہی نسخہ ہے جس پر سب صحابہ کا اتفاق ہوا تھا۔ اور جس کو حضرت حفصہؓ کے پاس رکھوا دیا گیا اور بعد میں اس کی نقلیں تیار کی گئیں اور ہر جگہ ان کو بھیج دیا گیا۔ غالباً یہ اختلاف اعراب بھی ان ہی میں شامل ہے۔ ورنہ قرآن میں جو اعراب ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔

کیا حضرت سید محمد جونپوری ہی مہدی موعود ہیں

جن لوگوں کو مہدی موعود علیہ السلام کی بعثت کے نظریہ ہی سے اتفاق نہیں ہے ان سے تو اس مسئلہ میں بحث ہی بیکار ہے۔ البتہ جو لوگ بعثت مہدی کے قائل ہیں ان کی طرف سے ثبوت مانگا جاتا ہے۔ چونکہ اولاً اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کی احادیث پیش کی جاتی ہیں تو بعض کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ احادیث میں اختلاف ہے ان احادیث میں بیان کردہ علامات میں تضاد ہے اس لئے قطعی طور پر ان سے نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ہاں قرآن سے اگر اس بارے میں ثبوت فراہم ہو تو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

نہایت جزم کے ساتھ پوچھا جاتا ہے کہ کیا قرآن میں مہدی کا نام ہے اس کا جواب پچھلے صفحات پر دیا جاچکا ہے کہ قرآن میں بیسیوں مقامات پر مہدیؑ کے بارے میں ذکر ہے۔ لیکن لفظ مہدی کی صراحت کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ اللہ کی عادت ہی یہ نہیں رہا کی ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں آئندہ بعثت کے بارے میں نام کی صراحت کرے۔ پورے انبیاء علیھم السلام کی کتابیں اور صحیفے اس پر دال ہیں۔ البتہ انجیل میں آنحضرت ﷺ ختمی مرتبت کے بارے میں جو نام آیا ہے وہ بھی نصاریٰ کے پاس متنازعہ مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ کیوں کہ ان کا استدلال ہے کہ انجیل میں ''احمد'' کی بشارت ہے اور مسلمان ''محمد'' کو پیغمبر مان بیٹھے ہیں۔ علماء اسلام کی جانب سے اس اعتراض کے شافی جوابات دئے گئے ہیں۔ لیکن مانتے وہی ہیں جن کو توفیق ایزدی ملتی ہے۔

غور طلب بات یہاں یہ بھی ہے کہ قرآن میں مختلف مقامات پر جس بعثت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی تصریح' اس کی شرح آنحضرت ﷺ نے امت پر شفقت کرتے ہوئے اپنی احادیث میں لفظ ''مہدی'' سے فرمائی ہے۔ بس کیا تھا علماء نے اسی کو پکڑ لیا اور مطالبہ کرنے لگے کہ ''مہدی'' کو قرآن میں بتائو تو مانیں۔ صاف اور سیدھی بات تو یہ ہے کہ ''مہدی'' کا لفظ آنحضرت ﷺ کی احادیث میں ہے اور آپ نے موعودہ بعثت کی شرح کے طور پر اس لفظ کا اظہار فرمایا ہے۔ تحقیق کرنی ہو تو مہدیؑ کو کلام رسول میں دیکھنا چاہئے نہ کہ کلام خدا میں۔ زبان رسول ﷺ سے نکلی ہوئی بات کو اللہ کے کلام میں ڈھونڈھنا اور ہم سے مطالبہ کرنا کہ قرآن میں وہ لفظ بتاؤ۔ غلط مطالبہ ہے۔ اس کے باوجود پچھلے صفحات پر ان مقامات کی نشاندھی کی گئی ہے۔ جہاں مہدی علیہ السلام ہی مراد ہیں۔ احادیث کے سلسلہ میں تو خاصی لمبی بحثیں ہوتی آئی ہیں یعنی

(۱) یہ احادیث اُحاد ہیں۔

(۲)۔ ان کے راوی ثقہ اور معتبر نہیں ہیں۔

(۳) ان میں بیان کردہ علامات میں تضاد ہے۔

حالانکہ یہ ساری باتیں لوگوں کو گمراہ کرنے اور سادہ لوح عوام کو دھوکہ دینے کی باتیں ہیں عوام کو کیا خبر کہ مہدی موعود علیہ السلام کے تعلق سے آئی ہوئی حدیثوں کا کیا مقام ہے۔ محدثین نے ان کو کیا درجہ دیا ہے۔ اور علامتوں کے اختلاف کا کیا حل نکالا ہے۔

مختصراً ہم یہاں ان اعتراضات کا جواب درج کرتے ہیں جس پر علماء اہل سنت کا اتفاق ہے یعنی مہدی موعود علیہ السلام کے متعلق احادیث اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے جدا جدا ہیں لیکن وہ ''متواتر'' ہیں اور جو حدیث متواتر ہوتی ہے وہ یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا جو احادیث متواتر ہوتی ہیں ان کے راویوں سے بحث نہیں کی جاسکتی۔ علامتوں میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن اس حد تک تو سب کا اتفاق ہے کہ مہدی اہل بیت رسول اللہ ﷺ سے، فاطمہؓ کی اولاد سے ہوگا اور اللہ اس کو جب چاہے گا مبعوث کرے گا بلکہ وہ خاتم الدین ہوگا وہ اشراط ساعت سے ہے۔ جس کا ظہور یقینی ہے۔ اشراط ساعۃ کا انکار بھی کفر ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس پر پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ سید محمد جونپوری ہی مہدی موعود ہیں اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ مہدی موعود علیہ السلام اگرچہ ''نبی'' نہیں ہیں لیکن ایک پیغمبر کی صداقت معلوم کرنے کے لئے جو دلیلیں دی جاتی ہیں اور خصوصاً خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی ﷺ کی نبوت کی صداقت کے لئے جو دلیلیں دی جاتی ہیں ان کو ہی مہدی موعود علیہ السلام کی مہدیت کی صداقت کا معیار تجویز کرلیں پھر دیکھیں کہ کیا حضرت سید محمد جونپوری اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کے لئے علماء اسلام نے چار زبردست دلیلیں پیش فرمائی ہیں۔

(۱) کتب سابقہ کی پیشین گوئیاں (۲) دعویٰ نبوت اور تادم آخر اس پر بقاء (۳) معجزے (۴) اخلاق۔

(۱) کتب سابقہ کی پیشین گوئیاں: آیئے سب سے پہلے پیشین گوئیوں کے بارے میں گفتگو کریں۔ اس سے پہلے بھی یہ بیان کردیا گیا ہے کہ پیشین گوئیوں کی زبان وضاحت اور صراحت کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ بس اشارے دئے جاتے ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کے مصادیق کو متعین کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے تعلق سے کہا گیا ہے کہ وہ رئیس العالم ہوگا۔ کیا مکہ میں آنحضرت ﷺ کی جو پوزیشن تھی اس پر رئیس العالم کا اطلاق صادق ہوسکتا ہے۔ بلکہ مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے بعد بھی جو آپ کا مقام تھا کیا اس پر ''رئیس العالم'' کا اطلاق ہوسکتا ہے جبکہ پورا عرب بھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ علاوہ ازیں یہ پیشین گوئی دیکھئے جو انجیل میں آنحضرت ﷺ کے تعلق سے آئی ہے۔

یسوع مسیح کا مکاشفہ جو خدا نے اسے دیا تا کہ اپنے بندوں کو وہ باتیں جن کا جلد ہونا ضروری ہے دکھادے۔ یوحنا کہتا ہے پھر میں نے آسمان کھلا ہوا دیکھا اور دیکھو (۱) ایک نقرئی گھوڑا اور اس کا سوار (۲) امانت دار اور سچا کہلاتا ہے (۳) اور وہ راستی سے عدالت کرتا ہے (۴) اور وہ لڑتا ہے (۵) اس کی آنکھیں آگ کے شعلوں کی مانند ہیں۔ (۶) اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں۔ (۷) اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا کسی نے نہ جانا (۸) اور خون میں ڈوبا ہوا لباس وہ پہنے تھا (۹) اور اس کا نام کلام خدا ہے (۱۰) اور وے فوجیں جو آسمان میں ہیں صاف اور سفید اور کتانی لباس پہنے ہوئے نقرئی گھوڑوں پر سوار اور اس کے پیچھے ہولیں (۱۱) اور اس کے منھ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے کہ وہ اس سے قوموں کو مارے (۱۲) اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکمرانی کریگا (۱۳) اور وہ قادر مطلق خدا کے قہر اور غضب کے کولھو میں روندتا ہے (۱۴) اور اس کے لباس اور اس کی ران پر یہ نام لکھا ہے۔ ''بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند'' (رحمۃ للعالمین۔ قاضی محمد سلیمان سلمان پوری)

یہ ہے پیشین گوئی کی عبارت اور اس کے الفاظ اب اگر اس پیشین گوئی کے ظاہری الفاظ کو نظر کے سامنے رکھیں اور حضور کی نبوت کے دعویٰ کی تحقیق کریں تو بتائیے کیا حاصل ہوگا مطلب یہ کہ جب تک پیشین گوئیوں کے الفاظ کی تاویل نہیں کی جائے گی صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا بحمد اللہ علمائے اسلام نے ان میں سے ایک ایک علامت کی صحیح تأویل کرتے ہوئے اس کو آنحضرت ﷺ کے حال کے مطابق ہونا بیان کیا ہے، اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ لیکن عیسائیوں کا اصرار ہے کہ ان میں سے ایک علامت بھی (حضرت) محمد ﷺ پر صادق نہیں آتی کیوں کہ وہ الفاظ کے ظاہری معنی کو دیکھ رہے ہیں۔ بس یہی حال مہدی موعود علیہ السلام کے بارے میں مروی احادیث میں موجود علامتوں کا بھی ہے۔ علماء بظاہر ان کے ظاہری معنی پر اڑے ہوئے ہیں حالانکہ ان کا مطلب سمجھنے کے لئے دینی دانش کی ضرورت ہے جو انسان کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ اپنے اختیار کردہ مسلک کے خول سے باہر آئے یہ بات بھی صرف چند احادیث کی حد تک ہے ورنہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مہدی علیہ السلام کے بارے میں جتنی تفصیلات بتائی ہیں ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے کسی خلیفے نے اپنے بعد آنے والے خلیفۃ اللہ کے تعلق سے ان کا عشر عشیر بھی نہیں بتایا یعنی رسول اللہ ﷺ نے مہدی موعود علیہ السلام کا نام۔ نسب۔ کنیت۔ گھرانہ۔ بعثت کا مقام۔ وجہ بعثت۔ مرتبہ و مقام۔ دعویٰ کی جگہ، مدت ارشاد وہدایت، بعثت کے وقت زمانہ کے حالات اور آپ کا مشن وذمہ داری وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

چنانچہ احادیث میں آیا کہ مہدی میری عترت سے فاطمہ کی اولاد سے ہے۔ یہ علامت حضرت سید محمد جونپوری علیہ السلام میں ہے۔ حدیث میں آیا ہے يصلحه الله في ليلة یعنی اللہ آپ کو ایک ہی رات میں صلاحیت دیگا۔ یہ علامت بھی حضرتؑ

میں ثابت ہے کہ آپ کو اللہ سے بلاواسطہ تعلیم ہوتی تھی۔

حدیث میں آیا ہے کہ مشرق سے لوگ نکلیں گے اور آپ کی تائید کریں گے یہ علامت بھی آپ میں موجود ہے کہ جونپور سے عرب اور افغانستان تک کے لوگوں نے آپ کی تصدیق کی۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

یہاں علماء کو اعتراض ہوتا ہے کہ سید محمد جونپوری نے ساری زمین کو عدل و انصاف سے کب بھر دیا حالانکہ حدیث میں صرف ''الارض'' ہے جس کے معنی زمین کے ایک خطے کے بھی ہوسکتے ہیں اور قرآن میں جہاں سماء یا سمٰوٰت کے مقابلے میں الارض آیا ہے تو اس کے معنی پوری زمین کے ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں صرف ارض آیا ہے تو اس کے معنی اس خاص زمین یا ملک کے ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے الْحَمْدُ لِلَّـهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ﴿الزمر:۷۴﴾۔(سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم کو زمین کا وارث بنایا) ظاہر ہے کہ اس ارض سے مراد پوری زمین تو نہیں ہے۔ بلکہ مفسرین نے یہاں الارض سے جنت مراد لی ہے۔ نیز آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جب پوری زمین عدل و انصاف سے نہیں بھری تو مہدی علیہ السلام کے زمانے میں یہ کہنا کہ پوری زمین عدل وانصاف سے بھر جائے گی باطل قرار پائے گا۔

ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس حصہ زمین پر آپ کے قدوم مبارک یا آپ کی تعلیمات پہنچیں اور وہاں کے لوگوں نے ان کو قبول کیا تو وہ حصہ عدل و انصاف سے بھریگا چنانچہ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین کے ذیل میں لکھا ہے معناہ لمن یطیعہ۔ یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ رحمت ہیں اس کے لئے جس نے آپ کی اطاعت کی۔

يملك سبع سنين۔ یعنی سات سال (امر ارشاد کے) مالک رہیں گے۔ تو یہاں بادشاہت سے ملک دنیا کی حکومت اور سلطنت مراد نہیں ہے جیسا کہ عام علماء سمجھتے ہیں بلکہ یہاں بادشاہت سے مراد دین اور روحانیت ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کو رئیس العالم کہا گیا ہے وہاں بھی ریاست سے مراد دین اور نبوت ہے مہدی علیہ السلام نے احمد آباد میں تاج خاں سالار کی مسجد میں ۹۰۳ھ میں دعویٰ فرمایا تھا ۹۱۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ اس طرح اس دعویٰ کے بعد آپ سات سال بقید حیات رہے۔ ظاہر ہے کہ متضاد علامات تو ایک شخص میں پائی نہیں جاسکتیں البتہ دعویٰ کرنے کے بعد جو علامت اس شخصیت کے حسب حال ہوگی وہی صحیح تر سمجھی جائے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، یعنی حضرت سید محمد جونپوری میں وہ علامات پائی گئیں جو احادیث میں موجود ہیں لیکن آنحضرت ﷺ کے متعلق پیشین گوئیوں کی طرح یہاں بھی احادیث کا صحیح مفہوم متعین کرنا ضروری ہے۔ اور بحمد اللہ مہدوی علماء نے یہ

کام بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔

(۲) دعویٰ تادم آخر اس پر بقاء: رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی دوسری دلیل آپکا دعویٰ ہے۔ کیوں کہ بغیر دعویٰ کے تو کوئی مقدمہ ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن فقط دعویٰ کافی نہیں ہے بلکہ عزم وجزم کے ساتھ آخر دم تک اس دعویٰ پر برقرار رہنا ضروری بھی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ کیا تو آپ کو کفار قریش اور مشرکین مکہ کی جانب سے اقسام وانواع کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قدر کہ اگر کوئی جھوٹا نبی ہوتا تو وہ کبھی کا بھاگ گیا ہوتا۔ لیکن چونکہ آپ سچے نبی تھے۔ ہر حال میں آپ نے نہایت صبر واستقامت کے ساتھ ان تمام مصائب کا مقابلہ کیا اور نہ کسی ترغیب کا شکار ہوئے اور نہ کسی ترہیب سے اس دعویٰ سے منھ موڑا۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی اس کی شاہد عادل ہے۔ پھر مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد تو یہودیوں کی ریشہ دوانیوں سے سابقہ پڑا۔ پھر کئی غزوات ہوئے۔ لیکن اللہ کا رسول برابر اپنی جگہ قائم رہا اور کہا۔ انا النبي لا كذب انا ابن عبدالمطلب۔

یہی حال حضرت سید محمد جونپوریؑ کا بھی رہا۔ جب سے آپ نے بحکم خدا مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تو علماء وفقہاء کی جماعتوں نے آپ کو ستایا۔ ایذائیں پہنچائیں۔ بادشاہوں کے کان بھر کر ان ممالک سے اخراج کروایا۔ غرض کہ جس مقام پر بھی آپ تشریف لے گئے خاص کر علماء سوء نے آپ کو اپنے ستم کے تیروں کا نشانہ بنایا لیکن بحمد اللہ آپ اپنے دعویٰ پر تادم آخر باقی رہے اور یہی فرمایا کہ بندہ کا ناصر اللہ تعالیٰ ہے۔

(۳) معجزے: آنحضرت ﷺ کی نبوت کی تیسری دلیل آپ کے معجزات ہیں۔ ویسے کفر وشرک کی وادی میں "نعرۂ توحید" خود ایک معجزہ ہے۔ امی ہونے کے باوجود فصیح ترین کلام اللہ قرآن شریف کا پیش کرنا خود ایک معجزہ ہے۔ اور معجزہ بھی ایسا جو رہتی دنیا تک کے لئے ایک چیالنج ہے۔ پھر چاند کو شق کرنا۔ انتہائی کم وقت میں سفر معراج کرنا۔ انگلیوں سے پانی کا نکلنا۔ لعاب دہن سے ٹوٹی ہوئی ہڈی کا جڑ جانا بے سروسامان ٹکڑی کا ایک عظیم لشکر پر فتح پانا بلکہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خود ایک معجزہ ہے۔ اسی طرح حضرت مہدی علیہ السلام بھی چونکہ اللہ کے خلیفے تھے۔ آپ سے بھی کئی معجزات کا صدور ہوا ہے۔ چنانچہ نظر کی تاثیر سے دنیا میں مدہوش لوگوں کا دنیا کو ترک کرکے آپ کے ساتھ ہو جانا۔ آپ کے قتل کے ارادے سے تلوار سمیت اٹھے ہوئے ہاتھ کا تین بار شل ہو جانا۔ پس خوردہ سے مریضوں کا شفا پانا۔ بیان قرآن سن کر ہزاروں لوگوں کا تائب ہو جانا۔ فیض نظر سے دریا کا طوفان تھم جانا۔ لحد مبارک میں جسد اطہر کا غائب ہو جانا۔ وصال کے بیس سال بعد

پیشین گوئی کے مطابق حضرت بندگی میاں سید خوند میر صدیق ولایت سید الشہداء حامل بار امانتؓ کا ساٹھ فقراء کے ساتھ پہلے دن مظفر کے مقابلے میں کامیاب ہونا۔ اور دوسرے دن جام شہادت نوش کرنا اور تین جگہ دفن ہونا۔

آپ کا سب سے بڑا معجزہ آپ کا بیان قرآن تھا۔ جو آپ نے ساری زندگی عصر اور مغرب کے درمیان فرمایا۔ آپ کے بیان کی خصوصیت یہ تھی کہ بیان کے دوران سامعین کے دلوں میں جو سوالات ہوتے تھے ان کے جوابات ازخودان کو مل جایا کرتے تھے دوسری خصوصیت یہ کہ آپ کے بیان کو سننے کے لئے ہزاروں لوگ جمع ہوتے تھے لیکن دور اور نزدیک بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو آپ کی آواز یکساں پہنچتی تھی۔ تیسری خصوصیت یہ کہ آپ جس خطے میں جاتے وہاں کی زبان میں بیان فرماتے تھے چوتھی خصوصیت یہ کہ آپ کے بیان کو بتمامہ من وعن کوئی تحریر کر نہیں سکتا تھا۔ پانچویں خصوصیت یہ کہ بیان کے دوران کئی لوگ جذبۂ حق میں بے ہوش ہو جاتے تھے۔ یہ چند معجزے ہیں جو یقیناً مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ جس طرح معجزے آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیل تھے اسی طرح حضرت مہدی موعود علیہ السلام کی مہدیت کی دلیل ہیں۔

(۴) اخلاق: آنحضرت محمد مصطفی ﷺ کی سب سے بڑی دلیل آپ کے اخلاق عظیم ہیں جسے قرآن نے وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴿القلم: ۴﴾ کے نام سے یاد کیا ہے علماء اسلام نے زیادہ زور اخلاق پر ہی دیا ہے کیونکہ جاہل اور کٹر لوگ معجزات کو جادو سے بھی ملا سکتے تھے۔ لیکن اخلاق کا میدان اتنا سنگلاخ ہے کہ اس میں صرف وہی چل سکتے ہیں جن کو چلانے والا اپنی رہنمائی میں چلائے اور ہوا بھی یہی کہ آنحضرت ﷺ اپنا ہر قدم اللہ کی ہی رہنمائی میں آگے بڑھاتے تھے۔ ورنہ جاہلوں کے درمیان نبوت ملنے کے بعد مکہ میں تیرہ سال' گالی گلوج 'مار پیٹ' برے القاب 'طعنے' بائیکاٹ وغیرہ کو برداشت کرتے ہوئے باعزت شریف اور صبر کی زندگی گذارنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی یہ صرف آپ تھے جو چل رہے تھے اور آپ کا خدا تھا جو اس راستے پر چلا رہا تھا۔ خون کے پیاسوں کو معاف کرنا۔ دشمنوں کو دعا دینا۔ ظلم کا جواب صبر سے دینا۔ ناکامی پر ہراساں نہ ہونا اور کامیابی پر فخر وغرور نہ کرنا ہمیشہ اللہ پر بھروسہ کرنا۔ نہایت تنگی میں بغیر سوال کے زندگی گذارنا۔ رات بھر اللہ کے آگے کھڑے ہونا اور فقط امت کے حق میں دعا کرنا یہ وہ اوصاف ہیں جن کے آپ بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ اور یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ آپ کا کٹر سے کٹر مخالف بھی آپ کے اخلاق عالیہ کے بارے میں ایک غلط لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

اسی طرح حضرت سید محمد جونپوری کے اخلاق فاضلہ کو سامنے رکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی ان ہی اخلاق کا عکس نظر آتا ہے۔ علم۔ حلم۔ تواضع۔ فقر وفاقہ۔ توکل۔ سخاوت۔ جوانمردی۔ عبادت۔ ذکر اللہ۔ دنیا سے اعراض۔ دنیاداروں سے اجتناب۔ کتاب اللہ کے ساتھ شریعت مصطفوی کی بے خطا پیروی غرض کہ جو وصف وہاں تھا یہاں بھی جلوہ گر تھا۔ اس لئے

کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا المھدی منی یقفو اثری ولا یخطی۔ مہدی مجھ سے ہے میرے نقش قدم پر چلے گا اور خطا نہ کرے گا۔ واضح باد کہ آنحضرت ﷺ کے نقش قدم پر چلنا اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی خطا نہ ہو معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ ناممکن ہے ہاں اللہ نے جس کو اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے البتہ اس سے وہ ممکن ہو سکتا ہے کیوں کہ اس راہ پر چلانے والا اللہ ہی ہے۔

چنانچہ مہدی علیہ السلام نے فرمایا بندہ حضور کی اتباع احادیث کو پڑھ کر نہیں کرتا بلکہ قلب محمد پر پہنچ کر روح رسول اللہ ﷺ سے پوچھ کر کرتا ہے۔ جب اتباع کا یہ حال ہو تو اس ذات گرامی کا مقام کتنا اعلیٰ اور ارفع ہے محتاجِ بیان نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس معیار پر آنحضرت ﷺ کی نبوت کو جانچا جاسکتا ہے اسی معیار پر حضرت سید محمد مہدی علیہ السلام کی مہدیت کو جانچا جائے تو بحمد اللہ کوئی فرق نہیں ملے گا۔ اور جن دلائل سے حضور کی نبوت کا اثبات ہو سکتا ہے ان ہی دلائل سے حضرت کی مہدیت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

اب رہی بحث کہ گذشتہ کئی صدیوں میں کئی لوگوں نے مہدی ہونے کا دعوی کیا ہے کوئی بھی دعویدار حقیقی معنوں میں ایسا نہیں تھا جن کا احادیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ مختلف ادوار میں مختلف امصار میں کئی لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا لیکن کیا مختلف اور متعدد لوگوں کے دعویٰ کرنے سے اصل مسئلہ ہی معدوم ہو جائے گا۔ اس سے تو بات اور پختہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب مختلف شہروں میں مختلف صدیوں میں متعدد لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ مہدی علیہ السلام کے تعلق سے احادیث نبویہ کثرت سے موجود ہوں اور ہر جگہ ان کی شہرت ہوئی ہو۔ اور مہدی علیہ السلام کا ظہور ضروریاتِ دین سے ہونا اس درجہ لوگوں میں متعارف ہو گیا ہو کہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ لوگ آپ کے منتظر ہوں۔

ایک یہودی یا ایک نصرانی یہ کہے کہ چونکہ بہت سے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ان میں سے ایک بھی حقیقی معنوں میں اس لئے نبی نہیں ہے کہ اس پر تورات اور انجیل میں موجود پیشین گوئیاں صادق نہیں آتیں۔ تو کیا نعوذ باللہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی نبوت بھی معرض بحث و تردد میں آجائے گی۔ بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے زمانے میں اور آپ کے بعد کے زمانے میں بہت سے لوگوں نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا لیکن وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ اور اسی لئے اللہ نے ان کو ناکام اور نابود کر دیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ سچے نبی تھے اس لئے آخر وقت تک آپ اپنے دعویٰ پر باقی رہے اور اللہ نے آپ کو نصرت عطا کی اور آپ کو غلبہ دیا۔ اور آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ اور یہ کہ دوسرے دعویداران نبوت کا آپ کی نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ آپ کا معجزہ قرآن شریف اور آپ کے

اخلاق فاضلہ قیامت تک آپ کے نبوت کے گواہ ہیں۔ نیز توریت اور انجیل میں جو پیشین گوئیاں آئی ہیں۔ علماء اسلام نے ان کی بھی صحیح تاویل و تعبیر کر کے ان کا آپ کے حق میں صادق آنا ثابت کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اور بعد کے زمانے میں بھی بہت سے لوگوں نے جن میں مسلیمہ کذاب، اسود عنسی، سجاح (عورت) متنبی اور غلام احمد قادیانی وغیرہ بھی شامل ہیں نبوت کا دعویٰ کیا، جھوٹے ہونے کی وجہ سے اللہ نے ان کا منھ کالا کر دیا۔ اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے اسی طرح حضرت سید جونپوری مہدی موعود علیہ السلام سے پہلے بھی لوگوں نے دعویٰ مہدیت کیا لیکن ان میں سے بعض تائب ہو گئے اور بعض غائب۔ حضورؑ ان کے زمرہ میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں حضرت سید محمد جونپوری مہدی علیہ السلام کے سوا جن لوگوں نے مہدی ہونے کا دعوی کیا ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ لوگ جو ''یملک'' وغیرہ کے ظاہری معنی لیکر یا علماء سوء کے بہکاوے میں آکر حکومت اور سلطنت کی طمع میں مہدی ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے جیسے مہدی سوڈانی وغیرہ۔ اور دوسری قسم ان صوفیاء اور اہل اللہ کی ہے جنہوں نے اپنے جذبہ وحال کی مستی میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد اس دعویٰ سے رجوع بھی کر لیا۔ اور توبہ کی۔ چنانچہ جن بزرگوں نے لغوی مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہماری کتابوں میں ان کے نام اسطرح ہیں۔

(۱) خواجہ حسن بصری (۲) خواجہ جنید بغدادی (۳) خواجہ عثمان مغربی (۴) خواجہ حسن نوری (۵) خواجہ عبد اللہ خفی (۶) خواجہ شیخ عیسیٰ (۷) شیخ عبد القادر جیلانی (۸) شیخ محمد عربی (۹) سید محمد گیسو دراز علیہم الرحمتہ

آخر میں حضرت سید محمد جونپوری نے ہوش و حواس کی درستی کی حالت میں امر الٰہی سے دعویٰ فرمایا دلیل میں کتاب و سنت کو پیش کیا اور آخر وقت تک اپنے دعویٰ پر قائم اور باقی رہے۔ خلافت اور مہدیت، نبوت سے تو اونچی نہیں ہے کہ اس کے لئے نبوت کے معیار سے بھی اونچا معیار تجویز کیا جائے۔ نبوت کے لئے جو معیار اور جو دلائل قوی سمجھے جاتے ہیں ان ہی دلائل کے معیار پر حضرت سید محمد جونپوری کی مہدیت و خلافت الٰہیہ کو رکھا جائے تو بادنیٰ تامل یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ دیگر مدّعیان مہدیت کے مقابلے میں حضرت سید محمد جونپوری ہی سچے مہدی موعود ہیں کیونکہ آپ ہی کے حسب حال وہ ساری باتیں ہیں جو قرآن اور احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔

آپ نے دینِ اسلام کی کس طرح خدمت کی اور اپنے مفوضہ فرائض انجام دئے اس کا ہلکا سا خاکہ غیر جانبدار مؤرخین کی زبانی سنئے۔

(۱) عربی تاریخ ''ظفر الوالہ'' میں لکھا ہے حضرت سید محمد جونپوری وہاں سے احمد آباد، پٹن، نہر والہ گئے اور بڑی نامی

قریہ میں قیام کیا جو وہاں سے تین فرسخ کے فاصلہ پر ہے اور آپ نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ فرمایا۔ عوام کے جم غفیر نے ان کی اطاعت کی اور پھر خاص خاص لوگوں میں بھی پیروی کا سلسلہ جاری رہا۔

(۲) ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے "میر سید محمد جونپوری جو اعظم اولیاء کبار میں ہوئے ہیں ہندوستان میں مہدیت کا دعویٰ کیا"

(۳) ابو القاسم فرشتہ نے "تاریخ فرشتہ" میں لکھا ہے "حضرت سید محمد جونپوری نے ہندوستان میں دعویٰ کیا کہ میں ہی شرع محمدی کی زبان میں مہدی موعود ہوں"

(۴) صاحب تحفتہ الکرام میر شیر علی قانع نے لکھا ہے "حضرت سید محمد جونپوری صرف لفظی دعویٰ کرنے والوں میں نہیں تھے بلکہ صاحب حال و صاحب ولایت تھے"

(۵) نامور مورخ شیخ محمد اکرام نے "رود کوثر" میں لکھا ہے حضرت سید محمد جونپوری فقط ایک عالم ہی نہیں تھے بلکہ پہلو میں ایک حساس دل اور منہ میں پر تاثیر زبان بھی رکھتے تھے وہ شرع کی پابندی پر بڑا زور دیتے تھے اور جہاں خلاف شرع کوئی بات دیکھتے تھے روک دیتے تھے۔

(۶) اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لکھتے ہیں "آخر اس زمانے کے طوفان جہالت اور شرک و بدعت کی ظلمت و ضلالت کو دیکھ کر جونپور سے حضرت سید محمد جو مہدی موعود کے نام سے مشہور ہیں۔ محض کتاب و سنت کی اشاعت پر کمربستہ ہوئے"

(۷) فرہنگ آصفیہ میں مولوی سید احمد دہلوی نے لکھا ہے 'فرقہ مہدویہ کے عقائد کا دارو مدار امور ذیل پر ہے۔ مہدوی مذہب کا معتقد ہونا۔ صدق دل سے توبہ کرنا۔ بغیر انا کے حسن عمل۔ ذکر دوام۔ عبادت الٰہی۔ منع سوال۔ ترک احتیاج۔ ضروریات سے جو کچھ بچے اس کی خیرات اور آئندہ کے لئے جمع مال و دولت سے پرہیز"

(۸) جناب سید ابو ظفر ندوی لکھتے ہیں "بجز عقیدہ مہدویت کے عقائد و اعمال میں حنفی المذہب ہیں۔ دنیا میں رویت باری کے قائل ہیں۔ ۲۷ رمضان کو شب قدر یقینی جانتے ہیں"

(۹) مولوی خیر الدین صاحب "جونپور نامہ" میں لکھتے ہیں۔ "سید محمد اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور رسول مقبول کے معجزوں میں سے ایک معجزہ تھے۔ ہاتھ میں تلوار اور سر پر قرآن ان کا امتیازی نشان تھا۔ فروعی مسائل میں ابو حنیفہؒ کی تقلید کرتے ہیں لیکن حدیث کی اتباع میں شدت سے کام لیتے ہیں"

(۱۰) مولوی ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں اسلام کی تعلیم کا اصلی عملی دور، مہدویہ جماعت نے شروع کیا۔ ان کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ اور والہانہ تھے اور ایسے تھے کہ صحابہ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔

(۱۱)"سچ یہ ہے کہ ہدایت کی روسے مہدی کا خطاب ان کے شایاں ہے کہ خود ہدایت عام اور کافہ انام کے ارشاد کے لئے مامور ہیں"(جونپور نامہ)

(۱۲)خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں "جونپور کے ایک بزرگ سید محمد صاحب نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ لاکھوں مسلمانوں نے اس کو قبول کیا۔ اور آج تک حیدرآباد' پالن پور جۓ پور' میسور سرحد میں ہزاروں پیرو، ان کے موجود ہیں"۔

کوثر

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ﴿الکوثر:۱﴾۔ بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کو عطا کردہ خصوصیات میں سے کوثر کا آپ کو عطا کیا جانا ایک خصوصیت ہے جس میں کسی نبی کی بھی شرکت نہیں ہے۔ کوثر ایک حوض کا نام ہے۔ جس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور اسکی خوشبو مشک سے زیادہ بہتر ہے اگر کوئی شخص ایک مرتبہ بھی اس حوض کا پانی پی لیتا ہے تو پھر وہ کبھی پیاس محسوس نہیں کرے گا۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ قیامت کے دن میں حوض کوثر پر رہوں گا۔ لوگ گروہ در گروہ وہاں آئیں گے۔ میں اپنے لوگوں کو پہچان کر اس کا پانی پلائوں گا۔ صحابہؓ نے کہا آپ ہم کو تو پہچان لیں گے لیکن بعد میں آنے والوں کو کیسے پہچانیں گے آپ نے جواب دیا، وضو کے نشانوں سے پہچان لوں گا جو اعضاء وضوء میں دھوئے جاتے ہیں (مثلاً ہاتھ، منھ اور پیر) وہ روشن رہیں گے (ایسے میں ایک گروہ آئے گا) میں ان کو دیکھ کر پہچان لوں گا اور ان کو بلاؤں گا۔ ایک آواز آئے گی (اور ایک روایت ہے کہ بعض فرشتے ان کو وہاں سے ہٹادیں گے) محمد ان کو مت بلانا یہ آپ کے نہیں ہیں (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) میں کہوں گا یہ میرے ہیں۔ کیوں کہ ان کے اعضاء روشن ہیں۔ آواز آئے گی کہ یہ آپ کے نہیں ہیں کیوں کہ ان لوگوں نے بعد میں نئی نئی باتیں پیدا کرلی تھیں اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد میں کیا کیا کیا۔ اور کتنی نئی باتیں نکالیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں ما احدثوا بعدك۔

اسکی خوبی یہ ہے کہ اس سے نہریں جاری ہوتے ہوئے بھی اس کا پانی جتنا تھا اتنا ہی رہے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد خیر کثیر ہے۔ اس میں ہر قسم کی دنیاوی اور دینوی دولتیں اور حسیّ و معنوی نعمتیں داخل ہیں۔ بعض لوگوں کے پاس اس سے مراد قرآن ہے۔ اور بعض کے پاس اس سے مراد نبوت، کتاب و حکمت ہے۔ یہ تو ہوئی شرح ازروئے شریعت۔ ان معنوں کو باقی رکھتے ہوئے طریقت میں "الکوثر" کی تعریف اسطرح بیان کی گئی ہے۔

الکوثر بحرِ بے پایاں ولایت ہے: حضرت مہدیؑ مبیّن مراد اللہ نے فرمایا بھائی سید خوندمیر فرمانِ حق تعالیٰ می شود کہ انا اعطیناک الکوثر مراد از کوثر ذات شما است۔ خاتم سلیمانی میں ہے مراد از کوثر ذات بھائی سید خوندمیر است۔ صاحب شواہد الولایت نے اس بشارت کی شرح اس طرح کی ہے۔ فاعلم ایھا المصــــدق قدثبت ان الکوثر الخیر الکثیر هو اســـم الولایت المحمدیة الذی ختم الله علی المهدي شـــهد الله تعالیٰ بالکوثر لِاَنّ کل نهرا لجنة - یجری منه وکل عین یاخذ منه، کذلك یجری نهر فیض الأنبیاء و الاولیاء من الولایت المحمدیة، وهو ذات المهدیة ثم قال المهدي بأمَر الصــمدفي حق میراں سید خوندمیر یا أخي انا وانت واحد۔ یعنی: اے مصدق جان لے کہ یہ بات ثابت ہے کہ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ جو نام ہے ولایت محمدیہ کا جس کو اللہ نے مہدی پر ختم کیا ہے۔ اللہ نے کوثر کی گواہی دی ہے کیونکہ جنت کی ہر نہر اس سے جاری ہوتی ہے اور ہر چشمہ اسی سے لیتا ہے اسی طرح ولایت محمد سے انبیاء اور اولیاء کے فیض کی نہر جاری ہوتی ہے اور وہ ذات مہدیت ہے۔ پھر مہدیؑ نے اللہ کے حکم سے میراں سید خوندمیر کے حق میں فرمایا اے بھائی میں اور تو ایک ہیں۔ نیز مہدیؑ نے فرمایا جس طرح بندے سے فیض جاری ہے تم سے بھی جاری رہیگا اور بہت سے لوگ تمہارے بیان اور پسخوردہ سے خدا تک پہنچیں گے۔

کسب حلال

مومن کیلئے عموماً اور طالب خدا کیلئے خصوصاً طہارت ظاہری کے ساتھ طہارت باطنی کا بھی خاص خیال رکھنا چاہئے۔ اور اس کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جو لقمہ اس کے حلق سے اترے وہ حلال ہو۔ طیب ہو اور پاک ہو۔ حرام اور مشتبہ لقمہ کھا کر حق تعالیٰ کے تقرب اور دیدار کی آرزو کرنا گویا ریت یا پانی پر نقش بنانے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴿المؤمنون:۵۱﴾ یعنی پاک چیزیں کھاؤ اور اچھے عمل کرو۔ اس آیت میں عمل صالح سے پہلے طیب لقمہ کھانے کا حکم ہے۔ حضرت سعدؓ نے التجا کی یا رسول اللہ میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالی میری دعا قبول فرمائے۔ آپ نے فرمایا" طِب طعمتك تســتجب دعوتك "یعنی اپنی غذا پاک حلال اور طیب رکھ تیری دعا مقبول ہو گی۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں "اگر تم نماز پڑھتے پڑھتے کمان کی طرح جھک جاؤ اور روزہ رکھتے رکھتے تنکے کی طرح سوکھ جاؤ تو بھی اللہ تمہارے اعمال قبول نہیں کرے گا جب تک تم حرام سے نہ بچو گے۔

حرام کھلا ہوا ہے یعنی کیا کیا حرام ہے وہ بیان کر دیا گیا ہے اسی طرح حلال بھی ظاہر ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں کچھ مشتبہ امور بھی ہیں پس جس نے اپنے آپ کو ان مشتبہ امور سے بچالیا اس نے اپنا دین بچالیا۔ اور جو چیز دل میں کھٹک پیدا کرے

اس سے بھی بچنا ضروری ہے اسی کا نام تقویٰ ہے۔

کلمۂ طیبہ

لا الہ إلّا اللہ محمد رسول اللہ

روایت ہے کہ حضرت مہدیؑ نے فرمایا کہ کلمۂ لا الہ إلّا اللہ کی چار قسمیں ہیں۔

ایک لا الہ إلّا اللہ گفتنی، یعنی صرف کہنے کی حد تک، دوسری لا الہ إلّا اللہ دانستنی یعنی صرف جاننے کی حد تک تیسری لا الہ اِلّا اللہ دیدنی یعنی دیکھنے کی حد تک۔ چوتھی لا الہ إلّا اللہ شدنی یعنی ہوجانے کی حد تک۔ ان میں سے تین مرتبے تو انبیاء اور اولیاء کے لئے ہیں یعنی علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ اور ایک قسم جو صرف کہنے کی حد تک ہے، منافقوں سے متعلق ہے۔ بعض روایتوں میں دیدنی کے بجائے چشیدنی ہے۔

ان مراتب کی تفہیم کے لئے بطور تمثیل یہ بیان کیا جاتا ہے کہ درجۂ گفتنی کی مثال ایسی ہے جیسے کہ پتھر پانی میں یعنی جب تک پانی میں ہے، پانی کا اثر اس پر ہوسکتا ہے بس اتنا ہی اثر اس درجہ والے ذاکر میں ہوتا ہے۔ جوں ہی اس پتھر کو پانی سے نکال لیا جائے تو اس پتھر پر پانی کا اثر باقی نہیں رہتا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ خشک ہوجاتا ہے۔

اور درجۂ دانستنی کی مثال اسی پتھر کی ہے جسے آگ میں ڈالا جائے۔ جب تک پتھر آگ میں رہتا ہے۔ پتھر پر آگ کا اثر باقی رہتا ہے۔ جلا تو نہیں سکتا لیکن اسکو کوئی ہاتھ لگا نہیں سکتا۔ لیکن جوں ہی اس پتھر کو آگ سے باہر نکال لیا جاتا ہے تو وہ تھوڑی دیر میں پھر ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ یہی مثال ہے اس شخص کی جو ذکر کو اسی انداز میں اختیار کرتا ہے۔

اور درجۂ دیدنی یا چشیدنی کی مثال اس لوہے کی ٹکڑے کی ہے جسے آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ جب تک وہ آگ میں رہتا ہے تو وہ نہ صرف آگ کی صفت اختیار کرلیتا ہے بلکہ اسکا رنگ بھی آگ کی طرح ہی سرخ ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر اسکو بھی آگ سے باہر نکال لیا جائے تو وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے بلکہ اپنے اصلی رنگ میں آجاتا ہے۔ دیدنی کے مرتبہ کے ذاکر کی بھی ایسی ہی مثال ہے۔ اور درجہ شدنی کی مثال اس لکڑی کی ہے جسے آگ میں ڈالا جاتا ہے تو لکڑی نہ صرف جل جاتی ہے بلکہ کوئلہ بن جاتی ہے۔ اور کوئلہ جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ یعنی وہ اپنا وجود کھودیتی ہے۔ یہی حال ہے اس مرتبہ کے ذاکر کا۔ یعنی اس مرتبہ میں ذاکر "تخلّقوا باخلاق اللہ" کا حامل بن جاتا ہے۔ اور اس درجہ کمال پر پہنچ جاتا ہے کہ "قیامت شو قیامت را بہ بیں" کے اصول پر فنا فی اللہ کے ساتھ ساتھ بقا باللہ کا مقام حاصل کرلیتا ہے نیز امامؑ نے فرمایا لا الہ إلّا اللہ بندہ کے دل پر اس قدر اثر کرے جتنا مونگ کا دانہ گائے کی سینگ پر مارا جائے تو اثر کر سکتا ہے یعنی جتنی دیر ٹھہر سکتا ہے تو اس بندہ کا مقصد پورا ہوجائے گا۔ اسی

طرح ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ اماممنا مہدیؑ نے فرمایا کہ لا الہ اِلّا اللہ سے مومن کے دل پر ایسا اثر ہونا چاہئے جیسا کہ روئی سے بھرے ہوئے گھر میں ایک چنگاری کر سکتی ہے کہ جس سے ساری روئی جل جاتی ہے لیکن لا الہ اِلّا اللہ کی تاثیر تو یہ ہے کہ غیر اللہ کی محبت پوری پوری سوختہ ہو جاتی ہے۔

کذب

اسکے معنی جھوٹ کے ہیں۔ یعنی امر واقع کے خلاف کہنا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان اور جھوٹ جمع نہیں ہوسکتے یا یہ کہ مومن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

لیکن بعض لوگوں نے اللہ جل جلالہ کیلئے امکانِ کذب کو جائز قرار دیا ہے اوران کی دلیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّ اللَّـهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿البقرۃ:۲۰﴾۔ یعنی اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے۔ تو گویا اللہ، جھوٹ پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ حالانکہ اللہ کی طرف وقوع کذب ہو یا امکان کذب دونوں باطل بھی ہیں اور خلاف نص قرآن بھی۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَ مَن اصدقُ من اللہ حدیثاً۔ یعنی اللہ سے بڑھ کر سچی بات بولنے والا اور کون ہو سکتا ہے اور دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا ہے۔ إِنَّ اللَّـهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿آل عمران:۹﴾۔ یعنی اللہ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ ان آیات کے مطابق اللہ جل جلالہ کی ذات مقدس ہے۔ ہر قسم کے نقص اور عیب سے۔ اور جھوٹ تو بہت بڑا عیب بھی ہے اور نقص بھی۔ تو اللہ کیلئے کیسے روا ہو سکتا ہے۔

اب جو لوگ اللہ کی ذات کے تعلق سے کذب کو منسوب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ امکان کذب اور ہے اور وقوع کذب اور ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ صرف امکان کذب اللہ کے تعلق سے جائز ہے۔ لیکن وقوع کذب محال ہے۔ یعنی اللہ نے جو وعدہ فرمایا ہے وہ اس کے خلاف کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے اگرچہ کرے گا نہیں۔ امکان کو وقوع لازم نہیں اور وقوع کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ذات خداوندی کے ساتھ کسی بھی عیب یا نقص کی نسبت کرنا خواہ وہ امکان ہو یا وقوع ہو، حد درجہ گستاخی ہے۔ ایسا کہنے والوں یا اعتقاد رکھنے والوں کو توبہ کرنی چاہئے۔

کفّارہ

نماز، روزہ اور حج کا جب وہ فوت ہو جائیں۔

اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے ذمہ بہت سی نمازیں اور روزے تھے تو ان کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے' اس کا صحیح طریقہ اسطرح بیان کیا گیا ہے۔ولو مات وعلیه صلوات فائتة و اوصی بالکفارة یعطی لِکُلّ صلواة نصف صاع من برّ کالفطرة۔ اور اگر ایک شخص مرا اوراس کے ذمہ فوت شدہ نمازیں ہیں اور وصیت کی کفارہ دینے کی تو ہر نماز کیلئے آدھا صاع گیہوں مانند صدقہ فطر کے دیا جائے یعنی آدھا صاع گیہوں یا آٹا یا ستّو یا ایک صاع جو یا چھوارہ (کھجور) یا ان کی قیمت دے اور وصیت کرنی اس شخص کو لازم ہو گی اگر وہ قادر تھا فوت ہونے والی نمازوں پر اور اس نے ادا نہ کی تھی وکذا حکم الوتر- والصوم - وانما یعطیٰ من ثلث ماله ولو لم یترك یستقرض وارثه نصف صاع مثلا وتدفعه لفقیر ثم یدفعه الفقیر للوارث وثم حتیٰ یتمّ۔ اور ایسا ہی حکم ہے یعنی فرض نمازوں کے مانند وتر اور روزہ کا یعنی ان میں سے ہر ایک کے عوض صدقہ ٔ فطر کے مانند دینا چاہیئے۔ اور یہ کفارہ میت کے مال کی تہائی سے دیا جائے اور اگر میت نے کچھ مال نہ چھوڑا ہو یا اتنا نہ ہو کہ سب نمازوں کے کفارہ کو کافی ہو تو میت کا وارث یہ تدبیر کرے کہ نصف صاع گیہوں مثلاً وہ قرض لے اور اسکو فقیر کے حوالے کرے۔ پھر فقیر وہ گیہوں وارث کو ہبہ کر دے۔ اور وارث پھر فقیر کو دیدے۔ اسی طرح اتنی بار دادوستد کرے۔ یعنی لیا اور دیا کرے کہ کفارہ تمام ہو جائے۔ یہ حیلہ اس امر کا ہے جو اس زمانہ میں اسقاط کے نام سے مشہور ہو رہا ہے۔ اور اہل ہند اس باب میں بالفعل یہ حیلہ استعمال کرتے ہیں۔ کہ عمر بھر کے نمازوں اور روزوں کا حساب کر کے کفارہ کا نقد دام ٹھہرایا۔ یا اناج معلوم کر لیا۔ پھر فقیر کو وہ نقد یا غلہ زبانی دے کر اپنے ذمہ قرض لیا۔ بعد اس کے اس قرض کے عوض ایک قرآن مجید فقیر کے حوالے کرتے ہیں۔ اور یہ اسقاط وارث کے ذمہ واجب نہیں ہے بلکہ تبرّع ہے مگر اس طرح کا تبرع تکلف سے خالی نہیں ہے۔

ولو قضـــاها ورثته بامره لم تجز لانها عبادة بدنیة بخلاف الحج لانه یقبل النیابة۔ یعنی اگر میت سے فوت شدہ نمازوں کو میت کے وارثوں نے اس کے حکم سے قضا پڑھیں تو اس کے طرف سے درست نہ ہوں گی۔ اس لئے کہ نماز عبادت بدنی ہے ہر مکلف کو حکم ہے کہ اپنے بدن سے اس کو بجالائے۔ دوسرے کے ادا کرنے سے ادا نہ ہوں گی۔ بخلاف حج کے اس لئے کہ حج نیابت (قائم مقامی) کو قبول کرتا ہے۔ یعنی وارث کے حج کرنے سے میت کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر چہ میت نے اسکی وصیت نہ کی ہو۔ کیونکہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو اس کے میت باپ کی طرف سے حج ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ کذا في الطحاوی - و لوادّی للفقیر اقلّ من نصف صاع لم

تجز، ولو اعطاہ الکلّ جاز۔ اور اگر وارث نے فقیر کو ایک صاع سے کمتر دیا تو جائز نہ ہو گا۔ اور اگر سب غلہ (یا پوری رقم) اسکو دیدیا تو درست ہے۔ یعنی صدقۂ فطر اور اس کفارہ میں اتنا فرق ہے کہ نصف صاع سے کم ایک فقیر کو فطرہ درست ہے۔ اور کفارہ نماز وروزے کا درست نہیں۔

ولوفدی عن صلواتہ في مرضہ لایصح بخلاف الصوم۔ اور اگر فدیہ دیا میت نے اپنی نماز کا اپنے مرض موت میں تو صحیح نہ ہو گا یعنی اس پر واجب ہے کہ وصیت کر جائے بخلاف روزہ کے کہ اگر مرض موت میں روزہ کا فدیہ دے دے تو درست ہے۔ لیکن اسکی صحت بعد موت کے ثابت ہو گی کذا في الطحاوی۔ ماخوذ از ترجمہ دُرّ مختار جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب قضاء الفوائت صفحہ ۳۳۶

اس سے ثابت ہوا کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء کو چاہیئے کہ میت کی طرف سے جتنی نمازیں اور جتنے روزے فوت ہو چکے ہیں ان کا حساب کرے اور خود میت کے مال میں کے ایک تہائی سے ان کو ادا کرے۔ اسی طرح میت کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے ورثاء کو اس تعلق سے وصیت کرے۔ اس کے بغیر چھٹکارہ نہیں۔ بعض لوگ جو اس کو ٹیکس (Tax) کہتے ہیں وہ ان کی کم علمی، کج فہمی اور فقہی معلومات کی کمی کا کھلا ثبوت ہے۔

لغت میں کفارہ کے معنی چھپانے والی چیز کے ہیں۔ اللہ کے احکام میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کی وجہ سے اللہ سے دوری اور دل میں جو میل پیدا ہو جاتا ہے اسکو دور کرنے کیلیئے اللہ نے ایک کار خیر کا حکم دیا ہے جس کے کرنے سے وہ میل چھپ جاتا ہے اور پھر سے اللہ کا قرب حاصل ہونے کی امید کی جاسکتی ہے چنانچہ قرآن شریف میں اللہ نے بعض گناہوں کے سلسلے میں کفاروں کا بھی حکم دیا ہے۔

(۱) چنانچہ قسمیں کھا کر توڑنے پر کفارہ دینے کا حکم دیا ہے جس کا ذکر ہم نے قَسَمْ کے باب میں کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) ایک انسان جب کسی پر ظلم کرتا ہے اور اسکے ہاتھ پیر وغیرہ کو نقصان پہنچاتا ہے تو اللہ نے اس ضمن میں کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ﴿المائدہ:۴۵﴾ ترجمہ: ہم نے ان پر کتاب تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے تو وہ اس کیلیئے کفّارہ ہو گا۔

(۳) قتل مومن کے سلسلے میں کفارہ اسطرح بیان کیا ہے: وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿النساء:۹۲﴾ ترجمہ: اور جو شخص بھولے چوکے سے کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو وہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں (تو ان کو اختیار ہے) اور اگر مقتول تمہارے دشمن کی جماعت سے ہو اور مومن ہو تو صرف ایک مسلمان غلام یا لونڈی آزاد کرنا چاہئے اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خوں بہا دینا اور ایک مسلمان غلام یا لونڈی آزاد کرنا چاہئے۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو تو وہ دو مہینے کے متواتر روزے رکھے (یہ کفارہ) خدا کی طرف سے توبہ (قبول کرنے) کا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جانتا اور بڑی حکمت والا ہے۔

(۴) انسان جب حالت احرام میں ہوتا ہے تو کسی جانور کا شکار کرنا یا کسی جانور کو ذبح کرنا یا قتل کرنا منع ہے۔ لیکن اگر کسی نے ایسا کر لیا تو اس کیلئے کفارہ مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: وَمَن قَتَلَهُ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ﴿المائدۃ:۹۵﴾ ترجمہ: تم میں سے جو جان بوجھ کر اُسے قتل کرے گا تو اس کا بدلہ اسی طرح کا چوپایہ ہے جس کا تم میں سے دو معتبر شخص فیصلہ کریں گے (جس کو) بطور قربانی کعبہ تک پہنچایا جائے یا (بطور کفارہ) چند مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔ یا اس کے برابر روزے رکھے تا کہ اپنے کام (گناہ) کی سزا کا مزہ چکھے۔

(۵) جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں، بہن وغیرہ کہہ دیتے ہیں یا ان کے پیٹ، پیٹھ، ران وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں جن کی طرف دیکھنا حرام ہے تو اسکو ظہار کہتے ہیں۔ ایسا کہنا حرام ہے۔ اس سے بیویاں اپنے شوہر سے قریب نہیں ہو سکتیں۔ اگر خدانخواستہ احیاناً ایسا ہوجائے تو اللہ نے پھر سے ان بیویوں کے قریب ہونے کا طریقہ یہ بتلایا ہے۔ الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنكُم مِّن نِّسَائِهِم مَّا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا ذَٰلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا فَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ﴿المجادلۃ:۲ تا ۴﴾ ترجمہ: تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو دراصل وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے۔ وہ بے شک ایک نامعقول بات ہے

اور جھوٹ ہے۔ اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور وہ اپنے قول سے رجوع کر لیتے ہیں تو ان کے ذمہ (بطور کفارہ) ان سے ہم بستر ہونے سے پہلے ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اس حکم سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ پس جس کو غلام نہ ملے تو اُسے دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھنے ہیں۔ ہم بستر ہونے سے پہلے اور جس کو اسکی بھی استطاعت نہیں ہے تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظہار کا کفارہ ہم بستر ہونے سے پہلے ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اور اگر غلام نہ ملے تو دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھنے ہیں۔ ہم بستر ہونے سے پہلے اور جو یہ بھی نہ کر سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

کسب

کسب کے معنی محنت سے کسی چیز کو کمانا یا حاصل کرنا ہے۔ خواہ وہ روٹی ہو یا اور کوئی چیز۔ شریعت میں انسان کو کسب کی اجازت ہے۔ ممانعت تو نہیں ہے۔ قرآن شریف کی آیات، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے مومن کیلئے کسب حلال کی اجازت ہے۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ (۱) مومن کیلئے (۲) کسب حلال۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو مومن نہ ہو گا اس کا کسب ناجائز ہو گا اور جو مومن ہے لیکن اس کا کسب حلال طریقہ سے نہ ہو گا وہ حرام ہی ہو گا۔ مہدویہ کے پاس بھی مطلق کسب ناجائز نہیں ہے۔ البتہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو اپنی مرضی سے متوکل علی اللہ قرار دے لیا ہے البتہ ان کو کسب کی اجازت نہیں ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی مرضی سے خدا کی محبت و عشق کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچنے کی غرض سے بالفاظ دیگر خدا کے دیدار کی "طلب" میں ماسوی اللہ کے "کسب" سے کمال بے رغبتی کی روش اختیار کرلی ہے۔ ان کا پھر ادنیٰ درجہ کی طرف رخ کرنا نہایت درجہ کم ظرفی اور دون ہمتی کا اظہار ہے جو ناپسندیدۂ حق ہے۔ ورنہ عام حالات میں عام مومن کو کسب حلال کی اجازت ہے۔

چنانچہ حضرت مہدی علیہ السلام سے ایک مرتبہ علماء نے سوال کیا کہ آپ کسب کو حرام کہتے ہیں، آپ نے فرمایا مومن کیلئے کسب حلال ہے، مومن بننا چاہئے اور قرآن میں غور تو کرو کہ مومن کس کو کہتے ہیں: (نقلیات میاں عبدالرشید)

اسی طرح نقل ہے حضرت مہدی علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ کسب کرنا کیسا ہے، حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا پہلے تو کسب کرنے والا مومن ہونا چاہئے پھر پوچھا کہ کوئی مومن ہو کر کسب کرے، حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا جس کا طریق پیغمبروں کا ہے شاید کہ وہ کسب کرے، حدود کسب کی حفاظت کرسکے۔ پھر پوچھا کہ کسب کے حدود کیا ہیں۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا۔ پہلی حد یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ کرے۔ کسب پر نظر نہ کرے دوسری حد یہ ہے کہ پانچ وقتہ نماز جماعت سے ادا کرے۔ تیسری حد یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرے، چوتھی حد یہ ہے کہ حرص نہ کرے، تھوڑی غذا اور ستر عورت پر اکتفا کرے پانچویں حد یہ ہے کہ پورا عشر خدا کی راہ میں دے۔ چھٹی حد یہ ہے کہ طالبان خدا کی صحبت میں رہے، ساتویں حد یہ ہے کہ اپنی ذات پر ہمیشہ ملامت کرے۔ آٹھویں حد یہ ہے کہ ہر دو وقت کی حفاظت کرے یعنی فجر کی نماز سے طلوع آفتاب تک اور عصر کی نماز سے عشاء تک اللہ کا ذکر کرے۔ نویں حد یہ ہے کہ اذاں کے بعد کام کرنا جائز نہیں۔ اور اگر کام کرے تو وہ کسب حرام ہے۔ دسویں حد یہ ہے کہ زبان سے جھوٹ نہ کہے، جو کچھ قرآن میں آیا ہے سب پر عمل کرے ممنوعات سے پرہیز کرے۔

ہم نے پہلے ہی یہ بتادیا ہے کہ کسب کے معنی کسی چیز کو محنت و مشقت سے حاصل کرنے کے ہیں۔ مگر عام لوگوں نے اسکو فقط دنیا کی حد تک محدود کر دیا ہے اور اسی وجہ سے جب بھی کسب کی بات نکلتی ہے تو ان کے نظر میں کسب معاش ہی رہتا ہے۔ لیکن قرآن نے دنیا کے علاوہ دوسرے امور کیلئے بھی کسب کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن کی آیت ہے۔ تلک اٰمۃ قد خلت لھا ماکسبت ولکم ماکسبتُم۔ وہ قوم تھی جو گذر چکی۔ اس کیلئے اس کے اعمال (جو وہ کمائے ہیں) اور تمہارے لئے تمہارے اعمال (جو تم نے کمائے ہیں) اس آیت میں کسبَت اور کسبتم سے مراد ہر گز مال نہیں ہے۔ بلکہ یہاں بحث اعمال سے کی جارہی ہے۔

قرآن شریف میں غور کرتے ہیں تو کسب اور اسکے دیگر مشتقات یعنی کسبَ۔ کسبا۔ کسبوا۔ کسبت۔ کسبتُم۔ اکَتسب۔ اکَتسبو۔ وغیرہ ۶۸ مقامات پر اللہ نے لائے ہیں۔ ان سب مقامات پر معنی کسب اعمال کے ہی ہیں۔ البتہ صرف ایک مقام پر یہ لفظ کمائی کے معنی میں ہے۔ اور وہ آیت سورۂ لقمان: ۳۴ کی ہے وماتدرِیُ نفس ماذاتکسبُ غدا۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا (مال) کمائے گا۔

کسب کا اطلاق جس طرح مال اور اعمال پر ہوتا ہے اسی طرح کسب کا اطلاق "حال" پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے ہر پیغمبر کو جو نبوت عطا فرمائی ہے وہ دولت اور نعمت کسبی نہیں ہے بلکہ وہبی ہے۔ یعنی کسی پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے نبوت اس شخص کی محنت مشقت عبادت اور ریاضت کی وجہ سے نہیں عطا فرمائی بلکہ اللہ نے اس منصب کیلئے جس ہستی کو اس غرض کیلئے مناسب سمجھا اس سے سرفراز فرمایا۔

البتہ ولایت دو طرح کی ہوتی ہے ایک ولایت کسبی اور دوسری ولایت وہبی۔ ولایت کسبی وہ ولایت ہے جو بندہ، اتباع قرآن اور سنت کی پابندی کرتے ہوئے زہد و تقویٰ کے اعلیٰ مدارج پر جب پہنچتا ہے تو اللہ تعالی اسکو ولایت سے سرفراز فرماتا ہے اسکو ولایت کسبی کہتے ہیں۔ اور ایک ولایت وہ ہے کہ اللہ کسی بندے کو خود پسند کرتا ہے اور اسکو ولایت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اسکو ولایت وہبی کہتے ہیں۔ اسکو ایک معنی میں سالک مخدوب اور مجذوب سالک بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حضور امامنا وسیدنا مہدی موعود علیہ السلام کو جو ولایت عطا ہوئی بلکہ آپ کو خاتم ولایت کا جو منصب ملا وہ محض "وہبی" ہے جس کی پیش گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیشتر احادیث کے ذریعہ فرمائی ہے۔

کسب کے دوسرے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الکاسب حبیب اللہ۔ یعنی کاسب اللہ کا دوست ہے۔ مگر بُرا ہوا الٹی سمجھ کا کہ لوگوں نے اس حدیث کے مطلب کو ہر کمانے والے پر چسپاں کر دیا۔ اور بڑے

فخر کے ساتھ کہنے لگے کہ کسب کی شریعت میں نہ صرف اجازت ہے بلکہ آنحضرت تو کاسب کو اللہ کا دوست کہہ رہے ہیں۔ اب آپ سوچئے کہ آج دنیا میں جو لوگ جو کچھ کمارہے ہیں کیا وہ سب صحیح اور جائز ہے۔ اور سب کے سب اللہ کے دوست ہیں۔ اور اگر ایسا ہے تو بتایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسپر خود عمل کیوں نہیں کیا۔ آپ کے اہل بیت کو اسپر عمل کرنے کیوں نہیں دیا۔ یا بتلایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد کیا کسب کیا؟ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، جب کہ آپ کو سخت ضرورت تھی۔ کیا آپ کے پاس مال تھا۔ یا آپ نے انتہائی فقر وفاقہ کے عالم میں جب کہ کئی کئی دن بس گذر جاتے تھے تو آپ نے کس کسب کو اپنایا۔ لوگوں کو "الكاسب حبيب الله" کہہ کر کسب کی فضیلت بیان کرنے والی ہستی نے خود کیوں کسب کو اختیار نہیں کیا۔ اصحاب صفہ کو کیوں کسب کا حکم نہیں دیا؟ کیوں کہ آپ نے فرمایا "الفقر فخرِي" تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں الکاسب سے مراد وہ شخص ہے جو راہ خدا میں محنت و مشقت کر کے اللہ کا فضل جو کمانے والا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کا حبیب ہے۔ ہاں بر سبیل تنزل یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سوال کرنے کی ذلت اور گداگری کی رسوائی سے بچنے کیلئے مومنانہ انداز میں حلال کمائی کی راہ کو جس نے اپنایا، خدا کی عبادت کی، حرص سے اپنا دامن بچایا وہ اللہ کا دوست ہے۔

اب رہی یہ بات کہ کسی نے توکل کو ہی اپنا پیشہ بنالیا لیکن اُسے اضطراری کیفیت لاحق ہوگئی اسطرح کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا تو وہ کیا کسب کر سکتا ہے تو حضرت مہدی علیہ السلام نے ایسی صورت میں ایک چیتل دو چیتل یعنی ایک ٹکا دو ٹکے کی کسب کی اجازت مرحمت فرمائی ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ وہ اگر آج پیسہ دو پیسے کمائے گا تو کل اسکو اس سے زیادہ کمانے کی حرص پیدا ہو جائے گی (پھر تو وہ دنیا کے دلدل میں پھنس جائے گا (غالباً ذوق نے کیا خوب کہا ہے

گر بعد ترک پھر سگ دنیا ہوا فقیر　　　کم بخت پاک ہو کے پلیدوں میں مِل گیا

حضرت مہدی علیہ والسلام نے اس اضطراری کیفیت میں جو یہ کسب کی اجازت دی بھی تو صرف اس لئے کہ سوال کی ذلت سے بچ جائے۔ اور ویسے اللہ تعالیٰ متوکلین کو دوست رکھتا ہے۔ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿آل عمران:۱۵۹﴾۔

کراماکاتبین

اللہ تعالیٰ نے سورۃ انفطار میں فرمایا ہے وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كِرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ﴿الانفطار: ۱۰﴾۔ بے شک تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ عالی قدر اور تمہارے اعمال کے کے لکھنے والے تم جو کچھ کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں، یہ حق ہے اور انسان کو چاہئے کہ تنہائی میں بھی یہ یقین کرے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے یا کسی ایسی جگہ جہاں تیسرا کوئی نہیں ہوتا وہ کسی سے کچھ کہتا ہے تو کراماکاتبین اسکے قول و عمل کو لکھ لیتے ہیں اور روز قیامت جب اعمال نامے پیش کئے جائیں گے تو انسان انکار نہ کر سکے گا۔

لیکن عاشقوں کا مقام اور ہے کہ اللہ اور اسکے خاص دوستوں کے درمیان ایسی رازو نیاز کی باتیں بھی آتی ہیں جن کی اطلاع ان فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔ بظاہر یہ بات قرآنی آیت کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے مخلوق کے رازو نیاز اور ہیں۔ اور خالق و مخلوق کے درمیان ہونے والے رازو نیاز کی باتیں الگ ہوتی ہیں۔ چنانچہ مولانا روم علیہ الرحمتہ نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست　　　　کراماکاتبیں راہم خبر نیست

یعنی عاشق (بندہ) اور معشوق (خدا) کے درمیان ایک ایسا راز ہے کہ کراماکاتبین کو بھی اسکی خبر نہیں ہے۔

چنانچہ حجتہ الاسلام حضرت امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم کے باب عجائبات قلب میں لکھتے ہیں ''بعض مکاشفین سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے کراماکاتبین نے ظاہر ہو کر کہا کہ تم اپنا ذکر خفی و مشاہدۂ توحید لکھ کر دو کیوں کہ ہم تمہارا یہ عمل نہیں لکھتے اور ہم اس بات کے آرزو مند ہیں کہ جس عمل سے تم تقرب الی اللہ حاصل کرتے ہو اسکو لیکر ہم آسمان پر جائیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم میرے فرائض وغیرہ نہیں لکھتے۔ بولے ہم فرائض تو لکھ لیتے ہیں۔ میں نے کہا لکھ لینے کو اتنا بس ہے اس سے معلوم ہوا کہ کراماکاتبین کو بھی اسرار قلب کی اطلاع نہیں ہوتی۔

کفر

کفر کے معنی چھپانے کے ہیں۔ چھپانے والے کو کافر کہتے ہیں، قرآن میں ان لوگوں کو کافروں کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جو حق کو چھپاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں صاف طور کہا گیا ہے وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّـهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿المائدۃ:۴۴﴾۔ یعنی جو شخص اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق حکم یا فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔ قرآن شریف میں کافر، کافرون، کافرین، کفار کے الفاظ ۱۴۶ (ایک سو چھیالیس) مرتبہ حق کا انکار کرنے والوں کے معنی میں آئے ہیں۔

اس سے اتنی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ لفظ گالی و دشنام نہیں ہے۔ بلکہ ایک منفی صفت رکھنے والوں، ایک سچی بات کا انکار کرنے والوں، غلط بات پر اڑنے والوں اور دلائل پیش کرنے کے باوجود دھٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے والوں کیلئے استعمال کیا گیا ہے ورنہ نعوذ باللہ، اللہ تعالی گالی باز ہو جائے گا۔ تعالی اللہ عن النقص والعیب اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک شخص جس آسانی کے ساتھ معمولی علمی و عملی اختلاف پر دوسرے کیلئے یہ لفظ استعمال کر لیتا ہے۔ مگر دوسرے کو خود اپنے حق میں اس لفظ کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔

اور آج کل تو یہ بات نہایت مضحکہ خیز ہے کہ مسلمان، کافروں کو تو کافر کہنے کیلئے تیار نہیں ہیں لیکن اختلاف عقائد یا اختلاف مسلک کی بناء پر دھڑلے سے وعظ و بیان کی مجلسوں اور کتابوں یا رسالوں میں اپنوں کو ہی نہایت فراخ دلی کے ساتھ اس کا شکار کر لیتے ہیں۔

مہدویہ کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کیا جاتا رہا۔ ابتداء اسطرح ہوئی کہ جب حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنی مہدیت موعودہ کا دعویٰ فرمایا اور کتاب اللہ و بے خطا اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دلیلیں پیش فرمائیں اور وہ بھی ایک دو جگہ نہیں بلکہ برّ صغیر کے ہر خطہ میں آپ جہاں جہاں تبلغ دین حق اور اپنی مہدیت کے دعوی کیلئے تشریف لیگئے اور عصر اول کے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا تو علماء سوء اور مشائخین دنیا پرست آپ کے مخالف ہو گئے اس لئے کہ لوگ جب مہدی علیہ السلام کے وعظ و بیان، پھر اسپر عمل آوری کو دیکھتے تو بے اختیار کہہ اٹھتے کہ اصل اسلام تو یہ ہے۔ مشائخین دنیا پرست اور علماء سوء کو اپنی دنیا ہاتھوں سے جاتی نظر آنے لگی تو بادشاہوں کو مہدی علیہ السلام کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اکسانے لگے اور اخراج کا حکم صادر کروایا اور یہ بھی کہدیا کہ "یہ لوگ ہم کو اور آپ کو کافر کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سن کر کسی کو بھی غصہ آہی جاتا ہے پس بادشاہوں نے مہدویوں کے اخراج کا حکم دے دیا اور یہ پروپیگنڈہ ہو گیا کہ مہدوی

دوسروں کو کافر کہتے ہیں۔ حالانکہ مہدیوں کا یہ چیلنج ہے کہ کوئی شخص بھی یہ بتادے کہ مہدوی، مسلمانوں کو، کافر کہتے اور لکھتے ہیں اس سے بڑی جھوٹی بات روئے زمین پر نہ ہوگی۔ ہاں اگر کوئی موجب شرعی کے تحت حکم لگاتے ہیں تو وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب امام مہدی علیہ السلام نے ۹۰۵ھ میں دعویٰ موکد فرمایا، تو ان الفاظ میں فرمایا خدا کا حکم ہوتا ہے کہ تیری ذات ہی مہدی موعود ہے۔ جس نے تجھے مانا وہ مومن ہے اور جس نے تیرا انکار کیا وہ کافر ہے۔ اسی بنا پر مہدی موعود نے وہی الفاظ دہرائے تو یہاں کفر کا حکم خالی از سببِ شرعی نہیں ہے، جہاں موجبات کفر موجود ہوں تو ان کی وجہ سے کفر کا حکم لگایا جاتا ہے وہ بھی قرآن واحادیث کی روشنی میں۔ اس سے پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ قرآن میں آیا ہے جو شخص حکم خدا کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

اسی طرح حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من انکر المهدي فقد كفر۔ جس نے مہدی کا انکار کیا تو اس نے کفر کیا۔ یا وہ کافر ہوگیا۔ تو اگر قرآن وحدیث کی اتباع میں قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کفر کا حکم سنایا گیا وہ بھی تشخّص، تعیّن، نام یا اشارہ کئے بغیر۔ تو مہدویہ پر کس طرح الزام تراشا جاسکتا ہے کہ مہدوی دوسروں کو کافر کہتے ہیں؟

یہ تو ہوا سکّہ کا ایک رخ۔ اب اسی سکّہ کا دوسرا رخ دیکھئے کہ یہی ملاّ، علماء اوران کی سرپرستی میں دوسرے عام بھی مہدویہ کو بے دھڑک کافر کہہ دیتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ چونکہ مہدویہ، حضرت سید محمد جونپوری کو مہدی موعود مانتے ہیں جو (نعوذ باللہ) کاذب اور جھوٹے ہیں۔ تو اس لئے یہ کافر ہیں کہ یہ لوگ اس مہدی کے انکار کرنے والے ہوئے جو آئندہ زمانے میں آئیں گے۔ مطلب یہ کہ آئندہ جو ان کے مہدی آئیں گے ان پر ایمان لانا فرض ہے۔ اور چونکہ یہ مہدوی اُس مہدی پر ایمان نہیں لائیں گے اس لئے وہ کافر ہوں گے۔ حالانکہ بات ایک ہی ہوئی کہ "مہدی کا انکار کرنے والا کافر ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ نہیں فرمایا "اِن کا مہدی" یا "اُن کا مہدی"۔

پس جس حدیث اور جس آیت قرآنی سے انکار مہدی پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے وہ "اصل" اور 'بناء استدلال" ہے۔ اس سے ہمارے مہدی اور تمہارے مہدی کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہاں یہ تفریق کی جارہی ہے کہ اس حدیث سے ان کو استدلال کرنے کا حق ہے وہ بھی ایسے مہدی کیلئے جو ابھی معرض وجود میں نہیں آیا۔ لیکن تم کو اس مہدی کیلئے جو آچکا ہے اور جو لوگ اس کا انکار کررہے ہیں، اس حدیث شریف سے استدلال کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس ایک مسئلہ پر سے صرف نظر کریں اور مختلف فرقوں میں پائے جانے والے اختلافات کو دیکھیں اور فقہاء کے درمیان پائے جانے والے مناقشات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہوگا جو سب کی نظر میں مسلمان ہے۔ ورنہ حالت تو یہ ہے کہ ایک آدمی اس فرقے کی نظر میں مسلمان تو دوسرے فرقے کی نظر میں یا مشرک ہے یا کافر۔ بدعتی تو ہے ہی۔

کبڈی

کبڈی ایک فوجی کھیل ہے جس سے سپاہیوں میں چستی اور چالاکی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت بندگی میاں سید خوندیر صدیق ولایت سید الشہدا رضی اللہ عنہ نے ۱۱؍ شوال ۹۳۰ھ کی رات کو بیعت سے فارغ ہو کر عشاء کی نماز کے بعد فقراء حزب اللہ کو کبڈی کھیلنے کیلئے فرمایا تھا تو رات میں کبڈی کھیلی گئی۔ اس کھیل کی ترکیب تین طرح سے لکھی ہے۔ پالن پور میں جس کھیل کو "کوٹ کوٹ بروزن" روٹ" بمعنی بڑے قرص روغنی روٹی کہتے ہیں (کیونکہ دم نہ ٹوٹے تک 'کوٹ کوٹ" بولنا لازمی ہے) وہ بھی اسی کے مشابہ ہے۔ لیکن اس میں در بھیرو اور دوبڑ بھیرو نہیں ہوتے جیسا کہ کبڈی میں ہوتے ہیں۔

مولوی سید احمد نے فرہنگ آصفیہ میں اس کھیل کی ترکیب اسطرح لکھی ہے۔ کبڈی، اسم مؤنث، لڑکوں کے ایک کھیل کا نام ہے جس میں برابر کے دو گروہ بنا کر کھیلتے ہیں اور بیچ میں ایک حد فاصل مقرر کر کے وہاں مٹی کا ڈھیر وغیرہ رکھتے ہیں۔ اسکو پالا کہتے ہیں (پال بمعنی کنارہ، حد فاصل جیسے تالاب کی پال از حضرت خوب میاں صاحب قبلہؒ) اسکے کھیلنے کا طریق یہ ہے کہ ایک لڑکا ایک گروہ کی طرف سے دوسرے گروہ کی حد میں "کبڈی کبڈی" کہتا ہوا جاتا ہے اگر وہ مخالف کے کسی آدمی کو چھو کر بغیر دم ٹوٹے پالے تک آئے گا تو گویا اُسے یہ مار آیا۔ یعنی اس کھیلنے والے کو نکما کر دیا۔ وہ گروہ میں سے الگ ہو کر جا بیٹھتا ہے اور جو طرف ثانی نے اسکو پکڑ لیا اور پالے تک کبڈی کبڈی بولتے ہوئے نہ آنے دیا تو یہ مر گیا۔ غرض اس طرح کھیلتے کھیلتے جب کسی گروہ کے سب آدمی مر جاتے ہیں تو وہ گروہ ہار جاتا ہے اور اسکے نام پالا ہوتا ہے۔

چونکہ بندگی میاں رضی اللہ عنہ نے خصوصیت سے اس رات کو اپنے جانبازوں کو یہ کبڈی کھلائی تھی اس لئے اگرچہ پانچ سو سال گذر گئے لیکن اس وقت سے اب تک بھی جہاں کہیں مہدوی رہتے ہیں بڑی عقیدت سے برکتہً" اور اتباعاً" کبڈی کھیلتے ہیں جسکی وجہ سے واقعۂ شہادت کی یادگار ہر سال تازہ ہو جاتی ہے۔ اور نوجوان بڑی خوشی کے ساتھ اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ کبڈی کھیلتے ہیں۔ اسکے دوسرے دن یعنی بارھویں شوال کی صبح کو دشمن کے لشکر کی جانب سے جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔

کبڈی کی شرح میں ڈنکن فاربس ایل ایل ڈی اپنی ڈکشنری میں یہ بیان کرتا ہے کہ کبڈی لڑکوں کا ایک کھیل ہے لڑکے اپنے کو دو جماعتوں میں تقسیم کر لیتے ہیں ان میں سے ایک جماعت ایک لکیر کے جو زمین پر کھینچی جاتی ہے ایک طرف رہتی ہے اور اس لکیر کو پالا کہتے ہیں۔ اور دوسرے فریق کہ اس لکیر کے دوسرے جانب کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک لڑکا کسی ایک فریق کا کبڈی، کبڈی چلاتا ہوا اس خط سے گذرتا ہے اور دوسرے فریق کے کسی ایک شخص کو چھونے کی کوشش کرتا ہے پس اگر وہ کسی

کو چھو کر اپنی جماعت میں چلا آیا تو وہ لڑکا جو چھوا گیا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مر گیا۔ یعنی ہار گیا اور اگر وہ لڑکا جس نے حملہ کیا تھا خود ہی پکڑا گیا اور اپنی جماعت میں واپس نہ آسکا تو وہ وہیں مر گیا۔ یعنی ہار گیا۔ اسی طرح سے یکے بعد دیگرے ہر فریق سے دوسرے فریق پر حملہ ہوتا رہتا ہے۔ اور وہ جماعت جیتتی ہے جس میں کچھ لوگ ابھی باقی رہ جاتے ہیں۔ جبکہ دوسرے فریق والے سب مر گئے ہوں۔ (مأخوذ از رفع الغواشی عن وجوہِ الترجمۃ والحواشی ص ۱۸۳، ۱۸۴)

کشف

غیب کے حالات یا اشیاء کا منکشف ہو جانا بہت بڑی بات ہے، اور ایسا شخص رفیع المرتبت ہے، بشرطیکہ وہ قرآن کا اور سنت کا اتباع کرنے والا ہو، چناچہ بخاری و مسلم میں آیا ہے۔ انس بن نصر نے فرمایا، میں جبل احد کے پیچھے سے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔ نیز حضرت سعد بن وقاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے جنگ احد کے دن آنحضرت ﷺ کے دائیں اور بائیں دو شخص دیکھے جن پر سفید کپڑے تھے اور بہت سخت لڑائی فرمارہے تھے، میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا، یعنی جبرئیل و میکائیل علیہما السلام (بخاری و مسلم) حضرت جبرئیلؑ و میکائیل علیہما السلام کا حضرت سعد کو نظر آنا حدیث میں صریحا مذکور ہے، پس یہ حدیث، کشف ملائکہ پر دلیل ہے۔ کشف دو طرح سے ہے، کشف کونی۔ کشف الٰہی۔

کشف کونی یہ کہ زمانے کا یا مکان کا بُعد اس کیلئے حجاب نہ ہو، یعنی اس پر زمانہ اور مکاں کی قید کے بغیر کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے۔

کشف الٰہی یہ کہ علوم، اسرار، معارف، حقائق و دقائق جن کا تعلق سلوک سے ہو یا ذات وصفات سے، اس کے قلب پر وارد ہو جائیں یا عالم مثال میں یہ چیزیں متمثل ہو کر مکشوف ہوں اور واردارت غریبہ مثل ذوق و شوق، محبت و انس، انکشاف اسرار احکام اور اس کے اور اس کے اللہ کے درمیان کا معاملہ اس پر واضح ہو جائے۔

بعض اوقات اہل کشف کو خود اپنے کشف کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا، جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ "حضرت اسید بن حضیر کو ملائکہ کا کشف تو ہوا مگر خود ان کو اطلاع نہ ہو سکی کہ وہ ملائکہ ہیں (جب رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تو آپ کو ادراک ہو سکا) اس سے معلوم ہوا کہ کشف کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان پر معانی کی آگاہی بغیر مرشد کامل کے نہیں ہو سکتی، پس ہر صاحب کشف کو اپنے کشف میں اپنے فہم و ادراک پر اعتماد نہ کر لینا چاہئے، ورنہ ایسا شخص بہت سی غلطیوں یا غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیگا، بلکہ گمراہی کے گڑھے میں گر جائے گا۔

نیز معلوم ہوا کہ بزرگوں کو جو کشف ہوتا ہے وہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ صرف اللہ کے اختیار میں ہوتا، چنانچہ حضرت یعقوبؑ کو ایک مدت تک حضرت یوسفؑ کی خبر نہ ہوئی حالانکہ وہ پاس ہی میں کنویں میں تھے، ایک یہ وقت تھا اور ایک وہ وقت آیا کہ میلوں دور سے حضور یوسفؑ کے پیرہن کی خوشبو آگئی۔

کشف سے جو چیز حاصل ہوتی ہے، اگر وہ موافق شرع محمدی ہے تو وہ قابل عمل ہے ورنہ واجب الترک ہے اور کشف صاحب کشف کیلئے دلیل تو بن سکتا ہے لیکن دوسروں کیلئے نہیں، نیز یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ معارف و حقائق ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہوتا ہے، مگر سب کا اس پر اتفاق ہے کہ معارف و حقائق وہ مقبول ہیں جن کو شریعت رد نہ کرے، اور ان علوم کی دلیل کشف ہی ہے، اور کشف کے حصول اور معارف و حقائق کے معلوم ہونے کا ذریعہ قرآن و محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے، اگر کوئی شخص اپنے نفس کو فنا کردے اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں لگ جائے تو خود ہی حقائق و معارف منکشف ہو جائیں گے، جیسا کہ مولانا رومؒ نے فرمایا:

”بینی اندر دل علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستاد“ یعنی بغیر تعلیم و معلم کی انبیاءؑ کے علوم منکشف ہو جائیں گے۔

”فہم و خاطر تیز کردن راہ نیست۔ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ“، یعنی اسرار و معارف عقل و فہم کے تیز کرنے سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ شکستگی اور انقیاد سے ہی اللہ کا فضل متوجہ ہوتا ہے یوں تو حقائق و معارف کی معرفت اطاعت اور عبدیت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ عقل پرستی اور لایعنی سوالات، قیل و قال کی بوچھار سے حاصل نہیں ہوتی، جیسا کوئی شخص اپنے کسی محبوب و مطیع کو اپنے محل کی سیر کراتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ دیکھو یہ خزانہ یہاں ہے، یہ چور دروازہ ہے، یہاں بیگمات رہتی ہیں، یہ ہماری آرام گاہ ہے، لیکن وہ اگر خود پوچھنے لگے کہ حضور کی بیگم کہاں رہتی ہیں اور خزانہ کا کمرہ کونسا ہے، تو اس کا حشر کیا ہوگا، کہنے کی ضرورت نہیں ہے، ایسا ہی آدمی اپنے کو بادشاہی حقیقی کے سامنے بالکل فنا کردے تو وہ خود حقائق سے جب بھی چاہے گا، جو بھی چاہے گا آگاہ کردے گا۔ انسان پتھر کی طرح برسوں بہاروں میں رہے، کبھی سرسبز نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اگر وہ خاک ہو جائے تو رنگارنگ پھول اس میں کھل جائیں گے۔

گجرات

گجرات کے تعلق سے حضرت مہدیؑ نے متعدد بشارتیں دی ہیں

(۱) ملک گجرات کان عشق است۔ ملک گجرات عشق کی کان ہے۔
(۲) ملک گجرات در ہماملکہا مانند جوہر در انگشتری است۔ ملک گجرات تمام ملکوں میں، انگوٹھی میں نگینہ کے مانند ہے۔
(۳) جہاں انگشتری و گجرات نگیں است۔ دنیا انگوٹھی ہے اور گجرات نگینہ ہے۔
(۴) عشق از جونپور برخاست او گجرات برداشت، عشق جونپور سے اٹھگیا اور گجرات نے اسکو برداشت کرلیا۔
(۵) عشق از گجرات برخاست و بر گجرات بارید و در فراہ مدفون شد۔ عشق جونپور سے اٹھ گیا اور گجرات پر برسا اور فراہ میں مدفون ہو گیا۔
(۶) ایں مرد گجراتی ایں بندہ راحیران ساخت، اس مرد گجراتی (بندگی میاں سید خوندمیرؓ) نے بندہ (حضرت مہدیؑ) کو حیران کردیا۔

پٹن شریف گجرات کا ہی ایک علاقہ ہے اور حضرت بندگی میاںؓ کا مولد ہے، اسکے تعلق سے حضرت مہدیؑ نے فرمایا "ازیں جابوئے عشق می آید"۔ اس جگہ سے عشق کی بو آتی ہے۔ "ازیں جابوئے ایمان می آمد"۔ یہاں سے ایمان کی بو آتی ہے۔ پھر فرمایا "نہروالہ (پٹن) معدن مومناں است"۔ نہروالہ مومنوں کا معدن ہے۔

گندم کاشت

حضرت سیدنا امامنا سید محمد جونپوری مہدی موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ''آدم صفی اللہؑ گندم کاشت'' ''نوح نجی اللہؑ آب داد'' ''وابراہیم خلیل اللہ کشت پاک کردو خاشاک رابیروں انداخت'' ''وموسیٰ کلیم اللہؑ دِرَو کرد'' ''عیسیٰ روح اللہ خرمن کرد'' ''محمد رسول اللہ ﷺ آرد کرد، ونان پخت وخود چشید وبرائے فرزند داشت وآں فرزند مہدی است'' ''و بندہ چشیدہ ومیاں سید خوندمیر راچشانید'' یعنی آدم صفی اللہؑ نے گیہوں بویا، اور نوح نجی اللہؑ نے پانی دیا، اور حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے کھیت کو پاک کیا اور کچرے کوڑے کو نکال باہر کیا، موسیٰ کلیم اللہؑ نے فصل کاٹی، عیسیٰ روح اللہؑ نے خرمن کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے آٹا کیا، روٹی پکائی، خود کھائی اور اپنے فرزند کیلئے بھی رکھ چھوڑی اور وہ فرزند مہدی ہے، اور بندہ (مہدی علیہ السلام) نے چکھا اور میانسید خوندمیر کو بھی چکھایا۔

نقل گندم کاشت کے جیسی تمثیل شریعت میں بھی ملتی ہے۔ چنانچہ ملا مسکینؒ حاشیہ کنز الدقائق میں لکھتے ہیں۔ ''وقد قالوا الفقة زرعه عبد اللہ بن مسعود و سقاه علقمة وحصده ابراهيم النخعى ودرسه حماد وطحنه ابو حنيفة وعجنه ابو يوسف وخبزه محمد وسائر الناس ياكلون من خبزه'' یعنی، فقہ کا بیج بویا عبداللہ بن مسعودؓ نے، اسکی سینچائی کی علقمہؒ نے، اسکو کاٹا ابراہیم نخعیؒ نے، اسکو پاک صاف کیا حماد نے اور اسکو پیس کر آٹا بنایا ابو حنیفہؒ نے اور آٹا گوندھا ابو یوسفؒ اور اسکی روٹی بنائی محمدؒ نے اور تمام لوگ وہی روٹی کھاتے ہیں۔

لوط علیہ السلام

حضرت لوطؑ کا ذکر قرآن شریف میں ۲۷ مقامات پر آیا ہے جن میں ۱۷ مقامات پر لوط ہے اور دس (۱۰) مقامات پر ''لوطاً'' آیا ہے اسکا سبب یہ ہے کہ عربی زبان میں اِعراب، فاعل اور مفعول کے اعتبار سے بدلتے ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے

(۱) قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ﴿ھود ۷۰﴾۔ ترجمہ: انہوں نے کہا مت ڈرئیے ہم قوم لوط کی طرف (بغرض عذاب) بھیجے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ابراہیمؑ کے تذکرہ میں یہ واقعہ ذکر کیا جاچکا ہے۔ اب آگے کا ذکر اس طرح ہے کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو فرزند کی خوش خبری سنائی اور قوم لوط کی جانب جانے کا ذکر کیا تو ابراہیمؑ نے فرشتوں سے بحث شروع کردی کہ وہاں لوطؑ بھی ہیں۔ ایسے میں اس بستی کو کسطرح ہلاک کیا جاسکتا ہے تو فرشتوں نے کہا۔ اے ابراہیم اس بات کو جانے دو۔ اللہ کا حکم صادر ہوچکا ہے پس ان بدبختوں پر عذاب آکر رہے گا اور ان پر سے کسی صورت وہ ٹلنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس آئے، وہ فرشتے نہایت حسین و جمیل اور کم عمر تھے (یاد کھائی دیتے تھے) داڑھی، مونچھ بھی نکلی نہیں تھی، لوطؑ ان کو دیکھ کر پریشان بھی ہوگئے اور دل میں تنگی بھی محسوس کرنے لگے۔ حضرت لوطؑ کی نظر میں تو وہ مہمان تھے اور وہ بھی امرد اور خوبصورت اور ان کی قوم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں (لونڈوں) کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اس لئے بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا آج کا دن مجھ پر بڑا بھاری اور سخت ہے کیوں کہ مہمانوں کو نہ ان کے حوالے کرسکتے تھے اور نہ ان ظالموں کے ہاتھ سے ان کو چھڑا سکتے تھے۔

جب قوم کے لوگوں کو خوبصورت مردوں کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ اِرادہ تو بد ہی تھا، مطالبہ کرنے لگے۔ لوطؑ نے بڑی لجاجت سے کہا، اے میری قوم شہوت پوری کرنے کے لئے جو جائز اور حلال طریقہ ہے وہ یہی ہے کہ قوم میں جو لڑکیاں ہیں ان سے نکاح کرلو۔ قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں ان سے بعض لوگوں نے سمجھنے میں دھوکا کھالیا ہے۔ قرآن میں آیا ہے لوطؑ نے فرمایا يَا قَوْمِ هَـٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّـهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي ﴿ھود:۷۸﴾۔ یعنی اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں جو تمہارے لئے پاک اور جائز ہیں۔ سو اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھ کو بے آبرو مت کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوطؑ نے اپنی بیٹیاں ان کو پیش کی تھیں۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ قوم میں جو لڑکیاں ہیں۔ چونکہ ہر نبی قوم کا باپ ہوتا ہے اس لئے آپ نے ''اپنی بیٹیاں'' کہا۔ اور کہا یہ تو میرے مہمان ہیں، مہمان کا اپمان، میزبان کی بھی بے عزتی ہے۔ کم سے کم مہمانوں کے سامنے مجھے ذلیل تو نہ کرو۔ کیا اتنے جم غفیر میں ایک آدمی بھی صاف اور سیدھی بات کو سمجھنے والا اور شائستہ خو نہیں ہے۔

انہوں نے کہا اے لوط تم تو جانتے ہو کہ ہم کو تمہاری بیٹیوں کی ضرورت نہیں ہے ہم جو چاہتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے۔ اب تو حضرت لوطؑ بہت گھبرا گئے۔ کیوں کہ یہ لوگ ہر قیمت پر مہمانوں کی بے عزتی پر تلے ہوئے ہیں۔ اور ان کا مجمع کثیر بھی تھا۔ حضرت لوطؑ نے فرمایا کاش مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ میں اکیلا ہی تم سے لڑتا یا کسی مضبوط اور مستحکم پناہ گاہ میں چلا جاتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ لوطؑ پر رحم کرے کہ وہ تو مضبوط اور مستحکم پناہ گاہ میں تھے۔ یعنی اللہ کی پناہ میں۔ گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں لوطؑ کی نظر ظاہری اسباب کی طرف چلی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ لوطؑ کی بیوی نے قوم کو مہمانوں کی آمد کی خبر دی تھی۔

جب فرشتوں نے لوطؑ کی پریشانی اور اضطراب وبے چینی کی یہ کیفیت دیکھی تو کہا اے لوط "إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ" ﴿ھود: ۸۱﴾۔ ہم تمہارے رب کے فرشتے ہیں۔ یہ ہرگز آپ تک نہ پہنچ سکیں گے۔ ایسا کیجئے کہ رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر چلے جایئے اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے بجز تمہاری بیوی کے کہ وہ مڑ کر دیکھے گی اور اُسے وہ آفت آنے والی ہے جو دوسروں پر آئے گی۔ ان کے عذاب کے وعدہ کا وقت صبح ہے کیا صبح قریب نہیں ہے۔ پھر جب اللہ کا حکم ان پر پہنچا تو اللہ کہتا ہے کہ ہم نے اس بستی کو اوپر نیچے کر ڈالا اور انپر کنکر کے پتھر برسائے جو تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان زدہ تھے کہتے ہیں کہ ان پتھروں پر خاص قسم کے نشانات تھے جو عذاب الٰہی کا مظہر تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر پتھر پر اس شخص کا نام تھا جس سے اُسے مرنا تھا۔ (نوٹ): یہ پورے واقعات آیت نمبر ۷۰ سے آیت نمبر ۸۳ تک بیان ہوئے ہیں۔

اللہ نے یہی مضمون الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ سورۂ حجر میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہو آیت نمبر ۵۸ سے آیت نمبر ۷۷ تک۔ اسی طرح لوطؑ کی قوم کا ذکر، سورۂ حج آیت ۴۳۔ سورہ شعراء میں آیت نمبر ۱۶۰ سے ۱۷۵ تک۔ سورۂ نمل میں آیت نمبر ۵۴ سے لیکر آیت نمبر ۵۸ تک۔ سورۂ عنکبوت میں آیت نمبر ۱۸ سے لیکر آیت نمبر ۲۵ تک۔ سورۂ ص میں آیت ۱۳ تا ۱۵۔ سورۂ ق میں آیت ۱۳ میں۔ سورۂ القمر میں آیت نمبر ۳۳، ۳۴۔ سورۂ تحریم میں آیت نمبر ۱۰۔

لوطؑ کا ذکر قرآن میں سورۂ انعام میں آیت ۸۶ سورۂ اعراف میں آیت نمبر ۸۰ تا ۸۴ سورۂ ھود میں آیت نمبر ۷۷ تا ۸۳ سورۂ انبیاء میں آیت نمبر ۷۱ تا ۷۴ سورۂ نمل میں آیت نمبر ۵۴ تا ۵۸۔ سورۂ عنکبوت میں آیت نمبر ۲۶۔۲۸ تا ۳۵ سورۂ الصفّات میں آیت نمبر ۱۳۳ تا ۱۳۸، آیا ہے۔

لقمان حکیم

"وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ﴿لقمان:۱۲﴾" اور ہم نے لقمان کو دانش مندی عطا کی۔ کہ اللہ کا شکر ادا کرو

حضرت لقمان کے بارے میں اکثریت کا اتفاق اس پر ہے کہ وہ ایک حکیم تھے۔ دانا تھے۔ علم اور عمل کے جامع تھے مگر نبی تو نہیں تھے۔ ان کی حکمت کی باتیں اتنی بلیغ تھیں کہ اللہ نے ان کی بعض باتوں کا ذکر قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ جس سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب اوپر جا کر حضرت ابراہیمؑ کے والد سے ملتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ لقمان حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ حضرت داؤ علیہ السلام کے زمانے میں یہ موجود تھے اور بعض امور میں ان کے مشیر بھی تھے۔ نبی نہ ہونے کے باوجود توحید کا وعظ کہنا اللہ کی قدرتِ کاملہ کو بیان کرنا۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دینا اور دیگر بہتر باتوں کی تلقین کرنا ان کی فطرت سلیمہ کی عکاسی ہے۔ یعنی پیغمبر تو نہیں تھے لیکن کام تو پیغمبرانہ ہی کیا ہے۔

دوسری جگہ اسی سورہ میں اللہ نے حضرت لقمان کی اپنے فرزند کو نصیحت کا ذکر کیا ہے "يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴿لقمان:۱۷﴾۔ اے میرے بیٹے نماز قائم کر۔ اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کر۔ اور جو مصیبت تجھ پر پڑے اس پر صبر کر بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

یہاں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت کا بیان ہے۔ درمیان میں جو اللہ کا کلام ہے وہ نہایت درجہ مفید مطلب بھی ہے۔ اور پہلے سے مربوط بھی ہے۔ یعنی لقمان علیہ السلام نے اللہ کا حق بیان فرمایا۔ اللہ کی عبادت کی نصیحت کی۔ والدین کا اور خود اپنا حق کیا ہے۔ بیان نہیں کیا۔ حالانکہ اللہ مربی حقیقی ہے اور وجود بخشنے والا ہے۔ لیکن دنیا میں بچے کو لانے والے اور ان کی تربیت کرنے والے والدین ہی ہیں۔ اور ان میں بھی ماں کا حق مقدم ہے تو اللہ ان کا حق بیان فرما دیا گویا لقمان نے اللہ کا حق بیان کیا اور اللہ نے والدین کا حق بیان فرما دیا۔ گویا حق اللہ اور حقوق العباد ساتھ ساتھ ذکر کر دئے گئے ہیں۔ ایک صحابی کا اس سلسلے میں یہاں تک قول ہے کہ اگر کسی شخص نے پانچ نمازیں ادا کریں تو اس نے اللہ کا شکریہ ادا کر دیا۔ اور نمازوں کے بعد والدین کے حق میں دعا کی تو گویا اس نے والدین کا شکر ادا کیا۔ بیٹے نے پوچھا کہ اگر میں چھپ کر کوئی کام کروں تو! لقمان نے جواب دیا کہ رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل یا کوئی خصلت ہو اور وہ غایت درجہ پوشیدہ مقام و مکان میں بھی ہو تو اللہ اس کے سامنے لائے گا۔ کیونکہ اللہ بہت زیادہ باریک بین بھی ہے۔ اور بہت زیادہ باخبر ہے۔ اسکے علم اور اس کی قدرت کے احاطے سے باریک

سے باریک اور خفی سے خفی چیز باہر نہیں ہے۔

"وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿لقمان:١٤﴾" ترجمہ: اور ہم نے انسان کو اس کے ماںباپ کے تعلق سے تاکید کر دی کہ اس کی ماں نے صعب اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور اسکا دودھ دو برس میں چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گذاری کر۔ آخر میری ہی طرف لوٹنا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے تعلق سے جو تاکید کی وہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ ما قبل کی آیت سے ربط یہ ہے کہ پہلی آیت میں باپ نے بیٹے کو نصیحت کی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ کے ذریعہ یہ بتانا ہے کہ اللہ کے بعد قابل تعظیم اور واجب الا طاعت ہستی دنیا کے اعتبار سے کوئی ہے تو وہ والدین ہیں انسان کو چاہئے کہ اپنے والدین کی اطاعت کریں۔ پھر ماں کا درجہ خدمت کے اعتبار سے باپ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے کہ باپ کی بہ نسبت ماں ہی بچے کی بہت زیادہ خدمت کرتی ہے نو مہینے پیٹ میں رکھتی ہے اور خاصی مصیبت جھیلتی ہے پھر دردزہ کی تکلیف وضع حمل کی شدت، پھر دو سال تک دودھ پلانے کی زحمت، پس ماں باپ دونوں کی خدمتوں کا بدلہ زندگی بھر دیا نہیں جاسکتا۔ البتہ اتنا ہو سکتا ہے کہ ان کی خدمتوں کی قدر کی جائے ورنہ مرنے کے بعد جب اللہ کے پاس جائیں گے تو یقیناً اس کے بارے میں پوچھ ہو گی۔

"وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ﴿لقمان:١٥﴾"۔ اور اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کا کہنا مت مان اور دنیا میں دستور کے مطابق ان کا ساتھ دے۔ اور اس کے راستے پر چل جو میری طرف رجوع لائے۔ والدین کی خدمت کرنے کی حد بھی بتادی۔ کہ ان کی جس قدر خدمت کی جاسکتی ہے کرنی چاہئے۔ بشرطیکہ اللہ کی نافرمانی نہ ہو۔ اگر وہ اللہ کی نافرمانی اور شرک کرنے کا حکم دیں تو اس صورت میں اللہ کا حق مقدم ہے۔ اللہ کی بات سنیں اور ان کی بات کو نہ سنیں۔ چنانچہ کہا گیا کہ لا طاعة لمخلوقٍ في معصية الخالق۔ اور پھر فرمایا کہ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ مطلقاً چھوڑ دیا جائے نہیں دنیا کی حد تک ان کے ساتھ حسن سلوک اور حسنِ خدمت کرنا چاہئے۔ یعنی پیغمبروں اور نیک بندوں کی راہ پر چلنا۔ دین کے خلاف ماں باپ کی اطاعت یا تقلید نہ کرنا۔ نیک بندوں میں مرشد، ہادی اور مومن استاد آتے ہیں۔

نیز آپ نے اپنے بیٹے کو یہ بھی فرمایا کہ "یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصلوٰۃ وَاْمُرْ بِالْمعروف (الخ) اے بیٹے نماز قائم کر۔ اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کر کیونکہ نماز تو اللہ کا حق ہے اس سے انسان میں پاکیزگی۔ عاجزی اور نیکی پیدا ہوتی ہے۔ نیکی

کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی نیکی کی ترغیب دے اور برائیوں سے روکے اس لئے کہ اعلیٰ مرتبۂ انسانیت یہ ہے کہ خود بھی صاحب کمال ہو اور دوسروں کو بھی مکمل کرے۔ جب آدمی دوسروں کو ٹوکتا ہے۔ تو لازمی برا بھلا سننا پڑتا ہے تو کہا گیا کہ اس سلسلے میں اگر لوگ ملامت کریں تو برداشت کرلے اور صبر و تحمل سے کام لے کیوں کہ یہ امور بڑی ہمت کے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بعد فرمایا کہ "وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿لقمان:١٨﴾" اور لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا اور زمین پر اکڑ کر مت چل بے شک اللہ کسی اترانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (المراد) خود کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا بھی بہت بری بات ہے اسی طرح زمین پر اکڑ کر چلنا، اترانا اور فخر کرنا بھی بہت معیوب ہے۔ ایسوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ خود لوگ بھی ایسے شیخی بگھارنے والے کو ذلیل سمجھتے ہیں۔

اور حضرت لقمان نے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے آواز و اندازِ گفتگو کی بھی تعلیم دی کہ "وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿لقمان:١٩﴾" اور بیچ کی چال چل اور اپنی آواز پست کر بے شک آوازوں میں بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔

مراتب مہدی موعود علیہ السلام

قرآن شریف اور احادیث رسول اللہ ﷺ سے حضرت مہدیؑ کے تعلق سے جو مقامات عالیہ اور مراتب جلیلہ بیان ہوئے ہیں۔ وہ حق ہیں، علمائے حقانی ان سے واقف ہیں۔ لیکن اعتراض کرنے والے حقائق کو توڑ مروڑ کر اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سادہ لوح عوام ان کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور مہدویہ کے تعلق سے غلط اعتقادات کو منسوب کر دیتے ہیں۔ ان کا اصل مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ عوام میں ان کے تعلق سے غلط پروپیگنڈہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ان اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ: مہدیؑ کے پیروکار، اپنے امام کو، خلفاء اربعہ سے افضل گردانتے ہیں جبکہ تمام اہل سنت کا اجماعی عقیدہ اس کے خلاف ہے (ہدیہ مہدویہ صفحہ ۱۷)

ہدیہ مہدویہ، مہدیؑ اور مہدویہ کے ایک سخت معاند اور کٹر مخالف کی کتاب ہے، اگر چہ اس کتاب کا منقولات اور معقولات کے ذریعہ دندان شکن جواب دے دیا گیا۔ لیکن افسوس کہ بعد کے لوگ بھی جوابات کو دیکھے بغیر وہی اعتراضات دہر اکر اپنی ہلکی اور سستی شہرت کے خواہاں ہوتے ہیں حال میں ایک سائل نے یہ سوال کیا ہے۔

مؤلف ہدیہ مہدویہ نے بھی یہ نہیں لکھا کہ ”امام مہدیؑ خود کو خلفاء اربعہ سے افضل جانتے ہیں۔ لکھا تو یہ کہ ان کے پیروکار اپنے امام کو خلفاء اربعہ سے افضل جانتے ہیں اور اسکو غلط قرار دینے کے لئے یہ لکھ دیا کہ ”تمام اہل سنت کا اجماعی عقیدہ اس کے خلاف ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ہدیہ مہدویہ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس بات میں اہل سنت کا اجماعی عقیدہ کیا ہے۔ ہم سوال کرنے والوں سے مطالبہ کرتے ہیں اور یہ چیلنج دیتے ہیں کہ آپ پہلے اکابر اہل سنت کی کسی کتاب سے جو کہ ۸۴۷ھ سے قبل کی ہو یہ ثابت کریں کہ خلفاء اربعہ حضرت مہدیؑ سے افضل ہیں۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ یہ مقدمہ ان ہی الفاظ کے ساتھ کس دور میں، کس کے سامنے پیش ہوا تھا؟ اور کس دور کی اجماع نے اس باب میں اپنا متفقہ فیصلہ دیا تھا؟ یعنی اس پر اجماع صحابہ ہوا تھا، یا اجماع تابعین، اجماع تبع تابعین، اجماع مجتہدین، اجماع مفسرین، اجماع متکلمین وصوفیاء محققین؟ محض افسانوی انداز میں لکھ دینا اور وہ بھی اجماعی عقیدہ کے نام سے کیا جہالت پر مبنی نہیں ہے۔ پہلے آپ اپنے طور پر تحقیق کر لیتے کہ اس باب میں صحابہ سے لیکر متکلمین، متقدمین اور صوفیا محققین کا اعتقاد کیا ہے؟ پھر قلم اُٹھاتے تو شاید آپ کو اس قسم کا بے جا اعتراض کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

مسلمانوں میں سب سے بڑے دو فرقے ہوئے ہیں ایک اہل تسنّن اور دوسرے اہل تشییع۔ پھر اہل سنت کس کو کہتے

ہیں اس کو حضرت امام جعفر صادقؒ نے اسطرح بیان کیا ہے۔من عاش في ظاهر الرسول فهو سنّيٌ ومن عاش في باطن الرسـول فهو الصـوفي (حلیۃ الاولیاء جلد ا ص ۲۰) ترجمہ: جس نے رسول کی ظاہری زندگی کی روشنی میں زندگی بسر کی وہ سنّی ہے اور جس نے رسول کی باطنی زندگی کی روشنی میں زندگی بسر کی وہ صوفی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت کا اطلاق جس طرح علماء مجتہدین پر ہوتا ہے اسی طرح صوفیاء محققین پر بھی ہوتا ہے، پس ان کا کسی امر میں جو اعتقاد ہوتا ہے وہی صحیح اعتقاد ہے اور اسی کو عقیدۂ اہل سنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اب صورت مبحوث عنہا میں بحمد اللہ مہدویہ کا وہی اعتقاد ہے جو اکابر اہل سنت و محققین صوفیاء امت کا ہے۔ آپ کو تو یہ بات معلوم ہی ہے کہ عقائد وہی ہیں جو پہلے سے قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں مدوّن، منضبط اور شائع ہوئے ہیں۔ آیئے اس باب میں اکابر اہل سنت کا اعتقاد معلوم کریں تاکہ آپ کے اعتراض کی حقیقت خود آپ کے سامنے کھل جائے۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور بات پر بھی آپ کی توجہ مبذول کروانی ضروری ہے۔ آپ نے یہ لکھ کر "ان کے پیرو اپنے امام کو خلفاء اربعہ سے افضل جانتے ہیں"، عوام کو یہ غلط باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہم اپنے امام کو خلفاء اربعہ سے افضل جانتے ہیں۔ لیکن اس موقع پر آپ نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے صرف لفظ امام لکھا۔ کیونکہ اسی صورت میں آپ کا اعتراض وقیع ہونے کا امکان تھا۔ ہاں آپ نے امام کے بعد "مہدی" یا "مہدی موعود" نہیں لکھا۔ کیوں کہ آپ جانتے تھے کہ ایسی صورت میں آپ کے اعتراض کی وقعت باقی نہ رہتی۔

اصل مسئلہ میرا امام یا تیرا امام کا نہیں ہے۔ بلکہ اس منصب عالی کا ہے جس پر مہدی موعود فائز ہوئے ہیں۔ اور تمام فضائل اور کمالات جو اس تعلق سے بیان کئے جاتے ہیں وہ اسی منصب کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ اس منصب عظیم کے قطع نظر محض شخصی یا ذاتی حیثیت سے ان فضائل اور کمالات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ بھی ایک پیغمبر ہیں لیکن آپ چونکہ خاتم الانبیاء والرسل ہیں تو اسی منصب جلیل کے اعتبار سے ان تمام فضائل اور کمالات کا آپ پر اطلاق ہوتا ہے جن کا ہم اعتقاد رکھتے ہیں۔ اگر اس خصوصی حیثیت کو قطع نظر کرکے کوئی یہودی یا نصرانی یہ کہے کہ مسلمان عبد اللہ کے بیٹے کو یا اپنے پیغمبر کو افضل الانبیاء و خیر الرسل، لواء الحمد کے حامل، حاشر اور عاقب مانتے ہیں تو یہ ایک بے جا بات ہوگی۔ آنحضرت ﷺ کے یہ تمام فضائلِ نبوت و رسالت اللہ کی طرف سے ہیں اور بحیثیت خاتم الانبیاء کے ہیں۔ اسی طرح حضرت سید محمد جونپوری، فقط ایک پیر، مرشد، امام یا ولی نہیں ہیں جن کے تعلق سے ہم کچھ اعتقادات اپنے طور پر گھڑ لئے ہیں۔ بلکہ ہم چونکہ حضرت سید محمد جونپوری کو مہدی موعود اور خاتم الاولیاء کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں تو لازماً وہ تمام فضائل اور کمالات آپ کی ذات سے وابستہ

ہو جاتے ہیں جن کا اطلاق احادیث صحیحہ کی روشنی میں اکابر اہل سنت اور محققین صوفیاء ملت نے اس منصب جلیل کے حامل کے حق میں کیا ہے۔ اس جہت ختمیت ولایت اور مہدویت عظمٰی کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ اب آیئے اور دیکھئے کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔

(۱) حضرت مہدی علیہ السلام خلیفۃ اللہ ہیں: چنانچہ ابن ماجہ میں حضرت ثوبانؓ سے جو حدیث آئی ہے وہ علانیہ اس جہت کا اعلان کرتی ہے، حدیث کے الفاظ ہیں۔ فاذا سِمعتموه فَبَايِعُوهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ فَإِنَّهُ خَلِيفَةُ اللَّهِ الْمَهْدِيُّ (سنن ابن ماجہ) ترجمہ: پس جب تم اس کے بارے میں سنو تو اس سے بیعت کرو اگرچہ تم کو برف پر سے رینگ کر جانا پڑے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔ معلوم ہو کہ یہ روایت موضوع یا ضعیف نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کو کسی نے ابن ماجہ کے موضوعات میں شمار نہیں کیا (ما تمسّ اليه الحاجة لمن يطالع ابن ماجه) نیز اس کے متابعات ابو داؤد میں کتاب المہدی صفحہ ۲۳۲ جلد دوم میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں حاکم کی مستدرک جلد ۲ صفحہ ۲۔۵ میں بھی اس کا متابع موجود ہے۔

(۲) حضرت مہدیؑ معصوم عن الخطا ہیں: اس لئے کہ (ا) آپ خلیفۃ اللہ ہیں، اور جو خلیفۃ اللہ ہوتا ہے وہ لازماً معصوم عن الخطا ہوتا ہے (ب) خود آنحضرت ﷺ نے حضرت مہدیؑ کے بارے میں انہ یقفو اثري وَلَا يُخْطِي کے ذریعہ آپ کے معصوم عن الخطا ہونے کی شہادت دی ہے۔

(۳) حضرت مہدیؑ دافع ہلاکت امت محمدیہ ہیں: چنانچہ روایت ہے، كيف تهلك امة انا اولها والمهدي في وسطها والمسيح في آخرها۔ وہ امت کیسے ہلاک ہوگی جس کے اول میں ہو، درمیان میں مہدی ہیں۔ اور اسکے آخر عیسیٰ بن مریم ہیں۔ اس روایت سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں

ا) حضرت مہدیؑ آنحضرت ﷺ اور عیسیٰؑ کی طرح دافع ہلاکت امت محمدیہ ہیں

ب) حضرت مہدیؑ وَسَطِ امت میں ہیں یعنی آنحضرت کے بعد اور عیسیٰؑ سے پہلے

ج) حضرت مہدیؑ کا ذکر دافع ہلاکت امت محمدیہ کی حیثیت سے دو پیغمبروں کے درمیان میں ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مہدیؑ، پیغمبر نہ ہونے کے باوجود مُلحق بالانبیاء ہیں۔

(۴) حضرت مہدیؑ خاتمِ دین ہیں: چنانچہ حدیث میں آیا ہے عن علّى رضي الله عنه قال قلتُ يا رسول الله أَمِنَّا آل محمد المهدي اَمْ مِن غيرنا فقال بل مِنّا يختم الله به الدّين كما فتحَ بِنا۔ ترجمہ: حضرت علیؓ نے آنحضرت

سے پوچھا مہدی ہم آل محمد سے ہیں یا ہمارے غیر سے فرمایا بلکہ ہم میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر دین کو ختم کرے گا جیسا کہ ہم سے اس کی ابتداء کی۔ اس حدیث کی نعیم بن حماد نے تخریج کی ہے، طبرانی نے بھی معجم اوسط میں یہی روایت، الفاظ کے اختلاف کے ساتھ لکھی ہے۔ الفاظ اسطرح ہیں۔ عن علّی رضـــي الله عنه قال قال رســـول الله أَمِنَّا المهدي اَمْ مِن غيرنا يا رســول الله فقال بل مِنّا بنا يختم الله كما فتح بنا۔ ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت سے پوچھا کہ مہدی ہم میں سے ہیں یا ہمارے غیر سے فرمایا نہیں بلکہ ہم سے ہیں ہم سے ہی اللہ (دین کا) اختتام فرمائے گا جس طرح کہ ہم سے شروع کیا۔

ایک تیسری روایت حافظ ابو بکر بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں اس طرح لائی ہے عن ابی ســـعيد مولیٰ ابن عباس رضـــي الله عنه قال سمعت ابن عباس يقول قال رســول الله ﷺ إِنّي لأرجو ان لَا تذهب الأيام والليالى حتّیٰ يبعث الله مِنّا اهل البيت غلامًا شاباً حدثا لم تلبسه الفتن ولم يلبسها يقيم امر هذه الامة - كما فتح هذا الامر بنا ارجو ان يختم الله بنا (کحل الجواہر تنویر الابصار، مقدمہ سراج الابصار) ترجمہ: ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے دن ورات ختم نہ ہوں گے جب تک کہ ہم اہل بیت میں سے ایک نوجوان پیدا نہ ہو جائے جو فتنوں سے محفوظ رہے گا اور امت کے امور کو سیدھا کرے گا پس جس طرح کہ یہ امر (دین) ہم سے شروع ہوا ہے میں امید کرتا ہوں کہ اللہ اس کا اختتام بھی ہم سے ہی فرمائے گا۔

اس روایت سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدیؑ اہل بیت سے ہیں اور آپ پر دین کا اختتام ہونا گویا رسول اللہ ﷺ پر ہی دین کا اختتام ہونا ہے۔ گویا فرق ظاہر اور باطن کا ہے۔

(۵) آپ کی تصدیق (بیعت) واجب ہے جیسا کہ ثوبانؓ کی روایت فبایعوہ سے ثابت ہے۔

ان فضائل کے مقابلے میں خلفاء اربعہ کو رکھیں تو جو نتائج بر آمد ہوتے ہیں وہ اسطرح ہیں

(ا) حضرت مہدیؑ اللہ کے خلیفے ہیں۔ خلفاء اربعہ، اللہ کے خلیفے نہیں ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفے ہیں پس خلیفۃ اللہ خلیفۂ رسول سے افضل ہوتا ہے۔

(ب) حضرت مہدیؑ معصوم عن الخطا نصّاً ہیں۔ جیسا کہ حدیث "یقفو اثری ولا یخطی" سے ثابت ہے۔ حضرات خلفاء اربعہ رضی اللہ عنھم، معصوم عن الخطا نصاً نہیں ہیں۔ یعنی ان کی عصمت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے بلکہ وہ بھی اپنے اس مقام سے واقف تھے کہ وہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں۔ بلکہ بعض مسائل میں وہ اجتہاد کرتے تھے۔ اور اس بارے میں غلطی کے

امکان سے اللہ سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ ابن سعد نے ابن سیرین سے یہ روایت کی ہے۔و إنّ ابابکرٍ نزلت فیه قضـیة فلم یجد لها في کتاب الله اصـلا ولا في السـنة اثرا فقال اجتهد برائی- فان یکن صـوابا فمن الله وان یکن خطاء فمِنّي واستغفر الله (تاریخ الخلفاء ص ۷٦) ترجمہ: ابو بکرؓ کے پاس ایک مسئلہ پیش ہوا آپ نے اس بارے میں نہ تو کتاب اللہ میں کوئی اصل پائی۔ اور نہ سنت میں کوئی حدیث۔ پس آپ نے فرمایا، میں اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں۔ اگر صحیح ہو تو اللہ کی جانب سے اور اگر خطا ہو تو میری جانب سے اور میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں۔

اسی طرح کلالہ کے بارے میں حضرت ابو کر صدیقؓ کا یہ قول مشہور ہے۔قال إني سـأقول فیها برائی فان یکن صـوابا فمن الله وان یکن خطاءً فمنّي و مِن الشـیطان (تاریخ الخلفاء صفحہ ٦٩) ترجمہ: آپ نے فرمایا اس بارے میں، میں اپنی رائے سے کہتا ہوں۔ اگر صحیح ہو گیا تو وہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہو تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ ان مندرجہ بالا دونوں عبارتوں سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ خود حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اس بات کا علم تھا کہ وہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں حالانکہ خلیفۂ رسول تھے۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کی یہ کیفیت ہے تو آپ کے بعد کے خلفاء ثلاثہ یا ائمہ اربعہ کیلئے تقابلی گفتگو کا موقع ہی کیا ہے؟ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو معصوم عن الخطا ہو گا وہ غیر معصوم سے یقیناً افضل ہو گا۔

(ج) حضرت مہدیؑ منصوصاً دافع ہلاکت امت محمدیہ ہیں جیسا کہ کیف تھلک امۃ والی حدیث سے ثابت ہے جس کا حوالہ سابق میں دیا جاچکا ہے۔ حضرات خلفاء اربعہ منصوصاً دافع ہلاکت امت محمدیہ نہیں ہیں۔ پس جو دافع ہلاکتِ امت محمدیہ ہو گا وہ یقیناً غیر دافع ہلاکت امت محمدیہ سے افضل ہو گا۔

(د) حضرت مہدیؑ خاتم دین ہیں منصوصاً جیسا کہ سابق میں حوالہ دیا جاچکا ہے۔ حضرات خلفاء اربعہ خاتم دین نہیں ہیں۔ پس خاتم دین، غیر خاتم دین سے افضل ہو گا۔ اس کے علاوہ حضرت مہدیؑ کا اہل بیت سے ہونا، منّا کا شرف پانا، حضرت فاطمۃ الزہراء کی اولاد سے ہونا، جنت کے سرداروں سے ہونا، داعی الی اللہ ہونا، موعود رسول اللہ ﷺ ہونا ایسے فضائل ہیں جو قطعاً خلفاء اربعہ میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ حضرت مہدیؑ سے افضل نہیں ہیں جیسا کہ حضرت عوف بن منبہ سے روایت آئی ہے۔قال کنّا نتحدّث انه یکون في هذه الامة خلیفة لا یفضـل علیه ابوبکر و عمر رضي الله عنهما (عقد الدرر فی اخبار المہدی المنتظر باب ہفتم) ترجمہ: عوف بن منبہ کہتے ہیں کہ ہم آپس میں یہ تذکرے کرتے تھے کہ اس امت میں ایک خلیفہ ہو گا جس سے ابو بکر و عمر افضل نہ ہوں گے۔ نیز محمد بن سیرین سے جو روایت آئی ہے اس سے بھی عوف بن منبہ کی روایت کی اور زیادہ توضیح بھی ہوتی ہے اور تاکید و تائید بھی۔ روایت اس طرح ہے۔

عن محمد بن سیرین قال قیل له المهدي خيرٌ ام ابوبکر و عمر رضي الله عنهما قال هو خيرٌ منهما و يعدل النبيّ وفي رواية انه ذكر فتنا تكون فقال اذا كان ذلك فاجلسوا في بيوتكم حتىٰ تسمعوا على الناس بخير من ابي بكر و عمر رضي الله عنهما قيل خيرٌ من ابی بکر و عمر قال قد كان يفضل على بعض الانبياء(اخرجهما الحافظ نعیم بن حماد فی کتاب الفتن) ترجمہ: محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کہ مہدی بہتر ہے یا ابو بکر و عمر۔ آپ نے کہا مہدی ان دونوں سے بہتر ہیں۔ اور نبی کے برابر۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ہونے والے فتنوں کا ذکر کیا۔ اور کہا جب ایسا ہو تو تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو یہاں تک کہ ابو بکر و عمر سے بہتر شخص کی لوگوں پر امامت ہونا سن پاؤ۔ لوگوں نے کہا کیا ابو بکر و عمر سے بہتر (ہو گا) کہا (یہی نہیں) وہ بعض انبیاء سے افضل ہو گا۔

ان دونوں روایتوں کا ماحصل یہ ہے کہ صحابہؓ کرام اور تابعین کے دور میں ہی یہ بات عام ہو چکی تھی کہ ایک خلیفہ ایسا ہو گا جو ابو بکرؓ و عمرؓ سے افضل ہو گا یعنی مہدیؑ۔ کیونکہ مہدی کو خلیفہ اللہ ہونے کی جہت سے راست اللہ سے علم حاصل ہو گا اور ابو بکر و عمرؓ کتاب اور سنت میں کوئی اصل اور اثر نہ پانے کی صورت میں اپنی رائے پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے کاتب نے ایک تحریر لکھی، "یہ وہ رائے ہے جو اللہ نے عمر کو سمجھائی" حضرت عمر نے فرمایا، نہیں اسے مٹاؤ اور لکھو کہ یہ عمر کی رائے ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے لوگو میری رائے کو شریعت کا رنگ نہ دو۔ تم نے مجھے یوم ابو جندل کے موقع پر دیکھا اگر میرا بس چلتا کہ میں آنحضرت ﷺ کا حکم پھیر دوں تو میں اس دن اُسے پھیر دیتا (ابن القیم الجوزی عصرہ ومنہجہ ص ۴۳۹، ۴۴۰)۔ مندرجہ بالا حوالوں سے جو امر مفہوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ حضرت مہدیؑ پر حضرت ابو بکر و عمرؓ کو خصوصاً اور خلفاء اربعہ کو عموماً فضیلت نہیں ہے۔ کیا آپ کوئی خبر واحد یا کوئی ضعیف روایت بھی ایسی پیش کرسکتے ہیں جس میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو کہ "حضرت ابو بکر و عمر یا حضرات خلفاء اجمعینؓ حضرت مہدیؑ سے افضل ہیں" جس طرح کہ ہم نے ایسی روایتیں پیش کی ہیں جن میں یہ صراحت ہے کہ مہدیؑ، ابو بکر و عمرؓ سے افضل ہیں۔

اس کے علاوہ ملا علی قاری نے رسالہ المہدی میں حدیث ثوبانؓ کے تحت لکھا ہے۔ وربما يكون المهدي افضل من الصديق من هذهِ الحيثيةِ۔ (تنویر الابصار صفحہ ۴۳) یعنی اس خلافت الٰہیہ کی جہت سے مہدیؑ صدیقؓ سے افضل ہوں گے۔ اسی طرح برزنجی نے اشاعہ فی اشراط الساعہ میں لکھا ہے۔ و قد مرّ عن الشيخ في الفتوحات انه معصوم في حكمه مقتف اثر النبي ﷺ لا يخطى ابدا ولا شكَّ ان هذا لم يكن في الشيخين وان الأمور التسعة التي مرت لم يجتمع كلها في امام من ائمة الدين قبله فمن هذه الجهات يجوز تفضيله عليهما- الخ (تنویر الابصار صفحہ ۴۳، ۴۴) ترجمہ: فتوحات میں لکھا ہوا شیخ کا یہ قول گذر چکا ہے کہ مہدیؑ اپنے حکم میں معصوم اور نبی کی پوری پیروی کرنے والے ہیں۔ اور کبھی خطا

نہیں کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات شیخین میں نہیں ہے اور وہ نو(۹) امور میں جن کا بیان پہلے گذر چکا ہے مہدی سے پہلے کسی امام میں جمع نہیں ہوئے۔ ان وجوہ سے مہدیؑ کی فضیلت شیخین پر جائز ہے۔

جناب پروفیسر محمد یوسف خاں صاحب استاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے اپنی تالیف ''اسلام میں امام مہدی کا تصور'' میں ایک باب بعنوان ''امام مهدي افضــل يا شــيخين؟'' باندھا ہے۔ اور اس میں ابن سیرینؒ کی یہ روایت درج کی ہے۔ عن ابن ســيرين قيل له المهدي خيرا و ابوبكر و عمر رضــي الله عنهما ؟ قال هو خيرٌ منهما ويعدل بنبي۔ ترجمہ: علامہ ابن سیرین سے پوچھا گیا کہ امام مہدی زیادہ بہتر ہیں یا ابو بکر و عمرؓ تو آپ نے فرمایا امام مہدی ان دونوں سے زیادہ بہتر ہیں اور نبی کے برابر۔۔ پھر لکھتے ہیں، اس قسم کی دو روایتیں علامہ سیوطی نے بھی الحاوی للفتاویٰ ج ۲ صفحہ ۹۲ پر نقل فرمائی ہیں جن میں سے ایک روایت تو ضمرہ کی سند سے ابن سیرین سے یوں منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اذا كان ذلك فاجلســوا في بيوتكم حتّٰى تســمعوا على الناس بخير من ابى بكر و عمر قيل افياتي خير من ابى بكر و عمر؟ (قال) قد كان (كاد) يفضــل على بعض (الانبياء) ترجمہ: جب فتنوں کا زمانہ آجائے گا تو تم اپنے گھروں میں بیٹھ جانا۔ یہاں تک کہ تم حضرت ابو بکر و عمرؓ سے زیادہ بہتر آدمی کے آنے کی خبر سن لو (پھر باہر نکلنا) لوگوں نے پوچھا کہ کیا حضرت ابو بکر و عمرؓ سے بھی افضل کوئی شخص آئے گا؟ تو فرمایا وہ تو بعض انبیاء پر فضیلت رکھتا ہوگا۔ صفحہ ۵۱

علامہ سیوطی نے دوسری روایت مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کی ہے جس میں ابن سیرین کا قول یوں نقل کیا گیا ہے۔ يكون في هذه الامة خليفة لا يفضــل عليه ابوبكر ولا عمر (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۹۳) ترجمہ: اس امت میں ایک خلیفہ ہوگا جس پر نہ حضرت ابو بکر کو بھی فضیلت نہ ہوگی اور نہ عمرؓ کو۔

اس روایت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ''اس امت میں ایک خلیفہ ہوگا'' کہا گیا ہے اور پھر کہا گیا ہے کہ اسپر ابو بکر و عمر کو بھی فضیلت نہ ہوگی۔ اس میں قابل غور بات ''ایک خلیفہ ہوگا'' ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے بعد تو خلیفہ ابو بکرؓ تھے اور اگر اسے توسیع دیں تو حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علیؓ ہوسکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ایک خلیفہ ہوگا، اور اسپر ابو بکر و عمرؓ کو بھی فضیلت نہ ہوگی اس بات کا اعلان ہے کہ وہ خلیفہ، خلیفۃ اللہ ہوگا۔ اور وہ صرف مہدی موعودؑ ہی ہوسکتے ہیں جیسا کہ حضرت ثوبانؓ کی روایت میں آیا ہے۔ بعض علماء نے مہدیؑ کی ابو بکر و عمرؓ پر فضیلت والی حدیثوں کی اپنی طرف سے تاویل کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ

(۱) علامہ سیوطی نے لکھا ہے۔ ”میرے خیال میں ان دونوں کی وہی تاویل کی جائے گی جو اس حدیث کی کی جاتی ہے کہ حضور نے صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ آخر زمانے میں نیک عمل کرنے والے کیلئے تم میں سے پچاس کے برابر ثواب ہو گا۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ آخیر زمانے کے مسلمان، صحابہ کرام سے بڑھ جائیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی فضیلت اتنی زیادہ ہے۔ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ صفحہ ۹۳)

۲) اسی طرح علامہ ابن حجر ہتیمی مکی نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے۔ ”امام مہدی کی فضیلت اور ثواب کا اضافہ ایک امر نسبی ہے۔ اس لئے کہ کبھی کبھار مفضول میں ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو افضل میں نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے طاؤس نے امام مہدی کا زمانہ پانے کی تمنا کی ہے۔ اس لئے کہ امام مہدی کے زمانے میں نیک کام کرنے والے کو زیادہ ثواب ملے گا اور گنہ گار کو توبہ کی توفیق ہو گی۔ الخ (القول المختصر فی علامات المہدی المنتظر۔ ص ۷۰)

۳) اسی طرح علامہ سید محمد برزنجی نے اپنی تحقیق یوں رقم کی ہے۔ ”تحقیقی بات یہ ہے کہ باہمی فضیلت کی جہات مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم کسی ایک فرد کو مطلق فضیلت دے دیں۔ ہاں اگر حضور ہی کسی کو کلی فضیلت دے دیں تو اور بات ہے ورنہ درست نہیں۔ کیوں کہ ہر مفضول میں کسی نہ کسی جہت سے کوئی ایسی اضافی چیز پائی جاتی ہے۔ جو افضل میں نہیں ہوتی (الاشاعۃ ص ۲۳۸)

۴) ملا علی قاری نے اپنی کتاب ”المشرب الوردی فی مذہب المہدی“ میں تحریر کیا ہے ”امام مہدی کی افضلیت پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو خلیفۃ اللہ فرمایا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو زیادہ سے زیادہ ”خلیفۂ رسول اللہ“ کہا جاتا ہے“ (الاشاعۃ صفحہ ۲۳۸)

رہا علامہ ابن سیرینؒ کا یہ کہنا کہ مہدی تو بعض انبیاء کے درجے کے قریب ہوں گے (حالانکہ اصل میں جو لفظ ہے وہ یہ ہے یعدل بعض الانبیاء وبروایتے یعدل النبیؐ، یعنی بعض انبیاء کے برابر ہوں یا دوسری روایت کے لحاظ سے ”نبی کے برابر“ ہوں گے) اس سے مراد (مؤلف کتاب کی ذاتی رائے) یہ ہے کہ چونکہ عیسیٰؑ ان کی (مہدی) کی اقتدا کریں گے اور یہ امام ہوں گے اور امام، مقتدی سے افضل ہوتا ہے اس لئے امام مہدی کو حضرت عیسیٰؑ پر جزوی فضیلت حاصل ہو گی۔ (اسلام میں مہدی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا تصور صفحہ ۵۵)

لیکن یہ مؤلف کا ذاتی نظریہ ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا سبب آنحضرت ﷺ کا وہ فرمان ہے جس میں آپ نے حضرت مہدیؑ کو بحیثیت دافع ہلاکت امت محمدیہ اوّل دور میں اپنے اور آخر اُمت میں، حضرت عیسیٰؑ کے درمیان، وسط امت میں

رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں **كيف تهلك امة انا في اولها وعيسىٰ بن مريم في آخرها والمهدي مني في وسطها۔**

اس روایت میں حضور نے مہدیؑ کو دو پیغمبروں کے درمیان رکھا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن ملحق بالانبیاء ہیں۔ اس لحاظ سے بھی آپ ابو بکر و عمرؓ سے افضل قرار پاتے ہیں اور یہ فضیلت کلی ہے جزوی نہیں ہے۔ یہ تو ہوا اہل سنت کے ایک طبقہ یعنی متکلمین کا مسلک۔ اب ہم آپ کو اہل سنت کے دوسرے بڑے طبقے یعنی محققین صوفیاء کے مسلک سے بھی آگاہ کریں گے تاکہ آپ پر قطعیت کے ساتھ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ مہدیؑ کی شیخین پر اور خلفاء اربعہ پر فضیلت اہل سنت کا متفقہ فیصلہ ہے۔ آپ نے اسکو مہدویہ کا اعتقاد سمجھ کر اعتراض کرنے کی جسارت کی ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ مہدویہ کا مخصوص اور منفرد عقیدہ نہیں ہے بلکہ اس باب میں مہدویہ وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو اہل سنت کے اکابر کا ہے۔ ضمناً ایک اور بات آپ پر واضح کر دینا اور آپ کو اس سے آگاہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب ہم سید محمد جونپوری کو مہدی موعود مانتے ہیں تو لازماً آپ کو ان تمام اوصاف، مراتب، فضائل اور کمالات سے متصف مانتے ہیں، صوفیاء کرام، محققین عظام حضرت مہدی موعودؑ میں جن کے ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ یعنی جو مہدی موعود ہوگا وہی خاتم اولیاء ہوگا۔ خاتم ولایت محمدیہ ہوگا اور باطن محمد مصطفی ﷺ ہوگا۔ اسکی تشریح یہ ہے کہ محققین صوفیاء کے پاس ہر نبی اور ہر رسول کی دو جہتیں ہوتی ہیں ایک جہت وہ جس میں نبی کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے اور دوسری وہ جس میں نبی کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے۔ پس نبی جس جہت سے خالق کے ساتھ مشغول اور اس سے فیض اخذ کرتا ہے اسکو ولایت کہتے ہیں۔ اور جس جہت سے وہ مخلوق کے ساتھ مشغول اور حاصل کردہ فیض کو مخلوق کو عطا کرتا ہے اسکو نبوت کہتے ہیں اسی وجہ سے ولایت کو صفت الٰہی اور نبوت کو صفت مخلوق کہتے ہیں۔ یوں بھی "ولی" اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس لئے ولایت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اور نبوت صفت مخلوق ہے اسلئے وہ منقطع اور ختم ہونے والی ہے۔

ہر نبی کی طرح خاتم الانبیاء محمد مصطفی ﷺ کے لئے بھی دو جہتیں ہیں۔ ایک آپ کی ولایت اور دوسری آپ کی نبوت۔ اور جس طرح ہر نبی کی جہتِ ولایت، اسکی جہت نبوت سے اعلیٰ ہوتی ہے اور جس طرح حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی ﷺ کی نبوت تمام انبیاء کی نبوت سے زیادہ کامل اور افضل ہے اسی طرح ولایت محمدیہ بھی دوسرے تمام انبیاء کی ولایت سے افضل واعلیٰ ہے۔ ولایت محمدی کو "نور محمدی" اور "حقیقت محمدی" بھی کہا جاتا ہے اور صوفیاء کرام کے پاس یہی مرتبہ "تعین اوّل" ہے جو تمام کائنات کے ظہور کا باعث ہے۔ اسی کو "مرتبہ **لو لاك لما اظهرتْ ربوبيتي**" "اگر تو نہ ہوتا تو میں اپنی ربوبیت ظاہر نہ کرتا" بھی کہتے ہیں۔

تمام انبیاءؑ اسی نور محمدی یا ولایت محمدی کے مظہر ہیں۔ ہر ایک نبی اسی نور کا ظہور ہے۔ بحسب استعداد قابلیت چنانچہ ''گلشن راز میں اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ بود نور نبی خورشید اعظم گہ از موسیٰ پدید و گہ ز آدم، یعنی نور نبی خورشید اعظم تھا۔ جو کبھی موسیٰ سے ظاہر ہوا اور کبھی آدم سے (مفاتیح الاعجاز شرح گلشن راز سوال چہارم صفحہ ۱۷۸)

اس ولایت محمدی کے مظہر کو ہی صوفیاء ''خاتم ولایت محمدی، خاتم الاولیاء یا باطن خاتم الانبیاء کہتے ہیں۔

چنانچہ جامیؒ شرح فصوص میں لکھتے ہیں۔ **اعلم ان الحقیقة المحمدیة مشتملة علی حقائق النبوّة والولایة کلها** ترجمہ: یہ جان لو کہ حقیقت محمدیہ تمام حقائق نبوت و ولایت کو شامل ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں۔ **فالأولیاء والأنبیاء کلهم مظاهر لحقیقة المحمدیة الأنبیاء بظاهر نبوته والأولیاء بباطن ولایته وخاتم الأولیاء مظهر احدیة جمعه لحقائق ولایته الباطنة**۔ ترجمہ: پس کل اولیاء اور انبیاء حقیقت محمدیہ کے مظہر ہیں انبیاء آپ کی ظاہر نبوت کے اور اولیاء آپ کے باطن ولایت کے اور خاتم الاولیاء آپ کی ولایت باطنہ کی احدیت الجمع کے مظہر ہیں۔

گلشن راز میں اس حقیقت کو اسطرح بیان کیا گیا ہے

نبوت را ظہور از آدم آمد کمالش در وجود خاتم آمد
ولایت بود باقی تا سفر کرد چو نقطہ در جہاں دور دگر کرد

یعنی نبوت کا ظہور آدم سے ہوا اور اس کا کمال خاتم کے وجود سے ہوا ولایت باقی تھی تا کہ سفر کرے نقطہ کی طرح دنیا میں دوسرا دور کرے

ظہور کلّ او باشد بخاتم بدو یابی تمامی دور عالم
وجود اولیا او را چو عضو اند کہ او کل است وایشاں ہم چو جزو اند

یعنی ولایت کا کامل ظہور خاتم الاولیاء سے ہو گا اور اسی سے دورِ عالم تمامیت کو پہنچے گا۔ تمام اولیاء خاتم الاولیاء کی نسبت اعضاء کے جیسے ہیں (کیونکہ) وہ (خاتم الاولیاء) کل ہے اور تمام اولیاء اس کے اجزاء کے مانند ہیں۔ مفاتیح الاعجاز، شرح گلشن راز میں ان اشعار کی شرح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ظہور تمامی ولایت و کمالش بخاتم الاولیاء خواہد بود کہ عبارت از محمد مہدی استؑ کہ موجود است و بآنحضرت دورِ عالم کمال تمام یابد و حقائق اسرار الٰہی درزمان آنحضرت تمام ظاہر شود، چنانچہ درزمان خاتم الانبیاءؐ کمال احکام شریعت بظہور

پیوستہ۔ پھر آگے لکھتے ہیں۔ یعنی در دائرہ ولایت مطلقا کہ خاتم الاولیاء مظہر آنست بقاء وجود اولیاء بصفتے کہ از صفات کمال ظاہر شدہ وبجمیع صفاتِ کمال در نقطۂ اخیرہ کہ حضرت محمد مہدیست ظہور یابد

چو او باخواجہ یابد نسبت تام از و باظاہر آید رحمت عام

اسکی شرح میں لکھتے ہیں، بداں کہ نسبت فرزندی سہ است۔ یکے صلبی کہ مشہور است، دوم قلبی کہ بحسن ارشاد ودل تابع مثل دل متبوع گردد، سوم حقیقی کہ تابع ببرکت حسنِ متابعتِ متبوع بنہایت کمال کہ جمع وفرق بعد الجمع است برسد۔ وتابع ومتبوع یکے شود، وچوں خاتم الاولیاءؑ البتہ از آن محمد است ﷺ نسبت صلبی ثابت است وچوں دل مبارکش بحسن متابعت خاتم الانبیاء صلوات اللہ علیہ مرآت تجلیات نامتناہی الٰہی شدہ نسبت قلبی واقع است۔ وچوں وارث مقام لی مع اللہ شدہ است نسبت حقیقی تحقیق یافتہ پس ہر آئینہ نسبت تام کہ ثلاث است واقع باشد۔ وچوں بین الختمین ایں نسبت تام محقق است بحکم الولد سرٌ لا بیہ خاتم الاولیاء نیز مظہر رحمت رحمانیہ گشتہ مخالفات دائرہ طرف ولایت راجامع گردد وسعادت دو جہانی در متابعت آنحضرت منحصر گردد۔ واصول ہر ایک قرار گیرد۔ واختلاف کثیر بحکم ظہور وحدت از میان برخیزد۔ وآنچہ شیخ سعد الدیں حموی فرمودہ کہ " لن یخرج المہدی حتیٰ یسمع من شراک نعلہ اسرار التوحید بر منصہ ظہور جلوہ کند

پھر آگے لکھتے ہیں۔

شود او مقتدائے ہر دو عالم خلیفہ گردد از اولا آدم

یعنی خاتم الاولیاءؑ کہ باطن نبوت خاتم الانبیاء است علیہ الصلاۃ والتسلیم وحسنہ از حَسَنات آنحضرت، مقتداء وواسطۂ فیض ہر دو عالم ملک وملکوت گردد، وخلافت وتصرف از وے ظہور پیوندد (مفاتیح الاعجاز شرح گلشن راز صفحہ ۸۹)

مندرجہ بالا عبارت سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) نبوت کے دائرہ کی ابتداء آدمؑ سے ہوئی اور اس کا کمال حضرت خاتم الانبیاءؑ سے ہوا

(۲) نبوت ختم ہونے کے بعد ولایت باقی رہی اور اس نے دوسرا دور شروع کیا

(۳) ولایت مصطفی کے دور کی ابتداء حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوئی اور اس کا ظہور کلی خاتم الاولیاء سے ہوگا جس سے حضرت مہدیؑ مراد ہیں۔

(۴) اس دائرۂ ولایت میں جملہ اولیاء اعضاء کے برابر ہیں اور حضور مہدی موعودؑ کی حیثیت کل کی ہے۔

(۵) حضرت مہدیؑ کو حضرت محمد مصطفی ﷺ سے نسبت تام حاصل ہے باعتبار کمال تبعیت تابع اور متبوع ایک

ہوگئے ہیں۔

پھر آخر میں لکھتے ہیں، نماند در جہاں یک نفس کافر شود عدل حقیقی جملہ ظاہر۔ اور اسکی شرح اس طرح کی گئی ہے۔

چوں ذات آنحضرتؑ مستلزم انکشاف اسرار توحید است، کفر و شرک از لوازم جہل است، نماند، وہمہ عارف و مؤحد شدند و عدل حقیقی کہ ظلّ وحدت حقیقی است کہ مشتمل بر علوم شریعت و حقیقت بہ تمام و کمال ظاہر شود۔ چنانچہ اختلاف ملل انبیاءؑ بوجود شریعت خاتم الانبیاء ﷺ تسویہ یافت، اُصول بریک اساس قرار گرفت۔ مخالف احکام باز بظہور خاتم الاولیاءؑ تسویہ یابد۔ و مخالفت برخیزد و عدل حقیقی ظاہر شود، (مفاتیح الاعجاز شرح گلشن راز صفحہ ۹۵)۔

واضح ہو کہ شیخ سعد الدین شبستری کا سنہ ولادت ۶۴۸ھ اور سنۂ وفات ۷۲۰ھ ہے۔ تصوف سے متعلق ایک صوفی کی طرف سے پندرہ سوالات کے جواب میں ایک ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی لکھی جو گلشن راز کے نام سے مشہور ہے۔ ادب تصوف میں اس مثنوی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس شرح سے حسبِ ذیل امور مستخرج ہوتے ہیں۔

(۱) حضرت مہدیؑ کاشف اسرار توحید ہوں گے، کفر و شرک جو لوازم جہل سے ہیں باقی نہ رہیں گے

(۲) لوگوں کو عرفان اور توحید حقیقی کی معرفت حاصل ہوگی اور عدل حقیقی جس سے مراد ظل وحدتِ حقیقی ہے اور جو علومِ شریعت اور حقیقت پر مشتمل ہے اپنی تمامیت اور کمالیت کے ساتھ ظاہر ہوگا۔

(۳) جس طرح انبیاءؑ کی ملتوں کا اختلاف خاتم الانبیاءؑ کی شریعت کے وجود سے ختم ہوگیا اور سب کی ایک اساس مقرر ہوگئی اسی طرح (مجتہدین کے) مختلف اور مخالف احکام خاتم الاولیاء کی بعثت کے سبب ختم ہوجائیں گے اور عدل حقیقی (ظل وحدتِ حقیقی) ظاہر ہوگا

بحمد اللہ، حضرت مہدی موعود کی بعثت سے شرک باطنی تک کا خاتمہ ہوا۔ انا کو فنا سے بدل دیا گیا۔ لوگوں کو عرفانِ حقیقی نصیب ہوا یعنی دیدار الٰہی کو حاصل کرنے کی تعلیم ملی۔ فقہاء کے آپسی اختلاف کو جو اجتہاد اور قیاس کی بنیاد پر پیدا ہوئے تھے، بلاواسطہ امر الٰہی اور مشاہدہ روحِ رسالت پناہی کی اساس پر شرع حقیقی سے ختم فرمایا۔ اور کتاب و سنت سے ہٹ کر جو ظلم اور جور کی راہیں پیدا ہوئی تھیں ان کو پاٹ کر قسط و عدل کی شاہراہ عظیم قائم فرمادی۔ لیکن یہ سب ان کیلئے جنہوں نے آپ کو مانا اور آپ کا اتباع کیا۔ رہے وہ جو آپ سے اور آپکی تعلیمات سے دور رہے تو چشمۂ آفتاب راچہ گناہ۔

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ حضرت مہدیؑ کا حقیقی مقام کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ آپ شیخین سے افضل ہیں بلکہ آپ حضور محمد مصطفی ﷺ کی ولایت کے خاتم اور آپ ہی کے باطن ہونے کے ناطے آپ سے نسبت تام بھی رکھتے ہیں۔ ایسی نسبت جہاں تابع اور متبوع ایک ہوجاتے ہیں۔ اسطرح کہ ایک کو دیکھیں تو دوسرا یاد آجائے۔

منّ وسلویٰ

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّـلْوَىٰ ﴿البقرۃ:۵۷﴾ ترجمہ: اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کئے رکھا اور تم پر ہم من وسلویٰ اتارتے رہے۔

اسکی تفصیل یہ ہے کہ موسیٰؑ کلام الٰہی سننے کیلئے جب طور پر گئے تو اپنے ساتھ ستّر (۷۰) منتخب آدمیوں کو بھی لے گئے تا کہ وہ بھی سنیں اور گواہ رہیں لیکن ساتھیوں نے کہا کہ ہم کو اس وقت تک یقین نہیں آئے گا جب تک کہ ہم اللہ کو علانیہ دیکھ نہ لیں۔ اس قسم کے مطالبہ کی جسارت پر ایک بجلی نے ان کا کام تمام کر دیا پھر موسیٰؑ کی دعا کے بعد اللہ نے ان کو زندہ کیا تا کہ وہ اللہ کا احسان مانیں اور شکر بجالائیں۔

چونکہ بنی اسرائیل سینا کے کھلے میدانوں میں تھے اور ان کے پاس خیمے بھی نہیں تھے کہ سر چھپائیں، تو اللہ نے ان کو دھوپ سے بچانے کیلئے ایک مدت تک آسمان کو ابر آلود کر دیا۔ اور ان کے کھانے پینے کیلئے من وسلوٰی نازل کیا۔ من دھنئے کی بیج جیسے دانے جو رات کو اوس کی طرح گر کر جم جاتے اور سلویٰ بٹیر کی قسم کا ایک پرندہ (بھنا ہوا)، یہ دونوں کثیر مقدار میں رات میں جمع ہو جاتے اور صبح کو ہر شخص اپنی قوت اور ضرورت کے مطابق ان کو چن کر ان پر اپنی زندگی بسر کر لیتا مگر شرط یہ تھی کہ نہ ان کا ذخیرہ کیا جائے اور نہ ان کے بدلے کھانے کی دوسری چیز طلب کی جائے۔ لیکن انہوں نے دونوں شرطوں کا خلاف کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ من وسلویٰ کا نزول رک گیا۔ (نورِ ایمان صفحہ ۱۱)

مہدویوں کا نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا نہ کرنا

مہدویوں کا سلف سے لیکر آج تک یہی عمل ہے کہ وہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا نہیں کرتے۔ اس سے ان پر یہ طعن کیا جاتا ہے کہ مہدویوں کے پاس دُعا نہیں ہے۔

فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا نہ مانگنے سے یہ فیصلہ کرلینا کہ مہدویوں کے پاس دعا کی ہی اہمیت نہیں ہے نہ صرف غلط ہے بلکہ علمی بے بضاعتی اور دین سے دوری کا شاندار مظاہرہ ہے۔ اس لئے کہ مہدوی۔

(۱) نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ خواہ منفرد ہوں کہ مقتدی اور سورۂ فاتحہ کا ایک نام سورۂ دعا بھی ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مہدویوں کے پاس دعا کی اہمیت نہیں ہے۔ دعا کی اہمیت تو ان کے پاس نہیں معلوم ہوتی جن کا مذہب یہ ہے کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہئے۔ مہدویہ کے پاس تو مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

(۲) مہدوی سلام کے ذریعہ اپنی نماز ختم کرنے سے پہلے درود پڑھتے ہیں اور دعائے ماثورہ پڑھتے ہیں دعائے ماثورہ میں اپنے لئے ماں باپ کے لئے مومن استاذوں کے لئے مرشدین کے لئے اور تمام مومنین کے لئے خواہ وہ بقید حیات ہوں کہ اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہوں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا کہ مہدویہ کے پاس دعا کی اہمیت نہیں ہے سراسر بہتان ہے۔

(۳) ہر فرض نماز کے بعد آہستہ وہ الفاظ دہراتے ہیں جن کو آنحضرت ﷺ اپنی فرض نمازوں کے بعد پڑھتے تھے اور آپ کی اتباع میں صحابہ کرام بھی پڑھتے تھے چنانچہ مسلم میں حضرت ثوبان سے یہ روایت آئی ہے **كان رسـول الله ﷺ اذا نصرف من صلاته استغفر ثلاثا ثم قال اللهم انت السلام ومنك السلام تباركت يا ذا الجلال و الإكرام** (منتخب الصحیحین صفحہ ۱۳۷) ترجمہ: رسول اللہ ﷺ جب اپنی نماز کے (پوری ہونے کے) بعد پلٹتے تھے تو تین بار استغفار پڑھتے پھر فرماتے **اللهم انت السـلام ومنك السـلام تباركت يا ذا الجلال و الإكرام** بحمد للہ مہدوی بھی یہی عمل کرتے ہیں۔ اس روایت سے تو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ فرض نماز کے بعد اللّٰھم انت السلام پڑھا کرتے تھے۔ اس سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے آنحضرت اس کے بعد دعا کرنے کے لئے بیٹھتے بھی ہوں تو اس کا جواب اس حدیث سے ملتا ہے جو حضرت عائشہؓ سے آئی ہے آپ فرماتی ہیں۔

كان ﷺ لم يقعد إلّا بمقدار ما يقول اللهم انت السلام ومنك السلام تباركت يا ذا الجلال والإكرام

صحیح مسلم عن عائشہؓ منتخب الصحیحین صحفہ ۱۳۸ ترجمہ یعنی رسول ﷺ (نماز کے بعد) نہیں بیٹھتے تھے بجز اس قدر کہ آپ کہہ لیں

اللهم انت السـلام ومنك السـلام تباركت يا ذا الجلال و الإكرام دیکھئے حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ فرض نماز کے بعد بس اتنی مقدار میں بیٹھتے تھے کہ آپ اللهم انت السـلام ــــ۔ الخ پڑھ لیں۔ لم يقعد کے الفاظ تو بتا رہے ہیں کہ بی بی عائشہؓ نے آنحضرتؐ کے اس عمل کو بار ہا دیکھا ہے۔ چونکہ حضرت عائشہ کا حجرہ مسجد سے بالکل متصل تھا اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی حیثیت فقط روایت کی نہیں ہے بلکہ اسکی حیثیت "رؤیت" کی ہے یعنی آپ نے جو کچھ بار ہا دیکھا ہے اس کو بیان فرمایا ہے اب اس کے تناظر میں آج کل کے اس عمل کو سامنے رکھیں کہ فرض نماز کے بعد امام صاحب اور مقتدی کافی دیر تک بیٹھتے ہیں اور بڑی لمبی چوڑی دعائیں مانگتے ہیں اور ایسا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اس حد تک کہ وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ جس نے نماز کے بعد دعا نہیں کی اس کی نماز ہی ناقص ہے؟ استغفر اللہ دیکھئے ان کے ایسا کہنے کی زد میں کون آ رہے ہیں؟ مہدویہ یا آنحضرت ﷺ؟

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کل فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر لمبی چوڑی دعائیں مانگنے کا جو عمل ہے وہ "بدعت" ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں اور آنحضرت ﷺ کے بعد کے زمانے میں بھی یعنی خلفاء راشدین کے دور میں بھی یہ عمل نہیں تھا۔ اس تعلق سے کوئی حدیث صحیح بھی مروی نہیں ہے۔

اس موقع پر اگر یہ کہا جائے کہ ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا آنحضرت سے کئی ایک احادیث سے ثابت ہے تو ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم کو اس سے انکار نہیں ہے، لیکن بحث تو یہاں فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے کی ہے اور اس سلسلے میں کوئی روایت آنحضرتؐ سے ثابت نہیں ہے۔

اوپر کی بحث کا خلاصہ یہ کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے کی کوئی روایت آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور جہاں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے کی روایت آئی ہے وہاں فرض نمازوں کا ذکر نہیں ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا خلاف حکم قرآنی ہے۔ قرآن میں دعا کرنے کے جو آداب وحدود بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَـرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿الأعراف:۵۵﴾ ترجمہ اپنے رب سے دعا مانگو تضرع کے ساتھ (عاجزی وزاری کے ساتھ) اور پوشیدہ طور پر اس آیت میں دعا کے دو آداب بیان کئے گئے ہیں یعنی دعا تضرّع الحاح اور زاری کے ساتھ ہو اور دعا پوشیدہ طور پر ہو۔ اب اگر کسی نے دعا کے سلسلے میں ان دونوں آداب اور حدود کا لحاظ نہ رکھا یعنی دعا میں تضرع نہیں کی اور دعا میں پوشیدگی کو ملحوظ نہیں رکھا تو وہ گویا آداب دعا اور حدود دعا سے باہر ہو گیا اور آیت میں صاف کہا گیا ہے کہ اللہ حد سے متجاوز ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے سے ان دونوں مذکورہ حدود قرآنی کی خلاف ورزی ہوتی ہے

اور دعا میں تضرع کے ساتھ اخفاء (پوشیدگی) کی شرط اس لئے رکھی گئی ہے کہ پوشیدگی، اخلاص کی دلیل ہے۔ ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے اور زورزور سے دعا کرنے میں اخفاء کے بجائے اظہار کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اب رہی بات تضرّع کی تو وہ اپنے تمام وکمال کے ساتھ صرف سجدے میں پایا جاتا ہے جبھی تو حدیث میں آیا کہ بندہ جب سجدے میں ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اللہ کے حکم میں دعا کے جو حدود بیان کئے گئے ہیں ان کی تکمیل صرف سجدے میں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ سجدہ خود انتہائے تضرع کی ہیئت کا نام ہے جس میں بندہ اپنے اشرف الاعضاء یعنی منھ کو اسفل ترین چیز یعنی زمین پر اوندھا رکھتا ہے۔ اور اپنی انتہائی پستی، عاجزی کی ہیئت اور صورت سے سبحان ربي الاعلىٰ کہتے ہوئے اپنے پرور دگار کی بڑائی اور عظمت کا اعتراف کرتا ہے نیز سجدے میں جو دعا ہوتی ہے وہ پوشید ہوتی ہے

اسی طرح سجدے میں کی جانے والی دعا میں قرآن میں بیان کردہ دعا کے آداب وحدود کی پوری رعایت ملحوظ ہوتی ہے اسی لئے مہدویہ کے پاس سجدے میں دعا کی جاتی ہے۔ ہاتھ اُٹھا کر دعا نہیں کی جاتی۔ البتہ ان مقامات پر جہاں آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اتباع میں مہدوی بھی ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے ہیں اور وہ مقامات جیسا کہ فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں آٹھ ہیں جس کا خلاصہ فقعس صمعج بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) ف سے مراد افتتاح صلوٰۃ یعنی تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ اُٹھانا

(۲) ق سے مراد وتر میں دعائے قنوت پڑھنے کے وقت ہاتھ اُٹھانا (نیز قبروں پر فاتحہ کے وقت)

(۳) ع سے مراد عیدین کی نماز میں تکبیرات کہنے کے لئے ہاتھ اُٹھانا

(۴) س سے مراد استلام حجر اسود۔ حجر اسود کو بوسہ دینے یا استلام کرنے کیلئے ہاتھ اُٹھانا

(۵) ص سے صفا کی پہاڑی پر ہاتھ اُٹھانا

(۶) م سے مروہ کی پہاڑی پر ہاتھ اُٹھانا

(۷) ع سے عرفات کے میدان میں ہاتھ اُٹھانا

(۸) ج سے جمروں پر ہاتھ اُٹھانا

خلاصہ یہ کہ مہدویہ، فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا نہیں مانگتے اور اس عمل کی بنیاد کتاب الٰہی اور عمل رسالت پناہی ہے اور سجدے میں دعا کرتے ہیں اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اقرب ما یكون العبد من ربه وهو ساجد فاكثروا الدعاء فيه یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا بندہ سجدے کی حالت میں اللہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے پس سجدے میں

ہی زیادہ دعا کرو۔ اس کے علاوہ نماز استسقاء یعنی بارش کیلئے نماز پڑھنا اور زیارت قبور کے مواقع پر بھی آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی ہے۔ حضور ﷺ کی اتباع میں مہدوی بھی ان مواقع پر ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے ہیں۔

چونکہ فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنا آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں ہے اس لئے مہدوی بھی فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا نہیں کرتے۔

مریم

حضرت مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں۔ چونکہ عیسیٰ ؑ بغیر باپ کے محض اللہ کی روح سے پیدا ہوئے تو اللہ نے قرآن شریف میں اکثر مقامات پر عیسیٰ ؑ کا ذکر عیسیٰ بن مریم یا مسیح بن مریم سے فرمایا ہے۔ آپکا نام قرآن میں تقریباً ۳۴ مقامات پر آیا ہے البتہ آل عمران میں آپ کے بارے میں کسی قدر تفصیل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿آل عمران:۳۶﴾ ترجمہ: اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود (کے فتنے) سے۔

واقعہ یہ ہے عمران کی عورت کا نام "حَنّہ بنت فاقوذا" ہے۔ اس نے اپنے زمانے کے رواج کے موافق منت مانی تھی کہ خداوند جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں اسے تمام دنیاوی امور و مشاغل سے اور قید نکاح سے آزاد کراتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمیشہ خدا کی عبادت اور کلیسا کی خدمت میں لگا رہے گا۔ اے اللہ تو اپنی مہربانی سے میری نذر کو قبول فرما۔ تو میری عرض کو سنتا اور میری نیت اور اخلاص کو جانتا ہے۔ گویا لطیف انداز میں یہ استدعا تھی کہ لڑکا پیدا ہو کیوں کہ اس خدمت کیلئے لڑکیاں قبول نہیں کی جاتی تھیں۔

پھر جب اس نے لڑکی کو جنا تو کہا اے میرے رب میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوئی۔ حالانکہ اس کے ہاں جو کچھ پیدا ہوا تھا اللہ اس کو خوب جانتا ہے تو حسرت سے کہا کہ مجھے تو لڑکی پیدا ہوئی۔ اور لڑکا جس کی مجھے توقع تھی وہ لڑکی کی طرح (ضعیف اور ناتواں) نہیں ہوتا۔ اللہ فرماتا ہے کہ اس لڑکی کی قدر و قیمت کو خدا ہی جانتا ہے وہ جس طرح کے بیٹے کی خواہش مند تھی وہ اس بیٹی کی قدر و قیمت کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ یہ بیٹی بذات خود مبارک و مسعود ہے۔ اس کے وجود میں ایک عظیم الشان، مبارک، مسعود نرالا پیغمبر جو صاحب کتاب ہو گا پوشیدہ ہے۔

حضرت مریم نے دعا مانگی کہ اسکو شیطان مردود کے مسّ اور فتنے سے بچنے کیلئے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ رسول اللہ

ﷺ کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آدمی کے بچے کو ولادت کے وقت جب ماں سے جدا کر کے زمین پر رکھا جاتا ہے تو اُسے شیطان مس کرتا ہے مگر عیسیٰ اور مریم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مریم کے معنی عابدہ اور خادمہ کے ہیں۔ گو یہ لڑکی تھی اور اس وقت کے رواج کے مطابق کوئی لڑکی مجاورہ نہیں بن سکتی تھی۔ لیکن اللہ نے اس لڑکی کو اپنے گھر کی خدمت کیلئے قبول فرمالیا اسطرح کہ وہاں کے مجاوروں اور انتظام کرنے والوں کے دلوں میں بھی یہ بات ڈال دی کہ مریم کو بطور عابدہ اور خادمہ قبول کرلیا جائے۔ اب یہ بحث پیدا ہوئی تھی کہ مریم کی کفالت کون کریگا۔ ہر مجاور کی یہ تمنا تھی کہ اس بچی کی پرورش وہ کرے۔ جب معاملہ نے طول پکڑا تو مسئلہ کے حل کیلئے قرعہ اندازی پر اتفاق ہوا۔ یعنی وہ تمام دعویدار اپنے جن قلموں سے توریت لکھتے تھے ان کو بہتے پانی میں ڈال دیں۔ جس کا قلم پانی کے بہاؤ پر نہ بہے بلکہ الٹا چلے وہ مریم کی کفالت کا حقدار ہو گا۔ اس قرعہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم پانی کے بہاؤ کے خلاف چلا تو آپ ہی مریم کے کفیل گویا خدا کی طرف سے مقرر ہو گئے۔

جب کبھی زکریا مریم کے پاس جاتے تو وہاں رزق پاتے۔ رزق کے معنی کھانے کے بھی ہیں جس سے جسم انسانی نشو نما پاتا ہے۔ اس معنی میں مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ حضرت زکریاؑ بی بی مریم کے پاس عبادت خانے میں سردی کے موسم میں گرمی کے پھل اور گرمی کے زمانے میں سرما کے پھل پاتے تو انہیں حیرت ہوتی کہ جو چیز بازار میں نہیں ہے وہ یہاں کون لاتا ہے اور بظاہر بازار جاکر یہاں لانے والا بھی کوئی نہیں تھا اور خود مریم بھی بازار نہیں جاتی تھیں۔ پوچھا اے مریم یہ کہاں سے آتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ کے پاس سے۔ اللہ جسکو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر معاً حضرت زکریا کے دل میں خیال آیا کہ جب اللہ بے موسم کے پھل دے سکتا ہے تو میرے ساتھ بھی اللہ ایسا ہی کر سکتا ہے۔ یعنی حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھی۔ فوراً اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے اپنی جانب سے صالح اولاد عطا فرما تو دعا کا سننے والا ہے۔

رزق کے معنی ظاہری اعتبار سے تو کھانا (طعام) ہے لیکن باطنی معنی یہ ہیں کہ اللہ کی جانب سے علمی کمالات اور روحانی فیوض آپ کو عطا ہوتے تھے۔ جن کو دیکھ کر حضرت زکریا پوچھ بیٹھے کہ یہ سب تجھے کہاں سے آتے ہیں۔ کہا اللہ کی جانب سے۔ یعنی جسمانی غذا کا بھی انتظام ہوتا تھا اور روحانی غذا کا بھی۔ ابھی زکریا علیہ السلام عبادت خانے میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ فرشتوں نے ان کو آواز دی کہ (اے زکریا) اللہ تمہیں یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والے ہیں اور جو سردار ہوں گے، عورتوں سے بے جا رغبت والے نہ ہوں گے۔ اور صالحین میں سے نبی بھی ہوں گے۔ زکریا نے کہا اے میرے رب میرے ہاں لڑکا کیوں کر پیدا ہو گا جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اللہ نے

فرمایا۔ اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہوں نے کہا اے میرے پروردگار میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرما۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن اشاروں کے سوا بات نہ کر سکے گا۔

درمیان میں مناسبت کی وجہ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر آگیا تھا۔ اب پھر مریم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے کہ فرشتوں نے حضرت مریم سے کہا کہ (تو کوئی معمولی عورت نہیں ہے) بلکہ اللہ نے تجھے منتخب کیا، تجھے پاک و صاف بنایا اور (اسوقت کی تمام) عورتوں پر تجھ کو فضیلت بخشتے ہوئے تیرا انتخاب کر لیا۔ یعنی باوجود لڑکی ہونے کے اللہ نے اپنی نیاز میں تجھے قبول فرمایا۔ حضرت زکریا کی سرپرستی عطا فرمائی۔ دن رات اللہ کی عبادت میں مشغول رکھا۔ ستھرے اخلاق، پاک طبیعت، ظاہری نظافت باطنی نزاہت عطا فرما کر اپنی مسجد کی خدمت کے لائق بنایا اور اس وقت کی تمام عورتوں پر تجھکو فضیلت بخشی یعنی بدون مسّ بشر اس سے حضرت مسیح علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر پیدا کیا۔ یہ امتیاز تو دنیا میں کسی عورت کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ اب تجھے چاہئیے کہ اپنے پروردگار کی فرماں برداری کر، سجدہ بجالا اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس کے بعد اللہ کے حکم سے فرشتے مریم کو مسیح عیسیٰ نامی بیٹے کی خوشخبری سناتے ہیں۔ اس کا ذکر عیسیٰؑ کے عنوان میں دیکھئے۔ نفخ روح کس طرح ہوا۔ اللہ نے اس کا ذکر سورۂ مریم میں اسطرح فرمایا ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا فَاتَّخَذَتْ مِن دُونِهِمْ حِجَابًا --﴿مریم ۱۷،۱۶﴾ ترجمہ: اور یاد کرو مریم کو جب وہ اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان میں جدا ہوئی پھر ان کے درمیان ایک پردہ پکڑ لیا۔

ہوا یہ کہ مریم کو جبکہ ان کی عمر ۱۳ یا ۱۵ سال کی تھی پہلا حیض آیا تو وہ شرم کے مارے گھر والوں سے الگ ہو کر ایک مکان میں چلی گئیں غسل حیض کی غرض سے وہ مکان بیت المقدس سے مشرق کی طرف تھا۔ اسی لئے نصاریٰ نے مشرق کو اپنا قبلہ بنالیا۔ جب آپ غسل سے فارغ ہوئیں تو اللہ نے ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا یعنی جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا جو نوجوان اور خوبصورت مرد کی شکل میں اچانک مریم کے سامنے آگئے۔ حضرت مریمؑ نے اول وہلہ میں سمجھا کہ کوئی آدمی ہے۔ دفعتاً ایک مرد کے سامنے آجانے سے قدرتی طور پر خوف زدہ ہوئیں اور اپنی حفاظت کی فکر کرنے لگیں۔ مگر اس مرد نے کہا، میں فرشتہ ہوں اور اسی لئے تیرے پاس آیا ہوں کہ خداوند قدوس کی طرف سے تجھ کو ایک پاکیزہ، صاف ستھرا اور مبارک و مسعود لڑکا عطا کروں۔ مریم کے دل میں خدا نے یقین ڈال دیا کہ یہ بے شک فرشتہ ہے۔ مگر تعجب ہوا کہ جس عورت کا شوہر نہیں جو اس کو حلال طریقے پر چھو سکے۔ اور بدکار بھی نہیں کہ حرام طریقے سے بچہ حاصل کر سکے پھر اس کو پاکیزہ اولاد کیسے مل جائے گی۔

جواب دیا گیا ایسا ہی ہو گا۔ اور یہ کام تیرے رب کیلئے آسان ہے۔ وہ بڑی قدرت والا ہے اور اللہ اسی طرح اس بچہ کو لوگوں کیلئے اللہ کی نشانی بنانا چاہتا ہے۔ جس طرح آدمؑ کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کیا۔ حوا کو صرف مرد کے وجود سے پیدا کیا اور تجھ سے جو بچہ پیدا ہو گا وہ بغیر باپ کے پیدا ہو گا۔ یہ تجھ پر اور اس بچے پر اللہ کی مہربانی ہے۔ کہتے ہیں کہ فرشتہ نے گریبان میں پھونک ماری۔ حمل ٹھہر گیا۔ دراصل روح پھونکنے والا اللہ ہی ہے۔ پھر حمل کے وضع کے وقت شرم کے مارے سب سے علیحدہ ہو کر کسی دور مقام پر چلی گئیں شاید وہی جگہ ہو جسے "بیت اللحم" کہا جاتا ہے۔ یہ مقام بیت المقدس سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ پھر جب زچگی کی تکلیف (درد) شروع ہوئی ایک کھجور کی جڑ کا سہارا لینے کے لئے اس کے قریب پہنچی۔ اس وقت درد کی تکلیف، تنہائی بے بسی و بیکسی، سامان ضرورت کا فقدان اور سب سے بڑھ کر ایک عفیفہ پاکباز کو دینی حیثیت سے آئندہ بدنامی اور رسوائی کا تصور سخت بے چین کئے ہوئے تھا چنانچہ اسی کرب واضطراب کے غلبہ میں کہہ اٹھی کہ اس وقت کے آنے سے پہلے مر چکی ہوتی اور دنیا میں میرا نام ونشان بھی نہ ہوتا اور کسی کو بھولے سے میں یاد بھی نہ آتی۔

وہ مقام جہاں حضرت مریم کھجور کے درخت کے نیچے تشریف رکھتی تھیں کچھ بلند تھا اس کے نیچے سے پھر اسی فرشتہ کی آواز آئی غمگین اور پریشان مت ہو خدا کی قدرت سے ہر قسم کا ظاہری اور باطنی اطمینان حاصل کر۔ نیچے کی طرف دیکھ۔ اللہ نے کیسا چشمہ جاری کر دیا جو تیرے پینے کیلئے ہے۔ کھانے کیلے اسی کھجور کے درخت (جڑ) کو ہلا۔ پکی اور تازہ کھجوریں شاخوں سے ٹوٹ کر گریں گی۔ پس تازہ کھجور کھا اور چشمہ کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پی اور پاکیزہ بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی رکھ۔ اگر تو دیکھے کسی اور آدمی کو جو تجھ سے کچھ سوال کرنے لگتا ہے تو اشارے سے بتا دینا کہ میں نے اللہ کیلئے نذر کا روزہ رکھا ہے۔ پس کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی۔ پھر جب مریمؑ بچے کو اُٹھائے ہوئے اپنی قوم کی طرف آئیں تو لوگ یہ منظر دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے اور کہنے لگے مریم تو نے تو غضب کر دیا۔ یہ حیرت انگیز اور جھوٹ کا طوفان کہاں سے لے آئی۔ اس سے زیادہ جھوٹ کا طوفان اور کیا ہو گا کہ ایک لڑکی کنواری ہوتے ہوئے دعویٰ کرے کہ یہ بچہ میرا ہے۔ اور کہا اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ پھر یہ بُری خصلت تجھ میں کہاں سے آئی مریم کو اخت ہارون یعنی ہارون کی بہن اس لئے کہا وہ حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ کی سی تھی۔ یا یہ کہ مریم کے بھائی کا نام ھارون تھا تو حضرت مریمؑ نے ہاتھ سے بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ خود اس سے دریافت کر لو۔ اس کے بعد کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عنوان کے ذیل میں دیکھئے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے سورۂ مومنون کے کی آیت نمبر (۵۰) میں حضرت مریمؑ کا ذکر اسطرح فرمایا ہے۔ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴿المؤمنون:۵۰﴾۔ ترجمہ: اور ہم نے مریم کے بیٹے (عیسیٰؑ) کو اور ان

کی والدہ کو ایک نشانی بنایا اور ان دونوں کو ایک بلند جگہ پر لے جا کہ پناہ دی جو رہنے کے لائق تھی اور جہاں پانی تھا۔

یہ جگہ کونسی تھی اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریم تشریف رکھتی تھیں کہ وہ جگہ بلند تھی نیچے پانی کا چشمہ تھا اور اوپر کھجور کا درخت تھا۔ بعض کہتے ہیں دمشق، بعض کہتے ہیں مصر۔ ابن عباسؓ کے پاس وہ مقام بیت المقدس تو حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس "رملہ"۔ مفسرین یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے بچپن کا واقعہ ہے۔ ایک ظالم بادشاہ ہیر دوس نامی، نجومیوں سے یہ سن کر کہ حضرت عیسیٰؑ کو سرداری ملیگی، لڑکپن سے ہی دشمن ہو گیا تھا اور قتل کے درپے تھا۔ حضرت مریمؑ الہام ربانی سے ان کو لیکر مصر چلی گئیں۔ اور اس ظالم کے مرنے کے بعد پھر شام واپس آ گئیں۔ ذات ربوۃ سے ایسی زمین مراد ہے جو اونچی ہو اور ماء معین سے مراد وہ جگہ جہاں پانی کا چشمہ ہو۔ غالباً حضرت مریم نے اسی جگہ کا انتخاب کیا ہو جہاں وضع حمل کے وقت گئی تھیں۔

لیکن کسی نے بھی ربوۃ سے مراد کشمیر کا نام تک نہیں لیا۔ اور نہ کشمیر میں عیسیٰؑ اور آپ کے والدہ ماجدہ کی قبر بتلائی، مگر تیرھویں صدی کے بعض تیرہ ذہن افراد نے ربوۃ سے خطہ کشمیر مراد لیا ہے اور یہ مشہور کرنے کی مذموم کوشش کی ہے کہ اسی مقام پر حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی ولدہ کی قبر ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اوپر اُٹھالیا اور آپ قرب قیامت دوبارہ نازل ہونے والے ہیں جس کا ثبوت قرآن اور احادیث سے حسب ترتیب ملتا ہے تو کشمیر میں قبر کس طرح بن سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی نے من گھڑت افواہ اُڑادی ہو جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اللہ عزّوجلّ نے سورۂ تحریم یں حضرت مریمؑ کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ﴿التحریم:۱۲﴾ ترجمہ: اور عمران کی بیٹی مریم جنھوں نے اپنی شرم گاہ کو ہر طرح محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور انہوں نے اپنے رب کے پیغاموں اور اسکے کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں سے تھیں۔

شرم گاہ کو حرام تو خیر حرام ہی تھا۔ حلال سے بھی محفوظ رکھا یعنی کسی سے نکاح بھی نہیں کیا اللہ نے ان میں بذریعہ جبرئیل اپنی روح پھونک دی یعنی عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ پھر سخت ترین حالات کا مقابلہ مردانہ وار کیا۔ اللہ کے احکام۔ بجالائیں اور اس کے کتابوں کی تصدیق کی اور مردوں کی طرح اللہ کی فرماں بردار بنی رہیں۔

مسجد ضرار اور مسجدِ قبا

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّـهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّـهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴿التوبة:۱۰۷﴾ ترجمہ: جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد بنائی کہ ضرر پہنچائیں، کفر کی باتیں کریں اور مومنوں میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کیلئے گھات کی جگہ بنائیں جو پہلے سے ہی اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ لڑ رہا ہے اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا مقصود تو ایک بھلائی تھی۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں چند منافقین تھے جو برابر اللہ کے رسول کو اور مومنوں کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے اور اندرونی طور پر سازشوں کا ایک جال بچھانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ انہی کوششوں میں سے ایک کوشش یہ بھی تھی کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنائی جائے۔ بظاہر نماز بھی پڑھی جائے تاکہ مسلمانوں کو اس طرف ہونے والی کارروائیوں پر گمان بھی نہ ہو اور وہ خفیہ طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیں۔ چنانچہ ابو عامر والد حضرت حنظلہ جن کا لقب غسیل ملائکہ ہے جو نصرانی تھا اسکی شہ پر منافقوں نے ایک مسجد، مسجد قبا کے مقابلے میں بنائی جس کا مقصد قرآن کے الفاظ میں (۱) اسلامی کاز کو نقصان پہنچانا (۲) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کافروں کے جمع ہونے اور آپس میں مشورے کرنے کا ایک مقام بنانا (۳) مسجد نبوی اور مسجد قبا کے مصلیوں کی تعداد کم کرنا (۴) اور اس مسجد میں آنے والے مصلیوں میں پھوٹ ڈالتے ہوئے نفاق کا بیج بونا تھا۔

ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے اس مسجد کا افتتاح کرنے کی درخواست بھی کی۔ آپ اس وقت غزوۂ تبوک کیلئے رخت سفر باندھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ ابھی تو سفر درپیش ہے۔ واپسی پر یہ کام انجام دے سکوں گا۔ لیکن اللہ نے آپ کو اس "مکان" کی حقیقت سے مطلع فرما دیا۔ اور آپ کو حکم دیا لاتقم فیه ابدا۔ اے رسول اس مسجد میں کبھی کھڑے بھی نہ ہونا۔ اللہ کے رسولؐ نے اس کے بعد دو صحابہ کو بھیج کر اس مکان کو آگ لگوا دی اور جو کچھ بچا تھا اسکو منہدم کروا دیا۔ اللہ تعالیٰ اس جگہ کو جسے منافقین نے مسجد کا نام دیا تھا۔ مسجد ضرار کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اللہ نے اس مسجد کے مقابلے میں جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا، مسجد قبا کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ﴿التوبة:۱۰۸﴾ ترجمہ: البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس قابل ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مسجد قبا کی تعریف تو اللہ نے فرمائی تھی۔ مزید بر اں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے فرمایا اس مسجد میں نماز پڑھنا عمرہ کرنے کے برابر ہے۔

مباہلہ

عیسائی رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ سے اس بات پر جھگڑتے تھے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے قرآنی آیت کے تحت یہ فرمایا کہ عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے نہیں بلکہ بندے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ بندے نہیں ہیں۔ جب اس سے انکار کیا گیا تو انہوں نے پوچھا کہ بتاؤ کہ عیسیٰؑ کے باپ کون ہیں؟ جواب میں کہا گیا آدمؑ کو نہ ماں تھی اور نہ باپ۔ اسکے باوجود وہ وجود میں آگئے (عیسیٰؑ) کے تو صرف باپ نہیں تھے۔ آدم کے وجود کو بندے کی حیثیت سے مانتے ہو تو عیسیٰؑ کو کیوں بندہ نہیں مانتے۔ اگر محض باپ نہ ہونے کی وجہ سے عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہو تو یہ صورت تو بدرجہ اولیٰ آدمؑ میں پائی جاتی ہے کہ ان کو نہ ماں تھی نہ باپ، پھر آدمؑ کو خدا کا بیٹا کیوں نہیں مانتے۔ اور جب عیسائیوں نے عیسیٰؑ سے متعلق قرآن کے بیان کو تسلیم نہیں کیا تو آنحضرتؐ نے قرآن کے حکم سے ان کو "مباہلہ" کی دعوت دی تاکہ قطعی فیصلہ ہو جائے۔

مباہلہ کے معنی یہ ہیں کہ طرفین اپنی اپنی ذات اور اپنے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایک مقام پر جمع ہو جائیں اور اللہ سے دعا کریں کہ ہم میں جو جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے بہ نفس نفیس خود، فاطمہؓ، علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ کے ساتھ مقررہ وقت پر متعین جگہ تشریف لائے مگر عیسائیوں میں جو دانش مند تھے انہوں نے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ اور آپ کے ساتھ جو نورانی چہرے تھے ان کو ملاحظہ کرتے ہوئے۔ منھ پھیر لئے اور یہ مشورہ دیا کہ یہ نورانی چہرے ایسے ہیں کہ اگر یہ دعا کریں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ جزیہ دے کر صلح کر لو۔ حضور نے بعد میں فرمایا اگر یہ لوگ مقابلے پر آتے تو پوری وادی آگ بن کر ان پر برستی اور ایک بھی زندہ نہ رہتا۔ (نورِ ایمان صفحہ ۷۸)۔

اسی واقعہ کو قرآن میں اللہ نے اس طرح بیان فرمایا۔ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿آل عمران:٦١﴾ ترجمہ: پھر بھی یہ لوگ عیسیٰؑ کے بارے میں آپ سے جھگڑا کریں حالانکہ آپ کے پاس یقینی علم تو آچکا ہے تو آپ ان سے کہئے کہ ہم اپنے بیٹوں اور اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں اور ہم خود بھی آتے ہیں تم بھی اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور خود بھی آجاؤ ہم دونوں فریق مل کر خدا سے دعا کریں۔ "جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو"

منکرین حدیث

اسلام میں جہاں مختلف طبقے یا فرقے ہیں ان میں ایک فرقہ اپنے آپ کو ''اہل قرآن'' کہتا ہے۔

اس کا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی آخری آسمانی الہامی کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ اس سے ماقبل کی تمام الہامی کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ پس ہر مسلمان کو چاہیئے کہ اسی کتاب کے احکام کو مانیں اور ان ہی کی تعمیل کریں۔

یہی نہیں بلکہ ان کے پاس ''قرآن ہی حجت'' ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز حجت نہیں۔ حتیٰ کہ رسول مقبول ﷺ کا قول اور فعل بھی نہ حجّت ہے اور نہ واجب الاتباع ہے۔ اسی بناء پر یہ فرقہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا ہے۔ مگر اس سے یہ بات بھی بدیہی طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ یہ فرقہ حقیقت میں ''منکر حدیث'' ہے اس اعتبار سے کہ یہ لوگ حدیث کی حجیت کے منکر ہیں۔ تاریخی اعتبار سے رسول کو بھی مانتے ہیں اور حدیث کو بھی، لیکن جہاں تک مقام، مرتبہ اور حیثیت کا سوال آتا ہے تو ان لوگوں کا اعتقاد عام مسلمانوں کے اعتقاد سے الگ اور جداگانہ ہے۔

جہاں تک قرآن شریف کا تعلق ہے عام مسلمان بھی یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے جبرئیلؑ کے ذریعہ حضور نبی کریم محمد مصطفی ﷺ پر نجماً نجماً ۲۳ سال کی مدت میں نازل فرمایا۔

اور حضور نے ہی وحی کے الفاظ کو سنایا اور لکھوایا۔ اللہ تعالیٰ نے اسکی حفاظت کا وعدہ '' وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿یوسف: ۱۲﴾ '' کے ذریعہ فرمایا۔ اور اسی وعدہ الٰہی کے مطابق آج تک اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے اور قیامت تک بھی اسی طرح محفوظ رہے گا۔ اور یہ بھی امر ثابت ہے کہ حضور نے قرآن کے احکام پر عمل بھی فرمایا۔ عمل کے طریقے بھی بتائے اور مشکل الفاظ کے معنی سے بھی باخبر فرمایا۔ اللہ نے فرمایا أَقِيمُوا الصَّـــلَاةَ ۔ سب نے سن لیا۔ مگر نماز کیسے قائم کی جانی چاہیئے۔ اسکی تفصیل ہم کو حضور کے ذریعہ ہی معلوم ہوئی۔ آتُوا الزَّكَاةَ اللہ نے فرمایا۔ مگر زکوۃ کس پر کتنی کب اور کس کو دینی چاہیئے اس کا تفصیلی علم حضور کے ذریعہ ہی معلوم ہوا ہے۔ اسی طرح روزہ اور حج کے مسائل کی تفصیلات کا علم بھی حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے ہی ہوا ہے۔ اب اگر قرآن لے لینے کے بعد یہ کہیں کہ اللہ نے آپکو مبعوث اس لئے کیا تھا کہ آپ کے ذریعہ قرآن ہم تک پہنچادے۔ اور وہ کام آپ کے ذریعہ پورا ہو گیا۔ اور بس، ہم کو اب آپ کی ضرورت نہیں تو ایسا اعتقاد حضور کی شان اقدس میں زبردست گستاخی کا مستوجب ہے اس اعتقاد سے حضور کے مقام، منصب اور آپ کی عظیم الشان حیثیت کا بدیہی انکار آشکار ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس حضور کی حیثیت محض ایک Messenger پیغام پہنچانے والے یا فقط ایک Postman ڈاکیہ کی ہے۔

کیا آنحضرت ﷺ کا اللہ کے پاس یہی مقام تھا۔ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ" ﴿النحل:۴۴﴾ تاکہ تو لوگوں کو قرآنی تعلیمات کھول کھول کر بیان کرے اور کیا رسول اللہؐ نے قرآن کی ایک ایک آیت پر جس کا تعلق عمل سے تھا، خود عمل کر کے نہیں بتایا اور لوگوں کو ہدایت نہیں دی۔ پس یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کا مقصد ہی "محمد" کو رسولؐ بنا کر دنیا میں بھیجنے کا یہی تھا کہ حضور لوگوں کو ایک تو اللہ کا پیغام بھی سنائیں اور دوسرا یہ کہ اسکی شرح زبانی بھی کریں اور عملی بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اشهد ان لا اله الا الله کے بعد اشهد انَّ محمداً رسول الله کو بھی کلمہ طیبہ کا جزو بنایا گیا۔

جب کلمہ کے پہلے جزء "لا اله الا الله" کو مان لیں تو کیا صرف یہ اقرار کافی ہے۔ یا اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے احکام کی اتباع کو بھی فرض جانیں۔ لیکن اگر کسی نے اللہ کی ذات کو تو مان لیا لیکن اسکی بات کو نہیں مانا تو اسکو "ابلیس" کے سوا اور کس نام سے پکارا جائے گا۔ آخر ابلیس کا عمل یا قصور بھی تو یہی تھا کہ اس نے اللہ کو مانا۔ ہزاروں برس اسکو سجدے کئے۔ لیکن جب اس نے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس نے اس کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یہاں بحث یہ نہیں ہے کہ اس نے کیوں انکار کیا؟ بحث یہی ہے کہ اس نے اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا، گویا اس نے ذات کو تو مانا لیکن بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہی ہوا کہ وہ ہمیشہ کیلئے مردود اور ملعون ہو گیا۔ اسی طرح جب کلمہ کا دوسرا جزء " اشهد انَّ محمداً رسول الله" کہتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس بات کی میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور اسی شہادت کے ضمن بھی کیا یہ بات بھی لازمی نہیں ہو جاتی کہ جسطرح ذات کو مانتے ہیں اسی طرح آپ کی بات کو بھی مانیں۔ شیطان تو اتنا مؤحّد تھا کہ وہ اپنے ناقص خیال میں اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ شیطان کو اللہ کی ربوبیت سے انکار نہیں تھا چنانچہ اس نے کہا رَبِّي۔ اے میرے پروردگار۔ شیطان کو قیامت کے دن سے انکار نہیں تھا چنانچہ اس نے کہا رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿الحجر:۳۶﴾، اے میرے رب مجھے قیامت کے دن تک کی مہلت دے۔ لیکن اس کا قصور کیا تھا کہ اسکو یہ سزا سنائی گئی۔ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿الحجر:۳۴﴾۔ یہاں سے نکل جا۔ تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت ہے۔ اس کا قصور یہی تھا کہ اس نے اللہ کی ذات کو مانا مگر اس کی بات کو نہیں مانا۔ اسی طرح جو لوگ حضور کو تو نبی اور رسول مانتے ہیں لیکن آپ کی بات "حدیث" کو نہیں مانتے تو ان کا حشر کیا ہو گا؟ محتاج بیان نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے پہلے ہی سے ایسے طبقے کے بارے میں پیشین گوئی فرما دی ہے چنانچہ حضرت مقداد بن معدی کربؓ سے روایت آئی ہے۔ الا انِّي اوتيتُ القرآن و مثله معه، الا يوشك رجلٌ شبعان على اريكته يقول عليك بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فاحلّوه وما وجدتم فيه من حرام فحرّموه، إنّ ما حرّم رسول الله ﷺ كما حرّم الله (مشکوٰۃ) اسی طرح حضرت عرباض بن ساریہؓ سے اسطرح مروی ہے أَ يحسبُ احدكم مُتّكئاً على اَريكته،

یظنّ ان اللہ لم یُحرّم شیئا إِلّا مافي ھذا القرآن- اَلَا إِنّي واللہِ قد اَمَرْتُ و وعظتُ و نَھَیْتُ عن اشیاء- انّھا لَمثل القرآن او اکثر(مشکوٰۃ) آگاہ ہو جاؤ۔ میں قرآن کریم دیا گیا ہوں اور اس کے مانند (بھی) اس کے ساتھ دیا گیا ہوں سنو۔ ایک پیٹ بھرا آدمی اپنے تخت پر بیٹھا یہ کہے گا کہ تم یہ قرآن مضبوط پکڑو۔ جو اس میں حلال ہے اسکو حلال سمجھو۔ اور جو اس میں حرام ہے اسکو حرام سمجھ۔و، حالانکہ جو چیزیں اللہ کے رسول نے حرام کی ہیں وہ بھی ایسی ہی حرام ہیں جیسی کہ اللہ نے حرام کی ہیں۔ کیا تم میں سے ایک شخص اپنے تخت پر ٹیک لگائے یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ نے بس وہی چیزیں حرام کی ہیں جو اس قرآن میں ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ خدا کی قسم میں نے بھی احکام دئے ہیں اور نصیحتیں کی ہیں اور بہت سی باتوں سے منع کیا ہے۔ بے شک کہ وہ قرآن کے بقدر ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔

بطور حجت ہم نے یہاں دو حدیثیں درج کی ہیں ورنہ کئی مثالیں حضور کی سیرت سے ایسی ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی واجب العمل ہے اور خود اللہ نے بھی حضور کے بیان کردہ احکام کو قبول کرنے اور منع کردہ باتوں سے باز رہنے کا قرآن شریف میں ہی حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا﴿الحشر:۷﴾۔ ترجمہ: رسول نے تم کو جو دیا اسکو لے لو اور وہ جس سے منع کرے اس سے باز آجاؤ۔

نیز یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن تشریف جو اللہ کے احکام پر مشتمل ہے وہ "آئیڈیا" ہے کہ کن اصول پر زندگی گذارنی چاہئیے۔ اور حضور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم "Ideal" ہیں یعنی نمونہ ہیں۔ پس نہ "Idea" کو نظر انداز کرسکتے ہیں اور نہ "Ideal" سے صرف نظر کرسکتے ہیں۔ چنانچہ امامنا حضرت مہدیؑ سے جب علماء نے پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے تو آپ نے جواب دیا۔

"مذہب ماکتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ" مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو لوگ حدیثوں کو مانتے ہیں ان کا رویہ بھی یہ ہے کہ ہم جب احادیث سے ثابت شدہ امور کو پیش کرتے ہیں تو وہ "اہل قرآن" کی اتباع میں کہتے ہیں کہ بھائی قرآن سے ثابت کرو تو ہم ماننے کیلئے تیار ہیں۔ رہی بات احادیث کی تو اسکی کئی قسمیں ہیں۔۔۔۔ اور قرآن کی بات ہی اور ہے۔ چنانچہ مہدی موعودؑ کے تعلق سے لوگ یہی کہتے ہیں کہ قرآن سے ثابت کرو۔ یا قرآن میں "مہدی کا نام بتلاؤ" تو ماننے کیلئے تیار ہیں۔ رہی احادیث تو وہ امر قطعی نہیں ہے اس میں بہت سے اختلافات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ابن خلدون نے بھی اسی نظریہ کو اپنایا اور چونکہ وہ فاطمیین کا دشمن تھا اسی لئے اس نے اپنے مقدمہ میں ایک عجیب تصور پیش کیا کہ احادیث میں تو مہدی کا ذکر ہے۔ لیکن بخاری و مسلم میں نہیں ہے۔ اور جب صحیحین میں نہیں ہے۔ اور باقی دیگر کتب احادیث میں ہے تو وہ کتابیں ان دو کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتیں۔

خلاصہ یہ کہ لوگ انکار کرنے کے لئے احادیث کو یا احادیث کی کتابوں کو ڈھال بنالینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ حالانکہ امت مسلمہ کا ایک بڑا حصّہ صرف احادیث کی بنیاد پر بہت سی باتوں پر عمل کرتا ہے اور وہ ایسی باتیں ہیں جن کا قرآن میں کوئی ذکر بھی نہیں ہے۔ چنانچہ مردوں کیلئے سونا حرام ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے صرف احادیث میں ممانعت آئی ہے۔ مردوں کیلئے ریشم کے کپڑوں کا استعمال ممنوع ہے۔ قرآن میں یہ حکم نہیں ہے صرف احادیث سے ممانعت آئی ہے۔ حق شفعہ کا حکم احادیث سے ثابت ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ألأئمة من قريش، حدیث سے ثابت ہے جسے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین کے مجمع میں پیش فرمایا۔ اور سب نے اسکو قبول بھی کرلیا اور اسپر عمل بھی ہوا۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ قرآن سے ثابت کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح، قرآن کے ساتھ، آنحضرت ﷺ کا قول و عمل بھی حجت ہے۔ اسی لئے اللہ نے قرآن میں واضح الفاظ میں فرمایا۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّـــهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ﴿الأحزاب:٣٦﴾۔ ترجمہ: جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں تو کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں رہتا (سوائے اس کے کہ اسکو تسلیم کریں، اور اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی بھی محسوس نہ کریں)

منکر نکیر

منکر نکیر دو فرشتوں کے نام ہیں۔ منکر نکیر کے معنی ہیں انجان اور ناواقف لوگ۔ چونکہ ان کی شکل و صورت نہ آدمیوں کے مشابہ ہوتی ہے نہ فرشتوں کے اور نہ دنیا کی کسی جاندار چیز کے۔ اسلئے ان کو منکر نکیر کہتے ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ دنیا کی زندگی میں کوئی انہیں نہیں دیکھتا اور قبر میں بھی پہلی مرتبہ ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے رسول اللہؐ سے دریافت فرمایا یا رسول اللہ ﷺ یہ منکر نکیر کون ہیں آپ نے جواب دیا۔ یہ دونوں "فتّان قبر" ہیں یعنی قبر میں (ایمان کا) امتحان لینے والے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اسکے پاس دو فرشتے آتے ہیں جنکی آنکھیں نیلگوں ہوتی ہیں اور آواز خوفناک اور دانت ایسے ہوتے ہیں جیسے بیل کے سینگ۔ اور ان کے سانس کے ساتھ آگ کے شعلے نکلتے ہیں ان فرشتوں کے دونوں مونڈھوں کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا ہے یہ فرشتے مومنوں کے سوا کسی پر رحم نہیں کرتے۔ ان کے ہاتھ میں ایک (گرز) ہتھوڑا ہوتا ہے جو اتنا وزنی ہوتا ہے کہ اگر تمام جن و انس مل کر بھی اسکو اُٹھانا چاہیں تو اُٹھا نہیں سکتے۔ یہ دونوں میت کو اُٹھا کر بٹھاتے ہیں اور میت سے سوال کرتے ہیں۔ اسکا بیان آچکا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام

مصر میں قبطی بھی آباد تھے جو فرعون کی قوم تھی اور سبطی بھی جو بنی اسرائیل کہلاتے تھے۔ لیکن فرعون نے اپنے ظلم وستم سے بنی اسرائیل کو کچل کرر کھ دیا تھا اور ان کو ان کے جائز حقوق دے کر ابھرنے کا بھی موقع نہیں دیتا تھا۔ گویا قبطی آقا بنے ہوئے تھے اور سبطی یعنی موسیٰ کی قوم غلام۔ سبطیوں سے ذلیل کام لئے جاتے تھے اور ان سے بیگار بھی لیا جاتا تھا۔ حالانکہ سبطی پیغمبروں کی اولاد میں سے تھے لیکن ان کی ملک میں نہ کوئی عزت تھی اور نہ وقعت۔ کہتے ہیں کہ فرعون نے ایک خواب دیکھا جسکی تعبیر کاہنوں نے یہ دی کہ کسی اسرائیل کے ہاتھ سے تیری سلطنت برباد ہو جائے گی اس نے پیش بندی کے طور پر یہ ظالمانہ تدبیر سوچی کہ بنو اسرائیل کو اس قدر ذلیل اور کمزور کرنا چاہیئے کہ ان کو حکومت کا مقابلہ کرنے اور اپنا جائز حق مانگنے کا حوصلہ ہی نہ ہو اور آئندہ جو لڑکے ان کے ہاں پیدا ہوں ان کو ذبح کر ڈالنا چاہیئے۔ اس طرح آئندہ کی مصیبت سے ہم بچ جائیں گے۔ البتہ لڑکیوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہیں زندہ رہنے دیا جائے وہ بڑی ہو کر باندیوں کی طرح ہماری خدمت کریں گی۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل آپس میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ایک پیش گوئی کا ذکر بھی کرتے تھے جس میں یہ خبر دی گئی تھی کہ ایک اسرائیلی نوجوان کے ہاتھ پر سلطنت مصر کی تباہی مقدر ہے یہ تذکرے شدہ شدہ فرعون کے کانوں تک بھی پہنچ گئے تو اس بیوقوف نے اللہ کی جانب سے جو فیصلے (قضاء وقدر کے) ہو چکے تھے، ان کی روک تھام کے لئے ظلم وستم کی یہ راہ نکالی تھی ادھر فرعون یہ مذموم حرکتیں کر رہا تھا اُدھر اللہ کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ کمزوروں اور مظلموں کی مدد کی جائے۔ جس قوم کو فرعونیوں نے ذلیل اور غلام بنا رکھا تھا ان ہی کے سروں پر دین کی امامت اور دنیا کی سرداری کا تاج رکھ دیں۔ اس سلسلے میں ھامان ایک شخص تھا جو فرعون کا وزیر بد تدبیر تھا اور جو ظلم وستم ڈھانے میں فرعون کا شریک وسہیم تھا۔ فرعون جس خطرہ کے پیش نظر بنی اسرائیل کے ہزاروں لاکھوں بچوں کو ذبح کر واڈالا تھا۔ اللہ نے چاہا کہ اسی خطرہ کو ان کے سامنے لائے۔ فرعون نے ایسے پورے انتظامات کر لئے تھے کہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک لڑکا بھی زندہ نہ رہے۔ جاسوسی نظام اتنا مکمل تھا کہ لڑکے کی ولادت کی خبر کے ساتھ حکومت کی پوری مشنیری حرکت میں آتی اور اس بچے کو ختم کر دیا جاتا۔ لیکن اللہ جسے رکھے اُسے کون چکھے کے مصداق آخر کار وہ بچہ فرعون کے محل میں پیدا ہوا۔ فرعون کے گھر میں۔ فرعون کے بستر پر فرعون کی گود میں اسکی نشو نما کرائی۔ چنانچہ بچہ جب پیدا ہو تو موسیٰؑ کی والدہ کو خوف ہوا کہ کہیں وہ لوگ اس بچے کو ذبح نہ کر ڈالیں تو اللہ نے ان کی والدہ کی طرف وحی کی (خفیہ پیغام بھیجا) کہ جب تک ذبح کا خوف نہ ہو تو دودھ پلاتے رہنا اور جب اندیشہ بڑھ جائے تو بچے کو صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریا میں ڈال دو۔ (دریا کی ایک شاخ فرعون کے باغ میں سے گذرتی تھی۔ پس وہ صندوق اس میں سے ہو کر کنارے جالگا۔ جیسا کہ اللہ کی حکمت تھی ویسا ہی ہوا) اس صندوق کو مع بچہ میرا اور اس کا دشمن اُٹھالیگا۔ پھر اللہ نے اس وقت کی

مخلوق کے دل میں موسیٰؑ کی محبت ڈال دی کہ جو دیکھے وہ پیار کرے۔

فرعون کے گھر والوں نے اس صندوق کو اٹھالیا پھر کھول کر دیکھا تو ایک خوبصورت بچہ تھا۔ فرعون کی بیوی نے کہا یہ کیسا پیارا بچہ ہے۔ ہمارے کوئی لڑکا بھی نہیں ہے۔ چلو اس سے ہم اپنا دل ٹھنڈا کر لیں گے تو فرعون نے کہا جیسا کہ روایت آئی ہے لک لالی (تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو گی۔ میری نہیں) یہ تقدیر ازلی کے الفاظ تھے جو اس ملعون کی زبان سے نکل رہے تھے۔ آخر وہی ہوا۔ فرعون کی بیوی نے یہ بھی کہا کہ اسکو مت قتل کرو۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ بچہ ہمارے کام آئے یا ہم اسکو اپنا بیٹا بنا لیں ادھر موسیٰ کی والدہ نے حسب وحی الٰہی بچہ کو تو دریا میں ڈال دیا مگر ماں کی ممتا کو چین کہاں؟ اُسے رہ رہ کر موسیٰ کا خیال آتا تھا، دل کا قرار اُٹھ گیا۔ ہر سانس میں بچہ کا خیال۔ قریب تھا کہ صبر وضبط کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور عام طور پر ظاہر کر دیں کہ ہاں میں نے بچہ جنا تھا اور اُسے میں نے دریا میں ڈال دیا اگر کسی کو اسکی خبر ملے تو کہو۔ لیکن اللہ کا وعدہ بھی یاد آجاتا کہ اللہ نے کہا تھا "ہم اسکو تیری طرف لوٹائیں گے ہم اسکو پیغمبر بنائیں گے۔ تو ہر گز غمگین نہ ہو۔ تو موسیٰ کی والدہ کے دل کو کچھ قرار آگیا۔ جب بچہ محل پہنچ گیا اور شہرت بھی ہو گئی تو موسیٰ کی والدہ نے اپنی بیٹی کو (جو موسیٰ کی بہن تھی) حکم دیا کہ تو بچے کے حالات کا پتہ لگانے کیلئے چلی جا اور علیحدہ رہ کر اجنبی کی طرح دیکھ کہ وہاں کا ماجرا کیا ہے۔ لڑکی ہوشیار تھی جب بچے کے گرد دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی تو وہ وہاں جا کر اجنبی کی طرح دور سے دیکھتی رہی کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ اس بچہ کی بہن ہے۔

فرعون کی بیوی نے فرعون کو تو بچّہ کو محل میں رکھنے اور اسکی پرورش پر راضی کر لیا لیکن دودھ پلانے کی فکر ہوئی۔ دائیاں طلب کی گئیں۔ فرعون کے آدمی اسی فکر اور تجسّس میں تھے۔ دائیاں بھی لائی گئیں لیکن موسیٰؑ نے کسی کا دودھ پینے سے انکار کر دیا کیوں کہ اللہ کا فیصلہ بھی انکے حق میں یہی تھا۔ اب تو گھر والوں کی فکر اور بڑھ گئی ایسے میں موسیٰ کی بہن نے کہا آپ کہو تو میں ایک ایسے گھر کا پتہ بتاتی ہوں جو امید ہے کہ وہ بچہ کو پال لینگے اور وہ گھرانا بھی شریف ہے اور وہ بچہ کی خیر خواہی کے ساتھ پرورش کریں گے۔ پس موسیٰ کی والدہ کو طلب کیا گیا۔ وہ آئیں اور بچہ کو چھاتی سے لگانا تھا کہ بچہ دودھ پینے لگ گیا۔ دودھ پلانے والی نے ضد کی کہ میں صبح و شام میں یہاں آکر دودھ نہیں پلاسکتی (کیوں کہ میری بھی ذمہ داریاں ہیں) ہاں ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے گھر لے جا کر اسکی پرورش کروں گی۔ اسطرح موسیٰؑ امن و اطمینان کے ساتھ آغوش مادر میں پہنچ گئے۔

پھر جب موسیٰؑ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچے تو اللہ نے ان کو بہت سی حکمت کی باتیں سمجھائیں اور خصوصی علم و فہم بھی عطا فرمایا۔ ایک دن جب آپ شہر میں پہنچے تو رات کا وقت تھا اور لوگ بے خبر سو رہے تھے کہ آپنے دیکھا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں ان میں سے ایک قبطی تھا اور دوسرا اسرائیلی۔ اسرائیلی نے آپ سے کہا کہ مجھے اس کے ظلم و ستم سے بچاؤ، غالباً موسیٰؑ

ان کے درمیان میں صلح وصفائی کردینے کی نیت سے آگے بڑھے اور قبطی سے کچھ کہا تو قبطی نے بھی آپ کو بھی برا بھلا کہا، تو موسیٰ نے اس قبطی کو ایک گھونسہ دیا جوانی، غصہ اس کافر کا ظلم، اور اپنے قوم کے آدمی کی فریاد ان سب باتوں کا اثر ایسا ہوا کہ ایک ہی گھونسے میں اس شخص نے دم توڑ دیا۔

حالانکہ آپ کا مقصد جان سے مارنا نہیں تھا۔ یا تو وہ ضرب موسوی تھی یا وہ شخص اتنا بودا تھا کہ ایک ہی مکے میں زمین بوس ہو گیا۔ موسیٰ کو احساس ہو گیا کہ ارادہ تو صرف گوشمالی اور معاملہ کو ٹھنڈا کرنے کا تھا مگر یہاں تو قتل ہو گیا۔ اگرچہ ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ ہوا کہ کہیں بات بڑھ کر فرقہ وارنہ رنگ اختیار نہ کرلے۔ ان دونوں باتوں کے پیش نظر آپ نے فرمایا کہ یہ ایک شیطانی عمل تھا۔ اس وقت شیطان ہی نے درمیان میں آکر اپنی دشمنی مجھ سے نکالی ہے۔ فوراً اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور اللہ سے مغفرت طلب کی۔ اللہ نے آپ کو بخش بھی دیا۔ صبح ڈرتے ڈرتے اُٹھے اور اس بات کا بھی انتظار تھا کہ دیکھو کل کے حالات کا آج کیا اثر ہوتا ہے، آپ نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل آپ سے مدد مانگ رہا تھا آج کسی دوسرے سے لڑ رہا ہے۔ اور آپ سے مدد مانگ رہا ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا تو صریحاً بے راہ (اور جھگڑالو) ہے۔ پھر جب آپ اس شخص پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اس نے کہا اے موسیٰ یہ کیا تو آج مجھے بھی مار دینا چاہتا ہے جس طرح کہ کل ایک قتل کر چکا ہے۔ کیا تجھے داداگری کرتے ہوئے قتل کرنا ہی آتا ہے۔ سمجھا بجھا کر آپس میں صلح وصفائی کرنا نہیں آتا۔ بات پھیل گئی۔ مقتول کے ورثاء فرعون کے دربار میں پہنچ گئے۔ حقیقت حال سنائی۔ درباریوں میں مشورہ ہوا کہ غیر قوم کے آدمی کی آج یہ ہمت ہو گئی کہ شاہی قوم کے افراد کو قتل کر ڈالے سپاہی دوڑائے گئے کہ موسیٰ کو گرفتار کرلیں اور ہاتھ لگ جائیں تو قتل بھی کر دیں۔ اللہ نے اس مجمع میں کے ایک نیک دل آدمی کے دل میں موسیٰ کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا کر دیا وہ حالات کی سنگینی کو بھانپ گیا اور فوراً اندر کے راستے سے بھاگتا ہوا آکر موسیٰؑ کو مشورہ دیا کہ فوراً یہ مقام خالی کر دیں ورنہ انجام اچھا نہ ہو گا۔ حضرت موسیٰؑ فوراً مصر سے نکل تو گئے لیکن راستوں سے واقف نہیں تھے۔ خدا سے دُعا کی کہ صحیح راستہ بتادے۔ اللہ نے مدین کے راستے پر ڈال دیا۔ چنانچہ بخیرو خوبی مدین پہنچ گئے۔

مدین: مصر سے آٹھ دس دن کی مسافت پر ہے۔ وہاں گئے تو دیکھا کہ ایک کنویں پر لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں اور دو عورتیں (لڑکیاں) اپنی بکریوں کو لئے دور کھڑی ہوئی ہیں۔ ان میں نہ اتنی ہمت تھی کہ مجمع کو ہٹا کر اپنی بکریوں کو پانی پلائیں نہ طاقت کہ ایک بڑا ڈول پانی کھینچ لیتیں۔ پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا کہ جب تک یہ لوگ واپس نہیں جاتے ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں اور ہم کو یہاں اس لئے آنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے والد تو ہیں لیکن وہ بوڑھے ہیں۔ کمزوروں کی

مدد کرنے کا جذبہ بیدار ہو گیا فوراً کنویں پر گئے اور بڑے ڈول سے پانی کھینچ کر ان کی بکریوں کو پانی پلایا اور پھر ایک سائے میں جا کر بیٹھ گئے۔ لڑکیاں جب خلاف توقع اور خلاف عادت اپنے گھر جلد پہنچیں اور اپنے والد ماجد سے (حضرت شعیبؑ سے) سارا احوال کہہ سنایا۔ والد نے کہا جا کر اس کو بلالاؤ۔ ایک لڑکی شرم وحیا کے ساتھ آپ کے پاس آئی اور کہا کہ والد آپ کو بلارہے ہیں تاکہ آپ نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا معاوضہ دیں۔ قصہ مختصر جب آپ شعیبؑ کے پاس گئے اور شروع سے پورا قصہ سنایا تو پہلے شعیبؑ نے فرمایا اب آپ کو یہاں کوئی خوف نہیں ہے۔ اس ظالم کی سرحد سے مدین باہر ہے۔ آپ یہاں اطمینان سے رہ سکتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہا کہ آپ اس کو نوکر رکھ لیجئے کیوں کہ نوکر میں جو دو باتیں ہونی چاہئیں وہ اس شخص میں ہیں ایک طاقت و قوت اور دوسرا امانت داری۔

حضرت شعیبؑ نے موسیٰ کی حالت اور اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ تمہارا نکاح کر دیتا ہوں اس شرط پر (جو کہ مہر ہے) کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو۔ اور اگر دس برس میری خدمت کرو گے تو تمہارا احسان۔ اور میں تم کو مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ تم میرے پاس رہو گے تو تم کو خود تجربہ ہو جائے گا کہ میں بری یا سخت طبیعت کا آدمی نہیں ہوں بلکہ تم مجھے نیک بختوں میں پاؤ گے۔ موسیٰؑ نے کہا بس معاہدہ طے پا چکا۔ دونوں مدّتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کروں وہ میرا اختیار ہے اور اس معاہدہ پر اللہ گواہ ہے۔

اور جب موسیٰؑ نے اپنی مدت پوری کر دی اور گھر والوں کو لیکر چلے تو طور کی جانب سے آگ دیکھی تو آپ نے گھر والی سے کہا تم (یہیں) ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دیتی ہے شاید وہاں سے میں راستہ کا پتہ معلوم کرلوں یا آگ کا انگارہ لے آؤں تاکہ تم سینک لو۔ پس جب آگ کے پاس پہنچے تو میدان کے دائیں کنارے سے ایک مبارک جگہ میں ایک درخت سے آواز آئی اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں پروردگار عالم۔ اور یہ کہ اپنی لاٹھی ڈال دو۔ جب دیکھا کہ وہ حرکت کر رہی ہے گویا کہ وہ سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر چل دئے اور مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آواز آئی اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت۔ تم کو کوئی خطرہ نہیں، اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو تو بغیر کسی عیب کے سفید نکل آئے گا۔ اور خوف دور ہونے کی خاطر اپنے بازو اپنی طرف سکیڑ لو۔ پس یہ دو دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے ان کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جاؤ کیوں کہ وہ نافرمان قوم ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب میں نے ان میں کے ایک شخص کو مار دیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ بھی مجھے قتل کر دیں گے۔ اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے اس کو میرے ساتھ میرا مددگار بنا کر بھیج تاکہ وہ میری تصدیق کرے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اللہ نے فرمایا ہم تمہارے بھائی کے ذریعہ تمہارے بازو مضبوط کریں گے تم دونوں کو غلبہ عطا کریں

گے۔ ہماری ان نشانیوں کے سبب وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ اور تم دونوں اور جو تمہاری پیروی کریں گے وہ غالب رہیں گے۔ پس جب موسیٰؑ ان کے پاس اللہ کی نشانیاں لیکر آئے تو وہ کہنے لگے یہ تو صرف ایک جادو ہے جو گھڑا گیا ہے اور ہم نے ایسی باتیں ہمارے باپ دادا میں نہیں سنیں۔ موسیٰ نے کہا۔ میرا رب اسکو اچھی طرح جانتا ہے کہ جو اسکی طرف سے ہدایت لیکر آیا ہے اور جس کیلئے عاقبت کا گھر ہے۔ بے شک ظالموں کا کبھی بھلا نہیں ہو گا۔ فرعون نے کہا اے اہل دربار، میں اپنے سوا تمہارا اور کوئی خدا نہیں جانتا۔ تو اے ہامان تو بھٹی میں اینٹیں پکوا کر تیار کر پھر اس سے ایک اونچا محل بنا تاکہ میں اس پر چڑھ کر اس کے خدا کو جھانک کر ہی دیکھ لوں۔ کیوں کہ زمین پر تو کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے تو مجھے اسکی یہ بات بھی جھوٹی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ خدا ہوتا تو سب کو نظر آتا۔ اس کی یہ تمام باتیں خدا کو اور اپنے بُرے انجام کو بھول کر ہوئی تھیں اس کا انجام یہ ہوا کہ اللہ نے اسکو اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور دریا برد کر دیا۔

قرآن میں اللہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اللہ پر ایمان لایا۔ چنانچہ سورۂ یونس میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔ حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُالْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُ لَا إِلَـٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ﴿یونس ۹۰ تا ۹۲﴾ ترجمہ: یہاں تک کہ جب (فرعون) ڈوبنے لگا بولا۔ میں نے یقین کر لیا کہ بجز اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے کوئی معبود نہیں۔ اور میں فرمان برداروں میں ہوں (تو جواب دیا گیا) اب یہ کہتا ہے حالاں کہ تو پہلے انکار کرتا رہا۔ اور مفسد بنا رہا۔ تو آج ہم تیرے بدن کو بچا لیتے ہیں تاکہ تو بعد میں آنے والوں کیلئے نشان (عبرت) ہو۔

اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فرعون ایمان لایا تھا۔ بظاہر اسکی زبان سے اسلام اور ایمان کے الفاظ نکلے ہیں مگر کب؟ عذاب کو دیکھ لینے کے بعد اور روح کے نکلنے کے وقت۔ ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں کسی کا ایمان اللہ کے پاس مقبول نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ فرعون ایمان لایا اور اسکا ایمان قبول ہوا تو اللہ نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کی دعا کو قبول کر لئے جانے کی جو خبر دی تھی وہ غلط ہو جائے گی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بظاہر یعنی زبان سے مسلم ہو جانے کا اعتراف کیا تو اللہ نے بھی اس کے بدن کو نجات دی، اور اسکا بدن دریا کے باہر موجوں نے ڈال دیا اور وہ آج تک محفوظ ہے۔ تاکہ اللہ کے منکروں کو یہ منظر دیکھ کر عبرت نصیب ہو۔ اس سلسلے میں ترمذی میں ایک عجیب روایت آئی ہے کہ جبرئیلؑ نے آنحضرت ﷺ سے فرمایا کہ وہ فرعون کے منھ میں مٹی (کیچڑ) بھر رہے تھے اس اندیشہ سے کہ کہیں وہ لا إله إلّا الله نہ کہہ دے۔ جس کی وجہ سے اللہ اس پر رحم فرمادے۔ مگر وہ فرعون تھا مرتے وقت بھی وہ کہا تو یہ کہا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان

لائے ہیں یعنی اسکی زبان سے پھر بھی لا إلہ إلّا الله نہیں نکلا۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ نے فرعون اور اسکے جادو گروں اور موسیٰؑ کے درمیان جو مقابلہ ہوا اس کا ذکر اسطرح فرمایا ہے کہ جب موسیٰؑ نے اپنے معجزے بتاتے ہوئے فرعون کو توحید کی دعوت دی، بصورت انکار عذاب کی وعید سنائی اور بنی اسرائیل پر ظلم و ستم کرنے سے روکا تو اس نے کہا۔ 'کیا تو ہمارے پاس اس غرض سے آیا ہے کہ ہم کو جادو دکھا کر ہماری سرزمین سے ہم کو نکالدے تو ہم بھی تیرے مقابلے میں ایسا ہی ایک جادو لائیں گے۔ پس جس دن اور جس جگہ تو مقابلہ کرنا چاہے تجھے اس کا اختیار دیا جاتا ہے۔ ضرورت اسکی ہے کہ جو وقت مقرر ہو جائے فریقین میں سے کوئی اس سے گریز نہ کرے۔ میدان بھی وسیع اور صاف ہو۔ کسی کی روک ٹوک نہ ہو۔ تا کہ سب آسانی سے تماشہ دیکھ سکیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا بہتر ہے جس دن تمہارا بڑا میلہ اور جشن ہوتا ہے اس دن جب دن چڑھ جائے کھلے میدان میں مقابلہ ہو۔ کہتے ہیں کہ وہ دن فرعون کی سالگرہ کا تھا۔ یہ طے کرنے کے بعد فرعون اُٹھا اور ساحروں کو جمع کرنے اور مہم کو کامیاب کرنے کے انتظامات کرنے میں لگ گیا۔ شہروں میں کارندوں کو بھیجا تا کہ جس قدر جادو گر جمع ہو سکتے ہوں جمع ہو جائیں۔ وقت مقررہ پر مکمل تیاری کے ساتھ معین اور مقرر میدان میں حاضر ہو گیا۔ جادو گروں کی ایک بڑی فوج اسکے ساتھ تھی، جیت پر انعام و اکرام دینے اور مصاحبین میں شامل کر لینے کے وعدے بھی ہوئے۔ جب آمنا سامنا ہوا تو حضرت موسیٰؑ نے جادو گروں سے کہا کہ دیکھو تم حق کا مقابلہ جادو کے ذریعہ کرنے آئے ہو۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو حق کی نشانیوں اور معجزات کو جادو گری کہنا اور حق کے مقابلے میں آنا گویا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ جھوٹ باندھنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں پر کوئی آسمانی آفت آجائے اور ان کو ختم کر دے۔ موسیٰؑ کے وعظ نے ساحروں کی جماعت میں کھلبلی مچادی کہ اس شخص کی باتیں تو جادو گر کی باتیں نہیں معلوم ہوتیں اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن فرعون نے پھر موقع کو سنبھال لیا اور کہا اصل میں یہ شخص تم کو پرانے طور و طریقوں سے جو بہتر ہیں ہٹا دینا چاہتا ہے اور تمہارے کسب معاش کے جو ذرائع ہیں وہ بھی تم سے چھین لینا چاہتا ہے۔ آج کچھ سوچنا نہیں ہے، بلکہ تم سب مل کر اس پر اس طرح حملہ کرو کہ وہ بھاگ جائے اور میدان ہمارے ہاتھ رہے۔ موسیٰؑ نے بلا جھجک ان جادو گروں سے کہا کہ چلو یوں ہی سہی تم اپنے حوصلے دکھا دو اور جو کرتب تم جانتے ہو دکھا دو۔ پھر موسیٰؑ کو یوں معلوم ہونے لگا کہ گویا رسیاں اور لاٹھیاں سانپوں کی طرح دوڑ رہی ہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا وہ تو صرف نظر بندی تھی۔ لیکن موسیٰؑ نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا کہ کیا آج باطل سر چڑھ کر بولے گا۔ اور یہ لوگ کیا جادو اور معجزہ میں فرق کو محسوس کریں گے۔ لیکن اللہ نے ڈھارس دلائی اور فرمایا موسیٰ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں جو لاٹھی ہے اُسے زمین پر ڈال۔ انہوں نے جو کچھ بنایا ہے وہ سب کو تمہارا یہ عصا نگل جائے گا۔

چنانچہ ہوا بھی یہی کہ حکم خداوندی سے جیسے ہی موسیٰؑ نے اپنا عصا زمین پر ڈالا وہ اژدھا بن گیا اور پورے میدان میں جادوگروں کے جو سانپ کی شکل میں رسیاں اور لاٹھیاں تھیں وہ آن واحد میں سب کو نگل گیا۔ جادوگر اپنے فن میں ماہر تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ سحر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ سحر سے اوپر کوئی حقیقت ہے۔ کیوں کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ تو جادو تھا۔ لیکن موسیٰ نے جو کیا وہ بھی اگر جادو ہوتا تو سانپ نہ رہتے لیکن لکڑیاں اور رسیاں تو رہتیں۔ لیکن یہاں نہ لکڑی باقی ہے نہ رسی۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جادو نہیں ہے۔ یہ سمجھ میں آیا اور فوراً خدا کے معجزے پر ایمان لائے اور سجدے میں گر پڑے (طٰہٰ ۵۶ تا ۷۰﴾ نیز دیکھئے اعراف ﴿۱۰۳ تا ۱۲۲﴾

جب موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے سینا پہنچے تو اللہ نے توریت عطا کرنے کے لئے ۴۰ شبانہ روز کے وعدے سے طور پر بلایا۔ آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کے تقریباً ستر آدمی بھی تھے۔ اللہ نے کتاب عطا کی۔ اور موسیٰ سے اللہ نے کلام بھی فرمایا لیکن اجڈ قوم نے کہا کہ ہم آپ کی بات پر یقین نہیں کرتے جب تک کہ ہم اللہ کو علانیہ نہ دیکھ لیں اسی وقت ایک بجلی نے ان کو جلا دیا۔ پھر موسیٰؑ نے دعا کی تو اللہ نے ان کو زندگی بخشی ﴿سورہ بقرہ ۵۱، ۵۵﴾ ادھر موسیٰؑ طور پر پہنچے ادھر چند لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا اور اسکو سجدہ کرنا شروع کر دیا۔ مگر کچھ لوگوں نے سجدہ نہیں کیا تو توبہ کی یہ صورت بتائی کہ جنہوں نے سجدہ نہیں کیا وہ ان کو قتل کر دیں جنہوں نے سجدہ کیا(۵۴)۔ اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کیلئے پانی مانگا تو اللہ نے انکو حکم دیا کہ تم اپنا عصا پتھر پر مارو، موسیٰؑ نے حکم کی تعمیل کی تو بارہ چشمے پھوٹ پڑے قبیلے بھی بارہ تھے۔ ہر ایک نے ایک ایک گھاٹ لے لیا۔ اللہ نے فرمایا کھاؤ، پیو اللہ کا دیا ہوا رزق ہے مگر ملک میں فساد مت مچاؤ ﴿بقرہ ۶۰﴾۔

سورۂ اعراف میں آیت نمبر ۱۴۲ سے لیکر ۱۵۱ تک موسیٰؑ سے متعلق بہت سے مضامین آئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ اللہ نے موسیٰؑ کو پہلے تیس دن کے وعدہ پر طور پر بلایا تا کہ احکام الٰہیہ عطا فرمائے۔ پھر دس دن اور بڑھادئے۔ کہتے ہیں کہ تیس دن (۳۰) مکمل ہونے پر اللہ سے ہم کلام ہونے کی تیاری میں موسیٰؑ نے مسواک کیا۔ تو اللہ نے دس دن اور بڑھادئے اس لئے کہ روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔ موسیٰؑ نے طور کو جانے سے پہلے اپنے بھائی کو باقی بنی اسرائیل کے لئے اپنا جانشین بنایا اور تاکید کی کہ ان پر دھیان دینا اگر ان میں کوئی فساد پھیلانے کی کوشش کرے تو اس کا ساتھ نہ دینا۔

غرض جب آپ مقررہ وقت پر کوہ طور پر گئے اور اللہ نے آپ سے کلام فرمایا۔ ظاہر ہے کہ وہ کلام بے واسطہ ہی رہا ہوگا۔ یعنی اس کلام میں نہ حروف تھے نہ آواز موسیٰؑ کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ اللہ کا کلام سن رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰؑ نے اس کلام کو صرف کانوں سے نہیں سنا جیسا کہ عام طور پر عادت ہے بلکہ آپؑ نے اپنے جسم کے ہر بال سے سنا۔ جب کلام الٰہی کو

سنا تو اسکی مٹھاس نے اسکو دیکھنے کا شوق پیدا کر دیا تو بے ساختہ پکارا۔ اے رب مجھے دکھائی دے میں تجھے دیکھ لوں حکم ہوا کہ تو مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو تو مجھے دیکھ سکیگا۔ رؤیت باری تعالیٰ کے بارے میں عام طور پر چار مذاہب ہیں۔(۱) دیدار ممکن ہی نہیں (۲) دیدار عقلا ممکن ہے شرعاً ممتنع (۳) دنیا میں ممکن نہیں آخرت میں جائز ہے (۴) دنیا اور آخرت دونوں میں ممکن اور جائز ہے (اسکے شرطوں کے ساتھ) جو لوگ سرے سے دیدار کا انکار کرتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے موسیٰ جیسے اولو العزم پیغمبر کو لن ترانی فرمادیا۔ لن ہمیشہ کی نفی کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کبھی بھی رؤیت جائز نہیں۔ مگر لن کے ذریعہ ان کا استدلال ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے یہودیوں کے بارے میں فرمایا لَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا ﴿البقرۃ:۹۵﴾ یعنی یہود کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے حالانکہ قیامت کے دن جب وہ عذاب دیکھیں گے تو موت کی تمنا کریں گے۔ اہل بدعت، خوارج اور معتزلہ کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا مذہب۔ اہل سنت کے بعض لوگوں کا یہی مذہب ہے کہ رویت باری عقلا ممکن ہے لیکن شرعاً ممتنع۔ دلیل میں حضرت موسیٰ والی آیت پیش کی جاتی ہے کہ عقلاً ممکن ہے ورنہ موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر غیر معقول اور امر محال کا سوال نہ کرتے۔ اور جب اللہ نے جواب دے دیا کہ "تو" "مجھے" ہر گز نہ دیکھ سکے گا تو معلوم ہوا کہ جب موسیٰؑ جیسے پیغمبر کو جواب اس طرح دیا گیا تو عام لوگ کس قطار و شمار میں۔

تیسرا مذہب یہ ہے کہ دنیا میں ممکن نہیں آخرت میں ممکن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن اور احادیث میں آخرت میں اللہ کو دیکھنے کی بات آئی ہے۔ مثلاً وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿القیامۃ:۲۲،۲۳﴾۔ یا حدیث میں ہے کہ جسطرح بدر کو دیکھنے میں تم کو کوئی چیز حارج نہیں ہوتی اسی طرح قیامت میں تم لوگ اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ یا یہ حدیث کہ آدمی جب تک مر نہیں جاتا اللہ کو نہیں دیکھے گا۔ اور چوتھا مذہب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی رؤیت جائز ہے۔ صوفیاء کرام کا یہی مذہب ہے اور مہدویہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اسکی دلیل قرآن کی آیت۔ وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿الاسراء:۷۲﴾ ہے۔ یعنی جو شخص یہاں (دنیا) کا اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ظاہری بینائی مراد نہیں ہے۔

یہ کہنا کہ لن کے ذریعہ ہمیشہ کی نفی کر دی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ لن کے ذریعہ نفی موسیٰؑ کے حق میں ہے۔ اللہ کے حق میں نہیں۔ یعنی یہ کہا گیا کہ تو جو فی الحال رؤیت طلب کر رہا ہے تو سن لے کہ تو نہیں دیکھ سکے گا یہ نہیں کہا گیا لَن أُرٰی۔ یعنی میں ہر گز دکھائی نہیں دوں گا۔ ہاں اگر یہ جواب دیا جاتا تو بحث کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ اور اللہ نے لن تریٰ کہا بھی تو حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شان آپؐ کے مرتبہ، منصب اور آپؐ کے اعزاز کی وجہ سے کہا کہ دیدار تو اوّلاً محمد ﷺ کو ہو گا اس کے بعد

دوسروں کو ہوگا۔ نیز یہ کہنا کہ دیدار دنیا میں نہیں ہوگا آخرت میں ہوگا تو یہ دیدارِ الٰہی کو ''دار'' کے ساتھ مقید کرنا ہوا۔ ذاتِ باری تو مطلق ہے اسکو دار کے ساتھ مقید کرنا غلط بات ہے اس پر یہ حرف بھی آسکتا ہے کہ وہ دنیا میں دیدار سے عاجز ہے۔ حالانکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس پر کوئی کسی قسم کی پابندی نہیں لگا سکتا۔ نیز یہ کہنا کہ مرنے کے بعد ہی اللہ کو دیکھا جاسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے موت دو قسم کی ہوتی ہے ایک موت اضطراری اور دوسری موت اختیاری۔ موت اضطراری کے بعد دیدار یقینی بھی نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ موت سے مراد موت اختیاری ہے۔ یعنی بندہ جب اپنی خودی کو ختم کر دیتا ہے یعنی خودی کو فنا کر دیتا ہے تو وہ اسکی اختیاری موت ہوتی ہے پھر وہ خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا موتوا قبل ان تموتوا۔ یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ اللہ نے فرمایا۔ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ﴿الکھف:۱۱۰﴾۔ جو شخص اپنے پروردگار کے دیدار کی آرزو رکھتا ہے تو اسکو چاہئے کہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ واضح ہو کہ مہدیؑ نے دیدار کو فرض قرار نہیں دیا بلکہ طلبِ دیدارِ خدا کو فرض فرمایا۔ کہ اللہ کو دیکھنا چاہئے سر کی آنکھوں سے یا دل کی آنکھوں سے یا خواب میں۔ کم از کم طلب تو رکھنی چاہئے۔ یہی مومن کی شان اور صفت ہے۔

وَمَا أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَا مُوسَىٰ ---﴿طٰہٰ ۸۳ تا ۹۸﴾ اے موسیٰ تم کو اپنی قوم سے آگے (جلدی) آجانے کا کیا سبب ہے۔

قصہ یہ ہے کہ کوہ طور پر اللہ نے موسیٰؑ کو بلایا تھا لیکن قوم نے کہا کہ ہمارے بھی چند سربرآوردہ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ تا کہ اللہ سے جو تمہاری بات چیت ہوتی ہے یہ لوگ اس کے گواہ رہیں۔ اللہ سے اجازت لیکر موسیٰؑ ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلے۔ لیکن شوق کا تقاضہ تھا موسیٰؑ قوم سے آگے بڑھ گئے تو اللہ نے پوچھا کہ تم قوم سے آگے کیوں آگئے۔ موسیٰ نے جواب دیا کہ میرا مقصد تیری خوشنودی حاصل کرنا تھا اور ویسے بھی قوم کے لوگ زیادہ دور نہیں ہیں بلکہ پیچھے ہی ہیں۔ اللہ نے فرمایا تم ادھر چلے آئے اور ادھر تمہاری قوم کا یہ حال ہے کہ وہ ایک فتنہ اور آزمائش میں مبتلا ہوگئی ہے اور سامری نے ان کو بہکا کہ ایک بچھڑے کی پوجا میں لگا دیا ہے وہ ایک بد فطرت اور منافق آدمی تھا۔ جس نے موسیٰؑ کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل کو گوسالہ کی پرستش میں لگا دیا تھا۔ یہ سن کر موسیٰؑ غم و غصہ میں بھرے ہوئے واپس ہوئے اور قوم سے پوچھا کیا اللہ نے تم سے توریت جیسی کتاب دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا اور مجھے تو چالیس دن ہی وہاں رہنا تھا کیا یہ مدت تم کو اتنی لمبی معلوم ہوئی کہ تم انتظار کرتے کرتے تھک گئے یا یہ کہ جان بوجھ کر تم نے اللہ کے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور اپنا وعدہ توڑتے ہوئے اللہ کے غضب کو

دعوت دی۔ قوم کے لوگوں نے کہا ہم نے آپ کے وعدہ کا خلاف اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ فرعون کی قوم کے زیوروں کا بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا سو ہم نے اسکو (آگ میں) ڈال دیا۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی ڈالا۔ اس کا اصل واقعہ یہ تھا کہ قوم فرعون سے جو زیورات ہم نے مستعار لئے تھے وہ ہمارے ہی پاس تھے۔ جب فرعون اور اس کا لشکر دریائے نیل میں ڈوب گیا تو دریائے نیل نے ان کے زیورات کو باہر پھینک دیا لوگوں نے اُٹھا لیا گویا وہ مال غنیمت تھا۔ اور ان کی شریعت میں مال غنیمت حلال نہیں تھا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اس کا کیا کرنا چاہیئے۔ ھارونؑ نے کہا کہ ایک گڑھا کھود کر وہ تمام زیورات اس میں ڈال دو سامری نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ھارونؑ نے کہا کہ آگ سلگائی جائے اور اس میں یہ تمام زیورات ڈال دئے جائیں۔ پس ایسا ہی کیا گیا۔ اس اثناء میں سامری نے ان زیورات سے ایک بچھڑے کی شکل کا مجسمہ بنالیا۔ چونکہ وہ پہلے بچھڑے ہی کی پرستش کرتا تھا اس میں وہ جبرئیلؑ کے گھوڑے کے کھر کے نیچے کی مٹی ڈال دی جس سے آواز آنے لگی تو سامری نے کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰؑ کا بھی۔ لیکن موسیٰؑ اسکو بھول گئے اور خدا کی تلاش میں طور پر چلے گئے۔ حالانکہ ھارونؑ نے ان سے پہلے ہی کہدیا تھا کہ لوگو اس سے صرف تمہاری آزمائش کی گئی تھی اور تمہارا رب تو وہ خدائے واحد و رحمان ہے، تو تم میری پیروی کرو اور میرا کہا مانو تو وہ کہنے لگے جب تک موسیٰؑ ہمارے پاس لوٹ نہ آئیں ہم اسی (بچھڑے) کی پوجا پر قائم رہیں گے۔ (واپسی پر) موسیٰؑ نے کہا اے ہارونؑ جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو اسی وقت تم کو میرے پاس چلے آنے سے کس نے روکا تھا کیا تم نے میری نافرمانی نہیں کی۔ یہ ساری باتیں موسیٰؑ نے ھارونؑ کی ڈاڑھی پکڑ کر غصے میں کہیں تو ھارونؑ نے کہا بھائی میرے سر کے بال اور ڈاڑھی نہ پکڑیئے میں تو اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں یہ نہ کہیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔ پھر سامری سے پوچھا تیرا کیا حال ہے۔ اس نے کہا میں نے ایسی چیز دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتے کے نقش قدم سے مٹی کی ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو (بچھڑے) میں ڈال دیا۔ موسیٰؑ نے کہا جا تیرے لئے دنیوی زندگی میں یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا رہے گا مجھ کو ہاتھ نہ لگاؤ (اگر کوئی اس سے ملتا یا یہ کسی سے ملتا تو دونوں کو تپ چڑھ جاتی۔ اس لئے سب سے الگ رہتا اور کہتا کہ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ) اور آخرت کا عذاب تو تجھ سے ٹل نہ سکیگا۔ دیکھ تو جس معبود کی پرستش پر جما ہوا ہے ہم اسکو جلادیں گے پھر اسکی راکھ کو اڑا کر دریا میں بکھیر دیں گے۔

موسیٰؑ کے معجزے: اللہ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ----الخ ﴿الاسراء:١٠١﴾ اور ہم نے موسیٰؑ کو نو (۹) کھلی نشانیاں دیں آیات بینات سے مراد معجزے ہیں یعنی عصا، ید بیضاء، طوفان، ٹڈی دل، جوں، مینڈک (کا عذاب) خون، قحط، پھلوں کی کمی، بعض مفسرین نے حجر اور پہاڑ کو بھی گنا ہے۔ اور بعض مفسرین نے نو احکام بتائے ہیں۔ جن کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا نو احکام یہ ہیں۔ (۱) شرک نہ کرو (۲) زنا نہ کرو (۳) ناحق قتل

نفس نہ کرو(۴) اسراف نہ کرو(۵) جادو نہ کرو(۶) سود نہ کھاؤ(۷) بے گناہ آدمی کو بادشاہ کے پاس نہ لیجاؤ تا کہ وہ اُسے قتل کردے(۸) پاک دامن پر بہتان نہ لگاؤ(۹) میدانِ جنگ سے نہ بھاگو۔

موسیٰؑ اور گائے کو ذبح کرنے کا واقعہ: اللہ کا ارشاد ہے: وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّـهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا بَقَرَةً ﴿البقرۃ:۶۷ تا ۷۱﴾ اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ موسیٰؑ نے کہا میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتائے کہ گائے کس طرح کی ہو۔ کہا، پروردگار فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھڑا بلکہ ان کے درمیان (جوان) ہو پس جیسا تم کو حکم دیا جاتا ہے ویسا کرو۔ انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے کہو وہ ہم کو اس کا رنگ بیان کرے (موسیٰؑ نے کہا) پروردگار کہتا ہے کہ اس گائے کا رنگ گہرا زرد ہونا چاہئے کہ دیکھنے والے کا جی خوش ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے کہو کہ وہ ہم کو بتادے کہ وہ کسطرح کی ہو۔ کیوں کہ بہت سی گائیں ایک دوسرے سے مشابہ ہوتی ہیں۔ پھر خدا نے چاہا تو ہم کو ٹھیک بات معلوم ہو جائے گی۔ موسیٰؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے کام میں لگی ہوئی نہ ہو۔ نہ تو زمین جوتتی ہو اور نہ پانی کھیتی کو پہنچاتی ہو۔ سالم ہو۔ اس میں کسی طرح کا داغ (دھبہ) نہ ہو انہوں نے کہا اب ساری باتیں تم نے بتادیں۔ انہوں نے اسکو ذبح کیا۔

حالانکہ وہ ذبح کرنے والے نہیں تھے واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص جس کا نام عامیل تھا مارا گیا اور قاتل کا پتہ نہ چلا وہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے اور یہ قصہ سنایا اور قاتل کے تعلق سے پوچھنے لگے۔ موسیٰؑ نے بحکم خدا مقتول کے رشتہ داروں سے کہا کہ ایک گائے کو ذبح کرو اور اس کا ایک ٹکڑا مُردے پر مارو۔ وہ زندہ ہو کر قاتل کی نشاندہی کرے گا۔ قوم نے گائے کے تعلق سے مختلف سوالات کرنے شروع کردئے اور اپنے لئے ہی مشکلات کھڑی کرلیں۔ تیسرے سوال کے آخر میں کہا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّـهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿البقرۃ:۷۰﴾ (خدا نے چاہا تو ہم کو ٹھیک سے معلوم ہو جائے گا) رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ یہ اچھا ہوا کہ انہوں نے ان شاء اللہ کہہ دیا۔ تو بات سمجھ میں آگئی اور اگر ان شاء اللہ نہ کہتے تو سوالات کا سلسلہ چلتا ہی رہتا اور ان کو صحیح بات نہ ملتی۔

پھر جب ان صفات والی گائے کو ڈھونڈھنے کے لئے نکلے تو پورے گاؤں میں صرف ایک مقام پر وہ گائے نظر آئی اور اس کا مالک ایک نیک بخت تھا جو اپنی والدہ کی خدمت بہت اچھی طرح کرتا تھا۔ جب اس سے مول تول ہوا تو اس نے اس گائے کی یہ قیمت رکھی کہ اس گائے کی کھال میں جتنا سونا بھرا جاسکتا ہے اس کے برابر کی رقم دی جائے۔ مجبوراً وہ لوگ وہ قیمت دے

کر گائے کو لیا اور ذبح کیا۔ پھر اس کی دم یا اس کے گوشت کے ایک ٹکڑے کو مردے پر مارا تو وہ جی اُٹھا، اس نے قاتل کا نام لیا۔ جو مقتول کا رشتہ دار ہی تھا، جس نے مال کی ہوس میں اسکو قتل کر دیا تھا۔

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ﴿طٰہٰ:۹﴾ واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ سے مدین سے مصر جانے کی اجازت مانگی تا کہ وہ اپنی والدہ اور بھائی سے ملاقات کر سکیں۔ چنانچہ جب وہ اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر چلے تو وہ موسم سرما کا تھا۔ رات برفانی تھی اور گھپ اندھیرا تھا۔ آپ شام کے بادشاہ کے خوف سے غیر معروف راستے سے جا رہے تھے اہلیہ حاملہ تھی اور دن پورے تھے یعنی دن یا رات میں کسی بھی وقت وضع حمل ہو سکتا تھا پھر ایسے وقت میں دردزہ شروع ہو گیا آپ نے چقماق سلگانے کی کوشش کی لیکن آگ پیدا نہ ہو سکی، اتنے میں آپ نے دور سے ایک آگ دیکھی تو اس وقت آپ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا تم یہیں ٹھہرو۔ وہاں آگ نظر آرہی ہے۔ میں وہاں سے یا تو شعلہ (لکڑی کے ایک سرے پر سلگایا ہوا) لاتا ہوں یا وہاں جو کوئی بھی ہو گا اس سے راستہ دریافت کر لیتا ہوں۔ پھر آپ نے گھاس پھوس جمع کیا تا کہ اس سے آگ سلگائیں لیکن اللہ کی قدرت کہ جوں جوں آپ آگ کے قریب جاتے تھے تو وہ آپ سے دور ہو جاتی تھی اور جب آپ دور ہوتے تو وہ آپ سے قریب دکھائی دیتی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ آگ نہیں تھی بلکہ اللہ کا نور تھا جسے موسیٰؑ اپنی ضرورت کے تحت نار سمجھ رہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ حیران و پریشان کھڑے ہو گئے کہ اب کیا کرنا چاہیئے کہ اچانک اس آگ سے (جو ہرے بھرے درخت میں تھی) آواز آئی اور آپ کو پکارا گیا اے موسیٰ۔ موسیٰؑ نے فوراً جواب دیا اگر چہ آپ کو معلوم نہ ہو سکا کہ کون پکار رہا ہے۔ ہاں میں تیری آواز سن رہا ہوں لیکن تجھے دیکھ نہیں رہا ہوں۔ بتا تو کون ہے اور کہاں ہے جواب دیا گیا میں تیرے آگے ہوں تیرے پیچھے ہوں۔ تیرے اوپر ہوں تیرے نیچے ہوں تیرے ساتھ ہوں اور تجھ سے تیری بہ نسبت زیادہ قریب ہوں۔ ان الفاظ سے موسیٰؑ کو یقین ہو گیا کہ کلام کرنے والا اللہ رب العالمین ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے یہ آواز سنی تو شیطان نے آپ کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کیا کہ یہ شیطانی آواز ہے۔ لیکن موسیٰؑ نے کہا کہ میں دونوں میں فرق کو جانتا ہوں یہ آواز مجھے شش جہات سے آرہی ہے اور اس کو میں پورے اعضاء سے سن رہا ہوں۔ سبحان اللہ موسیٰؑ پیغمبر تھے۔ کیا خوب فرق بیان فرمایا ہے۔ حضرت بندگی میاں سید خوندمیر سے ایک بار ایک ملاّ نے پوچھا کہ کیا تم خدا کو دیکھتے ہو آپ نے جواب دیا ہاں اس نے کہا خدا کو دیکھنے کا کیا طریقہ ہے آپ نے جواب دیا اس طرح کہ اللہ نے میرے ہر بال کو دو آنکھیں دی ہیں جن سے میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ ملاّ نے کہا واقعی دیدار کا یہی طریقہ ہے۔

پھر جب موسیٰؑ اس آگ کے پاس پہنچے تو من جانب اللہ ان کو آواز دی گئی اے موسیٰ میں ہی تمہارا رب ہوں۔ پس تم

اپنی جوتیاں اتار دو۔ تم یہاں پاک میدان طُویٰ میں ہو۔ نعلین سے مراد نفس اور بدن یا دنیا اور آخرت ہے۔ اس لئے کہ جہاں ذات ہے وہاں دنیا اور عقبیٰ بھی حجاب بن جاتے ہیں اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ کے جوتے مرے ہوئے گدھے کے غیر مدبوغ چمڑے کے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ جوتے اتارنے کا حکم اس لئے دیا گیا تاکہ آپ اس مقدس سرزمین سے لگ کر اس سے برکت حاصل کر سکیں۔

پھر اللہ نے کہا کہ میں نے تم کو (نبوت کے لئے) پسند کیا ہے تو جو حکم دیا جا رہا ہے اُسے سنتے رہو، بے شک میں ہی اللہ ہوں میرے سوائے کوئی معبود نہیں۔ بس تم میری ہی بندگی کرو اور نماز کو قائم کرو میری یاد کے لئے۔ یقینا قیامت آنے والی ہے میں اس (کے وقت) کو سب سے مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو اس کی کوشش (اور عمل) کا بدلہ مل جائے۔ (قیامت کے وقت کو پوشیدہ رکھنے کا مقصد تہویب بھی ہے اور تہّوب بھی۔ یعنی جب لوگوں کو قیامت کا وقت معلوم نہ ہو گا تو وہ ہر وقت اس سے ڈریں گے اور معاصی سے بچیں گے اور نیک اعمال میں مشغول ہوں گے۔ اسی طرح اللہ نے انسان کی موت کے وقت کو بھی مخفی رکھا ہے تاکہ آدمی کو جب اپنی موت کا معین وقت معلوم ہو گا تو وہ گناہوں میں مشغول رہیگا پھر جب وہ وقت آجائے گا گناہوں سے توبہ کر لے گا اور آخر وقت میں نیک بن جائے گا۔ یہ ہوئی تہویب، اور تہّوب کے معنی تیاری کے ہیں یعنی قیامت کا اور موت کا وقت معلوم ہو جانے پر ہر شخص اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیتا ہے۔ اللہ کا منشا یہ نہیں ہے اسی لئے اللہ نے اسکو مخفی رکھا ہے تاکہ ہر شخص اپنے آپ کو ہر وقت اس کے لئے تیار رکھے یہ سمجھتے ہوئے کہ پتہ نہیں وہ کب آجائے۔

پس تم کو اس سے وہ شخص باز نہ رکھے جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے ورنہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے اور اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے۔ (حالانکہ اللہ کو اس کا علم تھا۔ لیکن پوچھنے کی غرض یہ تھی کہ موسیٰؑ کو ہشیار کر دیا جائے کہ یہ عصا ہی ہے پھر جب اللہ اس کو سانپ سے بدل دے گا تو موسیٰؑ کو یقین ہو جائے کہ یہ معجزہ ہے۔)

موسیٰؑ نے کہا میری لاٹھی ہے۔ اس پر میں سہارا لیتا ہوں اور اس سے میں اپنی بکریوں کیلئے پتے جھاڑتا ہوں۔ اور اس سے میرے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ مثلاً اسے سفر میں ساتھ رکھتا ہوں اس سے اپنا توشہ باندھتا ہوں۔ اسی سے کنویں سے پانی نکالتا ہوں، سانپوں کو مارتا ہوں، جنگل کے جانوروں کو ہانکتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اللہ نے کہا اے موسیٰ تم اُسے (زمین پر) ڈال دو تو انہوں نے ڈال دیا تو اچانک وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔ (شاید وہ سرسراتا ہوا آپ کے پاس ہی آیا) اللہ نے کہا اسکو پکڑ لو اور اس سے مت ڈرو۔ (جب تم اسکو پکڑ لو گے تو) ہم اسکو اسکی پہلی حالت پر پھیر دیں گے اور اپنا ہاتھ اپنے بغل میں لگاؤ تو وہ کسی عیب کے بغیر سفید (روشن) ہو کر نکلے گا۔ یہ دوسری نشانی ہے (یہ اس لئے کیا) تاکہ ہم تم کو ہماری بڑی نشانیاں دکھا دیں۔ (اب) فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ موسیٰ نے کہا پروردگار میرا سینہ کھول دے۔ اور میرا کام آسان فرما۔ اور

میری زبان کی گرہ کھول دے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں اور میرے گھر والوں میں سے ایک کو میرا وزیر بنادے یعنی میرے بھائی ہارون کو۔ ان کے ذریعہ میری قوت کو مستحکم کردے اور ان کو میرے کام میں شریک کردے تا کہ ہم (دونوں) تیری بہت تسبیح کریں اور تجھے کثرت سے یاد کریں تو بے شک ہمارے حال سے واقف ہے۔ فرمایا اے موسیٰ تمہاری دعا قبول کر لی گئی۔

حضرت موسیٰؑ کا جہاد کے لئے قوم سے خطاب اور ان کا گستاخانہ جواب۔ يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ---﴿المائدہ:۲۱ تا ۲۶﴾ اے میری قوم کے لوگو تم اس مقدس سرزمین (ملک شام) میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے لیکن وہ لوگ کہنے لگے کہ وہاں تو بہت بڑے زبردست لوگ ہیں ہم تو وہاں ہرگز قدم بھی نہیں رکھیں گے جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔

روایت ہے کہ اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ شام کی سرزمین اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔ اب صرف تمہارے حملے کی دیر ہے، بس وہ فتح ہو جائے گی موسیٰؑ نے اس سے پہلے شام کی سرزمین کے حالات معلوم کرنے کے لئے بارہ قبیلوں سے بارہ سرداروں کو منتخب کر کے روانہ کیا تھا۔ انہوں نے واپس آکر رپورٹ دی کہ ملک بڑا سرسبز وشاداب ہے لیکن وہ عمالقہ کے قبضے میں ہے۔ وہ بہت جری، طاقت ور اور بارعب ہیں۔ موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ لوگوں کے سامنے ملک کی کیفیت بیان کرو، عمالقہ کی صفت مت بیان کرو۔ مگر بارہ میں سے دس نے آپ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور عمالقہ کا زور اور طاقت کا حال بیان کر دیا۔

مگر دو نے آپ کی نصیحت پر عمل کیا، جب بنی اسرائیل نے عمالقہ کا حال سنا تو ڈر گئے، ہمت ہار گئے اور موسیٰؑ سے کہا وہاں تو زبردست لوگ ہیں ہم وہاں ہرگز نہیں جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ مگر ان دونوں نے جن کے نام یوشع بن نون اور کالب بیان کئے گئے ہیں انہوں نے کہا کہ ظاہری طاقت کو مت دیکھو، اللہ اور اسکا پیغمبر جو کہہ رہا ہے اس کو سنو اور عمل کرو۔ یقیناً فتح تمہاری ہی ہوگی، کم از کم اتنا تو کرو کہ ہمت کر کے دروازہ پر ہلّہ بول دو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے لیکن ان بزدلوں نے بڑی گستاخی سے کہا کہ ہم کو وہاں نہیں جانا ہے۔ اگر جانا ہے تو تم اور تمہارا خدا دونوں جاؤ اور لڑو۔ ہم تو یہاں آرام سے بیٹھے رہیں گے۔ ایک طرف تو یہ قوم اور اس کے پیغمبر کے ساتھ یہ سلوک، دوسری طرف امت مسلمہ کا حال دیدنی ہے، کہ جب وقت پڑا تو صحابہ کرامؓ نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ آپ حکم دیں تو ہم سمندر کی موجوں میں گھس جائیں گے، ہم موسیٰؑ کی قوم نہیں ہیں جنہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جاؤ اور دشمن سے لڑو۔ ہم یہیں بیٹھے رہیں گے (اور جب تم ان کو وہاں

سے بھگادو گے ہم شہر میں داخل ہوں گے)

اس گستاخانہ جواب کا حضرت موسیٰؑ کے دل پر کیا اثر ہوا ہو گا محتاج بیان نہیں۔ ایک پیغمبر ان حالات میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ آپ نے اللہ سے دعا فرمائی کہ اے خدا اب یہ حال ہے کہ میرے بس میں میری ذات اور میرا بھائی ہارون بس یہ دورہ گئے ہیں۔ اب تو ہمارے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ اب ہم ساتھ نہیں رہ سکتے تو اللہ نے اس سرزمین کو ان کے حق میں چالیس سال تک حرام کر دیا۔ وہ تیہ کے جنگل میں چالیس برس تک بھٹکتے رہے۔ خیال کیا جاسکتا ہے کہ چالیس سال تک بھیانک جنگلوں میں انہوں نے کس طرح زندگی بسر کی ہو گی۔ لیکن اللہ کہتا ہے۔ خبر دار ان کی اس حالت زار پر افسوس کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ انہوں نے جو کیا یہ اس کا پھل ہے۔ اللہ کے حکم کی نافرنی کی سزا تھی جو ان کو دی گئی۔

مرشد

وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿الکھف:۱۷﴾ جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی مرشد نہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست — پس بہر دستے نباید داد دست

ترجمہ: اے ابن آدم جان لے کہ بہت سے ابلیس آدمؑ کی صورت لئے ہوئے رہتے ہیں پس ہر ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہئے

ہر کہ اواز کشف خود گوید سخن — کشف اور اکفش کن بر سر بزن۔

ترجمہ: جو شخص اپنے کشف سے بات کرتا ہے اس کے کشف کو جوتا بنا کر سر پر مارنا چاہئے۔

مرشد، متبع سنت ہو۔ اس کو دیکھنے سے خدا یاد آئے۔ اس کی صحبت میں دنیا کی محبت سرد ہو جائے اور خدا اور رسولؐ کی محبت غالب اور وساوس شیطانی و خطرات نفسانی کم ہوں۔

سب سے پہلے مرشد آنحضرتؐ ہیں۔ مرشد کے بغیر راہ طریقت نہیں مل سکتی۔ جو لوگ قرآن اور سنت رسولؐ کو کافی سمجھ کر مرشد کی ضرورت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لوگ حقیقت میں خدا پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہماری اصلاح کیلئے صرف قرآن کا بھیج دینا کافی تھا۔ آنحضرتؐ کو نبی بنا کر کیوں بھیجا۔ بلکہ سلسلہ نبوت کے پورے نظام پر ان کا اعتراض ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ کی مصلحت یہی تھی کہ قلبِ انسانی، کسی انسان سے ہی بدلتا ہے نہ کہ کتاب سے۔

پھر آنحضرتؐ نے بھی صفہ نامی چبوترہ پر صحابہؓ کی (مبلغین و مرشدین) کی ایک جماعت تیار فرمائی جن کی تعداد ۴۰۰ کے قریب تھی اور وہ تارک دنیا تھے۔

متاع

متاع کا لفظ قرآن مجید میں ۲۱ مقامات پر آیا ہے۔

(۱)وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿البقرة:۳۶﴾ اور تمہیں زمین پر ایک خاص وقت تک ٹھہرنا اور زندگی بسر کرنا(فائدہ اٹھانا) ہے

(۲)وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿البقرة:۲۴۱﴾ اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ (یعنی شوہر کی استعداد و حیثیت کے مطابق) خرچ دینا چاہئے، پرہیز گاروں پر یہ بھی حق ہے۔

(۳)مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ﴿آل عمران:۱۴﴾ یہ سب دنیاوی زندگی کا وقتی فائدہ ہے اور اللہ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے۔

(۴)وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿آل عمران:۱۸۵﴾ اور دنیا کی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے۔

(۵)مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿آل عمران:۱۹۷﴾ تھوڑا سا فائدہ ہے (چند روزہ بہار ہے) پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے۔

(۶)قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿النساء:۷۷﴾ اے پیغمبر۔ آپ کہدیجئے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت پرہیز گاروں کیلئے بہتر ہے۔

(۷)وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿الأعراف:۲۴﴾ اور تمہیں زمین میں ایک خاص مدت تک ٹھہرنا اور زندگی بسر کرنا (فائدہ اٹھانا ہے) ہے

(۸)فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿التوبة:۳۸﴾ پس دنیاوی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔

(۹)إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴿یونس:۲۳﴾ اے لوگو، تمہاری شرارت کا وبال تم پر ہی ہو گا، دنیاوی زندگی کا فائدہ۔

(۱۰) مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿یونس:۷۰﴾ دنیا کا چند روزہ فائدہ ہے، پھر ان کو ہماری طرف لوٹنا ہے۔ پھر ہم ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے، ان کے کفر کے بدلے۔

(۱۱) وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ (الرعد:۱۷﴾ اور جس چیز کو زیور یا سامان بنانے کیلئے آگ

پر تپاتے ہیں، اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔

(۱۲) مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿النحل:۱۱۷﴾ چند روزہ عیش ہے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

(۱۳) وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿الأنبياء:۱۱۱﴾ اور میں نہیں جانتا (کہ تاخیر عذاب) شاید تمہارے لئے آزمائش ہو اور ایک مدت تک تم کو فائدہ پہنچانا ہے۔

(۱۴) لَّيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ﴿النور:۲۹﴾ تم پر کچھ گناہ نہ ہوگا اگر تم ایسے گھروں میں جاؤ جہاں کوئی بستا نہ ہو اور جس میں تمہارا اسباب رکھا ہو۔

(۱۵) وَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا ﴿القصص:۶۰﴾ اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیوی زندگی کا سامان ہے اور زینت ہے۔

(۱۶) أَفَمَن وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيهِ كَمَن مَّتَّعْنَاهُ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴿القصص:۶۱﴾ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے نیک وعدہ کر رکھا ہے اور وہ شخص اسکو پانے والا ہے کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دنیوی زندگی کے فائدہ سے بہرہ مند کیا ہے۔

(۱۷) يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿غافر:۳۹﴾ اے میری قوم یہ دنیا کی زندگی محض چند روزہ فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور جو آخرت ہے وہ ہمیشہ کا گھر ہے۔

(۱۸) فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿الشوریٰ:۳۶﴾ لوگو۔ جو مال و متاع تم کو دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا فائدہ ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ان کیلئے جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(۱۹) وَإِن كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿الزخرف:۳۵﴾ یہ سب چیزیں ناپائیدار دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور آخرت تمہارے پروردگار کے پاس پرہیزگاروں کیلئے ہے۔

(۲۰) وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿الحدید:۲۰﴾ اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیتوں کے ذریعہ دنیا کی حقیقت بیان کر دی کہ دنیا زندگی گذارنے کی جگہ ہے، زندگی گذارنے کیلئے کچھ ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اسکو پیدا کیا جا سکتا ہے، اس میں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ اور اس میں خود انسان کو نہ تکلیف ہوتی ہے اور نہ اس کے جانے پر افسوس ہوتا ہے۔ اور نہ اسکو چھوڑ کر جانے کا رنج ہوتا ہے، لیکن اسکے برعکس انسان اپنے آپ کو فقط چیزوں کے جمع رکھنے کیلئے وقف کر دے تو اس سے بڑھ کر اسکی کوئی حماقت نہیں ہو سکتی۔ ضرورتوں کی حد تک تو

چھوٹ ہے۔ لیکن آدمی ضروریات سے آگے بڑھ کر ''آسائشات''میں قدم رکھتاہے۔ تو اسکو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس سے قدم آگے بڑھا کر ''آرائشات''کا دلدادہ ہوجاتاہے۔ تو زندگی میں اسے بہت زیادہ پریشانی مول لینی پڑتی ہے اور اگر اس سے قدم آگے بڑھا کر ''نمائشات'' کے میدان میں قدم رکھتاہے تو گویا وہ اپنی موت کو دعوت دیتاہے۔ مرد مومن کی پیاری، مطمئن اور آرام دہ زندگی ''قناعت پسندی''میں ہے۔ نہ کہ حرص وہوس میں، اس لئے کہ یہاں کی زندگی کو نہ قرار ہے نہ قیام، آخر کار سب چھوڑ کر جانا تو طے ہے، پھر موت سے غفلت، حماقت کی انتہاء ہے، آخرت کو یاد کرتے ہوئے جو زندگی گذاری جائے جو مستعار ہے وہی خدا کو اور خدا کے رسولؐ کو پسند ہے۔

متاع کے لغوی معنی کی تحقیق: علاّمہ اصمعی جو کہ بہت بڑے علماء نحو میں سے ہیں ان کو خیال ہوا کہ ''متاع''کا لفظ جو قرآن شریف میں نازل ہوا ہے اسکے معنی کیا ہیں معلوم کریں۔ تو وہ عرب کے دیہاتوں میں گئے۔ چونکہ بڑے شہروں میں عرب اور عجم میں اختلاط ہوگیا تو اس وجہ سے ایک دیہات گئے تاکہ اسکی صحیح لغت جو عرب بولتے ہیں وہ معلوم کرسکیں۔ اور گاؤں میں زبان زیادہ صحیح اور محفوظ ہوتی ہے تو وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا بچہ ۵ یا ٦ سال کا بیٹھا ہوا تھا کہ ایک کتا آیا اور باورچی خانہ میں گھس گیا۔ اور میلا کپڑا جس سے پونچھا لگایا جاتاہے اور برتن صاف کیا جاتاہے اس کتے نے اسکو لے لیا اور لیجا کر پہاڑ پر بیٹھ گیا۔ اب اسکی ماں آئی تو جو عربی زبان اس بچے نے استعمال کی علامہ اصمعی جیسے شخص نے جو عالم نحو ہیں اسکو فوراً نوٹ کرلیا۔ کہ الحمد للہ لغت مل گئی اور مسئلہ حل ہوگیا کیوں کہ قرآن پاک عربوں کے محاورات پر نازل ہوا ہے۔ اس بچے نے کہا یا امي جاء الرقيم، واخذ المتاع و تبارك الجبل۔ یعنی ایک کتا آیا اور اس نے متاع اُٹھائی (متاع یعنی وہ صافی جس سے برتن صاف کرتے ہیں) اور پہاڑ پر چڑھ گیا اس سے معلوم ہوا کہ متاع سے مراد قلیل اور حقیر پونجی ہے۔ جسکی کوئی قیمت نہیں ہے۔

مقام محمود

حضرت مہدیؑ نے ﴿عَسَىٰٓ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾ (الإسراء:۷۹) کے بیان میں فرمایا، مقام محمود ولایت اللہ است (حاشیہ انصاف نامہ)

پس مقام محمود، ولایت اللہ، اور ہاہوت مترادف الفاظ ہیں۔ اور اس مرتبہ کی رؤیت کو ''مو بمو'' اور ''ورائے مو بمو'' فرمایا جو خاتمینؑ کو اور آپؑ کے صدقے سے سیدینؓ کو حاصل ہے۔

معراج

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿الإسراء:۱﴾ پاک ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی۔ جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنادیا ہے تاکہ ہم اسکو ہماری نشانیاں دکھائیں بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے محمد کو سیر کرائی۔ یا اپنے رسول کو سیر کرائی بلکہ یہ فرمایا"اپنے بندے کو" سیر کرائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مقامات سے افضل مقام "مقام عبدیت" ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے پاس یہی مقام سب سے بڑا ہے اگر کوئی دوسرا مقام یا منصب اللہ کے پاس اس سے زیادہ پسندیدہ ہوتا تو اللہ اسکو بیان فرماتا۔ واقعی اللہ کو جو مقام پسند ہے وہ "عبدیت کاملہ" ہے حضور ﷺ ہر اعتبار سے "عبد کامل" ہیں

چنانچہ حضرت مہدی موعودؑ نے ایک مرتبہ عبدیت کی شان بیان کرتے ہوئے فرمایا" خدا بننا آسان ہے، بندہ بننا مشکل ہے۔ اللہ نے اپنے فضل واحسان سے جس کو عبد کامل بنادیا، بنادیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے: میں دے کر بندگی ہرگز نہ لوں شان خداوندی۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ام ہانی کے مکان میں یا حرم کے پاس آرام فرمارہے تھے کہ جبرئیلؑ آئے، آپ کو جگایا، اللہ کی جانب سے سلام پیش کیا اور کہا کہ اللہ آپ کو بلارہا ہے۔ براق پر آپ سوار ہوکر جبرئیل کے ساتھ مسجد اقصیٰ پہنچے۔ وہاں تمام پیغمبر جمع تھے۔ آپ نے امام ہوکر سکبو دو رکعت نماز پڑھائی۔ گویا اللہ نے تمام پیغمبروں کو حضورؐ کے مقام ومرتبہ سے واقف کروایا۔ کہ یہ رسول جو آخر میں آیا ہے وہ امام الانبیاء ہے۔

اس کے بعد سیڑھی لگائی گئی اور حضورؐ پہلے آسمان پر جبرئیلؑ کے ساتھ گئے۔ وہاں سے فرشتوں کے پروں پر ساتویں آسمان تک تشریف لے گئے۔ ہر آسمان پر موجود پیغمبروںؑ سے ملاقات ہوئی۔ ساتویں آسمان سے سدرۃ المنتہٰی تک جبرئیلؑ کے پروں پر گئے۔ وہاں جبرئیلؑ رک گئے۔ حضورؐ نے فرمایا آگے بڑھو۔ جبرئیلؑ نے فرمایا میری پرواز یہیں تک ہے آگے بڑھوں گا تو میرے پر جل جائیں گے۔ وہاں سے رفرف پر آپ سوار ہوئے اور مقام روح تک پہنچے۔ پھر وہاں ندا آئی اُدنُ مِنّی یا محمد اے محمدؐ مجھ سے قریب ہوجاؤ۔ اس آواز کی رہبری میں آپ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ اللہ سے جاملے، ملاقات ہوئی، دیدار سے مشرف ہوئے۔ بلاواسطہ جو وحی ہونی تھی ہوئی۔ جو آنکھ نے دیکھا دل نے اسکی گواہی دی۔ پچاس نمازیں اور چھ مہینے کے

روزے فرض ہوئے۔ آپ واپس ہوئے راستہ میں حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ اللہ نے کیا دیا۔ حضور نے فرمایا امت پر روزانہ پچاس نمازیں اور سال میں چھ مہینے کے روزے فرض ہوئے۔ موسیٰؑ نے فرمایا آپ کی اُمت اسکی طاقت نہیں رکھتی۔ آپ واپس جاکر کم کروایئے۔ حضورؐ اللہ کے پاس گئے، تخفیف ہوئی، پھر راستہ میں موسیٰؑ نے پوچھا۔ جواب سن کر کہا کہ آپ کی اُمت یہ بھی نہ کرسکے گی۔ آپؐ واپس جاکر کم کروایئے۔ حضورؐ پھر اللہ کی پاس گئے۔ پھر تخفیف ہوئی۔ پھر موسیٰؑ نے کہا اور کم کرائے۔ اسی طرح نو مرتبہ آپ ﷺ اللہ کے پاس جاکر کم کرواتے رہے یہاں تک کہ دن رات میں پانچ نمازیں اور سال میں ایک مہینہ کے روزے فرض ہوئے۔ پھر موسیٰؑ نے کہا کہ پھر بھی کم کروایئے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ میری اُمت اتنا تو کرلے گی۔

قارئین آپ کو تعجب ہوگا کہ موسیٰؑ کو حضور کی اُمت سے کیا ہمدردی تھی کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے کہہ کر نمازوں اور روزوں میں کمی کرواتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے پاس جاتے وقت بھی موسیٰؑ نے حضورؐ کو دیکھا تھا اور واپسی میں بھی دیکھا تو واپسی کے وقت حضورؐ کی آنکھوں میں دیدار خدا کی وجہ سے جو شان اور تجلّی نظر آرہی تھی، موسیٰؑ کو اپنی مراد بر آتی نظر آئی۔ کیوں کہ موسیٰؑ نے اللہ کو طور پر دیکھنے کی تمنا ظاہر کی تھی رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ ﴿الأعراف:۱۴۳﴾ تو اللہ نے جواب دیا تھا لَن تَرَانِي ﴿الأعراف:۱۴۳﴾ تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ موسیٰؑ کو اس جواب سے مایوسی ہوئی تھی۔ اب حضورؐ کی آنکھوں میں، حضورؐ کے چہرہ میں آپ نے اللہ کا دیدار کرلیا تھا۔ اب یہ چاہتے تھے کہ اس کا نظارہ بار بار کریں اور ہر بار ایک نئ شان سے کریں۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿الرحمن:۲۹﴾ ہر دن ہی نہیں بلکہ ہر لحہ اسکی نئ شان ہے اس لئے موسیٰؑ نے حضورؐ کو بار بار اللہ کے حضور بھیجا تاکہ ہر چکر میں ایک نئ شان اور ایک نئ تجلی اللہ کی دیکھ لیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فرائض اسلام میں سے دو فرائض یعنی نماز اور روزہ زمین پر نہیں بلکہ حضوری خدا میں فرض ہوئے ہیں۔ حضوری خداوندی کو ہی ولایت کہتے ہیں۔ زکواۃ اور حج بذریعہ جبرئیلؑ زمین پر وحی سے فرض کئے گئے ہیں لیکن نماز اور روزے خاص دربار خداوندی میں فرض ہوئے۔ اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ نماز اور روزوں کی پابندی کرے۔ اس سے غفلت نہ برتے۔

راز و نیاز کے بعد اللہ نے اپنی تمام نشانیاں آپ کو دکھائیں پھر آپ واپس ہوئے مگر اس سفر کی شان یہ تھی کہ جب آپ واپس ہوئے تو وضوء کا پانی بہ رہا تھا اور دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی۔ اور انار کے درخت کی جس ڈالی سے آپ کا مبارک کندھا لگا تھا وہ بھی ہل رہی تھی۔ اور آپ کا بستر بھی گرم تھا۔ سوال یہ ہے کہ اتنا لمبا سفر اتنے کم وقت میں کیا یہ ممکن ہے؟ اس کا

جواب یہ ہے کہ دنیا کے اعتبار سے تو یہ ممکن نہیں ہے لیکن یہ حضور کا معجزہ تھا۔ اور معجزہ کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو بات نہ سمجھ میں آجائے اور نہ دوسرے ایسا کام کر سکیں۔ دنیا نے بہت ترقی کی، ہوائی جہاز کے ذریعہ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو رہا ہے۔ چاند تک کمندیں پھینکی جارہی ہیں۔ آبدوز کشتیوں کے ذریعہ سمندر کی تہوں کو کھنگالا جارہا ہے موبائل کے ذریعہ دنیا مٹھی میں آگئی ہے۔ لیکن جو کام دنیا والے نہ کر سکے اور آئندہ بھی نہ کر سکیں گے وہ ہے ٹائم، اسپیڈ اور اسپیس Time, Speed and Space پر قابو پانا اور اسپر فتح حاصل کرنا۔ اللہ نے معراج میں حضور کے لئے وقت اور فاصلہ دونوں کو "Nil" کر دیا۔ وقت بھی منہ دیکھتارہ گیا اور فاصلہ بھی۔ دنیا کا بلکہ آسمانوں کا لمبے سے لمبا سفر کم سے کم وقت میں جس کو نل Nil کہا جاسکتا ہے، طے ہو گیا۔ آخر یہ کیوں کر ہوا؟ اسکو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہوں۔ آپ اپنے گھر میں ایک گھڑی میں سیل لگائیں گے تو اس گھڑی کی سوئیاں اپنے اسی وقت سے جہاں پر وہ رکی ہوئی تھیں چلنا شروع کریں گی اسی طرح "محمد" ﷺ کائنات کی جان ہیں۔ کائنات کا سیل ہیں۔ جب اللہ نے اس سیل کو اپنے پاس بلالیا تو کائنات کی گھڑی کی ہر سوئی اپنی اپنی جگہ رکی رہی۔ پانی جہاں تھا وہیں رک گیا، دروازے کی کنڈی جہاں تک گئی تھی وہیں رک گئی، انار کی ڈالی نے اپنی حرکت بند کر دی، اس طرح وقت ٹھہر گیا۔ کیوں کہ وقت کی نبض نہیں تھی۔ وہ تو اللہ کے پاس تھی۔ پھر جب حضور واپس ہوئے تو ہر چیز میں حرکت آگئی۔ گویا پھر سیل کائنات کی گھڑی میں رکھ دیا گیا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی بندے نے عرش خداوندی پر قدم نہیں رکھا تھا۔ جب حضور "محمد" ﷺ کے قدم عرش پر گئے تو یہ ایک ایسا محیرّ العقول اور نادر الوجود واقعہ تھا کہ دنیا تو کیا آسمانوں اور فرشتوں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ جب یہ واقعہ ہوا تو سب کے سب، اپنی اپنی رفتار، اور اپنی اپنی حرکت کو بھول کر اس واقعہ کو دیکھنے میں لگ گئے جیسا کہ فطرت کا تقاضہ ہے کہ جب کوئی کسی عادت کے خلاف کسی چیز کو دیکھتا ہے تو وہ اس اسکو دیکھنے میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ منھ میں رکھنے کے لئے جو نوالہ ہاتھ میں لیتا ہے وہ بھی ہاتھ اور منھ کے درمیان رہ جاتا ہے اور منھ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے، اسکو سوائے یہ منظر دیکھنے کے اور کسی بات کا ہوش باقی نہیں رہتا۔ ایک شاعر نے اس منظر کا نقشہ بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ کہتا ہے

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

یعنی اب کس کے پاس دماغ تھا کہ باغباں سے یہ پوچھے کہ (جب چمن میں بہار آئی تو) بلبل نے کیا کہا، پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا۔ بس یہی حال کائنات کے ہر ذرہ کا تھا کہ ہر ذرہ یہ نادر الوقوع واقعہ دیکھنے میں مشغول ہو گیا کہ ایک بندہ نے عرش پر قدم رکھا اور اپنی آنکھوں سے اپنے اللہ کو ہوش و حواس میں دیکھا۔ جسکی ایک تجلی کی تاب موسیٰؑ کوہ طور پر نہ لاسکے۔

بقول مولانائے رومؒ

موسیٰ زہوش رفت بیک تجلّی صفات　　　تو عین ذات می نگری در تبسّمے

یعنی موسیٰؑ تو اللہ کی صفات کی ایک تجلی سے بے ہوش ہوگئے تھے لیکن (سبحان اللہ آپ نے تو (اے محمد ﷺ) مسکراتے ہوئے اللہ کی عین ذات کا دیدار کرلیا۔

معراج کے واقعہ کی جان۔یہی دیدار خداوندی ہے وہ بھی کیسے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿النجم:۱۷﴾ یعنی نہ نظر بھٹکی اور نہ بہکی۔ اللہ کا منشاء بھی یہی تھا کہ سب سے پہلے اس کا دیدار محمد ﷺ کو ہو۔ اسکے بعد دیدار کی دعوت عام دی جائے۔ چونکہ اس کا تعلق ولایت محمدی سے تھا اس لئے اسکی عام دعوت خاتم ولایت محمدیہ حضرت سید محمد مہدی موعودؑ کے ذریعہ دی گئی۔ اسی لئے مہدیؑ نے فرمایا "آمدن بندہ بینائی خدا" یعنی بندے کا آنا اللہ کے دیدار کے لئے ہے۔ پھر فرمایا تصدیق بندہ بینائی خدا۔ مگر کمال بندگی اس کی شرط ہے اور بندگی کا کمال اپنے نفس کو یعنی اپنی خودی کو فنا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک خودی ہے خدا نہیں ملتا۔ جس گھڑی خودی کا نکال ہوتا ہے اسی وقت خدا کا وصل ہوتا ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ شرع محمدی کی سختی کے ساتھ پابندی بھی ضروری ہے۔ شریعت کے بغیر طریقت گمرہی ہے۔ مہدیؑ کا یہ فرمان ہر شخص کے دل میں کندہ ہونا چاہیئے "مذہب ما کتاب اللہ واتباع محمد رسول اللہ "

مسکین

مہدویہ کے پاس شب قدر میں دوگانہ کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔

اللَّهُمَّ أَحْيِنا مِسْكِينًا، وَأَمِتْنا مِسْكِينًا، وَاحْشُرْنا يَوْمَ الْقِيامَةِ فِي زُمْرَةِ الْمَساكِينِ (ترجمہ) اے اللہ ہم کو بحیثیت مسکین زندہ رکھ اور بحیثیت مسکین موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے زمرہ میں ہمارا حشر فرما۔

اس مقدس رات میں یہ دعا کیوں کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہم سال بھر روپیہ پیسہ کمانے کی فکر کرتے ہیں اور اس کیلئے محنت و مشقت بھی برداشت کرتے ہیں۔ پھر اس عظیم اور مقدس رات میں اللہ تعالیٰ سے مسکینی کی حیات اور مسکینی کی موت کیوں مانگتے ہیں؟

یہ سوال اکثر لوگوں کی زبان سے نکلتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ یہ دعا حضور محمد ﷺ نے فرمائی ہے آنحضرت ﷺ سردار الانبیاء خاتم المرسلین اور شہنشاہِ دوجہاں ہیں۔ آپؐ نے جو دعا مانگی ہے ہم غلاموں کو بھی وہی دعا کرنی چاہئے کیوں کہ حضورؐ کی اتباع میں ہی ہماری دنیا و دین کی بہتری ہے۔ اس کے علاوہ حضور مہدی موعودؑ تابع تام محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی دعا کے یہی الفاظ دہرائے ہیں۔ پس ہم سب پر واجب ہے کہ ہم بھی مہدی موعودؑ اور آپ کے متبوع حضرت رسول اللہ ﷺ کی متابعت میں وہی دعا کریں۔

یہ تو تھا منقولی جواب۔ اب اس کا معقولی جواب بھی دیکھئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ لفظ، مسکین، سے گھبرا گئے ہیں، اور آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا بات ہے کہ ہم اس مقدس رات میں جبکہ ہماری ہر دعا اللہ کے پاس مقبول ہوتی ہے اللہ سے مسکینی طلب کریں۔ آج کی رات تو ہم کو اللہ سے دھن دولت، روپیہ پیسہ عزت، رعب، دبدبہ، شان و شوکت طلب کرنی چاہئے تاکہ ہم پورا سال خوشحال اور فارغ البال زندگی بسر کر سکیں۔

یہ محض آپ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ کو مسکین کے لفظ کے صحیح معنی معلوم ہو جائیں تو شاید کیا یقینا آپ ہر روز اپنے اللہ سے یہی دعا کریں گے۔ سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ مسکین، سکون سے ہے۔ اور سکون کا مطلب تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ آج ساری دنیا جو کچھ کر رہی ہے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے دماغ کو اس کے دل کو سکون حاصل ہو۔ یہ اور بات ہے کہ سکون حاصل کرنے کیلئے اس نے جو راستے اختیار کئے ہیں وہ ایسے راستے ہیں جن میں اسے، سکون کے سوا سب کچھ ملتا ہے، سکون کا ضد تناؤ، Tension ہے۔ آرام سے رہنا چین کی نیند سونا کس کی خواہش نہیں ہے۔ آدمی سکون سے جینے کیلئے ہی

محنت، مزدوری، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت بلکہ سیاست کرتا ہے۔لاکھوں کروڑوں کی تجارت، لین دین، امارت ووزارت، اسمبلی و پارلیمنٹ کی ممبری آخر یہ سب کچھ ایک ہی غرض کے تحت ہوتی ہے۔اور وہ ہے، سکون، مگر وہ کسی کو نہیں ملتا۔پھر اگر صحیح طریقے سے وہ سکون نامی 'پری' حاصل نہیں ہوتی تو جوا، لاٹری، لوٹ مار قتل چوری ڈکیتی، غصب اور حق تلفی جیسے جرائم کے ذریعہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔لیکن آپ دیکھتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایسے لوگوں میں سے کسی کے پاس سکون کا ایک لمحہ بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔سب کے پاس ہائے ہائے۔سب کے پاس بے چینی۔اضطراب اور پریشانی ہے۔لیکن اگر سکون کسی کے پاس ہے تو وہ مسکین کے پاس ہے۔

مسکین کو بھی مسکین اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے پاس نہ کچھ خواہش ہوتی ہے اور نہ اختیار۔یہی دو چیزیں یعنی خواہشات نفسانی اور اختیار انسان کو خدا سے دور کرنے والی ہیں۔اگر انسان ان دونوں چیزوں سے دست بردار ہو جائے تو وہ حقیقی مسکین ہے۔جو اللہ کی مرضی کے تابع ہو گیا اور اپنے اختیار سے بے اختیار ہو گیا تو وہ مسکین ہے چنانچہ حضرت مہدی موعودؑ نے بارہا یہ آیت پڑھی ہے۔وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَـــاءُ وَيَخْتَارُ﴿القصص:٦٨﴾ اور تیرا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) پسند کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح فقر کی دو قسمیں ہیں ایک فقر اضطراری اور دوسرا فقر اختیاری۔فقر اضطراری وہ فقر ہے جو انتہائی مجبوری اور تنگدستی کا نام ہے۔اور فقر اختیاری وہ فقر ہے جسے چاہ کر اور اپنے اختیار سے پسند کیا جاتا ہے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فقر اختیاری تھا۔یعنی آپ نے اپنے اختیار سے اسکو پسند فرمایا تھا اسی لئے آپ نے فرمایا، الفقر فخري۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا آپ بادشاہ اور پیغمبر بننا چاہتے ہیں یا فقیر اور پیغمبر بننا۔تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا بلکہ میں فقیر اور پیغمبر بننا چاہتا ہوں تا کہ ایک دن کھاؤں تو تیرا شکر ادا کروں اور دوسرے دن بھوکا رہوں تو صبر کروں۔چنانچہ مولانا رومی نے فقراء کے تعلق سے شعر فرمایا ہے

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم شہانِ بے کمر و خروان بے کلہ اند۔

ترجمہ) گدایان عشق کو حقیر مت سمجھو کہ یہ لوگ بے تخت و تاج کے بادشاہ ہیں۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم۔

ترجمہ: میکدہ کا گدا ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ میں آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکم چلاتا ہوں۔

اسی طرح مسکین کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ مسکین جو بدحال ہے۔یعنی خوشحال فارغ البال نہیں ہے۔یہ مسکینی اضطراری ہے جو قابل تعریف نہیں ہے۔ایسا آدمی کام کا نہیں ہے، نکما ہے، بے پرواہے، سست و مست ہے اور کاہل ہے۔

اور دوسرا وہ مسکین جو اختیاری ہے۔ یعنی جس نے اپنے اختیار سے اپنا سب کچھ بلکہ اپنا اختیار، اپنی خودی، اپنی انا اس اللہ کے حوالے کر دیا جو مالک و غنی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مسکین مال کا نہیں بلکہ، حال، کا ہے۔ یہ مسکین طبیعت کے اعتبار سے ہے۔

چنانچہ ایک مالدار آدمی ہے لیکن اسکی طبیعت میں غرور، تکبر، فخر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اور وہ سب سے نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کیا مسکین طبیعت پائی ہے۔ غرض کہ صرف مال نہ رکھنے والے کو مسکین نہیں کہتے بلکہ جس کا شعار عاجزی، خاکساری اور فروتنی ہوتا ہے اسکو بھی مسکین کہتے ہیں۔ اور یہ مسکین ایک ایسے بڑے سخت مرض کا علاج ہے جو تمام امراض و مفاسد کی جڑ ہے۔ اس سے تمدّن اور تدّین دونوں بگڑتے ہیں اور وہ مرض کبر و نخوت کا ہے کہ اسی سے دوسری تمام بیماریاں جیسے لڑائی، حسد، غیبت وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔

آخر میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ نے آنحضرت ﷺ کو ان لوگوں کے ساتھ یعنی ان فقراء و مساکین کے ساتھ رہنے کا حکم دیا جو دن رات صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ اور دعا کے یہ الفاظ تو خاص توجہ کے مستحق ہیں کہ آخرت میں میرا حشر مساکین کے ساتھ فرما۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے ساتھ ان کا حشر فرما۔

اسی طرح ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۔ پر اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہیں کہ "المسکین من المسکنۃ و ھو التواضع علی وجہ المبالغۃ" یعنی مسکین مسکنت سے ہے اس کے معنی ہیں غایت تواضع اور کمال فنائیت و عبدیت یعنی اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا بلکہ خود کو سب سے حقیر اور کمتر سمجھنا جو تواضع و فنائیت کا درجہ ء کمال ہے، چناچہ بقول شاعر

یہ دل کی ہے آواز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں　　اس پر ہے مجھے ناز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
کچھ ہونا مرا ذلت و خواری کا سبب ہے　　یہ ہے مرا اعزاز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں

(خزائن شریعت وطریقت۔ ص ۳۵۴)

مکہ و مدینہ

مکہ کی حقیقت تجلی الوہیت ہے۔ مدینہ کی حقیقت تجلی عبدیت ہے۔ انسان کے اندر یہ تجلیات موجود ہیں۔ مگر دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔

مجاہدہ

جہاد "جهد" سے ہے جس کے معنی کوشش کرنے کے ہیں، شرعی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے عبادت میں کوشش کرنا اور تصوّف کی اصطلاح میں اسکے معنی ذکر و فکر کے وقت دل کو نفسانی وسوسوں سے بچانے کے ہیں۔ نفس کے ساتھ جہاد کرتے رہنا۔ فتح الباب حاصل ہونے تک بھی مجاہدہ کرنا چاہیئے۔

مجاہدہ، مفاعله کے باب سے ہے، مفاعله میں دو چیزیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں، جیسے مناظرہ، جس میں دو عالِم ایک دوسرے کے مقابلہ میں کسی ایک موضوع پر گفتگو کرتے ہیں، جب بحث دو کے درمیان ہوتی ہے تو اس کو مباحثہ کہتے ہیں۔ اسی طرح مجاہدہ بھی ہے، جس میں ایک مد مقابل کے سامنے کڑی کوشش ہوتی ہے۔ ہر دو ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک سامنے والے کو پچھاڑ کر خود فتح پانے کی کوشش کرتا ہے۔

پس مجاہدہ میں بھی دو ہوتے ہیں، ایک تو وہ ہوتا ہے جو امر دین پر چلنے، عبادت کرنے یا کوئی دوسرا اچھا اور نیک کام کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں ایک شخص یا ایک جماعت ہوتی ہے جو اسکے راستے میں مزاحم ہوتی ہے اور اسکو کامیاب ہونے نہیں دیتی، نیک کام کرنے والے کے مقابلے میں اگرچہ چند لوگ ہوتے ہیں جو اسکے اچھے کام میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں اور اسے شکست دینے کی بھرپور کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ اگر کوئی نہ ہو تو انسان کا نفس اور اس کا شیطان خود اسکے مقابل ہو جاتا ہے، اور بہر حالت اسکو ناکام کرنے کی بساط بھر کوشش کرتا ہے، تو اس شخص کو جو امر دین کو قائم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، مخالف کے مقابلے میں جی توڑ کوشش کرنے کی نوبت آجاتی ہے، ہر قسم کی محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مقابل کے سامنے اس قسم کی کوشش، کاوش، جدوجہد کرنے کا نام "مجاہدہ" ہے۔

قرآن شریف میں کئی جگہ مجاہدین کی تعریف آئی ہے، لیکن خالی مجاہدین نہیں کہا گیا بلکہ اللہ نے ان کو مجاہدین فی سبیل اللہ کے نام سے یاد کیا ہے، اللہ کے کلام جاهد، جاهدا، جاهدوا، تجاهدون، يجاهدون، يجاهدوا، جاهِد، جاهِدهم، جاهِدوا، جهادٍ، جهاداً، جهاده، المجاهدين۔ المجاهدين کے صیغوں کے ساتھ کئی آیتیں آئی ہیں، مثلاً

(۱) أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ﴿التوبة:۱۹﴾ کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے کو اور مسجد الحرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے اعمال کے برابر کر دیا جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔

(۲)إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّـهِ أُولَـٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّـهِ وَاللَّـهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿البقرۃ:۲۱۸﴾ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہ لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

(۳) أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّـهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ﴿آل عمران: ۱۴۲﴾ کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ اللہ نے نہیں جانا ان کو کہ تم میں سے کون مجاہد ہیں اور کون صابر ہیں۔

مختصراً یہ تین آیتیں لکھی گئی ہیں، حقیقت میں اللہ نے اسی حقیقت کو قرآن میں مختلف صیغوں کے ساتھ ۲۵ مقامات پر بیان فرمایا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ نے خود رسول اللہ ﷺ کو جہاد کا حکم بھی دیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

(۱)يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴿التحریم:۹﴾ اے پیغمبر کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

(۲) فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ﴿الفرقان:۵۲﴾ پس آپ کافروں کا کہنا مت مانئے اور ان کے ساتھ مقابلہ اس قرآن کے ذریعہ پوری قوّت اور زور سے کیجئے۔

لیکن یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ خواہ مخواہ اچانک بغیر کسی اشتعال انگیزی اور چھیڑ چھاڑ کے حملہ کرنے اور جہاد کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ اگر مخالفین کی جانب سے اشتعال انگیزی اور عملی چھیڑ چھاڑ ایسی ہو کہ اسکا دفاع کئے بغیر چارہ نہ ہو تو اس صورت میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جہاد "اقدامی تحریک" نہیں ہے بلکہ "مدافعتی حل" ہے۔

مقام

سلوک کے جس مرتبہ میں سالک نے استقامت اور پختگی حاصل کرلی اسکو مقام کہتے ہیں۔

مشاہدہ

مرشد کے تصور کو کہتے ہیں۔یعنی اولاً شہود مرشد اپنے سراپا میں دیکھنا۔ پھر اس کے ذریعہ انفس و آفاق کی نفی کرتے ہوئے شہود حق کو دیکھنا۔مشاہدہ کرنے والے کو سوائے حسن معشوق کے اور کچھ نظر نہ آئے۔فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴿البقرۃ:۱۱۵﴾۔

اہل تصوف کے نزدیک مشاہدہ ذات حق کو چشم باطن سے دیکھنے کا نام ہے یعنی جلوۂ حق دل میں تجزیہ کے بغیر دیکھے خلوت ہو یا جلوت۔پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اجیعوا بطونکم دعوا الحرص، واعروا اجسادکم، قصّروا الامل واظمأنوا اکبادکم، دعوا الدنیا لعلکم ترون اللہ بقلوبکم- اپنے پیٹوں کو خالی رکھو۔ حرص کو چھوڑو۔ جسموں کو لباس سے آراستہ نہ کرو۔ تمناؤں کو کم کرو۔ جگروں کو پیاسے رکھو، دنیا کو چھوڑ دو، تاکہ دلوں میں مشاہدہ حق حاصل ہو۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضورؐ سے جب احسان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ: أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (تم اللہ کی ایسی عبادت کرو کہ تم گویا اسے دیکھ رہے ہو، اگر تو حق کو نہیں دیکھ سکتا تو ایسی عبادت کر وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔

حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی۔یا داؤد أتدری ما المعرفة قال لا- قال هی حیوة القلب في مشاهدتي۔اے داؤد کیا تو جانتا ہے کہ میری معرفت کیا ہے عرض کیا نہیں فرمایا۔میرے مشاہدہ سے دل کا زندہ ہونا۔

مشاہدہ کی حقیقت کے دو پہلو ہیں: ایک مشاہدہ صحیح یقین ہے۔اور دوسرا غلبہ محبت حق۔یعنی غلبہ محبت حق سے وہ مقام حاصل ہو جہاں طالب ہمہ تن حدیث محبوب ہو کر رہ جائے۔اور اسے بجز اس کے کچھ نظر نہ آئے۔

ایک آدمی کسی چیز کو ظاہری آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کے فاعل پر ظاہری نظر پڑتی ہے۔دوسرا فاعل کی محبت میں مستغرق ہو کر ہر چیز سے قطع نظر کر لیتا ہے اور صرف فاعل کو دیکھتا ہے۔پہلا طریق استدلال ہے اور دوسرا جذبہ باطن ہے۔جب محب حق موجودات سے نظر پھیر لیتا ہے تو چشم باطن سے مشاہدہ حق میں مشغول ہو جاتا ہے۔

باطن کی نظر کا مشاہدہ، مجاہدۂ ظاہر سے وابستہ ہے حضرت سہل بن عبد اللہ تستری فرماتے ہیں جو چشم زدن کیلئے اپنی نظر حق تعالیٰ سے پھیر لیتا ہے وہ ساری عمر ہدایت نہیں پا سکتا۔

اہل مشاہدہ کی زندگی یہی ہے کہ وہ مشاہدۂ حق میں مشغول رہیں۔زندگی کا جو حصّہ حق تعالیٰ سے دوری میں گذرتا ہے

وہ اسے زندگی میں شمار نہیں کرتے

چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ سے آپ کی عمر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا چار سال یا بروایتے چالیس سال۔ لوگوں کو تعجب ہوا تو آپ نے فرمایا، میں ستر برس تک دنیوی حجابات میں رہا ہوں۔ صرف چار سال سے مشاہدہ حق میں مصروف ہوں۔ حجاب کا زمانہ شامل زندگی نہیں ہوتا۔

مشاہدہ۔ دل کے حاضر ہونے اور زبان کے قاصر ہو جانے کا نام ہے۔ یہی سبب ہے کہ خاموشی گفتگو سے بہتر ہوتی ہے۔ خاموشی علامت مشاہدہ ہے اور گفتگو شہادت مشاہدہ۔ شہادت اور مشاہدہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پیغمبر آخریں محمد ﷺ نے قربِ حق کے اس بلند مقام پر یعنی معراج میں فرمایا، میں تیری ثناء پر حاوی نہیں ہو سکتا (احاطہ نہیں کر سکتا) حضورؐ مقام مشاہدہ پر تھے اور مشاہدہ کمال اتحاد ہوتا ہے۔ اتحاد کے عالم میں زبان کو کام میں لانا اظہار بے گانگی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا، تو وہ ہے کہ میں اپنی ثناء آپ کر رہا ہوں، یعنی جو تو کہے وہ گویا میں نے کہا ہے۔

مراقبہ

ابلیس سے رخ پھیرنا، شرک وکفر کے کاموں سے بچنا، حق کی عبادت میں چست وچالاک ہونا، ماسویٰ سے کنارہ کر کے رب العزت کے طرف کامل توجہ کے ساتھ ذکر میں مشغول ہونا۔ "رقیب" اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

پس یوں جاننا چاہئے کہ میں جو کہتا ہوں اللہ سنتا ہے۔ میں جو کرتا ہوں اللہ دیکھتا ہے۔ میں جو سمجھتا ہوں اللہ جانتا ہے۔

بچانا اپنے دل کو غیر کے خطروں سے اور وساوس نفس وشیطان سے اور اپنے دل میں ان کو نہ آنے دینا اور یوں جاننا کہ اللہ حاضر وناظر سمیع علیم وبصیر ہے۔

حضرت میاں ولی جیؒ نے مراقبہ کے معنی اس طرح بیان فرمائے ہیں۔

مراقبہ کے دو معنی ہیں: ایک مراقبہ بمعنی محافظہ ہے۔ جو رقابة سے مشتق ہے جس کے معنی حفاظت کے ہیں۔ یعنی دل کو غیر حق کے خطروں سے بچا کر ذکرِ حق میں مشغول رکھنا اور حق کو اپنے پر آگاہ سمجھنا۔ یہ مراقبہ مبتدیوں کا ہے۔
دوسرا مراقبہ بمعنی مشاہدہ ہے جو رقوب سے مشتق ہے جس کے معنی دیکھنے کے ہیں یعنی ذات وصفات حق کے جمال اور جلال کے مشاہدہ میں ایسا مستغرق ہو کہ کوئی چیز یاد نہ آئے اور یہ مراقبہ منتہیوں کا ہے۔ اعضاء کے افعال کا دل کی پریشانیوں میں بھی صادر ہونا ممکن ہے۔ لیکن مراقبہ بغیر خلوت باطن کے بالکل ناممکن ہے۔ پس اے عزیز طالب حق کے لئے لازم ہے کہ

ہمیشہ مراقبہ میں رہے اور جو کچھ معاملہ وخواب میں دیکھے مرشد سے عرض کرے۔ اپنی خودی میں مغرور نہ ہو جائے۔

محرّم

اسلامی سال کا پہلا مہینہ محرم ہے، ہمیں چاہئے کہ ہر نئے سال کا استقبال اس طرح کریں جس طرح کہ ہم اپنے گھر آنے والے مہمان کا کرتے ہیں یعنی گھر کو پاک وصاف کرتے ہیں چیزوں کو سلیقے سے رکھتے ہیں بلکہ گھر کو سجاتے ہیں، گھر والے اچھے کپڑے پہن کر اس کا استقبال کرتے ہیں اور ایسی کوئی چیز ہونے نہیں دیتے جس سے مہمان کو تکلیف پہنچتی ہے یا اس کو ناگوار گزرتی ہے پس اسی طرح اسلامی سال کا آغاز جس مہینے سے ہوتا ہے اس کا استقبال ہم گناہوں سے اور اللہ سے غافل کرنے والی چیزوں کو ترک کرتے ہوئے، بری عادتوں اور فرسودہ بدعتوں سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے کریں، اس مہینہ کا استقبال اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اللہ کے دربار میں توبہ کرتے ہوئے کریں، کیونکہ اللہ نے فرمایا کہ، جس نے اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی پس وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اس کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اللہ کے مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ گیا تو اللہ اسکو دوزخ میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہیگا، اور اس میں اس کیلئے توہین آمیز عذاب بھی ہوگا، رسول اللہؐ نے فرمایا ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے، حضرت مہدی موعودؑ نے فرمایا، کہ مہدی کو اللہ نے اس وقت بھیجا جبکہ دنیا سے دین کا مقصد اٹھ گیا تھا، پھر فرمایا کہ دین کا مقصد تین باتوں سے اٹھ جاتا ہے، رسم، عادت، بدعت۔ اور جب مہدی ظاہر ہوگا تو وہ رسم، عادت اور بدعت کو دور کریگا۔ اور دین محمدؐ کو نصرت دیگا، جیسا کہ شرح مقاصد میں ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجھہ سے روایت ہے کہ مہدی (علیہ السلام) کسی بدعت کو مٹائے بغیر اور کسی سنت کو قائم کئے بغیر نہیں چھوڑے گا، اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ مہدیؑ کو اس وقت بھیجے گا جب کہ دنیا میں رسوم، عادات اور بدعات کی کثرت ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ سنتیں مٹتی چلی جائیں گی۔ کیونکہ جب ایک بدعت جنم لیتی ہے تو اسی وقت ایک سنت مٹ جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مہدی موعودؑ کی بعثت کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ مہدیؑ کے ذریعہ رسوم، عادات اور بدعات کو مٹائیگا، اور حضورؐ کی سنتوں کو زندہ فرمائیگا، چنانچہ حضرت مہدیؑ نے بارہا فرمایا "مذہب ما کتاب اللہ و اتباع محمد رسول اللہؐ" پس ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم جہاں تک ہو سکے بیجا رسوم، غلط عادتوں اور بیہودہ بدعتوں کو اپنی زندگی سے دور کریں اور اللہ کی کتاب قرآن مجید اور اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سنتوں کے مطابق زندگی بسر کریں۔

مراتب و مقام محمد رسول اللہ ﷺ

واضح ہو کہ اللہ کے بعد سب سے بڑا، اعلیٰ اور برتر مقام رسول اللہ ﷺ کا ہے، ویسے تو ہر رسول اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے جسکو اللہ تعالیٰ بندوں کی ہدایت کیلئے مبعوث فرماتا ہے تاکہ وہ اللہ کے حکم سے شرک وبت پرستی کی آلائشوں سے پاک کرے، اخلاق عالیہ کی تعلیم دے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے، بہتر معاشرہ کی تعمیر کرے، ظلم وعدوان کا خاتمہ کرتے ہوئے عدل وانصاف، بھائی چارگی، اخوت اور ایثار و قربانی کے بے بہا موتیوں کے زیور سے ان کو سنوارے اور سجائے۔ ہر رسول کا دائرہ عمل اور اختیار محدود ہوتا تھا لیکن ہمارے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کا دائرہ عمل پوری کائنات ہے۔اس لئے آپؐ میں یہ خوبیاں بدرجہ اُتم موجود تھیں۔

اس عظیم منصب کے لحاظ سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ رسول کا ہر قول و عمل معیار حق ہو۔وہ، مطاع مطلق ہو، اور یہ کہ وہ تنقید سے بالاتر ہو۔یعنی خدا کے رسول کی غیر مشروط اطاعت کرنا فرض ہے۔اور رسول کو حق و صداقت کی کسوٹی قرار دے۔ بعض لوگ جیسے اہل قرآن رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی حجیّت کے قائل نہیں ہیں، وہ رسول اللہؐ کو فقط 'پوسٹ مین ' (post man) کا درجہ دیتے ہیں۔

ہم ذیل میں رسول اللہ ﷺ کے مقامات اور آپؐ کے مراتب کا بیان قرآن ہی کی روشنی میں کریں گے۔

قرآن شریف کی چار آیتوں میں رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط اور مطلق اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہر بات حجت اور ماخذ قانون ہے۔خواہ وہ قرآن میں مذکور ہو یا نہ ہو۔ ان آیات میں سے چند آیتیں بطور مثال پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّـهِ ﴿النساء:٦٤﴾ ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ﴿النساء:٥٩﴾ ترجمہ: اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

(۳) اسی طرح سورۂ شعراء میں حضرت نوحؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کا یہ فرمان نقل ہوا ہے فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿الشعراء:۱۷۹، ۱۶۳، ۱۵۰، ۱۴۴، ۱۳۱، ۱۲۶، ۱۱۰، ۱۰۸﴾ یعنی اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

(۴)مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّـهَ ﴿النساء:۸۰﴾ جس نے رسول کی اطاعت کی حقیقت میں اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اتباع کے معنی پیروی کرنا، پیچھے چلنا۔

طاعت 'طوع' سے ہے اور طوع کے معنی دل کی خوشی سے کسی کا حکم ماننا، اور طوع کا ضد ہے "کرھاً" یعنی ناگواری اور مجبوری، تو اطاعت کرو رسولؐ کی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دل میں کسی قسم کی تنگی اور مجبوری کے بغیر خوشدلی اور پسندیدگی خاطر کے ساتھ رسول کی پیروی کرنا ہے۔ ان مذکورہ بالا آیتوں میں اللہ نے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ اللہ نے اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

اور چند آیتوں میں اللہ نے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے:

(۱) قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّـهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّـهُ ﴿آل عمران:۳۱﴾ آپؐ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اور پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کریگا۔

(۲)الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ ﴿الأعراف:۱۵۷﴾ وہی لوگ فلاح پاتے ہیں جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جس کا ذکر لکھا ہوا پاتے ہیں وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں۔

(۳)وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿الأعراف:۱۵۸﴾ رسولؐ کی فرمانبرداری کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

ان آیات میں اللہ نے صرف کتاب اللہ کی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط اور غیر مقید پیروی کا حکم دیا ہے۔ ان آیات کا مفہوم یہی ہے فلاح، نجات اور ہدایت کے موتی صرف رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے ہی مل سکتے ہیں، زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کے رسول کی اتباع کو لازمی و فرض گردانناضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور اطاعت کیوں ضروری ہے

اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں بلیغ پیرایہ میں دیا ہے۔ فرماتا ہے۔

(۱) لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّـهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّـهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّـهَ كَثِيرًا ﴿الأحزاب:۲۱﴾ بے شک اللہ کے رسول کی زندگی میں تمہارے لئے اچھا نمونہ ہے۔ یعنی ان لوگوں کیلئے جو اللہ کی خوشنودی اور روز آخرت (کے اجر) کی امید رکھتے ہیں اور یاد کرتے ہیں اللہ کو کثرت سے۔

(۲)قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ﴿الممتحنة:۴﴾ بے شک تمہارے لئے اچھا نمونہ ہے ابراھیمؑ کی زندگی میں اور ان لوگوں کی زندگیوں میں جو ان کے ساتھ ہیں۔

(۳)لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿الممتحنة:۶﴾ بے شک تمہارے لئے ابراھیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگیوں میں اچھا نمونہ ہے۔یعنی ان لوگوں کیلئے جو اللہ کی خوشنودی اور روز آخرت کے اجر کی امید رکھتے ہیں اور جو بھی ان سے منہ پھیرے تو اللہ ان کا محتاج نہیں ہے اور وہ تعریف کے لائق ہے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ قرآن میں امراء اور مومنین صالحین کی پیروی کا حکم بھی دیا گیا ہے، تو کیا وہ سب مطاع مطلق، معیار حق اور تنقید سے بالاتر ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امراء و صالحین مومنین کی ہدایت اور احکام قرآن و سنت کی صریح نصوص پر مبنی ہوں تو ان کی اطاعت، قرآن و سنت ہی کی اطاعت میں شمار ہو گی۔ لیکن اگر وہ ذاتی آراء استنباط اور اجتھاد پر مبنی ہوں تو ان سے اختلاف رائے کو قرآن میں جائز قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورہ نساء (۵۹) میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد یہ فرمایافَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ﴿النساء:۵۹﴾ یعنی اگر تمہارے درمیان تنازع اور اختلاف رائے واقع ہو جائے تو اسے اللہ اور اسکے رسول کی طرف لے آؤ۔

رسول اللہ ﷺ کا مقام اتنا بلند ہے کہ آپ کی اتباع شرط ایمان ہے۔

قرآن شریف کی ۱۷ آیتیں ایسی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کو شرط ایمان قرار دیا گیا ہے۔ ۱۶ آیات میں لفظ حکم کے ساتھ اور ایک آیت میں قضا کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو حکم دینے والا، قانون دینے والا اور فیصلہ دینے والا کہا گیا ہے۔ یعنی آپ کے حکم اور فیصلہ کو ماننا تقاضائے ایمان ہے اور خلاف ورزی کرنا منافیء ایمان ہے۔ خواہ وہ فیصلہ و قانون اور حکم صریحی طور پر قرآن میں موجود ہو یا نہ ہو۔

مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱)فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿النساء:۶۵﴾ تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کا حکم تسلیم نہ کریں، اس

معاملہ میں جو ان کے درمیان اختلاف کا باعث ہو پھر اپنے اپنے دلوں میں آپ کے حکم اور فیصلے کے بارے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور آپ کے حکم کو دل کی گہرائیوں سے نہ مان لیں۔

اس آیت کا مطلب یہی ہے کہ ہر معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو خوشدلی کے ساتھ ماننا ایمان کا تقاضا اور مطالبہ ہے، اور یہ تقاضا اتنا شدید ہے کہ اسکے بغیر کوئی مومن ہی نہیں ہو سکتا، اور یہ بات اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے اپنی قسم کھا کر کہہ رہا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کا انکار تو دور کی بات ہے آپ کی فیصلے کی صداقت کے بارے میں دل میں تنگی، تردّد اور معمولی سی خلش بھی ایمان کے سراسر خلاف ہے۔

(۲) إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّـهُ ﴿النساء:۱۰۵﴾ ہم نے آپ کی طرف (یہ) کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے تا کہ آپ، لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں، اس علم کے ساتھ جو اللہ نے آپ کو بتایا ہے۔

(۳) إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّـهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ﴿النور: ۵۱﴾ بے شک ایمان والوں کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں کہ ہم نے سنا اور ہم اطاعت کریں گے۔

اس آیت کے ذریعہ مومنوں کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول کی طرف ان کے کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے کیلئے بلایا جائے تو ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کا فیصلہ سننے کے بعد، کسی قسم کی تکرار، بحث، کسی سے مشورہ، حکم کی علت و حکمت طلب کئے بغیر بلا چوں و چرا سر تسلیم خم کریں۔ اس لئے کہ یہی ایمان کا تقاضہ ہے۔

(۴) پھر وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کیلئے تہدیدی حکم یہ بھی دیتا ہے کہ خبردار اللہ کے رسول کے حکم کی مخالفت سے ہمیشہ ڈرنا چاہئے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کے ان پر یا تو دنیا کی کوئی آفت یا آزمائش آ پڑے گی یا ان کو دردناک عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

چنانچ ارشاد ربانی ہے، فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿النور: ۶۳﴾ پس ڈرتے رہیں وہ لوگ جو رسولؐ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اس بات سے کہ ان پر کوئی دنیوی آفت آ پڑے یا ان کو دردناک عذاب آ پہنچے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے پاس حکم رسول کی کتنی اہمیت ہے، مخالفت امر رسول پر دنیاوی فتنہ یا

دردناک عذاب کی دھمکی جارہی ہے کیوں ؟ اس لئے کہ رسول کا حکم آپ کی ذاتی رائے پر مبنی نہیں ہوتا تھا بلکہ وحی الٰہی اسکی بنیاد ہوتی تھی، اب وحی خواہ متلو ہو جیسے قرآن یا وحی یا غیر متلو یعنی حدیث ہو لیکن بات جب حضور ﷺ کی مبارک زبان سے نکلتی ہے تو اس کا ماننا مومنین پر واجب ہے۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کو بھی کسی بات کا حکم دینے یا کسی کام سے روکنے کا پورا اختیار ہے۔ چناچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ ﴿الأعراف:۱۵۷﴾ رسولؐ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور ان کو برائی سے روکتا بھی ہے۔ سچی بات تو یہی ہے کہ نہ ہم کو بھلائی کی خبر ہے اور نہ برائی کی۔ ہمارے لئے بھلائی اور برائی کے علم کی بنیاد ہی اللہ اور اس کے رسول کی اجازت اور ممانعت ہے۔

(۶) اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو بھی کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا کامل اختیار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ ﴿الأعراف:۱۵۷﴾ اور وہ (رسولؐ) حلال کرتا ہے ان کیلئے پاکیزہ چیزوں کو اور حرام قرار دیتا ہے ان پر گندی چیزوں کو۔

(۷) حرام و حلال احکام کے سلسلہ میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کو اللہ یہود و نصاریٰ کا شعار بتاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ﴿التوبة:۲۹﴾ اور یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے۔

اوپر بیان کردہ دونوں آیتوں میں رسول ﷺ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ وہ جس چیز کو حلال قرار دیدیں وہ پاکیزہ اور حلال ہے اور جس چیز کو اللہ کا رسول حرام قرار دیدے وہ حرام ہو گی۔ خواہ اس کے حلال یا حرام ہونے کا ذکر وحی متلو یا وحی جلی یعنی قرآن شریف میں ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ گویا رسول اللہ ﷺ کو کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا غیر مشروط حق و اختیار دیا گیا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف میں مردوں کیلئے سونا پہننے کے جواز یا عدم جواز کے تعلق سے کوئی نص نہیں ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مردوں کیلئے سونا پہننا حرام قرار دیا ہے۔ پس دنیا بھر کے مسلمان اسی پر اپنا عقیدہ رکھتے ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کیلئے حضور ﷺ نے ریشم کا لباس حرام قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن میں اس کے تعلق سے کوئی صراحت نہیں ہے، پس تمام مسلمان مرد صرف آنحضرت ﷺ کے حکم پر ہی ایمان لاتے ہوئے ریشم کے کپڑوں اور سونے کے زیور کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ ہادی مطلق ہیں جیسا کہ اور انبیاء اپنے زمانوں میں اپنی اپنی امت کیلئے ہادی تھے۔

(۱) چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد سے خطاب کرتے ہوئے فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿مریم:۴۳﴾ میری پیروی کرو تاکہ میں تمہیں سیدھا راستہ دکھاؤں۔

(۲) وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا ﴿الأنبياء:۷۳﴾ اور ہم نے ان انبیاء کو رہنما بنایا تھا جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) رہنمائی کرتے تھے۔

(۳) وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿الشوریٰ:۵۲﴾ اور یقیناً آپ لوگوں کو سیدھا راستہ بتاتے ہیں۔

(۴) فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوا ﴿التغابن:۶﴾ پس انہوں کہا کیا بشر ہم کو ہدایت دیتے ہیں، انہوں نے کفر کیا اور منہ پھیر لیا۔

(۵) وَأَهْدِيَكَ إِلَىٰ رَبِّكَ ﴿النازیات ۱۹﴾ اور میں تجھے (اے فرعون) تیرے پروردگار کیطرف رہنمائی کرتا ہوں۔

ان آیات میں نبیؐ اور رسولؐ کا فرض منصبی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ہر معاملے میں انسان کی رہنمائی کرے، اچھی باتوں کا حکم دے اور ناپسندیدہ امور سے منع کرے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس ضمن میں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جب ہر نبی کا فرض منصبی تمام انسانوں کی رہبری کرنا ہے تو اللہ نے قرآن شریف میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے یہ کیوں فرمایا إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَـٰكِنَّ اللَّـهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿القصص:۵۶﴾ تو جسے چاہے اسے ہدایت نہیں دے سکتا بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہدایت کے دو مفہوم ہوتے (۱) اراءۃ الطریق یعنی راستہ دکھانا (۲) ایصال الی المطلوب یعنی منزل پر پہچانا

اس آیت میں نفی دوسرے مفہوم کی ہے نہ کہ پہلے کی۔ مطلب یہ کہ اے رسولؐ آپؐ کا فرض منصبی ہی یہ ہے کہ آپ تمام دنیا کو (ہدایت کا) راستہ دکھائیں۔ تو آپؐ تو وہ کام کر بھی سکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔ لیکن اگر آپؐ کسی کی محبت میں یہ

چاہیں کہ ضرور وہ آپ کی بات کو مان کر ہدایت حاصل کرلے یعنی منزل مقصود کو پہنچ جائے تو یہ چیز صرف اللہ کی مشیئت پر موقوف ہے۔یعنی لوگوں تک حق وہدایت کی آواز کو ان کے کانوں تک آپؐ پہنچاسکتے ہیں لیکن اس بات کو دلوں میں اتارنا یہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے یعنی ہر چیز پر اللہ کی مشیت ہی غالب ہوتی ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے محبوب چچا ابوطالب کا آخری وقت آپہنچا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے، آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس آخری وقت میں آپ ان کو حق کی تفہیم کریں تاکہ مشرکین مکہ کی جانب سے کئے جانے والے مظالم کے مقابلہ میں ابوطالب نے جو آپ کی حمایت کی تھی اس کا بہترین معاوضہ بشکل ایمان ان کو عطا کردیں۔اس غرض سے آنحضرت ﷺ نے ابوطالب کو ایمان کی دعوت دی۔ابوطالب نے پوچھا کہ ”میرے باپ دادا وغیرہ کہاں ہیں؟، آپؐ نے فرمایا”نار میں“تو ابوطالب نے جواب دیا کہ ”میں عار کو بمقابلہ نار پسند کرتا ہوں“ یعنی میں آپ کی بات کو مان کر اسلام قبول کرلوں گا تو قریش کی عورتیں میرے بعد یہ کہیں گی کہ ابوطالب جیا تو آزاد لیکن مرتے وقت بھتیجہ کا کلمہ پڑھ کر مرا۔تو میں اس کو پسند نہیں کرتا اس کے مقابلہ میں نار پسند ہے“اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ اے رسولؐ آپ اپنی محبت، تعلق اور لگاؤ کی بنیاد پر جو محض نسبی اور خاندانی ہے ان کو ہدایت دینا چاہیں گے تو وہ ممکن نہیں ہے۔ہاں اگر اللہ چاہے گا تو ہدایت دیگا۔تو اس آیت میں ”مشیئت ایزدی“ کو ہی ہدایت کی بنیاد بنایا گیا ہے۔رہی ہدایت بمعنی راستہ بتانا۔حق کی دعوت دینا تو وہ عام ہے اور آنحضرت ﷺ نے شروع سے ہی جس طرح دوسروں کو ہدایت کی دعوت دی تھی، اسی طرح ابوطالب کو بھی آپؐ نے دی تھی۔لیکن ابوطالب نے اس کو نہ مانا اور آخری وقت پر بھی ابوطالب کا جواب آنحضرت ﷺ کے لئے مایوس کن تھا۔تو اللہ نے رسول اللہ ﷺ کی تسلی کیلئے اور آپؐ کا دل رکھنے کی غرض سے ارشاد فرمایا۔اس میں آپ کی ناکامی نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود میری مشیئت یہ تھی کہ وہ اسلام وایمان کو قبول نہ کریں۔

آنحضرت ﷺ کا مرتبہ عظمیٰ یہ بھی تھا کہ آپؐ کتاب وحکمت کے معلم تھے

چناچہ ارشاد ربانی تعالیٰ ہے۔

(۱) كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿البقرۃ:۱۵۱﴾ جیسا کہ ہم نے بھیجا تمہارے درمیان تمہیں میں سے ایک رسول جو پڑھتا ہے تمہارے سامنے ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور تعلیم دیتا ہے تم کو کتاب وحکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تم کو ان باتوں کی جن کو تم نہیں جانتے تھے۔

(۲) لَقَدْ مَنَّ اللَّـــــهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُـــولًا مِّنْ أَنفُسِـــهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴿آل عمران:۱۶۴﴾ اللہ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا جب کہ اس نے ان کے درمیان انہیں میں سے ایک رسول کو بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

(۳) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی شان، مقام، مرتبہ اور آپ کا منصب اس طرح بیان فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُـــولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَـلَالٍ مُّبِينٍ ﴿الجمعة:۲﴾ وہی اللہ ہے جس نے انپڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسولؐ بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انکو پاک کرتا ہے اور انکو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک یہ لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی کا شکار تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے منصبوں میں ایک اہم منصب قرآن شریف اور وحی الٰہی کی تشریح اور تبیین ہے۔

یعنی کھول کھول کر بیان کرنا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴿النحل:۴۴﴾ اور ہم نے تیری جانب نصیحت (قرآن) اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے سامنے اس کو کھول کر بیان کرے تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بلاغ سے مراد صرف آیات قرآنی پہنچانا نہیں ہے بلکہ خدا کے طرف سے آپؐ کو آئے ہوئے ہر قسم کا پیغام ہے خواہ وہ وحی جلی یعنی قرآنی آیات ہو یا وحی خفی یعنی حدیث رسولؐ۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کا ہر پیغام، ہر عمل اور ہر بیان واجب التصدیق اور لازم العمل ہے، آپؐ کے کسی پیغام اور فرمان کے تعلق سے یہ سوال کہ اس کا وجود یا اس کی اصل قرآن میں بھی ہے یا نہیں، ایک مہمل سوال ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے آئندہ زمانے میں ہونے والے کئی واقعات کا اظہار فرمایا ہے، من جملہ ان کے حضرت مہدیؑ کی بعثت اور حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے واقعات ہیں۔ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے ان کے بارے میں کج کاوی یا شکوک و شبہات کا اظہار ایمان کے ضعف کی علامت ہے۔

نیز قرآن میں گیارہ (۱۱) آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا رسولؐ، صرف رسولؐ ہی نہیں بلکہ رسول مبیّن ہے یعنی اس پیغام کی تشریح کرنے والا رسولؐ جو اللہ کی جانب سے اس کے پاس آیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن میں اللہ کے رسول کو نذیر، اور نذیر مبین بھی کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی

(۱)وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿الدخان:۱۳﴾یعنی بے شک آ گیا ان کے پاس کھول کر بیان کرنے والا رسول۔

(۲)وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿الحجر:۸۹﴾کہہ دو کہ میں تو کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔

شاہد

نیز قرآن شریف میں نبی کریم ﷺ کو شاہد اور شہید بھی کہا گیا ہے یعنی بیان کرنے والا، گواہی دینے والا، اطلاع دینے والا۔ چناچہ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں "والشهادة قول صادر عن علم حصل بشهادة بصيرة او بصر" شہادت ہر اس قول کو کہتے ہیں جو بصیرت یا مشاہدہ پر مبنی ہو (مفردات القرآن، ص۲۶۹) مختار الصحاحه میں ہے "الشهادة خبر قاطع" یعنی شہادت قطعی خبر کو کہتے ہیں (ص۳۴۹)

اللہ نے رسول ؐ کو شاہد کے نام سے یاد کیا ہے چناچہ فرماتا ہے

(۱)يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا﴿الأحزاب:۴۵﴾اے نبی ہم نے تم کو حق کی گواہی دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔

(۲)إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا﴿الفتح:۸﴾ہم نے تمہاری طرف ایک شاہد کو بھیجا ہے۔

(۳)إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ ﴿المزمل:۱۵﴾ہم نے ہی بھیجا ہے تمہاری طرف رسول جو تم پر گواہ ہے۔

حضور ﷺ کا ایک منصب آپ کا داعي الي الله ہونا بھی ہے

قرآن شریف کی سترہ آیتوں میں حضور ﷺ کو داعی الی اللہ کہا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ داعی الی اللہ کی حیثیت سے جو حکم بھی آپ ؐ نے دیا اور جو ہدایت بھی آپ ؐ نے دی ہے وہ آپ ؐ کی امت کے حق میں خصوصًا اور عام انسانوں کیلئے عمومًا وحی خداوندی پر مبنی ہونے کی وجہ سے واجب التسلیم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ - إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴿النجم:۳،۴﴾اور نبی اپنی ذاتی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ ان کی ہر بات وحی (الٰہی) ہوتی ہے۔

اور آپ داعی الی اللہ ہیں اسکی گواہی خود اللہ نے دی ہے۔ ارشاد ربانیوَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ ﴿الأحزاب:۴۶﴾یعنی اللہ کیطرف بلانے والا اسی کے حکم سے

مذکّر

مذکر بھی رسول اللہ ﷺ کا منصب ہے چنانچہ ارشاد ہے فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿الغاشیة:۲۱﴾ یعنی پس یاد دہانی کرتے رہو بے شک آپ یاد دہانی کرنے والے ہیں۔

البینۃ

آپ کا مقام و مرتبہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی جانب سے روشن دلیل ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿البینة:۱﴾ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ منکر تھے وہ باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس آگئی کھلی دلیل یعنی اللہ کا رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا رسولؐ کھلی دلیل ہوتا ہے منجانب اللہ۔

البرہان

یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا اعلیٰ مقام ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے، يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿النساء:۱۷۴﴾ اے لوگو بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حجت اور سند آچکی ہے اور ہم نے نازل کی تمہاری طرف کھلی اور واضح روشنی۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں "برہان" اور "نور مبین" سے قرآن کریم ہی مراد ہے۔ لیکن مناسب بات وہ ہے جو ابن جریر نے تفسیر میں لکھی ہے "و هو محمد جعل الله عليكم حجة قطع بها عذركم (تفسیر ابن جریر جلد ۶، ص ۳۹)

برہان سے مراد محمد ﷺ ہیں جن کو اللہ نے تم پر حجت بنا کر بھیجا ہے جس سے اس نے تمہارے بہانوں کی بیخ کنی فرمادی۔ یعنی اتمام حجت کیلئے اللہ نے معلم کتاب کو بطور حجت اور سند مبعوث فرمایا پھر کھلی اور واضح روشنی یعنی قرآن بھی نازل کیا۔ ترتیب کے اعتبار سے بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اللہ کا رسول بطور سند اور حجت آیا اور پھر اس پر اللہ کا نور یعنی قرآن شریف نازل کیا گیا۔

نور اور سراج منیر

رسول اللہ ﷺ کی بعثت بحیثیت نور اور سراج منیر کی بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے، قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّـهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ﴿المائدة:۱۵﴾ بے شک آگئے تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور کتاب مبین۔ اور ارشاد ہوا وَدَاعِيًا إِلَى

اللّٰہِ بِإِذْنِہِ وَسِرَاجًا مُّنِیرًا ﴿الأحزاب:۴۶﴾ اور بھیجا ہم نے آپ کو اللہ کی طرف بلانے والا اسکے حکم سے اور روشن چراغ یا چمکتا ہوا سورج بنا کر۔

پہلی آیت میں بعض مفسرین نے نور اور کتاب مبین کے ایک ہی معنی یعنی قرآن لیتے ہوئے کہا کہ کتاب مبین، نور کی تفسیر ہے اور کہتے ہیں کہ کبھی "واو" تفسیر کیلئے بھی آتا ہے۔ لیکن حرف عطف کا تقاضہ یہی ہے کہ معطوف جدا معنی رکھتا ہو معطوف علیہ سے یعنی معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہو یعنی دونوں الگ الگ ہوں۔ چناچہ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے "وبنور محمد الذی أنار اللہ به الحق و اظهر به الاسلام ومحق به الشرك فهو نور لمن استنار به" (تفسیر ابن جریر) نور سے مراد محمد ﷺ ہیں جن کی وجہ سے اللہ نے حق کو روشن اور اسلام کو غالب کیا اور شرک کو مٹایا، پس محمد روشنی اور اجالا ہیں ہر اس شخص کیلئے جو آپؐ سے روشنی حاصل کرنا چاہتا ہو۔

بشیر و مبشر

قرآن شریف کی ستائیس آیتوں میں رسول اللہ ﷺ کو بشیر و مبشر کے نام سے یاد کیا گیا ہے یعنی خوشخبری سنانے والا اور بشارتیں دینے والا۔ بشیر و مبشر کا ذکر مطلق ہوا ہے پس اس میں قرآنی بشارتیں بھی شامل ہیں اور قرآن کے علاوہ دیگر بشارتیں بھی شامل ہیں۔ جیسے حضرت مہدیؑ کا خروج اور حضرت عیسیٰؑ کا نزول وغیرہ۔

نذیر اور منذر

قرآن شریف میں ۹۶ مقامات پر رسول اللہ ﷺ کو نذیر اور منذر کا نام دیا گیا ہے۔ نذیر اور منذر کے معنی ڈرانے والے کے ہیں اور عذاب کی خبر دینے والے کے ہیں۔ عام ازیں کے وہ خبر قرآن شریف میں مذکور ہو کہ نہ ہو۔ اس عموم مطلق کا تقاضہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعمال سیّئہ، کفر و شرک کی مذمت، کفار و مشرکین و منافقین و فاسقین کی تعذیب سے متعلق جو ارشاد فرمائے ہیں وہ بھی من جانب اللہ ہیں یعنی ان کی بنیاد بھی وحی الٰہی ہے۔ اس لئے کہ خدا کا نبی اپنی خواہش اور اپنی رائے سے نہ حکم شرعی بیان کرتا ہے اور نہ حکم اخروی۔ یعنی ثواب و عذاب۔

رحمۃ للعالمین

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے حق میں فرمایا وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿الأنبیاء:۱۰۷﴾

رسول اللہ ﷺ کے رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی تعلیمات، آپؐ کی شریعت، آپؐ کے فرامین و احکام،

آپ ؐ کی سنت اللہ کی رحمت ہے۔ آیت میں بالخصوص مومنین کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ تمام عالموں کیلئے رحمت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگر یہاں یہ سوال ہو کہ جب آپ ؐ تمام عالموں کیلئے رحمت ہیں تو پھر دنیا کے اکثر حصوں میں زحمت، تکلیف، عناد، فساد، لڑائی جھگڑے، خون خرابہ، ظلم وستم اور دیگر جرائم کیوں پرورش پا رہے ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ رحمت محمدیہ، سیرت نبویہ، اور سیرت طیبہ کی برکات سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو نا صرف صدق دل سے مانتے ہوں بلکہ آپ ؐ کی تعلیمات اور آپ ؐ کے اقوال، افعال اور احوال کو اپنے پیش نظر رکھ کر اس پر عمل بھی کرتے ہوں۔ اور جنھوں نے آپ ؐ کی نہ تصدیق کی اور نہ آپ ؐ کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا، اللہ کی رحمت انکو کس طرح فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس کی مثال علامہ حافظ ابن قیم نے اس طرح دی ہے

"کما یقال ھذا دواء لھذا المرض فاذا لم یستعملہ لم یخرج عن ان یکون دواء لھذا المرض" (جلاء الفہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام، ص۹۹) جیسا کہا جاتا ہے "یہ چیز اس مرض کی دوا ہے تو جو شخص اس دوا کو استعمال نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس مرض کی دوا نہیں ہے"

اس طرح علامہ آلوسی لکھتے ہیں "انہ علیہ السلام ارسل بما ھو سبب لسعادۃ الدارین ومصلحۃ النشائتین الّا ان الکافر فوّت علی نفسہ الانتفاع بذلك و اعرض لفساد استعدادہ عما ھناك فلا یضر ذالك في کونہ ارسل رحمۃ بالنسبۃ الیہ ایضا کما لا یضر في کون العین العذبۃ مثلًا نافعۃ عدم انتفاع الکسلان لکسلہ (روح المعانی جلد۷ اص۱۰۴) نبی کریم ﷺ ایسی شریعت دیکر بھیجے گئے جو دونوں جہاں کی سعادت اور مصلحت کے حصول کا ذریعہ ہے اگر کافر اپنے آپ کو اس کے فوائد سے خود کو محروم کر رکھا ہے اور اپنی استعداد کو بگاڑ کر ان برکات سے روگردانی کی ہے جو اس شریعت میں موجود ہیں پس یہ اعراض اور فساد استعداد رسول اللہ ﷺ کے رحمت ہونے کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ جیسے کہ میٹھے پانی کے چشمہ کے نفع بخش ہونے کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ کوئی سست ہمت اور کاہل اپنی کاہلی سے اس چشمہ سے اپنی پیاس نہیں بجھاتا۔

حضور محمد مصطفیٰ ﷺ نہ صرف نبی ہیں بلکہ امام الانبیاء ہیں خاتم النبیین ہیں خاتم الشرائع ہیں اور افضل المرسلین ہیں۔ اگر آپ ؐ کی تشریف آوری نہ ہوتی تو یہ جہاں نہ علم نافع سے مانوس ہوتا، نہ عمل صالح سے باخبر ہوتا۔ نہ معیشت و معاشرت درست ہوتی اور نہ نظام مملکت و حکومت صحیح ہوتا۔ لوگ جانوروں، خونخوار درندوں کی طرح بے حس اور سنگ دل مخلوق بن کر رہ جاتے۔ اچھائی، برائی، نیک وبد، خوب و ناخوب، خیر و شر میں تمیز ہی نہ ہوتی۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے آداب و

اخلاق پر بہار آئی۔ انسانیت کے چمن پر نکھار آیا، محبت، اخوت، بھائی چارگی، اخلاص، صبر، ایثار و قربانی، رعایت و مروت کی تعلیم عام ہوئی۔ حضور ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرائی ہی کے یہ سب برکات ہیں۔ لیکن حضور ﷺ کی تعلیمات سے جب دوری ہونے لگی تو برائیاں جنم لینے لگیں، ایسا اس لئے ہوا اور ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا کہ یہ عالم ایک جسم ہے اور اس کی روح نبوت ہے۔ یہ جسم بغیر روح کے قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ جو اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے "آسمان پھٹ جائیگا اس کے ستارے بکھر جائیں گے، اس کا سورج لپیٹ دیا جائیگا، اس کا چاند ڈوب جائیگا، پہاڑ اڑا دئے جائیں گے، زمین میں زلزلہ آجائیگا، لوگ ہلاک ہو جائیں گے، سمندر جوش مارنے لگیگا۔" اس کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ یہ قیامت کے قریب ہوگا، اور قیامت کیا ہے؟ قیامت یہی تو ہے کہ لوگ قرآن کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے دور ہو جائیں گے۔ اور امت کو ہلاکت سے بچانے کیلئے ہی رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی تھی "وہ امت کیسے ہلاک ہوگی جس کے اول میں ہوں، درمیان میں مہدی ہیں اور آخر میں عیسیٰؑ ہیں" حضور ﷺ کے فرمان کا مطلب تو یہی تھا کہ مؤخر الذکر دونوں حضرات شرع محمدی کی پابندی کرتے ہوئے امت کو شرع مصطفیٰ کی پاسداری اور نگہبانی کرنے کی تعلیم دینے والے ہیں۔

مجدد

مجدد کی معنی تجدید کرنے والے کے ہیں، دین کو تجدید کرنے والے کو "مجدد دین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ابو داؤد میں جو حدیث آئی ہے وہ اسی کے تعلق سے ہے، حدیث کے الفاظ ہیں۔"ان اللہ یبعث لھذہ الأمة علی راس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا"(ترجمہ: تحقیق اللہ تعالیٰ اٹھائیگا اس امت کیلئے ہر سو برس کے سرے پر ایسے شخص کو جو اس امت کے دین کو تازہ کریگا۔)

اس حدیث کی بنیاد پر معترضین یہ کہتے ہیں زیادہ سے زیادہ سید محمد "مجدد دین" ہوسکتے ہیں۔ مہدی موعودؑ نہیں۔ حالانکہ ہم اس حدیث کو اپنے مذہب کی دلیل ہی نہیں بناتے۔ زیادہ سے زیادہ اس حدیث کو بتقدیر صحت خبر واحد کہہ سکتے ہیں اور اخبار آحاد کا جو حکم ہے اس خبر واحد کا بھی وہی حکم ہے۔

یہ خبر واحد تو ہے ہی لیکن اس سے جو امر ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر صدی کے سرے پر مجدد دین کا پیدا ہونا ہے گویا ہر زمانے میں ایک مجدد دین پیدا ہوگا، اس طرح مختلف زمانوں میں مجدد دین پیدا ہوتے رہیں گے جو لازماً متعدد بھی ہوں گے۔ اس میں مہدیؑ کی بعثت کا کوئی ذکر نہیں ہے، صرف ہر زمانے میں ایک مجدد دین کے پیدا ہونے کا ذکر ہے اور جہاں احادیث میں جو متواتر المعنی ہیں، مہدیؑ کا ذکر آیا ہے، وہاں مجدد دین کا ذکر تک نہیں ہے۔ گویا مہدیؑ والی حدیثیں جو سینکڑوں کی تعداد میں "تواتر" کے ساتھ آئی ہیں ان کے مقابلہ میں "مجدد دین" والی خبر واحد کو لانا دین کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے برابر ہے۔

نیز مجدد دین اور مہدیؑ میں جو واضح فرق ہے اس کو نظر کے سامنے رکھیں تو مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلا اور بڑا فرق یہ ہے کہ باتفاق اہل سنت و اہل تشیع امام مہدیؑ معصوم عن الخطا ہیں اور مجدد کیلئے معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے جن بزرگوں کو مجدد مانا ہے ان میں سے کوئی بھی مجدد کے معصوم عن الخطا ہونے کا قائل نہیں ہے۔
دوسرا یہ کہ امام مہدیؑ کے خلیفۃ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے تابع تام ہونے اور کامل طور پر آپ کے نقش قدم پر چلنے کی صراحت آئی ہے لیکن کسی مجدد کا خلیفۃ اللہ یا تابع تام رسول اللہ ﷺ یا نقش قدم رسول اللہ ﷺ پر چلنے والا ہونا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے نہ یہ کسی حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ مجدد خلیفۃ اللہ ہو گا۔
تیسرا یہ کہ اہل سنت کے نزدیک امام مہدیؑ کی ذات اقدس خلیفۃ اللہ، ملہَم من اللہ (بلا واسطہ) اور معصوم عن الخطا ہونے کے اعتبار سے مجتھدین سے بھی اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ مجدد دین کا یہ مقام و مرتبہ نہیں ہے۔

چوتھا یہ کہ امام مہدیؑ کی ذات محققین صوفیاء کرام کے نزدیک حسب صراحت احادیث خاتم دین یعنی خاتم ولایت محمدیہ اور خاتم الاولیاء ہے۔ مجدّدِ دین کو یہ منصب حاصل نہیں ہے۔ اور کسی حدیث میں ایسی صراحت ان کے تعلق سے نہیں ہے۔

پانچواں یہ کہ مہدیؑ کا وجود احادیث شریفہ کی موجودگی میں اشراط وعلامات قیامت اور ضروریات دین سے ہے؛ لیکن کسی مجدد کا وجود ضروریات دین سے نہیں ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ امام مہدیؑ پر ایمان لانا ضروری اور آپؑ کا انکار کرنا بفحوائے حدیث رسول اللہ ﷺ "من أنكر المهدي فقد كفر" کفر ہے، مگر کسی مجدد کا ماننا یا اسکی تصدیق کرنا ضروری نہیں ہے اور نہ اس کے انکار کرنے والے پر کوئی حکم عائد ہو سکتا ہے۔

ساتویں بات یہ ہے کہ مجدد کیلئے کوئی خاص معیار، قابلیت یا خصوصیت نہیں ہے، ہر مجتھد، عالم وہر مصلح اپنے زمانے کا مجدد ہو سکتا ہے۔ اس کیلئے مجدد ہونے کا دعوی کرنا بھی شرط نہیں ہے، جن لوگوں کو بزرگوں نے مجدد مانا ہے ان میں سے بہت کم بزرگوں نے خود اپنے مجدد ہونے کا دعوی کیا ہے بلکہ دوسرے لوگوں نے جو ان کے ہم عصر تھے اپنی رائے اور قیاس کی بناء پر ان کو مجدد قرار دیا ہے۔ چنانچہ سراج المنیر شرح جامع الصغیر میں مجدد والی حدیث کی شرح میں لکھا ہے "قال ابن كثير و قد ادعىٰ كل قوم في امامهم انه المراد بذلك والظاهر حمله العلماء من كل طائفة قال العلقمي معني التجديد احياء ما اندرس من العمل بالكتاب و السـنة و الامر بمقتضـهما واعلم ان المجدد انما هو بغلبة الظن بقرائن احواله و الانتفاع بعمله" ابن کثیر نے کہا کہ ہر جماعت نے پانے امام کے متعلق دعوی کیا ہے کہ مجدد سے وہی مراد ہے اور ظاہر ہے کہ ہر جماعت کے علماء پر مجدد کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ علقمی نے کہا کہ تجدید سے مراد کتاب وسنت پر جو عمل مٹگیا ہو اس کو تازہ کرنا اور ان کے موافق حکم دینا ہے۔ معلوم ہو کہ مجدد کا اطلاق اس کے احوال کے قرائن اور اس کے عمل سے منتفع ہونے کے لحاظ سے ظن غالب پر مبنی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں اور ایک ہی مقام پر ایک سے زیاد اشخاص کو مجدد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابل امام مہدیؑ کی شان وعظمت اس سے ارفع و اعلیٰ ہے اور سب سے بڑی بات یہ بھی ہے کہ مجددیت کسبی ہے "منصب مہدیت 'وہبی' ہے" کسبی نہیں ہے۔ مہدیت کے منصب کیلئے دعوی کرنا شرط ہے، مجددیت کیلئے دعوی کرنا شرط نہیں ہے، لوگوں کے ظن، قیاس اور گمان غالب کی بناء پر کسی کو مجدد کہدیا جاتا ہے۔

ماھیت فرامین امامنا مہدی موعود علیہ السلام

نقل ہے کہ حضرت میراں سید محمد مہدی موعود علیہ السلام نے فرمایا

(۱)''ہمہ خلق خدائے رامی بیند امانمی شناسد''یعنی تمام مخلوق خدا کو دیکھتی ہے مگر پہچانتی نہیں۔

اس نقل شریف کی ماہیت یہ ہے کہ اللہ کا وجود، احکام، آثار واعیان سے ظاہر ہو چکا ہے۔ تمام لوگ احکام، آثار و اعیان دیکھ رہے ہیں لیکن حق کے وجود کو نہیں دیکھتے، کیوں؟ اس لئے کہ لوگوں کی نظر کثرت پر رہتی ہے، وجود حق پر نہیں رہتی۔ اسی لئے وہ حق سے حجاب میں ہیں۔ حالانکہ ہر کام اور حرکت اسی کی ذات کی بدولت ہے، اسکی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

ایک دانہ کو مٹی میں دبا دیا جاتا ہے، پھر پانی دیا جاتا ہے، پودا نکلتا ہے، کھاد ڈالی جاتی ہے، پودا بڑھتا ہے، پھر سر سبز ہوتا ہے، اور مضبوط ہوتا ہے۔ پھر شاخیں نکلتی ہے، پھل اور پھول لگتے ہیں، یہ سب دیکھتے ہیں اور ان چیزوں سے ہمہ اقسام کے فوائد بھی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جو ہستی ان سب چیزوں میں کار فرما ہے، وہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ خیال سے بھی اوجھل ہے۔ سبب اسکا یہ ہے کہ آدمی کثرت میں اتنا گم ہو گیا ہے کہ وحدت کی طرف نظر ہی نہیں جاتی۔ اسی کو غفلت کہا جاتا ہے۔ اور غفلت کو دور کرنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے۔ جب ذکر اللہ کثرت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور کبھی یہ بھی ہے کہ جب محبت زیادہ ہوتی ہے تو اسکا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ پھر وہ ہستی خواب میں نظر آتی ہے یا چشم قلب کو نظر آتی ہے۔ یا چشم سر سے اسکا دیدار ہوتا ہے۔

دیکھو حروف سیاہی سے بنتے ہیں، لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ ہم حروف تو پڑھ لیتے ہیں لیکن کبھی خیال میں بھی نہیں آتا کہ حروف سیاہی سے بنے ہیں مطلب یہی ہوا کہ دیکھتے تو ہیں لیکن پہچانتے نہیں چنانچہ ایک عارف اللہ کے الفاظ دیکھئے۔ وجود محض مطلق راہمہ جا، ہر زماں دیدم بہ ہر سوئے بہ ہر کوئے بہ ہر مظہر عیاں دیدم۔ ترجمہ: وجود محض، مطلق کو سب جگہ ہر وقت دیکھا، ہر سو، ہر گلی میں ہر مظہر میں عیاں دیکھا۔

(۲) حضرت مہدیؑ نے حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ سے فرمایا:''برادرم سید خوندمیر ما و شما ایک ذات و ایک وجود ہستیم، درمیان ما و شما ہیچ فرقے نیست''یعنی بھائی سید خوندمیر ہم اور تم ایک ذات اور ایک وجود ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں۔

پھر فرمایا"ایں بار امانت بر سر شما آمدہ است، ہوشیار باشید"یعنی امانت کا بار تمہارے سر پر آیا ہے، ہوشیار ہو

پھر فرمایا"شما را فنا در ذات بندہ است، بندہ و شما ہر دو ایک ذاتی ہستند، ہیچ فرقے نیست"یعنی تم کو بندے کی ذات میں فنا حاصل ہے، بندہ اور تم ہر دو ایک ذات ہیں، کچھ فرق نہیں ہے۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بندگی میاںؓ کو مہدی موعودؑ کی ذات میں فنائیت تامہ حاصل تھی۔ اسی لئے فرمایا"ہم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہاں ذہن میں برابری کا تصور بھی گناہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ برابری میں دو ذاتوں کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن فنائیت اس وقت نصیب ہوتی ہے، جبکہ ایک ذات دوسری ذات میں فنا ہو جائے۔ اسی لئے مہدی موعودؑ نے اپنی چوتھی صفت جو"قاتلوا وقتلوا"کی تھی، بندگی میاںؓ کے حوالے خدا کے حکم سے فرمائی، گویا بندگی میاںؓ سے جو امر قتال ہوا وہ اصل میں مہدی موعودؑ کی چوتھی صفت تھی۔ اس کا اظہار جب بندگی میاںؓ سے ہوا تو گویا اس کا اظہار مہدیؑ سے ہی ہوا۔ اس لئے کہ اس صفت میں بندگی میاںؓ بدلہ ٔذات مہدی علیہ السلام تھے۔

(۳) سر تاپا مسلمان

نقل ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بندگی میاںؓ نے حضرت مہدی موعودؑ سے عرض کیا کہ تمام عالم میں دو مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت مہدیؑ نے فرمایا'تم کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی، صدیق ولایتؓ نے عرض کیا، میرانجیؑ(آپؑ) سے معلوم ہوئی۔ حضرتؑ نے پوچھا کہ وہ دونوں کون ہیں۔ صدیق ولایتؓ نے عرض کیا۔ ایک محمد رسول اللہ ﷺ دوسرے مہدی مراد اللہؑ، حضرت مہدیؑ نے فرمایا۔ ہاں ایسا ہی ہے۔

اس نقل میں جو بات کہی گئی ہے اس سے مراد بینائی خدا ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ آدمؑ سر تک مسلمان تھے، اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمؑ کو نوع انسانی میں بینائی حق حاصل تھی۔ نوحؑ سینے تک مسلمان تھے اس کے معنی یہ ہیں کہ نوحؑ کو انسان اور حیوان میں بینائی حاصل تھی۔ ابراہیمؑ پہلوئے راست تک مسلمان تھے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ابراہیمؑ کو انسان، حیوان اور نباتات میں بینائی حاصل تھی۔ موسیٰؑ ہر دو پہلو تک مسلمان تھے اس کے معنی یہ ہے کہ موسیٰؑ کو انسان، حیوان، نباتات اور جمادات میں بینائی حاصل تھی۔ عیسیٰؑ ناف تک مسلمان تھے اس کے معنی یہ ہے کہ عیسیٰؑ کو انسان، حیوان، نباتات، جمادات اور عالم الملکوت میں بینائی حاصل تھی۔ حضرت خاتم الانبیاء وخاتم الاولیاء سر تاپا مسلمان تھے اس کے معنی یہ ہے کہ عرش سے فرش تک تمام اجسام و ارواح میں یعنی مظاہر الٰہیہ میں سے کسی مظہر کو بغیر بینائی خدا کے نہیں دیکھا اور نہیں پایا اور تمام چیزوں کو بجز

انوار ذات کے ملاحظہ نہیں فرمایا، تمام اشیاء میں حق کو دیکھا۔اس کی مثال اس طرح ہے، چاند پہلے دن آفتاب کے مقابل آتا ہے تو ایک حد تک روشن ہوتا ہے، پھر زیادہ مقابل دوسرے، تیسرے، چوتھے دن آتا ہے اسی قدر روشن ہوتا ہے یہاں تک کہ جب چودھویں رات آتی ہے تو وہ اس کے برابر مقابل آجاتا ہے "بدر" ہوجاتا ہے۔خاتمین کی مثال بدر کی ہے کہ آفتاب حقیقی سے روشن اور تاباں ہوجاتے ہیں اس لئے کہ خاتمین مظہر ذات اور مظہر جمیع اسماء اور صفات ہیں۔ دیگر تمام انبیاء صرف مظہر صفات ہیں، یعنی ان میں سے بعض مظہر جمال ہیں اور بعض مظہر جلال ہیں لیکن خاتم الانبیاء وخاتم الاولیاء مظہر اتم ہیں۔

(۴) ہر کہ خدا نہ شود خدائے رانہ بیند یعنی جو کہ خدا نہیں ہوتا، خدا کو نہیں دیکھتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن نہیں کہ مقید مطلق کو دیکھے، اس لئے کہ کسی چیز کی کمال معرفت اسی وقت میسر ہوتی ہے جب کہ وہ چیز اس کا عین ہوجائے "**لایعرف الله الا الله**" یعنی اللہ کو، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔

چناچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں

عارف حق آں بود کو حق شود   کے مقید واصل مطلق شود

عارفِ حق وہ ہے جو حق ہوجائے   مقید کس طرح "واصل مطلق" ہوسکے گا

مطلب یہ کہ جب تک ہستی اور خودی باقی ہے خدا کا دیدار نہیں ہوتا، جس دم خودی ختم ہوتی ہے اسی دم خدا سے وصال ہوتا ہے۔

ماھیت ظلوما جھولا

اللہ نے فرمایا "إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿الأحزاب:۷۲﴾ یعنی بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا پس انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا۔ اور اس سے ڈر گئے، پھر ایک انسان نے اسکو اٹھالیا، بے شک وہ ظلوم اور جھول ہے۔

حضرت مہدیؑ نے فرمایا انسان سے مراد حضرت سید خوندمیر ہیں۔ پس ظلوما سے مراد اپنی ہستی کو فنا کر دیا اور حق کے ساتھ باقی ہو گئے۔

جَهُولًا: جھل سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے اپنے دل کی لوح سے غیر کی صورت کے نقش کو دھو دیا، پس یہ ظلم اور جہل محمود ہے نہ کہ مذموم۔ واضح ہو کہ امانت سے مراد "عشق" ہے، نیز مہدیؑ نے فرمایا "امانت سے مراد بینائی خدا ہے۔ معلوم ہوا کہ عشق دو قسم کا ہے۔ ایک عشق مقید اور دوسرا عشق مطلق۔ ظہور مطلق کی ذات حق تعالیٰ ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے "العشق ھو اللہ"۔ لیکن جو عشق مقید ہوتا ہے وہ صفت نار سے موصوف ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے "العشق نار اللہ"۔ جو عشق غیر اللہ سے ہوتا ہے، اس کا انجام آگ پر ہی ہوتا ہے۔

(۱) چنانچہ پروانہ شمع کا عاشق ہے، جہاں شمع سلگتی ہے، پروانہ بے تحاشہ اسکی طرف دوڑتا ہے اور اس کے اطراف چکر لگاتا ہے۔ لیکن انجام اسکے قدموں میں راکھ ہو جاتا ہے۔

(۲) لوہا، مقناطیس کا عاشق ہوتا ہے، جہاں مقناطیس نظر آیا وہ اسکی طرف کھنچ کر اس سے چمٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کا انجام یہ کہ اسکو لوہار آگ کی بھٹی میں جلاتا ہے، پھر کوٹتا اور پیٹتا ہے اور چھری، چاقو، کدال، سبل، ریل کی پٹریاں، موٹر کے پہیے، عمارت کی تعمیر میں استعمال میں آنی والی چیزیں بنائی جاتی ہیں، غرض کہ اسکی قسمت میں، جلنا، بے تحاشہ مار کھانا، پیٹا جانا اور دوسروں کا بوجھ اٹھانا ہی لکھا ہے۔ اسلئے کہ اسکو مقناطیس سے محبت ہے۔

(۳) مچھلی کو محبت (عشق) پانی سے ہے۔ اس قدر کہ وہ چند لمحے پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پانی کے باہر اسکو نکال دیا جائے تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے۔ لیکن اسکی قسمت میں کیا ہے؟ اسے کانٹوں میں پھنسا کر پکڑا جاتا ہے، جال میں اسکو پھنسایا جاتا ہے، پھر پتھر پر اسکو رگڑا جاتا ہے، اسکے ٹکڑے کئے جاتے ہے، پھر اسے ہانڈی میں یا توے یا کڑھائی پر گرم آگ میں پکایا

جاتا ہے اور مزے لیکر کھایا جاتا ہے، لیکن ہماری اصل بات تو اپنی جگہ ہے کہ بالآخر اسے آگ پر سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔

ضمناً یہاں دو امور اور قابل غور ہیں

مچھلی کو پانی سے عشق ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے وہ معلوم ہو چکا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب مچھلی کھالی جاتی ہے اور پیٹ میں پہنچ جاتی ہے تو وہ اپنا اثر دکھاتی ہے یعنی مچھلی کھانے والے کو پیاس لگتی ہے اور اسے بار بار پانی پیناہی پڑتا ہے۔ اور اسکی دوسری خاصیت یہ ہے کہ یوں تو پانی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو بھی پاک کرتا ہے، لیکن مچھلی پانی میں رہنے کے باوجود، اس میں بدبو رہتی ہے، لاکھ اسکو پاک صاف کریں، راکھ میں اگر رگڑ رگڑ کر دھوڈالیں مگر بدبو تو اس میں رہتی ہی ہے۔ جس برتن میں اسے پکایا جاتا ہے اس برتن میں بدبو رہتی ہے، کھاتے ہیں تو ہاتھوں میں بدبو رہتی ہے، کھانے کے بعد جس گلاس سے پانی پیتے ہیں تو اس گلاس میں بھی بدبو معلوم ہوتی ہے۔

مناقب حضرت بندگیمیاں سید خوندمیرؓ

حضرت بندگی میاں سید خوندمیر بدلۂ ذات مہدی، صدیق ولایت حامل بار امانت رضی اللہ عنہ داماد و خلیفۂ امامناؑ، تولد ۸۸۵ھ یا ۸۸۶ھ، شہادت ۱۴ شوال المکرم ۹۳۰ھ بروز جمعہ مطابق ۱۵ آگسٹ ۱۵۲۴ء مدفن سدراسن، پٹن، چاپانیر (گجرات)۔

آپؓ کی سیرت، آپؓ کی حیات مبارکہ چار ادوار میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ایک دور امامناؑ کی ملاقات سے پہلے، دوسرا دور امامناؑ سے ملاقات کے بعد سے امامناؑ کی وفات تک، تیسرا دور مہدی موعودؑ کی وفات کے بعد سے وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا ﴿آل عمران: ۱۹۵﴾ (امر قتال واقع ہونے سے پہلے) تک، چوتھا دور وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا ﴿آل عمران: ۱۹۵﴾ کے کامل ظہور و وقوع تک۔

امامناؑ سے ملاقات سے پہلے کے حالات بتاتے ہیں کہ آپؓ دنیا سے بیزار تھے اور خدا کے طالب تھے ہمیشہ ذکر و فکر میں رہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کیلئے طالب مرشد تھے۔ آپؓ کو اسی غرض کی تکمیل کیلئے اس زمانے کے مشہور و معروف مرشدوں کے پاس بغرض بیعت لے جایا گیا لیکن آپؓ نے ان سے بیعت نہیں کی پہلے مودود چشتی کے پاس لیجایا گیا، انہوں نے کہا کہ آپ کا سلسلہ قادریہ ہے، میں ملک نصیر الدین مبارز الملک سے پوچھ کر آپ کو مرید کروں گا۔ تو میاںؓ نے اپنے ماموں سے فرمایا "ماموں یہ آج ملک نصیر الدین سے پوچھ کر مجھے مرید کرنے کی بات کرتے ہیں، شاید کل قیامت میں بھی یہ ان سے پوچھ کر میری شفاعت کریں گے"۔

دوسری مرتبہ حضرت شیخ احمد کھٹو کی مزار پر لیجایا گیا۔ وہاں کے پیر زادے نے سلسلہ لکھنا شروع کیا تو پہلے صاحب مزار کا نام لکھا، آپؓ کے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ ہم سب صاحب مزار کے مرید ہیں آپ بھی ان کے مرید ہوں گے، میاںؓ نے فرمایا مجھے مردہ نہیں زندہ پیر چاہئے تا کہ میری وقتاً فوقتاً رہ نمائی کرے اور مجھے خدا تک پہنچائے پھر مرید ہوئے بغیر آپؓ وہاں سے لوٹ گئے۔

تیسری مرتبہ ایک اور مرشد کے پاس لیجایا گیا انہوں نے ملک بخنؓ سے جو آپؓ کے ماموں تھے فرمایا، ماشاء اللہ جوان ہیں، خوبرو ہیں اور باڑی وال سے تعلق رکھتے ہیں، میں بادشاہ سے سفارش کر کے ان کو دربار میں اچھا منصب دلاؤں گا، یہ سن کر میاںؓ بھڑک اٹھے اور فرمایا ماموں خدا کی طلب میں یہاں آیا تھا۔ مگر یہاں تو بادشاہ کی اور دنیا کی بات کہی جارہی ہے۔ آپؓ وہاں سے بھی واپس ہو گئے۔

پھر جب آپؓ مہدی موعودؑ سے ملاقی ہوئے، نظریں دوچار ہوئیں تو آپؓ نے فرمایا "پھوٹ پڑے بندہ کی آنکھیں جو بندہ نے درمیان میں مہدی کو دیکھا، بندہ نے اپنے خدا کو دیکھا مہدی موعودؑ نے فرمایا "جو خدا ہو سو خدا کو دیکھے (تفصیل طویل ہے)

بعد میں جب بڑلی میں مہدیؑ نے دعویٰ ء موکد فرمایا تو آپؓ نے سب سے پہلے آمنا و صدقنا کہا، مہدی موعودؑ نے فرمایا "تم ہمارے صدیق ہو" مہدی موعودؑ نے کئی مواقع پر آپؓ کی نسبت ولایت کی طرف فرمائی ہے۔

(۱) مہدی موعودؑ نے فرمایا بھائی سید خوند میر شما با ستعداد تمام آمدہ بودید، چراغدان و فتیلہ و روغن موجود بود، اما ہمیں یک کار افروختن باقی ماندہ بود، اکنوں از چراغ ولایت محمدی روشن کردہ شد" ترجمہ: بھائی سید خوند میر تم تمام تیاری کے ساتھ آئے ہو، چراغ داں، بتی، تیل سب موجود تھا۔ لیکن جلانے کا ایک کام باقی رہ گیا تھا، اب چراغ ولایت محمدی سے روشن کر دیا گیا ہے۔

(۲) ذات شما قابلیت فیض ولایت بلا واسطہ می داشت کہ از خود روشن شود، فاما بواسطۂ مہدیؑ نور علی نور گشت۔ ترجمہ: آپ کی ذات بلا واسطہ ولایت کے فیض کی قابلیت رکھتی ہے کہ از خود روشن ہو جائے لیکن مہدیؑ کے واسطے سے نور علی نور ہو گئی

پدر نور و پسر نوریست مشہور ازیں جا فہم کن نور علی نور

(۳)مہدیؑ نے فرمایا "ذات شما سلطانا نصیرا، ناصر ولایت مصطفیٰ است۔ ترجمہ: تمہاری ذات سلطان نصیر ہے، ناصر ولایت مصطفیٰ ہے

(۴) بھائی سید خوندمیر شما اسد اللہ الغالب ولایت مصطفی ہستید۔ ترجمہ: بھائی سید خوندمیر تم اسد اللہ الغالب ولایت مصطفی ہو۔

(۵)ایں نور ولایت محمدی است (ﷺ) اولاً بر من آمدہ بعدہ بر شما آمد۔ یہ نور ولایت محمدی ہے (ﷺ) پہلے مجھ پر آیا اس کے بعد تم پر آیا۔

(۶)شمارا سیر در ولایت است تم کو ولایت میں سیر (حاصل) ہے

(۷)ایں بار ولایت است جز شما کسے برداشتن نتواند۔ یہ بار ولایت ہے تمہارے سوائے کوئی اسکو نہ اٹھا سکے گا۔

نیز مہدیؑ نے فرمایا: اگر تمام لشکر مشرق و مغرب بر شما آید روز اول از پیش شما بفرمان رب عز و جل بگریزد، و بروز دوم شہادت شود۔ یعنی مشرق و مغرب کا تمام لشکر آپ پر حملہ آور ہو، تو پہلے دن اللہ کے حکم سے تمہارے سامنے سے بھاگ جائیگا، اور دوسرے دن شہادت ہوگی۔

نیز فرمایا "برادرم سید خوندمیر آنجا کہ بار ولایت مصطفی آید سر جدا، تن جدا، و پوست جدا می شود یعنی اے میرے بھائی سید خوندمیر جس جگہ کہ مصطفی ﷺ کی ولایت کا بار آتا ہے سر جدا، تن جدا اور پوست جدا ہوتا ہے۔

حضرت مہدیؑ کے وصال کے دسویں دن حضرت بندگی میاںؓ بحکم مہدیؑ، حضرت ثانی مہدیؓ سے اجازت لیکر ہندوستان واپس تشریف لائے، پھر جب ثانی مہدیؓ حسب الحکم مہدیؑ فرہ مبارک سے ہندوستان تشریف لائے اور اسکی اطلاع بندگی میاںؓ کو ہوئی تو حضرت بندگی میاںؓ، حضرت ثانی مہدیؓ کی خدمت میں تشریف لائے اور آپ کے پاس ہی رہنے کی اجازت چاہی۔ حضرت ثانی مہدیؓ نے فرمایا کہ حضرت امامؑ نے جو بار آپ پر رکھا ہے وہ یہاں رہنے پر نہیں ہوگا، اسلئے آپ الگ ہی رہیں، نیز ثانی مہدیؓ نے تمام خلفاء کو الگ الگ دائرے بنا کر رہنے کا مشورہ دیا۔

۹۱۰ھ سے ۹۳۰ھ تک بندگی میاںؓ اپنے تن مبارک پر گویا مہدیؑ کا ہی سر رکھے ہوئے تھے یعنی مہدیؑ نے جو اپنا بار

(صفت چہارمی، قاتلوا و قتلوا کی ادائی) بندگی میاںؓ کے سرپر رکھا تھا اسی کو لئے ہوئے تھے۔ اور یہی فکر دامن گیر تھی کہ یہ صفت بحسن وخوبی ادا ہو جائے۔ حجت مہدیؑ پوری ہو جائے اس لئے کہ حضرت مہدیؑ نے فرمایا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو جانو کہ مہدی سچا تھا اور مہدی نے جو کچھ کہا تھا امر خداوندی سے کہا تھا

حضرت مہدیؑ کے وصال کے بعد سے میاںؓ کی شہادت تک ۲۰ سال کا عرصہ بندگی میاںؓ کیلئے بڑا کٹھن تھا۔ مشکلات، ہجرت، اخراج، ایذاء فی سبیل اللہ سے بھرا ہوا تھا۔ علماء سو اور مشائخ دنیا پرست، مسلسل آپؓ کے خلاف بادشاہان وقت کو بھڑکاتے، ورغلاتے اور نامعقول فتوے صادر کرتے ہوئے بے ضرر مہدویوں کو شہید کرواتے تھے۔ اس طرح بندگی میاںؓ پر عرصۂ حیات تنگ کرنے لگے تھے۔ پھر میاںؓ نے ان علماء سے ہی ان کے خلافِ شرع فتوؤں کے بارے میں فتوے طلب فرمائے۔ ان مفتیوں نے جو درحقیقت ''مفت خور'' تھے، مجبوراً حقیقت پسندی کے جذبہ کا اظہار فتوے کی شکل میں بس یہ دیا کہ ''قتل الموذي قبل الایذاء''۔ میاںؓ نے اس اجازت شرع کے تحت ظالموں اور قاتلوں سے قصاص لینا شروع کیا، جسکی علماء دنیا پرست تاب نہ لاسکے اور اب اس انداز میں بادشاہ کو بھڑکایا کہ اب بھی اگر میاں کی جانب سے آپ خاموشی اختیار کریں گے اور غفلت برتیں گے تو آپ کی بادشاہت اور حکومت کو ہی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ میاں کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے، گجرات کی دس تلواروں میں سے چھ تلواریں انکے عقید تمند ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پس بادشاہ وقت مظفر بے ظفر نے میاںؓ کے خلاف لشکر کشی کا حکم صادر کر دیا جس کا سربراہ عین الملک تھا۔

چوتھا دور میاںؓ کی جنگ اور شہادت کا تھا۔ بتاریخ ۹ شوال المکرم اتوار کے روز عین الملک نے میاں قاضی شاہ تاج حسینی کے ذریعہ حضرت صدیق ولایتؓ کو ایک تحریری پیغام بھیجا کہ ''آپ کھانبیل اور سدراسن ہی نہیں بلکہ سلطنت گجرات چھوڑ کر کسی اور ملک میں چلے جائیں ورنہ شاہی فوج سرپر آکھڑی ہو جائیگی اور تم لوگ ناحق مارے جاؤ گے، نیز میاںؓ کو قاضی شاہ تاج کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے مقابلے میں فقراء حزب اللہ ''آٹے میں نمک بھی نہیں'' تو بندگی میاں نے فرمایا"ان شاء اللہ آٹا اڑ جائے گا اور نمک رہ جائے گا، اسکے باوجود بندگی میاںؓ نے بشارت مہدیؑ کے بل پر عین الملک کو جوابا پیغام بھیجا، جو آب جواہر سے لوح دل پر لکھنے کے قابل ہے۔

''ان شاء اللہ ایسی شکست فاش دوں گا کہ بھاگتے بن نہیں پڑے، بلکہ پہلے روز مٹھی بھر فقیروں سے تمام فوج بھاگ جائے تو جان لو کہ مہدی موعودؑ سچے ہیں، یہ لشکر تو کیا اگر خود سلطان مظفر بھی چڑھ آئے تو شکست کھا کر فرار ہو جائے، پھر فرمایا۔ ایک مظفر تو کیا اگر سات مظفر بھی مل کر حملہ آور ہوں تب بھی بجز گریز کے کچھ چارہ نہ دیکھیں گے، بلکہ مشرق سے مغرب تک

تمام جہاں مقابلہ پر تل آئے تو بھی خدا کے حکم اور مہدی موعودؑ کے صدقہ سے پہلے روز بھگادوں گا اور ان شاء اللہ دوسری جنگ میں نام مہدیؑ پر فی سبیل اللہ اپنا سر قربان کرکے حسب بشارت حضرت مہدی موعودؑ تین جا دفن کیا جاؤں گا۔

حضرت صدیق ولایتؓ نے ۱۱ شوال منگل کے روز دائرہ عالیہ کے تمام مردوں اور عورتوں کو بلایا، قرآن پاک کا بیان کیا اور جو کچھ نصیحت و وصیت کرنے کی تھی کی، اس وقت دائرے کی بی بیوں نے عرض کیا، اب تو شہادت کا وقت آگیا ہے، ہمارے لئے آپ کیا فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا ''اللہ کا یہ فرمان ہورہا ہے، اے سید خوند میر تم اپنے اہل و عیال کو ہمارے دامن میں ڈال دو اور تم اپنی امانت ادا کرو۔'' اسلئے بندہ نے اپنے تمام اہل و عیال کو اللہ کے دامن میں رکھ دیا اور اسی کو سونپ دیا۔ بندہ یہ باتیں یقینی طور پر کہتا ہے کہ دشمن کے گھوڑے کے سم کی گرد بھی تم کو نہیں پہنچے گی اور اللہ تم کو دشمن کی زد سے محفوظ رکھے گا۔ تم کسی طرح کا غم اور افسوس نہ کرو، اگر ظالم تمہاری طرف آنے کا ارادہ کریں تو تم ان کی طرف مشت خاک ڈال دینا، جس سے اللہ ان کو مقہور کرڈالیگا۔ پھر آپؓ نے حاضرین سے فرمایا ''آؤ بیعت کرو، بیعت سے فارغ ہو کر عشاء کی نماز کے بعد آپ نے فقرائے حزب اللہ کو کبڈی کھیلنے کیلئے فرمایا، تمام رات کبڈی میں گذر گئی اور صبح ۱۲ شوال بروز چہار شنبہ ۹۳۰ھ بندگی میاںؓ مع فقراء ذکر اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دشمن کے ایک دستے نے آکر دائرہ کی باڑھ جلادی۔ اور بعض فقیروں کو تیروں سے زخمی کیا اس وقت آفتاب نکل چکا تھا، اس وقت بندگی میاںؓ اٹھے نعرۂ تسبیح بلند کرکے میدان جنگ کو روانہ ہوئے اور وہ دوہرا پڑھا جو مہدی موعودؑ پڑھا کرتے تھے،

جیتے تارے رین کے، ایتے وہری مج   دھڑ سولی، سیس کنگرے توئی نہ تجوے تج

یعنی جس قدر رات کے ستارے ہیں اتنے لوگ میرے دشمن ہو جائیں، میرا جسم دار پر اور سر حصار شہر کے کنگروں پر لٹکا دیا جائے تو بھی اے خدا میں تجھے ہر گز ہر گز نہ چھوڑوں گا

جب آپ نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تو آپ کے فرزند دلبند حضرت بندگی میاں سید محمود عرف سید نجیؒ (خاتم المرشدین) جن کی عمر چار سال یا سات سال کی تھی، اصرار کرنے لگے کہ ہم کو بھی ساتھ لے لو، آپؓ نے اپنے گھوڑے پر بچے کو بھی سوار کرلیا، کیا دیکھتے ہیں کہ دشمن کی فوج پر سکتہ طاری ہے، فوج دم بخود ہے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔۔ پھر میاںؓ نے فرزند سے فرمایا ''بیٹے جب تک تمہاری نظر لشکر پر ہے۔ لشکر کی کیا مجال کہ آگے بڑھے، پھر آپؓ نے فرزند کو دائرہ بھیج دیا، تب لشکر نے پیش قدمی کی۔ جب بندگی میاںؓ نے حضرت مہدی موعودؑ کی دی ہوئی تلوار ہاتھ میں لیکر میان سے کھینچی، صرف چار انگل تلوار نیام سے باہر آئی تھی کہ فرمان خدا ہوا کہ اوپر دیکھو۔ آپؓ نے دیکھا کہ تمام فرشتے اپنے اپنے ہاتھوں میں

چار چار انگل تلوار کھینچے ہوئے ہیں، حکم ہوا کہ یہ ہماری تلوار ہے، اگر یہ تلوار آج چل گئی تو کوئی زندہ نہ رہیگا، بندگی میاںؓ نے تلوار کو نیام میں رکھ لیا۔ برچھی ہاتھ میں لیکر بسم اللہ کہکر گھوڑے کو آگے بڑھایا، پھر جب کشتوں کے پشتے لگ گئے اور نیزہ بھی ٹوٹ گیا تو آپؓ نے کوڑا ہاتھ میں لیا اور اٹھارہ ہاتھیوں کو ایک ایک وار میں دودو ٹکڑے کئے، یہ منظر دیکھ کر دشمن کی فوج آٹھ ہزار لاشوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوگئی اور میاںؓ نے جو فرمایا تھا کہ "ان شاء اللہ آٹا اڑ جائیگا اور نمک باقی رہے گا" ایسا ہی ہوا۔

البتہ بھگوڑی فوج نے ان چالیس فقرائے حزب اللہ کو جنھیں بندگی میاںؓ نے دائرہ کے چھوٹے پھاٹک پر، ایک لکیر کھینچ کر اس تاکید کے ساتھ متعین فرمایا تھا کہ کسی حالت میں اس خط سے تجاوز نہ کریں۔ بھاگتے ہوئے شہید کر دیا۔

اس جنگ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ لشکر کے قلب میں گھس کرنے لڑنے والوں میں نہ کوئی سوار شہید ہوا اور نہ پیادہ۔

پھر ۱۴ شوال ۹۳۰ھ بروز جمعہ عین الملک نے دوبارہ فقرائے حزب اللہ پر سدراسن کے مقام پر حملہ کیا۔ اس جنگ دوم میں دشمن کی فوج میں سے چار سو اسلحہ دار مارے گئے اور مہدوی جانبازوں میں صرف ساٹھ سوار، پیدل ایک بھی نہیں شہید ہوئے (دفتر دوم)۔

جنگ دوم میں یہ بھی ہوا کہ فقراء حزب اللہ میں سے جو زخموں سے چور ہو جاتا تو وہ کسی بھی طرح اپنے آپ کو میاںؓ کے قدموں پر اپنی جان اللہ کے حوالے کرتا اس طرح بندگی میاںؓ کی شہادت کے بعد دیکھا گیا کہ اٹھارہ فدائیان بندگی میاںؓ کے سر کے بال حضرت سید الشہداءؓ کے پاؤں کے انگھوٹوں سے لپٹے ہوئے تھے۔

اس جنگ میں حضرت سید الشہداء کے بڑے فرزند دلبند قرۃ العین، حضرت بندگی میاں سید جلالؓ جو چودہ سال کے تھے، جنگ کرتے ہوئے لشکر عدو کے قلب میں گھس گئے، اس وقت آپ کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور عین الملک کے حکم سے ذبح کر دئے گئے۔ لیکن مجاہدین فی سبیل اللہ نے آپؓ کی لاش کو اٹھا کر بندگی میاںؓ کے قدموں میں ڈال دی۔ حضرت صدیق ولایتؓ شاہزادہ کی شہادت دیکھ کر سجدۂ شکرانہ ادا کیا اور کمال مسرت سے فرمانے لگے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے فرزند کا فدیہ دینا چاہا تو اس کے عوض دنبہ ذبح ہوا، یہاں خداوند کریم نے اپنے فضل و کرم سے بندہ کا ہدیہ بعینہ قبول فرمالیا۔

اس جنگ دوم میں آپؓ ضحیٰ کے وقت گھوڑے سے اتر کر جبکہ آپؓ زخموں سے چور چور ہو گئے تھے، فرش زمیں پر رو بہ قبلہ بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؓ کا سر مبارک جو ۲۷ سال پہلے پٹن شریف میں خدا کی نذر ہو چکا تھا اور آپؓ نے عصر، مغرب اور عشاء کی نماز بغیر سر کے پڑھی تھی، اب قدرت الٰہی سے جسم سے از خود جدا ہو گیا اور امانت مفوضہ حضور الٰہی میں پیش ہو گئی۔

عربی قطعہ: يا حامل الامانة يا صاحب النظر من سقيك النجيع لقد اثمر الشجر

اے حامل بار امانت، اے نظر کے مالک۔ تیرے دل کے گرم و تازہ خون سے (مہدیت کا) درخت بار آور ہوا

لا يظهر اللسان كما كان فضله بر سیرت امام توئی قصہ مختصر

زبان تیری فضیلت کا جیسا چاہئے اظہار نہیں کر سکتی۔ مختصر یہ کہ امام (مہدیؑ) کی سیرت پر تو ہی ہے

حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت حامل بار امانتؓ، حضرت مہدی موعودؑ کے وصال کے بعد بیس سال زندہ رہے اور تقریباً بیس سے پچیس دفعہ آپ کا اخراج ہوا، اور ۹۳۰ھ میں بدلۂ ذات مہدیؑ کی حیثیت سے آپؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ آپؓ نے اس عرصہ میں ثبوت مہدیؑ میں کئی ایک رسالے تصنیف فرمائے ہیں مثلاً عقیدۂ شریفہ، مقصد اول، مقصد ثانی، مکتوب ملتانی، رسالۂ بعض الایات، رسالہ ختم الولایت۔

مقصد اول کو 'رسالہ کلاں' اور 'ام الرسالہ' بھی کہتے ہیں، اس کے متعلق بندگی شاہ برہانؒ نے دفتر اول کے رکن پنجم باب اول میں لکھا ہے کہ "بعض پادشاہان ہند خصوصا ہمایوں پادشاہ و قطب شاہ چونکہ رسالہ پر ظہور نور رب غفور دیدند بسیار پسندند و بآب طلا نویسانیدند" یعنی ہندوستان کے بعض بادشاہوں نے خصوصا ہمایوں بادشاہ نے اور قطب شاہ نے اس رسالہ کو دیکھا جس سے رب غفور کا نور پوری طرح ظاہر ہے تو اسکو بے حد پسند کیا اور آب زر سے لکھوایا

آپؓ کی شہادت سے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں ذیل میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) رسالۂ چھند شریف از میاں علی محمد، یہ نظم "برج بھاکا" میں ہے، مصنف حضرت شہ دلاورؓ کے فقیر ہیں، پس یہ سنہ ۹۴۴ھ سے قبل لکھی گئی ہے۔ آپؓ کی شہادت کے تعلق سے قدیم ترین ماخذ ہے، اسے بندگی میاںؓ کے عرس کے روز چن پٹن، کرگاول، حیدر آباد اور پالن پور میں پڑھا جاتا ہے۔

(۲) مقتل۔ میاں ملک جمال نے فارسی مثنوی میں آپؓ کی شہادت کے واقعات قلم بند کئے ہیں سال تصنیف سنہ ۱۰۹۰ھ ہے۔

(۳) پریم سنگرام۔ یہ نظم بھرج بھاشا میں ہے، بندگی ملک یوسف (امیر دربار ابوالحسن تاناشاہ فرمانروائے گولکنڈہ نے لکھی ہے۔

(۴) تیج نامہ۔ میاں سید حسین خلیفۂ میاں سید راجو شہید نے ۱۰۸۸ھ میں ہندی زبان میں لکھی ہے۔ بندگی میاں سید راجو شہید کے واقعات بھی اس میں درج ہیں۔

(۵) مثنوی اسرار عشق۔ تصنیف میاں عبدالمومن سال تصنیف ۱۰۹۳ھ اس میں مہدی موعودؑ کی زندگی کے حالات لکھنے کے بعد بندگی میاں سید خوندمیرؓ کی شہادت کے واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔

(۶) اردو میں حضرت سید ابرہیم عرف باباصاحب میاں حیدر آبادی کی بہترین تصنیف ہے اس کا نام گنج شہداء ہے۔

(۷) دہقانی اردو میں بندگی میاںؓ کے ایک عاشق حضرت سید عالمؒ (کرگاول) نے بستان شہداء کے نام سے ایک نظم لکھی ہے، جو اپنے طور پر بہت اچھی ہے، واقعات جنگ اور دیگر حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

(۸) پنڈیال سے حضرت سید ولی صاحب نے بھی میاںؓ کی شہادت کے تعلق سے نظم تحریر کی ہے اس کا نام معرکہ ءبدر ولایت ہے۔

اس سے قبل حضرت بندگی میاں شاہ برہانؒ مصنف شواہد الولایت و دفتر نے بندگی میاںؓ کی شہادت پر علٰحدہ کتاب تصنیف فرمائی ہے، اسی طرح ملک میاں سلیمانی نے بھی شہادت نامہ بندگی میاںؓ ہندی اور فارسی میں لکھا ہے، ان کے علاوہ قصیدے، مرثیے، مخمس، مسدس وغیرہ توکئی حضرات نے لکھے ہیں (سراج منیر، ص ۲۷۲)۔

مناقب حضرت بندگی میراں سید محمودؓ

فرزند اکبر حضرت مہدی موعودؑ، تولد بمقام جونپور ۸۶۸ھ، وصال ۴ رمضان المبارک ۹۱۸ء مدفن بھیلوٹ، رادھن پور کے قریب علاقہ گجرات، آپؓ ام المصدقین بی بی الہ دادی سلام اللہ علیھا کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے، حضرت مہدیؑ نے آپ کا نام سید محمود رکھا اور یہ فرمایا کہ حضرت رسول اللہ ﷺ کا نام عرش پر محمود ہے اور زمین پر محمد ہے نیز آپؑ نے فرمایا "مقام محمود" ولایت اللہ ہے۔

آپؓ کی عمر ۱۸ یا ۱۹ سال کی تھی کہ آپؓ پر جذبہ کا عالم طاری ہوا، حضرت مہدیؑ نے اپنی حرم محترم سے فرمایا "سید محمود کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھو" سید محمود کا خون، گوشت، پوست و بال بال **لا الٰہ إلّا اللہ** ہو گیا ہے۔

حضرت نے اپنی والدہ محترمہ کے وصال کے بعد حضرت مہدیؑ سے کسب کی اجازت طلب کی، آپؑ نے فرمایا "ہر جا

کہ باشید بایاد خدا باشید"۔ ملک عثمانؓ نے سلطان محمود بیگڑہ سے آپؓ کی سفارش کی۔ بادشاہ نے دوسو سواروں کا منصب دیا اور ویرم گاؤں اور سانچور بطور جاگیر دئے۔ آپؓ کی پہلی شادی بائی خوب کلاں سے ہوئی جو صورت و سیرت میں بے مثال خاتون تھیں اور آپؓ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، ایک رات جب آپؓ کو گھر آنے میں دیر ہوگئی تو بے چینی بڑھ گئی اور صبح ہوتے ہوتے انتظار میں ہی روح پرواز کرگئی۔

آپؓ کی دوسری شادی ملک عثمان کی صاحبزادی بی بی کدبانوؓ سے ہوئی۔

ایک مرتبہ آپؓ نے خواب دیکھا کہ حضرت رسول اللہ اور حضرت مہدی موعودؑ تشریف لائے ہیں۔ حضرت مہدی موعودؑ نے فرمایا "آپ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ قدمبوسی کرو، پھر حضرت مہدی موعودؑ نے فرمایا۔ یہاں رہنا اب تمہارے شایان شان نہیں ہے۔ یہاں سے چلے جاؤ، بیدار ہوئے تو خود کو گھر کے صحن میں پایا، پھر آپؓ نے مہدی موعودؑ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے رخت سفر باندھ لیا۔ آپؓ کی زوجہ مطہرہ بھی آپؓ کے ساتھ رہیں۔

راستے میں جب زاد راہ کی تکلیف ہوئی تو حضرت بندگی میاں سید خوندمیرؓ نے آپؓ کے ساتھ تعاون فرمایا، اسطرح آپؓ مہدی موعودؑ کی خدمت اقدس میں یعنی فراہ مبارک پہنچے۔ جب حضرت ثانی مہدیؓ نے مہدی موعودؑ کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ اگر راستے میں سید خوندمیرؓ نہ ملتے تو بندہ راستے کا ہو جاتا۔ مہدی موعودؑ نے فرمایا "کچھ تعجب نہیں، سید خوندمیر تمہارے حقیقی بھائی ہیں۔ اس کے بعد حضرت مہدیؑ دن میں حضرت ثانی مہدیؓ کے حجرے میں بغرض تعلیم تشریف لیجاتے اور رات میں حضرت سید خوندمیرؓ کے حجرے میں۔ حضرت مہدیؑ نے ثانی مہدیؓ سے فرمایا "تم کو حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ذات میں سیر حاصل ہے، نیز فرمایا "بندے کا قدم جہاں ہے وہاں سید محمود کا قدم ہے۔ ایک دن آپؑ نے فرمایا کہ "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ ہم نے تجھے خاتم ولایت محمدی بنایا ہے تو میرے دربار میں کیا تحفہ لایا ہے تو عرض کروں گا "سیدین صالحین (بندگی میاں سید محمود اور بندگی میاں سید خوندمیر) کو پورے مسلمان بنا کر لایا ہوں"۔

حضرت مہدی موعودؑ کے وصال کے ایک سال کے بعد حضرت مہدی موعودؑ کے حکم سے آپؓ ہندوستان تشریف لائے اور بھیلوٹ میں دائرہ باندھا، آپؓ نے دیگر صحابہ مہدی کو الگ الگ دائروں میں جارہنے کی تاکید فرمائی۔

جب آپؓ کے بیان کا چرچہ بھیلوٹ کے اطراف واکناف میں ہونے لگا اور لوگ کشاں کشاں آپؓ کی خدمت میں آنے لگے، دین ومذہب میں ترقی ہونے لگی، دنیا پرست علماء اور جاہ طلب مشائخین نے حسد کی آگ میں جل کر بادشاہ کے پاس عرضی دی کہ "سید محمد نامی ایک شخص نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ خراسان میں ان کا انتقال ہوگیا، اب ان کے فرزند سید

محمود ان کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھ رہے ہیں، بے شمار لوگ ان کے مطیع اور معتقد ہوگئے ہیں، اس کا سد باب ضروری ہے انکو جب تک قید نہیں کیا جاتا اس وقت تک یہ فساد نہیں مٹتا"۔

اس عرضی کی بناء پر آپؓ کی گرفتاری کا حکم لیکر پولیس آئی اور آپؓ کو گرفتار کرلیا اور احمد آباد کے قید خانے میں آپؓ کو رکھا گیا۔ حضرت کے پیروں میں سوا من کی بیڑیاں ڈالی گئی تھیں، حضرت صدیق ولایتؓ نے سلطان کی دونوں بہنوں راجے سون اور راجے مرادی کو جو مہدوی ہوگئی تھیں، اس واقعہ کی اطلاع دی، ان دونوں بہنوں نے روتی پیٹتی ہوئی کڑی دھوپ میں صحن میں آکر کھڑی ہوگئیں اور کھانا پینا چھوڑدیا، سلطان کو جب کیفیت معلوم ہوئی تو اس نے فورا رہائی کا حکم جاری کردیا۔ سرکاری لوگوں نے پالکی میں سوار کرکے حضرت کو دائرہ میں پہنچایا۔ حضرت قید خانے میں ۴۰ یا ۴۱ دن رہے، آپؓ کی رہائی ۱۴ یا ۱۵ جمادی الثانی ۹۱۹ھ کو ہوئی، وزنی بیڑیوں کی وجہ سے قدم مبارک میں ناسور پڑ گئے تھے، غرض ڈھائی مہینوں کے بعد ان ہی ناسوروں اور زخموں کی تکلیف سے ۴ رمضان المبارک ۹۱۹ھ ۵۳ سال کی عمر میں پیر کے دن آپؓ نے اس دار فانی سے دار البقا کی طرف ہجرت فرمائی، بھیلوٹ میں تالاب کی پشت پر آپؓ کا مزار مقدس ہے۔ آپؓ کے تین فرزند اور ایک صاحب زادی ہیں۔ (۱) میاں سید عبد الحی روشن منورؓ جو مہدی موعودؑ کی حیات میں پیدا ہوئے اور حضرت مہدی موعودؑ سے ہی تربیت بھی ہوئے اور ان کا سلسلہء تربیت آج بھی جاری ہے۔ (۲) میاں سید اجملؓ جو بچپن میں ہی انتقال کرگئے (۳) میانسید یعقوب المخاطب بہ حسن ولایت و شجرۃ المرشدینؓ۔ دختر کا نام خونزا گوہر ہے جو پہلے حضرت بندگی میاں شاہ عبد اللطیف بن حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ کے عقد میں تھیں، ان کے بعد بی بی کدبانو نے ان کا نکاح اپنے بھانجے میاں محمود شاہ سے کردیا (دیگر تفصیلات کیلئے احقر کی تالیف سیرت اول میراں حضرت بندگی میراں سید محمود ثانی مہدیؓ دیکھئے)

منقبت حضرت بندگی میراں سید محمود ثانی مہدیؓ بزبان عربی از احقر

یا سائر النبوۃ یا احسن السیر　　من فیضك العمیم نما الدین و انتشر

اے سائر نبوت، اے بہترین سیرت (کے مالک) آپؓ کے فیض عام سے دین نے نشو نما پائی اور (چاروں طرف) منتشر ہوا

لا یکتب الأدیب کما کان شانه　　رہبر پس از امام توئی قصہ مختصر

آپؓ کی جیسی شان ہے کوئی ادیب لکھ نہیں سکتا　　قصہ مختصر یہ ہے کہ امامؑ کے بعد آپؓ ہی رہبر تھے۔

مناقب حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ

امام مہدیؑ کے خلیفۂ پنجم حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ مقبول مہدی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپؓ کے نسب کے تعلق سے ہماری کتابوں میں صرف یہ بات لکھی ہے کہ آپؓ رائے دلپت کے بھانجے تھے، والد اور والدہ کے ناموں کی صراحت نہیں ہے۔ قرائن سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ شاید بچپن میں ہی والد و والدہ انتقال کر گئے تھے۔ پھر ماموں کے پاس ہی آپؓ کی پرورش ہوتی رہی۔ امامؑ کے حکم سے جب سلطان شرقی نے والئ گوڑ کو خراج دینا بند کر دیا تو راجہ دلپت نے سلطان کے خلاف فوج کشی کی، حضرت مہدیؑ کی مدد سے اللہ نے سلطان کو راجا کے مقابلے میں فتح عطا فرمائی۔ سلطان کو بہت سامال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس مال غنیمت میں ایک قیمتی موتی بھی تھا جس کی قسمت میں اللہ نے مہدیؑ کی خدمت میں پیش ہونا لکھا تھا۔ وہ موتی تھا شاہ دلاورؓ، جب مال غنیمت میں حضرت شاہ دلاورؓ بھی گرفتار ہو کر آئے تو کہتے ہیں کہ آپؓ بہت خوبرو تھے، عمر ۱۰ یا ۱۱ سال کی تھی، ادھر سلطان حسین شرقی کی بہن سلیمہ خاتون لاولد تھی، ان کو یہ بچہ پسند آیا اور سلیمہ خاتون نے اس بچے کو گودی بیٹا بنالیا۔

قومی کتابوں میں آیا ہے کہ بچپن سے ہی آپؓ کی فطرت میں خدا طلبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور جب حضرت مہدی موعودؑ کی نظر فیض اثر آپؓ پر پڑی تو آپؓ مست اور بے خود ہو گئے۔

آپؓ کس طرح مہدی موعودؑ کی خدمت میں آئے اس کے تعلق سے ہمارے پاس دو روایتیں ملتی ہیں۔

ایک یہ کہ سلطان حسین شرقی کی بہن سلیمہ خاتون نے اپنے گودی بیٹے کیلئے ایک شاندار محل تعمیر کروایا تھا، اسی کے قرب وجوار میں مہدی موعودؑ بھی تشریف فرما تھے۔ ایک دن شاہ دلاورؓ سواروں اور پیادوں کے ساتھ، مہدی موعودؑ کی محفل مبارک میں تشریف لیگئے تو شاہ کے مصاحبوں میں سے ایک نے کہا کہ بھائی یہ حضرت سید محمد بڑے درجے کے ولی ہیں، جب سے میں نے ان کا پسخوردہ کھایا تھا، مجھے اللہ کے خیال کے مقابلے میں دوسری باتوں کا خیال بہت کم رہتا ہے، اس بات کا شاہ دلاورؓ کے دل پر بڑا اثر ہوا، پھر آپؑ سے ملنے کا آپؓ کو شوق دامن گیر ہوا اور آپؓ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ جب سے غیب سے شاہ دلاورؓ نے **لا الٰہ إلّا اللہ محمد رسول اللہ** کی آواز سنی تھی، اس وقت سے آپؓ مست و بے خود رہنے لگے تھے۔ آپؓ کا حال دیکھ کر سلیمہ خاتون نے ایک مرتبہ اپنے بھائی سلطان حسین شرقی سے کہا کہ بھائی یہ بچہ ہمیشہ خدا کی یاد میں رہتا ہے ہمارے کام کا نہیں معلوم ہوتا۔ پس مناسب یہی ہے کہ اس لڑکے کو حضرت مہدیؑ کی خدمت میں بھیج دوں۔

جب حضرت شاہ دلاورؓ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت مہدیؑ ظہر کی نماز کیلئے وضو فرمارہے تھےاور سر کا مسح کررہے تھے۔ جیسے ہی حضرت امامؑ کی نظر مبارک شاہ دلاورؓ پر پڑی تو آپؑ نے فرمایا" یہ دلاور نہیں بلکہ شاہ دلاور ہے، پھر فرمایا" یہ میرا مقبول ہے"۔

غرض امامؑ نے وضو سے فراغت پاکر دورکعت تحیۃ الوضو پڑھی، اسکے بعد شاہ دلاورؓ کو اپنے پاس بلایا، نزدیک بٹھایا، اپنا سیدھا ہاتھ حضرت شاہ دلاورؓ کے ہاتھ پر رکھ کر لا الٰہ ہوں نہیں کی تلقین کی اور اپنی زبان مبارک سے فرمایا" مرید اللہ ہو جاؤ"، اس کے بعد حضرت شاہ دلاورؓ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ پر رکھ کر ذکر خفی کے دوسرے جز الا اللہ توں ہے کی تلقین فرمائی اور فرمایا " مراد اللہ ہو جاؤ"

اس ذکر خفی کی تلقین کا آپؓ پر یہ اثر ہوا کہ آپؓ مست و بیخود ہوگئے اور آپؓ کا دل ایسا منور ہوگیا کہ عرش سے فرش تک کچھ پردہ نہ رہا۔ دانہ پور میں حضرت شاہ دلاورؓ نے ام المصدقین بی بی الہدادیؓ اور حضرت بندگی میاں ثانی مہدیؓ کو حضرت مہدیؑ کی بیعت اور تصدیق کا شرف حاصل کرتے دیکھا تو آپؓ نے بھی اسی وقت آپؑ کی تصدیق کا شرف حاصل کیا۔

اسکے فوراً بعد آپؓ پر جذبہ کا عالم طاری ہوگیا کہ آپؓ کے پاؤں ٹھہر نہیں سکتے تھے، حضرت مہدیؑ نے اسی حالت میں آپؓ کو میاں دراج کی مسجد میں چھوڑ دیا۔ میاں دراج نے آپؓ کی دیکھ بھال کی، جب حضرت مہدی موعودؑ تبلیغ فرماتے ہوئے ہندوستان کے مختلف حصوں سے گذرتے ہوئے مکہ معظمہ حج کیلئے تشریف لیگئے، وہاں پہلا دعویٰ مہدیت فرمایا اور ہندوستان واپس ہوئے اور احمد آباد تشریف لائے (گویا اس درمیان میں ۱۶ سال بیت چکے تھے) اس وقت شاہ دلاورؓ کو یک بیک ہوش آ گیا۔ اور فرمانے لگے کہ یہ بو کدھر سے آئی جس نے میرے مغز کو معطر کر دیا، یہ بو میرے مولا کی ہے۔ برسوں تک جذبہ میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے آپؓ کے پاؤں کھلتے نہیں تھے، لیکن جب بوئے عشق مہدیؑ اور بوئے جسم مبارک امامؑ شاہ دلاورؓ کو کئی منازل سے پہنچی تو آپؓ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے، پاؤں کھل گئے اور اسی خوشبو کو اپنا رہبر بنا کر امامؑ کی خدمت اقدس میں پہنچ گئے اور اسکے بعد حضرت شاہ دلاورؓ سفر اور حضر میں امامؑ کی صحبت میں رہے اور امامؑ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے تک آپ سے الگ نہیں ہوئے۔

حضرت امامؑ نے حضرت شاہ دلاورؓ کے حق میں فرمایا: یہ دلاور نہیں، شاہ دلاور ہیں۔ یہ میرا اور خدا کا مقبول ہے۔ جس نے ابو بکر صدیق کو نہیں دیکھا وہ شاہ دلاور کو دیکھے۔ بندہ کے بعد جو کچھ خواب یا معاملہ دیکھو تو میاں دلاور کے روبرو حل کرلو۔ میاں دلاور اہل دل ہیں۔ میاں دلاور عالم دل ہیں۔ میاں دلاور دفتر دل ہیں۔ میاں دلاور کو عرش سے تحت الثریٰ تک ایسا

روشن ہے جیسے کہ ہتھیلی میں رائی کا دانہ۔ میاں دلاور دیندار ہیں اور دیانت دار ہیں، جس کسی نے روئے زمین پر چلتا پھرتا مردہ نہیں دیکھا تو وہ میاں دلاور کو دیکھے۔

حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ کے دائرے کے چند کم عمر لڑکے جنگل سے لکڑی لانے گئے تھے۔ اس دوران نماز کا وقت آگیا، ایک لڑکے نے اذان کہی، ایک نے اقامت، پھر سب نے ایک کو امام بنا کر جماعت سے نماز پڑھی، نماز کے بعد ایک لڑکے نے چند آیات قرآنی کا بیان کیا، مطلب یہ کہ جو کچھ سنا تھا تقلید کے طور پر بیان کر دیا۔ اتفاقاً ایک عالم دوراں حضرت میاں عبد الملک سجاوندیؒ کا وہاں سے گذر ہوا۔ بیان سنا تو دنگ رہ گئے، پوچھا تم کون ہوں؟ بچوں نے بتایا تو آپؓ بچوں کے ساتھ حضرت شاہ دلاورؓ کے دائرے کو تشریف لائے اور مرید ہونے کی درخواست کی۔ حضرت شاہ دلاورؓ نے فرمایا "تم عالم و فاضل ہو، اور بندہ امی ہے بندہ کا حال یہ ہے کہ "قل" کو "کل" کہتا ہے۔ میاں عبد الملک نے فرمایا آپ کے "کل" پر میرا "قل" قربان۔ میں اپنا سارا علم دریابرد کر کے آیا ہوں۔ اپنے دل کی تختی کو صاف کر دیا ہے۔ آپ سے جو سنوں گا اسی پر قائم رہوں گا۔ پھر آپؓ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور آپؓ کا پسخوردہ پینے کے بعد ظاہری علم سے دور ہو گئے، جب شیخ علی متقی نے حضرت مہدیؑ کے خلاف رسالہ "الرد" لکھا تو حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؓ نے حضرت عبد الملک سجاوندیؒ سے خواہش کی کہ اس کا جواب تحریر کیا جائے، میاں عبد الملک سجاوندیؒ نے فرمایا "بندہ علم ظاہری سے بے بہرہ ہو چکا ہے"۔ حضرت شاہ دلاورؓ نے فرمایا کچھ فکر مت کرو، کاغذ قلم منگواؤ اور لکھنا شروع کرو۔ آپ نے لکھنا شروع کیا، آپ جس کتاب کا حوالہ دینا چاہتے، تو خیال کے ساتھ ہی اس کتاب کا مصنف آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عبارت لکھوا دیتا، اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کی بھی دلیل موجود ہے۔

بعض علماء (علماء پشاور) سید صاحب یعنی جناب شاہ سید احمد صاحب بریلوی کی خدمت میں آئے، ادھر کے علماء اکثر ایک فنی ہوتے ہیں، کوئی معقول میں یکتا ہے، کوئی صرف "صرف" جانتا ہے، کوئی "نحو" جانتا ہے غرض جمع ہو کر آئے اور مختلف سوالات شروع کئے، اگر دینیات کے متعلق کوئی سوال کرتے تو سید صاحب داہنی طرف رخ کر کے جواب دیتے اور جو غیر دینیات کا ہوتا تھا، معقول وغیرہ کا تو بائیں طرف رخ کر کے جواب دیتے تھے، اور جواب بھی کیسا اہل علم کی طرز پر، مریدین کو سخت حیرت ہوئی کہ سید صاحب کی زبان سے وہ الفاظ نکل رہے ہیں کہ کبھی عمر بھر بھی نہ سنے تھے، جب مجلس ختم ہوئی تو بعض لوگوں نے پوچھا، فرمایا کہ، جب یہ لوگ آئے تو میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ "اے اللہ مجھ کو رسوا نہ کیجئے" حق تعالیٰ نے امام ابو حنیفہؒ اور شیخ بو علی کی روح کو حکم دیا کہ جواب میں اعانت کرو، چنانچہ امام صاحبؒ کی روح میرے داہنی طرف تھی اور شیخ کی بائیں طرف، وہ جو کہتے تھے میں کہہ دیتا تھا۔ (وعظ الظہور، ص ۲۳) منقول از علمی مضامین، ص ۱۱۷، ۱۱۸)

اسطرح آپ کے قلم سے ''الرد'' کا جواب ''سراج الابصار'' کے نام سے جو معرکتہ الاراء تصنیف ہے عربی زبان میں منظر عام پر آیا۔ حضرت مہدیؑ نے آپؒ کا نکاح بی بی راجمتی سے کر دیا۔ جو ام المصدقین بی بی ملکاں کی جانب سے مہدیؑ کی خدمت میں آئی تھیں۔

آپؒ کے دو صاحب زادوں کے نام ملتے ہیں، ایک میاں حبیب اللہؒ اور دوسرا میاں سعد اللہؒ

حضرت بندگی میاں شاہ دلاورؒ کا وصال ۲ ذی قعدہ ۹۴۴ھ کو بروایت ۹۴۵ھ موضع بور کھیڑہ ضلع اورنگ آباد مہاراشٹرا میں ہوا۔ آپؒ وہیں آرام فرماہیں، آپؒ کے مزار پر انوار الہٰی کی بارش ہوتی ہے، زائرین حضرت کی خدمت میں پہنچ کر دل کے اطمئنان اور قلبی سکون کے عجیب عالم سے روشناس ہوتے ہیں۔

مناقب حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؒ

آپ حضرت مہدی موعودؑ کے جلیل القدر صحابی، عظیم المرتبت خلیفے اور ان بارہ ہستیوں میں سے ہیں جن کو امامؑ نے قطعی جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ جب پہلی مرتبہ امامناؑ کی نظر آپؒ پر پڑی تو آپؑ نے فرمایا ''تم شاہ نعمت ہو'' آپؒ کے والد کا نام ''شیخ بڑا'' تھا۔ آپؒ صدیقی ہیں یعنی آپؒ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد سے ہیں۔ آپؒ کے والد گجرات کے بادشاہ سلطان محمود بیگڑہ کے دور حکومت میں ایک بڑے منصب دار تھے، والد کے انتقال کے بعد آپؒ کو والد کا جو منصب ملنا چاہیئے تھا نہیں ملا، بلکہ کمی کے ساتھ ملا۔ نوجوانی کا زمانہ، طبیعت میں سختی، پہلوان تھے، سپہ گری بھی جانتے تھے۔ منصب کی کمی کو حق تلفی سمجھا اور شاہی نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ دل میں بیدار ہو گیا۔

اسی دوران حکومت کے امیروں کے ساتھ تکرار ہو گئی اور ان میں سے سات افراد کو قتل کر دیا۔ حکومت متوجہ ہو گئی لیکن آپؒ قابو میں نہ آسکے۔ ایک دن عبد اللہ حبشی نامی شاہی غلام کے لڑکے کو قتل کر دیا، یہ گویا بادشاہ کو چیلینج تھا، حکومت کی مشینری زور و شور کے ساتھ حرکت میں آگئی، چاروں طرف چوکسی بڑھادی گئی، ایک دن سولہ ساتھیوں کی طرف جارہے تھے، کسی طرح حکومت کو اطلاع مل گئی، سرکاری فوج آپؒ کا تعاقب کرنے لگی، ایسے میں آپؒ کے کانوں میں اچانک ظہر یا عصر کی اذان کی آواز سنائی دی، تعاقب کے خوف پر اللہ کی عظمت اور جلال کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے۔ تمام وسوسوں اور خدشات کو جھٹک کر آپؒ نے ساتھیوں سے کہا کہ اذان ہو رہی ہے یہ دیکھو ''حی علی الصلوٰۃ'' کی آواز، چلو ہم نماز پڑھ لیں گے، ساتھیوں نے کہا سردار یہ وقت یہاں رکنے کا نہیں ہے، پیچھے فوج کا دستہ ہے، لیکن اس جواب کا بھی شاہ نعمتؒ کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپؒ کے ساتھی

تو گھوڑے دوڑاتے ہوئے بھاگ گئے، آپؓ نے وضو کیا اور نماز پڑھنی شروع کر دی، ایسے میں شاہی سپاہی قریب آ گئے، دیکھا کہ ایک شخص کا گھوڑا درخت کے نیچے کھڑا ہے اور وہ خود نماز پڑھ رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہی ہمارا مطلوب ہے۔ دوسرے نے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ ایسے خطرناک حالات میں وہ نماز کیلئے کیسے رک سکتا ہے۔ وہ دیکھو جو لوگ آگے جا رہے ہیں ان میں سے کوئی ہو گا۔ غرض وہ سپاہی آگے بڑھ گئے۔ حضرت شاہ نعمتؓ نے بعد فراغ از نماز کسی سے پوچھا کہ یہ اذان کس نے دی، اس نے کہا کہ متوکلوں کی ایک جماعت جو احمد آباد سے آئی ہے یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ حکومت نے ان کا وہاں سے اخراج کر دیا ہے۔ اس جماعت کے سالار اور امیر سید محمد جونپوری مہدی ہیں۔ آپؓ کو ان سے ملنے کی خواہش ہوئی، دائرے میں آئے دیکھا کہ لوگ مفلوک الحال ہیں، لیکن چہروں پر انوار الٰہی کا تجلی ہے۔ پوچھا کہ تمہارا کوئی سردار بھی ہے؟ فقیروں نے آپؓ کو حضورؑ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ امامؑ کی نظر فیض اثر آپؓ پر پڑتے ہی آپؓ بے ساختہ امامؑ کے قدموں پر گر گئے اور کہا کہ میں بہت بڑا گنہ گار ہوں، میں اپنے گناہوں کو کس طرح معاف کروا سکتا ہوں، آپؑ نے فرمایا خدا کے حکم کے خلاف جو گناہ ہوئے ہیں اللہ سے معافی مانگو۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے بخشدے گا۔ لیکن مخلوق کے تعلق سے جو گناہ ہوئے ہیں مخلوق سے ہی معافی مانگنی ہو گی۔ اگر وہ معاف کر دیں تو تمہاری نجات ہے، امامؑ کے ارشاد کے مطابق آپؓ نے تلوار ہاتھ میں لے کر تمام دعوے داروں کے پاس گئے اور سب سے معافی مانگ لی۔ آخر میں اس حبشی غلام کے پاس بھی گئے اور اس سے کہا کہ میں تیرے بیٹے کا قاتل ہوں۔ یہ تلوار ہے اور یہ میری گردن ہے، قصاص لے لے۔ وہ آپؓ کی صورت دیکھتے ہی کہا تم وہ نہیں ہو جو پہلے تھے۔ تمہاری صورت بدل گئی ہے، میں اس شرط پر تم کو معاف کرنے کیلئے تیار ہوں کہ تم مجھے بھی وہیں لے چلو، جہاں سے تم کو یہ نعمت ملی ہے۔ غرض کہ آپؓ پٹن جا کر مہدیؑ سے ملے، ترک دنیا کی اور آپؑ کی صحبت فیض درجت میں رہ گئے۔ نہ صرف خدا بیں بن گئے بلکہ خدا نما بھی۔ آپؓ نے ۲۹ برس کی عمر میں توبہ کی اور امامؑ کی صحبت میں رہے۔ پھر حضرت مہدیؑ کے وصال کے بعد آپؓ ۲۴ یا ۲۵ سال زندہ رہے۔

مہدیؑ نے آپؓ کو "مرد قلاش"، "مقراض بدعت" اور "عمر ولایت" "مرد مرداں"، فرمایا۔ مہدیؑ کے وصال کے بعد جب آپ کو غسل دیا گیا تو جو پانی ناف میں رہ گیا تھا شاہ نعمتؓ نے اسکو پی لیا۔ ایک مرتبہ حضرت مہدیؑ نے آپ سے فرمایا "تو مجھے چاہے یا نہ چاہے میں تجھے چاہنے والا ہوں۔

حضرت شاہ نعمتؓ نے فرمایا جس طرح گائے کے پستان سے دودھ نکلتا ہے، پھر لاکھ کوشش کریں کہ وہ دودھ پستان میں جائے، نہیں جا سکتا، اسی طرح توبہ بھی ہونی چاہئے کہ گناہوں سے نکلنے کے بعد پھر واپس گناہوں میں نہ جائے۔

حضرت امامؑ نے فرمایا"ہمارے اور تمہارے توکل کے درمیان ایک کان کا فرق باقی رہ گیا ہے۔

حضرت مہدی موعودؑ نے میاں نعمتؓ کو"خوانِ نعمت"فرمایا۔

دولت آباد سے نظام شاہ بادشاہ نے افواج مغل سے ڈر کر اپنے خزانے، بیگمات وغیرہ کو قلعہ لوہ گڈہ کے ایک قلعہ کی طرف روانہ کیا۔ ان کا ذمہ دار ایک خواجہ سرا تھا۔ جس کا نام کفش بردار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسکو مہدویوں سے ازلی بیر تھا۔ ایک دن دائرے کے لوگ جنگل سے لکڑیاں لانے کیلئے گئے ہوئے تھے اور ۱۶، ۱۷ فقراء حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؓ کی سرکردگی میں ذکر اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے، اچانک شاہ کی فوج کا گذر، اس نعمت اللہ کے دائرے پر سے ہوا۔"ہٹو، سرکو، دور ہو جاؤ کہ آواز لگاتے ہوئے وہ قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ حضرت شاہ نعمتؓ اور آپؓ کے فقراء جو مصروف ذکر اللہ تھے، اس آواز کی آپؓ کو خبر تک نہ ہوئی، فوج کے ناظر نے قتل کا حکم دے دیا اور ذکر اللہ میں مصروف شاہ نعمتؓ اور آپؓ کے فقراء شہید ہو گئے، شہادت کے وقت آپؓ کی عمر ۶۱ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۹۳۵ھ اور تاریخ شعبان المعظم کی ۲۲ تھی۔

آپؓ کا روضۂ اطہر لوہ گڈہ شریف کے دامن میں واقع ہے، مرجع خلائق ہے۔ ہندو ہوں کہ مسلم آپؓ کی زیارت کو صعوبتیں اٹھا کر آتے ہیں، اور بامراد واپس جاتے ہیں، اب تو پونے سے بسوں، لاریوں اور کاروں کے ذریعہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جانے لگے ہیں۔

مناقب حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ

خلیفۂ چہارم امام الانام حضرت مہدی موعود علیہ الصلوٰۃ والتسلیم، جائس (یوپی میں جو بھاگل پور سے متصل ہے) کے بادشاہ تھے یہ سلطنت آپؓ کو باپ دادا سے وراثت میں ملی تھی۔

آپؓ کا سلسلۂ نسب حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اور اس کے اوپر حضرت ابراہیم ادھمؒ سے ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے دوسرے خلیفے حضرت سیدنا عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے چناچہ آپؓ کے نسب کا شجرہ اس طرح لکھا گیا ہے۔

حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ بن شاہ خداوند بن سلطان دارین بن شیخ نظام الدین بن شیخ رکن الدین بن شیخ فرید الدین گنج شکرؒ بن جمال الدین سلیمان بن شیخ شعیب بن شیخ احمد بن شیخ یوسف بن شیخ محمد بن شیخ شہاب الدین بن شیخ احمد الملقب بہ فرخ شاہ بن نصیر الدین بن محمد سلیمان شاہ بن سلطان شاہ بن سلیمان بن عبد اللہ مسعود بن واعظ عبد الکریم بن عبد الفتاح بن اسحاق بن ابراہیم ادہم بن سلیمان بن نصیر الدین بن عبد اللہ بن عمر فاروق (امیر المومنین) بن الخطابؓ۔

چناچہ مہدی موعودؑ نے ایک مرتبہ فرمایا" میاں نظام کے دادا شیخ فرید گنج شکر تھے اور میاں نظام رویت گنج ہیں۔

نیز حضرت مہدیؑ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میاں نظام فاروقی ہیں یعنی حضرت عمر فاروقؓ کی اولا سے ہیں، حق تعالیٰ نے نبوت کی خلافت کا بہرہ دیتے ہوئے ولایت کا خاص خلیفہ بنایا ہے۔ آپؒ کے اجداد میں سے جلال الدین بن سلیمان بن شیخ شعیب جو محمود غزنوی کے بھانجے ہوتے ہیں سب سے پہلے ۵۷۶ میں ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں قضاءت کے عہدہ پر فائز ہوئے اسکے بعد سلطان دارین نے دہلی کی مرکزی حکومت کو بے جان اور کمزور دیکھ کر، جائس میں ایک چھوٹی سی ایک خود مختار سلطنت کی بناڈالی، چناچہ تاریخ سلیمانی میں ہے کہ "حضرت گنج شکرؒ کے وصال کے دو تین پشت بعد حضرت کے فرزندوں کو امارت ملی تھی، رفتہ رفتہ شہر جائس جو بھاگل پور سے متصل ہے مع پرگنوں کے ان کے قبضہ میں آگیا، پھر وہ اس کے بادشاہ بن گئے۔

سلطان دارین کے فرزند شاہ خداوند، حاکم جائس کو اللہ نے دو بیٹے دئے تھے، بڑے فرزند حضرت بندگی میاں شاہ نظامؒ جو ۸۶۴ھ میں شہر جائس میں پیدا ہوئے، آپؒ کم عمری ہی میں حافظ قرآن شریف ہوگئے اور دیگر علوم میں بھی اچھی طرح آراستہ ہوگئے، والد کے انتقال کے بعد آپؒ تخت نشین ہوگئے۔

آپؒ کی فطرت میں خدا طلبی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ حکومت اور سلطنت کے امور اس راہ کی رکاوٹ بنتے نظر آئے تو چھوٹے بھائی کو تخت و تاج سونپ کر اللہ کی طلب میں حج کیلئے جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس سلسلے میں اعیان سلطنت سے مشورہ کیا تو سب نے مشورہ یہی دیا کہ پہلے آپ بھائی کو جانشین فرما کر کچھ دن سرپرستی فرمائیں، پھر دیکھیں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں، آپؒ نے اس پر عمل فرمایا، جب یہ بات مشہور ہوئی کہ ایک کمسن تخت و تاج کا مالک ہے، تو دوسری ریاستوں کے مالکوں کے منھ میں پانی بھر آیا۔ اور ایک والئی سلطنت نے تو حملہ کردیا۔ آپ ایک زبردست فوج لیکر مقابلہ کیلئے نکلے پہلے تو صرف جنگ کا نظارہ دیکھتے رہے اور جب یہ محسوس کیا کہ اپنی فوج کا پلہ کم ہوتا جارہا ہے تو آپؒ خود میدان جنگ میں اترے اور اس بے جگری سے لڑے کہ دشمن کی فوج کا سپہ سالار پکڑا گیا فوج کے قدم اکھڑ گئے اور آپ کو کامیابی ملی، اس کا اثر دوسری ریاستوں پر ایسا پڑا کہ پھر کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

اس کے بعد بغرض حج بیت اللہ و تلاش مرشد کامل آپؒ عازم سفر ہوئے، دل نے یہی فتویٰ دیا کہ پہلے مرشد کا ہاتھ تھام لو، وہ تم کو اللہ سے ملادیگا، اس خیال کے تحت ہندوستان کے مختلف مقامات پر تشریف لیگئے، مرشدان کرام، صوفیاء عظام اور سجادہ نشینوں سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنا مدعا پیش فرمایا۔ سب نے یہی کہا کہ آپ کا ظرف اونچا ہے ہم سے وہ بھر نہیں سکتا،

پھر آپؓ نے خیال کیا کہ حج کیلئے کعبۃ اللہ تشریف لے جائیں وہاں دنیا بھر کے لوگ ہوتے ہیں، شاید میرے مطلب کا کوئی مرشد وہاں ملجائے، آپؓ مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ تشریف لیگئے، وہاں شیخ الاسلام کا بڑا چرچہ تھا۔ آپؓ نے ان سے تربیت ہونا چاہا، توانہوں نے جواب دیا کہ تمہارا ظرف بہت اونچا ہے، یہ زمانہ ظہور مہدی موعودؑ کا ہے، اگر وہ مل جائیں تو تمہارا مقصد اس ہستی سے پورا ہو سکتا ہے۔ پھر آپ نے روم، شام، ایران، عراق وغیرہ ممالک کا سفر کیا۔ لیکن ہر جگہ سے مایوس ہو کر ہندوستان واپس آئے، لیکن اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئے، اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے چاپانیر میں سلیم خاں کی تعمیر کردہ ایک مناری مسجد میں قیام فرمایا۔ اسی زمانے میں امامؑ چاپانیر کی جامع مسجد میں قیام فرماتے، وعظ و بیان کی دھوم تھی۔ سلطان محمود بیگڑہ نے تحقیق کیلئے چند علماء کو اپنے دو معتمد امراء سلیم خاں اور فرہاد الملک کے ساتھ مہدیؑ کی خدمت میں بھیجا، سلیم خان اور فرہاد الملک نے آپؑ کا بیان سنکر آپؑ کے دست حق پرست پر بیعت کرلی۔ اور محمود بیگڑہ کو بھی حقیقت حال سے مطلع کر دیا، پھر سلیم خان نے حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ کو اطلاع دی کہ آپ کو جس مرشد کامل کی تلاش ہے، ایک ہستی جو ہم نام و ہم صفت پیغمبر ہے چاپانیر کی جامع مسجد میں قیام پذیر ہے اور فیض کا دریا بہا رہی ہے۔ آپؓ یہ سنتے ہی حضرتؑ کی خدمت میں پہنچنے کیلئے روانہ ہوئے، ایک عاشق صادق، معشوق کی طلب میں چاروں طرف گھوم گھام کر بصد اشتیاق اپنی منزل کی طرف آرہا ہے۔ تو حضرت مہدیؑ کو فرمان خدا پہنچا "اے سید محمد، ہمارا بندہ ہماری طلب میں تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر، ہم تک پہنچادو۔

حضرت مہدی موعودؑ نے آگے بڑھ کر حضرت شاہ نظامؓ کا استقبال کیا، آنکھیں چار ہوئیں تو مہدی موعودؑ نے فرمایا۔ صورت زیبائے ظاہر ہیچ نیست، اے برادر سیرت زیبا بیار۔ ترجمہ: صورت کی خوبی کچھ نہیں، اے بھائی سیرت کی خوبی لاؤ۔

اس کے جواب میں حضرت شاہ نظامؓ نے یہ شعر پڑھا

آنجا کہ در نگرم صورت دوست هر کہ دیدہ ندارد گناہ بجانب اوست

یعنی جہاں میں دیکھتا ہوں وہاں دوست ہی کی صورت ہے، جو شخص آنکھ نہیں رکھتا تو یہ اسکی خطا ہے۔

حضرت مہدیؑ نے آپؓ کو ذکر خفی کی تلقین فرمائی، اور جب مہدیؑ کی ناک حضرت شاہ نظامؓ کے منھ کے قریب ہوئی تو شاہ نظامؓ مست و بے ہوش ہوگئے، آنحضرت نے آپؓ کو اپنا پسخوردہ دیا، پھر ہوش آیا، پھر مسلسل تین دن تک آپؓ پر تجلیات الٰہی کی وہ فراوانی ہوئی تھی کہ آپؓ ہوش میں نہ آسکے، تیسرے دن مہدیؑ آپؓ کے حجرے میں تشریف لیگئے اور فرمایا "بھائی نظام السلام علیکم، مرد بنو۔ یہ سننا تھا کہ آپؓ کو ہوش آگیا، پھر آپؓ امامؑ کے ساتھ ہی رہے، سفر ہو کہ حضر، مہدیؑ کے وصال تک آپؓ

پھر حضرت سے جدا نہیں ہوئے۔

جب مہدیؑ بغرض حج مکہ مکرمہ تشریف لیگئے جہاں آپؑ کو حدیث کے مطابق حرم شریف میں رکن یمانی اور مقام ابراہیم کے درمیان دعوی مہدیت کرنا تھا تو حضرت شاہ نظامؓ بھی آپؑ کے ساتھ ہوگئے، طواف کیلئے جب مہدیؑ کعبہ کے پاس گئے تو حضرت شاہ نظامؓ سے پوچھا کہ "اس سے پہلے بھی آپ یہاں آئے تھے اور اب بھی بندے کے ساتھ آئے ہو، پہلے کیا دیکھا تھا اور اب کیا دیکھتے ہو، میاں نظامؓ نے عرض کیا کہ جب پہلی بار آیا تھا تو صرف مکان دیکھا تھا۔ اور اب میراں جیؑ کے صدقے سے مکان کے ساتھ مکین کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ پھر کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ بیت اللہ آپ کا طواف کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ﴿قریش:۳﴾ یہ سن کر امامؑ نے فرمایا "اللہ نے تم کو آنکھ اور کان دئے ہیں"

پھر جب حکم خداوندی سے مہدیؑ نے ۹۰۱ھ میں رکن یمانی اور مقام ابراہیم کے درمیان حجاج کے بھرے مجمع میں اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ فرمایا "کہ جس نے میری اتباع کی وہ مومن ہے تو اس وقت حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ، قاضی علاء الدین بدری اور دوسرے چند اہل عرب نے آمنا و صدقنا کہتے ہوئے آپ کی تصدیق کی۔ ایک مرتبہ شہر ٹھٹھہ میں جب وہاں کا حاکم جام نظام الدین جس کو جام نندہ بھی کہتے ہیں۔ دار دنیا میں دیدار خدا جائز ہونے کے مسئلہ پر اپنے چند علماء کو مہدیؑ سے بحث کیلئے بھیجا۔ دوران گفتگو مہدیؑ نے آیت شریفہ وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿الإسراء: ۷۲﴾ پڑھی۔ علماء کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ تو یہ کہا کہ یہ تو صرف آپ کا دعویٰ ہے کیا آپ کے گروہ میں سے کسی نے خدا کو دیکھا بھی ہے۔ امامؑ نے حضرت بندگی میاں شاہ نظامؓ اور حضرت شاہ دلاورؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سے پوچھ لو۔

حضرت مہدیؑ، حضرت شاہ نظامؓ کو قرآن کا درس دے رہے تھے کہ میاں فخر الدین اپنا خواب سنانے کیلئے امامؑ کی خدمت میں آنے لگے تو مہدیؑ نے ہاتھ کے اشارہ سے آپ کو روک دیا۔ بعد میں ظہر کی نماز کے بعد فرمایا کہ "بندے نے تم کو حلقۂ درس میں داخل ہونے سے اس لئے روک دیا" صاحب اپنے بندے کو درس دے رہا تھا، اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھتے تو جل جاتے۔

بشارات: مہدی موعودؑ نے فرمایا (۱) بھائی نظام شمع ولایت ہیں (۲) ہمارے بھائی نظام حافظ کلام اللہ ہیں اور شاہد رویت اللہ ہیں۔

مہدی موعودؑ نے آپؓ کے حق میں حسب ذیل ۷ بشارتیں فرمائیں (۱) دیدن و چشیدن (دیکھنا اور چکھنا) (۲) دریا

نوش (۳) مست مست ہوشیار ہوشیار (۴) کشک ملامت (۵) بل کلها فیه (اس میں سارے صفات ہیں) (۶) چشم سر سے اللہ کے دیدار کی گواہی دینے والا (۷) رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ﴿النور:۳۷﴾ (وہ مردان خدا جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں رکھتی)

میاں نظام دریا ہیں اور دریا نوش ہیں۔ میاں نظام مرد قلاش ہیں۔ میاں نظام مرد حضوری ہیں۔ میاں نظام مرد ربانی ہیں۔ میاں نظام کے دادا گنج شکر ہیں اور میاں نظام گنج رویت ہیں۔

حضرت بندگی میاں شاہ نظامؒ کی تین بی بیاں تھیں (۱) بی بی عائشہ جن سے ایک دختر راجے مریم تھی (۲) راجے فیروزہ ان سے ۴ فرزند تھے (۱) میاں شاہ عبد الرحمان (۲) میاں شاہ عبد القادر (۳) میاں شاہ عبد اللطیف (۴) میاں شاہ عبد الرزاق۔ جب شاہ عبد الرحمان پیدا ہوئے تو بی بی کو فقر و فاقہ کی وجہ سے دودھ نہیں تھا۔ حضرت بندگی میاں شاہ نظامؒ نے شہزادے کو لاکر مہدی موعودؑ کے قدموں میں ڈالدیا۔ مہدیؑ نے اپنے پیر کا انگھوٹا بچے کے منھ میں دیا، بچہ انگھوٹا چوس کر سیر اب ہو گیا۔ پھر تو اسی طرح کا معمول ہو گیا، پھر جب ماں کو دودھ آیا تو بچہ نہیں پیتا تھا۔ حضرت شاہ نظامؒ نے یہ بات مہدیؑ کو سنائی تو مہدی موعودؑ نے فرمایا۔ میاں عبد الرحمان دودھ کیوں پیتے، وہ نور پیتے ہیں۔ اس طرح میاں عبد الرحمان دو سال تک نور ہی پیتے رہے۔ تیسری بی بی۔ بی بی جی یا اچھوبی صاحبہ تھیں، آپ سے دو دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے یعنی بی بی نور اللہ اور بی بی رقیہ اور شاہ محمد اور شاہ صالح محمد، حضرت شاہ نظامؒ کے ۸ خلفاء تھے، جن میں بندگی میاں شاہ عبد الرحمان اور بندگی میاں ملک الہداد خلیفہؒ گروہ مشہور ہیں۔

مسنون دعائیں

نیند سے بیدار ہونے کے وقت أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَآ أَمَاتَنَا وَ اِلَيهِ اَلنُّشُورُ۔ ہر قسم کی تعریف اللہ کیلئے ہے جس نے ہم کو زندگی عطا فرمائی بعد اس کے کہ اس نے ہم سے زندگی لے لی تھی اور اسی کی طرف ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔

صبح کے وقت کی دعا اللّٰهُمَّ اصبحناوبِكَ أَمْسَيْنَا، وبِكَ نَحْيا، وبِك نموتُ وإِلَيْكَ اَلنُّشُوْرُ۔ اے اللہ تیری ہی اجازت سے ہم نے صبح کی اور تیری ہی اجازت سے ہم نے شام کی، تیری ہی اجازت سے ہم جیتے ہیں اور تیری ہی اجازت سے ہم مرتے ہیں اور تیری طرف ہی ہمارا لوٹنا ہے۔

بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الخبث والخبائث، والمخبث الشيطان الرجيم۔ اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں ہر برائی سے اور ہر برا کرنے والے شیطان سے جو مردود ہے۔

بیت الخلاء سے باہر نکلنے کے بعد الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذٰى و عَافِانِي۔ شکر ہے اللہ کا جس نے مجھ سے تکلیف کو دور کر دیا اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔

مسجد کو جاتے وقت اللّٰهُمَّ اجعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا وَفِي لِسَانِي نُورًا و فِي بَصَرِي نُورًا وفِي سَمْعِي نُورًا وَعَنْ يَمِيْنِي نُورًا وَعَنْ شمالِي نُورًا و فَوْقِي نُورًا وتَحْتِي نُورًا وأَمَامِي نُورًا وَخَلْفِي نُورًا وَاجْعَلْ لِي نُورًا۔ اے اللہ تو میرے دل میں نور عطا کر اور میری بصارت میں نور عطا کر اور میرے کانوں میں نور عطا کر اور میری زبان میں نور عطا کر اور میرے سیدھے طرف سے نور عطا کر اور میرے بائیں طرف سے نور عطا کر اور میرے اوپر سے نور عطا کر اور میرے نیچے سے نور عطا کر اور میرے لئے نور عطا فرما۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت بِسْمِ اللهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلىٰ رَسُولِ اللهِ اللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ۔ مسجد میں داخل ہوتا ہوں اللہ کے نام سے، صلوٰۃ و سلام نازل ہو رسول اللہ ﷺ پر اے اللہ تیری رحمت کے دروازے میرے لئے کھول دے۔

وضوء کرنے کے بعد: اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوابَيْنِ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهَّرِيْنَ۔ اے اللہ مجھ کو توبہ کرنے والوں اور زیادہ پاک رہنے والوں میں سے بنا

اذاں سننے کے بعد: اللّٰهُمَّ رَبّ هٰذهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ والصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ أٰتِ مُحَمَّدانِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ

وَابْعَثْهُ مُقَامًا محموداً الَّذِی وَعَدْ تَّه وارزُقْنِي شَفَاعَتَهُ یومَ الْقِیامَة۔

نماز کے بعد: اللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلاَمُ وَمِنْكَ السَّلاَمُ وَاِلَیْكَ یَرْجِعُ السَّلام حیّنا رَبَّنَا بالسَّلامِ وَادْخِلْنَا دَارَالسَّلام۔ اے اللہ تو ہی سلامتی ہے اور تجھ ہی سے سلامتی ہے اور سلامتی تیری ہی طرف لوٹتی ہے اے ہمارے پروردگار ہم کو سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ اور ہم کو سلامتی کے گھر میں داخل فرما۔

مسجد سے باہر نکلتے وقت: اللّٰھُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ۔ اے اللہ میں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں۔

کھانے سے پہلے: بِسْمِ اللّٰهِ۔ میں کھانا شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے

کھانے کے بعد: الحمدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَطْعَمَنِيْ هَذٰا وَسَقَانِيْ۔ ہر قسم کی تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے کھلایا اور مجھے پلایا۔

کپڑے پہننے کے وقت: الحَمدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِي هَذٰا الثَوْبَ۔ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے یہ کپڑے پہنائے

گھر سے باہر نکلتے وقت: بِسْمِ اللّٰهِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ وَلاَ حَوْلَ وَلاَقُوَّةَ اِلاَّ بِاللّٰهِ۔ میں باہر نکلتا ہوں اللہ کے نام سے میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ طاقت اور قوت صرف اللہ کے ساتھ ہے

سفر کی دُعا (سواری پر بیٹھنے کے وقت): سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَـٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿الزخرف:١٣﴾ پاک ہے وہ ہستی (اللہ) جس نے اسکو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم ایسے تو نہ تھے کہ اس کو بس میں کر لیتے اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

مریض کی عیادت کے وقت: طَهُوْرٌ إنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ کوئی (فکر کی) بات نہیں یہ تمہاری پاکی کے لئے ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو تم کو صحت نصیب ہو جائے گی۔

ملاقات کے وقت: اَلسَّلاَمُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرْکَاتُهُ۔ تم پر اللہ کی جانب سے سلامتی، اسکی رحمت اور اسکے برکات ہوں

لوگوں کا شکریہ ادا کرتے وقت: جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا۔ اللہ تم کو اچھا بدلہ دے۔

قبروں کی زیارت کے وقت: السَّــلاَمُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمَؤمِنِيْنَ وَالْمؤمِنَات اَنْتُمْ السَّــلَفَ وَنَحْنُ بِالاَثَرْ وَاِنَّا إنْ شَــاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلاَحِقُوْنَ۔ اے مومن مردوں اور مومن عورتوں کے قبروں والو تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ تم آگے چلے گئے اور ہم پیچھے ہیں اور ہم انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔

اگر کسی کو چھینک آئے تو کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اور سُننے والا کہے يَرْحَمُكَ اللّٰه۔ اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔

مُرغ کی بانگ سنے تو کہے: اَسْأَل اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهِ۔ میں اللہ سے اس کا فضل مانگتا ہوں۔

کُتے یا گدھے کی آواز سنے تو یہ کہے: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود سے۔

گھر میں داخل ہوتے وقت: بِسْــمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْــمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا۔ ہم اللہ کے نام سے گھر میں داخل ہوئے اور اللہ کے نام سے نکلے اور اللہ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا۔

بارش کی دُعا: اللّٰهُمَّ اَغِثْنَا، اللّٰهُمَّ اَغِثْنَا اللّٰهُمَّ اَغِثْنَا۔ اے اللہ ہماری مدد فرما اے اللہ ہم پر بارش برسا

بارش زیادہ ہو اور نقصان کا اندیشہ ہو تو یہ دُعا کرے: اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلاَ عَلَيْنَا۔ اے اللہ (اب) ہمارے اطراف میں بارش برسا۔ ہم پر نہیں۔

رؤیت ہلال کے وقت: اللّٰهُمَّ أَهِلهُ عَلَيْنَا بِالأمْنِ والإيْمَــانِ، وَالسَّلامَةِ وَالإسْلامِ رَبِيّ وربُّكِ اللّٰهُ۔ اے اللہ اس (پہلی رات کے) چاند کو ہمارے لئے امن، ایمان، سلامتی اور اسلام کا باعث بنا۔ میرا اور (تیرا) چاند کا مالک اللہ ہے۔

شام کے وقت: اللّٰهُمَّ بِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيٰ وَبِكَ نَمُوْت وَاِلَيْكَ الْمَسِيْرُ۔ اے اللہ ہم تجھ سے ہی شام کرتے ہیں اور تجھ سے ہی صبح کرتے ہیں اور تجھ سے جیتے ہیں اور تجھ سے ہی مرتے ہیں اور تیری طرف ہی ہم چلتے ہیں۔

بستر پر لیٹتے وقت: بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتُ جَنْبِي۔ اے پروردگار میں تیرے نام سے لیٹتا ہوں۔

ہم بستری کے وقت: اللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبْ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا۔ اے اللہ ہم کو شیطان سے دور رکھ اور جو تو ہم کو (اولاد) دیتا ہے اس سے شیطان کو دور رکھ۔

نماز

اسلام کے پانچ بنیادی اعمال میں سے ایک رکن اعظم ہے۔ قرآن شریف میں متعدد مقامات پر اللہ نے نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ نماز قائم کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے نماز ترک کرنے والوں اور نماز میں سستی اور کاہلی برتنے والوں اور ریاکاری کرنے والوں کے حق میں ویل کی وعید سنائی ہے۔"الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ" کے بعد متقیوں کی دوسری اہم صفت "وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ" ہی فرمائی ہے۔

علائی نے سورۂ عنکبوت کی تفسیر میں لکھا ہے، "الصلاة عرس الموحدين فانه يجتمع فيها الوان العبادات كما ان العرس يجتمع فيه الوان الطعام - فاذا صلى العبد ركعتين، يقول الله عبدي اتيت بالوان العبادات قياما و ركوعا و سجودا و قرأة وتهليلا و تحميداو تكبيرا و سلاما۔ ترجمہ، نماز موحدین کی شادی کی دعوت ہے، اس لئے کے اس میں مختلف قسم کے عبادات ہیں جس طرح کہ شادی کی دعوت میں مختلف قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ پس جب بندہ دو رکعت نماز پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ، میرے بندے نے اپنے ضعف کے باوجود مختلف قسم کی عبادتوں کو لایا ہے جیسے قیام، رکوع، سجود، قرأت، تہلیل، تحمید، تکبیر، اور سلام۔ مجھے بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں تجھے اس جنت سے روک دوں جس میں انواع و اقسام کی نعمتیں ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا "واكرمك برؤيتي" اور میں تیرا اکرام میرے دیدار سے کرتا ہوں۔ اور حضرت جعفر بن محمد سے روایت ہے وہ اپنے دادا سے اور وہ حضرت علیؓ سے اور وہ حضرت رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ "الصلاة مرضاة للرب و حب الملائكة و سنة الأنبياء و نور المعرفة و اصل الايمان و اجابة الدعاء و قبول الاعمال و بركة في الرزق و سلاح على الاعداء و كراهية للشيطان و شفيع بين صاحبها و بين ملك الموت ونور في قلبه و جواب مع منكر ونكير ومونس و زائر معه في قبره الى يوم القيامة ،فاذا كانت القيامة كانت الصلاة ظلا فوقه و تاجا على راسه و لباسا على بدنه و نورا يسعى بين يديه و سترا بينه و بين النار و حجة للمؤمنين بين يدى رب العالمين و ثقلا في الميزان و جوازا على الصراط و مفتاحا للجنة ،لان الصلوٰة تحميد و تقديس وتسبيح و تعظيم وقرأه و دعاء و تمجيد ولان افضل الاعمال كلها الصلوات لوقتها (نزھۃ المجالس و منتخب النفائس للشیخ عبد الرحمان صفوری؛ ص ۱۴) یعنی (۱) رب کی خوشنودی (۲) ملائکہ کی محبت (۳) انبیاء کی سنت (۴) معرفت کا نور (۵) ایمان کی بنیاد (۶) دعاء کی قبولیت (۷) قبولیت اعمال (۸) رزق میں برکت (۹) دشمنوں کے مقابلے میں ہتھار (۱۰) شیطان کیلئے ناپسندیدہ (۱۱) مصلی اور ملک الموت کے درمیان شفاعت کرنے والی (۱۲) مصلی کے دل میں نور (۱۳) منکر اور نکیر کا جواب (۱۴) مصلی کا مونس (۱۵) قیامت کے دن تک اسکی قبر میں ملاقات کرنے والی اور جب قیامت قائم ہوگی تو نماز

(۱۶) نمازی کے سر پر سایہ (۱۷) اسکے سر پر تاج (۱۸) اسکے آس پاس دوڑنے والا نور (۱۹) اسکے اور دوزخ کے درمیان حجاب (۲۰) رب العالمین کے پاس مومنین کی حجت (۲۱) میزان میں بوجھ (۲۲) پل صراط پر گذرنے کا پاسپورٹ (۲۳) جنت کی کنجی، کیونکہ نماز (۲۴) تحمید ہے (۲۵) تسبیح ہے (۲۶) تقدیس ہے (۲۷) تعظیم ہے (۲۸) قرأت ہے (۲۹) دعا ہے اور (۳۰) تمجید ہے کیونکہ (۳۱) نماز تمام اعمال سے افضل ہے جب وہ وقت پر ادا کیجائے۔

حضور پرنور ﷺ سے نماز کے بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں جن میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) الصلوٰۃ عماد الدین فمن اقامھا فقداقام الدین و من ترک الصلوٰۃ فقد ھدم الدین: یعنی نماز دین کا ستون ہے، پس جس نے نماز قائم کی گویا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز چھوڑی اس نے دین کو منہدم کر دیا۔

(۲) من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر: یعنی جس نے عمداً نماز کو چھوڑا گویا اس نے کفر کیا، یا وہ کفر کے قریب ہو گیا۔

(۳) حبب الی من دنیا کم ثلاث،الطیب والنساء و قرۃ عینی فی الصلوٰۃ: یعنی تمہاری دنیا سے مجھے تین چیزیں پیاری ہیں۔ خوشبو، عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

فرض نمازیں پانچ ہیں۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء۔

فجر کی دو رکعتیں فرض، ظہر کی چار رکعتیں فرض، عصر کی چار رکعتیں فرض، مغرب کی تین رکعتیں فرض، عشاء کی چار رکعتیں فرض۔ وتر کی نماز واجب ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان اللہ زادکم صلوٰۃ الا و ھی الوتر" یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز زیادہ کی ہے آگاہ ہو جاؤ کہ وہ وتر ہے۔ وتر کی نماز کی تین رکعتیں ہیں، تیسری رکعت میں ضم سورہ کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک لے جائیں اور پھر رکعت باندھ لیں اور دعائے قنوت پڑھیں پھر رکوع اور سجود کرتے ہوئے نماز پوری پڑھ لیں۔ وتر کی نماز کا وقت عشاء کے بعد سے طلوع فجر تک ہے۔

تہجد کی نماز پڑھنے والوں کو چاہیئے کہ وہ تہجد کی نماز تک وتر کی نماز کو مؤخر کریں، تہجد کے بعد ہی وتر پڑھیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اجعلوا آخر صلوٰۃ اللیل الوتر" یا "اجعلوا الوتر آخر صلوٰۃ اللیل"۔ یعنی وتر کو تم رات کی آخری نماز بناؤ۔

نیز آپؐ نے فرمایا "لاوتران فی لیل واحد" یعنی ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔

سنت نمازیں: فقہ کی کتابوں میں سنت نمازوں کا باب نہیں ہے۔ بلکہ "باب النوافل" مذکور ہے۔ اس لئے کہ عربی میں

نفل کے معنی "زیادہ" کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نمازیں فرض ہیں، ان کے علاوہ حضور ﷺ نے جو نمازیں ادا کی ہیں ان کا بیان ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرض نمازوں کے علاوہ جو نمازیں پڑھی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ نمازیں جو حضورؐ نے پابندی کے ساتھ پڑھی ہیں ان کو سنت موکدہ کہتے ہیں۔ جیسے نماز فجر سے پہلے دو رکعت سنت، نماز ظہر میں، فرض سے پہلے چار رکعت اور بعد فرض دو رکعت سنت، نماز مغرب میں فرض کے بعد دو رکعت سنت اور نماز عشاء میں فرض کے بعد دو رکعت سنت۔ نماز عصر سے پہلے آپؐ نے کبھی چار رکعت سنت پڑھی اور کبھی نہیں تو اسکو سنت غیر موکدہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح عشاء کی نماز سے پہلے چار رکعت سنت کبھی آپؐ نے پڑھی اور کبھی نہیں، تو یہ بھی سنت غیر موکدہ ہے۔ اسی طرح آپؐ سے کئی اور نمازیں بھی مروی ہیں۔ جیسے

نماز اشراق یعنی فجر کی نماز کے بعد ذکر اللہ میں رہ کر طلوع آفتاب کے بعد آپؐ نے چار رکعتیں نماز پڑھی ہیں۔ یہ سنت ہے۔

نماز چاشت یعنی سورج ایک نیزہ بلند ہونے کے بعد تقریباً دس بجے آپؐ نے چار رکعتیں نماز پڑھی ہیں۔ یہ بھی سنت ہے۔

تحیۃ الوضوء یعنی جب بھی وضو کریں تو دو رکعت تحیۃ الوضوء یا وضو دوگانہ نماز آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔ بعد کے زمانے میں لوگوں نے اسکو چھوڑ دیا تھا، لیکن اہل اللہ اور صوفیاء کرام نے اس کی پابندی فرمائی تھی۔ حضور مہدیؑ نے چونکہ آپؑ کی بعثت کا مقصد ہی سنتوں کو زندہ کرنا تھا، اس سنت کی ادائیگی کا حکم دیا اور فرمایا جو شخص اس کو ترک کرتا ہے وہ دین کا بخیل ہے۔

تحیۃ المسجد یعنی اگر کسی مسجد میں جانا ہو تو پہلے دو رکعت نماز تحیۃ المسجد کی نیت سے پڑھ لی جائے، یہ بھی سنت ہے۔

تہجد: اسی طرح رات میں آنحضرت ﷺ سے جو نمازیں ثابت ہیں ان میں نماز تہجد ہے۔ یہ نماز آنحضرت ﷺ پر فرض تھی، جیسا کہ ارشادی خداوندی ہے۔ "ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک" چونکہ یہ نماز بالخصوص آنحضرت ﷺ کیلئے تھی جیسے ارشاد خداوندی "نافۃ لک" یعنی یہ خاص تیرے لئے زیادہ ہے، اس لئے آپؐ پر یہ نماز فرض تھی اور آنحضرت ﷺ نے اس کے بعد اپنی پوری زندگی میں ادا فرمایا۔ بجز ایک وقت کے کہ یہ نماز، نماز فجر کے ساتھ ہی قضا

ہوگئی تھی، جبکہ ایک مرتبہ آپ ایک غزوہ سے واپس ہورہے تھے تو رات میں ایک جگہ آپؐ نے مع اصحاب قیام فرمایا اور حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ مجھے وقت پر جگا دینا، لیکن یہ اتفاق ہوا کہ جب سورج کی کرنے آپؐ کے چہرے پر پڑی تو سب سے پہلے آپؐ ہی بیدار ہوئے اور حضرت بلالؓ کو بلا کر پوچھا کہ تم نے مجھے جگایا نہیں تو حضرت بلالؓ نے جواب دیا "جس نے آپؐ کو سلایا اس نے مجھے بھی سلا دیا" پھر آنحضرت ﷺ نے فوراً اس جگہ کو چھوڑا۔ تھوڑی دور جا کر جماعت کے ساتھ نماز فجر کی قضا نماز پڑھی۔

نماز تہجد کا تعلق ولایت سے ہے اسی لئے اللہ نے اس کے تعلق سے فرمایا "**عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا**" یعنی عنقریب تمہارا رب تم کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا، مقام محمود کا تعلق یقیناً ولایت محمدی سے ہی ہے، جیسا کی ابن عربیؒ نے اپنی تفسیر و دیگر تصانیف میں لکھا ہے۔ عربی میں تہجد کے معنی ہیں سو کر اٹھنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سو کر اٹھ کر پڑھنی چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ رات کے آخری پہر میں نیند سے بیدار ہو کر تہجد کی نماز پڑھیں اور فجر کا وقت شروع ہونے تک ذکر اللہ میں بیٹھیں اور (ہو سکے تو) اسی وضو سے فجر کی سنت اور فرض کی نماز پڑھیں۔ تہجد کے بعد سونے کا حکم نہیں ہے۔

یہ غلط ہے کہ رات میں جاگتے رہیں اور جب نیند کا غلبہ ہو تو نماز تہجد پڑھ کر سوئیں اور یہ بھی غلط ہے کہ سو کر اٹھیں، تہجد پڑھیں اور پھر سو جائیں۔ چونکہ یہ نماز بہت ہی خاص ہے۔ وقت بھی خاص ہے۔ انتہائی سکون اور اطمنان قلب کا وقت ہے، نزول رحمت کا وقت ہے اور اللہ تعالیٰ سے قرب خاص حاصل کرنے کا وقت ہے اور دل جمعی کا وقت ہے۔ اس لئے اس نماز سے باطن منور ہوتا ہے اور بے انتہا نوازشات الٰہی کا دل مسکن بنجاتا ہے۔ جس سے قرب الٰہی کے مراتب طے کرتے ہوئے دیدار الٰہی کے مرتبہ تک رسائی نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مرشد سے اجازت لیکر اس نماز کو پڑھنا چاہئے۔ عام لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا نماز کیلئے بھی مرشد کی اجازت لینی چاہئے؟ اس کا یہ جواب ہے کہ جہاں تک فرض نمازوں کا تعلق ہے بے شک ان کی ادائی کیلئے مرشد کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو اللہ کی جانب سے فرض ہے۔ اسی طرح سنتوں کی ادائی کیلئے بھی کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ یہ نماز خاص ہے، اور اس کی ادائی میں چند خاص اصول کی رعایت ضروری ہے۔ مثلاً سو کر اٹھکر پڑھنا، پڑھنے کے بعد نماز فجر تک نہ سونا اور ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد مرتے دم تک اس پر مداومت کرنا، یہ ایسے امور ہیں جن کی مراعات ضروری ہے، اور مرشد ہی جانتا ہے کہ وہ "مرید آیا اس کی پابندی کر سکتا ہے یا نہیں" وہ پہلے اس کا امتحان لیگا پھر جب اس کو یقین ہو گا کہ یہ شخص ہمیشہ اس کی پابندی کریگا تو اسکو اپنی صحبت سے سرفراز فرما کر اس کی اجازت دیگا۔ یہ نماز ایسی نہیں کہ کسی وعظ و بیان میں اس کے فضائل سن کر جوش و جذبہ کے تحت فوراً

دوسرے ہی دن سے شروع کردے۔ پھر جوش وجذبہ ٹھنڈا ہوگیا، مصروفیت بڑھ گئی، غفلت اور سستی نے اس کی ادائی سے بعض رکھا وغیرہ وغیرہ تو بجائے فائدے کے نقصان ہوگا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تہجد کے پابند مرشد سے اجازت حاصل کی جائے تاکہ "ماله" کے ساتھ "ما علیه" سے کماحقہ واقفیت حاصل ہوجائے۔

صلوٰۃ الحاجۃ: ان میں ایک نماز صلوٰۃ الحاجۃ بھی ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی خاص حاجت کے تحت دو رکعت نماز پڑھی ہے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ ایک صحابی نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ میرا گھر مسجد نبوی سے دور ہے، اندھیرا بھی رہتا ہے تو جماعت میں حاضر نہیں ہوسکتا، اگر آپ میرے گھر تشریف لاکر ایک جگہ نماز پڑھ لیں تو میں اسی جگہ کو "مصلیٰ" بناکے وہیں نماز پڑھا کروں گا۔ تو آپؐ وہاں تشریف لے گئے اور ایک جگہ نماز پڑھی تو ان صحابی نے برکۃ اسی جگہ کو مصلیٰ بناکر نماز پڑھنا شروع کیا۔

اسی طرح ایک دوسرے صحابی نے حضورؐ سے التجاء کی کہ وہ مقروض ہیں اور وہ یہودی جس سے انہوں نے قرض لیا ہے، سختی سے تقاضہ کرتا ہے۔ اور کھجور کی فصل بھی اتنی نہیں ہے کہ اس کا پورا قرض ادا ہو، تو آپؐ اسکے کھیت تشریف لیگئے اور آپؐ نے دو رکعت نماز پڑھی، اللہ سے دعا کی اور ان صحابی س فرمایا کہ کھجور کی جو فصل ہوئی ہے اسے ایک جگہ ڈھیر کردیں، پھر آپؐ نے دعا فرمائی اور فرمایا کہ اس یہودی کو بلایا جائے، پھر آپؐ نے حکم دیا کہ جتنا تیرا قرض ہے وہ پورا لے لے۔ اللہ کا فضل ہوا، یہودی نے اپنا پورا قرض وصول کرلیا اور اللہ نے اتنی برکت دی کہ اسکے باوجود اتنی ہی کھجوریں بچی رہی۔ بعض اہل اللہ نے بھی صلوٰۃ الحاجۃ پڑھی ہے۔

ہمارے پاس روایت ہے کہ حضرت بندگی میاں شاہ نظام دریائے وحدت آشامؓ جو حضور مہدی موعود علیہ السلام کے خلیفۂ چہارم ہیں، حضور مہدی موعودؑ سے اجازت لیکر صلوٰۃ الحاجۃ وتر سے پہلے پڑھا کرتے تھے، لیکن آپؓ کی حاجت کچھ دنیا کیلئے نہیں تھی بلکہ "دیدار خدا" ہی آپؓ کی حاجت تھی۔ حضرت مہدیؑ نے آپؓ کو اجازت مرحمت فرمائی تھی، یہ نماز بھی آنحضرت رسول اللہ ﷺ کی سنت تھی۔ نظامی خاندان اس سنت پر آج بھی عمل پیرا ہے۔

نوٹ: اوپر بیان کردہ سنتیں جو دن اور رات میں پڑھی جاتی ہیں، ان کی پابندی کرنی چاہیے، ان کے علاوہ بعد کے لوگوں نے اپنی مرضی سے مختلف ناموں سے جو نمازیں ایجاد کرلی ہیں وہ سب "ایجاد بندہ" ہیں۔ حضور ﷺ سے ان کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں ہے۔ اس لئے ان کا شمار بدعتوں میں ہوگا۔ نماز چونکہ "امر تعبدی" ہے پس اللہ کے حکم اور حضورؐ کی سنت میں جو ہوگا وہ عبادت ہوگی۔ اس کے علاوہ جو ہوگی وہ بدعت کہلائیگی۔

اسی لئے حضور مہدیؑ نے ایسی نفل نمازوں سے منع فرمایا اور فرمایا کہ ذکر اللہ فرض ہے۔ سنتوں سے فارغ ہونے کے بعد جو وقت ملتا ہے اس میں اللہ کو یاد کرو، کہ اللہ نے اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے ہوئے بھی ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی لئے وہ نمازیں جو ایجاد بندہ ہیں نہیں پڑھی جاتیں۔ واضح ہو کہ ایجاد کردہ نمازیں صلوٰۃ الفاتح، صلوٰۃ غوثیہ، خضر کی نماز، صلوٰۃ الاوابین وغیرہ ۔ صلوٰۃ الفاتح کا ثواب احمد تیجانی نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو کچھ زمین بھر میں ذکر اذکار پڑھے جاتے ہیں ان کو چھ ہزار سے ضرب دی جائے تو اس کے برابر ہے۔ (شریعت و طریقت، مولانا عبد الرحمان کیلانی، ص ۱۵۸)

قضاء الفوائت یعنی فوت شدہ نمازوں کی قضا۔ اگر کسی شخص سے کوئی نماز فوت ہو جائے یا وہ عمداً ترک کر دے تو اسے چاہئے کہ اسکی قضا پڑھ لے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "من نام عن صلوٰۃ او نسیھا فلیصلھا اذا ذکرھا" یعنی جس شخص سے نیند کی وجہ سے نماز چھوٹ گئی یا وہ بھول گیا تو اس کو چاہئے کہ جب اسے یاد آئے اس نماز کو پڑھ لے۔ اور جس شخص کی پانچ نمازیں قضا ہو جائے تو وہ ترتیب کے ساتھ قضا پڑھے اور جس شخص کی چھ نمازیں مسلسل قضا ہو جائیں تو وہ صاحب ترتیب نہیں رہا، قضا تو کرے لیکن ترتیب اس سے ساقط ہو جائیگی۔

قضا کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں پہلے ادا پھر قضا، بعض کہتے ہیں پہلے قضا پھر ادا۔

جن اوقات میں نماز مکروہ ہے اور جائز نہیں ہے ان کا بیان: طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت اور جبکہ آفتاب سر پر ہو (وقت استواء) نماز پڑھنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا، چنانچہ عقبۃ بن عامرؓ سے روایت ہے "قال نھانا رسول اللہ ﷺ ان نصلی و ان نقبر فیھا موتانا، عند طلوع الشمس حتیٰ ترتفع، عند زوالھا حتیٰ تزول، و حین تضیف الغروب حتیٰ تغرب" یعنی رسول اللہ ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے اور مردوں کو دفن کرنے سے ہم کو منع فرمایا۔ (۱) طلوع آفتاب کے وقت یہاں تک کہ وہ بلند نہ ہو جائے (۲) زوال کے وقت یہاں تک کہ زوال پورا نہ ہو جائے۔ (۳) وقت غروب، یہاں تک کہ وہ غروب نہ ہو جائے۔ ان اوقات میں نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت بھی منع ہے۔ اسی طرح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد طلوع آفتاب تک اور عصر کی نماز پڑھ لینے کے بعد غروب آفتاب تک بھی کوئی نماز نہ پڑھے (قدوری، ص ۳۱)

سجدۂ سہو: اگر نماز میں جنس نماز میں سے کوئی فعل زیادہ یا کم ہو جائے تو سہو کے دو سجدے کرے، اس طرح کہ تشہد کے بعد پہلے سیدھی جانب ایک سلام کرے پھر سہو کے دو سجدے کرے، پھر بیٹھ کر پھر سے تشہد پڑھے، درود و دعائے ماثورہ کے بعد دونوں جانب سلام کرے۔

نماز میں جو فرائض ہیں ان میں سے کوئی فرض ترک ہو جائے تو نماز ہی نہیں ہوتی، دوبارہ نماز پڑھنی چاہیئے۔ لیکن اگر تکرار فرض یا تاخیر فرض ہو یا ترک واجب ہو یا تکرار واجب ہو یا تاخیر واجب ہو تو ان صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہو جاتا ہے ۔ فرض جیسے تکبیر تحریمہ، قیام، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ ۔ واجبات جیسے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا، ضم سورہ کرنا، تکبیرات عیدین ، قعدۂ اولیٰ، تشہد، ظہر اور عصر کی نمازوں میں آہستہ قرأت کرنا اور فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں آواز سے قرأت پڑھنا وغیرہ، ان میں کسی فعل کا ترک کرنا، یا ان کی تکرار کرنا یا ان میں تاخیر کرنا، ان سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے۔ امام پر اگر سجدۂ سہو لازم آ جائے تو مقتدیوں کو بھی امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرنا لازمی ہے۔ لیکن اگر مقتدی سے سہو ہو جائے تو نہ تو امام پر سجدہ لازم آتا ہے اور نہ مقتدی پر۔

اگر کوئی شخص قعدۂ اولیٰ کو بھول جائے اور کھڑے ہونے کا قصد کرے، اتنے میں اسے یاد آ جائے تو وہ اگر بیٹھنے کے قریب ہو تو بیٹھ جائے اور اسپر سجدۂ سہو نہ ہو گا، لیکن اگر اٹھنے کے قریب ہو تو نہ بیٹھے بلکہ کھڑا ہو جائے اور ترک واجب کی وجہ سے آخر میں سجدۂ سہو کر لے اور نماز پوری کر لے۔ اور اگر آخری قعدہ کو بھول کر (چار رکعتوں کے بعد) کھڑا ہو جائے یعنی پانچویں رکعت میں آ جائے اور سجدہ کرنے تک بھی اسے یاد آ جائے تو وہ قعدہ کی طرف لوٹ آئے اور سجدۂ سہو کر لے اور نماز پوری کر لے اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کر لے تو اسکی نماز باطل ہو جائے گی۔ مگر اسکو چاہیئے کہ چھٹویں رکعت بھی پڑھ لے، وہ پوری نماز نفل ہو جائے گی اور دوبارہ اسکو نماز پڑھنی پڑے گی۔

اور اگر چوتھی رکعت میں تشہد کی مقدار بیٹھا، لیکن قعدۂ اولیٰ سمجھ کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا یعنی پانچویں رکعت کیلئے پھر اگر اسکو پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے یاد آ گیا کہ اس کی یہ پانچویں رکعت ہے تو اسکو چاہیئے کہ ایک اور رکعت کا اضافہ کر لے اور سلام پھیر لے، اسکی نماز پوری ہو جائے گی اور آخری دو رکعتیں نفل ہو جائے گی۔

اگر کسی کو نماز میں شک ہو کہ تین رکعت پڑھی یا چار تو اگر ایسا پہلی بار ہوا ہے تو نماز کو پھر سے پڑھ لینا چاہیئے اور اگر ایسا بار بار ہوتا ہو تو غالب ظن پر نماز پڑھے اور اگر ظن غالب نہیں تو یقین پر عمل کرے۔ یعنی جو کم ہے اسی کو اصل سمجھے اور اسی کی بناء پر نماز پوری کرے۔

مریض کی نماز: اگر کوئی مریض کھڑے ہونے سے عاجز ہو تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھے اور رکوع اور سجود کرے۔ لیکن اگر رکوع و سجود پر قادر نہ ہو تو اشاروں سے رکوع و سجود کرے۔ سجدہ کا اشارہ، رکوع کے اشارے سے زیادہ جھکا ہوا ہو۔

سجدہ کیلئے اپنے چہرے کے مقابل کسی اونچی چیز کو رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو

چت لیٹ کر نماز پڑھے ،اسطرح کے اپنے پاؤں قبلہ کی طرف کرے اور رکوع و سجود کیلئے اشارہ کرے اور اگر وہ پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھے تو قبلہ کی طرف منہ کرے اور رکوع و سجود کیلئے اشارے کرے تو جائز ہے۔ اور اگر وہ سر کا اشارہ بھی نہیں کر سکتا تو نماز کو موئخر کر دے، یہاں تک کے اسکو سر سے اشارے کی قدرت حاصل ہو جائے اور اگر پانچ نمازوں یا ان سے کم نمازوں کے اوقات میں بیہوشی کا عالم طاری ہو جائے تو صحت یابی کے بعد ان کی قضا کرے اور اگر اس سے زیادہ اوقات میں بیہوشی ہو تو قضا کی ضرورت نہ ہو گی۔

سجدۂ تلاوت: قرآن شریف میں چودہ مقامات پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ اگر امام نماز میں سجدۂ تلاوت پڑھے تو امام کے ساتھ مقتدیوں کو بھی سجدۂ تلاوت اسی وقت کرلینا چاہیۓ۔ اگر کوئی شخص جو داخل نماز نہیں ہے وہ اگر آیت سجدۂ تلاوت کرے اور سننے والے نماز میں ہیں تو وہ نماز میں سجدہ نہ کرے۔ بلکہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سجدۂ تلاوت کریں۔

اور اگر امام نماز میں وہ آیت پڑھے جس سے سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے اور جو شخص خارج نماز ہے اسنے وہ آیت سن لی تو اسکو خارج صلوٰۃ ہی سجدۂ تلاوت کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی شخص خارج نماز نے آیت سجدہ پڑھی مگر اس نے سجدۂ تلاوت نہیں کیا پھر اسنے نماز پڑھی اور اس میں وہی آیت سجدہ پڑھی اور سجدۂ تلاوت کیا تو وہ سجدہ دونوں کیلئے کافی ہو جائے گا۔ اگر کسی شخص نے ایک ہی بیٹھک میں ایک ہی آیت سجدہ کی کئی بار تلاوت کی تو ایک ہی سجدہ کافی ہو جائے گا۔ اور اگر اسنے جگہ بدل کر وہی آیت تلاوت کی تو دوبارہ سجدہ کرنا پڑیگا۔ سجدۂ تلاوت کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑا ہو، اللہ اکبر کہے مگر ہاتھوں کو نہ اٹھائے پھر سجدہ کرے اور اپنے سر کو اٹھائے۔ اس میں نہ تشہد ہے اور نہ سلام۔

مسافر کی نماز: اگر کوئی شخص ایسی جگہ جانے کا ارادہ کرے جو اس کے مقام سے اونٹ کی رفتار یا پیدل چلنے سے تین دن میں وہاں پہنچ سکتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ چار رکعتوں والی نماز کو دو رکعت پڑھے۔ اس کو قصر کرنا کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مسافر شرعی ہو اور اسنے چار رکعت ہی پڑھ لئے تو اس نے اگر دو رکعت کے بعد مقدار تشہد پہلے قعدہ میں بیٹھا ہو تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی۔ پہلے کے دو رکعت فرض ہوں گے اور بعد کے دو رکعت نفل ہو جائے گے۔

اور اگر وہ دو رکعت کے بعد نہ بیٹھا ہو اور پورے چار رکعت نماز پڑھ لی تو اس کی نماز باطل ہو جائیگی۔ قصر کی ابتداء گھر سے نکلتے ہی نہیں ہو گی، بلکہ جب مسافر اپنے مقام (شہر یا گاؤں) کے حدود سے باہر ہو جائیگا، اس وقت سے اس پر سفر کے احکام کا انطباق ہو گا۔ ایسے مسافر کیلئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم پندرہ دن یا اس سے زیادہ دوسرے مقام (شہر) میں قیام کرنے کی نیت کرے۔ اس سے کم دنوں کی نیت پر اس پر قصر کا حکم جاری نہ ہو گا۔ اگر مسافر کسی مقیم کے پیچھے نماز پڑھے تو اس پر قصر کا حکم نہ

ہو گا۔ اسے چاہئے کہ وہ امام کی اقتداء میں پوری نماز پڑھے۔ اس کے بر خلاف اگر وہ خود امام بن کر نماز پڑھا رہا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ قصر ہی پڑھے اور مقیم مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ دو رکعت تک اسکی اقتداء میں نماز پڑھیں اور جب وہ دو رکعت پورے ہونے پر سلام کرے تو وہ کھڑے ہو کر اپنی باقی دو رکعت نماز پوری کر لیں۔ ایسی صورت میں امام کو چاہئے کہ سلام پھیرنے کے بعد باآواز بلند یہ کہدے کہ مقیم لوگ اپنی نماز پوری کر لیں۔ اس لئے کہ میں مسافر ہوں۔ جب کوئی شخص ایک دوسرے مقام کو اپنا وطن بنالے، پھر اگر وہ کسی کام سے اپنے پرانے وطن کو جائے تو اسکو چاہئے کہ وہ اپنے وطن اول میں قصر کرے یعنی نماز پوری نہ پڑھے۔ مسافر کیلئے دو نمازوں کو فعلا جمع کرنا جائز ہے۔ یعنی ظہر کی نماز دیر سے پڑھے مگر ظہر کے وقت میں پڑھے اور عصر کی نماز اس کے وقت کے شروع میں پڑھے، دیکھنے والوں کو معلوم ہو گا کہ وہ دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کر رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ظہر کی نماز اس کے وقت میں ہو رہی ہے اور عصر کی نماز اسکے وقت میں۔ مثال کے طور پر اگر ظہر کا وقت ۴:۴۵ کو ختم ہو رہا ہے تو اسکو چاہئے کہ وہ ظہر کی نماز ۴:۳۰ کو پڑھ لے، پھر عصر کی نماز ۴:۵۰ کو پڑھ لے۔

نماز میں قصر کرنا عالیت ہے، اس لئے کہ مہدی موعودؑ نے قصر ہی پڑھی ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ امامنا مہدی موعودؑ بڑلی میں قصر کی نماز ہی پڑھتے تھے۔ جب پندرہویں دن آپؑ نے خدا کے حکم سے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ مؤکد فرمایا تو آپؑ نے اعلان کیا کہ اب بندہ نے یہاں قیام کرنے کی نیت کر لی ہے۔ اس لئے اب نماز پوری پڑھے گا۔ اگر نماز قصر رخصت ہوتی تو آپؑ اس پر عمل نہ کرتے۔ اس لئے کہ آپؑ نے فرمایا دین عزیمت ہے نہ کہ رخصت۔ مہدی موعودؑ نے ہمیشہ عزیمت و عالیت پر عمل فرمایا نہ کہ رخصت پر۔

نماز جمعہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "یا ایھا الذین اٰ منوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ و ذروا البیع ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون" (سورۂ جمعہ) اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کیلئے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر (نماز جمعہ) کیلئے دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ نماز جمعہ فرض ہے۔ اس کا انکار کرنے والا کافر ہے اور بلا عذر شرعی اس کو ترک کرنے والا گنہ گار ہے۔

نماز جمعہ جامع العبادات ہے۔ اس لئے اسکے شرائط بھی ہیں، ان کے پائے جانے کی صورت میں نماز جمعہ صحیح ہے۔ فقہائے کرام نے اس کیلئے بارہ شرطیں لکھی ہیں۔ چھ شرطیں نمازی کیلئے اور چھ شرطیں عام ہیں۔

نمازی کے شرائط ستہ

(۱) نمازی آزاد ہو، غلام پر نماز جمعہ واجب نہیں ہے۔

(۲) نمازی مرد ہو، عورت پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے، اسی طرح بچے پر بھی۔

(۳) نمازی مقیم ہو، مسافر کے حق میں نماز جمعہ فرض نہیں ہے۔

(۴) نمازی تندرست ہو، مریض پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے۔

(۵) نمازی کے دونوں پیر صحیح و سلامت ہو، پیروں سے اگر معذور ہو تو اس پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے۔

(۶) نمازی کی آنکھیں سلامت ہو، نماز کو جانے کیلئے وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔

وہ شرائط جن کا تعلق نمازی سے نہیں ہے

(۱) شہر ہو۔ ایسا مقام جہاں حکومت ہو، قضیوں کا فیصلہ ہوتا ہو، بازار ہو، گلی، کوچے اور سڑکیں ہو، جہاں مظلوم کی دادرسی ہوتی ہو، اور وہاں علماء ہو جن کے پاس پیش آنے والے واقعات کے تعلق سے رجوع ہو سکتا ہو۔ یعنی ضروریات زندگی کی جہاں تکمیل ہو سکتی ہے۔

(۲) سلطان ہو۔ یہ شرط غالباً اس وقت کے لحاظ سے فقہاء نے بادشاہ کے زیر اثر لگائی ہے تاکہ حکومت وقت کے خلاف کسی قسم کی بغاوت کا اندیشہ ہی نہ رہے۔ ورنہ نماز جیسی عبادت کیلئے جو خالص اللہ کیلئے کی جاتی ہے، سلطان یا امیر کی اجازت یا اسکی حاضری کی شرط غیر اسلامی ہے۔

یوں بھی دیکھا جائے تو اسلام میں سلطان یا بادشاہ کا دور دور تک کوئی تصور نہیں ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی سلطان یا بادشاہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خود آنحضرت ﷺ سلطان کائنات تھے، تو بے شک عقیدہ کی حد تک یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو سلطان کہا؟ یا دوسروں سے سلطان کہلوانا پسند کیا، نہ وہ شاہانہ رعب و دبدبہ تھا اور نہ دنیوی جاہ و جلال اگر رعب و دبدبہ یا جاہ و جلال تھا تو وہ روحانی تھا۔ آپ ﷺ نے تو فرمایا کہ "میں ایسی ماں کا بیٹا ہوں جو سوکھی روٹیاں کھاتی تھی۔ آپؐ کی غذا، لباس وضع قطع، رہن سہن سب کا سب فقیرانہ تھا۔ بستر، بیٹھک وغیرہ سے فقیری کی شان نمایاں تھی، پھر حضور ﷺ کے بعد بھی حضورؐ کے خلفاء نے ملک یا بادشاہ کا لقب اپنے لئے استعمال نہیں کیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خلیفۂ رسول اللہ کہا جاتا ہے، بعد خلفاء ثلاثہ کیلئے "امیر المومنین" کا لقب استعمال کیا جانے لگا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی سے فرمایا تھا، میرے بعد خلافت ہو گی، اسکے بعد ملوکیت کا دور ہو گا، خلافت میں بھی وراثت کو دخل نہیں تھا۔ البتہ اسکے بعد جب ملوکیت آگئی تو وراثت نے دخل اندازی کی اور وہ قیامت برپا ہوئی کہ اللہ کی پناہ۔

اسی طرح حضور مہدیؑ کے زمانے میں بھی بادشاہت کا دور دورہ تھا۔ لیکن کہیں بھی اسلامی طرز کی حکومت نہیں تھی، بلکہ احکام اسلام کے خلاف بادشاہوں کے اشاروں پر قاضی فیصلے کرتے تھے اور مفتی فتوے دیا کرتے تھے۔ گویا یہ لوگ بجائے اللہ ورسول کے احکام کی اتباع کرنے کے شریعت مصطفوی کو اپنا تابع بنا چکے تھے، کسی شاعر نے ان لوگوں کا نقشہ کتنے خوبصورت الفاظ میں کھینچا ہے۔

زنہار از آں قوم نباشی کہ فریبند　　　　حق رابسجودے ونبی رابہ درودے

اے مخاطب تو ہرگز ان لوگوں میں سے مت ہو جو اللہ کو سجدے اور نبی کریم ﷺ کو درود سے دھوکہ دیتے ہیں۔ خود حضور مہدیؑ نے جب مہدیت کا دعویٰ امر خدا سے کیا اور قرآن واتباع رسول ﷺ کو اپنے ثبوت میں پیش فرمایا تو (ان بادشاہوں کو سوا جن کو اللہ نے تصدیق کی توفیق مرحمت فرمائی تھی) بادشاہوں نے آپ کو اخراج کا حکم نہیں دیا؟، ہجرت پر مجبور نہیں کیا؟، انواع واقسام کی ایذائیں نہیں پہنچائیں ؟ اور حضرت بندگی میاں سید خوندمیر صدیق ولایت سید الشہداءؓ کے خلاف جنگ نہیں کی ؟ اور آپ کو مع ساتھیوں کے شہید نہیں کیا؟ اور اس سے پہلے حضرت بندگی میاں سید محمود ثانی مہدیؓ، حضرت بندگی میاں شاہ نعمتؓ، حضرت بندگی میاں سید علی بن مہدی موعودؑ، حضرت بندگی میاں عبد المجید نور نوشؓ، حضرات رنگریز شہداءؓ، حضرت بندگی میاں عبد الرشیدؓ، حضرت شیخ مصطفیٰ گجراتی وغیرھم کی شہادت کے ذمہ دار یہی علماء سوء اور سلاطین وقت تھے۔

پھر ایسی صورت میں حضور ﷺ کس طرح فرماسکتے تھے کہ دین کے ایک اہم رکن نماز جمعہ کی اقامت وادائی کیلئے ''سلطان'' کی اجازت ضروری ہے۔ مہدیؑ ہندوستان کے مختلف مقامات پر تشریف لیگئے، ان میں علاقہ راجھستان بھی تھا، آپ نے وہاں بھی نماز جمعہ پڑھی ہے حالانکہ وہاں سلطان نہیں بلکہ راجا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سلطان یا اسکے نائب کی اجازت شرعی شرط نہیں ہے۔ بلکہ خالص دنیاوی اور مفاد پرستی کی شرط ہے۔ جو قابل اعتناء نہیں ہے۔

(۳) تیسری شرط جماعت ہے۔ دوسری فرض نمازوں کیلئے جماعت سنت ہے، اگر جماعت نہ ملے یا عذر ہو یا سفر میں ہو تو تنہا بھی نماز پڑھ لینی چاہئے، اس لئے کہ جماعت شرط نہیں ہے۔ لیکن جمعہ کیلئے جماعت شرط ہے، اکیلا آدمی جمعہ کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ جماعت کیلئے امام کے سوا تین یا دو افراد کا کم ازکم ہونا ضروری ہے، نیز اس لئے بھی کہ اس میں خطبہ بھی شرط ہے۔

(۴) چوتھی شرط خطبہ ہے۔ خطبہ میں اللہ کی حمد، رسول اللہ ﷺ و مہدی موعودؑ پر درود وسلام اور اللہ تعالیٰ کے

احکام اور حضور کے فرامین وغیرہ کے ذریعہ قوم کو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے۔ امام یا خطیب جب منبر پر بیٹھے تو مؤذن پہلے اذاں کہے، پھر خطیب خطبہء اولیٰ دے، پھر خطیب منبر پر بیٹھ جائے اور پھر اٹھ کر خطبۂ ثانیہ دے۔ اسکے بعد اقامت ہو اور امام دو رکعت نماز پڑھائے، جس میں قرأت جہر سے ہو۔

نماز جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت پڑھی جائے اور نماز کے بعد پھر چار رکعت سنت پڑھی جائے، ایک روایت کے مطابق پہلے چار رکعت سنت پھر دو رکعت سنت پڑھی جائے۔

جمعہ کے دن اگر کوئی شخص ایسے وقت مسجد پہنچا جبکہ امام نماز پڑھا رہا تھا تو وہ امام کو جس حالت میں دیکھے، نماز میں شریک ہو جائے۔ خواہ وہ تشہد پڑھ رہا ہو یا سجدۂ سہو میں ہو اور اسکے بعد نماز پوری کرلے۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، لیکن صاحبین کہتے ہیں کہ اگر وہ امام کو دوسری رکعت کے اکثر حصہ میں یعنی رکوع سے قبل یا رکوع میں پائے تو نماز میں شریک ہو ورنہ ظہر پڑھ لے۔ اور جب امام خطبہ شروع کردے تو لوگوں کو چاہئے کہ کوئی نماز نہ پڑھیں اور نہ کوئی بات کریں۔ جب تک کہ وہ خطبہ سے فارغ نہ ہو جائے۔

(۵) پانچویں شرط خطبہ ہے اس کا بیان ہو چکا ہے۔

(۶) چھٹویں شرط اذن عام ہے یعنی لوگوں کو مسجد میں آنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، جیسے کرفیو وغیرہ کا نفاذ۔

نماز عیدین۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز واجب ہے، جس پر اور جہاں پر جمعہ واجب ہے اسپر اور وہاں عید کی نماز بھی واجب ہے۔ نماز عید الفطر کیلئے جانے سے پہلے یہ مستحب ہے کہ کچھ کھائے یعنی کھجور تین سے سات عدد تک یا کوئی میٹھی چیز، غسل کرے، اچھے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے، پھر نماز گاہ کی طرف جائے، راستہ میں تکبیر نہ کہے اور نماز گاہ میں کوئی نفل نماز نہ پڑھے۔ نماز عید کا وقت سورج بلند ہونے کے وقت سے زوال تک کا ہے۔ امام لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائے، دونوں رکعتوں میں قرأت بالجہر کرے۔

طریقۂ نماز یہ ہے کہ امام پہلے اللہ اکبر کہے، یہ تکبیر تحریمہ ہوگی، مقتدی بھی اسکی اقتداء میں اللہ اکبر کہیں اور ہاتھ باندھ لیں، اور ثناء پڑھیں اور تعوذ و تسمیہ بھی پڑھ لیں۔ پس پھر امام اللہ اکبر کہہ کر اپنے ہاتھوں کو کانوں تک لیجائے گا پھر اسی طرح دوبارہ کرے گا پھر اسی طرح سہ بارہ کرے گا اور ہاتھ باندھ لیگا، مقتدیوں کو بھی اسی طرح کرنا چاہئے۔

پھر امام سورۂ فاتحہ اور ضم سورہ کریگا، اور رکوع و سجدوں کے ساتھ ایک رکعت پوری کریگا، البتہ دوسری رکعت میں

امام پہلے سورۂ فاتحہ اور ضم سورہ کریگا پھر اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک لیجا کر چھوڑ دیگا، اسی طرح دوبارہ کریگا، اسی طرح سہ بارہ کریگا۔ چوتھی تکبیر کہہ کر امام (ہاتھوں کو کانوں تک لیجائے بغیر) رکوع میں جائے گا۔ اور رکعت پوری کریگا اور سلام پھیریگا۔ نماز ختم ہو جائیگی۔ اسکے بعد امام منبر پر سے دو خطبہ دیگا، خطبہ میں امام صدقۂ فطر اور اسکے احکام بیان کریگا یعنی یہ کہ

(۱) فطرہ کس پر واجب ہوتا ہے ؟ فطرہ آزاد مسلمان پر جو مالک نصاب ہے اس پر واجب ہے اسکو چاہئے کہ وہ اپنی طرف سے اور اسکے ان اہل و عیال کی طرف سے جن کا نفقہ اس پر واجب ہے فطرہ واجب ہوگا۔

(۲) کس کو دینا چاہئے ؟ فقیر اور مسکین، حاجت مندوں کو دینا چاہئے۔

(۳) فطرہ کب واجب ہوتا ہے؟ یوم الفطر کے طلوع فجر سے اسکا وقت شروع ہوتا ہے۔

(۴) فطرہ کتنا واجب ہے؟ گیہوں کا نصف صاع اور کھجور اور جوار ہو تو ایک صاع۔ آج کل کے پیمانے سے دو کلو تقریباً ہو جائیگیں۔

اگر امام نے عید کی نماز پڑھادی اور کسی کو نہ ملی تو اس پر قضاء نہیں ہے اور نہ وہ اکیلا پڑھ سکتا ہے، اگر انتیسوی رات کو ابر آلود موسم کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے اور زوال کے بعد چاند ہونے کی اطلاع ملے تو امام کو چاہئے کہ دوسرے دن نماز عید پڑھائے۔ اگر پھر دوسرے دن بھی کسی وجہ سے لوگ نماز نہ پڑھ سکے تو تیسرے دن نہ پڑھے۔

اور عید الاضحیٰ کے دن بھی غسل کرے، خوشبو لگائے اور نماز سے فارغ ہونے تک نہ کھائے اور نماز گاہ کی طرف تکبیرات کہتے ہوئے جائے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح عمل فرمایا تھا۔ پھر امام دو رکعت نماز پڑھائے اور دونوں رکعتوں میں قرآت بالجہر کرے اور نماز عید الفطر کی طرح پہلی رکعت میں تین زائد تکبیریں کہے قرات سے پہلے اور دوسری رکعت میں تین زائد تکبیریں کہے (رکوع سے پہلے)۔ اور نماز کے بعد امام منبر پر سے دو خطبہ دے اور خطبہ میں قربانی کے احکام بیان کرے۔ واضح ہو عیدین کی نماز میں نہ اذان ہے، نہ اقامت ہے، نہ صلوٰۃ ہے۔

یوم عرفہ کی فجر کی نماز کے بعد ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد تکبیرات تشریق پڑھے۔ تکبیرات تشریق "اللہ اکبر اللہ اکبر لا إلہ الاّ اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد" نماز عید کے بعد جن لوگوں پر قربانی واجب ہے وہ قربانی کرے۔

نماز کسوف۔ سورج گہن کی نماز (جب سورج گہن ہو جائے تو امام لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائے اور نمازوں کی طرح البتہ قرات کو طویل کرے، پھر اسکے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یہاں تک گہن ختم ہو جائے۔ اور لوگوں کو وہی شخص نماز

پڑھائے جو جمعہ پڑھاتا ہو، اگر وہ دستیاب نہ ہو تو لوگ علٰحدہ علحدہ نماز پڑھ لیں۔

چاند گہن کی نماز۔ چاند گہن کی نماز کی جماعت کے ساتھ نماز نہیں ہے۔ اگر لوگ چاہیں تو علٰحدہ علٰحدہ نماز پڑھ لیں۔ دونوں میں کوئی خطبہ نہیں ہے۔

صلوٰۃ الاستسقاء۔ بارش مانگنے کی نماز، حضرت ابو حنیفہؒ کے پاس استسقاء کی کوئی با جماعت نماز نہیں ہے، البتہ لوگ اگر تنہا تنہا نماز پڑھ لیں تو جائز ہے۔ استسقاء دراصل دعا اور استغفار ہے، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ امام دو رکعت نماز پڑھائے قرات جہر سے ہو، پھر خطبہ دے پھر قبلہ کی طرف منہ کرکے دعا بارش کیلئے کرے اور اپنی چادر کو الٹ دے۔ (یہ اب جو سوکھے کی حالت ہے اللہ اسکو بدل دے) لیکن جماعت اپنی چادریں نہ الٹیں، اس دعا میں اہل ذمہ شریک نہ ہو۔

نذر و نیاز

نذر کے معنی کسی ایسی چیز کو اپنے پر واجب کر لینا ہے، جو شریعت کی جانب سے واجب نہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا پورا کرنا واجب ہے؛ مثلاً اگر کسی شخص نے یہ نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو پانچ فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا تو وہ کام پورا ہونے پر کھانا کھلانا اس پر واجب ہو جائیگا، لیکن اگر کوئی شخص کسی مزار کے پاس جا کر صاحب مزار سے یہ کہے کہ "اے بزرگ اگر میرا یہ کام ہو جائے تو میں تمھارے نام پر کھانا کھلاوں گا تو یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ نذر ایک طرح سے عبادت ہے اور عبادت اللہ کے سوا کسی اور کیلئے جائز نہیں ہے۔ اس کے بر خلاف اگر یہ کہا جائے کہ "اے اللہ اگر میرا یہ کام یا میری یہ حاجت اس بزرگ کے وسیلہ سے اور برکت سے پوری کر دے تو میں یہاں یا کسی اور جگہ کھانا کھلاوں گا خصوصا مسافروں اور محتاجوں کو یہ جائز ہے۔

اصل میں نذر و نیاز اللہ ہی کیلئے ہے، مگر عام طور پر جو لوگ ایصال ثواب اور فاتحہ کو نذر اور پیروں اور مرشدوں کو جو دیتے ہیں اسے نیاز کہتے ہیں دراصل وہ ہدیہ ہوتا ہے، جسے یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی نذر ہے تو در حقیقت وہ ہدیہ ہوتا ہے؛ اس طرح لوگ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی نیاز دلائی، تو اس سے ان کی مراد فلاں بزرگ کو ایصال ثواب پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ دراصل نیاز کے دو معنی ہیں، ایک سراسر بندگی اور عاجزی، تو یہ صرف اللہ کیلئے ہی مخصوص ہے اور دوسرے معنی اللہ کی نذر کرنا اور میت کو ثواب پہنچانا (جس میں زبرگ بھی شامل ہیں) یہ جائز ہے۔ اور باعث خیر کثیر ہے۔

نصیرا

نصرت کے معنی مدد کے ہیں۔اسی سے ناصر اور نصیر بھی ہے جس کے معنی "مدد کرنے والا" کے ہیں۔ قرآن شریف میں نصیرا کا لفظ ۱۳ مقامات پر آیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو اسطرح دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔وقل ربّ ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا(بنی اسرائیل ۸۰) اور آپ دعا کیجئے اے رب مجھ کو خوبی کے ساتھ داخل کیجو اور خوبی کے ساتھ باہر نکالیو اور اپنے ہاں سے وہ غلبہ دیجو جسکے ساتھ نصرت ہو۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم کیلئے غالب نصرت والی ہستی حضرت مہدی علیہ السلام ہی کی ہے اس لئے کہ مہدی علیہ السلام کی بعثت کا مقصد ہی دین رسولؐ کی نصرت ہے ایسے وقت میں جبکہ وہ رسم، عادت اور بدعت کے سبب دنیا سے رخصت ہو چکا ہو گا۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی اس دعا میں خصوصی طور پر جو امر غور کے قابل ہے وہ "مِن لّدنک" ہے۔یعنی صرف نصرت اور مدد اور تائید ہی کے آپ طالب نہیں ہیں بلکہ وہ غالب نصرت ہے۔جو "من لّدنک" والی ہے۔یعنی ایسی نصرت جو صرف اللہ کی طرف سے ہو۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین کیلئے، ایسے وقت میں جب اس میں اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا ہو گا کہ وہ صرف نام کا رہ گیا ہو گا۔اللہ کی جانب سے ہی غالب نصرت کی دعا فرمائی ہے۔

اور وہ ہستی صرف مہدی علیہ السلام کی ہی ہو سکتی ہے۔اس لئے کہ اللہ نے آپ کو دین حقیقی کے تحفظ اور شرع مصطفیٰ علیہ السلام کی صیانت کی غرض سے خلیفہ اللہ تابع تام محمد رسول اللہ اور معصوم عن الخطا کی حیثیت سے مبعوث فرمایا ہے ۔چنانچہ آپ نے یہی دعویٰ فرمایا، ہم کسی مذہب یعنی اجتہادی مسلک کے مقید نہیں ہیں۔ ہمارا مذہب اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی اتباع ہے۔

چنانچہ مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے جس سلطانا نصیرا کی دعا اللہ سے فرمائی تھی۔اس کا مصداق یہ بندہ ہے۔اسی طرح حضرت مہدی موعود علیہ السلام کے حق میں غالب نصرت حضرت بندگی میاں سید خوندیر صدیق ولایت سید الشہداءؓ کی ہستی ہے۔

چنانچہ روایتوں میں آیا ہے کہ جب حضرت مہدی علیہ السلام بڑلی میں قیام فرماتھے۔اور یہ قیام عارضی تھا اور آگے

بڑھنے کیلئے ہر وقت فرمانِ خداوندی کے منتظر رہتے تھے اسی لئے قصر نماز پڑھا کرتے تھے۔ پندرھویں روز حضرت مہدی علیہ السلام اپنے دائرہ بڑلی میں کھرنی کے درخت کے نیچے مجمع صحابہ میں جلوہ افروز تھے کہ آپ کو جناب باری تعالیٰ سے اپنے مہدیت کا موکد دعویٰ کرنے کا حکم سختی سے ہوا۔ آپ دعویٰ کا اظہار فرمانا چاہتے ہی تھے کہ حاضرین مجلس میں سے ایک صحابی بے ساختہ بول اٹھے ''لو سید خوندیر آرہے ہیں''۔ یہ سنتے ہی مہدی علیہ السلام جوش محبت اور فرط مسرت میں یہ فرماتے ہوئے آگے بڑھے ''بھائی سید خوندیر! بیائید، خوش آمدید۔'' خدائے تعالیٰ مقصد خود خود می کند ذات شما سلطاناً نصیراً، ناصر ولایت مصطفی است۔ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم برائے نصرت ولایتِ خود ناصر خواستہ بودند کہ ''واجعل لّی من لّدنک سلطاناً نصیرا (بنی اسرائیل) یعنی اور کر میرے واسطے اپنی طرف سے غالب مدد دینے والا'' مراد زیں ذات شما است (نقلیات میاں سید عالم۔ انتخاب المو الید، خاتم سلیمانی، شواہد الولایت، اخبار الاسرار)

اس کے بعد آپ نے دیگر امور کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ اللہ کا فرمان ہوتا ہے۔ وترا ناصر دین محمدی کردیم۔ وماناصر تو ہستیم۔ اس کے بعد حضرت صدیق ولایت رضی اللہ عنہ کو بشارت دی ''تمہاری ذات سلطاناً نصیرا'' ناصر ولایت مصطفی ہے۔ اس فرمان سے واضح ہے کہ سیدنا مہدی علیہ السلام کی ذات ناصر دین محمدی ہے اور بندگی میاںؒ کی ذات ناصر ولایت مصطفی ہے۔

نیت

ہر کام سے پہلے نیت کرناضروری ہے اسلئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا"انما الاعمال بالنیات"یعنی اعمال کی قبولیت کا انحصار اور دارومدار نیتوں پر ہے، جس کی نیت جیسی ہوگی اسی کے مطابق اسکے اعمال مقبول ہوںگے اور ثواب کے مستحق ہوںگے۔ کسی بھی عمل کو عبادت بنانے والی چیز نیت ہوتی ہے، خالی اٹھ بیٹھ کریں گے تو وہ ورزش ہوگی لیکن نیت کے ساتھ اٹھیں گے، بیٹھیں گے، جھکیں گے اور طریقہ وترتیب کے ساتھ کریں گے تو وہ نماز کہلاتی ہے۔ قربانی کی نیت کے ساتھ جانور ذبح کریں گے تو وہ قربانی ہوگی۔ اور اگر یوں ہی ذبح کریں گے (بسم اللہ کہکر) تو وہ ذبیحہ ہوگا، جس کا گوشت کھانے کیلئے جانور ذبح کیا گیا ہے ۔اسپر قربانی کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اسی طرح دوسرے اعمال کا معاملہ ہے، یعنی اگر کوئی شخص اپنے وطن سے باہر جارہاہے اگر اس کا مقصد، اللہ اور اسکے رسولؐ کی خوشنودی حاصل کرنابطور تبلیغ کے یا اللہ کے راستے میں جہاد کیلئے جانا ہے تو اسے ہجرت کا ثواب ملیگا۔ لیکن اگر وہ دنیا کمانے یا کسی عورت سے شادی کرنے کیلئے سفر کررہاہے تو ایسے سفر کو نقل وطن کہیں گے۔ ہجرت نہیں کہیں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا زبان سے نیت کرنا یعنی زبان سے نیت کے الفاظ بھی کہنے چاہئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ویسے تو نیت کا مقام دل ہے۔ کرتے وقت دل میں ارادہ کرلے تو نیت ہوجائے گی، یہی مسلک بعض فرقوں کا ہے۔ وہ کہتے ہیں زبان سے نیت کرنا ظروری نہیں ہے۔ دل میں جو نیت ہے وہی کافی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زبان سے الفاظ کا دہرانا "افضل" ہے۔ کیوں کہ کام کرتے وقت جب زبان سے الفاظ کہے جاتے ہیں تو اس وقت کی مناسبت اور مطابقت کی وجہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اور دوسرے خیالات سے دوری نصیب ہوتی ہے اور روحانی سرور حاصل ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے حکم کی اتباع میں وہ کام کیا جارہاہے اسکی عظمت اور بڑائی کا خیال قلب ودماغ میں سما جاتا ہے، اس لئے فقہاء نے بھی کہاہے کہ زبان سے الفاظ کہنے چاہئیں تاکہ دل میں جو نیت ہے زبان اسکی موافقت کرے۔ یعنی دل اور زبان ایک ہوجائیں، کیوں کہ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے۔

اگر اس موقع پر یہ کہا جائے کہ دنیاوی کاموں کیلئے زبان سے کہنا ضروری ہے تاکہ مخاطب کو معلوم ہو لیکن عبادات میں کہنے کی کیا ضرورت ہے، دل کی حالت کو اللہ خوب جانتا ہے۔ تو اس کا یہ جواب ہے کہ ذبح کرتے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے، حالانکہ ہر مسلمان کے دل میں اللہ کی بڑائی کا تصور ہے۔ اور یہ مسئلہ بھی سبکو معلوم ہے کہ بسم اللہ کہے بغیر ذبح صحیح نہیں ہوتا لیکن پھر بھی زبان سے کہنا ضروری ہے اس قدر کہ اسکے بغیر ذبح صحیح نہیں ہوتا۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ زبان سے کہنے سے دل کی نیت کی تاکید ہوتی ہے۔ کہ یہ فرض ہے یا سنت ہے یا واجب ہے۔

فرض اللہ کہتے ہیں تو اللہ کی بڑائی کا تصور ہوتا ہے اور سنت رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں تو حضور ﷺ کی اتباع کا خیال دل میں آتا ہے۔

بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے تو ان کے ایسا کہنے میں ایک خاص مقصد پوشیدہ ہوتا ہے یعنی تحیۃ الوضو میں متابعۃ المہدی کہنا پڑتا ہے اور دوگانہ شب قدر میں "فرض اللہ" و "متابعة المهدی الموعود" کہنا پڑتا ہے۔ اور ان لوگوں کو یہ کہنا گوارا نہین ہے، بلکہ وہ ایسا کہنا ہی نہیں چاہتے کیوں کہ یہ ان کا عقیدہ بھی نہیں ہے۔ دنیا کو دکھانے کیلئے رسماً عمل کر لیتے ہیں تو وہ اسی میں اپنی عافیت ڈھونڈ لیتے ہیں کہ بھائی زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے، دل سے نیت کر لو کہ کونسی نماز پڑھ رہے ہیں کافی ہے۔ امام کو تو چاہئے کہ خاص خاص موقعوں پر جہاں مجمع کثیر ہو، خصوصیت کے ساتھ فرض ،واجب اور سنت کا اظہار کرنا بطور تعلیم و عقیدہ کے ضروری ہے۔ نیت کے الفاظ کو دوہرائے تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ ہم کونسی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور اس کا کیا نام ہے۔ اور کس کی اتباع میں پڑھ رہے ہیں۔

نیز یہ بات بھی یاد رکھنے کہ قابل ہے کہ جس طرح عمل کی نیت ہوتی ہے اسی طرح نیت کی بھی ایک نیت ہوتی ہے۔ پس جب تک جس نیت سے کام کیا جارہا ہے اس کی نیت کا بھی اچھا ہونا ضروری ہے، جب تک وہ نیت صحیح نہیں ہوگی نہ وہ نیت صحیح ہوگی اور نہ وہ عمل۔ مثال کے طور پر ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اس نے اس کی نیت بھی صحیح کر لی لیکن نیت باندھ کر نماز پڑھنے کی نیت اللہ کا فرض یا رسولؐ کی سنت ادا کرنے کی نہیں ہے بلکہ دوسروں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ "میں رات میں بھی نماز پڑھتا ہوں" اب بتائے کہ کیا عمل مقبول ہوگا۔ پس عوام کو تو چاہیئے کہ زبان سے نیت کرتے ہوئے دل کی نیت کو موکد کریں، تاکہ دل میں جو ہے زبان اس کا اظہار اور اقرار کرے اور منافقت سے دور رہیں۔

نبوت وولایت

نبی: اللہ تعالیٰ قوم کی اصلاح اور ہدایت کیلئے اپنے ایک بندے کو اپنی طرف سے چن کر بھیجتا ہے، اس پر اللہ کی جانب سے وحی یعنی خفیہ پیغام حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ اتارتا ہے۔ وہ معصوم عن الخطاء ہوتا ہے، اللہ ہی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ پیغمبر اپنے آخری وقت تک لوگوں کو توحید کی دعوت دیتا ہے۔ آخرت کے دن کی یاد دلاتا ہے۔ لوگوں کو اچھے کام کا حکم دیتا ہے اور تمام برائیوں سے روکتا ہے، اور اس ہدایت دینے کے عوض قوم سے اجرت کا طالب نہیں ہوتا۔ ان کی جانب سے کئے جانے والے ظلم وستم کو انتہائی صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ اگر وہ معجزہ طلب کریں تو اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے مطالبہ کو پیش کرتا ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہو تو اللہ اس پیغمبر کے ذریعہ معجزہ دکھاتا ہے۔ بعض پیغمبروں کو اللہ نے بڑی کتابیں عطا کیں اور بعض کو صحیفے دیۓ۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں یکے بعد دیگرے پیغمبر مبعوث فرمائے، جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کچھ زیادہ بتائی جاتی ہے۔ قرآن شریف میں چند پیغمبروں کے نام اور انکی تبلیغی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، آپ پر نبوت اور رسالت کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ آپ نے اپنی امت کیلئے ہدایت کے دو چشمے چھوڑیں ہیں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری آپ کی عترت۔ جو شخص ان دونوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھتا ہے وہ کبھی گمراہ نہیں ہوتا، حضور ﷺ نے عترت رسول اللہ ﷺ ہی میں حضور مہدی موعودؑ کی بشارت دی ہے اور ان کے آنے پر بیعت کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ تمام انسانوں میں افضل طبقہ انبیاء کا ہے۔ نبی خبر دینے والے کو کہتے ہیں یعنی وہ شخص جو اللہ کی جانب سے وہ خبریں دیتا ہے جو غیب کی ہیں، جیسے آخرت، جنت، دوزخ، اعمال کا حساب، جزاوسزا۔

ولی وہ بندۂ خدا ہے جو نبی کی اتباع کرتے ہوئے ولایت کا مقام حاصل کرتا ہے۔ ولایت کے معنی قرب ونزدیکی کے ہیں، مگر اس کیلئے نبی کی اطاعت واتباع شرط ہے۔ پس عام تو کیا خاص ولی بھی نبی سے افضل نہیں ہوتا۔ لیکن خود نبی کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک ولایت کی اور دوسری نبوت کی۔ یعنی نبی پہلے اللہ تعالیٰ سے احکام ''اخذ کرتا'' ہے۔ پھر مخلوق کے سامنے آکر ان احکام کو ''دیتا ہے''۔ یعنی ہر نبی پہلے ذات خداوندی سے فیض حاصل کرتا ہے اور پھر مخلوق کو وہ حاصل کردہ فیض عطا کرتا ہے، یعنی ایک جہت سے وہ خالق کے ساتھ رہتا ہے اسطرح کے وہ دنیا ومافیھا سے کٹ کر اللہ کے ساتھ مشغول رہتا ہے۔ اسی جہت کو ''ولایت'' کہتے ہیں اور اس جہت میں اسکی بشریت فنا ہو جاتی ہے۔ اور جس جہت میں وہ مخلوق میں مشغول رہتا ہے اور اسکی بشریت باقی رہتی ہے اسکو نبوت کہتے ہیں۔ نتیجۃً نبی کی وہ جہت جس میں وہ اللہ سے مشغول رہتا ہے، فیض اخذ کرتا ہے، لازماً افضل ہوتی ہے اس جہت سے جس میں وہ مخلوق کے ساتھ مشغول رہتا ہے اور ان کو احکام الٰہی اور فیض ولایت دیتا ہے۔

پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عام ولی نبی سے افضل ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ کوئی ولی کسی نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ اولیاء کا انبیاء کے زیر قدم آنا اور ان کے مقام کو پہنچنا صحیح ہے۔ بحث تفصیل سے بعد میں آئے گی۔

آنحضرت ﷺ کی جو حدیث "الولایة افضل من النبوة" آئی ہے تو بعض لوگوں کو اس کی مراد سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ اور خصوصاً علماء ظاہری اس حدیث کو ماننے سے انکار کر دیتے ہے۔ لیکن صوفیاء کے پاس اس حدیث کو قبولیت حاصل ہے۔ اور وہ اس کی مراد یہ بیان کرتے ہیں کہ "ہر نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ اور مہدویہ کے پاس بھی، اہلسنت والجماعت کے صوفیاء اور محققین کے مذہب کے مطابق یہی اعتقاد ہے کہ نبی کی ولایت اسکی نبوت سے افضل ہے۔ اور اسکے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) نبوت میں مخلوق میں مشغولیت ہے اور ولایت میں خالق میں مشغولیت ہے۔

(۲) نبوت میں بندوں کو فیض دیا جاتا ہے۔ اور ولایت میں اللہ سے فیض لیا جاتا ہے۔

(۳) نبوت محض وہبی ہے، یعنی اللہ جسکو چاہتا ہے اپنی طرف سے منتخب کرتا ہے۔ اس میں کسی کے عمل، عبادت، ریاضت اور مشقت کا دخل نہیں ہوتا یعنی وہ کسبی نہیں ہے۔ اور ولایت وہبی بھی ہوتی ہے اور اکثر کسبی ہوتی ہے، یعنی بندہ رسول کی اتباع، شریعت کی پیروی، اخلاص فی العبادۃ، ریاضت اور مشقت کے ذریعہ مقام ولایت پر پہنچتا ہے۔

(۴) نبوت کی انتہاء ہے اور ولایت کی انتہاء نہیں ہے۔

نبوت مشرقی کیوں؟

تمام پیغمبر آخر مشرقی کیوں ہیں؟ اللہ پر ایمان لانے کے بعد اسکے فرشتوں، اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں پر بھی ایمان لانا فرض ہے؛ ان میں سے کسی ایک کے انکار کے سبب انسان کافر ہو جاتا ہے؛ اللہ تو ایک ہے، واحد ولا شریک ہے۔ اسکی ذات اور اسکے صفات میں نہ کوئی اس کا مماثل ہے اور نہ مقابل۔ اللہ کے فرشتے کتنے ہیں ان کی صحیح تعداد بھی صرف اللہ کو معلوم ہے۔ لیکن جتنے بھی ہیں ان سب پر ایمان لانا فرض ہے، فرشتے اللہ کی نورانی مخلوق ہے، وہ بھی اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں، جو للہ کے احکام کی بلا عذر تعمیل کرتے ہیں، اور ان میں حکم الٰہی سے سرتابی کرنے کا مادہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی بھی نہیں کرتے۔ "لا یعصون ما امرھم اللہ" کی آیت قرآنی گواہ ہے۔ اسی طرح اللہ کی کتابیں چھوٹی ہوں یا بڑی ان کی صحیح تعداد بھی نہیں معلوم ہے، مگر اتنا تو یقیناً صحیح ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبروں پر اپنی جانب سے بندوں کی ہدایت کیلئے احکام پر مشتمل کتابیں نازل کیں۔ ان کو اللہ نے کہیں "کتب"، کہیں "زبر" اور کہیں "صحائف" کے نام سے یاد فرمایا ہے، ان سب پر

ایمان لانا ضروری ہے، لیکن چونکہ قرآن شریف سے پہلے کی کتابیں اور صحیفے خورد برد کا شکار ہو گئیں، ان میں تصحیف کر دی گئی، ان کے بعض کلمات کو بدلا گیا اور تحریف کے آرے ان پر چلائے گئے۔ اس لئے اب وہ قابل عمل نہیں رہے۔ لیکن نفس الامر میں لائق ایمان ہیں۔ کتابوں اور صحیفوں کی صحیح تعداد اس لئے بھی معلوم نہ ہو سکی کہ ان کو جن پیغمبروں پر اتارا گیا خود ان کی تعداد کا بھی صحیح علم نہیں ہے؛ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ بعض کہتے ہیں ایک لاکھ اسی ہزار ہے، اس اختلاف کی بنا پر یہ کہدیا جاتا ہے کہ ہم اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ "لا نفرق بین احد من رسلہ" یعنی ایمان کے معاملے کی حد تک ہم ان میں کوئی فرق بھی نہیں کرتے۔

قرآن شریف میں کوئی ستائیس پیغمبروں کے نام ملتے ہیں اور بس۔ اور خود اللہ نے قرآن میں ہی فرمایا ہے کہ ان میں سے بعض پیغمبروں کے حالات و واقعات ہم نے بیان کئے ہیں۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کے واقعات اور حالات ہم نے بیان نہیں کئے۔ اس سلسلے میں قرآن شریف میں ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے تقریباً تمام بستیوں میں پیغمبر اور ہادی یا تو بھیجے ہیں یا مقرر فرمائے ہیں۔ چناچہ اس کا دعویٰ ہے "و ان من قریۃ الا خلا فی ھا نذیر" (سورۂ فاطر آیت ۲۴) یعنی کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ ہوا ہو۔ نذیر کے معنی الٰہی احکام پر عمل نہ کرنے والوں کو انجام بد سے ڈرانے والے کے ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر قرآنی اصطلاح میں پیغمبر کیلئے نذیر کا لفظ کہا گیا ہے۔ اس کی جمع "نذر" ہے۔ یہ لفظ بھی قرآن میں کئی جگہ پر ملتا ہے۔

حضور پر نور محمد مصطفیٰ ﷺ کیلئے بھی اللہ نے قرآن میں کہیں بشیر و نذیر فرمایا ہے، کہیں فقط نذیر فرمایا ہے۔ چناچہ ان مقامات میں سے ایک مقام پر اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے "انما انت نذیر ولکل قوم ھاد" یعنی آپ تو فقط لوگوں کو برے انجام سے ڈرانے والے ہیں، ہر قوم کیلئے ایک ھادی ہے؛ اس جگہ پر مفسرین کے "درمیان" لفظ ھادی کے مصداق کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ھادی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ البتہ نذیر پیغمبر ہوتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے جب اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ "ویھدی من یشاء" یعنی وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ تو ہدایت کا دینے والا صرف اللہ ہے۔ اور دوسری جگہ پر اللہ فرماتا ہے کہ "انک لا تھدی من احببت والکن اللہ یھدی من یشاء" یعنی آپ ﷺ جس کو پسند کرتے ہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے کفر و شرک کی ظلمتوں سے نکال کر نور ایمان کیطرف رہبری فرماتا ہے۔

لیکن بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں ھادی سے مراد پیغمبر بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہی تو ہدایت اور دعوت الی

اللہ یا دعوت الی الخیر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ چونکہ وہی سبب بنتے ہیں، اسلئے انہیں ھادی بھی کہا جاسکتا ہے۔ ابھی ہم نے جو آیت اوپر درج کی ہے یعنی ”لکل قوم ھاد“۔ اس کی تفسیر میں بھی علماء اور مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ایک کلیہ قاعدہ بیان کیا جارہا ہے کہ ہر قوم کیلئے ایک ھادی ہوتا آیا ہے۔ لیکن دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی ذات اقدس ہے۔ اور یہ آیت آپ کی نبوت عامہ کی دلیل ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ پہلے یہ بات کہی گئی کہ ”انما انت منذر“ یعنی آپؐ تو محض ڈرانے والے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ کہا جارہا کہ ”لکل قوم ھاد“ ہر قوم کیلئے ایک ھادی ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ عام بات نہیں کہی جارہی ہے بلکہ آیت کے اس حصے کا تعلق بھی حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی ذات سے ہے، یعنی آپؐ ڈرانے والے تو ہیں ہی اس کے ساتھ ساتھ آپؐ کی ہدایت کا دائرہ ہر قوم اور ملت سے ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ آپؐ سے پہلے کے انبیاء کا حال تھا کہ وہ مخصوص گروہ، جماعت، طبقہ، قوم، مقام، وقت سے تھا۔

اس سے حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا ختم مرتبت ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ الگ الگ زمانوں اور مکانوں کیلئے پیغمبر مبعوث ہوتے تھے۔ تو دوسرے مقام پر اور بعد کے زمانے میں پیغمبروں کے آنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔

قرآن میں جن پیغمبروں کے نام ملتے ہیں اور وہ جن مقامات میں بھیجے گئے ہیں ان پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک چونکا دینا والا جو نکتہ ملتا ہے وہ یہ کہ وہ تمام انبیاء کرامؑ جن سے ہم مانوس ہیں اور جن کے اسماء گرامی کتابوں میں ملتے ہیں یہ سب کے سب آخر مشرقی ہی کیوں ہیں؟ اور وہ بھی صرف مشرق وسطیٰ سے ہی کیوں تعلق رکھتے ہیں۔ اور انہی بستیوں میں رہنے والوں کی ہدایت کیلئے ہی کیوں مامور ہوئے ہیں؟ کیا دوسرے مقامات پر ضلالت و گمراہی، کفر و شرک، معصیت و گناہ، طغیان و سرکشی کے عناصر نہیں تھے؟ کیا دیگر خطے ان جرائم سے آلودہ نہیں تھے؟ اگر تھے تو ان کی ہدایت کیلئے اللہ نے کیا انتظام فرمایا؟

گہری نظر سے بھی دیکھیں تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو بابل میں، حضرت موسیٰؑ کو مصر میں، حضرت عیسیٰؑ کو فلسطین میں اور حضرت محمد مصطفی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو عرب (مکہ) میں پیدا فرمایا۔ اور بنی اسرائیل کے سب انبیاء بھی انہی علاقوں سے وابستہ رہے ہیں۔

کیا دوسرے علاقوں میں انسان آباد نہیں تھے، یا آباد تو تھے لیکن کیا انہیں پیغمبروں کی ضرورت نہیں تھی؟ آخر اس کا جواب کیا ہے؟

(۱) اس کا ایک جواب تو وہی ہو سکتا ہے جو ہم نے اس مضمون کی ابتداء ہی میں لکھا، کہ خود قرآن مجید کے اعتراف کے مطابق دوسرے مقامات پر بھی انبیاء آئے ہیں۔ لیکن ان کا ذکر و تذکرہ نہ تو قرآن میں ہے اور نہ ہماری دینی کتابوں میں۔ چند

پیغمبروں کے ذکر کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ انبیاء اتنے ہی ہیں اور بس۔

(۲) جن انبیأء کا ذکر کیا گیا ہے ان پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان ایک ربط ہے۔ایک تسلسل ہے۔وہ ایک دوسرے سے متعلق رہے ہیں۔اسطرح کہ ان میں سے ہر نبی اپنے سے پہلے نبی کے مشن کی تکمیل یا تبلیغ کیلئے آیا ہے۔یا اس معاشرہ وسماج کی اصلاح کیلئے آیا ہے جو پہلے پیغمبر کی تبلیغ وہدایت کے بعد گمراہی وانحراف کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔اسطرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔یہاں تک کہ ایک عالمی دین اور آفاقی مذہب پر یہ سلسلہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔اور اسلام چونکہ اسی سلسلہ کی ایک آخری لیکن عالمگیر اور سب پر حاوی کڑی تھی۔جس کی نظر ان تمام معاشروں اور سماجوں پر تھی اور دعوتی اعتبار سے وہ ان تمام سے مربوط بھی تھا اسی وجہ سے ان تمام انبیاء کرام کے حالات اور ان کے زمانوں کے واقعات کو بیان کیا گیا۔

(۳) سب سے اہم سوال یہاں یہ ہے کہ دین کی ضرورت کہاں اور کب ہوتی ہے۔غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جہاں تہذیب وتمدن نشو نما پاتا ہے تو دین ومذہب کی ضرورت ہوتی ہے۔پہلے تمدن جنم لیتا ہے۔پھر جسکی کوکھ سے وہ تمام خرابیاں اور برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔جو معاشرہ کو تباہ وبرباد کرنے والی ہوتی ہیں۔ان کا سدباب کرنے کیلئے مذہب اور دین کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔مثال کے طور پر اگر ایک بالکل چھوٹا گاؤں ہو جہاں دو چار یا پانچ پچیس افراد کھیتی باڑی کے ذریعہ اپنی زندگی گذارتے ہو تو نہ وہاں ٹرافک سسٹم کی ضرورت ہے اور نہ پولیس چوکی کی۔نہ عدالت ومجسٹریٹ کی۔اس لئے کہ وہاں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور نہ تناؤ اور مسابقت کا چکر۔لیکن جب وہی گاؤں ترقی کرکے ایک شہر بن جاتا ہے تو وہاں پولیس کی، تھانے کی، عدالت کی، مجسٹریٹ کی، ٹیکس کی، پاکی صفائی کی، ٹرافک سسٹم کی ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں۔گویا جہاں ''تمدن'' ہوتا ہے وہاں ''تدین'' کی ضرورت ہوتی ہے۔چناچہ آثار قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق تہذیب وتمدن کی پیدائش اور نشو نما کا قدیم ترین گہوارہ ومرکز مشرق کے یہی چند علاقے رہے ہیں۔مثلا کلدہ (قدیم بابل) آسور (نہر دجلہ کا وسطی میدانی علاقہ)، مصر، عیلان، بابل، ہند اور چین۔

اگر کوئی علاقہ تہذیب وتمدن کا مرکز ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ وہاں مختلف النوع لوگوں کا اجتماع ہے۔اور وہاں کی زندگی معاشرتی زندگی ہے۔اور یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایک خطۂ ارضی پر مختلف رنگ ونسل، قوم اور قبیلہ کے لوگ اکٹھے ہوں۔ان کے ذرائع معاش مختلف ہوں۔اور ان کی زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں میں وسعت پیدا ہو جائے اور لوگ بڑھتے تقاضوں کی تکمیل کیلئے یا دوسروں پر اپنی برتری جتانے کیلئے زیادہ دوڑ دھوپ شروع کر دیں تو لازما ان میں آپس میں مسابقتی دوڑ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔پھر حقوق تلفیاں، مکر، فریب، جھوٹ، جعلسازی اور باہمی ٹکراؤ جیسے امراض وجود میں آتے ہیں۔اسکے علاوہ

جرگہ سسٹم، قبائلی نظام، پنچایت راج، نوابی شان، جاگیر دارانہ نظام اور شاہی حکومت اور شہنشاہی رعب وداب جیسے عناصر لوگوں کو آقاؤں اور غلاموں میں بانٹ دیتے ہیں۔ پھر ظلم و تشدد، جور و ظلم کی چکی چلنے لگتی ہے۔ اور سماج اس میں پسنے لگتا ہے۔ اور صاحب اختیار اپنی من مانی کرنے لگتے ہیں اور جن کو حکومت مل جاتی ہے تو وہ حکومت کے نشے میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ خود کو آقا نہیں بلکہ "معبود" سمجھنے لگتے ہیں اور عملاً اپنی رعایا سے خود کو سجدہ کرواتے ہیں۔

جب حالت اس مقام کو پہنچ جاتی ہے تو اللہ غریبوں، مزدوروں، بے یار ومددگار لوگوں کی مدد کرنے کیلئے اس جگہ پر اپنے پیغمبروں کو بھیجتا ہے جو وہاں یہ اعلان کرتے ہیں کہ سب بندے برابر ہیں۔ ان میں کوئی آقا اور غلام نہیں ہے، بلکہ سب کے سب اللہ کے غلام ہیں۔ اور سب کا آقا صرف اللہ ہے۔ حکم کا اختیار بھی صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔"لہ الحکم و لہ الامر"۔ عبادت کی مستحق بھی اس کی ہی ذات ہے۔ اس کے سوا کسی کیلئے عبادت جائز نہیں ہے۔ ملک بھی اس کا ہے۔"لہ ملک السمٰوٰت والارض"۔ اگر کوئی بظاہر بادشاہ یا حاکم سلطنت بن گیا ہے، تو اسکو چاہئے کہ اللہ کی زمین پر بسنے والے اللہ کے بندوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرے۔ رعایا کو بہتر سہولتیں عطا کرے۔ انکی حق تلفی نہ کرے، ان پر ظلم نہ کرے ورنہ قیامت کے دن ان کو پکڑا جائے گا اور ان کو سزا دی جائے گی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبروں کے اولین مخالفین دو گروہ رہتے ہیں (۱) مترفین (۲) مسرفین۔ مترفین سے مراد خوش حال لوگ ہیں، بے پناہ مال ودولت کے مالک لوگ ہیں۔ اور مسرفین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے اس مال کو بے تحاشہ فضول خرچیوں میں لگاتے ہیں اور قوموں کی ہلاکت کے بھی یہی ذمہ دار ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے"واذا اردنا ان نهلک قریۃ امرنا مترفیها ففسقوا فیها فحق علیها القول،فدمرناها تدمیرا "۔یعنی جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو چھوٹ دیدیتے ہیں، پھر وہ لوگ حد سے آگے بڑھ جاتے ہین، پھر ان پر ہمارا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے ہیں۔ اگر یہاں یہ سوال ہو کہ یہاں تو کسی پیغمبر کے بھیجنے کا ذکر ہی نہیں ہے، کیا یوں ہی ان کو تباہ کر دیا جاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے اس آیت سے پہلے کی آیت میں اس کا جواب دے دیا ہے، چناچہ اللہ فرماتا ہے"وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا"اور ہم کسی کو عذاب نہیں دیتے، جب تک کہ ہم ان لوگوں میں ایک پیغمبر بھیج نہیں دیتے۔

چناچہ حضرت ابراہیمؑ کو نمرود سے مقابلہ کرنا پڑا، حضرت موسیٰؑ کو فرعون کا سامنا کرنا پڑا، اسی طرح قوموں کا حال تھا۔ خلاصہ یہ کہ جو مقامات برائی کے اڈے، شر وفساد کے مرکز، ظلم و عدوان کے سنٹر اور لاقانونیت کی آماجگاہ تھے۔ اللہ نے

صحیح نظام قائم کرنے کیلئے، عادلانہ اور منصفانہ قوانین اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بھیجے گویا انبیاء کا ظہور انسانوں کے تمدن اور عظیم اجتماعات سے مربوط اور منسلک ہے۔ رہے وہ مقامات جہاں یہ باتیں نہیں تھیں تو شاید ان مقامات پر انبیاء کے خلفاء اور تربیت یافتہ افراد ان کی ہدایت کیلئے کافی سمجھے گئے۔

نظر بر قدم

اسکی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) چلتے پھرتے میں اپنی نظر نیچی کر کے پیروں پر نگاہ رکھے، ادھر ادھر نہ دیکھے۔ کیوں کہ ادھر ادھر یا آس پاس جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں، ان کی طرف توجہ ہونے سے توجہ الی اللہ میں خلل پڑتا ہے۔ اور خیالات منتشر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض مرشدین اگر کسی خاص ضرورت کے تحت مسجد سے باہر نکلتے ہیں تو اپنے سر پر رومال یا چادر اوڑھ کر نکلتے ہیں تا کہ ادھر ادھر کی چیزیں نظر ہی نہ آسکیں اور نظریں صرف نیچی ہی رہ سکیں۔

(۲) اسکی دوسری صورت یہ ہے کہ نیکی اور برائی میں اپنے قدم کو دیکھے کہ آیا نیکی کی جانب زیادہ مائل ہے یا برائی کی جانب، اگر برائی میں قدم آگے ہے تو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرے اور نیکی میں ہے تو اس میں قدم کو اور آگے بڑھائے اور اس میں ثبات اختیار کرے۔

(۳) اپنے قرب وولایت کو دیکھے کہ کس مقام پر ہے اور اس مقام سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

نفس

انسان کے اندر ایک قوت ہے جس سے وہ کسی چیز کی خواہش کرتا ہے، خواہ وہ خیر کے تعلق سے ہو یا شر کے۔ نفس کی چار قسمیں بتلائی جاتی ہیں۔

(۱) نفس امارہ۔ وہ نفس ہے جو ہمیشہ شر کی خواہش کرتا ہے اور اسپر کبھی ندامت یا ملامت نہیں کرتا۔

(۲) نفس لوامہ۔ وہ نفس ہے جو شر کی خواہش کرتا ہے لیکن اس کے بعد نادم بھی ہونے لگتا ہے اور اس فعل پر ملامت بھی کرتا ہے۔

(۳) نفس ملہمہ۔ وہ نفس ہے جو زیادہ تر خیر کی خواہش کرتا ہے

(۴) نفس مطمئنہ۔ وہ نفس ہے جو خیر سے ہی اطمئنان حاصل کرتا ہے اور چونکہ اللہ "خیر کل" ہے، اس لئے نفس کو خیر سے اس درجہ رضامند ہو کر اس سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ "خیر کل" یعنی رب کی جانب سے خطاب کا مستحق ہو جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے کہ "یایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فا دخلی فی عبادی وادخلی فی جنتی "۔

نفس شیطان سے بھی بڑھ کر ہے، کیوں کہ شیطان کو بھی نفس نے خراب کیا تھا، پس نفس کو مغلوب کرنا کفار کو مغلوب کرنے سے بھی زیادہ اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ مجاہدۂ نفس کو جہاد اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سلوک میں نفس کو مارنے سے مراد خواہشات نفسانی (ھویٰ) کی اتباع سے باز رہنا ہے، نفس میں جب شر کی خواہش کا جذبہ ختم ہو جائے گا تو وہ خوف بخود مطمئنہ بن جائے گا۔ نفس کو باقی رکھنا ضروری ہے، صرف نفس کی بری صفت کو اچھی صفت سے مبدل کرنا شریعت کا مقصود ہے اور یہی عین کمال سلوک بھی ہے۔

فرمان مہدیؑ: نفس عجیب روسیاہ ہے۔

نگہداشت

دل میں غیر اللہ کے خیالات آنے سے اسکی نگہبانی کرنا ہے۔

نس بندی

کیااسلام میں نس بندی (birth control) کی اجازت ہے ؟اگر ہے تو کن صورتوں میں اور اگر نہیں ہے تو کیوں ؟

اسلام میں نس بندی جائز نہیں ہے،کیونکہ قرآن میں تو صاف الفاظ میں حکم ہے"ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق ،نحن نرزقکم و ایاھم"یعنی مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو(کیونکہ) ہم تم کو بھی رزق دینگے اور انکو بھی۔اس حکم میں اگرچہ افلاس وغربت کے اندیشہ سے اولاد کو قتل کرنے سے صاف طور پر منع کیا گیا ہے،لیکن مفسرین نے اس کے تحت اسقاط حمل اور حمل کو روکنے والی دواوں کے استعمال پر بھی اس کا اطلاق کیا ہے۔کیونکہ در حقیقت حمل کو گرادینا،جنین کو پیٹ میں ہی ماردینا اور اسی طرح ایسی دواوں کا استعمال کرنا یا ایسے ذرائع (devices)استعمال کرنا جس سے حمل ہی ٹھہر تا نہ ہو، قتل اولاد کے برابر ہے۔واضح ہو کہ جب اللہ نے انسان کو زمین میں کائنات کی مشنری چلانے کیلئے اپنا نائب مقرر کیا تو اسکی بقاء کیلئے غذا کا اہتمام وانتظام فرمایا۔اور آئندہ اس سلسلے کو باقی اور جاری رکھنے کیلئے گویا اس کے ارتقاء کیلئے عورت کو پیدا فرمایا،جس کا مقصد توالد اور تناسل ہے،یعنی اس سے اسکی نسل آئندہ چلنا اور بڑھنا ہے۔لیکن بعض مغربی اسلام دشمن عناصر یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہو،تو انہوں نے مذہبی انداز سے ہٹ کر معاشی اور اقتصادی نظریہ کا سہارا لیکر یہ ہوّا کھڑا کر دیا ہے کہ آبادی بڑھے گی تو غذا کی قلت ہو جائے گی،لوگ بھوکے مریں گے،اسلئے یہ نظریہ پیش کیا کہ آبادی کو مت بڑھاؤ۔بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ آبادی بڑھیگی تو مکان کا مسئلہ کھڑا ہو جائیگا اور یہ بھی سمجھایا کہ بچے زیادہ پیدا ہونگے تو انکے اخراجات،ان کی تعلیم اور انکی صحت کے مسائل اتنے پیدا ہو جائینگے کہ آدمی ان کو برداشت نہ کر سکیگا۔اسلئے زیادہ سے زیادہ دو بچے پیدا کرنا چاہئے اور بس۔یہ بالکل غیر اسلامی نظریہ ہے،کیونکہ جہاں تک غذا کا سوال ہے اس کے تعلق سے اللہ نے ارشاد فرمایا"ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا"یعنی روئے زمین پر جتنے جاندار ہیں اللہ پر ہی ان کے رزق کی ذمہ داری ہے۔پھر حدیث میں آیا ہے"لا تطلبوا الرزق،بل اطلبوا الرازق فان الرزق یطلبک"۔رزق طلب مت کرو بلکہ رازق کو طلب کرو کیونکہ رزق خود تم کو طلب کرتا ہے۔اللہ نے زمین میں اتنی قوت نمو رکھی ہے کہ جس قدر آبادی بڑھیگی اس سے کہیں زیادہ اناج اور غلہ پیدا کر سکتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دو ہاتھوں سے بارہ ہاتھ زیادہ کما سکتے ہیں۔اگر ٦ بچے پیدا ہوں تو آئندہ بارہ ہاتھ کام کرنے والے مل سکتے ہیں۔جن کی وجہ سے گھروں کی معاشی حالت سدھر سکتی ہے اور غربت وافلاس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا یارسول اللہ ﷺ میں ایک عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں،وہ خوبصورت بھی ہے،لیکن وہ بانجھ ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا"تزوجوا الودود الولود"یعنی ایسی عورت سے شادی کرو جو زیادہ چاہنے والی اور زیادہ بچے پیدا

کرنے والی ہو۔رہاسوال کہ بچے پیدا ہونے سے غربت میں اضافہ ہو گا۔تو قرآن میں جو حکم ہے وہ اسکے بالکل بر خلاف ہے، قرآن تو کہتا ہے"ان یکونوا فقراء یغنیھم الله "یعنی اگر وہ فقیر ہیں تو انکو چاہئے کہ وہ شادی کریں اللہ ان کی غنی کر دیگا۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو آج کل ضروریات سے ہٹا کر تعیشات اور غیر معمولی آرائشات کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے، تاکہ مغربی مصنوعات کی یہاں پر کھپت ہوسکے اور اسلامی ممالک تجارت کی منڈیاں بن جائیں۔بس اسی ناپاک عزائم کے تحت یہ گمراہ کن نظریہ پھیلانے کی کوشش میں سرگرم ہیں۔اور لوگ ان کی ناپاک سازشوں کے جال میں پھنس رہے ہیں، نس بندی جائز نہیں ہے۔اگر عورت کو سخت بیماری ہے اور خطرناک حالات میں بڑے آپریشن (major operation) سے بار بار گذرنا جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔یا بچوں کی صحت کی خاطر کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔اور کوئی خدا سے ڈرنے والا اور احکام اسلامی کی پابندی کرنے والا ڈاکٹر یہ مشورہ دے تو ان حالات میں جائز ہو سکتا ہے، لیکن افلاس اور غربت کے اندیشے سے تو ہر گز نہیں۔ایسا کرنے سے، کرنے والی اور اسکی اجازت دینے والا دونوں حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے خدا کے پاس گنہگار ٹھہریں گے۔

نام ونسب

امام علیہ السلام کا اسم مبارک سید محمد اور کنیت ابو القاسم ہے۔ آپؑ کے والد ماجد سید عبد اللہ ہیں جن کا خطاب سید خاں ہے۔ آپ چودھویں جمادی الاولیٰ ۸۴۷ھ پیر کے دن پیدا ہوئے، آپ کا مولد شہر جونپور ہے۔ جو سلاطین شرقیہ ہند کا پائے تخت تھا۔ مولوی خیر الدین محمد صاحب الہٰ آبادی نے جونپور نامہ کے باب پنجم میں آپ کے حالات میں لکھا ہے۔

پدرش خواجہ عبد اللہ از جانب سلطنت سید خاں خطاب داشت و مادرش آمنہ خاتون کہ خواہر قوام الملک باشد بہ آغا ملک مخاطب بود، ہر دو مادر و پدر از اجلہ سادات بنی فاطمہ بودند۔

یعنی سید محمد (مہدی علیہ السلام) کے والد سید عبد اللہ کو سلطنت کی طرف سے سید خاں کا خطاب دیا گیا تھا، آپ کی والدہ ماجدہ آمنہ خاتون قوام الملک کی بہن تھیں اور آغا ملک ان کا خطاب تھا، ماں اور باپ دونوں اکابر سادات بنی فاطمہ سے تھے۔

حضرت مہدی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کے متعلق صاحب جونپور نامہ نے لکھا ہے کہ "وہ حسنی تھیں، جونپور نامہ کی عبارت یہ ہے "پدر حسینی و مادر حسنی"۔ لیکن خاتم سلیمانی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ حسینی تھیں، چناچہ مولف سیر مسعود نے بھی یہی لکھا ہے۔ "حضور مہدی موعود کی والدہ صاحبہ کے والد کا نام بھی عبد اللہ تھا، اور بقولے سید جلال" (سیر مسعود۔ ص ۷)

اس طرح ثابت ہوا کہ آپ بنی فاطمہ سے تھیں۔ مولود میاں عبد الرحمن اور مطلع الولایت میں آپ کے ماموں کا نام قیام الملک لکھا ہے۔ صاحب جونپور نامہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ امام موسیٰ کاظم کی اولاد سے ہیں۔ اسی طرح صاحب تحفۃ الکرام نے بھی بیان کیا ہے۔ "سید الاولیاء سید محمد الملقب بہ میراں مہدی بن میر عبد اللہ المعروف بہ سید خاں کہ نسبتش بہ امام موسیٰ کاظم می پیوند" (تحفۃ الکرام، ص ۲۲)

اس عبارت سے چار باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ آپ سید الاولیاء کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میراں مہدی بھی آپ کا لقب تھا۔ تیسرے یہ کہ آپ کے والد کا نام سید عبد اللہ اور خطاب سید خاں تھا، چوتھے یہ کہ آپ امام موسیٰ کاظم کی اولاد سے ہیں (مقدمہ سراج الابصار، ص ۴)

محمد معصوم بھکری المتخلص بہ نامی نے تاریخ سندھ میں قاضی قاضن کے بیان میں لکھا ہے (ترجمہ) سید محمد جونپوری المعروف بہ میراں مہدی۔۔۔۔۔۔ تاریخ سندھ قلمی، ص ۹۹،۹۸۔ تاریخ فارسی اسٹیٹ، سنٹرل لائبریری۔

صاحب جونپور نامہ نے بھی یہ لکھا ہے۔ ”شہر جونپور اور اسکے نواح میں آپ میراں جی کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور علماء خواجہ کے نام سے (فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ص ۳۲۰) ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کا امام موسیٰ کاظم کی اولاد سے ہونا کتب غیر مہدویہ سے بھی ثابت ہے۔

چناچہ صاحب جونپور نامہ نے آپ سے متعلق لکھا ہے۔ ”از نسل حضرت جعفر بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق رضی اللہ عنہم“،” وہمیں جعفر را نعمت اللہ می گفتند، باب پنجم“

صاحب شواہد الولایت نے امام علیہ السلام کا کرسی نامہ اسطرح بیان کیا ہے۔ ”حضرت امیر سید محمد مہدی موعود خاتم الولایت المقیدہ المحمدی صلی اللہ علیہ وسلم بن سید عبد اللہ بن سید عثمان بن سید خضر بن سید موسیٰ بن سید قاسم بن سید عبد اللہ بن سید یوسف بن سید یحییٰ بن سید جلال الدین بن سید اسماعیل بن سید نعمت اللہ بن سید امام موسیٰ کاظم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الی آخرہ“

حضرت مہدی موعود علیہ السلام کے والد کا نام۔

سوال: حضرت سید محمد مہدی موعود کا نام محمد، والد کا نام عبد اللہ ہوگا اور وہ اہل بیت سے ہوں گے، جب کہ ان کے ہم عصر مصنفین سے کوئی بھی والد کا نام عبد اللہ نہیں لکھتا، اور بعد کی تالیفات معتبر نہیں، علامہ عبد الحی بن فخر الدین الحسنی اپنی مشہور کتاب نزہۃ الخواطر کے صفحہ ۴۸۶ میں لکھتے ہیں ”الشیخ الکبیر محمد بن یوسف الحسینی الجونفوری المہدی المشہور بالہند“ آگے لکھتے ہیں، ”بدل اسم ابیہ بعبد اللہ و اسم امہ بآمنہ و اشاعھا فی الناس و صنف کتابا فی اصول ذالک المذہب“ (نزہۃ الخواطر، جلد ۴، صفحہ ۳۲۴، دائرۃ المعارف حیدر آباد)۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبدیلی مہدویت کے شوق کے بعد کی گئی۔

جواب۔ گویا آپ نے حسب ذیل امور بیان کئے ہیں،

(۱) حضرت سید محمد جونپوری مہدی موعود علیہ السلام کے والد کا نام عبد اللہ نہیں ہے۔

(۲) اس لئے کہ ان کے ہم عصر مصنفین میں سے کسی نے بھی آپ کے والد کا نام عبد اللہ نہیں لکھا۔

(۳) بعد کی تالیفات معتبر نہیں ہیں۔

(۴) ثبوت میں نزہۃ الخواطر کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۵) ناموں میں تبدیلی مہدویت کے شوق کے بعد کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا امور پر ہمارا تبصرہ دیکھئے

(۱) حضرت سید محمد جونپوری مہدی موعود علیہ السلام کے والد کا نام سید عبد اللہ عرف سید خاں ہے۔ یہ ہماری تمام

کتابوں میں مذکور ہے اور اس بارے میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے، البتہ عرفیت سید خاں کی وجہ سے بعض مخالفین نے یا توشبہ کی بنیاد پر یا مزید استفسار کی نیت سے تجاہل عارفانہ برت کر یہ اعتراض کیا ہے کہ آپ کے والد کا نام سید خاں ہے۔

خود امام علیہ السلام کا اس بارے میں قطعی بیان ہے کہ آپ کے والد کا نام سید عبد اللہ ہے۔ ''صاحب البیت ادریٰ بمافی البیت'' گھر والا اس بات کو بہتر جانتا ہے کہ گھر میں کیا ہے۔

ہماری مشہور کتاب ''مطلع الولایت میں ہے۔'' در میان آنحضرت و موسیٰ کاظم دوازدہ پشت اند، چنانچہ از کرسی ایشاں روشن است، حضرت میراں سید محمد مہدی موعود خاتم الولایۃ المقیدہ المحمدیہ بن سید عبد اللہ بن سید عثمان بن سید خضر ـــــــــ''

اسی طرح ایک اور مشہور کتاب شواہد الولایت میں حضرت کا نسب نامہ اس طرح لکھا ہے۔ ''امیر میراں سید محمد مہدی موعود خاتم ولایت محمدیہ بن سید عبد اللہ بن سید عثمان بن سید خضر ـــــــــــــ الی آخرہ''

ان دونوں کتابوں میں جو ہمارے مستند قدیم ماخذ ہیں، حضرت مہدی علیہ السلام کے والد کا نام سید عبد اللہ ہی لکھا ہے، جناب عالی آپ تو جانتے ہیں کہ بحث ہمیشہ روایات اور اعتقادات مسلم الطرفین سے کی جاتی ہے۔ اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ امام مہدی کے والد کا نام سید عبد اللہ ہے، اور سید خاں آپ کا بادشاہ وقت کی طرف سے دیا ہوا خطاب ہے۔ نام بدلنے کی بات کسی مخالف رائے اور قیاس کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ جو سراسر تحریف ہے۔

(۲) پروفیسر سید ابو ظفر ندوی نے مراۃ احمدی کا ترجمہ تاریخ اولیاء گجرات کے نام سے لکھا ہے، موصوف نے تذکرہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے ترجمہ مناقب میں حضرت مہدی علیہ السلام اور مہدیت کے تعلق سے اس طرح لکھا ہے، اس فرقہ اور بانیٔ فرقہ کا حال راقم الحروف سید ابو ظفر ندوی اپنی تاریخ گجرات جلد دوم میں اس جگہ نقل کرتا ہے کہ ناظرین کو صحیح معلومات حاصل ہوں۔ سید محمد نام خاتم الاولیاء لقب المعروف بہ ''مہدی موعود'' بن سید عبد اللہ بن سید عثمان بن سید موسیٰ ـــــــــ بن سید امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجھہ (تذکرہ شیخ محمد طاہر، صفحہ ۵۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مراۃ احمدی میں آپ کے والد کا نام سید عبد اللہ ہی ہے۔ مراۃ احمدی جو ۸۸۶ھ کے آس پاس لکھی گئی ہے۔ البتہ آئین اکبری میں آپ کے والد کا نام سید بڈھ جو لکھا ہے وہ یقیناً اس زمانے میں آپ کی عرفیت ہوگی، آئین اکبری کی عبارت یوں ہے۔ ''سید محمد جونپوری سید بڈھ اویسی از فراوان روحانیہ فیض برگرفتہ در صوری و معنوی علم چیرہ دست'' (آئین اکبری، جلد دوم صفحہ ۲۳۱) ترجمہ: سید محمد جونپوری سید بڈھ اویسی کے فرزند ہیں، انہیں کثرت سے روحانی فیض

حاصل تھا۔ علم ظاہری و معنوی میں ماہر تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں بڑے کو بڈھ کہتے تھے، پس سید بڈھ کے معنی بڑے سید ہیں۔ جیسا کہ مقدمہ سراج الابصار نے لکھا ہے، "چونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو مھدیت موعودہ کے شرف سے نوازنے والا تھا، اسلئے آپ کو حسب ونسب کے اعتبار سے ایسے مشہور گھرانے میں پیدا فرمایا جسے عرف عام میں سید بڈھ (بڑے سید) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

(۳) میر شیر علی قانع نے اپنی تصنیف تحفۃ الکرام میں حضرت مھدی موعودؑ کا نسب اسطرح بیان کیا ہے۔ "سید الاولیاء سید محمد الملقب بہ میراں مھدی بن میر سید عبد اللہ المعروف بہ (سید) خاں کہ نسبتش بہ امام موسیٰ کاظم می پیوند (تحفت الکرام مطبع ناسری جلد دوم صفحہ ۲۲) ترجمہ۔ سید الاولیاء سید محمد الملقب بہ میراں مھدی بن میر عبد اللہ المعروف بہ (سید) خاں کہ جنکی نسبت امام موسیٰ کاظم سے ملتی ہے۔

(۴) نیز مولوی خیر الدین محمد صاحب الہ آبادی نے جونپور نامہ کہ باب پنجم میں حضرت مھدی موعودؑ کے حالات میں لکھا ہے کہ "پدرش خواجہ عبد اللہ از جانب سلطنت سید خاں خطاب داشت، مادرش آمنہ خاتون کہ خواہر قوام الملک باشد بہ آغا ملک مخاطب بود، ہر دو مادر و پدر از اجلہ سادات بنی فاطمہ بودند" ترجمہ۔ حضرت سید محمد کے والد سید عبد اللہ کو سلطنت کی طرف سے سید خاں کا خطاب دیا گیا تھا۔ آپ کی والدہ آمنہ خاتون قوام الملک کی بہن تھیں، آغا ملک ان کا خطاب تھا۔ ماں اور باپ دونوں اکابر سادات بنی فاطمہؓ سے تھے۔

واضح ہو کہ جونپور نامہ ۱۲۱۶ھ میں لکھا گیا ہے۔

مندرجہ بالا حوالوں سے جو قدیم ہیں یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سید محمد جونپوری کے والد کا نام سید عبد اللہ تھا۔ اور آپ کا خطاب سید خاں تھا۔ جس کی وجہ سے آپ امراء میں سید خاں اور عرف عام میں بڈھ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ بعض لوگوں نے نزھۃ الخواطر کے حوالے سے آپؑ کے والد کا نام یوسف الحسینی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مولف نزھۃ الخواطر کا زمانہ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء ہے۔ پس نزھۃ الخواطر اس سے کچھ پہلے تصنیف ہوئی ہوگی، اگر آپ ان حوالوں کو سامنے رکھیں جو ہم نے اوپر دئے ہیں، اور ان تصنیفات کے سنین کا ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت مہدی موعودؑ سے قریب العصر کون ہیں؟ اور بعید العصر اور بعد والے کون ہیں؟ پھر یہ فیصلہ کرنے سہولت ہو جائے گی کہ کون قابل اعتبار ہے اور کون ساقط الاعتبار۔ ذیل میں ہم کتابوں کے نام اور انکے مولفین کا زمانہ درج کرتے ہیں۔

(۱) مراۃ احمدی ۷۸۸ھ (۲) آئین اکبری ۱۰۱۱ھ (۳) تحفۃ الکرام ۱۱۸۱ھ (۴) جونپور نامہ ۱۲۱۶ھ

ان کے مقابلہ میں صاحب نزھۃ الخواطر کا زمانہ ۱۳۰۴ھ ہے۔ اسکے علاوہ ایک دوسری ہم عصر روایت سے بھی صاحب نزھۃ الخواطر کا بیان رد ہو جاتا ہے۔ شیخ علی متقی نے جسے زمانے کے اعتبار سے حضرت خاتم الاولیاء سید محمد جونپوری کا ہمعصر کہا جاسکتا ہے۔ اپنے رسالہ 'برہان' کے مقدمے میں حضرت مہدی موعودؑ اور مہدویہ کے تعلق سے جو اجمالی حالات لکھے ہیں، وہیں حضرت مہدی موعودؑ کے تعلق سے یہ عبارت لکھی ہے۔ "لقد کثرت ھذہ الطائفۃ فی بلاد الھند یعتقدون شریفا فی الھند اسمہ السید محمد بن السید خاں الجونفوری مات و لہ نحو اربعین سنہ ،انہ ھو المھدی الموعود۔" (البرہان فی علامات مہدی آخر الزمان صفحہ ۳۰) ترجمہ۔ یہ جماعت جو ہندوستان کے شہروں میں کثرت سے ہے ۔ ایک ذی شرف ہستی کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد رکھتی ہے، جن کا نام سید محمد بن سید خاں جونپوری ہے۔ جن کو وفات پائے تقریباً چالیس (۴۰) سال ہوئے ہیں۔

اس عبارت سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) مہدویہ ہندوستان کے شہروں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

(۲) مہدی موعود ایک ذی شرف ہستی ہیں۔

(۳) آپ کا نام سید محمد ہے۔

(۴) آپ کے والد کا نام سید خاں ہے۔

(۵) آپ کے وصال کو (اس وقت) چالیس سال ہوئے ہیں۔

حضرت مہدی موعودؑ کا وصال ۹۱۰ھ میں ہوا۔ مولف رسالہ البرہان کے بیان کے مطابق اگر اس میں چالیس (۴۰) سال ملائے جائیں تو رسالۂ البرہان کا سنہ تالیف ۹۵۰ھ ہوتا ہے۔

اس حوالے میں حضرت مہدی موعودؑ کے والد کا نام سید خاں لکھا ہے، یعنی وہ نام جو اس وقت امراء میں مشہور تھا اور عرف کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن ۹۵۰ھ کے حوالے سے صاحب نزھۃ الخواطر کا یہ بیان تو کھلا جھوٹ ثابت ہو گیا، کہ آپ کا نام "محمد بن یوسف الحسینی" ہے۔ کیونکہ صاحب نزھۃ الخواطر نے آپ کے نسب کے تعلق سے یہی لکھا ہے "الشیخ الکبیر محمد بن یوسف الحسینی الجونفوری"۔

شیخ علی متقی کے بیان "اسمہ السید محمد بن السید خاں الجونفوری سے صاحب نزھۃ الخواطر کا بیان کیا من گھڑت ثابت نہیں ہوتا؟ اور یہ رسالہ البرہان کے مقابلے میں بعد کی تصنیف ہے۔ کیا شیخ علی متقی سے بھی زیادہ کوئی حضرت مہدی موعودؑ کے

زمانے کے لحاظ سے ہمعصر ہو سکتا ہے؟ غالباً صاحب نزھۃ الخواطر نے یہودیوں اور عیسائیوں کی اتباع میں محمد بن یوسف الحسینی لکھا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی حضرت عیسیٰؑ کو یوسف نجار کا بیٹا مانتے ہیں۔ سچ فرمایا تھا رسول اللہ ﷺ نے کہ "تم لوگ، تم سے پہلے کے لوگوں (یہودیوں اور نصرانیوں) کی اتباع کروگے۔ **اعاذنا الله منه**

حالانکہ شیخ علی متقی بھی مہدویت اور حضرت مہدی موعودؑ کا کٹر مخالف تھا، یہاں تک کہ اس نے مہدویت کے خلاف "**الرد**" نام کا اک رسالہ بھی لکھا ہے۔ لیکن اس نے ناموں میں اتنی تحریف نہیں کی۔ کیوں کہ تاریخی حقیقت بھی ایک چیز ہے۔ افسوس کہ صاحب نزھۃ الخواطر نے اس کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ اور خوبی کی بات یہ ہے کہ نزھۃ الخواطر میں مہدی موعودؑ کا جو نسب لکھا ہے اس کا کوئی حوالہ بھی نہیں دیا، بس من گھڑت بات لکھدی۔ اور یہ کہنا کہ ناموں کی تبدیلی مہدویت کے شوق کے بعد کی گئی ہے، بے بنیاد ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نزھۃ الخوطر میں یہ تبدیلی انکار مہدی موعودؑ کے طوق کی وجہ سے کی گئی ہے۔ نیز یہ بات بھی قابل غور ہے کہ صاحب نزھۃ الخواطر نہ تو نساب ہیں اور نہ نزھۃ الخواطر انساب کی کتاب ہے، پھر اسمیں جو لکھا گیا ہے، اس سے کسی کے نسب پر کسطرح استدلال کیا جاسکتا ہے، نزھۃ الخواطر تو بس سیر و سوانح کی کتاب ہے۔ اس سے انساب پر گفتگو کرنا اور اسکو بنیاد بنانا صریح غلطی بھی ہے اور بہتان بھی۔

رسول اللہ ﷺ نے تو نساب کے تعلق سے یہ تک فرمایا ہے "**کذب النسابون**" نسب بیان کرنے والوں نے جھوٹ کہا ہے۔ جب حضور ختمی مرتبت ﷺ کے نسب کے سلسلے میں نساب کے بیان کو آنحضرت ﷺ نے کذب فرمایا تو حضرت مہدی موعودؑ کے نسب کے بارے میں ایسے شخص کا بیان جو نساب بھی نہیں ہے، کسطرح معتبر قرار دیا جاسکتا ہے باپ دادا کے ناموں میں اختلاف کا ہونا اور بعض اوقات لقب کا زیادہ مشہور ہو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

چناچہ امام اعظم ابو حنیفہ کے نسب کے تعلق سے اسی قسم کا اختلاف نظر آتا ہے، چناچہ عام طور پر حضرت کا نسب اس طرح لکھا گیا ہے کہ "نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ" یہ امر جیسا کہ خود ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب عجمی النسل تھے۔ خطیب مورخ بغدادی نے امام کے پوتے اسماعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے "کہ میں حماد بن نعمان بن ثابت بن مرزبان ہوں" (مختصر تاریخ بغداد لابن جزلہ، نیز دیکھئے سیرت نعمان صفحہ ۱۳)۔

اسماعیل نے امام صاحب کے دادا کا نام "نعمان" بتایا اور پر دادا کا نام "مرزبان"۔ حالانکہ عام طور پر "زوطی" اور "ماہ" مشہور ہے۔ غالبا جب زوطی ایمان لائے تو ان کا نام نعمان سے بدل دیا گیا۔ اسماعیل نے سلسلۂ نسب کے بیان میں زوطی کا وہی

اسلامی نام لیا اور حمیت اسلامی کا مقتضا بھی یہی تھا کہ زوطی کے باپ کا اصلی نام غالبا کچھ اور ہو گا۔ اور ماہ، مرزبان لقب ہوں گے ۔ کیونکہ اسماعیل کی روایت سے اسقدر اور بھی ثابت ہے کہ ان کا خاندان فارس کا ایک معزز اور مشہور خاندان تھا۔ فارس میں رئیس شہر کو مرزبان کہتے ہیں۔ اس لئے نہایت قرین قیاس ہے کہ ماہ اور مرزبان لقب ہیں۔ امام حافظ ابو المحاسن نے قیاس لگایا کہ ماہ اور مرزبان ہم معنی الفاظ ہوں گے۔ انہوں نے قیاسا کہا۔ کیونکہ وہ فارسی نہیں جانتے تھے، لیکن میں یقینا کہتا ہوں کہ در حقیقت ماہ اور مرزبان ایک معنی ہیں۔ ماہ دراصل وہی مہ ہے، جسکے معنی بزرگ اور سردار کے ہیں۔ مشہور مصرع ہے۔

نہ کہ رامنزلت ماند نہ مہ را　　عربی لہجہ نے مہ کو ماہ کر دیا　　(سیرت نعمان صفحہ ۱۴)

دیکھئے امام ابو حنیفہ کے باپ اور دادا کے ناموں میں کسقدر اختلاف ہے۔ اور کس طرح ان کے القاب انکے ناموں پر بھاری آگئے اور بالآخر وہی مشہور ہوگئے۔ اور ماہ جس کے معنی بزرگ اور سردار کے ہیں۔ اسی طرح آپؓ کے دادا کا نام ہو گیا۔ جس طرح کے بڈھ حضرت مہدیؑ کے والد کا نام بن گیا۔ جس کے معنی بزرگ اور بڑے کے ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہی کہ امام مہدیؑ کے والد کا نام سید عبد اللہ ہی تھا۔ البتہ آپ کا خطاب سید خاں مشہور ہو گیا تھا۔ جس طرح کے امام ابو حنیفہ کے دادا اور پر دادا کا نام ماہ اور مرزبان ہو گیا تھا۔

نفی

نفی سے مقصود عزیت متوہمہ (ماسوائے حق کی وہ شکلیں جو وہم کی بدولت صورت پذیر ہوتی ہے) کو دور کرتا ہے اور یہ نعمت سالک کو بحر وحدت میں مستغرق ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

عادات بد سے کنارہ کشی اور تہذیب واخلاق اختیار کرنے سے اگرچہ آدمی فرشتہ بن جاتا ہے مگر کمال ولایت کی نسبت یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کے ذکر میں فرماتا ہے "وما منا الا وله مقام معلوم" یعنی ہم میں سے ہر ایک کیلئے ایک درجہ مقرر ہے۔ مذکورہ صفات والا آدمی عنایت الٰہی کا مستحق اور خوارق عادات کا مظہر بن سکتا ہے۔ کیونکہ ایس کرامات عادات بد سے بچنے اور اطاعت الٰہی اختیار کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ایسا صاحب کرامت ابھی ولایت حقیقیہ سے بہت دور ہے کیونکہ یہ ابھی اپنے آپ میں مشغول ہے اور ایسا آدمی جو خود بیں ہو سالکان طریقت میں کیسے شمار ہو گا۔

ملائکہ کے مقامات و مدارج، محدود و مقرر ہیں اور صاحب ولایت خاصّہ کا مقام جو تجلّی ذات کے شرف سے مشرف ہو ، کوئی حد و نہایت نہیں رکھتا۔

نماز جنازہ کی حقیقت

صلوٰۃ جنازہ: عربی زبان میں جو صلوٰۃ جنازہ کہتے ہیں وہ صحیح ہے، لیکن اردو میں جو اسکے ترجمہ کے طور پر نماز جنازہ کہتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ در حقیقت وہ میت کیلیئے دعا ہے۔ کیونکہ نماز تو صرف اللہ ہی کیلیئے پڑھی جاتی ہے۔ نیت میں بھی یہی کہا جاتا ہے، نویت ان اصلی للہ تعالیٰ۔ عربی میں صلوٰۃ کئی معانی ہوتے ہیں؛ اور اسکے صلہ کے بدلنے سے بھی اسکے معنی بدل جاتے ہیں۔ چناچہ "صلیت للہ" کہتے ہیں تو اسکے معنی ہوتے ہیں کہ میں نے نماز اللہ کیلیئے پڑھی۔ اور اگر صلیت بالناس کہتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں "میں نے لوگوں کو نماز پڑھائی" اور جب "صلیت علیہ" کہتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ میں نے اسکی نماز جنازہ پڑھی۔ یعنی میں نے اس میت کیلیئے دعا کی۔

اور اسی طرح صلی کا فاعل بدل جاتا ہے تو اسکے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ چناچہ حضرت محمد ﷺ کے معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد پر صلوٰت نازل کیئے۔ وہاں اسکے معنی نہ نماز کے ہوتے ہیں اور نہ دعا کے ہوتے ہیں۔

چناچہ آیت شریفہ "ان الله و ملٰئکته يصلون على النبى؛يا ايهاالذين أ منوا صلوا عليه و سلموا تسليما" میں صلوٰۃ کے معنی فاعل کے اعتبار سے مختلف کرنے پڑھتے ہیں۔ چناچہ اللہ اور فرشتوں کی طرف صلوٰۃ کی نسبت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اللہ نے اور فرشتوں نے حضور ﷺ پر صلوٰۃ نازل فرمائے (اور وہ صلوٰت کیا ہیں وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے)۔ ہماری مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ اور جب اللہ فرماتا ہے کہ اے ایمان والو؛ صلوا، تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ اے ایمان والو تم بھی حضور ﷺ پر رحمتیں نازل کرنے کی اللہ سے دعا کرو۔ اور خوب سلام بھیجو۔ تو میت کیلیئے دعا کی جاتی ہے۔ عرف عام میں اسکو نماز جنازہ کہتے ہیں۔

لیکن اس دعا کی خوبی یہ ہے کہ یہ جماعت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اور اس کیلیئے ایک امام ہوتا ہے۔ ویسے اگر جماعت میسر نہ ہو تو؛ تنہا بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ ایک مرد مسلمان کی تدفین نماز جنازہ کے بعد ہی ہونی چاہیئے۔ یہاں تک کہ اگر کسی مسلمان کی میت کو بغیر نماز کے دفنا دیا گیا ہو تو تین دن کے اندر قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ اگر نومولود بچہ سانس لے اور آواز کرے پھر مر جائے تو اس کی بھی نماز جنازہ پڑھنی چاہیئے۔ اور اگر نومولود نہ سانس لے اور نہ آواز نکالے تو اسکی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ نماز جنازہ کیلیئے نہ اذان ہے اور نہ اقامت۔ البتہ لوگوں کو آگاہ کرنے کیلیئے الصلوٰۃ، الصلوٰۃ، الصلوٰۃ لھذا المیت الصلوٰۃ، بلند آواز سے کہ دینا چاہیئے تا کہ صف بندی ہو جائے اور لوگ شریک جماعت ہو جائے۔ عورتوں کی نماز جنازہ کیلیئے "لھذہ المیت" کہنا چاہیئے۔

اس نماز کیلئے وضو ضروری ہے۔ لیکن وقت اتنا تنگ ہو کہ وضو کی مشغولیت کی وجہ سے نماز نہ ملنے کا یقین ہو تو تیمم کیا جاسکتا ہے۔ مسلمان گنہ گار کی بھی نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے خود کشی بھی کی ہے۔

نیت نماز جنازہ۔نویت ان اودی اربع تکبیرات صلوٰۃ الجنازۃ الثناء للہ و الدعا لھذ المیت اقتدیت ھذا الامام متوجھا الی جھۃ الکعبۃ الشریفۃ" امام کو چاہیئے کہ یہ کہے کہ انا امام علی الجماعۃ لمن حضر ولمن لم یحضر۔ اگر میت مونث ہو تو۔والدعا ء لھذہ المیتۃ کہیں۔ اس کے بعد امام اللہ اکبر کہے اور ہاتھ باندھ لیگا۔ مقتدی بھی اسی طرح کہیں۔ ہاتھ باندھ کر ثناء پڑھے۔ پھر امام دوسری تکبیر کہے گا اور اس میں درود ابراہیم پڑھیں۔ پھر امام تیسری تکبیر کہیگا اور اس میں اپنے لئے، میت کیلئے اور تمام مسلمانوں مردون اور عورتوں کیلئے دعائے مغفرت کریں اور یہ بھی دعا کریں کہ اے اللہ تو ہم مین سے جن کو زندہ رکھتا ہے تو اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے تو جن کو موت دیتا ہے تو ایمان پر موت عطا فرما۔

عربی میں دعا اسطرح ہے۔اللھم اغفر لحینا و میتنا و شاھدنا و غائبنا و کبیرنا و صغیرنا و ذکرنا و انثانا، اللھم من احییتہ منا فاحیہ علی الاسلام و من توفیتہ منا فتوفہ علی الایمان۔

پھر چوتھی تکبیر کہے،ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار پڑھے پھر دونوں طرف سلام پھیر دے۔

واضح ہو کہ نماز جنازہ کی ایک صفت ہے، ایک شرط ہے، ایک رکن ہے اور کچھ سنتیں ہیں۔

)ا(۔صفت یہ ہے کہ وہ فرض کفایہ ہے یعنی اگر جماعت میں سے بعض افراد نماز پڑھ لیں تو سب کی طرف سے ہوجائے گی اور اگر کوئی نہ پڑھے تو سب گنہ گار ہوجائینگے۔

)۲(۔شرط۔ نماز جنازہ کے شرائط چھ ہیں(ا) میت مسلمان ہو(۲) اسے طہارت ہو، غسل دیا گیا ہو اور وضو کرا وایا گیا ہو(۳) میت حاضر ہو(۴) میت رکھی گئی ہو(۵) میت یا اسکا اکثر حصہ امام کے سامنے ہو، پس صحیح طریقہ یہ ہے کہ امام میت کے سینے کے مقابل کھڑا ہو(۶) اس کو قبلہ کی سمت رکھا جائے۔ اور اسکا رکن۔ اس کے دو رکن ہیں (ا) تکبیرات اربعہ (چار تکبیریں)۔(۲) قیام

ان مزکورہ بالہ باتوں سے معلوم ہوا کہ میت اگر غائب ہو تو غائبانہ نماز جنازہ صحیح نہیں ہے۔ اگر غسل نہ دیا گیا ہو تو بھی نماز جنازہ نہیں ہوتی۔ البتہ شہید کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو غسل نہیں دیا جاتا، لیکن اسکی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کا

غسل تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں بہے ہوئے اسکے خون سے ہی ہو جاتا ہے۔اسی طرح میت اگر پیچھے یا دائیں یا بائیں ہو تو بھی نماز جنازہ درست نہیں ہوتی۔اسی طرح میت اگر کسی جانور وغیرہ کی پیٹھ پر ہو تو بھی نماز صحیح نہیں ہوتی۔اسی طرح بغیر عذر کے بیٹھ کر بھی نماز جنازہ نہیں پڑھی جاسکتی۔

نماز جنازہ کی سنتیں تین ہیں۔ تحمید، ثناء، اور دعا۔

نماز جنازہ کی امامت کیلئے زیادہ مستحق اس کا ولی ہے لیکن اگر ولی کسی کو اجازت دے تو وہی نماز پڑھائیگا۔اگر ولی کی اجازت کے بغیر کوئی نماز جنازہ پڑھالے تو ولی کو نماز جنازہ پڑھانے کا حق باقی رہتا ہے۔

جس مسجد میں جماعت سے نماز ہوتی ہے اس مسجد میں نماز جنازہ نہ پڑھیں۔۔

واضح ہو کہ ہمارے پاس جنازہ کی نماز میں ہر تکبیر پر اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔اسکا سبب غالبا یہ ہے کہ اللہ کو اپنی ان آنکھوں کا واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں جن سے یا تو دیدار ہوا ہے یا جو طالب دیدار ہیں کہ " اے اللہ اس میت کی تو مغفرت فرما اور اسکو بھی اپنے دیدار سے مشرف فرما۔یا یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ نماز میت کی نہیں ہے جو سامنے رکھی ہوئی ہے بلکہ یہ تو صرف دعا ہے اور دعا کا قبلہ آسمان ہے۔

اب رہا یہ اعتراض کہ نماز میں سر کو اونچا کرنے سے سخت منع کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ "نماز میں جو سر اونچا کرے گا تو خدشہ ہے کہ اسکی بینائی سلب کرلی جائے۔تو اسکا جواب یہ ہے کہ بے شک ایسا ہی ہے لیکن یہ حکم اس نماز کیلئے ہے جس میں رکوع و سجود ہو۔اور وہ اللہ کیلئے ہو۔نماز تو شروع سے آخر تک خشوع و خضوع، عاجزی اور تذلل کی علامت ہے۔اس میں سر کو جھکانے کے بجائے، بلند کرنا تکبر اور بڑائی کا اظہار ہے۔جو خدا کو پسند نہیں۔لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ نماز جنازہ در اصل دعا ہی ہے، اسپر نماز کا اطلاق حقیقی نہیں، بلکہ مجازی ہے۔اس لئے کہ صلوٰۃ کے معنی یہاں دعا ہی کے لئے جاتے ہیں۔پس دعا میں ہاتھوں کو بلند کرنا اور منہ کو اوپر اٹھانا ممنوع نہیں ہے۔چنانچہ نماز استسقاء میں بھی حضور ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اوپر اتنا بلند فرمایا تھا کہ آپؐ کے بغل مبارک کی سفیدی نظر آتی تھی۔نماز جنازہ میں ہاتھ تو باندھے ہوئے رہتے ہیں اس لئے منہ اوپر اٹھا کر آنکھوں کا واسطہ دے کر مغفرت اور دیدار کی دعا کی جاتی ہے۔البتہ بحالت نماز خواہ وہ فرض ہو یا سنت ، منہ اوپر اٹھانا منع ہے۔

اسکے بعد میت کا منہ دیکھا جاتا ہے۔پھر کندھوں پر میت کو اٹھا کر حظیرہ (قبرستان) کی طرف لے چلیں۔چال تیز ہونی چاہیئے لیکن دوڑ سے کم۔اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عجلوا بموتاکم "یعنی اپنی میتوں کو لے جانے میں جلدی کرو۔پھر

آپؐ نے اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اگر وہ میت نیک ہے تو اسکو اسکی منزل تک پہنچانے میں پیش قدمی کرو اور اگر وہ بد ہے تو اسکو اپنے کندھوں سے اتارنے میں جلدی کرو (اور راحت پائو)۔ لوگوں کا میت کے پیچھے چلنا افضل ہے۔

حظیرہ (قبرستان) پہنچنے کے بعد میت کو کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھنے سے پہلے دوسرے لوگوں کو بیٹھنا نہیں چاہیئے۔

پلنگ کو قبر کی سیدھی جانب رکھنا چاہیئے اور میت کو قبر میں اتارنا چاہیئے۔ قبر میں ایک، دو اور تین آدمی بھی اتر سکتے ہیں، چنانچہ حضور ﷺ کی لحد مبارک میں حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور حضرت صہیبؓ اترے تھے۔ میت کو قبر میں رکھتے وقت "بسم اللہ و علی ملۃ رسول اللہ ﷺ کہنا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس میت کو رکھ رہے ہیں اللہ کے نام کے ساتھ اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت پر ہم تجھ کو سونپ رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر میت کا منہ دکھایا جاتا ہے۔

ہمارے پاس یہ روایت آئی ہے کہ میت کا منہ دو مرتبہ بدلتا ہے، ایک نماز جنازہ کے بعد، اور دوسری مرتبہ قبر میں رکھنے کے بعد۔ اگر خیر ہے تو چہرہ اچھا ہو جاتا ہے ورنہ نہیں۔ (دوسری صورت سے اللہ ہم سکو محفوظ رکھے اور قبر میں چہرہ منور فرمادے۔ آمین)

اسکے بعد کفن کے بند کھول دیں (مشت خاک کا بیان "م" میں آئیگا، ان شاء اللہ) پھر مٹی ڈالیں اور قبر کو کوہان کی شکل میں بنائیں یعنی مسطح نہ کریں۔ پھر ہمارے پاس مرشد قبر پر "مہر کرتے ہیں، اس کا بیان بھی "م" میں آئیگا، ان شاء اللہ۔ پھر پھول ڈال کر فاتحہ، قل ھو اللہ اور درود پڑھا جاتا ہے اور صاحب قبر کو اس کا ثواب پہنچانے کی اللہ سے التجاء کی جاتی ہے۔

نوٹ۔ قبر کو کوہان کی شکل دینی چاہیئے، قبر کو مسطح نہیں بنانا چاہیئے۔

نکاح

ارشادی خداوندی ہے "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع" یعنی جو عورتیں تم کو پسند ہو ان سے نکاح کرو ، دو دو، تین تین ، چار چار۔ مگر اللہ نے اس کیلئے یہ شرط بھی لگادی کہ ایک سے زیادہ ،بیویاں رکھنے کا ارادہ ہو تو ان کے درمیان عدل وانصاف کا برتائو کرنا چاہیئے۔ اگر عدل کرنے کی قوت نہ ہو تو "فواحدۃ" فرمایا یعنی ایک ہی کرنا چاہیئے۔

نکاح کی غرض وغایت "دفع شہوت" ہے۔ پس جس شخص کے پاس قوت شہوت ہے۔ اسے نکاح کرنا چاہئے اور جو شخص قوت شہوت سے عاری ہو تو ہرگز اسے نکاح نہیں کرنا چاہیئے۔

چناچہ اہل طریقت کی ایک جماعت کہتی ہے کہ نکاح دفع شہوت کیلئے ہے اور کسب دل کی فراغت کیلئے ہے۔ اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ نکاح کا مقصد دفع شہوت کے علاوہ قیام نسل بھی ہے تا کہ اولاد ہو۔ توالد اور تناسل کا سلسلہ جاری رہے۔ چناچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تنا کحوا وتوالدوا واستکثروا، فانی اباھی بکم الامم یوم القیامۃ ولو بالسقط۔ یعنی نکاح کرو، کثیر الاولاد ہو جائو، تو مجھے تمہاری کثرت پر قیامت کے دن سب امتوں پر فخر ہو گا۔ ساقط بچے ہی کیوں نہ ہو۔ نکاح کن عورتوں سے کرنا چاہئے اس کے تعلق سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "ان اعظم النکاح برکۃ اقلہ مونۃ ا۔ یعنی عظیم ترین وبابرکت نکاح وہ ہے جو کفایت شعار ہو۔ ویسے نکاح سنت ہے لیکن جو شخص حرام سے پرہیز نہ کرسکے اسپر فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تنکح النساء علی اربعۃ۔ علی المال والحسب والحسن والدین، فعلیکم بذات الدین۔ فانہ ما استفاد امروء بعد الاسلام خیرا من زوجۃ مومنہ موافقۃ، لیسر بھا اذا نظر الیھا۔ عورت سے نکاح چار وجوہ کی بناء پر کیا جاتا ہے۔ مال، حسب ، حسن اور دین۔ دیندار عورت سے نکاح کرو، کیونکہ اسلام کے بعد مومن کیلئے فرمانبردار بیوی جسے دیکھ کر مسرت حاصل ہو مغتنم ہے۔

جملہ برائیاں تنہائی میں ہیں اور سب سعادتیں صحبت میں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "الشیطان مع الواحد۔ شیطان تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ شادی کے بغیر رہنے میں دو برائیاں ہیں۔ ایک تو ترک سنت اور دوسری خواہشات نفسانی کی غلطیاں اور حرام میں مبتلا ہونے کا قوی امکان۔ نیز حضور ﷺ نے فرمایا "حبب الی من دنیا کم ثلاث ، الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" تمہاری دنیا سے مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ خوشبو، عورت اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز۔

دوسرے مقام پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ما ترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء" میں نے اپنے بعد

مردوں کیلئے عورتوں سے بڑھ کر زیادہ نقصان دہ کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔ خلاصہ یہ کہ آدمی کی ہلاکت نہ نکاح کرنے میں ہے اور نہ مجرد رہنے میں۔ ہلاکت دراصل اپنے اختیار کو بروئے کار لانے اور خواہشات نفسانی کی متابعت کرنے میں ہے۔ ہلاکت سے بچنے کا واحد راستہ شریعت محمدی کی اتباع میں ہے۔ اگر شریعت مصطفویہ کو چھوڑ کر کوئی شخص اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے تو اس کیلئے ہلاکت کا دروازے کھل جاتے ہیں۔

نکاح دراصل ایک عاقل و بالغ مرد اور ایک عاقلہ و بالغہ عورت کے درمیان ایک سماجی معاہدہ ہے۔ جس کے ذریعہ وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے تاحیات مل جل کر احکام شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد، دو عاقل بالغ گواہوں کے روبرو کرتے ہیں۔ عورت کی جانب سے مہر کا تعین بھی ضروری ہے تاکہ بعد میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ نکاح کیلئے ولی یا اسکی جانب سے وکیل کا ہونا ضروری ہے۔ جو عورت کی رضامندی کی دلیل ہے۔ ایجاب و قبول نکاح کی بنیادی شرط ہے۔ عورت کی جانب سے ایجاب ہو اور مرد کی جانب سے قبول۔ شوہر کی جانب سے "میں نے قبول کیا" کہنا ضروری ہے۔

اگر بوقت نکاح مہر کا تعین نہ ہوا ہو تو "مہر مثل" کی ادائی ضروری ہے۔ اس کے مطالبہ پر شوہر کو بہر حال ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن اگر وعدہ کرے تو ٹھیک ہے لیکن وعدہ کا وفا کرنا بھی ضروری اور لازمی ہے۔ نکاح کے بعد بیوی کا نان و نفقہ اکل حلال سے دینا شوہر کے ذمہ واجب ہے اسی طرح شوہر پر بیوی کے ساتھ وظیفۂ زوجیت کا ادا کرنا بھی لازمی ہے۔ نان و نفقہ کی عدم ادائیگی پر عورت کو طلاق کے مطالبہ کا حق پہنچتا ہے۔ اسی طرح وظیفۂ زوجیت کی عدم ادائیگی پر عورت کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں قاضی کے پاس رجوع ہو۔ قاضی کو چاہئے کہ وہ شوہر کو ایک سال کی مدت دے، تاکہ وہ دوا وغیرہ کے ذریعہ عورت کے قابل ہو جائے، اس کے بعد بھی اگر وہ "ناقابل" ہی رہے تو اسکو "عنین" قرار دیا جا کر دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائیگی۔

فرقۂ ناجیہ

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعدی ما جاء ھم البینات۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائو جو آپس میں متفرق ہو گئے اور جن کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آنے کے باوجود آپس میں اختلاف کرنے لگے۔

عوف بن مالکؓ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے "یہود کے ۷۱ فرقے ہو گئے، ان میں سے ایک جنت میں اور ۷۰ دوزخ میں۔ اور نصاریٰ کے ۷۲ فرقے ہو گئے، ان میں سے ۷۱ دوزخ میں اور ایک جنت میں۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میری امت کے ۷۳ فرقے ہو جائیںگے۔ اور ان میں ایک فرقہ جنت میں اور ۷۲ فرقہ دوزخ

میں ہوں گے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون ہیں ؟ جواب دیا "ما انا علیہ الیوم و اصحابی " آج جس راستے پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔ اسی مضمون کو اہل سنت والجماعت کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی روش پر کون عامل ہے؟ یوں تو ہر فرقہ اپنی زبان سے یہی کہتا ہے کہ ہمارا فرقہ ناجی ہے۔ اور دوسرے ہالک ہیں ۔ لیکن دعویٰ کرنا الگ بات ہے اور اس پر دلیل قائم کرنا جدا بات ہے۔ خلفائے راشدینؓ کے زمانے کے بعد تو ملوکیت قائم ہو گئی اور خلافت ختم ہو گئی۔ پھر بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد حکومت میں جو رسوم، رواج، عادات، بدعات اور خرافات اسلام میں داخل ہوئے۔ تاریخ کی کتابیں اس کی گواہ ہیں۔ خصوصا نویں صدی ہجری کا زمانہ انتہاء درجہ پر آشوب رہا۔ اسقدر کے اسلام سے فقط نام اور قرآن سے فقط الفاظ باقی رہ گئے تھے۔ اور عمل تو بالکل ناپید ہو گیا تھا۔ ایسے ہی دور میں جب کے رسوم، عادات اور بدعات کے سبب دنیا سے دین رخصت ہو گیا تھا۔ اللہ نے حضرت سید محمد جونپوری کو مہدی کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔ کہ دین کو اسکے اصلی خدو خال کے ساتھ برپا کیا جائے۔ اور آنحضرت ﷺ کی سنتوں کو زندہ کیا جائے، پس حضرت مہدی موعودؑ نے ببانگ دہل مہدی ہونے کا اعلان بحکم خدا فرمایا۔ اور دلیل میں کتاب اللہ اور اتباع محمد رسول اللہ ﷺ کو پیش فرمایا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ جس نے مہدی موعودؑ کی تصدیق کی اور آپؑ کے بیان کردہ احکام پر جو کہ حقیقت میں احکام قرآن اور اتباع محمد رسول اللہ ﷺ سے عبارت ہیں عمل کیا وہی ناجی ہے۔

نور

نور کے معنی مختار الصحاح میں الضیاء کے کئے گئے ہیں یعنی روشنی اور اجالا۔

امام راغب نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں۔النور الضوء المنتشر الّذی یعین علی الابصار (مفردات القرآن صفحہ ۵۲۸) ترجمہ: نور اس روشنی کو کہتے ہیں جو زمین پر پھیلتی ہو اور ماحول کو دیکھنے میں آنکھوں کی مدد کرتی ہو۔ روشنی کی دو قسمیں ہوتی ہیں (۱) محسوس (۲) معنوی

محسوس وہ روشنی ہوتی ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتی ہو جیسے سورج، چاند، ستاروں، بجلی اور چراغوں کی روشنی۔ اس نوع کی روشنی سے سطح زمین منور ہوتی ہے۔ معنوی روشنی وہ ہے جو بصیرت اور دل کی بینائی سے محسوس کی جاتی ہے۔ یعنی وہ امور الٰہیہ اور احکام شرعیہ جو انسانوں کے ظاہر اور باطن کو حسن اعتقاد، حسن کردار، حسن گفتار، اور حسن اخلاق کے نور سے منور کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اگرچہ اپنی ذات اور تخلیق کے اعتبار سے بشر اور انسان تھے۔ لیکن آپ کی تعلیمات اور آپ کی سیرت وہ ہمہ گیر اور عالمگیر روشنی ہے جس کی وجہ سے کفر و شرک کی تاریکیاں چھٹ گئیں اور توحید اسلام کا اجالا چار سو پھیل گیا۔

اللہ تعالیٰ خود نور ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ اللّٰہ نورالسَمٰوٰتِ والارض۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

بعض مفسرین نے اسکی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کو منور کرنے والا ہے۔ لیکن بات ایک ہی معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ نور ہو گا تبھی تو اسکے نور سے آسمان اور زمین منور ہوتے ہوں گے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کے ہی نور سے ہیں۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے۔ لولاک لما خلقتْ ربوبّیتی۔ یا، لولاک لما خلقت الافلاک۔ نیز صوفیاء کے ہاں ایک حدیث بہت مشہور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ انامن نور اللّٰہ وکل شیئٍ من نوری۔ میں اللہ کے نور سے ہوں اور ہر چیز میرے نور سے ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوئی اور آپ نے اللہ کو دیکھا، یعنی آپ کو رویت الٰہی نصیب ہوئی۔ اور آپ نے اس واقعہ کا ذکر صحابہؓ سے فرمایا تو بی بی عائشہ صدیقہؓ نے اور دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا نام ہے۔ پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ کو دیکھا تو آپ نے جواب دیا نورانیّ اراہ۔ میں نے اسکو دیکھا وہ نورانی ہے۔

مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی چیز کو دیکھنے کیلئے دو نور کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک داخلی نور اور دوسرا خارجی نور، جب تک یہ دونور نہیں ہوتے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر ہم مسجد کو دیکھنا چاہیں تو خارجی نور یعنی سورج کی روشنی یا چاند کی روشنی یا چراغ و قمقمہ کی روشنی چاہیئے اور ہماری آنکھ کو بھی بینا ہونا چاہیئے تو مسجد نظر آتی ہے۔ اس کے بر خلاف اگر باہر روشنی تو ہو مگر آنکھ میں بینائی نہ ہو تو مسجد نظر نہیں آئے گی۔ اسی طرح آنکھ میں بینائی ہو لیکن خارج میں روشنی نہ ہو تو بھی مسجد نظر نہیں آئے گی۔ یہ تو عام چیزوں کو دیکھنے کی بات ہے۔

لیکن قرآن اور نبی کو دیکھنے کیلئے دل میں نور کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک دل میں نور نہ ہو وہ نہ قرآن دیکھ سکتے ہیں اور نہ نبی کو۔ اس لئے ابو جہل نے لاکھ مرتبہ "محمد" ﷺ کو دیکھا لیکن اس نے صرف "محمد بن عبد اللہ" کو دیکھا محمد رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھ سکا اس لئے اس کے دل میں جس نور کی ضرورت تھی وہ نہیں تھی۔ لیکن عبد اللہ بن ام مکتومؓ نے جو بظاہر نابینا تھے۔ اور محمد بن عبد اللہ کو بھی نہیں دیکھا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کو دیکھ لیا اور ایمان لے آئے۔ قرآن شریف میں نور۔ النور ۲۵ مقامات پر آیا ہے جو واحد ہے اور اسکے مقابل "ظلمات" کا لفظ جمع کے صیغہ کے ساتھ آیا ہے گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ ظلمتیں اور تاریکیاں خواہ کتنی بھی ہو لیکن وہ سب مل کر بھی ایک "نور" کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر ظلمت و تاریکی کیلئے الگ الگ نور کی ضرورت در پیش ہوتی ہے۔ بلکہ ایک نور میں ہی اتنی قوت ہوتی ہے کہ جب وہ آتا ہے تو ہر قسم کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں اور ہر قسم کی ظلمتیں کافور۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ دل میں نور ایمان آجائے تو ساری تاریکیاں، اندھیرے اور ظلمتیں نابود ہو جاتی ہیں۔ انگریزی میں ایک مشہور مقولہ ہے۔

it is better to light a candle than to curse the darkness.

یعنی اندھیرے کو کوسنے سے بہتر یہ ہے کہ ایک موم بتی جلالی جائے۔

وراثت

کسی شخص کے انتقال کے وقت اس کے چھوڑے ہوئے مال میں سے اس کے رشتہ داروں سے جن جن لوگوں کو جتنا جتنا حصہ دینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کو فرائض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

گویا مال متروکہ کی حسب احکام شریعت تقسیم کرنا۔

میراث میں مردوں میں سے نو (۹) ہیں۔ بیٹا، پوتا (اسی طرح اور نیچے والے)، باپ، دادا (اسی طرح اوپر والے)، بھائی، بھتیجا، چچا، چچا کا بیٹا، شوہر۔

اور عورتوں میں سے سات (۷) ہیں۔ بیٹی، پوتی، ماں۔ دادی، بہن، بیوی۔

چار افراد وارث نہیں ہوتے۔ غلام (آج کل ان کا وجود نہیں ہے) قاتل، (جس نے اس کو قتل کیا ہے جس سے اسے حصہ ملنا ہے) مرتد۔ یہود و نصاریٰ۔

اور اللہ نے قرآن میں جو حصے مقرر فرمائے ہے وہ چھ ہیں۔ نصف (آدھا) ربع (چوتھائی) ثمن (آٹھواں حصہ) ثلث (ایک تہائی) سدس (چھٹواں)

شوہر کو بیوی کے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ملے گا اگر میت کو کوئی اولاد نہ ہو۔ اگر میت کو اولاد (بیٹا یا پوتا ہے) تو شوہر کو چوتھائی حصہ ملے گا۔

اسی طرح بیوی کو شوہر کے متروکہ میں سے چوتھائی حصہ ملے گا اگر مرحوم کے بیٹا یا پوتا نہ ہو۔ اور اگر مرحوم کے بیٹا یا پوتا ہو تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

واضح ہو کہ میراث میں صرف مردوں کا حق نہیں ہے، جیسا کہ عام طور سمجھا جاتا ہے بلکہ اس میں عورتوں کا بھی حق ہے، نیز یہ کہ میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہئے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو، ہاں اگر شرکاء مستحقین میراث آپس میں معاوضہ کے طور پر لین دین کر لیں، وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال اور املاک پر جاری ہوگا خواہ وہ جائیداد منقولہ ہو کہ غیر منقولہ یعنی اگر مکان، دکان، زمین، کارخانہ وغیرہ۔ ایک مرد کا حصّہ دو عورتوں کے برابر ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ عموماً خاندانی زندگی میں، معاشی زندگی میں ذمہ داریوں کا زیادہ تر بوجھ مردوں پر ہی ڈالا گیا ہے (اِلّا ماشاء اللہ) اور عورتوں کو معاشی ذمہ داریوں سے سبکدوش رکھا ہے، لہذا انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ عورتوں کا حصّہ مردوں سے کم ہی رکھا جائے۔

اور اگر میّت کے وارث صرف دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انہیں پورے ترکہ کا دو تہائی دیا جائے۔ اور اگر میت کی وارث ایک ہی لڑکی ہو تو اسے آدھا ترکہ دیا جائیگا۔ اور اگر صاحب اولاد ہے تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصّہ دیا جائے۔ اور اگر میت صاحب اولاد نہ ہو اور والدین (ماں، باپ) ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو ترکے کا تیسرا (33) حصّہ دیا جائیگا۔ اور اگر دوسرے وارث نہ ہوں تو باقی (2/3) باپ کو ملیگا، اگر دوسرے وارث ہوں تو باقی (2/3) میں باپ اور دوسرے وارث شریک ہوں گے۔ میت کے اگر بھائی، بہن ہو تو ماں کا حصہ (1/3) کے بجائے (1/6) ہو گا، اگر میت کے والدین زندہ ہو تو اسکے بہن، بھائیوں کو حصّہ نہیں ملیگا۔ اور اگر میت جس کی میراث تقسیم طلب ہے، بے اولاد ہو اور اس کے ماںباپ بھی زندہ نہ ہوں مگر اس کا بھائی یا ایک بہن ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو مال متروکہ کا چھٹا حصّہ ملیگا، اور اگر بھائی اور بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی (1/3) میں وہ سب شریک ہوں گے۔

مگر یہ بات یاد رہے کہ میراث کی تقسیم کرنے سے پہلے اگر میت نے کچھ وصیّت کی ہے، پوری کر دی جائے اور جو قرض اس نے چھوڑا ہے، ادا کر دیا جائے۔ یہ بھی یاد رہے کہ کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا یعنی جن رشتہ داروں کے حصّے قرآن میں مقرّر کر دئے گئے ہیں۔ ان کے حصّوں میں نہ تو وصیت کے ذریعہ نہ تو کمی بیشی کی جاسکتی ہے نہ تو کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی وارث کو اسکی قانونی اور قرآنی حصّہ کے علاوہ کوئی چیز بذریعہ وصیت دی جاسکتی ہے۔

اور وصیت جائید اداکے صرف ایک تہائی حصّے کی حد تک کی جاسکتی ہے، وصیت جاری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنا چاہئے، چنانچہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک جنازہ لایا گیا، آپؐ نے نماز جنازہ پڑھنے سے پہلے دریافت فرمایا کہ، کیا اس پر کسی کا قرض ہے؟ کسی نے کہا کہ ہاں میرا قرض اسپر واجب ہے، پھر آپؐ نے پوچھا کہ کیا کوئی اس قرض کو ادا کریگا؟ جواب نفی میں پاکر آپؐ نے فرمایا، تم اسکی نماز جنازہ پڑھ کر، دفن کر دو، آپؐ نے اسکی نماز جنازہ نہیں پڑھی، اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ شخص جو حضور ﷺ کی دعا (نماز جنازہ) سے محروم ہو گیا۔ حالانکہ اللہ نے حضور ﷺ کو فرمایا'' وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴿التوبة:١٠٣﴾ '' آپ ﷺ ان پر نماز جنازہ پڑھئے کیوں کہ آپ کی دعا ان کے حق میں سکون کا باعث ہو گی۔

وصیت

وصیت، انسان اپنی زندگی کے آخری احوال یعنی موت کے قریب اپنا مال یا ملک کا کسی دوسرے کو اپنے اختیار سے مالک بنانے کے عمل کو وصیت کرنا کہتے ہیں۔

اس کے شرائط: وصیت کرنے والا دوسرے کو مالک بنانے کا اہل ہونا چاہیئے۔ اس کا مال اس کی ملک قرض میں ڈوبی نہ ہونی چاہیئے۔ جس کے وصیت کی جارہی ہو وہ وصیت کے وقت زندہ ہو۔ جس کے وصیت کی جارہی ہو وہ وصیت کرنے والے کا قاتل نہ ہو۔ جس چیز کی وصیت کی جارہی ہے وہ وصیت کرنے والے کی ملکیت ہو اور مال کا تہائی ہو اس سے زیادہ نہ ہو۔

وصیت کا رکن: وصیت کرنے والے کا یہ قول کہ "میں فلاں کو اپنے مال یا اس ملکیت کی وصیت کر رہا ہوں۔

وصیت کا حکم یہ ہے کہ وصیت کرنے والا جس چیز کی وصیت دوسرے شخص کے لئے کر رہا ہے وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی۔ چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿البقرۃ:۱۸۰﴾۔ تم میں سے جب کسی کے موت کا وقت قریب آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو وصیت کر جائے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے (جو وارث نہ ہوں) دستور کے مطابق۔

عام طور پر اس آیت کو سورۂ نساء کی آیت "يُوصِيكُمُ اللَّـهُ فِي أَوْلَادِكُمْ "﴿النساء:۱۱﴾ سے منسوخ قرار دیا جاتا ہے، تعجب ہے کہ جب پورا قرآن عمل کے لئے نازل ہوا ہو تو اس میں کی کوئی آیت کیسے منسوخ سمجھی جا سکتی ہے۔ اور طرفہ ماجرا یہ کہ وہ منسوخ آیت قرآن میں موجود بھی ہے۔ اور پڑھی بھی جاتی ہے۔ مہدویہ کا اعتقاد ہے کہ قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ صرف یہ نظر کی کمی ہے۔ جس کے سبب بظاہر نسخ سمجھ میں آتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ منسوخ نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت میں وصیت کا حکم صرف ایسے ماں باپ اور ایسے رشتہ داروں کے لئے ہے جو اللہ کے بیان کردہ قانونِ وراثت میں وارث نہیں بنتے۔ چنانچہ جو ماں باپ یا دارالحرب میں ہوں۔ اسی طرح وہ رشتہ دار جو فی الحقیقت مستحق امداد ہیں مگر قانون وراثت کی رو سے وارث نہیں بن سکتے۔ ان کی امداد کی یہی صورت رہ جاتی ہے کہ مرنے والا ایک تہائی مال کے اندر ان کے لئے وصیت کر جائے۔ مثلاً پوتے اور نواسے جن کے ماں باپ، دادا یا نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں وہ قانوناً ترکہ کے حقدار نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ امداد کے مستحق ہوتے ہیں۔ مگر لوگ ان سمجھی سے قانونِ شریعت پر ہی اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ غلطی ان کی ہے کہ انہوں نے خدا کے بنائے ہوئے قانون (وصیت) کو نظر انداز کر دیا۔ خدا نے تو ایسے ہی رشتہ داروں کے لئے وصیت کو فرض کیا ہے۔ اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ ان رشتہ داروں کے لئے ہے جو اللہ کے

بیان کردہ قانونِ وراثت سے باہر ہیں۔

اور ''یُوصِیکُمُ اللّٰـــہُ'' کی آیت ان رشتہ داروں کے حق میں ہے جو ترکہ کے وارث ہیں جن کا بیان اللہ نے قانون وراثت میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

مزید تعجب تو یہ ہے کہ اس وصیت کو تو خدا نے دو لفظوں سے مستحکم فرمایا ہے۔

(۱) کُتِبَ عَلَیْکُمْ۔ یعنی تم پر وصیت فرض کی گئی ہے۔

(۲) حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِینَ۔ یعنی یہ حق ہے متقیوں پر۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اللہ نے کسی چیز کو فرض فرمایا اور جسے خدا نے حق فرمایا وہ منسوخ کیسے ہو سکتی ہے۔﴿نور ایمان۔ ص:۳۷﴾

اگر کوئی مسلم کسی کافر کے لئے یا کوئی کافر کسی مسلمان کے لئے وصیت کرے تو جائز ہے۔

اگر کسی نے حقوق اللہ میں سے بعض امور کی وصیت کی تو ان میں فرائض کو غیر فرائض پر مقدم کیا جائے گا۔ فرائض جیسے حج۔ زکوۃ اور کفارات۔ اگر کسی نے ان کے ادا کرنے کی وصیت کی۔ تو ان کو دوسرے افعال پر مقدم رکھا جائے۔

اگر کسی نے حج کی وصیت کی۔ تو کسی شخص کو اس کی طرف سے حج کرانا چاہئے۔ اور وہ بھی اس کے شہر سے جس میں وہ آدمی رہتا ہے۔ کسی بچے کی وصیت صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ عطا اور صدقہ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اگر کسی نے سسرال والو ں کے لئے وصیت کی تو اس سے مراد اس کی بیوی کے محرم افراد ہوں گے۔ اگر کسی نے دامادوں کے لئے وصیت کی تو اس سے محرم عورتوں کے شوہر مراد ہوں گے۔ اگر کسی نے اپنے اقرباء کے لئے وصیت کی تو اس سے مراد الاقرب فالاقرب ہوں گے اس کے محرم رشتہ داروں میں سے۔ لیکن ان میں ماں باپ، بیٹے شامل نہیں ہوں گے۔ اس لئے کہ ماں باپ تو اصل قرابت دار ہیں اور بیٹا خود اپنی جان سے اس کے قریب ہے۔

ولایت

ولایت کی دو قسمیں ہیں۔(۱)ولایت عامہ۔(۲)ولایت خاصہ

ولایت عامہ: ہر ایک مومن کو حاصل ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا﴿البقرة:۲۵۷﴾

ولایت خاصہ: بلا کسی امید و وہم کے خدا کی یاد دل میں ایسی مستحکم ہو اور ذات پاک سے دل کا تعلق اس قدر مضبوط ہو کہ راحت یا تکلیف کسی حال میں اس سے غفلت نہ ہو۔ نیز قرب حق، یقین کامل، محبت خدا اور رسول و اتباع سنت کا نام ولایت ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّـهِ وَرَسُولِهِ ﴿النساء:۱۳۶﴾ اس آیت میں ایمان والوں سے ایمان لانے کہا جارہا ہے۔ پس ایمان ثانی کی تکمیل کے لئے طریقت ہے۔ جس طرح ایمان اول کے لئے شریعت ہے۔ اسی ایمان ثانی کے کمال کو ولایت کہتے ہیں۔

قرآن پاک، احادیث صحیحہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

دلیل اول: حضرت موسیٰؑ نے خضرؑ سے فرمایا: هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿الکهف:۶۶﴾ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا

ہمراہ چلے، کشتی میں سوراخ، بچے کو مارنا، یتیم کی دیوار بنائی، اعتراض کیا جو شریعت موسوی کے تحت تھے۔ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا﴿الکهف:۶۵﴾۔ اس آیت میں رحمۃ من عندنا اور من لدنا علما سے مراد ولایت ہے۔

دلیل دوم: عقائد و اعمال کے علاوہ ایک دوسری چیز ہے جسے احسان کہتے ہیں۔

دلیل سوم: حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث۔ ولایت کی تعریف مہدی موعودؑ نے ذات خدا سے کی ہے۔ الولاية افضل من النبوة۔

وحدت و کثرت

مرتبہ احدیت ذات بحت (خالص) کا پہلا مرتبہ ہے۔ پھر جب ذات نے مخلوق کے ذریعہ اپنے ظہور کا ارادہ کیا تو اس مرتبہ کا نام وحدت ہوا۔ پھر اس وحدت سے ذات نے کثرت میں ظہور کیا یعنی بہت سے عالَم پیدا ہوئے۔ جیسے عالم ارواح، عالم مثال، اور عالم اجساد اور ہماری یہ دنیا اور جو کچھ آسمانوں اور زمین کے درمیان موجود ہے۔ یہ عالَم ناسوت کہلاتا ہے۔ لیکن اس کثرت تخلیق کے باوجود حق کی ذات اور اس کے مرتبہ وحدت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ ذات پاک جیسے تخلیق سے پہلے تھی اب بھی ایسی ہی ہے۔

تمام صوفیاء حضرات، **وحدۃ الوجود** کے قائل ہیں یعنی وہ حق تعالیٰ کے وجود کے علاوہ ہر وجود کی نفی کرتے ہیں۔ اور **لا موجود إلّا الله** کہتے ہیں۔ اور عالم میں جو اشیاء کی کثرت نظر آرہی ہے۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کا اپنا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کائنات حق تعالیٰ کے مظاہر ہیں۔ اور اس کے اسماء وصفات کے جلوہ گاہ ہیں۔ بے شائبہ تنزل، تغیر و تبدل کے گمان کے بغیر۔ جس طرح سایہ کسی شخص کا زمین پر ہو تو کہہ نہیں سکتے کہ وہ سایہ اس شخص کے ساتھ متحد ہے۔ یا اس شخص کا عین ہے یا وہ شخص تنزل کر کے سایہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بلکہ وہ شخص اپنی اصالت کی حالت میں ہے۔ اور سایہ اس سے بے شائبہ تنزل و تغیر وجود میں آیا ہے۔ کوئی وجود نہیں ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کا مسلک یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز معدوم ہے۔ اور وجود صرف ایک باری تعالیٰ کا ہے۔ اور اس کے علاوہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب اسی ذات پاک کا عین ہے۔ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ مگر مجدّد الف ثانی کہتے ہیں کہ وجود تو ہے مگر وہمی اور خیالی ہے۔ پس جو صوفیا وحدۃ الوجود کے قائل ہیں وہ حق پر ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے، اور جو علماء کثرت وجود کے قائل ہیں وہ حق پر ہیں، ان کی اپنی پرواز کے اعتبار سے یعنی وہم اور احساس کے اعتبار سے۔ یعنی پہلی صفت حقیقت پر ہے۔ اور دوسری مجاز پر۔ جیسے ایک شعلہ جوالہ لکڑی کے سرے پر کچھ آگ لگا کر زور سے گردش دیں تو ایک دائرہ معلوم ہوتا ہے آگ کا۔ حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگرچہ حقیقت کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ اور اس سے پیدا ہونے والا دائرہ مجاز کی طرح ہے۔ جو وہمی اور احساسی ہے۔ (انیس العارفین۔ ص: 112)

راہِ معرفت میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ جب سالک اس مقام پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ جو کچھ بھی اس عالم میں موجود ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔ اور تمام اشیاء کائنات ایک ہی وحدت سے وابستہ ہیں۔ جب یہ حالت غلبہ پالیتی ہے تو پھر سالک کی نظروں سے اشیاء کی کثرت غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خود اس کا وجود بھی اس کو محسوس نہیں ہوتا اور

صرف ایک ذات حق کے علاوہ وہ دوسری ہر چیز اور اس کا وجود بھی اس کی نظروں میں کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کی تحقیق یہ ہے کہ کثرتِ اشیاء معدوم نہیں ہوتیں۔ وہ سب اپنی جگہ موجود رہتی ہیں۔ البتہ سالک کو غلبہ توحید کی وجہ سے کثرت سے ایک قسم کا ذہول ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی توجہ ذاتِ حق کی طرف ہو جاتی ہے۔ جیسے آسمان پر ستارے کہ آفتاب طلوع ہوتے ہی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس کو وحدت الشھود کہتے ہیں۔ ص:۱۰۸۔۱۰۷ سوائے ذات حق کے اور کچھ مشاہدہ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی شریعت کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور اکتسابی بھی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کیفیت حق تعالیٰ کی عطاؤں میں سے ایک عطا ہے۔ جب وہ کسی خوش بخت کے دل سے اپنے آفتاب وحدت کو طلوع کرتے ہیں تو اس کے لئے ساری کثرت ایک وحدت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور وہ زبان حال سے پھر یہ کہتا ہے۔لا آدم في الكون ولا ابليس - لا ملك سـليمان ولا بلقيس فكل عبارة و انت المعنى - يا من هو للقلوب مقناطيس۔ یہ سلوک کا ایک اعلیٰ اور ارفع مقام ہے۔ اور آنحضورؐ نے بھی اس مقام کی طرف اشارہ اپنے قول مبارک "لي مع الله وقت" والی حدیث سے کیا ہے۔ لیکن جتنا بزرگ اور اعلیٰ مقام ہے اتنا ہی زبردست خطرات کا حامل ہے۔ چنانچہ ایک سائل نے مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: یہ مسئلہ حق اور صحیح اور واقع کے مطابق ہے۔ اور کچھ اس مسئلہ پر شک و شبہ نہیں ہے اور متفقہ علیہ تمام مشائخ کا ہے۔ مگر قال و اقرار نہیں ہے۔ البتہ حال و تصدیق ہے۔ اور استار (چھپانا) اس کا لازم اور فساد (ظاہر کرنا) ناجائز۔ کیونکہ اسباب سلوک اس مسئلہ کے کچھ نازک ہیں بلکہ بے حد دقیق کہ فہم عوام بلکہ علماء میں جو تصوف کی اصطلاح سے عاری ہیں نہیں آتے۔ تو الفاظ میں کہنا اور دوسرے کو سمجھانا کب ممکن ہے۔ بلکہ جن صوفیوں کا سلوک ناتمام ہے۔ اور مقام نفس سے ترقی کر کے مقام قلب تک نہیں پہنچے۔ اس مسئلہ سے شدید ضرر پاتے ہیں اور مکر نفس سے چاہ الحاد اور قعر ضلالت میں پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے "من صرح باسرار الربوبية فقد كفر"

ہجرت

ہجرت ھجر سے ہے۔ جس کے معنی چھوڑنا، ترک کرنا اور قطع تعلق کے ہیں۔ قرآن شریف میں یہ لفظ متعدد جگہ آیا ہے۔ ان سب مقامات پر ہجر کے معنی چھوڑنے کے ہیں جیسا کہ ابراھیم علیہ السلام کے والد نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا واھجرنی ملیاً۔ تو ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ دے اور مجھ سے قطع تعلق کر۔ اور اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿المدثر:۵﴾ اور ناپاکی سے دور ہو جا۔ وغیرہ۔

اور جب ھاجر کہا جاتا ہے تو اس کے معنی ہیں، ترک وطن کرنا، ایک مقام سے دوسرے مقام کو چلے جانا۔ قرآنی اصطلاح میں ہجرت کے معنی ہیں، جس مقام پر دین کا قیام، دین کا اظہار، دینی احکام پر آزادی کے ساتھ عمل دشوار اور متعذر ہو تو وہاں سے نکل کر اس کو چھوڑ کر ایسے مقام پر جانا جہاں دین کا قیام ہو سکے، دین کی تبلیغ ہو سکے اور دینی احکام پر عمل کرنے میں آزادی بھی ہو اور آسانی بھی۔ چنانچہ سب سے پہلی ہجرت جو مسلمانوں نے کی وہ صحابہ کی جماعت تھی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مکہ سے حبش کی طرف کی تھی، یہ بھی یاد رہے کہ اس وقت تک ملک حبش اسلامی ملک نہیں تھا۔ بلکہ حبش کا بادشاہ عیسائی تھا۔ پھر آنحضرتؐ کے حکم سے ہی جو لوگ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف آنحضرت کے حکم سے گئے تھے اس وقت مکہ دارالکفر تھا لیکن اس وقت مدینہ کو دارالاسلام نہیں کہہ سکتے تھے۔ بلکہ جس وقت خود آنحضرتؐ نے حکم خداوندی سے مکہ سے مدینہ کو جو اس وقت یثرب تھا، تشریف لے گئے اس وقت بھی وہ دارالاسلام نہیں تھا۔ لیکن آپ کے اس عمل کو ہجرت کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اس تاریخ ساز واقعہ ہجرت کو ہمیشہ کے لئے دنیا والوں کے دلوں پر ثبت کرنے کی غرض سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے سنہ ھجری تجویز کیا گیا۔ تو ہجرت کی یہ تعریف کہ مسلمانوں کا جو سفر دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہو اسی کو ہجرت کہا جاتا ہے حقیقت سے بے خبری اور تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

قرآن شریف میں تو ہجرت کی فضیلت اور جن لوگوں نے ہجرت کے حکم سے روگردانی کی، ان کے بارے میں سخت وعید سنائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَـٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿النساء:۹۷﴾ جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حالت میں تھے وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز اور کمزور تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین اتنی وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوا کہ ہجرت کن حالات میں فرض ہوتی ہے۔ اوران حالات میں ہجرت کا فرض ادانہ کرنے پر کس طرح ان کاٹھکانہ دوزخ بتلایا گیاہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت مہدی علیہ السلام نے اس وقت کے مخصوص حددرجہ مخالف اسلام ماحول اور حالات کے پیش نظر ہجرت کو فرض گردانا۔ اور تارکین ہجرت پر منافقین کا اطلاق کیا مگر افسوس کہ بعض علماء نے حضرت مہدی علیہ السلام کے اس حکم اور آپ کے اس عمل کو جو دراصل احیاء شریعت تھا "نسخ مذہب" اور "دین میں زیادتی" کے نام سے یاد کیا اور ثبوت میں "لا هجرة بعد الفتح" کی حدیث کو پیش کیا۔ حالانکہ حضور کے اس فرمان کا مقصد تو بس اتنا تھا کہ اب جبکہ مکہ فتح ہو چکا ہے تو قیامت تک اب یہاں بتوں کی پرستش نہیں ہوگی۔ بلکہ یہاں کوئی مشرک داخل بھی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ اب مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا کوئی موقع نہیں ہے (اس لئے کہ ضرورت بھی نہیں ہے) چنانچہ بعد الفتح کے الفاظ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ یہ حدیث فتح مکہ کے بعد کی ہے۔ اور مکہ سے ہجرت کے لئے مخصوص ہے۔

مگر علماء نے دوسرے مقامات پر سخت سے سخت اور مخالف اسلام حالات میں بھی عاجزوں اور عورتوں کی طرح وہیں رہنا پسند کیا اور دوسروں کو بھی ہجرت سے منع کرتے رہے۔ جب مہدی علیہ السلام نے قرآن سے ثابت فرض ہجرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہم سنت کی تجدید فرمائی اوراس کو زندہ کیا تو علماء سو نے آپ کا پیچھا کیا اور آپ کے خلاف فتوے صادر کئے اور قرآنی حکم کی خلاف ورزی میں اپنی ساری عمر بتادی۔ حضرت مہدی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں کوئی نیا مذہب نہیں لایا ہوں۔ میرا مذہب کتاب اللہ اور اتباع محمد رسول اللہؐ ہے۔

صاحب کشاف نے اوپر بیان کردہ آیت کی تفسیر میں لکھا ہے "اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اگر کسی شہر میں ہو جہاں بعض اسباب اور موانع کی وجہ سے جیسا چاہیئے اقامت امر دین ممکن نہ ہو تو وہیں رہنے پر اصرار نہ کرنا چاہیئے۔ اور جب وہ اس بات کو جانتا ہے کہ کسی دوسرے شہر میں اللہ کے حقوق زیادہ خوبی کے ساتھ قائم کر سکتا ہے اور عبادت پر زیادہ مداومت کر سکتا ہے تو اس پر ہجرت لازم ہو جاتی ہے۔ (جلد اول، ص ۳۱۵)

نیز امام زاہد نے اپنی تفسیر میں ﴿الَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّـــهِ﴾ (البقرۃ:۲۱۸) کے ذیل میں لکھا ہے:
ترجمہ: بعض نے کہا ہے کہ ہجرت باقی اور غیر منسوخ ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے دلیل لی ہے "الھجرۃ باقیۃ الی یوم القیامۃ" یعنی ہجرت قیامت تک باقی ہے۔

صاحب تفسیر مدارک نے ﴿فَتُهَاجِرُوا فِيهَا﴾ (النساء:۹۷) کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے: یہ آیت اس امر پر دلالت

کرتی ہے کہ جس شخص کے لئے کسی شہر میں اپنا دین قائم رکھنا ممکن نہ ہو جیسا کہ چاہئے اور اس کے علم میں یہ بات ہو کہ دوسری جگہ اس کے دین کی اقامت ممکن ہو تو ''حقت علیہ المھاجرۃ'' اس پر ہجرت فرض ہو جاتی ہے اور حدیث میں آیا ہے ''جو شخص اپنے دین کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا اگرچہ بالشت بھر زمین ہی کیوں نہ ہو تو اس کے لئے جنت واجب ہے۔ اور وہ اپنے باپ ابراہیم اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیق ہو گا۔

نیز مدارک میں فَالَّذِينَ هَاجَرُوا کے ذیل میں لکھا ہے۔ ترجمہ: اور وہ ہجرت کرنا ہے اپنے وطن سے اللہ کی طرف اپنے دین کے لئے اس مقام کی طرف جہاں دین کے لئے امن مل جائے ''فالھجرۃ کائنۃ في اخر الزمان کما کانت في اوّل الاسلام'' یعنی پس ہجرت آخر زمانے میں اسی طرح ہو گی جس طرح کہ اول اسلام میں تھی۔

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: لا تنقطع الھجرۃ حتیٰ تنقطع التوبۃ۔ ہجرت منقطع نہیں ہوتی جب کہ توبہ منقطع نہ ہو۔ اس کی تشریح میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔ یعنی منقطع نہیں ہوتی ہجرت اور اس کا حکم دُور نہیں ہوتا جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو جائے اور اس کے دروازے بند نہ ہو جائیں یعنی قیامت کے دن تک (اشعۃ للمعات۔ ج ۱، ص: ۳۶، ۳۷)

ہجرت کی اہمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اتنی زیادہ تھی کہ آپ نے فرمایا: ان الھجرۃ تھدم ما کان قبلھا وان الحج یھدم ماکان قبلہ۔ ہجرت اپنے سے پہلے کے گناہوں کو منہدم کر دیتی ہے اور حج منہدم کر دیتا ہے اس سے ما قبل کے گناہوں کو خلاصہ یہ کہ جہاں اسباب ہجرت ہوں وہاں سے ہجرت فرض ہو جاتی ہے۔

ہجرت کی دو قسمیں ہیں (۱) ہجرت ظاہری (۲) ہجرت باطنی۔

ہجرت ظاہری: ہجرت ظاہری تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ ہجرت ہے جو دین کی بقاء، دین کی اقامت اور دین کے بلا روک ٹوک اظہار کی غرض سے ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتے ہیں جہاں انہیں یہ موانع نہ ہوں۔

ہجرت باطنی: دوسری ہجرت باطنی ہے۔ اس سے مراد اللہ نے جن امور سے منع فرمایا ہے ان کو چھوڑ دینا ہے۔ جیسا کہ صاحب اشعۃ اللمعات نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے

جب آپ سے پوچھا گیا ''أيّ الھجرۃ أفضل قال من ھجر ماحرّم اللہ علیہ'' یعنی اس شخص نے اس چیز کو چھوڑ دیا جو اللہ نے اس پر حرام کی ہے''۔ گویا یہ ہجرت باطنی ہے۔

ہجرت: تلسی رن میں جھوجھنا ایک گھڑی کا کام نت اٹھ من سے جھوجھنا بن کھانڈے سنگرام

اے تلسی داس میدان جنگ میں جہاد کرنا صرف ایک گھڑی کا کام ہے۔ لیکن ہر روز اٹھتے ہی نفس سے مقابلہ کرتے رہنا جہاد بے شمشیر ہے (انصاف نامہ)

بعض لوگوں کے یہ کہنے پر کہ "صرف ہجرت باطنی ضروری ہے" سیدنا مہدیؑ نے فرمایا جب تک کہ اولاً ظاہری گھروں سے ہجرت نہ کریں، باطنی ہجرت حاصل نہیں ہوتی بلا ہجرت ظاہری، ہجرت باطنی شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی ہے جو کہ النادر کالمعدوم ہے (انصاف نامہ)

آیت: إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿النساء:۹۷تا۹۹﴾ ہجرت اور صحبت ہر اس شخص پر فرض ہے جس نے مہدیؑ کو قبول کیا ہے۔ بصورت عدم ادائی اس پر حکم منافقت بآیت لَّا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ ﴿النساء:۹۵﴾ آتا ہے۔

حضرت بندگی میاںؓ نے فرمایا کہ نابالغ لڑکوں اور عورتوں پر بھی ہجرت فرض ہے (انصاف نامہ) پھر فرماتے ہیں، ہجرت کی برکت سے اللہ تعالیٰ ذکر اللہ کی توفیق عنایت فرماتا ہے۔

بندگی میاں شاہ دلاورؓ فرماتے ہیں کہ جس نے آتش فقر یا آتش شمشیر کا مزہ نہیں چکھا اس کے لئے تیسری آگ یعنی آتش دوزخ تیار ہے۔

ہجرت ظاہری کے بعد ایک اور ہجرت ہے جس کی نسبت مہدیؑ فرماتے ہیں "خانہ گل و چوبیں سے تو نکلے لیکن خانہ استخواں سے کب نکلے۔

ہوائیں

ہوائیں آٹھ قسم کی ہیں۔ چار ہلاک کرنے والی ہیں اور چار ہوائیں اللہ کی نعمت ہیں۔

ہلاک کرنے چار ہوائیں یہ ہیں (۱) صرصر (۲) عاصف (۳) قاصف (۴) عقیم

چار ہوائیں نعمت ہیں وہ یہ ہیں (۱) ناشرات (۲) مبشرات (۳) مرسلات (۴) ذاریات

ہاروت وماروت

یہودیوں کی خباثت نفسی کا یہ عالم تھا کہ وہ اللہ کی کتاب توریت کو اور اسکی تعلیمات کو تو پیچھے ڈال دیتے تھے، اس پر عمل کرنا تو درکنار اسکی طرف توجہ بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کے بر خلاف وہ جادو ٹونے کا علم سیکھتے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ اور اپنے اس عمل کو جائز اور ثابت کرنے کے لئے اس علم کی نسبت حضرت سلیمانؑ کی طرف کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمانؑ اللہ کے پیغمبر تھے۔ ان کو اس ناپاک علم سے کیا واسطہ لیکن یہ لوگوں کو یہ کہہ کر بہکاتے تھے کہ سلیمانؑ نے بھی جو انسانوں اور جنوں وغیرہ پر حکومت کی تو اسی جادو کے علم سے کی اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان کو اس سے بری ثابت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ماکفر سلیمان یعنی سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جادو کرنا کفر، کرنے کے مترادف ہے۔ اور قرآن شریف میں بھی آیا ہے "لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ﴿یونس:۷۷﴾" جادوگر کبھی فلاح نہیں پاتے۔ دوسری طرف ہاروت اور ماروت نامی فرشتوں کے پاس بطور آزمائش جو علم جادو کا تھا یہ لوگ ان سے یہ سیکھ کر لوگوں میں اور ملک میں اس کے ذریعہ فتنہ وفساد مچاتے تھے۔

حالانکہ وہ فرشتے صاف کہہ دیتے تھے کہ ہمارے پاس جو علم ہے وہ لوگوں کو فائدہ نہیں دیتا بلکہ اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اصرار کرکے ان فرشتوں سے وہ علم حاصل کرتے جس کا مقصد میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کرنا ہوتا تھا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بڑا (اُستاد) شیطان دوسرے شیطانوں سے روزانہ ان کے کرتوت کا حساب لیتا ہے اور ان کی کارکردگی پر خوشی کا اظہار کرتا ہے جب ایک شیطان یہ کہتا ہے کہ اس نے ایک بیوی اور اس کے میاں کے درمیان جھگڑا پیدا کرکے دونوں کو جُدا کر دیا تو وہ فرط مسرت سے اچھل کر اسکو گلے سے لگاتا ہے اور کہتا ہے یہ ہوا کچھ کام۔ خلاصہ یہ کہ جادو منتر شیطانی اور گندے کام ہیں۔ لوگوں کو ایسے کام سے اور ایسے کام کرنے والوں سے دور رہنا چاہئے۔ یہ بات تو ہر مومن کو یاد رکھنی چاہئے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ کسی کی جادوگری سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اللہ جس کا بھلا کرنا چاہے دنیا کی کوئی طاقت اس کا بُرا نہیں کر سکتی۔ ایمان ویقین کی بنیادیں مضبوط ہوں تو کسی قسم کا نقصان نہیں ہوگا۔ ایمان اور یقین کی جڑیں کھوکھلی ہوں تو پتہ بھی کھڑکتا ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔

یہود اپنے دین وکتاب کا علم چھوڑ کر جادو کا علم تلاش کرنے لگے چونکہ یہ علم سلیمانؑ کے عہد حکومت میں شیطانوں (جنوں) نے سکھایا تھا تو عام طور پر کہنے لگے کہ یہ علم ہم نے سلیمانؑ سے ہی سیکھا ہے اللہ نے کہا کہ جادو کفر ہے۔ اور سلیمانؑ کا کام کفر کی تعلیم دینا نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ ہاروت وماروت نامی دو فرشتے جو انسانی بھیس میں تھے، ان کے پاس سحر کا علم تھا۔ اگر

کوئی طالب ان کے پاس آتا تو وہ کہہ دیتے کہ اس سے ایمان باقی نہیں رہتا۔ پھر بھی اگر اصرار کرکے چاہتا تو اسکو سکھا دیتے مگر اس سے انہیں نقصان ہی ہوتا نہ کہ فائدہ۔ فائدہ کی چیز تو ایمان اور اللہ کی کتاب کا علم ہے جس سے دنیا میں بھی فائدہ ہے اور آخرت میں بھی کامیابی ہے۔

ہمت

دل کی کسی کام کی طرف ایسی یک سوئی کہ اس کے غیر کا خطرہ نہ آنے پائے۔ چنانچہ فرمان مہدی موعودؑ ہے "اپنی ہمت سے باہر آنا"۔

ہوش در دم

ہر سانس میں ہوشیار رہنا یعنی یہ خیال رکھنا کہ کوئی دم اللہ کی یاد سے خالی نہ جائے اور نہ معصیت میں گذرے۔

ہمہ اوست

ہمہ اوست کہ معنی ہیں سب کچھ وہی ہے۔ اس کے کہنے والے اہل حق بھی ہیں اور اہل باطل بھی۔ اہل حق تو وہ ہیں جو واقعی مقربان بارگاہ الٰہی اور واصلان بارگاہ رب العزت ہیں۔ جب غلبہ عشق میں ان کی نظروں میں حق تعالیٰ کی پاک ذات کے سوا سب پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ اور ہر جگہ ذات حق کا ہی ظہور نظر آتا ہے تو وہ ہمہ اوست کہہ اٹھتے ہیں۔ اور اپنے قول میں وہ سچے بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ تمام جہات متفرقہ واقعات اور کثرت ایک ہی ذات حق کا ظہور ہیں۔ جس طرح زید کی صورت مختلف آئینوں میں منعکس ہو جائے۔ اور ان میں ظہور پیدا کرے۔ اور اس صورت میں اگر ہمہ اوست کہہ دیں تو مطلب یہ ہوگا کہ تمام صورتیں جو مختلف آئینوں میں ظاہر ہو رہی ہیں ایک ہی ذات یعنی زید کا ظہور ہیں۔ اس صورت میں نہ جزئیت ثابت ہوتی ہے نہ اتحاد اور نہ حلول نہ تلون۔

منصور نے جو انا الحق کہا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں حق ہوں اور حق کے ساتھ متحد ہوں کہ یہ معنی کفر کے ہے۔ بلکہ ان کے قول "انا الحق" کی مراد یہ ہے میں نہیں ہوں حق تعالیٰ موجود ہے۔

یاجوج

یاجوج وماجوج عجمی نام ہیں اور غیر منصرف ہیں۔ اور یہ دونوں **یفعول** اور **مفعول** کے وزن پر ہیں اس کی تائید اللہ کا یہ قول کرتا ہے وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿الکھف:۹۹﴾ "وذالک عند خروجھم من السدوز حفھم"

اس سلسلہ میں مولوی ابو الکلام آزاد نے " وَيَسْأَلُونَكَ عَن ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿الکھف:۸۳﴾ " کے تحت لکھا ہے یاجوج وماجوج بظاہر عبرانی معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ اپنی اصل پر ہیں اور اجنبی کلمات ہیں جو عبرانی صورت پر ہیں اور اور یونانی زبان میں غاغ، (GOG) اور ماغاغ (MAGOG) کہے جاتے ہیں۔

یاجوج وماجوج یافث بن نوحؑ کی اولاد کے دو قبیلوں میں سے ہیں۔ عبد الرزاق نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ یاجوج و ماجوج کے ۲۲ قبیلے ہیں۔ بخاریؒ نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے یہ روایت لائی ہے "أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم دَخَلَ عَلَيْهَا فَزِعًا يَقُولُ "لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هَذَا" وَحَلَّقَ بِإِصْبَعِهِ وَبِالَّتِي تَلِيهَا، فَقَالَتْ زَيْنَبُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنَهْلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ قَالَ "نَعَمْ، إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ" رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ زینب بنت جحش (حرم محترم رسول اللہؐ) کے پاس گھبرائے ہوئے آئے اور آپؐ یہ فرمارہے تھے لا الہ الا اللہ عربوں کیلئے اس شر سے ہلاکت ہے جو قریب آچکا ہے۔ شر سے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت مرادلی گئی ہے، جو حضور ﷺ کے بعد ہوئی پھر مسلسل فتنے پیدا ہوتے گئے اور عرب کی حالت اس پیالہ کی سی ہوگئی جو کھانے والوں کے درمیان رہتا ہے۔ خبث کا لفظ جو حدیث میں آیا ہے اس سے مراد یا تو زنا اور اولاد زنا ہے یا فسوق وفجور ہے۔

ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے "ان یاجوج و ماجوج یحفرون السد کل یوم" یعنی یاجوج وماجوج روزانہ دیوار کھودتے رہیں گے (تاکہ اس کو گرادیں) یہ روایت ترمذی میں آئی ہے اور انھوں نے اس کو حسن کہا ہے۔ نیز ابن حبان اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ابو ہریرہؓ سے مرفوع کہا ہے پوری روایت یوں ہے کہ یاجوج وماجوج دیوار کو کھودتے رہیں گے ہر روز (عام طور پر یوں مشہور ہے کہ وہ دیوار کو چاٹتے رہیں گے) حتیٰ کہ جب وہ اسے ڈھانے کے قریب ہو جائیں گے تو ان میں جو شخص ان کا امیر ہوگا وہ کہیگا اب لوٹ جاؤ، ہم کل اس کو گرادیں گے لیکن دوسرے دن اللہ اسکو پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیگا، یہاں تک کہ جب انکی مدت پوری ہو جائیگی اور اللہ ان کو باہر لانے کا ارادہ کریگا تو یہ ہوگا کہ ان کا امیر کہیگا اب لوٹ جاؤ، ہم اس کو کل ان شاء اللہ گرادیں گے تو وہ لوگ لوٹ جائیں گے، تو دوسرے دن اس دیوار کو اسی حالت میں پائیں گے جس حالت میں وہ چھوڑ

کر گئے تھے۔ پس وہ اس کو گرا دیں گے اور لوگوں پر خروج کر جائیں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ کب نکلیں گے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا خروج عیسیٰؑ کے نزول اور دجال کے قتل کے بعد ہو گا، چنانچہ قرآن میں اس کے تعلق سے اسطرح آیا ہے، جب ذوالقرنین دیوار کو پختہ کر دیں گے تو کہیں گے۔ قَالَ هَـٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا﴿الکھف:۹۸﴾ یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے پس جب میرے رب کا وعدہ (اس کا وقت) آئے گا تو وہ اسکو ریزہ ریزہ کر دیگا اور میرے رب کا وعدہ حق ہے۔

دَكَّاءَ کے معنی زمین دوز کر دینا، اور یہ سب قیامت سے پہلے اور دجال کے بعد ہو گا۔ حضرت علیؓ سے البتہ ایک روایت آئی ہے "یاجوج وماجوج في وقت عیسیٰ ابن مریم (عقد الدرر، ص۳۶۹)۔ وہ کیسے نکلیں گے اور وہ کس طرح فساد مچائیں گے؟

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا "حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَـٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿انبیاء:۹۶،۹۷﴾ یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی (پہاڑ وپہاڑی) سے دوڑیں گے اور سچے وعدہ کا وقت قریب ہو گیا، اچانک کافروں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیگی اور وہ کہیں گے، ہائے ہماری ہلاکت ہم اس دن سے غفلت میں تھے، بلکہ ہم تو ظالم وسرکش تھے۔

امام احمد نے ابو سعید الخدری سے روایت کی ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "تفتح یاجوج وماجوج، فیخرجون علی الناس کما قال اللہ عزّ و جلّ "وهم من کل حدب ینسلون" فیغشون الناس و ینحاز المسلمون عنهم الی مدائنهم و حصونهم و یضمون الیهم مواشیهم و یشربون میاه الارض حتیٰ ان بعضهم لیمر بالنهر، فیشربون ما فیه حتیٰ یترکوا یابسا، حتیٰ ان من بعدهم لیمر بذالك النهر فیقول قد کان هٰهنا ماء مرة حتیٰ اذا لم یبق من الناس احد الا احد في حصن او مدینة قال قائلهم، هٰئولاء اهل الأرض قد فرغنا منهم، بقی اهل السماء قال ثم یحض احدهم حربته ثم یرمی بها اعناقهم کنغف الجراد الذی یخرج في اعناقهم فیصبحون موتیٰ، لا یسمع لهم حسّ، فیقول المسلمون - الا ان رجلا یشری لنا نفسه فینظر ما فعل هذا العدو؟ قال فینحدر رجل منهم محتسباً نفسه قد اوطنها علی انه مقتول، فینزل فیجدهم موتیٰ بعضهم علی بعض، فینادی یا معشر المسلمین - الا ابشروا ان اللہ عزّ و جلّ قد کفیٰ کم عدوکم، فیخرجون من مدائنهم وحصونهم و یسرحون مواشیهم فما یکون لهم رعی الا لحومهم، فتشکر عنهم کاحسن ما شکرت

عن شیء من النبات اصابته قط"(بشریٰ البشر فی المہدی المنتظر ص ۱۶۷۔۱۷۷، مولفہ الشیخ محمود غرباوی) ترجمہ: یاجوج وماجوج آزاد کر دئے جائیں گے، پس وہ لوگوں پر چڑھ دوڑیں گے جیسا کہ اللہ نے فرمایا "وہ ہر بلندی سے دوڑ آئیں گے" پس وہ لوگوں پر چھاجائیں گے اور مسلمان ان سے الگ ہو کر اپنے شہروں اور قلعوں کی طرف چلے جائیں گے اور انکے مویشیوں کو اپنے ساتھ لیلیں گے اور زمین کا پانی پی لیں گے یہاں تک کہ ان میں سے بعض کا ایک نھر پر سے گذر ہو گا تو اس کا پورا پانی پی جائیں گے یہاں تک کہ اس کو خشک چھوڑ دیں گے، یہاں تک کہ اس میں کا ایک آدمی اسی نہر پر سے گذریگا تو کہیگا، یہاں تو ایک مرتبہ پانی تھا، پھر جب سب لوگ قلعوں اور شہروں میں ہو جائیگے تو ان میں کا ایک آدمی کہیگا، یہ تو زمین والے تھے اور ہم ان سے فارغ ہو چکے ہیں، اب آسمان والے باقی رہ گئے ہیں۔ کہا پھر ان میں کا ایک آدمی اپنا حربہ حرکت میں لائے گا، پھر ان کی گردنوں کی طرف پھینکے گا جو ٹڈی کی تھوک کی طرح ہو گا، جو گردنوں میں سے نکلے گا پس وہ مردہ ہو جائیگے، بے حس۔ تو مسلمان کہیں گے، آگاہ ہو جاؤ ایک آدمی نے ہمارے لئے اپنی جان کی بازی لگادی ہے پس دیکھیں کہ اس دشمن نے کیا کیا۔ پس ان میں کا ایک آدمی نیچے اترے گا اور دل میں یہ خیال کریگا کہ وہ مقتول ہے۔ پھر وہ نیچے اترے گا اور انکو انکے مویشیوں پر پڑے ہوئے مردے پائیگا، پھر وہ اعلان کریگا اے مسلمانوں کی جماعت، خوشخبری ہے تمھارے لئے، کہ اللہ عزّ و جل نے تمہارے دشمن سے بدلہ لے لیا ہے، پس وہ اپنے شہروں اور قلعوں سے باہر نکلیں گے اور اپنے مویشیوں کو چرائیں گے، مگر ان کیلئے ان کے گوشت کے سوائے کوئی گھاس نہ ہو گی پھر بہترین انداز میں شکریہ ادا ہو گا۔

تفسیر حسینی میں ہے کہ عیسیؑ اس قوم کے مظالم پر اللہ سے انکے حق میں بد دعا کریں گے اور وہ قوم مر جائیگی۔

یوسف علیہ السلام

قرآن شریف میں حضرت یوسفؑ کا نام ۲۷ مرتبہ آیا ہے اور صرف سورۂ یوسف میں ۲۵ مرتبہ آیا ہے۔ ایک سورۂ انعام میں آیت نمبر ۸۴ اور دوسرے سورۂ غافر میں آیت نمبر ۳۴ میں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ اللہ نے قرآن میں ''احسن القصص'' کے نام سے بیان کیا ہے۔ یوسفؑ کے ساتھ زلیخا کا نام عشق و محبت کی دنیا میں ضرب المثل کی حیثیت سے زبان زد خاص وعام ہے۔ لیکن اللہ نے اسکو فقط ''حسن و عشق'' کے ظاہری اور عامیانہ جوڑے کی حیثیت سے پیش نہیں فرمایا بلکہ مختلف شعبہ جات زندگی سے تعلق رکھنے والوں کو جس اونچ نیچ اور نشیب فراز کی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے نہ صرف ان کا ذکر ہے بلکہ ان مشکل مسائل کا صحیح جائز، شرعی اور اخلاقی حل بھی ہے۔ یعنی یتیم بچوں کے حالات، علاتی بھائیوں کا حسد، اولاد کا باپ کے ساتھ سلوک، مکر و فریب کی چالبازیاں، دروغ گوئی، دھوکہ دہی، مسکینوں پر ظلم اور ایذا رسانی، تنہائی کا غم، جدائی کا احساس، غلامی کی ذلت، اچانک کی خوشحالی، خوبصورت عورت کے ساتھ یکجائی، عورت کا جال، عصمت و عفت اور امانت داری کا خیال، خوف خدا کا سنگین حالات میں لحاظ، جھوٹے الزامات اور اتہامات کا سامنا، قید و بند کی تکلیف و اذیت، خواہ مخواہ کی رسوائی، صبر و استقامت کا اعلیٰ مظاہرہ، تقویٰ کا بلند معیار، اخلاق اور کردار کی حفاظت، حسن تدبیر، دشمنوں سے درگذر و عفو کا برتاؤ جیسے معاملات کا حسن سلیقگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جب اللہ کسی کو نوازنا چاہتا ہے تو ساری دنیا والے بھی مل کر اس کی عطا کو روک نہیں سکتے۔ اور غلط کار لاکھ تدبیریں اختیار کر لیں لیکن مشیت ایزدی کو چیالنج نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہ اللہ جب کسی کو بلند مقام دینا چاہتا ہے تو اسکے دشمنوں سے ہی کام لیتا ہے۔ اللہ حضرت یوسفؑ کو ان کے حاسد بھائیوں کی غلط صحبت سے دور رکھنا چاہتا تھا اور مصر میں حکومت کے بلند مقام پر پہنچانا چاہتا تھا تو اللہ نے یہ کام خود ان کے حاسد بھائیوں سے لیا، بھائی یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم اپنی دلی آرزو پوری کر رہے ہیں اور اللہ یہ کہہ رہا تھا کہ میں تم سے اپنا کام لے رہا ہوں۔ تم نے یوسف کو اندھے کنویں میں ڈالا اور میں نے اسکو مصر کے شاہی محل میں نکالا۔ سچ ہے کہ اللہ کا ارادہ سب کے ارادوں پر غالب ہوتا ہے۔

ہوا یہ کہ ایک رات یوسفؑ نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند ان کو سجدہ کر رہے ہیں۔ یوسفؑ نے یہ خواب اپنے والد محترم حضرت یعقوبؑ کو سنایا۔ والد محترم بھی چونکہ پیغمبر تھے۔ فوراً سمجھ لیا کہ اسکی تعبیر کیا ہے۔ لیکن بولے نہیں۔ البتہ یہ ضرور نصیحت کی کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنائیں۔ کیونکہ یعقوبؑ جانتے تھے کہ بھائیوں کو پہلے سے ہی حسد ہے۔ یہ خواب سنیں گے تو اور جل جائیں گے اور ہلاک کرنے کی تدبیر کریں گے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنی پیغمبرانہ فراست

سے جس بات کا اندیشہ ظاہر کیا تھا بالآخر وہی بات سامنے آگئی۔ یوسفؑ کے بھائیوں نے ایک دن مل بیٹھ کر آپس میں مشورہ کیا کہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں جو ابا کے کام آسکتے ہیں اور یہ دو کم سن بچے ہیں جو کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ اس کے باوجود ابا کی محبت ہمارے مقابلے میں ان سے زیادہ ہے۔ یہ ان کی کھلی غلطی ہے۔ پس ہم کو کچھ ایسی صورت نکالنی چاہئے کہ ابا میاں کا پیار و تلطف ہم سے وابستہ ہو جائے۔ آپسی بحث و گفتگو کے نتیجے میں دو باتیں سامنے آئیں یا تو یوسف کو قتل کر دو یا پھر اسکو ایسی جگہ پھینک دو کہ وہ کسی درندہ کا شکار ہو جائے۔ کام تو برا ہے مگر کرنا ضروری ہے۔ پھر اس کے بعد ہم توبہ کرلیں گے اور نیک ہو جائیں گے۔ باپ کی ہم سے بے رخی اب ہم برداشت نہیں کرسکتے۔ ویسے حسد تو یوسف اور آپ کے چھوٹے بھائی بنیامین دونوں سے تھا لیکن بنیامین ابھی بہت چھوٹے تھے اس لئے فی الحال ان سے صرف نظر کرتے ہوئے سارا زور یوسفؑ پر لگایا گیا۔ مشورہ میں یہ بات سامنے آگئی کہ یوسف کو قتل کر دیا جائے لیکن ان بھائیوں میں یہوذا جو صاحب سمجھ تھا اس نے کہا کہ قتل تو بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ کام مت کرو۔ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو یوسف کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دو اس طرح وہ زندہ بھی رہے گا اور کسی قافلے کے ہاتھ لگ جائیگا۔ وہ اسے غلام بنالیں گے پھر اسکو فروخت کر دیں گے اس طرح ہم کو یوسف سے چھٹکارہ مل جائے گا۔ اس دوسری تجویز پر سب متفق ہو گئے۔ پھر دوسرے دن سب نے یعقوبؑ سے درخواست کی کہ ابا جان ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ یوسفؑ کے بارے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ہمیشہ ان کو اپنے ہی پاس رکھتے ہیں۔ گھر بیٹھے بیٹھے ان کی صحت بھی متاثر ہو گی اور دل بھی نہیں بہلے گا۔ ہم سب باغ تماشے کیلئے جا رہے ہیں۔ بچہ بھی ہمارے ساتھ رہے گا کھیلے گا کودے گا۔ کھائے گا اور پیئے گا اس کا دل بھی بہلے گا۔ اسکو ہمارے ساتھ کر دیجئے گا۔ یعقوبؑ نے فرمایا کہ ایک تو اسکی جدائی کا غم ہو گا اور دوسرا یہ اندیشہ لگا رہے گا کہ تم اپنے کھیل کود اور سیر و تفریح میں رہو گے اور اچانک جنگل سے کوئی بھیڑیا آکر بچے کو ختم کر دے گا تو کیا ہو گا؟

کچھ لوگ یہاں یہ کہتے ہیں کہ یعقوبؑ کے اس اندیشے کے اظہار سے یوسفؑ کے بھائیوں کو بھیڑئے کی تجویز سجھائی دی۔ مگر فقیر موؔلف کہتا ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے جو سوچا تھا۔ یعقوبؑ نے اپنے نور بصیرت سے اسکو دیکھ لیا تھا اس لئے آپ نے وہی کہا جو وہ کہنے والے تھے۔ یہ سُن کر انہوں نے کہا ابا آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ ہم گیارہ (کی ایک پوری جماعت ہے) اور اگر ہماری موجودگی میں اسکو بھیڑیا کھا جائے (اور ہم اسکی حفاظت نہ کرسکے تو ہم تو بالکل ازکار رفتہ اور ناکارہ ہو جائیں گے)۔

پھر جب ان کو لیکر وہ گئے اور سب نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ ان کو کسی گمنام کنویں میں ڈال دیں گے۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کی طرف وحی بھیج دی کہ کیا ہونے والا ہے اور یہ بھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ آپ ان کو ان کی

حرکتوں کی تفصیل بتائیں گے اور وقت ایسا ہو گا کہ وہ آپ کو پہچانیں گے بھی نہیں۔ انہوں نے اپنی اسکیم کے مطابق کام کر ڈالا۔ رات کے انتظار میں رہے۔ پھر جب اندھیرا پھیل گیا تو جان بوجھ کر رات کے اندھیرے میں والد ماجد کے پاس روتے ہوئے آئے۔ دن میں اس لئے نہیں آئے کہ منہ دکھانے کے قابل نہیں تھے۔ اور دوسرا یہ کہ روتے تو ضرور تھے مگر فقط آواز سے۔ آنکھ میں آنسو تو نہیں تھے۔

اسکیم کے مطابق مکالمہ دہرایا یعنی کہنے لگے اباجان کہ ہم نے بچے کی حفاظت کا پورا انتظام کیا تھا جہاں ہمارا مال واسباب تھا وہیں بچے کو بھی بٹھایا تھا۔ پھر ہم کچھ دیر کیلئے آپس میں دوڑ لگانے میں مصروف ہو گئے۔ پتہ نہیں کدھر سے ایک بھیڑیا آ گیا اور یوسف کو دبوچ لیا اور اسکو کھا لیا مگر آپ پہلے ہی ہم سے بدگمان تھے اب ہماری بات کا آپ کس طرح یقین کریں گے۔ اپنے بیان کی تائید میں انہوں نے یوسفؑ کی قمیص بھی پیش کی جس پر ایک بکری کا خون لگا ہوا تھا۔ یہ سن کر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا یہ سب تمہارے دل کی تراشی ہوئی باتیں ہیں۔ (یعنی ایک سازش ہے) خیر جب تم کہہ رہے ہو تو اب صبر ہی بہتر (علاج) ہے یعنی ایسا صبر کہ نہ تو کسی سے شکایت کی جائے اور نہ انتقام کا جذبہ۔ اس بارے میں اللہ ہی سے مدد مانگوں گا۔ جوان بیٹے فقط ایک جہاں دیدہ باپ سے نہیں بلکہ ایک پیغمبر وقت سے جھوٹ کہہ رہے ہیں اس پیغمبر سے جو کنعان میں بیٹھا ہوا۔ مصر میں موجود اپنے بیٹے کے کرتے کی خوشبو سونگھ لیتا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ یعقوبؑ نے کرتہ دیکھ کر اپنے بیٹوں سے فرمایا کہ بھیڑیا بھی بڑا حلیم ہے کہ بچہ کو تو بڑی بے دردی سے کچل ڈالا لیکن کرتہ صحیح سلامت اتار کر باز ورکھ دیا۔

اس کنویں پر سے ایک قافلہ کا گذر ہوا۔ انہوں نے پانی لانے کے لئے ایک آدمی کو بھیجا اس نے پانی کے لئے کنویں میں ڈول ڈالا تو یوسفؑ اس ڈول میں بیٹھ گئے اور رسّی پکڑلی جب ڈول سمیت بچہ آیا تو ڈول ڈالنے والے نے پکار کر کہا خوشخبری ہے۔ یہ تو ایک خوبصورت بچہ ہے۔ خوش خبری اس معنی میں کہ ہم کو ایک غلام مل گیا۔ قافلہ والوں نے یوسفؑ کو تجارت کا مال سمجھ کر چھپا لیا اور یہ طے کیا کہ دوسرے شہر میں اسکو فروخت کر کے اچھی قیمت وصول کر لیں گے۔ اللہ کو ان کی کارگذاریوں کا پورا پورا علم تھا۔ بھائی، یوسفؑ کو دور کرنا چاہتے تھے۔ قافلہ والے یوسفؑ کو فروخت کر کے قیمت اینٹھنا چاہتے تھے اور اللہ یوسفؑ کو مصر کے خزانوں کا مالک بنانا چاہتا تھا (اور آخر کار بھائیوں کو یوسف کے قدموں میں ڈالنا چاہتا تھا)۔

یوسفؑ کنویں میں تین دن رہے۔ اور ان کے بھائی برابر ان کی خبر پوشیدہ طور پر لیتے رہتے تھے۔ جب بھائیوں کو خبر ملی کہ قافلہ والوں نے یوسفؑ کو کنویں سے نکال لیا اور ان کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں تو بھاگے بھاگے ان کے پاس آئے اور کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھگوڑا ہے۔ اب ہم اس کو اپنے پاس رکھنا بھی نہیں چاہتے۔ تم چاہو تو اسکو خرید لو۔ پھر تو جلدی میں یوسفؑ کو

بہت ہی سستے داموں میں اہل قافلہ کو بیچ دیا یعنی اٹھارہ درہموں میں سودا کر لیا۔ ایک بھائی نے اپنا حصہ نہیں لیا دیگر بھائیوں میں سے ہر ایک بھائی کو دو دو درہم ملے۔

قافلہ والوں نے یوسفؑ کو مصر کے بازار میں نیلامی میں رکھ دیا۔ بولی لگنے لگی۔ جس شخص کی بولی تھی وہ مصر کا مدار المہام تھا۔ وہ اس بچے کو اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ یہ بچہ بڑا ہونہار، خوبصورت اور پیارا بچہ ہے۔ اسکو عزت سے رکھو۔ یعنی اس کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک مت کرو، ہو سکتا ہے کہ آئندہ یہ بچہ ہمارے کاروبار سنبھال لے یا ہم اسکو اپنا بیٹا بنا لیں۔ کیوں کہ ہماری کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ اس طرح یوسفؑ شام سے نکل کر مصر پہنچے۔ اللہ کا منشا بھی یہی تھا کہ گاؤں کے ماحول سے نکل کر شہر کے ماحول کا مطالعہ کریں۔ کھیتی باڑی چھوڑ کر امور سلطنت کو دیکھیں اور سیکھیں، حاسد بھائیوں سے دور رہ کر امراء کے ساتھ رہیں وسیع حلقے میں باتوں کا گہرائی سے جائزہ لیں اور ایک خوشگوار ماحول میں اللہ جو باتیں سکھانا چاہتا ہے وہ سیکھ لیں اور بالخصوص تاویل الاحادیث بھی جان لیں۔

تأویل احادیث کے معنی تعبیر رویا یعنی خوابوں کی صحیح تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ یا ہر بات کے موقع و محل کو سمجھنا اور پیش آمدہ معاملات کے عواقب اور نتائج کو فوراً پرکھ لینا یا خدائے تعالیٰ اور پیغمبروں کے ارشادات عالیہ اور کتب منزّلہ کے مضامین کی تہ تک پہنچ جانا بھی ہو سکتا ہے۔ اور جب یوسفؑ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچے۔ اعضاء میں قوت پیدا ہوئی اور عقل نے کمال کا منہ دیکھا تو اللہ نے ان کو اپنی جانب سے علم و دانائی اور فہم و فراست عطا فرمائی اور علم و حکمت کے دہانے ان پر کھول دئے معاملات کا تصفیہ، قضایا کا حل، توحید کے اصول، شریعت کے قوانین و آداب کے ساتھ ساتھ خوابوں کی تعبیر کا فن بھی اللہ نے سکھا دیا۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے کہ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿الأنعام: ۸۴﴾ یعنی جو لوگ اخلاق کی پاکیزگی، نفس کی طہارت اور عمدہ اصول کی رعایت کے ساتھ حوادث اور مصائب کو صبر و سکون کے ساتھ جھیل لیتے ہیں اور تقویٰ کو کسی قیمت پر ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اللہ ان کو اپنی جانب سے بہتر بدلہ اور مزید انعامات سے سرفراز فرماتا ہے یوسفؑ کا حسن و جمال تو مشہور زمانہ تھا کہتے ہیں کہ آپ جب مصر کی گلیوں میں نکل جاتے تو در و دیوار چمک اٹھتے تھے، زلیخا نے جو خود بھی خوبرو اور لاولد تھی چاہا کہ یوسف کا قرب حاصل کرے، پتہ نہیں وہ کب سے موقع کی تلاش میں تھی، ایک مرتبہ شوہر کی غیر حاضری میں ہر طرح سے اپنے آپ کو آراستہ کر کے گھر کے تمام دروازے بند کرنے کے بعد مخملین، بستر پر یوسفؑ کو آواز دی، چلے آؤ، جلدی کرو، اب دیر کس بات کی ہے۔ حالات موافق، سامنے خوبصورت عورت، بجلیاں گراتی ہوئی، یوسفؑ بھی اکیلے، کڑیل نوجوان، کوئی دیکھنے والا نہیں، تہمت اور بدنامی کا بھی اندیشہ نہیں۔ گھر کی بات گھر کے اندر، خود عورت کی طرف سے نہ صرف دعوت بلکہ خود سپردگی کا پورا

اہتمام۔ مگر یوسفؑ نے کہا معاذ اللہ، اللہ کی پناہ، تیرا شوہر میرا آقا ہے۔ اس نے مجھے عزت واکرام سے رکھا (اور تم کو تاکید بھی کردی تھی کہ دیکھو اس کی آبرو کا خیال رکھنا) نہ تو میں میرے مشفق، میرے مربیؒ کو دھوکہ دے سکتا ہوں اور اسکی امانت میں خیانت کرسکتا ہوں اور نہ میں میرے اللہ، مالک حقیقی کی جس نے مجھ پر غیر معمولی احسانات کئے اور انعام واکرام سے نوازا ہے، ناشکری کرسکتا ہوں۔ اور اگر میں ایسا کروں تو میں ناشکرا اور احسان فراموش ہو جاؤں گا اور ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

ایسے ماحول میں جبکہ زلیخا نے آپ کا پورا ارادہ کر لیا تھا، ان کے دل میں بھی کچھ خیال ہو چکا تھا اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھ لیتے۔ قرآن شریف میں آیا ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ ﴿یوسف:۲۴﴾ هَمَّ کے معنی ارادہ کے ہیں۔ هَمَّ کی دو قسمیں ہیں (۱) هَمّ ثابت (۲) هَمّ عارضی۔ هَمّ ثابت وہ ہے جس میں عزم اور قصد ہو۔ اور هَمّ عارضی وہ ہے جس میں عزم اور قصد نہ ہو۔ بس ایک خیال ہو۔ زلیخا کا جو ہم تھا وہ بالکل پکا تھا۔ اس کا بناؤ سنگھار، اسکی تیاری، دروازوں کو بند کرنا، ریشمیں بستر اور کھلی دعوت دینا اس کے عزم کا ثبوت تھا۔ لیکن یوسفؑ کے تعلق سے جو هَمّ آیا ہے وہ بس نفس کی ایک موہوم اور کمزور تحریک، ایک ہلکا سا خیال، جو اس مہلک اور خطرناک ماحول کا اثر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جو پہلے کھلی دعوت دی تھی اور اس کے جواب میں انتہائی بے پروائی کے ساتھ معاذ اللہ کہہ کر امانت میں خیانت نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو زلیخا اپنے مقصد میں ناکامی کا منھ دیکھ کر بپھر گئی۔ اور اب عزم مصمّم کر لیا کہ بہر قیمت یوسفؑ سے اپنا مطلب حاصل کر کے رہوں گی تو وہ دستدرازی اور مقابل ہو کر زبردستی کرنے لگی، اس اثناء میں یوسفؑ نے کیا کیا؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ بھی کچھ مائل ہو گئے تھے کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یوسفؑ نے اسکو مارڈالنے کا ارادہ کیا تاکہ ایسے میں اللہ نے ان کو اپنی برہان دکھادی، یعنی یوسفؑ کو اس کمرہ کے ہر گوشے میں حضرت یعقوبؑ کی شبیہ دکھائی دی یا ایک پنجہ نظر آیا۔ جس پر لکھا ہوا تھا وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ﴿الإسراء:۳۲﴾۔ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔ اسی طرح ایک اور پنجہ نظر آیا جس پر لکھا ہوا تھا وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كِرَامًا كَاتِبِينَ ﴿الانفطار:۱۱﴾۔ بے شک تم پر محافظ فرشتے مسلّط ہیں جو تمہارے اعمال لکھنے والے ہیں۔ ایک اور پنجہ نظر آیا جسپر لکھا ہوا تھا۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ﴿البقرۃ:۲۸۱﴾۔ اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ یہ دیکھ کر یوسفؑ ڈر گئے اور بھاگ گئے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ زلیخا نے اپنے کمرے میں رکھے ہوئے بت پر کپڑا ڈال دیا۔ یوسفؑ نے پوچھا یہ کیوں؟ اس نے جواب دیا میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے حالت گناہ میں دیکھے۔ تو یوسفؑ نے فرمایا تم اس سے

ڈرتی ہو جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے اور نہ سمجھتا ہے تو میں زیادہ مستحق ہوں کہ اس اللہ سے ڈروں جو سنتا بھی ہے دیکھتا بھی ہے۔ محققین نے کہا کہ "برہان" سے مرد "نور نبوت" ہے جو ان کے اور اللہ کی ناراضی کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یوسفؑ کو نہ صرف زنا سے بلکہ اس کے مقدمات یعنی بوس و کنار سے بھی روک دیا جائے۔ یہ برہان دیکھ کر حضرت یوسفؑ دروازے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ زلیخا نے بھی آپ کا پیچھا کیا اور پیچھے سے یوسفؑ کے کرتے کا دامن اس کے ہاتھ آ گیا اس نے یوسفؑ کو باہر جانے سے روکنے کے لئے جو دامن کھینچا تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا۔ یوسفؑ مرد تھے۔ طاقتور تھے۔ اور گناہ سے بچنا چاہتے تھے۔ دروازہ کھول دیا کیا دیکھتے ہیں کہ باہر عزیز مصر، زلیخا کے ایک رشتہ دار بچے کے ساتھ دروازے کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اسکو دیکھتے ہی زلیخا ڈر گئی اور تہمت کا اندیشہ کر لیا۔ پوچھنے سے پہلے اپنے شوہر سے بولی کہ جو شخص تمہاری بیوی کے ساتھ بدارادہ کرے اسکی سزا کیا ہونی چاہئے پھر اسکو خوف پیدا ہوا کہ کہیں اس کا شوہر غصے کے مارے یوسفؑ کو قتل نہ کر دے، خود ہی بول پڑی یا تو اسکو قید میں ڈال دیا جائے یا اس کو کوڑے مارے جائیں۔

یوسفؑ اب تک تو خاموش تھے لیکن جب زلیخا نے اپنے بچاؤ کیلئے یہ شاطرانہ چال چلی تو آپ نے فرمایا اصل بات یہ ہے کہ اس نے خود مجھے پھسلانے کی کوشش کی تھی اور مجھ سے غلط حرکت کی متمنی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا اور بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ ایسے میں ایک شاہد نے جو زلیخا کے خاندان سے تھا یہ فیصلہ سنایا کہ اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو زلیخا جھوٹی اور یوسف سچے۔ اور اگر قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ سچی اور یوسف جھوٹے۔ وہ شاہد کون تھا اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ سعید بن جُبیر کہتے ہیں کہ وہ جھولے میں پڑا ہوا ایک بچہ تھا جسے اللہ نے گویائی عطا کی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے روایت ہے کہ چار بچوں نے کم سنی میں بات کی (۱) ابن مشاطہ (۲) فرعون کی بیٹی (۳) یوسفؑ کا شاہد (۴) حضرت عیسیٰؑ۔

اس کے علاوہ بھی کئی ایک علامات تھے جو یوسفؑ کی صداقت کے دلیل تھے (۱) یوسفؑ غلام تھے اور زلیخا مالکہ، غلام مالکہ پر دست اندازی نہیں کرتا (۲) یوسفؑ بھاگ رہے تھے، طلب کرنے والا بھاگتا نہیں (۳) زلیخا نے اپنے آپ کو آراستہ کیا تھا۔ ایک زمانے تک یوسف کو دیکھا تھا۔ اور یوسفؑ سے کبھی ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی جو اس قسم کے اِقدام سے مناسبت رکھتی ہو۔

شاہد کے فیصلے کے تحت جب یہ دیکھا کہ حضرت یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے کہا کہ یہ عورتوں کا فریب ہے اور واقعی عورتوں کے فریب بڑے بھاری ہوتے ہیں۔ پھر کہا اے یوسف اس بات کو اب جانے دو، اس کا تذکرہ کسی سے مت کرو۔ تمہاری براءت تو ظاہر ہو چکی ہے۔ اب بات کو بڑھانے سے کیا فائدہ، اور زلیخا سے کہا کہ اللہ کے حضور اپنے گناہ

(کے ارادہ) کی معافی مانگ تو ہی بلاشک وشبہ گناگار تھی۔

پہلے پہل صرف چار عورتوں کو یہ واقعہ معلوم ہوا تھا(۱) پہرہ دار کی بیوی (۲) نانبائی کی بیوی (۳) سقّہ کی بیوی (۴) جیلر کی بیوی۔ اور بعض لوگ پانچواں نام صاحب اصطبل کی بیوی کا بھی لیتے ہیں۔ ایک ہی عورت سے جب بات پھیل جاتی ہے تو یہ تو پانچ تھیں۔ سارے شہر میں دھوم ہوگئی۔ عورتوں نے طعنے دینے شروع کئے۔ کہتے ہیں کہ ان طعنوں کے پیچھے اس ہستی کو بھی دیکھنا تھا جس پر عزیز مصر کی بیوی لٹو ہوگئی تھی پھر یہ بات پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور جگہ جگہ اسی کا تذکرہ ہوتا رہا کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام کو اپنی طرف پھسلاتی ہے اور اسکا غلام اسکی محبت میں فریفتہ ہوچکا ہے۔ یہ تو اسکی بہت بڑی غلطی ہے۔ جب زلیخا کو بھی اسکی اطلاع مل گئی تو اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ عورتیں جو آج مجھکو طعنے دے رہی ہیں وہ نہیں جانتیں کہ میں جس پر عاشق ہوئی ہوں وہ کون ہے؟ اور کیسا ہے؟ اگر وہ اسکو دیکھ لیتیں تو مجھ پر طعنے نہ کستیں۔ زلیخا نے اپنے پاس ایک دعوت کا انتظام کیا۔ پھل پھلاری بھی رکھے گئے اور ساتھ ہی پھل کاٹنے کی چھریاں بھی۔ عین اس وقت جب عورتیں پھل کاٹنے کے لئے چھریاں اپنے ہاتھوں میں لیں، پہلے سے مقررہ پروگرام کے مطابق زلیخا کے اشارے پر یوسفؑ ان کے سامنے سے گذرے۔ تو عورتیں ان کو دیکھنے میں اس قدر بے خود ہو گئیں کہ بجائے پھلوں کے خود اپنے ہی ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ لیں۔ تکلیف کا احساس تک نہیں ہوا۔ البتہ خون کا احساس ہوا۔ اور بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ یہ آدمی نہیں بلکہ فرشتہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی ایک مرتبہ حسن یوسف کی تعریف فرمائی کہ معراج میں میں نے دیکھا کہ یوسفؑ ستاروں میں چاند کے مانند تھے۔ لیکن خود ہمارے حضور ﷺ کا حسن، یوسفؑ کے حسن سے بھی بدرجہا بڑا ہوا تھا۔ بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ محمد ﷺ کے حسن کا، یوسف کے حسن سے کیا مقابلہ حسن یوسف پر تو زنان مصر نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں، لیکن حسن محمد ﷺ کی یہ شان کہ اس پر مردانِ عرب کے سر کٹ گئے اور انشاء اللہ قیامت تک کٹتے رہیں گے۔

یہ دیکھ کر زلیخا نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے برا بھلا کہتی تھیں۔ اور واقعی میں نے ہی اسکو اپنی طرف مائل کیا تھا۔ مگر وہ بچ گئے مگر ایک مرتبہ ناکام ہوگئی تو کیا ہوا اگر اب بھی وہ میری بات نہ مانے گا تو میں اسکو قید خانہ میں ڈلوادوں گی، اور وہ ذلیل بھی ہوگا۔ یہاں عورت کی فطرت کا اظہار کیا جارہا ہے کہ وہ ہارنا نہیں جانتی، بہرحال اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے یا اپنے مخالف کو زک دینا چاہتی ہے یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ جب زلیخا نے یہ دھمکی دی تو اسی وقت حضرت یوسفؑ نے اللہ سے دعا کی اے میرے رب یہ مجھے جس بُرے کام کی طرف بلارہی ہے تو اس سے مجھے بچالے۔ یہ کام کرنے سے مجھے قید میں زندگی کاٹنا زیادہ پسند ہے اور اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہوجاؤں گا اور نادانی کر بیٹھوں گا۔

تو اللہ نے انکی دعا قبول فرمائی اور ان کو عورتوں کے فریب سے دور کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمع شدہ تمام عورتوں نے یہ سفارش کی تھی کہ زلیخا کی بات مان لیں اس لئے حضرت یوسفؑ نے بھی جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ اگرچہ نشانیوں سے یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ یوسفؑ بَری ہیں پھر بھی عزیز مصر اور زلیخا کی شان باقی رکھنے کے لئے یہ طے کیا گیا کہ کچھ مدت تک یوسفؑ کو قید خانہ میں رکھا جائے تا کہ عوام یہ سمجھ لیں کہ عورت صحیح تھی۔ نیز کچھ مدت تک زلیخا کی نظروں سے بھی یوسفؑ کو دور رکھنا منظور تھا۔ تا کہ محبت سرد ہو جائے اور زلیخا کا یہ منشاء تھا کہ قید خانہ کی مصیبتیں جھیل کر شاید یوسف بھی نرم پڑ جائیں گے۔

یوسفؑ کے ساتھ دو اور قیدی بھی اسی دن جیل خانہ میں لائے گئے۔ یوسفؑ کی طہارت تقویٰ، نماز و روزہ کی پابندی حسنِ کردار اور خوش اخلاقی کا جیل خانہ میں شہرہ تھا۔ ایک رات جب ان دونوں قیدیوں نے خواب دیکھا تو ان کے دل میں آیا کہ چلو یوسفؑ سے اسکی تعبیر پوچھ لیں اس لئے کہ خواب کی تعبیر ہمیشہ نیک لوگوں سے ہی پوچھنی چاہئیے۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا نانبائی تھا اور دوسرا ساقی۔ ان دونوں پر حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں شریک ہو کر روٹی اور شراب میں زہر ملانے کا الزام تھا۔ نانبائی نے یہ خواب دیکھا کہ اسکے سر پر روٹیاں ہیں جسے پرندے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اور ساقی نے یہ خواب دیکھا کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے تا کہ شراب پلا سکے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے محض آزمائش کیلئے ایک ایک فرضی خواب گھڑ کر سنایا تھا۔ وعظ و نصیحت کے بعد جب یوسفؑ نے خواب کی تعبیر سنائی تو دونوں نے کہا کہ یہ خواب فرضی تھا مگر آپ نے جواب دیا کہ خواب فرضی ہو تو ہو لیکن تعبیر سچی ہے۔ اس کے تعلق سے فیصلہ ہو چکا ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ کبھی جھوٹا خواب صالحین کو سنا کر تعبیر نہ پوچھیں حضرت یوسفؑ پیغبر تھے۔ اور پیغمبر کا اہم فریضہ لوگوں کو دین حق کی تعلیم کے سوا اور کیا ہوتا ہے جیل خانے کے ماحول میں بھی پیغمبر اپنے فرضِ منصبی کو نہیں بھولتا۔ بلکہ قید خانہ کی چار دیواری کے اندر بھی وہ برابر توحید کی دعوت دیتا، شرک کی برائی بیان کرتا امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کے فرائض انجام دیتا ہے۔ پہلے تو آپ نے ان کو یقین دلایا کہ اب جو تم کو کھانا آنے والا ہے وہ کھانا آنے سے پہلے ہی تم کو اسکی تعبیر بتا دوں گا مگر کیسے (کسی حساب، رمل، فال اور نجوم سے نہیں) بلکہ مجھے اللہ کی جانب سے یہ خاص علم دیا گیا ہے اسی علم کی بنیاد پر میں تم کو تعبیر بتا دوں گا۔ ان دونوں کو یہ اُمید تو پیدا ہو گئی کہ انہیں ان کے خواب کی تعبیر ملنے والی ہے۔ اسوقت تک یوسفؑ جو باتیں کہہ رہے تھے ان کو سننا ہی تھا اس لئے وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ آپ نے فرمایا خواب کی تعبیر سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جس نے ہم کو پیدا کیا۔ اور جس کے پاس مر کر ہم سب کو لوٹنا ہے۔

جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت کے منکر ہیں میں نے انکا مذہب اور طریقہ چھوڑ دیا ہے اور ان کا راستہ اختیار کیا جو حق پرست تھے۔ میں اپنے باپ دادا (ابراہیم، اسحاق، اور یعقوبؑ کے مذہب پر چلتا ہوں) اس لئے نہیں کہ وہ میرے باپ دادا تھے بلکہ اس لئے کہ وہ اللہ کے پیغمبر تھے اور انہوں نے اللہ کی وحدانیت اور اسکی اطاعت کا درس دنیا کو دیا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ توحید کے نظریے سے ہم کو یا دوسروں کو کیا فائدہ ہو گا اور شرک کے عقیدہ سے کیا نقصان، تو سنو کہ ایک اللہ کو ماننا اور اُسی سے مانگنا اور اسی کی عبادت کرنا اور اسی عقیدہ پر جینا اور مرنا ہم پر اللہ کا فضل واحسان ہے اسی میں انسانیت کی تعظیم ہے۔ ورنہ جو لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر دوسروں کے سامنے جھک رہے ہیں وہ دراصل خود اپنے مقام کو پتھروں سے بھی بدتر ثابت کر رہے ہیں۔ کیا ہمارا مقام بے جان چیزوں سے بھی بدتر ہے۔ اگر نہیں تو پھر توحید کے عقیدے میں ہماری بڑائی ہے۔ اور ہماری بڑائی یہی ہے کہ ہم سمجھ کر اپنے پیدا کرنے والے اور مارنے والے کے آگے سر عبادت خم کر رہے ہیں۔ اور شرک کے عقیدے میں سراسر بُرائی ہی بُرائی ہے۔

پھر فرمایا کہ اے قید خانے کے میرے دونوں ساتھیو مجھے ایک بات بتاؤ کہ جدا جدا معبود اچھے یا خدائے یکتا و غالب، ایک ہو گا تو ہم سب اس کا حکم مانیں گے۔ اور یہ ممکن بھی ہے لیکن اگر کئی حاکم ہوں اور محکوم (غلام) ایک ہو تو نتیجہ کیا ہو گا۔ ایک غلام کس کا حکم سنے گا اور کس کا حکم بجالائے گا۔ اگر حکم کی تعمیل میں کوتاہی ہو جائے تو پھر سزا بھگتنا پڑے گی۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اسی طرح دین کا معاملہ بھی ہے کہ ایک اللہ کو مانو، اسی کے احکام بجالاؤ اور اسی کی نافرمانی سے ڈرتے رہو۔ اور پھر مرنے کے بعد تو ہم سب کو اسی کے پاس جانا ہے۔ اب تم خود سوچو کہ ایک بہتر ہے یا کئی اچھے ہیں۔

ایک اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے تو انکی کوئی سند نازل نہیں کی۔ حکم تو بس اللہ ہی کا ہے اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ دین کا پیغام پہنچانے کے بعد یوسفؑ نے ان دونوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتادی، ساقی سے کہا کہ تو بری ہو کر پھر وہی اپنی پرانی خدمت پر مامور ہو جائے گا۔ اور نانبائی سے کہا کہ تجھے سولی پر لٹکایا جائے گا اور پرندے تیرا سر نوچ نوچ کر کھاجائیں گے۔ کہتے ہیں وہ دونوں قیدیوں پر بادشاہ کو زہر خورانی کا الزام تھا۔ تفتیش کے دوران دونوں نے اپنی براءت ظاہر کی حقیقت میں ساقی نے بھی گو شراب میں زہر ملانے کا وعدہ کیا تھا لیکن عین وقت پر وہ گناہ پر متنبہ ہو گیا اور زہر نہیں ملایا۔ لیکن نانبائی نے روٹیوں میں حسب وعدہ زہر ملا دیا۔ فیصلہ یہ سنایا گیا کہ دونوں اپنی اپنی وہ چیزیں جو انہوں نے تیار کی تھیں خود کھائیں۔ ساقی نے شراب پی لی۔ چونکہ اس میں زہر نہیں تھا وہ بچ گیا۔ البتہ نانبائی نے روٹی کھانے سے ہچکچایا۔ اور اقرار کر لیا تو

اس کو سولی دیدی گئی یا مجبوراً کھایا اور مر گیا۔ تو واقعہ کی تشہیر کی غرض سے اسکو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

یوسفؑ نے ساقی سے کہا کہ جب تم بری ہو کر بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا کہ ایک بے گناہ اور مظلوم آدمی بھی قید خانے میں رکھا گیا ہے۔ لیکن وہ رہائی پانے کی خوشی میں اور دوسرے کاموں میں مصروفیت کے سبب اسکو یوسفؑ کی وہ بات یاد نہ آئی اسی کو اللہ "پس اسکو شیطان نے بادشاہ کے پاس یوسفؑ کا ذکر کرنے سے بھلا دیا" کہتا ہے۔

اچھے کاموں کو بھلا دینا شیطان ہی کا کام ہے، یہ عام مفسرین کی تفسیر ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کے پاس اس آیت کے معنی اسطرح ہیں کہ یوسفؑ کا ساقی سے جو کہ ایک عام آدمی ہے مدد مانگنا عزیمت اور عالیت کے خلاف تھا۔ اگرچہ سخت اور سنگین حالات میں فطرتاً جائز ہے یعنی رخصتی فعل ہے لیکن عام لوگوں کیلئے نہیں، یوسفؑ تو پیغمبر تھے۔ پیغمبر کی نظر تو ہمیشہ اور ہر کام میں اللہ پر رہنی چاہئے اور اسی سے مدد مانگنی چاہئے۔ پھر کیوں یوسفؑ نے اللہ کو چھوڑ کر جو ان کا رب ہے جس کے بارے میں انہوں نے کچھ لمحوں پہلے قیدیوں سے پوچھا تھا کہ ایک رب بہتر ہے یا متعدد ارباب، تو اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ یوسف کو شیطان نے ان کے رب یعنی اللہ سے درخواست (ذکر) کرنے سے بھلا دیا۔ اور ساقی سے درخواست کی کہ تو اپنے مالک سے میرا ذکر کر۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ یوسف پر رحم کرے۔ اگر انہوں نے یہ جملہ نہ کہا ہوتا تو وہ اتنے سال قید میں نہ رہتے جتنے سال کہ وہ رہے۔ غالباً اسی وجہ سے اللہ نے ان کی قید کی مدت کو بڑھا دیا یعنی روایتوں کے مطابق پانچ، سات یا بارہ برس قید میں رہے۔ اور یہ بھی روایت آئی ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ خطاب ہوا "أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا﴿الإسراء: ٢﴾" "تم میرے سوا، اور کو اپنا کارساز مت بناؤ۔ یہ عتاب نہیں ہے بلکہ خطاب ہے۔

جس میں یوسفؑ سے کہا جارہا ہے کہ تمہارا مقام، منصب اور تمہاری پیغمبرانہ شان یہ نہیں ہے کہ تم اپنے جیسے آدمی سے مدد کی اُمید رکھو۔ پھر اس کے بعد یہ بات ہوئی کہ خود بادشاہ نے ایک حیرت انگیز خواب دیکھا۔ پورے ملک میں کوئی اسکی صحیح تعبیر نہ بتلا سکا تو اب اس ساقی کو اچانک یوسفؑ یاد آئے کہ خواب کی سچی تعبیر بولنے والا تو ایک شخص ہے مگر وہ قید میں ہے۔ پھر اس نے یوسفؑ کے پاس آکر بادشاہ کا خواب بیان کیا اور کہا کہ آپ اسکی تعبیر کہئے۔ میں دربار میں جاکر تعبیر سنادوں گا۔ پھر لوگ پوچھیں گے کہ یہ تعبیر کس نے بتائی تو میں آپ کا نام لوں گا۔ تب بادشاہ سمیت سب کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کا کیا مرتبہ ہے۔ اور ایسے ذی قدر لوگوں کو انہوں نے کہاں ڈال رکھا ہے بادشاہ نے ایک دن درباریوں سے کہا کہ میں خواب دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھارہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسری سوکھی۔ اے سردارو اگر تم خوابوں کی تعبیریں بتلا سکتے ہو تو میرے اس خواب کی تعبیر بتلاؤ۔ انہوں نے کہا کہ یہ پریشان خیالات ہیں اور سچی

بات تو یہ ہے کہ ہم کو خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں ہے۔ پھر ان دونوں قیدیوں میں سے جس نے قید سے رہائی حاصل کی تھی اور جس کو ایک مدت کے بعد یوسف کی بات یاد آئی تھی کہا کہ میں اسکی تعبیر بتاتا ہوں۔ مجھے باہر نکالو (مجھے یوسف کے پاس بھیجو) پھر وہ شخص یوسفؑ کے پاس قید خانے میں آیا اور کہا اے یوسف میرے سچے دوست ہم کو تعبیر بتا اس خواب کی کہ سات موٹی گائیوں کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں۔ اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات سوکھے ہیں۔

یوسفؑ نے کہا کہ تم سات سال متواتر کھیتی کروگے تو جو غلّہ تم کاٹو تو تمہارے اس غلّے کے سوا جو تمہارے کھانے میں آئے اُسے خوشوں میں ہی رہنے دو پھر اس کے بعد سات سال ایسے سخت (قحط کے) آئیں گے کہ جو غلّہ تم نے جمع کر رکھا ہوگا وہ سب کے کھانے کے کام میں آجائے گا صرف تھوڑا سارہ جائے گا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے پھر اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور اس میں لوگ رس بھی نچوڑیں گے۔ یعنی ہر قسم کی پیداوار بکثرت ہوگی۔ انگوروں سے شراب نچوڑی جائے گی اور تِلوں سے تیل۔

جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تعبیر ایک ایسے شخص نے بتائی ہے جو ایک ناحق مقدمہ میں قید میں رکھا گیا ہے تو اس نے حکم دیا کہ اس قیدی کو ہمارے پاس لاؤ۔ جب شاہی ہرکارے یوسفؑ کے پاس آئے اور کہا کہ بادشاہ آپ کو بلا رہے ہیں تو یوسفؑ نے شتابی نہیں دکھائی۔ اور ہوتے تو اس موقع کو غنیمت جان کر بادشاہ کا قرب حاصل کرنے کیلئے ایک لمحہ کی بھی دیر نہ کرتے۔ لیکن یوسفؑ عام آدمیوں میں سے نہیں تھے بلکہ پیغمبر تھے اور جیل سے نکل کر آپ کو عام لوگوں میں وعظ و نصیحت کرنا تھا۔ یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ آپ کا دامن کسی بھی وجہ سے داغ دار نہ ہو۔ ورنہ جب کسی پر کوئی تہمت لگے اور وہ اس سے بری نہ ہو تو لوگوں میں اس کا کردار تو مشتبہ ہی رہتا ہے جسکی وجہ سے اسکی بات، اسکی دعوت اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کے تحت حضرت یوسفؑ بادشاہ کے بلاوے پر بھاگے بھاگے چلے نہیں گئے بلکہ صبر و تحمل اور اعلیٰ کردار کا وہ نمونہ پیش کیا جو پیغمبروں کی خصوصیت ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کے ذریعہ یہ دریافت کروایا کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ ادب و احترام کے سبب زلیخا کا نام نہیں لیا۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ عورتوں کے مکر و فریب سے اللہ خوب واقف ہے۔ یہ ان کے مکر و فریب ہی کا نتیجہ تھا کہ مجھے جیل میں رکھا گیا۔ یہ جواب سن کر بادشاہ نے عورتوں سے پوچھا کہ تمہارا کیا قصہ ہے جب تم نے یوسفؑ کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا حاشا للہ ہم نے اس میں کوئی برائی معلوم نہیں کی۔ عزیز مصر کی بیوی نے کہا اب سچی بات تو ظاہر ہو ہی گئی۔ میں نے خود اس کو اپنی طرف پھسلایا تھا۔ اور بے شک وہ سچا ہے۔

یوسفؑ نے کہامیں نے اس لئے پوچھا کہ عزیز مصر کو یقین ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اسکی امانت میں خیانت نہیں کی۔ اور اللہ خیانت کرنے والوں کے مکر کو چلنے نہیں دیتا۔ بس اب یوسفؑ نے کہامیں اپنے نفس کو (بالذات) بری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے۔ بجز اس نفس کے جس پر میرا رب رحم فرمائے۔ بے شک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے۔ اسکے بعد بادشاہ نے حکم دیایوسف کو میرے پاس لاؤ میں اسکو اپنا خاص مصاحب بنالوں گا۔ پھر یوسفؑ بادشاہ کے پاس آئے، ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے کہا کہ آج سے تم ہمارے پاس معزز اور معتبر ہو۔ یوسفؑ نے کہا مجھ کو ملکی خزانوں پر مامور فرمایئے کیوں کہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور ان امور سے واقف بھی ہوں۔ اس طرح اللہ نے یوسفؑ کو اس سرزمین میں جگہ دی۔ وہ ملک میں جہاں چاہیں رہ سکتے تھے پھر جب قحط کا زمانہ آیا اور اناج کی قلت ہوگئی تو یوسفؑ کی تجویز کے مطابق جو غلّہ اسٹاک کیا گیا تھا وہ راتب بندی کے تحت لوگوں میں تقسیم کیا جانے لگا اور وہ بھی نسبتاً سستے داموں میں۔ باہر سے آنے والوں کیلئے بھی ایک اونٹ کا بوجھ غلّے کی رعایت تھی۔ جب یہ بات مشہور ہوگئی تو کنعان سے لوگ قافلوں کی شکل میں اونٹوں پر آنے لگے۔ یوسفؑ کے بھائیوں کو بھی ترغیب ہوئی وہ بھی مصر آئے۔ یوسفؑ کو جب کنویں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ بہت چھوٹے تھے۔ اب وہ بڑے بھی ہو گئے تھے اور بڑے عہدے کے مالک تھے۔ بھائی اس وضع قطع میں ان کو پہچان نہ سکے۔ لیکن یوسفؑ ان کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔

چونکہ یوسفؑ نے باضابطہ رجسٹر رکھوایا تھا جس میں غلّہ لینے والوں کے نام مع ولدیت اور افراد خاندان درج ہوتے تھے۔ تو بھائیوں نے یوسفؑ سے کہا کہ ہم اتنے بھائی ہیں اور ہمارا ایک باپ ہے۔ مگر ایک بھائی جو ہم سے چھوٹا ہے اس کو ہم اپنے ساتھ لا نہ سکے کیوں کہ ہمارے باپ اس کو اپنے سے کبھی جدا نہیں کرتے اور دوسرے یہ کہ وہ نابینا بھی ہیں۔ ان کی خدمت کیلئے کسی نہ کسی کا وہاں رہنا ضروری بھی ہے۔ یوسفؑ نے ان کی بات کو تسلیم تو کر لیا مگر جاتے وقت کہا کہ آئندہ غلّہ لینے کے لئے آؤ تو اسکو بھی ساتھ لانا تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میں ہر ایک کے حساب سے ناپ بھی پورا دیتا ہوں اور مہمانوں کی یہاں خاطر داری بھی اچھی طرح ہوتی ہے۔ اب تو اس کے حصے کا غلّہ خلاف قاعدہ دے دیا جاتا ہے لیکن آئندہ چکر میں اُسے ضرور ساتھ لانا۔ اگر تم اسکو ساتھ نہ لاؤ گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم جھوٹ بول کر ایک اونٹ غلّہ زیادہ لے جا رہے ہو۔ یاد رکھو دوبارہ آنا ہے تو بھائی کو ضرور ساتھ لاؤ ورنہ اس ملک میں قدم رکھنے کی ہمت بھی نہ کرنا ورنہ سزا کے مستحق سمجھے جاؤ گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے والد کو آمادہ کریں گے اور اسکے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔

یوسفؑ نے اپنے ماتحتوں سے کہہ کر غلّہ کی قیمت بھی غلّہ کی بوریوں میں ان کی لاعلمی میں رکھوادی اسکی وجہ یہ ہو سکتی

ہے کہ بھائیوں سے غلّہ کی قیمت لینا مروّت کے خلاف تھا۔ یا یہ کہ ان کے پاس شاید دوبارہ غلّہ خریدنے کی سکت نہ ہو اور وہ نہ آسکیں یا یہ کہ جب وہ غلہ کی قیمت کو بوریوں میں پائیں گے تو ان کو مزید ترغیب ہوگی کہ وہ دوبارہ غلہ خریدنے کیلئے آئیں۔ پھر جب وہ غلہ لیکر اپنے باپ کے پاس گئے تو بولے ابا ہمارے لئے غلّہ کی بندش کر دی گئی ہے تو آئندہ چکر میں آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے تا کہ ہم غلّہ لاسکیں۔ اور ہم بھائی کی پوری طرح حفاظت کریں گے۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کیا میں اس کے بارے میں ایسا ہی اعتبار کروں جیسا کہ اس سے پہلے اس کے بھائی پر کر چکا ہوں۔ سو خدا ہی بہتر نگہبان ہے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ پھر جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا تو انہوں نے اپنا سرمایہ (بوریوں میں) پایا جو ان کو واپس کر دیا گیا تھا۔ تو بولے اے ابا جان ہمیں اور کیا چاہئے۔ یہ دیکھو ہماری پونجی ہمیں واپس کر دگئی ہے۔ اب ہم اپنے گھر کے لئے (آئندہ) غلّہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت (بھی) کریں گے اور ایک اونٹ بوجھ غلہ بھی زیادہ لائیں گے، یہ غلّہ تو تھوڑا ہے، یعقوبؑ نے فرمایا میں ہرگز اسکو تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم اللہ کی قسم کھا کر پکّا قول نہ دوگے کہ تم ضرور اسکو میرے پاس واپس لاؤ گے بجز اس صورت کے کہ تم گھیر لئے جاؤ۔ یعنی ایسی کوئی ناگہانی آفت آجائے اور تم سب کے سب اس کا شکار ہو جاؤ (پہلے کی طرح نہیں کہ بھیڑیا تم کو چھوڑ کر صرف یوسف کو کھا گیا)

جب انہوں نے پکا قول و قرار دیا تو یعقوب علیہ السلام نے کہا ہمارے قول و قرار پر اللہ ضامن ہے۔ پھر جب وہ بنیامین کو لیکر دوبارہ جانے لگے تو یعقوبؑ نے کہا اے میرے بچّو! شہر میں ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔ بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے داخل ہونا (ورنہ تم لوگوں کی نظروں میں آجاؤ گے) یہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ فقط ایک احتیاطی تدبیر ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کے حکم سے اگر کوئی بات ہونے والی ہے تو اس تدبیر سے تم بچ جاؤ گے۔ حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے۔ ہاں اللہ کے حکم کے آگے انسان کی ساری تدبیریں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ لیکن انسان کو چاہئیے کہ تدبیر اختیار کرے اور اللہ پر بھروسہ کرے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک اعرابی سے فرمایا اونٹ کو درخت سے باندھ پھر اللہ پر بھروسہ کر۔ یہ عام لوگوں کیلئے ہے لیکن جن کا قدم تسلیم و تفویض کے میدان میں ہوتا ہے ان کی بات ہی کچھ اور ہے اور جب وہ شہر میں داخل ہوئے جس طرح کہ ان کے والد نے داخل ہونے کا حکم دیا تھا وہ تدبیر ذرا بھی اللہ کے حکم کو ٹال نہیں سکتی تھی سوائے اس کے کہ اس سے یعقوبؑ کے دل کی تسلّی اور ان کے دل کے تقاضے کی تکمیل ہوگئی۔ بے شک یعقوبؑ صاحب علم تھے کیوں کہ اللہ نے ان کو علم دیا تھا۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد جب وہ سب بھائی یوسفؑ کے پاس غلّہ لینے کے لئے پہنچے تو یوسفؑ نے بنیامین کو جو ان کے چھوٹے بھائی تھے الگ سے جگہ دی اور تنہائی میں یہ بتلادیا کہ میں تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں۔ جسے ان بھائیوں نے کنویں میں

ڈال دیا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اگر تمہارے ساتھ بھی راستے میں کوئی بدسلوکی کی ہے تو اس کا رنج نہ کرنا کیوں کہ اب غم غلط ہونے کا وقت آگیا ہے اب ان کی کچھ نہ چلے گی۔ پھر جب ان کا اسباب ان کے واسطے تیار کر دیا تو پانی پینے کا پیالہ بنیامین کے اسباب میں رکھ دیا۔ پھر جب وہ جانے لگے تو پکارنے والے نے پکار کر کہا اے قافلہ والو تم تو چور ہو وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تمہاری کونسی چیز گم ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا ہے اور جو شخص اسکو حاضر کریگا اسکو اونٹ کا ایک بوجھ غلّہ ملیگا اور میں اس کا ضامن ہوں، انہوں نے کہا اللہ کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم شہر میں فساد مچانے کو نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔ وہ بولے اگر تم جھوٹے نکلے تو اسکی کیا سزا ہے۔ کہنے لگے اسکی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں وہ ملے پس وہی اس کا بدل ہے (یعنی اسکو روک لیا جائے) پھر یوسفؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کے تھیلوں کی تلاشی شروع کی، پھر اپنے بھائی کے تھیلے سے پیالہ نکال لیا۔ یہ بھی جو کارروائی ہوئی تھی الہام خداوندی کے تحت ہی ہوئی تھی ورنہ وہاں کے قانون کے تحت یوسفؑ بنیامین کو روک نہیں سکتے تھے۔ کیوں کہ وہاں چور کی جو سزا تھی وہ تو یہ تھی کہ یا تو اسکو مارا جائے یا مال مسروقہ کی دگنی قیمت وصول کی جائے۔ یوسف کے بھائیوں نے کہا کہ اگر اسنے چوری کی تو (عجب نہیں) اس لئے کہ اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی۔

یوسفؑ کی چوری کیا تھی اس سے متعلق مختلف اقوال بیان کئے گئے ہیں (۱) آپ نے ایک سائل کو مرغیوں کے ڈربے میں سے ایک مرغی نکال کر دے دی تھی وہ بھی اپنے گھر ہی کی (۲) گھر میں ایک بت تھا جس کی پرستش کی جاتی تھی۔ آپ اسے خفیہ طور پر اُٹھا کر باہر لے گئے اور اس کو توڑ ڈالا۔ (۳) گھر ہی کے دستر خوان پر سے ایک آدھ روٹی پوشیدہ طور پر اُٹھا کر رکھ لئے تا کہ کسی سائل کو دے دیں۔ ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان واقعات میں سے ایک واقعہ پر بھی کیا چوری کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ مگر واہ رے حسد کہ علاتی بھائیوں نے یوسف اور بنیامین کو چور بنا ڈالا۔

(نوٹ) مفسرین نے یہ تینوں واقعات لکھے ہیں لیکن ان میں جو دوسرا واقعہ ہے ذہن اسکو قبول کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہے۔ حضرت یوسفؑ کو یہ بات بری لگی کہ یہ لوگ تو اپنے آپ کو پاکباز ظاہر کر رہے ہیں اور اپنی دوسری ماں کے دونوں بیٹوں کو چور ثابت کر رہے ہیں مگر حضرت یوسفؑ غم کھا گئے اور غصہ پی گئے اور دل میں کہا کہ تم تو بڑے بدقماش ہو۔ پھر ان بھائیوں نے کہا اے عزیز ان کے والد بہت بوڑھے ہو چکے ہیں سو ایسا کیجئے کہ اسکے بجائے ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیجئے۔ ہم کو آپ نیک مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ یوسفؑ نے کہا اللہ کی پناہ اس ناانصافی سے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی اس کو چھوڑ کر کسی اور کو پکڑ لیں۔ یہ تو بڑی ناانصافی کی بات ہو گی۔ جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ سب

سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کی قسم کھِلا کر وعدہ لیا ہے کہ تم اس بچے کی حفاظت کروگے۔ اور اس سے پہلے بھی تم یوسف کے حق میں کتنی حق تلفی کر چکے ہو سو میں اس جگہ سے ہر گز نہیں سرکوں گا جب تک میرے والد مجھے حکم نہ دیں یا اللہ میرے لئے کوئی فیصلہ فرمائے۔ کیوں کہ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم سب اپنے والد کے پاس جاؤ اور کہو ابّا آپ کے بیٹے (بنیامین) نے چوری کی اور ہم نے وہی کہا تھا جس کی ہم کو خبر تھی۔ یعنی ہم نے جو وعدہ کیا تھا وہ اپنی معلومات کی حد تک تھا ہمیں کیا خبر تھی کہ آپ کا یہ بیٹا چوری کرے گا غیب میں کیا ہونے والا ہے ہم کو تو اسکی خبر نہیں تھی۔ اور آپ ذمہ دار آدمیوں کو بھی بھیج کر اس بستی کے لوگوں سے بھی حقیقت دریافت کر سکتے ہیں علاوہ ازیں جو قافلے ہمارے ساتھ تھے آپ ان سے بھی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو یقین آجائے گا کہ ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ پھر بھی حضرت یعقوبؑ کو یقین نہ آیا آپ نے فرمایا یہ تو بس تمہارے دل کی ایک چال ہے (اس مرتبہ چال کا اشارہ حضرت یوسفؑ کی طرف تھا) بس اس مرتبہ بھی میں صبر کرلوں گا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اللہ اس طرح ان سب کو جو بچھڑے ہوئے ہیں یعنی یوسف اور بنیامین اور ایک بڑا بھائی جو سب بھائیوں سے الگ ہو کر رہ گیا تھا ایک جگہ جمع کر دے۔ بشر ہونے کی حیثیت سے صدمہ تو ہوا تھا پس آپ نے ان سے منھ پھیر لیا اور کہا ہائے افسوس یوسف پر (اور اتنا روتے رہے) کہ غم کی شدّت سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں اور وہ غم سے گھٹا کرتے تھے۔ بھائیوں نے کہا خدا کی قسم، آپ یوسف کی یاد کو نہیں چھوڑیں گے یہاں تک گھل جائیں یا جان ہی کھو دیں۔ یعقوبؑ نے فرمایا میں تو اپنے رنج و غم کا اظہار صرف اللہ سے کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے جو مجھے معلوم ہے وہ تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کے فیض رحمت سے نااُمید مت ہو بے شک اللہ کی رحمت سے وہی مایوس ہوتا ہے جو کافر ہے۔

پھر جب غلّہ لینے کے لئے یوسفؑ کے پاس گئے تو کہا اے عزیز ہم پر اور ہمارے اہل و عیال پر سخت تکلیف آپڑی ہے اور ہم یہ حقیر پونجی لائے ہیں سو آپ ہمیں پورا غلّہ بھی دیجئے اور کچھ بطور خیرات بھی۔ اللہ خیرات کرنے والوں کو اچھا بدلہ دیتا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ یوسفؑ نے کہا کہ تم کو خبر ہے کہ تم نے اپنی نادانی سے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا؟ یہ کہا اور یوسفؑ مسکرادئے۔ آپ کے دانتوں کو دیکھ کر بھائیوں کو گمان ہو گیا کہ یہ دانت تو ہمارے بھائی یوسف کے ہیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سوچا ہو کہ یہ کون آدمی ہے جو ہمارے گھر کے پورے رازوں سے واقف ہے۔ کنعان سے مصر تک کا سفر اور مصر میں یہ سوال، کیا یہی سچ مچ یوسف ہیں۔ فوراً بول اُٹھے کیا آپ ہی سچ مُچ یوسف ہیں۔ یوسفؑ نے فرمایا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے (یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہم سب کو ملا دیا۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے، جسے تم نے بھگوڑا غلام کہہ کر بیچ دیا تھا، آج مصر کی سلطنت عطا کی ہے۔ اور تم کو میرے سامنے خیرات مانگتے ہوئے کھڑا کیا ہے)۔ واقعی جو لوگ اللہ سے

ڈرتے ہیں اور مشکلات میں صبر کرتے ہیں اللہ ان کی محنتوں کا اچھا بدلہ دیا کرتا ہے۔ بھائیوں نے کہا اللہ کی قسم اللہ نے ہم پر آپ کو فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم ہی خطا کار تھے۔

یوسفؑ نے جب دیکھا کہ سب بھائی بے بسی اور ندامت کے ساتھ اپنی غلطیوں اور خطاؤں کا اعتراف کر رہے ہیں تو آپ بے تاب ہو گئے اور فرمایا آج تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا آج تم پر کوئی عتاب بھی نہیں ہو گا اللہ تم کو معاف کرے۔ جاؤ اور یہ میرا کرتہ بھی لے جاؤ اور اُسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دو وہ بینا ہو جائیں گے۔ سبحان اللہ کیا معجزہ ہے، کرتے کی خوشبو ناک نے محسوس کی اور آنکھوں میں بینائی آ گئی۔ کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ معجزہ تو اسی کو کہتے ہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ ورنہ جو سمجھ میں آجائے وہ یا تو فلسفہ ہے یا سائنس، کرتہ محض ایک ظاہری سبب تھا، مسبب الاسباب نے جب اپنا حکم جاری کر دیا بس کام ہو گیا۔ اور دوسری بات جو نہایت تعجب خیز ہے وہ یہ ہے کہ یوسفؑ، کنعان کے آس پاس کنویں میں تین دن رہے اور بھائیوں نے جھوٹ کہہ دیا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا تو یعقوبؑ کو یوسف کی اطلاع نہیں ہوئی۔ مگر ایک مدت کے بعد جب قافلہ یوسفؑ کا کرتہ لیکر مصر سے روانہ ہوا تو یوسفؑ کی خوشبو، یعقوبؑ کی مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔ بس یہ سب راز کی باتیں ہیں جو صرف خدا ہی جانتا ہے۔

اور آپ نے یہ بھی فرمایا تم تمام گھر والوں کو بھی ساتھ لاؤ۔ یہ اس لئے فرمایا کہ والئی سلطنت ہونے کی وجہ سے آپ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اُدھر یہ قافلہ یوسفؑ کا پیرہن لیکر نکلا اور ادھر یعقوبؑ کی زبان سے نکلا کہ اگر تم یہ نہ کہو کہ میں بڑھاپے میں بہک گیا ہوں، یوسف کی محبت میں عقل سٹھیا گئی ہے تو میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ گھر والوں نے کہا خدا کی قسم تم تو بس یوسف کی محبت میں وارفتہ ہو گئے ہو۔ بس یہی خیال ہے کہ یوسف زندہ ہے، تلاش کرنے پر وہ مل جائے گا وغیرہ۔ یہی پرانے خیالات آپ پر حاوی ہو گئے ہیں۔ پھر جب خوش خبری دینے والا یعقوبؑ کے پاس آیا اور یعقوبؑ کے چہرے پر یوسفؑ کا کرتہ ڈالا تو آپ کی آنکھیں روشن ہو گئیں تب آپ نے فرمایا کیا میں تم سے یہ نہیں کہتا تھا کہ اللہ کی طرف سے مجھے ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کو تم نہیں جانتے۔ اس وقت یعقوبؑ کے فرزندوں نے کہا اے ہمارے ابا جان بیشک ہم ہی خطا کار تھے اب آپ اللہ سے ہمارے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے ہمیں بخشوائیے۔ آپ نے فرمایا عنقریب میں تمہارے لئے دعاء مغفرت کروں گا۔ بے شک وہ غفور الرحیم ہے۔ پھر ماں باپ، سب بھائی اور گھر والے جب مصر پہنچے تو حضرت یوسفؑ استقبال کے لئے شہر کے دروازے پر آئے۔ ماں باپ کو اپنے قریب میں جگہ دی (نوٹ) اس باب میں اختلاف ہے کہ کیا یوسفؑ کی والدہ حیات تھیں یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وصال پا چکی تھیں۔ البتہ آپ کی خالہ تھیں جو آپ کی پرورش کر رہی تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ

وہ حیات تھیں اور یعقوبؑ کے ساتھ مصر تشریف لائی تھیں واللہ اعلم۔ پھر آپ نے سب سے کہا شہر میں چلو اور راحت و اطمینان سے رہو پھر یوسفؑ نے والدین کی تعظیم و تکریم کی۔ والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب ان کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا جو آدم سے لیکر عیسیٰؑ تک جائز تھا۔ سجدہ عبادت تو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہے۔ اللہ کے سوا دوسروں کیلئے سجدہ عبادت حرام ہے اور کرنے والا مشرک ہے۔ بعض لوگوں نے سجدہ کے معنی محض جھکنے کے لئے ہیں۔ لیکن جب خرّوا لہ سُجّداً کے الفاظ آئے ہیں تو یہاں معنی صرف جھکنے کے نہیں ہوسکتے۔ البتہ ایک نفیس توجیہ یہ کی گئی ہے کہ لہٗ میں لام کو سببیہ سمجھا جائے اور معنی یہ کئے جائیں کہ سجدہ تو اللہ کے لئے تھا لیکن اس کا سبب اس خاص موقع پر یہ تھا کہ چونکہ اللہ حضرت یوسفؑ کو نہ صرف زندہ رکھا، بلکہ اونچا مقام عطا فرمایا۔ سلطنت و حکومت سے نوازا نبوت عطا فرمائی اور ماں باپ سے ملایا تو ان اسباب کی وجہ سے اللہ کا سجدۂ شکرانہ ادا کیا گیا۔

اس وقت پر حضرت یوسفؑ نے فرمایا اے ابّا جان اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے بلکہ بچپن میں میں نے جو خواب دیکھا تھا یہ اس کی تعبیر ہے جس کو اللہ نے سچ کر دکھایا۔ پھر آپ نے اللہ کے احسانات کا ذکر فرمایا یعنی ایک تو یہ کہ اس نے مجھے قید خانے سے (عزت کے ساتھ) نکالا اور دوسرا یہ کہ اس نے تم سب کو گاؤں سے یہاں لایا حالانکہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا۔ اور یہ کہا بے شک میرا پرودگار جو چاہتا ہے اس کے لئے عمدہ تدبیر کرتا ہے۔ وہی خبر دار اور حکمت والا ہے۔ پھر یوسفؑ نے دعا کی اے میرے رب تو نے مجھے سلطنت بھی دی اور خوابوں کی تعبیر کا علم بھی سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے مجھ کو اسلام پر موت دے اور مجھکو نیک لوگوں میں شامل فرما۔

یادداشت ذکر

قرآن مجید میں اللہ نے جتنازور ذکر پر دیا ہے کسی اور چیز پر نہیں دیااور جتنی تعریف ذکر کرنے والوں کی فرمائی ہے کسی اور کی نہیں (اسلام، شیخ علی طنطووی، ترجمہ سید شبیر احمد ۱۴۵) علاوہ ازیں زبان سے بھی اللہ کو یاد کرنا چاہئے، خوشی، غمی، کے تمام موقعوں پر اللہ کو زبان سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ بشر طیکہ حضور قلب میّسر ہو۔ اور اگر ذہن غائب ہو اور جو کچھ آپ زبان سے ادا کر رہے ہیں دل میں نہ اترے تو یہ ذکر کلام مہمل ہو گا بے مقصد اور بے معنی۔

جس طرح شام کے وقت کیک بیچنے والے آواز لگاتے ہیں ''اللہ کریم'' ان کا مقصد ذکر الٰہی نہیں بلکہ کیک فروخت کرنا ہوتا ہے یا سبزی فروش پکارتے ہیں اللہ دائم وغیرہ اور کبھی کبھی زبان کا ذکر گناہ بھی بن جاتا ہے مثلاً کوئی شخص شراب پیتے وقت بسم اللہ پڑھے یا پیشہ ور گانے والیوں کے فحش گیتوں پر سبحان اللہ کہا جائے۔ ۱۴۷

رقص (وجد وحال) آج کل جن محفلوں کو محفل ذکر کہا جاتا ہے ان میں رقص (وجد وحال) کا رواج ہے اور اس وجد میں قیام، رکوع، جھکنے اور سیدھا کھڑا ہونے کی سی متوازن حرکات سرزد ہوتی ہیں، مخصوص نغمے گائے جاتے ہیں اور صاحب وجد کلمہ طیبہ کے بجائے اکثر آہ، واہ، اوہ قسم کی مبہم آوازیں نکالتا ہے۔ بنابریں رسائل ابن عابدین میں لکھا ہے کہ یہ عمل حرام ہے۔

البتہ اگر صاحب وجد مغلوب الحال ہو اور اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو اور یہ حرکتیں ارادۃً نہ کر رہا ہو بلکہ اس کا باعث غلبۂ جذبات ومستئی حال ہو تو حرام نہیں ہے۔ ۱۴۸

یتیم

جس نابالغ بچے یا بچی کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے اس کو یتیم کہتے ہیں اور جس لڑکے یا لڑکی کے ماں اور باپ دونوں مر جاتے ہیں اس کو یتیم الطرفین کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ﴿النساء:۲﴾ اور یتیموں کو انکا مال واپس کر دو اور (انکے) پاکیزہ مال کو (اپنے) برے مال سے نہ بدلو، اوران کا مال اپنے مال میں ملا کر نہ کھاؤ، بے شک یہ بڑا سخت گناہ ہے۔

ایک شخص اپنے بھتیجے کا جو یتیم ہو گیا تھا، ولی بن گیا، وہ بچہ مال دار تھا، جب وہ بچہ بالغ ہو گیا اور اپنا مال واپس لینا چاہا تو اس کے چچا نے دینے سے انکار کر دیا، بچہ کی ماں نے آنحضرت ﷺ سے اس امر کی شکایت کی، حضور ﷺ نے اس کو بلا کر سمجھایا، اسنے دیدیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ عام طور پر قرابت دار ہی یتیموں کے والی ہوتے ہیں، اس لئے قرابت داری کے ذکر کے ساتھ ان یتیموں کا بھی ذکر کر دیا، کیونکہ یتیم کا مال کھانا گویا پیٹ کو آگ سے بھرنا ہے، عام طور پر یہ بھی ہوتا ہے اگر لڑکیاں یتیم ہو جائیں، تو وہ کسی ولی کی زیر سرپرستی ہی رہتی ہیں، پس اگر یتیم لڑکی صاحب مال اور صاحب جمال ہوتی تو وہ ولی خود اس سے شادی کر لیتا، تاکہ مال و جمال دونوں سے لطف اندوز اور بہرہ مند ہو، کبھی ولی اس کے مال کی خاطر اس سے نکاح کر لیتا، لیکن اس کی طرف توجہ نہ دیتا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا، لڑکی صاحب جمال تو نہیں ہے لیکن صاحب مال ہے تو ولی اس خیال سے کہ اگر میں اس سے نکاح نہ کروں گا تو کوئی دوسرا اس کے مال میں شریک ہو جائیگا، اس یتیم لڑکی سے (بڑی ہونے کے بعد) شادی کر لیتا، لیکن برائے نام، اس کی نظر تو صرف اس کے مال پر ہوتی۔ کبھی یہ صورت بھی ہوتی کہ ان یتیموں کے اچھے مال کو اپنے برے مال میں ملا دیا جاتا، ان صورتوں میں یتیم لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے ان کو روک دیا، اور فرمایا کہ اگر تم کو پسند ہے تو کرو، اور اگر تم کو وہ پسند نہیں ہیں تو دوسری جو عورتیں تم کو پسند ہیں تم آزادی کے ساتھ چار بیویوں کی حد تک نکاح کر سکتے ہو، انصاف اور عدل کی شرط کے ساتھ ورنہ بس ایک ہی پر اکتفاء کرنا پڑیگا، اسی لئے اللہ فرماتا ہے، وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ﴿النساء:۳﴾ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند ہوں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کر لو، اگر تم کو ڈر ہے کہ تم سب کے ساتھ یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک ہی کرو، یا وہ (شرعی) لونڈی جس کے تم مالک ہو، یہ زیادتی سے بچنے کا قریب تر (طریقہ) ہے۔

اللہ نے یتیموں کے بارے میں یہ حکم بھی دیا کہ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ﴿النساء:٦﴾ اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں، پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی (تمیز) پاؤ تو ان کا مال انکے حوالے کر دو اور تم فضول خرچی کرتے ہوئے اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے، جلدی جلدی ان کا مال مت کھاجاؤ، اور جو شخص آسودہ حال ہے اس کو تو بچنا چاہئے، اور جو شخص فقیر ہو تو وہ دستور کے مطابق کھائے اور جب تم ان کا مال ان کے حوالے کر دو تو لوگوں کو انپر گواہ بھی کر لیا کرو، اور حساب لینے کیلئے اللہ کافی ہے۔

ایک آیت میں تو اللہ نے غریبوں، یتیموں، مسکینوں اور کنبے کے (غیر وارث) رشتہ داروں کو بھی کچھ تبرع (احسان) کے طور پر دیدینے کا حکم دیا ہے، اگر وہ لوگ میراث کی تقسیم کے وقت حاضر ہو جائیں، چنانچہ ارشاد باری ہے "وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿النساء:٨﴾ اور جب میراث کی تقسیم ہو رہی ہو اگر (غیر وارث دور کے) رشتہ دار اور یتیم اور غریب آجائیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دیدیا کرو۔ اور ان کے ساتھ اچھی بات کرو۔

اللہ نے یتیموں کا مال کھانے والوں کو سخت وعید سنائی ہے چنانچہ فرماتا ہے إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿النساء:١٠﴾ بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناانصافی سے کھاجاتے ہیں وہ (در حقیقت) اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

یونس علیہ السلام

ذوالنون کا نام یونس ہے۔ ذوالنون آپ کا لقب کیوں ہوا۔ اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یونسؑ بھی پیغمبر تھے۔ اللہ نے پیغمبروں کی فہرست میں آپ کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

(۱) وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿النساء:١٦٣﴾۔ اس آیت میں اللہ نے ان مقدس ہستیوں میں یونسؑ کا بھی نام لیا ہے جن کی طرف اللہ نے وحی بھیجی تھی۔ (۲) اسی طرح سورۂ انعام کی ۸۶ ویں آیت میں بھی یونسؑ کا ذکر پیغمبروں کے ساتھ فرماتے ہوئے

ارشاد ہوا ہے کہ ان کو ہم نے تمام دنیاوالوں پر فضیلت بخشی ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿الأنعام:٨٦﴾۔ اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی (ہم نے ہدایت دی) اور سبکو ہم نے دنیاوالوں پر فضیلت دی۔

(۳) فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿یونس:٩٨﴾ ترجمہ: پس کوئی بستی ایسی نہ ہوئی کہ وہ ایمان لائی تو اس کا ایمان لانا اس کو نفع بخش ہوا سوائے قوم یونس کے کہ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی سے ذلت کے عذاب کو دور کر دیا اور ایک مدت تک ان کو فائدہ پہنچایا۔

تفصیل یوں ہے: ایک بات تو یقینی ہے کہ عذاب کے آثار کو دیکھ کر اگر کوئی ایمان لائے تو اس کا ایمان نہ مقبول ہے نہ معتبر۔ البتہ یونسؑ کی قوم کی توبہ کو اللہ نے قبول کیا جو کہ ایک استثناء ہے واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونسؑ کو اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا آپ نے سات سال تک متواتر، توحید کا پیغام دیا۔ مگر لوگ آپ کو جھٹلاتے رہے۔ آخر میں تنگ آکر آپ نے کہا کہ دیکھو تین دن کے اندر تم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ تیسری ہی رات کو آدھی رات کے بعد آپ اس بستی کو چھوڑ کر چلے گئے، عذاب کے آثار و علامات شروع ہو گئے۔ دھوئیں کی ایک کیفیت پیدا ہوئی جو بڑھتے بڑھتے ان کے گھروں کی چھتوں تک پہنچ گئی یہ دیکھ کر پوری بستی والے ڈر گئے۔ یونسؑ کی تلاش شروع کی وہ نہ ملے بالآخر وہ سب مرد عورتیں اور بچے بلکہ جانور مویشی وغیرہ کو ساتھ لیکر روتے چلاّتے اس بستی سے نکل کر ایک جنگل میں چلے گئے اور سچے دل سے توبہ کرتے ہوئے اللہ کو پکارنے لگے اللہ کو ان کی حالت زار پر رحم آگیا اور اس نے عذاب کی وہ علامتیں ہٹا دیں۔ اس طرح دنیوی زندگی میں ذلت کا عذاب جو ان کو ملنے والا تھا وہ ٹل گیا۔ اور وہ دنیا میں کافی دنوں تک اچھی حالت میں رہے۔ اب یہاں سے ایک قضیہ کلیہ بیان ہو رہا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو زمین پر بسنے والے سب کے سب مومن ہو جاتے لیکن اللہ کی مشیت ایسی نہیں ہے بلکہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو ہم نے جو عقل عطا فرمائی ہے اس کو کام میں لائیں اور اچھے برے میں تمیز کریں، حق اور باطل کو کھیں اور ایمان لائیں جو شخص سوچ سمجھ کر ایمان لانے کا ارادہ کرتا ہے اللہ اس کو ایمان کا نور عطا کرتا ہے اور جو شخص سمجھ کر بھی محض ہٹ دھرمی، ضد اور انانیت کے سبب دلائل اور براہین قطعیہ کا انکار کرتا ہے تو اللہ اسکو ایمان سے محروم کر دیتا ہے۔

یقین

واقعہ کے مطابق پکّے اعتقاد کو یقین کہتے ہیں اس کے تین درجے ہیں، علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔

(۱) علم الیقین: کوئی شخص کسی چیز کو پختہ اعتقاد کے ساتھ جان لے، مثلاً یہ علم کہ آگ کا کام جلانا ہے۔
(۲) عین الیقین: کسی شخص کو اس علم کے ساتھ اس کا مشاہدہ بھی ہو جائے، مثلاً اپنی آنکھوں سے دیکھلے کہ آگ کسی چیز کو جلا رہی ہے۔
(۳) حق الیقین: کوئی شخص اس کی صفت سے متصف ہو جائے، جیسے آگ میں ہاتھ ڈال کر دیکھ لے کہ اس کے ہاتھ کو آگ کس طرح جلا رہی ہے۔

قرآن میں لفظ یقین سات مقامات پر آیا ہے۔
(۱) وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿الحجر:۹۹﴾ ترجمہ۔ اپنے پروردگار کی عبادت کر، یہاں تک کہ تجھ کو یقین آجائے۔
(۲) إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴿الواقعة:۹۵﴾ ترجمہ۔ بے شک یہی حق الیقین ہے۔
(۳) أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ﴿النمل:۲۲﴾ ترجمہ: مجھے وہ بات معلوم ہوئی جسکی آپ کو خبر نہیں، میں سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔
(۴) وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿المدثر:۴۶،۴۷﴾ ترجمہ: ہم قیامت کے دن کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ یقینی بات ہمارے سامنے آگئی۔
(۵) وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿الحاقة:۵۱﴾ ترجمہ: اور یہی یقینی بات ہے۔
(۶) كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ﴿التکاثر:۵﴾ ترجمہ: ہر گز ایسا نہیں، کاش کہ تم کو علم یقین رکھتے، اگر تم علم الیقینر رکھتے ہو۔
(۷) ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ﴿التکاثر:۷﴾ ترجمہ: پھر تم اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے۔
آیت نمبر ۶ میں علم الیقین کہا گیا ہے اور آیت نمبر ۷ میں عین الیقین کی بات کہی گئی ہے، آیت نمبر (۲) اور آیت نمبر (۵) میں "حق الیقین" فرمایا گیا ہے۔